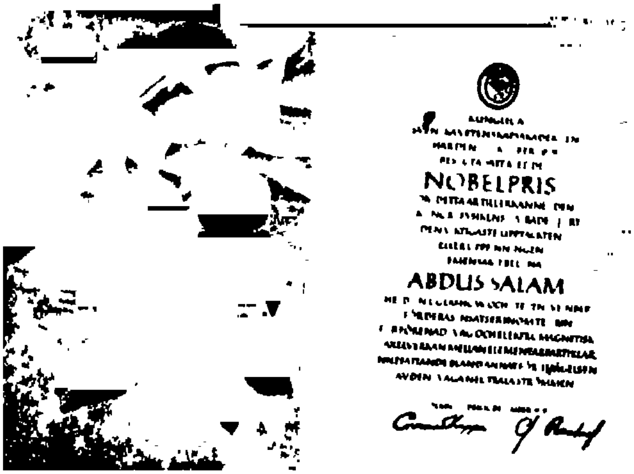
تہذیب الاخلاق

۱۹۸۴



عبدالسلام نمبر



Rs. 4.50


بہار نو بے بی ٹانک
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا اور دانت
نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
شربت
نزلہ
کھانسی
زکام۔ نزلہ کے لئے
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
دماغین
تمام دماغی کام کرنیوالوں
کے لئے نایاب تحفہ
خون صفا
خون کی خرابی پھوڑے
پھنسی، خارش اور
داد وغیرہ کی
دوا
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE M.U. ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ یو۔ پی


بہار نو بے بی ٹانک
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے اور دانت
نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
شربت
نزلہ
کھانسی
زکام. نزلہ کے لئے
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
دماغین
تمام دماغی کام کرنیوالوں
کے لئے نایاب تحفہ
خون صفا
خون کی خرابی سے
دانہ وغیرہ کی
دوا

Litho Colour Printers, Achal Tal, G. T. Road, Aligarh Phone : 4185

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

پروفیسر عبدالسلام

کی

ساٹھویں سالگرہ

پر

تہذیب الاخلاق

کی

خصوصی پیش کش

بانی : سرسید احمد خاں

سرپرست : سید ہاشم علی
وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مدیر : سید حامد

مدیر مسؤل : نورالحسن نقوی

مرتبین
پروفیسر نسیم انصاری
پروفیسر آئی احمد
ڈاکٹر عالم حسین

تزئین : سرفراز

مدیر معاون
قمرالہدیٰ فریدی

جلد ۵ ✱ یکم تا ۳۱ جنوری ۱۹۸۶ء ✱ شمارہ ۱، ۲

مندرجات

نذر عبدالسلام ——— ۳

یقین محکم، عمل پیہم ——— پروفیسر عبدالسلام ——— ۵

اسلام اور سائنس ——— پروفیسر عبدالسلام
ترجمہ پروفیسر نسیم انصاری ——— ۱۱

آئی سی ٹی پی ——— پروفیسر آئی احمد ——— ۳۲

عبدالسلام ـــ ایک مجاہد سائنس داں ——— پروفیسر آئی احمد ——— ۳۳

وحدت، حقیقت اور عبدالسلام ——— پروفیسر جان زیمان
ترجمہ ڈاکٹر عالم حسین ——— ۳۷

یورپ کی عالمی ذمہ داریاں ——— پروفیسر عبدالسلام
ترجمہ حسن شاہد رضوی ——— ۴۳

پروفیسر عبدالسلام کے کارنامے ایک نظر میں ——— ۵۰

نذرِ عبدالسلام

سرسید اپنے ملک و قوم کی محبت میں ایسے سرشار تھے کہ ان کی زندگی کا کوئی لمحہ اس کی فکر سے خالی نہ تھا۔ سفرِ انگلستان کے دوران انھیں ایک نئی دنیا کی سیر کا موقع ملا جو ان کے اپنے ملک کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوشحال اور ترقی یافتہ تھی۔ جب وہ بہترین درسگاہیں دیکھتے تو ملال ہوتا کہ ہم ایسی درسگاہوں سے کیوں محروم ہیں۔ جدید طرز کی شاندار عمارتیں دیکھتے تو جی چاہتا کہ کاش ہماری عمارتیں ان سے بڑھ کر ہوتیں۔ انگلستان کے خوش رنگ پھولوں پر نظر پڑتی تو خواہش ہوتی کہ ایسے ہی پھول ہمارے چمنوں میں بھی لہلہائیں۔ مغربی اقوام کے صحت مند اور شاداب چہروں پر رشک آتا اور افسوس ہوتا کہ ہم ان کے مدِمقابل کیوں نہ ہوئے۔ کچھ ایسی ہی تڑپ پروفیسر عبدالسلام کے دل میں بھی رہی ہے۔ سائنس کی دنیا پر یورپ کی حکمرانی دیکھ کر انھیں تاسف ہوا کہ ہمارے ملک ترقی کی اس دوڑ میں دوسروں سے پیچھے کیوں ہیں۔ ٹیکنالوجی کے ہر میدان میں جاپان کو آگے بڑھتے دیکھ کر انھیں تیسری دنیا کا خیال آیا جو ابھی تک پوری طرح خواب سے بیدار بھی نہیں ہوئی۔ مسلم ممالک کی پسماندگی نے انھیں اور بھی زیادہ مغموم کیا کہ کبھی انھیں کے دم سے علم کا چراغ روشن تھا۔

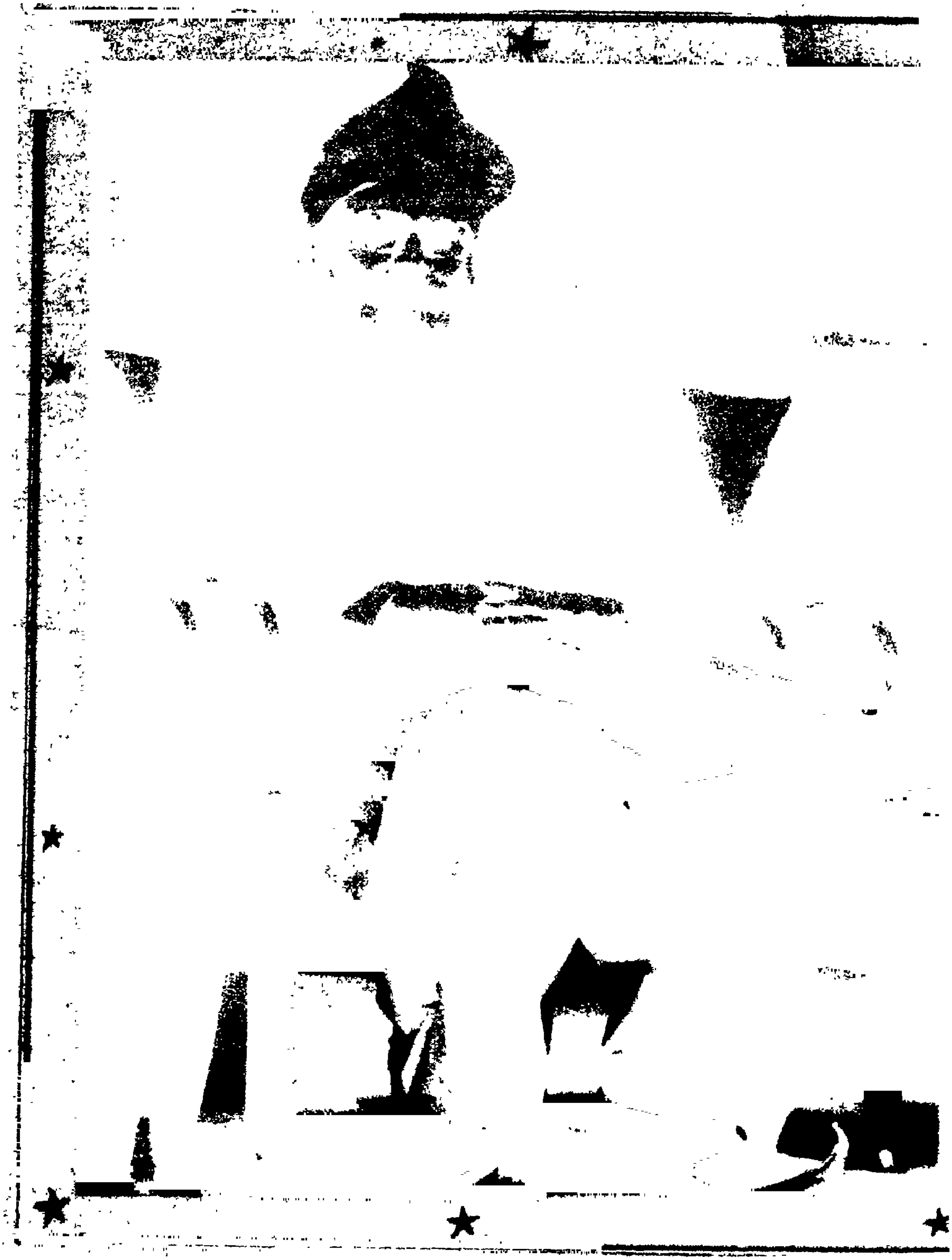
سرسید نے اپنی تعلیمی اور اصلاحی سرگرمیوں کو ہندوستان اور پھر حالات سے مجبور ہو کر ہندوستانی مسلمانوں تک محدود رکھا۔ سرسید کے ایک صدی بعد پروفیسر عبدالسلام نے سائنس کے فروغ کا بیڑا اٹھایا تو ساری کوششیں اس پر صرف کردیں کہ بلا امتیازِ مذہب و ملت پوری دنیا کی پسماندہ اقوام کو کس طرح ترقی یافتہ قوموں کے برابر لا کھڑا کریں لیکن سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں مسلمانوں کی حالت آج بھی کم و بیش وہی ہے جو سرسید کے زمانے میں تھی۔ اس لیے مسلمانوں کی طرف ان کی توجہ نسبتاً زیادہ ہے۔

پروفیسر عبدالسلام کی صلاحیتوں کا اعتراف بہت پہلے کیا جانے لگا تھا اور کم عمری ہی میں انھیں رائل سوسائٹی کا فیلو منتخب کر لیا گیا تھا۔ اب سے بائیس سال قبل وہ نظریاتی طبیعیات کے عالمی مرکز (I.C.T.P.) کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ ۱۹۷۹ء میں نوبل پرائز حاصل کرنے کے بعد اس کے قوی امکانات موجود ہیں کہ انھیں اس قابلِ رشک اعزاز سے ایک بار پھر نوازا جائے۔ اتنے اعزازات و اعترافات کے بعد عجب نہ تھا کہ دوسرے عظیم سائنس دانوں کی طرح وہ بھی سائنسی تحقیق کی دنیا میں گم ہو کے رہ جاتے مگر انھوں نے تیسری دنیا کے لیے ایک سائنس اکیڈمی (TWAS) قائم کی ہے جس کی سرگرمیوں کا آغاز ہو چکا ہے۔ کچھ دنوں پہلے تہذیب الاخلاق کے صفحات پر اس خیال کا اظہار کیا گیا تھا کہ ہندوستان میں بھی ایک ایسے ہی ادارے کی ضرورت ہے جو خاص طور پر مسلمانوں کو سائنس کی طرف متوجہ کر سکے۔ الحمدللہ کہ سینٹر فار پروموشن آف سائنس کے نام سے علی گڑھ میں یہ ادارہ پروفیسر اسرار احمد کی کوششوں سے وجود میں آچکا ہے جسے حکومتِ ہند کے علاوہ پروفیسر عبدالسلام اور ان کے مرکز کی مکمل سرپرستی حاصل ہے۔

تہذیب الاخلاق اس سائنسی مرکز کا ترجمان ہے اور اس کے ذریعے سائنس کو فروغ دینے کی کوششیں جاری ہیں۔ اور تہذیب الاخلاق کے ساتھ پندرہ روزہ ہندی ثقافت میں بھی سائنس پر مضامین شائع کیے جارہے ہیں۔ پروفیسر عبدالسلام تہذیب الاخلاق کے لائف ممبر ہیں۔ یقین ہے کہ ان بامقصد رسالوں کو ان کی اور ان کے مرکز کی سرپرستی ہمیشہ حاصل رہے گی۔

تہذیب الاخلاق کا یہ خصوصی شمارہ پروفیسر عبدالسلام کی ساٹھویں سالگرہ پر ان دعاؤں کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے کہ تیسری دنیا بالخصوص عالمِ اسلام میں سائنس کے فروغ کے لیے پروفیسر صاحب جو مساعی فرما رہے ہیں خدا انھیں کامیاب کرے اور اپنی قوم کی ترقی کے لیے ان کے دل میں جو امنگیں اور آرزوئیں ہیں وہ اس قوم کے نونہالوں کو بھی عطا ہوں۔

نورالحسن نقوی



پروفیسر عبدالسلام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یقیں محکم، عمل پیہم

میں جھنگ کالج میں ۱۹۳۸ء میں ۱۲ برس کی عمر میں داخل ہوا۔ چار سال یہاں گزارے۔ اس زمانے میں یہ کالج انٹرمیڈیٹ کالج تھا۔ نویں، دسویں، فرسٹ ایئر اور سکنڈ ایئر کی کلاسیں تھیں۔ کثرت ہندو طلبار کی تھی۔ میری خوش قسمتی تھی کہ کالج میں مجھے نہایت قابل اور شفیق استاد ملے۔ پرنسپل گجرات کے حکیم محمد حسین مرحوم تھے۔ انگریزی کے استاد شیخ اعجاز احمد، عربی کے شفیق استاد صوفی ضیاء الحق، فارسی کے استاد خواجہ معراج الدین، حساب اور سائنس کے مضمون اس زمانے میں ہندوؤں اور سکھوں کی ملکیت سمجھے جاتے تھے۔ حساب میں لالہ بدری ناتھ اور لالہ رام لال۔ فزکس کے استاد لالہ ہنس راج اور کیمسٹری کے استاد لالہ نوبت رائے تھے۔

میرے تعلیمی کیریر کی بنیاد اسی کالج میں پڑی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری بعد کی ہر کامیابیاں اس کالج کی تعلیم اور میرے جھنگ کے استادوں کی شفقت کی مرہون منت ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ استاد کی شفقت اور توجہ کی نگاہ شاگرد کو آسمان تک پہنچا سکتی ہے۔ اس توجہ کی ایک مثال عرض کروں۔ فرسٹ ایر کے دوران میں نے انگریزی کے بہت سے نئے اور خوبصورت لفظ سیکھے۔ پسند آئے اور میں اپنی تحریر میں ان مشکل اور بعض اوقات متروک لفظوں کو بے تکلف اور بے محل استعمال کرنے لگا۔ استاد گرامی جناب شیخ اعجاز صاحب نے کئی بار ٹوکا۔ تنبیہ فرمائی۔ میری طرف سے تعاون نہ ہوا۔ سہ ماہی کا امتحان آیا جناب شیخ صاحب نے پرچہ مارک فرمایا۔ ہر متروک اور بے محل لفظ کے استعمال پر فی لفظ پانچ نمبر کے حساب سے نمبر کاٹ لیے۔ ظاہر ہے میرا ٹوٹل صفر کے قریب جا پہنچا۔ پھر اسی پر اکتفا نہ کی کلاس میں میرا پرچہ لائے اور ہر ہر غلط لفظ کا تذکرہ ساری کلاس کو سنایا۔ اس کے بعد پرچہ میرے حوالے کیا اس پر تحریر تھا۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی ۔ کیں راہ کہ میروی بترکستان است

اس وقت مجھے یہ خصوصی سلوک بہت ناگوار گزرا لیکن اب غور کرتا ہوں تو یہ سراسر شفقت تھی، نوازش تھی، کرم تھا۔ اس SHOCK THERAPY کا اثر یہ ہوا کہ کم از کم انگریزی میں خوبصورت لیکن بے محل لفظ استعمال کرنے کی عادت چھوٹ گئی۔

میری تعلیم جہاں استادوں کی مرہون منت تھی اس سے زیادہ قبلہ والد صاحب کی نگہ اور ان کی دعاؤں کی مرہون منت تھی۔ اس زمانے میں میٹرک کا امتحان صوبہ پنجاب کے لیے ایک قسم کا اکھاڑا ہوا کرتا تھا۔ جس میں مختلف اسکولوں کے پہلوان دنگل کیا کرتے تھے۔ خاص طور پر سناتن دھرم اور آریہ اسکولوں کے طلبار اس دنگل کے نامی پہلوان تصور کیے جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے جس دن میٹرک کا نتیجہ نکلا میں مگھیانہ کچہری میں قبلہ والد صاحب کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ رزلٹ کی کاپی دوپہر کے وقت لاہور سے مگھیانہ اسٹیشن پہنچی۔ والد صاحب نے آدمی بٹھا رکھا تھا۔ کاپی ان کے دفتر میں لائی گئی۔ ساتھ ہی لاہور سے مبارکبادوں کے تار آنے لگ گئے۔ جس طرح میں نے عرض کی ہے اس زمانے میں میٹرک کا رزلٹ ایک نیشنل EVENT کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی وجہ ہندو COMMUNITY کی علم دوستی تھی۔ مجھے یاد ہے دو بجے دوپہر سائیکل پر سوار ہو کر میں مگھیانہ سے جھنگ شہر واپس لوٹا۔ رزلٹ کی خبر جھنگ شہر میں میرے آنے سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ چونکہ پولیس والے گیٹ سے مجھے بلند دروازہ کی طرف جانا تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے وہ ہندو دوکاندار جو گرمی کی اس تیز گرم دوپہر کے وقت اپنے کھاٹوں پر دو دو کھلی کے چھپروں کے سائے تلے سوئے ہوئے تھے جس وقت میں سائیکل سے گزرا اس روز وہ سب تعظیماً اپنی دوکانوں میں میرے آنے کے انتظار میں قطاروں میں کھڑے تھے۔ ان کی اس علم نوازی کا نقش ہمیشہ میرے دل پر رہا ہے۔

ھمارا قافلہ کیسے آگے بڑھے!

فلسفہ ھمارے دایئں ہاتھ میں ہوگا اور
نیچرل سائنس ھمارے بایئں ہاتھ میں اور
کلمہ لا الہ الا اللہ کا تاج ھمارے سر پر۔
مقالات سرسید

یں جاپانی بادشاہ ہیں۔ نہ صرف انھوں نے وہ ایجاد دوبارہ دریافت کی بلکہ انھوں نے اس کا نسخہ رسالہ عام میں شایع کر دیا، تاکہ جو چاہے، ہندوستانی ہو، پاکستانی ہو، عرب ہو، ایرانی ہو، ٹرانسسٹر ٹیکنالوجی کو DEVELOP کرسکتا ہے۔

یہ علم کے رستم جاپانی کون ہیں آپ یقین نہ کریں گے یہ وہی لوگ ہیں جو انیسویں صدی کے اوائل میں گھوڑوں کی نعل بندی کے فن سے ناآشنا تھے۔ ایڈمرل PERRY امریکن ایڈمرل جب پچھلی صدی میں اپنے جنگی جہاز جاپان لے کر آئے اور جاپانیوں نے انہیں روکنا چاہا تو جہاز کی توپوں کی چند باڑوں نے جاپان والوں کو اپنی بندرگاہیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امریکن ایڈمرل کے جہاز سے ایک چوری ہوئی وہ ایک گھوڑے کی چوری تھی۔ رات کے وقت گھوڑا غائب ہوگیا اور دوسرے دن اسے واپس کر دیا گیا۔ جاپانی اس کے نعل غور سے دیکھنے اور نعل بندی سیکھنے کے مشتاق تھے۔ اس وقت ان کی METALLURGY اس حد تک نہ پہنچی تھی کہ لوہے کے نعل بناتے۔

آج کیفیت یہ ہے کہ جاپان کے میٹرک کے امتحان کا موسم خودکشی کا موسم کہلاتا ہے۔ اس امتحان کے نتائج بہایت عمدہ داخلے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا معیار اس قدر بلند ہوتا ہے کہ اس عمر کے بچے دنیا کے کسی اور ملک میں ریاضیات، فزکس اور کیمسٹری میں اس سے اعلیٰ سطح پر امتحان نہیں دیتے۔ ان امتحانوں کے دوران میں بر چوں کے راز افشا نہیں ہوتے۔ اسٹرائکیں نہیں ہوتیں امتحان کے سینٹروں کے دروازے اور شیشے توڑے نہیں جاتے۔ ساری قوم اسب والدین

طالب علم EXAMINATION FEVER کا شکار ہوتے ہیں اور پھر یہ لوگ ان امتحانوں کے نتائج کو اپنی مخصوص طرز پر قبول کرتے ہیں۔

ستمبر کے مہینے میں مجھے خوش قسمتی سے چین جانے کا موقع ملا۔ چین کے مڈل اسکول میں طالب علم بارہ برس کی عمر میں آتا ہے اور سترہ برس کی عمر میں ان کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ ان مڈل اسکولوں کو میٹرک طالب علمی کے زمانے کے انٹرمیڈیٹ کالج سمجھیے۔ ان ۵ سالوں میں لازمی تعلیم کی وجہ سے ہر چینی کو ۱۲ مضامین پڑھنا پڑھتے ہیں۔ جن میں کوئی مضمون اختیاری نہیں ہوتا۔

وہ بارہ مضامین مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ وطنیات
۲۔ چینی زبان
۳،۴۔ دو غیر ملکی زبانیں۔ انگریزی، روسی یا جاپانی
۵۔ ریاضی
۶۔ فزکس
۷۔ کیمسٹری
۸۔ بیالوجی اور زراعت
۹۔ تاریخ
۱۰۔ جغرافیہ
۱۱۔ آرٹس، ڈراما، میوزک
۱۲۔ ورک شاپ

ہر طالب علم پورے بارہ مضمون پڑھتا ہے۔ چینیوں نے فیصلہ کیا ہے کہ سو فیصدی طالب علم سائنس اور آرٹس دونوں پڑھیں گے۔

آپ شاید یہ گمان فرمائیں کہ سائنس کی اس لازمی تعلیم کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ ان مضمونوں کا معیار ۱۶/۱۷ برس کے طالب علم کے لیے ہمارے انٹرمیڈیٹ کے معیار سے کم ہوگا۔ اس کا تجربہ کرنے کے لیے میں نے فزکس اور MATHEMATICS دونوں کے ایک ایک گھنٹے کے درس ATTEND کیے، MATHEMATICS میں میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ چودہ سالہ طالب علم ORDERS OF INFINITY پڑھ رہے ہیں۔ یہ وہ مضمون ہے جو ہم لوگ بی۔ اے میں پڑھاتے ہیں۔

چین نے تہیہ کیا ہے کہ ہر INDUSTRICAL TECHNIQUE

کو چین میں رائج کریں گے۔ ان کی نئی قومی زندگی ہمارے دو سال بعد ۱۹۴۹ء میں شروع ہوئی۔ لیکن ان کے اس عزم کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان ۳۰ سالوں میں انھوں نے قومی سطح پر ELECTRONICS کا فن اس کے آخری مرحلوں تک حاصل کیا ہے۔ فولاد سازی ۲ ہزار ٹن سالانہ سے شروع کر کے آج انگلستان کے برابر دو کروڑ ٹن تک جا پہنچی ہے۔ وہ اب SOPHISTICATED MACHINE TOOLS بناتے ہیں، مگ ۲۱ ہوائی جہاز بناتے ہیں۔ ہر چینی طالب علم اپنے اسکول اور اپنی یونیورسٹی کے زمانے میں ہفتے میں ایک دن WORKSHOP PRACTICE میں صرف کرتا ہے، جس اسکول کا معائنہ میں کرنے گیا تھا اس میں یہ کیفیت تھی کہ ۱۴ سال سے ۱۶ سالہ طلبا کا ایک گروپ TRANSISTER COMPONENTS بنا رہا تھا۔ دوسرا گروپ POTASIUMCARBONATE معدنی صورت سے لے کر GRINDING TITRATION وغیرہ کرنے کے بعد بوتلوں میں بند مارکیٹ کے لیے تیار کر رہا تھا۔ ۱۲ سالہ ۱۳ طالب علموں کا ایک گروپ اپنے ہم جماعتوں کے باقی طلبا کے جوتوں کی مرمت کرنے میں مصروف تھا۔ ان میں سے ایک بچی بول اٹھی۔ آپ اس کمرے کی کھڑکیوں پر نگاہ ڈالیں، ان پر چپڑے ڈالے ہوئے ہیں۔ ہم نے جب پہلے جوتوں کی مرمت شروع کی تھی تو ہم بدبودار جوتوں کو ہاتھ لگانے سے شرماتے تھے۔ کھڑکیوں پر پردہ ڈالے رہتے تھے۔ آہستہ آہستہ ہمیں اس محنت سے اب شرم نہیں آتی۔ ضروری ہے کہ ہم اپنی طالب علمی کے زمانے میں PRODUCTIVE بنیں PARASITE نہ ہوں۔ سارے چین میں یونیورسٹی کالج اور اسکول کے طلبا اور استاد اپنی تعطیلات گرما فیکٹریوں اور فارموں پر گزارتے ہیں۔

آپ میری باتوں میں مبالغہ سمجھیں گے۔ یقین مانیے مجھے بھی کوئی اگر یہ کہانی سناتا کہ اتنا بڑا ملک کس قدر یک جہتی سے چل رہا ہے تو میں ہرگز نہ مانتا، لیکن اپنے مشاہدے کو کس طرح جھٹلاؤں۔ ایک بار نہیں میں تین بار چین کا سفر کر چکا ہوں۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ ۸۰ کروڑ انسان کسی طرح قومی مفاد کے لیے نہ صرف اپنے ذاتی منافع کو قربان کرسکتے بلکہ اس سے بھی زیادہ قومی خودی میں اپنی انفرادی خودی مدغم کرسکتے ہیں اس قوم کا ہر فرد دن رات ان تھک طریقہ پر کام کرتا ہے۔ ان کے شہر جو ۱۹۴۹ء میں مکھیوں سے بھنبھناتے تھے، پیکنگ جہاں شاہی محل کے عقب میں DRAGON SEA کے نام سے معروف گندگی کی چالیس فٹ چوڑی نہر تھی جو ۳۰۰ سال سے صاف نہ ہوئی تھی، یہ شہر اب آئینہ کی طرح صاف ہیں اور یہ صفائی خاکروبوں کی مرہون منت

علم کا کارواں

زمانہ روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے۔ اگر زمانہ کسی حد تک منتہی ہو جاتا تو یہ خیال صحیح تھا کہ علوم منتہی ہو گئے، مگر ہر کوئی جانتا ہے کہ زمانہ رکتا نہیں وہ آگے چلتا جاتا ہے۔

سرسید (لیکچرز ص ۱۸۳)

نہیں۔ یہ صفائی وکیلوں، استادوں، طالب علموں، سیاستدانوں، دوکانداروں کی مرہون منت ہے۔ یہ کام اسٹوڈنٹس یونینوں سے لیا گیا تھا اور وہ اس معاملے میں مقدم اور پہل کرنے والی تھیں۔

یہ صحیح ہے کہ چینی نظام شاید قائم اس لیے ہے کہ یہ EQUALITARIAN نظام ہے۔ چینی وزیر سائیکل پر دفتر آئے گا۔ سرکاری کار تب استعمال کرے گا جب وہ آپ کو VISITOR کی حیثیت سے RECEIVE کرنے آئے گا۔ ان چیزوں کا اثر یہ ہے کہ قوم ایثار کرتی ہے۔ لیکن یہ کہنے کے باوجود میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس سسٹم کا اس قوم کے اس عزم سے کہ TECHNOLOGY اور فن سیکھے جائیں گے، براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ چین سے پہلے میں انگلستان اور جاپان کی مثالیں عرض کر چکا ہوں۔

چین کے بیان میں میں اپنے موضوع سے بہت دور ہٹ گیا۔ میں عرض کر رہا تھا کہ اگر انگریز نے INDUSTRIAL TECHNIQUE ایجاد کیے اور انھیں تعلیم کے ذریعے اپنی قوم میں پھیلایا۔ اگر جاپان تعلیمی نظام کے ذریعے بغیر معدنی یا دیگر وسائل رکھنے کے اپنی ساری قوم میں SKILLS پھیلا سکتا ہے، اگر چین والے اپنی قوم کو ذہنی اپاہج نہیں سمجھتے اور ہر بچے سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی قسم کی سائنس اور کوئی نہ کوئی SKILL سیکھے گا، اسے بڑھائے گا۔ اگر یہ سب قومیں اپنی غربت کا علاج اس طرح کر رہی ہیں تو کیا اس میں ہمارے لیے سبق نہیں ہے۔ آپ فرمائیں گے کہ غریبی خود ایسی لعنت

*

وہ خدا پاک ہے جس نے زمین کی نباتات کے اور
خود ان کے اور جن چیزوں کی ان کو خبر نہیں سب کے جوڑے
بنائے اور ایک نشانی ان کے لیے رات ہے کہ اس میں سے ہم
دن کو کھینچ لیتے ہیں تو اسی وقت ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔

...... قرآن پاک

*

ہے کہ اگر انسان بھوکا ہو، ننگا ہو تو اس کی دماغی صلاحیتوں کے بڑھانے کی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں مجھے جرمنی کا ایک واقعہ نہیں بھولتا۔ ۱۹۴۷ء کی بات ہے میں کیمبرج میں طالب علم تھا۔ جرمنی شکست کھا چکا تھا۔ جرمن قوم سرنگوں تھی۔ کیمبرج اور دیگر یونیورسٹیوں کے طلبا کی ایک پارٹی کو امریکن کنٹرول کمیشن والوں نے جرمنوں کی حالت دیکھنے کے لیے دعوت دی۔ تقریباً ۵۰ کے قریب طالب علم سارے یورپ سے نیورمبرگ پہنچے۔ اس شہر میں ایک عمارت بھی نہیں تھی جو صحیح وسالم ہو۔ اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ جرمن مکانوں میں نہیں بلکہ بلوں میں رہ رہے ہیں۔

ہمارے لیے شہر کے ایک پارک میں خیمے لگائے گئے۔ ان خیموں کے شہر میں میں نے سنا کہ ایک جرمن میری تلاش کر رہا ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ ایک ریسرچ اسکالر ہے۔ اس وقت کے لحاظ سے اسے شاید ۱۲ روپے ماہوار ملتے تھے۔ اس مشاہرے سے شاید وہ ایک وقت کی روٹی کھا سکتا تھا۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ جنگ کے دنوں میں وہ ایک جنگی قیدیوں کے کیمپ میں ملازم تھا۔ جہاں بعض پنجابی قیدی بھی تھے۔ ان پنجابی قیدیوں سے اس نے پنجابی زبان کی تحصیل کی۔ ۱۹۴۷ء میں یہ جرمن ایک پنجابی جرمن ڈکشنری کی تالیف کر رہا تھا۔ پنجابی زبان میں اس کا کل سرمایہ ہیر وارث شاہ کی ایک کاپی اور ایک لاہور سے چھپی ہوئی اور انتہائی خستہ حالت میں پھٹی ہوئی ڈکشنری کی کاپی تھی۔ یہ سن کر شہر میں ایک پنجابی وارد ہے، وہ جرمن میری تلاش کر رہا تھا کہ ڈکشنری میں بعض مشکل مقامات میں اسے سمجھا دوں۔ اس کی بدقسمتی سے یہ مقامات میرے لیے بھی بہت مشکل تھے اور اس بے چارے کی یہ خواہش تشنۂ تکمیل رہ گئی۔

اس واقعہ پر غور فرمائیے۔ مجھے معلوم نہیں وہ ڈکشنری شایع ہوئی یا نہیں۔ اگر شایع ہوئی بھی تو اسے کتنے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہ ایک علم دوست قوم کی کہانی ہے۔ ایسی قوم جس کا سارا اثاثہ علم ہے۔ سائنس کا علم ٹیکنالوجی کا علم، زبانوں کا علم اور پھر ایسی قوم جس کے افراد میں یہ عزم ہے کہ جرمن پنجابی ڈکشنری کا لکھنا بے معنی ہی سہی لیکن اپنا وقت تاش کھیلنے میں نہیں گزاریں گے، اسٹرائیکیں نہیں کریں گے، فلمیں نہیں دیکھیں گے، اپنے یونیورسٹی کے وقت کو کھیل کا وقت نہیں سمجھیں گے، علم سیکھیں گے اور علم پیدا کریں گے۔ شاید اس میں ہمارے لیے بھی سبق ہو سکتا ہے۔

اسی سلسلے میں ایک کہانی دہرانا چاہتا ہوں۔ یہ داستان چیرمین ماؤ نے بیان کی تھی اور اسے آپ ہم چینی کی زبان سے سنیں گے۔

"پرانے زمانے میں چین کے شمال میں ایک بوڑھا رہتا تھا۔ اس کا نام "پیر کم عقل" تھا۔ اس بوڑھے کے مکان کی سمت جنوب کی طرف تھی، لیکن اس کے دروازے کے سامنے تائہانگ اور وانگ وو کے دو عظیم پہاڑ کھڑے تھے جن کی وجہ سے سورج کی کرنیں اس کے گھر میں کبھی نہ پہنچتی تھیں۔ ایک دن اس بوڑھے نے اپنے جوان بیٹوں کو بلایا اور انھیں کہا کہ آؤ ہم اس پہاڑ کو کھود کر دور کر دیں۔ اس کے ہمسائے نے جن کا نام "پیر دانش ور" تھا، اس بے عقل بوڑھے سے کہا۔ یہاں مجھے معلوم تھا کہ تم بیوقوف ہو لیکن اتنا گمان نہ تھا کہ اس قدر کم عقل ہو گے۔ تم کھودنے سے کس طرح ان دونوں پہاڑوں کو رفع کر سکو گے بے عقل بوڑھا بولا تمہارا کہنا درست ہے، لیکن اگر میں مر گیا تو اس کے بعد میرے بیٹے ہیں، ان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے، ان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے۔ یہ سلسلہ ہمیشہ رہے گا۔ پہاڑ اور زیادہ طویل نہیں ہوں گے۔ ہر کھودنے کے ساتھ ان کی طوالت کم ہی ہوگی، بڑھے گی نہیں۔ ایک دن یہ لعنت ہمارے دروازے سے دور ہو ہی جائے گی۔

پیر کم عقل کی یہ بات سن کر پاک ذات کو ترس آیا۔ دو فرشتے آئے اور انھوں نے ان دونوں پہاڑوں کی لعنت کو دور کر دیا۔"

میری عرض یہ ہے سوسائٹی کی لعنتیں ان دو پہاڑوں کی مانند ہیں۔ انھیں اپنے حلقۂ اثر میں PATIENCE کے ساتھ دور کرنے میں کوشاں رہیے اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کو آپ کی کوششوں پر بھی ترس آئے گا۔ آمین۔

یہ فکر نہ کیجیے کہ آپ کی کوشش کامیاب ہو گی یا نہیں۔ آپ اپنا فرض ادا کیجیے خداوند تعالیٰ کی پاک ذات اس میں برکتیں ڈالے گی۔

پروفیسر عبد السلام،
ترجمہ: پروفیسر نسیم انصاری

اسلام اور سائنس

(باب اول)

۱۔ قرآن کریم اور سائنس

ابتدا اس اقرار سے کرتا ہوں کہ میرا عقیدہ اور عمل اسلام ہے اور میں اس وجہ سے مسلمان ہوں کہ قرآن کریم پر میرا ایمان ہے۔ قرآن کریم میں بحیثیت ایک سائنس داں کے مجھ پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ میں فطرت کے قوانین کو سمجھنے کی کوشش کروں اور ان کی تلاش طبیعات، حیاتیات، طب اور ہیئت کے مشاہدات میں کروں کہ ان میں سب کے لیے نشانیاں ہیں۔ چنانچہ کہا گیا ہے؛

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ۝

(تو کیا وہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح (عجیب طور پر) پیدا کیا گیا اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح بلند کیا گیا۔ اور پہاڑوں کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح کھڑے کیے گئے ہیں۔ اور زمین کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح بچھائی گئی ہے)

اور پھر ارشاد ہوتا ہے؛

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝

(بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات کے اور دن کے آنے جانے میں دلائل ہیں اہل عقل کے لیے۔)

قرآن شریف کی ساڑھے سات سو آیتوں میں یعنی اس پاک کتاب کے تقریباً آٹھویں حصہ میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ ایمان لانے والے فطرت کا مشاہدہ کریں، اس پر غور کریں اور اس کے بھید کھولنے کے لیے کوشاں رہیں کہ انہیں عقل اسی لیے دی گئی ہے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ وہ تحصیل علم کو اپنی روزمرہ زندگی کا حصہ بنائیں۔ درود و سلام ہمارے پیارے نبی پر کہ انہوں نے تعلیم کو ہر مرد و عورت کے لیے ضروری بتایا۔

یہ گویا بنیاد ہے علم و حکمت کی طرف اسلامی تصورات کی۔ اس کے ساتھ دوسری اہم بات وہ ہے جس کی طرف مارس بوکیل نے اپنے مقالہ "بائبل، قرآن اور سائنس" میں اشارہ کیا ہے اس نے لکھا ہے کہ قرآن کی ایک آیت بھی ایسی نہیں ملی جس میں فطرت کے مظاہر کی ایسی توجیہ کی گئی ہو جن سے ہماری سائنسی تحقیقات کی نفی لازم آئے۔

تیسری بات جو قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ پوری اسلامی تاریخ میں گیلیلیو والے قصّہ کی طرح کا کوئی واقعہ نہیں ملتا۔ سائنسی نظریات کے لیے نہ تو کسی کو سزا دی گئی اور نہ کسی پر کفر کے فتوے لگے۔ حالانکہ بدقسمتی سے آج بھی مذہبی معاملات میں یہ شدت جاری ہے۔ اور ان معاملات کے لیے کفر کے فتوے بھی دیئے جاتے رہے ہیں۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ نظریاتی احتساب کا معاملہ اسلامی تاریخ میں سب سے پہلے کٹر مذہبی لوگوں نے نہیں اٹھایا بلکہ معتزلہ نے پہل کی جو اپنے آپ کو روشن خیال اور آزادیٔ فکر کا علمبردار سمجھتے تھے۔ اس جگہ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ معتزلہ بھی درحقیقت مذہبی عالم تھے۔ اور ان کے احتساب اور ان کی مذہبی عصبیت کا شکار احمد بن حنبلؒ جیسے پایہ کے بزرگ عالم دین رہے تھے۔

۲۔ موجودہ سائنس۔ یونانی۔ عرب میراثہ۔ سوالیہ

کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے پرانی تعلیمات اور اپنے پاک نبیؐ کے اُن ارشادات کی طرف کیا رویّہ اختیار کیا؟

اپنے پاک نبیؐ کے وصال کو ابھی سو برس بھی نہیں ہوئے تھے کہ انہوں نے اس زمانہ تک کے سارے علوم پر عبور حاصل کرنے کی کوشش شروع کردی اعلیٰ تعلیمی اداروں کے قیام سے ایک سلسلہ جاری ہوا جس سے ان کو ایسی علمی برتری حاصل ہوئی جو آیندہ ساڑھے تین سو سال تک باقی رہی۔

اسلامی دنیا میں سائنس کا جو مرتبہ تھا اس کا کچھ اندازہ اس سرپرستی سے لگایا جاسکتا ہے جو سائنس کو مسلمانوں کی دولت مشترکہ میں نصیب تھی۔ یہاں ہم کسی قدر ترمیم کے ساتھ ایچ۔ اے۔ آر گب کے وہ اقوال نقل کرتے ہیں جو ادب کے متعلق کہے گئے تھے۔

"دوسری مملکتوں کے مقابلہ میں دنیائے اسلام میں سائنس کی ترقی کا انحصار بہت حد تک اس سرپرستی پر تھا جو اسے حاصل رہی۔ جب تک دارالحکومتوں میں وزیر اور شہزادے سائنس کی سرپرستی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہے علم کی شمع بھی روشن رہی۔ یہ سبقت کبھی ذاتی فائدہ، کبھی محض اپنی خوشی اور کبھی حصول عزت کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھی"۔

بلاشبہ اسلامی دنیا میں سائنس کی ترقی کا نقطۂ عروج ۱۱۰۰ء کے آس پاس تھا یہ زمانہ ابن سینا کا تھا جو قرونِ وسطیٰ کے آخری عالم تھے۔ البیرونی اور ابن الہیثم ان کے نامور ہم عصر دورِ جدید کے نقیب تھے۔

ابن الہیثم (جنہیں یورپ والے الہیزن کہتے ہیں، ۱۰۳۹-۹۶۵) کا شمار دنیا کے جیّد ترین علمائے طبیعات میں ہوتا ہے۔ علم البصر یعنی آپٹکس میں ان کے تجربات اعلیٰ ترین معیار کے تھے اور ان سے علم میں قابل قدر اضافہ ہوا ان کا مشاہدہ تھا کہ "روشنی کی کرن جب کسی واسطہ یا فضا سے گذرتی تو ایسا راستا اختیار کرتی ہے جو سب سے آسان اور سب سے جلد طے ہوسکتا ہو"۔ ابن الہیثم کے اسی مشاہدہ کو سینکڑوں برس بعد فرما (FERMAT) نے نور کے سفر کے کم سے کم وقت والے اصول کے نام سے پیش کیا۔ یہ ابن الہیثم ہی تھا جس نے سب سے پہلے مادہ کے جمود (INERTIA) کا تصور دیا جو کافی بعد نیوٹن کے حرکت کے پہلے قانون کے نام سے مشہور ہوا۔ راجر بیکن کی تصنیف "اوپس میجس" کا پانچواں جز تو گویا ابن الہیثم کے علم البصر کی نقل ہے۔

البیرونی (۱۰۴۸-۹۷۳) ابن سینا کے دوسرے نامور ہم عصر نے آج کل کے افغانستان میں کام کیا۔ ابن الہیثم کی طرح اس کے علم کی بنیاد بھی ذاتی مشاہدہ پر تھی وہ دورِ جدید کے سائنسداں تھے اور قرونِ وسطیٰ سے اتنا ہی دور جتنا ۶ سو سال بعد پیدا ہونے والا گیلیلیو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی سائنس یونان۔ عرب میراث ہے۔ لیکن عام طور پر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اسلامی سائنس کی بنیاد روایتوں سے نتائج نکالنے پر ہے اور یہ کہ مسلمان سائنسدانوں نے آنکھ بند کرکے یونانی علمی روایتوں کی تقلید کی ہے اور سائنس کے تجرباتی میدان میں انھوں نے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔

یہ سراسر غلط بیانی ہے۔ ذرا سنیے کہ البیرونی ارسطو کے بارے میں کیا کہتے ہیں:

"زیادہ تر لوگوں کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ وہ ارسطو کے خیالات کا حد سے زیادہ احترام کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ارسطو کے خیالات میں کسی غلطی کا کوئی امکان نہیں حالانکہ وہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ارسطو نے صرف اپنی بساط بھر ہی نتیجے اخذ کیے ہیں"۔

اور قرونِ وسطیٰ کے توہمات کے بارے میں لکھتے ہیں،

"لوگ کہتے ہیں کہ ۶ر جنوری کو ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب زمین کا تمام کھاری پانی میٹھا ہو جاتا ہے۔ لیکن چونکہ پانی کی تمام خصوصیات کا دار و مدار صرف اُس زمین کی نوعیت پر ہوتا ہے جہاں یہ پانی پایا جائے اس لیے یہ خصوصیات ایک مستقل حیثیت رکھتی ہیں اور اس لیے مندرجہ بالا بیان غلط ہے اور یہ غلطی ہر اس شخص پر ظاہر ہو جائے گی جو طویل اور مسلسل تجربات کا طریقہ اختیار کرے"۔

اور آخر میں البیرونی کے خیالات علم طبقات الارض کے بارے میں بھی سنیے کہ کس طرح وہ مشاہدہ پر زور دیتا ہے۔

"اگر آپ ہندوستان کی مٹی دیکھیں اور اس کی نوعیت پر غور کریں، اگر آپ ان گول پتھروں کو دیکھیں جو آپ کو زمین کے اندر ملتے ہیں چاہے جتنی بھی گہرائی میں جائیں۔ ایسے پتھر جو پہاڑوں

کے قریب بہت بڑے ہوتے ہیں جہاں دریاؤں کا بہاؤ طوفانی ہوتا ہے اور پہاڑوں سے دوری پر یہ پتھر بہت چھوٹے ملتے ہیں کیونکہ یہاں دریا کا بہاؤ کم ہو جاتا ہے۔ دریا کے دہانے کے قریب تو یہ پتھر ریت کی صورت میں ملتے ہیں کہ یہاں تو دریا کا بہنا تقریباً بند ہو جاتا ہے۔ اگر آپ ان سب باتوں پر غور کریں تو لازمی طور پر اس نتیجہ پہنچیں گے کہ ایک زمانہ میں ہندوستان سمندر تھا جو آہستہ آہستہ دریاؤں سے لائی ہوئی ریت سے بھر گیا۔"

بریفالٹ (BRIFFAULT) کے الفاظ میں:

"یونانیوں نے تدوین کا کام کیا، عام اصول بنائے اور انہیں علمی زبان میں بیان کیا لیکن طویل اور مسلسل مشاہدات کا حصول اور صبر آزما طریقہ اور تجربہ کی کسوٹی پر نتائج اخذ کرنا یونانی فطرت کے خلاف تھا جسے ہم لوگ سائنس کہتے ہیں اس کی بنیاد مشاہدات، تجربات اور ناپ تول پر ہے اور ان نئے طریقوں سے یورپ والوں کو عربوں نے متعارف کرایا۔ اسلامی تہذیب کا سب سے قیمتی عطیہ موجودہ دور کی سائنس ہے۔"

ان ہی خیالات کا اظہار سائنس کے مشہور مورخ جارج سارٹن نے اس طرح کیا ہے۔

"قرون وسطیٰ کا اصلی لیکن سب سے کم معروف کارنامہ تجرباتی طریقہ کی تخلیق ہے اور یہ دراصل مسلمانوں کی کاوشوں کا نتیجہ تھا جو بارہویں صدی تک جاری رہا۔"

تاریخ کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ سائنس کا یہ جدید طریقہ جاری نہ رہ سکا اور اس میں تسلسل ختم ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سائنسی طریقوں میں کوئی مستقل تبدیلی نہ ہو سکی۔ البیرونی اور ابن الہیثم (IBN-AL-HAITHAM) کو گذرے ابھی سو برس بھی نہ ہوئے تھے کہ دنیائے اسلام میں سائنس کی تخلیق بالکل رک گئی۔ اب پانچ سو برس تک وہ بالغ نظری" وہ مشاہدوں پر اصرار اور وہ تجربات کی تکرار دیکھنے اور سننے کو نہیں ملتی یہاں تک کہ ٹائیکو براہے (TYCHO BRAHE) گیلیلیو (GALILEO) اور ان کے ہم عصروں نے یہ تان دوبارہ اٹھائی۔

۳۔ دنیائے اسلام میں سائنس کا زوال

آخر اسلامی دنیا میں سائنس کیوں ختم ہو گئی۔ یہ زوال ۱۱۰۰ء کے آس پاس شروع ہوا اور آئندہ ڈھائی سو برسوں میں مکمل ہو گیا۔

کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا ہے شک بہت سی خارجی وجوہات بھی تھیں جیسے منگولوں کی لائی ہوئی تباہی و بربادی۔ لیکن میرے خیال میں سائنس کا زوال اسلامی دنیا میں اس سے بہت پہلے سے شروع ہو چکا تھا اور اس کا سبب بہت سے اندرونی حالات تھے سب سے پہلے تو اپنے آپ میں محدود ہونے والا

التماس

"یہ بات بالکل صاف ہے کہ جب تک تمہارے ہم وطن اپنے علم کے موجودہ ذخیرہ میں اور کچھ نہ بڑھاویں گے۔ اور کاہلی اور سستی اور خود غرضی اور ہم وطنوں کی خیر خواہی سے بے پروائی کی حالت میں جس میں وہ اب دکھائی دیتے ہیں اور جس بدبختی سے وہ آپڑے ہیں، پڑے رہنے پر راضی رہیں گے۔ اس وقت تک ان کو کسی طرح ترقی کرنے کی توقع نہیں ہو سکتی۔ پس آؤ ہم مستعد ہوں اور کوشش کریں۔ اور قوموں کے مختلف فنون اور علوم کے اور ان کو بخوبی حاصل کر کے اپنے علم کو بڑھاویں۔ اس مردے پنے کی کاہلی کی حالت میں سے نکلے کہ جس کی روز بروز ہم میں ترقی معلوم ہوتی ہے، ہر برس جو گذرتا ہے ایک نئی مشکل پیدا کرتا ہے۔ اور ہر برس۔ دقت کو زیادہ کرتا ہے۔ اے مسلمانو! تم ہمیشہ سے مستعدی اور چالاکی اور ذہانت اور علم و فضل میں نامی ہو۔ اے ہندوؤ! تم قدیم الایام سے مشکل مشکل علوم کی ایجاد میں مشہور ہو۔ اب تم دونوں کو کس بدبختی نے گھیرا ہے جس سے تم اپنے بزرگوں کے ناموں کو بھی ڈبوتے ہو۔ ایک نہایت خجالت کا دھبہ اپنے اوپر لیتے ہو۔ جاگو اور ہوشیار ہو۔ اور اس پُر امن وقت کو غنیمت سمجھو۔ اور اپنے بزرگوں کی طرح علوم و فنون کے حاصل کرنے میں مستعد ہو کر اپنے بزرگوں کے ناموں کو آفتاب کی مانند روشن کر دو۔" ——— سر سید

التماس بخدمت ساکنان ہندوستان، ۱۸۶۳ء

غازی پور، ص ۲۰

وہ کیفیت جس نے سائنسی کارروائیوں کا رشتہ باقی دنیا سے توڑ دیا اور دوسری طرف تخلیقی طرزِ فکر کی ہمت شکنی اور اس کی جانب منفی رویہ نے زیادہ نقصان پہنچایا اور تقلیدی طرزِ فکر کو عام کیا۔ گیارہویں صدی کے اختتام اور بارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں دنیائے اسلام سخت مذہبی گروہ بندیوں اور سیاست دانوں کی شہ پر بڑھتی ہوئی تنگ نظری کا شکار تھی۔ اور اسی دور سے دنیائے اسلام کے زوال کی بنیاد پڑی۔ حالانکہ امام غزالی بھی ۱۱۰۰ء کے آس پاس یہ لکھ سکتے تھے: "مذہب کے خلاف سب سے بڑے جرم کا ارتکاب وہ لوگ کرتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اسلام کا دفاع علومِ ریاضی کے انکار ہی سے ہو سکتا ہے جب کہ ان علوم میں کوئی بات مذہب کے خلاف نہیں ہے"۔ لیکن زمانہ کا مزاج تخلیقی علوم کے خلاف ہو چکا تھا ہر طرف کٹرپن کا رواج اور رواداری کا فقدان تھا جس کا اثر یہ ہوا کہ تقلید عام ہوئی اور اجتہاد کا دروازہ تمام علوم پر بند ہوا جنمیں سائنسی علوم بھی شامل تھے۔

کیا حالت اب بھی یہی ہے؟ کیا ہم اب سائنسی تحقیقات کی ہمت افزائی کرنے لگے ہیں؟

روئے زمین کی اہم تہذیبوں میں سائنس سب سے کمزور اسلامی دولتِ مشترکہ میں ہے۔ بدقسمتی سے ہم میں سے بہت سے مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ علم و حرفت یعنی ٹیکنالوجی بنیادی طور سے بے ضرر ہے۔ اور اس کی زیادتی کا مداوا اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر عمل سے کیا جا سکتا ہے، لیکن سائنس کا معاملہ بالکل مختلف ہے کیونکہ اس سے کچھ قدریں بھی وابستہ ہیں۔ یہ خیال ہے کہ جدید سائنس عقلیت کا راستہ دکھاتی ہے۔ جو لامذہبیت کی طرف جاتا ہے۔ اور یہ بھی خیال ہے کہ ہم میں سے جو سائنس داں ہیں وہ ایک دن ہماری تہذیب کے مابعد الطبیعاتی مفروضات سے منحرف ہو جائیں گے۔ قطع نظر اس سے کہ اعلیٰ صنعت و حرفت بغیر اعلیٰ سائنس کے پنپ نہیں سکتی اور اس توہین سے بھی قطع نظر جو ہماری تہذیب کے مابعد الطبیعاتی مفروضات اور فکری انجماد کو ہم معنی بنا دینے سے ہوتی ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ سائنس کی طرف یہ رویہ ان پرانے جھگڑوں کی وراثت ہے جن میں نام نہاد عقلی گروہ کے وہ فلسفی الجھے ہوئے تھے جنھوں نے ارسطو کے تصورِ کائنات کو بے چون و چرا مان لیا تھا اور جس میں کسی تبدیلی کو برداشت نہیں کرتے تھے اور انھیں ان خیالات کو اپنے مذہبی عقائد کے ساتھ یکجا کرنے میں مشکلیں پیش آ رہی تھیں۔

یہاں ہمیں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ اس قسم کے بلکہ اس سے بھی شدید جھگڑوں میں قرونِ وسطیٰ کے عیسائی اہلِ مکتب مبتلا تھے۔ اہلِ مکتب کے لیے سب سے اہم مسائل تصورِ کائنات اور مابعد الطبیعات سے متعلق تھے۔

"کیا دنیا کسی غیر متحرک جگہ میں واقع ہے؟" کیا خدا محرکِ اوّل کو خود براہ راست حرکت میں لانے کا محض ایک سبب ہے یا وہ مسبب الاسباب اور آخری وجہ ہے؟ کیا تمام افلاک کا محرک ایک ہی ہے یا مختلف؟ کیا وہ محرک جو کائنات کو حرکت میں لاتے ہیں کبھی تھک بھی سکتے ہیں؟ جب گلیلیو نے کوشش کی کہ پہلے ان مسائل کی فہرست تیار کرے جن کا تعلق محض طبیعات سے ہے اور اس کے بعد ان مسائل کو طبیعاتی تجربات کی مدد سے حل کرے تو وہ احتساب کی زد میں آ گیا۔ اس احتساب نے اٹلی میں سائنس کی ترقی کو کم از کم اٹھارہویں صدی تک تو روکے ہی رکھا۔ اب ساڑھے تین سو برس کے بعد نظرِ ثانی تو آباد کاری ہو رہی ہے۔

ویٹیکن (VATICAN) کی ایک مخصوص تقریب میں عالی جناب جان پال ثانی نے اعلان کیا "کلیسا تجربوں اور غور و فکر سے خود سبق لیتا ہے۔ آج یہ بات زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے کہ تحقیقات میں آزادی کے کیا معنی لیے جائیں۔ انسان تحقیق کے ذریعہ ہی سے حق کی طرف آتا ہے۔ اسی لیے کلیسا کو یقین ہے کہ سائنس اور مذہب میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ بہرحال عاجزانہ اور انتھک غور و فکر کے بعد ہی کلیسا مذہب کی روح کو کسی عہد کے سائنسی نظامِ فکر سے ممیز کر سکتا ہے۔

۴۔ سائنس کی تنگ دامانی

جو اقوال میں نے اوپر نقل کیے ہیں ان میں پاپائے اعظم نے اس بالغ نظری پر زور دیا ہے جو کلیسا نے سائنس کے ساتھ معاملت میں حاصل کی۔ اگر وہ چاہتے تو اس بات کو الٹ کے بھی کہہ سکتے تھے کہ گلیلیو کے وقت سے آج تک سائنسی نظریات میں اس معنی میں پختگی آئی ہے کہ سائنسداں اپنے حدود سے واقف ہو گئے ہیں۔ انھوں نے سمجھ لیا ہے کہ بعض مسائل ایسے ہیں جو آج بھی ان کے دائرہ فکر سے باہر ہیں اور مستقبل میں بھی یہی صورت رہے گی۔ سائنس کی ترقی کا راز یہ ہے کہ اس نے اپنا دائرہ عمل ایک خاص قسم کی تحقیق تک محدود کر لیا ہے۔ اور اس محدود دائرہ میں بھی آج کا سائنسداں جانتا ہے کہ وہ کہاں

سے قیاس کے میدان میں قدم رکھ رہا ہے اس میدان میں وہ کبھی قطعیت کا دعویٰ نہیں کرتا۔ طبیعات میں اس صدی کے شروع میں دو مرتبہ ایسا ہوا پہلے تو اس نظریہ کے نتیجے میں جس میں زمان و مکان میں نسبت اضافی بتائی گئی ہے اور دوسرے کوانٹم (QUANTUM) نظریہ کے سلسلے میں۔ یہ صورت پھر پیش آسکتی ہے۔

آئنسٹائن (EINSTEIN) کی وقت کے اضافی ہونے کی تحقیق ہی کو لیجیے۔ یہ بات بالکل قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ کسی وقفہ کے طول کا دارومدار ہماری رفتار پر ہے۔ عمر ہی کے وقفہ کو لیجیے۔ ایک ایسے شخص کی نظر میں جس کی رفتار ہم سے کم ہے ہماری عمر اتنی لمبی ہوتی جائے گی جتنی کہ ہماری رفتار تیز ہوگی۔ اسے قیاس آرائی نہ سمجھا جائے۔ آپ ذرا ہمارے ساتھ جنیوا میں واقع سرن (CERN) کی تجربہ گاہوں تک چلیے جہاں ذراتی طبیعات پر کام ہو رہا ہے۔ وہاں ایسے ذرات تیار کیے جاتے ہیں جن کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔ ان میں میوان (MUON) نامی ذرات بھی ہیں۔ آپ ایک ریکارڈ تیار کیجیے اس وقفہ کا جس میں مختلف رفتار سے چلنے والے میوان فنا ہو کر الیکٹرون (ELECTRON) اور نیوٹران بن جاتے ہیں۔ آپ دیکھیے گا کہ تیز رفتار میوان دیر میں فنا ہوتے ہیں اور سست رفتار میوان جلدی ختم ہو جاتے ہیں۔ ناقابل یقین بالکل سچ۔ !

آئنسٹائن کے زمان و مکان کے نظریات نے طبیعات کے عالموں میں ایک ذہنی انقلاب برپا کر دیا۔ ہم لوگوں کو طبیعات سے متعلق اپنے طرز فکر میں بہت سی تبدیلیاں کرنا پڑیں لیکن تعجب اس پر ہوتا ہے کہ پیشہ ور فلسفی جو انیسویں صدی تک زمان و مکان سے متعلق نظریات کو صرف اپنی ملکیت سمجھتے تھے اب تک آئنسٹائن کے مشاہدات کی روشنی میں کوئی فلسفیانہ نظام فکر نہیں بنا سکے۔

دوسرا اور زیادہ دھماکہ خیز ذہنی انقلاب ۱۹۲۶ء میں ہائزن برگ (HEISENBERG) کی اس تحقیق سے ہوا کہ یقینی علم کے حصول کی بھی حدود ہیں۔ ہائزن برگ کے اصولِ غیر یقینیت (UNCERTAINTY PRINCIPLE) کی رو سے مثلاً یہ بات کسی طور نہیں معلوم کی جا سکتی کہ سامنے کی میز پر ایک ساکت الیکٹرون ایک خاص مقام پر موجود ہے۔ ایسے تجربات ضرور کیے جا سکتے ہیں جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ الیکٹرون کہاں ہے۔ لیکن یہی تجربے یہ معلوم کرنے کا ہر امکان ختم کر دیں گے کہ الیکٹرون حرکت میں بھی ہے اور اگر حرکت میں ہے تو کس رفتار سے۔ اس کو اگر الٹ کر کہیں تو یہ کہا جائے گا کہ کسی شے کے متعلق ہمارے علم کی بھی ایک حد ہے اور اس حد کا تعین اس شے کی فطرت سے وابستہ ہے۔ میں یہ سوچ کر کانپ جاتا ہوں کہ اگر ہائزن برگ قرون وسطیٰ میں ہوتا تو اس کا کیا انجام ہوتا۔ کیسی کیسی مذہبی بحثیں اس مسئلہ پر اٹھتیں کہ آیا یہ حد اس علم پر بھی لگائی جا سکتی ہے جو خدائے تعالیٰ کو ہے۔

جیسا کہ ہونا تھا معرکے گرم ہوئے لیکن صرف بیسویں صدی کے علمائے طبیعات کے درمیان ہائزن برگ کے انقلابی نظریات تمام علمائے طبیعات کے لیے قابل قبول نہیں ہیں۔ اگرچہ اب تک جتنے تجربے بھی کیے گئے ان کی تصدیق ہی ہوئی۔ طبیعات کے ممتاز ترین عالم آئنسٹائن نے بلا شبہ اپنی عمر کا سب سے قیمتی حصہ اس جستجو میں صرف کیا کہ ہائزن برگ کے نظریات میں کوئی نقص نکلے۔ وہ تجربات کے نتائج کا انکار تو نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن انھیں یہ امید تھی کہ ان نتائج کی علمی توجیہہ کچھ اور کی جا سکے گی۔ ابھی تک ایسی کوئی توجیہہ نہیں کی جا سکی۔ لیکن کوئی خصوصاً ایک ماہر طبیعات یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کہانی یہیں ختم ہوتی ہے۔

۵. ایمان اور سائنس

سوال یہ ہے کہ کیا سائنس اور مابعد الطبیعات کی سیدھی ٹکر آج کل ناگزیر ہے؟ اور یہ بھی صحیح ہے کہ معاملہ سائنس اور اسلام ہی کا نہیں ہے۔ بلکہ سائنس اور ہر طرح کے ایمان کا ہے بشرطیکہ یہ تسلیم کیا جائے کہ اس قسم کا کوئی معاملہ ہے بھی۔ کیا ایمان اور سائنس کا ساتھ ساتھ گزارا ہو سکتا ہے؟ اس سوال سے متعلق جدید سائنس طرز فکر سے کچھ مثالیں آپ کے سامنے پیش ہیں:

پہلی مثال کے طور پر مابعد الطبیعات کے اس عقیدہ کو لیجیے کہ تخلیق بغیر شے کے ہوئی۔ آجکل بہت سے علم کائنات کے ماہرین یقین کرتے ہیں کہ کائنات میں مادہ و توانائی کی کثافت کی ممکنہ قیمت کچھ یوں ہے کہ کائنات میں مادے کی کل مقدار صفر آتی ہے۔ اگر مادہ کی مقدار واقعی صفر ہے (اور اس مقدار کی پیمائش ممکن ہے) تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ صاف خلاء کی طرح کائنات بھی بے مادہ ہے۔ دس برس ہوئے کسی نے بڑی جرأت سے معاملہ کو اور آگے بڑھا کر یہ خیال ظاہر کیا کہ کائنات محض خلاء کی ارتعاشی لرزش ہے گویا کہ یہ لا شے کی ایک کیفیت

> آدمی کے خیالات و نظریات پر اُس کی ثقافتی میراث اور تمدنی روایات کا اثر ہوتا ہے۔
> (پروفیسر عبد السلام)

ہے جو زمان و مکان میں بغیر کسی شے کے تخلیق کی گئی ہے۔ لیکن طبیعات اور مابعد الطبیعات میں جو فرق ہے وہ یہ کہ طبیعات میں کائنات کے مادہ کی کثافت ناپی جا سکتی ہے۔ اور اس ناپ کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ جو نظریہ پیش کیا گیا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اگر کثافت کی پیمائش سے معلوم ہوا کہ نظریاتی نتیجہ غلط ہے تو پھر یہ نظریہ رد کر دیا جائے گا۔

میں دوسری مثال میں اُس جوش و خروش کی طرف اشارہ کروں جس کا مظاہرہ ابھی حال میں اس وقت ہوا جب ہم یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ فطرت کی دو بنیادی قوتیں برق مقناطیسی اور خفیف نیوکلیائی قوتیں اصل میں ایک ہی ہیں۔ اب ہم اس امکان پر غور کر رہے ہیں کہ زمان و مکان کے ابعاد دس (ایک اور شرح کے مطابق گیارہ) ہیں اس نظریہ کے پس منظر میں ہمیں امید ہوتی ہے کہ ہم خفیف برقی قوت کو باقی دو بنیادی قوتوں یعنی کشش ثقل اور قوی نیوکلیر قوتوں کے ساتھ ایک لڑی میں پرو دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان دس ابعاد میں سے چار ابعاد زمان و مکان کے ہیں جو سب کو معلوم ہیں۔ ہماری کائنات کی وسعت اور اُس کی عمر کا حساب اس خمیدہ خط سے لگایا جا سکتا ہے جو ان چار ابعاد زمان و مکان کو ملا کر کھینچا جائے۔ اور نو دریافت چھ ابعاد کی مدد سے جو خط خمیدہ بنے گا اس سے برقی اور نیوکلیر چارجوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

آخر ہم لوگ نئے حدود کو براہ راست کیوں نہیں سمجھ سکتے۔ ان کے سمجھنے کے لیے بالواسطہ طریقہ ہی کیوں ضروری ہے جس کے لیے برقی اور نیوکلیر چارجوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اور پھر جاننے سے پہلے زمان و مکان کے چار ابعاد اور نو دریافت داخلی ابعاد میں فرق کیوں ہے۔ ہمارے موجودہ اندازہ کے مطابق ان کی جسامت 10^{-32} سینٹی میٹر سے زیادہ نہیں ہے۔

فی الحال ہم نے اس کو قابل یقین بنانے کے لیے ایک قسم کے نظریۂ خود استقامت (SELF CONSISTENCY) سے کام لیا ہے ہم ایک ایسے میدانِ قوت کے وجود کا تصور کرتے ہیں جس کی مدد سے ایک پائیدار اور مستحکم کائناتی نظام کا وقوع ممکن ہو سکے۔ نظریہ اسی وقت کامیاب سمجھا جائے گا جب زاید ابعاد کی تعداد صرف چھ (یا نظریہ کی دوسری تشریح کے مطابق صرف سات) ہو۔ اور پھر کچھ ہلکے سے اور خفیف مادّی نتائج

ماحول کا اثر

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میرا باپ ایسا شخص تھا جو علم سے بہت محبت رکھتا تھا۔ وہ اگرچہ مجھے سرکاری افسر بنانا چاہتے تھے، لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ میرا رجحانِ طبع سائنس کی طرف ہے تو پھر انہوں نے اس طرف میری ہر ممکن حوصلہ افزائی کی۔ میرے ماموں، جو بعد میں میرے خسر بھی بن گئے، وہ بھی علم کے بڑے قدر دان تھے اور ان سے میں نے بہت اثر قبول کیا۔ پھر مجھ پر بڑے شفیق، محبت کرنے والے اور محنتی اساتذہ کا سایہ رہا۔ مجھے مولوی عبد اللطیف بار بار یاد آتے ہیں، جنہوں نے مجھے آٹھویں جماعت میں پڑھایا میں نے جب ایک سوال منٹوں میں حل کر کے انہیں دکھایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے جیب سے ایک پیسہ نکال کر مجھے انعام دیا اور آبدیدہ ہو کر کہا: اگر میرے پاس کچھ اور ہوتا تو وہ بھی تمہیں دیدیتا؛ اپنے انگریزی کے استاد شیخ اعجاز احمد یاد آتے ہیں جو مجھے سخت تنبیہہ کیا کرتے تھے کہ میں موٹے موٹے الفاظ غلط تلفظ اور لہجے کے ساتھ استعمال نہ کیا کروں۔ بعد میں خوش قسمتی سے میں کیمبرج آگیا جو حصول علم کے لیے واقعی مثالی جگہ ہے وہاں محنتی طلباء کا مذاق نہیں اڑایا جاتا، بلکہ ان کی تکریم کی جاتی ہے۔ وہاں پڑھانے والے اساتذہ میں سے بعض بڑے اور نامی گرامی دانشور تھے۔ ماحول میں نیوٹن اور میکسویل کی قائم کردہ عظیم روایات تھیں جن سے طلبا اثر لیتے تھے۔ لوگ اسکالر کیونکر بن جاتے ہیں؟ اپنے ماحول کی وجہ سے، اپنے معاصرین کی وجہ سے۔ ماحول ہو تو آدمی کی باطنی تخلیقی امنگ کی پرورش میں مدد ملتی ہے۔ ایک سائنسدان کو سے آگے بڑھنے کیلئے راہ مل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ اس بات پر زور دیا کرتا ہوں کہ علمی ماحول اور علمی ادارے پیدا کیے جائیں جہاں دانشور اور سائنس دان باہم گفتگو کر سکیں، مکالمہ کر سکیں۔

—— عبد السلام

بھی باقیات کی طرح ملیں جیسے حال ہی میں دریافت ہوئے تین درجہ حرارت والے (BLACK BODY) سیاہ جسمی شعاعیں جو کائنات کو پُر کیے ہوئے ہیں۔ اور جن کے متعلق ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ کائنات کے ارتقار کے اوائل کے باقیات ہیں۔ ہم ان باقیات کو تلاش کریں گے۔ اگر اس تلاش میں ناکام رہے تو اپنے نظریہ کو خیر باد کہہ دیں گے۔

بغیر کسی شے کے تخلیق، زاید ابعاد اور ان سب کا ذکر بیسویں صدی کی طبیعات میں عجیب سا لگتا ہے۔ یہ تو پرانے زمانہ میں مابعد الطبیعاتی مباحثہ کی یاد دلاتے ہیں۔ لیکن فرق اتنا ہے کہ طبیعات میں ہر نظریہ صرف عارضی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور اس پر اصرار ہوتا ہے کہ ہر قدم پر اسے تجربہ کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کے اطلاق کے حدود کا یقین کر لیا جائے۔

ایک متشکک (AGNOSTIC) کی نگاہ میں اس نظریہ خود استقامت کی کامیابی (اگر ثابت ہوئی) عقیدہ وجود خدا کے بے معنی ہونے کے مترادف ہو سکتی ہے۔:

فمن یضللہ فلا ھادی لہ (وہ جسے گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا)

لیکن اہل ایمان کے لیے یہ ان کے رب العالمین کے کسی بڑے منصوبہ کا محض ایک جز ہے جس کے تجزّ کا ظہور جلوے جس شکل میں ہو ان کی نگاہوں کو منور کر دیتا ہے اور وہ وارفتہ وار اس کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں۔

ہائنس پے جل (HEINZ PAGELS) اس زمانہ کے غالباً سب سے ممتاز سائنسداں فائن مین (FEYNMAN) کے متعلق ایک قصہ سناتے ہیں۔ "وہ مدہوشی کی سی کیفیت میں تھے کہ انھیں ایک غیر مادّی تجربہ ہوا۔ انھیں یہ محسوس ہوا کہ وہ اپنے بدن سے باہر آگئے ہیں اور اُن کا جسم ان کے سامنے پڑا ہے۔ یہ یقین کرنے کے لیے کہ انھیں جو محسوس ہو رہا وہ حقیقت ہے انھوں نے اپنے ہاتھ کو جنبش دینا شروع کی اور انھوں نے کہا کہ جب میں نے یہ دیکھا تو مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں میں اپنے جسم کے باہر ہی نہ رہ جاؤں اس لیے یہ طے کیا کہ اس میں فوراً واپس چلا جاؤں۔ یہ قصہ سنکر میں نے ان سے پوچھا کہ اس عجیب واقعہ کے متعلق ان کا کیا خیال ہے فائن مین نے ایک ماہر سائنس داں کی نپی تلی زبان میں جواب دیا "میں نے اس میں

طبیعات کے کسی قانون کو رد ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے پہلے ہی عرض کر دیا ہے کہ ان معاملات میں جن میں طبیعات خاموش ہے میرا ایمان اسلام کے نہ فنا ہونے والے پیغام پر ہے۔ اس کا صاف اشارہ تو سورۃ فاتحہ کے بعد قرآن کی پہلی آیت میں موجود ہے "یہ کتاب بلا شبہ راستہ دکھاتی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو جو اَن دیکھی پر ایمان لاتے ہیں۔"

اَن دیکھی (انسان کی نگاہوں سے اوجھل۔ وہ جس کا علم نہیں ہو سکتا اصل عربی الفاظ میں

"یؤمنون بالغیب" (جو غیب پر ایمان لاتے ہیں)

(باب دوم)

اسلامی دولت مشترکہ میں سائنس اور حرفت کس حالت میں ہے!

شناخت کے لیے اسلامی عوام کو چھ جغرافیائی منطقوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ پہلے منطقہ میں جزیرہ نما عرب اور خلیج فارس کے نو ممالک ہیں۔ دوسرے خطّہ میں شمالی عرب کے سیریا، اردن، لبنان، فلسطین مغربی کنارہ اور غازہ کے ممالک آتے ہیں۔ تیسرے علاقہ میں ترکی مسلم وسط ایشیا، ایران، افغانستان اور پاکستان واقع ہیں۔ چوتھے گھنی آبادی والے علاقے میں بنگلہ دیش ملیشیا اور انڈونیشیا ہیں۔ اسی علاقہ میں ہندوستان اور چین کی کثیر تعداد والی مسلم اقلیتیں بھی ہیں۔ پانچویں علاقہ میں شمالی افریقہ کی ریاستیں ہیں اور چھٹے حصّہ میں افریقہ کے غیر عرب ممالک شامل ہیں۔ (آخر میں دی ہوئی جدول نمبر ۱، ۲ ملاحظہ ہو)

اگر ہم اٹھارہ سال سے پچیس سال کی عمر کے لوگوں کے سائنس اور ٹیکنالوجی کے مضامین میں داخل ہونے والوں کی تعداد کو لیں اور ان سے سائنس ذخیرہ کا اندازہ لگائیں تو پتہ چلتا ہے کہ اسلامی ممالک میں اس عمر کے لوگوں میں سے صرف دو فیصد یونیورسٹی کے سائنس کے شعبوں میں داخلہ لیتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ممالک میں اس آبادی کا ۱۲ فیصد حصّہ سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔

(آخر میں دی ہوئی جدول نمبر ۳)

یہی ایک اور چھ (۶:۱) کا تناسب مسلم دولت مشترکہ اور ترقی یافتہ ممالک کے اس صرفہ میں ملتا ہے جو وہ اپنی قومی پیداوار میں سے سائنس اور

حرفت یعنی ٹکنالوجی کی تحقیقات پر کرتے ہیں۔ جو لوگ سائنسی تحقیقات میں معروف ہیں ان سے متعلق تفصیلی اعداد و شمار ہمارے پاس نہیں ہیں۔ لیکن اسلامی کانفرنس تنظیم کے سائنٹفک کمیشن کے پہلے اجلاس میں جو ۱۰-۱۳ مئی ۱۹۸۳ء میں ہوا تھا ایک رپورٹ پیش کی گئی تھی جس کے مطابق ساری دنیائے اسلام میں صرف ۴۵ ہزار سائنس اور انجینئرنگ کے محقق ہیں بمقابلہ پندرہ لاکھ محققوں کے جو سوویت یونین میں ہیں اور چار لاکھ کے جو جاپان میں ہیں۔

امریکن یونیورسٹی بیروت کے ایک معلم اے بی زہلان نے تحقیق کر کے اندازہ لگایا ہے کہ جہاں تک طبیعات کا تعلق ہے "ترقی یافتہ ممالک کے سائنس دانوں کی تعداد کا صرف دسواں حصہ اسلامی دنیا میں ہے اور سائنسی تخلیقی کاموں میں ان کا حصہ ترقی یافتہ ممالک کے کاموں کا صرف ایک فیصدی ہے۔ یہ اندازہ شائع شدہ تحقیقاتی مضامین کی تعداد پر مبنی ہے۔

پاکستان کا شمار اسلامی ممالک میں سائنسی میدان میں سب سے آگے رہنے والے ملکوں میں ہے۔ وہاں ۱۹۸۳ء میں انیس یونیورسٹیاں تھیں۔ لیکن ان میں صرف تیرہ طبیعات کے پروفیسر تھے اور صرف بیالیس پی۔ ایچ ڈی اساتذہ اور تحقیقی کام کرنے والے تھے۔ اگر یہ ذہن میں رکھیے کہ پاکستان کی کل آبادی آٹھ کروڑ ہے۔ اور اس کے بعد انگلستان کے صرف ایک کالج امپیریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی سے مقابلہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ صرف اسی کالج میں بارہ پروفیسر اور سو تحقیقی کام کرنے والے ہیں۔

اب ذرا ایک باہر سے تماشہ دیکھنے والے کا تاثر ملاحظہ ہو۔ فرانسیس گائلز (FRANCIS GILES) ۲۴ مارچ ۱۹۸۳ء کے مشہور عالم نیچر کے شمارہ میں لکھتے ہیں:

"آخر مسلم سائنس میں کیا خرابی ہے؟ ایک ہزار سال پہلے جب مسلم دنیا نقطۂ عروج کو پہنچ چکی تھی اس نے سائنس میں بے بہا اضافے کیے۔ خاص کر ریاضی اور طب میں۔ بغداد اور جنوبی اسپین میں ایسی یونیورسٹیاں تھیں جہاں لوگ ہزاروں کی تعداد میں رہتے تھے۔ یہ زمانہ ان کے عروج کا تھا۔ اس زمانہ میں ان کے حکمران سائنس دانوں اور فنکاروں میں گھرے رہتے تھے۔ اور آزادی کی ایسی ہوا چل رہی تھی کہ اس میں یہودی عیسائی اور مسلمان سب ساتھ سائنس پڑھتے اور کام کرتے تھے۔ اب یہ سب کچھ خواب ہے۔"

"جو رقم سائنس اور ٹیکنالوجی پر خرچ کی جاتی ہے اس میں گذشتہ چند برسوں میں اضافہ تو ہوا ہے لیکن یہ اضافہ صرف تیل پیدا کرنے والے ملکوں تک ہی محدود ہے۔ غالباً یہ ناگزیر بھی ہے، لیکن ان میں سے بعض لڑائیوں میں معروف ہیں جن میں کروڑوں ڈالر ضایع ہوتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد سائنس کی ترقی کے لیے بہت کم بچتا ہے۔ تجارت کا انتظام پوری طرح درآمد کی ہوئی ٹکنالوجی کے شکنجے میں ہے اور سائنسی نظام میں بھی تخلیق کے بجائے منقولات کی کارفرمائی ہے۔

"تیل کی برآمد سے حاصل ہوئی نئی دولت کا بھی بہت زیادہ اثر نہیں پڑا ہے۔ یہ بات اگرچہ سائنس دانوں کو بہت بری لگتی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ مشرق وسطیٰ میں سیاست اور سائنس کی پالیسی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس علاقہ میں شخصی استبداد کا تسلط ہے اس میں کہیں رحم دلی ہے اور کہیں حالت اس کے برعکس ہے۔ اس لیے جب بھی یہ کوشش ہوتی کہ سائنس اس سرزمین میں جڑ پکڑے تو دشواریاں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اس علاقہ سے ترقی یافتہ ملکوں کی طرف جو ذہنی ہجرت جاری ہے اس سے سارے مشرق وسطیٰ میں علمی حالت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔"

بڑی سخت تنقید ہے یہ! لیکن جن لوگوں پر کی گئی ہے وہ اسی قابل ہیں اور یہ تنقید حقیقت پر مبنی ہے۔

نیچر (NATURE) کے اسی شمارہ میں ایک مضمون اسرائیل کی تحقیقی مردم شماری کے بارے میں بھی ہے جس کا اقتباس میں یہاں پیش کرتا ہوں:-

"اس ضرورت کو عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ علمی اعتبار سے تربیت یافتہ لوگوں کی تعداد میں اضافہ کی ضرورت ہے۔ تحقیق اور ترقی کی قومی کونسل نے تجویز پیش کی ہے کہ ۱۹۹۵ء تک چھیاسی ہزار سات سو (۸۶۷۰۰) ایسے آدمیوں کی ضرورت ہوگی۔ بمقابلہ ۱۹۷۴ء کے جب ایسے لوگوں کی کل تعداد چونتیس ہزار آٹھ سو (۳۴۸۰۰) تھی۔ ڈیڑھ سو فی صدی اضافہ"۔ ذرا اسرائیل کے (۳۴۸۰۰) تربیت یافتہ لوگوں کا مقابلہ اسلامی ممالک کے پینتالیس ہزار (۴۵۰۰۰) ایسے ہی افراد سے کیجیے اور یہ دھیان میں رکھیے کہ دونوں جگہوں کی آبادی کا تناسب ایک اور دو سو

(۲۰-۱۱۲) کلب۔

فاعتبروا یا اولی الأبصار

(پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو)

آگے چل کر اسی مضمون میں لکھا ہے: "۱۹۶۰ء کی دہائی میں ییل یونیورسٹی (YALE UNIVERSITY) کے پروفیسر ڈیرک ڈی سولا پرائس نے سائنٹفک افراد کی تعداد کا اندازہ ان مضامین کی اشاعت سے لگایا جو معیاری علمی رسالوں میں چھپتے ہیں۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس ملک میں اس تعداد کے مقابلہ میں پانچ گنا تربیت یافتہ افراد ہیں جس کی توقع ملک کی تمام پیداوار و آبادی کے تناسب سے ہم ہوتی۔ پرائس کا اصرار ہے کہ صورت حال آج بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ ملک میں اب بھی تربیت یافتہ افراد کی ایک زبردست جماعت محفوظ ہے اور یہ بات ایسی ہے جس پر بہت شکر کرنا چاہیے اس لیے کہ اس کے سائنس داں اور کاریگر اس کے تیل اور معدنیات کے فقدان کی نہ صرف تلافی کرتے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔

۷۔ اسلام میں سائنس کا نشاۃ الثانیہ

کیا ہم تاریخ کے اوراق پلٹ کر دوبارہ سائنس میں برتری حاصل کر سکتے ہیں؛ میں بہت عاجزی سے گذارش کروں گا کہ یہ ممکن ہے بشرطیکہ پورا اسلام اور خصوصاً ہمارے نوجوان اس کو اپنا مقصد بنالیں۔ کہ اس کی بنیاد ہماری نظریاتی روایتوں میں اور خود ہمارے قرونِ اولیٰ کے تجربات میں ہے لیکن ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس نشاۃ الثانیہ تک پہنچنے کا کوئی آسان راستہ نہیں ہے۔ یہ مقصد جبھی حاصل ہوگا جب ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں اس کی تمنا بیدار ہو جائے اور پوری قوم اس کا بیڑا اٹھالے۔ اس کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ قوم اپنے کام کرنے والے افراد میں سے آدھے سے زیادہ لوگوں کو سائنس کی اعلیٰ تربیت دینے کا انتظام کرے اور قومی پیداوار کا ایک سے دو فیصد حصہ بنیادی اور کام میں آنے والی سائنس کی ترقی کے لیے مخصوص کردے اور اس رقم کا کم سے کم ایک چوتھائی سے ایک تہائی تک کا حصہ صرف بنیادی سائنس پر خرچ کرے۔

یہ سب جاپان میں ہو چکا ہے جب وہاں کے شہنشاہ نے میجی (۱۸۶۸ء) کے انقلاب کے زمانہ میں یہ قسم کھائی تھی کہ علم روئے زمین کے جس کونے سے بھی حاصل کیا جاسکے حاصل کیا جائے۔ یہ سب سوویت یونین میں بھی ساٹھ برس پہلے ہو چکا ہے جب پیٹر اعظم (PETER THEGREAT) کی قائم کردہ سوویت اکیڈمی آف سائنس سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے ممبروں کے حلقہ کو وسیع کرے اور سائنس کے ہر شعبہ میں سبقت حاصل کرنے کا حوصلہ کرے۔ آج اس کے مختلف اداروں میں پانچ لاکھ سائنس داں کام کر رہے ہیں۔ اور انھیں کام کرنے کی جو سہولتیں حاصل ہیں اور ان کے کاموں کو جو اولیت دی جاتی ہے اس پر باقی دنیا رشک کرتی ہے۔ اکیڈمیشین مال سیو (MALCEV) کہتے ہیں کہ یہ زیادہ تر ۱۹۴۵ء کے لگ بھگ ہوا جب سوویت یونین کی معیشت لڑائی میں تباہ ہو چکی تھی۔ اسٹالن نے اس زمانہ میں طے کیا کہ سائنس پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے اور بغیر کسی سے مشورہ لیے خود ہی یہ فیصلہ کر دیا کہ سائنس دانوں اور اہل حرفت کی آمدنی میں تین سو فیصدی کا اضافہ کر دیا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ ذہین نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جوق در جوق سائنس کے تحقیقی میدان میں آئیں۔ سائنس پر اسی طرح کا زور آجکل عوامی جمہوریہ چین میں دیا جا رہا ہے۔ وہاں یہ منصوبہ بنالیا گیا ہے کہ اس صدی کے خاتمہ تک وہ لوگ برطانیہ سے خلائی سائنس جینیٹکس مائکرو الیکٹرانکس، ہائی انرجی فزکس، فیوژن فزکس اور تھرمونیوکلیر انرجی کو قابو میں لانے والے میدان میں آگے بڑھ جائیں گے۔ چینیوں نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ تمام بنیادی سائنس ضروری ہیں اور آج کی سائنس کی سرحد بنیاد بنے گی کل کی اس سائنس کی جسے کام میں لایا جائے گا۔ اور ضرورت اس کی ہے کہ ہمیشہ سائنس کی آخری سرحدوں پر کام کیا جائے۔ یہاں ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اسلامی ممالک کی قومی پیداوار چین کی قومی پیداوار سے زیادہ ہے اور چین کو ہم سب پر سائنس کے میدان میں صرف چند دہائیوں کی برتری حاصل ہے۔ تو ہم کیوں نہ ٹھان لیں کہ چین کے اس راستہ پر ہم بھی چلیں گے؟

جن معاشروں کا ہم نے ذکر کیا ہے ان میں سے کہیں بھی لوگ چینی ہندوستانی یا روسی سائنس کے خبط میں نہیں مبتلا ہیں کیونکہ وہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ان نعروں سے لوگ بہک جاتے ہیں۔ وہ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ ہر معاشرہ میں سائنس کی مختلف شاخوں میں سے بعض پر زیادہ زور دیا جائے گا اور بعض پر کچھ کم۔ ان شاخوں کا انتخاب تو مقامی ضرورت کے مطابق کیا جائے گا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سائنس کے قوانین اس کی روایتیں اور طریقہ کار ساری دنیا کے لیے ایک جیسے ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی بلحاظ مقام کے

نہیں ہوتی۔ ان کو یہ ڈر نہیں لگتا کہ مغربی سائنس اور ٹکنالوجی سے ان کا مخصوص کلچر تباہ ہو جائے گا وہ اپنی روایتوں کو اتنا حقیر اور کمزور جان کر ان کی توہین نہیں کرتے۔

میں اس سے قبل سائنس کی سرپرستی کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ سائنس کے عالموں کو اپنے کام کا تسلسل برقرار رکھنے کی ضمانت مل جائے۔ اور وہ اپنے کو محفوظ سمجھیں۔ آج کل یہ حال ہے کہ ایک عرب یا مسلمان سائنس داں اگر ضروری قابلیت رکھتا ہے تو اُسے پورا یقین ہے کہ وہ ممالک متحدہ امریکہ اور انگلستان میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور عمر بھر وہاں اس کا خیر مقدم ہوگا۔ وہاں اُسے حفاظت، عزت اور کام کرنے کا برابر کا موقع یہ سب چیزیں ملیں گی۔ ہم لوگوں کو اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ کیا یہ سب باتیں ہمارے معاشرہ میں بھی ممکن ہیں۔ اور ہمیں اپنے آپ سے یہ بھی پوچھنا چاہیے کہ کہیں ہم اپنے سائنس دانوں میں تفریق تو نہیں کرتے ہیں بلکہ کبھی کبھی ان کی ملازمت محض اس لیے ختم کر دیتے ہیں کہ ان کی پیدائش کسی ایسے ملک میں ہوئی ہے جہاں کی حکومت سے ہمارے کچھ عارضی اختلافات ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ممالک متحدہ امریکہ نے سائنسی میدان میں اپنی موجودہ برتری بہت ہی کم وقت میں حاصل کی۔ اور یہ اس طرح ہوا کہ اس نے ان سائنس دانوں کا خیر مقدم کیا جو دو عالمی جنگوں کے درمیان کے زمانہ میں یورپ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن اس خیر مقدم میں کوئی ظاہر داری نہیں تھی۔ ان سائنس دانوں کو حقوق شہریت دیے گئے اور یہ شرط نہیں تھی کہ وہ اپنا کام ختم کرنے کے بعد اپنے وطن واپس چلے جائیں گے۔ ان سائنس دانوں نے انگریزی سیکھی اور ممالک متحدہ میں ان کے خاندان پھلے پھولے۔ اینریکو فرمی (ENRICO FERMI) کے متعلق یہ قصہ تو عام طور سے مشہور ہے کہ اسٹاک ہام (STOCK HOLM) کی تقریب کے فوراً بعد ہی وہ نوبل پرائز کے روپیہ سے اپنا اور اپنے خاندان کا ٹکٹ خرید کر امریکہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ان سے کہا گیا کہ وہ ایٹمی ریئکٹر چلائیں۔ یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا تھا جب ان کے پاس رہنے کی سرکاری اجازت نہیں تھی اور ارباب حل و عقد کی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس معاملہ میں جلدی کریں کیونکہ اندیشہ

تھا کہ اس سے محوری طاقتوں کی خفیہ تنظیمیں چوکنا ہو جائیں گی۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے ممالک میں بھی ممتاز ترین سائنس دانوں کی طرف یہی رویہ اختیار کیا جاتا ہے؟ کیا ہم اِن عالموں کو اتنی ہی حفاظت اور اطمینان کا یقین دلا سکتے ہیں۔ کیا ہم ان کا استقبال بھی ایسی ہی گرم جوشی سے کرتے ہیں کہ وہ بھی ہمارے لیے جی جان سے کوشش کر کے تحقیقی ادارے قائم کر دیں۔

میری رائے میں ضرورت اس کی ہے کہ سیاسی دولت مشترکہ کے بننے کا انتظار کیے بغیر اسلامی ممالک میں سائنس کی دولت مشترکہ بنائی جائے ایسی سائنسی دولت مشترکہ اسلامی سائنس کے شاندار ماضی میں موجود تھی جب وسط ایشیا کے رہنے والے ابوسینا اور البیرونی عربی ہی میں لکھتے تھے اور اس کو بالکل قدرتی بات سمجھتے تھے یا ان کے ہم عمر اور میرے طبیعاتی بھائی ابن الہیثم (IBN. UL - HAITHAM) بغیر کسی اندیشہ کے خلفائے بنو عباس کی مملکت بصرہ سے ان کے رقیب بنو فاطمہ کے زیر نگیں مصر چلے گئے تھے اور اس اطمینان کے ساتھ گئے تھے کہ باوجود ہر قسم کے اختلاف کے (جس میں فرقہ وارانہ اختلاف بھی شامل تھا) وہاں انھیں عزت اور مرتبہ ملے گی۔ یہ خیال رہے کہ اس زمانہ میں فرقہ وارانہ یا مذہبی اختلاف اتنے ہی شدید تھے جتنے کہ آج کل۔ اسلامی سائنس کی دولت مشترکہ کے لیے ضرورت ہے کہ ہم شعوری طور پر اس کے لیے کوشش کریں اور اس کوشش میں ہم دونوں یعنی اہل سائنس اور اہل حکومت برابر کے شریک ہوں۔ آج کل ہم سائنس دانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ بین الاقوامی معیار کے ایک فیصد سے لے کر زیادہ سے زیادہ دس فیصد تک اور یہی حالت ہمارے ذرایع اور علمی سرمایہ کی بھی ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم سب متحد ہو کر اپنے ذرایع کو ملائیں اور سب ایک جماعت بنا کر سائنس کے تحقیقاتی اداروں کو تمام اسلامی ممالک میں پورے ضبط اور نظم سے چلائیں۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم حکومتوں کو اس پر آمادہ کریں کہ وہ ایک عرصہ کے لیے مثلاً پچیس برسوں کے لیے ہمیں خاص رعایتیں دیں جن کے سہارے ہمارے سائنس دانوں کو ایک محفوظ طبقہ سمجھا جائے اور وہ ملک کے سیاسی فرقہ وارانہ جھگڑوں سے الگ رکھے جائیں تاکہ وہ ایک امت العلم کی طرح کام کر سکیں بالکل اسی طرح جس طرح ماضی میں سائنس کی اسلامی دولت مشترکہ میں کام ہوتا تھا۔

اور آخر میں اس پر غور کرنا ہے کہ ہماری سائنسی سرگرمیاں بین الاقوامی

سائنس سے وابستہ نہیں ہیں۔ یہ بہت ہی تعجب کی بات ہے کہ سوائے مصر کے جو سولہ بین الاقوامی یونینوں یا تنظیموں کا ممبر ہے اور کوئی اسلامی ملک پانچ سے زیادہ بین الاقوامی سائنس تنظیموں کا ممبر نہیں ہے۔ کوئی بین الاقوامی سائنسی مرکز ان ملکوں میں نہیں ہے اور بہت کم بین الاقوامی سائنسی کانفرنسیں یہاں ہوتی ہیں ہم میں سے ان لوگوں کو باہری سائنسی مرکزوں میں جانے کے یا کانفرنسوں میں شرکت کرنے کے مواقع نہیں ملتے جو اسلامی ممالک میں کام کرتے ہیں۔ اس طرح کے سفر کو عیاشی سمجھا جاتا ہے۔

علیحدگی کے اس احساس ہی کی وجہ سے میرے دل میں بین الاقوامی سائنس کے ایسے مرکز بنانے کا خیال پیدا ہوا جہاں ترقی پذیر ممالک کے سائنسدان بغیر اپنے کو جلا وطن کیے اپنے مضمون کے متعلق جدید ترین باتیں جان سکیں۔ یہ مرکز اقوام متحدہ کی دو ایجنسیوں کی ملکیت ہے۔ یہ دو ایجنسیاں آئی۔ اے۔ ای۔ اے (IAEA) اور یونسکو (UNESCO) ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کے ایک ہزار ماہرین طبیعات میں سے تقریباً ایک سو پچھتر (۱۷۵) اسلامی ممالک کے سائنسدان یہاں ہر سال آتے ہیں اور ان کے قیام کا انتظام یہ ادارہ کرتا ہے ان میں سے پندرہ کی کفالت کویت فاؤنڈیشن فار سائنس اور کویت اور قطر کی یونیورسٹیاں کرتی ہیں۔ باقی کی کفالت میری کوششوں سے سویڈن اور اٹلی سے ہوتی ہے۔

اور معاملہ صرف ہمارے سائنسدانوں کی عالم سائنس سے جسمانی علیحدگی کا نہیں ہے۔ علیحدگی تو پورے سائنسی طریقہ کار سے ہے۔ ہمارے اور مغربی نظریوں میں زبردست فرق ہے اور یہی فرق ہمارے اور سویت اکیڈمی آف سائنس کے طریقہ کار میں بھی ہے۔ ہمارے یہاں پیشہ ورانہ تنظیموں کا کوئی ٹھیک نظام نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ایسی کمیٹی ہے جو سائنس کے کاموں کا مطالعہ اور ان پر تبصرہ کر سکے۔ اور نہ کوئی ادارہ ایسا ہے جو آزادی سے ہمارے علمی اور ادبی معیار کا جائزہ لے سکے اور نہ کوئی سائنس کا ایسا مرکز ہے جس کا انتظام سائنسدان ہی کرتے ہوں اور نہ ان کاموں کے لیے سرمایہ کا ایسا انتظام جو سرکاری بندشوں سے آزاد ہو۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی دولت مشترکہ میں سائنس کے احیا کے لیے کم از کم پانچ شرطیں پوری ہونا چاہئیں یعنی اس مقصد سے شدید جذباتی لگاؤ، فیاضانہ سرپرستی، حفاظت کا انتظام خود مختاری

اور سائنسی کارکردگی میں بین الاقوامی نقطۂ نظر۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (الرعد)

(حقیقت یہ ہے اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی ذاتی صلاحیتیں نہیں بدل دیتی)

لیکن اس میں کسی کو کوئی شک نہیں ہونا چاہیے کہ اس کام کی مخالفت ضرور ہوگی۔ رونا تو اس کا ہے کہ مخالفت کرنے والے اسلامی شرع اور روایات کی حفاظت کا دعویٰ کریں گے۔ آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں اور ان کے خیالات کی نمایندگی لندن سے شایع ہونے والے ایک کثیرالاشاعت رسالہ میں اس طرح کی گئی ہے۔

"کیا قرون وسطیٰ کی سائنس صحیح معنوں میں اسلامی سائنس تھی؟"

"اگر اس زمانہ کے سائنسدانوں مثلاً الکندی (AL-KINDI) الفارابی (AL-FARABI) ابن الہیثم (IBN AL HAYTHEM) اور ابن سینا (IBN SINA) کے حالات دیکھے جائیں تو معلوم ہوگا کہ سوائے اس کے وہ سب مسلمان تھے ان میں یا ان کی کتابوں میں کوئی اور بات اسلامی نہیں تھی۔ بلکہ اس کے برخلاف ان کی زندگیاں واضح طور پر غیر اسلامی تھیں، ان کے طب، کیمیا، طبیعات اور فلسفیانہ کارنامے قدرتی اور منطقی نتیجہ تھے یونانی طریقۂ فکر کے۔

"الکندی معتزلہ (MUTAZALITE) خیالات رکھتا تھا۔ ابن الہیثم ایک دوسرا ارسطو کا ماننے والا تھا۔ بقول مشہور سائنسی مورخ ڈی بور (DE BOER) "الہیثم مختلف نظریات کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان میں سے ہر ایک میں سچائی تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے"۔ اس کی نظر میں حقیقت صرف وہ ہے جس کا ادراک حواس سے ہو سکے، اس لیے اس میں تعجب کی کون سی بات ہے اگر اس کا شمار لامذہبوں میں ہوتا ہو اور اسی لیے آج انہیں دنیائے اسلام نے تقریباً بالکل ہی بھلا دیا ہے"۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہم بلاشبہ ایسی زبان میں باتیں کر رہے ہیں جو ایک دوسرے کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس ناقابل یقین حملہ کا نشانہ وہ ممتاز علمائے سائنس تھے جن پر سب مسلمان فخر کرتے ہیں اس کے بعد مصنف ایک ویسی حکمت عملی کی تلقین کرتا ہے جس نے ماضی میں ہماری

سائنس کی روایات کو مٹا دیا تھا۔ یہ حکمت عملی علیحدگی والی ہے۔

"وہ ممالک جو مغربی طاقتوں کے تسلط سے بچے رہے تھے اب یکطرفہ طور پر ایسی پالیسی اختیار کر رہے ہیں جو ان کے لیے کارآمد ہے۔ چین اور روس دونوں جگہ یہی حال ہے اور اگر کمانڈر پیری امریکہ سے تجارتی اشتراک کی شرط پر جاپان کو آزادی نہ دیتے تو جاپان کا بھی یہی رویہ ہوتا۔۔۔۔

۔۔۔ مسلمان ملکوں کو بھی چاہیے کہ وہ ایسی سائنسی پالیسی اختیار کریں جو انھیں مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی کو خیرباد کہنے کے قابل بنا دے۔"

اَلحِکمَۃُ ضَالَّۃُ المُؤمِن

(حکمت مومن کا کھویا مال ہے)

جہاں تک ٹیکنالوجی کا معاملہ ہے مجھے اس سے پورا اتفاق ہے۔ لیکن سائنس؟

اس پر تو مجھے البیرونی کا وہ قصہ یاد آتا ہے کہ جب کسی ہم عصر مولوی نے ان پر کفر کا فتویٰ اس وجہ سے لگایا کہ انھوں نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا تھا جس میں نماز کا وقت معلوم کرنے کے لیے بازنطینی جنتری (BYZANTINE) سے مدد لی گئی تھی تو البیرونی نے بگڑ کر کہا، "بازنطینی تو روٹی بھی کھاتے ہیں تو کیا آپ روٹی کے خلاف بھی مذہبی اعتراض کریں گے۔"

(تیسرا باب)

وہ اقدام جو دنیائے اسلام میں سائنس کے احیاء کیلئے ضروری ہیں

۸. (الف) سائنس کی تعلیم

کلام پاک میں دو باتوں پر بہت زور دیا گیا ہے ایک تفکر یعنی قوانین فطرت پر غور اور ان کی دریافت پر اور دوسرے تسخیر یعنی فطرت پر اپنے فن کی مدد سے قابو پا لینے پر۔ اس ارشاد خداوندی اور آج کل کے حالات کے پیش نظر پہلی بات جو امت کے کرنے کی ہے وہ یہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم و تربیت کی ہمت افزائی ثانوی آخری اور یونیورسٹی کے درجوں تک کی جائے۔

تعلیم پانے والوں میں سائنس میں داخلہ لینے والوں کی تعداد کا فیصد اندازہ فہرست نمبر ۳ میں پیش ہے۔ بدقسمتی سے اس فہرست میں جو عالمی بینک نے اپریل ۱۹۸۱ء میں شائع کی ہے) سائنس، ٹیکنالوجی اور دوسرے شعبہ جات میں کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے، لیکن اس کے باوجود یہ پتہ تو چل ہی جاتا ہے کہ اسلامی ممالک دوسرے ترقی پذیر ممالک کے اوسط کو بھی نہیں پہنچے، ترقی یافتہ ملکوں سے مقابلہ کا تو ذکر ہی نہیں۔

سائنسی اور غیر سائنسی شعبہ جات میں داخلہ کے تناسب کا کوئی اندازہ قابل بھروسہ اعداد و شمار کے بغیر ممکن نہیں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ سائنس میں داخلہ کا اوسط بہت ہی کم ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کے مقابلہ میں تو شاید یہ ایک چوتھائی یا ایک تہائی کے برابر ہو اور جہاں تک معیار کا تعلق ہے تو وہ اور بھی کم ہے۔ مملکت متحدہ (یونائیٹڈ کنگڈم) کے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی ایک رپورٹ کے مطابق وہاں سائنس اور آرٹس کے طلباء کا تناسب ۴۸ : ۵۲ کا تھا (۱۹۸۲ء میں) اور جہاں تک چین اور جاپان کا معاملہ ہے وہاں ثانوی درجات میں سائنس کی تعلیم لازمی ہے۔ سوویت یونین میں موسیقار اور فٹ بال کھیلنے والے، سلائی کرنے والے کو بھی طبیعات اور کیمسٹری ریاضی اور حیاتیات کی تعلیم ۱۶ برس کی عمر تک کے لیے لازمی ہے۔ لیکن اس طرح کی کوئی پابندی کسی اسلامی ملک مثال کے طور پر پاکستان میں نہیں ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت کم مسلمان سائنس کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ جس طرح بھی ہو ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کو اسکول اور یونیورسٹی کے درجوں میں بڑھاوا دینا ہوگا۔

یہ تب ہی ہو سکے گا جب اسکول کے مرحلہ پر سائنس پڑھانے کا بندوبست کیا جائے۔ اور اس کے لیے لائق اساتذہ اور سائنسی سامان کی ضرورت ہوگی لیکن غالباً سب سے زیادہ ضرورت تو اس بات کی ہوگی کہ سائنسی تعلیم کو ہونہار طلباء کے لیے ایسا پرکشش بنایا جائے کہ وہ آگے چل کر اسے آسانی سے نہ چھوڑ سکیں۔ سائنس چھوڑ دینے کے واقعات بہت سے ہوتے ہیں اور اس کی بہت بڑی وجہ معاشی تنگ دستی ہے۔ والدین کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے بچوں کو اتنی طویل تعلیم دلا سکیں جو پیشہ ور سائنس داں کے لیے ضروری ہے۔

امت میں سائنس کی تعلیم کے عام رواج کے لیے ایک ایسے سرمایہ کی ضرورت ہوگی جس سے ان نوعمر طلباء کی ہمت افزائی ہو سکے جو سائنس

اور ٹیکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہیں۔ اور جن کی عمر ۱۵ برس کے آس پاس ہو۔ ہندوستان کے حالیہ ایک دورہ میں مسلمان ماہرینِ تعلیم سے ایک گفتگو کے دوران یہ اندازہ ہوا کہ صرف شمالی ہندوستان کے بیس بڑے شہروں میں سائنسی تعلیم کے وظیفوں کے لیے تقریباً پچاس لاکھ ڈالر سالانہ کی ضرورت ہوگی۔ اس حساب سے پانچ کروڑ ڈالر کا سرمایہ اگر فراہم ہو سکے تو پچاس لاکھ ڈالر سالانہ کے وظیفوں کا انتظام ہو سکے گا۔ بدقسمتی سے ہندوستانی مسلمان معاشی اعتبار سے ایسی پستی میں ہیں کہ ان کے لیے اتنی بڑی رقم کی فراہمی ممکن نہیں ہے۔ اس سرمایہ کا انتظام توان کے لیے اور امت کے دوسرے غریبوں کے لیے کرنا پڑے گا۔

تمام دنیائے اسلام کے ہونہار طلباء کے وظائف کے لیے تقریباً پانچ کروڑ ڈالر سالانہ وظیفوں کی ضرورت ہوگی۔ اور چونکہ اتنے کثیر سرمایہ کی فراہمی امت کے لیے بہت آسان نہیں ہے غالباً ابتدا میں تیل پیدا کرنے والے ممالک کو خود اپنے یہاں کے لیے اپنے وظائف کا انتظام کرنے میں فیاضی سے پہل کرنا ہوگی۔ اس کے بعد اس سرمایہ کے دروازہ کو دوسرے مسلمان ملکوں کے لیے بھی کھولا جا سکتا ہے اور ان میں جغرافیائی اعتبار سے خاص مضامین کی تقسیم ہو سکتی ہے۔

۸۔ (ب) دنیائے اسلام کی سائنس کیلیے سرمایہ

۱۹۷۴ء میں میری تحریک پر حکومتِ پاکستان نے اسلامی ملکوں کی چوٹی کانفرنس سے لاہور میں درخواست کی کہ وہ ایک بلین ڈالر سے فورڈ فاؤنڈیشن کے برابر سائنس کی ترقی کے لیے ایک سرمایہ کا انتظام کریں اس کے آٹھ برس بعد صرف پانچ کروڑ ڈالر کا سرمایہ اکٹھا ہو سکا یعنی جتنا مانگا تھا صرف اس کا آدھا فیصدی ملا۔ اس سے اچھا تو یہ تھا کہ ہم اتنی چھوٹی سی رقم جمع کر کے اپنے کو دھوکا نہ دیتے۔ بہر حال جو میں نے ۱۹۸۱ء میں کہا تھا وہ میں آپکے ملاحظہ کے لیے درج کر رہا ہوں۔

اسلامی سائنسی وقف

۱۔ تجویز یہ ہے کہ اعلیٰ معیار کی سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے اسلامی ممالک ایک وقف بورڈ بنائیں۔ اس وقف کا بند و بست رابطۂ اسلامی کی مدد سے یہی ممالک کریں اور اس کا دائرہ عمل بھی یہی ممالک ہوں۔ اس کے لیے ایک ہزار ملین (یعنی ایک ارب) ڈالر کا سرمایہ فراہم کیا جائے جس سے سات آٹھ کروڑ ڈالر سالانہ کی آمدنی کی توقع ہو۔ یہ وقف بالکل غیر سیاسی ہو اور اس کا انتظام دنیائے اسلام کے سائنس اور ٹیکنالوجی کے ماہرین کے ذمہ کیا جائے۔

۲۔ ضرورت

شرقِ وسطیٰ یا مشرقِ بعید میں یا افریقہ کے کسی مسلم ممالک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا معیار ایسا نہیں ہے کہ جس کا مقابلہ ترقی یافتہ ممالک سے کیا جا سکے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سماج اور حکومت دونوں معیار بلند کرنے کے معاملہ میں لاپرواہی برتتا ہے جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں اقتصادی اعتبار سے مفید آبادی کا ۲ فیصد حصہ اعلیٰ سطح کی سائنس، ٹکنالوجی اور طب کی تحصیل علم میں مصروف ہے۔ اور قومی آمدنی کا ایک فیصد حصہ اس میں خرچ کیا جاتا ہے۔ اس پیمانہ پر اگر دیکھا جائے تو ترقی یافتہ ممالک اسلامی دنیا سے دس گنا زیادہ آگے ہیں۔

۳۔ وقف کے مقاصد

تجویز یہ ہے کہ اسلام کا سائنسی وقف دو مقاصد کو سامنے رکھکر بنایا جائے ایک تو اعلیٰ معیار کے سائنس داں تیار کرنا اور دوسرے سائنسی اداروں کا قیام۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے،

(الف) وقف کی تجویز سے یہ کوشش ہوگی کہ جہاں کسی میدان میں کام کرنے والے لوگ نہ ہوں وہاں ایسے لوگ تیار کیے جائیں اور جہاں اس میدان میں کام کرنے والے ہوں وہاں ان کی حیثیت کو مستحکم کیا جائے اور اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے برق رفتاری سے کام کیا جائے۔

۴۔ پروگرام

اپنے مقاصد یعنی (الف) اعلیٰ سائنس کے کارکنوں کی تیاری اور (ب) ان کارکنوں کی مدد سے اسلامی سوسائٹیوں میں سائنس کا استحکام

اور ترقی کے حصول کے لیے مندرجہ ذیل پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔

(الف) ۱۔ تحقیق میں جہاں جہاں ہم پیچھے ہیں اور جہاں سائنس میں رہنمائی کرنے والے افراد نہیں ہیں وہاں کے اہل علم کو وقف اپنی طرف سے ایسے کسی ادارہ میں بھیجنے کا انتظام کرے گا جہاں اس میدان میں اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کی جا سکتی ہے۔ ان کی اپنے ملک میں واپسی پر وقف ان کے کام کو جاری رکھنے میں ہر ممکن مدد کرے گا۔ ایک کروڑ ڈالر کے سرمایہ سے اس کا انتظام ہو سکتا ہے کہ چار ہزار ایسے اہل علم کی مدد کی جا سکے جو فارغ التحصیل ہو کر اپنے ملک واپس جائیں اور جنھیں اپنے کام کے لیے خاص مدد کی ضرورت ہو۔

۲۔ موجودہ ماہرین سائنس کی رہنمائی میں ویسے پروگرام بنائے جائیں جن سے اعلیٰ سطح کے سائنس دانوں کی تعداد میں اضافہ کیا جا سکے مختلف یونیورسٹیوں سے معاہدہ کر کے خاص خاص مضامین میں ان کی کارگزاریاں کو مستحکم بنایا جائے۔ معاہدے ان یونیورسٹیوں کے اساتذہ کی لیاقت کی بنیاد ہی پر کیے جائیں گے اس مقصد کے لیے تقریباً ڈیڑھ کروڑ ڈالر سالانہ کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی دنیا کے سائنس دانوں کا دوسرے سائنس دانوں سے رابطہ

اسلامی ممالک میں سائنس کمزور ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عالمی سائنس سے بے نیاز ہو گئی ہے۔ مسلم ممالک میں کام کرنے والے سائنس دانوں کا کوئی تعلق باہر کے سائنس دانوں سے نہیں ہے۔ جس کی بہت بڑی وجہ ملکوں کے درمیان فاصلہ ہے۔ سائنس کے پنپنے کی شرط ہی یہ ہے کہ آپس میں تبادلۂ خیال اور تنقید کے مواقع برابر فراہم ہوتے رہیں جن ممالک میں بین الاقوامی سائنس سے تعلق نہیں رہتا وہاں سائنس دم توڑ دیتی ہے۔ وقف کی کوشش ہو گی کہ یہ صورت حال بدل جائے۔ اس کے لیے ضروری ہو گا کہ دانشور اور ماہرین فن کی آپس میں ملاقات کا انتظام کیا جائے اور کسی طویل وقفہ کے بغیر ان ملکوں میں بین الاقوامی سائنسی کانفرنسیں اور دوسرے اجلاس منعقد کیے جائیں۔ جو سرمایہ اس کے لیے ضروری ہو گا اس کا تخمینہ تقریباً پچاس لاکھ ڈالر سالانہ ہے اس سے تین ہزار سائنس دانوں کا سفر کا ایسا انتظام ہو سکتا ہے کہ وہ دو مہینوں تک باہر رہ سکیں۔ اگر اس کے دائرہ عمل میں دس سائنسی علوم ہوں اور پندرہ ممالک اس میں شریک ہوں تو اس سرمایہ سے ہر ملک سے کسی ایک سائنسی علم کے بیس افراد کے سفر کا انتظام ہو سکتا ہے۔

(ب) عملی سائنس کی تحقیقات کا انتظام

وقف ڈھائی کروڑ ڈالر سالانہ اپنے مرکزوں کے قیام اور استحکام پر خرچ کر سکتا ہے۔ مشرق وسطیٰ اور دوسرے اسلامی ممالک کی ترقی سے متعلق مسائل پر تحقیق کریں۔ یہ نئے مرکز بین الاقوامی معیار کے ہوں گے اور ان میں صحت ٹیکنالوجی (جس میں پیٹرولیم ٹیکنالوجی بھی شامل ہے) زراعت اور پانی کی فراہمی کے مسائل پر تحقیقی کام ہو گا۔ یہ ادارے اقوام متحدہ کی یونیورسٹیوں کے نظام سے متعلق کیے جا سکتے ہیں تاکہ وہاں اسی معیار کا کام ہو سکے جو بین الاقوامی سطح پر قابل قبول ہو۔ اس قسم کے ایک کامیاب ادارے مثلاً بین الاقوامی رائس انسٹی ٹیوٹ (RICE INSTITUTE) جو فلپائن میں ہے کے بنانے میں تقریباً پچاس لاکھ ڈالر کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے چلانے میں بھی اتنا ہی خرچ ہو گا اگر اسے بین الاقوامی معیار پر چلایا جائے۔

(ج) اسلامی ممالک کے لوگوں کے انداز فکر میں سائنس اور ٹیکنالوجی داخل کرنے میں وقف کو تقریباً پچاس لاکھ ڈالر کی رقم خرچ کرنا پڑے گی۔ یہ کام اطلاعات عامہ کے ذریعہ کتب خانوں، نمائشوں اور سائنسی عجائب خانوں کی مدد سے انجام دیا جائے گا اور اسی کے ساتھ ایجاد و دریافت کے لیے انعام بھی دینا ہوں گے۔ عوام تب ہی سائنس اور ٹیکنالوجی سے متاثر ہوں گے جب وہ اپنی آنکھوں سے خود ان کے فائدے دیکھیں۔

(د) وقف اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے مضامین کو اس طرح بدلنے کا انتظام کرے گا کہ وہ دور حاضر کے تقاضوں پر پورے اتریں۔

۵۔ وقف کا طریقۂ کار

(الف) وقف کو بنانے میں وہ تمام ممالک حصہ لے سکتے ہیں جو اسلامک کانفرنس کے ممبر ہیں۔

(ب) وقف کا صدر مقام وہیں ہو گا جہاں اسلامک کانفرنس کا۔ اپنے قائم کردہ اداروں اور اپنے چلائے ہوئے تحقیقاتی کاموں پر مسلسل نگرانی

کے لیے وقف دفاتر قائم کرسکتا ہے اور ماہرین سائنس پر مشتمل کارندے مقرر کرسکتا ہے۔ یہ کارندے دو طرح کے ہوں گے ایک وہ جو کسی جگہ مستقل رہیں اور دوسرے وہ جو دورہ کرنے والے ہوں۔

(ج) بورڈ آف ٹرسٹیز (BOARD OF TRUSTEES) گورنمنٹ کے نمائندوں پر مشتمل ہوگا جو اگر سائنس داں ہوں تو اچھا ہے۔ بورڈ وقف قائم کرنے والی حکومتوں سے رابطہ قائم رکھے گا۔ وقف کا بنیادی سرمایہ بورڈ آف ٹرسٹیز کے نام رہے گا۔

(ح) وقف کی ایک مجلس انتظامیہ ہوگی جو ممبر ممالک کے ممتاز سائنسدانوں پر مشتمل ہوگی۔ پہلی مجلس منتظمہ اور اس کے صدر کا تقرر بورڈ آف ٹرسٹیز پانچ برس کے لیے کریں گے یہ مجلس بورڈ آف ٹرسٹیز کی سائنسی پالیسی بنائے گی، اس کے اخراجات طے کرے گی اور روپیہ کے خرچ اور علم انتظامات کی ذمہ دار ہوگی۔ وقف اور اس کی مجلس انتظامیہ کے کاموں میں کوئی سیاسی مداخلت نہ ہوگی اور بورڈ آف ٹرسٹیز کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ اپنے قوانین کے ذریعہ اس عدم مداخلت کو یقینی بنائیں

(خ) وقف کی قانونی حیثیت ایک رجسٹری شدہ منافع نہ کمانے والے ادارہ کی ہوگی اور نہ تو اس کی آمدنی پر کوئی ٹیکس لگایا جائے گا اور نہ اس کے عملہ کی تنخواہوں پر۔

(د) وقف اپنا تعلق اقوام متحدہ، یونیسکو اور اقوام متحدہ کے یونیورسٹیوں کے نظام سے قائم کرے گا اور اس میں ان کی حیثیت ایک غیر سرکاری ادارہ کی ہوگی۔

۷۔ وقف کے سرمایہ کا انتظام

(الف) یہ امید کی جاتی ہے کہ قائم کرنے والے ممالک آپس میں طے کرکے ایک ارب یعنی ایک ہزار ملین ڈالر کی رقم چار سالانہ قسطوں میں مہیا کریں گے۔

(ب) اس سرمایہ میں ممبران ممالک کا حصہ ان کی برآمدات کی آمدنیوں کا ایک جزو مقرر کیا جائے گا۔

۱۹۸۱ء کی برآمدات آمدنیوں کی ایک فہرست منسلک ہے۔ امید ہے کہ آنے والے برسوں میں اس آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ بہر حال ۱۹۸۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق بھی ان ملکوں کی برآمدات سے سالانہ آمدنی پچیس ۲۵ ملین ڈالر تھی۔ اس آمدنی کا ایک فیصدی سے بھی کم حصہ اگر ہر ملک دے تو بھی چار برسوں میں ایک ملین ڈالر آسانی سے مہیا کیا جاسکتا ہے۔

(مورخہ ۲ جولائی ۱۹۷۳ء)*

* یہ مضمون ۱۹۷۳ء کی اقتصادی فضا میں لکھا گیا تھا۔ اگر میں اُسے آج لکھنے بیٹھوں تو میں فورڈ کے برابر ایک وقف پر ہرگز راضی نہ ہوں۔ اگر معیار برقرار رکھنا ہے تو دنیائے اسلام کو سائنس، ٹیکنالوجی اور سائنس کی تعلیم کے لیے پچاس بالکل آزاد اوقاف کی ضرورت ہوگی۔ یہ ہماری ضرورت ہی نہیں ہمارا حق بھی ہے۔ یہ اس لیے کہ پچھلے بارہ برسوں میں اسلامی ممالک کی کل آمدنی میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے آج یہ پانچ سو ملین ڈالر سے بھی زیادہ ہے۔

ہمارے ملکوں میں پانچ بہت قد آور ہیں (سعودی عرب، ایران، ترکی اور نائیجیریا) ان میں سے ہر ایک کی سالانہ آمدنی پچاس بلین ڈالر سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ آٹھ ایسے ممالک بھی ہیں جن کی آمدنی بیس ۲۰ بلین ڈالر سے زیادہ ہے۔ یہ ہیں عراق، پاکستان، ملیشیا، الجیریا، لیبیا، مصر اور عرب امارات متحدہ

اپنی مشترکہ ذمہ داریوں کے متعلق بس صرف یہی کہنا ہے کہ حساب کے دن ان قوموں اور افراد سے پوچھا جائے گا جنھیں کلام پاک میں مترفیہا کہا گیا ہے کہ انھوں نے اس دولت کا کیا استعمال کیا جو اس نے انھیں بخشی تھی۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا
وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ
مِنْ قَبْلِنَا.

(اے ہمارے رب ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائیں ان پر گرفت نہ کر۔ مالک ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔)

۸۔ ہمارے ملکوں میں ٹیکنالوجی کا حال

اب میں ٹیکنالوجی کی طرف آؤں گا۔ کلام پاک میں تفکر اور تسخیر پر برابر کا زور دیا گیا ہے یعنی جتنی تاکید کی گئی ہے علم کو حاصل کرنے کی اتنی ہی تاکید کی گئی ہے سائنس کے علم کی مدد سے فطرت پر قابو پانے کی۔ قرآن

پاک میں ہمیں مثال دی گئی ہے حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ کی کہ انھوں نے اپنے زمانہ کی ٹکنالوجی پر عبور حاصل کر لیا تھا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ مِنَّا فَضْلًا ..... وَأَلَنَّا لَهُ الْحَدِيدَ ۝ أَنِ اعْمَلْ سَابِغَاتٍ وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ .....

اور ہم نے داؤد کو اپنی طرف سے کئی طرح کی برتری دی تھی .... اور ان کے لیے ہم نے لوہے کو ملائم کر دیا تھا ......

وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ وَأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ ۝ اور اسی طرح ہوا کو سلیمان کا تابع کر دیا تھا ....

اور ہم نے ان کے لیے تانبے (کو پگھلا کر اس) کا ایک چشمہ بہا دیا تھا۔

یعنی میری ناچیز رائے میں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس زمانہ کی ٹیکنالوجی پر قدرت رکھتے تھے اور اسے عمارتوں محلوں اور دریاؤں پر پشتے بنانے میں استعمال کرتے تھے۔ اس کے بعد ہمیں ذوالقرنین کی یاد دلائی جاتی ہے۔ جو فولادی چٹانوں اور پگھلے ہوئے پیتل سے دفاع کا انتظام کرتے تھے۔ اس طرح دھاتوں، بھاری تعمیرات، ہواؤں سے کام لینے اور ذرائع نقل و حمل کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ اور یہ بات تو ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن مجید میں جتنی روایتیں بیان کی گئی ہیں ان سب کا مقصد ہدایت ہے کہ لوگ ایسی ہی باتوں پر عمل کریں اور انھیں اپنے لیے مثال سمجھیں۔

" تلك الامثالُ نضربها للناس لعلّهم يتفكّرون

"(ہم لوگوں کے لئے یہ مثالیں دیتے ہیں کہ شاید وہ غور کریں) سورۃ الحشر/٢١

ہمارے نبیؐ نے اس معاملہ میں ایک مثال قائم کر دی وہ بڑے شوق سے حفاظت کے لیے یہ نئی ایجاد کو قبول فرماتے تھے چنانچہ دیکھیے کس طرح خندق کا عرب میں پہلی دفعہ استعمال ہوا۔ یا ان کے اس حکم کو لیجیے جو انھوں نے منجنیق (MANJANIQ) بنانے کے لیے دیا تھا تاکہ اس سے خیبر کی تسخیر کی جا سکے عربوں کے لیے جو بالکل نئی چیز تھی لیکن قبل اس کے کہ یہ تیار کی جا سکے خیبر پر قبضہ ہو گیا۔

سوال یہ ہے کہ آخر اسلامی ملکوں کے سامنے میں کون سی ایسی رکاوٹیں ہیں جو ہمیں اعلیٰ ترین ٹیکنالوجی نہیں حاصل کرنے دیتیں خصوصًا وہ ٹکنالوجی جس کی بنیاد جدید ترین سائنس پر ہے۔ عرب مسلم ملکوں میں جتنی کانفرنسیں اور جتنے سرمایے، ٹکنالوجی کا استعمال گذشتہ دس برسوں میں ہوا اتنا کبھی نہیں ہوا۔ بقول اہلان کے ۱۹۸۲ء تک ان ممالک اور ان کے باہر کے مال فراہم کرنے والے تاجروں کے درمیان چار سو ملین ڈالر کے معاہدے ہو چکے تھے۔ ان میں وہ منصوبے بھی شامل تھے جن کا تعلق ہائیڈرو کاربن اور پیٹرو کیمیکلس سے ہے (۱۶۰ ملین ڈالر) تعمیرات اور وسائل نقل و حرکت (۸۰ ملین ڈالر) اور صنعتی کارخانے جن میں لوہے، فولاد، دوائیں اور کھاد بنانے والے کارخانے شامل ہیں (۴۰ ملین ڈالر)۔

بدقسمتی سے ان تمام منصوبوں کو ایسی فضا میں عملی شکل دی گئی جس میں ٹکنالوجی سیکھنے کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی۔ جب یہ بروئے کار آئے گئے تو اس کی کوشش نہیں کی گئی کہ عرب ملکوں کے ماہرین فن اور انجینئر بھی اس میں شامل کیے جائیں اور ان ملکوں کی اس مختصر سی جماعت کی بھی کوئی نمائندگی ہو جن کا تعلق تحقیق اور ترقی سے ہے۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ منصوبے الگ الگ ٹکڑوں میں بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ زہلان کی روایت کے مطابق پیٹرو کیمیکلس کے ۴۰۰ منصوبے تھے جن کی تکمیل ۱۹۶۵ء تک ہوئی ان کے بنانے میں ۸۲ بین الاقوامی کمپنیاں شامل تھیں، ان منصوبوں میں سولہ کا تعلق یوریا بنانے کے کارخانوں سے تھا ان میں سے الجیریا کے لیے ایک، مصر کے لیے ایک، عراق کے لیے ایک، سوڈان کے لیے ایک سیریا کے لیے، ایک متحدہ عرب امارات کے لیے ایک کارخانے شامل تھے لیکن کسی ایک عرب ملک میں بھی یہ ٹیکنیکل صلاحیت نہ جاگی اور نہ اب ہے کہ ان کارخانوں کا نقشہ تیار کریں یا انھیں تعمیر کریں یا اب اتنے تجربہ کے بعد ان کے چلانے اور اس کو ترقی دینے کی ذمہ داری لے سکیں حد تو یہ ہے کہ عرب ممالک اس میں مل کر بھی یہ کام نہیں کر سکے

اس کے برخلاف جاپان کو دیکھیے کہ جس کی آبادی عرب ممالک کی آبادی کے تقریبًا برابر ہے اور جس نے پیٹرو کیمیکلس مشینوں کے میدان میں ابھی صرف بیس برس ہوئے کہ قدم رکھا ہے۔ پہلے دن سے ہی جاپانیوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ ان مشینوں کی برآمد کریں گے چنانچہ پچھلے بیس برسوں میں ہر تین میں سے ایک مشینری برآمد کر دی گئی۔ جاپانی قوم نے اس کا عزم بھی کر لیا تھا اور وہ اس قابل بھی تھے کہ ایسا کر دکھائیں۔ اگر اس کام کے جاننے والے شروع میں وہاں نہ بھی ہوتے تو ایسے لوگوں کا تیار کرنا کچھ مشکل نہیں تھا کیونکہ وہاں بنیادی سائنسوں کے جاننے والے لوگ کافی تعداد میں موجود تھے۔ اور یہ معزز سائنسداں ایسے قابل تھے کہ وہ بہت آسانی سے ٹکنالوجی کی تربیت

دے سکتے ہیں۔

جو غفلت ہم نے صدیوں سے صنعت و حرفت کی طرف کی ہے اس کا اندازہ ۱۸۳۸ء میں استنبول میں مقیم برطانوی سفیر ولیم ایٹن (William Eton) کی ایک تحریر سے لگایا جاسکتا ہے جس میں اس نے ترکی حکومت کے متعلق اپنے تاثرات بیان کیے ہیں۔

"کسی کو جہاز رانی کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہے اور نہ ہی وہ مقناطیس کا استعمال جانتے ہیں۔ سفر کرنے والوں کی کوئی ہمت افزائی نہیں کی جاتی اور وہ یہ نہیں سمجھتے کہ سفر سے روشن خیالی آتی ہے۔ اس میں کچھ دخل تو ان کے مذہبی غرور و نخوت کو ہے اور کچھ اس حسد کو بھی ہے جو غیر سرکاری کام کے غیر ملکیوں سے رابطہ قائم کرنے والوں سے ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے لوگ جن کو ہم سائنسداں کہہ سکیں یہاں مفقود ہیں اگر کوئی توپ ڈھالنے یا جہاز بنانے یا اسی قسم کے کسی اور کام کے علاوہ بھی کوئی دلچسپی رکھتا ہو تو عام طور سے لوگ اسے پاگل سمجھتے ہیں اس کے بعد وہ اپنی تحریر کے خاتمہ پر ایک ایسی بات کہتا ہے جو بدقسمتی سے آج بھی برمحل معلوم ہوتی ہے۔

وہ ایسے لوگوں سے تجارت کرنا پسند کرتے ہیں جو ان کے لیے ایسا بیش قیمت سامان مہیا کر سکیں جسے تیار کرنے کی زحمت انھیں نہ اٹھانا پڑے"

آخر آج وہ صنعت و حرفت میں خود کفیل کیوں نہیں ہونا چاہتے؟ اس کا جواب تقریباً ہر اسلامی ملک کے لیے ایک ہی ملے گا (انڈونیشیا کی طرح کے چند ممالک کو چھوڑ کر) اور وہ یہ کہ جن لوگوں کو فیصلہ کرنے کا اختیار ہے وہ ماہرین فن نہیں ہیں۔ ہمارے ملکوں میں تو ان لوگوں کی چاندی ہے جو بیٹھ کر منصوبے بنائیں یا ملک کا بندوبست کریں۔ معاملات کا فیصلہ کرنے میں ماہرین فن کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔ مثلاً پاکستان میں منصوبہ بندی کمیشن میں سائنس اور ٹکنالوجی کا کوئی شعبہ ابھی تین برس پہلے تک نہیں تھا۔ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ برطانوی سول سروس کی یہ روایت پاکستان جیسے ملکوں میں ابھی تک چلی آرہی ہے کہ کوئی ماہر فن یعنی ٹکنالوجسٹ اتنا وسیع النظر نہیں ہوتا کہ وہ معاملات کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر سکے۔ یہ بات بالکل نظرانداز کر دی جاتی ہے کہ جاپان، چین، کوریا، سویڈن اور فرانس میں ماہرین فن سائنسداں اور ملک کے منتظمین مفاہمت، باہمی اشتراک، لگن اور بھروسہ کی فضا میں کام کرتے ہیں اور ملک کی اور صنعتی ترقی کا ... (بیڑا اٹھاتے) ہیں۔

صنعت اور ایسی ٹکنالوجی سے قطع نظر جس کی بنیاد سائنس پر ہو بہت سے اور شعبے ایسے ہیں جن کا انحصار سائنس پر ہے مثلاً زراعت، صحت عامہ، بایو ٹکنالوجی، قوت یا انرجی کے نظام، رسل و رسائل اور دفاع۔ بدقسمتی سے ان تمام میدانوں میں ایک جیسی کیفیت ملتی ہے۔ خصوصاً دفاع میں۔ دفاع کے لیے ساز و سامان ضرور خریدا جائے گا لیکن دفاعی سامان پیدا کرنے کی صنعت اور اس کے لیے مہارت کا نام و نشان بھی نہیں۔ انتہا ہے غفلت کی۔ کیا ہم اس خواب غفلت سے کبھی بیدار نہ ہوں گے؟ ابن خلدون (Ibn Khaldun) نے بہت زوردار الفاظ میں اس کی طرف توجہ دلائی ہے۔ "جو چیز بعض لوگوں کو دوسروں پر ممتاز کرتی ہے وہ ان کی خوب تر کی جستجو ہے۔ جب کسی شہر یا قوم کے لوگ خوبیوں کی جستجو کو بیکار سمجھنے لگتے ہیں تب وہ ظہور میں آتا ہے جس کا وعدہ خداوند کریم نے کیا ہے اور یہی معنی ہیں قرآن کریم کی اس آیت کے:

وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا
فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا

(جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوشحال
لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں
تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اسے
برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔)

(باب چہارم)

۹۔ حرف آخر

آخر اتنا کچھ گوارا کر کے یہ التجا کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ لوگ سائنسی تخلیق کی طرف متوجہ ہوں، اس کی وجہ صرف یہ ہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم میں جاننے کی صلاحیت پیدا کی ہے یا آج کی دنیا میں طاقت صرف علم ہی کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہے یا بغیر سائنس کے کوئی مادی ترقی نہیں ہو سکتی، بلکہ ایک بہت بڑی وجہ حقارت کے وہ تازیانے ہیں جو اہل علم ہم پر برساتے رہتے ہیں چاہے زبان سے وہ کچھ نہ کہیں۔

فزکس کے ایک نوبل انعام یافتہ عالم کے الفاظ اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں" سلام! کیا تم واقعی سمجھتے ہو کہ ہم ایسی قوموں کی خبر گیری اور مدد کرنا چاہیں گے یا ان کے زندہ رہنے کے لیے غذا کا انتظام کرنا چاہیں گے

جنہوں نے انسانی علم کو ذرہ برابر بھی آگے نہیں بڑھایا ؟" اور اگر انھوں نے یہ نہ بھی کہا ہو تا تب بھی میرا سر شرم سے اس وقت جھک جاتا ہے جب میں کسی اسپتال میں ہوں اور یہ دیکھتا ہوں کہ وہاں جان بچانے کے لیے جتنی دوائیں استعمال ہو رہی ہیں چاہے وہ پین سیلین ہو یا کوئی اور دوا اس کے دریافت کرنے اور بنانے میں ہم مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ہمارے علمائے دین بھی اسی طرح سوچتے ہیں اس لیے امام غزالی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف " احیاء العلوم " کے پہلے باب میں ایسی سائنسوں کی تخلیق اور ترقی پر زور دیا ہے جو اسلامی معاشرہ کے لیے ضروری ہیں مثلاً صحت عامہ کی سائنس انھوں نے اس قسم کی سائنس کی تحقیق کو فرض کفایہ بتایا ہے یعنی وہ فرض جو ساری امت پر ہے لیکن اگر کچھ لوگ اسے ادا کردیں تو ساری امت کی طرف سے ادا ہو جاتا ہے۔ اور اگر کوئی ادا نہ کرے تو اس کی ذمہ داری اور گناہ ساری امت پر ہوتا ہے۔

میں آج اوّل تو ان لوگوں سے مخاطب ہوں جنہیں اللہ نے دولت سے مالا مال کیا ہے۔ دوسرے ان لوگوں سے جو ہمارے وزیر اور سلاطین ہیں اور جو ہماری سائنسی پالیسی کے لیے ذمہ دار ہیں اور تیسرے ہمارے علمائے دین۔

جیسا کہ میں بار بار کہہ چکا ہوں سائنس اس لیے ضروری ہے کہ اس سے کائنات کے بھید کھلتے ہیں اور فطرت کے نہ بدلنے والے قوانین کا علم ہوتا ہے اور اس کی مصلحتیں بھی سمجھ میں آتی ہیں۔ سائنس کے ذریعہ ہمیں مادی فائدے حاصل ہوتے ہیں اور یہ ہمارے دفاع کے لیے بھی ضروری ہے اور ایک اہم بات یہ ہے کہ یہ ساری دنیا کو ایک دھاگے میں پروتی ہے۔ یہ ایک ذریعہ بن سکتی ہے قوموں خصوصاً اسلامی قوموں کے آپسی تعاون کا۔ بین الاقوامی سائنس کے ہم قرضدار ہیں اور ہماری عزت نفس کا تقاضا ہے کہ ہم اس ادھار کے چکانے کا سامان کریں۔

میں آج کل ایک چھوٹے سے شہر میں رہتا ہوں جس کی کل آبادی ڈھائی لاکھ کے قریب ہے اور جہاں کے لوگ بہت رئیس نہیں ہیں یہاں ایک بینک ہے کاسا ڈی ریزپارمیو (CASSA DI RISPARMIO) اس بینک نے ۱۹۸۳ء میں پندرہ لاکھ ڈالر کا گرانقدر عطیہ انٹرنیشنل سنٹر [illegible] کو [illegible] عمارت بنانے کے لیے دیا ہے سنٹر

میری ہی تحریک پر بنایا گیا تھا۔ شہر کے لوگوں نے اب وعدہ کیا ہے کہ وہ کے بایو ٹکنالوجی کے مرکز کے لیے چار کروڑ ڈالر دیں گے۔ ان کے سائنس سے اس لگاؤ اور دور اندیشی پر مجھے سخت حیرت ہے۔ کاش یہ مثال ہمارے شہر والوں اور بینک کے مالکوں کی غیرت کو للکارے اور وہ بھی ایسے جانے کی کوشش کریں ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے کہ مجھے معلوم ہوا کہ امریکہ میں تیل نکالنے والے ایک قدرے گمنام خاندان کے وقف کک فاؤنڈیشن (KEK FOUNDATION) نے سات کروڑ ڈالر کی رقم کیلیفورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کو اس مقصد کے لیے دی ہے کہ وہ اس سے دنیا کی سب سے بڑی دوربین بنائیں جس کا قطر دس میٹر کا ہوگا۔ مجھے رشک بھی ہوا کہ یہ سب ایک ایسے شعبہ علم میں ہو رہا ہے جس میں کبھی ہمارا دخل بھی تھا یعنی ہیئت میں۔

بین الاقوامی معیار کے مطابق اپنی کل سالانہ پیداوار کا ایک فیصد اگر دنیائے اسلام میں سائنس کی تحقیق اور ترقی پر خرچ کیا جائے تو یہ رقم پانچ اور دس بلین ڈالر کے درمیان ہوگی اور ان کا ایک چوتھائی سے ایک تہائی حصہ تک بنیادی سائنس پر خرچ ہونا چاہیے۔ صدیوں قبل اس طرح کی روایات ہمارے یہاں بھی تھیں آپ کو خیال ہوگا کہ گیارہویں صدی عیسوی میں امام غزالی نے عراق اور ایران کی سرزمین کو خراج تحسین دیتے ہوئے کہا تھا :" دنیا میں اور کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام کرنا اتنا آسان ہو۔" یہ اس وقت تھا جب وہ تارک دنیا ہو کر درویشی اختیار کرنا چاہتے تھے۔ آج ہمیں ایک نہیں بلکہ کئی ایسے اوقاف کی ضرورت ہے جن کا مقصد سائنس کی ترقی ہو اور جس کا انتظام خود سائنسداں کریں۔ ہمیں بین الاقوامی اعلیٰ تعلیمی اداروں کی ضرورت ہے خود ہمارے اپنے ملکوں میں اور دوسرے ملکوں میں بھی جہاں ہمارے علمائے سائنس اور ان کا علم پنپ سکے۔ کاش اب مستقبل کا کوئی گبس (GIBBS) یہ نہ لکھے کہ پندرہویں صدی ہجری میں مسلمان سائنس داں تو موجود تھے لیکن ایسے تاجر، وزیر اور سلاطین نہیں تھے جو انھیں ان کی علمی سرگرمیوں کا سامان مہیا کرتے :

رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلَىٰ رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا
يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ
(خداوند جو وعدہ تونے اپنے رسولوں کے ذریعے سے کیے ہیں

ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال۔ بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں۔)

کچھ لوگوں کو تشویش ہے کہ موجودہ سائنس کا اسلام پر کیا اثر پڑے گا۔ ان سے عرض ہے کہ سائنس کے حدود کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم عصر حاضر کی سائنس میں پورے طور پر شامل ہو جائیں۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو ہم ماضی کی فلسفیانہ بحثوں ہی میں الجھے رہیں گے۔ آپ یقین مانیے کہ ہم میں اعلیٰ سائنس کی تخلیق کرنے والے موجود ہیں اور ہمارے بہت سے نوجوانوں میں اس کی صلاحیت ہے اور وہ بڑی بے تابی سے علمی جد و جہد میں حصہ لینے کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ ان پر اعتماد کیجیے ان کا ایمان کسی سے کم نہیں۔ آپ اعلیٰ معیار کی سائنس کی تخلیق کے لیے انھیں سامان فراہم کیجیے۔ یہ اسلام پر ہمارا قرض ہے۔ آپ انھیں موقع دیجیے کہ وہ سائنس کے حدود کا اندازہ اندر سے کر سکیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ سائنس اور مذہب میں کوئی تضاد نہیں۔

آخر میں مجھے دو باتیں کہنے کی اجازت دیجیے۔ پہلی بات تو طلب علم کے متعلق ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں قرآن شریف کے حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق علم کی تخلیق اور تحصیل ہر مسلمان پر فرض ہے اس کے گہوارہ سے اس کی قبر تک۔ میں نے اس سلسلہ میں البیرونی کا ذکر کیا ہے۔ جو ایک ہزار سال قبل غزنہ میں رہتے تھے۔ ان کی وفات کے متعلق ان کے ایک ہم عصر لکھتے ہیں" جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ مرض الموت میں مبتلا ہیں تو میں ان کی آخری زیارت کے لیے ان کے گھر گیا۔ انھیں دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ اب وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہیں گے۔ جب لوگوں نے انھیں میرے آنے کی اطلاع دی تو انھوں نے آنکھیں کھول دیں اور مجھ سے پوچھا کہ تم فلاں ہو۔ میں نے کہا جی ہاں۔ انھوں نے فرمایا" میں نے سنا ہے کہ تمہیں اسلامی قانون وراثت کے پیچیدہ مسائل کا علم ہے اور اس کے بعد انھوں نے ایک مشہور مسئلہ کا ذکر کیا۔ میں نے کہا" ابو ریحان۔ اس وقت اس کا کیا تذکرہ" اور ابو ریحان نے جواب دیا" کیا تمہیں نہیں معلوم کہ کسی بات کو جان کر مرنا اس سے بہتر ہے کہ بغیر اس کو جانے ہوئے مر جائے" دل غمزدہ کے ساتھ میں نے جو کچھ مجھے معلوم تھا ان سے بیان کر دیا۔ اجازت لے کر میں نے ابھی دہلیز پر قدم ہی رکھا تھا کہ اندر سے آہ و بکا کی آوازیں آئیں۔ البیرونی ختم ہو چکے تھے۔

اور آخر میں اللہ کی اس کتاب کے چند کلمات دہرا کر اپنی تحریر ختم کرتا ہوں جس کتاب کے متعلق مرمادیوک پکتھال (MARMADUKE PICKTHALL) کا کہنا ہے کہ اس کی بدولت دل مسرور اور چشم اشکبار کو کیسی کیسی نعمتیں میسر ہیں۔

" چاہے ساری دنیا کے درخت قلم بن جائیں اور سمندر کا پانی روشنائی ہو جائے اور سات سمندر بھی باقی رہیں اس روشنائی میں اضافہ کے لیے تب بھی تمہارے رب کی بزرگی اور فراست کے یہ الفاظ کافی نہ ہو سکیں گے۔"

زوال

جارج سارٹن نے اپنی کتاب "تاریخ سائنس" میں سائنسی کارناموں کو عہد بہ عہد تقسیم کیا ہے، مثلاً ۴۵۰ تا ۴۰۰ ق م افلاطون کا زمانہ وغیرہ ۷۵۰ء تا ۱۱۰۰ء مسلسل چار صدیاں مسلمان سائنسدانوں کا زمانہ ہے جن میں جابر بن حیان، خوارزمی، رازی، مسعودی، ابو الوفا، البیرونی، اور عمر خیام جیسے مشاہیر کے نام آتے ہیں۔ اس کے بعد ڈھائی سو سال کا زمانہ پھر آتا ہے جس میں ابن رشد، طوسی، اور ابن نفیس جیسے فرزندان اسلام سائنس کا پرچم بلند کرتے ہیں۔ لیکن جب اسلام کو ہندوستان میں عروج ہوتا ہے تو حکمت و سائنس کی روایت ختم ہو چکی تھی زمام اقتدار ناخواندہ بادشاہوں کے ہاتھ میں تھی جو اپنے جاہ و جلال کا شوق رکھتے تھے اور بس انہوں نے آئندہ نسلوں کے لیے عالیشان مقبروں کے سوا اور کچھ نہ چھوڑا۔ کسی مسلمان بادشاہ نے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لیے روپیہ خرچ نہیں کیا۔ مسلمان بادشاہوں کا یہ رویہ ہنوز جاری ہے۔ — عبدالسلام

TABLE 1 جدول ١

The number of visitors from Arab-Islamic Countries to the International Centre for Theoretical physics, Trieste

Member States	No. of visitors from 1970-84	Federation Agreement	GNP US Dollars billions (UN 1980)
GROUP I			
Bahrain	3		3.2
Iraq	86	1	n. a.
kuwait	73	2	30.6
Oman			5.4
Qatar	8	1	6.5
Saudi Arabia	51	2	117.2
United Arab Emirates	1		28.9
Yemen Arab Republic	28	1	3.3
Yemen's People,s Republic	1	0	.9
GROUP II			
Jordan	78	3	3.8
Lebanon	89	2	n.a.
Syria	52	4	14.6
West Bank	7	1	n.a.
GROUP III			
Afghanistan	11		n.a.
Iran	135	3	n.a.
Maldives			n.a.
Pakistan	365	4	29.8
Turkey	327	8	70.2
CROUP IV			
Bangladesh	183	2	12.8
Indonesia	118		78.7
Malaysia	93		26.1
GROUP V			
Algeria	86	2	42.0
Djibuti			.18
Egypt	602	20	28.1
Libya	73	2	26.0
Morocco	62	2	17.9
Sudan	106	2	7.4
Tunisia	36	1	9.3
GROUP VI			
Central Africa	3		.7
Cameroon	23		4.6
Chad			.5
Comoros			.1
Ethiopia	17		4.5
Gabon	4		2.8
Gambia			.22
Guinea-Bissau			.15
Guinea	7		1.6
Ivory Coast	8		10.5
Mali	27		1.3
Mauritania	4	1	.7
Niger	8		1.9
Nigeria	230	7	76.1
Senegal	38	1	2.5
Sierra Leone	44	1	1.1
Somalia	5		1.2
Togo	20		1.0
Upper Volta	10		1.5
Uganda	3		n.a.
Grand Total	3,134	74	

TABLE 2

R & D Manpower in Islamic Countries

Name of contry	Year	Population (Millions)	R & D Scientists, Engineers
Algeria	1972	16.8	242
Bahrain	1967	0.3	—
Bangladesh	1973	79.0	—
Cameroon	1976	7.5	—
Chad	1971	4.0	85
Comoros	—	—	—
Djibuti	1973	0.1	—
Gabon	1970	0.5	8
Gambia	1973	0.5	—
Gutnea	—	—	—
Guinea Bissau	—	—	—
Indonesia	1976	140.0	7,645
Iran	1974	33.0	4,896
Iraq	1972	11.1	1,486
Jordan	1977	2.7	452
Kuwait	1975	1.0	606
Lebanon	1972	2.5	180
Libya	1980	2.4	60
Mali	—	—	—
Malaysia	1970	11.9	—
Maldives	—	—	—
Mauritania	—	—	—
Morocco	—	—	—
Niger	1976	4.6	93
Nigeria	1970	65.7	2,200
Oman	—	—	—
Pakistan	1979	70 2	5 144
Qatar	1974	0 2	—
Saudi Arabia	1974	7.2	—
Senegal	1972	4.5	522
Somalia	1965	2.0	—
Sierra Leone	—	—	—
Sudan	1971	15.7	3,268
Syria	1970	7.4	—
Tunisia	1974	5 6	—
Turkey	1975	40 3	11,808
U.A.E.	—	—	—
Uganda	—	—	—
Upper Volta	—	—	—
Yemen Arablic Repulic	1974	6.0	60
S. Yemen	—	—	—
Egypt	1976	37.0	10.665
Afghanistan	1966	14.0	330
Total			45,136

The figures are taken from the Secretariat Report presented to the first meeting of the Islaamc Conference on Science and Technology, May 1983.

میری گذارش

" اے میری قوم کے لوگو! اپنے عزیزوں اور پیارے بچوں کو غارت نہ کرو۔ ان کی پرورش کرو۔ اُن کی آیندہ کی زندگی اچھی طرح بسر ہونے کا سامان کرو۔

مجھ کو تم کچھ ہی کہو۔ میری بات سنو یا نہ سنو، مگر یاد رکھو کہ اگر تم ایک قومی تعلیم کے طور پر ان کو تعلیم نہ دو گے تو وہ آوارہ اور خراب ہوں گے۔ تم ان کی ابتر حالت کو دیکھو گے اور بے چین ہو گے۔ روؤ گے اور تم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ ابھی وقت ہے۔ اور تم سب کچھ کر سکتے ہو مگر یاد رکھو، میں یہ پیشین گوئی کرتا ہوں کہ اگر اور چند روز تم اسی طرح غافل رہے تو ایک زمانہ ایسا آوے گا کہ تم چاہو گے کہ اپنے بچوں کو تعلیم دو، ان کی تربیت کرو مگر تم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔

میں تم سے خدا کے سامنے کچھ سفارش نہیں چاہتا۔ میں تم سے اپنی شفاعت کے واسطے خواستگار نہ ہوں گا۔ میں جو کچھ کہتا ہوں تمہارے بچوں کی بھلائی کے لیے کہتا ہوں۔ تم انہیں پر رحم کرو۔ اور ایسا کچھ کرو کہ آیندہ کو پچھتانا نہ پڑے۔"

سرسید۔ لیکچر بمقام لدھیانہ ۲۳ جنوری ۱۸۸۳ء)

لیکچروں کا مجموعہ صفحہ ۱۵۹

TABLE 3 جدول ۳

Net Enrollment in Islamic Countries and Countries with Large Muslim Minorities 1980 (World Bank)

	Percentage of Population Enrolled			
	6-11 years	12-17 years	18-23 years	ICTP Visitors 1970-79
1. South East Asia				
Bangladesh	52.8	12.2	3.9	81
Indonesia	66.1	37.6	6.7	58
Malaysia	92.0	57.7	3.0	30
Philippines	78.2	63.2	22.7	23
2. Central Asia and Europe				
Pakistan	44.7	13.6	3.0	179
Iran	72.3	59.2	14.3	74
Turkey	67.7	56.9	10.9	104
Afghanistan	16.8	13.9	3.0	6
India	63.7	26.7	5.9	506
3. Arab Countries				
Algeria	74.7	40.3	3.7	36
Tunis	77.2	48.4	12.3	13
Morocco	43.9	29.5	4.5	40
Egypt	69.5	39.0	19.9	255
Syria	93.9	65.2	18.2	26
Lebanon	89.2	62.6	30.7	62
Iraq	83.7	64.6	16.5	43
Jordan	76.4	57.7	8.3	35
Sudan	306.0	23.7	3.7	63
Saudi Arabia				30
Oman	40.9	18.3	1.9	
Yemen	23.0	8.4	1.1	11
Yemen (PDR)	67.6	33.1	6.7	
Bahrain	78.1	65.2		
Libya				14
4. Africa				
Nigeria	65.8	32.4	2.5	99
Senegal	35.4	26.2	7.4	99
Tanzania	53.8	32.1	1.3	18
Sierra Leone	34.8	23.1	4.6	27
Cameroon	85.5	49.0	6.0	12
Mali	21.0	16.5	3.2	15
Mauritania	23.2	18.6	1.9	1
Chad	30.0	13.8	1.0	
Upper Volta	12.2	6.2	.5	5
Somalia	21.7	16.5	.8	3
Central Africa Rep.	56.8	25.2	2.4	1
Guinea	26.0	21.4	7.2	1
Gambia	28.7	16.8	.7	
Developing countries	64	38	8.7	
Developed Countries	94	86	38	

آئی سی ٹی پی

تاج محل سے کون واقف نہ ہوگا۔ مشرق کی یہ وہ نادر المثال یادگار ہے جس نے ہر چشمِ فکر پر ایک نیا عکس بنایا ہے اور جسے دیکھنے والا خراجِ تحسین پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سنگِ مرمر کے اس تماشہ کے دل کو چھو لینے والے حسن اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے جمال کا سرچشمہ دردِ عشق ہے جو تاج کی شکل میں مجسم ہو گیا ہے۔ ٹیگور کی زبان میں؛

"تاج ایک چشمِ عشق کا منجمد آنسو ہے"

آئی۔ سی۔ ٹی۔ پی۔ (انٹرنیشنل سینٹر فار تھیوریٹیکل فزکس، ترئستے۔ اٹلی) ایک بین الاقوامی ادارہ ہے جس کا بنیادی مقصد تیسری دنیا کے ممالک میں سائنسی علوم کا فروغ ہے۔ یہاں دنیا کے کونے کونے سے ترقی یافتہ و پسماندہ ممالک کے سائنسداں مختصر مدت کے لیے علم کی پیاس بجھانے آتے ہیں۔ کچھ سیکھتے ہیں کچھ سکھاتے ہیں۔ پھر نئے خیالات و نئے رجحانات کی مے سے سرشار واپس لوٹ کر اپنے اپنے ممالک کی تعمیر و ترقی میں لگ جاتے ہیں۔ فی الحقیقت آئی۔ سی۔ ٹی۔ پی۔ ایک ادارہ نہیں انسانی برادری کے وحدت کے خواب کی زندہ تعبیر ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں امیر و غریب، رنگ و نسل اور مذہب و قومیت کی ساری سرحدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہاں مسلمان عیسائی کو گلے لگاتا ہے، گورا کالے کو خوش آمدید کہتا ہے اور اشتراکی سرمایہ دار کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔ اس ادارے نے دانستہ و نادانستہ طور پر پسماندہ ممالک میں سائنسی علوم کو پھیلانے میں کیا اہم کردار ادا کیا ہے اس کا صحیح اندازہ تو آنے والا مورخ ہی کرے گا۔ البتہ یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس ادارے نے پسماندہ ممالک میں سائنسی انقلاب کی ایک لہر پیدا کر دی ہے جو ہر آن بڑھتی جا رہی ہے۔

تاج کی طرح آئی۔ سی۔ ٹی۔ پی۔ بھی ہر چشم بینا سے خراجِ عقیدت وصول کر رہا ہے۔ اٹلی کے ایک چھوٹے سے شہر میں قائم اس ادارے کے جمال بیلیٔ علم و نورِ شمع انسانیت کا سرچشمہ ایک حساس اور درد مند انسان کا خونِ جگر ہے۔ سچ تو یہ ہے ،

آئی۔ سی۔ ٹی۔ پی۔ ایک غمگسار دل کا منجمد لہو ہے۔

اور وہ غمگسار دل سائنس کے اس تاج محل کے شاہجہاں محمد عبدالسلام کے علاوہ کس کا ہو سکتا ہے جو صرف کائنات کے رازِ سربستہ سے سرگوشی ہی نہیں کرتے بلکہ تیسری دنیا خصوصاً عالمِ اسلام کی حالتِ زار پر اشکِ خوں بھی بہاتے ہیں۔

پروفیسر آئی۔ احمد
ڈپارٹمنٹ آف فزکس، اے ایم یو

عبدالسلام
ایک عظیم سائنس داں

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اقبالؒ کے اس شعر پر سبھی جھوم اٹھتے ہیں۔ لیکن اقبال کے مرد کی شمشیر ہاتھ میں لے اٹھنے کا حوصلہ بہت کم کو ہوتا ہے۔ نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام ان چند جیالوں میں سے ہیں جس نے نہ صرف اس شمشیر کو اٹھایا بلکہ اس سے بھرپور جہاد بھی کیا۔ ۲۹ر جنوری ۸۶ء کو ساٹھ سال پوری ہونے والی ان کی زندگی اقبال کے اس شعر کی تفسیر ہے۔

ساٹھ سال کا زمانہ — کائناتی پیمانہ پر اس کی حقیقت ایک خفیف ترین وقفے سے زیادہ نہیں۔ البتہ جب یہی زمانہ کسی مردِ کامل کے ہاتھوں کائنات کی حقیقتوں پر پڑے ہوئے دبیز پردوں کو اٹھانے، منشائے تخلیق کی تہ تک پہنچنے اور مخلوقِ کائنات کے درد کو سمجھنے اور بانٹ لینے میں صرف ہو تو وہ مستقبل کو جذب کر کے ایک لامتناہی حجم اختیار کر لیتا ہے۔ وہ جاوداں بن جاتا ہے اور تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو جاتا ہے۔ عبدالسلام ایک ایسا ہی مردِ کامل ہے جس نے کائنات کے رازِ سربستہ سے سرگوشی کی، فطرت کی بظاہر مختلف قوتوں کو وحدت کی مضبوط لڑی میں پرو دیا، تیسری دنیا کے دکھ درد کو سمجھا اور اس کے مداوا کے لیے شب و روز ایک کر دیا۔ اس طرح انھوں نے اپنی گذشتہ عمر کے ساٹھ سال کو زمانۂ مستقبل پر محیط کر دیا۔

سطحِ آب پر کبھی مختلف لہروں کو باہم متصل ہوتے ہوئے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو گا۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ باہم ملنے والی لہروں کے نشیب و فراز کسی خاص ترتیب و نظم یا آہنگ سے نہیں ملتے۔ چنانچہ ایک لہر کا نشیب دوسرے کے فراز سے مل کر ایک دوسرے کے اثر کو کم کرتا رہتا ہے اور سطحِ آب پر صرف ہلکورے نظر آتے ہیں۔ البتہ بعض انتہائی مخصوص حالات میں یہ بھی ممکن ہے کہ ایک خاص مقام پر مختلف لہروں کے فراز ایک خاص ترتیب کے ساتھ ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہوئے ملیں۔ ایسی صورت میں پانی اپنی نارمل سطح سے کافی اونچا اٹھ کر ایک بڑے فراز کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ عبدالسلام کی ابتدائی زندگی حالات کی لہروں کے فرازوں کا باہم مل کر ایک بڑا فراز بن جانے کے مترادف ہے۔ انہوں نے ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جو علم دوست تھا۔ انہیں ایسے والدین ملے جنھوں نے ان کی تعلیم و تربیت میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ قدرت نے انھیں ایک غیر معمولی ذہن سے نوازا۔ نتیجہ — ان جیسا شاندار تعلیمی ریکارڈ شاید ہی کسی کا ہو۔ ہر امتحان میں کامیاب ہونے والوں میں وہ سرِ فہرست رہے اور بیشتر میں نئے ریکارڈ قائم کیے۔ پھر قدرت نے کچھ ایسے حالات پیدا کیے کہ وہ اپنے عزیز و اقارب کی شدید خواہش کے باوجود سول سروس میں لیے نہ جا پائے۔ اس طرح ان کی عبقریت بے موت مرنے سے بچی۔ اتنا ہی نہیں قدرت نے یہ بھی انتظام کر دیا کہ وہ علومِ جدیدہ کے بہترین گہوارے میں زانوئے تلمذ تہ کریں۔ یعنی اعلیٰ تعلیم کے لیے اسکالرشپ کی ایک ایسی رقم کا قیام جس سے صرف اور صرف عبدالسلام مستفید ہو سکے۔ اس طرح حالات کی لہروں کا فراز انہیں ان کی موجودہ بلندی کی طرف لے گیا۔

گو قدرت نے عبدالسلام کی پشت پناہی قدم قدم پر کی۔ لیکن یہ سب کچھ اللہ کی سنت کے مطابق ہوا۔ خدا انھیں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ عبدالسلام کی ہر کامیابی کے پیچھے ان کی شب و روز کی محنت، لگن اور

علم کیا چیز ہے

اضوس یہ ہے کہ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ اس زمانہ میں علم کیا چیز ہے جس سے قومی ترقی ہوتی ہے۔ آج تک جو ہم نے جانا اور جو ہمارے بزرگوں نے جانا۔ علم کی حقیقت کو اسی قدر جانا کہ ایک شے عقلی ہے جو خیال میں اور حافظہ میں رہتی ہے اور نفس کو اس سے بہت مزا اور روح کو خوشی حاصل ہوتی ہے مگر اس زمانہ میں اسی کو اصل علم کہتے ہیں جو دیکھنے اور برتنے اور تجربہ میں آوے اور انسان کے لیے اس کے تمام کاموں میں مفید ہو۔ سرسید (لیکچرس صہ ۵)

اپنے مقصد سے جذباتی لگاؤ کا ہاتھ زیادہ ہے۔ اگر وہ قدرت سے عطا کی گئی زرخیز زمین کو اپنے عرقِ انفعال سے سیراب نہ کرتے تو ان بلندیوں کو جن پر وہ آج ہیں چھو پانا ممکن نہ ہوتا۔ ایسا نہیں کہ زندگی کے سفر میں انہیں ہمیشہ ہی ہموار راستہ ملا ہو۔ ایسا ہونا خلافِ فطرت ہوتا۔ ان کی راہ میں کئی ناہمواریاں بھی آئیں۔ خصوصاً اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد جب وہ اپنے وطن پاکستان واپس لوٹے اور پنجاب یونیورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔ اس زمانہ میں پاکستان میں کوئی علمی ماحول نہ تھا۔ خصوصاً سائنسی علوم کے لیے وہاں کی زمین بالکل بنجر تھی (آج بھی حالات کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں) عبدالسلام نے اس بنجر کو زرخیز بنانے کی بہت کوشش کی مگر کچھ کامیابی نہ ملی۔ انہیں اپنی کوششوں کے جواب میں تمسخر، حوصلہ شکنیاں اور حاسدانہ جذبات ملے۔ یقیناً انہیں اپنی ساری اعلیٰ تربیت خاک میں ملتی نظر آئی ہوگی۔ اپنے ملک کو بین الاقوامی سائنس میں ایک خاص مقام دلانے کا ان کا خواب چور چور ہو گیا ہوگا۔ پر وہ عبدالسلام ہی کیا جو رکاوٹوں سے گھبرا جائے۔ ناساعد حالات کے سامنے سپر ڈال دے۔

بہم ہوائیں لاکھ مزاحم ہوئیں مگر
دیوانہ وار موج نے ساحل کو جا لیا

انہیں جب یہ یقین ہوگیا ہوگا کہ وہ اپنے وطن کی خدمت اپنے وطن سے دور رہ کر زیادہ بہتر طور پر کر سکتے ہیں تو انہوں نے پردیس کی طرف رخ کیا۔ انگلستان نے ان کا خیر مقدم کیا۔ جہاں وہ پہلے نظریاتی طبیعات کے لکچرر پھر چند ہی سال بعد پروفیسر بنائے گئے۔ ہر چشم بینا یہ دیکھ سکتی ہے کہ باہر رہ کر انھوں نے جو کمال حاصل کیا اور جس طرح انھوں نے اپنے ملک وملت کی خدمت کی وہ پاکستان میں رہ کر ممکن نہ تھی۔

عبدالسلام کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ ان میں کئی کمال ہیں، کئی خوبیاں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان میں کوئی انسانی کمزوری نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ فرشتہ ہوتے، پھر اس دنیا کے کام کے نہ رہ جاتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی شخصیت میں کمالات کا وہ جگمگاتا ہے اور عظمتوں کی وہ چکاچوند ہے کہ انسانی کمزوریوں کے چند خفیف دھبے جو یقیناً ہوں گے نظر نہیں آتے۔

عبدالسلام کی عظمت کی مضبوط بنیاد یہ ہے کہ وہ ایک عظیم سائنس داں ہیں۔ سائنس کے میدان میں اپنی عظمت کا سکہ انھوں نے نہایت کم عمری میں ہی جما لیا تھا۔ ان کا پہلا اہم کام یہ ہے کہ انھوں نے نظریاتی ذریاتی طبیعات میں موجود ایک ریاضیاتی بھونڈے پن کو دور کرنے کا طریقہ کار دیا۔ جس سے نظریاتی طبیعات کے حسن میں نکھار آگیا۔ سائنسی کمیونٹی میں ان کے اس کام کی کافی پذیرائی ہوئی اور انتہائی کم عمری ہی میں ان کو فیلو آف رائل سوسائٹی چن لیا گیا۔ ان کا دوسرا اہم کام بھی نظریاتی طبیعات کو، تجربات کی روشنی میں، خوبصورت تر بنانے سے متعلق ہے۔ ۱۹۵۶ء تک یہ عام خیال تھا کہ کائنات میں کارفرما مختلف قوتیں کسی طبیعاتی عمل اور آئینے میں اس کے عکس میں تمیز نہیں کرتیں۔ عبدالسلام نے یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ اصول مطلق نہیں۔ خفیف نیوکلیائی قوت اس سے انحراف کرتی ہے۔ اسی زمانہ میں دو امریکی سائنس داں لی (Lee) اور یانگ (Yang) نے بھی ایسا ہی نظریہ پیش کیا جس پر انہیں نوبل انعام سے نوازا گیا۔ یہ ایک طرح کا تعصب تھا جو عبدالسلام کو اس نوبل انعام میں شریک نہیں کیا گیا۔ نوبل کمیٹی کا یہ رویہ جس پر منصف مزاج سائنس دانوں کا حلقہ متعجب بھی ہوا عبدالسلام کی دل شکنی کا باعث نہ بن سکا۔ وہ مستقل اپنی گرانقدر سائنسی تحقیقات سے طبیعات کو نوازتے رہے اور ذراتی طبیعات کو نئی نئی راہوں سے روشناس

کرائے رہے۔ سن ۱۹۶۷ء کے لگ بھگ انھوں نے دوسرا بنیادی اہمیت کا نظریہ پیش کیا۔ یہ برقی مقناطیسی، خفیف نیوکلیائی قوتوں کی وحدت کا نظریہ ہے۔ اس نظریے کی صداقت کا تجرباتی ثبوت سن ۱۹۷۳ء میں ملا۔ اور اسی نظریہ کو پیش کرنے پر انہیں سن ۱۹۷۹ء میں نوبل انعام ملا۔ یہ نظریہ دراصل عبدالسلام کے پیش کردہ کائنات میں کارفرما بظاہر مختلف قوتوں کے وحدت کے وسیع تر نظریہ کی پہلی کڑی ہے۔ اس کی دوسری کڑی برق مقناطیسی، خفیف نیوکلیائی و قوی نیوکلیائی قوتوں کی وحدت کا نظریہ ہے جس کی ایک پیشین گوئی یہ ہے کہ اب تک اٹوٹ سمجھا جانے والا پروٹان بھی ایک لمبے عرصے کے بعد ٹوٹ سکتا ہے۔ دنیا کی کئی بڑی تجربہ گاہوں میں عبدالسلام کے اس نظریہ کی پیشین گوئی کو تجربہ کی کسوٹی پر پرکھا جا رہا ہے۔ اگر ان کی یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی تو عام خیال ہے کہ ان کو ایک بار پھر نوبل انعام سے نوازا جائے گا۔ آج کل وہ کائنات کی کل چار بظاہر مختلف قوتوں یعنی برق مقناطیسی، خفیف نیوکلیائی، قوی نیوکلیائی اور کشش ثقل کی وحدت کی ایک قابل قبول تھیوری دینے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ کیا عجب قدرت نے توحید کے اس پرستار کو کائنات کی بظاہر مختلف چاروں قوتوں کے وحدت کے راز آشکار کرنے کے لیے چن لیا ہو۔

عبدالسلام کی عظمت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ مشرق کی روحانی قدروں کے پرجوش علمبردار ہیں۔ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ مغرب میں گذارنے کے باوجود وہ سرتاپا مشرقی ہیں۔ مغربی تہذیب کی چکاچوند یا اس کے نت نئے رجحانات کے تیز دھاروں سے وہ چنداں مرعوب نہیں۔ وہ نیوٹن اور میکسویل کے دیس میں رہتے ہوئے بھی بو علی سینا اور ابن ہیثم سے قریب ہیں۔ وہ اپنے دین اسلام کی حقانیت پر کامل یقین رکھتے ہیں اور اس کی ہدایات پر سختی سے عمل بھی کرتے ہیں۔ مغرب میں ہونے والی کانفرنسوں کی پارٹیوں میں جب سب شرکاء کے ہاتھ میں جام لنڈھائے جاتے ہیں عبدالسلام کے ہاتھ میں دودھ یا کسی شربت کا گلاس ہوتا ہے۔ انہیں اپنے کلچر پر فخر ہے اور اس کے اعلیٰ ہونے کا وہ برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اس بابت ان کے جذبات کا اندازہ نوبل انعام کے جشن کے موقع پر ان کے لباس کے انتخاب سے لگایا جا سکتا ہے۔ نوبل انعام لیتے وقت وہ جھنگ کے مخصوص علاقائی لباس میں تھے۔ شلوار و شیروانی، سر پر پگڑی اور پیروں میں لمبی نوکوں والے جوتے۔

ایثار

نوبل انعام حاصل کرنے کے بعد جب مجھے پاکستان مدعو کیا گیا تو میں نے پیش کش کی تھی کہ میرے انعام کی رقم سے اور کچھ سرکاری سرمایہ سے ایک "سائنس فاونڈیشن" قائم کی جائے جو طلباء سائنس کو وظائف اور انعامات دیا کرے۔ افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ لیکن میں نے اپنا کام جاری رکھا اور اپنے انعام کی رقم سے از خود ایک فاونڈیشن قائم کردی۔ مجھے احساس ہے کہ ساٹھ ہزار ڈالر کی رقم کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن کچھ نہ کچھ ہونا بالکل نہ ہونے سے بہتر ہے۔ کچھ طلباء تو اس سے مستفید ہو رہے ہیں سال میں پچاس طلباء۔ گذشتہ برس ہم نے ایک خاتون ماہر طبیعیات کو بھی ایک ہزار ڈالر کا انعام دیا۔ اس سال خاتون ریاضی دان کی باری آئیگی۔ اسی طرح جب مجھے "ایٹم برائے امن" کا انعام ملا تو میں نے وہ رقم جھنگ، ساہیوال اور لاہور کے بعض اسکولوں اور کالجوں میں لیبارٹری بڑھانے پر وقف کردی۔ میرا ایک کام نتھیا گلی سمر سکول برائے طبیعیات کا قیام ہے۔ یہ پاکستان میں اپنی نوعیت کا منفرد اسکول ہے جسے میں نے ۱۹۷۶ء میں قائم ہونے میں مدد دی تھی اور یہ ایٹمی انرجی کمیشن کے تحت ابتک چل رہا ہے۔

(پروفیسر عبدالسلام)

عبدالسلام کی عظمت کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ وہ پایہ کے سائنس داں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انتہائی کامیاب ایڈمنسٹریٹر (ADMINISTRATOR) بھی ہیں۔ عام محققین میں انتظامی صلاحیت نہیں کے برابر ہوتی ہے۔ یا اگر کسی میں ہے بھی تو وہ انتظامی امور سنبھالنے کے بعد علمی کام یکسر چھوڑ دیتا ہے۔ ان عبدالسلام کا کمال ہی کہیے کہ وہ اعلیٰ پیمانہ کی تحقیق بھی کرتے ہیں اور ساتھ ایک کافی بڑے پیمانہ قوامی مرکز کا انتظام بھی سنبھالتے ہیں۔ ان کے تذ

ایسا کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ بس ذرا سی توجہ اور اپنے اوقات میں ترتیب کی ضرورت ہے۔ اکثر وہ اس بات پر اظہار تاسف بھی کرتے ہیں کہ ہمارے پسماندہ ممالک کی یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ ان کے سائنس دان اعلیٰ انتظامی عہدہ سنبھالتے ہی علمی کام چھوڑ دیتے ہیں۔ یعنی وہ اسی کام سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں جس کی بدولت انہیں وہ عہدہ ملا تھا۔ اس وجہ سے علمی ترقیوں سے ان عہدہ داروں کی ناواقفیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ جس کا ایک برا اثر ملک کی سائنسی پالیسی پر پڑتا ہے۔

ادھر چند سالوں سے عبدالسلام کے کاندھوں پر انتظامی امور کا کچھ زیادہ ہی بوجھ آن پڑا ہے۔ انھوں نے تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنس کو قائم کیا ہے جس کے وہ صدر ہیں۔ اس کے باوجود وہ علمی تحقیق کے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔

عبدالسلام کی شخصیت کا سب سے زیادہ روشن پہلو یہ ہے کہ وہ ایک درد مند دل کے مالک ہیں۔ وسیع القلب ہیں اور منکسر المزاج ہیں۔ اور یہی وہ پہلو ہے جو انہیں دنیا کے عظیم سائنس دانوں کے درمیان قد آور بناتا ہے۔ عبدالسلام کے ہم پلہ یا ان سے بڑے اور بھی سائنس داں ہیں۔ ان جیسے کامیاب اور بھی اپنے اپنے ملک میں ہیں۔ اپنی تہذیب کے پرجوش علمبردار بھی کم نہیں۔ لیکن کسی ایک فرد میں ان کمالات کا اجتماع ہونا اور ساتھ ہی اس فرد کا منکسر المزاج اور درد مند ہونا صرف عبدالسلام کا ہی تشخص ہے۔ ان کی بلند قامتی صرف اس وجہ سے نہیں کہ انہوں نے بنیادی اہمیت کے سائنسی نظریات پیش کیے بلکہ اس سے زیادہ ان کی اس تگ و دو کی وجہ سے ہے جو وہ پسماندہ ممالک کے سائنسدانوں کو اعلیٰ تحقیق کے وسائل فراہم کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ یہ ہے کہ پسماندہ ممالک میں نہ جانے کتنے عبدالسلام پیدا ہونے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔ پسماندہ ممالک کے سائنسداں بھائیوں کی مدد کے لیے انھوں نے اٹلی میں ایک بین الاقوامی مرکز قائم کیا ہے جس کا نام انٹرنیشنل سینٹر فار تھیوریٹیکل فزکس ہے۔ پچھلے بیس سال سے وہ اس مرکز کو خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں جس سے پچاسوں ہزار سائنسدانوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ یہ مرکز بھی عبدالسلام کے زرخیز ذہن کی ایک اعلیٰ تخلیق ہے۔ اس کے دور رس اثرات بیان کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ مختصراً اس مرکز نے پسماندہ ممالک میں ایک سائنسی انقلاب کی بنیاد ڈال دی ہے۔

[illegible]

دانشوں کی، عمل و جفاکشی کی اور اپنے تہذیبی ورثہ میں جائز فخر کی۔ یہ تحریک ہے دنیا سے غربت و جہالت مٹانے کی اور طاقتور ممالک کے ظلم و استحصال کے خلاف جہاد کی۔ وہ اپنی تحریروں و تقریروں کے ذریعے مستقل یاد دلاتے رہتے ہیں کہ دنیا کے ترقی یافتہ و طاقتور ممالک بڑی عیاری سے پسماندہ ممالک خصوصاً عالم اسلام کا خون چوس رہے ہیں۔ ان ترقی یافتہ ممالک کے امدادی پروگرام وان کے بظاہر فیاضانہ سلوک کے پس پردہ پسماندہ ممالک کا معاشی و سیاسی استحصال ہے۔ ترقی یافتہ ممالک نے کبھی بھی دل سے یہ نہ چاہا کہ دنیا سے غربت و افلاس و معاشی و علمی ناہمواری دور ہو۔ وہ اس بات کا اظہار انتہائی پردرد الفاظ میں کرتے ہیں کہ پسماندہ دنیا آج جس بحران سے دوچار ہے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی، حتیٰ کہ نوآبادیاتی دور میں بھی نہیں جب تیسری دنیا کے خام مال پر ترقی یافتہ ممالک کو کامل اختیار حاصل تھا۔ اس دور میں پسماندہ دنیا سے صرف خام مال برآمد ہوتا تھا اور آج خام مال کے ساتھ بہترین دماغ بھی۔ اپنی ان باتوں کی صداقت کے ثبوت میں وہ مختلف ذرائع سے حاصل کیے گئے اعداد و شمار پیش کرتے ہیں۔

وہ اس بات کی مستقل تبلیغ کرتے رہتے ہیں کہ عالم اسلام کی فلاح خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونے اور اپنے گم شدہ ورثہ کے حاصل کر لینے میں ہے۔ ان کے نزدیک یہ گم شدہ ورثہ سائنس ہے۔ وہ مسلمانوں کو بار بار ان کی تاریخ یاد دلاتے ہیں کہ کس طرح ان کے آبا و اجداد بلا شرکت غیرے چار سو سال تک دنیائے علم و دانش کے امام رہے اور سائنس کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ان کے خیال میں ملت اسلامیہ کے زوال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس نے مغرب میں آنے والے سائنسی انقلاب اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والے تکنیکی انقلاب سے خود کو باخبر نہ رکھا۔ اور اس کی طرف سے مکمل بے اعتنائی برتی۔ وہ بڑے اعتماد سے کہتے ہیں کہ ملت اسلامیہ صرف چند دہائیوں میں عالمی برادری میں اپنا کھویا ہوا وقار پھر سے بحال کر سکتی ہے اور مسند امامت پر پھر سے فائز ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ علم و دانش کی راہ اپنائے، سائنسی تخلیق کی عرق ریزیوں کی لذتوں سے خود کو آشنا کرے اور ایسے نوجوان سائنس داں پیدا کرے جو اس فنا فی الذات

[illegible]

I

پروفیسر جان زیمان
ترجمہ:
ڈاکٹر عالم حسین
ڈپارٹمنٹ آف اپلائیڈ فزکس اے۔ ایم۔ یو۔

وقت، حقیقت اور عبدالسلام

(پروفیسر جان زیمان (FRS) نے ۲ جولائی ۱۹۸۱ء کو پروفیسر عبدالسلام کو برسٹل یونیورسٹی میں ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری عطا کرنے کے لیے وائس چانسلر کے سامنے جو خطبہ دیا تھا اس کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔)

عبدالسلام کی زندگی اور کارہائے نمایاں دونوں میں ایک ہی تصور کارفرما ہے اور وہ ہے ارتباط و اتحاد۔ عبدالسلام دین اسلام پر ایمان رکھتے ہیں اور انھوں نے اپنی زندگی کو نظریۂ وحدت کے لیے وقف کر دیا ہے — وحدت جو کہ فطرت میں رچی بسی ہوئی ہے اور بنی آدم کو اتحاد کے رشتوں میں منسلک کیے ہوئے ہے۔ ایک فلسفی کی حیثیت سے عبدالسلام اس نکتے تک پہنچے کہ بنیادی مادّی ذرّات کے مابین کارفرما مختلف النوع قوتوں کو اصل میں صرف ایک بنیادی مادّی قوت کی مختلف شکلوں کے علاوہ کچھ اور نہ ہونا چاہیے۔ ایک سیاسی اور اخلاقی رہنما کی حیثیت سے انھوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ قوموں اور تہذیبوں کا اختلاف ایک عالمی سائنسی برادری کے قیام کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

آج اس عظیم ہستی کا استقبال ہم اپنی فیکلٹی میں اس لیے کر رہے ہیں کیوں کہ وہ اس وقت تمام دنیا میں نظریاتی طبیعیات کے ممتاز ترین ماہرین میں سے ایک ہیں۔ کیمبرج میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے سے پہلے ہی انھوں نے ایسا نمایاں تحقیقی کام کیا تھا کہ اس پر ۱۹۵۰ء میں ان کو اسمتھ پرائز (SMITH PRIZE) سے نوازا گیا۔ اس دن سے آج تک عبدالسلام مکمل طور تحقیق کی مہم پر مہم سر کر رہے ہیں۔ ان کے اس تحقیقی مشن کی نوعیت جواہر حقیقت کی حصول کان کنی کے مانند ہے جس میں عبدالسلام دھیرے دھیرے چھوٹو کو ہٹا کر الجھی گتھیوں کو سلجھا کر حقیقت کو عیاں کرنے کی جد و جہد میں مستقل لگے ہوئے ہیں۔ کوانٹم طبیعیات کے پیرہن میں پنہاں مادّے کے بنیادی اجزا کی کھوج اور اس کی تفہیم کے ڈرامے کے ہر سین میں عبدالسلام نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ وہ عوامی امور میں بھی کافی عمل دخل رکھنے کے باوجود، بنیادی ذرّات کی فزکس میں اب تک دو سو سے زاید نمایاں تحقیقی مقالات پیش کر چکے ہیں اور یہی نہیں بلکہ اب بھی شدید مقابلوں اور ذہنی کاوشوں کی ہل چل کے درمیان نکالتا اپنے لیے راہ بناتے چلے جا رہے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ آج بھی عبدالسلام تحقیق کے میدان میں اتنی مضبوطی سے قدم جمائے ہوئے معروف کارزار ہیں کہ میں نے ان کے کارناموں کی مکمل فہرست کندہ کرانے کی ہمت ابھی تک نہیں کی ہے۔ کیا معلوم کہ آنے والی صبح میں کہیں کوئی مشاہدہ ہو جس کے نتیجے میں عبدالسلام کی کارگزاریوں کی فہرست میں ایک نئی تھیوری کا اضافہ ہو جائے! عبدالسلام غیر معمولی سائنسی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ مثال کے طور پر وہ مادّی حقائق پر مبنی ایسے نظریاتی رشتے بہ آسانی تجویز کر دیتے ہیں جن کی صداقت کو پرکھنے کی کاوش کے رایگاں جانے کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ عبدالسلام کے تشکیل کردہ الیکٹرو ویک قوت کے تصور نے ان کو ۱۹۷۹ء کے طبیعیات کے نوبل پرائز میں حصے دار بنایا۔ اس تصور کو انھوں نے ۱۲ سال قبل پیش کیا تھا، اس کے بعد تین چار سال تک کسی نے اس پر وقت صرف نہ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نظریے کو سمجھنے کی راہ میں تقریباً ناقابل عبور ریاضیاتی

ہُنر، فن اور علم

> ہنر، فن اور علم ایسی چیزیں ہیں کہ ان میں ہرایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا چاہیئے۔ ایک متعصب انسان ان تمام دلچسپ اور مفید باتوں سے جو نئی نئی تحقیقات اور نئے نئے علوم سے حاصل ہوتی ہیں محض جاہل اور ناواقف رہتا ہے۔ اس کی عقل اور اس کی دماغ کی قوت محض بیکار ہوجاتی ہے اور تربیت وشایستگی تہذیب وانسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا۔ . . .
>
> سرسید

مسائل درپیش تھے۔ جب یہ مسائل بھی حل ہو گئے تب ان ریاضیاتی پیشین گوئیوں کو احتیاط طلب اور نازک و نفیس تجربات کے ذریعے پرکھ ثابت کرنے کا نمبر آیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں اس ولولہ انگیز دور میں ٹریسٹے (TRIESTE) ہی میں تھا جب عبدالسلام کے الیکٹرو ویک قوت کے نظریے کی روشنی میں کی گئی پیشین گوئیوں کی صداقت پرکھنے کے لیے دنیا میں کیے گئے تجربوں کے نتائج آنے شروع ہوئے تھے۔ مختلف براعظموں میں بکھری ہوئی تجربہ گاہوں سے بذریعہ ٹیلیفون اعداد وشمار حاصل کیے جا رہے تھے اور ان کو چیک کیا جا رہا تھا۔ اولین نتائج سے ایسا لگتا تھا کہ شاید حقیقت عبدالسلام کے پیش کیے نظریے کے برعکس ہے۔ لیکن عبدالسلام کے اطمینان میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور وہ اپنے نظریے پر اٹل رہے اور آخر کار کامیابی نے ان کو لبیک کہا۔ اس دن ٹریسٹے میں ہم سب کی خوشی کی انتہا نہ رہی تھی۔ یہ کہنا درست ہی ہوگا کہ عبدالسلام میں فزکس کے لیے ایک ایسا ولولہ ہے جو دوسرے لوگوں میں بھی اس علم کے لیے جذبۂ کشش کے خوشگوار و سبک احساسات کو خوش اسلوبی سے ابھار دیتا ہے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ آپ کو الیکٹرو ویک قوت کے نظریے کے بارے میں کچھ بتاؤں۔ سب جانتے ہیں کہ نیوٹران جس قوت کے تحت پروٹان اور الیکٹران میں تبدیل ہوتا ہے اسکو کمزور یا "ویک" قوت (WEAK FORCE) کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور قوت جس کی واقفیت میں عام ہے وہ ہے برقی ذرات کے درمیان کام کرنے والی برقی مقناطیسی قوت (ELECTROMAGNETIC FORCE)۔ عبدالسلام نے اپنے الیکٹرو ویک قوت کے نظریے میں یہ تجویز کیا کہ ذرات کے زوال میں کارفرما کمزور قوت کو الگ حیثیت دینے کے بجائے اس کو برقی مقناطیسی قوت کا جز ماننا چاہیے۔ اس وقت اس نظریے کا سمجھنا ہنسی کھیل نہ تھا۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ عبدالسلام کا طریقۂ فکر وکار دوسروں سے الگ ہے۔ آجکل کے نظریاتی طبیعیات کے ماہرین کے مقابلے میں عبدالسلام ریاضیاتی مسائل ذرا پرانے ڈھنگ سے حل کرتے ہیں لیکن بلاشبہ ان کو اس کام میں مہارت حاصل ہے۔ فیراڈے (FARADAY) اور میکسویل (MAXWELL) اگر آج اوپر بیان کیے گئے کارنامے کو دیکھ سکتے تو بہت خوش ہوتے کیونکہ عبدالسلام کا یہ کام ان جید سائنس دانوں کے اس معرکۃ الآرا کام سے مشابہت رکھتا ہے جس میں انھوں نے سو سے زائد برس پہلے مقناطیس اور برق کو یکجا کر کے ایک رشتے میں منسلک کر دیا تھا۔

رسمی انداز میں سائنس کی سمٹی ہوئی تہوں کو پھیلا کر عیاں کرنے کا منظر پرلطف ہوتا ہے۔ قدرے قدامتی طرز میں کام کرنے کی وجہ سے عبدالسلام کو جدوجہد تو خاصی سخت کرنا پڑی لیکن ان کو ایسی کامیابی ملی جس نے کوانٹم طبیعیات میں ایک بڑے انقلاب کی آمد کے لیے راہ ہموار کر دی۔ اس نئے انقلاب کا رخ جس منزل کی جانب ہے وہ ہے ارض وسموات میں کارفرما سب طرح کی قدرتی قوتوں کا اتحاد یعنی ایک اعلیٰ وحدت (GRAND UNIFICATION) کے تصور کی تشکیل۔ ہوسکتا ہے کہ یہ صرف ایک سراب ہو یا پھر دوسری بات سچ ہو یعنی مادے اور توانائی کی حتمی ساخت کی اصلیت کے بارے میں عبدالسلام کی نظریاتی اسکیم ہی درست ہونی چاہیے۔ ایسی صورت حال میں ظاہر ہے کہ اس اسکیم کی روشنی میں عبدالسلام نے جن مشاہدات کی پیشین گوئیاں کی ہیں وہ کہیں نہ کہیں کھوج لیے جائیں گے اور عبدالسلام کے نظریے کے علاوہ کسی دوسری طرح ان کو نہ سمجھا جاسکے گا۔ عبدالسلام کے اعلیٰ وحدت کے تصور کے مطابق ایک پیشین گوئی جس کی بڑی شہرت ہوئی ہے وہ پروٹان کے زوال کے سلسلے میں ہے چونکہ تمام کائنات کا بنیادی جز ہے، عبدالسلام کے کہنے کے مطابق اس کی عم

بھی ایک حد ہونا چاہیے یعنی نیوٹران کی طرح پروٹان کا بھی زوال ہونا چاہیے۔ یہ اور بات ہے کہ خوش قسمتی سے نیوٹران کے برعکس پروٹان کے زوال کا امکان بہت کم ہے یعنی پروٹان کی زندگی بہت طویل ہے۔ ہمارے دور حاضر کے پروٹان کو چھینے کے لیے کائنات کے شروع ہونے سے لیکر اب تک کے وقت کا اربہا ارب گنا وقت ابھی باقی ہے۔ یہ وقت یقیناً اس وقت سے تھوڑا زیادہ ہے جو مجھے عبدالسلام کے نظریات کو پہلے اچھی طرح سمجھنے اور بعد ازاں اس مجلس کے حاضرین کرام کو قاعدے سے سمجھانے کے لیے درکار ہوگا۔ اس صورت حال کے پیش نظر، محترم وائس چانسلر مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اس خوش گوار محنت سے بچالیں گے اور عبدالسلام کی عالمی سائنسی شہرت کو ان کو اس یونیورسٹی میں اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کرنے کے لیے ثبوت کے طور پر قبول فرمالیں گے۔ لیکن اس سے پہلے میں آپ کے سامنے عبدالسلام کی شخصیت کا ایک اور پہلو اجاگر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ ان کا شمار دنیا کے اوّل شہریوں میں کیا جاتا ہے۔ ان کو صف اوّل کا انگلستانی سائنس دان بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہ پچھلے بیس سال سے لندن یونیورسٹی کے امپیریل کالج میں پروفیسر ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا کافی وقت ٹریسٹے میں صرف ہوتا ہے اور اقوام متحدہ (نیویارک) میں بھی ان کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ یہ کہنا بہت مناسب ہوگا کہ عبدالسلام کی ذات فرد واحد پر مشتمل مختلف اقوام کی اس کارپوریشن کے مانند ہے جو کہ دنیا کے پچھڑے ہوئے ممالک کو ذہنی ٹکنالوجی بہم پہنچانے کے کام میں ہر دم مصروف ہے۔

عبدالسلام کا وطن پاکستان ہے اور ان کو اپنے ملک سے گہرا لگاؤ ہے۔ ان کی پیدائش و پرورش ایک چھوٹے سے شہر جھنگ میں ہوئی۔ یہ شہر مغلوں کے محلوں اور باغات کی قدیم جنت یعنی لاہور سے زیادہ دور نہیں ہے۔ لاہور گورنمنٹ کالج سے ایک وظیفے نے سلام کو کیمبرج پہنچا دیا یہاں انڈر گریجویٹ سطح کی تعلیم فزکس و ریاضیات پر عبدالسلام نے تاحال عبور حاصل کرنے کے بعد بتدریج بلند ہوتی ہوئی تحقیق کی منازل کو تیزی سے طے کرنا شروع کر دیا۔ صرف ۲۵ سال کی تھوڑی سی عمر میں وہ پروفیسر ہو کر لاہور لوٹ آئے۔ ان دنوں عام معیار کے لحاظ سے عبدالسلام کی علمی کامیابی اتنی کافی تھی کہ اس کے سہارے وہ بہت آرام دہ زندگی گزار سکتے تھے۔

لاہور میں انھوں نے تین سال گزارے۔ عبدالسلام کا وقت یہاں شدید کرب اور کشمکش میں گزرا۔ انگریزوں کے زمانے میں لاہور کے گورنمنٹ کالج کا شمار اچھے علمی اداروں میں ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود تحقیق کے میدان میں یہاں کسی کو ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔ وہاں بیتے ہوئے دنوں کی یاد کو عبدالسلام اس طرح بیان کرتے ہیں کہ کالج میں درس و تدریس سے فراغت پانے کے بعد ان کے پاس کافی وقت بچتا تھا کالج کے پرنسپل نے اس فالتو وقت کے استعمال کے لیے عبدالسلام کو تین ذمہ داریوں کی پیش کش کی تھی: وارڈن ...

ناقدری

ہمارے ہاں جو تربیت خاص دی جاتی ہے، اس کا ہماری افسر شاہی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس کی ایک مثال دینا چاہتا ہوں۔ میں جب گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھاتا تھا تو میں پلاننگ کمیشن کے سربراہ سے ملنے گیا (جو اس سے پہلے پولس کے سربراہ تھے) اس وقت رہائش کا مسئلہ درپیش تھا۔ لاکھوں مہاجرین کے آجانے سے مکانات کی قلت تھی۔ میں نے عرض کیا، محترم، کچھ ہونا چاہیے۔ انہوں نے فرمایا: "ہر شخص فٹ پاتھ پر سوتا ہے آپ بھی سو جائیے"۔ میں نے فوراً پوچھا، "اور جناب! آپ اپنے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔ آپ کے پاس تو بہت بڑا بنگلہ ہے؟" اس پر انہوں نے جواب دیا: "وہ میں نے اپنی گرہ سے بنوایا ہے"۔ پھر میں نے ان سے عرض کیا کہ پلاننگ کمیشن کو چاہیے کہ منصوبہ بندی کے کام میں سائنسدانوں سے مدد لی جائے۔ ان کا جواب انتہائی شاندار تھا: "دیکھو مسٹر، سائنس دان کی مثال باورچی کی سی ہے۔ اس کا کام ہے آرڈر پر چیزیں تیار کر دینا۔ پورے گھر کا انتظام باورچی پر نہیں چھوڑا جا سکتا"۔ اب آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ جہاں ارباب اختیار کے فکر کا انداز یہ ہوگا تو وہاں سائنسی حکمت و دانش کیونکر فروغ پا سکتے ہیں۔

(پروفیسر عبد السلام)

بے عزتی کی بات

کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں
کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے
بزرگوں کی کمائی کو کھو دے۔

سر سید احمد خان

(لیکچروں کا مجموعہ صفحہ ۱۴۴)

کہ جو ذمہ داری ان کو پسند ہو اسکو سنبھال لیں۔ چاہے وہ کالج کے کسی ہوسٹل کے وارڈن ہونا قبول کریں، یا کالج کے حسابات کے محکمے کے انچارج بن جائیں یا پھر فٹ بال کلب کے صدر ہو جائیں۔ سلام کو تیسری تجویز کچھ بہتر لگی اور فٹ بال کلب کے صدر بن گئے۔

لاہور میں گذرے ان سالوں میں عبدالسلام کا سب سے بڑا نقصان جدید سائنسی مسائل پر مشغول کار ہم عصر سائنس دانوں سے رابطے کا منقطع ہو جاتا تھا۔ بعد میں عبدالسلام نے اپنے اس ناقابلِ تلافی نقصان کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ غیر ترقی یافتہ ممالک میں تحقیق کے کام پر پژمردگی چھائے رہنے کا سبب وہاں پر باہری دنیا سے روابط کا برائے نام وجود ہے۔ خود عبدالسلام ہی کے الفاظ میں:

"تیسری دنیا کے ممالک جیسے کوریا، لبنان، برازیل اور پاکستان کے باصلاحیت اور ذہین افراد تدریس و تحقیق میں مہارت حاصل کرنے کے لیے اپنے وطن سے دور مغرب یا روس جاتے ہیں اور بعد میں اپنے وطنی اداروں کی تعمیر نو کی غرض سے واپس آجاتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ عام طور پر یہ ماہرین اپنے وطن کی یونیورسٹیوں میں خود کو بالکل تنہا محسوس کرتے ہیں۔ کبھی کبھار ان کے گرد اگر کوئی چھوٹا سا گروپ بن بھی جاتا ہے تو وہ اتنا حقیر ہوتا ہے کہ علم کی بھٹی کی آگ کو دہکانے اور بھڑکانے کے لیے بالکل ہی ناکافی ہوتا ہے۔ ان اداروں میں اچھی لائبریریاں اور باہری سائنس دانوں سے علمی لین دین کا فقدان ہوتا ہے۔ نتیجے میں یہ لوگ جو کام کرتے ہیں اسے کون سمجھے اور اس کی کون تصحیح کرے۔ اس کے علاوہ ان دنیا سے الگ سائنس دانوں کو دنیائے سائنس میں نت نئے ابھرتے ہوئے تصورات کی خبریں بہت دیر سے ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ جن بلندیوں سے یورپ یا روس کے اداروں کے ولولہ انگیز ماحول میں روشناس ہوتے تھے ان کے نئے تحقیقی کام بھی ان بلندیوں کی حدود کے اندر ہی پڑا کر رہ جاتے ہیں۔ یہ سب ہمارے سائنس داں اپنے وطن واپس پہنچ کر علیحدگی کی ایک ایسی زندگی گذارتے ہیں جو علمی قید کے مترادف ہوتی ہے۔ علمی دنیا سے اس طرح ناطہ ٹوٹ جانا نظری طبیعیات میں خاص طور سے اور دوسرے علمی شعبوں میں بھی ان ہونہار افراد کی علمی موت کے برابر ہے۔ جب میں نے لاہور میں یونیورسٹی جوائن کی تھی تو مجھے بھی اسی طرح کے حالات و حادثات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔"

نوجوان عبدالسلام جیسا کوئی بھی غیر معمولی ذہین شخص دھیرے دھیرے زندہ درگور ہونے کا خطرہ مول نہ لے سکتا تھا۔ عبدالسلام ۵۴ء میں انگلستان واپس آ گئے اور فوراً ہی لندن میں علمی منصب پر فائز ہو گئے۔ یہاں رہ کر بھی اپنے وطن سے ذاتی اور علمی سطح پر قربت کے رشتوں کو انہوں نے کبھی کمزور نہ پڑنے دیا۔ اگرچہ عبدالسلام بعد میں اپنے وطن میں کسی باقاعدہ عہدے پر فائز نہیں ہوئے پھر بھی ان کو اس بات پر فخر ہے کہ نوبل پرائز پانے والے وہ پہلے پاکستانی ہیں۔

عبدالسلام جتنے اعلیٰ درجے کا ذہن رکھتے ہیں ساتھ میں اتنا ہی وسیع دل بھی ان کے سینے میں دھڑکتا ہے۔ پاکستان میں گذرے ہوئے چند ناخوشگوار سالوں کی یاد نے ان کا دل کھٹا نہیں کیا بلکہ یہ یاد ایک ایسے تخلیقی نقطے میں بدل گئی جس کے گرد ان کی عظیم علمی کامیابیوں کے وسیع حلقے کی تخلیق وجود پذیر ہوئی۔ عبدالسلام نے یہ تہیہ کیا کہ کم ترقی یافتہ ممالک کے ہونہار نوجوان سائنس دانوں کے لیے اس طرح کی سہولیات مہیا کریں گے کہ جس سے وہ سائنس کی دنیا سے کٹ کر نہ رہ جائیں اور علمی موت سے ہمکنار نہ ہونے پائیں اور ان کو اپنے وطن کو بھی خیرباد نہ کہنا پڑے۔ عبدالسلام کا یہ عزم آج مجسم حقیقت بن کر دنیا کے سامنے درخشاں ہے۔

صرف ایک سطر جو ان کے کارہائے نمایاں کی طویل فہرست میں حروف میں درج ہے بتاتی ہے کہ عبدالسلام ۱۹۶۴ء سے لیکر آج تک سرتی

نظریاتی طبیعیات کے بین الاقوامی مرکز INTERNATIONAL CENTRE (FOR THEORETICAL PHYSICS AT TRIESTE) کے ڈائریکٹر کے فرائض لگاتار انجام دے رہے ہیں۔ یہ واحد سطر اُن کے پاس سے نایاب انعامات پر بھاری ہے جو کہ نمایاں تحقیقی کارناموں کے عوض دنیا بھر میں بکھری ہوئی یونیورسٹیوں اور مشہور علمی اداروں کی طرف سے عبدالسلام کو عطا کیے گئے ہیں۔ ان کا معرکتہ الآرا کارنامہ یہ مرکز ہے جس کی تخلیق انھوں نے صفر سے کی۔ آج یہ مرکز سب سے زیادہ کامیاب اور قابل احترام بین الاقوامی اداروں میں سے ایک ہے۔ ترقی پذیر ممالک کے سائنس داں جدید ترین سائنس سے باخبر ہونے کی غرض سے ٹریسٹے کے اس مرکز میں آکر مستفید ہوتے ہیں۔ تحقیق کے نئے طریقے سمجھنا اور سیکھنا ہوں تو یہ مرکز ان کی مرادوں کی منزل ہوتا ہے۔ یہاں پر ان کو ترقی یافتہ ممالک کے، ترقی پذیر ممالک کے بلکہ دنیا بھر کے سائنس دانوں سے ملاقات کے مواقع ملتے ہیں یہاں آ کر وہ خصوصی مضامین کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، یا صرف چپ چاپ مطالعہ مقصود ہو تو مرکز کی بہترین لائبریری میں غرق ہو جاتے ہیں، یا ہونہار نوجوان سائنسدانوں سے بحث و مباحثے کرتے ہیں، یا پھر سویڈن کے بہت سمجھدار معمر سائنسدانوں سے مضمون کے باریک نکات کو سیکھتے ہیں۔ ٹریسٹے کا یہ مرکز اس معروف ترین ریلوے جنکشن کے مانند ہے جہاں علم و دانشوری کی ریلوں کی ہر وقت آمد و رفت ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے صرف چند سالوں کے وقفے میں یہ مرکز شاندار عمارتوں سے پٹ گیا ہے۔ خوش قسمت ہے یہ ادارہ کہ یہاں کا تمام عملہ اپنے کو مرکز کے مقاصد کے لیے وقف کیے ہوئے ہے۔ بس ایک کمی ہے اور وہ ہے سرمایے کی قلت جو یہاں کبھی ختم نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود یہ مرکز پوری طرح زندہ ہے، اچھی طرح کام کر رہا ہے اور گزرتے وقت کے ساتھ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور سائنس کی پوری دنیا کی خدمت میں لگاتار مشغول ہے۔

اس مرکز کے قیام کا معرکہ کس طرح سر ہو سکا؟ اُن دنوں نوجوان پروفیسران میں عبدالسلام کو سب سے زیادہ مشکل اور ناقابلِ فہم پروفیسر تصور کیا جاتا تھا۔ ایسے شخص نے کس طرح جامد و ساکت بین الاقوامی اداروں جیسے یونیسکو (UNESCO) اور بین الاقوامی اٹامک انرجی ایجنسی (IAEA) کے جذبات سے عاری اور ہوشیار منتظمین کو عام روش سے ہٹ کر اس مرکز کے منصوبے پر سرمایہ لگانے کے لیے راضی کیا ہوگا؟ کس طرح عبدالسلام نے اٹلی کی حکومت کو اپنا ایسا دوست بنا لیا جس نے دامے، درمے اور سخنے ان کی مدد کی ہو گویا

اپنی خامیوں کا احساس

دنیا میں کسی قوم کی ترقی کے یہی دو نشان ہیں ایک یہ کہ وہ سمجھنے لگیں کہ وہ ذلت اور خرابی میں مبتلا ہیں اور دوسرا نشان یہ ہے کہ اس ذلت سے نکلنے کی کچھ کوشش شروع کر دیں۔

سرسید (لیکچروں کا مجموعہ ص ۲۴۸)

ہوئے چند سالوں میں عام مالی بدحالی اور بڑھتی ہوئی کرسی شاہی کے نظام نے بڑے بڑے شاندار منصوبوں کو ناکامی کی نذر کر دیا تو یہ کیسے ممکن ہوا کہ اسی نظام میں رہ کر یہ مرکز نہ صرف زندہ رہ سکا بلکہ پھلتا اور پھولتا بھی رہا؟

وہ تنہا قوت جس کی وجہ سے ٹریسٹے کا یہ مرکز نہ صرف قائم ہوا بلکہ شہرۂ آفاق بنتا جا رہا ہے۔ وہ ہے اس مرکز کے ڈائرکٹر عبدالسلام کی ذاتی قوتِ ارادی۔ محترم وائس چانسلر صاحب میں آپ کو ہوشیار کرنا چاہتا ہوں کہ میکانیات میں ایک ایسی غیر مرئی قوت کا خیالی تصور ملتا ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔ عبدالسلام کی ذات اس قوت کا حقیقی مظہر ہے۔ بالفرض وہ آپ سے ایک معمولی احسان کی درخواست کریں جیسے کہ آپ تین ہفتے کے لیے VLADIVOSTOCK یونیورسٹی تشریف لے جائیے، تب آپ کے پاس صرف تین عدد جوابات ممکن ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ دیکھو عبدالسلام میرے مذہب میں وہاں جانے کی ممانعت ہے اور اگر میں اگست میں VLADIVOSTOCK چلا گیا تب دوزخ ہی میرا مقدر بن جائے گا۔ یا پھر آپ یہ کہیں گے کہ عزیز دوست مجھے افسوس ہے، BOGOTA میں لیکچر دینے کے لیے میں پہلے ہی پورا مہینہ وقف کر چکا ہوں، آپ کا تیسرا ممکنہ جواب یہ ہوگا۔ اچھا تو میں وہاں کس طرح پہنچوں گا۔ تو گویا آپ چلے گئے۔ عبدالسلام اپنے ملاقاتیوں پر بلا تفریق اسی طرح چھا جاتے ہیں چاہے یہ ملاقاتی سیاستداں ہوں، یا سرکاری افسران یا بین الاقوامی اداروں کے افسران یا رفقائے کار سائنس داں عبدالسلام کی دیانت داری، خلوص اور

*

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے بڑا کام ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

ـــــ قرآن عظیم

ترقی کی جڑ

سب (ترقی) کی جڑ یہی ہے کہ سب سے پہلے علم کے خزانوں کو اپنے قابو میں کر لو۔

سر سید (لیکچروں کا مجموعہ صہ۳۱)

مقصد کی یکسوئی سب کو متاثر کرتی ہے اور بہت موثر انداز سے اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ وہ کم ترقی یافتہ اقوام کی بے لوث خدمت میں مشغول ہیں۔

ابتدا میں ترئیستے کا یہ مرکز اوّل درجے کی نظریاتی سائنس کے لیے وقف تھا اور یہاں تیسری دنیا کے افراد فزکس میں اعلیٰ ترین سطح پر کارہائے نمایاں انجام دے کر اونچے مقام پیدا کرتے تھے۔ اس مرکز کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے اور اس کے علاوہ ۱۹۶۰ء سے لیکر ۱۹۷۴ء تک پاکستانی حکومت کی سائنسی پالیسی کے معمار اور مشیر کار کی حیثیت سے عبدالسلام جن تجربات سے دوچار ہوئے ان سے ان کو نیا درس ملا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ وہ ممالک جو اقتصادی اور سماجی بہتری کی جد و جہد میں نبرد آزما ہیں، ان کے یہاں پہنچنے والی سائنس کے مقاصد میں وسیع النظری ہونا ضروری ہے عبدالسلام کی طرف سے اس تبدیلی کا اثر مرکز کی کارکردگیوں پر فوراً ہی شروع ہو گیا اور وقت کے ساتھ یہاں تبدیلی آتی چلی گئی۔ اب جو ورکشاپس (WORKSHOPS) اور کانفرنسیز (CONFERENCES) یہاں منعقد ہوتی ہیں، جو سیمینارز (SEMINARS) یہاں کیے جاتے ہیں، جن خصوصی کورسیز (COURSES) کی تعلیم یہاں دی جاتی ہے یا وظائف کا جو پروگرام یہاں جاری ہے، سب میں ایک ایسا پھیلاؤ آ چکا ہے جس کے تحت کارآمد سائنس کے ہر میدان میں مجموعی تحقیق تسلی بخش طریقے سے پرورش پا رہی ہے۔ یہاں پر تربیت حاصل کرنے والے سائنس دانوں کے خصوصی رول کے بارے میں عبدالسلام کہتے ہیں کہ بین الاقوامی اور قومی سائنسی اداروں کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر ان سائنسدانوں کا رول بہت پرکشش اور مفید ثابت ہوگا۔ عبدالسلام کی ایک اور قابل ستائش عظیم کاوش کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ حال ہی میں عبدالسلام نے چھوٹی اور غریب اقوام جو اپنی بہبودی کی کوشش میں لگی ہوئی ہیں۔ ان کی ہمت افزائی، مدد اور صلاح دینے کی غرض سے ایک مزید نئے ادارے کے بنیادی ڈھانچے کو قائم کرنے کے لیے عالمی سطح پر جد و جہد شروع کی ہے اور اس اعلیٰ مقصد جہاد میں وہ اپنے ذاتی اثر و رسوخ، اپنی دولت اور نوبل انعام کی شہرت کے ساتھ معروف ہیں۔

فلسفے کے فطری اور سماجی دونوں وسیع حلقوں میں عبدالسلام لگاتار ربط پیدا کرنے، جوڑنے یا متحد کرنے کی جستجو میں جانفشانی سے معروف ہیں۔ اس راہ پر چلتے ہوئے فطرت میں پنہاں وحدت اور خیالی انسانی برادری کے حقیقی روپ کو عبدالسلام پہلے ہی دریافت کر چکے ہیں۔ اس لیے عالی جناب وائس چانسلر صاحب یہ بہت ہی مناسب ہوگا کہ ہم بھی ان کو عزت و احترام سے نوازیں۔ اسی غرض سے آپ کے روبرو عبدالسلام کو ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری عطا کرنے کے لیے پیش کرتا ہوں کیونکہ وہ سب سے بڑھ کر اس اعزاز کے مستحق بن چکے ہیں *

اصل خطبے کا حوالہ ـــ

IDEALS AND REALITIES

EDITED BY: Z. HASSAN & C. H. LAI

PUBLISHED BY: WORLD SCIENTIFIC

PUBLISHING CO PTE LTD

P. O. BOX 128 FARRER ROAD SINGAPORE 9128

پروفیسر عبدالسلام
ترجمہ: حسن شاہد رضوی

سائنس ٹکنالوجی و ماحولیات کے میدان میں

یورپ کی عالمی ذمہ داریاں

(پروفیسر عبدالسلام کی ایک تقریر کا ترجمہ)

سب سے پہلے میں آج یہاں بولنے کے لیے مدعو کیے جانے پر اظہار مسرت کرنا چاہتا ہوں گا. میں اس بات پر خوش ہوں کہ اس انجمن میں مجھے یہ موقع ملا ہے کہ میں اطالوی سرکار کی اُس غیر معمولی فیاضی اور سخاوت کو خراج پیش کرسکوں جو اس نے ترقی پذیر ممالک کو تبادلۂ سائنس کے سلسلے میں ترئیستے کے نظریاتی طبیعات کے بین الاقوامی مرکز (INTERNATIONAL CENTRE FOR THEORETICAL PHYSICS, ICTP) اور تیسری دنیا کے اکیڈمی آف سائنس (THIRD WORLD ACADEMY OF SCIENCES TWAS) کی مدد کرکے کی ہے.

میرے خوش ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ مجھے موقع ملا ہے کہ میں ان عالمی مسائل کا تذکرہ کرسکوں جن کے حل کے سلسلے میں اپنی سائنس اکور ٹکنالوجی کی شدبد کو استعمال کرتے ہوئے یورپ دنیا کی ترقی اور خوشیوں کے لیے کام کرسکتا ہے.

اس میں دو رائے نہیں کہ ترقی پذیر دنیا آج عجب ہولناک حالات سے گذر رہی ہے. ایتھوپیا کے قحط کی آفت محض اس کا ایک نمونہ ہے. اس کے علاوہ اور بھی دوسری اتنی ہی ہلاکت خیز نشانیاں ہیں جن کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے. مثال کے طور پر امن اور سلامتی کو ہی لے لیجیے. دوسری عالمی جنگ کے بعد سے اب تک کوئی ایک سو دس لڑائیاں ہوئی ہیں اور تقریباً ساری کی ساری ترقی پذیر ممالک کی سرزمین پر لڑی گئی ہیں. آج بھی بارہ ایسی لڑائیاں چھڑی ہوئی ہیں جو سب کی سب تیسری دنیا میں ہو رہی ہیں. ان بارہ میں سے کم سے کم چھ میں بڑی طاقتیں براہِ راست یا پوشیدہ طور پر شامل ہیں. سلامتی کی کمی اور لڑائیوں سے پیدا شدہ مہلک اثرات کا اندازہ ICTP جیسے مراکز تک کو ہوجاتا ہے گو کہ یہاں محض سائنسی علوم پر کام ہوتا ہے اکثر ہم سے اُن ممالک کے فزکس دانوں کا خیر مقدم کرنے کو کہا جاتا ہے جہاں یہ لڑائیاں لڑی جارہی ہوں.

اس کے علاوہ تیسری دنیا کے معاشی دیوالیہ پن کو لے لیجیے جو خاص طور پر نئے بین الاقوامی معاشی نظام میں مجسم منصوبات کی نشوونما کی کمی کے باعث اور اس نظام کے اس اصرار پر کہ ترقی پذیر ممالک کی اشیا کی مناسب قیمت ادا کی جائے. مجموعی طور پر ترقی پذیر دنیا ایک نہایت ناخوشگوار جگہ ہے جہاں رہا جائے.

اب دیکھنا یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک کی کچھ دشواریوں کو کم کرنے میں یورپ کیا رول ادا کرسکتا ہے؟

انفرادی طور پر یورپ کے کچھ ممالک ترقی پذیر ممالک کی بدنصیبی کے لیے اظہار تشویش کرنے میں اور فراخدلی کے ساتھ مدد کرنے میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں. اس کا اندازہ اس براہ راست امداد سے لگایا جاسکتا ہے جو اقوام متحدہ کی ۰،۷ فیصد مدد کی سفارش سے کہیں زیادہ ناروے، ہالینڈ، سوئڈن، فرانس اور ڈنمارک فراہم کررہے ہیں. بلجیم اپنے GNP (کل ملکی پیداوار) کا ۱،۶ فیصد اور مغربی جرمنی ۰،۵ فیصد مدد کر رہا ہے. کچھ ممالک معینہ حد تک نہیں پہنچ پائے ہیں (یا پہلے پہنچ چکے تھے مگر اب پیچھے رہ گئے ہیں)، جیسے برطانیہ ۰،۳۵، سوئٹزرلینڈ ۰،۳۱، اٹلی ۰،۲۴ اور آسٹریا ۰،۲۴ فیصد مگر یہ آخری دونوں ممالک یعنی آسٹریا اور اٹلی جنہوں نے ماضی قریب

میں ہی امداد فراہم کرنا شروع کیا ہے وہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ (USA) کی ۲.۴ فیصد کی برابری کرتے ہیں یہاں اس بات کی یاد دہانی کرا دینا چاہوں گا کہ مارشل پلان (MARSHALL PLAN) کی ابتدا کے دنوں میں جب ریاست ہائے متحدہ یورپ کی مدد کر رہا تھا تو اپنے ملک کی پوری پیداوار کا ۲.۴ فیصد خرچ کر رہا تھا۔

مگر اس قابلِ قدر سخاوت کے باوجود یہاں خاص طور پر اٹلی کا تذکرہ کرنا چاہوں گا جو اقوام متحدہ کے ملٹی نیشنل پروگراموں میں مدد کرنے والے ممالک میں امتیازی درجہ رکھتا ہے) مجھے یہ کہنے کے لیے معاف کریں کہ جب ہم اناج کے اِن فاضل ذخائر کی بات سنتے ہیں جو یورپ میں گرانی برقرار رکھنے کے لیے مشرقی یورپ کے ممالک کے جانوروں کو کھلا دیے جاتے ہیں، جب ہم سنتے ہیں کہ اشیاء اور صنعتی قیمتوں میں نمایاں توازن کی کمی کے سلسلے میں یورپ اپنا سیاسی دباؤ نہیں ڈال رہا ہے تو ترقی پذیر ممالک کو یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ یورپ کا یہ رویہ بہت نامناسب ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ تصور غالباً حق بجانب نہیں ہے۔ سکہ کا دوسرا رخ یہ کہتا ہے کہ کرۂ ارض کے کوئی پچاس کروڑ لوگ یعنی ہر ۹ میں سے ایک بُری طرح سے صحت بخش خوراک کو ترس رہے ہیں۔ کوئی ڈھائی لاکھ بچے اس ہفتہ غذا کی کمیابی سے متعلق بیماریوں سے ہلاک ہو جائیں گے۔ اس سلسلے میں میں اجازت چاہوں گا کہ میں لندن کے اخبار اکانومسٹ (ECONOMIST) کے حوالے سے ای۔ای۔سی (EEC) کے آڈیٹروں کی عدالت کے کچھ اقتباسات پیش کروں۔ اس عدالت نے نہایت سختی کے ساتھ ای۔ی۔سی کی انسان دوست امداد کی انتظامیہ کی تنقید کی ہے۔

اکانومسٹ کا کہنا ہے کہ آڈیٹروں نے اپنی ۱۹۸۴ء کی سالانہ رپورٹ میں تقریباً بدتمیزی کے ساتھ کہا ہے کہ بیشتر اوقات میں مدد یا تو دیر سے مہیا کی جاتی ہے یا غلط وقت پر فراہم کی جاتی ہے۔ اخبار لکھتا ہے کہ دسمبر ۱۹۸۲ء کے اختتام پر کچھ ممالک جنہیں امداد کی بے انتہا ضرورت تھی جیسے تنزانیہ، زامبیا، گھانا، صومالیہ، سری لنکا اور مڈغاسکر، ان کو ۱۹۸۱ء کے امدادی پروگرام کے تحت وعدہ کی گئی مدد کا ذرہ برابر حصہ بھی نہیں بھیجا گیا۔ مجموعی طور پر کمیشن کے وعدہ کردہ غلّہ کا صرف ۴۲ فیصدی، دودھ پاؤڈر کا ۳۶ فیصدی اور گھی کا محض ۲۹ فیصدی ہی فراہم کیا گیا۔

میں نے اپنی تقریر کا آغاز معاشی اور سیاسی مسائل پر نکتہ چینی سے کیا ہے، یہ وہ میدان ہیں جہاں میری کوئی خاص مہارت نہیں ہے۔ ان باتوں کو آپ کے سامنے پیش کرنے پر معذرت خواہ ہوں۔ اور اب میں اپنے خاص میدان کی بات کروں گا جو صرف سائنس کے مسائل سے متعلق ہے۔ میں اصرار کروں گا کہ یورپ ترقی پذیر ممالک میں سائنس سے متعلق ضروری ڈھانچہ تیار کرانے میں قائد کے فرائض انجام دے۔

مجھے آپ حضرات کو یہ بتانے کی شاید کوئی ضرورت نہیں کہ ترقی کی راہ میں آنے والے مسائل کو کیوں کر سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے حل کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ موجودہ دنیا میں ایک دوسرے پر انحصار اور اس کے بطن سے نکلے مسائل بنیادی طور پر ان ماہرین طبیعیات کے پیدا کردہ ہیں جنھوں نے نقل و حرکت و مراسلت کے مختلف نظام ممکن کر دکھائے اور اُن علم کیمیا اور علم حیاتیات کے ماہرین کی وجہ سے ہیں جنھوں نے پنسلین اور زود عمل کھادوں کو تیار کر کے ہماری زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ چنانچہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ ترقی پذیر دنیا کے مسائل کا واحد علاج ان کو سائنس اور ٹکنالوجی کی طرف اسے رجوع کرانا اور اس کے لیے درکار بھاری اخراجات کے لیے امداد فراہم کرنا ہے۔

ظاہر ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی صف بندی کے لیے پیسہ درکار ہے مگر اس سے پہلے ضرورت ہے کہ ہمارے پاس سائنس داں اور ٹکنالوجی کے ماہرین ہوں اور وہ بھی اعلیٰ ٹریننگ سے آراستہ۔ افسوس کہ ٹریننگ یافتہ سائنس دانوں کو پیدا کرنے کا رواج ہمارے ترقی پذیر ممالک میں نہیں کے برابر ہے۔ بالائے ستم، گو کہ ٹکنالوجی کے ماہرین کی ضرورت کو ترقی پذیر دنیا خوب سمجھ رہی ہے مگر اسے سائنس داں اور بنیادی سائنس کی ضرورت کا رتی بھر بھی احساس نہیں ہے۔ چنانچہ گو حال میں اپنی بقا اور ملک کے معاشی سدھار کی قوی امیدوں کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی کی ضرورت کا احساس تو کر لیا گیا ہے پھر بھی ٹکنالوجی کے مقابلے میں سائنس کی طرف رجحان بس آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ صرف ارجنٹائنا، برازیل، چین اور ہندوستان چار ایسے ممالک ہیں جن کو اس ضرورت کا احساس بہت ہو چکا ہے۔ اور ان کی کہانی کچھ مختلف ہے۔ میں اس نکتہ پر مزید تبصرہ تو نہیں کروں گا مگر یہ حقیقت ہے کہ شمالی ممالک کے امدادی اداروں، اقوام متحدہ کی ایجنسیاں اور بدقسمتی سے ترقی یافتہ ممالک کے سائنس داں طبقوں نے جن سے بہر صورت قدرتی طور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ تیسری دنیا کے تحصیل سائنس کی ضرورت کو سمجھیں گے اور پورا پورا تعاون کریں گے، اپنا رول ادا نہیں کیا ہے۔

آخر میں اس بات کو اتنے پرزور طریقے سے کیوں بیان کر رہا ہوں کہ ترقی پذیر ممالک میں تحصیل سائنس پر نہایت معمولی زور ہے! اس کی دو واضح وجوہات ہیں۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ پالیسی بنانے والے ہوشمند و اعلیٰ کمیشن (مثال کے طور پر برینڈٹ کمیشن) اور امداد کنندگان عام طور پر صرف ٹکنالوجی کے تبادلہ کے مسائل کی ہی بات کرتے ہیں گویا مسئلہ محض اتنا ہی ہو۔ آپ شاید یقین نہ کریں مگر یہ سچ ہے کہ برینڈٹ رپورٹ میں سائنس کا لفظ بھی نہیں آیا ہے ترقی پذیر دنیا میں شاذ و نادر ہی لوگ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ لمبے عرصہ کی اثر اندازی کے لیے تبادلہ ٹکنالوجی کے ساتھ ساتھ تبادلہ سائنس بھی درکار ہے اور آج کی سائنس کی افادیت تب ہی ممکن ہے جب اس کی جانکاری وسیع ہو۔ میں یہاں تک کہوں گا کہ اگر میں شکی مزاج ہوتا تو سائنس کے تبادلے کے بغیر صرف ٹکنالوجی بھیجنے والوں کے ارادوں میں شرارت آمیز پہلو ضرور تلاش کرتا۔ ایسے ملک کے مناسب سائنس (RELEVANT SCIENCE) کے نعرہ نے ہم تیسری دنیا والوں کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اتنا کسی اور شے نے نہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ممالک میں بلا سوچے سمجھے اس نعرہ کو اپنایا گیا ہے اور اس کے سہارے ہر طرح کی سائنس کی نشوونما کا گلا گھونٹنے کو حق بجانب قرار دیا جاتا رہا ہے۔

یہ بات واضح طور پر نہیں سمجھی جا سکی ہے کہ تبادلہ سائنس صرف سائنس داں طبقوں کے ذریعے اور اسی طبقہ تک اس کے پہنچنے پر اثر پذیر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ترقی پذیر ملک میں برابر سائنس داں طبقہ پیدا کرنا ہوگا ان کی تعداد کو بڑھانا اور کام کرنے کے لیے ضروری ڈھانچہ فراہم کرنا ہوگا۔ اس کے لیے لمبے عرصے کی پابندی، با سخاوت سرپرستی، خود مختاری اور بین الاقوامی ربط کی آزادی والی دانشمندانہ سائنسی پالیسیاں درکار ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے ممالک میں قومی تعمیر کے سلسلے میں اعلیٰ درجے کے سائنس دانوں کو پیشہ ور منصوبہ گروں، معاشیات اور ٹکنالوجی کے داناؤں کے ساتھ ساتھ برابری کا درجہ دینا ہوگا۔ افسوس ہے کہ بس چند ایک ترقی پذیر ممالک نے اس طرح کی پالیسیاں نافذ کی ہیں اور کچھ ہی ایسے ادارے ہیں جنہوں نے ہمارے سائنسی ڈھانچوں کو مضبوط کرنے اور فروغ دینے پر توجہ کی ہو۔

اب میں آپ کی توجہ ایک خاص بات کی طرف مرکوز کرانا چاہتا ہوں گا یورپ سے میں توقع کرتا ہوں کہ وہ اپنی امدادی سرگرمیوں میں اس بات پر زور دے کہ ترقی پذیر ممالک میں فروغ سائنس کے لیے ضروری ڈھانچہ تیار ہو اور مزید یہ کہ وہ اپنے مراکز قائم کرنے کی سعی کرے جیسا کہ اطالوی سرکار نے تھیوریٹیکل فزکس کے مرکز اور آئندہ قائم ہونے والے بایوٹیکنالوجی کے یو۔ این۔ آئی۔ ڈی۔ او (UNIDO CENTRE FOR BIOTECHNOLOGY) کی امداد کر کے مشعلِ راہ دکھائی ہے۔

مثال کے طور پر میں دو شعبوں کا تذکرہ کرنا چاہوں گا جن کی طرف پوری اور کافی توجہ نہیں دی گئی ہے۔ یہ ہیں توانائی کی سائنس اور علم ایکالوجی (ماحولیات) کا میدان۔ اِن علوم میں سائنٹفک ٹریننگ اور تحقیق کے اداروں کے قیام کی ضرورت اور افادیت کو اچھی طرح سمجھا جا چکا ہے۔ مثلاً ریاست ہائے متحدہ کے سکریٹری آف اسٹیٹ کی حیثیت سے ڈاکٹر ہنری کسنجر نے ۱۹۷۵ء میں عالمی اشتراکی ترقی کی ضروریات کے سلسلے میں ریاست ہائے متحدہ کی جانب سے یہ وعدہ کیا تھا کہ انواع و اقسام کے اداروں کا قیام کیا جائے گا۔ ان میں دو باتیں غور طلب تھیں۔ پہلی تھی ترقی کی سلامتی کی تجویز جس میں اشیاء کی قیمتوں کی روک تھام برآمدات کی آمدنی کے بھونڈے پن کے برخلاف کی جاسکے۔ دوسری بات سرمایہ، ٹکنالوجی اور انتظامیہ کے شعبہ تک پہنچ کو آسان بنانے کے اقدامات جس میں بالخصوص ایک بین الاقوامی توانائی ادارہ اور ایک ٹکنالوجی کی اطلاعات کے تبادلے کا بین الاقوامی مرکز اور ایک بین الاقوامی صنعتی ادارہ کے قیام کی پیش کش۔

کسنجر نے ایسے اداروں کی ضرورت کے متعلق اظہار خیال کیا کہ "اس صدی کے بچے ہوئے سالوں میں کرۂ ارض کو شمال اور جنوب میں بانٹ دینے کا مطلب شاید سرد جنگ کے سیاہ ترین دنوں سے بھی بدتر دور سے گزرنا ہوگا نتیجہ بڑا بھیانک ہوگا۔ ہمیں ایک سیلابی چھوڑنے جیسی کشمکش کے دور سے دوچار ہونا پڑے گا جہاں معاشی جنگیں ہوں گی قومی کوششیں کی جائیں گی جہاں اشتراک کی کسی بھی سعی کو ناکام بنانے کی ترکیبیں کی جائیں گی، جہاں بین الاقوامی اداروں کا پتہ کاٹا جائے گا۔ اور نتیجہ ظاہر ہے۔ انتقار کی تمام کوششیں بے سود ہو کر رہ جائیں گی۔"

باتیں بڑی بڑی ہوئیں مگر ان میں سے کسی بھی وعدہ پر عمل نہ کیا گیا۔ ۱۹۸۳ء میں مراکش میں میری ملاقات ڈاکٹر کسنجر سے ہوئی تو میں نے ان کو یاد دلایا کہ

لیے ہوئے وعدوں کی یاد دہانی کرائی اور خاص طور پر ادارہ توانائی کے قیام کے بارے میں گفتگو کی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ مجھے لکھو۔ میں نے لکھا۔ انھوں نے میرے خط کو رسید سے نوازا اور کہانی ختم ہوگئی۔

یہ بات بے شک غور طلب ہے کہ آخر میں توانائی کے چند ایک اداروں کے قیام اور ان کی افادیت پر اتنا زور کیوں دے رہا ہوں۔ وجہ یہ ہے جیسے ماہر معاشیات مانتا ہے کہ دنیا میں پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک میں تین چوتھائی آبادی رہتی ہے مگر کل توانائی کا صرف ایک پانچواں حصہ کی حقدار ہے جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں رہنے والے کل ایک چوتھائی لوگ ۸۰ فیصدی توانائی استعمال میں لاتے ہیں اور یہ فرق ایندھن کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے ساتھ ساتھ اور بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ صدر کارٹر کے زمانہ میں ریاست ہائے متحدہ نے غیر روایتی توانائی سے متعلق تحقیق کی ضرورت پر زور دینا شروع کیا اس اقدام کے ضمن میں صحیح مگر ترقی پذیر ممالک کی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے اگر تحقیق کی شروعات کی گئی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس سلسلے میں اقوام متحدہ کی ایک کانفرنس نیروبی میں منعقد تو ہوئی مگر اس کے سوا جہاں تک میری معلومات ہیں اب تک کسی بھی ایسے بین الاقوامی مرکز کا قیام نہیں ہوا ہے جہاں ترقی پذیر ممالک کے سائنس داں توانائی سے متعلق تحقیق کر سکیں اور اس فن میں ٹریننگ حاصل کر سکیں۔ چنانچہ ایک ایسے مرکز کے فوری قیام کی ضرورت ہے جس میں توانائی سے منسلک بنیادی خالص سائنس پر زور دیا جائے۔ مجھے پھر اجازت دیں کہ لندن کے اکانومسٹ کے ۲۷ ستمبر ۱۹۸۰ء کے شمارہ کے حوالہ سے عرض کر سکوں کہ "اگر شمسی توانائی دنیا میں ایندھن کے بحران کا حل ہے تو یہ حل چھتوں پر بنائے ہوئے ریڈی ایٹروں والی ٹکنالوجی سے نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ خاطر خواہ حل تب ہی تلاش کیا جا سکتا ہے جب کوانٹم فزکس، بایوکیمسٹری اور بیسویں صدی کے دیگر علوم کو استعمال کیا جائے۔ موجودہ دور میں ٹکنالوجی پر منحصر تمام صنعتیں نئی سائنس پر ہی ٹکی ہوئی ہیں۔

جب تک سالڈ سٹیٹ (SOLID STATE) اور میٹریل سائنس (MATERIALS SCIENCE) میں خاطر خواہ مہارت نہ حاصل کر لی جائے تب تک سائنس پر مبنی فوٹو وولٹائک بیٹریوں کی صنعت کا فائدہ اٹھایا بھی نہیں جا سکتا۔ روشنی کو برقی توانائی میں منتقل کرنے والے آلہ آپٹیکل کنورٹر (OPTICAL CONVERTER) کو جتنا کم سے کم مادی کام میں لایا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ کتنے کم کا انحصار شمسی روشنی کے بیٹھنے کی گہرائی (PENETRATION DEPTH) پر ہے اور اشتعال شدہ والے اسٹیٹ (EXCITED STATE) کے بہاؤ کی دوری پر ہے جس پر خاص طور پر کنورزن کا عمل انحصار کرتا ہے۔ امارفس مادوں میں کنورزن کا طور پر کنورزن کا عمل انحصار کرتا ہے۔ امارفس مادوں میں کنورزن کا انحصار مادہ کے عیب کی کثافت اور متعلقہ بصیرت پر ہے چنانچہ فوٹو وولٹائک بیٹریوں کی کارکردگی اور کم قیمت پر دستیابی ٹکنالوجی ماہرین کے شدید پر مبنی نہ ہو کر ٹھوس مادہ کی فزکس کے سمجھنے کیلئے کہ توانائی سے متعلقہ مادوں کی دریافت اور تحصیل کے کام کا آغاز کرے گا اور خصوصی توجہ سطحوں کی فزکس پر مرکوز کرے گا۔ ہم نے اس سلسلے کے کئی سال سے کالج لگائے ہیں اور کوئی ایک ہزار فزکس کے ماہرین نے ان میں حصہ لیا ہے مگر ہر دوسرے سال کالج کا انعقاد کر لینا ترقی پذیر ممالک کے لیے موزوں ایک بھرپور توانائی ادارے کے قیام کا بدل ہرگز نہیں ہو سکتا۔

ان حالات کے تحت میں پر زور سفارش کروں گا کہ یورپ کے تعاون اور مدد سے ایک توانائی سے متعلقہ عالمی ادارہ کا قیام ہو جس میں شمسی توانائی اور ترجیح کے طور پر فوٹو وولٹائک اور ایسے ہی دوسرے علوم و فنون پروان چڑھیں۔

دوسرا میدان جس میں بین الاقوامی معیار پر عمل پیرا ہونے کا متمنی ہوں وہ کالوجی کا میدان ہے جہاں آب وہوا کا مطالعہ خاص توجہ کا حامل ہے مجھے یہ تو گمان نہیں ہے کہ ہم آب وہوا کو بدل سکیں گے مگر یہ بات نہایت سنسنی خیز ہے کہ ایک لمبے عرصہ سے ساحلیہ کے علاقہ کی آب وہوا کا کوئی معقول مطالعہ نہیں ہوا ہے۔ ان علاقہ جات کی یونیورسٹیوں میں فزکس اور موسمیات کے شعبے موجود ہیں مگر کمزور ہیں، غیر منظم ہیں اور سرمایہ کے محتاج ہیں ان کو مضبوط بنانے کی ضرورت ہے۔ ہم ٹریسٹ کے مرکز پر کوشاں ضرور ہیں کہ حالات بہتر ہوں مگر ایک بار پھر عرض کرنا چاہوں گا کہ وہاں پر مختلف مضامین میں سے یہ ایک مضمون ہوگا اور حق نہ ادا کیا جا سکے گا۔ میری حسرت ہے کہ یورپ کی کوئی تنظیم خود کو تیسری دنیا کی ان ضروریات کی طرف وقف کرے اور ہمارے سائنسی معیار کو بڑھانے کی کوشش کرے۔

ایک اور میدان جس میں عمل درکار ہے اس کی طرف خاص طور پر اپلائیڈ

سٹری کی بین الاقوامی یونین (INTERNATIONAL UNION OF PURE AND APPLIED CHEMISTR) نے توجہ دلائی ہے۔ ہم ب مانتے ہیں کہ اس صدی کے اختتام تک ہماری آبادی ۷ ارب سے بڑھ کر وب ہو جائے گی جبکہ زراعت کے لیے موزوں رقبہ میں صرف ۷ فیصدی اضافہ ہو پائے گا۔ دسمبر ۱۹۸۲ء میں فلپین میں دنیا کے کوئی ۱۰۰ صف اول لے کیمسٹری کے ماہرین یکجا ہوئے اور ایک منصوبہ تجویز کیا جس میں کیمسٹری استعمال کرکے غذا کی پیداوار کو اگلے ۱۵ برس میں بڑھانے کی پیش کش کی گئی۔ نھیں توقع تھی کہ سن ۲۰۰۰ء تک غذا کی پیداوار کو ۵ فیصدی بڑھایا جاسکتا ہے۔ س سلسلے میں کئی ایسے عالمی اداروں کے قیام کی بات جن میں تیسری دنیا سے وابستہ لیسٹوں کی درس وتدریس، ٹریننگ اور تحقیق کے انتظامات مہیا کیے جائیں۔ مگر میری دانست میں اب تک کوئی شروعات نہیں ہوئی ہے۔

اکالوجی کے سلسلے میں اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے اور گرم ممالک کے جنگلات کے کاٹے جانے کی طرف غور کرتے ہوئے ایک متوقع قہر آلود اندیشہ یہ ہے کہ ان جنگلات سے وابستہ انواع واقسام کی ہیئت کا نام ونشان مٹ جائے گا۔ یاد رہے کہ ہر دست ہم ایندھن یا زراعت کے لیے درکار زمین کی خاطر فی سال اپنے جنگلات کا ۲ فیصدی کاٹے جارہے ہیں۔ آج تک ہم نے کوئی ایک کروڑ پچاس لاکھ ہیئتوں کا پتہ لگالیا ہے، ان کا نام تجویز کرلیا ہے اور ان کی درجہ بندی کرلی ہے مگر ان میں سے گرم ممالک سے وابستہ کل ۳۰ لاکھ ہیئتوں کے نام ہیں۔

گرم ممالک میں پائی جانے والی ہیئتوں میں سے ایک کثیر تعداد ایسی ہے جو بہت مخصوص اکالوجیکل اور متعلقہ ماحول پر منحصر ہیں۔ اس کے سوا وہ بہت چھوٹے چھوٹے جغرافیائی علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ اگر ان ہیئتوں کی پیدائش کی اصلی جگہوں کے ساتھ چھیڑ خانی کی جاتی رہی تو گرم ممالک سے وابستہ ہیئتوں کے نیست ونابود ہو جانے کے قوی امکانات ہیں۔ ان ہیئتوں میں سے آدھے سے زیادہ نشیبی جنگلات سے وابستہ ہیں اور ان علاقوں کے زیادہ تر اگلے ۲۰ یا ۳۰ برس میں ختم ہو جائیں گے اور ان ہی کے ساتھ کوئی ۲۰ لاکھ ہیئتوں کا بھی صفایا ہو جائے گا۔

ہیئتوں کے اختتام سے نہ صرف یہ کہ ہم ان کو سمجھنے کے موقع کو کھو بیٹھتے ہیں بلکہ ان کو انسان کی ضروریات میں استعمال کرنے سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔ ان کا فائدہ نہ صرف گرم خطے کے لوگ اٹھا سکتے تھے بلکہ دوسرے خطوں کے باشندگان کے بھی کام آسکتے تھے۔ جنگلی ہیئتوں کے معاشیاتی افادیت سے ہم اچھی طرح واقف ہیں حالانکہ ہم ان کے بہت چھوٹے حصہ کو کام میں لاتے ہیں۔ اتنا کہنا کافی ہوگا کہ کروڑوں ہیئتوں میں سے ہم نے شاید کچھ سو کا فائدہ اٹھایا ہے اور اسی پر ہماری تہذیب وتمدن کا دارومدار ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ ہم ابھی ابھی ہوش میں آئے ہیں اور باقی ہیئتوں کی صفات کا تعاون کرنا شروع کیا اور ان کی افادیت کو خوابیدہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

فنا کے عمل کو پلٹا یا نہیں جاسکتا ہے ہاں اس کے تاثر کو کم ضرور کیا جاسکتا ہے وہ یوں کہ وہ بہترین طریق عمل دریافت کرائے جائیں اور ان تمام ایسی ہیئتوں کا فائدہ اٹھانے کے اقدامات کیے جائیں جن کی بقاء کا گمان ہو۔ تحفظ اور ارتقاء کے تعلق کی تمام خوبیاں اور خامیوں کا تخمینہ ان عالمی تحفظ کی حکمت عملی کے دستاویزوں میں بیان کیا گیا ہے جو قدرت اور قدرتی وسائل کے تحفظ کی بین الاقوامی یونین، عالمی جنگلی زندگی فنڈ اور اقوام متحدہ کے ماحولی پروگرام (INTERNATIONAL UNION FOR CONSERVATION OF NATURE AND NATURAL RESOURCES, WORLD WILDLIFE FUND AND UNITED NATIONS ENVIRONMENTAL PROGRAMME) کے تعاون سے ۱۹۸۰ء میں جاری کیا گیا۔

'بلیٹن آف اٹامک سائنٹسٹ' نام کے رسالے کے ایک تازہ ترین شمارے میں پی۔ ایچ راون نے بحث کی ہے کہ اگر مغرب اکالوجی کے مفلوج علاقوں کی بنیادی غربت کو دور کرنے کے ذرائع تلاش نہیں کر پائے گا تو وہاں بسنے والے عوام کسی بھی حکومت کا تختہ پلٹ دیں گے خواہ وہ عوام دوست حکومت ہو خواہ عوام دشمن چنانچہ ان کے نزدیک یہ کوئی اتفاقیہ بات نہیں ہے کہ وسط امریکہ کے تمام ممالک میں ال سالوا ڈور اکالوجی کے اعتبار سے سب سے زیادہ تباہ شدہ ملک ہے اور اس کے باوجود کسی رپورٹ مرتب کرنے والوں نے اکالوجی کی ان وجوہات پر کوئی توجہ نہیں دی ہے جو کسانوں کو اس بات پر مجبور کرتی ہیں کہ وہ جنگلوں کو کاٹ کاٹ کر ان کو قطعی طور پر تہس نہس کرکے نئی نئی زرخیز زمینوں کو تلاش کرتے پھریں۔ سوال

اٹھتا ہے کہ کیا یہ ترقی یافتہ ممالک بالخصوص یورپ کے ماحولی گروہوں کا فرض نہیں ہے کہ اس عالمی میراث کے تحفظ کے سلسلے میں قدم اٹھائیں؟ کیا انھیں ترقی پذیر ممالک کی مدد کے لیے کمر بستہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس قسم کی عالمی امداد بین الاقوامی برادری کی اولین ذمہ داری نہیں ہے؟ میرا سوال ہے کہ کیا یورپ اس جانب پہلا قدم اٹھائے گا؟

ہم نے آپ کے سامنے چند مثالیں پیش کی ہیں جو سائنس کے میدان میں عالمی فریضہ ہیں۔ ان میں اضافہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ بہر حال نئے نئے ادارے نئی نئی ٹریننگ اور تحقیق سے متعلق جماعتوں اور نئی نئی اکالوجی اور سائنس سے متعلق تنظیموں کی ضرورت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ کیا میں سفارش کرسکتا ہوں کہ ایسی تنظیموں کے قیام میں یورپ پہل کرے۔

مختصراً میں عالمی فریضہ کی ایک فہرست آپ کے سامنے پیش کرنا چاہوں گا جن میں سے کچھ تو نئی سائنسی تحقیق سے متعلق ہیں اور کچھ انفراہ سے میں واشنگٹن ڈی۔ سی میں مقیم عالمی وسائل کے ادارے کی مرتب کردہ فہرست سے اکالوجی کے ان حقیقی سنجیدہ مسائل کو پیش کروں گا جو عالمی توجہ کے مستحق ہیں۔

۱۔ کاشت اور چارے کے لیے درکار آراضی کا صحرا بننے، کثاؤ، غیر زراعتی کاموں میں استعمال اور دوسری وجوہات کی بنا پر لگاتار فقدان۔ اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق پوری دنیا میں کاشت اور چارہ کے لیے درکار زمین ہر سال دو کروڑ ہیکٹر کی درسے صفر پیداوار کی مرتکب ہوتی جا رہی ہے۔

۲۔ دنیا کے گرم خطے کے جنگلات کا اختتام جس کی وجہ سے جنگلوں سے وابستہ وسائل کا نقصان ہو رہا ہے۔ تشویشناک آبی تباہیاں مثلاً کٹاؤ، سیلاب وغیرہ اور دوسرے مضر اثرات۔ کہا جاتا ہے کہ کاٹ کر برابر کر دیے جانے کی وجہ سے موجودہ صدی کے اختتام تک کوئی دس کروڑ ہیکٹر کے رقبہ میں گرم علاقوں کے جنگلات کا صفایا ہو جائے گا۔

۳۔ جنگلوں سے وابستہ حیوانات کے خاتمہ کے باعث ہیئتوں کا نیست نابود ہو جانا اور ان سے منسلک توالد و تناسل کے وسائل کا اختتام۔ ایک تخمینہ کے مطابق ہر برس ایک ہزار سے بھی زیادہ نباتاتی ہیئتیں ناپید ہوتی جا رہی ہیں اور ان کی حد میں اضافہ ہونے کے قوی امکانات ہیں۔

۴۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی تیسری دنیا میں نئے نئے شہروں کا آباد ہونا اور غیر مناسب اکالوجی سے بھاگے ہوئے رفیوجیوں کے مسائل بھاری آبادی اگلی صدی کی ابتدائی دہائیوں تک دوگنی ہو جانے کے امکانات ہیں علاوہ ترقی پذیر ممالک کے تقریباً نصف باشندگان شہروں میں رہنے لگیں گے جن میں سے کچھ تو غیر متعینہ حدود سے تجاوز کر جائیں گے۔

۵۔ تازہ پانی کے ذخائر اور انصرام کی کمی۔ موجودہ زمانے میں دنیا کی تمام بیماریوں میں سے کوئی ۸۰ فیصدی بیماریاں پانی کی وجہ سے پھیلتی ہیں۔

۶۔ سمندر کے ماحول کو غیر مناسب مقدار میں مچھلیاں پکڑ کر، متعلقہ ہیئتوں کو تباہ کر کے اس کے پانی کی آلودگی۔ زیادہ مچھلیاں پکڑنے کی وجہ سے دنیا کی کوئی پچیس بے حد گرانقدر مچھلی کی شکارگاہیں آج مچھلیوں سے قطعاً محروم ہو کر رہ گئی ہیں۔

۷۔ پیسٹی سائڈ (PASTICIDE) اور دیگر پُرخطر اشیاء اور انسانی فضلہ کا حامل جراثیم گندے نالوں کے پانی میں موجود امراض سے انسانی صحت کو تخویف و اندیشہ۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ ترقی پذیر ممالک کے ۱۵ سے ۲۰ لاکھ افراد پیسٹی سائڈ کے زہریلے اثر سے بری طرح اذیت سے دوچار ہوتے ہیں اور کوئی دس ہزار افراد ہر برس ہلاک ہو جاتے ہیں۔

۸۔ فضا میں گرین ہاؤس [GREENHOUSE] گیسوں کے جمع ہونے کے باعث آب و ہوا کا تبدیل ہو جانا۔ کاربن ڈائی آکسائڈ اور دیگر گیسوں کے فضا میں برابر بڑھتے جانے کی وجہ سے پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ حرارت میں اضافہ اور مقامی آب و ہوا کو تبدیل کر دینے والی گرین ہاؤس تاثیر (GREENHOUSES EFFECT) پیدا ہو جائے گی۔ گیسوں کا یہ اضافہ خاص طور پر زمین سے نکالے ہوئے ایندھن کو جلانے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ کیا مقامی آب و ہوا کی تبدیلیاں ہوں گی بلکہ یہ ہے کہ کس قدر ہوں گی۔ انواع و اقسام کی وجوہات کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ غریب ممالک پر آب و ہوا کے تبدیل ہونے کا عتاب زیادہ ہوگا۔

۹۔ تیزاب آلود بارش اور عموماً تیزابوں کے پیچیدہ مکسچر اور اوزون (OZONE) اور دیگر فضائی آلودگیوں کے مچھلی کی شکارگاہوں، جنگلات اور فصلوں پر برے تاثرات۔

۱۰۔ توانائی کے لیے درکار ایندھن کی بدانتظامیاں اور توانائی کے وسائل پر دباؤ۔ ان وسائل میں جلانے کی لکڑی بھی شامل ہے جو غربا

ے پٹرول کی حیثیت رکھتی ہے جہاں ترقی یافتہ ممالک میں توانائی کا بحران
ب عالمی آمیزش کا مصداق ہے وہیں ترقی پذیر ممالک میں تیل کی اونچی
قیمتوں اور جلانے کی لکڑی کے فقدان نے ان کی کمر توڑ کے رکھ دی ہے۔

جہاں ہم ایسے عالمی وظیفہ خواہ وہ سائنس سے تعلق رکھتے ہوں یا نہ
رکھتے ہوں کا تذکرہ کر رہے ہیں اور ان کے ہو جانے کا خواب دیکھ رہے ہیں وہیں
میں ایک اور فہرست کا ذکر کرتے ہوئے اپنی گفتگو کو ختم کرنا چاہوں گا یہ فہرست
ناکاجیا نے مرتب کی ہے اور وہ اسے 'خواب برائے بنی آدم' کہتا ہے۔ اس نے چند
عالمی سپر انفراسٹرکچر (SUPER INFRASTRUCTURE) والی تجاویز
پیش کی ہیں جن میں ایک نئے عالمگیر معاہدے کے عنصر تلاش کیے ہیں۔ اس کا خیال
ہے کہ ہتھیار بنانے کے بجائے اگر امیر ممالک اس کے سپرد پروجیکٹوں کی تعمیل
کریں تو یہ صنعت و حرفت تعمیری مطالبات میں تحریک پیدا کرنے کی حامل ہو گی
قرین قیاس اور امید افزا بات یہ ہے اگر ان تجاویز پر عمل کیا جائے تو نہ صرف
یہ کہ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ دونوں طرح کے ممالک کی جی ان پی (GNP) یعنی
ملکی پیداوار بڑھے گی بلکہ روزگار کے لیے ذرائع بھی پیدا ہوں گے۔ ناکاجیا
کا خیال ہے کہ وقت آگیا ہے کہ بنی آدم ایک جرأت مند، نیا، باہمت اور مستحکم بصیرت
سے کام لے کر ایک ایسی بصارت جو چند روزہ تنگ نظر قومی مفاد سے پرے ہو۔
جیسا کہ پیغمبر بادشاہ سلیمان نے بائبل میں کہا ہے کہ 'جہاں بصیرت نہیں ہے۔
وہاں انسانیت فنا ہو جاتی ہے'

جیسا کہ دنیا کے عظیم المرتبت مذاہب ہم کو سکھاتے ہیں آخر میں نوع
انسانی اعمال انسان کے اخلاقی شعور سے ہی آشکار ہوتے ہیں میں بنات
و انسان کے اخلاق اور روحانی درجہ کا ثابت قدم معتقد ہوں اور میں اپنے
کلام کا اختتام ایک یورپ کے صوفی جان ڈون (JOHN DONE) کے
ان الفاظ سے کرنا چاہوں گا جن سے اس نے سترہویں صدی کے خاندانِ
بشری کے بین الاقوامی معیار کی ترجمانی کی ہے یعنی 'کوئی بھی انسان مکمل طور پر
جزیرہ کی حیثیت کا حامل نہیں ہو سکتا۔ ہر انسان بر اعظم کا ایک حصہ ہے،
اصل کا ایک ٹکڑا۔ اگر سمندر کسی روڑے کو بہالے جائے یا یورپ کو بہالے
جائے اور خشکی کے کسی بلند حصہ کو بہالے جائے یا تمہارے دوستوں یا تمہارے
اپنے متعلقوں کو بہالے جائے۔ کسی بھی انسان کی موت مجھ کو مختصر کرتی ہے
کیونکہ میں انسانیت میں شامل ہوں اور اس لیے تم یہ معلوم کرنے کی کوشش
نہ کرو کہ کس کا ماتم ہو رہا ہے۔ در حقیقت یہ تمہارا اپنا ماتم ہے۔"

خواب برائے بنی نوع انسان

نام عمل	ملحق ممالک (خطات)	تجاویز کا خاکہ
(۱) صحراؤں کو سبزہ زار بنانا	شمالی افریقی ممالک اور یورپ ریاستیں	سستائی اور جزیرہ نما عرب کے ریگستانوں کو سبز کرنا
(۲) شمسی حرارت کا کلکٹنگ اسٹیشن		دنیا کے کسی دور دراز علاقہ میں شمسی توانائی کو اکٹھا کرنے کا ایک وسیع پیمانے کا انسٹالیشن۔ زمین پائپ لائنوں اور مزید ساز و سامان مہیا کرنے میں کوئی دو تا پانچ بلین امریکی ڈالر کی لاگت آئے گی۔ اس کا سالانہ ماحصل کوئی بیس کھرب تیل کے پیپوں کے برابر ہوگا۔
(۳) سمندر کی دھاروں سے برقی سکت پیدا کرنا		خط استوا سے لیکر منطقہ معتدلہ تک غیر ترقی یافتہ سمندری ساحل سے منسلک ایک درجن زرخیز علاقے ہیں۔ ایک علاقہ میں تین کروڑ پچاس لاکھ کلو واٹ طاقت پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ مجموعی طور پر سارے علاقوں سے کوئی بیس کروڑ کلو واٹ طاقت پیدا کی جاسکے گی۔
(۴) ہمالیہ کے پانی سے بجلی بنانے کا منصوبہ	ہندوستان، چین اور بنگلہ دیش	دریائے برہم پترا کے بالائی حصوں میں بہنے والی سانپو ندی پر جو چین اور ہندوستان کے صوبہ آسام کے سرحدی علاقہ میں ہے ایک باندھ باندھا جائے اور جمع شدہ پانی کو ایک سرنگ کے ذریعہ ہمالیہ پار ہندوستان میں بہایا جائے۔ اس سے زیادہ سے زیادہ پانچ کروڑ اور اوسطاً تین کروڑ ستر لاکھ کلو واٹ طاقت پیدا کی جاسکے گی۔ ہر سال ۲۲۴ تا ۳۲۴ کھرب کلو واٹ اوقات بجلی پیدا ہونے کے امکانات ہیں۔
(۵) افریقہ کی وسطی جھیل	وسطی افریقی ممالک	کانگو دریا پر باندھ بناکر اس کی روانی پر قابو پانے کے خیال سے وسطی افریقہ کا ایک بڑا علاقہ میں ایک بڑی جھیل بنائی جائے جس سے ان علاقوں کے قدرتی حالات کو بہتر بنایا جاسکے۔

پروفیسر عبدالسلام کے کارنامے ایک نظر میں

ABDUS SALAM

Date of birth : 29 January 1926
Place of birth : Jhang, Pakistan

Educational Career

Government College, Jhang and Lahore	(1938-1946)	M. A. (Panjab University)
Foundation Scholar, St. John's Cambridge	(1946-1949)	B.A. Honours Double first in Mathematics (Wrangler) and Physics
Cavendish Laboratory, Cambridge (1952)		Ph D. in Theoretical Physics

D. Sc. Honoris Causae

Panjab University, Lahore, Pakistan	(1957)
University of Edinburgh, Edinburgh, U. K.	(1971)
University of Trieste, Trieste, Italy	(1979)
University of Islamabad, Islamabad, Pakistan	(1979)
Universidad Nacional de Ingenieria, Lima, peru	(1980)
University of San Marcos. Lima, Peru	(1980)
National University of San Antonio Abad, Cuzco, Peru	(1980)
Universidad Simon Bolivar, Caracas, Venezuela	(1980)
University of wroclow, Poland	(1980)
Yarmouk University, Yarmouk, Jordan	(1980)
University of Istanbul, Istanbul, Turkey	(1980)
Guru Nanak Dev University, Amritsar, India	(1981)
Muslim University, Aligarh, India	(1981)
Hindu University, Banaras, India	(1981)
University of Chittagong, Bangladesh	(1981)
University of Bristol, Bristol, UK	(1981)
University of Maiduguri, Maiduguri Nigeria	(1981)
University of the Philippines, Quezon city, Philippines	(1982)
University of Khartoum, Khartoum, Sudan	(1983)
Universidad Complutense de Madrid, Spain	(1983)
The City College, The City University of New York, New York, USA	(1984)
The University of Nairobi, Nairobi, Kenya	(1984)
Universidad Nacional be Cuyo, Cuyo, Argentina	(1985)
Universidad Nacional de la plata, La Plata, Argentina	(1985)
The University of Cambridge, Cambridge, UK	(1985)

Awards

Awarded Smith's Prize by the University of Cambridge for the Most outstanding pre-doctoral Contribution to physics	(1950)
Hopkins Prize (Cambridge University) for the most outstanding contribution to physics during 1957-1958	
Adams Prize (Cambridge University)	(1958)
First recipient of Maxwell Medal and award (Physical Society, London)	(1961)
Hughes Medal (Royal Society, London)	(1964)
Atoms for Peace Medal and Award (Atoms for Peace Foundation)	(1968)
J. Robert Oppenheimer Memorial Medal and Prize (University of Miami)	(1971)
Guthrie Medal and Prize (Institute of Physics, London)	(1976)
Sir Devaprasad Sarvadhikary Gold Medal (Calcutta University)	(1977)
Matteuci Medal (Accademia Nazionale di XL, Rome)	(1978)
John Torrence Tate Medal (American Institute of Physics)	(1978)
Royal Medal (Royal Society, London)	(1978)
Nobel Prize for Physics (Noble Foundation)	(1979)
Einstein Medal (UNESCO, Paris)	(1979)
Shri R. D. Birla Award (Indian Physics Association)	(1979)
Josef Stefan Medal (Josef Stefan Institute, Ljubljana)	(1980)
Gold Medal for outstanding contributions to physics (Czechoslovak Academy of Sciences, Prague)	(1981)
Peace Medal (Charles University, Prague)	(1981)
Lomonosov Gold Medal (USSR Academy of Sciences)	(1983)

Orders

Order of Nishan-i-Imtiaz (Pakistan)	(1979)
Order of Andres Bello (Venezuela)	(1980)
Order of Istiqlal (Jordan)	(1980)
Cavaliere di Gran Croce dell 'ordine al Merito della Repubblica Italiana	(1980)

Appointments

Professor, Government College and Panjab University (Lahore)	(1951–1954)
Elected Fellow, St John's College (Cambridge)	(1951–1956)
Member, Institute of Advanced Study (Princeton)	(1951)
Lecturer, Cambridge University (Cambridge)	(1954-1956)
Professor of Theoretical Physics, London University, Imperial College (London)	(1957-)
Founder and Director, International Centre for Theoretical Physics (Trieste)	(1964-)

Academies and Societies

Elected, Fellow, Pakistan Academy of Sciences (Islamabad)	(1954)
Elected (first) Fellow of the Royal Society, (London), from Pakistan, 1959	(1959)
Elected, Fellow, Royal Swedish Academy of Sciences (Stockholm)	(1970)
Elected, Foreign Member of the American Academy of Arts and Sciences (Boston)	(1971)
Elected, Foreign Member, USSR Academy of Sciences (Moscow)	(1971)
Elected, Honorary Fellow, St. John's College (Cambridge)	(1971)
Elected, Foreign Associate, USA National Acadmy of Sciences (Washington)	(1979)
Elected, Foreign Member, Accademia Nazionale dei Lincei (Rome)	(1979)
Elected, Foreign Member, Accadema Tiberina (Rome)	(1979)
Elected, Foreign Member, Iraqi Academy (Baghdad)	(1979)
Elected, Honorary Fellow, Tata Institute of Fundamental Research (Bombay)	(1979)
Elected, Honorary Member, Korean Physics Society (Seoul)	(1979)
Elected, Foreign Member, Korean Physics Society (Seoul)	(1979)
Elected, Foreign Member, Academy of the Kingdom of Morocco (Rabat)	(1980)
Elected, Foreign Member, Accademy Nazionale delle Scienze (dei XL), (Rome)	(1980)
Elected, Member, European Academy of Science, Arts and Humanities (Paris)	(1980)
Elected, Associate Member, Josef Stefan Institute (Ljublijana)	(1980)
Elected, Foreign Fellow, Indian National Science Academy (New Delhi)	(1980)
Elected, Fellow, Bangladesh Academy of Sciences (Dhaka)	(1980)
Named, Member, Pontifical Academy of Sciences (Vatican City)	(1981)
Elected, Corresponding Member, Academy of Science (Lisbon)	(1981)
Founding Member, Third World Academy of Sciences	(1983)
Elected, Corresponding Member, Yugoslav Academy of Sciences and Arts (Zagreb)	(1983)
Elected, Honorary Fellow, Ghana Academy of Arts and Science	(1984)

United Nations Assignments

Scientific Secretary, Geneva Conferences on Peaceful Uses of Atomic Energy	(1955 and 1958)
Member United Nations Advisory Committee on Science and Technology	(1964–1975)
Member, United Nations Panel and Foundation Committee for the United Nations University	(1970–1973)
Chairman, United Nations Advisory Committee on Science and Technology	(1971–1972)
Member, United Nations University Advisory Committee	(1981-1983)
Member, Council, University for Peace	(1981)
Chairman, UNESCO Advisory Panel on Science, Technology and Society	(1981)

Member, Scientific Council, SIPRI (Stockholm International Peace Research Institute) (1970)

Vice President, International Union of Pure and Applied Physics (1972-1978)

Pakistan Assignments

Member, Atomic Energy Commission, Pakistan. (1958-1974)

Adviser, Education Committee, Pakistan (1959)

Member, Scientific Commission, Pakistan (1959)

Chief Scientific Adviser to President of Pakistan (1961-1974)

President, Pakistan Association for Advancement of Science (1961-1962)

Chairman, Pakistan Space and Upper Atmosphere Committee (1961-1964)

Governor from Pakistan to the International Atmoic Energy Agency (1962-1963)

Member, National Science Council, Pakistan (1963-1975)

Member, Board of Pakistan Science Foundation (1973-1977)

Pakistani Awards

Sitara-i-Pakisten (S. PK.) (1959)

Pride of Performance Medal and Award (1959)

Nishan-e-Imtiaz (1979)

Published Papers

Around 250 scientific papers on physics of elementary particles.

Scientific Contributions

Research on physics of elementary particles. Particular contributions-two-component neutrino theory and parity violation in weak interaction; gauge unification of weak and electromagnetic interactions; predicted existence of weak neutral currents and W, Z particles before their experimental discovery; symmetry properties of elementary particles; unitary symmetry; renormalization theory; gravity theory and its role in particle physics; two tensor theory of gravity and strong interaction physics; unification of electroweak with strong nuclear forces, grand (electro-nuclear) unification; and related prediction of proton-decay; supersymmetry theory, in particular superspace and superfields.

Books

Symmetry Concepts in Modern Physics, Iqbal Memorial Lecture, (Atomic Energy Centre, Lahore), 1966

Edited with E. P. Wigner, Aspects of Quatum Mechanics (Cambridge University Press), 1972

فکر و نظر کے خصوصی شمارے

نامورانِ علی گڑھ

(پہلا کارواں)

یہ خصوصی شمارہ شایع ہوتے ہی ختم ہوگیا تھا۔ اب دوسرا ایڈیشن شایع ہوگیا ہے لیکن اس کا بہت بڑی تعداد میں چھاپنا ادارے کے لیے دشوار ہے۔ اس لیے سرپرستوں سے گزارش ہے کہ اپنا رسالہ دوستوں کو پڑھنے کے لیے عنایت فرمائیں۔

جو ایجنسیاں مقررہ قیمت سے زیادہ وصول کریں اس کی دفتر کو اطلاع دینے کی زحمت فرمائیں۔

زرِ سالانہ: بیس روپے　　　فی شمارہ: پندرہ روپے

تحریکِ آزادی نمبر

اس شمارے میں ہندوستان کی تحریکِ آزادی پر مبسوط مضامین شامل ہیں اور تحریکِ آزادی میں مسلمانوں نے جو حصہ لیا ہے اس کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے

قیمت: دس روپے

(یہ شمارے تہذیب الاخلاق کی ایجنسیوں پر دستیاب ہیں)

(سرکولیشن منیجر)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۲۱/ ۸۵ - ۸۶

درج ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں

۱- سینیر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (ایک اسامی) (مستقل) ڈیپارٹمنٹ آف پریوینٹو اینڈ سوشل میڈیسن، جے این میڈیکل کالج

شرح تنخواہ : ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت I لازمی : بی ایس سی اور میڈیکل لیب ٹیکنالوجی میں ڈپلومہ کے ساتھ کسی منظور شدہ پبلک ہیلتھ لیبوریٹری / میڈیکل کالج کے پریوینٹو اور سوشل میڈیسن شعبہ میں ٹیکنیکل اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کرنے کا کم از کم پانچ سالہ تجربہ۔

II پسندیدہ : ان لوگوں کو ترجیح دی جائے گی جو بایوکیمیکل انوسٹیگیشن اور بیکٹیریالاجی میں تجربہ رکھتے ہوں

نوٹ : (i) وہ امیدوار جو کہ اشتہار نمبر ۴۳/م/ ۸ - ۸۵ مورخہ ۲۷ - ۲ - ۸۵ کے تحت درخواست ارسال کر چکے ہیں انھیں دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

(ii) امیدواروں کو ایک عملی امتحان سے گذرنا ہوگا۔

۲- فورمین (ایک اسامی) (مستقل) ڈیپارٹمنٹ آف کیمیکل انجینیرنگ زیڈ۔ ایچ۔ کالج آف انجینیرنگ اینڈ ٹیکنالوجی۔

شرح تنخواہ : ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت I لازمی : متعلقہ برانچ میں ڈپلومہ کے ساتھ مختلف کیمیکل انجینیرنگ کی تجربہ گاہوں میں تجربوں کے انتظام اور اہتمام کا آٹھ سالہ تجربہ۔

II پسندیدہ : سائنس مضمون میں گریجویٹ ہونے کے ساتھ مصنوعی اشیاء بنانے، تجربے کے لیے آلات لگانے، ان کے چالو کرنے اور کیمیائی تجربات کے لیے استعمال ہونے والی اشیاء کے طریقۂ کار کا تجربہ۔ ایسے امیدوار کو ترجیح دی جائے گی جو خراد اور دوسری ورک شاپ کی مشینوں پر کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ غیر معمولی حالات میں وسیع مدتی اور مخصوص تجربہ کے حامل امیدوار کے لیے قابلیت میں کچھ کمی کی جا سکتی ہے۔

نوٹ : امیدوار کو انٹرویو سے قبل ایک عملی امتحان سے گذرنا ہوگا۔

۳- <u>نرسنگ آفیسر (ایک اسامی) (مستقل) یونیورسٹی ہیلتھ سروس۔</u>

شرح تنخواہ : ۵۵۰ - ۲۰ - ۶۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت I لازمی : جنرل نرسنگ اور مڈوائفری میں سرٹیفکٹ اور کسی اسٹیٹ میڈیکل فیکلٹی سے رجسٹرڈ، تسلیم شدہ سسٹر ٹیوٹر یا نرسنگ ایڈمنسٹریشن کورس کا سرٹیفکیٹ۔ سات سالہ نرسنگ کا تجربہ۔

II پسندیدہ : دو سال یا اس سے زیادہ کا انتظامی تجربہ۔ مرد اسٹاف کو ترجیح دی جائے گی۔

آرٹسٹ (ایک اسامی، مستقل) ڈیپارٹمنٹ آف حیوانیات۔

شرح تنخواہ: ۴۲۵-۱۵-۵۰۰-ای بی-۱۵-۵۶۰-۲۰-۷۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔

قابلیت I لازمی: آرٹس، سوشل سائنس، سائنس یا کامرس میں گریجویٹ ڈگری اور ڈپلومہ ریفائن آرٹس یا ڈرائنگ اور پینٹنگ میں کسی تسلیم شدہ ادارے سے سرٹیفکیٹ۔

II پسندیدہ: آرٹسٹ کی حیثیت سے کام کرنے کا کم از کم دو سالہ تجربہ۔ بائیولاجی سے متعلق تصاویر کے بنانے اور پینٹ کرنے کی صلاحیت۔ ثبوت میں شہادت۔

۵۔ فارمیسٹ (ایک اسامی، مستقل) اے۔ کے۔ طبیہ کالج

شرح تنخواہ: ۳۳۰-۱۰-۳۸۰-ای بی-۱۲-۵۰۰-ای بی-۱۵-۵۶۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔

قابلیت: (۱) ہائی اسکول یا اس کے مساوی اور یونیفل قابلیت جو کسی یونیورسٹی سے تسلیم شدہ ہو۔

(۲) فارمیسی میں ڈپلومہ یا سرٹیفکیٹ جو کسی اسٹیٹ میڈیکل کونسل سے تسلیم شدہ ہو۔

(۳) دوا بنانے اور کمپاؤنڈنگ کے تین سالہ تجربہ کے حامل امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی۔

جونیئر لیب اسسٹنٹ (ایک اسامی، مستقل) ڈیپارٹمنٹ آف ریڈیولاجی۔ جے۔ این۔ میڈیکل کالج۔

شرح تنخواہ: ۲۶۰-۸-۳۰۰-ای بی-۸-۳۴۰-۱۰-۳۸۰-ای بی-۱۰-۴۳۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت: I لازمی: میٹرک یا اس کے مساوی سائنس مضمون کے ساتھ۔

(II) پسندیدہ: ایکس۔رے سیکشن میں کام کرنے کا کم از کم دو سالہ تجربہ۔

۷۔ ڈرائیور (ایک اسامی، مستقل) (پوسٹ پارٹم پروگرام) ڈیپارٹمنٹ آف آبسٹیٹرکس اینڈ گائنیکولوجی۔ جے۔ این۔ میڈیکل کالج۔

۸۔ ڈرائیور (ایک اسامی، عارضی) (آئی۔ سی۔ اے۔ آر۔ پروجیکٹ کے تحت) ڈیپارٹمنٹ آف باٹنی۔

شرح تنخواہ: ۲۶۰-۶-۲۹۰-ای بی-۶-۳۲۶-ای بی-۸-۳۹۰-۱۰-۴۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔

قابلیت I لازمی: (۱) حرف شناس

(۲) ہلکی / وزنی گاڑیوں کے چلانے کا لائسنس

(۳) ہلکی اور وزنی گاڑیوں کے چلانے کا خاصہ تجربہ

(۴) اردو اور ہندی کی قدرے معلومات۔

(II) پسندیدہ: موٹر میکینک کا تجربہ۔

زیادہ تجربے اور اعلیٰ قابلیت کے حامل امیدواروں کو شروع ہی سے اعلیٰ تنخواہ دی جا سکتی ہے۔ جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا، ان کو ایک طرف کا سیکنڈ کلاس ریلوے کرایہ [illegible] ادا کیا جائے گا۔

مطبوعہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دفتر سے ۲/۷۵ روپے نقد ادا کر کے (مسلم یونیورسٹی فنانس آفس کے کیش سیکشن میں) یا رجسٹرار مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا اسی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر بھیج کر ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ڈاک سے حاصل کرنے کی صورت میں ۲۳×۱۰ سینٹی میٹر سائز کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور مطلوبہ ڈاک ٹکٹ چسپاں ہوں بھیجا جانا ضروری ہے۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۰ جنوری [illegible] (آفس اوقات میں) ہے۔ نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں قبول نہیں کی جائیں گی۔

شاہد علی
رجسٹرار

No. PA/767/2155 PRO

اقلیتوں کے لیے مارجن منی قرض سہولت

اترپردیش مالیاتی و ترقیاتی کارپوریشن اقلیتوں کے افراد کے لیے جن میں مسلمان سکھ، عیسائی، بودھ اور پارسی شامل ہیں صنعت، دکانداری و دیگر کاروبار کرنے کے لیے جس کی کل لاگت دو لاکھ تک ہوگی، بینک یا مالیاتی اداروں کے ذریعہ مطلوب مارجن منی کا ۷۵ رفی صد قرض کے طور پر دے گا۔ اس پر سالانہ سود ½۷ فی صد ہوگا۔ سود اور اصل رقم کی ادائیگی ۹ سال میں کرنی ہوگی۔ شروع کے تین سالوں میں سود اور اصل کی ادائیگی رکی رہے گی۔

حکومت ہند یا صوبائی حکومتوں سے جن کو صنعت یا دستکاری کے لیے ایوارڈ ملا ہے یا وہ انجینئر جو بے کار ہیں انھیں اپنی اسکیم کے لیے بینکوں یا مالیاتی اداروں سے مطلوب سارا مارجن منی قرض کے طور پر مل سکے گا۔

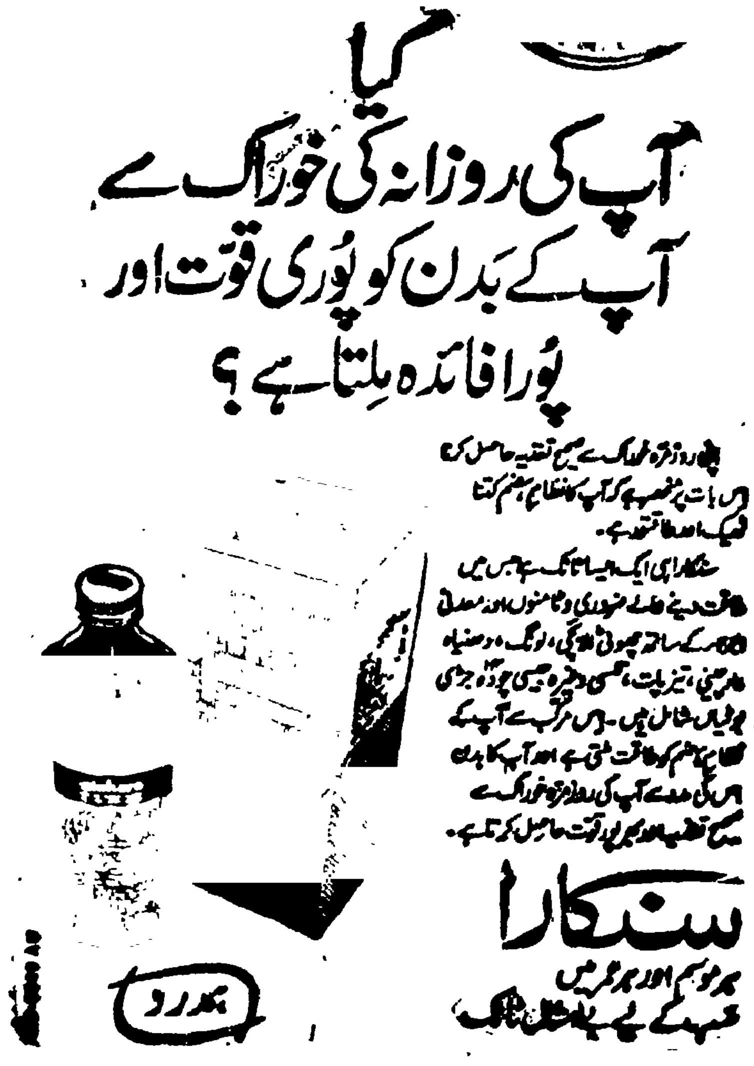
اسکیموں کے لیے بینکوں یا مالیاتی اداروں سے قرض کی منظوری کے بعد ہی کارپوریشن سے قرض حاصل ہو سکے گا۔

اس اسکیم و کارپوریشن کی دیگر اسکیموں کی مزید تفصیلات جنرل منیجر ڈسٹرکٹ انڈسٹریز سینٹر یا کارپوریشن کے ہیڈ آفس ۲۸ ر نشاط گنج پیپر مل کالونی لکھنؤ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

نیاز حسن
(چیرمین)

سراج حسن
(جوائنٹ منیجنگ ڈائرکٹر)

انیس انصاری
(منیجنگ ڈائرکٹر)

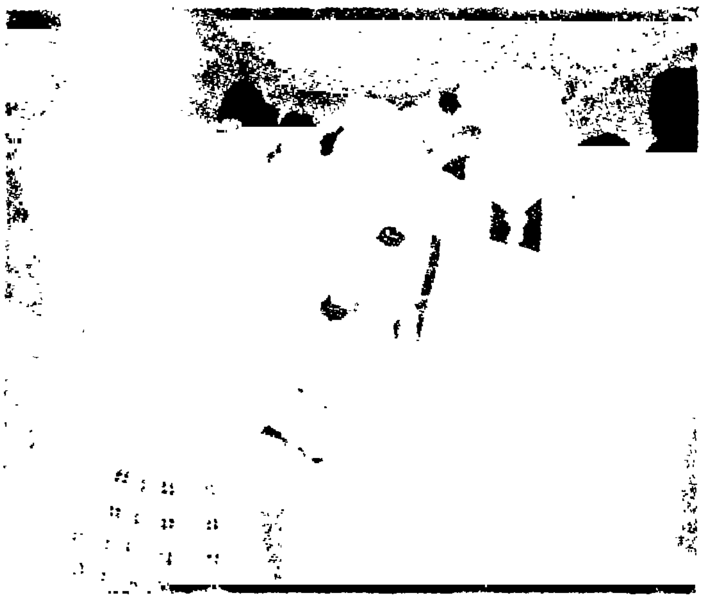


Litho Colour Printers, Achal Tal, Aligarh Phone 4185

تہذیب الاخلاق



Price Rs. 1.50





THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۵ * یکم تا ۱۵ فروری ۸۶ء * شمارہ ۳

*

ترسیل زر کا پتہ : پروفیسر منظر عباس نقوی
ٹریزرر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ،
شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

قیمت فی شمارہ : ڈیڑھ روپیہ
زر سالانہ : تیس روپے
تاحیات : تین سو روپے

منددجات

صفحہ

۱ : اداریہ ______ ۳

۲ : وائس چانسلر صاحب کی خیر مقدمی تقریر ______ ۵

۳ : نظریۂ ارتقائے حیات
جدید علمی تحقیقات کی روشنی میں ... افتخار عالم خاں ______ ۹

۴ : جنگِ آزادی کا ایک جانباز مجاہد ... منظر عباس نقوی ______ ۱۰

۵ : خالد بن ولید (نویں قسط) ... قاضی عبدالستار ______ ۱۴

۶ : مسلم یونیورسٹی کے شب و روز ... راحت ابرار ______ ۱۹

۷ : انعامات ... قمرالہدیٰ فریدی ______ ۲۳

۸ : عمرانیات کا قومی سیمینار ... بشیر احمد دابلا ______ ۲۴

سرورق پر: تہذیب الاخلاق کے خصوصی شمارے پر پروفیسر عبدالسلام دستخط کرتے ہوئے

[illegible] Salem

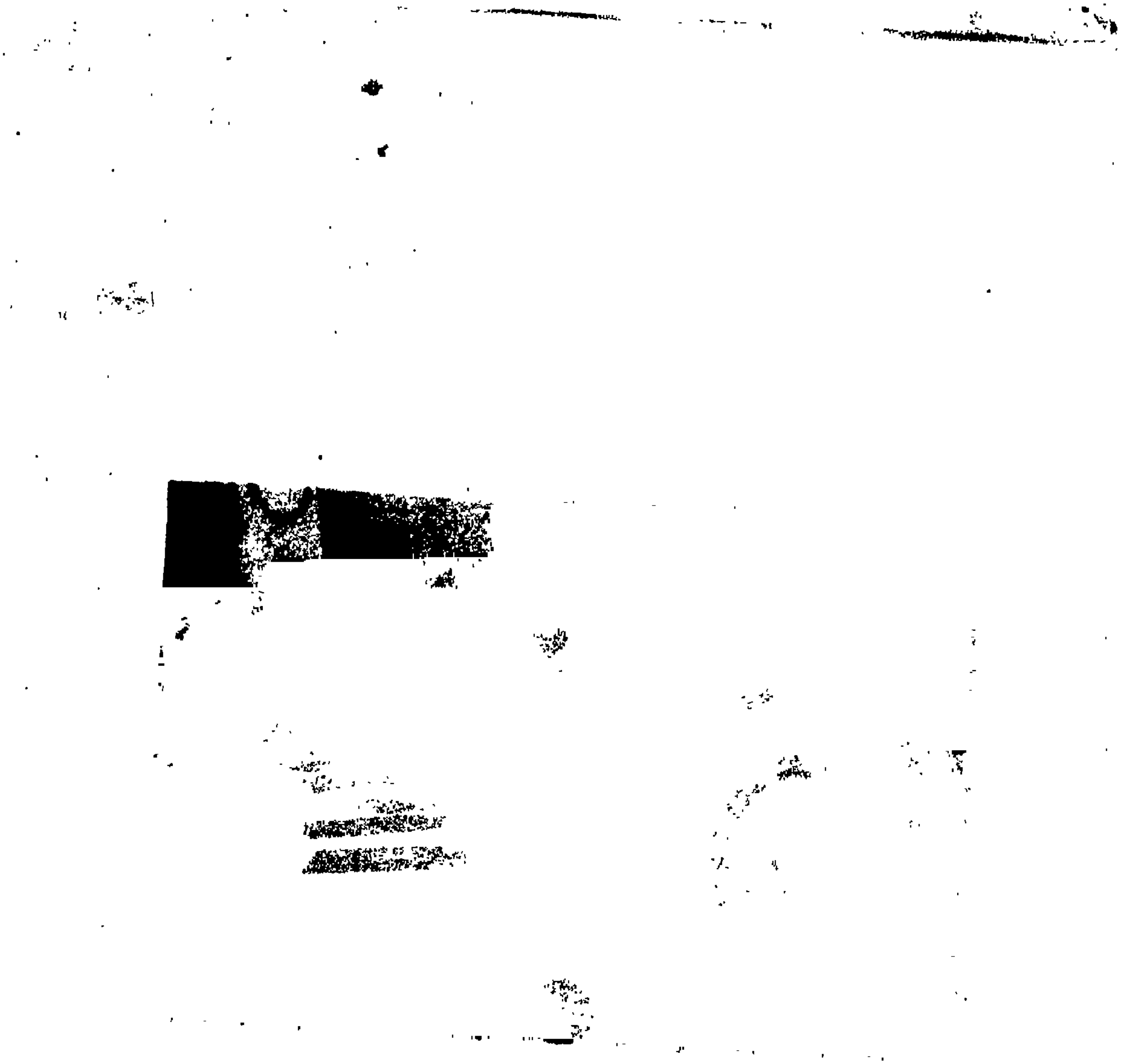
پروفیسر عبد السلام کا خیر مقدم

دنیا کے نامور سائنس داں اور تیسری دنیا کی سائنس اکیڈمی کے صدر پروفیسر عبد السلام پچھلے مہینے مسلم یونیورسٹی کی دعوت پر علی گڑھ تشریف لائے۔ اس موقع پر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ نے بھی ایک خیر مقدمی جلسے کا اہتمام کیا۔ جلسے میں مسلم یونیورسٹی کے چانسلر، پرو چانسلر، وائس چانسلر اور ٹرسٹ کے نائب صدر جناب حکیم عبد الحمید نے بھی شرکت فرمائی۔ پروفیسر عبد السلام نے اپنی تقریر میں تہذیب الاخلاق کی خدمات کو سراہا، مکمل تعاون کا یقین دلایا اور ایک ہزار ڈالر کے گراں قدر عطیے سے ٹرسٹ کو نوازا، جس کے لیے ٹرسٹ ان کا شکر گزار ہے۔ ایک چھوٹے سے رسالے پر ایک جلیل القدر سائنس داں کی بے پایاں عنایات کا سبب یہ ہے کہ پروفیسر عبد السلام نے تیسری دنیا اور عالم اسلام میں تعلیم اور خاص طور پر سائنس کی تعلیم کے فروغ کو زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔ چھوٹے پیمانے پر سہی لیکن اب کا تہذیب الاخلاق بھی اس کام میں مصروف ہے اور اس کی حیثیت اس ننھے سے بے حقیقت دیے کی ہے جو تاریکی کو مٹانے کے لیے جان کی بازی لگا دیتا ہے۔

ہماری خواہش تھی کہ اس یادگار موقع پر موجودہ تہذیب الاخلاق کے بانی جناب سید حامد بھی تشریف لاتے لیکن ان دنوں سید صاحب کی مصروفیات بہت زیادہ ہیں۔ اور وہ اس کوشش میں مصروف ہیں کہ مدرسے [illegible] کسی طرح جدید علوم کو بھی اپنے نصاب میں شامل کر لیں۔ انشاء اللہ وہ اپنی کوشش میں ضرور کامیاب ہوں گے۔

پروفیسر عبد السلام نے سینٹر فار پروموشن آف سائنس کی کانفرنس کا افتتاح بھی فرمایا۔ اس مرکز کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو سائنس کی تعلیم کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اس کانفرنس میں جو مقالات پیش کیے گئے وہ آئندہ اشاعتوں میں بالاقساط پیش کیے جائیں گے۔ کانفرنس نے باتفاق رائے اس خواہش کا اظہار کیا کہ تہذیب الاخلاق میں سائنس پر اور زیادہ مضامین شائع کیے جائیں اور یہ رسالہ اس مرکز کا مکمل ترجمان ہو۔ آئندہ سائنس پر مضامین کی تعداد کچھ زیادہ ہوگی اور کوشش کی جائے گی کہ یہ مضامین پُر از معلومات ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور قابل فہم ہوں تاکہ سائنسی مزاج پیدا کرنے میں ان سے پوری مدد ملے۔ اب دیکھنا ہے کہ آپ انہیں کس حد تک پسند فرماتے ہیں۔

نور الحسن نقوی



تہذیب الاخلاق کے عبدالسلام نمبر کی رسمِ اجرا کا ایک منظر

دائیں سے بائیں: پروفیسر منظر عباس نقوی، پروفیسر عتیق احمد صدیقی (صدر شعبۂ اردو) جناب حکیم عبدالحمید،
الحاج عبیدالرحمان خان شروانی (پرو چانسلر)، پروفیسر عبدالسلام، پروفیسر اے آر قدوائی (چانسلر)
پروفیسر وسی الرحمان (وائس چانسلر)، ڈاکٹر نورالحسن نقوی

وائس چانسلر صاحب کی خیر مقدمی تقریر

محترم جناب پروفیسر عبدالسلام صاحب!

جناب چانسلر صاحب

جناب پرو چانسلر صاحب

جناب حکیم عبدالحمید صاحب

ڈاکٹر نورالحسن صاحب

معزز خواتین و حضرات!

میرا انتہائی خوشگوار فرض ہے کہ اس وقت تہذیب الاخلاق ٹرسٹ کے پلیٹ فارم سے میں ایک ادنیٰ سائنس کے طالب کی حیثیت سے شہرۂ آفاق سائنس داں پروفیسر عبدالسلام صاحب کو خوش آمدید کہوں!

خواتین و حضرات!

میں اپنے اور انکساری کے درمیان ایک طویل فاصلہ قائم رکھتے ہوئے نہایت دیانت داری سے کہنا چاہوں گا کہ میں اس مبارک موقع کو اپنی زندگی کا اہم ترین، سب سے زیادہ باسرّت، سب سے زیادہ باعث فخر، اور سب سے زیادہ بیش قیمت لمحہ سمجھتا ہوں۔

پہلے تو میں یہ عرض کردوں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اس تعلق خاطر کے لیے شکر گذار ہے جو پروفیسر عبدالسلام صاحب اس علمی ادارے سے رکھتے ہیں۔ وہ یہاں کے تعلیمی منصوبوں میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ اور انہیں عملی جامہ پہنانے میں ہمیشہ ہماری مدد کی ہے۔ اس درس گاہ کے کئی شعبوں سے ان کا براہِ راست قریبی تعلق ہے۔ اسی طرح ہمارے پندرہ روزہ "تہذیب الاخلاق" کو بھی آپ کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ یہ بامقصد علمی رسالہ ایک صدی قبل بانیٔ درسگاہ سر سید احمد خاں نے جاری کیا تھا۔ اور ان کے تعلیمی مشن کو کامیاب بنانے میں اس رسالے نے نہایت اہم رول ادا کیا تھا۔ یہ محسوس کرنے کے بعد کہ آج پھر اسی طرح کے ایک رسالے کی ضرورت ہے، یہ ناانصافی ہوگی اگر میں اس حقیقت کا انکشاف نہ کروں کہ اس پاکیزہ اور تعمیری احساس اور جذبے کا سہرا ہمارے سابق وائس چانسلر محترم جناب سید حامد صاحب کے سر ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے اور نہایت ہی مسرت کا مقام ہے کہ ہمارے موجودہ وائس چانسلر محترم جناب سید ہاشم علی صاحب اسی پاکیزہ اور تعمیری احساس اور جذبے کو فروغ دے رہے ہیں۔ چار سال قبل اسے دوبارہ جاری کیا گیا۔ اس وقت سے آج تک یہ نہایت باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ادارتاً اس کی حیثیت مسلم یونیورسٹی کے علمی و ثقافتی ترجمان کی ہے۔ مطلب یہ کہ علم کے فروغ کے جس کام کو پروفیسر عبدالسلام صاحب عالمگیر پیمانے پر کر رہے ہیں اسی کو چھوٹے پیمانے پر یہ رسالہ بھی انجام دے رہا ہے۔ اس لیے یہ آپ کے بھرپور تعاون اور سرپرستی کا متمنی ہے۔

معزز مہمانِ خصوصی کو یہ جان کر مزید خوشی ہوگی کہ سرسید علیہ الرحمۃ کے گراں قدر خیالات جن کی ترجمانی آپ کی تحریروں اور تقریروں سے اکثر و بیشتر ہوتی رہتی ہے، کو وسیع تر اشاعت اور فروغ دینے کے لیے "تہذیب الاخلاق" کا ایک ہندی روپ بھی اسی ادارے سے "نشانت" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔

پروفیسر عبدالسلام صاحب کی تشریف آوری کی تقریب میں "تہذیب الاخلاق" نے ایک خصوصی شمارہ شائع کرکے اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن کسی مختصر رسالے سے پروفیسر موصوف کے بیش بہا کارناموں کا پوری طرح اعتراف ممکن نہیں تاہم یہ ایک ادنیٰ سی کوشش ضرور ہے۔

اس ادارے کے لیے اور ہم سب کے لیے یہ نہایت فخر کی بات ہے کہ دنیا کا ایک عظیم سائنسداں اس وقت ہمارے درمیان موجود ہے یہی نہیں بلکہ ان کی تشریف آوری اور کشش سے کئی قابل قدر ہستیوں کا یہاں اجتماع ہو گیا۔

میں معزز مہمانِ خصوصی اور ان سب حضرات کا خیر مقدم کرتا ہوں اور ان کی تشریف آوری کے لیے تہہ دل سے مشکور ہوں۔

پروفیسر وصی الحسن

افتخار عالم خان
جنرل ایجوکیشن سینٹر، آئی ایم یو

نظریۂ ارتقائے حیات

جدید علمی تحقیقات کی روشنی میں

ڈارون کے نظریۂ ارتقا کو شایع ہوئے آج تقریباً سوا سو سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اس عرصے میں سائنس کے ہر شعبے میں تحقیق کا بیش بہا کام ہوا ہے۔ اسی لیے جدید نظریہ ارتقا کی تشکیل کسی ایک سائنس داں یا کسی ایک سائنسی میدان میں ہونے والی تحقیق کے نتیجے میں نہیں ہوئی۔ بلکہ متعدد عالموں کی تحقیق اور مختلف سائنسی اقلیموں میں ہونے والے کام نے اس معمہ کے مختلف حل تلاش کرنے میں مدد دی ہے۔

ڈارون کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے نظرۂ ارتقاء کی صداقت کو عام لوگوں تک پہنچایا اور وہ انھیں یہ بات باور کروانے میں کامیاب ہوا کہ مختلف انواع کے جاندار لاکھوں سالوں کے ارتقائی عمل کے ذریعے ایک ہی نوع کے جانداروں سے ارتقا کرکے بنے ہیں۔

ڈارون کے نظریہ کی اہمیت اس بات سے اور بڑھ گئی تھی کہ پہلی بار اُس نے بہت ہی مدلل انداز میں اس بات کو عام لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا کہ "ارتقا ہوتا ہے"۔ یہ اور بات ہے کہ "ارتقا کس طرح ہوتا ہے" اس بات کو سمجھنے اور سمجھانے میں اسے مکمل کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

ڈارون کا نظریہ اس لحاظ سے بھی اہم تھا کہ اس نظریہ نے پہلی بار ساری دنیا کے عام تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن کو جھنجوڑ دیا۔ وہ چاہے فلسفی ہوں یا محقق، مذہبی پیشوا ہوں یا ادیب، تاریخ داں ہوں یا سیاست داں، ڈاکٹر ہوں یا انجینیر غرض کہ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے اپنے طور پر ڈارون کے نظریے کو سمجھنے کی کوشش کی اور یا تو اسے قبول کیا یا اس سے انحراف کیا۔ کسی نے ڈارون کو فلک پر پہنچایا تو کسی نے اس پر کیچڑ اچھالی۔ کچھ لوگوں نے اس کے نظریے کو سمجھنے کی کوشش کی تو کچھ نے اس کی نیت پر شک کیا۔ کچھ لوگ ایسے تھے جنھوں نے اس کی کتاب کو سینے سے لگا کر رکھا تو کچھ لوگوں نے اسے نذرِ آتش کیا اور کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنے تکیوں کے نیچے چھپا چھپا کر اس کی کتاب کا مطالعہ کیا۔

متعدد سائنسی نظریات، فلسفے اور سیاسیات کے اصول سماجی و اخلاقی اقدار، انقلابی تحریکیں، ادبی تنقیدیں و مختلف معاشی نظام غرض دانشورانہ سرگرمی کا ہر شعبہ نظریۂ ارتقا سے متاثر ہوا اور ان میں ارتقائی اصولوں کو بنیاد بنا کر اہم تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہو گئیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی کمزوریاں خود اس کی زندگی ہی میں سامنے آنے لگی تھیں۔ خاص طور پر اس کے نظریہ کا وہ اہم پہلو جس کی رو سے مختلف جانداروں میں ہونے والی چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ایک نسل سے دوسری نسل میں پہنچ کر انھیں آہستہ آہستہ نسل در نسل تبدیل کرتی رہتی ہیں عام طور پر زیر بحث رہتا تھا اس سلسلہ میں بہت حد تک ڈارون خود یہ سمجھنے اور سمجھانے سے قاصر رہا کہ یہ تبدیلیاں جانداروں میں کس طرح رونما ہوتی ہیں۔ اور کس طرح ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتی ہیں۔

اپنے اس نظریہ کے اس پہلو کو واضح کرنے کے لیے ڈارون کو بھی لامارک کے نظریے کا سہارا لینا پڑا جس کی رو سے جسم کے مختلف حصوں کے "کثرتِ استعمال" یا "غیر استعمال" سے کسی بھی جاندار میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں رونما ہو سکتی ہیں جو اس کے "[illegible]" پہنچ جاتی ہیں اور اس طرح آیندہ نسلوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ حالانکہ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی جاندار کے جسم میں ہونے والی ان چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کا ہونا اور ان کا "سفر" میں پہنچنا اور ان کے ذریعے آیندہ نسلوں کو منتقل کرنا ایک نہایت [illegible]

تشریح تھی۔ ڈارون خود اپنے نظریے کے اس پہلو کی کمزوری سے بخوبی واقف تھا۔ جس کا احساس اس کے ایک جملے سے ہوتا ہے جو اس نے ایک جگہ اس سلسلہ میں لکھا تھا: "ان چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کے رونما ہونے کے سلسلہ میں کون سے اصول کارفرما ہیں۔ اس سلسلہ میں ہماری لاعلمی مسلم ہے۔"

بدقسمتی دیکھیے کہ ڈارون اپنے نظریے کے سلسلہ میں جن اہم سوالوں کے جواب کا متلاشی تھا انہی اہم سوالوں کا مکمل حل گریگور مینڈل [Gregor Mendel] کے سائنسی پرچہ میں موجود تھا جو اس نے ۱۸۶۶ء میں شائع کیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اس وقت مینڈل کے کام کی اہمیت کو نہ سمجھا گیا۔ گریگور مینڈل آسٹریا [Austria] کے رہنے والے ایک راہب تھے۔ وہ اپنے طور پر تحقیق کے کام میں مصروف تھے۔ انھوں نے مٹر کے پودوں پر جو تجربات کیے تھے ان کے نتائج ایک علمی پرچہ کی صورت میں ۱۸۶۶ء میں شائع کیے تھے۔ لیکن ۱۹۰۰ء میں پہلی بار مینڈل کے تجربات کی اہمیت سائنس دانوں پر عیاں ہوئی اور بعد میں علم توالد و تناسل [Genetics] کے میدان میں ہونے والی تحقیق کے لیے مینڈل کے تجربات نے ایک ٹھوس بنیاد فراہم کی۔

۱۸۹۲ء میں ویزمین [Weismann] نے اپنا نظریہ پیش کیا جسے جرمی مادۂ حیات کا نظریہ [Theory of Germ plasm] کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ویزمین کا خیال تھا کہ جو چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں [Variations] جانداروں میں رونما ہوتی ہیں، ان کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک تو وہ جو پیدائشی ہوتی ہیں اور دوسری وہ جو ماحول کے ردعمل کے طور دورانِ زندگی میں پیدا ہوتی ہیں۔ جو پیدائشی ہوتی ہیں وہ جرمی مادہ حیات [Germ plasm] پر اثر انداز ہوتی ہیں اور اسی وجہ سے ایک نسل سے دوسری نسل میں پہنچتی رہتی ہیں۔ دوسری قسم کی تبدیلیاں جو اپنے ماحول کے ردعمل کے نتیجے میں کسی جاندار کے اندر اس کے دورانِ زندگی میں واقع ہوتی ہیں وہ اس جاندار کے جسمانی خلیوں تک ہی محدود رہتی ہیں اور چونکہ یہ اس جاندار کے جرمی مادۂ حیات پر اثر انداز نہیں ہوتیں اسی وجہ سے ایک نسل سے دوسری نسل میں نہیں پہنچ پاتیں۔ ڈی وریز [De Vries] نے ۱۹۰۱ء میں اپنا نظریہ "جستی تغیر نوع" [Theory of Mutations] پیش کیا۔ اس کے نظریہ کی بنیاد ان مشاہدات تھے جن کے دوران اس نے دیکھا تھا کہ ایک مخصوص جڑی بوٹی [Evening primrose] میں یکایک چند تبدیلیاں واقع ہوئیں اور اس نے یہ بھی دیکھا کہ یہ تبدیلیاں پائیدار تھیں اور افزائشِ نسل کے دوران ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچ سکتی تھیں۔ اپنے ان مشاہدات کی بنا پر اس نے نتیجہ اخذ کیا کہ جانداروں میں ارتقائی عمل آہستہ آہستہ ہونے والی چھوٹی چھوٹی تدریجی تبدیلیوں کے رونما ہونے سے واقع نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے برخلاف یہ عمل بہت بڑے پیمانے پر یکایک رونما ہونے والی خلقی تبدیلیوں کے ظہور میں آنے سے ہوتا ہے۔ جن کو اس نے جستی تغیر نوع یا [Mutation] کے نام سے موسوم کیا۔

ویزمین اور ڈی وریز کے تجربات اور مشاہدات نے بڑی حد تک اس بات کی تشریح کرنے کی کوشش کی کہ جانداروں میں ارتقائی عمل کس طرح ہوتا ہے۔ لیکن اس معمہ کا صحیح حل اس وقت مل سکا جب ۱۹۰۰ء میں سائنس دانوں نے مینڈل کے تجربات کے نتائج کو سمجھنے اور ان پر مزید تحقیق کرنے کی طرف دھیان دیا۔

مینڈل نے اپنے تجربات کے نتائج یوں تو ۱۸۶۶ء میں شائع کیے تھے لیکن اس سے پہلے سائنس دانوں نے اس کے تجربات کی اہمیت کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔ مینڈل نے اپنے یہ تجربات مٹر کے پودوں پر کیے تھے۔ اپنے ان تجربات کے لیے مینڈل نے مٹر کے پودوں کی چند مخصوص خصوصیات کو منتخب کیا تھا۔ اور یہ دیکھنے کی کوشش کی تھی کہ یہ خصوصیات کس طرح ایک نسل سے دوسری نسل کے پودوں تک پہنچتی ہیں۔ ان تجربات کے لیے جن مخصوص خصوصیات رکھنے والے پودوں کو منتخب کیا گیا تھا ان کے بارے میں افزائش نسل کے ذریعے یہ تشفی کرا لی گئی تھی کہ وہ ان خصوصیات کے سلسلہ میں خالص النسل ہیں۔ اس بات کو زیادہ آسانی سے اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ سب سے پہلے مینڈل نے مٹر کے دو طرح کے پودوں کو علیحدہ کیا۔ ایک وہ جو دراز قد کے پودے تھے اور دوسرے وہ جو "پستہ قد" کے پودے تھے۔ پھر دراز قد کے پودوں کی افزائش نسل کر کے یہ تشفی کی گئی کہ آئندہ نسلوں میں بھی ان کے بیجوں سے پیدا ہونے والے

دے پستہ قد ہی کے تھے۔ یعنی اس طرح یہ تشفی کرلی گئی کہ "قد کی خصوصیت" کی سلسلہ میں یہ دونوں طرح کے پودے خالص النسل ہیں۔ مینڈل نے "قد" کے سلسلہ میں خالص النسل پودے منتخب کرنے کے بعد لمبے قد کے پودوں سے پستہ قد کے پودوں کا جوڑا لگایا اور اس طرح جو بیج بنے اور ان سے جو پودے پیدا ہوئے اور جو پہلی نسل پودوں کے سامنے آئی اس نسل میں سارے پودے "لمبے قد" کے تھے لیکن بعد میں جب اس پہلی نسل کے لمبے پیڑوں کا آپس میں جوڑا لگا کر بیج بنائے گئے اور ان سے جو دوسری نسل کے پودے پیدا ہوئے تو اس میں لمبے اور پستہ قد دونوں طرح کے پودے شامل تھے۔ اور جب ان کا شمار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس نسل میں لمبے اور پستہ قد کے پودوں کا اوسط تین اور ایک کا تھا۔ یعنی اگر کل چالیس پودے پیدا ہوئے تو ان میں سے ۳۰ پودے لمبے قد کے اور دس پودے پستہ قد کے تھے۔ اسی طرح جب دوسری نسل کے ان ۳۰ پودوں کا آپس میں جوڑا لگا کر تیسری نسل کے پودے اگائے گئے تو مینڈل نے دیکھا کہ ان میں سے دس لمبے پودے ایسے تھے جو خالص النسل تھے اور ان کی آئندہ نسلوں کے سب پودے لمبے قد کے تھے لیکن باقی بیس "لمبے پودوں" کا جب آپس میں جوڑا لگایا گیا اور ان کے بیجوں سے چوتھی نسل کے پودے اگائے گئے تو ان میں دوبارہ لمبے قد اور "پستہ قد" کے پودے پیدا ہوئے اور ان کا اوسط وہی تھا جو پہلی نسل میں دیکھا گیا تھا یعنی ۳ لمبے قد کے پودے اور ایک پستہ قد کا پودا (یعنی ۳:۱ کا اوسط) لیکن اس کے برخلاف دوسری نسل کے دس پستہ قد پودوں کا آپس میں جوڑا لگایا گیا اور تیسری نسل کے پودے اگائے گئے تو وہ سب خالص النسل پستہ قد کے پودے تھے جن کی آئندہ نسلوں کے سب ہی پودے پستہ قد کے تھے

اس طرح مندرجہ بالا تجربات کی روشنی میں مینڈل نے جو نتائج اخذ کیے وہ مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔ کسی جاندار کی ہر مخصوص خصوصیت کے لیے اس کے افزائش نسل کے خلیوں میں ایک "عنصر" ہوتا ہے۔ نیز یہ عنصر "جوڑوں" میں ہوتے ہیں۔ مثال "لمبے قد" اور "پستہ قد" کے عنصر افزائش نسل کے خلیوں میں ایک "جوڑے" کے طور پر موجود ہوں گے۔ اس جوڑے کے دونوں عنصر انفرادی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

۲۔ ایک ہی طرح کی خصوصیات کے لیے "عناصر" کا جو جوڑا ذمہ دار ہوتا ہے، اس کے "دو عنصر" میں سے ایک کبھی کبھی دوسرے پر فوقیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس طرح فوقیت حاصل کرنے والا ابھر کر سامنے آجاتا ہے اور دوسرا دب جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب "لمبے قد" کے پودوں کا "پستہ قد" کے پودوں سے جوڑ لگایا گیا تو اس طرح جو پہلی نسل پودوں کی بنی اس میں سب پودے لمبے قد کے تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے اجداد کے افزائش نسل کے خلیوں میں لمبے قد اور پستہ قد" کے عناصر کا جوڑا موجود تھا لیکن ان دونوں میں سے "لمبے قد" کی خصوصیت والے عنصر نے "پستہ قد" کی خصوصیت رکھنے والے "عنصر" کو دبا دیا تھا اور اسی وجہ سے پہلی نسل کے سب پودے "لمبے قد" کے تھے۔

۳۔ لیکن پہلی نسل کے ان "لمبے قد" کے پودوں کے اندر "چھوٹے قد" کا "عنصر" دبا ہوا موجود تھا۔ اسی وجہ سے جب پہلی نسل کے ان "لمبے قد" کے پودوں کا آپس میں جوڑ لگا کر نسل بنائی گئی تو اس دوسری نسل کے پودوں میں "لمبے قد" کے پودوں کے ساتھ ساتھ "چھوٹے قد" کے پودے بھی پائے گئے جن کا تناسب ایک اور تین کا تھا۔ "لمبے اور پستہ قد" پودوں کے ساتھ ساتھ ان کی دوسری خصوصیات مثلاً پھولوں کے رنگ۔ پتیوں کی ساخت۔ تنے کا رنگ وغیرہ کو لے کر بھی مینڈل نے تجربات کیے اور ان سب تجربات کے نتائج ایک جیسے ہی نکلے۔

مینڈل کے ان تجربات سے ایک بات بہت واضح طور پر سامنے آگئی تھی کہ جو بھی عناصر ان خصوصیات کے لیے ذمہ دار ہوتے ہیں وہ افزائش نسل کے خلیوں میں "ذرات" Particles کی صورت میں موجود رہتے ہیں اور اسی وجہ سے ان میں آمیزش نہیں ہوتی۔ اگر یہ عناصر ٹھوس ذرات کی صورت میں نہ ہو کر رقیق یا گیس کی صورت میں ہوتے تو ان کے اندر آپس میں آمیزش ہونا لازم ہو جاتا اور وہ خصوصیات جن کے لیے یہ ذرات ذمہ دار ہیں مخلوط قسم کا مرکب نہیں بنا سکتے

اس کے برخلاف یہ اپنے طور پر آزادانہ بروئے کار رہتی ہیں اور نسل در نسل رونما ہوتی رہتی ہیں۔

مینڈل کے مندرجہ بالا تجربات و مشاہدات اس میدان میں ہونے والی تحقیق اور جدید علم توالد و تناسل [Genetics] کے اصولوں کی بنیاد بنے۔ جدید تحقیق سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ افزائش نسل کے خلیوں میں بہت ہی باریک دھاگے کی ساخت کے کروموزوم [Chromosome] موجود ہوتے ہیں جن کے اوپر باریک دانے دار ساخت کے ذرات لگے رہتے ہیں جن کو جین [Gene] کہتے ہیں۔

مینڈل نے جن ذرات نما عنصر کی افزائش نسل کے خلیوں میں موجودگی کے سلسلے میں قیاس آرائی کی تھی اور کسی حد تک ان کی موجودگی اپنے تجربات سے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ بعد کی تحقیق اور جدید آلات جیسے الیکٹرون مائیکرواسکوپ [یا خوردبین] کے بننے کے بعد انسان نے اپنی آنکھ سے افزائش نسل کے خلیوں میں موجود "کروموزوم" اور ان پر لگے "جین" کو نہ صرف دیکھا۔ بلکہ یہ بھی معلوم کر لیا کہ نر مادہ تولید کا اپنی ہم جنس مادہ کے انڈے سے ملنے پر کس طرح ایک نئے فرد کے جنم لینے کی ابتدا ہوتی ہے اور اس میں کروموزوم، و جین کتنا اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ہم آج اس حقیقت سے بھی پوری طرح واقف ہیں کہ اگر کسی جاندار کے انڈے یا نر مادہ تولید کے خلیوں میں موجود کسی "جین" کو جزوی طور پر یا پوری طرح سے اگر تباہ کر دیا جائے تو آئندہ پیدا ہونے والے بچے پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔

آج جو حیرت انگیز ترقی علم توالد النسل [Genetics] کے میدان میں ہوئی ہے، اس کا سہرا مینڈل کے سر ہے جس نے اپنے تجربات کے ذریعے ۱۸۶۶ء میں اس علم کے میدان میں تحقیق کے لیے ایک ٹھوس بنیاد فراہم کر دی تھی۔ اگر یہ تجربات اور ان کے نتائج ڈارون کے علم میں آجاتے تو غالباً اس کو اپنے نظریہ ارتقا کے سلسلے میں اس بات کو واضح کرنے کے لیے کہ جانداروں میں چھوٹی چھوٹی مخصوص قسم کی تبدیلیاں کس طرح سے رونما ہوتی ہیں اور کیسے یہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی ہیں لامارک کی "کثرت استعمال" و "عدم استعمال" کے نظریہ کا سہارا نہ لینا پڑتا۔

آج علم توالد و تناسل کے میدان میں جو کچھ کام ہوا ہے، اس نے نہ صرف مینڈل کے تجربات کی صداقت کو ثابت کیا ہے۔ بلکہ اس نے بڑی حد تک مدد فراہم کی ہے کہ جانداروں میں ارتقائی عمل کس طرح ہوتا ہے اور اسی لیے آج ہم قدرے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جانداروں کے ارتقا کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل چیزیں مجموعی طور پر اثر انداز ہوتی ہیں اور غالباً یہی جدید نظریہ ارتقا کی اہم اکائیاں ہیں۔ جدید نظریہ ارتقاء کی رو سے جانداروں کی نئی انواع کا ظہور میں آنے کی ذمہ دار جانداروں میں واقع ہونے والی وہ چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں [Mutations] ہوتی ہیں جو وقتاً فوقتاً ان میں مختلف وجوہ کی بنا پر پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ ان تبدیلیوں کا جدی یا آبائی ہونا ضروری ہے۔ کیوں کہ اسی حالت میں یہ تبدیلیاں علم توالد و تناسل کے اصولوں کے تحت ایک نسل سے دوسری نسل میں پہنچ سکتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ "انسانی انتخاب" یا "قدرت کا عمل انتخاب" اور کسی جاندار کی آبادی کا علیحدگی [Isolation] میں رہنا کسی جاندار کے اندر ارتقائی تبدیلیوں کو بروئے کار لانے میں بہت اہم رول ادا کرتے ہیں۔ مندرجہ بالا تمام اثرات کی وجہ سے کسی بھی جاندار میں ارتقائی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اور ایک نئی نوع کے جاندار کا وجود میں آنا ممکن ہو جاتا ہے۔ یہ ارتقائی عمل اکثر بہت تیز اور دوسری حالتوں میں سست رفتار بھی ہو سکتا ہے۔

اس مضمون کے لکھنے میں مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا۔

1- Carr Philip (1961) Giants of Science, [illegible] Books, New York.
2- Rhodes F.H.T (1958) Life, time and Darwin University College of Swan Sea.
3- DeBeers G. R.A. (1971) Charles Darwin and the Theory of evolution. The [illegible] Hall and [illegible], Edward Arnold.
4- Weisz Paul B. (1959) The Science of Biology Mc-Graw-Hill Book Co. 2nd Ed.

پروفیسر منظر عباس نقوی

جنگِ آزادی کا ایک جانباز مجاہد

حسرت موہانی

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ سب سے پہلے کس نے لگایا تھا؟ شاید آپ کو یہ معلوم نہ ہو کہ دلوں کو گرما دینے والا یہ نعرہ اردو کے ایک ایسے شاعر کی ایجاد ہے جسے بیسویں صدی میں غزل کا سب سے ممتاز شاعر مانا گیا ہے۔ وہ شاعر تھے مولانا حسرت موہانی جن کی زندگی کا بڑا حصہ اپنے دیش کی آزادی کی خاطر انگریزوں کی قید میں گزر گیا۔ وہ چکی بھی پیستے رہے اور شاعری بھی کرتے رہے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

مولانا حسرت کا پورا نام سید فضل الحسن تھا۔ حسرت اُن کا تخلص ہے، یعنی وہ چھوٹا نام جس کو وہ اپنی تحریروں میں استعمال کرتے تھے۔ اُن کا آبائی وطن ترہسوہ تھا جو ضلع فتح پور میں واقع ہے لیکن وہ اپنے ننہیالی وطن موہان میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے، اس لیے موہانی کہلائے۔

موہان اُتر پردیش کے ضلع اُناؤ میں ایک چھوٹا سا مگر مشہور قصبہ ہے۔ اس کے پاس ہی ایک ندی بہتی ہے۔ جو سئی ندی کہلاتی ہے۔ موہان کا علاقہ بڑا ہرا بھرا ہے۔ یہاں ہر طرف لہلہاتے کھیت اور گھنے باغات دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بستی بہت پرانی ہے۔ اس کے نام "موہان" کے بارے میں کئی کہانیاں مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب رام چندر جی کو بن باس ملا اور وہ اپنے بھائی اور بیوی کے ساتھ اجودھیا سے روانہ ہوئے تو شتروگھن اُن کو رخصت کرنے کے لیے اس بستی تک آئے تھے۔ موہ کے معنی ہیں محبت اور "ہان" کا مطلب ہے چھوڑنا۔ چونکہ شتروگھن کو اس جگہ پہنچ کر اپنے بھائی کی محبت کو ترک کرنا پڑا اس لیے اس بستی کا نام موہان پڑ گیا۔ ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ اس جگہ کو موہن بابا نامی ایک مہاتما نے آباد کیا تھا۔ موہن باغ کے نام سے ایک باغ آج بھی موہان کے قریب موجود ہے۔

موہان میں ایک بزرگ کا مزار بھی بڑی شہرت رکھتا ہے۔ ان بزرگ کا نام ہے حضرت شاہ وجیہ الدینؒ۔ جو دلی کے مشہور صوفی بزرگ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے شاگردوں اور جانشینوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ہر سال ماہ شوال کو اُن کے مزار پر عرس ہوتا ہے۔ حسرت موہانی انھیں بزرگ کی اولاد میں سے تھے۔

حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کا نسب دسویں پشت میں سید محمود نیشاپوری نامی ایک بزرگ سے ملتا ہے جو ایران کی سکونت ترک کر کے ہندوستان آگئے تھے اور موہان کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ اُن کا مزار محلہ حبیب اللہ گڑھی میں ایک کھجور کے درخت کے قریب ابھی تک موجود ہے۔ سید محمود نیشاپوری رضوی سید تھے اور اُن کے باپ دادا کا سلسلہ سترھویں پشت میں آٹھویں امام حضرت موسیٰ علی رضا علیہ السلام تک پہنچتا ہے جن کا مزار ایران کے شہر مشہد میں ہے۔

موہان میں ایک محلہ "مولوی گھونا" کہلاتا ہے۔ اسی محلے کے ایک مکان میں جو بارہ دری کے نام سے مشہور تھا سید فضل الحسن یعنی حسرت موہانی [illegible] میں پیدا ہوئے۔

حسرت کے پردادا کا نام مظہر حسن، دادا کا اظہر الحسن اور والد کا [illegible] تھا۔ سید اظہر حسن کے تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں۔ حسرت کے بھائی [illegible] میں ایک اُن سے بڑے اور ایک اُن سے چھوٹے تھے۔ بڑے بھائی کا نام سید [illegible] الحسن اور چھوٹے کا [illegible]

حسرت [illegible] (ص ۱۲)

پچاوہ دن تک آنکھ نہ کھول سکے۔ سارے چہرے پر آبلے ہی آبلے تھے جن کے نشانات تو فروز رہ گئے لیکن بینائی خدا نے بچالی۔ انھیں اپنے بچپن کے واقعات اس طرح یاد تھے جیسے کل کی باتیں ہوں۔ اور تو اور انھیں اپنی والدہ کا دودھ پینا بھی یاد تھا۔ بچپن میں انھیں قصے کہانیاں سننے کا بڑا شوق تھا جو جوانی تک برقرار رہا۔ چنانچہ چھٹیوں میں جب علی گڑھ سے گھر آتے تو اپنی پھوپی صاحبہ سے کہانیوں کی فرمائش ضرور کرتے۔ کہانیوں میں انھیں وہ کہانیاں بہت پسند تھیں جو پرانے زمانے کی جنگوں سے تعلق رکھتی تھیں۔

لڑکپن میں انھیں کھیل کود سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ تیراکی، شطرنج، پتنگ بازی اور بانسری بجانا اُن کے دل پسند مشغلے تھے۔ شام کو بانسری لے کر بستی سے نکل جاتے اور سئی ندی کے پل پر بیٹھ کر گھنٹوں بانسری بجایا کرتے

ان کی ابتدائی تعلیم پرانے طرز کی مکتب میں ہوئی جہاں دستور کے مطابق قرآن مجید ختم کرنے کے بعد انھوں نے اردو، فارسی اور عربی کی کتابیں میاں جی غلام علی موہانی اور میاں جی بلاقی موہانی سے پڑھیں۔

مکتب کی تعلیم مکمل ہو جانے پر انھیں قصبے کے مڈل اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ یہاں سے مڈل کا امتحان انھوں نے درجہ اول میں پاس کیا اور صوبے بھر میں اوّل آنے کی وجہ سے سرکاری وظیفہ پایا۔

اُن کے والد سید اظہر حسن صاحب خاندانی جائیداد کی دیکھ بھال کے سلسلے زیادہ تر فتح پور میں رہتے تھے۔ اسی لیے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے وہ اپنے والد کے پاس چلے گئے اور فتح پور کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اسی اسکول سے ۱۸۹۹ء میں انھوں نے ہائی اسکول کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا اور سرکاری وظیفہ پایا۔

شعر و شاعری سے دلچسپی انھیں بچپن ہی سے تھی اور اس کا آغاز اگرچہ اسی زمانے میں ہو چکا تھا جب وہ موہان کے مڈل اسکول میں تعلیم پاتے تھے، لیکن فتح پور ہسوہ کا ماحول ادبی ذوق کو پروان چڑھانے کے لیے بڑا سازگار ثابت ہوا۔ یہاں انھیں ایسے بزرگوں کے پاس اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا جو پڑھے لکھے لوگ تھے۔ ان بزرگوں میں اُردو کے مشہور ادیب حضرت نیاز فتح پوری کے والد ماجد خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں جن کی صحبت کے فیض نے ان کے دل میں شاعری اور نثر نگاری کا بڑا شوق پیدا کر دیا۔ اُس زمانے میں نیاز اُن کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔

حسرت کے ہائی اسکول کا نتیجہ نکلا اور اُن کی شاندار کامیابی کی خبر علی گڑھ گزٹ میں چھپی تو ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم نے جو علی گڑھ میں حساب کے استاد تھے اُن کے والد کو مبارکباد کا خط لکھا اور مشورہ دیا کہ اس ذہین نوجوان کو علی گڑھ کالج میں داخل کرائیں۔ چنانچہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج دیے گئے۔

اُس زمانے کے بزرگوں کا بیان ہے کہ حسرت یکے سے اتر کر اس شان سے بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہوئے کہ جسم پر پرانی وضع کا چارخانے کا انگرکھا تھا، سر پر کلابتونی ٹوپی، پاؤں میں گھیتلی جوتی، ڈھیلا پاجامہ جس کے پائنچے ٹخنوں سے اونچے، آنکھوں پر کمانی دار عینک، ایک ہاتھ میں چھتری اور دوسرے ہاتھ میں پاندان تھا۔ علی گڑھ کے اپ ٹو ڈیٹ طالب علموں نے یہ حلیہ کہاں دیکھا ہوگا، چپ نہ رہ سکے اور بیچارے حسرت کو "خالہ جان" کا لقب دے دیا۔ لیکن کچھ ہی دنوں میں جب اِن "خالہ جان" کی خوبیاں سامنے آئیں تو علی گڑھ کے یہی نوجوان اُن کا احترام کرنے پر مجبور ہو گئے اور بوڑھا بچہ ہر ایک انھیں "مولانا" کہنے لگا۔

کالج کے ماحول نے اُن کی وضع قطع میں یہ تبدیلی تو پیدا کر دی کہ وہ انگرکھے کی جگہ شیروانی اور کلابتونی ٹوپی کے بجائے علی گڑھ کی ترکی ٹوپی پہننے لگے، لیکن اُن کے مزاج میں جو ہندوستانیت تھی اُس نے انھیں کوٹ پتلون سے ہمیشہ دور رکھا۔ ایک مشہور بزرگ پروفیسر احمد خاں شروانی جو اس زمانے میں ساتویں درجے کے طالب علم تھے سنہ [illegible] میں حسرت سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"۱۹۰۳ء کا ذکر ہے۔ میری عمر کوئی بارہ برس کی ہو گی مدرسے سے آیا تو معلوم ہوا کہ ملاقات کے کمرے میں ایک صاحب بیٹھے والد صاحب سے کچھ گفتگو کر رہے ہیں۔ اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ ملازم سے دریافت کیا تو پتا چلا کہ سید فضل الحسن حسرت موہانی ہیں۔ میرا دل نہ مانا۔ دروازے پر پہنچا تو عجب اک پیکر دیکھ کر نگاہ حیرت سے معمولی وضع کی اچکن پہنے سر پر بالکل چپٹی قسم کی ترکی ٹوپی، بے حد گھنی سیاہ داڑھی رکھے والد صاحب (حاجی موسیٰ خاں شروانی) کے پاس بیٹھے تھے۔ آگے چل کر احمد خاں لکھتے ہیں کہ: میں حسرت

کو دیکھ کر مرعوب سا ہو گیا اور سوچنے لگا اس شخص میں کیا خوبیاں ہوں گی کہ اس نے طالب علمی ہی کے زمانے میں اتنا نام پیدا کر لیا ہے۔

حسرت کے دل میں لڑکپن ہی سے وطن کی محبت کا جذبہ بہت زیادہ تھا۔ علی گڑھ آ کر اس جذبے نے انگریز حاکموں کے خلاف نفرت اور بغاوت کی صورت اختیار کر لی۔ اس زمانے میں سجاد حیدر یلدرم سے اُن کی بڑی گہری دوستی تھی۔ یلدرم نے اپنے ایک مضمون میں اُس زمانے کا ایک واقعہ لکھا ہے جس سے حسرت کی انگریز دشمنی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ شملے میں علی گڑھ کی کرکٹ ٹیم نے کسی انگریزی کلب کو ہرا دیا تھا۔ یہ خبر علی گڑھ پہنچی تو یہاں کے نوجوان خوشی کے مارے آپے سے باہر ہو گئے۔ انھوں نے تھالیاں، لوٹے، گلاس، کھانے کی سینیاں غرض جو ہاتھ لگا پیٹنا شروع کر دیا اور اس بری طرح پیٹا کہ رات کی تاریکی میں قیامت کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ حسرت کو اگرچہ کھیل کود سے کبھی کوئی واسطہ نہ رہا تھا لیکن انھوں نے جب یہ سنا کہ انگریزی ٹیم کے ہارنے کا جشن منایا جا رہا ہے تو وہ بھی ایک ٹوٹا سا مٹی کے تیل کا کنستر لیے اپنے کمرے سے نکل آئے۔ تیل کو آگ لگا کے چراغاں کیا اور اپنا خالی کنستر بجاتے خوشی منانے والوں کے جلوس میں سب سے آگے آگے چلنے لگے۔ یہ جلوس کالج کے پرنسپل سر تھیوڈور ماریسن کے بنگلے کے سامنے سے گزرا تو وہ بہت ناراض ہوئے اور حسرت کا نام اُس بلیک لسٹ میں شامل کر لیا گیا جو اُن کے داہنی طرف میز کی دراز میں رکھی رہتی تھی۔

حسرت کی جن ادبی دلچسپیوں کا آغاز فتح پور میں ہو چکا تھا اُن کو پروان چڑھنے اور پھلنے پھولنے کا علی گڑھ میں شاندار موقع ملا۔ ابھی وہ بی۔ اے ہی میں تھے کہ اُن کی شاعری کا ہر طرف چرچا ہونے لگا۔ شعر اُسی زمانے کی یادگار ہے:

دیارِ شوق میں ماتم بپا ہے مرگِ حسرت کا
وہ وضعِ پارسا اُس کی وہ عشقِ پاکباز اس کا

حقیقت یہ ہے کہ جیسی پارسائی اُن کی وضع قطع میں تھی ویسی ہی پاکیزگی اُن کی شاعری میں بھی پائی جاتی ہے۔ حسرت اُردو غزل کے شیدائی تھے۔ غزل میں محبت کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ حسرت کی غزل بھی یقیناً محبت ہی کی داستان ہے لیکن اُن کے یہاں محبت کا جذبہ بالکل فطری اور شریفانہ انداز میں ظاہر ہوا ہے۔

حسرت کی طالب علمی کے زمانے میں یہاں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو غزل کا جانی دشمن تھا اور اُس کو قوم کی تمام اخلاقی برائیوں کی جڑ خیال کرتا تھا۔ حسرت اس گروہ سے ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے۔ یہاں اُن کے ہم خیال دوستوں کی بھی کمی نہ تھی۔ اُس دور کے دوستوں میں سید سجاد حیدر یلدرم، عبدالباری خاں وفا اور کرامت اللہ خاں گستاخ رام پوری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان دوستوں نے مل جل کر ایک ادبی انجمن قائم کی تھی جس کا نام ——— "انجمن اُردوئے معلّیٰ" تھا۔ یہ انجمن آج بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں موجود ہے بلکہ ملک بھر میں اپنی ادبی سرگرمیوں کے لیے مشہور ہے۔ ۱۹۰۲ء میں جب حسرت اس انجمن کے سکریٹری بنائے گئے تو انجمن نے ایک شاندار مشاعرے کا اہتمام کیا۔ اس مشاعرے میں مرزا غالب کے شاگرد میر مہدی مجروح بھی تشریف لائے تھے۔ حسرت کے دوست گستاخ رام پوری امیر مینائی کے شاگرد تھے اور اُن کی غزل کبھی کبھی کافی شوخ ہو جاتی تھی۔ مشاعرہ طرحی تھا۔ گستاخ نے جو غزل پڑھی اس کا مطلع تھا:

یہ مرض گستاخ کیسا تجھ کو پیدا ہو گیا
جس کی صورت اچھی دیکھی اُس پہ شیدا ہو گیا

کچھ حضرات جن پر مغربی شاعری کا رنگ چڑھا ہوا تھا اور اُردو غزل پر ناک بھوں چڑھاتے تھے، مشاعرے سے اٹھ کر سیدھے پرنسپل ماریسن کے پاس پہنچے اور کہہ دیا کہ مشاعرے میں تہذیب سے گرے ہوئے اور اخلاق کو بگاڑنے والے اشعار پڑھے گئے ہیں۔ ثبوت کے طور پر اُن لوگوں نے پرنسپل صاحب کو گستاخ کا یہ شعر بھی سنا دیا۔ ان حضرات نے [illegible] سے گستاخ کے شعر کا کیا مطلب بیان کیا کہ سنتے ہی وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اگلے روز کلاس ختم ہونے کے بعد پرنسپل نے حسرت کو دفتر میں طلب کیا۔ وہ پرنسپل کے سامنے پہنچے تو اُس نے غراتے ہوئے پوچھا "کیا اخلاق کے دو معیار بھی ہوتے ہیں؟" سیدھی اور کڑکتی آواز میں حسرت نے جواب دیا "جی ہاں! ہم لوگوں کا معیار آپ سے مخ... مخ (حسرت قدرے ہکلاتے تھے) مختلف ہے۔"

ماریسن جھنجھلا کر بولا "یہ سب بکواس ہے۔"

اِس گفتگو کے بعد مارلین نے کالج کے ٹرسٹیوں کا ایک خاص اجلاس طلب کیا اور اُس میں یہ تجویز رکھی کہ حسرت کو کالج سے نکال دیا جائے۔ لیکن حسرت کی قابلیت کا سکّہ ہر دل پر بیٹھا ہوا تھا اس لیے اس تجویز میں اتنی ترمیم منظور کر لی گئی کہ حسرت کا نام تو کالج سے خارج کر دیا جائے لیکن انھیں بی۔ اے کے امتحان میں بیٹھنے سے نہ روکا جائے۔ چنانچہ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے بی۔ اے کا امتحان ریاضی اور عربی کے اختیاری مضامین کے ساتھ پاس کر لیا۔

بی۔ اے کرنے سے پیشتر ہی اُن کی شادی اپنی ماموں زاد بہن نشاط النسا بیگم سے ہو چکی تھی جو ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور نہ صرف شعر و ادب بلکہ ملکی سیاست کا بھی اچھا شعور رکھتی تھیں۔ بی۔ اے کے امتحان کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی حسرت نے ایک رسالہ جاری کرنے کے لیے ڈیکلریشن داخل کر دیا تھا۔ کچھ ہی دن بعد یہ رسالہ "اُردوئے معلیٰ" کے نام سے جاری ہو گیا۔ حسرت چاہتے تھے کہ بی۔ اے کے بعد ایل۔ ایل۔ بی کریں چنانچہ اُس میں داخلہ بھی لے لیا تھا لیکن مسٹر مارلین نے وظیفہ دینے سے انکار کر دیا مجبوراً حسرت کو ایل۔ ایل۔ بی کا خیال چھوڑنا پڑا۔ اب وہ ملکی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینا چاہتے تھے اور اس کے لیے ضروری تھا کہ یونیورسٹی چھوڑ کر شہر میں رہنا شروع کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے علی گڑھ شہر کے محلہ رسل گنج میں اقامت اختیار کر لی اور بیگم کو بھی موہان سے بلا لیا۔

جولائی ۱۹۰۳ء کو اردوئے معلیٰ کا پہلا شمارہ شایع ہوا۔ یہ ایک ماہوار رسالہ تھا جس کی سالانہ قیمت مع محصول ڈاک صرف ایک روپیہ ہوتی تھی۔ اس رسالے میں ادبی اور سیاسی دونوں قسم کے مضامین شایع کیے جاتے تھے۔

حسرت نے اس رسالے کے پہلے ہی شمارے میں لکھا تھا کہ اس رسالے کا مقصد "اصلاحِ مذاق" ہے۔ اس رسالے کے پہلے ہی شمارے سے پتا چل گیا کہ "اصلاحِ مذاق" سے اُن کا مطلب صرف ادبی مذاق کی اصلاح نہیں تھا بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کے اندر صحیح سیاسی مذاق پیدا کرنا بھی تھا چنانچہ اُردوئے معلیٰ کے ابتدائی شماروں ہی سے ایسے مضامین کا سلسلہ شروع ہو گیا جن کا مقصد ملکی سیاست میں مسلمانوں کے رول کو واضح کرنا اور قومی تحریکوں کی حمایت کرنا تھا۔ اِس موضوع پر حسرت نے خود بھی کئی مضامین لکھے اور اپنے دوستوں سے بھی لکھوائے۔

سر سید نے اپنی تعلیمی تحریک کو ترقی دینے کے لیے کئی سال پہلے مسلمانوں کو ملکی سیاست سے دور رہنے کا جو مشورہ دیا تھا، ہندوستانی مسلمان لیڈر کے فقرے نے اب تک اُسی مشورے پر عمل کر رہے تھے حالانکہ اب حالات بدل چکے تھے چنانچہ ستمبر ۱۹۰۳ء کے اُردوئے معلیٰ میں حسرت نے لکھا:

"کیا زمانے کی اب بھی وہی حالت ہے جو سر سید کے وقت میں تھی؟ کیا سرکارِ انگریزی کو اب بھی کسی متنفس پر بغاوت کا شبہ ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر ننگ و عار کا موجب کون امر ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی فلاح و بہبود کے لیے خود کوشش نہ کریں بلکہ دوسروں کی حمایت پر بھروسہ کریں اور اپنے جائز حقوق کے طلب کرنے سے صرف ایک خیالی خوف کی امید کی وجہ سے باز رہیں۔"

غرض حسرت نے اُردوئے معلیٰ کے ذریعے مسلمانوں کے سوئے ہوئے سیاسی شعور کو بیدار کرنا شروع کر دیا۔ یہ وہ دور تھا جبکہ بال گنگا دھر تلک کو ملک نے اپنا سب سے بڑا سیاسی لیڈر تسلیم کر لیا تھا۔ حسرت بھی باضابطہ طور پر آل انڈیا نیشنل کانگریس سے وابستہ ہو گئے اور دوسرے قومی رہنماؤں کے ساتھ آزادی کی جدوجہد میں کندھے سے کندھا ملا کر کام کرنے لگے۔

مئی ۱۹۰۴ء میں کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔ مولانا حسرت ایک ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ حسرت کی سیاسی زندگی کا آغاز تو اردوئے معلیٰ میں شایع ہونے والے مضامین ہی سے ہو چکا تھا اب وہ عملی طور پر بھی آزادی کی جنگ میں شامل ہو گئے۔

سودیشی تحریک سے دلچسپی بھی اِسی زمانے میں شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں جب آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی تو حسرت نے اُس میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا اور بدیشی مال کے بائیکاٹ اور سودیشی چیزوں کے استعمال کی حمایت میں ایسے زوردار مضامین اُردوئے معلیٰ میں لکھے کہ یہ تحریک ملک بھر میں پھیل گئی۔

(دوسری قسط اگلے شمارے میں ملاحظہ فرمائیے)

پروفیسر قاضی عبدالستار
شعبۂ اُردو، اے۔ایم۔یو۔

(نویں قسط)

خالد بن ولید

عراق سے آئے ہوئے فاتحوں اور یرموک پر پڑے ہوئے مجاہدوں میں زبردست فرق محسوس ہوا ساز و سامان سے قطع نظر فاتحوں کے بدن مسلسل لڑائیوں سے سانچے میں ڈھل گئے تھے۔ شیروں اور چیتوں کے جسموں کی طرح کس گئے تھے۔ چہروں پر فتوحاتِ مسلسل نے وہ چمک پیدا کر دی تھی جس کے سامنے غنیم کی کثرت اور ہتھیاروں کی آب و تاب دھندلی پڑ جاتی ہے۔ یرموک کے سپاہیوں کے چہروں پر تھکن اور اکتاہٹ کی پرچھائیاں دور سے نظر آتی تھیں۔ صحرائی جفاکش زندگی کے کسے ہوئے بدن چربی کے کوٹ پہننے لگے تھے۔ آنکھوں پر انجامِ جنگ کی فکر نے سائے ڈالنے شروع کر دیے تھے۔ گھوڑوں کا وہ چھل بل سونے لگا تھا جو سواروں کی دسترس کے پر لگا دیتا ہے۔ سیف اللہ نے گھوڑے کو چھوڑ دیا۔ اور رومی لشکر کو دیکھا جو ایک دیو قامت زرنگار اور زندہ کمان کی طرح چڑھا ہوا تھا۔ گھوڑا قریب ہوا تو اطلس و ریشم کی سرخ و سبز اور لاجوردی قبائیں الگ الگ نظر آنے لگیں، چاندی کی کلاہیں اور کامدار خودوں میں چمکتی ہوئی کلغیاں اور چمکنے لگیں۔ جھنیوں کی طرح چڑی ہلکی دوہری پیٹیوں میں پھنسی ہوئی تلواروں کے صلیبی قبضے تک دکھائی دینے لگے۔ اکثر سواروں کی طرح ضرورت سے زیادہ چمکتے ہوئے گھوڑے آہنی پاکھروں میں اور بھاری نظر آنے لگے شہزادیوں کی طرح سجے ہوئے زرکار جھنڈے سورج کی روشنی میں تڑپ رہے تھے۔ بوڑھی لانبی سیاہ عباؤں اور سفید داڑھیوں کے درمیان ستارہ نما انجیلوں کے ہیرے جگمگا رہے تھے۔ وہ دشمن کے میسرے کے سامنے اتنے قریب سے گذر رہے تھے کہ معمولی تیر انداز انھیں اپنا نشانہ بنانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ عدی بن حاتم نے ان کی لگام تھام لی اور گھوڑے کو خیمے کی طرف موڑ دیا۔

نمازِ ظہر کے بعد تمام سپہ سالاروں قبائل کے سرداروں اور مشہور جانبازوں کی مجلسِ شوریٰ منعقد ہوئی۔ جب سیف اللہ کا خیمہ بھر گیا تو وہ کھڑے ہوئے

"اے محمدی علم کے پاسبانو!
میں تمہارے لشکر کے جائزے اور رومیوں کے نظارے سے فکرمند ہوں۔ ہرقل کے سائے میں موجیں مارتا یہ سیلاب لشکر میدانِ جنگ کے تجربوں اور فنونِ حرب کی مہارت سے امیر ہے۔ اس کی عسکری طاقت میں دینِ مسیح کے علمداروں نے نعرۂ جہاد کا پیوند لگا کر اور طاقتور بنا دیا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ تم نے اس قلعۂ آہن کو زیر کرنے کا کون سا نقشۂ جنگ مرتب کیا ہے تاکہ میں بھی اس تدبیر میں شریک ہو سکوں۔"

دیر کے سکوت کے بعد امین الامت نے فرمایا —

"اے سیف اللہ ہم نے جب شام پر چڑھائی کی تو ہمارا خیال تھا کہ ہرقل کی لاکھ ڈیڑھ لاکھ فوج تقسیم ہو کر مختلف شہروں کی حفاظت پر ہمارے سامنے آئے گی اور ہمارا کوئی بھی سپہ سالار پچیس تیس ہزار فوج کو آسانی سے زیر کر لے گا۔ لیکن غنیم کی ہر فوج ساٹھ ستر ہزار کی نفری پر مشتمل ہو کر مقابلے پر چڑھ آئی۔"

عمرو بن العاص نے لقمہ دیا۔

"ساٹھ ستر ہزار سپاہی تو صرف لڑنے والے ہیں ہر گھوڑے کے ساتھ ایک آدمی جو مسلح ہے اور ہر پانچ سوار کا علیحدہ جو افسر ہے اس کے پاس خادموں کی ایک فوج ہے جو ہتھیار بند ہے اس لیے نفری کا اندازہ ایک طرح سے درست نہیں ہے۔"

تاہم خالد بن سعید کی شکستِ فاش نے رومیوں کو لڑائی پر دلیر کر دیا اور عام لشکری سہم گیا۔ ہم نے کمک کی مزید درخواست کی تو [illegible]

ہزار مجاہد دو قطعوں میں آئے اور چاروں لشکروں میں تقسیم ہو گئے۔

امین الامت خاموش ہو گئے تو یزید بن ابی سفیان نے کہا۔

"یا ابا سلیمان۔ آپ نقشہ جنگ بنائیے۔ ہم تعمیل حکم کریں گے"

"بیشک ہم تعمیل حکم کریں گے۔

امین الامت کے ساتھ سب نے تکرار کی

دیر کے بعد آواز آئی۔

"مجھے کچھ مہلت دیجیے ۔ ابھی تک میں تمام خبرداروں سے خبریں بھی نہیں سن سکا۔"

اور محفل برخاست کر دی

سارا سارا دن گھوڑے پر چڑھ کر مجبوروں سے خبریں سنتے رہے۔ رومی لشکروں کا جائزہ لیتے رہتے اپنے لشکر کے دانت اور پنجے تیز کرتے رہتے اور ساری ساری رات مصلے پر کھڑے رہتے۔ فتح کی تدبیریں سوچا کرتے۔ دعائیں مانگا کرتے۔

پھر ایک رات نامداران لشکر کو طلب کر لیا۔ جب سب نامور جمع ہو گئے تو ارشاد کیا۔

"میری ناچیز فہم میں ایک ہی تدبیر آتی ہے۔ کہ ہم سارے لشکر اسلام کو ایک ہی کمانڈر کی کمان میں دے دیں۔

"وہ تو ہو چکا ـــ ہم سپہ سالار ہیں۔ آپ صدر سپہ سالار"

عمرو بن العاص نے بے چینی سے لقمہ دیا۔

"نہیں ہو سکا۔ خدا کی قسم نہیں ہو سکا میری آمد سے پہلے امین الامت صدر سپہ سالار تھے لیکن تم تینوں سپہ سالاروں کے لشکر اپنے اپنے سپہ سالاروں کی امامت میں نماز پڑھتے تھے۔ میں بھی اپنے عراقی رسالوں کی امامت کرتا ہوں۔ نہ صرف یہ بلکہ ہر سپہ سالار کی کمان میں جتنی نفری ہے وہ اپنے اپنے قبیلوں کے سرداروں کے ماتحت ہے اور سردار تمہاری ماتحتی میں ہے۔ یعنی تم خود اپنے لشکر کے براہ راست حاکم نہیں ہو اور میں پورے لشکر اسلام کو ایک سپہ سالار کی براہ راست ماتحتی میں دینا چاہتا ہوں۔ پورے لشکر کو متحد کر کے مٹھی بھر کر دینا چاہتا ہوں کہ اس کے علاوہ کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

سب سے پہلے امین الامت نے تائید کی۔

"یا ابا سلیمان۔ تم یہ سمجھ لو کہ تم صدر سپہ سالار ہو اور ہم سپہ سالار نہیں قبیلے کے سردار بھی نہیں صرف ایک بے نام سپاہی ہیں۔ اور تمہارے حکم کے منتظر ہیں۔"

تو پھر میں تمام لشکر کو چالیس دستوں میں تقسیم کرتا ہوں اور ہر دستے پر ایک سپہ سالار تعینات کرتا ہوں۔ اور ہر سپہ سالار سے توقع کرتا ہوں کہ وہ اپنے ہزار سپاہیوں کی کارکردگی کا جوابدہ ہوگا۔ نہ صرف یہ بلکہ ہر روز نقشہ جنگ بدلتا رہے گا تاکہ ہر نامور سپہ سالار کو اپنی صلاحیت کے اظہار کا موقع مل سکے۔

"سبحان اللہ سبحان اللہ۔ تمہارا سخت سے سخت دشمن بھی تمہاری عسکری فراست کے سامنے سر جھکا دینے پر مجبور ہے" امین الامت نے ارشاد کیا

صدیوں کی عربی عصبیت، قبیلا کی رقابت اور خاندانی عصبیت جس پر ظہور اسلام نے خاک ڈال دیا تھا لیکن جو تحت الشعور میں موجود تھی زندہ تھی اور نئے نئے بھیس بدلتی تھی اس تدبیر سے اس کا چراغ بجھ گیا۔ یرموک کی تاریخ ساز جنگ کی فتح کا راز اسی تدبیر میں پوشیدہ تھا۔

تیرہ سو برس بعد اور پہلی جنگ عظیم میں اتحادی فوجوں کے عالی کمانداروں کو اسی تدبیر کا آموختہ پڑھنا پڑا اور اسی تدبیر کے مطابق معاہدۂ شمالی اوقیانوس کی تنظیم کے تحت مغربی یورپ کی فوجوں کو ایک سپریم کمانڈر کے ماتحت دینا پڑا

کاتب طلب ہوا چالیس سپہ سالاروں کے نام لکھے جانے لگے

دس بیس ناموں کے بعد امین الامت نے عبدالرحمان بن خالد کا نام لیا تو سیف اللہ کے علاوہ ہر زبان نے تائید کی لشکر کی قاضی کی خدمت مشہور صحابی حضرت ابوالدرداء کے سپرد ہوئی۔ قاری لشکر حضرت مقداد مقرر ہوئے۔ افسر سامان کے منصب پر حضرت عبداللہ بن مسعود فائز کیے گئے۔ اور قریش کے مشہور سردار ابی سفیان لشکر کے واعظ منتخب ہوئے

تمام سپہ سالاروں کو حکم ہوا کہ اپنے اپنے ہمرکابوں کو اسی وقت باخبر کر دیں اور یہ بھی کہ فجر کی نماز ستاروں کی چھاؤں میں پڑھی جائے گی۔

ابھی رات باقی تھی کہ آنکھ کھل گئی۔ خیمے کے دوسرے درجے میں آہٹ سی محسوس ہوئی پہلے سے تلوار کھینچ کر پردہ ہٹایا تو وہ بیٹا جو ان کے نامی گرامی گھوڑوں کو پسینوں میں نہلا دیا کرتا تھا۔ مصلے پر سوار تھا۔

غلام بکتر پہنائے کھڑے تھے کہ بیٹا سلام کو حاضر ہوا نگاہ اٹھا کر دیکھا خود سے پاپوش تک ہر چیز نئی تھی۔ غلام کو ہٹا کر اس کے قریب پہنچے ماں سپہ سالار ولید کے پوتے ـــ تیرے باپ کے خاص خدمتگار ہیں کہ ولید کے بیٹے نے کبھی کسی جنگ کے لیے گھوڑا طلب نہیں کیا جب تک دشمن

ممکن نہیں کرنی؟"

بیٹے نے بکتر کے کانٹے ہٹا کر قبا کا گریبان کھول دیا۔

بیٹے کو کفن پہنے دیکھ کر سر سے پاؤں تک مسکرا دیے:

آج کے دن کے لیے کون سا گھوڑا پسند کیا

یاقوت رومی۔

بیٹے کے نیام سے تلوار کھینچ کر اس کے جوہر دیکھتے ہوئے بولے

"پوری زندگی میں صرف ایک میدان جنگ نے خالد کو پیچھے ہٹتے دیکھا — ختم المرسلینؐ کے قاصد نے جگا کر حاضری کا حکم سنایا۔ غلاموں نے گھبراہٹ میں جو گھوڑے لگائے ان میں ایک اتھر جانور بھی تھا۔ کچھ نیند کا خمار کچھ رات کی تاریکی آسی پر سوار ہو گیا بڑی شائستگی سے چلتا رہا۔ میں خوش ہوا۔ بارگاہ رسالت پر حاضر ہوا تو رسالت پناہ کوچ فرما رہے تھے۔ ہم رکاب ہو گیا۔ میدان کارزار برپا ہوا۔ عادت کے مطابق غنیم کے قلب پر گھوڑا اٹھا دیا اس طرح اٹھا جیسے عقاب اٹھتا ہے لیکن تلواروں کی ایک ہی یورش میں بے حواس ہو گیا۔ بھاگنے کے لیے منھ زوریاں کرنے لگا۔ لگام توڑ دی۔

"لگام توڑ دی؟"

لگام توڑ دی — اب میں کیا کرتا — میدان سے ہٹنے کی ذلت گوارا کی۔ ختم المرسلین کی رکاب سے ہٹنے کی لعنت برداشت کرنا پڑی جب کچھ بس نہ چلا تو تلوار سے گردن اڑا دی اور آل مخزوم میں سے کسی کا گھوڑا مانگ کر میدان میں جانا پڑا۔"

"یاقوت — نہ صرف یہ کہ شائستہ ہے بلکہ مزاج آشنا ہو چکا ...

آپ اطمینان فرمائیں۔"

فجر کی اذان نے اس تاریخ ساز دن کے طلوع کا اعلان کر دیا جس کی روشنی میں کسی عظیم ہستی کی ایک قربانی اس کی قوم اس کی ملت اور اس کی امت کو آسمانوں کی رفعت عطا کر دیتی ہے۔ اس کی تاریخ کے بازوؤں میں سونے کے پر لگا دیتی ہے۔ اس کے مستقبل کے تمام اندھیرے اپنے گریبان میں دفن کر لیتی ہے لیکن اس کے راستے روشن کر دیتی ہے۔

سیف اللہ خیمے سے نکلے تو محسوس ہوا جیسے چالیس ہزار گردنیں بلند ہو گئیں۔ چالیس ہزار تلواریں فتح نصیب ہو گئیں۔ چالیس ہزار زبانیں تکبیر کہنے لگیں۔ جوش و خروش کا ایک دریا تھا کہ موجزن تھا۔

امین الامت نے پیشوائی کر کے امامت پر کھڑا کر دیا۔

نماز اس طرح پڑھی گئی جیسے آخری بار پڑھی جا رہی ہو۔ خطبہ دینے کھڑے ہوئے تو پتھروں تک کی سماعت مودب ہو گئی۔

"اے حرمِ علم کے پاسبانو!

خانۂ خدا کے نگہبانو —

یہ سچ ہے کہ تم نے رسالتمآب کی رکاب میں بڑے بڑے دشمنوں کو زیر کیا۔ یہ حق ہے کہ تم نے جھوٹے رسولوں کے قہار لشکروں کو روند ڈالا۔ ارتداد کا پورا جہنم بجھا کر پھینک دیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آج تم روئے زمین کی سب سے طاقتور سلطنت کے فاتح شہنشاہ کی آزمودہ کار اور تربیت یافتہ فوجوں کے انبوہ کثیر کے سامنے کھڑے ہو۔ ان کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ تمہارے ایک سپاہی کے مقابلے پر ان کے سات سوار مسلط ہیں۔ ان کے گھوڑے بلند اور سوار تنومند ہیں۔ ساز و سامان کا یہ حال ہے کہ ان کے ایک پیادے کو جو کچھ میسر ہے وہ تمہارے سپہ سالاروں کو بھی نصیب نہیں۔ وہ اپنے ملک کے قلب میں جمے ہوئے ہیں اور تم اپنے گھروں سے سینکڑوں کوس دور اپنے ایمان کا امتحان دینے نکلے ہو۔ معلوم ہے کہ تم اپنے خدا اور اپنے رسول کے حکم اور خلیفۃ المسلمین کے فرمان پر جانوں سے گزر جاؤ گے۔ اپنے خون سے وہ تاریخ لکھو گے جو قیامت تک کے لیے تمہاری امت کو سرخرو کرے گی لیکن قبل اس کے کہ میدان کارزار برپا ہو میں تم سے ایک گزارش کرتا ہوں کہ آج کے دن کے یہ قبائل کی تقسیم مٹا دو خانوادوں کی تفریق ڈھا دو اپنی شجاعت اور شہادت اپنے غرور اور افتخار کے تمام خزانے حرم علم کی حرمت پر لٹا دو۔ آج اگر تم نے رومیوں کو ڈھکیل دیا تو قیامت تک ڈھکیلتے رہو گے اور اگر آج رومیوں کو بڑھنے کا حوصلہ مل گیا تو مدینۃ النبی کی آبرو خطرے میں پڑ جائے گی۔ خدا کی قسم آج کی جنگ شام کی پہلی اور آخری جنگ ہے۔ اسے فتح کر لو کہ فتح المقدمہ ہے۔

خاموش ہوتے ہی چالیس سپہ سالاروں نے جن کی حیثیت کرنلوں کی تھی صفوں سے نکل کر گھوڑے کے سامنے نیم دائرہ بنا لیا۔ امین الامت کو اٹھارہ دستوں کے ساتھ جنرل کا مرتبہ دے کر اپنی سرابی میں قلب پر تعینات کیا عکرمہ بن ابوجہل اور قعقاع بن عمرو کو ان کی نیابت پر مقرر کیا۔ میمنہ کی کمان دس رجمنٹوں کے ساتھ کہ ہر دستہ رجمنٹ کی حیثیت رکھتا تھا عمرو بن العاص کو تفویض ہوئی۔ اور شرحبیل بن حسنہ کو ان کے ماتحت کر دیا۔ یزید بن ابی سفیان کو دس رجمنٹوں کے ساتھ میسرہ پر مامور کیا اور ابو ایوب کو ان کا مددگار مقرر کیا قباث بن اشیم کو دو رجمنٹوں کے ساتھ ساقہ پر حاکم کیا۔ پھر حکم ہوا کہ تمام سوار اور پیادے اتنے فاصلے پر کھڑے ہوں کہ نیزوں کی لڑائی میں ایک دوسرے کی قربت مانع نہ ہو۔ اس ترتیب سے خود مسلمانوں کی نگاہوں میں اپنا لشکر وقیع ہو گیا۔ اور غنیم کی نظروں میں چڑھنے لگا۔ گھوڑے کو چھیڑ کر ایک ایک رجمنٹ ایک ایک صف ایک ایک قطار کا معائنہ کیا۔ صفوں کی ترتیب میں رد و بدل کیا قطاروں کے مقامات تبدیل کیے اور گھوڑا اڑا کر لشکر کی پشت پر آ گئے۔ جہاں عرب کی مشہور خاتون ہندہ زوجہ ابی سفیان، اسماء بنت حضرت ابوبکر، خولہ ہمشیرہ ضرار، ام ابان زوجہ عکرمہ، عزنہ بنت عاصم اور عطا اور عاکہ کے ساتھ مردانہ لباس پہنے ہتھیار باندھے لشکر کے فاضل اونٹوں پر سوار جانیں دے ڈالنے کو تیار کھڑی تھیں۔ سیف اللہ کے شانے پر لگے نیزے میں لہراتے سیاہ پھریرے کو دیکھ کر اللہ اکبر کے نعروں سے استقبال کیا سیف اللہ نے مسکرا کر ان کی تنظیم کو مرتب کیا اور افسر سامان عبداللہ بن مسعود کو جو مٹھی بھر بہادر پیادوں کے ساتھ خیموں کے سامنے کھڑے تھے ہندہ کے رسالے کی سرداری پر نامزد کیا۔ اور قباث بن اشیم کو حکم دیا۔ کہ اپنی رجمنٹ کے ساتھ سو گز کے فاصلے پر قائم ہو جائیں اور دوسرے حکم کا انتظار کریں اور خود پورے لشکر کا چکر کاٹ کر محمدی علم کے سامنے آن کھڑے ہو گئے۔

خالد کے نام کی ہیبت سے بیقرار ہو کر شہنشاہ انطاکیہ سے نکل پڑا تھا اور یرموک سے ایک منزل کے فاصلے پر سفری امپیریل کیمپ ڈال دیا تھا۔ اور یرموک تک ہر ایک گھنٹے کی ڈاک مقرر کر دی تھی اور میدان جنگ کی چھوٹی سی چھوٹی تفصیل پر دست خاص سے احکامات لکھتا رہا تھا۔ فرمان دے چکا تھا کہ جنرل باہان شہنشاہ تھیوڈورس سے کمان لے کر میدان جنگ اپنے ہاتھ میں رکھ لے۔ اب شاہی فوج باہان کی کمان میں اس طرح آراستہ ہوئی کہ قلب

پر کھڑی چاندی کی گرانڈیل صلیب اور قیصر روم کے پرچم اعظم کے حلقے میں ہزار آہن پوش تیر انداز پیروں میں زنجیریں پہنے ایک دوسرے میں جکڑے کھڑے تھے ان کے آگے چالیس ہزار فولاد پوش فوج سوار تھی جس کا ایک ایک سوار منتخب تھا جن کے گھوڑے سموں تک لوہے کی پاکھروں میں غرق تھے جن کی تلواروں کے صلیبی قبضے چاندی کے تھے اور خود کی کلغیاں سنہری تھیں اور جوشنوں سے جھانکتی آستینیں سرخ ریشم کی تھیں۔

ان کے آگے خود باہان تھا جو اپنے ذاتی سنہرے جھنڈے کے نیچے کھڑا تھا اور اس کے دونوں بازوؤں پر مغرب کے وہ جانباز ہجوم کیے ہوئے تھے جو اپنی قتل سے زمین کو خالی سمجھتے تھے۔ میمنے کے ستر ہزار سواروں اور پیادوں پر جنرل قناطیر اس پرچم کے نیچے قائم تھا جسے ہرقل نے بدست خاص عطا کیا تھا سرجیس اور دراقص ستر ہزار فوج لیے میسرہ سنبھالے ہوئے تھے۔ اور اپنے اپنے ذاتی پرچموں کے نیچے گھوڑے تھامے کھڑے تھے۔ تمام فوج دس دس ہزار کے ڈویژن میں منقسم تھی ہر قطار کے سامنے اسقف اور راہب ہاتھوں پر انجیل کھولے مہد مسیح کے تحفظ پر للکار رہے تھے۔ اور انعامات عقبیٰ کی بشارت دے رہے تھے۔ کہ آسمان پر چھوٹی چھوٹی بدلیوں کا ہجوم ہونے لگا۔ اور ہوا لہریں لینے لگی۔ اور انجیل مقدس کے اوراق بند ہونے لگے قلب پر کھڑے ہوئے القدس کے اسقف نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور اس آواز میں خطاب کیا جو اس کا حصہ تھی۔

"مہد مسیح کے محافظو، مسیح کے حکم پر آسمان نے دھوپ کے عذاب سے بچانے کے لیے تمہارے سروں پر غبار کا شامیانہ قائم کر دیا۔ بڑھو اور نص انجیل کی تصدیق میں دشمنوں سے میدان چھین لو"

۲۰ اگست ۶۳۶ء کا وہ دن گرم موسم کا انتہائی گرم دن تھا لیکن ہوا چلی تک اپنے دامن سے تمازت کا غبار جھاڑنے لگا۔ کسی حد تک خوشگوار ہونے لگا۔ اسقف کے حکم پر باہان گھوڑا موڑ کر صلیب کے سامنے کھڑا ہوا سینے پر صلیب بنائی دولت روم الکبریٰ کے پرچم اقبال کو دیکھا سونے کی ڈانڈ میں سرخ ریشمی پھریرے کے ایک طرف زرتار صلیب تھی اور دوسری طرف سنہرا عقاب اڑ رہا تھا۔ اس کو بوسہ دیا۔ اور نیام سے تلوار کھینچ کر علم کے اوپر بایاں دستانہ پوش ہاتھ کاندھے تک اٹھا کر جم گیا۔ پرچم بردار نے پرچم کو تین بار مثبت جنبش دی اور وہ بینڈ بجنے لگا۔ گرجنے لگا کہ جسے ہرقل نے

شہنشاہ ایران نے القدس فتح کر لینے کی تقریب مبارک پر خود اپنی نگرانی میں ترتیب دیا تھا۔

رومی قلب کے ہراول کو حرکت کرتے دیکھ کر سیف اللہ گھوڑے سے پھاند پڑے تین سو تیرہ اصحاب رسول اللہ کے ساتھ سجدۂ الٰہی ادا کیا۔ گھوڑے پر چڑھ کر وہ نیزہ کھینچ لیا جس کے سیاہ پھریرے پر سردارانِ فوج کی آنکھیں لگی رہتی تھیں۔ اور اپنے بائیں پہلو پر زمین میں گاڑ دیا۔ اور دونوں بازوؤں سے اصحاب بدر قرآن پاک کی تلاوت کرتے نکلے اور ان کے پیچھے اصحاب رسول اللہ کی صفیں جنبش کرنے لگیں۔ اچانک سیف اللہ نے نیزہ کھینچ لیا اور عراقی رسالوں کے ساتھ اصحاب رسول اللہ کی صفوں کا چکر کاٹ کر سامنے آ گئے اور آہستہ آہستہ بڑھنے لگے کہ قعقاع بن عمرو کا گھوڑا کاوے کاٹتا مقابل میں آ گیا۔ یا امیر عساکر اسلام —— آرزو تھی کہ مدائن پر تیری رکاب سے نکلتے اور محمدی علم پر قربان ہو جاتے۔ لیکن تقدیر نے یاوری نہ کی۔ جو کفن مدائن کے لیے بنایا تھا وہ یرموک میں پہن لیا۔"

اور اپنی زرہ کی کڑیاں کھول دیں۔

سیف اللہ نے اپنے ہاتھ سے کاٹ برابر کیے اور گرجے

"بہت بے ادب ہو۔ قعقاع بن عمرو —— ہمارے ہاتھ سے ہماری نعمت چھینے لیتے ہو"

اور گھوڑا موڑ کر اپنی صفوں کو دیکھا۔

"خدا کی قسم آج کی لڑائی میں سبقتِ شہادت ایک نعمت ہے اور اس پر خالد کا نام لکھا ہوا ہے!"

اب رومی قلب کا مقدمہ جرنل جرجیس کی کمان میں اتنے قریب آ گیا تھا کہ اونچے اور بھاری گھوڑوں کی پیشانیوں پر سجے ہوئے پیتل کے کنگورے پھول چمکنے لگے تھے اور ان پر بیٹھے ہوئے تندرست و توانا سواروں کے جوشنوں اور آہنی دستانوں کے درمیان جھانکتی ہوئی قبا کی آستینوں کا رنگ نظر آنے لگا تھا۔ اصحاب بدر کی صف سے ایک ہاتھ نکلا اور سیف اللہ کی لگام پر جم گیا۔

"تم سپہ سالار ہو —— تمہارا مقام ہمارا قلب ہے"

اور اصحاب رسول کی تمام صفیں ان کے گھوڑے کے سامنے قائم ہو گئیں قبل اس کے کہ رومی ہراول کی تلواریں اور عربی نیزے باہم دست و گریبان ہوں۔ رومی رسالوں کی دوسری صف سے آواز آئی۔

"سپہ سالار خالد —— میں سپہ سالار خالد سے ملنا چاہتا ہوں"

اور ایک بلند و بالا سوار خود پر چاندی کی صلیب لگائے خود کے آہنی چھجے کے نیچے فکر مند آنکھوں سے اصحاب بدر کی صفوں میں کچھ ڈھونڈتا ہوا سامنے آ گیا۔

"تو کیا چاہتا ہے؟"

صف سے کسی نے سوال کیا!

"سپہ سالار خالد سے ملنا چاہتا ہوں"

اور اس کے پیچھے تمام رسالے جم کر کھڑے ہو گئے۔ چشم زدن میں سپہ سالار سامنے آ گیا۔

جرجیس نے غور سے دیکھا سیاہ عمامے سے جھانکتے ہوئے خود کے نیچے گھنے سیاہ ابرو، عقاب کی آنکھیں، کھڑی ناک، سنجیدہ و متفکر لب، گھنی سیاہ داڑھی، سیاہ زرہ بکتر سے جھانکتی ہوئی سفید سوتی قبا کی آستینیں سفید ازار کے پائنچے سرخ چرمی موزوں میں بند بلا مہمیز کے سرخ جوتوں کے پنجے رکابوں میں پیوست، داہنے ہاتھ میں ننگی تلوار، بائیں شانے پر وہ مشہور نیزہ جس کے سیاہ پھریرے پر ایک دنیا کی فتح لکھی ہوئی۔ جرجیس نے جنبش کی یہاں تک کہ دونوں گھوڑوں کی گردنیں ایک دوسرے کے قریب آ گئیں۔

سپہ سالار خالد میں جرجیس ہوں، رومی قلب کا دوسرا کماندار تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ سچ سچ بتانا کہ شریف آدمی جھوٹ نہیں بولتے۔

اس نے شام میں بولی جانے والی اکھڑی ہوئی عربی میں سوال کیا۔

"مسلمان کبھی جھوٹ نہیں بولتا جسے تم شریف نہیں کہتے۔ پوچھو۔ کیا پوچھنا چاہتے ہو۔"

"اور تم مجھے دھوکا بھی نہیں دو گے کہ سپاہی دھوکا نہیں دیتا"

"مسلمان دو کاندار تک دھوکا نہیں دیتے۔ تم بے خوف ہو کر سوال کرو"

"کیا تمہارے نبی کی دعا پر آسمان سے کوئی تلوار اتری ہے جو تمہارے نبی نے تم کو عطا کر دی اور اس کی برکت سے تم ہمیشہ فاتح رہتے ہو؟"

حضرت مسکرا دیئے

"یہ افسانہ ہے۔ جھوٹ ہے"

"پھر تم کو سیف اللہ کیوں کہا جاتا ہے؟" (جاری ہے)

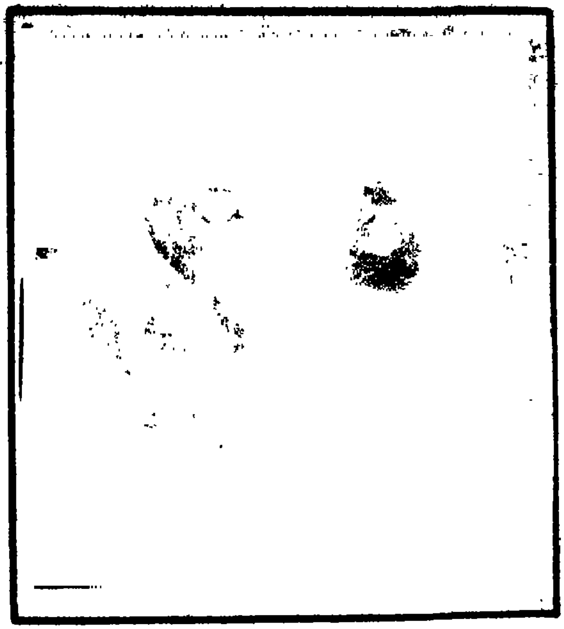
راحت ابرار

مسلم یونیورسٹی کے شب و روز

پروفیسر عبدالسلام کی آمد

۱۴ر جنوری ۸۶ء کو نوبیل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام کو تہذیب الاخلاق ٹرسٹ کی جانب سے استقبالیہ دیا گیا۔ ایک بچی جوہی حسین اور جناب قمرالہدیٰ فریدی نے معزز مہمان کی گل پوشی کی۔ ڈاکٹر نورالحسن نقوی نے موصوف کا خیر مقدم کرتے ہوئے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ پدم شری قاضی عبدالستار نے بھی معزز مہمان کو خوش آمدید کہتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔
ڈاکٹر عالم حسین نقوی نے پروفیسر عبدالسلام کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ اقوامِ عالم اس بات کو باعثِ فخر سمجھتی ہیں کہ عبدالسلام کو اعزازات سے نوازا جائے۔ دنیا کی مشہور یونیورسٹیوں سے ان کو ڈی ایس سی کی اعزازی ڈگریاں ۲۵ بار مل چکی ہیں اور دنیا کے ممتاز ترین اٹھارہ انعامات بھی وہ حاصل کر چکے ہیں اور عالمِ سائنس کی ۲۴ اکادمیوں سے ان کا تعلق ہے۔ اس کے علاوہ اقوامِ متحدہ کے نو مخصوص اعزازی عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ دورِ حاضر کی فزکس کے اہم ترین موضوع "بنیادی ذرات" پر ۲۵۰ سے زائد مقالے پیش کر چکے ہیں۔ قابلِ ذکر بات تو یہ ہے کہ ان کے نظریات کی تصدیق اور اس پر کام کرنے والے بھی نوبیل انعام کے حقدار قرار پائے۔
ڈاکٹر نورالحسن نقوی کی درخواست پر تہذیب الاخلاق کے نائب صدر محترم عبدالمجید صاحب نے پروفیسر عبدالسلام کو تہذیب الاخلاق کا "عبدالسلام نمبر" پیش کیا۔

اس استقبالیہ تقریب کو خطاب کرتے ہوئے پروفیسر عبدالسلام نے کہا کہ آج کے دور میں سائنسی علوم سے واقفیت اور ان کی تحصیل بہت ہی ضروری ہے۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فزکس کی سرگرمیوں کی تعریف کی۔ اور تہذیب الاخلاق ٹرسٹ کو ایک ہزار ڈالر عطیہ دینے کا اپنی طرف سے اعلان کرتے ہوئے اس رسالے کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔
مسلم یونیورسٹی کے چانسلر اور بہار کے سابق گورنر جناب اخلاق الرحمن قدوائی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ پروفیسر عبدالسلام سرسید کی طرح ہی مسلمانوں میں سائنسی مزاج پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ تیسری دنیا کے مسلمان سائنس کے میدان میں آگے آئیں۔
قائم مقام وائس چانسلر پروفیسر وصی الرحمن نے معزز مہمان کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ علم کے فروغ کے جس کام کو عبدالسلام عالمی پیمانے پر کر رہے ہیں اسی کو چھوٹے پیمانے پر تہذیب الاخلاق بھی انجام دے رہا ہے جس کے دوبارہ اجراء کا سہرا سابق وائس چانسلر جناب سید حامد کے سر ہے۔
آخر میں ٹرسٹ کے ٹریژرار پروفیسر منظر عباس نقوی نے اس رسالے کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ دوسرے دن کینیڈی ہال میں "ملک میں سائنسی تعلیم (ہندوستانی مسلمانوں کے حوالے سے)" کے موضوع پر تین روزہ کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے تیسری دنیا کی سائنس اکادمی کے صدر نوبیل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام نے مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں سے اپیل کی کہ وہ دینی اداروں میں پرائمری اور ثانوی درجات تک سائنس کی تعلیم کو اپنے نصاب میں شامل کریں تاکہ ہندوستان اور دیگر ترقی پذیر ممالک میں مسلمان سائنسی علوم سے آراستہ ہو سکیں۔
انھوں نے کہا کہ میں یہاں سرسید احمد خاں کے پیغام کو دہرانے کے لیے حاضر ہوا ہوں جنھوں نے سو برس قبل سائنس کے فروغ کے لیے سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی تھی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مجھ کو دنیا بھر کی یونیورسٹیوں سے ۲۵ سے زائد ڈی ایس سی کی اعزازی ڈگری سے نوازا گیا ہے مگر میں جتنا اس یونیورسٹی کی ڈگری پر فخر کرتا ہوں اتنا کسی اور پر نہیں۔
مسلم یونیورسٹی کے قائم مقام وائس چانسلر پروفیسر وصی الرحمن نے معزز مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ یہ ادارہ اپنی پوری توانائی اور قوتِ عمل کے ساتھ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے میدا



شعبۂ طبیعیات میں پروفیسر عبدالسلام

کا خیر مقدم کرتے ہوئے

پروفیسر محمد شفیع صدر شعبۂ طبیعیات

۱۴ر جنوری ۸۶ء



بایوٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح کرتے ہوئے

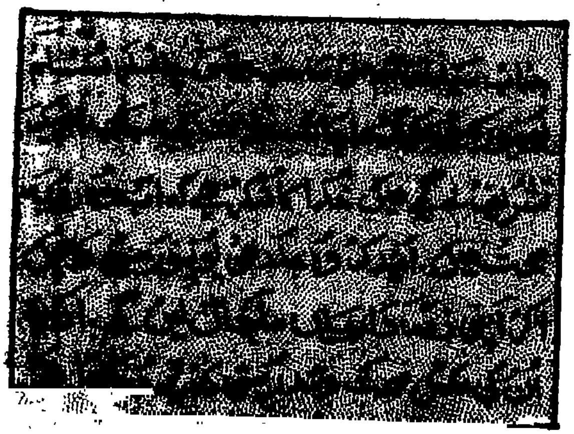
بائیں سے دائیں: پروفیسر عبدالسلام، پروفیسر صلاح الدین صدر شعبۂ ٹیکنالوجی، محترم الحاج عبدالرحمٰن خاں شروانی

پرو چانسلر یونیورسٹی۔ اور جناب راحت ابرار



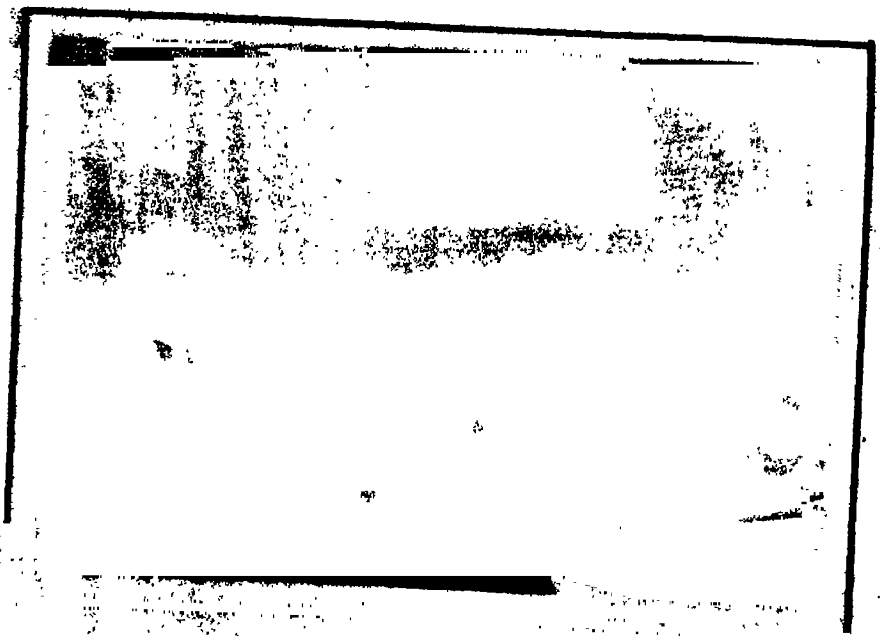
یا گیا ہے۔ انھوں نے سائنس اکادمی تیسری دنیا کی علی گڑھ شاخ کا ذکر
ہوئے کہا کہ اس سینٹر کا بنیادی مقصد ہندوستانی مسلمانوں پر سائنسی معلومات
یل وٹکنالوجی کی اہمیت واضح کرنا اور مسلمانوں کے زیر انتظام تعلیمی اداروں
ِ دینی مدرسوں میں اعلیٰ معیار کی سائنسی تعلیم کے نظریہ کو فروغ دینا ہے
یسر عتیق احمد صدیقی صدر شعبہ اردو نے تہذیب الاخلاق ٹرسٹ کی جانب
ہر برس سائنس کے موضوع پر اردو میں لکھے جانے والے بہترین مضمون
ِ ہزار روپے کے ایوارڈ کا اعلان کیا

پروفیسر عبدالسلام نے جواہر لال نہرو میڈیکل کالج کے تحت بائیوٹیکنالوجی
ٹیوٹ کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے کہا کہ بائیوٹیکنالوجی اکیسویں
ی کی سب سے عظیم سائنس ہے۔

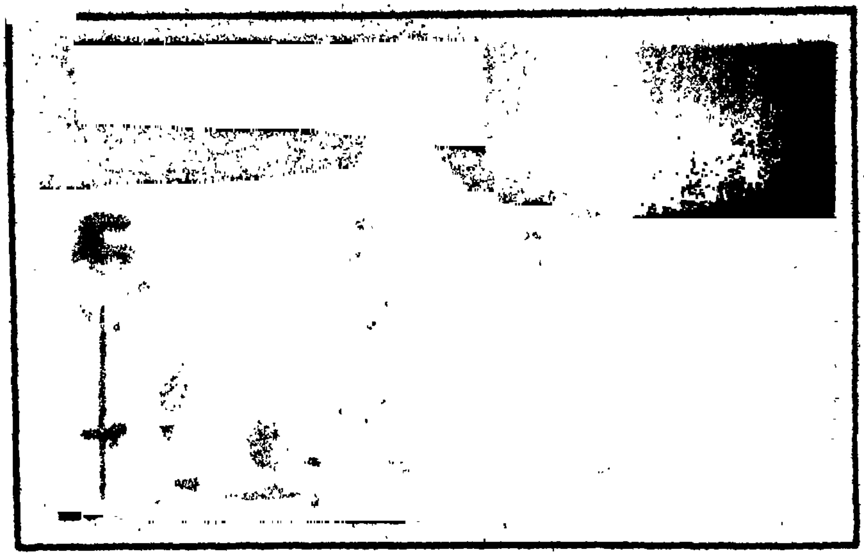


بائیوٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر صلاح الدین نے کہا کہ
ادارہ برصغیر میں اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے۔ تین کروڑ روپیہ کی لاگت
اس انسٹی ٹیوٹ کا قیام دو سال میں مکمل ہو جائے گا۔

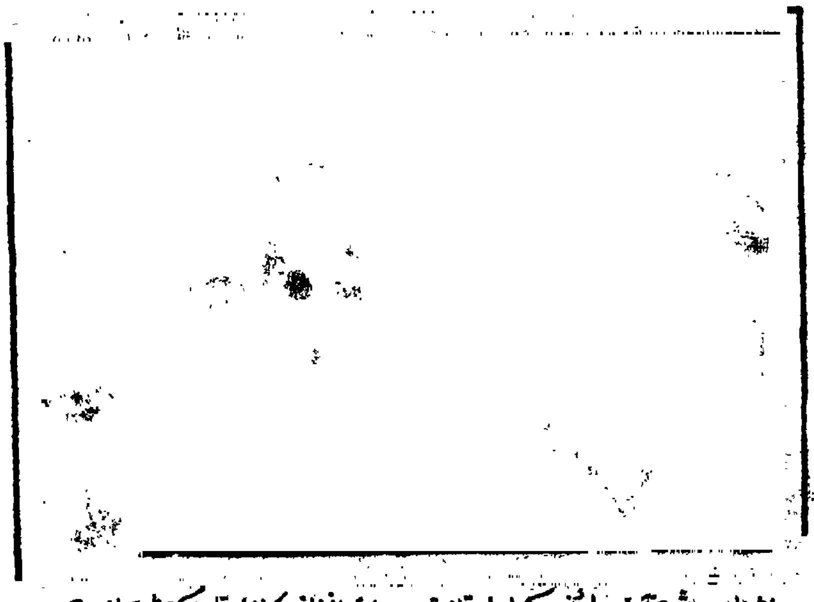
چانسلر محترم اخلاق الرحمٰن قدوائی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ
ئنس اور ٹکنالوجی میں ہندوستان نے بہت ترقی کی ہے۔ انھوں نے کہا
ملک کی پانچ ممتاز ترین یونیورسٹیوں میں مسلم یونیورسٹی کا بھی شمار کیا جاتا
ہے۔



ڈاکٹر عالم حسین
استقبالیہ تقریر کرتے ہوئے



محترم جناب حکیم عبدالحمید پروفیسر عبدالسلام کو تہذیب الاخلاق کا خصوصی شمارہ پیش کرتے ہوئے



سینٹر فار پروموشن آف سائنس کے زیر اہتمام تین روزہ کانفرنس کا افتتاح کینیڈی ہال میں

دائیں سے بائیں۔ پروفیسر آئی اے احمد (ڈائرکٹر سی۔پی۔ایس) محترم جناب حکیم عبدالحمید، پروفیسر رئیس الرحمٰن (وائس چانسلر) پروفیسر عبدالسلام (صدر سائنس اکادمی تیسری دنیا) پروفیسر آر۔ آر۔ قدوائی (چانسلر) الحاج عبدالرحمٰن خان شیروانی (پرو چانسلر) پروفیسر محمد شفیع الرحمٰن میاں ڈاکٹر زماں مجیب (جوائنٹ ڈائرکٹر سی۔پی۔ایس)

اِنعامات

دنیا کے مایہ ناز سائنس داں اور تیسری دنیا کی سائنس اکیڈمی کے بانی صدر پروفیسر عبدالسّلام کی تشریف آوری کے موقع پر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ نے ایک ہزار روپے سالانہ کے ایک انعام کا اعلان کیا جو عبدالسّلام ایوارڈ کے نام سے موسوم ہوگا۔

عبدالسّلام ایوارڈ

ہر سال اردو میں سائنس کے کسی موضوع پر لکھے گئے مضمون پر دیا جایا کرے گا۔ اس مقصد کے لیے کل ہند پیمانے پر تحریری مقابلہ ہوا کرے گا۔ جو مضامین موصول ہونگے انھیں ماہرین سائنس کی خدمت میں بھیجا جائے گا۔ جو مضمون سب سے بہتر قرار دیا جائے گا وہ عبدالسّلام ایوارڈ کا مستحق ہوگا۔ یہ تجویز بھی ٹرسٹ کے زیرِ غور ہے کہ عبدالسّلام ایوارڈ ایک ہزار روپے کے ایک سالانہ انعام کے بجائے ایک ایک ہزار کے دو انعامات پر مشتمل ہو۔ پہلا فزکس کے لیے اور دوسرا سائنس کی دوسری شاخوں (کیمسٹری۔ بیالوجی) کے لیے۔

ہمدرد ایوارڈ

پروفیسر عبدالسلام کو مسلم یونیورسٹی میں خوش آمدید کہنے کے لیے جناب حکیم عبدالحمید صاحب بھی دہلی سے تشریف لائے تھے۔ انہوں نے اعلان فرمایا کہ ہمدرد فاؤنڈیشن کی طرف سے میڈیکل سائنس پر اردو میں لکھے گئے بہترین مضمون پر ہر سال ایک ہزار روپے کا ایوارڈ دیا جائے گا۔ اس کے لیے بھی تہذیب الاخلاق کے زیرِ اہتمام ہر سال ایک تحریری مقابلہ ہوا کرے گا اور ماہرین جس مضمون کا انتخاب کریں گے اس پر ہمدرد ایوارڈ دیا جائے گا۔

سائنس ایوارڈ

پروفیسر عبدالسّلام نے اعلان فرمایا کہ مسلم یونیورسٹی کا جو طالب علم ایم۔ ایس۔ سی کے امتحانات میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرے گا اسے انعام دیا جائے گا۔ پروفیسر سلام نے اس کے لیے ایک ہزار ڈالر مرحمت کرنے کا وعدہ فرمایا۔

ماہانہ انعامات

سینٹرل فار پروموشن آف سائنس کے اجلاس میں یہ تجویز بہ اتفاق رائے منظور ہوئی کہ تہذیب الاخلاق اس سائنسی مرکز کی ترجمانی کا حق ادا کرے یعنی آیندہ تہذیب الاخلاق میں سائنس پر زیادہ مضامین شایع ہوا کریں۔ اس میں شک نہیں آج کے بدلے ہوئے زمانے میں سائنس پر بطور خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار (ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ) نے فرمایا کہ ہر مہینے کے بہترین مضمون (سائنس) پر سو روپے کا انعام دیا جایا کرے۔ پہلے انعام کی رقم انھوں نے خود پیش فرمائی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر پیر محمد رحمانی (رحمانی کاسمکس ریسرچ کلینک، مالی گاؤں، مہاراشٹرا) ڈاکٹر عبدالکفیل حنیفی (الحفیظ کالج، آرہ، بہار) پروفیسر فخرالدین احمد (جموں) نے بھی اسی مقصد کے لیے سو سو روپے عنایت فرمائے۔

ہم ان تمام حضرات کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں۔

—— قمر الہدیٰ فریدی

بشیر احمد دابلا
شعبۂ عمرانیات ایس ایم یو

عمرانیات کا قومی سیمنار

آزادی کے بعد ہندوستان میں مختلف نوع کی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن میں سماجی نوعیت کی تبدیلیاں خاص اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ ان کی وجہ سے ایک نیا ہندوستانی سماج تعمیر ہو رہا ہے۔ ان سماجی تبدیلیوں نے جہاں ہندوستانی سماج کو نئی بنیادیں دیں، وہاں اس میں بہت سارے مسائل بھی پیدا کیے۔ پچھلی کئی دہائیوں میں ان مسائل کا زور اتنا بڑھ گیا کہ عام انسانی زندگی سے لے کر ملک کی ترقی بھی ان سے متاثر ہونے لگی۔ اس وسیع پس منظر میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اہم سماجی مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے پر زور دے رہا ہے۔ اس سلسلے میں کمیشن نے ۱۹۸۵ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عمرانیات کی صدر مسز شاہ بانو احمد کو ایک قومی سیمنار منعقد کرنے کے لیے کہا۔

یہ قومی سیمنار بہ عنوان "RELEVANCE OF SOCIOLOGY IN THE INDIAN SCENE" شعبۂ عمرانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں منعقد ہوا جس میں قومی و بین الاقوامی شہرت کے مالک ماہرینِ عمرانیات نے شرکت کی۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، حیدر آباد یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی، ایم ایس یونیورسٹی، اور لندن اسکول آف اکونامکس کے ماہرینِ عمرانیات نے اپنے مقالے پیش کیے۔ مندوبین حضرات میں قابلِ ذکر نام پروفیسر آندرے بیتے، پروفیسر امتیاز احمد، پروفیسر مقبول احمد، پروفیسر ریاض پنجابی، پروفیسر نرمل سنگھ، پروفیسر کے ایل شرما، ڈاکٹر مونیکا کاریکر، ڈاکٹر موہنی انجم، ڈاکٹر رتنا نائیڈو، ڈاکٹر رینا دوا، ڈاکٹر جے ایم شاہ اور ڈاکٹر چندر شیکھر ہیں۔ سیمنار بحیثیت مجموعی بہت کامیاب رہا۔ ہر روز صبح ۹½ بجے سے لیکر رات ۸ بجے تک سیشن چلتے رہے۔ شعبۂ عمرانیات کے اساتذہ، ریسرچ اسکالروں اور طلبہ کے علاوہ اس یونیورسٹی کے دوسرے اساتذہ اور طلبا نے بھی اس سیمنار میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

پروفیسر آندرے بیتے اس سیمنار کے خصوصی مہمان تھے۔ انہوں نے سیمنار کا KEY-NOTE ایڈریس دیا جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ علم عمرانیات (SOCIOLOGY) کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے کے لیے مقامی طور پر اور نچلی سطح پر بہت سارے سماجی موضوعات پر وسیع پیمانے پر تحقیقی کام ہونا چاہیے۔

اس قومی سیمنار میں چار خاص موضوعات پر توجہ مرکوز کی گئی۔ یہ موضوعات حسب درج ذیل ہیں۔

الف۔ فرقہ واریت — a. COMMUNALISM

ب۔ قومی یکجہتی — b. NATIONAL INTEGRATION

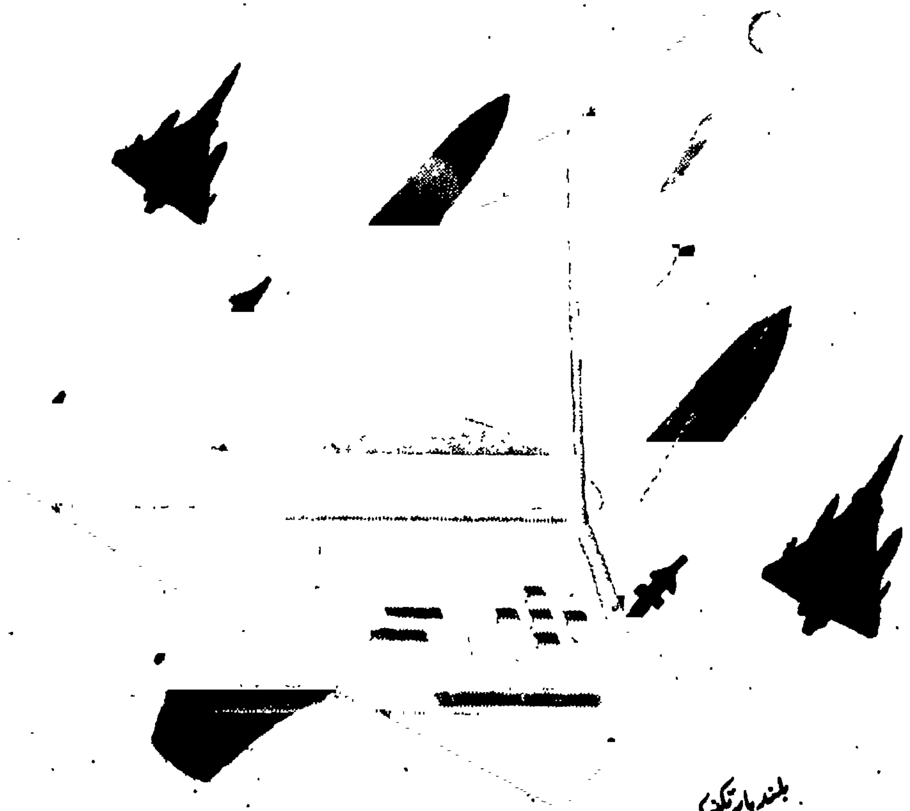
ج۔ مطالعۂ نسواں — c. WOMEN STUDIES

د۔ ہریجنوں کے مسائل — d. PROBLEMS OF HARRIJANS

فرقہ واریت پر ۵ مقالے پیش کیے گئے۔ ان کا نچوڑ یہ تھا کہ ہندوستانی سماج اور اس کا کلچر بنیادی طور پر سیکولر ہے اور فرقہ واریت حال کی تبدیلیوں کی وجہ سے ابھر آئی ہے۔ فرقہ واریت اور سیکولر کی تشریح و تفہیم پر مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا۔ یہ نکتہ بار بار ابھارا گیا کہ ہندوستانی اسٹیٹ اور سماج دونوں سیکولرزم کے بارے میں اندرونی و بیرونی تضاد کے شکار ہیں۔ مطالعۂ نسواں کے سلسلے میں ۹ مقالے پیش ہوئے۔ مطالعۂ نسواں کے تاریخی پس منظر کو جانچنے کے لیے علاوہ ان مقالات میں عورتوں کے موجودہ مسائل کو تفصیل سے پرکھا گیا اور ان کے حل کی جانب اشارات کیے گئے۔ قومی یکجہتی کا موضوع بہت دلچسپ رہا اور اس پر ۹ مقالات پیش ہوئے جن میں یہ نکتے اٹھائے گئے تھے کہ قومی یکجہتی کے لیے یہ ضروری ہے کہ مختلف علاقوں اور مختلف فرقوں کے اختلافات کو برداشت کیا جائے۔ یہ اختلاف ہی ہندوستان کی تمدنی دولت ہے۔ کشمیر اور باقی ملک کی باہمی یکجہتی پر خصوصی مقالات پیش کیے گئے۔ ہریجنوں کے مسائل سے متعلق جو مقالے پڑھے گئے ان کا تعلق ہریجنوں کے تعلیمی مسائل اور ان کے ساتھ تفریق سے تھا۔

کانفرنس کے دوران ۵ اہم تقاریر کا بھی اہتمام کیا گیا۔ ایک تقریر پروفیسر عرفان حبیب نے "چین میں سوشلزم کے مسائل" کے موضوع پر کی۔ دوسری تقریر پروفیسر ریاض پنجابی نے "کشمیر کے سماجی اور سیاسی حالات کا ایک تجزیہ" کے عنوان سے کی۔

21 ویں صدی کی جانب



بلند پایہ تکنیکی جانکاری، کمپیوٹری کنٹرول،
فضائی سفر، بحری تہوں کی چھان بین،
جنوبی منطقہ بارِدہ کی کھوج۔
عظیم کیریر ہر موڑ پر ہمارا منتظر ہے۔
ہمیں ابھی سے، اس کے لئے تیار ہونا چاہئے۔
مبادا ہم اس ابھرتے انقلاب سے چوک جائیں
سائنس اور صنعت کی مدد سے
ہم غریبی کے مسائل پر قابو پائیں گے

اور مل کر آگے بڑھیں گے

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۲۴/ ۸۵-۸۶

درج ذیل اسامیوں کے لیے مجوزہ فارم پر درخواستیں طلب کی جاتی ہیں۔

۱۔ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (ریاضی)۔ (ایک اسامی) (مستقل)۔ ایس۔ ٹی۔ ہائی اسکول۔
تنخواہ کا اسکیل۔ ۵۵۰/- ۲۵- ۷۵۰- ای بی ۳۰- ۹۰۰ روپے مع بھتہ
تعلیمی لیاقت۔ ا۔ لازمی (۱) ریاضی میں ماسٹر کی ڈگری۔
(۲) سیکنڈری اسکول کے درجات کو کم سے کم تین سال پڑھانے کا تجربہ۔
(۳) انگریزی، اردو اور ہندی میں پڑھانے کی صلاحیت
II ترجیحی لیاقت۔ تدریس یا تعلیم میں ڈگری یا ڈپلومہ۔

۲۔ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (فزکس) (ایک اسامی) (عارضی)۔ گرلس ہائی اسکول
تنخواہ کا اسکیل۔ ۵۵۰/- ۲۵- ۷۵۰- ای بی ۳۰- ۹۰۰ روپے مع بھتہ
تعلیمی لیاقت (۱) مضمون میں ماسٹر کی ڈگری یا مضمون میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما، دہلی یونیورسٹی سے تفویض کیا گیا ہو۔
(۲) ہائی اسکول، ہائر سیکنڈری انٹرمیڈیٹ اور منظور شدہ اسکول کالجوں کے کلاسوں میں انگریزی، اردو اور ہندی کے ذریعے پڑھانے کی صلاحیت۔

۳۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر (ریاضی) (ایک اسامی) (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید ہے)۔ سٹی ہائی اسکول
تنخواہ کا اسکیل۔ ۳۳۰- ۲۰- ۵۰۰- ای بی ۲۵- ۷۰۰- ای-بی ۲۵- ۷۵۰ روپے مع بھتہ
تعلیمی لیاقت I۔ لازمی (۱) بی۔ ایس سی کی ڈگری جس میں ریاضی خاص مضمون کی حیثیت سے ہونا چاہیے۔
(۲) ایجوکیشن میں ڈگری یا ڈپلوما
(۳) انگریزی، اردو اور ہندی کے ذریعے پڑھانے کی صلاحیت
II۔ ترجیحی قابلیت۔ کسی بھی سکنڈری اسکول میں پڑھانے کا تجربہ

۴۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر (جنرل) (ایک اسامی) (مستقل)۔ سٹی ہائی اسکول
تنخواہ کا اسکیل۔ ۳۳۰- ۱۰- ۵۰۰- ای بی ۲۵- ۷۰۰- ای بی ۲۵- ۷۵۰ روپے مع بھتہ
تعلیمی لیاقت اول لازمی۔ بی اے سطح تک ہندی، اکنامکس، جغرافیہ اور پولیٹیکل سائنس مضامین میں سے کسی دو میں ڈگری۔

(ii) ایجوکیشن میں ڈگری یا ڈپلوما

(iii) انگریزی، اردو اور ہندی کے ذریعے پڑھانے کی صلاحیت۔

(ii) ترجیحی قابلیت :- کسی سکنڈری اسکول میں پڑھانے کا تجربہ۔

۵- ڈپٹی ڈائرکٹر (آرکیالوجی) (ایک اسامی) (مستقل) - شعبۂ تاریخ۔

تنخواہ کا اسکیل:- ۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰/- معہ بھتہ

تعلیمی لیاقت

۱۔ اچھا تعلیمی ریکارڈ آرکیالوجی/قدیم ہندوستانی تاریخ کلچر اور آرکیالوجی/تاریخ آرکیالوجی میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما کے ساتھ

۲- آرکیالوجی کے کھدائی کے اور تحقیقی میدان میں تقریباً آٹھ سال کا تجربہ۔ مطبوعہ کام یا پی ایچ۔ ڈی/پی ایچ۔ ڈی کے مساوی مطبوعہ کام آرکیالوجی کے شعبے میں۔

۶- ریسرچ اسسٹنٹ (دو اسامی) (عارضی) (انٹر ڈسپلنری اسٹڈیز، فیکلٹی آف سوشل سائنسز)

تنخواہ کا اسکیل- ۶۵۰-۳۰-۷۴۰-۳۵-۸۸۰- ای-بی ۴۰-۹۶۰ روپے معہ بھتہ۔

تعلیمی لیاقت۔

(۱) لازمی- شماریات (اسٹیٹسٹکس) میں اوّل یا اعلیٰ دوم کلاس کی ماسٹر ڈگری

(۲) ترجیحی (۱) کمپیوٹر سائنس میں ڈپلوما یا کمپیوٹر پروگرامنگ کی معلومات

(۲) سروے کے تحقیقی پروجیکٹوں میں تجربہ۔

۷ سینیئر کیوریٹر (ایک اسامی) (مستقل) (شعبۂ تاریخ)

تنخواہ کا اسکیل- ۵۵۰-۲۵-۷۵۰- ای بی ۳۰-۹۰۰ روپے معہ بھتہ

تعلیمی لیاقت-

(۱) لازمی: ایم۔اے (تاریخ) (اعلیٰ سکنڈ ڈویژن)۔

(۲) ترجیحی:- آرکیالوجی میں ڈپلوما یا کیوریٹر کی حیثیت سے تجربہ

لازمی (۱) بی۔اے (آنرز) (اول پوزیشن تاریخ کے ساتھ) اور دس سال کام کرنے کا تجربہ۔

ترجیحی (۲)۔ سول انجینئرنگ میں ڈپلوما یا آرگنائزنگ آرکیالوجیکل ایکسپلوریشن میں اس کے برابر تجربہ۔

سنسکرت اور فارسی معلومات رکھنے والے امیدوار کو ترجیح دی جائے گی۔

۸- سینیئر ٹکنکل اسسٹنٹ (دو اسامیاں) (مستقل) (نماٹولوجی پراجیکٹ کے تحت۔ شعبۂ زولوجی)

تنخواہ کا اسکیل:- ۵۵۰-۲۵-۷۵۰- ای بی ۳۰-۹۰۰ روپے معہ بھتہ

تعلیمی لیاقت-

۱- لازمی

(۱) ایگریکلچرل نماٹولوجی میں خصوصیت کے ساتھ اول یا دوم کلاس ایم۔ایس سی (زولوجی)

(۲) ترجیحی- نماٹوڈ کنٹرول/بایولوجیکل کنٹرول میں ریسرچ ورک کا کچھ تجربہ۔

نوٹ:۔ جو امیدوار مطبوعہ تحقیقی کام رکھتے ہوں، ان کو زائد ابتدائی تنخواہ دی جائے گی۔

۹ سینئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (ایک اسامی) (مستقل) ۔ شعبہ ریڈیالوجی

تنخواہ کا اسکیل۔ ۵۵۰۔ ۲۵۔ ۷۵۰۔ ای۔بی۔ ۳۰۔ ۹۰۰ روپے معہ بھتہ

تعلیمی لیاقت:۔ بی۔ایس سی (سائنس گروپ) ڈپلوما ان میڈیکل لیب ٹکنالوجی یا بی۔ایس سی (ریڈیالوجی) ریڈیو تھراپی شعبہ میں دو سال کا تجربہ

نوٹ۔ اہل امیدواروں کا انٹرویو سے پہلے پریکٹیکل امتحان ہوگا۔

۱۰۔ فیلڈ مین (ایک اسامی) (عارضی) شعبۂ زولوجی

تنخواہ کا اسکیل۔ ۴۲۵۔ ۱۵۔ ۵۰۰۔ ای بی ۱۵۔ ۵۶۰۔ ۲۰۔ ۷۰۰ روپے معہ بھتہ۔

تعلیمی لیاقت

(۱) لازمی۔ ہائی اسکول یا شعبۂ بایولوجی میں کم سے کم ۵ سال کا کام کرنے کا تجربہ۔

(۲) ترجیحی۔ جانوروں کو جمع کرنے کا کچھ تجربہ۔

۱۱ جونیئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (ایک اسامی) (عارضی) ۔ شعبۂ فزکس۔

تنخواہ کا اسکیل۔ ۴۲۵۔ ۱۵۔ ۵۰۰۔ ای۔بی ۱۵۔ ۵۶۰۔ ۲۰۔ ۷۰۰ روپے معہ بھتہ

تعلیمی لیاقت (۱) لازمی:۔ فزکس کے ساتھ بی۔ایس سی

(۲) ترجیحی۔ اسپیکٹرو فوٹومیٹرس/اسپیکٹروسکوپ آلات چلانے کا تجربہ

۱۲۔ ٹیکنیکل اسسٹنٹ (پروگرام) (ایک اسامی) (عارضی) (ڈی۔ایس۔اے پروگرام کے تحت) شعبۂ فزکس۔

تنخواہ کا اسکیل۔ ۴۲۵۔ ۱۵۔ ۵۰۰۔ ای بی۔ ۱۵۔ ۵۶۰۔ ۲۰۔ ۷۰۰ روپے معہ بھتہ۔

تعلیمی لیاقت۔

(۱) فزکس اور ریاضی کے ساتھ بی۔ایس سی۔

(۲) فورٹران پروگرامنگ میں مہارت

۱۳ ٹیکنیکل اسسٹنٹ (ایک اسامی) (مستقل) شعبۂ سول انجینئرنگ۔

تنخواہ کا اسکیل۔ ۴۲۵۔ ۱۵۔ ۵۰۰۔ ای بی۔ ۱۵۔ ۵۶۰۔ ۲۰۔ ۷۰۰ روپے معہ بھتہ

تعلیمی لیاقت۔

انجینئرنگ کی مناسب برانچ میں پوسٹ میٹرک ڈپلوما مع دو سال مناسب تجربے کے ساتھ۔

یا

مناسب ٹریڈ میں ٹریڈ سرٹیفکیٹ اور سات سال کا مناسب تجربہ

نوٹ۔ امیدواروں کو انٹرویو سے قبل پریکٹیکل ٹیسٹ بھی دینا ہوگا۔

۱۴ جونیئر الیکٹریشین مکینک (ایک اسامی) (مستقل) ۔ شعبۂ سول انجینئرنگ۔

تنخواہ کا اسکیل۔ ۴۲۵۔ ۱۵۔ ۵۶۰۔ ای بی ۲۰۔ ۶۴۰ روپے معہ بھتہ

تعلیمی لیاقت۔

ٹریڈ میں آئی۔ٹی۔آئی کا سرٹیفکیٹ

ویلڈر اور پلمبر کی حیثیت سے ۵ سال کا تجربہ

نوٹ۔ انٹرویو سے قبل امیدواروں کو پریکٹیکل امتحان بھی دینا ہوگا۔

جونیئر انسٹرومینٹس میکینک (مولڈنگ) (ایک اسامی) (مستقل) (ورکشاپ) شعبہ میکینکل انجینئرنگ۔

تنخواہ کا اسکیل۔ ۴۲۵ – ۱۵ – ۵۶۰ – ای۔بی – ۲۰ – ۶۴۰ روپے موسجتہ

تعلیمی لیاقت۔

متعلقہ شعبہ میں ۵ سال کے کم از کم تجربے کے ساتھ مزید سرٹیفکیٹ۔

مولڈنگ میں دس سال کا تجربہ

نوٹ۔ انٹرویو سے قبل امتحان بھی دینا ہوگا۔

جونیئر انسٹرومینٹس میکینک (الیکٹریشن) ایک اسامی۔ (مستقل) شعبۂ الیکٹریکل انجینئرنگ۔

تنخواہ کا اسکیل۔ ۴۲۵ – ۱۵ – ۵۶۰ – ای۔بی۔۲۰ – ۶۴۰ روپے۔ موسجتہ

تعلیمی لیاقت۔

کسی یونیورسٹی کی الیکٹریکل انجینئرنگ لیبارٹری میں استعمال ہونے والے آلات کی دیکھ بھال اور اُن کی مرمت کے کام کے دو سال کے تجربے کے ساتھ الیکٹریکل انجینئرنگ میں ڈپلوما۔

یا

الیکٹریکل مشینوں کے وائنڈر کی حیثیت سے آٹھ سال کے تجربے کے بعد عام طور پر آٹھ سال اسکول کا تجربہ۔

یا

الیکٹریکل مشینوں کے وائنڈر کی حیثیت سے ۵ سال کا تجربہ یا ٹریڈ سرٹیفکیٹ۔

نوٹ۔ امیدواروں کو انٹرویو سے قبل پریکٹیکل امتحان دینا ہوگا۔

ڈرافٹ مین (ایک اسامی) (مستقل)۔ شعبۂ کیمیکل انجینئرنگ۔

تنخواہ کا اسکیل۔ ۳۸۰ – ۱۲ – ۵۰۰ – ای۔بی – ۱۵ – ۵۹۰ – ۶۰۰ روپے موسجتہ

تعلیمی لیاقت۔

I لازمی : ۱۔ ڈرائنگ، ٹریسنگ اور متعلقہ آلات کو چلانے کے تین سال کے تجربے کے ساتھ ڈرافٹس مین شپ میں سرٹیفکیٹ

یا

ڈرائنگ، ٹریسنگ اور متعلقہ آلات کو چلانے کے اچھے تجربے اور معلومات کے ساتھ میکینکل انجینئرنگ میں ڈپلوما۔

II ترجیحی : ڈرائنگ پراسس آلات میں تجربہ اور کیمیکل انجینئرنگ شعبہ میں کام کرنے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔

نوٹ۔ خاص صورت میں تعلیمی لیاقت میں نرمی کر کے طویل اور خصوصی تجربہ رکھنے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔

- میکینک (جنریٹر) ایک اسامی (مستقل)۔ شعبۂ الیکٹریسٹی (سپلائی)

تنخواہ کا اسکیل۔ ۳۰۰۔ ۳۳۰۔ ۱۰۔ ۳۸۰۔ ای-بی۔ ۱۲۔ ۵۰۰۔ ای بی ۱۵۔ ۵۶۰ روپے مع بھتہ
تعلیمی لیاقت I موٹر مکینک ٹریڈ میں آئی-ٹی-آئی سرٹیفکیٹ
II ڈیزل / پٹرول انجن کی مرمت اور دیکھ بھال کا تین سال کا تربیتی تجربہ۔

یا

ڈیزل/پٹرول انجن کی مرمت اور دیکھ بھال میں تعلیم یافتہ شخص کا ۵ سال کا تجربہ

نوٹ۔ امیدوار کو انٹرویو سے قبل پریکٹیکل امتحان دینا ہوگا۔

۱۹۔ فارمیسٹ (تین اسامیاں) (ایک مستقل دو عارضی) یونیورسٹی ہیلتھ سروس
تنخواہ کا اسکیل۔ ۳۰۰۔ ۳۳۰۔ ۱۰۔ ۳۸۰۔ ای بی۔ ۱۲۔ ۵۰۰۔ ای-بی ۱۵۔ ۵۶۰ روپے مع بھتہ
تعلیمی لیاقت۔ لازمی (i) ہائی اسکول یا اس کے مساوی
(ii) کسی بھی منظور شدہ ادارے سے فارمیسی میں ڈپلوما
(iii) ریاست کی کسی بھی فارمیسی کونسل سے فارمیسٹ کی حیثیت سے منظور شدہ
II ترجیحی۔ (i) منظور شدہ اسپتال یا ڈسپنسری میں فارمیسٹ کی حیثیت سے کام کرنے کا تین سال کا تجربہ
(ii) کسی خاص معاملے میں تعلیمی لیاقت میں نرمی کی جا سکتی ہے۔

۲۰۔ جونیئر لیبارٹری اسسٹنٹ (پلانٹ مونٹر اور ہربیریم مونٹر) (دو اسامیاں) (مستقل) شعبہ باٹنی
تنخواہ کا اسکیل۔ ۲۶۰۔ ۸۔ ۳۰۰۔ ای بی ۸۔ ۳۴۰۔ ۱۰۔ ۳۸۰۔ ای بی۔ ۱۰۔ ۴۳۰ روپے مع بھتہ
تعلیمی لیاقت۔ سائنس مضمون کے ساتھ میٹرک یا اس کے مساوی

۲۱ جونیئر لیبارٹری اسسٹنٹ (ایک اسامی) (مستقل) (آٹو رہنولارینجالوجی (ای این ٹی) جے۔ این۔ میڈیکل کالج
تنخواہ کا اسکیل۔ ۲۶۰۔ ۸۔ ۳۰۰۔ ای بی۔ ۸۔ ۳۴۰۔ ۱۰۔ ۳۸۰۔ ای بی ۱۰۔ ۴۳۰ روپے مع بھتہ
تعلیمی لیاقت۔ لازمی
(i) میٹرک سائنس کے ساتھ یا اس کے مساوی
II ترجیحی (ii) آٹولارینگولوجی ٹکنیک میں تجربہ

۲۲۔ تھیٹر اسسٹنٹ (دو اسامیاں) (ایک مستقل ایک عارضی) جے این میڈیکل کالج اسپتال
تنخواہ کا اسکیل۔ ۲۶۰۔ ۶۔ ۲۹۰۔ ای بی۔ ۶۔ ۳۲۶۔ ای بی۔ ۸۔ ۳۹۰۔ ۱۰۔ ۴۰۰ روپے مع بھتہ
تعلیمی لیاقت۔
(i) میٹرک یا مساوی
(ii) ٹیچنگ اسپتال میں نگرانی کے کام میں آپریشن تھیٹر کے کام کا تجربہ۔

۲۳۔ پلمبر (ایک اسامی) (مستقل)۔ ایم ایم ہال۔
تنخواہ کا اسکیل۔ ۲۶۰۔ ۶۔ ۲۹۰۔ ای بی۔ ۶۔ ۳۲۶۔ ای بی۔ ۸۔ ۳۹۰۔ ۱۰۔ ۴۰۰ روپے مع بھتہ
تعلیمی لیاقت۔ لازمی (i) پلمبر ٹریڈ میں سرٹیفکیٹ آئی ٹی آئی سے / منظور شدہ تکنیکی ادارے سے تجربہ [illegible]

(۱۱) ترجیح - فریج میں کام کرنے کی اعلیٰ صلاحیت

عمر :- ۲۵ سال سے کم نہیں۔

نوٹ - انٹرویو سے قبل پریکٹیکل امتحان ہوگا۔

۳۴ - نسخہ بند ؛ ایک اسامی ؛ مستقل ؛ - اے کے طبیہ کالج اسپتال

تنخواہ کا اسکیل - ۲۲۶ - ۶ - ۳۲۶ - ای بی - ۸ - ۳۵۸ روپے مع بھتہ

تعلیمی لیاقت - ہائی اسکول یا اس کے مساوی کسی منظور شدہ یونیورسٹی سے

ٹیکنیکل :- یونانی ادویات میں ڈپلوما - یا کسی ریاستی بورڈ / یونیورسٹی سے منظور شدہ سہایک حکیم

تجربہ :- نسخہ بندی میں تین سال کا تجربہ رکھنے والے کو ترجیح دی جائے گی۔

۳۵ - بلو پرنٹر - ؛ ایک اسامی ؛ مستقل ؛ - شعبہ سول انجینئرنگ -

تنخواہ کا اسکیل - ۲۲۵ - ۵ - ۲۶۰ - ۶ - ۲۹۰ - ای بی - ۶ - ۳۰۸ روپے مع بھتہ

تعلیمی لیاقت - تعلیم یافتہ - ایک سال کا تجربہ میکنگ کی حیثیت سے۔

غیر معمولی لیاقت اور تجربہ رکھنے والے امیدواروں کو زیادہ سے زیادہ ابتدائی تنخواہ دی جاسکتی ہے
انٹرویو کے لیے بلائے جانے والے امیدواروں کو ایک طرف کا ریلوے کا سکنڈ کلاس کا کرایہ دیا جائے گا۔
مجوزہ درخواست فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
کے رجسٹرار کے دفتر سے اسامی نمبر ۱، ۲، ۳، ۴، ۵ اور ۶ کے لیے ۵/- روپے اور باقی اسامیوں
کے لیے ۳/- روپے ادا کر کے جو کیش سیکشن فائنانس آفس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یا انڈین پوسٹل آرڈر
کے ذریعے جو فنانس آفیسر اے۔ایم۔یو علی گڑھ کے نام قابل ادا ہو یا ۲۳x۱۰ کا موٹے کاغذ کے پتہ لکھا لفافہ بھیج
کر حاصل کیا جاسکتا ہے۔

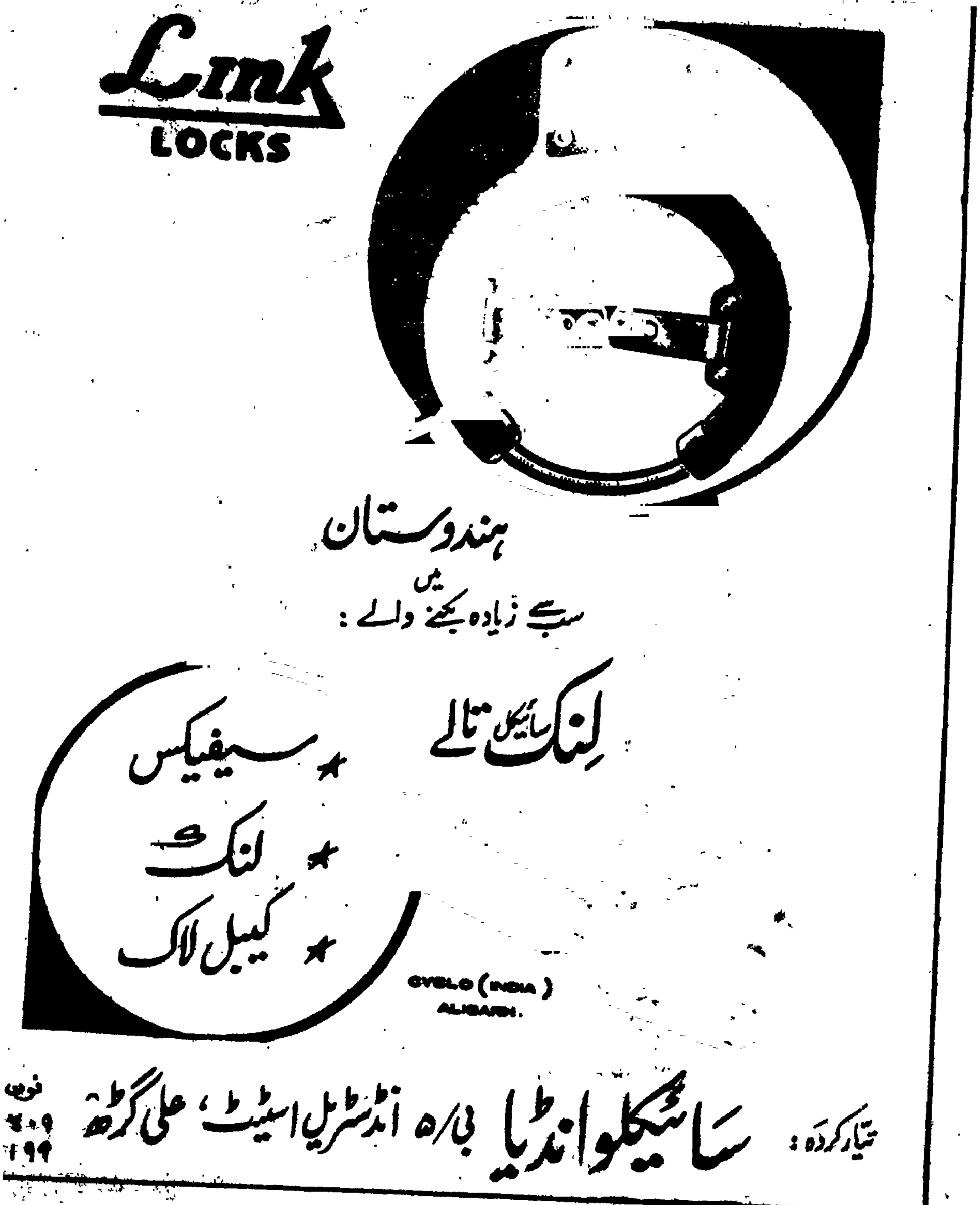
درخواستیں وصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۲ فروری ۱۹۸۶ ہے (صرف دفتر
کے اوقات کے دوران ؛ -

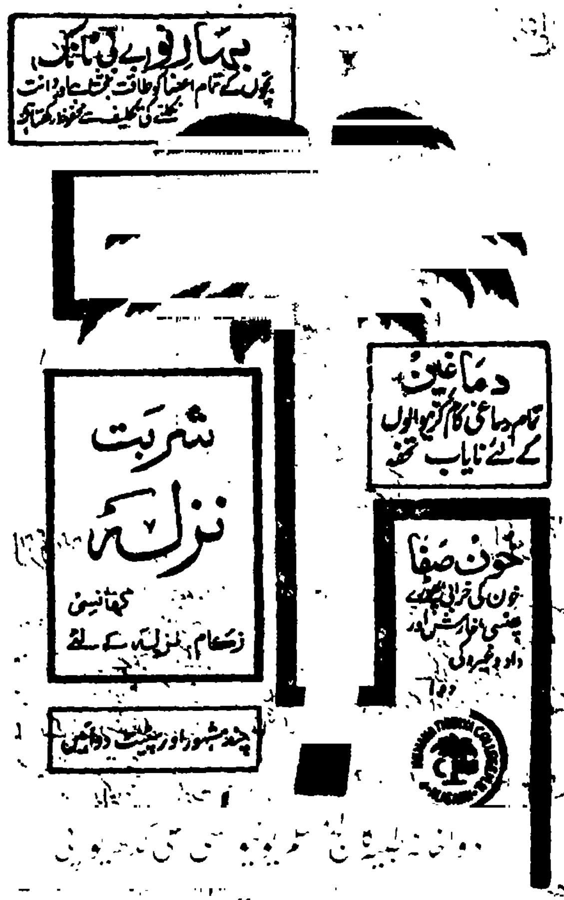
نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا

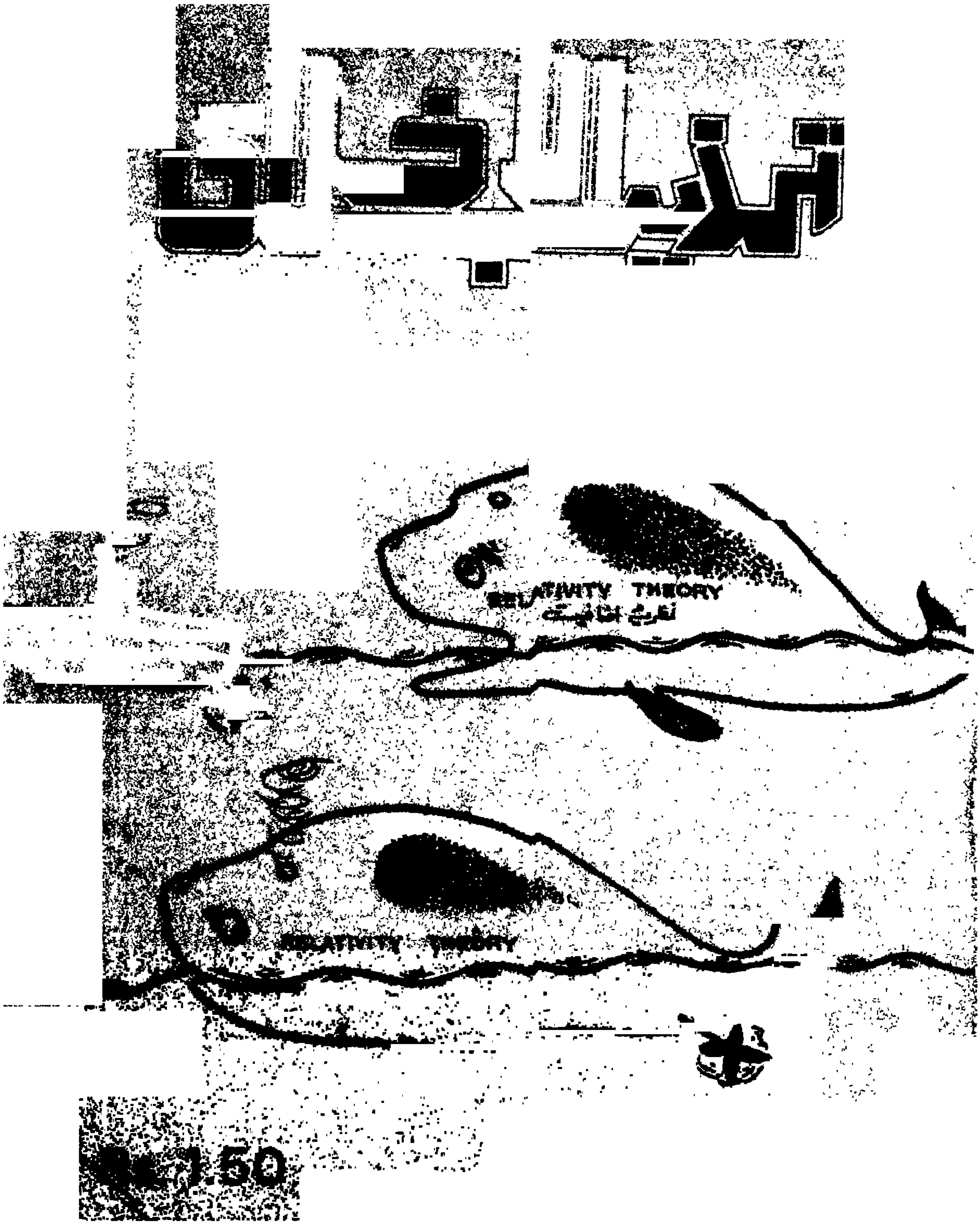
سید شاہد علی

رجسٹرار

801/2348


Link
LOCKS
ہندوستان
میں
سب سے زیادہ بکنے والے :
لنک سائیکل تالے
★ سیفیکس
★ لنک
★ کیبل لاک
CYCLO (INDIA)
ALIGARH.
تیار کردہ : سائیکلو انڈیا بی/۵ انڈسٹریل اسٹیٹ، علی گڑھ
فون


بہار نو بے بی ٹانک
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا اور دانت نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
شربت نزلہ
کھانسی
زکام اور نزلہ کے لئے
چند مشہور اور بہترین دوائیں
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں کے لئے نایاب تحفہ
خون صفا
خون کی خرابی سے پھوڑے پھنسی خارش اور داد وغیرہ کی


RELATIVITY THEORY
RELATIVITY THEORY
7.50

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۵ ✳ ۱۵ر تا ۲۸ر فروری ۸۶ء ✳ شمارہ ۴

بانی : سرسید احمد خاں

سرپرست : سید ہاشم علی

وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مدیر : سید حامد

مدیر مسؤل : نور الحسن نقوی

مدیر معاون : قمر الہدیٰ فریدی

✳

مجلس ادارت :

پروفیسر نسیم انصاری

پروفیسر اسرار احمد

ڈاکٹر عالم حسین

✳

تزئین : سرفراز

✳

ترسیل زر کا پتہ : پروفیسر منظر عباس نقوی

ٹریزرار تہذیب الاخلاق ٹرسٹ،

شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

قیمت فی شمارہ : ڈیڑھ روپیہ

زر سالانہ : تیس روپے

تاحیات : تین سو روپے

مندرجات

۱ : چچا چھکن دنیا کے عجائب ہیں .... ڈاکٹر عالم حسین

۲ ———

۲ : ایک ننھی کائنات .... جارج گیمو

ترجمہ ڈاکٹر انیس عالم ... ۳

۳ : خالد بن ولید (دسویں قسط) ...... قاضی عبدالستار

۸ ———

۴ : جنگ آزادی کا ایک جانباز مجاہد ..... پروفیسر منظر عباس نقوی

۱۳ ———

۵ : کہانی الیکٹرانکس کی .... حسن شاہد رضوی

۱۶ ———

۶ : وعدے کے پھول .... اسٹیفن لاکنر

ترجمہ مناظر عاشق ہرگانوی ۱۹

۷ : اصلاح معاشرہ .... ابن سینے

۲۱ ———

۸ : بائیو ٹکنالوجی .... راحت ابرار

۲۵ ———

۹ : مسلم یونیورسٹی کے شب و روز ——— ۲۶

سرورق : V. Smigla کی کتاب Relativity and Man سے ماخوذ ایک تصویر

:- چچا چھکن دنیائے عجائب میں :-

تہذیب الاخلاق کے قارئین کو سائنس کے اہم موضوعات سے واقف کرانے کی غرض سے اس شمارے سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ ہم نے پہلا انتخاب ایک عام فہم اور بہت دلچسپ کتاب Mr. Tomkins in the Wonderland کا کیا ہے۔ یہ کتاب اس صدی کے مشہور و معروف سائنس داں جارج گیمو (George Gamow) نے لکھی تھی۔ اس کتاب میں بیان کیے گئے قصوں کے مرکزی کردار ایک معمولی انسان "مسٹر ٹامپکنس" ہیں جو کہ مقامی جامعہ میں جدید طبیعات پر ایک پروفیسر کے تین خطبے سنتے ہیں جن کے موضوعات

۱۔ Relativity of space and Time یعنی زمان و مکان کی اضافیت (خصوصی نظریہ اضافیت)

۲۔ Curved Space and Gravitation یعنی منحنی خلا اور تجاذب (عام نظریہ اضافیت)

۳۔ The Quantum of Action یعنی عمل کا قدریہ (کوانٹم تھیوری)

اوپر دیے ہوئے تینوں خطبے بہت اہم موضوعات پر ہیں اور ہم اپنے جریدے کے صفحات پر ان موضوعات کو گاہے گاہے بیان کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ فی الحال ابتدا ان موضوعات میں سے نمبر ایک یعنی نظریہ اضافیت کے ہلکے سے تعارف سے کرتے ہیں۔

یاددہانی کے لیے اتنا کہنا کافی ہوگا کہ زمان و مکان کو سمجھنے میں تین سو سال سے رائج عظیم فلسفی و سائنس داں نیوٹن کا علم ناکافی ثابت ہوا۔ بعدازاں ۱۹۰۵ء میں آئنسٹائن نے نظریہ اضافیت پیش کیا جس کو سمجھنے اور قبول کرنے میں اس دور کے لوگوں کو کافی دقت ہوئی اور اس کی اہمیت کا احساس فوری طور پر نہ ہو سکا یعنی کچھ ہی عرصہ میں نئے تصورات نے سائنس کی دنیا میں ایک نئے انقلاب کو جنم دیا اور صدیوں سے قائم کلاسیکل میکانیات آئنسٹائن کے نظریہ اضافیت کی نذر ہوگئی۔

زمان و مکان کے بارے میں آئنسٹائن کے نظریہ اضافیت (خصوصی) کے چند اہم نکات کو سادے و مختصر الفاظ میں اس طرح پیش کر سکتے ہیں:

الف۔ مساوی رفتار سے حرکت کرنے والے تمام نظاموں میں فزکس کے قوانین بدلتے نہیں ہیں اور اس طرح کے کسی ایک استمراری نظام (Inertial system) کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔

ب۔ ہر ایک استمراری نظام میں خلا میں روشنی کی رفتار برابر ہے۔

ج۔ ہر وہ شے جس کی رفتار روشنی کی رفتار سے کم ہے اس کی رفتار کو کسی بھی طرح بڑھا کر روشنی کی رفتار کے برابر لانا یا اس سے تجاوز کرانا ممکن نہیں ہے۔

د۔ وقت، لمبائی اور کمیت (یعنی مقدار مادہ) مطلق المقدار نہیں ہیں اور رفتار سے نسبت رکھتے ہیں۔

جارج گیمو کی کتاب کے کردار "مسٹر ٹامپکنس" معمولی پڑھے لکھے ہیں اور پروفیسر کا آخری خطبہ تو کیا ان کی سمجھ میں تو پہلا، دوسرا خطبہ بھی بالکل نہیں آیا لیکن ان کے دماغ پر کچھ دھندلے نقوش بن جاتے ہیں اور چونکہ سو لیتے ہیں تو خوابوں میں عجیب و غریب دنیاؤں کی سیر کر لیتے ہیں۔ ان خوابوں میں وہ ایسے مظاہر قدرت سے روشناس ہوتے ہیں جو کہ عام حالات میں ہمارے حواس خمسہ کی نارسائی کی وجہ سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ بظاہر مسٹر ٹامپکنس کے یہ خواب مہمل معلوم ہوتے ہیں لیکن اصل میں قابل مصنف جارج گیمو نے ان خوابوں کے ذریعہ فزکس کے مشکل اور اہم ترین موضوعات کو عام فہم انداز میں بڑی خوبی سے عوام تک پہنچانے کی ایک بہت کامیاب کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر انیس عالم (پاکستان) نے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ قارئین کے لیے اس دلچسپ سائنسی ادب کی سلسلہ وار اشاعت ہم اس شمارے سے شروع کر رہے ہیں۔ بغیر کسی اہم تبدیلی کے یہ ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ بس ایک فرق ہے کہ مسٹر ٹامپکنس کی جگہ "چچا چھکن" محو خواب نظر آتے ہیں۔

۔ عالم حسین

جارج گیمو
ترجمہ : ڈاکٹر انیس عالم، پاکستان

"مجھے نہیں معلوم کہ دنیا کو میں کیا لگتا ہوں، لیکن میں
خود کو سمندر کے کنارے کھیلتے ہوئے ایک بچے کے
مانند محسوس کرتا ہوں۔ کبھی کبھار میں کوئی چکنا سنگریزہ
یا حسین سیپی پا جاتا ہوں اگرچہ سچائی کا ایک عظیم
غیر منکشف ساگر میرے سامنے جوش مار رہا ہے۔"
—— نیوٹن

ایک ننھی کائنات*

چچا چھکن شہر کے ایک بڑے بینک کے ایک معمولی سے کلرک تھے۔
سارا دن جمع تفریق کرتے کرتے ان کے دماغ کی چولیں تک ہل جاتی تھیں۔
ایک دن انھیں دفتر میں سخت کام کرنے کے بعد بہت زیادہ تھکان ہو گئی۔ اور انھوں نے اپنے تھکے ہوئے اعصاب کو آسودگی دینے کے لیے تفریح کی ضرورت محسوس کی۔ شام کا اخبار اٹھا کر فلمی صفحہ دیکھا تو کوئی فلم ایسی نظر نہ آئی جسے دیکھنے سے سکون ملتا۔ انھیں اکثر فلموں کے فرسودہ موضوعات اور مشہور فلمی ستاروں کے معاشقوں سے سخت نفرت تھی۔

کاش اس وقت کوئی ایسی فلم لگی ہوتی جس میں حقیقی مہمیں ہوتیں یا غیر معمولی واقعات ہوتے اور اس طرح ان کی طبیعت ذرا بہل جاتی! اچانک ان کی نگاہ ایک اشتہار پر پڑی۔ مقامی جامعہ میں جدید طبیعیات کے پیچیدہ پیچیدہ موضوعات پر خطبات کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ آج کا خطبہ زمان و مکان اور کونیات (COSMOLOGY) پر تھا۔ انھوں نے یہ خطبہ سننے کا فیصلہ کر لیا۔ طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے ایک مہم جو ماہر فلکیات کے متعلق ایک کتاب پڑھی تھی جو ایک راکٹ میں بیٹھ کر مختلف ستاروں اور سیاروں پر گیا تھا۔ وہ سمجھے کہ آج کا خطبہ بھی ایسے ہی کسی مہم جو کی مہمات کے متعلق ہوگا۔

جب وہ خطبہ گاہ میں پہنچے تو خطبہ شروع ہو چکا تھا۔ کمرہ طلبا سے بھرا ہوا تھا جو ایک طویل قد، باریش عالم کا خطبہ سننے میں محو تھے۔ اس وقت مقرر صاحب تختۂ سیاہ پر ایک نہایت ہی عجیب و غریب قسم کا ریاضیاتی فارمولا لکھ رہے تھے، جو یہ تھا۔

$$R_{\mu\nu} - \frac{1}{2} g_{\mu\nu} R = K T_{\mu\nu}.$$

چچا چھکن کی ریاضیاتی معلومات جمع تفریق اور ضرب تقسیم تک محدود تھیں اور بینک میں وہ زیادہ تر پہلے دو قاعدے استعمال کرتے تھے، اس لیے اس عجیب و غریب فارمولے کے معنی ان کی سمجھ سے بالاتر ہی رہے۔ انھوں نے سمجھا کہ شاید پروفیسر صاحب تختۂ سیاہ کو ان عجیب و غریب فارمولوں سے پر کرنے کے بعد اس کائنات کے بارے میں کوئی قابلِ فہم بات بھی کہیں گے لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور اکثر دہرائے جانے والے اس فقرے کے سوا کہ "یہ خلا جس میں ہم رہتے ہیں محدود ہے اور ساتھ ہی پھیل بھی رہی ہے" اور کچھ ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ اس فقرے کے بھی پورے معنی نہ سمجھے تاہم اس نے ان کے دماغ پر ایک گہرا نقش بٹھا دیا۔ گھر واپس آتے ہوئے انھوں نے خلا کا تصور اپنے ذہن میں قائم کرنے کی ان تھک کوشش کی...

---

* اس خواب میں جس کائنات کا خواب ہے اس میں روشنی کی رفتار ہماری کائنات میں روشنی کی رفتار سے ایک کروڑ گنا کم ہے اور تجاذبی مستقل ایک کھرب گنا بڑا ہے۔ اس کائنات کا قطر اپنے زیادہ سے زیادہ پھیلاؤ کے وقت تقریباً ایک سو میل اور اس کی گرد کی کثافت تقریباً ایک پونڈ مکعب میل ہے۔ کائنات کا بحران تقریباً دو گھنٹے ہے۔ چٹانوں کی کثافت وہی ہے جو کرۂ ارض پر ہے۔

ن مسجد کے گول گنبد کے علاوہ اور کچھ ذہن میں نہ آسکا۔ انھوں نے سوچا ـــــــ مجھے اس خطبے میں نہیں جانا چاہیئے تھا۔ سائنس کے اعلیٰ تصورات رے جیسے آدمی کے سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں۔" اور وہ ان ہی خیالات میں غرق پنے نرم اور گرم لحاف کے اندر گھس گئے۔

پچا چھکن کو اٹھتے وقت ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی سخت چیز پر پڑے ہوئے ہیں۔ آنکھیں کھولیں تو خود کو ایک ایسی شے پر چت لیٹے ہوئے پایا۔ جو پہلی نظر میں انھیں ساحلِ سمندر کی ایک چٹان معلوم ہوئی۔ بعد میں انھیں پتہ چلا کہ یہ چٹان جس کا قطر بیس فٹ کے لگ بھگ ہے۔ خلا میں کسی مرئی سہارے کے بغیر ٹکی ہوئی ہے۔ اور کائی کی قسم کی کوئی چیز اس پر جمی ہوئی ہے اور کہیں کہیں شگافوں میں سے ننھے ننھے پودے بھی سر نکال رہے ہیں۔ چٹان کے گرد فضا جھلملاتی روشنی سے منور تھی اور گرد سے اٹی ہوئی تھی۔

انھوں نے پہلے ہوا میں کبھی اتنی گرد نہیں دیکھی تھی، قلمی گرد کے طوفانوں میں بھی نہیں۔ انھوں نے اپنی ناک پر رومال باندھ لیا جس سے انھیں کافی سکون حاصل ہوا۔ لیکن فضا میں گرد کے علاوہ اور زیادہ خطرناک چیزیں بھی تھیں۔ اکثر اوقات ان کے سر جتنے اور اس سے بھی بڑے پتھر چٹان کے قریب فضا میں گھومتے دکھائی دیتے اور وقتاً فوقتاً اس سے ٹکرا بھی جاتے۔ انھوں نے اپنے جسم جتنی بڑی دو ایک اور چٹانیں بھی دیکھیں جو کچھ دور فضا میں تیر رہی تھیں۔ ان تمام مشاہدات کے دوران میں وہ چٹان کے ایک آگے کو نکلے ہوئے پتھر کو پکڑے چٹان سے چمٹے پڑے رہے تاکہ گرد آلود گہرائیوں میں گریں نہیں۔ پھر کچھ ہمت کرکے رینگتے ہوئے چٹان کے کنارے تک پہنچنے کی کوشش کی تاکہ دیکھ سکیں کہ کیا واقعی اس کے نیچے کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اسے سہارا دے رہی ہے۔

جب وہ یوں رینگ رہے تھے تو انھیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ گو انھوں نے چٹان کا ایک چوتھائی سے زیادہ محیط طے کر لیا تھا، وہ چٹان سے گرے نہیں بلکہ ان کا وزن انھیں متواتر چٹان پر دبا رہا ہے۔ چٹان کے کنارے پہنچ کر انھوں نے نیچے جھانک کر دیکھا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی چٹان کو سہارنے والی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ وہ حیران رہ گئے۔ جب انھیں جھلملاتی روشنی میں چٹان کی دوسری جانب ایک طویل قد باریش آدمی کی شکل نظر آئی، جس کا سر بظاہر نیچے کی طرف تھا اور جو اپنی جیبی نوٹ بک میں کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ انھوں نے اس آدمی کو فوراً پہچان لیا۔ یہ وہی عالمِ طبیعیات تھا جس کا خطبہ انھوں نے آج شام سنا تھا۔

اب ان کی سمجھ میں کچھ آنا شروع ہوا۔ انھیں یاد آیا کہ مدرسے میں انھیں یہ پڑھایا گیا تھا کہ دنیا ایک وسیع و عریض گول چٹان ہے جو بغیر کسی سہارے کے فضا میں سورج کے گرد گردش کر رہی ہے۔ انھیں کرۂ ارض کے متخالف پہلوؤں پر دو مقاموں کا خیال بھی آیا جہاں ایک کے نقطۂ نظر سے دوسرے کی ہر چیز الٹی ہوتی ہے۔ اچھا تو ان کی یہ چٹان بھی ایک بہت ہی چھوٹا کوکبی جرم ہے جو ہر شے کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور وہ اور پروفیسر صاحب اس چھوٹے سے سیارے کے تنہا باشندے ہیں۔

اس سے انھیں اطمینان ہوا کہ اب ان کے اس چٹان سے گرنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

انھوں نے پروفیسر کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے کہا:

"صبح بخیر۔"

پروفیسر نے نظر اٹھائی اور بولا "یہاں کوئی صبح نہیں ہوتی۔ یہاں کوئی سورج بھی نہیں اور نہ اس کائنات میں کوئی روشن ستارہ ہے۔ خوش قسمتی سے یہاں کے اجرام کی سطح پر کیمیائی عمل جاری رہتا ہے ورنہ میں اس فضا کے پھیلاؤ کا مطالعہ کبھی بھی نہ کر سکتا۔"

یہ کہہ کر پروفیسر پھر اپنی نوٹ بک کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"اس پوری کائنات میں میرے علاوہ صرف ایک آدمی اور ہے اور وہ بھی اتنا اکھل کھرا!"

یہ سوچ کر چچا چھکن کو بڑی مایوسی ہوئی، خلافِ توقع ایک چھوٹا شہاب اُن کی مدد کو آیا۔ وہ بڑے زور سے پروفیسر کی نوٹ بک سے ٹکرا اور نوٹ بک پروفیسر کے ہاتھ سے چھوٹ کر ان کے چھوٹے سے سیارے سے تیزی سے دور ہوتی چلی گئی۔

"اب آپ اسے کبھی نہ پا سکیں گے!" چچا چھکن نے نوٹ بک کو نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی تھی، دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کے برعکس یہ جلد ہی میرے پاس واپس آ جائے گی۔" پروفیسر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "تم دیکھ رہے ہو کہ یہ فضا جس میں ہم اس وقت ہیں، وسعت میں لامتناہی نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہ

میں پڑھایا گیا تھا کہ فضا لامتناہی ہے اور دو متوازی خط آپس میں کبھی نہیں ملتے لیکن یہ بات نہ تو اس فضا کے بارے میں صحیح ہے جس میں باقی انسان بستے ہیں، نہ ہماری موجودہ فضا کے بارے میں۔ بلاشبہ انسانوں کی فضا بے حد وسیع ہے۔ موجودہ سائنسی اندازے کے مطابق اس کا قطر ۱۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ میل ہے جو ایک عام آدمی کے نزدیک تقریباً لامتناہی ہی ہے۔ اگر میری نوٹ بک اس کائنات میں گم ہو جاتی تو اسے مجھ تک پہنچنے میں ناقابلِ یقین حد تک زیادہ وقت لگتا لیکن یہاں حالات بالکل مختلف ہیں۔ میں نے نوٹ بک ہاتھ سے چھوٹنے سے پہلے اندازہ کر لیا تھا کہ اس کائنات کا قطر صرف پانچ میل ہے، گو کہ یہ بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آدھ گھنٹے کے اندر اندر میری نوٹ بک میرے پاس واپس آجائے گی۔

"گویا آپ کے نوٹ بک آسٹریلیا کے وحشی قبائل کے بومرینگ[۱] کی طرح ایک منحنی مدار میں اڑان کے بعد آپ کے قدموں میں آگرے گی؟" چچا چکن نے پوچھنے کی جسارت کی۔

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" پروفیسر نے جواب میں کہا۔ "اگر تم سمجھنا چاہتے ہو کہ درحقیقت یہ سب کیسے ہوتا ہے تو میں ایک مثال سے اسے واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔ تم ایک ایسے قدیم یونانی امیر کا تصور کرو جو یہ نہیں جانتا کہ زمین ایک کرہ ہے۔ یہ امیر اپنے ایک غلام کو حکم دیتا ہے کہ وہ شمال کی جانب اپنی ناک کی سیدھ میں چلتا رہے۔ اب ذرا اس یونانی امیر کی اس وقت کی بوکھلاہٹ کا تصور کرو جب اس کا غلام جنوب کی طرف سے اس کے پاس پہنچ جائے گا۔ چونکہ اس امیر کو دنیا کے گرد سفر کا کوئی علم نہیں اس لیے وہ یہی سوچے گا کہ اس کے غلام نے اس کی ہدایت کے خلاف راستہ اختیار کیا جس کی وجہ سے اس کی واپسی ممکن ہوئی لیکن اس کا غلام تمام وقت اس سیدھی سے سیدھی لکیر پر سفر کرتا رہا جو دنیا کی سطح پر کھینچی جا سکتی ہے چنانچہ وہ مخالف سمت سے امیر کے پاس پہنچ گیا۔ بالکل یہی کچھ میری نوٹ بک کے ساتھ بھی ہو گا۔ بشرطیکہ کوئی پتھر اس سے ٹکرا کر اسے خطِ مستقیم سے نہ ہٹا دے۔ لو یہ دوربین لو اور دیکھو کہ کیا تم اسے اب بھی دیکھ سکتے ہو؟"

چچا چکن نے دوربین آنکھوں پہ لگائی تو انھیں گرد آلود فضا میں پروفیسر کی نوٹ بک دور سفر کرتی ہوئی دکھائی دی۔ انھیں اس پر کچھ حیرت ہوئی کہ اس فاصلے پر نوٹ بک سمیت تمام اشیاء گلابی رنگ کی دکھائی دیتی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے پروفیسر سے کہا: "میں آپ کی نوٹ بک واپس آتی دیکھ رہا ہوں۔ اس کی جسامت برابر بڑھ رہی ہے۔"

"نہیں،" پروفیسر نے کہا۔ "ابھی تو یہ پرے ہی جا رہی ہے۔ تم جو اس کی جسامت بڑھتی دیکھ رہے ہو، دراصل یہ ایک خاص اثر کی وجہ سے ہے جس کے تحت روشنی کی شعاعیں خلا میں ایک عدسے پر مجتمع ہو جاتی ہیں۔ اس یونانی امیر کی مثال پھر لو۔ اگر نوری شعاعوں کو دنیا کی کروی سطح کے ساتھ ساتھ سفر کرنے دیا جائے (کرۂ ہوائی کے انعطافِ نور کے ذریعے) تو ایک طاقتور دوربین کی مدد سے وہ یونانی اپنے غلام کو پورے سفر کے دوران میں دیکھ سکتا ہے۔ اگر تم کرۂ زمین پر نظر ڈالو تو تم دیکھو گے کہ اس کی سطح پر جو سب سے سیدھے خطوط کھینچے جا سکتے ہیں، یعنی خطوطِ نصف النہار وہ پہلے ایک قطب سے منتشر ہوتے ہیں اور پھر خطِ استوا سے گزرنے کے بعد دوسرے قطب کی طرف جھک جاتے ہیں۔ اگر نوری شعاعیں خطوطِ نصف النہار کے ساتھ ساتھ سفر کریں اور اگر امیر ایک قطب پر کھڑا ہو تو جیسے جیسے غلام اس سے دور ہوتا جائے گا وہ چھوٹا ہوتا دکھائی دے گا۔ حتیٰ کہ وہ خطِ استوا پر پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد وہ بڑا ہوتا دکھائی دے گا اور ایسا معلوم ہو گا جیسے وہ واپس آرہا ہے گو اس کی پیٹھ امیر کی طرف ہے۔ جب وہ مقابل قطب پر پہنچے گا تو وہ امیر کو اتنا ہی بڑا دکھائی دے گا جیسے وہ اس کے پاس کھڑا ہو۔ لیکن وہ اسے چھو نہ سکے گا جیسے کروی آئینے کا عکس چھوا نہیں جا سکتا۔ اس دو ابعادی مثال سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ سہ ابعادی خلا میں نوری شعاعیں کیا روش اختیار کریں گی..... میرے خیال میں اب نوٹ بک کی تمثال کافی قریب ہے ـــ؟"

واقعی چچا چکن اب دوربین کے بغیر نوٹ بک کو دیکھ سکتے تھے۔ جو صرف چند گز کے فاصلے پر نظر آرہی تھی لیکن اس کی شکل بڑی حد تک بگڑا

۱؎ آسٹریلیا کا ایک لکڑی کا ہتھیار جو پھینکنے والے کے پاس واپس آجاتا ہے۔

چکی تھی اس کے کنارے گھس چکے تھے، اس کے صفحوں پر لکھے ہوئے فارمولے مشکل سے پڑھے جا سکتے تھے اور ساری نوٹ بک ایک ایسے فوٹو جیسی دکھائی دے رہی تھی جسے بڑی بے احتیاطی سے کھینچا اور دھویا گیا ہو۔

چچا چھکن نے نوٹ بک کو پکڑنا[۱] چاہا مگر ان کا ہاتھ اس تمثال میں سے بغیر مزاحمت کے گزر گیا۔

پروفیسر نے کہا، خود کتاب اس وقت اس کائنات کے مخالف قطب کے بہت قریب ہے اور جو تم دیکھ رہے ہو، وہ محض اس کی دو تمثالیں ہیں۔

چچا چھکن: کیا اس قسم کے اثرات اس عظیم کائنات میں بھی ہوتے ہیں جس میں ہم پہلے رہتے تھے؟

پروفیسر: ہوتے کیوں نہیں! لیکن وہ کائنات اس قدر وسیع ہے کہ نوری[۱] شعاعوں کو اس کا چکر لگانے میں کھربوں سال لگتے ہیں تم قینچی آئینے کے بغیر بھی اپنے سر کی پشت کے بال کٹتے ہوئے دیکھ سکتے ہو لیکن اس کے لیے حجامت کے بعد کھربوں سال درکار ہوتے۔ اس کے علاوہ بین کوا کبی گرد تصویر کو غالباً دھندلا کر دیتی۔ اور ہاں ایک دفعہ ایک انگریز ماہرِ فلکیات نے یہاں تک کہہ دیا تھا، غالباً مذاق کے طور پر، کہ ہم ستارے آسمان پر دیکھتے ہیں بہت ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی ایک حقیقی نہ ہوں بلکہ اربوں سال پہلے موجود ستاروں کی تمثالیں ہوں۔

ان سب باتوں کو سمجھنے کی کوشش سے تھک جانے کے بعد چچا چھکن نے اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالی اور یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے کہ آسمان کی صورت بہت کچھ بدل چکی تھی۔ گرد میں کچھ کمی ہو گئی تھی اور انہوں نے رومال ناک پر سے ہٹا لیا۔ اب چھوٹے چھوٹے پتھر زیادہ وقفوں سے گزر رہے تھے اور ان کی چٹان سے تھوڑے زور سے ٹکرا رہے تھے۔ ابتداء میں قریب نظر آنے والی بڑی بڑی چٹانیں اب اس قدر دور ہٹ چکی تھیں کہ ان کا نظر آنا دشوار ہو گیا تھا۔

"خوب! اب حالت پہلے سے بہتر ہوتی جا رہی ہے۔" چچا چھکن نے اپنے دل میں خیال کیا "ان اڑتے ہوئے پتھروں سے تو سر پھوٹنے کا ڈر تھا"

"کیا آپ ہمارے ماحول کی تبدیلی کی تشریح کر سکتے ہیں؟" انہوں نے پروفیسر سے سوال کیا۔

پروفیسر: آسانی سے۔ ہماری یہ ننھی سی کائنات تیزی سے پھیل رہی ہے اور ہمارے یہاں آنے کے بعد سے اس کا قطر پانچ میل سے بڑھ کر سو میل ہو گیا ہے میں نے آتے ہی دور کی اشیاء کے گلابی رنگ سے اس پھیلاؤ کا اندازہ لگا لیا تھا۔

چچا چھکن: دور کی اشیاء کا گلابی پن تو مجھے بھی دکھائی دے رہا ہے لیکن اس کا کائنات کے پھیلاؤ سے کیا تعلق ہے؟

پروفیسر: کیا تم نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ تمہاری طرف آتی ہوئی ریل گاڑی کی سیٹی کا سُر اونچا اور تم سے پرے جاتی ہوئی گاڑی کی سیٹی کا سُر نیچا سنائی دیتا ہے؟ اسے ڈاپلر اثر کہتے ہیں یعنی امتداد کا منبع کی رفتار پر انحصار۔ جب تمام خلاء پھیل رہی ہو تو اس میں موجود ہر جسم ایسی رفتار سے پرے کو حرکت کرتا ہے جو شاہد سے فاصلے کے متناسب ہوتی ہے۔ چنانچہ جو روشنی ایسے اجسام سے نکلتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ سُرخ ہوتی جاتی ہے یہ علم المناظر میں کمیٔ امتداد کے مترادف ہے۔ جتنا کوئی جسم مشاہد سے دُور ہوگا اتنی ہی اس کی رفتار تیز ہوگی اور وہ مشاہد کو اتنا ہی زیادہ سُرخ نظر آئے گا۔ ہماری پرانی کائنات میں بھی یہ پھیلاؤ جاری ہے اور اس سرخی میں تبدیلی کے ذریعے فلکیات دان بہت دور کے ستاروں اور سحابیوں کا زمین سے فاصلہ معلوم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر نزدیک ترین سحابیوں میں سحابیہ اینڈرامیڈا کی سُرخی ۰٫۵ فی صد ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا زمین سے اتنا فاصلہ ہے جسے روشنی آٹھ لاکھ سال میں طے کر سکتی ہے لیکن ہماری زیادہ سے زیادہ طاقتور دوربین سے دکھائی دینے والے ایسے سحابیے بھی ہیں جن کی سُرخی ۱۵ فیصد ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا زمین سے فاصلہ کوئی سو کروڑ سال[۲] کے برابر ہے۔ خیال ہے کہ یہ سحابیے اس عظیم کائنات کے خطِ استوار کے درمیانی نقطے کے قریب ہیں اور ارضی فلکیات دانوں کو فضا کا جو کل حجم معلوم ہے وہ اس کائنات کے کل حجم کا معتدبہ حصہ ہے۔ کائنات کے پھیلاؤ کی موجودہ شرح ۰٫۰۰۰۰۰۰۰۱ فیصد فی سال ہے چنانچہ ہر سیکنڈ میں کائنات کا نصف قطر ایک کروڑ میل بڑھ جاتا ہے ہماری یہ چھوٹی سی کائنات مقابلتہً زیادہ تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اس کے حجم میں ایک فی صد فی منٹ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

---

[۱] واضح رہے کہ روشنی کی رفتار ۱۸۶،۰۰۰ میل فی ثانیہ ہے۔ [۲] نوری سال وہ فاصلہ ہے جو روشنی ایک سال میں طے کرتی ہے روشنی کی رفتار ۱۸۶،۰۰۰ میل فی ثانیہ ہے اس طرح ایک نوری سال تقریباً چھ ارب میل کے برابر ہوتا ہے۔

چچا چھکن: کیا یہ پھیلاؤ کبھی نہ رکے گا؟

پروفیسر: کیوں نہیں رکے گا! پھیلاؤ ختم ہو جانے کے بعد سکڑاؤ شروع ہو جائے گا۔ ہر کائنات بہت ہی چھوٹے نصف قطر اور بہت ہی بڑے نصف قطر کے درمیان سکڑتی پھیلتی ہے۔ بڑی کائنات میں سکڑاؤ اور پھیلاؤ کا درمیانی وقفہ تقریباً کئی کھرب سال ہے۔ اس کے برعکس ہماری اس چھوٹی کائنات کے لیے یہ وقفہ صرف تقریباً دو گھنٹے ہے۔ میرے خیال میں اب ہماری کائنات اپنے زیادہ سے زیادہ پھیلاؤ پر ہے تم دیکھ ہی رہے ہو کہ اب سردی کتنی بڑھ گئی ہے۔

دراصل وہ حرارتی اشعاع جس سے یہ کائنات پر تھی اور جو اب بہت بڑے حجم میں پھیلا ہوا تھا۔ ان کے چھوٹے سے سیارے کو بہت کم حرارت پہنچا رہا تھا۔ چنانچہ وہ تپش نقطۂ انجماد کے قریب تھی۔

پروفیسر: یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ابتدا میں ہماری کائنات میں کافی اشعاع تھا جس کی وجہ سے پھیلاؤ کے موجودہ مرحلے پر بھی کچھ حرارت مل رہی ہے۔ ورنہ بہت ممکن تھا کہ آس پاس کی ہوا کثیف ہو کر مائع بن جاتی اور ہم ٹھٹھر کر مر جاتے لیکن فکر کی کوئی بات نہیں اب سکڑاؤ شروع ہو گیا ہے اور جلد ہی کافی گرمی ہو جائے گی۔ چچا چھکن نے نظر اٹھائی تو انھیں دور کے اجرام کا رنگ گلابی سے بنفشی ہوتا نظر آیا جو پروفیسر کی توجیہ کے مطابق اس بات کی دلیل تھی کہ تمام کوکبی اجرام نے ان کی طرف حرکت کرنا شروع کر دیا تھا۔ انھیں قریب آتی ہوئی گاڑی کی سیٹی کے اونچے امتداد کی مثال یاد آئی تو وہ خوف سے کانپنے لگے اور کہنے لگے، "اگر اب ہر چیز سکڑ رہی ہے تو کیا جلد ہی وہ تمام بڑی بڑی چٹانیں جن سے یہ کائنات بھری ہوئی ہے ایک دوسرے سے مل نہیں جائیں گی اور ہم پس نہیں جائیں گے؟"

پروفیسر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "بے شک یہی کچھ ہوگا لیکن اس انجام سے بہت پہلے کائنات کی تپش اس قدر بڑھ جائے گی کہ ہم دونوں جوہروں میں بٹ جائیں گے۔ یہ ہماری بڑی کائنات کے اختتام کی چھوٹے پیمانے کی تصویر ہے۔ تمام اجسام مل ملا کر ایک یکساں کثافت کے گرم گیس کے کرے کی صورت اختیار کر لیں گے اور پھر نئے پھیلاؤ کے ساتھ ہی نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔

✱ "بہت ہو چکا۔ نیوٹن تم مجھ کو معاف کرنا۔ تمہارے
✱ زمانے میں ایک اعلیٰ ترین صلاحیت، ذہانت والا شخص
جو کچھ کر سکتا تھا وہ تم نے کیا۔ جن تصورات کو تم نے جنم
✱ دیا تھا وہ آج بھی فزکس میں ہماری رہبری کر رہے ہیں
حالانکہ ہم کو اب معلوم ہو چکا ہے کہ اگر حقائق کی گہرائی
✱ اچھی طرح سمجھنا ہے تب تمہارے پیش کردہ تصورات
کو ہٹا کر ان کے عوض نئے تصورات کو لانا ہوگا۔"......

✱ ✱ ✱ ——— آئنسٹائن

"خدایا اب کیا ہوگا! آپ کے بیان کے مطابق ہماری بڑی کائنات کا خاتمہ ہونے میں تو ابھی کھربوں سال باقی ہیں لیکن یہاں تو یہ عمل بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ مجھے تو اس لباسِ خواب میں بھی گرمی محسوس ہو رہی ہے میں تو اپنے کپڑے اتارتا ہوں۔"

پروفیسر نے کہا "بہتر یہی ہے کہ تم کپڑے نہ اتارو۔ اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ بس لیٹ جاؤ اور جب تک ہو سکے مشاہدہ جاری رکھو!"

چچا چھکن نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ گرم ہوا ناقابلِ برداشت تھی۔ گرد بہت کثیف ہو چکی تھی۔ ان کے گرد جمع ہونی شروع ہو گئی تھی۔ انھیں ایسا معلوم ہوا جیسے انھیں کسی گرم اور نرم کمبل میں لپیٹا جا رہا ہے۔ انھوں نے اس کمبل سے آزاد ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کیے۔ یکایک ان کا ہاتھ باہر ٹھنڈی ہوا میں نکل آیا۔

ان کا پہلا تاثر یہ تھا کہ شاید میں نے اس بے رحم کائنات میں چھید کر لیا ہے۔ پروفیسر سے اس کے بارے میں پوچھنے کے لیے ان کی طرف مڑے تو وہ کہیں نظر نہ آئے۔ اس کی بجائے صبح کی ہلکی روشنی میں انھیں اپنی خواب گاہ کے جانے پہچانے نقوش دکھائی دیے۔ وہ اپنے پلنگ پر ایک اونی کمبل میں لپٹے تھے اور ابھی ابھی ایک ہاتھ کمبل سے باہر نکالا تھا۔

"پھیلاؤ کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔" انھوں نے بوڑھے پروفیسر کے یہ الفاظ یاد کرتے ہوئے کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ ہماری کائنات ابھی پھیل رہی ہے" اور وہ غسل خانے کی طرف چل دیے۔

پروفیسر قاضی عبدالستار

(دسویں قسط)

خالد بن ولید

"ہمارے نبی نے ہم کو ایک بار سیف اللہ کے نام سے یاد فرمایا تھا۔ بس مسلمان مجھے سیف اللہ کہنے لگے"

"تم مجھے کیا دعوت دیتے ہو؟"

"اوّل خدا کی وحدانیت کا اقرار دوئم نبی آخرالزماں کی رسالت پر ایمان یہ نہیں کر سکتے تو جزیہ دو۔ ہم تمہاری حفاظت کے ذمّے دار ہوں گے۔ ورنہ یہ تلوار ہے فتح جس کی عادت بن چکی"

"اس شخص کا مرتبہ کیا ہوگا جو آج تمہارے دین میں داخل ہو جائے"

وہی جو میرا ہے"

"مجھے وہی اجر و ثواب ملے گا جو تمہارا حق ہے"

"بیشک بلکہ تم کو کچھ زیادہ ملے گا"

وہ کس طرح ؟

جب ہم دین اسلام میں داخل ہوئے تو ہمارے نبی کی حیات مبارک قائم تھی۔ ہم ان کی زبانِ قدسیہ سے زمین و آسمان کے اسرار و رموز سمجھنے پر قادر تھے۔ وہ ایمان افروز نظارے جو ہم نے دیکھے ان کا کم از کم تقاضہ یہ تھا کہ ہم مسلمان ہو گئے۔ لیکن تم نے وہ نہیں دیکھا جو ہم نے دیکھا۔ وہ نہیں سنا جو ہم نے سنا پھر بھی تم مسلمان ہوتے ہو تو ہم سے افضل ہو گئے"

"تم اپنے خدا کی قسم کھاؤ کہ تم نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے"

"خالد نے گھوڑے کو بڑھا کر اس کی تلوار پر ہاتھ رکھ دیا"

"خدا کی قسم میں نے تم سے جو کہا سچ کہا"

جرجیس نے اپنی ڈھال الٹ دی۔

"مجھے اپنے کیمپ نے چلو مسلمان کرو۔ اب میں یہ جنگ تمہاری رکاب میں لڑوں گا"

"قعقاع بن عمرو امین الامت کو خبر دیں کہ وہ میدان کے محافظ ہیں"

"سپہ سالار مطمئن رہیں۔ میری واپسی تک رومی لشکر اسی مقام پر قائم رہے گا"

صلیب سے خالی خود، صلیب سے عاری بکتر پہنے قبضۂ صلیب سے پاک تلوار علم کیے خالد کے پہلو میں کھڑے ہوئے جرجیس کو دیکھ کر رومی صفوں میں تہلکہ پڑ گیا۔ تھوڑی دیر کے ہنگامے کے بعد رومی صف سے ایک گاندیا اٹھلیں کرتے گھوڑے کو جو زنجیروں کی لگام پہنے تھا سنبھالتا سامنے آیا اور مبارز طلبی کرنے لگا۔

فضل بن عباس عبدالرحمان بن ابو بکر، عبداللہ بن عمر اپنی اپنی صفوں سے گھوڑے اڑاتے نکلے لیکن سپہ سالار کی اجازت سے قیس بن ہبیرہ میدان میں نکل چکے تھے۔ لمبی وزنی ڈانڈ اور چوڑے بھدّے پھل کا بھاری نیزہ گھوڑے کی زین پر رکھ کر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اور لگام چھوٹتے ہوئے گھوڑے کو ایڑ لگائی گھوڑا توپ کے گولے کی طرح غنیم پر چلا رومی سردار نے چاہا کہ گھوڑا کاٹ کر وار بچالے لیکن عرب چاروں پیروں سے اٹھ رہا تھا اور تیر موت کی طرح قریب ہو رہا تھا اس نے تکونی ڈھال سینے پر ڈھانپ لی۔ اور اپنے گھوڑے کو پیچھے رہا نیزے کی جھونک جس کی پشت پر سوار کے ہاتھوں کے علاوہ جانور کی طاقت بھی تھی رومی ڈھال نے سنبھال لی لیکن بایاں ہاتھ صدمے سے بیکار ہو گیا۔ اس نے ڈھال پھینک دی۔ ڈھال کا پھینکنا تھا کہ قیس تاڑ گئے۔ اور گھوڑے کو جولان دے دوسرا وار کیا۔ تیسرا وار کیا۔ رومی نے اس وار کو بھی گھوڑے کے کاوے کاٹنا چاہا لیکن ممکن نہ ہوا بھالے کی انی پہلو میں لگتے ہی عرب اپنی عالمی شہرت کے مطابق سوار کے حکم کا انتظار کیے بغیر جھک کر لوٹ پڑا۔ چھٹ

چکلی بجلی کی طرح اس پہلو توڑ کر باہر نکل گئی۔ اسلامی قلب نے تکبیر کے نعروں سے قیس کا استقبال کیا۔

جرجیس کی قبولیت اسلام سے سراسیمہ رومی لشکر کی نفسیات کو قیس کی فتح نے اور خراب کر دیا۔ اور اسلامی لشکر کے حوصلوں کو پر لگا دیے۔ سیف اللہ نے قلب کی دو رجمنٹیں مزعور بن عدی اور ہاشم بن عتبہ کے ساتھ پہلو میں نکال کر کھڑی کر لیں اور حکم دیا کہ تم حکم ثانی کا انتظار کیے بغیر میری ہر جنبش کے پابند ہو گے۔ ابھی سیف اللہ کے عراقی سوار اپنی جگہوں پر سنبھل رہے تھے کہ رومی قلب کا ہراول مقدمہ باہان کی کمان میں رومی باجوں کی کڑک دھمک کے ساتھ لوہے کے ایک زندہ قلعے کی طرح حرکت کرنے لگا۔ لشکر کے قاری مقداد سورۂ فتح کی تلاوت کرنے لگے اور عرب کا مشہور خطیب ابی سفیان سیاہ اونٹ پر چڑھ کر عمر بھر کی شعلہ بیانی کی ساری دولت لٹانے لگا۔ اور سیف الٰہی علم کی کمان پر پیدلوں نے جھپٹ کر اپنے سواروں کے سامنے دیوار کھڑی کر دی۔ اور ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر برچھے سیدھے کر لیے۔ اور گھوڑوں کے پیچھے کھڑے ہوئے اونٹوں پر سوار مجاہدوں نے سانگ اور حربے تول لیے اور کمانوں میں تیر جوڑ لیے۔ باہان جو فیل مست کی طرح سیاہ گھوڑے پر سوار اپنا قلب ہو لتا چلا آ رہا تھا اس دفاعی تنظیم سے مطلق بے نیاز تھا۔ پہلی ہی ٹکر میں تہلکہ پڑ گیا۔ سینکڑوں رومی گھوڑے سواروں سے خالی ہو گئے۔ سینکڑوں عربی پیدل کچلے گئے اور ان کی جگہ وہ اصحاب رسول اللہ قائم ہونے لگے جن کے ہاتھوں پر بدر و حنین کے معرکے فتح ہوئے تھے۔ لیکن صفوں کو توڑتا اور قطاروں کو پھاڑتا رومی قلب دھنستا چلا آ رہا تھا۔ عکرمہ بن ابوجہل، عیاض بن غنم، عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور عبداللہ بن عمر جیسے منتخب روزگار شجاعان عرب نے زمین پر گھٹنے گاڑ دیے تھے اور رومیوں کی ایک ایک قطار کو اپنے برچھوں پر تول رہے تھے۔ اور اصحاب رسول ایک ایک بالشت زمین پر اپنے سر کٹا رہے تھے کہ سیف اللہ نے رومی قلب کے بائیں پہلو پر وہ حملہ کیا جس کے لیے وہ ساری دنیا میں مشہور تھے۔ صفوں کو روندتے اور قطاروں کو الٹتے باہان کے سامنے پہنچ گئے۔ باہان نے انتہائی طراری کے ساتھ پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ اور جنرل ورنجار نے اپنی اگلی صفوں کو لوہے کے قلعے کی طرح تھام لیا۔ اور سیف اللہ اپنے سواروں سے کٹ گئے۔ ہاشم بن عتبہ نے تڑپ کر آواز دی۔

"اے ناموران کتہ —— سیف اللہ کی مدد پر چلو —— رومیوں کے نرغے میں ہیں!"

اس آواز کا بلند ہونا تھا کہ پورا اسلامی قلب جان دینے پر تل گیا۔ اور ہاشم بن عتبہ کے ساتھ اپنے سینے دشمن کی تلواروں پر ڈال دیے۔ اور ورنجار کا گھوڑا مار کر راستہ بنا لیا اور اپنے سپہ سالار کی رکاب میں کھڑے ہو کر تکبیریں بلند کرنے لگا۔ ورنجار کے رسالے جو اسلامی قلب کے درمیان برچھوں اور تیروں کے حلقے میں کٹتے جا رہے تھے تیزی کے ساتھ دونوں پہلوؤں سے راستہ نکال کر باہان کے پیچھے آ گئے۔ جس کی پیش قدمی روک دی گئی تھی اور اب ایک ایک انچ پیچھے ہٹنے لگا تھا۔ ساتھ ہی سیف اللہ کی رکاب میں پہنچ کر عراقی سواروں نے ہولناک حملے شروع کر دیے۔ اونٹوں پر بیٹھے ہوئے قدر انداز تیروں اور حربوں اور سانگوں کے بجائے موت کی بارش کرنے لگے۔ اور ابی سفیان گرجنے لگا۔

"آج کی جنگ بدر کی جنگ سے بڑی جنگ ہے کہ اس جنگ میں
تمہارے سروں پر آقائے دو عالم کا سایہ موجود تھا۔ اور آج تمہارے
پاس صرف یہ محمدی علم ہے۔ خدائے ذوالجلال کی قسم یہ مدینے
کا محافظ ہے عالم اسلام کا محافظ ہے۔ اے قریش کے افتخارو!
اس کی پرچھائیوں کو اپنے خون سے شاداب کر دو اپنے سروں
سے روشن کر دو۔"

سیف اللہ کے ساتھ قعقاع اور عکرمہ اور جرجیس کی تاخت و تاراج فوج نے باہان کو مجبور کر دیا کہ منظم پسپائی پر مائل ہو۔ ساتھ ہی تازہ دم رسالوں کی کمک کا حکم دیا۔ کہ اس کا ذاتی جھنڈا مثبت نشانیں دے رہا تھا۔ سیف اللہ نے اس کا ارادہ بھانپ لیا اور تمام گھوڑے سمیٹ کر ایک ہی دھاوے میں جھونک دیے اور باہان کی منظم پسپائی کو شکست میں تبدیل کر کے دور تک دھکیل دیا یہاں تک کہ تازہ دم سوار اس کی ٹوٹی پھوٹی قطاروں کو جمانے لگے۔ ابھی سیف اللہ قعقاع کو ہدایت دے رہے تھے کہ امین الامت نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ بڑھتی ہی صفوں کی خالی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ امین الامت نے دربار خلافت کے قاصد سے پروانۂ خلافت لے لیا۔ پڑھنے لگے۔

"امین الامت ابو عبیدہ بن الجراح کو اس تحریر کے ذریعے
یرموک پر موجود تمام عساکر اسلام کا صدر سپہ سالار مقرر کیا
جاتا ہے کہ خالد بن ولید کے ہاتھ سے لشکر اسلام کی قیادت
چھین کر اپنے ہاتھ میں لے لو۔"

سیف اللہ نے اس طرح سنا جس طرح مخبر سے خبر سنی جاتی ہے۔
"انا للّٰہ وانا الیہ راجعون" کہکر گھوڑے سے اترے۔ قبلہ رو ہوکر ایک سجدہ کیا۔ کھڑے ہوکر نگاہ اٹھائی تو امین الامت کے چہرے پر جم گئی جو سوگوار تھا۔ آنکھیں اٹھیں۔ جیسے آنسوؤں سے وضو کرکے اٹھی ہوں۔ بولے جیسے نماز کے لیے تکبیر کہہ رہے ہوں۔

"خدا شاہد ہے کہ میں نے اس منصب کی خواہش نہیں کی۔ خدا گواہ ہے کہ تمام عساکر اسلام میں صرف تم کو یہ حق پہنچتا کہ اس قیادت عظمیٰ کے منصب سے سرفراز ہو۔ مجھے حکم تھا کہ تم کو ابھی یہ خط پڑھنے پر مجبور کروں۔" اور عمامے کا شملہ آنکھوں پر رکھ لیا۔

خالد نے نیزہ زمین میں گاڑ دیا۔ ان کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ دیے
آمین الامت، سپہ سالار اسلام — آنکھیں پونچھ ڈالیے۔ اگر لشکر نے دیکھ لیا تو مشکل سے جمائے ہوئے قدم اکھڑ جائیں گے۔ اور لاکھوں سپاہیوں کا یہ سیلاب عظیم مدینۃ النبی کی دیواروں سے ٹکرانے لگے گا۔ خالد بن ولید جسے ختم المرسلین نے سیف اللہ کا خطاب دیا۔ جسے خلیفہ اکبر نے شہر اسلام کا لقب دے کر صدر سپہ سالار بنایا وہ اتنا کم ظرف نہیں ہو سکتا کہ اس سوتی پھریرے کے شانے سے اتر جانے کے ملال میں جہاد پر اٹھی ہوئی تلوار کا قبضہ ڈھیلا کر دے خالد یہ لڑائی خدائے ذوالانصاف والاکرام کے لیے لڑ رہا ہے۔ نبی آخر الزماں کے جھنڈے کی آبرو کے لیے لڑ رہا ہے۔ ابن حنتمہ[1] کی خوشنودی کے لیے نہیں۔ صدر سپہ سالار سے صرف یہ گذارش ہے — مجھے حکم دے کہ لشکر کے کس بازو پر — ایک سپاہی کی طرح جنگ کروں۔"

امین الامت نے ان کے دونوں رخسار اپنے ہاتھوں میں لے لیے
"ابا سلیمان — سپہ سالار بنتے رہیں گے مرتے رہیں گے۔ لیکن اس ذات رسالت کو کوئی کہاں سے لائے گا جو سیف اللہ کا دوسرا خطاب نصیب ہو کسی کی زبان خلیفہ اکبر کی زبان نہیں بن سکتی جو کسی دوسرے کو شہر اسلام کا خطاب دے سکے۔ خدا کی قسم خلیفہ اکبر نے سچ کہا تھا کہ تم ایسے ہو جیسا اب کوئی ماں پیدا نہیں کر سکتی۔"

"صدر سپہ سالار نے میرے مقام کا تعین نہیں کیا۔"
پہلی بار آواز میں سیف الٰہی گھن گرج پیدا ہوئی

"تمہارے مقام کا تعین تو زبان نبوی کر چکی — زبان خلافت اوّل کر چکی — پورا لشکر تمہارا ہے۔ خلیفہ کا حکم پورا ہو چکا — تم جس طرح لڑ رہے تھے — اسی طرح لڑو"
"نہیں — آپ کو میرے مقام کا تعین کرنا ہوگا۔"
آواز حد ادب میں رہتے ہوئے بھی سخت تھی
دیر تک خاموشی رہی — پھر امین الامت گرجے
"میں صدر سپہ سالار — تم کو حکم دیتا ہوں کہ میرے نائب کی حیثیت سے سارے لشکر اسلام کی سپہ سالاری کرو۔"
اور خود صفوں میں کھو گئے۔

اشتر نے اچانک کنوتیاں کھڑی کر لیں اور زمین کھرچنے لگا کہ رومی باجوں کی آوازیں سر پہ آ گئی تھیں۔ سیف اللہ نے اشتر کے ایال مٹھی میں داب لیے۔ اچھل کر گھوڑے کی زین پر جم گئے۔ ہاتھ بڑھا کر نیزہ کھینچ لیا — اس کے پھریرے کو گھور کر دیکھا، قبل اس کے ہاتھ پھریرے کو نیزے سے نوچ لیتا — معاذ بن جبل نے اپنے سفید بالوں سے بھرے ہوئے ہاتھوں میں ہاتھ تھام لیا۔ ایک نرم نگاہ ان کی آنکھوں کی نذر میں گذار دی اور آواز بلند ہوئی جس پر خاتم النبیین کی تربیت کی تقدس کا سایہ تھا۔
"سیف اللہ — یرموک پر نظر کرو — محمدی علم پر نگاہ رکھو"
ابو قتادہ انصاری نے جو خلافت نبوی کے دعویدار تھے بازوؤں پہ ہاتھ رکھ دیا
"فاتح — اگر عمر بن خطاب یرموک میں ہوتے تو ہم نہیں جانتے کہ کیا ہوتا"
اصحاب بدر کی آنکھ جھپکی تھی کہ اشتر کی جھپٹ سے رومیوں کے رسالے تہ و بالا ہونے لگے ساتھ ہی امین الامت کی تلاوت قرآن کی صیقل سے چمکتی آواز بلند ہوئی
"اے نامداران قریش
اے شہسواران حجاز!
سیف اللہ پر نگاہ رکھو — کہیں ایسا نہ ہو کہ جوش جہاد میں شہادت لوٹ لیں"
یہ امین الامت کی پہلی للکار تھی جو یرموک کے میدان نے سنی معاذ بن جبل نے تکبیر بلند کی جس کی تکرار میں پورا قلب ایک جان ہو کر اٹھا اور

---

[1] حضرت عمر

رومیوں کے قلب پر گرپڑا جو خالد اور ان کے عراقی رسالوں کی مار سے چیخ اٹھا تھا اور اپنی جگہ سے ہل گیا تھا۔ ساتھ ہی قعقاع اور عیاض نے داڑھیاں دانتوں میں داب کر لگامیں چھوڑدیں اور دونوں ہاتھوں میں نیزے تھام کر اس طرح گھوڑے اٹھائے کہ باہان کی للکار اور اسقف کی پکار سے سنبھلتی ہوئی قطاروں میں زلزلہ ڈال دیا۔ سیف اللہ نے راسیں کھینچ لیں۔ اور صفوں کو چیرتے اپنے میسرے کی طرف چلے۔ جہاں یزید بن ابی سفیان رومیوں کے نرغے میں جان دیئے ڈال رہا تھا۔ سپہ سالار کو دیکھتے ہی پورا میسرہ تکبیر کہنے اور تکرار کرنے لگا۔ خالد کے وجود، ان کی للکار اور تلوار کے زور پر رومیوں کو دھکیلنے لگا۔

یزید بن ابی سفیان کی پشت مضبوط کر کے اپنے سواروں کے ساتھ میمنے پر توجہ کی تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ عمرو بن العاص جیسا فرزند روزگار سپہ سالار اپنی عسکری سیاست اور فراست کے باوجود پیچھے ہٹ رہا ہے۔ میدان یرموک میں پہلی بار تکبیر کہی تو جیسے پورا میمنہ زندہ ہو گیا۔ اس قہر سے دشمن پر گرے جس طرح قہر الٰہی گرتا ہے۔ صفوں کو چیرتے قطاروں کو توڑتے رومی تنظیم کو روندتے عمرو بن العاص کے پاس پہنچ گئے اور گرج کر مخاطب کیا۔

"العاص کا فرزند ارجمند روزگار کہاں ہے!"

"جنت کی دہلیز پر کھڑا ہوں یا سیف اللہ"

"تم اور یہ پسپائی"؟

"یا سیف اللہ کیا کروں دشمن کی کثرت دیکھ رہے ہیں!"

"دشمن کی کثرت کو خیال میں لاتے ہو۔ خدا کی قسم اگر اشقر کے سم ٹھیک ہوتے تو ہرقل سے کہتا اتنا ہی لشکر اور نکال کر ڈالدے"

اور رکابوں پر کھڑے ہو کر اپنے رسالوں کو آواز دی۔

"ہاں عاشقان عراق... یہی وقت ہے تمہاری آبرو کی آزمائش کا وقت ہے"

ایک ایک سوار اپنی جان سے گذرنے لگا۔ دراقص اور سرجیش اپنے اڈی گارڈز کے ساتھ جنگ کی آگ میں کود پڑے انجیل کی آیتیں پڑھ پڑھ کر فوجوں کو سنبھالنے لگے لیکن اب العاص کا بیٹا موت کے گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا اور ان کے اکثر سوار جو قبیلۂ ازد سے تعلق رکھتے تھے اپنے سردار عمرو بن طفیل کی للکاروں پر آگ ہو چکے تھے۔ جو اونٹ پر کھڑا ہوا چیخ رہا تھا۔

"اے ازدیو۔ تمہارا سپہ سالار قریش ہے۔ اپنی جانیں دے ڈالو اس کا غرور چھین لو"

جب دراقص کا گھوڑا پیچھے ہٹنے لگا اور سرجیش اپنے گارڈز کی دیوار کے پیچھے پہنچ گیا تب عمرو بن العاص نے تکبیر بلند کی اور دس ہزار آوازوں نے تکرار کے ساتھ یلغار کی اور نوے ہزار فوج کے قدم ہلا دیے اور ان کے مرکز میں گھس کر دباتے چلے گئے۔ عمرو بن العاص سوگز آگے بڑھے ہوں گے کہ مزعور بن عدی نے لگام پر ہاتھ ڈال دیا۔

"یا حضرت قلب پر چڑھیے۔ بڑے بڑے صحابہ شہید ہوئے جاتے ہیں۔ تیزی کے ساتھ قلب پر مراجعت کی تو جیسے دنیا تاریک ہونے لگی۔ باہان نے بڑی حکمت کے ساتھ رومی پرچم کے گرد کھڑے ہوئے ساٹھ ہزار زنجیر پوش پیدلوں کے ساتھ صلیب مقدس اور پرچم اعظم کو حرکت دے دی ان کی کمک پر سواروں نے جنرل دربخار نے نوے ہزار سواروں کے ساتھ یلغار کردی اور محمدی علم کو دھکیلتے ہوئے خیمہ سپہ سالار تک چلے آئے تھے۔ جہاں اصحاب رسول اللہ محمدی علم کے گرد پروانوں کی طرح قربان ہو رہے تھے۔ اور اس کے بازوؤں پر قعقاع اور عیاض اور حبیس خون میں نہا رہے تھے اور سامنے عکرمہ قریش کے سواروں کے ساتھ جنگ سلطانی لڑ رہا تھا۔ رکابوں پر کھڑے ہو کر دیکھا۔ خود سے گھوڑے کے سُم تک لہو میں تر بتر عراقی رسالہ حکم کا منتظر تھا۔

"مزعور کی کمان میں دشمن کی پشت توڑ دو"

"عکرمہ کہاں ہے"

"تلواروں کے درمیان یا سیف اللہ"

تم جیسے ناموران عرب کے سامنے محمدی علم پیچھے ہٹ گیا؟ خدا کی قسم ایسے ایک قدم پر میں اپنا سر دے دیتا۔

عکرمہ گھوڑے سے پھاند پڑا اور چیخا۔

"اے نامداران مکہ کون ہے جو میرے ہاتھ پر موت کی بیعت کرتا ہے۔!"

سینکڑوں آوازوں نے جن میں اس کے نوجوان بیٹے اور بھتیجے شامل تھے لبیک کہا۔

تمہارے سر پر محمدؐ کا علم اور سامنے سپہ سالار سیف اللہ خدا کی قسم
اس سے خوبصورت موت نہیں ہو سکتی!"
اور دونوں ہاتھوں میں نیزے لے کر اس بے جگری سے حملہ کیا جو لڑائیوں کو تاریخ ساز بنا دیتا ہے۔ سات سو قریشی نیزے جو گھوڑوں سے بچھا ند پڑے تھے دشمن کی صفیں توڑتے درنجار کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ معاذ بن جبل نے گھوڑے سے اتر کر آواز دی۔
"میں موت کی بیعت کر چکا کوئی بہادر اس گھوڑے سے انصاف کر سکے تو حاضر ہے"۔
بیٹا اچھل کر سوار ہو گیا۔
"یہ میرا حق ہے اور میں ادا کروں گا!"
اب سیف اللہؓ نے دیکھا کہ مزعور عراقی سواروں کے ساتھ دشمن کی پشت پر پہنچ چکا۔ نیزہ کھینچ لیا۔ ستر سوار جو ان کے پہلو میں کھڑے تھے ان کو دیکھا۔ وہ ایک ساتھ گرجے
"اے سپہ سالارانِ لشکرِ اسلام ہوشیار"
تین آوازوں کے بعد سیف اللہ نے نیزے کو وہ تین جنبشیں دیں جن کا مطلب تھا جنگ مغلوبہ۔ خود سیف اللہ نے تکبیر کہی اور ستر سواروں کے ساتھ رومی قلب کے داہنے پہلو پر ٹوٹ پڑے اللہ اکبر کی اٹھارہ ہزار آوازوں کی ہیبت سے ابھی درنجار سنبھلا بھی نہ تھا کہ مزعور بن عدی نے پشت پر وار کر دیا۔ رومی قطاروں میں زلزلہ آ گیا۔
عکرمہ بن ابی جہل، ضرار بن الازور معاذ بن جبل بڑے بڑے نام اسی مقام پر کھیت رہے لیکن باہان کو ہزاروں سروں کے پیچھے ہٹنا پڑا۔ اسلامی قلب کے بڑے بڑے ناموروں کی شہادت نے یقیناً سیف پر موت کا جنون طاری کر دیا تھا۔ اور وہ موج در موج یلغار کر رہے تھے۔ درنجار زخمی ہو کر گر چکا تھا۔ باہان ایک ماہر سپہ سالار کی طرح اس دہکتے ہوئے جوش و خروش کے سرد پڑنے کے انتظار میں منظم پسپائی کر رہا تھا۔ کہ دفعتاً رومی کے داہنے ہاتھ قناطر کو قناطرِ اعظم بننے کا شوق پیدا ہوا اور وہ اپنے تیس ہزار پیدلوں کو یزید بن ابی سفیان کے سواروں سے الجھا کر ساٹھ ہزار سواروں کے ساتھ باہان کی مدد کو چلنے لگا۔ لیکن اس کے مقابلے پر یزید بن ابی سفیان تھے جن کی ذہانت اور فراست اور شجاعت کا بنی امیہ میں جواب نہ تھا اور جن کے سامنے عمرو بن العاص تک سرنگوں ہو سکے
قناطر کے ہلتے ہی یزید نے ارادہ بھانپ لیا۔ اور اپنے پیدلوں کو قناطر کے پیادوں پر جھونک کر ایک ایک شتر سوار رکاب میں لے کر راستہ روک لیا لیکن ساٹھ ہزار سواروں کے سامنے سات ہزار سوار جن میں اکثر شتر سوار تھے صرف راستہ روک رہے تھے۔ اور قناطر ایک ایک بالشت بڑھ رہا تھا کہ نابغۂ روزگار سپہ سالار کو اپنے بیٹے کا خیال آ گیا۔
رومی بادلوں سے بجلی کی طرح نکلے تو دیکھا کہ یزید گھٹنوں پر کھڑا قناطر کو روک رہا ہے۔ دور ہی سے آواز دی اے بنی امیہ کی شمشیرِ بے نظیر!
قریب پہنچے تو رکابوں پر کھڑے ہو گئے۔
"تم نے اور تمہارے باپ نے ختم المرسلینؐ کے منبر پر تلواریں کھینچی ہیں۔ ان کا جھنڈا تم سے حساب مانگتا ہے... یہ روک کفارہ مانگتا ہے"
یزید سُن ہو گیا۔ پھر تڑپ گیا۔ گرجا۔
یا ابا سلیمان — یہ کیا کہہ دیا۔ یہ کیا کہہ ڈالا؟
ہم تو وہ ہیں کہ تمہارے گھوڑے کے ایک سم پر اپنا سر دے ڈالیں"
جیسے اس پر جنون طاری ہو گیا۔ گھوڑے کو اپنے حلقے میں گھمانے لگا اپنے عم زادوں کی ڈھالیں نوچ نوچ کر پھینکنے لگا۔ چیخنے لگا۔
"اے وہ جن سے قریش کی نخوت عبارت ہے۔
اے وہ جو عرب کی شجاعت کے امانت دار ہیں
اے وہ جو مکہ کی عظمت کے محافظ ہیں!
سنو خالد نے کیا کہہ دیا۔ خدا کی قسم اگر ہرقل نے کہا ہوتا تو اس پر گھوڑا ریل دیتا۔
لیکن خالد — خالد ہیں — اے بنی اعمام جانوں کو نثار کر دو کہ جان آبرو کا صدقہ ہوتی ہے۔ اپنے بنی اعمام کو سمیٹ کر قناطر کی بھیڑ پھاڑنے لگا۔ قناطر — جو قناطرِ اعظم کا خواب دیکھ رہا تھا اپنی تباہی کے لیے زندہ رہنے پر مجبور تھا۔ بے بس ہو کر منظم پسپائی پر جو عیسائی تعلیم کا سبق ہوتی ہے مائل ہوا لیکن یزید کے سواروں نے اس کے ہوئے قدموں کو دوبارہ جمنے کا موقع نہ دیا۔

(جاری ہے)

(دوسری قسط)

پروفیسر منظر عباس نقوی

جنگِ آزادی کا ایک جانباز مجاہد

حسرتؔ موہانی

ان سیاسی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ حسرتؔ کے ادبی کاموں کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ اسی زمانے میں انھوں نے اُردو شاعروں کے کلام کا وہ انتخاب کیا جو اُردوے معلیٰ اور اُس کے ضمیموں کی شکل میں کئی سال تک شایع ہوتا رہا۔ یہ انتخابات گیارہ جلدوں پر مشتمل ہیں۔

ابھی اُردوے معلیٰ کو جاری ہوئے چار ہی سال ہوئے تھے کہ حسرتؔ کو ایک مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ ۱۹۰۸ء کی بات ہے گویا غدر کی پچاسویں سالگرہ تھی۔ انگریزی حکومت ڈرتی تھی کہ کہیں پھر اس کے خلاف کوئی ہنگامہ برپا نہ ہو جائے۔ چنانچہ ہر ہر چیز پر کڑی نظر رکھی جا رہی تھی۔ اسی زمانے میں اُردوے معلیٰ میں ایک مضمون شایع ہوا جو مصر میں انگریزوں کی پالیسی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس مضمون کے لکھنے والے حسرتؔ کے ایک دوست فضل امین تھے جو علی گڑھ کالج میں تعلیم پاتے تھے۔ اِس مضمون کا لب و لہجہ کچھ بہت سخت تو نہ تھا لیکن یو۔پی کے گورنر صاحب برطانوی حکومت کے خلاف ذرا سی مخالفت کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے چنانچہ حسرتؔ موہانی پر بغاوت کا الزام لگا کر مقدمہ قائم کر دیا گیا۔ حسرتؔ نے اس مقدمے کی پیروی کرتے ہوئے انتہائی اعلیٰ کردار کا ثبوت دیا اور اُردوے معلیٰ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے قابلِ اعتراض مضمون کی ساری ذمہ داری اپنے سر لے لی اور مضمون لکھنے والے کا نام بتانے سے انکار کر دیا۔ لوگ انگریز کی مخالفت سے اتنا ڈرتے تھے کہ حسرتؔ کو اپنے مقدمے کی پیروی کے لیے کوئی وکیل تک نہ ملا۔ وہ ہر پیشی کے موقع پر خود ہی اپنی صفائی پیش کرتے رہے۔ نتیجہ ظاہر تھا کہ وہ مقدمہ ہار گئے اور عدالت نے ان کے لیے دو سال کی بامشقت قید اور پانچ سو روپے جرمانے کا حکم سنا دیا۔ حسرتؔ کے پاس دھرا ہی کیا تھا کہ وہ جرمانہ ادا کر سکتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا قیمتی کتب خانہ جو انھوں نے بڑی محنت سے جوڑا تھا محض ساٹھ روپے میں نیلام کر دیا گیا اور یہ ساٹھ روپے ان کے جرمانے میں جمع کر لیے گئے۔

مولانا گرفتار کر کے جیل لے جائے گئے تو اُس وقت اُن کے مکان پر اُن کی بیگم اور ایک خادمہ کے سوا کوئی نہ تھا۔ اُن کی دودھ پیتی بچی نعیمہ سخت بیمار تھی لیکن اُن کی بیگم نے ذرا بھی پریشانی کا اظہار نہیں کیا بلکہ دوسرے ہی روز مولانا کو جو خط لکھا اس سے ان کی ہمت اور حوصلے کا پتا چلتا ہے۔ انھوں نے مولانا کو لکھا: "تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو۔ میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا۔ خبردار تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو۔"

حسرتؔ نے "مشاہداتِ زنداں" کے نام سے اس قید کے جو حالات لکھے ہیں ان سے اُن کی بیگم کے بلند کردار کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ حسرتؔ کا بیان ہے کہ بیگم کا یہ خط پا کر ان کے دل کو بڑی قوت ملی۔ انھوں نے تار دے کر حسرتؔ کے بھائی صاحب کو علی گڑھ بلا لیا تھا جن کے ہمراہ اکثر اپنے بہادر شوہر سے ملنے جیل خانے آیا کرتی تھیں۔ ابھی حکومت کی طرف سے اخبار پر پابندی نہیں لگی تھی اس لیے بیگم نے یہ بندوبست کیا کہ روزانہ مولانا کی پسند کے اخبار انھیں جیل خانے میں بھجواتی رہیں۔

اس گرفتاری کے دو ہی روز بعد حسرت کے سیاسی گرو بال گنگا دھر تلک بھی گرفتار کر لیے گئے جس کا حسرت کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ تقریباً چالیس دن بعد حسرت کے مقدمے کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ ۴ر اگست ۱۹۰۸ء کے انھیں دو سال کے لیے سخت قید کی سزا دی گئی تھی۔ اب حسرت کچہری سے جیل واپس پہنچے تو ان کے اپنے کپڑے اتروا لیے گئے اور ایک لنگوٹ، جانگیہ اور ایک ٹوپی کرتا پہننے کے لیے اور ٹاٹ کا ٹکڑا اور کمبل اوڑھنے بچھانے کے واسطے دیا گیا۔ اس کے علاوہ بقول حسرت دو لوہے کے پیالے ایک بڑا ایک چھوٹا "دیگر جملہ ضروریات کو رفع کرنے کی غرض سے مرحمت ہوا"۔ حسرت کے مزاج میں جو درویشی تھی اُس کو اس بے سر و سامانی میں بھی جرأت کا ایک سبق مل گیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ،

ابتدا میں رہن سہن کے سامان کی اس کمی سے کسی قدر تکلیف ضرور محسوس ہوئی، لیکن بہت جلد طبیعت نے انھیں کے استعمال پر قناعت کر کے ایک عجیب و غریب سبق حاصل کیا کہ اگر انسان دنیا کی ہوس کو چھوڑ دے تو زندگی کی ضرورتیں اس قدر کم ہیں اور وہ بھی اتنی آسانی کے ساتھ فراہم ہو سکتی ہیں کہ انسان کو جبر و ستم یا مکر و فریب کے طریقے اختیار کرنے یا دوسروں کی غلامی منظور کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

کچھ ہی دنوں بعد حسرت کا تبادلہ علی گڑھ جیل سے الٰہ آباد جیل کو کر دیا گیا۔ حکومت نے سفر کے اخراجات کے لیے کرایہ ریل کے سوا کچھ نہیں دیا تھا یہاں تک کہ ایک آنہ روز کے حساب سے قیدیوں کی خوراک کے لیے جو رقم دی جاتی تھی وہ بھی منظور نہیں کی گئی تھی چنانچہ الٰہ آباد پہنچنے تک دو مٹھی بھنے چنوں کے سوا کھانے کو کچھ نہ ملا۔ حسرت الٰہ آباد کی سنٹرل جیل میں داخل ہوئے تو علی گڑھ جیل کے کپڑے اتار لیے گئے اور کہا گیا کہ یہاں کے کپڑے کچھ دیر میں ملیں گے، اس وقت تک کالے کپڑے پہنو۔ وہ کالے کپڑے اتنے گندے اور بدبودار تھے کہ بیان نہیں ہو سکتا لیکن مجبوراً مولانا کو وہی کپڑے پہننے پڑے۔

مولانا کے لیے چکی پیسنے کی مشقت تجویز ہوئی تھی۔ یہ چکی بڑی بھاری ہوتی ہے اور دو قیدی مل کر چلاتے ہیں۔ مولانا اور ان کے ساتھی قیدی کو ایک من گیہوں روزانہ پیسنا پڑتا تھا اگر چالیس سیر آٹا دو چھٹانک بھی کم ہو جاتا تو جیلر کے سامنے پیشی ہو جاتی۔ مولانا لکھتے ہیں:

"بعض قیدی کافی خوراک نہ پانے کے سبب سے مجبوراً کچا غلہ چبا ڈالتے ہیں اور بعد میں آٹا پورا کرنے کے لیے گیہوں میں مٹی یا جوار یا چاولوں میں پانی ملا دیتے ہیں۔ جو لوگ نہیں کھاتے انھیں بھی کچھ نہ کچھ ملانا ضرور پڑتا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ آٹا پیسنے کے دوران میں کچھ تو چکی میں رہ جاتا ہے اور کچھ اڑ کر ہوا میں مل جاتا ہے، کچھ پیسنے والوں کے بدن پر پسینے کے ساتھ جم جاتا ہے۔ داروغہ صاحب علانیہ فرماتے تھے کہ جو چاہو کرو۔ ہم کو آٹا پورا دو، ورنہ ہم پیشی کر دیں گے۔"

غرض الٰہ آباد سنٹرل جیل میں لگ بھگ ایک سال تک مولانا چکی بھی پیستے رہے اور شاعری بھی کرتے رہے۔ یہ شعر انھیں دنوں کی یادگار ہے،

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

اس زمانے میں حسرت نے بہت سی غزلیں کہیں جن کے چند اشعار ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

توڑ کر عہدِ کرم ناآشنا ہو جائیے
بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے
ہم نے اس شوخ کو مجبورِ حیا دیکھا ہے

نیاز فتح پوری نے اپنے ایک مضمون میں صحیح لکھا ہے کہ حسرت کا یہ رنگ جیل جانے سے پہلے ہی اپنا ایک خاص اسلوب قائم کر چکا تھا لیکن اس کو علی گڑھ اور الٰہ آباد کے قید خانوں میں پختگی حاصل ہوئی اور یہ رنگ اُن کی شاعری میں بہت دنوں تک قائم رہا۔

اِسی قید کے زمانے میں جب رمضان کا مبارک مہینہ آگیا تو مسلمان قیدیوں میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی۔ حسرت لکھتے ہیں کہ سب قیدیوں نے روزے رکھے اور سحر و افطار کے وقت ایک جگہ بیٹھ کر کھانے کا انتظام کر لیا۔ حسرت پر ذاکر نام کا جو قیدی نگرانی کے لیے مقرر تھا اس کے سخت دل پر بھی اس مبارک مہینے کا یہ اثر ہوا کہ ایک روز حسرت سے کہنے لگا بھائی حسرت میری جانب سے سختی کا خوف آپ اپنے دل سے نکال دیجیے۔ مجھ سے جو کچھ کہا گیا ہے وہ میں کچھ نہ کروں گا بلکہ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو یا جو تکلیف ہو مجھ سے بے تکلف کہہ دیجیے گا! حسرت کا بیان ہے کہ ذاکر نے اس غیر معمولی برتاؤ نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ اُس نے جو کچھ کہا تھا سچے دل سے کہا تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ اُس کے بعد جب تک وہ اِن قیدیوں کی بارک میں رہا روزانہ شام کو اپنے کارخانے سے افطار و سحر کے لیے مختلف قسم کی چیزیں پکا کر لاتا رہا اور سب کے ساتھ کھانے میں شریک رہا۔

حسرت نے اس شعر میں اِسی رمضان کو یاد کیا ہے:

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

غرض سال بھر تک الٰہ آباد کی نینی سنٹرل جیل میں روزانہ ایک من آٹا پیسنے کے بعد ۱۹۰۹ء میں مولانا رہا ہو کر گھر آ گئے۔ رسالہ اُردوئے معلیٰ پھر سے جاری ہو گیا اور مولانا نے انگریزی حکومت کی مخالفت میں پھر پُرجوش مضامین لکھنے شروع کر دیے۔ بعض دوستوں نے جو مولانا سے ہمدردی رکھتے تھے انھیں یہ مشورہ دیا کہ سیاست سے بالکل کنارہ کش ہو جائیں۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ اگر ہندوستانی عوام کی حمایت کا ایسا ہی خیال ہے تو کانگریس کے نرم دل کی روش اختیار کریں۔ مولانا کسی مصلحت کی وجہ سے اپنی روش کو بدلنے والے انسان نہ تھے۔ انھوں اُردوئے معلیٰ میں ایک مضمون لکھا اور اس میں اپنے اِن دوستوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اعلان کر دیا کہ اُن کی نظر میں مذہبی یا سیاسی عقیدے کو کسی خوف یا مصلحت کے خیال سے ترک یا تبدیل کر دینا اخلاقی گناہوں میں سے ایک بدترین گناہ ہے۔ انھوں نے لکھا کہ سیاسی معاملات میں ہماری پالیسی وہی رہے گی جو مسٹر تلک اور آربندو گھوش کی ہے یعنی ملک کے لیے مکمل آزادی کا مطالبہ۔ مولانا کا کہنا تھا کہ ایشیا بھر میں ہندوستان کے سوا کوئی اور بڑا ملک ایسا نہیں جو آزادی کی نعمت سے محروم ہو رہا۔ کانگریس کا نرم فریق تو ان حضرات کا مقصد اس سے زیادہ نہیں کہ ہم غلام سے ترقی یافتہ غلام اور محکوم سے خوش حال محکوم بن جائیں۔

اس زمانے میں سودیشی تحریک کو مقبول بنانے کے لیے دُور دُور کے سفر کیے ایک ایسے سفر کے بارے میں مولانا سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"میری حسرت کی ملاقات ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔ لکھنؤ کے اخبار "حق" کے دفتر والے مکان میں میں رہتا تھا۔ مولانا کو شب میں ایک بار وہیں قیام کرنا پڑا۔ سردی کا زمانہ تھا اُن کے پائنتی ایک کمبل رکھ دیا گیا جو اتفاق سے ولایتی تھا۔ حسرت نے رات سردی میں اسی طرح کاٹ دی مگر وہ کمبل نہیں اوڑھا۔"

سودیشی مال کی یہ حمایت وہ اُس زمانے میں کر رہے تھے جب کہ عام طور پر لوگوں میں بدیشی چیزوں کے استعمال کا شوق بڑھا ہوا تھا۔ اُن کی کوششوں سے یہ تبدیلی آئی کہ ملک بھر میں جگہ جگہ بدیشی مال کا بائیکاٹ کرنے کے لیے جلسے اور اسٹرائیک ہونے لگے اور بدیشی کپڑوں کی ہولیاں جلنے لگیں۔

(تیسری قسط اگلے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔)

شاہد حسن رضوی
شعبۂ طبیعیات،
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کہانی الیکٹرانکس کی

ریڈیو کی ایجاد سے سماج میں وہ ولولہ پیدا ہوا کہ جب تصویر کے ارسال کی پیش کش کی گئی تو کسی نے بھی اس تجویز پر لبیک کہا اور ٹیلی وژن کے خواب کی تکمیل کی کوششیں ایک ساتھ چار ممالک ریاست ہائے متحدہ، برطانیہ، جرمنی اور فرانس میں زور و شور کے ساتھ شروع کر دی گئیں۔ تحقیق کے لیے درکار سرمایہ بڑی فراخ دلی سے مہیا کیا گیا اور امریکی سائنس دانوں اور انجینیوں نے بڑے منظم ڈھنگ سے کام کرتے ہوئے اس نہایت مشکل کام کو عملی جامہ پہنانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اس تنظیم کے ذریعہ انھوں نے ایک اور پہلو پیدا کیا اور وہ یہ کہ الکٹرانکس کو تقریباً وہی درجہ دلا دیا جو سماج میں شاید ادویات و جراحی کو حاصل تھا۔ الکٹرانکس کو کم و بیش سوشل سائنس تسلیم کیا جانے لگا۔ اس اثنا میں انھوں نے ٹیلی وژن سے متعلق بہت سی ایجادات کیں اور بہت سے نئے علوم و فنون میں قدرے مہارت حاصل کر لی۔ ایپلائڈ الکٹران آپٹکس (APPLIDE ELECTRON OPTICS) کے مختلف زاویوں پر عبور حاصل کیا گیا کیتھوڈ رے ٹیوب CATHODE RAY TUBE) کو عکس ریسیو (RECEIVE) کرنے کے قابل بنا لیا گیا۔ فوٹو سیل (PHOTOCELL) کو امیج سنسر یعنی عکس محسوس کرنے کا آلہ (IMAGE SENSOR) کے طور پر استعمال کرنے کی سعی کی گئی اور آئی کانو سکوپ (ICONOSCOPE) ایجاد کیا گیا جس سے تشریح عکس کا کام نہایت باریکی اور نزاکت کے ساتھ لیا گیا۔ یہ آلہ اسٹوریج کے نظریہ (STORAGE PRINCIPLE) کا بڑی خوبی کے ساتھ فائدہ اٹھاتے ہوئے تیار کیا گیا تھا۔ گہرے پانی میں بیٹھ کر کی گئی اس ایپلائڈ ریسرچ کی تہ میں دراصل رنگین ٹیلی وژن بنانے کا خواب موجیں لے رہا تھا اور اس خواب کے حقیقت بن جانے کے امکانات اس سیکوئنشیل پراسس (SEQUENTIAL PROCESS) میں نظر آئے جو نپکو وڈسک (NIPKOV DISK) پر مبنی تھا اور جس کی وکالت ریاست ہائے متحدہ کی سی بی ایس کمپنی اور برطانیہ کے بائرڈ نے کی تھی۔ بائرڈ نے ایک کمپنی بنائی اور ۱۹۳۶ء میں باقاعدہ کاروباری سطح پر رنگین ٹیلی وژن کی کارکردگی سب کے سامنے ڈیمانسٹریٹ کر دکھایا۔

ان سب کے باوجود معاشرتی پریشانیاں زبردست پیمانے پر آڑے آئیں اگرچہ ان کا حل قدرے معمولی تھا مگر فوری طور پر سائنس دانوں اور ٹیکنیشینوں کی پکڑ میں نہ آسکا کیونکہ انھوں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا۔ پریشانی یوں پیدا ہوئی کہ ٹیلی وژن نہ صرف تفریح کا ایک ذریعہ ہے بلکہ زمانہ حاضر کی تہذیب کا ایک معاشرتی خدمت گزار بھی ہے۔ چنانچہ معاشرہ آڑے آیا۔ ہاں ریاست ہائے متحدہ میں ان پریشانیوں سے ذرا کم دو چار ہونا پڑا کیونکہ وہاں کی سرکار ریڈیو تنظیم کے قیام کے دوران اسی قسم کے دور سے گزر چکی تھی اور وہاں ۱۹۲۷ء میں فیڈرل ریڈیو کمیشن (FEDERAL RADIO COMMISSION) کا قیام کیا جا چکا تھا۔ مگر پھر بھی دس سال تک اپنی مالکوں کو بڑی محنت سے دھار دہار کر وہاں کے جرأت مند اہل نظر قومی ٹیلی وژن سسٹم کمیٹی NATIONAL TELEVISION SYSTEM COMMITTEE, NTSC) کی تشکیل کرانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ اس کمیٹی نے بالآخر مئی ۱۹۴۱ء میں وہ نمونے مرتب کر لیے جن سے آواز کی پرواز اور ٹیلی وژن کی نشریات کے بابت قواعد کی سفارش کی گئی اور امریکی قوم نے ان تمام سفارشات کو مان بھی لیا۔ اس کمیٹی نے بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیا

اپنی سفارشات میں رنگین ٹیلی ویژن کے لیے موزوں ضروریات کا خانہ بھی پیدا کیا۔ ۳۰ اپریل ۱۹۳۹ء کو نیویارک شہر میں لگے عالمی میلے کا جب صدر روزولٹ نے افتتاح کیا تو اس موقع کو ٹیلی ویژن کے ذریعے دکھایا گیا اور نیویارک کے شہریوں نے جھوم جھوم کر ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔ یہ پروگرام نیشنل براڈکاسٹنگ کارپوریشن (این بی سی) ٹرانسمیٹر کے ذریعہ نشر کیا گیا تھا اور اس میں چوڑا ماڈولیشن بینڈ (جو چار میگاہرٹز سے زائد تھا) کام میں لایا گیا تھا۔ تصویریں بہت صاف نظر آئی تھیں اور آواز بھی صاف سنائی دی تھی۔ اس کامیابی کا سہرا دراصل این ٹی ایس سی کی اس سفارش کے سر جاتا ہے جو اس نے ایک نئے ماڈولیشن یا اس وسٹی جیل سائڈ بینڈز VESTIGIAL (SIDEBAND) کی پیش کش اور سفارش کر کے کی تھی۔ اس طریقہ میں آواز کو تو فریکوئنسی ماڈولیٹ (FREQUENCY MODULATE) کر لیتے ہیں مگر تصویر والے سگنل کو ایمپلی چیوڈ ماڈولیٹ کرا کے اس کے نچلے سائڈ بینڈ کو تین چوتھائی حصے زیادہ دبا دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے کل نشر کیے جانے والے بینڈ کی چوڑائی خاصی کم ہو جاتی ہے۔

دراصل تصویر میں اتنی باریکیاں اور نزاکتیں، پیچیدگیاں اور لطافتیں موجود ہوتی ہیں کہ ان تمام صفات کے تحفظ کے ساتھ نشر کرانے کے لیے بہت چوڑی بینڈ وڈتھ کی ضرورت درکار ہوتی ہے۔ ٹیلی ویژن کے اسکرین (SCREEN) پر ملنے ڈولنے والی تصویریں درحقیقت اسی اصول پر مسلسل دکھائی دیتی ہیں جس پر سینما کی تصویریں مسلسل ہونے کا گمان پیدا کرتی ہیں یعنی اگر یکے بعد دیگرے اتاری گئیں کوئی سولہ یا اس سے زائد تصویریں ایک سکنڈ کے وقفہ میں ایک ہی اسکرین پر فوکس (FOCUS) کی جائیں تو دیکھنے والے کی آنکھوں کو یوں لگے گا گویا تصویریں چل پھر رہی ہوں اور ان میں زندگی بھر دی گئی ہو۔ ٹیلی ویژن میں عموماً ۲۴ فریم فی سکنڈ بدلتے ہیں اور ہر فریم کھڑی اور پڑی لائنوں (جن کی روشنی یکساں نہ ہو کر اصل تصویر کے ہر نقطہ کی روشنی کے مطابق ہوتی ہے) کے اجتماع سے مل کر تیار ہوتا ہے۔ اس عمل کے لیے تصویر کو مخصوص کیمرے کی مدد سے اتارا جاتا ہے اور اس میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ کتنا سیاہ اور کتنا سفید، کون سا حصہ ہے اس کے مطابق اوپر سے نیچے اور دائیں سے

دائیں جانب والے سگنل تیار کیے جائیں۔ گویا سین (SCENE) کے ہر حصہ کا باریکی کے ساتھ جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس عمل کو سیمپلنگ (SAMPLING) گردانا جاتا ہے۔ چنانچہ تصویر کے مجموعی سگنل میں بہت کم (۰ ہرٹز سے بھی کم) سے لے کر بہت زیادہ یعنی کوئی ۴۵ لاکھ ہرٹز تک کی فریکوئنسی موجود ہوتی ہے۔ پھر اس سگنل کو اس میں موجود سب سے زیادہ فریکوئنسی سے بھی کئی گنا زیادہ موزوں فریکوئنسی پر سوار کرا کے نشر کرا دیا جاتا ہے۔

چند مشکلات جن کا سامنا ماہرین کو کرنا پڑا اور جن پر قابو پائے بغیر ٹیلی ویژن کا خواب غالباً تکمیل کو نہ پہنچ پاتا یا شاید تجربہ گاہوں تک محدود رہ گیا ہوتا۔ پہلی مشکل تو ایسے وائڈ بینڈ ایمپلی فائروں کی تشکیل سے متعلق تھی جس سے اتنی کم تا اتنی زیادہ فریکوئنسی والے سگنل کو خاطر خواہ درجے تک بغیر کسی خرابی کے ایمپلی فائی کرایا جا سکے اور دوسری مشکل ان کو نشر کرانے کی تھی۔ اگر ٹیلی ویژن کے ماڈولیٹ کیے ہوئے سگنل کو یونہی اینٹینا (ANTENNA) لگا کر نشر کرایا جائے تو یہ لہریں ایک محدود دائرہ تک اثر پذیر ہوتی ہیں اور ان کے آگے یا تو پائی ہی نہیں جاتیں یا اتنی لاغر ہو جاتی ہیں کہ ان سے کوئی حاصل نہیں۔ یہاں میں ایک موازنہ کر کے اس بات کو صاف کرنے کی کوشش کروں گا۔ میڈیم لہروں اور شارٹ لہروں پر سوار آواز کو نشر کرانے میں ہماری زمین کے گرد کی سطحوں آئنوسفیر (IONOSPHERE) اور کینیلی ہیوی سائڈ پرت کی خدمات لی جا سکتی ہیں اور زمین کی سطح خود ان کو منعکس کرا سکتی ہے مگر جن لہروں پر ٹیلی ویژن کا سگنل سوار ہوتا ہے وہ اتنی زیادہ فریکوئنسی کی ہوتی ہیں کہ یہ تمام پرتیں جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے ان لہروں کے آگے بے بس ہو جاتی ہیں اور انہیں اپنے اندر سے نکل جانے دیتی ہیں۔ اب صرف ایک طریقہ بچا اور وہ یہ کہ نظر کی سیدھ میں ان کو نشر کرایا جائے اور جہاں تک یہ پہنچ جائے غنیمت۔ اس نظر کی سیدھ میں نشر کیے جانے والے طریقہ میں ہماری زمین کا گول ہونا بھی آڑے آ جاتا ہے۔ مگر ماہرین نے ہمارے دور دراز کے پروگراموں سے لطف اندوز ہونے کی تڑپ کا احترام کرتے ہوئے ایسی کواکسیل (COAXIAL) لائنیں بچھانے کا تجربہ کیا جن کے ذریعہ یہ سگنل دور تک لے جائے جا سکتے تھے۔ اب پہلا تجربہ کامیابی کے ساتھ نیویارک اور فیلاڈلفیا شہروں کے درمیان

لائنیں بچھا کر ۱۹۳۰ء میں کیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک چکر اور ہوا، وہ یہ کہ سگنل میں موجود بہت چھوٹی فریکوینسیوں کو گھریلو اور صنعتی کاموں میں کام آنے والی ایسی ہی فریکوینسیوں سے رخنہ پیدا ہو رہا تھا۔ یہ دشواری بھی دور کی گئی۔

ٹیلی ویژن فراہم کردینے کی شروعات دوسری عالمی جنگ کے ابتدائی دنوں کی تھی اور ریاستہائے متحدہ کے اس جنگ میں شامل ہو جانے سے اس کو اعلیٰ ترین صنعت بن جانے کا فوری شرف تو نہ حاصل ہو سکا مگر جنگ کے اختتام پر یکایک اتنی مانگ ہوئی کہ ۱۹۵۱ء تک صرف ریاستہائے متحدہ میں کوئی دو کروڑ اسی لاکھ سیٹ بک چکے تھے یعنی ہر گھر میں ایک ٹی وی آ گیا تھا۔

۱۹۵۳ء کا سال ایک اور اہمیت اپنے اندر سموئے ہوئے آیا۔ اس سال تصویر کے سگنل کو مائکرو ویو ریلے MICRO WAVE RELAY کے ذریعہ دور دور تک پلک جھپکتے میں پہنچانے کی ترکیب عملی شکل میں سامنے آ گئی۔ پھر کیا تھا ہزاروں میل دور سے پلوں میں رابطہ قائم ہو گیا۔

* * *

اسٹیفن لالنر
ترجمہ : مناظر عاشق ہرگانوی
مارواڑی کالج ، بھاگل پور

وعدے کے پھول

ایسا لگا کہ ہم سراب دیکھ رہے ہیں۔ نیلی اور سنہری چمک کے پھول یہاں کیسے ؟ کیلیفورنیا کے اس "موزاوے" ریگستان میں ؟

ریگستان کی سخت گرمی سے بچنے کے لیے ہم تین بجے ہی نکل پڑے تھے۔ ڈبوں میں پینے کا پانی اور کار میں پٹرول بھر لیا تھا۔

یکایک ہمیں ریت کے ٹیلوں کے بدلے پھولوں کی کیاریاں نظر آئی تھیں۔ میلوں تک زمین طرح طرح کے پھولوں سے ڈھکی پڑی تھی —— کتنے تعجب کی بات تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک مکان کے پاس آ پہنچے۔ یہاں لاریوں میں پھولوں کے بیج کے تھیلے بھرے جا رہے تھے۔ میری بیوی نے مشورہ دیا کہ یہاں تھوڑی دیر ٹھہر کر پھول خریدیں اس سے ریگستان کا سفر کچھ سرور انگیز اور شادماں ہو جائے گا۔

آفس میں ہمیں ایک آدمی نظر آیا۔ اس نے جواباً کہا "معاف کیجئے ہم پھول نہیں بیچتے صرف بیج فروخت کرتے ہیں۔ کیا آپ خود پھول نہیں توڑ سکتی ہیں؟" اس نے میری بیوی کی طرف قینچی بڑھاتے ہوئے کہا۔ پہلے ہم نے کچھ بیج خریدے پھر پہلی ہی کیاری میں پھول توڑنے لگے۔

لیکن اسی وقت ایک بوڑھا آدمی ہماری طرف آتا نظر آیا۔ سخت دھوپ ہونے پر بھی اس نے سر پر ہیٹ نہیں لگایا تھا۔ چاندی سے چمکتے سفید بالوں کی ایک لٹ اس کے دھوپ سے تپے ہوئے بھورے چہرے پر لہرا رہی تھی۔

وہ پیلے رنگ کے پائپ سے دھوئیں کے گاڑھے بادل نکالتا ہوا ہمارے قریب آ گیا۔ ہمیں پس و پیش میں دیکھ کر وہ خود ہی بولا "آپ کو میرے پھول پسند آئے۔"

"جی ہاں! آپ کے نوکر کی اجازت سے ہم پھول . . ."

اس نے بات کاٹ کر کہا "مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ نے میرے ان پھولوں کو اپنایا ہے۔ میرے تو لاکھوں بیچے ہیں۔" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

مارگریٹ نے مسکراتے ہوئے بوڑھے سے کہا "پھولوں کے درمیان رہنے میں کتنی مسرت حاصل ہوتی ہوگی۔ آپ یہاں کب سے رہتے ہیں؟"

"زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔"

"مگر آپ کے آنے سے پہلے تو یہاں ایک بھی پھول نہ رہا ہوگا؟ باغبانی کے لیے اس ریگستان میں جگہ پسند کرنے کی آخر وجہ . . . ؟"

بوڑھے کے کتابی چہرے پر رنج و غم کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی "کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ میں نے یہ جگہ کیوں پسند کی؟ ٹھیک ہے میرے ساتھ چلیے میں آپ کو بتاتا ہوں۔"

وہ ہمیں نوکیلی چھت والے ایک مکان کی طرف لے گیا۔ یہ اسپینش طرز کا مکان تھا۔ ایک چھوٹے سے باغ میں ایک قبر پر ہری ٹہنیاں جھکی ہوئی تھیں اور وہ پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔

"یہاں میری بیوی سوئی ہوئی ہے۔" بوڑھے نے بتایا۔

قبر پر لکھا ہوا تھا :

جین پورٹر ۱۸۷۴ — ۱۸۹۴

فیل پورٹر ۱۸۷۰ ،

* * *

"فل، فل، ٹھہر جاؤ۔ مجھ سے اب زیادہ سہا نہیں جاتا ——"

جین کی درد بھری آواز سن کر فل نے گاڑی کھڑی کر دی۔ ریگستان کی بے رحم دھوپ سے بچانے کے لیے اس نے جین کو پیچھے بٹھا کر اپنی بیوی کو اس پر لٹاتے ہوئے اس نے پوچھا "کچھ کھاؤ گی؟"

جین ایک گھونٹ پانی پی کر بولی "باسٹرو شہر یہاں سے کتنی دور ہے؟"

فل کا ایک چچا باسٹرو میں رہتا تھا وہاں اس کا ایک بڑا فارم تھا۔

یہ لوگ چچا کے پاس سردیاں گزارنے کے لیے مشرق کی طرف سے آ رہے تھے۔ میشی گن کی سردیاں جین کے لیے خطرناک تھیں۔ بہت سے بیار کیلیفورنیا آ کر تندرست ہو جاتے تھے ــــ ریل گاڑی میں یہ لوگ سینٹ برنارڈینو تک پہنچ گئے تھے۔ یہاں آ کر ان دونوں نے ایک گھوڑا گاڑی خریدی تھی۔ اور اب ریگستان کو پار کر رہے تھے۔

"اب ڈیڑھ دن کا راستہ رہ گیا ہے۔"

جین کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا تھا۔ فل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

شام کی دھندلی روشنی میں آہ بھرتے ہوئے جین بولی "تو تمہیں کیا یقین ہے کہ ہم صحیح راستے پر ہیں؟ مجھے تو اس راستے کا کوئی اختتام نہیں دکھائی دیتا۔ کتنا لمبا راستہ ہے ـــ لا انتہا ـــ اور ابھی تک کتنی دیر ـــ"

"گھبراؤ نہیں اب دور نہیں ہے۔"

تھوڑی دیر میں اندھیرے نے لمبے لمبے قدم بڑھا کر سارے افق کو ڈھک لیا۔ جین نے کراہتے ہوئے کہا "کاش میں چچا کے فارم تک پہنچ سکتی۔ وہاں انسانوں اور تازہ پھولوں کے بیچ مرنے میں مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔ مگر یہاں آخری لمحے میں کچھ خوبصورتی نظر نہیں آتی۔"

"تمہیں مرنے کی بات نہیں کرنی چاہیے۔ باسٹرو میں ڈاکٹر مل جائے گا اور تم پھر تندرست ہو جاؤ گی۔"

فل گاڑی میں سے کچھ لکڑیاں لے آیا اور اس نے جین کے پیروں کے پاس آگ جلائی۔ آگ کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ جین کا چہرہ بالکل پھیکا پڑ گیا ہے۔

آسمان میں اب تارے ٹمٹمانے لگے تھے۔

جین آہستہ سے بولی "میں یہاں اس ریگستان میں اکیلی مر جاؤں گی۔ فل، کیا میری قبر پر ایک آدھ پودا بھی نہیں لگایا جائے گا؟"

"ایسی باتیں مت کرو۔ سونے کی کوشش کرو۔"

"فل وعدہ کرو ـــ ایک آدھ پودا ـــ جو برسوں میں ایک بار بھی پھولتا ہو ـــ اب میں سو جاؤں گی ـــ میں پھولوں کے خواب دیکھوں گی ـــ خوب سارے پھول۔"

* * *

بوڑھے نے عینک اتار کر آنکھیں صاف کیں "وہ اس رات مر گئی۔ یہاں اس جگہ ـــ! یہاں کے موسم کی وجہ سے مجھے فوراً ہی اسے دفنا دینا پڑا۔ تھوڑی دور پر مجھے آدھا مرجھایا ہوا ایک پودا مل گیا۔ اس ریگستان میں اس پودے کو دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ امید نہ تھی کہ وہ جڑ پکڑ سکے گا اور جم جائے گا۔ میں نے قبر کی تھیلی بھر مٹی باسٹرو لے جانے کے لیے لے لی تھی۔

کچھ عرصہ بعد میں نے وہ مٹی تحقیق کے لیے بھیج دی۔ سائنسی جانچ سے معلوم ہوا کہ اس مٹی میں پودوں کے لیے سبھی ضروری خاصیتیں ہیں۔ کمی صرف پانی کی ہے۔

جب میں نے کچھ پیسہ کمایا تو احساس ہوا کہ مجھے اس جگہ لوٹنا ہے۔ میرا ایک چچیرا بھائی میرے ساتھ تھا۔ ہم نے یہاں آ کر دیکھا کہ جو پودا میں نے قبر پر لگایا تھا وہ ہرا بھرا تھا اور کافی بڑا ہو گیا تھا۔

ہم نے فوراً کھدائی شروع کر دی، اور آخر میں پانی مل گیا۔

اور اس طرح میں نے جین سے اس کی قبر پر پھولوں کے پودے لگانے کا وعدہ پورا کر دیا۔ دیکھو میں نے کتنے پھول اس کے لیے لگا دیے ہیں۔" بوڑھے نے پودوں کی طرف شفقت اور ناز سے اشارہ کیا۔

میری بیوی بولی "جین کی آخری خواہش آپ کے لیے بڑی آرام دہ ثابت ہوئی۔"

بوڑھے نے سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں! سرکار سے زمین پانا بہت آسان تھا۔ جو جتنی زمین چاہے گھیر لے اور کارندے کو مطلع کر دے۔ ایک پیسہ بھی مجھے خرچ کرنا نہیں پڑا۔ آج جین اور میرے بیج اس ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔"

میں نے بیجوں کا پیکٹ جیب سے نکالتے ہوئے کہا "ہم ان بیجوں کو بوئیں گے۔ اور اس خوبصورت مقام کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔"

فل نے بیجوں کے پیکٹ پر چھپی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں ایک جوان عورت کی تصویر تھی جس کے کالے بالوں میں پھول لگے ہوئے تھے۔

بوڑھا بولا "یہ جین ہے۔ میں نے اس کے ساتھ کیا ہوا اپنا وعدہ نبھایا ہے۔"

* * *

ابنِ سیف

اصلاحِ معاشرہ اور طنزیہ ادب

کینسر اور طاعون یا اسی طرح کے دوسرے مہلک امراض جن سے آدمی ہمیشہ دور بھاگتا ہے اور انھیں اپنے قریب بھی بھٹکنے نہیں دیکھنا چاہتا۔ خدانخواستہ اگر کسی ایسے ہی خطرناک مرض میں گرفتار ہو جاتا ہے تو جلد از جلد اس سے چھٹکارا پانے کے لیے کسی اچھے ڈاکٹر اور حکیم کے پاس فوراً آجاتا ہے تاکہ ان کی دوائیں استعمال کرکے صحت یاب ہو جائے۔ اس میں کسی طرح کا تساہل نہیں کرتا مبادا کہیں وہ مرض اس کی ہلاکت کا سبب نہ بن جائے۔

سائنسی ارتقاء کے اس دور میں جہاں مختلف النوع بیماریوں کی ایجادات بھی بڑی برق رفتاری سے ہو رہی ہوں اس بات کی اشد ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ بیماریوں کی تشخیص کے ساتھ ان کی دوائیں بھی بنائی جائیں تاکہ ان کے ذریعہ آدمی اپنے آپ کو صحت مند بنا کر سکھ اور چین کی نیند سو سکے۔

بیمار صرف انسان کا جسم ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ روحانی اور اخلاقی بیماریوں کا بھی شکار ہوتا ہے۔ وہ صرف گوشت اور ہڈیوں کا مرکب نہیں ہے کہ جسمانی آزار ہی اس کی صحت کو خراب کریں اس کے اندر ایک روح نامی ایک شے بھی پائی جاتی ہے جس کے ذریعہ وہ حرکت کرتا ہے۔ یہ روح بھی بیمار ہوتی ہے۔ لیکن اس کی بیماری کا بیشتر انسان شعور نہیں رکھتے۔ ایسے مریضوں کو جنھیں اپنی بیماریوں کی خبر نہ ہو ان کا علاج کرنا آسان نہیں ہوتا۔ مریض اسی وقت دوا کھانے پر آمادہ ہوتا ہے جب اسے معلوم ہو کہ وہ بیمار ہے۔

انسانی معاشرے میں اخلاقی و روحانی بیماریوں کی نشاندہی اور ان کے علاج کے مختلف طریقے دریافت کیے گئے ہیں اور ان دریافت شدہ طریقوں کو عمل میں لانے کے مختلف ذرائع اپنائے گئے ہیں ان ہی میں ایک ذریعہ ادب بھی ہے۔ جس کے ذریعہ انسانی زندگی کی تعمیر ہوتی ہے۔ جو ادب زندگی کی تعمیر نہیں کرتا وہ مشغلۂ وقت گزاری تو ہو سکتا ہے مگر ادب نہیں۔ قرآن کے الفاظ میں وہ "لہو الحدیث" ہے۔ اس تعمیری ادب کا بہترین نمونہ خدا کی کتاب قرآن میں ہمیں ملتا ہے جو ادب عالیہ کا عظیم شاہکار ہے۔ جس نے اپنے کلام سے عربوں کی زبانیں گنگ کر دی تھیں اور وہ اس سے بہتر کلام نہیں پیش کر سکے تھے۔

ادب کے مختلف اسلوب اور انداز بیان ہوتے ہیں۔ ان اسالیب یا اصناف میں ایک انداز طنز و مزاح کا بھی ہے۔ مریض اس دوا کو بڑی آسانی کے ساتھ ہنس ہنس کے کھا لیتا ہے۔ قرآن پاک نے بھی اس اسلوب کا استعمال بہت اچھے ڈھنگ سے کیا ہے۔ یہاں صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ نافرمان لوگ جو خدا کے باغی ہوتے ہیں ان کے متعلق کہتا ہے "فبشرھم بعذاب الیم" انھیں دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو۔ اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔ اس طنز کی خوبی یہ ہے کہ اس میں بلا کی کاٹ ہوتی ہے تھوڑی سی دوا کبھی بڑے سے بڑے مرض کو نکال کر پھینک دیتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ عرض کرتا ہوں جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ کبھی کبھی ایک لمبی تحریر میں وہ اثر نہیں ہوتا جو چند جملوں کے نشتر میں ہو جاتا ہے۔

مولانا مودودیؒ سے ایک صاحب نے کہا!

مولانا جن مسائل میں آپ نے اکابر علماء اور سلف کے حوالے بھی دیے ہیں۔ ان میں بھی بہت سے لوگ آپ کو گالیاں دیتے ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

مولانا نے فرمایا!

"وجہ تو گالیاں دینے والے ہی بتا سکتے ہیں۔ مگر میں ان گالیوں کو جمع کرکے محفوظ کرتا جا رہا ہوں۔ انشاء اللہ قیامت کے روز میں ان کا یہ تبرک ان بزرگوں کی خدمت میں پیش کر دوں گا اور ان سے عرض کروں گا کہ یہ دراصل تھیں تو آپ کے لیے مگر یہ غلط فہمی کی وجہ سے میرے پاس پہنچ گئیں!"

اگر طنز میں مزاح کا پہلو نہ ہو اور اس کا لہجہ اور الفاظ بھی درست نہ ہوں تو وہ بیہودگی کہلائے گا۔ اس میں ایک مقصد بھی پوشیدہ ہوتا ہے، وہ نفسیات انسانی کو اپیل کرتے ہوئے اس کے مختلف جذبات کو حرکت میں لاتا ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے حوالے سے طنز و مزاح کا مقصد بتلاتے ہوئے کہتے ہیں:-

"ہجو یا ہجا (طنزیات کے مفہوم میں) کا مقصد یہ ہے کہ کسی بے ڈھنگے یا مضحکہ خیز واقعہ یا حالت پر ہمارے جذبۂ تفریح یا نفرت کو تحریک ہو بشرطیکہ اس ہجو یا طنز میں ظرافت یا خوش طبعی کا عنصر نمایاں ہو اور اسے ادبی حیثیت بھی حاصل ہو اگر ان حیثیتوں کا فقدان ہو تو پھر یہ گالی گلوج یا دہقانوں کی طرح منہ چڑھانا ہوگا!"

مزید براں رشید صاحب نے اس اسلوب کو اپنانے کے لیے کچھ شرطیں بھی بیان کی ہیں جو عربوں میں رائج تھیں۔ وہ شرطیں آج بھی اپنائی جا سکتی ہیں،

۱۔ جو چیز فی نفسہٖ قبیح یا مکروہ ہے اس کی ہجو کی جا سکتی ہے
۲۔ جسمانی یا فطری نقائص کی مذمت ناروا ہے۔
۳۔ آبا و اجداد کی فروگذاشتوں یا اولاد کو مورد و معرض طعن قرار دینا جائز نہیں!
۴۔ انھیں معائب کو قابلِ گرفت تصور کرنا چاہیے جو عقل کے نزدیک قابل گرفت ہوں
۵۔ بہترین ہجو وہ ہے جو ذہن میں محفوظ ہو جائے جس کی ترکیب اور معنی میں پیچیدگی نہ ہو جس کو عام مذاق قبول کرے اور صرف قبول ہی نہ کرے بلکہ اس کو صحیح سمجھتا ہو۔

ان شرائط میں سے چوتھی شرط میں بطور تنبیہ اتنا اضافہ کرنے کو جی چاہتا ہے کہ عقل جب تک خالقِ عقل کے تابع نہ ہو اس وقت تک خطا و صواب کی تشخیص ہی نہیں ہو سکتی۔ اگر عقل اپنے خالق کی بتائی ہوئی خطا و صواب کو صحیح اور غلط نہ سمجھے تو وہ بھی ایک بڑا عیب ہے جسے دور کرنا عقلمندی اور اس عیب کو پروان چڑھانا سفاہت کہلائے گا۔

اردو ادب کے ایام طفولیت سے ہی اس صنف کا رواج پایا گیا ہے۔ جعفر زٹلی کی ہزلیات اور سودا کی ہجویات، جرأت کی رنگینیات اور رنگین کی ریختیات اور مرزا غالب کے طنزیات سے اکبر الہ آبادی کی اصلاحیات اور دم نسیم کی طنزیات تک یہ صنف بھانت بھانت کے رنگوں کا گلدستہ بنی رہی۔ اور اس کے ذریعہ لوگوں نے ایک دوسرے کے معائب و نقائص

اور حقائق و شوائق دل کھول کر بیان کیے جس سے حمق اور حماقت، دونوں کے دامن بھر گئے۔ یہ نفسیات انسانی کی ایک صفت ہے جو حسنِ ازل سے ہر آدم زاد کو عطا کی گئی ہے۔ اس میں تیر و نشتر سے لے کر حکایت و ظرافت سبھی آ جاتے ہیں۔ لوگ تفننِ طبع اور تفریح کی خاطر لطائف کا سہارا بھی لیتے ہیں ان لطائف میں کبھی کبھی معانی کا سمندر ہوتا ہے اور وہ ذہن میں چپک کر رہ جاتے ہیں۔ علامہ اقبال نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا خطبۂ صدارت دیتے ہوئے ایک لطیفہ بیان کیا۔

"جنگ عظیم کے بعد ابلیس کے چند مرید اس کے پاس گئے تو دیکھا کہ وہ خالی ہاتھ بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا ہے۔ اس بیکاری کا سبب دریافت کیا تو اس نے جواب دیا آج کل مجھے بالکل فرصت ہے۔ اس لیے کہ میں نے اپنا سارا کام برطانوی وزارت کے سپرد کر رکھا ہے۔"

علامہ نے اپنی مشہور نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کے ذریعے امت مسلمہ جو غفلت کی دبیز چادر اوڑھے سو رہی ہے ۔ بڑا اگر انشتر چلایا ہے جس میں بہت سے دریا موجزن ہیں۔

طنز کے نشتروں سے آپریشن اس لیے کیا جاتا ہے کہ زخموں کو شفا ملے۔ اخلاقی و روحانی بیماریاں صحت مند معاشرے کے لیے سمِ قاتل ہوتی ہیں انہیں اگر کھلی چھوٹ مل جائے تو وہ دیمک کی طرح اندر ہی اندر پوری سوسائٹی کو کھوکھلا کر دیتی ہیں اور ایک دن اس کی بلند و بالا عمارت دھڑام سے زمین بوس ہو کر عاد و ثمود اور روم و یونان کے عبرتناک کھنڈرات میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان بیماریوں کو وجود میں لانے کے لیے جن ہیڈ کوارٹرس سے باقاعدہ لائسنس اور پرمٹ ملتے ہیں وہ انسان کی اپنی طبیعت اور مزاج کی تابعدار ہوتی ہے جو انسان کو اپنا غلام بنا لیتی ہے۔ اور جب کسی بااثر ہستی کے آگے جواب دہی کا تصور اس کے ذہن سے نکل جاتا ہے تو وہ من مانی کرنے لگتا ہے۔ خود ہی اپنا قانون بنا کر لوگوں کو ان کی پیروی پر بالجبر مجبور کرتا ہے۔ ایسے حاکموں پر جو خود آئین بن بیٹھیں اور اپنی بندگی کرانے لگیں ان پر تو ضربِ کلیمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ انعام الرحمٰن خاں نے قرآنی انداز میں ان حاکموں پر ضرب لگائی ہے جو احکم الحاکمین کو نہیں مانتے۔ وہ ٹھیٹھ لہجے میں کہتے ہیں:

"انسان کے سوا کوئی مقتدرِ اعلیٰ (sovereignty) نہیں کیونکہ وہ دانا اور صاحبِ عقل ہے اسی کا ہے جو کچھ چاند پر ہے اور جو کچھ زمین پر ہے، کون ہے جو اس پر اپنا حکم چلائے اس کی اجازت کے بغیر اس کا سکہ چاند پر بھی چلنے والا ہے اور نیپچون پر بھی چلا ہے ۔۔۔ پس عقل اور وحی کا فرق واضح ہو گیا۔ اب جو شخص اذعانِ عقیدہ کے چکر سے نکل کر دنیا ہی کو اپنا مقصود اور عقل کو ہی اپنا مقصد بنائے تو اس نے ایک ایسے سہارے کو تھام لیا جو مرتے دم تک کام دے گا۔ اور انسان بے شک سننے اور جاننے والا ہے۔"

طنز و مزاح کے ذریعے لوگوں نے کہاں کہاں اور کیسی کیسی بیماریوں کی طرف نشاندہی کی ہے مزید مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ چونکہ رشید صاحب کے حوالے سے آغاز ہوا تھا۔ اس لیے سب سے پہلے انہیں ہی سامنے لانا چاہتا ہوں۔ اس اسلوب کو اپنانے میں رشید صاحب کا ایک خاص معیار ہے اور کبھی کبھی ان کے قلم میں بڑی بلندی اور بہت ہی معیار آ جاتا ہے جس کے آگے ہاتھ بھی بہت نظر آتا ہے ہم جیسے لکھتے ہیں مگر اس کی بلندی کی تاب نہیں لا پاتے اور نیچے ہی سے گزر جاتے ہیں۔ ایک جگہ سیاسی لیڈروں کا دھوبی سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اکثر سوچتا ہوں دھوبی اور لیڈر میں اتنی مماثلت کیوں ہے۔ دھوبی لیڈر کی ترقی یافتہ صورت ہے یا لیڈر دھوبی کا۔ دونوں دھوتے پچھاڑتے ہیں۔ دھوبی گندے سے گندے کپڑے کو پٹخ پٹخ کر دھوتا ہے صاف اور اجلا کر کے دوبارہ پہننے کے قابل بنا دیتا ہے۔ لیڈر ہر ملک گندے سے گندے کپڑے دھوتا ہے گندگی اچھالتا ہے ... لیڈر کا مقصد نجاست کو دور کرنے کا اتنا نہیں ہوتا جتنا نجاست اچھالنے کا۔"

موجودہ زمانے میں بیشتر اساتذہ کا جو حال ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ ایسے لوگ جو طالب علموں کی صفات سے بھی کورے ہیں اور استادی کا فن دکھانے کے لیے معلمی کی مسند پر جلوہ افروز ہو جائیں تو طلبا کا کیا حشر ہوگا۔ رشید صاحب کہتے ہیں:

"ہمارے معلم بھی دھوبی سے کم نہیں۔ وہ شاگرد کو اسی طرح دھوتے پچھاڑتے، نچوڑتے اور اس پر استری کرتے ہیں جیسے دھوبی کرتا ہے۔ آپ نے بعض دھوبیوں کو دیکھا ہوگا جو دھلائی کی زحمت سے بچنے اور مالک کو دھوکا دینے کے لیے سفید کپڑے پر نیل کا ایسا رنگ دے دیتے ہیں۔ دھوبی کو اس کی مطلق پروا نہیں ہوتی کہ سر سے گھما گھما کر کپڑے کو پتھر پر پٹکنا، اینٹھنا اور نچوڑنا اور اس کا لحاظ نہ کرنا کہ کپڑے کے تار و پود کا کیا حشر ہوگا، بٹن کہاں جائیں گے، لباس کی وضع قطع کیا سے کیا ہو جائے گی، استری ٹھیک گرم ہے یا نہیں ٹھنڈی استری کرنا چاہیے یا گرم۔ بالکل اسی طرح معلم کو اس کی پروا نہیں کہ طالب علم کس قماش کا ہے، اس پہ کیسا رنگ چڑھا ہوا ہے اور اس کے دل و دماغ کا کیا عالم ہے۔ وہ اسے دے دے مارتا ہے اور اس کا کچومر نکال دیتا ہے۔ وہ طالب علم کی استعداد، اس کے میلانات اور اس کی الجھنوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا صرف اپنا رنگ چڑھانے کی کوشش کرتا رہتا ہے ... دھوبی کی یہ روایات معلمی میں پوری طور پر سرایت کر چکی ہیں۔"

یہ تو لیڈر اور معلمی کی حکایتیں تھیں۔ اب ذرا تہذیبِ جدید کو دیکھیں جو مغرب سے امپورٹ کی گئی ہے جس میں عریانیت ایک آرٹ ہے اور لباس ایک اضافی شے کا نام، جو فطری تقاضوں کی ادائیگی میں ایک زبردست رکاوٹ ہے، اگر کہیں لباس کی وجہ سے پردے اور پردے کی جھلکیاں نظر آتی ہیں تو جدید تہذیب اس پر کس طرح تبرا کرتی ہے۔ یہ خواہش المغرب کی زبان سے سنیے۔ ایک ماسٹر صاحب اپنی نوجوان شاگردہ کو ایک ایسی فلم دیکھنے کی دعوت دیتے ہیں جس میں ایک مشہور ڈانسر انو بیلا کا خاص رقص دکھایا گیا ہے۔ ننگے ناچ کا نام سن کر لڑکی چونکتی ہے (شاید کچھ قدامت پسندی ابھی باقی ہے) اور باوجود ماڈرن ہوتے ہوئے حیرت سے پوچھتی ہے۔

"آپ کا مطلب شاید یہ ہے کہ بہت ضروری ہی لباس اس کے بدن پر باقی رہ جاتا ہوگا"

ماسٹر صاحب کہتے ہیں:

"نو بے بی ۔۔۔ ضروری کا لفظ اس موقع پہ مہمل ہے۔ ضرورت تو ایک اضافی شے ہے ہم جاڑے میں کوٹ اور جرسی پہنتے ہیں لیکن گرمیوں میں بس شرٹ ہی ضرورت کا مفہوم پورا کر دیتی ہے۔ اسی طرح آرٹ اور فن کے دائرے میں ضرورت کا معیار ہماری عام زندگی سے مختلف ہے کیا تم نے ایلورا اور اجنتا وغیرہ کی نقاشی اور آرٹ کا حال نہیں پڑھا۔ وہاں مجسمے بالکل بے نقاب ہیں۔ آرٹ زندگی کے سادہ اور فطری رخ کا ترجمان ہوتا ہے اسے مصنوعی لباس اور پردوں میں مقید کرنا وحشیانہ تنگ دلی ہے۔ تم دیکھو گی انو بیلا لباس کی مصنوعی قید سے نکل کر ایک مقدس اور نورانی پیراہن اختیار کر لیتی ہے اس کے ایک ایک موئے بدن سے کرنیں سی پھوٹتی ہیں اور تماشائی کچھ دیر کے لیے رنگین قوسِ قزح کی الوہی فضاؤں میں پہنچ جاتے ہیں جہاں فطرت اپنے اصلی حقیقی اور سادہ رنگ میں جلوہ گر ہے۔"

یہ لڑکی جو ماسٹر صاحب سے نظم و ضبط کی دعوت دی تھی ... ہے ماسٹر صاحب سے اپنے ڈیڈی اور ممی کے ...

"ممی دلیپ کمار کی بہت مداح ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ دلیپ کے بالوں کا اسٹائل جوگ بتوں کے لیے پُراسرار معصومیت کا بڑا موثر پیغام ہے" اور ڈیڈی کو جنتی مالا بہت پسند ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جنتی مالا کا ہر رقص سماج کی کسی نہ کسی دکھتی رگ پر انگلی رکھتا ہے اور اس کے پیروں کی ہر جنبش ایسے جذبات، مسائل اور محرومیوں کی نشاندہی کرتی ہے جو زندگی کی جدید قدروں کو اپنائے بغیر بھی اچھے نہیں ہو سکتے۔"

جس لڑکی کو ایسے مہذب والدین اور کلچرڈ اساتذہ میسر ہوں وہ اندھا دھند ہی بنے گی اس کے لیے مولوی اور ملّا نمونۂ رجعت پسندی اور جہالت کہلائے گا۔ یہ تو مغربی تہذیب کی باتیں ہیں مشرقی تہذیب بھی کچھ کم نہیں یہاں کا عالم ہی نرالا ہے وہاں جنسیات ہیں تو یہاں خرافات و بدعات۔

آپ نے کسی ادیب کو سائنس داں بنتے نہیں دیکھا ہوگا۔ اگر خدانخواستہ کوئی ادیب سائنس داں بن جائے تو سارے سائنٹسٹ اپنی انرجی کو بھول کر شاعری کرنے لگیں گے۔ ہم آپ کو ایک ایسے ادیب سے ملاتے ہیں جو راتوں رات سائنس داں بن گئے اور پھر ان پر سائنسی الہام بھی نازل ہونے لگے اور انھوں نے مادہ کی تینوں قسموں ٹھوس، مائع اور گیس کی اپ ٹو ڈیٹ تعریفیں وضع کر دیں۔ صرف ایک قسم "ٹھوس" کی تعریف سُن لیجیے بقیہ آپ ہی تک محدود رکھیے گا ورنہ ہم سائنس داں سے ادیب ہو جائیں گے اور دنیا ایک عظیم سائنس داں ابن انشاء سے محروم ہو جائے گی۔ یہ تعریف اتنی ٹھوس ہے کہ اسے کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کہتے ہیں:

ٹھوس کا مطلب ہے ٹھوس جیسے ٹھوس دلائل، ٹھوس اقدامات، ٹھوس نتائج وغیرہ۔

ٹھوس دلائل ایسے دعووں کے لیے لائے جاتے ہیں جو خود کمزور ہوں۔ جیسے ٹھوس دلیل اب تک لاٹھی ہی ثابت ہوئی ہے بھینسوں کے لیے بھی انسانوں کے لیے بھی۔ ٹھوس اقدامات اتنے ٹھوس ہوتے ہیں کہ کبھی اٹھائے نہیں جا سکتے ہیں بس حکومتیں ان کے ٹھوس دعوے کرتی ہیں۔ ٹھوس نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسی حکومتیں بہت دن نہیں رہتیں۔ ٹھوس اشیاء اپنی شکل نہیں بدلتیں ہاں دوسروں کی بدل دیتی ہیں، پتھر ٹھوس ہے۔ جیسا ہے ویسا ہی رہتا ہے لیکن کسی آدمی کے لگے تو وہ کیسا ہی ٹھوس کیوں نہ ہو اس میں سے مائع اور گیس وغیرہ نکلنے لگتے ہیں مائع آنسو، گیس جیسے آہیں کراہیں وغیرہ۔

ابھی تک آپ کے سامنے ادب کا صرف ایک پہلو آیا ہے علاوہ ازیں بھی خاصا قحط ہے۔ اس زمین میں ابھی کتنے ہی فیصلے آرام کر رہے ہیں مگر طوالت سے بچنے کے لیے عدل و انصاف کی خاطر دوسرے پہلو پر نظر ڈالنا بھی ضروری ہے۔

آج کل مغربی تہذیب کا بڑا غلغلہ ہے۔ اس کی ایک سوغات مخلوط تعلیمی نظام بھی ہے۔ جس میں لڑکے اور لڑکیاں مل کر مہذب بننے کی کوشش کرتے اور ایک ساتھ ارتقاء کے منازل طے کرتے اور درمیان میں عشق و محبت جیسے معصوم احساس متعدد کے علی رغم اپنا کام کرتے ہیں۔ اس نظام کی برکتیں دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ جاہل لوگ بھی کہاں تھے جو کو-ایجوکیشن کو خطرناک طریقۂ تعلیم کہتے ہیں۔ اس تہذیب کے چاہے دسیوں نقصان ہوں تو کوئی مذاق نہیں۔ معاملہ جب یہاں تک آ پہنچا تو استاد نما حضرت مرزا ہمیں کو بتا جانا اچھا موقع ہی تعلیم کا حل جانتے ہیں جلسے میں کسی دوسرے سبجیکٹ کی ضرورت نہیں بلکہ صرف حسن و عشق کا سبق یاد کیا جاتا ہے۔ استاد نما کہ جب

عشق اک سائنس ہے یا آرٹ سمجھا کر لکھو ۔۔ یا یہ دونوں عشق کا ہیں پارٹ سمجھا کر لکھو

کچھ مثالیں دے کے سمجھاؤ یہ قولِ مستند ۔۔ عشق اول در دلِ معشوق پیدا می شود

اپنے اندازہ سے طولِ شامِ تنہائی بتاؤ ۔۔ صرف تخمیناً شبِ ہجراں کی لمبائی بتاؤ

کیا تعلق طبِ یونانی کو ہے رومان سے ۔۔ کیپسول دو مجنوں کو کر دو لقمان سے

چھوٹے چھوٹے نوٹس لکھو ذیل کے مضمون پر ۔۔ شامِ غم، شامِ جدائی، دردِ دل، دردِ جگر

وصل کی درخواست پر کس کی سفارش چاہیے ۔۔ عشق کے پودے کو کتنے انچ بارش چاہیے

انڈیا کا ایک نقشہ اپنی کاپی پر بناؤ ۔۔ اور پھر اس میں حدودِ کوچۂ جاناں دکھاؤ

اس تہذیب نے صرف تعلیم ہی میں اختلاط برپا نہیں کیا بلکہ اس کا دائرہ قوسِ قزح کی طرح مغرب سے مشرق تک پھیلتا چلا گیا۔ کارزارِ حیات کے سبھی شعبے انجام دینے کے لیے عورتیں بھی خم ٹھونک کر میدانِ جہاد میں کود پڑیں اور پھر ہوا یہ کہ حشر سے پہلے ہی ایسی قیامت برپا ہوئی کہ جان کینیڈی اور خروشچیف جیسے سورما بھی چیخ چیخ کر کہنے لگے کہ نوجوان نسل کی مردانگی زنانی ہوتی جا رہی ہے اس پر بند نہ لگایا گیا تو سارا ملک ڈوب جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ اس پر بند لگایا کیسے جائے۔ اس کی روک تھام تو دین و مذہب کے پاس ہے اور اسے آپ نے دیس نکالا دے دیا۔ اب روتے زار زار کیا اور کیجیے ہائے ہائے کیوں۔

ہمارے بھارت ورش میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو دین و مذہب کا حقہ پانی بند کرنے "یوجنا" چلا رہے ہیں۔ ان دانشوروں نے ابھی انسان کے فطری دین کو جانا اور پرکھا نہیں ہے۔ ان کا سارا اشتعال اصل میں ان جہلاء پر ہے جنہوں نے مذہب کے بھیس میں دین و اخلاق کی شکل مسخ کر کے اسے جہلِ مرکب کا معجون بنا کر عوام کے سامنے پیش کیا ہے۔ حالانکہ مذہب کو تختۂ مشق بنانے والے ان سے کہیں زیادہ کج فہمی کا شکار ہیں یہ حضرات اپنے دل و دماغ کی کھڑکیاں کھول کر "نور" میں کو دیکھیں تو اس کے حسن سے ان کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔ لیکن دیدۂ بینا کو جب دونوں ہاتھوں سے بند کر لیں تو سورج کی روشنی میں بھی اندھیرا ہی نظر آئے گا۔ بہرکیف یہ تو دانشوروں کی باتیں ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ الیکشن کا زمانہ بڑا گہما گہمی کا ہوتا ہے۔ الیکشن چاہے کالج کی یونین کا ہو میونسپلٹی کا ہو یا پارلیمنٹ اور اسمبلی کا اس کی بہاروں سے تو وہی لوگ صحیح معنوں میں مزا لیتے ہیں جو باقاعدہ الیکشن لڑتے اور لڑاتے ہیں۔ اور سچ لطف تو انھیں آتا ہے جو کسی عہدے کے امیدوار ہوتے ہیں اور بہترین لذت تو امیدوار کو اس وقت ملتی ہے جب وہ اپنی ساری غیرت گھر میں مقفل کر کے باہر نکلتا ہے۔ رشید صاحب کے "مولانا سہیل" سے کسی دل جلے نے کہا مولانا! آپ خود اپنا پروپیگنڈا کرتے ہیں شرم کی بات ہے۔ تو مولانا نے برجستہ فرمایا پیغمبر اگر نبوت کا دعویٰ نہ کرے تو آپ نبوت کے کب قائل ہوں"۔ ایسے ہی ایک صاحب کا واقعہ ظریف لکھنوی کی زبان سے سنیے۔ جو میونسپلٹی کا ممبر بننے کے لیے کنویسنگ کے لیے نکلتے ہیں مختلف لوگوں سے ملتے اور انھیں نوٹ دے کر ووٹ کا وعدہ لیتے ہوئے ایک باریش بزرگ کے پاس پہنچتے ہیں اور ان کی قصیدہ خوانی کا قطب مینار تعمیر کرتے ہیں۔ اپنی تعریف سُن کر مولوی صاحب خاصے فربہ ہو جاتے ہیں۔ آگے قصہ یوں چلتا ہے:

خوش ہو گئے سُن کر جنابِ مولانا کہنے لگے ۔۔ یا تصورِ رشوت یہ اس طرح توہین کا

آپ اس کے اہل ہیں پیری نظر میں آتی ؎ ذلت سوالی کو سمجھتا ہوں میں فخر بری

محترم میں وعدہ قبل از وقت کر سکتا نہیں

فرض ہے ایفائے وعدہ پھر مکر سکتا نہیں

اس میں اک اشکال شرعی اور بھی کیا کہوں ؎ میں اعانت آپ کی بالفرض تو مانگا کروں

لائے کو اپنی اب کر دوں اگر کچھ بھی تخلصا ؎ کیوں بلا شامل کروں کس وا سطے مجبور ہوں

جانتا ہوں یہ بھی میری رائے ہے کتنی قبیح!

مفت کیوں ضائع کروں جب میں نہیں ہوں مستطیع

رائے دے دوں گا عوض میں آپ کو تحسین کے ؎ اتنے ہی ملتے ہیں مجھ کو وعدے تحقیق کے!

حضرت والا تو کچھ پابند ہیں آئین کے ؎ اس سے کم ورنا مرادف ہے میری توہین کے!

ہاں یہ ممکن ہے کہ کچھ تقلیل فرما دیجیے

ہے یہ کار خیر اب تعجیل فرما دیجیے

یہ تھیں الکشن کی بہاریں۔ بڑا ستم ہوگا اگر اس بزم میں حضرت اکبر آلہ آبادی کو شامل نہ کیا جائے۔ طنز و مزاح کی محفل ویران ہے اگر اس میں اکبر الہ آبادی نہ ہوں۔ اکبر اور ان کی شاعری بھی قریب اور بعید میں نقادوں کے نزدیک موضوع بحث بنی رہی۔ مخالف و موافق دونوں ہی اس کے لیے سر بگریباں رہتے ہیں اور اپنے اپنے انداز میں حق مخالفت و موافقت ادا کرتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اکبر نے بڑے بڑے صاحب قلم کو متاثر کیا ہے صرف علامہ اقبال کا خیال ان کے متعلق سن لیجیے۔ فرماتے ہیں،

"ان کے کلام کے لطائف سمجھنے پر نہ جائیے۔ ان کے قہقہوں اور قہقہوں کے آنسوؤں کو پڑھ دار ہیں، وہ اپنے نہاں خانۂ صنعت میں اس وقت تک آپ کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے جب تک کہ آپ ان کا مال خریدنے کے لیے ذوقِ سلیم کے درہم اپنی جیب میں ڈال کر نہ لائیں۔

اکبر کی برق کلیسا، اور فرضی لطیفہ جیسی نظمیں تو درسی کتب میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی دوا خانہ میں ہر مرض کی دوا پائی جاتی ہے۔

شاعری میں بے ہنگم اور عریاں، چھا چھاتی، کی باتیں مسلسل کہی جاتی رہی ہیں جس سے دل و دماغ پر تخریب کی چھاپ چڑھتی چلی جاتی ہے ایسی شاعری پر حضرت اکبر نے جا بجا تبصرہ کیا ہے! کہتے ہیں،

حقیقی اور مجازی شاعری میں فرق یہ پایا ؎ کہ وہ جامے سے باہر ہے یہ پاجامے سے باہر ہے۔

امت مسلم کی زبوں حالی پر بہت سے لوگوں نے ماتم کیا ہے مگر کہتے ہیں کہ اکبر کا بے اعلان اور

اس قبلہ رو جماعت کا انتشار دیکھو ؎ اس باغ میں خزاں کی آکر بہار دیکھو

لکھے کو کیا حسرت دنیا کی روشنی میں ؎ اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں

سیاسی اور قومی لیڈر ملک و ملت کی حالت پر آنسوؤں کے ہر نالے کس انداز میں بہاتے ہیں یہ بھی دیکھیے۔

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ ؎ رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

نئی تہذیب میں لوگ مشکلیں ہوسکتی ہیں۔ داڑھی مائیت کا ٹریڈ مارک ہے۔ اس عجب ز

وہ / بم کو فقط ۔ ۔ ۔

"داڑھی خدا کا نور ہے بیشک مگر جناب ؎ فیشن کے انتظام صفائی کو کیا کروں!

جنریشن گیپ ان کے یہاں بھی باعث تشویش ہے۔

بوڑھوں کے ساتھ لوگ کہاں تک وفا کریں ؎ لیکن نہ موت آئے تو بوڑھے بھی کیا کریں

اسلام کے کرم فرماؤں کا بڑا حربہ یہ ہے کہ یہ تلوار سے پھیلا۔ اس کا جواب بھی اکبر نے دے دیا۔

یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام ؎ یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے

موجودہ دور میں تعلیم و ترقی کی بڑی بڑی باتیں ہو رہی ہیں ان پر تبصرہ سنیے۔

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے ؎ جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے۔

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں ؎ میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیویاں نکلیں

مصیبت میں بھی اب یاد خدا آتی نہیں ہم کو ؎ دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں!

انسانوں کے اختراعی نظریات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں انھیں استحکام اور ثبات کبھی نہیں ہوا مگر جو حقیقت ہے وہ کبھی نہیں بدل سکتے ہیں

صدیوں فلاسفی کی چناں اور چنیں رہی ؎ لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی!

ماڈرن میاں بیوی ملاحظہ ہوں:

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں

حجاب ان کو نہیں آتا انھیں غصہ نہیں آتا!

چلتے چلتے حضرت اکبر کی گراں قدر نصیحت ساتھ لیتے جائیے تاکہ وہ قبر میں بھی کام آ سکے۔

جب نکیرین آئے میری قبر میں بہر سوال ؎ میں نے یہ چاہا کہ لکھوا دوں انھیں اپنا بیان

ہاتھ پاکٹ میں جو ڈالا مجھ کو حیرت ہو گئی ؎ یعنی تھی جو نوٹ بک وہ اس سفر میں کھو گئی

کہہ دیا میں نے کہ اب ہر طرح معذور ہوں ؎ رہ گئی دنیا میں میری نوٹ بک مجبور ہوں

یہاں صرف چند مثالیں نثر و نظم میں طنز و مزاح کی پیش کی گئی ہیں۔ ان مثالوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس صنف کی کیا اہمیت و افادیت ہے معاشرے کی اصلاح میں طنز و مزاح وہی رول ادا کرتا ہے جو کھانے میں نمک کا ہوتا ہے۔ نمک زیادہ ہو جائے تو کھانا خراب لگتا ہے اور اگر کم رہ جائے تب بھی مزا پھیکا پڑ جاتا ہے اس لیے بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے نمک کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ طنز و مزاح کے سرحدیں پھکڑپن سے ملی ہوتی ہیں۔ قلم ذرا بہکا اور پھکڑپن شروع ہوا۔ اس لیے قلم پر قابو رکھنا بڑے مجاہدے کا کام ہے۔

---

1 ۱۹۶۲ء میں امریکہ کے صدر مسٹر کینیڈی نے ایک اہم بیان میں کہا کہ امریکہ کا مستقبل خطرے میں ہے کیونکہ نوجوان جنس پرستی میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہے۔ فوج میں شمولیت کے لیے ہر آنے والے سات نوجوانوں میں چھ نا کام لوٹا دیے جاتے ہیں کیونکہ شہوت پرستی نے ان کی طبی اور نفسیاتی حالت ابتر بنا دی ہے۔ خود خروشچیف نے بھی کینیڈی کی طرح ۱۹۶۲ء میں بیان دیا کہ روس کا مستقبل خطرے میں ہے اور روس کے نوجوانوں کے مستقبل پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ وہ شہوت پرستی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

(جدید جاہلیت از محمد قطب ص ۱۶۹-۱۷۰)

راحت ابرار

بایوٹکنالوجی

سرسید احمد خاں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو جن مقاصد کے لیے قائم کیا تھا اس کا ایک مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو جدید علوم سے روشناس کرانا بھی تھا۔ بانیٔ درسگاہ کے اس خواب کی عملی تعبیر کا سلسلہ بدستور جاری ہے اور ہندوستان میں بایوٹیکنالوجی کا سب سے پہلا انسٹیٹوٹ اسی تعلیمی ادارے میں قائم ہو گیا ہے اور اس ادارے نے اپنا کام بھی شروع کر دیا ہے۔

بایوٹیکنالوجی کا میدانِ عمل اکیسویں صدی کی سائنس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ پورے برصغیر میں اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے جس میں گذشتہ جنوری سے پانچ طلبار کو اس نئے مضمون کے کورسیز کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔

بایوٹیکنالوجی دراصل عبارت ہے تکنیکی اور صنعتی مقاصد کے حصول کے لیے مائکروبایولوجی، بایوکیمسٹری اور انجنیرنگ کے عملی امتزاج سے۔ یہ مضامین اس جدید علوم کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

اس انسٹیٹوٹ کے قیام کا سہرا جواہر لال نہرو میڈیکل کالج کے شعبۂ بایوکیمسٹری کے سربراہ پروفیسر صلاح الدین کے سر جاتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اکیسویں صدی کی سائنس کے وہی میر کارواں ہوں گے۔

پروفیسر صلاح الدین کے قول کے مطابق ادارے کی تمام تر توجہات ان تشنۂ تکمیل علمی میدانوں پر مرکوز ہوں گی جو بحالت موجودہ جدید بایولوجی کی سرحدوں سے وابستہ ہیں جیسے جنٹک (GENETIC) انجنیرنگ، ہائی بریڈوم (HYBRIDOME) ٹکنالوجی، انزائم (ENZYME) انجنیرنگ فرمنٹیشن (FERMENTATION) بایوٹیکنالوجی اور ٹشو کلچر (TISSUE CULTURE) ٹیکنالوجی۔

اس علم کے مختلف گوشوں پر تحقیقات سے ہی ہمارے ملک کے بڑے بڑے مسائل کا حل ممکن ہو سکے گا جیسے بھوک، افلاس، ناداری، بیماری، بڑھتی ہوئی آبادی، بحران توانائی اور آلودگی۔

یہ انسٹیٹوٹ جس کا قیام پچاس لاکھ روپیہ سے عمل میں آیا ہے، کمپیوٹر سائنس میں بھی طلبار اور ریسرچ کرنے والوں کی تعلیم و تربیت میں معاون و مددگار ثابت ہوگا۔

اس وقت بیس ریسرچ اسکالرز، بایوٹیکنالوجی کے مختلف موضوعات پر کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے اپنے موضوعات پر غیر معمولی تحقیقی کارنامے انجام دیے ہیں جن کا عالمی سطح پر اعتراف کیا جارہا ہے۔

یہ انسٹیٹوٹ امریکہ کی ڈیوک (DUKE) اور مشی گن MICH-IGAN یونیورسٹیوں کی ہمکاری میں متحدہ ریاست امریکہ کے بیس لاکھ روپیہ کے عطیہ سے تحقیق کا کام شروع کرے گا۔ اس کا یہ کام پی۔ ایل۔ ۴۸۰ اسکیم کے تحت انجام پائے گا جس کا بنیادی مقصد نائٹروجن فکزیشن کی تحقیق ہے۔ اس موضوع پر تحقیق سے ہمارے ملک میں فرٹی لائزرس کی بڑھتی ہوئی ضرورت کو پورا کرنے میں مدد ملے گی۔

دوسرا میدان عمل جو امیونولوجی (IMMUNOLOGY) سے متعلق ہے، اسے پندرہ لاکھ روپیہ کی امداد سے مطالعہ میں شامل کیا جائے گا۔ یہ میدان علم لیمفوسائٹ ایکٹیویشن (LYMPOCYTE ACTIVATION) ہے۔ یہ ہمارے جسم کے دفاعی میکنزم کو سمجھنے کی کوششوں میں معاون ہوگا

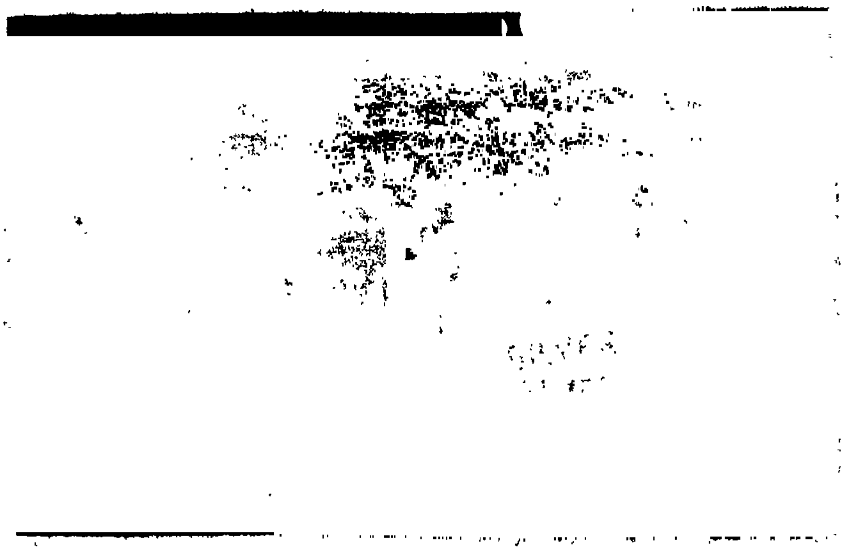
فرمنٹیشن بایو ٹیکنالوجی صنعتی میدان کی سب سے بڑی مددگار ہے نیز سازو سامان کی تیاری میں بھی معاون ہوتی ہے۔ یہ توانائی کے منتقل کرنے میں بھی مدد کرتی ہے۔ غیر مروجہ طریقہ سے اس توانائی کو جمع کیا جا سکتا ہے

فرمنٹیشن بایو ٹیکنالوجی ایک ایسی توانائی ہے جس میں آلودگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

نائٹروجن فکزیشن — یہ مشتمل ہے بایولوجیکل فرٹیلائزرو کے بنانے پر جس میں ماحولیاتی نائٹروجن زمینی بیکٹریا کا سہارا لیتی ہے اور اس سبب سے سستے فرٹیلائزر تیار ہو جاتے ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا یہ انسٹی ٹیوٹ ایم ایس سی بایو ٹیکنالوجی کا کورس شروع کرنے میں اولیت کا درجہ رکھتا ہے اور آئندہ تعلیمی سال سے پوسٹ گریجویٹ طلبار کو داخلے کی مزید سہولت فراہم ہو جائے گی۔

مسلم یونی ورسٹی کے شب و روز



دائیں سے بائیں: مقبول محمود شاہ، افتخار احمد صابری (سکریٹری)، پروفیسر حبیب الرحمن، کوآرڈینیٹر، پروفیسر محمود قریشی (مہمان خصوصی)، پروفیسر وصی الرحمن (وائس چانسلر) امتیاز الحق ملک، آرگنائزنگ سکریٹری، مائک پر جناب این اے کے درانی صدر

یونیورسٹی فلم کلب کی سلور جوبلی تقریبات ۶ جنوری سے ۱۲ جنوری تک ہوئیں۔ اس موقع پر ایک فلم سیمینار اور کئی دلچسپ پروگراموں کا انعقاد کیا گیا۔ تقریبات کا افتتاح جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ماس کمیونیکیشن سنٹر کے پروفیسر محمود قریشی صاحب نے کیا۔

— راحت ابرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۲۶/ ۸۵-۸۶

مقررہ فارموں پر درج ذیل جگہوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ پرنسپل یونیورسٹی پالی ٹیکنک۔
۲۔ پرنسپل۔ ویمنس پالی ٹیکنک۔
شرح تنخواہ۔ ۱۵۰۰۔ ۶۰۔ ۱۸۰۰۔ ۱۰۰۔ ۲۰۰۰۔ ۱۲۵/۲۔ ۲۵۰۰ روپے و دیگر الاؤنس۔
قابلیت:۔ ۱۔ انجینئرنگ/ٹیکنالوجی میں ماسٹر کی ڈگری۔
۲۔ تدریس کا کم از کم دس سالہ تجربہ۔
۳۔ ان افراد کو ترجیح دی جائے گی جن کو انجینئرنگ انسٹی ٹیوشن میں ایڈمنسٹریشن کا کچھ تجربہ ہو۔

۳۔ پرنسپل۔ ویمنز کالج۔
شرح تنخواہ:۔ ۱۵۰۰۔ ۶۰۔ ۱۸۰۰۔ ۱۰۰۔ ۲۰۰۰۔ ۱۲۵/۲۔ ۲۵۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔
قابلیت:۔ امیدوار آرٹس، سوشل سائنس یا سائنس میں اعلیٰ تعلیمی صلاحیت کا حامل ہو۔ اضافی طور پر امیدوار کو ویمنز کالج میں کسی اعلیٰ تدریسی اور انتظامی جگہوں کا کافی تجربہ ہونا چاہیے۔
نوٹ:۔ صرف خواتین امیدوار ہی اس جگہ کے لیے درخواست دیں۔
جو امیدوار پہلے درخواستیں دے چکی ہیں اُن کو دوبارہ درخواستیں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

۴۔ پرنسپل۔ اے۔ ایم۔ یو سٹی ہائی اسکول۔
شرح تنخواہ۔ ۱۱۰۰۔ ۵۰۔ ۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔
قابلیت:۔ ۱۔ ماسٹرس ڈگری یا کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے آنرز ڈگری جو کہ یو۔پی۔ایس۔سی کے ذریعہ کسی ہندوستانی یونیورسٹی کی ماسٹر ڈگری کے مساوی ہو اور تسلیم شدہ ہو۔ یا کسی ہندوستانی یونیورسٹی کی آنرز ڈگری ہو جو یو۔پی۔ایس۔سی کے ذریعہ ماسٹر کی ڈگری کے مساوی اور تسلیم شدہ ہو۔

۲۔ ایجوکیشن میں تدریسی ڈگری، ڈپلوما یا اِن کے مساوی۔

۳۔ درج ذیل میں سے کسی ایک چیز میں تجربہ ہونا چاہیے۔

ا۔ انٹرمیڈیٹ یا ہایر کلاسز کے تسلیم شدہ کالج میں انتظامی امور کا کم از کم ۳ سالہ تجربہ۔

ب۔ کسی تسلیم شدہ ہائی اسکول میں انتظامی امور کا کم از کم پانچ سال کا تجربہ

ج۔ کسی تسلیم شدہ کالج یا ہائر سکنڈری اسکول میں تدریس کا کم از کم پانچ سالہ تجربہ۔ یا اتنا ہی کسی ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوشن میں تدریس کا تجربہ۔

د۔ کسی تسلیم شدہ ہایر سکنڈری اسکول میں تدریس کا ۸ سال کا تجربہ۔

ہ۔ تسلیم شدہ ہائی اسکول، ہایر سکنڈری اسکول یا ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوشن میں پانچ سال کا تجربہ جس میں ۳ سالہ تعلیمی اور انتظامی تجربہ اور ۲ سالہ تدریسی تجربہ ہو۔

[۵]۔ بیچلر آف انجینیرنگ کے ساتھ کسی تسلیم شدہ کالج یا ہایر سکنڈری اسکول میں ۵ سال کا تدریسی تجربہ۔

— یا —

[C] کسی تسلیم شدہ ہائی اسکول کا ٹرینڈ گریجویٹ ہیڈ جو ۴۵ سال تک کا ہو اور کم از کم ۱۵ سال کا سکنڈری کلاسز کو پڑھانے کا تجربہ رکھتا ہو ایسے ہائی اسکولز / ہایر سکنڈری اسکولز میں جو تسلیم شدہ ہوں [جن میں سے ۵ سال کسی تسلیم شدہ ہائی اسکول کے ہیڈ کی حیثیت سے انتظامی تجربے کے ہوں]

— یا —

[D] ایسے افراد جن کے پاس ماسٹرس ڈگری ہو اور ساتھ میں کسی ہائر سکنڈری اسکول اور یا کسی تسلیم شدہ کالج میں ۱۵ سال کا تدریسی تجربہ ہو اور عمر ۴۵ سال تک کا ہو۔

یا

[E] کسی تسلیم شدہ مڈل اسکول کا ٹرینڈ پوسٹ گریجویٹ ہیڈ ہو جس کو تسلیم شدہ میڈل اسکولز میں ۸ سال کا بحیثیت ہیڈ کے انتظامی تجربہ ہو۔

یا

ایسے افراد جن کے پاس ایجوکیشن میں ماسٹرس ڈگری ہو اور وہ مطلوبہ شق الف تا ی میں سے کوئی ایک شرط پوری کرتے ہوں۔

نوٹ۔ دو یا دو سے زیادہ اقسام کو قسم نمبر ۳ [ج] کے ساتھ متناسب طور پر ضم کیا جا سکتا ہے اور جہاں تک شق الف (د ہ) کا تعلق ہے، اسے حسب ضرورت ۸:۵ یا ۵:۸ کے تناسب سے ضم کیا جا سکتا ہے۔

پروفیسرز۔

شرح تنخواہ۔ ۱۵۰۰۔ ۶۰۔ ۱۸۰۰۔ ۱۰۰۔ ۲۰۰۰۔ ۱۲۵/۲۔ ۲۵۰۰ روپے۔ مع دیگر الاؤنسز

۵۔ پروفیسر آف جیالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف جیالوجی۔
۶۔ پروفیسر آف سوشیالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف سوشیالوجی۔
۷۔ پروفیسر آف ایجوکیشن۔ ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن۔
۸۔ پروفیسر آف لنگوئسٹکس۔ ڈپارٹمنٹ آف لنگوئسٹکس۔

قابلیت

۱۔ لازمی۔ معروف اسکالر جس کی اعلیٰ معیاری مطبوعات ہوں اور عملی طور پر تحقیقی کام میں مشغول ہو۔ درس و تدریس یا تحقیق کا دس سال کا تجربہ ہو اور ڈاکٹریٹ کے معیار کی تحقیق کی نگرانی کا تجربہ ہو۔

یا

ایسا غیر معمولی لیاقت کا امیدوار جس نے علم کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہو۔

ii۔ پسندیدہ۔ پوسٹ نمبر ۷ پروفیسر آف ایجوکیشن کے لیے۔
درج ذیل میں سے کسی ایک ایریا میں امتیاز ہو۔
ایڈوانسڈ سائیکامیٹرکس، چائلڈ ڈیولپمنٹ سائیکالوجی آف لرننگ، ایجوکیشنل ٹیکنالوجی فار سوشیالوجی آف ایجوکیشن۔

ریڈرشپ۔

شرح تنخواہ۔ ۱۲۰۰ - ۵۰ - ۱۳۰۰ - ۶۰ - ۱۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔

۹۔ ریڈر ان جغرافیہ۔ ڈیفنس کالج۔
۱۰۔ ریڈر ان اکنامکس۔ ڈپارٹمنٹ آف اکنامکس۔

قابلیت۔ اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اس کے مساوی مطبوعہ کام۔ اور اس بات کا عملی وافر ثبوت کہ امیدوار (i) ریسرچ یا (ii) انوویشن ان ٹیچنگ میتھڈ یا (iii) پروڈکشن آف ٹیچنگ میٹریل میں معروف ہے۔
تدریس اور / یا تحقیق کا تقریباً ۵ سال کا تجربہ جس میں سے کم از کم ۳ سال متعلقہ مضمون میں بحیثیت لیکچرر کے ہونا چاہیے۔
اگر امیدوار تدریس / تحقیق میں اعلیٰ صلاحیت کے حامل ہوئے تو اس صورت میں مندرجہ بالا شرائط میں نرمی برتی جا سکتی ہے۔

نوٹ۔ پوسٹ نمبر ۹ ریڈر ان جغرافیہ کے لیے
وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۱۶/ ۸۵ - ۸۶ - مورخہ ۳/ اکتوبر ۱۹۸۵ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں، ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ موزوں خیال کیے گئے تو ان کو پہلی درخواست کی بنا پر ہی امیدوار تصور کیا جائے گا۔

لیکچررس۔
شرح تنخواہ۔ ۷۰۰۔ ۴۰۔ ۱۱۰۰۔ ۵۰۔ ۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔

۱۱ لیکچرر ان اسٹیٹسٹکس۔ ڈپارٹمنٹ آف اسٹیٹسٹکس۔
۱۲۔ لیکچرر ان میتھمیٹکس۔ (عارضی) میتھ سیکشن۔ انجینئرنگ کالج۔
۱۳۔ لیکچرر ان فزکس۔ ویمنس کالج۔
۱۴۔ لیکچرر ان باٹنی۔ ویمنس کالج۔
۱۵۔ لیکچرر ان اردو ویمنس کالج۔
۱۶ لیکچرر ان عربک ڈپارٹمنٹ آف عربک
۱۷ لیکچرر ان ہندی۔ ڈپارٹمنٹ آف ہندی

(۱۳ تا ۱۷) جگہیں عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید ہے۔

قابلیت۔ ا۔ لازمی (ا) ڈاکٹریٹ ڈگری یا اس کے مساوی اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام

ب اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ کم از کم سکنڈ کلاس (سی سیون پوائنٹ اسکیل میں) کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے متعلقہ مضمون میں ماسٹرس ڈگری یا اس کے مساوی ڈگری کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے حاصل کی ہو۔

بین الوضعی ترقیاتی پروگرام کے لیے مذکورہ بالا (الف) و (ب) کے متعلقہ موضوع میں ڈگری ہونا چاہیے۔

اگر سیلیکشن کمیٹی اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی امیدوار کا تحقیقی کام جیسا کہ اس کی تھیسس سے ظاہر ہے یا اس کا مطبوعہ کام انتہائی اعلیٰ پائے کا ہے تو وہ (ب) کے تحت دی ہوئی مطلوبہ استعداد کو ختم کر سکتی ہے۔

اور اگر ڈاکٹریٹ ڈگری یا اس کے مساوی مطبوعہ کام کا حامل کوئی امیدوار میسر نہ آئے یا بصورت دیگر وہ موزوں نہ ہو تو اس صورت میں اچھے تعلیمی ریکارڈ کے حامل امیدوار (اس صورت میں ایم فل ڈگری یا اس کے مساوی کوئی ڈگری یا اعلیٰ درجے کے تحقیقی کام کو وزن دیا جائے گا) تقرر کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کو تحقیقی کام دو سالہ تجربہ ہو یا اس نے کسی ریسرچ لیباریٹری میں یا آرگنائزیشن میں دو سال کام کیا ہو۔ ایسے امیدوار کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اپنی تقرری سے پانچ سال کے اندر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرے یا اعلیٰ پائے کے تحقیقی کام کا ثبوت پیش کرے۔ ورنہ اس کو مستقبل میں اس وقت تک کوئی سالانہ ترقی نہیں دی جائے گی جب تک وہ ان شرائط کو پورا نہ کرے۔

(۲) قابل پسندیدہ۔ پوسٹ نمبر ۱۶ لیکچرر ان عربک کے لیے۔
تدریس کا تجربہ اور کچھ مطبوعہ کام۔

نوٹ   صرف پوسٹ نمبر ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ کے لیے
خواتین امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی۔

فیکلٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی۔

۱۸۔ پروفیسر آف سول انجینئرنگ و ہائیڈرولکس ۔ ڈپارٹمنٹ آف سول انجینئرنگ۔
شرح تنخواہ۔ ۱۵۰۰-۶۰-۱۸۰۰-۱۰۰-۲۰۰۰-۱۲۵/۲-۲۵۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔
قابلیت۔   معروف اسکالر جس کے اعلےٰ معیاری مطبوعات ہوں اور عملی طور پر تحقیقی کام میں مشغول ہو۔ دس سال کا تحقیق اور تدریس کا تجربہ ہو اور ڈاکٹریٹ کے معیار کی تحقیق کی نگرانی کا تجربہ ہو۔

یا

ایسا غیر معمولی صلاحیت کا انجینئر یا ٹکنالوجسٹ جو اپنے میدان میں شہرت رکھتا ہو اور جس نے علم کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہو۔

۱۹ ریڈر ان سول انجینئرنگ۔ ڈپارٹمنٹ آف سول انجینئرنگ
شرح تنخواہ۔ ۱۲۰۰-۵۰-۱۳۰۰-۶۰-۱۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔
قابلیت ۔ اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ متعلقہ مضمون میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری۔ تقریباً ۵ سال کا تدریس اور/یا ریسرچ اور ڈویلپمنٹ کا تجربہ۔
اگر امیدوار پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری نہیں رکھتا تو ریسرچ کے مساوی اس کا مطبوعہ کام یا کسی ادارے یا انڈسٹری میں اعلےٰ پیمانے پر کام کی ترقی کا ہونا لازمی ہے۔

یا

اس صورت میں جب امیدوار کسی انڈسٹری یا پروفیشنل میں ہو۔ سات سالہ پروفیشنل کام کے ساتھ اچھا تعلیمی ریکارڈ بھی رکھتا ہو جو اِن نوویشن اور/یا ریسرچ اور ترقی سے متعلق ہو۔

۲۰۔ لکچرر ان میکینکل انجینئرنگ۔ میکینیکل انجینئرنگ سیکشن۔ یونیورسٹی پالی ٹیکنک۔
شرح ۷۰۰-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔
قابلیت:۔ ا انجینئرنگ/ٹیکنالوجی کے میدان میں ماسٹر ڈگری
ب۔ انجینئرنگ/ٹیکنالوجی میں گریجویشن کی ڈگری کے ساتھ اچھا تعلیمی ریکارڈ اول درجہ میں گریجویشن کی ڈگری اور/یا ماسٹر سطح کی ڈگری۔
ج۔ ایک سالہ متعلقہ پروفیشنل تجربہ۔ اکیڈمک ریسرچ انسٹی ٹیوشن کے علاوہ۔
انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کے نئے شعبوں کی ضرورت کا لحاظ رکھتے ہوئے اور ترقی پذیر بین الموضوعی پروگراموں کے پیش نظر اچھی تعلیمی استعداد رکھنے والے امیدواروں کے لیے انجینئرنگ/ٹیکنالوجی کا مطالبہ

اسناد کی شرائط کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

مزید یہ کہ اگر کسی امیدوار کو پیشہ ورانہ تجربہ حاصل نہیں ہے، یا ایسے تجربہ رکھنے والے امیدوار کو اس جگہ کے لیے مناسب خیال نہیں کیا جا سکتا تو منتخب امیدوار کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے تقرر سے پانچ سال کی مدت کے اندر مطلوبہ پیشہ ورانہ تجربہ حاصل کر لے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ سالانہ ترقی سے محروم رہے گا جب تک کہ وہ اسی شرط کو پورا نہ کرے۔

اگر ایم۔ای۔ یا ایم۔ٹیک۔ استعداد کے امیدوار دستیاب نہیں ہوتے ہیں یا اس جگہ کے لیے مناسب نہیں سمجھے جاتے تو لازمی استعداد میں رعایت برتی جائے گی اور اول درجے میں پاس انجینئرنگ گریجویٹس کو منتخب کر لیا جائے گا۔ اس صورت لازم ہوگا کہ وہ تقرر سے ۵ سال کے اندر ایم۔ٹیک یا ایم۔ای کی ڈگری حاصل کرے۔

ایسا نہ ہونے کی صورت میں وہ آئندہ ترقی سے محروم کر دیا جائے گا، جب تک کہ وہ مطلوبہ استعداد حاصل نہ کرے۔

مطلوبہ استعداد اور تجربوں کے ساتھ جو امیدوار زیادہ تعلیمی استعداد رکھتے ہیں ان کی ملازمت کا آغاز زیادہ تنخواہ سے کیا جا سکتا ہے۔

درخواستوں کے لیے مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) کے دفتر سے پانچ روپے نقد ادائیگی (مسلم یونیورسٹی کے فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام واجب الادا اسی قیمت کے کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر بھیج کر ذاتی طور پر یا بذریعے ڈاک حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ڈاک سے طلب کرنے کی صورت میں ۱۵ × 23 سینٹی میٹر سائز کا ایسا لفافہ بھیجنا ضروری ہے جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہوں۔

انٹرویو کے لیے بلائے جانے والے افراد کو صرف ایک طرف کا سکنڈ کلاس کا ریلوے کا کرایہ دیا جائے گا۔

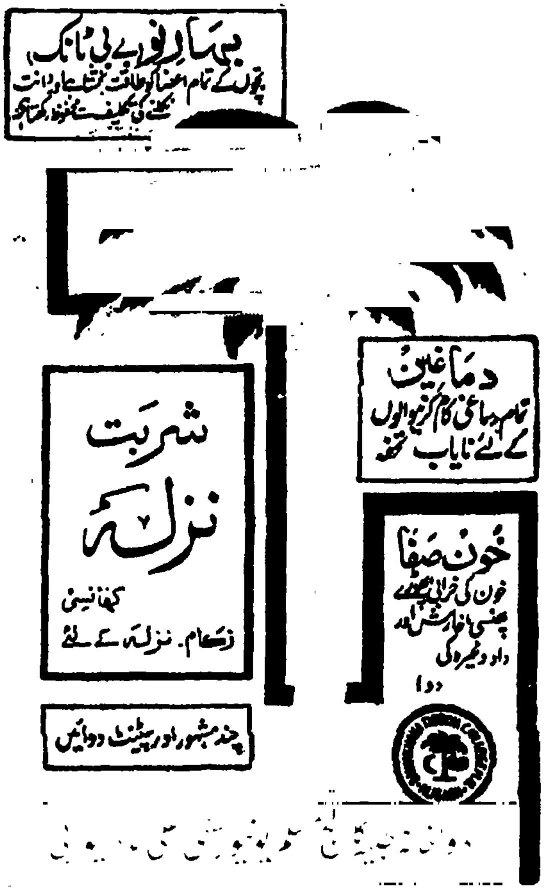
درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۰ مارچ ۱۹۸۶ء ہے (آفس ٹائم تک)
نامکمل اور تاخیر سے ملنے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔
نوٹ:۔ مناسب اور موزوں امیدوار مستقبل میں تقرری کے لیے پینل پر رکھے جائیں گے۔

سید شاہد علی
رجسٹرار

No. M/813/2366

کاتب : [illegible] قریشی
پرنٹر پبلشر : نورالحسن نقوی ، مقام اشاعت : شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ، پریس : ایس۔کے۔ آفسیٹ پرنٹرز۔ دہلی۔

ahzibul Akhlaq Fortnightly 16th to 28th Feb. 86 Regd. No L/ALG 247



Litho Colour Printers, Achal Tal, Aligarh Phone 4185



بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

آئٹم ریٹ کی بنیاد پر سربمہر ٹینڈر مطلوب ہیں جو ۲۸ مارچ ۱۹۸۶ء کو صبح ساڑھے دس بجے تک موصول ہو جانے چاہئیں۔ ٹینڈر اسی تاریخ میں ساڑھے دس بجے کھولے جائیں گے۔

ٹینڈر کے کاغذات یونیورسٹی انجینیر کے دفتر سے چھٹی کے دنوں کے علاوہ باقی دنوں میں کارکردگی کے اوقات میں حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

ٹینڈر فارموں کی فروخت ٹینڈر کھلنے کے مقررہ وقت سے چوبیس گھنٹے قبل بند ہو جائے گی۔

نمبر شمار	کام کی نوعیت	ٹینڈر میں جمع ہونے والی رقم	پیشگی رقم	ٹینڈر کی قیمت	مکمل ہونے کا وقت
۱۔	ویمنس کالج (سائنس بلاک) کے برآمدے میں گرل یعنی لوہے کا جال لگانا سی.پی.ڈبلیو.ڈی شیڈول ۱۹۸۱ پر منحصر	۸۳،۰۲۰ روپے	۲۰۰۰ روپے	۵۰ روپے	ایک ماہ

لفٹیننٹ کرنل حسن مظفر
یونیورسٹی انجینیر

سرورق:
۱۵۲۸ عیسوی میں دیکھے گئے دُم دار ستارہ کی خیالی تصویر
یہ دُم دار ستارہ اتنا خوفناک تھا کہ کچھ لوگ تو اس کو دیکھ کر وحشت سے مر گئے......
ماخوذ:
Discovering Astronomy
By Williams H. Jefferys and Robbins
(John Wiley & Sons)

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۵ ✻ یکم تا ۱۵ مارچ ۸۶ء ✻ شمارہ ۵

ترسیل زر کا پتہ : پروفیسر منظر عباس نقوی
اڈیٹر تہذیب الاخلاق کوٹھی
شعبۂ اردو ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

قیمت فی شمارہ : ڈیڑھ روپیہ
سالانہ : تیس روپے
تاحیات : تین سو روپے

مندرجات

۱ : قافیوں کی قید ... سید حامد ___ ۲

۲ : خالد بن ولید ... گیارھویں قسط ... قاضی عبد الستار ___ ۵

۳ : جنگ آزادی کا ایک جانباز مجاہد ... قسط ۳ ... منظر عباس نقوی ___ ۱۰

۴ : دمدار تارے ... ڈاکٹر عبد القیوم ___ ۱۴

۵ : چچا چھکن کا دوسرا خواب ... جارج کیمو
ترجمہ : انیس عالم ___ ۱۴

۶ : ناک ... نکولائی گوگول
ترجمہ : اعدعجال پاشا ___ ۱۹

۷ : ہندوستان ۔ تاشقند کی غیر جانبداریت ... بشیر احمد جابلا ___ ۲۹

۸ : مسلم یونیورسٹی کے شب و روز ... راحت ابرار ___ ۳۲

سید حامد

قافیوں کی قید

تین قافیوں نے مسلمانوں کو قید کر رکھا ہے۔ وہ جاہل ہیں، غافل ہیں، کاہل ہیں۔ اس شکستہ عمارت کے، ملّتِ اسلامیہ جس کا نام ہے، تین ستون یہی ہیں جہالت، غفلت اور کاہلی۔ زوال اور ادبار کے جس دائرہ میں وہ محصور ہیں اس کے محیط پر یہ تین نقطے بنے ہوئے ہیں۔ نگوں بختی کے اس چکر کو توڑ کر روشنی حرکت اور شعور کی تازہ ہوا میں سانس لینا ان کے لیے محال نظر آتا ہے۔ جو کاہل اور غافل ہوں وہ جہالت کیسے دور کریں؛ جو غافل اور جاہل ہوں وہ کاہلی کے دلفریب طلسم کو کیوں توڑیں؛ جو کاہل اور جاہل ہوں غفلت سے ان کا ناتہ کیسے ٹوٹے۔

اُردو شاعری جو قافیہ کے حصار میں قید تھی کبھی کبھی زور لگا کر باہر نکل آئی لیکن اُردو شاعری کے مداحین تین قوافی کو نشانِ انحطاط بنائے ہوئے ہوں، ان کے دام سے ہنوز نکل نہیں پائے۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور خود اپنے حال سے نا آشنا غافل ہیں۔ علوم نے گذشتہ چار سو سال میں جو ترقیاں کی ہیں ان کی طرف سے انھوں نے منہ موڑ رکھا ہے لہٰذا وہ جاہل ہیں۔ زندگی کی رزمگاہ کو چھوڑ کر انہوں نے عافیت طلبی اور تن آسانی کو شعار بنا لیا ہے، چنانچہ جانفشانی مہم طلبی، جستجو اور نبرد آزمائی سے وہ محروم ہو گئے ہیں؛ یعنی کاہل ہیں۔

ضرورت ہے اس قید خانہ کی دیوار کو توڑنے کی۔ باہر سے کوئی کیوں توڑنے لگا۔ دنیا اسی میں عافیت دیکھتی ہے کہ کمہار کا ضیغم شیر قالین بنا رہے اندر سے زنداں کی دیوار توڑنے کا سر و سامان وہ کرے جو شعور رکھتا ہو جس میں حوصلہ ہو، ہمت ہو، حمیت ہو، غیرت ہو، یہاں یہ سب ناپید اور ناپیدہ کیا کیا جائے؛ دیوانہ وار دیوار سے ٹکرانے سے سر تو پاش پاش ہو جائیں گے دیوار بھی نہیں بچے گی۔ دیوار ٹوٹی تو روشنی آئے گی، تازہ ہوا داخل ہو گی۔ پھیپھڑے جو گیس نکالے ہوئے غبارے کی طرح پچک گئے ہیں پھر پھول جائیں گے سینے جو سکڑ گئے ہیں چوڑے ہو جائیں گے، سر جو گریبان کی طرف جھک گئے ہیں جیسے منکا ڈھلک گیا ہو، آسمان سے باتیں کرنے لگیں گے۔ عروق مردہ میں خونِ زندگی دوڑ جائے گا۔ غفلت کاہلی اور جہالت رخصت ہو جائیں گی۔

شرط یہ ہے کہ زندانیوں میں سے ہر ایک گھٹن محسوس کرے، اسے قافیہ تنگ ہوتا ہوا نظر آئے۔ وہ اس شعر کی عملی ترجمانی چھوڑ دے؛

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں ؛ گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔

اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ زندگی آرام کے لیے نہیں بنی ہے۔ زندگی جہاں ختم ہوتی آرام ہی آرام ہے۔ موت آرام کے لیے بنی ہے۔ جو فرد یا جماعت آرام ڈھونڈتی ہے وہ موت کو دعوت دیتی ہے۔ زندگی جدوجہد ریاضت جستجو اور آرزو کے لیے ہے۔ زندگی تڑپنے اور پھڑکنے کے لیے ہے۔ زندگی پہاڑوں کو تسخیر کرنے، سمندروں کو کھنگال ڈالنے، ارض و ماہ، سیاروں اور کہکشاں اور کائنات کو زیرِ قدم لانے کے لیے ودیعت کی گئی ہے۔ زندگی نام ہے خوب سے خوب تر کی لامتناہی تلاش کا۔ زندگی عبارت ہے ایک اٹوٹ اور متواتر سفر سے۔ زندگی کا خمیر حوصلہ اور زندہ دلی سے بنا ہے۔ اس کے خواص غیرت اور سرافرازی ہیں۔ زندگی کڑھنے، گھٹنے، شکایت کرنے، فریاد کرنے اور آہ کرنے کے لیے نہیں بنی ہے۔ جو لوگ زندہ ہوتے ہیں ان کے ردِ عمل کی گونج فردوسی کے اس مصرع میں سنائی دیتی ہے۔

من و گرز و میدان و افراسیاب

زندگی حرکت ہے، زندگی علم ہے، زندگی شعور ہے، زندگی بیداری ہے، زندگی کا ناخن کائنات کی گتھیوں کو سلجھاتا ہے، جہاں ایک گتھی کو سلجھایا دوسری گتھیاں اس کے ناخنوں کی پذیرائی کرتی ہیں۔ جہاں ایک ہفتخواں طے کیا ستر اور ہفتخواں اس کو دعوت مبارزت دینے کے لیے سامنے آ جاتے

ہیں جیسے ایک دانے سے ستر دانے نکلتے ہیں اسی طرح ایک سفر پھر ایک سفر ستر اور سفروں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ سفر کو ترک کرنا زندگی کو خیرباد کہنا ہے۔

کاہل صرف وہ نہیں جو اعضاء کو حرکت دیتے ہوئے ہچکچاتے ہیں، کاہل وہ بھی نہیں جو حوصلہ کی نداآن سنی کر دیتے ہیں؛ جو فکر کے پر کترتے ہیں تاکہ اس میں اڑنے کا یارا ہی نہ رہے۔ جو جستجو کو کروٹ لینے ہی نہیں دیتے کہ ذہنی سفر کی صعوبت کو وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ جو تقلید میں ہی عافیت ڈھونڈتے ہیں جو کسی تبدیلی کو گوارا نہیں کرتے غافل اس امر سے کہ زندگی ہر آن بدلتی ہے اس کا تانا بانا ہر پل ہونے والی تبدیلیاں ہیں۔ کاہل وہ بھی ہیں جنھوں نے خودغرضی کا خول پہن لیا ہے، انھیں شاید نہیں معلوم کہ اپنی فکر اپنے اعمال اور اپنی صلاحی کو اپنے تک محدود کر دینا سب سے بڑی تنگدستی ہے۔ دولت ہمدردی، خیراندیشی، یاوری، دستگیری، وسعت نظر، توسیع افق، رفعتِ فکر کی دولت۔ اُن کی دسترس میں تھی۔ انہوں نے اپنی نادانی میں اسے ٹھکرادیا اور فکر و عمل اور جذبہ کے لحاظ سے کنگال ہو گئے۔ ان کے بس میں تھا کہ کائنات خلقِ خدا اور انسان کو اپنے احاطہ میں لے لیں۔ اس دنیا کو تسخیر کر لیں جو آرزو جستجو، ہمدردی، دردمندی اور امدادِ باہمی کی دنیا ہے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور اپنے مرجھائے ہوئے سکڑے سکڑائے ہوئے وجود کو اپنی کائنات بنالیا۔ انہوں نے ساری قدروں ساری خوبیوں، ساری خیراندیشیوں کو خیرباد کہا اور لگے حریصانہ مادی اشیاء کو سمیٹنے، گویا وہ اس دنیا میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ چمکتے ہوئے کھلونے انھیں ایک لمحہ بھی سکون اور خوشی دے سکیں گے۔ یا پھر جو کچھ انہوں نے اکٹھا کیا ہے اور جمع کیا ہے فراعنۂ مصر کی طرح وہ اسے قبر میں ساتھ لے جائیں گے۔

جاہل صرف وہ نہیں جو اَن پڑھ ہیں، حرف ناآشنا ہیں۔ جاہل وہ بھی ہیں جو پڑھ لکھ کر نابھو رہتے ہیں، جو بات کی تہہ تک نہیں پہنچتے، اس کے حاشیہ پر منڈلاتے رہتے ہیں، جن کا ذہن صاف نہیں ہوتا، جن کی فکر الجھی ہوئی ہوتی ہے۔ جنھیں نہ تناسب کا احساس ہوتا ہے نہ تناظر کا، جو انتخاب نہیں کر سکتے، فیصلہ نہیں کر سکتے۔ جو امور کا ٹھنڈے دل سے تجزیہ نہیں کر پاتے، جو بات سنتے ہی بھڑک اٹھتے ہیں اور اپنے نقطۂ نظر کو دلائل سے ثابت کرنے کے بجائے چڑھی ہوئی آستین، بھنچے ہوئے گلے اور کف آلود دہن سے کام لیتے ہیں، جو کرختگی، قطعیت اور شدت گفتار کی راہ اختیار کرتے ہیں جو یہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ دوسرے کی بات میں بھی کوئی وزن، اس کے نقطۂ نظر میں بھی کوئی صداقت ہو سکتی ہے، جو دوسروں کے جذبات کو جراحت پہنچا کر مسرور و مفتخر نظر آتے ہیں۔ جو اس انحطاط کو ہم قافل سمجھتے ہیں جو ظلم و صداقت روی کے ساتھ چلتا ہے۔ جو اصل کو چھوڑ کر فروع میں الجھے رہتے ہیں۔ جو بنیاد کی مضبوطی سے زیادہ وزن اس پر بنے ہوئے نقش و نگار کو دیتے ہیں۔ جو دھیمے لہجے کو کمزوری اور استدلال کو گمراہی سمجھتے ہیں، جو عقل سے ہمہ وقت دور رہتے ہیں، جذبہ سے سدا مخمور۔

غافل صرف وہ نہیں جو بے نیاز ہیں اس سے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے صرف وہ بھی نہیں جو اپنی بقاء، سلامتی، صحت اور سرخروئی سے بے اعتنا ہیں غافل وہ بھی ہیں جو آنکھیں موندے رہتے ہیں، جو کانوں میں روئی دے لیتے ہیں، جو نہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں۔ نفع نقصان کی فکر انھیں دامن گیر نہیں ہوتی خطرہ کی آہٹ سننے کے لیے وہ تیار ہی نہیں ہوتے۔ انھیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ حواس اور ذہن کو بیدار کیے بغیر جینا موت سے بدتر ہے، وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ غفلت متعدی ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ نہ صرف انھیں بلکہ اس جماعت کو بھگتنا پڑتا ہے جس سے ان کا تعلق ہے۔ انھیں زمانہ کی تیز رفتاری کا مطلق اندازہ نہیں ہوتا، نہ یہ بات ان کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک لمحہ کی غفلت راہی کو سو سال پیچھے کر دیتی ہے۔ غفلت اس بے ہوشی یا نیم بیہوشی کو بھی کہتے ہیں جو سنگین بیماری کا ہاتھ پکڑ کر آتی ہے اور جو بسا اوقات موت کا پیشہ خیمہ ہوتی ہے۔ اس غفلت کو "سنبھالے" کی بہن کہا جاتا ہے تیماردار کو دونوں سے ڈر لگتا ہے۔

ہمیں ان تین قافیوں کے استبداد کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا چاہیئے لیکن کوئی قافیہ پیما یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ قافیوں کا کیا قصور، اسی وزن پر تین قافیے اور بھی ہیں کامل، عاقل، عامل۔ اس کو کیا کیجیے کہ ہم نے انتخاب ہی غلط کیا۔ لہٰذا قافیوں کے استبداد کی حیثیت جملہ معترضہ اور مذرلنگ سے زیادہ نہیں۔ عنوان تراشی کے شوق اور تجنیس کے خبط نے قافیوں کو مضمون کا محور بنادیا ورنہ سیدھی سادی بات جو کہنے کی تھی وہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی بقا، فلاح و اصلاح اور ترقی کے لیے یہ امر ضروری ہے کہ اُن کے نقطۂ نظر اور افتادِ طبع اور صلاحیتوں میں انقلاب لایا جائے۔ یہ انقلاب اب نہیں آیا تو وہ زمانہ آجائے گا کہ یہ بے سود ہوگا۔

ارشاداتِ قرآن

اور سب مل کر اللہ کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑے رہنا اور متفرق نہ ہونا اور اللہ کی اس مہربانی کو یاد کرو، جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے۔

——— سورۃ آلِ عمران

کیا ان لوگوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ فضائے آسمانی میں گھرے ہوئے کس طرح اڑتے رہتے ہیں۔ ان کو اللہ ہی تھامے رکھتا ہے۔ اس میں اہلِ ایمان کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

——— سورۃ نحل

اے گروہ جن و انس اگر تمہیں قدرت ہو تو آسمان اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ۔ تو نکل جاؤ۔ اور (علم کے) زور کے سوا تو تم نکل سکتے نہیں۔

——— سورۃ رحمٰن

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا جو معتوب نہیں ہوئے اور جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔

——— سورۃ فاتحہ

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کیا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور شکر گزار ہو۔

——— سورۃ جاثیہ

[illegible] جداگانہ وعظ و تلقین سے ہوگا، نہ چھوٹی موٹی [illegible] ایک عہد آفریں انقلاب کی ضرورت ہے۔ بے حسی [illegible] اور اقتدار کی ہوس کو بھی مسمار کرنا ہے۔ اس کے [illegible] جفاکشی اور جرأت درکار ہوگی۔ انقلاب کوئی بیرونی طاقت [illegible] کرے گی نہ یہ کسی شہسوار مرکب دوراں کا رہین منت ہوگا. انقلاب [illegible] کے عزم اور جماعت کی کوشش سے آئے گا۔ حرکت کی لہر فرد سے اٹھے گی اور جماعت تک پہنچے گی۔ اس کے بالعکس نہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کوشش کرے گا، خود کو سدھارے گا اور غفلت، جہالت اور سستی کو اپنی شخصیت کا پورا زور لگا کر ترک کرے گا تو بات بنے گی۔ قافیوں سے گفتگو کا آغاز ہوا ہے تو نامناسب نہ ہوگا اگر تان بھی شعر و شاعری پر ٹوٹے۔ شمالی ہندوستان کے مسلمان یوں بھی شعر و شاعری کے بغیر قدم نہیں رکھتے، نوالہ نہیں توڑتے، وہ لفظوں سے کھیلتے رہتے ہیں، بدم گفتگو پن کرنے میں انھیں خاص لطف آتا ہے کہ دماغ پر اس سے آنچ نہیں آتی اور ایک سستا خطاب ہاتھ آجاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم آساں راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں یا مشکل راستہ سہل راہ یہ ہے کہ جان ملک الموت کے سپرد کیجیے اور خاموشی کے ساتھ من حیث الجماعت لحد میں اتر جائیے ایک ٹانگ اس میں لٹکائے ہوئے نہ جانے کب سے ہیں۔ زحمت بس اتنی ہوگی کہ دوسری ٹانگ کو بھی پہلی ٹانگ کے برابر لے آئیے۔ اس عمل میں نہ دماغ پر آنچ آئے گی نہ جسم کو تکلیف ہوگی، پھسلتے ہوئے آرام گاہ میں پہنچ جائیں گے۔ دوسرا راستہ مشکل ہے زبس مشکل وہ راستہ ہے محنت ریاضت جفاکشی، تدبیر جد و جہد کا، قدرت کا قانون ہے کہ غالب وہی ہوگا جو مشکل راہ اختیار کرے۔ ہمارے ادب میں ہمارے دوسرے شعرا پر اسد اللہ خاں غالب کیوں ہوئے مشکل پسندی کی وجہ سے۔



پروفیسر قاضی عبدالستار

گیارھویں قسط

خالد بن ولیدؓ

ایک ایک بالشت زمین کے لیے سر دے ڈالے قناطر کو ڈھکیل کر سیف اللہ پھر قلب کی طرف چلے کہ حباشش ایک پیر رکاب میں ڈالے دوسرے گھٹنے سے خون کا پرنالہ بہتا نظر آیا۔ سیف اللہ کو دیکھ کر سہم گیا۔

"یا سیف اللہ میرا پیر کٹ کر گر گیا ہے۔ میں اُسے ڈھونڈ رہا ہوں" اور دشمنوں کی صف میں گھس گیا۔

باہان نے جب دیکھا کہ ساٹھ ہزار زنجیر پوش پیدلوں کی حفاظت جن کی بڑی تعداد سلامت تھی اور چالیس ہزار سواروں کی جمعیت جس کا ایک معقول تعداد برباد ہو چکی تھی اسلامی جوش جہاد کے سیلاب عظیم پر قابو پانے سے عاجز ہے اور رومی پرچم اقبال اور صلیبِ مقدس کی پیش قدمی تقریباً روک دی گئی تو اس نے اپنے ترکش سالاری سے دوسرا تیر نکالا۔ عقب کے سواروں کی قطاریں جو اگلی صفوں کی پشت دبائے کھڑی تھیں اور ان کے گرتے ہوئے سواروں کی جگہ بھر رہی تھیں ان کے دس ہزار سواروں کے ساتھ اسلامی سپہ سالار کے خیمے پر چڑھ دوڑنے کے لیے اس طرح سے نکالا کہ امین الامت جو قلب پر قائم تھے اس کے ارادوں کو بھانپ نہ سکے باہان گھوڑوں کو اٹھانے کے لیے میدان پا رہا تھا کہ قباث بن اشیم نے جو دو ہزار سواروں کے ساتھ ساقہ پر حاکم تھے لیکن جنگ مغلوبہ کا حکم پاتے ہی دشمن کے قلب پر جا پڑے تھے باہان ہی کی سی پھرتی اور چالاکی کے ساتھ اپنے ہزار سواروں کے ساتھ خیام خالد کی حفاظت پر پہنچتے پہنچتے افسر سامان کو للکار دیا جو چند سو پیدلوں کے ساتھ ہندہ اور دوسری عورتوں کی حفاظت پر مامور تھے۔ تاہم باہان کے تازہ دم سواروں نے قباث کے شتر سواروں اور پیدلوں پر اپنے تیار عسکری گھوڑوں کی برتری سے خیموں کے سامنے تک پہنچ جانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ یرموک کا چوتھا پڑا

معرکہ اسی مقام پر برپا ہوا۔ ہندہ کی کمان میں کئی سو عورتوں نے ٹولیوں پر چڑھ کر فلاخن سے سنگ باری کی سانگوں اور تیروں سے دشمنوں کو شکار کیا۔ جس نے بھاگنے کی کوشش کی اُسے خیمے کی چوبوں سے مار مار کر ڈھکیل دیا۔ ابی سفیان جو خطابت کرتے کرتے شجاعت کا اظہار کرنے لگے تھے دشمن کے ریلے میں بہتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگے تو ہندہ نے آواز دی کا

"اے جوانی کے جواں مرد — اے سپہ سالاروں کے باپ بڑھاپے کو رسوا نہ کر" اور ابی سفیان نے اپنے اونٹ کو دشمن پر اس طرح ڈھکیل دیا کہ وہ تلواروں کا شکار ہو گیا۔ اور خود زخموں سے چور ہو گئے باہان آہستہ آہستہ برتری حاصل کرنے لگا تھا کہ سیف اللہ جو یزید کو قناطر پر چڑھا کر قلب پر متوجہ ہو رہے تھے جبر داروں کے نیزوں کے نشانے پر باہان کو دیکھتے ہی جھپٹ پڑے۔ دیکھا کہ قباث بن اشیم دشمنوں کے حلقے میں کھڑا تلواریں توڑ رہا ہے اور عربوں کی مثالی شجاعت کا اظہار کر رہا ہے تلوار ٹوٹتے ہی پکارنے لگا —

"کوئی اس شخص کو تلوار دے جو گھوڑے سے تختے پر اتر آیا"

"اے سپہ سالار — میں نے زخمی عبدالرحمن کو یہ تلوار نہیں دی لیکن تو قبول کر تیری سپہ سالاری کی نذر ہے۔ تو نے سپہ سالاری کا حق ادا کر دیا"

خالد کی آواز کا بلند ہونا تھا کہ وہ جو تختے پر اتر آئے تھے موت پر ہاتھ دھرنے لگے جو زخموں سے چور ہو کر گر چکے تھے۔ اونٹوں کے پالان اور گھوڑوں کی زینیں تھام کر کھڑے ہو گئے۔ ابی سفیان نے خون سے سرخ آواز میں للکار دیا۔

"ہاں اے اہل مکہ سپہ سالار کے خیمے پر سپہ سالار کے سامنے جان دے دو"

ساتھ ہی سیف اللہ نے تکبیر بلند کی عورتوں تک نے تکرار کی اور باہان کی صف پر وہ ہولناک یلغار کی کہ اس کا گھوڑا مارا گیا اور اپنے گارڈ کے گھوڑے پر چڑھتے چڑھتے زخمی ہو گیا۔ ایک سالار اس کے پیچھے بیٹھ کر میدان سے نکال لے گیا اور میدان قباث بن اشیم کے ہاتھ میں دے گیا کہ سیف اللہ باہان کے گرتے ہی صلیب مقدس پر باگیں اٹھا چکے تھے۔

دراقص جو عمرو بن العاص کی پیش قدمی پر قابو پا چکا تھا اور باہان کی حکمت عملی سے باخبر تھا۔ باہان کے سرخ پوش گارڈز کو اس کے زرنگار جھنڈے کے ساتھ نکلتے ہوئے دیکھ کر تڑپ گیا۔ سرفش کو میسرہ دے کر تیزی سے صلیب مقدس کی حفاظت کو نکلا کہ اچانک آسمان گرجنے لگا۔ کڑکنے لگا اور طوفان ابر و باد آ گیا۔ تصور سے زیادہ تیز رفتار طوفان آ گیا۔ گرد و باد کے بگولے عربوں کی پشت پر اور رومیوں کے منہ پر تھے۔ اور عرب پیدل تک جیسے اُن بگولوں پر سوار ہو کر حملہ کرنے لگے دراقص نے پہنچتے ہی باہان کا مقام لے لیا اور پیدل تیر اندازوں کو تیر باری کا حکم دے دیا۔ پہلا تیر چلتے ہی سیف اللہ نے ہوشیار کیا

"فاتحو۔ اپنے چہروں کو ڈھالوں سے چھپا لو — اور جھپٹ پڑو"

ایک ایک لفظ کی تعمیل کی گئی لیکن ساٹھ ہزار تیر اندازوں کے تیروں سے سات سو آدمی زخمی ہو گیا۔ جوشِ جہاد میں دیوانے سواروں نے چہروں پر ڈھالیں رکھنے کے بجائے کمانداروں کو جھپٹ لیا۔ اس جاں سپاری اور جاں فروشی میں بڑے بڑے نامور آنکھوں سے محروم ہو گئے۔ ہاشم بن عتبہ نے اپنی آنکھ میں دھنسا ہوا تیر نوچ کر پھینک دیا اور گھوڑے سے پھاند کر پیدلوں کا صفایا کرنے لگے۔ ابی سفیان نے بھی اپنی اس آنکھ سے تیر نکالا جو حنین کی لڑائی میں بینائی سے محروم ہو چکی تھی۔ اونٹ سے اتر کر پیدلوں پر ٹوٹ پڑے۔ دراقص نے رومی پرچم کا سامنا ٹوٹتے ہوئے دیکھا تو پہلوؤں کے دستے سامنے اور پشت کا انبوہ پہلوؤں پر جھونکنے لگا۔ سیف اللہ نے یہ دیکھتے ہی طوفان کے پرشور جھکڑوں کی آڑ میں صلیب مقدس اور پرچم اعظم کی خالی پشت پر اپنے سوار ریل دیئے زنجیر پوش پیدل ڈویژن تیزی کے ساتھ حرکت کرنے سے مجبور تھا۔ دست بدست جنگ سے بھی بڑی حد تک معذور تھا کہ ایک سپاہی کا ایک زخم اس کی زنجیر میں جکڑے ہوئے دوسرے دس دس بارہ بارہ سپاہیوں کی کارکردگی کو لے ڈوبتا وہ سیف اللہ کے عتاب کا شکار ہونے لگے۔ دراقص چہرے پر ڈھال رکھے دوسرے ہاتھ سے بھڑکتے گھوڑے کو سنبھالے تقاضے اور مزعوراون عیاض کی یورش کو سنبھالنے میں کامیاب ہو رہا تھا کہ اچانک دولت روما کا پرچم اعظم گر پڑا۔ صلیب مقدس سرنگوں ہو گئی۔ باجے بجانے والوں کے ہاتھ سو گئے۔ ساتھ معاذ بن جبل عبدالرحمان بن ابی بکر ابو قتادہ انصاری عبداللہ بن عمر، عمرو بن معدیکرب اور جابر بن عبداللہ نے ایک ساتھ تکبیر کہہ کر وہ آخری حملہ کر دیا جس نے پورا قلب اور آدھا میدان غارت کر دیا۔ سیف اللہ نے چار ہزار سوار رومی میسرے پر جھونک دیے اور خود ان کے میمنے پر اپنے علم کا سایۂ اجلال ڈال دیا۔

نقشے کے عین مطابق صلیب مقدس اور پرچم اعظم کے گرتے ہی نازک مزاج اور عیش پسند قوم کے سواروں نے اپنے سپہ سالاروں کی چیخ پکار کے باوجود بھاگنا شروع کر دیا۔ بھاگتے ہوؤں کو روکنے کے بجائے اپنے سواروں کو پہلوؤں میں سمٹ کر بھاگنے والوں کے لیے راستے بنا دیے۔ دونوں بازوؤں پر چند ہزار سوار عمرو بن العاص اور یزید بن ابی سفیان کی تلواروں کا شکار ہونے کے لیے رہ گئے اور قلب کے زنجیر پوش پیدل اونٹوں پر بیٹھے ہوئے قادر تیر اندازوں کا ہدف ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

فتح کی تکبیریں سن کر پیدل بھی پیچھے ہٹنے لگے لیکن ایک ایک زنجیر میں دس دس پانچ پانچ سپاہیوں کی ٹکڑیاں بندھی تھیں ان میں سے کوئی ایک گرتا یا زخمی ہوتا تو دوسروں کی کارکردگی لے ڈوبتا۔ ان کے تیر انداز کیا عاجز تھے کہ دست بدست لڑائی نے کمانوں کو کھینچنے کی مہلت نہ دی۔ عراق کی جنگوں کے تجربہ کار سواروں کی کمان میں شتر سوار اپنی سانگوں اور برچھوں اور تیروں سے اُن پر موت کی بارش کرنے لگے اور وہ واقوصہ کی گھاٹیوں میں گرنے لگے۔ کھڈوں میں ڈھلکنے لگے۔

شام ہونے سے پہلے رومیوں کا آفتاب اقبال غروب ہو گیا سپہ سالار اپنے دستوں کے ساتھ سجدۂ فتح ادا کر چکے تھے اور مبارکباد لے رہے تھے اور سیف اللہ ایک زانو پر عکرمہ کا اور دوسرے زانو پر اس کے جوان بیٹے کا سر رکھے اپنے عمامے کے شملے سے خون پونچھ رہے تھے

اور کہہ رہے تھے "خدا کی قسم ابن حنتمہ (حضرت عمرؓ) نے غلط کہا کہ ہم لوگ شہادت نہیں پا سکتے۔" اور آگے بڑھے تو جرجیس کی لاش پڑی تھی۔ اس کی پیشانی کا بوسہ لے کر اصحاب رسول اللہ کی لاش ڈھونڈنے لگے کہ تین ہزار شہیدوں میں سے ایک ہزار کی تعداد اوپر چھائے ہوئے تھے ان میں سے بھی تین سو وہ برگزیدہ نام تھے جنھیں بدر سے نسبت تھی۔ پھر امین الامت آگئے گھوڑے سے پھاند پڑے سینے سے لگا لیا۔ "سیف اللہ کو فتح الفتوح مبارک ہو" "صدر سپہ سالار کو مبارک ہو" پھر خبردار گھوڑے اڑاتے آئے۔ "یا سیف اللہ۔ باہان کے کیمپ پر سواروں کا سیلاب چڑھ رہا ہے" سیف اللہ نے سنا اور امین الامت کو دیکھا۔ امین الامت کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور جانے لگے کہ اگر سیف اللہ کو بھیجتے ہیں تو صدر سپہ سالاری کا اظہار کرتے ہیں اور خود سوار ہوتے ہیں تو بھی صدر سپہ سالاری کے اختیار کا نام ہوتا ہے۔ ابھی وہ اسی کشمکش میں مبتلا تھے کہ یزید بن ابی سفیان عمرو بن العاص شرجیل بن حسنہ، ابی سفیان قعقاع بن عمرو معاویہ بن ابی سفیان اور عبدالرحمن بن خالد سب کے سب ایک ساتھ گھوڑے کڑکڑاتے آگئے۔ سیف اللہ کو یرموک مبارک ہو۔ فاتح یرموک کو فتح مبارک ہو۔ "صدر سپہ سالار کو فتح الفتوح مبارک ہو" مبارکباد کے نعروں سے میدان گونجنے لگا۔ ابی سفیان چہرے کی بلائیں لینے لگا۔ عمرو بن العاص اور دوسرے سیف اللہ کے ہاتھوں کو بوسہ دینے لگے اور وہ اپنے خون آلودہ ہاتھوں کو چھڑانے کی کوشش کرتے رہے عبدالرحمان اور معاویہ بن ابی سفیان نے سیف اللہ کا گھوڑا تھام لیا۔ اس کے زخموں کو دیکھنے لگے۔ ہرچند کہ چہرے پر وہی تبسم آوازیں وہی پُروقار گرم جوشی، وہی اندازو ادا پر وہی تمکنت وہی شوکت، لیکن پھر بھی کہیں کوئی چیز کم ہو گئی تھی۔ کوئی شے کھو گئی تھی اور نگاہیں بار بار چہروں سے اٹھ کر خلاؤں میں کچھ تلاش کرنے لگی تھیں۔ امین الامت نے فرمایا۔ "سیف اللہ کے دونوں ہاتھ دونوں کلائیاں اور چہرہ تک لہولہان ہے" "جسم کے زخم بھر جاتے ہیں امین الامت۔ وقت بھر دیتا ہے" "جی چاہتا تھا کہ باہان کے کیمپ پر وہی ہاتھ محمدی علم لہراتے جنھوں نے حیات طیبہ سے آج تک اس علم کو فتوحات کا مرکز بنا دیا لیکن" قبل اس کے کہ امین الامت اپنا جملہ پورا کریں۔ سیف اللہ اشقر پر سوار ہو چکے تھے اور سوار ہوتے ہی چھوڑ دیا تھا اور طرارے بھرنے لگا تھا: تمام سالاروں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور امین الامت کی اقتدا میں گھوڑوں پر چڑھ گئے دیرالجبل پر کھڑے ہوئے شاہی کیمپ پر شام اتر رہی تھی اور روضۃ الکبریٰ کا وہ مغرور علم جس کی طاغوتی پرواز مدینۃ النبی کا خواب دیکھنے لگی تھی اسی شکوہ سے لہرا رہا تھا جو کسی دولت عظمیٰ کو زیب دیتا ہے۔ اور اس کے چاروں طرف ان زخمی سواروں کا انبوہ کثیر آہیں بھر رہا تھا جن کے سپہ سالار انھیں تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے تھے سیف اللہ نے گھوڑے کو موڑ کر دیکھا تو امین الامت تک اپنے سواروں کے ساتھ موجود تھے۔ سیف اللہ نے باگا و قیصری کے دروازے کی طرف گھوڑا ڈال دیا۔ چند ہی قدم چلے تھے کہ رومی سواروں میں اتھل پتھل مچ گئی۔ گھوڑوں سے اتار کر تلواریں پھینکنے لگے سجدوں میں گرنے لگے۔ فرار ہونے لگے۔

سرخ دیبا سے منڈھی ہوئی سیڑھیوں کے سامنے اشقر کھڑا ہو گیا تمام گھوڑے کھڑے ہو گئے سامنے سرخ مخمل سے منڈھے تخت پر پرچم اعظم کھڑا تھا۔ سیف اللہ نے پرچم کو دیکھ کر ان سواروں کو دیکھا جو امین الامت کی قطار سے آگے نکل آئے تھے اور ان کے گھوڑوں کی گردنیں سیف اللہ کی رکابوں کے قریب تھیں۔ ایک سوار نے اٹھکائی گھوڑا تخت پر پہنچا ہی تھا کہ تلوار کی بجلی چمکی اور پرچم ایک عظیم الشان درخت کی طرح زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے سواروں نے اسے اپنی کمندوں میں باندھ کر کھینچ لیا۔ سیف اللہ اترے سب اتر پڑے۔ آہستہ آہستہ تخت پر چڑھ گئے اپنے شانے سے نیزہ کھینچا آسمان کی طرف بلند کیا تھا کہ مجاہدوں نے اپنے پھیپھڑے چیر ڈالے۔

اللہ اکبر!

اللہ اکبر!

اللہ اکبر!

اور محمدی علم لہرانے لگا۔ اشتر کے ایال مٹھی میں لے کر مڑے۔ اور گرجے

"کیمپ پر امین الامت نزول فرمائیں"

اور چڑھتے ہی گھوڑے کو چھوڑ دیا۔

کروڑوں کی دولت کی فردیں بن رہی تھیں ہزاروں غلاموں کے نام لکھے جا رہے تھے۔ ہزاروں گھوڑے تھوبلوں میں دیے جا رہے تھے۔ شہدار کی نمازیں پڑھی جا چکی تھیں زخموں کی مرہم پٹی ہو چکی تھی۔ رات چڑھنے لگی تھی اور بڑے بڑے نام امین الامت کے خیمے کے سامنے چٹائیوں کے فرش پہ اترنے لگے تھے۔

قدِ آدم شمعوں کی روشنی میں فاتحانِ یرموک حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ خالد کے گھوڑے سے اترتے ہی امین الامت کھڑے ہو گئے اپنے پاس بٹھا کر اپنا تکیہ اُن کی پشت سے لگا دیا۔ خالد نے کھڑے ہو کر وہی تکیہ اُن کی پشت سے لگا دیا اور ذرا آگے بڑھ کر دو زانو بیٹھ گئے۔ دیر تک خاموشی سے چھائی رہی پھر امین الامت کی بلند آواز اور بلند ہوئی۔

"اے امیرانِ عساکرِ اسلام — اے فاتحانِ یرموک ہمارا فرض ہے کہ سب سے پہلے ہم اُن شہیدوں کے حق میں دعائے مغفرت کریں جنہوں نے اپنی جان دیکر ہم کو فاتح کیا۔ خدا کے نام اور نبیؐ کے پیغام کو توقیر عطا کی صبح کی نماز جن کے دم قدم سے منور تھی شام کی نماز ان کے وجود سے محروم ہو گئی"

اور فاتحے کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

"کاش ایسا ہوتا کہ یہ خبر سنانے سے پہلے میری زبان سوکھ جاتی مجھے موت آجاتی کہ خلیفۂ اکبر۔۔۔

کہ خلیفۂ اکبر کا خورشیدِ حیات ڈوب گیا!

یہ فقرہ ادا ہوتا تھا کہ جیسے کہرام مچ گیا۔ تفصیلات جاننے کے لیے سوالات کی یورش ہونے لگی۔ دیر کے بعد جب سکون ہوا تو ارشاد کیا،

"عمر ابن خطاب کا آفتاب امامت طلوع ہو گیا۔ اور ان کے اولین فرمان کے مطابق محاذِ شام کے تمام عساکرِ اسلام کی صدر سپہ سالاری

مجھے قبول کرنا پڑی"

کتنے ہی بدن چونک پڑے۔ کتنی ہی آنکھیں چمک گئیں۔ کتنے ہی چہرے سُن ہو گئے۔ کتنی ہی نگاہیں خلا پر اُٹھ گئیں۔

"آپ کو مبارک ہو یا امین الامت۔ آپ کے مراتبِ دینی کا یہ ایک معمولی سا اعتراف ہے اور"

قبل اس کے کہ سیف اللہ دوسرا جملہ پورا کریں بڑے جذبے کے ساتھ فرمانے لگے۔

"پوری تاریخ اسلام۔ نہیں پوری تاریخ عرب میں وہ کون سا فاتح معظم اور سالار اعظم ہے جس نے حجاز سے نکل کر چند مہینوں میں الابلہ سے یرموک تک ایک دنیا فتح کر کے ڈال دی ہو روئے زمین کے سب سے بڑے شہنشاہوں کی سب سے بڑی فوجوں کو چند گھنٹوں میں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ہو۔ وہ تم ہو یا ابا سلیمان۔ خلیفۂ اکبر نے سچ کہا تھا کہ اب تم جیسا فرزند کسی ماں کو نصیب نہ ہوگا۔ اور تم کہہ رہے ہو کہ میری سپہ سالاری میری عبادت اور ریاضت کا انعام ہے۔ تم نے مجھے تسلی دی ہے ورنہ تم سے زیادہ کون جانتا ہوگا کہ وہ تاریخ ساز میدان جنگ جو مذہبوں اور قوموں اور تہذیبوں کی تقدیر لکھتا ہے وہ محض کلام الٰہی کی صحیح قرآت اور مسائل زکوٰۃ و نماز کے حل اور اس کے نفاذ سے مختلف اور بلند ہوتا ہے سپہ سالار اعظم کے لیے ضروری ہے کہ فنونِ حرب و ضرب میں مہارت کامل رکھنے کے علاوہ عسکری بصیرت اور دوربینی اور دوراندیشی اور مردم شناسی اور لشکروں اور سرداروں کی نذیر و زیرکی تفہیم سے لیس قیادتِ عظمیٰ کی وہ صلاحیت رکھتا ہو جو مٹھی کے ہاتھوں کو اپنی ترغیب سے ایسا شعلۂ جوالہ بنا دے کہ ان کے کارنامے آسمانوں کو روشن کر دیں۔ اور خدا نے تمہیں ان صفات عالیہ سے متصف کر دیا ہے۔ جو تمہارا حق تھا وہ تم کو ملا۔ میں تمہارے اس حق کی حفاظت بھی کرتا لیکن اس ہولناک حقیقت سے بھی تم مجھ سے زیادہ واقف ہو کہ اسلام اپنی تاریخ کے ایسے موڑ پر آ گیا ہے کہ فتنے کا ایک رخنہ برداشت نہیں کر سکتا۔ دربار خلافت کے احکامات کی مکمل پابندی ہی میں اسلام کی نجات ہے تمہاری نجات ہے ہماری نجات ہے خدا کی قسم وہ آہنی تنظیم اور اس کے تئیں مکمل سپردگی جس کی بنیاد ذاتِ رسالت کے مقدس ہاتھوں

سے رکھی گئی۔ اور جسے بلند کرنے کے لیے نائب رسول کے ساتھ خود سیف اللہ نے جان کی بازی لگا دی وہ ہمیں اپنی جانوں سے زیادہ عزیز ہے ورنہ ہم بھی جانتے ہیں کہ عمر ابن خطاب عرب کے امیر ہیں ایران کے کسریٰ اور روم کے قیصر نہیں ہیں۔ یا ابا سلیمان تم جس آزمائش میں مبتلا ہوئے اس میں ہم بھی تمہارے شریک ہیں۔ شریکِ غالب ہیں۔ خدا گواہ ہے کہ ہم تمہارے احسان مند ہیں کہ تم نے اپنے ساتھ ہم کو بھی اس کٹھن امتحان کی خطرناک گھڑی سے کامران اور کامیاب گزار دیا۔"

ابی سفیان عمرو بن العاص، یزید بن ابی سفیان اور معاویہ بن ابی سفیان سب اس طرح خاموش بیٹھے تھے جیسے سفیر نبوت تقریر کر رہا ہو اور سرداران قبائل سن رہے ہوں۔

پھر کاتب طلب ہوا اور یرموک کا فتح نامہ لکھنے لگا۔

نائب نائب رسول عمر ابن خطاب کے نام

حمدِ الٰہی ومنقبتِ رسولؐ اور ہدیۂ سلام کے بعد باعثِ تحریر یہ ہے کہ خلیفۂ اکبر کے وصال بے ہنگام سے پورا لشکر اسلام بے حواس ہے۔ وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جو دل ریزہ ریزہ کی کیفیت کا اظہار کرسکیں۔ ابھی ہم پر آسمان گرے ہوئے دو سال اور کچھ دن گزرے تھے کہ پیروں کے نیچے سے زمین بھی نکل گئی۔ خدا عالم اسلام کو اتنی طاقت دے کہ اس صدمۂ عظیم کو برداشت کرسکے۔

ہرقل کی ہرزہ سرائی پر غضب ناک ہو کر نائب رسول نے فرمایا تھا کہ خالد کو بھیج کر ہرقل کی ایسی مار لگواؤں گا کہ صدیوں کی شہنشاہی کا نشہ دنوں میں اتر جائے گا۔ خلیفۂ اکبر کی تحریر دیکھتے ہی سیف اللہ قہر آسمانی کی طرح اٹھے۔ قراقر سے سوا تک کا وہ ہیبت ناک سفر جو تاریخ عالم میں آج تک کسی سالار اعظم سے سرانجام نہ ہو سکا پانچ دنوں میں قالین پوش راستوں کی طرح لپیٹ کر پھینک دیا چند سو مجاہدوں کے ساتھ شہنشاہ مشرق و مغرب کے شہروں اور قلعوں کو شکار کھیلتے یرموک پہنچ گئے۔

شام کے عالموں کا قول ہے کہ تاریخ عالم میں کسی شہنشاہ اعظم نے کسی ایک مقام پر ایسا عظیم الشان اور اتنا کثیر التعداد لشکر جمع نہیں کیا جیسا سیلاب لشکر ہرقل اعظم نے یرموک پر ڈال دیا۔ اے امیر اسلام! تجھے کیا معلوم کہ چالیس ہزار مجاہدین اسلام اپنی ذاتی مصلوں پر سوار ہو کر اور دن گھوڑوں پر چڑھ کر کس طرح گزار رہے ہے اور مجاہدین اسلام نے سیف اللہ کے نزول اجلال پر کیا محسوس کیا۔ کہ ہم نے یہ محسوس کیا کہ ان کا مسیحا اتر پڑا۔ پھر خبر آئی کہ القدس کا فاتح سالار اعظم باہان کو یرموک کی کمان دے کر ہرقل بنفس نفیس اس جنگ میں شرکت کرنے والا ہے۔ اس خبر کے جواب میں سیف اللہ شیر اسلام سپہ سالار اعظم خالد بن ولید نے لشکر اسلام کو اس ترتیب عجیب سے آراستہ کیا کہ ہم کو رومیوں کا ڈھائی لاکھ لشکر قلیل معلوم ہونے لگا۔ حقیر معلوم ہونے لگا۔ ہر چند کہ ہرقل چند فرسنگوں پر اپنے کثیر لشکر کی پشت دبائے کھڑا تھا تاہم خالد کی تلوار نے کہ ہر یلغار قہر الٰہی تھی قہر آسمانی تھی لشکر روم کو تہ و بالا کر ڈالا۔ اور اپنے خلیفہ کے حکم کی لفظ بہ لفظ تعمیل میں چند گھنٹوں کے اندر شہنشاہ مشرق و مغرب کا غرور شہنشاہی جھاڑ کر رکھ دیا۔ امیر اسلام کو امت مسلمہ کو اور مستقبل اسلام کو یہ فتح الفتوح مبارک ہو اور خدا ہم کو یہ توفیق دے کہ ہم اجماع امت اور تنظیم ملت کی حفاظت کی خاطر ذاتی پسند و ناپسند کی سطح سے بلند ہو سکیں۔ تفصیلات خمس کے ساتھ ارسال کی جانے والی ہیں۔

والسلام — امیر مسا کا اسلام۔ ابوعبیدہ بن الجراح

خط پر مہر لگ رہی تھی۔ آنکھیں نم تھیں۔ چہروں کے خطوط سے انگارے برس رہی تھیں اور ہاتھ تلواروں کے قبضوں پر اٹھ رہے تھے کہ سیف اللہ نے پہلو بدلا۔ امین الامت نے پشت پر ہاتھ رکھ دیا۔

(جاری ہے)

پروفیسر منظر عباس نقوی

جنگ آزادی کا ایک جانباز مجاہد

حسرت موہانی

حسرت نے "اردوئے معلیٰ" تو جاری کر دیا تھا لیکن اس رسالے کی انگریز دشمنی کو دیکھتے ہوئے کوئی پریس اسے چھاپنے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔ آخر کار حسرت نے اس مشکل کا بھی حل نکال لیا۔ انہوں نے لکڑی کا ایک دستی پریس اور چند پتھر خرید کر اپنا ذاتی چھاپہ خانہ قائم کر لیا جس کا نام "اردو پریس" رکھا گیا۔ اس پریس کا سارا کام حسرت اور اُن کی بیگم خود ہی انجام دیتے تھے، وہ خود ہی پتھر بنا لیا جاتے، خود پریس چلاتے اور خود ہی رسالے کی جز بندی کرتے۔ ان کاموں میں ان کی بیگم بھی ہمارے اُن کا ہاتھ بٹاتی رہتیں اور یہ میاں بیوی کرائے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رات دن اپنے کاموں میں معروف رہتے، لیکن حکام یہ بھی برداشت نہ کر سکے اور ۱۲، ۱۳ مئی ۱۹۱۳ء کو رات کے وقت علی گڑھ کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے حسرت کے مکان پر وارد ہو کر حکومت کی جانب سے ایک نوٹس دیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ اردو پریس میں چونکہ پریس ایکٹ ۱۹۱۰ء کی رو سے کچھ الفاظ قابلِ اعتراض چھپے ہیں اس لیے پریس کے مالک کو حکم دیا جاتا ہے کہ ایک ہفتے کے اندر اندر تین ہزار روپے کی ضمانت ضلع مجسٹریٹ کے دفتر میں داخل کرے۔ حسرت تین ہزار کا بندوبست کہاں سے کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹ مئی ۱۹۱۳ء کو پریس، کاپیاں، پتھر سب ضبط کر لیے گئے۔

مولانا نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اردوئے معلیٰ کے آخری پرچے میں لکھا کہ "سر جیمس مسٹن (گورنر یوپی) کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی ناراضی سے ہم جیسے آزاد فقیر مرعوب نہیں ہو سکتے۔ جن جن تحریکوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ پریس جاری کیا گیا تھا وہ اس وقت تک ملک میں پھیل چکی ہیں۔ نایاب ادبی کتابوں کی اشاعت بہت کچھ ہو چکی باقی آئندہ ہوتی رہے گی۔ آزادی حاصل کرنے کا جذبہ لوگوں میں عام ہو چکا ہے، سودیشی تحریک ترقی کر رہی ہے۔ ہم نے اپنے دل میں عہد کر لیا ہے کہ ان تمام قومی تحریکوں کی حمایت کسی نہ کسی طرح کرتے رہیں گے۔ تحریر سے ممکن نہ ہوگا تو تقریر سے کام لیں گے۔ بہر طور ان تحریکوں سے دنیا کی کوئی طاقت ہم کو روک نہیں سکتی"۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنے اخبار 'الہلال' میں لکھا:

> "گورنمنٹ اس سے بے خبر نہیں کہ اردو پریس اور اس کے مالک کی کیا حالت ہے۔ حسرت موہانی جب قید سے رہا ہو کر آیا تو کوئی چیز دنیا میں ایسی باقی نہ تھی جو اس کے لیے ذریعۂ تقویت و ماں ہوتی۔ دو ڈیڑھ روپے ماہوار کرائے کا ایک جھونپڑا ہے جس کے اندر ایک چھوٹی سی صحنچی اور کوٹھری ہے اور باہر بھی اتنی ہی مکانیت ہے۔ اندر وہ فقیرِ حریت مع اپنی کوہ عزم بیوی کے رہتا ہے اور باہر کاٹھ کا دستی پریس اور دو چار پتھر ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ خود اس نے اپنے ہاتھوں سے اردوئے معلیٰ کی کاپیاں لکھی ہیں، خود ہی پتھر پر جمائی ہیں اور خود ہی پریس چلا کر چھاپا ہے۔ یہ کل کائنات اردو پریس اور اس کے مالک کی ہے۔ کوئی دوسرا ذریعۂ آمدنی نہیں... اردوئے معلیٰ کے دو چار سو خریدار ہیں۔ اس کی قیمت سے شاید چند روپے مہینہ میں بچ رہتے ہیں اور اسی سے دو وقت کی روٹی کھا کر نشۂ آزادی کی بے خودی

سے مست رہتا ہے۔"

پریس ضبط ہو جانے سے جب حسرت کے پاس روزی کا کوئی ذریعہ نہ رہا تو حسرت نے سوچا کہ کچھ کاروبار کرنا چاہیے سودیشی تحریک کے وہ بڑے پرجوش حامی تھے اور چاہتے تھے کہ سودیشی مال کا استعمال عام ہو اس لیے ایک سودیشی اسٹور کا منصوبہ بنایا گیا۔ لیکن اسٹور کھولنے کے لیے پیسے کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں مولانا شبلی نے ان کی مدد کی اور اپنے ملنے والے بمبئی کے ایک سیٹھ سر فاضل بھائی کریم بھائی سے ان کی ملاقات کرادی۔ سیٹھ صاحب نے حسرت کو کاروبار شروع کرنے کے لیے قرضے پر مال دلوادیا۔ حسرت دھن کے پکے اور محنتی آدمی تھے۔ بہت جلد ان کی دوڑ دھوپ سے یہ سودیشی اسٹور جس کا نام موہانی سودیشی اسٹور تھا خوب چل نکلا۔ مولانا شبلی نے جب ان کے کاروبار کا حال سنا تو فرمایا "تم آدمی ہو یا جن، پہلے شاعر تھے، پھر پالیٹیشین بنے اور اب بنیئے ہوگئے۔"

اُس زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کا مسئلہ ہر طرف بحث کا موضوع بنا ہوا تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے مطالبہ تھا کہ ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جو ملک بھر کے مسلم اداروں، اسکولوں اور کالجوں کو اپنی نگرانی میں رکھ سکے۔ دوسرے یہ کہ تعلیمی اور انتظامی معاملات میں یہ یونیورسٹی حکومت کے اثر سے بالکل آزاد ہو۔ حکومت مسلمانوں کی یہ شرطیں ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ حسرت نے اس سلسلے میں بڑی بے خوفی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ملک بھر میں وہ "سید الاحرار" یعنی آزادوں کے سردار کے لقب سے مشہور ہوگئے۔ حکومت ان کے رویے سے سخت پریشان تھی۔ کانپور میں انگریز حاکموں نے سڑک نکالنے کے لیے ایک مسجد کا وضوخانہ شہید کرادیا تھا، جس کی وجہ سے مسلمانوں میں انگریزی حکومت کے خلاف بڑے غم و غصے کے جذبات پائے جاتے تھے۔ ان حالات میں حکومت کو اندیشہ تھا کہ یہ مخالفت کہیں خطرناک صورت اختیار نہ کرلے اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ حسرت موہانی کو نظر بند کردیا جائے۔ حسرت نے نظر بندی کا حکم ماننے سے انکار کردیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مئی ۱۹۱۶ء میں انھیں للت پور جیل میں قید کردیا گیا اور وہاں سے علی گڑھ جیل میں بھیج دیئے گئے۔ ان حالات میں اُن کی بیگم کو بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا مگر ان کے حوصلے پست نہ ہوئے اور سوائے خدا کے کسی کی امداد گوارا نہ کی۔ حسرت کے ایک دوست پنڈت کشن پرشاد کول لکھتے ہیں:

"غالباً ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء کی بات ہے کہ حسرت جیل میں بند تھے۔ کانگریس کے کام سے مجھے علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں اپنے احباب سے میں نے سنا کہ حسرت کے گھر والوں کی زندگی بڑی مصیبت اور عسرت سے گزر رہی ہے۔ میں نے کوشش کی کہ میں بیگم حسرت موہانی سے ملوں۔ وہ میرے نام اور حسرت سے میرے مراسم سے یقیناً واقف تھیں۔ میں ان سے ملنے گیا۔ کچے مکانوں کے ایک احاطے میں نیم کے درخت تلے ایک کچا چھوٹا سا مکان تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اپنا نام بتایا۔ بیگم حسرت نے دروازہ کھولا اور مجھے ایک کمرے میں جس میں ایک پرانی دری بچھی ہوئی تھی لے جاکر بٹھایا۔ اس زمانے میں بیگم حسرت اپنی بوڑھی اور بیمار ماں اور اپنی بچی کو ساتھ لے کر اس مکان میں رہتی تھیں۔ حسرت کے متعلق بات چیت ہوئی۔ وہ جیل میں حسرت کا حال اور کیفیت مجھے بتاتی رہیں۔ حسرت تو جیل میں تھے لیکن ان کے گھر کے در و دیوار سے حسرت ٹپک رہی تھی۔ آخر میں نے جھجکتے ہوئے دبی زبان میں کہا "اگر آپ منظور کریں تو کچھ مالی امداد کا انتظام کیا جائے۔" انھوں نے کہا مجھے یہ گوارا نہیں کہ میرے لیے پبلک سے چندہ کیا جائے میں جس حالت میں ہوں خوش ہوں۔ آپ اس کی زحمت نہ گوارا کریں۔ لمحہ بھر کے سکوت کے بعد پھر بولیں کہ حسرت نے شعرا کے کئی دیوان چھپوائے تھے۔ ان کا یہ ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اُردوئے معلیٰ بند ہو چکا ہے یہ کاروبار ہی ابتر ہو گیا۔ اب یہ ڈھیر یہاں پڑا بیکار جگہ گھیر رہا ہے۔ اگر آپ ان دواوین کے فروخت کرانے کا کوئی انتظام کرسکیں تو البتہ کچھ سہولت ہوجائے گی۔"

حکومت کو یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ مولانا حسرت کو علی گڑھ جیل میں رکھا جائے اس لیے وہ پھر للت پور جیل میں بھیج دیے گئے۔ اس کے بعد وہاں سے جھانسی، جھانسی سے الٰہ آباد، الٰہ آباد سے پرتاب گڑھ، پرتاب گڑھ سے فیض آباد، فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوتے رہے۔ ہر جگہ ان پر بڑی سختیاں ہوئیں۔ حکومت کے اس ظلم کے خلاف ملک بھر میں جگہ جگہ جلسے ہوئے، اخبارات نے مضامین لکھے اور زور دیا گیا کہ مولانا کو رہا کیا جائے یا کم از کم علی گڑھ جیل ہی میں رکھا جائے تاکہ وہ اپنے بال بچوں سے قریب رہیں اور ان مصیبت زدوں کو مولانا سے ملنے میں آسانی ہو۔ لیکن حکومت پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔

قید کی تکلیفوں سے مولانا کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ بیگم حسرت نے یو۔ پی کے گورنر سے ملنا چاہا مگر انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر جب پبلک کا مطالبہ خطرناک صورت اختیار کرنے لگا تو حکومت انھیں کچھ شرطوں پر رہا کرنے کے لیے تیار ہو گئی، لیکن مولانا نے ذلت آمیز شرطوں پر رہائی سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر بیگم حسرت نے اخباروں کو جو بیان دیا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بیگم حسرت عورت ہوتے ہوئے بھی کتنی بہادر تھیں۔ اس بیان میں کہا گیا تھا:

"حسرت نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اس میں ضد اور خودداری کو مطلق دخل نہیں ہے۔ میں نے ان کی اس کاروائی کو بے حد اطمینان اور خوشی کے ساتھ دیکھا ہے۔ ایسی نظربندی سے قید بہر حال بہتر ہے۔ حسرت نے خوب کیا۔ مجھے ان سے ایسی ہی امید تھی۔"

بہر حال کچھ عرصے بعد حکومت نے محسوس کیا کہ اگر حسرت کو رہا نہ کیا گیا تو ملک میں اس کی مخالفت کا طوفان زور پکڑ سکتا ہے۔ مولانا رہا کر دیے گئے مگر اس شرط پر کہ علی گڑھ میں نہ رہیں۔ چنانچہ رہا ہونے کے بعد انھوں نے کانپور میں سکونت اختیار کر لی۔ سودیشی مال کا کاروبار پھر شروع ہو گیا۔ اب کی بار جو سودیشی اسٹور کھولا گیا اس کا نام خلافت سودیشی اسٹور رکھا گیا۔ اس اسٹور کے کئی حصے دار تھے۔ پہلے ہی سال کے خاتمے پر اسٹور کا منافع اس کے حصہ داروں میں تقسیم کر دیا گیا۔

(باقی اگلے شمارے میں ملاحظہ کریں)

کاہلی

یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا، کام کاج محنت مزدوری میں چستی نہ کرنا، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے میں سستی کرنا کاہلی ہے مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ دلی قویٰ کو بیکار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔

—— سر سید احمد خاں

ڈاکٹر عبدالقیوم
شعبہ فزکس۔ اے ایم یو

دُمدار تارے
(COMETS)

سائنس کی ترقی ایک سیدھی سادی، سوچی سمجھی مبنی بر عقل تخیلات کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کی تاریخ سیاسی نظریہ ارتقا سے بھی زیادہ الجھی ہوئی ہے۔ مبہم خیالات، پریشان کن حالات، فکر و عمل میں بے تعلقی، وہم، اندیشہ، آسیب وغیرہ سے بھری ہوئی ایک عجیب داستان ہے پھر یہ کیوں کر ممکن تھا کہ دمدار تاروں کے ساتھ عجیب و غریب کہانیاں وابستہ نہ ہوتیں؟

زمانہ قدیم سے دُمدار تارے کا فلک پر نمودار ہونا بدشگونی کی علامت سمجھا جاتا رہا ہے۔ ایسا یقین کیا جاتا رہا ہے کہ ۱۰۶۶ء میں انگلش بادشاہ ہیرولڈ (HAROLD) کی ولیم (WILLIAM) کے ہاتھوں شکست، ۱۴۵۳ء میں سلطنت قسطنطنیہ کا زوال اور ۱۹۱۰ء میں تاجدار برطانیہ ایڈورڈ ہفتم (EDWARD VII) کی موت اسی تارے کی بدشگونی کا نتیجہ ہے۔ امبروز پارے (AMBROSE PARE) نام کے یورپی طبیب نے ۱۵۲۸ء میں نمودار ہونے والے اس تارے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ "دُمدار تارہ اس قدر خوفناک اور دہشتناک تھا کہ کچھ لوگ اس سے ڈر کر مر گئے اور بیشتر لوگ بیمار پڑ گئے۔ یہ دُمدار تارہ بہت لمبا تھا اور خون کے رنگ کے مشابہ تھا۔ اس کے جھکاؤ کا انداز ایسا تھا جیسے ہاتھ میں تلوار لیے کسی کے قتل پر آمادہ ہو۔ اس کے اندر کچھ چھپے ہوئے انسانی چہرے بھی نظر آتے تھے۔ ان کے بال سؤر کے بالوں کی طرح سخت دکھائی دیتے تھے۔ ایسا لگتا تھا گویا یہ لوگ ہاتھوں میں تلواریں، کلہاڑیاں اور چاقو لیے ہوئے ہوں جن پر خون کے نشانات بھی موجود ہوں"۔ اس سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آج کا ترقی یافتہ یورپ بھی ان برے خیالات کا کس قدر شکار تھا لیکن علم کی روشنی نے بدشگونی کے چھائے ہوئے غلاف کو ہٹا کر اس تارے کو اور زیادہ منور کر دیا ہے تاکہ انسان اس کو اچھی طرح دیکھ اور سمجھ سکے نہ کہ اپنے حالاتِ زندگی کو اس تارے سے منسوب کرے۔

موجودہ نظریہ کے مطابق دمدار تارہ کا مرکزی حصہ گرد و غبار برف اور برف کی طرح جمی ہوئی گیس کا بنا ہوا ایک ٹھوس گولا ہے۔ یہ مرکزی حصہ مبہم گیس سے ڈھکا ہوا ہے۔ یہ ذرات خود منور نہیں ہے اس لیے اس کو ستارہ کہنا مناسب نہیں ہوگا۔ آج کے نظریہ کے مطابق ستارے کے ذرات خود منور ہونا ضروری ہے۔ سائنس دانوں کا قیاس ہے کہ اس طرح کے تارے کروڑوں یا شاید اربوں کی تعداد میں سورج سے بہت دور نظام شمسی کے ہی کنارے پر یونہی بے ترتیب حرکت میں ہیں۔ اس کو سائنس میں OORT SPACE کہتے ہیں۔ یہ جگہ زمین سے تقریباً دس سنکھ کیلومیٹر دوری پر واقع ہے۔ کبھی کبھی یہ کسی طرح بھٹک کر سورج کی کشش کی وجہ سے اس کے بہت نزدیک آ جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو سورج کے گرد چکر لگاتے ہوئے پھر اپنی جگہ واپس چلے جاتے ہیں اور کچھ خاص مدار میں سورج کے ہی گرد چکر لگانا شروع کر دیتے ہیں اور خاص مقررہ وقت کے بعد فلک پر نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ دمدار تارہ بھی ہمارے ہی نظام شمسی کا ایک جزو ہوا۔ ہر دمدار تارہ کا مدار مختلف ہوتا ہے۔ دوربین کے ذریعہ اب تک تقریباً سات سو ایسے تارے دیکھے جا چکے ہیں۔ ان میں سے پچاس ایسے ہیں جو دو سو سال سے کم عرصے کے بعد دوبارہ نظر آتے ہیں۔ ENCKES نام کا دمدار تارہ تو تقریباً ۳ سال ۴ مہینہ کے بعد ہی دوبارہ نظر آ جاتا ہے۔ ہر سال دوربین کے ذریعہ تقریباً بیس دمدار تارے دیکھے جاتے ہیں لیکن ایک صدی میں صرف چار یا پانچ ہی واقعی ایسے حامل ہوتے ہیں جبکہ وہ

ہ اسقدر روشن ہوتا ہے کہ دن میں بھی اس کو بغیر دوربین کی مدد سے دیکھا جا سکے۔

جسامت اور کمیت یعنی وزن کے اعتبار سے دمدار تارے مختلف قسم ہے اور کرہ ارض کے مقابلہ میں کافی چھوٹے ہوتے ہیں۔ دوربین کے ذریعہ پایا گیا ہے کہ اوسطاً ان کا قطر دس کیلو میٹر ہے اور اوسط کمیت ایک ارب میلوگرام ہے جو کہ زمین کی کمیت کے دس اربویں حصے سے بھی کم ہے چونکہ اس کا باہری حصہ ٹھوس نہیں ہے اس لیے سورج سے دوری کے لحاظ سے یہ اپنی شکل اور درجہ چمک بدلتا رہتا ہے۔ جیسے جیسے یہ سورج کے نزدیک آتا جاتا ہے سورج کی روشنی اس کی سطح پر بڑھتی جاتی ہے جس کی وجہ سے درجہ حرارت بڑھتا رہتا ہے۔ درجہ حرارت زیادہ ہونے کی شکل میں تیز گیس کی وجہ سے ٹیوب کی روشنی کی طرح روشن ہو جاتا ہے اور ہمیں نظر آنے لگتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کی کمیت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک دمدار تارہ ہزارویں مرتبہ سورج کے قریب سے گذرتے ہوئے اپنی تمام کمیت کھو بیٹھے گا اور بالکل نہیں کے برابر رہ جائے گا۔ جس وقت یہ سورج کے قریب تر ہوتا ہے باہری مبہم گیس کا حصہ پھیلنے لگتا ہے اور بعض دفعہ اس مبہم گیس کا پھیلاؤ ایک لاکھ ساٹھ ہزار کیلو میٹر تک پایا گیا ہے۔ اس کے پہلے جو روشن دمدار تارہ گذرا تھا اس کی دُم کا پھیلاؤ ہماری زمین کی باہری فضا تک تھا۔

شعاعوں میں طاقت ہونے کی وجہ سے یہ دباؤ ڈال سکتی ہیں۔ اسی لیے جب یہ تارہ سورج کے قریب ہوتا ہے تو شعاعوں کے مجموعی دباؤ کی وجہ سے مبہم گیس سورج کی دوسری طرف پھیل جاتی ہے جس کے نتیجہ میں دُم نظر آنے لگتی ہے۔ اور یہ دُم ہمیشہ سورج کی دوسری طرف ہوتی ہے سورج کی فضا سے باہر کی طرف جانے والے طاقتور ذرات بھی دُم بنانے میں کافی حصہ لیتے ہیں اور بعض دفعہ انھیں وجوہات سے بہت صاف دُمیں نظر آنے لگتی ہیں۔

سورج کی ٹھیک دوسری طرف سیدھی دُم جس میں زیادہ تر گیس کا حصہ ہوتا ہے ذرات کی وجہ سے بنتی ہے اور دوسری دم جو ذرا جھکی ہوئی نظر آتی ہے اس میں بیشتر گرد و غبار ہوتے ہیں سورج کی شعاعوں کے دباؤ کی وجہ سے بنتی ہے۔ مجموعی طور پر اس کی شکل جھاڑو کی سی ہو جاتی ہے اس لیے اس زبان میں ان تاروں کے لیے کامیٹ (COMET) لفظ استعمال کیا جاتا ہے

سترہویں صدی عیسوی میں ایڈمنڈ ہیلی (EDMOND HALLEY) نام کے ایک سائنس داں نے انگلستان میں نیوٹن کے کشش کے قانون کی مدد سے چوبیس دمدار تاروں کے مدار کا تخمینہ لگایا تھا۔ اسی تخمینہ کی بنیاد پر ہیلی نے پیش گوئی کی تھی کہ ۱۷۵۸ء میں ایک دمدار تارہ فلک پر نمودار ہوگا۔ یہ بات سچ واقع ہوئی اور اسی کے نام پر اس دمدار تارے کا نام ہیلی کامیٹ رکھا گیا۔ ہیلی نے ہی یہ معلوم کیا تھا کہ یہ تارہ ہر ۷۶ سال کے بعد نظر آتا رہے گا۔ یہ تارہ اکتوبر ۱۹۸۵ء کے آخری دنوں سے ہی [illegible] اور دوربین کی مدد سے دیکھا جا رہا ہے اور مئی ۱۹۸۶ء تک دیکھا جا سکتا ہے۔ بغیر دوربین کے جنوری تا اپریل ۱۹۸۶ء تک دیکھ سکتے ہیں۔ پچھلے ریکارڈ سے ظاہر ہوتا ہے کہ چین میں جو تارہ قبل مسیح ۲۴۰ء میں دیکھا گیا تھا وہ یہی دمدار تارہ ہیلی کامیٹ ہی تھا اس سے پہلے اس کامیٹ کو ۱۹۱۰ء میں دیکھا گیا تھا اور پھر یہ ممکن ہے اس کو ۲۰۶۱ء کے قریب دیکھا جا سکے گا۔

ہیلی کامیٹ یا کسی کامیٹ کی رفتار سورج سے دوری کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ ہیلی کامیٹ جس وقت سورج کے بہت قریب ہوگا اس وقت اس کی رفتار دو لاکھ کیلو میٹر فی گھنٹہ ہوگی اور وزن میں ڈھائی ہزار ٹن روزانہ کی کمی واقع ہوگی۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ۹ فروری ۱۹۸۶ء کو تقریباً ۲ بجے شام کو سورج کے قریب تر ہوگا اور مارچ ۱۹۸۶ء میں زمین کے قریب تر ہوگا جس وقت یہ زمین کے قریب تر ہوگا اس وقت بھی اس کی دوری زمین سے تقریباً تین کروڑ کیلو میٹر ہوگی۔ ہیلی دمدار تارہ اس بار اتنا چمکدار نہیں ہوگا جتنا کہ ۱۹۱۰ء میں نظر آیا تھا کیونکہ جس وقت یہ زمین کے نزدیک ہوگا اس وقت اس کی دوری سورج سے زیادہ ہوگی۔ اگر یہ ایک ہی وقت دونوں کے قریب ہوتا تو اس کی چمک دن میں بھی نظر آتی۔ جنوبی ہندوستان میں اس کامیٹ کو زیادہ صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ بغیر دوربین کے چاندنی رات میں یا شہر کی روشنی میں دیکھنا مشکل ہوگا۔ شہر سے باہر جہاں پر شہر کی روشنی کم نظر آتی ہو

اور رات میں اندھیری ہوتب آپ اس تارے کو بغیر دوربین کے دیکھ سکتے ہیں دیے ہوئے جدول سے آپ معلوم کر سکتے ہیں کہ اس تارہ کو کہاں پر اور کتنی دیر تک دیکھا جا سکتا ہے۔ سب سے اچھا ہفتہ اس کو دیکھنے کے لیے ۲ اپریل سے ۱۰ اپریل ہوگا۔

جدول

تاریخ	ستاروں کے جھرمٹ جس میں کامیٹ کو دیکھا جا سکتا ہے	گھنٹہ جتنی دیر تک دیکھ سکتے ہیں — عرض بلد (شمال) ۱۰°	۲۰°	۳۰°
۱۰ جنوری	BETWEEN PEGASUS & CAPRICORNUS	۱.۷	۱.۷	۱.۷
۹ فروری	CAPRICORNUS	—	—	—
۱۱ مارچ	CAPRICORNUS	۲.۰	—	—
۹ اپریل	SCORPIUS	۷.۹	۷.۳	۵.۳
۹ مئی	HYDRA	۹.۵	۵.۷	۴.۸



ایڈمنڈ ہیلی

[redacted]

کامیٹوں کے نقطہ آغاز اور آزلی جزو کے بارے میں مزید جانکاری کے لیے پانچ ممالک نے اپنے خلائی طیارے فضا میں بھیجے ہیں۔ جس میں جیاٹو (GIOTTO) قابل ذکر ہے۔ یہ خلائی طیارہ یورپ اسپیس ایجنسی (EUROPE SPACE AGENCY) نے ایک سو ستر کروڑ روپیہ کی لاگت سے تیار کیا ہے۔ یہ ہیلی کامیٹ کی خاطر خواہ تصویریں تقریباً اس کے مرکزی حصّے سے پانچ سو کیلو میٹر کی دوری سے ۱۳ مارچ ۱۹۸۶ء کو لے سکے گا۔ یہ بات اب سے پہلے تقریباً نا ممکن تھی۔ ان علمی تحقیقات کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہونے کا امکان ہے کہ سائنس دانوں کو ہمارے نظام شمسی کے نقطہ آغاز کے بارے میں اشارہ مل سکتا ہے۔ ان انکشافات سے آئین نظام کائنات کو آئینہ کرنے کے مزید گر معلوم ہو سکیں گے۔



ہیلی کامیٹ کی ۱۹۱۰ء کی تصویریں

جارج گیمو

چچا چھکن کا دوسرا خواب

ترجمہ : ڈاکٹر انیس عالم

قدریاتی کمرہ (The Quantum Room)

دوسرا خطبہ جو چچا چھکن نے سنا، وہ نظریہ قدریت[1] کے مسائل پر تھا یہ پہلے خطبے سے بھی کم قابلِ فہم ثابت ہوا کیونکہ پروفیسر نے زیادہ وقت سامعین کو اس بات کا قائل کرنے پر صرف کیا کہ کسی جسم کا مقام اور رفتار جیسے عام تصورات اتنے سادہ نہیں جتنے سمجھے جاتے ہیں اور کسی متحرک جسم کی رفتار کا ذکر کرنا جدید طبیعیات کے اصولوں سے مکمل ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ ایک جانا پہچانا لفظ جو اُن کے کان میں پڑا وہ تھا "بے اعتباری"[2] پروفیسر کے قول کے مطابق کسی جسم کی صحیح رفتار اور مقام کے متعلق کبھی تیقن نہیں ہو سکتا تھا۔ "حرکت کی تشبیہ صرف ایک قسم کی آش سے دی جا سکتی ہے۔" پروفیسر نے انگلیوں کی حرکت سے ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ کس قسم کی آش کا تصور کر رہے ہیں۔ بالآخر انھوں نے تختہ سیاہ پر ایک بڑا یونانی حرف[3] لکھا جو پروفیسر کے بیان کے مطابق "آش کے پھیلاؤ کو قابو میں رکھتا ہے" لیکن اس یونانی حرف کے معنی، سننے والوں کے لیے یونانی زبان ہی کی طرح ناقابلِ فہم رہے پر پروفیسر نے مفہوم واضح کرنے کی آخری کوشش کرتے ہوئے کہا کہ ریاضیات جاننے والے ان مسائل کو "لا متناہی غیر متبدل گوشواروں"[4] کے حوالے سے غالباً زیادہ آسانی سے سمجھ سکیں گے۔ یہ کہہ کر پروفیسر نے تختۂ سیاہ پر گوشوارے کی شکل بنائی جو کچھ اس طرح کی تھی۔

$$
\begin{matrix}
q_{11} & q_{12} & q_{13} & q_{14} & \cdots \\
q_{21} & q_{22} & q_{23} & q_{24} & \cdots \\
q_{31} & q_{32} & q_{33} & q_{34} & \cdots
\end{matrix}
$$

گو کہ اس شکل کو دیکھ کر چچا چھکن کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اُن کے سر پر ہتھوڑا دے مارا ہو۔ مگر ان کے قریب بیٹھے ہوئے دھان پان سے ایک طالب علم نے جو عینک لگائے ہوئے تھا، بڑے جوش سے کہا "اب پتا چلا کہ مقام اور رفتار کیوں غیر متبادل ہیں۔"

گھر لوٹتے ہوئے ان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی ابھی کسی پاگل خانے سے نکل کر آ رہے ہوں۔ "بے اعتباری اور رفتار کا پھیلاؤ" انھوں نے خود سے کہا "شکر ہے کہ پولیس والے اس قسم کی باتیں نہیں جانتے ورنہ وہ کسی بھی شخص پر یہ کہہ کر کہ وہ کسی حد تک قانونی حدِ رفتار سے زیادہ تیز کار چلا رہا تھا، جرمانہ ٹھونک دیا کریں۔"

آخر کار وہ اپنے گھر پہنچ گئے اور جب بستر پر لیٹ گئے تو انھوں نے سوچا "میں کسی حد تک نہیں، بلکہ حقیقتاً اپنے بستر میں ہوں" اور اسی قسم کی باتیں سوچتے ہوئے نیند کی آغوش میں پہنچ گئے۔

انھوں نے خود کو ایک بہت بڑے کمرے میں پایا جہاں بہت سے لوگ پوری آستین کی قمیض پہنے مرکزی میز پر بلیرڈ کھیل رہے تھے۔ انھیں ایسا معلوم ہوا جیسے وہ پہلے بھی یہاں آ چکے ہیں لیکن کب —؟ ہاں یاد آیا۔ جب ان کے ساتھی کلرک انھیں بلیرڈ سکھانے لے گئے تھے وہ میز کے قریب رک کر کھیل دیکھنے لگے۔ یہاں تو کچھ عجیب ہی تماشا تھا۔ ایک کھلاڑی نے گیند میز پر رکھی اور اسے چھڑی سے ضرب لگائی۔ لڑھکتی ہوئی گیند کو دیکھ کر ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب وہ کئی گیندوں میں تبدیل ہونے لگی۔ انھیں گیند کے اس عجیب و غریب ڈھنگ کے اظہار کے لیے اس سے بہتر کوئی الفاظ نہ ملے۔ گیند میز کی ہری سطح پر حرکت کرتے ہوئے چند رنگ ظاہر ہوتی جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک گیند کے بجائے بہت سی گیندیں جو جزوی طور پر ایک دوسرے میں پیوست ہو کر لڑھک رہی ہوں۔ اُن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ انھوں نے سوچا "دیکھتے ہیں یہ آش جیسی گیند دوسری گیند سے کس طرح ٹکراتی

Quantum Theory : 1
Uncertainty : 2
Greek : 3
Matrix : 4

جس کھلاڑی نے گیند کو ضرب لگائی تھی وہ کوئی مشاق کھلاڑی معلوم ہوتا تھا کیونکہ لڑھکتی ہوئی گیند جب توقع دوسری گیند سے سیدھی ٹکرائی تصادم سے ایک اونچی آواز پیدا ہوئی اور دونوں گیندیں (یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ کونسی گیند پہلے ساکن تھی اور کونسی متحرک) تمام مختلف سمتوں میں حرکت کرنے لگیں۔ بڑا عجیب نظارہ تھا۔ دو غیر واضح گیندوں کی جگہ اب ان گنت گیندیں، جن میں سے ہر ایک کی شکل بالکل غیر واضح تھی، ٹکراؤ کی جگہ کے گرد ۱۸۰ درجے کے زاویے میں حرکت کر رہی تھیں اور نقطۂ تصادم سے ایک عجیب و غریب موج پھیلتی نظر آ رہی تھی لیکن چچا چھکن نے دیکھا کہ اصل تصادم کی سمت میں سب سے زیادہ گیندیں لڑھک رہی تھیں۔

"یہ ایس (s) موج کا انتشار ہے!" پیچھے سے پروفیسر کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

چچا چھکن نے ان سے پوچھا "کیا یہاں بھی وہی انحنا کا چکر ہے جناب؟ مجھے تو میز کی سطح بالکل ہموار نظر آ رہی ہے۔"

پروفیسر نے کہا: "تمہارا خیال صحیح ہے یہاں فضا بالکل ہموار ہے لیکن جو کچھ تم دیکھ رہے ہو یہ ایک قدریاتی میکانکی منظر ہے۔" "اچھا، گود!" چچا چھکن نے طنزاً کہا۔

"بلکہ حرکت کی بے اعتباری۔" پروفیسر بولا۔ "اس کمرے کے مالک نے یہاں بہت سی ایسی چیزیں جمع کر رکھی ہیں جو قدریاتی ورم کے مرض میں مبتلا ہیں۔ درحقیقت فطرت میں تمام اجسام قدریاتی کلیات کے پابند ہیں لیکن ان مظاہر کو اپنا پابند کرنے والا قدریاتی مستقل بے حد چھوٹا ہے۔ اتنا چھوٹا کہ اس کی عددی قیمت میں اعشاریہ کے بعد ستائیس صفر آتے ہیں لیکن ان گیندوں کے لیے یہ مستقل بہت بڑا ہے، تقریباً ایک کے برابر یہی وجہ ہے کہ تم اپنی آنکھوں سے ان مظاہر کا مشاہدہ کر رہے ہو، جنھیں سائنس داں انتہائی حساس آلات اور مشاہدے کے نہایت ترقی یافتہ طریقے استعمال کرنے کے بعد ہی دریافت کر سکے۔"

یہ کہہ کر پروفیسر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولا "میں نکتہ چینی نہیں کرنا چاہتا لیکن میں یہ ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ یہ شخص گیندیں کہاں سے لایا ہے، ایسی گیندیں ہماری دنیا میں تو ہو نہیں سکتیں، کیونکہ وہاں تو قدریاتی مستقل کی بڑی نہایت قلیل قیمت ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ گیندیں کسی اور دنیا سے درآمد کی ہوں؟" چچا چھکن نے خیال ظاہر کیا لیکن پروفیسر اس سے مطمئن نہ ہوا۔

اس نے کہا: "تم نے دیکھا کہ ایک گیند کی کئی گیندیں بن گئیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ میز پر ان کا مقام غیر معین ہے تم کسی صحت سے نہیں بتا سکتے کہ گیند ٹھیک کس مقام پر ہے۔ صرف یہ کہہ سکتے ہو کہ گیند زیادہ تر یہاں ہے اور کسی حد تک کہیں اور۔"

"یہ بات تو بڑی خلاف معمول ہے!" چچا چھکن بڑبڑائے۔

"نہیں" پروفیسر نے زور دے کر کہا۔ "یہ بات بالکل معمول کے مطابق ہے، ان معنوں میں کہ ہر مادی جسم کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے لیکن قدریاتی مستقل کی نہایت ہی چھوٹی قیمت اور ہمارے بے ڈھنگے طریق مشاہدہ کی بنا پر یہ غیر تعین پذیری مشاہدے میں نہیں آتی اور ہم یہ غلط نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں کہ اجسام کی رفتار اور ان کا مقام معین مقدار ہیں۔ دراصل یہ دونوں کسی حد تک ہمیشہ غیر معین ہوتی ہیں اور اگر ایک چیز، مثلاً رفتار، زیادہ صحت سے معلوم ہو جاتی ہے تو دوسری، یعنی مقام، زیادہ غیر معین ہو جاتی ہے۔ قدریاتی مستقل ان دونوں غیر معین مقداروں کا باہمی تناسب مقرر کرتا ہے۔ لو دیکھو! میں اس گیند کو اس لکڑی کے مثلث میں ڈال کر اس کے مقام کی حدیں متعین کر دیتا ہوں۔"

جیسے ہی پروفیسر نے گیند کو اس مثلث میں رکھا، سارا مثلث گیندوں سے پُر ہو گیا۔

پروفیسر: "تم نے دیکھا، میں نے گیند کا مقام اس مثلث کی حدود تک معین کر دیا۔ اس سے رفتار خاصی غیر یقینی ہو گئی اور گیند حدود کے اندر تیزی سے حرکت کر رہی ہے۔"

چچا چھکن: "کیا آپ اسے روک نہیں سکتے؟"

پروفیسر: "نہیں، طبیعی طور پر یہ ناممکن ہے۔ محدود فضا میں ہر جسم کی کچھ نہ کچھ حرکت ہوتی ہے ہم طبیعیات داں اسے نقطۂ صفر کی حرکت کہتے ہیں۔ اس کی مثال کسی جوہر میں برقیوں کی حرکت ہے۔"

جب چچا چھکن گیند کو اس احاطے میں پنجرے کے شیر کی طرح ادھر ادھر تیزی سے بھاگتے دیکھ رہے تھے تو ایک خلاف معمول واقعہ پیش آیا۔ گیند مثلثی احاطے کی دیواروں سے رِس کر، باہر نکل گئی اور دوسرے لمحے

ہنر کے دوسرے کنارے کی طرف لڑھک رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ احاطے کی دیواروں کے اوپر سے نہیں پھاندی تھی بلکہ بیچ سے اور اسٹیل کے بیزان کے نکل گئی تھی۔

چچا چھکن بولے، "دیکھیے پروفیسر صاحب، یہ آپ کی صفر حرکت، بھاگ نکل کیا یہ بھی قواعد کے مطابق ہے؟"

پروفیسر بولا، "یقیناً! بلکہ یہ تو قدریاتی نظریے کا نہایت ہی دلچسپ نتیجہ ہے کسی شے کو کسی احاطے میں بند رکھنا ناممکن ہے بشرطیکہ اس میں دیوار پار کرنے کے بعد بھاگ جانے کی کافی توانائی ہو۔ جلد یا بدیر وہ رِس کر باہر نکل جائے گی۔"

چچا چھکن نے چڑیا گھر کے پنجڑوں میں بند شیروں، چیتوں اور بھیڑیوں کا تصور کیا اور دل ہی دل میں آیندہ کبھی چڑیا گھر نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ نہ معلوم کب کوئی جنگلی جانور اپنے پنجڑے سے رِس کر، نکل بھاگے! پھر ایک کار کا خیال آیا۔ انھیں کار مقفل گیراج کی دیواروں میں سے اس طرح نکلتی ہوئی نظر آنے لگی جیسے وہ قرونِ وسطیٰ کا کوئی بھوت ہو۔ انھوں نے پروفیسر سے پوچھا، "کیوں جناب ایک پرچ پرچے کی کار کو مقفل گیراج میں سے نکل بھاگنے میں کتنا عرصہ لگے گا؟"

پروفیسر نے جلدی جلدی ذہن میں حساب کرنے کے بعد جواب دیا، "اسے کوئی ... . ۱ سال لگیں گے۔"

چچا چھکن کو بینک کے حسابات میں بڑی بڑی رقموں سے سابقہ پڑتا رہتا تھا لیکن پروفیسر کے بتائے ہوئے صفروں کی تعداد کا انھیں اندازہ نہ رہا۔ بہرصورت انھیں اطمینان ہو گیا کہ کار کے گیراج سے نکل بھاگنے کا فی الحال کوئی اندیشہ نہیں ہے تاہم پروفیسر سے کہنے لگے۔

"اگر میں آپ کی ان تمام باتوں کو مان بھی لوں تو یہ بتائیے کہ ایسی گیندوں کی عدم موجودگی میں ان مظاہر کا مشاہدہ کس طرح ممکن ہے؟"

پروفیسر صاحب بولے، "تمھارا یہ اعتراض معقول ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان بڑے اجسام کے متعلق جن سے ہمیں معمولاً سابقہ پڑتا ہے، ہم قدریاتی مظاہر کا مشاہدہ کر سکتے ہیں لیکن بات یہ ہے کہ جب قدریاتی کلیات کا اطلاق جوہروں اور برقیوں جیسی نہایت قلیل کیتوں پر ہوتا ہے تو ان کے اثرات زیادہ قابلِ مشاہدہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے یہ قدریاتی اثرات اتنے قوی ہوتے ہیں کہ عام میکانکی کلیات قطعاً ناقابلِ اطلاق ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ دو جوہروں کا تصادم بالکل اسی طرح دکھائی دیتا ہے جیسے دو گیندوں کا تصادم جو تم نے ابھی دیکھا ہے اور جوہر کے اندر برقیوں کی حرکت مثلث میں رکھی ہوئی اس گیند کی نقطۂ صفر کی حرکت سے بہت مشابہ ہوتی ہے۔"

چچا چھکن پوچھنے لگے، "اور کیا جواہر اپنے گیراج سے اکثر نکل بھاگتے ہیں؟"

پروفیسر نے بتایا، "ہاں، ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم نے تابکار اجسام[1] کے متعلق سنا ہوگا کہ ان کے جوہروں کا از خود تکسّر ہوتا ہے اور ان سے نہایت تیز رفتار ذرّات کا اخراج ہوتا رہتا ہے۔ اس قسم کا جوہر بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس کا مرکزی حصّہ جسے جوہری نواۃ[2] کہتے ہیں، کار کے گیراج کے مماثل ہوتا ہے، جس میں کاریں یعنی دوسرے ذرات رکھے رہتے ہیں۔ یہ ذرّے نواۃ کی دیواروں میں سے نکلتے بھی رہتے ہیں۔ بعض اوقات تو وہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی اندر نہیں ٹھہرتے۔ ان نواتوں میں قدریاتی مظاہر عام ہو جاتے ہیں۔"

چچا چھکن اس لمبی گفتگو سے تھک کر اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے کہ ان کی نظر ایک بڑے سے پرانے فرشی گھنٹے پر پڑی جو کمرے کے کونے میں کھڑا تھا۔ اس کا پرانی وضع کا رقّاص آہستہ آہستہ جھول رہا تھا۔

پروفیسر نے کہا، "معلوم ہوتا ہے تم اس گھنٹے سے دلچسپی رکھتے ہو۔ یہ بھی ایک مشین ہے جو غیر معمولی ہے لیکن اب متروک ہے۔ یہ گھنٹہ لوگوں کے اس اندازِ فکر کا آئینہ دار ہے جو وہ قدریاتی مظاہر کے متعلق رکھتے تھے اس کا رقاص ایسی ترکیب سے بنایا گیا ہے کہ اس کا حیطۂ اہتزاز صرف معین دفعوں ہی سے بڑھ سکتا ہے لیکن آج کل گھڑیوں میں چلنے والے رقاص مستعمل ہیں۔"

چچا چھکن کی نظریں گھنٹے پر لکھے ہوئے عجیب و غریب ہندسوں پر جمی ہوئی تھیں جلد ہی اس رقاص کے کئی رقاص بننے شروع ہو گئے اور اس کے سائے جیسی صورتوں سے پورا کمرہ بھر گیا۔ پروفیسر اور دوسری اردگرد کی اشیا دھندلی ہوتی چلی گئیں اور ان کی جگہ چچا چھکن کی خواب گاہ کے جانے پہچانے نقوش نے لے لی۔ اور ان کی آنکھ کھل گئی۔

1: Radioactive Bodies 2: Atomic nucleus
3: P

نکولائی گوگول
ترجمہ: احمد جمال پاشا

ناک

۲۵ مارچ کو پیٹرس برگ میں ایک عجیب حیرت انگیز واقعہ ہوا۔ حجام ایوان یاکوف لیوچ ساکن وزنیسکی پراسپیکٹ (جن کے خاندانی نام کا پتہ نہ چل سکا۔ دوکان کے سائن بورڈ سے بھی نہیں معلوم ہوتا۔ اس پر ایک شخص کی تصویر ہے۔ جس کے گال پر صابن کے جھاگ ہیں۔ نیچے لکھا ہے "یہاں فصد نکالی جاتی ہے۔")

اس دن حجام کی آنکھ صبح تڑکے کھل گئی۔ اُن کی ناک میں گرم گرم روٹی کی خوشبو آئی۔ انہوں نے پلنگ سے جھانکا، ان کی بیوی جو خاصی عزت دار خاتون ہیں۔ انہیں کافی پسند ہے۔ تندور سے وہ روٹیاں نکال رہی تھیں وہ بولے۔

"میں آج کافی نہیں پیوں گا۔ میرا دل تو گرما گرم روٹی پیاز سے کھانے کو چاہ رہا ہے۔" (دراصل وہ چاہتے تھے کہ انہیں دونوں چیزیں مل جائیں۔ وہ جانتے تھے کہ ایک ساتھ دونوں ملنا محال ہیں۔ اِس لیے کہ اُن کی اہلیہ کو اُن کے نخرے پسند نہ تھے) ان کی اہلیہ نے سوچا۔

"کھانے دو احمق کو روٹی اچھا ہے۔ مجھے ایک کافی اور مل جائے گی۔" انہوں نے روٹی اُن کے لیے میز پر پھینک دی۔ ایوان یاکوف لیوچ اٹھ کر میز کے پاس بیٹھ گئے۔ نمک نکالا۔ پیاز چھیلی۔ چھری سے ڈبل روٹی کاٹنے لگے۔ ابھی انہوں نے اس کے صرف دو ہی ٹکڑے کیے تھے کہ اس کے اندر کوئی سفید سی چیز دیکھ کر انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ اسے چھری سے کریدا پھر انگلی سے ٹٹولا اور سوچا،

"سخت معلوم ہوتی ہے۔ آخر کیا چیز ہو سکتی ہے۔ ؟"

انہوں نے ڈبل روٹی میں انگلیاں ڈال کر اسے نکال لیا۔ وہ ناک تھی۔ ان کا ہاتھ گر گیا۔ انہوں نے آنکھیں ملیں اسے پھر ٹٹولا تو وہی ناک بالکل جانی پہچانی ناک، اُن کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا۔ لیکن یہ خوف اُس غصّے اور نفرت کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا۔ جو اس وقت اُن کی اہلیہ پر طاری تھا۔ وہ غصّے سے چلائیں۔

"جنگلی! تو نے یہ کس کی ناک کاٹ لی؟ ذلیل، میں پولیس میں خبر کر دونگی۔ ڈاکو! لوگ مجھ سے شکایت کرتے ہیں کہ تو حجامت بنانے میں اُن کی ناک پکڑ کر نوچتا، گھسیٹتا ہے درندے۔ معلوم نہیں وہ اُن کے چہرے پر رہ کیسے جاتی ہے۔؟"

یاکوف لیوچ، جیسے سکتہ طاری تھا۔ انھوں نے پہچان لیا کہ یہ ناک میجر کوالیف کی ہے۔ جن کا شیو وہ ہر بدھ اور اتوار کو بناتے ہیں۔

انہوں نے اہلیہ سے کہا۔ "چپ ہو جاؤ میں اسے کپڑے میں لپیٹ کر کونے میں رکھ دوں پھر اسے لے جاؤں گا۔"

"میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔ ! تو سمجھتا ہے میں کٹی ہوئی ناک اپنے یہاں پڑی رہنے دونگی...... تجھے بس اُسترا تیز کرنا آتا ہے۔ اب تو اس کام کا بھی نہ رہے گا۔ احمق، آوارہ کہیں کا... لے جا اس کو ابھی لے جا! جہاں تیرا جی چاہے لے جا، لیکن میں اس کی بو تک نہیں سونگھنا چاہتی۔ !"

اُن کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے انہیں کسی نے قتل کر دیا ہو۔ وہ مسلسل سوچے جا رہے تھے۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ آخر انہوں نے کان کھجاتے ہوئے کہا۔ "شیطان ہی جانے کہ یہ کیا ہوا، اور کیسے ہوا ہے تو یہ تعجب کی بات روٹی تو تندور میں سینکی جاتی ہے۔ مگر ناک تو سینکنے کی چیز نہیں...... سمجھ میں نہیں آتا... !"

ایوان یاکوف لیوچ خاموش ہو گئے۔ وہ بوکھلائے ہوئے تھے۔ کہیں

پولیس انہیں ناک کے ساتھ گرفتار نہ کرے۔ پھر کیا ہوگا۔ آنکھوں کے سامنے سرخ کالر، اس پر روپہلی گوٹ اور لٹکتی ہوئی تلوار گھوم رہی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہے تھے۔ بیوی کے کوسنے جاری تھے۔ وہ لباس بدل کر، کپڑے میں ناک لپیٹ کر سڑک پر باہر نکل گئے۔

وہ چاہتے تھے کہ اسے کہیں چھپا دیں۔ پھاٹک پر یا کسی پتھر کے پیچھے چپکے سے گرا کر کسی گلی میں مڑ جائیں پریشانی یہ تھی کہ بار بار کوئی جان پہچان کا مل جاتا۔ اور پوچھتا۔ کہاں جا رہے ہو؟ "یا سویرے سویرے کس کی حجامت بنانے جا رہے ہو؟" اسی لیے ایسا کرنے کا موقع ہی نہ مل پاتا۔ ایک بار انہوں نے وہ کپڑا گرا بھی دیا جس میں ناک تھی۔ لیکن گشت کے سپاہی نے انہیں پکار کر ڈنڈے سے اشارہ کیا۔ "دیکھو تم نے کچھ گرا دیا ہے۔ !" اور انہیں کپڑا، اٹھا کر ناک پھر جیب میں رکھنی پڑی۔ ان کا دل بیٹھنے لگا۔ کیونکہ دکانیں کھلنے لگی تھیں۔ سڑکوں پر لوگوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔

انہوں نے فیصلہ کیا کہ پل پر جا کر، موقع پا کر ناک کو دریائے نیوا میں پھینک دیں۔

جہاں تک ایوان یاکوف لیوچ کے بارے میں معلومات کا تعلق ہے۔ وہ ایک خوددار روسی دستکار کی حیثیت سے بلا کے لاابالی تھے۔ روزانہ سب کا شیو بنانے کے باوجود ان کا شیو ہمیشہ بڑھتا رہتا۔ ان کے ٹیل کوٹ کا رنگ ابلقی تھا، مگر اس سیاہ رنگ پر بھورے اور سرمئی دھبے تھے۔ کالر اتنے گھس گئے تھے کہ چمکنے لگے تھے۔ کوٹ میں بٹنوں کی جگہ دھاگے لٹکے ہوئے تھے۔ وہ کلبیت پسند تھے۔ میجر کوالیف کا شیو بناتے وقت۔ جب وہ ان سے شکایت کرتے کہ "آپ کے منہ سے بہت بدبو آ رہی ہے۔" تو وہ انکار کرتے ہوئے، نسوار کی چٹکی بھر کر ان کے گال، ناک، کان، ٹھوڑی، جہاں جی چاہتا صابن لگانے لگتے۔ انہوں نے کیف سکی پل پر پہنچ کر ادھر ادھر دیکھا۔ مچھلیوں کو دیکھنے کے بہانے پل پر جھکے چپکے سے ناک والے کپڑے کو گرا دیا۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے منوں بوجھ ان کے کندھے پر سے اتر گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے، حجامت بنانے کے لیے جانے کے بجائے ایک چائے خانے کی طرف چل دیے۔ پل کے دوسرے سرے پر انھوں نے اچانک ایک پولیس انسپکٹر کو دیکھا۔ ہٹا کٹا، رعب دار، گل مچھے، تکونا ہیٹ اور تلوار لگائے۔ وہ اپنی جگہ پر جم سے گئے۔ انسپکٹر پولیس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے انہیں پکارا۔ "بھلے آدمی ذرا ادھر تو آنا۔" انھوں نے احتراماً ہیٹ اتار لیا، تیزی سے آگے بڑھ کر کہا۔

"حضور کی صحت و سلامتی کی دعا کرتا ہوں۔"

"نہیں بھائی! حضور کہنے کی ضرورت نہیں، لیکن یہ بتائیے کہ آپ وہاں پل پر کیا کر رہے تھے۔؟"

"حضور! قسم خدا کی حجامت بنانے جا رہا تھا۔ سوچا ذرا دریا کا بہاؤ دیکھ لوں۔"

"تو بالکل جھوٹ بول رہا ہے۔ تو بچ نہیں سکتا۔ سچ سچ بتا دے!"

"حضور میں ہفتہ میں دو تین بار آپ کی حجامت بنا دیا کروں گا۔"

"نہیں یہ فضول سی بات ہوئی۔ تو بتا کہ وہاں کیا کر رہا تھا۔؟"

ایوان یاکوف لیوچ کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

۲

میجر کوالیف کی آنکھ بہت ہی تڑکے کھل گئی۔ انھوں نے منہ سے "بر رر" کی آواز نکالی۔ جس کے وہ عادی تھے۔ انگڑائی لی اور یہ دیکھنے کے لیے کہ رات ان کی ناک پر جو دانہ نکل آیا تھا۔ اس کا کیا حال ہے۔؟ آئینہ لانے کا حکم دیا۔ آئینہ دیکھ کر انہیں بڑی حیرت ہوئی کہ جہاں ان کی ناک ہونی چاہیے تھی۔ وہ جگہ اب بالکل سپاٹ ہے۔ مارے ڈر کے انہوں نے پانی منگوایا۔ تولیہ سے آنکھیں ملیں سچ مچ واقعی ناک نہیں تھی۔! انہوں نے چٹکی کاٹی کہ وہ کہیں سو تو نہیں رہے ہیں۔؟ انہیں یقین ہو گیا کہ وہ جاگ رہے ہیں۔ وہ بستر سے اچھل پڑے۔ اپنے آپ کو جھنجھوڑا۔ ناک نہیں ہے۔!.... فوراً کپڑے بدل کر پولیس کمشنر کے دفتر کی طرف چل دیے۔ کالیجیٹ اسیسر یا میجر کوالیف کا یہ تعارف ہے کہ انھوں نے میجر یا کالیجیٹ اسیسر کا عہدہ بمد دبد عنوانی حاصل کیا تھا۔ دو سال سے رشوت کے بل پر اس عہدے پر قابض تھے۔ وہ اپنے اس نئے وقار میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہمیشہ خود کو میجر کہتے۔ کسی کو بلاتے تو کہتے۔ "میرا گھر سدووایا روڈ پر ہے کسی سے بھی پوچھ لینا کہ میجر کوالیف کہاں رہتے ہیں وہ بتا دے گا۔"

میجر کی عادت روزانہ نیوسکی پراسپکٹ میں ٹہلنے کی تھی۔ ان کی قمیص کا کالر کلف دار اور گل مچھے نمایاں نظر آتے۔ وہ پیٹرسبرگ اپنی حیثیت کے شایان شان کوئی عہدہ حاصل کرنے کے چکر میں آئے تھے۔ جو نائب گورنر کے برابر تک ہو سکتا تھا۔ وہ شادی کے خلاف نہ تھے۔ بشرطیکہ دلہن دولت کے معاملے

تک کا عہدہ لینا تھا۔ اتنی اونچی اڑان کے دوران جب انہوں نے اپنی ناک ہی غائب دیکھی، تو پڑھنے والے خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اُن کے ذہن کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔

ٹھیک جیسے کہ مصیبت میں ہوتا ہے۔ سڑک پر ایک بھی گاڑی والا نظر نہ آیا۔ مجبوراً انہیں پیدل چلنا پڑا۔ لبادے میں لپٹے لپٹائے ناک پر ایسے رومال رکھے گویا نکسیر پھوٹ گئی ہو۔ "ناک اس طرح تو غائب نہیں ہو سکتی۔ ؟" یہ سوچ کر وہ ایک بیکری میں گھس گئے۔ مقصد آئینے میں ناک دیکھنی تھی۔ بیرے جھاڑو دے رہے تھے۔ خوش قسمتی سے کوئی سامنے نہیں تھا۔ جس پر انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ جھجکتے ہوئے آئینے کے سامنے گئے۔ رومال ہٹاتے ہی تھوکتے ہوئے بولے

"ارے ناک کی جگہ پر کچھ نہ کچھ تو ہوتا مگر یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

جھنجھلاہٹ میں وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بیکری سے باہر آ گئے۔ اچانک ایک ڈیوڑھی کے پاس وہ ٹھٹک کر رہ گئے۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے ایک بالکل ناقابلِ یقین منظر تھا۔ پھاٹک پر ایک گاڑی رکی، دروازہ کھلا، ایک وردی پوش عہدیدار کود کر نکلا۔ دوڑ کر سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ آپ خیال کیجیے کہ میجر کو کتنا تعجب خیز اور خوفناک معلوم ہوا ہوگا۔ جب انھوں نے پہچانا ہوگا کہ وہ تو اُن کی اپنی ناک ہے۔ وہ چکرا گئے۔ ان سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ انھوں نے پھر بھی فیصلہ کیا کہ خواہ کچھ بھی ہو۔ وہ ناک کا انتظار کریں گے۔ جب تک وہ گاڑی پر واپس نہیں آتی۔ یہ اسی طرح کھڑے تھر تھر کانپتے رہے۔ جیسے انہیں بخار ہو۔ دو منٹ بعد ناک واپس آ گئی۔ اُس کی وردی سنہرے فیتے والی تھی۔ کالر اونچا اور سخت، سفید چرمی برجیس، پہلو میں تلوار لٹکی ہوئی۔ کلغی دار ہیٹ سے ظاہر ہوتا کہ وہ اسٹیٹ کونسلر کے برابر عہدے کی ہے۔ انداز سے معلوم ہوتا کہ اسے کہیں ملاقات کے لیے جانا ہے۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ گاڑی والے کو پکارا۔ "ادھر لے آؤ۔!" اُس کے سوار ہوتے ہی گاڑی چل دی۔

بے چارے کووالیف حواس باختہ ہو گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ آخر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ ناک جو کل تک ان کے چہرے پر تھی، اب باوردی گھوم رہی ہے۔ گرجا گھر پر گاڑی رک گئی۔

میجر تیزی سے گرجا گھر کی طرف بھاگے۔ فقیر بڑھیوں کو دھکے دیتے گرجا میں گھس گئے۔ اندر لوگ کم تھے۔ دروازے کے قریب ہی کھڑے تھے۔ ناک ایک طرف کھڑی عبادت میں مصروف تھی۔ اُس کے پاس پہنچ کر وہ کھانسنے لگے۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اُسے ناک کے پاس جا پہنچے۔ [illegible] معلوم ہوتی ہے۔ "وہ کہاں [illegible]۔ مگر وہ عبادت کر رہی ہے۔ میجر نے بڑی ہمت سے کہا۔

"حضور والا! ....حضور والا۔!" — ناک نے گھوم کر پوچھا —

"کیا ہے — ؟"

"مجھے بڑا تعجب ہے حضور والا... مجھے محسوس ہوتا ہے... کہ آپ کو اپنا مقام معلوم ہونا چاہیے۔ لیکن اچانک آپ کو میں نے ڈھونڈ لیا اور وہ بھی کہاں ؟ گرجا میں۔ آپ یہ مانیں گی کہ.....؟"

"معاف کیجیے گا۔ میری کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ کس چیز کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ صاف صاف کہیے۔"

"میں یہ صاف صاف کیسے کہوں۔ ؟" — اُنہوں نے سوچا پھر پوری ہمت سے کام لیکر کہنا شروع کیا:

"ظاہر ہے.... آخر میں میجر ہوں، آپ یہ نہ مانیں گی کہ میرے لیے بغیر ناک کے نکلنا مناسب نہیں ہے۔ کوئی سنترے بیچنے والی تو بلا ناک کے پل پر بیٹھ سکتی ہے۔ جبکہ میں ترقی کے لیے کوشاں ہوں... بہت سے گھروں کی خواتین سے میری رسم و راہ ہے۔ اسٹیٹ کونسلر چیختاریوف کی بیوی اور دوسروں سے.... اب آپ خود ہی فیصلہ کیجیے.... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس طرح کہوں.... (انھوں نے بے بسی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا) معاف کیجیے گا۔ اگر آپ اسے فرض اور عزت کے پہلو سے دیکھیں تو بالکل مان لیں گی کہ....."

ناک نے جواب دیا۔ "میری کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ بتلائیے آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ ؟"

"حضور! معاملہ بالکل واضح ہے.... بات یہ ہے کہ آپ میری ناک ہیں"
ناک کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ "آپ کو غلط فہمی تو نہیں ہوئی۔ میں خود ایک شخص ہوں۔ وردی سے آپ دوسرے محکمے کے معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے ہمارے درمیان کوئی تعلق بھی نہیں ہو سکتا۔" — یہ کہہ کر [illegible] پھر دعا مانگنے لگی۔

کووالیف کی عقل دنگ تھی۔ اسی وقت ان کو کسی خاتون کے لباس کی [illegible] سرسراہٹ سنائی دی۔ ایک عمر رسیدہ خاتون کے ساتھ ایک [illegible]

لباس میں۔ اس کے پیچھے ایک دراز قد دربان جس کے گل مچھوں والا کاریں لگائے،
نسوار دان کھول کر کھڑا ہو گیا۔

کووالیف کچھ اُس کے نزدیک ہو گئے۔ کالر درست کی، جیبی گھڑی کی زنجیر درست کی۔ مسکراتے ہوئے حسینہ کی جانب متوجہ ہوئے۔ وہ انکھیوں سے بھنویں سنوار رہی تھی۔ اسے دیکھ کر ان کی باچھیں کھل گئیں مگر اچانک وہ اس طرح پیچھے ہٹے جیسے کسی نے انہیں داغ دیا ہو۔ انہیں یاد آ گیا تھا کہ اُن کے ناک تو ہے ہی نہیں۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ تیزی سے مڑے کہ وہ اُس سے صاف صاف کہہ دیں کہ وہ اسیٹٹ کونسلر ہونے کا ڈھونگ رچا رہی ہے۔ وہ دغاباز لفنگی ان کی ناک ہے۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔۔۔ مگر ناک تو غائب ہو چکی تھی۔

میجر کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ بہا مدے میں بھی نظر نہ آئی۔ اس کے اوور کوٹ، گاڑی اور گھوڑوں کا رنگ بھی اُنہیں یاد نہ تھا کہ اگر گاڑی پر خدمت گار تھا تو اس کی وردی کیسی تھی۔؟ اتنی زیادہ گاڑیوں میں کسی ایک گاڑی کی شناخت بھی آسان نہ تھی۔ بے حد خوشگوار دھوپ تھی۔ نیوسکی پراسپکٹ پر بھیڑ تھی۔ پُل تک آبشار کی طرح خواتین رواں تھیں۔ کئی دوست بھی دکھائی دیے۔ مگر وہ سب پر لعنت بھیج کر گاڑی سے پولیس کمشنر کے یہاں روانہ ہو گئے۔ دربان سے معلوم ہوا کہ وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ ناک کے سلسلے میں پریشان کن خیالات میں تنہا اخبار کے دفتر چل دیے۔ انہوں نے گاڑی تیز چلانے کے لیے کوچوان کو گھونسوں تک سے مارا۔ آخر گاڑی رُکی۔ وہ تیزی سے دوڑتے ہوئے کمرۂ ملاقات میں پہنچے۔ انہوں نے ایک سفید بالوں والے عینک لگائے کلرک سے چلا کر کہا۔

یہاں اشتہار کون لیتا ہے۔؟ اچھا کہو آپ کے مزاج کیسے ہیں۔؟

کلرک سکوں کا ڈھیر گن رہا تھا۔ اس نے انہیں دیکھ کر کہا۔ "دعا ہے۔" اپنے کام میں لگ گیا۔ "میں اخبار میں چھپوانا چاہتا ہوں کہ۔۔۔"

"بس ایک منٹ انتظار کیجیے۔" وہ سکے گن کر لکھتا رہا۔ کسی بڑے گھر کے باوردی خدمت گار نے بے تکلفی ظاہر کرنے کے لیے کہنا شروع کیا۔

"جناب وہ کتا تو اسی کوپک کا بھی نہیں۔ بس تو اس کے لیے کوڑی بھی نہ دوں۔ لیکن کاؤنٹس تو جان چھڑکتی ہیں۔ اس لیے جو بھی اسے تلاش کرے گا۔ اُسے وہ سو روبل انعام دیں گی۔"

معزز کلرک لیکچر سنتے سنجیدگی سے اپنا حساب بھی کرتا رہا۔ خدمت گار جو ہر چہرہ لایا تھا۔ اس نے اُس کے الفاظ کی تعداد گنی۔ اس کے چاروں طرف بہت سی بڑھیاں، سیلز مین اور دربان سب کے سب مشتاق ہے تھے۔ کسی کو ٹھیک ٹھاک کوچوان کے لیے ملازمت درکار تھی۔ کوئی بگھی بیچنی ہوئی گاڑی بیچنا چاہتا تھا۔ جو ۱۸۱۴ء میں پیرس سے خریدی تھی۔ کسی کو کسان غلام لڑکی چاہیے تھی۔ جو دھلائی استری کے ساتھ دوسرے کام بھی کر سکتی ہو۔ کوئی بلا کاٹھی کی نئی گھوڑا گاڑی بیچنا چاہتا تھا۔ تو کوئی سترہ سال کی نوعمر گھوڑی فروخت کرنا چاہتا تھا۔ کوئی لندن سے منگائے ترکاریوں کے بیج بیچنا چاہتا تھا۔ اور کوئی اپنا بنگلہ نیلام کا اشتہار تھا۔ جوتوں کے تلے خریدنے والوں کے لیے یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جس میں اتنے بہت سے لوگ جمع تھے۔ میجر کووالیف کو اس میں گھٹن کا احساس تک نہ تھا۔ وہ منہ پر رومال رکھے تھے۔ ان کی ناک تو خدا جانے اس وقت کہاں تھی۔؟ انہوں نے بے صبری سے کہا

"حضور والا۔ میں درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ۔۔۔ میرے لیے بہت ضروری ہے کہ۔۔۔"

"بس ابھی! دو روبل پینتالیس کوپک! ابھی فوراً! ایک روبل چونسٹھ کوپک۔!"

سفید بالوں والا کلرک بوڑھی عورتوں، دربانوں کی طرف کاغذ کے پرزے پھینک پھینک کر حکم دے رہا تھا۔ آخر اُس نے کووالیف سے پوچھا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں۔؟" ــــ کووالیف نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ۔۔۔ یہ دغابازی ہے یا کمینہ پن، میں ابھی تک اس کی تصدیق نہیں کر سکا ہوں میں صرف یہ چھپوانا چاہتا ہوں کہ جو شخص بھی اس لفنگے کو میرے پاس لے آئے گا اسے کافی انعام دیا جائے گا۔"

"جناب کا نام ــــ؟"

"نہیں نہیں، نام کی کیا ضرورت ہے۔؟ وہ تو میں نہیں بتا سکتا۔ میرے بہت سے واقف کار ہیں۔ اسیٹٹ کونسلروں کی بیویاں۔ اگر انہوں نے دیکھ لیا تو۔۔۔ خدا بچائے! آپ صرف یہ لکھ سکتے ہیں کہ ایک میجر کا اس سے بھی بہتر ہوگا کہ میجر کے عہدے کے ایک صاحب۔"

"اور وہ شخص بھاگا ہے۔ وہ آپ کا کسان غلام ہے۔؟"

"کسان غلام؟ یہ تو کوئی ایسی دغابازی نہ ہوتی۔ میں تو ناک کے بھاگنے کی بات کر رہا ہوں۔۔۔"

"ہوں! عجیب سا نام ہے۔! اور ان مسٹر ناک نے آپ کے ساتھ

بڑی دلچسپ دغا کی ہے۔؟"

"ناک یعنی.... آپ سمجھے نہیں! ناک، میری اپنی ناک غائب ہو گئی، پتہ نہیں کہاں۔؟ کیا کہا جائے سوائے اس کے کہ شیطان میرے ساتھ مذاق کرنا چاہتا تھا۔!"

"آخر کس طرح غائب ہو گئی۔؟ میں پھر ٹھیک سے سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔؟"

"یہ تو میں خود بھی نہیں بتا سکتا کہ کس طرح غائب ہو گئی۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ اب وہ شہر بھر میں اِدھر اُدھر دوڑتی پھر رہی ہے۔ اور خود کو اسٹیٹ کونسلر ظاہر کر رہی ہے۔ اس لیے میں آپ سے یہ اشتہار چھاپنے کی درخواست کر رہا ہوں کہ جو بھی اسے پکڑے وہ سیدھا میرے پاس لے آئے اور بغیر کسی تاخیر کے۔ آپ خود فیصلہ کیجیے کہ جسم کے اتنے نمایاں حصّے کے بغیر میں کیسے رہ سکتا ہوں۔؟ یہ تو ایسا نہیں ہے کہ پاؤں کی کوئی انگلی نہیں رہی اور میں کسی کے دیکھنے سے پہلے ہی جھٹ سے جوتے پہن لوں۔ ہر جمعرات کو میں اسٹیٹ کونسلروں کی بیویوں سے ملنے جاتا ہوں آپ خود ہی فیصلہ کیجیے کہ اب میری کیا حالت ہو رہی ہے.... اب تو میرے ان کے سامنے جانے کا سوال ہی نہیں۔"

کلرک سوچتا رہا جس کا اندازہ اس کے بھینچے ہوئے ہونٹوں سے ہو رہا تھا۔ دیر تک خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"میں اخبار میں اس قسم کا اشتہار نہیں چھاپ سکتا۔!"

"کیا؟ کیوں؟"

"بس اس لیے کہ اخبار کی بڑی بدنامی ہو سکتی ہے۔ اگر ہر شخص یہ چھپوانا شروع کر دے کہ اس کی ناک اس کے پاس سے بھاگ گئی ہے تو.... اور یہ تو اس وقت بھی لوگ کہتے ہیں کہ اخبار میں بہت سی بے تکی اور جھوٹی باتیں چھپتی ہیں۔"

"لیکن اس میں بے تکی بات کون سی ہے۔؟ ایسی تو بظاہر اس میں کوئی بات نہیں ہے۔"

"یہ تو آپ کو لگتا ہے کہ کوئی بے تکی بات نہیں ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے ایسا ہو چکا ہے۔ ایک افسر بالکل ایسا ہی اشتہار لے کر آئے جیسے آپ۔ ان کی عبارت کے دو روبل ستّر کوپک بنے۔ اعلان میں کہا گیا تھا کہ 'کالے بالوں والا ایک پوڈل کتا بھاگ گیا ہے۔' بظاہر تو اس میں کوئی برائی نہ تھی۔ مگر چل گیا ہتک عزت کا مقدمہ اخبار پہ۔ پوڈل ایک ادارے کے خزانچی کو کہا گیا تھا۔"

"لیکن میں کسی پوڈل کے بارے میں تو اشتہار نہیں دے رہا ہوں، بلکہ اپنی ناک کے بارے میں.... جس کے یہ معنی ہوئے کہ میں تقریباً اپنے بارے میں!"

"نہیں! میں اس طرح کا اعلان کسی طرح نہیں چھاپ سکتا۔!"

"جبکہ سچ مچ میری ناک غائب ہو چکی ہے۔!"

"اگر غائب ہو چکی ہے تو یہ ڈاکٹر کا کام ہے۔ ایسے ڈاکٹر ہیں جو آپ کے کسی بھی طرح کی ناک لگا سکتے ہیں۔ بہرحال میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ خوش مزاج انسان ہیں سوسائٹی میں آپ کو مذاق کرنے کا بڑا شوق ہے۔!"

"میں آپ سے خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ جب نوبت یہاں تک آ گئی ہے تو میں آپ کو دکھا دیتا ہوں...."

کلرک نے نسوار لیتے ہوئے کہا "کیوں زحمت کرتے ہیں۔؟" پھر تجسس سے بولا "ہاں سچ یہ بہت ہی غیر معمولی اور عجیب و غریب بات ہوئی۔ یہ حصّہ بالکل چکنا ہے۔ جیسے تازہ تلا ہوا گلگلا۔ جی ہاں ناقابلِ یقین حد تک ہموار سا!"

"اب بھی آپ بحث کریں گے۔؟ آپ خود ہی دیکھ رہے ہیں کہ اس کے بارے میں نہ چھاپنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں آپ کا بہت ہی شکر گزار ہوں گا" میجر نے چاپلوسی کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے خوشی ہے کہ اس حادثے کی بدولت آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہو گیا۔" کلرک نے کہا۔

"چھاپنا تو خیر کوئی ایسا بڑا کام نہیں ہے۔ لیکن مجھے اس میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ آپ چاہتے ہی ہیں تو کسی قلم کے دھنی کو دیجیے وہ اس کے بارے میں لکھے۔ 'یہ قدرت کی نادر تخلیق ہے'۔ اسے "شمالی شہد کی مکھی" میں چھپوا دے" (نسوار لیکر) "نوجوانوں کے فائدے کے لیے۔" (کلرک نے تجسس میں اپنی ناک صاف کی)، اُن سے اظہارِ ہمدردی بھی کیا۔ اور نسوار کی ڈبیا اُن کی جانب بڑھا دی۔ انھوں نے گھبرا کر کہا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرے پاس وہ ہی نہیں ہے جس سے میں نسوار لے سکوں۔؟ جہنم میں جائے آپ کی نسوار۔!"

وہ بڑی جھنجھلاہٹ میں اخبار کے دفتر سے نکل کر پولیس سپرنٹنڈنٹ کے گھر روانہ ہو گئے۔ جنھیں شکر بہت پسند تھی۔ ان کے کھانے کا کمرہ مٹھائی کی دکان بنا ہوا تھا۔ جو دکاندار ان سے دوستی کے لیے لاتے تھے۔ اس وقت ان کی باورچن اُن کے فُل بوٹ اتار رہی تھی۔ تلوار اور فوجی وردی کمرے کے کونے میں لٹکائی جا چکی تھی۔ ان کا تین سالہ بچہ ان کے باوقار تکونے ہیٹ سے کھیل رہا تھا۔

جب وہ سونے کے لیے لیٹنا چاہتے تھے تو کوالیوف پہنچے۔ ان کی آمد بالکل

ناوقت تھی۔ اگر وہ اپنے ساتھ چائے یا کڑھی کا تھال لاتے، تب بھی ان کا استقبال خوش دلی سے ہوتا کیونکہ وہ دلی اور مستورات کے قدردان تھے بلکہ زیادہ اہمیت کرسی نوشی کو دیتے۔ وہ کہا کرتے کہ اس سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ کھانے کو نہیں مانگتی، جگہ کم گھیرتی ہے، ہمیشہ جیب میں آجاتی ہے۔ گرنے پر ٹوٹتی بھی نہیں۔"

کووالیف سے وہ بڑی رکھائی سے ملے بولے "کھانے کے بعد تفتیش کا وقت نہیں ہوتا۔ قدرت کا نظام ہے کہ کھانے کے بعد ہمیں آرام کرنا چاہیے۔"

میجر کووالیف بہت زود رنج انسان تھے۔ وہ اپنے عہدے یا رتبے کے خلاف ایک لفظ بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے پُروقار انداز میں کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کی اتنی ہتک آمیز باتوں کے بعد میں کچھ اور نہیں کہہ سکتا...." وہ وہاں سے چل دیے۔ کووالیف گھر واپس پہنچے۔ تھکے ہوئے تھے۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ فلیٹ بھائیں بھائیں کرتا تھا۔ ان کا خدمت گار ایوان چمڑے کے گندے صوفے پر لیٹا ہوا چھت پر نشانہ لگا کر تھوک رہا تھا۔ انہیں غصہ آ گیا۔ وہ اس کی حماقت پر چلائے، اُس کے سر پر اپنا ہیٹ دے مارا۔

ایوان فوراً اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ مالک کا لبادہ اُتارنے لگا۔ کمرے میں تھکے ماندے آرام کرسی پر لیٹ کر آہیں بھرتے ہوئے بولے۔

"میرے خدا، اے میرے خدا! کس لیے مجھے اتنا مجبور کر دیا۔ ہاتھ نہ ہوتا پیر نہ ہوتا تو بھی بہتر ہوتا۔ کان کے بغیر شکل بھی قابل برداشت ہوتی۔ لیکن ناک کے بغیر انسان.... بس کوڑا کرکٹ ہے۔ وہ بھی اپنی غلطی سے نہیں گنوائی۔ وہ تو بس غائب ہو گئی۔ بلا کسی سبب کے، بس یونہی، مفت میں! لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ ناک غائب ہو جائے۔ بالکل ناممکن ہے۔ کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں....؟"

پوری طرح یقین کرنے کے لیے کہ وہ خواب تو نہیں دیکھ رہے ہیں۔؟ انہوں نے اپنے آپ کو اتنے زور سے چٹکی لی کہ وہ چلا اٹھے۔ اس درد نے انہیں یقین دلا دیا کہ وہ ہوش میں ہیں۔ وہ دبے پاؤں آئینے تک اس امید پر گئے کہ شاید انہیں ان کی ناک اپنی جگہ پر پھر سے نظر آ جائے۔ لیکن وہ اپنا عکس دیکھ کر اچھل کر ہٹ گئے۔ اور بولے۔ "کس قدر مضحکہ خیز نظارہ ہے!"

اُن کی کچھ بھی سمجھ میں نہ آتا۔ اگر کوئی بٹن، چاندی کا چمچہ، گھڑی یا کچھ اور کھو جاتا تو، لیکن کھو بھی تو کیا۔؟ وہ بھی اپنے ہی فلیٹ میں!.... میجر کووالیف نے تمام حالات پر غور کیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کے پیچھے قرین قیاس ہے اسٹاف افسر پوڈتوچینا کی بیوی ہیں۔ جن کی صاحبزادی سے ان کی شادی کرنا چاہتی ہیں۔

کووالیف خود اُس لڑکی سے عشق جتانا پسند کرتے۔ لیکن کوئی قطعی بات کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے۔ جب اسٹاف افسر کی بیوی نے اُن سے کہہ ہی دیا کہ "وہ اپنی بیٹی کی ان سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔" تو انہوں نے بڑی احتیاط سے اپنی جان بچائی۔ خوب خوب تعریفیں کیں۔ اور یہ کہا کہ "یہ تو ابھی بہت ہی کم عمر ہیں۔ ابھی پورے پانچ سال انہیں ملازمت کرنی پڑے گی۔ تب وہ ۴۲ سال کی عمر میں پہنچیں گے۔" اسی لیے اسٹاف افسر کی بیوی ظاہر ہے کہ اُن سے بدلہ لینا چاہتی ہیں۔ انہوں نے انہیں برباد کرنے کے لیے چڑیلوں سے مدد لی۔ ان کی ناک کیسے اُٹھا لی گئی۔ جبکہ ان کے کمرے میں کوئی آیا تک نہیں۔ گذشتہ بدھ کو اس کمرے میں اُن کا حجام ایوان یاکوف لیچ ان کا شیو بنانے کے لیے آیا تھا۔ بدھ کو دن بھر، پھر جمعرات کو دن بھر ان کی ناک سلامت تھی۔ پھر اگر کوئی کاٹتا تو اُنہیں درد محسوس ہوتا۔ اور زخم کے اتنی جلد بھر آنے اور [illegible] کی طرح سُرخ اور چکنی ہو جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ انہوں نے منصوبے بنانے شروع کیے کہ وہ اسٹاف افسر کی بیوی پر مقدمہ چلائیں۔ یا اُن سے مل کر انہیں کھری کھری سنائیں۔ اُن کے خیالات اُس روشنی سے منتشر ہونے لگے۔ جو دروازے کی درازوں سے آنے لگی جس سے انہیں پتہ لگا کہ ایوان نے سامنے کے کمرے میں شمع روشن کر دی ہے۔ جلد ہی ایوان شمع لیے ہوئے آ گیا۔ جس سے پورا کمرہ روشن ہو گیا۔ کووالیف نے جھٹ سے رومال اٹھا کر خالی جگہ کو ڈھک دیا، تاکہ ان کا بے وقوف نوکر ہکا بکا ہو کر اپنے مالک کو تکنے نہ لگے۔

ایوان اپنی کوٹھری میں داخل بھی نہ ہوا تھا کہ دہلیز سے ایک اجنبی آواز سنائی دی۔

"کیا یہ کالج اسیسر کووالیف کا گھر ہے۔؟"

"آئیے! میجر کووالیف میں ہی ہوں۔!" یہ کہتے ہوئے انہوں نے لپک کے دروازہ کھول دیا۔

ایک خوش پوشاک انسپکٹر پولیس اندر داخل ہوا۔ گل مُچھے اور بھرے بھرے گال۔ یہ وہی پولیس افسر تھا جو اس کہانی کے شروع میں حجام ایوان یاکوف لیچ کو پکڑ رہا تھا۔

"کیا آپ نے اپنی ناک گم کر دی ہے۔؟"

"ہاں۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں۔؟" میجر کووالیف چیخ پڑے۔ مارے خوشی کے ان کی زبان گنگ ہو گئی۔ وہ آنکھیں پھاڑے پولیس افسر کو دیکھ رہے تھے۔

طرح واضح تھی۔ ؟"

"جناب! عجیب واقعہ ہوا۔ وہ فرار ہونے ہی والی تھی کہ ہم نے اسے گرفتار کرلیا۔ وہ کوئی پیچھو کر رہی تھی کسی افسر کے نام سے اس کے پاس ایک ٹھکانا یا پتہ بھی تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ میں اسے پہلے آدمی سمجھا۔ خوش قسمتی سے میرا ہیڈ کانسٹیبل پاس تھا جس نے اسے فوراً دیکھ لیا۔ کہ وہ ناک ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟ ابھی بھاگ کر جاتا ہوں۔۔۔"

"آپ پریشان نہ ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو اس کی ضرورت ہوگی۔ اسی لیے میں اسے اپنے ساتھ لیتا آیا ہوں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس معاملے میں خاص مجرم وہ فرنیسنگی اسٹریٹ والا لوفر چھوکرا ہے۔ جو اس وقت تھانے میں بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے اس پر بہت دنوں سے شبہ تھا کہ یہ چور ہے۔ صرف دو دن پہلے ہی اس نے ایک دکان سے ایک درجن بٹن چرائے۔ آپ کی ناک بالکل ویسی ہی ہے۔ جیسی کہ وہ تھی۔"

پولیس انسپکٹر نے یہ کہہ کر جیب سے کاغذ میں لپٹی ہوئی ناک نکالی۔

"وہی ہے۔" کووالیف نے کہا۔ "بالکل وہی! بیٹھیے۔ چائے کے ساتھ چائے پیجیے۔"

پولیس انسپکٹر نے اپنی کچھ پریشانیاں بیان کیں۔ میجر اس کا مطلب سمجھ گئے۔ انھوں نے اسے دس روبل کا ایک نوٹ دیا۔ وہ جھک کر سلام کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ اگلے لمحے سڑک پر اس کی آواز سنائی دی۔ جہاں وہ کسی احمق کسان کے دانتوں پر گھونسہ مار کر اسے سمجھا رہا تھا۔ جو اپنی گاڑی باغیچے کی کیاریوں میں سے لے جا رہا تھا۔

انسپکٹر پولیس کے جانے کے بعد میجر چند لمحوں تک تو سکتے کے عالم میں بیٹھے رہے۔ اس اچانک خوش قسمتی کا احساس ان پر ایسا غالب تھا کہ چند منٹ بعد ہی ان کی دیکھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت واپس آسکی۔ آخر کار انھوں نے انتہائی احتیاط سے اپنی دوبارہ یافتہ ناک کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بغور اس کا معائنہ کیا۔ مارے خوشی کے ان کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ لیکن اُن کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ انھوں نے سوچا۔ مل گئی تو اسے اب اس کی اصل جگہ پر دوبارہ چپکانا بھی تو ہے۔ اور اگر نہ چپکی تو ۔۔۔؟"

اپنے آپ سے یہ سوال کرتے ہی اُن کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ دوڑ کر سنگار میز کے آئینے کے سامنے پہنچے۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ ناک بالکل ٹیڑھی نہ لگے

چپکے۔ اسے اُس کی سابق جگہ پر رکھتے ہیں اُن کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ غضب خدا کا! ناک چپکتی ہی نہ تھی۔ انھوں نے پھر اسے منھ سے لگا کر اپنی سانس سے گرم کیا۔ اور دونوں گالوں کے درمیان کی چکنی جگہ پر رکھا۔ لیکن ناک اپنی جگہ پر ٹک کر بھی نہ ٹکی۔

"اچھا اب بس ہوا! اپنی جگہ پر ٹک جا بے وقوف!" انھوں نے ناک سے کہا۔ مگر ناک لکڑی کی طرح سخت تھی۔ وہ میز پر گر پڑی تو ایسی آواز آئی جیسے وہ کارک کی بنی ہوئی ہو۔ میجر کا چہرہ تشنج سے اینٹھ سا گیا۔ انہوں نے ڈرتے ہوئے کہا

"ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ یہ چپکے ہی نہیں؟" انہوں نے نہ جانے کتنی بار کوشش کی۔ لیکن ہر بار انہیں ناکامی ہی ہوئی۔ انہوں نے ایوان کو بلا کر اس سے کہا۔ کہ "وہ جا کر ڈاکٹر کو لے آئے۔" ڈاکٹر اسی عمارت کی پہلی منزل کے سب سے عمدہ فلیٹ میں رہتے تھے۔ وہ بڑے ہی باوقار انسان تھے۔ اُن کے گل مُچھے سیاہ تھے۔ ان کی بیوی بڑی صحت مند اور ہنس مکھ تھیں۔ ڈاکٹر روزانہ صبح تازہ سیب کھاتے۔ منہ صاف رکھتے۔ جس کے لیے وہ روزانہ پون گھنٹہ غرارہ کرتے۔ پانچ مختلف برشوں سے دانت صاف کرتے۔ وہ فوراً ہی آ گئے۔ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ یہ مصیبت کب نازل ہوئی۔ انہوں نے ٹھوڑی پکڑ کر میجر کا سر اوپر اٹھایا چہرے کے اس حصے کو جس پر پہلے ناک تھی۔ اتنے زور سے دبایا کہ انھوں نے جھٹک کر سر پیچھے کر لیا۔ سر دیوار سے ٹکرا گیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔" پھر ان سے سر کو دائیں طرف جھکانے کو کہا۔ اور اس جگہ کو ٹٹولنے کے بعد جہاں ناک تھی۔ بولا "ہوں۔" پھر سر کو بائیں طرف جھکانے کو کہا۔ ڈاکٹر نے "ہوں" کہہ کر اس جگہ کو انگوٹھے سے ایسا دبایا کہ میجر اس طرح سر جھٹکنے لگے۔ جیسے دانت دکھانے میں گھوڑا کرتا ہے۔ جانچنے کے بعد ڈاکٹر نے سر ہلا کر کہا۔

"نہ، یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کے لیے بہتر ہے کہ اسے یونہی رہنے دیں۔ ورنہ معاملہ اور خراب ہو جائے گا۔ چپکانے کو تو ظاہر ہے کہ چپکائی جا سکتی ہے۔ میں ابھی ایسا کر سکتا ہوں۔ لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ آپ کے لیے اور بھی برا ہوگا۔"

میجر پر سکتہ طاری ہو گیا اُن کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"کیا خوب؟ بھلا میں بنا ناک کے کیسا لگوں گا۔ ؟ آخر اب بھلا اس سے برا کیا ہوگا۔ ؟ معلوم نہیں کیا مصیبت ہے۔ اس شرمناک حالت میں کہاں اپنا منھ دکھاؤں گا۔ ؟ میرے کافی اچھے جاننے والے ہیں۔ اسٹیٹ کونسلر [illegible]

ماچری، اسٹاف افسر کی بیوی پر توچھینا . . . حالانکہ ان کی اس حرکت کے بعد ان سے میں کوئی واسطہ ہی نہ رکھوں گا سوائے پولیس کے ذریعہ . . بہرہ گو گڑانے لگے۔

"میں آپ سے مؤدبانہ التجا کرتا ہوں کہ اسے کسی نہ کسی طرح سے چپکا دیجیے۔ اچھی طرح سے نہ سہی۔ بس یہ ٹکی رہے۔ میں ناچتا نہیں ہوں۔ اس لیے لاپرواہی سے گردش کرنے میں اس کے گرنے کا بھی کوئی خطرہ نہیں۔ میں آپ کا شکریہ ادا کروں گا اور آپ کی حیثیت کے مطابق . . . . "

ڈاکٹر نے قائل کرتے ہوئے کہا "آپ یقین کیجیے! میں کبھی ذاتی فائدے کی غرض سے لوگوں کا علاج نہیں کرتا۔ یہ فن اور قاعدے کے خلاف ہے۔ یہ تو سچ ہے۔ کہ میں گھر پر مریض دیکھنے کی فیس لیتا ہوں لیکن صرف اس خیال سے کہ میرے انکار سے مریض کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے۔ میں آپ کی ناک تو چپکا سکتا ہوں، مگر نتیجہ کہیں زیادہ بُرا ہوگا . . . آپ اپنی ناک اسپرٹ کے مرتبان میں محفوظ کر لیجیے اور بھی اچھا ہوگا کہ تھوڑا سا سرکہ بھی ڈال دیجیے۔ تب آپ کو اس کی معقول قیمت مل جائے گی۔ میں خود ہی خرید لوں گا۔ بشرطیکہ آپ بہت زیادہ قیمت نہ مانگیں۔"

میجر بیزار ہو کر چلائے۔ "نہیں نہیں، میں اسے کسی قیمت پر نہیں بیچوں گا۔ بہتر ہے کہ یہ سڑ گل جائے۔"

ڈاکٹر نے معذرت کی اور بڑے وقار کے ساتھ کمرے سے باہر چلے گئے۔ میجر نے ان کی طرف دیکھا تک نہیں۔ وہ سکتے کی حالت میں تھے۔

دوسرے دن انہوں نے فیصلہ کیا کہ مقدمہ دائر کرنے سے پہلے وہ اسٹاف افسر کی بیوی کو خط لکھ کر پوچھیں کہ وہ چیز جو جائز طور پر ان کی ہے۔ اسے واپس کرنے پر وہ راضی ہوں گی یا نہیں۔ ؟ انہوں نے مندرجہ ذیل خط لکھا؛

" محترمہ . . .

میں آپ کے اس عجیب برتاؤ کو بالکل نہ سمجھ پایا۔ یقین کیجیے کہ اس سے آپ کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اپنی صاحبزادی سے شادی کرنے پر آپ کسی طرح بھی مجھے مجبور نہیں کر سکتیں۔ یقین جانیے میں اپنی ناک کے سلسلے میں سارے معاملے سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ اس معاملے کی اصل حامل آپ ہی ہیں۔ اپنی صحیح جگہ سے اس کی اچانک علاحدگی، اس کا فرار ہونا محض بدلنا پہلے ایک سرکاری عہدیدار کی حیثیت سے، پھر اپنی شکل میں آپ نے جادو کے جو عمل کیے ہیں۔ آپ کو میں یہ آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر آج میری مذکورہ بالا ناک اپنی صحیح جگہ پر واپس نہ آ گئی تو میں قانونی کارروائی کے لیے مجبور ہوں گا۔ پھر بھی انتہائی احترام کے ساتھ مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں ہوں۔ آپ کا ادنیٰ خادم

پلاتون کووالیف"

" عزیز من جناب پلاتون کوزمچ،

مجھے آپ کا خط پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ میں آپ سے صاف صاف کہتی ہوں کہ میں ہرگز اس کی توقع نہیں کر رہی تھی، خاص کر آپ کی طرف سے بالکل ہی نازیبا تند کلامی کی۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں نے اس عہدیدار کا جس کا آپ نے ذکر کیا ہے کبھی اپنے گھر پر استقبال نہیں کیا۔ نہ اس کی اصل حیثیت میں، نہ بدلے ہوئے بھیس میں۔ یہ سچ ہے کہ فلپ ایوانووچ پوتاپیکوف ہم سے ملنے آئے اور یہ بھی سچ ہے کہ انہوں نے میری صاحبزادی کے لیے خواستگاری کی اور وہ خود عمدہ سنجیدہ مزاج کے آدمی اور پڑھے لکھے انسان ہیں، لیکن میں نے کبھی کسی طرح ان کی ہمت افزائی نہیں کی۔ آپ نے ناک کا بھی ذکر کیا ہے۔ اگر اس سے آپ کا یہ مطلب ہے کہ گویا میں نے آپ پر ناک بھوں چڑھائی یعنی آپ کو یکسر رد کر دیا تو مجھے تعجب ہے کہ آپ خود اس کے بارے میں بات کر رہے ہیں، چونکہ آپ جانتے ہیں کہ میری رائے اس کے بالکل ہی برعکس تھی۔ اور اب بھی اگر آپ میری بیٹی کے لیے قانونی طور پر درخواست دیں گے۔ تو میں اس کو قبول کر لینے کے لیے فوراً تیار ہو جاؤں گی۔ اس لیے کہ یہ تو ہمیشہ میری شدید ترین خواہش تھی۔ جس کی امید میں، میں ہمیشہ آپ کی نیاز مند ہوں۔

پلاگیا پوتوچینا۔"

کووالیف نے خط رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں۔ وہ ہرگز قصوروار نہیں ہیں۔ وہ نہیں ہو سکتیں۔ کوئی بھی شخص جو کسی جرم کا قصوروار ہو وہ ایسا خط لکھ ہی نہیں سکتا۔ آخر یہ سب ہوا کیسے۔ ؟ شیطان ہی جانے !" انہوں نے ہاتھ گراتے ہوئے کہا۔

اس دوران اس غیر معمولی واقعے کے سلسلے میں بہت سی افواہیں دارالحکومت میں پھیل گئیں۔ اس زمانے میں لوگوں کے ذہن ہر غیر معمولی واقعے کو مان لینے کے لیے تیار رہتے تھے۔ اس سے پہلے شہر میں ناچتی ہوئی کرسیوں کے دیکھے جانے کی افواہ پھیل گئی تھی۔ تعجب کی بات [illegible] کہ

تھوڑے ہی دنوں بعد افواہ نے یہ صورت اختیار کر لی کہ میجر کووالیف کی ناک نیوسکی پراسپکٹ میں روزانہ ٹھیک تین بجے ٹہلا کرتی ہے۔ ہر روز تماشائیوں کا ایک ہجوم جمع ہو جاتا۔ کسی نے اڑا دی کہ "فلاں ناک فلاں دکان میں گئی ہے" دکان کے آگے زبردست مجمع ہو گیا۔ پولیس بلانی پڑی۔ ایک منافع خور نے جو تھیئٹر کے دروازے پر خشک مٹھائی بیچتا تھا۔ کچھ بنچیں بنوالیں۔ اسی کونیک میں بنچ پر کھڑے ہو کر ناک کو دیکھنے کا اعلان کیا اور وارے نیارے کر لیے۔ ایک کرنل صاحب بڑی مشکل سے بھیڑ میں گھس کر دکان تک پہنچ گئے۔ تو بجائے ناک کے انہیں ایک تصویر نظر آئی۔ جس میں ایک لڑکی اپنے پاؤں کے موزے درست کر رہی تھی اور پیچھے سے ایک لڑکا اسے تاک رہا تھا۔ انہیں بہت غصہ آگیا۔ یہ تصویر تو اس دکان پر دس سال سے لگی ہوئی تھی وہ افواہیں پھیلانے والوں پر بگڑ گئے۔

پھر یہ افواہ گرم ہوئی کہ میجر کووالیف کی ناک بازار نہیں باغ میں ٹہل رہی ہے۔ اور کئی دن سے وہاں چہل قدمی کرنے جاتی ہے۔ اور ایرانی سفیر شہزادے خسرو مرزا حرہ کا وہیں محل میں قیام تھا۔ قدرت کا یہ معجزہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ سرجیکل اکادمی کے کئی طلبا وہاں گئے۔ ایک عالی خاندان خاتون نے باغات کے نگراں کو لکھا کہ "وہ ان کے بچوں کو یہ حیرت انگیز منظر ضرور دکھا دیں۔ اگر ممکن ہو تو کمسن بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے سبق آموز معلمانہ وضاحت بھی فرما دیں۔"

دعوتوں میں خواتین کا دل بہلانے والوں کو اس موضوع سے دلچسپ باتیں کر کے دل بہلانے کا موقع مل گیا۔ کچھ محترم قانون پسند ناخوش تھے۔ ایک شریف انسان نے اعلان بھی کیا کہ "وہ یہ سمجھنے سے معذور ہیں کہ آج کے روشن خیالی کے دور میں اس قسم کے مضحکہ خیز قصے کیسے پھیل جاتے ہیں۔؟ تعجب ہے کہ حکومت اس معاملے پر کوئی توجہ نہیں دے رہی ہے!" ان صاحب کا تعلق شہریوں کے اس گروہ سے تھا۔ جو حکومت کو ہر چیز میں یہاں تک کہ اپنی بیویوں کے ساتھ روزمرہ کے جھگڑوں تک میں الجھا چاہتا تھا۔ اس کے بعد... پھر سارے واقعہ پر ایک دھند سی چھا گئی۔ پھر کیا ہوا۔ یہ قطعی طور پر نہ معلوم ہو سکا۔

(۳)

ایک دن وہی ناک جو اسٹیٹ کونسلر کی حیثیت سے بگھی پر سوار ہو کر گھومتی تھی جس نے شہر میں اتنی ہلچل مچا دی تھی، پھر سے اس طرح جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، ٹھیک اپنی جگہ پر یعنی میجر کووالیف کے دونوں گالوں کے درمیان نمودار ہو گئی۔ یہ واقعہ ٹھیک ۷ اپریل کو ہوا۔ میجر کووالیف صبح کو سو کر اٹھے، اتفاق سے ان کی نظر آئینے پر پڑی۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ناک۔! انہوں نے اسے پکڑ لیا۔ ہاں ہاں! اُن کی ناک۔ "اہا ہا!" انہوں نے کہا اور مارے خوشی کے وہ ننگے پاؤں ہی رقص شروع کرنے والے تھے۔ لیکن اچانک ایوان کے آجانے سے گڑبڑ ہو گئی۔ انہوں نے فوراً ہاتھ منہ دھونے کا سامان منگوایا۔ منہ دھو کر انہوں نے دوبارہ آئینے میں دیکھا۔ ناک اپنی جگہ پر تھی۔ تولیے سے منہ پونچھ کر انھوں نے پھر آئینے میں دیکھا۔ ناک وہیں تھی۔

"ہوں! ایوان ذرا دیکھنا تو میرے خیال میں، میری ناک پر ایک دانہ ہے۔" وہ سوچنے لگے۔ اگر ایوان نے کہہ دیا کہ "نہیں حضور تو کیا ناک ہی نہیں ہے۔" تو کیا ہو گا۔؟۔ لیکن ایوان نے کہا۔

"دانہ تو کہیں نہیں ہے۔ آپ کی ناک تو بالکل صاف ہے۔"

میجر نے دل میں کہا۔ "ٹھیک ہے۔ چلو خیریت ہوئی — انہوں نے چٹکی بجائی۔ ٹھیک اسی وقت حجام ایوان یاکوف لیوچ دروازے میں سے جھانکے مگر وہ اس بلی کی طرح سہمے ہوئے تھے جیسے چربی چرانے پر ابھی ابھی پٹا گیا ہو۔ کووالیف نے دیکھتے چلائے۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے ہاتھ صاف ہیں یا نہیں۔؟"

"صاف ہیں حضور!"

"جھوٹ بولتے ہو۔!"

"خدا کی قسم! صاف ہیں حضور۔"

"اچھی طرح دیکھ لو نہیں تو اچھا نہ ہو گا۔" کووالیف بیٹھ گئے۔ حجام نے ان کے تولیہ لگا دیا۔ اور آناً فاناً برش سے ان کی داڑھی بلکہ ان کے گالوں کے ایک حصے پر بھی صابن کے جھاگ پھیر دیئے۔

ایوان یاکوف لیوچ نے ناک کو دیکھ کر دل ہی دل میں کہا۔

"یہ بات ہے۔!" پھر سر جھکا کر ایک پہلو سے ناک کو دیکھا۔

"دیکھیے ذرا، بھلا کون سوچ سکتا ہے۔!" وہ دیر تک ناک کو دیکھتے رہے۔ آخر انہوں نے احتیاط سے ناک کو پکڑنے کے لیے انگلیاں اٹھائیں۔ یہ اُن کا طریقہ تھا کہ ناک کو سنبھالے۔

"اچھا، اچھا، ذرا خیال رکھنا ۔!"

اس [illegible] ہاتھ لگا دیا ہے۔ آخر انہوں نے ڈرتے ڈرتے میجر کی ٹھوڑی کے نیچے کھرچنا شروع کیا مگر ان کے لیے یا ناک کو بچانا [illegible] بہت مشکل تھا۔ انہوں نے اپنا کھردرا انگوٹھا میجر کے گال اور جبڑے پر ٹکا کر [illegible] کا ٹھیکہ دیا۔

اس کے بعد میجر نے جلدی سے کپڑے پہنے، گاڑی بلائی اور سوار ہو کر سیدھے بیکری میں پہنچے۔ انہوں نے بیرے کو پکار کر "ایک پیالی چاکلیٹ ۔" کا آرڈر دیا۔ وہ فوراً آئینے کی جانب گھوم گئے۔ ناک اپنی جگہ پر تھی۔ وہ بڑے بانکپن سے مڑے اور آنکھیں میچ کر ایک طنزیہ نظر ان دو افسروں پر ڈالی۔ جن میں سے ایک کی ناک واسکٹ کے بٹن سے بڑی نہ تھی۔ اس کے بعد وہ اس محکمے کے دفتر کی جانب روانہ ہوئے۔ جس میں وہ نائب گورنر یا وہ نہ سہی تو منتظم کے عہدے کا سودا کر رہے تھے۔ استقبالیہ سے گزرتے ہوئے انہوں نے شیشے پر نظر ڈالی۔ ناک اپنی جگہ پر تھی۔

ملنے جلنے والوں میں وہ ایک اور میجر سے ملاقات کے لیے گئے۔ جو طنز کرنے کے ماہر تھے۔ جن کے چبھتے ہوئے نشتروں کے جواب میں وہ عموماً یہ کہا کرتے تھے کہ "اچھا، اچھا اب زیادہ ڈنک مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم تو بہت تیز ہو۔!" انہوں نے سوچا کہ اگر یہ [illegible] بھی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ نہ ہو گئے۔ تو یہ اس بات کی یقینی علامت ہوگی کہ سب کچھ ٹھیک اور ہر چیز اپنی جگہ پر ہے۔ لیکن میجر نے تو پلک تک نہ جھپکائی۔

کووالیف نے سوچا "ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہے چلو خیریت ہوئی۔!"

شہر کے بیچ میں ان کی ملاقات مادام پلاٹوچینا اور اُن کی صاحبزادی سے ہو گئی۔ کووالیف نے سر جھکا کر انہیں سلام کیا۔ دونوں نے ان کا استقبال پرمسرت چیخوں سے کیا۔ صاف ظاہر تھا کہ ان کی شکل و صورت میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ وہ بڑی دیر تک ان لوگوں سے باتیں کرتے رہے انہوں نے جان بوجھ کر نسوار کی ڈبیا نکالی، بڑے سوچ سمجھے انداز میں دو نتھنوں میں [illegible] بھر لی۔

"لیجیے خواتین، [illegible]!"

انہیں [illegible] اس طرح آنے جانے لگے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا [illegible] پر چلتے [illegible] ٹھہرتے [illegible] نظر آتے۔ ان کی ناک بھی ان کے چہرے پر یوں جمی رہی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا [illegible] تھی۔ اس کے بعد میجر ہمیشہ خوش دل اور خوش مزاج نظر آتے [illegible] خوبصورت عورتوں کا پیچھا کرتے [illegible] ایک [illegible] خرید [illegible] اس لیے کہ وہ تو کسی [illegible] کے نائب [illegible]

تو یہ تھا واقعہ ریاست کے شمالی دارالحکومت میں پیش آیا۔ اب ہم اس پورے قصے پر غور کرتے ہیں [illegible] اس میں بہت سی باتیں ناقابلِ یقین ہیں۔ ناک کی غیر قدرتی علیحدگی [illegible] کے سبب میں جگہ جگہ اس کا نظر آنا۔ پھر کووالیف کی یہ سمجھ میں کیوں نہیں آیا کہ اخبار میں گمشدہ ناکوں کے اشتہار نہیں چھاپے جاتے... پھر یہ کہ ناک ایک تازہ سینکی ہوئی روٹی میں کیسے پہنچ گئی۔؟ اور کیسے خود ایوان [illegible] پہنچ...؟ سب سے مشکل سے سمجھ میں آنے کی بات یہ ہے کہ ادیب آخر اس طرح کے حادثوں کو اپنا موضوع کیوں بناتے ہیں۔؟ میں یہ اعتراف کرتا ہوں [illegible] یہ میری سمجھ سے بالکل باہر ہے... نہیں، نہیں میں بالکل نہیں سمجھ سکتا۔ پہلی بات تو یہ کہ اس سے قوم کا بالکل کوئی فائدہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ... نہیں اور دوسری بات بھی یہی کہ کوئی فائدہ نہیں [illegible] میں نہیں جانتا کہ یہ کیا ہے...؟

بہر حال پھر بھی، ساری چیزوں کو دیکھتے ہوئے، ہم خیال کر سکتے [illegible]... میرا مطلب ہے کہ عجیب و غریب چیزیں تو ہر وقت ہی ہوتی رہتی ہیں، ہوتی ہیں نا۔؟ اور یہ تو آپ کو ماننا ہی پڑے گا کہ آپ ذرا غور کریں کہ اس میں کچھ تو سچائی ہے۔ اب چاہے کچھ بھی کہیے اس طرح کی چیزیں دنیا میں ہوتی رہتی ہیں۔ شاذ و نادر [illegible]

بشیر احمد ڈابلا
شعبۂ عمرانیات - اے ایم یو

ہندوستان

قائد تحریک غیر جانبداریت

ہندوستان، عرب جمہوریہ مصر اور یوگوسلاویہ کے ساتھ غیر جانبدار تحریک کا بنیادی رکن ہے۔ اس لیے اس تحریک کے مقاصد کا تعین کرنے میں، اس کو ہر لحاظ سے بڑھاوا دینے میں اور کامیاب بنانے میں ہندوستان کا خاص رول رہا ہے۔ لیکن اس بین الاقوامی تحریک میں ہندوستان کو اس وقت ایک نیا اور اہم رول ادا کرنا پڑا جب اس کی سربراہی (CHAIR PERSONSHIP) ہندوستان کو سونپی گئی جس کی وجہ سے بین الاقوامی تعلقات، اقوام متحدہ اور دوسرے بین الاقوامی فورموں میں ہندوستان کے رول نے بنیادی اہمیت حاصل کر لی۔

ہندوستان کو غیر جانبدار تحریک کی سربراہی کا اعزاز اس وقت ملا جب ۱۲ مارچ ۱۹۸۳ء کو نئی دہلی میں غیر جانبدار ممالک کی چھٹی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ایشیا، افریقہ، لاطینی امریکہ اور یورپ کے ۹۹ ممالک نے شرکت کی۔ یہ کانفرنس کئی وجوہات کی بنا پر خاص اہمیت کی حامل تھی۔ ان وجوہات میں مختلف ممالک کے درمیان بڑھتے ہوئے سرد اور گرم جنگ کا رجحان اور کانفرنس کے انعقاد کی جگہ بغداد سے نئی دہلی کی منتقلی بھی شامل ہیں۔ اس کانفرنس میں ممبر ممالک کے مسائل کے علاوہ دنیا کے اہم ترین معاملات پر بھی غور و خوض کیا گیا۔ ہندوستان کی سرکردگی میں کانفرنس نے دو اہم کامیابیاں حاصل کر لیں۔ ایک یہ کہ ہوانا کانفرنس میں شروع کی گئی CONTROVERSY (جس کے مطابق کئی ممالک سوشلسٹ بلاک کو غیر جانبدار تحریک کا قدرتی ساتھی (NATURAL ALLY) سمجھتے تھے اور دوسرے کئی ممالک اس سے انکار کرتے تھے) کا خاتمہ ہوا اور دوسری یہ کہ تحریک کو سیاسی مسائل کے ساتھ ساتھ زبردست معاشی رنگ دیا گیا۔ یہ سب باتیں دہلی اعلانیہ میں بھرپور طریقے سے جھلکتی تھیں۔ اس سیاسی اعلانیہ میں ہتھیاروں کی دوڑ کو ختم کرنے، ایٹمی جنگ کو روکنے، بیرونی افواج کی موجودگی کو ختم کرنے، بغیر طاقت استعمال کیے معاملات کو سلجھانے، جبری قبضے میں پھنسے ہوئے علاقوں کو خالی کرنے، نمیبیا اور فلسطین کے عوام کو سہارا دینے، بیرونی مداخلت کو روکنے اور کمپوچیا اور افغانستان سے بیرونی فوجوں کے واپس جانے، اقوام متحدہ کو مضبوط تر بنانے اور سپر طاقتوں کا دائرہ اثر بڑھانے کی مزاحمت کرنے کی باتوں پر زور دیا گیا اور معاشی اعلانیہ میں ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک کو درپیش مسائل کے حل کی خاطر بین الاقوامی سطح پر بات چیت شروع کرنے، ترقی پذیر ممالک کی خوراک، ایندھن، مالیات، تجارت اور خام مال سے متعلق مسائل کو اقوام متحدہ کی کانفرنسوں اور نشستوں میں خاص اہمیت دینے، IMF، UNCTAD اور WB جیسے اداروں کو صحیح سمت میں استعمال کرنے اور پیسہ اور مال کی ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کرنے کے معاملات پر زور دیا گیا۔ آخر میں کانفرنس نے بڑی طاقتوں سے اپیل کی کہ وہ ایٹمی جنگ سے گریز کریں۔ PROTECTION کی پالیسی چھوڑ دیں اور ایک نئے بین الاقوامی معاشی آرڈر کے لیے کوشش کریں۔

اس کانفرنس کے بعد ہندوستان نے عملی طور سے بنیادی اور اہم کام شروع کیے جو اس کے سپرد کیے گئے تھے۔ اگرچہ تحریک کے ممبر ممالک کے مسائل گوناگوں اور مشکل ہیں، ہندوستان نے ان کو سلجھانے

کی بے حد کوشش کی۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر تحریک کے وقار کو بڑھانے کے علاوہ کئی ٹھوس کام کیے۔ ساتویں چوٹی کانفرنس کے فیصلے پر عمل کرتے ہوئے شریمتی اندرا گاندھی نے ۳۰ ستمبر ۱۹۸۳ء کو اقوام متحدہ میں عالمی لیڈروں کی چوٹی کانفرنس منعقد کروائی جس کا مقصد یہ تھا کہ بین الاقوامی مالیاتی اداروں میں اہم ترین اصلاحات کو زیر غور لایا جائے۔ اور لوگوں کے علاوہ اس کانفرنس میں کینیڈا کے وزیر اعظم مسٹر TRUDEAU تنزانیہ کے صدر مسٹر جولیس نیریرے اور EEC کے صدر مسٹر تھارن شامل ہوئے۔ اس کانفرنس میں شامل ۴۲ ممالک نے دنیا کے اہم ترین مالیاتی اداروں کو بین الاقوامی ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور اس سلسلے کی فائدہ مند گفتگو کو قائم رکھنے کا فیصلہ کیا۔ انہی دنوں مسز گاندھی نے ہندوستان اور دوسرے ۱۰۰ غیر جانبدار ممالک کی نمائندگی کرتے ہوئے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایک اہم تقریر کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ ایٹمی اور مہلک ہتھیاروں کو مکمل طور سے تباہ کیا جائے۔ DISA-RMAMENT کی بات چیت کو شروع کیا جائے اور ایٹمی ہتھیاروں کے بنانے پر مکمل روک لگائی جائے اور مغربی ایشیا وسطی امریکہ، مغربی افریقہ، افغانستان اور کمپوچیا کے تنازعات کو پُرامن سیاسی حل کے ذریعے حل کیا جانا چاہیے۔

اقوام متحدہ میں تحریک غیر جانبداریت کے سربراہ کی حیثیت سے ہندوستان پر جو ذمہ داریاں عاید ہوتی تھیں، وہ اس نے ڈھنگ سے نبھائیں۔ اقوام متحدہ میں ہندوستان کے مستقل نمائندے مسٹر دی کرشنن ہر مسئلے پر بے باکی سے اپنی پوزیشن واضح کرتے ہیں اور اقوام عالم کے سامنے تحریک کا نقطۂ نظر پیش کرتے۔ بالخصوص بڑی طاقتوں کی آپسی چپقلش کا معاملہ ہو یا بین الاقوامی معاشی مشکلات کا مسئلہ ہو، فلسطین کا تنازعہ ہو یا مغربی افریقہ کا انسانی المیہ ہو، وہ ہر موقع پر تحریک کی جانب سے اپنا موقف پیش کرتے ہیں۔

اس بین الاقوامی رول کے علاوہ ہندوستان نے تحریک کے ممبر ملک کے مسائل میں بھی خاصی دلچسپی لی اور ان کو سلجھانے کی بے حد کوشش کی۔ خلیج کی جنگ کو روکنے کے لیے ہندوستان نے بہت کوشش کی۔ ایران عراق جو تحریک کے ممبر ہیں، کو اس جنگ کے خطرناک اثرات سے آگاہ کیا اور جنگ بند کرنے کے لیے بہت ساری تجاویز پیش کیں۔ مسٹر نرسمہا راؤ (جو جنگ خلیج سے متعلق تحریک غیر جانبداریت کی مقرر کردہ کمیٹی کے ممبر بھی تھے) کئی بار ایران اور عراق گئے اور دونوں ممالک کو تحریک کی زبردست تشویش سے آگاہ کیا اور جنگ بند کرنے کے لیے بہت ساری تجاویز پیش کیں۔ اس کے علاوہ مسز گاندھی کی اپیل کے نتیجے میں ان دونوں ممالک کے نمائندے دہلی آئے اور اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ جنگ خلیج کو روکنے کے سلسلے میں غیر جانبدار تحریک کی کوششیں اب بھی جاری ہیں۔ اسی طرح مشرق وسطیٰ کے تنازعات خاص کر لبنانی، فلسطین اور عرب اسرائیل تنازعات کو سلجھانے میں ہندوستان نے بھرپور رول ادا کیا۔ ہندوستان جہاں فلسطین کے عوام کی حق خود داریت اور ان کے آزاد وطن کے قیام کی مسلسل حمایت کرتا رہا ہے، وہیں اسرائیل کو مقبوضہ عرب علاقے چھوڑنے اور پورے خطے میں پُرامن حالات بحال کرنے پر زور دیتا رہا ہے۔ لبنان کے معاملے میں ہندوستان نے بیرونی مداخلت کو مسترد کیا خواہ وہ امریکہ کی طرف سے ہو یا اسرائیل کی جانب سے اور وہاں کے لوگوں پر زور دیا کہ وہ مفاہمت کا طریقہ کار اپنائیں اور ملک کو خانہ جنگی کی تباہی سے بچائیں۔ جنوبی افریقہ کی نسل پرست پالیسی کی ہندوستان نے ہر فورم میں اور ہر محاذ پر مخالفت کی اور وہاں کی حکومت پر زور دیا کہ وہ اس انسان دشمن پالیسی کو یکدم ختم کر دے۔ نمیبیا کے لوگوں کی آزادی کی مسلسل حمایت بھی ہندوستان کی پالیسی میں شامل رہی ہے۔ مشرقی افریقہ کے عرب ممالک کے مسائل کو حل کرنے کی خاطر مسز گاندھی نے لیبیا اور سوڈان کا دورہ کیا اور ان کے مسائل کو حل کرنے میں مدد دی۔

غیر جانبدار تحریک کے اس جذبے کے تحت ہندوستان نے اپنے ہمسایہ ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھے۔ پاکستان کے ساتھ تعلقات کی استواری روز بروز بڑھ رہی ہے اور زیادہ سے زیادہ شعبوں میں دونوں ممالک ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کر رہے ہیں۔ بنگلہ دیش اور نیپال کے ساتھ بھی ایسے ہی دوستانہ تعلقات روا رکھے گئے ہیں۔ ہندوستان ان ممالک کی معاشی ترقی میں ایک خاص اور مثبت رول ادا کر رہا ہے۔ سری لنکا میں کئی ناخوشگوار واقعات

کے برعکس بھی ہندوستان نے کبھی کسی ملک پر ایسی حرکت نہیں کی بلکہ ان معاملات کو سلجھانے میں ان کی مدد کی۔

غیر جانبدار تحریک نے ہندوستان کی سربراہی میں سیاسی معاملات کے علاوہ اور میدانوں میں بھی پیش رفت کی جن میں معیشت، تعلیم، کلچر اور انفارمیشن کے میدان قابل ذکر ہیں۔ ہندوستان کی کوشش یہ رہی ہے کہ تحریک کے ممبران ممالک خود کفالت کی پالیسی اپنا لیں اور مغربی ممالک پر انحصار کم کریں۔ اس کے لیے ممبر ممالک کے آپسی تعاون کی بہت ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستان نے دوسرے تحریکی ممالک کو مختلف قسم کی امداد مہیا کی۔

اسی طرح انفارمیشن کے میدان میں ہندوستان ایک نیا بین الاقوامی انفارمیشن نظام بنانا چاہتا ہے جس میں مغربی خبر رساں ایجنسیوں کا غلبہ نہ ہو بلکہ تیسری دنیا کے ممالک اپنی خبروں کے خود مالک ہیں۔ اس سلسلے میں ایک بین الاقوامی کانفرنس NAMEDIA نئی دہلی میں منعقد کی گئی اور اس کے فیصلوں پر عمل جاری ہے۔ ہندوستان میں غیر جانبدار ممالک کے اخبار نویسوں کو تیار کرنے کے لیے ایک خاص ادارہ UMC بھی کام کر رہا ہے۔

* * *

کیا آپ جانتے ہیں ؟

۱ : انسان کا بال ایک سال میں سولہ (۱۶) انچ بڑھتا ہے۔
۲ : انگلی کا ناخن ایک سال میں ڈھائی انچ بڑھتا ہے۔
۳ : بچہ دن کے وقت کم بڑھتا ہے اور رات کے وقت زیادہ بڑھتا ہے۔
۴ : ہمارے جسم میں ۲۰۷ ہڈیاں ہیں۔
۵ : ہمارے جسم میں تین لاکھ نسیں اور تین کروڑ مسام ہیں۔
۶ : چیونٹی کی رفتار فی گھنٹہ ۷۸۰ فٹ ہوتی ہے۔
۷ : شیر کا دل اور جانوروں کے دلوں سے چھوٹا ہوتا ہے۔

.... شبانہ جمال

علم

یہ علم تو ایک مادرِ مہربان ہے کہ اپنے بچوں کو تمام غلاظتوں اور نجاستوں سے پاک صاف کرتی ہے۔ اس میں توانائی بڑھاتی ہے .....

نرمی اس کی فطرت ہے۔ وہ اپنی اولاد میں عزت و شان کے پیدا کرنے کی فکر میں رہتی ہے اور ان کو بتلاتی ہے کہ تم ان عمدہ خوبیوں کو کیوں کر باقاعدہ اور منظم بنا سکتے ہو جن کے بغیر تمہاری زندگی تکلفات کے سبب وبالِ جان ہے۔

.... منشی ذکاء اللہ

مالک : تہذیب الاخلاق ٹرسٹ۔
پرنٹر پبلشر : ظفر الحسن نقوی، مقام اشاعت : شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پریس : ایس کے آفسیٹ پریس - دہلی۔

راحت ابرار

مسلم یونیورسٹی کے شب و روز

اردو کے نامور صاحب طرز ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی کی یاد میں جن وادی لیکھک سنگھ کی جانب سے "یوم رشید" کا اہتمام کیا گیا جس کا افتتاح کرتے ہوئے مسلم یونیورسٹی کے قائم مقام وائس چانسلر پروفیسر وصی الرحمٰن نے کہا کہ رشید صاحب کو علی گڑھ سے اور علی گڑھ کو رشید صاحب سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ آج کا یہ جلسہ رشید احمد صدیقی صاحب کے خفیہ گوشوں کو اجاگر کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

اس موقع پر شعبۂ اردو کے ریڈر ڈاکٹر اصغر عباس کی کتاب "رشید احمد صدیقی — آثار و اقدار" کا اجرا بیگم رشید احمد صدیقی نے فرمایا۔ جلسہ کی صدارت پروفیسر عبدالعظیم صدر شعبۂ لسانیات و ڈین فیکلٹی آف آرٹس نے فرمائی۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے کہا کہ رشید صاحب کی متعدد حیثیتیں تھیں۔ آخری زمانے میں انھوں نے بہت سے ایسے مضامین لکھے جو معاشرے کی تہذیبی قدروں کے آئینہ دار ہیں۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ ادب زندگی کا بہت بڑا حصہ ہے۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے اپنے مقالے میں کہا کہ مسلم یونیورسٹی اینٹ گارے سے بنی محض ایک عمارت کا نام نہیں ہے بلکہ ایک روایت اور تہذیب کا نام ہے۔ رشید صاحب نے علی گڑھ والوں کو وہ سب کچھ دیا جو ان کے پاس تھا۔ شعبۂ اردو کو رشید صاحب کے نام پر ایک چیئر قائم کرنی چاہیے اور گولڈ میڈل یا اسکالرشپ ان کے نام سے موسوم کیا جانا چاہیے۔

انہوں نے کہا کہ علی گڑھ پر سب سے زیادہ آزمائشی دو اس وقت آیا جب سرسید کا انتقال ہوا۔ دوسرا آزمائشی دور رشید صاحب کے جنازے کو دیکھ کر ہوا۔ جب علی گڑھ میں علی گڑھ والے نظر نہیں آئے اور خفا ہو کر رہ گئے۔

ڈاکٹر نصیر احمد نے رشید احمد صدیقی کے فن پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ رشید صاحب کی تحریروں کا رنگ فلسفیانہ ہے۔ تکرار، تضاد اور اختصار ان کے اسلوب کی خوبیاں ہیں۔

پدم شری پروفیسر قاضی عبدالستار نے اس موقع پر رشید احمد صدیقی کے نثری آہنگ پر ایک مقالہ پیش کیا۔ قاضی صاحب نے کہا کہ میری آرزو تھی کہ یہ ایک بڑا جلسہ ہوتا جس میں ہندو پاک کے تمام لوگ شریک ہوتے جنھوں نے رشید صاحب کے دسترخوان سے اپنے خوان سجائے۔

پروفیسر زاہدہ زیدی نے رشید صاحب سے اپنے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے ماموں خواجہ غلام السیدین کے تعلق سے رشید صاحب سے اکثر ملاقات کرتی رہتی تھیں اور اپنا پہلا مجموعۂ کلام سب سے پہلے رشید صاحب کو پیش کیا تھا۔

ہندی کے نامور ادیب اور شعبۂ ہندی کے سابق سربراہ پروفیسر شیو شنکر شرما راکیش نے کہا کہ جس طرح غزل اردو کی آبرو ہے اسی طرح مسلم یونیورسٹی کی آبرو رشید احمد صدیقی تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۷۷ء کا سال میرے لیے حادثوں کا سال تھا جب کہ میرے والد اور رشید احمد صدیقی کا انتقال ہوا۔

جن وادی لیکھک سنگھ کی سکریٹری نمیتا سنگھ نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ ہمارے ملک کی سیاست سماج کو ٹکڑوں میں بانٹ رہی ہے اور زبان و تہذیب کو بھی خانوں میں تقسیم کرنا چاہتی ہے جبکہ ادب لوگوں کے دلوں کو جوڑتا ہے اور راہ دکھاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ رشید احمد صدیقی اپنے آپ میں مکمل ادارہ تھے۔ کندن، چارپائی اور ارہر کے کھیت ان کے مشہور مضمون ہیں۔ انھیں بہت سے اعزازات سے نوازا گیا جن میں پدم شری ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور مسلم یونیورسٹی نے اپنے ہی استاد کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔

پروفیسر عبدالعظیم نے اپنی صدارتی تقریر میں رشید صاحب کو ایک شفیق استاد اور اعلیٰ کردار کا انسان بتاتے ہوئے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

انکم ٹیکس کی اپنی ذمہ داریاں کم کیجئے

انکم ٹیکس قانون کی دفعہ
80 سی کے تحت 15 سالہ پبلک پراویڈنٹ
فنڈ (پی پی ایف) میں رقم جمع کرا کے

کم سے کم سرمایہ کاری سال میں 100 روپے زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاری سال میں 40 ہزار روپے (ڈاکٹروں، مصنفوں، فنکاروں وغیرہ کیلئے 60 ہزار روپے) یہ رقم یکمشت یا 12 قسطوں میں جمع ہو سکتی ہیں۔

1985-86ء میں 10 فیصد سالانہ سود جس پر ٹیکس نہیں لگے گا۔

قرضے اور جزوی رقم نکالنے کی سہولت۔

عدالت کی طرف سے اس رقم پر ڈگری نہیں ہوسکتی۔

ازخود روزگار مہیا کرنے والوں کے لئے بہترین اسکیم۔

اس کھاتے میں جو رقم جمع کردی جاتی ہے بشمول اس رقم کے جو جمع کرنے والے پر انحصار رکھنے والی بیوی اور اس کے بچوں کے نام سے بھی جمع کرادی جائے، اسے انکم ٹیکس اور دولت ٹیکس میں رعایت کی مستحق سمجھا جاتا ہے۔

تمام ہیڈ پوسٹ آفسوں، اسٹیٹ بنکوں اور قومی ملکیت کے بنکوں اور دیگر مجاز شاخوں میں کھاتے کھولے جا سکتے ہیں۔

ان میں جمع رقوم پر دولت ٹیکس نہیں لگتا۔ اس کے لئے چھ ماہ تک رقم جمع رکھنے کی شرط بھی عائد نہیں ہوتی۔

قومی بچت ادارہ
12 - سیمینری ہلز، ناگپور - 440006

davp85/440

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ

اشتہار نمبر ۲۷/ ۸۶ - ۸۵

مقررہ فارم پر درج ذیل جگہوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱- مائیکروفوٹوگرافسٹ۔ (ایک جگہ) (مستقل) سرسید اکیڈمی

شرح تنخواہ۔ ۴۲۵- ۱۵- ۵۰۰- ای بی- ۱۵- ۵۶۰- ۲۰- ۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:- ۱- فزکس میں ایم ایس سی اور ساتھ میں فوٹوگرافی مائیکروفلمنگ میں جانکاری۔

۲- اردو سے واقفیت۔

۲- جونیئر ریسرچ فیلو۔ (ایک جگہ) (عارضی) (ڈی ایس اے پروگرام کے تحت)۔ ڈپارٹمنٹ آف فزکس۔

شرح تنخواہ۔ ۶۰۰/ روپے ماہانہ (مقررہ)

قابلیت:-

۱- لازمی- اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ فزکس میں ایم- ایس سی-

۲- پسندیدہ (i) نیوکلیر فزکس میں تخصیص-

(ii) کاسمک ریز فزکس میں تحقیق کا تجربہ-

۳- ہربیریم اور میوزیم کیوریٹر- (ایک جگہ) (مستقل) باٹنی ڈپارٹمنٹ۔

شرح تنخواہ- ۴۲۵- ۱۵- ۵۳۰- ای بی ۱۵- ۵۶۰- ۲۰- ۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔

قابلیت

۱- لازمی- میوزیالوجی میں ماسٹر کی ڈگری یا سائنس میں بیچلرز ڈگری جس میں باٹنی بطور ایک مضمون

کے رہا ہو۔ اور کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے میوزیالوجی میں ڈپلوما حاصل کیا ہو۔
ii پسندیدہ: کسی گورنمنٹ یا یونیورسٹی میوزیم میں کام کا تجربہ ہو۔

۴۔ سپروائزرس (دو جگہیں) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف گارڈن اینڈ لینڈ
شرح تنخواہ: ۲۶۰-۶-۲۹۰-ای بی-۶-۳۲۶-۸-۳۶۶-ای بی-۳۹۰-۱۰-۴۰۰ روپے
مع دیگر الاؤنسز۔
قابلیت:
۱۔ لازمی: ہائی اسکول۔ ساتھ میں ڈپلوما جس میں اگریکلچر بطور ایک مضمون کے ہو۔
پسندیدہ: کسی رجسٹرڈ نرسری یا گورنمنٹ گارڈن میں کام کرنے کا دو سالہ تجربہ۔

۵ اسسٹنٹ وائرمین۔ (تین جگہیں) (ایک مستقل، دوسری عارضی لیکن امید یہ ہے کہ وہ مستقل ہو جائے۔ اور تیسری مکمل عارضی) (ورکس اینڈ مینٹس) ڈپارٹمنٹ آف الیکٹریسٹی۔
شرح تنخواہ: ۲۶۰-۶-۲۹۰-ای بی-۶-۳۲۶-۸-۳۶۶-ای بی-۳۹۰-۱۰-۴۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز
قابلیت: وائرمین کا لائسنس ہو۔
یا
الیکٹریشین ٹریڈ میں آئی-ٹی-آئی کا سرٹیفکیٹ ہو۔

نوٹ: موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے پیشتر ایک پریکٹیکل امتحان بھی دینا ہوگا۔

۶۔ ریکارڈز کلرک (دو جگہیں) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری۔
شرح تنخواہ: ۲۶۰-۶-۲۹۰-ای بی-۶-۳۲۶-۸-۳۶۶-ای بی-۳۹۰-۱۰-۴۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔
قابلیت:
۱۔ لازمی: بی-اے- بی ایس سی- بی کام
۲۔ پسندیدہ: ۴۰ الفاظ فی منٹ کی رفتار سے ٹائپ کرنے کی صلاحیت

نوٹ: [illegible] امیدواروں کو انٹرویو سے پہلے ایک ٹائپنگ کا ٹیسٹ بھی دینا ہوگا
جو امیدوار اس ٹائپنگ ٹیسٹ میں کامیاب قرار دے دیے جائیں گے ان کو ہی صرف
انٹرویو میں طلب کیا جائے گا۔

اعلیٰ قابلیت اور اعلیٰ تجربہ کے حامل افراد کو ابتدا سے
ہی زیادہ تنخواہ سے شروعات دی جا سکتی ہے۔
وہ امیدوار جن کو انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا ان کو ایک طرف کا
سنگل سیکنڈ کلاس ریل کا کرایہ بطور ٹی۔ اے دیا جائے گا۔

مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس،
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دفتر سے تین روپے نقد ادائیگی (مسلم
یونیورسٹی کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر جو
فنانس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو، بذات خود یا
"4 x 9" کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور مطلوبہ ٹکٹ چسپاں
ہوں، بھیج کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

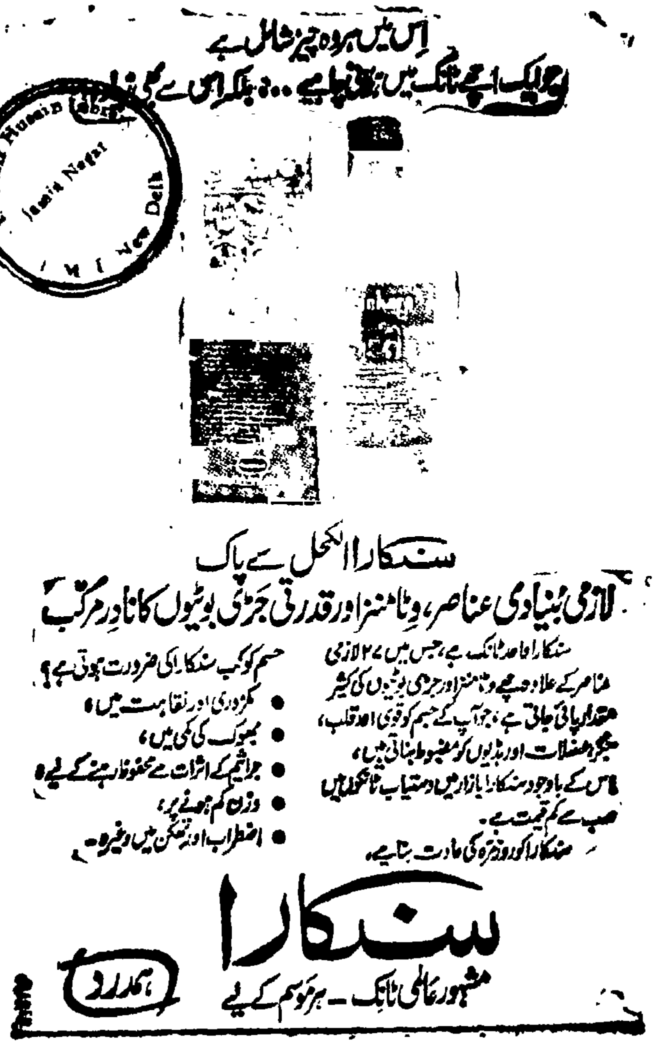
درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۲ر مارچ ۱۹۸۶ء
(آفس ٹائم تک) ہے۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں ناقابل
قبول ہوں گی۔

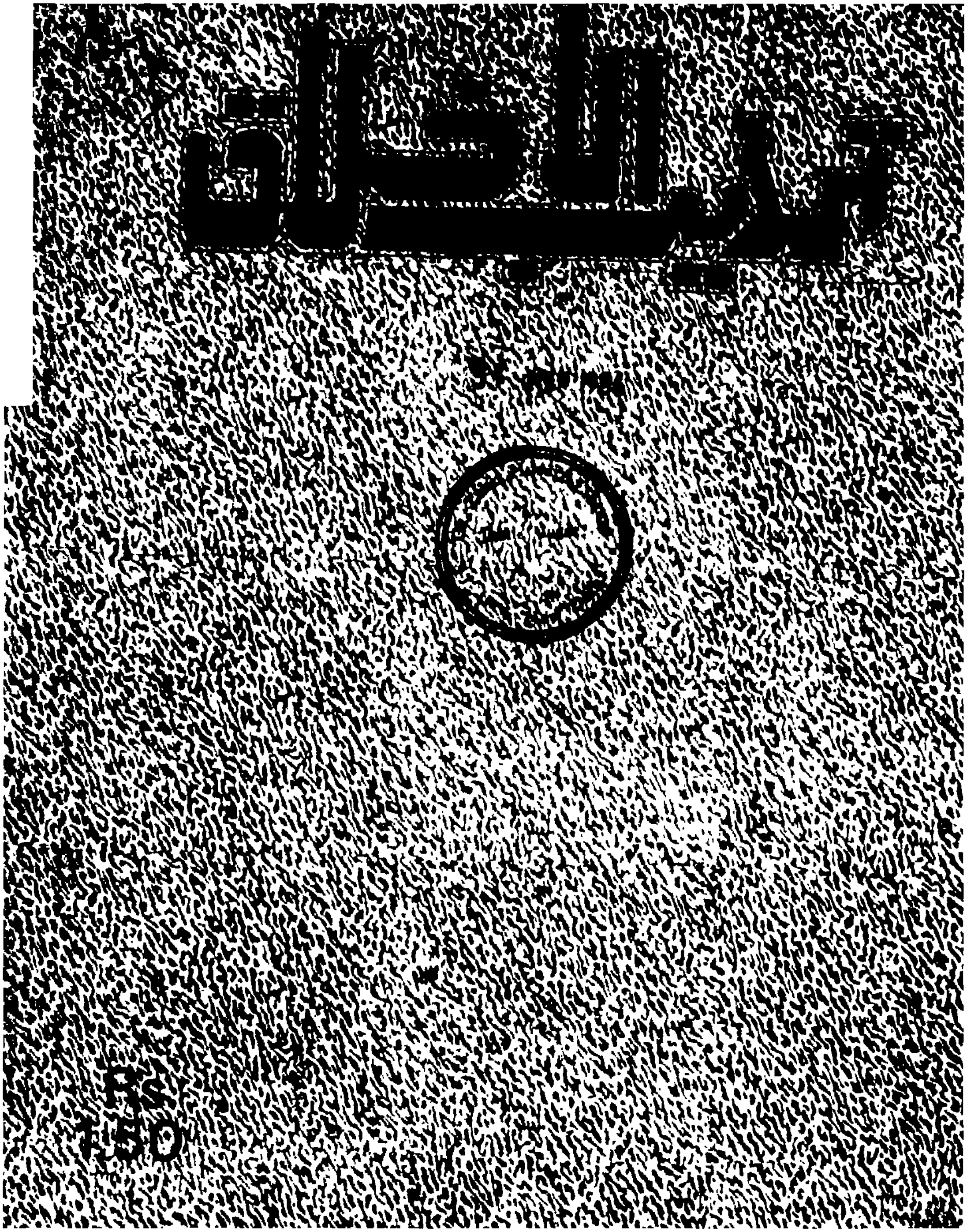
سید شاہد علی
رجسٹرار

E No. PA/ 829/ 25163

Tahzibul Akhlaq Fortnightly 1st to 15th March 86 Regd. No. L/ALG 247



Litho Colour Printers, Achal Tal, G. T. Road, Aligarh Phone : 4185


Rs
1.50

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

۱۵ر تا ۳۱ر مارچ ۸۶ء

جلد ۵ — شمارہ ۶

ترسیل زر کا پتہ : پروفیسر منظور عباس نقوی
فنانس تہذیب الاخلاق ٹرسٹ
شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

قیمت فی شمارہ : ایک روپیہ۔ زر سالانہ : تیس روپے
تاحیات : تین سو روپے

مشمولات

: اداریہ ۲

: کمپیوٹر ... ڈاکٹر ثمینہ سلیم ۳

: خالد بن ولید (بارہویں قسط) ... پروفیسر قاضی عبدالستار ۷

: جنگ آزادی کا ایک جانباز مجاہد ... پروفیسر منظور عباس نقوی ۱۲

: چیا چیکن کا تیسرا خواب ... جان ہیگو
ترجمہ۔ انیس عالم ۱۵

: نکولائی وسیل یوچ گوگول ... احمد جمال پاشا ۱۹

: کاغذ کی ڈھال ... صبیح محسن ۲۵

: مسلمانوں کا فن خطاطی اور جلد سازی ... اخلاق احمد ۲۸

: مسلم یونیورسٹی کے شب و روز ... راحت ابرار ۳۹

اداریہ

تہذیب الاخلاق کے پچھلے چند شماروں میں آپ نے نمایاں تبدیلی محسوس کی ہوگی۔ سائنس پر مضامین تو ایک عرصے سے پیش کیے جا رہے تھے لیکن اب ان کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ یہ قدم ہم نے تجربے کے طور پر اٹھایا ہے اور جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارے قارئین اس تبدیلی کو پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ ان مضامین کے انتخاب میں دو باتوں پر خاص توجہ دی گئی ہے — جو کچھ کہا گیا ہے وہ قابل فہم اور پیشکش کا انداز دلچسپ ہو۔

ترقی یافتہ ممالک کے عروج کا راز یہ ہے کہ وہاں سائنس کی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا۔ یعنی آپ کو کوئی بھی پیشہ اختیار کرنا ہو، سائنس کی تعلیم بہرحال حاصل کرنی ہوگی۔ بظاہر یہ بات عجیب سی لگتی ہے لیکن ہے یقیناً درست اور اس کے نتائج دنیا کے سامنے ہیں۔ اس ضرورت کا احساس اب ہمارے ملک میں بھی پیدا ہو چلا ہے اور بیشتر ریاستوں نے سائنس کی تعلیم کو لازمی قرار دیا ہے مگر صرف اس سے کام نہیں چلے گا۔ بچوں اور نوجوانوں کے دلوں میں اس کا شوق پیدا کرنا ہوگا۔ بہت سی کتابیں تیار کرانی ہوں گی اور رسالوں کے ذریعہ بہت سے مضامین ان تک پہنچانے ہوں گے۔

مسلمان بچوں کی تعلیم کا معاملہ اور بھی پیچیدہ ہے۔ ان کی ایک بہت بڑی تعداد تو وہ ہے جسے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ انھیں جہالت کی تاریکی سے نکالنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس کے بعد [illegible] نمبر پر ایک بڑی تعداد ان بچوں کی ہے جو مکاتب اور دینی مدارس میں تعلیم پا رہے ہیں۔ ان مدارس کے نصاب میں تبدیلی کرنا اور جدید علوم کو شامل نصاب کرنا آسان نہیں لیکن شاید یہ زیادہ دشوار نہ ہو کہ ہم ایسی مفید کتابیں اور رسالے ان تک پہنچا دیں جنھیں وہ فرصت کے اوقات میں اپنے شوق سے پڑھ لیا کریں اور جن کے مطالعہ سے اس محرومی کی کسی حد تک تلافی ہو جائے۔

ملک میں دینی مدارس کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ تہذیب الاخلاق کا ان سب تک پہنچنا آسان نہیں لیکن ہر ماہ تقریباً سو مدارس کو تہذیب الاخلاق ہدیۃً بھیجا جائے گا۔ توقع ہے کہ جن مدارس کی مالی حالت بہتر ہے وہ خریدار بننے کی کوشش کریں گے۔

[illegible]

ڈاکٹر [illegible] سلیم
(پاکستان)

کمپیوٹر

تعارف: انسان نے جب سے اس روئے زمین پر قدم رکھا ہے عقل و شعور کی بے پایاں صلاحیت کے باعث تہذیبی ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ یہیں سے اس کی تمدنی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ انہی راہوں علم و فن کے سوتے پھوٹتے اور ذہنِ انسانی کی موشگافیوں سے نئی نئی تخلیقات منصۂ شہود پر ظہور پذیر ہونے لگیں۔ خصوصاً سائنس اور ٹیکنالوجی میں روز افزوں ترقی انسانی ذہن کی بہترین کرشمہ سازیوں میں شمار ہوتی ہے۔ یوں تو حیرت انگیز ایجادات کا سلسلہ بہت قدیم ہے بلکہ یہ کہنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ کم و بیش ہر نئی ایجاد اوّل اوّل حیرت انگیز طور پر جلوہ گر ہوتی ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عمومی حیثیت کی حامل ہو جاتی ہے جبکہ دورِ حاضر کی یہ اہم ترین سائنسی ایجاد اس قدر انقلاب آفرینی کی حامل ہے کہ کئی عشروں پر محیط عرصہ گزار لینے اور زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں جگہ بنا لینے کے باوجود ابھی تک ارتقا کی حیرت انگیز صلاحیت کی حامل ہے۔ آج بھی کمپیوٹر پر تحقیق کرنے والے محققین اس میں چونکا دینے والی تبدیلیاں کر دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ محض چند سال پرانا کمپیوٹر مارکیٹ میں جدید ترین کمپیوٹر کے آجانے کے باعث اپنی قدر و قیمت گھٹا لیتا ہے۔ کمپیوٹر کی ہر نئی شکل پہلے سے زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں مختلف النوع کام کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

کمپیوٹر اور انسانی دماغ: کمپیوٹر اپنے موجد انسان کی [illegible] انسانی دماغ سے مشابہ ہے [illegible] صرف اتنا ہے کہ انسانی دماغ اپنے طور پر جس قسم کا کام کرنا چاہے کر گزرتا ہے جبکہ کمپیوٹر اپنا لائحہ عمل مرتب کرنے کے لیے انسانی ہدایات کا محتاج ہے۔ دوسری طرف کمپیوٹر نہ صرف انسان کے جیسے کام کر سکتا ہے بلکہ اس کی کارکردگی کیفیت و کمیت دونوں اعتبار سے انسان سے بدرجہا بہتر ہے۔ ایک طرف اس کے ہاتھوں غلطی کا امکان بہت کم ہے بلکہ مشین کے کسی سرکٹ وغیرہ کی خرابی یا غلط معلومات کے امکان کو اگر خارج کر دیا جائے تو غلطی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ دوسری طرف اس کی تیز رفتاری کا یہ عالم ہے کہ ایک لحاظ سے اس ایجاد نے انسان کی عمر کو بڑھا دیا ہے کیونکہ بہت سے لوگوں کی مدد سے مہینوں میں تکمیل پانے والا کام کمپیوٹر کی مدد سے صرف چند لوگوں کے ہاتھوں چند گھنٹوں میں سرانجام دیا جا سکتا ہے اور اس طرح سے بچ جانے والے وقت کو کسی اور مصرف میں لا کر عمر کی محدود ساعتوں میں گوناگوں کاموں کو سرانجام دینے کے مواقع میسر آ سکتے ہیں۔

کمپیوٹر کی ساخت: کمپیوٹر کے لفظی معنی ہیں حساب کرنے والا یا شمار کرنے والا آلہ۔ اس کا عربی ترجمہ "حاسب" ہے اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ابتداً اس کو سائنس دانوں نے عددی حساب کتاب میں سہولت کی غرض سے تخلیق کیا لیکن اب یہ زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں اہم خدمات انجام دے رہا ہے۔ مختلف شعبوں میں استعمال کے لیے مختلف النوع کمپیوٹر ایجاد ہو چکے ہیں جو شعبہ جات کی ضروریات کے مطابق مختلف النوع کام کر سکتے ہیں۔ تاہم کمپیوٹر بنیادی طور پر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک حاسب DIGITAL COMPUTER یا عددی حاسب اور قیاسی یا ANALOGUE COMPUTER

پہلی قسم کے کمپیوٹر معلومات کو مختلف شکلوں میں پیش کرتے ہیں اور یہ دی سائنسی کاموں کے لیے زیادہ مناسب ہوتے ہیں جبکہ دوسری قسم کے کمپیوٹر معلومات کے نتائج کو تسلسل کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور زندگی کے بہت سے شعبوں میں زیادہ معتبر خدمات انجام دے سکتے ہیں۔

کمپیوٹر کے اندر کی دنیا میں جھانک کر دیکھا جائے تو اس کے اندر برقی دوروں کا ایک جال سا بچھا دکھائی دیتا ہے۔ برقیات (الیکٹرانکس) کی ترقی نے انسان کو بہت سے ایسے چھوٹے چھوٹے برقی دور (ELECTRONIC CIRCUITS) فراہم کر دیے ہیں جو جمع تفریق کے اور ضرب و تقسیم کے بنیادی حسابی عوامل کو برقی لہروں میں تبدیلی کی صورت میں سامنے لاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی برقی اکائیوں پر مشتمل ایمپلیفائر (AMPLIFIER) سرکٹ اور سوئچنگ سرکٹ کمپیوٹر کے اندر اکائیوں کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان چھوٹے برقی دوروں کی مختلف ترتیب سے کمپیوٹر کے مختلف حصوں میں مختلف قسم کے کام انجام دینے کے لیے چھوٹے چھوٹے برقی دور تشکیل دیے جاتے ہیں۔ ان برقی دوروں تک پیغام رسانی کے لیے برقی اشارے یا (SIGNALS) استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ برقی اشارے حسابی یا دیگر عوامل کے تحت اپنی حالت کو تبدیلیوں سے ہمکنار کرتے ہوئے کمپیوٹر کے اندر مطلوبہ عوامل کے نتائج کو ریکارڈ کر کے آخر میں پھر انسان کی سمجھ میں آجانے والی زبان کی شکل میں پیش کر دیتے ہیں۔ ان برقی اشاروں میں ہر قسم کے پیچیدہ اور حسابی عوامل کو کر گزرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ کمپیوٹر کو پنچ کارڈز (PUNCH CARDS)، مقناطیسی فیتوں (MAGNETIC TAPES) یا براہ راست ٹائپ رائٹر کی طرز پر بنی ہوئی مشین کی مدد سے ٹی وی جیسی سکرین (CONSOLE) پر لکھ کر یا کسی اور طریقے سے پہنچائے جانے والے پیغام کے تحت اس کے اندر جس قسم کے عوامل ہوتے ہیں ان کے نتائج کو وہ ٹائپ رائٹر کی طرز پر بنے ہوئے لائن پرنٹر کے ذریعے کاغذ پر پرنٹ کر دیتا ہے یا پھر کنسول پر دکھا دیتا ہے یا پھر مقناطیسی فیتوں پر محفوظ کر دیتا ہے۔ اس طرح کمپیوٹر بھی مورس کوڈ کی طرح انسانی زبان کو برقی اشاروں میں منتقل کرنے اور ان برقی اشاروں کو بعد ازاں انسانی زبان میں دوبارہ منتقل کر سکتا ہے۔

کمپیوٹر کی اس پیچیدہ الیکٹرانی ساخت سے قطع نظر اس کے طریق کار کو سمجھنے کے لیے بنیادی طور پر اس کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جن میں آلات دخل (INPUT DEVICES) مرکزی حافظہ (MEMORY) حساب و منطق کا یونٹ (A.L.U) (ARITHEMATIC & LOGIC UNIT) آلات خروج (OUTPUT DEVICES) اور نگراں حصہ (CONTROL UNIT) شامل ہیں۔ مرکزی حافظہ، نگراں یونٹ اور حساب و منطق کے یونٹ کو مجموعی طور پر مرکزی عامل حصہ (CENTRAL PROCESSING UNIT) بھی کہا جاتا ہے اور اس طرح کمپیوٹر صرف تین حصوں پر مشتمل ہو جاتا ہے۔

آلات دخل کمپیوٹر کو ضروری معلومات فراہم کرتے ہیں۔ یہ معلومات آلات دخل سے تار برقی کے ذریعے کمپیوٹر کے حافظے میں ایک پیغام کی شکل میں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ یہ پیغام کمپیوٹر کے حساب و منطق کے یونٹ کو کام کی نوعیت سے آگاہ کر کے ضروری معلومات فراہم کرتا ہے۔ وصول کردہ معلومات کے تحت کمپیوٹر کا یہ اہم حصہ مطلوبہ عوامل کو کر کے اس سے حاصل شدہ نتائج دوبارہ تار برقی کے ذریعے حافظے میں محفوظ کر دیتا ہے ان نتائج کو آلات دخل کے ذریعے پیغام بھیج کر مطلوبہ آلات خروج (لائن پرنٹر کنسول۔ پلاٹر وغیرہ) کے ذریعے وصول کر لیا جاتا ہے۔ کمپیوٹر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ پروگرام یا لائحہ عمل کو مرتب کرتے وقت سرزد ہو جانے والی غلطیوں کی نشاندہی بھی کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں کمپیوٹر کو دی گئی ہدایات یا لائحہ عمل اور حساب و منطق کے یونٹ سے حاصل کردہ نتائج بیک وقت کمپیوٹر کے حافظے میں محفوظ ہو سکتے ہیں اس لیے انہیں حسب ضرورت ترتیب کے ساتھ حاصل کیا جا سکتا ہے کیونکہ پیچیدہ حسابی عوامل کے لیے حافظے کی زیادہ گنجائش درکار ہوتی ہے اس لیے کمپیوٹر کی کارکردگی میں حافظے کی گنجائش سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ حافظے کی اس گنجائش پر کمپیوٹر کی درجہ بندی کا تعین ہو سکتا ہے۔

کمپیوٹر کا نگراں حصہ پروگرام (لائحہ عمل) [illegible] کی تشریح کرتا ہے اور [illegible]

کا دستور العمل کرتا ہے بالکل اسی طرح جیسے ہمارا اعصابی نظام ہمارے جسم میں رونما ہونے والے عوامل کی نگرانی کرتا ہے۔ کنٹرول یونٹ کمپیوٹر کے ہر حصے سے بوقت ضرورت حسب ضرورت کام لیتا ہے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ یونٹ کمپیوٹر کے اندر انتظامیہ کے فرائض انجام دیتا ہے۔ بڑے بڑے کمپیوٹرز میں ایک وقت میں کئی کئی چینل استعمال کرنے کی گنجائش ہوتی ہے ایک ہی کمپیوٹر کے مختلف ٹرمینل بیک وقت مختلف زبانوں کے مختلف پروگرام ایک کمپیوٹر پر چلا سکتے ہیں۔

ہارڈ ویئر اور سافٹ ویئر: ۔ کمپیوٹر کی ساخت کا مطالعہ تو محدود پیمانے پر کیا جاتا ہے لیکن کمپیوٹر کے استعمال کا طریق کار جاننا آج ترقی یافتہ ممالک میں بیشتر لوگوں کی زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔ اس طرح کمپیوٹر کے مطالعہ کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں ایک ساخت کے ذریعے ہونے والا عمل (سافٹ ویئر) کمپیوٹر کی ساخت اور عمل میں وہی تعلق ہے جو دماغ میں اور ذہن یا ٹیپ اور اس پر محفوظ کیے گئے الفاظ اور موسیقی میں ہوتا ہے۔ ٹی وی کے اندرونی سرکٹ اور ٹی وی اسکرین کی حیثیت بھی کمپیوٹر کے ہارڈ ویئر جیسی ہے۔ جیسے ٹی وی اپنے تمام اجزا کے ساتھ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اسی طرح کمپیوٹر کا ہارڈ ویئر تو ایک دفعہ کمپیوٹر کو تشکیل دینے کے بعد موجود رہتا ہے لیکن ٹی وی کی اسکرین پر پروگرام دیکھنے یا کمپیوٹر کے مختلف اجزا کو کام پر لگانے کے لیے اسے برقی توانائی فراہم کرنا پڑتی ہے۔ اس لیے (سافٹ ویئر) یا کمپیوٹر کا عمل اس توانائی کی موجودگی میں شروع ہوتا ہے اور توانائی کا سلسلہ توڑتے ہی یہ عمل رک جاتا ہے۔ لہذا توانائی کے ذریعے کمپیوٹر کے عمل کا مطالعہ بھی دو طرح سے کیا جاتا ہے ایک کمپیوٹر میں موجود مختلف حصوں کے کام کی نوعیت اور دوسرا کمپیوٹر کو عمل یعنی پروگرام فراہم کرنے کا طریق کار۔ اس کے لیے مختلف طریقے وضع کیے گئے ہیں جن کو کمپیوٹر کی زبانیں قرار دیا جاتا ہے جو مخصوص علامات اور مخصوص الفاظ سے تشکیل پاتی ہیں۔

اس طرح کمپیوٹر کے پارٹس کے ماہرین ہارڈ ویئر انجینئرز ہوتے ہیں جو کمپیوٹر بناتے ہیں۔ جبکہ سافٹ ویئر کے ماہرین وہ لوگ ہوتے ہیں جو کمپیوٹر کے استعمال کے طریقوں کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

کمپیوٹر کی زبانیں: ۔ کمپیوٹر جیسی پیچیدہ مشین کا استعمال کو آسان تر بنانے کے لیے اس کی زبانوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا ہے۔ خاص قسم کے مسائل کو کمپیوٹر کی مدد سے حل کرنے کے لیے ایک خاص زبان زیادہ آسان ثابت ہوتی ہے۔ کسی خاص مسئلے کو حل کرنے کے لیے متعلقہ مخصوص زبان میں لائحہ عمل مرتب کر کے کمپیوٹر کو مہیا کر دیا جاتا ہے۔ کمپیوٹر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے اندر اس قسم کے ترجمان موجود ہوتے ہیں جو ایک خاص زبان میں انسان کا پیغام لے کر اسے کمپیوٹر کی زبان میں منتقل کر دیتے ہیں کمپیوٹر کے اس حصے کو مؤلف کہا جاتا ہے۔ کمپیوٹر کو استعمال کرتے وقت سب سے پہلے تو یہ پیغام دیا جاتا ہے کہ پروگرام چلانے والا کس زبان میں پروگرام دینا چاہتا ہے۔ اس پیغام کے ملتے ہی کمپیوٹر کا نگران حصہ متعلقہ زبان کے مؤلف کو معلومات وصول کرنے اور انہیں کمپیوٹر کی اپنی زبان میں جو خاص سگنلز یا اشاروں پر مشتمل ہوتی ہے منتقل کرنے کے لیے تیار رہنے کا پیغام بھیج دیتا ہے۔ مؤلف اسی طرح انسان کی طرف سے دیے گئے پیغام کو کمپیوٹر کی زبان میں منتقل کرتا ہے جس طرح مورس کوڈ میں کیا جاتا ہے۔ کمپیوٹر کو چلانے کے لیے بہت سی زبانیں استعمال کی جاتی ہیں۔ ان زبانوں کے نام خاص مقاصد کے مختلف ہیں جن زبانوں سے حل کیے جانے والے مسائل کی نوعیت کے مطابق ہیں۔ مثلاً بنیادی زبان (BASIC) چھوٹے اور سادہ حسابی فارمولوں کے حل کے لیے استعمال کی جاتی ہے اس میں ایک سے پروگرام لکھ کر کمپیوٹر کو دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی جبکہ کوبول (COBOL) کو عموماً کاروباری مسائل کے حل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور فورٹران ریاضی (FORTRAN) کے فارمولوں کے حل کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اس سے [illegible] سائنسی فارمولوں کو حل کیا جاتا ہے [illegible] اور عام استعمال کی زبانوں کے نام یہ ہیں [illegible] وغیرہ PASCAL MACRO, ENDRAN [illegible] کو بہت طریقوں یعنی زبانوں کی مدد سے کام میں لایا جا سکتا ہے۔

آج کے مائیکرو کمپیوٹر: ابتدا میں کمپیوٹر کی ایجاد [illegible] کتاب میں [illegible]

چہ از اں انسانی ذہن کی تخلیقی کاوشوں کے نتیجے میں اس کا ارتقا کار تر ہوتا گیا۔ بالخصوص مائیکرو الیکٹرانکس میں سیلیکان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں (SILICON CHIP) کا وجود کمپیوٹر کی دنیا کے انقلابی حیثیت حاصل کر گیا۔ لمبی لمبی تاروں اور بڑی بڑی الیکٹرانی وں کا الجھاؤ جس کی موجودگی میں کمپیوٹر کو قابل استعمال حالت میں برقرار رکھنا بھی ایک مسئلہ تھا اس کے ختم ہو جانے سے کمپیوٹر کی صلاحیتوں بڑھانے کے امکانات میں از حد اضافہ ہو گیا۔ اب سیلیکان چپ کے ذریعے کمپیوٹر کے دیوہیکل ادوار کو چھوٹے چھوٹے مائیکرو الیکٹرانی ادوار میں تبدیل کر دیا گیا۔ کیونکہ چپ کٹنا ٹوٹنے کے ہاتھ آ جانے سے ادوار کا کئی گنا کم ہو گیا تھا اس لیے ان ادوار کو مزید پیچیدہ شکل دے کر بھی سنبھالنا مشکل نہ رہا جس سے بڑے بڑے کمپیوٹر کی تشکیل کے امکانات روشن ہو گئے اور کمپیوٹر کا حجم بھی کم تر ہو گیا۔ اب سیلیکان چپ پر بہت چھوٹی چھوٹی الیکٹرانی اکائیوں کو باریک خوردبینی رابطے کے ساتھ منسلک کر کے مائیکرو پروسیسر (MICRO PROCESSOR) کو تشکیل دیا جاتا ہے جو کمپیوٹر کا اہم ترین حصہ ہوتے ہوئے کمپیوٹر میں وقوع پذیر ہونے والے عوامل کو سر انجام دیتا ہے۔

آج کے اس دور میں کمپیوٹر عددی حساب کتاب سے آگے نکل کر زندگی کے مختلف شعبوں میں کامیابی سے داخل ہو گیا ہے۔ اس کے استعمال کے شعبوں میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا ہے۔ اس کا دائرہ کار وسیع تر ہوتے ہوتے سائنس دانوں اور انجینیروں کے ساتھ ساتھ کاروباری اداروں، بینکوں، گھروں، ڈاک خانوں اور سرکاری و نجی دفاتر تک پہنچ گیا ہے۔ اس کے بڑھتے ہوئے استعمال سے زندگی کی رفتار میں حیرت انگیز حد تک تیزی آ گئی ہے ترقی یافتہ ممالک میں مادی وسائل کی فراوانی کے باعث وقت کی بچت کے نقطہ نظر سے اس کا استعمال بہت حد تک ناگزیر ہو چکا ہے۔ لائبریریاں، تعلیمی ادارے، دفاتر، شاپنگ سنٹر، ٹرانسپورٹ غرض کہ ہر جگہ کمپیوٹر کو رسائی حاصل ہو گئی ہے حتیٰ کہ بعض جگہوں پر تو فنکاروں نے اپنے تخلیقی اظہار کے لیے بھی اسی کو ذریعہ بنانے کی کوشش کی ہے۔

(**نتھا کتھا** ؛ ترقی پذیر ممالک میں محدود مادی وسائل کے

کاوش کمپیوٹر کا استعمال مغربی دنیا کے مقابلے میں بہت کم ہے تاہم گزشتہ چند برسوں میں کمپیوٹر تعلیم یافتہ طبقے میں بہت تیزی سے متعارف ہونے لگا ہے تاہم ابھی بھی اس کے ماہرین کی قلت اور کمپیوٹر پر تحقیق کے رجحان اور وسائل دونوں کی کمی کے باعث کمپیوٹر کو کلیدی حیثیت دینے اور اس سے بھرپور طرح استفادہ کرنے میں خاصی دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو آج ہم تحقیق کی رفتار کو اس وقت سرعت دے سکتے ہیں جب ہمارے محققین کمپیوٹر سے استفادہ کرنا جانتے ہوں مغربی دنیا میں کمپیوٹر نے ترقی کی رفتار کو جتنا تیز کر دیا ہے اس کے ساتھ پہنچنا تو کجا محض ترقی کے اس فاصلے کو کم کرنے کے لیے کمپیوٹر ناگزیر ہو گیا ہے۔ آج سائنس کی ہر شاخ تحقیق و ترقی کے لیے ریاضی کی مرہون منت ہے اور ریاضی کے مسائل کمپیوٹر کی مدد سے انسانی ذہن کے مقابلے میں سینکڑوں گنا تیزی سے حل کیے جا سکتے ہیں۔

سائنسی تحقیق میں اہم کردار ادا کرنے کے علاوہ سرکاری اور نجی اداروں اور کاروباری مراکز میں کمپیوٹر کام کی رفتار کو تیز تر کرنے میں بہت معاون ثابت ہوتا ہے جیسے بڑے بڑے پراجیکٹس کی پلاننگ آمدنی اور اخراجات میں توازن۔ پیداوار کا تخمینہ۔ ملازمین کی تنخواہوں کا حساب اور اسی قسم کے بہت سے دیگر مقاصد کے لیے کمپیوٹر کی مدد سے کام کی رفتار کو تیز تر کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں کمپیوٹر میں استعمال ہونے والے مقناطیسی فیتوں کی مدد سے دفتروں میں موجود ہزاروں فائلوں کے جنگل سے چھٹکارا پانے کے علاوہ فائلوں کی حسب منشا ترتیب اور حسب ضرورت فائل کی تلاش وغیرہ کے سلسلے میں ضائع ہونے والے وقت کو بچانے کے علاوہ فائلوں کے ردوبدل کا خیال رکھنے والے بہت سے ملازمین کو دوسرے اہم کاموں پر لگایا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں اس بات کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندیشہ قطعی درست نہیں کہ کمپیوٹر کے عام ہو جانے سے افرادی قوت کا ...

پروفیسر قاضی عبدالستار

خالد بن ولید

(بارھویں قسط)

"یا اباسلیمان — کیا بیٹھنے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ ہم سب کی خواہش ہے کہ آیندہ کے اقدامات پر تمہارا مشورہ سن لیتے"!

ابھی سیف اللہ خاموش ہی تھے کہ عیاض بن غنم یوں اٹھے ——

"یا امین الامت! سیف اللہ نے یرموک میں شام فتح کر لیا۔ عراق میں جنگ حفیر کے بعد جو میدان آراستہ ہوئے وہ میدان جنگ نہیں تھے جہاں بقول آپ کے قوموں کی تقدیر لکھی جاتی ہے وہ غرورِ شہنشاہی اور وجودِ درفش کاویانی کا اظہار تھے۔ اور اُن کے انجام سے دنیا واقف ہے اب شام میں جو لڑائیاں ہوں گی وہ ہرقل کے غرور کا اظہار ہوں گی۔ جس طرح اس وقت بھی واقوصہ کی گھاٹیوں میں شاہی دستے اپنے وجود کا اظہار کر رہے ہیں اور ہم فتح نامہ لکھ چکے ہیں"

عیاض بن غنم نے سانس لی تو عمرو بن العاص گویا ہوئے ——

"یا امیر! عیاض نے جو کچھ کہا صحیح کہا۔ ہرقل ہار چکا۔ شام ہار چکا۔ اب جو کچھ ہوتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بادشاہ مرتا ہے تو مرنے کے بعد کے معاملات درپیش ہو جاتے ہیں۔ میں اب شام کو کوئی مسئلہ نہیں سمجھتا۔ میں تو آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ آپ نے امین الامت کے خطاب کی تصدیق کر دی۔ دنیا کی تاریخ میں شاید ہی کسی سپہ سالار نے اتنی بڑی تاریخ ساز فتح کا سہرا جو قانوناً اس کے سر کا حق ہو گیا تھا اس شخص کی خدمت میں گذار دیا ہو جو اس کا واقعی مستحق تھا۔ آپ نے جس بے نفسی اور دوراندیشی کے ساتھ اس مسئلے کو جو ایسے [illegible] [illegible] کہ مہرِ شاہی کی زمین ہی ہلتی، اتنی خوبصورتی سے حل کیا، یہ آپ ہی کا حق ہے اور آپ ہی کو زیب دیتا ہے۔ یہ عظمت سایۂ نبوت کے تربیت کا [illegible] ہے اور کسی کسی کو ہی میسر آتی ہے۔"

امین الامت نے سر اٹھایا اور جواب دیا ——

"العاص کے بیٹے کی باتیں نفس کو موٹا کرنے والی ہیں۔ یہی [illegible] کیا وہ نہ کرتا تو آنے والا مورخ کیا کر دیتا اور میں روز قیامت آقائے دوجہاںؐ کے سامنے کس منہ سے پیش ہوتا"

"یا امیر عساکر اسلام"!

سب سے نوجوان اور اہم سپہ سالار یزید بن ابی سفیان نے پہلو بدلا اور سینے میں دہکتی آگ کو دبا کر بولے ——

"اُن کو جو کرنا تھا کر چکے۔ وہ ہو چکا۔ اب شام کے محاذ کی حد تک اجتماع امت کی لگام آپ کے مقدس اور مضبوط ہاتھوں میں ہے۔ اہل مکہ کی دعا ہے کہ آپ کے ہاتھوں کی تقدیس اور طاقت برقرار رہے"

عیاض بن غنم، شرحبیل بن حسنہ اور ابو قتادہ انصاری نے چونک کر ساتھ لقمہ دیا۔

"یہ کیا کہتے ہو یزید بن ابی سفیان 'اہل مکہ' ہی کیوں تمام عرب کی دعائیں شریک ہیں"

"اہل مکہ" کے دو لفظوں نے امین الامت کے چہرے کی شگفتگی [illegible] کر دیں۔ سیف اللہ کے اٹھتے ہی چند اصحاب رسول کے سب اٹھ پڑے۔

سیف اللہ کے خیمے پر تمام گھوڑے خالی ہو گئے۔ خادموں نے بکتر کھولا، خود سنبھالا اور موزے اتارنے لگے۔ [illegible] کے گرد جمع ہوئے لیکن گردن کی ایک جنبش نے واپس کر دیا۔ اس تکیے سے لگ کر بیٹھ گئے جس کے سہارے بیٹھ کر [illegible] کے مناصب عطا کیے تھے۔ عہدے تقسیم کیے تھے۔ عمرو بن العاص [illegible]

مدینہ کی آبرو! ابی سفیان کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں جیسے
قائم شرحبیل بن حسنہ قباث بن اشیم قعقاع بن عمرو اور دوسرے
پہلوؤں پہ ذاتی وفاداری کی وہ تحریر روشن تھی جو میدان جنگ میں
جنگ سلطانی اڑاتی ہے اور میدان سیاست میں اپنے ہاتھ سے اپنی گردن
میں سولی کا پھندا پہن لیتی ہے۔ سب کی آنکھیں سیف اللہ کے
ابروؤں پر جمی تھیں۔ سب کے کان سیف اللہ کے ہونٹوں پر لگے تھے
لیکن سیف اللہ سکوت اور تسلیم کا مجسمہ بنے بیٹھے تھے۔ شاعر سپاہی اور
جرنیل قعقاع بن عمرو جو اپنے غیظ و غضب کے لیے مشہور تھا کھڑا ہو گیا۔
خالد کی تلوار دونوں ہاتھ سے تھام لی۔

"یا سیف اللہ۔ آپ کے کسی گھوڑے کے ایال کا ایک بال پورے
کے سپہ سالاروں کی گردنوں سے زیادہ قیمتی ہے اس کی حفاظت
کے لیے ہم اپنے بیٹوں کے سر دے ڈالیں گے۔"

تلوار ٹھکانے کے پہلو میں رکھ کر بجلی کی طرح باہر نکل گیا۔ پھر [illegible]
[illegible] کھڑے ہوتے —

"قعقاع کی فہرست میں غلام کا بھی نام لکھ لیجیے۔"

شرحبیل بن حسنہ اور قباث بن اشیم نے ایک ساتھ اٹھ کر کہا —

"قعقاع نے ہم سب کے جذبات کی ترجمانی کی ہے یا سیف اللہ"

ہندہ کے ساتھ ابی سفیان آ گئے۔ ہندہ کے بال منزلوں کے
غبار سے میلے ہو چکے تھے۔ لیکن چہرے پر قریش کے سرداری کی روایتی
شان اب تک موجود تھی اپنے بیٹوں کے ساتھ بیٹھتے ہی گرجنے لگی —

"ابن حنتمہ کو خلیفہ کا تحفہ مبارک ہو — عکرمہ اور اس کے
جوان بیٹے کے سر کا صدقہ مبارک ہو!"

آواز جیسے دانتوں سے پس کر نکل رہی ہو۔

"یمن سے حجاز تک اور عراق سے شام تک کون سی فتح ہے
جس پر ہمارے شہیدوں کا نام نہیں لکھا ہے — آج کی لڑائی میں
خالد کو چھوڑو — خالد تو خالد ہے۔ کون سا محاذ تھا جس پر ہمارے
جگر کے ٹکڑے اپنا خون نہیں بہا رہے تھے۔ کون سا معرکہ تھا جس
میں ابو عبیدہ نے اپنی صف سپہ سالاری کا اظہار کیا — لیکن وہ مدینے
کے منظور نظر ہیں۔ ابن خطاب کے دوست ہیں۔ وہ حاکم ہیں۔ ہم محکوم
ہیں۔ فاتحان عرب و عراق و شام مظلوم ہیں۔"

سب گم ہو رہے تھے۔ سب خاموش بیٹھے تھے۔

"قبا کی آستین پھاڑ کر ابا سفیان۔ ہندہ دیکھتی رہ گئی۔ نہیں تو گریبان
پھاڑ کر نیچے سے نکل جاؤں گی"

خالد نے ہاتھ بڑھا دیا۔

وہ قہر جھلکتی جاتی اور آگ اگلتی جاتی

"اگر میری کوکھ ہری ہوتی تو اس رانڈ کے ہر زخم پر ایک بیٹا نثار کر دیتی"

یزید اور معاویہ دونوں اپنی ماں کے قہر کی آگ میں پھنک رہے تھے

سب جا چکے تھے۔ عبدالرحمن تک رخصت ہو چکا تھا۔ اور سیف اللہ
مصلے پر بیٹھے تھے۔ اور ہاتھوں میں تلوار کے بجائے تسبیح چل رہی تھی
کہ آنکھوں کے سامنے سے ایک شبیہ مقدس کا سایہ گزر گیا۔ گویا کہ پورے
محل پہ کی روشنائی کی پرچھائیں سی لرز گئی۔ اور [illegible] بیقراری کی [illegible]
موذن کی آواز شعلوں کی ایک لمبی زنجیر کی طرح لپکنے لگی۔ غلام
وضو کا پانی لے کر حاضر ہوا۔ ان کو مصلے پر دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ واپس چلا گیا۔

مسجد کی خدمت انجام دینے والے میدان کے لیے نکل رہے تھے۔
غلام نے تلوار [illegible] کے کندھے پر ڈال لی۔ جنہیں گھڑی ہو رہی تھیں
جیسے بجے سے گرد آلود قیدیوں کے سوالوں کی گردنیں شانوں سے
نکل آئی تھیں۔ انھوں نے تا دیکھا آنکھیں مطمئن ہو گئیں۔ مصلے پر قدم
رکھا تھا کہ امین الامت نے [illegible] طلب کر لیا۔

"یا سیف اللہ ہم آپ کی امامت کا انتظار کر رہے ہیں"

وہ جس صف کے سامنے سے گزرتے پچھلی محبت اور اندھی عقیدت کے
وہ پھول جن سے قیصر و کسریٰ کے گلستان خالی تھے ان کے قدموں میں
بچھا دیتی۔ امین الامت کا جواب تھا —

"یا حضرت جہاد نے زندگی کو اتنی مہلت نہیں دی کہ قرآن پاک حفظ
کر سکتا۔ اس لیے امامت کے منصب کے ساتھ جو انصاف ہونا چاہیے اس
سے معذور رہتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ آج [illegible] کی امامت میں [illegible]
آج مدتوں کے بعد جنگ کی اذان نصیب ہوگی تو نماز کا لطف حاصل
کر سکوں گا۔"

"سیف اللہ نے [illegible] کہا"

یزید بن ابی سفیان نے کہا۔
"آپ کی امامت میں نماز اور سیف اللہ کی امارت میں جہاد کا مزا ہی کچھ اور ہوتا ہے"
"اے ابن ابی سفیان شیرِ اسلام جب جہاد کی امارت کرتے ہیں تو تاریخ بناتے ہیں اور جب ہم ان کی امامت میں نماز پڑھتے ہیں تو تاریخ ہوتے ہیں"
"سیف اللہ تاریخ بنا چکے یا امیر ــــ خلیفۂ روم کی ہزار کوششیں بھی اسے مٹا نہیں سکتیں"
یزید بن ابی سفیان کے اس فقرے پر مسجد میں سناٹا ہو گیا۔ سیف اللہ نے امین الامت کے دونوں بازو تھام لیے اور امامت پر کھڑا کر دیا۔ اور بلا آل بغیر کسی ہدایت کے تکبیر کہنے لگے۔

اور یرموک سے ایک منزل کے فاصلے پر شہنشاہ بہ نفسِ نفیس اپنے خدم و حشم کے ساتھ چھاؤنی چھائے پڑا تھا۔ آدھی رات تک موصول ہونے والی آخری خبروں کے مطابق ہولناک لڑائی جاری تھی۔ ہزارہا سال کی تاریخ میں پہلی بار کسی ایک شہنشاہ نے کسی ایک مقام پر ڈھائی لاکھ کا مرتب اور آزمودہ کار لشکر روانہ کیا تھا۔ پوری تاریخِ عالم میں پہلی بار کسی عظیم الشان سلطنت کے کسی عظیم المرتبت شہنشاہ کی ایسی تربیت یافتہ اور کثیر افواج قاہرہ کے سامنے چالیس ہزار ایسے انسانوں نے تلوار اٹھائی تھی جن کی پشت پر عسکری فتوحات کی کوئی عالمی تاریخ نہیں تھی جن کا بیشتر لشکر پیدلوں اور اونٹوں پر مشتمل تھا۔ جن کے گھوڑے چھوٹے اور مختصر ہتھیار معمولی اور کمتر اور ساز و سامان بدتر تھا۔ ان سے ہولناک لڑائی کی خبر نے مزاجِ شاہی مکدر کر دیا تھا۔ سرخ دیبائے رومی کی بلند و بالا اور وسیع و عریض بارگاہ شاہی کی پشت پر حرمِ شاہی کے خیام روشن تھے اور شمشیر بردار دستہ سامنے دور تک سرخ قالینوں کے صحن پر سرخ مخمل کی قناتیں بندی کے اس طرف جنرل میناس اور جنرل ورداں پچاس ہزار زرہ پوش سواروں کو رکاب میں لیے لوہے کا لباس پہنے اطلاع کا انتظار کر رہے تھے۔ حاجبِ بارگاہ نے خبر دی تھی کہ میدانِ جنگ کی خبر نامہ پڑھتے ہی مزاجِ شاہی برہم ہو چکا ہے اور شہنشاہ قبا پوش خاص سے نکل کر بارگاہ میں داخل ہو گیا ہے اور مقربانِ

دولت تک حاضری سے محروم ہیں۔
سورج نکل کر نکلنے کے بعد بھی یرموک سے نکلنے والے قاصد کے انتظار کی کالی رات برقرار رہی تو وہ تحمل اور تجمل جو سلطنت کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے اور تاج و تخت کی صحبت میں جوان ہوتا ہے اضطراب کا شکار ہو گیا اور ہرقل کے ہاتھ نے پوری زندگی میں پہلی بار گھنٹہ بجا دیا۔ حاجبانِ بارگاہ نے قدم رکھتے ہی میناس کا نام سنا الٹے پاؤں سیدھے ہوئے اور بھاگتے قدموں سے میناس کے پاس پہنچے۔ جنرل گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے سن ہو چکا تھا۔ مستعدی سے ہی اچھا نہ پڑا۔ ایک لفظ وصول کرتے ہی لپکا۔ بارگاہِ عظمیٰ کے دروازے پر کھڑی ہوئی شمعوں کے درختوں کے سامنے اپنا جائزہ لیا خود اتار کر بائیں ہاتھ میں تھام لیا داہنا ہاتھ سونے کے نیام میں بند تلوار کے صلیبی قبضے پر رکھا مودب ہاتھوں میں کھینچے ہوئے پردوں کی محراب میں داخل ہوا۔ قدم رکھا تھا کہ آواز نازل ہوئی۔
"یرموک نے ہرقل کو باہان کا محتاج کر دیا"
شہنشاہ سفید ریشم کی قبا پہنے تھا جس کی ڈھیلی آستینیں بانہوں تک الٹی ہوئی تھیں اور کشادہ دامن گھٹنوں سے بلند۔ کمر کا جامہ کمر بند خالی۔ پنڈلیوں پر کسے ہوئے سرخ موٹے مخمل کے جوتوں تک دراز۔ زرنگار کرسی کے پہلو میں رکھی قد آدم شمع سے دور کھڑا جگمگا رہا تھا۔
میناس گھٹنوں پر گر پڑا۔
"کسریٰ ایران کو ایک لاکھ اسی ہزار فوجوں سے شکست فاش دی گئی۔ القدس کے سر پر صلیب کا تاج رکھ دیا گیا۔
وہ وہی جنرل ــــ وہی فوجیں"
"نہیں۔ ان سے بہتر جنرل ان سے بہتر فوجیں ۔"
"غلام کا خیال ہے ــــ کہ نڈر جنرل مکمل فتح کے انتظار میں تاخیر کا مرتکب ہے"
"اس شدید موسم میں القدس کی ٹھنڈی عورتوں اور جنت نظیر باغوں کو چھوڑ کر ہم اس ویرانے میں باہان کی تاخیر کا فیصلہ کرنے کے لیے پڑے ہوئے ہیں"
آٹھ پشتوں کی شہنشاہی کے جلال کا سایہ چمک رہا تھا۔ میناس نے کچھ عرض کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ ایک صاحب بہ مشتبہ عرض کرتے

رکھ دیا گیا۔ دونوں گھٹنوں پر گر کر دونوں ہاتھوں پر رکھا ہوا کھلا خط
پیش کر دیا۔ ہرقل نے خط اس طرح اٹھایا جس طرح شہنشاہ کو اٹھانا
چاہیئے۔ حاجب پر نگاہ کی۔

"بہادر والا تبار — شہزادۂ عالی مقام"

"تھیوڈرس"

ہرقل کی زبان سے یہ ایک لفظ اس طرح نکلا جیسے اندیشوں کے پردے
میں کا بند کھل گیا ہو۔

"خادم خاص نے یہ خط اسی طرح جنرل وردآن کو دیا اور گھوڑے
سے گر پڑا۔"

ہرقل نے اس لیے چوڑے کھردرے کاغذ کو اس طرح حاجب کی طرف
پھینک دیا جیسے وہ خط نہیں سانپ کی کینچل ہو۔ اور ابرو سے پڑھنے
کا حکم دیا۔

شہنشاہِ مشرق و مغرب

خالد کی آسمانی تلوار کے خوف میں جرجیس نے غداری کی۔ ہم
نے موت کی سزا دے دی۔ ہم اتنی بہادری سے لڑے کہ خالد کا جھنڈا جھکنے
ڈھکیلتے خالد کے کیمپ تک چلے گئے۔ قریب تھا کہ ہم فتح کے باجے بجانے
کا حکم دیں کہ خالد کی آسمانی تلوار نے ہم کو روک دیا۔ ہم کو دھکیل دیا۔
ہم کو غارت کر دیا۔ عالی مقام خالد سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ کمانڈر
جنرل ایسا زخمی ہوا کہ گھوڑے پر اٹھا کر لایا گیا۔ جنرل قناطر اور دریجار
میدان جنگ میں کام آگئے۔ سینکڑوں سرداروں نے پرچم اقبال کے
سائے میں خودکشی کر لی۔ ہزاروں سپاہی کھڈوں میں گر کر ہلاک ہو گئے
ہزاروں دریا میں پھاند پڑے — ہزاروں نے آنکھوں پر پٹیاں باندھ
کر تلواروں پر گردنیں رکھ دیں۔ شاہی کیمپ کے گرتے ہی"

ہرقل نے کرسی زرنگار کا تکیہ تھام لیا۔

"پھر پڑھو"

"پھر سنا"

"پھر سنتا"

خط مٹھی میں جھپٹ کر مٹھی کو کستا چلا گیا

"پھر پڑھو!"

بارگاہ کے دالان پر کھڑا ہوا حاجب پردے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ ہرقل
آہستہ آہستہ چلتا ہوا جنرل میناس کے سامنے آ گیا۔ جنرل گھٹنوں سے
اٹھ پڑا۔ ہرقل نے اس کو غصے سے دیکھا۔ ہاتھ کھول دیا۔ کاغذ کا گولہ
گر پڑا۔

"القدس پر صلیب مقدس آویزاں کرنے والے ہاتھ ناپاک ہو گئے۔"

"اس تحریر نے ناپاک کر دیئے"

ہرقل نے کاغذ کے گولے کو اپنے جوتے سے مسل دیا۔ میناس کا
جی چاہا کہ اپنا سر کاٹ کر اس کے قدموں میں ڈال دے۔ ہرقل تیز قدموں
سے کرسی کی طرف گیا۔ پھر واپس آیا۔

"حمص پر کتنی فوج ہے؟"

"ساٹھ ہزار"

"القدس؟"

"ستر ہزار!"

"یرموک سے آنے والے تمام راستوں پر جاسوس بچھا دو — فوجیں
کھڑی کر دو — رومۃ الکبریٰ کے آبرو مند سپاہیوں کو ہرقل کے
پاس آتے شرم آتی ہے۔ ان کو بتاؤ — کہ ایک جنگ نکل گیا القدس
باقی ہے۔ قدم سلامت ہے۔ ہرقل زندہ ہے"

میناس کو بہت دیر میں علم ہوا کہ شہنشاہ جا چکا ہے۔ تخت
کے سامنے تن بدن خم ہوا اٹھا۔ قدم بارگاہ سے نکلا تو ایک ایک سپاہی
کے چہرے پر شکست کی تحریر لکھی تھی۔ بڑے بڑے افسروں کو خیمہ پایا۔
سپاہی نے رکاب تھام لی۔ اس نے لگام پکڑ کر پیر رکھا تو پھسل گیا۔
لگام چھوڑ دی۔ وردآن بھی گھوڑے سے اتر پڑا اور ساتھ لے کر فوجوں
کی قطاروں کے سامنے سے آہستہ آہستہ اپنے خیمے کی طرف چلنے لگا۔

میناس اعلیٰ احکامات عالیہ کی تعمیل کر رہا تھا کہ حاجب نے
حمص کے لیے شہنشاہ کے سوار ہونے کی خبر کے ساتھ ہی کا حکم سنایا۔

ہزاروں غلاموں اور ہزاروں گھوڑوں کے ساتھ سیکڑوں اونٹ
مال غنیمت اور یرموک کا فتح نامہ لے کر روانہ ہو چکے تھے [illegible]
کا خیمہ عسکری ناموں سے بھرا ہوا تھا جہاں حاجب [illegible] جاسوسوں کا [illegible]
پڑھ رہے تھے۔

"وہ بیت المقدس کی آنسوؤں سے بھیگی سفید داڑھیاں
اور کھلی ہوئی آنکھیں لیے شہر شہر اور بستی بستی پھر رہے
کی حفاظت کی بھیک مانگتے پھر رہے ہیں شہنشاہ
حمص میں بیٹھا ہوا احکامات لکھ رہا ہے۔ شام سے
مصر تک تمام فوجی چھاؤنیوں کے راستوں پر سوار لگاتار
گھوڑے اڑا رہے ہیں۔ روم کے تمام فرمان روا ہو چکا
کہ ایک ایک تلوار بیت المقدس کی حفاظت پر کھڑی کر دی
جائے۔ بڑے بڑے گرجا کیمپ بن گئے ہیں جہاں ناتجربہ
کار جوانوں کو فوجی تربیت دی جا رہی ہے بچے کھلونوں
کے بجائے ہتھیاروں سے کھیل رہے ہیں عورتوں نے
زیور اتار دیے اور بال کاٹ دیے۔ بوڑھے جہاد کے
نام پر جنت کی بشارت بانٹتے پھر رہے ہیں اور القدس
میں جہاد کا پرچم کھول دیا گیا ہے"

ایک چہرے کے علاوہ تمام چہرے تردد میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ابن ملامت کی للکار بلند ہوئی۔

"آپ حضرات کو اسی لیے یاد کیا گیا ہے کہ اس کڑے وقت میں اپنے مشوروں سے رہنمائی کیجیے"

ابو عبیدہ نے سب کی آنکھیں پڑھیں۔

"جب آپ نے ساری کیفیت خلیفۂ دوم کو لکھ دی اور ان کی ہدایت کے انتظار کا ارادہ کر لیا تو پھر انتظار ہی کیجیے گا۔"

"تو میں کہہ رہا تھا کیونکہ جب بڑے شہروں سے دور میدان مقام جو ہر طرح کی قدرتی امداد سے محروم ہے اگر دشمن کے نرغے میں گھر گیا تو کیا ہوگا؟"

"یا سیف اللہ میں آپ کا مشورہ سننا چاہتا ہوں"

"یا امین الامت اگر آپ نے فتح جنگ کے بعد فوراً مجھ سے مشورہ مانگا ہوتا تو میں آپ کی اجازت سے حمص پر حملہ کرتا۔ ہرقل کو باندھ لیتا تمام [illegible] کو اٹھا لاتا اور وہ سارے تماشے جو اب ہونے والے ہیں ان سب کا آپ کو فیصلہ کرنا تھا"

"یا سیف اللہ تم نے جو کہا سچ کہا لیکن تم سیف اللہ ہو اور میں ابو عبیدہ [illegible] رحمت کی [illegible] کہ وہ اگر [illegible] ہوتی تو میں بھی

دیا کرتا — مجھے یہ بتلاؤ کہ کیا کرنا ہے"

"جنگ — خون آشام جنگ — آپ جس سے [illegible] کا انتظار کر رہا ہوں۔ ہارا ہوا دشمن مہلت چاہتا ہے۔ زخموں کے سینے کی مہلت، مرتے ہوئے لشکر کو نیا خون دینے کی مہلت سامان جنگ فراہم کرنے کی مہلت — عمر بن خطاب نے یہ مہلت ہرقل کی گذارش کے بغیر ہرقل کی خدمت میں نذر کر دی — تاہم اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے آپ حکم کے لیے اٹھ پڑیں جہاں بھاگے ہوئے لشکر کیمپ ڈالے ہوئے ہیں۔ ہرقل حمص میں جو نئے میدان کے نقشے بنا رہا ہے وہ بگڑ جائیں گے۔ ہم یرموک پر اس طرح پڑے ہوئے ہیں گویا ہم نے یرموک کو نہیں یرموک نے ہم کو فتح کر لیا اور ہم کمک کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہرقل کے پاس مشہور عالم سپہ سالاروں کا ہجوم موجود ہے جو اسے ہر ممکن پہلو سے کا مشورہ دے رہے ہوں گے۔ ورنہ حقیر سے فوجوں کا [illegible] کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہرقل یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ ہم القدس پر مائل ہوں گے اور وہ دعا مانگ رہا ہوگا کہ ہم ایسا کریں تاکہ وہ القدس سے جہادیوں کا سیلاب چڑھا کر ہماری پشت پر ایک لاکھ تلواریں ڈال دے۔ حقیر کا جائے وقوع اسی نقشے کے عین مطابق ہے اس لیے ہم کو دمشق کے لیے لشکر ہرقل کو حیرت زدہ کر دینا چاہیے مگر اس طرح کہ ہماری چھوٹی چھوٹی منزلوں اور کاوک راستوں سے اس وقت تک ہرقل پر [illegible] منزل کا راز فاش نہ ہو جب تک ہم ایسے مقام پر نہ پہنچ جائیں جہاں سے ہم ہرقل سے پہلے دمشق پر ہاتھ ڈال سکیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ عمر بن خطاب اس تجویز سے اتفاق کریں گے اس لیے کہ جنگ کے نقطۂ نظر سے شام میں تین ہی بڑے شہر ہیں۔ بیت المقدس حمص اور دمشق۔ بیت المقدس جہاد کا مرکز ہو چکا۔ حمص پر خود ہرقل موجود ہے دمشق جو ساری [illegible] ہے قدیم دارالحکومت ہے اور نسبتاً غیر محفوظ — ساری دنیا میں دمشق کی فتح اگر شام کی فتح کے مترادف نہیں ہوگی تو ایک بڑی فتح ضرور ہوگی"

یزید بن ابی سفیان، عمرو بن العاص اور شرحبیل بن حسنہ نے [illegible] تائید کی۔ ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ حارث بن [illegible] نے [illegible] کی اطلاع دی

(جاری ہے)

پروفیسر منظر عباس نقوی

جنگِ آزادی کا ایک جانباز مجاہد
حسرت موہانی

کاروبار کے ساتھ مولانا کی سیاسی سرگرمیاں بھی پھر سے شروع ہو گئیں۔ ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا۔ مولانا بھی اس اجلاس میں شرکت کی غرض سے امرتسر پہنچے۔ اجلاس کے لیے پنڈال اسی جلیانوالہ باغ میں بنایا گیا تھا جہاں چند مہینے پہلے ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں کا جنرل ڈائر کے حکم سے قتلِ عام ہو چکا تھا۔ اب گاندھی جی ہندوستان کی سیاست پر پوری طرح حاوی تھے اور مولانا محمد علی شوکت علی اور دوسرے قوم پرست مسلمانوں نے اپنے کو کانگریس تحریک سے وابستہ کر لیا تھا۔ خلافت کی تحریک شروع ہونے والی تھی۔ گاندھی جی کے مشورے سے مسلم لیڈروں کا ایک وفد وائسرائے ہند سے ملا۔ اس وفد میں مولانا حسرت بھی شامل تھے۔ مولانا کی حق پرستی اور بے باکی کا مظاہرہ اس وقت ہوا جب گفتگو ختم ہونے پر وہ وائسرائے سے ہاتھ ملائے بغیر جھجکے باہر نکل آئے۔

امرتسر میں مولانا اسلامیہ ہائی اسکول کی دوسری منزل پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُن کی بیگم بھی اُن کے ہمراہ تھیں۔ عبدالمجید سالک لکھتے ہیں کہ وہیں حسرت سے اُن کی پہلی ملاقات ہوئی۔ "مولانا کی غزلیں پڑھ پڑھ کر ان کی شکل صورت کے متعلق جو دلکش تصور قائم تھا وہ انھیں دیکھ کر بالکل کافور ہو گیا۔ سر پر ترکی ٹوپی جس کے کنارے پر ایک ایک انچ چیکٹ جما ہوا۔ گندمی رنگ، چہرے پر چیچک کے داغ، ابھری ہوئی بے ترتیب سی داڑھی، کھدر کی شیروانی، میلا پاجامہ، جوتے ایسے کہ کبھی پالش کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ آواز کچھ ایک بھرائی ہوئی۔ اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے میں سادگی اور غربت کے مجسم نمونہ — یہی حالت بیگم کی بھی تھی۔

وہ بھی ایک غیور شوہر کی فقیر بیوی تھیں اور ایک خاصے خوش حال خاندان کی بیٹی ہونے کے باوجود درویشی کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔"

یہ وہ دور تھا کہ مولانا اکثر سفر میں رہتے۔ لاہور جاتے تو بجائے کسی بڑے آدمی کے یہاں ٹھہرنے کے اپنے پرانے دوست شیخ مبارک علی تاجر کتب کے ہاں قیام فرماتے۔ انھیں سادگی اور بے تکلفی ہی میں آرام ملتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ مولانا ٹرین سے اتر کر صبح سویرے سیدھے شیخ مبارک علی کی دکان پر پہنچ گئے۔ دکان ابھی بند تھی اور نو بجے کھلنے والی تھی۔ مولانا نے اپنی رسی سے بندھی دری، لوٹا اور چھوٹی سی صندوقچی دکان کی سیڑھیوں پر رکھی اور خود بھی وہیں بیٹھ گئے۔ گھنٹہ بھر کے بعد شیخ صاحب آئے اور حیرت سے کہا "مولانا آپ نے کمال کر دیا۔ پاس ہی تو گھر تھا۔ وہاں آ جاتے نا۔" کہنے لگے "ابھی نہیں۔ میں نے کہا مبارک علی آخر یہیں آئے گا، سو یہیں بیٹھ گیا۔ گھر جا کر کیا کرتا!"

غرض اسی شان سے جہاں کوئی سیاسی جلسہ ہوتا مولانا اپنی پوٹلی بغل میں دبائے ہاتھ میں چھتری لیے جا دھمکتے۔ [illegible] ریل کا بھی سفر کا [illegible] تھا۔ ہمیشہ تھرڈ کلاس میں سفر کرتے۔ ایک دفعہ [illegible] "مولانا آپ تھرڈ کلاس میں کیوں سفر کرتے ہیں" تو انھوں نے جواب دیا "کیوں کہ کوئی فورتھ کلاس نہیں ہوتی۔" ۱۹۲۱ء میں حسرت [illegible] کانگریس کے [illegible] اہم [illegible] تھے۔ ہر شخص اُن کی عزت کرتا تھا۔ اسی زمانے میں [illegible] کانگریس کا اجلاس [illegible] منعقد ہوا۔ اس اجلاس [illegible] حسرت [illegible] نے [illegible]

کی مکمل آزادی کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ گاندھی جی ابھی مکمل آزادی کا مطالبہ کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ چنانچہ ان کے اور حسرت کے درمیان زبردست اختلاف رائے ہوگیا۔ دوسرے دن گاندھی جی نے یوپی کے نمائندوں کو بلایا۔ قاضی عدیل عباسی کا بیان ہے کہ ان نمائندوں میں وہ خود بھی شریک تھے۔ گاندھی جی نے کہا کہ "یو۔پی پر حسرت کا بڑا اثر ہے اور یہ بھی کہا کہ "آپ لوگ یا میرے ساتھ رہیں یا حسرت کے ساتھ رہیں دونوں کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ہریش چندر، جو بعد میں ایم ایل اے ہوئے اور فیض احمد قدوائی (کی پارٹی کے ممتاز رکن تھے) کھڑے ہوئے اور بولے "مہاتما جی آپ کو غلط فہمی ہے۔ ہم لوگوں پر حسرت کا اثر نہیں ہے" گاندھی جی نے فوراً کہا "بیٹھ جایئے، میں نے آپ سے رائے نہیں پوچھی ہے۔ ایک حقیقت بیان کی ہے"۔

۱۹۲۱ء ہی میں حسرت آگرہ کانفرنس کے صدر چنے گئے۔ وہاں اسٹیشن پر ان کے استقبال کا بڑا زبردست انتظام کیا گیا تھا۔ حسرت صبح کی ٹرین سے آنے والے تھے۔ لیکن وہ اپنے عقیدت مندوں کو جُل دے کر رات ہی میں آگرہ پہنچ گئے۔ اور اپنا ٹین کا بکس بغل میں دبائے پیچھے پیدل وہاں جا پہنچے جہاں کانفرنس کا پنڈال لگا ہوا تھا۔ دوسرے دن لوگوں نے ان سے شکایت کی اور پوچھا کہ آپ پروگرام کے مطابق مقررہ وقت پر کیوں نہیں آئے تو انھوں نے بڑی سادگی سے جواب دیا "کوئی بات نہیں"۔ غرض وہ استقبالیہ ہاروں اور نعروں سے خود کو صاف بچا لیتے تھے۔

اسی سال احمد آباد میں مسلم لیگ کا بھی سالانہ جلسہ ہوا۔ حسرت اس جلسے کے صدر بنائے گئے۔ انھوں نے یہاں بھی مکمل آزادی کا وہی مطالبہ پیش کیا جو کانگریس کے اجلاس میں پیش کر چکے تھے۔ انگریزی حکومت ان کے ان خیالات سے بہت پریشان تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا خطبہ ضبط کر لیا گیا اور پھر قید کر دئے گئے۔ اس بار گاندھی جی اور مولانا حسرت ایک ہی جیل میں تھے۔ اگرچہ انھیں دو سال قید کی سزا ہوئی تھی لیکن مقررہ مدت ختم ہونے سے پہلے ہی رہا کر دئے گئے۔ مولانا کانپور آگئے اور پھر اپنے کاروبار کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ اسٹور کی فکر ان کو جیل میں بھی لگی رہتی تھی۔ اس سلسلے میں اپنی بیگم کو برابر خط لکھتے رہتے تھے۔ ان کی بیگم بھی بڑی محنتی خاتون تھیں۔ وہ جہاں تک بن پڑا ان کی غیر موجودگی میں کاروبار کو سنبھالے رہیں لیکن پھر بھی کاروبار پٹ گیا تھا مجبوراً کچھ دنوں بعد مولانا کو سودیشی اسٹور بند کر دینا پڑا اور تمام حصہ داروں کی رقمیں ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کر دی گئی۔ بہرحال ۱۹۲۵ء سے اُردوئے معلیٰ پھر جاری ہوگیا۔

کانپور ایک صنعتی شہر ہے اس لیے یہاں ہزاروں کی تعداد میں مزدور رہتے ہیں۔ حسرت کو ان مزدوروں کی زندگی کو قریب سے دیکھنے اور ان کے مسائل کو سمجھنے کا بڑا موقع ملا۔ کیمونزم سے اُن کو دلچسپی تو شروع ہی سے تھی۔ اب اس دلچسپی نے عملی صورت بھی اختیار کر لی۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں اُن کی کوششوں سے آل انڈیا کیمونسٹ پارٹی کی پہلی کانفرنس کانپور میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کی مجلسِ استقبالیہ کے صدر مولانا ہی تھے۔ انھوں نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں کیمونسٹ تحریک سے اپنے تعلق اور اس تحریک کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

"کیمونزم کی تحریک کاشتکاروں اور مزدوروں کی تحریک ہے اس تحریک کے اصول اور اغراض و مقاصد سے جمہور اہل ہند قطعاً اتفاق کرتے ہیں۔ البتہ بعض غلط فہمیوں کی بنا پر کیمونزم کے نام سے بعض کمزور اور وہمی طبیعت کے لوگ گھبراتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلط فہمیاں سب سرمایہ داروں اور دوسرے بدخواہوں کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ مثلاً بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کیمونزم اور خوں ریزی و فساد لازم و ملزوم ہیں۔ حالانکہ اس کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم لوگ عدم تشدد کو صرف وقت اور مصلحت کی بنا پر جائز سمجھتے ہیں۔ نیز بعض احمق اور شریر لوگ یہ بھی کہتے پھرتے ہیں کہ کیمونزم اور "جو تیرا سو میرا" ایک ہی چیز ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں جائیداد اور ملکیت کی بھی دو قسمیں مقرر ہیں۔ ایک ذاتی جس کو انگریزی میں 'پرسنل' کہتے ہیں مثلاً گھڑی یا چھتری، لوٹا، بستر، کپڑے، مکان وغیرہ۔ دوسرے شخصی جس کو انگریزی میں 'پرائیویٹ' کہتے ہیں مثلاً زمین، کارخانے وغیرہ۔

کیمونسٹ اصول کا عمل ذاتی جائیداد پر نہیں ہوتا، صرف شخصی پر ہوتا ہے ــــ بعض بد باطن لوگ کیمونزم پر یہ بے جا الزام لگاتے ہیں کہ وہ لازمی طور پر مذہب کا دشمن ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ

ہر ایک مذہب کے بارے میں اپنا صحیح نقطۂ نظر کو مناسب سمجھتے ہیں
ولیکن ہمارے اصولوں کو ماننے والے ہمارے نزدیک باطل ہے خواہ وہ چند
ہو اسلام ہو عیسائی ہو یا یہودی، مذہبی شخص ہو یا لامذہب۔ بالفاظ دیگر ہم
ہر مذہب کا وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک لامذہبی بھی ایک مذہب ہے

ہمارے بعض مسلمان لیڈر بلا وجہ کمیونزم کو اسلام کے خلاف بتاتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت حال اس کے بالکل برخلاف ہے۔ بلکہ از کم سرمایہ داری کے خلاف تو اسلام کا فیصلہ شاید کمیونسٹ عقیدے سے بھی زیادہ سخت ہے اور فریضۂ زکوٰۃ کا منشا بھی زیادہ تر یہ ہے کہ خلق خدا میں جب تک ایک شخص بھی بھوکا ہے اس وقت تک مال داروں کو عیش کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

(بقیہ صفحہ [illegible] کا)

اور رشوت ستانی جیسی اخلاقی برائیوں میں بھی کمی آسکتی ہے بس صرف ذرا احتیاط کی ضرورت ہے۔

مغربی دنیا میں تو کمپیوٹر گھریلو کام کاج اور اس قسم کے دیگر نجی مقاصد کے لیے بھی استعمال ہونے لگا ہے۔ علاوہ ازیں شادی بیاہ کے معاملے میں لڑکے لڑکی کی تلاش قسمت کا حال جاننے۔ بچوں کے کھیلنے کے لیے کھیل وغیرہ کرنے غرض کہ تفریحی اور سماجی مقاصد کے لیے بھی کمپیوٹر کو استعمال میں لایا جانے لگا ہے۔ ایسی صورت حال میں یہ فیصلہ کرنا ابھی دشوار ہے کہ آئندہ کمپیوٹر کی ترقی کیا رخ اختیار کرے اور انسانی زندگی میں اس کا عمل دخل [illegible] انسان کو کہاں تک لے جائے گا۔

کیونکہ نسلی تحریک سے [illegible] چونکہ [illegible] ایک انتہائی [illegible] تھے [illegible] چنانچہ ایسی [illegible] سعودی جہاز [illegible] اور [illegible] سعودی عرب کی [illegible] کی گئی تو [illegible] ہم نے لکھنؤ میں مولانا عبدالماجد [illegible] کے مشورے سے ایک انجمن قائم کی گئی جس کا نام انجمن خدام الحرمین (یعنی مدینے اور مکے کے خادموں کی جماعت) تھا۔ اس انجمن کے اہتمام سے لکھنؤ میں ایک آل انڈیا حجاز کانفرنس منعقد کی گئی جس کی صدارت کے فرائض حسرت نے انجام دیے۔ انھوں نے [illegible] ابن سعود کی کھل کر مذمت کی اور حجاز میں مقبروں اور [illegible] کا جو حشر ہوا تھا اس کے خلاف مسلمانوں کے جذبات کا شدت سے زوردار الفاظ میں اظہار کیا۔ (جاری ہے)

طباعتی کام کے لیے ٹینڈر

مندرجہ ذیل رسائل کی طباعت کے لیے ٹینڈر مطلوب ہیں۔ کام کی تفصیل نیچے درج کی جا رہی ہے:

۱۔ تہذیب الاخلاق
پندرہ روزہ ۔ صفحات کی اوسط تعداد ۳۲
(فوٹو آفسیٹ)

۲۔ نشانات
پندرہ روزہ ۔ صفحات کی اوسط تعداد ۳۲
(لیتھو)

۳۔ فکر و نظر
سہ ماہی ۔ صفحات کی اوسط تعداد ۱۲۵
(فوٹو آفسیٹ)

ٹینڈر میں طباعت، کاغذ اور جلد بندی کے نرخ علیحدہ علیحدہ دیے جائیں۔
ٹینڈر [illegible]
پتہ: [illegible]

جارج گیمو
ترجمہ: ڈاکٹر انیس عالم

چچا چھکن کا تیسرا خواب

شہری حدِ رفتار[1] (City speed Limit)

چچا چھکن کو اپنے خواب پسند آئے تھے اور وہ اپنی طبیعت میں مہارت کا سواد حاصل کرنے کے لیے اگلے ہفتے کی بڑی بے چینی سے منتظر تھے لیکن یہ معلوم کر کے انھیں بے حد مایوسی ہوئی کہ قدرے سیاق نظریے پر خطبہ اس سلسلے کا آخری خطبہ تھا اور اب اس سال کوئی اور خطبہ نہ ہوگا لیکن ان کی مایوسی قدرے کم ہو گئی جب وہ پہلے خطبے کا اچھا وہ حصہ جو سمجھ نہ سکے تھے اس کا مسودہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

آدھا بینک کا بڑا کمرہ تقریباً خالی تھا چچا چھکن نے بھاری بھرکم مسودہ کھولا اور ان ناقابلِ فہم فارمولوں اور ہندسی اشکال کی بار توڑنے کی کوشش کرنے لگے جن کی مدد سے پروفیسر نے نظریۂ اضافیت کی تشریح کرنے کی کوشش کی تھی لیکن پورا مسودہ پڑھ لینے کے بعد انھیں صرف اتنا معلوم ہوا کہ اس خطبے کا لبِ لباب یہ ہے کہ رفتار کی ایک آخری حد (رفتارِ نور) ہے جس سے کوئی بھی متحرک مادی جسم تجاوز نہیں کر سکتا اور یہ کہ اس نکتے سے حیرت انگیز اور خلافِ معمول نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ رفتارِ نور ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ ہے اس لیے روزمرہ کی زندگی میں اضافیت کے اثرات کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا

چچا چھکن کے لیے ان تمام خلافِ معمول اثرات کی نوعیت کا سمجھنا بہت زیادہ مشکل تھا اور انھیں یہ سب کچھ بظاہر عقلِ سلیم کے سراسر خلاف معلوم ہوا۔ انھوں نے پیمائش کے سکڑاؤ اور گھڑیوں کے کام کرنے کے عجیب و غریب ڈھنگ کا تصور کرنے کی کوشش کی لیکن ایسے اثرات کی جو پیش آ سکتے ہیں جو شکل پیش آ سکتی ہے اگر اجسام تقریباً رفتارِ نور کی تیزی سے حرکت کر رہے ہوں کہ اثرات تو اسی حالت میں وقوع میں آتے ہیں جب جسم کی رفتار نور کی رفتار کے لگ بھگ ہو جاتی ہے ان خیالات سے ان کا سر چکرانے لگا آہستہ آہستہ نیند آ گئی۔

جب انھوں نے پھر آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو ایک خوبصورت شہر کے ایک چوک میں کھڑا پایا۔ انھیں شبہ ہوا کہ شاید خواب دیکھ رہے ہیں لیکن ان کے گرد و پیش کوئی خلافِ معمول منظر وقوع پذیر نہیں ہو رہا تھا جس پر انھیں خاصی حیرت ہوئی۔ چوک کے سامنے کونے پر کھڑا ہوا سنتری عام سنتریوں جیسا نظر آ رہا تھا۔ گھنٹہ گھر کے گھنٹے کی سوئیاں دوپہر کے تقریباً بارہ بجا رہی تھیں اور سڑک تقریباً خالی تھی۔ ایک اکیلا سائیکل سوار ان کی طرف آ رہا تھا اور جب وہ ان کے قریب آیا تو چچا چھکن کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، کیونکہ سائیکل سوار اور اس کی سائیکل دونوں حرکت کی سمت میں ناقابلِ یقین حد تک چپٹے نظر آ رہے تھے جیسے انھیں کسی اسطوانی عدسے سے دیکھا جا رہا ہو۔ گھنٹہ گھر نے بارہ بجائے سائیکل سوار، جو بظاہر جلدی میں تھا، تیزی سے پاؤں مارنے لگا۔ چچا چھکن کو سائیکل سوار کی رفتار میں تو کوئی خاص اضافہ ہوتا نظر نہ آیا البتہ سائیکل سوار اپنی سرگرمی کے نتیجے میں پہلے سے زیادہ چپٹا نظر آنے لگا اور بالکل ایسا دکھائی دینے لگا جیسے گتے پر بنی ہوئی تصویر کاٹ لی گئی ہو۔ اس پر چچا چھکن بڑے خوش ہوئے کیونکہ ان کی سمجھ میں آ گیا کہ سائیکل سوار کی یہ حالت کیوں ہے۔ یہ سب فرق اجسام کا سکڑاؤ تھا جس کے متعلق انھوں نے ابھی ابھی مسودے میں پڑھا تھا۔ "یقیناً اس شہر میں فطرت کی حدِ رفتار کم ہے" انھوں نے سوچا۔ "یہی وجہ ہے کہ کونے پر کھڑا سنتری اتنا سست نظر آ رہا ہے۔ آخر حدِ رفتار سے تجاوز کرنے والے یہاں ہیں ہی کہاں۔"

---

[1] [illegible] تقریباً ۱۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ ہے۔ دنیا کے دوسرے مستقل Quantum Theory [illegible]

بہت سمجھایا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں!" بریک مین نے کہا۔ "لیکن مجھے ایسا ہی ایک مرتبہ ریل گاڑی میں سفر کرتے ہوئے یونیورسٹی کے ایک پروفیسر سے یہی سوال میں نے بھی کیا تھا۔ انھوں نے ایک بڑی لمبی چوڑی تقریر کرکے مجھے یہ سب کچھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ آخر میں انھوں نے کچھ ایسا کہا کہ شاید یہ سب کچھ سرخ تبدیلی کے مماثل ہے۔ کیا آپ نے بھی کبھی سرخ تبدیلی کے متعلق سنا ہے؟"

"نہیں تو!" چچا چھکن نے قدرے متذبذب ہو کر کہا اور بریک مین سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔

اتنے میں ایک طویل قد اور اداس سا بیرا چچا چھکن کے پاس بلانے کو آیا اور وہ ریڈ گارڈ کے بل کے لیے اپنی جیبیں ٹٹولنے لگے۔ جب کچھ نہ ملا تو انھوں نے بیرے سے پوچھا، "چیک دے دوں؟"

"نہیں،" بیرا فرمایا۔ "مجھے نقد رقم چاہیے!"

"لیکن میرے پاس تو نقدی ہے نہیں،" چچا چھکن گھبرا کر بولے۔

"اسے سنبھال دیکھو!" بیرے کی غصیلی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ چچا چھکن نے منہ پھیر سر اٹھایا۔ سامنے اس اکھڑ بیرے کے بجائے ان کا وہی ہمسفر زمانہ یعنی بوڑھا پروفیسر کھڑا تھا اور ایک چیک ان کی طرف بڑھا رہا تھا۔

"ارے!" چچا چھکن زور دار مسرت سے چلا اٹھے۔ "مجھے آپ کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ مجھے آپ سے یہ پوچھنا تھا کہ آیا تمام وقت بھاگتے رہنے سے کوئی شخص ابدی زندگی پا سکتا ہے؟" "مجھے افسوس ہے، میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا" پروفیسر نے کہا۔ "ذرا یہ چیک بھنا دیجیے۔ مجھے جلدی ہی ایک جلسے میں شرکت کرنی ہے۔" دراصل سنو ونگ کا پروفیسر کا رویہ اتنا مشفقانہ نہیں تھا جتنا خوابوں میں ہوتا ہے۔ چچا چھکن نے آدھی کا نوٹ گننے شروع کر دیے۔

حدیثِ رسولؐ

پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ ایک بردبار آدمی کی تین علامتیں ہیں:

اول - یہ کہ وہ سستی اور لاپرواہی نہ کرے۔

دوم - یہ کہ آزردہ و ملول نہ ہو۔ اور

سوم - یہ کہ اپنے پروردگار کی شکایت نہ کرے

کیونکہ اگر اس نے سستی و لاپرواہی سے کام لیا تو اپنا حق ضائع کر دیا۔

اگر افسردہ خاطر اور رنجیدہ و ملول ہوا تو وہ اپنے پروردگار کا شکر بجا نہ لائے گا اور

اگر اس نے اپنے پروردگار کی شکایت کی تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔

نہج البلاغہ سے

اللہ کی عظمت کا احساس تمہاری نظروں میں کائنات کو حقیر و پست کر دے گا۔

تھوڑا دینے سے شرماؤ نہیں۔ کیونکہ خالی ہاتھ پھیرنا تو اس سے بھی گری ہوئی بات ہے۔

وہ گناہ جس کا تمہیں رنج ہو اللہ کے نزدیک اس نیکی سے کہیں اچھا ہے جو تمہیں خود پسند بنا دے۔

جس شخص نے لوگوں کے عیوب کو دیکھا اور ان کو برا سمجھا پھر اپنے نفس کے لیے ان ہی عیوب کو اختیار کر لیا وہ بالکل احمق ہے۔

احمد جمال پاشا

نکولائی وسیلی یوچ گوگول

نکولائی وسیلی یوچ گوگول قزاقستان میں یوکرائن کے پولتاوا کے نزدیک میرگورود گاؤں میں ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد اعلیٰ تعلیم یافتہ قابل انسان اور صاحب طرز ادیب تھے۔ ادبیات میں انتہائی دلچسپی کے ساتھ وہ بہت سے طربیوں کے خالق اور اس گاؤں کے چھوٹے سے زمیندار تھے۔

اسی ادبی ماحول میں گوگول نے آنکھیں کھولیں، انہوں نے ادب اور ظرافت ورثے میں پائی۔ قزاق گاؤں میں قزاقستان کی تہذیب اور ثقافت کے گہرے اثرات قبول کیے۔ اسی میں ان کا بچپن گزرا جس کے نمایاں نقوش ہمیں ان کی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔ وہ دیہات کے رہنے والے تھے۔ انہیں دیہی زندگی عزیز تھی۔ اسی لیے وہ اپنی دہقانیت کے آگے، کبھی بھی شہری زندگی کی کھوکھلی اور سپاٹ نفاست اور چمک دمک سے مرعوب نہ ہو سکے۔

گوگول نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم میرگورود میں حاصل کی۔ وہ یوکرائن سے ۱۹ سال کی عمر میں اعلیٰ تعلیم کے لیے سینٹ پیٹرس برگ پہنچے۔ اس دور دراز صوبے میں ان کے پاس تعلیمی تصدیق نامہ (خارجہ) تیرہواں درجہ پاس کر چکنے کا تھا جس کی بنا پر چودھویں درجے میں داخلہ لے سکتے تھے۔

نوجوان گوگول نے اس قدیم روسی دارالحکومت سینٹ پیٹرس برگ میں [illegible] انسانی اقتدار کی پامالی، پولیس کے مظالم، فرد کی [illegible] نفسی نفسی اور [illegible] دیکھی۔ اسی لیے اس نئے شہر نے انہیں سخت [illegible] کیونکہ یہ سب کچھ ان کے تصورات سے قطعی مختلف اور تکلیف دہ تھا۔

گوگول ٹھیٹھ دیسی آدمی تھے۔ انہوں نے یورپ کی نقالی کے بجائے اپنی بات اپنے انداز میں کہنے کو ترجیح دی۔

اسکول کی طرح کالج کی تعلیم پر بھی ان کے آبا و اجداد [illegible] کا ناخوشگوار اثر ہوا۔ انہیں اکثر مضامین بہت ناپسند تھے۔ [illegible] اور روسی ادبیات کو وہ حقارت سے دیکھتے۔ فرانسیسی اطوار و انداز کا مذاق اڑاتے۔ انہوں نے جرمنی ادبیات میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ اس زمانے کے معیار تعلیم کے مطابق ان کی تعلیم اچھی نہ تھی۔ جس سے یہ اچھا نتیجہ نکلا کہ زمانۂ تعلیم کے دوران انہوں نے افسانے، ناول اور ڈرامے لکھنے شروع کر دیے۔

نوجوان گوگول سینٹ پیٹرس برگ کے محکمۂ زراعت میں ملازم ہو گئے مگر وہ آزاد طبیعت انسان تھے۔ اس لیے اس ڈھرے کی دفتری ملازمت کے گورکھ دھندے سے دو ہی سال کے اندر نکل آئے اور یورپ کی سیاحت کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ مگر آدھے ہی راستے سے واپس لوٹ آئے۔ ان کے سامنے اب ادب کا وسیع میدان تھا۔

گوگول نے قلم اٹھاتے ہی ادبی فتوحات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ۱۸۳۱ء میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "جانکا کے قریب ایک بستی کی کہانیاں" شائع ہوا۔ اس وقت ان کی عمر فقط ۲۲ سال تھی۔ مجموعہ شائع ہوتے ہی گوگول مشہور ہو گئے۔

گوگول کی بڑھتی ہوئی شہرت نے ان میں عالم بننے کا شوق پیدا کیا۔ انہوں نے روس کی تاریخ لکھنے کا اعلان کیا۔ جو کبھی بھی مکمل نہ ہو سکی مگر چند مقالات [illegible] کے قلم سے نکلے جن کی بنا پر یونیورسٹی

ء، [illegible] مارچ کو پروفیسر بنا دیا گیا۔ مگر پہلے ہی لیکچر میں گوگول کے سارا خزانہ خالی ہو گیا۔ انھیں مجبوراً ڈیڑھ سال بعد پروفیسری سے مستعفی ہونا پڑا۔

گوگول کا نصب العین قومی نجات تھا۔ جب ناولوں، افسانوں اور ڈراموں میں بھی انہیں اپنی منزل نظر نہ آئی، تبدیلی یا انقلاب کے آثار انہیں نہ دکھائی دیے تو انہوں نے مایوس ہو کر دوستوں کو اپنے خطوط میں لکھ کر بار بار یہ اعلان کیا کہ "انہوں نے ناول نویسی وغیرہ ترک کر دی ہے۔" ۲۰ 'دوستوں کے نام خطوط' سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے یہ خطوط داخلی بے بسی اور سماجی ماتم کا مجموعہ ہیں۔ اس عظیم فنکار نے مادی بے گانگی، مادرِ وطن سے بے حسی اور دنیا داری کے سماجی رویّے سے مایوس ہو کر مذہب کی آغوش میں پناہ لی۔ جس کا ثبوت اُن کے یہ خطوط ہیں۔ جو دراصل مذہبی وعظوں کا مجموعہ ہیں۔

۱۸۵۲ء میں نہ صرف روسی بلکہ ادبیات عالم کا یہ عظیم ظرافت نگار صرف ۴۲ سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔

روسی ادب میں ظرافت کی روایت بیشتر طنزیات کی شکل میں کانتیمیر سے فون وزین۔ گریبو یدوف اور گوگول تک ظرافت نگاروں میں نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتی رہی۔ گوگول سے شیچدرین اور چیخوف تک۔

گوگول نے روسی ظرافت کو نیا سماجی مواد، عصری بصیرت اور بے مثال گہرائی اپنی خلاقانہ فنکاری سے عطا کی۔ انہوں نے عصری حقیقت کو ابھارنے کے لیے سماجی تنقید کی بنیاد سچائی پر رکھی۔ اُن کے مزاح میں تباہ کرنے والی قوت سب سے زیادہ ہے۔ انہوں نے عوام کو زیادہ برتر حقائق سے آگاہ کیا۔ وہ روسی ادبیات میں پشکن کے عظیم جانشین ہیں۔ پشکن کی روایت پر وہ اپنے ہی بنائے ہوئے راستے پر برابر آگے بڑھتے رہے۔ پشکن نے سماجی تضادات کو بے نقاب کیا تھا۔ یہ تضادات زندگی کے حسن و توازن اور اثبات سے ابھرتے تھے۔ مگر گوگول کی دنیا میں پشکن سے بہت مختلف نظر آتی ہے۔ جو معاصر زندگی کے حقائق سے پُر ہے۔ اُن کی حقیقت نگاری میں ہمیں اُن کے عصری سماجی فضا کی ناہمواریوں کا بے خوف، بے باک اور فنکارانہ تجزیہ نظر آتا ہے۔ وہ پنہاں حقائق کی نفی سے اپنے ارد گرد کی زندگی کو بے نقاب کرتے ہیں۔ ناہمواریوں کی نفی کا جذبہ ان کی ظریفانہ تحریروں پر حاوی ہوتا چلا گیا۔

گوگول پہلے روسی ادیب ہیں جو طنز کو تجزیاتی اور تحقیقاتی کردار اور مزاج عطا کرتے ہیں۔ وہ برائیوں، خرابیوں اور خامیوں کی پھیلی ہوئی جڑوں کو مکڑی کے جال کی طرح نمایاں کرتے چلے جاتے ہیں۔

جب انہوں نے ظرافت [illegible] کی ابتدا کی تو روسی ظرافت عالمی ظرافت میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکی تھی۔ روسی ادبیات میں طنز کی روایت ایک محترم مقام حاصل کر چکی تھی۔ اس ظرافت میں اب تک صرف طنز کے حربے سے حقائق کو بے نقاب کرنے کا کام لیا جا رہا تھا۔ گوگول نے بین السطور کے طنز کے فن کو اس کے اندرونی طنز سے اس یقین اور اعتقاد کے ساتھ چیلنج کیا کہ "یا سماج کو بدلے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا" محض ایک خیالِ خام ہے۔" روسی روشن خیال طبقوں میں اُن کی ظرافت نے قبولِ عام حاصل کر لیا۔ روسی سماج میں تبدیلیوں کی جدوجہد کا معیار گوگول قرار پائے۔ روسی رہنماؤں اور نقادوں نے خواص و عوام کے ساتھ گوگول کے فن کو ایسا سراہا کہ اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے اور رہے گا۔

عالمی ادب میں بھی گوگول ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ عالمی ظریفانہ ادبیات کی صفِ اول میں گوگول، سروانتیس، جان راپے، شیکسپیئر، گوئٹے، بالزک اور چارلس ڈکنس وغیرہ کی آفاقیت میں شامل ہو گئے۔

گوگول نے پہلی بار روسی طربیہ میں اپنی بات اپنے انداز سے کہی۔ پیروئ مغرب سے انحراف کی یہ پہلی خوشگوار مثال تھی۔ جیسے روسی ناول اور ڈرامہ جگمگا اٹھے۔ ان کی شہرت کا آغاز "جاہنکا کے قریب ایک گاؤں میں سنی ہوئی کہانیاں" سے ہوا۔ جن کا ذائقہ اتنا مختلف اور خوشگوار تھا کہ وہ مطلعِ ادب پر چھا گئے۔ وہ روسی ادب کی بلندیوں پر پہنچ گئے۔ گوگول میں جدت اور مصوری تھی۔ جیتی جاگتی، ہنستی بولتی وہ اپنی زندگی کے زندگی سے بھرپور مرقع تھے۔ قدرتِ زبان، باریک بینی، بلند ہمدردانہ احساس میں ظرافت اپنے عروج کمال پر نظر آتی ہے۔ وہ ہر زندگی کو جانتے [illegible] آسیب، محبت، پریت، روحانی [illegible] انسانوں کے [illegible] دلکشی اور ملاحظت کے ظاہر معاشرت اور زندگی [illegible] کے حقائق کو پیش کیا گیا تھا، [illegible]

اور طبقوں کو انہوں نے بڑی شائستگی اور شگفتگی سے پیش کر کے افسانے
اور حقیقت کے درمیان پردہ اٹھا دیا۔ "سی کی رات" دو کرداروں گاؤں کا
مکھیا اور شراب بنانے والے کے کیری کیچر اُن کی ظریفانہ کردار نگاری کی
روشن مثال ہیں۔

۱۸۳۵ء میں گوگول کا دوسرا افسانوی مجموعہ "میرگورد" دو حصوں میں
شائع ہوا۔ حصہ اول میں "پرانے زمیندار" — اور — "تاراس بلبا"
شامل تھے۔ گوگول میرگورد گاؤں میں پیدا ہوئے تھے یہ افسانے اسی
ماحول کے ہیں۔ ان میں زبان و بیان کی خوبیاں نمایاں ہیں۔ گوگول کی پُر
مذاق ظرافت کا یہ کمال ہے کہ ظرافت نگار کی حقیقت نگاری کا یہ وصف نمایاں
ہو جاتا ہے کہ وہ ایک آنکھ سے ہنستے اور دوسری آنکھ سے روتے ہیں۔ اُن کا
یہ فن ہمیں اس مجموعہ میں پوری شان سے جلوہ گر نظر آتا ہے۔

گوگول کے افسانوں جن میں اُن کے ناول اور طویل مختصر افسانے
شامل ہیں۔ کا مجموعہ "گل کاریاں اور کہانیاں" شائع ہوا۔ جن میں "پرانی
وضع کے زمیندار" — "اوان اوان کی لڑائی" —
"نیفسکی پراسپکٹ" — اور — "لبادہ" جیسے شاہکار شامل ہیں۔

"پرانی وضع کے زمیندار" — میں زمیندار طبقہ کی بے عملی کو نشانہ
بنایا گیا ہے۔ جو دنیا سے خوش اور بے گانہ ہیں۔ کھانا اور کھلانے کے
بارے میں گفتگو اور چھیڑ چھاڑ کے دوران زمیندار اپنی بیوی سے سوال
پر سوال کرتا رہتا ہے۔ جیسے "اگر گھر میں آگ لگ جائے تو ہم کہاں جائیں
گے...؟" اُن میں دلچسپ نوک جھونک، پھر اس سے لطف اندوز ہونا۔
بلی کو اپنی موت سمجھنا اور رخصت کی برسوں تیاری کے بعد آخر مر جانا۔

"اوان اوان کی لڑائی" میں بات بات پر لڑائی کے ذریعہ زمیندار
طبقہ کا مذاق اڑایا گیا ہے۔

"نیفسکی پراسپکٹ" میں گوگول نے عکاسی شہری زندگی کا المناک
منظر پیش کیا ہے۔ فوجی افسروں اور ادنیٰ طبقے کے [illegible] کو نشانہ
بنایا گیا ہے۔ اس [illegible] ظرافت باریک بینی سے ابھرتی ہے۔ [illegible]
[illegible] کرداروں میں [illegible] ہے۔ [illegible] کی وجہ
[illegible] ہے۔
[illegible] ناولوں اور افسانوں میں جو کردار پیش کیے ہیں۔

وہ حقیقت پسندی سے پیش کیے گئے ہیں اپنے طبقے کے نمائندہ کرداروں [illegible]
کی پیداوار ہیں۔

۱۸۴۲ء میں گوگول کے ناولوں اور افسانوں کے مجموعے کی تیسری
جلد — "پیٹرس برگ کے ناولوں اور افسانوں کے مجموعے کی تیسری جلد"
"پیٹرس برگ کے افسانے" شائع ہوئی جس میں انہوں نے "نیفسکی
پراسپکٹ" — "تصویر" — "اوورکوٹ" "بگھی" "پاگل کی ڈائری" اور
"ناک" شامل کیے۔ ان افسانوں میں خیال اور فن کی آمیزش بڑی
فنکارانہ ہے۔ ان افسانوں کے تمام واقعات روسی دارالحکومت پیٹرس
برگ میں پیش آئے تھے۔

"اوورکوٹ" کا ہیرو اکاکی اکاکئے وچ ایک معمولی کلرک ہے۔
جس کی اوورکوٹ بنوانے کی خواہش کا انجام نیا اوورکوٹ بنوا لینے
میں کامیاب ہو جانے کے بعد ایک اُچکا اسے اُن سے چھین کر لے جاتا ہے
اسی صدمے سے وہ مر کر بھوت بن جاتا ہے۔ اور شہر میں بھٹکنے لگتا ہے۔
"اوورکوٹ" میں انسان کی چھوٹی چھوٹی بنیادی ضروریات سے محرومی
اور ان محرومیوں پر پیٹ بھروں کا ہنسنا، اسے گوگول نے بڑی فنکاری
سے پیش کیا ہے۔ وہ ان نارسائیوں پر جذبات ابھارنے پر اکتفا نہیں
کرتے، بلکہ جذبات کے گھونٹ سے دو ٹکرا آنسوؤں میں [illegible] بہا دیتے
ہیں۔ "اوورکوٹ" کو پڑھنے والوں اور نقادوں نے [illegible]
لیا۔ ممتاز روسی ناقد الکساندر گیرتسن نے "اوورکوٹ" کو گوگول کی [illegible]
تخلیق قرار دیا جس میں آمریت اور کسان غلاموں کے [illegible] کی
سماج میں غریب آدمی کے مقدر کی بھرپور ترجمانی کی گئی ہے جس سے
روسی ظرافت میں عوام نگاری کا دور شروع ہو گیا۔ فیودر دستوئیفسکی نے
انیسویں صدی کی پانچویں اور ساتویں دہائی کے روسی ادیبوں کے
بارے میں کہا تھا کہ "ہم سب گوگول کے "اوورکوٹ" سے نکلے ہیں"
بحیثیت مصور گوگول بھی قاری کے قہقہوں میں شامل ہو کر اوورکوٹ
کے ہیرو کی مصیبت سے پیدا ہونے والی مضحک صورت حال سے
ہمدردی اور انسان دوستی کے آثار رواں کر دیتا ہے گوگول کہانی
کی بنیاد پر قائم رہتا ہے۔ مبالغہ یا غلط بیانی کو [illegible] نہیں [illegible]
اور بے چاروں کے دکھ کا المیہ اس حقیقت کے ساتھ [illegible]

جاتا ہے کہ اکاکی اکاکئے وچ جیسے بے چارے لوگ قطعی نظر انداز دیے جائیں۔ وہ اُسے قابلِ رحم حد تک مضحک بنا کر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

گوگول کے دو ڈرامے "انسپکٹر جنرل" اور "شادی" دونوں ڈراموں میں مضحک کرداروں کی بھرمار ہے۔ گوگول ہمیں ہنساتے ہنساتے اس منزل پر پہنچا دیتے ہیں جہاں ہم انسانی ہمدردی سے بے قابو ہو کر آنسوؤں اور آہوں سے اُس کے کمالِ فن پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ "انسپکٹر جنرل" کے مضحک کردار مفسد اور بد دیانت ہیں۔ سرکاری ملازموں میں بے ایمانی اور رشوت خوری پر ہم بجائے برہم ہونے کے اُن کی بے کسی پر ترس کھانے لگتے ہیں جب بدعنوان کردار صفائی پیش کرتے ہیں تو وہ مسخرے معلوم ہوتے ہیں کسی شہر میں اس خبر سے کہ انسپکٹر جنرل راجدھانی سے سرکاری کارگزاری کا جائزہ لینے آ رہے ہیں۔ بدعنوان رشوت خور عملوں میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔ سب کے سب بالکل بد حواس ہیں کہ انسپکٹر جنرل بھیس بدل کر آئیں گے۔ ایک آوارہ اور اوباش نوجوان جب آ کر ایک ہوٹل میں قیام کرتا ہے تو سب یہ سمجھتے ہیں کہ انسپکٹر جنرل آ گئے۔ نوجوان اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ نوجوان کے ایک بالکل ہی معمولی ہوٹل میں ٹھہرنے پر شبہ یقین میں بدلنے لگتا ہے کہ ضرور وہ نوجوان انسپکٹر جنرل ہیں اور بھیس بدلے ہوئے ہیں۔ سب اُس کے پاس پہنچتے ہیں۔ وہ ان سب سے رشوتیں وصول کرتا ہے دعوتیں اڑاتا ہے۔ نقلی انسپکٹر جنرل جب غائب ہو جاتا ہے تو سپاہی حاکم سب کو اطلاع دیتا ہے کہ انہیں انسپکٹر جنرل نے طلب کیا ہے۔ اس ڈرامے کے مناظر بہت ہی دلچسپ اور مضحک ہیں۔ میونسپلٹی کا صدر، اسپیشل منصف، اسکول اوقاف خیرات خانے اور یتیم خانے کے سربراہ اور پوسٹ ماسٹر وغیرہ کے کرداروں کے کھوکھلے پن کو نمایاں کر کے گوگول سرکاری نظم و نسق میں ناہمواریوں کو دل کھول کر نشانہ بناتا ہے۔

ڈرامہ "شادی" کو گوگول مضحک سیرتوں کا عجائب گھر بنا دیتا ہے ہیرو مدتوں کے بیاہ کے سپنے سجاتا ہے۔ اس پر یہ خوف طاری ہونے لگتا ہے کہ شہر والوں کو نہ معلوم ہو جائے اور وہ اس کا مذاق اڑانے لگیں۔ شادی کے دوسرے امیدواروں کو ہیرو کا دوست دھکا کر بھگا دیتا ہے۔ لیکن جب دلہن گرجا جانے کے لیے تیار ہوتی تو ہیرو کھڑکی سے کود کر بھاگ

جاتا ہے۔

گوگول کے ڈرامے بے حد پسند کیے گئے۔ خود زار نکولائی نے اسے پڑھا، بہت پسند کیا اور اسٹیج پر دکھائے جانے کا حکم دیا۔ پہلے شو میں خود بھی جا کر بیٹھے اور داد دینے میں پیش پیش رہا مگر سرکاری عہدیداروں نے مخالفت کا طوفان کھڑا کر دیا۔ اور اسٹیج پر دکھانے کی قطعی ممانعت کرا کے دم لیا۔ اس ڈرامے نے گوگول میں قومی اصلاح کی روح بیدار کر دی۔ مشاہدہ، باریک بینی اور ذہانت کے ساتھ بس ان کا نقطۂ نظر بدل گیا۔ اہلِ روس کو حقیقتِ حال سے باخبر کرنے کے لیے حیرت انگیز تصویریں پیش کر کے تبدیلی اور بہتر زندگی کی آرزوؤں سے عوامی ضمیر کو روشن کرتا تھا۔

گوگول کی اگلی چھلانگ "مُردہ روحیں" تھیں۔ اس ناول میں انہیں روسی زندگی کا بھرپور مرقع پیش کرنا تھا جس کے لیے لچکدار پلاٹ کا ناول نگار نے انتخاب کیا۔ پلاٹ پختہ ہے۔ تسلسل کی کوئی ذمہ داری نہ تھی۔ "مردہ روحیں" کا ہیرو، چچیکوف ایک نہایت معمر چالاک، خود غرض اور عیار انسان ہے۔ جو غبن اور رشوت کے الزام میں دو دفعہ سرکاری ملازمت سے برطرف کیا جاتا ہے۔ وہ روپیہ کمانے کا ایک نیا راستہ تلاش کر لیتا ہے۔ مردہ روحیں خرید لینا۔ اس زمانے میں روسی کسان، زمینداروں کے غلام تھے۔ وہ آٹے، دال کی طرح بیچے اور خریدے جاتے تھے۔ زمینداروں پر لگان ان "روحوں" کے حساب سے لگایا جاتا۔ ہر دس سال بعد ہی مردم شماری ہوتی۔ اس لیے زمینداروں کو درمیان میں مر جانے والے کسانوں کا بھی لگان ادا کرنا پڑتا۔ ہیرو کی ترکیب یہ تھی کہ وہ زمینداروں سے سستے داموں پر ایسی "مردہ روحیں" خرید لے۔ جس کے لیے وہ ان سے ذاتی قیمتیں لگا کر ان سے بیع نامہ کر لے جیسا کہ اس زمانے میں زمینداروں کی خرید و فروخت میں کرایا جاتا تھا۔ پھر معقول رقم کے بدلے کسی بینک میں رہن رکھا دے۔ روحیں خریدنے کے لیے وہ ایک گاڑی میں بیٹھ کر اپنے تجارتی دورے پر روانہ ہوتا۔ وہ زمینداروں سے سودے کرتا۔ اس ڈرامے میں [illegible] کے کردار ابھرتے ہیں۔ [illegible] میں وہ [illegible] حاصل کرنے کی کوشش میں [illegible] انسانی زندگی کے گوشوں [illegible] خلافت کا اہتمام کیا ہے۔ جب [illegible]

[illegible] کو ستاتے. تو وہ گھبرا کر چلا اٹھے!
"انتقال ہاتھ دس کمی کیا عجیب ویرانہ ہے۔"

۱۸۴۲ء میں "مردہ روحیں" کی اشاعت پر ہونے والے تبصروں میں گوگول کی حقیقت نگاری کی تعریف کرتے ہوئے نقادوں نے کہا۔

جس سوسائٹی میں صرف ایسے ہی لوگ ہوں، جیسے کہ گوگول نے اپنے ناول میں دکھائے ہیں تو اس کا صفحۂ ہستی پر قائم رہنا ممکن ہے۔ "مردہ روحیں" کا یہ پہلا حصہ تھا۔ دوسرے حصے میں انھوں نے نجات کا راستہ دکھانے کا وعدہ کیا تھا۔ انھوں نے دوسرا حصہ لکھ کر تین بار جلایا۔ اُن کے انتقال کے بعد جو کچھ چھپا وہ نہایت ہی بے تکا تھا۔ دراصل ۱۸۴۲ء ہی میں گوگول نے دوستوں کو خطوط لکھے تھے کہ "اب انھوں نے ناول نگاری ترک کر دی ہے۔"

"ناک" گوگول کا طویل افسانہ ہے۔ جو انھوں نے ۱۸۳۳ء تا ۱۸۳۶ء مسلسل تین سال کے عرصے میں مکمل کیا۔ پشکن نے اسے اپنے رسالے "سوورمینک" (معاصر) کے تیسرے شمارے میں شائع کرتے ہوئے اپنے اِدارتی نوٹ میں لکھا تھا۔!

"نکولائی گوگول ایک عرصے تک اس مزاح کی اشاعت پر رضامند نہیں ہوئے۔ لیکن ہمیں اس میں اتنی غیر متوقع، دوراز کار خوش مذاق اور طبع زاد چیزیں ملیں کہ ہم نے اُن سے اصرار کیا کہ وہ اس خوشی میں، جو ہمیں ان کے مسودے سے حاصل ہوئی ہے۔ پبلک کو بھی شریک ہونے کی اجازت دیں۔"

"ناک" دراصل ایک تمثیل خواب کے پیرائے میں ہے۔ جس کے وسیلے سے روسی زندگی میں نوکر شاہی اور دوسرے سماجی طبقوں کی بدعنوانیوں، ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کا مذاق اُڑا کر سماجی، معاشرتی طنز و مزاح پیدا کیا گیا ہے۔

قیصہ "ناک"، میں کالجیٹ اسیسر یا میجر کووالیوف کی صبح جب آنکھ کھلتی ہے اور ناک پر نکلنے والا دانہ دیکھنے کے لیے آئینہ دیکھتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چہرے پر سے ناک ہی غائب ہے۔ [illegible] کے ناشتے میں ڈبل روٹی کے اندر سے برآمد ہوتی ہے۔ وہ اسے چھپانے کے [illegible] کرتے ہوئے پکڑے جاتے ہیں۔ میجر کا خوبصورت [illegible] شادی کے بدلے دو لاکھ روبل کی رقم اور نائب گورنری [illegible] تک ترقی کے سامنے خواب ہوا ہو جاتے ہیں۔ وہ پولیس کمشنر [illegible] اس کی رپورٹ لکھوانے جاتے ہیں۔ ناک کو ایک عہدیدار کی [illegible] گاڑی پر دیکھتے، حیرانی سے اس کا پیچھا کرتے گرجا پہنچتے ہیں [illegible] ناک اُن سے بات چیت کے بعد پھر فرار ہو جاتی ہے۔ وہ اس [illegible] کے لیے اخبار میں اشتہار دینے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ [illegible] سپرنٹنڈنٹ کے یہاں جاتے ہیں مگر اس کی بے رُخی سے [illegible] گھر آ جاتے ہیں۔ طرح طرح کے خدشات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اسٹاف افسر کی بیوی پر انہیں شبہ ہوتا ہے کہ چڑیلوں کی مدد سے اس نے ناک غائب کرا دی ہے۔ ایک پولیس انسپکٹر اُن کی ناک لاکر واپس کرتا ہے مگر ناک جڑ نہیں پاتی ڈاکٹر بھی ناکام ہو جاتا ہے۔ مایوسی میں اسٹاف افسر کی بیوی کو دھمکی آمیز خط لکھتے ہیں مگر جواب سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ پھر اچانک ناک اُن کے چہرے پر واپس آ جاتی ہے۔ اور سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔

گوگول کی "ناک"، عالمی ظریفانہ ادب میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ اس خیالیہ تمثیل میں انھوں نے معاشرہ نگاری کی ہے۔ سماج کے [illegible] طبقوں کے اوچھے پن کو نمایاں کر کے انھوں نے مزاح پیدا کیا ہے جس سے سماجی طنز ابھرتا ہے۔ وہ روسی سماج میں برائیوں، خامیوں [illegible] خامیوں اور بدعنوانیوں کو دکھاتے چلے جاتے ہیں۔ اُن کے تمام کردار سماج کے مختلف طبقوں کے نمائندہ کردار ہیں۔ "تماشہ بیں روسی زندگی" ہے۔ جو قاری کو ہنسنے کے بعد سوچنے کی دعوت دیتی ہے اور تبدیلی کے جذبے کو بیدار کرتی ہے۔

حجام ایوان کے وسیلے سے علم سے محروم محنت کش طبقے کو دکھایا گیا ہے کہ وہ کن برائیوں اور کمزوریوں میں مبتلا ہے۔ اپنی گھریلو زندگی اور باہری دنیا کو کیسا عذاب بنائے ہوئے تلخ بنائے ہوئے ہے۔

کالجیٹ اسیسر کے کردار سے انھوں نے سرکاری افسروں اور عہدوں کی نااہلی، خوشامد، نمود و نمائش، رشوت، بدکرداری اور [illegible]

کا بے عمل کردار بجا ہے۔ وہ اپنی ناک کو اونچی رکھنے کے لیے کوشش بھی جو کرتیں کرتے اور اپنی ناک کٹواتے رہتے ہیں اسی بات کو اجاگر کرنے کے لیے افسر شاہی کی ناک غائب کر دی ہے۔ جواری ہیڈ کلرک، بے زبان چھوٹے کوچوان، افسر، کلرک، اشتہاری کاروبار افسروں کی بیویاں لڑکیاں ڈاکٹر، پولیس حکام، نوکروں کے ساتھ مجاہد تاجر، غلام کسان، توہمات افواہ باز اور منافع خور، ہر طبقے اور سماجی سطحوں میں نا ہمواری کا مزا لے لے کر، گوگول نے "ناک" میں جی بھر کے مذاق اڑایا ہے اور منی کے پردے میں قاری کو دکھا دیا کہ اس سماج کی جڑیں اب کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ بلا سماجی نظام میں تبدیلی اور انقلاب کے سماجی اصلاح اور بہتری ممکن نہیں۔

بلاشبہ گوگول ایک عظیم طنز و مزاح نگار ہیں۔ جو نہ صرف ظرافت کے فن پر قادر ہیں بلکہ انہوں نے عوام الناس کی ایک ایسی نئی شاہراہ بنائی جس پر عالمی ظرافت کا کارواں رواں دواں ہے۔ ان کے چراغ سے جو چراغ جلے ان میں روسی ظرافت کے علمبرداروں میں شیدرین اور چیخوف جیسے نام اس بات کی ضمانت ہیں کہ پھر روسی کلاسیکی ظرافت نکھرتی ہی چلی گئی۔ جو بلاشبہ گوگول کا فیض ہے۔ گوگول نے اپنی مختصر سی زندگی میں ظرافت کے فن کو اتنا مالا مال کیا کہ ہم ان کے "ناک" جیسے شاہکاروں سے جتنا بھی لطف اندوز ہوں اور فیض اٹھائیں کم ہے۔

اعلان بابت ملکیت

مالک : تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

قومیت : ہندوستانی

حصہ دار : تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

ایڈیٹر : نورالحسن نقوی

قومیت : ہندوستانی

پرنٹر پبلشر : نورالحسن نقوی

قومیت : ہندوستانی

پریس : ایس۔ کے۔ آفسیٹ پریس۔

اشاعت کی مدت : پندرہ روزہ

مقام اشاعت : شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

میں اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اطلاعات میرے یقین کی حد تک درست ہیں۔

نورالحسن نقوی

صبیح محسن

کاغذی ڈھال

خیال یہ تھا کہ عائلی قوانین کے اس دور میں جبکہ بیویوں کو کھٹکا نہ رہا ہو گا یا اسے سوکن کا کھٹکا بالکل ختم ہو جائے گا لیکن برا ہو خواتین کے ذوقِ خود آزاری کا کہ ایسا نہ ہو سکا اور حوا کی بیٹیوں نے ہم بیچارے آدم کے بیٹوں کی بعض عادتوں یا مصروفیتوں یہاں تک کہ مجبوریوں کو بھی رقیبانہ نگاہوں سے دیکھ دیکھ کر انھیں سوکن کا درجہ دے دیا۔

اب اس سوکن کو ہی لیجیے جس کا ہمیں نصف کشتہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ انھیں ہمارے اخبار پڑھنے پر شدید اعتراض ہے۔ ہم نے انھیں لاکھ سمجھایا کہ اے نیک بخت! اس زمانے میں جب کسی کو یہ نہ معلوم ہو کہ کل صبح برازیل کے صدر کو چھینکیں آئی تھیں یا یہ کہ چھانگا مانگا سے ساہیوال جانے والی بس اور ایک مست خرام بھینس کی ٹکر میں کتنے مسافروں کو کہاں کہاں خراشیں آئیں، اسے پڑھے لکھے لوگوں کی مجلس میں بیٹھنے کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن نہ ہماری ان باتوں کا اُن پر کوئی اثر ہوا اور نہ اخبار سے اُن کا جلاپا کم ہوا۔

مگر صاحب ہم بھی ایک ہی چکنے گھڑے واقع ہوئے ہیں۔ وہ لاکھ آنکھیں لال پیلی کریں، دانت پیسیں، ہونٹ چبائیں، ہم گھر پہنچتے ہی اخبار سنبھال لیتے ہیں۔ اب ہوتا یہ ہے کہ اخبار ہاتھ میں ہے اور آنکھیں افریقہ میں ہولناک قحط کی خبر پہ، پانی کا گلاس ہونٹوں پہ ہے اور کنکھیوں سے نیو کراچی میں نلکوں کے خشک ہو جانے پر خصوصی رپورٹ دیکھ رہے ہیں۔

اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی دانست میں کوئی بہت ہی اہم بات کہہ رہی ہوتی ہیں اور ہم ہیں کہ اخبار میں گم۔ اس کے بعد اخبار ایک جھٹکے کے ساتھ ہمارے ہاتھوں سے چھوٹ کر دور جا پڑتا ہے اور ایک تند سی آواز آتی ہے، "پھر وہی اخبار!"

ہم کھسیانی سی مسکراہٹ چہرے پر طاری کرتے ہوئے اُن سے پوچھتے "ہاں ہاں تو کیا کہہ رہی تھیں آپ ۔۔۔؟"

"خاک کہہ رہی تھی۔ آپ کو اخبار سے کبھی فرصت بھی تو ہو۔"

اُن کا کہنا ہے کہ نارمل تک پہنچتے پہنچتے جس وقت گفتگو اور وہ اپنے اصل موضوع پر واپس پہنچتی ہیں، ہم تو بیٹھے بیٹھے نیند کے مزے لے رہے ہوتے ہیں یا پھر اخبار میں غرق ہو چکے ہوتے ہیں۔

مزے کی بات یہ ہے کہ ہمیں اوثق ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جب ہم دفتر میں ہوتے ہیں تو ہماری غیر حاضری میں یا یوں کہیے کہ ہماری نظر بچا کر وہ خود بڑے انہماک اور دلچسپی کے ساتھ اخبار کا مطالعہ فرماتی ہیں۔ ایک دن ہمت کر کے ہم نے اُن سے پوچھ ہی لیا کہ جب آپ اپنے لیے اخبار پڑھنا معصیت نہیں سمجھتیں تو ہمارے لیے اس شغل پر پابندی کیوں؟ جواب ملا "ہم کوئی آپ کی موجودگی میں تھوڑا ہی پڑھتے ہیں۔ لیکن آپ ۔۔۔؟ آپ تو ٹھیک اسی وقت لے کر بیٹھتے ہیں جب ہمیں فرصت ہوتی ہے اور ہم آپ سے دو چار باتیں کرنے آتے ہیں۔"

کہتی تو ٹھیک ہی ہیں وہ، اس لیے اب آپ ہمارا دکھڑا بھی سن لیجیے۔ قصہ اصل میں یہ ہے کہ جب بھی ہمارے اور اُن کے درمیان [illegible] اُن کے دو چار باتیں ہوتی ہیں تو موضوعِ گفتگو ابتدا میں خواہ کچھ ہی ہو، گھوم گھما کر بات منّے میاں پر پہنچ جاتی ہے اور ان مسائل کا ذکر شروع ہو جاتا ہے جن کے تذکرے سے ہم اس لیے کتراتے ہیں کہ مقصود اُن سے قطعِ [illegible]

کل ہی کی بات ہے۔ ہم نے جی کڑا کر کے اخبار ایک طرف رکھ دیا تھا اور ہم دونوں ننھے میاں کی معصوم حرکتوں کا تذکرہ کر کے محظوظ ہو رہے تھے۔ اخبار کے رپورٹر کی زبان میں بات چیت بڑے ہی خوشگوار ماحول میں ہو رہی تھی۔ اچانک اُن کے چہرے پہ افسردگی کے آثار پیدا ہوئے۔ ہم چوکنے ہو گئے تاکہ

نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر کہا گیا۔ ہائے بیچارے نانا نانی تو دیکھنے کو ہی ترس گئے اور نہ جانے کب تک ترسیں گے۔

یہی خوشگوار ماحول، آن کی آن میں کشیدگی کے عالم میں تبدیل ہوگیا۔ ویسے آپ سے کیا چھپانا۔ دو سال بھی تو نہیں ہوئے ہم انھیں اُن کے میکے لے گئے تھے۔ یقین کیجیے اس سفر پر ہماری گھریلو معاشیات کو جو دھکا لگا تھا اس کے نتیجے میں ہمارا بجٹ عرصے تک خسارے میں چلتا رہا۔ چونکہ ہم ابھی تک اس بلا پھر ایسے کٹھن دور سے گزرنے کی سکت اپنے آپ میں نہیں پاتے اس لیے بوجہ شرمساری منہ چھپاتے پھرتے ہیں اور منہ چھپانے کے لیے اخبار کے صفحات سے بہتر اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟

اگلے وقتوں میں لوگ اک گونہ بے خودی کے لیے مے پیا کرتے تھے اور برملا کہتے تھے کہ اس سے غرض نشاط ہرگز نہیں۔ آج کے زمانے میں شاید بے خودی کی کچھ زیادہ ہی ضرورت ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ مے کے لیے نہ صرف زرِ نقد بلکہ زرِ مبادلہ بھی چاہیے کہ اسکاٹ لینڈ یا فرانس سے درآمد ہوتی ہے۔ اس لیے ہم جیسے خالی جیب جدوجہدِ زندگی کے مارے ہوئے بے خودی کے طلب گاروں یا فراریت پسندوں کے لیے مے کی جگہ اخبار نے لی ہے۔ اور لاکھ کوئی کچھ کہے، چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

تکلف برطرف ہمارے نزدیک اخبار کے مطالعے کا اصل مقصد دنیا کے حالات سے باخبر ہونا نہیں بلکہ اپنی حالت سے بے خبر ہو جانا ہے۔ اس کے صفحات میں کھو کر ہم اپنے ذاتی مسائل، ناکامیوں اور محرومیوں کو بھول جاتے ہیں۔ کچھ ہی دیر کے لیے سہی۔

خیر چھوڑیے ان باتوں کو آئیے اخبار پڑھیں۔

ضرورت

مسلمانوں کو یہ لازم ہے کہ عربی زبان کی تحصیل نہ چھوڑیں۔ یہ ہمارے باپ دادا کی مقدس زبان اور ہمارے قدیم ملک کی زبان ہے جو فصاحت و بلاغت میں سب ملک کی زبانوں میں لاثانی ہے۔ مگر افراط و تفریط نہ ہو۔ اسی زبان میں ہمارے مذہب کی ہدایتیں ہیں لیکن جب کہ ہماری معاش، ہماری بہتری، ہماری زندگی بہ آرام بسر ہونے کے ذریعے بلکہ ہمارے اس زمانے کے موافق آسان بنانے کے وسائل انگریزی زبان سیکھنے میں ہیں تو ہم کو اس طرف توجہ کرنی چاہیے۔

...... سرسید احمد خان

ترقی کا راز

انگریز قوم نے جو اس قدر ترقی کی ہے وہ صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ تمام علوم و فنون اسی زبان میں ہیں جو وہ لوگ بولتے ہیں۔ اگر انگریزی زبان میں تمام علوم و فنون نہ ہوتے بلکہ لیٹن یا گریک میں یا عربی فارسی میں ہوتے تو تمام انگریز اب تک ایسے ہی جاہل اور بے علم اور ناخواندہ ہوتے جیسے کہ بدنصیبی سے ہم لوگ ہندوستان میں جاہل ہیں اور آیندہ کو بھی جب تک کہ تمام علوم و فنون ہماری زبان میں نہ ہوں گے ہم جاہل اور ذلیل رہیں گے اور کبھی عام ترقی نہ ہوگی۔

سرسید احمد خان

اشفاق احمد

مسلمانوں کا فنِ خطاطی اور جلد سازی یورپ میں

خطاطی اور خوشنویسی مسلمانوں کا اپنا اچھوتا فن ہے۔ اس فن پر کسی بھی تہذیب کا پرتو یا عکس نظر نہیں آ رہا ہے۔ عربی رسم الخط مسلمانوں کا محبوب رسم الخط بن گیا کیونکہ یہ قرآن کا رسم الخط تھا۔ مسلمان اس رسم الخط کو صرف پسند ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اُن کے نزدیک اس کے لیے تقدس احترام اور پاکیزگی بھی ضروری تھی۔ اس کے علاوہ عربی رسم الخط خود خطاطی کو دعوت دیتا تھا۔ مثال کے طور پر اگر لفظ اللّٰہ کو غور سے دیکھا جائے تو ایک مخروطی شکل ابھرتی ہے۔ پھر زیب و زینت کے اجزاء ترکیبی کے ساتھ فن خطاطی کو بام پر پہنچانا آسان ہو گیا۔ مسلمانوں کا پڑھا لکھا طبقہ زیادہ تر کاتب اور خوش نویس بھی ہوا کرتا تھا۔ نسلاً بعد نسل یہ فن ترقی کرتا گیا۔ یہاں تک کہ فن خطاطی اوج کمال پر پہنچ گیا۔

مسلمان کاتب کی نگاہ میں قرآن کا ایک ایک حرف نیکیوں سے معمور اور ہر نقطہ آنکھ کی پتلی نظر آتا تھا۔ ان کا لکھنا ثواب سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے کسی جاندار کی شکل یا تصویر بنانا منع ہے اس لیے اچھا مصور بہترین خطاط بن گیا۔ بہت سے مسلمان بادشاہ خود قرآن کی کتابت کرتے تھے اور قرآن کی یہ تیار شدہ کاپیاں زیادہ قیمتی ہوتی تھیں۔

مسلمان خطاط اپنی مرضی کے مطابق اصل عبارت کی نقل کرتا اور ایک ایک حرف کو اپنی خواہش کے مطابق بہتر ترکیبی اجزاء کے ساتھ آراستہ اور مزین کرتا تھا۔ عربی جاننے والے فن کاروں نے فن خطاطی کو ہر ممکن طریقے سے ترقی و وسعت دینے کی کوشش کی اور ان فنکاروں کی وجہ سے یہ فن مکمل طور سے آراستہ ہو گیا۔ عیسائی یورپ کے اندر زیادہ تر عربی تحریر زینت بخشتی تھی۔ اس کے معنی اور مطالب سے تو

ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ یہ منقش تحریریں اطاعت گزاروں کی تذلیل کر رہی ہیں۔ ان کو اس بات کا ذرا بھی علم نہ ہوتا تھا کہ اس عبارت کا مطلب کیا ہے۔ یورپ کے کاریگر معنی تو سمجھنا درکنار عربی عبارت پڑھ بھی نہیں سکتے تھے لیکن دھیرے دھیرے تقلید میں مسلمانوں کے جانشین نارمنوں نے اپنے سکوں پر کلمات توحید و رسالت تک عربی حروف میں برقرار رکھا۔ یاس کی شکل و صورت سے آشنا ہو گئے تھے۔ ان کے سکوں پر عربی الفاظ پائے جاتے تھے۔ صلیب پر کوفی رسم الخط میں بسم اللّٰہ کا لفظ زینت کے طور پر لکھا جاتا تھا۔ اگر عیسائی کاریگر معنویت سے واقف ہوتا تو مقدس صلیب کے اوپر یہ لفظ کیسے لکھا جا سکتا تھا۔ یورپ میں فن خطاطی نہیں پایا جاتا تھا۔ اس لیے عربی الفاظ اور عبارت کی خوبصورتی اور آرائش کو دیکھ کر یورپ کا کاریگر نقالی پر مجبور تھا۔ اگرچہ مطلب کچھ بھی ہو۔ مریم عذرا کی شبیہ اور عبا کے حاشیوں پر بھی عربی حروف کا استعمال کیا گیا تھا۔ انھیں عربی حروف کا استعمال ریشمی پارچہ جات، ملبوسات اور ظروف سے سیکھا جو مشرق سے یورپ لائے گئے تھے۔ اس کے طشتری، گلدان، گلاس، صراحی وغیرہ ظروف پر خط کوفی جلوہ گر تھا۔ یہاں تک کہ دندان کلید کوفی حروف میں نظر آتے تھے۔

کاغذ کی ایجاد کا سہرا چینیوں کے سر ہے لیکن وسط ایشیا کا جب مسلمانوں نے فتح کیا جو زیادہ تر چینیوں کے زیرِ اثر تھا اور اسی سے چین کی ریشمی تجارتی شاہراہ بھی گزرتی تھی تو چینی تہذیب و [illegible] سے دوچار ہونا لازمی ہو گیا۔ [illegible]ء میں سمرقند فتح ہوا، جہاں کاغذ کے چینی کاریگر موجود تھے۔ مسلمانوں نے ان کاریگروں سے کاغذ سا

کا فن سیکھنا شروع کیا۔ بارھویں صدی میں یہ فن مسلمانوں کے ذریعہ یورپ پہنچا۔ خود مسلمانوں نے اسپین اور سسلی کے اندر کاغذ کے کارخانے قائم کیے۔ سسلی سے آسانی کے ساتھ یہ فن اٹلی میں رواج پانا شروع ہوگیا۔ یورپ نے جب کاغذ سازی کا فن مسلمانوں سے سیکھا تو وہیں سے کاغذ کا استعمال سیکھنا برحق سمجھنا ثابت ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے کاغذ کا بھرپور استعمال نویں صدی میں شروع کر دیا تھا۔ عربی مسودات، ملفوظات لکھنے کے لیے کاغذ کا استعمال ہوتا تھا۔ مجلد کتابیں وجود میں آنا شروع ہوگئیں۔ پھر جلد سازی کا کام جاری ہوگیا۔

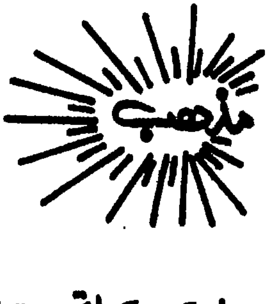
جلد سازی میں چمڑہ، ٹھپہ، سطح کی آرائش، سنہری رنگ، قرمزی رنگ، شاندار لفافے، ڈیزائن، نئے آرائشی عناصر، قدرتی مناظر، خطاطی کے نمونے، ابری، لیس وغیرہ کا استعمال شروع ہوا، جن کو مسلمان کاریگروں اور جلد سازوں نے تکمیل تک پہنچایا۔ انیسویں صدی میں یورپ کے اندر جلد سازی کا کام مشین کے ذریعہ شروع ہوا تو مشین کی جلد سازی میں مسلمانوں کی قدیم ہاتھ کی بنائی ہوئی جلدوں کو خاص طور سے ملحوظ رکھا گیا۔ کتاب مزین کرنے

کا فن جو دمشق کے دوسرے فنون کی طرح سے مذہب سے اثر پذیر تھا۔ قرآن پاک کو مزین کرنا مسلمانوں کی ایجاد تھی۔ بیشک اس طرح کتاب مزین کرنے کا فن خاص طور سے جلد سازی کا فن مسلمانوں کے ذریعہ عیسائیوں تک پہنچا۔ مسلمانوں نے کاغذ کا استعمال چینیوں سے سیکھ کر عیسائیوں تک پہنچایا۔ اس کارنامے کی وجہ سے یورپ میں چھپائی کی ایجاد آسان ہوگئی۔

جلد سازی کے کام میں مسلمان یکتائے روزگار ہوئے، لیکن تعجب یہ ہے کہ آج کے مشینی دور میں بھی وہ جلد سازی کے کام میں چھپا ہوا زیادہ تر ہاتھوں سے کام لے رہا ہے۔ مگر پھر بھی جلد سازی اور کتاب سازی کی جو مثالیں قائم کی گئیں وہ آج بھی قابل تقلید ہیں۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی



ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار

قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں

اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

راحت ابرار

مسلم یونیورسٹی کے شب و روز

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام انڈین اکیڈمی برائے نیورو سائنس کی پانچویں سالانہ کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے میسی ٹیپی یونیورسٹی، امریکہ کے وائس چانسلر پروفیسر جون اوٹن نے کہا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں امریکہ والوں کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہو گیا ہے اور اب وہاں ساٹھ سال کا انسان ضعیف تصور نہیں کیا جاتا بلکہ ضعیفی کا تصور ۸۰ سال کی عمر کے بعد شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ میں سائنس کی تحقیقات کے نتیجہ میں انسان کا قدم چاند پر پہنچ گیا ہے مگر ہم نیورو سائنسداں اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ زمین پر رہنے والے ہر انسان کو ذہنی سکون میسر ہو۔

پروفیسر اوٹن نے کہا کہ امریکہ کے لوگ جیٹ ایج میں رہ کر سائنس کی اس تازہ ترین شاخ یعنی نیورو سائنس پر کام کرتے ہیں جبکہ ہندوستان کے لوگ ابھی رکشہ کا استعمال کرتے ہیں۔ اس کے باوجود تحقیقی کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے دہلی سے علی گڑھ ریل میں سفر کیا اور یہاں پہلی مرتبہ رکشہ کا استعمال کیا جو میری زندگی کا انتہائی عجیب تجربہ تھا۔

اس سے قبل مسلم یونیورسٹی کے قائم مقام وائس چانسلر پروفیسر [illegible] الرحمن نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ انسانی دماغ آج تک ایک معمہ ہے جسے مکمل طور پر حل نہیں کیا جا سکتا۔ دماغ کو جسمانی دیگر اعضاء سے [illegible] الگ کرتی ہے وہ اس کی عجیب و غریب کارکردگی ہے جو اطلاعات کا ذخیرہ جمع کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے سے متعلق ہے۔ دماغ [illegible] کہیں زیادہ عجیب و غریب ہے [illegible] کا انحصار در آمد پر ہے اور ان کی ترتیب پر ہے جو وہ اپنے رضاکار پروگرام سے حاصل کرتا ہے۔ اس [illegible] سوچنے اور تخلیق کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ انھوں نے کہا کہ جدید سائنس کے ذریعہ آئندہ سالوں میں الزائمر، پارکنسن جیسے مسائل کا حل ممکن ہو سکے گا۔ ایک عام آدمی کے لیے اس بات کی ضمانت فراہم کی جا چکی ہے کہ وہ بعض دواؤں سے اپنے موڈ کو کنٹرول میں رکھ سکے۔ ان حقیقی کارہائے نمایاں کے علاوہ بالعموم نیورو سائنس سے متعلق تحقیقات اور بالخصوص خواب آور دواؤں کی دریافت مستقبل کے لیے نہایت خوش آئند پہلو لیے ہوئے ہے۔

جواہر لال نہرو میڈیکل کالج کے پرنسپل پروفیسر مہدی حسن نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ ہمارے جواں سال وزیر اعظم [illegible] گاندھی کی فعال قیادت اور وزیر صحت کی کامیاب کوششوں نے [illegible] اکیسویں صدی میں داخل کر دیا ہے۔ انھوں نے اکادمی کو جانب سے یقین دلاتے ہوئے کہا کہ ہم اپنے طبی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔

اس موقع پر نیورو سائنس اکادمی کی جانب سے اپنے ممبران کی اعلیٰ خدمات کی ستائش کی گئی اور خصوصی تقسیم اسناد کے ذریعہ امریکہ کے پروفیسر ایس ایس پرمار، پروفیسر سکسینہ، پروفیسر مہدی حسن، ڈاکٹر کے سی سنگھل کو فیلوشپ عطا کی گئی۔

اس تین روزہ کانفرنس میں ملک و بیرون ملک کے نامور دماغی سائنس دانوں نے حصہ لیا۔

٭٭٭

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ٹنڈر نوٹس

مندرجہ ذیل کاموں کی تکمیل کے لیے سی. پی. ڈبلیو. ڈی کے اے/بی کلاس ٹھیکیداروں/ بلڈنگ ڈپارٹمنٹ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے ٹھیکیداروں سے یا پی. ڈبلیو. ڈی، ریلوے اور ایم ای ایس وغیرہ کے مساوی درجہ کے ٹھیکیداروں سے جو متعلقہ کام کا سابقہ تجربہ رکھتے ہیں، آئیٹم ریٹ کی بنا پر سربمہر ٹنڈر طلب کیے جاتے ہیں۔ جو فرمیں یا ادارے سرکاری محکموں سے رجسٹرڈ نہیں ہیں، اُن کے ٹنڈر بھی قابلیت کی بنا پر زیر غور رہیں گے۔

جو ٹھیکیدار بلڈنگ ڈپارٹمنٹ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے رجسٹرڈ نہیں ہیں بمطابق تفصیلات اور گزشتہ پانچ برسوں کے دوران انجام دیے متعلقہ کاموں کے ثبوت نامے پیش کریں۔ ٹنڈر دستاویزات دفتر یونیورسٹی انجینئر سے کام کے کسی بھی دن حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ ٹنڈر فارم کی فروخت کھلنے کی تاریخ سے دو روز قبل بند کر دی جائے گی۔ ٹینڈر کھلنے کی تاریخ کو دوپہر ایک بجے تک وصول کیے جائیں گے۔ ٹینڈر ۲۷ مارچ ۱۹۷۸ ساڑھے تین بجے سہ پہر کھول دیے جائیں گے۔

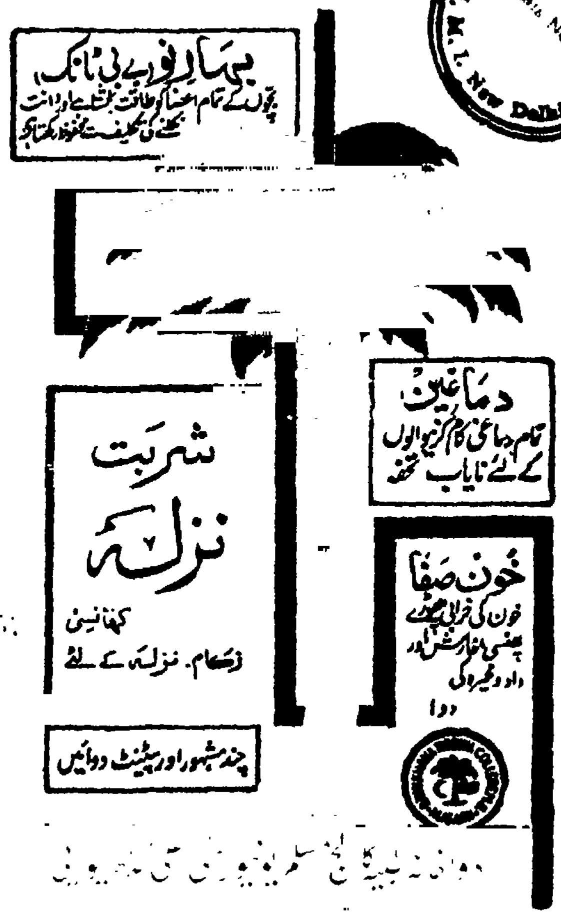
تکمیل کی مدت	ٹنڈر کی قیمت	زر بیعانہ	ٹینڈر کی تخمینہ لاگت	کام کا نام	نمبر شمار
۴ ماہ۔	۱۰/-	۱۲۵۲۵/- روپے	۵۰۰۹۱۰/- روپے	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں جنرل سیکشن کی دسول اور سینیٹری ورکس کی تعمیر۔	۱۔

دستخط

لیفٹننٹ کرنل حسن مظفر

یونیورسٹی انجینئر

Tahzibul Akhlaq Fortnightly 16th to31st March 86 Regd. No. L/ALG 247



Litho Colour Printers, Achal Tal, G. T. Road, Aligarh Phone : 4185

تہذیب الاخلاق

Rs.
1.50

THE MOHAMMEDAN
SOCIAL REFORMER
تہذیب الاخلاق

جلد ۵ یکم تا ۱۵ اپریل ۱۹۸۶ء شمارہ ۷

مندرجات

۱۔ خطبہ حجۃ الوداع ——— ۲
۲۔ خالد بن ولید (تیرھویں قسط) قاضی عبدالستار ——— ۳
۳۔ میراث ——— خوشہ چیں ——— ۸
۴۔ چچا چھکن کا چوتھا خواب ——— جارج گیبر
ترجمہ: انیس عالم ۱۴
۵۔ تعلیم نسواں ——— ثمینہ سلیم ——— ۱۷
۶۔ فرقہ ملامتیہ ——— کبیر احمد جائسی ——— ۲۱
۷۔ ابن رشد ——— احسان اللہ، اظہر حسین ——— ۲۴
۸۔ حیات بعد ممات ——— غلام یحییٰ انجم ——— ۲۷
۹۔ مسلم یونیورسٹی کے شب و روز راحت ابرار ——— ۳۱

بانی: سر سید احمد خاں
سرپرست: سید ہاشم علی
وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
مدیر: سید حامد
مدیر مسئول: نورالحسن نقوی
مدیر معاون: قمرالہدیٰ فریدی

مجلس ادارت:
پروفیسر نعیم انصاری
پروفیسر اسرار احمد
ڈاکٹر عالم حسین

نقش نویس: سرفراز

ترسیل زر کا پتہ: پروفیسر مظہر عباس نقوی
ٹریژرر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ،
شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
قیمت فی شمارہ: ڈیڑھ روپیہ
زر سالانہ: تیس روپے
تاحیات: تین سو روپے

سرورِ کائنات ﷺ کا

خُطبہ حجّۃ الوداع

لوگو! میری بات سنو، میں نہیں سمجھتا کہ ہم آئندہ کبھی اس طرح کسی مجلس میں یکجا ہو سکیں گے۔

لوگو! ارشاد خداوندی ہے ــــ "انسانو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں جماعتوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا کہ تم الگ الگ پہچانے جا سکو۔ تم میں زیادہ عزت و کرامت والا اللہ کے نزدیک وہی ہے جو اس سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔"

چنانچہ نہ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت ہے نہ عجمی کو عربی پر۔ نہ کالا گورے سے افضل ہے نہ گورا کالے سے۔ بزرگی اور فضیلت کا کوئی معیار ہے تو وہ تقویٰ ہے۔

تمام انسان آدم کی اولاد ہیں۔ اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

قریش کے لوگو! خدا نے تمہاری جھوٹی نخوت کو ختم کر ڈالا اور باپ دادا کے کارناموں پر تمہارے فخر و مباہات کی کوئی گنجائش نہیں۔ لوگو! تمہارے خون و مال اور عزتیں ایک دوسرے پر ہمیشہ کے لیے قطعاً حرام کر دی گئیں۔

تم سب خدا کے آگے جاؤ گے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس فرمائے گا۔

دیکھو میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہیں ایسا نہ ہو کہ آپس ہی میں کشت و خون کرنے لگو۔

اگر کسی کے پاس امانت رکھوائی جائے تو وہ اس بات کا پابند ہے کہ امانت رکھوانے والے کو امانت پہنچا دے۔

ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اور سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اپنے غلاموں کا خیال رکھو۔ اپنے غلاموں کا خیال رکھو۔ انہیں وہ کھلاؤ جو خود کھاتے ہو۔ ویسا ہی پہناؤ جیسا تم پہنتے ہو۔

دورِ جاہلیت کا سب کچھ میں نے اپنے پیروں تلے روند دیا۔ زمانۂ جاہلیت کے خون کے سارے انتقام اب کالعدم ہیں۔ پہلا انتقام جسے میں کالعدم قرار دیتا ہوں میرے اپنے خاندان کا ہے۔ ربیعہ بن الحارث کے دودھ پیتے بیٹے کا خون جسے بنو ہذیل نے مار ڈالا تھا میں معاف کرتا ہوں۔

لوگو! خدا نے ہر حق دار کو اس کا حق خود دے دیا۔ اب کوئی کسی وارث کے حق کے لیے وصیت نہ کرے۔

بچہ اسی کی طرف منسوب کیا جائے گا جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا۔ جس پر حرام کاری ثابت ہو اس کی سزا پتھر ہے۔ حساب کتاب خدا کے یہاں ہوگا۔

جو کوئی اپنا نسب بدلے، یا کوئی غلام اپنے آقا کے بجائے کسی اور کو اپنا آقا ظاہر کرے اس پر اللہ کی لعنت۔

قرض قابلِ ادائگی ہے۔ عاریتاً لی ہوئی چیز واپس کرنی چاہیے۔ تحفے کا بدلہ دینا چاہیے۔ اور جو کوئی کسی کا ضامن بنے وہ تاوان ادا کرے۔

کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے کچھ لے، سوائے اس کے جس پر اس کا بھائی راضی ہو۔ اور خوشی خوشی دے۔ خود پر اور ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرو۔

عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کا مال اس کی اجازت کے بغیر کسی کو دے۔ دیکھو! تم پر تمہاری عورتوں کے کچھ حقوق ہیں اور اسی طرح ان پر تمہارے حقوق ہیں۔

عورتوں پر تمہارا یہ حق ہے کہ وہ اپنے پاس کسی ایسے شخص کو نہ بلائیں جسے تم پسند نہیں کرتے۔ اور وہ کوئی خیانت نہ کریں۔ کوئی کام کھلی بے حیائی کا نہ کریں۔ اور اگر وہ ایسا کریں تو خدا کی جانب سے اس کی اجازت ہے کہ تم انہیں معمولی سزا دو اور وہ باز آجائیں تو انہیں اچھی طرح کھلاؤ، پہناؤ۔

پروفیسر قاضی عبدالستار

خالد بن ولید

"یا امیر۔ فحل پر شاہی فوجوں کا جماؤ دیکھا گیا ہے"

"فحل ؟"

"جی ہاں فحل"

ابی سفیان نے سپہ سالار کو مخاطب کیا:

"یہ تمام علاقے دیکھے ہوئے ہیں۔ فحل اس شاہراہ پر جو بیت المقدس کو جاتی ہے ایک بڑی بستی ہے"

شرحبیل بن حسنہ نے دخل دیا۔

"یعنی سیف اللہ کے بیان کی تائید ہو چکی۔ حمص سے ہرقل کے حکم سے القدس کے لیے لشکر نکل چکے اب اگر حمص پر چڑھتے ہیں تو ہماری پشت اور فحل کی تلواریں اور اگر ہم فحل کی طرف بڑھتے ہیں تو حمص کے لشکر ہمارے عقب میں پہنچ جاتے ہیں۔"

ان کی بات ختم ہوئی تھی کہ عشاء کی اذان سنتے ہی سب کھڑے ہو گئے۔

حمص کے امپیریل کیمپ پر شہنشاہ القدس کے بطریق اعظم کی پیشوائی کی تیاریاں کر رہا تھا کہ جاسوس نے تصدیق کے ساتھ خبر دی۔ نائب رسول اللہ کا انتقال ہو گیا۔ عمر بن خطاب مسلمانوں کے خلیفہ ہو گئے۔ نئے خلیفہ کے پہلے حکم نے آسانی تلوار کو معزول کر دیا۔ اور ابو عبیدہ کے ماتحت کر دیا۔ بڑے بڑے سپہ سالار خصوصاً یزید بن ابی سفیان، عمرو بن العاص عیاض بن غنم، شرحبیل بن حسنہ اور قباث بن اشیم دار الخلافت کے اس فیصلے سے برہم ہو چکے ہیں اور فوج میں خاموش بغاوت کے آثار ہیں۔ ثبوت یہ ہے کہ اتنی بڑی فتح کے باوجود اسلامی فوج یرموک میں بندھی پڑی ہے کہ کہیں بڑے سپہ سالار اپنی وفادار فوجوں کے ساتھ بغاوت نہ کر دیں۔

کتنے دنوں بعد ہرقل کے چہرے پر تبسم روشن ہوا تخت کے جواہر نگار تکیے سے پشت لگائی زریں پائیدان سے ایک پیر اٹھا اور مسند پر سوار ہو گیا۔ رومی قاقم کی دیواروں کے گلستانوں میں بھٹکتی بیدار نگاہ میناس اور وردان اور سپہر اور خاندانِ شاہی کے افراد عالی مقام کے چہروں کی سیر کرتی قد آدم شمعوں کی زریں بیٹھکوں پر جم گئی۔

"بطریق اعظم کے ورود مسعود کی برکت نے اس خبر سے سرفراز کیا لیکن ابھی تک وہ خبر نہیں موصول ہوئی جس کا ہم انتظار کر رہے ہیں۔ عبیدہ کیا چاہتا ہے۔ مدینے کی کمک کا انتظار کر رہا ہے تو منزلِ مقصود کیا ہے؟"

ہرقل بول رہا تھا۔ جیسے خود کلامی کر رہا ہو۔ سب سن رہے تھے۔ سر سے پاؤں تک سماعت بنے ہوئے، تخت کے جواہر، ستونوں کی چاندی، قالین کے پھول، اور رومتہ الکبریٰ کے امرائے عظام، وہ ستون اعظم جن کی صلابت پر سلطنتیں قائم رہتی ہیں۔

"رومتہ الکبریٰ کی ولایت شام میں پڑے ہوئے ہرقل کو نہیں معلوم کہ شام کے کس شہر پر جنگ ہونے والی ہے۔ سات سو جاسوس دامن دولت سے وابستہ ہیں لیکن یہ نہیں بتلا سکتے کہ عبیدہ کیا سوچ رہا ہے ۔۔۔ شام جیسا حسین ملک مقدس ملک ہمارا برزخ ہو گیا ہے"

ہرقل کی نگاہ اٹھی تو میناس سر سے پاؤں تک چمک گیا۔

"القدس کے گورنر کو فرمان دو کہ فحل کو چھاؤنی بنا دے، قدیم نمک خواروں اور آزمودہ کار فوجوں کو صرف پر انڈیل دو ۔۔۔ اگر عبیدہ القدس کی طرف بڑھتا ہے تو فحل اور صرف کی پوری طاقت پشت پہ ڈال دو۔ اگر حمص کی طرف آتا ہے تو بھی اس کی پشت کچل دو"

تخت سے اترا ۔۔۔ آہستہ آہستہ چلتا جرنیل کے سامنے آ گیا۔

"کاش یرموک کی کمان ہمارے ہاتھ میں ہوتی"

"کاش مدینے کا بادشاہ ہمارے مقابلے پر ہوتا اور ہم مدائن کے بادشاہ کی طرح اس کا شکار کھیلتے"

ہیثر کو غضب ناک نعروں سے دیکھا

"کہا جاتا ہے کہ اگر طوفان نہ آگیا ہوتا تو قسطنطنیہ یرموک فتح کرلیتا"

"کہا یہ جانا چاہیے تھا کہ طوفان کے باوجود قسطنطنیہ یرموک فتح کرلیا"

اب اس نے وردان کے چہرے کو سربلند کیا

"کسریٰ نے بھی ہم کو نابلوس کے محاذ پر کامیاب نہیں ہونے دیا تھا"

"نابلوس ہمارے دامن کا داغ"

"القدس کی فتح عظیم کی مہیب گرد کے نیچے اس طرح چھپ گیا۔ مٹ گیا کہ کسریٰ کے روزناموں کے علاوہ کہیں اس کا نام ونشان نہیں ملتا"

"لیکن یرموک"

"یرموک نے ہمارے وجود کو اس طرح ناپاک کردیا کہ مدینے کی ساری آبادی کا خون"

جملہ پورا کیے بغیر وہ انتہائی تیز قدموں سے چلتا ہوا ایک پردے میں غروب ہوگیا۔

اسلامی کیمپ میں جہاد کی عدم موجودگی جوشِ جہاد کو سُلانے لگی تھی۔ فتح الفتوح کا نشہ جو بکریوں کو شیروں پر چڑھا دیتا ہے اترنے لگا تھا۔ سیف اللہ کی معزولی سے بڑے بڑے سوالیہ نشان کھڑے ہونے لگے تھے۔ قبیلے اور خانوادے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ان پر اندیشوں کے گھونسلے بنانے لگے تھے عدیم النظیر معرکے اور فقید المثال کارنامے ایک زبان کے ایک فقرے کے سامنے بے مایہ ہو چکے تھے۔ بنی ہاشم اور بنی امیّہ اور بنی مخزوم اور مولفۃ القلوب اور انصار کے بڑے بڑے نام بغیر کسی ارادے اور کوشش کے ایک دوسرے کے قریب آنے لگے تھے۔ تیز ڈنک ہونے لگے تھے۔ رسول اور نائب رسول کے احکامات کی تردید کا مسئلہ اپنی تمام شعلہ سامانیوں کے ساتھ روشن ہونے لگا تھا۔ اور عام سپاہی میدانِ جنگ سے بددل ہونے لگے تھے۔ اور وہ آرزوئیں جنھیں غنیم کی موجودگی دبائے رکھتی ہے سر اٹھانے لگی تھیں۔ بوڑھے والدین کی آنسوؤں میں ڈوبی دعائیں اور بلکتے ہوئے بچوں کی پکاریں کانوں میں زہر ٹپکانے لگی تھیں۔

مجبوبوں سے آراستہ بستروں کی یادیں آنے لگی تھیں اور خبرداروں کی خبروں کی سرخیوں سے خون ٹپکنے لگا تھا کہ فحل پر کثیر فوجیں جمع ہوکر آراستہ ہوچکی تھیں شہنشاہ مشرق ومغرب کے وہ مشہور عالم سپہ سالار حاضر ہو چکے تھے جو دولتِ روم کی عظمت کے نشان تھے۔ وہ فوجیں گھوڑے کدانے لگی تھیں جن کے شانوں پر فتح بیت المقدس کے جھنڈے اڑ رہے تھے اور جن کے سالاروں کی کمریں ہرقل کے ہاتھ کی بندھی تلواریں چمک رہی تھیں۔

بڑے انتظار کے بعد دربارِ خلافت سے دمشق پر چڑھائی کا تائید نامہ میسر ہوا۔ اسی دن ظہر کی نماز کے وقت امین الامت نے مکبروں کے وسیلے سے ایک ایک سپاہی کو کوچ کا پیغام سنا دیا اور نماز ختم ہوتے ہی سپہ سالارانِ اسلام مشورے کے لیے بیٹھ گئے اور امین الامت نے فرمایا۔

"سیف اللہ سے میری گذارش ہے کہ یرموک کے میدان کی طرح دمشق کا محاذ بھی اپنی کمان میں سنبھال لیں"

"صدر سپہ سالار کو اپنی نیابت کسی سپہ سالار کو بھی سونپ دینے کا اختیار کلی حاصل ہے"

"بیشک حاصل ہے ــــ بیشک حاصل ہے"

تمام آوازوں نے تکرار کی۔ دیر کے بعد سیف اللہ کی آواز طلوع ہوئی۔

"علقمہ بن محکش کو دس ہزار فوج دے کر فحل کے راستے پر ڈال دیجیے۔ ذوالکلاع کو دو ہزار سواروں کے ساتھ صفر پر اتار دیجیے۔ علقمہ بن حکیم اور مسروق دو دو ہزار سواروں کے ساتھ حمص اور بیت المقدس کی شاہراہوں پر قابض ہوجائیں۔ باقی لشکر ایک ایک ہزار کی نفری میں تقسیم ہوکر دو دو چار چار کوس کا فاصلہ رکھ کر ایک کمان کی صورت میں عام راستوں سے دور دور دمشق کی طرف اس طرح جنبش کرے گویا دمشق ہماری منزل نہیں سب کچھ اس طرح انجام پذیر ہو کہ ہرقل کو پانچ لشکروں کی خبریں ایک ہی وقت میں موصول ہوں"

عمرو بن العاص اور یزید بن ابی سفیان ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ نمازِ مغرب کا سلام پھیرتے ہی انتہائی تیزی کے ساتھ خیمے کھلنے لگے

ہو رہے تھے۔ نماز ظہر پڑھ کر سارا لشکر ایک مشین کی طرح تقسیم ہو کر اپنے رہبروں کی رہبری میں ایک مشعل جلائے بغیر کوچ کرنے لگا۔ منصوبے کے مطابق چھوٹی چھوٹی پلٹنیں خوب پھیل گئیں اور بڑی بڑی رجمنٹیں سمٹ کر چلنے لگیں۔ اترنے لگیں۔

ابھی دمشق بیس کوس تھا اور نماز ظہر کے لیے صفیں کھڑی ہونے لگی تھیں کہ سیف اللہ نے اعلان کیا۔

"برادران اسلام۔ خدا نے توفیق دی تو ہم فجر کی نماز دمشق کے دروازوں پر پڑھیں گے"

نماز ختم ہوتے ہی چند سوار گھوڑوں پر چڑھے اور دونوں بازوؤں پر دور تک پھیلے ہوئے لشکروں کو دمشق کی بشارت دینے لگے۔

دمشق کے سورج کی آنکھ کھلی تو قیصر کے باب حکومت پر لشکروں کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ جولیان کی "چشم مشرق" مجاہد تیر اندازوں کا ہدف بن چکی تھی۔ خرقیل کے عروس البلاد سے عرب گھوڑے ترکتازیاں کر رہے تھے۔ اور "مشرق کی جنت" دمشق کے شرقی دروازے پر سیف اللہ کا علم کھل چکا تھا۔ عمرو بن العاص باب فرادیس پر تعینات ہو چکے تھے شرجیل بن حسنہ باب توما، قیس بن ہبیرہ باب کیسان اور امین الامت باب جابیہ پر اپنے نشان کھول چکے تھے۔

پورا شہر پچاس ہاتھ اونچی اور پانچ ہاتھ چوڑی پتھر کی فصیل کی حفاظت میں تھا اور فصیل کے چاروں طرف پچیس ہاتھ چوڑی خندق پانی سے لبریز تھی اور ہر دروازے کے سامنے کا پل توڑا جا چکا تھا۔ برجوں، کنگروں، مرغولوں اور رخنوں سے ان سواروں پر تیروں اور پتھروں کی بارش ہو رہی تھی جنھوں نے جوش جہاد میں گھوڑے خندق میں ڈال دیے تھے۔ شام تک سنگ و خدنگ کی آزمائش برپا رہی۔ حساب لیا گیا تو معلوم ہوا کہ فصیل کی سنگین بلا معمولی سی خراش سے بھی محفوظ ہے اور سینکڑوں سوار تیروں اور پتھروں سے لہو لہان پڑے ہیں۔

حمص میں ہرقل نے دمشق کی گرفتاری کی خبر تحیر اور تردد کے ساتھ سنی۔ جنرلوں کے ستے چہروں کو غور سے پڑھا سوچتی آوازوں اور دھیمے لہجوں میں ہوتے ڈھیلے ڈھالے لفظوں سے چھلکتے ابہام پر حیرت کا اظہار کیا۔ تمام جنرلوں کا متفقہ فیصلہ تسلیم کر لیا کہ ریگستان کے بیٹے دمشق کی سردی سے چیخ اٹھیں گے اور ہلاک ہو جائیں گے۔ [illegible] گھوڑیوں اور اونٹوں اور ٹھٹھرتے کانپتے سواروں کو شہر دمشق کی لاکھوں تلواریں مار کر بھگا دیں گی۔ نامہ بر کبوتروں کے ذریعے دمشق کے گورنر کے نام فرمان پہنچا کہ تمام جوان آبادی کو مسلح کر کے اس وقت کا انتظار کرے جب حمص اور فلق کی فوجیں اس کی نجات کو نازل ہو جائیں گی۔

مسلمانوں کے بوڑھے ٹھنڈے اور محتاط سپہ سالار اعظم نے مشرق کے سب سے قدیم اور جلیل المرتبت دار الخلافت کی فتح کے لیے کسی بے تابی کا اظہار نہیں کیا۔ یرموک کی فتح میں آئی ہوئی منجنیقوں کی وضع پر سینکڑوں منجنیقوں اور دبابوں کی تعمیر کا حکم دے دیا۔ سامان جنگ اور رسد کی فراہمی کا سلسلہ قائم کیا اور محاصرہ اتنا سخت کر دیا کہ دمشق چیخ اٹھا۔ دمشق کا بطریق چند عالموں کے ساتھ سفیر بن کر حاضر ہوا اس کو پیشوائی کا احترام دیا لیکن تمام شرطیں نامنظور کر دیں۔ حکم دیا کہ دمشق کی دولت کا پانچواں حصہ دینے پر جب رضامند ہو جانا تو دروازے کھول دینا ہم مسافروں کی طرح داخل ہو جائیں گے۔

موسم سرما جس کی آمد پر روضۃ الکبریٰ کے مشرقی بازو کی نجات کا انحصار تھا آ گیا۔ لیکن ریگستانوں کے فرزندوں نے ایک دو کمبلوں سے زیادہ کسی چیز کی پرواہ نہ کی۔ ساری ساری رات گھوڑوں کی پیٹھ پر گزار کر گدھوں کی طرح کسی دروازے کو ایک دراز کی اجازت نہ دی۔ دمشق محاصرے کا عادی ہو چکا تھا۔ زندگی نے سختیوں سے [illegible] کر دیا تھا اور معمولات کی بجا آوری پر رضامند ہو چکی تھی اور سیف اللہ پوری فصیل کا گشت لگا کر شرقی دروازے پر اپنے کیمپ کے سامنے اترے تھے کہ غلام نے جاسوس کو پیش کیا جو غسانی تھا اور اس سے پہلے بھی خدمتیں انجام دے چکا تھا اور اجرتیں وصول کر چکا تھا اس نے عرض کیا۔

"آج بطریق (لارڈ پادری) کے بیٹے کی شادی ہے۔ تمام شہر اور فوج کی دعوت ہے۔ شراب اور رقص و سرود سب ہو گا اور حسب سوا ہو گا۔"

حضرت نے اسے نظر بند کر دیا اور خاص اپنے لشکر کو طلب کیا اور اپنا منصوبہ کھول کر رکھ دیا۔ سب نے پرجوش تائید کی اور پوری

رازداری کے ساتھ ضروری سامان فراہم کرنے اٹھ گئے

دمشق کا خط آسمانی دھندلی روشنی سے روشن تھا اور گانے بجانے کی آوازیں آنے لگی تھیں ادھر کی خود فراموش آوازیں اٹھنے لگی تھیں، عراق سے آئے ہوئے پانچ سو مجاہدین نے اپنے سروں پر کپڑوں کی گٹھریاں باندھ کر رسیوں کی سیڑھیاں اور کمندیں پیٹھ پر لادیں اور ہوا سے بھری مشکوں کے سہارے ایک دوسرے کی مدد کرتے پانی کے جانوروں کی طرح خاموشی سے خندق پار کر گئے۔ جسم خشک کئے، کپڑے پہنے اور برجوں اور مرغولوں پر کمندیں پھینکنے لگے۔ جب ستر کمندیں لگ گئیں تب حضرت بنفسِ نفیس اپنے جانثاروں کے ساتھ فصیل پر پہنچے اور رسیوں کی سیڑھیاں برجوں سے بندھوادیں جب پورا بریگیڈ اوپر چڑھ کر نیچے اترنے لگا تو فصیل کے نیچے مشعلیں جلنے لگیں۔ مشعلوں کا جلنا تھا کہ پورے پانچ ہزار سواروں نے خندق میں کشتیاں ڈال دیں۔ سیف اللہ نے فصیل سے اترتے ہی دروازے کے بدمست نگہبانوں کو قابو میں کر لیا اور دروازہ کھول دیا۔ دمشق کا یہ مشرقی دروازہ تمام دروازوں سے زیادہ مضبوط تھا۔ فصیل کی خندق زیادہ چوڑی اور زیادہ گہری تھی اسی لیے سیف اللہ کے نام نکھا گیا تھا اور اسی لیے اس دروازے کی طرف سے رومی جنرل نے ایک حد تک غفلت برتی پانچ چھ ہزار فوج کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے تو نشاط اور شراب میں مست رومی فوج کا قتلِ عام شروع ہو گیا تو ماشاہ نے جو ہرقل کا داماد اور دمشق کا گورنر تھا انتہائی تیزی اور عیاری کے ساتھ ساری فوج سیف اللہ کے لشکر پر جھونک دیا اور شہر کے تمام دروازے کھول دیے اور امین الامت کے سامنے پہنچ کر ان کی تمام شرطیں تسلیم کر لینے کا اعلان کر دیا، اور گذارش کی کہ آپ فوراً اپنی عملداری قائم کر لیجیے کہ آسمانی تلوار نے قتل و خون کا بازار گرم کر دیا ہے۔ بھولے بھالے اور سیدھے سادے امین الامت تو ماشاہ کے فریب کا شکار ہو گئے اور سوار ہوتے ہی گھوڑا کڑکڑا دیا۔ سیف اللہ مارتے کاٹتے قصرِ حکومت کے سامنے پہنچ چکے تھے کہ امین الامت کا سامنا ہو گیا۔ سپہ سالارِ اعظم نے سیف اللہ کو حکم دیا کہ ہم نے اپنی شرطوں پر شہر کو امان دی اپنی تلواروں کو نیام کرو۔ سیف اللہ نے گردن جھکا دی اور تلوار نیام کر لی۔ تمام تلواریں غلاف ہو گئیں کسی ایک زبان سے یہ نہ نکلا کہ شہر کو ہم نے اپنی طاقت سے فتح کیا ہے کہ قومیں جب عروج کے راستے پر ہوتی ہیں ان کا سپاہی سے بڑا فرد انتہائی تنظیم ہوتا ہے۔ نظم و ضبط ہوتا ہے۔ جوان کا اپنے افسران کے غلط احکامات کی بھی تعمیل ہوتا ہے۔

تمام فوجیں قصرِ حکومت اور شاہی گرجا کے درمیانی میدان میں جمع ہونے لگیں۔ اس شامیانۂ عظیم میں جہاں تھوڑی دیر قبل رومی اور شامی اور مصری کنیزوں کے بدن اور شراب کے شیشے عیش و مستی کی بارش کر رہے تھے اور جو سینکڑوں شمع دانوں سے روشن تھا تو ماشاہ اور افواجِ شاہی کا کماندار جنرل بہتیک امین الامت کی خدمت میں حاضر تھے۔ امین الامت نے طلاکار قالین کا کونا اپنی تلوار کی نوک سے ہٹایا اور دری پر بیٹھ گئے ذوالکلاع حمیری صلح نامہ لکھنے لگے جس کے مطابق تین دن کی امان دی گئی دمشق کے ہر شخص کو حق تھا کہ اپنے مال و اسباب کے ساتھ جہاں چاہے چلا جائے۔ جو لوگ تین دن بعد بھی قیام کریں گے ان کو اپنی نصاب کی پیداوار کا پانچواں حصہ ادا کرنا ہوگا اور ایک روپیہ سالانہ جزیہ ادا کرنا ہوگا۔ سیف اللہ کی آنکھیں توماشاہ پر لگی ہوئی تھیں جس نے انتہائی چالاکی سے دمشق کی فتح ان سے چھین لی تھی اور مسلمان لشکر کو باہمی تلواروں کی نوک پر رکھ دیا تھا۔ جو اپنے بلند و بالا بھاری بھرکم بدن پر سجی ہوئی قاقم کی قبا کے زرنگار کمربند کے مرصع خنجر پر ہاتھ رکھے۔ جڑاؤ صلیب پہنے، شراب اور کامرانی کے نشے سے جھکتی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ کماندار ہربیس ریشمی کپڑوں پر تلوار پہنے سپاہی کے بجائے وزیر بنا گورنر کے اشاروں پر ناچ رہا تھا۔

ابھی رات باقی تھی کہ رومی رخصت ہو گئے۔ مسلمان سپہ سالاروں کے کیمپ اٹھنے لگے۔ امین الامت اسی بارگاہ میں بیٹھے رہے۔ سیف اللہ نے آہستہ آہستہ ان کے کان میں فتحِ دمشق کی تفصیل رکھ دی۔ وہ سر جھکائے بیٹھے رہے۔

"کاش سیف اللہ نے اپنے حملے کے متعلق ایک ذرا سا اشارہ کر دیا ہوتا۔"

"وقت کی کمی اور رازداری مانع رہی۔"

"تم تنظیم کا وہ مینارۂ نور ہو جس سے امت قیامت تک روشنی حاصل کرتی رہے گی۔"

دمشق کے تمام گھوڑے، خچر اور گدھے سامان سے بھر گئے۔ بوجھ

عورتیں اور بچے تک بگھیوں اور گھوڑیوں سے لد گئے۔ گورنر اور کمانداروں نے بھی
اپنی تمام فوج اور خزانے اسباب شاہی اور سامان جنگی نفیر اور قطیر کے
ساتھ نکلنے لگے۔ منجنیقوں اور دبابوں کو گھوڑے ڈھکیلنے لگے۔ سورج
ڈھلنے لگا تھا لیکن توماشاہ کے کارواں ابھی تک جا رہے تھے۔ اور امین
الامت اپنے خیمے پر سپہ سالاروں کے ساتھ کھڑے ان فوجوں کو دیکھ رہے
تھے جن کے گھوڑوں کی گردنیں اور شکس اسباب سے اٹی ہوئی تھیں اور لشکر
سوچ رہا تھا کہ یہ عسکری سامان معلوم نہیں کس میدان میں ہمارے سامنے
آئے گا۔ یہ لشکر نہیں حمص اور رقہ اور بیت المقدس میں پڑی ہوئی فوجوں
کے دانت اور پنجے ہیں یہ ہم سے واقف ہو چکے ہیں۔ یہ ہرقل کے جاسوس
ہیں جیسے دن کی شام تک مسلمانوں کی نفسیاتی بے چینی عروج تک
پہنچ چکی تھی ان کو معلوم تھا کہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی آبادی کا بڑا حصہ موجود
ہے مسلح ہے اور منظم ہے۔ ہرقل کا فرماں بردار ہے۔ چپے چپے سے واقف
ہے اور وہ خود جن کی تعداد پندرہ سولہ ہزار سے زیادہ نہ تھی لمبے چوڑے
شہر میں بکھرے ہوئے ہیں اور بند ہیں۔ زمین و آسمان تک اجنبی ہیں اور رومیوں
کی عیاری ضرب المثل ہے۔ امین الامت نے نماز عشاء کے بعد سپہ سالاروں کو
مشورے کے لیے طلب کیا اور لشکر نے اندیشے کھول کر ڈال دیے۔ سب
خاموش تھے سب کی نظریں سیف اللہ پر لگی تھیں جو پوری بے نیازی کے
ساتھ امین الامت کے پہلو میں بیٹھے تھے۔

"یا ابا سلیمان آپ اس طرح خاموش بیٹھے ہیں جیسے دمشق آپ نے
نہیں ہم نے فتح کیا ہے"

امین الامت کے اس فقرے پر سب مسکرا دیے۔ شرجیل بن
حسنہ نے کہا۔

"سیف اللہ نے دمشق فتح کر لیا۔ لیکن دمشق عام مجاہد کے اعصاب فتح
کیے ڈال رہا ہے"

سیف اللہ نے مڑ کر شرجیل بن حسنہ کو دیکھا۔

"دمشق کی فتح نے نہیں ــ صلح کی شرائط نے لشکر کو بے حواس کر دیا۔
خیر ــ یا امیر آپ نے جو فرمایا وہ مجھے معلوم تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ
[illegible] اطراف کی چیدہ فوجیں کہاں ہیں اور کن فوجوں کا انتظار کر رہی
ہیں [illegible] دمشق کی بادشاہت کا کیا منصوبہ بنا رہی ہیں"

"وہ کیسے یا ابا سلیمان؟"

امین الامت نے حیرت سے سوال کیا۔

"آپ جانتے ہیں یا امیر عساکر اسلام کہ میری سپہ سالاری میں لشکر نے کبھی
شکست کا منہ نہیں دیکھا"

"ساری دنیا جانتی ہے"

"اس کا سبب یہ ہے کہ میں دشمن کی معمولی سے معمولی تفصیل جاننے کی
کوشش کرتا ہوں۔ اس کے لیے درہم دینار خرچ نہیں کرتا بہاتا ہوں۔
جب دربار خلافت نے عراق کے مصارف جنگ کا حساب طلب کیا تو میں نے
لکھ دیا تھا کہ میں ایک ایک درہم کا نہیں ایک ایک قلعے اور ایک ایک شہر کا
حساب رکھنے کا عادی ہوں۔ درہم و دینار کا حساب لینا ہو تو سپہ سالار
کسی اور کو بنا دیجیے"

امین الامت نے با آواز بلند فرمایا۔

"اور عالم اسلام جانتا ہے کہ نائب رسول نے فرمایا تھا کہ اللہ کی اس
تلوار کو جسے ختم المرسلین نے علم کیا اسے غلاف کرنے والا میں کون ہوتا ہوں"

مرحبا کے نعروں سے خیمہ بھر گیا۔

"یا امیر ــ جب لشکر سوتا ہے تب میں جاسوسوں کی تلاش کرتا ہوں
انھیں خریدتا ہوں اور اپنے منصوبوں کو مالا مال کرتا ہوں اگر ایسا [illegible]
ہو تو عراقی سواروں کے ساتھ اٹھوں تو ماشاہ کا سر اور ہرقل کی [illegible]
خدمت میں پیش کر دوں"

خاموشی حد سے گزرنے لگی تو ایسے نے آہستہ سے کہا

"سیف اللہ نے عراقی سواروں کی قید کیوں لگا دی ــ سارا لشکر اسلام
تمہاری طرف تمہاری رکاب میں جان دینے کو سعادت جانتا ہے!"

"سچ ہے یا امیر ــ لیکن عراق کے سوار ایک مدت سے میرے ساتھ لڑ رہے
ہیں۔ میرے ابرو کی جنبش اور میرے گھوڑے کی تڑپ کے معانی جانتے
ہیں۔ میں جو کچھ سوچتا ہوں وہ کر ڈالتے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ لشکر اسلام
کا ہر مجاہد میرا ہے اور میں اس کا ہوں"

"کیا تو ماشاہ کے اس جم غفیر کے لیے عراق کے چند سو سوار کافی ہوں گے یا
شیر اسلام"

"کافی سے زیادہ ہوں گے یا امین الامت"

(جاری ہے۔)

خوشہ چیں

مِیراث

خوشہ چیں (گنگناتے ہوئے):

گندم از گندم بروید جو ز جو

جویا: بھائی صاحب یہ کہاں کی شایستگی ہے، جانتے ہو میں فارسی نہیں جانتا، اور میرے سامنے فارسی شعر پڑھے جا رہے ہو۔

خوشہ چیں: معاف کرنا جویا، یہی نہیں کہ تم فارسی نہ جانتے ہو تمہیں شاید مصرع اور شعر کا فرق بھی نہیں معلوم، اور یہ بھی تو سوچو اگر میں فارسی دانوں کا انتظار کرنے لگوں، تو شاید فارسی شعر پڑھنے کی نوبت ہی نہ آئے۔

جویا: انسان سے سہو ہو ہی جاتا ہے۔ کبھی کبھی زبان بہک جاتی ہے میں تمہیں نہ ٹوکتا تو تم دوسرا مصرع پڑھ ہی دیتے۔ شعر ہو جاتا۔ میرے استفسار کو استقبالیہ کیوں نہیں مان لیتے۔ معاف کرنا خوشہ چیں بھیا آپ کوئی شاعر تو نہیں کہ میر تقی میر کی طرح گھنٹوں ایک مصرع دہراتے رہیں:

اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے

گویا تکمیلِ شعر کے لیے دوسرے مصرع کی تلاش میں ہوں۔ آپ اگر شاعری کا دعویٰ کریں گے تو لوگ زیادہ سے زیادہ آپ کو قافیہ پیما تسلیم کر پائیں گے۔ اور آپ یہ بھول گئے کہ آپ کے رفقا میں ایک ایسے استاد بھی ہیں جو قافیہ اور ردیف میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ پھر میرے جیسے اَن پڑھ نے اگر مصرع اور شعر کو ملغوبہ کر دیا تو کون سا ظلم کیا؟

خوشہ چیں: تم تو ناحق برا مان گئے، میں نے شاعری کا دعویٰ کب کیا تھا کہ تک بندی کی تہمت اٹھاؤں۔ میر صاحب تو فکرِ شعر کر رہے تھے میں بیچارہ تو میر صاحب سے کہیں بڑے ایک شاعر کا صرف ایک مصرع گنگنا رہا تھا حیرت اور افسوس اور جستجو کے ساتھ۔ دوسرا مصرع میں جان کر پڑھ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ میرے کام کا نہیں تھا۔ میرا مفہوم یہ تھا کہ ہم نے گندم کے ورثے سے جو کی کھیتی کیوں کر حاصل کر لی؟

جویا: کھل گیا نہ راز آخر۔ بلی بورے سے نکل بھاگی۔ غیر سے آپ بھی اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنی کاربر آری کی خاطر قول کو ماقبل سے توڑ کر اور سیاق و سباق سے الگ کر کے نقل کرتا ہے۔ دور کیوں جائیے حال ہی میں بعض حضرات حقِ نمک ادا کرنے کے لیے شاہ بانو کے مقدمہ کے فیصلہ پر چھڑی ہوئی بحث میں، چولا بدل کر مفسرِ قرآن بن بیٹھے اور قرآن کریم کی شرح، سیاق و سباق اور قرآن کریم کے پیرایۂ بیان کو نظر انداز کرتے ہوئے، اس طرح کرنے لگے جیسے عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

خوشہ چیں: میاں جویا ناحق تم نیت پر حملہ کرنے لگے۔ تم نے ایک شوشہ اور فراہم کر دیا انحطاط پذیر مسلم معاشرہ کی توازن باختگی اور تناظر گم کردگی کبھی سوچا ہے تم نے مسلمانوں کے یہاں صالح قیادت کیوں نہیں بن پاتی؟ ان کے یہاں اصلاح کی کوئی تحریک جانبر کیوں نہیں ہوتی، وجہ اس کی یہ ہے کہ جس کسی نے رفاہ، اصلاح اور فلاح کی راہ میں قدم رکھا، اس کی نیت پر حملوں کی بوچھار ہر طرف سے شروع ہو گئی۔ بیچارہ گھائل ہو کر کھسیانا اپنے گھر میں واپس چلا جاتا ہے، سر چھپا لیتا ہے، منہ سی لیتا ہے۔

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی ۔ دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد

جویا: نیت پر شبہ کیوں نہ کریں کتنی بار دھوکا کھایا ہے ان لوگوں نے۔ کتنے قاید اور مصلح ایسے تھے جو چندہ کر کے روپیہ کھا گئے، اور کتنے اس سے بھی زیادہ۔ گئے گزرے نکلے، جنہوں نے خود کو اور ملت کے مفاد کو دوسروں کے ہاتھ بیچ دیا۔

خوشہ چیں: صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ میرا شمار بھی تم ان ہی لوگوں میں کرنے لگے ہو۔

لہ۔ میں نے ہونٹوں پر گفتگو کی راہ اس طرح بند کر دی گویا چہرے پر ایک زخم تھا جو بھر گیا ہے۔

جویا: بھائی صاحب آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ میں نے تو ہمیشہ آپ کا احترام کیا ہے۔ میں نے تو آپ کی نیت پر اس وقت بھی شبہ نہیں کیا جب ساری دنیا آپ کی مخالف تھی۔ اب جب کہ گرد چھٹ چکی ہے اور نکتہ چیں بھی اعتراف پر مجبور ہیں، اس وقت میں آپ کا ساتھ چھوڑوں گا اور آپ کی نیت پر شبہ کروں گا؟ میں معذرت خواہ ہوں کہ بحث کی رو میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا، یہ بات یاد ہی نہیں رہی کہ بات آپ کی نیت سے شروع ہوئی تھی اور تان لامحالہ اسی پر ٹوٹنی تھی۔

خوشہ چیں: اب سوچتا ہوں تو ابتدائی قصور میرا ہی تھا۔ میں نے ناحق تمہاری شعر فہمی پر حملہ کر دیا۔ ظاہر ہے کہ تمہیں یہ بات ناگوار گزری، تمہاری غیرت کو جراحت پہنچی۔ مجھ سے دلشکنی کا گناہ سرزد ہوا جس کے متعلق شاعر نے کہا ہے کہ

در طریقتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

(ہمارے مسلک میں دلشکنی کے علاوہ کوئی گناہ ہے ہی نہیں)

تم نے زخم کھا کر تلملا کر دفاعی وار کیا، تو کیا برا کیا؟

میری ابتدائی برہمی کا راز جاننا چاہو گے؟ مجھے تم سے شکایت ہے کہ اردو کا اچھا خاصا ذوق رکھنے کے باوجود اور میری منت سماجت کے باوصف تم فارسی سیکھنے سے گریز کر رہے ہو۔ گریز ہی نہیں، بلکہ مٹھی بھر اُن لوگوں پر معترض ہو جو ابھی تک فارسی کا دامن پکڑے ہوئے ہیں۔ کیا تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے دور میں فارسی پڑھنے سے کیا حاصل۔ میاں جویا فارسی کا ادب ہماری میراث کا جزو ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی سے شغف برحق اور برمحل مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم شعر و ادب اور ان کے منابع و مخازن کو ترک کر دیں۔ ان دونوں میں ہرگز رشتہ ضد کا نہیں ہے۔

جویا: آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن ذرا گھر کا جائزہ تو لیجیے۔ جس ادارہ پر آپ جان دیتے ہیں اس میں شعر و ادب کو سمجھنے والے کتنے ہیں اس نے اس دور میں اردو کو سوائے زبانی ہمدردی کے اور بھی کچھ دیا؟ اس میں کتنے طالب علم ایسے باقی ہیں جو اُردو لکھ سکتے ہوں یا روانی کے ساتھ پڑھ سکتے ہوں۔ اس کی منتظمہ ایک عرصے سے اُردو کو تدریس میں اس کی جائز جگہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے، اس خوف سے کہ فرقہ واریت کا اس پر الزام آ جائے گا۔ وہ اپنی روشن خیالی اور عافیت اسی میں دیکھتی ہے کہ ہندی اور اردو کو تدریس کی ہر منزل میں برابر رکھے۔ ہندی کا احترام کون نہیں کرے گا کہ وہ ہمارے ملک کی زبان ہے لیکن اس ادارہ کا بنیادی مقصد ہے مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی کے لیے جتن کرنا۔ عالم یہ ہے کہ یہاں ایک عرصے سے کوئی قابلِ ذکر کام نہ اسلامیات میں ہوا نہ عربی، فارسی اور اُردو زبانوں میں۔ ہم لوگ مستشرقین کی برائی کرتے ہوئے نہیں تھکتے، لیکن کیا ہم نے کوئی ایک عالم بھی ایسا پیدا کیا جو مستشرقین کے تبحرِ علمی یا اس کی دقت نگاہ کو چھو بھی سکتا ہو۔ آپ سرسید، مولانا حالی، علامہ شبلی، ڈاکٹر عبدالحق، مولانا عبدالعزیز میمن یا مولانا ضیا احمد بدایونی کے نام لے دیں گے۔ لیکن یہ تو ہمارے آبا رہے تھے، ہم تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا بیٹھے ہیں۔ میراث پر دھیان دیجیے تو حالیہ کم علمی اور بے بضاعتی اور واضح ہو جاتی ہے۔ اور پھر مذکورہ حضرات میں سے بیشتر آپ کے ادارہ کی پیداوار بھی تو نہیں۔

خوشہ چیں: خدا کا شکر ہے گھوم پھر کر تم بھی وہی بات کہنے لگے جو میں کہے جا رہا تھا۔ اُردو کے سلسلہ میں منتظمہ کو ہی کیوں الزام دیتے ہو۔ اساتذہ کو کیا کرو گے جو اُردو کا دیا کھاتے ہیں لیکن اُردو کے لیے پسینہ کا ایک قطرہ بہانے کو تیار نہیں؟ میری مراد اکثریت سے ہے سب سے نہیں۔ لازمی اُردو کا سوانگ خوب رچایا جاتا ہے لیکن حاصل کیا ہوتا ہے ہمارے استاد اُردو انجمنوں کے جلسوں میں شریک ہو کر تقریریں کرتے ہیں لیکن خود اُردو کی تعلیم دینے کے لیے اس حصار سے باہر نہیں نکلتے جو مشاعرہ اور ضابطے نے کھینچ رکھا ہے۔ بلکہ ان میں سے ایک معقول تعداد نہ مشاعرہ کا حق ادا کرتی ہے نہ ضابطے کے اوقات کا۔ اُردو ایثار، قربانی اور محنت چاہتی ہے؛ زبان ہونے کے باوجود زبانی جمع خرچ سے وہ عاجز آ چکی ہے۔ وہ حریفانِ مئے مرد افگنِ عشق کو صلا دے رہی ہے: ایک بار، بقول حالی 'طلب کے طور پر' اور دوسری بار یاس کے انداز میں۔ اتنے بڑے شعبے کے ہوتے ہوئے کیا یہ شرم کی بات نہیں کہ اس ادارہ میں کئی سال رہنے کے باوجود بہت کم طالب علم اتنی لیاقت حاصل کر پاتے ہیں کہ اُردو میں خط لکھ سکیں، یا اردو اخبار پڑھ سکیں۔ اُردو تھوڑی بہت جو ہمارے ادارے میں باقی ہے وہ بیمار کے دم سے ہے یا طلبہ کا

کی بدولت ۔

جویا: یوپی میں مسلمانوں اور دوسرے اُردو بولنے والوں کی تعداد بہار سے بہت زیادہ ہے، پھر یوپی اُردو کا گہوارہ رہی ہے ۔ کیا وجہ ہے کہ یہاں سے اُردو کا چلن اُٹھ گیا؟

خوشہ چیں: اس کی وجہ پوچھتے ہو؟ بیگانوں کی بے رخی، اپنوں کی بے حسی، تنگ نظروں کی عداوت اور ترجمانوں کی بے نیازی ۔ اردو اور اُردو پڑھانے والے اداروں نے زہر کا جام اسی خوشدلی کے ساتھ نوش جاں کیا جس طرح کبھی سقراط نے کیا تھا ۔

جویا: لیکن فرق یہ ہے کہ سقراط نے زہر کا پیالہ مقصد کے جلو میں پیا اور اُردو اور اردو والوں نے مقصد کے برخلاف پیا ۔ انھیں یہ احساس بھی نہ ہوا کہ یہ زہر ہے ۔ مشروب کی تلخی سے یہ کم نصیب آہستہ آہستہ حظ اندوز ہونے لگے جیسے قہوہ پی رہے ہوں یا کڑوا چوکولیٹ کھا رہے ہوں ۔ ایک فرق اور بھی ہے ۔ اس زہر کے پیالہ پر جو سقراط کو پلایا گیا، خیر اندیشی اور بہی خواہی کی جالی ڈھکی ہوئی نہ تھی اور جو پیالہ ہم نے اور ہماری زبان نے پیا اس پر خیر خواہی کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے ۔ اختیار یہ کہ دانش مندوں نے یہ سوانگ بھرا کہ بات مان لو لیکن نفاذ نہ ہونے دو ۔

خوشہ چیں: تم ٹھیک کہتے ہو جویا، لیکن ہمیں سب سے پہلے شکایت اپنوں سے ہے ۔ ہمارے ادارہ میں اُردو فی سبیل اللہ اور فی سبیل اللسان ضابطہ اور مشاہرہ کے حدود سے نکل کر پڑھانے کے لیے کوئی محب اردو تیار نہیں ہے ۔ یہ محبت انوکھی ہے جو عافیت اور آرام میں خلل پڑنے ہی نہیں دیتی ۔ اُردو والے خواہ استاد ہوں خواہ والی، خواہ عہدیداران انجمن اُردو کی قبر پر مجاور بن کر بیٹھے ہیں ۔

جویا: آپ اس خود غرضی اور بے حسی کی حکایت کو اتنا نہ بڑھائیے وہی لوگ جنھیں آپ زبانی ہمدردی کا الزام دے رہے ہیں، برابر مطالبہ کر رہے ہیں کہ آپ کے ادارے میں ذریعہ تعلیم اُردو ہو جائے پھر بھی آپ سمجھتے ہیں کہ انھیں اُردو سے محبت نہیں ہے اور اردو کی ترقی اور فتحمندی کے وہ خواہاں نہیں ہیں ۔

خوشہ چیں: محبت ہے کہ نہیں، یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے مجھے اس کا یارا نہیں کہ دلوں کے اندر جھانک سکوں ۔ میں اسی محبت کو تسلیم کر سکتا ہوں جو مجھے نظر آئے عمل، ایثار، لگن، اقدام اور انضباط کی شکل میں پھر غور کرو اگر اُردو کو ذریعہ تعلیم اس ادارے میں بنا دیا گیا تو حاصل کیا ہوگا ۔ جو طالب علم ہائی اسکول کر کے یہاں داخل ہوتے ہیں وہ کورسے کے کورے رہ جائیں گے ۔ یہ بات جاننے کے لیے ماہر نباتیات ہونا درکار نہیں کہ گیہوں کو سینچ کر درخت کو سیراب اور تناور نہیں کیا جا سکتا ۔ علاوہ بریں اُردو میڈیم سے دوسرے مضامین پڑھ کر نکلنے والوں کی روزگار کے بازار میں کھپت کیونکر ہوگی؟ نادان دوستوں اور دانا دشمنوں کا بے قصد اتحاد اردو کو بہت مہنگا پڑ رہا ہے ۔

جویا: آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ۔ زبان پر فریفتہ ہونے کا سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ انسان زبان کو عمل کا بدل سمجھنے لگتا ہے ۔ جتنی توانائی ہم نے اُردو کے لیے مانگیں اور اس کا ماتم کرنے میں صرف کی اس سے نصف بھی اگر اردو پڑھانے میں خرچ کرتے تو اس کی جان کے لالے نہ پڑتے لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہم اپنے اکثر ہم قوموں کی طرح بات کرتے کرتے بھٹک گئے، اور لگے اُردو کا دکھڑا رونے ۔ بتائیے آپ جو مصرع گنگنا رہے تھے اس کا مطلب اور اس وقت اس کی شانِ نزول کیا تھی ۔

خوشہ چیں: مطلب سیدھا سادہ ہے ۔ پہلے دوسرا مصرع بھی سن لو جس کو نہ پڑھنے کے تم شاکی تھے :

از مکافاتِ عمل غافل مشو

عمل کے پھل سے غافل نہ ہو ۔ گیہوں بوؤگے تو گیہوں اگے گا جو بوؤگے تو جو اُگے گا ۔

جہاں تک کہ شانِ نزول کا تعلق ہے صبح میں نے "ٹائمز آف انڈیا" (۱۵ر دسمبر ۱۹۸۵ء) میں ایک خبر دیکھی، اور میں سوچنے لگا کیا اس زمانہ میں زراعت اور اخلاق کا مذکورہ بالا مشترک اصول متروک تو نہیں ہو گیا ۔ تو جہاں گیہوں بویا گیا تھا وہاں اب ہم جو اگتے ہوئے دیکھ رہے ہیں ۔ میراث کا مفہوم ہی بدل گیا ۔ راہبر و اب راہبر کی دکھائی ہوئی راہ کے برعکس چلتے ہیں ۔ مزاروں پر مجاوروں کی دراز دستیاں دیکھیے ۔ منبر پر علماء کی گندم نما جو فروشی پر غور کیجیے ۔

جویا: لیکن یہ باتیں تو ہم آپ عرصے سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں ۔ آپ آج اچانک حیرت اور فکر میں کیوں پڑ گئے؟

خوشہ چیں: میں تو اپنوں میں یہ باتیں دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا کیونکہ دنیا وہی ہیں اور اسلاف کے مسلک سے شدید ترین انحراف انہوں نے ہی کیا ہے۔ آج اخبار میں دیکھا کہ مسیح علیہ السلام کی ولادت گاہ پر جو کلیسا بنا ہوا ہے اس کو صاف کرنے اور اس کو مرمت کرنے کے لیے عیسائیوں کے تین فرقوں راسخ العقیدہ یونانی، آرمینی اور رومن کیتھولک کے درمیان سخت مقابلہ اور مسابقت ہے۔

جویا: اس میں حیران اور فکرمند ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ امر طبعی ہے کہ حضرت عیسیٰ کے ماننے والے ان کے مولد کو پاک و صاف رکھنے اور اس کو آراستہ و پیراستہ کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔

خوشہ چیں: نہیں بھائی جویا، یہاں وہی نیت کی بات درمیان میں آجاتی ہے جس کے تذکرہ پر میں نے تم سے ناخوشگواری کا اظہار کیا تھا۔ جائے ولادت کو صاف کرنے اور اس کی مرمت کرنے میں بہ قول نامہ نگار، اخلاص، عقیدت اور محبت سے زیادہ یہ جذبہ کار فرما ہے کہ مسیح علیہ السلام کے مولد پر قبضہ کر لیا جائے۔ نیت سے گزر جائیے، عمل پر نگاہ ڈالیے۔ گذشتہ سال آرمینی اور راسخ العقیدہ یونانی پادریوں کے درمیان دھینگا مشتی ہوا تھا پائی اور تشدد نے اتنی شدت پکڑی کہ پولیس کو اس خانہ جنگی میں مداخلت کرنا پڑی۔ اس نے رہنمایان کلیسا کے جھگڑے میں بیچ بچاؤ کرایا۔ تم جانتے ہو کہ فوجداری قابل دست اندازی پولیس ہوتی ہے۔

نامہ نگار رقمطراز ہے کہ ان تینوں عیسائی فرقوں کی رقابت نے وبائی شکل اختیار کر لی ہے۔ ۱۶۰۰ سال پرانے اس کلیسا کو صاف اور آراستہ کرنے کے لیے امن و صلح کے اس پیغمبر کے پیرو (عام پیرو نہیں بلکہ خود پادری) فوجداری پر کمربستہ رہتے ہیں۔ اسرائیلی حکام کو اندیشہ ہے کہ اس بار پھر تشدد کا مظاہرہ ہوگا۔ غور کرو یہ میراث ہے اس پیغمبر کی جس نے انسانوں کو ہدایت کی تھی کہ اگر ایک گال پر کوئی تھپڑ لگائے تو دوسرا گال اس کے سامنے کر دو۔ میں سوچنے لگا کہ مذہب کے نگہبان علما جب جہلا کی طرح لڑیں جھگڑیں گے۔ جو تم بیزار پر اتر آئیں گے تو مذہب کے عام ماننے والوں اور خود مذہب کا کیا حشر ہوگا۔

جویا: آپ دوسروں پر نکتہ چینی کرنے لگے اور یہ بھول گئے کہ خود آپ کے ایک دینی ادارے میں کیا ہوا۔ تشدد اور اخلاق باختگی کا جو مظاہرہ

ابھی چند سال ہوئے وہاں ہوا تھا اس کی مثال غالباً دنیا کا کوئی عیسائی ادارہ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ایک دینی ادارہ پر مافیا کو ے کر شبخون ایسے مارا گیا جیسے وہ کوئی قلعہ ہو، دنیاوی جاہ اور اقتدار کا۔ علما کی آبرو کو اس بازاری طرز کے نزاع نے مٹی میں ملا دیا۔

خوشہ چیں: پھر سوچتا ہوں کیا یہی پچھن ہیں الحاد اور مذہب دشمنی کا مقابلہ کرنے کے۔ ایسا لگتا ہے کہ ادیان نے الحاد اور اخلاق دشمنی اور بدچلنی کے آگے سپر ڈال دی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ہمارا میراث کا تصور۔ ہم اپنے ورثہ کو زبانی خراج ادا کرنے کے بعد اپنے افعال کو اس کے برعکس ڈھالنے کے لیے آزاد ہو جاتے ہیں۔ خود فریبی کے بطن سے جو آسودگی پیدا ہوتی ہے وہ عمل کی طاقت کو معطل اور اصلاح کی راہ کو مسدود کر دیتی ہے۔ ہم یہ سمجھ کر کہ اپنی میراث کا اتباع کر رہے ہیں اپنے افعال اور طریق کار کے حسن و قبح کو جانچنے سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ میراث معکوس کے طلسم میں گرفتار ہوں اُن کے حق میں یہ بہتر ہوگا کہ وہ میراث سے اپنا ناتہ توڑ لیں، اور ہوا اور روشنی میں آنکھیں کھول کر اچھائی اور برائی کے بارے میں فیصلہ کرنے کی عادت ڈالیں۔ اور ایسا کرنے کی طرف اگر طبیعت مائل نہ ہو تو میراث کو آلائشوں، آمیزشوں اور جھوٹی تعبیر و تفسیر سے پاک کر کے اسے لفاظی اور خود فریبی کے دلدل سے نکال کر اس کے احترام کا واحد طریقہ اختیار کریں یعنی اس پر بے غرضی اور بے نفسی اور اخلاص کے ساتھ عمل کریں۔ میراث دشمن وہ لوگ ہیں جو میراث کا حق صرف زبان سے ادا کرتے ہیں۔

جارج گیمو
ترجمہ: ڈاکٹر انیس عالم

چچا چھکن کا چوتھا خواب

مزید غیر یقینی (MORE UNCERTAINTY)

نومبر کی ایک ابر آلود صبح کو چچا چھکن اپنے بستر میں پڑے اونگھ رہے تھے کہ انھیں کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ مڑ کر دیکھا تو انھیں اپنا وہی رہبر یعنی بڈھا پروفیسر ایک کرسی پر بیٹھا دکھائی دیا۔ جو اپنے گھٹنوں پر ایک نقشہ پھیلائے اس کو بغور دیکھنے میں محو تھا۔ اس نے نقشے پر سے سر اٹھاتے ہوئے ان سے پوچھا "تم بھی چل رہے ہو؟"

چچا چھکن جو اپنے کمرے میں پروفیسر کی موجودگی پر حیرت زدہ تھے، پوچھنے لگے، "کہاں لے جا رہے ہیں مجھے؟"

"قدریاتی[1] جنگل کے ہاتھی اور دوسرے جانور دیکھنے۔ بلیرڈ کے مالک نے مجھے اس جگہ کا پتہ بتایا تھا جہاں سے اس کی بلیرڈ کی گیندوں کے لیے ہاتھی کے دانت آتا ہے۔ یہ دیکھو، میں نے اس نقشے پر سرخ پنسل کے نشان سے اس علاقے کو ظاہر کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے کی تمام اشیا بہت بڑے قدریاتی[2] مستقل کے ذریعے قدریاتی قوانین کی پابند ہیں۔ وہاں کے اصلی باشندے اسے بھوتوں کی بستی سمجھتے ہیں اور ہمیں وہاں شاید ہی کوئی رہبر مل سکے۔ لیکن اگر تم ساتھ چلنا چاہتے ہو تو ذرا جلدی تیار ہو جاؤ۔ جہاز کے روانہ ہونے میں صرف ایک گھنٹہ باقی ہے اور ابھی راستے میں ہمیں ادریس صاحب کو بھی ساتھ لینا ہے۔"

"یہ ادریس صاحب کون ہیں؟" چچا چھکن نے پوچھا۔

پروفیسر بولا "تعجب ہے تم نے ان کا نام نہیں سنا۔ مشہور شکاری ہیں۔ شیر کا شکار خوب کرتے ہیں۔ جب میں نے انھیں شکار ملنے کا یقین دلایا تو ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئے۔"

چچا چھکن اور پروفیسر جب گودی پر پہنچے، اس وقت کئی بڑے بڑے صندوق جہاز پر لادے جا رہے تھے۔ ان میں ادریس صاحب کی رائفلیں اور سیسے کی گولیاں تھیں جو انھوں نے خاص اس مہم کے لیے قدریاتی جنگل کے قریب واقع کانوں کے سیسے سے بنوائی تھیں۔ ابھی چچا چھکن جہاز کے ایک کمرے میں اپنا سامان ٹھیک ٹھاک کر ہی رہے تھے کہ جہاز نے سفر کا آغاز کر دیا۔ سمندری سفر معمول کے مطابق تھا جس کے بعد وہ ایک خوب صورت مشرقی شہر میں پہنچے۔ یہی اس پراسرار قدریاتی جنگل کی نزدیکی بستی تھی۔

پروفیسر نے کہا "اب اندرون ملک کے سفر کے لیے ہمیں یہاں سے ایک ہاتھی خریدنا ہوگا۔ چونکہ مجھے امید نہیں کہ کوئی مقامی باشندہ ہمارے ساتھ چلنے کو تیار ہوگا، اس لیے تمھیں ہاتھی کا مہاوت بننا پڑے گا۔ میں اپنے سائنسی مشاہدات میں اور ادریس صاحب اپنے شکار میں مشغول رہیں گے۔"

جب وہ شہر سے باہر ہاتھیوں کی منڈی میں پہنچے تو چچا چھکن ان بڑے بڑے ہاتھیوں کو دیکھ کر جن میں سے ایک کا مہاوت انھیں بننا تھا، ٹھٹکے۔ ادریس صاحب نے جو ہاتھیوں کے بارے میں خاصی معلومات رکھتے تھے ایک بہت بڑا ہاتھی چنا اور مالک سے اس کی قیمت پوچھی۔

"ہُروپ باتورک اوجوبوٹ ہُم۔ باگدری بوہا لاپام ان بوہو بوی۔" مقامی باشندے نے اپنے سفید دانت دکھاتے ہوئے کہا۔

ادریس صاحب نے مطلب سمجھایا "یہ اس کی بہت بڑی رقم مانگ رہا ہے لیکن کہتا ہے کہ یہ ہاتھی قدریاتی جنگل کا ہے اس لیے اس کی قیمت زیادہ ہے۔ میرا خیال ہے ہم اسے لے ہی لیں۔"

پروفیسر بولا "درست ہے۔ میں نے جہاز پر سنا تھا کہ قدریاتی علاقے کے ہاتھی بعض اوقات ادھر آ نکلتے ہیں اور مقامی باشندے انھیں پکڑ لیتے ہیں۔ ایسے ہاتھی دوسروں کے مقابلے میں بہتر ہوتے ہیں۔ ہمارے لیے یہاں سے

---

[1] قدریاتی جنگل QUANTUM JUNGLE [2] قدریاتی مستقل QUANTUM CONSTANT

[illegible] قدریاتی جنگل اسے کہا جاتا ہے۔"

چچا چھکن اس دوران میں گھوم پھر کر ہاتھی کا معائنہ کر رہے تھے۔ یہ بلند قامت اور خوبصورت تو تھا لیکن اس میں اور چڑیا گھر کے عام ہاتھیوں میں بظاہر کوئی فرق نظر نہ آتا تھا۔ چچا چھکن مڑ کر پروفیسر سے کہنے لگے "آپ کہتے ہیں کہ یہ قدریاتی ہاتھی ہے لیکن مجھے تو اس میں اور عام ہاتھیوں میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ اس کی چال ڈھال میں کوئی ویسی عجیب بات بھی نہیں ہے جیسی اس کے سپاہی بندروں کے ہاتھوں سے بنی ہوئی بلیرڈ کی گیندوں میں تھی۔ یہ سب طرف پھیلتا کیوں نہیں؟"

پروفیسر بولا "تمہاری عقل کچھ موٹی معلوم ہوتی ہے۔ یہ سب اس کی بہت بڑی کمیت کی وجہ سے ہے۔ میں نے تمہیں ایک دفعہ بتایا تھا کہ مقام اور رفتار کی غیر یقینی تمام تر کمیت پر منحصر ہوتی ہے۔ جتنی بڑی کمیت ہوگی اتنی ہی کم غیر یقینی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری دنیا میں گرد کے ذروں جیسے ہلکے اجسام میں بھی قدریاتی کیفیتوں کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا لیکن یہ کیفیتیں برقیوں میں بڑی اہمیت اختیار کر لیتی ہیں کیونکہ وہ گرد کے ذروں کے مقابلے میں کھربوں گنا ہلکے ہوتے ہیں۔ قدریاتی جنگل میں قدریاتی مستقل خاصا بڑا ہوتا ہے لیکن پھر بھی اتنا بڑا نہیں کہ وہ ہاتھی جیسے وزنی جانوروں کے طرز عمل میں نمایاں قدریاتی اثرات پیدا کر سکے۔ قدریاتی ہاتھی کے مقام کی غیر یقینی کا اندازہ تم صرف اس کے بیرونی خدوخال کے بغور مشاہدے ہی سے کر سکتے ہو۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ اس کی جلد کی سطح مکمل طور پر واضح نہیں ہے اور کچھ دھندلی سی معلوم ہوتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ غیر یقینی نہایت آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہے۔ اس مقامی روایت کی توجیہ کہ قدریاتی جنگل کے بوڑھے ہاتھیوں کے بڑے بڑے بال ہوتے ہیں، اس غیر یقینی سے کی جا سکتی ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ نسبتاً چھوٹے جانوروں میں قدریاتی مظاہر خوب نمایاں ہوں گے۔"

چچا چھکن نے سوچا "یہ تو اچھا ہی ہوا کہ ہم اس مہم میں گھوڑوں پر سوار نہیں ہیں۔ کہیں اگر ایسا ہوتا تو مجھے غالباً معلوم نہ ہوتا کہ آیا گھوڑا میرے گھٹنوں کے درمیان ہے یا اگلی وادی میں۔"

جب پروفیسر اور ادریس صاحب اپنی مالکن سمیت ہاتھی کے [illegible] چچا چھکن نے ہاتھی کی کمر پر چڑھ کر [illegible]

[illegible]

اور ہاتھی کو اس پہاڑ جنگل کی طرف بڑھانا شروع کیا۔ [illegible] نے انہیں بتایا کہ انہیں منزل پر پہنچنے میں تقریباً ایک گھنٹہ [illegible] نے ہاتھی کے کانوں کے درمیان اپنی نشست [illegible] اس موقع پر پروفیسر سے قدریاتی مظاہر کے متعلق [illegible] حاصل کی جائیں۔

"اچھا آپ یہ بتلائیے کہ چھوٹی کمیت والے اجسام میں قدریاتی مظاہر اتنے نمایاں کیوں ہوتے ہیں؟ اور قدریاتی مستقل کے عام فہم معنی کیا ہیں؟" انہوں نے پروفیسر سے سوال کیا۔

پروفیسر بولا "اسے سمجھنا چنداں دشوار نہیں۔ ان تمام اجسام کی حرکات و سکنات جن کا تم قدریاتی دنیا میں مشاہدہ کرتے ہو، صرف اس لیے عجیب و غریب معلوم ہوتی ہیں کہ تم ان کو دیکھ رہے ہو۔" چچا چھکن "کیا مطلب؟ کیا وہ اتنے شرمیلے ہوتے ہیں؟"

پروفیسر: "ان کے لیے شرمیلے کا لفظ موزوں نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ کسی جسم کی حرکت کا مشاہدہ کرتے ہی اس میں خلل پڑ جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تم کسی جسم کی حرکت کے بارے میں کچھ معلوم کرتے ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ متحرک جسم نے تمہارے حواس یا آلات پر کچھ اثر ڈالا ہے۔ عمل اور ردِ عمل کے برابر ہونے کی وجہ سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہمارے حواس یا ہمارے پیمائشی آلات بھی متحرک جسم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یعنی دوسرے لفظوں میں اس جسم کی حرکت میں خلل پڑتا ہے جس سے اس کے مقام اور رفتار میں غیر یقینی کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔"

چچا چھکن: "بہت خوب! لیکن یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ ظاہر ہے کہ اگر میں نے بلیرڈ کی گیند کو اپنی انگلی سے چھوا ہوتا تو یقیناً اس کی رفتار میں تبدیلی ہوتی لیکن صرف میرے دیکھنے سے اس کی رفتار پر کیسے اثر پڑ سکتا ہے؟"

پروفیسر: "پڑ سکتا ہے۔ تم گیند کو اندھیرے میں نہیں دیکھ سکتے لیکن اگر تم روشنی کر دو تو روشنی کی وہ شعاعیں جو گیند سے منعکس ہوتی ہیں اور جن کی مدد سے تم اسے دیکھ سکتے ہو گیند پر عمل بھی کریں گی اور اس کی رفتار میں خلل بھی پیدا کر دیں گی۔ یہ روشنی کے دباؤ کی وجہ سے ہوتا ہے۔"

چچا چھکن: "لیکن فرض کیجیے میں نہایت ہی نازک اور حساس آلات استعمال کرتا ہوں۔ کیا اس طرح میں متحرک جسم پر ان کے اثر کو کم سے کم [illegible]

کے بہار جیسی کر سکتا؟

پروفیسر: مقدریہ عمل کی دریافت سے قبل ہر کلاسیکی طبیعیات دان یہی سمجھتا تھا لیکن بیسویں صدی کے آغاز میں یہ دریافت ہوا کہ کسی جسم کے عمل کو ایک خاص حد سے کم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حد جو قدریاتی[1] مستقل کہلاتا ہے 'h' سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ ہماری دنیا میں عمل کا قدریہ بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کی عددی قیمت میں اعشاریہ کے بعد ستائیس صفر لگائے جاتے ہیں اور یہ برقیوں جیسے ہلکے ذرات ہی میں اہمیت اختیار کرتا ہے کیوں کہ ان کی نہایت قلیل کمیت[2] کی وجہ سے نہایت چھوٹے عمل بھی ان پر اثر انداز ہو جاتے ہیں۔ قدریاتی جنگل میں جہاں ہم جا رہے ہیں، عمل کا قدریہ بہت بڑا ہوتا ہے اور چونکہ یہ ایک غیر مسطح دنیا ہے لہذا یہاں کوئی لطیف عمل ناممکنات میں سے ہے اس قسم کی دنیا میں اگر کوئی شخص بلی کے بچے پر پیار سے ہاتھ پھیرنے کی کوشش کرے تو یا تو بلی کا بچہ کچھ بھی محسوس نہ کرے گا یا پیار کے عمل کا پہلا ہی قدریہ اس کی گردن توڑ دے گا۔

چچا چھکن: سمجھا ہے۔ لیکن اگر اشیا کو کوئی نہ دیکھ رہا ہو تو کیا قدریاتی مظاہر وقوع پذیر نہ ہوں گے؟ میرا مطلب ہے کیا اجسام ہمارے حسب توقع عمل کریں گے؟

پروفیسر: جب کوئی مشاہد موجود نہ ہوگا تو کون بتا سکے گا کہ ان اشیا کا برتاؤ کیسا ہے۔ چنانچہ تمہارے سوال کے کوئی طبعی معنی ہی نہیں ہیں۔

چچا چھکن: بہرحال مجھے تو یہ فلسفہ معلوم ہوتا ہے۔

پروفیسر: (بُرا مانتے ہوئے)، اب تم اسے فلسفہ کہو یا کچھ اور لیکن حقیقت یہ ہے کہ جدید طبیعیات کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ان مظاہر کے متعلق کبھی کچھ نہ کہو جن کا تمہیں علم نہیں ہو سکتا۔ جدید طبیعی نظریہ تمام تر اسی اصول پر مبنی ہے۔ اس کے برعکس فلسفی اسے بالعموم نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثلاً مشہور جرمن فلسفی کانٹ کے نزدیک اجسام دکھائی کچھ دیتے ہیں لیکن درحقیقت کچھ اور ہوتے ہیں اور اس نے اپنی عمر کا کافی حصہ حقیقی اجسام کی خصوصیات معلوم کرنے میں صرف کر دیا۔ لیکن جدید طبیعیات دان صرف ان خصوصیات کو اہمیت دیتا ہے جو قابل مشاہدہ ہوں اور ساری جدید طبیعیات انہی قابلِ مشاہدہ خصوصیات کے باہمی رشتوں پر مشتمل ہے۔ ناقابلِ مشاہدہ امور صرف ہوائی قلعے بنانے والوں کے کام آ سکتے ہیں۔

فلسفہ دان جو اس کا جی چاہے ایجاد کر سکتا ہے، اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ مگر اس کے ایجاد کیے ہوئے اصولوں کو کوئی پرکھ نہیں سکتا اور نہ ان سے استفادہ کر سکتا ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ فضا ایک خوفناک چنگھاڑ سے گونج اٹھی۔ ان کا ہاتھی اتنی شدت سے اچھلا کہ چچا چھکن گرتے گرتے بچے۔ شیروں کا ایک ہجوم چاروں طرف سے بیک وقت ان کے ہاتھی پر حملہ کر رہا تھا۔ ادریس صاحب نے اپنی رائفل سنبھالی اور قریب ترین شیر کی آنکھوں کے درمیان نشانہ باندھ کر فائر کیا۔ اگلے لمحے چچا چھکن نے ان کے منہ سے نکلنے والی جیسی گالی سنی کیونکہ گولی شیر کا بال بیکا کیے بغیر اس کے سر کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ پروفیسر نے چلا کر کہا۔

"اور فائر کرو! اور چاروں طرف کرو! اور ٹھیک نشانہ باندھنے کی پروا نہ کرو! شیر صرف ایک ہے لیکن ہاتھی کے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ اس کو ہلاک کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہیملٹونین کو بڑھایا جائے۔"

پروفیسر نے ایک اور رائفل سنبھالی اور گولیاں چلنے کی آواز قدریاتی شیر کی گرج میں مل گئی۔ یہ شور و غوغا ختم ہونے تک مظہر کو ایسا معلوم ہوا کہ ایک لامتناہی عرصہ گزر گیا۔ آخر کار ایک گولی نشانے پر بیٹھی۔ شیر جو اب دفعتاً ایک ہو گیا تھا، زور سے اچھلا اور اس کا مردہ جسم ہوا میں خطِ منحنی بناتے ہوئے دور درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے جا پڑا۔

جب یہ خطرہ سر سے ٹل گیا تو مظہر نے پروفیسر سے پوچھا "یہ ہیملٹونین کون ہے؟ کیا وہ کوئی مشہور شکاری ہو گزرا ہے جسے آپ اپنی مدد کے لیے قبر سے اٹھانا چاہتے تھے؟"

پروفیسر بولا "مجھے افسوس ہے کہ میں گھبراہٹ میں سائنسی زبان استعمال کر گیا جسے تم نہیں سمجھ سکتے۔ ہیملٹونین ایک ریاضیاتی اصطلاح ہے جو دو اجسام کے درمیان قدریاتی تعامل کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کا نام ایک آئرستانی ماہر ریاضیات ہیملٹن کے نام پر رکھا گیا ہے جس نے یہ ریاضیاتی طریقہ سب سے پہلے استعمال کیا۔ میرا مطلب فقط اتنا تھا کہ زیادہ تعداد میں گولیاں چلانے سے ہم گولی اور شیر کے جسم کے درمیان تعامل کے امکانات بڑھا سکتے ہیں۔ تم دیکھ ہی چکے ہو کہ قدریاتی دنیا میں کوئی بھی شخص نہ تو ٹھیک نشانہ لے سکتا ہے، نہ اسے گولی [illegible] سکتا ہے گولی

[1] قدریاتی مستقل: PLANCK'S CONSTANT [illegible]

[2] Mass of electron = 9.1×10^-28 [illegible]

[illegible] QUANTUM OF ACTION

اور خود نشانے کے پھیلنے کی وجہ سے گولی ٹھیک نشانے پر لگنے کا صرف معدود امکان ہی ہو سکتا ہے، یقین نہیں ہو سکتا۔ موجودہ صورت میں ہم نے کم از کم تیس فائر کیے تب جا کر کہیں شیر کے گولی لگی اور پھر شیر پر گولی کا عمل اس قدر شدید تھا کہ شیر کا جسم دور جا پڑا۔ یہی کچھ ہماری دنیا میں بھی ہو رہا ہے لیکن بہت ہی چھوٹے پیمانے پر۔ جیسا کہ میں تمھیں پہلے بتا چکا ہوں، عام دنیا میں قدریاتی مظاہر کے مشاہدے کے لیے بہت ہی چھوٹے ذرّوں مثلاً برقیوں کا مطالعہ ضروری ہے۔ تم نے شاید سنا ہوگا کہ جوہر ایک مقابلتاً بھاری نوات اور اس کے گرد گردش کرنے والے متعدد برقیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ نوات کے گرد برقیوں کی گردش آفتاب کے گرد سیاروں کی گردش سے مشابہ ہے لیکن دقیق چھان بین سے ثابت ہوا ہے کہ حرکت کے عام تصورات جوہر جیسے چھوٹے نظام کے لیے بالکل نامکمل اور تخمینی ہیں۔ وہ عمل جو جوہر کے اندر اہم کردار ادا کرتے ہیں، جسامت میں اسی درجے کے ہوتے ہیں جیسے عمل کا قدریہ، لہٰذا ساری تصویر پھیل جاتی ہے۔ نوات کے گرد برقیوں کی گردش کئی لحاظ سے اس شیر کی حرکت سے مشابہ ہوتی ہے جو ہمیں ہاتھی کے چاروں طرف پھیلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

چچا چھکن نے پوچھا، "کیا برقیوں کو بھی اسی طرح نشانہ بنایا جا سکتا ہے جس طرح ہم نے ابھی ابھی شیر کو نشانہ بنایا؟"

"کیوں نہیں بنایا جا سکتا!" پروفیسر نے کہا۔ "بعض اوقات جوہر خود نہایت طاقتور نوری قدریے یا نور کی عملی اکائیاں خارج کرتا ہے۔ تم جوہر کے باہر سے بھی برقیے پر نور کی شعاع ڈال کر اس پر فائر کر سکتے ہو۔ وہاں بھی وہی کچھ ہوتا ہے جو ہمارے شیر کے ساتھ ہوا تھا۔ کئی نوری قدریے برقیے کے مقام سے اس پر اثر انداز ہوئے بغیر گزر جاتے ہیں تاآنکہ ایک قدریہ برقیے پر عمل کرتا ہے اور اسے جوہر سے باہر نکال پھینکتا ہے۔ قدریاتی نظام پر تھوڑا سا اثر کبھی نہیں ہوتا۔ یا تو اس پر اثر ہوتا ہی نہیں یا پھر یہ بہت کچھ تبدیل ہو جاتا ہے۔"

"جس طرح،" چچا چھکن نے کہا، "قدریاتی دنیا میں بلی کے بچے پر ہاتھ پھیرنا اس کی گردن توڑے بغیر ناممکن ہے۔"

اتنے میں ادریس صاحب نے ہرنوں کی ایک ڈار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "وہ دیکھیے، کتنے سارے ہرن دوڑ رہے ہیں!"

بانسوں کے جھنڈ میں سے ہرنوں کی ایک ڈار برآمد ہوئی تھی۔

چچا چھکن نے اپنے دل میں سوچا۔ "سدھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اس طرح دوڑ رہے ہیں جیسے سپاہی پریڈ کر رہے ہوں۔ کہیں یہ بھی کوئی قدریاتی اثر نہ ہو!"

ہرنوں کی ڈار تیزی سے دوڑتی ہوئی ہاتھی کے قریب آ رہی تھی۔ ادریس صاحب فائر کرنے ہی کو تھے کہ پروفیسر نے انھیں روک دیا۔ "مفت میں کارتوس ضائع نہ کیجیے۔ ایک جانور جب کثیر شعاعی انداز میں حرکت کر رہا ہو تو اسے نشانہ بنانا بے حد مشکل ہوتا ہے۔"

"ایک جانور!" ادریس صاحب بولے۔ "کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ یہ تو کم از کم کئی درجنیں ہیں۔"

پروفیسر نے کہا، "نہیں دوست! ہرن ایک ہے اور وہ کسی چیز سے خوفزدہ ہو کر بانسوں کے جھنڈ میں سے بھاگ رہا ہے۔ سب اجسام کا پھیلاؤ عام روشنی کے پھیلاؤ کی طرح ایک خاص خصوصیت کا حامل ہوتا ہے۔ جب کبھی یہ پھیلاؤ درزوں کے کسی باقاعدہ سلسلے سے گزرتا ہے۔ مثلاً الگ الگ بانسوں کے تنوں کے درمیان سے، تو کثیر شعاعی مظاہر ظہور میں آتے ہیں۔ اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ مادے کی ماہیت موجی ہے۔"

لیکن دونوں مخاطبوں میں سے کوئی بھی پروفیسر کی اس پراسرار ترکیب کثیر شعاعی کے معنی نہ سمجھ سکا، اس لیے گفتگو اسی جگہ ختم ہو گئی۔

قدریاتی علاقے میں سے آگے گزرتے ہوئے ہمارے سیاحوں نے بہت سی دلچسپ چیزیں دیکھیں جیسے قدریاتی مچھر جن کا مقام متعین کرنا ان کی قلیل کمیت کی بنا پر تقریباً ناممکن تھا، اور دلچسپ قدریاتی بندر۔ اب وہ ایک ایسی شے کی طرف بڑھ رہے تھے جو بہت کچھ ایک گاؤں جیسی دکھائی دیتی تھی۔ پروفیسر نے کہا، "مجھے معلوم نہ تھا کہ اس علاقے میں انسان بھی بستے ہیں۔ ان کے شور سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی تہوار منا رہے ہیں۔ گھنٹیوں کی مسلسل آواز سنائی دے رہی ہے۔" ان لوگوں کو الگ پہچاننا ناممکن تھا۔ وہ بظاہر ایک بڑے الاؤ کے گرد ناچ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں طرح طرح کی چھوٹی بڑی گھنٹیاں تھیں جن سے

WAVE CHAR-ACTER OF MATTER — DIFFRACTION OF PHOTONS یا LIGHT QUANTA کے ELECTRONS کے NUCLEUS کے ATOM کے

سے شمار شور ہوا تھا۔ جوں جوں وہ تینوں گاؤں کے قریب ہوتے گئے، جھونپڑیاں اور ارد گرد کے بڑے بڑے درختوں سمیت ہر چیز پگھلنے لگی اور گھنٹیوں کی آواز ناقابلِ برداشت ہوتی گئی۔ چچا چھکن نے ہاتھ بڑھا کر کسی چیز کو پکڑا اور اسے دور پھینک دیا۔ الارم گھڑی میز پر رکھی ہوئی پانی کے گلاس سے ٹکرائی اور ٹھنڈے پانی کے دھارے نے چچا چھکن کو خواب سے جگا دیا۔ وہ فوراً بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور جلدی جلدی کپڑے پہننے لگے۔ انہیں آدھ گھنٹے کے اندر اسٹیشن پہنچنا تھا۔

ہماری کچھ ایجنسیاں

۱۔ مسکین بک ڈپو
موتی ڈونگری روڈ۔ جے پور راجستھان

۲۔ میسرز نکہت بک ڈپو، اے۔ بی۔ مارکیٹ آسنسول

۳۔ مسٹر محمد حسین (بک سیلر) اسٹیشن روڈ دھنباد

۴۔ میسرز نسیم بک ڈپو، ٹاور چوک دربھنگہ (بہار)

۵۔ مسٹر اعظم خاں،
ٹاؤن اینڈ پوسٹ آفس تھریا نجابت خاں
ڈسٹرکٹ بریلی (یوپی)

۶۔ میسرز بک ایمپوریم، سبزی باغ۔ پٹنہ ۴ (بہار)

۷۔ میسرز محمد الیاس نیوز ایجنسی
۹۱ کولوٹولہ اسٹریٹ۔ کلکتہ (بنگال)

۸۔ اسلامیہ بک ڈپو
تاتارپور چوک۔ بھاگلپور سٹی ۸۱۲۰۰۲

۹۔ میسرز نصرت بک ایجنسی،
کوئن روڈ۔ انجمن بلڈنگ۔ ہبلی

۱۰۔ میسرز مکتبہ معارف الاسلام،
نظام پورہ بھیونڈی

۱۱۔ میسرز آزاد بک اسٹور، ساکچی بازار جمشید پور

۱۲۔ میسرز کتاب منزل، سبزی باغ پٹنہ (بہار)

۱۳۔ مسٹر طالب حسین،
[illegible] ہائر سیکنڈری اسکول [illegible] سرائے آباد

۱۴۔ [illegible] انصاری، اردو نیوز ایجنٹ والشیادہ [illegible]
۲۲۱۰۰۱

۱۵۔ محمد پرویز اقبال، (میگزین ایجنٹ)
پوسٹ، محمد میموریل پرائمری اسکول۔ ۲۲۰۔ بی۔ ٹی روڈ۔ بانس جگن
پوسٹ ٹیٹاگڑھ ڈسٹرکٹ ۲۴ پرگنہ (مغربی بنگال)

۱۶۔ طارق نیوز ایجنسی،
تکیہ معصوم شاہ، مومن پورہ۔ ناگپور

۱۷۔ مسٹر احمد حسین،
جمال بک ڈپو، باری روڈ۔ گیا

۱۸۔ مسٹر ایم اسماعیل،
نیشنل ٹریڈرس۔ مولانا حسرت موہانی روڈ (اسٹیشن روڈ) کانپور

۱۹۔ میسرز الفیصل نیوز ایجنسی،
معرفت قمر نظامی۔ معروف گنج گیا (بہار)

۲۰۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ۔ جے۔ جے۔ روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

۲۱۔ آزاد اسٹور، اردو بازار دربھنگہ (بہار)

۲۲۔ انوار بک ڈپو، شمشاد مارکیٹ اے ایم یو علی گڑھ

۲۳۔ مسٹر جلیل جاوید
بلال منزل۔ حمایت نگر ڈسٹرکٹ ناندیڑ (مہاراشٹر)

۲۴۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ اے ایم یو علی گڑھ

۲۵۔ الکاشف بک ایجنسی، سیلان لین، بکریم گنج، [illegible] ۱۰۰۲۳

۲۶۔ میسرز لیسین المظفر، ایم ایس آئی انٹر کالج، گورکھپور

۲۷۔ میسرز محمد نورانی بک سیلرس،
کمپنی باغ، مظفر پور (بہار) [illegible]

۲۸۔ شرفی بک سینٹر، قلعہ گھاٹ دربھنگہ

[illegible]

تعلیم نسواں

تخلیق آدم کے وقت انسان کو جنسی اعتبار سے دو انواع میں تقسیم کیا گیا تو عورت اور مرد کی جداگانہ حیثیتوں کا تعین کیا جانے لگا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ زن و مرد کی جنسی تقسیم میں ان کی معاشرتی ذمہ داریوں میں اختلاف نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے تقاضوں کے مطابق معاشرتی اور اخلاقی اقدار کو پیش نظر رکھتے ہوئے دونوں کی حیثیتوں پر بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ہر معاشرہ اور ہر قوم اپنی اقدار کے آئینے میں عورت کی نفسیات سے شروع کر کے اس کی زندگی کے ہر پہلو کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کی بہترین صلاحیتوں کو کام میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ قوموں کی اجتماعی ترقی میں مرد اور عورت کی ذمہ داریاں جدا ہیں لیکن بہترین معاشرتی اقدار کی ترویج میں ہر دو کا حصہ برابر ہے۔ دونوں اپنے اپنے مقام سے اعلیٰ اقدار کی آبیاری کرتے ہوئے قومی سلامتی کے ننھے سے پودے کو ایک تناور درخت کی صورت عطا کر دیتے ہیں۔ تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ قوموں کو مشکلات سے نکالنے اور اجتماعی زندگی کو خوشحال بنانے کے لیے مرد اور عورت کو یکساں محنت، لگن اور جانفشانی سے کام لینا پڑتا ہے اور اپنی اپنی اجتماعی ذمہ داریوں سے بخوبی عہدہ برآ ہو کر قوموں کی تقدیر کے ستارے کو حسب منشا اوپر چلاتا ہوتا ہے۔

عورت کے متعلق آج تک جن موضوعات پر بحث کی گئی ان میں تعلیم نسواں کا موضوع سب سے اہم ہے۔ ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگ اس پر گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ اسکول کے بچوں سے لے کر بڑے بڑے علما اس موضوع پر قلم اٹھاتے رہتے ہیں۔ وجہ دراصل یہ ہے کہ انسانی زندگی کے ابتدائی دور میں علم و حکمت کی باگ ڈور ہمیشہ مردوں کے ہاتھوں میں رہی۔ سو یہی علوم فنون کا ارتقا اور وہ سنہری دور سے ترقی دی۔ انسانیت پر ہمیشہ سے مردوں کی حکومت رہی، اکا دکا مثالوں کو چھوڑ کر آج بھی یہی سلسلہ [illegible] ہے۔ تعلیم کے میدان میں بے پایاں ترقی کے باوجود ہمیں علمی میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینے والوں میں خواتین بہت کم نظر آتی ہیں۔ وجہ [illegible] یہ ہے کہ عورت کو صنف نازک اور کم عقل خیال کرتے ہوئے اسے ہمیشہ چراغ خانہ یا شمع محفل قرار دے کر علامت حسن بنا کر پیش کیا گیا۔ اس کی صلاحیتوں پر شک کیا جاتا رہا اور مردوں نے اس کی نزاکت کے خیال سے علمی میدان میں بھی اسے نارواداریوں سے نوازا۔ اگرچہ یہ سب کچھ اس کی حوصلہ افزائی کے خیال سے کیا جانے لگا لیکن اس سے عورت کی بہترین صلاحیتیں پوری طرح اجاگر نہ ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ترقی یافتہ معاشروں میں جہاں عورت کو بظاہر مردوں پر غلبہ حاصل ہے وہاں بھی عورتیں چھوٹے چھوٹے کام تو خود سنبھالے ہوئی ہیں لیکن [illegible] عہدوں پر مرد ہی فائز ہیں۔ عورتوں کی بھرپور صلاحیتوں کا اظہار وہاں بھی کم کم ہی نظر آتا ہے۔ البتہ ان معدودے چند مثالوں سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ عورت کو بھی اگر مناسب حالات میسر آجائیں تو وہ کارہائے نمایاں انجام دے سکتی ہے۔

اسلام سلامتی کا مذہب ہے۔ اس کی بنیاد اعتدال پر قائم ہے۔ یہ اعتدال فکر و عمل، جذبات اور زندگی کی اقدار میں نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اسلام نے زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح زن و مرد کے مقام کے تعین میں بھی زبردست اعتدال سے کام لیا ہے۔ اس نے عورت کے ذہن و فکر کو مکمل آزادی سے نوازا لیکن اس کے خیالات و عمل کو بے راہ روی سے بچانے کے لیے اس پر چند ایسی پابندیاں عائد کیں جن کے تحت وہ معاشرے میں خرابی پیدا کرنے کا باعث نہ بنے۔ اسے قرآن

دست گرداں کی طرح سربازار بیچنے والوں کو اسے گھر کی ملکہ بنانے کی تلقین کی۔ عورتوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کرنے والوں سے کہا کہ لڑکیوں کی صحیح پرورش کرنے والے والدین کو خدا اپنی خاص رحمتوں سے نوازے گا۔ عورت پر خود کو ڈھانپ کر باہر نکلنے کا حکم اس لیے صادر ہوا کہ وہ اپنی جنسی دلکشی کے باعث فتنہ انگیزیوں کا سبب نہ بنے۔ اسے اس کی تمام تر دلکشی اور حسن کو اس کے شوہر کے لیے وقف کر دینے کی تلقین کی گئی۔ اس طرح عورت اور مرد دونوں کو جنسی تسکین کا سامان بھی میسر آگیا اور دونوں کو بے راہ روی سے بچنے کے لیے ایک مناسب بات سمجھائی دینے لگا جہاں پر مرد کو بھی عورت کو نظر غلط انداز سے دیکھنے اور اس کے دیدار سے تفریح حاصل کرنے سے منع کیا گیا۔ اب اگر عورت خصوصًا مسلمان عورت اپنے حسن کے ناجائز اظہار پر قابو پا سکے تو اس کے پاس اس کی فکری پرواز کی راہیں ہموار ہو جاتی ہیں۔ خصوصًا حصول علم کے سب راستے اس کے لیے وا ہو جاتے ہیں۔ اسلام کے ابتدائی دور میں بھی عورت کے اس طرز عمل کی بہترین مثالیں نظر آتی ہیں خصوصًا ازواج مطہرات کا زندگی گزارنے کا طریقہ خواتین کے لیے ایک بہت بڑی مثال ہے اور پھر خاتون جنت حضرت فاطمہ الزہرہؓ کی طرز زندگی کو کیوں کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ ازواج مطہرات میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اسلامی تعلیم اپنے دور میں ایک مثال تھی۔ ان کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات انہیں زبانی یاد تھے یہی وجہ تھی کہ آنحضورؐ کے وصال کے بعد دینی مسائل کے حل میں اکثر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خدمات حاصل کی جاتی رہیں۔ خصوصًا خواتین کے مسائل میں تو وہ ایک سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ازدواجی زندگی کے معاملات میں بھی آپ کے ذریعے ہی سنتِ رسولؐ کے مختلف گوشے سامنے آتے ہیں۔ یہی نہیں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اسلام میں جو انتشار پیدا ہوا اس کو دور کرنے میں آپ نے نمایاں کردار ادا کیا۔ آپ کی ذہانت و فطانت سے اسلام کو بہت فائدہ پہنچا۔ ان کی سادگی، علمیت، سخاوت، دینداری اور پرہیزگاری مسلم خواتین کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

یوں تو خاتون جنت اور دیگر ازواج مطہرات نے بھی اس نوزائیدہ مذہب کے آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا لیکن حضرت عائشہ کو وصالِ نبیؐ کے بعد بھی کافی عرصہ تک اسلام کا سہارا بننے کا موقع ملا۔ خاتون جنت تو چند ماہ بعد ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئیں اور پھر خانۂ رسولؐ کی خواتین ہی کیا موقوف اسلامی تاریخ خولہ بنت آزور، فاطمہ بنت عبداللہ اور دیگر بے شمار ایسی خواتین کے ذکر سے بھری ہوئی دکھائی دیتی ہے جنھوں نے اسلام کی بہت خدمت کی اور جن کے پاس علم کی کمی نہ تھی۔ اسلامی تاریخ کی یہ روایت خود برصغیر میں مسلمان حکمرانوں کے دور میں بھی قائم رہی خاندانِ مغلیہ کی خواتین کا علم و فضل بھی قابل ذکر ہے جنھوں نے محل میں رہ کر کتب کی تصنیف ایسے کام انجام دیے اور شاید یہی سبب تھا کہ اس وقت مسلمان حاکم تھے اور دیگر قومیں محکوم۔

آج مسلمان قوم تاریخ کے جس نازک موڑ پر ہے وہاں دیگر اقوام سائنسی ترقی کے بل پر علمی، اقتصادی اور حربی لحاظ سے بہت مضبوط ہیں۔ دنیا بھر میں مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے مسلمان قوم آج اس مقام پر ہے جہاں مذہب کے ابتدائی دور میں دکھائی دے رہی تھی۔ آج ہمارے سامنے مشکلات اور مصائب کے پہاڑ ہیں اس لیے اب ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے کا وقت نہیں ہے۔ ہماری بے عملی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ ایسے زوال سے محفوظ رہنا مشکل ہے تاآنکہ ہم خود کو فعّال بنانے کی کوشش نہ کریں آج ہمیں ہر گھڑی اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ہے کہ

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم اپنی حالت کو کیسے کر بدل سکتے ہیں۔

آج کا دور علم کا دور ہے۔ اس وقت حصولِ علم کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے اب مسلمانوں کی نجات علم میں ہے۔ اس مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ علم حاصل کر کے اپنا تن من دھن قوم کی خدمت کے لیے وقف کرنا ہے تب جا کر کہیں یہ قوم اپنی کھوئی ہوئی روایات کی امین ہو سکتی ہے۔ اب ہمیں خود سے [illegible] نکل کر قوم کے بچے بچے کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا ہو [illegible]

کا وقت نہیں کہ عورتیں گھر کی چار دیواری میں بند رہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے اس سے بڑے مقاصد ہونے چاہیں۔ اس وقت عورت کے گھر سے باہر نکل آنے کے باعث جنم لینے والی معاشرتی خرابیوں کی روک تھام کرنی چاہیے نہ کہ عورت کو چار دیواری میں بند کر کے اسے محض گھرداری کے لیے وقف کر دیا جائے۔ بلکہ عورت کی تربیت پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے اسے اخلاقی طور پر یہ احساس دلانے کی ضرورت ہے کہ وہ گھر سے باہر نکل کر میدان عمل میں قدم رکھتے ہوئے قومی خدمت سے سرشار ہوں اور اپنے دلوں میں کام کرنے اور بڑے بڑے مقاصد کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔ یوں بھی تعلیم تو عام انسان کو بہتر انسان بنا دیتی ہے۔ علم کو صحیح طور سے حاصل کرنے والے میں شعور کی بالیدگی وسعت نظر اور نگاہ بصیرت افروز کے باعث معاملاتِ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے اسلامی تاریخ کے اس نازک دور میں عورتوں کی صلاحیتوں کو ضایع کرنے کی بجائے ان کو ابھرنے کا موقع فراہم کرتے ہوئے اس سے بھرپور استفادہ کرنے کی ضرورت ہے۔

قومی ترقی کے لیے تعلیم نسواں اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے کیوں کہ تعلیم ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کو حاصل کرنے سے عورت کی شخصی تعمیر ممکن ہو سکتی ہے۔ مسلمان عورت صدیوں سے جس پس ماندگی کا اور جہالت کا شکار ہے اس کی تاریکیوں سے نکالنے کے لیے علم کی شمع درکار ہے۔ علم کی روشنی میں عورت کی شخصیت کو جلا مل سکتی ہے۔ اس کی صلاحیتوں کو بیدار کیا جا سکتا ہے اور اسے باشعور بنا کر قومی تعمیر کے جذبے سے بہرہ ور کیا جا سکتا ہے۔ مرد کی سرپرستی میں عورت کو تعلیم کے بہتر مواقع فراہم کر کے قوم کے فعال کرداروں میں از حد اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یوں بھی آج کے دور میں جب کہ مردوں میں سے بہت کم صحیح معنوں میں انتہائی سنجیدگی سے علم حاصل کرتے ہیں ورنہ عموماً حصول تعلیم کا بڑا مقصد ذریعۂ معاش حاصل کرنا ہے لوگوں کو علم سے زیادہ ڈگری سے دلچسپی ہے۔ کیوں کہ ملازمت کے حصول کے لیے علم سے زیادہ ڈگری کی اہمیت ہوتی ہے ایسے میں عورت چوں کہ [illegible] کے نسبتاً کم حساس ہے لہٰذا وہ مقابلتاً

سنجیدگی کے ساتھ علم حاصل کرتی ہے اور قوم میں علم کی کمی کو پورا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ اور مردوں کو بھی حصولِ علم میں دلچسپی پیدا کرنے کی ترغیب دے سکتی ہے۔

تعلیم نسواں کی اہمیت اس لحاظ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ ماں کی حیثیت سے عورت معاشرتی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے اس کی گود بچے کی سب سے پہلی تربیت گاہ ہوتی ہے اور وہ بچے کی پہلی استاد ہونے کی حیثیت سے اس کے معصوم ذہن میں جو بات ڈال دیتی ہے وہ تا حیات اس پر قائم رہتا ہے ماہرین نفسیات کی تحقیق کے مطابق بچے کے سن شعور تک پہنچنے سے بہت پہلے اس کی عمر کے ابتدائی چند سالوں میں ہی اس کی نفسیات بن جاتی ہے۔ بعد ازاں اس میں چھوٹی موٹی نفسیاتی تبدیلیاں تو ممکن ہوتی ہیں لیکن اُسے مکمل طور پر بدل دینا مشکل ہوتا ہے لہٰذا ماں کی گود میں رہ کر بچہ جو کچھ حاصل کرتا ہے وہ اس کی تمام تر زندگی کے لیے انتہائی اہم ہوتا ہے ظاہر ہے کہ ایک پڑھی لکھی ماں بچے کی نفسیاتی تربیت میں زیادہ اہم کردار ادا کر سکتی ہے تعلیم یافتہ ماں شعوری کوشش سے بچے کی نفسیاتی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی بہتر سے بہتر تربیت کر کے قوم کو مہذب شہری مہیا کر سکتی ہے۔ یوں بھی اگر باپ پڑھا لکھا ہو اور ماں جاہل ہو تو بچوں کی تعلیم کم رہ سکتی ہے لیکن اگر ماں پڑھی لکھی ہو تو بچوں کا تعلیم یافتہ ہونا قریباً لازم ہو جاتا ہے کیونکہ ایک پڑھی لکھی ماں اپنے بچوں کی جہالت کو کسی صورت بھی گوارا نہیں کر سکتی پھر وہ تعلیم کی اہمیت سے بھی واقف ہوتی ہے اس لیے اپنے بچوں کو اچھے شعبوں میں اعلیٰ تعلیم دلا سکتی ہے۔ یوں بھی مرد بچے کی تعلیم کے خواہاں تو ہوتے ہیں لیکن عموماً اپنی مصروفیات کے باعث بچے کو پوری توجہ سے پڑھا نہیں سکتے جبکہ عورت پیشہ ورانہ مصروفیتوں کے باوجود اپنے بچوں کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ وقت نکالے گی یا اس کا کوئی متبادل انتظام ضرور کر دے گی۔ گویا تعلیم یافتہ ماں کی کوکھ سے جنم لینے والے بچے زیادہ تعلیم یافتہ، مہذب اور ذمہ دار شہری بن سکتے ہیں اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ ایک مرد کی تعلیم فرد کی تعلیم ہے اور عورت کی تعلیم اجتماع کی یہ اجتماع کم از کم اس کے بچوں کی تعداد کے برابر

فرد ہوتا ہے۔

جہاں تک مسلم خواتین کا سوال ہے ان کو تعلیم دلانا نہ صرف مذہبی لحاظ سے جائز ہے بلکہ پسندیدہ فعل ہے۔ بانیٔ اسلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حصولِ علم پر بہت زور دیا ہے اور اسے عبادات میں شمار کیا ہے۔ بشرطیکہ علم کو کسی دنیاوی لالچ یا عزت و شہرت کے حصول کی بجائے انسانیت کی فلاح اور دین کی خدمت کی غرض سے حاصل کیا جائے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ جو شخص حصولِ علم کی غرض سے ایک گھنٹہ گھر سے باہر گزارتا ہے اس کا رب اس کو ہزار مہینوں کی عبادات سے زیادہ ثواب دیتا ہے۔ آپؐ کی علم دوستی اور مسلمانوں کو اس کی طرف رغبت دلانے کے لیے آپؐ کے فرمودات کا احاطہ تو اس مختصر سے مضمون میں مشکل ہے البتہ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ علم مرد اور عورت دونوں پر فرض ہے اور علم حاصل کرنے کے لیے مشکلات سے نبرد آزما ہونا جہاد کا درجہ رکھتا ہے۔ حصولِ علم کے لیے سفر بھی کارِ ثواب بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاندانِ رسولؐ کی خواتین بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ نظر آتی ہیں۔ اس لیے علم عورت کا زیور ہے کہ اس کے شخصی حسن میں نکھار پیدا کر دیتا ہے۔ عورت کی شخصیت کی تعمیر و تکمیل علم سے ہی ہوتی ہے اور اگر علم حاصل کرنے کے بعد بچوں کی بہترین تربیت کے علاوہ بھی میدانِ عمل میں آ کھڑی ہو اور قومی ترقی میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتے ہوئے مردوں کے دوش بدوش کام کرنے لگے تو اس کا یہ اقدام ہر لحاظ سے مستحسن سمجھا جائے گا۔ بشرطیکہ وہ اپنے کردار کو مضبوط رکھے اور مذہبی تعلیم سے اس قدر بہرہ ور ہو کہ اپنے حسن و دلکشی کو اپنے شوہر کی امانت سمجھتے ہوئے اپنے جلووں سے دوسروں کے اخلاق پر برے اثرات مرتب کرنے سے احتراز کرے۔ جو عورت اخلاقی پابندیوں کے ساتھ قومی تعمیر و ترقی میں حصہ لے وہ یقیناً ہر وقت عبادت میں مصروف رہتی ہے اور اپنے رب کی نگاہ میں عزیز ہو جاتی ہے۔ پھر اس کا رب اپنی مدد سے اس کی مشکلات کو آسان بنا کر اسے اس کے عزمِ صمیم پورا اترنے کی ہمت عطا کر دیتا ہے۔

میری گزارش

اے میری قوم کے لوگو! اپنے عزیزوں اور پیارے بچوں کو خانت نہ کرو۔ ان کی پرورش کرو۔ ان کی آیندہ کی زندگی اچھی طرح بسر ہونے کا سامان کرو۔

یہ کو تم کچھ ہی کہو۔ میری بات سنو یا نہ سنو، مگر یاد رکھو کہ اگر تم ایک قومی تعلیم کے طور پر ان کو تعلیم نہ دو گے تو وہ آوارہ اور خراب ہوں گے۔ تم ان کی ابتر حالت کو دیکھو گے اور بے چین ہو گے۔ روؤ گے اور کچھ نہ کر سکو گے۔ اگر تم مر جاؤ گے تو اپنی اولاد کی خراب زندگی دیکھ کر تمہاری روحیں قبروں میں تڑپیں گی اور تم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ ابھی وقت ہے۔ اور تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ مگر یاد رکھو، میں یہ پیشین گوئی کرتا ہوں کہ اگر اور چند روز تم اسی طرح غافل رہے۔ تو ایک زمانہ ایسا آوے گا کہ تم چاہو گے کہ اپنے بچوں کو تعلیم دو، ان کی تربیت کرو۔ مگر تم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔

میں تم سے خدا کے سامنے کچھ سفارش نہیں چاہتا۔ میں تم سے اپنی شفاعت کے واسطے خواستگار نہ ہوں گا۔ میں جو کچھ کہتا ہوں تمہارے بچوں کی بہتری کے لیے کہتا ہوں۔ تم انہیں پڑھاؤ اور ایسا کچھ کرو کہ آیندہ کو پچھتانا نہ پڑے۔"

سرسید۔ لیکچر بمقام لدھیانہ ۲۳ رجنوری ۸۴ء
لیکچروں کا مجموعہ ص ۱۵۹

دنیا میں کسی قوم کی ترقی کے یہی دو نشان ہیں۔ ایک یہ کہ وہ سمجھنے لگیں کہ وہ ذلت اور خرابی میں مبتلا ہیں اور دوسرا نشان یہ ہے کہ اس ذلت سے نکلنے کی کچھ کوشش شروع کر دیں۔

سرسید۔ لیکچروں کا مجموعہ [illegible]

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی

فرقہ ملامتیہ اور مشائخ نقشبندیہ

مشہور ایرانی عالم سعید نفیسی نے اپنی کتاب "سرچشمۂ تصوف در ایران" میں فرقۂ ملامتیہ کے بارے میں بڑی دلچسپ بحث کی ہے اسی سلسلے میں انھوں نے ایک باب میں اس بات سے بھی بحث کی ہے کہ نقشبندیہ سلسلے کے بزرگ ملامتیوں کی نہ صرف یہ کہ نفی نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے پیشواؤں کو بھی ملامتی سمجھتے تھے۔ جو حضرات تصوّف سے عملی اور نظری تعلق رکھتے ہیں، اُن کے لیے سعید نفیسی کے خیالات کا مطالعہ مفید ہوگا اس لیے درج ذیل سطور میں سعید نفیسی کے خیالات کا ایک جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

سعید نفیسی نے اپنی بات کے آغاز میں خواجہ محمد پارسا کی کتاب "فصل الخطاب بوصل الاحباب" کا ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے کھجور کے باغ سے لکڑی کا گٹھر سر پر رکھے واپس آرہے تھے، لوگوں کو آپ کی اس حالت پر تعجب ہوا اور انھوں نے آپ سے کہا کہ "یہ آپ کیا کرتے ہیں"۔ جواب میں حضرت عثمانؓ نے فرمایا "اگرچہ میرے پاس بہت سے غلام ہیں لیکن اپنے جسم کو ہر تکلیف کا عادی بنانا چاہتا ہوں تاکہ اس کو کسی کام سے عار نہ ہو"۔ حضرت عثمانؓ کے اس واقعے کو نقل کرکے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اس سے اہل ملامت کے مذہب کی راستی اور درستگی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے ملامت کو اہل حق کا شعار قرار دیتے ہوئے بہت سی مثالیں بھی پیش کی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب نبی نہیں تھے تو لوگ آپ کو امین کہتے لیکن جب آپؐ کو قرب حق حاصل ہو گیا تو وہی لوگ آپ کو نعوذ باللہ کاہن، ساحر اور اسی طرح کے دوسرے برے الفاظ سے یاد کرنے لگے اس واقعے سے مذکورہ کتاب کے مصنف نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جو شخص جس قدر حق دوست ہو حق کے قریب ہوتا جاتا ہے خلق اس کو اتنی ہی ملامت کرتی جاتی ہے اس کی وجہ مصنف کے نزدیک یہ ہے کہ غیرت حق اس بات کو گوارا نہیں کرتی کہ اس کے دوست پر کسی دوسرے کی بھی نگاہ پڑے اس لیے خلق کو ملامت کنندہ بنا دیتی ہے تاکہ اس کا دوست صرف اسی کا ہو کر رہے۔ اسی بات کو مصنف نے بہت پھیلا کر اور طرح طرح کی مثالیں دیتے ہوئے واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ جن لوگوں کی دنیا والے ملامت کرتے ہیں وہ لوگ خدا کے نزدیک پسندیدہ ہوتے ہیں۔ اس پوری عبارت کے بین السطور سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ ملامتیہ حضرات اس نکتے سے آگاہ ہوتے ہیں اس لیے وہ ایسے افعال و اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں کہ دنیا والے ان کی ملامت کریں اور وہ لوگ اسی ملامت کی وجہ سے حق تعالیٰ کے قریب سے قریب تر ہوتے جائیں۔

خواجہ محمد پارسا کی عبارت کے ساتھ ہی ساتھ سعید نفیسی نے [illegible] السلمی النیشاپوری (نیشاپوری) کے رسالہ کی ایک طویل عبارت اس طرح نقل کی ہے جس سے اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ عبارت سعید نفیسی نے براہ راست مذکورہ رسالے سے نقل کی ہے یا خواجہ محمد پارسا کی کتاب میں اس کو ایک اقتباس کی حیثیت سے نقل کیا گیا ہے۔ بہرحال اس عربی عبارت کا اُردو ترجمہ درج ذیل ہے:

"جن لوگوں کو ملامتیہ کا لقب دیا گیا ہے ان کی باطنی کیفیت تو یہ ہے کہ اللہ نے ان کو لطف کی قسموں اور تقرب کے درجات سے نوازا ہے لیکن ان کی ظاہری کیفیت کو عام مخلوق کے مشابہ قرار دیا ہے۔ ظاہر و باطن کا یہ فرق ان کو اس لیے عطا ہوا ہے کہ ان کی باطنی کیفیت عام لوگوں پر واضح نہ ہو۔ اس بات کو سمجھانے کے لیے حضور اکرمؐ کے واقعۂ معراج کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اگرچہ آپ شب معراج میں

قرب الٰہی سے متمتع ہوئے لیکن جب آپ دنیا میں واپس تشریف لائے تو آپ نے دنیا کے لوگوں کے ظاہری احوال ہی کے مطابق ان سے گفتگو فرمائی اس مثال کو پیش کرنے کے بعد ابو عبدالرحمٰن سلمی نے لکھا ہے کہ صوفیہ کا حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس حال کے مانند ہے کہ وہ اللہ کی طرف ایک نظر اٹھا کر نہ دیکھ سکے۔ عبداللہ بن منازل نے اہل ملامت کے بارے میں کہا ہے کہ ظاہر میں اہل ملامت کے احوال لوگوں پر آئینہ کی طرح روشن نہیں ہیں اور باطن میں اللہ پر ان کا کوئی دعویٰ بھی نہیں اس کے باوجود ان کے اور اللہ کے درمیان جو تعلق ہے اس سے نہ تو ان کے قریب ترین اعزا اور اقربا واقف ہوتے ہیں اور نہ ہی اُن کے قلوب۔ جہاں تک اہل ملامت کے اصولوں کا تعلق ہے ایک اصول تو ان کا یہ ہے کہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی تو ضرور کرتے ہیں مگر اپنے حقوق کو ترک کر دیتے ہیں۔ ملامتیہ کا دوسرا اصول غفلت ہے جو مخلوق کو ان کے احوال و افعال سے دور رکھتی ہے اُن کا ایک اور اصول اپنے نفس کی مدد اس کے انتقام کو ترک کرنا اور دوسروں کی خدمت گذاری ہے۔ عبداللہ حجام سے ابو صالح قصار نے جب کسب (ظاہری ذریعۂ معاش) ترک کرنے کا ذکر کیا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ اپنے کسب کو جاری رکھنا چاہیے مزید یہ بھی کہا کہ ان کو عبداللہ زاہد یا عبداللہ عارف کہلائے جانے کے مقابلے میں عبداللہ حجام کے نام سے موسوم ہونا زیادہ پسند ہے۔ ابو حفص رحمۃ اللہ اپنے گھر میں داخل ہوتے ہی صوف یا پھٹے پرانے کپڑے پہن لیتے لیکن جب بازار کے لوگوں کے پاس جاتے تو اہل بازار کا لباس پہن کر ان کے درمیان جاتے۔ ملامتیہ کا ایک اصول یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب ان کی دعا قبول ہو جاتی ہے تو ان پر دہشت اور غم طاری ہو جاتا ہے اور وہ اس کو مکر اور استدراج سمجھتے ہیں۔ فراست کے بارے میں ملامتیوں کا اصول یہ ہے کہ انسان کو مومنوں کی فراست سے بچنا چاہیے اور اپنے لیے فراست کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے۔ ملامتیوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اپنی زندگی میں فقر اور اور استغنا کو ظاہر کرنا چاہیے اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ فقر تو موت کے بعد خود بخود ظاہر ہو جائے گا۔ ان کا ایک اصول تمام اعمال میں نفس کی مخالفت کرنا ہے۔ ابو یزید بسطامی کا ارشاد ہے کہ "مخلوق سمجھتی ہے کہ اللہ کی طرف لے جانے والا راستہ سورج سے زیادہ روشن اور دن سے زیادہ واضح ہے لیکن وہ اللہ کا احسان ہے کہ وہ اپنے بندے پر اپنے راستے کو سوئی کی نوک کے برابر بھی کھول دے"۔ ملامتیوں کے مشایخ اسی طرح تھے کہ اللہ سے ان کا تعلق نہایت صحیح

اور بلند تھا اس کے باوجود وہ لوگ جیسے تواضع اور اپنے حالات پر پردہ ڈالنے والے تھے۔ امت محمدی کے ملامتی طبقہ کی منزلت و معرفت کے بارے میں بعض بزرگ عارفوں نے فرمایا ہے کہ یہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضرت ابو بکرؓ کا مقام ہے اور جو شیوخ اس مقام پر فائز ہوئے ان میں حمدون قصار، ابو سعید خراز اور ابو یزید بسطامی تھے۔ ملامتیہ عام مسلمانوں پر کوئی امتیاز نہیں رکھتے اور ان ہی میں سے سمجھے جاتے ہیں۔ بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں، لوگوں سے گفتگو کرتے ہیں اللہ کی مخلوق میں سے کوئی بھی ان کو عام لوگوں سے کسی فرض عمل میں زیادہ نہیں سمجھتا اور نہ ہی عام لوگوں سے زیادہ بلند رتبہ ان کو دیتا ہے۔ وہ خاص اللہ کے ہو جاتے ہیں راسخ ہوتے ہیں، اللہ کی عبادت میں ان کے قدم ڈگمگاتے نہیں۔ کسی ریاست و سیادت کی ان کو تمنا نہیں ہوتی کیونکہ ان کے دلوں پر ربوبیت کا غلبہ ہوتا ہے اور دنیا کے لیے ان کے دلوں میں تحقیر کا جذبہ اللہ ان کو ان تمام احوال مقامات اور اعمال کا علم عطا فرماتا ہے اور وہ ہر ایک کے شایان شان معاملہ کرتے ہیں وہ بلند ترین لوگ ہیں جو تمام منازل سے گذر چکے ہیں اور اس بات سے واقف ہیں کہ اللہ نے اس دنیا کی مخلوق سے پردہ کر رکھا ہے، چونکہ ان کے آقا (اللہ) نے حجاب کر رکھا ہے اس لیے ان لوگوں نے بھی خود کو مخلوق کی نگاہوں سے چھپا رکھا ہے۔ پس وہ حجاب کے پیچھے ہیں اور مخلوق میں سوائے اپنے آقا کے کچھ نہیں دیکھتے جب قیامت قائم ہوگی اور خدا اپنی تجلی ظاہر کرے گا تو یہ لوگ بھی اپنے مالک کے ظہور کے سبب ظاہر ہو جائیں گے اور صوفیہ عام لوگوں کے نزدیک دعووں، خوارق کا اظہار اور دعا کی قبولیت کے لیے معروف ہیں۔ ہر خرق عادت ان کی اللہ کی قربت کو ظاہر نہیں کرتی ہے کیونکہ وہ اپنے خیال میں اللہ کے سوا کسی اور چیز کا مشاہدہ نہیں کرتے اور وہ یہی حال ہے جس میں وہ مکر اور استدراج سے بچ سکتے ہیں اور ملامتیہ کسی میں بھی تمیز نہیں کرتے، تمام شریعت، ملامتیت کے احوال ہیں اور ملامتیہ صحیح علم کے علمبردار۔ وہ بلند ترین طبقہ اور بہترین طریقے کے سردار ہیں اور مقامات کے علم میں ان کو "ید بیضا" حاصل ہے اور وہ اس کے اہل ہیں۔ ان کو موازین (میزانوں) اور ادائے حقوق کا علم ہے اور حضرت سلمان فارسیؓ ان میں سب سے بلند درجے پر فائز تھے۔ وہ اصحاب رسول اللہؐ میں سے اس مقام پر فائز ہیں اور یہ دنیا میں مقام الٰہی ہے اور یہ مقام علوم کی ماہیت ہے اور یہ علم حکمت اور انسان کے کشف کا علم ہے جو فرشتوں کی پہنچ سے باہر ہے "اور آخرۃ موجلۃ، اور دنیا کے موجلۃ کا علم ہے"۔ ۱

۱ میں اس عربی عبارت کے ترجمے کے لیے ڈاکٹر لیسین مظہر صدیقی کا شکر گزار ہوں۔

اس کے بعد سعید نفیسی نے بہاءالدین نقشبند کے رسالے "رسالہ قدسیہ" کا حوالہ دیتے ہوئے خواجہ نقشبندیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ خواجگان اور اہل ملامت کے پیر سلسلہ ایک ہی ہیں اس لیے اہل ملامت کے احوال میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا انطباق خواجگان پر بھی ہوتا ہے۔ اس بیان کی روشنی میں سعید نفیسی نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ انہی کے الفاظ میں یہ ہے:

"ازایں جا پیداست کہ مشائخ طریق نقشبندی کہ پیروان طریقۂ خواجگان بودہ اند خود را از ملامتیان می دانستہ اند و پیشروان ایشان کہ مشائخ طریقۂ خواجگان باشند نیز ہمیں عقیدہ را داشتہ اند و از بیان آن بہ صراحت تمام خودداری نہ کردہ اند و نا چار برخی از وجوہ اشتراکی کہ درمیان ملامتیان از صوفیہ و جوانمردان و فتیان بودہ درین طریقہ نیز بودہ است" (ص ۱۴)

[اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طریق نقشبندیہ کے مشائخ جو طریقہ خواجگان کے پیرو تھے ملامتیوں کو اپنے ہی میں محسوب کرتے تھے اور ان لوگوں کے پیشرو جو کہ طریق خواجگان کے مشائخ تھے وہ بھی اسی طرح کا خیال رکھتے تھے اور انھوں نے اس کے صراحتاً اظہار سے دریغ نہیں کیا ہے۔ صوفیوں، جوانمردوں، فتیوں اور ملامتیوں کے درمیان جو چیز مشترک تھی لازماً اس طریق (نقشبندی) میں بھی موجود تھی]

اس باب میں سعید نفیسی کی یہ کوشش رہی ہے کہ وہ ملامتیوں کے بارے میں ان روایتوں قصص اور حکایات کو نمایاں کریں جن سے اس امر کو تقویت پہنچے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر حمدون قصار اور عبداللہ حجام تک جتنے بھی صوفیہ گذرے ہیں سب کو ملامتی ثابت کیا جائے اور اس بات کو ابھارا جائے کہ خواجگان اور ملامتیوں کے طریقہ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے اگر کوئی فرق و اختلاف ان کے درمیان ہے بھی تو صرف اس قدر ہے کہ ملامتی خود کو حجاب میں رکھتے ہیں اور وہ ایسا صرف اس لیے کرتے ہیں کہ ان کا آقا (خدا) حجاب میں ہے اس کے برعکس دوسرے تمام صوفیہ اپنے آپ کو ظاہر کر دیتے ہیں اور اس طرح کا کوئی فعل ان سے سرزد نہیں ہوتا جس کی وجہ سے عام لوگ ان پر لعنت ملامت کریں اور ان کا شمار گھٹیا درجے کے انسانوں میں کرنے لگیں۔ عام صوفیوں اور ملامتیوں کے درمیان صرف یہی ایک ظاہری فرق ہے ورنہ باطنی طور پر ملامتی حضرات بھی عام صوفیوں کی طرح خدا کے مقرب بندے ہوتے ہیں۔

(زیر ترتیب کتاب "سعید نفیسی کی علمی خدمات" کے چند صفحات)

احسان اللہ
اظہر حسین (ایم۔ ڈی۔ یو)

ابنِ رشد

دنیائے طب کی منفرد شخصیت

"جس شخص نے تشریح (ANATOMY) کا علم حاصل کیا اللہ پر اس کا ایمان زیادہ ہوا"

یہ قول بارہویں صدی عیسوی کے مشہور مسلمان طبیب اور فلسفی ابن رشد کا ہے۔ اس کا نام محمد، کنیت ابوالولید اور باپ کا نام احمد بن رشد تھا اس کی جائے پیدائش ۵۲۰ھ مطابق ۱۱۲۶ء میں بمقام قرطبہ ہے جو کہ اس زمانے میں علم و ہنر کا گھر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کا خاندان قاضیوں کا خاندان تھا۔ اس تعلیم یافتہ اور معزز قاضیوں کے خاندان میں پیدا ہونے والا ابن رشد بھی اپنے آبا و اجداد کی طرح خداداد صلاحیتوں کا مالک تھا۔ ذی علم اور صاحب کمال باپ نے اس ہونہار فرزند نے دستور وقت کے مطابق سب سے پہلے قرآن شریف پڑھا۔ اور پھر زبان سیکھنے کے لیے گھر ہی پر استاد مقرر کیے گئے۔ ابن رشد کے اس استاد کا نام ابی محمد بن رزاق تھا جو بذات خود نہایت ہی خوش اخلاق عابد و زاہد اور حافظ قرآن تھے۔

ابن رشد نے مختصر سے عرصے ہی میں قرآن کریم اور زبان دانی کی تعلیم سے فراغت حاصل کر لی۔ اس کے بعد فقہ اور حدیث میں دسترس حاصل کی۔

علم توحید یعنی فلسفہ اسلام و عقائد فقہ میں مہارت کے ساتھ ساتھ فلسفہ طب و حکمت اور ریاضیات میں وہ اپنے زمانے کا بے مثل عالم تسلیم کیا جاتا تھا۔ طب کے سلسلے میں اس نے ابو جعفر بن ہارون سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ اس کی خصوصیات و کمالات کو دیکھتے ہوئے مبصر کہتا ہے کہ یہ کئی اعتبار سے مغربی خلافت کا ابن سینا تھا۔ آخری دور میں اسے بہت زیادہ ذلیل و رسوا کیا گیا تھا۔ ضعیفی میں یہاں تک نوبت پہنچی کہ اس (فیض) مسجد کے سامنے ابن رشد بیٹھا رہتا تھا اور لوگ اس کے منہ پر تھوکتے تھے۔

ابن رشد کے اس نظریہ کو مخالفت کا سبب بنایا گیا جس میں وہ کہتا ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد ارواح تحلیل ہو جاتی ہیں اور اس کا وجود باقی نہیں رہتا جبکہ مسلمانوں اور عیسائیوں کا مذہبی نظریہ اس کے برعکس ہے اس طرح مسلمان اور عیسائی دونوں ابن رشد کے مخالف ہو گئے اور انھوں نے طرح طرح سے اسے پریشان کرنا شروع کر دیا۔

مختلف علمی میدان میں کمال رکھنے کے ساتھ ساتھ ابن رشد نظم و نسق کی بھی خصوصی صلاحیتوں کا حامل تھا۔ اس کی انھیں صلاحیتوں کی بنا پر خاندان موحدین کے دربار میں کام کرنے کا موقع نصیب ہوا ابو یعقوب یوسف اور اس کا بیٹا یعقوب المنصور جو نہایت زبردست فاتح بادشاہ گزرے ہیں ان کے دربار میں ابن رشد کا آفتاب علم و فضل عروج کی منزل کو پہنچا اور اس کو کئی اہم عہدوں پر فائز رہ کر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع فراہم ہوا۔ ابن رشد کا تعلق قاضیوں کے خاندان سے تو تھا ہی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ عدل و انصاف پسندی اور انتظامی صلاحیتوں نے اسے قاضی کے اہم اور ذمہ دارانہ عہدہ پر پہنچا دیا لہٰذا ۵۶۵ھ مطابق ۱۱۶۹ء میں اندلس کے حاکم نے اسے شہر اشبیلیہ کا قاضی القضاۃ مقرر ہوا۔ اور پھر قرطبہ کا اور پھر المنصور یعقوب نے ۵۹۱ھ میں اسے چانسلر بنایا۔ اس جلیل القدر اور مشغول ترین عہدہ پر فائز ہوتے ہوئے بھی اس نے اپنے علمی مشاغل کو جاری رکھا اور جب بھی موقع ملتا۔ تصنیف و تالیف کا کام کرتا۔ اس نے محض یادداشت سے ارسطو کی کتاب "کتاب الحیوان" کی شرح لکھی۔ اور بطلیموس کی مشہور کتاب مجسطی کا بھی خلاصہ تیار کیا۔

حاکم وقت ابن رشد سے اس درجہ متاثر تھا کہ اکثر اوقات وہ اپنی مجلس میں وہ مقام اور مرتبہ عطا کرتا جو دوسرے درباریوں اور امراء کے لیے ناقابل برداشت ہوتا۔ ابن اصیبعہ نے لکھا ہے کہ اعلیٰ مرتبہ اور اقتدار جو کہ بادشاہ کی

سلطنت میں ابن رشد کو حاصل تھا محض اس مرتبہ کو پانے کے لیے ابو محمد عبدالعبد شیخ ابی الحفص نے اپنی لڑکی بادشاہ کے نکاح میں دی تھی۔ اس منزلت کی وجہ سے بھی لوگوں کے تیور برداشت کرنے پڑتے تھے اور پھر حسد و رقابت اس حد تک بڑھی کہ حاکم وقت لوگوں نے بھڑکانا شروع کر دیا۔ اور بالآخر اس نے ابن رشد کو قید کرنے کا حکم دیدیا اس کا واقعہ یوں تحریر ہے کہ اس کے فلسفیانہ خیالات پر مبنی منطقی و عقلی دلائل اس وقت کے علماء کی سمجھ سے بالاتر تھے اور انہوں نے اس کا دوسرا ہی مطلب نکالا اور ابن رشد پر کفر و الحاد کا فتویٰ صادر کر دیا۔ اور مختلف طریقہ سے سلطان المنصور یعقوب کو اس کی طرف سے بدظن کر دیا۔ آخر کار سلطان اس سے برہم ہوا اور حکم دیا کہ ابن رشد کو شہر بدر کر کے مقام "یوسینا"، جو یہودیوں کا ایک گاؤں تھا میں متعہد کر دیا جائے۔

اس طرح مخالفین و حاسدین نے اس عظیم مفکر کو دربار سے رسوا کرایا اور درباری امراء کو اس کا مخالف بنا دیا۔ "یوسینا" میں قید کرنے کی وجہ یہ تھی کہ دشمنوں نے سلطان سے کہا تھا کہ ابن رشد یہودی الاصل ہے اور خلاف مذہب عقائد کی اشاعت کرتا ہے۔ لہٰذا اسے اسی گاؤں میں قید کیا گیا جس میں یہودی آباد تھے۔ "یوسینا" میں قید کا زمانہ تین سال تھا۔ اس زمانے میں یہودی عالموں نے اپنے علم کی تشنگی بجھائی اور برابر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ چلتا رہا کئی ایک قابل یہودی عالم اس کے شاگرد رہے اور انہوں نے ابن رشد کے حکمت و فلسفہ کو کافی فروغ دیا۔ انہیں علماء نے اپنے فاضل استادوں کی کتابوں کا عربی زبان سے عبرانی زبان میں ترجمہ کیا اور یورپ میں رائج کیا۔ جس سے لاتعداد لوگوں کو اس فلسفی کے نظریات سے استفادہ کا شرف حاصل ہوا۔

ابن رشد فلسفہ میں ارسطو کا پیرو تھا۔ ارسطو کے فلسفے زبان و عبارت کی دقت کی وجہ سے لوگوں کی سمجھ سے بالاتر تھے اس نے اپنی زبان میں نہایت شستہ و شائستہ انداز میں بیان کیا اس طرح سے فلسفہ ارسطالیس سے خلق خدا نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اور بعض مسائل فلسفہ ارسطو جو اس وقت تک نہ سلجھنے والی گتھی بنے ہوئے تھے لوگوں کی سمجھ میں بآسانی آگئے۔

ابن رشد نے شیخ الرئیس بو علی سینا (۱۰۳۷ - ۹۸۰) کی کتابوں پر نہایت محققانہ شرحیں لکھی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بعض مقامات پر شیخ سے اختلاف بھی کیا ہے۔ بیشتر مقامات پر شیخ پر اعتراضات کئے ہیں جس سے شیخ کے مقلدین کو کافی گہرا صدمہ پہنچا ہے مگر یہ اعتراضات اس قدر ٹھوس اور مدلل ہیں کہ اسے تسلیم کرنے کے علاوہ چارہ نہیں۔ شیخ کا سب سے بڑا پیرو اور معتقد خواجہ نصیر الدین طوسی اپنی کتاب شرح اشارات میں ایسے ہی ایک موقع پر لکھتا ہے کہ علم و حکمت کے کل قواعد بھی دیگر علوم کے قواعد کی طرح استثنائی مستثنیات رکھتے ہیں اور ایسی صورت پیش آنے پر حکماء کو یہ ماننا پڑتا ہے کہ بعض امور ان کے مقرر کردہ عام اور کامل اصول کے تحت نہیں آتے۔

ابن رشد جہاں پایہ کا مصنف تھا وہیں اعلیٰ درجہ کا طبیب بھی تھا وہ علم و عمل دونوں حصوں پر حاوی تھا گو کہ اس نے باقاعدہ طبابت نہیں کی تھی مگر جس قدر بھی معالجات کے سلسلہ میں فرمایا وہ معرکۃ الآراء ہے۔ علم طب میں اس کی کتاب "کتاب الکلیات" بڑے پایہ کی تصنیف ہے جس کے بارے میں خیال ہے کہ یہ بہت سے اعتبارات سے القانون کے مساوی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس کتاب کا اصل نسخہ شاید کہیں موجود نہیں۔ البتہ اس کا عبرانی ترجمہ موجود ہے۔ ابن رشد کی زیادہ تر کتابیں محض ترجمہ کی وجہ سے ہی محفوظ رہ سکی ہیں جو اس کے یہودی شاگردوں کی مرہون منت ہیں۔

"الکلیات فی الطب" میں اس نے مختلف موضوعات پر بحث کی ہے۔ اس کی شروعات انسانی جسم کی تشریح (HUMAN ANATOMY) اور مختلف اعضاء انسانی کے افعال (HUMAN PHYSIOLOGY) سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس نے عام بیماریوں کا ذکر کیا ہے۔ پھر مختلف اعضاء کی بیماریاں اور ساتھ ہی ساتھ آنکھ کی مختلف بیماریوں کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ نبض کے باب میں بیان کرتے ہوئے مریض کی نبض اور صحت مند انسان کی نبض میں تفریق کی ہے اور بیماریوں میں قارورے کے تغیر و غیرہ سے متعلق ابواب قائم کیے ہیں۔ [illegible] حصہ غذا، دوا اور سمیات سے تعلق رکھتا ہے۔ ریاضت، دلک وغیرہ کا تفصیلی بیان ہے۔ آخری باب میں جو علاج درج ہے۔ حصہ علم الجراحت سے متعلق ہے اس میں باقاعدہ خاکے کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور ساتھ ہی خراج (پھوڑا) کا علاج۔ نیز مصنف نے جریان الدم (خون کا بہنا) کو روکنے کے لیے جالینوس الدم (دافع) عمل کی اور مجروح حصے کی بندش کرنے کو بیان کیا ہے اس کے علاوہ زخم کے علاج میں مجروح سطحوں کو قریب لانا اس پر جبیرہ باندھنے کی ہدایت کی ہے۔ ابن رشد ہی وہ پہلا حکیم ہے جس نے اپنی کتاب میں یہ انکشاف کیا ہے کہ چیچک انسان کو پوری زندگی میں ایک بار سے زیادہ نہیں نکل سکتی۔ آنکھ کے پردہ شبکیہ (RETINA) کی مکمل تشریح اور افعال کو سب سے

پہلے ابن رشد ہی نے واضح کیا ہے کیمپل لکھتا ہے کہ ابوالقاسم زہراوی (۱۱۲۲ء) اور ابن رشد (۱۱۹۸ء) نے طب اور سرجری کی بنیادیں رکھیں اور مغربی طب پر اُن کے گہرے اثرات نمایاں ہیں۔

ابن رشد کی مخالفت بڑے پیمانے پر ہوئی ہے یورپ کا عہد جاہلیت مذہبی پیشواؤں کی من مانی اور جابرانہ حکومت کا عہد تھا اور ابن رشد کے فلسفہ میں ایسے عقلی دلائل موجود تھے جو گرچہ دین عیسوی کے مخالف نہیں تھے مگر پادریوں کے جابرانہ احکام کی مخالفت جھلکتی تھی۔ یورپ کے بعض علما فلسفہ رشد کی طرف مائل ہوئے اور انہوں نے ابن رشد کا تتبع اختیار کیا۔ اس سے ان کے عقلی اور ذہنی قوی کو تازگی ملی۔ اور کلیسا کے روایتی اور رواجی احکاموں کی مخالفت پر عمل کرنے لگے۔ چرچ کے اراکین یہ صورت حال دیکھ کر کافی پریشان ہوئے اور انہیں اپنا بھرم کھلتا ہوا نظر آیا لہٰذا انہوں نے علم و حکمت کی دشمنی کو فرض اولین سمجھا اور ابن رشد ہی کے مخالف ہو گئے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے فلسفہ کو پڑھنا اور پڑھانا دونوں ممنوع قرار دیا گیا۔ اور رشدانی لوگ گردن زدنی ٹھہرائے گئے۔ لیکن باوجود اتنی پابندی کے جن لوگوں کو فلسفہ رشد کی چاٹ لگ گئی تھی وہ اس سے کسی بھی طرح باز نہ رہ سکے۔ اور پادریوں کی تمام تر کوششیں ناکام ہوئیں۔ بلکہ جوں جوں ان لوگوں نے علم کی اس آگ کو بجھانے کی کوشش کی اتنی ہی تیزی کے ساتھ یہ آگ بھڑکی۔ اور تمام ملکوں میں پھیل کر فرقہ پروٹسنٹ کی بنیاد ڈالی۔ اس گروہ نے کلیسائی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اس میں کامیاب ہوئے۔ اس طرح ابن رشد کا فلسفہ جدید سائنس اور فلسفہ کی بنیاد بن گیا۔

تمام تر مخالفتوں، مشکلوں، پریشانیوں اور رسوائیوں کو برداشت کرنے والا بے نظیر فلسفی اور علامہ ۱۰ دسمبر ۱۱۹۸ء کو مراکش میں اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔

ارشادات

اور تمہارے پروردگار نے یہ حکم قطعی دے دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرتے رہو۔ اگر ان دونوں میں سے ایک یا دونوں تمہاری موجودگی میں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کے سامنے اُف بھی نہ کرو اور نہ اُن کو جھڑکو۔ اور اُن سے ادب و اخلاق کی باتیں کرو۔ اور رحم و مروّت سے سرِ عجز ان کے سامنے خم کرو اور یہ کہا کرو کہ اے میرے پروردگار تو ان دونوں پر ایسا ہی رحم فرما جیسا کہ ان دونوں نے مجھے ننھا سا پالا تھا۔ تمہارا پروردگار جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس سے خوب واقف ہے اگر تم نیکسار ہو گے تو وہ بھی توبہ کرنے والوں کے لیے بڑا ہی بخشنے والا ہے اور (اے رسولؐ) تم قرابت والے کو اس کا حق دے دو، اور مسکین و مسافر کو اُس کا۔ اور بے جا نہ اُڑاؤ۔

(اسرا، آیت ۲۲)

اور تم میں سے مال دار و صاحبِ مقدور لوگ یہ قسم نہ کھا بیٹھیں کہ وہ رشتہ داروں، مساکین اور راہِ خدا میں ہجرت کرنے والوں کو کچھ نہ دیں گے۔ اور ان کو چاہیے کہ معاف کر دیں اور درگذر کریں۔ کیا تم اس کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ بخش دے اور اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

(النور: آیت ۲۲)

بالتحقیق اللہ عدل و احسان اور رشتہ داروں کو (ان کے حقوق) دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی، بدی اور بغاوت سے منع فرماتا ہے تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو اور اللہ کے عہد کو جب تم عہد کر چکے ہو پورا کرو اور قسموں کو ان کے پختہ کر دینے کے بعد نہ توڑو۔ جس حال میں کہ تم اللہ کو ضامن دے چکے ہو بیشک جو کچھ تم کرو گے اللہ اس سے خوب واقف ہے

(النحل، آیت ۹۰۔۹۱)

ضحیٰ انجم
شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

حیات بعد ممات

اگر ہم کائنات، گردش لیل و نہار، زندگی اور موت کے حقائق کا جائزہ لیں تو ہمیں ہر شے میں خالق کائنات کی قدرت کے جلوے نظر آئیں گے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

"بدیع السمٰوات والارض"

اور وہ انسان جو "لم یکن شیئاً" کی منزل میں تھا اسے رب تبارک و تعالیٰ نے وجود سے سرفراز فرمایا۔ اور یہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جس قدرت نے اس انسان کو عدم سے وجود بخشا اور "نہیں" سے "ہاں"، کیا وہی ذات اس انسان کو مارنے اور پھر دوبارہ جلانے پر بھی قادر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے،

"کیف تکفرون باللہ وکنتم امواتاً فاحیاکم ثم یمیتکم
ثم یحییکم ثم الیہ ترجعون"

تم کیوں کر خدا کے منکر ہو گئے حالاں کہ تم مردہ تھے
اس نے تمہیں زندگی دی، پھر تمہیں موت دے گا پھر تمہیں
جلائے گا۔ پھر اس کی طرف پلٹ کر جاؤ گے"

سورۂ بقرہ - آیت نمبر ۲۸

خدا کا یہ فرمان دنیا کے ملحد مادہ پرستوں کے خیالات کو باطل کرتا ہے جن کا کہنا ہے کہ اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں۔ جیسا کہ ان کے اسلاف نے ان سے پہلے کہا تھا۔

"وقالوا ما ھی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا وما
یھلکنا الا الدھر وما لھم بذالک من علم ان
ھم الا یظنون"

"اور وہ کہتے ہیں کہ نہیں مگر یہی دنیا کی زندگی مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں ہلاک نہیں کرتا مگر زمانہ اور انھیں اس کا علم نہیں وہ تو نرے گمان دوڑاتے ہیں"

(سورۃ الجاثیہ - آیت نمبر ۲۴)

اس طرح سورۂ بقرہ میں پانچ مقامات ایسے ہیں جہاں مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے کا ثبوت ملتا ہے اور اس کا بھی ثبوت ہم پہنچاتے ہیں وہ دن دور نہیں جب لوگ قیامت کے دن اٹھائے جائیں گے اور ان کو اُن کے اعمال کی جزا ملے گی۔ اچھے عمل کا اچھا صلہ اور بُرے عمل کا بُرا بدلہ ملے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"واذ قلتم یا موسیٰ لن نؤمن لک حتی نری اللہ
جھرۃ فاخذتکم الصاعقۃ وانتم تنظرون۔ ثم بعثنٰکم
من بعد موتکم لعلکم تشکرون"

"اور جب تم نے کہا۔ اے موسیٰ! ہم ہرگز تمہارا یقین نہ لائیں گے جب تک کہ علانیہ خدا کو نہ دیکھ لیں۔ تو تمہیں کڑک نے آلیا۔ اور تم دیکھ رہے تھے پھر مرے پیچھے ہم نے زندہ کیا کہ کہیں تم احسان مانو"

(سورۂ بقرہ - آیت نمبر ۵۵)

یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہ قصد کر کے چلے تھے کہ اللہ کی بارگاہ میں بچھڑے کی عبادت سے معذرت پیش کریں، وہ ستر افراد تھے۔ ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نامزد اس لیے کیا تھا کہ انھوں نے ہی حضرت موسیٰ سے کہا تھا کہ جو اللہ کے یہاں سے لائے ہیں، انھیں ہم اس وقت تک تسلیم نہیں کر سکتے جب تک اللہ جل شانہ کو ہم کھلم کھلا نہ دیکھ لیں۔ ان کی سرکشی اور بے باکی کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک ہلاکت خیز آواز بھیجی، بعض کا خیال ہے کہ آسمان سے آگ نازل ہوئی تھی۔ اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انھوں نے تباہ کن آواز سنی اور

غش کھا کر گر گئے اور مر گئے اور عذاب الٰہی بھی ان پر اس حکمت کے ساتھ مسلط کیا گیا کہ ان میں سے کچھ غش کھا کر گرتے اور کچھ انھیں دیکھتے ہوئے پھر غش کھاتے ہوئے ہوش و حواس میں آتے اور دوسرا ایک وسا ... کر دیا غش کھا کر گرتا، اس طرح ان سب نے اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ کس طرح اللہ نے انھیں موت دی اور پھر زندہ کیا۔ یہ عذاب ان کے لیے عبرت کا سامان اور ان کے "لن نؤمن لک حتی نری اللہ جہرۃ" کہنے کا صلہ تھا تاکہ اس کے بعد اس طرح کا مطالبہ نہ ہو سکے۔ اس واقعہ کا مرکزی نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں مارا پھر جلایا اور وہی حساب کے لیے قیامت کے دن ہمیں بھی جلانے پر قادر ہے۔

قرآن حکیم میں ہے۔

وإذ قتلتم نفسا فادّارأتم فيها والله مخرج ما كنتم تكتمون فقلنا اضربوه ببعضها كذلك يحيي الله الموتى ويريكم آياته لعلكم تعقلون۔

اور جب تم نے ایک خون کیا تو ایک دوسرے پر اس کی تہمت ڈالنے لگے اور اللہ کو ظاہر کرنا تھا جو تم چھپاتے تھے تو ہم نے فرمایا کہ اس مقتول کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو اللہ یوں ہی مردے جلائے گا اور تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے کہ کہیں تمھیں عقل ہو۔"

سورہ بقرہ آیت نمبر۲

اس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ قوم بنی اسرائیل میں ایک شخص نے کسی کو قتل کر دیا اور اس قاتل کا سراغ نہ لگ سکا، بنی اسرائیل قاتل کا سراغ لگانے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ بنی اسرائیل کے لوگ گائے ذبح کریں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وإذ قال موسى لقومه إن الله يأمركم أن تذبحوا بقرة قالوا أتتخذنا هزوا قال أعوذ بالله أن أكون من الجاهلين۔

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو۔ بولے کہ آپ ہمیں مسخرہ بناتے ہیں۔ فرمایا۔ خدا کی پناہ کہ میں جاہلوں میں سے ہوں۔
(سورہ بقرہ۔ آیت ۶۷)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں ان کے حاضر ہونے کا سبب یہ تھا کہ وہ مقتول کے بارے میں مختلف الرائے تھے ایک جماعت یہ کہتی کہ تم نے قتل کیا، ہم نے نہیں قتل کیا۔ دوسری جماعت کا قول اس کے برعکس تھا۔ چھان بین کے بعد جب مطلوبہ گائے انھیں مل گئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انھیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ بنی اسرائیل نے گائے ذبح کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انھیں گائے کے ایک ٹکڑے سے مقتول کو مارنے کا حکم دیا۔

"فقلنا اضربوه ببعضها كذلك يحيي الله الموتى"

جب انھوں نے گائے کے ایک ٹکڑے سے مقتول کو مارا مقتول فوری طور پر زندہ ہو گیا۔ ان لوگوں نے پوچھا تمھیں کس نے قتل کیا۔ اس نے جواب دیا کہ مجھے فلاں نے قتل کیا۔ پھر وہ مر گیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"كذلك يحيي الله الموتى ويريكم آياته لعلكم تعقلون"

اللہ تعالیٰ نے مردہ جلانے پر اپنی قدرت کا مظاہرہ ایسے واقعے سے کیا جسے انھوں نے خود دیکھا۔ اور اس واقعہ کو بعثت کے حق ہونے کی دلیل بنائی، جو ان لوگوں کے درمیان باہمی نزاع تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو دور کیا اور ان کی عقلوں کو بھی جھنجوڑا اور فرمایا۔ غور و فکر سے لو۔ تمھیں یقین ہو جائے گا کہ جو ذات ایک نفس کو دوبارہ زندگی بخشنے پر قادر ہے وہ تم کو بھی جلانے اور دوبارہ قیامت کے دن اٹھانے پر قدرت رکھتی ہے۔

۲۔ ارشاد ربانی ہے۔

"ألم تر إلى الذين خرجوا من ديارهم وهم ألوف حذر الموت فقال لهم الله موتوا ثم أحياهم إن الله لذو فضل على الناس ولكن أكثر الناس لا يشكرون۔"

"اے محبوب کیا تم نے نہیں دیکھا انھیں جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلے اور وہ ہزاروں تھے۔ تو اللہ نے

نے ان سے فرمایا۔ مرجاؤ پھر انھیں زندہ فرمایا۔ بےشک اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے۔ لیکن اکثر لوگ ناشکرے ہیں۔"

سورہ بقرہ۔ آیت نمبر ۲۴۳

اس پورے واقعے کی تلخیص یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے تقریباً چار ہزار افراد طاعون کی وبا سے اپنے دیار چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ اس فرار سے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ ایسی جگہ پہنچ جائیں، جہاں موت کی رسائی نہ ہو جب وہ اپنی مقررہ جگہ پر پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں موت دی۔ اسی دوران ان کے قریب سے ایک نبی کا گزر ہوا۔ ان لوگوں کو مردہ دیکھ کر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے ان کی زندگی کے لیے دعا فرمائی۔ دعا باب اجابت سے ٹکرائی اور اللہ تعالیٰ نے انھیں زندہ کر دیا۔ اس واقعہ میں واضح عبرت روشن نشان، تعلیم ہمت اور کھلی ہوئی دلیل ہے کہ مشیّت مقدر سے کوئی بچ نہیں سکتے اور اللہ کے سوا کوئی ٹھکانہ نہیں ان لوگوں نے طاعون کی وبا سے راہ فرار اختیار کی تھی اور موت کے چنگل سے آزاد ہونا چاہتے تھے جو بہرحال آنی تھی اور وہ حیات طولانی کے خواہاں تھے۔ لیکن ان کے اس منصوبے کے برعکس کارروائی کی گئی وہ سب کے سب بیک وقت مر گئے قرآن کریم نے ان کے اس انکار کی مختلف مقامات پر صراحت کی ہے۔

۴۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"او کالذی مر علیٰ قریۃ وھی خاویۃ علیٰ عروشھا قال انیٰ یحیی ھذہ اللہ بعد موتھا فاماتہ اللہ مائۃ عام ثم بعثہ۔ قال کم لبثت قال لبثت یوما او بعض یوم۔ قال بل لبثت مائۃ عام فانظر الیٰ طعامک وشرابک لم یتسنہ وانظر الیٰ حمارک ولنجعلک آیۃ للناس وانظر الی العظام کیف ننشزھا ثم نکسوھا لحما فلما تبین لہ قال اعلم ان اللہ علیٰ کل شیء قدیر"

"یا اس کی طرح جو گزرا ایک ایسی بستی پر اور وہ ڈھی پڑی تھی اپنی چھتوں پر۔ بولا اسے کیوں کر جلائے گا اللہ اس کی موت کے بعد تو اللہ نے اسے مردہ رکھا سو برس پھر زندہ کر دیا۔ فرمایا تو یہاں کتنا ٹھہرا۔ عرض کی دن بھر ٹھہرا ہوں گا یا کچھ کم۔ فرمایا نہیں۔ بلکہ تجھے سو برس گزر گئے اور اپنے کھانے اور پانی کو دیکھ کہ اب تک بو نہ لایا اور اپنے گدھے کو دیکھ کہ جس کی ہڈیاں تک سلامت نہ رہیں اور یہ اس لیے کہ تجھے ہم لوگوں کے واسطے نشانی کریں اور ان ہڈیوں کو دیکھو کیوں کر ہم انھیں اٹھان دیتے پھر انھیں گوشت پہناتے ہیں۔ جب یہ معاملہ اس پر ظاہر ہو گیا۔ بولا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے"

سورہ بقرہ۔ آیت نمبر ۲۵۹

ان آیات میں حضرت عزیر علیہ السلام سے متعلق ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب وہ بیت المقدس کی ایک بستی سے گزرے تو وہاں انھوں نے کسی کو نہ پایا۔ پوری بستی تہ و بالا تھی۔ چھتیں زمیں بوس ہو گئی تھیں۔ یہ نقشہ دیکھ کر حضرت عزیر حیران و سراسیمہ سے ہو گئے کیوں کہ یہ پہلے آباد شہر تھا، اس شہر کی یہ تباہی اور بربادی دیکھ کر متاثر ہونا فطری بات تھی۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت عزیر علیہ السلام کے ساتھ حمار (گدھا) اس پر کھجور اور تھوڑا سا شربت بھی تھا۔

بیت المقدس کی تباہی کا سبب مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ بخت نصر قوم بنی اسرائیل پر اچانک حملہ آور ہوا اور انھیں قتل کیا اور ان کی اولاد کو نظر بند کیا۔ حضرت عزیر نے اس بستی کے سامنے کھڑے ہو کر یہ سوال کیا۔ " انیٰ یحیی ھذہ اللہ بعد موتھا" اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے سو سال کے لیے موت دے دی۔ پھر انھیں زندگی دی اور فرشتے کے توسط سے ان سے سوال کیا کہ آپ یہاں کتنے دن ٹھہرے انھوں نے جواب دیا۔ ایک دن یا اس سے کچھ کم۔ یہ اندازہ انھوں نے اس لیے پیش کیا تھا کہ وہ دن کے ابتدائی حصہ میں موت کی نیند سوئے تھے اور دن کے اخیر حصے میں زندہ ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ سمجھا یہ وہی دن ہے۔ حالاں کہ وہ پورے سو سال آرام فرما رہے۔ ان کی اس طویل عرصے کی نیند کے دوران وہ بستی آباد ہو گئی اور باشندے سے کچھ کچھ بھر گئی اور بنی اسرائیل بھی وہیں واپس آ گئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انھیں حیات

بخشنے کا ارادہ فرمایا تو سب سے پہلے ان کی آنکھوں کو زندگی دی تاکہ وہ اللہ کی قدرت کا تماشہ دیکھیں کہ اللہ نے ان کے جسم میں زندگی کی نہر کیسے دوڑائی اور کس طرح حیات سے دوبارہ لطف اندوز ہوسکے۔ جب وہ ہر اعتبار سے زندہ ہوگئے تو ہر چیز کی تحقیق و جستجو کرنے لگے اور متحیر ہو کر ہر ایک چیز پر نظر ڈالنے لگے۔ اللہ نے کیسے زندہ کیا؟ بستی کیسے آباد ہوگئی۔ بستی والے کیسے پلٹ آئے؟ اللہ نے اس کے تمام اسرار و رموز سے انھیں باخبر کیا اور فرمایا۔ اپنے کھانے اور پانی یعنی کھجور اور انگور کی طرف دیکھیے اور اپنی سواری (حمار) کو دیکھیے۔ جب اس پر نظر پڑی تو وہ مرچکا تھا۔ تمام اعضا بکھر چکے تھے، ہڈیاں چمک رہی تھیں لیکن اس سو سال کی مدت میں انجیر اور انگور کا رس ویسے ہی تازہ رہا۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہوئی نہ رنگ ہی بدلا اور نہ مزے میں تغیر ہوا۔ لیکن حمار (سواری) کے اجزا سب منتشر تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہوا بھیجی۔ ہوا نے ان اجزا کو جمع کیا اور ہر ایک ہڈی حسب ضرورت ترتیب دی گئی۔ ہڈیوں پر گوشت چڑھایا گیا گوشت پر کھال آگئی، بال نکلے، پھر اس میں روح پھونکی گئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بولنے لگا۔ آپ نے قدرت خداوندی کا مشاہدہ کیا اور فرمایا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ زندگی اور موت کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں ہے۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ احادیث میں بھی ملتا ہے۔ ایک انسان سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بوسیدہ ہڈی لے کر آیا اور کہنے لگا۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ اس کے بارے میں علم رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے بھی کل قیامت کے دن پیدا کرے گا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ اللہ تمہیں عدم میں لے جائے گا۔ پھر وجود بخشے گا۔ اسی سلسلے میں قرآن کی آیت نازل ہوئی۔ جس کا ترجمہ یہ ہے۔

"اور کیا آدمی نے نہ دیکھا کہ ہم نے اسے پانی کی بوند سے بنایا۔ جبھی وہ صریح جھگڑالو ہے اور ہمارے لیے کہاوت کہتا ہے۔ اور اپنی پیدائش بھول گیا۔ بولا۔ ایسا کون ہے کہ ہڈیوں کو زندہ کرے جب وہ بالکل گل گئیں۔ تم فرماؤ انھیں وہ زندہ کرے گا جس نے پہلی بار انھیں بنایا

اور اسے ہر پیدائش کا علم ہے۔"

۵۔ سورہ بقرہ میں پانچویں اور آخری جگہ جہاں زندگی بعد موت کا ثبوت ملتا ہے۔ اس آیت کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

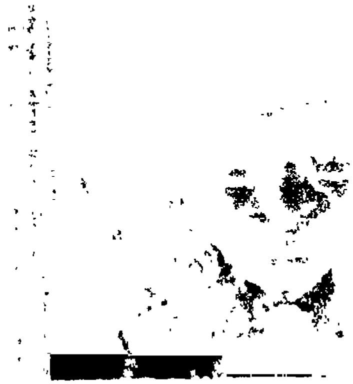
"اور جب عرض کی ابراہیمؑ نے اے رب دکھا دے تو کیوں کر مردے کو جلائے گا۔ فرمایا کیا تجھے یقین نہیں عرض کی یقین کیوں نہیں مگر یہ چاہتا ہوں کہ میرے دل کو قرار آجائے۔ فرمایا۔ تو اچھا چار پرندے کر اپنے ساتھ ہلا . . . پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ہر پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر انھیں بلا وہ تیرے پاس چلے آئیں گے۔ پاؤں سے دوڑتے اور جان رکھ کہ اللہ غالب حکمت والا ہے۔"

سورہ بقرہ۔ آیت نمبر ۲۶۰

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قدرت الٰہی کا مشاہدہ کرنے کا ارادہ فرمایا کہ دیکھیں اللہ جل شانہٗ مردوں کو کس طرح زندگی بخشتا ہے۔ جل شانہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مخاطب ہو کر فرمایا کیا اس قدرت پر تم کو یقین نہیں جو مردوں کو زندگی عطا کرتی ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ مجھے اس پر یقین ہی نہیں بلکہ ایمان کامل مگر اطمینان قلب کے لیے تیری قدرت ظاہراً دیکھنا چاہتا ہوں۔ تو ارشاد ہوتا ہے کہ اے ابراہیم! آپ چار پرندوں کو پکڑیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حکم خداوندی پر عمل کیا اور چار پرندوں کو پکڑا جس میں فاختہ، مرغ، مور اور کوا تھے۔ ان پرندوں کو ذبح کر کے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور ہر ایک جز کو ایک دوسرے سے خلط ملط کر کے پہاڑ کی چوٹی پر پھینک دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہوا کہ آپ ان پرندوں کو آواز دیں آپ نے ایسے ہی کیا آپ کی پکار پر تمام پرندے اپنی شکل درست ہو کر جلدی سے آپ کی بارگاہ میں پہنچے۔ واقعہ کا مقصد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مردہ زندہ کرنے کی قدرت کا مشاہدہ کرنا تھا جس کا انھوں نے سوال کیا تھا۔ اس واقعے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا "واعلم ان اللہ عزیز حکیم" آسمان و زمین کی پنہائیوں میں کسی بھی چیز کا وجود نہیں جس پر اللہ تعالیٰ کا غلبہ نہ ہو۔ یہ وہ چند آیات تھیں جن سے مردوں کو زندہ فرمانے کا ثبوت ملتا ہے (عربی سے ترجمہ)

راحت ابرار

مسلم یونی ورسٹی کے شب و روز



وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی کی امریکہ سے واپسی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی امریکہ سے اپنے دل کا آپریشن کرانے کے بعد مورخہ ۱۵ مارچ کو یہاں واپس آ گئے ہیں۔ اس موقع پر علی گڑھ پبلک اسکول کے بچوں نے وائس چانسلر صاحب اور ان کی اہلیہ کا شاندار استقبال کیا اور انھیں گلہائے عقیدت پیش کیا۔

وائس چانسلر لاج پر پرو وائس چانسلر پروفیسر وصی الرحمٰن کے علاوہ طلبا، اساتذہ اور غیر تدریسی عملے کی بڑی تعداد ان کے استقبال کے لیے موجود تھی۔

جناب سید ہاشم علی کے صحت یاب ہونے کی خوشی میں اسٹاف ایسوسی ایشن کی جانب سے بھی ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا جس میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر آر پی رستوگی بھی شریک تھے۔

یاد رہے کہ ۲۳ نومبر کو امریکہ کے ہیوسٹن ہسپتال میں ہاشم صاحب کی بائی پاس سرجری دنیا کے نامور ڈاکٹر کولی نے کی تھی بائی پاس سرجری کے بعد ہاشم صاحب کی صحت میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اور اب وہ پہلے سے بھی زیادہ بہتر طور پر یونیورسٹی کی خدمات انجام دے سکیں گے۔

اسلامی علوم میں ہندوستان کا حصّہ — ایک تین روزہ نیشنل سیمینار؛

مطالعات اسلامی علوم میں ہندوستان کا حصّہ کے موضوع پر تین روزہ نیشنل سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر پروفیسر وصی الرحمٰن نے کہا کہ اسلامی مطالعہ کا دائرہ پانچ سو عیسوی سے اب تک پھیلا ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسلام کا مطالعہ مذہبی، ثقافتی، تہذیبی اور اخلاقیاتی نیز فلسفیانہ نقطۂ نظر سے کیا جانا بہت ضروری ہے۔ خدائی و حدانیت کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کو مصائب و آلام میں تسکین ملتی ہے۔

انھوں نے کہا کہ دنیا کا ہر چوتھا یا پانچواں آدمی اسلام کا پیرو ہے اور دنیا کے نقشہ کا بڑا حصّہ اسلامی نماز کی برکتوں سے مالا مال نظر آتا ہے۔

اپنے کلیدی خطبہ میں پروفیسر مقبول نے توقع ظاہر کی کہ اس سیمینار سے یہ کوشش پروان چڑھے گی کہ ہم تخلیقی اور بنیادی تحقیق کی طرف متوجہ ہوں اور حقایق کو سمجھنے سمجھانے میں ہمارا نقطۂ نظر معروضی ہو۔ ہمارے تعصبات و معتقدات تحقیق کی راہ میں مانع نہ ہوں۔

انھوں نے علما سے اپیل کی کہ وہ اس کام میں خصوصی رول ادا کریں۔

افتتاحی جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے مسلم یونیورسٹی کے پرو چانسلر الحاج عبیدالرحمٰن خان شروانی نے کہا کہ علم کا اہم کام عمل ہے۔ ہمارا عمل ایسا ہونا چاہیے کہ دوسرے لوگ بھی ہماری بات کو مانیں اور جو شکوک پیدا ہو گئے ہیں وہ دور ہو جائیں۔

اس موقع پر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ پروفیسر محمد علی نے مندوبین کا استقبال کیا اور سیمینار کے ڈائرکٹر پروفیسر اکمل ایوبی نے شکریہ ادا کیا۔ اس سیمینار میں ہندوستان کے مسلم دانشوروں اور ماہرین اسلامیات نے حصّہ لیا مثلاً پروفیسر شبیر الحق، پروفیسر رفیع الدین، پروفیسر مصباح الحسن، پروفیسر ضمیرالدین صدیقی، پروفیسر عطا کریم، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر ایم ایس خان، پروفیسر ضیاءاللہ انصاری، پروفیسر اقبال انصاری وغیرہ۔

علی گڑھ ۱۲ مارچ۔ ریاستی سطح پر نیشنل ٹیلنٹ سرچ کے امتحان میں میرٹ کی بنیاد پر علی گڑھ ضلع کے چار طالب علم کامیاب ہوئے ہیں جن میں مرزا محمد سفیان بیگ اور راجیو کار مسلم یونیورسٹی کے ایس ٹی ہائی اسکول سے وابستہ ہیں۔

یہ امتحان دسویں کلاس کے طلبا کے لیے ہوئے ہیں جن کا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ ہمارے صوبے میں کتنے باصلاحیت اور ذہین طلبا ہیں۔

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ٹینڈرز نوٹس

درج ذیل کاموں کے لیے ایٹم ریٹ کی بنیاد پر سر مہر ٹینڈرز مطلوب ہیں۔ ٹینڈرز اور اس سے متعلق کاغذات یونیورسٹی انجینیر کے دفتر سے آفس ٹایم میں چھٹی کے دن کے علاوہ کسی بھی روز حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

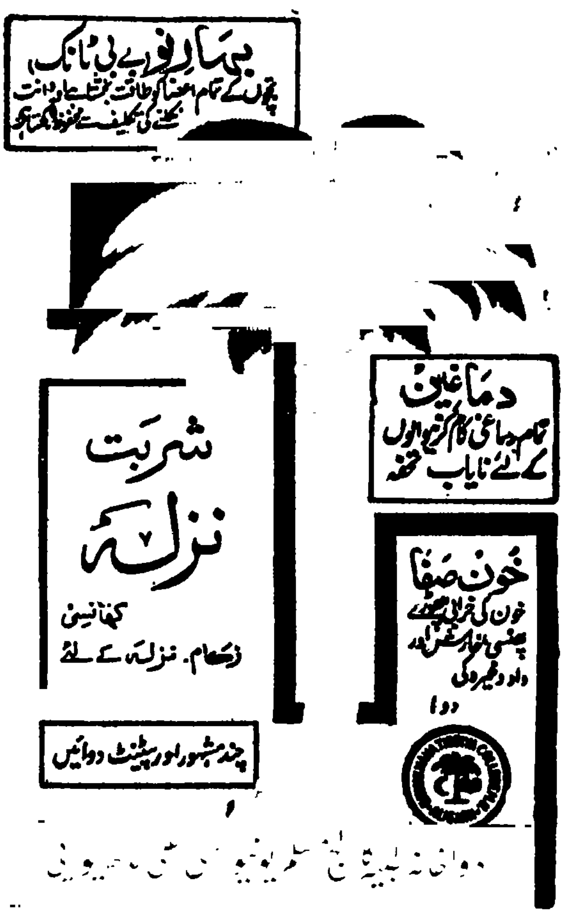
ٹینڈرز فارم کی فروخت ٹینڈرز فارم جمع کیے جانے کی تاریخ سے ۲۴ گھنٹے قبل بند کردی جائے گی۔

ٹینڈرز دوپہر ایک بجے ٹینڈرز کھولے جانے کے دن تک وصول کیے جائیں گے۔

نمبر شمار	کام کا نام	کام کے لیے مختص رقم
۱-	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۵۰۰ طلبا کے ہوسٹل کی بلڈنگ کے واسطے ایک سائیکل اسٹینڈ کی تعمیر جو کہ سی پی ڈبلیوڈی کے شیڈول ۱۹۸۱ء کے ریٹ پر ہوگی	41,065-00
۲-	زر ضمانت	1027-00
۳-	ٹینڈر فارم کی قیمت	57/-
۴-	کام کے مکمل کرنے کی مدت	تین ماہ
۵-	ٹینڈرز کھولے جانے کی تاریخ	۱۵ اپریل ۱۹۸۶ء بوقت ساڑھے تین بجے تک

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

یونیورسٹی انجینیر


بہار نو بے بی ٹانک
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشنے اور دانت نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
شربت نزلہ
کھانسی زکام. نزلہ کے لئے
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں کے لئے نایاب تحفہ
خون صفا
خون کی خرابی پھوڑے پھنسی خارش اور داد وغیرہ کی دوا
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں



Litho Colour Printers, Achal Tal, G. T. Road, Aligarh Phone : 4185


الاخلاق
یونیورسٹی کانووکیشن کے موقع پر
خصوصی پیشکش

MOHAMMEDAN
SOCIAL REFORMER
تہذیب الاخلاق

جلد ۵ ✱ ۱۵ر تا ۳۰ر اپریل ۱۹۸۶ء ✱ شمارہ ۸

مندرجات

			صفحہ
۱	وائس چانسلر کا پیغام		۲
۲	اداریہ		۳
۳	اے عزیز طالب علمو	سر سید احمد خاں	۵
۴	علی گڑھ اور نیا ہندوستان	ابوالکلام آزاد	۷
۵	حرفِ دانش ترجمہ ۔ منظر عباس نقوی	الیس راد ھا کرشنن	۱۵
۶	کانووکیشن کے مہمانِ خصوصی		۱۷
۷	تعمیرِ شخصیت	ڈاکٹر ذاکر حسین	۱۹
۸	شہریت کی ذمہ داریاں	پروفیسر محمد مجیب	۲۳
۹	یونیورسٹی کے ترقیاتی کاموں پر ایک نظر	راحت ابرار	۲۶
۱۰	یونیورسٹی کانووکیشن ۔۔ تاریخ وار گوشوارہ	محمد احمد	۳۰

ترسیلِ زر کا پتہ : پروفیسر منظر عباس نقوی
ٹرسٹی تہذیب الاخلاق ٹرسٹ،
شعبۂ اردو ۔ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ ۔
قیمت فی شمارہ : ڈیڑھ روپیہ
زرِ سالانہ : تیس روپے
تاحیات : تین سو روپے

SYED HASHIM ALI
VICE - CHANCELLOR

OFFICE : 3994
RES : 3173
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH - 202001
U.P. INDIA

مجھے بڑی خوشی ہے کہ تہذیب الاخلاق اور فکر و نظر کے
خاص نمبر جلسہ تقسیم اسناد کے سلسلے میں شائع ہو رہے ہیں
جو دس سال بعد پہلی مرتبہ منعقد کیا جا رہا ہے۔
جلسہ تقسیم اسناد یونیورسٹی کے طالب علم کی زندگی میں ا
اہم واقعہ ہوتا ہے جس کی یاد اسے عمر بھر آتی رہتی۔
مجھے امید ہے کہ ان خاص شماروں میں یونیورسٹی سے
اچھے مضامین شائع ہوں گے تاکہ نئے طالب علموں
یونیورسٹی کی قدیم روایات اور اس کی تاریخ سے
ہو سکے۔

ہاشم علی

اداریہ

عید اور بقرعید کے تہواروں کی طرح کانووکیشن بھی ہماری یونیورسٹی میں بڑی دھوم سے ہوتا ہے جیسے کوئی جشن منایا جا رہا ہو اور [illegible] ایسا کسی دوسری یونیورسٹی میں شاید ہی دیکھنے کو ملے۔ اس دفعہ کانووکیشن دس برس کے بعد ہو رہا ہے۔ ان دس برسوں میں کچھ ایسے حالات رہے کہ یہ جلسہ نہ ہو سکا۔ بڑے تکلیف دہ حالات تھے۔ بہرحال۔ شکر ہے کہ اب یہ بادل چھٹے ہیں اور مطلع صاف ہوا ہے۔

اس عرصہ میں یونیورسٹی میں جو کچھ ہوا وہ وائس چانسلر صاحب کی رپورٹ میں درج ہے یہاں ہم اسے دہرانا نہیں چاہتے، لیکن اپنے پڑھنے والوں سے اتنا ضرور کہیں گے کہ بادِ مخالف کے تیز جھونکوں میں بھی یہاں کچھ نئے چراغ جلائے گئے جیسے میڈیکل کالج میں نرسنگ اسکول کا قیام کہ اس کے بننے سے ایک ایسا دروازہ کھلا جو ہندوستان کے مسلمانوں نے اب تک اپنے اوپر بند رکھا تھا۔ اسی طرح انجینئرنگ کالج میں کیمیکل اور پیٹرو کیمیکل انجینئرنگ کے نئے شعبوں کے بننے سے ایک پرانی شکایت کسی حد تک دور ہو گئی کہ کالج کو بنے ہوئے اب پچاس برس ہونے کو آئے لیکن اس کے تین شعبوں سول، الیکٹریکل اور میکینیکل کے سوا چوتھا شعبہ نہیں بنا۔ نئے شعبے کھلنے سے ان لوگوں کے حوصلے بڑھ گئے جو اس کالج کو ہندوستان کے کالجوں میں سب سے ممتاز دیکھنا چاہتے ہیں۔

اگر ان تمام سیمیناروں، تعلیمی مذاکروں اور اسکولوں کا تذکرہ کیا جائے اور سارے ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کے ان عالموں کا نام لیا جائے جنھوں نے پچھلے دس برسوں میں اس یونیورسٹی کو رونق بخشی تو فہرست بہت لمبی ہو جائے گی۔ اسی طرح تصنیف اور تالیف کا کام جس بڑے پیمانہ پر پچھلی دہائی میں ہوا اس کی مثال اس سے پہلے ہماری یونیورسٹی میں نہیں ملتی۔

تہذیب الاخلاق کا اجراء اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ سو برس پہلے سرسید نے اسی نام کا ایک رسالہ نکالا تھا جس کے ذریعہ وہ لوگوں کو جگانا چاہتے تھے۔ ہمارے سابق وائس چانسلر سید حامد صاحب نے محسوس کیا کہ اس قسم کی کوشش کی ضرورت آج بھی ہے۔ چنانچہ سرسید کا تہذیب الاخلاق دوبارہ نکالا گیا بلکہ ہندی میں بھی اس کا ہمنوا "نشانت" نکلنا شروع ہوا۔ امید ہے کہ یہ رسالے علی گڑھ تحریک کے نقیب بن کر پڑھے لکھے لوگوں کو ترقی کے راستوں کی طرف بلائیں گے۔

آزادی کے بعد ہم لوگ جس ڈگر پر چل رہے ہیں اس کے ہر موڑ پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ نئے ہندوستان کے بنانے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا کیا حصہ ہے۔ اس سوال کا جواب ان وزیروں، سفیروں، وائس چانسلروں، سائنس والوں، ڈاکٹروں، انجینیروں اور دوسرے میدانوں کے عالموں کی فہرست میں ملے گا جن پر ملک بجا طور پر ناز کرتا ہے۔ ہندوستان کی کسی بڑی یونیورسٹی یا انسٹی ٹیوٹ کے وزٹنگ پروفیسروں اور انعام لینے والوں کے نام دیکھ لیجیے ان میں کتنے ہی علی گڑھ کے استادوں کے نام نظر سے گزریں گے۔ یونین پبلک سروس کمیشن ہو یا ریاستی کمیشن ان کے ممبروں میں علی گڑھ کے نمائندے ضرور ہوں گے۔ کھیل کود کے کتنے ہی میدان ایسے ہیں جہاں علی گڑھ والوں نے جھنڈے گاڑ رکھے ہیں۔ ملیشیا اور افریقہ کے ملکوں کی ترقی میں ہمارے ملک کا جو حصہ ہے اس سے کون نہیں واقف۔ لیکن ذرا دیکھیے تو کتنے لوگ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے اس ترقی میں حصہ لے رہے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی کارگزاری سے اس یونیورسٹی کا نام ساری دنیا میں روشن کیا ہے۔

ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ اپنے کارناموں کا ذکر کر کے اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالیں۔ ہماری کمزوریوں سے ہم عوام سے زیادہ واقف ہیں۔ سب سے بڑی کمزوری تو یہ ہے کہ ایک آدھ کو چھوڑ کر شاید ہی کوئی مضمون ایسا ہو جس کے بارے میں لوگ کہیں کہ اگر اس میں مہارت حاصل کرنا ہے تو علی گڑھ جاؤ اور جس کے متعلق ہم خود کہہ سکیں کہ ہمارا فرمایا ہوا مستند ہے اور جب تک بہت سے مضامین کے بارے میں یہ نہ کہا جا سکے اس وقت تک نہ تو اس ادارہ کی نئے ہندوستان میں کوئی توقیر ہوگی اور نہ اس اقلیت کی جس کے نام سے یہ یونیورسٹی منسوب ہے۔

ہم اس بات کو تہذیب الاخلاق کے ہر شمارہ میں یاد دلاتے رہیں گے۔

(پروفیسر) نسیم انصاری

* * *

اداریہ

مسلم یونیورسٹی میں جلسۂ تقسیم اسناد کا انعقاد اس بات کی علامت ہے کہ اب تعلیم و ترقی کے لیے اس ادارے کا ماحول سازگار ہے اور درس و تدریس کو معمول پر لانے کی جو کوشش پچھلے کئی برسوں سے جاری تھی وہ اب برگ و بار لا رہی ہے۔ کسی ادارے میں تعلیم کا کام صرف اسی صورت میں جاری رہ سکتا ہے کہ ضبط و نظم پوری طرح قائم ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری درسگاہ میں جو خلفشار پیدا ہو گیا تھا اب اس کے اثرات تک معدوم ہو چکے ہیں۔ ہر جگہ لائبریری اور ریڈنگ روم میں طلبہ کا ہجوم نظر آتا ہے۔ یقین ہے کہ یہ فضا برقرار رہے گی اور یونیورسٹی کے علمی ماحول میں مزید استحکام پیدا ہوگا۔

جدید علوم میں آج بے حد اضافہ ہو چکا ہے اور اب ان کی تحصیل کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لیے پوری توجہ اور وقت دینے کی ضرورت ہے۔ جو طلبہ ہنگامہ آرائی سے کنارہ کر کے خود کو ہمہ تن تحصیل علم کے لیے وقف کر دیں، صرف وہی اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ جس ملک یا جس ادارے کے طلبہ ضبط و نظم سے عاری ہوں وہ ملک، قوم کی ترقی میں رکاوٹ بننے کے سوا اور کسی مصرف کے نہیں۔ ہمارے طلبہ نے شاید اب اس راز کو پا لیا ہے اور وہ یکسو ہو کر ہمہ تن اپنے کام میں مصروف ہیں۔

جلسۂ تقسیم اسناد کسی تعلیمی ادارے کی زندگی میں ہمیشہ ایک یادگار دن ہوتا ہے اور طالب علم کی زندگی میں تو اس کی حیثیت یوم حساب کی سی ہے کہ پچھلے سال دو سال میں اس نے جو کچھ کیا ہے یہ اس کی جزا سزا کا دن ہے۔ اس جلسے کا انعقاد ہر سال ہونا ہی چاہیے تاکہ ہونہار محنتی طلبہ کی حوصلہ افزائی ہوتی رہے۔ جنھوں نے اپنے وقت اور صلاحیت کا صحیح استعمال کیا وہ سرخرو ہوئے اور آج اپنی محنت کا صلہ پا رہے ہیں۔ ادارۂ تہذیب الاخلاق کی طرف سے ان سب عزیزوں کی خدمت میں مبارکباد اور کانووکیشن نمبر کا یہ بیش قیمت تحفہ! بیش قیمت اس معنی میں کہ اس شمارے میں قوم کے محسن اعظم سر سید احمد خاں کے وہ قیمتی مشورے بھی شامل ہیں جو انھوں نے اپنے عزیز طلبہ کو دیے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد جیسے عالم، ڈاکٹر رادھا کرشنن، ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر مجیب جیسے ماہرین تعلیم کے خطبات بھی اس شمارے میں پیش کر دیے گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر کو حاصل کرنے میں دشواری ہوتی اور ہم نے مناسب خیال کیا کہ انھیں یکجا کر کے بطور تحفہ آپ کی نذر کر دیا جائے۔ ان خطبات کا ایک ایک حرف ہمارے نوجوانوں کی توجہ کا طالب ہے۔ ان بزرگوں کے مشورے اور خیالات ہمارے آپ کے لیے ہمیشہ مشعل راہ کا کام دیں گے۔

جو طلبہ اپنی تعلیم مکمل کر کے آج ہم سے رخصت ہو رہے ہیں اور عملی دنیا میں قدم رکھ رہے ہیں ان کے لیے مذکورہ بالا خطبات میں ایسا زاد سفر موجود ہے جو زندگی کے دشوار گزار سفر کو سہل اور خوشگوار بنانے میں مددگار ثابت ہوگا۔ ان خطبات کی موجودگی میں ہمارے لیے آپ سے کچھ کہنے کو باقی نہیں رہ جاتا۔ پھر بھی ہم اتنا ضرور عرض کریں گے کہ قدیم قوموں اور ملکوں کو زندہ رہنے کے لیے نوجوانوں کا خون درکار ہوتا تھا۔ آج کے بدلے ہوئے زمانے میں خون کی کم اور پسینے کی زیادہ ضرورت ہے۔ آپ خود بھی زندگی میں سربلند رہیں گے اور آپ کا ادارہ بھی آپ کے دم سے نیک نام ہوگا اگر آپ نے دو چیزوں کا دامن مضبوطی سے تھام لیا ——— دیانت اور محنت!

نورالحسن نقوی ———

* * *

سرسید احمد خان

اے عزیز طالب علمو

اے عزیز طالب علمو! مجھ کو اور تم کو اور تمہارے استادوں اور تمہارے ماں باپ تمہاری قوم کو اس بات سے نہایت خوشی ہوگی کہ تم دور دراز فاصلہ اور مختلف شہروں بلکہ مختلف ملکوں سے اس جگہ تحصیل علوم کے لیے جمع ہو کر مختلف علوم کو پڑھتے ہو اور مختلف مصنفوں کے عمدہ خیالات، عمدہ مسائل علمی، عمدہ مقولات اخلاق سے فائدہ اٹھاتے ہو۔ تمہارے استاد تمہارے ساتھ پدرانہ شفقت اور محبت رکھتے ہیں اور ہر طرح تمہاری بہتری و ترقی کے خواہاں ہیں۔ وہ تم کو عمدہ عمدہ کتابوں سے جو بڑے بڑے عالموں اور مصنفوں نے تصنیف کی ہیں سبق دیتے ہیں مگر آج میں تم کو ایسی کتاب سے سبق دینا چاہتا ہوں جو نہ کاغذ پر لکھی ہوئی ہے نہ کسی پریس کی چھپی ہوئی ہے بلکہ قدرت نے اپنے کامل اور فیاض ہاتھوں سے اس کو بنایا ہے۔ اس کے حروف بہت پکار اور مجسم ہیں مگر اُن کا دیکھنا اور پڑھنا کس قدر مشکل ہے، اس کے معنی بھی بہت آشکارا ہیں مگر اُن کا سمجھنا کچھ آسان نہیں۔ اس کے پڑھنے کے لیے اس کے کھولنے کی ضرورت نہیں، وہ تمہاری آنکھ کے سامنے ہر وقت کھلی ہوئی ہے۔

اس کتاب کو تم اپنے کالج کی لائبریری یا اپنی بینر کی کتابوں میں مت ڈھونڈو، وہ ہر وقت تمہارے پاس موجود ہے۔ وہ کتاب کیا ہے۔ خود تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا اس کالج میں ایک جگہ جمع ہونا ہے۔ پس تم کو سمجھنا ہے کہ اس کتاب کو کیوں کر پڑھو اور اس کے معنی کیوں کر سمجھو۔

اے عزیزو! اس کتاب کا نام ہے "کالج لائف یا نئی زندگی" جیسی کہ اصلی [illegible] اس کو پڑھنا اور اسی کا سمجھنا اصلی فائدہ اور اصلی زندگی کا اور اس کالج کا ہے۔ اس کتاب کو اگر تم نے اچھی طرح پڑھا اور اچھی طرح رکھا اور اختیار نہ کیا تو تمہاری آئندہ زندگی وہ ہوگی جس کے لیے انسان کو زندہ رہنا چاہیے ورنہ اس کی زندگی اور موت دونوں برابر ہیں، بلکہ موت زندگی سے بہتر ہے۔

اب مجھ کو یہ بتانا ہے کہ تم کو کالج لائف سے کیوں کر فائدہ اٹھانا اور اس کو کیوں کر گزارنا چاہیے۔

سب سے اوّل اور تمام برکتوں کی جڑ تمہارا آپس میں سلوک اور محبت سے رہنا ہے۔ تمام طالب علم ہندوستان کے ہوں یا پنجاب کے، پورب کے ہوں یا پچھم کے، اتر کے ہوں یا دکھن کے۔ جب وہ سب تمہاری اس عاقل ماں (کالج) کی گود میں پڑے ہیں تو وہ سب تمہارے بھائی ہیں۔ اگر تم نے ان کے ساتھ مثل بھائی بھائی کے برتاؤ نہ کیا اور برادرانہ محبت ایک دوسرے کے ساتھ نہ برتی تو تم نے اس پہلے اصول کو کہ تم سب ایک عاقل ماں کے بچے ہو توڑ دیا۔

تمہارا کھانا، پینا، رہنا سہنا، آپس میں ہر وقت ملنا، ہمسائی میں رہنا، کھیلوں کو مل کر کھیلنا، لٹریری جلسوں میں شریک رہنا، یہ سب باتیں کاسٹ یہی ہیں کہ آپس میں محبت اور دوستی، ایک دوسرے کی ہمدردی ہو جو بنیاد ایک قوم بننے کی ہیں۔ پھر اگر تم نے اس میں قصور کیا تو تمام قوم کا مظلمہ تمہارے سر ہوگا اور تم پر افسوس ہوگا کہ جس عمارت کی تم خود ایک اینٹ ہو اسی عمارت کو تم برباد کرنا چاہتے ہو۔

(مقالات سرسید ص ۶۸ . ۶۹)



ابوالکلام آزاد

علی گڑھ اور نیا ہندوستان

آپ کے وائس چانسلر صاحب نے جب یونیورسٹی کی جانب سے
[illegible] مجھے دعوت دی کہ اس سالانہ تقریب میں شریک ہوں اور مجلس
سے خطاب کروں تو قدرتی طور پر میرے ذہن میں بعض گزرے ہوئے واقعات
کی یاد تازہ ہو گئی۔ مجھے بے اختیار یاد آ گیا کہ آج سے ۳۶ برس پہلے میرا
سابقہ علی گڑھ سے کن حالات میں ہوا تھا۔ اور اس نے علی گڑھ کے اندر اور باہر
کیا اثرات [illegible] پیدا کیے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے مسلمان
بحیثیت جماعت ملک کی تمام سیاسی سرگرمیوں سے الگ تھے۔ صرف الگ
ہی نہیں تھے، بلکہ سیاسی بیداری کے ہر مطالبے کے خلاف تھے۔ انڈین
نیشنل کانگریس [illegible] سے ملک میں قائم تھی اور اپنی زندگی کی تمام ابتدائی
منزلوں سے گزر چکی تھی مگر [illegible] افراد کے سوا مسلمانوں کا اس میں کوئی
حصہ نہ تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے مسلمانوں کا ایک سیاسی نظام قائم
ہو چکا تھا لیکن وہ اس لیے قائم نہیں ہوا تھا کہ مسلمانوں میں سیاسی سرگرمی
پیدا کرے، بلکہ اس لیے کہ سیاسی سرگرمیوں سے انہیں باز رکھے۔ اس وقت کے
مسلمانوں کی سیاست صرف ایک منفی سیاست تھی۔ [illegible] اپنے
[illegible] تعبیر سیاست کے عدم [illegible] سیاست سے
[illegible] سکتی ہے، یہی سیاسی مسلک تھا جسے اس وقت کی
[illegible] پالیسی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

[illegible] سیاسی مسلک کے لیے اگرچہ مختلف اسباب جمع
[illegible] سب سے بڑی ذمہ داری مرحوم سید احمد خان کی
[illegible] تعلیمی ادارے کے بانی اول تھے۔ انہوں نے [illegible]
[illegible] ایک سیاسی
[illegible] سے

[illegible] اعلان جاری کیا اور مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس میں شریک [illegible]
ملک کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے کی دعوت [illegible]
تھا کہ سرسید مرحوم کی اس سیاسی رہنمائی پر باقاعدہ [illegible]
جو لوگ اس رہنمائی کے علم بردار تھے ان سے تصادم [illegible]
کا یہ نتیجہ نکلا کہ علی گڑھ کے حلقے میں مجھے سرسید مرحوم اور ان [illegible]
تصور کیا گیا، اور خیال کیا گیا کہ میں نہ صرف یہاں کی سیاسی رہنمائی [illegible]
بلکہ سرے سے خود اس تعلیمی ادارے کا [illegible] میں نے یہاں [illegible]
استعمال کیا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ جو فضا میرے لیے یہاں [illegible]
گیا تھا وہ مخالف نہیں تھا، دشمن تھا۔

لیکن کیا میں فی الحقیقت سرسید مرحوم اور ان کے قائم [illegible]
ادارے کا مخالف تھا؟ یا اس وقت کا زمانہ [illegible]
ہوئے کہوں کہ دشمن تھا؟ واقعہ یہ ہے کہ میں [illegible] سکتا تھا [illegible]
شاندار اصلاحی کاموں کا معترف اور ان کی عظمت کا [illegible]
آتی نہیں تھی کہ سرسید مرحوم سے ملنے کی عزت حاصل کر سکتا [illegible]
جانشینوں اور ان کے حلقے کے بعض بزرگوں [illegible]
کی خدمت میں مجھے نیاز مندی حاصل تھی۔ [illegible] زندگی [illegible]
بھی گزر چکا ہے جب سرسید مرحوم کی تصنیفات [illegible]
گئی تھا اور یہ میری طالب علمی کا ابتدائی زمانہ تھا [illegible]
گزر [illegible] فکر و نظر کی [illegible] منزلوں [illegible]
کی [illegible] عمل کے [illegible] سے کبھی [illegible]
[illegible] کے ایک خاص [illegible]
آئندہ [illegible]

کا حال ہم سب کو معلوم ہو چکا ہے۔ یہ کالج کا انگلش اسٹاف تھا جو مسٹر بیک کی سرکردگی میں سرسید مرحوم پر چھا گیا تھا۔ اور وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن اور صوبہ کے لفٹنٹ گورنر سر آکلینڈ کالون کی پشت گیری اُسے حاصل تھی۔

بہر حال میں سرسید مرحوم کا مخالف نہ تھا میں اُن کے مداحوں میں تھا مگر یہ مداحی مجھے اس سے باز نہیں رکھتی تھی کہ سمجھ بوجھ کے مطابق اُن کی کوتاہیوں اور غلطیوں کا بھی اعتراف کروں۔ آج جبکہ ۳۶ برس کی مدت اس دور پر گزر چکی ہے۔ اور اس عرصہ کی پوری داستان ہمارے قبضہ سے نکل کر تاریخ کے قبضے میں داخل ہو چکی ہے، میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی کوئی رائے بھی ایسی نظر نہیں آتی جس کی تبدیلی کا خواہش مند ہوں۔ میرے سامنے بیک وقت دونوں باتیں آ رہی ہیں اور مجھے بیک وقت ان دونوں کے تسلیم کر لینے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ میں سرسید مرحوم کی سیاسی رہنمائی کو اُن کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی یقین کرتا ہوں مگر ساتھ ہی یہ بھی یقین کرتا ہوں کہ وہ انیسویں صدی کے ایک بڑے ہندوستانی مصلح تھے۔ اور انھوں نے ملک کے لیے شاندار اصلاحی اور تعلیمی خدمتیں انجام دیں۔ جناب! چھتیس برس پہلے میں نے ان کی سیاسی رہنمائی سے اختلاف کیا تھا۔ آج میں یہاں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ ان کی شاندار اصلاحی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اپنا خراجِ عقیدت پیش کروں۔ موجودہ زمانہ میں جبکہ مغربی علوم کی تعلیم ہندوستانی زندگی کی ایک عام حقیقت بن گئی ہے۔ اور ہم تعلیم کے لفظ کا اطلاق صرف اس تعلیم پر کرنے لگے ہیں بہت کم لوگ اُس جدوجہد کی دشواریوں کا صحیح اندازہ کر سکیں گے جو آج سے سو برس پہلے نئی تعلیم کے حامیوں کو پیش آئی تھیں۔ انہیں صرف ایک نیا راستہ ہی نہیں دکھانا تھا۔ اس راستے میں قدم قدم پر لڑنا تھا۔ ان کی راہ قدامت پرستی کی بے شمار قوتوں سے رُکی ہوئی تھی۔ جو ہمیشہ نئی تبدیلیوں کی راہ روکنا چاہتی ہیں۔ صدیوں کے اوہام و تعصبات ہر طرف چھائے ہوئے تھے طرح طرح کے دماغی عقائد جذباتی رجحانات بر سرِ پیکار تھے۔ مخالف قوتوں کے ہاتھ میں ایک بڑا ہتھیار مذہب کا بھی تھا۔ مذہب کی راہ اصلاً علم اور عقل کی راہوں کی مخالف نہیں ہے۔ لیکن اُسے ہمیشہ مخالف بنایا گیا ہے۔ وقت کا عام عقیدہ یہ تھا کہ مغربی علم کی تعلیم لوگوں کو مذہب سے برگشتہ کر دے گی اور اگر ہمیں مذہب عزیز ہے تو پرانی تعلیم پر قناعت کر لینی چاہیے۔ دراصل یہ جنگ فکر انسانی کی تاریخ کا ایک عالمگیر خاصّہ تھی۔ یورپ میں یہ کشاکش

سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں ہوئی۔ اور مشرقی ممالک کا اس سے سامنا انیسویں صدی میں ہوا۔ ہندوؤں میں یہ جنگ جلد شروع ہوئی اور ختم ہو گئی مگر مسلمانوں میں اس نے بہت زیادہ وقت لیا۔ بالآخر وہی جو ہمیشہ ہوا ہے۔ وقت کے تقاضے فتح مند ہوئے اور قدامت پرستی کو ہار مان لینی پڑی۔ جہاں تک کہ مسلمانوں کا تعلق ہے بلا خوف و ڈر کہا جا سکتا ہے کہ اس فیصلہ کن جنگ کا مردِ میدان وہی شخص تھا جو اس یونیورسٹی کے ایک گوشے میں مدفون ہے۔ یہ جنگ اسی علی گڑھ میں لڑی گئی۔ اور یہی علی گڑھ اس کی فتح مندی کا یادگاری مینارہ ہے۔

زمانۂ حال کے بعض اہلِ قلم نے سرسید مرحوم کو راجہ رام موہن رائے سے تشبیہ دی ہے۔ اور یہ بہت حد تک صحیح ہے۔ راجہ رام موہن رائے نے جو کام بنگال میں کیا وہی اُن سے چالیس برس بعد سرسید نے شمالی ہند میں کیا۔ اور خاص طور پر مسلمانوں میں کیا۔ دونوں میں اگر فرق ہے تو یہ کہ پہلے کے اصلاحی کاموں کا اصل میدان مذہب تھا۔ اور دوسرے کا ... اگرچہ دونوں نے اپنی اصلاحی اور تخلیقی قوتوں کی چھاپ وقت کی تمام ... پیداوار پر لگا دی تھی۔ مذہب، تعلیم، معاشرت، زبان، ادب، صحافت میں ان کی اصلاحی روح آج بھی بول رہی ہے۔

یہ بات ہمیں یاد رکھنی چاہیے کہ اگرچہ سرسید مرحوم نے ... سیاسی تحریک کی مخالفت کی تھی۔ لیکن اُن کی مخالفت میں ہندو مسلم کا کوئی رنگ نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی مخالفت کی سرگرمیوں میں مسلمانوں ہندوؤں دونوں کو یکساں طور پر شریک کیا تھا۔ وہ مدت العمر ہندو مسلم یکجہتی کے حامی رہے۔ اور ہمیشہ ایسی باتوں کی مخالفت کرتے رہے جن سے دونوں جماعتوں کے باہمی اتفاق و یکجہتی میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو۔ انہوں نے بارہا اپنی تقریروں میں یہ خوبصورت استعارہ دہرایا تھا کہ مادرِ ہند کی دو آنکھیں ہیں۔ ایک ہندو ایک مسلمان۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک بگڑ جائے گی تو اس کے چہرے کا سارا حسن بگڑ جائے گا۔

ہندوستانی قومیت کے متعلق اُن کا جو خیال تھا اس کا اندازہ اس سے لگا سکتے ہیں کہ "ہندو" لفظ کا مفہوم ان کے ذہن میں کیا تھا؟ ہندو انجمن کے ممبروں کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

"مجھے افسوس ہے کہ آپ نے ہندو کے معنی بہت محدود کر دیے

ہیں۔ آپ نے اس کا اطلاق ایک خاص مذہبی گروہ پر کیا ہے۔ مگر میری رائے میں یہ اطلاق صحیح نہیں ہے۔ میں اُن تمام لوگوں کو جو کہ ہندوستان کے باشندے ہیں ہندو تصور کرتا ہوں۔ خواہ وہ کسی نسل اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں یہی وجہ ہے کہ میں نہایت خوشی اور فخر کے ساتھ اپنے آپ کو ہندو سمجھتا ہوں!

ہندو مسلمانوں نے اس رائے کی روح کو سمجھا ہوتا اور اس کی پیروی کی ہوتی تو آج ملک کی تاریخ کا رُخ دوسرا ہوتا۔

سرسید مرحوم نے اس تعلیمی ادارے کی بنیاد ایک اہم مقصد سامنے رکھ کر ڈالی تھی۔ انہوں نے انگلستان کے تعلیمی نظام کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔ اور یہ حقیقت معلوم کرلی تھی کہ اس نظام کی اصلی خصوصیت محض اس کی تعلیم ہی نہیں بلکہ ایک خاص طرح کی تربیت ہے۔ یہی تربیت ہے جو نوجوانوں کی سیرت ڈھالتی ہے، اور اس کے لیے ایک مضبوط اور بامقصد سانچہ مہیا کردیتی ہے۔ انہوں نے اس بات کی بھی ضرورت محسوس کی کہ مغربی تعلیم کے ساتھ مسلمانوں کے لیے ان کی مذہبی تعلیم و تربیت کا انتظام بھی ہونا چاہیے بغیر اس کے نئی تعلیم اُن میں مقبول نہیں ہوسکے گی۔ چونکہ یہ دونوں مقصد بغیر اس کے عمل میں نہیں آسکتے تھے کہ ایک خاص درسگاہ قائم کی جائے اس لیے انہوں نے اپنی بقیہ عمر اس کام کے لیے وقف کردی۔ جہاں تک پہلے مقصد کا تعلق ہے ہمیں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ علی گڑھ کالج اس قسم کا پہلا ہندوستانی کالج تھا۔ ابتدا میں کام کا جو نقشہ انہوں نے اپنے سامنے رکھا تھا وہ ہمیں معلوم ہے کہ ایک اقامتی یونیورسٹی کا تھا۔ جو کیمبرج یونیورسٹی کے نمونے پر قائم کی جاتی۔ لیکن بالآخر انہیں صرف کالج کے قیام پر قناعت کرلینی پڑی اس وقت کی استعداد دیکھتے ہوئے اتنے کام کا انجام پا جانا بھی دشوار تھا۔ یونیورسٹی کی تحریک اُن کے انتقال کے بعد بطور اُن کی یادگار کے شروع ہوگئی اور بیس برس کی کدوکاوش کے بعد کامیاب ہوئی۔

سرسید مرحوم اور ان کے ساتھیوں نے علی گڑھ میں صرف ایک کالج ہی قائم نہیں کیا تھا بلکہ وقت کی تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک ترقی پسند حلقہ پیدا کردیا تھا۔ اس حلقہ کی مرکزی شخصیت خود ان کا وجود تھا اور ان کے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہوگئے تھے۔ ہندوستان کے کسی موقت الشیوع رسالے نے شاید ہی ایسے گہرے اثرات وقت کی دماغی رفتار پر ڈالے ہوں گے جیسے کہ "تہذیب الاخلاق" سے مترتب ہوئے۔ یہ رسالہ انہوں نے انگلستان کی سیاحت کے بعد نکالا تھا اور اس میں اُن کے حلقے کے لوگوں کے مضامین نکلا کرتے تھے۔ فی الحقیقت جدید اُردو علم و ادب کی بنیادیں اسی رسالے نے استوار کیں اور اسے اس قابل بنا دیا کہ آج ہر طرح کے علمی اور ادبی مطالب ادا کرنے کی اس میں صلاحیت پیدا ہو گئی ہے اس عہد کا شاید ہی کوئی قابلِ ذکر اہل قلم ایسا ہوگا جو اس مرکزی حلقے کے اثرات سے متاثر نہ ہوا ہو۔ جدید ہندوستان کے بہترین مسلمان مصنف اس حلقے کے زیر اثر پیدا ہوئے اور یہیں نئے قسم کی اسلامی تحقیق و تصنیف کی راہیں پہلے پہل کھلی گئیں۔ اُردو کی نئی شاعری کی بنیاد اگرچہ لاہور میں پڑی تھی مگر اسے نشوونما یہیں کی آب و ہوا میں ملی اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں نئی قسم کی نظمیں پڑھی جانے لگیں۔ اُردو خطابت کی بھی یہی پہلی درسگاہ تھی۔ اس دور کے تمام مشہور مقرروں کو اسی حلقے نے پیدا کیا تھا۔ اور اگر پیدا نہیں کیا تھا تو اُن کے لیے پلیٹ فارم یہیں مہیا کیا گیا۔ انیسویں صدی کا آخری نصف حصہ اکثر مشرقی ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی ایک انتقالی دور تھا۔ اس دور میں ملک کی دماغی زندگی کے پرانے سانچے ٹوٹ رہے تھے۔ اور نئے سانچے ڈھلنا شروع ہوگئے تھے۔ پرانے ہندوستان کی مٹی ایک نئے ہندوستان کا ڈھانچہ تعمیر کر رہی تھی۔ اور پرانے موسم کا اختتام نئے موسم کی آمد کا اعلان تھا۔ جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے، کہا جا سکتا ہے کہ اس انتقالی دور کا سب سے موثر عمل یہیں انجام پایا۔ نئے ہندوستان کے پیدا کرنے میں ملک کے جن نئے حلقوں نے نمایاں حصہ لیا ہے اُن میں ایک حلقہ یہ بھی تھا۔ ہندوستان کی نئی دماغی سرگرمیوں کے لیے انیسویں صدی نے ایک نشات جدیدہ RENAISSANCE کا دور بہم پہنچایا۔ اور اس نشاتِ جدیدہ کا ایک گوشہ علی گڑھ بھی تھا۔ اگرچہ سرسید مرحوم کے انتقال کے بعد یہاں کی یہ خصوصیت بہت حد تک کم ہوگئی۔ کالج ترقی کرتے کرتے یونیورسٹی بن گیا۔ لیکن اپنے دور کی شاندار روایتیں واپس نہ لا سکا۔ تاہم یہ روایتیں آپ ہی کی اس درسگاہ کی روایتیں ہیں اور آپ ہی اس شاندار ورثے کے وارث ہیں۔ آپ کے اسٹریچی ہال کی دیوار پر جو کتبے ثبت ہیں ممکن ہے کہ وہ کسی وقت مٹ جائیں۔ لیکن آپ کی درسگاہ

نے زمانے کے لازوال صفحوں پر جو کتبے ثبت کر دیے ہیں۔ وہ کبھی نہیں مٹ سکتے۔ وہ ہمیشہ باقی رہیں گے۔ اور ہندوستان کے آنے والے مورخ اُن سے اپنی کہانیوں کے لیے مواد حاصل کر سکیں گے ؂

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ایک ایسا تعلیمی ادارہ جو اپنی ماضی کی ایسی شاندار داستان رکھتا ہو قدرتی طور پر اس کا مستحق ہے کہ ایک شاندار مستقبل اپنے سامنے دیکھے۔ مجھے معلوم نہیں اس وقت آپ کے احساسات کیا ہیں؟ آپ اپنے مستقبل کی طرف نظر اٹھاتے ہیں تو وہ کس رنگ و روپ میں آپ کے سامنے آتا ہے؟ آپ کو دروازوں کے بند ہونے کی آواز سنائی دیتی ہے یا کھلنے کی؟ میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی نگاہیں کیا دیکھ رہی ہیں۔ لیکن میں آپ کو بتلا سکتا ہوں کہ میری آنکھیں کیا دیکھنے لگی ہیں؟ آپ شاید دیکھ رہے ہیں کہ بہت سے پرانے دروازے بند ہو گئے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت سے نئے دروازے کھل جائیں گے ؂

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو
تو بستن در و من فتح باب می شنوم

میں چاہتا ہوں کہ آپ سے جو کچھ کہوں بغیر کسی ذہنی تحفظ کے بے پردہ کہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی مجھ سے ایسے ہی طرز کلام کے متوقع ہوں گے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے ملک پر فرقہ وارانہ سیاست کی جو آب و ہوا چھائی ہوئی تھی۔ اگر میں محسوس کرتا کہ اس کے اثرات اب بھی آپ کی یونیورسٹی میں کام کر رہے ہیں تو بلا تامل میں آپ سے کہہ دیتا کہ آپ کا مستقبل مجھے اس قدر روشن نہیں دکھائی دے رہا ہے جس قدر روشن دیکھنے کا بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان ہونے کے مجھے خواہش مند ہونا چاہیے مگر میں خوش ہوں کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد سے یہاں کی پرانی فضا میں ایک نئی تازگی پیدا ہونی شروع ہو گئی۔ اور وہ روز بروز زیادہ محسوس اور نمایاں ہونے لگی۔ آپ نے یہ حقیقت بر وقت محسوس کر لی کہ وقت کے بدلے ہوئے حالات میں آپ کے تعلیمی ادارے کا ذہنی مزاج کیسا ہونا چاہیے؟ اور یہاں کے کارخانے سے اب کس طرح کے دل و دماغ ڈھل کر نکلنے چاہئیں؟ آپ نے نئی تبدیلیوں کے تقاضوں کا بلا تاخیر جواب دیا۔ اور وقت کے نئے بیانوں سے بلا انتظار مطابقت پیدا کر لی۔ مجھے آج یہ کہنے میں ذرا بھی تامل محسوس

نہیں ہوتا کہ آپ نے یہ طرز عمل اختیار کر کے نہ صرف اس تعلیمی ادارے کی بلکہ تمام مسلمانانِ ہند کی ایک بروقت اور قیمتی خدمت انجام دی ہے۔ میں تہِ دل سے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ میں آپ کو مختصر طور پر بتلانا چاہتا ہوں کہ آپ کی مرکزی حکومت کے سامنے ملک کی قومی تعلیم کے نظام کا نقشہ ہے اس کی بنیادی نوعیت کیا ہے؟ اور ایک ایسے تعلیمی ادارے کے لیے جس طرح کا ادارہ آپ کی یہ یونیورسٹی ہے اس میں کس طرح کی جگہ ہوتی ہے۔ آپ تسلیم کریں گے کہ ایک غیر مذہبی جمہوری حکومت کے لیے ضروری ہے کہ اُس کا ایک غیر مذہبی تعلیمی نظام ہو۔ جو ملک کے تمام باشندوں کے لیے بلا امتیاز ایک ہی نوعیت کا تعلیمی سانچہ مہیا کر دے۔ اس نظام کا ایک خاص دیسی مزاج ہونا چاہیے۔ ایک خاص طرح کا قومی رنگ ہونا چاہیے اور اسے انسانی خوش حالی اور ترقی کا ایک خاص رُخ اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ انڈین یونین ایک ایسا ہی عام تعلیمی نقشہ اپنے سامنے رکھتی ہے۔ اور اس میں کسی طرح کے امتیاز اور تفرقے کی گنجائش نہیں تسلیم کرتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ تسلیم کرتی ہے کہ اس عام تعلیم کے ساتھ ایسے خاص اداروں کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جو ملک کی تاریخ اور تہذیب و تمدن کے خاص خاص شعبوں کے مطالعے کا خاص اہتمام رکھتے ہوں۔ اور ان کے دروازے اُن تمام افراد کے لیے کھلے ہوں جو ان شعبوں کے مطالعے اور تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ ملک کے تعلیمی نقشے کا یہی گوشہ ہے جہاں آپ کا ادارہ اپنی صحیح جگہ پاتا ہے۔ اور وقت کے عام نقشے سے بھی جڑ جاتا ہے۔ آپ اپنی ایک خاص جگہ رکھتے ہوئے بھی تعلیم کے عام نظام سے الگ نہیں ہو جاتے۔ بلکہ اس کی ایک خاص ضرورت کو پورا کر دیتے ہیں۔ آپ کی یہ خاص جگہ کسی خاص جماعت کے ساتھ مخصوص نہیں ہونی چاہیے بلکہ ان سب کے لیے ہونی چاہیے جو ان خاص شعبوں سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ افلاطون کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ اس نے اپنی درسگاہ پر یہ کتبہ کندہ کرا دیا تھا:

"من لم یعرف جیامیتری۔ فلیس لہ دالمدخل"

یعنی "جو شخص جیومیٹری نہیں جانتا اس کے لیے یہاں جگہ نہیں"

مگر آپ کو کسی ایسے کتبہ کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔ آپ کی درسگاہ کا کتبہ یہ ہونا چاہیے۔ "جو لوگ جیومیٹری جانتے ہیں اور جو لوگ نہیں جانتے

سب کے لیے یہاں جگہ موجود ہے!

مجھے معلوم ہے کہ آپ کی درسگاہ کا پہلے دن سے ایسا ہی طرز عمل رہا ہے۔ آپ کی درسگاہ جب نئی نئی قائم ہوئی تھی۔ تو طالب علموں کی سب سے پہلی جماعت جو اس میں داخل ہوئی اس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی تھے۔ آپ کے اساتذہ کی صف میں بھی ہمیشہ سب کے لیے جگہ رہی۔ یہاں کے بعض ہندو پروفیسروں کا نام آج بھی یہاں کی تاریخ کے صفحات میں پڑھا جا سکتا ہے۔ آپ کا یہ قدیمی طرز عمل آئندہ اور زیادہ نمایاں ہوگا اور زیادہ وسعتیں پیدا کرے گا۔

اسلامی علوم اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ اور اس کی تحقیقات آپ کی درسگاہ کی قدیمی روایت ہے مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ سر سید مرحوم کے دور کے بعد اس کی سرگرمیاں بہت کچھ دھیمی پڑ گئیں۔ اور علم و فن کا عام مذاق بھی کچھ زیادہ بلند نہیں رہا۔ یونیورسٹی قائم ہوئی تھی تو اسے اپنے قیام کے ساتھ ایک نیا علمی دور لانا تھا۔ لیکن اس توقع کو بھی ابھی تک انتظار ہی کرنا پڑا ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ اپنی درسگاہ کی پرانی روایتوں کو از سر نو تازہ کریں اور یونیورسٹی کے اندر مطالعہ اور تحقیقات کا اعلیٰ معیار پیدا کر دیں۔

میں نے ابھی آپ کو یاد دلایا تھا کہ اردو زبان کے جدید علم و ادب کی نشو و نما اسی سرزمین میں ہوئی۔ یہ ادبی ترقی آپ کے تعلیمی ادارے کا ایک قابل فخر ورثہ ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ آپ کی ادبی سرگرمیوں کو جولانیوں کے لیے اب اس سے بھی زیادہ وسیع میدان ملنا چاہیے۔ آپ کو ہندی علم و ادب میں بھی پوری دلچسپی لینی چاہیے۔ زبان اور علم و ادب کی تحصیل مسلمانوں کا تاریخی خاصہ رہا ہے۔ اور ہندی ادب کو جو دعویٰ ہندوستان کے ہندوؤں پر ہے ویسا ہی دعویٰ ہندوستان کے مسلمانوں پر ہے۔ اردو کی طرح ہندی ادب کی ترقی میں بھی دونوں نے یکساں طور پر حصہ لیا تھا۔ ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ میں برج بھاشا کی شاعری کا جو نیا دور پیدا ہوا اس میں اگر ایک طرف اکبر اور جہانگیر کی فیاضانہ سرگرمیاں ہمارے سامنے آتی ہیں تو دوسری طرف محمد جائسی، خانخاناں اور عبدالجلیل بلگرامی جیسے شاعروں کا زندہ جاوید کلام ہمیں یاد آ جاتا ہے۔ اٹھارھویں صدی کے آخر تک ہم دیکھتے ہیں کہ برج بھاشا کے مسلمان شاعروں کی ایک بہت بڑی صف ہمارے سامنے کھڑی ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی اس پرانی روایت کو پھر تازہ کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ اب اس ادارے میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہو جو اردو اور ہندی دونوں کے یکساں طور پر ماہر ہوں۔

وقت کا ایک سوال رسم الخط کا بھی مسئلہ ہے آپ کو معلوم ہے کہ گاندھی جی کی اس بارے میں کیا رائے تھی؟ اُن کی دلی خواہش تھی کہ ہندوستان کا ہر باشندہ دونوں رسم الخطوں سے واقفیت پیدا کرے اردو رسم الخط سے بھی اور دیو ناگری سے بھی۔ انہوں نے ہندوستانی سبھا اس غرض سے قائم کی تھی۔ اور اس کے کارکنوں کے لیے دونوں رسم الخطوں کا جاننا ضروری ٹھہرا دیا تھا۔ برسوں سے میری رائے بھی اس بارے میں یہی رہی ہے۔ یقین کرتا ہوں کہ اس رسم الخط کے مسئلہ کا بحالتِ موجودہ یہی ایک صحیح حل ہو سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اردو سے ذوق رکھنے والے اشخاص اس کا انتظار نہ کریں کہ ہندی سے ذوق رکھنے والے کیا طرز عمل اختیار کرتے ہیں وہ جس بات کو ملک کے لیے ضروری سمجھتے ہیں اسے بلا تامل خود اختیار کر لیں۔ زندگی کے میدان میں دوسروں کے بڑھنے کا انتظار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن علم کے میدان میں نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں خود قدم بڑھانا چاہیے۔ جو دوسروں کا انتظار کرے گا وہ اپنی فضیلت کا موقع کھو دے گا۔ اگر دوسرے لوگ صرف ایک ہی رسم الخط سے آشنا ہوں گے تو ہمیں اس پر افسوس نہیں کرنا پڑے گا کہ ہم ایک کی جگہ دو رسم الخطوں کو جاننے والے ہیں۔ میری دلی خواہش ہے کہ ہندوستان کا ہر مسلمان اردو اور دیو ناگری دونوں رسم الخطوں کو سیکھ لے۔ اور اس بارے میں اپنا عملی نمونہ ملک کے سامنے رکھ دے یہ مہاتما جی کا پیغام تھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ مسلمان اس پیغام پر پوری سرگرمی کے ساتھ عمل کریں گے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ اس کام کی ضرورت کا احساس ہر طرف پیدا ہو رہا ہے۔ اور اردو میں کثرت کے ساتھ ایسے رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ جن کے ذریعہ دیو ناگری رسم الخط اور ہندی علم و ادب کا سیکھنا اردو جاننے والوں کے لیے آسان ہو جائے گا ملک کے بعض حصوں میں اس غرض سے بعض ادارے بھی قائم ہو گئے ہیں۔ اور انہوں نے اپنی سرگرمیاں بھی شروع کر دی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ نے بھی اس ضرورت کو پوری طرح محسوس کر لیا ہے۔

ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنی تعمیر سامانیوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ گئی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں مگر ہم ایک زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بے گانہ تھے، مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں، اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی اس گزری ہوئی تہذیب و معاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے، تو میں ان سے کہوں گا کہ وہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے۔ کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی سرزمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے۔" (خطبۂ ابوالکلام آزاد رام گڑھ کانگریس ۱۹۴۰ء)

اب میں اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے چاہتا ہوں کہ چند الفاظ ان نوجوانوں سے کہوں جنھوں نے آج اپنی طالب علمی کا دور ختم کر لیا ہے۔ اور زندگی کی نئی منزلوں میں قدم رکھنے والے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس عظیم تبدیلی کے اثرات و نتائج سے بے خبر نہ ہو گے جو تمہاری طالب علمی کے زمانے میں وطن پر طاری ہو چکی ہے۔ جب تم پہلے پہل اس یونیورسٹی میں داخل ہوئے تھے تو تم ایک محکوم ہندوستان کے باشندے تھے جس کی قسمت کی باگ دوسروں کے ہاتھوں میں تھی آج جب تحصیل علم کے بعد تم یہاں سے نکل رہے ہو۔ تو تم ایک آزاد ہندوستان کے باشندے ہو۔ اور ملک کی قسمت کی باگ خود تمہارے ہاتھوں میں آ چکی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس انقلابی تبدیلی کے گہرے اور دور رس نتائج کو تم سب نے پوری طرح محسوس کر لیا ہے یا نہیں۔ ایک محکوم قوم کے فرد ہونے کی حیثیت سے تمہارے فکر و عمل کا دائرہ بہت تنگ تھا۔ اور اس لیے تمہاری ذمہ داریاں اور سہولتیں محدود تھیں۔ اس تبدیلی نے جہاں تمہارے آگے ترقی اور کامرانی کے بے شمار نئے دروازے کھول دیے ہیں۔ وہاں تمہارے لیے اپنی حکومت سے وابستگی اور وفاداری کا بھی ایک نیا گہرا رشتہ پیدا کر دیا ہے۔ ایک اجنبی حکومت کی وفاداری تمہارے لیے محض ایک وقتی مصلحت تھی، لیکن اپنی قومی حکومت کی وفاداری تمہارے لیے قومی زندگی کا بنیادی فریضہ ہے۔ آج محرومیوں اور ناسازگاریوں کی تمام رکاوٹوں سے تمہاری راہ صاف ہو چکی ہے۔ تمہاری ترقیوں کے لیے کوئی حد بندی نہیں رہی۔ ایک آزاد ملک کا فرد جو کچھ اور جہاں تک حاصل کر سکتا ہے۔ وہ سب کچھ تمہارے لیے موجود ہے۔ لیکن یاد رکھو یہی حقیقت کہ تم ایک آزاد ملک کے فرد ہو۔ تم سے واجبات و فرائض کے نئے نئے مطالبات بھی رکھتی ہے۔ تمہارے لیے ضروری ہے کہ انہیں پورا کرو۔

تم ایک غیر مذہبی جمہوری نظام حکومت کے باشندے ہو۔ جس نے اعلان کر لیا ہے کہ ملک کی سیاسی اور اجتماعی زندگی کو غیر مذہبی اور جمہوری طریقہ کے مطابق نشوونما دے گی۔ ایک غیر مذہبی جمہوری نظام کا جوہری خاصہ یہ ہے کہ وہ ملک کے تمام کے تمام افراد کے لیے یکساں طریقہ پر ہر طرح کی ترقیوں کے مواقع پیدا کر دیتی ہے۔ اس میں مذہب، نسل، ذات اور فرقے کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ ایک ایسی حکومت کے باشندے ہونے کی حیثیت سے تم قدرتی طور پر یہ توقع کر سکتے ہو کہ تمہارے آگے ملکی زندگی کے تمام دروازے کھل جائیں۔ سیاست، انتظام حکومت، صنعت و حرفت، مختلف قسم کے کوئی دروازہ ایسا نہ ہو جو تم پر بند ہو۔ میں تمہیں پوری ذمہ داری کے

یقین دلاؤں کہ آج کوئی بھی دروازہ تم پر بند نہیں ہے ملک کی زندگی کا ہر دروازہ کھلا ہے۔ بشرطیکہ تم قابلیت کی پختگی اور محنت کی سرگرمی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سیرت کی مضبوطی کے ساتھ قدم بڑھا سکو۔ کل تک تمہارا تعلیمی نصب العین بہت پست اور محدود تھا۔ اس یونیورسٹی کے سند یافتہ اپنی امیدوں کا اس سے زیادہ بلند مصرف نہیں رکھتے تھے کہ کوئی بڑی یا چھوٹی سرکاری ملازمت حاصل ہو جائے۔ لیکن اب ضروری ہے کہ قومی آزادی کی فضا تمہارے مطمح نظر کو زیادہ بلند، تمہاری ہمتوں کو زیادہ اولوالعزم اور تمہارے دلوں کو زیادہ وسیع کر دے۔ تمہیں اب پرانے ہندوستان کے ذہنی ماحول سے نکلنا ہے اور نئے ہندوستان میں اپنی قابلیت اور صلاحیت کا نیا مصرف ڈھونڈھنا ہے۔ تمہاری بلند پروازیوں کے لیے اب پچھلی بلندیاں پست ہو گئیں۔ اور تمہاری جولانیوں کے لیے اب پرانے میدان تنگ ہو گئے۔ تم نے سعی و عمل کے جو پیمانے پہلے اپنے ہاتھوں میں رکھے تھے۔ وہ وقت کی نئی پیمائشوں کے لیے کام نہیں دے سکتے۔ تمہیں اب نئے پیمانے ڈھالنے ہیں۔ تمہیں نئے جوش سے سعی و عمل کی نئی مقداریں تولنی ہیں۔ تمہیں اب زندگی کی جدوجہد میں نئے ولولوں اور نئی اولوالعزمیوں کے ساتھ قدم اٹھانا ہے۔ اور اس قابلیت کو جو تم نے اس درسگاہ سے حاصل کی ہے، ایسے کاموں میں لگانا ہے جو تمہارے ملک کی نئی رفعت طلبیوں کا ساتھ دے سکیں۔ میرا دماغ اس بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں رکھتا کہ اگر تم نے وقت کی ترقی پسند قومیت کی روح اپنے اندر پیدا کر لی جو تمہاری غیر مذہبی جمہوری حکومت کا دستور العمل ہے، تو تمہارے وطن کی کوئی بلندی بھی ایسی نہیں ہوگی جہاں تمہارا ہاتھ نہ پہنچ سکے۔ اور کوئی کامرانی بھی ایسی نہ ہوگی جو تمہارا استقبال نہ کرے۔

(خطبہ تقسیم اسناد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
منعقدہ ۲۰ر فروری ۱۹۴۹ء)

* * *

ہندوستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح نمودار بھی نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی اور پھر یکے بعد دیگرے سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی۔ انہیں قافلوں میں ایک آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نقشِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا۔ اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ بہتے رہے لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے، دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔ ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے اور یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالا مال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیے۔ ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیام پہنچایا۔

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔ جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہبِ اسلام کے پیرو ہیں۔ میں اس دائرے کو اس سے زیادہ وسیع کروں گا۔ میں ہندوستانی مسیحی کا بھی یہ حق تسلیم کروں گا کہ وہ آج سر اٹھا کر کہہ سکتا ہے کہ میں ہندوستانی ہوں اور باشندگانِ ہند کے ایک مذہب یعنی مسیحیت کا پیرو ہوں۔

(ابوالکلام آزاد خطبہ رام گڑھ کانگریس مارچ ۱۹۴۰ء سے ایک اقتباس)

ڈاکٹر ایس۔ رادھا کرشنن

حرفِ دانش

ترجمہ: پروفیسر منظر عباس نقوی

آزادی حاصل کرنا آسان ہے، لیکن اس کا استحقاق بے حد دشوار۔ ہمارے ملک میں ۸۰ کروڑ آدمی بستے ہیں۔ صحیح معنوں میں آزاد ہم اُسی وقت کہلائیں گے جب ان سب کے لیے روٹی، کپڑا، مکان اور روزگار فراہم کر سکیں۔ اس نصب العین سے ابھی ہم کتنے دور ہیں، یہ بات آپ میں سے ہر شخص پر آشکارا ہے۔ دراصل معاملہ سارا اُس مسافت کا ہے جو ہمیں طے کرنا باقی ہے۔ یہاں آپ میں سے ہر فرد کی ایک ذمہ داری ہے۔ ہم یونیورسٹیوں میں اس لیے داخلہ لیتے ہیں تاکہ ایسے علوم و فنون کا اکتساب کریں جو ہمارے ملک کی تعمیر و ترقی میں معاون ہوں۔ ذرا سوچیے، کیا ہم یہ کام پوری طرح انجام دے رہے ہیں؟ کیا ہماری یونیورسٹیاں نوجوانوں کو اُن علوم و فنون کے زیور سے آراستہ کر رہی ہیں جو تعمیری کاموں کے لیے ناگزیر ہیں؟ ہم یہاں آتے ہیں، تاکہ سائنس کا مطالعہ کریں، انسانی علوم کا مطالعہ کریں، دینیات کا بھی مطالعہ کریں، کیونکہ دینیات بھی بہر حال کوئی غیر اہم علم نہیں۔ سائنس بڑی اہمیت رکھتی ہے، اس لیے کہ سائنسی عجائبات نے دنیا کو یکسر بدل دیا ہے۔ آج ہمارے پاس طرح طرح کے ذرائع آمد و رفت ہیں؛ سائیکلیں بھی، موٹریں بھی اور ہوائی جہاز بھی۔ کل ہی میں نے سُنا کہ راکٹ سے چلنے والا جہاز ہمیں صرف ۲۵ منٹ کے عرصے میں ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جا سکتا ہے۔ یہ سب عظیم کارنامے ہیں جن میں ہمیں بھی شریک ہونا ہے۔ ہم میں سے ہر فرد کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ جہاں تک سائنس کے ان کارناموں کا تعلق ہے ہم سب کو اُن کے فروغ میں اپنا حصہ ادا کرنا ہے۔ ایک وقت تھا جب بلیک نے کہا تھا "آرٹ شجرِ حیات کی آبیاری کرتا ہے اور سائنس شجرِ موت کی"، لیکن یہ ایک غلط اور گمراہ کن تصور ہے۔ یہ سچ ہے کہ سائنس کا غلط استعمال کیا جا سکتا ہے، لیکن اس میں سائنس کا کیا قصور؟ سارا قصور تو انسان کا ہے۔ پس ہمارے لیے ضروری ہے کہ اپنے طلبہ کو سائنس اور ٹکنالوجی کے بہترین پہلوؤں سے روشناس کرائیں۔

یہی وہ طریقہ ہے جس سے ہم اپنے عوام کے لیے ضروریاتِ زندگی فراہم کر سکتے ہیں۔

انسانی علوم بھی کچھ کم اہم نہیں، کیونکہ ان سے ہمیں خود اپنی فطرت کا عرفان حاصل ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ ہماری روز بروز نشو و نما کیسے ہوتی ہے؟ تہذیبات سے کیا مراد ہے؟ معیار اور مرادوں کا کیا مفہوم ہے، یہی سب باتیں ہیں جن کی آگہی ہمیں انسانی علوم سے حاصل ہوتی ہے۔ بہر طور خواہ سائنسی علوم ہوں یا انسانی علوم طبیعی علوم ہوں یا سماجی علوم، اُن کی رسائی لے دے کے حقیقت کی بیرونی سطح تک ہے۔ یہ سب علوم محض خارج کو چھوتے ہیں، صورت سے سروکار رکھتے ہیں اور کثرتِ مظاہر میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن آپ کو تو یہ بھی جاننا چاہیے کہ ان سب دائروں کا مرکزی نقطہ کہاں ہے؟ محض علوم، خواہ وہ طبیعی ہوں یا سماجی، کسی طالب علم کو حقیقی معنوں میں ایک تعلیم یافتہ انسان نہیں بنا سکتے۔ اس کے لیے آپ کو اس غور و فکر اور استغراق کی ضرورت ہوگی جو آپ کو آپ کے وجود کے اُس مرکزی نقطے تک پہنچا سکے جو زندگی کے دوسرے تمام حقایق کا مخرج و منبع ہے۔

آخر سائنس کا کیا کام ہے؟ یہی نا کہ وہ اشیاء کی تشخیص کرتی ہے۔ اس کا سارا کام ایک ذہنی مہم جوئی ہے، ذہنِ انسانی کی ایک تخیلی مہم جوئی۔ یہ تو ہوئی سائنس کی ماہیت۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کا محرک کیا ہے؟ تو اس کا محرک انسان کا وہ ذی حیات جوہر ہے جو جہل پر کبھی قانع نہیں ہوا اور ہمیشہ کی کوشش رہی ہے کہ جہالت اور لاعلمی کے پردوں کو چاک کر کے حقائق کا ادراک حاصل کرتا رہے۔ اب انسانی علوم کو لیجیے اور ان کی غرض و غایت پر غور کیجیے تو پتا چلے گا کہ وہ بھی انسانی ذہن کی اسی قوت سے کام لیتے ہیں لیکن قدرے مختلف انداز میں، یعنی انسانوں کے باہمی تعلق کی تلاش میں۔ لیکن انسانی روح تک آپ کی رسائی نہ طبیعی علوم کے وسیلے سے ہو سکتی ہے اور نہ انسانی علوم کی مدد سے۔ بات یہ ہے کہ یہ علوم آپ کو یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ انسانی وجود میں پایا جانے والا وہ ذی حیات جوہر کہاں ہے جس کے

مظاہر ہے سب طبیعی اور انسانی علوم ہیں؟ اس کا جواب پانے کے لیے آپ کو فنونِ لطیفہ، ادبیات اور مذہب سے رجوع کرنا ہوگا۔ یہاں مذہب سے میرا مطلب اُس ادعائی اور فرقہ وارانہ مذہب سے نہیں جو انسان کو انسان سے نفرت کرنا سکھاتا ہے، بلکہ میری مُراد مذہب کی اُس سچی روح سے ہے جو عبارت ہے بصیرت و شفقت سے، یعنی داخلی طور پر عرفان و آگہی اور خارجی سطح پر احسان اور حسنِ سلوک۔ یہی وہ مذہب ہے جس کی طرف اُن آیاتِ قرآنی میں اشارہ کیا گیا ہے جن کی ابھی آپ کے سامنے تلاوت ہوئی۔ وہی مذہب جو انسان کو تعلیم دیتا ہے کہ اُس ذاتِ بزرگ و برتر کے حضور میں سرِ نیاز خم کردے جو کائنات کی سب سے عظیم حقیقت ہے اور ہم سب کی خلقت کا سرچشمہ۔ مثنوی مولانا روم میں کہا گیا ہے "چاند دریا میں نہیں، آسمان میں ہے"۔ دنیا میں جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ تو بس ایک عکس ہے۔ حقیقت اس عالمِ محسوسات سے ماورا ہے۔ یہ وہ شے ہے جس کا ادراک مظاہرِ عالم میں گم ہو کر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے آپ کو اوپر کی طرف دیکھنا ہوگا۔ رہا دیکھنے کا طریقہ، تو اس کے لیے کسی خاص ہادی یا نبی سے وابستگی کی قید نہیں۔

آپ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت محمدؐ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی گروہِ انسانی کو نبی سے محروم نہیں رکھا۔ ہر گروہ انسانی کا کوئی نہ کوئی نبی ہے۔ ہمارے ملک کے دستور نے یہ اعلان کرکے کہ ہمیں مذہب کے معاملے میں عقیدے اور عمل کی پوری آزادی حاصل ہونی چاہیے، دراصل اسی بنیادی اصول کی ترجمانی کی ہے۔ یہ وہ دستوری حق ہے جس میں کسی وقت اور کسی حالت میں بھی کوئی تخفیف نہیں ہونی چاہیے۔

مجھے توقع ہے کہ اس یونیورسٹی میں طبیعی علوم، انسانی علوم اور مذہب تینوں مل جل کر ایک اکائی کی حیثیت سے کام کریں گے۔ انسانی علم کو خانوں میں نہیں بانٹا جاسکتا۔ آپ کا ہر عمل بیک وقت دنیاوی بھی ہے اور دینی بھی۔ آپ کا ہر عمل ایک ابدیت کے پس منظر میں ہوتا ہے۔ یقین جانیے کہ کوئی بڑا کام انجام نہیں دیا جاسکتا جب تک دل میں یہ احساس نہ ہو کہ ہم سب وہ عاجز و درماندہ بندے ہیں جنھیں کچھ مخصوص فرائض کی انجام دہی پر مامور کیا گیا ہے۔

دنیا حرکت میں ہے۔ انسانی تہذیب کا سفر اب سے دس ہزار سال پہلے شروع ہوا تھا۔ اُس وقت سے یہ کارواں منزل بہ منزل آگے بڑھا ہے۔ آج

ہم جس جدوجہد میں مصروف ہیں وہ یہ ہے کہ کس طرح عالمی وحدت کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو۔ ہم جن علوم کا بھی اکتساب کریں، جو بھی تربیت پائیں، جن فنون میں بھی مہارت حاصل کریں، ہمیں عہد کرنا چاہیے کہ اُن کا استعمال انسانیت کی فلاح، بنی آدم کی خوشحالی اور عالمی وحدت کو بروئے کار لانے کے لیے کریں گے۔ اس طرح کا عہد ہر فارغ التحصیل طالب علم کو کرنا چاہیے۔

پس ہم سب مل جل کر ایک مشترک مقصد کے لیے کام کررہے ہیں۔ ہر طالب علم کو اپنی تمام تر صلاحیتیں اس مشترک مقصد کے حصول کے لیے وقف کردینی چاہئیں۔ کسی کے بارے میں بھی بُرے خیال کو اپنے دل میں جگہ نہ دیجیے۔ ہوسکتا ہے کہ اپنے طور طریق کے اعتبار سے وہ آپ کو بیگانہ نظر آئے، ہوسکتا ہے کہ وہ گم راہ ہو، ہوسکتا ہے کہ وہ بدقماش ہو، ہوسکتا ہے کہ وہ بدہیئت ہو، وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، بہر حال بحیثیتِ انسان آپ کا بھائی ہے۔ آپ کو یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ وہ ایک انسان ہے اور انسان نمو پذیر اور اصلاح پذیر ہوتا ہے۔ آخر اس دنیا میں ہم سب کا یہی تو نصب العین بھی ہے۔

میری دلی آرزو ہے کہ اس یونیورسٹی کا بین الاقوامی سطح پر عظیم یونیورسٹیوں میں شمار ہو۔ یہ منزل سر ہوگی آپ کی کارکردگی سے نہ کہ نعرہ بازی سے۔ نعرے بازی سے کوئی عظیم کام سرانجام نہیں پاسکتا۔ زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کے لیے ضرورت ہے لگن کی، انہماک کی، ایک جذبۂ صادق کی۔ اگر آپ اس جذبۂ صادق سے محروم ہوگئے تو پھر ہر قسم کی ذہنی عفونت کا شکار ہوجائیں گے۔ اس زمانے میں ذہنی امراض کی زیادتی کیوں ہے؟ اسی لیے کہ لوگ اپنے مرکزِ وجود سے بیگانہ ہوگئے ہیں۔ وہ مرکزِ وجود جو ہماری ساری سرگرمیوں کا مخرج و منبع ہے۔ اگر آپ اس مرکز کو یاد رکھتے ہیں تو پھر آپ کبھی اپنی راہ سے نہیں بھٹکیں گے، آپ انتہائی ناسازگار حالات میں بھی فکر و تردد کا شکار نہیں ہوں گے اور کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے آپ کے سکونِ قلب اور طمانیتِ خاطر میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اگر آپ کو اپنے جذبۂ باطن پر اعتماد ہے، اگر آپ اُس پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں، اگر آپ اس کی صدا کو سنتے رہتے ہیں تو پھر آپ محسوس کریں گے کہ پوری نوعِ انسانی ایک رشتۂ اخوت میں منسلک ہے۔ اس دنیا میں اس سے بڑا کوئی انکشاف نہیں ہوا کہ ہم سب ایک خدا کے اور ایک خاندان!!!

(یونیورسٹی کانوکیشن منعقدہ [illegible] میں پیش کیے گئے خطبے سے ایک اقتباس)

کانووکیشن کے مہمانِ خصوصی

صدرِ جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ

ـــــــ ایک مختصر تعارف

ہمارے لیے بڑی خوشی اور فخر کی بات ہے کہ اس سال مسلم یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں ملک کے ہر دل عزیز صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے تشریف لارہے ہیں۔ آپ کی تشریف آوری یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبا اور بالخصوص اس کانووکیشن میں سندیں پانے والوں کے لیے ہمت افزائی کا باعث ہوگی۔

صدر جمہوریہ ہند کی زندگی قومی خدمات اور وطن پرستی کی ایک طویل داستان ہے۔ وہ ۵ مئی ۱۹۱۶ء کو سندھوان گاؤں ضلع فریدکوٹ کے ایک کاشتکار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد سردار کشن سنگھ ۵۶ ایکڑ اراضی کے مالک تھے جو گیانی ذیل سنگھ اور اُن کے دو بھائیوں کو ورثہ میں ملی۔

محترم گیانی ذیل سنگھ کو اُردو اور ہندی دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہے وہ ایک اچھا ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ انھوں نے سکھوں کی مذہبی کتب کے علاوہ قرآن شریف، گیتا اور رامائن بھی پڑھی ہے۔

عالی جناب گیانی ذیل سنگھ کی سیاسی زندگی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۸ء میں ہوا جب انھوں نے فریدکوٹ میں آل انڈیا کانگریس کی شاخ قائم کی۔ اور نتیجہ کے طور پر پانچ سال قید بامشقت کی سزا پائی۔ اسی زمانے میں وہ مہاتما گاندھی کے نظریۂ عدم تشدد سے متاثر ہوئے۔

جب موصوف وزیر زراعت و مالیات تھے اُن دنوں انھوں نے فریدکوٹ میں کسانوں، مزدوروں اور چھوٹے چھوٹے صنعت کاروں پر ڈھائے جانے والے مظالم کے خلاف عملی قدم اٹھایا۔ ۱۹۵۶ء میں وہ راجیہ سبھا کے ممبر اور پنجاب پردیش کانگریس کمیٹی کے سینیر وائس پریسیڈنٹ مقرر ہوئے مارچ ۱۹۷۲ء میں وہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ ہوئے اور ریاست کی ترقی و خوش حالی میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ جنوری ۱۹۸۰ء میں لوک سبھا کے ساتویں انتخاب میں پنجاب کے ہوشیار پور حلقے سے منتخب ہوئے اور وزیر داخلہ مقرر کیے گئے۔ اور پھر وہ وقت بھی آیا جب لوگوں نے انہیں صدر جمہوریہ ہند کی حیثیت سے جانا، پہچانا ـــــ یہ ہیں ہمارے مہمانِ خصوصی گیانی ذیل سنگھ!

❋

ڈاکٹر ذاکر حسین

تعمیر ش[illegible]یت

جناب والا، جناب شیخ الجامعہ، بزرگو، دوستو اور عزیزو!

میں کس طرح اپنی شکر گزاری کا اظہار کروں اس اعزاز پر جو آپ نے مجھے بخشا ہے۔ اس کا مستحق ہوتا بہ فرض محال، اور آپ بخشتے تو شکر گزار ہونا چاہیے تھا، لیکن آپ نے تو میری نااہلی سے چشم پوشی فرما کر مجھے یہ عزت بخشی ہے۔ اس کی وجہ تو آپ کی محبت ہی ہو سکتی ہے اور محبت سے محبت پیدا ہوتی ہے اور شکر گزاری۔

اس موقع پر جی چاہتا ہے کہ میں اس دانش گاہ کے اور اپنے تعلق کو جس طرح محسوس کرتا ہوں اس کا ذکر آپ سے کروں

میرا دھیان اس وقت ۴۴ برس پہلے کی اس گرم دوپہر کی طرف رہ رہ کر جاتا ہے، جب میں پہلی بار اس دانش گاہ میں پہنچا تھا۔ اپنے سینکڑوں دوسرے ساتھیوں سے ذرا کم اجنبی، کہ میرے دو بڑے بھائی پہلے سے یہاں موجود تھے۔ یہ دونوں یہاں رہ بس کر یہاں کے ہو چکے تھے، میں نووارد تھا۔ سہ پہر میں شہر سے ایک جوتا، کچھ کتابیں اور ایک لالٹین بھائی صاحب نے خریدوا دی تھی۔ شہر گئے تھے ہم پیدل، ادھر سے آئے تھے اکے میں، اس لیے کہ ہاتھ میں سامان اٹھا کر چلنا اس زمانے میں کسرِ شان سمجھا جاتا تھا۔ یاد ہے کہ بھائی صاحب مجھے اپنی کچی بارک کے کمرے میں چھوڑ کر اپنے دوستوں سے ملنے چلے گئے تھے اور مجھے بتا گئے تھے کہ مغرب کے بعد جب گھنٹی بجے تو ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے چلے جانا۔ گھنٹی بجی، جیسے اندازہ سے ذرا پہلے۔ میں ترکی ٹوپی، ترکی کوٹ اور جراب اور انگریزی جوتے پہنے بغیر کھانا کھانے کی مشق ۱۶ برس تک بہم پہنچا چکا تھا، یہ نئی وردی پہننے میں دیر کی، اور دیر کیسے نہ کرتا جوتے کا فیتا ایک سوراخ سے کھینچا تو دوسرے سے نکل گیا، اس میں سلیقے سے گرہ دینے کا جو فن سہ پہر میں بھائی صاحب نے سکھایا تھا اور جس کی کچھ مشق بھی اس نئے جوتے پر کرا دی تھی وہ گھبراہٹ میں سب حافظہ سے اتر گیا اور کئی بار کے بست و کشاد سے ایک نئے انکشاف کی طرح ہاتھ آیا۔ لیکن جب کس بند کر کمرے سے نکلا تو دیر ہو چکی تھی اور دوسرے زیادہ چوکس ساتھی ڈائننگ ہال جا چکے تھے۔

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

راستہ معلوم نہ تھا، نہ جانے کتنی دیر اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا اور اپنے خیال میں تلاش منزل کی ناکام کوشش کے بعد پھر اپنے ہی کمرے کے سامنے آن پہنچا۔ کمرہ بند تھا، دوسرے کمرے بھی سب بند تھے۔ گھڑی دیکھی، یہ بھی اسی دن نئی نئی بھائی صاحب نے دی تھی۔ اس سے پہلے اسکول کے گھنٹے یا سورج کی مدد سے دن کی تقسیم کر لیا کرتا تھا۔ گھڑی جو دیکھی تو پتا چلا کہ کھانے کی گھنٹی کا جو وقت بتایا گیا تھا اُسے گزرے صرف آٹھ منٹ گزرے ہیں۔ اور اس جانِ ناتواں نے ان آٹھ منٹ میں خود فراموشی، بازیافت، تلاشِ منزل، گم کردہ راہی اور ناکامیٔ سفر کے جملہ مقامات طے کر لیے تھے!

سچ ہے وقت صرف گھڑی کی سوئیوں ہی سے نہیں ناپا جاتا ہیں

گزرتا ہے اس کی کیفیت بھی اس کا ایک پیمانہ ہے، کبھی چند منٹ، انتظار اور مایوسی کے چند منٹ، پہاڑ بن جاتے ہیں؛ کبھی کشفِ حقیقت قصدِ نیک مشاہدۂ جمال، مجاہدانہ سرفروشی کے ایک لمحے میں ازل اور ابد سمٹ کر سما جاتے ہیں؛ کبھی بے مقصدی، بے راہ روی، بے دلی میں پوری پوری عمر بیت جاتی ہے کہ گھڑی کا ایک منٹ بھی اس پر حقارت سے ہنستا ہے۔ خیر تو ہم آٹھ منٹ بعد جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ گئے۔ چارپائیاں باہر نیم کے درختوں کے قریب پڑی تھیں، وہاں بیٹھے ہی تھے کہ دوسرے ساتھی کوئی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، کوئی گنگناتے، کوئی ہنستے، کوئی ذرا چپ چاپ واپس آنے لگے۔ یعنی جانا، کھانا، آنا سب ۹۔ ۱۰ منٹ میں ختم۔ اس زمانے میں اور چیزوں میں تو نہیں البتہ کھانے میں بہت ہی فوجی شان تھی۔ اس پر زیادہ وقت صرف کرنا بدذوقی سمجھا جاتا تھا اور منتظمین کی طرف سے بھی ایسا اہتمام تھا کہ زیادہ وقت صرف کرنے کا موقع بھی کم ہی ہوتا تھا۔

یہ اس دن کی یاد اس تفصیل سے کیوں آرہی ہے آج؟ شاید اس لیے کہ وہاں سے وہ زندگی شروع ہوتی ہے جس نے ۴۴ برس میں بہت سے رنگ دیکھے، مگر جس میں اس دانش گاہ سے برابر دل کو تعلق رہا، گہرا تعلق، نہ ٹوٹ سکنے والا تعلق۔ یہاں بہت کچھ سیکھا اور زیادہ نہ سیکھ سکنے پر دلگیر ہونا سیکھا، ساری زندگی کو یہاں کے ناتمام کام کا تتمہ بنانے کا ولولہ یہیں سے پایا، یہاں دوست پائے، دوستی کی قدر پہچانی، مل جل کر کام کرنا سیکھا، اختلاف کے باوجود نباہ کے ڈھنگ سیکھے، بھانت بھانت کی زندگی کے نمونوں کو برتنا اور پرکھنا سیکھا۔

جناب والا! رسم سی ہے کہ تقسیم اسناد کے جلسے میں جس شخص کو خطبہ دینے کے لیے بلایا جاتا ہے وہ اعلیٰ تعلیم کے کسی مسئلے یا بعض مسائل کے متعلق اپنے خیالات دانش گاہ کے طلبہ اساتذہ اور کارکنوں کے سامنے رکھتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ایسا نہ کروں، اس لیے کہ جو کہا جاتا ہے وہ محفل آرائی بلکہ وقت گزاری کے سوا بظاہر کسی کام نہیں آتا، مگر سوچتا ہوں کہ تکرار ہمیشہ سے تعلیم کا، چاہے افراد کی ہو، چاہے جماعتوں کی، خاصا موثر ذریعہ رہا ہے، اس لیے عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

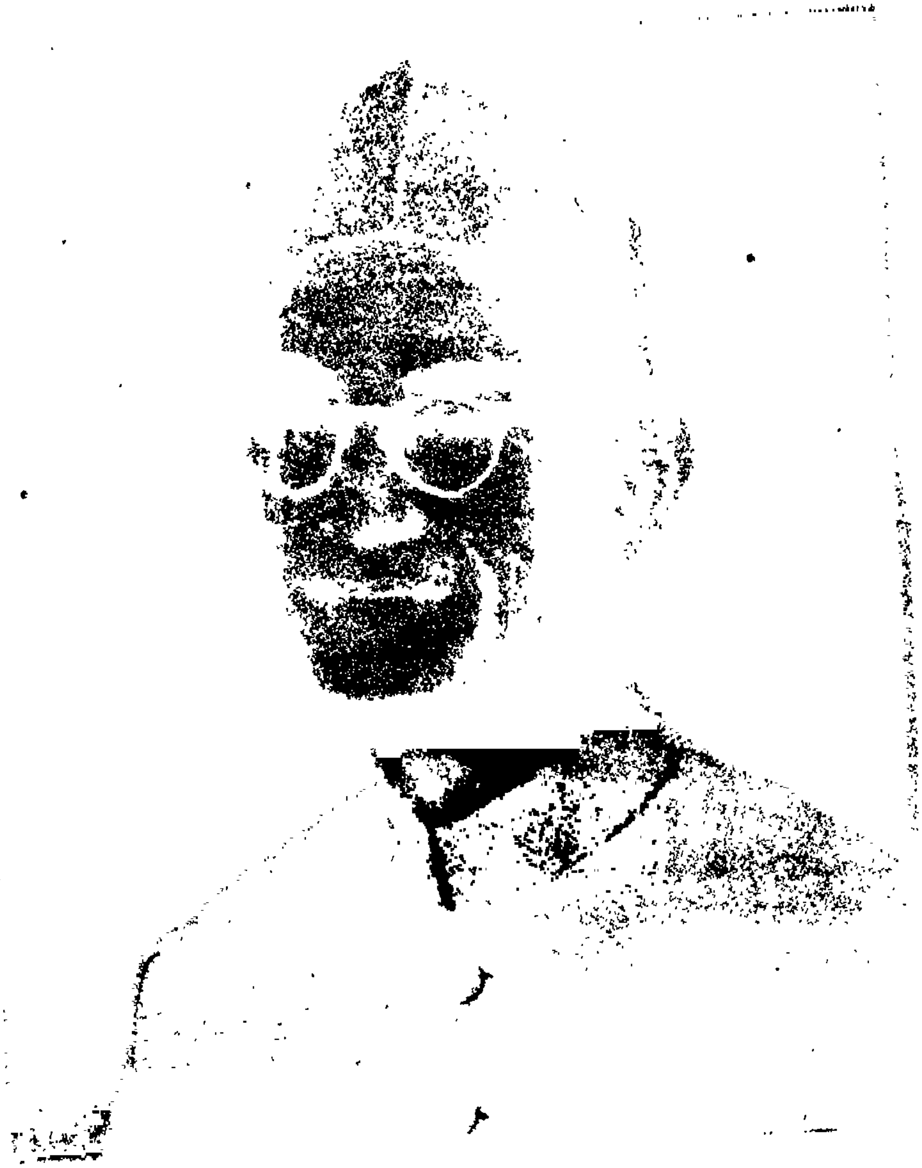
سب سے پہلی چیز جو میرے خیال میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے ادارے تیزی سے بڑھیں گے اور اس شور کے، جو ہم روز سنتے ہیں کہ ضرورت سے زیادہ لوگ اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں، اور اس لیے بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ اعلیٰ تعلیم پانے والوں کی تعداد کو قابو میں رکھ سکنے کی خام خیالی کا نتیجہ بس یہ ہوگا کہ اس بڑھتی تعداد کے لیے اچھی اعلیٰ تعلیم کے صحیح انتظامات سوچ سمجھ کر اور پوری تیاری کے ساتھ نہیں کیے جائیں گے۔ معیار تعلیم گرے گا، ادھ کچرے گریجویٹ جو کسی مرض کی دوا نہ ہوں گے، لاکھوں کی تعداد میں نکلیں گے، بوجھ بجھکڑ فرمائیں گے کہ تعداد کم کرنی چاہیے! سمجھیں گے کہ بڑی دور کی کوڑی لائے اور تعداد ہوگی کہ بڑھتی جائے گی۔ بوجھ بجھکڑوں کے ذہن نشین اگر یہ ہو جائے کہ ہزار جتن کرنے پر بھی تعداد بڑھے گی تو شاید اس بڑھتی ہوئی تعداد کو اچھی تعلیم دینے کے انتظامات کی طرف زیادہ دھیان دیا جا سکے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم ملک میں بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے اور اس توسیع کی رفتار کو ابھی اور بھی تیزتر ہونا چاہیے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے پھیلاؤ کی رفتار بھی اس وقت ہے اس سے اعلیٰ تعلیم تک پہنچنے والوں کی تعداد بڑھے گی۔ اگر آپ چن چن کر خاص قابلیت کے لوگوں کو ہی یونیورسٹی کالجوں میں داخلہ دیں گے، اور ان کا ٹھیک چناؤ بھی کھیل نہیں ہے، تب بھی ان چنے ہوئے لوگوں کی تعداد بھی موجودہ تعداد سے جلد ہی زیادہ ہو جائے گی اور اس وقت جو تعداد ہے اس کے لیے کب ٹھیک اور کافی انتظام ہے۔ ثانوی تعلیم کی درستی کی کوشش ضرور ہونی چاہیے۔ جو کوشش ہو رہی ہے وہ میری نظر میں بہت ناکافی ہے لیکن اس پر غلط بھروسہ کرکے اعلیٰ تعلیم کی توسیع کے فرض کو بھلانا بڑی بھول ہوگی۔

یہ تو ہے توسیع کے متعلق میرا خیال۔ لیکن اگر توسیع ارادے سے نہیں ہوئی، تیاری کے ساتھ سوچ سمجھ کر نہیں ہوئی تو وہ ایسی من مانی اور اوٹ پٹانگ شکلیں اختیار کرے گی اور اس تیزی سے اعلیٰ تعلیم کو ایسا کھوکھلا کردے گی کہ پھر اس کو سنبھالنا مشکل ہوگا۔ یاد رہے کہ اس نامراد منزل تک پہنچنے میں بہت فاصلہ باقی نہیں ہے۔ طالب علموں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی نسبت سے استادوں کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوا ہے، اچھے استادوں کے درس گاہوں میں لانے کی

بیرمیں بھی کچھ بہت کارگر ثابت نہیں ہو رہی ہیں؛ سامانِ تعلیم عمارتیں
ب خانوں میں اس نسبت سے ترقی نہیں ہوئی ہے؛ سارے نظام
علیم میں بیک وقت بڑی بڑی تبدیلیوں کی تجویزوں نے ابھی جڑ
نہیں پکڑی ہے، اس لیے بھی خاصی گڑبڑ سی ہے؛ تعلیم میں انگریزی
بان کی جگہ کے متعلق روز کوئی نیا خیال سامنے آجاتا ہے، سب
یاستوں کا ایک سا خیال نہیں ہے یونیورسٹیاں زیادہ انگریزی سے
ی کام لے رہی ہیں، اس نے بھی تعلیم کے معیار کو خاصا گرا دیا ہے۔ اگر
س صورت حال کی درستی کی طرف فوراً دھیان نہ دیا گیا تو یہ بھی کچھ دن
مدسنبھالے نہ سنبھلے گی تیلی پر سرسوں تو زندگی کے اہم شعبوں میں کم ہی کہیں
جمتی ہے مگر تعلیم تو خاص طور پر دیر طلب کام ہے۔ اگر کام شروع ہی نہ کیا
جائے یا ٹھیک شروع نہ کیا جائے تو مدت گزرنے پر بھی کچھ نہیں ہوتا
اسی لیے جلد از جلد کچھ کرنا چاہیے۔ نئے کالج اور یونیورسٹیاں کھولی جلیں
ان میں اور موجودہ تعلیم گاہوں میں تعلیم پانے والوں اور تعلیم دینے والوں
کی تعداد میں ٹھیک نسبت ہو، صرف بڑی بڑی جماعتوں کے سامنے
لکچروں سے تعلیم کا کام نہ نکالا جائے بلکہ چھوٹے چھوٹے گروہوں، لکچروں
کے ساتھ مذاکرہ DISCUSSION کا طریقہ زیادہ رائج کیا جائے
استاد اور شاگرد میں شخصی تعلق کا امکان پیدا کیا جائے؛ اور تعلیم کے
کام میں اچھے استادوں کو لگانے کے لیے ہر ممکن تدبیر کی جائے۔ امتحان
کے طریقے کو بدلا جائے۔ یہ بڑی ذمّے داری کا اور خاصا پیچیدہ کام
مگر ایسے کام بھی کرنے ہی سے ہوتے ہیں، باتیں بنانے سے نہیں بنتے۔

نوجوان دوستو! تم جو آج سندیں لے کر عرف عام میں زندگی
میں قدم رکھ رہے ہو تم سے بھی کچھ کہنا چاہیے۔ کیا کہوں؛ اگر سیاست کے
میدان میں انتخاب کا امیدوار ہوتا تو میرا کام آسان ہوتا۔ تمہاری تعریف
کرتا، مبالغہ کے ساتھ تعریف، خوشامد کا جادو بڑے بڑے گھاگھوں پر چل
جاتا ہے، تم ایسے کہاں کے دانا ہو کہ اس سے متاثر نہ ہوتے، تم خوش
ہو جاتے، مجھے ووٹ مل جاتے۔ کہہ سکتا تھا کہ تمہارے ہاتھوں میں
قوم کا مستقبل محفوظ ہے، جی نہیں دنیا کا مستقبل تم ہمارے مستقبل کی
کی امید ہو، اس کی درخشانی کا وعدہ ہو۔ مگر کیا کروں اور کیسے یہ نہ سوچوں
کہ تم سے پہلے اور پہلے اور لوگ بھی اس دیس میں نوجوان رہ چکے ہیں۔
وہ بھی تو امید تھے، وہ بھی تو ایک وعدہ تھے، پر وہ وعدہ پورا نہ ہوا
وہ امید بر نہیں آئی۔ اگر تم امید ہو اور وعدہ تو اس کا پورا ہونا تمہاری
کوشش، ساری زندگی پیہم کوشش پر منحصر ہے۔ اس پر منحصر ہے کہ تم
سمجھو کہ زندگی خاصی گمبھیر چیز ہے، خالی لفظوں سے باتوں سے اس کی
ساخت نہیں ہوتی۔ یہ خالی فقرے بازی نہیں، محض شخصی نفع نقصان
کا کھاتا نہیں، خود بینی اور خود پروری نہیں، خالی آرام و آسائش کی تلاش
نہیں، اچھی سی تنخواہ اور بالائی یافت کا نام نہیں، کہ بس بی اے کیا
نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے۔ جس ڈھرے پر زندگی گردش کرتی ہے
وہ سود و زیاں آرام و تکلیف، حظ و کرم کا ڈھرا نہیں۔ وہ ڈھرا ہے
خوب و زشت، اعلیٰ و ادنیٰ کا، ترقی اور انحطاط کا۔ بڑی کٹھن چیز ہے
زندگی پر بڑی دلکش چیز ہے یہ، اعلیٰ کو جان کر ادنیٰ پر راضی ہونے
کی معصیت جانتی ہے اور خوب ترکی طرف بڑھے جانے کی
پیہم سعی کا نام ہے۔ زندگی ایک مشن ہے، زندگی عبادت ہے۔ اس خدمت
کو انجام دینے اس مشن کو پورا کرنے، اس عبادت کا حق ادا کرنے کے
لیے تمھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی فطری صلاحیتوں کا پتا چلانا ہوگا، اور
ان میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرنا ہوگا۔ بے لاگ فکر کی آنچ میں تپا تپا
کر اور مخلصانہ عمل کے ہتھوڑے سے اسے کوٹ کوٹ کر اپنی زندگی کے
مسالے کو استواری اور پائے داری بخشنی ہوگی۔ ارادے کی قوت
کو مشق سے مضبوط کرنا ہوگا اور قابو میں لینا ہوگا تاکہ وہ بس کبھی کبھی
ایک طغیانی عمل کی صورت میں اپنے آپ کو ظاہر نہ کیا کرے بلکہ ایسا
معتبر منبع ہو کر اس سے ایک مدت تک توانائی حاصل کی جاتی رہے
اور ان کاموں میں اس کو لگایا جا سکے جو واقعی کرنے کے کام ہیں اور جن
کی ماہیت میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ اپنی تکمیل کے لیے ایک زمانہ چاہتے ہیں
اپنی عقل اور سمجھ کی برابر تربیت کرنی ہوگی تاکہ ہمیشہ دوسروں ہی کا منہ
نہ تکو خود فیصلے کر سکو خصوصاً ایسے فیصلے جو تم ہی اپنے لیے کر سکتے ہو
اور ان سے کوئی مفر نہیں ہوتا: تمھیں اپنی نظر کو برابر وسعت دینے کی
مشق کرنی ہوگی تاکہ دوسروں کا نقطۂ نظر بھی سمجھ سکو اور اس کے
ردو قبول سے پہلے اسے بے تعصبی سے جانچ سکو۔

(خطبہ جلسہ تقسیم اسناد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۷ر جنوری ۱۹۵۷ء)



پروفیسر محمد مجیب

شہریت کی ذمہ داریاں

مجھے مسلم یونیورسٹی کے کونوکیشن کے موقع پر خطبہ دینے کی عزت ناگہانی طور پر پیش کی گئی اور اس محبت اور اصرار کے ساتھ کہ اسے قبول کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اب مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ میں کیوں اس عزت افزائی کے قابل سمجھا گیا اور اپنی بے مائیگی دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ علم کی قدر بڑھانے کی کوشش میں بھی شریک نہیں ہو سکا ہوں، اور نوجوانوں کے جو اخلاقی اور سماجی مسائل ہیں اُن سے اس قدر دور ہوں کہ نصیحت یا رہنمائی کی ہمت نہیں ہوتی۔ مسلم یونیورسٹی میں میرے بہت سے عزیزوں اور دوستوں نے تعلیم پائی، میں صرف اس سے محروم نہیں رہا بلکہ ہندوستان کی کسی یونیورسٹی کو اپنی مادرِ علمی نہیں کہہ سکتا۔ اس وجہ سے اور بھی محسوس ہوتا ہے کہ میں آپ کو ایسے اہم اور نمایاں موقع پر مخاطب کرنے کا حقدار نہیں ہوں۔ اپنی طرف سے بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ایک قومی تعلیم گاہ میں قریب تیس سال گزارے ہیں اور اس زمانے میں جو کچھ دیکھا ہے اور سنا ہے اس کی بدولت تعلیم کے مسائل کچھ سمجھنے لگا ہوں۔

دنیا میں بہت سی تعلیم گاہیں قائم ہوئی ہیں، ان کا مقصد تعلیم دینا ہے۔ اور یہ بہت بڑی بات سمجھی جاتی ہے اگر وہ تعلیم دینے کا کوئی نیا اور رائج طریقوں سے کچھ بہتر طریقہ اختیار کرتی ہیں۔ مگر جیسے ہم اس شخص کو بہت مانتے ہیں جس کی زندگی اخلاقی یا تہذیبی قدروں کی خدمت کرنے کی وجہ سے ممتاز ہو، ویسے ہی ہم اُن تعلیم گاہوں کو بڑا مرتبہ دیتے ہیں جن کا مقصد صرف تعلیم دینا نہیں بلکہ اخلاقی اور تہذیبی قدروں کی نمائندگی کرنا ہو۔ آپ کو اس کالج کی تاریخ معلوم ہے جو ترقی کرتے کرتے مسلم یونیورسٹی بن گیا۔ کالج کے بانی سرسید احمد خاں کے آپ وارث ہیں اور وراثت کی وجہ سے جو آسانیاں اور دشواریاں پیدا ہوئیں ان کا آپ کو علم ہے۔ آپ ایک خاص تہذیبی منصب کو ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ اس منصب نے آپ کو صرف ہندوستان میں نہیں بلکہ ان تمام ملکوں میں جو مشرق و مغرب کی کشمکش میں مبتلا ہیں ایک حیثیت دے دی ہے جو بہت کم تعلیم گاہوں کو نصیب ہوتی ہے۔

تعلیم گاہوں کا میدان علم کی دنیا ہے، سیاست کی دنیا نہیں ہے۔ ان کو سیاسی مصلحتوں کا پابند ہونے کے بجائے حالات کو اس بلندی سے دیکھنا چاہیے جہاں سے زمانہ مصلحت کا پس منظر نہیں معلوم ہوتا بلکہ مصلحت کو خود زمانے کا پس منظر بنا دینا ممکن معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ زندگی کے مسائل سے دور نہیں ہو جاتی ہیں، مسائل کو سمجھنے کی وہ استعداد پیدا کرتی ہیں جس کی بدولت جماعتوں کے وقتی جذبات اور اصل طبیعت عارضی کیفیتوں اور مستقل میلانات، سیاسی مصلحت اور اخلاقی اصول، حکومت کی پالیسی اور قوم کے مفاد میں تمیز کی جا سکتی ہے، اور ایسی عاقبت اندیشی کی عادت ڈالی جا سکتی ہے جس کے سامنے زمانہ سازی کا سر جھک جاتا ہے

ہمارے ملک میں مذہب سیاسی اختلافات کی لپیٹ میں آچکا ہے اور سیاست نے مذہب کا اس کامیابی سے بھیس بنا لیا ہے کہ اب

تک اس کے چہرے سے مذہب کا رنگ چھڑایا نہیں جا سکا ہے۔ اب یہ طرح محسوس ہو رہا ہے کہ ہندوستان کی تقسیم نے صرف جائیداد اور پرمٹ کے مسئلے پیدا کیے ہیں کسی معاملے کو انتظامی یا علمی اعتبار سے طے نہیں کیا ہے۔ ہم پہلے غور کرتے تو شاید یہ بات واضح ہو جاتی کہ مذہب اور سیاست کے مقاصد میں ہم آہنگی لازمی سہی مگر ان کی فطرت، ان کی ماہیت الگ ہے، یہ کائنات کا نظام ہے تو وہ زندگی کا معمول، یہ حیات کا قانون ہے تو وہ روزگار کا ذریعہ، یہ آنکھوں کا نور ہے تو وہ ہاتھوں کا ہنر۔ اسی سلسلے میں ہم کو اس کا بھی یقین ہو جاتا ہے کہ سیاست کا کوئی مذہب نہیں ہونا چاہیے اور مذہب کی کوئی سیاست نہیں ہونی چاہیے، اور وہی ریاست جو خود غیر مذہبی ہو مذہب اور سیاست میں صحیح قسم کا تعاون پیدا کر سکتی ہے۔ حکومت عالی شان مندر اور مسجد اور کلیسا بنا سکتی ہے، مذہبی لوگوں کو عزت اور عہدے دے سکتی ہے مگر اسے مذہبی حیثیت دی گئی تو یہ ناممکن ہے کہ وہ مذہبی قدروں کو اپنا آلۂ کار نہ بنائے۔ مذہب حکومت کو اعلیٰ اخلاقی اصولوں کا پابند کر سکتا ہے، اس کے دل، اس کے عمل میں نیکی اور مردم دوستی پیدا کر سکتا ہے، مگر سیاسی اقتدار کا نشہ اس کے لیے بہت برا ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ لاٹھی کے کام دعاؤں سے اور دعاؤں کے کام لاٹھی سے لینا شروع کر دیتا ہے۔ ہم سب کی کوشش ہونا چاہیے کہ ریاست کا مذہبی رنگ قائم رہے تاکہ ہمارے مذہبوں اور ہماری سیاست کے الگ الگ رنگ نکھر سکیں اور سب کا مجموعہ زندگی کی حسین تصویر ہو۔

مگر ایسی علمی بحثوں کی وجہ سے ہماری آپ کی کوئی ذمہ داری کم یا محدود نہیں ہوتی، اور ان کا فیصلہ ہونے تک ملک اور قوم کے کسی حق کو ادا کرنا ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ شہریت غیر مشروط ہوتی ہے اور بہرحال غیر مشروط رہتی ہے۔ آپ اپنے غور و فکر کو اس مفروضے سے، یا یوں کہیے کہ اس مقام سے شروع کیجیے تو آپ کے پاؤں زمین پر جمے رہیں گے، آپ کے خیال اور عمل کا ساتھ نہ چھوٹے گا اور وہ ایک دوسرے کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔

آپ کا یہ حق ہے کہ آزادی سے رائے دیں، اچھے کو اچھا اور برے کو برا کہیں۔ جھاڑ پونچھ ہر گھر میں کی جاتی ہے اور اس کام کو زیادہ خوبی سے وہ انجام دے سکتے ہیں جن کی ہمت جوان ہو، ہاتھ پاؤں مضبوط ہوں اور نظر تیز ہو، البتہ اس کا خیال ضرور رہنا ہے کہ صفائی کے شوق میں نفیس اور نازک چیزیں توڑ نہ دی جائیں، ہر وقت گرد نہ اڑاتی رہے، گھر کی صورت نہ بگڑ جائے، اپنے ملک سماج میں، اپنے خاص ماحول میں صفائی ضرور کیجیے، مگر وقت سے سلیقے سے کیجیے۔ پھوہڑپن بہرحال ایک عیب ہے اور صفائی کی خاطر گوارا نہیں کیا جا سکتا۔

سلیقے سے کام کرنے کا مطلب ہے کام کا حق ادا کرنا۔ آپ کے لیے شاید سورماؤں کے حوصلے دل میں رکھنا زیادہ آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ آپ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں کی طرف توجہ کریں، اور دیکھتے رہیں کہ آپ نے انہیں کس خوبی یا خرابی سے انجام دیا ہے۔ دراصل یہی چھوٹے چھوٹے کام آدمی کی شخصیت کو ایک شکل دیتے ہیں، اس شکل میں حسن پیدا کرتے ہیں۔ انہیں کی بدولت ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے نام کی وجہ سے نہیں، اپنے کام کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے، اس کا ضمیر اس درجہ بیدار ہو جاتا ہے کہ اپنے کسی حکم کو ٹالنے نہیں دیتا۔ جب ضمیر کا حکم چلنے لگتا ہے تو چھوٹے اور بڑے، ادنیٰ اور اعلیٰ کام میں فرق نہیں کیا جاتا، سب ایک معیار کے مطابق محنت اور سلیقے سے کیے جاتے ہیں اور سب اسی سر کو اونچا کرتے ہیں، جو ان کے سامنے جھکا تھا۔ یہی ہے آدمی اور کام کی دوستی جو ایک دفعہ پیدا ہو جائے تو پھر بڑھتی رہتی ہے، یہاں تک کہ آدمی اور آدمیت کی دوستی، آدمی اور خدا کی دوستی بن جاتی ہے۔ ہمارے کام ہی تو ہیں جو ہمیں ایک دوسرے کو پہچاننے کا موقع دیتے ہیں۔ ہماری زندگیوں کو ایک مضبوط رشتے سے جوڑ دیتے ہیں اور ہماری کارگزاری کو تخلیق کے ابدی سلسلے کا حصہ بنا دیتے ہیں۔

میں نے ابھی کہا تھا کہ شہریت غیر مشروط ہوتی ہے اب کہتا ہوں کہ کام کا دوست بنیے۔ آپ کو خیال ہوگا کہ میں آپ کو نصیحت کر رہا ہوں کہ کام میں لگے رہیے فائدہ نقصان کا خیال نہ کیجیے۔ دینے کا طریقہ اختیار کیجیے، لینے کا نہ کیجیے۔ اگر میری باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے تو آپ اس نتیجے سے گھبرائیں کیوں؟ آپ نے بہت سے گڑھے دیکھے ہوں گے، جو اپنے ماحول کی پستی کا اور اپنے خالی ہونے کا اعلان

ں، گویا یہ بھیک مانگنے کے پیالے ہیں۔ جن کو برسات کا پانی یا آس پاس کے نالے بھر دیا کرتے ہیں۔ ان میں پانی رہتا ہے، مگر کس ذلت سے، آدمی ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں، مگر کس کراہت کے ساتھ۔ پانی چشموں میں بھی ہوتا ہے جو پہاڑ کے سینے سے پھوٹ کر نکلتے ہیں، اور ان کی کیا شان، کیا عزت ہوتی ہے، انسان ان کے احسان اٹھا کر خوش ہوتے ہیں، ان پر ناز کرتے ہیں، ان کی دریا دلی کو اپنے لیے مثال مانتے ہیں۔ سوداگری کی نظر سے دیکھیے تو تالاب لینے والوں میں ہے، چشمہ دینے والوں میں سے ہے، تالاب اپنا مال سمیٹ کر رکھتا ہے، چشمہ اپنا مال لٹاتا ہے۔ آپ کو ان دونوں صورتوں میں سے جو پسند ہو اسے اختیار کیجیے، انجام بہرحال ایک ہے۔ چشمہ کا پانی بہتا رہتا ہے، تالاب کا سوکھا رہتا ہے۔

میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ دینے والا نقصان نہیں اٹھاتا، آپ نے چشمے کا انداز اختیار کیا تو شاعروں کے نغمے آپ کے سروں سے سر ملاتے رہیں گے، آپ دوسروں کی نظروں میں حسن ہی کی جھلک دیکھیں گے، آپ کے صاف شفاف پانی کو گدلا کرنے والے نہ ہوں گے۔ چشمے کی شان اور عزت اسی کو حاصل ہو سکتی ہے جو سکون کی آرزو کو دل سے نکال دے، جو اس کے لیے تیار ہو کہ لوگ اس کے نغمے کو لوری سمجھیں، جسے دکھ نہ ہو اگر اس کے فیض سے صرف مالی فائدے اٹھائے جائیں۔ اس عالم مثال میں صرف یہ ایک مثال نہیں ہے۔ نفع و نقصان کی بات سمجھانے والوں میں ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ٹہنی میں لگے رہنا بہتر ہے، چاہے کوئی کانٹا ہی کہلائے۔ اس میں گمنامی ہے مگر سلامتی بھی ہے۔ پھول بن کر نظروں کو لبھانا، کسی کے حسن کی زینت بننے کے لیے شاخ سے جدائی گوارا کرنا حماقت ہے۔ آپ نے کانٹے بھی دیکھے ہوں گے، پھول بھی دیکھے ہوں گے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ کانٹا کیسے کانٹا بنتا ہے، پھول کس طرح کھلتے ہیں۔ فائدے اور نقصان دونوں طرح سے ہیں۔ آپ کو اختیار ہے کہ جو چاہیں بنیں۔ بس اتنا یاد رکھیے کہ کانٹا چبھ کر بتا دے کہ وہ کیا ہے تب بھی پھول کو اپنی آبرو کا خیال رہتا ہے۔ وہ کھلتا ہے اس کے زبان نہیں ہوتی۔

اگر آپ طے کر لیں کہ سودا نہ کریں گے، ہندوستانی شہریت کی ذمہ داریوں کو بغیر کسی شرط کے قبول کریں گے، تو آپ کے [illegible] سے بہتر کوئی ملک نہیں ہے، یہاں کی وسعت کو دیکھیے [illegible] کو دیکھیے اس غریبی، اس جہالت، اس قدامت پرستی اور تعصب کو دیکھیے جو رفاہ کے ہر کام کو مشکل بنا رہا ہے تو آپ کے دل پر وہ چوٹیں لگیں گی جو مردوں کے دلوں کو اور کہیں نصیب نہیں ہوتی ہیں۔ یہاں راستے کی دشواریوں اور منزل کی دوری کو دیکھیے تو آپ کے ایمان اور آپ کے صبر کی وہ آزمائش ہوگی جو اور کہیں نہیں ہو سکتی، اور کہیں بھی حال کی ناکامیوں سے اس طرح مستقبل کی کامیابیوں کا یقین پیدا نہیں کیا جا سکتا، اور کہیں بھی توفیق دل کو درد آشنا بننے کا ایسا قطعی حکم نہیں دیتی، اور کہیں بھی عشق کی بات اس طرح ویرانے میں نہیں رکھی جاتی۔ آپ شہریت کا حق دل و جان سے ادا کرنا چاہتے ہیں تو دوسروں کے پاس روز روز گر نہ جائیے، رہنما تلاش نہ کیجیے، موتی سیپ کے اندر رہ کر بڑھتا ہے، آب پاتا ہے، موتی بننے کی اور کوئی صورت نہیں ہے۔ تسلی اور تسکین کی باتوں سے فریب نہ کھائیے، اپنا خیر خواہ اسی کو سمجھیے جو آپ کے لیے دعا کرے کہ آپ کے کندھے بوجھ اٹھا اٹھا کر مضبوط ہوں، آپ کے پاؤں میں طاقت تھکنے سے پیدا ہو، آپ کا دل مصیبت کی آنچوں میں سونا بنے۔

میں نے بات شروع کی تھی مسلم یونیورسٹی کے منصب سے، اپنے خیال میں اسی کا ذکر کرتا رہا ہوں، اور میں سمجھوں گا کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا وہ آپ تک پہنچ گیا ہے۔ اگر آپ کے دل میں یہ شوق پیدا ہو جائے کہ دین کی اور دنیا کی، علم کی اور اخلاق کی، سیاست کی اور جمالیات کی حدود کو ملا دیں۔ مسلم یونیورسٹی کے منصب کی اور تفصیل، میری نہیں، آپ کی زندگی ہی بیان کر سکتی ہے، خدا آپ کو ایسی زندگی دے، جس میں دین اور علم، اخلاق، آدمیت اور ہندوستان کی شہریت کی شان نظر آئے۔

[خطبہ جلسہ تقسیم اسناد منعقدہ
۱۳؍ دسمبر ۱۹۵۰ء]

راحت ابرار

مسلم یونیورسٹی کے ترقیاتی کاموں پر ایک نظر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے جناب سید ہاشم علی کے ایک سالہ دور میں یہ ادارہ حسبِ سابق مذہبی اور علاقائی تعصبات سے بالاتر ہو کر ترقی کی راہ پر گامزن ہے طلبا، اساتذہ اور غیر تدریسی عملے کے تعاون سے یونیورسٹی کی تعلیمی اور انتظامی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے ایک لائحہ عمل اور طریقۂ کار بھی مرتب کیا گیا ہے جس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

جناب سید ہاشم علی نے ۸ راپریل ۱۹۸۵ء کو اس ادارے کے وائس چانسلر ہونے کے بعد اس عظیم دانش گاہ کا وقار، نظم و ضبط، پُرامن ماحول اور تعلیمی اصلاحات کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اس سے اس ادارے کی عظمت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

موصوف نے اپنے ایک سالہ دور میں جو سب سے اہم اور عظیم کارنامہ انجام دیا ہے اس میں جواہر لال نہرو میڈیکل کالج میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے داخلوں کے لیے سیٹوں کے اضافہ کا ہے۔ پچھلے برس تک صرف پچاس طلباء کو ہی ایم بی بی ایس کے پہلے سال میں داخلے کی سہولت فراہم تھی مگر اس برس اس کورس کے لیے مزید پچاس سیٹوں کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ جو ہندوستان کے بہت کم میڈیکل کالجوں میں ہے۔

۲ر دسمبر ۱۹۸۵ء کو وائس چانسلر کی دعوت پر اتر پردیش کے وزیرِ اعلیٰ مسٹر ویر بہادر سنگھ علی گڑھ تشریف لائے تو انھوں نے مولانا آزاد لائبریری کی عمارت کی توسیع کے لیے دس لاکھ روپیہ کے عطیہ کا اعلان فرمایا اور چند ہی دنوں میں اس عطیہ کا چیک وائس چانسلر کو بھیج دیا۔ ریاستی حکومت کی طرف سے مسلم یونیورسٹی کے لیے یہ اب تک کی سب سے بڑی امدادی رقم ہے۔ وائس چانسلر نے سٹی ہائی اسکول سے ملحق زمین اسکول کو دیے جانے، یونیورسٹی کے ایگریکلچر کالج کے لیے سرکاری زرعی فارم اور یونیورسٹی کے قرب و جوار میں سرکاری عمارت اور آراضی کو بھی یونیورسٹی کے حوالے کیے جانے کی اپیل کی جس پر وزیرِ اعلیٰ نے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔

علی گڑھ پبلک اسکول، دواخانہ طبیہ کالج، جواہر لال نہرو میڈیکل کالج ہسپتال اور مولانا آزاد لائبریری کی بعض بنیادی ضرورتوں کو پورا کرانے کے لیے عالمی اسلامی بینک سے رابطہ قائم کیا گیا جس کا مرکزی دفتر جدہ میں ہے۔ اس بینک کے بعض ذمہ داران نے ایک وفد کی شکل میں پچھلے برس ۱۶ر اکتوبر کو اس ادارے کا دورہ کیا اور مالی امداد کی فراہمی کے لیے یونیورسٹی انتظامیہ سے گفت و شنید کے بعد بھرپور تعاون کی یقین دہانی فرمائی۔

مسلم یونیورسٹی میں علمی فضا کو برقرار رکھنے کے لیے توسیعی خطبات کا جو سلسلہ ہے، اس کے تحت ہر شعبہ میں نامور دانشوروں اور ماہرینِ تعلیم کو مدعو کیا جا رہا ہے تاکہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا ان دانشوروں کے خیالات اور تجربات سے استفادہ کر سکیں۔ ان توسیعی خطبات میں جن غیر ملکی دانشوروں کو مدعو کیا گیا ہے ان میں آسٹریلیا کے نامور جغرافیہ داں پروفیسر کیری اور سعودی عربیہ، ریاض کے پروفیسر مرتضیٰ صدیقی خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اس ایک سال کے دوران مختلف موضوعات پر کانفرنسوں، سیمیناروں، تجدیدی کورسوں اور مذاکروں میں جن ملکی و غیر ملکی دانشوروں نے حصہ لیا ان میں نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام، عالمی مذہبی فیڈریشن کے صدر مسٹر رو بیرینٹ سوگو مہگا ہی، عرب کے مشہور صحافی عثمان ال فتی، امریکہ کی میسیسپی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر جون اوٹن، تیونس یونیورسٹی کے پروفیسر المنصف بن سالم، پاکستان انجمن عارٹ کمیشن کے چیرمین

جناب حبیب الرحمٰن، پاکستان یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ڈائرکٹر جنرل مسٹر ایم اے رحمٰن، انجمن ترقی اردو، پاکستان کے سابق جنرل سکریٹری مسٹر مشفق خواجہ، راج شاہی یونیورسٹی، بنگلہ دیش کے پروفیسر کلیم سہسرامی، مرکزی وزیر تجارت مسٹر پی شیو شنکر، مرکزی وزیر مملکت مسٹر خورشید عالم خان، عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈی۔ این راؤ، بنارس ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر آر پی رستوگی، دلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر مونس رضا، اتر پردیش اور اڑیسہ کے سابق گورنر جناب اکبر علی خان کے علاوہ عراق اور دولت مشترکہ کی یونیورسٹیوں کے وفود بھی قابل ذکر ہیں۔

سینٹر فار پروموشن آف سائنس کا قیام بھی ایک اہم واقعہ ہے۔ اس سینٹر کا بنیادی مقصد ہندوستانی مسلمانوں پر سائنسی علوم کی تحصیل و تدریس کی اہمیت واضح کرنا اور مسلمانوں کے زیر انتظام تعلیمی اداروں میں اعلیٰ معیار کی سائنسی تعلیم کے نظریہ کو فروغ دینا ہے۔

چھٹے پنج سالہ منصوبے میں اعلیٰ تعلیمی ترقی کے پروگرام کے تحت یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے پروفیسر مادھوری شاہ کی سربراہی میں ملک کی درسگاہوں کے اساتذہ پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی تھی جس نے مسلم یونیورسٹی کا دورہ کرنے کے بعد اس یونیورسٹی سے متعلق بھی اپنے مشاہدات اور سفارشات پیش کی تھیں جن کی بنا پر جناب سید ہاشم علی نے تمام اساتذہ کو یہ ہدایات جاری کیں کہ وہ کم از کم چھ گھنٹے روزانہ اپنے شعبہ میں درس و تدریس و تحقیق کے علاوہ تصنیف و تالیف کے کاموں میں سرگرم رہیں۔ تعلیمی سال میں ۱۸۰ دن کا تدریسی پروگرام بھی شروع کیا گیا ہے۔ وائس چانسلر کی اس ہدایت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو رہا ہے کہ طلبا اور اساتذہ کے درمیان ایک مستحکم رشتہ قائم ہو گیا ہے جو مسلم یونیورسٹی جیسے اقامتی ادارے کے لیے بے حد ضروری ہے۔

جناب سید ہاشم علی نے اپنا عہدہ قبول کرنے کے فوراً بعد تمام ہاسٹلوں کا دورہ کیا اور طلبا سے ان کی اقامت گاہوں میں ملاقات کی۔ اس رابطہ مہم کے دوران طلبا نے بعض دشواریوں سے بھی وائس چانسلر کو روشناس کرایا جن میں سب سے بڑا مسئلہ بجلی کا تھا جس سے یہ طالب علم دوچار تھے۔ وائس چانسلر نے بجلی کی اس پریشانی کو دور کرنے کے لیے صوبائی سرکار کے اعلیٰ حکام سے ملاقات کی اور بجلی کی کٹوتی کو ختم کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے ساتھ ہی ہر کمرے میں بجلی کا پنکھا لگوانے کے لیے سولہ لاکھ روپیہ منظور فرمایا جس کی تعمیل فوری کی گئی۔ اس سے قبل چند ہی ہاسٹلوں میں یونیورسٹی انتظامیہ کی جانب سے پنکھے کی سہولت فراہم کرائی گئی تھی۔

مسلم یونیورسٹی احاطے سے ملحق بازاروں میں کھانا کھانے اور چائے وغیرہ کے جو ہوٹل ہیں وہ اتنے خراب ہیں کہ اس سے طلبا کی صحت پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ یونیورسٹی کینٹین کا انتظام بھی انتہائی ناقص تھا جس کی شکایت اکثر وائس چانسلر سے ہوتی رہتی تھی۔ وائس چانسلر نے طلبا کی اس پریشانی کو دور کرنے کے لیے ایک عالی شان کینٹین کے قیام کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے دس لاکھ روپیہ منظور فرمایا۔ اس کینٹین میں وہ تمام سہولیات فراہم کرائی جائیں گی جو ایک تھری اسٹار ہوٹل میں ہوتی ہیں۔ عبداللہ ہال میں کینٹین کے قیام کے لیے ۳۶ ہزار روپیہ بھی منظور فرمایا

مرکزی صحت عامہ کے منصوبے کی طرح مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ اور غیر تدریسی گرانٹس کمیشن سے رابطہ قائم کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اساتذہ کے پیمنٹ پروموشن اسکیم کی مدت میں اضافہ بھی وائس چانسلر کی کوششوں کا نتیجہ ہے

مسلم یونیورسٹی بنیادی طور پر ایک اقامتی ادارہ ہے اس کے باوجود یہاں کے اساتذہ اور غیر تدریسی عملے کی رہائش کے لیے کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں ہے اور یونیورسٹی کے یہ ملازمین کرایہ کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ ہاشم صاحب کی کوشش ہے کہ یونیورسٹی میں کام کرنے والے ہر شخص کا اپنا ذاتی مکان ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی سے مالی امداد کی فراہمی کی اپیل کی گئی ہے اور یونیورسٹی ملازمین کے رہائشی مسئلہ کو دور کرنے کے لیے "ہڈکو" سے بھی رابطہ قائم کیا گیا جس کے نتیجہ میں پانچ سو مکانات کی تعمیر کی منظوری حاصل ہو چکی ہے۔

غیر تدریسی عملے کو ترقی کے مزید مواقع فراہم کرانے اور انھیں مالی امداد بہم پہنچانے کے لیے کیڈر ریویو سیل کی تشکیل دی گئی جس کی سفارشات کو یو جی سی نے تسلیم کر لیا ہے اور اب ان سفارشات پر عمل درآمد بھی شروع ہو گیا ہے۔

اعلیٰ تعلیم کی برکتیں غریب و نادار طلبا تک پہنچانے کے لیے۔ یہ
ڈیولپمنٹ سوسائٹی اور ایجوکیشنل کانفرنس کو فعال بنانے کی ضرورت
پر بھی زور دیا گیا اور یہ محسوس کیا گیا کہ اب مناسب یہ ہے کہ انسٹیٹیوٹ آف
ڈیولپمنٹ اسٹڈیز کا قیام عمل میں آئے جو بالعموم ہندوستانی قوم اور
بالخصوص مسلم معاشرے کی ترقیاتی ضروریات کی نشان دہی کرے۔ مسلم یونیورسٹی
ڈیولپمنٹ سوسائٹی انسٹیٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ اسٹڈیز کا قیام عمل میں لانے اور
اس ادارے کو سہولیات فراہم کرانے کے لیے جناب سید ہاشم علی نے ایک
اپیل بھی جاری کی اور اپنی جیب خاص سے ایک اسکالرشپ بھی منظور
کیا۔ وائس چانسلر کی اس دردمندانہ اپیل کا نتیجہ یہ نکلا کہ چھ ماہ کی مدت میں
ہی اس سوسائٹی کو ایک لاکھ روپیہ سے زائد کے عطیات وصول ہوئے
جو اپنے آپ میں ایک ریکارڈ ہے۔

جناب سید ہاشم علی نے بعض ایسے فیصلے بھی کیے ہیں جو
تاریخ کا روشن باب بن کر سامنے آئیں گے اور جن کے نتائج دیرپا ہوں گے
انھیں فیصلوں میں ایک اہم فیصلہ اولڈ بوائز حلقہ سے یونیورسٹی کورٹ
کی نمائندگی کے لیے ۲۵ ممبران کے انتخاب کا ہے۔ علی گڑھ کی توانائی کا ایک
سرچشمہ اس وابستگی سے پھوٹتا ہے جو یونیورسٹی کے اولڈ بوائز کو اپنی مادر درسگاہ
سے ہے۔ اس ادارے کے فرزند جو پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں وہ اسے
اپنا سب سے قیمتی سرمایہ تصور کرتے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی ۱۹۸۱ء کے ترمیمی
ایکٹ کی رو سے ان ۲۵ فرزندوں کو یونیورسٹی کورٹ میں نمائندگی کا حق دیا
گیا ہے مگر اولڈ بوائز کے یہ نمائندے زیادہ تر چند شہروں کے ہی ہوا کرتے
تھے، جس کی وجہ سے یونیورسٹی اپنی توسیعات کے باوجود سمٹنے لگی ہے۔
اس رجحان کا رُخ موڑنے کے لیے نئے قوانین یونیورسٹی کورٹ کے زیر غور
ہیں جنھیں ایگزیکیٹو کونسل پہلے ہی اپنی منظوری دے چکی ہے۔

وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی کی اس تجویز کا سب سے
بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ مسلم یونیورسٹی کا رشتہ ایک مرتبہ پھر ساری دنیا سے
قائم ہو جائے گا اور اس ادارے کے فرزند جو پوری دنیا میں پھیلے ہوئے
ہیں جب وہ کورٹ کے رکن منتخب ہوں گے تو اپنے بچوں کو بھی اپنی مادر
درسگاہ میں تعلیم حاصل کرانے کے لیے داخل کریں گے۔ یو. جی. سی
کی کمیٹی نے بھی مسلم یونیورسٹی کے کل ہند کردار کو برقرار رکھنے کی سفارش
کی ہے۔ مسلم یونیورسٹی اپنا ملک گیر کردار اسی صورت میں برقرار رکھ سکتی ہے
جبکہ اتر پردیش اور بہار سے باہر کے طالب علم بھی یہاں آئیں۔ مسلم یونیورسٹی
محض ایک ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک ولولہ انگیز تحریک ہے جو ہندوستانی
مسلمانوں کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اسی لیے آزاد ہندوستان کی قانون
ساز مجلس نے مسلم یونیورسٹی کے ۱۹۸۱ء کے ترمیمی ایکٹ کی رو سے
ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی و ثقافتی ترقی کو فروغ دینے کی ذمہ داری
اس کے شانوں پر رکھی ہے۔

جناب سید ہاشم علی کی اس تجویز سے بلندئ معیار کی شہرت کے
علاوہ، ایک طرف معاشرہ اور دوسری طرف یونیورسٹی کو اچھے طالب علموں کو
دور دراز ریاستوں سے بڑی تعداد میں کھینچنے کے لیے اولڈ بوائز کو یونیورسٹی کورٹ
میں نمائندگی دے کر وظائف اور رعایتوں کا انتظام کرنا پڑے گا۔ اس کے
علاوہ یونیورسٹی کی ملک گیر حیثیت کے استحکام کا اور کوئی بہتر طریقہ نہیں ہو
سکتا۔

مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی اور اقامتی کردار کے ساتھ ہی جمہوری کردار
پر بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ اکیڈمک کونسل، ایگزیکیٹو کونسل اور یونیورسٹی
کورٹ کے نمائندوں کے انتخاب انتہائی پرامن ماحول میں اختتام پذیر
ہوئے۔

اے ایم یو اسٹوڈنٹس یونین کے قیام کا مقصد طلبا کی تحریری
اور تقریری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ہی ادبی، ثقافتی اور
تعلیمی سرگرمیوں کے فروغ کا تھا۔ دھیرے دھیرے یہ یونین اپنے مقصد
سے ہٹتی چلی گئی اور سیاست والوں کا غلبہ ہونے لگا۔ اس پیشہ وارانہ سیاست
کو ختم کرنے کے لیے بھی ایک ضابطہ متعین کیا گیا ہے جس کے مثبت
اور دیرپا نتائج برآمد ہوں گے۔

اس ادارے کی قدیم اور اعلیٰ روایتوں کو پھر بحال کیا جا رہا ہے اور
گذشتہ آٹھ سال بعد سرسید ڈے تقریبات کا اہتمام انتہائی جوش و عقیدت
کے ساتھ کیا گیا جس میں مرکزی وزیر فوا دشمن کے سی پنت نے شرکت فرمائی
اور سولہ ہزار سے زائد افراد کو عشائیہ بھی دیا گیا جو علی گڑھ کی تہذیب، شائستگی
اور مزاج کی شناخت کا آئینہ دار تھا۔ ایک مدت بعد سرسید میموریل لیکچر کا
اہتمام بھی کیا گیا جس میں ہریانہ کے گورنر جناب سید مظفر حسین برنی نے

"اقبال اور قومی یکجہتی" پر اپنا مقالہ پیش کیا۔

مسلم یونیورسٹی ایکٹ کی دفعہ ۵ کی رو سے جس میں ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی کے فروغ کی ذمہ داری کے تحت ملک بھر کے مسلم زیر انتظام تعلیمی اداروں کے مسائل کا ازالہ کرنے اور تعلیمی رہنمائی کا کام انجام دینے کی غرض سے وائس چانسلر نے یونیورسٹی کے اساتذہ پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی ہے تاکہ ان اداروں کی حالت کو بہتر بنایا جا سکے۔ مسلم یونیورسٹی کے ارباب اقتدار یہ محسوس کرتے ہیں کہ جب گذشتہ صدی کے حوصلہ شکن حالات میں سرسید اپنے مشن کو جاری رکھنے میں کامیاب ہو سکتے تھے تو کوئی وجہ نہیں کہ آج ہم ہمت سے کام نہ لیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے پانچ سو سے زائد مسلم زیر انتظام تعلیمی اداروں کے سربراہوں کو خطوط بھی لکھے گئے ہیں تاکہ ایک جامع حکمت عملی تیار کی جا سکے۔

جناب سید ہاشم علی کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ جب وہ اپنے دل کا آپریشن کرانے کے لیے امریکہ تشریف لے گئے تو یہاں کی مسجدوں میں ان کی صحت یابی کے لیے دعائیں کی گئیں اور صحت مند ہو کر واپس آنے پر ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔

جناب سید ہاشم علی ایک ریٹائرڈ آئی۔اے۔ ایس۔افسر ہونے کے علاوہ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد کی وائس چانسلرشپ کا وسیع تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کریر کا آغاز استاد کی حیثیت سے کیا تھا۔ اس لیے وہ طلبا، اساتذہ اور غیر تدریسی عملے کی نفسیات سے واقف ہیں اور یہی ان کی کامیابی کا راز بھی ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے بہی خواہوں کے لیے اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ تقریباً دس برس کے تعطل کے بعد ٢٩ را پریل ١٩٨٦ء سالانہ جلسہ تقسیم اسناد کا اہتمام کیا جا رہا ہے جس میں صدر جمہوریہ ہند جناب گیانی ذیل سنگھ کو مدعو کیا گیا ہے۔

* * *

"مجھ کو افسوس ہوگا اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ یہ کالج ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز ظاہر کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔ خاص سبب جو اس کالج کے قائم کرنے کا ہوا یہ تھا جیسا کہ میں یقین کرتا ہوں آپ بھی واقف ہیں کہ مسلمان روز بروز زیادہ تر ذلیل اور محتاج ہوتے جاتے تھے۔ ان کے مذہبی تعصبات نے ان کو تعلیم سے فائدہ اٹھانے سے باز رکھا تھا جو سرکاری کالجوں اور مدرسوں میں مہیا کی گئی تھی اور اسی وجہ سے یہ امر ضروری خیال کیا گیا کہ ان کے واسطے کوئی خاص انتظام کیا جائے۔ اس کی مثال اس طرح پر دی جا سکتی ہے۔ فرض کرو کہ دو بھائی ایسے ہیں جن میں سے ایک بالکل طاقتور اور تندرست ہے اور دوسرا بیمار ہے اور اس کی تندرستی زوال پر ہے۔ پس اس کے تمام بھائیوں کا یہ فرض ہوگا کہ اس بیمار بھائی کی صحت کی تدبیر کریں اور اس کو مدد دیں۔ یہی خیال تھا جس نے مجھ کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے قائم کرنے پر آمادہ کیا۔ مگر میں اس بات کے بیان کرنے سے خوش ہوں کہ اس کالج میں دونوں بھائی ایک ہی تعلیم پاتے ہیں۔ کالج کے تمام حقوق جو اس شخص سے متعلق ہیں جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے بلا کسی قید کے اس شخص سے بھی متعلق ہیں جو اپنے تئیں ہندو بیان کرتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ذرا بھی امتیاز نہیں ہے۔ صرف وہی شخص انعام کا دعویٰ کر سکتا ہے جو اپنی سعی و کوشش سے اس کو حاصل کرے۔ اس کالج میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر وظیفوں کے مستحق ہیں اور دونوں کی نسبت بطور برادر کے یکساں طور پر سلوک کیا جاتا ہے۔ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں۔" (تقریر بمقام لاہور، ۳ فروری ۱۸۸۴ء)

سید محمد احمد
پبلک ریلیشن آفس
مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

یونیورسٹی کانووکیشن

تاریخ وار گوشوا

تاریخ	سالانہ رپورٹ پیش کردہ	شیخ الجامعہ	صدارت	اعزازی سند یافتگان	خطبہ جلسہ تقسیم ا
۲۸ر دسمبر ۱۹۲۲ء	ڈاکٹر ضیاء الدین احمد (پرو وائس چانسلر)	محمد علی محمد خاں راجہ محمود آباد	ہر ہائنس سلطان جہاں بیگم بھوپال چانسلر	سر محمد شفیع۔ ڈی لٹ (ایجوکیشن ممبر حکومت ہند)	ہر ہائنس سلطان جہاں
۱۴ر فروری ۱۹۲۳ء	ڈاکٹر ضیاء الدین احمد	صاحبزادہ آفتاب احمد خاں	صاحبزادہ آفتاب احمد خان	. . . .	صاحبزادہ آفتاب احمد خا
۲۶ر جنوری ۱۹۲۵ء	" "	" " "	ہر ہائنس سلطان جہاں بیگم	سید امیر علی ڈی لٹ، سر ہارکورٹ بٹلر ڈی لٹ گورنر آف برما	ہر ہائنس سلطان جہاں
۱۹ر دسمبر ۱۹۲۵ء	ڈاکٹر ضیاء الدین احمد	نواب محمد مزمل اللہ خاں شیروانی (قائم مقام)	نواب محمد مزمل اللہ خاں شیروانی	عماد الملک سید حسین بلگرامی ڈی لٹ	شیخ عبد القادر
۱۵ر نومبر ۱۹۲۶ء	ڈاکٹر ضیاء الدین احمد	صاحبزادہ آفتاب احمد خاں	ہر ہائنس سلطان جہاں بیگم	. . . .	ہر ہائنس سلطان جہاں
۱۸ر فروری ۱۹۲۸ء	ڈاکٹر ضیاء الدین احمد	نواب محمد مزمل اللہ خاں شروانی	نواب محمد مزمل اللہ خاں شروانی	. . . .	سر الف آکڈ ف
۳ر جنوری ۱۹۲۹ء	میاں محمد شریف (قائم مقام)	نواب محمد مزمل اللہ خاں شروانی	نواب محمد مزمل اللہ خاں شروانی	. . . .	مسٹر آر۔ لیٹل ہیل ایجوکیشنل کمشنر۔ گورنمنٹ آ
۲۵ر جنوری ۱۹۳۰ء	ای۔ اے ہارن پرو وائس چانسلر	سید راس مسعود	سید راس مسعود	. . . .	سر میلکم ہیلی گورنر
۳۰ر دسمبر ۱۹۳۰ء	ہنری مارٹن۔ پرو وائس چانسلر قائم مقام	سید راس مسعود	سید راس مسعود	. . . .	نواب سر صادق محمد خاں نواب آف بہاولپور
۲۱ر دسمبر ۱۹۳۱ء	آر۔ بی رمیس باتھم	" " "	" " "	. . . .	خواجہ ناظم الدین منسٹر تعلیم
۲۲ر دسمبر ۱۹۳۲ء	آر۔ بی رمیس باتھم	سید راس مسعود	" " "	سر فرینک نوائس ایل ایل ڈی	سر فرینک نوائس وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل
۱۴ر نومبر ۱۹۳۳ء	" " "	" " "	" " "	۱۔ نواب احمد سعید خاں صاحب ایل ایل ڈی گورنر یوپی ۲۔ نواب محمد مزمل اللہ خاں شروانی ایل۔ ایل ڈی	سر جارج اینڈرسن کمشنر تعلیمات۔ گورنمنٹ آ
۲۲ر دسمبر ۱۹۳۴ء	سر بی آر رمیس باتھم	نواب محمد اسماعیل خاں	نواب محمد اسماعیل خاں	۱۔ سید راس مسعود ڈی لٹ ۲۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال ڈی لٹ ۳۔ سر شاہ محمد سلیمان ڈی لٹ	شاہ محمد سلیمان چیف جسٹس۔ الہ آباد۔ ہا
۱۶ر نومبر ۱۹۳۵ء	ابوبکر محمد حلیم	ڈاکٹر ضیاء الدین احمد	ڈاکٹر ضیاء الدین احمد	. . . .	سر گرجا شنکر باجپائی ممبر تعلیمات۔ وائسرائے کی ا

تاریخ	سالانہ رپورٹ پیش کردہ	شیخ الجامعہ	صدارت	اعزازی سندیافتگان	خطبہ جلسہ تقسیم اسناد
مارچ ۱۹۳۱ء		ڈاکٹر ضیاء الدین احمد	ہز ایکزالٹڈ ہائنس میر عثمان علی خاں نظام حیدرآباد۔ چانسلر	لارڈ ولنگڈن ایل ایل ڈی وائسرائے آف انڈیا مسلم یونیورسٹی کے وزیٹر	اسپیشل کانووکیشن
مارچ ۱۹۳۲ء	ابوبکر احمد حلیم	ڈاکٹر ضیاء الدین احمد	ڈاکٹر ضیاء الدین احمد		سر فرینک نوائس ممبر انچارج ڈیپارٹمنٹ آف انڈسٹریز اینڈ لیبر گورنمنٹ
جنوری ۱۹۳۶ء	ابوبکر احمد حلیم	سر شاہ محمد سلیمان	ہز ہائنس سلطان محمد شاہ آغا خاں پرو چانسلر	ہز ہائنس رضا علی خاں ایل ایل ڈی نواب آف رامپور	مارکوئس آف لوتھین
دسمبر ۱۹۳۷ء	ابوبکر احمد حلیم	شاہ محمد سلیمان	نواب رضا علی خاں آف رامپور پرو چانسلر		نواب مرزا یار جنگ وزیر قانون و عدل مملکت آصفیہ
نومبر ۱۹۳۹ء	اسپیشل کانووکیشن	شاہ محمد سلیمان	شاہ محمد سلیمان ،،	۱۔ ہز ہائنس محمد حمید اللہ خاں ایل ایل ڈی نواب آف بھوپال ۲۔ ہز ہائنس نواب سر صادق محمد خاں ایل ایل ڈی نواب آف بہاولپور	
۱۱ دسمبر ۱۹۳۹ء	ابوبکر احمد حلیم	سر شاہ محمد سلیمان	سر شاہ محمد سلیمان	- - - - - -	ہز ہائنس محمد حمید اللہ خاں نواب آف بھوپال
۳ نومبر ۱۹۴۰ء	اسپیشل کانووکیشن	سر شاہ محمد سلیمان	،، ،، ،،	پرنس اعظم جاہ ایل ایل ڈی پرنس آف برار	
۱۲ دسمبر ۱۹۴۰ء	ابوبکر احمد حلیم	شاہ محمد سلیمان	شاہ محمد سلیمان	— — — — —	سر سلطان احمد، بیرسٹر ایٹ لا (پٹنہ)
۱۰ فروری ۱۹۴۲ء	،، ،، ،،	ڈاکٹر ضیاء الدین احمد	ہز ہائنس رضا علی خاں، نواب آف رامپور، پرو چانسلر		
۱۳ فروری ۱۹۴۳ء	ڈاکٹر ضیاء الدین احمد (وائس چانسلر)	— — — —	ہز ہائنس رضا علی خاں، نواب آف رامپور	۱۔ صدر الصدور نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی ڈاکٹر آف تھیالوجی۔ ۲۔ مولوی عبدالحق ڈی لٹ ۳۔ سید سلیمان ندوی ڈاکٹر آف تھیالوجی	سید عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لا (پٹنہ)
۱۳ نومبر ۱۹۴۳ء	اسپیشل کانووکیشن	ہز ہائنس رضا علی خاں پرو چانسلر	،	ہز ایکسلنسی ایم پی ہیلٹ گورنر یوپی	
۲۲ دسمبر ۱۹۴۳ء	ڈاکٹر ضیاء الدین احمد	ہز ہائنس رضا علی خاں، نواب آف رامپور			سر عزیز الحق، کامرس ممبر حکومت ہند
۱۸ نومبر ۱۹۴۴ء	،، ،، ،،	ڈاکٹر ضیاء الدین احمد			نواب مہدی یار جنگ، وزیر تعلیمات مملکت آصفیہ۔ حیدرآباد۔ پرو چانسلر جامعہ عثمانیہ
دسمبر ۱۹۴۵ء	،، ،، ،،	ہز ہائنس رضا علی خاں نواب آف رامپور			نواب زین یار جنگ منسٹر پبلک ورکس، مملکت آصفیہ۔ حیدرآباد
اپریل ۱۹۴۶ء	اسپیشل کانووکیشن	ڈاکٹر ضیاء الدین احمد وائس چانسلر	ہز ہائنس نواب رضا علی خاں آف رامپور پرو چانسلر	ہز ہولینس سیدنا طاہر سیف الدین ڈاکٹر آف تھیالوجی داعی مطلق	

تاریخ	سالانہ رپورٹ پیش کردہ	شیخ الجامعہ	صدارت	اعزازی سند یافتگان	خطبہ جلسہ تقسیم اسناد
۲۳ فروری ۱۹۴۶ء	الحاج حبیب الرحمن خاں شیروانی قائم مقام وائس چانسلر	الحاج حبیب الرحمن خاں شیروانی			نواب لیاقت علی خاں فائنس ممبر حکومت ہند
۱۳ نومبر ۱۹۴۸ء	اسپیشل کانوکیشن	نواب محمد اسماعیل خاں وائس چانسلر	نواب اسماعیل خاں	ہز ایکسیلنسی سروجنی نائیڈو، ڈی لٹ گورنر اتر پردیش	
۲۴ جنوری ۱۹۴۹ء	نواب محمد اسماعیل خاں	،، ،،			پنڈت جواہر لال نہرو (وزیر اعظم)
۱۷ نومبر ۱۹۴۹ء	اسپیشل کانوکیشن	نواب محمد اسماعیل خاں وائس چانسلر	نواب محمد اسماعیل خاں	شری راجگوپال آچاریہ ایل ایل ڈی گورنر جنرل آف انڈیا	
۲۰ جنوری ۱۹۵۰ء	ڈاکٹر ذاکر حسین وائس چانسلر		ہز ہائنس رضا علی خاں نواب آف رامپور	مولانا ابوالکلام آزاد ڈاکٹر آف تھیالوجی	مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیمات، حکومت ہند
۲۷ فروری ۱۹۵۰ء	کرنل محمد حیدر خاں قائم مقام وائس چانسلر		ہز ہائنس رضا علی خاں نواب آف رامپور	۱۔ پنڈت گووند بلبھ پنتھ ایل ایل ڈی وزیر اعلیٰ اتر پردیش ۲۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل ایل ایل ڈی۔ (وزیر داخلہ، حکومت ہند) ۳۔ خان بہادر محمد شریف الدین صاحب ایل ایل [illegible] ۴۔ محمد حبیب الشفاں۔ ایل ایل ڈی ۵۔ شیخ محمد عبداللہ (پاپا میاں) ایل ایل ڈی ۶۔ ڈاکٹر آرتھر ایچ کومپٹن ڈی ایس سی چانسلر واشنگٹن یونیورسٹی	پنڈت گووند بلبھ پنتھ وزیر اعلیٰ اتر پردیش۔
۲۲ نومبر ۱۹۵۰ء	اسپیشل کانوکیشن	ڈاکٹر ذاکر حسین وائس چانسلر	ہز ہائنس رضا علی خاں نواب آف رامپور	ہز ایکسیلنسی ایچ پی مودی۔ ایل ایل ڈی گورنر اتر پردیش	
۴ فروری ۱۹۵۱ء	ڈاکٹر ذاکر حسین وائس چانسلر	ہز ہائنس رضا علی خاں نواب آف رامپور	مرزا محمد اسمٰعیل ایل ایل ڈی		مرزا محمد اسمٰعیل، و سابق دیوان میسور، جے پور و صدر اعظم حیدرآباد
۳ نومبر ۱۹۵۱ء	ڈاکٹر ذاکر حسین		ہز ہائنس رضا علی خاں	ڈاکٹر راجندر پرشاد ایل ایل ڈی	ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ صدر جمہوریہ ہند
۱۳ مارچ ۱۹۵۲ء	اسپیشل کانوکیشن	ڈاکٹر ذاکر حسین	نواب احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری، پرو چانسلر	مسز ایلینور روزویلٹ، ایل ایل ڈی	
۲۳ جنوری ۱۹۵۳ء	ڈاکٹر ذاکر حسین		،، ،، ،،		ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن نائب صدر جمہوریہ ہند
۲۳ فروری ۱۹۵۴ء	ڈاکٹر ذاکر حسین		،، ،، ،،		ڈاکٹر اے ایل مدالیار وائس چانسلر مدراس یونیورسٹی
۲۶ فروری ۱۹۵۵ء	،،		،، ،، ،،	ہز [illegible] حسن تقی زادہ، ڈی لٹ [illegible]	ڈاکٹر کے ایس کرشنن ڈائریکٹر نیشنل فزیکل لیبارٹری ہند

۳؍دسمبر ۱۹۵۵ء	سالانہ رپورٹ پیش کردہ	شیخ الجامعہ	صدارت	اعزازی سند یافتگان	خطبہ جلسہ تقسیم اسناد
۱۳؍دسمبر ۱۹۵۵ء	اسپیشل کانووکیشن	ڈاکٹر ذاکر حسین	سیدنا طاہر سیف الدین چانسلر	ہز مجسٹی شاہ سعود بن عبدالعزیز ایل۔ ایل ڈی فرماں روائے مملکت سعودی عرب	
۱۴؍دسمبر ۱۹۵۵ء	ڈاکٹر ذاکر حسین		نواب احمد سعید خاں صاحب چھتاری	۱۔ ڈاکٹر علی اصغر حکمت۔۔ ڈی لٹ سفیر کبیر ایران متعینہ ہند ۲۔ سری سمپورنانند۔۔ ایل۔ ایل ڈی ۳۔ سر فضل علی ۔۔۔ ایل ایل ڈی ۴۔ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو۔ 〃 〃 ۵۔ سردار کے ایم پانیکر۔ 〃 〃 ۶۔ ڈاکٹر غلام یزدانی ڈی لٹ	شری سمپورنانند وزیر اعلیٰ۔ اتر پردیش
۲۳؍فروری ۱۹۵۶ء	اسپیشل کانووکیشن	ڈاکٹر ذاکر حسین وائس چانسلر	سیدنا طاہر سیف الدین چانسلر	رضا شاہ پہلوی آریہ مہر شہنشاہ ایران	
۱۷؍جنوری ۱۹۵۷ء	کرنل بشیر حسین زیدی (وائس چانسلر)		نواب احمد سعید خاں صاحب	ڈاکٹر ذاکر حسین۔ ڈی لٹ	ڈاکٹر ذاکر حسین سابق شیخ الجامعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۱۳؍دسمبر ۱۹۵۸ء	〃 〃	〃 〃	〃 〃		پروفیسر محمد مجیب شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی
۱۷؍فروری ۱۹۵۸ء	اسپیشل کانووکیشن	کرنل بشیر حسین زیدی (وائس چانسلر)	سیدنا طاہر سیف الدین (چانسلر)	ہز مجسٹی شاہ ظاہر شاہ فرماں روائے افغانستان	
۳؍اکتوبر ۱۹۵۸ء	اسپیشل کانووکیشن	〃 〃	نواب احمد سعید خاں صاحب چھتاری پرو چانسلر	پروفیسر لڈونگ ایئرہارڈ ڈپٹی چانسلر۔ مغربی جرمنی	
۳۰؍دسمبر ۱۹۵۸ء	کرنل بشیر حسین زیدی	〃 〃	〃 〃	پروفیسر ہمایوں کبیر ڈی لٹ سالم علی۔ ڈی ایس سی	پروفیسر ہمایوں کبیر منسٹر آف کلچر اینڈ سائنٹفک ریسرچ حکومت ہند
۲۳؍دسمبر ۱۹۵۹ء	〃 〃	〃 〃	〃 〃	۱۔ یشونت راؤ بلونت راؤ چوہان ایل ایل ڈی ۲۔ پروفیسر محمد حبیب۔ ڈی لٹ ۳۔ علی سکندر جنگ مراد آبادی ڈی لٹ	وائی بی چوہان وزیر اعلیٰ بمبئی اسٹیٹ
یکم اپریل ۱۹۶۰ء	اسپیشل کانووکیشن	〃 〃	〃 〃	ہز ایکسیلینسی جمال عبدالناصر صدر مملکت متحدہ عرب جمہوریہ	
۱۴؍نومبر ۱۹۶۱ء	کرنل بشیر حسین زیدی		نواب احمد سعید خاں صاحب چھتاری	خواجہ غلام السیدین ڈی لٹ سر الیگزنڈر ٹاڈ۔ ڈی ایس سی	سر الیگزنڈر ٹاڈ چیف سائنٹفک ایڈوائزر۔ گورنمنٹ آف برٹش
۲۸؍جنوری ۱۹۶۲ء	کرنل بشیر حسین زیدی	〃 〃	〃 〃	خواجہ غلام السیدین ڈی لٹ مسٹر اے۔ ایم خواجہ ڈی لٹ مسٹر بی این سپرو ایل۔ ایل ڈی پرنس محمد یوسف نجم الدین ڈی لٹ	خواجہ غلام السیدین

تاریخ	سالانہ رپورٹ پیش کردہ	شیخ الجامعہ	صدارت	اعزازی سند یافتگان	خطبہ جلسہ تقسیم اسناد
۲۹ اکتوبر ۱۹۶۲ء	اسپیشل کانوکیشن	بدرالدین فیض الحسن بدرالدین طیب جی (وائس چانسلر)	نواب احمد سعید خاں صاحب چھتاری	تنکو عبدالرحمٰن ایل ایل ڈی وزیر اعظم ملیشیا	
۱۳ جنوری ۱۹۶۳ء	بی ایف ایچ طیب جی	نواب احمد سعید خاں صاحب چھتاری (چانسلر)		ڈاکٹر کرن سنگھ ڈی لٹ بخشی غلام محمد ایل ایل ڈی	ڈاکٹر ڈی ایس کوٹھاری چیرمین یونیورسٹی گرانٹس کمیشن
۱۹ دسمبر ۱۹۶۳ء	بی ایف ایچ طیب جی	〃 〃 〃		ہز ایکسیلینسی سردونا آف سکوتا الحاجی احمدو بیلو ایل ایل ڈی	اسپیشل کانوکیشن
۱۲ جنوری ۱۹۶۵ء	بی ایف ایچ طیب جی	〃 〃 〃		مسٹر بھرت رام ایل ایل ڈی شری اشوک مہتا ایل ایل ڈی کرنل بشیر حسین زیدی ڈی لٹ	مسٹر بھرت رام پریسیڈنٹ انڈین چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری
۱۹ دسمبر ۱۹۶۴ء	بی ایف ایچ طیب جی	〃 〃 〃		شری لال بہادر شاستری ایل ایل ڈی ڈاکٹر ابرٹ بیلارو ایل ایل ڈی پریسیڈنٹ سپریم ... کمیشن ڈاکٹر ہومی جہانگیر بھابھا ڈی ایس سی ڈاکٹر گیندا سنگھ ڈی لٹ	لال بہادر شاستری وزیر اعظم ہند
۲۴ فروری ۱۹۶۶ء	نواب علی یاور جنگ (وائس چانسلر)	〃 〃 〃		ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن ڈی لٹ	ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن صدر جمہوریہ ہند
۱۰ اکتوبر ۱۹۶۶ء	نواب علی یاور جنگ (وائس چانسلر)	〃 〃 〃		ہز ہائی نس سیدنا برہان الدین، ڈاکٹر آف تھیالوجی	اسپیشل کانوکیشن
۹ مارچ ۱۹۶۷ء	نواب علی یاور جنگ	〃 〃 〃		ڈاکٹر ڈی این واڈیا ڈی ایس سی ڈاکٹر تارا چند ڈی لٹ ڈاکٹر آر پی تریپاٹھی ڈی لٹ	ڈاکٹر ترگنا سین وزیر تعلیمات حکومت ہند
۳۰ اپریل ۱۹۶۸ء	نواب علی یاور جنگ	نواب احمد سعید خاں صاحب چھتاری (چانسلر)		ہز ایکسیلینسی سید اسماعیل الازہری ایل ایل ڈی، صدر جمہوریہ سوڈان	اسپیشل کانوکیشن
۱۸ فروری ۱۹۶۹ء	پروفیسر عبدالعلیم (وائس چانسلر)	〃 〃 〃 〃			شری جے پرکاش نرائن
۲۷ جنوری ۱۹۷۰ء	پروفیسر عبدالعلیم (وائس چانسلر)	〃 〃 〃 〃			پی بی گجیندر گڈکر، وائس چانسلر بمبئی یونیورسٹی، سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ
۱۴ فروری [illegible]	〃 〃 〃	〃 〃 〃 〃			ڈاکٹر تارا چند
[illegible]	〃 〃 〃	〃 〃 〃 〃		بابا جان غفوروف ڈی لٹ	اسپیشل کانوکیشن
۲ فروری [illegible]	〃 〃 〃	〃 〃 〃			ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی گورنر اتر پردیش
[illegible]	〃 〃 〃	〃 〃 〃 〃			جسٹس محمد ہدایت اللہ سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ
[illegible]	پروفیسر علی محمد خسرو (وائس چانسلر)	〃 〃 〃 〃		ڈاکٹر ہومی نوشیروانجی سیٹھنا ڈی ایس سی ڈاکٹر دولت سنگھ کوٹھاری ڈی ایس سی پروفیسر محمد بابر مرزا ڈی ایس سی پروفیسر رشید احمد صدیقی ڈی لٹ مولانا عبدالماجد دریابادی ڈی لٹ پروفیسر ہارون خان شروانی ڈی لٹ	شری فخرالدین علی احمد صدر جمہوریہ ہند
[illegible] ۱۹۸۱ء	جناب سید حامد (وائس چانسلر)	سید حامد		پروفیسر عبدالسلام ڈی ایس سی ایف آر ایس نوبل انعام یافتہ	اسپیشل کانوکیشن
[illegible] ۱۹۸۰ء	جناب سید حامد 〃 〃	〃 〃		ہز ایکسیلینسی مامون عبدالقیوم ڈی لٹ صدر جمہوریہ مالدیپ	اسپیشل کانوکیشن
[illegible] ۱۹۸۰ء	〃 〃 〃	〃 〃		پروفیسر ... صدیقی ڈی ایس سی ایف آر ایس	اسپیشل کانوکیشن
۲۰ اپریل ۱۹۸۶ء	جناب سید ہاشم علی	سید ہاشم علی	پروفیسر اخلاق الرحمٰن قدوائی	گیانی زیل سنگھ ایل ایل ڈی	گیانی ذیل سنگھ، صدر جمہوریہ ہند

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

پرسینٹیج کی بنیاد پر سربمہر ٹینڈر مطلوب ہیں جو کہ ۳۰/ اپریل ۱۹۸۶ء دوپہر ایک بجے تک موصول ہو جانے چاہییں۔ ٹینڈرز اسی روز شام چار بجے کھول دیے جائیں گے۔ ٹینڈر فارم اور دیگر ہدایات یونیورسٹی انجینیر کے دفتر سے چھٹی کے علاوہ کسی دن بھی آفس ٹایم میں حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ٹینڈر فارموں کی فروخت ٹینڈر جمع کیے جانے کی مقررہ تاریخ سے ۲۴ گھنٹے قبل بند کر دی جائے گی۔

نمبر شمار	کام کا نام	کام کے لیے مختص رقم	زر ضمانت	ٹینڈر فارم کی قیمت	تکمیل کی مدت
	نمبر ۲۔شبلی روڈ پورشن۔ ۸/۹ پبلک اسکول نمبر ۴، جو کہ آرکیالوجی ڈپارٹمنٹ کو الاٹ کیا گیا ہے، کی مرمت۔اور دیگر	28,370/-	710/-	5/-	تین ماہ
	ڈی۔ایس۔آر ۱۹۸۱ء کی بنیاد پر				

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

یونیورسٹی انجنیر

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

سر بمہر ٹینڈر ایٹم ریٹ کی بنیاد پر مطلوب ہیں جو کہ ٣٠ اپریل ٨٦ء ایک بجے دوپہر تک موصول ہو جانے چاہئیں۔ ٹینڈر اسی روز شام چار بجے کھول دیے جائیں گے۔ ٹینڈر فارم اور ہدایات یونیورسٹی انجینیر کے دفتر سے آفس ٹائم میں چھٹی کے علاوہ کسی دن بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

ٹینڈر فارم کی فروخت ٹینڈر وصول کیے جانے کی مقررہ تاریخ سے ٢٤ گھنٹہ قبل روک دی جائے گی۔

نمبر شمار	کام کا نام	کام کے لیے مختص رقم	زرضمانت	فارم کی قیمت	تکمیل کی مدت
١	چھتاری ٹینس پویلین سے یونیورسٹی جیمنیزیم تک پکا روڈ ببٹومینس سرفیس کی تعمیر۔ ڈی۔ ایس۔ آر ١٩٨١ء کی بنیاد پر۔	٦٢،٤٥٠/-	١،٥٦٥/-	٥/-	تین ماہ

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

یونیورسٹی انجینیر۔

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

سربمہر ٹینڈر ایٹم ریٹ کی بنیاد پر مطلوب ہیں ۔ جو کہ ۳ مئی ۱۹۸۶ء ایک بجے دوپہر تک موصول ہو جانے چاہییں۔ ٹینڈر اسی روز شام چار بجے کھول دیے جائیں گے۔ ٹینڈر فارم اور ہدایات یونیورسٹی انجینئر کے دفتر سے دفتر کے اوقات میں چھٹی کے دن کے علاوہ کسی روز بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں ۔

ٹینڈر فارم کی فروخت ٹینڈر وصول ہونے کی آخری تاریخ سے ۲۴ گھنٹہ قبل روک دی جائے گی۔

نمبر شمار	کام کا نام	تخمینی رقم	زر ضمانت	ٹینڈر کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱	گروپ II ۔ A کی چھتوں کی ری ٹریسنگ	۶۹,۸۶۰/-	۱۷۵۰/-	۵/-	۳½ ماہ
۲	گروپ II B کی چھتوں کی ری ٹریسنگ	۱,۲۵۶۱۰/-	۳۱۴۰/-	۱۰/-	۵ ماہ
۳۔	گروپ III ۔ A کی چھتوں کی ری ٹریسنگ	۵۰۲۸۰/-	۱۲۶۰/-	۵/	۳ ماہ
۴۔	گروپ III B کی چھتوں کی ری ٹریسنگ	۷۷۶۸۰/-	۱۹۴۵/-	۵/	۵ ماہ
۵	گروپ III C کی چھتوں کی ری ٹریسنگ	۴۰۳۷۰/-	۱۰۱۰/-	۵/-	۳ ماہ

سی ۔ پی ۔ ڈبلیو ۔ ڈی شیڈول ۱۹۸۱ء کی بنیاد پر

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

یونیورسٹی انجینیر

[50/111]

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

سربمہر ٹینڈرز آئیٹم ریٹس کی بنیاد پر طلب کیے جاتے ہیں جو کہ ۲۴ اپریل ۷۶ء ایک بجے دوپہر تک وصول ہو جانے چاہئیں۔ ٹینڈرز اُسی تاریخ کو شام چار بجے کھول دیے جائیں گے۔ ٹینڈرز فارم اور دیگر معلومات یونیورسٹی انجینیر کے دفتر سے چھٹی کے دن کے علاوہ آفس ٹائم میں کسی بھی وقت حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ٹینڈرز فارم کی فروخت وصولیابی کی آخری تاریخ سے ۲۴ گھنٹے قبل بند کردی جائے گی۔

نمبر شمار	کام کی نوعیت	مختص رقم	زرِ ضمانت	ٹینڈر کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱	ایڈیشن اور آلٹریشن، اندرونی سجاوٹ اور فرنیشنگ ورکس	۲،۶۵۳۶۰/-	۶۹۲۰/-	۱۵/-	تین ماہ
۲	سینٹری اور واٹر سپلائی وی سی اور پی۔ وی سی بلاک، اے ایم۔ یو علی گڑھ ایڈمنسٹریٹو بلاک میں	۱۱،۳۴۰/-			
		۲۷۶،۷۰۰/-			

نوٹ:۔ ٹینڈر دینے والے حضرات کو اس قسم کے کام کا تجربہ ہونا چاہیے اور وہ اس قسم کا ڈیڑھ لاکھ روپے کا کام کر چکے ہوں۔

لفٹیننٹ کرنل حسن مظفر

[یونیورسٹی انجینیر]

20/75

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

سالانہ جلسہ تقسیم اسناد ۱۹۸۵ء

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا "جلسۂ تقسیم اسناد" برائے ۱۹۸۵ء، ۲۹ راپریل ۱۹۸۶ء بوقت نو بجے صبح یونیورسٹی اسٹیڈیم نزد انجینئرنگ کالج میں منعقد ہوگا۔

ہز ایکسیلنسی صدر جمہوریہ ہند جناب گیانی ذیل سنگھ نے کانووکیشن ایڈریس دینا منظور فرمالیا ہے۔

وہ طلبا جو اس یونیورسٹی سے ۱۹۸۵ء میں فیکلٹی آف تھیالوجی، آرٹس، کامرس، سوشل سائنسز، سائنس، انجینئرنگ، میڈیسن اور لا، سے بیچلرز ڈگری، ماسٹرس ڈگری یا ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے اہل ہوں اور وہ کانووکیشن میں شرکت کرنے اور بذات خود ڈگری اور میڈلس وصول کرنے کے خواہش مند ہوں، اُن سے درخواست ہے کہ وہ ۲۵ راپریل ۱۹۸۶ء سے پیشتر اپنی ڈگری کی تفصیلات اور جس ہال میں وہ رہائش پذیر ہوں یا رہے ہوں اُس کی مکمل تفصیلات سے دستخط کنندہ کو مطلع کریں۔

ایسے تمام طلباء کو چاہیے کہ وہ اپنے متعلقہ پرووسٹ کو رپورٹ دیں۔ اور وہاں سے ۲۸ راپریل ۱۹۸۶ء تک یا اس سے پہلے اپنے ڈگری کارڈز حاصل کرلیں۔

طلباء کو اُن کی متعلقہ فیکلٹی کے ڈین آفس سے ڈگری کارڈز دکھائے جانے پر گاؤن مہیا کیے جائیں گے اور اُن سے ان کا کرایہ چارج کیا جائے گا۔

این۔ مؤیدین

کنٹرولر امتحانات اور داخلہ

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

پر سینٹیج کی بنیاد پر سربہر ٹینڈر مطلوب ہیں۔ جو کہ ۲ر مئی ۱۹۸۶ء دوپہر ایک بجے تک موصول ہو جانے چاہییں۔

ٹینڈر اسی تاریخ کو شام چار بجے کھول دیے جائیں گے

ٹینڈر فارم اور دیگر ہدایات یونیورسٹی انجینیر کے دفتر سے چھٹی کے دن کے علاوہ کسی بھی دن دفتر کے اوقات میں حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ٹینڈر فارم کی فروخت فارم وصول کیے جانے کی مقررہ تاریخ سے ۲۴ گھنٹہ قبل بند کر دی جائے گی۔

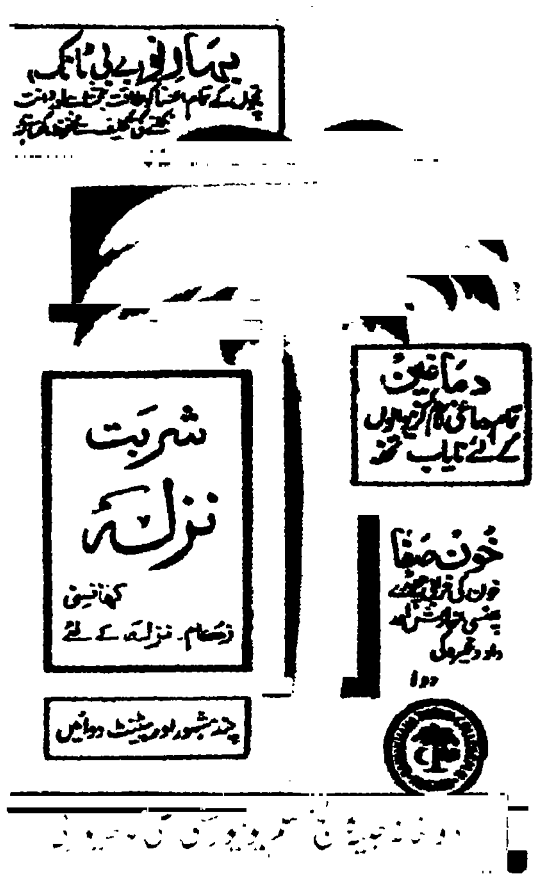
نمبر شمار	کام کی نوعیت	مختص رقم	زرِ ضمانت	فارم کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱۔	ری۔ ٹریننگ نشین بلڈنگ میں	۲۲,۰۰۰/-	۵۰۰/-	۵/-	تین ماہ

سی۔ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی شیڈول ۸۱ء کی بنیاد پر

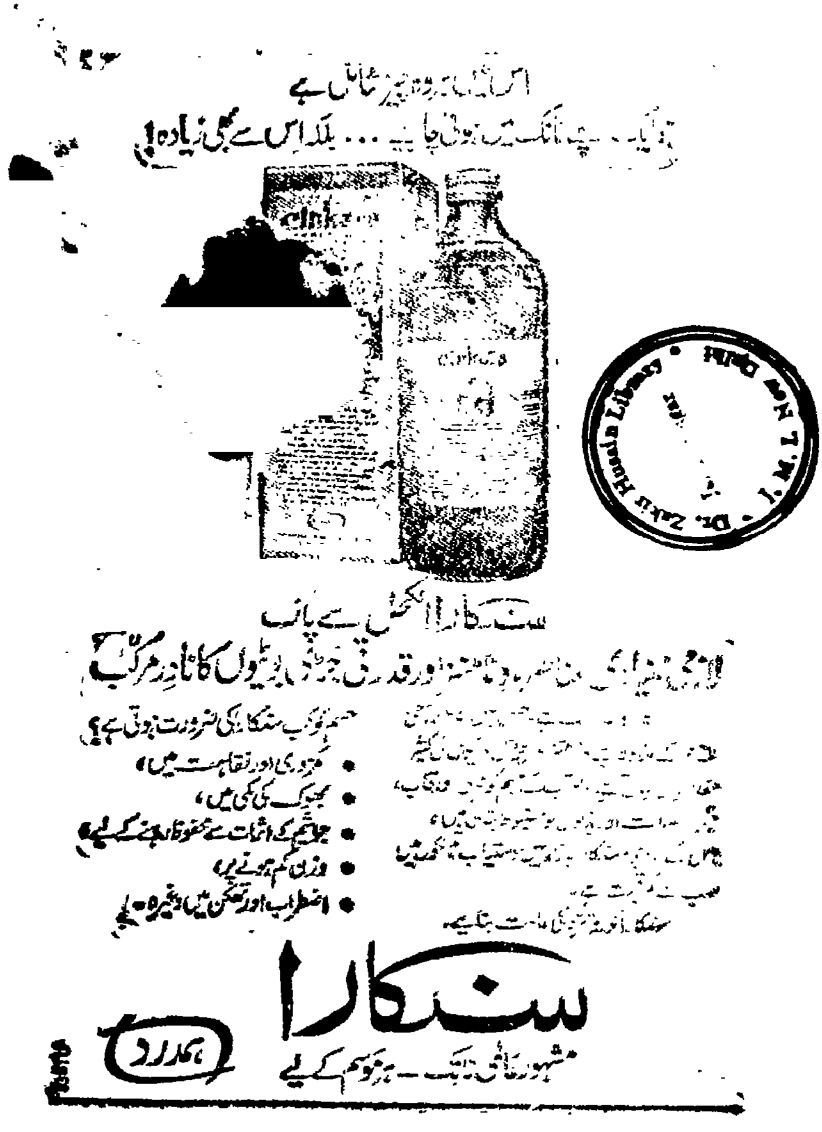
لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

یونیورسٹی انجینیر

[70/133]


شربت
نزلہ
کھانسی
زکام۔ نزلہ کے لئے
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں کے لئے نایاب تحفہ
خون صفا
دوا

Tahzibul Akhlaq Fortnightly Regd. No. L/ALG 247



Litho Colour Printers, Achal Tal, G. T. Road, Aligarh Phone : 4185

خصوصی شمارہ



اس تجویز کا خیر مقدم کیا اور ۹ مئی ۱۹۸۶ء کو یہ کارروائی مکمل ہو گئی۔ تہذیب الاخلاق اور فکر و نظر اب تک اس بے سر و سامانی کے عالم میں نکلتے رہے ہیں کہ انہیں کوئی کلرک اور چپراسی تک میسر نہیں۔ ایک نہیں دو پندرہ روزہ رسالوں کا اس حالت میں نکالنا کتنا دشوار ہے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ الحمد للہ کہ اب تک یہ رسالے نہایت پابندی کے ساتھ نکلتے رہے۔ اب یونیورسٹی نے ایک کلرک اور ایک چپراسی کی جگہ منظور کر دی ہے جس کے لیے ہم شکر گزار ہیں۔

شروع ہی میں اعلان کر دیا گیا تھا کہ ادارت وقتاً فوقتاً مختلف ہاتھوں میں جاتی رہے گی۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ تازہ دم لوگ داخل ہو کر رسالوں میں نئی روح پھونکتے رہیں اور یہ خوب سے خوب تر ہوتے جائیں۔ پروگرام یہ تھا کہ ہر سال نہیں تو دو سال بعد ادارت ضرور تبدیل کر دی جایا کرے گی لیکن یہ سلسلہ تین سال تک جاری رہا جس نے ہمیں بہت تھکا دیا۔ علالت نے کام کو دشوار تر بنا دیا۔ آخرکار ۹ مئی کے جلسے میں راقم کو عرض کرنا پڑا کہ اب اسے سبکدوش کر دیا جائے۔ ٹرسٹ کے صدر اور اراکین کا ارشاد تھا کہ اس وقت رہائی پر اصرار نہ کیا جائے مگر خرابی صحت تعمیل ارشاد میں مانع تھی۔

آئندہ سے پروفیسر اسرار احمد ادارت کے فرائض انجام دیں گے۔ ان کے نام سے آپ ضرور واقف ہوں گے۔ پروفیسر اسرار سینٹر فار پروموشن آف سائنس کے ڈائرکٹر ہیں۔ وہ کئی برس سے سائنس کی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے کوشاں ہیں اور ان دنوں خاص طور پر اس کوشش میں مصروف ہیں کہ سائنس کی تعلیم کسی طرح ہمارے دینی مدارس تک پہنچ سکے۔ پروفیسر صاحب انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی مضامین لکھتے رہے ہیں جو آپ کی نظر سے گزرے ہوں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کے ہاتھوں میں پہنچ کر یہ رسالے بہت تیزی سے ترقی کریں گے۔ ہماری ادارت کے دوران کوئی فروگذاشت ہوئی ہو تو اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ خدا حافظ!

نور الحسن نقوی

خطبہ صدرِ جمہوریہ کا

جناب چیف ریکٹر صاحب، جناب چانسلر صاحب، وائس چانسلر صاحب، پروفیسر صاحبان، اساد یافتگان، یونیورسٹی کے طلباء رطالبات، خواتین و حضرات۔

مجھے اس کانووکیشن میں شرکت کے لیے دعوت دی گئی ہے، س کے لیے میں یونیورسٹی کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ سب سے پہلے ں ان تمام لڑکیوں اور لڑکوں کو مبارک باد دیتا ہوں جنھوں نے ں کانووکیشن میں ڈگریاں اور میڈل حاصل کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ھیں اپنی زندگی میں کامیابیاں عطا فرمائے

یہاں مجھے اس بات پر زور دینے کی ضرورت محسوس نہیں تی کہ ہمارے ملک کو اپنی اقتصادی اور تہذیبی تعمیر نو کی وسیع وجہد میں آپ سب کی لیاقتوں اور مہارتوں کی بے حد ضرورت ۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اس عظیم ادارے نے فارغ التحصیل نوجوانوں اس قومی جدوجہد میں شریک ہونے کے لیے پوری طرح تیار کر دیا ہے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میری تربیت ایک بالکل مختلف قسم درسگاہ میں ہوئی ہے۔ وہ تھی محنت شاقہ اور جدوجہد آزادی درسگاہ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میری نگاہ میں آپ کا جیسا تعلیمی رہ بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ ایسے اداروں کو مسلسل فروغ ل ہونا چاہیے۔ خاص طور سے جب میں علی گڑھ کے بارے میں چتا ہوں تو مجھے اس اعلیٰ مقصد اور بلند نصب العین کا خیال ہے جس کی بنا پر آپ کے اس ادارے کو بجا طور پر ایک مخصوص ترم مقام حاصل ہے۔

بات یہ ہے کہ علی گڑھ بیک وقت عبارت ہے اس خدمت سے بھی جو اس نے ایک بڑے ہندوستانی فرقے کی تعلیم کے سلسلے میں انجام دی ہے اور سیکولرازم کے ان اصولوں سے بھی جو اس عظیم ادارے کا طرہ امتیاز رہے ہیں۔ یہی ہے وہ قابل قدر ورثہ جو آپ کو اپنے ادارے کے عظیم بانی سرسید سے ملا ہے۔ ان مسائل پر سرسید نے وقتاً فوقتاً جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ یقیناً ہم سب کے لیے ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۸۸۴ء میں پنجاب کے شہر گورداس پور میں تقریر کرتے ہوئے سرسید نے ارشاد فرمایا تھا کہ " ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے، ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی جو اسی ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں" یا اُن کے وہ مشہور الفاظ جو انھوں نے ۱۸۸۳ء میں پٹنہ میں کہے تھے " ہندوستان ایک دلہن کے مانند ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں"

انھوں نے یہ بات پوری طرح واضح کر دی تھی کہ " کالج کے تمام حقوق جو اس شخص سے متعلق ہیں جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے، بلا کسی قید کے اس شخص سے بھی متعلق ہیں جو اپنے تئیں ہندو بیان کرتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ذرا بھی امتیاز نہیں ہے!

مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی مسرت ہے کہ اس یونیورسٹی میں ملک کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ مل جل کر دوستانہ ماحول میں کام کرتے رہے ہیں۔ یہ یونیورسٹی اس کی ایک روشن

مثال ہے۔ کوئی بھی شخص، چاہے وہ سرسری طور پر ہی علی گڑھ کیوں نہ آیا ہو، آپ کے کالجوں، ہوسٹلوں اور ہالوں کے ناموں سے اور اس بات سے کہ کس طرح مختلف مذاہب کے طلبا یہاں کے اقامتی ہالوں میں مل جل کر رہتے ہیں۔ اس حقیقت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی شخص اگر علی گڑھ کا بغور جائزہ لے تو اس نتیجے پر پہنچے گا کہ علی گڑھ صرف مسلم ثقافت کا مرکز ہی نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا بھی ایک اہم مرکز ہے۔

بات صرف اتنی ہی نہ تھی کہ سرسید جدید تعلیم کو فروغ دینا چاہتے ہوں وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ہندوستانیوں کو فرسودہ خیالات اور تعصبات سے نجات ملے۔ یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ تعلیم نسواں کے فروغ دینے میں علی گڑھ نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ اس موقع پر ممتاز ماہر تعلیم مرحوم شیخ عبداللہ کی خدمات کا ذکر کرنا چاہوں گا جن کی کوششوں سے علی گڑھ میں ویمنس کالج کا قیام ممکن ہوا اور تعلیم نسواں کے سلسلے میں جن کی بیش بہا خدمات کو ایک شکر گزار قوم کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

آج علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے ملک کے دور دراز علاقوں سے طالب علم آتے ہیں اور جناب وائس چانسلر صاحب! مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ آپ ان تمام فرزندان علی گڑھ کا جو ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں، اپنی مادر درسگاہ سے تعلق استوار کرنے کے سلسلے میں پوری کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے یہ یاد کر کے بڑی خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ سرزمین پنجاب کے ممتاز مورخ پروفیسر گنڈا سنگھ جنھیں آپ نے چند سال پہلے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی تھی اس یونیورسٹی کے ایک پرجوش اولڈ بوائے تھے۔

میں ان تمام طالب علموں کا بھی خیر مقدم کرتا ہوں جو بیرونی ممالک سے حصول تعلیم کے لیے علی گڑھ آئے ہوئے ہیں۔ وہ سب اپنے گھروں سے دور، ہمارے مہمان ہیں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ جب وہ اپنے ممالک کو واپس جائیں گے تو اپنے ساتھ علی گڑھ اور ہندوستان کے لیے دوستی اور خیر سگالی کا جذبہ لے جائیں گے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ بات اس سے پہلے بھی کہی گئی ہو، لیکن اس کا اعادہ شاید بے سود نہ ہوگا کہ فرزندان علی گڑھ نے قومی تحریک کو فروغ دینے اور کامیاب بنانے کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ شبلی نعمانی، محمد علی، شوکت علی، حسرت موہانی، راجا مہندر پرتاپ، سیف الدین کچلو، ڈاکٹر ذاکر حسین، اے ایم خواجہ، رفیع احمد قدوائی، تصدق حسین شیروانی، طفیل احمد، کے ایم اشرف، شیخ محمد عبداللہ کے اسمائے گرامی سے بخوبی واقف ہوں گے۔ یہ ایک طویل فہرست ہے اور انتخاب کا کام دشوار۔ آپ کے ان مایہ ناز فرزندوں نے ملک کی آزادی کے لیے جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں ان کا آسانی سے لفظوں میں احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس موقع پر میں ان سب کی یاد میں اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کرتا ہوں۔

اس یونیورسٹی کو ایک قومی ادارے کی حیثیت سے ہمارے آئین میں ایک خصوصی مقام حاصل ہے۔ ۱۹۵۱ء اور ۱۹۸۱ء کے ایکٹوں کے ذریعہ ہمارے پارلیامنٹ نے اس یونیورسٹی کو ایک ایسا انتظامی ڈھانچہ فراہم کیا ہے جو اس کی نوعیت اور مقاصد کے لیے موزوں ترین ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ حصول آزادی کے بعد یونیورسٹی میں غیر معمولی توسیع ہوئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حکومت ہند اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے آپ کو جو فراخدلانہ امداد اور تعاون ملتا رہا ہے اس کا سلسلہ بدستور جاری رہے گا۔

اگرچہ اس یونیورسٹی کے بارے میں قانونی طور پر کوئی ذمہ داری حکومت اتر پردیش پر عائد نہیں ہوتی، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ریاستی حکومت اس ادارے کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔ وائس چانسلر صاحب کی رپورٹ سے مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ مولانا آزاد لائبریری میں اضافے کے لیے ریاستی سرکار نے دس لاکھ روپے کی رقم منظور کی ہے اور اس بات کا بھی خصوصی بند و بست کیا ہے کہ یونیورسٹی کو بجلی سپلائی برابر ملتی رہے۔

یہاں میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور بنارس ہندو یونیورسٹی یہ دونوں اتر پردیش میں واقع دو بڑی مرکزی یونیورسٹیاں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں ادارے باہمی اشتراک عمل اور تعاون کی نئی راہیں نکالنے پر غور کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں کچھ اقدامات بھی ہوئے ہیں۔ مثلاً کھیل کود کے معاملے میں۔ مجھے امید ہے

کہ ایسے اقدامات بدستور جاری رہیں گے اور مشترکہ عمل اور تعاون کی دیگر منزلوں کی تلاش باقاعدہ ہوتی رہے گی۔

مجھے ہمیشہ سے اس بات پر یقین رہا ہے کہ طلباء کی نمائندہ اور باصلاحیت جماعت کو ملک اور قوم کی بہبود اور ترقی کے کاموں میں ایک آزاد شہری کی طرح کردار ادا کرنے میں مصروف ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سیاست دانوں سے دور رہیں۔ کیونکہ سیاست دانوں کا ہمیشہ سے یہ وطیرہ اور قاعدہ رہا ہے کہ وہ طلباء کی یونین سے پہلے رابطہ قائم کرتے ہیں اور اس کے بعد اُن کو اپنے اغراض کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ فعل ناپسندیدہ ہے اور جسے اب قطعی طور پر ختم ہونا چاہیے تاکہ طلباء یکسوئی سے اپنی تعلیم کو سدھارنے اور بہتر طریقے سے تعلیمی زندگی گزارنے کی طرف توجہ دے سکیں اور تعلیمی اداروں کا علمی ماحول تباہ و برباد نہ ہو۔

لہٰذا میں تمام سیاسی جماعتوں کو مشورہ دوں گا کہ ملک کو ایک مؤثر، بہتر اور باوقار طریقہ کار مہیا کرنے پر غور کریں اور طلباء کو تخریب کاری کے لیے استعمال نہ کریں تاکہ طلباء کو بہتر اور نمایاں کردار سازی کا موقع مل سکے

وائس چانسلر صاحب! ابھی جب میں آپ کی سالانہ رپورٹ کے اس حصّہ کو سن رہا تھا جس میں یونیورسٹی کے مرتب کردہ توسیعی منصوبوں کا ذکر ہے تو مجھے ان منصوبوں کے بارے میں جان کر بڑی خوشی ہوئی جن کا مقصد پوسٹ گریجویٹ سطح پر زراعتی تعلیم کو فروغ دینا ہے زراعت ہمارے ملک کا سب سے بڑا اور اہم پیشہ ہے۔ اسی کے فروغ پر ہماری اقتصادیات کا زیادہ تر انحصار ہے۔ خوراک کے معاملے میں خود کفیل ہونا ہمارے لیے از حد ضروری ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری یونیورسٹیاں اور اعلیٰ تعلیمی ادارے ہمارے ملک کی زراعتی اور صنعتی ترقی میں مدد کر سکتے ہیں۔

وائس چانسلر صاحب، آپ کی سالانہ رپورٹ سے یہ معلوم ہو کر بڑی خوشی ہوئی کہ یونیورسٹی برادری کے مختلف طبقوں میں اشتراکِ عمل اور امدادِ باہمی کی فضا پیدا کی جا رہی ہے۔ خاص طور سے انتظامیہ اساتذہ اور طالب علموں کے باہمی روابط کو بہتر اور مضبوط بنایا جا رہا ہے۔ یہ یقیناً بڑی حوصلہ افزا بات ہے کہ نظم و ضبط کی پابندی کے ساتھ کام کرنے کے رجحانات کو فروغ حاصل ہے۔ یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ تقریباً چھ ہزار طالب علم روزانہ لائبریری کی سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

حال ہی میں حکومت نے نئی تعلیمی پالیسی کے بارے میں اپنی تجاویز کا اعلان کیا ہے۔ اگرچہ آزادی کے بعد ہم نے تعلیمی میدان میں عظیم کامیابیاں حاصل کی ہیں پھر بھی اس ملک میں غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

چانسلر صاحب! آج آپ نے چار ممتاز حضرات کو اعزازی ڈگریاں عطا کی ہیں۔ جو ادب، میڈیسن، سائنس اور انسانی فلاح و بہبود سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں آپ کے انتخاب کی داد دیتا ہوں اور چاہوں گا کہ اپنے احساسِ طمانیت کا اظہار کروں کہ آپ نے ان حضرات کی گرانقدر خدمات کا اعتراف کر کے "حق بحقدار رسید" پر پوری طرح عمل کیا ہے۔

میں ایک بار پھر تمام اسناد پانے والوں کو مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ان کا مستقبل روشن ہو۔ آپ میں سے بہت سے اس یونیورسٹی کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ آپ نے اتنا کچھ حاصل کیا ہے۔ جب آپ زندگی سے مدمقابل ہوں گے تو آپ کو بے شک و شبہ قدم قدم پر مشکلات سے واسطہ پڑے گا لیکن آپ جہاں کہیں بھی ہوں جس حیثیت سے بھی کام کر رہے ہوں، آپ کو ملک کی عظمت اور بہبود کا خیال رکھنا ہوگا۔ آپ اس مادرِ درسگاہ کے قرضے کی کس طرح ادائیگی کر سکتے ہیں؟ میرے نوجوان دوستو! اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنی بساط بھر اس ملک کی تعمیر میں اپنا رول ادا کریں، غریبوں اور پسماندہ لوگوں کی حالت کو سدھارنے میں مدد کریں اور ہندوستانی عوام کے اتحاد اور یک جہتی کے لیے خود کو وقف کر دیں۔ جس جذبہ، ایثار اور قربانی سے ہم نے آزادی حاصل کی تھی اسی جذبہ محبت، حب الوطنی اور ایمانداری سے ہمیں اس آزادی کو برقرار رکھنا ہوگا۔ ہمیں مذہب اور ذات پات کے احساسات کو بالائے طاق رکھ کر ایک متحدہ اور مضبوط مادرِ وطن کی بقا کے لیے کام کرنا ہوگا۔ یہ آپ کے ملک اور علی گڑھ دونوں کے لیے عظیم ترین خدمت ہوگی۔

سید حامد

اکیسویں (۲۱) صدی

ہندوستان کو آزاد ہوئے انتالیس سال بیت چکے۔ ہم نے شروع ہی میں طے کر لیا تھا کہ ہمہ جہت ترقی کا ہمہ جہت منصوبہ بنائیں گے اور اس کو عملی جامہ پہنائیں گے۔ منصوبہ بندی کی عمر بھی اب ۳۵ سال کے لگ بھگ ہو گئی۔ بغیر منصوبہ بندی کے اب کام چلتا بھی نہیں ہے۔ منصوبہ بندی یا پلاننگ کے سوائے کوئی چارہ نہیں رہتا اگر وسائل محدود ہوں اور ضرورتیں زیادہ۔ آگے بڑھنے کے لیے کئی راستے ہیں۔ فیصلہ یہ کرنا ہوتا ہے کہ ذرائع، حالات، ضروریات امکانات اور خواہشات کو دیکھتے ہوئے، کون سا راستہ اختیار کیا جائے؛ یہ بھی کہ کس مقصد کو کتنا وزن دیا جائے، اور معیشت کے کس حصے کو کس مقدار میں مدد دی جائے۔ صنعت و حرفت پر زیادہ سرمایہ کاری ہونی چاہیے یا زراعت پر، خود صنعت و حرفت میں بڑی اور بنیادی، درمیانی، چھوٹی اور گھریلو صنعتوں پر توجہ اور وسائل کی تقسیم کس ڈھنگ سے ہو۔ قومی سرمایہ کا کون سا حصہ ان مدوں پر صرف ہو جن سے افرادی طاقت بنتی ہے، یعنی تعلیم اور تندرستی جس میں روک اور علاج دونوں شامل ہیں۔ بنیادی ڈھانچے کو بنانے میں دھیان کی لاگت کس عنوان ہو۔ بنیادی ڈھانچا یا انفرا اسٹرکچر اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اسی پر ترقی کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ اس میں سڑکیں، ریلیں، نہریں، وسائل حمل و نقل، بجلی اور تربیت یافتہ افرادی طاقت شامل ہیں۔ بنیادی ڈھانچہ پورا ہو جائے تب کہیں وہ منزل آتی ہے جسے معصوبی اسی زبان میں آغازِ پرواز یا ٹیک آف کہتے ہیں۔ ہر محاذ یا سیکٹر کی پرداخت کے طریقے وقت اور ضروریات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ان کی باہمی ہم آہنگی منصوبہ کی کامیابی کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔

ضروری وسائل کیسے حاصل کیے جائیں، یہاں بھی فیصلہ کی طاقت کا امتحان ہوتا ہے۔ ٹیکسوں یا محصولوں کی شرح بڑھانے سے آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے لیکن ایک حد وہ بھی آجاتی ہے جس کے آگے اگر شرح بڑھائی جائے تو ایک طرف آمدنی گھٹتی ہے، دوسری طرف پیداوار۔ اور پھر جس پارٹی نے حکومت بنائی ہے اس کے امکانات پر بھی اثر پڑ سکتا ہے۔ ٹیکس کی چوری اور ٹیکس کی شرح میں بہت تعلق ہوتا ہے۔ ٹیکس کی چوری کی کوکھ سے متوازی معیشت جنم لیتی ہے جس سے معاشرہ کو نقصان پہنچتا ہے۔

دوسرا وسیلہ ہے بچت۔ وکاس بچت کے سایہ میں پروان چڑھتا ہے۔ بچت کیسے بڑھے۔ خوشحالی بڑھتی ہے تو بچت بڑھتی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ افراطِ زر یا انفلیشن قابو میں رہے۔ اگر قیمتوں کے بڑھنے کی رفتار شرحِ سود کے برابر یا اس سے زیادہ ہو جاتی ہے تو بچت کی رغبت پر ضرب پڑتی ہے، اور لوگ روپیہ کو بینک میں جمع کرنے کے بجائے اسے جائیداد یا سونا یا اس کے زیور خریدنے میں صرف کر دیتے ہیں۔

ٹیکس اور بچت ناکافی ہو جائیں تو عالمگیر اداروں یا ترقی یافتہ ممالک کے سامنے دستِ سوال دراز کیا جاتا ہے۔ یہاں زرِ مبادلہ یا فارین ایکسچینج کا سوال اٹھتا ہے۔ یہ مبادلات یا ایکسپورٹ، اور ملکیوں کی باہر سے بھیجی ہوئی رقوم یا غیر ملکیوں کی ہندوستان میں خرچ کی ہوئی رقموں سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بغیر ہم وہ مشین اور مال خرید ہی نہیں سکتے جس کی درآمد ہماری معیشت کے لیے ضروری ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ مسئلہ کو سادہ اور سہل بنا کر کہا گیا ہے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ منصوبہ بندی کی راہ میں کتنے پیچ و خم اور نشیب و فراز آتے ہیں۔ ہندوستان گزشتہ ۳۵ سال میں ان سب سے گزرا ہے۔ اس نے ٹھوکریں بھی کھائی ہیں؛ اس کے اقتصادی فیصلے بعض اوقات غلط بھی ثابت ہوئے۔ اس کی منصوبی کامیابیاں عوام کو نہال نہ کر سکیں۔ اس کے دو

اسباب ہیں؛ ایک تو آبادی ترقی کی رفتار کو پسپا کرتی رہی؛ دوسرے ترقی نے خوشحال اور کنگال کے درمیان فاصلے کو بڑھا دیا۔ آئین کی منشا کے مطابق منصوبہ سازوں نے "ترقی سماجی انصاف کے ساتھ" کو اپنایا۔ اس میں شک نہیں کہ سماجی انصاف کی راہ پر چلنے کی کوششیں کی گئیں لیکن انھیں صرف جزوی کامیابی حاصل ہو سکی۔

ہندوستان نے سائنس اور ٹکنولوجی کے میدان میں کارہائے نمایاں کیے۔ ہندوستان کے انجینئر سائنداں، ڈاکٹر، دنیا کے بازار میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔ باوجود رکاوٹوں کے ہمارے ملک نے اوسطاً تقریباً ۵ء۳ فی صد کے حساب سے سال بہ سال ترقی کی۔

ملک ترقی کی اس رفتار سے نا مطمئن ہے۔ موجودہ وزیر اعظم بے چین ہیں کہ ارتقاکی رفتار کو اب سے لے کر ۲۰۰۰ء تک سال بہ سال تیز کیا جائے۔ ملک کی نگاہ اب اکیسویں صدی پر ہے۔ اس کو ہدف بنا کر ہر سمت میں تیز رد و کاس کے جتن کیے جا رہے ہیں۔ بندوبست یا منیجمنٹ اور جدید سائنس اور ٹکنولوجی کے بازووں پر ملک کو نئی صدی کی طرف گرم پرواز کیا جا رہا ہے۔

یہاں سوال ملک کے ایک خاصے بڑے طبقے کا اٹھتا ہے۔ مسلمان ۱۹۵۱ء سے جب کہ منصوبہ بند ترقی کا آغاز ہوا، اب تک ملک کی ترقی کا ساتھ نہیں دے سکے۔ تعلیمی اعتبار سے وہ ہندوستان میں سب سے پیچھے ہیں۔ اقتصادی اور سماجی اعتبار سے بھی ان کی حالت دگرگوں ہے۔ ان کے زوال میں اپنوں اور بیگانوں دونوں کا ہاتھ ہے، اپنوں کا زیادہ۔ وہ جاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں اور ستم زدہ بھی۔ آیندہ پندرہ سال یہ فیصلہ کریں گے کہ ہندوستانی مسلمان فنا ہوتے ہیں، جابر ہوتے ہیں، یا سرخ رو ہوتے ہیں۔ لیکن خود انھیں اس کا احساس ہی نہیں کہ وہ فنا اور بقا کے دوراہے پر کھڑے ہوئے ہیں۔ اگر وہ متحد ہو کر اور اونچ نیچ سمجھ کر اور پسینہ بہا کر جتن کرتے ہیں تو وہ اکیسویں صدی میں عزت اور اہمیت کے ساتھ داخل ہوں گے، اگر وہ کاہل اور غافل بنے رہے اور جہالت اور اوہام اور افواہوں اور جذباتیت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھتے ہیں تو صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیے جائیں گے، اور کوئی اُن کا نوحہ خواں بھی نہ ہوگا۔

قوم کے ادارے جن پر ترقی اور بقا کا انحصار ہوتا ہے معیار کے اعتبار سے تیسرے درجے کے ہیں؛ اس پر مستزاد یہ کہ خانہ جنگی اور افراتفری کا شکار ہیں ـــ وہ چھوٹی چھوٹی اور برق رفتار خوشحالیوں اور آسودگیوں پر مطمئن ہو بیٹھتے ہیں۔ زمانے سے قرنوں پیچھے رہتے ہیں۔ ان کا وقت جھگڑوں سے بچتا ہے تو بے کاری میں صرف ہوتا ہے۔ وقت کا نقیب پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ "میرا ساتھ دو نہیں تو مٹ جاؤ" اُن کی بے سُدھ کردیں جواب دے رہی ہیں کہ "مٹنے سے وہ ڈرے جو دوامی پٹہ لکھوا کر لایا ہو۔" دنیا میں رکھا ہی کیا ہے کہ کوئی اس کے لیے سر کھپائے، پسینہ بہائے اور دن کا چین اور رات کی نیند حرام کرے۔ تاریخ اعلان کر رہی ہے کہ جس قوم نے خانہ جنگی اختیار کی وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ختم ہو گئی۔ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم "انفرادیت کے علم بردار ہیں، کوئی جانور نہیں کہ گلہ بنا کر چلیں۔ ہم میں سے ہر ایک ایک نئی روش نکالے گا اور اپنی سرفرازانا کی تشفی کرے گا!"

لامذہبیت صدا دے رہی ہے۔ یہ اس کی صدا سے بیزار ہیں لیکن عملاً اس کا راستہ ہموار کر رہے ہیں۔ ان کے فرقوں میں صدیوں سے لایعنی اور مضحکہ خیز بحثیں چھڑی ہوئی ہیں جنھوں نے اسلام کی قبا کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ دین کے ماننے والوں کی تنگ سری اور دشنام طرازی کو دیکھ کر لوگ دین ہی سے بیزار ہیں۔ اور یہ لوگ پھر بھی اسی خیال میں مگن ہیں کہ دین اور اخلاق کی حفاظت اُن کے دم سے ہو رہی ہے۔

عقل چلا چلا کر کہہ رہی ہے کہ راہ تاریک ہے، میری روشنی میں چلو تو منزل تک پہنچ جاؤ گے۔ ان کی نیند جواب دے رہی ہے کہ تاریکی شب کا وصف ہے، اس لیے سونے کی اس گھڑی کو غنیمت سمجھو، آرام کرو۔ اور ان کی جذبہ پرستی تلقین کرتی ہے کہ زندگی کا لطف اگر ہے تو جذبات کو شہ دینے میں اور ان کی دھاروں میں بہتے رہنے میں۔

یہ سوال و جواب عرصے سے ہوتے چلے آ رہے ہیں، لیکن یہ تعیش اب زیادہ دن چلنے کا نہیں۔ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ پانی سر سے اوپر آیا چاہتا ہے۔ اوپر آ گیا تو کام تمام ہے۔ اور بالفرض اگر کام تمام بھی نہ ہوا تو بے غیرتی اور درماندگی سے جینا بھی کوئی جینا ہے۔ افراد کی طرح اقوام کے لیے بھی یہ اچھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں چلتے ہاتھ پیر اٹھائے۔ اگر مرنا ہی ہے تو سسک سسک کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا کیا۔ ڈوبنا ہے تو سکون کے ساتھ بغیر جنبش کیے غرقاب ہو جانا کیا؟

ہاتھ پر ہاتھ مارکر موجوں سے ٹکرا کر ڈوبے تو کم سے کم عزت کی موت تو مرے۔

اس لیے لازم ہے کہ ہم اپنے اختلافات اور عداوتوں کو بھول جائیں

• جہالت اور تن آسانی کو خیرآباد کہیں، عقل کی روشنی میں قدم آگے بڑھائیں کیا عجب کہ ہم آنے والے سیلاب کی حدود سے اس وقت تک آگے نکل چکے ہوں۔ ایک بعید امکان اس کا ابھی باقی ہے، دو چار سال اسی طرح گزر گئے تو وہ امکان امیدِ موہوم کی راہ سے مایوسی کی ویران منزل تک پہنچ جائے گا۔ کیا اس نامراد قوم کے راہبر اور اہل فکر اور اہلِ درد وقت کی نزاکت کو محسوس کریں گے اور سر جوڑ کر ہمارے امراض کا علاج تجویز کریں گے اور ادبار کے استخوان شکن چنگل سے نکالنے کی تدابیر سوچیں گے۔ یا پھر کیا اکیسویں صدی ہم پر اس طرح طلوع ہوگی کہ ہندوستان کا قافلہ ترقی کی شاہراہ پر تیزی سے رواں دواں ہے اور ہندوستانی مسلمان اس طرح گھسٹتے ہوئے چلے جارہے ہیں جیسے وہ افراد جنھیں تیز رو گھوڑوں کی ٹانگوں سے باندھ دیا گیا ہو؟ یہ خود مجروح اور معذور و مقہور اور گھوڑے خشمگیں اور غضبناک کہ ان کو یہ بندھے ہوئے اپاہج سرپٹ دوڑنے ہی نہیں دیتے۔

پروفیسر قاضی عبدالستار

خالد بن ولید

چودھویں قسط

" خدا آپ کے درجات بلند کرے ۔ وہ انعام دے جس کے آپ مستحق ہیں "!

توماشاہ غیر معمولی ساز و سامان ، کثیر جانوروں اور آدمیوں اور بھاری آلات حرب کے ساتھ شاہراہ پر رینگنے کے لیے مجبور تھا۔ ناز و نعم میں پلا ہوا جسم ، دولت روما کے درباروں کا کڑھا ہوا مزاج ، جبروت و جلال کے سائے میں بنی ہوئی عادتیں اور ہرقل کی بیٹی کا تزک و احتشام ۔ نتیجہ یہ تھا کہ قدم قدم پر منزلیں برپا ہوتیں جب اگلی منزل پر تمام عشرت خانے قائم ہو جاتے تب کوچ کا حکم ہوتا۔ پورے تین دن میں دس کوس کا سفر تمام ہوا تھا۔ ایک سبزپوش پہاڑی کی گھاٹی میں ندی کے کنارے پورے ایک کوس میں خیام شاہی چھائے ہوئے تھے ۔ دور ترنج کے باغوں میں مسلح سوار کھڑے تھے جن کی حیثیت آرائشی اشیا سے زیادہ نہ تھی کہ ترنج کے باغات اُن کے خون سے سینچے جانے لگے اور وہ کٹے ہوئے درختوں کی طرح گرنے لگے ۔ کماندار ہر بیس نے خطرے کا بگل بجا دیا اور جیسے تیسے ہتھیار پہن کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ توماشاہ کو بکتر پہننے کا موقع نہ ملا قبا پر تلوار پہن کر گھوڑے پر چڑھ گیا خیمے کے حصار سے نکلا تو دیکھا کماندار اپنے سواروں کو مردہ چھوڑ کر بھاگ رہا ہے اور عرب گھوڑے اس کا تعاقب کر رہے ہیں ابھی وہ کچھ سوچ نہیں سکا تھا کہ اس کے عقب سے عرب رسالے نے حملہ کر دیا۔ روایتی شجاعت اور مردانگی نے تھوڑی دیر تلوار ہلانے کی زحمت کی لیکن کب تک اس کے گرتے ہی انسانی انبوہ نے جسے لشکر کا لقب حاصل تھا ہتھیار ڈال دیے ۔

توماشاہ کے گھوڑے پر ہرقل کی بیٹی کو بٹھا کر اور نیزے پر ہرقل کے داماد کا سر چڑھا کر سیف اللہ چند سواروں کے ساتھ دمشق کے لیے سوار ہو گئے ۔ کیمپ قعقاع کی عملداری میں چھوڑ دیا۔ دمشق کے قصر شاہی کے سامنے لگے ہوئے شامیانے میں جو مسجد کی خدمت انجام دے رہا تھا فجر کی نماز ہو چکی تھی امیران لشکر اپنے اپنے خیموں کی طرف جا رہے تھے کہ سیف اللہ کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ امین الامت نے آگے بڑھ کر دیکھا تو سیف اللہ گھوڑے سے اُتر رہے تھے۔ اور چند سواروں کے جھرمٹ میں شہنشاہ روم کی بیٹی کھڑی سارے منظر کو دیکھ رہی تھی مصافحے کے بعد توماشاہ کا سر ملاحظہ کیا۔ ابی سفیان سے فرمائش کی کہ اپنے خاندان کی عورتوں کو شہزادی کی خدمت پر مامور کریں۔ اور عیاض بن غنم کو پانچ ہزار سواروں کے ساتھ قعقاع کی کمک پر لپکا دیا۔ اور اسی شامیانے میں مشورے کے لیے بیٹھ گئے کسی چالاک سپہ سالار نے مشورہ دیا کہ بیٹی کا واسطہ دے کر ہرقل سے من مانی شرطیں تسلیم کرائی جائیں ۔ تائید میں آوازیں بھی بلند ہونے لگیں قبل اس کے کہ سپہ سالار فیصلہ کر دے سیف اللہ نے عرض کیا " ہرقل کی بیٹی کو وسیلہ بنانا فاتحان عرب و عراق و شام کی شان کے خلاف ہے ، میرا خیال ہے اسے ہرقل کے پاس اس انداز سے روانہ کیا جائے جو فاتحوں کو زیب دیتا ہے "!

سپہ سالار کی جنبش سر نے فیصلے کی تصدیق کر دی ۔ اسی دن شام ہونے سے قبل ہرقل کی بیٹی توشے اور تحفے اور تکلفات کے ساتھ حلب کے قلعے کی طرف روانہ کر دی گئی ۔

دمشق کی آبادی کو توماشاہ کا سر دے کر شجاعت اور ہرقل کی بیٹی کی باعزت روانگی سے شرافت کا سبق دیا ۔

چشمِ رسالت کے بند ہوتے ہی تین اصحابِ اعظم یعنی نائبِ رسول خلیفہ دوم اور امین الامت کے اتحاد نے مغربی تاریخ میں اتحادِ ثلاثہ کا لقب پایا۔ نائبِ رسول کے وصال فرماتے وقت امین الامت شام میں جہاد پر تھے اور حضرت عمر حاضرِ خدمت تھے۔ حضرت عمر نے خلیفہ ہوتے ہی سیف اللہ کی معزولی کا پروانہ لکھ دیا۔ تعمیل بھی ہو گئی لیکن خالد کی خاموش معزولی بے لوث معزولی نے امتِ مسلمہ کے ذہنوں میں سوالات کا جنگل پیدا کر دیا۔ شام میں موجود اصحابِ رسول خلیفہ دوم کے ہر اقدام کو رسول اللہ اور نائبِ رسول کے احکام کی ترازو پر تول رہے تھے۔ سیف اللہ کی معزولی نے ان کو بڑی حد تک مایوس کیا تھا۔ امین الامت امت کے نباض تھے۔ اپنے دوست اور خلیفہ دوم کو صورتِ حال سے پوری طرح باخبر رکھ رہے تھے۔ نئے فرمانِ خلافت نے ظاہر کر دیا کہ نائبِ رسول نے جس سپہ سالار کو شام کا جو صوبہ تفویض کیا تھا وہ اسی پر حاکم کیا جائے گا۔ اس فرمان نے ایک طرف بنی امیہ کی دلاسائی کی تو دوسری طرف اہلِ مکہ کو خوفناک اندیشوں سے نجات دی۔ اور یزید بن ابی سفیان نے دمشق کی حکومت سنبھال لی۔ اور عمرو بن العاص جو فلسطین کی فتح پر تعینات ہوئے تھے۔ اپنے گھوڑوں کے سموں میں بجلیوں کے نعل باندھنے لگے اور قبضۂ شمشیر کو فتوحات کا آشیانہ بنانے کا خواب دیکھنے لگے۔

گورنر دمشق کو دو ہزار سوار دے کر امین الامت فحل کی جانب بڑھے۔ فحل کا سامنا ہوا تو ساری زمین پانی اور دلدلوں سے بھری ہوئی تھی کہ ہرقل کے حکم نے تمام دریاؤں کے بند توڑ دیے اور اولوالعزم فاتحوں کے راستے بند کر دیے تھے۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ قدرت حکمرانی اسی قوم کو عطا کرتی ہے جو حکمرانی کے قابل ہوتی ہے وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ دلدل بنانے والے ہاتھ خود ہی دلدل کا شکار ہو جائیں گے۔

امیر الاشکر نے خوب پھیل کر کیمپ لگائے اور پانی کی لذتوں سے کھیلنے لگے۔

اس رات جب پورے چاند کی چاندنی پانی پر بچھی تھی اور نوجوان کشتیاں ڈالے امرؤالقیس کے اشعار گنگنا کر اپنے محبوبوں کو یاد کر رہے تھے۔ اور غلام اشقر کی رکاب تھامے سیف اللہ کا انتظار کر رہے تھے کہ ایک طرف سے امین الامت پاپیادہ نمودار ہوئے۔ ان کے جلو میں وہ نامدار تھے جو دنیا کا نقشہ بدل ڈالتے اٹھے تھے۔ سب سیف اللہ کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ گئے۔ بیٹھتے ہی امین الامت نے سوال کیا۔

"یا سیف اللہ اس عجیب و غریب محاصرے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

سیف اللہ نے ادب کے ساتھ عرض کیا۔

"اتنا تو ہرقل بھی جانتا ہوگا کہ اس پانی کے ڈر سے ہم مدینے نہیں بھاگ جائیں گے۔ تاہم میرا خیال ہے دمشق کی فتح نے اسے بے حواس کر دیا ہے اور مغرب سے آنے والی فوجوں کے انتظار میں مہلت چاہتا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میدانِ جنگ میں ہاری ہوئی فوجیں ہم کو سوتے میں پکڑ لینے کا خواب دیکھ رہی ہوں۔"

"یا حضرت امیر لشکر یہ جاننا چاہتے ہیں مہم سرانجام کس طرح ہو؟"

عمرو بن العاص نے سوال کیا۔

"پہلی بات تو یہ کریں اسے مہم مانتا ہی نہیں۔ یہ تو ایک طرح کی رکاوٹ ہے جس کا علاج یہ ہے کہ دس پانچ کوس کا چکر کاٹ کر دشمن کے سروں پر جا پڑیں اور فیصلہ کر دیں۔ لیکن اتلافِ جان کا خوف ہے۔ دوسرا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم دشمن کو اسی کے میدان میں زیر کر لیں۔

سب نے دوسرے طریقے پر اتفاق کیا۔

دستور ہو گیا کہ مسلمان لشکر سارا دن آرام کرتا اور ساری رات انتظار ۔ ۔ ۔ اور پھر وہ رات آ ہی گئی جس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے اصحابِ رسول کتنے ہی قرآن ختم کر چکے تھے۔ شام ہی سے سیف اللہ کچھ مضطرب نظر آنے لگے تھے اور اپنے سرداروں کو باری باری طلب کر رہے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد اتنے انتظام سے اٹھے کہ امیر لشکر نے تعجب کا اظہار کیا۔ حضرت بلال سورۂ مزمل کی تلاوت کر رہے تھے اور ساعت نذرِ آنسو گزار رہی تھی کہ ایک مخبر بھاگتا ہوا آیا اور سیف اللہ کے کان کی خدمت کرنے لگا۔

"پچاس ہزار فوج تین سپہ سالاروں کے ماتحت تین سمتوں سے حملہ آور ہو رہی ہے اور خیال ہے کہ تھوڑی ہی دیر میں نمودار ہوا چاہتی ہے۔"

امین الامت نے سپہ سالاری کا علم سیف اللہ کے کاندھے پر رکھ دیا اور گھوڑے پر سوار ہو گئے۔

سیف اللہ نے چار ہزار سوار ہراول پر رکھ کر قیس بن ہبیرہ کو حاکم بنا کر جاسوس کے ساتھ لپکا دیا۔ چار ہزار سواروں کا میسرہ بنا کر مسروق کو

چڑھائی۔ امین الامت کو چار ہزار سوار دے کر تعاقب پر مامور کر دیا باقی دلاور
کو اپنی کمان میں لے کر بطور میمنہ مسروق کی مخالف سمت اٹھ پڑے۔ ہزار
گز چلے تھے کہ قیس بن ہبیرہ کی تکبیر سنائی دی ساتھ ہی جابر بن عبداللہ
نے ایک سمت نیزہ سیدھا کر دیا۔ سیف اللہ نے مشعلیں دیکھتے ہی اشقر کو
چھوڑ دیا۔ پہلی ہی ٹکر میں بھاری ڈانڈوں اور چوڑے پھل کے نیزوں نے
موت کی بارش کر دی سینکڑوں گھوڑے خالی ہو گئے۔ گھوڑے پلٹ کر
پیچھے بھاگے۔ سواروں سے ٹکرا گئے۔ الجھ گئے۔ پٹریاں بگاڑ دیں۔ قطاریں
توڑ دیں تنظیم بگڑنے لگی۔ شفاف چاندنی میں رومی میسرے کے جنرل
گاردان نے نکل کر اپنے قلب کے بھاگتے سواروں کو سنبھالا ہی تھا کہ
قعقاع نے اپنے وجود کی ساری طاقت تکبیر میں پھونک دی۔ چار ہزار مجاہدوں
نے اس شدت اور ہیبت سے تکرار کی کہ جنرل کی ساری کارروائی اور
کارگذاری اللہ اکبر کے اسم اعظم کی گرد ہو کر رہ گئی۔ قعقاع اور اس کے
سوار اپنی برچھیوں کی نوک پر پورا لشکر دبائے ہوئے میمنے کے اندر چلے
گئے۔ سیف اللہ نے اشقر کی راسیں سینے تک کھینچ لیں۔ بنی مخزوم کے
مشہور سواروں کو للکار کر قیس بن ہبیرہ کی طرف چلے جو کماندار جنرل سکلار
کے آہن پوش دستوں کے قلب میں عربوں کی روایتی شجاعت اور
جلادت کا اظہار کر رہا تھا۔ کہ بنی مخزوم کے سواروں نے "یا سیف اللہ" کا
نعرہ لگایا۔

"کیا بکتا ہے اس کو آواز دے جس کے قبضے میں ہماری جان ہے"
اور ساتھ ہی سیف اللہ نے خود تکبیر کہی۔ قیس بن ہبیرہ اور اس کا لشکر سیف اللہ
کی آمد ہی سے شیر ہو چکا تھا۔ سیف اللہ کی تکبیر سے قہر الٰہی ہو گیا۔ ایک ایک
دینے کے بجائے ایک ایک ہاتھ بڑھنے لگا۔ قیصر کا سرخ پرچم دیکھتے ہی
ایک سوار کو حکم دیا کہ امین الامت یلغار کریں اور اپنے گھوڑے سے
دشمن کی قطاریں پھاڑتے مسروق کی سمت اڑنے لگے۔ جو بطریق شام
کی کمان میں چڑھتی ہوئی فوج کو پوری کامیابی سے روک چکا تھا ایک
صف سے دوسری صف پر گر رہا تھا۔ قبیلوں اور ان کے سرداروں کو نام
لے لے کر موت پر چڑھا رہا تھا اور اپنے چہرے کا خون اپنے جھنڈے
کے پھریرے سے پونچھ رہا تھا۔
"کہاں ہے سپہ سالار مسروق؟"

"حکم دیجیے یا سیف اللہ"
"سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ تو نے سپہ سالاری کا حق ادا کر دیا۔ خدا
کی قسم یرموک کا دن دہرا دیا"
"یا سیف اللہ یہ سپہ سالار سا شہادت کے راستے کی دیوار بن گئی کہ میں تنہا
مرد میدان ہوں گھوڑے پر ڈالا نہیں جاتا"
کلام الٰہی کی تلاوت کرتا دبتی ہوئی صفوں کو اور دباتا ان کے درمیان
دھنستا چلا گیا۔

اب کماندار سکلار کا مورچہ پورا میدان جنگ بن چکا تھا کہ اس کی
فوج کے دونوں بازو دبتے دبتے اس کے پہلوؤں میں جم گئے تھے۔ اور امین الامت
اصحاب کبار کو جلو میں لیے جان دیے ڈال رہے تھے۔

جنرل کماندار کا منصوبہ اسی وقت ناکام ہو گیا تھا جب مسلمان اپنے
بستروں میں غافل ہونے کے بجائے میدان میں گھوڑوں پر تیار ملے تھے اور وہ
اپنے نام نامی کی آبرو کی خاطر جنگ آزما ہوا تھا۔ اس کے دونوں بازوؤں کے
کماندار سینکڑوں سردے کر منظم پسپائی کی تنظیم برقرار رکھے ہوئے تھے اور اب
وہ اپنے کمانداروں کے ساتھ پوری ترتیب برتتے ہوئے آہستہ آہستہ پیچھے
ہٹ رہا تھا اور مسلمانوں کا فتح نصیب جنرل اس کا ارادہ پڑھ چکا تھا۔

طلوع ہوتی ہوئی صبح کی دھندلی روشنی میں سیف اللہ نے اپنے
علم کو تین بار جنبش دی۔ جان پر کھیلتے سواروں نے اپنے ہاتھ سست
کر لیے۔ امین الامت نے گھبرا کر سیف اللہ کو دیکھا۔ سیف اللہ نے ان
کے گھوڑے کی راس پر ہاتھ ڈال دیا۔ اور پورا قلب پیچھے ہٹنے لگا۔ قیس
اور مسروق کی اپنے اپنے پہلوؤں میں مشین کی طرح پسپائی کو مہمیز کی
برکت خیال کیا اور اپنی جنگ کا نقشہ بدل دیا کہ اب مسلمانوں کا کیمپ
نظر آنے لگا تھا اور مسلمانوں کے ہراول کا سردار اپنے گھوڑے کداتا میدان
سے بھاگتا اس کے بائیں بازو سے ایک وار کیے بغیر نکلا چلا جا رہا تھا۔
قیس بن ہبیرہ کے گھوڑے نظروں سے اوجھل ہو گئے تب سیف اللہ گھوڑے
کی رکابوں پر کھڑے ہو کر پوری طاقت سے گرجے
"قلب بمین ... یسار"
عرب سواروں کے میدان میں پلے ہوئے ستے ہوئے جسموں
والے چھریرے بدنوں والے جفاکش سبک تیز رفتار گھوڑے

اپنے سواروں کی نشست کے انداز پر چونک اٹھنے والے گھوڑے تڑپے اور پورا قلب جیسے دو حصّوں میں تقسیم ہو کر دونوں بازوؤں کی طرف چلا۔

جنرل اسگلار نے فتح کے باجے بجوانے کے لیے مڑ کر اپنے نائبین کو دیکھا ہی تھا کہ تکبیر الٰہی کی ہولناک آواز بلند ہوئی اس کی تکرار کرتا ہوا ایک ایک سوار شہادت دبوچ لینے کے لیے ٹوٹ پڑا۔ پورا لشکر ایک تن واحد کی طرح جنرل کی پشت اور دونوں پہلوؤں پر گر پڑا۔ بھاری ضرورت سے زیادہ جھکے ہوئے آرام طلب زرنی ساز و براق سے آراستہ ایک دوسرے سے گتھے ہوئے رومی گھوڑوں اور سواروں کے لیے سامنے سے اچانک پشت کی طرف گھوم کر اس بھیانک یلغار کو انگیز کر لینا انتہائی دشوار تھا۔ جتنی مہلت ان کو مڑنے سنبھلنے اور میدان جنگ میں جمنے کے لیے درکار تھی اتنی ہی مہلت میں سیف اللہ فتح کو دبوچ کر اپنے جھنڈے میں ٹانک لینے پر قادر تھے اب خود سیف اللہ تکبیر کہتے ہوئے قلب میں دھنس چکے تھے تہلکہ ڈالے ہوئے تھے۔ قعقاع بن عمرو مزعور بن عدی اور جابر بن عبداللہ رومی پرچم کے محافظوں سے الجھ چکے تھے۔ اور جنرل اسگلار کے گارڈ اس سوار کی ہیبت سے فرار ہونے لگے تھے جو "شمشیر الٰہی" کی نشانیوں سے آراستہ تھا۔ جنرل اسگلار نے یا مسیح کا نعرہ لگا کر اپنے سواروں کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن اب سیف اللہ کا گھوڑا اس کے سر پر آچکا تھا۔ اس نے لگام چھوڑ کر ڈھال تھام لی وہ نیزہ جس میں سیاہ پھریرہ لگا تھا اس کی طرف موت کی طرح لپکا اس نے ڈھال سامنے کی لیکن وہ تو پیوست ہو چکا تھا اسگلار کے گرتے ہی رومی پرچم فاتحوں کے گھوڑے کے سموں میں ڈھیر ہو گیا۔ سورج نکلتے نکلتے ہزاروں سپاہی قیصر روم کی بنائی ہوئی دل دل میں دھنس چکے تھے۔ اور سیف اللہ اپنے جاں نثاروں کے ساتھ فحل کے شاہی کیمپ کی حراست پر روانہ ہو چکے تھے۔

سارا کیمپ کوسوں میں پھیلا ہوا زندگی کی نعمتوں اور لذتوں کی کی داد دے رہا تھا جیسے کسی بادشاہ کی شاہی تقریب کا ساز و سامان کھلا پڑا ہو۔ انواع و اقسام کی قیمتی اور بہت قیمتی قیام گاہیں اور خرگاہیں آراستہ و پیراستہ انسانوں اور جانوروں کے ہجوم سے آباد تھیں ان کے درمیان مطبخ سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے مینار لرز رہے تھے مرغن خوشبوئیں دعوت کام و دہن دیتی پھر رہی تھیں شراب کے خالی کدو، قرابے اور شیشے ان سے سینچی ہوئی عیاش آنکھیں اور چھلکتے ہوئے بے حجاب بدن دعوتِ تماشہ کے فرائض پر مامور تھے۔ شراب و شباب کے اس جزیرے میں سرحدی عیسائی بستیوں کی آبرو باختہ عورتوں کا بازار حسن لگا ہوا تھا۔ کہیں کہیں صلیب پوش بوڑھے راہب دین کی دوکان لگائے بیٹھے تھے جو سامان سے عاری اور خریداروں سے خالی تھیں کہ ایک طرف سے شور بپا ہے معنی لیکن ہولناک آوازوں کا شور، سب نے سب سے تصدیق چاہی لیکن کسی نے کسی کو بتانے کی کوشش نہ کی کہ سب اپنے سینوں کے چور کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے۔ اور جیسے فرار کے منتظر بیٹھے تھے۔ جس کا جس طرف منہ اٹھا نکل گیا۔ سیف اللہ کے سواروں کے شکار صرف وہ تھوڑے سے سپاہی ہو سکے جن کے پیروں میں نشے کی زنجیریں پڑی تھیں اور ہاتھ مشکیں گیسوؤں کے پھندوں میں پھنسے ہوئے تھے۔

شام کا سب سے بڑا رومی کیمپ شام تک اسلامی کیمپ بن چکا تھا۔ یزید بن ابی سفیان کے دمشق کی گورنری پر فائز ہوتے ہی عمرو بن العاص فلسطین کے لیے بے چین ہونے لگے کہ خلیفۂ اکبر نے ان کو فلسطین کے لیے نامزد کر دیا تھا۔ ادھر غنیمت کی فہرست بن رہی تھی اور ادھر عمرو بن العاص اپنے ناموروں کے ساتھ گھوڑے کُدکُراتے اٹھے بیروت اور صیدا اور رستیان جیسے مشہور قلعے اور شہر فتح کر کے فتراک میں ڈال لیے۔

فحل کو برباد کر کے سیف اللہ نے نصف لشکر کے ساتھ حمص کی طرف باگیں اٹھا دیں۔ بقیہ سپاہیوں کو سمیٹ کر امین الامت نے دوسرے راستے سے حمص پر چڑھائی کی دونوں سینکڑوں کوس کے راستے میں پڑنے والے شہروں اور قلعوں رسد خانوں، ہتھیاروں کے ذخیروں اور گھوڑوں کے طویلوں کو فتح کرتے بند و بست کرتے بڑھ رہے تھے۔ حمص صدیوں سے رومی شہنشاہوں کا عشرت خانہ تھا۔ القدس کی برگزیدگی، دمشق کی تاریخیت اور انطاکیہ کے انتظامی محل وقوع کے باوجود ہرقل حمص کا عاشق تھا۔ فصیل کے پتھروں کا جڑاؤ تک رومیوں کے ہیبت و جلال کے ساتھ ساتھ ان کے ذوقِ جمال کا مظہر تھا۔ دور سے معلوم ہوتا کہ بھورے اور زرد اور سرخ و سیاہ رنگ کے قالین تمام شہر پناہ پر ڈال دیے گئے ہوں۔ تمام دروازے

گوتھک طرزِ تعمیر کے اولین نمونے تھے۔ سایہ دار درختوں، سنگ مرمر کے حوضوں نوک پلک سے آراستہ باغوں اور محلوں میں وہ کون سی نعمت اور لذت تھی جس کا رومی شہنشاہ تصور کر سکتا تھا اور موجود نہ تھی۔ مغرب قریب سے مغرب بعید تک نامی گرامی خاندانوں اور خانوادوں کے چشم و چراغ قرب شاہنشہی کی امید میں اپنی جنتیں آباد کیے پڑے رہتے ساری دنیا کے نوادرات لیے باریابی کا انتظار کرتے رہتے ایک دہائی کی ایک باریابی عمر بھر کے خسارے کا حساب کر دیتی۔

لیکن اب وہ حمص خالی ہو رہا تھا کہ سیف الٰہی جبروت و جلال کے افسانوں سے قصرِ شاہی کے کنگورے ہلنے لگے تھے۔ شہنشاہ کا پیش خانہ رہا کے راستے پر آراستہ ہو چکا تھا۔ بطریق اعظم القدس کی حفاظت کے لیے رخصت ہو چکے تھے اور جنرل تفش روم کی تازہ دم افواج کے ساتھ تخت شاہی کے سامنے سلامی دے رہا تھا۔ اور جزیرہ کے عیسائی نمائندے جہاد کا اعلان کرنے حاضر ہو چکے تھے۔ در حقیقت یہ ہرقل کا آخری دربار تھا۔ آٹھ سو سال کی شاہنشاہی کا آخری اظہار تھا۔ جنرل تفش اور جنرل توذر جس نے صلیب اتار کر تلوار پہن لی تھی۔ شاہزادوں اور نوابوں کے عوام میں دور سے چمک رہے تھے۔ ہرقل نے نگاہ اٹھائی جو یرموک اور فحل کی شکست سے گرانبار تھی۔ تفش اور توذر کا جائزہ لیتی چلی گئی۔ ہرقل تخت سے اٹھا۔ اسے کہاں معلوم تھا کہ اب پھر کبھی اس تخت پر بیٹھنا نصیب نہ ہوگا سارے دربار کی سانسیں رکی ہوئی تھیں۔ ان کا سارا وجدان کی آنکھوں میں کھنچ آیا تھا شہنشاہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا توذر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ توذر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں لیکن وہ شہنشاہ کے قدموں میں لوٹنے لگیں۔

توذر گھٹنوں پر گر پڑا اور توذر کے نیام کو جسے غلام خالی کر چکا تھا اپنی کمر کی تلوار سے بھر دیا۔ اب ہرقل تفش کے سامنے تھا غلام کے ہاتھوں پر سدھا ہوا طشت ہرقل کے داہنے ہاتھ کے قریب آ چکا تھا اس نے تلوار اٹھائی۔ تفش کو نامراد آنکھوں سے دیکھا۔

"مغرب اور مشرق دونوں میرے ہاتھ میں — زخمی ہاتھ کا مرہم خالد کا سر ہے۔"

اور اپنے ہاتھ سے کمر میں تلوار باندھ دی۔

پھر اسے محسوس ہوا کہ اس کی پلکوں پر کوئی شے — نمناک سی شے رینگ رہی ہے۔ اسے حیرت ہوئی کہ اس کی آنکھیں تو نمی سے ناآشنا تھیں۔ آنکھیں تو اپنے آنسوؤں کے لیے اس کے دامن کی دو انگلی رہیں وہ اپنی آنکھوں کے تصور سے کانپ اٹھا کہ شہنشاہ رویا نہ کرتے — روم کا شہنشاہ — مشرق اور مغرب کا شہنشاہ — وہ اتنی تیزی سے چلا کر داخلۂ بارگاہ کا پردہ ہٹانے کے لیے شہزادوں کو جھپٹنا پڑا کہ خدام ادب تو دربار کے برخاست ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

دس ہزار فوج کے ساتھ شہنشاہ رہا کے لیے سوار ہو گیا۔ چالیس ہزار رومیوں کے ساتھ توذر جوشِ غضب میں خالد کے لیے اٹھ رہا۔ تفش اس وقت تک حمص میں مقیم رہا جب تک ایک ایک نجیب الطرفین خاندان اپنے وطن کے لیے سوار نہ ہو گیا۔ وزیروں اور امیروں اور جنرلوں اور پادریوں کے خدام اور متوسلین اپنی اپنی منزلوں کے لیے رخصت نہ ہو گئے۔ جب حمص بوڑھوں عورتوں اور بچوں تک سے خالی ہو گیا فوجوں اور ہتھیار بند حامیوں کی چھاؤنی بن گیا تب وہ تیر کی طرح نکلا کہ حضرت عبیدہ اپنے لشکر کے ساتھ خالد کی مدد کو نہ پہنچ سکیں جنہیں رومی جاسوسوں کے خیال کے مطابق توذر نے گھیر لیا تھا۔

قالین کے شیر توذر نے سیف اللہ کے لشکر کو دیکھا۔ چمکتے سواروں اور پھڑکتے گھوڑوں کا شکوہ دیکھا تو شہنشاہ کے ہاتھ سے بندھی ہوئی تلوار کا قبضہ ڈھیلا ہو گیا۔ ساتھ ہی مخبروں نے اطلاع دی کہ دمشق کا گورنر یزید بن ابی سفیان دو ہزار سواروں کے بوتے پر ستر اسی ہزار کا شہر دبوچے پڑا ہے۔ مفت میں ملی ہوئی عظمت کو متاع عزیز جان کر قزاقوں کی طرح دمشق پر چڑھ دوڑا لیکن مقابلے پر وہ نابغۂ روزگار تھا جو غنیم کی چال ڈھال سے اس کا دل و دماغ پڑھ لیتا تھا۔ گورنر کو حکم بھیجا کہ ہماری آمد تک توذر سے دفاعی جنگ کرتے رہو اور خود بھی گھوڑا طلب کر لیا۔ توذر کا لشکر ابھی فصیل دمشق کے نیچے کوسوں تک پھیلے ہوئے باغات کے سواد میں بھی نہ پہنچا تھا کہ ابن ابی سفیان اپنے سواروں کے ساتھ جھنڈا اڑاتا ہوا نظر آ گیا۔

(جاری ہے)

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

جدید سائنس اور اُس کا مقصدِ وجود

(اسلامی نقطۂ نظر)

سائنس کو مذہب کا حریف سمجھا جاتا ہے لیکن یہ محض غلط فہمی ہے۔ دونوں کا دائرہ کار بالکل مختلف ہے۔ اس صدی میں قرآن حکیم کے بہت سے بیانات کو سائنس اور تاریخ کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ ابھی تک سائنس یا تاریخ نے قرآن کے کسی بیان کو جھٹلانے میں کامیابی حاصل نہیں کی ہے، لیکن بالفرض اگر ایسی کوئی صورت سامنے آتی بھی ہے تو بھی اس سے قطعیت حاصل نہیں ہوتی۔ وہ محض تحقیق کی ایک منزل ہوتی ہے اور اس کا امکان باقی رہتا ہے کہ تحقیق مزید ہمیں اس منزل تک پہنچا دے جس کی طرف قرآن اپنی مخصوص بلیغ زبان میں اشارہ کر رہا ہے۔

مذہب کا مقصد شرفِ انسانیت کا اثبات اور تحفظ ہے۔ وہ انسان کامل کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ سائنس کے دائرہ کار میں یہ باتیں نہیں ہیں نہ ہی کوئی بڑے سے بڑا سائنس دان انسان کامل کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ اس لیے مذہب اور سائنس کا تصادم محض فرضی اور خیالی ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ مذہبی عقائد کی بنیاد عموماً عقل اور منطق پر نہیں ہے اس میں بڑا حصہ ایمان بالغیب یا توہمات یا اساطیر کا بھی پایا جاتا ہے۔ اسلام نے ایمان بالغیب کو باقی رکھا ہے کیوں کہ یہی نظریۂ آخرت کی بنیاد بن سکتا ہے مگر توہمات اور اساطیر کو بالکل بے دخل کر دیا ہے۔ نظریۂ آخرت کو بھی عقل اور منطق کی روشنی پر پرکھا جا سکتا ہے۔ اس کے سوا معاملات اور معاش کے جتنے احکام ہیں وہ خالصتاً عقل پر مبنی ہیں۔ اسلام واحد مذہب ہے جو تاریخ کی روشنی میں پیدا ہوا ہے، جس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی اور افعال و اقوال کو محفوظ رکھا گیا ہے، جس کے رسول پر نازل ہونے والی کتاب تحریف سے پاک ہے اور جس مذہب کے پیروؤں نے ہر دور میں تاریخی شعور کا ثبوت دیا ہے۔ تاریخی شعور عقلیت کی نفی کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذہبِ اسلام میں وہ عقلیت پسندی موجود ہے جو سائنس کی نشو و ارتقاء کے لیے شرطِ اول قدم ہے۔

اسلام کا تاریخی شعور اس امر سے ظاہر ہے کہ ابتداء ہی سے مسلمانوں نے تاریخی وقائع کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا اور اسے اصول شہادت (Law of Evidence) کی بنیاد پر فراہم کیا۔ ان روایات کے ساڑھے پانچ لاکھ ناقلین کے حالات نقد و تحلیل کے ساتھ جمع کیے اور متضاد روایات کو پرکھنے کے لیے علم الاصول وضع کیا۔ اسلام کی زندگی کے ایک ہزار برسوں میں جتنا تاریخی سرمایہ ہمیں ملتا ہے، وہ دنیا کے کسی دوسرے بڑے مذہب کو نصیب نہیں ہو سکا۔

اس تاریخی شعور کا فطری اقتضاء یہ تھا کہ ایک واضح سماجی شعور بھی پیدا ہو۔ اس کا اندازہ اسلام کے سماجی قوانین کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں جو اصلاحات نافذ کیں وہ ایک نہایت ترقی یافتہ سماجی شعور کا پتہ دیتی ہیں۔ انھوں نے اعلان کیا:

> وَاللہ لَئِنْ بَقِیتُ الی ھذا العام المقبل لالحقن
> أخر الناس باولھم۔ ولاجعلنھم رجلاً واحداً۔
> "خدا کی قسم! اگر میں آنے والے سال تک زندہ رہ گیا
> تو آخری آدمی کو پہلے سے ملا دوں گا اور تمام انسانوں
> کو ایک جیسا بنا کر چھوڑ دوں گا۔"

دوسرے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

> واللہ لئن سلمنی اللہ لادعن ارامل اھل العراق
> لا یحتجن الی احد من بعدی ابداً
> "خدا کی قسم! اگر اللہ نے مجھے سلامت رکھا تو عراق کی

بیواؤں کو اس حالت میں چھوڑ جاؤں گا کہ وہ میرے بعد
ہرگز کسی کی دست نگر نہ رہیں۔"

عہد حاضر کے تقاضہائے حیات میں سماجی تحفظ Social Security کی اس سے زیادہ کون سی ضمانت دی گئی ہے؟ تاریخی اور سماجی شعور کسی قوم میں اتنا ترقی یافتہ ہو اور سائنسی شعور موجود نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے اسلام اپنے سیاسی انتشار کے دور میں بھی کبھی عقلیت اور سائنس کا حریف نہیں رہا۔ قرآن کریم کی پہلی وحی کا پہلا لفظ "اقراء" ہے۔ یعنی پڑھو۔ مگر اس کے آگے وہ بات ہے جو جدید مغربی سائنسی فکر کو نہیں بھاتی یعنی "باسم ربک الذی خلق"۔ یہیں سے اسلامی مذہبی فکر اور مغربی سائنسی فکر کا اختلاف شروع ہو جاتا ہے اور یہ فاصلہ بڑھتے بڑھتے بعد المشرقین میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

ہمارے قدیم علماء اور مفسرین بھی جب ادبیات تخلیق سے بحث کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اللہ تعالٰی نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا۔ قرآن قلم کی حرمت کی قسم کھاتا ہے۔ "ن والقلم وما یسطرون [۶۸-۱]۔ اور قلم کو وسیلہ علم سمجھتا ہے۔ "علّم بالقلم" [۹۶-۴] اور علم وہ ہے جو سب سے پہلے آدمؑ کو ودیعت کیا گیا اور جو اس کے لیے اشرف المخلوقات ہونے کا سبب بنا۔ "وعلّم آدم الاسماء کلھا" [۲-۳۱] یہ تعلیم خود مبدء فیاض سے ملی تھی۔ اس لیے انسان کو ملائکہ سے بھی افضل قرار دیا۔ اور کہا کہ "انّی اعلم مالا تعلمون" [۲-۳۰]۔ دوسرے مذاہب میں طاقت کے مختلف مظاہر کو دیوتا کہا جاتا ہے اور انسان سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ ان کو سجدہ کرے۔ یہاں فرشتوں کو (جو بمنزلہ دیوتا ہیں اور لفظ ایل یعنی الہ جن کے نام کا جز ہے) حکم دیا جاتا ہے کہ انسان کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ "واذ قلنا للملئکۃ اسجدوا لآدم فسجدوا الا ابلیس ابیٰ واستکبر وکان من الکافرین" [۲-۳۴] ابلیس نے سجدہ کرنے سے استکبار کے سبب انکار کیا، یعنی وہ فرشتوں کو انسان سے افضل ماننے والوں میں سے تھا، اس لیے اسے ابد تک کے لیے مظہر شر و فساد قرار دے دیا گیا۔ اس لیے کہ خیر و صلاح انسانی عظمت کا اعتراف کرنے ہی میں ہے۔ اس سے زیادہ عقلی اور سائنسی رویہ کیا ہو سکتا ہے؟ علم چونکہ شرف انسانیت ہے، اس لیے اس کا احترام بھی واجب قرار دیا گیا۔ یعنی ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اگر خود علم حاصل نہ کرے تو علماء سے محبت اور ان کا احترام کرے اور علم کے پانچ مدارج مقرر کیے۔

اول العلم الصمت والثانی الاستماع والثالث
الحفظ والرابع العمل والخامس نشرہ۔

جدید اصطلاح میں علم Science ہی کو کہتے ہیں۔ اس سے یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ علم کے بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ صرف علم دین تک محدود ہے۔ علمائے قدیم نے تمام علوم کو سمیٹ کر دو خانوں میں بانٹ دیا۔ ایک کو وہ منقول کہتے ہیں جس کا تعلق تاریخی شعور سے ہے۔ دوسرے کو معقول کہا جاتا ہے جس کی بنیاد عقلیت پسندی پر ہے۔ مشہور مقولہ ہے: العلم عِلمانِ عِلمُ الاَدیانِ وَعِلمُ الاَبدانِ۔ یعنی علم کی دو قسمیں ہیں PHYSICS اور METAPHYSICS ان میں سے کسی کو کمتر بتایا گیا ہے نہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دی گئی ہے۔ لیکن اسلامی سائنٹفک نظریہ یہی ہے کہ علم کی ان دونوں شاخوں کو ایک وحدت کے روپ میں دیکھا جائے، نہ ان کو ایک دوسرے سے بیگانہ سمجھا جائے نہ ان میں سے کسی کی نفی کی جائے۔ مغربی سائنسی فکر نے PHYSICS اور METAPHYSICS کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی عقائد سے عقلیت معدوم ہو گئی اور سائنس عقیدے سے محروم ہو گئی۔ ریاضی اور الجبرا میں بال کی کھال کھینچنے والی قوم آج بھی تثلیث میں وحدت، پر ایمان رکھتی ہے، چاہے ریاضی لاکھ سر پٹکے کہ تین ایک اور ایک تین کیسے ہو سکتے ہیں، مگر انھوں نے بنا کر دکھا دیا۔

اسلام میں بالکل ابتدا ہی سے حفظ روایات کا اہتمام ہوا، پھر تدوین و تحقیق شروع ہو گئی، اور اصول و کلیات وضع ہونے لگے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوالاسود الدؤلی کو عربی زبان کی قواعد لکھنے پر مامور کیا تو یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔ عہد بنی امیہ کے آغاز ہی میں علم الکیمیا خاصی ترقی کر چکا تھا۔ یزید بن ابی سفیان کو کیمیا سازی کا شوق تھا اور کشتے پھونکنے کے لیے اس نے متعدد قسم کے تیزاب ایجاد کیے تھے۔

اسلام ترقی علوم کے خلاف نہیں تھا، اس لیے عہد عباسی میں دار الحکمۃ قائم ہوا۔ سنسکرت اور یونانی اور فارسی سے طب، فلسفہ اور منطق

کی کتابوں کے تراجم ہونے لگے۔ سائنس کی ترقی سے اسلام کو کوئی خطرہ نہیں تھا اس لیے کہ قرآن نے خود بار بار دعوت دی ہے کہ اپنے نفس میں غور کرو۔ "وَفی أَنفسکم افلا تبصرون (۵۱-۲۱)" مظاہر کائنات میں غور و تدبر سے کام لو۔" "افلا ینظرون إلی الإبل کیف خلقت وإلی السماء کیف رفعت [۸۸-۱۷، ۱۸] پھر اس پر غور کرو کہ جو شے عدم سے وجود میں آئی ہے کیا وہ پھر وجود سے عدم میں نہ چلی جائے گی اور جو اسے ایک بار بار اس وجود دے سکتا ہے۔ کیا اسے یہ قدرت حاصل نہیں ہے کہ وہ بوسیدہ ہڈیوں میں پھر جان ڈال دے۔ غرض تفکر فی الکائنات اور حکمت تکوین میں تامل و تدبر قرآن کی اساسی تعلیم ہے۔ جتنا کائنات کے اسرار سے پردہ اٹھاتے جاؤ گے۔ اللہ کا خوف اپنے دل میں زیادہ پاؤ گے۔ "انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء [۳۵-۲۸]۔

عیسائیت نے سائنس کی مخالفت اس لیے کی تھی کہ وہ اسلام کی طرح حکمت تکوینی میں غور کرنے کی دعوت نہیں دیتی تھی۔ اسے اپنی بنیادیں متزلزل ہوتی نظر آئیں تو اس نے سائنس کی مخالفت میں محاذ قائم کر لیا۔ اور چوں کہ اس کی بنیاد عقلیت پسندی پر نہیں تھی، اس لیے سائنس سے اسے شکست کھانی پڑی۔ آخر سمجھوتا اس پر ہوا کہ علوم طبیعیات Physical Science سے خدا کو بے دخل کر دیا جائے۔ تم اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر خوش۔

اسلام نے کبھی عقلیت کی نفی نہیں کی اور طبیعیات و ما بعد الطبیعیات کے رشتے کو جوڑے رکھا۔ اس کی بہترین مثال یہ واقعہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا اتفاق سے اسی دن سورج گہن بھی ہو گیا۔ لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ ابراہیم کی وفات کے باعث ہوا ہے، صدمے سے سورج کا کلیجا بھی شق ہو گیا۔ ایک بے پڑھی لکھی قوم کے عقیدت مندوں کو اس عقیدے پر اور بھی راسخ کر دینا کچھ دشوار نہ تھا۔ ادنیٰ درجہ یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر خاموش رہتے، نہ اُن کی تائید کرتے نہ تردید۔ مگر آپ نے فرمایا۔

"ایھا الناس ان الشمس والقمر آیتان من آیات
اللہ لا ینکسفان لموت احد ولا لحیاۃ احد فاذا
رأیتم ذلک فافزعوا الی المساجد ودمعت عینا

"لوگو! چاند سورج اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، یہ کسی کی موت یا زندگی پر نہیں گہناتے، جب تم ایسا دیکھو تو مسجدوں میں جاؤ، عبادت کرو، یہ کہتے ہوئے آپ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

اس روایت میں بھی "فافزعوا الی المساجد" کے الفاظ طبیعیات وما بعد الطبیعیات کے رشتے کی گواہی دے رہے ہیں۔ مسلمان کبھی علوم سے بدکے نہیں۔ یونانی فلسفے کے عربی تراجم نے بہت سے عقائد پر کاری ضرب لگائی اور علماء کو لایعنی بحثوں میں الجھا دیا، تب بھی انھوں نے یونانی علوم پر اپنا دروازہ بند نہیں کیا۔ ان فلسفیوں کے نظریات کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا اور یونانی فلسفیوں کو مجبور کر دیا کہ وہ افلاطونی نظریات پر نظر ثانی کریں۔ یونانی فلسفہ عقیدے کی جڑ کاٹتا تھا، مسلمان علماء نے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے علم الکلام ایجاد کیا، جو عقیدے کے اثبات کے ساتھ حیات و کائنات کے مسائل پر بحث کر سکتا ہے۔

اسلام کا نظریہ حیات و کائنات اس کی اجازت نہیں دیتا کہ طبیعیات کو ما بعد الطبیعیات سے یا دوسرے لفظوں میں مادے کو روح سے علیحدہ کر کے دیکھا جائے۔ علم کی غایت عرفان ہے اور انسان کی حد تک عرفان کی منزل اعلیٰ عرفان نفس ہے، اس کا مظہر خشیت ہے اور خشیت قساوت قلبی کی ضد ہے۔ آج انسانی معاشرے میں جو قساوت (Callousness) نظر آ رہی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ جدید صنعتی و سائنسی معاشرت سے خوف خدا رخصت ہو گیا ہے۔ اسلامی نظریہ سے اگر سائنس کا استعمال کیا جاتا تو وہ خشیت پیدا کرتا۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَآءُ کا یہی مفہوم ہے اور بعض مفسرین ایک قراءۃ یوں بھی کرتے ہیں؛

انما یخشی اللہُ مِنْ عِبادِہ العلماءَ (یعنی اللہ اپنے بندوں میں سب سے زیادہ علماء کا لحاظ کرتا ہے)

اسلام کے پاس ایک بہت قیمتی سرمایہ ہے جسے چھوڑ کر وہ کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔ وہ ہے نظریہ آخرت [illegible] اس کی بنیاد یہ ہے کہ وہ زندگی میں کسی [illegible] اعمال کا حساب اسی کو دینا ہوگا جو کسی [illegible]

تہذیب نہ زندگی کا کوئی مقصد سمجھتی ہے نہ غایت اس لیے اس کے ہاں کوئی حساب کتاب بھی نہیں ہے۔ وہ تو کائنات کو اتفاقات کا ایک لامتناہی سلسلہ مانتی ہے۔ کیچڑ میں رینگنے والا کیڑا اور خلا تک جانے والا انسان، زندگی میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ رینگتے ہوئے کیڑے ترقی کر کے پرندے اور چوپائے بن گئے، چوپایوں میں سے ایک قسم بندر بن گئی، دوسری انسان۔ ہر جاندار اپنے ماحول میں خود کو ڈھالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور بقا کے لیے مسلسل جدوجہد میں لگا ہوا ہے اس نظریے کی رو سے انسان کا خود کو اشرف المخلوقات کہنا اپنے منہ میاں مٹھو بننا ہے۔ انسان سے زیادہ جہد للبقا میں کامیاب وہ رینگنے والے کیڑے ہیں جو کروڑوں برس سے ایک سی حالت میں زندہ ہیں، خواہ کیچڑ میں پڑے ہیں مگر انسان سے زیادہ مطمئن ہیں۔ مغربی نظریہ حیات میں انسان ایک بے دُم کا لنگور ہے جو ایک بے مقصد زندگی گزارنے کے لیے اسی طرح پیدا ہوا ہے جیسے مکھی، مچھر، جھینگے اور کیچوے پیدا ہوئے ہیں۔ اشرفیت اور افضلیت کہاں سے آ گئی؟ جب جہد للبقا میں برابر ہو گئے تو احترام انسانیت کا نظریہ بھی باطل ہو گیا۔ مگر قرآن بار بار عظمت انسانیت کا نعرہ بلند کر رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ زندگی ایک اتفاقی عمل نہیں ہے، اس کا کوئی عامل ہے جو خالق ہے، رب ہے، رزاق ہے، محی ہے، ممیت ہے، قاہر ہے، قادر ہے، وغیرہ۔ اس نے انسان کو کسی مقصد سے پیدا کیا ہے۔
" افحسبتم انما خلقناکم عبثا و انکم الینا لا ترجعون " [۲۳-۱۱۵]
وہ زندگی کے اعمال کا حساب لے گا۔ اس نے انسان کو شرافت و کرامت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ " ولقد کرمنا بنی آدم " [۱۷-۷۰] اوصاف سے متصف کیا ہے، " ونفخت فیہ من روحی " [۱۵-۲۹] اور دوسرے مخلوقات کے مقابلے میں بہترین قوام سے انسان کو اٹھایا ہے، " لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم " [۹۵-۴]

انسان کے اعمال اسے شرف و فضیلت کا حقدار بنا دیتے ہیں " ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم " [۴۹-۱۳] اور اچھے اعمال ساری کائنات کی اصلاح اور احترام انسانیت کی بقا کے ضامن ہوتے ہیں۔ [illegible] احترام انسانیت ہو۔

یہودیوں پر جو فردِ جرم قرآن میں عائد کی گئی ہے۔ اس میں قتل انبیاء و رسل اور تحریف صحف سماوی کے ساتھ ہی سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ وہ اصلاح کے نام پر فساد پیدا کرتے ہیں اور اس پر اصرار کرتے ہیں۔ " واذا قیل لھم لا تفسدوا فی الارض قالوا انما نحن مصلحون o الا انھم ھم المفسدون ولکن لا یشعرون " [۲-۱۱]

آج کی دنیا میں دو بڑے انقلاب آئے ہیں۔ ایک سماجی علوم کی سطح پر اشتراکیت کا فلسفہ دوسرے سائنسی علوم میں نظریہ اضافیت اور ایٹم کی دریافت۔ دونوں کے موجد دو یہودی ہیں۔ کارل مارکس اور آئن اسٹائن۔ اشتراکیت نے انسانی سماج سے خدا کو بے دخل کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا ہے، وہ صرف مادی زندگی میں یقین رکھتی ہے، اس کے نزدیک ماورائے مادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ انسانیت پر اس کے مضر اثرات کا جائزہ لینا اس مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں ہے ایٹم کی دریافت نے بکثرت ایسے تباہ کن ہتھیار بنا کر رکھ دیے ہیں کہ اگر ان میں سے چند بھی استعمال ہو گئے اور کسی محوری جگہ پر گرا دیے گئے تو یہ زمین اپنے مدار سے سرک جائے گی، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اس نظام شمسی سے نکل کر پاش پاش ہو جائے گی۔ اب بتائیے کہ یہ اصلاح کے نام پر فساد ہے کہ نہیں؟

آج سائنس کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اسے کوئی مقصد اور غایت مل جائے، ورنہ اس کی زندگی بہت مختصر ہے۔ اتنے بہت سے اسباب ہلاکت فراہم ہونے کے بعد بھی یہ توقع کرنا کہ دنیا اسی طرح چلتی رہے گی اور سائنس یوں ہی نئے آفاق کا کھوج لگاتی رہے گی، جنت الحمقاء میں رہنے کے مترادف ہے۔ امن عالم کی بقا کے لیے کھوکھلے نعرے، کانفرنسیں، ترک اسلحہ کے وقتی معاہدے، غیر جانب داروں کا گٹھ جوڑ، یہ سب کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اصل ضرورت یہی ہے کہ طبیعیات و مابعد الطبیعیات کے درمیان کھنچی ہوئی دیوار کو گرایا جائے، مذہب کو عقل سے کچھ مزید روشنی ملے گی اور عقل کو مذہب سے کچھ گداز حاصل ہوگا۔ ورنہ ساری انسانی اقدار ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گی۔ اور سیاست و قیادت صرف تشکیک کے ہاتھوں میں رہ جائے گی۔ اور ظاہر ہے کہ اس کارزار حیات میں [illegible]

مغرب میں مادیت کی بڑھتی ہوئی لے بھی ایک ردِ عمل ہے اس لیے کہ ان ملکوں کو صدیوں تک مطالعۂ فطرت سے محروم رکھا گیا۔ جب انھوں نے چرچ سے بغاوت کرکے فطرت کا مطالعہ شروع کیا تو اپنی سائنسی فکر سے عقیدے کو بے دخل کر دیا، اسی طرح گویا "نظریۂ وجود" و وجودیت ہی بالکل الٹا ہو گیا۔ مادی فلسفے میں وجود کچھ نہیں یہ ایک بے حقیقت موہوم اور متغیر مظہر ہے۔ مادے اور کائنات میں حرکت ایک میکانکی عمل ہے جس کا کوئی عامل نہیں، اس لیے وہ بے مقصد بھی ہے۔ اسلام نے زندگی اور موت دونوں کو بامقصد بتایا ہے۔

خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً [۶۷-۲]

اگر کائنات کی علت کون حرکت مادی ہو تو وجود خداوندی کا اثبات کون سی منطق سے ممکن ہے؟

اس لیے مغربی تہذیب میں جو کچھ بچا کھچا تصورِ الوہیت ہے وہ بھی سر اسر بے بنیاد ہو جاتا ہے۔ جب مادے کو حقیقت اعلیٰ مان لیا گیا تو اس کے ماورا جو کچھ ہے وہ لازماً باطل ہوا۔ روح بھی ماورائے مادہ ہے لہٰذا وہ بھی باطل ہوئی۔ حق کا کوئی تصور مادے سے جدا ہو کر ممکن ہی نہیں رہا۔

جب روح اور نفس باطل ہو گئے تو ان پر جو انکشاف ہوگا اسے کیسے حقیقت مانا جا سکتا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم خود اپنے وجود کی نفی کر رہے ہیں۔ عقل بھی مادی علتوں کا ایک غیر موثر معلول ہے۔ یہ بے اثر معلول ایک ازلی و ابدی حقیقت اعلیٰ کا راز دار کیسے بن سکتا ہے؟

نفس اور عقل کوئی مادی شے نہیں ہیں۔ مگر یہ مادی جسم میں پیدا ہو رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ مادہ کوئی غیر مادی شے کیسے پیدا کر سکتا ہے؟ سائنس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ مادے کی میکانکی حرکت نے جسم میں تو جان ڈال دی، لیکن یہ عقل کہاں سے آئی؟ قرآن کے پاس اس کا سیدھا سا جواب موجود ہے۔

قل الروح من امر ربی [۱۷-۸۵] ونفخت فیہ من روحی [۱۵-۲۹] ونحن اقرب الیہ من حبل الورید [۵۰-۱۶]

اس کے مان لینے سے سائنس کے نظریات تلپٹ نہیں ہو جاتے۔ انھیں ایک مضبوط فکری اور مابعد الطبیعیاتی بنیاد مل جاتی ہے۔ جدید سائنس یہودیت اور عیسائیت کے ہاتھوں میں پڑ کر انسان کے لیے ہی نہیں سارے نظام کائنات کے لیے ایک زبردست خطرہ بن گئی ہے۔ یہاں سے مسلمان علماء کا قصور شروع ہوتا ہے۔

اسلام ہی وہ مذہب تھا جو سائنس کو ایک اعلیٰ اور ارفع مقصد و غایت دے سکتا تھا۔ اور مسلمان ہی اسے اصلاح فی الارض کا وسیلہ بنا سکتے تھے۔ اگر مسلمان علماء نے اجتہاد فی العلوم کے دروازے بند نہ کر دیے ہوتے اور علم الادیان کے ساتھ ہی علم الابدان کو بھی لے کر چلے ہوتے تو سائنس ایسی گم کردہ راہ نہ ہوتی جیسی کہ آج ہے۔ یہ جو کچھ زرق برق ایجادیں ہیں یہ سب ہوتیں، بس ان کا مقصد اور مصرف مختلف ہوتا۔ اسلام اور سائنس کی ترکیب و امتزاج سے دنیا کو توحید کا بھی ایک سائنسی تصور مل سکتا ہے اور آخرت کا بھی۔ سائنس کی زندگی بھی زیادہ طویل ہوتی اور اس سے صالح انسانوں کا وہ طبقہ پیدا ہوتا جسے زمین کا وارث کہا گیا ہے۔

لیکن ماضی تمنائی کے ان صیغوں میں گفتگو کرنے سے کیا ہوتا ہے سائنس اپنے راستے پر آگے نکل گئی ہے اور مسلمان اپنے خواب فراموش میں مست ہیں۔ نقصان انسانیت کا نہیں پوری کائنات کا ہو رہا ہے۔ ایک سوچنے والا باشعور ذہن سب سے زیادہ کرب و اذیت میں مبتلا ہے۔ وہ نہ سائنس کو بغیر تصورِ حقیقت اعلیٰ کے مان سکتا ہے اور نہ حقیقت اعلیٰ کے کسی غیر سائنسی تصور پر قناعت کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر ثریا ڈار

علامہ فضل حق خیرآبادی

علامہ فضل حق خیرآبادی جادۂ آزادی کے رہبر و مجاہد اعظم علمی وادبی کمالات میں مسلم الثبوت اور عزم وثبات کے پیکر تھے بلند پایہ محقق، اور ادبی دنیا میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ آپ ۱۲۱۲ھ — ۱۷۹۷ء میں اپنے آبائی وطن خیرالبلاد خیرآباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے جلیل القدر والد گرامی جناب فضل امام خیرآبادی دارالسلطنت دہلی میں صدر الصدور کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی کا سلسلۂ نسب خلیفۂ ثانی امیر المومنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ باغی ہندوستان میں آپ کا شجرۂ نسب یوں بیان کیا گیا ہے۔

"علامہ فضل حق بن مولانا فضل امام بن شیخ محمد ارشد ہرگامی بن حافظ محمد صالح بن ملا عبدالواحد بن عبدالماجد بن قاضی صدرالدین بن قاضی اسمٰعیل ہرگامی بن قاضی عمادالدین بدایونی بن شیخ ارزانی بن شیخ منور بن شیخ خطیرالملک بن شیخ سالار بن شیخ وجیہ الملک بن شیخ بہاء الدین بن شیر ملک شاہ ایرانی بن شاہ عطا الملک بن ملک بادشاہ بن ابوالفتح ملک بن محمد عمر حاکم ملک بن عادل ملک بن فاروقی بن جرجیس بن احمد بن محمد شہریار بن محمد عثمان بن ہامان بن ہمایوں بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن امیرالمومنین خلیفۃ المسلمین حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ" (۱)

علامہ فضل حق خیرآبادی کے اسلاف ایران کے ایک حصہ پر کافی عرصہ تک حکمراں رہے۔ گردش ایام کے باعث حکمرانی سے دست بردار ہو گئے۔ بعد ازاں علمی خدمات کو خاندانی شعار بنالیا۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ شیر الملک بن شاہ عطاء الملک کے دو صاحبزادوں بہاء الدین اور شمس الدین نے علوم و فنون میں بلند مقام حاصل کیا۔ ظاہری اور باطنی علوم میں کامل دونوں بزرگ ایران سے ہندوستان وارد ہوئے۔ فضل و کمال میں اعلیٰ مقام رکھنے کے باعث بہاء الدین قبۃ الاسلام بدایوں میں قاضی اور شمس الدین رہتک کے مفتی اعظم مقرر ہوئے۔ مفتی شمس الدین کے صاحبزادے ملا کمال الدین کے نامور پوتے شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم دہلوی تھے اور بہاء الدین کے صاحبزادے وجیہ الملک کے پوتے شیخ ارزانی بدایوں میں رہے، پھر شیخ ارزانی نے اپنے بیٹے عمادالدین کو تحصیل علم کی خاطر قاضی ہرگام کی خدمت اقدس میں بھیجا۔ قاضی ہرگام آپ کے علم و فضل، شرافت و نجابت اور ذاتی وجاہت و حسن اخلاق کے باعث بہت متاثر ہوئے اور اپنی دختر نیک اختر سے عقد کر کے آپ کو اپنی فرزندی میں لے لیا۔ قاضی صاحب موصوف کے انتقال کے بعد آپ ہرگام کے قاضی ہو گئے۔ آپ کے بعد آپ کے بیٹے قاضی اسمٰعیل اور پوتے قاضی صدرالدین بھی ہرگام کے قاضی رہے۔ قاضی صدرالدین کے بیٹے عبدالماجد اور پوتے عبدالواحد بھی اپنے عہد کے فاضل اجل تھے۔ ملا عبدالواحد کے صاحبزادے اور علامہ فضل حق خیرآبادی کے پر دادا حافظ محمد صالح، محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں منصب جلیلہ پر فائز تھے۔ حافظ صاحب کے بیٹے اور علامہ فضل حق خیرآبادی کے دادا شیخ محمد ارشد ہرگامی ہرگام کو چھوڑ کر خیرآباد ضلع سیتاپور اودھ میں سکونت پذیر ہوئے۔ علامہ صاحب کے والد محترم فضل امام خیرآبادی

صدر الصدور دہلی تھے۔

مولانا فضل حق خیرآبادی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد گرامی سے حاصل کی۔ اس دور کے دوسرے طلبہ کی طرح ایک طرف تو علم معقول کی تحصیل کے لیے اپنے والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دوسری طرف علم منقول یعنی حدیث، فقہ اور تفسیر وغیرہ کے لیے شاہ عبد العزیز محدث دہلوی اور شاہ عبد القادر محدث دہلوی کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کرتے۔ علامہ صاحب نے آٹھ برس کی عمر میں صرف ونحو کی طرف توجہ مبذول کی۔ قوی الحافظہ اور ذہین وفطین ہونے کے باعث چار ماہ کی قلیل مدت میں قرآن پاک حفظ کرلیا اور تیرہ برس کی عمر میں تمام مروّجہ علوم عقلیہ ونقلیہ سے فراغت حاصل کی۔

آپ نسبًا فاروقی، فقہی لحاظ سے حنفی اور عقائد میں ماتریدی تھے۔ آپ نے سلسلہ چشتیہ میں حضرت شاہ دھومن دہلوی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس لیے مولوی رحمان علی "تذکرہ علمائے ہند" میں انھیں "عمری، حنفی، ماتری، چشتی" لکھتے ہیں

رئیس زادہ ہونے کے باعث علامہ فضل حق خیرآبادی مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی کی معیت میں ہاتھی پر سوار ہوکر تحصیل علم کے لیے شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے۔

مولوی فضل حق صاحب اور مفتی صدر الدین جس روز خود کتاب لے کر جاتے، اس روز شاہ عبد القادر صاحب سبق پڑھاتے تھے اور جس روز خدمت گار کتاب ساتھ لے کر پہنچا، اس روز کشف سے مطلع ہوکر سبق نہ پڑھاتے۔" (۲)

علامہ صاحب علوم عربی میں مہارت تامہ رکھنے کے ساتھ ساتھ درسی مضامین ریاضی، منطق اور ہیئت کے ایک ایسے بحر زخار تھے کہ استفادہ کرنے والے ہمیشہ مطمئن لوٹتے تھے۔ "باغی ہندوستان" میں آپ کی ذہانت کی ایک روشن مثال موجود ہے کہ "شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے جب ردّ شیعہ میں تحفۂ اثنا عشریہ" محققانہ انداز میں تحریر فرمائی تو شیعان ہند کی طرح اہل تشیع ایران میں بھی ہیجان پیدا ہوا۔ ایران سے میر باقر داماد صاحب "افق المبین" کے خاندان کا متبحر عالم اور مجتہد، اونٹوں پر کتب فریقین لادکر شاہ صاحب سے مناظرہ کے لیے دہلی پہنچا۔ خانقاہ میں داخل ہونے پر شاہ صاحب نے فرائض میزبانی ادا فرماتے ہوئے قیام کے لیے مناسب جگہ تجویز فرماکر رخت سفر رکھوایا۔ شام کو فضل حق حاضر ہوئے تو شاہ صاحب کو مصروف مہمان نوازی دیکھ کر کیفیت معلوم کی۔ تھوڑی دیر حاضر خدمت رہ کر بعد مغرب مجتہد صاحب کی خدمت میں پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد کچھ علمی گفتگو کا سلسلہ شروع کردیا۔ مجتہد صاحب نے پھر پوچھا۔ "میاں صاحبزادے کیا پڑھتے ہو؟ عرض کیا، شرح اشارات، شفا اور افق المبین وغیرہ دیکھتا ہوں۔ مجتہد صاحب کو بہت حیرت ہوئی "افق المبین" کی کسی عبارت کا مطلب پوچھ لیا۔ علامہ نے ایسی مدلل تقریر کی کہ "صاحب افق المبین" پر متعدد اعتراضات کرگئے۔ معزز مہمان نے اعتراضات کی جواب دہی کی کوشش کی تو ان کے لیے جان چھڑانا اور بھی مشکل ہوگیا۔ جب خوب عاجز کرلیا تو اپنے شبہات کے ایسے انداز میں جوابات دیے کہ تمام ہمراہی علماء بھی انگشت بدنداں ہوگئے۔ آخر آپ نے یہ اظہار بھی کردیا کہ حضرت شاہ عبد العزیز کا شاگرد اور کفش بردار ہوں اور اظہار معذرت کرتے ہوئے رخصت ہوئے۔" (۳) ایرانی عالم یہ سن کر بہت متاثر ہوا اور اندازہ کرلیا کہ اس خانقاہ کے بچوں کے علم وفضل کا جب یہ عالم ہے تو خود شیخ خانقاہ خدا جانے کیسا ہوگا؟

"صاحب تذکرہ علمائے ہند" آپ کی ذہانت اور حسن بیان کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"دوازدہ صد وشصت وچہار ہجری موقعے کہ بمقام لکھنؤ بخدمتش رسیدہ دیدم کہ در میان کشتی وشطرنج بازی تلمیذی را سبق افق المبین میداد ومطالب کتاب را بہ تلمیذ با حسن بیانی دل نشین می نمودہ" (۴)

علامہ فضل حق خیرآبادی نے تیرہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس دور کے دستور کے مطابق والد محترم کے ارشاد پر درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔

غرض کہ ۱۸۰۹ء سے لے کر ۱۸۵۸ء تک مسلسل پچاس برس تک سلسلہ تدریس جاری رہا۔ اس دوران میں فرائض ملازمت کی انجام دہی کے ساتھ تصنیف وتالیف میں بھی مشغول رہے لیکن یہ تمام امور آپ کے سلسلۂ تدریس میں کبھی بھی حائل نہ ہوئے۔

مولانا فضل امام خیرآبادی کے انتقال کے وقت علامہ صاحب کی عمر اٹھائیس برس تھی۔ خاندانی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لیے دہلی کے محکمۂ ریذیڈنٹ کے سررشتہ دار مقرر ہوگئے۔ کچھ عرصہ بعد آپ نے ریذیڈنسی کمشنری میں اپنی تبدیلی کروالی۔ نازک مزاجی کے باعث جب یہ ملازمت بھی راس نہ آئی تو استعفیٰ پر ہی بات ختم ہوئی۔ پھر نواب فیض محمد خاں والیٔ جھجر نے پانچ سو روپے ماہوار پر نہایت عزت واحترام کے ساتھ اپنے پاس بلالیا۔ کچھ عرصے جھجر میں قیام پذیر رہنے کے بعد مہاراجہ الور کی دعوت پر الور چلے آئے۔ بعد ازاں نواب ٹونک اور پھر ریاست رام پور میں ملازمت اختیار کرلی، وہاں نواب یوسف علی خاں نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے۔ آٹھ برس رامپور میں قیام کرنے کے بعد لکھنؤ کے صدرالصدور بنا دیے گئے۔ جب ملک میں ابتری وانتشار کو فرو کرنے کے لیے ایک کچہری "حضور تحصیل" کے نام سے بنائی گئی تو علامہ فضل حق صاحب نے زمانۂ ملازمت میں تمام امور نہایت تندہی، ایمانداری اور دیانت داری سے سرانجام دیے۔

علامہ فضل حق اگرچہ خیرآباد میں پیدا ہوئے لیکن انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ دہلی میں گزارا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے چند سال لکھنؤ میں صدرالصدور کے عہدے پر فائز رہے۔ وہاں کے حالات دہلی سے بھی ابتر تھے۔ اس دوران میں مسجد ہنومان گڑھی (متصل اجودھیا) کا خونی واقعہ پیش آیا۔ مسلمانوں کو وہاں اذان دینے اور نماز پڑھنے سے روک دیا گیا۔ اگر کوئی مسلمان نماز کا وقت ہونے پر اذان دینے کے لیے چلا جاتا تو اسے لہولہان کرکے نکال دیا جاتا۔ آخر کار ذی قعدہ ۱۲۷۱ھ جولائی ۱۸۵۵ء میں شاہ غلام حسین اور مولوی محمد صالح مجاہدین کے ایک گروہ کے ساتھ کفار کا مقابلہ کرنے کے لیے ہنومان گڑھی پہنچے۔ کفار سے زبردست مقابلہ ہوا۔ نتیجتاً تمام مجاہدین مسجد کے اندر ذبح کر دیے گئے۔ کفار جوتے پہن کر مسجد میں گھس گئے، سنکھ بجائے گئے اور (نعوذ باللہ) قرآن کے نسخے پرزے پرزے کرکے پاؤں تلے روندے گئے۔ اس سنگین خونی حادثے کی اطلاع مولانا شاہ امیر علی ساکن امیٹھی کو ملی تو انھوں نے جوشیلی تقریروں کے ذریعے مسلمانوں کو جہاد کرنے پر آمادہ کرلیا۔ کفار کے خلاف جہاد میں حصہ لینے والوں کے امیر، امیر علی شاہ تھے۔ یہ مسلمان مجاہدین بھی سرکاری فوج کے ہاتھوں ختم ہوئے۔ اس اثنا میں علامہ فضل حق خیرآبادی، مفتی سعد اللہ رام پوری اور مولوی محمد یوسف فرنگی محلی نے مولوی امیر علی اور جہاد ہنومان گڑھی کے خلاف فتویٰ دیا۔ مگر علامہ فضل حق خیرآبادی نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مردانہ وار حصہ لیتے ہوئے اس واقعے کی پوری پوری تلافی کردی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے وقت علامہ صاحب الور میں مقیم تھے۔ اگست ۱۸۵۷ء کو علامہ الور سے دہلی پہنچے — مسلمانوں کی دو جماعتیں، جن میں ایک جماعت مجاہدین کی اور دوسری جنرل بخت خاں کے ماتحت روہیلوں کی تھی، دشمنوں سے لڑ رہی تھیں۔ علامہ فضل حق نے جنرل بخت سے ملاقات کی اور باہمی مشورے سے جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد علماء کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فتویٰ پیش کیا، جس پر مفتی صدرالدین خاں آزردہ صدرالصدور دہلی، مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی

اور سید مبارک شاہ رام پوری نے دستخط کیے۔ اس فتوے سے پورے ملک میں آگ لگ گئی۔ کمپنی کی فوج نے ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہر دہلی پر حملہ کر دیا اور ۱۹ ستمبر کو پورے دہلی شہر پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ جنرل بخت خاں اپنی فوج اور توپ خانہ کے ساتھ لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ اس دوران میں بے شمار لوگوں کو گولیوں سے اڑا دیا گیا۔ کئی کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا اور متعدد لوگ دہلی چھوڑ کر غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ علامہ فضل حق بھی فتوے کی بنا پر باغی قرار دیے گئے۔ قید ہونے سے پہلے اہل و عیال کے ساتھ کچھ مدت چھپے رہے۔ بالآخر جب ملکہ وکٹوریہ نے عفو عام کا اعلان کیا تو علامہ صاحب اپنے وطن خیر آباد پہنچ گئے۔ اپنے رسالے الثورۃ الھندیہ میں فرماتے ہیں؛

" غافلا عن انہ لا ایمان لمن لیس لہ ایمان
وانہ یمین بعد الیمین، من لا یتدین بدین و
لا یخاف یوم الدین"، (الخ)

خیر آباد میں چند روز تو نہایت سکون و اطمینان سے گزر گئے، لیکن دو آدمیوں کی مخبری کرنے پر آپ کو آپ کے گھر سے گرفتار کر کے مقدمے کے لیے لکھنؤ بھیج دیا گیا اور اُن پر سلطنت مغلیہ سے وفاداری یا فتوے جہاد پر جرم بغاوت میں مقدمہ چلا۔

" مولانا موصوف کے فیصلے کے لیے جیوری بیٹھی۔ ایک اسیسر نے واقعات سن کر بالکل چھوڑنے کا فیصلہ کیا، سرکاری وکیل کے مقابل خود مولانا بحث کرتے تھے بلکہ لطف یہ تھا کہ چند الزام اپنے اوپر خود قائم کیے اور پھر خود ہی خیل تار عنکبوت عقلی و قانونی ادلّہ سے توڑ دیے۔ جج یہ رنگ دیکھ کر پریشان تھا اور ان سے ہمدردی بھی تھی۔ جج نے صدر الصدوری کے عہد میں مولانا سے کچھ عرصے کام بھی سیکھا تھا۔ وہ مولانا کی عظمت اور تبحر سے بھی واقف تھا۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں۔ کرے تو کیا کرے۔ ظاہر یہ ہو رہا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں گے۔ سرکاری وکیل بھی لاجواب تھے۔"

دوسرا دن آخری دن تھا۔ مخبر بھی عدالت میں موجود تھا۔ اس نے عدالت میں آنے کے خوف سے اور پھر علامہ کی پُر وقار اور بارعب شخصیت سے متاثر ہو کر یہ کہہ دیا کہ یہ وہ فضل حق نہیں۔ لیکن علامہ صاحب نے اس کے بیان کی تصدیق و توثیق کرنے سے انکار کرتے ہوئے اس کے پہلے قول کی تائید کی اور فرمایا:

" پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی۔ اب عدالت میں میری صورت دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور جھوٹ بولا۔ وہ فتویٰ صحیح ہے، میرا لکھا ہوا ہے۔ اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔"

علامہ صاحب کے اس اقرار پر انھیں حبس دوام بہ عبور دریائے شور کا حکم سنا دیا گیا۔ بعد ازاں جزیرہ انڈومان روانہ کر دیا گیا۔ آپ نے اپنے علم و فضل اور تصنیف و تالیف کی بدولت اس بے آباد جزیرے کو بھی دار العلوم بنا دیا۔

علامہ صاحب نے اپنی پوری زندگی امیرانہ ٹھاٹھ سے گزاری تھی اور اب قید میں انھیں غیر معمولی مصائب اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں آپ کو بارکوں کی صفائی کرنے اور کوڑا کرکٹ جمع کر کے پھینکنے پر مامور کیا گیا۔ فرماتے ہیں؛

" میرے دشمن میری ایذا رسانی میں کوشاں اور میری ہلاکت کے درپے رہتے ہیں۔ میرے دوست میرے مرض کے مداوے سے لاچار ہیں۔ دشمنوں کے دل میں میری طرف سے بغض و کینہ مذہبی عقائد کی طرح راسخ ہو گیا ہے۔ ان کے پلید سینے کینہ و عداوت کے دفینے بن گئے ہیں۔ ان ظاہری اسباب پر نظر کرتے ہوئے میں اپنی نجات سے مایوس اور اپنی امیدوں کو منقطع پاتا ہوں۔"

انڈمان کی قید کے دوران آپ نے انگریز سپرنٹنڈنٹ کی

فارسی کی کتاب ہیئت کی عبارت درست کرکے دی، جس پر وہ بہت متاثر ہوا اور اس نے گورنمنٹ سے آپ کی رہائی کی سفارش کی۔ علامہ فضل حق کے صاحبزادے مولوی شمس الحق، خواجہ غلام غوث بے خبر اور میر منشی لیفٹیننٹ مغربی وشمالی صوبہ اودھ آپ کی رہائی کے لیے انتھک کوششوں میں مصروف تھے۔ رہائی کے احکام ملتے ہی مولوی شمس الحق انڈمان روانہ ہو گئے۔ جہاز سے اتر کر شہر میں گئے تو ایک بہت بڑے مجمع کے ساتھ ایک جنازہ بھی دکھائی دیا۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ یہ مولانا فضل حق خیرآبادی کا جنازہ ہے۔ علامہ صاحب ۱۲ر صفر ۱۲۷۸ھ ۱۹ر اگست ۱۸۶۱ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) مولوی شمس الحق بھی مایوسی کے عالم میں تدفین میں شریک ہوئے اور ناکام واپس لوٹے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی علم معقول کے امام و مجتہد اور عربی ادب کے بہت بڑے ماہر تھے۔ علمائے ہند میں سے عربی نثر اور نظم دونوں میں آپ کا کوئی ثانی نہ تھا۔ شاعری میں عرب کے شعرائے متاخرین پر سبقت لے گئے تھے۔ عروض و علم شعر میں اعلیٰ مقام رکھنے کے باعث چار ہزار سے زیادہ اشعار کہے۔ گویا آپ منطق و فلسفہ کے امام ہونے کے ساتھ ساتھ عربی ادب کے بلند پایہ ادیب اور شاعر بھی تھے۔ اس سلسلہ میں گل حسن شاہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ "علامہ صاحب نے ایک قصیدہ عربی زبان میں امرءالقیس کے ایک قصیدہ کی طرز پر لکھا اور مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کی خدمت میں سنانے کی غرض سے لے گئے۔ شاہ صاحب نے ایک مقام پر اعتراض کیا۔ اس کے جواب میں انھوں نے بیس شعر متقدمین کے پڑھ دیے۔ مولوی فضل امام بھی اس وقت وہاں موجود تھے۔ وہ فرمانے لگے کہ بس حد ادب۔ علامہ نے جواب دیا کہ حضرت یہ کوئی علم تفسیر و حدیث تو ہے نہیں، فن شاعری ہے۔ اس میں بے ادبی کی کیا بات ہے؟ شاہ صاحب نے فرمایا کہ برخوردار تم سچ کہتے ہو مجھ کو سہو ہوا تھا۔" (۵)

دہلی میں علامہ فضل حق کے ہاں روزانہ صاحب علم و فضل اور باکمال لوگوں کی نشست رہتی تھی۔ دہلی میں دو مقام ایسے تھے، جہاں پر علماء و شعراء کا اجتماع رہتا تھا۔ ایک علامہ کے ہاں اور دوسرا مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی کے دولت کدے پر۔ علامہ فضل حق خیرآبادی کے علمی دربار میں آٹھویں دن شعرائے دہلی کا اجتماع ہوتا تھا۔ "بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر، مولوی امام بخش صہبائی، علامہ عبداللہ خاں علوی، حکیم مومن خاں مومن، مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی، مرزا اسداللہ خاں غالب، نواب ضیاءالدین خاں نیّر، شاہ نصیر الدین نصیر، شیخ محمد ابراہیم ذوق، حکیم آغا خاں عیش، حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان، میر حسین تسکین اور خدا جانے کتنے سخن وارانِ باکمال کا جمگھٹا تھا۔ جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا۔" (۶)

علامہ صاحب نے بچپن سے جوانی میں قدم رکھتے ہی اپنے آبائی وطن خیرآباد اور اقامتی وطن دہلی میں علمی و ادبی مجالس اور شعر و شاعری کی صحبتوں میں رہتے ہوئے فنون ادبیہ میں مکمل مہارت حاصل کر لی تھی۔ سخن فہمی اور نکتہ پروری میں بلند مقام رکھتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے دیوان اردو کے انتخاب کا سہرا مولانا خیرآبادی اور مرزا خاں کے سر باندھا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں ان کا دیوان بہت بڑا تھا، یہ منتخب ہے۔ مولوی فضل حق خیرآبادی فاضل بے عدیل تھے۔ ایک زمانے میں دہلی کی عدالت ضلع میں سررشتہ دار تھے۔ اسی عہد میں مرزا خاں عرف مرزا خانی خان صاحب کوتوال شہر رہے۔ وہ مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ نظم و نثر فارسی اچھی لکھتے تھے۔ غرض کہ یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے۔ انھوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار

عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے ۔ مرزا نے کہا ، اتنا کچھ کہہ چکا ۔ اب تدارک کیا ہو سکتا ہے ؟ انھوں نے کہا ، خیر جو ہوا سو ہوا ۔ انتخاب کر و اور مشکل شعر نکال ڈالو ۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالے کر دیا ۔ .... دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا ۔ وہ یہی دیوان ہے جو آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں " (۷)

علامہ صاحب کا علمی کمال نہ صرف اردو ادب میں جلوہ گر ہے ، بلکہ آپ نے عربی زبان میں حضور پاک کی مدح اور کفار کی ہجو میں قصائد لکھے اور مرثیوں میں بھی طبع آزمائی کی ۔ اس کے ساتھ ساتھ فارسی زبان میں بھی یکتائے روزگار تھے اور فارسی شاعری میں انھوں نے اپنا تخلص " فرقتی " رکھا ۔ فصاحت و بلاغت اور روانی سلاست میں بیسیوں خطوط ، مضامین اور مقالات لکھے ، گویا آپ تمام علوم میں فاضل کامل اور متبحر عالم تھے ۔ سر سید احمد خاں علامہ صاحب کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں ۔

" مستجمع کمالات صوری و معنوی جامع فضائل ظاہری و باطنی بنا فضل و افضال بہار آرائے چمنستان کمال .... مبطل باطل و محقق حق ، مولانا محمد فضل حق جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا ان ہی کے فکر عالی نے بنا ڈالی ہے ۔ علمائے بلد میں فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سر گروہ اہل کمال کے حضور میں بساط مناظرہ آراستہ کر سکیں بار بار دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو یگانۂ فن سمجھتے تھے ، جب ان کی زبان سے ایک حرف سنا ، دعوی کمال کو فراموش کر کے نسبت شاگردی کو اپنا فخر سمجھے ۔ باایں ہمہ کمالات علم و ادب میں ایسا علم سرفرازی بلند کیا ہے کہ فصاحت کے واسطے ان کی عبارت شستہ محضر عروج معارج ہے اور بلاغت کے واسطے ان کی طبع رسا دست آویز بلندی مدارج ہے ۔ سحبان کو ان کی فصاحت سے سرمایہ خوش بیانی اور امرء القیس کو ان کے افکار بلند سے دستگاہ عروج معانی الفاظ پاکیزہ ان کے رشک گوہر خوش آب اور معانی رنگین ان کے غیرت لعل ناب ہیں " (۸)

گویا مولانا ایک فرد روزگار کامل و فاضل اور فلسفی تھے ۔ آپ کی جودت طبع رسائی ، ذہنی بلند خیالی اور دقیق النظری بے نظیر تھی ۔ ایک دفعہ مولوی اکرام اللہ شہابی نے شمس العلماء مولانا عبدالحق سے پوچھا بھائی صاحب اب دنیا میں حکیم کا اطلاق کن کن پر ہے ۔ مولانا کہنے لگے بھئی ساڑھے تین حکیم دنیا میں ہیں ، ایک معلم اول [ارسطو] دوسرے معلم ثانی [ابو نصر فارابی] تیسرے والد ماجد مولانا فضل حق خیر آبادی اور نصف بندہ ۔"

تصانیف :

علامہ فضل حق خیر آبادی نے اپنی عمر کے پچاس برس درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں بسر کیے ۔ اس دوران میں انھوں نے فرائض ملازمت کو بڑی تندہی اور ایمان داری سے سرانجام دیا ۔ لیکن یہ گوناگوں مصروفیات درس و تدریس اور معرکۃ الآراء تصنیفات کے سلسلہ میں کبھی بھی حائل نہ ہوئیں اگر ایک طرف آپ نے شاہانہ خلعت میں ملبوس ہو کر مختلف زبانوں میں کتب و رسائل کی تالیف کی تو دوسری طرف ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں خوفناک مصائب اور الم ناک حالات میں جزیرہ انڈمان میں محبوس فقیرانہ لباس میں ملبوس ہو کر بھی اپنے سلسلہ تصنیف کو نہ چھوڑا ۔ آپ کی تمام کتب میں ادبیت کی چاشنی اور فصاحت و بلاغت کی بلندی نمایاں ہے ۔ " باغی ہندوستان " میں آپ کی کتب کی حسب ذیل فہرست موجود ہے ۔

" الجنس العالی شرح جواہر العالی ، حاشیہ افق المبین ، حاشیہ تلخیص الشفا ، حاشیہ شرح مسلم قاضی مبارک ، اسی شرح کے معرکۃ الآرا مباحث کی فہرست " الثورۃ الہندیہ " میں موجود ہے ۔ اس کتاب کے بارے میں جزیرۂ انڈمان میں بعض

اسیر فرنگ علماء نے دریافت کیا کہ ہندوستان میں کیا یادگار
چھوڑی ہے۔ فرمایا دو یادگاریں چھوڑ کر آیا ہوں۔ ایک حاشیہ
شرح مسلم قاضی مبارک گوپاموی اور دوسری یادگار برخوردار ۸
عبدالحق۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ صاحب اپنی اس تصنیف
پر کس قدر فخر کرتے تھے۔

الہدیہ السعیدیہ فی الحکمۃ الطبیعیہ: یہ فلسفہ اور حکمت
کے موضوع پر ایک عمدہ اور مستند تصنیف ہے۔ اس کتاب میں ۹
زمین کی حرکت پر شرح و بسط کے ساتھ براہین قائم کرنے کے
بعد موجودہ سائنس کی تحقیقات کو غلط ثابت کرکے مخالفین کے
دلائل کو مسترد کر دیا ہے۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اور تین فنون
پر مشتمل ہے اور آج تک ہند اور بیرون ہند میں داخل نصاب
ہے۔ اس کتاب کا نام والی رام پور نواب محمد سعید خاں کے
نام پر رکھا گیا اور اس کی تصنیف کا سبب بھی نواب صاحب ہی
تھے۔ اس کے علاوہ موصوف نے درج ذیل کتابیں تصنیف کیں۔ ۱۰
رسالہ تشکیک ماہیات، رسالہ کلی طبعی، رسالہ علم و
معلوم، روض المجود فی تحقیق حقیقۃ الوجود، رسالہ قاطیغوریاس
رسالہ تحقیق حقیقۃ الاجسام، رسالہ الثورۃ الہندیہ، قصائد فتنۃ
الہند — قصائد فتنۃ الہند ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے
درد انگیز تاریخی واقعات، المناک حادثات، مجاہدین کی جلاوطنی
حبس دوام بہ عبور دریائے شور، مردوں، عورتوں اور بچوں
کا قتل عام اور مسلط حکومت کے مظالم کی دل ہلا دینے والی
خونی داستان ہے، جسے علامہ فضل حق صاحب نے جزیرہ انڈمان
میں حالت محبوسی میں مختلف کاغذ کے پرزوں اور کپڑوں پر
کوئلہ وغیرہ سے لکھا تھا اور جناب مفتی عنایت احمد کاکوروی
م ۱۲۷۷ھ کی رہائی پر ان کے ہاتھ اپنے خلف الرشید مولانا
عبدالحق خیرآبادی کے پاس بھیج دیا تھا۔ اس رسالے میں "قصائد
فتنۃ الہند" کو بڑی محنت و کاوش سے مرتب کیا تھا۔ ان
دو عربی قصائد ہمزیہ اور دالیہ میں اس وقت کے ہولناک
مصائب اور نصاریٰ کے خوفناک عزائم کا ذکر کرتے ہوئے علمائے
مجاہدین کے اعلان جہاد کو وقت کی اہمیت کے مطابق اشد ضروری
قرار دیا ہے۔ گویا الثورۃ الہندیہ اور قصائد فتنۃ الہند آپ کے
علمی و ادبی شاہکار ہیں۔

مجموعہ القصائد، امتناع النظیر، تحقیق الفتویٰ فی ابطال
الطغویٰ۔

مندرجہ بالا تصنیفات میں چار پانچ کے علاوہ باقی سب
غیر مطبوعہ ہیں۔ "الثورۃ الہندیہ" میں شروانی صاحب نے ان
سولہ تصنیفات کا ذکر کیا ہے۔ جب کہ تاریخ ادبیات عربی جلد دوم
میں علامہ صاحب کی ۲۳ کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی
بیوی کے بطن سے تین صاحبزادیاں اور ایک صاحب زادہ یعنی
شمس العلماء مولانا عبدالحق اور دوسری اہلیہ سے دو صاحبزادے
مولوی شمس الحق اور مولوی علاء الحق تھے۔

حوالہ جات۔

۱۔ عبدالشاہد خاں شروانی، باغی ہندوستان۔ ص ۱۲
اخبار مدینہ بجنور طبع اوّل ۱۹۴۷ء
۳۔ اشرف علی تھانوی، امیر الروایات۔ ص ۱۰۵۔ کتب خانہ
امداد الغربا سہارن پور
۴۔ مولوی رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۶۴، ۱۶۵
۱۔ عبدالشاہد خاں شروانی، باغی ہندوستان۔ ص ۲۱۶
۵۔ مولانا محمد حسن شاہ پانی پتی، تذکرہ غوثیہ۔ ص ۱۳۷
۶۔ سید عبدالحی لکھنوی، گل رعنا۔ ص ۲۳۰۔ طبع شدہ
لکھنؤ ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ
۷۔ محمد حسین آزاد، آب حیات۔ ص ۶۴۵، ۶۴۶۔ سرفراز
پریس لکھنؤ۔
۸۔ سرسید احمد خاں، آثار الصنادید۔ ص ۱۱۔ سید الاخبار

مستنصر حسین تارڑ

بیروت میں چند روز

دھماکہ اتنا شدید تھا کہ میں بے اختیار لڑکھڑاتا ہوا بستر سے فرش پر منتقل ہو گیا۔ اسی لمحہ کھڑکی کا ایک بڑا شیشہ فریم سے جُدا ہو کر قالین پر آگرا۔ میں سانس روک کے چادر میں ایک ممی کی طرح لیٹا پڑا رہا۔ باہر رات تھی۔ کمرے کے ٹھہرے ہوئے اندھیرے میں حرکت ہوئی ..... احمد جو میری طرح فرش پر پھینک دیا گیا تھا، دھیرے سے اُٹھا اور نیند میں چلنے والے ایک بچے کی طرح ہاتھ پھیلائے پھر بستر پر دراز ہو گیا......

ایک اور زور دار دھماکہ ہوا۔ کھڑکی کے بقیہ شیشے کانپے

"احمد!"

"کیا ہے؟" وہ تکیے میں سے بڑبڑایا۔

"یہ دھماکے کیسے ہیں؟"

"سو جاؤ۔ کچھ بھی نہیں۔"

"لیکن کیسے سو جاؤں؟" میں نے جھلا کر کہا۔ "باہر تو نہیں کیا کیا چل رہا ہے؟"

"ہینڈ گرینیڈ پھٹے ہیں، شاید اسی عمارت کے کسی حصے میں ..... سو جاؤ۔ سو جاؤ۔"

احمد کی بے اعتنائی میرے لیے ناقابلِ فہم تھی۔ باہر جو کچھ بھی پھٹ رہا ہے، اگر کھڑکی کے راستے اندر آ گرے اور کمرے میں پھٹ جائے تو! مگر وہ دودھ سے سیراب ہو کر سونے والے بچے کی طرح پاؤں پسارے چھوٹے چھوٹے خرّاٹے لے رہا تھا۔ میں بدن پر لپٹی ہوئی چادر سمیت لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور رینگتا ہوا بستر پر لیٹ گیا... تھوڑی دیر بعد مشین گن کا ایک برسٹ فائر ہوا..... میں ایک ہنہناتے ہوئے قہقہے کے انتظار میں رہا، مگر وہ مجھ تک نہ پہنچا۔ صرف دوڑتے ہوئے قدم اور آوازوں کا ملا جُلا شور ..... اس فائر کا جواب کہیں دور سے آیا اور پھر باقاعدہ تبادلہ شروع ہو گیا۔ فائرنگ کی آواز بے حد معصوم اور جعلی لگ رہی تھی۔ جیسے کوئی کھوپڑی کٹکٹا رہی ہے یا ٹین کی چھت پر کنکر برس رہے ہیں۔

اس دوران ایک اور دھماکہ سنائی دیا۔ کانوں کے قریب شاید ہماری کھڑکی کے عین نیچے۔ فائرنگ اتنی گھنی اور شدید ہو رہی تھی کہ کسی ایک مشین گن کا آہنی بہاؤ علیحدہ ہو نہیں پاتا تھا...

ایک دم میرے ذہن میں یہ خدشہ ابھرا کہ ہو سکتا ہے حملہ آور فلانجی ہوں اور پچھلے اپریل کی طرح آج بھی اس ہوٹل میں گھس کر مہمان حضرات کو شہید وغیرہ کر دیں۔

"احمد" میری آواز میں خطرے کا گھگھیاتا ہوا سائرن تھا۔

"سو جاؤ" ایک انتہائی بیزار آواز آئی۔

"احمد! کیا تم جانتے ہو کہ فلانجیوں نے پچھلے اپریل اسی ہوٹل میں مقیم چند مہمانوں کو ہلاک کر ڈالا تھا"

"ہاں"

"تو پھر"

"تو پھر کیا ..... ہوتا ہی رہتا ہے سو جاؤ"

میں بستر سے اُٹھا اور جھکا ہوا احمد کے قریب چلا گیا "اگر کسی نے کھڑکی میں سے ہینڈ گرینیڈ پھینک دیا تو؟"

احمد مجبوراً اُٹھ بیٹھا۔ "تم خوفزدہ ہو؟"

"بُری طرح"

"یااللہ ایسے ہتھیار کے بغیر کوئی بےسہارا محسوس کرتا ہے"۔
وہ جمائیاں لیتا ہوا بستر سے اُترا۔ اپنا سوٹ کیس گھسیٹ کر باہر نکالا اور استری شدہ قمیص اور بنیانوں کی تہہ میں ہاتھ ڈال کر ایک پستول نکالا اور مجھے تھما دیا۔ "بھرا ہوا ہے۔ دروازے والی دیوار کے کونے میں بیٹھ جاؤ اور اگر دروازہ یک دم کھلے تو..... شوٹ"۔

"شوٹ!" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

وہ شاید اندھیرے میں مسکرایا ہوگا۔

میں کونے میں جا کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد احساس ہوا کہ میں نے پستول کو ویسے ہی تھام رکھا ہے۔ لبلبی پر انگلی نہیں جمائی اور نہ ہی نالی کا رُخ دروازے کی جانب کیا ہے۔ چنانچہ بڑی مشکل سے لبلبی تلاش کر کے انگلی لپیٹی اور اسے سیدھا کر دیا۔

"اب تو خوف زدہ نہیں ہو۔؟"

"اب بھی ہوں" دروازے کا تو بندوبست ہو گیا ہے مگر کھڑکی میں سے آنے والے ہینڈ گرینیڈ کا کیا ہوگا"۔

"اس کے بارے میں کچھ نہیں ہو سکتا....." اس نے پاؤں بستر پر رکھے اور لیٹ گیا۔

"کھڑکی بند تو کی جا سکتی ہے نا"

"شیشہ کی ہے، فرق نہیں پڑے گا" وہ اونگھنے لگا "موت کا ایک دن معین ہے۔ اس کا ایمان غیر متزلزل دکھائی دیتا تھا۔

باہر متواتر فائرنگ ہو رہی تھی، چیزیں ٹوٹ رہی تھیں۔ میں نے یوں کونے میں چھپے سے ہاتھ میں پستول تھامے اپنے آپ کو کچھ کچھ احمق محسوس کیا۔ "تمہیں اتنے شور میں نیند آ جاتی ہے؟"

وہ بڑبڑایا "کون سے شور میں؟" اور آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ "ہاں یہ....." اس نے سستی سے پھر اپنا سوٹ کیس کھولا ایک اور پستول نکالا اور کمرے کے دوسرے کونے میں جا بیٹھا۔ "اب خوش ہو؟"

میری آنکھیں دروازے پر اتنی شدت سے چپکی ہوئی تھیں کہ پپوٹے دکھ رہے تھے۔ کواڑ ہلتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ لبلبی پر لپٹی انگلی پسینے سے تر تھی۔ پھسلتی ہوئی۔ باہر سے آنے والی فائرنگ کی آواز جتنی شدت اختیار کرتی، اسی حساب سے پستول پر میری گرفت سخت تر ہو جاتی۔ جیسے میری نم انگلیوں میں گرم ہوتی یہ دھات میرے جسم کو بلٹ پروف بنا دے گی۔ یہ طلسمان ہے جو مجھے محفوظ رکھے گا۔ میں نے ایک لحظہ کے لیے دروازے سے نظریں ہٹائیں اور پستول کی نالی کو دیکھا جو میری ناک سے چھ انچ کے فاصلے پر خفیف سی لرز رہی تھی۔ اور پھر دروازے پر آنکھیں جما دیں..... میں نے پھر پستول کی طرف دیکھا..... میں یہاں کیا کر رہا ہوں، یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں نے اس گھڑے سے پیاس کیوں بجھائی جس میں دیوانگی، سیاحت کے پانی تھے کولہو کے بیل کی زندگی کتنی خوبصورت تھی۔ ایک ڈگر پر شب و روز ایک ہی روٹین کی تابع، برس ہا برس گزر جاتے ہیں اور وہی چہرے، وہی ایک ناشتے کی دوکان، چھ آنے پا، یوسف اوئے یوسف..... گھر واپسی پر ٹیلی ویژن کے سامنے بت بنے بیٹھے رہنا۔ لیکن اپنے گھر میں..... پرسکون، دھماکوں سے پاک۔ ٹھیک ہے اس زندگی کا حساب نہیں تھا مگر انسان متواتر زندہ تو رہتا ہے کبھی اس کی کھڑکی تلے گرینیڈ نہیں پھٹتے۔ مشین گنوں کے برسٹ نہیں چلتے۔ اور وہ ایک بھرے ہوئے پستول کو تھامے خون میں جتنی توجہ اور سکوت کی جتنی قوت ہوتی ہے، اسے آنکھوں کے راستے دروازے پر منتقل کرتا ہوا اگلے سانسوں کی بے یقینی میں تو سانس نہیں لیتا..... متواتر زندہ تو رہتا ہے۔

آج رات دس بجے ترک جہاز اکڈنیز بیروت کی بندرگاہ سے لنگر اُٹھا رہا تھا اور اس کا میں متوقع مسافر تھا..... پچھلے چند روز زیادہ تر اسی چھت کی نیم عافیت میں گزرے احمد ایک ہمدرد اور اپنے پتھر کے چہرے کے نیچے ایک سیاہ

حس مزاح رکھنے والا دوست اور ساتھی ثابت ہوا تھا۔ میں صرف خوراک خریدنے کے لیے باہر جاتا یا کبھی کبھار ہوٹل کی پشت پر واقع ایک دیسی قسم کے قہوہ خانے چلا جاتا، جس کا قہوہ شاید کسی سکون آور بوٹی سے کشید کیا جاتا تھا کہ میرے اعصابی تناؤ کو یک دم نارمل کر دیتا۔ اور حقے کے طویل کش مجھے آس پاس سے لمحاتی طور پر بے خبر کر دیتے۔ ایک دو مرتبہ الحمرا کی طرف نکل گیا۔ نصف سے زیادہ دکانیں بند تھیں اور سی تھرو خواتین یکسر غائب ہو چکی تھیں۔ البتہ ہنہناتے ہوئے قہقہے والا لبنانی کبھی مایوس نہیں کرتا، وقت کی پابندی کرتا اور پھر صبح شاید ہماری ہی تفریح کی خاطر دو چار برسٹ فائر کرتا چلاتا اور ہنس ہنس کر دوہرا ہو جاتا۔۔۔ میں اس کی آمد کا انتظار رہتا اور ایک صبح اس کے اپنے فائر کو سن کر میں نے اپنی گھڑی درست کی چار بج کر دس منٹ۔۔۔۔۔

تقریباً ایک گھنٹے سے ہینڈ گرنیڈ کا کوئی دھماکہ نہیں ہوا تھا۔ البتہ فائرنگ وقفوں سے ہو رہی تھی۔۔۔۔ اور آج رات دس بجے بیروت کی بندرگاہ سے ترک جہاز اکڈینز کو رواں ہونا تھا۔ اذیتوں سے سکون اور رعنائیوں کی طرف۔۔۔۔ صبح کے آثار کے ساتھ جیسے متحارب قوتوں کے ہاتھ تھکنے لگے اور چھ بجے کے قریب فائرنگ بالکل ختم ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ بازار میں حرکت پیدا ہوئی اور پھر وہ روزمرہ کی آوازوں سے بھر گیا۔۔۔۔ احمد منہ پر ہتھیلی رکھے تھکاوٹوں کو روکتا اٹھا۔۔۔۔ میں نے خالی ہاتھ سے پستول کی نال تھامی اور دستے پر سیمنٹ ہوئی انگلیوں سے بمشکل علیحدہ کیا۔

احمد نے پستول سوٹ کیس میں رکھے اور اپنے نقشے نکال کر بیٹھ گیا۔ "یہ آوازیں الگ نہیں ہیں، خوانچہ فروشوں کی دہائی، ٹریفک کا شور، بچوں کی آوازیں، فائرنگ اور دھماکے، یہ سب ایک ہی بہاؤ میں ہمارے کانوں تک پہنچی ہیں۔ اگر ہم ہر دھماکے پر چوکنے ہو کر پستول نکالتے رہے تو زندگی معطل ہو جائے۔"

"اور اگر فلانجی سچ مچ ہوٹل میں گھس آتے یا کھڑکی کے راستے ہینڈ گرنیڈ پھینک دیا جاتا تو؟"

وہ ہنسا۔ "تو پھر ہم یقیناً مارے جاتے، ویسے بھی پستول تھام کر نیند خراب کرنے کا ہمیں کچھ فائدہ نہ ہوتا۔۔۔۔ اگر فلانجی آ ہی جاتے تو وہ دروازہ توڑ کر اپنے ہینڈ گرنیڈ اندر پھینکتے، پھر داخل ہوتے اور ظاہر ہے تم اندر ہی رہتے مگر قدرے بکھرے ہوئے۔۔۔۔۔ اور اگر کھڑکی کے راستے ہینڈ گرنیڈ ہمارے قالین پر آگرتا تو کیا تم اسے پستول سے شوٹ کر دیتے؟ انسان کو ذہنی طور پر دفاع کے لیے تیار رہنا چاہیے ورنہ جس گولی کو تمہارے لیے آنا ہے وہ اپنا تعارف کروا کے تمہارے بدن میں داخل نہیں ہو گی۔"

میں نے فرش پر سے ٹوٹے ہوئے شیشے چنے اور ٹوکری میں پھینک دیے۔ بالکونی پر آیا تو نیچے بازار میں زندگی ایک بے خوف روانی سے حرکت کر رہی تھی۔ جیسے چند لمحے پیشتر کسی نے سڑک کے بیچ ایک اسٹریو ڈیک رکھ کر لوگوں کو دھماکوں اور گولیوں کی آوازیں سنائیں اور پھر کیسٹ ختم ہونے پر چلا گیا، کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

ناشتے کے بعد میں سروس ٹیکسی کے ذریعے سفارت خانہ پہنچا تو میر صاحب اپنے کمرے میں موجود نہ تھے۔ دو گھنٹوں کے بعد جب وہ آئے تو قدرے پریشان آئے۔ مجھے دیکھ کر مزید پریشان ہو گئے۔ "آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"بیروت چھوڑنے سے پیشتر خدا حافظ کہنے آیا تھا۔"

"خدا حافظ۔" انھوں نے عجلت سے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"آپ ہوٹل سے فون پر ہی بات کر لیتے تو بہتر تھا۔۔۔ مگر آپ یہاں تک آ کیسے گئے؟"

"سروس ٹیکسی سے۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ صنائع اسکوائر کے قریب آج صبح کیا ہوا ہے؟"

"جو کچھ ہوا ہے وہ میری کھڑکی کے عین نیچے ہوا ہے۔ مگر اب تو حالات نارمل تھے"

"فی الحال" میر صاحب کچھ زیادہ ہی فکرمند تھے "آپ کا جہاز کتنے بجے چل رہا ہے؟"

"رات دس بجے"

"اور بندرگاہ سے چلے گا"

"ظاہر ہے"

"مگر بندرگاہ تو......" انھوں نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک کلرک اندر داخل ہوا۔ "عزیز کو بلاؤ"

عزیز آگیا۔ ڈھلتی عمر کا ایک گورا چٹا جچا تلا سا شخص۔

"عزیز ویسے تو ہمارے ہاں ڈرائیور ہے مگر بیروت شہر کو اس سے بہتر کوئی نہیں جانتا" گویا یہ شخص بیروت کے سفارت خانے کا محمد علی تھا۔

میر صاحب نے میرا تعارف کروایا کہ یہ میرے دوست ہیں آج رات دس بجے ان کا جہاز چلے گا اور بندرگاہ سے چلے گا.... تم کیا کہتے ہو؟"

"یہ نہیں جا سکتے" عزیز نے سستی سے کہا

"آپ نہیں جا سکتے" میر صاحب نے فوراً تائید کی۔

"کیوں"

جہاز میں سوار ہونے کے لیے آپ کو بندرگاہ پہنچنا ہوگا اور وہاں آپ پہنچ نہیں سکتے۔ کیوں کہ آج صبح بیروت پولیس نے ریڈیو پر جن خطرناک علاقوں کا اعلان کیا ہے۔ بندرگاہ ان میں سرفہرست ہے"

"عزیز صاحب اگر میں اپنی بالکونی سے جھانکوں تو بندرگاہ نظر آجاتی ہے.... میرے خیال میں تو......"

بندرگاہ تک پہنچنے کے لیے آپ کو اس علاقے میں سے گزرنا ہوگا، جہاں حرکت کرتی ہوئی ہر شے پر فائرنگ ہو رہی ہے..... مجھے افسوس ہے کہ آپ اس جہاز پر سوار نہیں ہو سکتے"

"اگر میں اس جہاز پر سوار نہیں ہوا عزیز صاحب تو ٹکٹ کے ایک سو ڈالر ضائع ہوتے ہیں...."

اور اگر آپ سوار ہونے کی کوشش کرتے ہیں"۔ عزیز لاپروائی اور سستی سے بولا۔ "تو آپ کی زندگی ضائع ہوتی ہے"

میں نے پچھلے پانچ روز اس آس میں گزارے تھے کہ بالآخر زندہ عذاب میں مبتلا اس شہر سے نکل جاؤں گا۔ اس سے پیشتر کہ زمین بھی گرم ہو جائے جس پر میں کھڑا تھا اور میرے سامنے ایک آہنی دروازہ تھا۔ اس کو ہاتھ لگا کر کھولنا چاہتا ہوں تو ہو سکتا ہے اس میں بجلی کی لہر دوڑ رہی ہو اور اگر نہیں کھولتا تو شاید بجلی کی وہی لہر دھیرے دھیرے اس زمین میں بھی آجائے جس پر میں کھڑا تھا۔ نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے!

"میں کوشش کرنا چاہتا ہوں" میں نے اپنے آپ کو یقین دلانے کے لیے سر جھٹکا "میں پہنچ جاؤں گا"

عزیز نے فون اٹھا کر بیروت پولیس کے ہنگامی دفتر سے بات کی اور پھر شہر کے ایک نقشے پر سرخ نشان لگا کر میرے حوالے کر دیا

"میں نے اس پر بندرگاہ جانے تک کے لیے ایک روٹ بنایا ہے۔ جو پولیس کے مطابق نسبتاً کم خطرناک ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور سے کہیے گا کہ صرف اسی راستے پر چلے اور اللہ آپ کی مدد کرے"

"خدا حافظ" میر صاحب نے جلدی سے ہاتھ آگے کر دیا۔ ان کے چہرے پر میری آخری رسومات تھیں۔

ٹیکسی کے لیے الحمرا پہنچا تو احساس ہوا کہ عزیز کی اطلاعات درست تھیں۔ لوگ ہراساں خرگوشوں کی طرح چوکنے ہو رہے تھے جھانک جھانک کر چل رہے تھے۔ کوئی گلی آئی تو رک کے جھانک کر اطمینان کیا اور پھر جلدی سے عبور کر گئے۔ ان کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ دکانوں کے شٹر گرے ہوئے تھے.... حمرا سکوائر میں بھی یہی کیفیت تھی۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے احمد کو پوری تفصیل بتائی، وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اٹھا اور بالکونی میں جا کر دو تین ہاتھ پر بندرگاہ کی طرف دیکھا۔ واپس آیا اور بیٹھ گیا۔ "حالات چاہے کتنے ہی خطرناک کیوں نہ ہوں۔ سڑک پر سے گزرنے والی ہر ٹیکسی اور ہر شخص پر فائر نہیں ہوتا۔ تمہارا جہاز کتنے بجے چلنا ہے؟"

رات دس بجے۔"

"ہوں" اس نے چند لمحے قالین کو گھورنے میں گزارے اور پھر سر اٹھا کر بولا "یہ ضروری تو نہیں کہ تم رات کو ہی یہاں سے نکلو۔ جہاز تو اس وقت بھی بندرگاہ میں کھڑا ہوگا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد فوراً چلے جاؤ۔"

"اور اگر جہاز وہاں موجود نہ ہوا تو۔"

"تو تم بندرگاہ کے اندر انتظار کر سکتے ہو۔ وہاں نسبتاً محفوظ رہو گے۔"

تین بجے ہم ہوٹل کی سیڑھیوں سے نیچے اترے۔ میں رک سیک کاندھے پر رکھے اور احمد جیکٹ کی جیب میں پستول رکھے۔

ٹیکسی رکتی۔ احمد "مینا" کا لفظ ادا کرتا اور ڈرائیور ہماری سادہ لوحی پر مسکراتا چلا جاتا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد ایک فلسطینی ٹیکسی ڈرائیور رکا۔ احمد خاصی دیر تک اس کے ساتھ گفتگو کرتا رہا۔

"میں ساتھ نہ جاؤں تو تمہارے لیے بہتر ہے۔" احمد نے ایک پرجوش معانقہ کیا۔ "میں.... فلسطینی لگتا ہوں اور ہوں بھی۔ تم اکیلے بیٹھو گے تو زیادہ محفوظ رہو گے۔"

"کل صبح اس ہنہناتے ہوئے گھوڑے کو میرا سلام کہنا جو سپہر صبح کھڑکی کے نیچے مشین چلانے آجاتا ہے۔"

"میں صرف تمہاری خاطر ٹھہرا ہوا تھا، آج میں چلا جاؤں گا۔"

"کہاں"

"کہیں۔ واپسی کے دن کو قریب لانے کے لیے" پھر چہرے سے ہونٹ علیحدہ ہو کر صرف میرے لیے مسکرائے۔

ٹیکسی چلنے لگی تو وہ کھڑکی پر جھکا۔ "اسے پانچ ڈالر ادا کر دینا"

"پانچ ڈالر"۔ میں نے حیران ہو کر ڈرائیور سے پوچھا۔ ایک کلومیٹر کے لیے پانچ ڈالر؟" اس نے جواب دینے کے بجائے ایک ناراض نظر سے دیکھا کہ بھئی بڑے ناشکرے ہو۔

رودشی کا بوچین تک ٹیکسی ہموار رفتار سے چلتی رہی۔ ٹریفک بھی تھی لوگ بھی نظر آرہے تھے۔

ایک چوک آیا۔ آگے کا سماں بالکل مختلف تھا۔ ڈرائیور نے بریک پر پاؤں رکھا اور گردن گھما کر کہنے لگا۔ "ہم سڑک کے دائیں ہاتھ پر چلیں گے، اس لیے بائیں کونے پر بیٹھ جاؤ۔ اپنا سامان ڈھال کے طور پر سینے کے آگے جما لو تاکہ اگر ادھر سے..... اور اگر ٹیکسی ایک دم رک جائے تو باہر کود جاؤ...." میں نے اس کی ہدایات پر عمل کیا اور رک سیک کو گھٹنوں پر رکھ کر کونے میں دبک گیا۔

ٹیکسی پھر چلی۔ چوک کے آگے جیسے کوئی نیا شہر شروع ہو گیا ہو۔ سرحد پار کوئی نئی آب و ہوا تھی.... ٹریفک نہ ہونے کے برابر۔ کھڑکیاں اور دروازوں کے پیچھے ایک آدھ سر جھانکتا ہوا اور خاموشی۔ ٹیکسی دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ شاید دس کلومیٹر کی رفتار سے.... کیونکہ تیز رفتار ٹیکسی پر ہمیشہ فائر ہوتا ہے۔ انھیں شک ہوتا ہے کہ اس میں سوار افراد گرینیڈ پھینک کر فرار ہونا چاہتے ہیں۔

میں کبھی کبھی کچھوے کی طرح گردن اونچی کر کے دائیں بائیں دیکھ لیتا.... ڈرائیور اپنے سامنے نظر ساکت کیے ہوئے ایک ہموار سست رفتار سے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا.... ایک برسٹ فائر ہونے کی آواز گونجی۔ ڈرائیور نے ایکسیلیٹر اس شدت سے دبایا، جیسے وہ پاؤں تلے آئے کسی موذی سانپ کو کچل دینا چاہتا ہو۔ میں دبکنے کی بجائے اتنا ہراساں ہوا کہ پہلے تو گردن اٹھا کر مڑ کے باہر دیکھنے لگا اور پھر فوراً ہی اپنے آپ کو نشست سے گرا کر رک سیک اپنے جسم پر گھسیٹ لیا۔ ٹیکسی کا انجن دھاڑتا ہوا شاید سوا سو کلومیٹر کی رفتار پر جا رہا تھا۔ ڈرائیور بھی شاید سیٹ کے نیچے بیٹھا ہاتھ سٹیرنگ پر رکھے ڈرائیو کرتا چلا جا رہا تھا۔ شاید دوسرے ہی لمحے ٹیکسی ایک شدید جھٹکے سے رکی۔ میں باہر کودنے کو تھا کہ ڈرائیور نے دروازہ کھول دیا۔

"آجاؤ" وہ ہنسنے لگا۔ "ہم بندرگاہ میں پہنچ چکے ہیں۔"

میں باہر آیا تو وہ ٹیکسی کے گرد گھوم کر معائنہ کرنے لگا، رکا، جھکا اور دو انگلیاں دو صاف ستھرے سوراخوں میں ڈال دیں۔ "میرا خیال ہے امریکی ساخت کی مشین گن تھی۔ سوراخوں کا سائز تو وہی ہے۔"

"میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ گولیوں کے چھید میری طرف کے

دروازے میں تھے

کرایہ ادا کیا تو وہ پھر سوراخوں کا معائنہ کرنے لگا۔ "تم کہتے تھے کہ پانچ ڈالر بہت ہیں۔ ان سوراخوں کی مرمت پہ پورے پانچ ڈالر خرچ ہوں گے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور اپنے فقرے پر محظوظ ہوتا ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

ٹیکسی پھاٹک سے باہر نکل کر بیروت شہر کی طرف گئی تو میں نے پہلی مرتبہ بندرگاہ کو دیکھا۔ جہاز "ایکڈینیر" ڈاک میں کھڑا تھا۔ ترکی اور لبنان کے جھنڈے مستولوں کے ساتھ لپٹے لہرا رہے تھے... آزادی۔

دائیں ہاتھ پر کسٹم ہال تھا۔ میں اندر گیا۔ خالم خالی، بے آباد اور سجاں سجاں کرتا ہوا۔ ایک کمرے میں سے ٹائپ مشین کی آواز آ رہی تھی۔ دروازہ کھولا۔ اندر ایک کسٹم افسر مشین پر جھکا ہوا تھا۔ آہٹ سن کر وہ چونکا ہو گیا۔ مجھے دیکھا اور غصے سے بولا "کیا چاہتے ہو؟"

"میرا سامان چیک کر لیجیے، میں لبنان چھوڑ رہا ہوں۔"

اس نے شش شک کر مشین سے انگلیاں اٹھائیں کہ یہ سیاح کہہ کیا رہا ہے اور پھر انتہائی بے چارگی سے کہنے لگا۔ "بابا جاؤ جاؤ کوئی چیکنگ نہیں۔"

اکڈینیر کی خالی سیڑھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں رک سیک اٹھائے بندرگاہ کے خالی میدان میں سیٹیاں بجاتا اس کی طرف چلنے لگا۔

ایک لبنانی پولیس افسر کرسی میز سجائے اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں قریب سے گزرا تو اس نے پوچھا "پاسپورٹ؟" میں نے پاسپورٹ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اس نے تمام اوراق پلٹے اور پھر اپنے آپ میں مگن ہوتے ہوئے کہا "تم لبنان نہیں چھوڑ سکتے۔"

گرم چیونٹیوں کا ایک لشکر میرے مساموں میں رینگنے لگا "کیوں"

"تمہارے پاس لبنانی پولیس کا اجازت نامہ نہیں ہے۔" وہ اخبار میں مگن ہو گیا۔

"لیکن میرے پاس لبنان کا ویزا ہے اور میں لبنان چھوڑ رہا ہوں، اس میں داخل نہیں ہو رہا۔"

"تم اس وقت تک لبنان نہیں چھوڑ سکتے جب تک تمہارے پاس لبنانی پولیس کا "خروج" اجازت نامہ نہ ہو۔"

میرا جی چاہا کہ میں اپنا سامان وہیں پھینک کر سرپٹ بھاگتا ہوا جہاز میں جا گھسوں اور ترک بھائیوں سے سیاسی پناہ طلب کر لوں لیکن یہ لبنانی بھائی پستول سے مسلح تھا اور خوف زدہ خرگوش کو شکار کرنا کتنا آسان ہوتا ہے، چاہے وہ سرپٹ ہی کیوں نہ بھاگ رہا ہو۔

لبنانی پولیس کا دفتر ظاہر ہے شہر بیروت کے کسی حصے میں ہو گا اور اگر میں وہاں تک پہنچ بھی جاؤں تو اجازت نامہ حاصل کرنے میں ایک دو روز تو لگیں گے۔ چنانچہ خدا حافظ اکڈینیر اور ہیلو مائی ڈیر سٹی آف بیروت میں تمہارے پاس واپس آتا ہوں۔

"یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ جاؤ جا کر اجازت نامہ لے کر آؤ۔" وہ میری موجودگی سے بیزار ہو گیا۔ "تم اس کے بغیر جہاز پر سوار نہیں ہو سکتے۔"

"کیا آپ ازراہِ مہربانی بتا سکتے ہیں کہ یہ اجازت نامہ کہاں سے دستیاب ہوتا ہے؟" میں دنیا جہان سے بیزار ہو چکا تھا۔

"بندرگاہ کے پھاٹک سے باہر دائیں ہاتھ پر روڈ ہے تقریباً دو سو میٹر کے فاصلے پر پولیس کا دفتر ہے وہاں سے۔"

بندرگاہ سے باہر اس علاقے میں جہاں مہربان ڈرائیور کی ٹیکسی چھیدوں سے نوازی گئی تھی۔ میں نے سوچا آہستہ آہستہ چلنا خطرناک ثابت ہو چکا ہے، اس لیے کیوں نہ سامان یہاں رکھ کر ایک اولمپک ریکارڈ کی دوڑ لگا کر پولیس کے دفتر پہنچ جایا جائے۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" اس نے مجھے رک سیک کندھے سے اتار کر زمین پر رکھتے دیکھ لیا۔

"سامان رکھ رہا ہوں۔ ذرا اجازت نامہ لے آؤں۔"

"لے جاؤ لے جاؤ" وہ رک سیک کو اپنی چھڑی سے دھکیلتا ہوا بولا۔ "اگر تم ادھر راستے میں مارے جاؤ تو میں اس سامان کے بارے میں خواہ مخواہ وضاحتیں پیش کرتا رہوں گا۔"

بندرگاہ کے پھاٹک کے باہر وہی ویرانی تھی جو اندر تھی مگر اس میں گھنی چھوٹی جھاڑی سبز گھاس کا خوف تھا، جس میں سانپ رینگتے ہیں۔ میں نے دائیں ہاتھ پر جھانکا۔ دو سو میٹر کے فاصلے پر ایک عمارت

کے ماتھے میں سے نکلتے ہوئے بانس پر لبنان کا پرچم لہرا رہا تھا۔ لبنانی پولیس کا دفتر..... دو سو میٹر... جو مجھے پیدل طے کرنا تھا۔

میں نے دانت بھینچے، رک سیک کے سٹریپ میں انگوٹھے ڈالے اور سر جھکا کر سڑک کے عین درمیان میں آہستہ آہستہ چلنے لگا..... مجھ پر رک سیک کے علاوہ ان تمام کھڑکیوں اور دروازوں کا بوجھ جھک رہا تھا جو میرے دائیں اور بائیں مکانوں میں مجھے دیکھ رہے تھے اور ان چہروں اور دہانوں کا بوجھ بھی تھا جو ویران سڑک کے وسط میں چلتے ہوئے ایک پیکر کو دیکھ رہے، اس کی قومیت اور رنگ کے بارے میں تذبذب میں تھے۔ اس کی حماقت کے بارے میں تذبذب میں نہ تھے... خوف کا ہاتھ جسم کے اسپنج کو دبا رہا تھا، اس میں سے پسینہ پھوٹ رہا تھا... وہ مجھے دیکھ رہے تھے۔ آنکھیں اور شاید چمکتی ہوئی نالیوں کے منہ .... میں چل رہا تھا مگر اس میں نیت اور عمل کو دخل نہ تھا۔ بس میرے پاؤں میکانکی سپاہی کی طرح آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔ دھپ دھپ دائیں اور بائیں دوسری اور تیسری منزل پر کھڑکیاں تھیں، ان کے پیچھے پردے تھے۔ پردوں کے درمیان میں خلا کی ایک لکیر تھی، اس کے پیچھے کچھ ہو سکتا تھا۔ دستک ہو رہی تھی۔ دل کے دھڑکنے کی دستک جیسے ہاون دستہ مونجھ کوٹ رہا ہو۔ دھم، دھم، دھم۔ ایک سٹیریو ڈیک میرے اندر پوری والیوم پر کھلا تھا۔ شریانیں اس کی دھمک سے لرز رہی تھیں۔ دھم، دھم، دھم اور باہر کھڑکیوں اور دروازوں میں سے اترتی دہشت سے حاملہ خاموشی ..... جس گولی کو تمہارے لیے آنا ہے وہ اپنا تعارف کروا کے تمہارے بدن میں داخل نہیں ہو گی۔ لیکن کون سی کھڑکی میں سے کس دروازے کی اوٹ میں سے ..... جب گلے کا گھنگھرو بجنے لگے تو احساس ہوتا ہے کہ انسان نے ابھی اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی نہیں گزارا اور ختم..... دنیا کی وحشی خوبصورتی کے نئے رنگ دماغ میں زہریلے سانپوں کی طرح بھڑکتے ہیں..... میں کیسے ان سے جدا ہوں گا۔ دھم، دھم، دھم.... کل آسمان پر ایک پرندہ ٹھہرے گا اور میرے پاس اس کے دیکھنے کے لیے آنکھیں نہ ہوں گی۔

پولیس افسر نے اجازت نامے کی مہر پاسپورٹ پر ثبت کی اور میری طرف دیکھا "کیا بات ہے السیدی، تمہارا چہرہ سفید ہو رہا ہے۔ آپ ٹھیک تو ہیں؟"

"ہاں" میں نے پاسپورٹ جیب میں رکھا اور نزدیکی صوفے پر گر گیا۔

"آپ اس وقت کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"بندرگاہ سے۔"

"میں نے باہر ٹیکسی رکنے کی آواز نہیں سنی۔"

"میں پیدل آیا ہوں۔"

جیسے سرپٹ دوڑتا ہوا گھوڑا اپنے آگے کھائی دیکھ کر بدکتا ہے وہ ٹھٹھکا۔ "پیدل؟"..... صبح سے تین لاشیں آ چکی ہیں..... آپ کو یہ رسک نہیں لینا چاہیے تھا۔ اب آپ یہاں آرام کیجیے کوئی نہ کوئی مسافر اجازت نامہ حاصل کرنے آئے گا اور ہم آپ کو اس کے ہمراہ بھیج دیں گے ......" وہ تیزی سے پچھلے کمرے میں گیا اور ایک خنک مشروب لے آیا.... مشروب میرے گلے میں اگی کانٹوں کی فصل کو نرم کرتا بخار زدہ جسم میں پھیلنے لگا۔

ایک ایشین کتا ایک جرمن سیاح کو کھینچتا دفتر کے اندر آیا سیاح نے اجازت نامے کے لیے درخواست کی۔ پولیس افسر نے اس کے پاسپورٹ پر فوراً مہر لگا دی۔ "اور مسٹر کروگر آپ ہمارے دوست کو اپنی ٹیکسی میں بندرگاہ تک لے جا رہے ہیں؟"

"ضرور" جرمن نے سر ہلایا۔

ٹیکسی بندرگاہ میں رکی۔ میں نے اجازت نامے پر پولیس افسر سے مہر لگوائی اور .... اکلائینر کی سفید سیڑھی پر تھکے قدموں سے چڑھنے لگا۔ رک سیک کا بوجھ ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ آخری سیڑھی پر ایک لینکی امریکی کھڑا تھا۔ ڈھیلے بازوؤں اور ٹانگوں والا .... اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر میرا رک سیک اچک لیا "ویلکم ابورڈ" عرشے پر قدم رکھتے ہی اس نے پرانے دوستوں کی طرح گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔ میں تمام کارروائی یہاں سے دیکھ رہا تھا...... بوائے جب تم بندرگاہ کے پھاٹک سے نکلے ہو تو میں اپنی زندگی کی شرط لگانے کو تیار تھا کہ تم واپس نہیں آؤ گے .... ویلکم ابورڈ اکلائینر۔"

جہاز کے ترک عملے نے میرا ٹکٹ اور پاسپورٹ چیک کر کے رسید

نکلوری۔ ڈیک کلاس اپنے نام کے مطابق عرشے پر نہ تھی بلکہ جہاز کے پیٹ میں تھی۔ انجن روم سے ملحقہ ایک ہال نما کمرہ تھا جس میں یوتھ ہوسٹلوں کی طرز پر دو منزلہ بستروں کی قطاریں تھیں۔ میں نے ایک بالائی بستر پر سامان رکھا اور سیلون میں آگیا جہاں گرتھ میرا انتظار کر رہا تھا۔

"کچھ پیوگے؟"

"میرا خیال ہے مجھے اعتراض نہ ہوگا"

"سب سے پہلے تم مجھے اپنی زندگی کی کہانی سناؤ۔ پھر میں سناؤں گا"

میں نے مختصراً اپنی زندگی کی کہانی بیان کر دی۔

گرتھ دمشق کے امریکی اسکول میں ٹیچر تھا اور آج صبح امریکہ جانے والی پرواز کے لیے ایرلائن کی بس میں بیروت سے ایرپورٹ کی طرف روانہ ہوا تھا۔ ایرپورٹ سے چند میل ادھر شاہراہ پر فلانجی دہشت پسندوں نے بیری کیڈ کھڑا کر رکھا تھا۔ بس پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی اور ڈرائیور نے پھرتی سے بس کو شہر کی جانب موڑ لیا۔ شہر کے قریب پہنچے تو انھیں ایک اور بیری کیڈ کا سامنا کرنا پڑا جو فلسطینیوں کا تھا یہ بیری کیڈ پہلے موجود نہیں تھا بلکہ اس وقفہ کے دوران کھڑا کیا گیا جب وہ اس مقام سے گزر کر ایرپورٹ کو جا چکے تھے۔ یہاں بھی شین گنوں نے انھیں پیچھے مڑنے پر مجبور کر دیا۔ اب وہ کہیں بھی نہیں جا سکتے تھے۔ ایک جانب فلانجی ایرپورٹ کا راستہ روکے ہوئے تھے اور دوسری طرف فلسطینی شہر میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ بس میں سوار تین امریکی نوجوانوں نے فیصلہ کیا کہ سڑک چھوڑ کر یہاں سے سمندر تک پیدل جایا جائے اور وہاں سے کسی طور سے شہر پہنچا جائے۔ باقی مسافر تو کسی غیبی امداد کے انتظار میں بس میں دبکے رہے اور گرتھ اور دو امریکی چھپتے چھپاتے سمندر کی طرف چل دیے۔ ساحل پر پہنچ کر انھوں نے ایک مچھیرے سے اس کی کشتی کا سودا کیا اور اسے کھینچتے ہوئے بندرگاہ میں آگئے اور پھر یہاں بقول گرتھ بولے اور بوائے ہم کیا دیکھتے ہیں کہ بندرگاہ میں ایک جہاز اور یورپ جا رہا ہے اور آج ہی جا رہا ہے۔ چنانچہ ہم نے ماضی کی تمام محبوباؤں کو یاد کیا، ان کے بھوت چڑے اور جہاز میں داخل ہو گئے "خوش قسمتی ہم ایک کتیا ہو اور ہم تم سے محبت کرتے ہیں"

"مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے جہاز حرکت کر رہا ہے" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پھر منہ کھول کر ہنسنے لگا۔ جہاز حرکت نہیں کر رہا ہم شاید تھوڑا سا نشے میں ہوں کیوں کہ ابھی صرف پانچ بجے ہیں اور وقت روانگی دس بجے رات دیا گیا ہے"

"اگرچہ میں بالکل نشے میں نہیں ہوں مگر مجھے بھی کچھ دیر محسوس ہو رہا ہے جیسے جہاز چل رہا ہے.... مگر یہ ہو نہیں سکتا"

ہم دونوں اٹھ کر باہر عرشے پر آگئے.... ہم بندرگاہ سے دو کلومیٹر باہر آچکے تھے..... گرتھ ہر ایک سے پوچھتا پھرتا تھا" اس وقت دس بجے ہیں اور اگر صرف پانچ بجے ہیں تو جہاز کیوں چل رہا ہے۔ بالآخر عملے کے ایک رکن نے بتایا کہ بیروت کے حکام نے جہاز کو وارننگ دی تھی کہ وہ تاریکی ہونے کے بعد مسافروں اور عملے کی سلامتی کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ اس لیے فی الفور بندرگاہ خالی کر دی جائے"

"اور اُن مسافروں کا کیا ہوگا جو پروگرام کے مطابق رات نصف کے قریب جہاز پر سوار ہونے کے لیے آئیں گے"

"شام کے بعد بندرگاہ تک آنے کے لیے تو ہیلی کاپٹر درکار ہوں گے۔ جتنے مسافر آنے تھے آچکے"

عرشے پر صرف چند مسافر تھے جو ڈری ڈری آنکھوں سے بیروت کی پیچھے ہٹتی عمارتوں کو دیکھ رہے تھے۔ بندرگاہ کا ویران علاقہ فٹبال کے خالی میدان کی طرح دکھائی دے رہا تھا، اس کے پیچھے عمارتیں خاموش تھیں۔ ان عمارتوں میں لوگ انتظار کر رہے تھے۔ کس کے ہاتھ میں غلام ہے اور کس کے ہاتھ میں بادشاہ کوئی نہیں جانتا.... بندرگاہ سے دور ہو کر ہم ساحل کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ بھورا راکس نظر آنے لگیں اور ان کے پیچھے روشے کی ویران سڑک.... اکلوتی کار کا ایک نقطہ سڑک پر رینگ رہا تھا۔ شہر کا آسمانی منظر خوف سے عبارت تھا۔ کسی گھنی آبادی میں سے دھویں کا ایک ڈولتا مینار آسمان کو اٹھتا ہوا ابھر رہا تھا، یہاں سے بیروت مجھے بہت اکیلا دکھائی دیا۔ ساحل پر بیٹھا ہوا ایک دیوزاد گم شدہ بچہ جو آنے والے کل کی دہشت سے سہما ہوا تھا۔ لیکن میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ میرے ہاتھ میں نہ بادشاہ تھا اور

نہ غلام۔ میں صرف ایک تماشائی تھا اور موت کھیلنے والوں سے پہلے تماشائیوں کی طرف بڑھتی ہے۔ کیا موت کو میں واقعی بیروت میں چھوڑ آیا تھا؟ ڈیلفی کا اوریکل خاموش تھا.... مگر اس جہاز کو یونانی دیو مالا کے سمندروں میں سفر کرنا تھا۔ اڈویسیس کے سمندروں میں سے اور میں راستے میں ڈیلفی کے اوریکل کی مدد کا طلب گار ہو سکتا تھا .... تم عمارتیں بناتے ہو، گھر سجاتے ہو مگر تمہاری ہڈیاں بکھری ہوئی ہیں وہ صرف چند لمحوں کے لیے یکجا ہوئی ہیں۔ جتنی دیر تک ہو سکے ان ہڈیوں کو سمیٹ کر چلتے رہو۔ میں بیچاری فقیرنی سفر میں ہوں اور میری ہڈیوں کی گٹھڑی کو ہر کوئی چھو کے دیتا ہے، اسے کھول دینے کی کوشش کرتا ہے۔ "بول فقیرنی تیری گٹھڑی میں کیا ہے؟" اور میں اسے سینے سے لگائے رہی، لپیٹے رہی، افغانستان میں، بیروت میں میری اپنی ہڈیاں ہیں مائی باپ..... جب تک میرا ایک بال بھی موت سے بندھا ہوا ہے۔

"مستنصر ہمارا سفر نیک شگون سے شروع ہوا ہے۔" گرتھ نے سمندر میں ابلتے ہوئے راستے کی طرف اشارہ کیا جو ہمارے جہاز کے گزرنے سے وجود میں آرہا تھا۔

"دیکھو۔"

اور میں نے دیکھا۔ درجنوں ڈولفن مچھلیاں اچھلتی کودتی سیٹیاں بجاتی ہمارے جہاز کے پیچھے چلی آرہی تھیں۔

جہاز رانوں کی قدیم کتابوں میں آیا ہے کہ جس جہاز کے سفر کے آغاز میں ڈولفن مچھلیاں اس کا پیچھا کریں، اس کے مسافر سلامتی سے اپنی منزل کو پہنچتے ہیں..... کیا قدیم کتابوں میں لکھا ہر حرف سچ ثابت ہوتا ہے؟

ولیم سرینڈن
ترجمہ: مناظر عاشق ہرگانوی

اولڈ ڈاگ

بورژوائی نسل کے اس کتے کا نام "اولڈ ڈاگ" تھا اور اولڈ ڈاگ کا مالک میرا دوست جوآن ایزکبرڈو تھا۔ بورژوائی نسل کے کتے بڑے شاندار ہوتے ہیں۔ لیکن اولڈ ڈاگ بورژوائی ہوکر بھی روہانسے چہرے والا ایک عجیب کتا تھا، جسے دیکھ کر ترس آتا تھا۔ بال گندے سمٹ میلے اور شکل مرگلی سی تھی۔ وہ کسی ایک پیر سے لنگڑا کر بھی چلتا تھا اور اسے سونے کا بڑا شوق تھا۔ جہاں جگہ ملی پڑ جاتا تھا۔

اولڈ ڈاگ اکثر جوآن ایزکبرڈو کے ساتھ میرے گھر آتا تھا اور آتے ہی وہ گٹھری کی طرح برآمدے کے ایک کونے میں پڑ کر سو جاتا تھا۔ جب جوآن جانے لگتا تب وہ اسے ہلا کر جگاتا اور وہ اٹھ کر لنگڑاتا ہوا اپنے مالک سے شاشا چل پڑتا۔

اولڈ ڈاگ کو صرف جوآن سے محبت تھی اور وہ جوآن کا ہی کہا مانتا تھا۔ اگر وہ سویا ہوتا اور کوئی اسے اٹھانا چاہتا تو وہ اپنی مرضی سے ٹس سے مس نہ ہوتا۔ اسے راستے سے ہٹانے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا یعنی خود سے اٹھا کر کنارے کر دینا۔ مگر اسے اٹھانا بھی آسان نہیں تھا کیونکہ وہ بہت وزنی تھا۔

جوآن بھی اولڈ ڈاگ کو بہت مانتا تھا۔ دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ پیار اسے صرف اولڈ ڈاگ سے تھا۔ وہ بھائی بہن سے محروم تھا اور اس کے گھر میں بڑی بے اطمینانی رہتی تھی۔ گھر میں جسے وہ اپنا ساتھی، عزیز یا دوست کہہ سکے وہ اولڈ ڈاگ ہی تھا۔ مگر گھر کی بے اطمینانی کی خاص وجہ جوآن ہی تھا۔ بات یہ تھی کہ اس کی نانی بھی اسی گھر میں رہتی تھی اور جوآن کے والد اور نانی میں اکثر ان باتوں کو لے کر جھگڑا ہوتا رہتا تھا کہ جوآن کی تعلیم کہاں اور کس طرح ہونی چاہیے، اسے کیا کھانا دینا چاہیے اور اسے گھر میں کیا کام کرنا چاہیے۔

ایک دن جوآن کے والد بہت روہانسے ہوکر میری ماں سے بولے "ذرا دیکھیے نا، میری ساس کیسی زیادتی کرتی ہے، اسے اپنے لڑکے، بچے جس طرح پالنے تھے، پال چکی۔ اب میں اپنے بچے کو کیسے پالوں، پوسوں اس کی آزادی تو مجھے ہونی ہی چاہیے، ہے کہ نہیں؟"

میری ماں ان کی بات سے متفق تو ہوئیں مگر ان ہی کی طرح بے بسی سے سر ہلا کر رہ گئیں۔ دوسرے گھر کے جھگڑے میں بھلا وہ اپنی رائے دے بھی دیں تو کیا فرق پڑنے والا تھا۔

روز روز کے اس گھریلو جھگڑے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جوآن کی طرف سے سب کا دھیان ہٹ گیا۔ کبھی کبھی جوآن کی ماں بھی اپنی ماں اور شوہر کی بحث میں کود پڑتی تھیں اور کبھی ایک فریق کا ساتھ دینے لگتیں، تو کبھی دوسرے کا۔ لیکن بہت بار ایسا بھی ہوتا کہ بجائے کسی ایک فریق کا ساتھ دینے کے وہ خود اپنی آزاد رائے لے کر میدان میں اتر پڑتیں۔ اور ایسے موقعوں پر تینوں میں اپنی اپنی بات کو لیکر گھنٹوں تک تکرار چلتی رہتی تھی۔ اور جوآن اسے گھر کی بے اطمینانی سے بڑی چڑھ تھی۔ اکثر اس کا دل گھر چھوڑ کر بھاگ جانے کو چاہتا تھا مگر اس کی خواہش میں رکاوٹ اس کا اولڈ ڈاگ تھا۔ مجھ سے جوآن اکثر کہا کرتا تھا کہ میں کسی دن پہاڑ پار کرکے اس پار کے پیکاڈس شہر میں گھوڑوں کے سائیس کی نوکری کرنے چلا جاؤں گا۔ مگر اولڈ ڈاگ بہت بوڑھا تھا اور اسے نیند بھی بہت آتی تھی۔ وہ جوآن کے ساتھ بھاگنے کے قابل نہیں تھا، اور یہی وجہ تھی کہ جوآن گھر سے بھاگ نہیں پاتا تھا۔

ادھر جوآن کے دل کی یہ حالت تھی اور ادھر اس کی نانی، ماں اور اس کے والد اپنی تکرار سے گھر کو دوزخ بنائے ہوئے تھے۔ صرف

اولڈ ڈاگ کے بارے میں یہ تینوں متفق تھے۔ تینوں کو اولڈ ڈاگ سے سخت نفرت تھی کیونکہ وہ دن رات پڑا سوتا رہتا تھا اور دو آدمیوں کی خوراک اکیلا کھا جاتا تھا۔

یہ سلسلہ بہت دنوں تک چلتا رہا جھگڑے ہوتے رہے اور اولڈ ڈاگ کے خلاف تینوں بزرگوں کی نفرت بڑھتی رہی۔ اور آخر ایک دن لاوا پھوٹ ہی پڑا۔

جوآن کو پچھلے کئی دنوں سے ٹھنڈ لگ جانے کی وجہ سے تیز بخار آگیا تھا۔ اس کی نانی چڑیل کا اثر دور کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں کیونکہ ان کے خیال میں جوآن پر چڑیل کا سایہ ہوگیا تھا۔ جوآن کے والد بھی بھوت پریت پر اعتقاد رکھتے تھے۔

ڈاکٹر نے جوآن کو دیکھ کر کہا کہ نمونیہ کا ڈر ہے اس لیے لڑکے کو بستر میں اچھی طرح اوڑھا کر رکھا جائے۔ جوآن کی اسی بیماری سے تینوں بزرگوں کو نہ جانے کیسے سوجھ گیا کہ اولڈ ڈاگ سے پیچھا چھڑانے کا یہ اچھا موقع ہے ــــ اور جوآن کے والد کار میں اولڈ ڈاگ کو لاد کر چل پڑے۔ اسکیم یہ تھی کہ وہ اسے دور کسی قصبے میں اپنے ایک دوست کو دے آئیں گے تاکہ وہ اسے ختم کردے۔ کئی سالوں میں یہ پہلا موقع تھا، جب اولڈ ڈاگ جوآن کے بستر سے دور تھا۔ جب جوآن کے والد اپنی کار لے کر جانے لگے اور ہمارے گھر کے سامنے سے گزرے تو کیچڑ میں ان کی گاڑی پھنس گئی۔ ہم لوگ باہر نکل آئے۔ پوچھنے پر انہوں نے سارا قصہ بتا دیا اور آخر میں کہا "اس کتے سے ہم تنگ آگئے ہیں۔ اب اگر یہ ہمارے یہاں رہا تو ہم سب پاگل ہوجائیں گے۔"

ہمیں ان کا یہ کام بڑا ذلیل لگا۔ میری خواہش ہوئی کہ دوڑ کر ساری بات جوآن کو بتا آؤں۔ مگر میری ماں نے روک لیا۔ بھلا دوسرے کے کام میں ہمیں ٹانگ اڑانے کا کیا حق تھا۔

لیکن جانے کس نے جوآن کو مطلع کردیا۔ یا ہوسکتا ہے اسے خود ہی کوئی غیبی احساس ہوا ہو۔ بہرحال اولڈ ڈاگ کے لے جانے کی بات اسے معلوم ہوگئی۔ اور جب اس کے والد خالی گاڑی لے کر واپس گھر آئے تو ہمیں پتہ چلا کہ لڑکا اپنے بستر سے، گھر سے غائب ہے۔

جوآن کی ماں روتی ہوئی ہمارے گھر پہنچیں "میرا بیٹا، ہائے میرا جوآن، میرا بچہ گھر چھوڑ کر اس برستے پانی میں نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔"

ہم لوگ اپنی پرانی موٹر میں بیٹھ کر جوآن کے گھر پہنچے، جوآن کی نانی اس کے کمرے میں خالی بستر کے پاس زمین پر اوندھی پڑی سسک رہی تھیں۔ جوآن کے کمرے کی کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ وہ اسی کھڑکی سے بھاگا تھا۔

جب ہمیں پتہ چلا کہ جوآن کے والد اس کی تلاش میں پہاڑ کی طرف گئے ہیں تو ہم لوٹ آئے۔ گھر آکر میری ماں نے پولیس اور ڈاکٹر کو ٹیلیفون کیا اور انہیں لڑکے کے لاپتہ ہونے کی خبر دے دی۔ میں نے اپنا گھوڑا کھولا اور جوآن کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ دور دور تک تلاش کرنے پر بھی مجھے جوآن کا کوئی پتہ نہیں ملا۔ جب میں ناامید ہو کر لوٹ رہا تھا تو راستے میں جوآن کے والد اپنی گاڑی میں جاتے دکھائی دیے۔ وہ گاڑی اتنی تیزی سے چلا رہے تھے کہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے موٹر پہ گاڑی کئی بار الٹتے الٹتے بچی۔

میری ماں کے ٹیلیفون کے جواب میں کچھ دیر بعد ڈاکٹر، ایک پولیس افسر اور ایک آدی باسی ریڈ انڈین جوآن کے گھر پہنچے۔ تینوں جوآن کی تلاش میں نکلنے کی تیاری کر کے آئے تھے۔ کچھ دیر بعد جوآن کے والد بھی واپس آگئے۔ ان کے ساتھ گاڑی میں گہری نیند سویا ہوا اولڈ ڈاگ بھی تھا جسے وہ اپنے دوست کے پاس مار ڈالنے کی ہدایت کر کے چھوڑ آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کا دوست اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ وہ اس کی بیوی کو ساری باتیں سمجھا کر آئے تھے۔ جب وہ اسے واپس لینے پہنچے، اس وقت تک بھی ان کا دوست گھر نہیں پہنچا تھا۔ اسی لیے اولڈ ڈاگ ابھی زندہ بچا ہوا تھا۔

انہوں نے اولڈ ڈاگ کو گود میں اٹھایا اور جوآن کے کمرے میں آہستہ سے زمین پر اتار دیا۔ اولڈ ڈاگ جاگ اٹھا اور لنگڑاتا ہوا جوآن کے خالی بستر کی طرف بڑھا۔ سبھی کمرے میں موجود تھے اور ان کی نظریں اسی پر لگی ہوئی تھیں۔ خالی بستر کے پاس پہنچ کر اولڈ ڈاگ "کوں کوں" کر کے رونے لگا۔

جوآن کے والد چلا اٹھے "اولڈ ڈاگ" جوآن کہاں ہے؟ جوآن کو تلاش کرو۔ ڈھونڈ کر لاؤ۔"

اولڈ ڈاگ مشتعل ہوا تھا اور لڑکھڑاتا ہوا کمرے میں ادھر ادھر گھومنے لگا۔ پولیس افسر بولا "اتنی بارش ہو چکی ہے، اس کے بعد بھی پتہ چلا سکے، ایسا کتا کہاں ہوگا؟"

"لیکن دوپہر کے بعد تو کوئی خاص بارش نہیں ہوئی ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

ساتھ آیا ہوا ریڈ انڈین خاموشی سے اولڈ ڈاگ کو گردن سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا کھڑکی تک لے گیا اور اسے اٹھا کر کھڑکی کے باہر اتار دیا۔ اور خود بھی کھڑکی کے باہر کود گیا۔ باقی لوگ دروازے کے راستے باہر نکل آئے۔ اولڈ ڈاگ کی ناک زمین سے سٹی ہوئی تھی اور وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک اولڈ ڈاگ دوڑنے لگا۔ اس سے پہلے کسی نے اس کتے دوڑتے نہیں دیکھا تھا۔ یکایک وہ لڑکھڑا کر گر گیا۔ ریڈ انڈین نے اسے سہارا دیکر کھڑا کیا اور وہ پھر دوڑنے لگا۔ کئی بار وہ گرا اور کئی بار اسے سہارا دیکر کھڑا کیا گیا۔ مگر وہ دوڑتا رہا۔ ریڈ انڈین ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا اور ہم لوگ پیچھے پیچھے دوڑ رہے تھے۔

ہم اب ان پہاڑوں کے نیچے پہنچ چکے تھے جن کے اس پار گھوڑوں کی سائیسی کرنے کی خواہش جوآن ظاہر کیا کرتا تھا۔ اچانک اولڈ ڈاگ اور ریڈ انڈین ایک موڑ پر جاکر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ جب ہم آگے بڑھے تو وہ دونوں ایک چٹان کے پاس کھڑے نظر آئے۔ چٹان کے نیچے جوآن گہری نیند سویا ہوا تھا۔ ہمارا شور و غل سن کر وہ جاگ اٹھا۔ پھر اس نے اولڈ ڈاگ کو دیکھا۔ مگر ایک لفظ بھی نہیں بولا۔

جوآن کی ماں لپک کر بیٹے سے لپٹ گئیں۔ اس کے والد نے دیکھا کہ لڑکا تر بتر ہے۔ وہ اپنی بیوی سے بولا "یہ تو بالکل بھیگ گیا ہے۔"

ڈاکٹر نے معائنہ کرتے ہوئے کہا "گھبرائیے نہیں، یہ پسینہ ہے۔"

اس حادثے کے فوراً بعد ہمارا خاندان کچھ دن کے لیے کسی رشتہ دار کے یہاں چلا گیا۔ لوٹنے پر ہمیں پورا قصہ معلوم ہوا۔ ہم نے دیکھا کہ جوآن اور اولڈ ڈاگ ہمیشہ کی طرح ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور جوآن کے گھر کی تو بالکل کایا پلٹ ہو گئی تھی۔ اب وہاں بے اطمینانی کا نام و نشان نہیں تھا۔ جوآن کے والد اپنی ساس کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے تھے اور ساس بھی اب سب کو بڑی شفقت کی نظر سے دیکھتی تھیں گھر میں کسی بات پر جھگڑا ہوا ہی نہیں تھا۔ سب کہتے تھے کہ یہ ایک معجزہ ہے لیکن جوآن نے ہمیں اصلیت بتائی کہ گھر کے سب لوگ ماننے لگے ہیں کہ اولڈ ڈاگ پر کسی چڑیل کا سایہ ہے۔ اس لیے اسے خوش رکھنے کے لیے لوگوں میں یہ کایا پلٹ ہوئی ہے۔

اور انہیں ایسا سمجھنے کی وجہ بھی تھی۔ جوآن کے لوٹنے کے بعد ہی انہیں ایک راز کا پتہ چلا تھا۔ حالانکہ جوآن کو اس راز کا علم پہلے سے ہی تھا کہ اس کا پیارا دوست اولڈ ڈاگ اندھا ہے۔ ●●

Miles to go before I sleep

Whose woods these are, I think I know
His house is in the village though ;
He will not see me stopping here
to watch his woods fill up with snow.

My little horse must think it queer
to stop without a farm house near
between the woods and frozen lake
the darkest evening of the year .

He gives his harness bells a shake
to ask if there is some mistake ,
The only other sound's the sweep
of easy wind and downy flake .

The woods are lovely , dark and deep
but I have promises to keep ,
And miles to go before I sleep ,
And miles to go before I sleep .

——— *Robert Frost*

حصارِ شام

ترجمہ: ڈاکٹر هلال فرید

معلوم ہے مجھ کو یہ جنگل ہے گھنا کس کا
کچھ دور ہی بستی میں شاید ہے مکاں اس کا
اس کو نہ خبر ہوگی کچھ دیر جو میں ٹھہروں
اور برف کے گہنوں سے جنگل کو سجا دیکھوں

کچھ آج مرا گھوڑا خدشوں میں گھرا ہوگا
اس دشت میں یوں رکنا اس کو نہ جچا ہوگا
اک جھیل کی ٹھنڈک اور تا حدِ نظر جنگل
جس سمت بھی دیکھو، ہے تاریک اُدھر جنگل

جھٹکے سے مرا گھوڑا گھنگرو کو بجاتا ہے
ہے بات غلط کوئی گویا کہ جتاتا ہے
سنسان بیاباں میں آہٹ نہ صدا کی ہے
بس برف کے گرنے پر یلغار ہوا کی ہے

دلکش ہے گھنا جنگل منظر بھی سہانے ہیں
مجھ کو تو مگر اپنے پیماں نبھانے ہیں
منزل ہے بہت آگے سب خواب بھلانے ہیں
منزل ہے بہت آگے سب خواب بھلانے ہیں

* * *

ہماری کچھ اہم ایجنسیاں

۱۔ مسکین بک ڈپو۔
موتی ڈونگری روڈ۔ جے پور۔ [راجستھان]

۲۔ جناب محمد حسین [بک سیلر]
اسٹیشن روڈ۔ دھنباد [بہار]

۳۔ میسرز نسیم بک ڈپو
ٹاور چوک۔ دربھنگہ [بہار]

۴۔ جناب اعظم خاں
ٹاؤن اینڈ پوسٹ آفس تھریا نجابت خاں۔ ڈسٹرکٹ بریلی [یوپی]

۵۔ میسرز بک ایمپوریم
سبزی باغ۔ پٹنہ ۴۔ [بہار]

۶ میسرز محمد الیاس نیوز ایجنسی
۹۱۔ کالوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ [مغربی بنگال]

۷۔ اسلامیہ بک ڈپو
تاتار پور چوک۔ بھاگل پور سٹی [بہار]

۸۔ میسرز نصرت بک ایجنسی
کوئن روڈ۔ انجمن بلڈنگ بیلی۔

۹۔ میسرز حنیف بک ڈپو۔ مومن پورہ ناگور۔

۱۰۔ میسرز مکتبہ معارف الاسلام۔ نظام پورہ۔ بھیونڈی [تھانے]

۱۱ میسرز آزاد بک اسٹور
سکیچی بازار۔ جمشید پور۔ [بہار]

۱۲ میسرز کتاب منزل۔ سبزی باغ۔ پٹنہ ۴ ["]

۱۳۔ جناب طالب حسین
ایف۔ ڈی ہائر سکنڈری اسکول۔ کاٹھ دروازہ۔ مرادآباد۔

۱۴۔ صدیق اختر انصاری۔ اردو نیوز پیپر ایجنٹ
وارث پورہ۔
کامٹی۔

۱۵۔ محمد پرویز اقبال [میگزین ایجنٹ]
پوسٹ محمد میموریل پرائمری اسکول۔ ۲۳۔ بی۔ ٹی روڈ۔ بنس بگان
پوسٹ آفس۔ ٹیٹاگڑھ۔ ۲۴ پرگنہ [مغربی بنگال]

۱۶۔ میسرز طارق نیوز ایجنسی
مکتبہ معصوم شاہ۔ مومن پورہ۔ ناگپور۔

۱۷۔ جناب احمد حسین۔ جمال بک ڈپو۔ باری روڈ۔ گیا [بہار]

۱۸۔ میسرز مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ ای۔ آر۔ روڈ۔ بمبئی

۱۹۔ میسرز آزاد بک اسٹور۔ اردو بازار۔ دربھنگہ [بہار]

۲۰۔ جناب جلیل احمد جاوید
بلال منزل۔ حمایت نگر۔ ڈسٹرکٹ ناندیر۔ [مہاراشٹر]

۲۱۔ میسرز الکاشف بک ایجنسی
سلیمان لین۔ کریم گنج گیا۔ [بہار]

۲۲۔ میسرز ظفر بک سیلر نمبر ۴ پوسٹ آفس جھریا۔ ڈسٹرکٹ دھنباد

۲۳۔ میسرز محمد نورانی بک سیلر۔ کمپنی باغ۔ مظفر پور۔ [بہار]

۲۴ میسرز قمر میگزین۔
پیر بہوڑ۔ داتا مارکیٹ۔ پٹنہ نمبر ۴ [بہار]

۲۵۔ میسرز ناصح اسٹیشنری اینڈ جنرل اسٹور
بینی پور۔ دربھنگہ۔ [بہار]

۲۶ میسرز تنویر بک ڈپو
۱۱۲۔ جی۔ ٹی روڈ۔ آسنسول [بہار]

۲۷۔ اے۔ کے دلکش کتاب گھر
جنک پور روڈ سیتا مڑھی۔ [بہار]

۲۸۔ میسرز مکتبہ عمر بک سیلر اینڈ نیوز پیپر ایجنٹ
مدینہ مسجد کمپلکس۔ میناکشی سرکل۔ بیجاپور۔

۲۹۔ میسرز سکریٹری غالب لائبریری
محلہ بخیا۔ فیروز آباد۔ آگرہ۔ یو۔ پی

۳۰۔ میسرز شالیمار بک اسٹال
۸۸/۴۶۴ نالہ روڈ۔ نزد ریم کراسنگ
کانپور۔ [یوپی]

۳۱۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ،
علی گڑھ

قندِ مکرر

سر سید احمد خاں

تعلیم

میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی روح بغیر تعلیم کے ایسی ہے جیسے سنگِ مرمر کے پہاڑ کی مانند ہے، کہ جب تک سنگتراش اس میں ہاتھ نہیں لگاتا، اس کا ڈھونڈلا اور کھردرا پن دور نہیں کرتا، اس کو خراش تراش کر سڈول نہیں بناتا، اس کو پالش اور جلا سے آراستہ نہیں کرتا، اس وقت تک اس کے جوہر اسی پر چھپے رہتے ہیں اور اس کی خوشنما نسیں اور دلربا رنگتیں اور خوبصورت بیل بوٹے ظاہر نہیں ہوتے۔ یہی حال انسان کی روح کا ہے۔ انسان کا دل کیسا ہی نیک ہو، مگر جب تک اس پر عمدہ تعلیم کا اثر نہیں ہوتا اس وقت تک ہر ایک نیکی اور ہر ایک قسم کے کمال کی خوبیاں جو اس میں چھپی ہوئی ہیں، اور جو بغیر اس قسم کی مدد کے نمود نہیں ہو سکتیں، ظاہر نہیں ہوتیں۔

ارسطو نے تعلیم کے اثر کو مجسم مورتوں کے بنانے کی تشبیہ میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ موہنی مورت ایک پتھر کے ڈھوکے میں چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ مگر مورت بنانے کا ہنر صرف فضول چیزوں کو اس میں سے گھڑ دیتا ہے۔ مورت تو پتھر ہی میں ہوتی ہے، مگر آذر صرف اس کو نمود کر دیتا ہے۔ جو نسبت کہ مورت کے گھڑنے والے کو اس پتھر کے ڈھوکے سے ہے وہی نسبت تعلیم کو انسان کی روح سے ہے۔

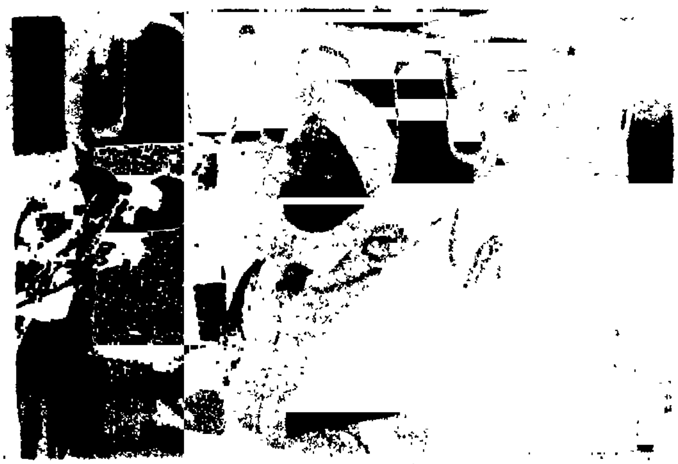
بڑے بڑے حکیم اور عالم، ولی و ابدال، نیک ذی عقل مند، بہادر و ناموَر ایک گنوار آدمی کی سی صورت میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں؛ یا ان کی یہ تمام خوبیاں عمدہ تعلیم کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ جب میں جاہل اور وحشی قوموں کے حالات پڑھتا ہوں، تو ان نیکیوں سے جو ان میں ہیں مگر ناشائستہ؛ اور اس دلیری اور جرأت سے جو اُن میں ہے، مگر خوفناک؛ اور اس استقلال سے جو اُن میں ہے مگر بے ڈھنگا، اور اس دانائی اور عقل مندی سے جو اُن میں ہے مگر جانوروں کے سے مکر و فریب سے ملی ہوئی؛ اور اس صبر و قناعت سے جو اُن میں ہے، اور گو یا ناامیدیاں ہی ان کی امیدیں ہیں، نہایت خوش ہوتا ہوں۔ سچ ہے کہ انسان کے دل کے جوش مختلف طرح پر کام کرتے ہیں؛ اور جس قدر کم ویسی عقل کی ہدایت اُن کو ہوتی ہے، اور جس قدر کہ عقل ان جوشوں کو درست کرتی ہے، اسی قدر مختلف طور پر اُن سے کام ہوتے ہیں۔

امریکہ کے حبشی غلاموں کا جب یہ حال سنتے ہیں کہ اپنے آقا کے مرنے پر، یا ایک کام سے چھوڑ کر دوسرے کام کے لگائے جانے پر، جنگلوں کے درختوں میں لٹک کر اپنی جان دے دیتے ہیں، یا ایک ہندو عورت اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ زندہ جل کر ستی ہو جاتی ہے، تو کون شخص ہے جو اُن کی وفاداری اور محبت کی تعریف نہ کرے گا گو کہ کیسے ہی ناشایستہ اور نامہذب طور سے ظاہر ہوتی ہے؟ اس قسم کی اور وحشی قوموں کے دلوں میں نہایت عمدہ عمدہ باتیں پائی جاتی ہیں، گو وہ وحشی پنے کی حالت میں کیوں نہ ہوں۔ لیکن ان کی مناسب طور سے اور عمدہ تعلیم سے درستی کی جاوے، تو وہی وحشیانہ نیکیاں کس قدر ترقی پا سکتی ہیں؛ اور کیسے کیسے عمدہ کام اور مہذب و شایستہ نیکیاں اُن سے پیدا ہو سکتی ہیں!

مجھ کو اسی بات کا رنج ہے کہ میں اپنی قوم میں ہزاروں نیکیاں دیکھتا ہوں، پر ناشایستہ، ان میں نہایت دلیری اور جرأت پاتا ہوں، پر خوفناک؛ اُن میں نہایت قوی استقلال دیکھتا ہوں، پر بے ڈھنگا اُن کو نہایت دانا اور عقل مند پاتا ہوں، پر اکثر مکر و فریب اور زور سے ملے ہوئے، ان میں صبر و قناعت بھی اعلیٰ درجہ کی ہے مگر غیر مفید اور بے موقع؛ پس میرا دل جلتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی ان کی عمدہ صفتیں عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جاویں، تو دین و دنیا دونوں کے لیے کیسی مفید ہوں۔



صدر جمہوریہ اور وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی اے ایم یو راؤنڈ ٹنگ کلب کے ممبران کے ہمراہ
یونیورسٹی کی روایتی بگھی میں وائس چانسلر لاج سے جلسہ گاہ تک جاتے ہوئے



صدر جمہوریۂ ہند گیانی ذیل سنگھ
خطبۂ تقسیم اسناد پیش کرتے ہوئے

راحت ابرار

مسلم یونیورسٹی کے شب و روز

جلسہ تقسیم اسناد

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں امسال ۲۹ر اپریل ۱۹۸۶ء کو ۶۸ واں تقسیم اسناد کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا جس میں صدر جمہوریۂ ہند عزت مآب گیانی ذیل سنگھ نے خطبۂ جلسہ تقسیم اسناد پیش کیا۔

یہ کانووکیشن پچھلے دس سال کے عرصے کے بعد منعقد کیا گیا تھا جس میں دو ہزار چار سو سے زائد طلبا اور طالبات کو جو مختلف فیکلٹیوں میں زیر تعلیم تھیں ان کو گذشتہ سال کی ڈگریاں پیش کی گئیں۔ یونیورسٹی کے ۸۵ ذہین اور لائق طالب علم اور طالبات جو اپنی کلاسوں میں فرسٹ پوزیشن سے کامیاب ہوئے تھے انھیں صدر جمہوریہ نے میڈل تقسیم کیے۔ ایم بی بی ایس فائنل کی طالبہ دیپا حسین کو سب سے زیادہ نو میڈل دیے گئے۔ دوسرے نمبر پر اسی فیکلٹی کے مندیپ سنگھ کو چھ میڈل دیے گئے۔

اس تقسیم اسناد کے جلسے میں ملکی و غیر ملکی شہرت یافتہ چار اصحاب کو اعزازی ڈگریاں بھی پیش کی گئیں۔ اُردو کے ممتاز شاعر اور ترقی پسند ادیب مسٹر علی سردار جعفری کو ڈی لٹ، نظام حیدرآباد کے پوتے شہزادہ میر کرامت علی خاں مفخم جاہ کو ایل۔ایل ڈی، ولبھ بھائی پٹیل انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر اوتار سنگھ کو ڈی ایس سی کی ڈگری عطا کی گئی جبکہ پلاننگ کمیشن کے رکن اور وزیر اعظم کے سائنسی مشیر پروفیسر ایم جی کے مینن کو ان کی غیر حاضری میں ڈی ایس۔سی کی اعزازی ڈگری دی گئی۔

شیخ الجامعہ کی تقریر

اس موقع پر تقسیم اسناد کے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی نے کہا کہ ہماری خوشی کی کوئی حد نہیں ہے کہ ہم دس سال کی مدت کے بعد کانووکیشن منعقد کر رہے ہیں۔ کچھ گمراہ کن عناصر کے اخراج کے بعد یونیورسٹی زیادہ مضبوط اور صحت مند ہو کر ابھری ہے۔ جن بہی خواہوں نے یونیورسٹی میں امن و امان قائم کرنے کی کوشش کی وہ ہمارے شکریہ اور تحسین و تعریف کے مستحق ہیں۔

انھوں نے کہا کہ ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں کی طرح اس ادارے میں بھی مشکلات کا سامنا برابر ہوتا رہا مگر قریبی پیش رو اور ان کے ساتھیوں نے بالآخر حالات پر قابو پایا اور ایک تکلیف دہ صورتِ حال ختم ہو گئی۔

وائس چانسلر نے معزز مہمان کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ صدر جمہوریہ کی آمد سے اس کانووکیشن کو رونق اور روشنی ملی۔ آپ کو عام انسانوں کی فلاح و بہبود سے دل چسپی ہے۔ اسی لیے آپ عوام و خواص میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔

جناب سید ہاشم علی نے کہا کہ ۱۸ اپریل ۸۵ء کو میں نے بحیثیت وائس چانسلر اپنا عہدہ سنبھالا۔ یہاں آنے کے دوسرے ہی دن سے میں نے یہاں کے مختلف طبقات سے رابطہ قائم کیا۔ ان کے درمیان جو خلیج حائل تھی اسے پُر کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ یہ کام اگرچہ مشکل تھا مگر مکمل کر لیا گیا۔ تدریسی اور غیر تدریسی عملے کے افراد نیز طلبا سے بے تکلف گفتگو کی جس سے میں یہاں کے لوگوں کے قریب ہوا اور یہاں کے لوگ بھی مجھ سے قربت محسوس کرنے لگے۔ میں نے یہاں کے مسائل کو سمجھا ہے اور انھیں حل کرنے کے لیے حالات کے تقاضے کے پیش نظر کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ یونیورسٹی کی ترقی میں سبھی لوگ مجھے



نظام حیدر آباد کے پوتے میر کرامت علی خاں مُعظّم جاہ
ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری کے ساتھ



اُردو کے ممتاز شاعر اور ترقی پسند ادیب جناب علی سردار جعفری ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری کے ساتھ
تصویر میں چانسلر پروفیسر اے۔ آر قدوائی کو دیکھا جا سکتا ہے۔

تعاون دیں گے جیسا کہ اب تک دے رہے ہیں۔ یہاں کے سبھی لوگ میری اس آرزو میں میرے ساتھ ہیں کہ یونیورسٹی ترقی کرے اور ہر لحاظ سے آگے بڑھے۔

وائس چانسلر نے کہا کہ مسلم یونیورسٹی ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات کا مرکز ہے اور یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس پر سب لوگوں کی توجہ ہوتی ہے۔ اس لیے یہ یونیورسٹی حکومتِ ہند کی خصوصی توجہ کی مستحق ہے تاکہ اس کا معیارِ تعلیم بلند ہو اور یہ اپنے تاریخی اور ثقافتی کردار کو قائم رکھ سکے۔

انھوں نے کہا کہ اس ادارے کے بنیادی مقاصد کے پیشِ نظر میں نے ہندوستانی مسلمانوں کے تمام تعلیمی اداروں کے سربراہوں کو لکھا ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کریں کہ آخر یہ ادارہ کس طرح ان کی مدد کرسکتا ہے۔ اس سلسلے میں مقامی اور بیرونی دانشوروں کی ایک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی ہے تاکہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی ضرورتوں کو پورا کیا جاسکے۔

جناب سید ہاشم علی نے ۸۶-۱۹۸۵ء کی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے مختلف سیمیناروں، مذاکروں اور کانفرنسوں کا ذکر کیا جو اس ادارے میں منعقد ہوئیں اور ان اساتذہ کی شاندار خدمات کو بھی سراہا جو ملک و بیرونِ ملک کی بے شمار کانفرنسوں میں شریک ہوئے

انھوں نے اپنی ایک سالہ کارکردگی کے دوران بعض نئے شعبوں کے قیام پر بھی روشنی ڈالی اور بتایا کہ موجودہ تعلیمی سال میں ڈپلوما انجینئرنگ آرکیٹکچرل اسسٹنٹ شپ، الیکٹریکل انسٹرومینٹیشن، ڈپلوما الیکٹرونکس (ٹی وی ٹیکنالوجی)، ایم ایس سی آپریشن ریسرچ، ایم ایس سی ایگریکلچر، پی جی ڈپلوما پیٹرولیم پروسیسنگ، ایم ڈی (کلیات و علم الامراض معالجات) کے علاوہ ریموٹ سینسنگ، ایپلیکیشن سنٹر بھی قائم کیا ہے جس میں پی ایچ ڈی اور پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما تک تعلیم دیے جانے کا انتظام ہے۔

اس سے قبل مسلم یونیورسٹی کے چانسلر پروفیسر اخلاق الرحمن نے مہمانِ خصوصی صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ کا استقبال کیا۔

صدر جمہوریہ نے اپنے علی گڑھ قیام کے دوران سب سے پہلے بانی درسگاہ سرسید احمد خاں کے مزار پر حاضری دی اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

وائس چانسلر کی رہائش گاہ پر تہذیب الاخلاق اور نشانات کے خصوصی شمارے بھی صدر جمہوریہ کو پیش کیے گئے۔ وی سی لاج سے کانووکیشن پنڈال تک اے ایم یو رائڈنگ کلب کے طلبا اپنی روایتی بگھی میں صدر جمہوریہ کو لے کر آئے۔



وَلّبھ بھائی پٹیل انسٹی ٹیوٹ
کے ڈائرکٹر
پروفیسر اوتار سنگھ
ڈی ایس سی کی اعزازی ڈگری
چانسلر پروفیسر اخلاق الرحمن قدوائی
سے
وصول کرتے ہوئے۔

بیورو کی چند اہم مطبوعات

۱۔ دکن میں اردو

نصیر الدین ہاشمی

صفحات ۵۴۴ قیمت ۴۲/۰ روپے

اردو زبان وادب کے ارتقا میں دکن کی خدمات کی ایک اہم دستاویز ہے۔ [illegible] نایاب تھی [illegible] اور اساتذہ پریشان تھے۔ نقاد اس کی تلاش میں تھے۔ ترقی اردو بیورو نے "دکن میں اردو" شائع کرکے ان سب کی مشکل کا حل نکال لیا ہے۔

۲۔ فرہنگ ادبی اصطلاحات

پروفیسر کلیم الدین احمد

صفحات ۲۰۶ قیمت ۲۷/۰ روپے

پروفیسر کلیم الدین احمد کا آخری اور یادگار علمی کارنامہ، اردو اور انگریزی ادب کا احاطہ کرنے والی تقریباً تمام اہم علمی اصطلاحات اور ان کی تشریح اور وضاحت مع امثال نہایت عالمانہ انداز میں۔ اس میں ایسی باتیں بھی ہیں جو معلومات سے بھرپور ہیں اور فکر انگیز بھی۔

۳۔ فرہنگ اصطلاحات نباتیات

ترقی اردو بیورو

صفحات ۱۰۱ قیمت ۱۵/۰ روپے

ملک کی مختلف یونیورسٹیوں سے وابستہ علم نباتیات کے ماہرین کی مدد سے طالب علموں اور عام قاری کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے نباتیات سے متعلق تقریباً تمام اہم اصطلاحوں کو اردو میں منتقل کرتے ہوئے معیاری اصطلاحات وضع کی گئی ہیں۔ یہ نباتیات کی درس و تدریس اور اس سے متعلق مضامین اور کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ترجموں کے کام کے لیے بےحد مفید ہے۔

۴۔ قبالیات

ڈاکٹر سید محمد عباس رضوی

صفحات ۵۴۳ قیمت ۳۵/۰ روپے

طب یونانی سے متعلق مختلف موضوعات پر ترقی اردو بیورو نے جدید معلومات پر مبنی کئی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ قبالیات بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی [illegible] ایک اہم کتاب ہے جس میں ۲۰ ابواب میں [illegible] قومی اور فزیالوجیکل اور تدبیرات کے متعلق تفصیلی معلومات درج ہیں۔ طالب علموں کے ساتھ ساتھ حکیموں اور ڈاکٹروں کے لیے بھی اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

۵۔ منتخب دساتیر کا تقابلی مطالعہ

شجاع الدین فاروقی

صفحات ۲۴۴، قیمت ۶۵/۰ روپے

دنیا کے اہم ممالک کے دستور کے مطالعہ کے لیے پیش ہے ترقی اردو بیورو کی اہم کتاب منتخب دساتیر کا تقابلی مطالعہ جس میں قوموں اور ملکوں کے سیاسی نظاموں اور ان کے دساتیر کا بھرپور جائزہ آسان زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ اردو میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے۔ حوالوں سے مزین اور معلومات کا خزانہ لیے ہوئے۔

۶۔ عام لسانیات

پروفیسر گیان چند جین

صفحات ۷۱۱ قیمت ۷۵/۰ روپے

لسانیات ایک جدید علم ہے جو دن بدن مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ پروفیسر گیان چند جین کا تازہ ترین علمی کارنامہ "عام لسانیات" اس شعبہ میں ایک اضافہ ہے۔ جس میں ۲۴ ابواب میں لسانیات کے مختلف پہلوؤں کا ماہرانہ انداز میں جائزہ دیا گیا ہے۔ یہ کتاب زبان اور علم زبان کی درس و تدریس میں ایک نیا اضافہ ہے۔

۷۔ حیات جاوید (دوسرا ایڈیشن)

مولانا الطاف حسین حالی

صفحات [illegible]

مولانا الطاف حسین حالی کا ایک عظیم الشان کارنامہ جو اردو زبان و ادب میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہے گا۔ اس میں سرسید احمد خان کی زندگی کے حالات اور ان کی سرکاری، قومی، علمی، ادبی اور تہذیبی خدمات کا مفصل بیان ہے جو از خود ایک تہذیبی تاریخ ہے۔

ملنے کا پتہ:- شعبۂ فروخت و نمائش

ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک ۱، آر کے پورم، نئی دہلی ۶۶

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اشتہار نمبر ۲/ ۸۶ — ۸۷ - مورخہ ۱۵ر اپریل ۱۹۸۶ء

درج ذیل جگہوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱- پوسٹ گریجویٹ ٹیچر [فزکس] [ایک جگہ] [مستقل] ایس۔ ٹی۔ ہائی اسکول
شرح اسکیل ـ ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای-بی ۳۰ - ۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز
قابلیت :- ۱- لازمی ۱- متعلقہ مضمون میں ماسٹرز ڈگری ہو یا دہلی یونیورسٹی سے متعلقہ مضمون میں پی۔جی۔ ڈپلوما حاصل کیا ہو۔
۲- اردو، ہندی اور انگریزی زبان میں تدریس کی قابلیت
پسندیدہ :- ایجوکیشن یا تدریس میں ڈگری یا ڈپلوما ہو۔

۲- ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر :- [کیمسٹری] [ایک جگہ] [مستقل] - ایس۔ ٹی۔ ہائی اسکول۔
شرح اسکیل - ۳۳۰ - ۳۰ - ۵۰۰ - ای-بی - ۲۵ - ۶۰۰ - ای-بی ۲۵ - ۷۵۰ روپے مع الاؤنسز
قابلیت : ۱- لازمی۔ متعلقہ مضمون میں گریجویشن کی ڈگری اور ساتھ میں ایجوکیشن میں ڈگری یا ڈپلوما جو کہ منظور شدہ ہو۔

یا

بی۔ ایس سی، بی۔ ایڈ۔ این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی ریجنل کالج آف ایجوکیشن سے کیا ہو۔
اردو، ہندی اور انگریزی زبان میں تدریس کی اہلیت۔
۲- پسندیدہ :- سکنڈری / ہائر سکنڈری کلاسز کو پڑھانے کا تجربہ۔

۳- سینئر ٹکنیکل اسسٹنٹ [ایک جگہ] [عارضی] ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری۔ جے۔ این میڈیکل کالج
شرح تنخواہ :- ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای - بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپے مع الاؤنسز
قابلیت :-
۱- لازمی - بی۔ ایس سی۔ ڈپلوما لیب ٹیکنالوجی میں۔ اور ہسٹالوجیکل کام کی جانکاری۔

پسندیدہ :- کسی تسلیم شدہ میڈیکل کالج میں لیب ٹیکنک کا پانچ سالہ تجربہ۔
نوٹ :- موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے پہلے ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۴- ٹکنیکل اسسٹنٹ (ایک جگہ) (مستقل) زولوجی ڈپارٹمنٹ۔
شرح اسکیل- ۴۲۵-۱۵-۵۰۰- ای-بی-۱۵-۵۶۰-۲۰-۷۰۰ روپے مع الاؤنسز
قابلیت :-
۱- بی-ایس سی دو مضامین زولوجی اور کیمسٹری کے ساتھ
۲- کمیاب جانوروں کے بارے میں ٹریننگ اور زولوجی ڈپارٹمنٹ میں لیبارٹری کا کام کا تجربہ۔

۵- انجن مستری (ایک جگہ) (مستقل) - ڈپارٹمنٹ آف مکینکل انجینئرنگ - ذاکر حسین کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی۔
شرح تنخواہ :- ۳۸۰-۱۲-۵۰۰- ای بی-۱۵-۵۶۰ روپے مع الاؤنسز
قابلیت :-
متعلقہ ٹریڈ میں موزوں ٹریڈ سرٹیفکٹ ہونا چاہیے اور
تین سال کا مناسب تجربہ ہونا چاہیے۔
یا
ایسے امیدوار جن کے پاس سرٹیفکٹ نہ ہو اُن کے لیے متعلقہ میدان کا دس سال کا تجربہ ہونا ضروری ہے۔
نوٹ :- موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے پہلے ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۶- سینیر لیبارٹری اسسٹنٹ (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف پریونٹیو اینڈ سوشل میڈیسن
شرح اسکیل :- ۳۸۰-۱۲-۵۰۰- ای بی-۱۵-۵۶۰ روپے مع دیگر الاؤنسز
قابلیت :-
۱- لازمی- سائنس کے مضامین کے ساتھ ہایر سکنڈری ساتھ میں کچھ تجربہ
۲- پسندیدہ :- ان امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی جن کے پاس پبلک ہیلتھ لیب ورکس/پریونٹیو اینڈ سوشل میڈیسن ڈپارٹمنٹ میں کام کا تجربہ ہو۔
نوٹ :- موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے پیشتر ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۷۔ جونیئر ریسرچ فیلو [دو جگہیں] [عارضی] [دو میں سے ایک باٹنی ۔ نیماٹولوجی میں اور ایک آرگینک کیمسٹری میں] [ریسرچ اسکیم کے تحت] ڈپارٹمنٹ آف باٹنی ۔

مقررہ ایک ہزار روپے ماہانہ [این۔ای۔ٹی کوالیفائڈ امیدواروں کے لیے] یا ۸۰۰/- روپے ماہانہ [دوسرے امیدواروں کے لیے]

قابلیت ۔ جگہ نمبر ۱ کے لیے

باٹنی میں فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس میں ایم۔ایس سی کی ڈگری۔ ساتھ میں پلانٹ پیتھالوجی/ نیماٹولوجی میں تخصیص۔ یا ایم۔ایس سی [اگریکلچر] نیماٹولوجی میں ساتھ میں فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس میں بی۔ایس سی کی ڈگری۔

جگہ نمبر ۲ کے لیے

فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس میں آرگینک کیمسٹری میں ایم۔ایس سی کی ڈگری ساتھ میں بی ایس سی کی ڈگری فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس میں ہونا چاہیے۔

پسندیدہ:۔ Prohibitins اور Phytoalexins پر کچھ تحقیقی تجربہ

نوٹ:۔ این۔ای۔ٹی کوالیفائڈ امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی۔

غیر معمولی استعداد اور تجربے کے حامل افراد کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جا سکتی ہے۔ انٹرویو کے بلائے جانے والے افراد کو بطور ٹی۔اے ریلوے کے سکنڈ کلاس کا یکطرفہ سنگل کرایہ دیا جائے گا۔

مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار [سلیکشن کمیٹی] کے دفتر سے ۵ روپے برائے اسامی نمبر ۱، ۲ اور ۷ کے لیے] اور ۳/- روپے [باقی ماندہ اسامیوں کے لیے نقد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کیش سیکشن میں جمع شدہ یا بذریعہ پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو، بذات خود یا 23 x 10 سینٹی میٹر کا ایسا لفافہ جس پر مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہوں اور اپنا پتہ تحریر ہو، بھیج کر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

درخواستیں موصول ہونے کی آخری تاریخ ۷ / مئی ۱۹۸۶ء [آفس ٹائم تک] ہے نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں ناقابل قبول ہوں گی ۔

سید شاہد علی

[رجسٹرار]

[83/156]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

داخلہ اشتہار نمبر ۴ سیشن ۸۷/۱۹۸۶ءم جولائی ۱۹۸۶ء بیج

اہل امیدواروں سے فیکلٹی آف میڈیسن میں ایم ڈی/ ایم ایس اور درج ذیل مضامین میں ڈپلوما کورسز میں داخلے کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

نمبر شمار	ایم۔ڈی کورسز	ممکنہ تعداد	نمبر شمار	نام کورس	ممکنہ تعداد
(۱)	انستھیسیالوجی	۳	(۲)	بایوکیمسٹری	۲
(۳)	فورینسک میڈیسن	۱	(۴)	جنرل میڈیسن	۱۰
(۵)	آبسٹٹک اور گائناکالوجی	۵	(۶)	مائیکروبیالوجی	۴
(۷)	پیڈیاٹرکس	۵	(۸)	پیتھالوجی	۷
(۹)	فارماکالوجی	۶	(۱۰)	فزیالوجی	۴
(۱۱)	پریوینٹیو اور سوشل میڈیسن	۶	(۱۲)	ریڈیو ڈائگنوسز	۲

ایم ایس کورسز

نمبر شمار	نام کورس	سیٹوں کی ممکنہ تعداد	نمبر شمار	نام کورس	سیٹوں کی ممکنہ تعداد
(۱)	اناٹومی	۳	(۲)	ای۔این۔ٹی	۲
(۳)	جنرل سرجری	۱۱	(۴)	آپتھلمالوجی	۸
(۵)	آرتھوپیڈک سرجری	۳			

پی جی ڈپلوما

۱۔	انستھیسیالوجی	[ڈی۔ اے]	۶
۲	چائلڈ ہیلتھ	[ڈی۔ سی۔ ایچ]	۱۰
۳	آبسٹٹک اور گائناکالوجی	[ڈی۔ جی۔ او]	۱۰
۴۔	لارنگالوجی اور اوٹولوجی	[ڈی۔ ایل۔ او]	۴
۵	میڈیکل ریڈیو ڈائگنوسز	[ڈی۔ ایم۔ آر۔ ڈی]	۴
۶	آپتھلمالوجی	[ڈی۔ او]	۱۲

۷- آرتھوپیڈک (ڈی- ارتھو) ۶

داخلے کے لیے کم از کم اہلیت کی ضرورت-

ایم-بی-بی-ایس اس یونیورسٹی سے پاس کیا ہو یا ایک ایسا امتحان جو ایم-بی-بی-ایس کے مساوی ہو اور یونیورسٹی کے نزدیک تسلیم شدہ ہو-

(الف) کلینکل اور پیرا کلینکل مضامین کے لیے

وہ امیدوار جنھوں نے ایم-بی-بی-ایس امتحان دو سے زیادہ سپلیمنٹری کے ذریعے پاس کیا ہے وہ اس میں شرکت کے مجاز نہیں ہیں - ایسے امیدوار جو ایک مضمون میں ایک سے زیادہ بار فیل ہو چکے ہیں، وہ اس مضمون کے پوسٹ گریجویٹ کورس میں داخلے کے اہل نہیں ہیں -

(ب) نان- کلینکل مضامین کے لیے

ایسے امیدوار جن کی سپلیمنٹری تین بار سے زائد آچکی ہو وہ نان کلینکل مضامین کے پوسٹ گریجویٹ کورسز میں داخلے کے اہل نہیں ہیں-

۲- وہ امیدوار داخلے کے اہل سمجھے جائیں گے جنھوں نے ایم-بی-بی-ایس فائنل امتحان پاس کرنے کے بعد ایک سال کی لازمی انٹرن شپ اطمینان بخش طریقے پر کرلی ہو اور اُن کا صوبائی میڈیکل کونسل میں رجسٹریشن ہونا لازمی ہے-

۳- امیدوار نے ہاؤس فزیشن/ہاؤس سرجن کی حیثیت سے ایک سال پورا کیا ہو اور جس میں سے کم از کم چھ ماہ کسی خصوصی شعبہ میں گزارے ہوں، یا ایم سی- آئی کے ذریعے متعین کیے گئے قواعد میں اس کے متبادل مساوی تجربہ ہونا چاہیے، مہینہ کی اس آخری تاریخ میں جو ٹیسٹ کے لیے مقرر کی گئی ہے - اس کے علاوہ وہ امیدوار جو اپنا ایک سال کا ہاؤس جاب ۳۱ر دسمبر ۱۹۸۶ء تک مکمل کر رہے ہوں، وہ بھی اس سال کے ٹیسٹ اور انٹرویو کے لیے درخواستیں دے سکتے ہیں- انٹرویو اور ٹیسٹ کی بنا پر میرٹ لسٹ تیار کی جائے گی- وہ امیدوار جن کا ہاؤس جاب ۳۱ر جولائی ۸۶ء کو مکمل ہو رہا ہے ان کو یکم اگست سے داخلہ دے دیا جائے گا- لیکن وہ امیدوار جن کا ہاؤس جاب ۳۱ر دسمبر ۸۶ء کو پایۂ تکمیل تک پہنچ رہا ہے، ان کو یکم جنوری، ۸۷ء سے داخلہ دیا جائے گا- مضمون کے انتخاب کے سلسلے میں میرٹ کو بنیاد سمجھا جائے گا اور داخلہ صرف ان ہی امیدواروں کو دیا جائے گا جو کہ اپنا ایک سال کا ہاؤس جاب درج بالا تاریخوں تک ہی پورا کر رہے ہیں-

وہ امیدوار جو مختلف شعبوں کے ڈپلوما کورسوں، ایم ڈی اور ایم ایس میں داخلے کے خواہش مند ہوں اُن کے لیے ایک عام ٹیسٹ کا انعقاد کیا جائے گا- امیدواروں کی میرٹ تحریری اور زبانی امتحان کے ذریعہ متعین کی جائے گی-

ٹیسٹ ۱۷ر جولائی ۱۹۸۶ء کو لیا جائے گا-

امیدواروں کو ٹیسٹ میں بیٹھنے کے لیے علیحدہ سے کوئی اطلاع نہیں دی جائے گی- وہ اہل امیدوار جنھوں نے اپنی درخواستیں مقررہ وقت میں جمع کر دی ہیں، ان سے گزارش ہے کہ وہ اپنے ٹیسٹ داخلہ کارڈ ایڈمیشن سیکشن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ٹیسٹ سے دو روز قبل حاصل کر لیں- اگر کوئی امیدوار جانچ کے وقت اہل نہ پایا گیا تو وہ امیدوار داخلہ ٹیسٹ کارڈ حاصل نہ کر سکے گا-

یہ بات دھیان میں رہے کہ کسی بھی حالت میں کسی منتخبہ موضوع میں کوئی بھی رد و بدل داخلے کی تکمیل کے بعد ہرگز نہیں کی جاسکے گی۔

درخواست داخلہ فارم اور گائڈ اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ بکس نمبر ۵۲ اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ سے ۳/- روپے کا کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر فنانس آفیسر، اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو اور ساتھ میں ۶½ x ۹½ سائز کا ایک ایسا لفافہ جس پر اپنا پتہ تحریر ہو اور ۵۰۔۲ ڈاک ٹکٹ (صرف ایک درخواست کے لیے) چسپاں ہوں روانہ کرکے بذریعہ ڈاک حاصل کرسکتے ہیں۔ اگر کوئی امیدوار یہ چاہتا ہو کہ وہ درخواست فارم بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک حاصل کرے تو اس کے لیے ۵۔۲۵ کے ڈاک ٹکٹ چسپاں لفافہ جس پر اپنا پتہ تحریر ہو، روانہ کرنا لازمی ہے۔ اگر ایک زائد درخواست داخلہ فارم کے حصول کا خواہش مند ہو تو ہر درخواست کے لیے علیحدہ سے مذکورہ بالا لفافہ روانہ کرنا ضروری ہے۔

درخواست داخلہ فارم اور دیگر متعلقہ معلومات اوپر دی گئی ہدایات کے مطابق بذریعہ پوسٹل آرڈر یا نقد تین روپے جمع کرکے درج ذیل رجنل انفارمیشن اور گائڈنس سینٹر سے بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر فخرالدین محمد۔ سر نظامت جنگ میموریل لائبریری۔ مدینہ مینشن۔ مرایان گدا۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۲۹

۲۔ پروفیسر ڈاکٹر یو۔ محمد۔ بیت الحمد۔ ۱۰ ازکریا الونیو۔ آگور۔ مدراس ۶۰۰۰۰۸

۳۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں۔ غوثیہ انڈسٹریل اینڈ انجینرنگ ٹرسٹ ہوسر روڈ۔ بنگلور۔ ۵۶۰۰۲۹

۴۔ جناب کے۔ عبدالرشید۔ جنرل سکریٹری۔ اے۔ ایم۔ یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن۔ الفانٹر یوس۔ الکاپوری بلڈنگ۔ کلکتہ ۷۰۰۰۰۲

۵۔ ڈاکٹر اے۔ یو شیخ آئی۔ اے۔ ایس (ریٹائرڈ) چیرمین شاد آدم شیخ ٹرسٹ ۱۱ "دولت" وڈ ہاؤس روڈ۔ بمبئی۔

درخواست فارم جو ہر طرح سے مکمل ہوں اور اس کے ساتھ رجسٹریشن فیس ۲۵/- روپے (ناقابل واپسی) بذریعہ کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر جو کہ فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو، بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک بھیجی جائے۔

یہ درخواستیں اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ بکس نمبر ۵۲۔ اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے یہاں ۱۷ رجون ۱۹۸۶ء شام پانچ بجے تک پہنچ جانی چاہییں۔ تاخیر سے ملنے والی اور نامکمل درخواستیں ناقابل قبول ہوں گی۔ ایسی درخواستوں کے بارے میں مستقبل میں کوئی خط و کتابت بھی نہیں کی جائے گی۔

این۔ موئیدین

کنٹرولر آف امتحانات اور داخلہ

[160/249]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ

اشتہار داخلہ II ـــ سیشن ۸۷-۱۹۸۶

۸۷-۸۶ء سیشن کے لیے درج ذیل کورسوں میں اہل امیدواروں سے داخلے کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔ کورسز کے بارے میں تفصیلات، درخواستیں جمع کیے جانے کی آخری تاریخیں، ٹیسٹ کی تاریخیں اور داخلے کے لیے کم سے کم مطلوبہ لیاقت ہر کورس کے سامنے تحریر کر دی گئی ہیں۔

نمبر شمار	کورس اور اس کی مدت	داخلے کے لیے کم از کم مطلوبہ لیاقت	فارم جمع کیے جانے کی آخری تاریخ	ٹیسٹ کی تاریخ
۱	ڈپلوما ان انجینئرنگ (آرکیٹکچرل اسسٹنٹ شپ، سول، الیکٹریکل، الیکٹرک (انسٹرومینٹیشن) اور مکینکل) ۳ سال کا کورس	سکنڈری اسکول سرٹیفکٹ یا اس کے مساوی کوئی امتحان جس میں یہ تین مضامین، انگریزی، ہایر میتھ اور ہایر سائنس شامل ہوں یا پھر کوئی اعلیٰ امتحان جس کے مضامین انگریزی، فزکس، کیمسٹری اور میتھ رہے ہوں اور سکنڈری اسکول سرٹیفکٹ کے امتحان میں انگریزی میتھ اور سائنس میں کم از کم ۴۵٪ فیصد مجموعی نمبر حاصل کیے ہوں۔ یا پھر اعلیٰ امتحان کے مضامین فزکس کیمسٹری، میتھ اور انگریزی رہے ہوں۔	۱۴؍جون ۸۶ء	۶؍جولائی ۱۹۸۶ء
۲	پری طب (خاص مضمون کامل طب وجراحت (بی۔یو۔ایم۔ایس) ۵½ سال کی مدت کے لیے ابتدائی امتحان) ۲ سال کا کورس	سکنڈری اسکول سرٹیفکٹ/ ہائی اسکول/ یا اس کے مساوی کوئی مشرقی امتحان (اردو، فارسی عربی کسی کا بھی)	۱۲؍جون ۱۹۸۶ء	۸؍جولائی ۱۹۸۶ء

جملہ تفصیلات، کورس، فیس کی ادائیگی اور درخواستیں بھیجنے کے بارے میں قواعد وضوابط گائڈ میں دے دیے گئے ہیں۔ درخواست فارم اور گائڈ برائے داخلہ اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ بکس نمبر ۵ اے۔ایم۔یو۔ علی گڑھ کو -/۳ روپے کی قیمت کا کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر جو کہ فنانس آفیسر اے۔ایم۔یو علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو، ایک ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور 2.50 کے ٹکٹ چسپاں ہوں (صرف ایک درخواست کے لیے) روانہ کر کے بذریعہ ڈاک حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

اگر درخواست فارم بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک حاصل کرنا چاہیں تو اس کے لیے 5-25 کے ڈاک ٹکٹ چسپاں اپنا پتہ لکھا ہوا لفافہ بھیجنا ضروری ہے۔

اگر ایک سے زائد درخواست فارم مطلوب ہوں تو ہر درخواست کے لیے علیحدہ علیحدہ درج بالا لفافے بھیجنا ضروری ہیں

درخواست فارم اور دیگر متعلقہ معلومات اوپر دی گئی ہدایات کے مطابق یا تین روپے نقد جمع کر کے درج ذیل پبلک انفارمیشن اور گائڈنس سینٹر سے بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر فخرالدین محمد۔ سر نظامت جنگ میموریل لائبریری۔ مدینہ مینسن۔ مراین گدا۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۲۹

۲۔ پروفیسر ڈاکٹر یو۔ محمد۔ بیت الحمد۔ ۱۰۔ زکریا ایونیو۔ آگمور۔ مدراس ۶۰۰۰۰۸

۳۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں۔ غوثیہ انڈسٹریل اینڈ انجینئرنگ ٹرسٹ۔ ہوسر روڈ۔ بنگلور ۵۶۰۰۲۹

۴۔ کے۔ عبدالرشید۔ جنرل سکریٹری اے۔ایم۔یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن۔ انفارنوس الکاپوری بلڈنگ۔ کلکتہ۔ ۷۰۰۰۲۳

۵۔ ڈاکٹر اے۔ یو۔ شیخ۔ آئی۔ اے۔ ایس (رٹائرڈ) چیرمین شاد آدم شیخ ٹرسٹ ۱۱۔ "للت"۔ ووے ہاؤس روڈ۔ بمبئی ۴۰۰۰۳۹

درخواست داخلہ فارم منگاتے وقت اس کورس کا نام جس میں داخلے کے خواہش مند ہوں، صاف صاف تحریر فرمائیں۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں ناقابل قبول ہوں گی اور ان کے سلسلے میں کوئی خط وکتابت بھی نہیں کی جائے گی۔

این۔ مویدین

(کنٹرولر آف امتحانات اور داخلہ)

(۱۴۶/236)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱ سیشن ۸۷/۱۹۸۶ء

برائے سیشن ۸۷/۱۹۸۶ء اہل امیدواروں سے سینئر سکنڈری اسکول سرٹیفکٹ کورس میں (کلاس ۱۱ ویں 10+2 سسٹم) کے تحت داخلے کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

کورس کی تفصیلات، داخلے کے لیے کم سے کم اہلیت کی شرط، داخلے کے لیے جملہ قواعد و قوانین، گائڈ برائے داخلہ نمبر ۱ میں دیے گئے ہیں۔

درخواست فارم اور گائڈ وغیرہ اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشنز) پوسٹ بکس نمبر ۵۲ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ سے مئی ۱۹۸۶ء کے پہلے ہفتے سے ہی حاصل کیے جاسکتے ہیں جس کے لیے ۲/ روپے نقد یا اسی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر جو کہ فنانس آفیسر اے ایم یو کے نام واجب الادا ہو، جمع کرکے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ وہ امیدوار جو درخواست فارم بذریعہ ڈاک حاصل کرنا چاہیں ان کو چاہیے کہ وہ (۱/۲ ۶ × ۱/۲-۹) کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور ۱-۹۰ کے ڈاک ٹکٹ چسپاں ہوں (صرف ایک درخواست فارم کے لیے) روانہ کریں۔

اگر کوئی امیدوار درخواست فارم بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک منگانا چاہے تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے پتے کے لفافہ پر ۵-۴۰ کے ڈاک ٹکٹ چسپاں کرے۔ اگر ایک سے زائد داخلہ فارم مطلوب ہوں تو ہر ایک فارم کے لیے الگ الگ ٹکٹ چسپاں لفافہ روانہ کرنا چاہیے۔ درخواست فارم اور دیگر ہدایات وغیرہ اوپر تحریر شدہ طریقے سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی درج ذیل ریجنل انفارمیشن اور گائڈ سینٹرز سے بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر فخرالدین محمد۔ سر نظامت جنگ میموریل لائبریری۔ مدینہ مینشن۔ مرائین گدا۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۲۹

۲۔ پروفیسر ڈاکٹر یو۔ محمد۔ بیت الحمد۔ ۱۰۔ زکریا ایونیو۔ آلکور۔ مدراس ۶۰۰۰۰۸

۳۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں۔ غوثیہ انڈسٹریل اینڈ انجینئرنگ ٹرسٹ۔ ہوسپر روڈ۔ بنگلور۔ ۵۶۰۰۲۹

۴۔ کے۔ عبدالرشید۔ جنرل سکریٹری اے ایم یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن۔ الفا فریلوس اکیڈمی بلڈنگ۔ کلکتہ۔ [illegible]

۵۔ ڈاکٹر اے۔ یو۔ شیخ۔ آئی۔ اے۔ ایس (ریٹائرڈ) چیئرمین شاہ آدم فتح ٹرسٹ۔ ۱۱ للت۔ ودے ہاؤس روڈ بمبئی ۴۰۰۰۳۹

درخواست فارم جو ہر طرح سے مکمل ہوں اور رجسٹریشن فیس مبلغ ۱۵/ روپے کی شرح سے ہر منتخب اضافی دو مضامین کے کمبینیشن کے واسطے (جو کہ ناقابل واپسی ہوں گے) بذریعہ کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر جو کہ فنانس آفیسر اے ایم یو علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو، اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشنز) پوسٹ بکس نمبر ۵۲ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے یہاں ۱۸ جولائی ۱۹۸۶ء شام ۵ بجے تک یا اس سے پہلے پہنچ جانا چاہییں۔ تاخیر سے موصول ہونے درخواستیں قبول نہیں کی جائیں گی۔

دستخط ایف موئیدین۔ کنٹرولر امتحانات اور داخلہ

نوٹس

برائے داخلہ یونیورسٹی ہائی اسکولس

برائے سیشن ۸۷/۱۹۸۶ء

درج ذیل کورسوں میں داخلے کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

	اسکول کا نام	کلاس	ذریعہ امتحان
۱	ایس۔ٹی ہائی اسکول۔ اے۔ایم۔یو۔ علی گڑھ	(۱) پہلی	اردو/انگریزی
	" " "	(۵) پانچویں (۹) نویں کلاس	صرف انگریزی
۲	اے۔ایم۔یو گرلز ہائی اسکول۔ علی گڑھ	(۱) پہلی کلاس	اردو/انگریزی
	" " "	(۵) پانچویں (۹) نویں "	اردو/ہندی/انگریزی
۳	اے۔ایم۔یو۔سٹی ہائی اسکول۔ علی گڑھ	(۵) پانچویں ۹ نویں "	اردو/ہندی/انگریزی
۴	اے۔ایم۔یو۔سٹی برانچ مڈل اسکول، قاضی پاڑہ۔ علی گڑھ	(۱) پہلی کلاس	صرف اردو

درخواست فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ ۱۴ جون ۱۹۸۶ء ہے۔

پراسپیکٹس مع درخواست فارم برائے اجازت داخلہ ٹیسٹ میں شرکت کرنے کے متعلقہ اسکول سے ۴/- روپے نقد ادائیگی کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

وہ حضرات جو درخواست فارم بذریعہ ڈاک منگانا چاہیں ان کو چاہیے کہ وہ ایک ایسا لفافہ جس ۵۔۴ کے ٹکٹ چسپاں ہوں اور خود کا پتہ تحریر ہو مزید روانہ کریں۔

منیجر
اے۔ایم۔یو۔ بوائز اسکولس۔ علی گڑھ

فوڈ کرافٹ انسٹی ٹیوٹ۔ علی گڑھ

(یونیورسٹی پالی ٹیکنک کیمپس) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

داخلہ اشتہار نمبر ۱/ایف سی-اے/۸۶ (سیشن ۸۶/۱۹۸۷ء)

برائے سال ۸۷-۱۹۸۶ء درج ذیل کورسوں میں داخلے کے لیے اہل امیدواروں سے درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱- ٹریول اور ٹورزم میں ڈپلوما کورس	ایک سالہ	۲۰ انٹیک
۲- کوکری میں سرٹیفکیٹ کورس	"	"
۳- ریسٹورنٹ اور کاؤنٹر سروس میں سرٹیفکیٹ کورس	"	"

کم سے کم قابلیت برائے داخلہ　　I کورس نمبر ایک کے لیے

بی-اے/بی-ایس سی/بی کام　　کم از کم عمر کی حد　۱۹ سال

ان امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی جن کے پاس داخلے کے لیے اہلیت کے امتحان میں میڈیول ہسٹری بطور ایک مضمون رہی ہو۔

II کورس نمبر ۲ و ۳ کے لیے

۱۰+۲ کے پیٹرن پر دسویں کلاس پاس شدہ یا ہائر سکنڈری یا اس کے مساوی کوئی امتحان جو کسی منظور شدہ ادارے سے پاس کیا ہو اور کم از کم اس میں مجموعی طور پر ۵۰ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں اور انگریزی بطور ایک مضمون کے رہی ہو۔

کم از کم عمر کی حد ۱۵ سال

درخواست فارم اور رعایات برائے داخلہ ایڈمنسٹریٹو آفیسر، فوڈ کرافٹ انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ (یونیورسٹی پالی ٹیکنک کیمپس) اے-ایم یو- علی گڑھ سے ۵/- روپے نقد ادائیگی یا اتنی ہی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر جو کہ سکریٹری فوڈ کرافٹ انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو، بھیج کر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

وہ امیدوار جو درخواست فارم بذریعہ ڈاک منگانا چاہیں، ان کو چاہیے کہ وہ ۱۲ × ۲۸ سینٹی میٹر کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور ۹۰- ۱ کے ٹکٹ چسپاں ہوں (صرف ایک فارم منگانے کے لیے) روانہ کریں۔ بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک سے طلب کرنے کی صورت میں پتہ لکھے لفافے پر ۸۵-۴ کے ٹکٹ چسپاں ہونے چاہیں۔

درخواست فارم جو ہر طرح سے مکمل ہوں، ایڈمنسٹریٹو آفیسر، فوڈ کرافٹ انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ (یونیورسٹی پالی ٹیکنک کیمپس) اے-ایم-یو علی گڑھ کے یہاں ہر حالت میں ۱۷ر جون ۸۶ء یا اس سے قبل پہنچ جانے چاہئیں۔

دستخط
ایکٹنگ پرنسپل/سکریٹری
فوڈ کرافٹ انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ

نوٹ: ۱- اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ جگہ کے لیے امیدوار ہو تو اس کو ہر ایک کے لیے الگ الگ درخواست دینی ہوگی
۲- ۱۰+۲ سسٹم کی گیارہویں کلاس ہائر سکنڈری کے مساوی نہیں ہے۔

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

آئیٹم ریٹ کی بنیاد پر سر بمہر ٹینڈر مطلوب ہیں۔ جو کہ ۳۱ رمئی ۸۶ء بارہ بجے دوپہر تک وصول ہو جانے چاہئیں — ٹینڈر اسی روز ایک بجے دوپہر تک کھول دیے جائیں گے۔

ٹینڈر فارم اور اس سے متعلق کاغذات یونیورسٹی انجینئر کے دفتر سے کام کے دن آفس ٹائم میں کسی بھی وقت حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

ٹینڈر فارم کی فروخت ٹینڈر جمع کیے جانے کی مقررہ تاریخ سے ۲۴ گھنٹہ قبل بند کر دی جائے گی۔

نمبر شمار	کام کا نام	کام کیلیے مختص رقم	زر ضمانت	ٹینڈر فارم کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱	اندرونی سجاوٹ اور فرنشنگ کا کام اے۔ایم۔یو۔ علی گڑھ کے ایڈمنسٹریٹیو بلاک میں۔	۲۵۸,۹۶۰/- روپے	۶,۴۷۵/- روپے	۵۰/- روپے	تین ماہ

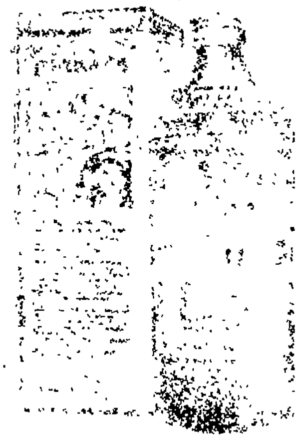
نوٹ۔ ٹینڈر دینے والے کو اس جیسے کام کرنے کا تجربہ ہونا چاہیے۔ اور وہ اس جیسے کام کا تقریباً دو لاکھ روپے کا کام کر چکے ہوں۔

لفٹیننٹ کرنل حسن مظفر
یونیورسٹی انجینیر

[۱۶۵/۲۶۰]

[illegible]


بہار نو بے بی ٹانک
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے اور دانت
نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں
کے لئے نایاب تحفہ
شربت
نزلہ
کھانسی
زکام۔ نزلہ کے لئے
خون صفا
خون کی خرابی پھوڑے
پھنسی، خارش اور
داد وغیرہ کی
دوا
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE
ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یو پی



تہذیب الاخلاق

اداریہ

یہ بات میرے خواب وخیال میں بھی نہ تھی کہ کسی دن مجھے "تہذیب الاخلاق" اور اُس کے ہندی روپ "نشانت"، کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالنی پڑے گی۔ یہ ایک رسالہ کا نہیں ایک تحریک کا نام ہے جو تقریباً ایک صدی پہلے عالمِ وجود میں آئی تھی۔

اس سے وابستہ ایک لمبی داستان ہے : مایوسیوں میں امید کی ایک کرن کی اور روایتوں کی زنجیروں سے انسانیت کو آزادی دلانے کی۔ اس کی ایک تاریخ ہے : پچھلی صدی کے مسلمانوں کی ڈوبتی کشتی بچالینے کی اور انھیں جہالت کی تاریکی سے نکال کر علم کی روشنی میں نہلانے کی، پَر افسوس! صدیوں کی تیرگی سے مانوس مسلم قوم، تہذیب الاخلاق کی روشنی برداشت نہ کرسکی۔ اُس نے صرف اسی پر اکتفانہ کیا کہ اپنی آنکھیں بند کرلے بلکہ پُرزور مخالفتوں کی وہ آندھیاں اُٹھائیں کہ یہ شمع مدتوں کے لیے گل ہوگئی۔

تہذیب الاخلاق کی بنیاد صدیوں پہ محیط عظمت کے حامل سرسیدؒ نے ڈالی۔ دورِ حاضر میں سابق وائس چانسلر سید حامد کے ملّی درد نے اس کے لیے دستِ مسیحا کا کام کیا۔ موجودہ وائس چانسلر سید ہاشم علی کی قومی خدمت کے جذبے سے سرشار سرپرستی نے اسے توانائی عطا کی اور استحکام بخشا۔ سابق مدیر نورالحسن نقوی کی ادیبانہ مہارت اور اُن کی رات دن کی محنت نے اسے پروان چڑھایا۔ اس رسالے سے وابستہ ان بلند وبالا شخصیتوں کی قطار میں خود کو کھڑا پاکر مجھے اپنے بونے پن کا احساس ہو تو کیوں نہ ہو۔ حیران ہوں اپنی اِس عزت افزائی پر، اور پریشان ہوں اس بوجھ کے احساس سے جو اِن کمزور کاندھوں پر آن پڑا ہے۔ غور کرتا ہوں اور بار بار غور کرتا ہوں کہ آخر اربابِ تہذیب الاخلاق نے مجھ میں وہ کون سی مدیرانہ صلاحیت پائی جس کی بنا پر مجھے یہ ذمّہ داری سونپی گئی۔ لیکن کوئی وجہ نظر نہیں آتی جز میری صلاحیتوں کے بارے میں اُن کے حسنِ ظن کے۔ تہذیب الاخلاق ٹرسٹ کے ممبران کے شدید اصرار کے باوجود جب ڈاکٹر نورالحسن نقوی اپنی خرابیٔ صحت کی بنا پر ادارت کی ذمّہ داریوں کو مزید سنبھالنے کے لیے تیار نہ ہوئے تو اِس خلا کو پُر ہونا ہی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ممبران کی نظرِ انتخاب مجھ جیسے سائنس کے طالب علم پر پڑی۔ اِس انتخاب میں ان کے حسنِ ظن کے علاوہ شاید ایک مقصد یہ بھی ہو کہ تہذیب الاخلاق کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں میں سائنس کی بابت بے رغبتی کو دور کیا جائے اور ان میں سائنسی مزاج پیدا کیا جائے۔ اس خیال کو اس بات سے کافی تقویت پہنچتی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں سائنسی تعلیم کے فروغ کے لیے ایک منصوبہ بند کوشش میری سربراہی میں مرکزِ فروغ سائنس [CENTRE FOR PROMOTION OF SCIENCE] کے تحت شروع کی جاچکی ہے اور ان صفحات پر کئی بار یہ اعلان کیا جاچکا ہے کہ یہ رسالہ اس مرکز کے ترجمان کا کام بھی کرے گا۔

یہ کوئی باریک بات نہیں کہ جس طرح دو انسانوں کی ہم شکلی تقریباً ایک غیر قدرتی امر ہے، اسی طرح دو انسانوں کا ایک طریق پر کار بند

ملنا بھی محال ہے۔ ہر فرد کی اپنی الگ فکر ہوتی ہے۔ اس کا اپنا تشخص ہوتا ہے اور کام کرنے کا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ حالات بھی یکساں نہیں رہتے۔ اس لیے آپ متعجب نہ ہوں۔ اگر آئندہ چند شماروں کے بعد آپ تہذیب الاخلاق میں چند نمایاں تبدیلیاں پائیں۔ اس رسالہ کے سفر کی منزل وہی رہے گی جو اس کے بانی سر سیدؒ کو مقصود تھی اور جسے اس کے دوبارہ اجرا کے وقت سے آج تک پیش نظر رکھا گیا ہے۔ البتہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے راہ تبدیل کی جاسکتی ہے۔ میں اس خیال سے صرف ایک مخصوص حد تک ہی اتفاق کرتا ہوں کہ سفر کے نقطۂ آغاز و منزل کے درمیان ایک اور صرف ایک ہی سیدھا اور آسان راستہ ممکن ہے۔ یہ نظریہ کلیتاً ہموار سطح کی جیومیٹری (اقلیدس) پر مبنی ہے۔ جب کہ کسی سفر میں ہمواری شاذ ہی میسر آتی ہے۔ راستے عموماً نشیب و فراز سے بھرے ہوتے ہیں۔ اور ایک ہلکی سی فکر یہ واضح کر دینے کے لیے کافی ہے کہ ایسی صورت میں منزل تک پہنچنے کے لیے کئی یکساں آسان راستے ممکن ہیں۔

تہذیب الاخلاق کا دوبارہ اجرا بڑے نامساعد حالات میں ہوا۔ بیشتر کا خیال تھا کہ یہ چند سانس لے کر دم توڑ دے گا۔ اگر چند نے کچھ رعایت برتی تو صرف اس حد تک کہ اس کی مدتِ حیات سیّد حامد کے علی گڑھ میں قیام تک ہے۔ ان حالات میں اسے پابندی سے نکالنا اور ممکن حد تک اچھے اور بامقصد مضامین سے مزین کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ لوگ اس میں اپنے مضامین شائع کرانے سے کتراتے تھے اس کے معیار کو بلند تر کرنا کس طرح ممکن ہوتا۔ مگر آج حالات مختلف ہیں۔ حسب توقع اسے نہ صرف موجودہ وائس چانسلر سیّد ہاشم علی کی پُرجوش سرپرستی حاصل ہے بلکہ انھوں نے اسے ایک مضبوط بنیاد بھی فراہم کر دی ہے۔ اب یہ ایک مقبول رسالہ ہے۔ اشاعت کی غرض سے آنے والے مضامین کی بھی کمی نہیں۔ اس لیے اب ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ اس کے ہر شمارہ کو مطلوبہ معیار دے سکیں اور اس میں صرف وہی مضامین شائع کریں جو اس کے اغراض و مقاصد کے حصول میں معاون ہوں۔ اس بابت ہم ایک خاکہ بنا رہے ہیں جس کے نقوش ابھی کچھ دھندلے ہیں۔ انشاء اللہ چند شماروں کے بعد یہ خاکہ واضح تر ہوتا ہوا آپ کے سامنے آجائے گا۔

اِس شمارہ سے تہذیب الاخلاق کو پندرہ روزہ کے بجائے ماہانہ کر دیا گیا ہے، اور اس کے صفحات کی تعداد دوگنی کر دی گئی ہے یہ ایک نمایاں تبدیلی ہے۔ ہو سکتا ہے آپ میں سے کچھ کو ناگوار گذرے۔ لیکن یہ بات عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی کہ مطلوبہ معیار تک پہنچنے کے لیے یہ تبدیلی ناگزیر ہے۔ اب یہ مستقبل ہی بتائے گا کہ ہمارا یہ فیصلہ کس حد تک درست ہے۔

فی زمانہ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی تنہا ایک شخص کے بس کی بات نہیں، کجا تہذیب الاخلاق جیسے بامقصد رسالے کو پابندی سے نکالنا اور اسے اعلیٰ ترین معیار تک لے جانا یہ ایک مشکل کام ہے۔ لیکن مشکل سے مشکل کام بھی آسان بن جاتا ہے اگر احباب دل سے مدد کرنے پر آمادہ ہوں۔ ہم ہر محبِ تہذیب الاخلاق سے بھرپور تعاون کی پرزور اپیل کرتے ہیں۔

آپ کا

اسرار احمد

سابق مدیر مسئول کی خدمات کا اعتراف

مکتوب سید حامد بنام سابق مدیر مسئول

۱۴ رمئی ۱۹۸۶ء

محترمی و مکرمی،　　　سلام و نیاز

کوئی غلط فہمی ہوئی یا مجھ سے لکھنے میں سہو ہوا۔ میری مراد تھی ۲۰ رمئی سے جسے ۸ رمئی سمجھا گیا۔

آپ ناحق تہذیب الاخلاق سے دستکش ہو گئے۔ آپ نے اسے بہت قرینہ اور 'رسانیت' کے ساتھ چلایا۔

تہذیب الاخلاق کے نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔ خدا کرے یہ رسالہ اپنے بانی کے مقصد کو پورا کرے۔ یونیورسٹی نے اسے گود لے لیا۔ اب اس کے لیے جینا آسان ہو گیا لیکن مشکلات کا اپنا الگ لطف ہے۔ اور ان میں حیات بھی مضمر ہے۔ اسے شاید اب جدوجہد نہ کرنا پڑے۔ تہذیب الاخلاق اب شاید خلوص کی اس حدت کا طالب نہ رہے جو تپا کر نکھارتی ہے (اس دور میں نہیں) کبھی آگے چل کر اس کی حیثیت جامعہ کی انتظامیہ کے ترجمان کی سی نہ ہو جائے، اس کی آزادیٔ فکر پر کہیں آنچ نہ آجائے۔ یہ گرد و پیش پھیلی ہوئی بے حسی کا شکار نہ ہو جائے۔ پارہ ہائے دل کی شمولیت اسے گراں نہ گزرنے لگے۔

ایسے اندیشہ ہائے دور و دراز، ایسے وساوس بے بنیاد ـــ خدا را وئی۔ ہمیں خوش ہونا چاہیے کہ تہذیب الاخلاق کی بقائے دوام کا اہتمام ہو گیا۔ مسلمانانِ ہند کی اصلاح اور پیش رفت کے لیے اس کی مساعی کو تیز تر کرنا چاہیے۔ اسے فروغ اور نیا رُخ دینا چاہیے۔ آپ کا ناتہ اپنے اس لختِ جگر سے، فاصلہ کی بدولت اور زیادہ مضبوط ہو تو بات ہے۔

مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی تامل نہیں کہ آپ نے تہذیب الاخلاق کے اہتمام اور آبیاری کا حق ادا کر دیا۔ ایک نازک وقت میں آپ نے اسے سنبھالا۔ اور ان تھک محنت کر کے اسے اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ آپ سب کو ساتھ لے کر چلے، یہ بڑی بات ہے۔ آپ نے تہذیب الاخلاق کے حلقہ کو وسعت دی، علی گڑھ میں، اور اس سے بھی زیادہ علی گڑھ سے باہر، اس کے خریدار بنانے میں آپ نے بڑی کاوش کی۔ آپ نے اس رسالہ کو پُر وقار لب و لہجہ دیا۔ آپ کا دورِ ادارت یاد رکھا جائے گا۔ بشرطیکہ اردو اور تہذیب الاخلاق پڑھنے والے باقی رہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مند اور خوش رکھے۔ آمین

والسلام

نیازمند

سید حامد

اقتباس از روداد جلسۂ ٹرسٹیان

منعقدہ ۹ رمئی ۱۹۸۶ء

صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

جناب سید ہاشم علی وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے ڈاکٹر نور الحسن نقوی کی خدمات کے سلسلے میں مندرجہ ذیل تجویز پیش کی جو باتفاق رائے منظور ہوئی

"ٹرسٹ کا یہ جلسہ ڈاکٹر نور الحسن نقوی کی ان خدمات کے لیے جو انھوں نے تہذیب الاخلاق اور نشانات کے مدیر مسئول کی حیثیت سے انجام دیں۔ اپنے جذبات تحسین و ستائش کا اظہار کرتا ہے، ٹرسٹ کے ان رسائل کو جو فروغ اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ ڈاکٹر صاحب موصوف کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے، ان کی جدوجہد سے نہ صرف یہ کہ رسالے کا پیغام وسیع تر حلقوں تک پہنچا بلکہ اس کے معیار میں ایسا اضافہ ہوا جسے ہر شخص آسانی سے محسوس کر سکتا ہے

ممبران ٹرسٹ کی خواہش تھی کہ نور الحسن صاحب بحیثیت مدیر برقرار رہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کی خرابی صحت کے باعث بڑے تامل کے ساتھ ٹرسٹ نے ان کا استعفیٰ منظور کیا اور انھیں سبکدوش کیا گیا۔

یہ بھی طے پایا کہ ڈاکٹر نور الحسن نقوی مجلس ادارت کے مستقل ممبر نامزد کیے جاتے ہیں۔"

سر سید احمد خاں

تہذیب

ہم دریافت کیا چاہتے ہیں کہ سولزیشن یا تہذیب کیا چیز ہے؟ اور کن کن چیزوں سے علاقہ رکھتی ہے؟ کیا یہ کوئی بنائی ہوئی چیز ہے؟ یا قدرت نے انسان کی فطرت میں اس کو پیدا کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ کوئی اصطلاح ہے جس کو لوگوں نے یا فیلسوفوں نے مقرر کیا ہے؟ یا یہ ایسی چیز ہے کہ اس کا مفہوم، اور جن جن چیزوں سے اس کا تعلق ہے، قانونِ قدرت میں پایا جاتا ہے؟ اس امر کے تصفیے کے لیے انسان کے حالات پر ہم کو نظر کرنی چاہیے۔ اگر تہذیب انسان میں ایک فطرتی چیز ہے، تو وحشیوں میں، شہریوں میں، سب میں اس کا نشان ملے گا۔ گو اس کی صورتیں مختلف دکھائی دیتی ہوں، اِلّا سب کی جڑ ایک ہی ہوگی۔

انسان میں یہ ایک فطرتی بات ہے کہ وہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز کو پسند کرتا ہے اور کسی کو ناپسند۔ یا یوں کہو کہ کسی چیز کو اچھا ٹھہراتا ہے، اور کسی چیز کو بُرا۔ اور اس کی طبیعت اس طرف مائل ہے کہ اس بُری چیز کی حالت کو ایسی حالت سے تبدیل کرے، جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے۔ یہی چیز سولزیشن کی جڑ ہے جو انسان کے ہر گروہ میں اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے۔ اسی تبادلہ کا نام سولزیشن یا تہذیب ہے؛ اور کچھ شبہ نہیں کہ یہ میلان یا یہ خواہش تبادلہ انسان میں قدرتی اور فطرتی ہے۔

سولزیشن یا تہذیب کی طرف انسان کی طبیعت کے مائل ہونے کے دو اصول ٹھہرے، اچھا بُرا؛ اور بُرے کو اچھا کرنا سولزیشن یا تہذیب ٹھہری۔ مگر اچھا اور برا قرار دینے کے مختلف اسباب خِلقی اور خُلقی، ملکی اور تمدّنی، ایسے ہوتے ہیں جن کے سبب اچھا اور بُرا ٹھہرانے میں، یا یوں کہو کہ قوموں کی سولزیشن میں، اختلاف پڑ جاتا ہے۔ ایک قوم جس بات کو اچھا سمجھتی ہے اور داخل تہذیب جانتی ہے، دوسری قوم اسی بات کو بہت بُرا اور وحشیانہ حرکت قرار دیتی ہے۔ یہ اختلاف سولزیشن کا قوموں کے باہم ہوتا ہے؛ اشخاص میں نہیں ہوتا، یا بہت ہی کم ہوتا ہے جب کہ ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے، تو اکثر ان کی ضرورتیں، اور ان کی حاجتیں، ان کی غذائیں، اور ان کی پوشاکیں، ان کی معلومات اور ان کے خیالات، ان کی مسرت کی باتیں اور ان کی نفرت کی چیزیں، سب یکساں ہوتی ہیں؛ اور اسی لیے بُرائی اور اچھائی کے خیالات بھی سب یکساں پیدا ہوتے ہیں؛ اور بُرائی کو اچھائی سے تبدیل کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے؛ اور یہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اس قوم یا گروہ کی سولزیشن ہے۔ مگر جب کہ مختلف گروہ ہیں مختلف مقامات میں بستی ہیں، تو ان کی حاجتیں اور خواہشیں بھی مختلف ہوتی ہیں؛ اور اس سبب سے تہذیب کے خیالات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مگر ضرور کوئی چیز ایسی بھی ہوگی جو سولزیشن کی ان مختلف حالتوں کا تصفیہ کر سکے۔

ملکی حالتیں، جہاں تک کہ وہ بود و باش سے تعلق رکھتی ہیں، نہ فکر اور خیال اور دماغ سے، ان کو تہذیب سے چنداں تعلق نہیں، بلکہ صرف انسان کے خیال کو اس سے تعلق ہے، جس کے سبب وہ اچھا اور بُرا ٹھہراتا ہے؛ اور جس باعث سے خواہشِ تبادلہ تحریک میں آتی ہے اور تبادلہ واقع ہوتا ہے، جو سولزیشن کہلاتا ہے۔ پس سولزیشن کی مختلف حالتوں کا فیصلہ وہ اسباب کر سکتے ہیں، جن کے سبب سے اچھے اور بُرے کا خیال دل میں بیٹھتا ہے۔

اچھے اور بُرے کی جگہ میں اور لفظ استعمال کروں گا، یعنی پسند اور ناپسند۔ انگریزی میں ایک لفظ "ٹیسٹ" ہے جو نہایت وسیع معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ ہماری زبان میں بھی اس قسم کے لفظ ہیں جیسا کہ "مزا یا مذاق"؛ مگر وہ استعمال میں ایسے خاص ہو گئے ہیں کہ

ان سے وہ عام اور وسیع معنیٰ خیال میں نہیں آتے؛ اس واسطے میں اس لفظ کا ترجمہ پسند کرتا ہوں۔ پس پسند کا صحیح ہونا، جو خیال کے صحیح ہونے کی فرع ہے بہت بڑا وسیلہ سولزیشن کی مختلف حالتوں کے تصفیہ کا ہے۔

خیال کی درستی اور پسند کی صحت کثرتِ معلومات پر، اور علمِ طبیعات سے بخوبی ماہر ہونے پر منحصر ہے۔ انسان کی معلومات کو روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے؛ اور اس کے ساتھ ساتھ سولزیشن بھی بڑھتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ آئندہ کوئی ایسا زمانہ آوے، کہ انسان کی تہذیب میں ایسی ترقی ہو کر اس زمانہ کی تہذیب کو بھی وہ لوگ ایسے ٹھنڈے دل سے دیکھیں جیسے کہ ہم اپنے سے اگلوں کی تہذیب کو ایک ٹھنڈے مگر مؤدّب دل سے دیکھتے ہیں۔

تہذیب، یا یوں کہو کر بُری حالت سے اچھی حالت میں لانا، دنیا کی تمام چیزوں سے، اخلاقی ہوں یا مادّی، یکساں تعلق رکھتا ہے، اور تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ تکلیف سے بچنے اور آسایش حاصل کرنے کا سب کو یکساں خیال ہے۔ ہنر اور اس کو ترقی دینا، تمام دنیا کی قوموں میں موجود ہے۔ ایک تربیت یافتہ قوم زر و جواہر، یاقوت و الماس سے نہایت نفیس نفیس خوبصورت زیور بناتی ہے ناتربیت یافتہ قوم بھی کوڑیوں اور پوتھوں سے اپنی آرائش کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ تربیت یافتہ قومیں اپنی آرائش میں سونے چاندی مونگے اور موتیوں کو کام میں لاتی ہیں؛ ناتربیت یافتہ قومیں جانوروں کے خوبصورت اور رنگین پروں کو تیلیوں سے چھلے ہوئے سنہری پوست، اور زمرد کے سے رنگ کی باریک اور خوشنما گھاس میں گوندھ کر اپنے تئیں آراستہ کرتی ہیں۔ تربیت یافتہ قوموں کو بھی اپنے لباس کی درستی کا خیال ہے؛ ناتربیت یافتہ قومیں بھی اس کی درستی پر مصروف ہیں۔ شاہی مکانات، نہایت عمدہ اور عالی شان بنتے ہیں، اور نفیس چیزوں سے آراستہ ہوتے ہیں؛ ناتربیت یافتہ قوموں کے جھونپڑے، اور ان کے رہنے کے گھونپے، درختوں پر باندھے ہوئے ٹانڈے، زمین میں کھودی ہوئی کھوئیں بھی، تہذیب سے خالی نہیں۔ معاشرت کی چیزیں، تمدن کے قاعدے، عیش و عشرت کی مجلسیں، خاطر اور مدارات کے کام، اور اخلاق و محبت کی علامتیں، دونوں جگہ پائی جاتی ہیں۔

علمی خیالات سے بھی ناتربیت یافتہ قومیں خالی نہیں؛ بلکہ بعض چیزیں ان میں زیادہ اصلی اور قدرتی طور سے دکھائی دیتی ہیں؛ مثلاً شاعری، جو ایک نہایت عمدہ فن تربیت یافتہ قوموں میں ہے، ناتربیت یافتہ قوموں میں عجیب عمدگی و خوبی سے پایا جاتا ہے۔ یہاں خیالی باتوں کو ادا کیا جاتا ہے، اور وہاں دلی جوشوں اور اندرونی جذبوں کا اظہار ہوتا ہے۔

موسیقی نے تربیت یافتہ قوموں میں نہایت ترقی پائی ہے، مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں بھی عجیب کیفیت دکھائی ہے۔ ان کی ادا اور آواز کی پھرت، اس کا گھٹاؤ اور اس کا بڑھاؤ، اس کا ٹھہراؤ اور اس کی اپج، ہاتھوں کا بھاؤ اور پانوؤں کی دھمک، زیادہ تر مصنوعی قواعد کی پابند ہے۔ مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں یہ سب چیزیں دلی جوش کی موجیں ہیں؛ وہ لے اور تال، راگ اور راگنی کو نہیں جانتے، مگر دل کی لہر، ان کی لے، اور دل کی پھڑک، ان کا تال ہے؛ ان کا غول باندھ کر کھڑا ہونا، طبعی حرکت کے ساتھ اچھلنا، دل کی بیتابی سے جھکنا، اور پھر جوش میں آکر سیدھا ہو جانا، گو نزاکت اور فنِ غنیاگری سے خالی ہو، مگر قدرتی جذبوں کا روکنا اور ان کو عمدہ حالت میں رکھنا، تمام قوموں کے خیالات میں شامل ہے۔ پس، جس طرح کہ ہم تہذیب کا قدرتی لگاو تمام انسانوں میں پاتے ہیں، اسی طرح اس کا تعلق عقلی اور مادی سب چیزوں میں دیکھتے ہیں۔ جن چیزوں میں کہ ترقی، یعنی بُرائی سے اچھائی کی طرف رجوع، یا ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ کی طرف، تحریک ہو سکتی ہے، اسی سے تہذیب بھی متعلق ہے۔

پس سولزیشن یا تہذیب کیا ہے؟ انسان کے افعال ارادی اور جذباتِ نفسانی کو اعتدال پر رکھنا، وقت کو عزیز سمجھنا، واقعات کے اسباب کو ڈھونڈھنا اور ان کو ایک سلسلہ میں لانا؛ اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور طریقِ تمدن اور علوم و فنون کو بقدر امکان قدرتی خوبی اور فطرتی عمدگی پر پہونچانا، اور ان سب کو خوش اسلوبی سے برتنا۔ اور اس کا نتیجہ کیا ہے؟ روحانی خوشی اور جسمانی خوبی اور اصلی تمکین، اور حقیقی وقار، اور خود اپنی عزت کی عزت۔ اور درحقیقت یہی پچھلی ایک بات ہے، جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز ہوتی ہے۔

محمد تقی امینی

اسلام میں علم کی تقسیم

اسلام دین فطرت ہے۔ اس کے پیغمبر (فداہ ابی و امی) صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہر اچھی و دانائی کی بات دانش مند کی گمشدہ پونجی ہے جہاں بھی وہ ملے اس کا وہ زیادہ مستحق ہے"[1]

ایک روایت میں "ضالۃ المومن"[2] ہے۔ یعنی مومن کی گمشدہ پونجی ہے جس کو اپنی سمجھ کر لینا اور قبول کرنا چاہیے کسی قسم کی تنگدلی و احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ محدثین نے اس حدیث کو کتاب العلم میں ذکر فرمایا ہے جس سے ظاہر ہے کہ "علم" اس کا اولین محل ہے۔

اسلام نے امت مسلمہ کو ایک مقام و منصب عطا کیا ہے جس کے پیش نظر اس نے دو قسم کے علم کی طرف رہنمائی کی ہے۔

(۱) وہ علم جس کا تعلق وحی الٰہی سے ہے۔

(۲) وہ علم جس کا تعلق عقل انسانی سے ہے۔

قرآن میں ہے۔

"اپنے رب کے نام سے پڑھئے جس نے پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے — آپ پڑھئے آپ کا رب نہایت کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا انسان کو وہ سکھایا جو وہ جانتا نہ تھا"[3]

یہ سب سے پہلی آیت ہے جس میں یہ حقیقت ظاہر کی گئی ہے کہ انسان کی پیدائش جس مادہ سے ہوئی اس کے اعتبار سے اگرچہ وہ کسی عزو شرف کا مستحق نہیں ہے۔ لیکن علم کی بدولت وہ ترقی کی ہر منزل پر پہنچ سکتا ہے۔

دوسری جگہ ہے۔

"اور اللہ نے آدم کو کل "الاسماء" سکھائے"[4]

مفسرین کے بیان کے مطابق "الاسماء" سے مراد اشیاء کی ذات اُن کے خواص، علم کے اصول صنعتوں کے قوانین اور حالات و کیفیات وغیرہ ہیں[5] ظاہر ہے کہ انھیں پر ریسرچ اور تحقیق کر کے موجودہ علم و فن کے مختلف شعبے قائم ہوئے ہیں۔ پھر علم سے مراد علم تفصیلی نہیں علم اجمالی ہے۔ علما اجمالیا و لیس المراد العلم التفصیلی[6] جس سے صلاحیت کی طرف نشاندہی ہے جو پیدائش ہی کے وقت انسان کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ پھر انسان کی غیر محدود خواہشوں اور ضرورتوں کے تحت مختلف علوم و فنون کی شکل میں یہ صلاحیت ظاہر ہوتی رہی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح علم وحی کی تفصیلات بیان کیں اسی طرح عقلی علوم کی چیزوں سے استفادہ کر کے رہنمائی کی شاید آپ کو سن کر تعجب ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ نفس نفیس اپنے زمانے کے جدید ترین قوت و طاقت کے آلات استعمال فرمائے۔ وہ یہ تھے۔

دبابہ — یہ خاص قسم کی گاڑی تھی۔ جو تیر سے حفاظت کے لیے موٹا چمڑہ منڈھ کر بنائی جاتی تھی اور قلعہ شکنی کے لیے استعمال کی جاتی تھی[7]۔

ضبر۔ لکڑی پر کھال منڈھ کر چھتری کی طرح بنائی جاتی جس کے ذریعہ پیچھے[8] کی تیر سے حفاظت ہوتی تھی۔

منجنیق، یہ ایک قسم کی مشین تھی۔ جس کے ذریعہ وزنی پتھر دشمنوں پر برسائے جاتے تھے اور قلعہ شکنی کا کام لیا جاتا تھا[9]۔

خسک: یہ ایک خار دار گھاس (گوکھرو) کی شکل کا ہتھیار تھا جس کو قلعہ اور لشکر کے چاروں طرف بکھیر کر راستہ کو مخدوش کر لیا جاتا تھا[10]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آلات کو بر آمد کر کے غزوہ طائف میں استعمال فرمایا[11]۔ بلکہ منجنیق سب سے پہلے خود چلائی اور خسک اپنے ہاتھ سے بکھیری۔

ابن ہشام کہتے ہیں۔

جس شخص پر اعتماد کرتا ہوں۔ اس نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ اسلام میں سب سے پہلے طائف والوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منجنیق چلائی[11]

مقریزی کہتے ہیں،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کے قلعہ پر منجنیق نصب[12] کی۔

دوسری جگہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قلعہ کے گرد خسک بکھیری[13]

جس منجنیق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال کیا تھا اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض کے نزدیک وہ باہر سے منگائی گئی تھی اور بعض کے نزدیک حضرت سلیمان فارسیؓ نے اسے بنایا تھا[14]۔

طائف فتح ہونے کے بعد ۹ھ میں عروہ بن مسعود ثقفی اور غیلان بن سلمہ ثقفی نے اسلام قبول کیا۔ اور "جرش" جا کر مذکورہ بالا ایجادات میں مہارت حاصل کی[15]

"جرش" دمشق کے مضافات میں ایک شہر تھا جو اس وقت کی دوسری بڑی طاقت "رومن امپائر" کے قبضہ میں تھا، اس میں ہتھیاروں کا بڑا کارخانہ تھا۔ شرجیل بن حسنہ نے حضرت عمرؓ کے زمانے میں اسے فتح کیا تھا[16]۔ جرش فتح ہونے کے بعد ہتھیار سازی کا کارخانہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تو انھوں نے اسے اور زیادہ ترقی دی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کی تفصیل سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ غلط فہمی دور کرنے کے لیے یہ تفصیل ذکر کی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ مذہب کے غلط تصور نے ایک بڑے طبقہ میں یہ خیال عام کر دیا ہے۔ کہ صرف مروجہ مذہبی مراسم و اعمال کی پابندی سے وہ سب کچھ مل جائے گا جس کو دنیا والے انتھک جد و جہد اور محنت و قربانی سے حاصل کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات قدرت کے قانون عدل کے خلاف ہے جب تک اس خیال کی اصلاح نہ ہوگی۔ صورت حال کی تبدیلی کی کوئی توقع نہیں ہے اور مزید ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ ایک بڑے طبقے کے نزدیک ہر قدیم شئے دین بن گئی جو محمود ہے۔ اور ہر جدید شے دنیا بن گئی جو مذموم ہے۔ منطق و قدیم فلسفہ دین ہے۔ سائنس و جدید فلسفہ دنیا ہے۔ تیر اندازی و شہسواری دین ہے اور این۔ سی۔ سی فوجی تربیت دنیا ہے۔ عبادت و اخلاق کی تعلیم دین ہے۔ اور ریسرچ وتحقیق کی تلقین دنیا ہے۔ غرض جس پر قدامت کی چھاپ ہو وہ سب دین اور جدت کی جس پر مہر لگی ہو وہ سب دنیا ہے۔

نہایت دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ تصور مسلمانوں کو زندہ رہنے قابل کبھی نہیں بنا سکتا۔ لامحالہ ان کو مسجد و مدرسہ کی چہار دیواری میں محدود ہو گا اور پھر بھی ان کی عزت و ناموس کا سودا ہوتا رہے گا۔

حواشی

[1] ترمذی و ابن ماجہ و مشکوٰۃ کتاب العلم۔

[2] ترمذی کتاب العلم و ابن ماجہ کتاب الزہد

[3] العلق ۱۶

[4] البقرۃ ۶ ۳

[5] قاضی عبداللہ بیضاوی ۶۷ الرازی تفسیر کبیر ۶۲

[6] قاضی ثناء اللہ تفسیر مظہری رکوع ۱۴ ص ۵

[7] ابو القاسم عبد الرحمٰن السہیلی الروض الانف سیرۃ النبویہ لابن ہشام فصل ذکر تعلیم اہل طائف۔

[8] ایضاً

[9] لسان العرب

[10] القاموس المحیط

[11] تقی الدین احمد بن علی مقریزی امتاع الاسماع حصن الطائف۔

[12] ابن ہشام السیرۃ النبویہ ذکر غزوۃ الطائف

[13] امتاع الاسماع حصن الطائف

[14] ایضاً

[15] ایضاً

[16] ابن ہشام السیرۃ النبویہ ج ۴ ذکر غزوۃ الطائف والروض الانف فصل ذکر تعلیم اہل الطائف۔

[17] امتاع الاسماع نظر رسول اللہ بالعرج حاشیہ ۳۶۶

"کارخانۂ قدرت پر غور کرنا بھی عبادت ہے"

[حضرت علیؓ]

عتیق احمد صدیقی

مسلمانوں کی تعلیم

ایک لمحۂ فکریہ

(یہ مقالہ انجمن اسلام احمد آباد کی صدسالہ تقریبات کے موقع پر پیش کیا گیا)

گذشتہ صدی میں کہ اب اس وقت کو سو سال سے زیادہ ہو چکے ہیں سرسید نے قوم کی فلاح کا نسخہ جدید تعلیم کے حصول کو قرار دیا۔ اور اس کے لیے مخلصانہ اور مجاہدانہ کوشش شروع کی۔ علاوہ ازیں کہ مغربی علوم اہل ہند بالخصوص مسلمانوں کے لیے اجنبی تھے اور اس وجہ سے ایک خاص قسم کی اجنبیت پیدا ہو گئی تھی اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ۱۸۵۷ء کے خونین واقعات بلکہ اس سے پہلے کی سیاسی ہزیمتوں کی وجہ سے انگریزوں اور ان سے متعلق ہر چیز کے بارے میں مسلمانوں کے دلوں میں گہری نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ انگریزوں کے ساتھ یورپ سے آنے والے علوم جدیدہ سے نفرت پیدا ہو جانا لازمی تھا خاص طور پر اس لیے بھی کہ ان علوم کے حصول کے بعد مذہب سے بیگانگی اور اپنی تہذیب کے بارے میں حقارت پیدا ہو جانے کی مثالیں نایاب نہیں تھیں۔ عیسائی مشنریاں ہندوستانیوں کی زبوں حالی سے فائدہ اٹھا کر عیسائیت کی تبلیغ میں سرگرم تھیں۔ لیکن سرسید کو یقین ہو گیا تھا کہ تمام تر خدشات کے باوجود علوم جدیدہ کو حاصل کیے بغیر چارہ کار نہیں ہے۔ ان کو معلوم تھا کہ برادران وطن کے بہت سے طبقے نئے حالات سے سمجھوتہ کر کے نئی شاہراہوں پر گامزن ہو چکے ہیں۔ اور بہت سی منزلیں طے کر چکے ہیں۔ یعنی تعلیم حاصل کر کے ایک طرف سرکاری و نیم سرکاری ملازمتوں پر قابض ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف تعلیم جدیدہ کے ثمرات و برکات کے طور پر تجارت اور صنعت و حرفت میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور مسلمان نہ صرف تعلیم جدیدہ کے ثمرات و برکات کے طور پر تجارت اور صنعت و حرفت میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور مسلمان نہ صرف تعلیم میں پیچھے رہ گئے ہیں بلکہ ان تمام میدانوں میں بھی پیچھے رہے جا رہے ہیں۔ ان کی جان توڑ کوششوں سے صورتِ حال میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ جمود ٹوٹا، قوم غفلت سے چونکی، موافقت و مخالفت کا شور پورے ملک میں پھیل گیا۔ اور انیسویں صدی ختم ہوتے ہوتے مسلمانوں کی تعلیم جدید سے جھجک ختم ہو گئی۔ تعلیم کے فروغ کے لیے انجمنیں قائم ہوئیں۔ جگہ جگہ اسکول اور کالج کھلنے لگے۔ اور اس طرح ایک عہد کا آغاز ہو گیا۔ ان کوششوں کو اب سوا سو سال گزر چکے ہیں لیکن کیا ان کے خاطر خواہ نتائج مرتب ہوئے؟ کیا مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ حل ہو گیا ہے؟ ابتدائی تاخیر و غفلت سے جو نقصان ہوا تھا کیا اس کی تلافی ہو گئی؟ کیا مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ حل ہو گیا ہے؟ ابتدائی تاخیر و غفلت سے جو نقصان ہوا تھا کیا اس کی تلافی ہو گئی؟ کیا مسلمان تعلیم میں ملک کے دوسرے طبقوں کے برابر آ گئے؟ کیا ملک میں تناسب آبادی کے اعتبار سے مسلم نوجوانوں کی متناسب تعداد تعلیم یافتہ ہو گئی؟ کیا ہم نے تعلیم کی ملی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ضروری اسباب مہیا کر لیے؟ کیا ہم نے ملک میں ایسے اور اتنے ملی ادارے قائم کر لیے جو ہماری ضرورتوں کی تکمیل ہو سکیں؟ کیا تعلیم کے ثمرات سے قوم پوری طور پر بہرہ ور ہونے لگی۔ کیا تعلیم کے ادنیٰ اور اعلیٰ مقاصد حاصل ہو گئے؟

کیا ندامت کا احساس ذہن پر نہیں چھا جاتا۔ جب معلوم ہوتا ہے کہ ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے؟ اس کے لیے قصوروار کون ہے۔ شاید ساری قوم کہ جس نے اس طویل مدت میں بھی خود کو اور وسائل ضروری کو اس طرح مجتمع نہیں کیا کہ مسلمانوں کے تعلیمی مسائل

حل ہوتے مگر اس مایوس کن صورت حال میں بھی قابل مبارکباد ہیں وہ اشخاص یا ادارے یا انجمنیں جو اپنی کوششوں کو برابر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ آپ کی یہ انجمن اسلام جس کی دعوت پر ہم سب یہاں جمع ہیں قابل مبارکباد ہے کہ اس نے سو سال سے اس دیار میں تعلیمی اور تہذیبی سرگرمیاں کو جاری رکھا ہے۔ اس انجمن نے جو کارنامے اس مدت میں انجام دیئے ہیں ان کا تفصیلی تعارف اس موقع پر کرایا جا چکا ہے۔ لیکن کوئی انجمن اتنی مدت تک اپنا وجود باقی رکھ سکے اور کچھ نہ کچھ کرتی چلی جائے۔ یہ بھی کچھ کم اہم بات نہیں ہے۔ اور وہ حضرات جن کے ہاتھوں میں اس کی باگ ڈور رہی ہو قابل صد ستائش ہیں۔

آج اس ہمہ گیر ترقیات کے دور میں علم اور تعلیم کی اہمیت کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے علم کی برکات آج اس طرح ظاہر اور روشن ہیں جس طرح ہمارے سروں پر دوپہر کا چمکتا ہوا سورج۔ علم انسان بلکہ انسانیت کا ذریعہ ہے۔ یہی تمام ترقیادت کی بنیاد ہے۔ اسی سے انسان کو نہ صرف دوسری مخلوق پر بلکہ اپنے ہم جنسوں پر بھی فضیلت اور برتری حاصل ہے۔ اسی سے انسان نے وہ قوت حاصل کی ہے جس کے ذریعہ اس نے روئے زمین پر اپنی حاکمیت قائم کی۔ اور اب آسمانوں پر کمندیں پھینک رہا ہے۔ جہاں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ افراد میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے وہیں تعلیم یافتہ قومیں بھی غیر تعلیم یافتہ قوموں سے ممتاز رہتی ہے۔ اور ان دونوں میں وہی نسبت نظر آتی ہے جو آدمی اور جانور میں ہوتی ہے۔ علم اور تعلیم کی کمی یا فقدان سے قوموں کی توانائی ختم ہو جاتی ہے کسی دانشور نے کہا تھا کہ جس طرح بدن میں خون کی کمی تمام بیماریوں کی جڑ ہے اسی طرح تعلیم کی کمی تمام مصائب کی جڑ ہے۔ اسلام نے حصول علم پر جس قدر زور دیا اور جس طرح سے اس کی ترغیب دی اس کی مثال مذاہب عالم میں ملنا مشکل ہے۔ لیکن یہ کیسے افسوس کی بات ہے کہ اسلام کے نام لیوا علم سے جتنی دور ہو گئے۔ شاید ہی دنیا کی کوئی قوم اس طرح دور ہوئی ہو۔ اس جدید دور میں ہمارے بزرگ اور دانشور پچھلے سو سال سے قوم کو تعلیم کی طرف آنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ مگر نتیجہ بہت زیادہ خوش کن نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے ابھی تک تعلیم کی اہمیت کو محسوس ہی نہیں کیا۔ اگر محسوس کر لیا ہوتا تو تمام تر دشواریوں پر قابو پا کر اب تک تعلیم کو عام کر دیا ہوتا۔ ایک تصور نے ہماری تعلیمی مساعی کو نقصان پہنچایا ہے۔ اور وہ یہ کہ تعلیم حاصل کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ پیٹ کے لیے پروانہ مل جائے۔ اور تعلیم یافتہ شخص چھوٹی یا بڑی سرکاری یا نیم یا غیر سرکاری ملازمت حاصل کرے۔ اور چاہے تنگ دستی کے ساتھ ہو لیکن زندگی بسر کرے۔ ہمارے نوجوانوں کے ذہن میں اور معاشرے میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ معاش کا اچھا ذریعہ ملازمت ہے کیونکہ اس میں تنخواہ کی ضمانت ہو جاتی ہے اور ملازم کے حوصلہ کی آزمائش بھی نہیں ہوتی بلکہ ایک مقررہ تنخواہ پر وہ مقررہ کام انجام دیے چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسکول کالجوں میں زیر تعلیم طلباء کی بڑی تعداد کا دھیان برابر ملازمت پر لگا رہتا ہے۔ اور جب وہ تعلیم ختم کر کے نکلتے ہیں تو اسی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ملازمتوں کا ملنا بھی آسان نہیں ہے۔ امیدواروں کی تعداد اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ سب سند یافتہ لوگوں کو ملازمت نہیں مل سکتی۔ بالخصوص مسلمانوں کو کہ ان کے پاس نجی کاروبار کے ادارے بہت کم ہیں اور دوسری جگہ ان سے امتیاز برتا جاتا ہے اور جب ملازمت نہیں ملتی تو وہ دل شکستہ ہو کر تعلیم ہی سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اور دوسرے ان کی مثالیں پیش کر کے بچوں کی تعلیم کی طرف سے بے توجہی برتتے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کہ فی زمانہ تعلیم اور اس سے حاصل ہونے والی تعلیمی سندیں حصول معاش کا ذریعہ ہیں۔ لیکن یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ تعلیم کا واحد مقصد یہ نہیں ہے۔ یہ تو بہت ادنی سا مقصد ہے جو تعلیم کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ بڑا فائدہ تو زندگی کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ وہ روشن خیالی پیدا ہوتا ہے جو زندگی کی شاہراہوں کو وسیع تر اور روشن تر کر دے۔ تعلیم تربیت ذہنی کا سبب ہے۔ اور زندگی کے دشوار مراحل کو آسان بناتی ہے۔ امکانات کی نئی دنیا کی تلاش علم ہی کی بنیاد پر کی جا سکتی ہے۔ علم ہی ہمیں زمانہ اور زندگی کی تکمیل کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ علم ہی ایسی توانائی بخشتا ہے جو کسی دوسرے ذریعے سے ممکن نہیں ۔۔۔ آج دنیا پر حکمرانی ان ہی قوموں کی ہے جن کے ہاتھ علوم کے خزانوں کی کنجیاں ہیں۔ علم کی اصلی برکات کو نظر انداز کر کے ادنی امور پر اکتفا کر لینا محض نادانی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ انسانی زندگی معاش کے گرد گھومتی ہے۔ کوئی بھی تصور جو معاش کو یکسر نظر انداز کر دے وہ زندگی سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا لیکن معاش کا انحصار صرف ملازمتوں پر نہیں ہے۔ تجارت، ...

صنعت و حرفت اور ایسے ہی دوسرے بہت سے آزاد پیشے کہیں زیادہ منفعت بخش ہیں۔ آزادی کے بعد ملک کی ترقی کی رفتار تیز ہو گئی ہے خاص طور پر زراعت اور صنعت و حرفت میں بے پناہ ترقی ہوئی ہے۔ اور تقاضائے وقت کے مطابق ان میدانوں میں ترقی اور معاش کے نئے باب کھلیں گے اور تجارت کو بھی اسی راہ سے فروغ ہوگا۔ جو طبقے اس سمت مناسب توجہ کریں گے وہ اپنے لیے درخشاں مستقبل کی داغ بیل ڈال سکیں گے۔ حکومت نے زراعتی اور صنعتی تعلیم کے اداروں کا نظام قائم کیا ہے۔ ان اداروں سے ہر سال ہزارہا افراد فارغ ہو کر نکل رہے ہیں۔ اور اگر ایک طرف معاشی طور پر خود کفیل ہو کر اپنے پیروں پر کھڑے ہو رہے ہیں۔ تو دوسری طرف ملک کی تعمیر و ترقی میں معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ ہم نے ابھی تک اس طرف بھی توجہ نہیں کی۔ اور تعلیم میں ہماری جو عمومی پسماندگی ہے وہ ان میدانوں میں اور بھی زیادہ بڑھی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا تعلیمی قافلہ جو پیچھے رہ گیا تھا وہ برابر پیچھے رہا جاتا ہے۔ بلکہ روز بروز زیادہ ہی پیچھے ہوتا جا رہا ہے۔ تعلیم کی طرف وہ رغبت اور شوق اور اس کے نتیجے میں ظاہر ہونے والی کوشش اور جد و جہد جو ہندوستان کے بعض دوسرے طبقوں میں نظر آتی ہے۔ مسلمانوں میں ابھی تک نظر نہیں آتی۔ اہل نظر پچھلی ایک صدی سے اس طرف توجہ دلا رہے ہیں۔ مگر ان کی ساری چیخ پکار خواہ بے سود نہ رہی ہو۔ لیکن اتنی نتیجہ خیز یقیناً نہیں ہو سکی جس کی ضرورت تھی۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

۱۸۷۰ء میں سر سید نے ایسے ہی اسباب معلوم کرنے کے لیے ایک انعامی اشتہار جاری کیا تھا اور ایک کمیٹی قائم کی تھی جو یہ معلوم کرے کہ (۱) سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان طالب علم کس لیے کم پڑھتے ہیں۔ اور (۲) علوم قدیمہ ان میں کیوں گھٹ گئے۔ اور علوم جدیدہ کیوں نہیں رواج پاتے۔ تمام تر تفتیش و تحقیق کے بعد جو نتائج اخذ کیے گئے ان کا خلاصہ یہ تھا۔

(۱) مسلمان انگریزی تعلیم کی نسبت تعصب رکھتے ہیں

(۲) مسلمانوں کی تعداد سرکاری مدارس میں جتنی ہونی چاہیے اس سے بہت کم ہے۔

(۳) سرکاری طریقہ تعلیم مسلمانوں کی ضرورتوں کے لیے کافی نہیں جن خیالات کی وجہ سے مسلمان اپنی اولاد کو سرکاری مدارس میں نہیں بھیجتے ہیں ان میں سے اکثر واجبی ہیں۔

(۴) سرکاری اسکولوں کے طریقہ تعلیم میں اگر کچھ تبدیلی بھی ہو جائے تو مسلمانوں کی تمام ضرورتیں رفع نہیں ہو سکیں۔

(۵) اپنے علوم قدیمہ کو محفوظ رکھتے علوم جدیدہ سے مستفید ہونے اور اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کرنے کے لیے اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ مسلمان اپنی تعلیم کی فکر خود کریں۔

حضرات!

اس امر کو ایک صدی سے زیادہ گزر جانے کے بعد اگرچہ مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد اسکولوں اور کالجوں میں زیر تعلیم ہے۔ لیکن تناسب آبادی کے اعتبار سے شاید بہت زیادہ فرق پیدا نہیں ہوا۔ ہندوستان کے دوسرے طبقوں کے مقابلہ میں ہم جس قدر سو سال پیچھے تھے۔ شاید اتنے ہی پیچھے اب بھی ہیں اور آج بھی ایسے ہی جائزے کی ضرورت پھر محسوس ہوتی ہے۔ اگرچہ دلچسپ صورت حال یہ ہے کہ اپنے اسکولوں کے لیے قائم کرنے میں جس قدر توجہ اس زمانے میں ہوئی ہے وہ امید افزا ہے۔ ہمدرد تعلیمی سوسائٹی نے سنہ ۱۹۸۲ء میں پورے ملک کے ۴۰۰ مسلم اسکولوں کا جائزہ لیا۔ اس جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے سنہ ۱۹۰۷ء تک اپنے صرف ۱۰۸ اسکول قائم کیے تھے سنہ ۱۹۰۷ سے سنہ ۱۹۴۷ تک ۴۱۲ اسکول قائم کیے اور ۱۹۴۷ء سے سنہ ۱۹۸۲ء تک ۱۲۷۹ اسکول قائم ہوئے ۳۵ سال میں قائم ہونے والے اسکولوں کی یہ تعداد بظاہر اطمینان بخش ہے۔ لیکن اب بھی ضرورتوں کی تکمیل نہیں ہو پا رہی ہے۔ سرکاری یا دیگر غیر سرکاری اسکولوں میں یا تو مسلمان بچوں کے لیے گنجائش ہی نہیں نکلتی۔ یا وہ خود بعض تعصبات یا تحفظات ذہنی یا حقیقی موانعات کی وجہ سے ان کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ نظریہ تعلیم کا یہ مسلم اصول ہے کہ جس فرقہ کو تعلیم دلانا مقصود ہے تعلیمی نظام کو اس فرقہ کی ضروریات کے موافق ہونا چاہیے اگرچہ اس ضرورت کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کسی ملک میں رہنے والے فرقوں کو مجموعی طور پر اس ملک کے تقاضوں کو بھی پورا کرنا چاہیے لیکن اگر نظام تعلیم کسی فرقہ کی ضرورتوں اور امنگوں کو پورا نہیں کرتا اور مزاج سے میل نہیں کھاتا تو یہ فرقہ رفتہ رفتہ تعلیم سے ہی دور ہو جائے گا۔ اور اگرچہ اس بُعد کی قیمت خود اس فرقہ کو چکانی پڑتی ہے لیکن اس کے مضر اثرات سے مجموعی طور پر ملک بھی نہیں بچ سکتا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کی کوششوں کے نتیجہ میں مسلمانوں نے خود کو حالات سے ہم آہنگ کیا تھا کہ ۱۹۴۷ء کے انقلاب نے ایک نئی صورت حال پیدا کر دی۔ جو پہلی

صورت سے بھی زیادہ خطرات کی حامل تھی۔ ہندی یا دوسری علاقائی زبانوں
کا نفاذ، درسی کتابوں میں ہندو اساطیر کی بھرمار، اسکولوں میں پڑھائی جانے
والی تاریخ کی کتابوں میں مندرجات ایسے امور تھے جو ایک مرتبہ پھر موانع
کے طور پر ابھرے۔ اور مسلمان اپنے بچوں کو سرکاری یا دیگر اسکولوں میں
بھیجنے سے اجتناب کرنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ ملی ادارے قائم کرنے کی
کی طرف توجہ دی گئی۔ لیکن اب بھی نہ تو یہ ادارے ہماری ضرورتوں کی
کفالت کرتے ہیں نہ تمام تر ترغیبات کے باوجود مسلمان ابھی تک تعلیم کی
طرف جتنا چاہیے اتنا متوجہ نہیں ہیں۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ معاملہ
یہاں مطلق تعلیم حاصل کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ اس مقابلہ کو بھی پیش
نظر رکھنا ہوگا۔ جو ملک کے مختلف طبقات کو ایک دوسرے کے ساتھ درپیش
ہے۔ جو طبقے ایک عرصہ سے بیدار ہیں اور ترقی کی دوڑ میں مسلمانوں سے پہلے
ہی بہت آگے ہیں۔ کوشش تو ان سے آگے نکلنے کی یا کم از کم ان کے برابر پہنچ جانے
کی ہونی چاہیے لیکن ہماری کوتاہی بخت نے شاید کبھی اس کا عزم ہی نہیں کیا۔
اور مقابلہ کی اسپرٹ سے خود کو دور رکھا۔ اسی میں عافیت بھی محسوس کی اور
خوش فہمی کی فضا بھی قائم کی نتیجہ صرف اتنا ہی نہ ہوا کہ ہم دوسروں کے برابر
نہ آسکے بلکہ مقابلہ آرا طبقوں کے دباؤ نے ہمیں مزید پیچھے ڈھکیل دیا۔ حالات
کی نامساعدت اس پر مستزاد ہوئی ہماری رفتار اور سست ہو گئی۔ یہاں تک
کہ پست اقوام جن کا کوئی مقام قومی زندگی میں نہیں تھا۔ مقابلہ میں وہ بھی تیز
قدم ہو کر آگے بڑھنے لگیں۔ یہاں تک کہ ہم ان کے لیے بھی گرد راہ بن کر رہ
گئے ۱۹۶۲ء کے پبلک سروس کمیشن کے سول سروس امتحان کے نتائج پر
نظر ڈالیے تو بات واضح ہوتی ہے۔ ۱۹۶۲ء منتخب امیدواروں میں مسلمانوں
کی تعداد صرف ۱۹ ہے۔ پست اقوام اور قبائل کے امیدواروں کی تعداد
۲۳۹ ہوتی ہے یعنی مسلمان صرف ۲ فی صدی اور پست اقوام ۲۵ فی صدی
ان اعداد کے سلسلے میں یہ بات بھی مدنظر رکھنی ہوگی کہ مقابلہ جاتی امتحانوں
میں امیدواروں کی کارکردگی کے ساتھ سرکار کی پشت پناہی بھی شامل ہے۔
جو خصوصی سہارے کے طور پر ان طبقوں کو حاصل ہے یہ صورت حال
صرف ملک کے اعلیٰ ترین واحد ادارہ کی نہیں بلکہ جس سطح پر بھی دیکھیے
کم و بیش یہی صورت حال ہے۔ عملاً نتیجہ اس کا ایک ہی ہے مسلمان اپنی
پچھڑی حالت میں مزید پچھڑتے جارہے ہیں اسباب کی تلاش کیجیے تو

خارجی تعصبات موانعات اور دشواریوں کے علاوہ ایک
کی طرف مناسب توجہ نہ ہونا ہے۔ لیکن خود یہ سوال پید
تجربوں آزمائشوں اور زمانہ کے تھپیڑوں کے باوجود حص
تعمیر کی بنیاد فراہم کرنے پر توجہ کیوں نہیں ہے۔ ان وجوہ کو
ان کے تدارک کی کوشش کرنا ملی فریضہ ہے وجوہ چند د
لیکن ان میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) مسلمانوں کے جن طبقوں یا خاندانوں میں تعلی
نہیں رہی۔ وہ اپنی جہالت میں ہی مگن ہیں۔ نہ تعلیم کی اہم
ہے۔ اور نہ ان کے معاشرہ میں اس کے لیے فضا سازگار ہے
میں تعلیم بالغان اور سماجی اصلاحی پروگراموں کے ذریعہ لو
کے ساتھ ترغیب پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

(۲) کبھی افلاس کو بھی تعلیم کی کمی کا سبب بتایا جاتا ہے
ایک وہمی اور خیالی بات ہے۔ کیوں کہ اول تو شاید آبادی
طبقہ ہی ایسا ہو جو افلاس کے اس درجہ پر ہو کہ بچوں کی ابت
بھی انتظام نہ کر سکے دوسرے دیگر قوموں کے یکساں اقتصادی
لوگوں میں اب تعلیم کا کافی چرچا ہو چلا ہے۔ اور وہ اپنی بساط
اولاد کی تعلیم میں کوشش کرتے ہیں اور اس پر خرچ کرتے ہیں۔
یہ ایک سبب تعلیم میں رکاوٹ کا بن سکتا ہے۔ ایسے بچوں کے
کو مالی امداد فراہم کرنی چاہیے جس درجہ تک سرکاری مفت تعلیم کا ان
اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اور آگے کے لیے یا دوسری ضرورتوں کے
وسائل کو کام میں لا کر اس دشواری کو دور کرنا چاہیے۔

(۳) ہمارا تعلیمی نظام ایسا ہے کہ بچے تعلیم کو ایک بار سمجھتے ہیں۔
تعلیم کے لیے دلچسپی اور شوق پیدا نہیں ہوتا۔ والدین کی ذمہ داری
وہ بچوں میں تعلیم کا شوق اور رغبت پیدا کرتے رہیں۔ اس سے ج
بڑی گئی بچے اسکول اور تعلیم سے اچاٹ ہو جاتے ہیں۔ یا تعلیم چھوڑ بیٹھ
یا نیم دلی سے اس کو جاری رکھتے ہیں۔ دونوں کا نتیجہ تقریباً ایک سا
ہے۔ یعنی یا تو ادھوری تعلیم یا ناقص تعلیم۔ اس میں پہلی ذمہ دار
کو محسوس کرنا چاہیے۔ خود ہمارے اسکولوں کو ایسا ماحول پیدا کرن
کہ تعلیم بچے کے لیے بوجھ نہیں بلکہ شوق اور دلچسپی کا ذریعہ بن جائے۔

ای تعلیمی سماجی تنظیموں کو بھی اس طرف توجہ کرنی چاہیے۔ ایسے مراکز قائم ہونے چاہیں جہاں بچے غیر نصابی امور (کھیل کود وغیرہ) کے لیے جمع ہوسکیں اور ان مراکز سے تعلیمی شوق کا کام لیا جائے۔

(۴) مسلم اداروں کے علاوہ دوسرے اسکولوں کا ماحول مسلم بچوں کے لیے ناسازگار ہوتا ہے۔ وہ تہذیبی اعتبار سے وہاں ہم آہنگ نہیں ہو پاتے بچے اور ان سے زیادہ ان کے والدین اسکولوں سے اجتناب برتنے لگے ہیں اور اس طرح تعلیم متاثر ہوتی ہے اول تو سرکاری اسکولوں کا ماحول ایسا ہونا چاہیے جو سب باشندگان ملک کے لیے سازگار ہو۔ اور کوئی بھی فرقہ یا طبقہ اس ماحول میں خود کو اجنبی نہ محسوس کرے۔ لیکن ایسا ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ خود ہمارے اپنے ادارے ہوں کم از کم ابتدائی تعلیم کے ادارے جہاں بچے اپنے عقائد و تصورات اور تہذیبی ماحول کے ساتھ تعلیم و تربیت حاصل کرسکیں۔ راقم الحروف کا تو خیال ہے کہ ثانوی اسکولوں اور کالجوں سے زیادہ اہمیت ابتدائی اسکولوں کی ہے کہ یہی ذہنی تعمیر کا وقت ہوتا ہے۔ جو تصورات بچے کے ذہن پر اس وقت مرتسم ہو جائیں۔ اور جس طرح کے رویوں کا وہ اس عمر میں عادی ہو جائے۔ وہ اس کی شخصیت کا جز بن جاتے ہیں اور ان کے نقوش کو مٹانا آسان نہیں ہوتا۔ مخالف و مختلف ماحول میں بھی یہ اثرات زائل نہیں ہوتے۔ عیسائی مشنریوں نے اس نفسیاتی نکتہ کا بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ ہندوستان کے گوشے گوشے میں انہوں نے مشن اور کانوینٹ اسکولوں کا جال پھیلا دیا۔ یہ سب فروغ تعلیم اور نوع انسان کی خدمت کے نام پر کیا گیا۔ لیکن کیا یہ بات روز روشن کی طرح عیاں نہیں ہے کہ اس پردے میں انہوں نے عیسائیت کی موثر تبلیغ کی کتنے لوگ دائرہ عیسائیت میں داخل ہوگئے۔ اور جو داخل عیسائیت نہیں ہوئے وہ بھی اپنے عقائد و تہذیب سے بیزار ہوگئے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ان اسکولوں نے تعلیم و تربیت کا جو نظام اور معیار قائم کیا ہے۔ ہمارے اسکول اس کی ہمسری نہیں کر پائے ہیں۔ لیکن یہ قصور ہمارا ہے۔ اگر اعلیٰ معیار کو مقصد بناکر مخلصانہ کوشش کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان جیسے بلکہ ان سے بہتر معیار کے اسکول قائم نہ کرسکیں۔ ہمارے قائم کردہ اسکولوں میں بڑی سہولت یہ ہوگی کہ ان کا ذریعہ تعلیم بچے کی مادری زبان ہوگی۔ اور اسے ایک غیر زبان کو سیکھنے میں وقت اور اپنی صلاحیتوں کو ضایع نہیں کرنا پڑے گا۔ مادری زبان کے ذریعہ تعلیم سے ہی ذہن کی صحیح نشوونما ہوسکتی ہے۔ ان امور کے پیش نظر ابتدائی اسکولوں کا قیام از بس ضروری ہے۔

(۵) ہمارے نوجوانوں میں ابھی تک مقابلہ کا جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ اب روز بروز زندگی ہمہ مقابلہ ہوتی جارہی ہے۔ عملی زندگی میں قدم قدم پر مقابلہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تجارت، صنعت و حرفت اور دیگر آزاد پیشوں میں ہی مقابلہ آرائی نہیں بلکہ حصول ملازمت کے لیے مقابلہ سے گزرنا پڑتا ہے۔ جن لوگوں نے کبھی مقابلہ میں حصہ نہ لیا ہو اور مقابلہ کا مزاج معلوم ہو ان کو مقابلہ کے نام سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ فی زمانہ ابتدا ہی سے ہی بچوں کے ذہن کو مقابلہ کے لیے تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ مرحلہ ابتدائی درجات میں ہی انجام پانا چاہیے تاکہ آگے چل کر مقابلہ سے گریزاں نہ ہوں۔

مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر بچہ اسکول سے اکتانے لگتا ہے۔ والدین بچہ کو خاندان کی آمدنی بڑھانے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ بچے جو ابتداء تعلیم کا آغاز کرتے ہیں وہ کالج تک پہنچتے پہنچتے تکمیل کے بغیر ہی تعلیم چھوڑ دیتے ہیں۔ ہمدرد تعلیمی سوسائٹی کے اعداد و شمار کے مطابق مسلم اسکولوں اور کالجوں میں اعداد اور ان کا تناسب ملاحظہ ہو۔

	کل تعداد	مسلم لڑکے	مسلم لڑکیاں	دیگر
اسکول	۲۶۴۶۷۴	۱۴۶۰۹۵	۷۵۶۷۸	۴۲۹۰۱
		۵۵٪	(۲۹٪)	(۱۶٪)
کالج	۳۶۵۰۸	۱۱۷۰۸	۳۰۴۵	۲۱۷۵۵
		(۳۲٪)	(۸٪)	(۶۰٪)

مسلم لڑکوں کا تناسب اسکول کے ۵۵٪ سے گھٹ کر کالج میں ۳۲٪ رہ گیا لڑکیوں کا ۲۹٪ سے صرف ۸٪۔ لیکن غیر مسلم طلباء کا تناسب اس کے برعکس ہے۔ اسکول کے ۱۶٪ سے بڑھ کر ہمارے کالجوں میں ۶۰٪ ہوگیا۔ اول تو تعلیم کی طرف متوجہ ہونے والوں کی تعداد ہی کیا تھی اس میں سے بھی کالج تک پہنچتے پہنچتے دس میں سے صرف چھ طالب علم باقی رہ گئے۔ تعلیم چھوڑ دینے کے اس رجحان کو روکنے کی ضرورت ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کو زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ڈھالا جائے۔ صرف یہی کافی نہیں ہوگا کہ موجودہ اسکولوں

کو چلایا جائے اور ضرورت کے مطابق نئے اسکول قائم کیے جائیں بلکہ اس بات پر بھی توجہ کرنی ہوگی کہ ان اسکولوں کو کس طرح چلایا جائے اور ان میں کیا پڑھایا جائے۔ عام اور سماجی مضامین سے دنیا کی توجہ ہٹتی جا رہی ہے۔ سائنس کے مضامین کی اہمیت روز افزوں ہے ہم صنعتی دور میں داخل ہو رہے ہیں اور تمام تر صنعت و حرفت کی بنیاد سائنس پر ہے۔

صنعتی تعلیم پر توجہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اور اس کی بنیاد کے طور پر سائنس کی تعلیم کی طرف، اس کے لیے جہاں سائنس کے اچھے استادوں کی ضرورت ہے وہیں ہر اسکول میں ایک اچھی تجربہ گاہ کی ضرورت بھی شدید ہو گئی ہے۔

صنعتی تعلیم اور سائنسی تعلیم کی ضرورتیں اتنی اہم اور اتنی بدیہی ہیں کہ اس کے بارے میں تفصیل سے کچھ کہنا لاحاصل ہے۔ مگر پھر بھی ہم نے ابھی اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔ یوں تو عمومی تعلیم پر بھی کون سی توجہ کی ہے۔ لیکن ہماری غفلت نے اب تک جو کچھ نقصان پہنچایا ہے۔ مزید غفلت اس سے بھی زیادہ مضر ثابت ہوگی۔ زمانہ کی تیز رفتاری کے ساتھ ساتھ جو قدم اٹھا کر نہیں چلے گا۔ نہ صرف پچھڑ جائے گا بلکہ کچل جائے گا۔ اس وقت بڑی احتیاط کے ساتھ منصوبہ بندی کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی آیندہ نسلوں کی تعلیم کا کیا اور کیا انتظام کریں۔ یعنی جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں وہ سائنسی یا سماجی علوم میں اعلیٰ تعلیم حاصل کریں دوسرے محض وقت گزاری کے لیے اعلیٰ تعلیم کے چکّر میں نہ پڑے رہیں بلکہ صنعتی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کر کے عملی زندگی کے میدان میں قدم رکھیں۔ موجودہ صنعتوں کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور نئی صنعتیں روز وجود میں آ رہی ہیں۔ ان سب کے لیے تربیت یافتہ افراد کی ضرورت ہے جو باہمت آگے بڑھیں گے ہاتھوں ہاتھ لیے جائیں گے مگر ہمارے باہمت نوجوان کو رہنمائی درکار ہوگی۔ اور یہ رہنمائی تعلیم کے ذمہ دار افراد ہی کر سکتے ہیں۔

اب تعلیم کو منصوبہ بند طریقہ پر آگے بڑھانا چاہیے زمانہ کے تقاضوں کو محسوس کرنا چاہیے اس کی سمت و رفتار پر نظر رکھ کر تعلیم کا منصوبہ بنانا چاہیے۔ اس کے لیے مرکزی اور علاقائی تنظیموں کو بھی وجود میں لانے کی ضرورت ہے اور خود اسکولوں اور کالجوں کی منتظم جماعتوں کو بھی بیدار رہنے کی۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی

تو رہ نورداں شوق کبھی پائے طلب کو مضبوط و متحرک ... ورنہ زمانہ کا قافلہ تو آگے بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ ہم کف ہی ملتے رہیں گے۔ اور اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

حضرات!

اس طول کلامی اور سمع خراشی کے لیے معذرت خوا... طور پر اس لیے بھی کہ اب گفتار کی نہیں کردار کی ضرورت ہے کی نہیں عمل کی ضرورت ہے۔ انتظار کی نہیں فوری اقدام کی۔ ان بہت سی باتوں میں سے اگر کسی ایک بات کو بھی قابل عمل سمجھ... ایک بات نے بھی یہاں حاضرین و سامعین کے دل میں عمل کی... کر دی تو میری سعی مشکور ہوگی۔

"اے صاحبو! ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ ...
نہ ہونے سے قوم کا حال روز بروز خراب ہو...
جاتا ہے۔ قوم کے بچّے اخراجاتِ تعلیم کے سوا...
نہ ہونے سے ذلیل اور رذیل ہوتے جا...
رہے ہیں۔ میں نے کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس...
سے قوم کے غریب بچّوں کے اخراجاتِ تعلیم میں...
مدد پہنچے، مگر افسوس! کامیابی نہیں ہو...
خود لوگوں سے بھیک مانگی، مگر قلیل ملی، وا...
بنانے چاہے، مگر بہت کم بنے اور جو بنے اُن...
کچھ بن نہ آئی۔ پس میں اسٹیج پر اس لیے...
ہوں کہ قوم کے بچّوں کی تعلیم کے لیے کچھ کرو...

سرسید احمد خاں

قاضی عبدالستار

پندرھویں قسط

خالد بن ولید

توذر نے بڑی دھوم دھام سے میدان آراستہ کیا کہ چالیس ہزار کا سے دو ہزار کا مقابلہ کیا۔ ہر طرف سے اطمینان کر کے یلغار کے باجے بجاتا ابن ابی سفیان پر چڑھنے لگا۔ یزید بن ابی سفیان سیف اللہؓ نہیں تھا لیکن سیف اللہؓ کا سپہ سالار تھا سیف اللہؓ کا عم زاد تھا۔ دوپہر تک میدان کو اس طرح سنبھالے رکھا کہ توذر چند سو گز زمین سے زیادہ کچھ حاصل نہ کر سکا۔ جب حاکم میش کوش رومی فوج تھکنے لگی اور گھوڑے اڑنے لگے تب اچانک پشت پر تکبیر الٰہی بلند ہوئی اور گورنر دمشق کی منتظر فوجیں زندہ ہو گئیں۔ جان پر کھیلنے لگیں توذر کے قلب میں دھنسنے لگیں۔ اور توذر جسے خالد کا خوف دمشق پر گھسیٹ لایا تھا۔ بے حواس ہو گیا اور بھاگنے کی کوشش میں سیف اللہؓ کی تلوار کا لقمہ ہو گیا۔ شام تک میدان کا ستھراؤ کر کے گورنر دمشق کی فوجوں کے ایک ایک نیزے میں دو دو سر گھونپ کر دمشق روانہ کیا جس کی آبادی اس خوفناک نظارے سے سہم گئی۔ اپنے لشکر کو آرام اور جانوروں کو راتب دے کر صبح ہوتے ہوتے امین الامت کی کمک پر سوار ہو گئے۔

انتہائی سرعت کے باوجود جب امین الامت کا سامنا ہوا تو وہ رومی لشکروں سے کھیل رہے تھے۔ کوچ پر کوچ کرتا ہوا لشکر تھک گیا تھا لیکن سپہ سالار کی آواز پر اس طرح میدان میں اترا جیسے بستر راحت سے اٹھ کر آیا ہو۔ جنرل تفش اپنی سفید فام فوجوں کے ساتھ گھنٹوں کی لڑائی کے باوجود ایک امین الامت پر غالب نہ ہو سکا تھا۔ سیف اللہ کا قہر کتنی دیر سہتا۔ ایک ہی فیصلہ کن دھاوے پر میدان چھوڑ دیا۔ ہزاروں سروں کا صدقہ دے کر اپنی قیمتی جان بچا لے گیا۔

حمص پر اسلامی لشکر اور جاڑے کا موسم ایک ساتھ اترا۔ برفیلے جھکڑوں، آہنی دروازوں اور سنگین فصیلوں نے لمبے محاصرے پر مجبور کر دیا۔ گورنر دمشق کو حکم بھیجا گیا کہ تمام منجنیقیں اور دبابے عجلت کے ساتھ روانہ کرے اور رسد کا سلسلہ دراز کرے لشکریوں نے شاہ بلوط کے درختوں کو کاٹ کر ڈھیر کر دیا۔ ساری ساری ساری رات بڑے بڑے الاؤ جلتے جن کے کنارے رومی کمبلوں اور اونی چادروں میں لپٹے ہوئے مجاہد شام کے قہوے میں مصری قند ملا کر صبح کا انتظار کرتے۔ بدر اور حنین کے غازیوں اور شہیدوں کی کہانیاں سناتے کلام پاک کی تلاوت کرتے امرا القیس کے قصیدے سنتے اور بنت عم کی کالی آنکھوں کے تصور میں کھو جاتے۔ وہ رات شام کی سرد ترین رات تھی۔ برفیلی ہواؤں کا طوفان برپا تھا۔ اشقر گردن سے کہنیوں اور گھٹنوں تک سرخ کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ سیف اللہ اونی عمامے پر خود پہنے ہوئے تھے جس کا شملہ ایک کان سے دوسرے کان تک چڑھا ہوا تھا سیاہ چمڑے کا وہ بکتر زیب بدن تھا جس کے اندر لوہے کے پتر چڑھے ہوئے تھے کاندھوں پر بھاری سیاہ شال پڑی تھی ہاتھوں پر چرمی دستانے چڑھے تھے۔ اور وہ لشکر کے گشت پر نکل رہے تھے کہ امین الامت کی سواری نظر آئی۔

سیف اللہؓ نے سلام کے ساتھ گھوڑے کو چھوڑ دیا۔ دونوں سپہ سالاروں کے ہم رکاب راسیں کھینچ کر ایک فاصلے کے ساتھ پیچھے پیچھے چلنے لگے دو مشعل بردار آگے چل رہے تھے۔

" ہم تو گشت کی عادت سے مجبور ہیں۔ آپ نے اتنے شدید موسم میں نکلنے کی تکلیف کیوں گوارہ کی۔"

" ہم نے سوچا کہ آج سیف اللہ کی شب بیداری میں شرکت کا لطف اٹھایا جائے۔ یہ بھی خیال تھا کہ اس لا حاصل محاصرے کے سلسلے میں مشورہ کیا جائے۔ سرداران عساکر بے چینی کا اظہار کرنے لگے ہیں۔ اور دشمن ہر طرح ہماری دسترس سے باہر ہے۔"

پتھریلی زمین پر گھوڑوں کی ٹاپوں کے علاوہ کوئی آواز نہ تھی دور دور تک بڑے بڑے الاؤ جل رہے تھے جن کی لال روشنی میں سواروں کے ہیولے خواب سے نظر آ رہے تھے۔

" محاصرے کا اٹھا لینا میری ناچیز رائے میں دانشمندی کے خلاف ہوگا ہرقل اور اس کے سپہ سالاروں کا شیرازہ بکھر چکا حمص کی فتح اس کی شہنشاہی کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوگی۔ اور وہ بیت المقدس کے بجائے روم کی طرف مراجعت پر مجبور ہو جائے گا۔"

" لیکن سرداران عساکر"

" انھیں سختی سے حکم کی پابندی پر مجبور کیجیے۔"

" دشمن کو اس سنگین اور عظیم پر جو ہے دان سے نکالنے کی کوئی تدبیر ممکن ہے؟"

" یہ امین الامت کا حکم ہے؟"

" نہیں — گذارش"

" تعمیل کی صورت نکالی جائے گی۔"

فن سپہ سالاری بھی فنون شریف کی طرح ایک فن شریف ہے۔ ایک فن عظیم ہے۔ جو اپنے فن کار پیدا کرتا ہے۔ نابغۂ روزگار پیدا کرتا ہے۔ اپنی دنیا کی تاریخ کی طرح ڈالتا ہے۔ سیف اللہ سپہ سالار نہیں تھے۔ نابغۂ روزگار تھے۔ ایسے نابغۂ روزگار جس کی مثال سے بڑی بڑی قوموں کی ہزاروں برس کی تاریخ خالی رہتی ہے۔ امین الامت رخصت ہو گئے۔ ہمرکاب جاں نثار اصرار کے ساتھ گرم بستروں کو سونپ دئے گئے۔ گھوڑا تبدیل کیا گیا کہ استقر آرام کر سکے۔ لیکن دیدبان اپنے اپنے مقام سے دیکھتے رہے کہ سپہ سالار سرخ گھوڑے پر سوار حمص کی فصیلوں کے نیچے ٹہلتا رہا۔ قبل اس کے کہ فجر کی اذان ہو سرخ گھوڑا بارگاہ کی طرف اڑنے لگا تھا۔

شام پر سیف اللہ کے نزول سے حمص کے محاصرے تک حیرت انگیز فتوحات نے ہزاروں غریب سیہ فام قبیلوں کو مسلمان کر دیا تھا۔ وہ اس لیے بھی مسلمان ہوئے تھے کہ ہر قسم کے ظلم سے محفوظ ہو گئے تھے۔ وہ اس لیے بھی مسلمان ہوئے تھے کہ رومیوں کے سور چراتے چراتے تھک گئے تھے وہ اس لیے بھی مسلمان ہوئے تھے کہ صدیوں سے ظالم اور چڑچڑے حاکموں سے نفرت کرنے لگے تھے اور وہ اس لیے بھی مسلمان ہوئے تھے کہ فاتح سپہ سالار کے دستر خوان پر بیٹھ کر اس کے ساتھ کھانا کھا سکتے تھے۔ ایسے کئی ہزار سیاہ فام لشکر میں موجود تھے۔ اور لڑائیوں میں شریک ہو کر چھوٹی چھوٹی خدمتیں بھی انجام دے چکے تھے۔ ایسے تمام مسلمانوں کو نماز فجر کے بعد ایک مقام پر طلب کیا گیا۔ ان کو بہترین لباسوں گھوڑوں اور ہتھیاروں سے آراستہ کیا گیا اور سیف اللہ کے ملاحظے میں پیش کیا گیا۔ سیف اللہ نے اس پانچ ہزار کے حبشی ڈویژن کو نوجوان سردار زادوں کی افسری میں تقسیم کر دیا۔ اور انھیں کو حمص کا محاصرہ دے کر مرکزی لشکر کو تمام مورچوں سے ہٹ جانے کا حکم دیدیا۔

رات کے سیاہ پردے کی آڑ میں اٹھارہ ہزار مجاہدین کا جرار لشکر اپنے خیمہ و خرگاہ کے ساتھ دو کوس پیچھے ہٹ آیا اور پہاڑوں اور دروں اور جنگلوں میں روپوش ہو گیا۔ صبح ہوئی تو دیدبانوں نے دیکھا کہ بجائے عربی سواروں کے وہ حبشی تلواریں تول رہے ہیں جو ابھی کل تک ان کے جانوروں کے چاکر تھے۔ رنگ اور نسل کے غرور سے بے قابو ہو کر حمص کے گورنر نے دروازے کھول دیئے اور حبشی سواروں پر اپنا سارا غضب انڈیلنے لگے۔ عرب نوجوان سرداروں کی کمان میں حبشی مجاہدوں نے تربیت یافتہ فوجوں کی پیشہ ورانہ تاخت و تاراج کو اپنی جا پر دیکھ روکنا چاہا کہ صدیوں میں پہلی بار ان کو اپنی عسکری اہمیت کے اظہار کا موقع ملا تھا لیکن سردار زادوں نے سیف اللہ کے نقشے

کے مطابق سنبھل سنبھل کر انھیں منظم پسپائی کے راستے پر ڈال دیا۔ گولانز کے نکلتے ہی مخبروں نے سیف اللہ کو خوش خبر کر دیا تھا اور وہ اپنے پورے لشکر کے ساتھ اس چورس میدان میں انتظار کر رہے تھے جس کے دونوں طرف سبز پوش پہاڑیاں کھڑی تھیں اور سارا سامنا عرب تلواروں سے پھیلا ہوا تھا۔ ابھی ایک پہر دن باقی تھا کہ بارہ ہزار رومی پانچ ہزار حبشیوں کو ڈھکیلتے ہوئے نمودار ہو گئے۔ زد میں آتے ہی اٹھارہ ہزار حربوں اور سانگوں اور تیروں کی مار سے چیخ اٹھے۔ گورنر نے جو افواج شاہی کا ایک جنرل تھا اپنی فوج کو اس عذاب الہٰی سے بچائے جانے کی ہر ممکن تدبیر کر ڈالی لیکن جب کوئی صورت سرسبز نہ ہوئی تو اپنے نام کی حرمت پر جان قربان کر دی۔ جنرل کے گرتے ہی تمام فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ سیف اللہ چند ہزار سواروں کے ساتھ شہر کے شرقی دروازے پر چڑھ گئے جسے پہرہ داروں نے بڑی ہوشیاری سے بند کر لیا تھا۔ لیکن جابر بن عبداللہ قیس بن ہبیرہ اور مسروق نے دروازہ نوچ کر پھینک دیا۔ بالآخر دمشق کی شرطوں پر امان دی گئی۔ اور صلح نامہ تحریر کیا گیا۔

امین الامت حمص کا انتظام کر کے نماز ظہر کے لیے اٹھے تو سیف اللہ کو تلاش کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنے رسالے کے ساتھ حماد کے شہر پر نازل ہو چکے۔ معرۃ النعمان کے سامنے پہنچے تو شہر نے خالد کے نام پر ہتھیار ڈال دیے۔ وہاں کا انتظام کر کے الاذقیہ کی طرف جنبش کی تو حاکم نے لشکر کے بجائے قاصد روانہ کیے اور تلوار پھینک کر پروانۂ امان اٹھا لیا۔

الآذقیہ کے سبزہ زاروں میں گھوڑے چر رہے تھے اور باغوں میں سوار ستار رہے تھے اور سیف اللہ جاسوسوں کو چاندی کے توڑے دے کر ہرقل کے ارادے خرید رہے تھے قعقاع بن عمرو اور مزعور بن عدی دس ہزار سواروں کے ساتھ حاضر ہوئے اور عرض کی کہ امین الامت کی نگاہیں قنسرین پر لگی ہیں جو سلطنت شام کا آخری سرحدی صوبہ ہے آخری فوجی مرکز ہے اور ہرقل کے قریب طاقتور ہے۔ سیف اللہ نے قعقاع اور مزعور اور ان کے لشکروں کی میزبانی کی۔ تین راتیں آرام سے گذارنے کی مہلت دی۔ ابھی قنسرین کے لشکر کی سرداریاں تقسیم ہو رہی تھیں کہ پرچہ لگا۔

شہنشاہ نے جنرل میناس کو وہ مناصب و مراتب عطا کیے ہیں جس کی مثال سے سلطنت روما کی تاریخ خالی ہے اس کے سر پر رومی پرچم کھلا ہوا ہے جو صرف شہنشاہ کی ذات سے مخصوص ہے اور میناس جبار سالاروں اور قہار لشکروں کے ساتھ قنسرین سے نکلنے والا ہے، سیف اللہ نے خبر کو تحمل اور تجمل سے سنا اور مہدی علم کھول دیا۔ تین کوس پر پہلی منزل کی۔ اور لشکر کا جائزہ لیا۔ یہ دیکھ کر غنیمت میں آئے ہوئے اونچے بھاری رومی گھوڑے بڑی تعداد میں موجود ہیں ناخوش ہوئے۔ نامدارانِ عرب کو حکم دیا کہ جہاں تک ممکن ہو میدان کارزار میں عرب گھوڑوں پر سوار ہوں کہ میدان جنگ میں گھوڑے کی ذرا سی کاہلی اور سستی اور بزدلی قوموں کی تاریخ بدل دیتی ہے۔

چھوٹی چھوٹی منزلیں کرتے۔ لشکر کو آرام و آسائش دیتے شام کے موسم سرما کے قہر کو رام کرتے میناس کو ہرقل کی ہیبت سے دور کرتے۔ عیسائیوں کے مذہبی جوش پر وقت کے چھینٹے مارتے جب میناس کے سامنے پہنچے تو ایک ایک عرب سپاہی سوتی چلتہ اور ازار پہنے ہوئے تھا اور ٹھنڈی ہوا سے راحت ٹپک رہی تھی اور میناس جس نے عراق سے شام تک خالد کی فتوحات مسلسل کے افسانے سن رکھے تھے۔ اور جسے یقین دلا دیا گیا تھا کہ خالد تاریخ عالم کا سب سے تیز رفتار جنرل ہے اس کے جاسوسوں نے جب خبر دی کہ فاتح عراق و شام تین تین کوس پر قیام کر رہا ہے تو مسکرانے لگا۔ خوشامدیوں اور مصاحبوں نے جو قوموں کے زوال کا سب سے بڑا سبب ہوتے ہیں میناس کو باور کرا دیا کہ آپ کے نام کا خوف سیف اللہ پر غالب آ چکا۔

حاضر کے میدان میں جب مسلمان اپنا کیمپ لگا رہے تھے اور سیف اللہ سرخ گھوڑے پر سوار میناس کی فوجی طاقت کا جائزہ لے رہے تھے۔ جو ایرانی اور رومی شہزادوں کی طرح زرق برق لباسوں اور جگمگاتے ہتھیاروں بلند و بالا قامتوں

دریمیں کمر غلاموں پر اترا رہی تھی اور چالیس ہزار سفید فام لڑکی پر ناز کر رہی تھی۔ نماز فجر کے بعد پوری چودہ ہزار فوج کو بانوے دستوں میں تقسیم کر دیا۔ آزمودہ کار سرداروں کے بجائے نوجوان سرداروں اور سردار زادوں کو ان کی کمان دے دی اور اپنی ہی وضع کردہ تکنیک کو دہراتے ہوئے تمام دستوں کو ایک مربع کی صورت میں کھڑا کر دیا اور سپہ سالاروں کی روایت کے برخلاف فوج کے آگے جھنڈی علم گاڑ دیا اور ایک ایک جانور اور ایک ایک آدمی کا بہ نفس نفیس معائنہ کیا۔

شام کا کھلا ہوا نیلگوں شیشے کا آسمان سورج سے آراستہ ہو چکا تھا۔ تفریح کے شاداب جنگلوں کے خودرو پھولوں اور ہرقل کی شکاری قیام گاہوں کے بہشت نظیر باغوں کی خوشبو سے لدی ہوا زندگی کو دلکشی اور دنیا کو خوبصورتی عطا کر رہی تھی اور میناس چمکتے لوہے کا لباس پہنے زرنگار صلیبوں اور خودوں کے ہجوم میں اپنے لشکر سے آگے نکل آیا تھا اور ہتھیلی کے سائے میں حیرت زدہ آنکھوں سے سپہ سالار خالد کی عجیب و غریب ترتیب لشکر دیکھ رہا تھا جس کا نہ میمنہ تھا نہ میسرہ نہ ہراول نہ ساقہ۔ اس کے سامنے اگر کسی ماتحت جنرل نے میدان جنگ کا یہ نقشہ پیش کیا ہوتا تو وہ اسے معزول کر دیتا لیکن مقابلے پر وہ سالار اعظم تھا جس نے دولتِ کسریٰ اور رومتہ الکبریٰ کی بڑی بڑی بعزت مند فوجوں اور جہاں کشا سپہ سالاروں کو کچل کر پھینک دیا تھا تاہم اس کے عسکری تجربوں نے یقین دلا دیا کہ پیہم فتوحات نے سیف اللہ کا دماغ چر لیا ہے اور وہ اپنے انجام کے قریب آ گیا ہے۔ ہمرکاب جنرل نے آغاز جنگ کے لیے باجے بجوانے کی اجازت مانگی تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اور قلب میں شہنشاہ کے جھنڈے کے نیچے کھڑا ہو گیا اور ہوا خواہوں کو دیکھ کر بولا۔

"انتظار کرو عربی کماندار کیا کرتا ہے۔ اس ترتیب لشکر سے کیا اظہار کرتا ہے۔"

آفتاب جھکنے لگا تھا کہ میناس کے سامنے کھڑی ہوئی ساری فوج گھوڑوں سے اتری۔ صفیں بنائیں سجدے کیے اور پھر گھوڑوں پر جم گئی۔ قبل اس کے کہ دوپہر کے کھانے کے لیے میناس کوئی حکم دے اس نے دیکھا کہ پورا لشکر ایک تن واحد کی طرح نپے تلے قدموں سے حرکت کرنے لگا ہے۔ میناس کا ہاتھ اٹھتے ہی نقارے گرجنے لگے۔ دولت مند حکمراں قوم کے آرام طلب فوجی اور عیش پیشہ افسر جو دوپہر کے کھانے کے انتظار میں مبتلا تھے جبراً لڑائی پر مائل ہوئے۔ رومی کماندار ابھی اپنے اپنے مقام پر پہنچ کر کمان اپنی گرفت میں لے بھی نہ پائے تھے کہ عرب گھوڑے چیتوں کی طرح چاروں پیروں پر زمین سے اٹھے چودہ ہزار سینوں کی مجموعی طاقت سے تکبیر الٰہی گرجی اور کانوں نے بھاری بھرے اچانک پوری طاقت سے میناس کی اگلی صفوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے لشکر کا عظیم مربعہ بغیر کسی حکم اور باجوں کی دھن کے چھوٹے چھوٹے مربعوں میں تقسیم ہونے لگا اور پھیل پھیل کر اس کے قلب کی ساری تنظیم کو تباہ کرنے لگا۔ ابھی وہ سوچ رہا تھا کہ اپنے بازوؤں کے کمانداروں کو کیا حکم دے کہ چشم زدن میں عرب اس کی صفوں تک دھاوے کرنے لگے۔ میناس اپنا گھوڑا ریل کر پرچم کے پیچھے آ گیا۔ چیخ چیخ کر حکم دینے لگا کہ بازوؤں کے کماندار غنیم کی پشت پر حملہ آور ہوں۔ کتنے ہی سوار جنرل کے حکم پر اپنے گھوڑوں کے منہ پھیر کر بھاگے ان کو بھاگتا دیکھ کر دور تک پھیلے ہوئے قلب کی ان صفوں میں جو تلواروں کی مار سے ابھی تک محفوظ تھیں بھگدڑ مچ گئی۔ اب سیف اللہ نے جو اپنے نقشۂ جنگ کی جزئیات سے واقف رہنے کے عادی ہو چکے تھے۔ خود تکبیر بلند کی اور پوری طاقت کے ساتھ میناس پر یلغار کر دی جو ڈگمگاتے ہوئے سپاہیوں کو سنبھال رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے افسروں کو نام لے لے کر پکار رہا تھا۔ اور اس کوشش میں رومی پرچم گر پڑا۔ پرچم گرتے ہی اتنی زبردست تکبیر بلند ہوئی کہ وہ خود ایک لمحے کے لیے مفلوج ہو کر رہ گیا۔ اتنی ہی دیر میں چند سو سواروں کے ساتھ حملہ آوروں کے نرغے میں محصور ہو چکا

تھا۔ اور سیف اللہ کی پچھلی صفیں میناس کے دونوں بازوؤں کے راستوں پر قائم ہو چکی تھیں اور میناس ان کی مدد سے قطعاً محروم ہو چکا تھا۔ اچانک بے ریش و بروت مسلمان سردار اپنے آزمودہ کار سواروں کے ساتھ خود میناس پر گر پڑے سیف اللہ کا سامنا ہوتے ہی میناس نے باگ موڑ دی لیکن فرار میں ناکام ہو کر شمشیر الٰہی کا شکار ہو گیا۔ ایک اونٹ کے کجاوے میں کھڑے ہوئے نیزے پر میناس کا سر چڑھا دیا گیا۔ دوسرے اونٹ پر ہرقل کا پرچم لگا دیا گیا۔ جو بھاگ سکے بھاگ گئے بقیۃ السیف نے ہتھیار ڈال دیئے۔

حاضر کی آبادی سروں پر شعلیں جلا کر حاضر ہوئی۔ جنگ کی ذمہ داری ہرقل کے سر تھوپ کر اپنے سروں کی سلامتی اٹھا لے گئی خالد نے شہسواروں کو طلب کیا۔ حکم دیا کہ ہتھیار پہن کر آرام کر لیا کر فجر کی نماز قنسرین کے راستے میں پڑھی جائے گی۔ مزعور بن عدی کو میناس کے کیمپ کا والی بنا کر خیمۂ مبارک میں چلے گئے۔

قنسرین سلطنت شام کے شمالی سرحدی صوبے کا دارالحکومت تھا۔ فارس و روم کی جنگ میں مرکزی حیثیت حاصل کر لی تھی تھوڑے سے تاجروں پادریوں اور پیشہ وروں کے علاوہ ساری آبادی عسکری خدمت گزاروں پر مشتمل تھی۔ ہرقل کی دور اندیشی نے یورپ اور ایشیا کے بڑے بڑے شمشیر زن خاندانوں اور خانوادوں کی نشانیوں کو بڑی بڑی سہولتیں دے کر اس لیے آباد کیا تاکہ ایرانیوں کے ہراول کی مار اتنی دیر تک برداشت کر سکیں کہ دور کھڑے ہوئے روم اور دمشق اس کی مدد پر پہنچ جائیں۔ نہ صرف یہ بلکہ چھوٹے سے شہر کی بھاری فصیل کو دمشق اور حمص کے انداز پر مستحکم کر دیا۔ زرخیز کھیتوں اور پھلدار باغوں کی کثرت نے خود کفیل بنا دیا بڑے بڑے اسلحہ خانوں رسد خانوں اور گھوڑوں کے غاروں سے اتنا دولتمند کر دیا کہ چشم زدن میں دس بیس ہزار کی فوج ظفر موج کھڑی ہو سکتی تھی اور یہ سبھی کہ قنسرین کے تینوں طرف اونچی اونچی زمینوں اور اوبڑ کھابڑ علاقوں کو کھائیوں خندقوں اور غاروں میں اس مہارت سے تبدیل کر دیا تھا کہ منجنیقوں اور دبابوں کا فصیل شہر کے نیچے تک پہنچا دینا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔

شہنشاہ نے میناس کی تباہی اور اس کے لشکر کی بربادی کی خبر سنتے ہی القدس سے الرہا تک کے تمام دفینے اور خزینے اور نادر روزگار مال و اموال اپنے حرم کے ساتھ قسطنطنیہ کے لیے روانہ کر دیے اور انطاکیہ میں اپنے باڈی گارڈز کے ساتھ روم سے پہنچنے والی تیسری فوج کا انتظار کرنے لگا جس کے متعلق قسطنطنیہ کے مغربی گورنر نے ایشیائی مبالغے کے ساتھ تفصیلات روانہ کی تھیں۔ ہرقل ابھی تک حاضر کی عجیب و غریب شکست کی تفصیلات سننے کے لیے بے چین تھا کہ جاسوسوں نے قنسرین کی حراست کی خبر پہنچا دی۔ اس خبر نے ہرقل کے ارادوں کی کمر توڑ دی۔ ساری رات شاہی نامہ بروں کے سرخ پوش سبز گھوڑے انطاکیہ سے نکلنے والے راستوں پر اڑتے رہے ساری رات قنسرین کا گورنر اپنے جرنلوں کے ساتھ سیف اللہ کے حکم نامے پر غور کرتا رہا۔ جس میں لکھا تھا۔

"اس طرح قلعہ بند ہو جانے کا تم کو کوئی فائدہ
نہیں ہوگا تم اگر آسمان پر بھی چڑھ جاؤ گے تو
خدا یا ہمیں تمہارے پاس پہنچا دے گا یا تمہیں
ہمارے پاس اتار لائے گا۔"

بالآخر شہنشاہ کے خوف نے قلعہ بند ہو کر لڑنے کا فیصلہ کیا سپہ سالار نے پہنچتے ہی پہنچتے تینوں سمتوں کی فصیل کا جائزہ لے ڈالا کہ چوتھی طرف پہاڑ تھا۔ چند ہی راتوں میں غاروں اور کھائیوں اور خندقوں کو خاص اپنی نگرانی میں ہزاروں ہاتھوں کی مدد سے اتنا وسیع اور عریض کر دیا کہ سوار اپنے گھوڑے کے ساتھ آرام سے روپوش ہو سکے۔

(جاری ہے۔)

الطاف علی قریشی

قرآن مجید کے حروفِ مقطّعات

قرآن مجید کی ۲۹ سورتوں میں مضمون سورۃ شروع ہونے سے پہلے کچھ مفرد حروف آتے ہیں۔ ان کو مقطعات کہتے ہیں۔ مثلاً سورۃ البقرہ کے شروع میں الٓمٓ ایک مقطعہ ہے جس میں تین حروف ہیں۔ الف لام اور میم۔ اسی طرح سورۂ مریم کے شروع میں کھیعص ہے۔ اس میں پانچ حرف ہیں، کاف۔ ھا۔ یا۔ عین۔ صاد۔ ان تمام مقطعات کے حروف الگ الگ پڑھے جاتے ہیں، ملا کر نہیں پڑھے جاتے۔ ان پر کہیں کہیں مد اور کھڑا زبر بھی لگا دیتے ہیں۔ پس مقطعات اور حروف مقطعات میں یہ فرق سمجھ لیں کہ الم۔ الر۔ کھیعص۔ یہ حروف مقطعات کہلاتے ہیں، اور الف۔ لام۔ میم یا الف لام۔ را یا کاف۔ ھا۔ یا۔ عین۔ صاد یہ حروف مقطعات ہیں۔

کل مقطعات قرآنی مع مکررات ۳۰ ہیں۔ اگر مکررات کو شمار نہ کیا جائے تو مقطعات کی تعداد ۱۴ بنتی ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) الم: ۶ دفعہ۔ (۲) المص: ۱ دفعہ۔ (۳) الرٰ: ۵ دفعہ (۴) المر: ۱ دفعہ۔

(۵) کھیعص: ۱ دفعہ۔ (۶) طٰہٰ: ۱ دفعہ۔ (۷) طسم: ۲ دفعہ (۸) طس: ۱ دفعہ۔

(۹) یٰسٓ: ۱ دفعہ۔ (۱۰) ص: ۱ دفعہ۔ (۱۱) حم: ۷ دفعہ۔ (۱۲) حم عسق: ۱ دفعہ۔

۱۳۔ ق: ۱ دفعہ۔ (۱۴) ن: ۱ دفعہ

قرآن مجید کی ان سورتوں کے نام جن میں یہ مقطعات آتے ہیں مع پارہ نمبر کے درج ذیل ہیں۔ صرف سورۃ الشوریٰ میں دو مقطعات ہیں۔

نمبر شمار	پارہ نمبر	نام سورہ	مقطعات
۱	۱	البقرہ	الٓمٓ
(۲)	۳	ال عمران	الم
(۳)	۸	اعراف	المص
(۴)	۱۱	یونس	الرٰ
(۵)	۱۱	ھود	الر
(۶)	۱۲	یوسف	آلر
(۷)	۱۳	الرعد	المر
(۸)	۱۳	ابراہیم	آلر
(۹)	۱۳-۱۴	الحجر	آلر
(۱۰)	۱۶	مریم	کھیعص
(۱۱)	۱۶	طٰہٰ	طہ
(۱۲)	۱۹	الشعراء	طسم
(۱۳)	۱۹	النمل	طس
(۱۴)	۲۰	القصص	طسم
(۱۵)	۲۰	العنکبوت	الم
(۱۶)	۲۱	الروم	الم
(۱۷)	۲۱	لقمان	الم
(۱۸)	۲۱	السجدہ	الم
(۱۹)	۲۲	یٰسٓ	یٰسٓ
(۲۰)	۲۳	ص	ص
(۲۱)	۲۴	المومن	حم
(۲۲)	۲۴	حم السجدہ	حم
(۲۳)	۲۵	الشوریٰ	حم
(۲۴)	۲۵	الشوریٰ	عسق

(۲۵)	۲۵	الزخرف	حم
(۲۶)	۲۵	الدخان	حم
(۲۷)	۲۵	الجاثیہ	حم
(۲۸)	۲۶	الاحقاف	حم
۲۹	۲۶	قٓ	ق
(۳۰)	۲۹	القلم	نٓ

ان مقطعات میں جو حروف تہجی آئے ہیں وہ پوری پوری آواز کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں، اور الگ الگ پڑھے جانے کی وجہ سے حروف مقطعات کہلاتے ہیں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ جس طرح مقطعات ۱۴ ہیں اسی طرح حروف مقطعات بھی ۱۴ ہیں۔

ال م ص ر ک ہ ی ع ط س ح ق ن (ا ح ر س ص ط ع ق ک ل م ن ہ ی)۔ ۱۴ حروف اور جس تعداد میں یہ حروف مندرجہ بالا ۲۹ سورتوں میں وارد ہوئے ہیں ان کا شمار درج ذیل ہے:۔

۱	ا	۔	۱۳ دفعہ
۲	ح	۔	۷ دفعہ
۳	ر	۔	۶ دفعہ
۴۔	س	۔	۵ دفعہ
۵۔	ص	۔	۳ دفعہ
۶۔	ط	۔	۴ دفعہ
۷۔	ع	۔	۲ دفعہ
۸۔	ق	۔	۲ دفعہ
۹۔	ک	۔	۱ دفعہ
۱۰۔	ل	۔	۱۳ دفعہ
۱۱۔	م	۔	۱۷ دفعہ
۱۲۔	ن	۔	۱ دفعہ
۱۳۔	ہ	۔	۲ دفعہ
۱۴۔	ی	۔	۲ دفعہ

یہ تمام حروف مقطعات سورۃ الفاتحہ میں موجود ہیں اور جو ۲۱ حروف تہجی سورۃ الفاتحہ میں موجود ہیں ان میں حروف مقطعات مندرجہ ذیل ترتیب سے شامل ہیں:۔

حروف سورۃ الفاتحہ۔ ا ب ت ح د ذ ر س ص ض ط ع غ ق ک ل م ن و ہ ی۔ ۲۱ حروف تہجی

حروف مقطعات۔ ا ۔ ۔ ح ۔ ۔ ر س ص ۔ ط ع ۔ ق ک ل م ۔ ہ ی۔ ۱۴ حروف۔

قرآن مجید کی ۲۹ سورتوں میں وہی چودہ حروف مقطعات لائے گئے ہیں جن سے اکثر اوقات کلام مرکب ہوا کرتا ہے۔ ان سب کو اگر ملا لیا جائے تو یہ عبارت بنتی ہے۔ "نص حکیم قاطع لہ سر"۔ تعداد کے لحاظ سے یہ ۱۴ حروف ہیں اور جملہ حروف تہجی چونکہ ۲۸ ہیں۔ اس لیے یہ کل کے آدھے ہوئے۔ چنانچہ یہ حروف جو لائے گئے ہیں ان حروف سے جو نہیں لائے گئے زیادہ فضیلت والے گردانے جاتے ہیں۔ مفسرین نے انھیں "حروف نورانیہ" کہا ہے اور اسی رعایت سے باقی ۱۴ حروف کے لیے "حروف ظلمانیہ" کی اصطلاح تجویز کی گئی ہے۔ ان میں سے وہ سات حروف یعنی ث ج خ ز ش ظ ف جو حروف مقطعات سے خارج ہیں اور سورۃ فاتحہ میں بھی موجود نہیں ان کو ظلمانیہ سفلیہ کہا جاتا ہے۔ انھیں سواقط الفاتحہ بھی کہتے ہیں، اور آخری بقیہ سات "ظلمانیہ علویہ" کے نام سے موسوم کیے گئے ہیں۔

حروف مقطعات پڑھے تو جاتے ہیں لیکن ترجمے میں ان کے معنیٰ نہیں کیے جاتے۔ تفسیر معارف القرآن میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب بیان کرتے ہیں کہ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ اُن سورتوں کے نام ہیں اور بعض نے فرمایا ہے کہ یہ اسماءِ الٰہیہ کے رموز ہیں۔ جمہور صحابہ، تابعین اور علمائے امت کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ حروف رموز و اسرار ہیں جن کا مطلب سوائے خدائے تعالیٰ کے کسی کو معلوم نہیں اور ہو سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا علم بطور ایک راز کے دیا گیا ہو جس کی تبلیغ امت کے لیے روک دی گئی ہو۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ان حروف کی تفسیر و تشریح میں کچھ منقول نہیں۔

تفسیر نعیمی میں ہے، حق تو یہ ہے کہ حروف مقطعات کے معنیٰ اللہ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ہم کو

چاہیے کہ اس کے حق ہونے پر ایمان لے آئیں اور کہہ دیں کہ اس کے معنیٰ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بتلائے اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جانے۔ تفسیر روح البیان میں فرمایا کہ الم ان کلاموں میں سے ہے جن کے معنیٰ کی خبر جبرئیلؑ کو بھی نہیں ہوتی تھی۔ جیسے ڈاکخانے کے ذریعے حکام کے پاس کچھ شاہی تاروں میں ایسے حروف آتے ہیں کہ جن کو خود تار لینے والا پوسٹ ماسٹر اور لانے والا تار بابو بھی نہیں سمجھتا۔ لیکن جس حاکم کے پاس وہ تار جاتا ہے وہ اسے خوب سمجھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ نے سب کچھ بتا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا ورنہ آپ ان متشابہات کے معنیٰ ہرگز نہ سمجھتے اور ان کا نزول بیکار ہوتا۔ نیز اللہ تعالیٰ نے صلوٰۃ و زکوٰۃ وغیرہ ساری عبادت کا حکم دیا، مگر کسی عبادت کی تفصیل بیان کی؟ نہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پوچھا کہ زکوٰۃ کتنے مال سے کتنی دیں، کب دیں اور کیسے دیں، بلکہ بلا تامل صحابہ کو ہر حکم قرآنی کی تفصیل سمجھا دی۔ کلمہ الم نے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علم پیدا ہونا بتا دیا۔ چنانچہ روایات سے ثابت ہے کہ جب کٓھٰیٰعٓصٓ نازل ہوئی اور حضرت جبرئیلؑ نے عرض کیا۔ "کاف" تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "میں نے جان لیا" پھر عرض کیا 'ھا' فرمایا "میں نے جان لیا" پھر عرض کیا 'یا' فرمایا "میں نے جان لیا" پھر عرض کیا 'عین' فرمایا "میں نے جان لیا"۔ پھر عرض کیا 'صاد' فرمایا "میں نے جان لیا" حضرت جبرئیلؑ نے عرض کیا کہ آپ نے کیا جان لیا۔ مجھے تو کچھ خبر نہ ہوئی۔

امام التفسیر قرطبی اپنی تفسیر میں بیان کرتے ہیں۔" عامر، شعبی سفیان ثوری اور محدثین کی ایک جماعت نے فرمایا ہے کہ ہر آسمانی کتاب میں اللہ تعالیٰ کے کچھ رموز و اسرار ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ حروف مقطعہ قرآن میں حق تعالیٰ کا راز ہے۔ اس لیے یہ ان متشابہات میں سے ہیں جن کا علم صرف حق تعالیٰ کو ہے، ہمارے لیے ان پر بحث گفتگو بھی جائز نہیں، مگر اس کے باوجود یہ ہمارے فائدے سے خالی نہیں۔ اوّل تو ان پر ایمان لانا پھر ان کا پڑھنا ہمارے لیے کار ثواب ہے۔ دوسرے ان کے پڑھنے کے معنوی فوائد و برکات ہیں جو خواہ ہمیں معلوم نہ ہوں مگر غیب سے ہمیں پہنچتے ہیں۔

حضرت صدیق اکبر، فاروق اعظم، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، عبداللہ بن مسعود وغیرہ جمہور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ان حروف کے متعلق یہی عقیدہ تھا کہ یہ اللہ کے اسرار ہیں۔ ہمیں ان پر ایمان لانا چاہیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں۔ اور جس طرح آئے ہیں ان کی تلاوت کرنی چاہیے اور معنیٰ معلوم کرنے کی فکر میں نہ پڑنا چاہیے۔ ابن کثیر نے بھی قرطبی وغیرہ سے نقل کر کے اسی مضمون کو ترجیح دی ہے اور بعض اکابر علماء سے جو ان کے معنیٰ منقول ہیں تو اس سے صرف تمثیل و تنبیہ اور تسہیل مقصود ہے یہ نہیں کہ مراد حق تعالیٰ یہی ہے۔

تفسیر مظہری میں بیان کیا گیا ہے کہ امام بخاری نے اپنی تاریخ میں اور ابن جریر نے بسند ضعیف بیان کیا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس کچھ یہودی آئے اور آپ نے ان کے روبرو سورۃ البقرہ پڑھی تو انھوں نے حساب لگا کر جی ہی جی میں کچھ شمار کر کے کہا کہ ہم ایسے دین میں کیوں کر داخل ہو سکتے ہیں جس کے رواج کی مدت زیادہ سے زیادہ ۷۱ برس ہے۔ کیونکہ الٓمٓ کے کل اعداد ابجد کے حساب سے ۷۱ ہوتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ اس پر یہودیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ کیا اس کے علاوہ کچھ اور بھی آپ پر نازل ہوا ہے۔ فرمایا ہاں المٓصٓ، الرٰ، المرٰ۔ یہ سن کر یہودی بولے کہ ابوالقاسم تم نے ہم کو اشتباہ میں ڈال دیا۔ کیونکہ المص کے عدد ۱۶۱ اور الر کے عدد ۲۳۱ اور المر کے عدد ۲۷۱ ہوتے ہیں۔ اب ہم سخت حیران ہیں کہ کس کو لیں اور کس کو چھوڑیں۔

اکثر مفسرین نے حروف مقطعات کو الفاظ کا قائم مقام سمجھا ہے اور حروف سے بامعنیٰ الفاظ کی طرف اشارہ کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں یہ طریق تمام زبانوں میں مروج ہے۔ قرآن مجید کی آیات کے نشان اور ر اوقاف میں تمام قراء اور حفاظ "ط" سے مطلق۔ "ج" سے جائز وغیرہ مراد لیتے ہیں۔ کتابت میں "ص" صلی اللہ علیہ وسلم اور "رضـ" رضی اللہ عنہ اور "ع" علیہ السلام کے مخفف ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں بھی اس طریق اختصار پر حروف مقطعات استعمال کیے گئے ہیں۔ آج کل انگریزی زبان میں تو اس کا رواج بہت زیادہ ہے۔ مثلاً امتحانوں کے نام جیسے "ایف۔ اے" "بی اے" "ایم۔ اے" انجمنوں کے نام جیسے واپڈا۔ یو۔ این۔ او۔ یونیسکو وغیرہ وغیرہ۔

تفسیروں میں عموماً حروف مقطعات کے معنی نہیں کیے جاتے حالاں کہ
بعض صحابہؓ سے ثابت ہے۔ بعض علماء نے بطریق تاویل کچھ معنی کیے ہیں اور
بعض بزرگوں نے اپنی کیفیات کے مطابق بالکشف کچھ سمجھا ہے، جس کا واقعی ہونا
محل نظر ہے، پھر بھی انھیں مختصر طور پر بیان کیا جاتا ہے:۔

۱۔ الم۔ حضرت ابن عباسؓ سے اس کے معنی "انا اللہ اعلم" مروی ہیں۔ یعنی "میں اللہ بہت جاننے والا ہوں"۔

۲۔ المص۔ "میں اللہ بہت جاننے والا بہترین فیصلہ کرنے والا ہوں"۔ اس مقطعہ میں "الم" کے ساتھ "ص" کا اضافہ کیا گیا ہے، جو صادق کا قائم مقام ہے، جیسا کہ ضحاک سے روایت ہے، یا افضل کے قائم مقام "یعنی بہترین فیصلہ کرنے والا" جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔

۳۔ الر۔ یہ مجموعہ حروف سورہ یونس کے علاوہ چار اور سورتوں کی ابتدا میں آتا ہے، یعنی ھود ۱۱۔ یوسف ۱۲۔ ابراھیم ۱۴ اور الحجر ۱۵۔ یہ حروف "انا اللہ اری" کے قائم مقام ہیں یعنی "میں اللہ دیکھتا ہوں"، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی سے روایت ہے۔

۴۔ المر۔ المر کے معنی حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہیں "انا اللہ اعلم واری"، یعنی "میں اللہ خوب جانتا اور دیکھتا ہوں"۔

۵۔ کھیعص۔ حضرت ام ہانیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان حروف کے معانی کے سلسلے میں روایت کی ہے کہ اس سے مراد اسمائے الٰہی کاف، ہا، عالم، صادق ہیں اور ابن اثیر میں سعید بن جبیر کی تفسیر میں مذکور ہے۔ کاف، ھاد، یمین، عزیز، صادق۔ چنانچہ اس کے معنی کافی ہادی برکت والا عالم صادق ہیں۔

۶۔ طٰہٰ یعنی اے مرد کامل۔ بعض لغتوں میں "یا رجل" کی جگہ بولا جاتا ہے۔ یعنی اے مرد۔ اور اس کے اسم نکرہ رکھنے میں عظمت اور کمال کی طرف اشارہ ہے۔ اور روح المعانی میں باب الاشارہ میں ہے کہ طہ کے عدد چودہ ہیں اور یہ مرتبہ بدریہ کی طرف اشارہ ہے، یا یہ کہ نور محمدیؐ جس کا انکار کیا جائے گا چودھویں کے چاند کی طرح اپنے کمال کو پہنچے گا، اور یہ عجیب بات ہے کہ وہ حق جو شروع میں ایک ہلال کی طرح تھا ٹھیک اپنے چودھویں سال میں یوں کمال کو پہنچا کہ اس کی قبولیت کو استحکام حاصل ہوا اور اس کے مخالفوں کی قوت و شوکت ٹوٹ گئی۔

۷۔ طسم۔ یہ تین سورتوں کو جامع ہے۔ سورۃ شعراء اور قصص جو طسم سے شروع ہوتی ہے اور سورۃ نمل جو طس سے شروع ہوتی ہے۔ محمد بن کعب سے مروی ہے کہ طا سے مراد ذی الطول اور س سے قدوس اور م سے رحمٰن ہے۔ لیکن اگر اسمائے الٰہی کا ان حروف کو قائم مقام سمجھا جائے تو س اور م سے مراد سمیع اور علیم ہو سکتا ہے کہ یہ دو اسماء اکثر اکٹھے آتے ہیں۔ لیکن جب ان تینوں سورتوں کے مضمون پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تینوں میں حضرت موسیٰؑ اور ان کے قصے کی طرف خصوصاً توجہ دلائی ہے، جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر روشنی پڑتی ہے، یعنی صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ وحی جو طور سینا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی قرآن کریم کے لیے بطور تمہید کے تھی۔ چنانچہ اس مضمون کو کھول کر اس مجموعہ کی آخری سورہ القصص میں بیان کیا ہے اور اس کے پہلے رکوع میں نہایت وضاحت سے یہ ذکر کیا ہے۔ اس لیے ان حروف میں بھی اسی وحی کی طرف معلوم ہوتا ہے جو طور سینا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور یوں طا سے مراد طور۔ س سے مراد سینا م سے مراد موسیٰ علیہ السلام ہے۔ گویا فرمایا ہے کہ اگر اس کتاب کی صداقت معلوم کرنا چاہتے ہو تو اس وحی پر غور کرو جو موسیٰ علیہ السلام پر طور سینا پر نازل ہوئی۔

۸۔ طس۔ طور سینا کی وحی پر غور کرو۔

۹۔ یٰس۔ اے انسان (کامل)، حضرت ابن عباسؓ سے اس کے معنی "اے انسان" مروی ہیں، اور بعض روایات میں ہے کہ اس کے یہ معنی لغت حبش یا لغت طے میں ہیں، اور بعض نے اسے اسمائے اللہ یا اسمائے قرآن یا اسمائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کہا ہے، اور ہو سکتا ہے کہ س مقطعات کے طور پر انسان

میں سے لیا گیا ہو اور انسان کا لفظ نکرہ لانے سے آپ کے کمال انسانیت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہو۔

۱۰۔ ص۔ اللہ صادق ہے۔ اس کی تفسیر ضحاک سے "صدق اللہ" مروی ہے، اور بعض نے "صدود الکفار عن القرآن" مراد لیا ہے، یعنی کفار کا قرآن سے رکنا، لیکن سیاق پہلے معنی کو چاہتا ہے۔

۱۱۔ حم۔ [اللہ تعالیٰ] بے انتہا رحم والا ہے۔ بعض کے نزدیک اس کے معنیٰ "قضی ما ھو کائن" یعنی "جو کچھ ہونے والا ہے، اس کا فیصلہ ہو چکا"۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے اس کی تفسیر میں تین قول آئے ہیں، ایک یہ کہ یہ اللہ کا اسم اعظم ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ قسم ہے اور تیسرا یہ کہ یہ الرحمٰن کے حروف ہیں۔ اور وہ سات سورتیں جن کی ابتداء میں حم آتا ہے، یعنی المومن۔ حم سجدہ الشوریٰ۔ الزخرف۔ الدخان۔ الجاثیہ اور الاحقاف یہ آل حم یا ذوات حم کہلاتی ہیں۔ اور ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ آل حم قرآن کا دیباچہ ہیں۔

۱۲۔ حٰمٓ عٓسٓقٓ۔ [اللہ تعالیٰ] بے انتہا رحم والا ہے، جاننے والا سننے والا قادر ہے۔ مفسرین عسق کے بارے میں خاموش ہیں۔ ابن جریرؒ نے حذیفہؓ سے ایک روایت بیان کی ہے جو ان حروف کو آنے والے فتنوں پر منطبق کرتے ہیں، اور حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت بیان کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ س ہر ایک فرقہ کی عمر ہے جو ہونے والا ہے، اور ق ہر ایک جماعت ہے جو ہونے والی ہے۔ بعض کے نزدیک یہ حروف اسمائے الٰہی کے قائم مقام ہیں، یعنی ع علیم س سمیع اور ق قادر کی جگہ، اور پہلی آیت میں حم رحمان کی جگہ ہے۔

۱۳۔ ق [اللہ سب باتوں پر] قادر ہے۔ ق کے متعلق ابن جریرؒ میں تین قول لکھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے، قرآن کے اسماء میں سے ہے، زمین کے اردگرد ایک پہاڑ ہے۔ مگر اس تیسری بات کو تو سیاق سے کوئی تعلق نہیں۔ اور روح المعانی میں ایک قول نقل کیا ہے کہ جبل قاف کا [جس کے بہت طویل قصے بنائے گئے ہیں] کوئی وجود نہیں اور پہلا قول جو حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے وہی صحیح ہے۔

۱۴۔ ن۔ دوات [گواہ ہے]۔ نون کے معنی مچھلی ہیں، اور یہاں ن کے معنی حسن اور قتادہ سے دوات مروی ہیں، اور حضرت ابن عباسؓ سے حوت مروی ہے اور زہری کا قول ہے کہ اس سے مراد دوات یا حوت ہوتے تو نون لکھا جاتا نہ کہ ن۔ ابن جریر میں ایک قول مروی ہے کہ اس سے مراد لوح نور ہے یعنی نورانی تختی۔

تفہیم القرآن جلد ۱ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی رائے یہ ہے کہ جس زمانے میں قرآن مجید نازل ہوا تھا اس دور کے اسالیب بیان میں اس طرح کے حروف مقطعات کا استعمال عام طور پر معروف تھا۔ خطباء اور شعراء دونوں اس اسلوب سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ اب بھی کلام جاہلیت کے جو نمونے محفوظ ہیں، ان میں اس کی مثالیں ہمیں ملتی ہیں۔ اس استعمال عام کی وجہ سے یہ مقطعات کوئی چیستاں نہ تھے جس کو بولنے والے کے سوا کوئی نہ سمجھتا ہو بلکہ سامعین بالعموم جانتے تھے کہ ان سے مراد کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم عصر مخالفین میں سے کسی نے بھی ایسی کوئی روایت منقول نہیں کہ انھوں نے آنحضرتؐ سے اُن کے معنیٰ پوچھے ہوں۔ بعد میں یہ اسلوب عربی زبان میں متروک ہوتا چلا گیا اور اس بنا پر مفسرین کے لیے اُن کے معانی متعین کرنا مشکل ہو گیا لیکن یہ ظاہر ہے کہ نہ تو ان حروف کا مفہوم سمجھنے پر قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرنے کا انحصار ہے اور نہ یہی بات ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے معنیٰ نہ جانے گا تو اس کے راہ راست پانے میں کوئی نقص رہ جائے گا۔ لہٰذا ایک عام ناظر کے لیے کچھ ضروری نہیں ہے کہ وہ ان کے معانی کی تحقیق میں سرگرداں رہے۔

یہی رائے جناب محمد علی صدیقی کاندھلوی صاحب نے اپنی تفسیر معالم القرآن میں درج کی ہے۔

ماخذ

۱۔ تفسیر معارف القرآن مولفہ مولانا مفتی محمد شفیع
۲۔ تفسیر حقانی مولفہ مولانا ابو محمد عبدالحق الحقانی دہلوی

۳۔ تفہیم القرآن مولفہ مولانا سید ابو اعلیٰ مودودی

۴۔ تفسیر ابن کثیر مولفہ علامہ ابن کثیر

۵۔ تفسیر نعیمی مولفہ علامہ احمد یار خاں نعیمی

۶۔ فیوض القرآن مرتبہ ڈاکٹر سید حامد حسین بلگرامی۔

۷۔ تفسیر مظہری۔ مرتبہ علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی

۸۔ درس القرآن ۔ ادارہ اصلاح و تبلیغ

۹۔ اردو دائرہ معارف الاسلامیہ مرتبہ درس قرآن بورڈ۔ جلد ۸۔

۱۰۔ بیان القرآن ۔ مرتبہ مولانا محمد علی۔

۱۱ مصطلحات قرآنی ۔ مولفہ ڈاکٹر میر محمد اسماعیل پانی پتی۔

۱۲۔ معالم القرآن مولفہ محمد علی صدیقی کاندھلوی

۱۳۔ اعداد القرآن ۔ مرتبہ ابو الکلام آزاد

۱۴۔ ترجمان القرآن ۔ مرتبہ ابو الکلام آزاد ۔

" دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے خود ہی تمام کمالات اور تمام خوبیاں اور خوشیاں حاصل کی ہوں۔ بلکہ ہمیشہ ایک قوم نے دوسری قوم سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر متعصب شخص اِن نعمتوں سے بدنصیب رہتا ہے علم میں اس کو ترقی نہیں ہوتی۔ ہُنر و فن میں اس کو دستگاہ نہیں ہوتی۔ دنیا کے حالات سے وہ ناواقف رہتا ہے عجائبات قدرت کے دیکھنے سے محروم ہوتا ہے حصولِ معاش اور دنیاوی عزت و تموّل مثل تجارت وغیرہ کے وسیلے جاتے رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ تمام دنیا کے انسانوں میں روز بروز ذلیل اور خوار اور حقیر و ناچیز ہوتا جاتا ہے۔ "

سر سیّد احمد خاں

محمد محسن

ادب میں جدیدیت
ایک نفسیاتی جائزہ

(خدا بخش افسانوی کنونشن کا خطبۂ صدارت)

ایک مدت تک ادبی تخلیقات کی بابت صرف دو جداگانہ نظریے یعنی ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی فنکار اور ناقد کی توجہ کا مرکز بنے رہے تھے لیکن برصغیر کی آزادی کے بعد اردو ادب کی دنیا میں ایک تیسرے نظریے کا بھی وجود ہوا جسے ادب برائے ذات کا نام دیا جا سکتا ہے۔ نسبتاً جدید ہونے یا روایت سے انحراف کی بنا پر اس نظریے کو جدیدیت کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ جہاں تک اول الذکر نظریوں کا تعلق ہے انہوں نے قاری کے لیے ترسیل و ابلاغ کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں کیا تھا۔ ان نظریوں کا بنیادی فرق ادب کی افادیت سے تعلق رکھتا ہے۔

ادب برائے ادب کے مطابق ادب کی کوئی خارجی افادیت نہیں ہونی چاہیے۔ اچھا فنکار اپنی کسی تخلیق کو کسی خارجی مقصد کا آلۂ کار بنانا روا نہیں رکھتا۔ اس کی ادبی تخلیق محض اس کی تخلیقی صلاحیت کے اظہار کا وسیلہ ہوتی ہے اس نظریے کے حامی اپنی تخلیقات قاری کے آگے پیش کر کے اپنی عزت نفس کا سامان اور اپنی قدر افزائی کے ثبوت کی فراہمی کرتے ہیں انھیں اس بات کی کد ہوتی ہے کہ اُن کی تخلیق کا مواد اور انداز بیان ایسا نہ ہو کہ قاری کے لیے ایک معمہ بن جائے۔

ادب برائے زندگی کے علمبردار کا موقف ادب کو ایک خارجی مقصد کے حصول کا ذریعہ بناتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی کو بہتر اور مفید بنانے میں ادب ایک نہایت اہم رول ادا کر سکتا ہے اور وہی ادبی تخلیق اعلیٰ اور ارفع سمجھی جائے گی جو اس مقصد کے حصول میں معاون ہوگی۔ اس کے خیال میں انسانی ذہن کی تربیت اور اصلاح میں ادب کا بہت بڑا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کے تحت ادبی تخلیق کی افادیت قاری تک اس کے پہنچنے پر ہی منحصر ہے۔ جس ادب کا کوئی قاری نہ بن سکے جو قاری کے اندر اپنی اور اپنے معاشرے کی بہتری کی فکر پیدا نہ کر سکے ایسا ادب کسی قدر و قیمت کا حامل نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس اعتبار سے ادب برائے زندگی پر عقیدہ رکھنے والے بھی اپنی تخلیقات کو ایسے قالب میں ڈھالنے پر پابند تھے کہ وہ قاری کے فہم و ادراک سے بالاتر نہ ہو سکیں اور قاری کی ان کے مافی الضمیر تک بہ سہولت رسائی ہو سکے۔

ادب برائے ذات پر اعتماد رکھنے والا اپنی داخلی ذات کو ہی اپنی تخلیقات کا مرکز بنانے کا قائل ہے۔ چنانچہ اس کی تخلیقات اس کی ذاتی کیفیات اور داخلی حالات کی کچھ اس انداز سے ترجمانی کرتی ہیں کہ اس کے قاری کے لیے ان کا فہم و ادراک ایک ناقابل عبور مہم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اپنے آپ کو قاری سے بے نیاز کرنے کے لیے وہ کچھ ایسی نت نئی اور مبہم علامتیں ایجاد کر لیتا ہے جس کا مفہوم خود اس کے سوا کسی دوسرے کے بس سے باہر ہو جاتا ہے۔ بادی النظر میں ہمیں اس کا یہ رویہ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں آدمی کا کوئی فعل بے معنی و بے سبب نہیں ہوتا اس کی غرض و غایت اس فعل کی تہہ میں پوشیدہ ہوتی ہے۔

جدیدیت کا آغاز ایک تحریک کی حیثیت سے ہوا تھا۔ جس کا ملک کی آزادی کے بعد خصوصاً اکثر نئی پود کے فنکار نے خیر مقدم کیا۔ ہر تحریک کی بنیاد کچھ خصوصی حالات کے زیر اثر پڑتی ہے۔ ہمارا ملک ماضی قریب میں دو غیر معمولی حالات سے دوچار ہوا تھا۔ ایک جو ہماری پہلی جنگ آزادی، جسے بدنام کرنے کے لیے انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کا غدر کہا تھا، کے نتیجے میں رونما ہوئے تھے۔ اس جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد ہمارا خوشحال کھاتا پیتا طبقہ دفعتاً بدحالی کا شکار ہو گیا تھا اور زندگی اس کے لیے اجیرن ہو گئی تھی۔ اسے سخت اقتصادی مشکلات اور معاشی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا ان حالات نے دو قسم کے ادبی رجحانات کو جنم دیا، جس کی وجہ سے دو مختلف

انداز کی تخلیقات وجود میں آئیں۔ ایک جن کا حاصل فقط زندگی کا غم غلط کرنا تھا اور جو اپنے قاری کو زندگی کی تلخ حقیقتوں کی طرف سے آنکھیں موند لینے کی ترغیب دیتے رہی تھیں ان کے خالق، ادب کو محض تفنن طبع اور خوش وقتی کا وسیلہ سمجھنے پر قانع تھے۔ ان کے سامنے ادب کا اس سے آگے کوئی مقصد نہیں تھا۔ اس اعتبار سے ایسے فن کار ادب برائے ادب پر اعتقاد رکھتے تھے۔ ان کی ادبی تخلیقات قاری کو فکر و نظر کی دعوت دینے سے زیادہ اس کے جذبات و احساسات کو مشتعل کر کے اسے شاد کام کرتی تھیں۔ اقتصادی بدحالی کے ساتھ اخلاقی اقدار میں بھی کافی گراوٹ آ گئی تھی۔ چنانچہ ایسی تخلیقات بھی وجود میں آنے لگی تھیں جن کی مقبولیت کا سبب یہی تھا کہ وہ اسفل و ادنیٰ جذبات و میلانات کی اصلاح کے عوض ان کو ہوا دیتی تھیں۔

دوسری نوع کی تخلیقات کے خالق وہ فن کار تھے جنہیں معاشرے کی اقتصادی بدحالی اور اخلاقی گراوٹ کے مداوا کی فکر دامن گیر تھی۔ وہ اپنی تخلیقات کو معاشرے کی درستگی اور اصلاح کا آلہ کار بنانے کی دھن میں لگ گئے۔ ان کے ادبی کارنامے ادب برائے زندگی کے ترجمان بن گئے۔ ان میں کچھ ایسے تھے جن کی تخلیقات کی غرض و غایت اخلاقی قدروں کی احیاء اور ترویج تھی۔ اور کچھ دوسروں نے معاشرے کی معاشی اور اقتصادی سدھار کو اپنی تخلیقات کا مقصد قرار دے دیا۔ اس نوع کے فنکار کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ عوام کی اقتصادی بدحالی کا حقیقی سبب وہ جاگیردارانہ استحصالی، عوام دشمنی، نابرابری اور سماجی ناانصافی کی بنیاد پر قائم نظام تھا جسے غیر ملکی، جابرانہ اور استبدادی حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس نظام کا قلع قمع کیے بغیر ملک کی اقتصادی اور اخلاقی سدھار کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے غیر ملکی حکومت کا تختہ الٹنا ضروری تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سب سے پہلے عوام کے اندر ان کی اقتصادی ابتری کا احساس پیدا کرا کر انہیں بیدار کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ ایسی ادبی تخلیقات وجود میں آنے لگیں جن کا تعلق خصوصیت سے اس طبقے کی زندگی سے تھا جو سب سے زیادہ سماجی ناانصافی، نابرابری اور استحصال کا شکار تھا اور جس پر حکومت کے اہل کار آئے دن مظالم ڈھایا کرتے تھے۔ اس طبقے کی بدحالی کا حقیقی اور واقعاتی منظر پیش کرنا اسی نوع کے ادب کا ابتدائی کارنامہ تھا تاکہ اپنی ابتری کا حقیقی احساس اور اس کے اسباب کی جانکاری اسے استحصالی طاقتوں کے خلاف نبرد آزمائی کے لیے کمربستہ کرے۔ ایسی نوع کے ادب نے ادب کے اندر اس تحریک کی بنیاد رکھی جسے ترقی پسند تحریک کا نام دیا گیا۔ یہ تحریک جلد ہی اس جنگ آزادی کا ادبی محاذ بن گئی جسے ہم دوسری جنگ آزادی سے موسوم کرتے ہیں اور جس نے انگریزوں کی حکومت کی بنیادیں ہلا دیں اور ملک آزاد ہو گیا۔

ملک کی آزادی کا تصور ایک سنہرے خواب کی جیتی جاگتی تصویر بن کر ہمارے سامنے آیا تھا۔ ہم یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ آزادی حاصل کرتے ہی ہماری بدحالی خوشحالی میں بدل جائے گی، ہم جہالت، غربت اور اخلاقی گراوٹ کی لعنتوں سے یکبارگی مبرا ہو جائیں گے۔ استحصالی طبقاتی نظام کی جگہ ایک ایسے جمہوری اور انسانیت پرست نظام کو مل جائے گی جس میں ملک کے ہر فرد کے لیے اپنی فطری صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے مساوی مواقع حاصل ہوں گے۔ سماجی بے انصافی اور نابرابری ایک قصۂ پارینہ ہو جائے گی۔ لیکن جلد ہی ہمیں یہ محسوس ہونے لگا کہ ہمارے خواب کی تعبیر الٹی ہو گئی۔ بظاہر ملک اقتصادی ترقی کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا تھا لیکن امیر اور غریب کا فرق پہلے سے کم ہونے کے بجائے اور زیادہ ہو گیا۔ ساری اخلاقی قدریں اور بلند مقاصد کفن پوش ہو گئے۔ ہم ایک ایسے شدید احساس ناکامی و نامرادی کے شکار ہو گئے جس نے مستقبل کے متعلق ہماری امیدوں کے سارے چراغ گل کر دیے۔ یاس و حرماں، بے اعتمادی اور بے یقینی، عدم تحفظ اور ذہنی انتشار نے ہمارے دل و دماغ کو اپنا مسکن بنا لیا۔ پہلی جنگ آزادی کی ناکامی نے اور دوسری جنگ آزادی کی کامیابی نے جو منفی ردعمل ہمارے اندر پیدا کیا تھا وہ ایک دوسرے کے مماثل ہونے کے بجائے بالکل مختلف تھے۔ پہلی جنگ آزادی کی ناکامیابی نے ہمارے حساس طبقے کی خوشحالی کو بدحالی میں بدل دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں اسے اپنی بدحالی دور کرنے کی فکر دامنگیر ہو گئی تھی۔ جس کے لیے ایک مثبت ترقی پسندانہ قدم اٹھایا گیا۔ ادب میں جس کی نمائندگی ترقی پسند تحریک نے کی۔ ہم نے آزادی کی جنگ لڑی اور کامیابی نے ہمارا قدم چوما۔ اس طرح پہلی جنگ آزادی کی ناکامیابی نے جو احساس ہمارے اندر پیدا کیا ہم اسے احساس محرومی کہیں گے جس کے لیے انگریزی کا لفظ (DEPRIVATION) نہایت موزوں سمجھا جائے گا۔ ہم خوشحالی سے محروم ہو کر بدحالی کے

شکار ہو گئے تھے۔ دوسری جنگ آزادی میں کامیابی کے بعد کے جس خوشحالی کا خواب ہم نے دیکھا تھا جب اس خواب کی تعبیر اُلٹی ہو گئی تو اس کے نتیجے میں جو احساس ہم پر شدت کے ساتھ مستولی ہو گیا اسے نامرادی کا نام دینا مناسب ہوگا جو انگریزی لفظ FERUSTRATION کے مترادف ہے۔ یعنی

ہم جس منزل پر پہنچے وہ ہمارے لیے سازگار ثابت نہیں ہوئی

FERUSTRATION یا احساس نامرادی اگر اپنی نچلی حد کے اندر رہتا ہے تو "نامرادیاں کامیابیوں کے ستون ہیں" کے مصداق یہ مثبت اور تعمیری اقدام کا پیش خیمہ بن جاتا ہے لیکن جب یہ اپنی حد سے تجاوز کر کے شدت کا حامل ہو جاتا ہے تو اس کے سارے نتائج منفی ہوتے ہیں۔ اس احساس کا ایک ردعمل وہ ہے جسے انگریزی میں Resignation کہا گیا ہے یعنی تسلیم و رضا۔ لیکن اس ردعمل کے لیے مذہبی میلان کا وجود ضروری ہے۔ ترقی پسند تحریک پر چونکہ اشتراکیت کا اثر غالب تھا اس لیے اس تحریک نے مذہبی اعتقاد کی بنیادیں نسبتاً کھوکھلی کر دی تھیں۔ چنانچہ آزادی کے بعد جو ادیب ہمارے سامنے آئے باوجود ترقی پسند تحریک کی مخالفت کے ان میں سے اکثر و بیشتر کا مذہب سے بالکل ہی رشتہ رہ گیا تھا۔ اس لیے ان کا ردعمل عام طور پر تسلیم و رضا کی صورت اختیار نہ کر سکا۔

FERUSTHATION کا ردعمل وہ ہے جسے انگریزی میں GETTING OUT OF THE FIELD کہتے ہیں یعنی میدان سے فرار۔ اس ردعمل کے نتیجے میں فرد سماج سے منھ موڑ کر اپنی ذات کے خول میں پناہ گزیں ہو جاتا ہے۔ نامرادی اور شکستگی کا احساس اُسے ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ماحول کے مثبت تعمیری تقاضوں کے لیے اس کے اندر کوئی کشش نہیں ہوتی۔ ان کی جگہ بے اعتمادی اور بے یقینی کو مل جاتی ہے۔ سماجی ماحول سے عدم وابستگی ALIENATION کا بھیانک احساس اسے ستانے لگتا ہے۔ سماج پر لاقانونیت ANOMIE کی عملداری کا تصور اسے سماج سے بیزاری کی ترغیب دینے لگتا ہے۔ اپنے آپ کو سماج کا فرد باور کرنے میں اسے شک ہونے لگتا ہے۔ سماج سے عدم تعلق NON-BELONGINGNESS کا احساس اس کا تعلق صرف اپنی ذات سے باقی رہنے دیتا ہے۔ چنانچہ تنہائی کے احساس کی گھٹن اسے آتش زیرپا رکھتی ہے۔ فرد کے اندر اپنے تشخص کا احساس (SELF IDENTITY) تصور ذات کے گوناگوں عناصر

کی ترتیب و تنظیم کی دین ہے لیکن سماج سے بے تعلقی کے بعد تصور ذات کے ساتھ احساس تشخص پر بھی پانی پھر جاتا ہے۔ اپنی ذات کا تصور دوسروں کی ذات سے اپنا موازنہ کر کے ہی پیدا ہوتا ہے لیکن جب دوسروں کی ذات سے بیگانگی ہو جاتی ہے ان پر اعتماد کرنے سے اٹھ جاتا ہے تو تصور ذات کی تشکیل و تنظیم کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ بجائے اپنے آپ کو دوسروں کے آئینے میں دیکھنے کے فرد دوسروں کو اپنے آئینے میں دیکھنے لگتا ہے۔ چنانچہ دوسروں کے تشخص پر بھی اس کا اعتماد باقی نہیں رہتا۔ وہ انہیں بھی اپنی ہی طرح یکہ و تنہا، نامرادی اور شکستگی، بے یقینی اور احساس عدم حفاظتی کا شکار باور کرنے لگتا ہے۔

FRUSTRATION کا ردعمل کبھی کبھی ذہنی مرض کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض ذہنی مریض ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں وہ ساری علامتیں پائی جاتی ہیں جن کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے۔ اگر ان کا مرض ایسی شدت نہیں اختیار کر لیتا ہے کہ وہ اپنی بنیادی حاجتوں کی بھی تکمیل بذات خود کرنے کے قابل رہیں تو اپنی ذہنی الجھنوں، اپنے انتشار و اضطراب کی کیفیتوں کو کسی دوسرے شخص کے سامنے بیان کرنے سے انہیں اک گونہ سکون و طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ اس طریقہ کار کو CATHARSIS یا ذہنی تنقیہ کہتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسے مریض کے لیے یہ مشورہ بھی نہایت کارآمد ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنی کیفیتوں کو کاغذ پنسل لے کر قلمبند کر لیا کرے۔ علم ایک طاقت ہے (KNOWLEDGE IS POWER) اپنی ذہنی کیفیتوں کا اپنی زبان یا قلم سے اظہار کر کے رفتہ رفتہ فرد میں ان پر قابو پانے کی صلاحیت عود کر آتی ہے اور مرض کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ اکثر یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اپنی کیفیتوں کے زبانی یا تحریری بیان میں فرد ایسی علامتوں کا بھی استعمال کرتا ہے جو عموماً خواب کے بیان میں پائی جاتی ہیں۔ ان کی حیثیت اکثر انفرادی ہوتی ہے اور بادی النظر میں یہ سننے والے یا پڑھنے والے کو بے معنی معلوم ہوتی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ مریض اپنی کیفیتوں کے اظہار میں احتیاط سے بالکل ہاتھ نہیں دھو بیٹھتا۔ عزت نفس کا تقاضہ باوجود اضمحلال کے بالکل ناکارہ نہیں ہو جاتا۔

سطور بالا میں FERUSTRATION کے ردعمل کا جو بیان پیش کیا گیا ہے اس کے نشانات شاید ہمیں ان مخلص اور حساس ذہنوں

[باقی صفحہ نمبر ۳۰ پر]

اقبال احمد قاسمی

قات

CATHA FORSK

قات ایک نبات ہے۔ اس کی صرف ایک ہی نوع ہوتی ہے جس کا نام Catha edulis ہے۔ یہ افریقی چائے کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس کے سرسبز و شاداب پودے مشرقی و شمالی افریقہ میں پائے جاتے ہیں۔ افریقہ کے گرم ممالک میں اس کی کاشت بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ شمالی و جنوبی یمن، صومالیہ، سوڈان، عراق، مصر اور سعودی عرب میں اس کے درخت پائے جاتے ہیں۔ ابھی حال میں ہندوستان میں بمبئی اور میسور نیز سری لنکا میں بھی اس کی کاشت کی گئی ہے۔ درختوں کی قامت ۱۲-۹ فٹ تک ہوتی ہے۔ پتیاں ابتداءً پتلی اور سخت کچھ مدت گزرنے کے بعد کافی دبیز اور موٹی ہو جاتی ہیں، اس کی لکڑیاں سوکھنے کے بعد زرد کتھئی اور سیاہی مائل ہوتی ہیں۔ جو نہایت سخت اور مضبوط ہوتی ہیں۔ قات کے سلسلے میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس کی پتیاں، کلیاں اور ڈنٹھل وجو کلیوں اور پتیوں سے لگے ہوئے نرم ہوتے ہیں، مذکورہ ممالک کے لوگ بڑے شوق سے پان کی بجائے کھاتے ہیں۔ اس کی پتیاں تازہ اور خشک دونوں حالتوں میں کھائی جاتی ہیں جن کا مزا پھیکا کسی قدر تلخ ہوتا ہے۔ پتیاں گہرے سبز رنگ کی لیبو تری موسری کی پتیوں کے برابر ہوتی ہیں۔ سب سے زیادہ شمالی اور جنوبی یمن میں استعمال ہوتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پان کی طرح اس میں کتھا چونا نہیں لگتا بلکہ صرف پتیاں ہی چبا کر کھائی جاتی ہیں۔ جس سے لوگ بہت سرور و نشاط محسوس کرتے ہیں۔ سعودی عرب کا تو اس معاملہ میں عجیب ہی دستور ہے کیوں کہ وہاں قات کھانے پر قانونی پابندی عائد ہے اور اگر کسی کو قات کھاتے ہوئے پکڑ لیا گیا تو اس پر تین سال قید بامشقت کی سزا حکومت کی جانب سے واجب ہو جاتی ہے۔ اس کی پتیوں کی ایک گانٹھ جس کا وزن تقریباً ۵ گرام ہوتا ہے بازاروں میں بڑی مہنگی لیکن فراوانی سے ملتی ہے۔ اصطلاح عرب میں ایک گانٹھ کو "ضربہ" اور دو "ضربات" کو ایک "شکل" کہتے ہیں۔ اس کی ایک شکل کم از کم پندرہ سعودی ریال کی ملتی ہے۔

قات کھانے کی ترکیب بھی بڑی انوکھی ہے۔ قات کھانے کے لیے پہلے زمین پر فرش ڈال کر اس پر چاندنی بچھائی جاتی ہے۔ چاروں طرف گاؤ تکیے رکھے جاتے ہیں۔ لوگ گاؤ تکیوں پر ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے ہیں ان کے سامنے طرح طرح کے مشروبات ہوتے ہیں۔ مثلاً کالی چائے، سرخ چائے اور بنج، کوکا کولا اور سوڈے کی بوتلیں یا اسی قبیل کی اور دوسرے مشروبات اس کے علاوہ سگریٹ، سگار، پائپ اور پاؤچ بھی سامنے ہوتا ہے۔ عام طور پر لوگ دوپہر کے کھانے کے بعد قات کی مجلس جماتے ہیں اور رات کے دس گیارہ بجے تک مشغول رہتے ہیں۔ ہر شخص ایک ایک گڈی لے کر بیٹھتا ہے۔ اس کی پتیاں صاف کر کے منہ میں رکھتا جاتا اور سگریٹ چائے یا کولڈ ڈرنک کا کش بیچ بیچ میں لگاتا جاتا ہے۔ ایک نشست میں ایک ایک آدمی کئی کئی گڈی قات کھا جاتا ہے۔ قات کھانے کے اصول میں سے یہ بھی ہے کہ اس کی پتیوں کی گلوریاں بائیں "کلّے" میں رکھی جائیں۔ جو لوگ دائیں جانب رکھتے ہیں وہ اس محفل میں "جونیئر" تصور کیے جاتے ہیں۔ قات کی پتیاں استعمال کرنے کے بعد بے پناہ Alertness نشاط محسوس ہوتا ہے۔ اس لیے مصری اور یمنی قرّاء قرأت قرآن کے مقابلے یا دینی جلسوں

...ہیں ... ئے بے قات کا سہارا لیتے ہیں۔ اور قات کی گلوری منہ میں دبا لینے کے بعد کئی کئی گھنٹے تک وہ بلا تکان تقریر یا تلاوت کرتے رہتے ہیں۔

زمانہ قدیم میں قات کی پتیوں سے عرب چائے نما ایک مشروب بھی تیار کرتے تھے۔ لیکن اس کو اب نئی پود استعمال نہیں کرتی۔ اس کی پتیوں کو دم دے کر اس سے حاصل شدہ عرق میٹھا، قابض اور کسی قدر خوشبو دار ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں لکھنوی تہذیب میں پان کی گلوریوں اور عطر کے پھلئے کو جو اہمیت حاصل تھی اور اس سے جو عزت افزائی تھی۔ بالکل اسی طرح عرب اپنے مہمانوں کا دل جیتنے کے لیے انھیں قات پیش کرتے ہیں۔ میرے عرب دوستوں نے اس ضیافت سے مجھ کو بھی کئی بار سرفراز فرمایا ہے۔

طبی منافع واستعمالات۔ دمہ، ضیق النفس، کھانسی اور سینے کی بیماریوں میں مفید ہے۔ عرب اس کی پتیاں خشک کرکے تمباکو کی طرح سگریٹ میں استعمال کرتے ہیں۔ غالباً یہ وہی طریقہ ہے جیسا دھتورے کی پتیوں کو ہندوستان میں دمہ کے مریض بیڑی میں رکھ کر پیتے ہیں جس سے ان کو افاقہ ہوتا ہے۔ قات محرک اعصاب C.N.S. Stimulant نشیلی اور مخدر ہے۔ لیکن Narcotics کے ساتھ حواس کو یکجا رکھتی ہے۔ چوں کہ اس کا براہ راست عضلات Muscles پر عمل ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی زیادہ مقدار کھلا دینا یا کثرت استعمال سے PARALYSIS ہو جاتا ہے۔

کیمیاوی تحقیقات۔ اس میں مندرجہ ذیل الکلائڈس ہیں۔

۱۔ کیتھن		Nor, Isoephedrine. or	1.
۱ کیتھین	فی صد	0.27%	Cathine
۲۔ کیتھنین	فی صد	0.15%	2 Cathinine
۳ کیتھیڈین	فی صد	0.32%	3. Cathidine

اس کے علاوہ شکریات ہیں Reducing Sugars، روغن فراری اور Tannines قابض مواد بھی پائے جاتے ہیں۔

تجارتی نقطہ نظر سے اس کی لکڑیوں کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ سیدھی چمکدار اور مضبوط ہوتی ہیں۔ اس سے بڑے بڑے صندوق اور پیٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ نیز اس کی لکڑیوں سے عمدہ قسم کی جاذب اوراق Blotting Papers بھی تیار کیے جاتے ہیں۔

بقیہ: "ادب میں جدیدیت"

[صفحہ نمبر ۲۸]

کی شعری یا نثری تخلیقات میں بھی مل سکیں گے جن کی آزادی سے وابستہ امیدوں پر بعد کی جانگسل حقیقتوں نے جھاڑو پھیر دی۔ وہ اس سارے ذہنی کرب و اذیت کے شکار ہیں جن کا ذکر کیا گیا اور جن سے ان کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ انہیں صفحۂ قرطاس پر منتقل کرکے وہ ان کے تخلیے کا سامان کر لیتے ہیں جو ان کے لیے اک گونہ تسکین کا باعث ہوتا ہے، لیکن اسے وہ اپنا ادبی کارنامہ سمجھ کر اپنی اس مریضانہ کیفیت پر نقاب ڈال دیتے ہیں۔ ان کا یہ عمل نا مراد ان کی حاجت رد کرکے اپنی افادیت کی تکمیل کر لیتا ہے اور اس طرح انہیں ترسیل و ابلاغ کی فکر سے بے نیاز بنا دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج کے زیادہ تر فنکار جنہوں نے جدیدیت کا لباس زیب تن کر لیا ہے اس کا استعمال محض فیشن کے طور پر کر رہے ہیں۔ چونکہ فیشن کو کبھی استقلال نصیب نہیں ہوتا، ایسے فنکار کی گروہی حیثیت رفتہ رفتہ کالعدم ہو جائے گی۔ مجھے خوف ہے کہ میری یہ تحریر ان فنکاروں کی آزردگی کا باعث ہوگی جو ادب میں جدیدیت کو اپنے تخلیقی کارناموں کا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔ ان سے معذرت کا خواستگار ہوں۔

"دوست ہمیشہ اپنے دوست کی نیکیوں کو بڑھاتا ہے اور دشمن عیبوں کو، اس لیے ہم کو اپنے دشمن کا زیادہ احسان مند ہونا چاہیے کہ وہ ہم کو ہمارے عیبوں سے مطلع کرتا ہے۔ اگر ہم نے اس کے طعنوں کے سبب ان عیبوں کو چھوڑ دیا تو دشمن سے ہم کو وہی نتیجہ ملا جو ایک شفیق استاد سے ملنا چاہیے تھا۔"

سر سید احمد خان

اسماعیل سعد

تعلیمی اداروں میں کتب خانوں کی ضرورت واہمیت

بنی نوع انسان کی علمی زندگی میں کتب خانوں نے شاید وہی خدمت انجام دی ہے جو فرد کی ذہنی زندگی میں حافظہ انجام دیتا ہے۔ جس طرح فرد کی ذہنی زندگی کی ابتدا اس کا تسلسل اور نشو ونما حافظہ ہی سے ممکن ہے اسی طرح بنی نوع انسان کی علمی زندگی کی بقا اس کا تسلسل اور ارتقا کتب خانوں کا ہی مرہونِ منت رہا ہے۔ جب بھی کسی معاشرہ اور تہذیب میں علم کو فروغ ہوا اور حصولِ علم پر زور دیا گیا تو وہاں کتب خانوں کے قیام کو بھی اہمیت حاصل رہی۔ خود ہم مسلمانوں نے علم کی خدمت میں کتب خانوں پر بے انتہا توجہ دی۔ مولانا شبلی نے اپنے مضمون "اسلامی کتب خانے" میں بغداد، اسپین اور مصر کے اسلامی کتب خانوں کا جو تذکرہ کیا ہے اس کا مطالعہ آج بھی ہمارے لیے بصیرت افروز ہے۔ انہی کتب خانوں میں وہ نوادر اور علم کے موتی جمع کیے گئے، جو بکھر کر مغربی ملکوں میں منتقل ہوئے اور جن کو یورپ کے کتب خانوں کی زینت دیکھ کر اقبال کا دل بھر آیا ؎

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھو ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

علمی سرمایہ کے امین ہونے کی حیثیت سے کتب خانوں کا تعلیم اور تعلیمی اداروں سے کسی نہ کسی طرح منسلک و متعلق رہنا قدرتی بات تھی اور تاریخی طور پر کتب خانوں نے ہر زمانے میں تعلیم کو متاثر بھی کیا لیکن یہ رشتہ اتنا قریبی کبھی نہ تھا جتنا ہمیں آج کے زمانے میں نظر آتا ہے۔ کتب خانوں کا گہرا اور براہ راست رشتہ بڑی حد تک موجودہ دور کے تقاضوں کی پیداوار ہے۔ موجودہ دور سے پہلے کتب خانوں نے زیادہ تر تعلیم یافتہ ذہنوں کی علمی تشنگی کی تسکین کا اہتمام کیا لیکن طلبہ کے ناپختہ ذہنوں کی تربیت اور عملِ تعلیم میں براہِ راست حصہ نہیں لیا۔ کتب خانوں کے لیے عمل تعلیم کو براہ راست متاثر کرنا ایک ایسے زمانے میں ممکن بھی نہ تھا جب تعلیمی مواقع کا دائرہ محدود تھا اور بس گنے چنے لوگ ہی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ لیکن جب سے زندگی میں تیز رفتاری آئی علم اور تعلیم کو عام کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ جمہوری تقاضوں نے ہر انسان کی قدر کرنا سکھائی اور ہر فرد کی صلاحیتوں کا احترام اور اس کی جدید تعلیم کی ذمہ داری بن گئی۔ لازمی اور جبری تعلیم کے تصورات مقبول ہوئے تو اس بدلی ہوئی فضا میں کتب خانوں کی تعلیمی افادیت میں اضافہ ناگزیر تھا۔

آج کتب خانے نظامِ تعلیم سے براہ راست وابستہ ہیں اور نظام درس وتدریس کا ایک بنیادی حصہ ہیں اب کسی تعلیمی ادارے کا تصور خواہ تعلیم کی کسی بھی منزل سے بھی متعلق ہو، کتب خانے کے بغیر ممکن نہیں۔ بعض ماہرینِ تعلیم نے تو یہاں تک کیا ہے کہ کتب خانے کو عملِ تعلیم میں ایک مرکزی حیثیت دے کر مختلف طریقۂ تعلیم وضع کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ ایک اہم تدریسی طریقہ' کار ڈالٹن منصوبہ کا تجزیہ کرنے کی کوشش کریں تو یہی نظر آئے گا کہ سارا عملِ تعلیم کتب خانے کے گرد گھومتا ہے۔ موثر تعلیم بچوں کے کتب خانے سے صحیح طور سے استفادہ کرنے پر مبنی ہے اور استاد کا کام یہی ہے کہ اس علمی جستجو میں بچوں کی رہنمائی کرے۔ بعض اور جدید طریقے مثلاً تدریسی مشینوں، لسانی تجربہ گاہوں کا بنیادی اصول بھی یہی ہے کہ کتب خانوں میں موجود مواد کو بچوں کے لیے زیادہ دلچسپ و دل کش بنا دیا جائے۔ لیکن اگر ان توسیعی پہلوؤں سے

قطع نظر ہم کتب خانے کے کسی قدر روایتی تصوّر کو ہی اپنے ذہن میں رکھیں تو بھی تعلیمی اداروں کے لیے کتب خانوں کی اہمیت کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ ہمارے لیے یہ کہنا تو جائز نہیں کہ کتب خانے عملِ تعلیم کا مرکزی و محوری رشتہ ہیں۔ اس لیے کہ عملِ تعلیم میں یہ اہمیت تو ابھی تک صرف اس زندہ تعلق کو حاصل ہے جو استاد اور شاگرد کے مابین ہوتا ہے۔ یہ وہ تعلق ہے جو انتہائی حقیقی ہے۔ لیکن جس کی صحیح ماہیت تمام تر علمی تحقیقات کے باوجود ابھی تک علماء کی پیمائش کی زد میں نہیں آسکی اور نہ ہی ایجادات و اختراعات کی مدد سے اس تعلق کو مصنوعی طور پر پیدا کرنا ممکن ہو سکا ہے۔ لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ بنیادی طور پر عملِ تعلیم استاد اور شاگرد کے تعلق سے عبارت ہے تو یہ ضرور کہنا چاہیے کہ اس تعلق کو مضبوط کرنے اور اس کو وسعت دینے کے لیے کتب خانے سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

کتب خانے استاد کی جگہ نہیں لے سکتے لیکن استاد کے کام کو آسان اور موثر بنانے کے لیے کتب خانوں کی خدمت ناگزیر ہے۔

تعلیمی اداروں میں کتب خانے بنیادی طور پر دو طرح استاد کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ کتب خانے کی سب سے بڑی تعلیمی اہمیت طالب علم میں تعلیم کے شوق کو جگانا ہے۔ علم کی جستجو کی چنگاری تو استاد طالب علم میں جلاتا ہے لیکن اس شرارے کو آتشِ شوق میں بھڑکانا کتب خانے کا کام ہے۔ یہ تو ہمیں معلوم ہی ہے کہ طالب علم ہر چیز کا براہِ راست تجربہ نہیں کر سکتا اسے بہت کچھ اور بیشتر دوسروں کے تجربے سے اخذ کرنا ہوتا ہے۔ یہ بالواسطہ تجربہ اسے کتابوں کی شکل میں کتب خانے کے اندر حاصل ہوتا ہے۔ کتب خانہ دراصل کتابوں کے بھیس میں عالموں، ادیبوں اور دانشوروں کی ایک محفل ہے اور یہ پرانی کہاوت درست ہے کہ آدمی اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے تو طالب علم کے لیے یہی سزاوار ہے کہ وہ کتب خانہ کے آئینہ میں پہچانا جائے۔ کتب خانہ ہی وہ ماحول مہیا کر سکتا ہے جو طالب علم کو دانشوروں اور عالموں کی ہم سفری کا خوگر بنا سکے۔

امریکہ کے موجودہ زمانے کے ایک کسی قدر قدامت پسند لیکن بڑے سلجھے ہوئے مفکر اور ماہرِ تعلیم نے اسی بنیادی تصوّر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک تعلیمی منصوبہ پیش کیا جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ طالب علم کو ایسی کتابوں کے درمیان چھوڑ دیا جائے جو اپنے زمانے کی شاہکار ہوں۔ اس نے ان عہد آفریں کتابوں کی ایک فہرست بنائی اور کتابوں کے اس سلسلے کو "عظیم کتب" کا نام دیا۔ اس مفکر کا یہ بڑا سوچا سمجھا خیال ہے کہ تعلیم کے اعلیٰ مدارج میں کوئی بھی طالب علم بغیر ان کتابوں کے پڑھے ہوئے اپنے کو پڑھا لکھا کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ غرض علم کا شوق اور ہر زمانے کے بڑے دماغوں سے علمی رابطہ کتب خانوں کے ذریعہ ہی ممکن ہے اور تعلیمی اداروں میں طالب علموں کی یہی خدمت کتب خانوں کا اولین فریضہ ہے۔

علم کے شوق کو جگانے کے ساتھ ساتھ کتب خانوں کی دوسری اہم خدمت طالب علموں میں عادت راسخ کرنا ہے کہ وہ علم اور علمی ذرائع سے صحیح طور سے استفادہ کر سکیں۔ دراصل تعلیم کا مقصد یہ نہیں ہے کہ طالب علم اپنے ذہن کو حقائق اور معلومات سے بھرے بلکہ یہ کہ وہ جانتا ہو کہ مختلف حقائق اور معلومات کو حاصل کرنے کے ذرائع اور طریقہ کار کیا ہیں۔ اور پھر حاصل شدہ معلومات سے زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں کیا مدد لی جا سکتی ہے۔ اچھا طالب علم وہ نہیں جو کسی چھوٹی موٹی لغت کو حفظ کر ڈالے یا خود انسائیکلو پیڈیا بن جائے، بلکہ وہ طالب علم ہے جو لغت اور انسائیکلو پیڈیا سے حسب منشا و ضرورت کے مطابق کام لے سکے۔ معلومات و حقائق کے انبار کو ذہن میں جمع کرنے کا کوئی شخص متحمل نہیں ہو سکتا۔ آج کل معلومات کا جو سیلاب ہے اس کے لیے جدید اصطلاح "علم کا دھماکہ" استعمال کی گئی ہے۔ اس دھماکہ کا اندازہ لگانا ہو تو صرف کیمیا کے میدان کی مثال لے لیجیے۔ حساب لگایا گیا ہے کہ کیمیا کے میدان میں جو نئی ترقیاں ہوئی ہیں اور تازہ معلومات کا جو اضافہ ہوا ہے اگر آج ہم انھیں پڑھنے بیٹھیں اور دن میں بارہ گھنٹے روزانہ پڑھتے رہیں اور بلاناغہ سالہا سال تک ایسا ہی کرتے رہیں تو آخر میں ہمیں یہ پتہ چلے گا کہ ابھی ہم دس سال پیچھے ہیں۔ اگر صرف ایک میدان میں معلومات کے اضافہ کا یہ حال ہو تو پھر علم کے مجموعی ذخیرہ میں جو اضافہ ہو رہا ہے اس کو ذہن میں لانے کی کوشش کیجیے۔ کسی طالب علم یا انتہائی اچھی

ذہنی صلاحیتوں کے مالک شخص سے بھی یہ توقع رکھنا سراسر زیادتی ہے کہ وہ اس تمام ذخیرۂ علم کو ازبر کرلے گا۔ تعلیم یافتہ ذہن وہی ہوسکتا ہے جو علم کے ذخیرہ میں انتخاب کا اہل ہو اور جو زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں منتخب کیے ہوئے حقائق و معلومات سے پوری طرح کام لے سکے۔ چنانچہ تعلیمی اداروں میں کتب خانوں کا ایک بڑا مقصد یہی ہے کہ وہ طالب علموں میں کتب خانے کی عادت پیدا کردیں تاکہ وہ کتب خانہ کا صحیح استعمال کرسکیں اور مختلف معلوماتی وسائل اور علمی ذرائع سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔

غرض طالب علموں میں علم کے شوق کو جگانا اور ان کے اندر ایسی ذہنی عادتیں پیدا کرنا کہ وہ علم اور معلوماتی وسائل سے صحیح طور پر کام لے سکیں، کتب خانوں کے بنیادی فرائض ہیں۔ اگر ہم تعلیم کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو خود عمل تعلیم کی منطق بھی یہی ہے کہ طالب علم کے اندر علم کا شوق پیدا ہو اور اس کے اندر وہ صلاحیتیں اور عادتیں ابھریں کہ وہ اپنی تعلیم کی ذمہ داری خود اپنے ہاتھوں میں لے سکے اور رسمی تعلیم کے خاتمے کے بعد تاحیات اپنی تعلیم جاری رکھ سکے۔ اسی لیے کسی بھی نظامِ تعلیم میں تعلیم کا کام استادوں اور کتب خانوں کے اشتراک سے ہی ممکن ہے۔ بغیر کتب خانوں کے تعلیمی اداروں کی شخصیت نامکمل اور ادھوری رہتی ہے۔

اگر یہ بات درست ہے کہ کتب خانے موجودہ نظامِ تعلیم کا بنیادی ستون ہیں تو پھر ان کو نظامِ درس و تدریس میں ایک بنیادی کی حیثیت بھی حاصل ہونا چاہیے۔ خود ہم اگر اپنے ملک میں نظامِ تعلیم کی آبیاری صحت مندانہ انداز میں کرنا چاہتے ہیں تو کتب خانوں کی طرف مزید توجہ سے دامن بچانا ممکن نہیں۔ نئی تعلیمی پالیسی کی شکل میں اس سال ہم نے تعلیم کے میدان میں ایک بڑا اہم قدم اٹھایا ہے لیکن ابھی یہ قدم اپنی تجرباتی منزل میں ہے۔ یہ تو ہم سب سمجھتے ہیں کہ پہلا قدم اٹھانے سے کوئی فی الفور منزل پر نہیں پہنچ جاتا۔ قدم تو صرف راہ رو کے عزم کا پیمانہ ہے اور اس کا رخ متعین کرتا ہے۔ منزل تک پہنچنے کے لیے راستے کی صعوبتیں اور دشواریوں کو عبور کرنا ہوتا ہے اور پھر تعلیم تو ایک ایسا عمل ہے جس کی منزل ہی مسلسل سفر ہے۔ تعلیم کے کام میں تو بس لگے رہنا ہوتا ہے۔ یہ سیاسی زندگی کے اتار چڑھاؤ کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ نئی تعلیمی پالیسی اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہے جب سیاسی مصلحتوں سے قطع نظر تعلیم کے ہر شعبہ میں پوری لگن، انہماک اور توجہ سے کام ہو۔ آج کے موضوع کو ذہن میں رکھتے ہوئے مجھے یہ کہنے میں باک نہ ہونا چاہیے کہ ہمارے نئے تعلیمی تجربہ کی کامیابی کا بہت کچھ انحصار اس بات پر بھی ہوگا کہ تعلیمی اداروں میں کتب خانوں کی طرف کس حد تک توجہ دی گئی اور ان کتب خانوں کے اندر کیا کام ہوا۔ یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں کتب خانے جس توجہ کے مستحق تھے وہ ابھی تک انھیں حاصل نہیں رہی۔ تعلیم کے ابتدائی مدارج میں اوّل تو کتب خانے تھے نہیں اور اگر کچھ تھے تو ان سے صحیح طریقے اور پورا پورا کام نہیں لیا گیا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کتب خانوں کے قیام اور ان کے استعمال کی طرف باقاعدہ توجہ دی جائے۔ طلبہ کی ضروریات اور تعلیمی مقاصد کے پیش نظر کتب خانوں کی ازسرِ نو تنظیم کی جائے اس مقصد کے لیے ضروری وسائل کا اہتمام تو کرنا ہی ہوگا لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جو وسائل بھی مہیا کیے جاسکیں ان کا بہتر سے بہتر استعمال ہو۔ کتب خانے اور نصاب تعلیم میں قریبی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور کتب خانے کو بچوں کے لیے ایک پُرکشش اور دلچسپ جگہ بنانے کی کوشش کی جائے تاکہ کتب خانہ علم کی گرمی اور زندگی سے بھرپور نظر آئے۔

ان تعلیمی اداروں میں جن کا تعلیم کے اعلیٰ مدارج سے تعلق ہے۔ مثلاً کالجوں میں کتب خانوں کی طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہوگی۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، یہ تعلیم کی وہ منزل ہے جہاں طالب علم اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے لگتا ہے اور اپنی تعلیم کی ذمہ داری خود قبول کرنے لگتا ہے۔ اس منزل پر کتب خانے کا زیادہ سے زیادہ استعمال طالب علم کے اندر ذہنی خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے کالجوں کا نصاب اس طرح مرتب کیا جائے کہ طالب علم کو خود بخود کتب خانے سے استفادہ کی ضرورت محسوس ہو۔ اعلیٰ تعلیمی مدارج میں علم کے شوق اور علمی عادتوں کی ترویج کے علاوہ کتب خانہ کا ایک تیسرا کام بھی ہے اور وہ ہے خود

تحقیق علم کی افزائش کا کام۔ ہمارے کالجوں میں طلبہ کو تحقیقی کاوشوں کی طرف متوجہ کرنے کے لیے بھی کتب خانوں کی خدمت کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے کتب خانوں کے وسائل میں اضافہ کرنا ہوگا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایسے مشترکہ کتب خانے بنائے جائیں جو قریب قریب آباد کئی کالجوں کی خدمت کرسکیں۔ یہ ضرور ہے کہ ابھی ہمارے کالجوں میں تعلیم کا معیار اتنا اونچا نہیں ہے کہ طلبہ کا رجحان تحقیقی کاموں کی طرف ہو۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ معیار اونچا کرنا ہوگا۔ خصوصیت کے ساتھ کالجوں کے آخری دو سالوں کا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کچھ کالجوں میں ایم۔ اے اور ایم۔ ایس سی جماعتوں کی تدریس کا اہتمام کیا جائے۔ یا بعض ایسے کالج قائم کیے جائیں جو یونیورسٹی سے ملحق ہونے کے بجائے خود ہی اپنی سند دینے کے مجاز ہوں۔ بہرحال یہ تو ایسے امکانات ہیں جن کی مستقبل کے لیے نشاندہی کی جاسکتی ہے خود کالجوں میں کتب خانوں کی موجودہ حالت کو بہتر بنانے کی بہت گنجائش ہے۔ کم از کم یہ تو کیا ہی جاسکتا ہے کہ کتب خانوں کا باقاعدہ بجٹ ہو۔ سال بہ سال نئی کتابوں کے اضافہ کا اہتمام اور موجودہ کتابوں کی جلد بندی اور حفاظت کے معقول انتظامات ہوں۔ تمام کالجوں کے کتب خانوں کا ایک مشترکہ کیٹلاگ یا فہرست ہو اور اساتذہ اور اچھے طلبہ کو ہر کتب خانے سے استفادہ کا موقع حاصل ہو۔ ہر کتب خانے میں درسی کتابوں کا ایک الگ حصّہ ہو جہاں سے طلبہ کو کتابیں مستعار لینے کی سہولت ہو۔

آخر میں ایک بات اور جہاں کتب خانوں کی موجودہ سہولتوں میں اضافہ کی گنجائش ہے وہاں اس عملہ کی طرف بھی توجہ ہونی چاہیے۔ جس کے ہاتھوں میں کتب خانہ کا انتظام و اہتمام ہوتا ہے۔ مہتمم اور منتظم کتب خانہ کی ذمہ داریاں اتنی ہی اہم ہیں جتنی تعلیمی اداروں میں کام کرنے والے اساتذہ کی۔ منتظمین کتب خانہ کے انتخاب اور تقرر میں باقاعدہ اور سخت شرائط ہونی چاہئیں لیکن جب قواعد کے مطابق ان کا تقرر ہو جائے تو ان کی اور دوسرے اساتذہ کی حیثیت میں کوئی تفریق نہ ہونی چاہیے۔ اساتذہ کے لیے درجۂ اوّل کا استحقاق خود اس پیشہ کے لیے بڑا اعزاز نہیں لیکن یہ اقدام اس لحاظ سے قابلِ قدر ضرور ہے کہ یہ ایک ایسے معاشرہ میں اساتذہ کی سماجی حیثیت کو مستحکم کرنے کی کوشش ہے جس کے سوچنے کا انداز اور قدر کا پیمانہ ابھی تک فرقِ مراتب رہا۔ اگر یہ بات درست ہے تو کتابوں کو اوڑھنا بچھونا بنانے والے اور طلبہ کی علمی خدمت کرنے والے منتظمینِ کتب خانہ کو بھی اس بات کا استحقاق ہونا چاہیے کہ ان کی سماجی حیثیت ایک ہی ادارے میں کام کرنے والے اپنے ساتھی اساتذہ سے کم نہ ہو۔

"اگر یہ خیال ہو کہ ان دنیاوی علوم کے سیکھنے سے ہمارے عقائد مذہبی میں سستی آتی ہے کیوں کہ مذہبی مسائل ان دنیاوی علوم کے پڑھنے سے مشتبہ یا غلط معلوم ہوتے ہیں تو نہایت ہی افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان اپنے ایسے روشن اور مستحکم سچے مذہب کو ایسا ضعیف اور کمزور سمجھتے ہیں کہ دنیاوی علوم کی ترقی سے اس کی برہمی کا خیال کرتے ہیں۔ نعوذ باللہ منہا۔ مذہب اسلام ایسا مستحکم اور سچا مذہب ہے کہ جس قدر دینی اور دنیاوی علوم کی ترقی ہوتی جائے گی، اسی قدر اس کی سچائی زیادہ تر ثابت ہوگی۔"

سرسید احمد خان

محمد سعود عالم قاسمی

اسلام عورت کا محافظ ہے

اسلام کمزوروں کا محافظ اور مظلوموں کا ہمدرد ہے وہ انسان اور انسان میں تفریق و امتیاز کا مخالف ہے۔ اس کی نظر میں انسانوں کا ہر گروہ اور ہر فرد بحیثیت انسان مساوی ہے۔ وہ انسانوں کے کسی گروہ یا فرد کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کی کمزوری کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اس کا استحصال کرے اور اس کے ساتھ ظلم و زیادتی اور ناانصافی کا معاملہ کرے۔

عورت اسلام کی نظر میں کمزور اور مظلوم ہے، عورت کی کمزوری اس کی طبعی ساخت اور نفسیاتی و جسمانی نظام کی فطری ہیئت میں مضمر ہے یہی وجہ ہے کہ وہ مردوں کے تعاون اور دست گیری کی محتاج ہے۔ مگر بسا اوقات اس کی کمزوری کی رعایت کرنے کے بجائے اس کا ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور اسے وہ عزت اور مقام نہیں دیا جاتا جس کا مرد اپنے لیے مطالبہ کرتا ہے اور اسے گویا اپنا پیدائشی حق تصور کرتا ہے بلکہ کچھ لوگ اس کے ساتھ وہ برتاؤ اور سلوک بھی کر گذرتے ہیں جس سے انسانیت کی تذلیل اور آدمیت کی تحقیر ہوتی ہے۔

تاریخ کے طویل عرصہ میں کم و بیش عورت مظلوم ہی نظر آتی ہے سماجی، تہذیبی اور مذہبی (مسخ شدہ) دائرے ہر جگہ اس کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا گیا ہے۔ یہاں تک کہ "روشن خیالی" اور "آزادئ افکار" کے موجودہ دور میں بھی عورت بدسلوکی سے محفوظ نہیں ہے اپنی فطری حیثیت اور نسوانی حقوق سے وہ اب بھی محروم ہے۔ اس کا استحصال کل بھی ہوتا تھا آج بھی ہو رہا ہے صرف نوعیت بدل گئی ہے۔ دست ہوس کا وہ کل بھی شکار تھی اور اب بھی ہے بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ۔ فرق اتنا ہے کہ کل اسے اپنی مظلومیت کا احساس تھا اور آج یہ احساس بھی اس سے چھین لیا گیا ہے، اس لیے مظلومین کی فہرست میں عورت زیادہ قابل رحم نظر آتی ہے۔ آزادی اور ترقی کے خوشنما نظریات نے اسے میدان حیات میں مردوں کا شریک کار بنا کر اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ تو کر دیا ہے مگر سچی ہمدردی، پاکیزہ محبت، حقیقی عزت اور مخلصانہ احترام اسے ہنوز حاصل نہیں۔ تہذیب جدید نے عورت کو نہاں خانہ سے اغوا کر لیا ہے اور اس حالت پر اسے مطمئن رکھنے کے لیے منافع و برکات اور مساوات کی فہرست اس کے سامنے رکھ دی ہے۔ مگر جب کبھی اس کے اندر کی عورت جاگتی ہے اور اسے اپنی مظلومیت کا احساس ہوتا ہے تو وہ اس بے قید آزادی اور مفاد پرستی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے اور مردوں سے یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

" KEEP YOUR LAWS AND YOUR MORALITY OF MY BODY "

"تم اپنے قوانین اور اخلاق میرے بدن سے دور رکھو۔"

آج کی عورت جس کرب میں مبتلا ہے اس کا اندازہ مذکورہ نعرے سے لگایا جا سکتا ہے جو نیویارک کی خواتین نے گذشتہ سال مظاہرہ کے دوران لگائے تھے۔ استحصال، ناانصافی اور مفاد پرستی کے طوفان میں اسلام ہی امید کا ساحل نظر آتا ہے۔ جو اس صنف ناتواں کی حفاظت کر سکتا ہے۔

اسلام واقعۃً عورتوں کا محافظ اور خیر خواہ ہے۔ اس نے اپنے احکام و قوانین میں اس کی پوری رعایت کی ہے اور پوری عزت اور احترام کا اسے حق دار بنایا ہے۔ اس نے مردوں کو بھی یہ حکم دیا ہے کہ وہ عورت کو اس کے حق سے محروم نہ کریں اور اس کے ساتھ حسن سلوک

را اچھا برتاؤ کریں اور اس کی کمزوریوں کی رعایت کریں۔

کمزوری کی رعایت

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"استوصوا بالنساء خیرا فانھن خلقن من ضلع وان اعوج شیء فی الضلع اعلاہ فان ذھبت تقیمہ کسرتہ وان ترکتہ لم یزل اعوج فاستوصوا بالنساء (بخاری ومسلم)

عورتوں سے حسن سلوک کے معاملہ میں میری نصیحت قبول کرو کیوں کہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں اور پسلی کا کج تر حصہ اس کا اوپر کا ہوتا ہے اگر تم اسے سیدھا کرنا چاہو گے تو اسے توڑ ڈالو گے اور اگر چھوڑ دو گے تو برابر ویسی ہی رہے گی۔ اس لیے عورتوں کے بارے میں بھلائی کی نصیحت قبول کرو۔

اس علامتی حدیث میں عورت کی فطری کمزوریوں کی طرف آنحضورؐ نے اشارہ کیا ہے مرد جن کا خیال نہیں کرتے اور جب کوئی ایسا ناخوشگوار مرحلہ آتا ہے تو فوراً قطع تعلق کر لیتے ہیں حدیث کے مطابق یہ طلاق دینا ہے گویا توڑ دینا ہے۔ آنجنابؐ کی نصیحت یہ ہے کہ اس کے بجائے ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیا جائے اور نرمی و حکمت سے معاملات طے کیے جائیں نہ کہ ان کی کمزوریوں کو بنیاد بنا کر ترک تعلق کا فیصلہ کر لیا جائے۔ قرآن حکیم میں یہی تعلیم اس انداز سے دی گئی ہے۔

وعاشروھن بالمعروف فان کرھتموھن فعسی ان تکرھوا شیئا ویجعل اللہ فیہ خیرا کثیرا (النساء-۱۹)

اور ان لوگوں کے ساتھ بھلے طریقہ سے زندگی بسر کرو اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو اور اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو اس آیت میں بڑے خوبصورت طریقہ سے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ اللہ نے عورتوں کو ذریعہ خیر و برکت بنایا ہے اور یہ کہ تم اپنی پسند ناپسند کو ہی حقیقت کل نہ سمجھو۔

تکلیف نہ دو:۔ بھلے طریقہ سے زندگی گذارنے کا تقاضا یہ ہے کہ مرد اپنی بالادستی کا غلط استعمال نہ کرے اور عورتوں پر دست ستم دراز نہ کرے اور اسے ذہنی و جسمانی اذیت پہنچانے سے پرہیز کرے۔ اللہ کا حکم ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھا ولا تعضلوھن لتذھبوا ببعض ما آتیتموھن الا ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ (النساء-۱۹)

اے ایمان والو! تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو اور نہ یہ حلال ہے کہ انہیں تنگ کر کے اس کے مہر کا کچھ حصہ اڑا لینے کی کوشش کرو جو کچھ تم اسے دے چکے ہو الا یہ کہ وہ کسی صریح بدچلنی کی مرتکب ہوں۔

اسی طرح جسمانی اذیت پہنچانے کی حدیث میں ممانعت کی گئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن زمعہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لا یجلد احدکم امراتہ جلد العبد ثم یجامعھا فی آخر الیوم" (بخاری ومسلم)

تم میں سے کوئی اپنی بیوی کو غلاموں کی طرح نہ مارے پھر دن کے آخری حصہ میں اسی سے مباشرت کرے۔

یعنی جس بیوی سے وہ رات کو مباشرت کرتا ہے اور جو اس کے لیے وجہ سکون وراحت ہے اسے نوکروں کی طرح مارنا نہ صرف عورت کی عزت و وقار اور وجاہت کے منافی ہے بلکہ خود مردوں کی شرافت اور وجاہت سے گری ہوئی بات ہے۔

راز فاش نہ کرو:۔

عورتوں کی عزت نفس اور وقار پاس و لحاظ ہر حال میں ضروری قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق بھی مردوں پر عائد ہوتے ہیں جن سے وہ پہلو تہی نہیں کر سکتے۔ قرآن میں صراحت موجود ہے۔

ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف (البقرۃ-۲۲۸)

عورتوں کے لیے بھی معروف طریقہ پر وہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔

اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ مرد عورت کی عزت و ناموس کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اس کا محرم راز ہو، وہ اس کے راز کو اپنا راز اس کے عیب کو

اپنا عیب تصور کرے وہ اس کی کوئی بات (جو راز کی ہو) دوسروں پر یہاں تک کہ انتہائی قریبی حلقہ احباب پر بھی نہ ظاہر کرے۔ مبادا اس کے جذبات کو ٹھیس لگے ایسا کرنا ایک قسم کی خیانت ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" ان من اشر الناس عند اللہ منزلۃ یوم القیمۃ الرجل الذی یفضی الی امراتہ وتفضی الیہ ثم ینشر سرھا (مسلم بحوالہ مشکوۃ)

قیامت کے دن اللہ کے نزدیک مومنوں میں بدترین وہ ہوگا جو اپنی بیوی سے مباشرت کرتا ہے پھر اس کے راز کو عیاں کر دیتا ہے۔

شرم و حیا عورت کا زیور ہے، اس کے راز کو ظاہر کرنا گویا اس کے زیورِ حیا کو نیلام کرنا ہے جو کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

نرمی اور مہربانی

اسلام مردوں کو حقوق و فرائض کی ادائیگی کی تعلیم کے ساتھ ان کے ساتھ نرمی اور مہربانی کا برتاؤ کرنے کی بھی تلقین کرتا ہے۔ عورت کا یہ بھی حق ہے کہ مرد اس کے ساتھ نرمی اور مہربانی کا معاملہ کرے بلکہ رسول کریم نے مردوں کی شرافت اور بردباری کا پیمانہ عورتوں کے ساتھ مہربانی اور حسن سلوک کو قرار دیا ہے چنانچہ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"خیر کم خیر کم لاھلہ و انا خیر کم" (ترمذی)

تم لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے حق میں بہتر ہو اور میں تم لوگوں میں اپنے اہل کے معاملہ میں سب سے بہتر ہوں۔

حضرت عائشہؓ ہی سے ایک دوسری روایت اس طرح ہے کہ رسول کریمؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان من اکمل المومنین ایماناً واحسنھم خلقاً والطفھم باھلہ (ترمذی)

مومنوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق اچھا ہو اور جو اپنے اہل و عیال پر زیادہ مہربان ہو۔

اور یہ واقعہ ہے کہ انسان گھر سے باہر جتنا با اخلاق پروقار اور مہذب نظر آتا ہے اگر گھر میں اس کا معاملہ اس سے مختلف ہو تو اس کا بیرونی اخلاق نمائش ہی کہلائے گا۔ بالعموم لوگ گھروں میں تنک مزاجی تندرا شتعالی اور ذرا ذرا سی بات پر ڈانٹ اور پھٹکار کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ اسلامی اخلاق کے بالکل منافی ہے۔

صحابہ کرامؓ نے حضرت عائشہؓ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں اسی لیے سوال کیا تھا کہ جلوت میں انہوں نے آنحضورؐ کا جو اخلاق دیکھا تھا خلوت کے اخلاق سے اس کی تصدیق ہو جائے چنانچہ حضرت عائشہؓ نے شہادت دی" کان خلقہ القرآن" آپؐ کا اخلاق قرآن کا آئینہ دار تھا۔

اسلام کی نظر میں مرد و عورت کے تعلق کی بنیاد محبت اور رحمت ہے اسلام چاہتا ہے کہ مرد و زن میں کامل محبت اور والہانہ تعلق ہو اور اسی میں دونوں کی عافیت ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے۔

ومن ایٰتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ۔ (الروم ۲۱)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔

یہ محبت اور رحمت ہی ہے جو مرد و کو رشتہ ازدواج میں منسلک رکھتی ہے اگر یہ ختم ہو جائے تو یہ رشتہ بھی برقرار نہ رہ سکے گا۔ بلکہ مرد و زن کے اختلافات اور مسائل اسی وقت پیدا ہوتے ہیں جب ان میں باہمی محبت اور رحمت کا جذبہ کم ہو جاتا ہے۔ اس محبت کے بغیر رشتہ ازدواج ہی کیا نظام معاشرت بھی برقرار نہیں رہ سکتا۔ اسلام بنیادی طور پر اس محبت اور رحمت کی ضرورت و افادیت کا شعور پیدا کرتا ہے اور مردوں سے خاص طور پر اس کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ اسے دین و ثواب بھی قرار دیتا ہے تاکہ ایک شخص اسے صرف جنسی تعلق کی بنیاد ہی تصور نہ کرے بلکہ دینی اور روحانی وظیفہ بھی گردانے۔ اللہ کے رسول نے فرمایا ہر اس کام میں اجر ہے جو اللہ کی رضا کے حصول کے لیے کیا جائے "حتی اللقمۃ ترفعھا فی امراتک (بخاری) یہاں تک کہ اس لقمہ میں بھی اجر ہے جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتے ہو رشتہ ازدواج کو برقرار رکھنے اور عورت کے ساتھ محبت و رحمت کا معاملہ کرنے کا اس سے بڑا محرک اور کیا ہو سکتا ہے؟

دراصل اسلام کو ایک ایسے معاشرہ کی تعمیر کا منصوبہ ہے جس میں حقوق و فرائض اور دائرہ عمل کے تعین کے ساتھ ان پر عمل کرنے والوں میں باہمی محبت اور تعاون کا جذبہ ہو اور ایک دوسرے کے ساتھ خلوص اور ہمدردی ہو اور عدل و مساوات کی کارفرمائی ہو، ایسے معاشرہ کو برپا کرنے کے لیے مرد و زن کے تعلقات کی نوعیت اسلام کی نظر میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے اسی بنا پر اسلام نے معاشرتی اصلاح پر بہت ہی زیادہ توجہ دی ہے۔

سید بختیار فاطمی

عادت اور اس کی اصلاح

آپ ایک ماہر انجینیر کو دیکھتے ہیں، کس آسانی سے بڑی بڑی پیچیدہ مشینوں کو چلاتا اور ان کی نگرانی کرتا ہے۔ آپ ایک مفکر کو دیکھتے ہیں، دنیا کے الجھے ہوئے مسائل کو کس خوبی سے سمجھاتا اور ان کا حل پیش کرتا ہے۔ آپ ایک ادیب کو دیکھتے ہیں، کس روانی سے مختلف موضوعات پر قلم اُٹھاتا اور معلومات کے دریا بہاتا چلا جاتا ہے، جیسے اس کے نزدیک یہ کوئی مشکل نہیں اور واقعی ان لوگوں کو یہ کام کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ آپ کو حیرانی ہوتی ہے کہ آخر یہ انجینیر، یہ مفکر اور یہ ادیب کس طرح ان کاموں کو سرانجام دیتے ہیں۔ لیکن ان کو آپ کی اس حیرت پر حیرت ہوتی ہے اور اس کام میں لطف آتا ہے، تسکین حاصل ہوتی ہے، فخر محسوس ہوتا ہے۔ آخر یہ کیا ماجرا ہے، بھید کیا ہے؟ ماہرین نفسیات نے اسے حل کر دیا ہے۔ آیئے ان کے افکار پر غور کریں۔

آپ کا ہمارا دن رات کا تجربہ ہے کہ عام لوگ بڑے آدمیوں کی سرگرمیوں کو اور اُن کے کارناموں کو کس قدر اشتیاق سے دیکھتے ہیں۔ کسی مصنف نے کوئی کتاب لکھی۔ اب آپ اس پر اظہار خیال کریں گے۔ کیا کتاب ہے صاحب! کمال کیا ہے۔ خوب ہی تحقیق کی ہے۔ قلم توڑ دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اللہ کی دین ہے، اور اس قسم کی باتیں آئے دن کہی جاتی ہیں۔ کسی ادیب یا مصنف پر ہی منحصر نہیں۔ کوئی انجینیر ہو، کوئی مفکر ہو، کوئی مقرر ہو، کوئی لیڈر ہو، اس کے متعلق اسی طرزِ فکر اور اسی ذہنیت کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن آپ غور کریں تو اس کا راز "عادت" میں پوشیدہ ہے۔ ایک آدمی مشینوں، کل پرزوں اور اُن سے متعلق باتوں سے دلچسپی اور ان کو سمجھنے کی لگاتار کوشش اور بار بار عمل سے مشینوں کی ترتیب، ان کے پیچ و خم، پرزوں کے آپس کے تعلق اور اُن کے اعمال پر عبور نظری یا عملی یا دونوں لحاظ سے حاصل کر لیتا ہے۔ پھر اپنی معلومات، تجربے اور عقل و ذہن کی مدد سے مشینوں کی درستگی، نگرانی اور اصلاح و مرمت کرتا ہے۔ اس مہارت اور واقفیت سے اس کی دلچسپی اور بڑھ جاتی ہے۔ ترقی کی منازل قریب سے قریب تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔

ایک گاڑی ایک مرتبہ ایک میدان سے گزرتی ہے۔ زمین پر اپنے کچھ نقوش چھوڑ جاتی ہے۔ ایک دوسری گاڑی ان ہی نقوش پر سے گزرتی ہے۔ دوسری گاڑی پہلی گاڑی کے مقابلے میں کم دقت سے چلی جاتی ہے اس لیے کہ پہلی گاڑی کے نقوش دوسری گاڑی کے پہیوں کو سہولت فراہم کرتے ہیں اور ساتھ ہی دوسری گاڑی کی وجہ سے وہ نقوش زیادہ گہرے ہو جاتے ہیں۔ اور اسی طرح گاڑیوں کے چلنے سے آسان سے آسان تر اور گاڑیوں کے ارتسامات عمیق سے عمیق تر ہوتے جاتے ہیں۔ بالکل یہی صورت "عادات" کی ہے۔ ایک مرتبہ ایک کام انسان کے اپنے NERVES [اعصاب] پر اپنا اثر چھوڑتا ہے اور اس کام کی تکرار [Repetition] ان اثرات و نقوش کو انسان کی رگ و پے میں رچا بسا دیتی ہے۔ دوسری مرتبہ انسان اُس کام کو انجام دینے کی رغبت اپنے اندر پاتا ہے۔ ایک ہی عمل کے تکرار سے وہ عمل انسان کے لیے آسان ہی نہیں دلچسپ بھی ہو جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں تو دوسری یا تیسری مرتبہ میں ہی "عادت" کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ آپ روز صبح جلد اُٹھتے ہیں۔ ایک روز اگر دیر سے اُٹھے تو دوسرے روز دیر سے اُٹھنا آپ کے لیے زیادہ پسندیدہ ہوگا۔ اگر آپ ایک ارادی کوشش نہ کریں تو روز بروز آپ کی تاخیر سے اُٹھنے کی عادت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جائے گی۔ آپ عادت کی مدد سے مشکل سے مشکل کام کر سکتے ہیں، بڑی سے بڑی مشکل پر غالب آ سکتے ہیں، مصیبت کو ٹال سکتے ہیں، زندگی کو خوش گوار بنا سکتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ مزدور اور کسان اور ان کے بچے کڑاکے کی سردی اور چلچلاتی دھوپ میں بڑے اطمینان سے زندگی بسر کرتے ہیں

کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی ۔ عادت کا ہی کرشمہ ہے کہ ایک شخص سرکس میں عجیب وغریب کمالات دکھاتا ہے، بلندی سے کودتا ہے، لمبی لمبی چھلانگ لگاتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ آپ کے لیے عجوبہ چیزیں ہیں ورنہ آپ کیوں اپنا وقت اور پیسہ صرف کرکے سرکس دیکھنے جاتے ہیں۔ لیکن "عادت" کے ذریعے آپ اسی قسم کے اور اُن سے بھی زیادہ اونچے اور اہم کام انجام دے سکتے ہیں۔ مسٹر William James کے مطابق، اگر ایک فعل چند بار کیے جانے کے بعد پہلے سے سہل نہ ہو جاتا اور اگر ہر بار اس کو کرنے کے لیے شعور کو اسی درجے میں اس کی طرف مائل کرنا پڑتا تو ظاہر ہے زندگی بھر کے کل افعال ایک یا دو تک محدود ہو جاتے اور کسی قسم کی ترقی عمل میں نہ آتی۔ ایک شخص دن بھر کپڑے بدلنے اور اتارنے میں مصروف رہتا، اپنے جسم کی حالت کے مطالعے میں اس کی تمام قوت و توجہ صرف ہو جاتی ہاتھوں کا دھونا اور بٹنوں کا لگانا اس کے لیے ہر بار اسی قدر دشوار ہوتا جتنا کہ بچے کے لیے پہلے پہل ہوتا ہے۔ آپ روزانہ دیکھتے ہیں کہ جب ہم کوئی نیا کام سیکھتے ہیں تو طبیعت کس قدر گھبراتی ہے۔ کافی پریشانی اور وقت اٹھانا پڑتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ صرف یہ کہ اس کام کی آپ کو عادت نہیں ہوتی۔ لیکن جب آپ کو مشق ہو جاتی ہے اور عادت پڑ جاتی ہے تو پھر کوئی الجھن باقی نہیں رہتی۔ آپ کا دل اس کام میں لگنے لگتا ہے۔ اور معمولی توجہ اور تھوڑی سی محنت کر کے آپ کام نہایت خوش اسلوبی اور سلیقے سے انجام دے لیتے ہیں۔ کسی کام کی عادت پڑ جانے کے بعد اس کام میں انسان کو کسی خاص شعوری توجہ کی ضرورت نہیں رہتی۔

شاید آپ کو حیرت ہو اگر آپ یہ سنیں کہ عوام کو قانون اور تہذیب کے حدود کے اندر رکھنے والی قوت بہت حد تک عادت ہی ہے۔ لوگوں کی اکثریت قانون کی پابندی اس لیے کرتی ہے کہ یہ ان کی عادت ہو گئی ہے۔ اسی طرح بہت سارے اخلاقی قیود کی پابندیاں بھی انسان اس لیے کرتا ہے کہ وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ ایک پرانا پنشن یافتہ سپاہی اپنا کھانا لیے گھر کی جانب جا رہا تھا۔ ایک مسخرے نے اس کو دیکھا اور زور سے کہا Attention یہ سنتے ہی سپاہی دونوں ہاتھ نیچے چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور اس کا کھانا نالی میں گر گیا۔ اس واقعہ پر غور کیجیے تو پتہ چلے گا کہ سپاہی نے ایک طویل زمانے تک "پریڈ" کی تھی۔ اس کے اثرات سپاہی کے NERVOUS SYSTEM کے جزو بن گئے تھے اس لیے وہ بغیر کسی سوچ بچار کے حکم کی تعمیل کر بیٹھا۔

کہا جاتا ہے کہ کردار عادتوں کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ ایک عام اور معمولی لگنے والی بات ہے۔ لیکن حقیقت سے بہت قریب۔ انسان اپنی عادات ہی کی وجہ سے نیک و بد کہلاتا ہے۔ بُری عادتیں انسان کے کردار اور اس کی زندگی کو تلخ بنا دیتی ہیں اور اچھی عادتیں نہ صرف اس آدمی کو بلکہ اس کے گرد وپیش کو بھی خوشگوار اور دلکش بنا دیتی ہیں۔

پرانی بُری عادتوں کا چھوڑنا اور اچھی نئی عادتوں کو اختیار کرنا ایک کامیاب اور خوش حال زندگی گزارنے کے لیے نہ صرف مفید بلکہ لازمی ہے۔ بُری عادت بعض اوقات بہت اہم اور بنے بنائے کام بگاڑ دیتی ہے۔ مثلاً آپ کی بدکلامی ایک اچھے خاصے تجارتی معاہدے یا سیاسی مصالحت کو بگاڑ سکتی ہے۔ لیکن بری عادتوں کو چھوڑ کر اچھی عادتیں ڈالنے کے لیے بھی خاصے ڈھنگ اور تربیت کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلی چیز قوتِ عزم ہے۔ معمولی ارادے سے کوئی بھی کام شروع کیا جائے تو اس کا پورا ہونا مشکل ہے۔ متزلزل اور کمزور ارادہ انسان کی ایک خامی ہے پرانی عادتوں کو چھوڑنے کے لیے قوی ترین ارادے کی ضرورت ہے، ورنہ پرانی عادت کمزور ارادے کو ناکام کر دے گی۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ جب آپ نئی عادت ڈالنے کے لیے سوچ لیں تو جلد سے جلد عمل کرنے کی کوشش کریں۔ زیادہ ہوائی قلعے بنانے کی کوشش نہ کریں بلکہ عمل کی صاف سیدھی شاہراہ کی طرف دیکھیں۔ زیادہ سوچ بچار، ہیر پھیر کرنا بھی قوت عمل کو شل کر دیتا ہے ایک مرتبہ خوب غور وفکر کے بعد عمل شروع کر دیجیے۔ گھڑی گھڑی ارادہ بدلنا بھی مضر ہے۔

مختصر یہ کہ صحیح غور وفکر، مضبوط قوت ارادی اور تکرار Repetition ، بری عادات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور نئی اچھی عادات ڈالنے کے لیے ضروری شرطیں ہیں۔

سر فرانسس بیکن
ترجمہ: انور سدید

کتابیں پڑھنا

کتابیں پڑھنا اکتسابِ مسرت کا وسیلہ ہے۔ اس سے لیاقت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسے زیبائشِ ذات کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے گوشۂ خلوت میں کتاب کا مطالعہ داخلی سرخوشی کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ شامِ دوستاں یا مجلسِ مباحثہ میں کتابوں کا ذکر نمائشِ ذات کے لیے ہوتا ہے۔ فرائضِ منصبی کی ادائیگی اور عقلِ سلیم کو بروئے عمل لانے کے لیے مطالعۂ فرد کی علمی قابلیت کا آئینہ بن جاتا ہے۔ ماہرین بعض امورِ خاص کو اپنی عقلِ سلیم سے سلجھا کر بتدریج وجود میں لا سکتے ہیں۔ لیکن امورِ عامہ، معاملاتِ حیات اور تفکر و تدبر کے لیے اہلِ علم ہی موزوں ثابت ہوتے ہیں۔

مطالعے میں غیر معمولی طور پر زیادہ وقت صرف کرنا تساہل کے مترادف ہے۔ اسے نمائشِ ذات کے لیے استعمال کرنا تصنع ہے۔ عقلِ سلیم کو کلیتاً کتابی ضوابط کا تابع فرمان بنا دینا ایک عالم کا وطیرہ ہے۔ مطالعہ انسانی فطرت کی تکمیل کرتا ہے۔ لیکن مطالعے کی تکمیل تجربے کی معاونت کے بغیر ممکن نہیں۔ انسان کی صلاحیت اس نخلِ خودرو کی طرح ہے جس کی شاخ تراشی دقتِ نظر سے کی جاتی ہے اور مطالعہ چوں کہ فکر و خیال کی سب حدوں کو پاٹتا چلا جاتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اسے تجربے کے ساتھ وابستہ رکھا جائے۔

چالاک آدمی مطالعے کی تحقیر کرتا ہے۔ سادہ انسان کتب بینی کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اہلِ خرد مطالعے سے استفادہ کرتے ہیں لیکن واضح رہے کہ مطالعہ فی نفسہٖ استعمال کی چیز نہیں۔ بلکہ اس سے بالاتر وہ دانش ہے جو تجربے اور مشاہدے سے حاصل ہوتی ہے کتاب کو اس خیال سے نہ پڑھیے کہ اس کے مطالعے سے آپ کسی مسئلہ کی تردید یا ابطال کر سکیں گے۔ کسی چیز پر مہرِ تسلیم و رضا ثبت کرنے یا اپنے ایقان کو اثبات فراہم کرنے کے لیے بھی مطالعہ نہیں کرنا چاہیے۔ مطالعے کا مقصد معاملہ بندی یا چرب زبانی بھی نہیں ہے۔ بلکہ مطالعہ صرف اس لیے کیا جاتا ہے کہ آپ کا فکر بیدار ہو اور آپ تقابل وزن کر سکیں۔

کتابوں کی کئی قسمیں ہیں۔ کچھ کتابیں صرف چکھنے کے لیے ہوتی ہیں بعض کو یوں ہی نگل جانا ہی مناسب ہوتا ہے۔ معدودے چند کتابیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں آہستہ آہستہ چبانا اور پھر ہضم کرنا ضروری ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بعض کتابیں صرف جزوی طور پر پڑھی جاتی ہیں۔ کچھ کتابیں پڑھی تو جاتی ہیں لیکن ان کے مطالعے میں عمیق یا گہری نظر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف چند کتابیں ایسی ہوتی ہیں جن کا مطالعہ پوری توجہ سے کیا جاتا ہے۔ بعض کتابیں آپ کے ماتحت پڑھتے ہیں اور آپ کے مطالعے کے لیے ضروری حصوں کی تلخیص تیار کر دیتے ہیں۔ اس قسم کا حربہ ادنیٰ کتابوں اور غیر اہم مباحثوں میں آزمایا جا سکتا ہے۔ اعلیٰ درجے کی کتاب تو اس عطر کی طرح ہے جو تقطیر کشید کے صبر آزما عمل سے حاصل ہوتا ہے۔ اور جس کی خوشبو دامنِ چمن تک محدود نہیں رہتی۔ اس قسم کی کتاب خیال افروز بھی ہوتی ہے اور اس کی روشنی دور دور تک جاتی ہے۔

مطالعہ انسان کی تکمیل کرتا ہے، گفتگو چالاک بناتی ہے اور تحریر سے انسان کو قطعیت حاصل ہوتی ہے۔ تھوڑا سا لکھنے کے لیے ذہنی قوت کو تیزی سے بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ گفتگو میں ذہن کو مستعد رکھنا ضروری ہے، لیکن اگر کوئی شخص مطالعے کی عادت سے محروم ہے اور وہ آج تک کسی کتاب کے پاس نہیں پھٹکا تو وہ زندگی کے معاملات میں مکاری اور عیاری سے کام لینے پر مجبور ہوگا۔ اس قسم کے انسان کے سامنے ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ وہ دوسروں

پر یہ ظاہر کر سکے کہ اسے ہر علم پر عبور حاصل ہے اور اسے وہ سب کچھ معلوم ہے جو درحقیقت وہ خود بھی نہیں جانتا۔

تاریخ کا مطالعہ انسان کو باشعور بناتا ہے جب کہ شاعری اسے نکتہ سنج بناتی ہے۔ ریاضی باریک بینی پیدا کرتی ہے اور فلسفہ اسے تعمق اور گہرائی عطا کرتا ہے۔ علوم عمرانیات حلیم و برد بار بناتے ہیں۔ منطق نکتہ شناسی کا اور انشاء قناعت کا راستہ دکھاتی ہے۔ عقل کی قوت بظاہر خود رواں ہے اور اس کے سامنے کوئی مزاحمت نہیں ہے۔ تاہم جس طرح مختلف ورزشوں سے جسمانی آزار درست کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح مناسب اور موزوں مطالعے سے عقل کی تربیت ممکن ہے۔ مثال کے طور پر گیند اندازی پتھری کے لیے، نشانہ بازی چھاتی اور پھیپھڑے کے لیے، چہل قدمی پیٹ کے لیے اور گھوڑ سواری دماغ کے لیے مفید ہے۔ اسی طرح اگر کوئی آدمی ذہنی انتشار میں مبتلا ہے تو اسے ریاضی کے مسئلے حل کرنے پر مائل کیجیے اور اس کی عقل اگر پھر بھی مرکز گریز پر ہی رہے تو ریاضی کی یہ مشق جاری رکھیے۔ اگر کوئی شخص مختلف اشیاء میں امتیاز کی صلاحیت نہیں رکھتا تو اسے اساتذہ کا مطالعہ کرنے کی دعوت دیجیے۔ اگر وہ مسائل کو پوری طرح کھنگالنے کے قابل نہیں اور ایک مسئلہ کو حل کرنے کے بجائے دوسرے مسئلے میں الجھ جاتا ہے تو اسے وکلا کے مقدمات کا مطالعہ کرنے دیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ دماغ کے ہر نقص کے لیے ایک نہ ایک تیر بہدف نسخہ موجود ہے۔

میں نے دمشق میں ایک بدو کو ترکی پولیس کی قید میں دیکھا۔ وہ سوار خوش اور بے فکر تھا۔ میں نے پولیس سے پوچھا کہ یہ کون ہے اور اس کا کیا جرم ہے؟ اس نے کہا یہ ڈاکو ہے اور اس نے ریل کی پٹریاں اکھاڑی تھیں اور ڈاکے بھی بہت مار چکا ہے۔ اب اس کو قتل کیا جائے گا۔ اور مجھے بھی بہت تعجب ہوا کہ مرنے کو جاتا ہے اور خوش ہے۔ پولیس کی اجازت سے میں نے بدو سے پوچھا کہ تم خوش معلوم ہوتے ہو۔ شاید تم کو پھانسی پانے کی خبر نہیں۔ بدو نے ہنس کر جواب دیا۔

"مجھے معلوم ہے کہ کل دوپہر کو میں اس سامنے والی رستی کے پل پر موت کی رسی پر لٹکایا جاؤں گا گو میں نے اپنے باپ سے سنا ہے کہ خوشی کی ایک ساعت ہزار موتوں سے خریدی جائے تب بھی سستی ہے، پھر میں کیوں کسی ساعت کی خوشی کو ایک موت کے ہاتھوں فروخت کر دوں؟"

.......خواجہ حسن نظامی (آپ بیتی)

کو پالی ٹیکنک اور پروڈکشن سینٹر کھولنا چاہیے اور ان میں لڑکیوں کے لیے مخصوص حرفتوں کی تعلیم دی جائے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے ان میں خواتین اتالیق مقرر کی جائیں۔ تربیت کا نصاب ایسا ہو جس میں خواتین کا خاص رجحان ہو۔ جیسے لباس بنانا، معتمدی کی مشق، الیکٹرونک سامان کا بنانا اور ان کی مرمت، دفاتر میں پیشوائی و پذیرائی اور سیاحت میں رہبری کے فرائض وغیرہ۔

۲۵۔ ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ تیزی سے کم ہو رہا ہے۔ اس وجہ سے تعلیم کی طرف مسلمانوں کی بے رخی بڑھ گئی ہے اور اب صورتِ حال بیگانگی کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ مسلمانوں کے لیے جگہیں محفوظ نہ کی جائیں مگر اس کے بجائے ہندوستان میں اقلیتوں کے لیے امریکہ کی طرح "پالیسی آن افرمیٹیو ایکشن" اختیار کی جائے۔

۲۶۔ سیمینار میں یہ رائے عامہ تھی کہ مسلم اقلیت کے تعلیمی مسائل کو قومی ڈھانچے میں غور کیا جانا چاہیے۔ مسلمانوں کی شدید پسماندگی کو دور کرنے کے لیے مخصوص اقدام کا مقصد انھیں تعلیمی ترقی کے بیچ دھارے میں لانا ہے۔ سیمینار میں اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ ان کاوشوں میں خاص زور خود فرقہ کی طرف سے لگنا چاہیے۔ جہاں جہالت، بے حسی اور مایوسی نے قوتِ اختراع ختم کر دی ہو، وہاں سرکار کو ایک ایسے کیمیا کی طرح کام کرنا ہوگا جو خود متاثر ہوئے بغیر دوسرے کیمیائی اجزائے عمل میں تغیر لاتی ہے۔ حالت نہ صرف سے قابلِ غور ہے بلکہ مہیب شکل اختیار کر چکی ہے اور ایک بہت بڑ کوشش اب وقت کی پکار ہے۔ ایک ملک جس کا دستور یہ ضمانت کہ ہر شہری کو یکساں و برابر کے حقوق حاصل ہوں گے اور جس نے ارتقا انصاف کا عہد لیا ہو، وہ "شانتی" سے صف دیکھا کرے کہ آبادی کا آ حقوق اور ترقی کے فوائد سے محروم رہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو کے لیے مدد دینی چاہیے تاکہ قومی ترقی میں ان کا حصہ ان کی آبادی سے ہو سکے۔

۲۷۔ یہ تجاویز بجز چند ایک جو خصوصی طور پر مسلم معاشرہ سے پالیسی پیپر میں شامل معیار عمل پر مبنی ہیں۔ گذارش ہے کہ پارلی پالیسی پر بحث کے بعد ان تجاویز کی تفصیلات تیار کر کے تکمیل کے وقت دستاویز میں شامل کی جائیں۔

ہمیں امید ہے کہ ہمارے نوجوان ڈائنمک (فعال) وزیر منصف مزاجی اور کام کرانے کی صلاحیت پر ہمیں پورا بھروسہ گے کہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور ہو اور ملک کی ترقی میں کوئی نہ آئے اور اس کے روشن نام کو دھبہ نہ لگے۔

"آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر کہ سوراج ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے، بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے، تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤں گا، مگر اس سے دستبردار نہ ہوں گا، کیونکہ اگر سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی، تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا، لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا، تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد)

محمد صابر صبرحدی

زہیر بن ابی سلمیٰ اور اس کی شاعری

جب زندگی اپنے دھندلکوں میں فلاح و طمانیت کے ذرائع
ھونڈتی ہے تو ایک بار رمز مزاج اور داخلی محسوسات یا وجدانی
ریافت تک بغیر کسی خارجی عقیدہ، ایمان اور احکام الٰہی کے پہنچ
سکتی ہے۔ آنحضرت مبعوث نہیں ہوئے تھے کہ زہیر نے اپنے اشعار
کے ذریعہ اخلاقی کلیات کو پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔ غالباً عربی شاعری
ں زہیر ہی نے سب سے پہلے حسنات کو اپنے کلام میں سمونے کی
وشش کی تھی۔

زہیر بن ربیعہ بن قرط نام تھا۔ لوگ اسے مزینہ سے منسوب
رتے تھے۔ اور اس کا نسب غطفان سے جا کر ملتا ہے۔ مزینہ سے
سبت کی طرف رہنمائی صرف کعب بن زہیر کے ایک شعر سے ملتی ہے۔

م الاصل منّی حیث کنت واننی ہو من المزنیین المصفین بالکرم

ن کی شاعری میں وہ تمام محاسن ہیں جو دور جاہلیت کے شعرا
ی بنیادی خصوصیات ہیں۔ اس عہد کے نقادوں نے ان الفاظ
ں اسے سراہا ہے "کان لایعاظل بین القول ولایتبع حوشی الکلام
لایمدح الرجل الا بما ھو فیہ۔ قدامہ بن موسیٰ کی نظر اشعار پر بہت
ہری قسم کی تھی۔ وہ زہیر کو تمام شعرا پر فوقیت دیتے تھے۔ زہیر
ے یہ اشعار انھیں بہت پسند تھے۔

وجعل المبتغون فی ھرم ؛؛ والسائلون الی ابوابہ طرقًا
ن یلق یومًا علی علاتہ ھرمًا ؛؛ یلق السماحۃ فیہ والندی خلقا

بدالملک نے اپنے وقت کے شعرا سے پوچھا کہ کس شعر میں مدح کی
ام خوبیاں ہیں لوگ زہیر کے اس شعر پر متفق الرائے ہوئے۔

تراہ اذا ماجئتہ متھللاً ؛؛ کانک تعطیہ الذی انت سائلہ

تمام علمائے ادب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زہیر کا شمار جاہلی دور کے ان تین شعرا میں سے ہوتا ہے، جو کہ فکر و فن کے لحاظ سے کامل تھے۔ ان میں امرؤالقیس، نابغہ، اور زہیر کا نام آتا ہے تیسری صدی کے مشہور اور لغوی ادیب اشتان دانی کا قول ہے کہ زہیر کا شمار جاہلی دور کے ان تین ممتاز اور بڑے شعرا میں ہوتا ہے۔ جو اس دور میں ہراول دستہ کی حیثیت سے معروف تھے۔ زہیر کے اشعار پاکیزگی اور عفت کے ساتھ حکمت و امثال سے بھی مالا مال ہیں۔ نہ وہ کلام میں پیچیدگی پیدا کرتا ہے اور نہ ہی گفتگو کو طول دیتا ہے اور آدمی کی بقدر خوبی تعریف کرتا ہے۔

اہل قریش زہیر کے اشعار سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے ثعلب نے زہیر کے دیوان کی شرح میں لکھا ہے کہ قریش میں اہل علم میں سے کوئی بھی ایسا شخص نہ تھا جو زہیر پر کسی شاعر کو ترجیح دیتا۔ نبی کریمؐ سے روایت ہے کہ میں نے بلغا اور خطبا کے کلام اور زہیر کے کلام کو سنا ہے لیکن اس کے مثل کسی کو بھی نہیں پایا۔

علامہ موسیٰ نے لکھا ہے کہ زہیر کے اشعار سب سے زیادہ حسین وجمیل اور بہت زیادہ معانی اور مفہوم کے جامع اور منطق سے دور، مدح میں صداقت کو لیے ہوئے اور حکمت و امثال سے پر ہیں۔ ابن عباس نے روایت کی ہے کہ ان سے حضرت عمرؓ نے کہا کہ تم مجھے سب سے بڑے شاعر کا کلام سناؤ تو میں نے کہا وہ کون امیر المومنین؟ تو انھوں نے فرمایا کہ زہیر وہ کلام میں پیچیدگی نہیں پیدا کرتا۔ حطیہ کا کہنا ہے

ہیں نے اس کے مثل کسی شاعر کو نہیں پایا جو قوافی اور اشعار
پر اختلاف کے باوجود اس سے زیادہ قدرت رکھتا ہو۔

زہیر کا قصیدہ جو سبع معلقہ میں داخل ہے اس کا پس منظر یہ
ہے کہ عبس اور ذبیان کے قبیلے داحس غبراء کی جنگ میں لڑ کر مر
رہے تھے۔ اور ایک بھائی دوسرے بھائی کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا
اس جنگ کو میل و محبت صلح و صفائی سے بدلنے میں قبیلہ ذبیان
کے دو سردار ہرم بن سنان اور حارث بن عوف نے بڑی جدوجہد
در قربانی سے کام لیا اور اس میں وہ کامیاب ہوئے۔ زہیر نے اس
قصیدہ میں ان ہی دو بڑی شخصیات کی تعریف ہے۔ جس سے خوش
ہو کر ہرم نے زہیر کو قیمتی اور یادگار خلعت پہنائی تھی۔ حضرت عمر نے
ایک مرتبہ زہیر کے لڑکے سے کہا وہ خلعت کہاں ہے۔ تو
اس نے جواب دیا وہ بوسیدہ ہو گئی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا
لیکن زہیر نے جو خلعت اس قبیلہ کو پہنائی ہے وہ ہمیشہ دوامی حیثیت
کی ہے۔ زہیر حطیہ کا استاذ تھا کسی نے حطیہ سے زہیر کے بارے
میں پوچھا تو اس نے کہا کہ میں نے زہیر جیسا قادر الکلام شاعر نہیں
دیکھا وہ قوافی کے الٹ پھیر سے مدح میں ذم اور ذم میں مدح کے
پہلو ڈھونڈ لیتے تھے۔ ابو عمر بن العلاء فرزدق کو زہیر کے مشابہ
قرار دیتے تھے۔ اصمعی کا کہنا ہے کہ زہیر اور حطیہ اس اعتبار سے
مماثل ہیں کہ انھوں نے اشعار کے نوک پلک سنوارنے اسے تہذیب
سے آشنا کرنے اور بدویت سے نکال کر شہریت کے آداب سکھانے
کی طرف توجہ کی۔ زہیر کے بارے میں بھی یہ مشہور ہے کہ اس نے
کوئی قصیدہ نظر ثانی کے بغیر عوام کے سامنے پیش نہیں کیا۔ بلکہ
بعض قصائد کے بارے میں تو یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اسے کہنے
میں پورا سال اس نے صرف کیا اور اتنی مدت ہی نظر ثانی میں
صرف کر دی۔ یہ اس کے احتیاط کی بین مثال ہے۔

زہیر کے چند اشعار جو اسلامی فکر سے مطابقت رکھتے ہیں
ترتیب کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں جس سے اس کی اسلامی فکر
کے ساتھ ساتھ شعری صلاحیت کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ومهما عند امرئٍ من خليقة   وان خالها تخفى على الناس تعلم

اگر کسی شخص کے اندر بری عادت ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ لوگوں
کو اس کا علم نہیں ہے تو یہ غلط ہے کیونکہ ایسی عادتیں لاکھ چھپائی
جائیں ایک نہ ایک دن کھل کر رہتی ہیں۔

وكائن ترى من صامت لك معجب   زيادته او نقصه في التكلم

اکثر لوگ جب تک چپ رہتے ہیں بڑے بھلے مانس دکھائی دیتے ہیں لیکن
ان کی حقیقت کا علم اس وقت ہوتا ہے جب وہ بولتے ہیں جس
کو فارسی میں یوں کہا گیا ہے۔ تا مرد سخن نہ گفتہ باشد۔ عیب و
ہنرش نہفتہ باشد

لسان الفتى نصف ونصف فؤاده   فلم يبق الا صورة اللحم والدم

آدمی عبارت ہے دل و زبان سے یعنی جس کا دل اچھا ہو اور زبان
پاک گوہر ہو درحقیقت وہ انسان ہے اگر یہ نہیں تو وہ گوشت پوست
کا لوتھڑا ہے

على مكثريهم رزق من يعتريهم   وعند المقلين السماحة والبذل

جو لوگ مالدار ہوتے ہیں ان کے ذمہ ناداروں کا رزق ہوتا ہے اور
جو لوگ کم استطاعت والے ہوتے ہیں ان کے ساتھ فیاضی اور
سخاوت کا برتاؤ کرتے ہیں۔

ومن يجعل المعروف من دون عرضه   يفره ومن لا يتق الشتم يشتم

جو شخص بھلائی کو اپنی عزت کے لئے ڈھال لیتا ہے وہ اسے بڑھا
لیتا ہے اور جو شخص گالی سے نہیں بچتا اسے گالی دی جاتی ہے

ومن يك ذا فضل فيبخل بفضله   على قومه يستغن عنه ويذمم

جس کے پاس ضرورت سے زیادہ مال ہوتا ہے۔ پھر وہ اپنی قوم سے
بخل کرتا ہے تو اس سے بے نیازی برتی جاتی ہے اور اس کی مذمت
کی جاتی ہے۔

ومن هاب اسباب المنايا ينلنه   وان يرق اسباب السماء بسلم

جو شخص موتوں کے راستے سے ڈرتا ہے تو موتیں اسے ضرور پا لیتی ہیں
چاہے وہ سیڑھی لگا کر آسمان کی بلندیوں پر کیوں نہ چڑھ جائے

فلا تكتمن الله ما في نفوسكم   ليخفى ومهما يكتم الله يعلم

جو کچھ تمہارے نفوس میں ہے اس کو تم اللہ سے پوشیدہ نہیں
رکھ سکتے بلکہ اللہ کو ہر چیز کا علم ہو کر رہے گا۔

یوخو فیوضع فی کتاب فیہ خو ،،/، لیوم حساب او یعمل نامہ اعمال کی سزا میں تاخیر برتی جائے گی اور اس کو تحریری شکل میں محفوظ رکھا جائے گا یوم حساب کے لیے یا اسی دنیا میں سزا مل جائے گی۔

زہیر کے اشعار میں زندگی کے گہرے مشاہدے کے ساتھ بھرپور تجربہ بھی ہے۔ اس تجربہ نے تخیل میں لالہ کاری اور تازہ کاری کا اعجاز دکھایا ہے اور یہ تخیل خصوصی تجربہ کو ایک آفاقی صداقت دیتا ہے۔ اس کی آواز اس کے اپنے دل گداختہ سے پگھل کر نکلتی ہے اور حیات و ممات کے کتنے ہی امکانات کو آئینہ دکھاتی ہے۔ اس کے یہاں شدید جذبات نہیں، اخلاقی پیام یا امید کی کرن کا محض دھندلا سا عکس اس کی شاعری پر ہے جو بہرحال اس کے کلام کی غبار خورشید نہیں ہے۔ اس کے یہاں محض وہ الفاظ کی خوبصورتی نہیں ہے جو خیال کے ہمراہ ہوتی ہے اور اسے خوش گوار بناتی ہے۔ زہیر کلام کا سارا حسن اس کی بصیرت اور اس کی بصیرت کی گہرائی اس کے حسیات کے دائروں میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہیں گے۔ زندگی کی ترجمانی کا جتنا بڑا شعور زہیر کو تھا کسی قسم کتنی گہری، کتنی حکیمانہ، کتنی سچی اور کتنی دور رس بصیرت دی۔ اس کے اندازہ کے لیے ہمیں اس کے کلام کا غائر مطالعہ کرنا پڑے۔ اس کے کلام کے اخلاقی پہلو کے بارے میں صرف یہ کہنا ہے کہ ا کا فن روایتی اخلاق کا قائم مقام نہ تھا۔ بلکہ اس کا کلام اپنی کی وجہ سے ایک صحیفہ اخلاق بن گیا۔ فن جب آفاقی ہو جاتا ہے تو آدم اور رسترہات کون و مکان کا ضمیر بن جاتا ہے۔ یہی زہیر کی فن کی انفرادیت ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ سچ بولنے کے لیے سننے والے بھی ضروری ہیں۔ کیوں کہ خوشامد، جس کی دکان میں آج موتی برس رہے ہیں، اس سے زیادہ جھوٹ اور کیا ہوگا۔ اور کون ایسا ہے جو اس کی قید کا زنجیری نہیں۔ ڈرپوک بیچارہ ڈر کا مارا خوشامد کرتا ہے، تابعدار، امید کا بھوکا، آقا کو خوش کرکے بیٹھے بھرتا ہے۔ دوست محبت کا بندہ ہے۔ اپنے دوست کے دل میں گھر کرتا ہے۔ بہت سے ایسے بھی ہیں کہ نہ غلام ہیں نہ ڈرپوک، انہیں باتوں ہی میں خوش کر دینے کا شوق ہے۔ اسی طرح جب جلسوں میں نمود بے گدھوں کے دعوے بلڈاگ کی آواز سے کئی میل آگے نکل جاتے ہیں تو ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جنھوں نے کچھ امید، کچھ ڈر، کچھ مروت سے غرض چار و ناچار کبھی ان کے ساتھ کبھی پیچھے دوڑنا پڑتا ہے۔"

[محمد حسین آزاد]

مظفر بلخی۔

علم طب اور مسئلۂ صحت

مرض عالم انسانیت کا کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اپنی نوعیت میں کچھ تفریق و یکسانیت کے ساتھ یہ کل بھی تھا اور آج بھی اپنے وسیع تر دائرے میں تمام خطۂ آبادی گرفتارِ مرض ہے۔ اس پر قابو پانے کی علاجی کوششیں بھی ہر جگہ ہو رہی ہیں۔ آج ساری دنیا میں مرض و علاج ایک جنگ کی شکل میں ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ مرض میں کمی نہیں ہوتی اور علاج میں خاطر خواہ پیش رفت بھی نہیں ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ مستقل ہیں۔ مرض زیر قابو آئے بھی تو کچھ ہی عرصے میں نئی علامتوں کے ساتھ پھر موجود ہو۔ اس صورتِ حال میں علم طب کے متعلق ایک عمومی ذہن شاید یہی بنتا ہے کہ اس علم کے ذریعے ایک بیمار حال شخص اپنے مرض سے نجات پائے۔ وہ کسی حالت میں صحت یاب ہو کر اپنے معمولاتِ زندگی کو انجام دینے لگے اور جب بھی بیمار پڑے معالج سے رجوع کرے۔ معالج دوا دے اور مریض اچھا ہو۔ مریض اور معالج کے درمیان یہ رشتے اتنے پائیدار اور ناقابل تقسیم بنتے جا رہے ہیں کہ عام آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ بیماری بھی لازمِ زندگی ہے جس کے پیچھے قدرتی طاقت کارفرما ہے۔ بیمار نہ ہونا انسانی اختیار میں نہیں۔ مرض و علاج کی کشمکش اتنی پیچیدہ اور ہمہ گیر بنتی جا رہی ہے کہ طبی درس گاہیں اور علاج و تحقیق کے تمام طبی مراکز بھی نہیں بچ سکے۔ ان اداروں میں تعلیم و تحقیق کا غالب حصہ مرض ہی کی تحقیق اور علاج کے حدود میں محصور ہوتا جا رہا ہے۔ یہ صورت حال بہت ہی غیر اطمینان بخش اور اس امر کی پیش بین ہے کہ مستقبل قریب میں انسان بھی عام مشینوں کے جیسی ایک مشین قرار دیا جائے۔ انسان کے دل، جگر، دماغ، گردے اور پھیپھڑے کسی انسان ساختہ مشین کے ہی پرزوں کے مانند ہو کر رہ جائیں۔ واقعہ تو اب بھی یہ ہے کہ انسانی جسم کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے وہ کسی فیکٹری ساز مشین ہی کی طرح ہے۔

آج علاج کی جو حیثیت ہے کل قدیم طب میں ثانوی تھی اور حفظ ماتقدم کی اوّل۔ مرض سے بچنے کی تدابیر، حفظان صحت کے اصول کتابوں میں ایک مقام کے حامل تھے۔ طبی درس گاہوں میں اس پر انتہائی زور تھا۔ مریض اور طبیب کے درمیان بھی یہ رشتہ اسی بنیاد پر قایم رہتا کہ مریض زیادہ سے زیادہ حفظان صحت کے اصولوں پر کاربند ہو، معالج مرض میں پہلے تدبیری علاج کرے۔ ناکامی کی صورت میں غذا بتلائے۔ اس کے بعد غذائے دوائی سے، چوتھے مرحلے میں دوائے غذائی اور آخری پانچویں صورت مجبوراً دوا کی ہوتی تھی۔ پھر یہ دوائیں جو نباتی یا دوسری قدرتی شکلوں میں آج کی طرح ضدِ حیوی Antibiotic یا سلفا گروپ جیسی نہیں ہوتی تھیں۔ یہ احتیاط لازم تھی کہ کوئی عطائی یا غیر مستند ناتجربہ کار طبیب نہ دے بلکہ سقراط کے لفظوں میں وہ طبیب ان کے پیش نظر اپنے مریضوں کے لیے خاص ہو جو علم تشریح انسانی ANATOMY اور علم الادویہ میں کامل دسترس نہ رکھتا ہو۔ علاج کی گراں باری سے بچانے کے لیے ہر سطح پر صحتی مراکز قایم کیے جاتے۔ یونان، شام اور اسپین جو کسی زمانے میں طب کے مرکز تھے، وہاں باغات، بازی گاہیں اور تفریح گاہیں بہت تھیں۔ اسی طرح حمام جسے طبی لحاظ کا ایک غسل خانہ سمجھنا چاہیے، ہر جگہ کثرت تھی۔ ملک بھر میں اس کی ہیئتِ مخصوص اور تعمیر، خاص صحتی نقطۂ نظر سے طبیبوں کے ہاتھ انجام پاتی۔

طبابت اپنی ذات اور اپنی تاریخ میں نہایت شریف اور باوقار پیشہ رہا۔ یہ پیشہ ان پیشوں سے قطعاً مختلف تھا، جن کا مقصد محض حصول معاش ہے۔ اس کی حیثیت پیشے سے زیادہ خدمت کی تھی۔ اس لیے اس کا تعلق براہ راست ذات انسانی اور اس کے تکلیف و آرام سے۔ انسانی جان تمام مخلوقات میں منفرد، اشرف اور قیمتی ہے۔ ساخت ا

اپنے افعال میں بھی اس قدر پیچیدہ جیسے خود اپنے اندر ایک کائنات ہو۔ اسی لیے اطبائے سابقین کا رویہ علاج کے معاملے میں بہت محتاط رہا۔ ایک طبیب کے لیے یہ بات بھی ضروری تھی کہ وہ مریض کے جسمانی علاج میں ذہنی، نفسیاتی اور روحانی تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھے۔ ان میں معالج کا صفر ہو جانا دیانتِ علاج کے خلاف سمجھا جاتا۔ ان اطباء کے پیشِ نظر طبیعت، مزاج اور نفسیات کو علاج میں خاص جگہ حاصل تھی۔ آج بھی یونانی طبی اصطلاح میں اگر انسان کی "طبیعت مدبرِ بدن" صحیح ہے تو پھر بیماریوں کے خلاف قوتِ حیات vitality مضبوط ہے۔ اور جسم ہر طرح کے تعدی اور وبائی حملوں کے مقابلے میں تیار ہے۔ پیشِ رو اطباء کے نزدیک علاج دوائی سے زیادہ اسی پہلو پر زور رہا۔ یہی وجہ ہے کہ بیماریوں کے قدم نہیں جمتے اور نہ اس کا دائرہ اثر پھیلتا۔ ملک روم کا ایک نامور عیسائی طبیب جب مدینۃ العرب پہنچا اور ایک دار العلاج قائم کیا تو مریضوں کا مرجوعہ کیا ہوتا اسے ایک بھی مریض علاج کے لیے نہ مل سکا۔ دربار رسالت میں شکایت کی کہ مسلمان تنگ نظر ہیں، تعصب کی وجہ سے علاج کو نہیں آتے اس لیے اب واپس جانا چاہتا ہوں۔ جناب رسول ؐ نے عیسائی طبیب کو جواب دیا کہ ہم حفظانِ صحت کے ان اصولوں کی پیروی کرتے ہیں، جن سے ہمارا معاشرہ بیماروں سے محفوظ ہے۔ ہم ذہنی اور روحانی لحاظ سے پُر سکون ہیں اور ہماری غذائیں قلیل ہیں۔

انسانی علاج وسیع مفہوم کا متقضی ہے جہاں حقیقی صحت کے لیے جسم کے ساتھ طبیعت کے بھی وہ تمام تقاضے پورے ہوں، جن سے مریض خود کو ہر طرح صحت مند محسوس کرے۔ کاموں کی انجام دہی میں وہ پوری طرح چاق و چوبند اور مستعد ہو۔ مریض بھی ان ہی امیدوں کے ساتھ اپنے آپ کو معالج کے حوالے کرتا ہے۔ کسی دوا سے ایک مرض تو اچھا ہو مگر اس کے ثانوی اور پہلوی اثرات بھی مریض کو تکلیف پہنچاتے رہیں اور یہی اثرات بڑھتے بڑھتے ہلاکت کی منزل تک پہنچ جائیں۔ اسی طرح جب ثانوی اثرات کو ختم کیا جائے تو دوسری پیچیدگیاں ظاہر ہوں۔ جس سے عمر بھر بھی مریض اپنی جان نہ چھڑا سکے۔ ہمیں اس پر نظرِ ثانی کرنی ہوگی اور ان دواؤں کی تلاش میں دماغ سوزی اور گراں باری اٹھانی ہوگی جو طبیعت کے ہر طرح موافق ہوں۔ انسانی مزاج ان دواؤں سے ہم آہنگ ہو۔ غریبوں کی قیمتی محنت کے چند پیسے جن سے ان کی بنیادی ضرورتیں پوری ہونی چاہئیں وہ نہ رہیں، محنت دوسرے اہم مقاصد پر صرف ہونے کے بجائے دواؤں پر صرف ہو جائے اور دوائیں بھی خاطر خواہ فائدہ بخش نہ ہوں، یقیناً انسانی ہمدردی کے خلاف ہے۔ آج انفرادی و اجتماعی دونوں سطح پر ہمارا اثاثہ درحقیقت ایک ناقابلِ تلافی نقصان کی نذر ہوتا ہے۔ قومی وقار کے بھی یہ خلاف ہے کہ اس کی سالانہ اسکیموں میں طبی اداروں، درس گاہوں اور صحت افزا مقاموں سے زیادہ تعداد اسپتالوں، ڈسپنسریوں اور دوائی فرموں کی ہو۔ اور یہ تعداد بھی کم ہونے کے بجائے تشویش ناک حد تک بڑھ رہی ہو۔

انگریزی سلطنت کے اسبابِ غلامی میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہماری ثقافت، تہذیب، زبان کے ساتھ ساتھ ہمارے فطری طریقۂ علاج پر بھی چھاپے پڑے۔ خوش نما رنگوں، شکلوں اور اشتہاروں کے سہارے چلنے والی دواؤں سے ہم فریب زدہ ہو گئے۔ آج بھی ترقی یافتہ ملکوں کے بازاروں میں جن دواؤں پر پابندی ہے وہ غریب ترقی پذیر ملکوں میں درآمد کی جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک عالمی بیزاری علاج کے ساتھ آج ساری دنیا میں متبادل طریقۂ علاج Alternative medicine نے کروٹ لی ہے۔ اپنی تہذیب اور آب و ہوا کے لحاظ سے جنوبی کوریا میں وہاں کا علاج بہت فروغ پا چکا ہے۔ چین کا اکیوپنکچر آج ساری دنیا میں متعارف ہے۔ ہندوستان میں یونانی اور آیورویدک طریقِ علاج مایوسی کے دور سے نکل کر فروغ و بقا کی مستحق قرار دی گئیں۔ عوامی اور حکومتی سطح پر بہت کم عرصے میں اب یہ دونوں طریقۂ علاج مقبول اور ممتاز ہیں۔ اس توجہ سے ہندوستان میں ہم آج کئی پیچیدہ اور مزمن مرض کے مقابلے میں کامیاب ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی اب ہر جگہ علاقائی علاج قبولیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ برطانوی ڈاکٹر رتھ ویسٹ اور ڈاکٹر بریان انگلیس کے مطابق برطانیہ میں متعدد ایسے ڈاکٹر جو طب جدید کے مطابق علاج کیا کرتے تھے، انھوں نے زہریلے ڈرگس کی طرف طب جدید کے بڑھتے ہوئے رجحان کو دیکھ کر برسوں کی پریکٹس ترک کر دی۔ ان میں کے اکثر ڈاکٹروں نے ہومیوپیتھک طریقۂ علاج کو بے ضرر دیکھ کر قبول کر لیا اور کچھ نے دستی

علاج Chiropractice کوذریعہ طبابت بنالیا۔ اس کے بعد مریضوں کی زیادتی سے بعض نے سرکاری ملازمت بھی ترک کردی۔ بین الاقوامی نمائندگی اور عالمی ادارۂ صحت WHO کے ممتاز ڈاکٹروں کی مشارکت میں ۹ تا ۱۳ نومبر ۱۹۸۶ء متبادل طب یونانی کی یہ بین الاقوامی تیسری کانفرنس کویت اور ترکی کے بعد پاکستان میں منعقد ہورہی ہے متبادل طبوں کے لیے مزید خوش آئند ہوگی۔

● دنیا جس ماحول میں اور جن کے پس منظر میں ان طریقۂ علاج کو دیکھنا چاہتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنے طریقۂ علاج کو اپنی طبیعت کے سازگار پائیں۔ یہ طبیں ہمارے جزوی اور علاماتی (Symptomatic) علاج کے بجائے تشخیصی (Diagnostic) علاج کا سامان بن سکیں۔ علاج کے نتیجے میں ناقابل علاج تکلیفیں بھی ساتھ ساتھ نہ آئیں۔

● معاشرتی زندگی میں جسمانی بیماریوں کا بڑا سبب طبیعت کی ناخوش گواری اور ذہنی بے سکونی ہے۔ وہ طبیں جو ہمارے ان تقاضوں کو بھی اہمیت دیں ہم ان کے خواہش مند ہیں۔ ہماری رہنمائی ایسے قوانین کی طرف ہو جہاں ہم خواب آور گولیوں اور اس قسم کے دوسرے مسکنات کے مضر اثرات سے بچ کر طبعی نیند اور بیداری کا بھی مزہ لے سکیں۔

● آج ہمارے علاج میں غذا نے دوا کی اور دوا نے غذا کی جگہ لے لی ہے، جیسے زندگی دوا ہی کے سہارے ہوگئی ہو۔ دوائیں کھانے کی خواہش کو مٹا کر غذا کی طرح استعمال ہورہی ہیں۔ افراط دوائی کے علاوہ نوع بہ نوع دوائیں لے اور ٹانیے کے وقفے سے دینا ہماری نفسیات کے خلاف ہے۔ ہم دواؤں سے فرار اختیار کرنا اور غذاؤں کے قریب جانا چاہتے ہیں۔

● تجارتی بنیاد پر فروخت ہونے والی دوائیں جن کے لٹریچروں میں مضر اثرات کی لمبی فہرست ملتی ہے۔ وہ مریض کے لیے اپنے مضر اثرات کے ساتھ نفسیاتی خلجان کا بھی موجب ہے۔ نیز اس سے پہلوی اثرات دوچند اور سہ چند ہوسکتے ہیں۔ اگر ہم اپنی ناکردہ بداحتیاطیوں کے نتیجے میں کبھی گرفتار مرض ہوں تو دواؤں سے یہ بھی ضمانت چاہتے ہیں کہ ان کے پہلوی یا ثانوی انتہائی مضر اثرات نہ ہوں گے اگر چند دوائیں بھی ہمارے علم میں ایسی ہیں جن کے مضر اثرات نہیں ہیں،

یا بہت خفیف ہیں تو یہ ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہیں۔ ہمیں ق سے ایسی دوائیں دستیاب ہوسکتی ہیں جو طبیعت انسانی کا خیال رکھ سکیں اور دفع مرض کے لیے مکمل کارگر ہوں۔ اس تحقیق کے لیے اس طرف قدم بڑھیں اور تعاون واشتراک ہموار ہوں۔

● دوائیں مشکل ترین مرحلوں سے نہ گزر کر مرحلوں تک ہمارے پاس آنی چاہیں یہ مناسب نہیں ہے کہ ملکی اور غیر ملکی دواساز کمپنیوں کا مرہون منت ہو۔ دوا اجزاء ترکیبی کے نقص و فریب کے علاوہ ایسے بھی مسائل ہیں ج کا حصول مشکل ہوجایا کرتا ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں دو جب عملاً دشوار بن گئی ہے تو قصبات اور دور دراز دیہی علاقو طرح ممکن ہے۔ مرض کی دوا نایاب ہو اور انتظار دوا میں دے۔ اس لیے ایسے طریقۂ علاج کو فروغ دیا جانا چاہیے اطباء کسی باہری بھروسے کے بغیر گردوپیش ہی سے مریض سامان کریں۔ اس سلسلہ میں مقامی جڑی بوٹیوں کی شکل میں نباتی ادویہ بھی ہماری مدد کرسکتی ہیں نیز ان کی کاشت بھ علاج میں اگر ہماری مطلوبہ ضرورتیں فوراً تکمیل یاب نہ ہوں تو جان ضائع ہوسکتی ہے۔

ان ہی قیاسات پر بہت سے اہم مسائل ہیں جن پر کسی بھی ایسی طب کلیت کو جلد از جلد جگہ دینا چاہتے ہیں جو کو پورا کرکے مضطرب انسانیت کو سکون دے سکے۔ جن طب بھی جسم انسانی کے اندر اپنے مطلوبہ تقاضوں کے ساتھ موج وہ تقاضے پورے ہوں جن سے روح کو آرام مل سکے۔ ان تا طب کا اپنا مقام ہو نہ کہ اس کا انحصار معاشرتی زندگی پر ہ اپنے ایک حصے میں صحیح طبی رہنما اصولوں کی طالب ہے۔ از معاشرت فلاح پاتی ہے۔ طب ہر اچھے برے معاشرت کی اپنی تاریخ، روایات، انفرادیت اور وجود تک کو بیچے جسمانی اور روحانی فلاح اور نمود ہی دراصل طب کا معاشرتی تغیرات کے نتیجے میں اس کا فقدان نہ ہو۔ اگر کوئی طب

مطلوبہ تقاضوں کو پورا کرنے کی ضمانت دے تو اسے صحت انسانی کے تحفظ اور بہتری پر نافذ ہونا چاہیے یا انقلاب زمانہ سے کچھ اس کی ہیئت میں فرق واقع ہوا ہوا اور بعض تقاضے پورے نہ ہو سکیں تو بلا تفریق قدیم و جدید چند طبیں مل کر ایسی طب متشکل ہوں جس سے طب و معاشرت کی ساری انسانیت کو آرام مل سکے۔ انسان امراض سے نجات پا کر جسمانی و روحانی صحت مندی کے ساتھ ترقی و فلاح کی طرف قدم بڑھائے۔

علم و فن ذاتی یا قومی میراث نہیں ہوتا۔ پھر وہ علم جس کا تعلق انسانی تکلیف و آرام سے ہے اسے تو بہر حال فلاح و ترقی پر صرف کیا جانا انسانی فرض ہے۔ یہ جامد اور مردہ نہ ہو بلکہ علمی تبادلوں اور فنی معاونت سے فروغ پائے۔ اسی سے علم و فن کی زندگی ہے اور انسانی خدمت بھی۔ اگر جدید تحقیقات کو قدیم علم طب کے لیے زہر ہلاہل سمجھا جائے اور جدید علم طب کے حاملین قدیم طب کے نظریوں کو اس کی افادیت کے باوجود محض روایتی کشاکش اور قدامت کے نتیجے میں قبول نہ کریں تو یہ بات علمی لحاظ سے افسوس ناک ہوگی۔ آج قدیم طب اپنے ایک حصے میں جدید طب اور دوسرے سائنسی علوم کی محتاج ہے۔ ان کمیوں کو دور کر کے اس کے بہترین حصوں کو جو ایک گراں قدر سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں، ضائع ہونے سے بچانا وقت کی اہم خدمت ہے۔ اطبائے سلف نے مریضوں پر برسوں تجربوں کے بعد بڑی محنتوں سے اصول طب وضع کیے۔ دواؤں کے حصول اور اس کے افعال و خواص پر تحقیق و تجربوں میں عمریں کھپائیں۔ ابھی یہ تاریخ سے ضائع نہیں ہوئے ہیں۔ صرف یونانی مفردات ادویہ کے بیان میں موفق ہروی، ابن سینا، ابن بیطار اور نجم الغنی جیسے مصنفین کی کتابیں سیکڑوں اور ہزاروں دواؤں کی ماہیت، مزاج، اس کی درجہ بندیوں، افعال و خواص، مضر و مصلح، ترکیب استعمال اور مقدار خوراک کے ذکر سے بھری ہیں۔ یہ ذخیرۂ مفردات ہزاروں سال جنگلوں، بیابانوں اور کوہساروں کی خاک پیمائی کے بعد حاصل ہو سکی ہیں۔ ان میں کے ایک ایک شخص نے تنہا موجودہ دور کی ایک یونیورسٹی اور اکیڈمی کے برابر خدمات انجام دیں۔ یہ کارنامے مکمل ذہنی و جسمانی صحت مندی کے ترجمان ہیں۔ بیمار معاشرت ترقیوں کی زیادہ منزلیں طے نہیں کر سکتی۔ اگر معاشرہ ذہنی اور جسمانی اعتبار سے صحت مند ہوگا تو اس کی ترقیوں کی حدیں بھی وسیع سے وسیع تر ہوں گی۔ ذہنی اور جسمانی طاقتوں میں اضافہ ہوگا وہ صلاحیتیں اور سرمائے بھی محفوظ ہوتے جائیں گے جو آج بیماریوں کی نذر ہو رہے ہیں۔

"انسان روح اور جسم کا مرکب ہے
جب روح جسمانی تقاضوں پر غالب
ہو تو وہ انسانیت ہے اور جب
جسمانی تقاضے روح پر غالب ہوں
تو وہ غلامی ہے۔"

[ارسطو]

"سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں
کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کر دینی
چاہئیں، یقیناً درست اور صحیح تھا۔ میرا خیال
ہے کہ بغیر اس تعلیم کے مسلمان طرز جدید کی قومیت
کی تعمیر میں کوئی قابل قدر حصہ نہ لے سکتے تھے
بلکہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے
ہندوؤں کے غلام بن جائیں جو تعلیم میں
اُن سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی
زیادہ مضبوط۔"

جواہر لال نہرو

جارج گیمو
ترجمہ:
انیس عالم

تعطیل میں سیر

بچا چھکن اضافیاتی شہر میں اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات سے محظوظ ہوئے تھے لیکن اس بات کا افسوس رہا کہ پروفیسر وہاں موجود نہ تھا کیونکہ وہ عجیب و غریب واقعات کی توجیہ سے واقف نہ ہوسکے تھے۔ وہ حیران تھے کہ کس طرح ریلوے کا ایک بریک مین مسافروں کو جلد بوڑھا نہ ہونے دینے پر قادر تھا! یہ بات انھیں سب سے زیادہ پریشان کر رہی تھی۔ کئی رات وہ بستر پر یہ توقع کرتے ہوئے لیٹے کہ شاید وہ شہر خواب میں پھر نظر آئے لیکن اب ان کی بہت کم خواب دکھائی دیتے اور جو دکھائی دیتے وہ زیادہ تر ناخوشگوار ہوتے۔ آخری خواب میں انھیں بینک کا منیجر نظر آیا جو انھیں بینک کے حسابات میں غیر یقینیت داخل کرنے پر ملازمت سے برخاست کر رہا تھا ـــــ ان تمام حالات سے پریشان ہوکر انھوں نے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر کسی ساحلی مقام پر تفریح کرنے کی سوچی

چنانچہ انھوں نے اپنے آپ کو ریل کے ایک ڈبّے کی کھڑکی سے باہر جھانکتا ہوا پایا۔ گاڑی اسٹیشن سے روانہ ہوچکی تھی۔ شہر کی عمارتوں کی جگہ دیہات کے پرفضا کھیتوں نے لے لی تھی۔ انھوں نے اخبار اٹھا کر پڑھنا شروع کیا اس میں کچھ لطف نہ آیا۔ ریل گاڑی اُن کو آہستہ آہستہ ہلکورے دے رہی تھی۔

جب انھوں نے اخبار نیچے کرکے دوبارہ کھڑکی سے باہر جھانکا تو منظر بالکل بدل چکا تھا۔ تار کے کھمبے اب اس طرح ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے جیسے وہ کسی جنگلے کی سلاخیں ہوں۔ د... سر نہایت ہی پتلے تھے اور وہ سرو کی طرح مخروطی نظر آ... سامنے کی نشست پر ان کا رہبر فرزانہ بوڑھا پروفیسر بیٹھ... باہر بڑی توجہ سے کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ ان کے اخبار کے د... ڈبے میں داخل ہوا تھا۔

"ہم اضافیت کی سرزمین میں ہیں، ہیں نا؟ بچا... پوچھا۔

"اچھا!" پروفیسر نے بڑے تعجب سے کہا" تو تم بہ... بہت کچھ جانتے ہو! تم نے یہ سب معلومات کہاں سے حا...

"میں ایک بار پہلے بھی یہاں آچکا ہوں لیکن اُ... آپ کی رفاقت سے محروم تھا۔" بچا چھکن نے جواب دیا۔

"پھر تو شاید اس دفعہ تم میرے رہبر بنوگے!" پرو... ہوکر بولا۔

"بندہ کس لائق ہے قبلہ! اس دفعہ میں نے بہ... معمول باتیں دیکھیں اور ان کی توجیہ میں نے مقامی لوگ... چاہی لیکن وہ مجھے مطمئن کرنے میں قطعاً ناکام رہے۔" چ...

"بالکل قدرتی بات ہے۔" پروفیسر بولا۔ "وہ اس... باشندے ہیں اور ان کے لیے یہ تمام مظاہر بدیہی ہیں۔[1] اگر یہی لوگ ہماری دنیا میں آئیں تو انھیں ہماری دنیا ک... خلافِ معمول نظر آئیں۔"

"محترم! کیا میں آپ سے ایک سوال پوچھ سکتا..." بچا چھکن نے کہا "پچھلی دفعہ جب میں یہاں آیا تھا تو ریلوے...

---

[1] حالات ویسی ہیں جو پیسرے خواب میں تھے۔ یعنی روشنی کی رفتار تقریباً دس میل فی گھنٹہ ہے اور دیگر کائناتی مستقلات حسبِ معمول ہیں۔

ٹین سے ملتا تھا جو اس بات پر مصر تھا کہ چونکہ ریل گاڑی رکتی ہے اور پھر چل دیتی ہے اس لیے اس کے مسافر شہر میں مقیم لوگوں کی نسبت دیر سے بوڑھے ہوتے ہیں. کیا یہ جادو ہے یا یہ بھی جدید طبیعیات کے اصولوں کے مطابق ہے؟

پروفیسر: نہیں یہ جادو نہیں ہے بلکہ طبیعیاتی کلیوں کا نتیجہ ہے. زمان و مکان کے نئے تصورات کے تجزیے کی بنا پر، یا یوں کہو کہ ان تصورات کے تجزیے کی بنا پر جو ہیں تو کائنات جتنے پرانے لیکن جن کا انکشاف اب ہوا ہے، آئین اسٹائین نے ثابت کیا کہ تمام طبیعیاتی عملوں کی رفتار اس وقت سست پڑ جاتی ہے جب وہ نظام جس میں وہ وقوع پذیر ہوں، اپنی رفتار تبدیل کر رہا ہوتا ہے. لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اضافی رفتار نوری رفتار کے لگ بھگ ہو. ہماری دنیا میں یہ اثرات اتنے خفیف ہوتے ہیں کہ مشاہدے میں نہیں آسکتے لیکن یہاں چونکہ روشنی کی رفتار کم ہے اس لیے وہ بہت نمایاں ہوتے ہیں. مثلاً یہاں اگر تم ایک انڈا ابالنا چاہو اور کیتلی کو آگ پر رکھے رہنے کے بجائے مسلسل ادھر ادھر ہلاتے رہو یعنی اس کی رفتار بدلتے رہو، تو انڈا ابالنے میں پانچ منٹ کی جگہ شاید چھ منٹ لگیں گے۔

بالکل اسی طرح جسم انسانی کے تمام اعمال بھی اس وقت سست پڑ جاتے ہیں جب کوئی شخص کسی جھولنے والی کرسی یا چلتی گاڑی میں بیٹھا ہو. ایسے حالات میں ہماری زندگی کی رفتار سست ہو جاتی ہے لیکن چونکہ تمام عمل مساوی حد تک سست رفتار ہو جاتے ہیں، اس لیے طبیعیات دان یہ کہتے ہیں کہ کسی غیر یکساں رفتار سے متحرک نظام میں وقت زیادہ آہستہ گزرتا ہے.

پچاچکتن: لیکن کیا سائنس دان ہماری دُنیا میں بھی ان مظاہر کا مشاہدہ کرتے ہیں؟

پروفیسر: وہ کرتے تو ہیں لیکن اس کے لیے بڑی مہارت کی ضرورت ہے مطلوبہ اسراع میں پیدا کرنا فنی لحاظ سے بہت مشکل ہے لیکن کسی غیر یکساں رفتار سے متحرک نظام میں موجود حالات بہت بڑی قوت جاذبہ کے اثرات کے مشابہ، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مساوی ہیں. تم نے دیکھا ہوگا کہ اگر تم ایک لفٹ میں سوار ہو جو تیز اسراع سے اوپر چڑھ رہا ہو تو تم اپنے آپ کو زیادہ وزنی محسوس کرتے ہو. اس کے برعکس نیچے اترنا شروع کرتا ہے تو تمھیں اپنا وزن گھٹتا ہوا محسوس ہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسراع سے پیدا شدہ تجاذبی میدانِ جاذبہ میں جمع یا اس میں سے تفریق ہو جاتا ہے. چونکہ سورج پر قو زمین کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے، اس لیے وہاں پر وقوع والے تمام عمل نسبتہً سست ہونے چاہئیں. فلکیات دان اس کرتے رہتے ہیں.

پچاچکتن: لیکن اس کا مشاہدہ کرنے کے لیے وہ سورج پر تو نہیں

پروفیسر: انھیں سورج پر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی. وہ سور زمین کی طرف آنے والی روشنی کا مشاہدہ کرتے ہیں. یہ روشنی کے گرد فضا میں موجود مختلف جوہروں کے ارتعاش سے پیدا ہو اگر وہاں سب عمل سست ہوں تو جوہروں کی رفتار ارتعاش بھی ہوگی. چنانچہ شمسی اور ارضی ماخذوں سے نکلنے والی روشنی کے مت یہ فرق معلوم ہو سکتا ہے. کیا تم جانتے ہو کہ اس اسٹیشن کا نام جس سے ہم گذر رہے ہیں؟

ان کی گاڑی دیہاتی علاقے کے ایک چھوٹے سے ریلوے سے گزر رہی تھی. اسٹیشن ماسٹر اور ایک قلی کے علاوہ جو ہتھ گاڑی، اخبار پڑھ رہا تھا. اسٹیشن پر اور کوئی نظر نہ آتا تھا. یکایک اسٹیشن ما نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور وہ اوندھے منہ پلیٹ فارم پر گر پڑا. چ ریل کی گڑگڑاہٹ میں بندوق چلنے کی آواز نہ سن سکے لیکن اس ماسٹر کے جسم کے گرد خون جمع ہونے سے شک وشبہ دور ہو گیا. پروفیس فوراً خطرے کی زنجیر کھینچی اور گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رک جب وہ گاڑی سے اترے تو قلی دوڑتا ہوا لاش کی طرف جار دیہاتی پولیس کا ایک سپاہی بھی اسی طرف آرہا تھا.

لاش کا معائنہ کرنے کے بعد سپاہی نے کہا "گولی دل پار ہو گئی" اور اپنا بھاری ہاتھ قلی کے کندھے پر رکھتے ہوئے "میں تمھیں اسٹیشن ماسٹر کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں"

"لیکن میں... میں نے تو اسے قتل نہیں کیا" بدنصیب بوکھلا کر بولا "جب میں نے گولی چلنے کی آواز سنی تو میں اخبار

رہا تھا۔ ان صاحبان نے جو ابھی گاڑی سے اترے ہیں، غالباً سب کچھ دیکھا ہے اور یہ بتا سکتے ہیں کہ میں بے قصور ہوں۔"

"ہاں،" چچا چھکن نے کہا،" میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جب اسٹیشن ماسٹر کے گولی لگی تو یہ شخص اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔"

"لیکن تم تو چلتی ہوئی گاڑی میں تھے،" سپاہی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "چنانچہ جو کچھ تم نے دیکھا وہ ہرگز صحیح شہادت نہیں۔ پلیٹ فارم سے دیکھنے والے کے نقطۂ نظر سے اس شخص نے غالباً اسی لمحے میں گولی چلائی۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ ہم وقتی کا انحصار اس نظام پر ہوتا ہے جہاں سے تم اس کا مشاہدہ کرتے ہو؟" سپاہی قلی کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے کہا کہ خاموشی سے میرے ساتھ چلے آؤ۔

پروفیسر نے بات کاٹتے ہوئے کہا،" سپاہی! معاف کرنا تم اس وقت بالکل غلط قدم اٹھا رہے ہو اور مجھے اُمید نہیں کہ تمہارے اس اقدام کو تمھارے صدر دفتر والے پسند کریں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس ملک میں ہم وقتی بڑی حد تک اضافی ہے اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ مختلف مقامات میں دو واقعات کا ہم وقت ہونا مشاہد کی حرکت پر منحصر ہے ——
لیکن تمھارے ہاں بھی کوئی مشاہد کسی علت سے پہلے اس کا نتیجہ نہیں دیکھ سکتا کیا تم نے کبھی کوئی تار وصول کیا ہے پیشتر اس کے کہ وہ تمھیں بھیجا جائے یا کھانا کھانے سے پہلے کبھی تمھارا پیٹ بھرا ہے؟ تم شاید یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے گاڑی کی حرکت کی وجہ سے گولی چلنے کے اثر کو گولی چلنے کے بہت بعد دیکھا اور چونکہ ہم اسٹیشن ماسٹر کو گرتے دیکھتے ہی گاڑی سے اتر آئے تھے اس لیے ہم نے گولی چلتے نہیں دیکھی! میں جانتا ہوں کہ پولیس میں تمھیں صرف انہی باتوں پر یقین کرنا سکھایا جاتا ہے جو تمھارے ہدایت میں درج ہوں لیکن تم ذرا ان ہدایات کو بغور پڑھو تو تمھیں اس واقعے کے متعلق ہدایات مل جائیں گی۔"

پروفیسر کے لب ولہجے سے سپاہی خاصا متاثر ہوا۔ اس نے اپنی ہدایات کی کتاب نکالی اور آہستہ آہستہ اسے پڑھنے لگا۔ جلد ہی ایک ندامت آمیز مسکراہٹ اس کے چوڑے اور سرخ چہرے پر پھیل گئی۔ "یہ ہے دفعہ ۲۲ ذیلی دفعہ ۲۱ پیراگراف ج، یعنی اگر کسی بھی متحرک نظام سے کوئی مستند شہادت مل جائے کہ جرم سرزد ہونے کے وقت ± رف کے پار وقفے کے اندر ملزم کسی اور مقام پر دیکھا گیا تھا تو یہ موقعِ واردات سے اس کی عدم موجودگی کا قطعی ثبوت مانا جائے گا۔" (ر = قدرتی حدِ رفتار، ف = موقعِ واردات کا فاصلہ)

"جاؤ میاں! اب تم آزاد ہو!" سپاہی نے قلی سے کہا۔ پھر پروفیسر سے کہنے لگا "آپ کا بہت بہت شکریہ! آپ نے مجھے صدر دفتر والوں کی جواب طلبی سے بچا لیا۔ دراصل میں نیا نیا بھرتی ہوا ہوں اور ابھی ان قواعد سے پوری طرح واقف نہیں ہوں لیکن مجھے قتل کی اطلاع تو بہرحال دینی ہے" اور وہ ٹیلی فون کرنے چلا گیا۔ ایک منٹ بعد اس کی آواز پلیٹ فارم کی پرلی طرف سے سنائی دی۔ "اب سب ٹھیک ہے۔ اصل قاتل اسٹیشن سے بھاگتا ہوا پکڑا گیا ہے۔ آپ کا ایک بار پھر شکریہ

جب گاڑی دوبارہ چلی تو چچا چھکن نے پروفیسر سے کہا "آخر یہ ہم وقتی کا کیا چکر ہے؟ کیا اس ملک میں ہم وقتی قطعی بے معنی شے ہے؟"

پروفیسر "ایسا نہیں ہے۔ ہم وقتی یہاں بالکل ہی بے معنی تو نہیں ہے، البتہ صرف کسی حد تک بے معنی ہے ورنہ میں اس مظلوم قلی کی مدد بالکل نہ کر سکتا۔ دراصل کسی جسم کی حرکت یا کسی اشارے کی ترسیل کے لیے قدرتی حدِ رفتار کی موجودگی ہم وقتی کے عام مفہوم کو زائل کر دیتی ہے۔ میں اس کی وضاحت کے لیے ایک مثال دیتا ہوں۔ فرض کرو تمھارا ایک دوست کسی دور دراز شہر میں رہتا ہے۔ تم اس سے خط و کتابت کے ذریعے رابطہ قائم کرتے ہو اور مواصلات کا سریع ترین ذریعہ ڈاک گاڑی ہے۔ اب مزید فرض کرو کہ تمھیں اتوار کے دن کوئی حادثہ پیش آتا ہے اور تمھیں پتا چلتا ہے کہ یہی حادثہ تمھارے دوست کو بھی پیش آنے والا ہے۔ ظاہر ہے کہ تم اسے بدھ سے پہلے اس کی اطلاع نہیں دے سکتے۔ اس کے برعکس اگر تمھارے دوست کو اس حادثے کا جو تمھیں پیش آنے والا تھا، پہلے سے علم ہوتا تو وہ زیادہ سے زیادہ پچھلی جمعرات تک تمھیں اس سے آگاہ کر سکتا تھا اس طرح تمھارا دوست چھ دن کے لیے یعنی جمعرات سے بدھ تک اتوار کے دن ہونے والے حادثے کو نہ تو ٹال سکتا، نہ اسے اس کی خبر ہی ہوتی یعنی علیت کے نقطۂ نظر سے تمہارا دوست تم سے چھ دن کے لیے کٹ جاتا۔

چچا چھکن: "ایسی صورت میں تار سے اطلاع کیوں نہ دے دی جائے"۔

پروفیسر: "لیکن میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اس ملک میں ریل گاڑی کی رفتار سے زیادہ کسی چیز کی رفتار نہیں ہو سکتی۔ ہماری دنیا میں روشنی کی رفتار عظیم ترین ممکن رفتار ہے اس لیے ریڈیو ہی وہ ذریعہ ہے جس سے کوئی پیغام جلد سے جلد بھیجا جا سکتا ہے"۔

لیکن پھر بھی چچا چھکن بولے، "اگر ڈاک گاڑی کی رفتار سے بڑھنا ممکن نہ بھی ہو تو اس کا ہم وقتی سے کیا تعلق ہے؟ میں اور میرا دوست بہرحال اتوار کا کھانا بہ یک وقت کھائیں گے"۔

"ہرگز نہیں، اس صورت میں اس بات کے کوئی معنی نہ ہوں گے کوئی ایک مشاہد تم سے متفق ہو گا لیکن مختلف گاڑیوں میں سفر کرنے والے ایسے مشاہد بھی ہوں گے جو مُصر ہوں گے کہ تم نے اتوار کا کھانا اس وقت کھایا جب تمھارا دوست جمعہ کا ناشتہ کر رہا تھا یا منگل کو دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا لیکن کوئی مشاہد تمھیں اور تمھارے دوست کو صرف تین دن کے وقفے کے اندر ہی بیک وقت کھانا کھاتے دیکھ سکتا ہے"۔

"لیکن یہ سب کیسے ممکن ہے؟" چچا چھکن نے نہ ماننے کے انداز میں کہا۔

"بڑی آسانی سے ممکن ہے۔ تم نے میرے خطبات سے سمجھ لیا ہو گا کہ مختلف متحرک نظاموں سے مشاہدہ کرنے پر بھی رفتار کی بالائی حد ایک ہی رہتی ہے۔ اگر ہم یہ مان لیں تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ"

جب پروفیسر کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے، چچا چھکن نے اس کے چہرے میں عجیب و غریب تبدیلیاں ہوتی دیکھیں۔ اس کے سفید بالوں کا رنگ دلفریب سنہرا ہو گیا۔ اس کی بھویں دفعتہً پتلی اور محراب دار ہو گئیں اور پلکیں لمبی ہو گئیں۔ آخر میں اس کی داڑھی بھی غائب ہو گئی اور چچا چھکن نے خود کو ایک خوب صورت دوشیزہ کی آنکھوں میں جھانکتا پایا جو پچھلے اسٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوئی تھی۔ وہ چچا چھکن کی طرف تعجب اور دبی مسکراہٹ سے دیکھ رہی تھی۔ چچا چھکن نے جلدی سے فرش سے اخبار اٹھایا اور باقی راستے بھر اپنا چہرہ اس کے پیچھے چھپائے رکھا۔ وہ بڑے شرمیلے تھے اور عورتوں سے بہت گھبراتے تھے۔

"پسٹلی صاحب کا یہ قول ہے کہ انسان کو دشمن کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ رکھنا چاہیے کہ اس کو دوست بنا لینے کا موقع رہے؛ اور دوست کے ساتھ اس طرح برتاؤ کرنا چاہیے، کہ اگر وہ کبھی دشمن ہو جائے تو اس کے ضرر سے بچنے کی جگہ رہے۔ اس قول کی پہلی بات جو دشمن کے ساتھ برتاؤ کی ہے وہ تو نہایت عمدہ ہے، مگر پچھلی بات جو دوست کے ساتھ برتاؤ کی ہے وہ کچھ اچھی نہیں۔ اس میں سمجھ کی کچھ بھی بات نہیں ہے بلکہ نری مکاری ہے۔ ایسے برتاؤ سے انسان زندگی کی بہت بڑی خوشی سے محروم رہتا ہے۔ اپنے دلی دوستوں سے بھی دل کی بات نہیں کہہ سکتا۔ سچ ہے بعض دفعہ دوست دشمن ہو جاتے ہیں اور بھید کو کھول دیتے ہیں مگر دنیا ان ہی کو دغاباز اور برا کہتی ہے اور دوست پر بھروسہ کرنے والے کو ناسمجھ نہیں کہتی۔ ہاں البتہ دوستوں کو منتخب کرنے میں بڑی سمجھ چاہیے۔"

سر سید احمد خاں

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۳/۸۶-۱۹۸۶ء

درج ذیل جگہوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ فزیکل ڈائرکٹر [ایک جگہ] مستقل ویمنز کالج۔

شرح تنخواہ۔ ۷۰۰-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ روپے مع الاؤنسز

قابلیت: ۱۔ لازمی۔ فزیکل ایجوکیشن میں ہائی سکنڈ کلاس میں ماسٹرز ڈگری۔ اور ساتھ میں کسی منظور شدہ ادارے سے اسپورٹس کوچنگ میں ڈپلوما۔

یا

فزیکل ایجوکیشن میں ہائی سکنڈ کلاس میں ماسٹرز ڈگری۔ اور ساتھ میں نیشنل چیمپین شپ میں انٹر یونیورسٹی/ صوبائی سطح پر نمائندگی کرنے کا ریکارڈ ہو۔

(ii) گیمس اور اسپورٹس کو آرگنائز کرنے کا تجربہ اور بڑے پیمانہ پر گیمس اور اسپورٹس میں حصہ لینے والوں کو تربیت دینا۔

(۲) پسندیدہ۔ باسکٹ بال / ہاکی میں کوچنگ کرنے کی صلاحیت۔

نوٹ ۱۔ عورت امیدوار کو ترجیح دی جائے گی۔

نوٹ ۲۔ وہ حضرات جو اشتہار نمبر ۲۵/۸۶-۸۵ء مورخہ ۲۰ جنوری ۸۶ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ موزوں تصور کیے گئے تو اُن کو پہلی درخواست کی بنیاد پر ہی امیدوار تسلیم کیا جائے گا۔

۲۔ اسسٹنٹ ایڈمنسٹریٹو آفیسر [ایک جگہ] [مستقل] ۔ جے این۔ میڈیکل کالج ہسپتال

شرح تنخواہ۔ ۵۶۰-۳۰-۷۴۰-۳۵-۸۱۰-ای بی-۳۵-۸۸۰-۴۰-۱۰۰۰-ای بی-۴۰-۱۲۰۰ روپے مع الاؤنسز

قابلیت۔ ۱۔ بی اے / بی۔ ایس سی / بی کام یا کسی مستند ادارے سے اِن کے مساوی کوئی امتحان۔

۲۔ ٹریننگ / کورس ہاسپٹل ایڈمنسٹریشن میں۔

کسی بڑے اسپتال میں سپروائزر کی جگہ پر بحیثیت اسسٹنٹ ایڈمنسٹریٹو آفیسر کام کرنے کا تجربہ

۳- پبلک ریلیشن آفیسر (ایک جگہ) (مستقل) پبلک ریلیشن آفس۔ اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ۔

شرح تنخواہ ۔ ۶۵۰- ۳۰- ۷۴۰- ۳۵- ۸۸۰- ای بی- ۴۰- ۹۶۰ روپے مع الاؤنسز۔

قابلیت: (۱) کسی معروف ہندوستانی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا ہو۔ یا اس کے مساوی کوئی غیر ملکی ڈگری۔

(۲) پبلک ریلیشن کے کام کا کم از کم ۵ سال کا تجربہ ہو۔ روزناموں کے ایڈیٹروں اور نامہ نگار حضرات سے روابط ہوں۔

(۳) اردو / ہندی میں لکھنے کی صلاحیت ہو۔

۴- سیکورٹی آفیسر (ایک جگہ) (مستقل) پروکٹر آفس۔

شرح تنخواہ ۔ ۶۵۰- ۳۰- ۷۴۰- ۳۵- ۸۸۰- ای بی- ۴۰- ۹۶۰ روپے مع الاؤنسز۔

قابلیت ۔ لازمی: بیچلرز ڈگری۔

۲- اعلیٰ سطح پر حفاظتی اور انتظامی امور کا کم سے کم ۱۰ سال کا تجربہ۔

۳- صحت اور جسمانی ساخت اچھی ہونی چاہیے۔

پسندیدہ- قانون کی ڈگری یا کریمنل لا اور اس کے طریقۂ کار کا عملی تجربہ۔ اور فوج یا پولیس میں حفاظتی امور کی انجام دہی کا تجربہ ہو۔

عمر- ۴۵ سال سے کم۔

(عمر کی حد میں چھوٹ بھی دی جا سکتی ہے۔ اگر امیدوار میں کوئی خصوصی یا اعلیٰ درجے کی موزوں صلاحیت پائی گئی تو امیدوار کی عمر میں چھوٹ بھی دی جا سکتی ہے)

ذمہ داریاں:- واچ اینڈ وارڈ سیکشن کی دیکھ بھال اور ایسی تمام ذمہ داریاں جو پروکٹر کی طرف سے تفویض کی جائیں۔

نوٹ:- ملٹری یا پولس کے ایسے افسران جو گزٹیڈ جگہوں پر رہے ہوں، وہ بھی اس جگہ کے لیے درخواستیں دے سکتے ہیں۔ اور اُن کے سلسلے میں عمر کی حد میں چھوٹ دی جا سکتی ہے لیکن اُن کو یہ جگہ صرف کنٹریکٹ کی بنیاد پر دی جائے گی۔

۵- ریسرچ ایسوسی ایٹ (دو جگہیں) (عارضی) شعبۂ تاریخ

شرح تنخواہ :- مقررہ تنخواہ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

کیٹگری	رقم۔
اے۔	۱۴۰۰/- روپے
بی۔	۱۶۰۰/- روپے
سی	۱۸۰۰/- روپے
ڈی	۲۰۰۰/- روپے

قابلیت

۱۔ لازمی۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری اور میڈیول (انڈین ہسٹری کے میدان میں خود کا مطبوعہ کام ہو۔

۲۔ پسندیدہ:۔ عمر ۴۵ سال سے کم (مردوں کے لیے) ہونا چاہیے۔
عمر ۵۵ سال سے کم (عورتوں کے لیے) ہونا چاہیے۔

۶ سینیئر ٹیکنکل اسسٹنٹ (تھیٹر) (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف آپتھلمالوجی

شرح تنخواہ۔ ۵۵۰۔ ۲۵۔ ۷۵۰۔ ای بی۔ ۳۰۔ ۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔

قابلیت لازمی بی۔ ایس سی یا اُس کے مساوی کوئی ڈگری۔ ساتھ میں نرسنگ میں ڈپلوما / سرٹیفکٹ ہو۔ کسی مشہور میڈیکل کالج یا آنکھوں کے اسپتال میں تھیٹر ٹیکنیشین کی حیثیت سے کام کرنے کا مناسب تجربہ ہو۔

یا

سائنس کے ساتھ انٹرمیڈیٹ یا اس کے مساوی کوئی امتحان پاس کیا ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ نرسنگ میں ڈپلوما / سرٹیفکٹ ہو۔ تھیٹر اسسٹنٹ ٹیکنیشن کی حیثیت سے دو سال کام کرنے کا تجربہ ہو۔ یا کسی آنکھوں کے اسپتال / میڈیکل کالج میں چار سال کا عملی تجربہ ہو۔

۲۔ پسندیدہ۔ او۔ ٹی میں اور خاص طور پر کسی دیہاتی آئی ریلیف کیمپ میں کام کرنے کا تجربہ۔

نوٹ: امیدوار کو ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت دیہاتی آئی ریلیف کیمپ میں کام کا تجربہ ہو۔

۷۔ جونیئر انجینیر (ایک جگہ) (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید۔) بلڈنگ ڈپارٹمنٹ۔

شرح تنخواہ۔ ۴۲۵۔ ۱۵۔ ۵۰۰۔ ای۔بی۔ ۵۶۰۔ ۲۰ ای بی۔ ۷۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔

قابلیت:۔ کسی منظور شدہ ادارے سے سول انجینیرنگ میں ڈپلوما۔ بلڈنگ کی تعمیرات اور مینٹینس کا کم از کم پانچ سال کا تجربہ ہو۔

عمر۔ ۲۵ سے ۴۰ سال تک ہونا چاہیے۔

۸۔ [illegible] (مولڈنگ) (ایک جگہ) (عارضی) ورکشاپ ڈپارٹمنٹ آف مکینکل انجینیرنگ

شرح تنخواہ۔ ۴۴۰۔ ۲۰۔ ۵۰۰۔ ای۔بی ۲۵۔ ۷۰۰۔ ای۔بی ۲۵۔ ۷۵۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔

قابلیت:۔ مکینکل انجینیرنگ میں ڈپلوما۔ مخصوص فیلڈ (مولڈنگ) میں کام کرنے کا آٹھ سال کا تجربہ۔

۹۔ ٹکنیکل اسسٹنٹ (سیکشن کٹر) (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف جیولوجی۔

شرح تنخواہ۔ ۴۲۵۔ ۱۵۔ ۵۰۰۔ ای۔بی۔ ۱۵۔ ۵۶۰۔ ۲۰۔ ۷۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔

قابلیت۔ ۱۔ لازمی چٹانوں اور کان کنی کے شعبہ میں کٹنگ کی تیکنک کا تجربہ۔ انگریزی کے الفابیٹس کی مکمل جانکاری

۲۔ پسندیدہ:۔

۱۰۔ کارڈیو تھراسک لیبارٹیری ٹیکنیشین (ایک جگہ) (مستقل) جے۔ این۔ میڈیکل کالج اسپتال۔

شرح تنخواہ۔ ۴۲۵۔ ۱۵۔ ۵۰۰۔ ای بی ۱۵۔ ۵۶۰۔ ۲۰۔ ۶۰۰ روپے مع الاؤنسز۔
قابلیت:۔ ۱۔ لازمی۔ بی۔ ایس سی (بیالوجی گروپ)۔ میڈیکل لیب ٹیکنالوجی میں ڈپلوما۔
۲۔ پسندیدہ:۔
نوٹ:۔ امیدوار کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۱۱۔ اسٹور سپروائزر۔ (ایک جگہ) (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید) ورکشاپ مکینیکل انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ۔
شرح تنخواہ۔ ۳۳۰۔ ۱۰۔ ۳۸۰۔ ای بی۔ ۱۲۔ ۵۰۰۔ ای بی ۱۵۔ ۵۶۰ روپے مع الاؤنسز۔
قابلیت:۔ مکینیکل انجینئرنگ میں ڈپلوما اور کسی مشہور و معروف تنظیم میں بحیثیت اسٹور سپروائزر کے ۵ سال کا تجربہ۔
یا
کسی منظور شدہ یونیورسٹی سے سائنس یا کامرس میں گریجویشن۔ اور ساتھ میں مخصوص فیلڈ میں آٹھ سال کا تجربہ

۱۲ مکینک (مکینکل) (ایک جگہ) (عارضی) جے۔ این۔ میڈیکل کالج
شرح تنخواہ:۔ ۲۶۰۔ ۶۔ ۲۹۰۔ ای۔ بی۔ ۶۔ ۳۲۶۔ ۸۔ ۳۶۶۔ ای۔ بی ۸۔ ۳۹۰۔ ۱۰۔ ۴۰۰ روپے مع الاؤنسز
قابلیت:۔ ۱ مکینک ٹریڈ میں آئی۔ ٹی۔ آئی کا سرٹیفکٹ (دو سالہ کورس) یا
مکینیکل ڈرافٹس مین شپ میں سرٹیفکٹ (دو سالہ کورس)
(۱) پلمبنگ اور سینیٹری فٹنگ وغیرہ کے کام کا تجربہ۔
نوٹ۔ امیدوار کو انٹرویو سے قبل ایک عملی ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۱۳ ٹریکٹر ڈرائیور (ایک جگہ) (مستقل) بلڈنگ ڈپارٹمنٹ۔
شرح تنخواہ۔ ۲۶۰۔ ۶۔ ۲۹۰۔ ای بی۔ ۶۔ ۳۲۶۔ ۸۔ ۳۶۶۔ ای۔ بی ۸۔ ۳۹۰ روپے مع الاؤنسز۔
قابلیت:۔ پڑھا لکھا ہونا چاہیے اور لوگ بک سمجھنے کا طریقہ جانتا ہو۔ بھاری گاڑیاں چلانے کا لائسنس ہونا چاہیے۔ ٹریکٹر چلانے کا ۵ سال کا تجربہ ہونا چاہیے اور روڈ رولر چلانا جاننے پر ترجیح دی جائے گی۔
عمر۔ ۲۵ سے ۴۰ سال تک ہونا چاہیے۔
امیدوار کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۱۴۔ کارندہ۔ (ایک جگہ) (مستقل) پراپرٹی ڈپارٹمنٹ۔
شرح تنخواہ۔ ۲۶۰۔ ۶۔ ۲۹۰۔ ای بی ۶۔ ۳۲۶۔ ۸۔ ۳۶۶۔ ای بی ۸۔ ۳۹۰۔ ۱۰۔ ۴۰۰ روپے مع الاونسز۔
کسی منظور شدہ یونیورسٹی سے یا بورڈ سے ہائی اسکول پاس کیا ہو۔ اردو اور ہندی جانتا ہو۔ سول ریونیو اور کریمنل کیسوں کی پیروی کرنے کا ۵ سال کا تجربہ ہو۔
۲ پسندیدہ۔ زمین کی ناپ اور جائیداد کے مینٹیننس اور ریکارڈ کا تجربہ ہو۔

اعلیٰ تجربے اور قابلیت کے حامل افراد کو ابتدا سے اعلیٰ تنخواہ دی جاسکتی ہے۔ وہ امیدوار جن کو انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا ان کو صرف ایک طرف سکنڈ کلاس ریلوے کرایہ بطور ٹی۔ اے دیا جائے گا

مقررہ درخواست فارم اور ان سے متعلق ہدایات سلیکشن کمیٹی سیکشن، رجسٹرار آفس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دفتر سے -/۵ روپے (نمبر شمار ۱-تا-۵ کی جگہوں کے لیے) اور -/3 روپے (باقی ماندہ جگہوں کے واسطے) فنانس آفس کے کیش سیکشن میں نقد جمع کرکے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

یا- اسی قیمت کے انڈین پوسٹل آرڈر کے ذریعہ جو فنانس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو جمع کرکے حاصل کرسکتے ہیں۔

اگر یہ فارم بذات خود حاصل کرنا چاہیں تو مذکورہ آفس سے حاصل کریں اور اگر بذریعہ ڈاک اس کا حصول مقصود ہو تو اس کے لیے 23x10 سائز کا ایسا لفافہ جس پر اپنا پتہ تحریر ہو اور اس پر مطلوبہ ڈاک ٹکٹ چسپاں ہوں بھیج کر حاصل کرسکتے ہیں۔

درخواستیں موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۸ جون ۱۹۸۶ء کو آفس ٹائم تک ہے

نامکمل اور ایسی درخواستیں جو تاخیر سے موصول ہوں ناقابل قبول ہوں گی۔

سید شاہد علی

رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۴/ ۸۷-۸۶

درج ذیل جگہوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

فیکلٹی آف میڈیسن

۱۔ پرنسپل۔ جے۔ این۔ میڈیکل کالج۔ اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ۔

شرح تنخواہ۔ ۱۵۰۰۔ ۶۰۔ ۱۸۰۰۔ ۱۰۰۔ ۲۰۰۰۔ ۱۲۵/ ۲۔ ۲۵۰۰ روپے مع الاؤنسز

قابلیت:۔ یونیورسٹی کی بنیادی میڈیکل و دیگر تعلیمی اسناد اور ساتھ میں دوسری لیاقت کے ساتھ ساتھ بحیثیت پروفیسر/ ایسوسی ایٹ پروفیسر/ کسی میڈیکل کالج میں ریڈر کی حیثیت سے تدریس کا کم از کم دس سال کا تجربہ ہو۔ ان دس سال میں سے کم از کم ۵ سال کسی ڈپارٹمنٹ میں بحیثیت پروفیسر کے تدریس کا تجربہ ہونا چاہیے۔

نوٹ:۔ کالج کے پرنسپل کو بحیثیت چیف سپرنٹنڈنٹ آف میڈیکل کالج اسپتال کی حیثیت سے بھی کام کرنا ہوگا۔

۲۔ پروفیسر آف بائیوکیمسٹری، بائیوکیمسٹری ڈپارٹمنٹ۔ جے۔ این۔ میڈیکل کالج۔

شرح تنخواہ۔ ۱۵۰۰۔ ۶۰۔ ۱۸۰۰۔ ۱۰۰۔ ۲۰۰۰۔ ۱۲۵/ ۲۔ ۲۵۰۰ روپے مع الاؤنسز۔

قابلیت ۱۔ لازمی۔ ایم ڈی (بائیوکیمسٹری)

ایم۔ بی۔ بی۔ ایس معہ

ایم ایس سی (میڈیکل بائیوکیمسٹری)

پی ایچ۔ ڈی (میڈیکل بائیوکیمسٹری)

ڈی۔ ایس سی (میڈیکل بائیوکیمسٹری)

تدریس/ تحقیق کا تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت ریڈر ان بائیوکیمسٹری چار سال کا تجربہ

امیدوار کا اتونولوجی/ مولیکولر بیالوجی کے میدان میں قابل ذکر کام ہونا چاہیے۔

۳۔ پروفیسر آف پیتھالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف پیتھالوجی

شرح تنخواہ۔ ۱۵۰۰/-۔ ۶۰۔ ۱۸۰۰۔ ۱۰۰۔ ۲۰۰۰۔ ۱۲۵/ ۲۔ ۲۵۰۰ روپے مع الاؤنسز۔

قابلیت:۔ ۱۔ لازمی۔ ایم۔ ڈی [پیتھالوجی]
ایم۔ ڈی [پیتھالوجی اینڈ بیکٹریالوجی]
ایم۔ ڈی [پیتھالوجی معہ بیکٹریالوجی]
پی۔ ایچ ڈی [پیتھالوجی]
ڈی۔ ایس سی [پیتھالوجی]
تدریس/ تحقیق کا تجربہ
کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت ریڈر ان پیتھالوجی چار سال کا تجربہ۔
۲۔ پسندیدہ:۔ ہندوستانی اور غیر ملکی جرائد میں اس مخصوص تخصص میں تحقیقی کام۔

۴۔ پروفیسر آف سائیکٹری۔ ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن۔
شرح تنخواہ۔ ۱۵۰۰۔ ۶۰۔ ۱۸۰۰۔ ۱۰۰۔ ۲۰۰۰۔ ۱۲۵/۲۔ ۲۵۰۰ روپے مع الاؤنسز۔
قابلیت:۔ ایم۔ ڈی [سائیکٹری]
ایم۔ ڈی۔ [سائیکولوجیکل میڈیسن]
ایم۔ ڈی ان میڈیسن معہ ڈپلوما ان سائیکولوجیکل میڈیسن۔
تدریس/ تحقیق کا تجربہ
کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت ریڈر ان سائیکٹری چار سال کا تجربہ۔

۵۔ پروفیسر آف نیورو سرجری۔ ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری۔
شرح تنخواہ۔ ۱۵۰۰/۔ ۶۰۔ ۱۸۰۰۔ ۱۰۰۔ ۲۰۰۰۔ ۱۲۵/۲۔ ۲۵۰۰ روپے مع الاؤنسز۔
قابلیت:۔ ایم۔ سی ایچ۔ [نیورو۔ سرجری]
تدریس/ تحقیق کا تجربہ
کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت ریڈر ان نیورو سرجری چار سال کا تجربہ۔

۶۔ ریڈر ان بائیو فزکس۔ ڈپارٹمنٹ آف بائیو کیمسٹری۔
شرح تنخواہ۔ ۱۲۰۰/۔ ۵۰۔ ۱۳۰۰۔ ۶۰۔ ۱۹۰۰ روپے مع الاؤنسز۔
قابلیت ۱۔ لازمی۔ ایم۔ ڈی [بائیو فزکس]
پی۔ ایچ۔ ڈی [بائیو فزکس]
ایم۔ ڈی [فزیالوجی] یا
ایم۔ ڈی۔ [بائیو کیمسٹری] معہ ایک سال کی ٹریننگ بائیو فزکس میں۔
تدریس/ تحقیق کا تجربہ
کسی میڈیکل کالج میں بائیو فزکس میں لکچرر کی حیثیت سے پانچ سال کا تجربہ۔
۲۔ پسندیدہ:۔ امیدوار بائیو فزکس/ بائیو فزیکل کیمسٹری اور خاص طور پر کنفرمیشن آف پروٹینس، نیوکلک اینڈ کنفرمیشن

اور پروٹین فولڈنگ کے میدانوں میں قابل قدر اور نمایاں مقام رکھتا ہو۔

کام کی نوعیت۔ منتخب امیدوار بائیو فزکس میں تدریسی اور تحقیقی پروگرام کو آرگنائز کرنے اور خصوصاً نیوکلیس ایسڈ اور اسٹرکچرل اسڈیز آف پروٹینز میں پروگرام کو آرگنائز کرانے کا ذمہ دار ہوگا۔

۷۔ ریڈر انستھیسیالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف انستھیسیالوجی۔

شرح تنخواہ۔ ۱۲۰۰/- - ۵۰ - ۱۳۰۰ - ۶۰ - ۱۹۰۰ روپے معہ الاؤنسز۔

قابلیت۔ ا۔لازمی۔ ایم۔ڈی (انستھیسیالوجی)

ایم۔ایس (انستھیسیالوجی)

تدریسی / تحقیق کا تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر ان انستھیسیالوجی پانچ سال کا تجربہ۔

پسندیدہ:۔ تحقیقی ذہن اور مطبوعہ پیپرس۔

۸۔ ریڈر ان نیورو سرجری۔ ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری

شرح تنخواہ۔ ۱۲۰۰/- - ۵۰ - ۱۳۰۰ - ۶۰ - ۱۹۰۰ روپے معہ الاؤنسز۔

قابلیت ا۔لازمی ایم۔سی ایچ۔ (نیورو سرجری)

تدریسی / تحقیقی کا تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر ان نیورو سرجری پانچ سال کا تجربہ۔

پسندیدہ ا۔ کسی اچھے نیورو سرجیکل سینٹر میں پانچ سال کا تجربہ۔

۹۔ ریڈر ان صعنول سرجری۔ (بائیو کیمسٹ) ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری۔

شرح تنخواہ۔ ۱۲۰۰/- - ۵۰ - ۱۳۰۰ - ۶۰ - ۱۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔

قابلیت ا۔لازمی ایم۔ڈی (بائیو کیمسٹری)

ایم۔بی۔بی۔ایس معہ ایم۔ایس سی (میڈیکل بائیو کیمسٹری)

پی ایچ۔ڈی۔ (میڈیکل بائیو کیمسٹری)

ڈی۔ایس سی (میڈیکل بائیو کیمسٹری)

تدریسی / تحقیق کا تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر ان بائیو کیمسٹری پانچ سال کا تجربہ۔

پسندیدہ ا۔ خصوصی سرجری کے مریضوں کی بائیو کیمیکل دیکھ بھال کا تجربہ۔

۱۰۔ ریڈر ان یورولوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری۔

شرح تنخواہ۔ ۱۲۰۰/- - ۵۰ - ۱۳۰۰ - ۶۰ - ۱۹۰۰ روپے مع الاؤنسز۔

قابلیت ا۔ ایم۔سی ایچ۔ (یورولوجی)

تدریسی / تحقیق کا تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لیکچرر ان یورولوجی پانچ سال کا تجربہ۔

۱۱- ریڈر ان ای-این-ٹی- ڈیپارٹمنٹ آف اوٹو- رہینو لارینگالوجی۔

شرح تنخواہ- ۱۲۰۰/- - ۵۰ - ۱۳۰۰ - ۶۰ - ۱۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔

قابلیت:- لازمی- ایم-ایس- (اوٹو- رہینو- لارینگالوجی)۔

تدریس/ تحقیق کا تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لیکچرر ان اوٹو- رہینو- لارینگالوجی- پانچ سال کا تجربہ۔

پسندیدہ:- مطبوعہ تحقیقی کام۔

نوٹ: ریڈرس کی تمام جگہوں کے لیے

وہ حضرات جن کا انتخاب اس سے پیشتر ۱۹۸۲ء کی ریکمنڈیشن کے تحت بحیثیت لیکچرر کیا گیا ہے تو اُن کا بحیثیت لیکچرر اور بحیثیت رجسٹرار یہ تجربہ شمار کیا جائے گا اور وہ ریڈر کی جگہ کے لیے موزوں متصور ہوں گے

۱۲- لیکچرارات فزیالوجی- ڈیپارٹمنٹ آف فزیالوجی۔

شرح تنخواہ- ۷۰۰/- - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپے مع الاؤنسز۔

قابلیت:- لازمی- ایم- ڈی (فزیالوجی)

ایم-بی-بی-ایس معہ ایم-ایس سی- (فزیالوجی)

پی ایچ- ڈی- (میڈیکل فزیالوجی)

ڈی-ایس سی (میڈیکل فزیالوجی)

تدریس/ تحقیق کا تجربہ

امیدوار تسلیم شدہ پوسٹ گریجویٹ قابلیت کا حامل ہو۔

پسندیدہ:- خصوصی میدان میں مطبوعہ تحقیقی کام۔

۱۳- لیکچرارات بائیوکیمسٹری- ڈیپارٹمنٹ آف بائیوکیمسٹری۔

شرح تنخواہ- ۷۰۰/- - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپے مع الاؤنسز۔

قابلیت- ایم- ڈی (بائیوکیمسٹری)

ایم-بی-بی-ایس معہ ایم ایس سی (میڈیکل بائیوکیمسٹری)

پی- ایچ- ڈی (میڈیکل بائیوکیمسٹری)

ڈی- ایس سی- (میڈیکل بائیوکیمسٹری)

نوٹ:- منتخب امیدوار کلینیکل بائیوکیمسٹری سیکشن اور اس کے ساتھ ساتھ میڈیکل بائیوکیمسٹری برائے ایم-بی-بی-ایس اور ایم- ڈی کے کلاسوں میں شامل کورسوں کو کنڈکٹ کرنے اور اس کو آرگنائز کرنے کے ذمہ دار ہوں گے۔

صرف وہی امیدوار درخواست دیں جن کے پاس میڈیکل کوالیفیکیشن ہو

۱۴- لکچرر کم ایپڈی میولوجسٹ- ڈپارٹمنٹ آف پریوینٹو اینڈ سوشل میڈیسن-

شرح تنخواہ- ۷۰۰/- ۴۰- ۱۱۰۰- ۵۰- ۱۶۰۰ روپے مع الاؤنسز-

قابلیت ۱- لازمی ایم-ڈی (سوشل اینڈ پریوینٹیو میڈیسن) /

ایم-ڈی (کمیونٹی میڈیسن)

ایم-ڈی (میڈیسن) مع ڈی-پی-ایچ-

تدریس / تحقیق کا تجربہ

امیدوار کے پاس اس موضوع میں پوسٹ گریجویٹ کوالی فیکیشن ہونا چاہیے-

پسندیدہ- خصوصی فیلڈ میں مطبوعہ تحقیقی کام ہونا چاہیے-

۱۵- لکچرر ان انستھیسیالوجی- ڈپارٹمنٹ آف آپتھلما لوجی-

شرح تنخواہ - ا-لا/ ۷۰۰- ۴۰- ۱۱۰۰- ۵۰- ۱۶۰۰ روپے مع الاؤنسز-

قابلیت ۱- لازمی- ایم-ڈی (انستھیسیالوجی) /

ایم-ایس (انستھیسیالوجی)

تدریس / تحقیق کا تجربہ-

امیدوار متعلقہ مضمون میں تسلیم شدہ پوسٹ گریجویٹ کوالی فیکیشن کا حامل ہونا چاہیے-

۲- پسندیدہ- انستھیسیا میں تجربہ-

اعلیٰ تعلیمی استعداد اور تجربے کے حامل افراد کو ابتدا سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے- انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے والے امیدواروں کو صرف ایک طرف کا ریلوے کے سکنڈ کلاس کا سنگل کرایہ بطور ٹی- اے دیا جائے گا-

درخواستوں کے لیے مقررہ فارم اور دیگر ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) کے دفتر سے پانچ روپے نقد ادائگی جو کہ مسلم یونیورسٹی کے فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع کی گئی ہو یا فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام واجب الادا اسی قیمت کے کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر بھیج کر ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کیے جاسکتے ہیں- ڈاک سے طلب کرنے کی صورت میں ۹×۴ سائز کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہوں بھیجنا ضروری ہے-

درخواستوں کی وصولیابی کی آخری تاریخ ۹ جولائی ۱۹۸۶ء (آفس ٹائم تک) ہے-

نامکمل اور تاخیر سے ملنے والی درخواستیں ناقابل قبول ہوں گی

نوٹ- موزوں امیدواروں کو آئندہ خالی ہونے والی جگہوں کے لیے پینل میں رکھا جاسکتا ہے-

سید شاہد علی
رجسٹرار

[321/4991]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

داخلہ اشتہار نمبر ۵

سیشن ۸۷-۱۹۸۶ء

برائے سال ۸۷-۱۹۸۶ء درج ذیل کورسوں میں مقابلہ جاتی ٹیسٹ/ٹیسٹ اور انٹرویو کی بنیاد پر اہل امیدواروں سے مقررہ فارموں پر داخلے کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔ داخلے کے لیے کم از کم اہلیت، کورس کی مدت، فارم کی وصولیابی کی آخری تاریخ اور داخلہ ٹیسٹ کی تاریخیں ہر کورس کے سامنے دی گئی ہیں۔

نمبر شمار	نام کورس اور مدت	کم از کم قابلیت برائے داخلہ	فارم وصولیابی کی آخری تاریخ	ٹیسٹ کی تاریخ
	I فیکلٹی آف انجینیرنگ اینڈ ٹیکنالوجی			
۱	بی۔ ایس سی انجینیرنگ (سول، الیکٹریکل، مکینکل، کیمیکل، الیکٹرونکس*، کمپیوٹر انجینیرنگ*) ۴ سالہ کورس * یو۔ جی۔ سی کی منظوری کے بعد	سینیئر سکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ/انٹرمیڈیٹ یا اس کے مساوی کوئی امتحان، انگریزی، کیمسٹری، فزکس اور میتھمیٹکس میں مجموعی طور پر ۵۲½ فیصد سے کم نمبر نہ ہوں یا کم از کم سکنڈ ڈویژن میں اس یونیورسٹی سے ڈپلوما انجینیرنگ کیا ہو۔	۲۵ جون ۱۹۸۶	۲۰ جولائی ۸۶ء
	II فیکلٹی آف میڈیسن			
۲	ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ۴½ سالہ کورس	سینیئر سکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ/پری میڈیکل امتحان اس یونیورسٹی سے پاس کیا ہو اور فزکس کیمسٹری اور بائیولوجی میں مجموعی نمبر کم از کم ۵۲½ فیصد حاصل کیے ہوں۔ اور انگریزی بطور ایک	۳۰ جون ۱۹۸۶ء	۲۸، ۲۹ جولائی ۸۶ء

		مضمون کے رہی ہو۔ یا اس کے مساوی کوئی امتحان جو اِس یونیورسٹی کے نزدیک تسلیم شدہ ہو، پاس کیا ہو۔ یا اِس یونیورسٹی سے بی۔ایس سی (آنرز) پاس کیا ہو یا اِس کے مساوی کوئی ایسا امتحان جس میں کیمسٹری زولوجی اور باٹنی میں مجموعی طور پر ۵۰ فیصد سے کم نمبر حاصل نہ کیے ہوں۔ امیدوار نے فزکس میں بی۔ایم۔سی کے معیار کا امتحان پاس کیا ہو یا پھر اس کے مساوی کوئی امتحان پاس کیا ہو۔		
۳۔	ایم۔ڈی (علم الادویہ/کلیات وعلم الامراض/معالجات)	بی۔یو۔ٹی۔ایس/بی۔یو۔ایم۔ایس/بی۔یو۔ایم۔ایم۔ایس/کامل الطب والجراحت (بی۔یو۔ایم۔ایس) امتحان اِس یونیورسٹی سے پاس کیا ہو یا اِس کے مساوی کوئی امتحان جو اِس یونیورسٹی سے تسلیم شدہ ہو، فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہو اور ایم ڈی کے لیے متعلقہ موضوع میں کم ازکم ۶۰ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں۔ کسی مخصوص موضوع میں کم ازکم چھ ماہ کا ہاؤس جاب تجربہ لازمی ہے۔ (برائے معالجات چھ ماہ کا ہاؤس جاب معالجات میں ہونا لازمی ہے) یا کم ازکم دو سال کا یونانی مطب کا عملی تجربہ لازمی انٹرن شپ کے بعد۔	۲۵ر جون ۸۶ء	۹۔۱۰ر جولائی ۸۶ء
	(III) فیکلٹی آف کامرس			
۴۔	ماسٹر آف بزنس ایڈمنسٹریشن (ایم۔بی۔اے) ۲ سال کا کورس	بی۔اے/بی۔ایس سی/بی کام/بی۔ایس سی انجینئرنگ/بی۔ایس سی ایگریکلچر یا اس کے مساوی کوئی امتحان جس میں مجموعی نمبر ۵۰ فیصد سے کم نہ ہوں۔	۲۷ر جون ۸۶ء	۲۵ر جولائی ۸۶ء

IV فیکلٹی آف سائنس

۵	ماسٹر آف کمپیوٹر سائنس اینڈ ایپلی کیشن (ایم۔سی۔اے) ۳ سالہ کورس	بی۔ایس سی کی ڈگری جس میں کم از کم ۶۰٪ فیصد نمبر فزکس اور میتھ میٹکس میں حاصل کیے ہوں / اسٹیٹسٹکس بحیثیت ایک خصوصی یا پھر اضافی مضمون کے بی۔ایس سی میں پڑھا ہو۔	۲۸؍جون ۸۶ء	۳۰؍جولائی ۸۶ء
۶	پوسٹ بی۔ایس سی ڈپلوما کمپیوٹر سائنس اور ایپلی کیشنز میں (پی۔ڈی۔سی۔اے) ایک سالہ کورس	فزکس کے ساتھ بی۔ایس سی کی ڈگری جس میں ۶۰٪ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں اور میتھ میٹکس / اسٹیٹسٹکس بطور ایک خصوصی یا پھر اضافی مضمون کے پڑھا ہو۔	۲۸؍جون ۸۶ء	۳۰؍جولائی ۸۶ء
۷	پی۔جی۔ڈپلوما ہائیڈرو جیولوجی میں ایک سالہ کورس	ایم۔ایس سی یا ایم ٹیک جیولوجی / اپلائیڈ جیولوجی یا جیو فزکس میں۔ اور اس میں کم از کم ۶۰٪ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں۔ یا بی۔ایس سی انجینئرنگ (سول) پاس شدہ اور اس میں ۶۵٪ فیصد سے کم نمبر حاصل نہ کیے ہوں۔	۲۸؍جون ۸۶ء	۱۶؍جولائی ۸۶ء

V فیکلٹی آف سوشل سائنس

۸	بی۔ایڈ۔ ایک سالہ کورس۔	(۱) بی۔اے / بی۔ایس سی / بی کام یا ان کے مساوی کوئی امتحان۔ ان میں مجموعی طور پر ۵۰٪ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں۔ اور کم از کم دو اسکول سبجیکٹس مثلاً انگریزی / اردو / ہندی / ہسٹری / جغرافیہ / سیوکس / اکونومکس / فزیکل سائنسز / بائیولوجیکل سائنسز / میتھ میٹکس / ہوم سائنس / کامرس گریجویشن میں رہے ہوں۔ (۲) اگر گریجویشن میں مجموعی نمبر ۵۰٪ فیصد سے کم ہوں تو کسی اسکول سبجکٹس میں سکنڈ ڈویژن میں ماسٹر ڈگری ہونا چاہیے۔	۲۲؍جون ۸۶ء	۲۲؍جولائی ۸۶ء

۹	ایم۔ ایڈ ایک سالہ کورس	بی۔ ایڈ یا اس کے مساوی کوئی امتحان — بی۔ ایڈ کے تھیوری کے پیپر میں مجموعی نمبر ۵۰٪ فیصد حاصل کیے ہوں۔	۲۲ر جون ۸۶ء	۲۳ر جولائی ۸۶ء
۱۰	بی۔ لب۔ سائنس۔ ایک سالہ کورس	بی۔ اے / بی۔ ایس سی / بی کام اس یونیورسٹی سے پاس کیا ہو یا ان کے مساوی کوئی امتحان — اور ان میں کم از کم ۴۵٪ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں۔ یا بی۔ اے / بی۔ ایس سی / بی کام میں ۴۵٪ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں اور ساتھ میں کسی منظور شدہ لائبریری میں ۵ سال کام کرنے کا تجربہ رکھتے ہوں۔ یا بی۔ اے / بی۔ ایس سی / بی کام میں ۴۵٪ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں اور ساتھ ہی ساتھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے یا کسی ایسے ادارے سے یا یونیورسٹی سے جو اس یونیورسٹی کے نزدیک تسلیم شدہ ہو سکنڈ ڈویژن میں ماسٹرس ڈگری حاصل کی ہو۔	۳۰ر جون ۸۶ء	۱۰ر جولائی ۸۶ء
۱۱	ایم۔ لب۔ سائنس ایک سالہ کورس	I- بی۔ لب سائنس یا اس کے مساوی کوئی امتحان پاس کیا ہو۔ اور اس میں کم از کم ۴۸٪ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں۔ II ایسے مستند اداروں کے لائبریرین جو ذمہ دارانہ پوزیشن پر فائز ہوں اور انھوں نے بی۔ لب سائنس سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا ہو وہ بھی ایڈمیشن ٹیسٹ اور انٹرویو میں شرکت کے لیے موزوں تصور کیے جائیں گے۔	۳۰ر جون ۸۶ء	۱۱ر جولائی ۸۶ء
	III انسٹی ٹیوٹ آف بائیوٹیکنالوجی			
۱۲	ایم۔ ایس سی۔ بائیوٹیکنالوجی ۲ سالہ کورس	بائیولوجیکل سائنس، فزیکل سائنسز، ایگریکلچر و ویٹرنیری سائنس میں بیچلرز ڈگری اور یا	۲۶ر جون ۸۶ء	۱۵-۱۶ر جولائی ۸۶ء

		بیچلرز ڈگری انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی (بی۔ٹیک) میں یا میڈیسن (ایم۔بی۔بی۔ایس) ڈگری۔ اِن میں مجموعی طور پر کم از کم ۵۰٪ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں۔		
	VII سینٹر آف پروفیشنل کورسز			
۱۳	ڈپلوما کمپیوٹر پروگرامنگ میں ایک سالہ کورس	اِس یونیورسٹی سے بیچلرز ڈگری یا اس کے مساوی کوئی امتحان جس کو یہ یونیورسٹی بیچلرز ڈگری کے مساوی تسلیم کرتی ہو۔ اور اِن میں مجموعی طور پر کم از کم ۵۰٪ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں۔	۲۸ جون ۸۶ء	۳۱ جولائی ۸۶ء
	VIII اسکول آف نرسنگ			
۱۴	جنرل نرسنگ اور مڈوائفری کورس میں ڈپلوما۔ ۳ سالہ کورس (صرف مستورات کے لیے)	سینیر سکنڈری اسکول سرٹیفکٹ کورس/انٹرمیڈیٹ یا ایک ایسا امتحان جس کو یونیورسٹی اِن کے مساوی تسلیم کرتی ہو، پاس کیا ہو۔ اور ان میں مجموعی طور پر کم از کم ۴۵٪ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں (وہ امیدوار جنھوں نے اوپر مذکورہ امتحانات سائنس کے مضامین اور انگریزی کے ساتھ پاس کیے ہیں اُن کو داخلے میں اولیت دی جائے گی)	۲۰ جون ۸۶ء	۱۲ جولائی ۸۶ء

شمار نمبر ۲، ۳، ۱ اور ۱۰ میں داخلے کے لیے تحریری مقابلہ جاتی ٹیسٹ ہوگا اور باقی ماندہ کورسوں میں داخلہ تحریری مقابلہ جاتی ٹیسٹ اور انٹرویو دونوں کی بنیاد پر ہوگا۔

کورس کے بارے میں جملہ تفصیلات، فیس کی ادائیگی، درخواست فارم بھیجنے کے قواعد وضوابط وغیرہ گائڈ ایڈمیشن ٹیسٹ نمبر ۳ میں دی گئی ہیں۔ درخواست داخلہ فارم اور گائڈ برائے داخلہ ٹیسٹ بذریعہ ڈاک اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ بکس ۲۵ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے یہاں سے بذریعہ ڈاک تین روپیہ کا کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر جو کہ فنانس آفیسر اے۔ایم۔یو۔ علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو بھیج کر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے لیے ایک خود کا پتہ لکھا ۹×۶ سائز کا ایسا لفافہ جس پر ۲۰ پیسہ کے ڈاک ٹکٹ چسپاں ہوں بھیجا جانا ضروری ہے۔

اگر امیدوار درخواست فارم بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک منگانا چاہیں تو اس صورت میں پتہ لکھے ہوئے لفافے پر 5.65 روپے کے ڈاک ٹکٹ چسپاں ہونا ضروری ہیں۔ اگر ایک سے زائد داخلہ فارم مطلوب ہوں تو مندرجہ بالا طریقہ پر درخواست کے ساتھ ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ لفافہ بھیجا جانا ضروری ہے۔

داخلہ فارم منگانے کے لیے درخواست میں صاف صاف یہ بیان کیا جائے کہ کس کورس کے واسطے داخلہ فارم طلب کرنا چاہتے ہیں۔ درخواست فارم اور اُس کے متعلق دوسری معلومات، اوپر تحریر شدہ طریقے پر، یا پھر -/3 روپے نقد ادا کر کے درج ذیل ریجنل انفارمیشن اور گائڈنس سینٹر سے بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر فخر الدین محمد۔ سر نظامت جنگ میموریل لائبریری۔ مدینہ مینشن۔ نارائن گدا۔ حیدر آباد ۵۰۰۰۲۹

۲۔ پروفیسر ڈاکٹر یو محمد۔ بیت الحمد۔ ۱۰۔ زکریا ایونیو۔ اگور۔ مدراس ۶۰۰۰۰۸

۳۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں۔ غوثیہ انڈسٹریل اینڈ انجینرنگ ٹرسٹ ۔ ہوسر روڈ۔ بنگلور۔ ۵۶۰۰۲۹

۴۔ مسٹر کے۔ عبدالرشید ۔ جنرل سکریٹری اے۔ ایم۔ یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن۔ الفا ٹریولس۔ الکاپوری بلڈنگ کلکتہ۔ ۶۷۳۰۰۲

۵۔ ڈاکٹر اے۔ یو شیخ۔ آئی۔ اے۔ ایس (ریٹائرڈ) چیرمین دی شاد آدم شیخ ٹرسٹ۔ ۱۱۔ للت ودے ہاؤس روڈ۔ بمبئی ۴۰۰۸۳۹

بیرونی امیدوار (جو اے۔ ایم۔ یو کے طالب علم نہ ہوں) کے داخلہ فارم جو ہر طرح سے مکمل ہوں اور ساتھ میں ۲۵/- روپے یا ۳۵/- روپے، جس کورس کے لیے جو بھی ضروری ہو، برائے رجسٹریشن اور ایڈمیشن ٹیسٹ فیس (ناقابل واپسی) کا کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو، اسسٹنٹ رجسٹرار (داخلہ) پوسٹ بکس نمبر ۲۵ اے ایم یو علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے یہاں شام پانچ بجے تک اُس آخری تاریخ میں جو کورس کے سامنے دی گئی ہے، ہر حالت میں پہنچ جانا چاہیئے۔

اے۔ ایم۔ یو کے طلبا اپنے ہر طرح سے مکمل فارم، مطلوبہ فیس اور دیگر کاغذات، داخلہ کے لیے ضروری امتحان کی مارکس کی مصدقہ نقل آخری تاریخ سے (جو ایڈمیشن آفس میں پہنچنے کے لیے مقرر ہے) دو روز قبل اپنے متعلقہ ہال کے پرووسٹ کے یہاں جمع کر دینی چاہئیں۔

نامکمل یا دیر سے موصول ہونے والی درخواستیں ناقابل قبول ہوں گی۔ اور اُن کے سلسلے میں مزید کوئی خط وکتابت نہیں کی جا سکے گی۔

این۔ مؤیدین

کنٹرولر آف ایگزامنیشن اینڈ ایڈمیشن

[197/303]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

داخلہ نوٹس نمبر ۶

سیشن ۸۷-۱۹۸۶

سیشن ۸۷-۸۶ء کے واسطے مقررہ فارم پر موزوں اور اہل امیدواروں سے درج ذیل کورسوں میں داخلے کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

یونیورسٹی کے ایڈمیشن آفس میں تکمیل شدہ درخواست فارم موصول ہونے کی آخری تاریخ ہر کورس کے سامنے تحریر ہے۔

نمبر شمار	کورس کا نام	وصولیابی کی آخری تاریخ
۱	ویمنز پالی ٹیکنک میں ڈپلوما کورسز ا۔ الیکٹرانکس انجینئرنگ ب۔ الیکٹریکل انجینئرنگ (ٹی۔وی۔ ٹیکنالوجی) ج۔ کاسٹیوم ڈزائننگ اینڈ ڈریس میکنگ۔ د۔ آفس اسسٹنٹ شپ اینڈ سکریٹیریل پریکٹس۔	۱۸ر جون ۸۶ء
۲۔	ڈرافٹس مین شپ میں سرٹیفکٹ (سول / مکینکل)	
۳۔	ڈپلوما آف ٹیچنگ (اردو میڈیم)	
۴۔	ڈپلوما اِن سٹینو ٹائپنگ	
۵۔	ڈپلوما اِن ڈرافٹنگ اینڈ ڈزائننگ (سول / مکینکل)	۲۰ر جون ۸۶ء
۶۔	ایم۔ ایس سی انجینئرنگ (سول / الیکٹریکل / مکینکل)	۲۶ر جون ۸۶ء
۷۔	پی۔ جی۔ ڈپلوما پٹرولیم پروسیسنگ میں	
۸	ایم۔ ٹیک (کمپیوٹر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی) (اس کورس میں داخلہ (یو۔ جی سی سے مہیا کیے جانے والے وظیفہ کے بعد ہی ہو سکے گا)	
۹۔	بی۔ اے (ایوننگ کورس)	۱۷ر جون ۱۹۸۶ء
۱۰	پوسٹ ایم۔اے ڈپلوما اِن اردو ٹرانسلیشن	یکم جولائی ۱۹۸۶ء

نمبر شمار	کورس کا نام	وصولیابی کی آخری تاریخ
۱۱	انگریزی زبان اور ادب میں پوسٹ ایم۔اے ڈپلوما	یکم جولائی ۱۹۸۶ء
۱۲	پرسنل منیجمنٹ میں ڈپلوما۔	
۱۳	مارکٹنگ منیجمنٹ میں ڈپلوما۔	

کورسز کے بارے میں تفصیلات، داخلے کے واسطے کم سے کم تعلیمی صلاحیت، داخلے کے متعلق قواعد وضوابط وغیرہ گائڈ ٹو ایڈمیشن ۸۶ میں دیے گئے ہیں۔

۔ درخواست داخلہ فارم اور گائڈ اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ بکس نمبر ۲۵ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے یہاں سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ اس کے لیے -/۳ روپے کا کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر جو کہ فنانس آفیسر اے ایم یو علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو، اور ساتھ میں ایک اپنا پتہ لکھا ۹x۶ سائز کا لفافہ جس پر 2.50 کے ٹکٹ چسپاں ہوں روانہ کریں۔

اگر درخواست فارم بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک حاصل کرنا چاہیں تو اس صورت میں اپنے پتہ لکھے ہوئے لفافے پر 5.25 کے ڈاک ٹکٹ چسپاں کریں۔

اگر ایک سے زائد داخلہ فارم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ایک درخواست کے ساتھ ہر فارم کے حصول کے لیے علیحدہ لفافہ ارسال کریں۔

درخواست فارم، دیگر معلومات کے لیے اوپر تحریر شدہ طریقے پر یا پھر نقد -/3 روپے جمع کرکے درج ذیل ریجنل انفارمیشن اور گائڈنس سینٹرز سے بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں

۱۔ ڈاکٹر فخرالدین محمد۔ سر نظامت جنگ میموریل لائبریری۔ مدینہ مینشن نرائن گدا۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۲۹

۲۔ پروفیسر (ڈاکٹر) یو۔محمد۔ بیت الحمد۔ ۱۰۔ زکریا ایونیو۔ اگمور۔ مدراس۔ ۶۰۰۰۰۸

۳۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں۔ غوثیہ انڈسٹریل اینڈ انجینرنگ ٹرسٹ۔ ہوسر روڈ بنگلور ۵۶۰۰۲۹

۴۔ مسٹر کے۔ عبدالرشید۔ جنرل سکریٹری اے ایم یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن۔ الفائر بوکس۔ الکاپوری بلڈنگ۔ کلکتہ ۷۰۰۰۷۲

۵۔ ڈاکٹر اے۔ یو شیخ۔ آئی۔ اے۔ ایس (ریٹائرڈ)۔ چیرمین دی شاد آدم شیخ ٹرسٹ۔ ۱۱۔ للت۔ ودے ہاؤس روڈ بمبئی ۴۰۰۰۳۹

درخواست فارم جمع کرنے کا طریقہ

طالبات کے لیے

وہ لڑکیاں جو ویمنز پالی ٹیکنک کے ڈپلوما کورسوں میں داخلے کی خواہش مند ہوں اُن کو چاہیے کہ وہ اپنی ہر طرح سے تکمیل شدہ درخواستیں، مطلوبہ کاغذات، داخلے کے لیے لازمی امتحانات کے مارکس لسٹ کی مصدقہ نقل کی کاپی اور رجسٹریشن فیس وغیرہ پرنسپل ویمنز پالی ٹیکنک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے یہاں مقررہ تاریخ تک جمع کرادیں۔

اس یونیورسٹی کے طلبا کو چاہیے کہ وہ اپنی ہر طرح سے تکمیل شدہ درخواستیں، مطلوبہ کاغذات کے ساتھ جس میں داخلے کے لیے لازمی امتحان کے مارکس لسٹ کی مصدقہ نقل اور رجسٹریشن فیس وغیرہ اپنے متعلقہ ہال کے پرووسٹ آفس میں درخواست جمع کیے جانے کی مقررہ آخری تاریخ سے دو روز قبل جمع کر دیں۔

دیگر

دیگر تمام امیدوار اپنی درخواستیں جو ہر طرح سے مکمل ہوں، مطلوبہ کاغذات جس میں داخلہ کے لیے لازمی امتحان کے مارکس لسٹ کی مصدقہ نقل کی کاپی اور رجسٹریشن فیس اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ بکس نمبر ۲ ۵ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۰۲۰۰۱ کے یہاں مقررہ تاریخ تک جمع کر دیں۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں ناقابل قبول ہوں گی اور اس سلسلے میں کوئی خط و کتابت بھی نہیں کی جائے گی۔

این۔ موئیدین

کنٹرولر امتحانات اور داخلہ

[219 · 326]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

تصحیح

برائے داخلہ اشتہار نمبر ۴

(ایم۔ ڈی/ایم ایس اور ڈپلوما کورسز)

کلاز نمبر ۴ "کم سے کم مطلوبہ لیاقت" کے تحت

"..... بہرحال وہ امیدوار جو اپنا ایک سال کا ہاؤس جاب ۱۵ر جنوری ۱۹۸۷ء (بجائے ۳۱ر دسمبر ۸۶ء جیسا کہ پچھلے اشتہار میں تحریر کیا گیا ہے) کو مکمل کر رہے ہیں وہ بھی اس ٹیسٹ کے لیے درخواست دے سکتے ہیں وہ امیدوار جن کا ایک سال کا ہاؤس جاب ۱۵ر جنوری ۱۹۸۷ء تک مکمل ہو رہا ہے (بجائے ۳۱ر دسمبر ۱۹۸۶ء کے جیسا کہ پچھلے اشتہار میں دیا گیا ہے) اُن کو ۱۶ر جنوری ۱۹۸۷ء سے داخلہ دیا جائے گا (بجائے ۱۵ر جنوری ۱۹۸۷ء کے جیسا کہ پچھلے اشتہار میں تحریر کیا گیا ہے)۔

دوسری تفصیلات میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔

این۔ موئیدین

کنٹرولر امتحانات اور داخلہ

[290/451]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار داخلہ نمبر ۷
سیشن ۸۷-۸۶ء

سیشن ۸۷-۸۶ء کے لیے درج ذیل کورسوں میں داخلے کے لیے اہل امیدواروں سے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔
یونیورسٹی کے ایڈمیشن آفس میں تکمیل شدہ درخواست فارم وصول ہونے کی آخری تاریخ ہر کورس کے سامنے تحریر ہے۔

نمبر شمار	کورس کا نام	درخواستوں کی وصولیابی کی آخری تاریخ
۱۔	بی۔اے (آنرز)/ بی۔ایس سی (آنرز)/ بی۔کام (آنرز) فیکلٹی آف آرٹس، سوشل سائنسز، سائنس اور کامرس کے تین سالہ ڈگری کورس کے پہلے سال میں۔	۲۳ جون ۱۹۸۶ء
۲۔	(الف) ایم۔اے (فیکلٹی آف آرٹس) عربی / انگریزی / فائن آرٹ / ہندی / لسانیات / ملیالم / فارسی / فلاسفی / سنسکرت / اردو۔ (ب) ایم۔اے۔ (فیکلٹی آف سوشل سائنس) اکونومکس / ایجوکیشن / ہسٹری / اسلامک اسٹڈیز / پولیٹیکل سائنس / سائیکلوجی / سوشیالوجی۔ (ج) ایم۔ایس سی (فیکلٹی آف سائنس) بائیوکیمسٹری / بوٹنی / کیمسٹری / جغرافیہ / جیالوجی / میتھمیٹکس / آپریشن ریسرچ / فزکس / اسٹیٹسٹکس / زولوجی۔ (د) ایم۔ایس سی (ایگریکلچر) (سینٹر آف ایگریکلچر) اینٹومولوجی / مائیکروبایولوجی / نیماٹولوجی / پلانٹ پیتھالوجی۔ (ہ) فیکلٹی آف کامرس۔ ۱۔ ایم کام ۲۔ ڈپلوما ان بینک ایڈمنسٹریشن (ڈی۔بی۔اے) ۳۔ ڈپلوما ان سکریٹریل ورکس (ڈی۔ایس۔ڈبلیو)	یکم جولائی ۱۹۸۶ء

(و) فیکلٹی آف تھیالوجی

۱۔ بیچلر آف تھیالوجی (بی۔ ٹی ایچ)

۲۔ ماسٹر آف تھیالوجی (ایم۔ ٹی ایچ)

یکم جولائی ۱۹۸۶ء

(ز) فیکلٹی آف لاء

۱۔ ایل ایل۔ بی ۲۔ ایل ایل۔ ایم

(ح) سینٹر آف پروفیشنل کورسز

ڈپلوما اِن پروفیشنل کورسز

۱۔ الیکٹرونکس ڈاٹا پروسیسنگ اینڈ مشین آپریشن۔ ۲۔ پیسٹ منیجمنٹ۔

۳۔ میوزیولوجی ۴۔ کمپنی لا، بینکنگ اینڈ انشورنس

۵۔ لیبر لا اور لیبر ریلیشن ۶۔ کریمنالوجی اور کریمنل ایڈمنسٹریشن۔

۷۔ لیبارٹری ٹیکنالوجی (فزیکل اور کیمیکل) ۸۔ جیم ٹیسٹنگ اور آرٹ آف لیپیڈیری

۹۔ میڈیکل لیب ٹیکنالوجی (ریڈیالوجی) ۱۰۔ جرنلزم

۱۱۔ اپلائیڈ آرٹ ۱۲۔ انسٹرومنٹ ٹیکنالوجی

۱۳۔ میڈیکل لیب ٹیکنالوجی (کلینکل پیتھالوجی) ۱۴۔ سکارٹوگرافی

۱۵۔ آرتھوپٹکس۔ ۱۶۔ پستی کلچر

کورسز کے بارے میں تفصیلات، داخلے کے واسطے کم سے کم تعلیمی قابلیت، داخلے کے متعلق قواعد وضوابط وغیرہ گائڈ ٹو ایڈمیشن ۸۷ میں دیے گئے ہیں۔

درخواست داخلہ فارم اور گائڈ برائے داخلہ اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ بکس نمبر ۵۲ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے یہاں سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

داخلہ فارم ڈاک سے منگانے کی صورت میں -/12 روپے (اس میں فارم کی قیمت اور رجسٹریشن فیس دو مضامین کے انتخاب کے لیے) بذریعہ کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر جو کہ فنانس آفیسر اے ایم یو کے نام واجب الادا ہو اور ایک 9x6 سائز کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور 2.50 کے ڈاک ٹکٹ (صرف ایک درخواست فارم کے لیے) چسپاں ہوں، بھیج کر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

اگر درخواست فارم بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک سے حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس صورت میں اپنے پتہ لکھے ہوئے لفافے پر 5.25 کے ڈاک ٹکٹ چسپاں کر کے ارسال کریں۔

اگر ایک سے زائد درخواست فارم حاصل کرنا چاہتے ہوں تو ایک درخواست کے ساتھ ہر ایک کے واسطے علیحدہ سے ایک مطلوبہ لفافہ ارسال کرنا ہوگا۔

درخواست فارم، دوسری معلومات کے لیے اوپر تحریر شدہ طریقے پر یا پھر نقد -/12 روپے جمع

کر کے درج ذیل ریجنل انفارمیشن اور گائیڈنس سینٹر سے بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر فخرالدین محمد۔ سر نظامت جنگ میموریل لائبریری۔ مدینہ مینشن۔ نارائن گدا۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۲۹

۲۔ پروفیسر ڈاکٹر یو۔ محمد۔ بیت الحمد۔ ۱۰۔ ذکریا ایونیو۔ اگمور۔ مدراس ۶۰۰۰۰۸

۳۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں۔ غوثیہ انڈسٹریل اینڈ انجینئرنگ ٹرسٹ۔ ہوسر روڈ۔ بنگلور ۵۶۰۰۲۹

۴۔ مسٹر کے۔ عبدالرشید۔ جنرل سکریٹری اے ایم یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن۔ الفا ٹریولس۔ الکاپوری بلڈنگ۔ کالی کٹ ۶۷۳۰۰۲

۵۔ ڈاکٹر اے۔ یو شیخ۔ آئی اے ایس (ریٹائرڈ)۔ چیرمین دی شاد آدم شیخ ٹرسٹ۔ ۱۱۔ لٹ۔ دوے ہاؤس روڈ۔ بمبئی ۴۰۰۸۳۹

درخواست فارم جمع کرنے کا طریقہ

۱۔ **طالبات امیدواروں کے لیے۔**

بی۔ اے آنرز (آرٹس اور سوشل سائنسز) اور بی۔ ایس سی آنرز کورسز میں داخلے کی خواہش مند ایکسٹرنل لڑکیاں اپنی ہر طرح سے مکمل درخواستیں جس میں مطلوبہ تمام دستاویزات اور داخلہ کے لیے ضروری پاس شدہ امتحان کی مارکس لسٹ کی مصدقہ نقل منسلک ہو اور اضافی انتخاب مضامین کے لیے، اگر چاہیں تو، بمعہ مطلوبہ فیس کے پرنسپل ویمنز کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے یہاں مقررہ تاریخ تک جمع کر دیں۔

ب۔ **انٹرنل امیدوار**

تمام انٹرنل طالب علموں کو چاہیے کہ وہ اپنی ہر طرح سے مکمل داخلہ درخواستیں جس میں تمام مطلوبہ کاغذات اور داخلے کے لیے لازمی امتحان کے مارکس لسٹ کی مصدقہ نقل ہو اور ساتھ میں انتخاب مضامین کے لیے اضافی انتخاب، اگر چاہیں تو، بمعہ مطلوبہ رجسٹریشن فیس کے اپنے متعلقہ پروسٹ آفس میں فارم جمع کیے جانے کی آخری تاریخ سے دو روز قبل جمع کر دیں۔

[ج] **دوسرے**

دیگر تمام طلباء کو چاہیے کہ وہ اپنی تکمیل شدہ درخواستیں اور اُن کے ساتھ دیگر مطلوبہ کاغذات داخلے کے لیے لازمی امتحان کی مارکس لسٹ کی مصدقہ نقل مزید دو سے زائد اضافی انتخاب مضامین اگر چاہیں تو، کے لیے مطلوبہ رجسٹریشن فیس کے ساتھ اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ بکس نمبر ۵۲۔ اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے یہاں مقررہ تاریخ تک پہنچا دیں۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں قابل قبول نہیں ہوں گی اور نہ ہی ان کے سلسلے میں کوئی خط و کتابت کی جائے گی۔

این مو شید ہی

کنٹرولر اگزامینشنز اور ایڈمیشنز۔

[258-363]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

تصحیح

برائے

داخلہ اشتہار نمبر ۱ اور نمبر ۷

سیشن ۸۷-۱۹۸۶ء

یو۔ پی، بہار بورڈ اور دیگر قریبی یونیورسٹیوں کے امتحانات کے نتائج کے اعلان میں تاخیر کے سبب یہ طے کیا گیا۔

کہ درج ذیل کورسوں میں داخلے کے لیے درخواستوں کی وصولیابی کی آخری تاریخوں کو آگے بڑھا دیا جائے۔ جن ؟

تفصیلاتِ حسبِ ذیل ہیں۔

کورس کا نام	درخواستوں کی وصولیابی کی سابقہ تاریخ	درخواستوں کی وصولیابی کی بڑھائی گئی
XI- کلاس [10+2]	۱۸ر جون ۱۹۸۶ء	۱۵ر جولائی ۱۹۸۶ء
بی اے/ بی. ایس سی/ بی کام آنرز پہلا سال	۲۳ر جون ۱۹۸۶ء	۱۰ر جولائی ۱۹۸۶ء
ایم اے/ ایم ایس سی/ ایم کام وغیرہ	یکم جولائی ۱۹۸۶ء	۲۲ر جولائی ۱۹۸۶ء

ایسی درخواستیں جو بڑھائی گئی مقررہ تاریخ کے بعد موصول ہوں یا داخلے کے لیے لازمی امتحانات کی مارکس لسٹ کی مصدقہ نقل کے بغیر موصول ہوں اُن کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

ایف۔ موئید

کنٹرولر امتحانات اور داخلہ

[370/1001]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

داخلہ اشتہار نمبر ۸

سیشن ۸۷-۱۹۸۶ء

سینٹر آف پروفیشنل کورسز میں ڈپلوما ان ہائی جینسٹ کم چیر سائڈ ڈینٹل اسسٹنٹ کورس میں داخلے کے لیے اہل امیدواروں سے مقررہ فارموں پر سیشن ۸۷-۱۹۸۶ء کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

داخلے کے لیے کم از کم تعلیمی لیاقت، کورس کی مدت، کم سے کم عمر کی حد اور درخواست فارم وصولیابی کی آخری تاریخ درج ذیل ہے۔

۱۔ کم از کم تعلیمی لیاقت:۔ سینئر سکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ یا اس کے مساوی امتحان سائنس سے پاس شدہ افراد کو ترجیح دی جائے گی۔

۲۔ کورس کی مدت:۔ ۱۵-۱۰ ماہ

۳۔ کم از کم عمر کی حد:۔ ۱۵ سال (۳۱ دسمبر ۸۶ء تک)

۴۔ درخواست وصولیابی کی آخری تاریخ:۔ یکم جولائی ۱۹۸۶ء

کورس میں داخلہ میرٹ کی بنیاد پر دیا جائے گا۔

درخواست فارم اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشنز) پوسٹ بکس نمبر ۵۲ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے یہاں سے ۱۲/ روپے بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر (کراسڈ) جو کہ فنانس آفیسر اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو اور ساتھ میں اپنا پتہ لکھا 9x6 سائز کا ایسا لفافہ جس پر Rs 2.50 کے ڈاک ٹکٹ چسپاں ہوں (صرف ایک فارم کے لیے) روانہ کر کے بذریعہ ڈاک حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اگر درخواست فارم بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک حاصل کرنا چاہیں تو لفافۂ مذکور پر Rs 5.25 کے ڈاک ٹکٹ چسپاں ہونا ضروری ہیں۔ اگر ایک سے زیادہ فارم حاصل کرنا چاہتے ہوں تو ہر درخواست فارم کے لیے علیحدہ علیحدہ مذکورہ لفافے بھیجنا ضروری ہیں۔

امیدواروں کو چاہیئے کہ وہ ہر طرح سے مکمل درخواست فارم، مطلوبہ کاغذات جس میں داخلے کے لیے لازمی امتحان کے مارکس لسٹ کی مصدقہ نقل کی کاپی شامل ہو، اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشنز) پوسٹ بکس نمبر ۵۲ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے یہاں مقررہ تاریخ تک جمع کر دیں۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں ناقابل قبول ہوں گی اور ان کے سلسلے میں مزید خط و کتابت بھی نہیں کی جائے گی۔

این۔ موئیدین

کنٹرولر امتحانات اور داخلہ

[310/470]



مالک: تہذیب الاخلاق ٹرسٹ۔ علی گڑھ۔ پرنٹر پبلشر: نورالحسن نقوی۔ مقام اشاعت: شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پریس ایس کے آفسیٹ پریس دہلی۔

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

پرسنیج / آئیٹم ریٹ کی بنیاد پر درج ذیل کام کے لیے سربمہر ٹینڈرز مطلوب ہیں۔ جو کہ ۱۹ جولائی ۱۹۸۶ء دوپہر ایک بجے تک موصول ہو جانا چاہئیں۔ ٹینڈرز اسی روز ساڑھے تین بجے دوپہر کو کھول دیے جائیں گے۔ ٹینڈر فارم وغیرہ یونیورسٹی انجینئر کے دفتر سے آفس ٹائم میں چھٹی کے دن کے علاوہ کسی روز بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔
ٹینڈرز فارم کی فروخت، ٹینڈرز کی وصولیابی کی مقررہ تاریخ سے، ۲۴ گھنٹے قبل بند کر دی جائے گی۔

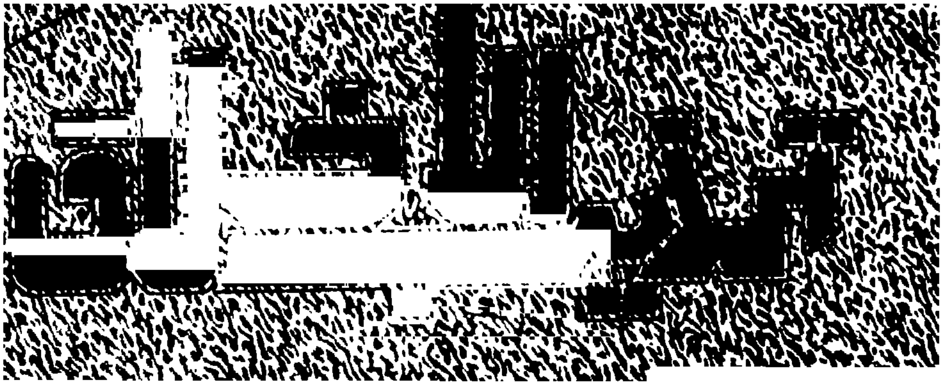
نمبر شمار	کام کا نام	کام کے لیے مختص رقم	زرِ ضمانت	ٹینڈر فارم کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱۔	فوڈ اینڈ کرافٹ آف پالی ٹیکنک ورکشاپ میں پینٹری۔کم۔اسٹور کی تعمیر	45,605/- روپے	1140/- روپے	5/- روپے	چار ماہ

ڈی۔ایس۔آر ۱۹۸۱ء کی بنیاد پر۔

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر
یونیورسٹی انجینئر

(7414/1067)

Litho Colour Printers, Achal Tal, G. T. Road, Aligarh Phone : 4185



مندرجات

اداریہ		۳
کن کن چیزوں میں تہذیب چاہیے	سرسید احمد خاںؒ	۵
مسلمان اور سائنسی تعلیم	پروفیسر عبدالسلام / پروفیسر اسرار احمد	۸
لکھنوتی کے خلجی خاندان کا آخری فرمانروا	پروفیسر نذیر احمد	۱۲
خالد بن ولید	پروفیسر قاضی عبدالستار	۲۲
قرآن مجید اور سائنسی علوم	حکیم الطاف احمد اعظمی	۲۷
یہ حقیر جراثیم ــ درس گاہ توحید کے معلم	پروفیسر سید کاظم نقوی	۴۰
زبانِ ہندوی میں صوفیا کی روایت	ڈاکٹر محمد انصار اللہ	۴۴
عرشی زادہ طریقہ تعلیم	ڈاکٹر ابو محمد سحر	۴۹
سرکاری ملازمتوں میں مسلمان ـ تمایل نہیں	نسیم اے۔ زیدی / سید شفیق احمد	۵۲
ابتدائی تعلیم ـ ایک جائزہ، ایک خاکہ	شیخ سلیم احمد	۵۴
نشہ آور دواؤں کی مہلک وبا	حکیم محمد مختار اصلاحی	۵۸
نابغہ ذبیانی اور اس کی شاعری	محمد صابر صبر حدی	۶۱

اداریہ

سنٹرل سروسز میں امسال منتخب ہونے والے امیدواروں کی فہرست سامنے ہے۔ سطر در سطر نگاہوں کو اُن ناموں کی تلاش ہے جن کے بہت کم پانے کے امکان کے باوجود کچھ زیادہ پالینے کی ایک موہوم سی امید بھی ہے۔ کسی مسلمان کا نام شاید اس سطر میں ہو، یا اُس سطر میں، کرتے کرتے جب امیدیں تقریباً دم توڑ چکنے کو تھیں کہ اکیاسیویں نمبر پر پہلے مسلمان کا نام ملا۔ کچھ ایسا مقامِ شکر نہ ہوتے ہوئے بھی شکر ادا کیا۔ اس کے بعد پھر وہی سلسلہ۔ اُسی امید و بیم کی کیفیت۔ کسی مسلمان کا نام اتفاقاً مل گیا تو مل گیا۔ اس طرح سات سو نوّے کی لمبی فہرست میں کل دس یا گیارہ مسلمانوں کے نام نظر آئے۔ یعنی دو فیصد سے بھی کم۔ جب کہ ملک میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے کم سے کم نوّے مسلمانوں کو منتخب ہونا چاہیے تھا۔ بات یہیں پر ختم ہو جاتی تو غنیمت تھا۔ مقابلہ میں کسی بھی مسلم امیدوار نے کوئی نمایاں مقام حاصل نہ کیا۔ اور پھر یہ کوئی اتفاقی بات نہیں کہ صرف اسی سال کا نتیجہ مسلمانوں کے لحاظ سے مایوس کن ہے۔ یہ ہر سال کا رونا ہے۔ احساسِ ناکامی اور حسرت و یاس کا ایک سلسلہ ہے جو مدتوں سے چلا آرہا ہے۔

سنٹرل سروس میں مسلمانوں کی کم تعداد میں آنے کی وجہ کیا ہے؟ ملک کے اکثریتی فرقہ کا تعصب؟ گورنمنٹ کی کوئی خفیہ پالیسی کہ مسلمانوں کو کلیدی آسامیوں سے دور رکھا جائے؟ یا خود مسلمانوں کی غفلت اور ناعاقبت اندیشی؟ اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اس معاملہ میں نہ تو کوئی تعصب کار فرما ہے اور نہ ہی کوئی خفیہ پالیسی۔ اس کی وجہ ہے خود مسلمانوں کی غفلت، ان کی کوتاہ نظری اور اُن کی تن آسانی۔ جب مسلمان جدید تعلیم سے دور بھاگے گا، محنت کرنے سے کترائے گا اور مقابلہ جاتی امتحانات میں شریک ہونے سے گریز کرے گا تو پھر دنیا کی وہ کون سی میکنزم ہے جس کے ذریعے ان مقابلوں میں کامیاب ہونے والے مسلم امیدواروں کی تعداد بڑھائی جاسکے۔ کسی قسم کے تعصب یا زیادتی کے امکان کا سوال اس وقت اُٹھتا جب کثیر تعداد میں مسلم نوجوان خوب تیاری کر کے اِن مقابلہ جاتی امتحانات میں شریک ہوتے اور نہ منتخب کیے جاتے۔ جب آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ان امتحانات میں شریک ہونے والے مسلمانوں کی تعداد ہی کم ہو تو اُن کے کم تعداد میں منتخب ہونے کا الزام کسی اور کے سر ڈالنا خود فریبی ہوگی۔ اور اس خود فریبی کے جال سے ہندوستانی مسلمان جتنی جلد نکل آئے اس کے حق میں بہتر ہوگا۔

بات صرف سنٹرل سروس کی دوڑ میں ہی پیچھے رہ جانے تک محدود نہیں بلکہ یہ تلخ حقیقت ہر سنجیدہ فکر ہندوستانی پر واضح ہے کہ ہر اُس دوڑ میں جس کا تعلق جدید تعلیم سے ہے ہندوستانی مسلمان دوسروں کے مقابلے میں کافی پیچھے ہیں۔ اور یہ کہ ان کے درمیان فاصلہ بجائے کم ہونے کے دن بدن بڑھتا چلا جارہا ہے۔ مثال کے طور پر یہ زمانہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا ہے۔ ملک تیزی سے اس میدان میں آگے بڑھ رہا ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس صدی کے خاتمے تک تقریباً ہر شعبہ میں جدید ٹیکنالوجی کا دخل ہو جائے گا۔ مگر مسلمان ہے کہ اس خاموش ملکی اور سماجی انقلاب سے بے خبر اپنی اُسی پُرانی ڈگر پر چلا جارہا ہے۔ ماضی پہ نازاں، حال سے ہراساں اور مستقبل سے بے پروا۔ ملک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا ایک بھی ایسا قابلِ ذکر ادارہ نہیں جس میں مسلمان ایک فیصد سے زیادہ ہوں۔

آج ہندوستان میں مسلمانوں کی بے شمار جماعتیں اور تنظیمیں ہیں۔ ہر جماعت اپنے اپنے انداز سے مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور اُن کی ترقی کے لیے کوشاں ہے۔ سب ہی اپنی اپنی جگہ مخلص ہیں۔ ہر ایک کے پیچھے ان کے اکابر کی قربانیاں ہیں۔ اس کے باوجود ہندوستانی مسلمان ہے کہ معاشی، سماجی اور

تعلیمی پسماندگی کے دلدل میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ خدا ان جماعتوں کی کوششوں کو برکت سے کیوں نہیں نوازتا؟ ہمارے نزدیک ا
یہ ہے کہ ان تنظیموں اور جماعتوں کی بیشتر توانائی مختلف النوع وقتی اور جذباتی مسائل میں الجھ کر صرف ہو جاتی ہے۔ اس لیے کسی طویل منصوبہ بند کام کے
پاس نہ وقت بچتا ہے اور نہ ضروری توانائی۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ جس ڈھانچہ میں رہ کر یہ تنظیمیں کام کر رہی ہیں وہ اس زمانہ کے مزاج سے م
نہیں رکھتا۔ وہ زمانہ گیا جب ایک طبیب نبض پر ہاتھ رکھ کر نسخہ لکھ دیا کرتا تھا۔ آج انسانی امراض اور ان کی تشخیص کے علم میں وہ وسعت آگئی ہے کہ
کی صحیح تشخیص اور اس کے مناسب علاج کے لیے کئی کئی ماہرین کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی طرح آج انسانی معاشرہ کے مسائل میں وہ الجھاؤ، وز
اور وہ پیچیدگیاں آگئی ہیں کہ کسی ایک انسان یا جماعت کی فکر یا اس پر مبنی طریق کار کے بس کی بات نہیں کہ ان کا ہر پہلو سے ماہرانہ گرفت کے ساتھ م
کر سکے۔ مسلم جماعتوں اور تنظیموں کے طریق کار میں ایک بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ اپنے علاوہ کسی اور کو 'صراطِ مستقیم' پر نہیں سمجھتیں۔ گو وہ اس
اعلان نہیں کرتیں مگر مختلف ملی مسائل پر ان کا رویہ اور طرزِ عمل ان کی اس سوچ کا اعلانیہ اظہار ہے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ان کے ذ
کا یہ اقلیدسی تصور کہ دو نقطوں کے درمیان صرف اور صرف ایک ہی سیدھی لکیر ممکن ہے۔ خمیدہ زمان و مکان میں لایعنی ہے۔ راہ پیچ و خم سے پُر ہو تو
کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔ اشتراکِ باہم اور آپسی تعاون ہمیشہ سے ہی کسی انسانی گروہ کی ترقی و کامیابی کا ضامن رہا ہے۔ مگر اس تیز رفتار سائنسی دور میں ا
اہمیت کچھ زیادہ ہی ہو گئی ہے۔ آج اس کے بغیر بقا بھی ممکن نہیں۔ پر کیا کہا جائے مسلم جماعتوں کے اس تصورِ صراطِ مستقیم کو جو انھیں کسی طویل منصوبہ بند ا
بہبود کے کام کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع نہیں ہونے دیتا۔ مسلمانوں کو درپیش مسائل کی نوعیت، ان کی پیچیدگی، وسائل کی کمی اور ان پر طاری م
کا جمود اس بات کا متقاضی تھا کہ ساری جماعتیں باہم مل کر ان کی ترقی اور فلاح و بہبود کا ایک جامع منصوبہ بنائیں اور اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کر
مگر افسوس کہ آزادی کے بعد سے آج تک ایسا نہ ہو سکا۔ ہم ہندوستان کی ہر مسلم جماعت سے دردمندانہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ کم سے کم جدید تعلیم کے مید
میں مسلمانوں کی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیں، ایک جامع منصوبہ بنائیں اور سارے اختلافات بھول کر اسے بروئے کار لائیں۔ ورنہ زمانہ
دیگر اقوام کی تیز رفتاری، مسلمانوں کی جدید تعلیم کی بابت بے رغبتی اور ان کی تن آسانی کے پیشِ نظر کچھ بعید نہیں کہ آج جو چند مسلمانوں کے نام سنٹرل سروس
اس قسم کے مقابلہ جاتی امتحانات کے کامیاب امیدواروں کی فہرست میں نظر آ جاتے ہیں کل وہ بھی نظر نہ آئیں۔

ہمارے نزدیک مسلم نوجوانوں کا سنٹرل سروس میں نہ آنا ایک سنگین مسئلہ ہے۔ اس لیے نہیں کہ کچھ مسلمان اس گلیمر سے محروم رہ جاتے ہیں جو اس
سروس سے وابستہ ہے۔ بلکہ اس لیے کہ جب تک گورنمنٹ مشنیری میں مسلمانوں کی مناسب نمائندگی نہ ہو گی اس وقت تک مسلم اقلیت کی فلاح و بہبود، ان
ترقی اور ان کی شکایتوں کے ازالہ کا کوئی بھی سرکاری منصوبہ بخوبی انجام نہیں پا سکتا۔ یہ کوئی ایسی باریک بات نہیں جو مسلم لیڈر شپ کی سمجھ میں نہ آئے گا
خدا جانے کیا بات ہے جو وہ اس مسئلہ کو قابلِ توجہ نہیں سمجھتی۔ آج اگر مسلمانوں کی ہر جماعت یہ تہیہ کرے کہ وہ ہر سال کچھ ذہین اور ہونہار مسلم طلباء کو ہر قسم کی ف
سے آزاد کر کے سنٹرل سروس کے لیے تیاری کرائے گی تو کوئی وجہ نہیں جو آئندہ سال سے ہی ان سروسوں میں مسلمانوں کی تعداد نہ بڑھنا شروع ہو جائے

آپ کا

اسرار احمد

سر سید احمد خاں

کن کن چیزوں میں تہذیب چاہیئے

جب کہ ہم کسی قوم کو تہذیب کی طرف مائل کرتے ہیں تو ہم کو ضرور ہے کہ ہم یہ بھی بتا دیں کہ اس قوم کو کن کن چیزوں میں تہذیب کرنی چاہیے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے جو حالات ہیں اُن کے لحاظ سے ہمارے خیال میں آتا ہے کہ مفصلہ ذیل چیزیں ہیں جن کی تہذیب پر اُن کو متوجہ ہونا چاہیے:۔

آزادیٔ رائے۔ مسلمانوں کی رائے اور ان کے خیالات ہر ایک امر میں تقلید کرتے کرتے اور رسومات کے پابند رہتے رہتے ایسے پست اور پامال ہو گئے ہیں، جن کے سبب کسی قسم کی ترقی کی تحریک ان میں نہیں ہوتی پس جب تک کہ رائے کی آزادی ان میں پیدا نہ ہوگی، اس وقت تک ان میں تہذیب نہیں آنے کی۔

عقائد مذہبی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے عقائد مذہبی جو اُن کی کتابوں میں لکھے ہیں وہ اور ہیں، اور جو اُن کے دلوں میں ہیں اور جن کا اُن کو یقین بیٹھا ہوا ہے وہ اور ہیں۔ ہزاروں عقائد خرکیہ ان کے دلوں میں ہیں پس اپنے عقائد کو ہیئتِ اسلام کے مطابق کرنا تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کی اصل جڑ ہے۔

خیالات و افعال مذہبی:۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں صدہا خیال اور توہمات ایسے موجود ہیں جن کو وہ عمدہ افعال مذہبی سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ حالاں کہ ان کو مذہب اسلام سے کچھ علاقہ نہیں ہے۔ پس ہم کو مہذب ہونے کے لیے ان کی تہذیب درکار ہے۔

ان تمام چیزوں کو جو مذہب سے متعلق ہیں، ہم نے تہذیب و شائستگی میں اس لیے داخل کیا ہے کہ قوم کے مہذب ہونے پر مذہب کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ پس جس قدر جس قوم کے مذہب میں نقص ہے اتنا ہی اس کی پوری تہذیب میں نقصان ہے۔

تعلیم اطفال۔ مذہب کے بعد جو چیز سب سے ضروری ہے، وہ تعلیم ہے ہم کو زمانۂ گذشتہ اور حال پر نظر کر کر ایک ایسا طریقۂ تعلیم معین کرنا چاہیئے، جس سے علوم دینی اور دنیوی، دونوں قسم کی تعلیم کا، اعلیٰ درجہ تک ہم کو قابو ملے۔

عورتوں کی تعلیم۔ کچھ شبہ نہیں کہ قومی تہذیب و شائستگی کے لیے عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضرور ہے۔ پس ہم کو لڑکیوں کی تعلیم کے لیے، اور اُن کو دستکاری سکھلانے کے لیے، کوئی عمدہ بندوبست کرنا چاہیے۔

سامانِ تعلیم۔ ہمارے لئے صرف طریقۂ تعلیم معین کرنا ہی کافی نہ ہوگا بلکہ آپس کی مدد، اور مجموعی ہمت اور فیاضی سے اس کا سر و سامان بھی مہیا کر دینا ضرور ہوگا۔

ہنر و فن حرفہ۔ اپنی قوم میں ہر قسم کے ہنر اور صنعت اور فن و حرفہ کو پھیلانا و ترقی دینا، قومی تہذیب کے لیے ایک بہت بڑا جزو ہے۔

مندرجۂ بالا باتیں وہ تھیں جو مجموعاً و منفرداً، ہر شخص سے اور کل قوم سے علاقہ رکھتی تھیں۔ اب ان باتوں کا ذکر کرتے ہیں، جو ہر ایک شخص کی ذات سے علاقہ رکھتی ہیں، مگر ان کا اثر کل قوم پر ہوتا ہے، اور ہر ایک میں ان باتوں کے ہونے سے قومی تہذیب و شائستگی قرار پاتی ہے۔

خود غرضی:۔ سب سے بڑا عیب ہم میں خود غرضی کا ہے، اور یہی مقدم سبب قومی ذلت اور نا مہذب ہونے کا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو ضرور ہے کہ رفاہ عام کا جوش دل میں پیدا کریں اور یقین جانیں کہ خود غرضی سے تمام قوم کی، اور اس کے ساتھ اپنی بھی، بربادی ہوگی۔ جس قوم کے لوگوں میں خود غرضی ہوتی ہے، جیسے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ہے، تو وہ آپ اپنے تئیں برباد کرتے ہیں۔

عزت اور رفعت۔ غیرت اور عزت یہ دونوں آپس میں ایسی ملی ہوئی ہیں

کہ کبھی جُدا نہیں ہوتیں۔ جس کو عزت ہے اس کو غیرت ہے؛ جس کو غیرت ہے اس کو عزت ہے۔ اب مسلمانوں میں ان دونوں چیزوں کی کمی کیا، بلکہ وہ معدوم ہو گئی ہیں۔ کس کو اس بات کی غیرت ہے کہ ہم کو کوئی جھوٹا خیال نہ کرے! کس کو اس بات کا خیال ہے کہ ہم آپس میں اور معمولی باتوں میں بھی سچ کی عزت پر بٹہ نہ لگائیں۔ کون ہے جو بلحاظ اپنی اخلاقی عزت کے کسی بُرائی کے فعل سے، بشرطیکہ اس میں سزائے دنیاوی کا اندیشہ نہ ہو، بچ کر اپنے تئیں معزز رکھنا چاہتا ہے؟ مہذب اور شائستہ قوموں میں ان باتوں کا بہت خیال ہے۔

ضبط اوقات۔ ہماری قومی تہذیب و شائستگی میں اوقات کے منضبط نہ ہونے سے بڑا نقصان پہونچا ہے۔ ہر ایک کو اپنے خاص کاموں میں اپنے خاص اوقات کا، اور جو کام عام قوموں سے متعلق ہیں، ان میں تمام قوم کو یکساں اوقات منضبط کرنا چاہیے، کہ یہ بھی ایک اصل اصول قومی تہذیب و شائستگی کا ہے۔

اخلاق۔ بالفعل مدار اخلاق ہم لوگوں میں اس پر رہ گیا ہے کہ جس کسی سے ملے، کچھ ہنس کر سلام کیا، کچھ محبت کی جھوٹی باتیں بنائیں؛ دو چار میٹھی میٹھی باتیں سنائیں؛ کچھ اپنی جھوٹی نیاز مندی کا اظہار کیا؛ کچھ اُن کی جھوٹی تعریف کی، آؤ بھگت کی؛ اور دل میں کہا کہ خوب اُلو بنایا۔ جب وہ چلا گیا تو بُرا کہنے لگے؛ یا جو باتیں کی تھیں اُن کا نقش بر آب کا سا بھی نشان باقی نہ تھا۔ یہ سب باتیں انسان کے دل کو اور اس کے اخلاق کو خراب کر دیتی ہیں۔ بلاشبہ ہم کو سب سے جھک کر اور خندہ پیشانی سے ملنا چاہیئے، مگر وہیں تک، جہاں تک کہ انسانیت کا مقتضیٰ ہے، مگر اس کو مکاری کی حد تک نہ پہونچانا چاہیئے۔

صدق مقال۔ یہ تو وہ صفت ہے جو انسان کو قطب و ابدال کے درجے سے بھی بڑھا دیتی ہے۔ مگر یہاں ہمارا مطلب دنیاوی باتوں میں سچے پن کا ہے۔ ضرور ہے کہ سب لوگ سچ میں عزت سمجھیں۔ ایک شخص دوسرے کی بات کو سچ سمجھے، تاکہ قائل کو قبل کلام اس بات کی عزت ہو کہ سامع میرے اس قول کو جھوٹ نہ سمجھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اپنے لڑکوں سے خوش طبعی میں کہتے ہیں کہ "کیوں جھوٹ بولتا ہے لا" آپس میں ایک دوست دوسرے دوست سے کہتا ہے کہ "یہاں لا کیوں جھوٹ بولتے ہو!" ان باتوں سے جھوٹ کے عیب اور جھوٹ کے طعنہ کی غیرت دل سے جاتی رہتی ہے، جو بڑا سبب ذلت قومی اور نامہذب اور ناشائستہ ہونے قوم کا ہے۔

دوستوں سے راہ و رسم۔ ہماری راہ و رسم جو دوستوں سے ہے، اس میں بھی نہایت نقص ہیں۔ ہم آپس میں اس طرح نہیں ملتے جیسے انسان انسان سے ملتے ہیں؛ بلکہ اس طرح پر ملتے ہیں جیسے حیوان آپس میں ملتے ہیں۔ ان کا تمام طریقوں اور قاعدوں میں تہذیب کرنا ایک بڑا ضروری امر ہے۔

کلام و سخن۔ طرز گفتگو اور سیاق کلام بھی جزو اعظم تہذیب و شائستگی کا ہے۔ جس کی ہم میں بہت کسر ہے۔ ہمارے کلام میں وہ الفاظ جو مہذبانہ گفتگو میں ہوتے ہیں، نہایت کم مستعمل ہیں اور اس لیے اُس کی اصلاح کی بہت ضرورت ہے۔

لب و لہجہ۔ اس کو بھی تہذیب میں بڑا دخل ہے۔ اکھڑ لہجہ، یا اس قسم کی آواز، جس سے شبہ ہو کہ آدمی بولتے ہیں یا جانور لڑتے ہیں، ناشائستہ ہونے کی نشانی ہے۔ کسی قدر اس پر بھی ہم کو توجہ درکار ہے۔

طریق زندگی۔ یہ تو ہمارا ایسا ابتر و خراب ہے کہ ہم بے مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے جانور ایسے ہیں جن کا طریق زندگی ہمارے طریق زندگی سے نہایت عمدہ اور اچھا ہے۔

صفائی۔ بدن اور گھر اور لباس سب کی صفائی تہذیب میں داخل ہے۔ انگریزی مثل ہے کہ "خدا اور خدا کے بعد صفائی"۔ مسلمانوں کے ہاں بھی حدیث ہے کہ "الطہور شطر الایمان"، مگر ہم مسلمان بہت کم اس کی طرف متوجہ ہیں۔ صورت دیکھو تو واہ وا! گھر دیکھو تو سبحان اللہ! اس لیے ہم کو صفائی پر توجہ کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔

طرز لباس۔ لباس کی قطع اور وضع درست ہونی بہت بڑی نشانی تربیت یافتہ ہونے کی ہے۔ دیکھ لو کہ تمام دنیا میں جس قدر وحشیانہ پن کم ہوتا گیا، اسی قدر لباس کی درستی ہوتی گئی۔ پس ہم کو اپنے لباس کی طرف متوجہ ہو کر دیکھنا چاہیئے کہ کس قسم کی ترمیم کے لائق ہے۔

طریق اکل و شرب۔ اگر ہم تعصب نہ کریں اور انصاف سے دیکھیں تو ہمارا طریق اکل و شرب ایسا ہے کہ جو قومیں ہم سے زیادہ صفائی سے کھاتی ہیں، جب وہ ہم کو کھاتے ہوئے دیکھتی ہیں، تو ان کو گھن آتی ہے۔

تدبیرِ منزل — ہماری تدبیرِ منزل یعنی انتظام خانہ داری ایسا ابتر و خراب ہے، جس میں نہایت درجہ کی اصلاح و ترقی کی حاجت ہے۔

رفاہ عورتوں کی حالت مایں — اصلی حالت عورتوں کی بلا شبہ ترقی کے لائق ہے، اور ہمارا برتاؤ عورتوں کے ساتھ بہت سی اصلاح اور تہذیب کا محتاج ہے۔

کثرتِ ازدواج — یہ رواج نہایت نالائق ہے، خدا اور خدا کے رسول کے حکم کے برخلاف، برتا جاتا ہے۔ یہ ایسی بدخصلت مسلمانوں میں جاری ہے، جس کی بدولت اسلام کو شرمندگی اور بدنامی ہے۔

غلامی — ہمارے دل میں اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ درحقیقت یہ رسم خلاف مسلانی مذہب، اور فی نفسہٖ خراب و نالائق تھی۔ اس لئے ہم کو اس پر توجہ کرنے کی ضرورت باقی ہے۔

رسوماتِ شادی و غمی — جو رسومات شادی کی ہم مسلمانوں میں رائج ہیں، ایک بھی ان میں سے مذہب اسلام کی رسم نہیں ہے اور جیسی نالائق اور نامہذب وہ رسمیں ہیں، شاید ہی اور کوئی رسم اس سے زیادہ ناشائستہ اور نامہذب ہوگی۔ اسی طرح رسوماتِ غمی کا حال ہے، کہ برخلاف مذہب اسلام کے ہم نے یہ نامہذب اور ناشائستہ رسمیں اختیار کرلی ہیں۔ خدا رحمت کرے مولوی اسمٰعیل شہید پر، جن کی بدولت بہت سی نامہذب و ناشایستہ رسمیں شادی و غمی کی ہم میں سے چھوٹ گئی ہیں؛ مگر اس پر بھی بہت کچھ باقی ہے، جن کی تہذیب پر ہم کو متوجہ ہونا چاہیے۔

ترقیٔ زراعت — کھیتی باڑی کی ترقی اور کاشتکاروں کی حالت کی بہتری قومی ترقی اور تہذیب میں بڑا اثر رکھتی ہے؛ اور اس میں بہت کچھ کرنا ہے۔

تجارت — یہ سب سے آخر جزو ہے قومی ترقی اور تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کا؛ اور ہم مسلمانوں میں سے یہ امر بالکل متروک ہوگیا ہے۔ پس ہم کو اپنی قوم میں اس کا رواج دینا اور عمدہ اصول پر اس کو قائم کرنا، ایک بہت بڑا امر واسطے تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کا ہوگا۔

یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ تمام دنیا کی چیزوں کی ترقی ہم سے کیوں کر ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ اگر ہم متوجہ ہوں گے اور تہذیب و شائستگی حاصل کرنے پر دل لگا دیں گے تو سب کچھ ہم سے ہو سکے گا۔ یہ باتیں ظاہر میں بہت سی معلوم ہوتی ہیں، لیکن آپس میں ایک دوسرے سے ایسا علاقہ رکھتی ہیں، کہ جب ایک بات میں ترقی شروع ہوتی ہے تو ہر ایک بات میں از خود ترقی ہو جاتی ہے۔ پر کوشش شرط ہے

"السعیُ مِنّی وَالاِتمامُ مِنَ اللّٰہ"

"ایوب بن موسیٰ رضؓ اپنے والد اور اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کسی باپ نے اپنی اولاد کو اچھے ادب سے بہتر عطیہ نہیں دیا۔ یعنی اولاد کے لیے باپ کی طرف سے بہترین عطیہ اور گراں قدر تحفہ اچھا ادب اور صحیح تربیت ہے۔"

عبد السلام*
ترتیب
اسرار احمد**

مسلمان اور سائنسی تعلیم

شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اور دار المصنفین اعظم گڑھ کے دورہ کے موقع پر کی گئی ایک تقریر

اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم   بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب صدر اور معزز حاضرین

میں شبلی پوسٹ گریجویٹ کالج اور دار المصنفین کے سربراہوں کا تہہ دل سے مشکور رہوں کہ انھوں نے مجھے یہاں مدعو کرکے اس سرزمین کو دیکھنے کا موقع دیا جس نے دنیائے اسلام کو **علامہ شبلیؒ** اور علامہ حمید الدین فراہیؒ جیسے عبقری دیئے اور جہاں سید سلیمان ندویؒ اور عبد السلام ندویؒ جیسے عالموں نے زندگی گزاری۔ یہ وہ خطۂ ارض ہے جو قدیم اور جدید کا سنگم اور علوم کی تجدید و تطہیر کا مسکن کہا جا سکتا ہے۔ یہاں فنِ تاریخ نے ایک نیا انداز پایا، علومِ اسلامیہ کو ایک نیا اسلوب ملا اور انوارِ سیرۃ النبی وسیرۃ الصحابہ کی تجلیات پر پڑے وقت کے دبیز کہر کو ہٹایا گیا۔ میں اس سرزمین کے ان عظیم علماء کو اپنا خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔

میں حکومت ہند کے ڈپارٹمنٹ آف سائنس وٹیکنالوجی کا بھی انتہائی مشکور ہوں کہ اس نے میرے اس دورے میں کافی دلچسپی لی اور مجھے ہر قسم کی سہولتوں سے نوازا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ اس ملک میں مختلف مذہبی ولسانی اقلیتوں کے تعلیمی ادارے پھل پھول رہے ہیں یہ اس ملک کے سیکولر جمہوری نظام کی برکت ہے۔

یقین کیجیے۔ یہاں آکر، آپ سب لوگوں سے مل کر اور شمع علم پر یہاں کی جاں نثاری دیکھ کر میرا دل مسرت سے لبریز ہے۔ آپ لوگوں نے جس تپاک، جس اپنائیت اور جس اہتمام و خلوص کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا، اس سے میرے دل میں جذباتِ ممنونیت کا وہ ہجوم ہے جس کا اظہار مشکل ہے۔ میری نگاہ میں میری بے مثال عزت افزائی جہاں ایک طرف فضل ہے اس رب العزت کا جس کا سایۂ کرم ہمیشہ سے مجھ پر رہا ہے، وہیں دوسری طرف فیض ہے اس نسبتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو میرے اور آپکے درمیان ہے۔

میں جو پیغام لے کر حاضر ہوا ہوں وہ بلا لحاظِ رنگ ونسل، مذہب و ملت ہر اُس انسانی گروہ کے لیے ہے جو سائنس کی دوڑ میں پیچھے ہے اور جس کی وجہ سے وہ پسماندہ، غریب اور کمزور ہے۔ یہ پیغام کسی ایک ملک یا ملّت یا قوم کے لیے مخصوص نہیں۔ لیکن چوں کہ یہاں میرے مخاطبین میں اکثریت مسلمانوں کی ہے جو سائنس کی دوڑ میں سب سے پیچھے ہیں، اس لیے میں وہ زبان استعمال کروں گا اور وہ مثالیں پیش کروں گا جن سے مسلمان بخوبی واقف ہیں۔

میری آج کی گفتگو کے موضوع کا یہ تقاضا ہے کہ میں ابتدائے گفتگو ہی میں یہ واضح کردوں کہ خدا کی ذات پر مجھے کامل یقین ہے اور بحیثیت مسلمان قرآن کریم کے ابدی پیغام پر میرا کامل ایمان ہے۔ اس پاک کتاب کی آیات میں مجھ جیسے طالب علم کے لیے بڑا سبق ہے۔ قرآن پاک طبیعات، حیاتیات، ہیئت اور طب سے بار بار مثالیں پیش کرکے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور اُن میں ہم انسانوں کے لیے بڑی نشانیاں بتاتا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے:

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت ہ والی السماء کیف رفعت ہ والی الجبال کیف نصبت ہ والی الارض کیف سطحت

"تو کیا وہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح (عجیب طور پر)

* پروفیسر عبد السلام، عالمی شہرت کے حامل نوبل انعام یافتہ سائنس داں۔ ڈائرکٹر انٹرنیشنل سینٹر فار تھیوریٹکل فزکس، تریستے۔ اٹلی۔

** پروفیسر اسرار احمد، شعبۂ طبیعات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔

پیدا کیا گیا ہے۔ اور آسمان کو نہیں دیکھتے) کہ کس طرح بلند کیا گیا ہے۔ اور پہاڑوں کو [نہیں دیکھتے] کہ کس طرح کھڑے کیے گئے ہیں۔ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح بچھائی گئی ہے۔"

اور پھر ارشاد ہوتا ہے:۔

ان فی خلق السموات والارض واختلاف
الیل والنہار لآیت لاولی الالباب

"بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات کے اور دن کے آنے جانے میں دلائل ہیں اہل عقل کے لیے۔"

قرآن شریف کی ساڑھے سات سو آیتوں یعنی اس پاک کتاب کے تقریبًا آٹھویں حصہ میں ایمان لانے والوں کو پُر زور تاکید کی گئی ہے کہ وہ نظامِ فطرت کا مطالعہ کریں، غور و فکر سے کام لیں، حقائق کی تلاش میں عقل کا استعمال کریں اور حصول علم کو اپنا شعار بنائیں۔ ہمارے پاک رسولؐ نے تحصیلِ علم کو ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے ایک اہم فریضہ قرار دیا ہے۔

یہ ہے وہ پہلا نکتہ جس سے اسلامی فکر کے ڈھانچے میں سائنسی علم کے صحیح مقام تک پہنچنے میں رہنمائی حاصل کرنا لازم ہے۔ دوسری رہنمایات وہ ہے جسے Maurice Bucaille کی حالیہ تحقیقی کتاب "بائیبل قرآن اور سائنس" نے مزید تقویت پہنچائی ہے۔ یعنی کلام پاک میں مظاہرِ فطرت کے بیان سے متعلق ایک بھی آیت ایسی نہیں ملتی جس سے اُن سائنسی حقائق کی نفی ہو جو حتمی طور پر ثابت شدہ ہیں۔

تیسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ پوری اسلامی تاریخ میں ایک بھی ایسا واقعہ نہیں ملتا جس میں کسی سائنس داں کو عیسائی دنیا کے گلیلیو کی طرح اپنی سائنسی تحقیقات کی بنا پر مسلسل اذیت کا شکار ہونا پڑا ہو۔ مسلم سوسائٹی اس لحاظ سے کافی روادار رہی ہے کہ اس میں سائنسی تحقیقات کے لیے نہ تو کسی کو سزا دی گئی اور نہ کفر کے فتوے لگائے گئے حالاں کہ بدقسمتی سے مذہبی اعتقادات کے میدان میں معاملہ ذرا برعکس ہے۔ اس میدان میں تنگ نظری تشدد و تکفیر کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں اور ان میں کمی کے آثار بھی نظر نہیں آتے۔ یہ اسلامی تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ نظریاتی احتساب کا معاملہ سب سے پہلے کٹر مذہبی گروہ نے نہیں بلکہ معتزلہ نے اُٹھایا جو خود کو روشن خیال اور آزادیٔ فکر کا علمبردار کہتے تھے۔ یہ یاد رہے کہ معتزلہ بھی درحقیقت مذہبی علماء تھے جن کی مذہبی عصبیت نے احمد بن حنبلؒ جیسے بزرگ عالم دین تک کو نہ بخشا۔

آئیے دیکھیں قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں نے قرآنی تعلیمات اور حضور اکرمؐ کے اِن ارشادات کے تئیں کیا رویّہ اختیار کیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ حضورؐ کے وصال کو سو سال بھی نہ گزرے ہوں گے کہ مسلمانوں نے اس زمانہ تک کے سارے علوم پر عبور حاصل کر لیا تھا اور اعلیٰ تعلیمی اداروں یعنی بیت الحکمہ کا ایک سلسلہ قایم کیا جس سے ان کو ایسی علمی برتری حاصل ہوئی جو آنے والے ساڑھے تین سو سال تک قایم رہی۔

اُس زمانے کے عالمِ اسلام میں سائنس کا کیا مرتبہ تھا اس کا کچھ اندازہ اس سرپرستی سے لگایا جا سکتا ہے جو مسلمانوں کی دولتِ مشترکہ میں سائنس اور دیگر علوم کو میسّر تھی۔ یہاں ہم موضوع کی مناسبت سے معمولی ترمیم کے ساتھ ایچ۔ اے۔ آر۔ گب کی ایک تحریر کا حوالہ دیں گے جسے انھوں نے اسلامی دولتِ مشترکہ میں ادب کی سرپرستی کے سلسلے میں قلمبند کیا ہے۔

"دوسری مملکتوں کے مقابلے میں دنیائے اسلام میں سائنس کی ترقی کا انحصار کافی حد تک اس سرپرستی پر تھا جو اسے حاصل رہی۔ جب تک دارالحکومتوں میں وزراء اور شہزادے سائنس کی سرپرستی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہے، علم کی شمع بھی روشن رہی۔ یہ سبقت کبھی ذاتی فائدہ، کبھی محض اپنی خوشی اور کبھی حصولِ عزت کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھی۔"

دنیائے اسلام میں سائنس کی ترقی کا نقطۂ عروج ۱۰۰۰ء کے آس پاس تھا۔ یہ زمانہ ابن سینا کا تھا جو قرونِ وسطیٰ کے آخری عالم تھے۔ البیرونی اور ابن الہیثم ان کے نامور ہم عصر اور دورِ جدید کے نقیب تھے۔

ابن الہیثم کا شمار دنیا کے جیّد ترین علمائے طبیعات میں ہوتا ہے۔ علم البصر یعنی آپٹکس میں ان کے تجربات کافی معیاری تھے۔ ان کا مشاہدہ تھا کہ روشنی کی کرن کسی واسطے میں سب سے آسان اور جلد طے ہونے والا

راستہ اختیار کرتی ہے۔ اُن کا یہی کام صدیوں بعد نور کے فرما اصول [Fermat Principle] کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ ابن الہیثم ہی تھا جس نے سب سے پہلے مادّہ کے جمود کا تصور دیا اور جو سیکڑوں سال بعد نیوٹن کے قوانینِ حرکت کی بنیاد بنا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی سائنس یونان و عرب کی میراث ہے لیکن عام طور پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اسلامی سائنس کی بنیاد روایتوں سے نتائج نکالنے پر ہے اور یہ بھی کہ مسلم سائنس دانوں نے یونان کی علمی روایتوں کی اندھی تقلید کی ہے اور یہ کہ تجرباتی سائنس میں انھوں نے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔

میں پُرزور الفاظ میں اس الزام کی تردید کروں گا۔ ذرا سنیئے کہ البیرونی ارسطو کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

"زیادہ تر لوگوں کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ وہ ارسطو کے خیالات کا بے حد و حساب احترام کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ارسطو کے خیالات میں کسی غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ حالاں کہ اُن کو خوب اچھی طرح جاننا چاہیے کہ ارسطو نے صرف اپنی بساط بھر ہی نتائج اخذ کیے ہیں۔"

اور سنیئے کہ Briffault نے کن الفاظ میں اسلامی تہذیب کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے:-

"آج جسے ہم سائنس کہتے ہیں اس کی بنیاد مشاہدات، تجربات اور ناپ تول پر ہے۔ اور ان نئے طریقوں سے یورپ والوں کو عربوں نے متعارف کرایا۔ اسلامی تہذیب کا سب سے قیمتی عطیہ موجودہ دور کی سائنس ہے۔"

پھر ایسے ہی خیالات کا اظہار سائنس کے مشہور مورخ جارج سارٹن نے بھی کیا ہے:

"قرونِ وسطیٰ کا بنیادی لیکن نامرئی کارنامہ تجرباتی طریقۂ کار کی تخلیق ہے اور یہ دراصل مسلمانوں کی کاوشوں کا نتیجہ تھا جو بارھویں صدی تک جاری رہا۔"

تاریخ کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ سائنس کا یہ جدید طریقہ جاری نہ رہ سکا اور اس کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ نتیجۃً سائنسی طریقوں میں کوئی مستقل تبدیلی نہ آ سکی۔ البیرونی اور ابن الہیثم کو گزرے سو برس بھی نہ ہوئے تھے کہ دنیائے اسلام میں سائنس کی تحقیقات بالکل رک گئیں جبکہ پانچ سو برسوں تک وہ بالغ نظری، وہ مشاہدات پر اصرار اور وہ تجربات پر تکرار اور سننے کو نہیں ملتی۔

اسلامی دنیا میں سائنس کا زوال ۱۱۰۰ء کے لگ بھگ شروع اور آنے والے ڈھائی سو سال میں مکمل ہو گیا۔ آخر یہ زوال کیوں آیا اسلامی دنیا سے سائنس کیوں ختم ہو گئی؟ اس سوال کا جواب یقین سے مشکل ہے۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس زوال کے اسباب خارج سے زیادہ داخلی ہیں۔ مسلم سوسائٹی میں کئی ایسے جراثیم گھر کر چکے تھے جو کہ صحت کے لیے دیمک ہیں۔ اور مسلم دنیا نے علمی لحاظ سے خود کو ایک خول میں بند کر لیا تھا جس سے باقی دنیا سے اس کا علمی رشتہ ٹوٹ گیا۔ دوسرے سخت قسم کی مذہبی گروہ بندی اور سیاست دانوں کی شدید تنگ نظری روش عام تھی۔ تیسرے تخلیقی طرزِ فکر کی حوصلہ شکنی اور تقلیدی طرزِ کا چلن زوروں پر تھا۔ مختصراً مسلم معاشرے کا مزاج تخلیقی علوم کے خلاف ہو چکا تھا۔ ہر طرف کٹرپن کا رواج اور بالغ نظری کا فقدان۔ نتیجتاً قطعیہ ہوئی اور اجتہاد کا دروازہ بشمول سائنس ہر قسم کے علوم پر بند ہو گیا تھا۔

کیا آج حالات کچھ مختلف ہیں؟ کیا اب سائنسی علوم کی ہمت افزائی کی جانے لگی ہے؟ بدقسمتی سے نہیں۔ باوجود یکہ قدرت نے مسلمانوں کو سرسید جیسے مخلص، بیدار مغز اور بالغ نظر لیڈر سے نوازا جس نے آج سے تقریباً سو سال پہلے — پچھلی پانچ صدیوں میں شاید پہلی بار — سائنسی علوم کے فروغ اور سائنسی طرزِ فکر اپنانے کی تحریک چلائی۔ اس تحریک پر سرسید نے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا۔ حتیٰ کہ دہریہ اور نیچری ہونے کا الزام اوڑھ لینا گوارا کیا۔ لیکن مسلمانوں کی اکثریت مزاجاً اس تحریک کے خلاف رہی۔ نتیجۃً سرسید کے بعد یہ تحریک زیادہ آگے نہ بڑھ سکی۔

آج دنیا کی اہم تہذیبوں میں صرف اسلامی تہذیب ایسی ہے جو سائنس میں سب سے زیادہ کمزور ہے۔ بدقسمتی سے ہم میں بیشتر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جدید سائنس عقلیت کا راستہ دکھاتی ہے جو لامذہبیت کی طرف لے جاتا ہے اور یہ بھی خیال ہے کہ ہمارے سائنس داں ایک نہ ایک دن مابعد الطبیعاتی مفروضات سے منحرف ہو جائیں گے۔ قطع نظر اس کے کہ کوئی اعلیٰ صنعت و حرفت بغیر اعلیٰ بنیادی سائنس کے پنپ نہیں سکتی اور اس توہین سے بھی قطع نظر جو ہماری تہذیب کے مابعد الطبیعاتی مفروضات اور

فکری انجماد کو ہم معنیٰ بنا دینے سے ہوتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ سائنس کی طرف یہ رویہ اُن پرانے جھگڑوں کی وراثت ہے جن میں نام نہاد عقلی گروہ کے وہ فلسفی الجھے ہوئے تھے جنھوں نے ارسطو کے تصورِ کائنات کو بے چون و چرا مان لیا تھا۔ اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس قسم کے بلکہ اس سے بھی شدید جھگڑوں میں قرونِ وسطیٰ کے عیسائی اہلِ مکتب مبتلا تھے۔

مغرب میں مذہب اور سائنس کے درمیان کشمکش، عمل و ردِّ عمل کا سلسلہ تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ دونوں ہی طرزِ فکر میں پختگی آگئی ہے خصوصاً سائنس داں بھی اپنے حدودِ کار سے آگاہ ہو گئے ہیں۔ انھیں یہ خوب اندازہ ہو گیا ہے کہ بعض مسائل ایسے ہیں جو آج بھی اُن کے دائرۂ فکر سے باہر ہیں۔ اور مستقبل میں بھی رہیں گے۔ سائنس کی ترقی کا راز یہ ہے کہ اس نے اپنا دائرۂ عمل ایک خاص قسم کی تحقیق تک محدود کر لیا ہے اور اس محدود دائرۂ میں بھی وہ خوب جانتا ہے کہ وہ کہاں سے قیاس کے میدان میں قدم رکھ رہا ہے۔ اس میدان میں وہ کبھی قطعیت کا دعویٰ نہیں کرتا۔ طبیعات ﴿فزکس﴾ میں دو بار ایسا ہوا ہے۔ پہلی بار نظریۂ اضافیت کے پیش کیے جانے پر اور دوسری بار نظریۂ قدر ﴿کوانٹم تھیوری﴾ کے سلسلے میں۔ ایسا آئندہ بھی ہو سکتا ہے۔

نظریۂ اضافیت کے تصورِ زمان و مکان نے طبیعات کے عالموں میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کر دیا۔ ہم لوگوں کو طبیعات سے متعلق اپنی طرزِ فکر میں بہت سی تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ لیکن تعجب اس پر ہوتا ہے کہ پیشہ ور فلسفی جو انیسویں صدی تک زمان و مکاں سے متعلق نظریات کو صرف اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔ اب تک نظریۂ اضافیت کی روشنی میں کوئی فلسفیانہ نظامِ فکر نہ بنا سکے۔

دوسرا اور پہلے سے زیادہ دھماکہ خیز ذہنی انقلاب ۱۹۲۶ء میں ہائزن برگ کے اصولِ غیر یقینیت [Uncertainty Principle] کے انکشاف سے آیا۔ اس اصول کی رُو سے کسی شے کی ہر خاصیت کا علم بیک وقت ایک خاص حد تک ہی یقینی یا معتبر ہو سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کسی شے کی بابت ہمارے علم کی بھی ایک حد ہے اور اس حد کا تعین اس شے کی فطرت سے وابستہ ہے۔ میں یہ سوچ کر کانپ جاتا ہوں کہ اگر ہائزن برگ قرونِ وسطیٰ میں ہوتا تو اس کا کیا انجام ہوتا۔ کیسی کیسی مذہبی بحثیں اس مسئلہ پر اٹھتیں کہ آیا یہ حد اس علم پر بھی لگائی جا سکتی ہے جو خدا سے تعلق رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا سائنس اور مابعد الطبیعات کا سیدھا ٹکراؤ آج کل ناگزیر ہے؟ کیا ایمان اور سائنس کا ساتھ گزارا ہو سکتا ہے؟ اور اس سوال سے متعلق جدید سائنسی طرزِ فکر سے چند مثالیں آپ کے سامنے پیش ہیں۔

پہلی مثال کے طور پر مابعد الطبیعات کے اس عقیدے کو لیجیے کہ تخلیق بغیر شے کے ہوئی ہے۔ آج کل ماہرینِ کائنات یہ یقین رکھتے ہیں کہ کائنات میں مادّہ اور توانائی کی کثافت کی ممکنہ قیمت کچھ یوں ہے کہ کائنات میں مادّے کی کل مقدار صفر آتی ہے۔ دس سال ہوئے کسی نے جرأت مندی سے یہ خیال ظاہر کیا کہ کائنات محض خلا کی ارتعاشی شکل ہے۔ گویا کہ یہ لاشئی کی ایک کیفیت ہے لیکن طبیعات اور مابعد الطبیعات میں جو فرق ہے وہ یہ کہ طبیعات میں کائنات کے مادّے اور توانائی کی کثافت ناپنے کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ پیش کردہ نظریہ صحیح ہے یا غلط۔

دوسری مثال یہ ہے کہ آج کل اس امکان پر سنجیدگی سے تحقیق ہو رہی ہے کہ زمان و مکاں کے ابعاد یعنی Coordinates معروف تعداد چار سے زیادہ ہیں۔ اس نظریے کے پس منظر میں یہ امید ہے کہ اس طرح ہم کائنات میں کارفرما چار بنیادی قوتوں کو ایک لڑی میں پرو دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس نظریے کو قابلِ قبول بنانے کے لیے فی الحال ہم نے ایک قسم کے اصولِ خود استقامت [Self Consistency] سے کام لیا ہے جس سے ایک مستحکم کائناتی نظام کا وقوع ممکن ہو سکے۔

بغیر کسی شے کے تخلیق! چار سے زیادہ ابعاد!! ان سب کا ذکر بیسویں صدی کی طبیعات میں عجیب سا لگتا ہے۔ یہ تو پرانے زمانے کے مابعد الطبیعاتی مباحثہ کی یاد دلاتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ طبیعات میں ہر نظریہ صرف عارضی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور اس بات پر اصرار ہوتا ہے کہ ہر قدم پر تجربہ کر کے اس کی صحت کا یقین کر لیا جائے۔

ایک متشکک [Agnostic] کی نگاہ میں اس نظریۂ خود استقامت کی کامیابی، اگر ثابت ہوئی، عقیدۂ وجودِ خدا کے بے معنیٰ ہونے کے مترادف ہو سکتی ہے۔

فَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ

[وہ جسے گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا]

لیکن اہلِ ایمان کے لیے یہ اُن کے ربّ العالمین کے کسی بڑے منصوبہ کا محض

ایک جز ہے جس کے تحیر کا ظہور چاہے جس شکل میں ہو ان کی نگاہوں کو خیرہ کر دیتا ہے اور وہ بے اختیار اس کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں نے پہلے ہی عرض کر دیا ہے کہ اُن فلسفیانہ معاملات میں جو طبیعیات کے دائرہ کار کے باہر ہیں میرا ایمان اسلام کے نہ ختم ہونے والے پیغام پر ہے۔ اس کا صاف اشارہ تو سورہ فاتحہ کے بعد کلام پاک کی پہلی آیت ہی میں موجود ہے۔ "یہ کتاب راستہ دکھاتی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو جو اَن دیکھی پر ایمان لاتے ہیں۔" اَن دیکھی، انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل، اس کے احاطۂ عقل سے باہر۔

آج دنیائے اسلام میں سائنس کس غربت کے عالم میں ہے، اس کی ایک جھلک دکھانے کے لیے میں چند مثالیں پیش کروں گا۔

(۱) اگر ہم ۱۸ تا ۲۵ سال کی عمر کے طلبا کی سائنس اور ٹیکنالوجی کے مضامین میں داخل ہونے والوں کی تعداد اور ان سے اسلامی دنیا میں سائنسی ذخیرہ کا اندازہ لگائیں تو پتہ چلتا ہے کہ اسلامی دنیا میں اس عمر کے طلبا میں سے صرف ۲ فیصد سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں داخلہ لیتے ہیں جب کہ ترقی یافتہ ممالک میں اس عمر کے طلبا کا ۱۲ فیصد سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔

(ب) ۱۹۸۳ء میں پیش کی گئی ایک رپورٹ کے مطابق دنیائے اسلام میں تخمیناً کل پینتالیس[۴۵] ہزار سائنس اور انجینئرنگ کے محقق ہیں۔ اس کے مقابلے میں ایسے محققین کی تعداد سوویت یونین میں پندرہ لاکھ، جاپان میں چار لاکھ، اور اسرائیل میں پینتیس[۳۵] ہزار ہے۔ یہ یاد رہے کہ اسرائیل کی کل آبادی لگ بھگ چالیس لاکھ ہے۔

(ج) معیاری رسالوں میں شایع شدہ تحقیقی سائنسی مضامین کی بنیاد پر اندازہ لگایا گیا ہے کہ سائنس کے تخلیقی کاموں میں اسلامی دنیا کا حصہ صرف ایک فیصد کے آس پاس ہے۔

اب ذرا ایک باہر سے تماشہ دیکھنے والے کا تاثر ملاحظہ فرمایئے۔ Francis Giles اپنے ایک مقالے میں سوال اٹھاتے ہیں کہ

"آخر مسلم سوسائٹی میں کیا خرابی ہے؟ ایک ہزار سال پہلے جب مسلم دنیا اپنے عروج پر تھی اُس نے سائنس میں بیش بہا اضافے کیے۔ خصوصاً ریاضی اور طب میں۔ بغداد اور اسپین میں ایسی یونیورسٹیاں تھیں جہاں لوگ ہزاروں کی تعداد میں رہتے تھے۔ یہ زمانہ اُن کے عروج کا تھا۔ اُس زمانہ میں اُن کے حکمراں سائنس دانوں اور فن کاروں میں گھرے رہتے تھے اور آزادی کی ایک ایسی ہوا چل رہی تھی کہ اُس میں یہودی، عیسائی اور مسلمان سب ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ لیکن آج یہ سب کچھ خواب ہے۔"

کیا ہم تاریخ کے اوراق پلٹ کر دوبارہ سائنسی علوم میں برتری حاصل کر سکتے ہیں؟ میں اعتماد سے عرض کروں گا کہ یہ عین ممکن ہے بشرطیکہ پوری مسلم سوسائٹی خصوصاً اِس کے نوجوان اس کا بیڑا اٹھالیں اور اسے مقصدِ زندگی بنالیں۔ یہ اس لیے اور بھی ممکن ہے کہ اس کی بنیاد ہماری نظری روایتوں اور ہمارے قرونِ اولیٰ کے تجربات میں موجود ہے۔ لیکن یہ اس طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اِس نشاۃِ ثانیہ تک پہنچنے کا کوئی آسان راستہ نہیں۔ مقصد جب ہی حاصل ہوگا کہ پوری قوم کے نوجوان تن من دھن سے اس کام میں لگ جائیں۔

یہ سب کچھ جاپانی سوسائٹی میں ہو چکا ہے جب وہاں کے شہنشاہ میجی [۱۸۶۸ء] انقلاب کے زمانے میں قسم کھائی تھی کہ علم روئے زمین پر جس گوشے میں ہو، حاصل کیا جائے گا۔ یہ سب اُسی سوسائٹی میں سا ٹھ برس پہلے ہو چکا ہے، جب نوجوانوں کو جوق در جوق سائنس کے میدان میں لایا گیا۔ آج کل چینی سماج بھی اسی راہ پر چل رہا ہے۔ انھوں نے عہد کیا ہے کہ اس صدی کے آخر تک وہ بیشتر سائنسی میدانوں میں برطانیہ سے آگے نکل جائیں گے۔

جن معاشروں کا ہم نے ذکر کیا ہے اُن میں سے کسی میں بھی لوگ چینی جاپانی یا روسی سائنس کے خبط میں مبتلا نہیں ہیں۔ کیوں کہ یہ نعرے راہ سے ہٹانے والے ہیں۔ انھیں یہ معلوم ہے کہ سائنس کے قوانین، اس کی روایتیں اور اس کا طریقۂ کار ساری دنیا اور سارے معاشروں کے لیے ایک ہی جیسے ہیں۔ اُن میں کوئی تبدیلی بلحاظ تہذیب نہیں ہوتی۔ ہماری طرح اُن لوگوں کو یہ ڈر نہیں لگتا کہ مغربی سائنس اُن کا مخصوص کلچر تباہ کر دے گی۔ وہ اپنی تہذیب اور اپنی روایتوں کو کمزور جان کر اس کی توہین نہیں کرتے۔

اسلامی سوسائٹی میں سائنسی نشاۃ ثانیہ لانے کی کوشش کر

والوں کو اس بات کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ ہم میں سے بعض گروہ اس کام کی مخالفت کریں گے اور بہت ممکن ہے یہ مخالفت اسلامی تہذیب روایات کے تحفظ کے نام پر ہو۔

یاد کیجیے ۔ سرسیدؒ کی جدید تعلیمی تحریک اور علمی معاملات میں سائنسی طرز فکر اپنانے کی ان کی تلقین کی کیا کیا مخالفت نہ کی گئی۔ ہر طرف سے "مذہب خطرے میں ہے"، کا شور و غوغا بلند ہو گیا۔ غور کیجیے اگر سرسیدؒ اور اُن کے رفقاء کے ضبط و حوصلہ و اخلاص کا بند تضحیک و تحقیر و تکفیر کے طوفان کا مقابلہ نہ کر سکا ہوتا تو آج نہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہوتی اور نہ برصغیر کے مسلمانوں میں جدید تعلیم کی نظر آنے والی یہ تھوڑی سی بہت روشنی۔

میرا یہ اندیشہ کہ اس دور میں بھی مذہب کے نام مسلم معاشرے میں سائنس کے فروغ کی مخالفت ہو سکتی ہے کچھ بے بنیاد نہیں۔ لندن سے شائع ہونے والے ایک موقر رسالے کے ایک مضمون کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے :-

"کیا قرون وسطیٰ کی سائنس صحیح معنوں میں اسلامی سائنس تھی؟ اگر اس زمانے کے مشہور سائنس دانوں مثلاً الکندی، الفارابی، ابن الہیثم اور ابن سینا کے حالات دیکھے جائیں تو معلوم ہوگا کہ سوائے اس کے کہ وہ سب مسلمان تھے ان میں یا ان کی کتابوں میں کوئی بات اسلامی نہیں تھی۔ بلکہ اس کے برخلاف ان کی زندگیاں واضح طور پر غیر اسلامی تھیں۔ ان عالموں کے طب، کیمیا، طبیعات اور فلسفہ کے میدانوں میں کارنامے قدرتی و منطقی نتیجے تھے یونانی طرز فکر کے۔"

دیکھا آپ نے۔ مخالفت کا پیکر وہی ہے جس سے سرسیدؒ اور ان کے رفقاء کو سابقہ پڑا تھا۔ بس ذرا پیراہن بدلا ہوا ہے۔ اس ناقابل یقین حملے کا نشانہ کوئی اور نہیں بلکہ وہ علمائے سائنس ہیں جن پر سارے مسلمان فخر کرتے ہیں۔ فاضل مضمون نگار اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ایک ایسی حکمت عملی کی تلقین کرتا ہے جس کی وجہ سے ہی آج ہم سائنسی علوم میں پسماندہ ہیں۔ یعنی مسلمانوں کا علمی دنیا سے قطع تعلق۔

کلام پاک میں دو باتوں پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اول قوانین فطرت پر غور و فکر اور اُن کی دریافت، اور دوم تسخیر یعنی اپنے علم کی مدد سے فطرت پر قابو حاصل کر لینے پر۔ اس ارشاد خداوندی اور آج کل کے حالات کے پیش نظر پہلی بات جو ملت اسلامیہ کے کرنے کی ہے وہ یہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم و تربیت کا بندوبست اور اُس کی ہمت افزائی ثانوی، آخری اور یونیورسٹی کے درجوں تک کی جائے۔ اس کے لیے لائق اساتذہ اور سائنسی سامان کی ضرورت ہو گی۔ لیکن سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سائنس کی تعلیم کو ایسا پرکشش بنا دیا جائے کہ وہ آگے چل کر اسے آسانی سے نہ چھوڑ سکیں۔ سائنسی تعلیم چھوڑ دینے کے واقعات بہت ہوتے ہیں، اور اس کی ایک بہت بڑی وجہ معاشی تنگ دستی ہے۔ والدین کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے بچوں کی اتنی طویل تعلیم دلا سکیں جو پیشہ ور سائنسدانوں کے لیے ضروری ہے۔

بس اُمت مسلمہ میں سائنس کی تعلیم کے فروغ کے سلسلے کا بنیادی کام ایک ایسے بڑے فنڈ کا قیام ہے جس سے ان ہونہار طلباء کی ہمت افزائی ہو سکے جو سائنس اور ٹیکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جن کی عمر لگ بھگ چودہ سال ہو۔ فی زمانہ کسی ایسے فنڈ کا قیام کوئی بڑا مسئلہ نہیں بس ذرا سی توجہ اور تھوڑی سی قربانی کی ضرورت ہے۔

اب آئیے اسلامی معاشرے میں ٹیکنالوجی پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے۔ کلام پاک میں تفکر اور تسخیر دونوں پر برابر کا زور دیا گیا ہے۔ یعنی جتنی تاکید کی گئی ہے علم حاصل کرنے کی اتنی ہی تاکید کی گئی ہے علم کی مدد سے فطرت پر قابو پانے کی۔ قرآن پاک میں کہیں مثال دی گئی ہے حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ کی کہ انھوں نے اپنے زمانے کی ٹیکنالوجی پر عبور حاصل کر لیا تھا۔

"اور ہم نے لوہے کو اُن کے لیے ملائم کر دیا"

"ہم نے ہواؤں کو ان کا تابعدار بنا دیا"

یعنی میری ناچیز رائے میں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس زمانے کی ٹیکنالوجی پر قدرت رکھتے تھے اور اسے عمارتوں، محلوں اور دریاؤں پر پشتے بنانے میں استعمال کرتے تھے۔ اس کے بعد کہیں ذوالقرنین کی یاد دلائی جاتی ہے جو فولادی چٹانوں اور پگھلے ہوئے پیتل سے اپنی حفاظت کے لیے پشتے بناتے تھے۔ اس طرح دھاتوں کے استعمال، بھاری تعمیرات، ہواؤں سے کام لینے اور ذرائع نقل و حمل کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ اور یہ بات تو ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن مجید میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں اُن سب کا مقصد ہدایت ہے یعنی لوگ ان واقعات سے سبق حاصل کریں۔ اور انھیں اپنے لیے مثال سمجھیں۔

ہمارے پاک نبیؐ نے اس معاملے میں ایک مثال قایم کر دی ہے۔ واقعہ ہے

شوق سے حفاظت اور دفاع کے لیے ہر نئی ایجاد قبول فرماتے تھے۔ چنانچہ دیکھیے کہ کس طرح خندق کا عرب میں پہلی بار استعمال ہوا ہے یا حضورؐ کے اس حکم کو لیجیے جو انھوں نے منجنیق بنانے کے لیے دیا تھا۔ تاکہ اس سے خیبر کی تسخیر کی جا سکے۔

آج مسلمانوں میں چاہے وہ کسی بھی خطۂ ارض کے ہوں ٹیکنالوجی کا وہی حال ہے جو بنیادی سائنس کا ہے اور یہ ایک قدرتی بات ہے کیوں کہ ٹیکنالوجی اور سائنس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ وہ کون سی رکاوٹیں ہیں جو مسلمانوں کو اعلیٰ ٹکنالوجی میں مہارت حاصل کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتیں اس کا جواب اُس غفلت، تن آسانی، بے جا غرور و نخوت میں تلاش کرنا چاہیے جس میں مسلمان صدیوں سے گرفتار ہیں۔

اعلیٰ صنعت اور ایسی ٹیکنالوجی سے قطع نظر جس کی بنیاد خالصتاً سائنس پر ہے بہت سے ایسے شعبے ہیں جن میں سائنس کی حیثیت محض معاون کی ہے۔ مثلاً زراعت، صحت عامّہ، بایوٹیکنالوجی، انرجی، رسل و رسائل وغیرہ۔ لیکن ان میں سے بھی کوئی میدان ایسا نہیں ہے جس میں مسلمان آگے ہوں۔ انتہا ہے غفلت کی۔ کیا کبھی اس خواب غفلت سے ہم بیدار بھی ہوں گے؟ ہم ابن خلدون کا یہ قول کتنی جلد بھول گئے۔

"جو چیز بعض لوگوں کو دوسروں پر ممتاز کرتی ہے وہ ان کی خوب تر کی جستجو ہے۔"

آخر اتنا گڑگڑا کر مجھے یہ التجا کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ لوگ سائنسی تخلیق کی طرف متوجہ ہوں۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں کہ خدا نے ہمیں جاننے اور سیکھنے کی صلاحیت دی ہے جسے بروئے کار لانا چاہیے یا آج کی دنیا میں ایک باعزت مقام صرف علم ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے یا بغیر سائنس کے کوئی مادی ترقی ممکن نہیں۔ بلکہ ایک بڑی وجہ حقارت کے وہ کوڑے ہیں جو دنیا کے اہلِ علم ہم پر برساتے رہتے ہیں چاہے زبان سے وہ کچھ نہ کہیں۔

فزکس کے ایک نوبل انعام یافتہ عالم کے یہ الفاظ اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں:۔

"سلام! کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ ہمیں ایسی اقوام کی خبر گیری اور مدد کرنا چاہیے یا اُن کے زندہ رہنے کے لیے غذا کا انتظام کرنا چاہیے جنھوں نے انسانی علم کو ذرّہ بھر بھی آگے نہیں بڑھایا"

اور کسی نے یہ نہ بھی کہا ہوتا تب بھی میرا سر شرم سے اس وقت جھک جاتا ہے جب میں کسی اسپتال میں جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ وہاں جان بچانے کے لیے جتنی دوائیں استعمال ہو رہی ہیں چاہے وہ پنسلین ہو یا کوئی اور دوا اُس کے دریافت کرنے اور بنانے میں پسماندہ دُنیا خصوصاً مسلمانوں کا کوئی ہاتھ نہیں مجھے پورا یقین ہے کہ ہمارے علمائے دین بھی اسی طرح سوچتے ہوں گے امام غزالیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "احیاء العلوم" کے پہلے باب میں ایسی سائنسوں کی تخلیق اور ترقی پر زور دیا ہے جو معاشرے کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً صحت عامّہ کی سائنس۔ انھوں نے اس قسم کی سائنس کی تخلیق کو فرض کفایہ بتایا ہے۔ یعنی وہ فرض جو ساری امت پر ہے لیکن اگر کچھ لوگ اسے ادا کر دیں تو ساری امّت کی طرف سے ادا ہو جاتا ہے اور اگر کوئی ادا نہ کرے تو اس کا گناہ ساری امّت پر ہوتا ہے۔

میں آج اوّل علمائے دین سے مخاطب ہوں۔ دوسرے اُن لوگوں سے جنھیں اللہ نے دولت سے مالامال کیا ہے۔ اور تیسرے قوم کے ان اکابرین سے جو قوم کے تعلیمی رجحان پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

میرے نزدیک سائنس اس لیے ضروری ہے کہ اوّل اس سے کائنات کے سربستہ راز کھلتے ہیں، فطرت کے نہ بدلنے والے قوانین کا علم ہوتا ہے اور خالقِ کائنات کی کاریگری اور اس کی مصلحتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ دوم اس کی مدد سے انسان آفات اور مشکلات پر قابو پاتا ہے، مادی فوائد حاصل کرتا ہے اور ایک بہتر اور آرام دہ زندگی گزار سکتا ہے۔ سوم یہ کہ سائنس ساری دنیا کو ایک دھاگے میں پرو تی ہے اور اس طرح مختلف قوموں میں آپسی تعاون کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس کے ضروری ہونے کی ایک اہم وجہ اور بھی ہے جس کا اظہار سر سیّدؒ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"ہنر، فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ اُن میں ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا چاہیے۔ ایک متعصب انسان ان تمام دلچسپ اور مفید باتوں سے جو نئی نئی تحقیقات اور نئے نئے علوم سے حاصل ہوتی ہیں محض جاہل اور ناواقف رہتا ہے۔ اس کی عقل اور اس کے دماغ کی قوت محض بیکار ہو جاتی ہے۔ اور تربیت و شائستگی، تہذیب و انسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا۔"

اس کے علاوہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، انھیں یہ نہ بھولنا چاہیے

کہ وہ بین الاقوامی سائنس کے مقروض ہیں۔ یعنی وہ سائنس کے مادی فوائد سے مستفید تو ہو رہے ہیں مگر اس کے فروغ میں ہاتھ نہیں بٹا رہے ہیں۔ ہماری عزتِ نفس کا تقاضا ہے کہ اس ادھار کے چکانے کا سامان کیا جائے۔

میں آج کل اٹلی کے ایک چھوٹے سے شہر میں رہتا ہوں، جہاں کے لوگ کچھ زیادہ رئیس نہیں ہیں۔ یہاں ایک بینک ہے CASA di Risparmio اس بینک نے ۱۹۶۳ء میں پندرہ لاکھ ڈالر کا گراں قدر عطیہ انٹرنیشنل سینٹر فار تھیوریٹیکل فزکس کی عمارت کو بنانے کے لیے دیا تھا۔ اس سینٹر کے قیام کی تجویز میں نے پیش کی تھی۔ ابھی حال میں ہی اس شہر کے لوگوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ بائیوٹیکنالوجی کے مرکز کے لیے چار کروڑ ڈالر دیں گے۔ ان لوگوں کے سائنس سے اس لگاؤ اور دوراندیشی پر مجھے سخت حیرت ہے۔ کاش یہ مثال ہمارے مالدار لوگوں کی غیرت کو للکارے۔ ابھی چند روز پہلے مجھے معلوم ہوا ہے کہ امریکہ کے ایک قدرے گمنام تاجر خاندان نے سات کروڑ ڈالر کی کثیر رقم اس مقصد کے لیے دی ہے کہ اس سے دنیا کی سب سے بڑی دوربین بنائی جائے۔ مجھے رشک بھی ہوا۔ یہ ایک ایسے علمی میدان میں ہو رہا ہے جن میں ہم کبھی امام تھے یعنی ہیئت میں۔

کچھ لوگوں کو تشویش ہے کہ موجودہ سائنس کا اسلام پر کیا اثر پڑے گا ان سے عرض ہے کہ سائنس کے حدود کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم عصرِ حاضر کی سائنس میں پوری طرح سے شامل ہو جائیں۔ اگر یہ نہ ہوا تو ہم ماضی کی فلسفیانہ بحثوں میں ہی الجھے رہیں گے۔ آپ لوگ نوجوان سائنس دانوں پر بھروسہ رکھیے۔ سائنسی علوم کے حصول میں ان کی مدد کیجیے، اُن کے ایمان کو محفوظ سمجھیے۔ اس لیے کہ مذہب اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں۔

آخر میں مجھے دو باتیں کہنے کی اجازت دیجیے۔ پہلی بات طلبِ علم سے متعلق ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، قرآن شریف کے حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق علم کی تحصیل و تخلیق ہر مسلمان پر فرض ہے گہوارہ سے قبر تک۔ میں نے اس سلسلہ میں البیرونی کا ذکر کیا ہے جو ایک ہزار سال قبل غزنہ میں رہتے تھے۔ ان کی وفات کے متعلق ان کے ایک ہم عصر لکھتے ہیں:-

"جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ مرض الموت میں مبتلا ہیں تو میں ان کی آخری زیارت کے لیے گیا۔ انھیں دیکھتے ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ اب زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہیں گے۔ جب لوگوں نے انھیں میرے آنے کی اطلاع دی تو انھوں نے آنکھیں کھول دیں اور مجھ سے پوچھا کہ تم فلاں ہو۔ میں نے کہا جی ہاں۔ انھوں نے فرمایا۔ میں نے سنا ہے کہ تمہیں اسلامی وراثت کے پیچیدہ مسائل کا علم ہے اور اس کے بعد انھوں نے ایک مشہور مسئلہ کا ذکر کیا۔ میں نے کہا "ابوریحان! اس وقت اس کا کیا تذکرہ؟" اور ابوریحان البیرونی نے جواب دیا۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ کسی بات کو جان کر مرنا اس سے بہتر ہے کہ انسان بغیر اس کو جانے ہوئے مر جائے۔ دل غمزدہ کے ساتھ میں نے، جو کچھ مجھے معلوم تھا، اُن سے بیان کر دیا۔ اجازت لے کر میں نے ابھی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ اندر سے آہ و بکا کی آوازیں آئیں۔ البیرونی ختم ہو چکے تھے۔"

آخری بات کے طور پر میں اس پاک کتاب کے چند کلمات دہرا کر اپنی گفتگو ختم کروں گا جس کتاب کی تلاوت آنکھوں کو پرنم اور دلوں پر وجد طاری کر دیتی ہے اور جس سے زیادہ اس ابدی تحیر کا اظہارہ جس سے میں اپنی سائنسی کاوشوں کے دوران بار بار دوچار ہوا ہوں کہیں اور نہیں ملتا:-

"چاہے ساری دنیا کے درخت قلم بن جائیں اور سمندر کا پانی روشنائی ہو جائے اور سات سمندر بھی باقی رہیں اس روشنائی میں اضافے کے لیے تب بھی اللہ کی باتوں کا بیان ختم نہ ہو سکے۔ بے شک خدائے تعالیٰ بڑی حکمت والا ہے۔"

بروایت عبداللہ بن مسعودؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے اصحاب میں سے کسی کے بارے میں مجھے کوئی بات نہ پہنچائے۔ اس لیے کہ میں چاہتا ہوں کہ میری ملاقات تم لوگوں سے اس حال میں ہو کہ میرا سینہ ہر ایک سے صاف ہو یعنی کسی کی طرف سے میرے دل میں کوئی کینہ یا رنجش موجود نہ ہو"

نذیر احمد*

لکھنوتی کے خلجی خاندان کا آخری فرمانروا

یہ ایک تحقیقی مضمون ہے جو شاید اس رسالے کے لیے زیادہ مناسب سمجھا جائے، لیکن یہاں ایک امر کی طرف اشارہ ناگزیر سا ہے، اس مضمون میں ایک نئے ماخذ یعنی محمد عوفی کی جوامع الحکایات سے استفادہ ہوا ہے، یہ کتاب قلمی شکل میں تھی، اس لیے عام طور پر مورخین کی دسترس سے باہر تھی۔ حال ہی میں تہران میں طبع ہو چکی ہے۔ چنانچہ اس مضمون کے سلسلے میں اس کا پہلی بار استعمال ہو رہا ہے۔ جوامع الحکایات التمش کے وزیر نظام الملک قوام الدین جنیدی کے نام پر لکھی گئی اور جنیدی مذکور اس خطے (کول) کا حاکم بھی رہ چکا تھا۔ چنانچہ اس کے عہد کا ایک کتبہ آج تک موجود ہے جو فی الحال مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ لکھنوتی کی مہم میں جس کی وجہ سے وہاں کے خلجی خاندان کے آخری فرمانروا کا خاتمہ ہوا، نظام الملک کے مشورے کو بھی دخل تھا۔ غرض چوں کہ جوامع الحکایات اور مہم لکھنوتی دونوں کی نسبت جنیدی کی طرف ہے، اور جنیدی کا تعلق کول یعنی علی گڑھ سے بہت گہرا رہا ہے، اس بنا پر یہ مختصر سا مقالہ بھی علی گڑھ کے ایک مجلے کے لیے زیادہ مناسب خیال کیا گیا۔ نظام الملک جنیدی کے کارناموں کے تعارف کی براہ راست ذمہ داری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ارباب علم کی ہے، اس لیے کہ جنیدی علی گڑھ کے "السابقون الاوّلون" میں تھا۔ [ن۔ا]

لکھنوتی بنگال کا ایک پرانا شہر تھا جو گنگا کے دونوں طرف آباد تھا اس خطے کو محمد بن بختیار خلجی نے ۵۹۰ھ/۱۱۹۴ء میں سلطان معز الدین محمد بن سام (سلطان شہاب الدین غوری۔ م: ۶۰۲ھ/۱۲۰۵ء) کے زمانۂ اقتدار میں فتح کرکے خلجی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اس خاندان کی تاریخ کا سب سے قدیم اور اہم ماخذ طبقات ناصری ہے۔ اس تاریخ کے اعتبار سے محمد بن بختیار کی وفات ۶۰۲ھ/۱۲۰۵ء میں ہوئی۔ اس کے بعد اس خاندان کے تین حکمراں کا ذکر ہوا ہے۔ اُن میں آخری فرمانروا حسام الدین عوض حسین خلجی بتایا گیا ہے، جو غیاث الدین کے لقب سے مشہور تھا۔ ۶۲۲ھ/۱۲۲۵ء میں سلطان التمش نے اس پر حملہ کرکے زیر کر لیا۔ غیاث الدین نے دلی کے سلطان کے نام پر سکہ ڈھالا اور اس کا نام خطبے میں شامل ہوا۔ التمش نے بہار کا خطہ ملک علاء الدین جانی کے سپرد کیا اور خود دلی واپس ہوا۔ غیاث الدین سلطان لکھنوتی نے بہار پر یورش کی اور ملک علاء الدین جانی کو بھگا دیا۔ دو سال بعد التمش کے بیٹے ناصر الدین محمود (وفات ۶۲۶ھ/۱۲۲۸ء) نے ۶۲۴ھ/۱۲۲۶ء میں اودھ سے لکھنوتی پر حملہ کیا۔ سلطان

* پروفیسر نذیر احمد۔ سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس، سابق صدر شعبۂ فارسی اے۔ ایم۔ یو۔۔۔۔ سرسید نگر۔ علی گڑھ

غیاث الدین نے مقابلہ کیا، لیکن اس کو شکست کھانی پڑی۔ اسیر ہوا اور پھر قتل کر دیا گیا۔ اس نے کل تیرہ سال حکومت کی۔ طبقات میں اس کے بعد اس خاندان کے کسی فرمانروا کا ذکر نہیں ہوا لیکن بعض دوسرے ذرایع سے معلوم ہوتا ہے کہ غیاث الدین کے بعد اسی خاندان کا ایک اور فرمانروا لکھنوتی کے تخت پر بیٹھا تھا۔ بعض اس کا نام ناصرالدین عوض لکھتے ہیں اور بعض کے نزدیک اس کا نام ملک دولت شاہ بلکا تھا۔ دراصل یہی آخری نام درست ہے۔ اور اگرچہ طبقات ناصری میں ملک بلکا کا نام سلاطین خلج کے ذیل میں درج نہیں ہے لیکن اسی تاریخ میں بعض جگہ اس کا ذکر اس طرح آیا ہے کہ اس کو سلطان جاننے کے علاوہ کوئی صورت نہیں۔ ذیل میں طبقات کے بیانات کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے:

"ماہ جمادی الاول سنہ ۶۲۶ھ (= مارچ ۱۲۲۹ء) میں ملک سعید ناصرالدین محمود کی وفات کی خبر پہنچی، اور بلکا ملک خلجی (بلکا ملک حسام الدین عوض خلجی) نے خطۂ لکھنوتی میں بغاوت کی اور سلطان شمس الدین مرحوم ہندوستان کے لشکر سے لکھنوتی پر حملہ آور ہوا اور اسی ۶۲۷ھ/۱۲۳۰ء میں اس باغی کو گرفتار کر کے خطۂ مذکور ملک علاء الدین جانی کے سپرد کر دیا (ج ا ص ۴۴۹)

"ایسا سنا گیا کہ سلطان سعید شمس الدین جب ملک ناصرالدین محمود مرحوم کی وفات کے بعد ملک اختیار الدین بلکا کے فتنہ کو فرو کرنے کے لیے لکھنوتی پہنچا تو وہاں سلطان غیاث الدین خلجی کی بھلائی کے کام اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔" (ایضاً ص ۴۴۳)

سلطان التمش کے دایرۂ ملوک میں بلکا کا نام اس طرح درج ہوا ہے۔

"ملک اختیار الدین دولت شاہ بلکا حسام الدین عوض خلجی ملک لکھنوتی (ایضاً ص ۴۵۲)

ان واقعات کے علاوہ محمد عوفی کی جوامع الحکایات میں مندرج ایک واقعہ سے دولت شاہ کا لکھنوتی کا حاکم ہونا مسلم ہو جاتا ہے۔ اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے، محمد عوفی ہم عصر مولف ہے:

"اس زمانے میں دولت شاہ باغی، ناشکرے، حق ناشناس کا واقعہ بھی اسی کے مانند ہے۔ یہ کافر نعمت سلطان جہاں، وارث ملک سلیمان، سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں بغاوت پر آمادہ ہو گیا شہنشاہ نے اس کی تربیت بڑی توجہ سے کی تھی۔ یہی غیر معمولی توجہ موجب عناد ہو گئی۔ گویا عنایت شاہی کا پودا اس کی کمینگی کے شورہ زار میں سوائے کفران نعمت کے اور کوئی پھل نہ دے سکا۔ دولت شاہ مردود نہایت تیرہ دل اور سیاہ رو تھا، اور باوجود اس کے کہ اس حکومت کا پروردہ اور اس دربار کا پرورش یافتہ تھا اور شاہانہ عاطفت کی بنا پر ادنیٰ درجے سے ترقی کر کے مقبول بارگاہ ہو گیا تھا۔ جو ایک سواری کے لائق نہ تھا وہ خدایگان جہاں کی توجہ سے پہلوان وقت اور صاحب فرمان ہو چکا تھا۔ اب اس کے سر پر شیطنت سوار ہوئی۔ جب اس نے دیکھا کہ زمانے کی بیوفائی اور آسمان کی بے مروتی کی وجہ سے وارث تخت خداوند زادہ ناصرالدین محمود بن سلطان کے وجود سے تخت سلطنت خالی ہو گیا اور وہ بے نظیر وجود بلوغ عمر میں خوشبودار پھول کی طرح بہت کم عمر ٹھہرا یعنی اس نے داعی اجل کو لبیک اجابت کہا تو اس کی ناشکری اور کفران نعمت نے اسے اس بات پر اتنا اکسایا کہ وہ استقلال کا دم بھرنے لگا اور لکھنوتی اور گوڑ کی وسیع مملکت کو اپنے قبضے اور تصرف میں لے آیا۔ اس کے ظلم کا جھنڈا بلند ہو گیا اور فتنے کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور اس نے اپنے نام کا خطبہ شروع کیا اور سلطان کہلانے لگا۔ ظلم و جفا کا سلسلہ شروع ہو گیا اور استقامت ملک کے لیے ایک ہزار سے زیادہ مشاہیر موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ سلطان التمش نے اس فتنے کی آگ بجھانے کا مصمم ارادہ کر لیا اور حکم دیا کہ خشکی اور تری دونوں راستوں سے حملہ کیا جائے۔ سلطان بہ نفس نفیس اس مہم میں شریک تھا۔ دولت شاہ پر بدبختی سوار تھی اور تھوڑی سی قوت جو اس کو حاصل ہوئی تھی، اس پر بہت پھولا ہوا تھا۔ وہ شاہی لشکر کے مقابلے کے لیے آمادۂ پیکار ہوا۔ لیکن ابھی نہ تو سلطان کا سایہ ہی اس کافر نعمت پر پڑا تھا اور نہ شاہی لشکر نے اس پر حملہ کیا تھا کہ اس کا کام تمام کر دیا گیا۔"

اس فتح کا شمار اہم فتوحات میں ہے جو درحقیقت نظام الدین

قوام الملک کی توجہ اور فکر کا نتیجہ تھی۔

حکایت بالا سے حسب ذیل نتیجے نکلتے ہیں۔

۱۔ دولت شاہ ادنیٰ درجے سے ترقی کرکے بڑے درجے تک پہنچا تھا۔ چوں کہ عام طور پر اس کو حسام الدین حسین عوض خلجی کا بیٹا بتایا جاتا ہے، اس صورت میں اس کے ادنیٰ درجے کا تصور مشتبہ ہے۔

۲۔ التتمش نے اس کی پرورش بڑی توجہ سے کی۔ اس سلسلے میں جوامع کے حسب ذیل جملے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

چون خیاط عنایت شاہنشاہی قبای تربیت از حد قداد دراز تر بریدہ بود موجب عناد عسرت گشت و چون بوستانبان عاطفت شاہانہ نہال اصطناع در زمین شورۂ دنائت نشاندہ بود جز کفران بار نیاورد

["چونکہ عنایت شاہنشاہی کے درزی نے اس کی تربیت کی قبا اس کے قد سے ذرا بڑی کاٹی تھی۔ یہی (تربیت) اس کی دشمنی کا موجب ہوئی اور شاہانہ عاطفت کے باغبان نے نیکی کا پودا اس کی کمینگی کے شورہ زار میں بویا تھا۔ اس میں سوائے ناشکری کے کوئی پھل نہ آیا]

"دولت شاہ، ضریر این دولت و وضیع این جہان حضرت بود و بہ ترشیح عاطفت شاہانہ از حضیض خمول بہ اوج قبول برآمد و از کمترین درجہ بہ عالی ترین مقامی متصاعد گشت۔"

[دولت شاہ اس دربار میں ایک حقیر اور پست درجہ رکھتا تھا اور شاہانہ تربیت سے گمنامی کی پستی سے قبولیت کی بلندی پر پہنچ گیا اور نہایت پست درجے سے بلند ترین مرتبے پر فائز ہو گیا تھا۔]

۳۔ وہ سلطان شمس الدین کی عنایت سے لکھنوتی کا فرمانروا ہوا تھا

" از یمن نظر خدایگان جہان خویشتن را پہلوان و صاحب فرمان دید۔"

[خداوند عالم کے فیض نظر سے اس نحیف نے اپنے کو پہلوان اور صاحب فرمان دیکھا۔]

۴۔ وہ کافر نعمت تھا اور کفران نعمت کی سب سے بڑی مثال اس کا استقلال اور آزادی کا خواب تھا۔ اس نے لکھنوتی اور گوڑ کی عظیم مملکت پر قبضہ کر لیا۔ خطبہ اپنے نام کا جاری کیا اور سلطان کہلانے لگا۔

" دولت شاہ را کفران نعمت و بطر دولت باعث و محرض آمد برآنکہ دم استبداد و استقلال زند و ولایت بسیط و عریض لکھنوتی و گوڑ را فرو گیرد، پس رایت ظلم افراخت و آتش فتنہ افروخت و خطبہ بنام خود کرد و خویشتن را نام سلطان نہاد۔"

[دولت شاہ کو نعمت کی ناشکری اور مرتبے کے غرور نے اس بات پر اکسایا کہ وہ آزادی اور استقلال کا دم بھرے اور لکھنوتی اور گوڑ کی وسیع مملکت کو ہتھیا لے پس اس نے ظلم کا جھنڈا بلند کیا اور فتنہ کی آگ بھڑکائی خطبہ اپنے نام سے پڑھنے لگا اور سلطان کہلانے لگا۔]

۵۔ ہزاروں مشاہیر موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

" واند و ہزار کس را از معارف از برای استقامت ملک باطل خود بہ ناحق کشت۔"

[ہزار سے زیادہ مشاہیر کو اپنی باطل حکومت کے استقلال کے لیے بے وجہ قتل کر دیا۔]

۶۔ خشکی اور تری دونوں راستوں سے شاہی فوج حرکت میں آئی، لکھنوتی شہر، دریائے گنگا کے دونوں طرف تھا۔ اس لیے دریائی راستے کا استعمال ناگزیر ہوا ہوگا۔

۷۔ التتمش خود اس مہم میں شامل تھا۔ دولت شاہ لڑائی سے قبل ہی قتل کر دیا گیا۔

" پادشاہ کامگار بہ نفس مبارک خود در ظل چتر فیروزی بداں طرف خرامید۔۔ و ہنوز پرتو آفتاب جلال سایۂ یزداں بر آں کافر نعمت نیفتادہ بود کہ۔۔ چوں سایہ بر خاک افتاد و ہنوز شیران بیشۂ نصرت حملہ نکردہ بودند کہ آں کافر نعمت را در گور خوابانیدند۔"

[بادشاہ نے خود بہ نفس نفیس شاہی لشکر کی معیت میں اس طرف حرکت کی۔ لیکن ہنوز اس کے جلال کا سایہ اس کافر نعمت پر نہیں پڑا تھا۔ اور شاہی لشکر نے اس پر حملہ نہیں کیا تھا کہ وہ قبر میں سلا دیا گیا۔]

۸۔ دولت شاہ کے لیے یہ رباعی اس موقع پر نظم ہوئی تھی۔ ناظم شاید محمد عوفی ہی ہو۔

ہر دل کہ خلافِ شہ در آن می گردد
چون دولتشہ بی سر و جان می گردد
بی سر تن او، بہ گاہ چون می سازد
بی تن سر او گرد جہان می گردد

"جس شخص کے دل میں سلطان سے دشمنی کا خیال پیدا ہوتا ہے وہ دولت شاہ کی طرح قتل ہوتا ہے۔ اس کا تن جس میں سر نہ تھا، قتل گاہ میں پڑا رہا اور اس کا سر تن سے جدا، سارے جہاں میں پھرایا جاتا رہا"۔

اس سے بجا طور پر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ دولت شاہ کا سر کاٹ کو بادشاہ کے حضور میں پیش کیا گیا ہوگا۔

۹۔ راورٹی کو اس بات پر شک ہے کہ سلطان ناصر الدین محمود کی وفات لکھنوتی میں ہوئی۔ عوفی نے بھی دولت شاہ کی بغاوت کا واقعہ شہزادہ کی وفات کے ذکر کے بعد بیان کیا ہے۔ اگرچہ اس میں کوئی تاریخ نہیں لیکن طبقات ناصری کے بیان سے ملانے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شہزادے کی وفات لکھنوتی میں ۶۲۶ھ/۱۲۲۸ء میں ہوئی ہوگی۔ ۶۲۴ھ/۱۲۲۶ء میں اس نے لکھنوتی ہی میں حسام الدین عوض خلجی کو شکست دے کر قتل کر دیا۔ وہیں اس کو چتر اور خلعت عطا ہوئے (۱۲۲۶ تا ۱۲۲۸ء) میں اس نے وہیں وفات پائی۔ اس سے واضح ہے کہ ۶۲۴ھ تا ۶۲۶ھ (۱۲۲۶ تا ۱۲۲۸ء) کے درمیان وہ لکھنوتی کا فرمانروا تھا۔ ظاہر ہے یہ مدت ایک سال سے کچھ ہی زیادہ ہوگی۔ لیکن اس سے راورٹی کے قیاس کی تائید نہیں ہو سکتی۔

دولت شاہ کی حکومت اور فرماں روائی کا ایک تیسرا اہم ماخذ اس کا ایک سکہ ہے جس کا تعارف مسٹر ٹامس کے ایک مضمون مجلہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ج ۶، ۱۸۷۳ء ص ۳۶۷ میں ہوا ہے۔ سکے پر سلطان کا نام اس طرح ملتا ہے۔

"ابوالمعالی دولت شاہ بن مودود" اور تاریخ ۶۲۷، ۶۲۹ دونوں پڑھی جاتی ہے "سبع عشرین وستمائۃ" میں "سبع" "تسع" بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

عبدالحی حبیبی نے ہودی والا کی سند پر سکے میں حکمراں کا یہ نام لکھا ہے:

شہنشاہ علاء الدین ابوالمعالی دولت شاہ بن داؤد (طبقات ۱، ۴۳۴ حاشیہ)۔ بہرحال سکہ کی شہادت بھی اسی امر کی ہے کہ دولت شاہ واقعی فرمانروا تھا۔

طبقاتِ ناصری میں ملک دولت شاہ کا نام کئی طرح پر ملتا ہے اور بیشتر یہ اختلاف اس کتاب کے مختلف قلمی نسخوں کے درمیان اختلافِ قرأت کا نتیجہ ہے۔

مثلاً ایک جگہ : ملک اختیار الدین بلکا (ج ۱ ص ۴۳۷)
دوسری جگہ : بلکا ملک حسام الدین عوض خلجی ملک لکھنوتی (ج ۱ ص ۴۴۸ حاشیہ)
تیسری جگہ : ملک دولت شاہ خلج ملک لکھنوتی (ج ۱۔ ص ۴۵۲)

بہرحال طبقات ناصری کے نسخوں کے اختلاف کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام دولت شاہ بلکا، لقب اختیار الدین اور اس کے باپ کا نام حسام الدین عوض خلجی تھا۔ لیکن عوفی نے جوامع میں اس کا نام صرف دولت شاہ لکھا ہے۔ البتہ سکہ سے کچھ اور ہی چیز مترشح ہوتی ہے۔ سکے کی عبارت یہ ہے۔

"شہنشاہ علاء الدین ابوالمعالی دولت شاہ بن داؤد"

اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بخوبی ممکن ہے کہ تخت نشینی کے بعد دولت شاہ کا لقب اختیار الدین کے بجائے علاء الدین ہو گیا ہو۔ ابوالمعالی اس کی کنیت طبقات اور جوامع میں مذکور نہیں۔ البتہ سکہ کی شہادت پر اس کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ لیکن سکے میں "بلکا" کا حذف سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ ترکی نام اتنا شاذ نہیں جتنا ظاہر ہوتا ہے

لقب اور کنیہ سے زیادہ پیچیدہ معاملہ باپ کے نام کا ہے۔ طبقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا باپ حسام الدین عوض خلجی ہے۔ اگرچہ حسام الدین لکھنوتی کا نامور فرماں روا گزرا ہے۔ لیکن تخت نشینی کے بعد اس کا لقب غیاث الدین ہو گیا تھا۔ اس لیے حسام الدین کے بجائے غیاث الدین کا اندراج زیادہ مناسب ہوتا۔ لیکن طبقات کی یہ روایت سکے کی شہادت کے خلاف ہے۔ اس میں باپ کا نام واضح طور پر داؤد لکھا ہے۔ ملاورٹی کی رائے یہ ہے کہ داؤد حسام الدین عوض کا اصلی نام ہوگا۔ لیکن یہ توجیہ زیادہ قابل قبول نہیں معلوم ہوتی۔ اس کا متداول نام حسام الدین اور تخت نشینی کے بعد غیاث الدین لقب تو طبقات وغیرہ میں موجود ہے۔ اس کے اصلی نام کا حذف بے ربط سی بات معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال اس میں شک ہی نہیں کہ دولت شاہ کے باپ کا نام داؤد تھا۔ ممکن ہے وہ حسام الدین عوض یعنی سلطان غیاث الدین ہی ہو۔ لیکن بحالت موجودہ بغیر مزید شہادت کے داؤد کا لقب حسام الدین یا غیاث الدین قابل قبول نہیں۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جوامع الحکایات میں دولت شاہ کے متعلق ہے کہ وہ ادنیٰ درجے سے اعلیٰ درجے تک پہنچا۔ سلطان غیاث الدین کا بیٹا بہرحال شاہزادہ تھا۔ اس کو ادنیٰ درجے کا قرار دینا خلاف قیاس ہے۔

اوپر نقل ہو چکا ہے کہ طبقات ناصری میں دولت شاہ کو لکھنوتی کا ملک قرار دیا گیا ہے اور محمد عوفی نے جوامع الحکایات میں اسے لکھنوتی کا سلطان بتایا ہے، جس نے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور خود سکے کی شہادت ہے کہ وہ ۶۲۷ھ میں لکھنوتی کا فرمانروا تھا۔ اور طبقات ناصری سے واضح ہے کہ ملک حسام الدین عوض کا قتل ۶۲۴ھ میں ہوا اور اس کے بعد التتمش نے سلطان ناصر الدین محمود کے لیے چتر لعل لکھنوتی بھیج کر اسے مکرم و مشرف کیا۔

"ازانجملہ یک تشریف گراں با چتر لعل بطرف لکھنوتی فرستاد و ملک ناصر الدین محمود علیہ الرحمہ بدان چتر و تشریفات و اکرام مشرف گشت"
(ص ۴۵۴)

[ان تحائف] میں سے ایک قیمتی خلعت ہیرے جڑے ہوئے چتر کے ساتھ لکھنوتی بھیجا اور سلطان ناصر الدین محمود علیہ الرحمۃ اس چتر اور دوسرے انعام و اکرام سے معزز و مشرف ہوا۔]

اس کے ڈیڑھ سال بعد ناصر الدین فوت ہوا (ص ۴۵۴) اور اس واقعہ کی خبر جمادی الاول ۶۲۶ھ میں دلی پہنچی (ص ۴۴۷) اور اس کے بعد بلکا خلجی کی بغاوت کا ذکر آتا ہے اور وہ ۶۲۷ھ میں گرفتار ہو جاتا ہے (ص ۴۴۸)۔ اسی سال کا سکہ بھی دولت شاہ کے نام کا موجود ہے بظاہر اواخر ۶۲۷ھ میں اس کی گرفتاری عمل میں آئی ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ملک ناصر الدین کی وفات کے فوراً بعد دولت شاہ بلکا کا تقرر عمل میں آیا ہوگا۔ یعنی جمادی الاول ۶۲۶ھ کے فوراً بعد اور گرفتاری دوسرے سال کے آخری حصے میں۔ اس حساب سے دولت شاہ کی فرمانروائی کی مدت شاید ایک سال سے دو ایک ماہ زیادہ ہوگی۔ لیکن چونکہ تاریخوں میں اس حکمران کا نام واضح مذکور ہے، اس لیے اس ایک سال کی فرمانروائی پر یہ سطریں قلم بند ہوئیں۔ طبقات ناصری میں فرماں روایان لکھنوتی میں اس کا عدم شمول اس وجہ سے نہ ہوا ہوگا کہ وہ التتمش کا دست نشاندہ اور زیر فرمان تھا۔ آخری چند مہینوں میں اس نے آزادی کا اعلان کر کے خطبہ اور سکہ اپنے نام کا جاری کیا۔ اس لحاظ سے وہ باغی تھا۔ شمالی ہند کا درباری مورخ باغی کو آزاد حکمران تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا بھی امکان ہے کہ ناصر الدین محمود کی حیات میں اس کے زیر فرمان رہا ہو، اور اس کی وفات کے بعد اس نے آزادی کا اعلان کر دیا ہو۔ بہرحال ابھی یہ موضوع تشنۂ تحقیق ہے۔ جس طرح جوامع کی مدد سے اس سلسلہ کی دو ایک پیچیدہ گتھیاں سلجھیں۔ عجب نہیں ممکن ہے تحقیق سے کچھ اور ماخذ سامنے آئیں اور یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہو جائے۔

استدراک

طبقات ناصری ج ۱ ص ۴۴۵ میں ہے کہ ۶۲۲ھ میں سلطان التتمش نے سلطان غیاث الدین عوض خلجی کو زیر کیا تو خلجی سلطان نے ۳۸ ہاتھی اور اسی لاکھ درہم سلطان دہلی کی خدمت میں بطور پیشکش

بھیجا، پھر خطبے میں اس کا نام شامل کیا اور سکہ بھی اس کے نام ڈھالا۔ مسٹر ٹامس نے ایشیاٹک سوسائٹی جنرل، ۱۸۷۴ ج ۶ میں اس دور کے چند سکوں کا تعارف کرایا ہے۔ اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ۶۱۶ ہجری میں غیاث الدین خلجی نے سلطان التتمش کی بالادستی تسلیم کرلی تھی اور سکہ بھی اس کے نام سے ڈھالنا شروع کر دیا تھا، مگر یہ رائے درست نہیں۔ پروفیسر قانونگو نے تاریخ بنگال ترتیب جدو ناتھ سرکار، طبع ڈھاکا، ۱۹۴۸ء کے باب اول ضمیمہ سوم میں لکھا ہے کہ ٹامس کی رائے کہ غیاث الدین خلجی نے ۶۱۶ ہجری تک التتمش کے نام سکے ڈھالے، اس کے بعد اپنے نام سے اور آخر میں ۶۲۲ سے ۶۲۴ھ تک پھر سلطان دہلی کے نام سکے ڈھالے، درست نہیں۔ پروفیسر مذکور نے غیاث الدین خلجی کے عہد کے پانچ سکوں کا ذکر کیا ہے جو معلوم ہیں ان میں سے کسی میں التتمش کا نام نہیں اور نہ ان سے اُس کی کسی قسم کی بالادستی ظاہر ہوتی ہے۔ ان سکوں میں ایک سکہ ۶۱۶ ہجری کا ہے، اس پر خلجی سلطان کا نام اس طرح مذکور ہے

"السلطان المعظم غیاث الدنیا والدین ابوالفتح عوض
بن الحسین ناصر امیر المومنین"

۶۱۷ ہجری کے سکے میں ناصر امیر المومنین کے بجائے "الناصر لدین اللہ" کندہ ہے۔

۶۲۰ ہجری والے سکے میں سلطان کا نام اس طرح ملتا ہے:

"غیاث الدنیا والدین قسیم امیر المومنین سلطان السلاطین
فی الدنیا والدین"

ربیع الآخر ۶۲۰ھ کے سکے میں جو گوہاٹی میں برآمد ہوا تھا۔ اس میں سلطان کا نام سکہ بالا کی طرح آیا ہے۔ راورٹی کو بھی ٹامس کی رائے سے اختلاف ہے۔ اس کا قول ہے کہ سلطان غیاث الدین ۶۲۲ھ تک آزاد حکمران تھا، التتمش کی ماتحتی کا کوئی سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ ۶۱۶ ہجری کے سکے جو التتمش کے نام کے ہیں اور بنگال کے ڈھلے ہوئے بتلائے جاتے ہیں۔ اُن کا تعلق غیاث الدین سے نہیں، وہ بہار کے دارالضرب کے ہوں گے، ان سکوں سے غیاث الدین کی ماتحتی ثابت نہیں ہوتی۔ اور بات وہی ہے کہ ۶۲۲ھ تک وہ آزاد حکمران تھا اس کے بعد التتمش نے اس کو اپنا ماتحت بنالیا تھا۔

[ترجمہ طبقات ج ۲۔ ص ۷۶۲، حاشیہ]

حواشی

۱۔ طبقات ناصری۔ طبع کابل ۲۔ ایضاً ج ۱، ص ۴۴۲۔ ۴۳۸
۳۔ ایضاً۔ ص ۴۳۱ ۴۔ ایضاً۔ ص ۴۳۸ ۵۔ ایضاً ص ۴۴۵ حاشیہ
۶۔ سلطان رضیہ کے زمانے میں ۶۳۴ھ/۱۲۳۶ء میں قتل ہوا۔ (طبقات ۱: ۴۵۹)۔
۷۔ طبقات ج ۱ ص ۴۵۳
۸۔ ۶۲۴ھ میں اس کی شکست ہوئی۔ اس حساب سے اس کا عہد ۶۱۲ھ تا ۶۲۴ھ/۱۲۱۵۔۱۲۲۶ء ہوگا۔ لیکن بعض لوگوں نے ۶۰۹ تا ۶۱۷ھ قرار دیا ہے (رک: ترجمہ راورٹی ج ۱، ص ۵۷۱ ح) طبقات سے مختلف ہونے کے علاوہ خود اس کا سکہ ۶۲۲ یا ۶۲۳ کا موجود ہے۔
۹۔ راورٹی ایضاً ج ۱، ص ۵۸۶ ح، ۵۹۵ ح۔
۱۰۔ اضافت ابنی ہے، یعنی بلکا ملک بن حسام الدین۔
۱۱۔ بلکا بن حسام الدین
۱۲۔ جوامع الحکایات جزو۲ قسم ۳، تہران ۱۳۵۳، ص ۵۵۲۔۵۵۳۔
۱۳۔ اسی کتاب ص ۵۴۹۔۵۵۲ میں طغرل کی حکایت ہے جو زبردستی غزنی کے تخت پر بیٹھ گیا تھا، مگر ایک سال کے اندر قتل ہو گیا۔
۱۴۔ مثلاً ترجمہ طبقات ج ۱ ص ۵۷۱ ح ۵ میں وفات اودھ میں بتائی گئی ہے اور ص ۶۳۰ ح ۱ میں طبقات کے بیان (یعنی لکھنوتی میں وفات) کی توثیق ہوئی ہے۔
۱۵۔ دیکھیے راورٹی ترجمہ طبقات ج ۲ ص ۴۴ حاشیہ۔
۱۶۔ راورٹی ۱: ۵۸۶ ملک اختیار الدین بلکا خلج
۱۷۔ کتابت در راورٹی ۱: ۶۱۷، بمبیی کے نسخے میں (متن میں ص ۲۴۸) بلکا خلجی ہے
۱۸۔ راورٹی کے یہاں ملک اختیار الدین دولت شاہ بلکا بن حسام الدین عوض خلجی ملک لکھنوتی (۱: ۶۲۲)
۱۹۔ محمود غزنوی کے دور کے ایک امیر کا نام جو مسعود غزنوی کے زمانے میں حاجب بزرگ کے عہدہ پر فائز ہوا تھا، بلکاتگین تھا۔ اسکے ذکر سے تاریخ بیہقی بھری ہے۔

قاضی عبدالستار*

سولھویں قسط

خالد بن ولید

پھر اچانک محاصرے میں کڑک دھمک سے شدت پیدا کر دی۔ فصیل کے تمام مرغولوں اور رخنوں میں اتنی شدید تیر باری کی کہ گورنر کو یقین ہو گیا کہ سیف اللہ کے حکم پر حمص اور دمشق سے منجنیقیں اور دبابے حاضر ہونے والے ہیں۔ وہ ساری رات اپنی مجلسِ شوریٰ کے ساتھ جاگتا رہا۔ ایک ایک دروازے کی نگہبانی کا معائنہ سنتا رہا۔

صبح ہوتے ہی اطلاع دی گئی کہ سیف اللہ نے محاصرہ اٹھا لیا تو اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ فوراً سوار ہو کر معائنہ کیا تو بصارت پر یقین نہ آیا۔ پھر بھی پوری احتیاط کے ساتھ اپنی نگرانی میں ایک دروازہ کھول کر چند سواروں کو اسلامی لشکر کی جستجو میں روانہ کر دیا۔ دوپہر تک یقین کر لیا اور شہنشاہ کے نام اپنی کارگزاریوں کے نامے کا مضمون بنانے لگا شام ہوتے ہوتے سارے دروازے کھل گئے۔ اور کھیتوں اور باغوں کے مالک اپنے اپنے نقصان کا اندازہ کرنے کے لیے نکلنے لگے کہ اچانک پورا ایک لشکر زمین سے پیدا ہو گیا اور دروازوں پر اتنی تیزی سے قابض ہوا کہ گورنر نے تلوار پھینک دی۔

قنسرین کی فوجی اہمیت کے پیشِ نظر اس کی شہر پناہ ڈھانے کا حکم دے کر شام کے آخری سرحدی شہر مرعش کے لیے سوار ہو گئے۔ شہر پناہ کے دروازے صلح کی دستکوں کے باوجود بند رہے تو رائیت اجلال کھول دیا۔ اور شہر کے سارے دفاعی نظام کو زیر و زبر کر ڈالنے کی رسم انجام دی اور البرکم کے لیے سوار ہو گئے کہ مخبروں کے بیان کے مطابق شہنشاہ البرکم کی طرف جنبش کر چکا تھا۔

ہرقل جو قنسرین کی فصیل کے انہدام اور مرعش کے انجام کے پیشِ نظر سلطنتِ شام سے مایوس ہو چکا تھا۔ اپنے کیمپ پر سیف اللہ کی توجہ پا کر بے قرار ہو گیا۔ ہر چند کہ ابھی سیف اللہ البرکم سے منزلوں دور تھے شہنشاہ جس عالم اور جس لباس میں بیٹھا تھا، سوار ہو گیا۔ حفاظتی دستوں کے رکاب میں داخل ہو جانے کے خیال سے گھوڑے کو تھامے ہوئے تھا۔ شہنشاہ کی پہاڑیوں پر نظر پڑی تو کلیجے میں ہوک سی اٹھنے لگی۔ کیسی کیسی تاریخ ساز یادوں کے کارواں آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ ابھی کل ہی تو اسی شہنشاہ کے دامن میں اس کی بارگاہ برپا تھی۔ جس کے دونوں طرف اس کا وہ باجبروت لشکر پڑا ہوا تھا جسے القدس کی فتح سے مشرف ہونا تھا۔ اسی بارگاہ میں کسریٰ ایران کا سفیر ہاتھ باندھے اپنے شہنشاہ کی گزارشات پیش کر رہا تھا اور اس کے ظفر نصیب جنرل تلواروں پر ہاتھ رکھے اپنے غضب کا اظہار کر رہے تھے۔ اسی چوٹی پر وہ روم کی ملکۂ عالیہ کے ساتھ چتر زرنگار کے نیچے بیٹھا تھا۔ جب کسی جنرل نے گھٹنوں پر گر کر قنسرین کی فتح کی مبارکباد پیش کی تھی۔ ہرقل نے نگاہ اٹھائی تو سامنے سورج غروب ہو رہا تھا۔ مشرق سے اس کے اقبال کی طرح رخصت ہو رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ گھوڑا کھڑا ہو گیا ہے۔ نگاہ کی کسی مقرب بارگاہ کے مودب ہاتھ لگام کو تھامے ہوئے تھے۔ وہ کھڑا رہا۔ شام کی گلابی دھوپ میں شام کے مناظر خوبصورتی کی حدوں سے گزر چکے تھے اور اب ان کی آب و تاب سونلانے لگی تھی اور اب سبزے کی سبزی اور پھولوں کی رنگت پر سیاہی کا سایہ پڑنے لگا اور جاں نثاروں نے اپنے سر رکاب زریں پر رکھ دیے تھے اور اس نے اپنی آواز سنی:

"الوداع ——اے شام —— اے سلطنتوں کی عروس۔"

"الوداع —— اے بادشاہوں کی دولھن۔ الوداع"

"رخصت ہونے والے کا سلام قبول کر —— اے شام۔"

* پروفیسر قاضی عبدالستار، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

"یہی ایسی جدائی ہے ۔ جس کے بعد"

"ملاقات"

"ممکن نہیں ۔ ممکن نہیں ۔"

مودب ہاتھوں سے لگام جھپٹ لی۔ گھوڑے کو اس طرح مہمیز کیا کہ آگے چلتے ہوئے گارڈز کا پرا کھل نہ جاتا تو وہ اُن پر چڑھ جاتا۔

الرہا کے شہر نے بھوتوں کے شہر کی طرح سیف اللہ کا استقبال کیا صلحنامہ گلے میں پہن کر اپنی آبادی کی جان بچالی۔ خبر داروں کے ساتھ شمشاط کی چوٹی پر اشقر سے اترے۔ زین پوش بچھا کر نماز شکر ادا کی اور اس راستے کو دیکھتے رہے جس نے چھتیس گھنٹے پہلے ہرقل کے فرار کا تماشا دیکھا تھا۔

انطاکیہ کے محلات شاہی پر سیف اللہ کا پڑاؤ پڑا تھا۔ قرب وجوار کی آبادیوں کے وفد پیشی کا انتظار کر رہے تھے کہ امین الامت کے قاصد نے حاضر ہو کر نامہ پیش کیا۔

"حاضر سے مرعش اور الرہا تک کی تمام فتوحات مبارک ہوں۔" آپ کے فتوحات نامے پڑھ کر امیر خلافت (حضرت عمر) تڑپ گئے۔ ارشاد ہوا کہ خالد تو خود اپنی خدمات سے سپہ سالار ہو گئے۔ سپہ سالار اعظم ہو گئے۔ خدا ابوبکر پر اپنی رحمت نازل کرے جو مجھ سے زیادہ مردم شناس تھے۔"

ساتھ ہی فرمان دیا گیا کہ قنسرین کے تمام علاقے آپ کی امارت میں دیے گئے۔"

خط پڑھ کر غلام کو دے دیا اور وفد کی پیشی کا انتظار کرنے لگے۔ سیکڑوں کوس پر پھیلے ہوئے کثیر المسائل سرحدی صوبے کے انتظام سے فارغ ہو کر دار الامارت کی طرف مراجعت فرما رہے تھے کہ دربارِ خلافت سے پروانہ موصول ہوا۔

"معلوم ہوا کہ تم نے شاہی حمام کا جھانواں جو شراب کی آمیزش سے تیار ہوتا ہے، اپنے جسم پر استعمال کیا۔ اللہ نے شراب کے ظاہر و باطن کو اسی طرح حرام کیا ہے جس طرح اس نے ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے گناہوں کو حرام کیا ہے۔ چہ جائیکہ اس سے غسل کیا جائے ۔ آئندہ سے شراب کو کبھی اپنے جسم سے مس نہ کرنا کیونکہ وہ نجس ہے۔ تم نے غلطی سے ایسا کر لیا۔ آئندہ ایسا کبھی نہ کرنا۔"

وہ تحریر کو پڑھتے رہے۔ سوچتے رہے۔ لفظوں کے درمیان آئندہ ظہور پذیر ہونے والے واقعات کی خوشبو تلاش کرتے رہے۔ غلام کو طلب کیا۔ دستِ خاص سے جواب لکھا۔

امیر خلافت کے نام

اللہ کے بندے رسول اکرم کے غلام سیف اللہ شمشیر اسلام خالد بن ولید کی جانب سے۔

سلام رحمت۔

شراب اپنی اصلی شکل میں اسی شدت اور نشہ پیدا کرنے والی حالت میں ہو تو حرام ہے۔ لیکن جب اس سے یہ صفات زایل ہو جائیں تو اسے شراب کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ جھانویں کی مٹی میں ملی ہوئی شراب کی تاثیر کو آگ میں پکا کر ضایع کر دیا گیا۔ اور وہ شراب کی خاصیت سے مبرا ہو چکا۔

والسلام"

جواب نامہ اسی وقت مہر بند کر کے قاصد کے ہاتھ پر رکھ دیا اور قنسرین کے لیے سوار ہو گئے۔

ان زمانوں میں مذہبی مقامات حکمرانوں کی مستقل فوجوں کی حفاظت کے بجائے خود اپنی حرمت اور عظمت کے سایے میں محفوظ ہوتے تھے ۔ اس لیے کہ اُن کی دیواروں کی ایک خراش پورے پورے ملکوں کی آبادیاں کو لہولہان کر دیتی تھی اور عوام ان ہی اسلحوں سے مسلح ہو کر کھڑے ہو جایا کرتے جن سے بڑے بڑے بادشاہوں کے خاص الخاص محافظ آراستہ ہوتے کہ شہنشاہ کے محافظ کے پاس بھی ایسا کوئی حربہ نہیں ہوتا جو عام آدمی کی دسترس میں نہ ہو۔ بیت المقدس کا معاملہ ذرا مختلف تھا کہ وہ ایک حاکم نشیں شہر تھا نہ صرف یہ بلکہ ہرقل کا شوقِ زیارت اسے اکثر مقیم رکھتا تھا۔ اس لیے بیت المقدس کا گورنر دس بارہ ہزار سواروں کو اپنے جلو میں رکھنے کا پابند تھا۔ تاہم فحل سے مرعش تک ساری سلطنت کی فتح اور شہنشاہ کے فرار نے بیت المقدس کو ایک پکا ہوا پھل بنا دیا تھا جو فاتحوں کی ایک جنبش پر اُن کے دامن کی زینت ہو سکتا تھا۔ اور ہرقل جانتا

تھا۔ بیت المقدس مسلمانوں کا قبلۂ اول ہے اور عیسائی راہبوں اور عالموں کو علم تھا کہ ختم المرسلین بیت المقدس کی پرامن فتح کی بشارت فرما چکے۔

ایک طرف سیف اللہ شام سے ہرقل کو نکال رہے تھے، دوسری طرف امین الامت بیت المقدس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بعض مقامات پر چھوٹی چھوٹی فوجوں نے جوش جہاد میں حملے بھی کر دیے لیکن ان معمولی خونریزیوں سے کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ نابلس اور عمواس اور بیت جبرین گھٹنوں پر گر پڑے اور بیت المقدس کا گورنر اسقف اعظم کے ساتھ حاضر ہوا اور گزارش کی کہ دنیا کے اس مقدس ترین شہر کی ان برگزیدہ ہستیوں کی جو پیغمبروں کی اولاد ہیں آرزو ہے کہ بیت المقدس کی حکومت سپہ سالار کے بجائے خود خلیفۃ المسلمین کے ہاتھوں میں سونپ دی جائے۔ تاکہ شہر کی تقدیس اور شہریوں کی تجدید تلوار سے محفوظ رہے۔ امین الامت نے جو سپہ سالار سے زیادہ صحابیٔ رسول تھے وفد کی میزبانی کی دلاسائی کی اور یقین دلایا کہ بیت المقدس کے نام پر میری تلوار نیام ہو چکی اور امید ظاہر کی کہ امیرِ خلافت بنفس نفیس بیت المقدس پر نزول اجلال فرمائیں گے۔

امین الامت کی گزارش پر مرکز اسلام نے مدینے سے جنبش کی تو عراق و شام میں زلزلہ آگیا۔ ممالک مفتوحہ کے قصر ہائے حکومت ہلنے لگے۔ بڑے بڑے سپہ سالار جن کے رأیت وعَلم کی پرچھائیوں سے ایک دنیا کانپتی تھی استقبال کی تیاریاں کرنے لگے۔ جزیرہ و شام کی سرحدوں پر فاتح ایران لشکروں کے گھوڑے کڑکنے لگے۔ قنسرین سے انطاکیہ تک نامدارانِ عرب کے نیزے کھڑکنے لگے۔ مصر سے آنے والی تمام شاہراہوں پر حبشی رسالوں کے جھنڈے چمکنے لگے۔

سیف اللہ دارالحکومت سے اس طرح نکلے جس طرح بادشاہ نکلتے ہیں وہ ہزاروں سوار رکاب میں تھے جن کے سینوں پر بزاخہ سے مرعش تک کی فتوحات کے تمغے لگے تھے۔ جن کے گھوڑوں نے بڑے بڑے شہنشاہوں کا تکبر کچل کر ڈال دیا تھا۔ امین الامت نے اصحاب رسول اللہ کے ساتھ پاپیادہ چل کر استقبال کیا تو وہ شخص اعظم جو اگر چاہتا تو حجاز سے شام تک تمام شاہراہوں کو خلعتوں سے ڈھانپ دیتا، ایسا کرتا پہنے نظر آیا، جس کی پشت کجاوے کی رگڑ سے پھٹ چکی تھی۔ ازار کے تین پیوند تین تراوک کی طرح چمک رہے تھے۔ سر کا عمامہ غبار اور پسینے سے مزین تھا۔ بدنما قبضے کی بھدی تلوار کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی۔ پاپوش کے نام پر چمڑے کے تلے رسیوں سے بندھے تھے۔ تنہا ایک غلام اونٹ کی مہار تھامے ہوئے تھا۔ خلیفہ اس طرح اترا جس طرح بادشاہ تخت سے اترتا ہے۔ ایک عظیم الشان سناٹے کا خط اعظم تھا جو زمین سے آسمان تک قایم تھا۔ سلام کیا تو آواز کی ہیبت ہڈیوں میں اتر گئی۔ مصافحہ کیا تو زمین کی زمامِ حکومت عطا کر دی۔ معانقہ کیا تو خلعت آسمانی سے مشرف کر دیا۔ مقربانِ بارگاہ رسالت کے ساتھ اس طرح پیدل چل رہے تھے جیسے فارس و روم کی سلطنتیں بچھی پڑی ہوں۔ جس سوار کے شکوہ اور سواری کی شان پر نگاہ اٹھ گئی اسے محسوس ہوا کہ ہرقل و کسریٰ نے رکابیں تھام لیں۔

بھورے نمدے کے دوہرے خیمے پر سپہ سالار کا جھنڈا اڑ رہا تھا جیسے رعبِ خلافت سے کانپ رہا ہو۔ قدم رکھا تو خیمہ روشن ہو گیا۔ سامان پر نگاہ کی تو اونٹ کے پالان، گھوڑے کی زین، کھجور کی چٹائی، چھال کے تکیے اور چند برتنوں اور ہتھیاروں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ خاموش کھڑے رہے۔ امین الامت کی گزارش پر اس طرح بیٹھ گئے جیسے اونٹ چرانے والے درخت کے نیچے بیٹھ جاتے ہیں۔ سپہ سالار اعظم سے امور جہانبانی پر گفتگو کر رہے تھے کہ "اللہ اکبر" کے نعروں سے خیمہ چھلکنے لگا۔ پیشانی کی شکن نے امین الامت سے دریافت کیا تو جواب ملا۔

"سیف اللہ اتر رہے ہیں۔"

شکن گہری ہو گئی۔ نگاہ پر فکر کا سایہ پڑنے لگا۔ دیر کے بعد کھانا طلب کیا۔ امیرِ شام نے لکڑی کے پیالے میں اونٹنی کا دودھ اور لکڑی کی قاب میں کھجوریں اور روٹی سامنے رکھ دی۔ کھانا کھاتے جاتے اور امین الامت کو دیکھتے جاتے۔ نمازِ ظہر کے لیے باہر نکلے۔ سواری نا مقبول ہوئی۔ تھوڑی دور چلے تھے کہ وہ سرخ خیمہ نظر آیا جس کے سامنے عرب کے جانبازوں کا ہجوم تھا۔ کھڑے ہو گئے۔

"یہ کس بادشاہ کا محل ہے؟"

جواب ملا۔

"یہ شمشیرِ اسلام کی کچھار ہے۔"

"سیف اللہ کا خیام ہے۔"

شامیانہ مسجد کے سامنے عمرو بن العاص، یزید بن ابی سفیان، شرحبیل بن حسنہ،

عیاض بن غنم اور دوسرے بڑے بڑے نام ور وردِ مسعود کا انتظار کر رہے تھے۔ مسجد میں قدم رکھا تھا کہ آواز آئی

"السلام علیکم یا خلیفہ، خلیفہ رسول اللہ!"

مڑ کر دیکھا تو سیف اللہ کھڑے تھے۔ بنی مخزوم کے جوان ہتھیاروں میں جکڑے ہوئے جلوداری کر رہے تھے۔

"وعلیکم السلام یا سیف اللہ!"

مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھائے تھے کہ ذاتِ خلافت نے باہوں میں سمیٹ لیا۔ نگاہ معزولی کے غبار سے اس طرح پاک ہو گئی جیسے سان پر رکھی ہوئی تلوار کی دھار۔

خطبے کے لیے اٹھے تو دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ مہین اور نفیس ریشمیں اور الملبیں قباؤں، مکلف ازاروں بنے ہوئے عماموں اور سجے ہوئے ہتھیاروں میں سرسراتی ہوئی رونیت اور مجوسیت کا خطرناک تماشا دیکھتے رہے۔ دولت اور فراغت شخصیتوں کو کرداروں کو کتنی خاموشی اور کتنی تیزی سے متاثر کرتی ہے اس کا نظارہ کرتے رہے۔ سارا خطبہ سادگی جفاکشی، درویشی، قلندری اور پارسائی اور ایمانداری اور خاکساری اور انکساری پر صرف کر دیا۔

بیت المقدس میں شور تھا کہ مسلمانوں کا وہ مہرقل آ رہا ہے جس نے ہرقل کو ہرقل کے ملک سے ملک بدر کر دیا۔ جس نے کسریٰ ایران کو ایران سے ڈھکیل دیا۔ وہ مجنوں نے شہنشاہوں کے جلوس کا خدم و حشم دیکھا تھا ہفتوں سے وردِ مسعود کا انتظار کر رہے تھے۔ ابھی آفتابِ خلافت بیت المقدس کے آسمان سے کوسوں دور تھا لیکن بیت المقدس کی زمین گھوڑوں کی کڑک اور ہتھیاروں کی چمک سے کھلنے لگی تھی۔ فصیلِ شہر کے تمام دروازے سیف اللہ اور یزید بن ابی سفیان اور عمرو بن العاص کے جھنڈوں اور سواروں کی حراست میں کھڑے تھے۔ پھر وہ ساعتِ محمود آ گئی جس کی ہیبت کے سامنے وقت ایک ایاز کی طرح بے دست و پا تھا۔ پورا شہر اپنے ہفت رنگ لباسوں اور صد رنگ رعنائیوں اور نیرنگ زیبائشوں کے ساتھ مکانوں اور دکانوں اور چھتوں اور راستوں پر امڈ آیا تھا لیکن کہیں کوئی آواز نہ تھی۔ وہ مہیب سناٹا تھا کہ گھوڑے اپنی دموں کا چنور کرنا بھول گئے۔ ایک سکوتِ اعظم تھا کہ تقدیرِ الٰہی کی طرح قائم تھا۔ اور

امیر المومنین ننگے گردآلود راستے پر پاپیادہ چل رہے تھے جیسے ہر قدم ایک سلطنت پر پڑ رہا ہو۔ بطریقِ اعظم اسقفوں اور راہبوں اور پادریوں اور جنرلوں اور امیروں کے ساتھ ہیکل سلیمانی کے سامنے حاضر تھا۔ پیوند سے آراستہ لباس، جفاکشی سے ستا ہوا بدن، نورِ ایمان سے پرجلال چہرہ جس طرف نگاہ اُٹھ جاتی، نگاہیں سجدوں میں گر پڑتیں۔ درویشی اور قلندری کا وہ وہ جلیل الشان نظارہ تھا کہ بطریقِ اعظم کی رہبانی رعونت اور مذہبی کدورت کا پورا قلعہ گر پڑا۔ اس عقیدت اور احترام سے پیشوائی کی جس عقیدت اور احترام سے ہرقل کا دامن خالی رہا۔ مصافحے کے لیے ہاتھ اُٹھے تو بطریق نے آنکھیں رکھ دیں۔ ایک ایک راہب اور جنرل اور امیر کا تعارف قبول کیا۔ ایوان میں جس کی تمام چھت اور دیواریں صدیوں کے کمال مصوری سے آراستہ تھیں، جس کے گوشے چاندی اور مرمر کے بے نظیر مجسموں سے پیراستہ تھے انبیا کی متبرک ہستیوں سے بھرا ہوا تھا۔ سب سے پہلے عمرو بن العاص داخل ہوئے کہ فلسطین کے گورنر تھے۔ ان کے بعد امین الامت اور سیف اللہ کے درمیان خلیفۂ وقت نے قدم رکھا۔ بطریقِ اعظم کے ساتھ ساتھ سارا ہجوم بیٹھ چکا تو آواز آئی۔

"لوگو! تمہارے ہاتھ ہمارے قاصدوں اور سفیروں مسافروں اور حلیفوں کے خون سے رنگین ہیں۔ تمہارے پاؤں ہماری مخالفت میں خوں ریز بادیہ پیمائی سے آبلہ پوش ہیں۔ تمہارے دل ہماری کدورت سے لبریز ہیں — تمہارے دماغ ہمارے خلاف جانگداز منصوبوں سے معمور ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ خیبر سے حضیرا اور انطاکیہ تک جب کبھی تمہاری جماعت کو اپنی عداوت کے اظہار کا موقع ملا تو اس نے ضائع نہیں کیا۔ تمہارا بادشاہ اپنی جان کی سلامتی کے لیے تم کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا گیا لیکن تمہاری روح پر ہرقل کی وفاداری کی مُہریں لگی ہیں۔ تم مرکزِ اسلام سے دور اور ہرقل سے نزدیک ہو۔ سمندر جو آبادیوں کے فراق کا ضامن ہوتا ہے، تمہارے وصال کی ضمانت ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب تمہارے نامداروں کی تحریریں ہرقل کے دربار میں باریاب نہ ہوتی ہوں، کوئی رات ایسی نہیں گزرتی جب ہرقل کے قاصد شیطانی شرارتوں کے پلندے لے کر تمہارے گھروں پر نازل نہ ہوتے ہوں۔ ہمارے لشکر تمہارے ان جاسوسوں کی چراگاہ بن گئے جن کو ہمارا بھیس بنا لینے کا ہنر آتا ہے۔ تمہارے گرجا وہ خفیہ اسلحہ خانے ہیں جو چشم زدن میں شہریوں کو

فوجیوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ تمہارے بلند و بالا گھوڑے تمہاری فوجی طاقت کا سب سے بڑا سہارا ہیں اور ہتھیار اپنے استعمال کا بہانہ ڈھونڈھتا ہے۔ اس لیے تم ہتھیار باندھ کر گھوڑے پر نہیں بیٹھ سکتے کہ سلطنتِ شام میں ہماری تھوڑی سی فوج تمہاری کثیر آبادی کے سامنے کوئی نفری قوت نہیں رکھتی۔ تم نے ان یتیم اور نابالغ بچوں کو جو درحقیقت مسلمان تھے ان کی باپ کی جائیداد سے محروم کر کے جبراً عیسائی بنا لیا۔ اس لیے تم اجازتِ خاص کے بغیر اصطباغ نہیں دے سکتے۔ تم مجوسیوں کو جو ہزاروں سال سے فارس کی شہنشاہی پر قابض ہیں حقارت سے دیکھتے ہو۔ تم عرب کے عیسائیوں اور یہودیوں تک سے جانوروں کا سلوک کرتے ہو۔ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے تمہارے دلوں میں کیا جذبہ ہو سکتا ہے۔ یونانیوں کے غرور اور تکبّر کا تو کہنا ہی کیا۔ وہ اپنے آپ کو ساری دنیا کے انسانوں سے افضل اور برتر سمجھتے ہیں اور اپنی فضیلت اور برتری کو تلوار سے منوانے کی کوشش کرتے ہیں اور ہر قسم کے فساد اور فتنے کا سبب بنتے ہیں۔ اس لیے ان کو شام چھوڑنا ہوگا۔

تم نے جب کبھی ہم پر فتح پائی اور تم نے ہمیشہ ہماری بستیوں میں رہنے والی عیسائیوں اور یہودیوں کی غداری کی طاقت پر فتح پائی تو تم نے ہمارے مکانوں اور کھیتوں اور چراگاہوں کو لوٹ لیا پھونک دیا اجاڑ دیا۔ عورتوں اور بچوں کو ہمارے جانوروں کے ساتھ ہانک لے گئے اور ہماری بستیوں کو اس طرح برباد کیا کہ وہ بے نام و نشان ہو گئیں۔ ہم کو یقین ہے کہ اگر تم نے ہم پر اس طرح فتح پائی ہوتی جس طرح ہم تم پر فتحیاب ہوئے تو تمہارا بادشاہ ہماری طرح گفتگو نہ کر رہا ہوتا۔ بلکہ اس کی لاکھوں تلواروں سے ہمارا خون ٹپک رہا ہوتا۔ میں اپنے بیان کے لیے تمہاری وہ کہانیاں پیش کرتا ہوں جن پر تم ناز کرتے ہو۔"

"تاہم اے گروہ نصاریٰ و یہود

یہ مقدس شہر ہمارے لیے بھی اسی تمجید اور تحریم کا حامل ہے جس کے تم دعوے دار ہو اور اسی تحریم اور تقدیس کے نام پر میں تم کو امان دیتا ہوں۔ یہ وہ امان ہے جو خدا کے بندے رسول کے غلام اور خلافت کا بار اٹھانے والے عمر بن خطاب نے ایلیا کے لوگوں کو دی۔ یہ امان ان کی جان، آبرو اور ملک و مال پر محیط ہے۔ ایلیا کے لوگو— تم کو جزیہ دینا ہوگا جس طرح مسلمان کو زکاۃ اور عشر دینا پڑتا ہے۔ جزیہ وہ محصول ہے جو تمہاری جان اور مال اور آبرو کی حفاظت کے اخراجات کے لیے وصول کرتے ہیں۔ ہاں اگر تم میں سے کوئی فوجی خدمت انجام دے گا تو اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے گا۔ اور اگر ہم تمہاری حفاظت سے عاجز ہو جائیں گے تو جزیہ کے نام پر وصول کی ہوئی تمام رقم واپس کر دیں گے۔ تم کو اپنے لباس پر یہ زنّار اسی طرح پہننا ہوگا تاکہ تم اگر ہماری آستینوں میں رینگ آؤ تو ہم تمہیں آسانی سے تلاش کر لیں۔ تم مسلمانوں کی محفلوں میں صلیب نہیں نکال سکتے۔ تم ہماری نمازوں کے اوقات میں باجے نہیں بجا سکتے۔ تم کھلے عام شراب کی تجارت نہیں کر سکتے۔ تم ہماری بستیوں میں سور نہیں پال سکتے۔ تم عرب غلاموں کو نہیں خرید سکتے۔ تم مسلمانوں کو تین دن سے زیادہ مہمان نہیں رکھ سکتے۔ تم اپنے اجتماعات میں شریک مسلمانوں کو بے عزت نہیں کر سکتے۔ تم ہماری بستیوں میں اپنے مکانات نہیں بنا سکتے — تم ہمارے قبرستانوں اور آبادیوں کے متصل اپنے مردے دفن نہیں کر سکتے کہ اس طرح امن و امان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔"

"اگر تم اپنے عہد پر قائم رہو گے تو ہم اپنے قول کے پابند رہیں گے اور تم دیکھو گے کہ اگر تم کو کوئی مسلمان قتل کرتا ہے تو ہم اس کو وہی سزا دیں گے جو کسی مسلمان کے قتل پر دی جا سکتی ہے۔"

زندہ مُردوں کی طرح بیٹھے تھے۔ سکوت فرماتے ہی عمرو بن العاص نے پروانۂ امن بطریقِ اعظم کے ہاتھوں میں رکھ دیا۔ اس نے ہر دفعہ کو غور سے پڑھ کر واپس کیا۔ خالد بن ولید، عمرو بن العاص اور معاویہ بن ابی سفیان نے دستخط کر دیے۔ امین الامت نے نمازِ ظہر کا وقت ہو جانے کی اطلاع دی۔

بطریق نے عرض کیا۔

"خلیفۂ وقت کا حکم ہو تو یہیں نماز کی ادائیگی کا انتظام کر دیا جائے۔"

فوراً جواب ملا۔

"ہم نے بطریق کی گزارش پر بھی اگر یہاں نماز پڑھ لی تو مسلمان جس ملک کو بھی فتح کریں گے اس کے عبادت خانے کو مسجد بنا لیں گے۔"

کسی خوش آواز نے اذان کہی۔ حوض پر وضو کیا۔ سبزے کے فرش پر زیب پوشوں اور چادروں کی جانمازیں بچھ گئیں اور صفیں کھڑی ہو گئیں۔

(جاری ہے)

الطاف احمد اعظمی*

قرآن مجید اور سائنسی علوم

(یہ مقالہ سنٹر فار پروموشن آف سائنس، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیرِ اہتمام منعقدہ سمینار بتاریخ ۱۵—۱۷ جنوری ۱۹۸۷ء کو پڑھا گیا)

علوم وفنون بالخصوص سائنسی علوم کے میدان میں مسلمانوں کی موجودہ پستی وپسپائی کے متعدد اسباب ہیں جن میں سے بعض اسباب سیاسی، بعض معاشی اور بعض مذہبی نوعیت کے ہیں۔ اس مقالے میں ان تمام اسباب وعوامل کی نشاندہی اور اُن کی شرح وتفصیل ممکن نہیں ہے اس لیے میں اپنی بحث وگفتگو صرف مذہبی اسباب تک محدود رکھوں گا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کو مختلف علوم وفنون کے میدان میں جن میں سائنسی علوم بھی شامل ہیں، ایک مدّتِ دراز تک سیادت وقیادت کا مقام حاصل رہا ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی سے یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے آغاز تک کسی نہ کسی شکل میں مسلم دانشوروں نے اپنی علمی فضیلت و برتری کو قایم رکھا۔ جابر بن حیّان (متوفی ۸۰۳ء)، ابو موسیٰ خوارزمی (متوفی ۸۵۰ء) ابن اسحاق کندی (متوفی ۸۷۳ء) زکریا رازی (متوفی ۹۲۵ء)، البتانی (متوفی ۹۲۹ء) ابونصر فارابی (متوفی ۹۵۰—۹۵۱ء) ابوالحسن علی مسعودی (متوفی ۹۵۷ء) ابوالوفا (متوفی ۹۹۷—۹۹۸ء) ابوالقاسم زہراوی (متوفی ۱۰۱۳ء)، ابن الہیثم (متوفی ۱۰۳۹ء)، ابن سینا (متوفی ۱۰۳۷ء)، البیرونی (متوفی ۱۰۴۸ء) الغزالی (متوفی ۱۱۱۱ء) عمر خیام (متوفی ۱۱۲۳—۱۱۲۴ء) ابن رشد (متوفی ۱۱۹۸ء)، ابن بیطار (متوفی ۱۲۴۸ء) نصیر الدین طوسی (متوفی ۱۲۷۴ء) ابن نفیس (متوفی ۱۲۸۸ء) قطب الدین شیرازی (متوفی ۱۳۱۱ء) ابن خلدون (م ۱۴۰۶ء) اور شاہ فتح اللہ شیرازی (متوفی ۱۵۸۹ء) جیسی یگانۂ روزگار ہستیاں اس تابندہ دور کی یادگار اور نمائندہ ہیں۔

چودھویں صدی عیسوی کے آغاز کے بعد مسلمانوں نے علوم وفنون کے میدان سے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا شروع کیا اور سولھویں صدی عیسوی میں داخل ہوتے ہی انھوں نے روپوشی اختیار کرلی۔ اور آج اس مقام پر کھڑے ہیں جس کو دیکھ کر یہ گمان کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ کسی دور میں مسلمان بھی آسمان علم کے آفتاب و ماہتاب رہ چکے ہیں۔

مذہبی نقطۂ نظر سے علوم وفنون بالخصوص سائنسی علوم کے میدان سے مسلمانوں کی رجعت وپسپائی کے دو بڑے اسباب ہیں۔ ایک سبب تو وہ مخالفانہ بلکہ محاربانہ رویہ ہے جو سائنسی علوم کے مغربی فاضلین نے مذہب کے بارے میں ایک عرصۂ دراز سے اختیار کر رکھا ہے۔ مغرب میں نشاۃِ ثانیہ کے بعد مذہب کی جو درگت بنی اور جس وسیع پیمانے پر خدا اور مذہب کو تنقید و استہزا کا نشانہ بنایا گیا وہ اربابِ مذہب کے لیے سخت اذیتناک تھا۔ مخالفین مذہب کے اس جارحانہ رویے کو دیکھ کر دیگر مذاہب عالم کے حاملین کی طرح مسلمانوں نے بھی یقین کرلیا کہ جدید سائنسی علوم فی الواقع مذہب اور مذہبی اقدار کے دشمن ہیں اور ان علوم کی تحصیل کا مطلب خدا اور مذہب سے کلیتًا دست بردار ہو جانا ہے۔ اس منفی خیال کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان کی اکثریت نے سائنسی علوم کی تحصیل سے کنارہ کشی اختیار

* حکیم الطاف احمد اعظمی (علیگ)، سینیر سائنٹفک آفیسر، ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری آف میڈیسن، ایچ۔ ایم۔ آر۔ ہمدرد نگر، نئی دہلی۔

کرلی اور اسباب و مذہب نے اپنی ساری توجہ خالص مذہبی علوم کی ترویج و اشاعت پر مرکوز کر دی۔ اور آج بھی امتِ مسلمہ کا سوادِ اعظم اسی جادۂ فکر پر گامزن ہے۔

اس کا دوسرا بڑا سبب قرآن مجید سے مسلمانوں کا فکری انقطاع ہے مجھے یقین ہے کہ اگر مسلمانوں نے قرآن مجید سے اپنا فکری رشتہ منقطع نہ کیا ہوتا تو مذہب کے خلاف مغربی اربابِ فکر و نظر کی تمام ہنگامہ آرائیوں کے باوجود وہ سائنسی علوم کی تحصیل سے ہرگز دست کش نہ ہوتے۔ آیئے ذرا تفصیل سے دیکھیں کہ سائنسی علوم کے باب میں قرآن مجید کا کیا نقطۂ نظر ہے؟

قرآن مجید، علم اور اہلِ علم

سائنسی علوم کے باب میں قرآنی نقطۂ نظر کو ٹھیک طور پر اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب پہلے یہ جان لیا جائے کہ آسمانی کتاب کے نزدیک علم اور اہلِ علم کا کیا مقام و مرتبہ ہے؟

قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک علم کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ زمانۂ نزول کے اعتبار سے سورۂ علق قرآن مجید کی اولین سورہ ہے اور اس کا موضوع علم و قلم ہے، فرمایا:

"پڑھو اے نبی اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے غلیظ خون سے انسان کی تخلیق کی، پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا، ہرگز نہیں انسان سرکشی کرتا ہے اس بنیاد پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے (حالانکہ) پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی کی طرف ہے۔"

[علق : ۱ تا ۸]

ان آیات سے نہ صرف علم کی غیر معمولی اہمیت کا اظہار ہوتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علم وہ سب سے بڑی نعمت ہے جس سے خدا نے اپنے بندوں کو نوازا ہے۔ لیکن بہت سے کم نظر و کم ظرف شرابِ علم کے چند گھونٹ پی کر اپنے خالق اور محسن حقیقی کا انکار کر بیٹھتے ہیں۔ کیوں ــــــ؟ صرف اس لیے کہ علم طاقت اور قوت کا سرچشمہ ہے اور یہی قوت ان کو خدا سے بے نیاز و بے پروا بنا دیتی ہے۔ لیکن شاید وہ نہیں جانتے کہ یہ علم غیر محدود نہیں بلکہ محدود ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان کو جو طاقت و قوت بھی حاصل ہے، وہ فانی ہے اور صرف ایک طاقت یعنی ذات باری تعالیٰ باقی رہنے والی ہے۔

قرآن مجید کی ایک دوسری آیت سے بھی علم کی بے پایاں اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ فرمایا:

"جسے وہ چاہتا ہے علم و دانائی (حکمت) بخشتا ہے اور جس کو دانائی ملی بے شک اس کو بڑی نعمت ملی" (البقرہ: ۲۶۹)

قرآن مجید کے نزدیک اہلِ علم کا جو مرتبہ و مقام ہے اس کو درج ذیل آیات کی روشنی میں بخوبی سمجھا جا سکتا ہے:

۱۔ خدا اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ فرشتے اور اہلِ علم جو انصاف پر قائم ہیں وہ بھی (گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) (آل عمران: ۱۸)

۲۔ "تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے، خدا ان کے درجے بلند کرے گا اور خدا تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔"

۳۔ "ہم یہ مثالیں لوگوں کو (سمجھانے کے لیے) بیان کرتے ہیں اور اسے تو اہلِ دانش ہی سمجھتے ہیں"۔ (عنکبوت: ۴۳)

۴۔ "خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو صاحبِ علم ہیں"۔ (فاطر: ۲۸)

۵۔ "کہہ دو، بھلا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ اور نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل مند ہیں"۔ (زمر: ۹)

آیات مذکورہ بالا سے واضح ہو گیا کہ قرآن مجید کے نزدیک انسانوں میں سے ان لوگوں کا مرتبہ و مقام بہت بلند ہے جو دولتِ علم سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایک انسان اور حیوان میں فی الواقع جو شے مابہ الامتیاز ہے وہ عقل کا جوہر گرانمایہ ہے۔ چنانچہ جو لوگ خدا کی بخشی ہوئی عقل سے کام نہیں لیتے یا دوسرے لفظوں میں علم و فکر سے تہی دست ہوتے ہیں وہ انھیں شرفِ انسانیت سے محروم قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ ایک جگہ فرمایا ہے:

"خدا کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے" (انفال: ۲۲)

دوسری جگہ فرمایا ہے:

"کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟
یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے"۔

[فرقان ۴۴]

قرآن مجید اور سائنسی علوم

علم اور اہل علم کے سلسلے میں قرآن مجید کے طرز التفات کی تعین و تشریح کے بعد اب میں سائنسی علوم کے باب میں قرآن مجید کے نقطۂ نظر کو قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کروں گا۔

علوم و فنون بالخصوص سائنسی علوم کے باب میں قرآن مجید کے نقطۂ نظر کی تعیین میں علمائے امت میں اختلاف پایا جاتا ہے اور وہ دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ ایک گروہ ان علماء کا ہے جو قرآن مجید میں سائنسی علوم کی موجودگی کا شدت سے منکر و مخالف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن مجید ایک ہدایت کی کتاب ہے اور اسے صرف ہدایت کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اس میں اگر کہیں بعض علوم کا تذکرہ آگیا ہے تو اس کی حیثیت بالکل ثانوی ہے اور یہ علوم بھی وہی ہیں جو عربوں میں معروف و مقبول تھے۔

اس گروہ کی ترجمانی کرتے ہوئے علامہ شاطبی نے اپنی کتاب الموافقات میں لکھا ہے کہ عرب کو جن علوم کی طرف فی الواقع میلان تھا، ان میں علم نجوم، علم الانواء، اوقاتِ باراں، بادلوں کی پیدائش، بادلوں کو اٹھانے والی ہواؤں کی گردش، علم تاریخ، امم ماضیہ کے احوال و کوائف، طب اور فنون بلاغت شامل ہیں اور یہ وہ علوم ہیں جن کا شمار علوم صحیحہ میں ہوتا ہے۔ علم قیافہ، وزجر (پرندوں سے شگون لینا) کہانت (غیب کی باتیں) اور خط رمل (کنکریاں مارنا اور شگون لینا) کا شمار علوم باطلہ میں ہوتا ہے۔ عرب کے ان علوم کے ذکر کے بعد علامہ شاطبی فرماتے ہیں:

"صحیح علوم کو برقرار رکھنے اور باطل علوم کو باطل ٹھہرانے میں شریعت نے انھیں باتوں کو پیش نظر رکھا ہے جو عرب کو معلوم تھیں۔ ان کی معروف باتوں سے کہیں بھی باہر قدم نہیں نکالا ہے"۔

اس کے بعد اُن لوگوں پر تنقید کرتے ہیں جو قرآن مجید سے علوم جدید کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، فرماتے ہیں:

"بعض لوگ اس معاملے میں حد سے تجاوز کر گئے ہیں اور انھوں نے قرآن مجید کی طرف ان تمام باتوں کو منسوب کر دیا ہے جنھیں کسی پہلو سے بھی زمرۂ علم میں شامل کیا جا سکتا ہے خواہ یہ علم متقدمین کا ہو یا متاخرین کا۔ مثلاً علوم طبیعیہ، علوم ریاضیہ و منطقیہ، علم الحروف اور دوسرے وہ تمام علوم جن میں ارباب فکر نے عقلی ترکتازیاں دکھائی ہیں۔ ان سب علوم کا منبع انھوں نے قرآن مجید کو ٹھہرایا ہے۔ ان کے اس خیال کو کسی طرح بھی درست نہیں کہا جا سکتا ہے"۔

دوسرا گروہ ان علماء کا ہے جو نہایت سختی کے ساتھ اس بات کا دعویدار ہے کہ قرآن مجید علوم کا جامع ہے۔ دنیا کا کوئی قابل ذکر اور مفید علم ایسا نہیں جو قرآن مجید میں نہ پایا جاتا ہو۔ ان کے نزدیک قرآن مجید کا یہ ایک ایسا معجزاتی وصف ہے جو آج بھی اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ قرآن مجید کلام الٰہی ہے۔ کیوں کہ یہ بات کسی انسان کے لیے ممکن نہ تھی کہ وہ چودہ سو سال پہلے کائنات کے ان حقائق و معارف کی خبر دیتا جو آج موجودہ سائنسی دور میں منکشف ہو سکے ہیں۔ اس گروہ کی ترجمانی کرتے ہوئے سید عبد الرحمٰن کواکبی لکھتے ہیں:

"ان سب علوم کی تصریحات یا ان کی طرف اشارے قرآن مجید میں تیرہ سو سال سے موجود ہیں اور اب تک مخفی اس لیے رہے کہ جب اُن کے ظہور کا وقت آ جائے تو وہ قرآن مجید کا معجزہ بن کر اس بات کی گواہی دیں کہ بے ریب قرآن اس رب حقیقی کا کلام ہے جس کے سوا کسی دوسرے کو غیب کا حقیقی علم حاصل نہیں ہے"۔

مصر کے مشہور ادیب مصطفیٰ صادق رافعی نے اپنی کتاب اعجاز القرآن میں لکھا ہے کہ قرآن مجید میں جملہ علوم کے اصول و کلیات موجود ہیں۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ عصر حاضر کی سائنسی ایجادات اور علوم طبیعیہ کی طرف قرآن مجید میں واضح اشارات پائے جاتے ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"اگر علوم جدیدہ کا کوئی ماہر قرآن مجید میں غور کرے اور خوب فکر کرے اور وہ فہم صحیح سے عاری نہ ہو اور کسی بات میں الجھ کر نہ رہ جائے تو اسے قرآن مجید میں ایسے بہت سے اشارے

ملیں گے جن سے حقائق عالم ظاہر ہوتے ہیں۔ البتہ قرآن مجید ان حقائق کو شرح و بسط کے ساتھ بیان نہیں کرتا۔ وہ حقائق کی طرف صرف رہنمائی کرتا ہے اگرچہ ان کے نام مقرر نہیں کرتا۔[۵]

اس گروہ کے اوّلین سرخیل امام غزالی ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب جواہر القرآن میں اس سلسلے میں بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ قرآن مجید میں تمام علوم موجود ہیں۔ حتیٰ کہ انھوں نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ قرآن مجید میں ایسے علوم بھی بالقوہ موجود ہیں جن کا ادراک بشر کی طاقت سے باہر ہے۔[۶]

راقم السطور کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں سائنسی علوم کی موجودگی کے باب میں مذکورہ دونوں گروہ کے علماء افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ اوّل الذکر گروہ کا یہ کہنا کہ قرآن مجید میں سائنسی علوم کا سرے سے کوئی ذکر نہیں، حقیقت واقعہ کے خلاف ہے۔ جیسا کہ میں آگے چل کر واضح کروں گا لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ موخر الذکر گروہ کا یہ خیال کہ قرآن مجید میں جملہ علوم کے اصول و کلیات موجود ہیں، محل نظر ہے اور اس میں صریح مبالغہ پایا جاتا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں متعدد ایسی آیات موجود ہیں جن میں سائنسی علوم کی طرف واضح اشارات پائے جاتے ہیں۔ درج ذیل آیاتِ قرآنی کا تعلق معروف سائنسی علوم سے بالکل واضح ہے۔

علم ہیئت

۱- "درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ پھر اپنے عرش پر جلوہ افروز ہوا (یعنی کائنات خلقت میں اپنے قوانین جاری کر دیے) جو رات کو دن پر ڈھانکتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے۔ سورج، چاند اور ستارے سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔ خبردار، اسی کی خلق اور اسی کا امر ہے۔ بڑا بابرکت ہے اللہ سارے جہانوں کا پروردگار" (اعراف: ۵۴)۔

۲- "اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں" (الانبیاء: ۳۳)

۳- اور وہ اللہ ہی ہے جو آسمان کو اس طرح تھامے ہوئے ہے کہ اس کے اذن کے بغیر وہ زمین پر نہیں گر سکتا ہے بیشک اللہ انسانوں کے حق میں بے اندازہ شفیق اور رحیم ہے"۔ (حج: ۶۵)

۴- "بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ (سورج) اور ایک چمکتا ہوا چاند روشن کیا۔ وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا" (فرقان: ۶۲)

۵- "کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں۔ اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ سب ایک مقررہ مدت تک چلے جا رہے ہیں" (لقمان: ۲۹)

۶- "لوگوں کے لیے ایک نشانی رات بھی ہے۔ ہم ہی دن کو رات سے علیحدہ کرتے ہیں تو اُن پر اندھیرا چھا جاتا ہے اور سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ زبردست قدرت اور علم رکھنے والی ہستی کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے اور چاند کی ہم نے منزلیں متعین کر دی ہیں۔ یہاں تک کہ اُن سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے۔ نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں" (یٰسین: ۳۷-تا-۴۰)

۷- "آسمان کو ہم نے اپنی طاقت سے بنایا ہے اور ہم ہی اس کو وسعت دینے والے ہیں" (ذاریات: ۴۷)

۸- "کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان طبق در طبق بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا" (نوح: ۱۵-۱۶)

علم طبیعیات:-

۱- کیا وہ لوگ غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے ان کو جدا کیا۔ (انبیاء: ۳۰)

۲۔ "وہ دن جب کہ ہم آسمان کو یوں لپیٹ دیں گے جیسے طومار میں اوراق لپیٹ دیے جاتے ہیں" [انبیاء: ۱۰۴]

۳۔ "پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت محض دھواں تھا۔" [حٰم سجدہ: ۱۱]

۴ "جس روز [یعنی قربِ قیامت کے وقت] آسمان پگھلی ہوئی چاندی [یا تانبے] کی مانند ہو جائے گا۔ اور آسمان دُھنے ہوئے اون کی طرح ہو جائے گا۔" [معارج: ۸،۹]

۵۔ "پوچھتے ہیں کب وقوع میں آئے گا وہ قیامت کا دن ؟ جب آنکھیں حیران اور خیرہ ہو جائیں گی۔ چاند بے نور ہو جائے گا۔ چاند سورج یکجا کر دیے جائیں گے۔" [قیامہ: ۶ تا ۹]

۶۔ "جب سورج لپیٹ دیا جائے گا اور جب تارے بکھر جائیں گے۔ اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔ اور جب سمندر بھڑکا دیے جائیں گے۔" [تکویر: ۱ تا ۶]

علم سائنس۔

۱۔ "اسی نے رات کو ذریعۂ سکون بنایا۔ اسی نے چاند اور سورج [کے طلوع و غروب] کا حساب مقرر کیا۔ یہ زبردست قدرت اور علم رکھنے والی ہستی کے ٹھہرائے ہوئے اندازے ہیں۔" [انعام: ۹۶]

۲ "وہی ہے جس نے سورج کو ضیا اور چاند کو نور بنایا اور چاند کی منزلیں مقرر کیں۔ تاکہ تم اسے برسوں کی گنتی اور [تاریخوں کا] حساب معلوم کر لیا کرو۔ اللہ نے یہ سب کچھ برحق پیدا کیا ہے۔ وہ اپنی نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں" [یونس: ۵]

۳۔ "سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں۔ اور تارے اور درخت سب سجدہ گزار ہیں۔ آسمان کو اس نے بلند کیا اور میزان قائم کر دی۔" [رحمٰن: ۵ تا ۸]

علم طبقات الارض

۱۔ "اور وہی ہے جس نے یہ زمین پھیلا رکھی ہے۔ اس میں پہاڑ نصب کر دیے ہیں اور دریا جاری کر دیے ہیں اور اس نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں..... اور دیکھو زمین میں الگ الگ خطے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے متصل واقع ہیں"۔ [رعد: ۳، ۴]

۲۔ "ہم نے زمین کو پھیلایا، اس میں پہاڑ نصب کیے اور اس میں ہر نوع کی نباتات ٹھیک ٹھیک نپی تلی مقدار کے ساتھ اگائی۔" [حجر: ۱۹]

۳۔ "اس نے زمین میں پہاڑ نصب کر دیے تاکہ زمین تم کو لے کر لڑھک نہ جائے اور اس نے دریا جاری کیے اور [قدرتی] راستے بنائے تاکہ تم راہ پالو۔" [نحل: ۱۵]

۴۔ "ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز کو پیدا کیا۔ کیا وہ اسے نہیں مانتے اور زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ انھیں لے کر لڑھک نہ جائے۔" [انبیاء: ۳۰۔ ۳۱]

۵۔ "وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا جاری کیے اور اس میں پہاڑ بنائے اور سمندروں کے بیچ پردے حائل کر دیے۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور بھی خدا [ان کاموں میں شریک] ہے، نہیں، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔" [نحل: ۶۱]

۶۔ "اور اس نے زمین میں پہاڑ نصب کر دیے تاکہ وہ تمہیں لے کر لڑھک نہ جائے۔ اس نے ہر طرح کے جانور زمین میں پھیلا دیے اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا اور زمین میں ہر قسم کی عمدہ نباتات اگا دیں۔ یہ تو ہے اللہ کی تخلیق۔ اب ذرا مجھے دکھاؤ ان دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے [جنھیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو] اصل بات

— اس کے متعدد معانی ہیں مثلاً، فلزات، جیسے چاندی، لوہا، تانبا۔ پگھلی ہوئی دھاتیں تیلا قطران، زیتون کا تیل وغیرہ۔ ان کثیر معانی کی وجہ سے یہ تعین مشکل ہے کہ اُن میں سے کون سے معنی یہاں مراد ہیں۔ یہ تعین اس لیے اور بھی مشکل ہے کہ ابھی یہ واقعہ سماوی ظہور میں نہیں آیا ہے۔"

یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔"
[لقمٰن: ۱۰-۱۱]

۷- "کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور پھر اس کے ذریعہ ہم ہر طرح کے پھل نکالتے ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ پہاڑوں میں بھی سفید، سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔"
[فاطر: ۲۷]

۸- "اور اللہ نے زمین کو تمہارے لیے فرش کی طرح بچھا دیا تاکہ تم اس کے اندر کھلے راستوں میں چلو۔" [نوح: ۱۹-۲۰]

۹- "کیا ہم نے زمین کو سمیٹ کر رکھنے والی نہیں بنایا — زندوں کے لیے بھی اور مردوں کے لیے بھی۔ اور اس میں بلند و بالا پہاڑ نصب کیے اور تمہیں میٹھا پانی پلایا"
[مرسلات: ۲۵ تا ۲۷]

علم نباتات

۱- "اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعہ ہر قسم کی نباتات اگائیں۔ پھر اُن میں ہری ہری شہنیاں نکالیں جن سے ہم گتھے ہوئے دانے نکالتے ہیں، اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے پیدا کرتے ہیں جو بوجھ سے جھکے پڑتے ہیں اور انگور، زیتون اور انار کے باغ اگائے جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور باہم مختلف بھی ہیں۔ یہ درخت جب پھلتے ہیں تو اُن میں پھل آنے اور پھر پکنے کی کیفیت کو ذرا غور سے دیکھو، ان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔"
[انعام: ۹۹]

۲- "اور بہت ساری چیزیں جو اس نے تمہارے لیے زمین میں پیدا کر رکھی ہیں ان کے رنگ باہم مختلف ہیں۔ اس میں بلاشبہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سبق حاصل کرنے والے ہیں۔"
[نحل: ۱۳]

۳- کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور پھر اس کے ذریعہ ہم نے پھل پیدا کیے جن کے رنگ باہم مختلف ہیں۔"
[فاطر: ۲۷]

۴- "پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے۔ خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود اُن کی اپنی جنس میں سے یا اُن اشیاء میں سے جن کو وہ جانتے نہیں۔"
[یٰسین: ۳۶]

علم حیوانات

۱- "زمین میں چلنے والے ہر قسم کے جانور اور پروں پر اُڑنے والے ہر قسم کے پرند تمہاری ہی طرح کے انواع ہیں"
[انعام: ۳۸]

۲- "اور تمہارے لیے چوپایوں میں بھی غور و فکر کا مقام ہے۔ ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں۔ یعنی خالص دودھ جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہے۔" [النحل: ۶۶]

۳- "اور دیکھو تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ٹٹیوں پر چڑھائی بیلوں میں اپنے چھتے بنا اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے رب کی مقرر کی ہوئی راہ پر چلتی رہ۔ اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ اس میں ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔"
[نحل: ۶۸-۶۹]

۴- "کیا ان لوگوں نے کبھی پرندوں کو نہیں دیکھا جو آسمان کی فضاؤں میں مسخر نظر آتے ہیں۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جو اُن کو تھامے ہوئے ہو۔ اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔" [نحل: ۷۹]

۵- "اور اللہ نے ہر جاندار کو ایک طرح کے پانی سے پیدا کیا کوئی پیٹ کے بل چل رہا ہے تو کوئی دو ٹانگوں پر اور

کوئی چار ٹانگوں پر، جو کچھ وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔" [نور: ۴۵]

۶۔ "اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔" [فاطر: ۲۸]

علم طب

۱۔ "وہی جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔" [انعام: ۹۸]

۲۔ "اے لوگو! اگر تم کو دوبارہ جی اٹھنے میں کوئی شک ہے۔ [تو اپنی ابتدائی حالت پر غور کرو جب] ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفے سے پھر علقہ [جمے ہوئے خون] سے پھر مضغہ [گوشت کا ٹکڑا] سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی۔ تاکہ تم پر [حقیقت] واضح کر دیں اور ہم جس نطفے کو چاہتے ہیں ایک وقت مقررہ تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں باہر نکال دیتے ہیں (پھر تمہاری پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم حد بلوغ کو پہنچ جاؤ۔"

[حج: ۵]

۳۔ "ہم نے انسان کو گیلی مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے ایک محفوظ جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا۔ پھر نطفہ کو علقہ بنایا پھر علقہ کو گوشت کے ایک لوتھڑے میں تبدیل کیا۔ پھر گوشت کے لوتھڑے کو ہڈیوں کی صورت دی۔ پھر ہڈی پر گوشت چڑھایا۔ پھر ہم نے اسے ایک بالکل دوسری ہی مخلوق بنا دیا۔ یقیناً اللہ بڑا ہی برکت والا اور سب خالقین سے افضل و بہتر خالق ہے۔" [مومنون: ۱۲ تا ۱۴]

۴۔ "جو چیز بھی اس نے بنائی خوب بنائی۔ اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا طین (گیلی مٹی) سے کی۔ پھر اس کی نسل ایک قسم کے حقیر پانی کے خلاصہ سے چلائی۔ پھر اس کو ہر زاویہ سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی۔ اور تم کو کان دیے، آنکھیں دیں اور دل دیے۔ تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔"

[سجدہ: ۷ تا ۹]

۵۔ "اور اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے پھر تمہارے جوڑے بنائے۔" [فاطر: ۱۱]

۶۔ "اس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا پھر وہی ہے جس نے اس جان سے اس کا جوڑا بنایا۔ اور اس نے تمہارے لیے مویشیوں میں سے آٹھ نر و مادہ پیدا کیے۔ وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔ یہی ہے اللہ تمہارا رب، بادشاہی اسی کی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پھر تم کدھر سے پھرائے جاتے ہو۔"

[زمر: ۶]

۷۔ "اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اگایا، پھر وہ تمہیں اسی میں واپس لے جائے گا، اور اسی میں سے [ایک دن] تم کو نکال کھڑا کرے گا۔ [نوح: ۱۷ - ۱۸]

۸۔ "کیا انسانوں پر زمانۂ لامتناہی (دھر) کا ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا۔" [دھر: ۱-۲]

۹۔ "انسان غور کرے کہ وہ کس چیز سے بنایا گیا ہے۔ ایک اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔ جو ریڑھ اور سینہ کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ یقیناً وہ اسے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔" [طارق: ۵ تا ۸]

آیات مذکورہ بالا سے نہ صرف قرآن مجید میں سائنسی علوم کی موجودگی عیاں ہو جاتی ہے، بلکہ اس خیال کی تردید بھی ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید میں صرف ان ہی علوم کا تذکرہ آیا ہے جو عربوں میں معروف و مقبول تھے۔

مظاہر فطرت اور قرآن مجید کی دعوت تفکر

قرآن مجید کی متعدد آیات میں انسانوں کو عالم فطرت کے واقعات اور مظاہر پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ ان میں

اربابِ علم و دانش کے لیے بہت سی نشانیاں (آیات) ہیں۔ اوپر کی سطروں میں سائنسی علوم سے متعلق جو آیاتِ قرآنی ہم نقل کر چکے ہیں، اُن میں سے بعض آیات میں مختصراً یہ دعوتِ تفکر موجود ہے۔ درج ذیل سطور میں اس دعوتِ تفکر کی حامل آیات کو قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ "تمہارا خدا ایک ہی ہے۔ اس رحمٰن و رحیم کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی ساخت میں اور رات اور دن کے بدلتے رہنے میں، اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی ہیں۔ بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور (اسی کے ذریعہ) زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے۔ ہواؤں کی گردش میں اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔"

[بقرہ: ۱۶۴]

۲۔ "یہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو بغیر کسی ظاہری ستون کے بلند کر رکھا ہے۔ پھر وہ اپنے تختِ اقتدار (عرش) پر جلوہ فرما ہوا (یعنی مخلوقات میں اپنے احکام و قوانین جاری کیے) اور آفتاب و ماہتاب کو تابع فرمان بنا دیا۔ ہر ایک، ایک متعین میعاد تک کے لیے (اپنی اپنی راہ) چلا جا رہا ہے۔ وہی (اس تمام کارخانۂ خلقت کا) انتظام کر رہا ہے۔ وہ (اپنی قدرت و حکمت کی) نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تمہیں یقین ہو جائے کہ تمہیں (ایک دن) اپنے پروردگار سے ضرور ملنا ہے اور وہی ہے جس نے یہ زمین پھیلا رکھی ہے۔ اس میں پہاڑ نصب کر دیے ہیں اور اس میں دریا جاری کر دیے ہیں۔ اور اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں۔ پھر وہی دن پر رات طاری کرتا ہے۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ اور زمین میں ٹکڑے (طبقات) ہیں ایک دوسرے سے متصل واقع، ان میں انگور کے باغ ہیں، کھیتیاں ہیں، کھجور کے درخت ہیں جن میں سے کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دوہرے۔ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں مگر ہم بعض پھلوں کو بعض پر مزے میں برتری دیتے ہیں۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔"

[رعد: ۲ تا ۴]

۳۔ "وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا جس سے تم خود بھی سیراب ہوتے ہو اور تمہارے جانوروں کے لیے بھی چارہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی پانی سے وہ تمہارے لیے (ہر طرح کے غلوں کی) کھیتیاں بھی اگاتا ہے۔ نیز زیتون، کھجور، انگور اور ہر طرح کے پھل پیدا کرتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے ایک بڑی نشانی ہے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ اُس نے تمہاری بھلائی کے لیے رات، دن، سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے اور ستارے بھی اسی کے تابع فرمان ہیں۔ اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں اور بہت سی بوقلموں چیزیں اس نے تمہارے لیے پیدا کر رکھی ہیں۔ اُن میں بھی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو سبق حاصل کرنے والے ہیں۔"

[نحل: ۱۰ تا ۱۳]

۴۔ "اللہ ہی نے آسمان سے پانی برسایا اور یکایک مردہ زمین میں اسی کی بدولت جان ڈال دی۔ بلاشبہ اُس میں اُن لوگوں کے لیے ایک نشانی ہے جو غور سے بات سنتے ہیں اور بلاشبہ تمہارے مویشیوں میں بھی ایک سبق ہے۔ ہم ان کے شکم سے خون اور کثافت کے درمیان تمہیں پلاتے ہیں یعنی خالص دودھ جو پینے والوں کے لیے نہایت خوش ذائقہ ہے۔ اسی طرح کھجور کے درختوں اور انگور کی بیلوں سے بھی ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں جسے تم نشہ آور بھی بنا لیتے ہو اور پاک رزق بھی۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانی

ہے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ اور (دیکھو) تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی پر یہ وحی کر دی (یعنی اس کی جبلت میں یہ بات ودیعت کر دیا) کہ پہاڑوں میں درختوں میں اور ٹٹیوں پر چڑھائی بیلوں میں چھتے بنا اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس۔ پھر اپنے پروردگار کے مقرر کیے ہوئے طریقے پر پوری فرماں برداری کے ساتھ چلتی رہ (اس کے نتیجے میں تم دیکھتے ہو کہ) اس کے شکم سے مختلف رنگوں کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں انسان کے لیے شفا ہے، بلاشبہ اس میں اُن لوگوں کے لیے ایک نشانی ہے جو غور و فکر کرتے ہیں۔"

[نحل: ۶۵ تا ۶۹]

"کیا انھوں نے کبھی اپنے آپ میں غور نہیں کیا، اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور اُن ساری چیزوں کو جو اُن کے درمیان ہیں برحق اور ایک مدت مقرر ہی کے لیے پیدا کیا ہے مگر بہت سے لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔"

[روم: ۸]

"اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر اب تم انسان ہو کہ زمین میں پھیلتے جا رہے ہو اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت و رحمت پیدا کر دی۔ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانش مندوں کے لیے۔ اور اس کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن کو سونا اور تمہارا اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔ یقیناً اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غور سے) بات سنتے ہیں۔"

[روم: ۲۱ تا ۲۳]

آیاتِ مذکورہ میں عالمِ فطرت سے متعلق جو موضوعات و مسائل مثلاً تخلیقِ ارض و سماء، اختلافِ لیل و نہار، نظامِ باراں، پانی کی اثر انگیزی، تصریفِ ریاح، زمین اور آسمان کے درمیان بادلوں کی تسخیر، عظیم الجثہ اجرامِ سماویہ کا فضائے نیلگوں میں کسی سہارے کے بغیر قائم رہنا، تسخیرِ شمس و قمر، تسخیرِ نجوم، تسخیرِ لیل و نہار، زمین کا توسع اور اس میں پہاڑوں اور دریاؤں کا وجود، موجوداتِ عالم میں اصول زوج کی کارفرمائی، طبقاتِ ارض، عالمِ نباتات کی بوقلمونی، درختوں کے پھلوں میں رنگ و بو اور مزہ کا کثیر اختلاف، جانوروں کے تھنوں میں شیریں دودھ کی پیدائش، شہد کی مکھی کا فنِ شہد سازی، عالمِ انفس، تخلیقِ انسان اور اس کے مدارج، انسانوں میں رنگ و زبان کا اختلاف وغیرہ زیرِ بحث آئے ہیں اور جن کو قرآن مجید نے اہلِ علم و عقل کے لیے آیات (نشانیاں) قرار دیا ہے ان سے قرآن کا مقصود کیا ہے؟

عالمِ فطرت سے متعلق متذکرہ موضوعات و مسائل کے بیان سے قرآن حکیم کی دو غرض بالکل واضح ہیں۔ ایک غرض تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے چاہتا ہے کہ وہ اس کی بخشی ہوئی عقل سے کام لیں اور اس کائنات رنگ و بو کے واقعات و مظاہر کو سرسری نگاہ سے دیکھ کر گزر نہ جائیں بلکہ ٹھہر کر ان پر غور و فکر کریں اور ان کے ظہور کے اسباب و علل کو جاننے کی حتی الوسع کوشش کریں۔ کیوں کہ حقائقِ فطرت کے فہم و ادراک میں خلقتِ کائنات کی اصل غرض و غایت پوشیدہ ہے۔ دوسری غرض یہ ہے کہ توحید و معاد (آخرت) کی حقیقت بندوں پر آشکارا ہو جائے۔

فی الواقع توحید و معاد، قرآنی دعوت کے بنیادی اجزائے ترکیبی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی دعوت کو قرآن مجید میں کہیں ایجاز و اختصار کے ساتھ اور کہیں شرح و تفصیل کے ساتھ آفاقی اور انفسی دلائل کے پہلو بہ پہلو پیش کیا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ انفس و آفاق کے واقعات و مظاہر کی حقیقت جن پر توحید و معاد کے قرآنی دلائل کی بنیاد قائم ہے محض آنکھوں سے دیکھنے سے اور محض سر جھکا کر سوچنے سے معلوم ہو سکتی ہے؟ کھلی بات ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ضروری ہوا کہ حقائقِ فطرت کے فہم و ادراک کے لیے موجودہ علمی وسائل و ذرائع کام میں لائے جائیں۔

بالفاظِ دیگر جدید سائنسی علوم حاصل کیے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنسی علوم کو حاصل کیے بغیر توحید و معاد سے متعلق قرآن کے آفاقی اور انفسی دلائل کی واقعی تفہیم ممکن نہیں ہے۔

یہاں ایک سوال آپ کے ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر توحید و معاد سے متعلق قرآن مجید کے آفاقی اور انفسی دلائل کی تفہیم سائنسی علوم کی تحصیل پر منحصر ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ ماضی میں جب جدید سائنسی علوم نہ تھے تو مسلمان جن میں جلیل القدر علماء بھی شامل ہیں، ان دلائل کے فہم سے عاجز تھے اور توحید و معاد پر ان کا ایمان بالکل سطحی اور غیر عاقلانہ تھا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ توحید اور معاد کے تصورات پر قرآن نے انفس و آفاق کے واقعات اور مظاہر سے ایسے بلیغ اسلوب اور معجزانہ الفاظ میں استدلال کیا ہے کہ ہر دور کا انسان اپنی اپنی لیاقت اور استعداد کے مطابق ان کا مفہوم سمجھتا رہا ہے اور ان کے مقصود و مطلوب کو بھی حاصل کرتا رہا ہے لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ فطرت کے واقعات و مظاہر کے ظہور کے اسباب و علل کے فہم و ادراک سے ماضی کا انسان قاصر تھا۔ مثال کے طور پر فلکیاتی نظام کو لے لیجیے۔ یہ نظام فضائے بسیط میں جس قانون تجاذب کے نتیجے میں قائم ہے اس سے ماضی بعید کا انسان بالکل بے خبر تھا۔ لیکن جہاں تک فلکیاتی نظام کے مشاہداتی تاثرات کا تعلق ہے اس میں دور قدیم و جدید کا انسان مساوی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی جس طرح ماضی کا انسان اپنی ننگی آنکھوں سے یہ دیکھ کر کہ ان گنت ستارے اور سیارے فضائے ناپیدا کنار میں کسی ظاہری سہارے کے بغیر مصروف گردش ہیں، متحیر رہ جاتا تھا اور اس کے دل میں خالق کائنات کے علم و حکمت اور اس کی عظمت و قدرت کے نقوش جاگزیں ہو جاتے تھے۔ ٹھیک اسی طرح دورِ جدید کے اربابِ علم و خرد جب بڑی بڑی رصدگاہوں سے طاقت ور دوربینوں کے ذریعہ فلکیاتی نظام کا مشاہدہ کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ ستارے اور سیارے اپنی کثرتِ تعداد، تیز رفتاری اور توسیع دائرہ حرکت کے باوجود کسی تصادم سے دوچار ہوئے بغیر حد درجہ حیرت کن نظم و ترتیب کے ساتھ مصروفِ عمل ہیں۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ قرآن مجید خدا کا آخری کلام ہے اور یہ ہر دور کے انسانوں کے لیے حجت ہے۔ اس لیے ماننا ہوگا کہ قرآن مجید کی ان آیات کے اصلی مخاطب جن کا تعلق عالمِ فطرت کے واقعات و مظاہر سے ہے، فی الواقع عصرِ حاضر کے انسان ہیں۔ قرآن میں ایسی آیتیں بھی موجود ہیں، جن کے مخاطب آنے والے زمانوں کے ہیں۔ اس کی تفصیل اگلی سطروں میں آ رہی ہے۔

قرآن مجید اور اسرار فطرت

قرآن مجید میں فطرت کے جن حقائق کو بے نقاب کیا گیا ہے ان سے بعض حقائق تو وہ ہیں جن کی صداقت دورِ حاضر کی سائنسی تحقیقات کے نتیجے میں ہم پر بالکل عیاں ہو چکی ہے۔ لیکن بعض ایسے حقائق بھی، جن تک ابھی سائنسی علوم کی رسائی نہیں ہو سکی ہے۔ ان حقائق سے متعلق چند آیتیں میں گزشتہ صفحات میں علم طبیعیات کے ذیل میں نقل کر چکا ہوں، یہاں صرف دو آیتیں پیش کروں گا۔ ایک آیت کا تعلق معلوم حقائق سے اور دوسری آیت کا تعلق بڑی حد تک نامعلوم حقائق سے ہے۔ پہلی آیت یہ ہے:

> "انسان دیکھے (یعنی غور کرے) کہ وہ کس چیز سے بنایا گیا ہے۔ ایک اچھلتے ہوئے پانی سے بنایا گیا ہے۔ جو ریڑھ اور سینہ کی ہڈیوں کے درمیان (بین الصلب والترائب) سے نکلتا ہے۔ بیشک وہ اس کو دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔"
> (طارق: ۵ تا ۸)

اِس آیت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا مادۂ منویہ (Seminal Fluid) پسلیوں اور ریڑھ کے درمیان سے نکلتا ہے۔ نزولِ قرآن سے پہلے کے کسی طبی لٹریچر میں جس میں یونانی طبی لٹریچر بھی شامل ہے۔ یہ نہیں کہا گیا ہے کہ انسان کا مادۂ منویہ پسلیوں اور ریڑھ کے درمیان سے نکلتا ہے۔ اس سلسلہ میں جدید علم تشریح کا بیان یہ ہے کہ مادۂ دافق (منی) انثیین (Testicles) میں بنتا ہے اور چھوٹی چھوٹی رگوں کے ذریعے ایک بڑی خمدار نلی میں آتا ہے جسے خصیۂ فوقانی Epididymis کہتے ہیں اور وہاں سے ایک بڑی نلی، مجریٰ ناقلہ External Duct کے ذریعہ کیسۂ منی Seminal Vesicle میں

آتا ہے جہاں سے وہ مجریٰ دافق (Ejaculatory Duct) کے ذریعہ
ج ہوتا ہے۔

اس جدید تشریحی بیان کی روشنی میں دیکھیے تو قرآن کا بیان غلط
م ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کا بیان بالکل سچائی پر
ا ہے۔ جدید تشریحی تحقیقات ۔ Modern Anatomical
Research ۔ سے معلوم ہوا کہ خصیے کا اصلی مقام فوطہ نہیں بلکہ
یک ٹھیک وہ جگہ ہے جسے قرآن مجید میں "بین الصلب والترائب"
ا گیا ہے۔ چوں کہ اندرونِ شکم درجۂ حرارت زیادہ ہوتا ہے اور خصیوں
ں تولید جراثیم کے عمل میں مانع تھا اس لیے دسویں قمری مہینے کے اختتام
یعنی بچے کی پیدائش سے کچھ پہلے خصیتے، فوطے میں منتقل ہو جاتے ہیں۔
یکن اخراجِ منی کے عصبی نظام کا کنٹرول روم "بین الصلب والترائب"
ا کے مقام پر رہتا ہے۔ چنانچہ بوقت جماع یا کسی بھی شہوانی خیال کے
ت جب دماغ سے برقی رَو اس مقام یعنی حرام مغز کے صلبی حصے
(Lumber Region) کے مرکز اعصاب کو پہنچتی ہے تو اس
ی تحریک (Trigar Action) سے کیسۂ منویہ سکڑتا ہے اور
ی ماءِ دافق کی صورت میں خارج ہوتی ہے۔

اسرار فطرت سے متعلق دوسری آیت یہ ہے۔

"اے گروہ انس و جن اگر تم اس کی طاقت رکھتے ہو کہ
زمین اور آسمان کے کناروں (فضائی حدود) سے نفوذ
کر سکو تو نفوذ کرو۔ تم نفوذ نہیں کر سکتے ہو مگر طاقت
کے ساتھ تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔
(جب تم طاقت کے استعمال کے بعد نفوذ کرو گے تو)
تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑ دیا جائے گا جس
کا تم مقابلہ نہ کر سکو گے۔ تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں
کو جھٹلاؤ گے (پھر اس وقت کیا حال ہوگا) جب آسمان
پھٹے گا (یعنی اس کی بندشیں کھل جائیں گی) اور وہ
سرخ چمڑے کی طرح ہو جائے گا۔ تم اپنے رب کی کن کن
قدرتوں کا انکار کرو گے۔"

[رحمٰن : ۳۲ تا ۳۸]

یہ قرآن مجید کی ایک اہم سورہ کی آیات ہیں اور گہرے غور و فکر کی طالب ہیں۔ ان آیات کی تفسیر میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے اور اس اختلاف کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ ان آیات کا تعلق اُن حقائقِ فطرت سے ہے، جن کی تہہ تک ابھی خود جدید سائنس بھی نہیں پہنچ سکی ہے۔ میں نے نظم کلام اور الفاظِ قرآنی کی روشنی میں جو کچھ سمجھا ہے، وہ بیان کرتا ہوں ان آیات میں تین اہم باتیں بیان کی گئی ہیں:

پہلی بات یہ ہے کہ انسان زمین کے فضائی حدود سے طاقت کے ذریعے نفوذ کر کے نظامِ شمسی کے دوسرے سیاروں کے حدود میں داخل ہو سکتا ہے۔ آیت "تم نفوذ نہیں کر سکتے مگر طاقت کے ساتھ" سے یہی مفہوم نکلتا ہے۔ آگے کی آیت "تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑ دیا جائے گا" سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ اگر آیت کا یہ مفہوم لیا جائے جیسا کہ اکثر مفسرین لیتے ہیں کہ انسان زمین کے کناروں یعنی حدود سے نفوذ نہیں کر سکتا تو پھر آگ کے شعلے اور دھوئیں سے دوچار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ مقام آتش و دود تو زمین اور آسمانوں کی حدود سے نفوذ کر جانے کے بعد ہی آ سکتا ہے۔ اب تک بین السیاراتی نفوذ کی انسانی کوششوں سے پہلی ہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔

دوسری اہم بات یہ بیان کی گئی ہے کہ انسان خواہ کتنی ہی جانفشانی کرے نظامِ شمسی کے سیاروں سے آگے اس کا گزر ممکن نہیں ہے۔ آیت مذکورہ "تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑ دیا جائے گا جس کا تم مقابلہ نہ کر سکو گے"۔ اس عدم امکان پر دلالت کرتی ہے، لیکن آیت کا صحیح مفہوم مستقبل میں سائنس کی مزید خلائی پیش رفت ہی سے جانا جا سکے گا۔

تیسری اہم بات ان آیات میں یہ بیان کی گئی ہے کہ نظامِ افلاک کی شکست و ریخت یعنی وقوع قیامت کے قریب آسمان سرخ ہو جائے گا۔ آسمان کی اس سرخی کو قرآن مجید نے چمڑے کی سرخی کے مشابہ قرار دیا ہے (وردۃ کدھان) یہ بات بھی ابھی وقت ناقابلِ فہم ہے۔ آئندہ سائنسی تحقیقات سے حیاتِ شمسی کے آخری ایام میں واقع ہونے والے اس واقعہ سماوی کی اصل حقیقت معلوم ہو سکے گی۔

آیات مذکورہ بالا میں کائنات مادی کے جن حقائق کی طرف اشارے کیے گئے ہیں ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کسی انسان کا کلام نہیں

بلکہ اس علیم و خبیر ہستی کا کلام ہے جو کائنات خلقت کے ہر راز سے واقف ہے۔ اس کے علاوہ جیساکہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، ان آیات سے اُن لوگوں کے اس خیال کی تردید ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید میں صرف ان ہی علوم کا تذکرہ ہے جو عربوں میں معلوم و مقبول تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آیاتِ مذکورہ میں جن کائناتی حقائق کو پیش کیا گیا ہے ان سے عرب واقف تھے۔ عرب تو کیا ماضیؔ قریب کے انسان بھی ان سے واقف نہ تھے۔ حتیٰ کہ دورِ جدید کا انسان بھی پورے طور پر ان سے آگاہ نہیں ہے:

قرآن مجید اور تسخیر فطرت

سطورِ بالا میں ہم نے قرآن مجید میں سائنسی علوم کی موجودگی کے باب میں جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ امر نمایاں ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید اپنے ماننے والوں کو سائنسی طرزِ فکر عطا کرتا ہے اور انھیں ان علوم کی تحصیل کی ترغیب دیتا ہے جن کی مدد سے وہ نہ صرف فطرت کے واقعات و مظاہر کی حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں بلکہ خود فطرت کو مسخر کر سکتے ہیں؛ اس سلسلے میں قرآن مجید کی درجِ ذیل آیت بڑی معنی خیز ہے۔ فرمایا:

"اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری ہی چیزوں کو تمہارے
لیے مسخر کر دیا ہے۔ سب اپنے پاس سے، اس میں بڑی نشانیاں
ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں" (جاثیہ ۱۳)

اس آیت کے علاوہ قرآن مجید کی دیگر آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ نے انسانوں کے لیے سورج، چاند، ستاروں اور سمندروں کو مسخر کر دیا ہے۔ (نحل: ۱۲۔ اعراف: ۵۴) بعض آیات میں جانوروں کی تسخیر کا ذکر آیا ہے (حج: ۳۶) لیکن آیت مذکورہ بالا میں کسی مخصوص شے کی تسخیر کے ذکر کے بجائے زمین اور آسمانوں کی جملہ اشیاء کی تسخیر کی بات کہی گئی ہے حالاں کہ اس کائنات مادّی میں بہت سی چیزیں اور قوتیں ایسی ہیں جو بالفعل انسانوں کے لیے مسخر نہیں ہیں۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ یہ بالقوہ مسخر ہیں۔ بالفاظ دیگر اگر انسان اپنی خدا داد عقل و فکر کی قوتوں کو صحیح طور پر بروئے کار لائے تو وہ عالم فطرت کی غیر مسخر اشیاء کو بھی مسخر کر سکتا ہے۔ جدید سائنسی علوم کے انکشاف سے پہلے بجلی کی حقیقت اور اس کے فوائد سے انسان بے خبر تھا۔ فضائے بسیط میں ریڈیائی لہروں وغیرہ کے وجود سے بھی ذرہ آگاہ نہ تھا لیکن سائنس کی مسلسل تحقیقات کے نتیجے میں آج انسان فطرت کی ان غیر مسخر قوتوں کو مسخر کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ تسخیر فطرت کا عمل اگر اسی رفتار سے جاری رہا تو ایک دن انسان کو عالمِ فطرت پر مکمل بالادستی حاصل ہو جائے گی اور "سخر لکم مافی السمٰوٰت ومافی الارض" کا قرآنی بیان حقیقت واقعہ بن جائے گا اور انسان اس وقت بجا طور پر خلیفۃ اللہ کہلانے کا مستحق ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ عالمِ فطرت پر تصرف کے اختیارات کے بغیر زمین پر انسان کا خلیفۃ اللہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ تسخیر فطرت کے لیے کی جانے والی جد و جہد میں مسلمانوں کا حصّہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ صرف اس لیے کہ مسلمانوں نے سائنسی علوم کو شجر ممنوع سمجھ رکھا ہے۔ میں یہاں یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ من حیث المجموع مسلمانوں نے اس سرزمین پر انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے کی حقیقت کو یا تو سمجھا نہیں اور اگر سمجھا تو اس کے مقتضیات پر سنجیدگی سے کبھی غور نہیں کیا ورنہ وہ سائنسی علوم سے اس درجہ بیزار، تعقل و تفکر سے اس حد تک تہی دامن اور سعی و محنت سے اس درجہ گریزاں ہرگز نہ ہوتے۔ قرآن مجید کی درجِ ذیل آیات مسلمانوں کے لیے منارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہیں: فرمایا:

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی خلقت میں اور رات اور دن
کے باری باری سے آنے میں نشانیاں ہیں، ان اربابِ
دانش کے لیے جو کسی حال میں بھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں
ہوتے خواہ کھڑے ہوں خواہ بیٹھے ہوں اور خواہ لیٹے ہوں،
اور آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور و فکر کرتے ہیں
(اس غور و فکر کے نتیجے میں ان پر اصل حقیقت بے نقاب
ہو جاتی ہے اور وہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں) خدایا
یہ سب کچھ جو تو نے پیدا کیا ہے بلاشبہ بے کار و عبث
نہیں پیدا کیا ہے۔ یقیناً تو اس سے پاک ہے کہ عبث
کام کرے۔ پس اے رب ہمیں دوزخ کے عذاب سے
بچا لے۔" [آل عمران: ۱۹۰ - ۱۹۱)

اس آیت میں ایک مردِ مومن کی جن دو صفات کا ذکر کیا گیا ہے وہ ذکر اور فکر ہیں۔ ان صفات کی روشنی میں جب ہم دورِ حاضر کے

مسلمانوں کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ ذکر اور فکر کے دو علیحدہ خانوں میں بٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جو اہلِ ذکر ہیں وہ صاحبِ فکر نہیں اور جو اہلِ فکر ہیں وہ صاحبِ ذکر نہیں۔ ذاکرین عبادت گاہوں میں مصروفِ ذکر ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ دانش مند اور مومن کامل ہیں اور متفکرین دانش گاہوں میں مصروفِ فکر ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ وہی دانش مند کامل ہیں ——— فی الواقع دونوں میں سے کوئی بھی دانش مند نہیں ہے۔ متذکرہ قرآنی معیارِ دانش کے مطابق صرف وہ لوگ دانش مند و اولی الالباب کہلانے کے مستحق ہیں جو ذکر کے ساتھ فکر کی صفت سے بھی متصف ہوتے ہیں

راقم سطور کے نزدیک علوم و فنون کیا زندگی کے ہر میدان میں مسلمانوں کی موجودہ پستی کا سب سے بڑا سبب یہی ذکر اور فکر کی تفریق ہے اور یہ تفریق نتیجہ ہے قرآن مجید سے فکری انقطاع کا۔ جب تک قرآن مجید سے مسلمانوں کا فکری انقطاع باقی رہے گا، اس وقت تک اصلاحِ حال کی کوئی تدبیر بھی کارگر نہ ہو سکے گی۔

ماخذ و حواشی

١۔ عربی لفظ علق ہے جو علقہ کی جمع ہے۔ علق کے لغوی معنیٰ خون، شگافی ہوئی چیز اور جونک کے ہیں (منجد) لسان العرب میں اس کے معنیٰ غلیظ خون کے ٹکڑے ہیں جو جامد ہو چکا ہو۔ لیکن خشک نہ ہوا ہو۔ اس کے ایک دوسرے معنیٰ جونک کے بھی مذکور ہیں۔ (لسان العرب ج ١٠ ص ٢٦٧ - طبع بیروت ١٩٥٦ء)

٢۔ الموافقات ج ٢ ص ٤٦ طبع سلفیہ ١٣٤١ھ

٣ " " "

٤ طبائع الاستعداد، عبدالرحمٰن کواکبی ص ٢٦ تا ٢٨

بحوالہ دائرہ معارف اسلامیہ (اردو) ج ٦ ص ٥٠٤ طبع لاہور ١٩٦٢ء

اس سلسلہ میں قارئین درج ذیل کتابوں کا بھی مطالعہ فرمائیں۔

- کشف الاسرار النورانیہ القرآنیہ فی ما یتعلق بالاجرام السماویہ و الارضیہ والحیوانات والنباتات والجواہر المعدنیہ: مصنف: محمد بن احمد اسکندرانی (تیرھویں صدی ہجری)
- بیان الاسرار الربانیہ فی النباتات والمعادن والخواص الحیوانیہ مصنف: محمد بن احمد اسکندرانی
- مقارنہ بعض مباحث الھیئۃ بالوارد فی النصوص الشرعیہ مصنف عبداللہ فکری پاشا (سابق وزیر تعلیم مصر)
- کتاب الحیوان۔ مصنف الجاحظ۔

٥۔ اعجاز القرآن، مصطفیٰ صادق رافعی ص ١٤٥ تا ١٦٦

بحوالہ دائرہ معارف اسلامیہ (اردو) ج ٦ ص ٥٠٥ طبع لاہور ١٩٦٢ء

٦۔ جواہر القرآن، امام غزالی ص ٣١ تا ٣٤ طبع مصر ١٣٢٩ھ

٧۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: گرویٹر اناٹی۔ ص ٢٦١، ١٥٥٤ اور راقم سطور کی کتاب "تجلیات حق" (وجود خدا کا اثبات قرآن اور سائنس کی روشنی میں) ص ٣٤١ تا ٣٤٧

٨۔ نفوذ کے معنیٰ چھید کر پار ہو جانے کے ہیں۔ نفذ السھم الرمیہ و نفذھا و منھا کے معنیٰ ہیں: تیر کا شکار میں لگ کر پار ہو جانا (منجد) مزید دیکھیں: لسان العرب ج ٣ ص ٥١٤ طبع بیروت ١٩٥٥ء

٩ عربی لفظ آلا ہے جو الی کی جمع ہے۔ اس کے دو معنیٰ ہیں: ایک نعمت اور دوسرے قدرت و کرشمہ کے۔ حدیث میں ہے: تفکروا فی آلاء اللّٰہ ولا تفکروا فی اللّٰہ۔ نابغہ کا شعر ہے: ھم الملوک وابناء الملوک لھم فضل علی الناس فی الآلاء والنعم

(لسان العرب ج ١٤ ص ٤٠ طبع بیروت ١٩٥٦ء)

١٠۔ عربی لفظ شواظ ہے جس کے معنیٰ بغیر شعلے کے دھواں کے ہیں۔ سورج اور آگ کی گرمی کے معنیٰ بھی آتے ہیں۔ (لسان العرب ج ٧، ص ٣٣٦ - طبع بیروت ١٩٥٦ء) ———

١١ عربی لفظ نحاس ہے۔ جس کے معنیٰ دھویں کے ہیں۔ یا ایسا دھواں جس میں شعلہ نہ ہو۔

(لسان العرب ج ٦ - ص ٢٢٧

طبع بیروت ١٩٥٦ء)

١٢۔ عربی لفظ دھان ہے۔ جس کے معنیٰ سرخ چمڑے کے ہیں۔

(لسان العرب ج ١٣ - ص ١٦٢ — طبع بیروت ١٩٥٥ء)

سیّد کاظم نقوی*

یہ حقیر جراثیم — درس گاہِ توحید کے معلم!

بہت سے لوگوں کا دل چاہتا ہے کہ وجودِ خدا کی دلیلیں آسمانوں کی بلندیوں میں ڈھونڈیں جو ہماری نظر کی حدود سے باہر ہیں۔ جہان کی سیر و سیاحت صرف دماغ کی نظری طاقت کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ یقیناً یہ لوگ اس لحاظ سے حق بجانب ہیں کہ خدا کو ہر جگہ ڈھونڈنا چاہیے آسمانوں کی بلندیوں میں، سمندروں کی گہرائیوں میں، پہاڑوں کی چوٹیوں پر، جنگلوں کے گنجان گوشوں میں، گھاٹیوں کی تہوں میں، خود انسان کے جسم و روح کے زاویوں میں۔ یقیناً یہ دور و دراز سفر بڑا پُر لطف ہے۔ خالقِ عالم کی قدرت اور عظمت کو سمجھنے کے واسطے ثوابت و سیارات اور اُن سے بڑھ کر عظیم الشان کہکشاؤں کی سیر و سیاحت بے شک معرفتِ خدا کا انتہائی کامیاب ذریعہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ عالمِ بالا میں خدا کی قدرت اور عظمت کا بہتر مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کی حیرت انگیز باریک بینی، نازک سازی کا اندازہ اُن موجودات کے اسرار و رموز جان کر بھی ہوتا ہے جو چھوٹے اور بہت چھوٹے ہیں۔ اگر وہ خالق کی قدرت و عظمت کی نشانی ہیں تو یہ اس کے غیر محدود علم کا پتہ دیتے ہیں۔ دونوں کے ذریعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ عالمِ کائنات میں ہمہ گیر نظم و ضبط موجود ہے۔

کہا جاتا ہے کہ لوئی پاسچر (Louis Pasteur) مشہور فرانسیسی سائنس داں سے پہلے کوئی نہیں جانتا تھا کہ زندگی کا دامن کہاں سے کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اسی چہار دیواری میں محدود ہے جسے ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں، یہی چو حدّی جس میں کچھ چھوٹے بڑے جانور، درخت اور پودے نظر آ رہے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ لوئی پاسچر سے سیکڑوں برس پہلے عظیم المرتبت رہنمایانِ اسلام نے جراثیم کی موجودگی کے متعلق دنیا کو اطلاع دے دی تھی۔ حضرت امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام نے فتح ابن یزید جرجانی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"تم یہ جو دیکھتے ہو کہ خدا کو "لطیف" کے نام سے یاد کرتے ہیں تو اس کی وجہِ تسمیہ یہ ہے کہ وہ انتہائی باریک اور نازک موجودات کا علم رکھتا ہے۔ آیا تم خدا کے آثارِ خلقت کو چھوٹے اور بڑے پودوں، ننھے ننھے جانوروں میں نہیں دیکھتے ہو؟ جیسے مچھر، اس سے چھوٹے بلکہ اس چھوٹے سے بھی چھوٹے، وہ جانور جنہیں ہرگز آنکھ نہیں دیکھ سکتی ہے۔ یہ اتنے چھوٹے ہیں کہ یہ امتیاز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے درمیان مادہ کون ہے اور نر کون؟ نومولود بچہ کون ہے اور اس کے بڑے بوڑھے کون؟ ان جانوروں کا مرکز سمندروں کی موجیں، درختوں کی چھالیں اور بیابان ہیں۔ ان مقامات پر وہ زندگی بسر کرتے ہیں۔" (اصول کافی)

باخبر افراد جانتے ہیں کہ جراثیم میں توالد و تناسل کا طریقہ اس کے عام طریقے سے مختلف ہے۔ دوسرے جاندار حاملہ ہوتے یا اُن کے نیچے انڈے رکھے جاتے ہیں، لیکن جراثیم خود بخود منقسم ہو کر اپنا مثل پیدا کرتے ہیں۔ کافی نشو و نما کے بعد اُن میں سے ہر ایک دو حصّوں پر منقسم ہو جاتا اور ہر حصہ ایک مستقل جاندار بن جاتا ہے۔ ان کے اس طریقۂ پیدائش کا لحاظ کرتے ہوئے جراثیم کے درمیان نر اور مادہ کی دو الگ الگ صنفیں قرار دینا بے معنی ہے، لیکن حضرت امام علی رضاؑ نے اس ارشاد میں صریحاً ان میں نر اور مادہ قرار دیے ہیں

* پروفیسر مولانا سیّد کاظم نقوی۔
شعبۂ دینیات۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔

امام علیہ السلام کے اس ارشاد کی گہرائی کا اندازہ سائنس دانوں کی جدید ترین تحقیق سے ہوتا ہے۔ انھوں نے انکشاف کیا ہے کہ تمام جراثیم میں منقسم ہونے کی صلاحیت نہیں ہے، جن میں منقسم ہونے کی قابلیت ہے اور وہ مادہ اور جن میں اس طرح کی قابلیت نہیں ہے وہ نر ہیں۔

بہرکیف عام طور سے آج کل کے تعلیم یافتہ حلقہ میں لوئی پاسچر کو اس حقیقت کا انکشاف کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنی عالمانہ جستجو اور آزمائش کے بعد ایک ایسی عجیب وغریب دنیا کا تماشا دیکھنے کے لیے ایک چھوٹا سا موکھا بنا دیا جہاں کروڑوں ننھے ننھے جانداروں کی بستی ہے اس کے بعد انتہائی طاقتور خوردبینوں نے اس پراسرار دنیا سے بالکل پردہ سرکا دیا۔ ان خوردبینوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ کسی چیز کو ہزار گنا بڑا کرکے دکھا سکیں! جراثیم کی بستی میں اگرچہ بظاہر سکون اور سکوت ہے، لیکن درحقیقت اس میں بھانت بھانت کے جاندار بڑے جوش وخروش سے طرح طرح کی حرکتوں میں مصروف رہتے ہیں۔ پانی کا ایک قطرہ ان کے لیے ایک چھوٹے سے سمندر کے مانند اور ہوا میں اڑتا ہوا ایک حقیر ذرّہ، ایک ہولناک کوہ پیکر ہوائی جہاز کے مانند ہے۔ ایک ایسا چھوٹا سا حقیر گھر جس میں چند آدمیوں سے زیادہ نہیں رہ سکتے اس کے ایک کونے میں ہزاروں جراثیم اطمینان سے زندگی بسر کرتے، لیکن ہم اپنے کو اکیلا سمجھتے ہیں، کیوں کہ ہمیں ان کی موجودگی کا علم نہیں ہے۔

سرسری نگاہ میں ان جراثیم میں سے بعض نقصان رساں اور بعض مفید ہیں، لیکن گہری نظر سے دیکھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ سب کے سب بلا استثنا ہماری زندگی کے لیے ضروری اور ہماری نشوونما میں مفید ہیں۔

چھوٹے اور کیسے چھوٹے!

جراثیم کی دو قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ ایک بکٹریا [Bactaria] اور دوسرے وائرس [Virus]

بکٹریا کو عام معمولی خوردبینوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ معمولی خوردبینیں بھی ایسی طاقتور ہوتی ہیں جو کسی چیز کو کئی ہزار گنا بڑا کرکے دکھاتی ہیں۔ یہ وائرس کے بہ نسبت جسمانی لحاظ سے بڑے اور کمزور ہوتے ہیں۔ ان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ پانی، ہوا، غذا اور جانداروں کے بدن میں رہ کر زندگی بسر کریں، لیکن وائرس ان کے بہ نسبت چھوٹے اور بہت چھوٹے ہیں۔ انھیں صرف ان انتہائی زبردست خوردبینوں سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے جو کسی چیز کو ایک لاکھ گنا یا اس سے بھی بڑا کرکے دکھاتی ہیں۔

درحقیقت ہم جس فضا میں زندگی بسر کرتے ہیں وہ عظیم الشان آسمانی کُرات اور دوسرے چھوٹے اور بہت چھوٹے موجودات ایٹم اور جراثیم کے بیچ میں ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے ہاتھوں میں جو پیمانے ہیں ان سے صرف اسی دنیا کی چیزوں کے سلسلے میں فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ عالم بالا آسمانی کُروں میں قدم رکھنے کے بعد ہمیں اپنے پیمانے اتنے چھوٹے نظر آتے کہ جو مذاق اُڑانے کے قابل ہیں۔ مجبوراً انھیں پھینک کر دوسرے عظیم الشان پیمانے منتخب کرنا پڑتے ہیں جن سے عالم بالا کی چیزوں کی پیمائش کی جا سکے۔

اسی طرح جب ہم ایٹم اور جراثیم کی انتہائی مختصر بستی میں قدم رکھتے ہیں تو ہماری دنیا کے عام پیمانے ہمیں بڑے اور بہت بڑے محسوس ہوتے ہیں۔ ان سے یہاں بالکل کام نہیں چل سکتا۔ یہاں اُن سے دستبردار ہو کر ایسے پیمانوں سے کام لینا پڑے گا جو اس چھوٹی سی بستی کے رہنے والوں کے خصوصیات کا پتہ چلانے میں ہماری مدد کر سکیں۔ بکٹریا کے ناپنے کے لیے سائنس والوں نے مخصوص پیمانہ ایجاد کیا ہے جسے فرانسیسی زبان میں "میکرون" کہا جاتا ہے۔ اس کی لمبائی کل جمع ایک ملی میٹر کا ہزارواں [illegible] حصہ ہے۔ اگر دس لاکھ بکٹریا جراثیم کو ایک دوسرے کے پہلو میں چنتے چلے جائیں تو اس لائن کی لمبائی ایک میٹر سے زیادہ نہ ہوگی۔

بیکٹریا کے مختلف اقسام کے لحاظ سے ان کا قد وقامت مختلف ہوتا ہے۔ اُن میں سے بعض چند میکرون کے اور بعض اس سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں، یعنی کل جمع [illegible] میکرون کے!!

وائرس کی پیمائش کے لیے اس سے بھی چھوٹا پیمانہ ایجاد کیا گیا ہے اس کی لمبائی میکرون کے بھی ہزارویں حصے [illegible] ملی میٹر کے برابر ہے۔

وائرس کی بھی گوناگوں قسمیں ہیں، بعض کی لمبائی ان دس انتہائی مختصر پیمانوں کے برابر ہے اور بعض کی لمبائی زیادہ سے زیادہ ن سو پیمانوں کے برابر ہے جن میں سے ایک کی مقدار [illegible] ملی میٹر ہے

حیرت انگیز توالد وتناسل

جراثیم کی عجیب وغریب صفت یہ بھی ہے کہ وہ انتہائی تیزی سے اپنا مثل پیدا کرتے ہیں۔ کافی نشوونما کے بعد ان میں سے ہر ایک دو حصوں پر منقسم ہو جاتا اور ہر حصّہ ایک مستقل جاندار بن جاتا ہے۔ یعنی ماں دو

فرزندوں کی شکل میں۔ اس کے بیٹے چار پوتوں کی شکل میں۔ پوتے پڑپوتوں کی صورت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح تولید مثل کرکے جراثیم کی تعداد آگے بڑھتی رہتی ہے۔ جس طرح ان جانداروں کے جسم اور ان کے اعضاء و جوارح چھوٹے ہیں اسی طرح ان کے نشوونما پانے اور اپنا مثل پیدا کرنے کی مدت بھی مختصر ہے۔ ان کی بہت سی قسمیں ایسی ہیں کہ اگر انھیں سازگار ماحول مل جائے تو وہ صرف آدھ گھنٹے کے اندر اپنا مثل پیدا کر دیں گی۔ چوں کہ ان کے یہاں تولید مثل کی صورت جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا یہ ہے کہ صرف آدھ گھنٹہ میں ان میں سے ہر ایک دو حصوں پر تقسیم ہو جاتا اور ہر حصہ ایک مستقل جاندار کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس لیے بڑی مختصر مدت میں ان کی تعداد میں عجیب و غریب اضافہ ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ صرف تین روز میں ایک عدد جرثومہ کی نسل اتنی بڑھے اتنی بڑھے کہ وہ پورے کرۂ زمین کو اس طرح ڈھانک دے کہ کوئی چھوٹی سی جگہ باقی نہ رہے!

اگر یقین نہ آرہا ہو تو آئیے ہم اور آپ مل کر حساب کریں کہ آیا واقعاً ایسا ہی ہے یا نہیں؟ دن رات میں ظاہر ہے کہ ۲۴ گھنٹے ہوتے ہیں، فرض کیجیے کہ ایک جرثومہ کو سازگار حالات مل گئے۔ وہ پہلے آدھ گھنٹے میں دونا اور دوسرے آدھ گھنٹہ میں چوگنا، تیسرے آدھ گھنٹہ میں آٹھ گنا ہو جائے گا۔ اسی طرح جراثیم کی تعداد ہر آدھ گھنٹہ بعد دونی ہوتی چلی جائے گی۔ یہاں تک کہ دسویں آدھ گھنٹہ میں ایک ہزار، بیسویں آدھ گھنٹہ میں ایک ملین، تیسویں آدھ گھنٹہ میں ایک ہزار ملین، چالیسویں آدھ گھنٹہ میں دس لاکھ ملین اور آخری اڑتالیسویں آدھ گھنٹہ میں ان کی تعداد ۲۵۰ بلین ہو جائے گی یعنی اگر ہر جرثومہ کی لمبائی ایک میکرون ۱/۱۰۰۰ ملی میٹر فرض کی جائے تو ہم ۲۴ گھنٹے کے بعد ان سے ایک ایسے برتن کو بھر سکتے ہیں جس کی گنجائش ۲۵۰ سینٹی میٹر مکعب ہو۔ دوسرے ۲۴ گھنٹوں میں بھی اگر یوں ہی حساب کرتے رہیں تو ۴۸ گھنٹے گزرنے کے بعد ہمیں یہ منظر دکھائی دے گا کہ جراثیم نے ۶۰ کلومیٹر مکعب سے زیادہ فضا کو پر کر دیا ہے۔ اگر اسی حساب کو آگے بڑھایا جائے تو دوسرے ۲۴ گھنٹے میں ان کا حجم کرۂ زمین سے بھی بڑھ جائے گا، وہ اس کی پوری سطح پر چھا جائیں گے۔ کسی دوسری چیز کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہے گی۔ ایک عدد جرثومہ میں یہ قابلیت ہے کہ صرف تین روز کے اندر اسی کی اولاد کرۂ زمین پر دوسرے جانداروں پر عرصۂ حیات تنگ کر دے

اگر جراثیم میں اتنی تیزی سے اپنی نسل بڑھانے کی صلاحیت نہ ہوتی تو اسی ننھی منی کمزور مخلوق کا اپنے کو نیست و نابود کرنے والے اسباب کی بدولت خاتمہ ہو جاتا، لیکن یہ نہ سمجھیے کہ جس ذات نے ان جانداروں کو اپنی نسل بڑھانے کی یہ قابلیت عطا کی ہے، اس نے انھیں بالکل آزاد چھوڑ دیا ہے کہ وہ خوب خوب پھلیں پھولیں، اس حکیم و علیم ہستی نے انھیں اپنی چادر سے باہر پیر نکالنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ اس نے ان کی خوراک کا اتنا سامان اور ان کی نشوونما کا مخصوص ماحول فراہم نہیں کیا ہے کہ وہ تھوڑی سی مدت میں پورے روئے زمین کے مالک و مختار بن جائیں صرف یہی نہیں کہ اس نے ان کی نشوونما کے لیے بہت سی رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں۔ بلکہ سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ خود ان کے جسم سے ایسا مادہ رستا رہتا ہے جو ان کو ہلاک کر ڈالتا اور ان کی نشوونما کو روک دیتا ہے۔

ہر جاندار کے زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے جسم میں مندرجہ ذیل چند حصے پائے جائیں، خواہ وہ جاندار بڑا ہو اور خواہ چھوٹا۔

(ا) اپنی خوراک حاصل کرنے اور اس کے جزو بدن بنانے کا ذریعہ تاکہ وہ اپنی خرچ ہو جانے والی طاقت کا قائم مقام بنا سکے۔

(ب) چلنے پھرنے اور حرکت کرنے کا وسیلہ تاکہ اپنی ضروریات زندگی حاصل کرنے کے لیے وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکے۔

(ج) اپنے مانند پیدا کرنے کا ذریعہ تاکہ وہ اپنی نسل کو باقی رکھ سکے۔

(د) اپنے گرد و پیش جو واقعات رونما ہو رہے ہیں ان سے باخبر ہونے کا وسیلہ تاکہ وہ خطروں سے اپنے کو بچا سکے۔

ظاہر ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام جانداروں کے جسموں میں اس طرح کے حصے یکساں ہوں بلکہ وہ بعض جانداروں میں انتہائی نازک اور پیچیدہ ہیں، ان کے برخلاف بعض جانداروں میں بہت معمولی اور مختصر۔

اب غور فرمائیے کہ ایسا ننھا سا جاندار جو سر سے پیر تک ایک میکرون ۱/۱۰۰۰ ملی میٹر سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کے جسم کو کتنا نازک لطیف اور پتلا ہونا چاہیے کہ اس میں تمام مذکورہ پہلوؤں کا لحاظ انتہائی سیدھے سادے طریقے سے کر دیا گیا ہو گا؟

کوئی شبہ نہیں کہ جراثیم کے منہ، دانت، معدے اور پھیپھڑے کی وہ شکل و صورت نہیں ہے جو کسی بڑے جاندار کے ان ہی اعضا کی ہے

لیکن اپنے اردگرد پھیلے ہوئے خوراک کے سامان سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے ضروری ہے کہ اس کی کھال ان تمام اعضاء کے کاموں کو انجام دے۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک خاص قسم کا مادّہ اس کے جسم سے رستا ہے جو اس کے اردگرد پھیلے ہوئے سامان غذا کو اپنے بدن میں جذب ہونے کے قابل بنا دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جراثیم کا معاملہ دوسرے بڑے جانداروں کے برعکس ہے۔ جراثیم پہلے اپنی خوراک کے مخصوص مادّوں کو ہضم کرتے اور اس کے بعد انھیں کھاتے ہیں، جب کہ دوسرے حیوانات پہلے ان کو کھاتے، پھر انھیں ہضم کرتے ہیں۔

جراثیم کے جسم میں اعصاب کا سلسلہ نہیں ہے، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ انہیں آس پاس ہونے والی باتوں کی خبر نہ ہو اور اُن میں طاقت احساس ہی موجود نہ ہو۔ واضح بات ہے کہ ان انتہائی مختصر اور چھوٹے جانداروں کے جسم میں ان کے زندہ رہنے کے شرائط بھی انتہائی نازک ہیں۔ جن چیزوں سے مل کر ان کے جسم بنے ہیں اگر ان کی مقدار یا کیفیت میں معمولی سی غلطی ہو جائے ان کی مخصوص طرح کی ساخت میں مکمل نظم و ضبط ملحوظ نہ رکھا جائے تو ہرگز وہ وجود میں نہیں آسکتے، نظم و ضبط کا انتہائی مکمل نمونہ ان کے اندر موجود ہے ہے۔

جس طرح بڑے بڑے جانوروں کے بدن کی تشکیل طرح طرح کے مادّوں اور جکوں سے ہوتی ہے، اسی طرح جراثیم کے اجسام کی تشکیل بھی گوناگوں مادوں نے کی ہے۔ جس طرح وہ ہوا، پانی اور اپنی خوراک بننے کے قابل مادّوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اسی طرح جراثیم بھی دست قدرت کے بچھائے ہوئے اس وسیع دسترخوان سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ جو خصوصیات دوسرے حیوانات میں ہیں وہی ان میں بھی ہیں، اگرچہ انھیں ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے، لیکن ان کی تعداد روئے زمین کی تمام انسانی آبادی سے بہت زیادہ ہے ان کے ذمہ ایسے بھاری اور اہم فرائض ہیں، جنھیں ان کے علاوہ کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا ہے۔

بقیہ "سرکاری ملازمتوں میں مسلمان"

کا سلوک روا نہیں رکھا جا رہا ہے۔

یہ مسئلہ فرقہ وارانہ یا سیاسی نہ ہو کر سماجی زیادہ ہے۔ مسلم خاندانوں کے موجودہ ماحول میں بچّوں کی تعلیمی نشو و نما اور ذریعۂ معاش کی تجویز و انتخاب کو عموماً کم اہمیت دی جاتی ہے۔ مسلم والدین اور سرپرستوں کا یہ انداز فکر اور ان کا تعلیم کی طرف رجحان و رسائی اصل وجہ فرق ہے۔ بچّوں میں اعلیٰ تعلیمی قدریں حاصل کرنے کے لیے احساس پیدا نہیں کیا جاتا ہے اور نہ انھیں موجودہ کار مفوضہ اور نہ مستقبل کے نشانوں کو پانے کے لیے تنبیہ کی جاتی ہے۔ مسلمانوں کی سیندہ، قیادت (اگر کوئی ہے) ہمیشہ بنا مسئلوں کے مسائل وہموں اور وسوسوں میں اس مقصد سے الجھی رہتی ہے تاکہ وہ اپنی شخصیت کو فرقہ کے سامنے کسی سنجیدہ اصلاحی کوششوں کے نمایاں طور پر پیش کر سکے۔ آزادی کے بعد سے فرقہ نے بے شمار خود ساختہ ذاتی اغراض میں منہمک سیاسی قائد پیدا کیے لیکن نام کے لیے بھی کوئی مصلح قوم و سماج پیدا نہیں کیا۔

"عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو۔ یہ نہ کہو کہ ہم اِس تغیر کے لیے تیار نہ تھے۔ بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے، لیکن سورج تو چمک رہا ہے اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو، جہاں اُجالے کی سخت ضرورت ہے۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد)

محمد انصار اللہ *

زبانِ ہندوی (قدیم اردو) میں

نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی تک

صوفیاء کی روایت

سمندری راستے سے ہندوستان کے جنوب۔ مغربی ساحل پر عربوں کی آمد کا سلسلہ بہت قدیم زمانے سے جاری ہے۔ بعثتِ اسلام کی خبریں بھی یہاں بہت جلد پہنچ گئی تھیں اور مسلمانوں نے مختلف مقامات پر آباد ہونا شروع کر دیا تھا۔ سندھ پر مسلمانوں کے حملے کا سبب بھی جنوبی علاقوں میں مسلمانوں کی موجودگی ہی بنی تھی۔ حکیم شمس اللہ قادری ناقل ہیں:

"تیسری صدی کے مشہور مورخ احمد البلاذری (۲۷۹ھ/۸۹۲م) نے فتوحاتِ سندھ کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جزیرۂ سرندیپ میں عرب کے بحری تجار کی ہمیشہ آمد و رفت رہا کرتی تھی اور مسلمان تاجر مع اپنے اہل و عیال کے وہاں جا کر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ اُن نوواردوں میں سے بعض کا انتقال ہو گیا اور ان کے اہل و عیال سرندیپ میں بے یار و مددگار رہ گئے تو وہاں کے راجہ نے انھیں ایک جہاز میں سوار کرا کر روانہ کیا یہ جہاز بلادِ سندھ میں دیبل کے قریب پہنچا تو اس علاقے کے بحری قزاقوں نے اسے لوٹ لیا اور جب یہ خبر حجاج کو معلوم ہوئی تو اس نے بدلہ لینے کی غرض سے سندھ پر یورش کی۔"

[ملیبار ص۲۱ تا ص۲۲]

بتایا گیا ہے کہ تین برس کی جدوجہد کے بعد ۹۳ھ/۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے سندھ پر قبضہ کر لیا۔ اس واقعے کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ اس زمانے میں ملتِ اسلامیہ ایک جسم کی حیثیت رکھتی تھی کہ درد کسی بھی جگہ ہو پورا جسم بےقرار ہو جاتا ہے اور جب تک درد کا سبب دور نہ ہو چین نہیں پڑتا۔ بڑی بات یہ تھی کہ دور دراز کے بسنے والے بھی مسلمانوں کو ایسا ہی سمجھتے تھے۔ ابتدائی زمانے کے مسلمانوں کے تمام معاملوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس پہلو کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے، شمال اور جنوب میں تقسیم کر کے بحثیں کرنا مناسب نہیں۔

دکن کے علاقوں میں اُس سلسلے میں جس سے بالآخر شنکر اچاریہ کا تعلق ہے، ایک شخص یامن اچاریہ ([illegible]) ہوا ہے۔ شنکر اچاریہ کے زمانے پر اگر قیاس کریں تو یامن اچاریہ کو پہلی صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کا آدمی ماننا ہوگا۔ تامل زبان میں اس کا نام آڑونڈار ([illegible]) ہے یعنی وہ جو حفاظت کے لیے آئے۔ مہرشی شیو برت لال ورمن کا کہنا کہ یامن اچاریہ مسلمان تھا (کبیر جوگ، جلد نمبر ۱ حصہ ۱ ص۲۳) اگر یہ خیال صحیح ہو تو ماننا پڑے گا کہ ہندوستان میں آنے کے بعد ہی مسلمان بزرگوں نے یہ طریقہ بنا لیا تھا کہ یہاں کے طور طریقوں کو اس طرح اختیار کیا جائے کہ غیر کا اظہار نہ ہو، تاکہ یہاں کے عوام زیادہ سے زیادہ قریب آئیں اور اُن

۱۔ ڈپارٹمنٹ آف ماڈرن انڈین لینگویجز، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر [illegible] نے اس ورڈن نے راقم کو یہ بات بتائی ہے لیکن انھیں یامن اچاریہ کو مسلمان تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ:

"سری رامانج کے پیچھے اُن کے شاگرد قریش سوامی ہوئے"

(ہندی ساہتیہ ص۱۲۶)

چنانچہ انکی تحریک میں مسلمانوں کی شرکت میں شبہ کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

* ڈاکٹر محمد انصار اللہ
ریڈر شعبۂ اردو۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

باتوں کو جلد از جلد قبول کریں اور اس طرح اسلامی عقاید اور تعلیمات بالواسطہ طریقے پر اُن میں عام طور پر رواج پاسکیں۔ ان کی اسی رواداری نے انھیں بھکتی یعنی نیازمندیِ عشق کے طریقے کو جو خالقِ کائنات تک رسائی بلکہ اس کی ذات میں فنا ہو جانے کا حامل تھا، اختیار کر لینے کی تحریک کی۔ یامن اچاریہ کا شمار بھکتی کے ابتدائی مبلغین میں ہوتا ہے۔ شمالی ہندوستان کے ابتدائی دور کے مسلمان بزرگوں نے بھی عشق کے راستے کو اختیار کیا اور یہاں کی زبان میں صوفی بھکت کہلائے۔ انھوں نے یہاں کے مخصوص حالات میں بہترین انداز پر تبلیغ و اشاعتِ مذہب کا کام انجام دیا۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ وہ پہلے بزرگ تھے جنھوں نے زبان ہندوی میں گیتوں کے گائے جانے کی اجازت دی (معاصر حصہ ۴/ ص۵۴)۔ آج تک عرس شریف کے موقع پر داستتی ( ) یعنی خدا کی حمد کے گائے جانے کا رواج چلا آتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ شارح اکرؔقی نے تو زبان ہندوی کی ابتدا کا سلسلہ بھی حضرت خواجہ بزرگ اجمیری ہی سے جوڑا ہے۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں :

"و توہم نہ کنند کہ اولیاء اللہ بغیر از زبان عربی تکلم نہ کردہ زیراکہ جملہ اولیاء اللہ در ملک عرب مخصوص نہ بودہ۔ پس ہر ملکے کہ بودہ زبان آں ملک را بکار بردہ اند۔ و گمان نکنند کہ ہیچ اولیاء اللہ بزبانِ ہندوی تکلم نہ کردہ، زیراکہ اوّل از جمیع اولیاء اللہ قطب الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحق والدین قدس اللہ سرہٗ بدیں زبان سخن فرمودہ، بعد ازاں حضرت قطب الاسلام قدس اللہ سرہٗ و بعد ازاں حضرت گنج شکر قدس اللہ سرہٗ"

(فہرست فارسی، انجمن کراچی ص۱۴۲)

لیکن بات اتنی ہی نہیں تھی بلکہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی مسلمانوں کو دو چیزوں کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔

اوّل مسجد　　دوم زبان اہلِ ہند

ملک کے جن مقاموں پر انھوں نے قیام کیا ہوگا وہاں کسی جگہ کو مسجد کے لیے مقرر کیا ہوگا۔ اور وہ مسجد بالآخر مسلمانوں کے دینی اور تعلیمی مرکز کی حیثیت اختیار کر گئی ہوگی۔

مسجدوں میں اسلام اور اسلامی عقاید کی تعلیم بھی دی جاتی ہوگی۔ اس تعلیم میں نومسلم اور غیرمسلم سب شریک ہوتے ہوں گے۔ بلکہ تعلیم دینے والوں میں نومسلموں کا کردار زیادہ سے زیادہ اہم ہوتا ہوگا۔ کیوں کہ وہی یہاں کی زبان اور یہاں کے لوگوں کے مزاج کو بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ تعلیم پانے والوں میں اکثریت اُن عوام کی رہی ہوگی جن کا تعلق غریب اور پست تر طبقہ سے ہوگا۔ چنانچہ تدریس کی زبان غیر سنسکرت ہوگی اور چوں کہ وہ بول چال میں رائج ہوگی، لب و لہجے کے اختلاف کے باوجود عام طور سے سمجھی جاتی ہوگی۔

کہا جا چکا کہ باہر سے آنے والے مسلمان مختلف النسل ہونے کے باوجود ایک وحدت کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس لیے شمال سے جنوب تک اُن کی تہذیبی اور علمی زبان فارسی تھی۔ انھوں نے اپنے مخصوص لسانی مزاج کے مطابق یہاں کی جس زبان کو اپنایا ہوگا اس کے بعض لفظ، فقرے، جملے اور پھر متفرق اشعار وغیرہ اپنی فارسی کتابوں میں نقل کیے ہوں گے۔ بعد میں اس زبان کی تصانیف بھی اسی خط میں لکھی جانے لگی ہوں گی۔ اس طرح ہندوستان کے پست بلکہ پسماندہ طبقہ کی وہ بولی ترقی کر کے فارسی خط میں لکھی جانے والی وہ ملک گیر زبان بن گئی جسے قدماء ہندوی کہتے تھے اور آج ہم اسے اردو کا نام دیتے ہیں۔

زبان ہندوی میں اسلامی تعلیمات کی تلقین و اشاعت کا ذکر سب سے پہلے تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے اواخر میں ملتا ہے۔ جب بقول بزرگ بن شہریار ایک عراقی نے "الراء" (اروڑ) کے راجا کو منصورہ کے بادشاہ عبداللہ کے حکم سے ۲۷۰ھ/۸۸۳ء میں وہاں جاکر اسلام کی شریعت کا حال "ہندوی زبان" میں بتایا تھا۔ (بحوالہ نوائے ادب جولائی ۱۹۶۶ء ص۱۰) تلقین و تبلیغ کا کام زبانی ہوا تھا اور یہی طریقہ تادیر صوفیاء کا رہا ہے۔

زبانِ ہندوی میں شعر و سخن کا سلسلہ اگرچہ بہت پہلے شروع ہو چکا ہوگا لیکن اب تک کی معلومات کے مطابق اس زبان میں جو قدیم ترین شعر ملے ہیں وہ حضرت فریدالدین گنج شکر سے منسوب ہیں۔ حضرت گنج شکر کا ایک قطعہ (چوپائی) جسے ذی علم صوفیاء میں قبول عام حاصل ہوا یہ ہے ؎

اول دلیلہ ہتّے نہ چاہیے　　پھاٹا پہنا، روکھا کھائیے
ہم درویشنہ ایہی ریت　　پانی لوڑیں اور میت

(بحوالہ خزائن رحمت)

اس مضمون کو بعد کے ایک سے زاید بزرگوں نے اپنے اپنے طور پر نظم کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی زبان سے جو کلمات ادا ہوتے تھے وہ خاص و عام کی زبانوں پر جاری ہوتے تھے۔

اس تعلق میں درویشوں کی ایک "ریت" کا بیان ہوا ہے جس کا بظاہر اسلامی تعلیمات سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن ایک لفظ "مسیت" (یعنی مسجد) ذہن کو مطلوبہ سمت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ صوفیائے کرام کی زبان سے نکلنے والا ایک لفظ ہی تو ہوتا تھا جو دنیا بدل دیتا تھا۔

صوفیائے کرام نے شروع سے ہی ہندوستان کے طور طریقوں پر بخوبی نظر رکھی تھی۔ یہاں کے ادھیا اور جوگی مختلف امراض کا علاج منتروں سے کیا کرتے تھے۔ یہاں کی عملی زندگی میں منتروں کی بہت اہمیت تھی۔ مسلمان صوفی بزرگوں نے بھی اپنے طور پر بعض منتر مرتب کر لیے تھے۔ آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی کے بزرگ حضرت شرف الدین یحییٰ منیری سے منسوب ایک منتر کے آخری کلمات یہ ہیں۔

مدھ کرکے سکت، مخدوم شیخ یحییٰ منیری کے بھگت ہت
شوا ہا بحق لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

(بحوالہ خزائن رحمت)

اس منتر کا اسلامی تعلیمات سے براہ راست واسطہ نہیں ہے لیکن اس کے آخر میں کلمۂ طیبہ کا الحاق سننے والے کے ذہن پر اپنا یہ تاثر ضرور چھوڑتا ہے کہ یہی وہ کلمہ ہے جو بیمار کو شفا اور مرتے ہوئے کو نئی زندگی عطا کر دیتا ہے۔ ہندوستان میں اسلام کی ترویج و اشاعت میں ان منتروں کو بھی اہمیت حاصل ہے اور صوفیاء کی روایات میں یہ بھی شامل ہیں۔

نویں ہجری / پندرھویں صدی عیسوی میں شیخ بہاء الدین باجن کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ انھوں نے سورۂ اخلاص کا ترجمہ زبان ہندوی میں اس طرح کیا ہے ؎

نا اُنہہ جنیا، نا وہ جایا　　نا اُنہہ مائی باپ کہایا
نا اُنہہ کوں کو وہ چڑھایا　　نا جن سب اُنہہ آپ بنایا
پرگٹ ہوا تا کہیں نہ دیٹھا، آپ دکھایا

(ابتدائی نشو و نما ۶۶)

یہ ترجمہ ایسا ہے کہ جب تک صراحت نہ کی جائے گمان بھی نہیں ہوتا کہ اس میں قرآن پاک کی ایک سورۃ کا مضمون نظم کیا گیا ہے۔ اس قسم کے مضامین ہندوستان کے خاص و عام کی زبانوں پر بے تکلف جاری ہو سکتے تھے۔

زبان ہندوی میں اب تک کی معلومات کے مطابق پہلی باضابطہ اور مربوط کتاب جو دستیاب ہوئی ہے مولانا داؤد کی چنداین ہے۔ یہ کتاب آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں فیروز تغلق بادشاہ کے عہد میں لکھی گئی تھی۔ اس کے بارے میں مورخ عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے۔

"مخدوم شیخ تقی الدین واعظ ربانی در دہلی بعضے از ابیات تقریبی او را بر سر منبر می خواند و مردم را از استماع آں حالتِ غریب روئے میداد۔ چوں بعضے از افاضلِ آں عہد شیخ را پرسیدند کہ سبب اختیار ایں مثنوی ہندوی چیست؟ جواب داد کہ تمام حقائق و معانی ذوقی ست و موافق بہ وجدانِ اہلِ شوق و مطابق تفسیر بعضے از آیاتِ قرآنی و خوش آواز ان ہند حالا ہم بہ سواد خوانی آں صید دلہا می ربانید۔"

یہ کم و بیش اسی قسم کی بات ہے جیسی مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی کے بارے میں کہی گئی ہے کہ ؎

ہست قرآں در زبان پہلوی

اپنی کتاب کی ابتدا مولانا داؤد نے اس حکم کے مطابق کہ :

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ

حمد و نعت سے کی ہے۔ چنانچہ ایک عنوان یہ ہے :

"فی التوحید آفریدگار و منتہائے عالم دنیاوی"

پھر مقامی امراء اور بادشاہ وقت کی تعریف و توصیف بیان کی ہے۔ اس میں بھی انھوں نے اسلامی عقاید اور تعلیمات کے بیان کی گنجائش نکال لی۔

چنانچہ ایک مصرع میں کہتے ہیں ؎

کہاں جہاں جو کون بڑائی، بڑ جو کینہ کرتار

یعنی خان جہاں کی بڑائی کچھ نہیں ہے بڑا تو وہ کارساز ہے جس نے اُن کو

۱؎ اس میں لفظ "مخدوم" کی شمولیت کی وجہ سے اس منتر کے حضرت شرف الدین سے انتساب کی صحت کو تسلیم کرنے میں راقم کو تامل ہوتا ہے۔

ایسا بنالیا ہے۔

داؤد نے اپنے مرشد کی مدح بھی کی ہے۔ اس مدح میں بھی "دھرم پنتھ" یعنی مذہب کے راستے کے بیان کی ایک صورت نکال لی ہے۔ ؎

سیکھ جنید ی ہمرں پتھ لاوا   دھرم پنتھ بنہ پاپ گنواوا

چنداین ایک طویل عشقیہ داستان ہے جس کے تمام کردار ہندوستان کی ایک پسماندہ قوم اہیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ قصّہ کے تمام معاملات اسی قوم کے معمولات کے مطابق ہیں۔ صرف بیانِ واقعات میں ضمناً شاعر کو جہاں بھی موقع مل سکا ہے، اس نے اپنے مسلک کی بات کہہ دی ہے۔ اصل قصّہ میں عشق و عاشقی کی روداد ہونے کے باوجود، چوں کہ بین السطور میں اپنے عقیدے کی بات کہی گئی ہے۔ کتاب نہایت مفید اور مؤثر ہو گئی ہے۔ اس کا یہ طرز اتنا مقبول ہوا کہ بعد میں تادیر اسی طور پر مختلف داستانیں نظم کی جاتی رہی ہیں۔ ان داستانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر رام کمار ورما نے لکھا ہے:

"عشقیہ منظوم داستانوں کی سب سے عجیب بات یہ ہے کہ داستان کی تشکیل پوری طرح ہندوستانی ہوتی ہے، ان میں تمام کردار ہندو مذہب کے ماننے والے ہوتے ہیں اس کے باوجود ان میں ہر جگہ اسلامی اصول مؤثر حد تک دخیل ہوتے ہیں۔" [آلوچناتمک اتہاس صہ۳۰۲]

مولانا داؤد نے چنداین لکھ کر جو روایت قایم کی تھی، بعد کے کم و بیش تمام صوفی شاعر ایک طویل مدّت تک اسی کے مطابق نظمیں لکھتے رہے۔ چنانچہ شیخ قطبن کی مرگاوت اور شیخ منجھن کی مدھومالت وغیرہ بھی اسی روایت کے مطابق ہیں۔ وہ روایت اتنی مثبت، دلنواز اور دلکش تھی کہ ہندوستان کے خاص و عام سب اسی سے متاثر ہوتے رہے۔ چنانچہ سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایک جین شاعر بنارسی داس نے بھی لکھا ہے ؎

تب گھر میں بیٹھے رہیں، ناہن ہاٹ بازار
مدھومالت مرگاوت پوتھی دوئی اُچار

[ہندی ساہتیہ صہ۹۹]

یعنی میں گھر میں بیٹھا رہتا تھا، ہاٹ بازار کا جانا بھی چھوڑ چکا تھا۔ بس مدھومالت اور مرگاوت نامی دونوں کتابوں کو پڑھتا رہتا تھا۔ اس بیان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صوفی بزرگوں کی تصانیف مسلمانوں میں ہی نہیں، غیر مسلموں میں بھی بہت بعد تک دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی رہی ہیں۔

اشاروں اور کنایوں اور کبھی تمثیلوں کے سہارے سے اپنی بات کہہ دینے کی جو روایت صوفیائے کرام نے اوّل روز قایم کی تھی وہی زبان ہندوی بلکہ زبانِ اردو کا مزاج بن گئی۔ چنانچہ جدید دور کے مشہور غزل گو شاعر جگر مرادآبادی نے بھی کہا ہے ع

بات جس کی ہے اُسی آفت جاں تک پہنچے

صوفیائے کرام کی قایم کردہ اس روایت کو کہیں رمزیت اور کہیں تغزل کا نام دیا گیا ہے۔ اس طرزِ بیان کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ اپنے پرائے سب اُن صوفیا کے تصنیفی کارناموں سے دلچسپی لیتے رہے لیکن اس کے مقابلے میں ایک اور بہت بڑا فایدہ یہ ہوا کہ لفظوں کو نئی معنویت حاصل ہوئی اور اس نئی معنویت نے فکر و خیال کے انداز کو بھی بدل دیا۔ چنانچہ اُن صوفیوں کے زیرِ اثر یہ بھی ہوا کہ لفظ "رام" اس خدا کے لیے استعمال ہونے لگا تھا جس کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ:

ایسور ایک ہے، اس کا کوئی روپ آکار نہیں ہے، وہ نرگن سگن سے پرے ہے، وہ سنسار کے ہر ذرّہ ذرّہ میں موجود ہے، وہ نورِ مطلق ہے، وہ نظر نہ آنے والا نہ چھوا جانے والا ہے۔"

[آلوچناتمک اتہاس صہ۱۹۴]

اور دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہی ہندوستانی معاشرے میں یہ باتیں عام ہونے لگی تھیں کہ

"خدا ایک ہے، اُس کی شکل صورت نہیں ہے۔
بُت پرستی بیکار ہے۔ اس سے خدا کی حیثیت محدود ہو جاتی ہے۔
مرشد کی اہمیت خدا سے بڑھ کر ہے۔
معاشرے میں ذات پات کی تفریق کے لیے کوئی جواز نہیں ہے۔ خدا کی عبادت میں سب برابر ہیں۔"

(ایضاً صہ۲۹۸)

یہ خیال ہندوستانی معاشرے میں اس حد تک جاری و ساری ہو گئے تھے کہ خود یہیں کی خاک سے ان خیالوں کو لے کر کے بعد دیگرے متعدد تحریکیں اٹھیں۔ مہرشی شیوبرت لال ورمن نے ایسی تحریکوں کی تعداد

تینتالیس بتائی ہے۔ (کبیر جگ، جلد اوّل، حصہ ۱ صفحہ ۹۸) لیکن اِن کے علاوہ دوسرے سلسلوں کی تحریکیں بھی کی تھیں۔ انھیں میں "رام سینہی مت"، بھی تھا جس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ،

"رام سینہی مت مسلمانوں کے طریق سے بہت کچھ ملتا ہے۔
اس میں بت پرستی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دن
میں نماز کی طرح پانچ بار خدائے مطلق کی عبادت ہوتی ہے
اس میں ذات پات کی قید بھی نہیں ہے۔"

[آلوچناتمک اتہاس صفحہ ۲۹۹]

اس میں شبہ نہیں کہ نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے خاتمے تک ہندوستان کی سرزمین پر یہاں کی بول چال کی کسی بھی زبان میں اسلامی تاریخ یا اسلامی تعلیمات سے متعلق براہِ راست کوئی تصنیفی کام نہیں ہوا تھا۔ باوجود اس کے شمال سے جنوب تک سارے ہندوستانی معاشرے میں اسلامی عقائد کی کارفرمائی موجود ہے اور زبان اردو کو جس کا قدیم نام ہندوی یا ہندی ہے اپنے ہی نہیں، غیر بھی اسلامیات کی پیش کش کی زبان سمجھتے ہیں۔ یہ کرشمہ ہے کردار اور عمل، قول اور بیان کی اُن بہترین روایات کا جو صوفیائے کرام نے قایم کی تھیں، جن کی طرف یہاں صرف مختصراً اشارہ کیا گیا ہے۔

ماخذ

۱۔ اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام۔
از مولوی عبدالحق۔ شائع کردہ: انجمن ترقی اردو۔ کراچی

۲۔ خزائنِ رحمت (قلمی) از بہارالدین باجن۔ اس کے اقتباسات
از راہ علم نوازی پروفیسر شیخ فرید برہانپوری نے عنایت کیے

۳۔ فہرست نسخ ہائے خطی فارسی، انجمن ترقی اردو کراچی (مرتب)
سید عارف نوشاہی۔ مطبوعہ ۱۹۸۴ء

۴۔ کبیر جگ جلد اول، حصہ اوّل از مہرشی شیو برت لال ورمن

۵۔ ملیبار۔ حکیم شمس اللہ قادری

۶۔ ہندی ساہتیہ کا اتہاس از پنڈت رام چندر شکل

۷۔ ہندی ساہتیہ کا آلوچناتمک اتہاس از ڈاکٹر رامکمار ورما

۸۔ سہ ماہی نوائے ادب، بمبئی۔ جولائی ۱۹۶۶ء

۹۔ رسالہ معاصر۔ پٹنہ حصہ ۴

"ارادہ کارخانۂ دنیا میں ایک عظیم الشان قوت ہے، انسان ایک برقی ٹریم ہے، دماغ برقی چھڑی ہے، ارادہ برقی تاروں کا ایک سلسلہ ہے جو اس کے اوپر پھیلا پڑا ہے۔ انسان کا کام صرف اتنا ہے کہ برقی چھڑی سے ارادے کے تاروں کو چھو لے۔ حرکت خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ پر زور خواہش اور اٹل ارادے جس انسان کے اندر موجود ہیں وہ عالی ہمت اور بلند حوصلہ انسان ہے، زمانہ کے نشیب و فراز ایسے عالی ہمت اور بلند حوصلہ انسان کے آگے آخرکار سر تسلیم خم کر دیں گے۔ جو ان کے سامنے اپنی گردن نہیں جھکاتا بلکہ مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے اور ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہے۔" [وحید الدین سلیم]

ابو محمد سحر*

عرشی زادہ طریقۂ تعلیم

[بچوں اور بالغوں میں شرح خواندگی بڑھانے کے لیے مروجہ قرآنی نظام تدریس سے فیض اٹھانے کی راہِ عمل]

اردو پڑھنا لکھنا سکھانے میں آسانیاں پیدا کرنے کا خیال اردو دانوں کو ایک عرصے سے دامن گیر ہے پہلے اس کی تہہ میں اردو کی توسیعِ اشاعت کا جذبہ تھا۔ تقسیم کے بعد ہندوستان میں اردو جن حالات سے دوچار ہوئی اُن میں رفتہ رفتہ یہ مسئلہ اردو کی بقا سے وابستہ ہو گیا۔ بہت سے اردو داں یہ سمجھتے ہیں کہ رسم الخط کی بعض مبینہ مشکلات اردو کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ہیں۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ ہم میں سے اکثر لوگ عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی رسم الخطوں سے واقف ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو رسم الخط ایک ہی قبیل کے ہیں۔ اُن کی دشواریاں بڑی حد تک مشترک ہیں۔ ہندی اور انگریزی رسم الخطوں کی دشواریاں مختلف بھی ہیں اور زیادہ بھی۔ جو حضرات آج کل ہندی رسم الخط کی آسانیوں پر رطب اللسان نظر آتے ہیں وہ یا تو ہندی رسم الخط سے پوری طرح واقف نہیں ہیں یا ہندی کے پروپیگنڈے کا شکار ہیں۔ عربی کے مقابلے میں اردو میں سات حرف زیادہ ہیں۔ فارسی کے مقابلے میں زائد حروف کی تعداد صرف چار رہ جاتی ہے۔ حرکات و سکنات ایک جیسی ہیں۔ پھر بھی اردو دانوں کے عدم اعتماد کا یہ حال ہے کہ انھیں اکثر اپنے رسم الخط کی مشکلات ہی دکھائی دیتی ہیں۔ اردو کے نئے قاعدے زیادہ تر اسی ذہنی پس منظر میں مرتب کیے جاتے ہیں اور جب وہ ناکام ثابت ہوتے ہیں تو اس کا الزام بھی اردو کے سر رکھا جاتا ہے۔

املا اور زبان کو اصلاحی اور منطقی طرزِ فکر کے اثرات سے کلیۃً الگ نہیں رکھا جا سکتا لیکن دونوں میں اس کا عمل دخل ایک حد تک ہی قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں ذریعہ یا وسیلہ ہیں۔ خیالات اور رجحانات میں جس رفتار سے تبدیلیاں ہوتی ہیں اس رفتار سے املا اور زبان میں عام طور پر ردّ و بدل نہیں ہوتا۔ چنانچہ کسی زبان کے املا، الفاظ اور اسالیبِ بیان وغیرہ کو اسی طرح سیکھا اور سکھایا جاتا ہے جس طرح وہ مروج و مستعمل ہوتے ہیں اور معیاری سمجھے جاتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مفروضہ مشکلات یا لسانی تحقیق اور منطق وغیرہ کے نام پر قاعدہ نویسوں کو اردو املا کے بنیادی نظام میں ترمیم و اضافہ کرنے کا اختیار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ انھیں یہ حق ضرور حاصل ہے کہ املا کے مقررہ نظام کے دائرے میں رہ کر اس کو سکھانے کے آسان طریقوں کی تلاش میں اپنی کوششیں صرف کریں۔

اردو کی تدریس میں آسانیاں فراہم کرنے کی ایک کوشش حال ہی میں عرشی زادہ طریقۂ تعلیم کی صورت میں سامنے آئی ہے۔ جو اردو کی ابتدائی تعلیم کو درپیش مسائل حل کرنے کے سلسلے میں ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ کیوں کہ اس تجویز کے ذریعے اردو پڑھنے پڑھانے کے لیے دور کی کوڑی لانے کے بجائے قرآنی تعلیم کے مروجہ طریقے ہی سے فائدہ اٹھانے کی راہ نکالی گئی ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ اردو املا کے بنیادی نظام میں ہر قسم کی ترمیم و تنسیخ سے پاک ہے اور دوسری طرف پوری طرح قابلِ عمل اور نہایت آسان ہے۔ اس کا دائرۂ کار ان بچوں اور بڑوں سے متعلق ہے جو ناظرہ قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس سے مسلمان بچوں اور بالغوں کو اردو سکھانے میں مدد لی جا سکتی ہے۔ لیکن ان بچوں اور بالغوں کی تعداد بھی اتنی زیادہ ہے اور اتنے بڑے علاقے پر پھیلی ہوئی ہے کہ اس کے اس دائرۂ کار کی وسعتوں کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔ ایک اطلاع کے مطابق پاکستان میں ایسے لوگوں کی تعداد جو قرآن مجید پڑھ سکتے ہیں ۳۸ فیصد اور ایسے لوگوں کی تعداد جو اردو پڑھ سکتے ہیں ۲۶ فیصد ہے۔ ہندوستان میں بھی اگر اعداد و شمار جمع کیے جائیں تو قرآن مجید پڑھنے والوں کی تعداد اردو پڑھنے والوں سے کہیں زیادہ نکلے گی۔ کیوں کہ پاکستان کے برعکس یہاں اردو کی تعلیم لازمی نہیں ہے۔

---

* ڈاکٹر ابو محمد سحر۔ ۳۹ مالویہ نگر۔ بھوپال۔

جو بچے ناظرہ قرآن مجید کی تعلیم کے لیے عربی رسم الخط کا پڑھنا سیکھتے ہیں، اور اس کے ساتھ ساتھ یا اس کے بعد اردو پڑھتے ہیں ان کو ایک طرح کی سہولت ہمیشہ سے حاصل ہے۔ عربی اور اردو حروف تہجی میں صرف سات حروف کا فرق ہے بقیہ حروف مشترک ہیں اور ان کی شکلیں قریبی مشابہت رکھتی ہیں۔ حرکات و سکنات ایک ہیں۔ اس طرح اردو سیکھنے کے لیے صرف سات نئے حروف یعنی پ، ٹ، چ، ڈ، ڑ، ژ اور گ سیکھنے پڑتے ہیں۔ اگر ہائے مخلوط کی حیثیت سے ہائے دو چشمی اور یائے مجہول منفصل کے فرق کو بھی ملحوظ رکھا جائے تو نئے حروف کی کل تعداد ۹ قرار پاتی ہے۔ اسی سہولت کے پیش نظر جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ، رضا لائبریری رام پور (بھارت) نے ایک شعوری اور منضبط طریقۂ تعلیم نکالا ہے۔

عرشی زادہ طریقۂ تعلیم کی دریافت ایک نجی درسی تجربے پر مبنی ہے جو جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ کو اپنے نو سالہ بچے حسان عرشی کو اردو پڑھنا لکھنا سکھانے میں حاصل ہوا۔ یہ بچہ جو قرآن مجید کی ناظرہ تعلیم کے سلسلے میں عربی رسم الخط سے واقف ہو چکا تھا، اردو کے نئے حروف کی صرف ڈھائی گھنٹے کی مشق کے بعد اس لائق ہو گیا کہ اس نے اپنے چچا کے نام مفرد حروف میں ایک مختصر اردو خط لکھ لیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے صحیح طور پر اردو لکھنا بھی سیکھ لی۔ اس کے بعد جناب عرشی زادہ نے دو اور بچوں کو ایک ساتھ قرآن مجید پڑھنا اور اردو پڑھنا لکھنا سکھایا اور اس میں بھی انھیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ قرآن مجید کا ناظرہ کرنے والے ایسے بچوں اور بالغوں کو جو اردو زبان سے واقف ہوں، حروف کی شناخت اور مشق کرائی جائے تو وہ بہت جلد اردو پڑھنا لکھنا سیکھ سکتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ایک ایسے قاعدے کا تصور پیدا ہوا جو بیک وقت ناظرہ قرآن مجید اور اردو پڑھانے کے لیے استعمال کیا جا سکے۔

جناب عرشی زادہ کا خیال ہے کہ قرآن مجید اور اردو پڑھانے کے لیے دو الگ الگ قاعدوں کی جگہ اگر ایک ہی قاعدہ جو مشترک ہو رائج کیا جائے تو وہ تمام بچے جو قرآن مجید پڑھیں گے لازمی طور پر اردو بھی سیکھ لیں گے۔ اس اعتبار سے یہ طریقہ ہندوستان کے طول و عرض میں اردو کی ترویج و اشاعت کو ایک نئی زندگی عطا کر سکتا ہے۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں میں اردو پڑھنے کا رجحان اس لیے بھی بڑھ سکتا ہے کہ ان کا مذہبی لٹریچر بیشتر اردو میں ہے۔

بادی النظر میں خیال ہوتا ہے کہ عربی اور اردو کی لکھائی، حروف کی شکلوں اور جوڑوں کے اختلافات یعنی نسخ اور نستعلیق کے فرق کی وجہ سے عرشی زادہ طریقۂ تعلیم کی تجویز کو قبول کرنے میں کچھ دشواریاں پیش آئیں گی، لیکن یہ محض ایک واہمہ ہے۔ نسخ اور نستعلیق کے اختلافات بہت معمولی ہیں۔ عربی اور اردو کے مشترک حروف کی شکلوں کا فرق بہت خفیف ہے۔ اردو کے زائد حروف کی شکلیں بھی اسی انداز کے عربی حروف کی شکلوں میں تھوڑے سے تغیر سے پیدا ہوتی ہیں۔ جوڑوں میں بھی زیادہ فرق نہیں ہے۔ شمسی و قمری حروف میں الف لام کا استعمال، الف ممدودہ و مقصورہ کا استعمال، تنوین کا استعمال غرض یہ کہ عربی املا کا کوئی قاعدہ ایسا نہیں جو اردو میں کم و بیش نہ ہو۔ اردو میں ہمیشہ سے صرف نستعلیق کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن چھپائی کے لیے نسخ کا استعمال بھی ہوتا رہا ہے۔ بہت سی کتابوں کے علاوہ رسائل اور اخبارات تک نسخ ٹائپ میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن کی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔ سرکاری گزٹ اور فارم ہی نہیں، امتحانات کے پرچے وغیرہ بھی عام طور پر ٹائپ ہی میں چھپا کرتے تھے اور اب بھی چھپتے ہیں۔ آزادی کے بعد متعدد کتابیں ہندوستان میں بھی ٹائپ میں چھپی ہیں۔ دیوانِ غالب کا نسخۂ عرشی اس کی ایک نہایت اہم مثال ہے۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی کا رسالہ نوائے ادب آندھرا پردیش سرکار کا ماہانہ رسالہ آج بھی ٹائپ میں چھپتا ہے۔ پاکستان میں تو بکثرت کتابیں ٹائپ میں چھپتی ہیں اور متعدد رسائل بھی ٹائپ میں چھپتے ہیں اردو کا ٹائپ رائٹر نسخ میں ہی ہے۔ اردو طباعت میں نستعلیق کے مقابلے میں نسخ کا چلن اگر نہیں ہوا تو اس کا سبب یہ تو ضرور قرار دیا گیا ہے کہ ٹائپ آنکھوں کو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن کسی نے یہ شکایت نہیں کی کہ بحیثیت خط کے اس کا پڑھنا دشوار ہے، حالاں کہ علیحدہ سے ٹائپ کا پڑھنا کسی کو نہیں سکھایا جاتا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ دستی کتابت میں بھی نستعلیق کے ساتھ نسخ کا استعمال عام ہے۔ شاعروں اور ادیبوں کے نام، کتابوں کے نام، فقرے اور اقتباسات اکثر نسخ میں لکھے جاتے ہیں اور کوئی بھی ان کے پڑھنے میں دشواری محسوس نہیں کرتا۔

نسخ تحریر کو پڑھنے کے لیے الگ سے اس میں مہارت حاصل کرنا بھی ضروری نہیں۔ نستعلیق جاننے والا اسے بآسانی پڑھ سکتا ہے۔ ایران میں فارسی کی چھپائی نسخ ٹائپ میں ہوتی ہے۔ لیکن لکھائی کے لیے نستعلیق کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ محض ایک غلط فہمی ہے کہ خط نسخ میں چھپنے والی

دوسری زبانوں مثلاً پشتو اور سندھی میں لکھائی بھی خط نسخ میں ہوتی ہے۔ خود ربی رقعی انداز میں لکھی جاتی ہے جس کے بیشتر جوڑ پیوند نستعلیق سے مماثلت رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نسخ اور نستعلیق دو الگ خط نہیں، لکھنے کے دو انداز ہیں خط عربی ہے، جس طرح خط رومن ہے اور اس کے چھاپنے اور لکھنے کے الگ الگ انداز ہیں۔ نسخ اور نستعلیق ایک دوسرے سے اتنے مختلف نہیں کہ دونوں کو الگ الگ سیکھے بغیر پڑھنا دشوار ہو۔ بچوں کو تو خاص طور سے دونوں کے فرق کا احساس نہیں ہوتا اور وہ کسی ایک کو سیکھنے کے بعد دوسرے کو آسانی سے پڑھ لیتے ہیں۔ یہاں اس سے غرض نہیں کہ اردو میں طباعت کے لیے نسخ کو اپنایا جائے یا نستعلیق کو برقرار رکھا جائے۔ کیوں کہ یہ مسئلہ جداگانہ ہے۔ یہاں مختصر صرف یہ ہے کہ نسخ اور نستعلیق میں کوئی مغایرت نہیں ہے۔ عرشی زادہ طریقۂ تعلیم کے ذریعے سے اردو رسم الخط کی تدریس کو قرآن مجید کی تعلیم کے وسیع حلقۂ اثر سے جوڑ دیا جائے تو اس سے کم سے کم مسلمانوں میں اردو کی ترویج کا ایک نہایت مضبوط سلسلہ قایم ہو سکتا ہے۔

عرشی زادہ طریقۂ تعلیم برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں اردو کی تعلیم اور شرح خواندگی بڑھانے کے لیے ایک مثبت، سہل، زود اثر اور سستا نسخہ ہے۔ بچوں کو ناظرہ قرآن مجید پڑھانے والے افراد اور مدارس کو اس کی طرف پوری توجہ دینا چاہیے۔ اس کو ایسے بالغوں کو اردو پڑھانے کے لیے بھی استعمال کرنا چاہیے جو عربی رسم الخط سے واقفیت رکھتے ہیں اور اردو پڑھنا چاہتے ہیں۔

آخر میں اتنا عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریقۂ تعلیم ایک مخصوص صورت حال میں دریافت ہوا۔ اس کی روشنی میں جناب اکبر علی خان عرشی زادہ قاعدہ عرشی کے نام سے جو قاعدہ مرتب کر رہے ہیں، وہ طالب علموں کے ایک مخصوص حلقے کے لیے ہوگا۔ یہ اردو کا عام قاعدہ نہ ہوگا۔ اردو کا عام قاعدہ اردو ہی پر منحصر ہو سکتا ہے، کسی دوسری زبان پر نہیں۔ عام قاعدے کے پڑھنے والے صرف وہ طالب علم نہیں ہو سکتے جو قرآن مجید پڑھتے ہیں۔ لہٰذا یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہیے کہ عرشی زادہ طریقۂ تعلیم کا مقصد اردو کی تعلیم کو صرف مسلمانوں سے جوڑنا ہے جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے اس کا مقصد مسلمانوں میں قرآنی تعلیم کے مروجہ نظام سے فیض اٹھانا ہے۔ اس نظام کے باہر اردو پڑھانے کے عام قاعدے بدستور اپنا اہم کردار ادا کرتے رہیں گے۔

"..... انصاف کا مقام ہے کہ جب ہم اپنے سے کمتر اور ناتربیت یافتہ قوموں کو حقیر مثل جانوروں کے خیال کرتے ہیں تو جو قومیں کہ ہم سے زیادہ شائستہ اور تربیت یافتہ ہیں، اگر وہ بھی ہم کو اسی طرح حقیر اور ذلیل مثل جانوروں کے سمجھیں تو ہم کو کیا مقام شکایت ہے۔

ہاں! اگر ہم کو غیرت ہے تو ہم کو اس حالت سے نکلنا اور اپنی قوم کو نکالنا چاہیے۔"

سر سید احمد خاں

اقتباس از "رسم و رواج"

نسیم اے۔ زیدی*

ترجمہ: سید شفیق احمد**

سرکاری ملازمتوں میں مسلمان

تمایل نہیں!

سرکاری و دیگر ملازمتوں میں مسلمانوں کی ناکافی نمائندگی باعث تشویش ہے اور مسلم فرقہ میں مایوسی پھیلا رہی ہے ملک کی سب سے برتر ملازمت یعنی انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس میں مسلمانوں کی نمائندگی کا تناسب دھیرے دھیرے گرتا جا رہا ہے۔ یہ رُخ ان تفصیلات سے صاف ظاہر ہے جو جناب اے۔ آر۔ شیروانی صاحب نے وزارتِ داخلہ کی شایع شدہ آئی۔ اے۔ ایس کی سول لسٹ سے مرتب کی ہیں۔

بقول ان کے (شیروانی صاحب) مسلمانوں کا فیصد تناسب آئی۔ اے ایس میں ۱۹۷۲ء ۵ر۴ تھا جو ۱۹۷۹ء میں گر کر ۲ر۳ ہوگیا۔ اور ۱۹۸۱ء میں یہ مزید گر کر ۳ فیصد رہ گیا۔ اپریل ۱۹۸۳ء میں شایع سول لسٹ کے مطابق ملک کے ۲۹۴۹ آئی۔ اے۔ ایس افسروں میں سے مسلمان افسرن کی کل تعداد ۶۰ تھی یعنی تقریباً ۲ فیصدی۔ اس کے برخلاف مسلمانوں کی آبادی ملک میں ۱۲ فیصدی اندازہ کی جاتی ہے۔ اگرچہ کہ دیگر ملازمتوں میں مختلف فرقوں کی نمائندگی کی تفصیلات حاصل نہیں ہیں لیکن یہ بات کسی حد تک یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان میں بھی حالت کچھ بہت بہتر نہیں ہے۔

آئیے ہم دیکھیں کہ یہ صورت حال صاحب اقتدار لوگوں کے کسی منصوبہ یا تدبیر کی وجہ سے ہے تاکہ وہ ملک کی سب سے بڑی اقلیت کو مستقل پچھڑی حالت میں رکھ سکیں یا یہ صورت حال مسلم فرقہ کی خود کردہ خامیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے ہے۔ اگرچہ کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کے ایک بہت چھوٹے طبقے کی ضروریات کو پورا کرتی ہے، پھر بھی وہ ہندوستانی مسلمانوں کی ملازمتوں سے وابستہ توقعات کو بہتر بنانے میں رہنمائی کر سکتی ہے۔

شایع شدہ تفصیلات سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ آئی۔ اے۔ ایس اور مشترکہ انجینیرنگ سروسز میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا کے خلاف کوئی تمایل برتا گیا ہو۔ یونین پبلک سروس کمیشن اپنی سالانہ رپورٹس میں دو مقابلے کے امتحانوں کا "کامیابی کا تناسب" (کامیاب اور شرکاء امتحان کی تعداد کا تناسب) شایع کرتا ہے۔ پچھلے سالوں میں اے۔ ایم۔ یو کے طلبا کی کامیابی کا تناسب بالمقابل تمام ہندوستان کے اوسط سے بہتر تھا۔ آئی۔ اے۔ ایس کے امتحان میں ۱۹۷۶ء میں اے ایم یو کے طلبا کی کامیابی کا تناسب ۱:۹٫۵ تھا جب کہ سارے ملک کا اوسط تناسب ۱:۲۶ تھا۔

اس لحاظ سے اے۔ ایم۔ یو نے سارے ملک کے ۱۰۴ اداروں میں جنھوں نے اپنے امیدوار برائے آئی۔ اے۔ ایس امتحان بھیجے تھے، تیسری جگہ حاصل کی تھی۔ دوران سال صرف دو یونیورسٹیاں۔ جے۔ این۔ یو اور نیہو (شیلانگ) نے اے۔ ایم۔ یو سے بہتر کامیابی کا تناسب حاصل کیا تھا۔ ۱۹۷۹ء میں اے۔ ایم۔ یو نے ۱۰۲ اداروں میں پانچویں جگہ حاصل کی۔ جب کہ اس کے ۳۲ میں سے ۶ طلبا کا انتخاب کیا گیا تھا۔

کامیابی کا تناسب

مشترکہ انجینیرنگ امتحانوں میں اے۔ ایم۔ یو نے بڑی کامیابی ۷۱-۱۹۷۰ء میں حاصل کی جب کہ اس کی کامیابی کا تناسب سارے ہندوستانی کے اوسط سے زیادہ تھا۔ اس سے قبل کے سالوں کی کامیابی کا تناسب موجودہ تحقیق میں شامل نہیں ہے۔ ۱۹۷۱ء میں اے۔ ایم۔ یو نے تیسری جگہ رڑکی اور آئی۔ آئی۔ ٹی کانپور کے بعد حاصل کی جب کہ اس کے ۲۴ شرکائے امتحان

---

* نسیم۔ اے۔ زیدی۔ "مسلمس ان پبلک سروسز" مطبوعہ۔ دی ٹائمس آف انڈیا۔ ۸ مئی ۱۹۸۶ء

** سید شفیق احمد، امیر نشاں، علی گڑھ

میں سے ۷ امیدواروں کا انتخاب ہوا۔ بعد کے سالوں میں کامیابی کا یہ تناسب بالمقابل دیگر اداروں کے گر گیا۔ منجملہ دوسری وجوہات کے ایک وجہ یہ تھی کہ اے۔ایم۔یو کی جدید طرز کی ترقی کی رفتار دوسرے مشہور انجینئرنگ اداروں کے مقابلہ میں کم تھی۔

گزشتہ سالوں میں اے۔ایم۔یو کے سابق طلبار کی بہتر کارکردگی سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ان کو غیر منصفانہ اور متعصبانہ رویہ کا شکار نہ ہونا پڑا۔ دونوں امتحانوں میں تعلیمی معیار کو ہی زیادہ اہمیت دی گئی۔

مشکل یہ ہے کہ ہر سال اے۔ایم۔یو کے نسبتاً کم ہی طلبار قومی ملازمتوں کے لیے امتحان پاس کر کے قانونی طور پر مستحق بنتے ہیں۔ مثلاً ۱۹۸۱ء میں اے۔ایم۔یو سے صرف ۱۴ امیدوار تھے جب کہ بالمقابل دوسری یونیورسٹیوں کی تعداد: دہلی ۱۰۱۶، الہ آباد ۴۶۴، لکھنؤ ۱۹۴، جے۔این۔یو ۲۱۰، بی۔ایچ۔یو ۱۲۸ گرونانک دیو یونیورسٹی ۱۵۹ تھی۔ اسی سال مشترکہ انجینئرنگ امتحانوں میں اے۔ایم۔یو کے طلبار کی کل تعداد ۱۰۶ تھی جب کہ رڑکی کی تعداد ۲۳۹، الہ آباد ۲۴۷، مدراس ۲۰۸، جبل پور ۱۸۴ اور انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرنگ کی تعداد ۲۳۷ تھی۔

یہ کچھ عجیب سا لگتا ہے کہ اے۔ایم۔یو کے طلبا نے ماتحت ملازمتوں کے لیے ناپسندیدگی پیدا کر لی ہے۔ جب کہ زیادہ تر کو یہ خوف ہے کہ وہ شاید اعلیٰ درجے کی ملازمتوں کے مقابلے کے امتحانوں میں کامیابی حاصل نہ کر سکیں ۔ دوسرے لوگ یہ سوچتے ہیں کہ وہ کم تر ملازمتوں کے لیے ضرورت سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔ ۳ جولائی ۱۹۸۳ء کو اسٹاف سلیکشن کمیشن نے تقریباً ۷ ہزار مرکزی ملازمتوں کی آسامیوں کو پُر کرنے کے لیے ایک امتحان لیا۔ تقریباً ۶ ہزار امیدواروں نے علی گڑھ سینٹر سے امتحان دینا طے کیا۔ وہ وہاں ۱۳ سب سینٹرس پر منعقد ہوا۔ ایسے پانچ سب سینٹرس میں شرکائے امتحان کی کل تعداد کا جائزہ لینے سے معلوم ہوا کہ اے۔ایم۔یو کے طلبار کا فیصد ۲ سے ۴٫۲ تک اور اوسط ۳٫۲ رہا۔ باقی دوسرے اداروں کے گریجویٹ تھے اور یہ صورتِ حال خود علی گڑھ میں تھی۔

اے۔ایم۔یو کے طلبار کی کارکردگی آئی۔اے۔ایس اور انجینئرنگ ملازمتوں کے علاوہ دیگر ملازمتوں کے مقابلے کے امتحانوں میں کبھی "نہیں" کے برابر رہی۔ ۱۹۸۳ء میں راقم سطور کے ایک مثالی جائزے سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ ۳۰ طلبار میں سے ایک بھی بینکوں کے پروبیشنری افسروں کے تحریری امتحان کو نہ پاس کر سکا۔ انکم ٹیکس اور اکسائز انسپکٹروں کی ملازمتوں کے لیے اسٹاف سلیکشن کمیشن کے امتحان میں ۱۱ میں سے صرف ۲ طلبا تحریری امتحان میں پاس ہوئے۔

غیر رسمی یا خارجی تعلیم

وجوہات تلاش کرنے کے لیے کہیں دور نہیں جانا ہے۔ ان تمام امتحانوں میں وہ طلباء جن کو خارجی تعلیم حاصل تھی فائدے میں رہے۔ جب کہ اے۔ایم۔یو کے طلبار نے صرف رسمی اور نصابی تعلیم پر زور دیا اور اب بھی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ صلاح و مشوروں اور مقابلے کے جذبات کا فقدان تھا۔ تقریباً ۶۴ فیصدی امیدوار پوری تیاری نہ ہونے کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے اور ۱۸ فیصدی طلبار نے یونیورسٹی کے نصاب کو زیادہ سود مند نہ پایا۔

اے۔ایم۔یو کے زیادہ تر طلبار میں مقابلے کے جذبات اور تعلیمی افضلیت کی کمی کی اصل وجہ یونیورسٹی میں داخلے سے قبل مسلمانوں کا معیارِ تعلیم ہے نہ کہ خود یونیورسٹی کا معیارِ تعلیم۔ اس سطح پر مسلمانوں کی تعلیم ماہیتی اور مقداری دونوں اعتبار سے پیچھے ہے۔ جناب اے۔ آر۔ شیروانی صاحب کے مطابق ۱۹۷۷-۷۸ء میں میرٹھ ڈویژن میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۳۵ فیصد تھی۔ لیکن وہاں اسکولوں میں مسلم طلبار کی تعداد ۱۰ فیصدی سے بھی کم تھی۔ اقلیتی کمیشن کے ایک حالیہ جائزے سے یہ نتیجہ نکلا کہ غیر مسلموں کی تعداد بہ نسبت مسلم طلباء کے اُن ۴۰ اسکولوں اور کالجوں میں بھی زیادہ تھی جو خود مسلم ادارے چلاتے ہیں۔

جیسے ہی تعلیمی معیار اوپر اٹھتا در حقیقت غیر مسلم طلبار کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً رام پور کی آبادی ۷۲ فیصدی مسلمانوں اور ۲۸ فیصدی غیر مسلموں پر مشتمل ہے۔ ۱۹۸۲ء میں ۸۹ مسلمان طلبا میں سے جنھوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا تھا صرف ۲ اوّل درجہ میں کامیاب ہوئے تھے۔ جب کہ ۳۴۴ میں سے ۴۰ غیر مسلم طلبار نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس بنا پر اور دوسری تفصیلات کی روشنی میں سکسینہ صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مسلمان تعلیمی اعتبار سے کم از کم دس گنا زیادہ (غیر مسلموں سے) پچھڑے ہوئے ہیں۔ چوں کہ ملک میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۱۲ فیصدی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کی ۲٫۱ فیصد نمائندگی ملکی ملازمتوں میں یہ ظاہر کرتی ہے کہ ان کے ساتھ کسی تعصب یا بھید بھاؤ

[باقی صفحہ نمبر ۴۲ پر]

شیخ سلیم احمد*

ابتدائی تعلیم ـــــ ایک جائزہ، ایک خاکہ

(یہ مقالہ الامین ایجوکیشنل سوسائٹی (بے پور) کی دوسری تعلیمی کانفرنس میں پڑھا گیا)

مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کا کوئی بھی منصوبہ یا خاکہ بناتے وقت قومی و ملکی نظام تعلیم کا جائزہ ناگزیر ہے کیونکہ مسلمان ہندوستانی تہذیب و تمدن اس کی معیشت و معاشرت اور سیاست و ادب کا جزو لاینفک ہے۔ ملک کے مسائل کے سیاق و سباق میں ہی کسی ایک طبقہ کی دشواریوں کا جائزہ بامعنی نتیجہ خیز اور مثبت ہو سکتا ہے۔ مسلمان ایک جزیرہ نہیں وہ قومی دھارے کا ایک حصہ ہے۔ اس کی تقدیر بھی ملک و قوم کی تقدیر سے جڑی ہے۔ یہ انتہائی خوشی کی بات ہے کہ الامین ایجوکیشنل سوسائٹی کی دوسری تعلیمی کانفرنس (۴-۳ اپریل ۱۹۸۶ء) ایسے موقع پر منعقد کی جارہی ہے جب کہ حکومت ہند ملک کے تعلیمی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لانا چاہتی ہے اور جس نے نئی تعلیمی پالیسی کا ایک خاکہ بھی ملک کے سامنے پیش کیا ہے جو ماہرین تعلیم اور دانشوروں کے لیے موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ تمام مباحثوں اور مذاکرات کی روشنی میں توقع ہے کہ اس سال کے آخر تک نئی تعلیمی پالیسی کو آخری شکل دے دی جائے گی اور اس پر عمل درآمد کا کام شروع ہو جائے گا۔ بہت اچھا ہوگا کہ اس کانفرنس کے مذاکرات و فیصلے نئی تعلیمی پالیسی کی تشکیل پر اثر انداز ہو سکیں اور ہماری آواز کی بازگشت حکومت کے ایوانوں میں بھی سنائی دے۔ اور اس اہم قومی کام میں بحیثیت مسلمان ہم بھی حصہ بٹا سکیں۔

اس مضمون میں میرے پیش نظر پانچ سے تیرہ سال تک کا بچہ اور اس کی تعلیم ہے۔ آٹھ سال کی یہ مدت بچے کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس عمر میں مستقبل کے انسان کی نیو رکھی جاتی ہے۔ ان آٹھ سالوں کی تعلیم و تربیت پر اس کی عملی زندگی کی کامیابی و ناکامی کا انحصار ہے۔ ماہرین تعلیم کا کہنا ہے کہ جو بچہ اس مرحلہ میں اچھی تعلیم پا جاتا ہے وہ زندگی میں کبھی پیچھے کی طرف مڑ کر نہیں دیکھتا کیونکہ وہ مشکلات پر قابو پانے کی صلاحیت حاصل کر چکا ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم کا یہ زمانہ آٹھویں درجہ تک پھیلا ہوا ہے۔ ـــــ اب ابتدائی تعلیم یا پرائمری ایجوکیشن میں مڈل اسکول کی تعلیم کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ کانفرنس کے چھپے ہوئے پروگرام میں اسی پرائمری تعلیم کو بیسک ایجوکیشن کا نام دیا گیا ہے جو صحیح نہیں؛ بیسک ایجوکیشن یا بنیادی تعلیم ایک دوسری تعلیمی اصطلاح ہے جس کا تصور مہاتما گاندھی نے دیا تھا اور جس کو مرحوم ذاکر حسین کی سرپرستی میں باقاعدہ ایک تعلیمی تحریک کی صورت میں آگے بڑھایا گیا جس کا مقصد تعلیم کو عملی بنانا اور ہاتھ اور دماغ میں تال میل پیدا کرنا تھا۔ اس اصطلاح کا استعمال ختم ہو گیا اور اس کے تصور کو ابتدائی تعلیم میں ضم کر دیا گیا ہے۔

ہمارے ملک میں پرائمری اسکولوں کی تعداد تقریباً ۵ لاکھ سے زائد ہے جو کل تعلیمی اداروں کا ۸۴ فیصد ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اکثر بچوں کو ان کے مکان سے ایک کلو میٹر کے اندر پرائمری اسکول مہیا کیے گئے ہیں۔ لیکن چھپے ہوئے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ آبادی کے پانچویں حصے کے لیے کوئی اسکول نہیں ہے۔ جہاں اسکول ہیں وہاں صورت حال یہ ہے کہ ۴۰ فیصد کی پختہ عمارتیں نہیں ہیں۔ اتنے ہی فیصد اسکولوں میں تختۂ سیاہ تک میسر نہیں۔ بیشتر اسکول پینے کے پانی تک سے محروم ہیں۔ ۶۰ فیصد اسکولوں،

* جناب شیخ سلیم احمد، ۱۵۰۔ بستی حضرت نظام الدین ـ نئی دہلی۔

میں صرف ایک ہی استاد کو تین یا چار مختلف جماعتوں کو پڑھانا پڑتا ہے۔ ایسے میں ان استادوں کے لیے ممکن نہیں کہ وہ طلبا کی مختلف دلچسپیوں اور تعلیمی ضروریات کے تنوع کی طرف توجہ کریں۔ درحقیقت ایسے سروے بھی ہوئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کئی اسکول ایسے بھی ہیں جن میں بیشتر اوقات کے لیے کوئی استاد ہی نہیں ہوتا اور بعض استاد ایسے ہیں جو درس و تدریس کا کام ایسے لوگوں کو ٹھیکے پر اٹھا دیتے ہیں جو نہ تو قابلیت کے اعتبار سے نہ ہی تجربے کے اعتبار سے اس کام کے اہل ہوتے ہیں۔ ان اسکولوں میں پڑھایا جانے والا نصاب بھی اطمینان بخش نہیں۔ وہ طلبا کے ماحول کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتا۔ پڑھانے کا طریقہ بھی قدیم اور فرسودہ ہے جس میں بچّہ کو رٹانے پر زور دیا جاتا ہے۔

جہاں اسکول ایسے ہوں اور آبادی کا ۴۰ فیصد غریبی کے خط سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہو تو یہ امر باعث حیرانی نہیں کہ ابتدائی تعلیم میں داخلہ لینے والوں کی کثیر تعداد بیچ میں ہی تعلیم ترک کر دیتی ہے۔ پہلی جماعت کے ۱۰۰ داخلہ لینے والے طلبا میں سے صرف ۲۳ بچّے آٹھویں کلاس تک پہنچ پاتے ہیں (یعنی ۷۷ فیصد ڈراپ آؤٹ ہوتے ہیں)

ملک کی پرائمری ایجوکیشن کا یہ حال ہے تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مسلمانوں کا کیا حال ہوگا جن کا تعلیم کے تئیں رویہ ہی معاندانہ ہے۔ ہم اپنے قصبے کے جس مسلم اسکول میں پڑھتے تھے۔ اس بات کو ۳۵ سال بیت گئے لیکن اس اسکول کی حالت ۳۵ سال پہلے کچھ بہتر تھی آج اس سے بھی زیادہ خراب ہے پہلے کچھ نظم و نسق تھا بھی اب یہ اسکول منیجر کی ذاتی دکان بن کر رہ گیا ہے۔ ہمیں اس جانب سب سے زیادہ محنت و سرمایہ صرف کرنا ہوگا۔ یہ میدان بھی خالی ہے۔ عیسائی مشنریوں کی طرح اعلیٰ معیاری اسکول قائم کرکے نہ صرف اپنی پسماندگی کو دور کر سکتے ہیں بلکہ ملک کے لیے قابلِ تقلید مثال بھی بن سکتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ میں ابتدائی تعلیم کے تعلق سے مخصوص مسلمانوں کے لیے چند تجاویز آپ کے سامنے پیش کروں، ایک فرانسیسی ماہر تعلیم ڈاکٹر اوڈولف فیریر کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جو اس نے زیر بحث بچوں کی جبلت کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"بچے کو اپنی فطرت اور اپنے رجحانات کے مطابق زندگی بسر کرنے کا موقع بہم پہنچایا جائے۔ قدرتی رکاوٹوں اور پابندیوں کا اصول صحیح ہے، لیکن یہ پابندیاں اور رکاوٹیں بچّے کے سامنے خود بخود اس کے ماحول سے پیدا ہونی چاہئیں ایسا ماحول جس میں بچّے کے لیے عمل کا وسیع میدان ہے۔ اچھا متمدن شہری بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ بچہ اچھا جاہل رہ چکا ہو۔ ہماری الجھی ہوئی زندگی ہمارے لیے بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ پھر ہم بچے کو اس کی ذہنی ضروریات سے زیادہ اور اس کی سمجھ سے بالاتر زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنے کا گناہ کیوں کریں۔ اگر ہم نرسری اور کنڈرگارٹن کے بچّے کی زندگی کا مقابلہ غاروں میں رہنے والے قدیم انسان کی زندگی سے کریں تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی ایک بات عیاں ہے ہمارے بزرگ عملی زندگی بسر کرتے تھے۔ اگرچہ ان کا تجربہ نامکمل تھا۔ ان قدیم انسانوں کا عمل جسمانی، دستی اور عملی ہوتا تھا۔ ان میں سوچ بچار کا مادہ کم تھا وہ مادّہ جس سے بلند خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ بچّے کو سوچ بچار کرنے کا موقع دینا چاہئے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے سوچ بچار کی ابتدا بھی ٹھوس چیزوں سے ہو۔ خیالات اور چیزوں کی علیحدگی بچوں کے لیے سم قاتل ہے بچّے کو چیزوں سے علیحدہ کر دینا گناہ ہے بچّے ٹھوس اور عملی دنیا میں رہنا چاہتے ہیں۔ ان کے عمل کا انحصار اس پر ہے اور ان کا تجربہ بھی اسی سے تقویت حاصل کرتا ہے۔ خیالات کی بلند پروازی کا ان کے پاس ابھی کافی وقت ہے۔ جلد یا بدیر ہر ایک کے لیے ایسا وقت آئے گا۔ شرط یہ ہے کہ ایسا وقت خود بخود آئے۔"

اس اقتباس کی روشنی میں ابتدائی تعلیم کا خاکہ کیا ہونا چاہیے، اسے چند لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ تعلیم اور زندگی میں ابھی بھی خلیج حائل ہے۔ اس خلیج کو پاٹنا ہوگا۔ زندگی میں کام کاج ہے محنت ہے۔ لوگوں سے میل جول ہے۔ حقوق و فرائض کی تقسیم ہے۔ کھیتی باڑی، دستکاری اور صنعت و حرفت کے دھندے ہیں۔ غریبوں کی زندگی کے

کٹھن اور تلخ مسائل ہیں۔ کام کرنا اور کام کرکے سیکھنا ہے۔ بوجھ اٹھا کر قوت پیدا کرنا ہے۔ ایک حد تک آزادی ہے اور اس کے جلو میں غلطیاں ہیں اور غلطیاں کرکے سیدھا راستہ دریافت کرنے کا امکان ہے۔ لیکن ہمارے ملک کے ابتدائی اسکولوں میں کام کرنے کے بجائے محض پڑھنا لکھنا ہے، جدوجہد کے بجائے جمود ہے۔ میل جول اور حقوق و فرائض کے بجائے درسی کاموں کا بندھا ٹکا معمول ہے۔ یعنی ہم نے اپنے اسکولوں میں ٹھوس اشیاء کے بجائے لکھے لفظوں کے ذریعہ مجرد تصورات و خیالات پر زور دینا ضروری سمجھا جو بچے کی فطری جبلت کے منافی ہے۔ حکومت کی مجوزہ نئی تعلیمی پالیسی میں بچوں کی نفسیات کے اس پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

موجودہ خاکے میں اس بات پر بہت زور ہے کہ کتابی تعلیم کے مقابلہ میں عملی تعلیم زیادہ ہو اس لیے اس پالیسی کے مطابق ابتدائی سطح سے ہی تعلیم کو پیشہ ورانہ بنا دیا جائے گا۔

ہمیں اپنے بچوں کے لیے تعلیم کا انتظام کرتے وقت اس نظریاتی بنیاد اور حکومت کی اس پالیسی کا خیال رکھنا ہوگا۔ ہم اپنے میں سے کچھ ایسے ماہرین تعلیم و سماجیات تیار کریں جو اس میدان میں ملک اور حکومت کی بھی رہنمائی کریں۔ یہ ایک طویل مدتی لائحہ عمل ہوگا جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جب کہ ہم یہ کہتے ہیں مسلمانوں کے تمام مسائل کا حل صرف تعلیم اور تعلیم ہی یا یہ کہ ہم تعلیم کے بغیر اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ سکیں گے تو پھر ہمیں ماہرین تعلیم کی ایک ٹیم تیار کرنی ہوگی جو اس شعبہ میں تلاش و تحقیق کا کام جاری رکھیں اور ان کے نظریات و خیالات سے سماجی کارکن اور اساتذہ فائدہ اٹھاتے رہیں۔

میں اب چند ان دشواریوں کی جانب اشارہ کروں گا جو ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں ہمیں درپیش ہیں۔

۱۔ ذریعہ تعلیم کیا ہو۔

ماہرین تعلیم کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ بچے کی ابتدائی تعلیم اس کی مادری زبان میں ہونی چاہیے۔ چوں کہ صلاحیتوں کی نشوونما مادری زبان میں ہی ممکن ہے۔ ترقی یافتہ قوموں کی ترقی کا راز یہ بھی ہے کہ انھوں نے دنیا کے علوم کے حصول کا ذریعہ اپنی مادری زبان کو بنایا۔ سید سلیمان ندوی نے مادری زبان کے بارے میں کہا تھا۔

"انسان کے تمام اعمال اس کے خیالات کے ماتحت ہیں۔
خیالات کی روح الفاظ کے جسم میں جلوہ گر ہوتی ہے اور
الفاظ زبان کا دوسرا نام ہیں۔"

اس قول سے تعلیم میں مادری زبان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اردو اس ملک کے کروڑوں شہریوں کی مادری زبان ہے مگر اسے تک کوئی علاقائی پوزیشن حاصل نہیں ہے ملک کے مختلف حصوں میں ا اسکول قائم ہیں جہاں ذریعہ تعلیم اردو زبان ہے۔ جن میں زیاد پرائمری سطح کے ہیں۔ کہیں آٹھویں تک تعلیم اردو میں ہوتی ہے اور کہیں تک بھی ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ مگر اس سلسلے میں سروے ہمارے سامنے جس کی بنیاد پر صورت حال کا صحیح صحیح اندازہ لگایا جاسکے۔

یہ سچ ہے کہ زیادہ تر جگہوں پر مسلمان بچے اب ہندی یا دو علاقائی زبانوں کے ذریعہ ہی تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ اردو کو ذر بنائے رکھنے میں دشواریاں ہیں۔ نصاب مہیا نہیں۔ تدریس کا معق انتظام نہیں۔ آگے چل کر چھٹی کلاس، نویں کلاس یا گیارہویں کلاس بچہ کو اردو چھوڑ کر ہندی یا انگریزی یا دوسری زبان کو اپنانا پڑ ان درجوں تک زبان کی حاصل کردہ مہارت اسے اس کے روزگا حاصل کرنے میں بھی معاون نہیں ہوتی۔ پھر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ا ساتھی طالب علم جس کی تعلیم ہندی یا دوسری زبان میں ہوتی ہے۔ زیادہ باخبر اور زیادہ باشعور طالب علم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اردو میں بچے اتنا معیاری لٹریچر فراہم نہیں کرسکتے، جو دوسرے بچوں کو ان اپنی زبانوں میں حاصل ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حا میں کیا ہم اردو زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر جاری رکھیں اور ا اردو ذریعہ تعلیم کے اسکول کھولنے پر زور دیں یا اردو کو محض ایک مضمون کی حیثیت سے اپنانے پر قانع ہوجائیں۔ اگر اول الذکر صو اختیار کرتے ہیں تو اس سے اردو کا مقدمہ کمزور پڑتا ہے اور سار تحریک بے جان ہوتی ہے۔ اس کانفرنس میں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم اردو کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اپنائے رکھیں یا محض ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھانے پر قانع ہوجائیں۔

اردو میں نصاب کی تیاری پر ہمیں خاص توجہ دینی ہوگی۔ ا

لیے جد و جہد کو تیز تر کرنا ہوگا۔

کوٹھاری کمیشن کے سہ لسانی فارمولے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مانگ زور دینا چاہیے کیوں کہ بعض ریاستوں میں سہ لسانی فارمولے کو ناکام بنا دیا گیا ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی کے محضر میں جسے مرکزی شعبۂ تعلیم تیار کیا ہے یہ اقرار موجود ہے۔ پالیسی کے الفاظ یہ ہیں:

"زبانوں کی تدریس کے معاملے میں بھی مرکزی حکومت سہ لسانی فارمولے پر ایماندارانہ عمل درآمد کرنے میں بھی ناکام رہی۔ لہٰذا اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ ہندوستان میں زبان ترقیاتی سرگرمیوں میں رکاوٹ نہ بنے۔"

(باب ۴- پیرا ۴۴)

حکومت کی یقین دہانیوں اور اس کی تسلیم شدہ مراعات سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے اور ان کے منوانے پر زور دیتے رہنا چاہیئے۔

۲- رضاکارانہ تنظیمیں

مسلمانوں میں رضاکارانہ سماجی خدمت کے اداروں کی بہت کمی ہے۔ اگرچہ اسلام میں حق العباد پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے اور خدمت خلق کو عین عبادت قرار دیا ہے۔ مگر مسلمان سماجی خدمت یا سوشل ورک کے میدان میں سب سے زیادہ پیچھے ہے یہ ایک شعبہ ایسا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے کو قومی مفادات اور مسائل سے ہم آہنگ کرسکتا ہے۔ یہ رضاکارانہ تنظیمیں ہر محلہ اور ہر گاؤں میں ہوں۔ ضروری نہیں کہ وہ بڑے بڑے کام کریں۔ معمولی معمولی کام جیسے درخواست لکھ دینا ہے کوئی معلومات وغیرہ دے دینا بھی اہم ہے۔ تعلیم اور ابتدائی تعلیم کے زیادہ سے زیادہ ادارے قائم کرنا سب سے بڑی دینی خدمت ہے۔ اس سے نہ صرف خود انھیں فائدہ پہنچے گا بلکہ ہم وطنوں کی نظروں میں ان کا وقار بھی بڑھے گا۔

۳- آنگن واڑیاں

حکومت نے تعلیمی پالیسی کے نئے محضر میں آنگن واڑیوں کی افادیت کو تسلیم کیا ہے۔ اس کے مطابق Integrated Child Development Scheme کے تحت چلنے والی آنگن واڑیوں میں جو بچے قبل پرائمری تعلیم پا رہے ہیں، وہ بعد کی منازل میں تعلیم میں کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت چلنے والی آنگن واڑیوں کی مدد سے تین سال تک قبل ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس نظام کے تحت لڑکیاں اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ اسکول جا سکتی ہیں۔ جب وہ اپنی اپنی جماعتوں میں پڑھائی کے لیے جائیں گی تو آنگن واڑیوں میں اُن کے چھوٹے بھائی بہنوں کی دیکھ بھال ہو سکتی ہے۔ مسلم اداروں اور تنظیموں کو اس اسکیم سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

۴- موجودہ دینی مکاتب و مدارس

اسلامی دینی تعلیم کے مدرسے و مکتب پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ خاص طور پر شمالی ہندوستان میں گاؤں درگاؤں ان مکتبوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ بڑا کام ہوگا اگر ان اداروں کو جدید تعلیم کے پرائمری اسکولوں میں تبدیل کر دیا جائے۔ زیادہ تر مسلمان اس خیال کو پسند نہیں کریں گے لیکن اس کو اپنانے میں ان کا فائدہ ہی فائدہ ہے نقصان کچھ بھی نہیں۔ اس سلسلہ میں بتدریج منصوبہ بند طریقے پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اب ملک میں ایک ایسا روشن خیال علماء کا طبقہ پیدا ہوگیا ہے جو جدید تقاضوں کو بھی اچھی طرح سمجھتا ہے۔ ان کے تعاون و اشتراک سے اس کام کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ وہ پیش قدمی کریں گے تو مسلم عوام کے لیے اس تصور کو قبول کرنا آسان ہوگا۔

۵- موجود وسائل کا استعمال

ضروری نہیں کہ ہم ہر جگہ نئے اسکول کھولیں۔ نئے سرے سے وسائل مہیا کریں۔ بعض محلوں اور علاقوں میں پہلے سے سرکاری و نیم سرکاری سہولتیں مہیا ہیں۔ اور دوسرے طبقوں کے ساتھ مسلمان بچے بھی ان سہولتوں کے خوشہ چیں ہیں۔ اس طرح کے علاقوں میں انفرادی اور اجتماعی طور پر مسلمانوں کو آگے بڑھ کر ان سہولتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ ایسی سرکاری اسکیموں کی مدد کرنی چاہیے۔ اسکولوں میں اساتذہ و والدین کی انجمنوں کا ممبر بننا چاہیئے۔ وقتاً فوقتاً اسکولوں میں حاضری دینی چاہیے۔ محلہ کے سرفے میں اسکول ٹیچروں کی مدد کرنی چاہیئے۔ اسکول کے ماحول اور نظم و نسق کو صاف ستھرا رکھنے میں تعاون دینا چاہیئے۔ نادار اور ان پڑھ والدین کو ان سہولتوں سے باخبر کرنا چاہیے اور استفادہ کی ترغیب دینی چاہیے۔ ہر وقت حکومت کی نیت پر شبہ نہیں کرنا چاہیے۔ حکومت کی فلاحی اسکیمیں

محمد مختار اصلاحی*

نشہ آور دواؤں کی مہلک وبا

آج کل مختلف قسم کی نشہ آور دواؤں کی وبا بڑی تیزی سے پھیل کر نئی نسل کو تباہی و بربادی کے گڑھے میں ڈھکیل رہی ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا وطالبات جس بری طرح سے اِس وبا سے متاثر ہو رہے ہیں اس کو دیکھ کر ہر ذی ہوش اور صاحبِ بصیرت اداس اور فکر مند ہے۔ اس سے بڑا المیہ اور کیا ہوگا کہ میڈیکل کالجوں کے وہ طلبا اور اساتذہ جو عوام کی صحت و زندگی کے محافظ اور اُن نشہ آور دواؤں کے خطرناک نتائج سے اچھی طرح واقف ہیں وہ بھی بخوشی اس زہر کو پی رہے ہیں۔ اب تو شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو، جہاں یہ لعنت نہ پائی جاتی ہو۔

نشہ آور دوائیں عام طور سے حسبِ ذیل اغراض کے لیے استعمال کی جا رہی ہیں۔

۱۔ تفریحِ طبع ۔ ذہنی سکون اور غم غلط کرنے کے لیے۔ اس مقصد کے لیے ہر قسم کی شرابیں، بھنگ اور تمباکو وغیرہ کا استعمال عام ہے۔

۲۔ درد کو رفع کرنے کے لیے۔ اس غرض کے لیے افیون، مارفیا ہیروئن اور پیتھے ڈین وغیرہ کا آج کل زیادہ رواج ہے۔

۳۔ نیند لانے کے لیے۔ خواب آور دوا کے بطور فینو باربی ٹون، نیمبوٹال، لومی نل اور اسی طرح کی بہت سی دواؤں کی بازار میں فراوانی ہے۔

۴۔ امساک کے لیے، اس مقصد کی انجام دہی کے لیے کوکین، بھنگ چرس اور گرد وغیرہ خاص طور سے مستعمل ہیں۔

یہ سب دوائیں فوری اور وقتی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آئی تھیں ۔ ان کا یہ تقاضا تھا کہ وہ بڑی احتیاط اور ڈا[illegible] کے ساتھ استعمال کی جاتیں ۔لیکن افسوس ہے کہ یہ آج کل بغیر سوچے سمجھے آنکھ بند کرکے استعمال کی جا رہی ہیں۔ یہ بھی بہت دکھ کی بات ہے کہ آج کل ہمارے بیشتر معالجین بھی اپنی ذمہ داریوں کا صحیح احساس نہیں کرتے او[illegible] اپنے مریضوں کو بآسانی نشہ آور دواؤں کا عادی بنا دیتے ہیں۔ مجھے اپنے مطلب میں ایسے بے شمار مریضوں کے معائنے کا موقع ملا جنھیں صحیح طریقہ علا[illegible] اختیار کرکے نشہ آور دواؤں سے بچایا جا سکتا تھا۔ مگر نادان معالجین اُنھیں مہلک اور خطرناک دواؤں کی بھینٹ چڑھا دیا۔ ادھر چند برسوں میں ایسے ستم زدہ لوگوں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھتی گئی اور یہ صرف اپنے ہی لیے نہیں بلکہ اپنی اولاد کے لیے بھی تباہی کا باعث بنے۔ منافع خوردا[illegible] اور اسمگلروں نے طلب گاروں کی طلب پر نشیلی ادویہ کو آج دنیا کے ہر[illegible] اور گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا۔ اس تباہ کن اور خطرناک صورتِ حال کو دیکھ [illegible] اقوام متحدہ نے ویانا کے اجلاس میں انتہائی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے تمام ممالک کو اس وبا کی روک تھام کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اِس بین الاقوامی اجلاس میں مختلف ممالک کی طرف سے اس وبا میں مبتلا ہونے والوں کے جو اعداد و شمار پیش کیے گئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہر حساس و در[illegible] انسان پر ایک لرزہ سا طاری ہو جاتا ہے۔ امریکہ اور یورپ وغیرہ کے تمام ترقی یافتہ ملکوں میں پابندیوں کے باوجود منشیات اب فیشن کے طور پر استعمال کی جا رہی ہیں ۔ اور مرد و عورت دونوں کی ایک بڑی تعداد

* حکیم محمد مختار اصلاحی، چیرمین محمدیہ طبیہ کالج، مالیگاؤں

سی مہلک وبا میں مبتلا ہے۔ فرانس میں تو عورتیں مردوں سے بہت آگے ہیں۔ پاکستان جیسے چھوٹے سے ملک میں ایک سروے کے مطابق نشہ آور دواؤں کے استعمال کرنے والوں کی تعداد دس لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔ ہندوستان میں انڈین کونسل آف میڈیکل ریسرچ کے ایک سروے کے مطابق پچھلی ایک دہائی میں نشیلی ادویات کا غیر قانونی پیشہ اپنی بلندی پر پہنچ گیا ہے اور اس سلسلہ میں ہمارے تعلیمی اداروں کا حال بھی نہایت افسوسناک ہے۔ دہلی اور الٰہ آباد یونیورسٹیوں میں ۳۲ فیصد، بنارس یونیورسٹی میں ۳۵ فیصد اور بمبئی یونیورسٹی میں ۵۵ فیصد طلباء کسی نہ کسی نشہ کے عادی ہیں تقریباً ہر کالج اور یونیورسٹی میں لڑکوں سے لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ ابھی ۱۵ر نومبر ۱۹۸۵ء کو نئی دہلی میں نشہ آور دواؤں کے بارے میں جو سیمینار ہوا تھا اس میں بھی اس تشویش کا اظہار کیا گیا کہ ہر سال نشہ کے متوالوں کی تعداد میں جس تیزی سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اگر اسے روکا نہ گیا تو ہر طرح کی تباہی و بربادی یقینی ہے۔ ممتاز دانشوروں کے ایک جائزے کے مطابق دنیا کے بگڑتے ہوئے حالات میں مخرب اخلاق فلموں کے علاوہ "منشیات" کا بھی بڑا دخل و عمل ہے۔ صحت کے بگاڑ کے ساتھ ساتھ معاشرے میں جو خطرناک قسم کی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں، ان کو نظر انداز کرنا اپنی ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔

تازہ میڈیکل رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ نشہ آور دواؤں کے جو عادی ہوتے ہیں ان کے خون اور پیشاب میں زبردست کمی واقع ہو جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں مستقل درد سر، چکر، لازمی بدہضمی، اختلاجِ قلب نیند کی کمی، کمزوری اور نامردی جیسے عوارض لاحق ہو جاتے ہیں۔

ماہرین صحت کی جدید تحقیقات سے یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ نوجوان لڑکیوں میں نشہ آور ادویات کے استعمال سے ان کے جذبات قبل از وقت بھڑک اٹھتے ہیں اور اس طرح وہ بہت سی بری عادتوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ایسی لڑکیاں جب ماں بنتی ہیں تو اُن میں اسقاط حمل کثرت سے پایا جاتا ہے اور جو بچہ پیدا بھی ہوتا ہے اس کا وزن بہت کم اور عام طور سے اس میں کوئی نہ کوئی نقص پایا جاتا ہے۔ اُن میں شرح اموات بھی زیادہ ہے۔ ایسے بچے عموماً بڑے ہو کر خراب عادتوں اور مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اب تک اس وبا کی روک تھام کے لیے اقوامِ متحدہ یا مختلف ممالک کی طرف سے جو کوششیں کی گئیں ان کے بارے میں یقین کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ اس سیلابِ بلا کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ کسی مرض اور وبا کے صحیح اور حقیقی اسباب کا کھوج لگا کر جب تک پوری توجہ کے ساتھ اس کو ختم کرنے کی کوشش نہ کی جائے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

یہ مہلک وبا جس تیزی سے ساری دنیا میں پھیل رہی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ تمام ممالک سر جوڑ کر جنگی پیمانہ پر اس کے انسداد کی کوشش کریں۔ جب ہم جنگی پیمانہ پر اس وبا کے خاتمے کی کوشش کریں گے تو ہمیں اس کے خلاف کئی محاذ قائم کر کے ہر محاذ سے بیک وقت ضرب لگانی ہوگی۔

۱۔ اقوامِ متحدہ کی نگرانی میں ہر ملک میں ایسے سیمینار منعقد کیے جائیں جن میں نئی نسل کو واقف کر کے نشہ آور ادویہ کی خرابیاں اور برائیاں ظاہر کی جائیں۔ انہیں پیار اور محبت کے ساتھ یہ سمجھایا اور یقین دلایا جائے کہ وہ ان خطرناک دواؤں کے سہارے کبھی اپنی صحت کو بحال نہیں رکھ سکتے بلکہ انھیں اس کی وجہ سے نئی نئی تکلیفوں اور خطرناک حالات سے دوچار ہونا پڑے گا۔

۲۔ اسکولوں اور کالجوں میں پرنسپل اور اساتذہ ایسے طلباء پر کڑی نگرانی رکھیں اور اُن کے سرپرستوں پر پورا دباؤ ڈالیں کہ اگر اُن کے بچے نے یہ عادتِ بد نہ چھوڑی تو اسکول اور کالج سے اس کا نام خارج کر دیا جائے گا۔

۳۔ اخباروں اور رسالوں میں زیادہ سے زیادہ اس عادتِ قبیحہ کے نقصانات کو واضح کیا جائے۔

۴۔ ایسی فلمیں بنائی جائیں جن میں اس گھر اُجاڑ عادت کی تباہیاں اور بربادیاں ظاہر کی جائیں۔

۵۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن وغیرہ سے عوام کو اس بری عادت کے خلاف نفرت دلائی جائے

۶۔ ایسی نشہ آور دواؤں کی تیاری اور درآمد پر سخت پابندی لگائی جائے اور اس کے لیے ایماندار و فرض شناس نگراں

مقرر کیے جائیں۔

۷۔ جو لوگ چوری چھپے ان خطرناک دواؤں کا کاروبار کرتے ہیں، ان کو گرفتار کرکے عبرت ناک سزائیں دی جائیں۔ یہ تمام طریقے حفظ ما تقدم کے طور پر اختیار کیے جائیں۔

۸۔ لیکن جو لوگ نشہ آور دواؤں کے عادی ہو چکے ہیں ہسپتالوں میں ان کے لیے مخصوص وارڈ بنائے جائیں اور ان کے علاج کے لیے ایسے معالج منتخب کیے جائیں جو تجربہ کار ماہر نفسیات بھی ہوں۔ بقول غالبؔ "چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی"۔ اس کو چھڑانے کے لیے دواؤں کے علاوہ مختلف تدابیر بھی اختیار کرنی ہوں گی۔

پرانے تجربہ کار حکیموں کا یہ کہنا ہے کہ اس بری عادت سے قوتِ اعتمادی بالکل کمزور ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس کو بحال کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ مریض کو جد و جہد کے لیے اکسایا جائے۔ کھلی ہوا میں ورزش، چہل قدمی، پیراکی اور کھیل کود سے بھی اس عادت کو چھڑانے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ماحول کو بھی درست کرنا ضروری ہے۔ ایسے لوگوں کو بری صحبت سے دور رکھا جائے اور مفید کاموں میں مشغول کر دیا جائے بہتر ہے کہ ان میں رفاہ عام کے کاموں سے دلچسپی پیدا کی جائے اور ان کو ہمہ وقت پر امید و خوش رکھا جائے۔

ہر ملک کے وہ ذمہ دار جو آج اقتدار کی کرسی پر براجمان ہیں اگر انھوں نے اس وبا کی ہلاکت خیزی کا صحیح احساس نہیں کیا اور بر وقت روک تھام نہ کی تو اس دنیا کی تباہی و بربادی کے لیے کسی ایٹم و ہائڈروجن بم کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ تنہا یہی وبا اس دنیا کو ہلاک و برباد کرنے کے لیے کافی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؛
"چار چیزیں تمہیں میسر ہوں تو دنیا کی کسی چیز سے محرومی تمہارے لیے نقصان دہ نہیں ہے
۱۔ امانت کی حفاظت ۲۔ راست گفتاری
۳۔ خوش خلقی ۴۔ روزی میں پاکیزگی"۔

بقیہ "ابتدائی تعلیم۔ ایک جائزہ، ایک خاکہ"

واقعی عوام کی بھلائی کے لیے بھی ہوتی ہیں۔ اور حکومت نیک نیتی سے چاہتی ہے کہ ان کا فائدہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے۔ پھر یہ کہ حکومت کے پاس لا محدود وسائل ہیں۔ بڑے اور اہم منصوبے صرف حکومت ہی تیار کر سکتی ہے۔ مرکزی وزارت داخلہ کے تحت Minorities Cell قایم کیا گیا ہے، جس نے مختلف ریاستوں میں State Resource Cell قایم کیے ہیں۔ اس سل کے سربراہ جناب آر۔ کے۔ سیّد صاحب ہیں جو اقلیتوں کی پسماندگی دور کرنے کے لیے ابتدائی تعلیم کے میدان میں قابل قدر کام کر رہے ہیں۔ ہم حکومت کو اس ادارے سے بہت کچھ فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔ ابھی حال میں اس ادارہ نے ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی اور NCERT کے تعاون سے بہت ہی مفید سمینار اور ورک شاپس کا اہتمام کیا۔

۶۔ مسلم صنعتی و تجارتی اداروں کا رول

مسلم صنعت کاروں کو ترغیب دلانی چاہیے کہ وہ مسلم بچوں کی تعلیم میں سرمایہ کاری کریں۔ مسلم آبادی کے دیہاتوں، محلّوں اور علاقوں کو adopt کریں اور ان کی تعلیمی ترقی کے لیے ابتدائی اور قبل ابتدائی تعلیم کے ادارے قایم کریں۔

جس علم کی ہم کو ضرورت ہے وہ وہ علم ہے جو ہماری ساکن اور پژمردہ قوتوں کو متحرک اور شگفتہ و شاداب کرے۔ نہ کہ وہ علم جو ہمارے متحرک اور شگفتہ قویٰ کو بھی ساکن اور پژمردہ کر دے۔ ایسے علم سے بے علمی سو درجہ بہتر ہے۔"
[حالی]

محمد صابر صبر صدی*

نابغہ ذبیانی
اور اس کی شاعری

حسن درون یا حسن پنہاں کی شاعری تو بہت بعد میں شروع ہوئی ابتدا ئہً واقعہ نگاری ہی میں طبع آزمائی کی جاتی رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مشاہدۂ کائنات یا نوامیس فطرت سے گہری وابستگی پیدا کرلینے کے بعد ہی انسان اپنی ذات سے متعارف ہوتا ہے۔ تاہم شاعر یا آرٹسٹ اپنے وجدانی ملکہ سے جانتا ہے کہ فطرت کی غلامانہ نقل کا نام شاعری یا آرٹ نہیں ہے بلکہ اس میں اپنی انفرادیت ذات کا تجسس یا نمائش کا ہونا ضروری ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ حیات اور کائنات کے کینوس میں خود اس کی شخصیت کا رنگ کتنا شوخ، کتنا دلآویز اور کیسا معنیٰ ہے۔ یہ زیادہ اہم بات ہے اپنی ذات کا ایسا ادراک، اپنی شخصیت کا اتنا ہمہ گیر احساس ہزار ڈیڑھ ہزار برس پہلے کے شعرا کے کلام میں نہیں دیکھا جاسکتا۔ اس لیے ایک نقاد کے لیے ضروری ہے کہ جو شاعر موضوع بحث ہوا سے اس دور کے پس منظر میں رکھنا چاہیے۔ یعنی شاعر اپنے سماج سے کتنا قریب یا کتنا دور ہے اظہارِ خیال پر اسے مکمل قدرت ہے یا نہیں۔ زبان اور محاورات کے برمحل استعمال پر اسے کتنا قابو ہے۔ کیوں کہ جہاں تک آئینہ الفاظ یا ساغرِ الفاظ کا تعلق ہے، اشعار کا حسنِ شعریت اور سادہ کیفیت آئینہ گداز و جام گداز ثابت ہوئے ہیں۔ الفاظ اشعار سوز شعریت میں پگھلتے ہوئے نظر آنے چاہیں۔ اس طرح کے شعروں میں چھوٹی باتیں اپنی عظمت، معمولی حالتیں، اپنی فسوں کاری، آتی جاتی چیزیں اپنی ابدیت کا اعلان کرتی ہیں۔ یہی ہے اشعار کی ماہیت، اصلیت اور نوعیت اور اسی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ نرم ترین شعلے کا زخم زخم شمشیر سے زیادہ کاری ہوتا ہے۔ نرم شعلہ کہتے کس کو ہیں؟ ایسی بات، ایسا انداز، الفاظ کا ایسا لوکیلا پن جو دل کو چھوتا ہی نہیں بلکہ تریم کش کی سی کیفیت سے دوچار کر دیتا ہے۔ جس کا راز نابغہ جیسے شعراء ہی جانتے ہوں گے۔

نام زیادہ بن معاویہ تھا اور کنیت ابوامامہ۔ نابغہ اس کے اس مصرعہ کی بنا پر کہا جانے لگا۔

قد نبغت لنا منهم شؤون

اہل حجاز نابغہ کو تمام شعراء پر فوقیت دیتے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ

"کان النابغة احسنهم ديباجة شعر واحسنهم رونق كلام واجزلهم بيتا"۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کے اشعار تکلف اور تصنع سے عاری ہیں۔ اس کی شاعرانہ عظمت کو ظاہر کرنے کے لیے یہ واقعہ بطور ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے۔ شعبی کا بیان ہے کہ ایک بار میں خلیفہ عبدالملک کے دربار میں حاضر تھا۔ وہاں ایک ایسا شخص پہلے سے موجود تھا جس سے میں ناواقف تھا۔ عبدالملک نے اس سے پوچھا:

"سب سے بڑا شاعر کون ہے"

اس نے جواب دیا:

"میں ہوں"

اب مجھے اس کی بابت خلیفہ سے دریافت کرنا ضروری معلوم ہوا۔ میرے پوچھنے پر خلیفہ کو حیرت ہوئی اور کہا:

"یہ اخطل ہے"۔

میں نے کہا اس سے بڑا شاعر وہ ہے جس کا یہ شعر ہے

هذا غلام حسن وجهه   مستقبل الخير سريع التمام

---

* محمد صابر صبر صدی، مدیر معاون فکر و نظر علی گڑھ

اخطل نے اعتراف کیا کہ

" نابغہ یقیناً مجھ سے بڑا شاعر تھا"

پھر مجھ سے عبدالملک نے نابغہ کے بارے میں پوچھا۔ میں نے جواب میں کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نابغہ کو تمام شعراء سے افضل سمجھتے تھے ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ قبیلہ غطفان کا ایک وفد آپ کی خدمت میں آیا ہوا تھا آپ نے اُن سے پوچھا یہ کس کا شعر ہے

أتيتك عاريا خلقا ثيابي   على خوف تظن بي الظنون

فألفيت الامانة لم تخنها   كذالك كان نوح لا يخون

لوگوں نے جواب دیا کہ یہ نابغہ کے اشعار ہیں۔

حضرت عمرؓ نے پھر دریافت فرمایا کہ اس شعر کا کہنے والا کون ہے؟

حلفت فلم اترك لنفسك ريبة   وليس وراء الله للمرء مذهب

لوگوں نے کہا نابغہ۔

آپ نے اس شعر کے بارے میں بھی پوچھا:

فانك كالليل الذي هو مدركي

وان خلت ان المنتهاى عنك واسع

وفد نے نابغہ کا نام لیا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا:

" یہی تم میں سب سے بڑا شاعر ہے"

نابغہ نعمان بن منذر اور اس کے باپ دادا کے دربار سے منسلک رہا۔ اور اُن کے انعام و اکرام سے بہرہ ور ہوتا رہا۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے ایک بار نعمان بن منذر کے دربار میں حاضر ہونے کے لیے رختِ سفر باندھا۔ مجھ سے ایک شخص نے پوچھا کہ کدھر کا ارادہ ہے؟ میں نے بادشاہ کا نام بتایا۔ اس نے کہا کہ وہاں پہنچنے کے بعد دو مہینے تک تمہیں باریابی کی اجازت نہیں ملے گی۔ اس کے بعد ایک بار دربار میں پیش کیے جاؤ گے۔ اگر تم نے بادشاہ کو اپنے حسنِ بیان سے متاثر کر دیا تو اس کی نوازشوں کے دروازے تم پر کھل جائیں گے۔

حسان بن ثابت کا کہنا ہے کہ میرے ساتھ ویسا ہی سلوک ہوا جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا۔ باریاب ہونے کے بعد میں نے زرِ کثیر حاصل کیا اور اس کی خاص مجلسوں میں شرکت کرنے لگا۔ اسی اثنا میں نابغہ دربار میں آیا۔ بادشاہ نے اسے خوش آمدید کہا۔ نابغہ نے دیکھا کہ دارالخلافہ میں سیاہ رنگ کے اونٹ آئے ہوئے ہیں۔ اس وقت پورے عرب میں کسی کے پاس ایک سیاہ اونٹ نہ تھا۔ نعمان نے شعر کہنے کی فرمائش کی۔ نابغہ نے حکم کی تعمیل کی۔ اس میں یہ شعر بھی تھا ؎

فانك شمس والملوك كواكب

اذا طلعت لم يبد منهن كوكب

بادشاہ نے اسے سو سیاہ اونٹ ہدیہ کیے۔ اس بے پایاں انعام اور اس کے اشعار کی عظمت دیکھ کر میرے دل میں ایسا حسد پیدا ہوا جو کبھی نہیں ہوا تھا۔

نعمان ایک بار نابغہ سے سخت ناراض ہوا۔ یہاں تک کہ اسے قتل کر دینے کا حکم صادر کر دیا۔ اس کے عتاب سے بچنے کے لیے نابغہ ملوک غسان کے یہاں چلا گیا اور ان کی مدح میں قصیدے کہے۔ جب نعمان کو اس کی خبر ملی تو قاصد بھیج کر کہلایا کہ

" تم نے ایسے شخص کی پناہ لی ہے جس نے میرے دادا کا قتل کیا تھا۔ مجھے تمہارے بارے میں غلط اطلاع ملی تھی کہ تم نے میری ہجو کی ہے"۔

ساتھ ہی نعمان نے اس سے واپس آنے کی درخواست کی۔ نابغہ نے وہ نعمان کے دربار میں حاضر ہونے سے پہلے یہ قصیدہ کسی دوسرے شخص کے ذریعہ روانہ کیا ۔

نبئت ان ابا قابوس اوعدني

ولا قرار على زأر من الاسد

مهلا فداء لك الاقوام كلهم

وما اثمر من مال ومن ولد

بادشاہ نے سنتے ہی کہا کہ یہ تو نابغہ کے اشعار ہیں۔ پھر اس کی ہو کی اطلاع دی گئی۔ نعمان نے اسے امان دے دی۔

اس کے چند اشعار ترجمہ کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ سے اس کی عظمت اور شعری محاسن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

علی لعمرو نعمة بعد نعمة
لوالده لیست بذات عقارب

عمرو کے والد کے بعد میرے اوپر عمرو کے ایسے احسانات ہیں جن میں تکلیفوں کی آمیزش نہیں ہے۔

۔ وثقت له بالنصر اذ قیل قد غزت
کتائب من غسان غیر اشائب

جب مجھ سے کہا گیا کہ غسان کی فوج نے حملہ کر دیا ہے تو مجھے اس کی فتح پر کامل یقین آگیا۔

۳۔ اذا ما غزوا بالجیش حلق فوقهم
عصائب طیر تهتدی بعصائب

جب وہ لشکر لے کر حملہ کرتے ہیں تو اُن کے اوپر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ یکے بعد دیگرے منڈلاتے رہتے ہیں۔

۴ فهم یتساقون المنیة بینهم
بایدیهم بیض رقاق المضارب

وہ آپس میں ایک دوسرے کو موت کا جام پلاتے ہیں ان کے ہاتھوں میں تیز چمکدار تلواریں ہوتی ہیں۔

۵۔ ولا عیب فیهم غیر ان سیوفهم
بهن فلول من قراع الکتائب

ان کے لشکر میں کوئی عیب ہے تو یہ ہے کہ ان کی تلواریں لشکروں سے نبرد آزما ہونے کی وجہ سے کند ہو گئی ہیں۔

۶۔ لهم شیمة لم یعطها الله غیرهم
من الجود والاحلام غیر عوازب

اور اللہ تعالیٰ نے انھیں سخاوت، عاقبت اندیشی اور زود فہمی کی کچھ ایسی عادتیں بخشی ہیں جو ان کے سوا دوسروں کو عنایت نہیں کیں۔

۷ والمرء یأمل ان یعیش
وطول عیش ما یضره

آدمی زندگی کی آرزو کرتا ہے حالاں کہ لمبی عمر اس کو نقصان ہی پہنچاتی ہے۔

۸ وتفنی بشاشته ویبقی
بعد حلو العیش مره

اس کی تر و تازگی ختم ہو جاتی ہے اور پرکیف زندگی ختم ہو کر تکلیف دہ زندگی باقی رہ جاتی ہے۔

۹۔ وتخونه الایام حتی
لا یری شیئاً یسره

زمانہ اس کے ساتھ بے وفائی کرنے لگتا ہے حتیٰ کہ اسے کوئی بھی مسرت انگیز چیز نظر نہیں آتی۔

۱۰ کم شامت بی ان هلکت
وقائل لله دره

میرے مرنے پر کتنے ہی سینوں میں ٹھنڈک پڑ جائے گی اور کتنے کہیں گے۔ کتنا اچھا آدمی تھا خدا اس کا بھلا کرے۔

اصمعی کا بیان ہے کہ
عکاظ کے میلے میں نابغہ کے لیے ایک سرخ رنگ کے چمڑے کا خیمہ نصب کیا جاتا تھا۔ شعراء اس کے پاس آکر اپنے اشعار پیش کرتے تھے۔

ان واقعات سے نابغہ کی مقبولیت اور اس دور کے شعراء میں اس کی افضلیت کا پتہ چلتا ہے۔ بعد کے شعراء نے بھی اس کا تتبع کیا ہے۔ خصوصاً اخطل کی شاعری کا انداز اور لب و لہجہ نابغہ سے مماثلت رکھتا ہے۔

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

آیٹم ریٹ کی بنیاد پر درج ذیل کام کے لیے سربمہر ٹینڈرز مطلوب ہیں۔ جو کہ ۶؍ اگست ۱۹۸۶ء ایک بجے دوپہر تک موصول ہو جانے چاہیں۔ ٹینڈرز اسی روز شام چار بجے کھول دیے جائیں گے۔ ٹینڈر فارم وغیرہ یونیورسٹی انجینئر کے دفتر سے چھٹی کے علاوہ کسی دن بھی آفس ٹائم میں کسی وقت بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

ٹینڈر فارم کی فروخت ٹینڈرز کی وصولیابی کی مقررہ تاریخ سے ۲۴ گھنٹے قبل روک دی جائے گی۔

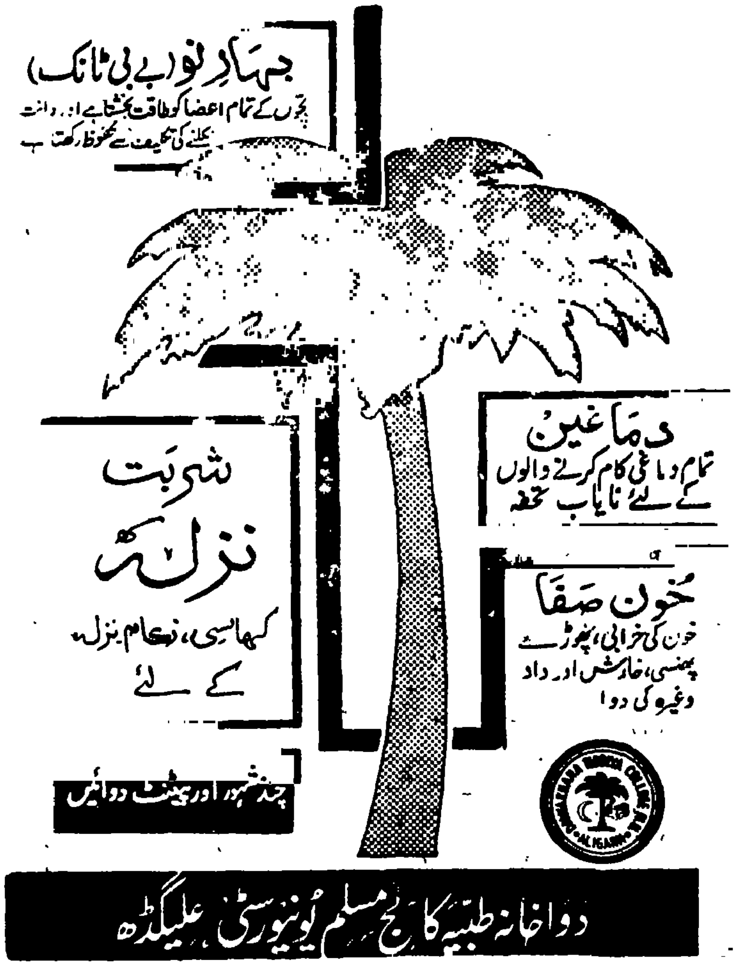
نمبر شمار	کام کا نام	مقررہ رقم	زرِ ضمانت	فارم کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱۔	A/R اے/آر، ٹو علامہ اقبال ہال	۳۹۲۷۵/= روپے	۹۰۵/- روپے	۵ روپے	دوماہ

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

یونیورسٹی انجینئر

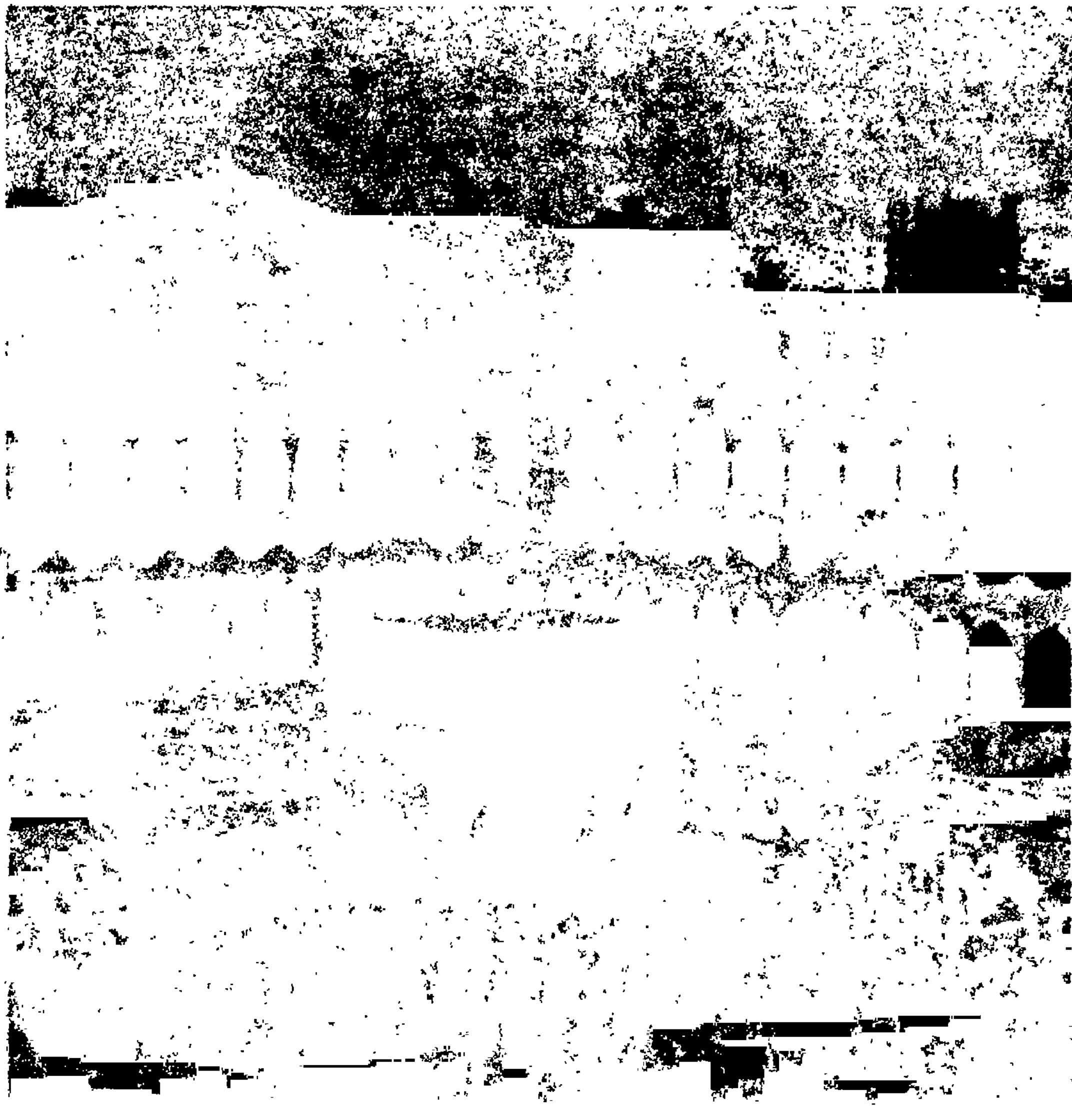
[469/188]

مالک: تہذیب الاخلاق ٹرسٹ - پرنٹر پبلشر: نور الحسن نقوی - مقام اشاعت: شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ - مطبوعہ: العربیک آفسٹ پرنٹنگ پریس دہلی



جہادِ نو (بے بی ٹانک)
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے اور دانت نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں کے لئے نایاب تحفہ
شربت نزلہ
کھانسی، زکام، نزلہ کے لئے
خون صفا
خون کی خرابی، پھوڑے پھنسی، خارش اور داد وغیرہ کی دوا
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

تهذیب الاخلاق



مجلس ادارت

(تہذیب الاخلاق و نشانات)

بانی
سرسید احمد خاںؒ

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER
تہذیب الاخلاق

سرپرست
سید ہاشم علی
وائس چانسلر، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

جلد ۵ — یکم اگست تا ۳۱ اگست ۱۹۸۶ء — مشترکہ شمارہ ۱۵-۱۶

ایڈیٹر
اسرار احمد

جوائنٹ ایڈیٹر
کبیر احمد جائسی

اسسٹنٹ ایڈیٹر
شباب الدین



قیمت — تین روپے
زرِ سالانہ — تیس روپے
تاحیات — تین سو روپے

ترسیل زر کا پتہ
پروفیسر منظر عباس نقوی
ٹریژرار تہذیب الاخلاق ٹرسٹ
شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

مندرجات

اداریہ		۳
مقاصد اجرائے تہذیب الاخلاق	سرسید احمد خاں	۵
قربانی کی اہمیت	مولانا عبد الرؤف	۱۰
ہماری تعلیمی صورت حال	پروفیسر آل احمد سرور	۱۵
خالد بن ولید	پروفیسر قاضی عبد الستار	۲۳
سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ	مصطفیٰ علی فاطمی	۲۸
احساس کمتری اور ہم	سلیم یزدانی	۳۳
بقراط	سید قاسم محمود	۳۶
ابوالقاسم قشیری	اسرار احمد خاں	۴۰
کیمیا سے کیمسٹری تک	نذیر احمد خاں	۴۶
نہیں دیتا ہے زیب	محترمہ ام ہانی	۵۱
مسلم سائنس داں اور فن سرجری	ڈاکٹر بصیر لودھی	۵۵

اداریہ

ہمارا دور اختصاص اور مقابلے کا دور ہے۔ موجودہ عہد میں کامیاب و کامراں اور نمایاں زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم کسی نہ کسی علم، فن یا ہنر میں اختصاص پیدا کریں اور زندگی کے ہر لمحے میں مقابلے کے میدان میں سرگرمِ عمل رہیں۔ جو لوگ اس زندہ حقیقت سے واقف ہیں وہ زندگی کے جس میدان میں بھی قدم رکھتے ہیں صرف کامیاب و کامراں ہی نہیں ہوتے بلکہ ایک ممتاز اور نمایاں جگہ بھی حاصل کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو اس حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہیں نہ صرف یہ کہ اُن کی زندگی عذاب جان بن جاتی ہے بلکہ وہ اپنے اہلِ خانہ اور اپنے سماج کے لیے بھی ایک مسئلہ بن جاتے ہیں۔ یہ مسئلہ اگر اس فردِ واحد کی زندگی کے ساتھ ساتھ ختم ہو جائے تو اس کو کڑوے گھونٹ کی طرح گوارا کیا جا سکتا ہے، مگر دقت یہ ہے کہ ایک مسئلہ، بہت سے مسائل کو پیدا کرتا ہے اور وہ مسائل جب نئے مسائل کو جنم دینے لگتے ہیں تو مسائل کا ایک لامتناہی سلسلہ پورے سماج کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

درج بالا باتوں کی روشنی میں جب ہم مسلمانوں کے سماج کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ من الحیث القوم مسلمانوں نے اس راز کو ابھی تک نہیں سمجھا ہے کہ اس دور میں باعزت اور کامیاب زندگی گزارنے کے لیے اختصاص اور مقابلے کی کیا اہمیت ہے؟ ہمارے ملک میں ہر سال مقابلے کے بہت سے امتحانات ہوتے ہیں۔ ان امتحانات میں مسلمان طلبہ اپنی آبادی کی فی صد کے حساب سے بھی شرکت نہیں کرتے اور جو طلبہ شرکت کرتے بھی ہیں وہ اپنے والدین کی بات رکھنے اور سماج کو یہ دکھلانے کے لیے کہ وہ بھی ان امتحانات میں شریک تھے نیم دلی کے ساتھ شریکِ امتحان ہو جاتے ہیں۔ اس نیم دلی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج مقابلے کے امتحانوں میں کامیاب مسلمان طلبہ کی تعداد انگشت شمار ہوتی جا رہی ہے اور اگر مسلمانوں نے من حیث القوم اپنے اندر مقابلے کا جذبہ نہ پیدا کیا تو یہ تعداد گھٹتے گھٹتے ایک دن معدوم ہو جائے گی۔

جو مسلمان طلبہ پوری محنت، تیاری اور جوش مندی و ولولے کے ساتھ مقابلے کے امتحانات میں شرکت کرتے ہیں، کامیابی اُن کے قدم چومتی ہے، وہ کامیاب و کامراں ہوتے ہیں اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد باعزت زندگی گزارتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نامساعد حالات کا رونا بند کیا جائے، اپنی محنت اور صلاحیت پر اعتبار کرتے ہوئے مقابلے کا امتحان دیا جائے، ایک بار کی ناکامی سے بددل ہو کر میدان نہ چھوڑا جائے اور نئے عزم و ارادے کے ساتھ دوبارہ مقابلے کا امتحان دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان طلبہ کامیاب نہ ہوں۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کو اجتماعی طور پر نئی نسل کی رہبری کرنی چاہیے۔ ان کے اندر مقابلے کا عزم و ارادہ پیدا کرنا چاہیے اور مصافِ زندگی میں بے خطر کود پڑنے کا درس دیتے رہنا چاہیے۔ اگر اس طرح کی کوئی اجتماعی کوشش نہ کی گئی تو حالات اس قدر خراب ہو سکتے ہیں کہ اُن کا چارہ کسی بھی چارہ گر کے پاس نہ مل سکے گا۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر مسلمان طالب علم ڈاکٹر یا انجینیر ہی بنے۔ اگر سب ہی لوگ ان پیشوں سے منسلک ہوجائیں گے تو پھر دوسرے پیشوں کو اختیار کرنے والے کہاں سے آئیں گے؟ اس حقیقت کو ہمیشہ مدّ نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ کوئی علم کسی دوسرے علم سے کوئی فن کسی دوسرے فن سے اور کوئی ہنر کسی دوسرے ہنر سے فروتر نہیں ہوتا۔ انسانی سماج کو ہر علم، ہر فن اور ہر ہنر کی ضرورت ہے۔ اپنے سماج میں ممتاز و نمایاں جگہ پیدا کرنے کے لیے کسی علم، فن یا ہنر میں اختصاص پیدا کرنا ہوگا، اگر اختصاص سے کوئی فرد یا کوئی قوم دامن کش رہے گی تو اس کی مثال سیلاب کے خس و خاشاک کی سی ہوگی جس کو پانی کا تیز دھارا اپنے بہاؤ کی سمت بہالے جاتا ہے۔ اختصاص ایک ایسی سنگین چٹان کی مانند ہے جس کو بھیانک سے بھیانک سیلاب یا طوفان متاثر نہیں کر پاتا۔ مسلمان طلبہ فارسی، عربی، اردو، ہندی، انگریزی، معاشیات، سیاسیات، جغرافیہ، تاریخ خواہ کسی بھی مضمون میں اعلیٰ ڈگری حاصل کریں۔ اگر وہ اپنے موضوع پر اختصاص کی دولت سے بہرہ ور ہوں گے تو اپنے سماج میں ان کی اہمیت کسی بھی ڈاکٹر یا انجینیر سے کم نہ ہوگی، اور اگر خدانخواستہ وہ اختصاص سے چشم پوشی کرتے ہیں تو وقت کا سیل رواں ان کو اس طرح بہالے جائے گا کہ ڈھونڈے سے بھی ان کا نام و نشان نہ ملے گا۔ اس لیے سماج کے ہر فرد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ نئی نسل میں اختصاص حاصل کرنے اور مقابلے کے میدان میں کود پڑنے کا جذبہ پیدا کرے، خود بھی مصاف زندگانی میں مقابلے کے لیے تیار رہے اور نئی نسل کو بھی اس کی تیاری کی ترغیب دیتا رہے۔ اگر ہم نے اپنی اس ذمہ داری کو بخوبی سمجھ لیا اور نئی نسل کو اس قابل بنا دیا تو انشاء اللہ چند ہی برسوں میں صورت حال تبدیل ہونے لگے گی اور قوم کے دلوں پر مایوسی و ناکامی و خود فریبی کی جو گھنگھور گھٹا چھائی ہے وہ چھٹ جائے گی اور روشن مستقبل نزدیک آتا دکھائی دینے لگے گا۔

تہذیب الاخلاق کا جولائی کا شمارہ آپ کو کچھ تاخیر سے ملے گا۔ رسالہ دہلی کے اس علاقے میں چھپتا ہے جو جولائی کے مہینے میں کرفیو کے زیر اثر تھا۔ اسی وجہ سے اس کی اشاعت میں تاخیر ہوئی۔ جولائی کے شمارہ کے ساتھ ہی ساتھ اگست کا شمارہ بھی شائع ہوگیا ہے جو جولائی کے شمارہ کے ساتھ ساتھ آپ تک پہنچے گا۔ امید ہے کہ ستمبر کا شمارہ اپنے وقت پر شائع ہوکر آپ کی خدمت میں ارسال کیا جاسکے گا۔

ہم اپنے قارئین کی خدمت میں یوم آزادی اور عید قرباں دونوں کی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ خوشی کے یہ دونوں دن ہم سے اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اجتماعی مفاد پر اپنے اپنے شخصی مفادات کو قربان کردیں اور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی سعی و جدوجہد کریں جو واقعی اور حقیقی انسانی معاشرہ کہلانے کا مستحق ہو۔ ایسا معاشرہ جس میں نہ تعصب ہو نہ نفرت، نہ جہل ہو نہ بھوک، نہ قتل و غارت گری ہو نہ لوٹ مار، نہ سرکشی ہو نہ فتنہ و فساد۔ ایسے معاشرے کی تشکیل کے لیے بلا اختلاف مذہب و ملت، رنگ و نسل ہر فرد کو کوشش کرنی ہے، کوشش ہی نہیں بلکہ اپنے خونِ جگر سے چراغ رہگذر روشن کرتے رہنا چاہیے، تاکہ ہمارا ملک ترقی کی راہوں پر گامزن ہو، اس کو استحکام نصیب ہو، اس کا ہر فرد خوش حال اور مطمئن ہوکر اپنے اپنے کام میں مصروف رہے اور چراغ سے چراغ جلتا رہے۔

عید قرباں سے جس ذبح عظیم کی ہم کو یاد دلاتی ہے اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے اور اس کو صرف ایک رسمی اور رواجی چیز نہ بنایا جائے تاکہ جب ہم اپنے خدا کے دربار میں حاضر ہوں تو سرخرو اور کامیاب حاضر ہوں نہ اس کے خالی ہو کر اس کے سامنے نہ کھڑے ہوں۔

آئیے ہم سب مل کر زبان ہی سے نہیں بلکہ دل سے بھی اس بات کا اقرار کریں کہ

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد

کبیر احمد جائسی

سر سید احمد خانؒ

مقاصد اجرائے تہذیب الاخلاق

انسان ایک ایسی ہستی ہے کہ آئندہ کی خبر اس کو نہیں ہو سکتی؛ مگر گذشتہ زمانہ کے تجربہ سے آئندہ زمانہ کی امید کو خیال کر سکتا ہے۔ پس ہم کو اس پرچہ کی بابت آئندہ زمانہ کی پیشین گوئی کرنے کے لئے پچھلے حالات اور واقعات پر نظر کرنی چاہیئے۔

جب ہم کچھ اوپر پچھلے ڈیڑھ سو برس کی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہم پاتے ہیں کہ لندن میں بھی وہ زمانہ ایسا ہی تھا جیسا کہ اب ہندوستان میں ہے؛ اور وہاں بھی اس زمانہ میں اسی قسم کے پرچے جاری ہوئے تھے جن کے سبب تمام چیزوں میں تہذیب و شائستگی پیدا ہوئی تھی۔ پس اول ہم اُن پرچوں کا کچھ حال بیان کرتے ہیں اور پھر اس پرچہ "تہذیب الاخلاق" کو ان سے مقابلہ کریں گے؛ اور پھر آئندہ کی حالت ہندوستان کا اس پر قیاس کر کے اپنی قومی ترقی کی نسبت پیشین گوئی کریں گے۔

جبکہ یورپ میں باہم ملکی لڑائیوں کا زمانہ تھا، تو بہت سے بڑے بڑے شہروں میں اخبار کا چھپنا اور پھیلنا شروع ہو گیا تھا، اور خاص لندن میں بھی اخبار چھپنے لگا تھا مگر اپنی قوم کی روزمرہ زندگی اور ان کے مزاج اور عادات اور خصلت پر نکتہ چینی کرنے، اور اس میں سے برائیاں کے نکالنے، اور عمدہ اور نیک خصلتوں کو ترقی دینے کا کسی کو کسی ملک میں خیال نہ تھا۔ ہاں البتہ فرنچ لوگوں نے اس پر کچھ خیال کیا تھا؛ اور سولھویں صدی عیسوی میں مانٹین نے جو ایک فرنچ عالم تھے، خصلت و عادت پر کچھ مضمون چھپوائے تھے۔ اس کے بعد لابروے نے، جو ایک فرنچ عالم تھے، ایک کتاب چھاپی تھی، جس میں چودھویں لوئی بادشاہ فرانس کے دربار کی بناوٹوں کو نہایت سلیقہ کی طعنہ زنی سے بیان کیا تھا۔ لیکن کسی شخص کو یہ خیال نہ آیا تھا کہ کوئی ایسا پرچہ یا رسالہ نکلے، جو جلد جلد ایک مناسب میعاد پر چھپا کرے، اور قومی برائیوں کو جتایا کرے، اور لوگوں کو قومی بھلائی کی ترقی پر رغبت دلاتا رہے۔ مگر خدا نے یہ کام لندن کے پیغمبر اور سویلزیشن کے دیوتاؤں "سر رچرڈ اسٹیل اور مسٹر ایڈیسن" کی قسمت میں لکھا تھا۔

سر رچرڈ اسٹیل نے ۱۷۰۹ء میں ایک پرچہ نکالا، جس کا نام "ٹیٹلر" اس کے اصلی اڈیٹر تو اسٹیل تھے مگر ایڈیسن بھی کبھی کبھی مدد دیتے تھے یہ پرچہ ہفتہ میں تین دفعہ چھپتا تھا۔ پہلا پرچہ اس کا بارھویں اپریل ۱۷۰۹ء کو نکلا تھا۔

سر رچرڈ اسٹیل نے خود کہا ہے کہ ان کی غرض اس پرچہ کے نکالنے سے یہ تھی کہ انسان کی زندگی، جو جھوٹی بناوٹوں سے عیب دار ہوتی ہے اس کو بے عیب کریں، اور مکاری اور جھوٹی تینی کو مٹا دیں، اور بناوٹی پوشاک اتاریں اور اپنی قوم کی پوشاک اور گفتگو اور برتاؤ میں عام سادہ پن پیدا کریں۔ اس پرچے کے صرف دو سو اکہتر [۲۷۱] نمبر چھپے۔ چنانچہ اخیر پرچہ اس کا جنوری ۱۷۱۱ء کو چھپا اور پھر بند ہو گیا۔

اس کے بعد سر رچرڈ اسٹیل اور مسٹر ایڈیسن نے مل کر ایک اور پرچہ نکالا؛ اور اس کا نام "اسپیکٹیٹر" رکھا تھا۔ یہ پرچہ ہر روز چھپتا تھا، اور وہی دونوں اخیر تک اس میں مضمون لکھا کرتے تھے۔ پہلا پرچہ اس کا یکم مارچ ۱۷۱۱ء کو چھپا تھا اور صرف تیں سو پچپن [۵۵۵] نمبر اس کے چھپے تھے۔

یہ پرچہ اپنے زمانہ میں بے نظیر تھا؛ اور صرف ٹیٹلر ہی کو اس نے نہیں بھلا دیا تھا، بلکہ اس زمانہ میں جس قدر کتابیں اس قسم کی تصنیف ہو چکی تھیں، ان سب پر فضیلت رکھتا تھا؛ عمدہ عمدہ اخلاق و آداب اس میں

سمجھے جاتے تھے، خویش اقارب کے ساتھ سلوک کرنے کے عمدہ قاعدے اس میں بیان ہوتے تھے۔ اس بات کا کہ انسان اپنی اس قوت کو، جس کا نام شوق ہے، کس طرح دیکھ بھال اور سوچ بچار کر کس بات میں صرف کرے نہایت عمدگی سے ذکر ہوتا تھا؛ اور ہر ایک مضمون نہایت خوبی اور بُردباری اور عجیب وظریب مذاق سے بھرا ہوتا تھا۔ یہ پرچہ اس لیے بھی بے انتہا تعریف کا مستحق ہے کہ اس نے طرزِ تحریر لوگوں کو سکھا دی؛ اور لوگوں کی گفتگو کو جو بُرے کلمات اور بدمحاورات اور ناپاک قسموں سے خراب ہو رہی تھی درست کر دیا۔ ہر روز صبح کو یہ پرچہ نکلا کرتا تھا، اور حاضری کھانے کے وقت تک لوگوں کے پاس آجاتا تھا۔ اور حاضری ہی کی میز پر لوگ اس کو پڑھا کرتے تھے۔ ۱۷۱۱ء میں اس کا چھپنا موقوف ہو گیا۔

اس کے بعد سر رچرڈ اسٹیل نے مسٹر اڈیسن کی مدد سے ایک اور پرچہ نکالا، جس کا نام "گارڈین" تھا۔ یہ پرچہ بھی ہر روز چھپتا تھا؛ اور صرف ایک سو پچھتر نمبر اس کے نکلے تھے کہ بند ہو گیا۔

اس کے بعد اٹھارہویں صدی میں بہت سے پرچے اسی مقصد سے نکلے۔ مگر ان میں سے "رامبلر" اور "اڈونچرز" اور "ائیڈلر" اور "ورلڈ" اور "مرر" اور "لونجر" نے کچھ شہرت پائی؛ اور ان کے سوا اور کسی کو کچھ فروغ نہ ہوا۔

ان پرچوں کے جاری ہونے سے انگریزوں کے اخلاق اور عادات اور دین داری کو نہایت فائدہ پہونچا؛ اور ہر ایک کے دل پر ان کا اثر ہوا۔ جس زمانہ میں کہ پہلے پہل "ٹیٹلر" نکلا ہے، انگلستان کے لوگوں کی جہالت اور بداخلاقی اور ناشائستگی نفرت کے قابل تھی۔ وضعدار لوگ، کیا مرد کیا عورت تحصیلِ علم سے نفرت رکھتے تھے؛ اور علم پڑھنے کو خود فروشی و بادفروشی کہتے تھے، اور کمینوں کا کام سمجھتے تھے۔ علم جو اب عام لوگوں میں وہاں پھیلا ہوا ہے، شاذونادر کہیں کہیں پایا جاتا تھا۔ علم کا ڈھونڈنا تو درکنار، جہالت کی شرم بھی کسی کو نہ تھی۔ عورت کا پڑھا لکھا ہونا، اس کی ہنسائی کا باعث ہوتا تھا۔ اشرافوں کے جلسوں میں امورِ سلطنت کی باتیں ہوتی تھیں، مگر عورتیں آپس میں ایک دوسری کی بدگوئی کیا کرتی تھیں۔ قسموں پر قسمیں کھانا اور خلافِ تہذیب کے باتیں کرنا، گویا ایک بڑی وضعداری گنی جاتی تھی۔ قمار بازی اور شراب خوری اور خانہ جنگی کی کچھ حد نہ تھی۔ چارلس دوم کے عہد میں جو خرابیاں تھیں وہ شریف شریف اور اعلیٰ درجہ کے لوگوں کی گویا عادت تھی۔ بیلوں اور ریچھوں کو کتوں سے پچھڑنا لوگوں کو انعام دے کر لڑوانا، اور خود ایسے تماشوں کو دیکھ کر خوش ہونا، گویا ہر ایک امیر کے شوق کی بات تھی۔ ان تمام خرابیوں کی درستی میں اسٹیل اور اڈیسن نہایت ہی سرگرم تھے؛ اور جس سرگرمی سے وہ اس میں مصروف ہوئے، ویسے ہی کامیابی بھی اس میں ان کی ہوئی۔

اسپیکٹیٹر میں ایک دفعہ لکھا تھا کہ:۔

"میں اخلاق میں خوش طبعی کی جان ڈالوں گا، اور خوش طبعی کو اخلاق سے ملاؤں گا؛ تاکہ جہاں تک ممکن ہو، اس کے پڑھنے والے دونوں باتوں میں نصیحت پاویں؛ اور تا وقتیکہ لوگ ان تمام خرابیوں سے، جن میں اس زمانہ کے لوگ پڑے ہیں سنبھل نہ جاویں، ہر روز ان کو نصیحت کی باتیں یاد دلاتا رہوں گا؛ کیوں کہ جو دل ایک دن بھی بیکار پڑا رہتا ہے، اس میں بے شمار عیب جڑ پکڑ جاتے ہیں؛ جن کے ریشے بہت ہی مشکل سے دور ہوتے ہیں۔ سقراط کی نسبت ایسا کہا گیا ہے کہ اس نے فلسفہ کو آسمان سے اتارا اور انسانوں میں بسایا، مگر میں اپنی نسبت صرف اتنا ہی کہلانا چاہتا ہوں کہ میں نے فلسفہ کو مدرسوں اور مکتبوں کے کتب خانوں کی کوٹھریوں میں سے نکالا، اور جلسوں اور چاء، قہوہ پینے کی مجلسوں تک میں پھیلایا، اور ہر ایک دل میں بسا لیا۔"

اسٹیل اور اڈیسن کی ایسی عمدہ تحریریں ہوتی تھیں کہ ان کا اثر صرف مجلسوں کی تہذیب و زبان و گفتگو کی شائستگی ہی پر نہیں ہوتا تھا، بلکہ اس زمانہ کے مصنفوں پر بھی اس کا نہایت عمدہ اثر ہوا تھا۔

ڈاکٹر ڈریک کا قول ہے کہ:۔

"عام لوگوں کو علم ادب کا شوق اسی وقت سے ہوا جب سے کہ ٹیٹلر چھپنا شروع ہوا، اور اسپیکٹیٹر اور گارڈین نے اس شوق کو اور زیادہ بھڑکا دیا۔"

ان پرچوں کی تاثیر صرف لوہ دولوہ کے لیے نہ تھی؛ بلکہ انگلستان میں

ہر فرقہ کے لوگوں میں نہایت مضبوطی سے پھیل گئی تھی۔ اِن پرچوں سے علم کو جو فائدہ ہوا وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ ان پرچوں نے اول اول نہایت خوش اسلوبی سے گذشتہ وحال کے زمانہ کے عمدہ ولائق مصنفوں کو بتلایا اور ان کی خوبیوں کی قدر کرنے کا شوق دلایا۔ مشہور ہے کہ ملٹن کی "پیراڈائز لاسٹ" [فردوس ز دست رفتہ] کا، جو نہایت عمدہ اور بے نظیر کتاب ہے، انہی پرچوں کی بدولت فروغ ہوا۔ ان پرچوں کے مذاق تحریر اور خیالات کے رنگ ڈھنگ نے بُری تحریروں کے اسباب کو بتادیا؛ اور جھوٹی عبارت آرائی اور لغو انشار پردازی کو جو کسبیوں کے بناؤ سنگار کی مانند تھی، اور رنڈیوں کے سے طعنے مہینیا لونڈوں کی سی گالم گلوچ کو تحریروں میں سے بالکل دور کر دیا۔ اچھی اور بُری تحریروں میں تمیز کرنا اور سنجیدہ ومتین نکتہ چینی اور تحقیقات کا شوق پیدا کیا۔ ذہانت اور متانت دونوں کو ترقی دی اور وہ تحریر میں مناسبت اور تہذیب کا خیال لوگوں کے دل میں بٹھا دیا۔ ان باتوں سے ان پرچوں کے پڑھنے والے لئیق اور عالم مصنفوں کی تصنیفوں سے حظ اٹھانے لگے، اور تمیز کے ساتھ ان کی قدر کرنے لگے۔

ایڈیسن کی تحریروں سے بالتخصیص، طرزِ عبارت بہ نسبت سابق کے بہت زیادہ صاف وشستہ وسلیس اور نہایت دلچسپ ہوگئی؛ اور درحقیقت ایڈیسن کی تحریر سے انگریزی زبان کے علم انشار میں ایک انقلاب عظیم واقع ہوگیا۔ باوجودیکہ زمانہ حال میں تحریروں کے عیب وہنر کو لوگ خوب جانچتے ہیں، اس پر بھی ایڈیسن کی تحریر پر بجز تعریف کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔

علاوہ اِن باتوں کے اسپکٹیٹر کے پرچوں میں انسان کے خیالات کے مخرج، اور ان خیالات سے جو خوشیاں حاصل ہوتی ہیں، ان کی تفریق نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے بتلائی گئی ہے۔ اور اس سے یہ نتیجہ ہوا کہ شاعروں کے خیالات اور ان کے اشعار کی خیال بندی نہایت عمدہ اور درست ہوگئی۔ لغو اور بے سروپا مضمون اشعار میں سے خارج ہوگئے اور اُن کی بجائے پُرتاثیر مضمونوں نے جگہ پائی۔ ہر ایک کو لئیق اور قابل مصنفوں کی تحریروں کے جانچنے اور ان کی قدر کرنے، اور ان سے مزا اٹھانے کی لیاقت پیدا ہوگئی، اور رفتہ رفتہ تمام قوم علم اور محقق کے لقب کی مستحق ٹھہر گئی۔ اسپکٹیٹر کے پڑھنے والوں کو علم انشار کی وہ خوبی جو ایڈیسن کے ذہن میں تھی، معلوم ہوئی۔ سب لوگ اس کی تحریر کے لطف ومعانی کی تعریف کرنے لگے اور سب لوگوں کو ایسے شخصوں کی تحریروں کے جانچنے کی، جو علم انشار میں ناموری کے خواہاں ہوتے تھے، لیاقت حاصل ہوگئی۔

اِن پرچوں سے صرف علم ادب اور علم انشار ہی میں ترقی نہیں ہوئی بلکہ اخلاق اور عادت اور خصلت کو بھی بہت کچھ ترقی ہوئی۔ نیکی کے برتاؤ میں جو خود انسان کی اپنی ذات سے اور اپنے خویش اور اقربار، دوست آشنا، یگانہ وبے گانہ سے علاقہ رکھتی ہے، نہایت اعلیٰ درجہ کی تہذیب حاصل ہوئی اور خود تہذیب وشائستگی کو ایسی عمدہ صیقل ہوئی، جس کی آج تک کوئی نظیر نہیں۔ ملکی امورات کی بحث ومباحثہ میں جو تیزی وعداوت اور دشمنی پیدا ہوتی ہے وہ تھوڑے سے عرصہ میں نہایت کم ہوگئی؛ اور جو لیاقت کہ صرف بحث ومباحثہ میں صرف ہوتی تھی، وہ خوشگوار پانی کی مانند، خوبصورت نہروں میں بہنے لگی؛ جنھوں نے اخلاق اور علم وادب کو سیراب کر کر لوگوں کے دلوں کے بُرے اور خراب جوش کو پاک وصاف کر دیا۔

ہندوستان میں ہماری قوم کا حال اس زمانہ سے بھی زیادہ بدتر ہے۔ اگر ہماری قوم میں صرف جہالت ہی ہوتی تو چنداں مشکل نہ تھی، مشکل تو یہ ہے کہ قوم کی قوم جہل مرکب میں مبتلا ہے۔ علوم، جن کا رواج ہماری قوم میں تھا، اور جن کے تکبر اور غرور سے ہر ایک پھولا ہوا ہے، دین اور دنیا دونوں میں بکار آمد نہیں۔ غلط اور بے اصل باتوں کی پیروی کرنا؛ اور بے اصل اور اپنے آپ پیدا کئے ہوئے خیالات کو امور واقعی اور حقیقی سمجھ لینا؛ اور پھر اُن پر فرضی بحثیں بڑھاتے جانا؛ اور دوسری بات کو، گو وہ کیسی ہی سچ اور واقعی کیوں نہ ہو، نہ ماننا؛ لفظی بحثوں پر علم وفضیلت کا دار ومدار ہونا؛ ان کا نتیجہ ہے

علم ادب وانشار کی خوبی صرف لفظوں کے جمع کرنے اور ہم وزن اور قریب اللفظ کلموں کے تک ملانے، اور دور از کار خیالات بیان کرنے، اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے۔ یہاں تک کہ دوستانہ خط وکتابت اور چھوٹے چھوٹے روزمرّہ کے رقعوں میں بھی یہ سب برائیاں بھری ہوئی ہیں۔ کوئی خط یا رقعہ ایسا نہ ہوگا جس میں جھوٹ اور وہ بات جو درحقیقت دل میں نہیں ہے، مندرج نہ ہو۔ خطوط رسمیہ کے پڑھنے سے ہرگز تمیز نہیں ہوسکتی کہ حقیقت میں اس خط کا لکھنے والا ایسا ہی ہمارا دوست ہے،

جیسا کہ اس میں لکھا ہے؛ یا یہ صرف معمولی مضمون ہے، جس کے لکھنے کا عموماً رواج پڑ گیا ہے۔ بس ایسی طرزِ تحریر نے تحریر کا اثر ہمارے دلوں سے کھو دیا ہے اور ہم کو جھوٹی اور بناوٹی تحریر کا عادی کر دیا ہے۔

فنّ شاعری، جیسا ہمارے زمانہ میں خراب اور ناقص ہے، اس سے زیادہ کوئی چیز بری نہ ہوگی۔ مضمون تو بجز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہے، وہ بھی نیک جذباتِ انسانی کو ظاہر نہیں کرتا۔ بلکہ ان جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو ضد حقیقی تہذیب و اخلاق کے ہیں۔

خیال بندی کا طریقہ اور تشبیہ و استعارہ کا قاعدہ ایسا خراب اور ناقص پڑ گیا ہے؛ جس سے، ایک تعجب تو طبیعت پر آتا ہے، مگر اس کا اثر مطلق دل میں یا خصلت میں، یا اس انسانی جذبہ میں جس سے وہ متعلق ہے، کچھ بھی نہیں ہوتا۔ شاعروں کو یہ خیال ہی نہیں ہے کہ فطرتی جذبات اور ان کی قدرتی تحریک، اور اُن کی جبلی حالت کا کسی پیرایہ، یا کنایہ، یا اشارہ، یا تشبیہ و استعارہ، میں بیان کرنا کیا کچھ دل پر اثر کرتا ہے۔ ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ" کچھ چیز نہیں ہے، بجز اس کے کہ انسان کی طبیعت کی حالت کی تصویر ہے، اس کا ہر ہر شعر دل میں گھر کرتا جاتا ہے۔ شیکسپیئر میں کچھ نہیں ہے بجز اس کے کہ اس نے انسان کا نیچر یعنی قدرتی بناوٹ طبیعت کو بیان کیا ہے، جو نہایت موثر انسان کی طبیعت پر ہے۔

علم دین تو وہ خراب ہوا ہے، جیسا خراب ہونے کا حق ہے! اس معصوم سیدھے سادے، سچے، اور نیک طبیعت والے پیغمبر نے جو خدا تعالیٰ کے احکام بہت سدھاوٹ و صفائی و بے تکلفی سے جاہل، ان پڑھ، بادیہ نشیں عرب کی قوم کو پہونچائے تھے، اس میں وہ نکتہ چینیاں، باریکیاں گھیسڑی گئیں، اور وہ مسائل فلسفیہ اور دلائل منطقیہ لائی گئیں، کہ اس میں اس صفائی اور سدھاوٹ اور سادہ پن کا مطلق اثر نہیں رہا۔ بمجبوری لوگوں کو اصلی احکام کو، جو قرآن و معتمد مستند حدیثوں میں تھے، چھوڑنا پڑا اور زید و عمرو کے بنائے ہوئے اصول کی پیروی کرنی پڑی۔

علم مجلس، اور اخلاق، اور برتاؤ دوستی کا، ایک ایسے طریقہ پر پڑ گیا ہے، جو نفاق سے بھی بدتر ہے۔ اخلاق صرف منہ پر میٹھی میٹھی باتیں بنانے اور اوپری تپاک جتانے کا نام ہے۔ آپس میں دو شخص ایسی محبت اور دلسوزی کی باتیں کرتے ہیں کہ دیکھنے سننے والے ان دونوں کو یک مغز و دو پوست سمجھتے ہیں؛ مگر جب ان کے دل کو دیکھو، تو یک پوست و دو مغز سے بے میل ہیں۔ صرف مکاری اور ظاہرداری کا نام اخلاق رہ گیا ہے؛ اور بے ایمانی اور دغابازی کا نام، ہوشیاری۔

گفتگو پر خیال کرو، تو عجب ہی لطف دکھائی دیتا ہے، اگرچہ اکثر لفظ تو نہیں ہوتے، مگر ہزاروں اکثر مضمون زبان سے نکلتے ہیں۔ نہایت مہذب، اور معقول و ثقہ، نیک و دیندار آدمی بھی اپنی گفتگو میں تہذیب و شائستگی کا مطلق خیال نہیں کرتے۔ دوست کی بات کو جھوٹ کہہ دینا؛ دوست کی نسبت جھوٹ کی نسبت کر دینا؛ یہ تو ادنیٰ سے ادنیٰ روزمرہ کی بات ہے۔ ایک نہایت نیک آدمی اپنے بڑے مقدس دوست کے بیٹے سے عین حالت تپاک اور خوشی اخلاق اور جوشِ محبت کی باتوں میں کہہ رہا تھا کہ:-

" تمہارے باپ تو جھوٹوں کے بادشاہ ہیں، وہ تو دن رات
سینکڑوں گپیں ہانک دیتے ہیں۔ اُن کی بات پر کیا
اعتبار ہے۔"

بس افسوس ہے ہم کو خود اپنے پر کہ ہمارے ایسے دوست ہیں !!

اگر اشراف جوان دوستوں کی محفل میں جاؤ، تو سنو کہ وہ آپس میں کیسی کالم گلوچ اور فحش باتیں ایک دوسرے کی نسبت کرتے ہیں۔ ایک نہایت معزز شریف خاندانی آدمی نے، جو صاحب تصنیف ہیں اور اردو کے علم ادب میں مشہور ہیں، تیس منٹ مجھ سے دوستانہ گفتگو کی، اور میں نے خوب خیال کر کر گنا کہ اُن کے منھ سے چھتیس "۳۶" لفظ گالیوں کے نکلے، جن میں سے کچھ اپنی نسبت تھیں اور کچھ اس کتاب اور اس کے مصنف کی نسبت جس کا ذکر تھا، اور کچھ ادھر اُدھر بیٹھنے والوں اور سننے والوں کی نسبت۔

امیروں کا حال دیکھو تو اُن کو دن رات بٹیر لڑانے اور مرغ لڑانے اور کبوتر اُڑانے، اور اسی طرح تمام لغویات میں اپنی زندگی بسر کرنے کے سوا اور کچھ کام دھندا نہیں!

نیکی پر متوجہ ہوتے ہیں، تو اس کو اتنا گھونٹتے ہیں کہ بدمزہ ہو جاتی ہے؛ اور جب بدی پر آتے ہیں، پھر تو شیطان کے بھی کان کترتے ہیں!

غرض جو کچھ اس زمانہ میں فرنگستان میں تھا، ویسا کچھ، بلکہ اس سے بھی

زیادہ اب ہندوستان میں موجود ہے؛ اور بلاشبہ ایک ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر کی یہاں ضرورت تھی۔ سو خدا کا شکر ہے کہ یہ پرچہ ان ہی کا قائم مقام، مسلمانوں کے لیے ہندوستان میں جاری ہوا ہے۔ مگر افسوس کہ یہاں کوئی اسٹیل اور ایڈیسن نہیں ہے۔

اسٹیل اور ایڈیسن کو اپنے زمانہ میں ایک بات کی بہت آسانی تھی کہ اُن کی تحریر اور اُن کے خیالات جہاں تک کہ تھے تہذیب و شائستگی و حسنِ معاشرت پر محدود تھے۔ مذہبی مسائل کی چھیڑ چھاڑ ان میں کچھ نہیں تھی! ہم بھی مذہبی خیالات سے بہت بچنا چاہتے ہیں، مگر ہمارے ہاں تمام رسمیں اور عادتیں مذہب سے ایسی مل گئی ہیں کہ بغیر مذہبی بحث کیے، ایک قدم بھی تہذیب و شائستگی کی راہ میں نہیں چل سکتے۔ جس بات کو کہو کہ "چھوڑو!" فوراً جواب ملے گا کہ "مذہباً ثواب ہے"۔ اور جس بات کو کہو کہ "سیکھو"! اسی وقت کوئی بولے گا کہ "مذہباً منع ہے"۔ پس ہم مجبور ہیں کہ تہذیب و شائستگی اور حسنِ معاشرت سکھانے میں ہم کو مذہبی بحث کرنی پڑتی ہے۔

مذہبی بحث کا ایک عجیب سلسلہ ہے کہ ایک چھوٹی سی بات پر بحث کرنے سے بڑے بڑے مسائل اور اصولِ مذہب بحث میں آجاتے ہیں؛ اور اس لیے لاچار کبھی ہم کو فقہ سے بحث کرنی پڑتی ہے، اور کبھی اصول فقہ سے؛ اور کبھی حدیث سے بحث کرنی پڑتی ہے، اور کبھی اصول حدیث سے اور کبھی تفسیر سے بحث کرنی پڑتی ہے، اور کبھی اصولِ تفسیر سے۔ پس ہندوستان میں صرف اسٹیل اور ایڈیسن ہی کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ مقدس لوتھر کی بھی بہت بڑی حاجت ہے۔

اسٹیل اور ایڈیسن کی خوش قسمتی تھی کہ ان کے زمانہ کے لوگ ان کی تحریروں کو پڑھتے تھے، اور قدر کرتے تھے؛ اور ہماری یہ بدنصیبی ہے کہ ہماری تحریروں کو مذہب کے برخلاف کہا جاتا ہے اور اُن کا پڑھنا باعث عذاب سمجھا جاتا ہے۔ اسٹیل اور ایڈیسن اپنے ہر پرچہ کے مشتہر ہونے کے بعد، "واہ! واہ!!" کی آواز سننے سے اپنی محنت اور مشقت فکر و خیال کی کلفت دور کرتے ہوں گے؛ اور ہم، اپنی تحریروں کے مشتہر ہونے کے بعد، بجز لعنت و ملامت سننے کے اور کسی بات کی توقع نہیں رکھتے ہیں۔ اسٹیل اور ایڈیسن جن لوگوں کی بھلائی کرتے تھے، اُن سے بھلا سنتے تھے؛ ہم جن کی بھلائی چاہتے ہیں، اُن سے بُرائی پاتے ہیں؛ جن کے حق میں بھلا کہتے ہیں، اُن سے بُرا سنتے ہیں۔ اسٹیل اور ایڈیسن کو ہزاروں دل اپنی طرف کر لینے کچھ مشکل نہ تھے؛ اور ہم کو ایک دل بھی اپنی طرف کرنا مشکل ہے۔ اسٹیل اور ایڈیسن کو بنے بنائے دل اپنی طرف جھکانا تھے؛ ہم کو یہ مشکل ہے کہ دل بھی ہم ہی کو بنانا ہے، اور ہم ہی کو اُس کا جھکانا ہے۔

لوگ ہمارے ان خیالات کو جنون اور مالیخولیا بتاتے ہیں۔ مگر "دیوانہ بکار خود ہوشیار" ہم خوب سمجھتے ہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ اس لیے ہم آئندہ کی بہتری کی خدا سے توقع رکھتے ہیں، اور اچھے دن آنے والوں کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔ گو اُن کے آنے کا زمانہ ہم نہیں جانتے، مگر یقین کرتے ہیں کہ ضرور بے شک آنے والے ہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ اس مسکین پرچہ کے ذریعہ سے ہندوستان میں وہ کچھ کریں گے جو اسٹیل اور ایڈیسن نے انگلستان میں کیا؛ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جہاں تک ہم سے ہو سکتا ہے، ہم اپنا فرض پورا کریں گے!!

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن لوگوں میں بدترین انسان دو چہروں والے (دو رخے) کو پاؤ گے، جو ان لوگوں کے پاس ایک چہرے سے آتا ہے اور دوسرے کے پاس دوسرے چہرے سے آتا ہے۔"

عبدالرؤف*

قربانی کی اہمیت

قربانی کی ابتدا

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خواب میں دیکھا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں، نبیوں کا خواب سچا ہوتا ہے اور اللہ تعالےٰ کی جانب سے تھا اور ایسی بات اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکم دیے جانے کے برابر مانی جاتی تھی۔ اس لیے انھوں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ میں نے ایسا خواب دیکھا ہے تمہاری کیا رائے ہے؟ بیٹے نے جواب دیا:

اے ابّا جان! آپ کو جو حکم ہوا ہے اس پر عمل کریجیے
آپ مجھے انشاء اللہ صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے
[الصّٰفّٰت ۱۰۲]

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مکہ مکرمہ سے لے کر چلے اور منیٰ میں جاکر ذبح کرنے کی نیت سے ایک چھری ساتھ لی (منیٰ مکہ معظمہ میں تین میل دور دو پہاڑیوں کے درمیان ایک بہت لمبا میدان ہے)۔ جب منیٰ میں داخل ہونے لگے تو ان کے بیٹے کو شیطان بہکانے لگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پتہ چلا تو شیطان کو اللہ اکبر کہہ کر سات کنکریاں ماریں۔ جس کی وجہ سے وہ زمین میں دھنس گیا۔ دونوں باپ بیٹے آگے بڑھے تو زمین نے شیطان کو چھوڑ دیا کچھ دور جاکر شیطان پھر بہکانے لگا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پھر اسے اللہ اکبر کہہ کر سات کنکریاں ماریں، وہ پھر زمین میں دھنس گیا، یہ دونوں باپ بیٹے آگے بڑھے تو پھر زمین نے اس کو چھوڑ دیا، وہ پھر آکر ورغلانے لگا۔ حضرت ابراہیمؑ نے پھر سے اللہ اکبر کہہ کر سات کنکریاں ماریں۔ پھر وہ زمین میں دھنس گیا اور اس کے بعد آگے بڑھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔ ابھی ذبح کرنے نہ پائے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ندا آئی۔

(اے ابراہیمؑ! تم نے اپنا خواب سچا کر دیا)

پھر اللہ پاک نے ایک مینڈھا بھیجا جسے اپنے بیٹے کی جانب سے حضرت ابراہیمؑ نے ذبح کر دیا۔ جیسا کہ حق تعالیٰ جل مجدہٗ کا ارشاد ہے "اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض میں دے دیا"

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں کتب تفسیر روح المعانی وغیرہ سورۂ صافات)۔

ذبح تو کیا مینڈھا، اور ثواب مل گیا بیٹے کی قربانی کا کیونکہ دونوں باپ بیٹے اپنے دل و جان سے اس کام کے انجام دینے کو طے کر چکے تھے جس کا اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکم ہوا تھا۔ باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا اور بیٹا ذبح ہونے کے لیے خوشی لیٹ گیا۔ دونوں نے اپنی جانب سے کوئی کسر نہیں چھوڑی، اللہ جل شانہٗ

* مولانا عبدالرؤف، کراچی۔ پاکستان۔

کے یہاں نیت دیکھی جاتی ہے۔ اپنی نیت میں یہ دونوں سچے تھے جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"آخر کو ان دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا" (الصّٰفّٰت)

یہ واقعہ قربانی کی ابتداء ہے اور حج کے موقع پر جو کنکریاں ماری جاتی ہیں ان کی ابتداء بھی اسی واقعے سے ہوئی ہے۔ حاجی ان ہی تین جگہوں میں کنکریاں مارتے ہیں جہاں شیطان زمین میں دھنس گیا تھا۔ اب اس جگہ کی نشاندہی کے لیے پتھر کے مینار بنا دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے جانوروں کی قربانی کرنا عبادت میں شمار ہو گیا۔ چنانچہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے بھی قربانی مشروع کی گئی۔ ہر صاحب حیثیت پر قربانی واجب ہے۔ اور اگر کسی کی اتنی حیثیت نہ ہو اور قربانی کر دے، تب بھی ثواب عظیم کا مستحق ہو گا۔

قربانی کرنے کی فضیلت :

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"بقر عید کی دس تاریخ کو کوئی نیک عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک قربانی کا خون بہانے سے بڑھ کر محبوب اور پسندیدہ نہیں اور قیامت کے دن قربانی کرنے والا اپنے جانور کے بالوں، سینگوں اور کھروں کو لے کر آئے گا۔ (اور یہ چیزیں ثواب عظیم ملنے کا ذریعہ بنیں گی۔"

نیز فرمایا کہ

"قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرف قبولیت حاصل کر لیتا ہے۔ لہٰذا تم خوش دلی کے ساتھ قربانی کیا کرو۔"

(ترمذی شریف)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بقر عید کے دن فرمایا کہ

"آج کے دن کوئی (قربانی) سے بہتر عمل نہیں کر سکتا۔ الّا یہ کہ

صلہ رحمی کرے۔" (طبرانی)

(یاد رہے کہ صلہ رحمی نفلی قربانی کا بدل تو ہو سکتی ہے واجب قربانی کا نہیں)

قربانی کے خون کا پہلا قطرہ گرتے ہی تمام گناہوں کی بخشش

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اے فاطمہؓ! جاؤ اپنی قربانی پر حاضری دو، کیونکہ اس کے خون سے جوں ہی پہلا قطرہ گرے گا تمہارے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ نیز وہ جانور (قیامت کے دن) اپنے خون اور گوشت کے ساتھ لایا جائے گا اور پھر اسے ستر گنا (بھاری کر کے) تمہارے میزان میں رکھا جائے گا۔"

حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (یہ عظیم الشان فضیلت سن کر بے ساختہ) عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا یہ (فضیلت عظیمہ صرف) آل محمدؐ کے ساتھ خاص ہے۔ کیوں کہ وہ (واقعۃً) اس کار خیر کے زیادہ مستحق ہیں یا آل محمدؐ اور تمام مسلمانوں کے لیے عام ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"یہ عظیم الشان فضیلت) آل محمدؐ کے لیے تو بطور خاص ہے اور تمام مسلمانوں کے لیے بھی عام ہے"۔ (یعنی ہر مسلمان کو بھی قربانی کرنے کے بعد یہ فضیلت حاصل ہو گی۔

(الترغیب والترہیب)

تشریح

اس روایت سے دو اہم فضیلتیں معلوم ہوئیں۔

۱۔ قربانی کے جانور کے پہلے خون کا قطرہ گرتے ہی قربانی کرنے والے والی کی مغفرت ہو جاتی ہے۔

۲۔ قیامت کے دن قربانی کا جانور خون اور گوشت کے ساتھ لایا جائے گا اور پھر اس کو ستر گنا وزنی کر کے میزان میں رکھا جائے گا اس لیے نہایت خوش دلی اور فراخ دلی سے قربانی کرنی چاہیے واجب نہ ہو تو بھی ان فضیلتوں کو حاصل کرنے کے لیے قربانی کریں یعنی

چاہیے۔

مسئلہ :۔ اپنی قربانی خود اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا افضل ہے اگر خود ذبح کرنا نہیں جانتا تو دوسرے سے بھی ذبح کرا سکتا ہے۔ مگر ذبح کے وقت وہاں خود حاضر رہنا افضل ہے۔ (درمختار)۔

بقر عید کے دن قربانی پر پیسہ خرچ کرنا افضل ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"عید کے دن قربانی کا جانور (خریدنے) کے لیے پیسے خرچ کرنا اللہ تعالیٰ کے یہاں اور چیزوں میں خرچ کرنے سے زیادہ افضل ہے۔" (طبرانی)

قربانی کے ہر بال کے بدلے ایک نیکی

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابۂ کرام نے عرض کیا:

"یارسول اللہ! یہ قربانی کیا ہے؟"

آپ نے فرمایا:

"یہ تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔"

انھوں نے عرض کیا:

"یارسول اللہ! اس میں ہمارا کیا فائدہ ہے؟"

آپ نے فرمایا:

(تمہارا فائدہ یہ ہے کہ تمہیں قربانی کے جانور کے) "ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی ملے گی۔"

انھوں نے عرض کیا:

"یارسول اللہ! (جن جانوروں کے بدن پر اون ہے اس) اون کا کیا حکم ہے؟ (کیا اس پر بھی کچھ ملے گا؟)

آپ نے فرمایا:

"اون کے ہر بال کے عوض بھی ایک نیکی ملے گی۔" (الترغیب والترہیب)

(الترغیب والترہیب)

تشریح :۔ غور کیجیے! اس سے بڑھ کر اور کیا ثواب ہوگا کہ ایک قربانی کرنے سے ہزاروں لاکھوں نیکیاں مل جائیں۔ دنبے اور بھیڑ کے بدن پر کتنے لاتعداد بال ہوتے ہیں۔ اگر کوئی صبح سے شام تک گننا چاہے تو بھی نہ گن سکے، تو سوچیے! ہمارے ہزار دو ہزار کے مقابلے میں کتنی بے حساب نیکیاں ہوئیں۔ اس قدر اجر و ثواب کو دیکھ کر قربانی کرنی چاہیے واجب تو واجب ہے ہی۔ اگر وسعت ہو تو نفلی قربانی بھی کرنی چاہیے ان مبارک دنوں کے چلے جانے کے بعد پھر یہ دولت کہاں نصیب ہوگی اور اس آسانی سے یہ بے شمار نیکیاں کہاں میسر ہوں گی، پھر اگر اللہ جل شانہٗ نے مالی فراخی عطا فرمائی ہے تو جہاں اپنی طرف سے قربانی کرے وہاں اپنے مرحوم عزیزوں کی طرف سے بھی کر دے۔ مثلاً ماں، باپ، بہن، بھائی وغیرہ ان کی طرف سے قربانی کرنے سے ان کی روح کو اتنا عظیم الشان ثواب پہنچ جائے گا، اور کیا ہی اچھا ہو کہ محسن اعظم نور مجسم رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اور آپ کے اہل بیت کی طرف سے بھی قربانی کی جائے، ورنہ کم از کم اپنی واجب قربانی تو ضرور ہی کر دے۔ جس شخص نے قربانی واجب ہوتے ہوئے نہ کی تو اس سے بڑھ کر بدنصیب اور محروم کون ہوگا؟ حدیث میں ایسے شخص کو عیدگاہ میں حاضری سے ہی منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو۔

واجب قربانی نہ کرنے پر وعید۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ محسن اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"جس شخص میں قربانی کرنے کی وسعت ہو پھر بھی وہ قربانی نہ کرے تو (ایسا آدمی) ہماری عیدگاہ میں حاضر نہ ہو۔"

(الترغیب والترہیب)

تشریح :۔ جو لوگ مالی وسعت اور قربانی کی استطاعت رکھتے ہوئے اپنی واجب قربانی ادا نہیں کرتے وہ آنکھیں کھولیں اور اپنے ایمان کی خیر منائیں۔ اوّل یہی خسارہ کیا کم تھا کہ قربانی نہ کرنے سے اتنے بڑے ثواب سے محروم ہو گئے، پھر اس پر مجسم رحمت پیکر شفقت صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو جائیں اور عیدگاہ میں حاضری سے روک دیں تو ایسے شخص کا کہاں ٹھکانہ ہوگا؟ عیدگاہ اور مساجد اللہ

کی محبوب جگہیں ہیں۔ یہاں جمع ہونے والوں پر عفو و کرم کی بارش ہوتی ہے۔ یہاں کی حاضری سے کسی بدنصیب سے بدنصیب ہی کو روکا جا سکتا ہے۔ اس لیے بخل سے کام نہ لیں، جس نے یہ مال دیا ہے یہ حکم بھی اسی کا دیا ہوا ہے۔ اس کی تعمیل کریں، اسی میں سلامتی ہے۔

ایک ضروری مسئلہ:

بعض جگہ دیکھا جاتا ہے کہ باپ بھی کماتا ہے اس کے چار پانچ لڑکے ہیں وہ بھی الگ الگ کماتے ہیں، ماں اور سب دلہنوں کی ملکیت میں سونے چاندی کا زیور بھی ہوتا ہے۔ لیکن بقرعید کو قربانی صرف ایک ہوتی ہے۔ اور جملہ اہل خانہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم سب کی طرف سے یہ واجب ادا ہو گیا، یہ سخت ناسمجھی اور مغالطے کی بات ہے۔ یاد رکھیں قربانی واجب ہونے کے لیے گھر کے ہر فرد کی علیحدہ علیحدہ ملکیت دیکھی جائے گی اور جس کی ملکیت میں کم از کم ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت ہو، یا مختلف سونے چاندی کا زیور ہو مگر مجموعی مالیت ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے مساوی ہو یا اس قدر چاندی کی قیمت کا مال تجارت ہو یا اتنی ہی مالیت کا فاضل سامان پڑا ہوا ہو تو اس پر بقرعید کے دن قربانی واجب ہوگی۔ چنانچہ اگر اتنا زیور یا روپیہ یا فالتو ساز و سامان ماں باپ تمام لڑکوں اور ان کی بیویوں کی ملکیت میں ہوا تو ان سب پر ایک ایک قربانی واجب ہوگی اور یہ بھی یاد رکھیں کہ قربانی فرض ہونے کے لیے مذکورہ بالا مقدار چاندی یا اس کی قیمت یا اس کے بقدر مال تجارت کے ملکیت میں ہونے پر سال گزرنا بھی ضروری نہیں ہے۔ اگر کسی کے پاس بقرعید کی بارہویں تاریخ کو عصر کے وقت اتنا روپیہ پیسہ یا مال تجارت یا غیر مال تجارت آیا جس کے ہونے سے قربانی واجب ہوتی ہے تو اس پر بھی قربانی واجب ہو جائے گی۔

قربانی کے مسائل: قربانی کس پر واجب ہے!

جس شخص پر زکوٰۃ فرض ہو یا جس کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت ہو یا اتنی قیمت کا مال تجارت ہو یا فاضل سامان پڑا ہو اس پر قربانی اور صدقۂ فطر واجب ہو جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ جس پر زکوٰۃ فرض نہیں اس پر قربانی بھی واجب نہیں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ یوں کہنا تو درست ہے کہ جس پر زکوٰۃ فرض ہے اس پر قربانی بھی واجب ہے، لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ جس پر زکوٰۃ فرض نہیں، اس پر قربانی واجب نہیں۔ کیوں کہ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن پر زکوٰۃ فرض نہیں اس لیے کہ ان کے پاس سونا چاندی یا مال تجارت یا نقدی نصاب کے بقدر نہیں ہوتی لیکن بہت سا فاضل سامان پڑا ہوتا ہے (جیسے استعمال کیا ہوا ضرورت سے زائد فرنیچر وغیرہ) اگر یہ فاضل سامان ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کو پہنچ جائے تو قربانی واجب ہو جاتی ہے لیکن زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی۔ ایک فرق اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ زکوٰۃ کا ادا کرنا اس وقت فرض ہوتا ہے جب نصاب پر چاند کے اعتبار سے بارہ مہینے گزر جائیں اور قربانی واجب ہونے کے لیے قربانی کی تاریخ آنے سے پہلے چوبیس گھنٹے گزرنا بھی ضروری نہیں ہے، اگر کسی کے پاس بقرعید کی نویں تاریخ کو عصر کے وقت ایسا مال آیا جس کے ہونے سے قربانی واجب ہو جاتی ہے اور وہ کل صبح تک اس کی ملکیت میں بھی رہا تو اس پر کل کو قربانی واجب ہو جائے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو بھی صاحب نصاب ہو اس پر قربانی واجب ہے اور ہر ایک کی ملکیت علیحدہ دیکھی جائے گی۔ اگر کسی گھر میں باپ بیٹے، بیٹوں کی ماں ہر ایک کی ملکیت میں اتنا مال ہو جس پر قربانی واجب ہوتی ہے تو ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ قربانی واجب ہوگی۔ البتہ نابالغ کی طرف سے کسی حال میں قربانی کرنا لازم نہیں۔ عورتوں کے پاس عموماً اتنا زیور ہوتا ہے جس پر قربانی واجب ہو جاتی ہے۔

قربانی کے جانور:

قربانی کے جانور شرعاً مقرر ہیں۔ گائے، بیل، بھینس، بھینسا، اونٹ، اونٹنی، بکرا، بکری، بھیڑ، بھیڑا، دنبہ، دنبی کی قربانی ہو سکتی ہے۔ ان کے علاوہ اور کسی جانور کی قربانی درست نہیں۔ اگرچہ کتنا زیادہ قیمتی ہو اور کھانے میں جس قدر بھی مرغوب ہو۔ لہٰذا ہرن کی قربانی نہیں ہو سکتی، اسی طرح دوسرے حلال جنگلی جانور قربانی میں ذبح نہیں کیے جا سکتے۔ [عالمگیری]

مسئلہ: گائے، بیل، بھینس، بھینسا، اونٹ، اونٹنی میں سات حصے ہو سکتے ہیں یعنی ان میں سے ایک جانور سے سات قربانیاں ہو سکتی ہیں خواہ ایک ہی آدمی ایک گائے کر کے اپنے گھر کے آدمیوں کے وکیل بنانے سے ان کا وکیل ہو کر سات حصے تجویز کر کے ذبح کرے یا مختلف گھروں کے آدمی ایک ایک یا دو دو حصے لے کر سات پورے کر لیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ جتنے شریک ہوں ہر ایک کی نیت قربانی کی ہو یا کسی نے عقیقے کے لیے ایک دو حصے لے لیے ہوں بجائے گ

عقیقے میں بھی اللہ ہی کے لیے خون بہایا جاتا ہے اس لیے عقیقے کا حصہ قربانی کے جانور میں لیا جا سکتا ہے۔ جتنے لوگوں نے قربانی کے جانور میں شرکت کی اگر ان میں سے کسی ایک آدمی کی نیت بھی اس گوشت کی تجارت کرنے یا محض گوشت کھانے کی ہو تو کسی کی قربانی ادا نہیں ہوگی۔ اور اگر بھینس، گائے، اونٹ میں سات حصوں سے کم حصے کر کے چھ آدمیوں نے ایک ایک حصہ لیا یا پانچ آدمیوں نے پانچ حصے کر کے ایک ایک حصہ لیا تب بھی قربانی درست ہو جائے گی بشرطیکہ کسی کا حصہ ساتویں حصے سے کم نہ ہو اور اگر آٹھ حصے بنا لیے اور آٹھ قربانی والے شریک ہو گئے تو کسی کی بھی قربانی درست نہ ہوگی۔ (عالمگیری)

مسئلہ:- چھوٹے جانور یعنی بکرا، بکری وغیرہ میں شرکت نہیں ہو سکتی۔ ایک شخص کی جانب سے ایک ہی جانور ہو سکتا ہے۔ [عالمگیری]

قربانی کے جانور کی عمریں۔

مسئلہ:- گائے، بیل، بھینس، بھینسا کی عمر کم از کم دو سال اور اونٹ اونٹنی کی عمر کم از کم پانچ سال اور باقی جانوروں کی عمر کم از کم ایک سال ہونا ضروری ہے۔ ہاں اگر بھیڑ یا دنبہ سال بھر سے کم کا ہو لیکن موٹا تازہ اتنا ہو کہ سال بھر والے جانوروں میں چھوڑ دیا جائے تو فرق محسوس نہ ہو تو اس کی قربانی بھی ہو سکتی ہے بشرطیکہ چھ مہینے سے کم کا نہ ہو۔

مسئلہ:- اگر جانور کا فروخت کرنے والا پوری عمر بتلاتا ہے اور ظاہری حالت سے اس کے بیان کی تکذیب نہیں ہوتی تو اس پر اعتماد کرنا جائز ہے۔ (احکام عید الاضحیٰ و قربانی)

کیسے جانور کی قربانی درست ہے۔

چونکہ قربانی کا جانور بارگاہ خداوندی میں پیش کیا جاتا ہے، اس لیے بہت عمدہ موٹا تازہ، صحیح سالم، عیبوں سے پاک ہونا ضروری ہے۔ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ قربانی کے جانور کے آنکھ، کان خوب اچھی طرح دیکھ لیں اور ایسے جانوروں کی قربانی نہ کریں جس کے کان کا پچھلا حصہ یا اگلا حصہ کٹا ہوا ہو اور نہ ایسے جانور کی قربانی کریں جس کا کان چیرا ہوا ہو یا جس کے کان میں سوراخ ہو۔ (رواہ الترمذی)

اور حضرت براء ابن عازبؓ کا بیان ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ قربانی میں کیسے جانوروں سے پرہیز کیا جائے؟ آپ نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ خصوصیت کے ساتھ چار طرح کے جانوروں سے پرہیز کرو۔

یعنی وہ لنگڑا جانور جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو۔

یعنی وہ کانا جانور جس کا کانا پن ظاہر ہو۔

یعنی ایسا بیمار جانور جس کا مرض ظاہر ہو۔

یعنی ایسا دبلا، مریل جانور جس کی ہڈیوں میں گودا نہ رہا ہو۔

(رواہ مالک والترمذی وابو داؤد وغیرہ)

حضرات فقہائے کرام نے ان احادیث کی تفسیر و تشریح کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ جو جانور بالکل اندھا ہو یا بالکل کانا ہو یا ایک آنکھ کی تہائی روشنی یا اس سے زیادہ روشنی جاتی رہی ہو یا ایک کان کا تہائی حصہ یا اس سے زیادہ کٹ گیا ہو یا دم کٹ گئی ہو یا اس کا ایک تہائی سے زیادہ حصہ کٹ گیا ہو یا اتنا دبلا جانور ہو کہ اس کی ہڈیوں میں بالکل گودا نہ رہا ہو، اس کی قربانی جائز نہیں۔ اگر جانور دبلا ہو مگر اتنا زیادہ دبلا نہ ہو تو اس کی قربانی ہو جائے گی۔ (عالمگیری) لیکن وہ ثواب کہاں ملے گا جو موٹے تازے جانور کی قربانی میں ملتا ہے۔ اللہ کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لیے گری پڑی حیثیت کا جانور اختیار کرنا ناسمجھی بھی ہے اور ناشکری بھی۔

مسئلہ:- جو جانور تین پاؤں پر چلتا ہے اور چوتھا پاؤں رکھتا ہی نہیں یا چوتھا پاؤں رکھتا تو ہے مگر اس سے چل نہیں سکتا، یعنی چلنے میں اس سے کچھ سہارا نہیں لیتا تو اس کی قربانی درست نہیں۔ اگر چاروں پاؤں سے چلتا ہے لیکن پاؤں میں کچھ لنگ ہے تو اس کی قربانی درست ہے۔ (شامی)۔

مسئلہ:- جس جانور کے بالکل دانت نہ ہوں اس کی قربانی درست نہیں اور اگر کچھ دانت گر گئے لیکن جو بھی باقی ہیں وہ تعداد میں گر جانے والے دانتوں سے زیادہ ہیں تو اس کی قربانی درست ہے۔ [درمختار]

مسئلہ:- اگر کسی جانور کے پیدائش ہی سے کان نہیں تو اس کی قربانی درست نہیں۔ اور اگر دونوں کان ہیں اور صحیح سالم ہیں لیکن ذرا چھوٹے چھوٹے ہیں تو اس کی قربانی ہو سکتی ہے۔ (عالمگیری)۔

مسئلہ:- جس جانور کے پیدائش ہی سے سینگ نہیں لیکن عمر اتنی ہو چکی ہے جتنی عمر قربانی کے جانور کی ہونی لازم ہے تو اس کی قربانی درست ہے اور اگر سینگ نکل آئے تھے اور ان میں ایک یا دونوں کچھ ٹوٹ گئے تو ان کی بھی قربانی ہو سکتی ہے۔ ہاں اگر بالکل جڑ سے ٹوٹ گئے اور اندر کی مینگ بھی ختم ہو گئی تو اس کی قربانی درست نہیں۔ (شامی)۔

مسئلہ:- خصی جانور کی قربانی نہ صرف یہ کہ درست ہے بلکہ افضل ہے کیونکہ اس کا گوشت اچھا ہوتا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایسے جانوروں کی قربانی کی ہے۔

آل احمد سرور*

ہماری تعلیمی صورتِ حال

موجودہ تعلیمی نظام اور تعلیمی صورتِ حال پر برابر اظہارِ خیال ہوتا رہتا ہے۔ رادھا کرشنن کمیشن اور کوٹھاری کمیشن کے علاوہ متعدد کمیشنوں میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ ۱۹۶۷ء کے پارلیمنٹ کے اعلان کی روشنی میں بہت کچھ ہوا ہے۔ ابتدائی منزل سے لے کر اعلا تعلیم اور تحقیق کی منزل تک خاصی پیش رفت ہوئی ہے۔ سائنس دانوں کی ایک فوج تیار ہو گئی ہے۔ خواندگی کی شرح بڑھی ہے اور علم کی کرنیں ان دیہاتوں تک پہنچ گئی ہیں جہاں پہلے جہالت اور ظلمت کا راج تھا، لیکن معروضی طور پر دیکھا جائے تو یہ ساری ترقی نہ صرف یک رخی ہے بلکہ اپنے ساتھ کچھ آشوب بھی لائی ہے۔ میں کوئی ماہرِ تعلیم نہیں مگر ایک استاد کی حیثیت سے تقریباً پچاس سال کا تعلیمی اور تدریسی تجربہ رکھتا ہوں اور میں اعلا تعلیم پر خصوصاً اور دوسرے شعبوں پر عموماً برابر نظریں جمائے رہا ہوں۔ ادب کے بعد میری دلچسپی تعلیم ہی سے رہی ہے۔ مجھے یہ فخر ہے کہ ۱۹۳۲ء سے مجھے ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے ماہرِ تعلیم سے قرب رہا ہے اور خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر عابد حسین اور آچاریہ نریندر دیو جیسے دانش وروں سے میرے گہرے مراسم رہے ہیں۔ جب ۱۹۳۷ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین بنیادی تعلیم کے سلسلے میں اپنی سفارشات تیار کر رہے تھے تو غیر رسمی صحبتوں میں ان کے، سیدین صاحب کے، آریانایکم کے، شری والا اور آشا دیوی کے ساتھ میں شریکِ گفتگو رہتا تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے میرا گہرا تعلق رہا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈی شملہ اور کشمیر یونی ورسٹی کی تعلیمی زندگی میں میں نے حصّہ لیا ہے اور اس لیے مجھے اس سلسلے میں تھوڑی بہت بصیرت حاصل ہو گئی ہے۔ اس لیے امید ہے کہ میرے معروضات پر توجہ ہو گی اور انھیں مجذوب کی بڑ کہہ کر نظر انداز نہ کیا جائے گا۔

ہمارا نصب العین یہ تھا کہ ہم آزادی کے بعد بیس سال کے اندر جبریہ اور مفت ابتدائی تعلیم عام کر دیں گے۔ ابھی ہم اپنی منزل سے بہت پیچھے ہیں۔ اس کے ساتھ اُن طلبہ کی جو بیچ میں پڑھنا چھوڑ دیتے ہیں، تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ تعلیمی حلقوں میں ابتدائی تعلیم کی اہمیت کا احساس ضرور ہے، مگر عملی طور پر اب بھی ہماری ابتدائی تعلیم کا ڈھانچہ کمزور ہے، بے مقصد اور رسمی ہے اور نہ یہ طالب علم کی شخصیت کو استوار کرتا ہے اور نہ اس کی تخلیقی صلاحیت کو بیدار کرتا ہے اور نہ اسے مادری زبان میں وہ دستگاہ دیتا ہے، جس کی ضرورت ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہم نے گاندھی جی اور ذاکر حسین کے بنیادی تعلیم کے تصوّر کو سہاری بغیر سمجھ کر چوما اور چھوڑ دیا۔ گاندھی جی کی دوربین نظر اس حقیقت پر تھی کہ کسی ملک میں ابتدائی تعلیم عام کرنے کے لیے جس بڑی رقم کی ضرورت ہوگی اس کی فراہمی موجودہ حالات میں ممکن نہیں ہے اس لیے وہ چاہتے تھے کہ ان مصنوعات کی فروخت سے جو بچے تیار کریں، اسکول کا خرچ پورا کیا جائے۔ ہاتھ سے کام کرنے کی اہمیت اور بچے کی نشوونما میں اس کے رول کو وہ سمجھتے تھے۔ ذاکر صاحب نے خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے بچپن

---

* پروفیسر آل احمد سرور، ڈائرکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر۔

کے تیار کیے ہوئے مال کے فروخت کی مخالفت کی۔ انھیں اندیشہ تھا کہ اس طرح خونِ جگر مالِ تجارت بن جائے گا لیکن ہاتھ کے کام کے ذریعہ سے ذہن کی تعمیر اور شخصیت کی استواری پر دونوں کی نظر تھی۔ یہ ضرور ہے کہ زیادہ تر کتائی پر توجہ سے اس نظریے کی افادیت محدود ہوئی اور ہمارے سیاسی اور دفتری نظام نے اس لیے جلد سے جلد اس سے رہائی حاصل کرلی۔ اگر آج بھی اس پر عمل کیا جائے اور ہر علاقے اور دیہات کے پیشوں کو مدِ نظر رکھ کر ہاتھ کے کام کو ابتدائی تعلیم میں مرکزی اہمیت دی جائے تو میرا خیال ہے کہ ہم بہت جلد جبری اور ابتدائی تعلیم کے نشانے تک پہنچ سکیں گے، ورنہ بڑھتے ہوئے اخراجات، تنخواہوں کے اضافے اور لال فیتے کے استبداد کی وجہ سے ہم مکمل ابتدائی تعلیم کے خواب کو کبھی پورا نہ کرسکیں گے۔ اب بھی پیشہ ورکنبوں میں اس ابتدائی تعلیم سے وحشت موجود ہے جو انھیں کلرک بناتی ہے، پیشے میں ان کی مدد نہیں کرتی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ خود کشمیر میں قالین بافی کی صنعت کے فروغ کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ والدین بچوں کو اسکول سے جلد اٹھا لیتے ہیں تاکہ ان کی نرم انگلیوں سے وہ کام لے سکیں جو بڑی عمر کے کارکنوں سے ممکن نہیں ہے۔ اگر ان کی ابتدائی تعلیم قالین بافی کے گرد ہوتی اور کام میں ان کی مہارت ان کی کامیابی کا زینہ ہوتی تو اُن کو ذہنی کشادگی بھی نصیب ہوتی اور اُن کے کام کا ایک بڑا حصہ اسکول کے اخراجات کے لیے بھی کام آتا۔ نظری تعلیم اور عملی تعلیم میں فرق ہے اور عملی تعلیم کی ملک کو زیادہ ضرورت ہے اور تعلیمی نقطۂ نظر سے یہ بات مسلّم ہے کہ کام ذہن کی کلید ہے اور اسے محور بنا کر زبان، ریاضی اور گرد و پیش کی دنیا کا علم عطا کیا جاسکتا ہے۔ آزادی سے پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے امتیاز کی وجہ یہی تھی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ابتدائی تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت دی تھی اور اس سلسلے میں بنیادی تعلیم کے علاوہ دوسرے تجربے بھی کیے تھے۔ ہمارے سیاسی رہنماؤں نے ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے ماہرِ تعلیم کو بہار کا گورنر، نائب صدر جمہوریہ اور صدر جمہوریہ بنا کر بڑی غلطی کی۔ انھیں ملک کا وزیر تعلیم بنانا چاہیے تھا۔ مجھے علم ہے کہ جواہر لال نہرو کے ذہن میں یہ بات تھی مگر کانگریس پارٹی کچھ اور چاہتی تھی اس نے ذاکر صاحب کے ۱۹۴۶ء میں عارضی وزارت میں شامل نہ ہونے کو کبھی معاف نہ کیا۔ ذاکر صاحب کو بڑی رفعت اور بلندی ملی مگر ملک آزادی کے بعد ہی سے اس دور کی سب سے بڑی فعّال اور جامع تعلیمی شخصیت کی صحیح سمت میں رہنمائی سے محروم ہوگیا۔

ثانوی تعلیم کی صورتِ حال ابتدائی تعلیم سے کسی طرح بہتر نہیں ہے۔ ہم نے اس منزل پر مادری زبان کو تو مناسب اہمیت دی ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ ہمارے عام اسکولوں میں وہ معیار ابھی نہیں آیا ہے جو پبلک اسکولوں میں ہے۔ پبلک اسکولوں کے متعلق بھی ہمارا رویّہ قابلِ غور ہے ہم عام طور پر اس بات کی مذمت کرتے ہیں کہ پبلک اسکولوں کے طلبہ، ہماری قومی زندگی کے دھارے سے کٹے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ زیادہ تر خوشحال طبقے کی پوری تعلیمی اور دفتری نظام میں بقا اور ترقی کا ذریعہ ہیں۔ مگر ہم نے عام اسکولوں میں ان کے معیارِ تعلیم تک پہنچنے کی کوئی کامیاب کوشش نہیں کی، دوسرے ہم نے پورے نظامِ تعلیم میں ثانوی تعلیم کے مرکزی رول کو پوری طرح نہیں سمجھا۔ دراصل کسی ریاست کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ اپنے سب شہریوں کو اعلا تعلیم ضرور دے۔ اس کا یہ فرض ضرور ہے کہ اسے ایسی ابتدائی تعلیم اور ثانوی تعلیم دے جو طالب علم کی شخصیت کی استواری کے ساتھ اسے روزگار کے قابل اور ایک اچھا شہری بنا دے۔ اگر ابتدائی تعلیم میں کسی ہاتھ کے کام کی مرکزی اہمیت ہو اور اس کے ذریعے سے زبان، ریاضی اور گرد و پیش کا کچھ علم دیا جاسکے تو ثانوی تعلیم کی منزل پر طالب علم کو سائنس، جغرافیہ، تاریخ اور تین زبانوں کے علم کے ذریعے سے ایسی استعداد عطا کی جاسکتی ہے کہ وہ زندگی میں قدم رکھ سکے۔ زبان کی تعلیم کے سلسلے میں سہ لسانی فارمولا' ایک اچھا فارمولا ہے مگر اس پر صحیح طور سے عمل بہت کم ہوا ہے۔ استادوں کی مناسب تربیت نہیں ہوتی، وہ عام طور پر اپنے کام سے لگن نہیں رکھتے کچھ پرائیویٹ ادارے جن کے چلانے والوں میں لگن اور جذبہ ہے بہت اچھے ہیں، مگر عام پرائیویٹ اداروں کی حالت سرکاری اداروں سے بھی خراب ہے۔ درسی کتابوں کی منظوری معیار کی بنا پر کم اور دوسرے مفادات کی بنا پر زیادہ ہوتی ہے۔ جن ریاستی حکومتوں نے خود درسی کتابیں تیار کروائی ہیں، ان میں یا تو ہمارے ملک کی تاریخ کو صحیح طور پر پیش نہیں کیا گیا ہے یا یہ کتابیں وقت پر دستیاب نہیں ہوتیں۔ این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی نے درسی کتابوں کی تیاری کے سلسلے میں ایک

اچھا قدم اُٹھایا ہے اور ریاستی حکومتوں کو اس کی ہمت افزائی کرنی چاہیے مگر این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کی کتابوں پر تنگ نظر حلقوں کے جو اعتراضات ہوئے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری جمہوریت ابھی ماضی پرستی، فرقہ واریت علاقائیت کے دُھندلکے کو چیر کر کھلی فضا میں قدم نہیں رکھ سکی ہے اور ابھی رہروِ راہِ محبت کا خدا ہی حافظ ہے، کیوں کہ ابھی اسے بہت سے سخت مقام جھیلنا ہیں۔ ملک میں ابھی ایسے پرائیویٹ اداروں کی کمی نہیں جو تعلیمی مقاصد کے تحت اور خدمت کے جذبے کے ساتھ نہیں بلکہ روپیہ کمانے کی ایک مشین کی طرح چلائے جاتے ہیں۔ ایسے اداروں پر کوئی روک نہیں۔ اس کے مہتمم افسروں سے میل ملا کر اور ان کی خاطر تواضع کر کے امدادی رقوم بھی حاصل کر لیتے ہیں، خاص تقریبات کے لیے بچوں سے چندہ بھی وصول کر لیتے ہیں، اساتذہ اور طلبا سے اپنے ذاتی اور سیاسی مقاصد بھی پورا کرا لیتے ہیں مگر کوئی نہیں پوچھتا کہ تمہارے مُنہ میں کتنے دانت ہیں؟ حال میں دس+دو کی جو اسکیم بنی ہے اس سے بہت سی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ اس کے ذریعے دسویں درجے تک تو ایک عمومی اور جامع تعلیم دی جاسکے گی۔ جس کا مقصد ذہنی صلاحیت، اظہار پر قدرت، گرد و پیش کا علم، عقلیت اور سائنسی مزاج پیدا کرنا ہوگا۔ مگر جمع دو کے مرحلے کو اگر چند مقبول پیشوں مثلاً انجینیری اور ڈاکٹری یا کامرس کی تعلیم تک محدود کر دیا گیا تو اس بھیڑ چال سے وہ پہلو داری اور ہمہ گیری نہ پیدا ہو سکے گی جو دراصل اس کا مقصد ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں چوکنا رہنا ہے کیوں کہ اس کے بعد تعلیم صرف ان لوگوں کے لیے ہونی چاہیے جو مخصوص صلاحیت رکھتے ہیں اور جس کی ملک کو ضرورت ہے اس لیے کالجوں اور یونیورسٹی کی تعلیم کو میں محدود کرنے کے حق میں ہوں۔ دفتروں کی ضروریات اور عام پیشوں کی ضروریات کے لیے بارھویں درجے تک لازمی تعلیم کافی ہے۔

کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم کا جو نقشہ آج ہمارے سامنے ہے اس سلسلے میں پہلی بات تو مجھے یہ کہنی ہے کہ اس میں سے آدھے طلبہ یہاں ہونے ہی نہیں چاہییں۔ بادی النظر میں یہ بات جمہوری اصولوں کے خلاف معلوم ہوتی ہے اور خواص پسند لگتی ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو ایسا نہیں ہے ہمارے ملک میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ میں اضطراب، بے چینی اور شورش ہے۔ کہیں کم اور کہیں زیادہ۔ اور اساتذہ اس شورش اور بے چینی کے خاموش تماشائی ہیں۔ چند اساتذہ کو چھوڑ کر عام طور سے طلبہ میں اساتذہ کا کوئی احترام نہیں اور کیسے ہو، جب اساتذہ یا تو پرائیویٹ ٹیوشن کے ذریعے سے اپنی جیبیں بھرتے ہیں یا رسمی طور پر کلاس لینے کو کافی سمجھتے ہیں اور طلبہ کی ذہنی تربیت کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے۔ یا صرف اپنے ہم خیال طلبہ کی پرورش میں لگے رہتے ہیں۔ طلبہ جانتے ہیں کہ ان کی محنت اور کوشش اور صلاحیت کے کوئی معنیٰ نہیں ہیں کیوں کہ ابھی ملازمتیں سفارشوں سے ملتی ہیں۔ وہ علم کیوں حاصل کریں، مطالعہ کیوں کریں، تحریری کام کرنے کی زحمت کیوں اٹھائیں جب بے پڑھے اور بے محنت کیے کام چل جائے۔ یہ بات Social Sciences اور Humanities میں زیادہ ہے، سائنس کے شعبوں میں کم، مگر وہاں بھی ہے۔ اساتذہ اگر برسوں پرانی معلومات دہراتے رہیں اور جدید معلومات سے بہرہ ور ہونے کی فکر نہ کریں تو اُن کا کچھ نہیں بگڑتا اور طلبہ اگر درس و تدریس مطالعے اور حصولِ علم کے دشوار گزار مرحلے کے بجائے اپنی اجتماعی طاقت (Student Power) کا سہارا لیں اور بالآخر بڑے بڑوں کو جھکنے پر مجبور کر دیں تو کیا حرج ہے۔ یورپ اور امریکہ میں اس صدی کی ساتویں دہائی میں جو شورش ہوئی تھی اس میں اور ہندوستان کے طلبہ کی شورش میں ایک بنیادی فرق ہے۔ وہاں مارکوزے اور مارکس کا نام لے کر تعلیمی نظام کے فرسودہ، میکانیکی اور دفتر شاہی کا شکار ہونے کے خلاف جدوجہد تھی اور یہ جدوجہد ان طلبہ کی طرف سے تھی جو بہترین صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اس کے پیچھے مغرب میں زندگی کے میکانکی، مصنوعی، بے روح ہونے کے خلاف احتجاج بھی تھا۔ ہمارے یہاں دراصل سستی سیاست، سطحی صلاحیت، فوری فوائد اور سہل پسندی کی خاطر تھا۔ ہاں اس کو ہوا حکومت کی بے حسی اور سیاست کی کجروی نے دی تھی۔ آزادی کے بعد ہونا یہ چاہیے تھا کہ اعلا تعلیم بامقصد، مخصوص اور قومی ضروریات کے پیشِ نظر ہوتی۔ مگر یہ ہر نئے سیاست داں کا کھلونا بن گئی۔ ہمارے یہاں چونکہ الکشن کے ذریعے سے پانچ سال کے لیے اقتدار ملتا ہے اس لیے برسرِ اقتدار افراد ان پانچ سالوں میں زیرِ زمین اور بنیادی کاموں کے بجائے نظر آنے والے، مرعوب اور متاثر کرنے والے، نگاہوں کو خیرہ کرنے والے کاموں سے کام کو

پھیلانا ضروری سمجھتے ہیں۔ چنانچہ کتنے سنگ بنیاد رکھے جاتے ہیں جن پر کوئی تعمیر نہیں ہوتی، کتنے ادارے بنتے ہیں جن کا صرف افتتاحیہ اجلاس ہوتا ہے، کتنی شاندار عمارتیں وجود میں آتی ہیں جن کے مکینوں کے متعلق جگر کا یہ مصرع صادق آتا ہے؎

سینہ خالی آنکھیں ویراں دل کی حالت کیا کہیے

اقبال نے جب کہا تھا کہ جہانِ تازہ کی نمود افکارِ تازہ سے ہوتی ہے کیوں کہ سنگ و خشت سے جہان پیدا نہیں ہوتے، تو غلط نہیں کہا تھا۔ مجھ سے ایک واقف کار نے بتایا تھا کہ نئی دہلی میں جو سرکاری عمارتیں آزادی کے بعد تعمیر ہوئی ہیں ان کی لاگت کا اندازہ لگایا جائے تو مرکزی حکومت کے پورے سال کے بجٹ کے برابر ہوگا۔ بہرحال شان دار عمارتوں کے شوق، نمائشی پروگراموں کے انعقاد، دفتر شاہی کے جال کے بڑھنے، تعلیم کے شعبے کو دوسرے شعبوں مثلاً تعمیرات، تجارت کے مقابلے میں کم تر درجہ دینے، انتظامیہ کو تعلیمی کارکنوں پر فوقیت دینے، کاغذ پر منصوبہ بنانے اور انسانی پہلو کو نظر انداز کرنے، یونی ورسٹیوں کی اندرونی آزادی میں مداخلت کرنے، اساتذہ سے فوری اور وقتی سیاست میں دلچسپی لینے کی توقع سے مجموعی طور پر ہمارا اعلا تعلیمی نظام بُری طرح متاثر ہوا ہے۔ بظاہر یہ بہت اچھی بات معلوم ہوتی ہے کہ آزادی کے بعد کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ مگر دراصل سیاسی رہنماؤں کا سستی مقبولیت کے لیے ضرورت سے زیادہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کا قایم کرنا دراصل ایک خطرناک میلان ہے، اس سلسلے میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی بے بسی باعثِ عبرت ہے کہ ریاستیں اس سے پوچھے بغیر اور اس کے مقرر کردہ پیمانوں کا لحاظ کیے بغیر نئی یونیورسٹیاں قایم کرتی جاتی ہیں۔ دہلی یونیورسٹی ایک زمانے میں ہندوستان کی چوٹی کی یونی ورسٹیوں میں شمار کی جاتی تھی، مگر ساٹھ سے اوپر کالجوں اور دو لاکھ کے قریب طلبہ نے اسے جس درجے تک پہنچا دیا ہے وہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دس، بارہ ہزار طلبہ کی گنجائش تھی وہاں تعداد اٹھارہ ہزار تک پہنچ گئی اور اس یونیورسٹی کے بہت سے مسائل اس ہجوم کی وجہ سے بھی ہیں۔ پہلی ڈگری کے لیے مادری زبان کے ذریعے سے تعلیم کو قومی پالیسی کا جز و مان لیا گیا ہے مگر مناسب تیاری کیے بغیر اور اچھی درسی کتابوں کی تصنیف و تالیف کیے بغیر، سستے تراجم سے کام چلانے کی روش نے علمی معیاروں پر بُرا اثر ڈالا ہے۔ نصابات پر باقاعدہ نظرثانی کا کام ایک رسم بن گیا ہے اور یہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ شعبوں کے تعلیمی بورڈوں کے اجلاس وقت پر نہیں ہوتے اور مجبوراً وائس چانسلر کو پچھلے نصابات کو جاری رکھنے کے احکام دینے پڑتے ہیں۔ تدریس میں لکچر بازی کا سلسلہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ تحریری کام یا تو بالکل نہیں ہوتا یا برائے نام ہوتا ہے۔ ادبیات کی تعلیم میں خصوصاً استاد کے لکچر بے معنی ہیں اگر ان کے ساتھ متن کی تشریح اور تحریری کام نہ ہو۔ اوّل تو نصاب ہی جامع نہیں ہوتا اور اس میں سے بھی آدھا یا تین چوتھائی حصہ تعلیمی سال میں مکمل ہو پاتا ہے جس کی وجہ سے طلبہ صرف نصاب کے ایک حصے سے آشنا ہوتے ہیں۔ دوسرے، مطالعے پر بالکل توجہ نہیں ہوتی، تیسرے، اندرونی جانچ یا سال بھر کے کام کو حقیقی بنانے کے بجائے زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کا راستہ بنا دیا گیا ہے۔ ذاتی طور پر میں بیرونی ممتحنین کا سرے سے قائل نہیں، استادوں کو یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ اپنے طلبہ کے معیار کے متعلق فیصلہ کریں مگر یہ اچھا اصول ہمارے ملک میں اس لیے ناکام ہو رہا ہے کہ اساتذہ اپنا پورا کام نہیں کرتے اور طلبہ صرف نمبر حاصل کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں مقامی یا علاقائی یا فرقہ وارانہ ذہنیت بھی کام کرتی ہے۔ کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے سربراہ، سرآوردہ اشخاص کے استقبال، مختلف کمیٹیوں کے اجلاسوں، طلبہ کے مطالبات اور اساتذہ کے آپس کے جھگڑے سلجھانے میں اتنے مصروف رہتے ہیں کہ انھیں تعلیمی مقاصد، تعلیمی معیار، علمی ماحول، تخلیقی صلاحیت کی نشو و نما پر توجہ کرنے کا پورا موقع نہیں ملتا۔ قصور کسی ایک حلقے کا نہیں، سب ایک صورتِ حال کے اسیر ہیں، سب ایک اندھی دوڑ میں بھیے جاتے ہیں، غور و فکر کا کسی کے پاس وقت نہیں۔ کالجوں اور یونی ورسٹیوں کی ابتر حالت کا باعث دراصل تعلیمی حلقوں کو پوری آزادی نہ دینا اور ان کے ذریعے سے سستے مقاصد پورا کرنے کا میلان ہے۔ مگر اس میں اساتذہ کی کوتاہی بھی خاصی ہے۔ اساتذہ کی انجمنیں حیثیتِ فکر بیجا اصرار کم کرتی ہیں، اساتذہ کے لیے سہولیات پر زیادہ۔ وہ دوسروں کے احتساب میں سب سے آگے ہیں مگر اپنا احتساب نہیں کر سکتیں۔ گو ہمارے ایسے

لوگوں کی تعداد خاصی ہے جو درس و تدریس کو صرف ایک پیشہ سمجھتے ہیں اس سے کوئی خاص لگن نہیں رکھتے۔ وہ اپنے طلبہ کی ذہنی تربیت پر پوری توجہ نہیں کرتے۔ صرف انھیں کلاس میں لکچر دینا کافی سمجھتے ہیں یا انھیں اپنے اغراض کا آلۂ کار بناتے ہیں۔ اُن میں سچی دانش وری نہیں۔ ان میں DISSENT کی ہمت نہیں ہے۔ وہ ہر بات پر ہاں کہنے کے عادی ہیں۔ انکار برائے انکار غلط ہے مگر حرّیتِ فکر کبھی انکار کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔ اساتذہ کے انتخاب کا طریقہ بھی ناقص ہو گیا ہے اور باہر کے ماہرین عام طور پر مقامی ماہرین کی تائید کرتے ہیں اور کبھی بے روح تجربے اور کبھی اپنے مخصوص حلقے کی حمایت کی وجہ سے اچھے تعلیمی ریکارڈ کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ذاکر صاحب مجھ سے کہا کرتے تھے کہ جامعہ ملیّہ اسلامیہ میں تقرر کے وقت وہ استاد کی تعلیمی صلاحیت کے ساتھ اس کی شخصیت، اس میں علم کی لگن اور اعلا قدروں کی پاسداری کو بھی ملحوظ رکھتے تھے۔ اب ان باتوں پر کوئی توجہ نہیں کرتا۔ دراصل بڑی حد تک ہماری عقلیت سائنسی نقطۂ نظر، انسان دوستی، تہذیبی احساس اوپری ہے۔ اندر سے ہم لوگ خوف اور بے یقینی کا شکار ہیں، اور زندگی میں ہمارا مقصد یا تو حصولِ زر ہے یا حصولِ اقتدار۔ ہم جمہوریت اور مساوات کا نام لیتے ہیں، قومی یک جہتی کی بات کرتے ہیں، انسان دوستی کے علمبردار ہیں، جدید دور اور اس کے تقاضوں کا راگ گاتے ہیں، مگر اندر سے ہم ابھی جاگیردارانہ ذہنیت، مذہبی تنگ نظری، علاقائی تعصب لسانی عصبیت کے بندے ہیں۔ گاندھی جی کے نام پر شہر میں سڑکیں تعمیر کرتے ہیں اور دو اکتوبر کو ہر سال ان کی جینتی مناتے ہیں مگر گاندھی جی کو بھول چکے ہیں جواہر لال نہرو کی نظر، ان کے جمہوری تصورات، اُن کی منصوبہ بندی، ان کے سوشلزم کے انسانی چہرے کو بھی ہم سر لیتے ہیں مگر ان کی پُر سوز عقلیت جمہوریت پسندی اور عوام دوستی اور تعمیری جذبے کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بلا شبہ ہم نے یونی ورسٹیوں اور ریسرچ کے اداروں کے ذریعے سے سائنس دانوں کی ایک بڑی فوج تیار کرلی ہے۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ سائنس کے شعبے میں ہماری ترقی ہو رہی ہے مگر یہ تحقیق اب بھی مغرب کی غلام ہے۔ ابھی ہم جاپان کی سی خود کفیلی نہیں ہے۔ زراعتی کونسل کو چھوڑ کر ہم نے اپنے تحقیقی اداروں میں قومی ضروریات کے مطابق ریسرچ کم کی ہے اور

یہ ریسرچ زیادہ تر تجربہ گاہوں تک محدود ہے۔ اس کے اثرات ملک کی صنعت و حرفت پر زیادہ تر ذاتی اداروں کے ذریعے سے پہنچے ہیں۔ اجتماعی علوم میں ہمارا کوئی اپنا نظریہ نہیں ہے۔ نہ ہم نے ہندوستانی اقتصادیات یا ہندوستانی سماجیات پر ایسی کتابیں لکھی ہیں جن کی عالمی حیثیت ہو جیسی Asian Drama کی ہے۔ ادبیات میں تحقیق و تنقید کے معیار بے شک بڑھے ہیں مگر ان میں بھی نوآبادیاتی دور کی فکر زیادہ نمایاں ہے۔ اپنی بنیاد، جڑوں، تاریخ، تہذیب، ماحول اپنے اجتماعی لاشعور، اپنے تشخص کا احساس کم ہے۔ مجھ سے رالف رسل نے کہا کہ میں اردو میں جدید میلانات کی بات نہیں سُننا چاہتا، مجھے یہ بتایے کہ آپ کے کلاسیکی ادب کی خصوصیات اور امتیازات کیا ہیں۔ ظاہر ہے کہ یونی ورسٹیوں کو قدیم و جدید سب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ مگر قدیم کی مضبوط بنیاد کے بغیر جدید شعور کی صحت مند تعمیر نہیں ہو سکتی۔ اقبال نے درست کہا ہے:

نئی بجلی کہاں ان بادلوں کے جیب و دامن میں
پرانی بجلیوں سے بھی ہے جن کی آستیں خالی

مغرب سے استفادہ ضروری ہے مگر مغرب کی نقالی غلط ہے۔ اس لیے ہمارے یہاں اول تو لے دے کے کتاب خواں ہی ہیں صاحبِ کتاب نہیں ہیں، اور اکثر جو ہیں ان کے یہاں دوسروں کے اقوال زیادہ ہیں اپنی بات کم ہے اور کیسے ہو جب اُن میں بصیرت ہی نہیں ہے۔

اگر سرکاری بیانات، اعداد و شمار کی فہرست اور دفتروں کی تیار کی ہوئی رپورٹوں کو دیکھا جائے تو ہمارے یہاں نہ صرف خیریت ہے بلکہ ہم آزادی کے بعد ترقی کے میدان میں بہت آگے ہو گئے ہیں۔ ہم صنعتی ملکوں میں دسویں نمبر پر ہیں، ہم ترقی پذیر ممالک میں سر فہرست ہیں۔ ہمارے یہاں تعلیمی اداروں، تحقیقی اداروں، تجربہ گاہوں، یونیورسٹیوں اور کالجوں کی تعداد بہت بڑھی ہے۔ ہمارے ماہرین اور سائنس داں باہر کے ملکوں میں خاصی تعداد میں چلے جا رہے ہیں۔ ہماری تکنیکی اور صنعتی معلومات سے بہت سے ترقی پذیر ممالک فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ یہ سب باتیں صحیح ہیں مگر حقیقت صرف یہی نہیں ہے اور ادھوری حقیقت کو پوری حقیقت سمجھنا خطرناک گمراہی میں مبتلا کرتا ہے۔ آج کل تعلیم برائے ترقی کا نعرہ بہت عام ہے (Education [illegible] [illegible] اور ترقی کے معنی صارفیت — For Development

کے لیے جاتے ہیں۔ اس ترقی میں روحانی اور اخلاقی قدروں، انسان دوستی، جمالیاتی قدروں کے فروغ کے لیے گنجائش کم ہی ہے۔ ترقی کا یہ تصور یک رخا ہے۔ یہ پورے انسان کی ترقی اور ذہنی شادابی اور اخلاقی و جمالیاتی صحت کا ضامن نہیں ہے۔ اس میں ماضی سے وہ صالح رشتہ نہیں ہے جو شخصیت کی استواری اور ذہن کی جامعیت کے لیے ضروری ہے۔ یہ روشن خیالی پر زور دیتی ہے، مگر یہ روشن خیالی ہماری تاریخ اور تہذیب کی بنیادوں کو نظرانداز کرتی ہے۔ یہ مادی ضروریات کو ہر چیز پر مقدم کر دیتی ہے، یہ تخصیص پر بجا زور دیتی ہے۔ اس لیے کہ تخصیص کی اہمیت مسلم ہے مگر اس تخصیص کے لیے اس بنیاد کو ضروری نہیں سمجھتی جو تہذیب اور انسان دوستی مزاج اور ماحول ادبیات اور علوم کی روح کے عرفان سے وجود میں آتی ہے یہ خواص پسندی کی طرف بڑھ رہی ہے اور جدید کاری، صنعت کاری، مشین کی حکومت اور مانگے کے اجالے کی طرف لے جا رہی ہے۔ یہ عوامی ضروریات، دیہات کے حقائق، مسائل اور ضروریات مزاج اور میلان پر دھیان نہیں دیتی۔ اسے اپنے طبقے کی ترقی کے معیار پر پرکھتی ہے۔ یہ تخلیقی صلاحیتوں کو صرف مشینی ضروریات کی طرف ہانکنا جانتی ہے۔ یہ اُس BRAVE - NEW WORLD - کی طرح ہے جس میں شیکسپیر کے مطالعے کی گنجائش نہیں۔ یہ ایسا کلچر پیدا کر رہی ہے جو ریڈیو اور ٹی۔ وی، ویڈیو اور فلم کے ذریعے سے ہمیں یکسانیت، سطحیت، سستی جدیدیت کی طرف دھکیل رہا ہے۔ اس کی دانش وری، علم کی رعونت سکھاتی ہے علم کا انکسار نہیں، یہ عوام سے محبت کا دعویٰ کرتی ہے مگر عوام کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ یہ جمہوریت کے گن گاتی ہے مگر جمہوریت کی روح یعنی رواداری کم رکھتی ہے۔ اس کی نظر ہمیشہ سیڑھی کے اگلے زینے پر رہتی ہے۔ اس کے پاس مشن نہیں منصوبہ ہے۔ پالیسی نہیں پروگرام ہے۔ نظر نہیں نشانے روزمرہ جیسے ہیں۔ یہ حبِ زر اور ہوسِ اقتدار کی زد میں آگئی ہے۔ آج ہمارے دانش وروں کا بڑا حصہ اقتدار کی جبیں کی ہر شکن پر نظر رکھتا ہے عام زندگی کی سلوٹوں پر نہیں۔ ایک بہت چھوٹا طبقہ ہے جو اقتدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا ہے اور اس کے وقتی اور فوری پروگرام کی نا شفی بخش واضح کر سکتا ہے۔ ایک طبقہ ایسا ہے جو سائنس کے علم سے مالا مال ہے مگر سائنسی نظر تجربہ گاہ میں چھوڑ آتا ہے اور روزمرہ زندگی میں توہم پرستی، تنگ نظری اور اندھی ماضی پرستی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ طبقہ دُہری زندگی بسر کرتا ہے، دُہری سوچ کا شکار ہے، دہری بات کرتا ہے۔ ایک زبان ہم پیشہ لوگوں کے سامنے یا پبلک کے لیے، دوسری اپنی نجی زندگی میں۔

اصلیت یہ ہے کہ آزادی کے بعد جو بڑھوتری (GROWTH) ہوئی ہے اس نے بھی بہت سے مسائل پیدا کیے ہیں۔ اُس نے ہماری زندگی میں توازن نہیں رکھا۔ اگر ترقی میں توازن ہوتا، اگر احکامات کے ساتھ احتساب بھی آتا، اگر حقوق پر اصرار کے ساتھ فرائض کا عرفان بھی ہوتا، اگر بنیادی ضروریات اور تن آسانی میں فرق کیا جاتا، اگر جمہوریت کی ذمے داریوں پر نظر ہوتی، صرف اس سے اپنا مطلب نکالنے پر نظر نہ ہوتی، اگر ہم فرد کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور فرد کی آزادی کو تسلیم کرنے کے معنی فرد کے من مانی کرنے اور سماجی تقاضوں سے بے نیاز ہونے کے نہ سمجھتے، اگر پیشوں کی گروہ بندی (Trade Unionism) استادوں، طالب علموں، عام کارکنوں میں اپنے حلقے کے مفادات سے لگاؤ اور سماجی خیر سے بے نیازی نہ سکھاتی، تو مسئلہ اتنا گمبھیر نہ ہوتا مگر ہمارے تعلیمی اداروں کا المیہ یہ ہے کہ وہ سماج اور سماج کے سربراہوں اور طاقت رکھنے والے عناصر پر اپنے علم و عرفان، اپنی قدروں اور اپنی نظر کا اثر کم ڈال پاتے ہیں۔ اس نظر سے برسرِ اقتدار طبقہ عوام کو فریب میں رکھنے کا کام لیتا ہے اور بس۔ ہاں یہ ادارے برسرِ اقتدار طبقے کی ہوسِ زر اور ہوسِ اقتدار اور ترقی کے یک رُخے تصور سے متاثر ہوئے ہیں اور ان کے مشاغل سے وہ درد و سوز وہ آرزومندی وہ لگن وہ مشن کا احساس کم ہوتا جا رہا ہے جو اُن کی خصوصیت ہے اور جس کے پھیلنے اور عام ہونے اور عوام کے دلوں میں اتر جانے سے زندگی، زندگی بنتی ہے ہماری اعلا تعلیم، ہمارے سماجی حالات کی رہنما نہیں ہے، اُس کی اسیر ہے اس کا المیہ یہ ہے کہ یہ احتجاج کیے بغیر اس سیلاب میں بہہ جانے کے لیے آمادہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایام کی راکب نہیں ایام کی مرکب ہے۔

پھر کیا کیا جائے؟ مارکس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس نے مرض کی صحیح تشخیص کی تھی مگر اس کا علاج یک رُخا تھا۔ ہر طبیب فوری ضروریات اور دور رس تقاضوں پر نظر رکھتا ہے، ہمیں فوری ضروریات پر گم ہو نا چاہیے دور رس نتائج پر بہر حال نظر رکھنا ہے۔ میرے نزدیک حسبِ ذیل اقدامات

موجودہ مشکلات کے حل میں قرار واقعی مدد دے سکتے ہیں۔

۱۔ تعلیم کا مسئلہ ہر معنیٰ میں قومی مسئلہ مان کر آگے بڑھنا چاہیے اور مرکز اور ریاستوں کو اپنے دائرۂ کار کو متعین کرتے ہوئے تعلیم کے مجموعی نقشے کے متعلق ایک واضح تصور پیدا کرنا چاہیے۔

۲۔ تعلیمی ضروریات کو مادی ترقی کے دوسرے شعبوں پر ترجیح دینا چاہیے کیونکہ تعلیم انسانی وسائل کا Investment ہے۔ وزارتِ تعلیم کو مرکز اور ریاست دونوں کی سطح پر کلیدی اہمیت دینی چاہیے۔

۳۔ تعلیمی منصوبے دس سال کے ہونے چاہئیں۔ ابتدائی تعلیم اور ثانوی تعلیم سب کے لیے ہونی چاہیے۔ اعلا تعلیم صرف اُن لوگوں کے لیے جو اس کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جیسا کہ ایل۔ کے۔ جھا نے کہا ہے۔ سرکاری ملازمتوں کے لیے ثانوی تعلیم کافی ہونی چاہیے اور ہر پیشے میں اپنی ضرورت کے مطابق تقرر کا حق اُس پیشے کو دینا چاہیے اور یہ تقرر مقابلے کے امتحان کے ذریعے ہونا چاہیے۔

۴۔ ابتدائی تعلیم میں کام کو محور بنا کر مادری زبان اور آخری دو سالوں میں سرکاری یا علاقائی زبان، یا اگر یہ مادری زبان ہو تو انگریزی یا کوئی جدید ہندوستانی زبان سکھانی چاہیے۔ ابتدائی منزل پر مادری زبان ذریعۂ تعلیم ہونی چاہیے اور اگر یہ سرکاری زبان مختلف ہو تو سرکاری زبان ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے آخری دو سالوں میں پڑھائی چاہیے۔

۵۔ نصاب ماحول کے مطابق ہونا چاہیے۔

۶۔ ثانوی منزل پر مادری یا سرکاری زبان کے ذریعے سے تعلیم دینا چاہیے اگر مادری زبان سرکاری زبان سے مختلف ہے تو سرکاری زبان ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھانا چاہیے۔ اس کے علاوہ تیسری زبان انگریزی ہونا چاہیے۔

۷۔ ثانوی منزل میں دسویں درجے تک تین زبانوں کے علاوہ حساب، سائنس جغرافیہ اور تاریخ لازمی طور پر اور ایک اختیاری مضمون پڑھانا چاہیے جس میں کلاسیکی زبانیں یا کوئی کام شامل ہو۔

۸۔ دسویں درجے کے بعد اگلے دو سال تک طالب علم کی استعداد کے لحاظ سے الگ الگ گروپ ہونے چاہئیں اور اُن میں تمام سماجی اور قومی ضروریات کی گنجائش ہونی چاہیے۔

۹۔ کالجوں میں مضامین کا انتخاب صرف طلبہ پر نہ چھوڑنا چاہیے بلکہ ان کی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے ایسا انتخاب کرنا چاہیے کہ ادبیات کے ساتھ کوئی سماجی علم اور سماجی علوم کے ساتھ کوئی ادب ضرور ہو۔ ہر کالج میں کسی خاص پہلو کی تخصیص پر توجہ ہونی چاہیے۔ کالجوں میں انگریزی [illegible] پر پڑھائی چاہیے تاکہ عالمی نظر اور معیار کا التزام کیا جا سکے۔ سائنس کے طلبہ کو انگریزی کے ذریعے سے سماجی علوم اور انسانی علوم (Humanities) کی روح سے آشنا کرنا چاہیے اور اسی طرح ادبیات اور سماجی علوم کے طلبہ کو سائنس کے مبادیات کا علم فراہم کرنا چاہیے۔

۱۰۔ کالج کی منزل پر لکچروں سے زیادہ تحریری کام پر توجہ ہونی چاہیے، جس کے بغیر امتحان نامکمل سمجھا جائے۔

۱۱۔ یونیورسٹی میں داخلہ محدود ہونا چاہیے۔ ہر شعبے کو اساتذہ کی تعداد اور تعلیمی وسائل کی سہولت کے مطابق داخلوں کی تعداد رکھنی چاہیے۔ کچھ عرصے تک پس ماندہ طبقوں کے لیے ایک تہائی نشستیں محفوظ کی جا سکتی ہیں۔

۱۲۔ تدریس کا موجودہ طریقہ بدلنا چاہیے اور سال بھر کا پروگرام بنا کر مشقوں، مضامین اور مطالعے کی رپورٹوں کی بنا پر اور آخر میں امتحان کی بنا پر طلبہ کی صلاحیت کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ امتحانات سوالات کے بینک کے ذریعے سے لیے جائیں۔ ممتحن وہی ہوں جنھوں نے درس دیا ہے مگر نتیجے کی تیاری کے وقت باہر کے ماہرین کو شریک کر کے اُن کی رائے کو مناسب اہمیت دی جائے۔

۱۳۔ اساتذہ کے تقرر میں صرف تعلیمی معیار کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اس تقرر میں تعلیمی ریکارڈ کو مناسب اہمیت دینی چاہیے اور صرف انٹرویو کے تاثر کو کافی نہ سمجھنا چاہیے۔ انتخاب کرنے یا رد کرنے کے وجوہ تحریر میں آنے چاہئیں اگر ماہرین کی اکثریت ان کے تقرر کے حق میں نہ ہو تو وہ تقرر نہ کرنا چاہیے۔

۱۴۔ پہلا تقرر صرف تین سال کے لیے ہونا چاہیے، اس کے بعد استاد کی تدریس کے معیار اور مطبوعہ کام اور اچھے طلبہ کے تحریری تاثر کی بنا پر اُستاد کو مستقل کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس کا کام تسلی بخش نہ ہو تو اُس کی ملازمت ختم کر دینا چاہیے۔ اگر معیار اطمینان بخش نہ ہو مگر بہتری کا امکان ہو تو تین سال کا اور موقع ملنا چاہیے، اس کے بعد یا تو اسے مستقل کیا

جائے یا اس کی ملازمت ختم کی جائے۔

۱۵۔ تدریس میں اعلا صلاحیت اور تحقیقی کام دونوں کو یکساں اہمیت دینی چاہیے اور دونوں پر اصرار کرنا چاہیے۔

۱۶۔ کوشش کرنا چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ اساتذہ یونی ورسٹی کے کیمپس میں رہیں اور صرف تدریس کے فرائض انجام نہ دیں بلکہ یونیورسٹی کی علمی فضا میں پورا حصہ لیں اور طلبہ سے ربط ضبط رکھیں۔

۱۷۔ طلبہ اور اساتذہ میں حریتِ فکر پیدا کرنا چاہیے۔ ان میں سیاسی شعور پر اعتراض نہ کرنا چاہیے انھیں اسٹڈی سرکل بنانے جلسے کرنے اور بحث و مباحثہ کرنے کی پوری آزادی ہونی چاہیے مگر کسی تخریبی کارروائی کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔

۱۸۔ اساتذہ کے لیے مناسب تنخواہوں کے علاوہ رہائش کی سہولیات، طبّی سہولیات اور کتابیں خریدنے کی سہولیات پر اصرار کرنا چاہیے۔

۱۹۔ نصابات پر باقاعدہ نظر ثانی، توسیعی لکچروں اور سیمیناروں اور اساتذہ کے کام کی اشاعت کو اہمیت دینی چاہیے اور اس کے لیے مناسب وسائل مہیا کرنے چاہییں۔

۲۰۔ یونی ورسٹیوں میں انتظامیہ کو تعلیمی سکٹر (Sector) پر حکومت کی اجازت نہ دینی چاہیے۔ یونی ورسٹیاں اساتذہ اور طلبہ سے بنتی ہیں انتظامیہ سے نہیں۔

۲۱۔ یونیورسٹیوں کی اندرونی خود مختاری کا احترام ہر حکومت کا فرض ہونا چاہیے۔

بقول ڈاکٹر ذاکر حسین تعلیم کا کام ریاضت چاہتا ہے۔ اسے سیاست کی وقتی ضروریات اور اقتدار کی مصلحتوں کا اسیر نہ ہونا چاہیے۔ اساتذہ کو حکومت کو مشورہ دینا چاہیے مگر حکومت کا جزو نہ ہونا چاہیے۔ انھیں (Pressure) انکار سے بھی حسبِ ضرورت کام لینا چاہیے۔ جب آندرے مالرو، ڈیگال کی حکومت میں شامل ہو گیا تو سارتر نے اس پر اعتراض کیا۔ اس نے کہا کہ دانش وروں کو اقتدار کے حلقے سے باہر رہ کر حکومت کی مدد کرنی چاہیے اور باہر رہ کر ہی حسبِ ضرورت وہ اس پر نکتہ چینی کر سکتے ہیں۔ سچی دانش وری بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو تو قوم بے یقینی، ذہن کی ویرانی، قدروں کے افلاس کا شکار ہو جاتی ہے اور فکر کے اندھیرے میں بھٹکتی ہے۔ یہ ہو تو قوم کو روشنی ملتی ہے۔ فکر کی صلابت ہاتھ آتی ہے، پُرسوز عقلیت کی چاندنی میسر آتی ہے، روایت پرستی نہیں روایت کی پاس داری آتی ہے، تجربے کی ہمت اور حرارت عطا ہوتی ہے مگر تجربوں سے چکاچوندھ نہیں ہوتی، مشین سے کام لینا آتا ہے، مشین کی حکومت نہیں ہوتی، خود شناسی اور خود اعتمادی آتی ہے مگر اسے سماج کے نصب العین اور اس کی صلاح و فلاح سے ہم آہنگی سکھائی جاتی ہے۔ نئی نسل سے ہمدردی آتی ہے اور قانونِ باغبانیِ صحرا کا علم ہوتا ہے مگر نئی نسل کو وہ شمع دکھائی جاتی ہے جس کی روشنی میں وہ اپنا راستہ پکڑ سکے۔ اُس پر اپنے خیالات کی مُہر نہیں لگائی جاتی۔ تعلیم پیشہ نہیں ہے قوم کی پاسبانی ہے، اس دنیا میں اسی کو بار ہونا چاہیے جو اس کے تقاضوں کو پورا کر سکے، جو اس کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کا اہل ہو۔ اس میں اپنے آپ کو برابر ذہنی طور پر بیدار رکھنا ہوتا ہے، ذہن کی ہر کھڑکی کھلی رکھنی ہوتی ہے تاکہ ہر طرف کی ہواؤں اور ہر طرف کی کرنوں سے مستفید ہونے کا موقع مل سکے، مگر اپنی بنیادوں، اپنی دھرتی، اپنی فضا، اپنے ماحول کو ہر وقت ملحوظ رکھنا پڑتا ہے اور ہر وقت اپنے آپ کو تجربات کے لیے تازہ دم رکھنا ہوتا ہے۔

میں موجودہ تعلیمی صورتِ حال سے ملول و حزیں ہوں مگر مایوس نہیں ہوں۔ مجھے اکثر پیر رومی و مریدِ ہندی کا یہ مکالمہ یاد آتا ہے؛

مریدِ ہندی:

ہند میں اب نور باقی ہے نہ سوز
اہلِ دل اس دیس میں ہیں تیرہ روز

پیرِ رومی:

کارِ مرداں روشنی و گرمی است
کارِ دوناں حیلہ و بی شرمی است

قاضی عبدالستار*

سترھویں قسط

خالد بن ولید

گرجا کی عمارات دیکھتے ہوئے مسجدِ اقصیٰ میں قدم رکھا تو خشیتِ الٰہی کا غلبہ ہوا۔ محرابِ داؤد میں سجدہ ادا کیا اور دیر تک بیٹھے رہے۔ کعب احبار کے ساتھ انبیائے سابقین کی یادگاروں کی زیارت کی اور اسی کی رہنمائی میں ساری عمارتوں کا دیدار کرتے رہے اور احوال سنتے رہے۔

ابھی آفتابِ خلافت فلسطین کے آسمان پر روشن تھا کہ یونانیوں کے قافلے نکلنے لگے۔ دفینوں اور خزینوں سے لدے ہوئے کارواں گزرنے لگے۔ چاند تاروں کو حسن کا سبق دیتی عورتوں کے کھلے ڈھکے چہروں سے راستے جگمگانے لگے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے اوباش اور عیاش نوجوانوں کی بے حیا آنکھوں میں خطرناک منصوبے چمکنے لگے۔ ابروئے خلافت کی ایک شکن پر فلسطین سے مصر کی سرحد تک تمام شاہراہوں پر تلواریں کھڑی ہو گئیں۔ سرحدی چوکیوں کو فرمان پہنچا کہ دس دس کوس تک اترنے والے ہر قافلے کی حفاظت تمہارے نام لکھی گئی۔ کسی کی دولت اور کسی کی عورت پر کوئی ہاتھ دراز نہ ہو سکا اور تمام کارواں مصر کی سرحد میں داخل ہو گئے۔

خلیفۂ اسلام کے کوچ کا اعلان ہوتے ہی وہ سب کچھ ہونے لگا جس کا اندیشہ تھا۔ ایک ایک گرجا تبلیغ و اشتہار کا مرکز بن گیا۔ صلح نامے کی شرطیں جھنڈوں پر چڑھا دی گئیں۔ اصطباغ کے مسئلے کو ھرقل نے مشرق سے مغرب تک تمام عیسائیوں کی مذہبی حمیت اور قومی غیرت کا سب سے بڑا پرچم بنا دیا۔ جہاد کا فتویٰ دے دیا گیا۔ عام بھرتی کا اعلان ہونے لگا۔ ایلیا میں موجود تمام شاہی فوج جس نے صلح کا یقین ہوتے ہی شہریوں کا لباس پہن لیا تھا اور ہتھیار دفن کر دیے تھے ہتھیار سجنے لگی۔ گرجوں کے میدانوں، قدیم محلوں اور عظیم مسکنوں کے صحنوں میں تربیتی کیمپ کھلنے لگے۔ مصر و شام کے سرحدی گاؤں تک ہرقل کی چھاؤنی بننے لگے۔

سیف اللہ قنسرین میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ آسودہ تھے اور ان کے حکم اور ذاتی نگرانی میں مرعش سے انطاکیہ تک کھجوروں کے باغات لگائے جا رہے تھے۔ دریاؤں سے نہریں نکالی جا رہی تھیں۔ بنجر زمینوں کو سیراب کیا جا رہا تھا۔ پیداوار میں پیوند لگایا جا رہا تھا۔ مسجدیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ مکانات بنائے جا رہے تھے۔ آہن گروں کی بستیاں بس رہی تھیں کہ ہتھیار تیار ہوتے رہیں۔ جنگلوں کے کناروں کی وادیاں گھوڑوں کے فارموں کے لیے نامزد ہو رہی تھیں۔ چمڑے کی دباغت کے لیے یمن سے کاریگر بلائے جا رہے تھے۔ تجارت کی منڈیوں اور بازاروں کو سہولتیں دی جا رہی تھیں۔ ولایتی سامان کے کاروانوں کے لیے رعایتیں تجویز ہو رہی تھیں کہ افواہوں کے پرندوں کی ڈاریں اترنے لگیں اور سب اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے کہ ہرقل اپنی فوج کے ساتھ پورا یورپ سمیٹ لایا ہے اور اپنے محبوب شہر دمشق کی یلغار کے لیے اٹھنے والا ہے۔ جزیرہ کی پوری آبادی کے ہاتھ پیروں والے جوان سرحدی جنگلوں اور پہاڑوں کے خفیہ مقامات پر جمع ہونے لگے ہیں۔ گرجاؤں میں اتوار کی عبادتیں طویل

* پروفیسر قاضی عبدالستار، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

ہونے لگیں۔ اسقفوں کے گھروں پر آدھی آدھی رات تک جلسے برپا رہنے لگے۔ بڑے بڑے پشتینی تاجر اپنا سامان سستے داموں پر لٹانے لگے۔ کاروان ایک ایک کوچ میں دو دو منزلیں طے کرنے لگے۔ مخبر میل بہ میل سنانے لگے اور شبخون کے خوف سے آبادیوں کو ڈرانے لگے۔ سیف اللہ نے مجبور ہو کر بستیوں کی تالیف قلب کے لیے ہر چہار جانب فوجیں تعینات کر دیں اور حکم دیا کہ دس دس کوس تک سڑکوں اور بستیوں کا دورہ کیا جائے۔ اور خود اپنے رات کے گشت کی مدت بڑھا دی۔ اس کے باوجود زمین سے دہشت ابل رہی تھی اور آسمان سے خوف برس رہا تھا کہ آدھی رات کے وقت امین الامت کے قاصد نے دستک دی جو پانچ سو نامی گرامی سواروں کی حفاظت ساتھ لے کر آیا تھا۔ تردد کے ساتھ نامہ کھولا تحریر تھا:

"کئی لاکھ فوج کے ساتھ ہرقل شام کی سرحد تک پہنچ چکا ہے۔ آرمینیا اور جزیرہ کی فوجیں سرحدوں کی جانب حرکت کر چکیں۔ امان پائے ہوئے عیسائی تلواریں تیز کر رہے ہیں۔ ہم نے دمشق اور حمص سے جو جزیہ وصول کیا تھا وہ واپس کر دیا دربارِ خلافت سے کمک مانگ چکے۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ اپنی فوج سوارہ کی حفاظت میں اہل و عیال کے ساتھ حمص کے لیے جنبش کیجیے۔ ہمارے دل و دماغ اور دست و بازو کو طاقت دیجیے۔"

خط پڑھ کر دیر تک سوچتے رہے لیکن دل کے کسی گوشے سے ایسی کوئی آواز نہ آئی جو مضمون کی تصدیق کر سکتی۔ تاہم امین الامت کے حکم کی تعمیل میں کوچ کا اعلان کر دیا۔ چپے چپے کی حفاظت کا انتظام کیا۔ پانچ ہزار نومسلم حبشیوں کو اطلسیں قبائیں پہنا کر رومی گھوڑوں پر چڑھا دیا۔ عراقی رسالے کے نوجوانوں کو ان کا افسر بنا دیا۔ حبشیوں کو اپنے اعتماد کی سند دینے کے خیال سے حرم ان کی نگہبانی میں چھوڑ دیا اور خود اتنی تیزی سے چلے کہ سات ہزار سواروں کے باوجود قاصد کے پہنچنے کے تیسرے دن حمص کے دروازۂ انطاکیہ پر جھنڈا کھول دیا۔ سیف اللہ کی آمد کا شور بلند ہوا تو سارا لشکر اسلام

پیشوائی کو نکل پڑا۔ ان کے جھنڈے کو دیکھتے ہی شمشیر الہیٰ، شیر اسلام اور فاتح عالم کے نعروں سے زمین تھرانے لگی، آسمان ہلنے لگا۔ ظہر کی اذان کے وقت تک مصافحہ اور معانقہ جاری رہا۔ اصحاب رسول اللہ کی گزارش پر حضرت بلال نے اپنی بے نظیر آواز اور بے محابہ جذبے سے اذان دی تو وہ مجنوں نے پیغمبر اسلام کی امامت کے مزے لوٹے تھے، رونے لگے۔ امین الامت کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

نماز کے بعد مجلس شوریٰ منعقد ہوئی۔ امیر شام نے ارشاد کیا

"تازہ ترین اطلاعات کے مطابق غنیم دو لاکھ کی جمعیت کے ساتھ بیس کوس کے فاصلے تک آ گیا ہے۔ جزیرہ سے تیس ہزار کی فوج نکل چکی۔ عرب و شام کی سرحد پر آباد عیسائی جہاد کے نشے میں چور کوچ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ہماری کمک پر آنے والا عراقی لشکر ابھی بہت دور ہے۔ امیر المومنین بنفس نفیس ایک لشکر کے ساتھ مدینہ منورہ سے جنبش فرما چکے۔ سپہ سالاروں کا اتفاق ہے کہ ہم کو حمص میں قلعہ بند ہو کر امیر المومنین کا انتظار کرنا چاہیے۔"

انھوں نے سانس لی تھی کہ سیف اللہ کھڑے ہو گئے۔ صدر نگاہ تک بیٹھے ہوئے نامداران حجاز اور شجاعان عرب پر نگاہ کی اور اس طرح مخاطب ہوئے جیسے میدان جنگ میں رجز پڑھ رہے ہوں۔

"اگر یہ صدر سپہ سالار کا حکم آخر ہے تو حمص کا شہر و قلعہ کیا چیز ہے، خالد کسی چوہے دان میں قید ہونے کو تیار ہے۔ لیکن اگر امین الامت میرا مشورہ سننا چاہتے ہیں تو میری رائے قطعی طور پر قلعے میں محصور ہو جانے کے خلاف ہے۔ ہم نے عرب و عراق و شام میں بڑی بڑی فوجوں کا تماشا دیکھا ہے۔ ہرقل کے اس نئے تماشے کو بھی دیکھ لیں گے۔"

مجمع لہریں لینے لگا۔

"یا ابا سلیمان! تمہاری شجاعت اور شہامت ہماری تلوار ہے، ہماری ڈھال ہے۔ لیکن جوش جہاد سے

دیوانے ہوتے ہوئے دشمن کو قلعہ بندی"۔

"آپ کی زبان سے قلعہ بندی کا لفظ سن کر جی چاہتا ہے کہ اپنی تلوار سے اپنی گردن کاٹ کر قدموں میں ڈال دوں۔ میں سیف اللہ ہوں یا امین الامت — دنیا کیسی ہی اور کتنی ہی تلواریں علم کرلے، خالد ان کے خوف سے حمص میں منہ چھپانے پر موت کو ترجیح دیتا ہے۔ اگر لشکرِ اسلام پر موت کا خوف طاری ہو چکا تو رب ذوالجلال کی قسم حکم دیجیے کہ میں بنی مخزوم کے آبرومند شہسواروں کے ساتھ نکلوں اور محمدی علم پر قربان ہو جاؤں۔ لیکن میری زندگی میں ممکن نہیں کہ محمدی علم کسی جھنڈے کے خوف سے کسی قلعے میں قید ہو جائے"۔

گرم مٹی کے پیدا کیے ہوئے، گرم موسم کے تربیت کیے ہوئے گرم غذاؤں کے پالے ہوئے سیف اللہ کے آنسوؤں پر آگ ہو گئے۔ تلواریں گھسیٹ کر کھڑے ہو گئے۔

"لشکرِ اسلام اور موت کا خوف؟"

"یا سیف اللہ! یہ آپ نے کیا کہہ دیا؟"

"حکم دے کر تو دیکھیے۔ ہم آگ کے طوفان پر گھوڑے چڑھا دیں!"

"اے بنی مخزوم کے آفتاب تیری رکاب کے لیے سارا عرب بنی مخزوم ہے"۔

مجلسِ شوریٰ جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت سے آتش کدۂ ایمان ہو گئی۔ صدر سپہ سالار کے سکوت کو رضامندی کا نام دے کر سارا لشکر حمص کی فصیل کے باہر صف بستہ ہو گیا۔ دشمن پر اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔

صدر سپہ سالار کی اجازت ملتے ہی ایک ایک کوچ میں چار چار قیام لپیٹے، بادلوں کی گرج اور بجلیوں کی چمک کو جرأت و جلال کا سبق دیتے، دریاؤں کو پھاڑتے، پہاڑوں کو روندتے، میدانوں کو چاک کرتے، ان وادیوں پر جا پڑے جہاں غنیم کا لشکر ہرقل کے احکامات کا انتظار کر رہا تھا۔ غیظ و غضب کا یہ عالم تھا کہ گھوڑے اور گدھے تک ذبح کر ڈالے۔ شام تک تمام پہاڑیاں خون سے لالہ زار ہو گئیں۔ یہ پہلی جنگ تھی جس نے دشمن کے کسی ایک سپاہی کو بھی ہتھیار ڈالنے کی مہلت نہ دی۔

میدانِ جنگ سے ایک منزل کے فاصلے پر امین الامت کو خبر دی گئی کہ سیف اللہ نے صرف ہراول کی طاقت سے غنیم کو کچل ڈالا تو سجدے میں گر پڑے۔ امیرالمومنین جابیہ پر نازل ہو رہے تھے جب قاصد نے فتح نامہ پیش کیا۔ سجدۂ شکر کے ساتھ واپسی کا فرمان جاری کر دیا۔

اب سیف اللہ کا آفتاب جلال اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ تمام مغرب ان کی تلوار کے خوف میں مبتلا ہو چکا تھا اور عالمِ اسلام میں ان کا نام فتح کا مترادف بن چکا تھا۔ ایک دنیا سیف اللہ خالد بن ولید کے نام پر مفتون ہونے لگی تھی اور سیف اللہ قنسرین میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ آرام کر رہے تھے۔ برسوں کی غیر معمولی جسمانی محنت نے چور چور کر دیا تھا کہ بنی کندہ کا شاعر اشعث بن قیس حاضرِ خدمت ہوا۔ دیر تک دونوں ہاتھوں کے بوسے لیتا رہا۔

"میں تو حمص کے ارادے سے نکلا تھا۔ سنا تھا کہ شیرِ اسلام کو حمص کی کچھار پسند آ گئی۔ حمص پہنچا تو آپ قنسرین کے لیے سوار ہو چکے تھے۔ تھکن تو کچھ اور کہہ رہی تھی لیکن دل چاہتا تھا کہ اس ہستی کو دیکھ لوں جس کی نظیر سے زمین و آسمان خالی ہیں۔ آخر دل کا کہنا مان لیا اور آپ کے دیدار سے امیر ہو گیا۔ میں نے کچھ اشعار کہے ہیں اجازت ہو تو عرض کروں"۔

حضرت خاموش رہے۔ نامورانِ عرب جو عسکری اور سیاسی فرائض سے حاضرِ خدمت تھے حلقہ بنا کر بیٹھ چکے تھے۔ قنسرین کے گلابوں کا عرق اور شہد کا شربت میزبانی کر چکا تھا۔ شیشے تک اپنا منہ کھولے ساکت بیٹھے تھے کہ شاعر شعر سرا ہوا۔

"اے شہسوارِ عرب تیرے گھوڑے کی رکابیں
ہرقل و کسریٰ کی گردن کا طوق ہو گئیں
ایک مدت سے فتح در بدر پھر رہی تھی۔

سیف اللہ کی تلوار نے آشیانہ عطا کر دیا
اس سال شام کے موسم سرما میں سورج نہیں نکلا
میں نے سبب پوچھا تو کہا کہ خالد سے ڈر لگتا ہے
میں نے موت سے پوچھا تو کراہتی کیوں ہے
بولی سیف اللہ کی خدمت کرتے کرتے تھک گئی ہوں
بانسے پوچھا کہ تم عقلمندی کی باتیں کیوں کرنے لگے
کہا خالد کا بھلا ہو ہم ناشتے میں بھی رومی سالاروں کا دماغ
کھاتے ہیں"

ہر شعر پر داد کی بارش ہوتی رہی۔ ایک ایک شعر کو دس دس بار سنا گیا۔ حاضرین نے داد کا حق ادا کیا۔ بنی اعمام حد سے گزر گئے۔ اشعث خاموش ہوا تو سیف اللہ اندر تشریف لے گئے۔ اُمّ لیلیٰ نے درہموں کے توڑے غلام پر لاد دیے۔ حضرت اپنے ہاتھ سے درہم اشعث کے سامنے رکھتے جاتے اور کہتے جاتے۔

"تمہارے فن کی قیمت نہیں ہے۔ چھوٹی سی نذر ہے۔
قبول کرلو۔ اس سے زیادہ کی بساط نہیں"

جہاں شہرت و اقبال کی سواری اترتی ہے وہیں حسد کے کتے بھونکنے لگتے ہیں۔ کدورت کے سانپ لہرانے لگتے ہیں۔ سیف اللہ کی شہرت اور سپہ سالار اسلام کے اقبال کا کہنا ہی کیا۔ تربیت رسولؐ سے مالامال دین داروں کی ارزانی نہیں ہوتی تو معلوم نہیں کیا ہو جاتا۔ پھر بھی اتنا تو ہونا ہی تھا کہ اس فن پروری کے افسانے بنالیے جائیں علم دوستی پر حاشیے چڑھائے جائیں۔ دربار فاروقی میں پرچے لگنے لگے۔ شکایات کے دفتر کھلنے لگے۔ انفرادی شہرت و اقبال کے اجتماعی نقصانات پر تقریریں ہونے لگیں۔ بیت المال کی تحریم اور اس کی خیانت کی تعذیب پر گفتگو ہونے لگی۔ درگزر سے پیدا ہونے والے خطرات کے پہاڑ اٹھائے جانے لگے اور امیر المومنین وہ شخص اعظم تھا جو اوامر و نواہی کی تعلیم اپنے گھر سے شروع کرتا تھا۔ عزیز قریب خالد بن ولید کی کسی لغزش کی طرف سے آنکھیں بند کرلینا فطرت کے خلاف تھا، حکمرانی کے تدبر کے منافی تھا۔ حاکم شام کو حکم ہوا کہ تحقیقات کی جائے۔ جرم ثابت ہونے پر خالد کو معزول کر دیا جائے۔ قاصد کو تاکید تھی کہ تعمیل حکم کی شہادت دے۔

امین الامت نے فرمان پڑھا اور قاصد کا بیان سنا تو ہل گئے۔ سارا دن سوچتے رہے، ساری رات مصلّے پر بیٹھے رہے۔ صبح اپنے ہاتھ سے تعمیلِ حکم میں طلب نامہ لکھا جیسے اپنے قتل کا محضر لکھ رہے ہوں۔ سیف اللہ نے طلب نامہ پڑھ کر خیال کیا کہ ہرقل نے شرارت کا کوئی نیا دروازہ کھول دیا یا بیت المقدس کی سیاست میں کوئی پیچ پڑ گیا۔ اس طرح اُٹھے جس طرح اُٹھنا اُن کا حق تھا۔ چار ہزار سواروں کے ساتھ شہروں اور قلعوں کے انتظام و انصرام کا معاینہ کرتے ہوئے دمشق میں داخل ہوئے۔

دارالحکومت کے اسی مقام پر جہاں فتح دمشق کے وقت امین الامت کے حکم پر تلوار نیام کی تھی یزید بن ابی سفیان، دمشق کے گورنر نے اسی وقت اس مسجد عظیم کی طرح ڈال دی تھی جسے عجائبات اسلام میں شمار ہونا تھا۔ مسجد اور قصر حکومت کے درمیانی میدان میں لشکر کو خیمے بپا کرنے کا حکم دیا اور خود جمعہ کی نماز کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔

نو تعمیر مسجد کا شامیانہ بھر گیا تو سیڑھیوں کے نیچے دور تک صفیں قائم ہوگئیں۔ مسجد میں قدم رکھا تو اللہ اکبر کے نعروں نے پیشوائی کی۔ جس صف میں کھڑے ہوتے اس سے اگلی صف کے بزرگ اپنے ساتھ انھیں بڑھالے جاتے۔ امین الامت نے مصافحہ کیا تو ہاتھ ٹھنڈے تھے آنکھیں رنجور، چہرہ اداس، اصحاب رسولؐ خاموش، فکرمند۔ سیف اللہ کچھ سوچنا چاہتے تھے، سمجھنا چاہتے تھے، جاننا چاہتے تھے کہ حضرت ابوعبیدہؓ خطبہ دینے کھڑے ہوگئے۔

کمزور دھندلی آواز میں ضروری مسائل کے علاوہ اجماع امت اور تنظیم ملت کے موضوع پر چند کلمات کہے اور بیٹھ گئے۔ ذرا سے توقف کے بعد حضرت بلالؓ اس طرح گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہوئے جیسے پیٹھ پر منوں بوجھ لدا ہوا ہے۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔ تمتمائے ہوئے چہرے پر پڑی ہوئی آبدار آنکھوں سے سیف اللہ کو دیکھا اور چیخ ماری۔

"امیر المومنین عمر بن خطابؓ کے حکم پر میں بلالؓ تم سے
سیف اللہ شیر اسلام خالد بن ولیدؓ سے سوال کرتا
ہوں"

پھر جیسے حضرت بلالؓ کی آواز غروب ہوگئی۔ الفاظ ختم ہوگئے۔

سیف اللہ کھڑے ہو چکے تھے ۔

" کہ اشعث بن قیس کو دس ہزار کی رقم کہاں سے دی؟"

سیف اللہؓ سن ہوگئے، سکتے میں آگئے، پتھر ہو گئے ۔

حضرتؓ نے تین بار اپنے سوال کو دہرایا۔ لیکن وہ شخص جس کی آواز پر ہزاروں نامداران عرب اپنی جانوں سے گزر جاتے تھے، اسی طرح خاموش کھڑا رہا۔

" تمہارا سکوت بیت المال کی خیانت پر استدلال کرتا ہے۔ یا اگر یہ ممکن نہیں تو تمہاری خاموشی اسراف کا اقبال کرتی ہے۔ اس لیے میں بلال امیرالمومنین عمر بن خطابؓ کے حکم پر تم کو سیف اللہ شمشیر اسلام خالد بن ولیدؓ کو معزول کرتا ہوں ۔"

دنیا کی کسی عبادت گاہ نے کسی پیغمبر کی زندگی میں بھی شاید ایسا نظارہ نہ دیکھا ہو جو مفتوح شام کی اس مسجد کا مقدر ہوا۔ بلالؓ نے خالدؓ کے سر سے وہ خود اتار لیا جو محمدؐ کی علم کے سائے میں بوڑھا ہو چکا تھا۔ جس کی ہر کڑی کسی نہ کسی تاریخ ساز فتح کی تاریخ تھی اور اُن ہی کے عمامے سے اُن کے ہاتھ باندھ دیے۔ ساری مسجد کھڑی ہو گئی۔ کہیں سے آواز آئی۔

" ابن حنتمہ (حضرت عمرؓ) کا حکم پورا ہو چکا۔"

" ہاتھ کھول دو ۔"

" کہیں ایسا نہ ہو کہ مسجد خون سے وضو کرنے لگے ۔"

وہ ہاتھ جنھوں نے ارتداد کا پورا جہنم بجھا کر ڈال دیا۔ عراق سے شام تک فتوحات کے ڈھیر لگا دیے۔ وہی بندھے ہوئے ہاتھ بلند ہوئے بھرائی آنکھوں نے کھنچتی ہوئی تلواروں کو دیکھا۔

" مسجد کا احترام کرنا سیکھو۔ صفیں درست کرو۔ امام کے حکم کا انتظار کرو۔ میں اپنا یہ انجام ابن حنتمہ کے حکم کی تعمیل کی خاطر نہیں۔ ختم المرسلینؐ کی اُمّت کی تنظیم کے نام پر قبول کرتا ہوں ۔"

ساری مسجد پر ایک ہولناک سناٹا طاری ہو گیا۔

پھر وہی آواز بلند ہوئی

" مدینے کی خلافت جو خدا کی علیمی اور تمہاری شجاعت کا انعام ہے، خالد کی زندگی میں خانہ جنگی کا دوزخ نہیں بن سکتی ۔"

ہاتھ کھلتے ہی مکبّر نے تکبیر کہی ۔ نماز جمعہ نماز جنازہ کی طرح پڑھی گئی ۔ امیر شام نے اوراد وظائف کے بعد نگاہ اُٹھائی تو چند اصحابِؓ رسول تسبیح لیے بیٹھے تھے ۔ ساری مسجد خالی ہو چکی تھی ۔ باہر نکلے تو سیڑھیوں سے سیف اللہ کے خیام تک جس طرف نگاہ اٹھتی آدمیوں کے غول نظر آتے جیسے سارا دمشق نکل پڑا ہو۔ اتنے ہجوم کے باوجود ایسا سکوت تھا کہ شام کے حاکم کو ڈر لگنے لگا۔ شمع رسالت کے پروانوں کو جلو میں لیے ہوئے گشت کرتے رہے ۔

ساری رات "مؤلفۃ القلوب" سے تعلق رکھنے والے وہ مردان بزرگ جو خلیفۂ اوّل اور خلیفۂ دوم کے انتخاب سے مطمئن نہیں تھے، مشورے کرتے رہے ۔ بنی ہاشم کے وہ بوڑھے شیر جو خلافت کو اپنی میراث خیال کرتے تھے، کچھار سے نکل کر گرجنے لگے ۔ بنی امیّہ کے وہ شہسوار جو سیف اللہ کے ہم رکاب تھے اور بنی اعمام تھے اور جن کے خون سے یرموک کا میدان سرخ رو ہوا گھوڑوں پر زین اور کاندھوں پر تلواریں رکھے تیوروں میں آگ جلائے آنکھوں میں آنسو بھرے سیف اللہ کے در دولت پر حاضر رہے۔ انصار کے سردار اور سردار زادے جو خلافت پر اپنے حق سے دست بردار نہیں ہوئے تھے، مجمع عام میں بلند آواز سے گفتگو کرنے لگے ۔ بیت المقدس اور حمص اور قنسرین کے راستوں پر سیاہ پوش سواروں کے سیاہ گھوڑے اُڑنے لگے ۔

(جاری ہے)

مصطفیٰ علی فاطمی*

سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ

حیدرآباد میں علم و ادب کی سرپرستی اور تعلیم کی ترقی کے سلسلے میں سلطان العلوم آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں والیٔ دکن کا ہم سب پر بڑا احسان ہے۔ مہتمم تعلیمات عماد الملک سید حسین بلگرامی کے مشورہ سے ساری ریاست حیدرآباد میں مدارس تحتانیہ سے فوقانیہ تک مادری اور سرکاری زبان اردو میں تعلیم کا بندوبست ہوا۔ دورِ حاضر کی تعلیم سے عام دلچسپی اور اعلیٰ تعلیم کا شعور پیدا ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں سر اکبر حیدری معتمد تعلیمات و امورِ عامہ نے ریاست حیدرآباد کے لیے ایک یونیورسٹی کے قیام کی عرضداشت حضور نظام کی منظوری کے لیے پیش کی۔ شہریارِ دکن نے واضح ہدایات کے ساتھ قیام عثمانیہ یونیورسٹی کے لیے ۲۶ر اپریل ۱۹۱۷ء کو فرمان جاری کیا

"مجھے بھی عرضداشت اور یادداشت کی معروضہ رائے سے اتفاق ہے کہ ممالک محروسہ کے لیے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں جدید و قدیم مشرقی و مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظامِ تعلیم کے نقائص دور ہو کر جسمی و دماغی و روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے اور جس میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرف طلبہ کے اخلاق کی درستی ہو اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجے کی تحقیق کا کام بھی جاری رہے۔ اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہیے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اردو کو قرار دیا جائے۔ مگر انگریزی زبان کی تعلیم بھی بحیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازمی گردانی جائے۔ لہٰذا میں بہت خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری تخت نشینی کی یادگار میں حسبِ مذکور اصول محولہ عرضداشت کے موافق حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے۔ اس یونیورسٹی کا نام عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد ہوگا اور ہر اہم و اصولی امر کی نسبت جو اس کارروائی میں پیدا ہو، صراحت کر کے میری منظوری وقتاً فوقتاً حاصل کی جاتی رہے۔"

[۴ر رجب المرجب ۱۳۳۵ھ].

اردو میں اعلیٰ تعلیم کے لیے جدید فلسفہ، نفسیات، منطق، اخلاقیات، تاریخ، سماجی علوم، قانون و دستور، سائنس و ریاضی، طب اور انجینیری کی علمی و فنی و نصابی کتابوں کا عربی، فارسی، جرمن، فرنچ اور خصوصاً انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ معتمد تعلیمات نے شعبۂ تالیف و ترجمہ کے قیام کی منظوری کے لیے معروضہ پیش کیا۔

معروضہ منظور ہوا اور بموجب فرمانِ خسروی مورخہ ۱۴ر اگست ۱۹۱۷ء جامعہ عثمانیہ کے پیش رو ادارے "سررشتۂ تالیف و ترجمہ" کا ۶ر ستمبر ۱۹۱۷ء کو قیام عمل میں آیا۔

اس سررشتہ کے لیے ایک ناظم اور دس قابل ادیب اور

---

* مصطفیٰ علی فاطمی، ریفرنس اسسٹنٹ، عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری، حیدرآباد۔

مترجم مقرر کیے گئے۔ زبان و ادب، علوم و فنون کے ماہرین اور اساتذہ کے علاوہ مجالس نصاب کے ارکان کی مدد سے ایک جامع منصوبے کی تیاری کے بعد انگریزی، فرنچ، جرمن اور عربی و فارسی سے پانچ سو مستند اور کارآمد کتابوں کا ترجمے کے لیے انتخاب کیا گیا۔ اردو میں ترجمہ کے بعد ان کتابوں کی طباعت و اشاعت سررشتۂ تالیف و ترجمہ کے فرائض میں داخل تھی۔ تیس سال کے عرصے میں ٤٥٦ کتابیں ترجمے اور طباعت سے آراستہ ہو کر آن بان کے ساتھ شائع ہوئیں۔ یہ نایاب ذخیرہ اب عثمانیہ یونیورسٹی کے ریفرینس کلکشن میں محفوظ ہے۔ اس کی ترتیب و تہذیب میرے ہاتھوں ہوئی ہے۔

ترجمہ و تالیف کی اولین ضرورت علوم و فنون کی اردو میں اصطلاح سازی تھی۔ اس مہم کے لیے مجلس وضع اصطلاحات بنائی گئی جس کی پانچ کمیٹیاں تھیں۔

١۔ کمیٹی برائے طبیعیات، کیمیا و ریاضی

٢۔ کمیٹی برائے آرٹس (فلسفہ، عمرانی علوم اور تاریخ و جغرافیہ)

٣۔ کمیٹی برائے حیاتیات۔

٤۔ کمیٹی برائے طب۔

٥۔ کمیٹی برائے انجینیری۔

مجلس وضع اصطلاحات کا پہلا اجلاس ١٩١٨ء میں ہوا اور آخری اجلاس کی تاریخ ٢٥ جولائی ٤٦ء ہے۔ وضع اصطلاحات کی کمیٹیوں نے ١٩٣٩ء تک ٥٥ ہزار علمی اصطلاحات کا انگریزی اور دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کر لیا۔ اور ان کی ایک ابجدی فہرست بھی شائع کی۔ اصطلاح سازی بڑے خلوص اور محنت سے ہوتی رہی اور تین دہائیوں یعنی ١٩٤٦ء تک اردو اصطلاحات کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہو گئی جس میں سے ٩١٠٨٨ کی فن واری تفصیل ڈاکٹر نظام الدین صاحب ناظم سررشتہ نے اپنے مرتب کیے ہوئے جدول میں اس نوٹ کے ساتھ دی ہے کہ متفرق اصطلاحات کی کثیر تعداد اس جدول کی فہرست میں شامل نہیں ہے۔ نظرثانی کے بعد انھیں فن واری ترتیب میں شائع کیا جائے گا۔

سررشتۂ تالیف و ترجمہ کی جانب سے چھ مجموعۂ اصطلاحات مرتب اور شائع ہوئے۔

١۔	مجموعہ اصطلاحات علمیہ	١٩٢٦ء
٢۔	مجموعہ اصطلاحات تدریسیات	١٩٣٦ء
٣۔	مجموعہ اصطلاحات ریاضیات	١٩٤٨ء
٤۔	اصطلاحات علم ہیئت	١٩٤٨ء
٥۔	مصطلحات طب جلد اول	١٩٤٨ء
٦۔	ترقیمات ریاضی و سائنس	١٩٤٩ء

مجلس وضع اصطلاحات میں زبان کے نمایندے بابائے اردو مولوی عبدالحق، پروفیسر وحید الدین سلیم، علامہ نظم طباطبائی اور عبداللہ عمادی صاحب تھے۔ سائنس کے نمایندے جناب نصیر احمد، برکت علی چودھری، قاضی محمد حسین اور عبدالرحمٰن خاں صاحب تھے۔ ؟ شعبۂ تعلیمی کی نمایندگی کے لیے ممتاز اساتذہ اور ماہرین مقرر تھے۔ ایک ایک اصطلاح کی منظوری کے وقت اراکین مجلس میں جو علمی و ادبی مباحثے ہوئے وہ خود ایک مستقل ریسرچ کا موضوع بن سکتے ہیں بشرطیکہ وہ روئدادیں انقلاب زمانہ اور دفتریت کی دستبرد سے بچ گئی ہوں۔

ابتدا میں اگرچہ دس مترجمین کا تقرر ہوا تھا۔ لیکن ترجمہ و تالیف طباعت و اشاعت میں ترقی کے سبب مستقل، موقتی یا عارضی مترجمین کی تعداد ١٢٠ سے زائد ہو گئی۔ ناظم سررشتہ کی عام نگرانی کے علاوہ دو ناظر بھی موجود تھے۔ ایک ناظر ادبی اور دوسرے ناظر مذہبی۔ ناظر ادبی کے تفویض ترجمے کے مسودہ کی ادبی اعتبار سے نظرثانی تھی اور ناظر مذہبی اس بات کا خیال رکھتے کہ ترجمے کی عبارت میں کسی مذہب یا عقیدے کے ماننے والوں کی دل آزاری نہ ہو اور طنز و تعریض نہ آنے پائے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سلطان العلوم کے مطلق العنان شاہی دور حکومت میں مذہبی رواداری، انسانی اقدار اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب کا کس قدر پاس و لحاظ رکھا جاتا تھا۔

سررشتۂ تالیف و ترجمہ کے پہلے ناظم مولوی عبدالحق صاحب تھے اور اُن کے بعد مولوی سید محی الدین پرنسپل اورنگ آباد کالج، حمید احمد انصاری صاحب رجسٹرار جامعہ عثمانیہ، محمد عنایت اللہ رکن دارالترجمہ، پروفیسر الیاس برنی، پروفیسر محمد نظام الدین اور آخری ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپا رہے۔ پہلے ناظر ادبی حیدر یار جنگ نظم طباطبائی مقرر ہوئے جن کے

سبکدوش ہونے پر جوش ملیح آبادی نے یہ کام کیا۔ پہلے ناظر مذہبی مولانا صفی الدین تھے اور اُن کے بعد مولانا عبداللہ عمادی کا تقرر ہوا تھا۔

سررشتۂ تالیف و ترجمہ کے ناظموں کی قابلیت ان کے خلوص اور سر اکبر حیدری صدر المہام فنانس کی خاص توجہ کے سبب سالانہ موازنہ (بجٹ) میں ضروری رقومات کی گنجائش فراہم ہوتی رہی۔ ۱۹۳۵ء میں تالیف و ترجمے کا بجٹ ۲ لاکھ ۶۱ ہزار ۴ سو ۱۵ روپے تھا اور اس سے متعلق عثمانیہ یونیورسٹی پریس کے لیے تہتر ہزار ۵ سو ۷۹ روپے فراہم کیے گئے تھے۔ مالیہ میں سال بہ سال اضافہ ہی ہوتا رہا۔ جو سلطان العلوم آصفِ سابع کی علمی سرپرستی اور اردو نوازی کا مظہر ہے۔

سررشتہ کی مطبوعات کی ابتدا ۱۹۱۹ء میں پانچ کتابوں سے ہوئی۔ پہلی مطبوعہ تالیف عبدالماجد (دریابادی) کی "منطق (استخراجی واستقرائی)" ہے اور آخری کتاب پروفیسر محمد مجیب کی تالیف "تاریخ تمدن ہند" مطبوعہ ۱۹۵۱ء ہے۔ تالیف و ترجمہ کی مطبوعہ کتب کا شعبہ جاتی اور زبان واری فیصد تجزیہ حسب ذیل ہے:

	فیصد کتابیں
ا۔ شعبہ فنون	
۱۔ فلسفہ نفسیات منطق اخلاقیات	۱۹٪
۲۔ تاریخ و جغرافیہ (بشمول سوانح)	۳۴٪
۳۔ عمرانیات، سیاسیات، معاشیات	۷٪
جملہ شعبہ فنون	۶۰٪
II شعبہ قانون و دستور	۸٪
III شعبۂ ریاضیات و سائنس	۲۲٪
IV شعبۂ انجنیری	۵٪
V شعبہ طب	۸٪
مجموعۂ اصطلاحات	۱٪

زبان واری تجزیہ	فیصد کتابیں
انگریزی سے اردو ترجمے	۷۶٪
جرمن سے اردو ترجمے	۱٪
فرانسیسی سے اردو ترجمے	۱٪
عربی سے اردو ترجمے	۱۰٪
فارسی سے اردو ترجمے	۱۴٪
اردو تالیفات	۹٪

۱۹۳۷ء کی فہرست مطبوعات مرتبہ پروفیسر الیاس برنی ناظم اور ۱۹۴۶ء کی فہرست مطبوعات مرتبہ ڈاکٹر نظام الدین ناظم سررشتہ تالیف و ترجمہ کا تقابلی مطالعہ درج ذیل ہے۔

شعبہ تعلیمی	تعداد مطبوعہ کتب مطابق فہرست ۱۹۳۷ء	تعداد مطبوعہ کتب مطابق فہرست ۱۹۴۶ء
I شعبہ فنون		
۱۔ فلسفہ نفسیات منطق اخلاقیات	۳۷	۵۹
۲۔ تاریخ جغرافیہ بشمول سوانح	۷۹	۱۱۸
۳۔ عمرانیات، سیاسیات، معاشیات	۱۸	۲۵
جملہ شعبہ فنون	۱۳۴	۲۰۲
شعبۂ تعلیمی		
II شعبۂ قانون و دستور	۱۳	۲۳
III شعبۂ ریاضیات و سائنس	۵۳	۷۰
IV شعبۂ انجنیری	۱۷	۲۱
V شعبۂ طب	۹	۳۰
مجلہ مطبوعہ کتب	۲۳۶	۳۵۶

فہرستِ مطبوعات ۱۹۴۶ء کے جدول کے مطابق ۳۵۶ کتابیں شائع ہوچکی تھیں اور ۵۰ کتابیں اس وقت زیر طبع تھیں۔ ان کے علاوہ ۵۵ کتابیں ترجمے تالیف و تیاری کے مرحلوں میں تھیں۔ ۱۹۴۷ء کی سیاسی سرگرمی حصول آزادی کے ساتھ ہی ہند۔ حیدرآباد قضیہ شروع ہوا۔ ستمبر ۱۹۴۸ء میں پولس ایکشن کے نتیجے میں سلطنت حیدرآباد کا خاتمہ ہوگیا ان قیامت خیز حالات کے باعث حیدرآباد کی علمی و ادبی زندگی میں بھی انقلاب آگیا۔

آج بھی یہ بات تحقیق طلب ہے کہ ۱۹۴۶ء میں ان ۵۰ کتابوں میں سے جو پریس میں تھیں کتنی چھپ سکیں اور جو طبع نہ ہوسکیں ان کے مسودات کیا ہوئے پھر اُن ۵۵ کتابوں پر کیا بیتی جو تیاری کے مرحلے میں تھیں اور وہ نامکمل مسودات اب کہاں ہیں؟ ان سب کا سراغ

بھی موجود ہے کہ نہیں؟ ڈاکٹر ایشور ناتھ توپا کے دورِ نظامت میں ۱۹۵۲ء کی فہرستِ مطبوعات سے مزید ۲۶ کتابوں کی طباعت کا پتہ چلتا ہے۔ ان فہرستوں میں مجموعۂ اصطلاحاتِ علمیہ کو کہیں شمار نہیں کیا گیا ہے۔ اس طرح جملہ مطبوعہ کتابوں کی تعداد ۲۸۳ ہوتی ہے۔ لیکن اس کو بھی قطعی اور آخری نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال یہ ہنوز تحقیق طلب اور حساس مسئلہ ہے کیوں کہ اگست ۱۹۵۵ء میں شعبۂ تالیف و ترجمہ کی عمارت کو آگ لگ گئی، کتابوں کا اسٹاک جل گیا اور ریکارڈ منتشر اور تلف ہو گیا اور اردو ترجموں کا زریں دور اپنے اختتام کو پہنچا۔

سر رشتۂ تالیف و ترجمہ کے چند ممتاز ارکان اور اُن کی کتابوں کی تعداد درج ذیل ہے:-

قاضی تلمذ حسین	۱۹
سید ہاشمی فرید آبادی	۱۸
احسان احمد	۱۶
قاضی محمد حسین	۱۵
عبداللہ عمادی	۱۴
برکت علی چودھری	۱۴
محمد نذیر الدین	۱۳
عبدالرحمٰن خاں	۱۲
فدا علی طالب	۹
رشید احمد	۸
مرزا محمد ہادی	۱۰
ڈاکٹر محمد عثمان خاں	۱۰
حمید احمد انصاری	۹
سید محمد ابراہیم ندوی	۸
مسعود علی	۷
برکت علی شیخ	۷
عبدالباری ندوی	۶
محمد الیاس برنی	۵
ہارون خاں شروانی	۴
رائے شیو موہن لال	۳
نصیر احمد عثمانی	۲
حیدر یار جنگ طباطبائی	۲
عبدالحلیم شرر	۲
ڈاکٹر عبداللہ	۱
مرتضیٰ راؤ	۱
معشوق یار جنگ	۱
عبدالقدیر صدیقی	۱
للت موہن مکرجی	۱
ڈاکٹر محمد رحیم اللہ	۱
معتمد ولی الرحمٰن	۶
سید علی رضا	۵
محمد عنایت اللہ	۴
ڈاکٹر محمد حسین	۴
ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۲
رائے بیج ناتھ	۲
سید عبدالباقی شطاری	۲
محمد سعید الدین	۲
پروفیسر کشن چند	۱
رشید احمد صدیقی	۱
و بے تیرتھ ساشور کر	۱
عبدالمجید صدیقی	۱
رحم علی الہاشمی	۱
میر اکبر علی موسوی	۱
ضیاء الدین انصاری	۶
ڈاکٹر غلام دستگیر	۵
ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	۴
ڈاکٹر اشرف الحق	۳
ڈاکٹر ولی الدین	۳

ڈاکٹر سیادت علی خاں	۲
مارما ڈیوک پکتھال	۲
حسین علی مرزا	۱
ظفر علی خاں	۱
ڈاکٹر زاہد علی	۱
سردار بلدیو سنگھ	۱
ڈاکٹر عابد حسین	۱
ڈاکٹر مظفر الدین قریشی	۱
ڈاکٹر حیدر علی خاں	۱
ڈاکٹر رضی الدین صدیقی (انگریزی تالیف)	۱

اراکینِ سررشتہ کے ناموں سے ہی ظاہر ہوگا کہ اس علمی خدمت کے لیے بلا امتیاز رنگ و نسل، مذہب و ملّت تمام عالی دماغ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ، عالم، فاضل، ادیب، صحافی، انشاپرداز، سائنس داں، ماہرینِ تعلیم اور ماہرینِ طب و انجنیری کی خدمات معقول مشاہرہ اور معاوضہ پر حاصل کی گئیں، اور اردو ترجمے اور تالیف کے کام میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، مدراسی، دکنی، پنجابی، دہلوی، لکھنوی، حیدرآبادی سب نے ٹیم اسپرٹ کے ساتھ حصّہ لیا ہے۔

اردو زبان کو علمی اور سائنسی زبان بنانے کا ایک جوش اور جذبہ ہے جو، ہر مترجم اور مولف میں موجزن ہے اور اس کے دل و دماغ خوب سے خوب تر اصطلاحات، الفاظ اور عبارت کی تلاش میں دن رات مصروف نظر آتے ہیں۔

اپنے ۳۳ سالہ دورِ کارکردگی میں سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ کی بدولت اردو میں فلسفہ، عمرانی علوم، قانون، سائنس و ریاضی انجنیری و طب اور دیگر فنون کو علمیت، مقبولیت اور عالمی شہرت ملی کہ بقول قاضی محمد حسین صاحب، وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی:

"علم غیر زبانوں میں مقید تھا، جامعہ عثمانیہ کے طفیل آزاد ہوا، آزاد ہی نہیں ہوا، آسان ہوا، آسان ہی نہیں ہوا، عام ہوا۔"

آج جب کہ اردو کے چاروں طرف بادِ سموم چل رہی ہے، ہمارے لسانی، علمی اور فنی ورثے کی حفاظت اور ضروری ہوگئی ہے۔ ہمارے شعر و ادب کے ساتھ ساتھ زمانۂ حاضر کے سائنس و ٹیکنالوجی کو اردو میں منتقل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیئے۔ اردو میں ترجمے اور جدید ترین اصطلاح سازی کے ذریعہ عالمی ادب اور عالمی زبانوں میں اردو اپنا مقام اور اپنا چلن برقرار رکھ سکتی ہے۔

ترجمہ ایک نازک فن ہے جو فطری صلاحیت، ریاضت خلوص اور پیہم جستجو کا طالب ہوتا ہے۔ سررشتۂ تالیف و ترجمہ جیسے ادارے ہمارے علم و فن، تہذیب و تمدن کی آبرو ہیں۔

مطلق العنان شاہی دورِ حکومت میں سلطان العلوم نے زبان و ادب، علوم و فنون کی سرپرستی کی تو موجودہ سلطانیٔ جمہور کے دور میں جمہور اور جمہوریت کا فرض ہے کہ وہ ماضی کے اس شاندار ورثے کے تحفظ اور اردو کی ترقی میں شایانِ شان حصہ لے۔

"تواریخ سے ثابت ہے کہ ایک قوم کسی قدر عرصہ تک ترقی کی حالت پر رہتی ہے، اور اس کے بعد ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔ مگر دیکھنا یہ چاہیے کہ یہ ترقی کب مسدود ہوتی ہے یہ اسی وقت مسدود ہوتی ہے جب کہ اس قوم میں سے وہ قوت اٹھ جاتی ہے، جس کے سبب سے نئی نئی قوتیں پیدا ہوتی ہیں، اور ٹھیک مسلمانوں کا اس زمانہ میں یہی حال ہے؛ بلکہ میں نے غلطی کی، کیوں کہ ترقی مسدود ہونے کا زمانہ بھی گزر گیا، اور تنزل اور ذلت و خواری کا زمانہ بھی انتہا درجہ کو پہونچ گیا۔"

سر سید احمد خاں

سلیم یزدانی *

احساسِ کمتری اور ہم

بنیادی طور پر دنیا میں انسان کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو عمل کرتے ہیں یعنی کچھ کرنا چاہتے ہیں، کچھ کرکے دکھانا چاہتے ہیں اور دوسرے وہ جو تماشائی ہیں وہ کچھ کرنا نہیں چاہتے، اُن کا لاشعور انھیں کچھ کرنے نہیں دیتا کہ زمانے کا خوف اُن پر غالب رہتا ہے۔ کچھ لوگ ازحد تماشائی بن جاتے ہیں۔ ویسے وہ ہر طرح سے نارمل ہوتے ہیں اور چاہیں تو پہلی قسم کے لوگوں میں شامل ہو سکتے ہیں، مگر انھیں اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ یہ کم مائیگی کا احساس ہی "احساسِ کمتری" ہے، یعنی خود کو دوسروں سے کمتر سمجھنا۔ فرائیڈ کے نزدیک احساسِ کمتری کی تعریف:

"کسی فرد کے منفی رجحانات ہیں۔"

سب سے پہلے ایڈلر نے باقاعدہ احساسِ کمتری پر کام کیا اور اسے باضابطہ نظریے کی حیثیت دی اور عام زندگی سے مثالیں دے کر اپنی تھیوری کی صداقت کا ثبوت دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ:

"انسان ہونے کا مطلب ہی خود کو کمتر سمجھنا ہے۔"

کم و بیش دنیا کے ہر فرد کو اس احساس کا تجربہ ضرور ہوتا ہے اور ایک بڑی تعداد اس مرض کا شکار ہے۔ جب کوئی فرد اس مرض کا شکار ہوتا ہے تو مسائل اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتے ہیں اور قوتِ عمل جواب دے جاتی ہے اور بہت کم لوگ اس سے نجات پانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ احساسِ کمتری فرد کی ہر راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔ ایسے لوگ نارمل زندگی نہیں گزار سکتے کیونکہ یہ احساس ہر وقت خوف، مبہم وسوسوں، ناقابلِ یقین وہموں اور غلط قیاسات کو جنم دیتا ہے۔ صحت مند دماغ ہی کسی فرد کی تندرستی کا ضامن ہے اور ذہن اس وقت ہی صحت مند ہوگا جب صحت مند مصروفیات ہوں گی۔ احساسِ کمتری کی جب تک مکمل طور پر بیخ کنی نہ کی جائے اور اس زہریلے پودے کو جڑ سے اکھاڑ کر نہ پھینکا جائے اس وقت تک فرد کی شخصیت کے گلہائے رنگ و ترنگ نہیں کھل سکتے۔

علم، عظمت، شہرت، دولت، ذہانت، حسن، لباس، فیشن، شکل و صورت یا پھر غربت اِس احساس کو جنم دیتی ہے۔

اِس بیماری کا مریض اِس مرض سے چھٹکارا پانے کے لیے برتری کے جھوٹے دعوے کرنے لگتا ہے۔ شیخی، خودنمائی، خودستائی، خودپسندی، نازک مزاجی اور انفرادیت وغیرہ سب برتری کے جھوٹے دعوے ہیں۔

احساسِ کمتری کا دوسرا رُخ نفرت، غصّہ، تخریب کاری، انتہاپسندی اور تشدد وغیرہ ہیں۔ تمام جرائم پیشہ افراد جو آئے دن سماج دشمن حرکتیں کرتے رہتے ہیں، اِن سب میں یہی احساس کارفرما ہوتا ہے۔ اگر ان کی تحلیلِ نفسی کی جائے تو ان کے لاشعور میں دبی ہوئی معاشرے سے بغاوت، نفرت، خاندانی پس منظر اور وہ تمام کچلی ہوئی خواہشات ہی ملیں گی۔ جس نے انھیں معاشرے سے بغاوت پر آمادہ کر دیا۔

بنیادی طور پر احساسِ کمتری کے دو اسباب ہیں۔

داخلی اسباب

داخلی اسباب میں فرد کی عضوی خامیاں یا نامکمل عضو

---

* سلیم یزدانی۔ شکارپور، پاکستان۔

ہیں۔ جس کے طبی اور قدرتی وجوہ ہیں، اندھے، لنگڑے، لولے، گونگے، توتلے، بہرے اور بدصورت چہرے جسمانی کمتری کے زمرے میں آجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ غدود کی کارکردگی میں تعطل یا نقائص کی وجہ سے اعضاء کی نشوونما مکمل طور پر نہیں ہوپاتی۔ جس کی وجہ سے فرد ذہنی طور پر ناکارہ اور جنسی لحاظ سے ابنارمل یا پھر ناکارہ ہوجاتا ہے۔

ان وجوہ کی بناپر فرد میں کمتری کا احساس ابھرتا ہے اور جب وہ دوسروں سے اپنا موازنہ کرتا ہے، پھر خود کو کمتر یا نامکمل پاتا ہے تو اس احساس کی شدت اس کے لیے انتہائی پریشان کن ہوتی ہے۔

اگر ایسے لوگ ان حقیقتوں کو امتحان سمجھ لیں، قدرت کا کڑوا لیموں سمجھ کر اس کا شربت بنالیں، خود کو بدقسمت سمجھنا چھوڑدیں، خودکشی کا ارادہ ترک کردیں۔ خود کو اس دھرتی پر بوجھ سمجھنا چھوڑدیں، خود کو کوسنا اور قدرت کو الزام دینا چھوڑدیں، ان حقیقتوں کے آگے سر جھکادیں، صابر و شاکر بن جائیں۔ قدرت کا سخت امتحان سمجھ کر اس میں پورے اترنے کی کوشش کریں اور حالات سے سمجھوتہ کرلیں تو پھر یہ لوگ نارمل افراد کی طرح زندگی گزار سکتے ہیں، نابینا لوگ بینا کی بہ نسبت زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ یوں قدرت نے ایک حس کو ختم کرکے دوسری حسوں کو بیدار اور زیادہ تقویت دے دی ہے۔ نابیناؤں میں ایک بڑی تعداد قرآن کے حافظوں کی ہے جو ایک بڑی ضخیم الہامی کتاب ہے۔ اس سلسلے میں ارسطو کی مثال دی جاتی ہے جو بڑا بھیانک اور بدصورت تھا، مگر علم کا سمندر تھا۔ وہ بڑا مفکر تھا آج بھی اس کا نام روشن ہے۔ اس نے اپنی جسمانی کمتری کا مقابلہ کیا اور حالات سے سمجھوتہ کرلیا۔ اگر وہ بدصورت نہ ہوتا تو شاید اتنا عظیم بھی نہ ہوتا۔ ٹامس سوانکہ ایک جرمن باشندہ تھا جو پیدائشی اپاہج تھا۔ اس کے دونوں بازو غائب تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ بہترین خوش نویس تھا۔ وہ پیر کی انگلیوں سے لکھتا تھا۔

محمد ادریس لیاقت مارکیٹ کراچی میں ان کی ایک دکان ہے، سیدھا بازو غائب ہے، اس کے باوجود وہ ایک بہترین پینٹر ہیں۔ ایسی بہت ساری مثالیں ہیں۔ مثلاً مشہور انگریزی شاعر ملٹن نابینا تھا۔ مگر آج بھی اس کا نام زندہ ہے۔ اس کی شاعری پڑھی جارہی ہے، ایک اور شاعر بائرن لنگڑا تھا۔ وہ ایک اچھا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین تیراک تھا۔

درحقیقت یہ وہ روشن مثالیں، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ سے، اپنے ماحول سے، اپنے حالات سے مقابلہ کیا اور جسمانی کمزوریوں کے باوجود کام کیا اور نام پیدا کیا۔

خارجی اسباب

خارجی اسباب میں سب سے پہلے ہمارا اپنا گھر ہے، جہاں وقتاً فوقتاً فرد کو مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ گھر میں پہلے بچے، آخری بچے اور اکلوتے بچے کی پرورش تقریباً ایک ہی انداز سے ہوتی ہے ان سے ٹوٹ کر محبت کی جاتی ہے، ناز و نخرے اٹھائے جاتے ہیں، والدین ہر وقت ان کی دلجوئی کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی ہر جائز اور ناجائز خواہشات پوری کی جاتی ہیں۔ بچے کبھی کبھی عجیب وغریب خواہشات کا اظہار کرتے رہتے ہیں، جو کچھ تو پوری ہوتی رہتی ہیں اور کچھ تکمیل کے قابل ہی نہیں ہوتیں۔ تب احساس کمتری ابھرتا ہے۔ گھر کے اس طرح کے ماحول سے نکل کر جب بچہ معاشرے میں قدم رکھتا ہے، تو وہ اس معاشرے سے ویسی ہی توقعات وابستہ کرلیتا ہے اور اسے وابستہ کرنا بھی چاہیئے کیوں کہ گھر میں اس نے جو چاہا وہ ملا۔ جب کہ معاشرہ اسے وہ کچھ نہیں دیتا اور دینے بھی کیوں لگا۔ تو پھر وہ بہت دکھی اور کبیدہ خاطر ہوتا ہے اور اس احساس تلے دبتا چلا جاتا ہے۔

یہ گھر ہی ہے جہاں یہ سبق بھی بچے کو ازبر کرایا جاتا ہے کہ تم ابھی چھوٹے ہو۔ حالاں کہ وہ بلوغت کی منزل تک پہنچ رہا ہوتا ہے۔ امیر غریب کی تکرار اسے بارہا یاد دلائی جاتی ہے کہ وہ امیر باپ کا بچہ ہے اور تم غریب باپ کے بچے ہو۔ ہم تمہیں اُن جیسے کپڑے، جوتے اور کھلونے خرید کر نہیں دے سکتے۔ کیوں کہ تمہارے باپ کی اتنی آمدنی نہیں ہے۔ بچہ اگر کمزور اور لاغر ہو تو پھر اسے یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ تم کمزور ہو۔ اس کے ساتھ مت کھیلو، اس سے مت لڑو، آہستہ آہستہ بچہ ان سب باتوں کا اثر قبول کرتا رہتا ہے اور آگے چل کر یہ احساس اور زیادہ قوی ہوجاتا ہے۔

بہت سے خاندانوں میں کئی لڑکیوں کے بعد لڑکا پیدا ہوتا ہے اور بہت سے خاندانوں میں کئی لڑکوں کے بعد لڑکی پیدا ہو تو اس بات کا بہت

تک امکان ہوتا ہے کہ لڑکا لڑکیوں کے اطوار اور لڑکی لڑکوں کے اطوار اختیار کرلے۔ پھر یہی طور طریقے آگے چل کر معاشرے کی نکتہ چینی کا باعث بنتے ہیں۔ کیوں کہ اس تربیت سے ان کی شخصیت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے اور جب معاشرے کی تنقید ہوتی ہے تو اُن کی شخصیت تقسیم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور یہ احساس شدّت سے ابھرتا ہے۔

تمام نفسیاتی امراض ناموافق ماحول اور تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ بچّوں کی تعلیم و تربیت نفسیاتی لحاظ سے بڑا نازک اور انتہائی پیچیدہ مسئلہ ہے۔ بیشتر والدین اپنے بچّوں کی پرورش صحیح طرح سے نہیں کر پاتے۔ گھر کے چھوٹے ماحول سے نکل کر جب وہ اپنے ارد گرد کے بڑے ماحول میں آتا ہے تو وہاں بھی وہ ایک طبقاتی کشمکش پاتا ہے۔ وہاں امیروں کے بچّے اعلیٰ قسم کے پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں جہاں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے۔ اور غریبوں کے بچّے گورنمنٹ اور کارپوریشن کے اسکول میں پڑھتے ہیں۔ جہاں کے ناگفتہ بہ حالات ان کی پسماندگی کا منھ بولتا ثبوت ہیں اور حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ان میں بھی پسماندہ ماحول کے نکلے ہوئے پسماندہ ذہن کے استاد ہی تعلیم دے رہے ہیں۔ جنھیں کہیں اور ملازمت نہیں ملتی' وہ پرائمری اسکولوں میں چلے جاتے ہیں۔ جہاں جا کر وہ پھر بچّوں کی درجہ بندی کرتے ہیں' ان کی درجہ بندی ذہین' درمیانے اور ناکارہ کی بنا پر کرتے ہیں۔ اس درجہ بندی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پہلی دو قسموں کے بچّے تعلیم حاصل کر لیتے ہیں۔ باقی تیسری قسم کے بچّے اس استاد سے، اس اسکول سے، اس ماحول سے اور اس معاشرے سے بغاوت کر دیتے ہیں۔ وہ اچھے شہری ثابت نہیں ہوتے اور اکثر جرائم پیشہ ہو جاتے ہیں کہ واپسی ممکن نہیں ہوتی۔ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ تمام جرائم احساسِ کمتری کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ جب استاد ہی اس مطلوبہ معیار پر پورے نہیں اُترتے جو استاد کے شایانِ شان ہے' جو اس کے منصب کے لحاظ سے مقدس اور مکرّم ہے، تو وہ بچّوں کو اچھا شہری کس طرح بنا سکیں گے۔ اس معیار کو گرانے میں رشوت اور سفارش کا بڑا ہاتھ ہے۔

تعلیم کے ماحول سے نکل کر جب فرد عملی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو وہ وہاں بھی دیکھتا ہے کہ کمتر اور برتر کے مسائل اژدہے کی طرح منھ پھاڑے بیٹھے ہیں۔ مقابلے کے امتحانوں میں امیروں کے بچّے ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے ان تعلیمی اداروں میں تعلیم و تربیت حاصل کی ہے جن کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہے' اور جن کا معیار بلند ہے، اور غریب کے بچّے ان پسماندہ اسکولوں میں تعلیم پاتے ہیں جہاں کی تربیت ناقص ہے اور جہاں ذریعۂ تعلیم انگریزی نہیں۔ ہمارے معاشرے میں انگریزی زبان نے بھی احساسِ کمتری کو فروغ دیا ہے۔ تب یہ کیسے ممکن ہے کہ غریبوں کے بچّے مقابلے کے امتحان پاس کر سکیں۔ اس طرح ایک طبقاتی کشمکش شروع ہو جاتی ہے جس کی اصل صرف اور صرف ناقص نظامِ تعلیم ہے جو ہمارے معاشرے' ہمارے ماحول اور ہماری اقدار سے میل نہیں کھاتا۔ آج کے اس ماحول میں مادّی ترقی کی ایسی دوڑ لگی ہوئی ہے کہ ہر شخص راتوں رات امیر بن جانے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہے۔ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی فکر میں نظر آتا ہے۔ اس نے اپنا ہر دن کا چین اور رات کا آرام حرام کر لیا ہے بس اس فکر میں گھلا جا رہا ہے کہ کس طرح دوسرے لوگوں پر برتری قایم کر سکوں۔ اس کے لیے چاہے وہ چوری کرے، ڈاکہ ڈالے، رشوت لے، فراڈ کرے، دھوکہ دے، غبن کرے، کچھ کرے، اسے تو صرف دوسروں سے آگے بڑھنا ہے۔ اور اپنی نام نہاد برتری اُن پر ثابت کرنی ہے۔ اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ وہ سب کچھ شرافت کے نام پر انتہائی معززانہ انداز میں کرے گا۔ اپنے ضمیر کو خوب خوب فریب دے گا۔ اس کو مطمئن کرنے کے لیے مختلف تاویلیں گڑھے گا۔ مگر ضمیر چوں کہ کسی غلط کام کو برداشت نہیں کرتا اور اسے مسلسل متنبہ کرتا رہتا ہے' جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس فرد میں احساسِ جرم پروان چڑھتا اور اس کی زندگی بے سکون ہو جاتی ہے۔

اگر بچّوں کی تعلیم و تربیت صحت مند ماحول اور صحت مند انداز سے ہو اور اس میں اعتدال کے پہلو کو نہ چھوڑا جائے۔ صابر و شاکر رہا جائے۔ حالات سے سمجھوتہ کیا جائے۔ آزمائش سمجھ کر اس میں کامیاب ہونے کی کوشش کی جائے۔ والدین بچّوں کی ہر موقع پر رہنمائی کریں' ان میں خود اعتمادی، قوّتِ ارادی، قوّتِ فیصلہ جیسے صحت مند رجحانات پیدا کریں۔ انھیں حالات کا مقابلہ کرنا سکھائیں۔ کوشش اور جدوجہد کی عادت ڈالیں' تو پھر اس احساسِ کمتری کی مکمل طور پر بیخ کنی کی جاسکتی ہے۔ بس اس میں ہمّت، جرأت اور استقلال کی ضرورت ہے۔ اگر ہمّت اور صبر و استقلال سے کام لیا جائے تو کوئی مشکل نہیں کہ اس مرض سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔

سیّد قاسم محمود*

بقراط

سقراط کے نام کے ساتھ بقراط کا نام ضرور آتا ہے، سقراط بقراط۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بقراط بھی دو تھے اور دونوں کے دونوں سقراط کے ہم عصر تھے۔ یہ خیال درست نہیں ہے کہ سقراط کسی ایک بقراط کا شاگرد تھا یا کوئی بقراط سقراط کا شاگرد تھا۔ تینوں ہم معصر بھی تھے اور ہم عمر بھی۔ اس لیے ایک دوسرے سے اثر لینا قدرتی امر ہے۔

سقراط کا ایک ہم عصر بقراط جزیرہ کیوس کا رہنے والا تھا۔ وہ ریاضی داں تھا بلکہ اس نے ایتھنز میں ریاضی کے ایک اسکول کی بنیاد ڈالی تھی۔ یہ اسکول پورے یونان کا مرکز بن گیا تھا۔ اس کی مرکزیت آئندہ دو صدیوں تک برقرار رہی۔ بقراط اصل میں تاجر تھا، لیکن اس کا سارا روپیہ ضائع ہو گیا تھا۔ ایک روایت یہ ہے کہ کاروبار میں خسارہ ہو گیا تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ ڈاکوؤں نے چھین لیا تھا۔ لیکن ارسطو نے لکھا ہے کہ وہ بیوقوف آدمی تھا — ایک دفعہ استنبول میں کسٹم کے افسروں نے دھوکا دے کر اس کی رقم ہتھیا لی تھی۔ وہ تجارت اور کاروبار کے معاملے میں احمق تھا یا عقل مند اس سے قطع نظر یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ وہ ایک لائق فائق ریاضی داں تھا۔

اس زمانے کے ریاضی دانوں کو تین بڑے مسائل کا سامنا تھا۔ ایک یہ کہ مکعب کی جسامت کیوں کر معلوم کی جائے۔ دوسرے یہ کہ جذر کیوں کر نکالا جائے اور تیسرے یہ کہ ایک مثلث کو برابر کے تین حصوں میں کیونکر تقسیم کیا جائے۔

بقراط کی وجہِ شہرت یہ ہے کہ اس نے تینوں مسئلوں کے حل دریافت کر لیے تھے۔ تاہم اس کے دریافت کردہ حلوں کا عملی اطلاق پچاس سال بعد ہپاس اور پھر "ارشمیدس" اور اس کے بعد اقلیدس نے کیا تھا۔

دوسرا بقراط "بابائے طب" کہلاتا ہے۔ وہ اپنے شاگردوں سے "حلفِ وفاداری" لیتا تھا جو ڈاکٹری کی سند پانے والے طلباء کو آج بھی اٹھانا پڑتا ہے۔

اردو زبان کی ایک طویل نظم "مدوجزرِ اسلام" جو مشہور شاعر خواجہ الطاف حسین حالی کی تصنیف ہونے کے باعث "مسدس حالی" کے نام سے مشہور ہے، بقراط کے تذکرے سے یوں شروع ہوتی ہے؛

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا
مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا
کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا
کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا

بقراط، جس کا دعویٰ تھا کہ دنیا میں کوئی مرض ایسا نہیں ہے جس کی دوا اللہ تعالیٰ نے پیدا نہ کی ہو، خود ایک ایسے زمانے

---

* سید قاسم محمود، ایڈیٹر ماہنامہ طالب علم، کراچی، پاکستان۔

میں پیدا ہوا جب امراض کے لیے دوا کے استعمال کا سرے سے رواج ہی نہ تھا۔ اس زمانے میں یونان کے جو لوگ بیمار پڑتے وہ دوا استعمال کرنے کے بجائے "ایس کلا پیس" دیوتا کے مندر میں جاتے جو صحت کا دیوتا خیال کیا جاتا تھا۔ اس کے بت کے آگے سرِ عقیدت خم کرتے، وہاں کے پجاریوں کو نذرانہ دیتے، ان سے تعویذ لے کر گلے میں ڈالتے اور گھر واپس چلے آتے۔ اُن میں سے جو لوگ محض قدرت کے علاج کے باعث شفا پا جاتے وہ اپنی صحت یابی کو دیوتا کا معجزہ خیال کرتے اور جو مرض کا شکار ہو کر لقمۂ اجل ہو جاتے ان کے اعزہ یہ سمجھ لیتے کہ اُن پر صحت کے دیوتا کی نظرِ کرم نہیں ہوئی۔ یہ وہ ماحول تھا جس میں بقراط نے اپنی آنکھ کھولی۔ خود اس کا باپ ہرقلیدس بھی ایک ایسا ہی پجاری تھا جو اس عہد کے دوسرے پجاریوں کی طرح تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک سے علاج کرتا تھا۔

ترکی اور یونان کے درمیان بحیرہ ایجئین واقع ہے۔ اس میں چھوٹے بڑے بہت سے جزیرے ہیں، جن پر کبھی یونان کبھی اٹلی اور کبھی ترکی کی عمل داری رہی ہے۔ اُن میں سے ایک جزیرے کا نام "کوس (Cos) ہے جو ایشیائے کوچک کے ساحل کے قریب واقع ہے۔ یہ جزیرہ رقبے میں بہت چھوٹا ہے۔ چنانچہ اس کی لمبائی تقریباً پچیس میل اور چوڑائی قریباً پانچ میل ہے۔ اسی جزیرے میں ۴۶۰ ق۔م میں بقراط کی ولادت ہوئی۔ یہی دمقراط کا بھی سنِ ولادت ہے۔ اس لحاظ سے بقراط اور دمقراط محض ہم عصر ہی نہ تھے بلکہ ہم عمر بھی تھے۔ بقراط کو اس کا باپ اپنا نیم معالج اور نیم پروہت کا آبائی پیشہ سکھانا چاہتا تھا کیونکہ اس پیشے میں عزت بھی تھی اور دولت بھی۔ لیکن بقراط کی افتادِ طبع بالکل اور طرح واقع ہوئی تھی اسے امراض کے علاج میں تعویذ ٹوٹکے اور جھاڑ پھونک پر قطعاً اعتقاد نہ تھا۔ اس لیے گو اس نے پیشہ تو معالج ہی کا اختیار کیا، مگر اپنے طریقِ علاج کی بنیاد باقاعدہ تشخیص اور تحقیق پر رکھی۔ اس نے مختلف امراض کے اسباب مدون کیے، مختلف ادویات کے خواص معلوم کیے اور ہر مرض کے لیے دوائیں اور دیگر تدابیر مقرر کیں۔

اس طرح وہ پہلا شخص ہے جس نے علم العلاج کی طرح ڈالی۔ اس نے طب کو فلسفے سے علیحدہ کر دیا اور اسے ایک باقاعدہ سائنس بنا دیا۔ سائنسی تحقیقات میں اس نے ایسی راہ متعین کی جس میں بعد کے آنے والوں کے لیے مسلسل طور پر ترقی کی گنجائش تھی۔ چنانچہ اس سے پانچ صدی بعد جالینوس نے اسی کے قائم کردہ اصولوں کی روشنی میں طب کو ایک نئی زندگی بخشی لیکن جالینوس کے بعد ترقی کا یہ سلسلہ صدیوں تک کے لیے مسدود ہو گیا۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

بقراط کی جوانی کا آغاز تھا کہ یونان کی ملحقہ ریاست مقدونیہ کا بادشاہ کسی مرض میں مبتلا ہوا، جب تمام ذرائع استعمال کرنے کے باوجود اس مرض سے افاقہ نہ ہوا، تو بقراط کو بلایا گیا۔ بقراط کے علاج سے بادشاہ نے کامل شفا پائی اور یہیں سے اس کی شہرت کا آغاز ہوا۔

بقراط کے زمانے کے نیم حکیم اپنے مریضوں پر رعب ڈالنے کے لیے ان کو عجیب و غریب عملیات بتایا کرتے تھے اور خود بھی بعض ایسے ذرائع سے کام لیتے تھے جن کا علم علاج سے کچھ علاقہ نہ تھا، مگر جن کی وجہ سے مریض کے اعزہ اور تیمار دار بہت مرعوب ہو جاتے تھے، بقراط نے اس فریب کاری کا پردہ چاک کیا اور ان عملیات کو باطل ٹھہرایا۔ بقراط کا قول تھا کہ انسانی جسم ایک خاص قسم کی حرارت سے زندہ رہتا ہے۔ یہ حرارت عمر کے بڑھنے سے بتدریج گھٹتی جاتی ہے اور جب یہ حرارت باقی نہیں رہتی تو انسان مر جاتا ہے۔ اس کے خیال میں اس کی حرارت کا منبع دل ہے۔

بقراط کے علم العلاج کی بنا چار اخلاط پر تھی۔ خون، بلغم، صفرا اور سودا۔ اس کے قول کے مطابق یہ چاروں اخلاط جب تک جسم کے اندر اپنے صحیح تناسب میں رہتی ہیں، انسان تندرست رہتا ہے، لیکن جب اُن میں سے کسی کی کمی یا زیادتی ہو جائے تو انسان بیمار پڑ جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ایک طبیب کا کام یہ ہے کہ اس کے جسم میں کسی خلط کی زیادتی یا کمی ہو گئی ہے اور پھر اسے ایسی دوائیں دے جن سے یہ زیادتی یا کمی ختم ہو کر اخلاط کا تناسب اعتدال پر آ جائے۔

جب بقراط کو کسی مریض کے علاج کے لیے بلایا جاتا، تو ضروری تشخیص کے بعد وہ فوراً اس کا علاج شروع کر دیتا۔ یہ طریقہ اس زمانے کے دیگر نام نہاد طبیبوں کے دستور کے خلاف تھا، کیوں کہ یہ طبیب مریض کو پانچ دن تک دوا اور علاج کے بغیر بستر مرض پر پڑا رہنے دینا علم العلاج کا ایک مسلّمہ اصول گردانتے تھے اور پانچ دن گزارنے کے بعد اس کے معالجے کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ پانچ دنوں کے اس خاصے لمبے عرصے میں بدقسمت مریض بے چارگی کے عالم میں موت سے ہم کنار ہو جاتا اور اس طرح اس کے نام نہاد طبیب کو معالجے کی ذمہ داریوں سے نجات مل جاتی، لیکن بقراط نے پانچ دنوں کے اس انتظار کو ایک لغو دستور ٹھہرایا اور مریض کے فوری علاج کی طرف توجہ مبذول کرنا طبیب کا اولین فرض قرار دیا۔

مزمن امراض میں اس زمانے کے نام نہاد اطبا کا ایک ہی طریقہ تھا، یعنی مریض کو مسلسل طور پر فاقہ کرایا جائے۔ اس طرح اکثر اوقات مریض ایک طرف مرض کی شدّت اور دوسری طرف فاقہ کشی کی صعوبت کا دہرا شکار ہو کر بہت جلد لقمۂ اجل بن جاتے تھے۔ بقراط نے اس احمقانہ دستور کی مخالفت کی اور اس کو ترک کر دینے پر زور دیا۔

بقراط غذا کا خاص خیال رکھتا تھا۔ صحت کی حالت میں بھی اور مرض کی حالت میں بھی۔ وہ مریض کی حالت کے پیش نظر اسے مناسب اور متوازن غذا دیتا تھا۔ مریضوں کے لیے جو آش اور شہد کا پانی جسے اطبا ماء العسل کہتے ہیں، اس کی تجویز کردہ مقبول غذائیں تھیں۔

بقراط نے اس عقیدے کی سختی سے تغلیط کی کہ امراض آفات آسمانی ہیں، جو نیک لوگوں کی آزمائش اور بُرے لوگوں کی سزا کے لیے بھیجی جاتی ہیں۔ اس کے خیال میں ہر مرض کے خاص طبعی اسباب ہوتے ہیں جن کے پیدا ہونے سے مرض پیدا ہو جاتا ہے، اور جن کے دور کرنے سے مرض دور ہو جاتا ہے۔

بخاروں کے علاج میں بقراط نے قدیم غیر سائنسی طریقوں کو یکسر بدل دیا۔ اس سے پہلے کے معالج بخار کے مریض کو جھاڑ پھونک کرنے کے ساتھ بعض قسم کی ورزشیں کرایا کرتے تھے، جنھیں وہ مذہبی رسوم کا ایک حصّہ سمجھتے تھے۔ ان ورزشوں میں مریض تھک کر نڈھال ہو جاتا اور بعض اوقات فوری طور پر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا تھا۔ بقراط نے بتایا کہ بخار میں مبتلا ہو کر انسان کا سارا جسمانی نظام کمزور ہو جاتا ہے، اس لیے اس حالت میں اسے مناسب دوا کے ساتھ مکمل آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے بخار کے دوران میں مریض سے ورزشیں کرانا سخت مضر اور خطرناک ہوتا ہے۔

اگرچہ بقراط کم و بیش تین سو مفرد دوائیوں کا علم رکھتا تھا، لیکن ان کا استعمال اشد ضرورت کے سوا نہیں کرتا تھا، عام معالجات میں وہ دواؤں سے علاج کرنے کے بجائے قدرتی طریقۂ علاج پر زیادہ انحصار رکھتا تھا۔ اس لیے وہ خوراک، پانی اور آب و ہوا کے اثرات کا بہت قائل تھا۔ مریض پر آب و ہوا کی تبدیلی کا اثر آج کل بھی علم العلاج کے مسلّمات میں سے ہے اور اس سے جدید اطبا بھی استفادہ کرتے ہیں۔

اس زمانے کے نظریات کے مطابق بقراط انسانی زندگی پر (صحت اور مرض دونوں حالتوں میں) ستاروں کی گردش کے اثرات کو بھی درست مانتا تھا۔ چنانچہ اس کا خیال تھا کہ جب آسمان پر شعریٰ ستارہ جسے انگریزی میں (SIRIUS) کہتے ہیں، نکلا ہوا ہو تو مرض کی شدّت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر مریض کے سر پر ثریا ستاروں کا جھرمٹ چمک رہا ہو تو اس کے خیال کے مطابق اس سے مرض کی شدّت میں کمی آ جاتی ہے۔

طب کی دو مشہور شاخوں، یعنی تشریح الاعضاء اور منافع الاعضاء کے بارے میں بقراط کو وہ علم تو حاصل نہ تھا جس کی دریافت اس کے صدیوں بعد ہوئی، لیکن وہ اپنے ہم عصروں کی طرح ان دونوں موضوعات سے بالکل بے خبر بھی نہ تھا۔ اسے انسانی جسم کی ہڈیوں سے بخوبی واقفیت تھی۔ رگوں اور پٹھوں کے متعلق بھی اسے ابتدائی علم حاصل تھا۔ دماغ کو وہ ایک بڑا سا غدود سمجھتا تھا جس میں بلغم بھرا رہتا ہے، لیکن دماغ کو وہ خیالات کا مرکز نہیں سمجھتا تھا۔ گردوں کو وہ ایسے غدود کہتا تھا جن میں پانی کو کشش کرنے کی

خاصیت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے انسان جو پانی پیتا ہے وہ گردوں میں چلا جاتا ہے اور گردے اس کا پیشاب بنا کر اسے خارج کرنے کی راہ سے خارج کر دیتے ہیں۔

بقراط کے ناقص علم یا اس کی غلطیوں پر اسے ملعون کرنا فی الحقیقت ایک بہت بڑی زیادتی اور اس کے ساتھ بے انصافی ہے۔ کیوں کہ اس نے کبھی انسانی لاش کو چیر کر اس کے اندرونی اعضاء کا مشاہدہ نہیں کیا اور نہ اس زمانے کے قانون کے مطابق اس کی اسے اجازت تھی۔ اس کے پاس کوئی آلات نہ تھے۔ وہ کیمیا کی سائنس سے جس کا طب کے ساتھ چولی دامن کا رشتہ ہے، قطعاً ناواقف تھا۔ اس کی حالت ایک ایسے شخص کی تھی جو رات کے وقت ایک اندھیرے کمرے میں کسی نازک مشین کے پرزوں کو درست کرنے کی کوشش میں مصروف ہو، اس لیے نامساعد حالات میں اس نے جو کچھ کیا وہ علم کی شاہراہ پر اس کے جو بھی قدم اُٹھے ان کے لیے وہ لائق تحسین و تبریک ہے۔

پھر اگر علم طب میں بقراط کے تمام نظریات درست نہیں تھے یا اس کے بعض اقوال ایسے تھے جو بعد کی تحقیقات سے غلط ثابت ہوئے تو ایسا کس زمانے اور کس سائنس داں کے ساتھ نہیں ہوا۔ سائنس کی ترقی کا انحصار ہی اس امر پر ہے کہ جدید تحقیقات سے پرانی غلطیوں کی اصلاح کی جائے۔ بقراط کی حقیقی عظمت اس بات پر مبنی ہے کہ اس نے علم العلاج کو طرح طرح کے اوہام میں سے نکال کر سائنس کی درست شاہراہ پر ڈال دیا۔

بلاشبہ بقراط طب کا بانی ہے اور دنیا میں پہلا شخص ہے جو صحیح معنوں میں طبیب کہلانے کا مستحق ہے۔

* * *

" میں اپنے دوستوں، رفیقوں اور عزیزوں سے یہ عرض کرتا ہوں کہ کہ اگر وہ دنیا میں انسانیت اور خودداری کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، اگر اُن کے دل میں اپنی قوم کی، اپنے ملک کی، بنی نوعِ انسان کی خدمت کرنے کی آرزو ہے تو خود غرضی، ہوس ناکی اور ادنیٰ خواہشوں اور عادتوں، توہمات و تعصبات کو ترک کر دیں اور محنت و مشقت اور برداشت کی عادت ڈالیں۔ یاد رکھیے کوئی بڑا کام محنت و مشقت اور تکلیف اُٹھائے بغیر اور بغیر سخت ریاضت اور ایثار کے نہیں ہو سکتا۔ اگر کچھ کرنا ہے تو یہی روش اختیار کرنی ہوگی۔ ورنہ قدرت کا قانون تادیبی کارروائی کے لیے سر پر کھڑا ہے۔"

بابائے اردو مولوی عبدالحق

اسرار احمد خاں*

ابو القاسم القشیری

ایک محدث، ایک فقیہ اور ایک صوفی

چوتھی صدی ہجری کا نصفِ آخر سلطنتِ عباسیہ کے زوال کا نقطۂ آغاز ہے۔ عباسیوں کی وسیع و عریض مملکت عجیب و غریب قسم کے بحرانی دور سے دوچار تھی۔ ہر طرف انارکی اپنے بال و پر پھیلائے پرواز کر رہی تھی۔ مملکتِ اسلامیہ ایک طرف سیاسی طوفانوں میں گھری ہچکولے کھا رہی تھی، دوسری طرف عوام و خواص اخلاقی لحاظ سے زوال کا شکار تھے۔ ایک طرف عباسی سلطنت کے اندر مختلف شورشیں سر ابھار رہی تھیں، عاملین صوبہ جات مرکز کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے نئی اور آزاد ریاستوں کی داغ بیل ڈال رہے تھے، تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس دور میں سلطنتِ عباسیہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم و منتشر ہو چکی تھی۔ دوسری طرف معاشرے کا بھی بُرا حال تھا۔ معاشرے پر سے اخلاقیات کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ لوگوں کی زندگیاں، ان کے مشاغل، ان کی معروفیات اور اُن کی دلچسپیاں صاف بتاتی تھیں کہ اُن کا محور و مرکز دنیا اور آسائش دنیا ہے۔ یہ صورتِ حال عوام و خواص دونوں کی تھی۔ شاہی محلات میں بھی اس کی جھلک نظر آتی تھی اور عوام الناس کے دائرے بھی اس مادہ پرستی کا پتہ دیتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ معاملہ اس سے دو قدم آگے بڑھ چکا تھا۔ مسلمان اپنی ذمہ داریوں کو بھول چکے تھے۔ اسلامی احکامات کی خلاف ورزی ان کا وطیرہ بن چکا تھا۔ اسلامی تعلیمات کی کوئی پرواہ نہ عام مسلمان کو تھی اور نہ حکام و اراکین سلطنت کو۔

ملتِ اسلامیہ کے اس نازک ترین دور میں اللہ نے خاص کرم کیا۔ اس دور میں کثیر تعداد میں علماء، فقہاء، محدثین، مفسرین اور صوفیاء پیدا ہوئے۔ انھوں نے صورت حال کا جائزہ لیا۔ اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ وہ مملکتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی تو نہ کر سکے، منتشر عباسی سلطنت کے ٹکڑوں کو باہم سیاسی طور پر جوڑ تو نہ سکے البتہ انھوں نے عوام الناس کی گرتی ہوئی اخلاقی دیواروں کو سنبھالا دیا اور انھیں از سر نو مضبوط بنیادوں پر قایم کرنے کی بھرپور اور کامیاب جدوجہد کی۔ اس دور کے انھیں مصلحین امت میں ایک نام علامہ ابو القاسم القشیری کا ہے۔

آج علامہ موصوف کو عام طور سے ایک صوفی مصنف کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ عوام الناس ہی نہیں بلکہ محققین بھی ان کا تذکرہ اسی حیثیت سے کرتے ہیں۔ یہ علامہ ابو القاسم کے ساتھ نہ صرف بے انصافی ہے بلکہ تاریخ اور اس کی حقیقتوں سے چشم پوشی بھی ہے۔ اور اہلِ علم کے یہاں چشم پوشی صرف کتمان حق ہی نہیں بلکہ بد دیانتی کے ہم معنیٰ ہے — علامہ ابو القاسم القشیری کیا تھے اور کیا نہیں تھے، یہ اس مقالے کا موضوع نہیں ہے۔ انشاء اللہ کسی دوسرے مقالے میں اس پر کھل کر گفتگو ہوگی۔ اس مقالے کا مقصد علامہ موصوف کی زندگی کے خدوخال نمایاں کر کے نذرِ قارئین کرنا ہے۔ ان کی زندگی کے مطالعے سے خود بخود یہ بات ابھر کر سامنے آجائے گی کہ وہ محض صوفی ہی نہیں اپنے دور کے مستند محدث اور مفسر بھی تھے۔ ذیل کی سطروں میں ان کا سوانحی خاکہ پیش خدمت ہے۔

نام و نسب:— ان کا پورا نام عبد الکریم بن ہوازن

---

* اسرار احمد خاں، ریسرچ اسکالر شعبۂ سنی دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

بن عبدالملک بن طلحہ بن محمد القشیری ہے۔ عام طور سے انھیں ابوالقاسم القشیری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انھیں قشیری اس لیے کہا جاتا ہے کہ اصلاً ان کا خاندانی اور نسبی تعلق مشہور عرب قبیلہ بنو قشیر بن کعب سے تھا۔ یہ قبیلہ یمامہ میں تھا۔ اس قبیلے کے تمام افراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ عام الوفود میں اس قبیلے کا ایک وفد رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایمان لایا تھا۔ بنو قشیر بن کعب قبیلہ کا براہ راست خونی اور نسبی رشتہ دوسرے معروف قبیلے بنو عامر بن صعصعہ سے تھا[۴]۔ بنو عامر بن صعصعہ وہی قبیلہ ہے، جس کے سردار بیحرہ بن فراس کو رسول اللہؐ نے طائف سے واپسی کے بعد اسلام کی دعوت دی تھی تو بیحرہ نے اسلامی دعوت کی اثر انگیزی اور اس میں مضمر انقلاب کو بھانپ لیا تھا۔ اس نے اللہ کے رسولؐ سے سودا کرنا چاہا یعنی اس نے کہا کہ اگر آپ وعدہ کریں کہ اس دعوت کے نتیجے میں آپ کو عرب و عجم کی جو سلطنت حاصل ہو گی اس کا نصف مجھے دے دیں گے۔ رسول اللہؐ نے سودا بازی سے انکار کر دیا لہٰذا بیحرہ بن فراس بھی اسلام کی برکتوں سے محروم رہا۔

پیدائش اور تعلیم:-

علامہ قشیری ۳۷۶ھ میں نیشاپور کے ایک گاؤں 'استوا' میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ہوازن بن عبدالملک صاحب ثروت تھے۔ قشیری ابھی چھوٹے ہی تھے کہ ہوازن بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا۔ ساری ذمہ داریاں والدہ پر آن پڑیں۔ ان کی والدہ انتہائی دانش مند اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنے بیٹے قشیری کی اس طرح سے پرورش و پرداخت کی کہ بچے کو باپ کی کمی کا احساس ہی نہیں ہوا۔ انھوں نے قشیری کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی۔ انھوں نے بچے کو اسی علاقے میں موجود ایک استاد اور عالم دین علامہ ابوالقاسم یمنی کے پاس بغرض تعلیم بھیجا۔ ان سے قشیری نے عربی زبان، صرف و نحو، اور ادب کی تعلیم حاصل کی[۵]۔ کم عمری ہی میں مروجہ علوم کی تحصیل مکمل کر لی۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کی طرف ان کا بالکل میلان نہیں تھا۔

علامہ قشیری بچپن ہی سے حکومت کے کسی بڑے عہدے اور منصب پر فائز ہونے کی تمنا رکھتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے ان علوم کی تحصیل کا منصوبہ بنایا جو اسی مقصد کے لیے معاون ہو سکتے تھے۔ ایک بڑا عہدہ جو حکومت کے مالیات کے شعبے سے متعلق تھا، وہ علامہ قشیری کے پیش نظر تھا۔ اس کے لیے ریاضی کا علم لازمی تھا۔ علم ریاضی کی تحصیل کی غرض سے وہ نیشاپور گئے۔ اس وقت نیشاپور خراسان کا دارالسلطنت اور علم و فن کا مرکز تھا[۵]۔

قشیری نیشاپور میں:-

ریاضی کی تعلیم کے لیے قشیری نے ایک مدرسہ میں داخلہ لیا۔ اور پوری توجہ کے ساتھ اس کے حصول میں لگ گئے۔ اپنی فرصت کے اوقات بھی وہ بلا وجہ ضائع کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا بہترین اور کارآمد مصرف یہ نکالا کہ نیشاپور کے مشہور و معروف علماء اور صوفیاء کی مجلسوں میں بیٹھنے لگے۔ ان مجالس میں جو روح پرور گفتگو اور مواعظ ہوا کرتے تھے ان سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ ایک دن وہ اُس وقت کے مشہور زمانہ عالم اور صوفی ابوالحسن بن علی الدقاق کی مجلس میں پہنچ گئے[۶]۔ وہاں انھوں نے ابوعلی دقاق کی باتیں سنیں، حد درجہ متاثر ہوئے۔ واپسی میں یہ فیصلہ کیا کہ اب اس مجلس میں روزانہ شرکت کروں گا۔ اب وہ دوسروں کی مجلسوں سے بے نیاز ابوعلی الدقاق کی مجلس کے گرویدہ ہو گئے۔ ایک عرصے کے بعد انھوں نے اپنا جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ ان کے دل کی دنیا بدل چکی ہے، زاویہ فکر و نظر میں تغیر آ چکا ہے، معیار خیر و شر میں نمایاں تبدیلی آ چکی ہے، دل میں دنیا کی طمع کی جگہ آخرت کی حرص نے لی ہے، ہوس جاہ و منصب بادِ ہوا ہو گیا ہے۔ اب ایک ہی فکر ہے وہ یہ کہ صالح اور پاکیزہ زندگی کیسے بسر کی جائے تاکہ دنیا لٹے تو لٹ جائے آخرت سنور جائے، جاہ و منصب ہاتھ سے جائے تو جائے آخرت کی سرخروئی مل جائے۔

انھوں نے ریاضی کی تحصیل کا خیال ترک کر دیا اور ابوعلی الدقاق کی خدمت میں خود کو وقف کر دیا اور تعلیم و تربیت کی درخواست کی۔ ابوعلی الدقاق علامہ قشیری کے جذبے سے کافی متاثر ہوئے اور اُن کی حوصلہ افزائی کی۔ لیکن اپنے یہاں کی مخصوص تعلیم و تربیت دینے سے پہلے استاد نے شاگرد کو مشورہ دیا کہ پہلے علوم شرعیہ کی تکمیل کر دو پھر

میرے پاس آؤ۔ ابوعلی الدقاق کے حسبِ حکم علامہ قشیری علوم شرعیہ کی تکمیل کے لیے مختلف علما اور فقہاء کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

انھوں نے فقہ کی تعلیم ابوبکر محمد بن ابی بکر طوسی (م ۴۰۵ھ) سے حاصل کی۔ حدیث اور اصولِ حدیث کے اسباق ابوبکر بن فورک (م ۴۰۶ھ) اور ابو اسحاق ابراہیم بن محمد اسفرائنی (م ۴۱۸ھ) سے پڑھے۔ کلام و منطق میں مہارت ابوبکر باقلانی (م ۴۰۳ھ) سے حاصل کی۔ علامہ ابوبکر باقلانی اپنے وقت کے مشہور متکلم اور فلسفی تھے۔

علوم شرعیہ کی تکمیل سے فراغت حاصل کر کے علامہ قشیری ابوعلی الدقاق کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ابوعلی الدقاق نے انھیں اب اپنا باقاعدہ شاگرد بنا لیا اور انھیں دنیائے تصوف کا سبق پڑھانے لگے۔ اس خانقاہ کی تربیت روایتی صوفیاء سے بالکل مختلف تھی۔

جس چیز کو قرآن کریم نے احسان کہا ہے۔ اسی کی تعلیم اور عملی تربیت وہاں ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ابوعلی الدقاق کسی شخص کو اس وقت تک اپنے حلقۂ ارادت میں نہیں لیتے تھے یا تصوف کی خاص تربیت نہیں دیتے تھے کہ جب تک کہ وہ شخص علوم شرعیہ یعنی تفسیر، حدیث، اصول تفسیر و حدیث، فقہ وغیرہ کی تکمیل نہ کرلے۔ علامہ قشیری جلد ہی احسان و تصوف کے بھی رمز شناس بن گئے اور استاد کی طرف سے تعلیم و ارشاد کی خصوصی اجازت حاصل کر لی۔ اپنی تعلیم و تربیت کے خاص انداز کی وجہ سے وہ بہت جلد مشہور ہو گئے۔ اس شہرت و عزّت کے باوجود کسرِ نفسی کا یہ عالم تھا کہ ابوعلی الدقاق کی وفات کے بعد بھی خود کو کوئی اہمیت نہ دی اور اس وقت کے ایک دوسرے صوفی ابوعبدالرحمٰن سلمی (م ۴۱۰ھ) سے بیعت کر لی اور جب تک وہ زندہ رہے انھیں اپنے استادِ اوّل ابوعلی الدقاق ہی کا مقام دیتے رہے۔ یہ ابوعبدالرحمٰن سلمی وہی ہیں جنھوں نے "طبقات الصوفیہ" لکھی ہے۔

قشیری بحیثیت محدث

علامہ قشیری اپنی تعلیم و تربیت کے سارے مراحل سے گزرنے کے بعد نیشاپور کی ایک مسجد میں علوم شرعیہ کے درس دینے لگے۔ ان میں حدیث اور فقہ پر مشتمل دروس کافی اہمیت کے حامل ہوتے تھے نیشاپور کے طالبانِ حدیث و جویانِ فقہ جوق در جوق ان کے درسوں کی سماعت کی غرض سے آنے لگے۔ بہت جلد ان کی شہرت نیشاپور سے نکل کر مملکت خراسان اور دیگر بلادِ اسلامیہ میں پھیل گئی۔ ان سے استفادہ کرنے کے لیے لوگ دور دور سے سفر طے کر کے نیشاپور میں آنے لگے۔

علامہ قشیریؒ کو احادیثِ نبوی سے کتنا شغف تھا اور صحیح اور مستند احادیث کا کتنا اہتمام کرتے تھے اس کا اندازہ دو باتوں سے ہو سکتا ہے۔ اوّل یہ کہ وہ اپنی زندگی کو حتی الامکان احادیثِ نبویؐ اور سنتِ رسولؐ کے مطابق ڈھالنے کی شعوری کوشش کرتے تھے۔ کوئی امر جو خلافِ سنّت ہوتا اسے ناگواری کے ساتھ اپنی زندگی سے کھرچ کر پھینک دیتے۔ دوم یہ کہ ان کی تصانیف میں احادیث نبویؐ کا کثرت سے التزام کیا گیا ہے۔ وہ اپنی کسی بات کو موکد اور مدلل بنانے کے لیے احادیثِ نبوی کا سہارا لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر تصوف کے نکات پر مبنی ان کا مشہور رسالہ "رسالۃ القشیریہ" کا ہر باب آیاتِ قرآنی کے ساتھ احادیثِ نبوی سے شروع ہوتا ہے۔ اس رسالے میں کل دس ابواب ہیں۔ ہر باب میں مستند اور صحیح احادیث دلائل کے روپ میں موجود ہیں۔ یہ اُن کی حدیث پر گہری نظر پر دلالت کرتی ہیں۔ "کتاب الاربعین فی الحدیث" ان کے حسنِ انتخابِ احادیث کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

قشیری بحیثیت فقیہ :-

علامہ تاج الدین السبکی نے اپنی تصنیف "طبقات الشافعیہ" میں علامہ قشیری کا تذکرہ اہم شافعی فقیہ کی حیثیت سے کیا ہے۔ وہ شافعی فقہ کے نہ صرف پیرو تھے بلکہ اس پر ان کی گہری نظر بھی تھی۔

قشیری بحیثیت مفسّر :-

دنیا نے ابھی تک علامہ قشیری کی اہمیت کو بحیثیت مفسر نہ سمجھا نہ جانا۔ قرآن کریم کی مکمل تفسیر "لطائف الاشارات" قرآن میں ان کی دقتِ نظر کا ثبوت ہے۔ یہ تفسیر ابھی تک مخطوطے کی شکل میں مختلف لائبریریوں کی زینت بنی ہوئی ہے۔ ہندوستان کے مشہور صوفی خواجہ گیسو دراز اس مخطوطے کا بڑی پابندی سے مطالعہ کرتے تھے۔

علمِ تفسیر میں ان کے مقام کی دوسری دلیل ان کی دوسری تصنیف "التیسیر فی علم التفسیر" ہے۔

قشیری کی ہجرت بغداد :- نیشاپور سلجوقی سلطنت کا مرکز

تھا۔ اس وقت سلجوقی حکمراں طغرل بیگ کا وزیراعظم ابونصر منصور بن محمد الکندری تھا۔ وہ مسلک کے اعتبار سے غالی معتزلی تھا۔ وہ بڑی حد تک غیر معتزلیوں اور اسلامی تعلیمات کا در پردہ دشمن تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً رسول اکرمؐ کے پاکباز صحابہؓ پر طعن و تشنیع اور سب و شتم کیا کرتا تھا۔ اس کا یہ طرز فکر و طرز عمل جمہور علماء اور عوام کے لیے باعث اذیت بنا ہوا تھا۔ الکندری نے اپنی حیثیت کا فائدہ اٹھا کر پوری مملکت میں ائمۂ مساجد اور خطبائے جمعہ مسلکِ اعتزال کے حاملین کو مقرر کیا۔ اور علمائے حق کو اپنے جور و ستم کا نشانہ بنایا اسی رو میں اس نے بہت سے علماء اور فقہاء کو ملک بدر کر دیا۔ ان ملک بدر کیے جانے والوں میں تین اہم شخصیتیں بھی تھیں۔ امام الحرمین علامہ جوینی، ابوسہل بن الموفق اور علامہ قشیری۔ یہ تینوں نیشاپور چھوڑ کر سلطنتِ عباسیہ کے دار المقام بغداد پہنچے۔ یہ واقعہ ۴۴۸ھ میں پیش آیا تھا۔ اس وقت تختِ بغداد پر القائم بامر اللہ فائز تھا۔ اس نے ان علماء کا کھلے دل اور گرم جوشی سے استقبال کیا اور انھیں ہر طرح کا آرام پہنچایا۔ نیشاپور سے ترکِ وطن کی داستانِ خونچکاں علامہ قشیری نے بڑی تفصیل سے ایک رسالہ "شکایۃ اہل السنۃ" میں لکھی ہے۔

بغداد میں وہ شافعی فقہ پر درس دینے لگے۔ وہاں بھی بہت جلد اپنی فقہی ژرف نگاہی اور بصیرت کے لیے مشہور ہو گئے۔ ان کے دروس اتنے مؤثر ہوا کرتے تھے کہ جو ایک بار سن لیتا وہ گرویدہ ہو جاتا اور دوبارہ سننے کے لیے بے چین رہتا۔ خلیفۂ بغداد القائم بامر اللہ بھی ان کے دروس میں شریک ہوا کرتا تھا۔ خلیفہ نے ان کے دروس کا انتظام شاہی محل میں بھی کیا تاکہ اس کے حرم کی مکینیں بھی مستفید ہو سکیں[1]۔ ایک عرصے کے بعد امام الحرمین اور ابوبکر البیہقی کے ساتھ امام قشیری حج بیت اللہ کو چلے گئے۔

نیشاپور میں دوبارہ آمد:۔

ہجرتِ بغداد کے دو ہی سال بعد سلجوقی حکمراں طغرل بیگ کو اپنے وزیراعظم الکندری کے فسق و فجور کا علم ہو گیا۔ جب اس پر اس کا ظلم واضح ہو گیا تو اس کے غصے کی کوئی حد و انتہا نہ رہی۔ چونکہ وہ ایک راسخ العقیدہ سنی مسلمان تھا۔ لہٰذا اس نے الکندری کو انتہائی عبرت انگیز انجام سے دو چار کیا۔ اس نے اس کے قتل کا حکم دے دیا اور پھر اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنی مملکت کے مختلف حصوں میں عبرت کے لیے بھیج دیے تاکہ پھر کسی کو ارتکاب فسق و فجور کا یارا نہ رہے۔

۴۵۵ھ میں طغرل بیگ کی موت کے بعد اس کا لائق اور جری بھتیجا الپ ارسلان تخت نشین ہوا۔ الپ ارسلان نے وقت کے مشہور عالم دوست نظام الملک کو اپنا وزیراعظم مقرر کیا۔ اس نے نیشاپور کی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ وہ مجلسیں جو الکندری کے جبر و ظلم سے خالی ہو چکی تھیں از سرِ نو آباد ہو گئیں۔ اس نے ان تمام علماء کو واپس بلایا جنھیں الکندری نے جلاوطن کر دیا تھا۔ نظام الملک کا دعوت نامہ اور درخواست علامہ قشیری کو بھی پہنچی۔ علامہ فوراً نیشاپور واپس چلے گئے۔ وہ مسند درس و افتاء دوبارہ سنبھال لی جو برسوں سے سونی پڑی تھی۔ طالبانِ حدیث اور جویانِ علم پھر قشیری کے حلقۂ درس میں جمع ہونے لگے[1]۔

وفات:۔ نیشاپور دوبارہ واپسی کے بعد دس سال زندہ رہ کر ۴۶۵ھ میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے[2]۔

قشیری کی اولاد:۔

علامہ ابو علی الدقاق اپنے شاگرد قشیری کی ذہانت طباعی، ژرف نگاہی اور تقوے سے اتنا متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنی بیٹی فاطمہ کو جو خود ایک عالمہ فاضلہ تھیں قشیری کے نکاح میں دے دیا۔ ان کی بیٹی نے علامہ ابونعیم اور صاحب المستدرک حاکم نیشاپوری جیسے یگانۂ روزگار علماء و محدثین سے احادیث کی سماعت کی تھی۔ فاطمہ کا انتقال اپنے شوہر کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔ ان سے قشیری کے چھ بیٹے ہوئے اور سب کے سب اپنے وقت کے مشہور اساطین علم ثابت ہوئے ان کے نام یہ ہیں[3]

۱۔ ابوسعد عبداللہ — ۲۔ ابوسعید عبدالواحد
۳۔ ابومنصور عبدالرحمٰن — ۴۔ ابونصر عبدالرحیم
۵۔ عبیداللہ — ۶۔ ابوالمظفر عبدالمنعم

قشیری کے شاگرد:۔

علامہ قشیری کے شاگردوں کی تعداد بے شمار ہے۔ تذکرہ نگاروں نے بہت سے شاگردوں کے نام گنائے ہیں۔ مشہور شاگرد یہ تھے[4]

۱۔ ابوبکر خطیب بغدادی ۲۔ ابو ابراہیم اسماعیل بن الحسن علوی ۳۔ ابو محمد اسماعیل بن ابو القاسم نیشاپوری۔ ۴
۵۔ ابو علی الفضل بن محمد

تصنیفات:۔

انھوں نے علوم شرعیہ کے مختلف گوشوں پر قلم اٹھایا۔ ان کی کتابیں تفسیر، حدیث، فقہ، کلام اور تصوف سب ہی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ علامہ تاج الدین السبکی کے مطابق انھوں نے کل پندرہ کتابیں لکھیں ۹؎

۱۔ التیسیر فی علم التفسیر ۲۔ الرسالۃ القشیریہ۔
۳۔ التحبیر فی التذکیر۔ ۴۔ آداب الصوفیا۔
۵۔ لطائف الاشارات۔ ۶۔ کتاب الجواہر۔
۷۔ عیون الاجوبہ۔ ۸۔ کتاب المناجات۔
۹۔ کتاب نکت اولی النہی۔ ۱۰۔ کتاب نحو القلوب الکبیر۔
۱۱۔ کتاب نحو القلوب الصغیر ۱۲۔ کتاب احکام السماع۔
۱۳۔ کتاب الاربعین فی الحدیث ۱۴۔ شکایۃ اہل السنۃ۔
۱۵۔ کتاب الفتوی۔

علامہ قشیری سے منسوب مزید کتب کی تحقیق ہوئی ہے۔

۱۶۔ حیات الارواح۔ ۱۷۔ کتاب المعراج
۱۸۔ الفصول ۱۹۔ اللمع
۲۰۔ التوحید النبوی ۲۱۔ ترتیب السلوک
۲۲۔ شرح اسماء الحسنیٰ۔

علامہ موصوف نے جتنی طویل عمر پائی اور کم عمری ہی سے لکھنے کا جو ذوق پایا تھا، اس کے پیش نظر یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اور بھی کتابیں لکھی ہوں گی جو زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ کر ہم تک نہ پہنچ سکیں۔ خود مندرجہ بالا فہرست کی کئی ایک کتابیں آج موجود نہیں ہیں۔ ان کی جو کتابیں موجود ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ الرسالۃ القشیریہ ۔ یہ قشیری کی اہم تصنیف ہے۔ ابونصر سراج کی کتاب اللمع کی دریافت سے قبل تک یہ رسالہ ہی دنیائے تصوف کی پہلی تصنیف تصور کی جاتی تھی۔ یہ کتاب پوری دنیا میں ہر جگہ موجود ہے اس کی طباعت کئی بار ہوچکی ہے۔ مشہور مصری محقق شیخ الاسلام زکریا انصاری نے اس رسالے کی بے نظیر شرح لکھی ہے۔

۲۔ ابھی حال ہی میں ادارۂ تحقیقات اسلامی، پاکستان نے قشیری کے تین رسائل شکایۃ اہل السنۃ، ترتیب السلوک اور "کتاب السماع" کی اشاعت کی ہے ۱۰؎

۳۔ لطائف الاشارات:۔ یہ تفسیر کی مکمل کتاب ہے۔ ابھی تک مخطوطے کی شکل میں آصفیہ لائبریری حیدرآباد اور دمشق اور لیڈن کے کتب خانوں میں محفوظ ہے۔

۴۔ حیاۃ الارواح:۔ یہ اسلاف کی چند متقدر ہستیوں کے سوانحی تذکروں پر مشتمل ہے۔ اس کا مخطوطہ اسکوائرل میں ہے۔

۵۔ کتاب المعراج:۔ حال ہی میں مصر سے ڈاکٹر حسن عبدالقادر نے اس کی اشاعت کی ہے۔

۶۔ الفصول:۔ اس کا مخطوطہ مصر میں ہے۔

۷۔ اللمع:۔ اس کا بھی مخطوطہ مصر میں ہے۔

۸۔ التوحید النبوی:۔ یہ بھی بشکل مخطوطہ مصر میں ہے۔

۹۔ کتاب الاربعین فی الحدیث:۔ لیڈن میں اس کا مخطوطہ محفوظ ہے۔

۱۰۔ شرح اسماء الحسنیٰ:۔ یہ مخطوطے کی شکل میں موصل، تہران، تیونس اور دمشق کے کتب خانوں میں ہے ۱۱؎

ان کی شخصیت:۔

علامہ قشیری ایک عظیم عالم دین، فقیہ، محدث، مفسر، متکلم، صوفی، نحوی، شاعر، ادیب اور خطیب تھے ۱۲؎ اللہ نے ان کو عقلی اور روحانی دونوں طرح کے کمالات وصفات سے نوازا تھا۔ وہ ایک بہترین شہسوار تھے۔ وہ جنگی آلات کے استعمال میں بھی مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ عوام وخواص سب ان کے علم وتقوے کے معترف اور گرویدہ تھے۔ ان کی مجلسوں میں حکام وارکین سلطنت بھی شریک ہوتے اور فیض اٹھاتے تھے اور تمام مسلمان بھی ایک خاص جذبۂ عقیدت سے معمور ان کے مواعظ ودروس سنا کرتے تھے۔ ان کے معاصرین نے ان کی عظمت کا کھلے دل سے

اعتراف کیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ وہ اپنی زندگی میں مفسر، محدث، فقیہ اور صوفی سب ہی کچھ تھے، لیکن ان کی موت کے بعد ان کی دوسری حیثیتوں کو بھلا دیا گیا اور انھیں صرف صوفی مصنف کی حیثیت سے یاد رکھا گیا اور یہ ناانصافی آج تک جاری ہے۔ دنیا اس بات کی منتظر ہے کہ اہلِ علم کی عدالت سے اس ظلم کے خلاف فیصلہ صادر ہو اور تلافیِ مافات کی کوئی سبیل نکالی جائے۔

علامہ موصوف کا حافظہ بلا کا تھا۔ وہ جو کچھ اپنے اساتذۂ کرام سے سماعت کرتے اسے فوراً یاد کر لیتے تھے۔ ایک بار وہ ابواسحاق اسفرائنی کے حلقۂ درس میں شریک تھے۔ تمام طلبا استاد کی گفتگو تحریری طور پر نقل کرتے جاتے تھے۔ لیکن قشیری اس سے بے نیاز دماغ کی تہوں میں نقش کرتے جاتے تھے۔ استاد کی نظر لوح و قلم سے بے نیاز شاگرد پر پڑی تو انھیں بھی لکھنے کا حکم دیا۔ اس کے جواب میں علامہ قشیری نے اب تک جو کچھ سنا تھا فرفر سنا دیا۔ علامہ اسفرائنی حیرت زدہ رہ گئے اور اتنے متاثر ہوئے کہ شاگرد کو اپنی تصنیفات پڑھنے اور ان سے استفادہ کرنے کی اجازت دے دی اور کہا کہ تمھیں میرے درس میں بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمھارے لیے میری کتابوں کا مطالعہ کافی ہے[۹]

وہ ایک شعلہ بار مقرر تھے۔ انھوں نے اپنی شعلہ بیانی سے لوگوں کو اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دی۔ ان کی تقریریں اتنی موثر ہوا کرتی تھیں کہ ان کا ایک ایک لفظ دل میں اترتا اور پیوست ہوتا چلا جاتا تھا۔ ان کی تقریر سن کر سامعین کی آنکھیں اشکبار ہو جایا کرتی تھیں ابوالحسن باخرزی اپنی کتاب "دمیۃ القصر" میں لکھتے ہیں کہ علامہ قشیری کی مجلسوں میں اتنی اثر آفرینی ہوتی تھی کہ اگر شیطان بھی انھیں سنتا تو اپنے گناہوں پر نادم ہو جاتا۔[۱۰]

ابن خلکان کہتے ہیں کہ امام قشیری وعظ و تذکیر کے میدان میں نمایاں تھے[۱۱] علامہ تاج الدین السبکی لکھتے ہیں کہ علامہ قشیری کے درس میں طلبا اکثر و بیشتر دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے تھے[۱۲] یہ علامہ قشیری کے [illegible] [۱۳] کی اثر انگیزی کا عالم تھا۔

ابوالحسن باخرزی کہتے ہیں کہ علامہ قشیری اپنے وقت کے ایک عظیم شاعر بھی تھے۔ انھیں عربی صرف و نحو اور لغت پر مکمل عبور حاصل تھا[۱۴]

ان کی شخصیت انتہائی دلآویز اور پرکشش تھی۔ وہ اپنے اساتذہ کا اتنا احترام کرتے تھے کہ علامہ ابوعلی الدقاق کی خدمت میں ہمیشہ غسل کر کے حاضر ہوا کرتے تھے کہ مبادا ان کے جسم سے نکلی ہوئی بو استادِ محترم کی اذیت کا باعث ہو[۱۵]

حوالہ جات

۱۔ حاجی خلیفہ: کشف الظنون جلد اول ص ۸۸۲ اور ابن قاضی شہبہ طبقات الشافعیہ ج اول۔ ص ۲۷۴

۲۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (اردو) ملاحظہ ہو حرف ق میں قشیری

۳۔ ابن خلکان: وفیات الاعیان ج دوم۔ ص ۳۷۵

۴۔ عبدالماجد دریابادی: تصوف اسلام ص ۸۱۔ ۸۰

۵۔ ابن خلکان: وفیات الاعیان ج دوم ص ۳۷۶ — ۳۷۵

۶۔ جامی، عبدالرحمان: نفحات الانس ص ۳۱۳۔

۷۔ چشتی، یوسف سلیم: تاریخ تصوف ص ۴۵۸ اور ابن قاضی شہبہ طبقات الشافعیہ ج اول ص۔ ۲۷۳

۸۔ السبکی، تاج الدین: طبقات الشافعیہ ج سوم ص ۲۴۳—۲۴۸

۹۔ ایضاً

۱۰۔ چشتی، یوسف سلیم: تاریخ تصوف ص ۴۵۹

۱۱۔ ابن خلکان: وفیات الاعیان۔ ج ۲ ص ۳۸۰

۱۲ چشتی، یوسف سلیم: تاریخ تصوف ص ۴۶۲ ۱۳۔ ایضاً

۱۴ السبکی، تاج الدین: طبقات الشافعیہ ج سوم ص ۲۴۸ – ۲۴۷

۱۵۔ چشتی، یوسف سلیم: تاریخ تصوف ص ۴۶۳

۱۶۔ مجلہ التربیۃ الاسلامیۃ، بغداد ۱۳۹۱ھ رمضان المبارک

۱۷۔ ابن خلکان: وفیات الاعیان، ج دوم ص ۳۷۵

۱۸۔ قادری، سید احمد: اسلامی تصوف ص ۳۵۶

۱۹۔ ابن خلکان: وفیات الاعیان ج دوم ص۔ ۳۷۵

۲۰۔ ایضاً۔

۲۱۔ ایضاً ج دوم ص ۳۷۸

۲۲۔ چشتی، یوسف سلیم: تاریخ تصوف۔ ص ۴۶۲ - ۴۶۱

۲۳ ایضاً۔

نذیر احمد خان*

کیمیا سے کیمسٹری تک

کیمیا کیا ہے اور اس نے الکیمیا سے الکیمی اور پھر کیمسٹری تک سفر کیسے کیا؟ یہ داستان بڑی ہی دلچسپ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس علم کا اصلی وطن مصر ہے۔ یونانی زبان میں کالے رنگ کے لیے کیم کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ وادیٔ نیل کی مٹی کالے رنگ کی ہے، اس لیے وہاں سے جب یہ علم اپنی ابتدائی شکل میں پہنچا تو یونانیوں نے اس کا نام کیمیا رکھ دیا اور جب مسلمان عرب دانشوروں نے اسے ترقی اور شہرت دی تو اہلِ یورپ اس علم سے الکیمیا کے نام سے متعارف ہوئے جو یورپی زبانوں میں الکیمی اور پھر سترھویں صدی عیسوی میں کیمسٹری کہلانے لگا۔

کیمیا کی وجہ تسمیہ کو وادیٔ نیل کی سیاہ مٹی سے نسبت ہو یا نہ ہو، لیکن بلاشبہ مصر ہی قدیم زمانے میں اس علم کا گہوارہ رہا ہے اور دعوے کے تحریری شواہد موجود ہیں۔ سب سے پرانی دستاویز جرمنی کے ماہر آثارِ قدیمہ جارج ایبرز کو ایک قبر سے ملی تھی، جو پیپرس پر لکھی ہوئی ہے۔ یہ دستاویز کسی قدیم کیمیادان نے ۱۵۵۰ ق م میں تیار کی تھی اور اس کے لیے ستر فٹ لمبا کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں مختلف بیماریوں کی دواؤں کے آٹھ سو سے زائد نسخے درج ہیں۔ پیپرس پر لکھی ہوئی چند اور دستاویزات سویڈن کے ایک سفارت کار کو ملی تھیں جن میں سے کچھ تو ہالینڈ کی لیڈن یونیورسٹی اور کچھ سویڈن کی سٹاک ہوم یونیورسٹی میں پہنچ گئیں۔ انھیں پڑھنے سے یہ معلوم ہوا کہ ان میں خاصی کیمیائی معلومات درج ہیں۔ جن کا تعلق رنگ سازی، دھاتوں کی آپس میں آمیزش اور مصنوعی قیمتی پتھر تیار کرنے سے ہے اور اُن کے لیے ستّر سے زیادہ طریقے بتائے گئے ہیں۔

ابتدا میں کیمیا مصر کے شہر اسکندریہ کی علمی فضا میں پروان چڑھی۔ ۳۳۲ قبل مسیح میں جب اسکندر نے مصر فتح کیا، تو اپنے نام پر اسکندریہ کا شہر آباد کیا اور بطلیموس شہنشاہوں نے جو اسکندر کے ہم وطن تھے، اسکندریہ کو علوم و فنون کا بہت بڑا مرکز بنا دیا۔ یہاں ایک بیش قیمت کتب خانہ اور ایک یونیورسٹی تھی جس کے اساتذہ میں نامور فلاسفر اور محقق شامل تھے۔ اسی شہر میں اقلیدس نے ریاضیات کا شاندار مدرسہ قائم کیا تھا۔ جس کا ایک ہونہار طالب علم ارشمیدس بھی تھا۔ اسکندریہ کے علمی حلقے میں ایراٹوس تھینیز بھی تھا، جس نے سب سے پہلے کرۂ ارض کی وسعت معلوم کی۔ ہپارکس بھی یہیں کا باشندہ تھا۔ جس نے ایک ہزار سے زائد ستاروں کی فہرست تیار کی۔ اسی شہر کا مکین اپولونیس بھی تھا، جس نے جیومیٹری کی ایک مشہور کتاب لکھی۔ دانشوروں اور فلاسفروں کے اسی ماحول میں کیمیا کو فروغ حاصل ہوا۔

لیکن اسکندریہ کے عہدِ زریں سے خاصی مدت پہلے اہلِ مصر بہت سے کیمیائی تجربات کر چکے تھے۔ کیمیائی تبدیلیوں کا سب سے اہم ذریعہ آگ ہے اور انسان آگ بہت پہلے دریافت کر چکا تھا۔ باور کیا جاتا ہے کہ زمینی آگ سے پہلے اس کی شناسائی آسمانی آگ سے ہوئی ہوگی۔ لیکن برق گرنے کی تمنا شاید ہی کسی نے کی ہو۔ پھر ہر جگہ اور ہر موسم میں بجلی گرتی بھی تو نہیں۔ اس کے علاوہ ایسی چیز کا کیا بھروسہ جو اپنے اختیار میں نہ ہو۔ اس لیے جب انسان

---

* نذیر احمد خان، — پاکستان۔

نے دو پتھر باہم رگڑ کر چنگاری پیدا کرنے کا راز معلوم کر لیا تو اسے آگ پر قدرت حاصل ہو گئی، اور اس دریافت سے کیمیا کی فتوحات وسعت اختیار کرتی چلی گئیں۔

آگ کی مدد سے مٹی کے پختہ برتن تیار ہوئے اور اُن میں کھانا پکنے لگا۔ کھانے میں لذت پیدا کرنے اور اسے زیادہ عرصے تک محفوظ رکھنے کے لیے نمک استعمال کیا گیا جسے پہلا کیمیکل مانا جاتا ہے۔ خمیر بنانے کا طریقہ مصری پہلے ہی دریافت کر چکے تھے، اب سرکہ بھی کھانے میں شامل ہو گیا اور یہ سب کچھ کیمیا کا مرہونِ منت تھا۔

کیمیائی تبدیلی پیدا کرنے کے لیے پھٹکری بھی قدیم زمانے سے استعمال کی جا رہی ہے۔ اس کا بہت بڑا ذخیرہ قاہرہ کے جنوب میں تھا جہاں سے وہ اسکندریہ لائی جاتی اور پھر پرانی دنیا کے بیشتر حصوں کو برآمد کی جاتی۔ اسے چمڑا کمانے اور پختہ رنگ بنانے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

سرزمینِ مصر کا ایک اور قابلِ ذکر کیمیکل خام شورہ تھا۔ یہ شیشہ سازی میں بھی کام آتا اور اس سے میلے کپڑے بھی صاف کیے جاتے لیکن اہلِ مصر نے خام شورے اور نمک کی آمیزش سے وہ حیرت انگیز کیمیائی نسخہ تیار کر لیا تھا جو مردہ جسموں کو طویل عرصے تک محفوظ رکھ سکتا تھا۔

فراعنہ مصر ان کیمیاگروں کے یقیناً شکر گزار ہوں گے جنھوں نے ان کی لاشیں حنوط کر کے ابدی زندگی پانے کا خواب بڑی حد تک سچ کر دکھایا۔

اہلِ مصر ابٹن اور غازے کے بھی شیدائی تھے۔ مصر کے قدیم باشندے یہ اشیاء نہ صرف حسن میں نکھار پیدا کرنے کے لیے استعمال میں لاتے، بلکہ یہ ان کا عقیدہ بھی تھا کہ بن سنور کر عبادت گاہوں میں جانے سے دیوی دیوتا خوش ہوتے ہیں۔ وہ لوگ بحیرۂ روم کے ایک گھونگے سے نیلا رنگ اور ایک ننھے کیڑے سے پختہ سرخ رنگ حاصل کرتے۔ سورج مکھی، زعفران اور ہلدی سے پیلا رنگ بنایا جاتا اور کپڑا رنگتے وقت اس میں خام شورہ بھی شامل کر لیا جاتا۔ گیرو، سرخ سیسے اور کھریا مٹی سے بھی رنگ بنایا جاتا، جس سے بادشاہوں اور امراء کے محلات کی دیواریں رنگی جاتیں۔

مصری کیمیاگروں کا ایک بہت بڑا کارنامہ پیپرس سے کاغذ بنانا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اُن ہی نے چراغ کی کالک بطور سیاہی استعمال کی۔ کاغذ اور سیاہی نے تحریر کی بنیاد رکھی اور یوں ایک نسل کا حاصل کردہ علم دوسری کو منتقل ہونے لگا۔

کیمیاگروں کے راز:

مصر کے علاوہ پرانی دنیا میں اور بھی ایسے علاقے تھے جہاں انسان کیمیائی تجربات کرنے لگا تھا، اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ مشرقِ اوسط، جنوبی ایشیا اور چین میں کیمیاگروں نے اتنی ہی ترقی کی ہو جتنی مصر سے منسوب ہے اور یہ بات تو یقینی ہے کہ عہدِ قدیم کے مختلف علاقوں میں دھاتوں پر کیمیائی عمل کے تجربات شروع ہو گئے تھے۔

خیال ہے کہ پہلے وہی دھاتیں روزمرہ کی زندگی میں داخل ہوئی ہوں گی، جو خالص شکل میں پائی جاتی ہیں، اور اُن میں سونا سرِفہرست ہے۔ پیرو (جنوبی امریکہ) میں ۹۰۰ ق م کے لگ بھگ اس کے خوبصورت زیورات تیار ہوتے تھے۔ فراعنۂ مصر کی مومیائی ہوئی لاشیں زیرِزمین مقبروں کے اندر سونے کے تابوتوں میں رکھی جاتی تھیں۔ فرعون توتنخ آمون کی مومیا جس تہہ خانے سے ملی اس میں پوری کی پوری دیوار سونے کی تھی۔ اسے دھاتوں کا ”گونگا محبوب“ کہا گیا ہے۔ کیمیاگروں کے خیال میں ہر دھات کی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اپنی تکمیل کی منزلوں سے گزر کر سونا بن جائے۔ اسی لیے وہ دوسری دھاتوں کو سونا بنانے میں کھوئے رہے۔

سونے کو ہر زمانے میں ابدیت سے منسوب کیا گیا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اگر سونے کو مائع بنا کر پی لیا جائے تو ابدی زندگی حاصل ہو جائے گی۔ مشہور مورخ پلینی لکھتا ہے ”سونا جسم پر رگڑنے سے جلدی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔ یہ نرم اتنا ہے کہ اس کے ایک انچ کے ساڑھے تین لاکھویں حصے سے بھی باریک ورق تیار کیے جا سکتے ہیں اور ایک اونس سونے سے پچاس میل لمبا تار حاصل کیا جا سکتا ہے۔“

سونے کے علاوہ ایک اور دھات پر بھی پرانے زمانے کے لوگوں کی نظر پڑی اور وہ ہے تانبا۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے تانبے کی بنی ہوئی ایسی چیزوں کا سراغ لگایا ہے جو ۴۰۰۰ ق م میں استعمال ہوتی تھیں، لیکن یہ تیز دھار اوزار بنانے میں کام نہ آ سکتا تھا۔ چنانچہ یہ اعزاز بھی کسی کیمیاگر کا ہے کہ اس نے تانبے میں قلعی (ٹین) ملا کر کانسی تیار

کر ڈالی۔ جس کے نام سے تہذیبِ انسانی کا ایک دور منسوب ہوا۔

لوہا پگھلانے کے لیے ۱۵۰۰ درجہ سینٹی گریڈ ٹمپریچر کی ضرورت ہوتی ہے اور پرانے زمانے میں اتنی زیادہ حرارت پیدا کرنے کا اہتمام نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اسے بار بار بھٹی میں ڈال کر سرخ کیا جاتا اور بھاری ہتھوڑے کی ضربات سے اس کی ملاوٹ دور کی جاتی۔ فولاد بنانے کا سہرا ایک شامی کیمیاگر کے سر ہے، جس نے ۱۴۰۰ ق م میں یہ پتہ لگایا تھا کہ اگر لوہے میں تھوڑا سا کاربن ملا دیا جائے تو کہیں زیادہ مضبوط اور کارآمد دھات حاصل ہوگی۔ بعد ازاں یہ بھی معلوم کر لیا گیا کہ اگر فولاد کو سرخ گرم کرکے فوراً ہی پانی میں ڈال کر ٹھنڈا کر لیا جائے تو اس کی پختگی بڑھ جاتی ہے۔

ابتدائی کیمیا کا یہ دور کوئی ۴۰۰۰ برس پر محیط ہے اور اس کے خدوخال اس وقت کچھ اور واضح ہوتے ہیں جب ہم ارسطو (۳۸۴-۳۲۲ ق م) کے زمانے میں پہنچتے ہیں۔ وہ پہلا دانشور ہے جس نے کیمیا کو سائنسی بنیادوں پر استوار کرنے کی سعی کی اور یہ نظریہ پیش کیا کہ دنیا کی ہر شے میں چار سے زیادہ بنیادی عناصر نہیں ہوتے اور یہ عناصر ہیں؛

مٹی ۔ ہوا ۔ پانی اور آگ

اگرچہ یہ نظریہ بعد میں غلط ثابت ہوا۔ لیکن اس کا سحر تقریباً دو ہزار سال تک دنیا کے بہترین دماغوں پر چھایا رہا۔ اہلِ چین کا نظریہ تھا کہ تمام دنیا پانچ عناصر سے مل کر بنی ہے:

پانی ۔ آگ ۔ مٹی ۔ لکڑی اور دھات

لیکن اس کے مقابلے میں یونانی فلسفے کو اس وجہ سے زیادہ شہرت ملی کہ اسے نشر و اشاعت کے بہتر مواقع اور مسلمان مل گئے جن کے ذریعے وہ دنیا بھر میں پھیل گیا۔ ڈیمو کریٹس وہ یونانی کیمیا داں تھا جس نے ۲۰۰ قبل مسیح میں "فزیکیا" نامی کتاب لکھی۔ اس کتاب کے چار حصے تھے۔ پہلے حصے میں سونا بنانے کا طریقہ درج تھا۔ دوسرے حصے میں چاندی تیسرے حصے میں ہیرے جواہرات اور چوتھے میں پیلا رنگ بنانے کے طریقوں پر بحث کی گئی تھی۔

دوسرا قلمی ریکارڈ پانچ سو سال بعد کا ہے، اور وہ ہے کہ مصر کے زاسی موس کا انسائیکلوپیڈیا جو اٹھائیس جلدوں میں لکھا گیا تھا اس میں کیمیاوی نسخے درج ہیں لیکن ان میں سے بیشتر طلسمات کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں۔

کیمیا کا اسلامی دور

زاسی موس کے بعد کافی عرصے تک کیمیائی تجربوں اور نسخوں کا کوئی مفصل اور جامع تحریری ریکارڈ نظر نہیں آتا اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس زمانے کی متمدن دنیا سیاسی اور معاشرتی استحکام سے محروم ہوتی جا رہی تھی۔ روم نے یونان اور مصر کا عہدِ زریں مٹا دیا لیکن وہ خود بھی اتنا بھاری بھرکم ہو گیا کہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ ۶۴۰ء میں رومیوں کو مصر میں عربوں کے ہاتھوں شکست ہوئی اور دو برس بعد مسلمانوں نے اسکندریہ پر قبضہ کر لیا۔ وہی اسکندریہ جو صدیوں سے علوم و فنون کا مرکز تھا۔ عربوں کی فتح محض حکمرانوں کی تبدیلی نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ انسانی تہذیب اور تمدن کا ایک باب بند ہوا اور دوسرا کھل گیا۔

تہذیب و تمدن کا یہ دوسرا باب مسلمانوں کی علمی تحقیقات سے منور ہے۔ انھوں نے کیمیا، ریاضیات، فلکیات اور میڈیکل سائنس میں خصوصی دلچسپی لی۔ اور ان کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے یونان و روم کے علوم محفوظ کیے اور انھیں وسعت بھی دی۔ یونانی اور رومی دانشور زیادہ تر تھیوری پر انحصار کرتے اور عملی تجربے کو حقیر سمجھتے ان کا خیال تھا کہ ہاتھ کا استعمال غلاموں کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن مسلمانوں نے تھیوری کو عمل کی میزان پر پرکھا اور فطرت کے مطالعے اور مشاہدے کو اپنا رہنما بنایا۔

پہلا کیمسٹ:

عربوں میں سب سے بڑا کیمیا داں جابر ہے جس کی پیدائش ۷۲۱ء اور وفات ۸۱۵ء میں ہوئی۔ وہ بہت بڑا عالم و فاضل تھا۔ اور اسے خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں ایک طبیب کی حیثیت سے اعلیٰ مقام حاصل تھا — اس نے علم کیمیا کے بارے میں تقریباً پانچ سو کتابیں لکھیں۔ اسے دنیا کا سب سے پہلا کیمسٹ بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے سب سے پہلے سائنسی لیبارٹری قائم کی اور مختلف کیمیائی آلات بنائے فولاد سازی کے مختلف طریقے بیان کیے، چمک دار سیاہی بنائی اور لوہے کو زنگ سے محفوظ رکھنے کا وارنش اور کئی طرح کے تیزاب تیار کیے۔ اسی نے سب سے پہلے اونٹ کا گوبر جلا کر امونیا گیس حاصل کی۔

عرب کیمیا دانوں میں دوسرا نام ابو محمد محمد بن زکریا الرازی (۸۶۴ء تا ۹۲۵ء) کا ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر دو سو مجلس کتابیں لکھی تھیں۔ علم طب پر ان کی تصنیف یورپ میں سترھویں صدی تک مقبول رہی۔ مسلمانوں میں سب سے پہلے انہی انسائیکلو پیڈیا مرتب کیا۔ انھوں نے مادّے پر کافی بڑی تحقیق کی اور دنیا میں پائی جانے والی تمام اشیاء کو مختلف گروہوں میں رکھا۔ اس ضمن میں ان کی تیار کردہ فہرست نو سو سال بعد تک برقرار رہی۔ انھوں نے کیمیا پر ایک عملی کتاب لکھی جس میں تجرباتی آلات کی تفصیل درج ہے۔

ایران میں ابو منصور موافع نے بہت سے کیمیکل دریافت کیے۔ سوڈیم کاربونیٹ اور پوٹاشیم کاربونیٹ کا فرق معلوم کیا اور یہ دریافت کیا کہ اگر جپسم کو گرم کرکے انڈے کی سفیدی ملادی جائے تو پلاسٹر آف پیرس کی طرح کا مرکب بن جاتا ہے۔

۹۸۰ء میں عربوں کا ارسطو پیدا ہوا اور وہ تھے ابن سینا انھوں نے لیبارٹری کے اندر دھاتوں اور معدنیات پر تجربے کیے اور یہ بتایا کہ تانبے کو سونے میں تبدیل کرنا ممکن نہیں۔ طب پر ان کا مرتب کردہ انسائیکلوپیڈیا دس لاکھ الفاظ پر مشتمل ہے۔ ان کی طبی تصانیف یورپ کی یونیورسٹیوں میں صدیوں تک داخل نصاب رہیں۔ ان کی ایک تصنیف معدنیات اور ان کے خواص کے بارے میں ہے۔

یورپ کی دلچسپی

ابن سینا کے بعد مسلمانوں میں اور بھی حکما پیدا ہوئے اور علم کے چرچے مختلف مراکز میں رہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ۷۳۲ء میں عربوں کی حکومت وادیٔ سندھ سے لے کر فرانس کے صوبۂ گال تک پہنچ گئی تھی۔ اور ایک زمانہ وہ بھی تھا جب وہ تمام یونانی، لاطینی، چینی اور ہندوستانی کتابیں عربی میں منتقل کردی گئیں تھیں جو کسی بھی گوشے سے دستیاب ہوسکیں۔ بغداد نئے خیالات کا پاور ہاؤس کہلاتا تھا۔ ...۱ء میں قرطبہ کی لائبریری میں فزکس، ریاضیات، طب، کیمیا اور دیگر علوم پر پانچ لاکھ سے زائد کتابیں موجود تھیں۔ لیکن پھر مسلمانوں کا علمی شغف بتدریج کمزور پڑتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ صلیبی جنگوں (۱۰۹۶ء۔ ۱۲۷۰ء) میں عیسائیوں نے مسلمانوں کا نام ونشان مٹانے کا بیڑا اٹھایا اور برطانوی پادری راجر بیکن نے اسلامی شہروں کو سائنسی طاقت سے جلا ڈالنے کے منصوبے بنانے لگے۔

بیکن کا خوفناک منصوبہ

راجر بیکن (۱۲۱۴ء تا ۱۲۹۲ء) کے ہاتھ مسلمان سائنس داں ابن الہیثم کی ایک کتاب لگی جس کا موضوع تھا "شیشۂ سوزاں" یعنی آتشی شیشہ، اس کی پہلی جلد میں ابن الہیثم نے جیومیٹری کے اصولوں سے یہ ثابت کیا تھا کہ سورج کی شعاعیں شیشے میں اس طرح اتاری جاسکتی ہیں کہ جلانے والا ہتھیار بن سکے۔ راجر نے پوپ کلیمنٹ چہارم کو لکھا کہ وہ ابن الہیثم کی کتاب پڑھنے کے بعد "شیشۂ سوزاں" تیار کر رہا ہے جس سے عربوں کے تمام شہر جلائے جاسکتے ہیں۔ اور صلیبی جنگوں میں کسی بھی سپاہی کو تلوار اُٹھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہ محض اتفاق ہے کہ اسے کتاب کی دوسری جلد نہ مل سکی اور وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

راجر بیکن علم کو طاقت کے حصول کا ذریعہ اور مشاہدے اور تجربے کو علم کی بنیاد سمجھتا تھا اور اس کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اہل یورپ نے اس کی ہدایات پر عمل کیا۔ وہ ہسپانیہ کے عربی کالجوں میں مدتوں علم حاصل کرتے رہے۔ انھوں نے اندلس کی لائبریریوں کا ورق ورق چھان مارا اور ان تمام کتابوں کے ترجمے کیے جو عربی زبان میں تھیں۔

عربی سے یورپی زبانوں میں ترجمہ کرنے والوں میں بارہویں صدی کے انگریز دانشور رابرٹ کو خاص مقام حاصل ہے۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ دو سال میں قرآن شریف کا ترجمہ لاطینی میں کیا اور پھر کیمیا کی ایک کتاب اس زبان میں ڈھالی۔ یورپ میں کیمیا کی یہ پہلی کتاب تھی انگلینڈ کے ایک دوسرے دانشور ایڈلارڈ نے بھی عربی سے ترجمے کیے اور اس نے بتایا کہ عربوں کی ترقی کا راز یہ ہے کہ انھوں نے علم کو مشعل راہ بنایا۔ ایک اور مترجم تولیدو (طلیطلہ) کا جیراڈ تھا اس نے تمام عمر عربی سے لاطینی ترجمے کے لیے وقف کردی۔

یہاں سے کیمیا ایک نیا رُخ اختیار کرگئی۔ اہل یورپ نے بھی پہلے پہل کیمیائی طور پر سونا اور اکسیر حاصل کرنے کی کوشش کی اور یہ سلسلہ صدیوں چلتا رہا، لیکن انھوں نے بتدریج کیمیا کو توہمات سے نکال کر سائنس کے روپ میں ڈھال دیا۔ وہ صلیبی جنگوں سے بہت کچھ

سیکھ چکے تھے اور جب مارکو پولو کو منگول شہنشاہ قبلائی خان کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور اس نے وطن واپس آکر ۱۲۹۵ء میں اپنا سفرنامہ لکھا تو اقوامِ یورپ کو دنیا کے عجائبات دیکھنے کا شوق ہوا۔ ۱۴۵۴ء میں گوٹنبرگ نے پرنٹنگ مشین ایجاد کی اور ۱۴۹۲ء میں کرسٹوفر کولمبس نے بحرِ ظلمات میں اپنے جہاز ڈال دیے اور جزائر غرب الہند دریافت کیے۔ ۱۴۹۷ء میں جان کیبٹ کینیڈا کے ساحل پر جا پہنچا اور اگلے ہی سال پرتگالی ملاح واسکوڈی گاما، برّاعظم افریقہ کا چکر کاٹتا ہوا ہندوستان پہنچ گیا۔ اس کے بعد مہم جوئی کا جو سلسلہ شروع ہوا اس نے اہلِ یورپ کو سمندروں کا مالک بنا دیا اور جب کبھی افریقہ، امریکا اور ایشیا کے مقامی باشندوں نے یورپی آبادکاروں کی مزاحمت کی تو گن پاوڈر (بارود) سے چلنے والی بندوقوں اور توپوں سے انھیں فنا کر دیا گیا۔ کوئلے، گندھک اور قلمی شورے کے آمیزے پر مشتمل یہ ہتھیار کیمیا ہی نے یورپ کو دیا تھا۔

اہلِ یورپ کے زیرِ نگین یک بیک بحر و بر کا اتنا وسیع علاقہ ہاتھ آگیا جو اُن کے خواب و خیال میں بھی نہ رہا ہوگا۔ انھوں نے جلد ہی یہ محسوس کر لیا کہ اتنے بڑے علاقے پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لیے مختلف مفید دھاتوں کی ضرورت پڑے گی۔ دھاتوں کو کارآمد بنانے کے لیے کیمیا کا علم لازمی تھا۔ ۱۵۵۶ء میں بازل کے کیمیا دان اگریکولا نے کان کنی اور دھاتوں کے بارے میں باتصویر کتاب شائع کی۔ ۱۵۹۷ء میں جرمنی کے کیمیا دان لیباویس نے کیمیا نامی کتاب شائع کی جس میں قدیم کیمیا کے روایتی اصولوں سے یکسر انحراف تو نہیں تھا لیکن اس کے باوجود اسے جدید کیمسٹری کا پہلا نصاب کہا جاتا ہے۔

سوئٹزرلینڈ کے مشہور کیمسٹ پیراسلیس نے سونا بنانے کا خیال ترک کر کے دوائیں بنانی شروع کیں اور اس نے یہ بتایا کہ دوا سازی کے لیے مختلف کیمیکلز انتہائی موزوں ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایک اور مشہور کیمیا دان گلابر نے پارے، سنکھیے اور سرمے کے مرکبات کی طبی اہمیت کا سراغ لگایا۔ گلابر سالٹ (سوڈیم سلفیٹ) آج بھی اس کے نام پر مشہور ہے۔

کیمیا کی افادیت کے پیشِ نظر اب یہ مضمون اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھایا جانے لگا، مگر اس کی مستند درسی کتب نایاب تھیں۔ جو کتابیں عربی زبان سے ترجمہ ہوئیں یا یورپی مصنفین نے لکھیں وہ کچھ زیادہ قابلِ اعتماد نہ تھیں اور اُن میں توہمات، قیاسات، روایات وغیرہ بھی کچھ شامل تھے۔ کیمیا کی باقاعدہ مخصوص درسی کتب لکھنے کا اعزاز لیڈن یونیورسٹی کے پروفیسر ہرمن بورہاو کو حاصل ہوا۔ اس نے ۱۷۳۲ء میں "ایلیمنٹا کیمیا" شائع کی جو اٹھارہویں صدی کے آخر تک پڑھائی جاتی رہی۔

ماضی میں عام خیال یہ تھا کہ ہوا کا وزن ہی نہیں ہوتا۔ مشاہدہ بھی یہی بتاتا تھا کہ پتھر اور لکڑی کے نیچے دب کر انسان مر بھی جاتا ہے، مگر کسی کو ہوا کے بوجھ تلے دبتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ اس کی کوئی شکل بھی نہیں تھی جو کاغذ پر اتار لی جاتی۔ اس کا رنگ تھا نہ بو اور نہ ذائقہ۔ لیکن بالآخر اس کا بھی سحر ٹوٹ گیا اور برطانیہ کے ایک سائنس داں رابرٹ بوائل نے جو تجربات کیے۔ ان سے ثابت ہوگیا کہ ہوا بھی وزن رکھتی اور دباؤ ڈالتی ہے۔ وہ پہلا دانشور تھا جس نے ارسطو کے چار عناصر کے نظریے سے اختلاف کیا۔ پھر ۱۷۷۴ء میں جوزف پریسٹلے نے زندگی بخش آکسیجن دریافت کی اور ہوا کی مختلف گیسوں کا تفصیلاً ذکر کیا۔

آگ اور پانی

۱۷۸۱ء میں ہنری کیونڈش نے ایک ایسی حقیقت کا انکشاف کیا، جس نے پوری دنیا کو چونکا دیا۔ اس نے یہ بتایا کہ آگ اور پانی میں بظاہر بڑا تضاد ہے۔ لیکن درحقیقت اُن میں بڑا گہرا لگاؤ ہے۔ اس نے اپنے تجربے سے یہ ثابت کیا کہ پانی دو گیسوں کا مرکب ہے جس میں ایک گیس ہائیڈروجن ہے اور دوسری آکسیجن۔ ہائیڈروجن ایک انتہائی آتش گیر گیس ہے اور آکسیجن اشیاء کے جلنے میں مدد دیتی ہے۔

انیسویں صدی میں کیمسٹری روزمرہ کی ضرورتوں کے لیے نئے نئے سامان پیدا کرنے لگی۔ پارچہ بافی، گیس انڈسٹری، دوا سازی، رنگ سازی، اسلحہ سازی، فوٹوگرافی اور ربڑ، پلاسٹک اور مصنوعی کھاد کی صنعتوں کے علاوہ کتنی ہی ایسی صنعتیں ہیں جو محض کیمیا کی بدولت وجود میں آئیں۔

باقی صفحہ نمبر ۶۵ پر

اُمّ ہانی*

”نہیں دیتا ہے زیبا سَ باغباں کو گل فروشی ہونا“

عصرِ حاضر کی ہواؤں کا رُخ بھی کیا خوب ہے۔ ایک ہلکا سا جھونکا بھی یہ احساس کرائے بغیر نہیں رہتا کہ اس میں کتنے تیز و تند بگولے پنہاں ہیں اور ادنیٰ جھونکا بھی آندھیوں کی تخریبی و تباہ کن عفریت کو اپنے جلو میں بہ ترکِ و احتشام لیے ہوئے ہے۔ کہنے کو تو آج انسانی تہذیب و تمدن کا ارتقاء ہو رہا ہے، مگر کیا واقعتاً حقیقت یہی ہے؟ جدھر نظر ڈالیے جانوروں کے بجائے انسانوں ہی وحشیانہ رقص دکھائی دے رہا ہے۔ کیا یہ سب کچھ دورِ جاہلی کی یاد دہانی نہیں کرتا؟ کیا اس وحشیانہ پن کو انسانیت کا عروج کہا جا سکتا ہے؟

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ نوجوان طبقہ ہر لمحہ ایک نئے انداز سے زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے وہ اندھا دھند کوئی بھی طریقۂ کار اپنانے سے گریز نہیں کرتا۔ مگر اس نوجوان طبقہ کو ابھارنے والے اسباب کیا ہیں؟ کیا ان اسباب کی طرف کبھی ہماری توجہ مبذول ہوئی ہے؟ ہم شور مچاتے، چلتے کودتے آبشار پر بندھ باندھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کی راہ میں حائل ان تیز نوکیلی چٹانوں کو نہیں اکھاڑ پھینکتے جو ان کی طغیانی کو اس قدر بڑھا دیتے ہیں کہ ہر باندھا ہوا باندھ ٹوٹ جاتا ہے۔ نوجوانوں کے مزاج میں پارہ بھرا ہوتا ہے۔ بالکل تیز رو آبشار کی ہی مانند وہ ہر گھڑی کچھ کرتے رہنا چاہتے ہیں — ہمہ وقت کسی نئی بات کی فکر میں رہتے ہیں — اور ہر چیز میں ندرت کے متلاشی۔ خواہ وہ نئی بات تعمیری ہو خواہ تخریبی۔ اس کے عقب میں کئی محرک ہیں جو انہیں ایسا کرنے کے لیے اکساتے رہتے ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے ان محرکات کا جائزہ لینا ہوگا اور تخریب کو ابھارنے والے ان شیدہ عناصر کا تدارک کرنا ہوگا۔

آج کوئی اور نہیں بلکہ خود والدین اپنی اولادوں کی نافرمانی سے نالاں ہیں۔ اُن کے بزرگ اِن کی عجیب و غریب حرکتوں، ملبوسات اور اخلاقی گراوٹ پر معترض ہیں۔ مگر کبھی ان بڑوں نے بھی خود پر ایک غائر نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ کبھی خود اپنا محاسبہ کرنے کی زحمت گوارا کی ہے کہ خود انھیں کی تربیت یافتہ اولادیں کیوں اس قدر بے راہ رَو ہیں؟ کیوں اپنے بزرگوں کے خلاف ہی قدم اُٹھانے کے درپے ہیں۔

آج والدین اپنی چند ظاہری ذمہ داریوں کو تو یاد رکھتے ہیں مگر ان ذمّہ داریوں کو کن حدودِ اربعہ میں رکھ کر تکمیل تک پہنچانا ہے، اس کو قطعاً فراموش کر چکے ہیں۔ وہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اپنے بچّوں کو تعلیم سے روشناس کرانا ضروری ہے۔ مگر کس قسم کی تعلیم ایک انسانی ذہن کے فطری ارتقاء کے لیے سود مند ہوگی، اس سے شاید وہ نابلد ہیں، یا پھر جان بوجھ کر چشم پوشی کرتے ہیں۔ تعلیمی درسگاہیں جو کبھی تہذیب کی اعلیٰ اقدار کی ضامن تھیں آج وہیں پر جا کر طلباء و طالبات کتنے بے باک اور بد تہذیب ہو جاتے ہیں — آخر کیوں؟

جیسے کہتے ہیں کہ آوا کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے، وہی اس زمانے کا حال ہے۔ اسکولوں میں ہر داؤں پیچ اپنانے کے بعد اور بھاری رشوت امداد (Donation) کے نام پر دینے کے بعد ننھے بچوں کو داخل کرا کے والدین بالکل مطمئن ہو جاتے ہیں۔ وہ اتنی فرصت نہیں نکال پاتے کہ خود اپنی گھریلو زندگی اور تربیت سے بھی بچّوں کی کوئی رہبری کر سکیں۔ مذہبی تعلیم دینا تو درکنار، عام اخلاقی تعلیم دینا بھی ان کے لیے محال ہو گیا ہے

---

1 محترمہ امّ ہانی، اقبال منزل، نزد سٹی اسٹیشن، لکھنؤ۔

معیارِ زندگی (Standard of Life) اس قدر بڑھ چکا ہے کہ مردوں کو روپیہ کمانے کے سوا کچھ سوجھتا نہیں اور عورتیں گھر کے اندر اور باہر ہر طریقے سے اس معیار کو قایم رکھنے میں کوشاں نظر آتی ہیں۔ ان دونوں کو خیال تک نہیں آتا کہ ان کا بچہ گھر سے باہر جا کر اسکول اور آس پاس کے ماحول سے کیا کچھ سیکھ رہا ہے۔ گالیاں تو وہ نہیں دے رہا۔ جھوٹ بولنا تو نہیں سیکھ لیا۔ چوری سے تو اسے دلچسپی نہیں ہو گئی۔ اپنے سے عمر میں بڑے بچوں، جاہل لڑکوں اور اسکول کے باہر سڑک چھاپ لوگوں کی غیر اخلاقی حرکات و فحش کلمات میں تو ملوث نہیں ہو گیا۔ لیکن انھیں اگر فکر ہوتی ہے تو اس کی کہ بچوں کا ٹیسٹ (TEST) کس روز ہے؟ امتحان کی تیاری کس طرح کرانی ہے؟ ٹیوٹر کا انتظام کہاں سے کرنا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس دائمی امتحان گاہ میں جانے کی کوئی تیاری نہیں! اس میں ناکام ہو جانے کا کوئی ملال نہیں۔! نارِ جہنم سے کوئی خوف نہیں!

اس سے قطعی انکار نہیں کہ مفید دنیاوی تعلیم نہایت ضروری ہے ورنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیوں یہ فرماتے کہ علم کے حصول کے لیے چین بھی جانا پڑے تو جاؤ۔ کیا اس زمانے میں چین جیسے دور دراز ملک میں جب کہ اسلامی تعلیمات وہاں تک نہیں پہنچی تھیں، کوئی دینی تعلیم حاصل ہوتی ہو! لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد دنیاوی تعلیم کے حصول سے بھی تھا۔ تاکہ انسان اللہ کی تخلیق کی ہوئی اس بے کنار کائنات کے اسرار و رموز سے واقف ہو۔ اللہ کی وحدانیت کا قائل ہو اور عقل و فہم استعمال کر کے قانونِ قدرت پر کاربند رہے۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میری آیات انھیں کے لیے نفع بخش ہیں جو فکر کرتے ہیں مجھ سے وہی ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔ آخرت پر وہی یقین رکھتے ہیں جو سمجھ دار ہیں۔ یہ فکر، یہ علم، یہ سمجھ تعلیم کے ذریعہ ہی حاصل ہوتی ہے مگر وہ تعلیم جو انسانی زندگی کے لیے مفید ہو۔ لیکن آج غیر مفید علوم بھی اسی ذوق و شوق سے حاصل کیے جا رہے ہیں۔ جب کہ ان غیر مفید دنیاوی علوم سے ہمارے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے

کاش کہ والدین مفید دنیاوی تعلیم دلانے کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کے دل و دماغ میں دینی فہم کو مذہبی تعلیم کے ذریعہ اس طرح اتار دیں کہ ان کی زندگی میں اس تعلیم کی جڑیں دور دور تک پھیل جائیں۔ اور زمانے کے سرد و گرم کا مقابلہ وہ طاقت، ہمت اور استحکام کے ساتھ کر سکیں۔ دینی تعلیم سے مراد محض چوبیس گھنٹے مصلیٰ بچھائے رہنے سے نہیں۔ بلکہ تمام زندگی کو اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ حد بندیوں کے مطابق گزارنا ہی اصل دین ہے اگر بنیادی طور پر ایک بچے کا وجدان اس کی نرمی و گرمی میں پروان چڑھا ہو گا تو بڑے ہونے پر وہ کیسے ہی فتنہ پرور ماحول میں کیوں نہ جائے، کتنی ہی غلط صحبتوں سے اس کا سابقہ کیوں نہ پڑے۔ اس کا ضمیر ہر وقت اسے غلط روی سے روکتا رہے گا۔ یہی تعلیم اس کی باطنی نیکی کی محافظت میں ہمیشہ معاون ثابت ہو گی۔

اپنی اولاد کے لیے روشن مستقبل کا لائحہ عمل تیار کرنے والے والدین انھیں اسکول کے امتحان کے لیے صبح صبح جگاتے ہیں۔ خود اُن کے ساتھ اسکول کی پڑھائی پڑھانے میں دماغ کھپاتے ہیں، اگر وافر دولت ہوئی تو ٹیوشن پر بے دھڑک خرچ کرتے ہیں۔ چند روزہ مستقبل کے لیے اتنے پاپڑ بیلتے ہیں لیکن دائمی مستقبل کو سنوارنے کے لیے نمازِ فجر کے لیے ان معصوموں کو جگانے کا انھیں خیال تک نہیں آتا۔ ذکرِ رب کرنے کی کوئی طلب، کوئی خواہش، کوئی فکر نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونۂ اخلاق سے اپنے بچوں کے کردار کو مضبوط اور نیک بنانے کی کوئی تمنا نہیں! اس سے کوئی انحراف نہیں کر سکتا کہ یہ دنیاوی تعلیم دنیا میں ترقی کرنے کے لیے، عزتِ نفس کی خاطر اور دنیا میں بہترین منصب کے حصول کے لیے اشد ضروری ہے۔ لیکن اخلاقی عروج، انسانی ترقی اور آخرت میں کسی بلند منصب کے حصول کے لیے اللہ اور اس کے احکامات کو جاننا اور اس کے سچے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی پیروی کرنا بھی ناگزیر ہے۔ آج اسی دینی تعلیم کے فقدان کے سبب روز بروز بے راہ روی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ دینی فکر و شعور کو تو خود بڑوں نے ہی پس پشت ڈال رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نسل میں بھی اس کے فرسودہ اور غیر اہم ہونے کا رجحان جڑ پکڑ رہا ہے۔ نتیجتاً وہ صرف اور صرف دنیا کی رنگینیاں سمیٹنے اور ناپائیدار عہدوں کے حصول کی خاطر ہر وہ حربہ اپنانے پر مصر ہیں جن کو اپنانے کا ان کے بڑوں نے وہم و گمان بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن انھیں اس راہ پر قدم بڑھانے کی ترغیب ان کے اکابرین کی ناقص تربیت نے ہی دی ہے۔ جس کا انھیں احساس تک نہیں۔ وہ نئی نسل پر صرف نکتہ چینی کرتے ہیں، ان پہ بے جا روک ٹوک

نکلتے ہیں مگر جب پلٹ کر وہ انھیں کا منہ چڑاتے ہیں تو وہ دنگ اور ششدر رہ جاتے ہیں۔!

تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کی ذہنی و جسمانی نشوونما کے لیے تفریحات بھی بےحد ضروری ہیں۔ مگر کیا واقعی انھیں صحیح و مناسب تفریح کے مواقع فراہم ہیں؟ مناسب و جائز تفریح کرانے کے لیے والدین کو محنت کرنی پڑے گی عقل و فراست سے کام لینا ہوگا۔ لیکن بچوں کے لیے اس قسم کی محنت کرنے سے وہ بےحد گھبراتے ہیں۔ وہ اپنی روزی روٹی کمانے میں اس قدر مشغول ہوتے ہیں، اپنا معیار زندگی بلند کرنے اور دنیاوی آسودگی کے حصول میں اتنے منہمک ہوتے ہیں کہ بچوں کی تربیت کی انھیں اوّل تو فرصت نہیں ملتی کہ ان کی تفریحات میں شامل ہونے کے لیے وہ پورا وقت پا ئیں ——— دوئم وہ دنیاوی آسائشوں کے حصول میں اس قدر تھک چکے ہوتے ہیں کہ اپنے بچوں کے لیے تن آسانی والی تفریحات کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ وہ بےہودگیوں اور فحاشیوں سے ہی کیوں نہ پُر ہو۔ بہترین آرٹ اور فن کے نام پر تمام تر آلودگیوں سے پُر کلب، تھیٹر، فلم، وڈیو اسکوپ پروگرام وغیرہ کو خود بھی پسند کرتے ہیں اور اپنے بچوں کے لیے بھی انھیں تفریحات کو منتخب کرتے ہیں۔

سائنس کی یہ بہترین و کارآمد ایجادات فلاح و بہبود کے لیے بھی تو استعمال کی جا سکتی ہیں۔ مگر ان سے صرف سستے جذبات کو ابھارنے اور بےحیائی کو عام کرنے کا کام لیا جارہا ہے۔ چند تعلیمی پروگرام ہیں بھی تو اس قدر خشک اور روکھے پھیکے کہ ان کی طرف بہت قلیل تعداد میں بچے ملتفت ہوتے ہیں۔ ان کے اذہان اور طبیعتیں بےحیائی و بےہودگی کو ہی قبول کرنے والی بن گئی ہیں یا بنادی گئی ہیں۔ فحاشی کا رواج قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ لیکن پہلے یہ سب کچھ ایک محدود دائرے میں ہوتا تھا جس کے سایے سے بھی شریف افراد دور بھاگتے تھے۔ مگر آج اسی فحاشی کو عام کرنے والے شرفاء کی صف میں شمار کیے جارہے ہیں۔ اس کے اپنانے والوں کو ہی تقلید کے قابل سمجھا جارہا ہے، اور اس کی تائید کرنے والے عقلمند اور ترقی یافتہ بن بیٹھے ہیں! رسائل، اخبارات، فلم اور اشتہارات وغیرہ غرض تمام ذرائع ابلاغ کے ذریعہ عریانی، بےہودگی اور فحاشی کو ترقی پسندی، آرٹ، فن اور فیشن کا نام دے کر اس قدر دلکش اور جاذب نظر انداز میں پیش کیا جارہا ہے کہ لامحالہ نوجوان دل و دماغ پوری سرعت کے ساتھ اسے اپنانے کو لپک رہے ہیں اور اسے فروغ دینے کی کوشش میں شب و روز مشغول ہیں۔ اسی میں اپنی تمام تر محنتیں، طاقتیں، حتیٰ یہاں تک کہ اپنا ضمیر و ایمان بھی داؤں پر لگا دے رہے ہیں۔ وہ اسے قطعی بُرا یا غلط نہیں سمجھتے کیوں کہ اسے بُرا یا غلط بنا کر ان کے سامنے کبھی پیش ہی نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس اسی کو تہذیب کی بلندی اور ترقی کی معراج سے تعبیر کیا جارہا ہے۔ حد یہ ہے کہ نوجوانوں کو کبھی اچھائی اور برائی کا موازنہ کرنے اور صحیح و غلط کو الگ الگ پلڑے میں رکھنے کا خیال تک نہیں آتا۔

آج مسلمانوں کو ذکاوت و ذہانت سے کام لینا ہوگا۔ والدین کو بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ خود جدید تعلیم سے روشناس ہو کر لڑکے اور لڑکیوں کا نفسیاتی مطالعہ کرنا ہوگا۔ بےراہ رو اور بھٹکے ہوئے نوجوانوں پر بتدریج اپنی نصیحتوں کا اثر ڈالنا ہوگا۔ کیوں کہ ان پر اچانک کوئی قدغن لگانا یکایک سخت قدم اٹھانا اور پوری طرح ان کی آزادی پر روک ٹوک لگانا اور ان سے جدید زمانے کی ہر چیز یکسر چھوڑ دینے کا مطالبہ کرنا کوئی خاطر خواہ نتیجہ اخذ نہ کر سکے گا۔ اس کے برعکس وہ اور بھی دین و مذہب کی باتوں سے دور بھاگیں گے اور درس اخلاقیات سے متنفر نظر آئیں گے۔

سب سے پہلے اکابرین خانہ کو خاص طور سے والدین کو نرمی کے ساتھ انھیں اپنے پرخلوص اور بےغرض ہونے کا یقین دلانا ہوگا۔ ان کا ہمدرد بن جانا ہوگا۔ ان کی خواہشات اور چھوٹے چھوٹے مسائل پر توجہ دینی ہوگی۔ پھر ان کی طرز زندگی اور تفریحات، تعلیم و تربیت وغیرہ کا نقشہ اس طرح مرتب کرنا ہوگا کہ اچھائی اور برائی، وصف و عیب، نقصانات اور فوائد کھل کر سامنے آجائیں۔ تاکہ وہ خود ہی ان دونوں کے درمیان موازنہ کر سکیں کہ انھیں کونسی سمت میں قدم اٹھانا ہے۔ ان کی دلچسپیوں کے ذریعے ہی انھیں ضمیر کے وجود کا احساس دلانا ہوگا تاکہ وہ خود اپنے سوئے ہوئے ضمیر کی آواز کو سن سکیں خود اپنی عقل و فہم کو بیدار کر سکیں۔ اور خود ہی اپنے دل میں نیکیوں اور اچھائیوں پر عمل کرنے کا تہیہ کر کے زندگی کی راہ پر آگے ہی آگے قدم بڑھا سکیں کسی بات کو سختی اور زبردستی کے ساتھ منوایا جائے تو وہ دیرپا ثابت نہیں ہوتی۔ بہ نسبت اس کے نرمی، ہمدردی اور خلوص کا برتاؤ خود بخود ہی دلوں کو پھیر دیتا ہے۔ اور اپنی طرف مائل کر لیتا ہے۔

اس معاملے میں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ مختلف انسانوں کے

اذہان بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ان کی فطرت کے تقاضے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم پر یہ بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ ان کی فطرت کے مطابق ان سے سلوک روا رکھیں۔ جہاں سختی کی ضرورت ہو وہاں سختی اور مستقل مزاجی سے کام لیں اور جہاں محض نرمی سے کام نکلتا ہو وہاں نرمی کو ہی بروئے کار لائیں۔

ایک مصلح اور رہبر کو خود اپنے اخلاق درست کرنے ہوں گے۔ تب ہی اس کی اصلاح و ہدایت کارآمد ہو سکتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اخلاق کی درستگی کی سب سے زیادہ تلقین فرمائی۔ تاریخِ اسلام کے سنہری دور میں اخلاقِ حسنہ و مزاجِ کریمانہ جو مومنین کا اولین وصف تھا اور انھیں اللہ کے رسولِ برحق محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے ورثہ میں ملا تھا، اسی وصف نے بڑے بڑے منکرین اور سخت دل کافرین کو بھی اللہ کی وحدانیت کا قایل کر دیا، انھیں سچا مومن بنا دیا اور اُن کے دلوں میں رشد و ہدایت کی شمعیں روشن کر دیں۔ اللہ تعالےٰ نے اسلام کو بہترین دین اور مسلمانوں کو افضل امت بنا لیا تاکہ وہ تمام عالم کے انسانوں کی ہدایت کا ذریعہ بنیں۔ لیکن آج مسلمان دوسروں کو ہدایت اور عملِ خیر کا درس دینے سے قبل انصاف کے ساتھ ذرا اپنا محاسبہ کریں کہ آیا وہ کس قدر عملِ خیر پر کاربند ہیں۔ کسی بھی بات کا اثر جب ہی ہوتا ہے جب اس کا کہنے والا خود اس پر عمل کرے گا۔

کسی بڑی جماعت یا گروہ یا ملک کو اپنے خیالات کا اسیر بنانا اور اپنی بات کا ان پر اثر ڈالنا بہت مشکل امر ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ کسی فرد کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر آمادہ کیا جائے۔ والدین چوں کہ سب سے زیادہ اپنی اولاد پر اثر انداز ہوتے ہیں، اس لیے وہ اس کام کو کرنے کے لیے بہت موزوں ثابت ہو سکتے ہیں کہ اپنی بہترین تربیت سے اپنی اولاد کو ایک سچا مومن اور ایک دلیر مجاہد بنا سکیں۔

باغباں ہی تو اپنے باغ کے پودوں اور پھولوں کی اچھی طرح نگہداشت کر سکتا ہے۔ وہی ایمانداری اور لگن کے ساتھ اپنے چمن کے لیے محنتیں کرتا ہے، اس کے حسن میں اضافہ کرتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔ والدین بھی باغباں کی ہی مانند ہیں۔ اور اُن کا چمن اُن کا خاندان اور اس چمن کے حسین و تابناک پھول ان کی اولاد۔ اسی لیے اللہ تعالےٰ نے قرآن حکیم میں حکم فرمایا ہے کہ خود کو اور اپنے اہل کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ حق سبحانہٗ کا ارشاد ہے۔

"بلاشبہ تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تمہارے لیے آزمایش کی چیزیں ہیں۔"

وہ والدین جو اپنی اولاد کے لیے دنیا میں پھولوں کی سیج بچھاتے ہیں کیا وہ یہ برداشت کر سکتے ہیں کہ آخرت میں اُن کے گھر والے اور اُن کی اولاد اللہ کی نافرمانی کے سبب عذاب بھگتیں !؟

رَبَّنَا اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ

انسان کے لیے معیارِ شرف جوہر ذاتی اور خود حاصل کردہ علم و عمل ہے نہ کہ اسلاف کی روایت پارینہ اور نسب فروشی کا غرور باطل ہم کو ایسا ہونا چاہیے کہ ہماری نسبت سے ہمارے خاندان کو لوگ پہچانیں نہ یہ کہ اپنی عزت کے لیے خاندان کے شرفِ رفتہ کے محتاج ہوں، ارباب ہمت نے ہمیشہ اپنی راہ خود نکالی ہے اور عظمت و رفعت کی تعریف صرف اسی سامان سے کی ہے جو خود ان کا بنایا ہوا تھا۔

[مولانا ابوالکلام آزاد]

بصیر لودی*

مسلم سائنسداں اور فن سرجری

فن سرجری اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ انسان کی ضرورت۔ اور دوسرے علوم کی طرح فن سرجری بھی اپنی ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ کسی بھی سائنس یا فن کے موجد کو بھلایا یا نظرانداز کیا جائے۔ جیسا کہ آج اسلامی سائنس دانوں کو نظرانداز کرکے ان کی اولیت اور اہمیت سے چشم پوشی کی جا رہی ہے

ابوالقاسم زہراوی (فادر آف سرجری) دسویں صدی ۔ 10th Century AD)۔ نے اس فن کی تعمیر اتنی مکمل اور مضبوط کر دی تھی کہ یورپ اس عمارت کو ڈھا کر نئی طرز کی تعمیر کرنے کی تو ہمت نہ کرسکا البتہ اس میں کچھ نقش و نگار کا ضرور اضافہ کر دیا۔

وہ ہمارے قدیم اطباء ہی تھے جنھوں نے سرجری سے متعلق تمام بنیادی اصول وضوابط قائم کیے جن کے سامنے یورپ کو سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ ان کی شاگردی اختیار کرنے میں اپنے لیے سعادت سمجھی اور ان اطباء کو استاد کہنے میں فخر محسوس کیا۔ اور زہراوی کی کتاب "کتاب التصریف" ایک ٹیکسٹ بک کی حیثیت سے یورپ کے طبی اداروں میں سترہویں صدی تک زیرِ مطالعہ رہی۔

قدیم اطباء ہی نے سرجنوں کو ہدایت کی کہ عمل جراحی سے قبل تشریح کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ مرض اور مریض کی حالت کو تجربات کی روشنی میں غور کرنا چاہیے۔ (اسی ہدایت پر آج Investigation کیے جاتے ہیں) اور آپریشن کے مواقع، موانع اور نتائج کا خیال رکھنا چاہیے۔ آپریشن سے پہلے ہاتھ دھونا اور ایسی جگہ اسپتال کا قیام جہاں زخم میں تعفن پیدا ہونے کے خطرات کم سے کم ہوں۔ (Asepsis کے تصور کی دلیل ہے)۔

اسپتال کا نظام اور مریض کی روداد قلم بند کرنے کا طریقہ یورپ کی ایجاد نہیں ہے۔ بلکہ صدیوں پہلے مشہور مسلم سائنس داں "رازی" نے سکھایا ہے۔

یہ بات فخر کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اطباءِ قدیم نے دورِ جدید کی سہولت نہ ہونے کے باوجود تقریباً سب ہی اعضاء پر (سوائے دماغ، قلب، پھیپھڑے، معدہ، جگر، پتہ وغیرہ) آپریشن کیے اور عمل ترقیع (Plastic Surgery) کے ذریعہ ناک کان، لب بنانے کے طریقے بھی تحریر کیے بے ہوشی کے لیے حشیش، بھنگ، شراب وغیرہ کا استعمال اس بات کی دلیل ہے کہ وہ آپریشن کے لیے بے ہوشی کو ضروری سمجھتے تھے اور اس کے فوائد بھی جانتے تھے۔ غذائی حقنہ کا استعمال کرکے یہ بھی ثابت کر دیا کہ جن حالات میں مریض کو غذا اور دوا بذریعہ منھ نہ دی جا سکے تو دوسرے راستے اختیار کیے جا سکتے ہیں اور آج اسی اصول پر وریدی راستہ سے گلوکوز دیا جاتا ہے۔

اطبائے قدیم کے کارنامے اور اطباءِ حال کی روداد کو دیکھ کر ہمارے ذہنوں کو یہ سوال پریشان کر رہا ہے کہ جن اطباء کے علمی و فنی کمالات سے ساری دنیا مستفید ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ ان ہی کے پیروکار اس فن سے محروم اور ناآشنا ہیں اور آج کی دنیا انھیں صرف نبض، قارورہ، امراضِ باہ تک محدود سمجھتی ہے اور ان کے فن کو معتمد و مستند ماننے کے لیے تیار نہیں خصوصاً فن سرجری سے تو ان کا کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں مانتی۔ اس گراوٹ میں دوسروں کے پروپیگنڈوں سے زیادہ خود ہمارے اطباء کی خودغرضیوں اور بے عملیوں کا بڑا دخل ہے۔

علامہ اقبال نے قوموں کے عروج و زوال کے فلسفہ کو ایک ہی مصرع میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔

* ڈاکٹر بصیر لودی۔ یونانی سرجن۔ طبیہ کالج۔ بمبئی۔

"شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر"

ہمارے قدیم اطباء نے جدوجہد اور سعی پیہم کی شمشیر و سناں لے کر شاہین کی طرح پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرا کرکے اپنے فن کو نکھارا اور سنوارا تھا اور اپنے علم و فن اور تجربات و ایجادات میں دنیا کی امامت کی تھی۔ مگر ہمارے جدید اطباء نے بادشاہوں، نوابوں، راجاؤں کے قصرِ سلطانی میں اپنا نشیمن بناکر اپنے ذہن و دماغ اور علم و فن کی ساری صلاحیتیں ان کی عیاشیوں کو فروغ دینے میں صرف کردیں۔ اب سعی و عمل و فکر و ایجاد ان کے بس کی بات نہ رہی اور فن سرجری کو جو اُن کے اسلاف کا قیمتی سرمایہ تھا احسان فراموشوں کے سپرد کردیا اور اپنے کو غیر جانب دار سمجھ لیا۔ اس فن سے بیزاری اور بے عملی کے ماحول نے فن سرجری پر ناقدری کی تہہ در تہہ دھول ڈال دی۔ مگر علم و فن کسی قوم کی میراث نہیں ہوا کرتے۔ جو قومیں جدوجہد و عمل کی شمشیر و سناں لے کر اُٹھتی ہیں وہ اپنی لگن سے اُنھیں دفینوں کی طرح کھود کر نکال لیتی ہیں۔ پچھلی صدیوں میں جب یورپ نے علمی ترقیات کے زینوں پر قدم رکھنا شروع کیا تو اس فن کی گرد و غبار کو جھاڑ کر اسے بھی اپنے سینے سے لگا لیا۔

ہمارے قدیم اطباء نے اس فن کو اس قدر جامع اور مکمل بنادیا تھا اور تمام بنیادی اصول و ضوابط وضع کردیے تھے کہ چاہے یونانی سرجن ہوں یا ایلوپیتھک سرجن سب کو فن کے اصولوں کی پابندی کرنا ہوگی۔ جس طرح یہ بات سچ ہے کہ اطباء ہی اس فن کے موجد اور امام تھے اسی طرح یہ بھی سچ ہے کہ یورپ نے اس فن کو رنگ و روغن اور نقش و نگار دے کر چمکا دیا ہے۔

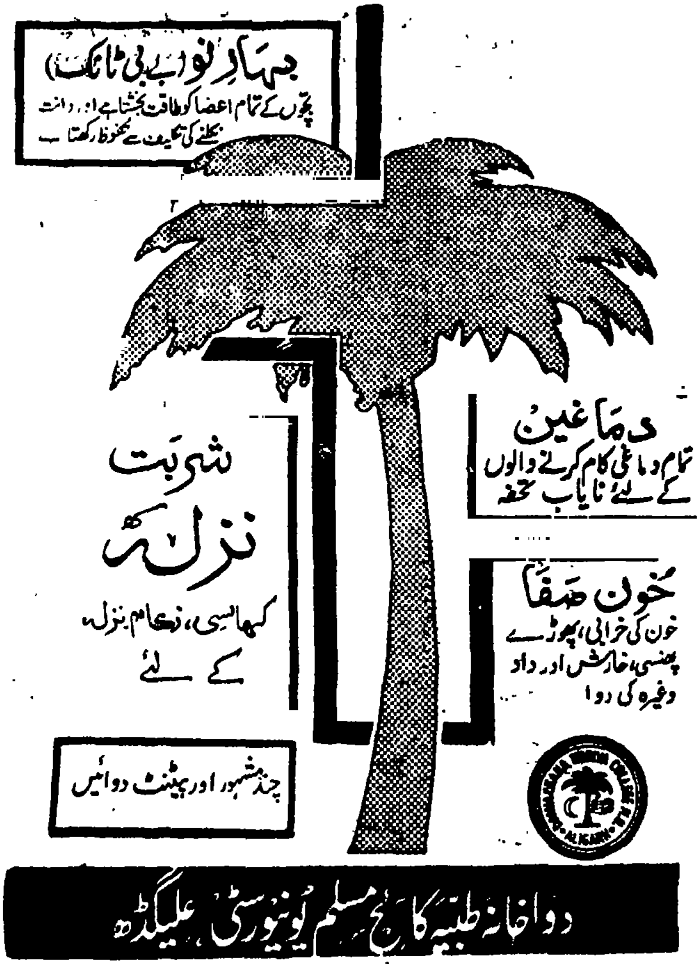
علمی ترقیات نے فن سرجری میں کافی سہولیات پیدا کردی ہیں جن سے ہر روشن دماغ انسان کو فائدہ اٹھانے کا حق بھی ہے اور فائدہ اٹھانا بھی چاہیے۔ جس طرح کسی طبیب کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ آپریشن کے اصول و ضوابط ہمارے اسلاف کے ایجاد کردہ ہیں ایلوپیتھ کو اس سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے۔ اسی طرح کسی ایلوپیتھ کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ جدید سہولیات کو اپنی میراث سمجھ کر یونانی سرجن پر ان کے استعمال کی پابندی لگائے۔ ہر علم و فن اور ہر سائنس اور ٹکنالوجی سے اپنے ظرف و فہم کے بقدر فائدہ اٹھانے کا حق پوری انسانیت کو ہے۔ اس پر کسی طرح کی پابندی لگانا کوتہ نظری اور تنگ نظری کی دلیل ہے۔ ع دلیل کم نظری قصۂ قدیم و جدید۔

امید ہے کہ ہمارے ناظرین کو اس مختصر تحریر سے فن سرجری کی حقیقت اور اس کی ایجاد و ترویج میں ہمارے اطباء اور مسلم سائنس دانوں کا حصہ اور مرتبہ معلوم ہوگیا ہوگا اور ہمارے یونانی اطباء جو انتہائی احساس کمتری کا شکار تھے اور ہر قدم پر ایلوپیتھ سرجن کی آغوش میں ہی پناہ نظر آتی ہے شاید اس مضمون سے ان کے احساسات میں کچھ گرمی پیدا ہو اور طب جدید کی برتری کا نعرہ لگانے والوں اور طب یونانی کو حقارت کی نظر سے دیکھنے والوں کو شاید احساس ہو کہ ہماری عظمتوں کے فانوس و قمقمے جس قصر میں جگمگا رہے ہیں وہ خالص اسلامی طب ہے۔ ان معلومات کی روشنی میں اعلیٰ انسانی قدروں کے ہر پاسدار کا فرض ہے کہ عظیم انسانیت کی خدمت کے لیے مسلمان سائنس دانوں کے کارناموں کی بازیافت کرکے عہد حاضر میں اُن کی اہمیت و معنویت کو واضح کریں تاکہ اسلامی علوم کے چشمہ حیواں سے پوری دنیائے انسانیت ایک بار پھر اسی طرح سیراب ہونے لگے جس طرح ہمارے اسلاف کے زمانے میں ہوئی تھی۔

بقیہ "کیمیا سے کیمسٹری تک"

ربڑ کا اصلی وطن جنوبی امریکہ ہے اور وہاں ۱۶۱۵ء میں ہسپانوی آبادکار ربڑ سے اپنے فوجی اوورکوٹ واٹر پروف بناتے تھے۔ یورپ میں اس کا استعمال ۱۸۲۰ء میں شروع ہوا جب یہ پتہ لگا کر ربڑ کو گرم کرکے مختلف چیزیں بنائی جاسکتی ہیں۔ جلد ہی امریکی صنعت کار چارلس گڈایئر نے یہ دریافت کرلیا کہ اگر ربڑ میں گندھک ملا کر اسے گرم کیا جائے تو قدرتی ربڑ کی بہت سی خامیاں دور ہوجاتی ہیں۔ ۱۸۴۶ء میں گاڑیوں کے لیے ٹھوس ربڑ ٹائر اور ٹیوب کا استعمال شروع ہوگیا۔ ۱۸۸۸ء میں ڈنلپ نے سائیکلوں میں ربڑ کے ٹائر ٹیوب رائج کیے۔

مالک: تہذیب الاخلاق ٹرسٹ علی گڑھ۔ پرنٹر پبلشر نورالحسن نقوی
مقام اشاعت: [illegible]


بہارِ نو (بے بی ٹانک)
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے اور دانت نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں کے لئے نایاب تحفہ
شربت
نزلہ
کھانسی، زکام، نزلہ کے لئے
خون صفا
خون کی خرابی، پھوڑے پھنسی، خارش اور داد وغیرہ کی دوا
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

Tahzibul Akhlaq Fortnightly Regd. No. L/ALG 247

Litho Colour Printers, Achal Tal, G. T. Road, Aligarh Phone : 4185

تہذیب الاخلاق

مجلس ادارت

(تہذیب الاخلاق اور نشانات)

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

بانی
سرسید احمد خاں رح

سرپرست
سید ہاشم علی
وائس چانسلر اے ایم یو علی گڑھ

جلد ۵ — یکم تا ۳۰ ستمبر ۱۹۸۶ء — مشترک شمارہ ۱۷ و ۱۸

ایڈیٹر
اسرار احمد

جوائنٹ ایڈیٹر
کبیر احمد جائسی

اسسٹنٹ ایڈیٹر
شباب الدین



قیمت	تین روپے
زرِ سالانہ	تیس روپے
تا حیات	تین سو روپے

ترسیلِ زر کا پتہ
پروفیسر منظر عباس نقوی
ٹریزرار تہذیب الاخلاق ٹرسٹ
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مندرجات

اداریہ		۳
رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات	سر سید احمد خاںؒ	۵
حسینؑ اور انسانیت	مولانا پروفیسر سید کاظم نقوی	۱۰
ایرانی مہینے کے تیس دنوں کے نام	پروفیسر نذیر احمد	۱۴
خالد بن ولید	پروفیسر قاضی عبد الستار	۲۱
ارشمیدس	جناب سیّد قاسم محمود	۲۶
دکنی میں تیلگو الفاظ	ڈاکٹر محمد انصار اللہ	۳۲
پروفیسر ہادی حسن	ڈاکٹر کبیر احمد جائسی	۳۸
اے۔ سی۔ جی	ڈاکٹر سعید انصاری	۴۷
مسلمانوں کی گومگو حالت	جناب ایس۔ ایس۔ گل / جناب سید شفیق احمد	۵۰
فائی سے لیا	جناب ظفر علی راجہ	۵۳
ساڑھے ننانوے فی صد پاس	جناب احمد رشید شیروانی	۵۵
سماج میں عورت کا مقام	محترمہ کہکشاں علوی	۵۷

[سرورق پر تصویر : پروفیسر ہادی حسن مرحوم]

اداریہ

عید قرباں آئی اور چلی گئی۔ اس موقع پر ساری دنیا کے مسلمانوں نے اُس عظیم الشان قربانی کی یاد تازہ کی جسے اللہ کے ایک نیک بندے اور رسول حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رضائے الٰہی کے در پر پیش کی۔ مستقل اشارۂ ایزدی پاکر انھوں نے اپنے بڑے بیٹے کو بارگاہِ ایزدی میں پیش کر دیا۔ اُن کے جذبۂ قربانی میں صداقت تھی، نیت میں خلوص تھا۔ اس لیے وہ امتحانِ عشق میں پورے اترے۔ اللہ نے اُن کی قربانی بھی قبول کی اور آلِ ابراہیم پر اپنی رحمتوں کے پھول برسا کر ان کو دینی اور دنیوی ترقیوں سے بھی نوازا۔

چشمِ بینا کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی حیاتِ مبارکہ میں بڑا سبق ہے۔ عشقِ الٰہی کی اس انتہائی منزل پر وہ کس راہ سے پہنچے کہ اپنی محبتِ پدری کو بھی قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے؟ یہ حق آگاہی ان کو ورثہ میں تو نہ ملی تھی۔ ان کے آباء واجداد کی راہ تو کچھ اور ہی تھی۔ وہ نہ صرف ایسے ماحول میں پیدا ہوئے تھے جس میں بت پرستی ہی خدا پرستی تھی بلکہ انھوں نے ایک ایسے گھر میں آنکھ کھولی جو بت پرستی کا منبع بھی تھا۔ پھر انھوں نے ایک اَن دیکھے خدا کو کیسے دیکھا؟ اور دیکھا بھی ایسا کہ اپنے دیکھنے پر یہ انتہائے یقین!

ہر قرآن مجید پڑھنے والا جانتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خدا کو عقل و دانش کی آنکھ سے دیکھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ جانتے ہوئے بھی انجان ہے۔ حضرت ابراہیمؑ سب سے پہلے اس ذہنی عہدِ طفلی سے نکلے جس میں ہر شخص ایک بچے کی مانند اپنے بزرگ، خاندان اور سماج کی ہر بات کو صحیح، افضل اور پتھر کی لکیر سمجھتا ہے۔ پھر انھوں نے اندھی تقلید کے طوق سے خود کو آزاد کیا۔ ان زنجیروں کے ٹوٹتے ہی ان کی فطری جستجو نے سب سے پہلے سوالیہ نشان اس وقت پوجے جانے والے ان خداؤں پر لگایا جو نہ چل سکتے تھے، نہ ہل سکتے تھے اور نہ بول سکتے تھے۔ تلاشِ حق کی اس جستجو میں وہ چاند کی پرنور مسکراہٹ اور ابھرتے ہوئے سورج کی چکاچوندھ کے دامِ فریب میں بھی اُلجھے مگر ہر جگہ عقل نے ان کی رہنمائی کی۔ جو خود مجبورِ فطرت اور رو بہ زوال ہوں وہ خدا کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ پکار اُٹھے! میرا خدا تو وہ ہے جو اس کائنات کا خالق ہے اور جس کا پابند اس کائنات کا ہر ذرہ ہے۔ اس طرح خدا کی دی ہوئی عقل کی رہنمائی میں وہ اس حقیقت تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے جس کا علم اس دنیا کے سب سے پہلے انسان حضرت آدمؑ کو تھا، لیکن جس پر آدمؑ کی اولاد نے جھوٹے خداؤں کے پیکر میں خود اپنی خدائی کا دبیز پردہ ڈال رکھا تھا۔

کیا آج کے مسلمان حضرت ابراہیمؑ کی اس سنت پر کاربند ہیں جس سے وہ یقین و ایمان کی اس اعلیٰ ترین منزل پر پہنچے جس کی یاد تازہ کرنے کے لیے دنیا کے مسلمان ہر سال خدا کے حضور میں کروڑوں جانوروں کی قربانی پیش کرتے ہیں۔ افسوس کہ نہیں آج دنیا کے تمام بڑے مذہبی گروہوں میں مسلمانوں کا ہی وہ گروہ ہے جس کی اکثریت نے عقل و دانش کی راہ ترک کردی ہے اور جس نے عقل کو جلا دینے والی شے، علم اور اس کی تخلیق کو بغیر اعلان اپنے اوپر حرام کرلیا ہے۔ وہ پھر اسی ذہنی عہدِ طفلی کی طرف پلٹ گیا ہے جہاں نقش قدم پر قدم رکھ کر چلنا مقدم اور اس سے ہٹ کر چلنا ارتداد ہے۔ اس نے پھر اندھی تقلید کی عینک اپنے ذہن کی آنکھوں پر لگالی ہے جس کے نتیجے میں وہ مختلف گروہوں میں بٹ گیا ہے اور ہر گروہ ایک مخصوص فکر اور طرزِ عمل کو اپنا قبلہ و کعبہ بنائے اس کے گرد طواف کررہا ہے۔ وہ یہ نکتہ سمجھنے سے قاصر ہوچکا ہے کہ ایک عالم، مفکر یا مصلح کی فکر اور دعوت کے دو اجزاء ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو ابدی حقائق پر مبنی ہوتا ہے اور زمان و مکان کی قید سے آزاد۔ دوسرا وہ جو مخصوص سماجی، معاشی، سیاسی اور جغرافیائی حالات کی زمین سے اُگتا ہے اور زمان و مکان کا پابند۔ پہلا باطن ہے، دوسرا ظاہر۔ پہلا بنیادی ہے اور صالح فکر کا مرکز۔ دوسرا فروعی ہے اور بہ لحاظِ زمان و مکان بزرگانِ ملّت کی تعلیمات میں فرق و اختلاف کا رنگ بھرنے والا۔ علم کے فقدان نے امّتِ مسلمہ سے یہ صلاحیت ہی سلب کرلی ہے کہ وہ اکابر کی تعلیمات کے ان دو اجزاء میں تمیز کرسکے۔ وہ اندھی عقیدت کو عقیدتِ بزرگاں اور اندھی تقلید کو تقلیدِ اسلاف سمجھ بیٹھی ہے۔ یہی جڑ ہے انتشارِ جماعت کی، اور یہی بنیاد ہے ذہنی جمود کی۔ یہ ہیں وہ اصنام جو حقیقی اسلام اور مسلمانوں کے درمیان حائل ہیں اور جنھوں نے مسلمانوں کی ہر قربانی کو بے برکت بنا کر رکھ دیا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کا طرزِ فکر، آج کل کی زبان میں، سائنٹفک تھا۔ حقیقت تک پہنچنے کے لیے انھوں نے سائنسی طرزِ استدلال اختیار کیا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر ہم مسلمان حضرت ابراہیمؑ کی عظیم قربانی کی یاد تازہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اس سنت پر بھی عمل کرتے۔

اسرار احمد

سر سید احمد خانؒ

رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات

کیا عمدہ قول ایک بڑے دانا کا ہے کہ "انسان کی زندگی کا منشاء یہ ہے کہ اس کے تمام قوے اور جذبات نہایت روشن اور شگفتہ ہوں، اور اُن میں باہم نامناسبت اور تناقض نہ ہو بلکہ سب کامل کر ایک کامل اور نہایت متناسب مجموعہ ہو۔" ایک اور بڑے دانا شخص کی رائے کا یہ نتیجہ ہے کہ "آزادی اور اپنی خوشی پر چلنا جہاں تک کہ دوسروں کو ضرر نہ پہنچے، ہر انسان کی خوشی اور اس کا حق ہے۔"

پس جہاں کہیں معاشرت کا قاعدہ اگلی روایتوں پر یا پرانی رسم و رواج پر مبنی ہے تو وہاں انسانوں کی خوشحالی کا ایک بڑا جزو موجود نہیں ہے، اور جو کہ خوشحالی ہر فرد بشر کی، اور نیز کل لوگوں کی ترقی کا بہت بڑا جزو ہے، تو اس ملک میں جہاں رسموں کی پابندی ہے وہ جزو بھی نابید ہوتا ہے۔

کسی شخص کی یہ رائے نہ ہوگی کہ آدمیوں کو بجز ایک دوسرے کی تقلید کے اور کچھ مطلق نہ کرنا چاہیئے، اور نہ کوئی شخص یہ کہے گا کہ آدمیوں کو اپنی اوقات بسری کے طریقے، اور اپنے کاروبار کی کارروائی میں اپنی خوشی اور اپنی رائے کے مطابق کوئی بات بھی کرنی نہ چاہیے۔ سیدھا طریقہ یہ ہے کہ آدمی کو اس کی جوانی میں اس طرح سے تعلیم ہونی چاہیے کہ اور لوگوں کے تجربوں سے جو نتیجے تحقیق ہو چکے ہیں، ان کے فوائد سے مستفید ہو، اور پھر جب اس کی عقل پختگی پر پہنچے، تو خود ان کی بھلائی اور بُرائی کو جانچے۔

بے سوچے اور بے سمجھے رسومات کی پابندی کرنے سے گو وہ رسمیں اچھی ہی کیوں نہ ہوں، آدمی کی ان صفتوں کی ترقی اور شگفتگی نہیں ہوتی، جو خدائے تعالیٰ نے ہر آدمی کو جُدا جُدا عنایت کی ہیں۔ ان قوتوں کا برتاؤ، جو کسی چیز کی بھلائی بُرائی دریافت کرنے، اور کسی بات پر رائے دینے اور دو باتوں میں امتیاز کرنے، اور عقل و فہم کو تیز رکھنے، بلکہ اخلاقی باتوں کی بھلائی اور بُرائی تجویز کرنے میں مستعمل ہوتی ہیں، صرف ایسی ہی صورت میں ممکن ہے، جبکہ ہم کو ہر بات کے پسند یا ناپسند کرنے کا اختیار حاصل ہو۔

جو شخص کوئی بات رسم کی پابندی سے اختیار کرتا ہے، وہ شخص اس بات کو پسند یا ناپسند نہیں کر سکتا، اور نہ ایسے شخص کو اس بات کی تمیز یا خواہش میں کچھ تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ اخلاقی اور عقلی قوتوں کی ترقی اس صورت میں حاصل ہوتی ہے جب کہ وہ استعمال میں لائی جاویں۔ ان قوتوں کو اوروں کی تقلید کرنے سے کسی بات کی مشق حاصل نہیں ہوتی، بلکہ ایسے شخص کے لیے بجز ایسی قوت تقلید کے جو بندر میں ہوتی ہے، اور کسی قوت کی حاجت نہیں۔ البتہ جو شخص اپنا طریقہ خود پسند کرتا ہے، وہ اپنی تمام قوتوں سے کام لیتا ہے۔ زمانۂ حال پر نظر کرنے کے لئے اُس کو قوتِ تحقیق درکار ہے، اور انجام کار پر غور کرنے کے لئے قوتِ تجویز، اور اس کا فیصلہ کرنے کو قوتِ استقرار، اور بھلا بُرا ٹھہرانے کو قوتِ امتیاز، اور سب باتوں کے تصفیے کے بعد اس پر قائم رہنے کے لئے قوتِ استقلال، اور یہی سب کام ہیں جو انسان کے کرنے کے لائق ہیں۔

آدمی مثل ایک کل کے نہیں ہے کہ جو اس کے واسطے مقرر کرد

ہے اسی کو انجام دیا کرے؛ بلکہ وہ ایک ایسا درخت ہے جو اُن اندرونی قوتوں سے جو خدا نے اس میں رکھی ہیں؛ اور جن کے سبب سے وہ زندہ مخلوق کہلاتا ہے، ہر چہار طرف پھیلے اور بڑھے، پھلے اور پھولے۔

جو امر کہ پسندیدہ اور تسلیم کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اپنے فہم اور اپنی عقل سے کام لیں، اور رسم و رواج کی پابندی بھی ایک معقول طور پر رکھیں۔ یعنی جو عمدہ و مفید ہیں اُن کو اختیار کریں؛ جو قابلِ اصلاح ہوں، ان میں ترمیم کریں اور جو بُری اور خراب ہوں، ان کی پابندی چھوڑ دیں؛ نہ یہ کہ اندھوں کی طرح، یا ایک کَل کی مانند، ہمیشہ اسی سے لپٹے رہیں۔

یہ بات خیال کی جاتی ہے کہ رسومات کی پابندی نہ کرنے سے آدمی خراب کاموں اور بُری باتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مگر یہ بات صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ انسان کی ذات میں، جیسے کہ خراب کام کرنے کی قوتیں اور جذبے ہیں، ویسے ہی ان کے روکنے کی بھی قوتیں اور جذبے ہیں؛ مثلاً ایمان یا نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے۔ پس خراب کام ہونے کا یہ باعث نہیں ہے کہ اس نے رسومات کی پابندی نہیں کی، بلکہ یہ باعث ہے کہ اس نے ایک قسم کی قوتوں اور جذبوں کو شگفتہ اور شاداب اور قوی کیا ہے؛ اور دوسری قسم کی قوتوں اور جذبوں کو پژمردہ اور ضعیف۔ اگر رسومات کی پابندی نہ رکھنے کے ساتھ انسان کا ایمان ضعیف نہ ہو، یا وہ دلی نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے پژمردہ نہ ہو تو بجز عمدہ اور پسندیدہ باتوں کے اور کسی بات کا ارتکاب نہ ہو۔

ہمارے زمانہ میں ہر شخص، اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک، رسم و رواج کا ایسا پابند ہے جیسے کوئی شخص ایک بڑے زبردست حاکم کے نیچے اپنی زندگی بسر کرتا ہو۔ کوئی شخص یا کوئی خاندان اپنے دل سے یہ بات نہیں پوچھتا کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے؟ اور ہمارے مناسب یا ہماری پسند کے لائق کیا بات ہے؟ یا جو عمدہ صفتیں مجھ میں ہیں، ان کا ظہور نہایت عمدگی سے کس طرح ممکن ہے؟ اور کون سی بات ان کی ترقی اور شگفتگی کی معاون ہے؟ بلکہ وہ اپنے دل سے یہ پوچھتے ہیں کہ میری حالت اور رتبے کے کون سی چیز مناسب ہے؟ میرے رتبہ اور مقدور کے آدمی کس رسم و رواج کے مطابق کام کرتے ہیں؟ اور کوئی اس بھی زیادہ بیوقوف ہوا، تو وہ اپنے دل سے اس سے بھی زیادہ سوال کرتا ہے، اور یوں پوچھتا ہے کہ جو لوگ مجھ سے برتر ہیں، اور ا اور مقدور میں زیادہ ہیں، وہ کن رسموں کو بجا لاتے ہیں تاکہ یہ شخص بھی ویسا ہی کر کر ان ہی کی سی شان میں شامل ہو۔

اس بات سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جو لوگ اس طرح پر رسوم کو بجا لاتے ہیں وہ اپنی خواہش اور مرضی سے ان رسومات کو اور چیزوں پر ترجیح دیتے ہیں، اور ترجیح دے کر پسند کرتے ہیں۔ نہیں! بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو بجز ایسی بات کے جو رسمی ہوتی ہے اور کسی بات کی خواہش کرنے کا موقع یا اتفاق نہیں ہوتا؛ اور اس لیے طبیعت خود متحمل اور مطیع رسموں کی ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ جو باتیں دل کی خوشی کی کرنی ہوتی ہیں، ان میں بھی اوروں کے مطابق کام کرنے کا خیال اوّل دل میں آتا ہے۔ غرض کہ ان کی پسند وہی ہوتی ہے، جو بہت سے لوگوں کی ہے۔ وہ صرف ایسی باتوں کے پسند کرنے پر راغب ہوتے ہیں، جو عام پسند ہوں؛ اور مذاق اور اصلی سلیقہ جو رسم و رواج کے مطابق نہ ہو، اس سے ایسی ہی گریز کی جاتی ہے جیسے کہ جرموں سے! یہاں تک کہ اپنی خاص طبیعت کی پیروی نہ کرتے نہ کرتے، ان میں اپنی طبیعت ہی باقی نہیں رہتی کہ جس کی پیروی کریں؛ اور اُن کی ذاتی قوتیں، بالکل پژمردہ اور بے کار رہنے کے سبب بالکل ضائع ہو جاتی ہیں؛ اور وہ شخص اپنی دلی خواہش کرنے، اور ذاتی خوشی اُٹھانے کے قابل نہیں رہتے، اور عموماً ایسی طبع زاد رائیں یا خیالات نہیں رکھتے، جو خاص اُن کی اصلی خوشی سے مخصوص ہوں۔ اب غور کرنا چاہیے کہ انسان کی ایسی حالت پسندیدہ ہو سکتی ہے یا نہیں۔

رسومات جو مقرر ہوتی ہیں، غالباً اس زمانہ میں جب کہ وہ مقرر ہوئیں، مفید تصور کی گئی ہوں؛ مگر اس بات پر بھروسہ کرنا کہ درحقیقت وہ ایسی ہی ہیں، محض غلطی ہے۔ ممکن ہے کہ جن لوگوں نے ان کو مقرر کیا، ان کی رائے میں غلطی ہو؛ یا ان کا تجربہ صحیح نہ ہو؛ یا ان کا تجربہ نہایت محدود اور صرف چند اشخاص سے متعلق ہو؛ یا اس تجربہ کا حال صحیح صحیح بیان نہ ہوا ہو؛ یا وہ رسم اس

وقت اور اس زمانہ میں مفید ہو، اِلّا حال کے زمانہ میں مفید نہ رہی ہو بلکہ مضر ہو؛ یا وہ رسم جن حالات پر قائم کی گئی تھی، کسی شخص کی وہ حالت نہ ہو۔ غرض رسموں کی پابندی میں مبتلا رہنا ہر طرح پر نقصان کا باعث ہے۔ اگر کوئی نقصان نہ ہو، تو یہ نقصان تو ضرور ہے کہ آدمی کی عقل اور دانش، اور جودتِ طبع، اور قوتِ ایجاد باطل ہو جاتی ہے۔

یہ بات بے شک ہے کہ کسی عمدہ بات کی ایجاد کی لیاقت ہر ایک شخص کو نہیں ہوتی، بلکہ چند دانا شخصوں کو ہوتی ہے، جن کی پیروی اور سب لوگ کرتے ہیں۔ لیکن رسم کی پابندی اور اس قسم کی پیروی میں بہت بڑا فرق ہے۔ رسومات کی پابندی میں اس کی بھلائی و برائی و مفید و غیر مفید و مناسب حال و مطابق طبع ہونے یا نہ ہونے کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا، اور بغیر سوچے سمجھے اس کی پابندی کی جاتی ہے؛ اور دوسری حالت میں بوجہ پسندیدہ ہونے کے، اور اس لیے دوسری حالت میں، جو قوتیں ترقی کی انسان میں ہیں، وہ معدوم و مفقود نہیں ہوتیں، اِلّا پہلی حالت میں معدوم و نابود ہو جاتی ہیں۔

رسم کی پابندی ہر جگہ انسان کی ترقی کی مانع و مزاحم ہے۔ چنانچہ وہ پابندی ایسی قوتِ طبعی کے جس کے ذریعے سے بہ نسبت معمولی باتوں کے کوئی بہتر بات کرنے کا قصد کیا جاوے، برابر مخالف رہتی ہے، اور انسان کی تنزلی حالت کا اصلی باعث ہوتی ہے۔ اب اس رائے کا دنیا کی موجودہ قوموں کے حال سے مقابلہ کرو؛ تمام مشرقی یا ایشیا کی ملکوں کا حال دیکھو کہ ان ملکوں میں تمام باتوں کے تصفیہ کا مدار رسم و رواج پر ہے۔ ان ملکوں میں مذہب اور استحقاق اور انصاف کے لفظوں سے رسموں کی پابندی مراد ہوتی ہے۔ پس اب دیکھو کہ مشرقی اور ایشیا کی قوموں کا، جن میں مسلمان بھی داخل ہیں، کیسا ابتر اور خراب اور ذلیل حال ہے۔

ان مشرقی یا ایشیا کی قوموں میں بھی کسی زمانہ میں قوتِ عقل اور جودتِ طبع اور مادۂ ایجاد ضرور موجود ہوگا، جس کی بدولت وہ باتیں ایجاد ہوئیں، جو اب رسمیں ہیں؛ اس لیے کہ ان کے بزرگ ماں کے پیٹ سے تربیت یافتہ اور حسنِ معاشرت کے فنون سے واقف پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ سب باتیں انھوں نے اپنی محنت اور علم اور عقل اور جودتِ طبع سے ایجاد کی تھیں، اور ان ہی وجوہات سے دنیا کی نہایت بڑی اور قوی اور مشہور قوموں سے ہو گئے تھے۔ مگر اب اُن کا حال دیکھو کہ کیا ہے؟ اسی رسومات کی پابندی سے اُن کا مآل یہ ہوا ہے کہ اب وہ ایسی قوموں کے محکوم ہیں، اور ایسے لوگوں کی آنکھوں میں ذلیل ہیں، جن کے آباؤ اجداد اُس وقت جنگلوں میں آوارہ بڑے پھرتے تھے؛ جس وقت ان قوموں کے آباؤ اجداد عالی شان محلوں میں رہتے تھے، اور بڑے بڑے عبادت خانے، اور مکانات شاہی اور شہنشاہی محل بنواتے تھے۔ اس کا سبب یہی تھا کہ اس زمانہ میں اُن قوموں میں رسم کی پابندی قطعی نہ تھی، اور جو کسی قدر تھی بھی تو اس ساتھ ہی آزادی اور ترقی کا جوش ان میں قائم تھا۔

تواریخ سے ثابت ہے کہ ایک قوم کسی قدر مدت تک ترقی کی حالت پر رہتی ہے، اور اس کے بعد ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔ مگر یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ ترقی کب مسدود ہوتی ہے۔ یہ اسی وقت مسدود ہوتی ہے جب کہ اس قوم میں سے وہ قوت اٹھ جاتی ہے، جس کے سبب سے نئی نئی قوتیں پیدا ہوتی ہیں؛ اور ٹھیک ٹھیک مسلمانوں کا اس زمانہ میں یہی حال ہے؛ بلکہ میں نے غلطی کی، کیوں کہ ترقی مسدود ہونے کا زمانہ بھی گزر گیا، اور تنزل اور ذلت و خواری کا زمانہ بھی انتہا درجہ کو پہونچ گیا ہے۔

ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ بات کہے کہ یورپ کی قوموں میں بھی، جو اس زمانہ میں ہر قسم کی ترقی کی حالت میں شمار ہوتی ہیں، بہت سی رسمیں ہیں؛ اور اُن رسموں کی نہایت درجہ پر پابندی ہے، تو وہ قومیں کیوں ترقی پر ہیں؟ یہ اعتراض سچ ہے، اور درحقیقت یورپ میں رسموں کی پابندی کا نہایت نقصان ہے؛ اور اگر اس کی اصلاح نہ رہے گی، جیسے کہ اب تک ہوتی رہی ہے، تو اُن کو بھی بدنصیبی کا دن آوے گا۔ مگر یورپ میں اور مشرقی ملکوں کی پابندیِ رسومات میں ایک بڑا فرق ہے۔ یورپ میں رسومات کی پابندی ایک عجیب اور نئی بات ہونے کو تو مانع ہے، مگر رسومات کی تبدیلی کا کوئی مانع نہیں۔ اگر کوئی شخص عمدہ رسم نکالے، اور سب لوگ پسند کریں

فی الفور پرانی رسم چھوڑ دی جاوے گی، اور نئی رسم اختیار کرلی جاوے گی؛ اور اس سبب سے ان لوگوں کے قوائے عقلی اور حالت تمیز اور قوتِ ایجاد ضائع نہیں ہوتی۔

تم دیکھو کہ یہ پوشاک جو اب انگریزوں کی ہے، ان کے باپ دادا کی نہیں ہے بالکل اپنی پوشاک بدل دی ہے۔ ہر درجے کے لوگوں کا جو مختلف لباس تھا، اس رسم کو چھوڑ دیا گیا ہے، اور ضرور سمجھا گیا ہے کہ ہر شخص ایک سا مثل اوروں کے لباس پہنے۔ اس وقت کوئی رسم یورپ میں ایسے درجہ پر نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی رسم اس کے برخلاف، مگر اس سے عمدہ ایجاد کرے اور لوگ اس پر اتفاق نہ کریں، اسی وقت تبدیل نہ ہو سکے؛ اور اسی تبدیلی کے ساتھ ان کی ترقی بھی ہوتی جاتی ہے۔

چنانچہ نئی نئی کلیں ہمیشہ ایجاد ہوتی رہتی ہیں، اور تاوقتیکہ کہ اُن کی جگہ بہتر کلیں ایجاد نہ ہو جاویں، وہ بدستور رہتی ہیں۔ ملکی معاملات اور تعلیم میں، بلکہ اخلاق میں، بلکہ مذہب میں، ہمیشہ ترقی کے خواہاں ہیں۔ پس یہ تصور کرنا کہ یورپ بھی مثل ہمارے، دوسری قسم کی رسموں میں مبتلا ہے، محض نادانی اور ناواقفیت کا سبب ہے۔

البتہ یورپ میں، اور بالتخصیص انگریزوں میں جو بات نہایت عمدہ اور قابل تعریف اور لائق خواہش کے ہے، اور درحقیقت بغیر اس کے کوئی قوم مہذب اور تربیت یافتہ نہیں ہو سکتی، وہی بات ان کے تنزل کا باعث ہوگی، بشرطیکہ اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے گی، اور وہ یہ ہے کہ تمام انگریز جو حبِّ وطن میں نامی ہیں، اس بات پر نہایت کوشش اور جانفشانی کر رہے ہیں کہ کل قوم کے لوگ یکساں ہو جائیں، اور سب اپنے خیالات اور طریقے یکساں مسائل اور قواعد کے تحتِ حکومت کر دیں؛ اور ان کوششوں کا نتیجہ انگلستان میں روز بروز ظاہر ہوتا جاتا ہے جو حالات کہ اب خاص خاص لوگوں اور فرقوں کے پائے جاتے ہیں، اور جن کے سبب ان کی خاص خاص عادتیں قائم ہوئی ہیں، وہ اب روز بروز ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے جاتے ہیں۔ انگلستان میں اس زمانہ سے پہلے مختلف درجوں کے لوگ، اور مختلف ہمسایوں کے لوگ، اور مختلف پیشے والے، گویا جدا جدا دنیا میں رہتے تھے؛ یعنی سب کا طریقہ اور عادت جدا جدا تھی۔ اب وہ سب طریقے اور عادتیں ہر ایک کی ایسی مشابہ ہو گئی ہیں کہ گویا سب کے سب ایک محلّے کے رہنے والے ہیں۔ انگلستان میں بہ نسبت سابق کے اب بہت زیادہ رواج ہو گیا ہے کہ لوگ ایک ہی قسم کی تصنیفات پڑھتے ہیں، اور ایک ہی سی باتیں سنتے ہیں، اور ایک ہی سی چیزیں دیکھتے ہیں، اور ایک ہی سے مقاموں میں جاتے ہیں اور یکساں باتوں کی خواہش رکھتے ہیں، اور یکساں ہی چیزوں کا خوف کرتے ہیں، اور ایک ہی سے حقوق آزادی سب کو حاصل ہیں، اور ان حقوق اور آزادیوں کے قائم رکھنے کے ذریعہ بھی یکساں ہیں؛ اور یہ مشابہت اور مساوات روز بروز ترقی پاتی جاتی ہے، اور تعلیم و تربیت کی مشابہت اور مساوات سے اس کو اور زیادہ وسعت ہوتی ہے۔ تعلیم کے اثر سے تمام لوگ عام خیالات کے اور غلبہ اور رائے کے پابند ہوتے جاتے ہیں؛ اور جو عام ذخیرہ حقائق اور مسائل اور رایوں کا موجود ہے، اس پر سب کو رسائی ہوتی ہے آمد و رفت کے ذریعوں کی ترقی سے مختلف مقاموں کے لوگ مجتمع اور شامل ہوتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے ہیں، اور اس سبب سے بھی مشابہت مذکور ترقی پاتی ہے۔ کارخانوں اور تجارت کی ترقی سے آسائش اور آرام کے وسیلے اور فائدے زیادہ شائع ہوتے ہیں، اور ہر قسم کی عالی ہمتی، بلکہ بڑی سے بڑی اولوالعزمی، کے کام ایسی حالت کو پہنچ گئے ہیں کہ ہر شخص ان کے کرنے کو موجود و مستعد ہوتا ہے۔ کسی خاص شخص یا گروہ پر منحصر نہیں رہا ہے، بلکہ اولوالعزمی تمام لوگوں کی خاصیت ہوتی جاتی ہے، اور ان سب پر آزادی اور عام رائے کا غلبہ بڑھتا جاتا ہے؛ اور یہ تمام امور ایسے ہیں جیسے انگلستان کے تمام لوگوں کی رائیں اور عادتیں اور طریق زندگی اور قواعد معاشرت اور اموراتِ رنج و راحت یکساں ہوتے جاتے ہیں۔ اور بلاشبہ ملک اور قوم کے مہذب ہونے کا اور ترقی پر پہنچنے کا یہی نتیجہ ہے اور ایسا عمدہ نتیجہ ہے کہ اس سے عمدہ نہیں ہو سکتا ہے۔

مگر باوصف اس کے ہم اس نتیجہ کو، بشرطیکہ اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے، باعثِ تنزل قرار دیتے ہیں، تو ضرور ہم کو کہنا پڑے گا کہ کیوں یہ عمدہ نتیجہ باعث تنزل ہوگا؟ سبب اس کا یہ ہے کہ جب لوگ ایک سی طبیعت اور عادت اور خیال کے ہو جاتے ہیں تو اُن کی طبیعتوں

میں سے وہ قوتیں جو نئی باتوں کے ایجاد کرنے اور عمدہ عمدہ خیالات کے پیدا کرنے اور قواعدِ حسنِ معاشرت کو ترقی دینے کی ہیں، زائل اور کمزور ہو جاتی ہیں اور ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ ترقی ٹھہر جاتی ہے، اور پھر ایسا زمانہ آتا ہے کہ تنزل شروع ہو جاتا ہے۔

اس معاملے میں ہم کو چین کے حالات پر غور کرنے سے عبرت ہوتی ہے۔ چینی بہت لائق آدمی ہیں، بلکہ اگر بعض باتوں پر لحاظ کیا جاوے تو عقل مند بھی ہیں؛ اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی خوش قسمتی سے ابتدا ہی میں ان کی قوم میں بہت اچھی اچھی رسمیں قائم ہو گئیں اور یہ کام ان لوگوں کا تھا کہ جو اس قوم میں نہایت دانا اور بڑے حکیم تھے۔

چین کے لوگ اس باب میں مشہور و معروف ہیں کہ جو عمدہ سے عمدہ دانش و عقل کی باتیں ان کو حاصل ہیں، ان کو ہر شخص کی طبیعت پر بخوبی منقش کرنے کے واسطے، اور اس بات کے لیے کہ جن شخصوں کو وہ دانش مندی کی باتیں حاصل ہیں ان کو بڑے بڑے عہدے ملیں نہایت عمدہ طریقے ان میں رائج ہیں؛ اور وہ طریقے حقیقت میں بہت ہی عمدہ ہیں۔ بے شک جن لوگوں نے ایسا دستور قائم رکھا، انھوں نے انسان کی ترقی کے اسرار کو پا لیا، اور اس لیے چاہیے تھا کہ وہ قوم تمام دنیا میں ہمیشہ افضل رہتی، مگر برخلاف اس کے ان کی حالت سکون پذیر ہو گئی ہے اور ہزاروں برس سے ساکن ہے؛ اور اگر ان کی کبھی کچھ ترقی ہو گی تو بے شک غیر ملکوں کے لوگوں کی بدولت ہو گی۔ اس خرابی کا سبب یہی ہوا کہ اس تمام قوم کی حالت یکساں اور مشابہ ہو گئی، اور سب کے خیالات اور طریق معاشرت ایک سے ہو گئے، اور سب کے سب یکساں قواعد اور مسائل کی پابندی میں پڑ گئے اور اس سبب سے وہ قوتیں جن سے انسان کو روز بروز ترقی ہوتی ہے ان میں سے معدوم ہو گئیں۔

پس جب کہ ہم مسلمان ہندوستان کے رہنے والے، جن کی رسومات بھی عمدہ اصول اور قواعد پر مبنی نہیں ہیں، بلکہ کوئی رسم اتفاقیہ اور کوئی رسم بلا خیال اور قوموں کے اختلاط سے آ گئی ہے، جس میں ہزاروں نقص اور برائیاں ہیں، پھر ہم ان رسموں کے پابند ہوں اور نہ اُن کی بھلائی برائی پر غور کریں، اور نہ خود کچھ اصلاح اور درستی کی فکر میں ہوں، بلکہ اندھا دھندی سے انھی کی پیروی کرتے چلے جاویں، تو سمجھنا چاہیے کہ ہمارا حال کیا ہو گیا ہے، اور آئندہ کیا ہونے والا ہے۔

ہماری نوبت چینیوں کے حال سے بھی رسومات کی پابندی کے سبب بدتر ہو گئی ہے؛ اور اب ہم میں خود اتنی طاقت نہیں رہی کہ ہم اپنی ترقی کر سکیں، اس لیے بجز اس کے کہ دوسری قوم ہماری ترقی اور ہمارے قوائے عقلی کی تحریک کا باعث ہو اور کچھ چارہ نہیں۔ بعد اس کے کہ ہمارے قوائے عقلیہ تحریک میں آ جاویں اور پھر قوت ایجاد ہم میں شگفتہ ہو، تب ہم پھر اس قابل ہوں گے کہ خود اپنی ترقی کے لیے کچھ کر سکیں۔

مگر جب ہم دوسری قوموں سے ازراہ تعصب نفرت رکھیں اور کوئی نیا طریقہ، زندگی کا وہ کیسا ہی بے عیب ہو اختیار کرنا، صرف بسبب اپنے تعصب یا رسم و رواج کی پابندی کے، معیوب سمجھیں تو پھر ہم کو اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کی کیا توقع ہے۔

"دنیا میں کوئی شخص نہیں چاہتا کہ اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ کمزوری کا بھی بے خطر برملا اعلان کر دے خصوصاً وہ لوگ جو ایک جماعت کی رہبری اور رہنمائی اور وہ بھی روحانی و اخلاقی ہادی بنا ہو۔ لیکن دیکھو کہ قرآن مجید میں متعدد آیتیں ایسی ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی ظاہری لغزشوں پر تنبیہ کی گئی ہے لیکن ان میں سے ہر آیت آپؐ نے پڑھ کر سنائی لوگوں نے یاد کی، ہر محراب و مسجد میں پڑھی گئی اور اب تک جہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے وہ آیتیں ان کے ماننے والوں کی زبانوں پر ہیں۔ حالاں کہ اگر ان معمولی فروگذاشتوں کا قرآن پاک میں ذکر نہ ہوتا تو آج دنیا کو ان کا علم بھی نہ ہوتا مگر ایک پاک زندگی کی ہر چیز روشن ہونی تھی اور وہ کی گئی۔"

(سید سلیمان ندوی)

سید کاظم نقوی*

حسینؑ اور انسانیت

سمندر کے ٹھہرے ہوئے پانی میں جب کوئی پتھر پھینکا جاتا ہے تو اس کے پہنچتے ہی اس کے محل وقوع کے اردگرد شروع میں پانی کی لہروں کا ایک چھوٹا سا دائرہ بنتا، پھر وہی وقت گزرنے کے ساتھ بڑا ہوتا رہتا ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کے واقعۂ شہادت کی بھی تقریباً یہی شان ہے کہ اگرچہ تیرہ سو برس سے زیادہ عرصہ اس کو پیش آئے ہوئے گزر چکا ہے، لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کے اثرات کا دائرہ برابر وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

جہاں کہیں ظلم و باطل کے خلاف کوئی مظلوم اور حق پسند طبقہ آواز بلند کرتا اور قدم اٹھاتا ہے تو اس کی نظر حضرت امام حسینؑ کے مثالی اقدام کی طرف جاتی ہے۔ وہ ان کی ہمت، جرأت، شجاعت، حق پسندی، صاف گوئی، فداکاری، ثبات و استقلال اور سکون و اطمینان کو اپنا رہنما قرار دیتا ہے۔

امام حسینؑ کی عظیم شخصیت کو صرف مسلمان قدر و منزلت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے ہیں بلکہ وہ تمام اقوام و ملل کے مذہبی عقائد کے انتہائی گہرے اختلافات کے باوجود سب کی عقیدتوں کا نہایت مقدس روحانی مرکز ہے۔ یقیناً گوناگوں وجوہ سے وہ اسی کی حق دار اور سزاوار ہے۔

۱۔ یہ دنیا خود غرضی کی گھنونی بستی کا نام ہے۔

اس دنیا میں اپنے دنیوی شخصی مفادات کے پجاری رہتے ہیں۔ عام طور پر لوگوں کو اپنے ذاتی مفاد سے سروکار ہے۔ یہاں خالص رفاہ عام کے کاموں کے پیچھے بھی پست نفسانی اغراض کارفرما نظر آتے ہیں۔ اکا دکا آدمی ملتے ہیں جو اپنے ذاتی فائدوں کو قربان کرتے ہوئے کسی ایسے کام کے لیے تیار نہیں ہوتے جو ان کے نزدیک غلط ہو۔ سیاست کی دنیا میں ایسے لوگوں کو عقل مند، مصلحت اندیش اور کامیاب نہیں سمجھا جاتا ہے۔

آخر اس میں کیا مضایقہ تھا کہ حضرت امام حسینؑ بھی بہت سے عوام الناس کی طرح یزید کی بیعت کر لیتے۔ یقیناً اس صورت میں خود ان کی جان، ان کے رشتہ داروں اور دوستوں کی جانیں بچ جاتیں۔ انھیں اپنا وطن مدینہ نہ چھوڑنا پڑتا، وہ دیار بدیار پناہ گاہ تلاش نہ کرتے پھرتے۔ انھیں گھیر کر تین دن کا بھوکا پیاسا کربلا کے تپتے ہوئے میدان میں تلواروں اور بھالوں سے ٹکڑے ٹکڑے نہ کیا جاتا۔ ان کی لاشوں پر گھوڑے نہ دوڑائے جاتے۔ ان کے وفادار جوان بھائی عباس کے شانے نہ کاٹے جاتے۔ ان کے سر پر گرز نہ مارا جاتا۔ ان کے کڑیل جوان بیٹے علی اکبر کے سینے پر برچھی نہ لگائی جاتی۔ ان کے چھ مہینے کے بچے کو بھوک پیاس کی حالت میں تین بھال کے تیر کا نشانہ نہ بنایا جاتا لیکن حسینؑ نے تمام دنیا کے انسانوں کے سامنے بلا تفریق مسلک و ملت یہ عملی مثال پیش کر دی کہ آدمی یہ تمام مصیبتیں، تمام تکلیفیں، تمام ظاہری ذلتیں برداشت کر سکتا ہے مگر جس کام کو اس کی عقل اور اس کا ضمیر غلط سمجھتا ہو، اسے وہ ہرگز نہیں کر سکتا۔

---

* پروفیسر مولانا سید کاظم نقوی، صدر شعبۂ دینیات شیعہ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

یزید کی طرف سے جب مدینہ کے حاکم ولید نے امام حسینؑ سے خواہش کی کہ وہ یزید کی بیعت کرلیں تو انھوں نے ایک ایسا جواب دیا جس نے تمام دنیائے انسانیت کے سامنے یہ اصول بنا کر رکھ دیا کہ ضمیر فروشی کسی قیمت پر بھی نہیں کی جاسکتی۔

"ان یزید رجل فاسق، شارب الخمر
قاتل النفس المحترمہ، معلن بالفسق و
مثلی لا یبایع مثلہ"۔ (لہوف سیدابن طاؤسؒ)

"یزید ایک فاسق و فاجر شخص ہے، وہ شراب
پیتا، کھلم کھلا خدا کے احکام کی نافرمانی کرکے ان
کی توہین کرتا ہے۔ میرا جیسا آدمی اس جیسے شخص
کی بیعت نہیں کرے گا۔"

امام حسینؑ چونکہ خاندان رسالت کے بزرگ ترین نمایندہ تھے اس لیے جانتے تھے کہ میرے بیعت کرلینے کا مطلب یہ ہے کہ میں نے یزید کو اس قابل مان لیا ہے کہ میرا جیسا انسان اس کی بیعت کرے۔ کوئی دوسرا ایسا کرسکتا تھا، لیکن حسینؑ جس بلند اور مثالیہ کیرکٹر کا نام ہے وہ ہرگز ایسا نہیں کرسکتے تھے۔ یزید کے سامنے اُن کے سر جھکانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیں۔ یزید کے لیے لوگوں سے جو بیعت لی جارہی تھی وہ یہ نہیں تھی کہ حاکم وقت کتابِ خدا، قرآن مجید اور پیغمبر اسلامؐ کی سنت وسیرت کے مطابق عمل کرے گا، اگر ایسا بھی ہوتا تب بھی حسینؑ کا یزید کی بیعت کرنا شرعی اور عقلی طور پر صحیح نہیں تھا کیوں کہ یزید کا گذشتہ اور موجودہ کیرکٹر اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس کے کسی توبہ نامے کی نشر و اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ "آزمودہ را آزمودن خطاست" کا اٹل اصول بھی اس کا روادار نہیں تھا۔ امام حسنؑ کی صلح کی شرطوں کا کیا حشر ہوا؟ اس کو کون نہیں جانتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب مسلم ابن عقبہ اہل مدینہ سے یزید کے لیے بیعت لے رہا تھا تو اس کے پاس یزید ابن عبداللہ ابن ربیعہ کو لایا گیا۔ مسلم ابن عقبہ نے اُن سے کہا کہ میری بیعت کرو۔ انھوں نے کہا کہ میں تمہارے ہاتھوں پر بیعت کرتا ہوں بشرطیکہ کتاب وسنت پر عمل کیا جائے۔ مسلم ابن عقبہ نے کہا کہ اس طرح بیعت نہیں ہوگی۔ اس طرح بیعت کرو کہ تم امیر المؤمنین یزید کی ملکیت ہو، وہ جو چاہے تمہارے ساتھ سلوک کرے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امام حسینؑ کی بیعت یزید کرلینے کا مطلب یہ تھا کہ آپ خدا سے اپنی بندگی کا رشتہ توڑ کر یزید کی بندگی اختیار کرلیں۔ خدا نے تمام انسانوں کو آزاد پیدا کیا ہے، لیکن یزید انھیں اپنا غلام بنانا چاہتا تھا۔

امام حسینؑ نے یزید کی بیعت سے انکار کرکے انسانی عزت و شرافت کا بھرم رکھ لیا۔ معقول حدوں کے اندر آزادی انسان کا فطری حق ہے۔ تمام عالم انسانیت کا دل اس لیے امام حسینؑ کی ذات کی طرف کھنچنا چاہیے کہ آپ نے اس کے اس فطری حق کو محفوظ کردیا۔ آپ وہ تھے جن کا مقولہ تھا کہ

"اے انسان تو اپنے کو کسی دوسرے کا غلام نہ بنا،
کیوں کہ خدا نے تجھے آزاد خلق کیا ہے۔"

امام حسینؑ اس لیے عزت واحترام کے حق دار ہیں کہ انھوں نے جو کہا تھا وہ کرکے دکھا دیا۔ اقوال کے میدان کے شہسواروں کی دنیا میں کمی نہیں ہے، لیکن ایسے لوگوں کی بہت کمی ہے جن کا عمل ان کے قول کے مطابق ہو۔ قول اور فعل کی ہم آہنگی ایک ایسی ممدوح صفت ہے جو ادیان و مذاہب کے افتراق سے بالاتر ہے، اس لیے حسینؑ کی ذات کو بھی ان جدائیوں سے بالاتر رکھنا چاہیے۔

۲۔ باطل اقتدار کے خلاف بغاوت قابلِ فخر ہے۔

یہ صدی دبی پسی قوموں کو سر اٹھانے کی صدی ہے۔ یہ صدی کمزوروں، مجبوروں اور بے سہارا لوگوں کے ابھرنے کی صدی ہے۔ یہ صدی ظلم و استحصال کا جوا اتار پھینکنے کی صدی ہے۔ یہ صدی انانیت و نخوت، غرور و تکبر کا سر کچلنے کی صدی ہے۔ یہ صدی فقر و تنگدستی، غربت و فلاکت، افلاس و بے چارگی کے باغیانہ جذبات کے بروئے کار آنے کی صدی ہے۔ اس صدی میں حسینؑ اور حسینیت ضرور اس قابل ہیں کہ دنیا کی تمام ایسی قومیں جو جابرانہ اقتدار سے چھٹکارے کے لیے قدم اٹھا چکی ہیں، یا اس کی بابت سوچ بچار کررہی ہیں، انھیں اپنا راستہ اور سنگ میل قرار دیں

جنھوں نے اس وقت جب کہ وہ یزید کی بیعت کرنے سے قطعی انکار کر چکے تھے اور مروان ابن حکم نے انھیں سرراہ آمنا سامنا ہوجانے کے موقع پر مخلصانہ انداز میں یہ نصیحت کی تھی کہ میری رائے یہ ہے کہ آپ یزید کی بیعت کر لیجیے، اسی میں آپ کے دین و دنیا کی بھلائی ہے تو اس وقت امام حسینؑ نے جواب میں فرمایا تھا کہ

"اگر تمہاری رائے کے مطابق میں یزید جیسے خدا کے کھلم کھلا نافرمان شخص کی بیعت کر لوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا سے خدا کی بندگی رخصت ہوجائے اور کوئی یہ نہ سوچے کہ اپنا سب کچھ اس کے سپرد کر دینا چاہیے، پھر اس پوری قوم اور انسانیت کا خدا ہی حافظ ہے جس کی زمام اقتدار یزید جیسے شخص کے ہاتھوں میں ہو۔"

حسینؑ نے تمام طاقت فرسا، ناقابل برداشت خطروں کو نظر میں رکھتے ہوے پورے ثبات و استقلال اور بھرپور عزم و جزم کے ساتھ یزید کی بیعت سے انکار کر کے مظلوم عوام کے ذہنوں میں اس کی حکومت اور اس جیسی ہر حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کا تصور پیدا کیا۔

دنیا کے کروڑوں مظلوم عوام کے بے شمار درود و سلام ہوں باطل کے خلاف حسینؑ کی اس غیر معمولی جرأت و ہمت اور ان کے اس مثالیہ عزم و ارادے پر جس نے ان کی آنکھوں کے سامنے ایک ہمہ گیر منارۂ ہدایت قایم کر دیا۔

۳ حسینؑ کی مظلومی میں بے مثال دلکشی ہے۔

دنیا میں مظلوم انسانوں کی فہرست بہت طولانی ہے لیکن امام حسینؑ کسی ایک رخ سے نہیں بلکہ بہت سے رخوں اور بہت سی حیثیتوں سے مظلوم تھے۔ وہ اتفاقی طور پر اچانک ظلم اور تشدد کا نشانہ نہیں بنے بلکہ انھوں نے ایک طے شدہ منصوبے کے ماتحت ہر قسم کے مظالم برداشت کیے ہیں۔ ان کی مظلومی میں سبق آموزی کا پہلو ہے۔ ان کی قتل گاہ صرف قتل گاہ نہیں بلکہ انسانیت کے لیے بے نظیر درس گاہ بھی ہے۔ ان کے موقف کا

بس یہ تقاضا تھا کہ وہ یزید کی بیعت نہ کریں، جس کا کردار اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں تھا۔ وہ اُن کے نزدیک بلکہ دوسرے ممتاز مسلمانوں کے نزدیک بھی اس قابل نہیں تھا کہ ان کے روحانی اور غیر روحانی اقتدار کی باگ ڈور اس کے ہاتھوں میں ہو۔ اس کے باوجود انھوں نے ہرگز کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھایا جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ وہ یزید کے تختۂ حکومت کو پلٹ کر اپنی حکومت قایم کرنا چاہتے ہیں اگرچہ وہ اس طرح کا قدم اُٹھانے میں بالکل حق بجانب تھے، پھر بھی انھوں نے اوّل سے آخر تک مصالحت آمیز رویہ اختیار کیا۔ وہ "جیو اور جینے دو" کے اصول پر کاربند تھے لیکن اس کے باوجود یزید اور اس کے ہواخواہوں نے شروع ہی سے آپ کے بارے میں تشدد سے کام لیا۔ یزید نے معاویہ کی وفات کے بعد حاکم مدینہ کے نام جو ہدایت نامہ بھیجا اس میں کھلم کھلا اسے حکم دیا گیا کہ اگر حسینؑ میری بیعت نہ کریں تو انھیں قتل کر دیا جائے۔ اس طرح کی ہدایت ان کے علاوہ کسی ایسے دوسرے شخص کی بابت نہیں کی گئی تھی جس سے بیعت لینے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیعت سے علیحدگی کی صورت میں یزید امام حسینؑ کے خود وجود کو اپنے اقتدار حکومت کے لیے ایک مستقل خطرہ سمجھتا تھا، اس لیے نہیں کہ اسے اس بات کا شبہ تھا کہ امام حسینؑ حکومت حاصل کرنے کے لیے کوئی مہم چلا سکتے ہیں، بلکہ اس لیے کہ اسے وثوق تھا کہ حسینؑ کے بلند انسانی اخلاق اور کردار کی وجہ سے خود بخود لوگوں کے دل اُن کی طرف کھنچ جائیں گے، وہ کبھی نہ کبھی ان کے بلند نظر اور مستغنی باپ کی طرح انھیں اقتدار حکومت قبول کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد امام حسین علیہ السلام نے جب مدینہ چھوڑ کر مکّے میں پناہ لی جو تمام لوگوں کے واسطے ایک عمومی پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا تھا تو وہاں بھی انھیں سکون و اطمینان سے نہیں رہنے دیا گیا بلکہ خفیہ طور سے ان کی زندگی کے ختم کرنے کا انتظام کیا گیا۔ انھوں نے مکّہ میں زمانۂ حج میں چھوڑ دیا۔ ان کے اور اُن کے ساتھیوں کے بڑھتے ہوے قدموں کو حر ابن یزید ریاحی کی مسلح فوج نے روک دیا۔ امام حسینؑ طاقت کا استعمال کر کے اس فوج کو تہس نہس کر سکتے تھے۔

ان کے ساتھیوں نے اس طرح کا مشورہ بھی دیا مگر حسینؑ اپنی طرف سے جنگ کی ابتدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آخر حُر نے کربلا کے میدان میں چھوٹے سے حسینی قافلے کو ٹھہرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ بھی سخت گرمی میں نہر فرات کے کنارے سے دور، پھر ساتویں محرم سے حسینؑ اور ان کے چھوٹے بڑے ساتھیوں پر پانی بھی بند کر دیا گیا۔ کربلا پہنچ کر حسینؑ نے یزیدی فوج کے سردار پسر سعد سے کئی مرتبہ بات چیت کر کے چاہا کہ آپس میں لڑائی اور ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے لیکن یزید کا مقرر کیا ہوا حاکم کوفہ ابن زیاد اپنی طاقت کے نشے میں غلط فہمی کا شکار تھا، وہ مظلومی کے ردِ عمل کو نہیں جانتا تھا' چنانچہ دسویں محرم کو جب لڑائی شروع ہوئی تو انھیں اور ان کے چھوٹے چھوٹے دودھ پیتے بچوں تک کو بھوکا پیاسا تہہ تیغ کر دیا گیا۔ اُن کی لاشوں پر گھوڑے دوڑائے گئے' ان کے سروں کو نوک نیزہ پر بلند کیا گیا۔ ان کے خیموں میں آگ لگائی گئی۔ ان کے گھرانے کی خواتین کو قیدی بنایا گیا اور ان کی توہین و تذلیل میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔

امام حسینؑ کی یہ بے مثال مظلومی جس کے پیچھے انکار بیعت کا شریفانہ جذبہ تھا پوری دنیائے انسانیت کے دلوں میں ان سے محبت اور عقیدت پیدا کرنے کا زبردست محرک ہے۔ اسی لیے بلا تفریق مذہب و ملت تمام لوگ ان کی عزت کرتے اور ان کی بارگاہ میں عقیدت و احترام کے پھول چڑھاتے ہیں۔

۴۔ آج جبکہ دنیا کے انسانیت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے

ہندوستان کا کیا ذکر کیا جائے۔ اس کو تو تہذیب و تمدن کے لحاظ سے یورپ اور امریکہ کے برابر نہیں سمجھا جاتا۔ امریکہ اور یورپ جنہیں تہذیب و تمدن کا نمونہ خیال کیا جاتا ہے وہاں رنگ اور نسل کے لحاظ سے جو افسوس ناک طبقاتی تفریق ہے' وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ہندوستان میں گاندھی جی کی قابل قدر کوششوں کے نتیجے میں کسی حد تک یہ طبقاتی تفریق دب گئی ہے' لیکن ابھی تک اس نے ہندوستانی سماج سے اپنا بوریا بستر مکمل طور پر نہیں باندھا ہے' لیکن حضرت امام حسینؑ وہ وسیع القلب اور بلند نظر انسان تھے جنھوں نے آج سے تقریباً چودہ سو برس پہلے اس طرح کی تفریق و امتیاز کو کربلا کی سرزمین پر بالکل نیست و نابود کر دیا۔ انھوں نے اپنے بھائی عباس ابن علیؑ اپنے بیٹے علی اکبرؑ اپنے بھتیجے قاسم ابن حسنؑ اپنے بچپنے کے دوست حبیب ابن مظاہر اور سیاہ رنگ کے جوان غلام ابوذر غفاری کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں قرار دیا۔ طبقاتی امتیازات کے ختم کرنے کے لیے امام حسین علیہ السلام نے یہ جو قدم اٹھایا' اس نے تمام پسماندہ طبقات کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ انھوں نے طبقاتی تفریق کے خلاف یہ وہ قابل قدر اقدام کیا جو آج بھی دنیائے انسانیت کے لیے ایک شمع راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

۵۔ ہندوستان کی اس زہریلی فرقہ وارانہ فضا میں

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان تقریباً تمام مختلف ادیان و مذاہب کے ماننے والوں کا عظیم مرکز ہے۔ اگرچہ کوئی مذہب کسی دوسرے مذہب کے ماننے والوں سے نفرت کرنے کا سبق نہیں دیتا ہے' لیکن یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ رقیبانہ سیاستِ وقت اکثر و بیشتر فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکا کر مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو لڑایا کرتی ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ فرقہ وارانہ نفرت و عداوت ہرگز اس حد تک نہیں ہے جو اپنے کسی جانی دشمن سے ہوا کرتی ہے۔ دشمن ہونے کا ہرگز یہ تقاضا نہیں ہے کہ ہمارے اور اس کے درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ یقیناً انسانیت کا وہ مشترک رشتہ ہے جو دوست اور دشمن دونوں کو شامل ہے۔ ان کے درمیان صرف رشتہ نہیں بلکہ اس کے تقاضے اور مخصوص حقوق بھی برقرار ہیں۔

اس سرزمین ہندوستان کی فرقہ وارانہ مکدر فضا میں جہاں ہر ایک فرقہ دوسرے فرقے سے دست و گریباں رہتا اور تمام انسانی اقدار و اخلاق کو خیرباد کہہ دیتا ہے۔ حضرت امام حسینؑ کے اس بلند انسانی کردار کو یاد دلانے کی شدید ضرورت ہے کہ آپ کے سامنے جب حُر ابن یزید ریاحی کی سرکردگی میں دشمن کا فوجی رسالہ اس طرح آیا کہ پیاس کی شدت نے اسے جاں بلب بنا دیا تھا تو آپ نے کسی گفت و شنید سے پہلے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ اس پوری پیاسی فوج کو سیراب کیا جائے۔ کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ ہندوستان کے اس فرقہ وارانہ ماحول میں مختلف فرقوں کے لوگوں کو برابر یہ یاد دلایا جاتا رہے کہ تمہیں امام حسینؑ کے اس بلند کردار کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ کسی کے دشمن ہونے کا ہرگز یہ تقاضا نہیں ہے کہ اس کا کوئی انسانی حق تمہارے ذمے نہ رہے۔ تم انسانیت کے مشترکہ حقوق اور فرائض سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتے۔ اگر ہمارے ملک کے مختلف فرقے امام حسینؑ کے صرف اسی ایک سبق کو یاد رکھیں اور اس کے مطابق عمل کریں تو کسی نہ کسی حد تک بدگمانی اور مہلک فرقہ وارانہ تعصب و نفرت خود بخود گھٹتا چلا جائے۔

نذیر احمد*

ایرانی مہینے کے تیس دنوں کے نام

ایران میں ہفتے کے سات دنوں کے نام تقریباً وہی ہیں جو ہندوستان کے شہروں میں رائج ہیں یعنی یک شنبہ، دوشنبہ، سہ شنبہ، چہار شنبہ، پنج شنبہ، جمعہ، شنبہ، ان میں پنج شنبہ کے بجائے جمعرات اور شنبہ کے بجائے سنیچر، یک شنبہ کے بجائے اتوار ہندوستان میں زیادہ مروج ہے گو پنج شنبہ، شنبہ اور یک شنبہ سے ہندوستانی واقف ہے۔ ہندوستان کے بعض علاقوں میں دوشنبہ کے بجائے پیر کا لفظ معمول ہے۔ ایران میں ہفتہ کے دنوں کا شمار یک شنبہ سے اور ہمارے یہاں دوشنبہ سے ہوتا ہے

ایران میں مہینے کے تیس دنوں کے نام مقرر ہیں۔ یہاں دنوں سے مراد تاریخ ہے۔ یعنی مہینے کی تیس تاریخوں کے الگ الگ نام ہیں اس طرح ہر ایک دن کے دو نام ہوتے ہیں۔ ایک ہفتے کے لحاظ سے اور ایک مہینے کے اعتبار سے۔ مثلاً مہینے کے پہلے دن کا نام ہرمز یا اورمزد ہے۔ پس اگر یہ پہلا دن (تاریخ) دوشنبہ کا ہے تو ہرمز اور دوشنبہ اس کے دو نام ہوں گے۔

ایرانی مہینے کے تیس ناموں کا سب سے قدیم ماخذ البیرونی کی آثار الباقیہ ہے۔ اس کی فصل پنجم میں مرقوم ہے:

"فارسی مہینوں میں ہر ایک تیس دن کا ہوتا ہے اور ہر دن کے لیے ان کی زبان میں ایک خاص نام ہوتا ہے اور یہ نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ہرمز ۲۔ بہمن ۳۔ اردی بہشت
۴۔ شہریور ۵ اسفندارمذ ۶۔ خرداذ
۷۔ مرداذ ۸۔ دَی باذر ۹۔ آذر
۱۰۔ آبان ۱۱۔ خور ۱۲۔ ماہ
۱۳۔ تیر ۱۴ گوش ۱۵۔ دَی بمہر
۱۶۔ مہر ۱۷۔ سروش ۱۸۔ رشن
۱۹۔ فروردین ۲۰۔ بہرام ۲۱۔ رام
۲۲۔ باذ ۲۳۔ دَی بدین ۲۴ دین
۲۵۔ ارد ۲۶ اشتاذ ۲۷۔ آسمان
۲۸۔ زامیاذ ۲۹۔ مارسفند ۳۰۔ انیران

ایرانیوں میں ان ناموں کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں اور مہینے کے تیس روز کے نام اسی ترتیب سے آئے ہیں، صرف ہرمز میں اختلاف ہے، بعض لوگ اس کو فرخ نام دیتے ہیں۔ اسی طرح انیران بعض کے نزدیک بہ روز ہے اور فارسی مہینوں کے کل ۳۶۰ دن ہوتے ہیں۔"

اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ البیرونی کے یہاں دال و ذال کے درمیان جو فرق تھا اس کا لحاظ رکھا گیا ہے یعنی جس دال کے پہلے مصوت (ا ہ ی) آیا ہے وہ ذال ہے، دال نہیں۔

---

* پروفیسر نذیر احمد، سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس، سابق صدر شعبہ فارسی، اے ایم یو، ـــــ سرسید نگر، علی گڑھ

اِس اعتبار سے اس نے مذ، خرداذ، مرداذ، اشتاذ، باذ، نامیاذ کو ذال سے لکھا ہے اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک میں آخری دال کے پہلے مصوت ہے، لیکن ارد اور سفند میں دالِ آخر کے پہلے کا حرف ساکن ہے، اس لیے پرانے قاعدے کے مطابق ان میں دال غیر منقوط ہے۔ لیکن موجودہ دور میں دال اور ذال کے اس فرق کا لحاظ نہیں رکھا جاتا اور سوائے چند الفاظ کے جن میں ذال اب تک چلی آرہی ہے، باقی تمام ذال کی جگہ دال نے لے لی ہے "مذ" ابھی ذال معجم ہی سے لکھا جاتا ہے۔

فارسی مہینے کے ناموں کا دوسرا اہم ماخذ مسعودِ سعدِ سلمان کا دیوان ہے، اس میں ان ناموں کو منظوم کر دیا گیا ہے۔ دراصل ہر نام پر ایک قطعہ ہے جس میں ملک ارسلان غزنوی کی مدح ہے۔ گویا یہاں تیس قطعے ملک ارسلان کی مدح میں موجود ہیں۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ مسعودِ سعدِ سلمان (وفات ۵۲۵ھ) نے ملک ارسلان ہی کے نام سے بارہ مہینوں سے متعلق بارہ قطعے اور ہفتے کے سات دنوں کے تعلق سے سات قطعے درج کیے ہیں۔ اس طرح اس ملک کی تعریف میں مہینے، دن اور ہفتہ کے ذیل میں ۴۹ قطعے لکھے ہیں اور ہر قطعہ کا وزن اور ردیف و قافیہ دوسرے قطعے سے مختلف ہے۔

ذیل میں مہینے کے دنوں کے نام جیسا کہ مسعود سعد سلمان کے یہاں پایا جاتا ہے، درج کیے جاتے ہیں:

(یکم) اورمزد روز[1]

امروز اورمزداست ای یار می گسار
برخیز و تازگی کن و آن جام بادہ آر
ای اورمزد روی که بده روز اورمزد
آن می که شادمان کندم اورمزد وار

[آج اورمزد روز ہے، اے شراب پینے والے دوست اٹھ، تازہ رو ہو، اور شراب کا پیالہ لا، اے اورمزد (مشتری) چہرے والے دوست مجھے اورمزد روز کو ایسی شراب دے جو اورمزد کی طرح مجھے بشاش کر دے]

(دوم) بہمن روز

بہمن روز ای صنم دلستان
بنشین با عاشق در بوستان
شاد نشینیم که زین مملکت
خلق جہان ہست ہمہ شادمان

[اے دلفریب محبوب بہمن روز کو عاشق کے ساتھ باغ میں بیٹھو، ہم خوشی کے ساتھ بیٹھیں اس لیے کہ اس عہد میں ساری دنیا خوش و خرم نظر آرہی ہے]

(سوم) اردی بہشت روز

اردی بہشت روز است ای ماہ دلستان
امروز چون بہشت برین است بوستان
زان بادہ که خرم از و گشت عیش و عمر
زان بادہ که گردد از و تازہ طبع و جان

[اے دلفریب محبوب آج اردی بہشت روز ہے بوستان بہشت بریں ہو رہا ہے، وہ شراب چاہیے جس سے عیش و عمر خوش و خرم ہے، اور جس سے طبیعت اور روح تازہ ہو جاتی ہے]

(چہارم) شہریور روز

ای تنت را ز نیکوئی زیور
شہرہ روزیست روز شہریور
می شناس ای نگار جان را قوت
گاہ می دہ مرا و گہ می خور

[تیرا تن خوبصورتی کے زیور کے اعتبار سے شہرۂ آفاق ہے۔ اے محبوب روح کی غذا تو پہچانتا رہ، کبھی کبھی شراب دیتا رہ اور کبھی خود شراب پی]

(پنجم) سپندارمذ روز

سپندارمذ روز خیز ای نگار
سپند آر مارا و جام می آر
می آر از پی آنکه بی می نشد
دلی شادمان و تنی شادخوار
سپند آر پی آنکه چشم بدان
بگرداند ایزد ازین روزگار

[اے محبوب! سپندارمذ روز کو اُٹھ اور میرے لیے سپند (رائی) اور شراب کا پیالہ لا، اس لیے کہ بغیر اس کے کوئی دل خوش اور کوئی تن آرام سے نہیں رہتا۔ رائی اس لیے کہ خدائے بزرگ اس عہد کو چشم بد سے محفوظ رکھے۔]

(ششم٦) خرداد روز

خرداد روز داد نباشد که بامداد
از لهو و خرمی بستانی ز باده داد
از باده جوی شادی و از باده باش خوش
بی باده این جهان صنما باد گیر باد

[خرداد روز اعتدال کا دن نہیں، صبح ہی سے لہو و لعب اور خوشی و خرمی کے ساتھ خوب شراب پینا چاہیئے شراب سے خوشی حاصل کر اور شراب سے خوش رہ۔ اے محبوب بغیر شراب یہ دنیا ہیچ پوچ ہے]

(ہفتم٧) مرداد روز

روز مرداد مژده داد بدان
که جهان شد بطبع باز جوان

[مرداد روز نے خوش خبری سنائی کہ دنیا اپنی طبیعت سے پھر جوان ہوگئی ہے]

(ہشتم٨) دی باذر روز

روز دی است خیز و بیار ای نگار می
ای ترک می بیار که ترکی گرفت دی

[روز دے ہے، اے محبوب! اٹھ اور شراب لا اے ترک (محبوب) شراب لا اس لیے کہ دے نے اصول ترکی سنبھالی ہے]

(نہم٩) آذر روز

ای خرامنده سرو تابان ماه
روز آذر می چو آذر خواه
شادمان کن مرا کیو که جهان
شادمان شد بفرّ دولت شاه

[اے سرو خراماں و ماہ تابندہ، روز آذر کو مے آتشیں طلب کر اور مجھے شراب سے خوش کر دے اس لیے کہ سارا جہاں بادشاہ کی حکومت کے کر و فر سے خوش و خرّم ہو رہا ہے]۔

(دہم١٠) آبان روز

آبان روز است و ماه آبان
خرم گردان بآب رز جان
بنشین بنشاط و دوستان را
ای دوست بعز و ناز بنشان
تا باده خوریم و شاد باشیم
بر یاد خدایگان گیهان

[ماہ آبان میں آبان روز کو شراب سے میری روح تازہ کر دے۔ خوشی سے خود بیٹھ اور دوستوں کو عزت و ناز سے بٹھا تاکہ ہم بادشاہ کی یاد میں شراب پییں اور خوش ہوں]۔

(یازدہم١١) خور روز

روز خور است ای بدو رخ همچو خور
تافت خور از چرخ فلک باده خور
باده خور و نیز مرا باده ده
خوبی احوال زمانه نگر

[اے محبوب! تیرے دونوں رخ سورج کی طرح چمک رہے ہیں۔ آسمان پر سورج طلوع ہوا شراب

پی، خود شراب پی اور مجھے بھی شراب دے اور زمانہ کے حالات کی خوبی ملاحظہ کر]۔

(دوازدہم[۱۱]) ماہ روز

ماہ روز ای بروی خوب چو ما
بادۂ لعل مشکبوی بخواہ
گشت روشن چو ماہ بزم گرگشت
نام این روز ماہ و روی تو ماہ

[اے محبوب! جس کا چہرہ چاند کی طرح ہے، سرخ رنگ کی شراب جو مشک جیسی خوشبو دیتی ہو، طلب کر محفل چاند کی طرح روشن ہو گئی اس لیے کہ اس دن کا نام ماہ ہے اور تیرا چہرہ بھی ماہ (چاند) ہے]

(سیزدہم[۱۲]) تیر روز

ای نگار تیر بالا روز تیر
خیز و جام بادہ دہ بر لحن زیر
عاشقی در پردۂ عشاق گوی
راہہای طبع خواہ دل پذیر

[اے بالا قد نگار، روز تیر ہے۔ اٹھ، شراب کا جام نغمۂ زیر پر پلا، عشاق کے پردہ میں راگ الاپ، ایسا راگ جو دلفریب اور دل پسند ہو]۔

(چہاردہم[۱۳]) گوش روز

گوش روز ای نگار مشکین خال
گوش بر ربط بگیر و نیک بمال
من ز بہر سماع خواہم گوش
بی سماعم مدار در ہر حال
من نگنجم ز شادی اندر پوست
زانکہ بینم بکام نیک سگال

[اے مشکیں خال محبوب! گوش روز ہے، بربط کے تار کو خوب کھینچ کر بجا۔ میرے کان کا مقصد صرف یہ ہے کہ میں گانا سنوں، بس کسی حال میں مجھے اس سے محروم نہ رکھ۔ میں چوں کہ خیر خواہ کا مقصد پہچانتا ہوں۔ اس لیے اتنا خوش ہوں کہ اپنے جامے میں نہیں سماتا]۔

(پانزدہم[۱۴]) دی بہر روز

ای مرا ہمچو جان و از جان بہ
بامدادان نشاط کن، بر جہ
دی بہراست مہربانی کن
کز ہمہ چیز مہربانی بہ

[اے محبوب تو میری جان ہے، بلکہ جان سے بھی بڑھ کر۔ صبح کو شراب سے محظوظ کر۔ آج دی بہر ہے میرے ساتھ مہربانی کر۔ مہربانی سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہیں]۔

(شانزدہم[۱۵]) مہر روز

روز مہر و ماہ مہر و جشن فرخ مہرگان
مہر بفزای ای نگار ماہ چہرہ مہربان
مہربانی کن بجشن مہرگان و روز مہر
مہربانی بہ بروز مہر و جشن مہرگان
جام را چون لالہ گردان از نبید بادہ رنگ
و ندر آن منگر کہ لالہ نیست اندر بوستان

[مہر روز ہے، ماہ مہر ہے اور مبارک جشن مہرگان کی تاریخ۔ اے ماہ رخ مہربان محبوب، مہر و محبت کی زیادتی کی التجا ہے۔ روز مہر اور جشن مہرگاں کے وقت مہربانی کر کیوں اس دن اور اس تقریب کے موقع پر مہربانی بڑی عزیز چیز ہے اپنا جام سرخ لالہ رنگ شراب سے پُر کر اور اس میں نہ دیکھ کہ باغ میں لالہ موجود نہیں ہے]۔

(ہفدہم[۱۶]) سروش روز

روز سروش است کہ گوید سروش
بادہ خور و نغمۂ مطرب نیوش

بسر شد از سبزه همه بوستان
مل می آرای صنم سبزپوش

(فرشتہ کہتا ہے کہ آج سروش کا دن ہے۔ شراب پی اور مطرب کا نغمہ سن۔ باغ سبزہ زار ہو چکا ہے۔ اے سبزپوش محبوب سرخ شراب لا۔)

(ہیجدہم[۱۸]) رشن روز

روز رشن است ای نگار دلربای
شاد بنشین و بجام می گرای
تا توانی هیچ یک ساعت مباش
بی می شادی فزای غمزدای

(اے دلربا محبوب! آج رشن کا دن ہے۔ خوش ہو اور شراب کی طرف توجہ کر۔ جہاں تک ممکن ہو ایک لمحہ بھی شراب پیے بغیر نہ گذرے۔ ایسی شراب جو خوشی بڑھاتی اور غم مٹاتی ہے)

(نوزدہم[۱۹]) فروردین روز

فروردینست و روز فروردین
شادی و طرب را کند تلقین
ای دو لب تو چو می مرا می ده
کآن باشد رسم روز فروردین

(ماہ فروردین اور روز فروردین کا اجتماع ہے یہ اقتران شادی اور طرب کی دعوت دیتا ہے۔ اے محبوب! جس کے دونوں لب شراب کی طرح ہیں، مجھے شراب دے اس لیے کہ فروردین روز کی یہی رسم ہے۔)

(بیستم[۲۰]) بہرام روز

ای روی تو بخوبی افزون ز مهر و ماه
بهرام روز باده بهرام رنگ خواه

(اے محبوب! تیرا چہرہ چاند اور سورج سے زیادہ تابناک ہے۔ بہرام روز کو سرخ رنگ کی شراب کی طلب کر۔)

(بیست و یکم[۲۱]) رام روز

رام روز است بخت و دولت رام
ای دلارام خیز و در ده جام
زان قنینه یکی قدح پر کن
همچو کبک دری یکی بخرام

(رام روز ہے۔ کامیابی اور خوش نصیبی تابع ہو چکی ہیں۔ اے محبوب اٹھ اور شراب دے۔ اس مٹکے سے ایک بڑا پیالہ شراب کا بھر اور پہاڑی چکور کی چال چل کر مجھے عنایت کر۔)

(بیست و دوم[۲۲]) باد روز

چو باد روز روز نشاط آمد ای نگار
شادی فزای هین دهد باده و بیار
باده است شادی دل پیوسته باده خور
بی باده هر چه بینی باد هوا شمار

(بادروز عیش و نشاط کا روز ہے۔ اے محبوب خوش ہو، شراب دے، شراب، دل کی خوشی کا نام ہے۔ ہمیشہ شراب پیا کر۔ جو بھی چیز بغیر شراب ہے وہ وجود خارجی میں ایسی ہے حقیقی ہے جیسی فضا کی ہوا۔)

(بیست و سوم[۲۳]) دی بدین

دی بدین است و دین مرد خرد
آن شناسم که مل باده خورد
باز دارد خرد ترا ز نبیذ
مشنو اندر نبیذ پند خرد
ای شگفتی نبیذ خواره همی
صد هنر در نبیذ بر شمرد

(آج دی بدین ہے۔ میرے نزدیک عقلمند وہ ہے جو سرخ رنگ کی شراب پیتا ہے۔ عقل کہتی ہے نبیذ و شراب نہ پی۔ تو شراب کے معاملے میں عقل کی پروا

نہ کر۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ شراب خوار نیند میں سیکڑوں
ہنر دیکھتا ہے؟]

(بیست و چہارم[۲۴]) دین روز

دین روز ای روتو آگفت دین
می خور و شادی کن و خرم نشین
با می و می خوردن دین را چہ کار
می خور و می نوش و دار دین؟

[اے کہ تیرا چہرہ دین کے لیے صدمہ ہے۔ دین روز کو خوشی و خرمی کے ساتھ شراب پی۔ شراب اور بادہ نوشی کو دین سے کیا تعلق۔ خوب شراب پی اور دین کی پروا نہ کر؟]

(بیست و پنجم[۲۵]) ارد روز

ارد روز است فرخ و میمونے
با ہمہ لہو و خرمی مقرونے
ای دلارای یار گلگوں رخ
خیز و پیش آر بادۂ گلگوں

[ارد روز مبارک دن ہے۔ خوشی و خرمی اور کھیل کود اس کا لازمہ ہے۔ اے دلبر گلرخ اٹھ اور سرخ شراب لا]۔

(بیست و ششم[۲۶]) اشتاد روز

اشتاد روز و تازہ ز گل بوستان
اے دوست می ستان ز کف دستان
در بوستان نشین و می لعل نوش
زیرا کہ سبز گشت ہمۂ بوستان

[اشتاد روز ہے اور گلستان میں تازہ پھول کھلے ہوئے ہیں۔ اے دوست! آج محبوبوں کے ہاتھ سے شراب لینا چاہیئے۔ بوستان میں بیٹھو اور سرخ شراب پیو، اس لیے کہ بوستان سارا کا سارا ہرا بھرا دکھلائی پڑتا ہے]۔

(بیست و ہفتم[۲۷]) آسمان روز

آسمان روز ای چو ماہ آسمان
بادہ نوش و دار دل را شادمان
جان ز بادہ شاد کن زیرا کہ عقل
بادہ را بیند ہمی شادی جان

[اے آسمان کے چاند کے مانند محبوب، آسمان روز کو شراب پی اور دل خوش رکھ۔ جان کو شراب سے خوش کر دے اس لیے کہ عقل کی رو سے شراب شادی جان ہے]۔

(بیست و ہشتم[۲۸]) زامیاد روز

چون روز زامیاد نیاری ز می تو یاد
زیرا کہ خوشتر آید می روز زامیاد

[کیا روز زامیاد کو تجھے شراب کی یاد نہیں آتی۔ یہ دن تو ایسا ہے کہ اس دن شراب بہت مزےدار لگتی ہے]۔

(بیست و نہم[۲۹]) ماہ اسپند روز

ای دلارام روز مار اسپند
دست بی جام لعل می مپسند
خرمی در جہان خرم بین
شادمانی کن و بناز بخند

[اے محبوب! ماہ اسپند روز کو ہاتھ شراب کے پیالے سے خالی نہ ہونا چاہیے۔ خوش و خرم دنیا میں تجھے بھی خرمی سے سازگار ہونا چاہیئے خوش خوش رہ اور ناز کے ساتھ ہنستا جا]۔

(سی ام[۳۰]) انیران روز

انیران ز پیران شنیدم چنان
کہ می خورد باید بہ رطل گران
دل اندر کم و بیش گیتی مبند
ہمی دار جان را ہمی شادمان

[بڑے بوڑھوں سے میں نے سنا ہے کہ انیران کے دن کافی مقدار میں شراب پینی چاہیئے ۔ اے دوست دنیا کی طلب میں دل نہ لگا۔ دل و جان کو شراب سے شادماں رکھنا چاہیئے]۔

ان میں سے بارہ نام وہی ہیں جو بارہ مہینوں کے ہیں ۔ بلکہ دَی ایک کے بجائے تین ماہ کے نام کے ساتھ مخصوص ہے ۔ دوسرے بعض نام زرتشتی دیوتاؤں کے نام پر ہیں، بعض ایسے ہیں جن کی وجہ تسمیہ معلوم نہیں۔ ایک اور قابلِ ذکر چیز یہ ہے کہ بیرونی کے یہاں اورمزد کے بجائے ہرمز، اسپندار کے بجائے اسفندار اور مارسفند کے بجائے مارسپند ہے ۔ رشید یاسمی کے مرتبہ دیوانِ مسعودِ سعدِ سلمان میں زامیاد کے بجائے رامیاد اور دَی بہ آذر روز کے بجائے دیبازروز ہے ۔ دی بمہر کی جگہ دیہر چھاپے کی غلطی ہے ۔ بیرونی نے ہرمز (= اورمزد) کا دوسرا نام فرخ اور انیران کا بہ روز لکھا ہے۔ مسعودِ سعد کے یہاں ان متبادل ناموں کا ذکر نہیں۔ اب ایران میں دنوں کے ناموں کا چلن نہیں، لیکن ادبیات میں ان کا ذکر آتا ہے۔ اسی وجہ سے فارسی فرہنگوں میں بھی یہ نام شامل ہیں۔ ادبیات کے طالب علم کے لیے ان ناموں سے شناسائی ناگزیر ہے یہی اس مقالے کی اشاعت کا جواز فراہم کرتا ہے۔

حواشی

۱ھ ترجمہ آثار الباقیہ از داناسرشت۔ تہران، ۱۳۵۲ ص ۶۹

۲ھ یہ لفظ ساسانی اور ایرانی فرہنگ معین میں مشترک ہے اور دونوں میں معنی آئین، دین، قانون آیا ہے۔ (فرہنگ معین)۔

۳ھ اکثر قطعے پانچ شعر کے ہیں۔ چند میں صرف ۴ شعر پائے جاتے ہیں۔

۴ھ سلطان مسعود سوم (فوت ۵۰۹ھ) کا بیٹا اور غزنوی خاندان کا ۱۰واں سلطان گزرا ہے۔ اس نے صرف دو سال حکومت کی۔ اپنے بھائی بہرام کے ہاتھ ۵۱۱ھ میں قتل ہوا۔

۵ھ آثار الباقیہ میں ہرمز ہے۔

۶ھ موسیقی کے دو پردے، ایرانی موسیقی میں بارہ پردے بتائے گئے ہیں۔ ان کو ہندوشاہ نخجوانی نے اس طرح نظم کیا ہے۔

نوا و راست، عینی و راہوی و عراق
حجاز و زنگلہ و بوسلیک با عشاق
دگر سپاہان باقی بزرگ و زیر افگند
اسامی ہمہ پردہ ہاست بر اطلاق

۷ھ ۔ ایرانیوں کا ساتواں مہینہ مہر ماہ ہے۔ اس کے سولہویں دن کا نام مہر روز ہے۔ اس روز ایرانی بڑی دھوم دھام سے جشن مناتے ہیں۔ اسی کو جشن مہرگان کہتے ہیں۔

بقیہ

سماج میں عورت کا مقام

انجام دے کر صالح اور کارآمد نسلیں تیار کی جاسکتی ہیں۔ مرد تو صرف روٹی روزی کمانے اور دنیاوی جاہ و جلال حاصل کرنے کی تگ و دو میں ساری زندگی صرف کر دیتا ہے۔ جب کہ عورتیں اپنے بچوں کی صحیح تربیت کر کے ملک و قوم کا مستقبل سنوار سکتی ہیں۔ اس لیے ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ معاملہ کمتری یا برتری کے احساس کا نہیں، بلکہ اصل مسئلہ اپنے حدود کو پہچاننے اور ان حدود میں رہتے ہوئے بڑے کارنامے انجام دینے کا ہے۔

قاضی عبدالستار*

اٹھارویں قسط

خالد بن ولید

سیف اللہ نے سلام پھیر کر ملّت کی تنظیم اور امّت کے اتحاد کی دُعا مانگی۔ صف سے اس طرح نکلے جیسے کڑی کمان سے تیر نکلتا ہے سنّاٹے میں کھنچے ہوئے خط کی طرح اپنے خیمے میں آئے۔ دروازے پر یزید بن ابی سفیانؓ، عمرو بن العاصؓ، عیاض بن غنمؓ، قباثؓ بن اشیم بنی امیہ اور بنی مخزوم کے مشہور ناموں کے ساتھ ہجوم کیے ہوئے تھے۔ وہ کسی سے مخاطب ہوئے بغیر اندر چلے گئے۔ غلام نے پانی کا پیالہ پیش کیا تو حکم ملا۔

"سپہ سالاری کا علم لپیٹ کر حاکم شام کے سپرد کر دو اور دروازے پر پہرہ لگا دو۔"

غلام نے محمدیؐ علم کی طرف ہاتھ اٹھایا تو عبدالرحمٰن بن خالدؓ نے جن کی ہیبت سے امیر معاویہؓ کی شہنشاہی خوف کھانے لگی تھی۔ تلوار کھینچ لی۔

"خبردار — یہ عمر بن خطابؓ کی امارت کا عطیہ نہیں ہے، صوبۂ قنسرین کا محصول نامہ نہیں ہے، اکرام رسالت ہے اصحاب بدر کا اعتماد مبارک ہے، نائب رسول کا الطافِ اقدس ہے۔ موتہ سے مرعش تک سیف الٰہی فتوحات کی دستاویز ہے۔ بنی مخزوم کی آبرو ہے۔ اس کی حفاظت کے لیے بنی مخزوم اپنے سر اتار کر پھینک دیں گے۔"

سیف اللہ پردے کے پیچھے کھڑے تھے اپنے خون کی حرارت کا اظہار سن رہے تھے۔

"جان اعمام نے سچ کہا۔ اس کی ناموس پر بنی امیہ اپنی جانیں نثار کر دینے کے لیے خالدؓ کی اجازت کی ضرورت نہیں سمجھتے۔"

مجمع سے نکل کر دمشق کے گورنر کے باپ، اور قریش کے سردار ابی سفیانؓ نے تائید کی اور دربار خلافت کا قاصد لفظوں میں دبی ہوئی آگ سے تحلیل ہو کر بھیڑ میں کھو گیا۔

سیف اللہ تخت پر بیٹھ گئے۔ اپنا پنجہ کھولا جس کی گرفت کے خوف سے مغرب کانپ رہا تھا۔ انگلیوں کے درمیان ابھی کبھی دنیا کی فتح قریب انگڑائیاں لے رہی تھی۔ وہ دیکھتے رہے اپنے ہاتھ دیکھتے رہے پھر جیسے کانپنے لگے۔ ہوش آیا تو عمامہ ان کے زانوؤں پر کھلا پڑا تھا۔ لوہے کا خود دونوں ہاتھوں میں کچل کر گیند بن چکا تھا اور انگلیوں سے خون بہہ رہا تھا۔ دونوں ہاتھ چہرے کے قریب لا کر کھولے تو فولاد کا گیند گود میں گر پڑا۔ انگلیوں سے ٹپکتے خون کے قطرے قبا کے دامنوں کو بھگونے لگے۔ عمامے کے کناروں سے انگلیاں صاف کیں۔ اٹھے۔ حمام میں جتنا پانی تھا اپنے سر پر انڈیل لیا۔ لباس تبدیل کیا اور جانماز پر کھڑے ہو گئے۔

عصر کی نماز کے وقت غلام پنجوں کے بل اندر آیا۔ دیکھا مصلّے پر سوار ہیں۔ حمام میں چلا گیا۔ تمام مشکیں خالی پڑی تھیں۔ پشت کے راستے سے مشکیں بھر کر رکھ دیں۔ کپڑے اٹھائے۔ خون دیکھ کر چونک پڑا۔ ڈر گیا

* پروفیسر قاضی عبدالستار، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ایک ایک کپڑا اٹھا کر غور سے دیکھا۔ چپکے سے باہر نکلا اور عبدالرحمان کے کان پر ہونٹ رکھ دیے۔ وہ بجلی کی طرح اندر آئے۔ باپ کے قیام و سجود کا نظارہ کیا اور تخت کے آگے پڑا ہوا خود کا گولہ اٹھا لیا۔ ہاتھ جلنے لگے۔ بدن کانپنے لگا۔ آنسوؤں سے بھگو دیا۔ سینے سے لگائے حمام میں داخل ہوئے۔ بڑے دامن میں بھر کر باہر آئے۔ نامداران حجاز کے سامنے ڈال دیے۔ دیکھتے رہے، کھولتے رہے۔ ابی سفیان نے قبا اٹھائی اس طرح بلند کی کہ خون کے دھبّے دور سے نظر آنے لگے۔

"اگر اس قمیص کو بانس پر چڑھا دیا جائے تو اس جھنڈے کے سامنے دنیا کا بڑے سے بڑا لشکر منھ کے بل گر پڑے۔"

سیف اللہ اور امین الامت دونوں نے الگ الگ اپنے خیموں میں اندھیری رات مصلّے پر گزار کر ایک دعا مانگی۔ فتنوں سے حفاظت کی دعا مانگی۔ امت کی سلامتی کی دعا مانگی۔ اٹھے۔ غسل کیا۔ چند کھجوریں کھا کر پانی پیا۔ سنتیں پڑھیں۔ نماز فجر کے لیے باہر نکلے تو حیرت نے قدم تھام لیے۔

دور دور تک آباد تاریخی دارالسلطنت دمشق میں عسکری تحفظات کے پیش نظر مسلمان تمام علاقوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ جمعے کے علاوہ ہر نماز اپنے محلّے کی مسجدوں میں ادا کرتے تھے۔ لیکن اس دن فجر کی نماز کی صفیں جمعے کی نماز کی صفوں سے دور تک اتر گئی تھیں۔ نماز ختم ہوتے ہی ابی سفیان بہت سے بوڑھے شیروں کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ لیکن ان کے زبان کھولنے سے پہلے ہی بنی ہاشم کے ایک مرد بزرگ نے آواز بلند کی۔

"اے امیر شام آپ نے امیر المومنین کے حکم پر فاتح عرب و عراق و شام سیف اللہ شیر اسلام خالد بن ولیدؓ کو ایک خیالی الزام میں جس اہانت کے ساتھ معزول کیا اس کی مثال عہد نبوی سے آج تک ہماری تاریخ میں موجود نہیں۔ معشر قریش کے شیر نے اسلام کی جو بے نظیر خدمت کی خلیفۂ وقت نے اس کو ویسی ہی بے نظیر سزا دی اور ہماری آنکھیں دیکھتی رہیں۔ اس لیے نہیں کہ ہم بزدل ہیں۔ یا کسی بیجا خوف میں مبتلا ہیں۔ رب ذوالجلال کی قسم موت ہمارے گھوڑے کا نام ہے۔ ہم امّت کی سلامتی کے نام پر خاموش رہے۔ ہم نے سکوت اختیار کیا کہ ہماری آواز سے کسی فتنے کا کوئی دروازہ نہ کھل جائے۔"

"فتنے کا دروازہ کھل چکا۔"

آوازیں آنے لگیں

"شیخ کو اپنی بات پوری کرنے دو۔" کسی نے گرج کر خاموش کر دیا۔

"اے امیر شام! امیر المومنین کو لکھیے کہ وہ اپنی سزائے عجیب کا جواز قرآن کریم اور حدیث مبارک کی روشنی میں پیش کریں۔"

"بے شک۔ بے شک۔ قرآن کریم اور حدیث مبارک کی روشنی میں ثبوت دیا جائے۔"

سیکڑوں آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ابی سفیان صفوں کو پھاڑ کر سامنے آ گئے۔ خاموشی کا انتظار کیا

"اے امیر شام۔ سیف اللہ نے اپنی برأت میں اپنی زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ لیکن عبدالرحمن بن خالدؓ اپنے باپ کی صفائی میں، ایسے باپ کی صفائی میں جس کی نظیر سے تاریخ عالم خالی ہے، کچھ کہنا چاہتا ہے۔"

امین الامت تلوار ٹیک کر کھڑے ہو گئے۔

"میرا خدا گواہ ہے، بندوں میں خود خالدؓ گواہ ہے کہ میں اس سے کیسی محبت کرتا ہوں۔ کتنی عزت کرتا ہوں۔ خالد کی خاموشی خاموشی نہیں تھی۔ تقدیر الٰہی تھی اور تقدیر الٰہی سے کون بھاگ سکتا ہے۔۔۔ عبدالرحمان۔ عبدالرحمان تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ ہرقل کا جاسوس بھی اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہے گا تو جراح کا بیٹا سر سے پاؤں تک سماعت ہو جائے گا۔"

امین الامت   کہ سیف اللہ کھڑے ہو گئے۔ سر پر سیاہ عمامہ لپٹا ہوا۔ سفید مہین قبا، ازار سے نکلے ہوئے دونوں پاؤں متورم، آنکھیں سرخ اور سوگوار آواز بھاری اور بلند۔

"امیرِ شام نے جو کہا۔ سچ کہا۔ جو کیا حق کیا۔ میں نے سکوت اور ثبوت میں سے سکوت کا انتخاب کیا کہ ابن حنتمہ (حضرت عمرؓ) کا الزام ثبوت کے بوجھ کے نیچے کچل کر رہ جاتا۔ میں عبدالرحمان کو روک دیتا۔ طاقت سے روک دیتا۔ لیکن عبدالرحمٰن بن خالد کی نجابت اور شرافت اور بلوغت کا حق ہے کہ وہ خاین باپ کا بیٹا ہونے سے انکار کرے۔"

سننے والوں کی نگاہوں میں اس بیان نے ان کا قد اور بلند کر دیا۔ ان کی عقیدت اور گہری ہو گئی۔ ان کے لیے کچھ کر گزرنے کی آگ اور تیز ہو گئی۔ عبدالرحمٰن بنی مخزوم اور بنی امیہ کے نوجوانوں کی صف سے نکلے جو اپنے غلاموں کو زربفت اور اطلس میں ڈھالنے ہوئے بیٹھے تھے۔ خود عبدالرحمٰن بہترین حریر کا عمامہ اور قبا اور ازار پہنے ہوئے تھے۔ ان کی تلوار کا نیام تک مرصع تھا۔

"اے امیرِ شام! آپ نے امیر المومنینؓ کے حکم کی تعمیل میں میرے باپ پر دس ہزار درہم کی معمولی سی رقم کے صرف پر اسراف کا الزام لگایا۔ میں نے غلط کہا یا امیر۔ اگر میرا باپ اپنی زبان سے اقرار کرتا کہ اس نے دس ہزار درہم اپنی کمائی سے دیے ہیں تب وہ اسراف کے جرم میں معزول ہوتا لیکن چوں کہ میرے باپ نے سکوت اختیار کیا اس لیے اے امیرِ شام، امیر المومنین کا حکم نامہ میرے باپ کی خیانت کا تصدیق نامہ بن گیا۔"

"میں واشگاف الفاظ میں اعلان کرتا ہوں کہ میرے باپ نے خیانت نہیں کی۔ اس لیے کہ خیانت کا جرم عام طور پر مفلس کرتے ہیں اور وہ فارغ البال کرتے ہیں جو کنجوس اور لالچی ہوتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ بنی مخزوم کے غلام تک ان صفات سے محروم ہیں۔"

"امیر المومنینؓ کے پرچہ نویس متوجہ ہوں۔"

"خالد بن ولید کے باپ نے جو خزانہ چھوڑا اُس میں ایک لاکھ سے زیادہ سونے کی مہریں تھیں اور دس لاکھ سے زیادہ چاندی کی مہریں تھیں اور جو املاک چھوڑی وہ مکے سے طائف تک پھیلی ہوئی ہے۔ میرے باپ نے سَو سے زیادہ جنگیں لڑی ہیں اور فتح پائی ہے۔ اکثر لڑائیوں نے کروروں کا مالِ غنیمت میرے باپ کے قدموں میں ڈال دیا۔ سپہ سالار باہان کی ٹوپی جو نائب رسول نے میرے باپ کو عطا کی تھی اس کی قیمت ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ جو ہاتھی نائب رسول نے روانہ فرمایا تھا اس کے ساز و سامان کی قیمت بھی ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ تو اے امیرِ شام! میرے باپ نے باہان کی ٹوپی کی قیمت سے دس ہزار درہم اشعث بن قیس کو عطا کر دیے اور اگر آپ میرے بیان کی تصدیق کرتے ہیں تو میرے باپ کو خیانت کے الزام سے بری کیجیے۔"

"اے میرے جگر کے ٹکڑے تو کیا کہہ رہا ہے۔ شاید ہی کسی امیر کو اس کی امارت نے میری طرح آزمائش میں مبتلا کیا ہو۔"

"بیٹے۔ کون ہے جو تیرے باپ کو خائن کہہ سکتا ہے۔ عمرؓ نے بھی خیانت کو مشروط کر دیا ہے۔ سارا زور اسراف پر ہے۔"

"میں امیرِ شام کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں۔ اب میں مسئلہ اسراف پر آتا ہوں۔ اے امیرِ شام! "اسراف" اضافی لفظ ہے۔ اِس کا مفہوم سیاق و سباق کے ساتھ بدل جاتا ہے۔ مثلاً ایک لاکھ درہم سالانہ کمانے والا اگر دس ہزار درہم کسی کو انعام دے ڈالے۔ پورے ایک سال میں صرف ایک بار عطا کر دے تو بھی اسراف کی دفعہ عائد نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ نوّے ہزار درہم ایک خاندان کی کفالت سے زیادہ ہیں۔ ان کو زمین میں دفن

کر دینے کے بجائے اگر کسی ضرورت مند پر صرف کر دیا کر دیا جائے تو مستحسن ہے"۔

"اے امیر شام — میرا باپ کروڑوں درہم کا مالک ہے۔ اور اس نے پوری زندگی میں دس ہزار درہم کی عطا صرف ایک بار کی۔ اس لیے اسے مُسرف نہیں کہا جا سکتا یہاں وہ ہستیاں موجود ہیں جنھوں نے سایۂ نبوت میں تربیت پائی ہے۔ ان سے میری گزارش ہے کہ اگر میرا بیان غلط ہے تو وہ اصلاح فرمائیں"۔

"تو نے سچ کہا"

"تو نے حق کہا"

"اگر کسی کو میرے باپ کی دولت پر شک ہے تو وہ عمر بن خطاب کی عدالت میں مقدمہ قائم کرے میں ثبوت دوں گا۔

اے امیر شام — عمر بن خطاب سے لفظ اسراف کا مفہوم سمجھنے میں خطا ہوئی، اس کا سبب ہے — سبب یہ ہے کہ جب امیر المومنین کا باپ خطاب اپنی ننگی پیٹھ پر لکڑیوں کا گٹھا لاد کر اپنی اور اپنے عیال کی روٹیاں فراہم کرتا تھا، اس وقت خالد بن ولید اپنے باپ ولید، وحید قوم ولید صاحب الامۃ ولید، کے اسراف کا تماشہ کر رہا تھا۔ "زاد الراکب" اور بیت الضیافت کا نظارہ کر رہا تھا۔ ہر دوسرے سال غلاف کعبہ کی تبدیلی کا منظر دیکھ رہا تھا۔

اے امیر شام! جب میرا باپ خالد زربفت کی قبا پر جواہرات پہن کر دس دس ہزار کے گھوڑوں پر غلاموں کو چڑھا کر شکار کو نکلتا تھا، اس وقت امیر المومنین کمبل کا کرتا پہن کر ساونٹ چرایا کرتے تھے۔ اس لیے عمر بن خطاب سے امیر المومنین سے اسراف کے معنی سمجھنے میں قصور ہوا"۔

"اے امیر شام! میں آپ کی عدالت میں استغاثہ پیش کرتا ہوں کہ عمر بن خطابؓ نے مسند خلافت پر قدم رکھتے ہی بی بی ام کلثوم سے نکاح کیا اور چالیس ہزار درہم کا مہر ادا کیا۔ یہاں ایسے حضرات موجود ہیں جن کے سامنے مہر ادا کیا گیا"۔

بنی ہاشم کے بزرگ کھڑے ہو گئے۔

"اے امیر شام! ہم خدا کو حاضر و ناظر جان کر عبدالرحمٰن بن خالد کے بیان کی تصدیق کرتے ہیں"۔

"اے امیر شام! میں عبدالرحمان بن خالد۔ امیر المومنین عمر بن خطابؓ پر بیت المال کی خیانت کا الزام لگاتا ہوں — گزارش کرتا ہوں کہ میرے باپ کی طرح ان کو بھی منصب امارۃ المومنین سے معزول کیا جائے۔ اگر وہ چالیس ہزار درہم کی فراہمی کا ثبوت میسر کر سکیں تو خطاب کے بیٹے پر اسراف کا جرم عاید کیا جائے اور معزول کیا جائے کہ خطاب کا بیٹا یقیناً مسرف ہے"۔

"سچ کہا — حق کہا — خدا کی قسم عبدالرحمٰن حق پر ہے"۔

ایک شور مچ گیا۔ اسی ہنگامے کے دوران عبدالرحمٰن بن خالد نے قبا کی جیب سے استغاثہ نکال کر پیش کر دیا جو چشم دید گواہوں کے دستخطوں سے مزین تھا۔

خالد بن ولید کے اٹھتے ہی ساری مسجد خالی ہو گئی۔ امین الامت نے خیمے پر پہنچتے ہی کاتب کو طلب کیا۔ ایک مفصل تحریر سپرد قلم ہوئی۔ قاصد کو حکم دیا گیا کہ آندھی کی طرح اٹھے اور دربار خلافت میں حاضر ہو۔

مسجد سے نکلتے ہی عبدالرحمانؓ کے بنی اعمام حمص اور بیت المقدس کے لیے جو مسلمان فوجوں کے بڑے بڑے مرکز تھے سوار ہو گئے اور خطابت کے جوہر دکھانے لگے جو عرب میں کھجور کی طرح عام تھی اور بنی مخزوم، بنی امیہ اور بنی ہاشم کے افراد کا طرۂ امتیاز تھی۔ خبریں آنے لگیں کہ دمشق کے بازاروں سے قاقم و سنجاب اور اطلس و کمخواب اور دیبا و زربفت کے سیکڑوں تھان خرید لیے گئے۔ بنی مخزوم کے غلاموں کی قبائیں تراشی جا رہی ہیں۔ گھوڑوں کے زین اور اونٹوں کے بالان

بنائے جا رہے ہیں۔ غلاموں کے لیے طلائی کنگن اور گھوڑوں کے لیے سیمیں ہیکلیں بن رہی ہیں۔ تلواروں کے لیے سونے چاندی کے نیام خریدے جا رہے ہیں۔ دیبائے زرکار اور مخمل طلاکار کے خیمے ڈھونڈے جا رہے ہیں۔ منادیاں ہو رہی ہیں کہ جو شاعر سیف اللہ کی شایانِ شان اشعار پیش کرے گا، اسے سونے سے ڈھانپ دیا جائے گا۔ مسجدوں اور ایوانوں اور بازاروں میں خالدؓ فتوحات کے قصیدے پڑھے جا رہے ہیں نبی اکرمؐ کے اقوال دُہرائے جا رہے ہیں ۔ نائب رسول کی تعریف و توصیف میں پیوند لگائے جا رہے ہیں۔ اصحابِ بدر کے حوالے سے حکایات سنائی جا رہی ہیں۔ اشعار پڑھے جا رہے ہیں اور آنسو بہائے جا رہے ہیں بیت المقدس اور حمص کے راستوں پر جہاں کہیں مجاہدوں کا جماؤ نظر آتا ہے، نوجوان خطیب خطابت کے دریا بہا دیتے ہیں۔ ایلیا سے قنسرین تک یہود و نصاریٰ کے بڑے بڑے سردار خالد کی اس سخاوت اور فیاضی کے افسانے سنا رہے ہیں جو عراق سے شام تک فتوحات میں سرانجام ہوئیں۔

رات پر سیاہی بازُو رکھ رہی تھی کہ سیف اللہ کے خیمے کی پشت پر ایک مشعل کی روشنی میں معاویہؓ بن ابی سفیان کے ساتھ کئی پادری گھوڑوں سے اتر کر انتظار کرنے لگے۔ معاویہؓ باہر آ کر انھیں اپنے ساتھ اندر لے گئے۔ مسند میں بیٹھے ہوئے سیف اللہ نے انھیں اپنے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جن کے سیاہ جُبّوں پر چاندی کی بڑی بڑی صلیبیں شمعوں کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ معاویہؓ کے اشارے پر ایک پادری نے اپنی مرغول نما سیاہ ریشمی ٹوپی کا زاویہ درست کرتے ہوئے کہا۔

"ہم دینِ مسیح کے پیشواؤں کے سفیر ہیں جو سیاسی مصلحتوں کی بنا پر آپ کی اجازتِ خاص کے بغیر حاضر نہیں ہو سکتے ہم کو حکم ہے کہ ہم آپ کے سامنے اُس الطاف و عنایت کا اعتراف کریں جو آپ نے عراق سے شام تک ہمارے دینی بزرگوں اور عبادت خانوں پر ارزاں کیں۔ ہم آپ کی خدمت میں عرض کرنے آئے ہیں کہ آپ کے ایک اشارے پر ایک لاکھ تلوار شام سے ایک لاکھ تلوار مصر سے اور ایک لاکھ تلوار روم سے برآمد ہو سکتی ہے۔ یہ تین لاکھ تلواریں آپ کے حضور میں اس طرح حاضر ہوں گی جس طرح بادشاہ کے سامنے غلام آتے ہیں۔"

سیف اللہ نے سر اٹھایا۔ جہاں دیدہ آنکھوں کی عقابی نگاہوں سے اُن کا جائزہ لیا۔

"آپ سوال کر سکتے ہیں کہ جب ہرقل، شام کو الوداع کہہ رہا تھا اس وقت یہ تلواریں کہاں تھیں؟"

"اے سیف اللہ!"

"ہرقل کا سارا نقشۂ جنگ مغربی سپہ سالاروں کے ہاتھ میں تھا جو شامی اور مصری افسروں تک کو حقارت سے دیکھتے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ سپاہی میدان جنگ میں فتح حاصل کرنے اترتا ہے اور اِس وقت پوری دنیا میں آپ سے بڑا فتح نصیب جنرل موجود نہیں ہے ۔ دنیا کی دونوں بڑی طاقتوں کے بڑے بڑے سالار اپنی بڑی بڑی فوجوں کے ساتھ آپ کی فتح نصیبی کے سامنے زمین کا پیوند ہو گئے۔ وہ پشتینی سورما جنھوں نے تلواریں توڑ کر فنِ حرب سے توبہ کر لی آپ کے پرچم کے نیچے تلوار اٹھانے پر رضامند ہیں۔ اس لیے کہ ان کو معلوم ہے۔ فتح آپ کے پرچم کے ہاتھ پر بیعت کر چکی۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ سیف اللہ خلا میں گھورتے رہے۔

"دمشق کے بڑے گرجا کا بڑا پادری اس حکم کا پابند ہے کہ جس وقت آپ کا غلام آپ کے فرمان کے ساتھ پہنچے اسی وقت سپاہی ہتھیار پہننے لگیں۔ مقام مقررہ پر حاضر ہونے لگیں۔"

تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد سیف اللہ نے نگاہ اٹھائی۔

کہیں دُور سے آواز آئی۔

(جاری ہے)

سید قاسم محمود*

ارشمیدس

اٹلی کے جنوب میں بحیرہ روم کا سب سے بڑا جزیرہ سسلی واقع ہے اس کے مشرقی ساحل پر ایک چھوٹی سی بندرگاہ سیراکوس (Syracuse) ہے جو سسلی کا اڑھائی ہزار سال پرانا شہر ہے۔ اس شہر میں حضرت مسیح سے ۲۸۷ سال پہلے یونانی علم و فضل کے اس قدیم زمانے میں ارشمیدس سے پہلے متعدد دانشور گزرے ہیں، مگر وہ سب کے سب فلسفی زیادہ اور سائنس داں کم تھے۔ کیوں کہ ان کی دماغی کاوشیں زیادہ تر فلسفہ اور حکمت پر مرکوز تھیں۔ سائنس میں ان کی تحقیقات کا حصہ بہت کم تھا اور جو کچھ تھا وہ محض نظریاتی تھا جس میں تجربات اور ایجادات کو کچھ دخل نہ تھا، لیکن ارشمیدس اِس لحاظ سے ان سب میں منفرد ہے کہ اس نے تمام عمر اپنی تحقیقات کا دائرہ محدود رکھا۔ پھر اس کی تحقیقات صرف نظریاتی نہ تھیں، بلکہ اس نے اپنے کلیات کو باقاعدہ تجربات سے ثابت کیا تھا۔ علاوہ ازیں اس نے سائنس کے اخذ کردہ اصولوں کو عملی جامہ پہنا کر متعدد کارآمد ایجادیں بھی کیں اور انھیں عملی زندگی میں کامیابی سے استعمال کیا چونکہ نظریاتی سائنس، تجرباتی سائنس اور ایجادات یہ سائنس کی تین بڑی شاخیں ہیں اور ارشمیدس پہلا شخص ہے جس کے کارنامے سائنس کی ان تینوں شاخوں میں پھیلے ہوئے ہیں، اس لحاظ سے یہ دعویٰ ہر لحاظ سے صحیح ہے کہ ارشمیدس دنیا کا پہلا کامل سائنس داں ہے۔

ارشمیدس کی پیدائش سے پہلے یونان کی قدیم سلطنت میں زوال آچکا تھا اور اس کے مقابل میں دو اور طاقتیں ابھر چکی تھیں۔ ان میں سے ایک اٹلی میں رومیوں کی تھی اور دوسری افریقہ کے ساحل پر (موجودہ ٹیونس کے قریب) کارتھیا والوں کی تھی۔ بحیرۂ روم کے چھوٹے چھوٹے ملکوں اور جزیروں پر بالادستی حاصل کرنے کے لیے اہل روم اور اہل کارتھیا ایک دوسرے کے مدمقابل تھے اور ان کے درمیان اکثر لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں، جن میں کبھی ایک فریق کا پلہ بھاری رہتا تھا اور کبھی دوسرے فریق کا۔ چنانچہ سسلی کے جزیرے پر اقتدار قائم کرنے کے لیے روم اور کارتھیا میں تقریباً ایک صدی تک مسلسل جنگیں ہوتی رہیں۔ یہی وہ پُرآشوب زمانہ ہے جس میں ارشمیدس کی ساری زندگی بسر ہوئی۔ اس کی پیدائش کے چند سال بعد سسلی کے جزیرے کے ایک بڑے حصے پر اہل کارتھیا نے قبضہ کر لیا تھا اور سیراکوس کی شہری ریاست کو ان سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس خطرے کے پیش نظر سیراکوس والوں نے یونان کی ایک ریاست کے حکمراں سے جس کا نام 'ایپی رس' تھا، مدد مانگی۔ شاہ 'ایپی رس' اپنی فوج کے ہمراہ ان کی کمک کو آیا مگر ان کی باہمی سازشوں سے بددل ہو کر دو سال کے بعد وہاں سے ہمیشہ کے لیے چلا گیا اور اہل سیراکوس کو اپنے معاملات سے آپ نمٹنے کے لیے اکیلا چھوڑ گیا۔ اس کے جانے کے بعد روما والوں نے سیراکوس پر حرص و آز کی نظر مرکوز کر دی اور پھر اس شہری ریاست کو اپنے اپنے حلقۂ اقتدار میں لانے کے لیے اہلِ روما اور کارتھیا کے درمیان طویل آویزش شروع ہو گئی، جس کا خاتمہ رومیوں کی فتح پر ہوا۔ اس طرح ارشمیدس کی ساری

* سید قاسم محمود، مدیر ماہنامہ طالب علم، کراچی، پاکستان۔

زندگی میں جنگ اور خطرۂ جنگ اس کے گرد منڈلاتے رہے۔

ارشمید کا باپ ایک معمولی شخص تھا، اس نے اپنے ہونہار بیٹے کو تعلیم دلانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ اس عہد میں علم و فن کے مرکز کی حیثیت سے ایتھنز کی عظمت ختم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ مصر کے ساحل پر اسکندریہ نے لے لی تھی، اس لیے جو طلباء اعلیٰ تعلیم کے خواہش مند ہوتے تھے وہ اسکندریہ کا رخ کرتے تھے۔ ارشمیدس کو لڑکپن میں اس کے باپ نے اسکندریہ میں بھیجا جہاں وہ عنفوانِ شباب تک حصول تعلیم کی جدوجہد میں مصروف رہا۔ اسکندریہ کے اس دارالعلوم میں ارشمیدس کی زندگی کے ایام کیوں کر گزرے، اس نے کن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، اس کا کوئی ریکارڈ کہیں موجود نہیں ہے لیکن اس نے بعد کی زندگی میں اپنے علم و دانش کا جو شاندار مظاہرہ کیا، اس کے پیش نظر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے زمانۂ طالب علمی کو پورے انہماک کے ساتھ اکتسابِ علم میں صرف کیا ہوگا۔

اسکندریہ کے قیام کے دوران میں ارشمیدس نے اپنی اختراعی قوتوں سے کام لینا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ پانی اٹھانے کا ایک آلہ، جسے اس نے مصریوں کی فرمائش پر ایجاد کیا تھا، اسی دور کی یادگار ہے۔ یہ آلہ جو "ارشمیدس کا پیچ" کہلاتا ہے ایک بل کھائی ہوئی کھوکھلی نلی پر مشتمل ہوتا ہے۔ جب اس کے نیچے کے سرے کو پانی میں ڈبو کر اور نلی کو ذرا ترچھا تھام کر اس کے محور کے گرد گھمایا جاتا ہے جب پانی اس میں اوپر چڑھتا جاتا ہے۔ اس آلے کو دریا یا تالاب میں سے پانی اوپر اٹھانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

جب ارشمیدس اسکندریہ سے فارغ التحصیل ہو کر اپنے وطن سیراکوس واپس آیا تو اس شہری ریاست پر ایک بادشاہ 'ہیرو' نامی حکمراں تھا۔ اس بادشاہ کے ساتھ ارشمیدس کے تعلقات تھوڑے ہی عرصے میں بہت گہرے ہو گئے اور وہ اس کا درباری اور مشیر بن گیا۔ ایک روایت کے مطابق ارشمیدس کی اس شاہی خاندان سے کچھ قرابت بھی تھی۔

ارشمیدس اپنے عہد کا واحد شخص تھا جو لیور اور چرخیوں کے اصول کو جانتا تھا اور ان کے عملی استعمال میں ماہر تھا۔ جس کے لیور کے اصول کے مطابق ایک متوازن لیور میں وزن اور وزن کے بازو کا حاصل ضرب قوت اور قوت کے بازو کے برابر ہوتا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ اگر ہم ایک طرف قوت کے بازو کو زیادہ سے زیادہ بڑھا دیں اور دوسری طرف وزن کے بازو کو کم سے کم کر دیں تو ہم معمولی قوت سے اتنے بڑے وزن کو اٹھا سکتے ہیں جس کی کوئی حد نہیں ہو سکتی۔ اس نکتے کو ایک لطیف اور دلچسپ پیرائے میں ارشمیدس یوں بیان کیا کرتا تھا۔

"مجھے ایک مناسب لیور اور زمین سے باہر کھڑا ہونے کے لیے جگہ دے دو تو میں اس لیور کی مدد سے پوری زمین کو ہلا دوں گا۔"

چرخیوں کے عملی استعمال سے بہت بڑے بوجھ کو معمولی قوت سے اٹھانے کی اختراع خاص ارشمیدس کی ایجاد ہے۔ اس میں متعدد چرخیاں کام میں لائی جاتی ہیں جو لٹکائی ہوئی بھاری شئے کے عملی بوجھ کو باری باری کم کرتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ بھاری شئے معمولی قوت سے اوپر اٹھائی جا سکتی ہے۔ یہ اختراع سائنس کی کتابوں میں ارشمیدس کا 'چرخیوں کا نظام' کہلاتی ہے۔

ایک موقع پر ارشمیدس نے اس اختراع کو بروئے کار لا کر نہ صرف شاہ ہیرو کی ایک مشکل کو حل کر دیا تھا بلکہ شاہ اور اس کے تمام ہم نشینوں سے اپنے کمال کا لوہا منوا لیا تھا۔ شاہ ہیرو نے مصر کے بادشاہ بطلیموس اوّل کے لیے موخرالذکر کی فرمائش پر ایک جہاز بنوایا تھا، جو اس عہد کے عام جہازوں سے بہت بڑا تھا۔ یہ جہاز بننے کو تو بن گیا، مگر جہاز راں، جو بہت آدمیوں کو لگا کر عام جہازوں کو سمندر میں اتار لیا کرتے تھے، اس جہاز کو اس کے بہت زیادہ بوجھ ہونے کے باعث کسی طور سے سمندر میں نہ اتار سکے۔ شاہ ہیرو اس وجہ سے بہت پریشان تھا۔ جب ارشمیدس کو شاہ کی اس مشکل کا علم ہوا تو اس نے جہاز کے قریب اپنا چرخیوں کا مشہور نظام قائم کیا اور اس کے ایک سرے سے جو ان چرخیوں پر سے گزرتا تھا، جہاز کو باندھ دیا۔ پھر اس نے رسے کا دوسرا سرا خود شاہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جوں ہی شاہ نے رسے کو کھینچنا شروع کیا، جہاز میں حرکت ہوئی اور وہ اتنی آسانی سے سمندر کی جانب بڑھنے لگا جیسے وہ تیرنے کا بنا ہوا ہو۔ اس کارنامے کے بعد بادشاہ اور رعایا دونوں پر

ارشمیدس کے کمال کی دھاک بیٹھ گئی۔

ان ہی دنوں ایک اور واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ ارشمیدس طبعاً خاموش اور سنجیدہ مزاج انسان تھا۔ وہ وقار کے ساتھ رہتا تھا اور کسی ایسی حرکت کا جو ثقاہت سے گری ہوئی ہو، اس سے گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ایک روز اہلِ شہر نے دیکھا کہ بازار کے ایک حمام میں سے، جس میں وہ تھوڑی دیر پہلے داخل ہوا تھا وہ مناسب لباس پہنے بغیر دیوانہ وار باہر نکل کر بھاگا جا رہا ہے اور اس کی زبان پر ایک ہی کلمہ ہے

"پالیا۔ پالیا"

کیا ارشمیدس پاگل ہو گیا تھا؟ بلاشبہ اس کی یہ حرکت پاگلوں کی سی تھی، مگر نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد کبھی اس سے کوئی ناشائستہ حرکت سرزد ہوئی۔ در اصل یہ ایک اضطراری کیفیت تھی، جو اچانک بہت زیادہ خوشی کے باعث اس پر طاری ہو گئی تھی۔ کیوں کہ اس نے نہ صرف اس مشکل مسئلے کا حل پالیا تھا جو کئی روز سے اسے درپیش تھا، بلکہ اس پر اس اصول کا راز بھی منکشف ہو گیا تھا جو اصول ارشمیدس کے نام سے موسوم ہو کر اسے زندۂ جاوید بنانے والا تھا۔

یہ سب کچھ یوں ہوا کہ شاہ ہیر نے اپنا ایک تاج بنانے کے لیے کچھ سونا وزن کر کے شاہی جوہری کو دیا۔ جب تاج بن کر آیا تو بادشاہ نے اسے بہت پسند کیا۔ چنانچہ جوہری کو اجرت کے علاوہ بہت سا انعام دے کر رخصت کیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد مخبروں نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ جوہری نے تاج میں سونے کے ساتھ چاندی کا کھوٹ ملا کر اس کا وزن پورا کر دیا ہے۔ اور اس طرح کافی سونا نکال لیا ہے۔ جب جوہری کو بلا کر پوچھا گیا تو اس نے اس الزام کی بزور الفاظ میں تردید کی۔ بادشاہ شش و پنج میں پڑ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے مخبروں کی اطلاع غلط نہیں ہوتی مگر ثبوت کے بغیر وہ جوہری کو بھی موردِ الزام نہیں گردان سکتا تھا۔ اس لیے اس نے یہ معاملہ ارشمیدس کے سپرد کر دیا۔ ارشمیدس کئی روز تک غور و فکر میں مبتلا رہا۔ مگر اسے اس معاملے کے حل کی کوئی تدبیر سجھائی نہ دیتی تھی۔ یہاں تک کہ ایک روز جب وہ پانی کے ایک حمام میں (جو بازار میں واقع تھا) نہانے کے لیے داخل ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ پانی کے اندر اس کے وزن میں کمی پیدا ہو گئی ہے۔ اس سے ارشمیدس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر شاہی تاج کو پانی میں ڈبویا جائے تو اس کے وزن میں کمی ہو گی اور اگر تاج کے ہم وزن سونے کی ڈلی لے کر اسے پانی میں ڈبویا جائے تو اس کا وزن بھی کم ہو جائے گا۔ اب اگر ان دونوں صورتوں میں وزن کی یہ کمی برابر ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تاج خالص سونے کا بنا ہے۔ لیکن اگر تاج کے وزن کی کمی اس کے برابر وزن کے سونے کی نسبت زیادہ ہوئی تو اس سے ثابت ہو گا کہ تاج میں سونے سے ہلکی دھات مثلاً چاندی کا کھوٹ ملا ہوا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی ارشمیدس پر وہ اضطراری کیفیت طاری ہوئی، جس کے تحت وہ بے اختیار "پالیا، پالیا" کہتا ہوا حمام سے نکل بھاگا۔ گھر پہنچ کر اس نے بادشاہ کے تاج کو پہلے ہوا میں اور پھر پانی میں وزن کیا۔ اس تاج کا وزن ہوا میں تین سو اکیس (۳۲۱) تولے اور پانی میں دو سو چورانوے (۲۹۴) تولے تھا۔ لیکن جب اس نے خالص سونے کی ایسی ڈلی کو پانی میں تولا تو اس کا وزن ہوا میں تین سو اکیس (۳۲۱) تولے یعنی تاج کے وزن کے برابر تھا تو پانی میں اس کا وزن تین سو ساڑھے چار (۳۰۴½) تولے نکلا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ جوہری نے تاج میں کھوٹ ملایا تھا۔

ارشمیدس نے اس اتفاقی واقعے کی بنا پر مزید تجربے کر کے اپنا مشہور اصول "اصول ارشمیدس" وضع کیا جو حسب ذیل ہے۔

"جب کسی ٹھوس شئے کو کسی مائع کے اندر پورے طور پر ڈبویا جائے تو اس ٹھوس شئے کے وزن میں کمی آ جاتی ہے اور یہ کمی اس شئے کے مساوی الحجم مائع کے وزن کے برابر ہوتی ہے۔"

سالہا سال سے ہزاروں لوگوں نے یہ مشاہدہ کیا ہو گا کہ جب پانی کے ایک برتن میں کسی بھاری شئے کو ڈبویا جائے تو پانی کی سطح اونچی ہو جاتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی مشاہدہ کیا ہو گا کہ جب تک کوئی جسم (مثلاً ڈول) پانی کے اندر ڈوبا رہتا ہے تو اس کا وزن کم محسوس ہوتا ہے، لیکن جوں ہی وہ پانی سے باہر آتا ہے، اس کا وزن بڑھ جاتا ہے۔ لیکن ارشمیدس سے پہلے کسی نے یہ

نہ ہو سکا کہ ان دونوں مشاہدات کو ایک سلسلے میں مربوط کر کے ایک قانون کی شکل دے دیتا۔ علمی دنیا کی یہ سعادت ارشمیدس ہی کے مقدر میں تھی۔

ارشمیدس نے اپنے مندرجہ بالا اصول کے تحت مندرجہ ذیل اصول بھی دریافت کیے۔

۱۔ جب کوئی جسم کسی مائع مثلاً پانی کی سطح پر تیر رہا ہو، اس کا اتنا حصہ پانی میں رہتا ہے کہ اس حصے کے ہٹائے ہوئے پانی کا وزن تیرنے والے جسم کے وزن کے برابر ہوتا ہے۔

۲۔ اگر کسی ہلکے جسم مثلاً لکڑی یا کارک کے ٹکڑے کو جو پانی (یا کسی اور مائع) کی سطح پر تیر رہا ہو، بیرونی قوت لگا کر پانی کے اندر مکمل طور پر ڈبو دیا جائے تو اس پر اوپر کی سمت میں اچھال کی اتنی قوت عمل کرنے لگتی ہے جو ہٹائے ہوئے پانی (یا مائع) کے وزن اور اس کے جسم کے حاصل تفریق کے برابر ہوتی ہے۔

ارشمیدس کے یہ قوانین طبیعیات کی اس شاخ سے تعلق رکھتے ہیں جو ماسکونیات کہلاتی ہے۔ ارشمیدس نے اس موضوع پر ایک مکمل کتاب "تیرنے والے اجسام" کے نام سے لکھی ہے، جو دنیا میں ماسکونیات پر پہلی تصنیف ہے۔

ارشمیدس کی قوت ایجاد اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ ایک بار محض فرصت کے مشغلے کے طور پر اس نے ایک ایسا کرہ بنایا جس کے اندر زمین سورج، چاند اور پانچ سیاروں یعنی مریخ، زہرہ، عطارد، مشتری اور زحل کے ماڈل بالکل قدرتی طریقوں سے حرکت کرتے تھے۔ انھیں چلانے کے لیے پانی کی طاقت سے کام لیا جاتا تھا اور ان کی حرکتیں اس درجے صحیح تھیں کہ سورج گرہن اور چاند گرہن کے مظاہر ان میں درست اوقات پر ظاہر ہو جاتے۔

زمین اور اس کی گردش کے متعلق اس کے خیالات ارسطو کی طرح غلط نہیں تھے۔ وہ درست طور پر جانتا تھا کہ زمین سورج کے گرد گردش کر رہی ہے اور یہ زمین کائنات کا مرکز نہیں ہے بلکہ کائنات میں اس کی حیثیت صحرا میں ایک ذرے کی سی ہے۔ ہیئت اس کا مضمون نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود ہیئت میں بھی اس کے نظریات حیرت انگیز طور پر صحیح تھے۔

ارشمیدس نے میکانیات میں قابل قدر کام کیا تھا چنانچہ اس ضمن میں لیور اور چرخیوں کی ایجاد کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ میکانیات میں اس کے دریافت کردہ قوانین، جو زیادہ تر لیور اور چرخیوں کے متعلق ہیں، آج بھی صحیح مانے جاتے ہیں اور روزمرہ زندگی میں ان کا استعمال بکثرت ہوتا ہے۔ ان میں سے چند ایک اصول یہ ہیں:

۱۔ لیور میں جو باٹ نصاب سے مساوی فاصلوں پر متوازن ہو جائیں وہ آپس میں برابر ہوتے ہیں۔

۲۔ جو باٹ غیر مساوی ہوں وہ لیور میں نصاب سے مساوی فاصلوں پر متوازن نہیں ہو سکتے۔

۳۔ لیور میں غیر مساوی باٹ، غیر مساوی فاصلوں پر متوازن ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ بڑا باٹ نصاب سے کم فاصلے پر اور چھوٹا باٹ نصاب سے زیادہ فاصلے پر اس طور پر رکھا جائے کہ بڑے باٹ اور اس سے کم فاصلے کا حاصل ضرب چھوٹے باٹ اور اس کے زیادہ فاصلے کے حاصل ضرب کے برابر ہو۔

ارشمیدس کی ایجادیں اور دریافتیں ایسی ہیں جو ہر زمانے کے انسانوں کے روزمرہ استعمال میں آتی رہی ہیں اور موجودہ زمانے میں بھی ان کی اہمیت اور افادیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ طبیعیات کی دو بڑی شاخوں یعنی میکانیات اور ماسکونیات کو وہ جس مقام پر چھوڑ گیا تھا، اٹھارہ سو سال تک دنیا کے سائنس داں اس جگہ سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکے اور جب ان شاخوں میں ترقی کی باری آئی تو اس ترقی کے سنگ بنیاد وہی اصول بنے جنھیں صدیوں پہلے ارشمیدس معلوم کر چکا تھا۔

ارشمیدس اس وقت کی دنیا کا سب سے بڑا موجد تھا، لیکن وہ اپنی بے مثال ایجادات کی کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا تھا بلکہ انھیں محض اپنے فارغ اوقات کا ایک مشغلہ خیال کرتا تھا کیونکہ اس کی تحقیقات کی اصلی جولاں گاہ ریاضی تھی۔ جب وہ ریاضی کے کسی سوال میں غرق ہو جاتا تو پھر اسے کسی بات کی سدھ نہ رہتی۔

دوپہر کے کھانے کا وقت آتا اور گزر جاتا۔ سہ پہر کے سایے لمبے ہوتے جاتے اور آخر کار شام کے دھندلکے میں گم ہو جاتے لیکن وہ بدستور اعداد کی بھول بھلیوں میں اپنے ذہن کی مدد سے آگے سے آگے پیش قدمی کیے جاتا، یا پھر کاغذ پر، زمین کی مٹی پر، چولہے کی راکھ پر خطوں، مربعوں اور دائروں کی شکلیں بنانے اور جیومیٹری کے مسائل حل کرنے میں پہروں مگن رہتا۔

جیومیٹری اس کا ایک محبوب مضمون تھا۔ وہ جیومیٹری میں نہ صرف پہلے سے معلوم مسائل کا عالم تھا، بلکہ ایک محقق کی طرح وہ نئے نئے مسائل اور ان کے حل دریافت کرتا رہتا تھا۔ اس کے یہ تحقیق کردہ مسائل جیومیٹری کی تمام شاخوں مثلاً اثباتی ہندسہ، عملی ہندسہ، مساحتی ہندسہ اور مثلثی ہندسے پر پھیلے ہوئے تھے۔

اعداد کی دنیا کا تو ارشمیدس گویا بادشاہ تھا، جس کی ہمسری کا کوئی شخص دعویٰ نہ کر سکتا تھا۔ ایک بار ایک اور ریاضی داں اپولونیس نے ریاضی میں اس کا مدِمقابل بننا چاہا تو ارشمیدس نے اس کے امتحان کے لیے اپنا مشہور و معروف، "مویشیوں کا مسئلہ"، اسے بھیج دیا جس میں آٹھ مختلف نوع کے مویشیوں کی تعداد معلوم کرنی پڑتی تھی۔ ارشمیدس کے صدیوں بعد ایک جرمن ریاضی داں نے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی تو اسے معلوم ہوا کہ اس سوال کے جواب میں جو آٹھ عدد آتے ہیں، اُن میں سے ہر عدد اتنا بڑا ہے کہ اگر اس کے ہندسوں کو کاغذ پر لکھا جائے تو اس کے لیے ایک عام کتاب کے ۸۰ صفحے درکار ہوتے ہیں۔ اس طرح اس سوال کا پورا جواب، جو اس جیسے آٹھ عددوں پر مشتمل ہے، ایک عام کتاب کے چھ سو سے زائد صفحوں میں سما سکتا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب سوال کا صرف جواب ہی چھ سو (۶۰۰) صفحوں میں آتا ہے تو اس کے حل کے لیے کتنے زیادہ صفحوں کی ضرورت ہوگی اور پھر جس شخص نے پہلے پہل یہ سوال بنایا اور اس کا حل معلوم کیا، اس کی دماغی قابلیت کس درجے کی ہوگی۔

ارشمیدس کے زمانے میں اعداد کو لکھنے کا موجودہ طریقہ، جو عربوں کی ایجاد ہونے کے باعث عربی طریقہ کہلاتا ہے رائج نہ تھا۔ اس کے بجائے اعداد رومن طریقے سے لکھے جاتے تھے، جس میں جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم کے سادہ عمل بھی نہایت مشکل اور پیچ دار بن جاتے تھے۔ مثلاً ہم عربی طریقے میں ایک سو چھتیس کو ۱۳۶ اور دو سو اڑتالیس کو ۲۴۸ لکھتے ہیں، لیکن رومن طریقے میں ان اعداد کو بالترتیب (CCXLVIII) اور (CXXXVI) لکھا جاتا ہے۔ اب فرض کرو کہ ہمیں ان دونوں عددوں کو جمع کرنا مطلوب ہے۔ اس کے لیے ہم دونوں طریقوں میں ان عددوں کو اوپر نیچے یوں لکھیں گے۔

۱۳۶	(CXXXVI)
۲۴۸	(CCXLVIII)

اول الذکر عربی طریقے میں جمع کا یہ عمل نہایت سادہ طور پر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن موخر الذکر رومن طریقے میں یہ عمل (اس طرز تحریر کے ناقص ہونے کے باعث) اتنا پیچیدہ دکھائی دیتا ہے کہ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ ان عددوں کی حاصل جمع کس طرح نکالی جا سکتی ہے۔ یہ تو ایک جمع کا حال ہے جو ریاضی کا نسبتاً سب سے زیادہ آسان قاعدہ ہے ضرب اور تقسیم کے عمل تو رومن طریقے میں ان سے بھی کہیں زیادہ مشکل اور پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔

ارشمیدس اعداد کو لکھنے کے رومن طریقے سے ہی واقف تھا اور اس پیچیدہ طرز میں اعداد کو لکھ کر ایسے مشکل سوالات حل کر لیتا تھا، جن کا ایک ایک جواب کئی کئی صفحوں میں آتا تھا۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اگر ہماری طرح سادہ عربی طریقے میں اعداد کو لکھنے کی آسانی اسے حاصل ہوتی تو اعداد کی دنیا میں اس کے کارنامے کس حد تک پہنچے ہوئے ہوتے۔

ارشمیدس کے بڑھاپے کے ایام تھے، جب وہ باتدبیر بادشاہ، جو ارشمیدس کا دوست اور مربی تھا، وفات پا گیا اور اس کے بجائے ایک جوشیلا نوجوان، "ہیرونامس"، تخت سلطنت پر بیٹھا۔ اس نے حکومت کی عنان ہاتھ میں لیتے ہی کارتھیا والوں سے سیاسی گٹھ جوڑ توڑ لیا۔ اس پر اہل روما ایک بڑی فوج لے کر جس کی کمان مشہور رومن جرنیل "مارسیلس" کے ہاتھ میں تھی، "سیراکوس" پر چڑھ آئے۔ ارشمیدس کو اپنے نوجوان بادشاہ کا یہ سیاسی فیصلہ پسند نہیں تھا۔ مگر چونکہ اب یہ فیصلہ ہو چکا تھا، اس لیے اس کی حب الوطنی کا تقاضا تھا کہ

وہ رومن حملہ آوروں کے خلاف ہم وطنوں کی مدد کرے۔ اس موقع پر ارشمیدس نے اپنا سائنس کا سارا علم جنگ کے نئے ہتھیار بنانے میں صرف کر دیا۔

توپ کا تو اس زمانے میں وجود نہ تھا لیکن ارشمیدس نے بیرون اور چرخیوں کی مدد سے ایسی منجنیقیں بنائیں جو توپ کے گولوں کی طرح بڑے بڑے وزنی پتھروں کی بوچھاڑ کرتی تھیں۔ اور دشمن کے جو سپاہی آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے انھیں موت کی نیند سلا دیتی تھیں۔ مگر ارشمیدس نے صرف منجنیقوں پر ہی اکتفا نہیں کی، بلکہ اپنے دشمنوں کے خلاف ایک اور ہتھیار سے بھی کام لیا جو ان کے لیے منجنیق سے بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوا۔

موجودہ زمانے میں بھاری اجسام کو اٹھانے کے لیے جس آلے سے کام لیا جاتا ہے، اسے کرین کہتے ہیں۔ یہ آلہ ارشمیدس کی ایجاد ہے اور اس کے ذریعے اس نے رومی حملہ آوروں کے جہازوں کو بہت بھاری نقصان پہنچایا تھا۔ اس کی نگرانی میں سیراکوس کی فوج کے سپاہی کرین کو بروئے کار لا کر رومی جہاز کو اوپر اٹھا لیتے اور پھر بلندی سے اپنے ساحل پر یا سمندر کے اندر گرا کر اس کو تباہ کر دیتے۔

آخر رومی کماندار نے ایک روز اپنی فوج کے سپاہیوں کو اکٹھا کر کے کہا:

اگر تم جلد فتح چاہتے ہو تو اس کی ایک ہی صورت ہے۔ ہمت کر کے آگے بڑھو اور اس ریاضی داں پر غلبہ پا لو جو ہمارے جہازوں کو کھلونوں کی طرح اوپر سے گرا کر پاش پاش کر دیتا ہے اور ہم پر پتھروں کی ایسی بارش برساتا ہے جیسی کہانیوں کے روایتی دیوؤں نے کبھی نہیں برسائی ہوگی۔

لیکن رومی سپاہی سخت خائف اور مرعوب ہو چکے تھے۔ ان کی یہ حالت تھی کہ جب قلعہ کی دیوار سے وہ ایک رسے کو نیچے آتا دیکھ لیتے تو یہ جان کر کہ وہ ارشمیدس کی کرین کا رسہ ہے، ان میں بھگدڑ پڑ جاتی۔ ان حالات میں رومی کماندار نے بالکل دوسری ترکیب سوچی۔ اس نے اپنی فوج کو پسپا ہونے کا حکم دیا اور چند میل پیچھے ہٹ جانے کے بعد سیراکوس کے گرد گھیرا ڈال کر اس شہر کی ناکہ بندی کر لی۔

جب دشمن کے سپاہ بظاہر نظروں سے غائب ہو گئے تو ارشمیدس ایک بار پھر اپنے مطالعے میں مستغرق ہو گیا اور جنگ کے متعلق سب کچھ بھول گیا۔ اپنے آخری دنوں میں کون سے نئے مسائل اس کے زیر غور تھے؟ کیا وہ کرہ اور اس میں گرنے والے بیرونی سلنڈر کے مسائل اسے بہت عزیز تھے۔ کیا اسی وجہ اس نے یہ وصیت کی تھی کہ اس کے مزار پر جو کتبہ لگایا جائے اس پر کرہ اور اس کے بیرونی سلنڈر کا نشان ہو۔ چنانچہ پہلی صدی عیسوی میں جب سسرو جو روم کا مشہور خطیب، مصنف اور سیاست داں تھا سسلی کی سیاحت کر رہا تھا کہ اس نے ایک قبر دیکھی جو شکستہ اور ویران حالت میں تھی۔ اس کا کتبہ مٹ چکا تھا مگر اس پر بنا ہوا کرہ اور سلنڈر کا نشان مدھم سا نظر آ رہا تھا۔ اس نشان سے اس نے جان لیا کہ یہ قبر سسلی کے نامور سائنس داں ارشمیدس کی ہے۔ اس نے اس قبر کی مرمت کرا دی اور کتبے کو از سر نو بنوا کر لگا دیا۔

لیکن بات تو سیراکوس کے محاصرے کی ہو رہی تھی۔ اس شہر کی ناکہ بندی کرنے کی جو تجویز رومی کماندار مارسی اس نے سوچی تھی، وہ جنگی نقطۂ نظر سے بہت کامیاب رہی کیونکہ شہر کے لیے باہر سے کھانے پینے کی چیزوں کی آمد بند ہو گئی اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ یہ ایک ایسی فوجی تدبیر تھی جس کا توڑ ارشمیدس کے پاس بھی نہ تھا۔ آخر کار بھوک سے تنگ آ کر اہل شہر نے ہار مان لی اور رومن سپاہی شہر میں داخل ہو کر قتل و غارت میں مصروف ہو گئے۔ رومن کماندار ایک بہادر دشمن کی حیثیت سے بوڑھے ارشمیدس کے کمال کا دل سے معترف تھا، اس لیے اس نے سپاہیوں کو حکم دے رکھا تھا کہ ارشمیدس کو کوئی گزند نہ پہنچائی جائے۔ لیکن عام سپاہیوں سے جو فتح کے نشے میں سرشار تھے اس حکم کی تعمیل کی امید بہت کم تھی۔ چنانچہ غارت گری کے دوران میں ایک سپاہی ارشمیدس کے مکان میں داخل ہو گیا۔ ارشمیدس اس وقت زمین پر شکلیں بنا کر جیومیٹری کے کسی ادق مسئلے میں ایسا غرق تھا کہ اسے اپنے گرد و پیش کی کچھ خبر نہ تھی۔ اس نے غصے سے بھری ہوئی آواز سے آنے والے کو روکا کہ وہ زمین پر بنی ہوئی شکلوں کو اپنے نقش پا سے نہ مٹائے۔ فتح مند سپاہی اس ہتک کی کب تاب لا سکتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ارشمیدس کے سینے میں اپنا نیزہ بھونک دیا، جس سے بوڑھے سائنس داں کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ رومی کماندار کو ارشمیدس کے قتل کا بہت رنج ہوا اور حقیقت بھی یہی تھی۔ ارشمیدس کی موت ایک ایسے سائنس داں کی موت تھی جس کا ثانی اس کے مرنے کے سترہ سو سال بعد تک پیدا نہ ہوا۔

محمد انصار اللہ*

دکنی میں تیلگو الفاظ

ایک زبان کے الفاظ جب دوسری زبان میں پہنچتے ہیں تو عموماً وہ اپنی اصلی حالت پر قایم نہیں رہ جاتے ہیں۔ کبھی ان کا املا اور تلفظ بدل جاتا ہے، کبھی معنیٰ اور محل استعمال میں فرق پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی صرف لب ولہجہ اور طرز ادا کی حد تک ہی اُن میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ کوئی زبان دوسری زبان کے الفاظ اس کی لغتوں اور فرہنگوں سے اخذ نہیں کرتی۔ اخذ و قبول کا انحصار بیشتر ضرورت پر ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ بات ممکن ہے کہ علمی اور معاشرتی یا دوسری ضرورتوں سے ایک زبان دوسری زبان کے علمی سرمایے سے بھی استفادہ کرے اور اس استفادے میں تحقیق کے اصولوں اور قواعد کے ضابطوں کو بھی دخل ہو لیکن معمولاً لفظوں کا تبادلہ بول چال کی زبانوں میں ہی ہوتا ہے۔ اس تبادلے میں اس زبان کے مزاج اور ضرورت کو بنیادی حیثیت حاصل رہتی ہے جو نئے الفاظ قبول کرنا چاہتی ہے۔ اس طرح جو الفاظ ماخوذ یا مستعار ہوتے ہیں معمولاً وہ اخذ کرنے والی زبان کے مزاج، آہنگ اور لب ولہجے کے مطابق ڈھل جاتے ہیں۔

جب دو زبانوں کے مابین لفظوں کے تبادلے کا مطالعہ کرنا ہو تو اُن دونوں کے تاریخی ارتقا اور رابطہ پر بہت اچھی طرح نگاہ رکھنی ضروری ہے۔ اس معاملے میں ادنا سہو بھی بعض وقت بڑی غلطیوں پر منتج ہو سکتا ہے۔ زبان اردو جس کا قدیم نام ہندی یا ہندوی ہے اپنی ابتدائی صورت میں شمال کے حملہ آوروں کے واسطے سے، جن میں دیوگری کے یادو حکمراں بھی شامل تھے، دکن کے اطراف میں پہنچی تھی۔ ابتدا میں دیوگیر اور اس کے آس پاس کا علاقہ ہی مسلم فاتحوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس لیے زبانِ ہندوی نے سب سے پہلے اسی جوار میں اپنی جڑیں قایم کیں۔ یہ علاقہ مرہٹی زبان کا تھا اور زبان ہندوی اور مرہٹی کے مابین پہلے سے ایک تعلق تھا، اس لیے الفاظ اور لہجے سے گذر کر ہندوی نے اس زبان کے قواعد کے بعض ضابطے بھی بہت جلد اپنا لیے۔

بہمنی سلاطین نے کچھ مدت تک گلبرگہ میں قیام کرنے کے بعد بیدر کو اپنا مستقر بنا لیا تھا۔ گلبرگہ اور بیدر دونوں کا تعلق لسانی اعتبار سے کنڑ زبان کے خطے سے تھا، لیکن پایۂ تخت ہونے کے سبب اردگرد کی بولیوں کے علاوہ بعض غیر ملکی زبانیں جیسے فارسی، ترکی، پرتگالی وغیرہ بھی وہاں پہنچ گئی تھیں۔ آخری بہمنی سلاطین کی کمزوری سے فایدہ اُٹھا کر جنیر میں احمد نظام الملک بحری نے، برار میں عماد الملک فتح اللہ نے اور بیجاپور میں یوسف عادل خاں نے خود مختاری حاصل کر لی تھی۔ یہ محض حسن اتفاق تھا کہ نظام الملک کا رجحان مقامی بولی کی طرف تھا۔ اس نے جو نیا

* ڈاکٹر محمد انصار اللہ، ریڈر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

شہر بسایا تھا، اس کا نام احمد نگر مقرر کیا تھا اس سے پہلے مسلم سلطنتوں میں جو نئے شہر آباد کیے گئے تھے ان کے ناموں میں عموماً آباد وغیرہ لاحقے شامل کیے جاتے تھے۔ نظام الملک کی سرپرستی میں زبان ہندوی نے تیزی سے ترقی کی۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ دکن کے علاقوں میں زبان ہندوی کی جو سب سے پہلی کتاب دستیاب ہوئی ہے وہ احمد نگر ہی کے علاقے میں لکھی گئی تھی۔ اس کا نام "نوسرہار" ہے۔ وہ ایک مثنوی ہے۔ اس کے مصنف اشرف بیابانی کا کہنا ہے کہ اس نے اس مثنوی کو ۹۰۹ھ/۰۴-۱۵۰۳ء میں لکھا تھا۔

مثنوی نوسرہار کے سلسلے میں سب سے زیادہ توجہ طلب بات یہ ہے کہ باوجودیکہ احمد نگر کے علاقے میں تصنیف ہوئی تھی جو مرہٹی زبان کا خطہ ہے، اس میں تیلگو زبان کے بھی چند الفاظ مل جاتے ہیں۔ تیلگو زبان کا تعلق دراوڑ خاندان سے ہے اور اس اعتبار سے اس کو ہندوستان کی قدیم بولیوں کے سلسلے میں شمار کیا جانا چاہیے۔ آریوں کی آمد کے بعد جب سنسکرت کو عروج حاصل ہوا تو ہندوستان کی دوسری بولیوں کی طرح تیلگو نے بھی اس کے اثرات قبول کیے لیکن یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ اخذ و قبول کا معاملہ یکطرفہ کبھی نہیں ہوتا۔ تیلگو اور سنسکرت میں بھی دوسری دراوڑ زبانوں کی طرح بہ کثرت الفاظ مشترک ہیں۔ ان کی اصل کے بارے میں حکم لگاتے ہوئے بہت احتیاط ضروری ہے۔

تیلگو تلنگانہ کے علاقے کی زبان ہے اور تلنگانہ کا علاقہ شمال کی طرف سمندر کے کنارے کنارے اڑیسہ تک پھیلا ہوا ہے۔ منجملہ زبان کے علاوہ سمندری راستوں سے پہنچنے والی مختلف قوموں کی زبانوں نے بھی تیلگو زبان پر کسی نہ کسی درجے میں اپنی چھاپ ضرور ڈالی ہوگی۔ تیلگو اور کنڑ ایک ہی اصل کی دو زبانیں ہیں۔ بیدر باوجودیکہ کنڑ کے علاقے کا شہر ہے تیلگو زبان کے اثرات سے خالی نہیں تھا۔ کچھ تو ایک مدّت تک بیدر کے زیرنگیں رہنے کی وجہ سے اور کچھ اس سبب سے کہ احمد نگر کے علاقے کی حدیں تلنگانہ سے ملتی تھیں، احمد نگر کی بول چال میں تیلگو کے تھوڑے بہت اثرات کا داخل ہو جانا خلافِ قیاس نہیں ہے۔ مثنوی نوسرہار میں بھی تیلگو زبان کے چند لفظوں کے استعمال پر حیرت یا شبہ کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

تیلگو زبان میں اکثر چیزوں کے اسما کے آخر میں "مُ" (بہ ضمۂ معروف) یا "مو" (بہ واو معروف کشیدہ) شامل ہو جاتا ہے اور اس سے پہلا حرف ہمیشہ مفتوح رہتا ہے جیسے ترنگمو (تُرنگَ + مو)، بھجنگمو (بُھجنگَ + مو) وغیرہ۔ عام اسما میں حرفِ آخر واضح طور سے مفتوح آتا ہے جیسے باٹا (باٹ) چیرا (چیر) وغیرہ۔ اِن لفظوں کو جب زبان ہندوی نے قبول کیا تو اپنے قاعدے کے مطابق تیلگو کی مذکورہ علامتوں کو حذف کر دیا اور صرف لفظِ صحیح کو لے لیا۔ اِس طریقۂ کار کی وجہ سے مستعار لفظوں کی شناخت کا کام بہت مشکل ہو گیا ہے۔ راقم نے ڈاکٹر شیخ مستان (استاذِ تیلگو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) کی مدد سے دکن کی بعض قدیم تصانیف میں تیلگو زبان کے لفظوں کی جستجو کی ہے۔ اشرف کی مثنوی نوسرہار کے بعض ایسے شعر جن میں تیلگو کے لفظ آئے ہیں، یہ ہیں:

ابھنگ راوت سارنگ چڑ
بیرین کیسرا رُخ پکڑ

لفظ سارنگ بمعنی گھوڑا، تیلگو میں سارنگو آتا ہے۔ مرہٹی کی لغت میں یہ لفظ موجود نہیں ہے۔ دوسرا لفظ ابھنگ ہے جسے ابھنگو بولتے ہیں لیکن یہ ایک عام ہندوی لفظ ہے۔ مرہٹی میں بھی مستعمل ہے اور شمالی ہندوستان کی بولیاں بھی اس سے ناآشنا نہیں ہیں۔

پیچھیں بیری، انگھیں گھاٹ
رات اندھیاری، بھولے باٹ

باٹ (باٹَ = باٹَ) تیلگو میں راستے کے معنی میں آتا ہے۔ مرہٹی میں بھی یہ لفظ موجود ہے لیکن وہاں یہ دھبّے کے معنی میں ہے۔ شمال میں باٹ وزن اور کبھی پتھر کے معنی میں مستعمل ہے۔ مشہور دہلوی استاد شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ نے بھی کہا ہے

سودا ہو نہ کیوں زیرِ فلک بارہ باٹ

باره باٹ کو اسی مفہوم میں اشرفؔ نے بھی اپنی مثنوی نوسرہار میں اس طرح نظم کیا ہے ؎

لہرے بڑے سگلے ساتھ
مار کرو سب بارہ باٹ

لفظ چیرا یا چیر تیلگو میں ساری یا لباس کے معنیٰ میں رائج ہے اس لفظ کو اس کے اصل مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میاں سادھن نے اپنی نظم میناست میں اس طرح نظم کیا ہے ؎

دکھن کی چیر آن پہرادا

اشرفؔ کی زیر نظر مثنوی میں یہ لفظ ایک جگہ پگڑی صافے کے معنیٰ میں بھی نظم ہوا ہے۔ مثلاً ؎

چیرا زریں سر باندھا

تیلگو میں وصیت نامہ کو ویلو نامہ (بہ یائے معروف) کہتے ہیں۔ یہ مرکب لفظ فارسی کے لاحقہ نامہ کی مدد سے بنایا گیا ہے۔ اشرفؔ نے اپنی مثنوی میں ویل وقتِ معینہ یا آخری گھڑی کے معنی میں نظم کیا ہے اور اسے طفیل کے ساتھ قافیہ کیا ہے ؎

اے سب ہوے اُس طفیل
آئی تجھ شہادت ویل

یہی لفظ زبانِ ہندوی میں تلفظ کے فرق کے ساتھ مستعمل تھا یعنی بیلا بمعنی موقع، پہر، وقت۔ چنانچہ قاضی محمود دریائی نے بھی کہا ہے ؎

روس رہن کی بیلا ناہیں

اِس مقام پر اِس حقیقت کا اعادہ پھر ضروری ہے کہ کوئی شخص جب کسی لفظ کو بولتا یا صرف میں لاتا ہے تو معمولاً وہ اس بات کی تحقیق نہیں کرتا ہے کہ یہ لفظ کس زبان کا ہے اور اصل میں اِس کا صحیح تلفظ یا محلِ استعمال کیا تھا وغیرہ۔ وہ اس لفظ کو اپنے علاقے کے تلفظ اور معنیٰ کے اعتبار سے اپنے کلام میں صرف کرتا ہے۔ چنانچہ اُس لفظ کو اُسی علاقے کی زبان سے منسوب کرنا چاہئیے جو مصنف کے زمانے اور علاقے سے قریب ترین ہو۔ اس اصول کے مطابق اِن تمام لفظوں کو تیلگو سے ہی ماخوذ سمجھا جانا چاہیے البتہ شمالی ہندوستان میں لفظ بیلا کا ماخذ تیلگو کو قرار نہیں دیا جائے گا کیونکہ وہاں اس کا تلفظ اور مفہوم بھی مختلف ہے اور تیلگو کے خطے سے وہ علاقہ دور بھی ہے۔ دونوں علاقوں کے مابین لسانی لین دین کے مواقع بھی بظاہر نہیں تھے۔

زبان ہندوی کی دوسری قدیم ترین تصنیف جو دکن کے علاقوں میں ابھی تک مل سکی ہے، فخرالدین نظامی کی مثنوی کدم راو پدم راو ہے جو بہمنی خاندان کے علاء الدین نامی آخری بادشاہ کے زمانے میں شروع کی گئی تھی۔ اِس کی تکمیل ۹۲۹ھ/۱۵۲۳ء میں یا اس کے فوراً بعد ہوئی تھی۔ اس وقت بہمنی سلطان کی وجہ سے بیدر کی مرکزی حیثیت کا بھرم چلا آتا تھا اور پایۂ تخت کی نسبت سے وہاں کے شعرا کو خودستائی اور فخر و مباہات کا موقع تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ احمد نگر نے کتابی اور تصنیفی زبان کا نمونہ پہلے پیش کر دیا تھا اِس لیے گمان غالب یہی ہے کہ اُسی علاقے کی زبان کو بیدر کے بھی ابتدائی زمانے کے شعرا نے نمونے کے طور پر اپنے سامنے رکھا ہوگا۔

بہمنی سلطنت کے انتشار کے بعد مختلف علاقوں کی سربراہی جن لوگوں کو ملی تھی وہ فارسی کے دلدادہ تھے۔ بیجاپور کے یوسف عادل شاہ اور اس کے بیٹے اسمٰعیل عادل شاہ کو تو سکھوان داس ہندیؔ نے بھی حدیقۂ ہندی میں فارسی کا شاعر بتایا ہے۔ فارسی ایک مدت سے نہایت وقیع اور علمی اعتبار سے بڑی سرمایہ دار زبان تھی۔ اِسے اربابِ اقتدار کی سرپرستی ملی تو بہت تیزی سے یہ زبانِ ہندوی پر چھا گئی۔ نوسرہار میں تو محض چند شعر فارسی کی ایک بحر میں تھے۔ مثنوی کدم راو تمام و کمال فارسی ہی کی بحر میں لکھی گئی۔ دونوں مثنویوں میں کئی کئی مصرعے پورے کے پورے فارسی زبان ہی میں ہیں۔ فارسی کے تیزی کے ساتھ اس غلبے نے مقامی بولیوں کے اثرات کو ایک حد تک روک دیا۔ کچھ مدت تک علاقۂ دکن میں تیلگو وغیرہ زبانوں کے لفظوں کی زبان ہندوی میں شمولیت نہ ہونے کے برابر رہی۔ مثنوی کدم راو میں تیلگو زبان کے لفظوں کا استعمال ہوا تو ہے لیکن بہت کم۔ چند شعر جن میں

تیلگو کے الفاظ آئے ہیں یہ ہیں ؎

بھاس جانیا راوتس ویل مانہہ
نہ تھا تیسرا کوئی ہم میل مانہہ

لفظ ویل نوسرہار میں بھی آیا ہے اور اوپر اس کا ذکر کیا جا چکا ہے

دھرم کوں دھرم، پاپ کوں پاپ سانٹھ
بتولا نہ کنبلی پہرن دیہہ گسانٹھ

کنبلی، کنبڑی یا کمری تیلگو میں کبل کو کہتے ہیں۔ مرہٹی میں کنبڑا پھٹے پرانے کمبل کے معنی میں آتا ہے۔ شمال میں کمبل اور کملی دونوں لفظ رائج ہیں۔ یہ مسئلہ تحقیق طلب رہ جاتا ہے کہ کمبل کا ایجاد کس علاقے سے متعلق ہے۔

کوبرا (واو مجہول و بائے مشدد) تیلگو میں کھوپرا یا ناریل کی گری کو کہتے ہیں۔ مرہٹی زبان میں کھوبری آتا ہے۔ مثنوی کدم راو میں ہے ؎

اٹارا و تیوں لون کا بھار تھیں
اٹے کوبرا یوں نہ کد ھار تھیں

انگوٹھے کو تیلگو میں بوٹن وریلو کہتے ہیں۔ نظامی نے ایک شعر میں صرف بونٹ نظم کیا ہے ؎

جو بونٹ اُس دکھاوے بونٹ۔۔۔
جو بھر آنکھ دیکھے کہوں آنکھ پھوڑ

خوشبو کو زبان ہندوی میں بھی سوگند کہتے ہیں۔ نظامی نے اس لفظ کو تیلگو کے تلفظ کے بموجب سوگندرم نظم کیا ہے ؎

کہ جیوں روکھ سرکھنڈ پر پل دھرے
سو بھی رکھ جو بھی سوگندرم کرے

قصبہ یا گاؤں کو تیلگو میں "پلی" کہتے ہیں۔ سو دیوالی کے موقع پر پورا علاقہ جگمگا اُٹھتا ہے۔ اس کی مناسبت سے اس تہوار کو دیوا پلی کا نام دیا گیا ہے۔ ایک شعر میں اس کا حوالہ اس طرح آیا ہے ؎

سرب وشٹ اُن کی ہے دیوا پلی
دھرکی توی بدھ سو کی جلی

تلاش کریں تو کچھ اور لفظ بھی مل جائیں گے لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا اُن کا تناسب کچھ زیادہ نہیں ہے

کچھ مدت کے بعد جب دکن کی نئی سلطنتوں کو استحکام حاصل ہوا تو زبان و ادب کی ترقی کے لیے بھی حالات سازگار ہو گئے۔ لیکن تیلگو زبان باوجودیکہ ایک مدت سے بول چال میں رائج چلی آتی تھی، اس میں تصنیف و تالیف کی روایت بہت قدیم نہیں معلوم ہوتی۔ قطب شاہی سلاطین کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے بھی اس زبان میں شاعری کی تھی لیکن ان میں سے بھی بیشتر کا کلام دستیاب نہیں ہے۔ چنانچہ تیلگو ادب کی تاریخ میں اس خاندان کے شروع کے بادشاہوں کے ناموں کی بس روایتی حیثیت معلوم ہوتی ہے۔ زبان ہندوی میں تیلگو کے برخلاف تصنیف و تالیف کی ایک مسلسل روایت موجود تھی۔ اس لیے شاعری کی ہیئت اور موضوعات کے اعتبار سے تیلگو سے اُس کے مستفید ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ بیدر میں زبان ہندوی (قدیم اردو) میں شعر گوئی کا خوب چلن ہوا۔ وہاں مثنوی کے علاوہ دوسری اصناف مثلاً غزل وغیرہ کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ کچھ مدحیہ نظمیں بھی لکھی گئیں لیکن ان سب میں فارسی سے استفادہ کا رجحان نمایاں ہے۔ مقامی زبانوں کی طرف توجہ کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔ کنڑ اور تیلگو کے مستعار لفظوں کے تناسب میں بھی کچھ اضافہ نہیں ہوا۔ دسویں صدی ہجری/ سولھویں صدی عیسوی کے خاتمے کے قریب وہاں ایک نظم "بھرت نامہ" کے عنوان سے لکھی گئی ہے۔ اُس کے مصنف نے صریحاً اپنے بیدری ہونے کا ذکر کیا ہے۔ کہتا ہے ؎

مجھے ناؤں ہے قطب دیں قادری
تخلص سو فیروز ہے بیدری

اپنے قلمی نام کے لیے "تخلص" کی اصطلاح کا استعمال کرنا اور تخلص کے ساتھ نسبتِ مکانی کا ذکر کرنا شعرائے فارسی کے یہاں عام تھا۔ زبان ہندوی میں یہ کام شاید سب سے پہلے فیروز نے کیا ہے۔ فیروز کے یہاں فارسی شاعری کی روایتوں کو

برتنے کی کوشش زیادہ شعوری اور نمایاں ہے۔ فیروز کی نظم پرت نامہ مختصر ہے۔ اس میں کل ایک سو اکیس شعر ہیں۔ باوجود اس کے اِس میں تیلگو کے کچھ لفظ مل جاتے ہیں مثلاً ؎

صد و بیست و یک جب کیا بیت میں
دو جگ مدح کی ماریا سیت میں

سیتو یا سیت ودتیلگو میں پُل کے واسطے آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ لفظ سنسکرت ہے۔ جو بھی ہو فیروز نے یہ لفظ اپنے علاقے کی بولی سے ہی لیا تھا۔ اس کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اُس نے سنسکرت کی کتابوں یا فرہنگوں کا مطالعہ کیا تھا۔ اس نے اپنی نظم کے لیے سنسکرت سے براہ راست کوئی ایک لفظ بھی نہیں لیا تھا۔ وہ بہ گمانِ غالب اس زبان سے واقف ہی نہیں تھا۔

لفظ راس تیلگو میں خرمن اور ڈھیر کے معنیٰ میں آتا ہے۔ اسے بھی اصلاً سنسکرت کہا گیا ہے۔ فیروز نے اپنی نظم میں اِسے صرف کیا ہے ؎

کہ عشقوں بسایا سو بازار راس
سچا عبد قادر خریدار خاص

اِسی طرح سونے کو تیلگو میں سِبنگار یا بنگار مو کہتے ہیں۔

پرت نامے میں یہ لفظ اِس طرح نظم ہوا ہے۔

جو تیری نظر جگ پہ یک بار ہوے
کہ سب خاک میری سو بنگار ہوے

دسویں صدی ہجری کے آغاز میں بیدر اور گولکنڈہ کے مابین آمد و رفت کا سلسلہ زیادہ ہوا۔ آخری شاہی سلطان امیر برید ثانی کو خود بھی ترک وطن کر کے گولکنڈہ میں پناہ لینی پڑی تھی کیوں کہ بیدر پر مرزا علی غاصب قابض ہو گیا تھا۔ اس قسم کے سیاسی حالات نے بیدر کے بعض شاعروں کو بھی گولکنڈہ میں ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

گولکنڈہ میں زبان ہندوی (قدیم اردو) میں شعرگوئی کا سلسلہ غالباً نسبتاً بعد میں شروع ہوا تھا۔ اِس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قطب شاہی سلاطین کو اپنی سلطنت کی بقا اور اس کے استحکام کے لیے جد و جہد میں زیادہ مصروف رہنا پڑا تھا۔ دکن کے علاقے میں اپنی شان و شوکت کے اعتبار سے گولکنڈہ کی سلطنت سب سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ یہی غالباً اس سلطنت کی شانِ امتیازی تھی کہ جب اس علاقے میں زبان ہندوی (قدیم اردو) میں شعر و سخن کا چلن ہوا تو اس زبان کو ہندوی کے بجائے دکنی کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ نام خود اس حقیقت کی غمازی کر رہا ہے کہ؛

۱۔ اب اہلِ دکن نے اِس زبان کو پوری طرح اپنا لیا تھا اور

۲۔ وہ اسے شمالی ہند کی زبان ہندوی سے ممیز کرنا چاہتے ہیں۔

اپنی زبان کو امتیازی صورت دینے کے لیے انھوں نے مقامی الفاظ ہی کو اس میں داخل نہیں کیا بلکہ اپنے علاقے کی خصوصیات اور بعض واقعات کو بھی انھوں نے اپنی شاعری میں داخل کرنا شروع کر دیا۔ اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ اپنی زبان کی انفرادیت کو معتبر بنانے کے لیے انھوں نے زبان ہندوی کی بعض تصانیف کو اپنے زمانے کی زبان میں منتقل بھی کیا۔ اِن حالات نے دکنی زبان کی ترقی کی رفتار کو بہت تیز کر دیا۔

گولکنڈہ دراصل تلنگانہ کے علاقے کا پایۂ تخت تھا اور تیلگو اس علاقے کی زبان تھی۔ یہاں زبان دکنی میں قدرتی طور پر تیلگو کے اثرات زیادہ ہوئے۔ گولکنڈہ میں دکنی زبان کی دستیاب اولین تصانیف میں سے ایک غواصی کی مثنوی "مینا ستونتی" بھی ہے۔ اپنی اس نظم کے ماخذ کی طرف غواصی نے اِس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

رسالہ اتھا فارسی لیا اول — کیا نظم دکنی سیتی بے بدل

غواصی کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ اس نے یہ نظم کہاں اور کب لکھی تھی؟ یہ بات بھی وثوق کے ساتھ معلوم نہیں ہے۔ اس بارے میں البتہ شبہ نہیں کہ مینا ستونتی کی تصنیف کا کام [illegible] سے پہلے مکمل ہو چکا تھا۔ اس میں تیلگو کے بہت سے الفاظ آئے ہیں چند یہ ہیں؛

دہلی کے سلطان فیروز تغلق نے اپنے زمانے میں ایک چھوٹا سا سکہ بیکا کے نام سے بنوایا تھا "تا غرضِ فقرا و مساکین حاصل شود" (بحوالہ خالق باری مرتبہ شیرانی مطبوعہ دہلی ۱۹۴۴ء ص ۱۱) یہی سکہ ہمارے زمانے میں اپنی شکل اور قیمت کو بدلتا ہوا پیسہ ہو گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ تلنگانہ کے علاقے میں یہ سکہ بھی چلتا تھا چنانچہ غواصی نے مینا ستونتی میں کئی بار اس کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ کہتا ہے ؎

او سندر سکوں دے کے بیکے چھڑائی — دے جیو دان اُسے بند میں تے چھڑائی

قطب شاہی افواج میں ہاتھی بھی ہوتے تھے۔ وہ ہاتھی اس زمانے کے رواج کے

مطابق سواری کے کام بھی آتے تھے۔ تیلگو میں ان کو کنجر مو (کنجر مضموم الاول) کہتے تھے۔ غواصی کا ایک شعر ہے ؎

فلک کے ادبھر مل دوارسے کے تئیں + ٹکے نتئیں او کو نثال کنجر کٹھین۔

اِس میں لفظ کٹھین بھی لائق توجہ ہے۔ تیلگو میں کٹھینو کہتے ہیں۔ لفظ کٹھین شمال میں بھی عام طور سے بھی بولا جاتا ہے۔ اسی طرح لفظ ندان ہے کہ جو اردو میں فوراً یا اچانک کے معنی میں مستعمل رہا ہے۔ مینا ستونتی میں آہستہ آہستہ کے لیے نظم ہوا ہے۔ تیلگو میں نِدا نمو کہتے ہیں ؎

جدا جو رسوں ہو گئی او ندان + سوتی جا کے خالی اتھا ایک دکان

لفظ دکان جو اصلاً فارسی ہے تیلگو میں دکانڑ ہو جاتا ہے۔

رُجی تٹ پو بہت کی بھانڈی تمام + بھری غم کی دارو دگوبی تمام

رجی تٹ یعنی خوبصورت تالاب ہے تیلگو میں تٹاکو کہتے ہیں۔ بھانڈی یا بھنڈلو بڑی ہانڈی کو کہتے ہیں۔ مرہٹی میں بھانڈیں عام برتن کے واسطے رائج ہے
اَنبِل یا امبل (الف وبائے مفتوح، لام مکسور) چاول وغیرہ کی پیچ ہے ؎

انبل جھا چہ کنکیاں سوتج لذتاں + تجے کا ئیکوں خاص کیا نعمتاں

اسی طرح ترنگو یا ترنگ (مضموم الاول) یعنی گھوڑا ہے ؎

ہزاں سوراپ دیس کا بڑ ترنگ + او مغرب کے دریا لوآیا انگ

یہ محض چند اشعار محض سرسری طور پر نقل کر دیے گئے ہیں۔ تلاش کریں تو ایسے اور اشعار بھی مل جائینگے جن میں تیلگو کے الفاظ نظم ہوئے ہیں۔

غواصی کی مثنوی مینا ستونتی کے جواب میں وجہی نے ایک مثنوی قطب مشتری کے نام سے لکھی ہے۔ اس مثنوی کا سالِ تصنیف ۱۰۱۷ھ/ ۱۶۰۸ء ہے۔ اس مثنوی میں شاعر نے محمد قلی قطب شاہ اور اس کے باپ ابراہیم قلی قطب شاہ کے نام کو بھی شامل کر دیا ہے۔ لیکن حقیقت میں اس مثنوی کے قصے کو ان بادشاہوں کے واقعات سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔

مثنوی قطب مشتری کا زمانۂ تصنیف وہ ہے جب بیدر کی سلطنت پر زوال آچکا تھا۔ جس طرح دہلی کی سلطنت کی تباہی کے زمانے میں لکھنؤ کی تہذیب اور بول چال پر لکھنؤ والے فخر و مباہات کرتے تھے بالکل اسی طرح وجہی نے اس مثنوی میں بیدر کے مرحوم استادوں کو یاد کیا ہے اور گولکنڈہ کی رونقوں اور وہاں کی زبان کی ستائش کی ہے۔ کہتا ہے ؎

دکھن ملک بہوتیچ خاصا اہے + تلنگانہ اُس کا خلاصہ اہے

اس نے دکھنی زبان کی تمام تصانیف میں اپنی مثنوی کو سب سے زیادہ شیریں اور بہتر بتایا ہے۔ غواصی پر اس نے کئی شعروں میں طنز بھی کیا ہے۔ لیکن سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اس کی مثنوی میں تلنگانہ کے علاقے کی زبان تیلگو کے الفاظ بہت ہی کم ہیں۔ دراصل وجہی اپنا تعلق ہندوستان سے بتاتا ہے اور اس نے اپنی آخری عمر میں ایک نثری کتاب سب رس کے نام سے زبان ہندوستان میں ہی لکھی ہے۔

بہرحال مثنوی قطب مشتری میں تیلگو کے جو الفاظ آئے ہیں اُن میں سے کچھ یہ ہیں
لفظ ڈاٹ یا ڈٹمو تیلگو میں دو معنوں میں آتا ہے۔ اول غور کرنا ؎

سورج کوں جو گھلے توں ٹک ڈاٹ کر
چڑے عرش پر دھاک کرتے نہاٹ کر

دوئم اچھل کر چلنا، چنانچہ اس شعر میں ہے ؎

چلے شاہ منزل کو یوں ڈاٹ ڈاٹ + کہ یک دیس میں جائیں جینے کی باٹ

بانس کو تیلگو میں بونگو کہتے ہیں۔ تعجب ہے کہ مطبوعہ مثنوی قطب مشتری میں بم بو چھپا ہے ؎

بم بو بیک بیداواں سارا کیا + سو چادر اُسے بند پھارا کیا

غالباً یہی لفظ انگریزی میں Bamboo ہو گیا ہے۔

عربی لفظ عماری تیلگو میں انباری ہو گیا ہے۔ وجہی نے بھی کہا ہے ؎

تماشاں کے بندے دیے بے شمار + ہتیاں کی انباریاں اُپر کر انبار

اِن چند کے علاوہ ناگل (ناگر) یعنی ہل اور نول یعنی نیا کے علاوہ توکا (بہ واؤ مجہول) یعنی دُم اور دکڑیال ایک کھانے کی چیز کا نام ہے، وغیرہ تیلگو نصوں کے ایسے الفاظ ہیں جو وجہی کی نثری کتاب سب رس میں آئے ہیں۔

یہاں تک دکن کے علاقے کی ان تصانیف کا ذکر تھا کہ جن کے مصنفین خاص تلنگانہ کے علاقے کے رہنے والے نہیں تھے (غواصی بھی بہ گمان غالب انھیں میں سے تھا) گیارھویں صدی ہجری یا سترھویں صدی عیسوی سے خود اہلِ تلنگانہ نے دکنی زبان میں تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا تھا۔ ان کی تصانیف کا بھی اس نظر سے جائزہ لیا جائے تو بعض دلچسپ حقایق سامنے آسکتے ہیں۔

❊ ❊ ❊ ❊

کبیر احمد جائسی* (علیگ)

پروفیسر ہادی حسن

مادرِ علمی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے اُن اساتذہ میں جو اُس کے تربیت یافتہ تو نہ تھے مگر خدمت گزار بن کر اپنی زندگی یہاں گزارنے آئے اور اپنی پوری زندگی درس و تدریس میں صرف کرنے کے بعد یہیں کی زمین میں آسودۂ خواب ہوئے، پروفیسر ہادی حسن کا نام سرِ فہرست ہے۔ ہادی صاحب کم و بیش تین دہوں تک یونیورسٹی کے علمی مطلع پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے، ان کے دامنِ تربیت سے ہزاروں طلبا فیض یاب ہو کر نکلے، اُن کی تحریروں سے لاکھوں لوگوں نے علمی پیاس بجھائی، اُن کی تقریروں سے بڑے سے بڑا مجمع مسحور ہوا۔ لیکن جب علم و ادب کا یہ آفتاب مغربِ فنا میں غروب ہوا تو کسی نے بھی اس بات کی زحمت گوارا نہ کی کہ اُن کی مدرسانہ اور مصنفانہ زندگی پر روشنی ڈال کر نئی نسل کو اس بات سے آگاہ کرائے کہ آخر یہ پروفیسر ہادی حسن تھے کون؟ ان کے انتقال کے فوراً بعد صرف استاذی ڈاکٹر شمعون اسرائیلی کی ایک انگریزی تحریر ضرور نظر سے گزری تھی جو کلکتہ کے ذو لسانی سہ ماہی مجلّہ INDO IRANICA میں شائع ہوئی تھی۔ پھر اس کے بعد ہر طرف سناٹا رہا۔ میں فارسی ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اس قرض کو ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جو فارسی ادبیات کے تمام طالب علموں پر مدت سے قرض چلا آ رہا ہے۔

پروفیسر ہادی حسن صاحب حیدرآباد دکن میں ۴ ستمبر ۱۸۹۴ء کو پیدا ہوئے۔ اُن کے والد محترم امیر حسن صاحب ریاست حیدرآباد دکن کی انتظامیہ کے ایک اہم عہدے پر فائز تھے اور مزید ترقی کر کے کمشنر کی حیثیت سے اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ہادی صاحب کی والدہ محترمہ ایک ایرانی النسل خاتون تھیں جن کی آغوشِ تربیت نے ہادی صاحب کو فارسی زبان و ادب کا جیّد عالم بنایا۔

ہادی صاحب نے اپنی ابتدائی اور ثانوی تعلیمات کے مراحل حیدرآباد دکن میں طے کیے۔ پھر سائنس کے ایک طالب علم کی حیثیت سے فرگوسن کالج پونہ میں داخل ہوئے، جہاں سے انھوں نے B.Sc. کی ڈگری لی۔ اس کامیابی کے بعد ریاست حیدرآباد کے وظیفے پر وہ مزید تعلیم کے لیے لندن گئے اور کیمبرج یونی ورسٹی میں داخلہ لیا جہاں اُن کے خاص موضوعات ارضیات [GEOLOGY] نباتیات [BOTANY] اور کیمیا [CHEMISTRY] تھے۔

جب ہندوستان میں آزادی کی جد و جہد فیصلہ کن مراحل میں داخل ہو گئی تو ہادی صاحب اس جد و جہد میں حصّہ لینے کے لیے اپنے وطن واپس آ گئے اور انھوں نے یہاں واپس آ کر سیاست میں عملی حصّہ لینا شروع کیا۔ بقول ڈاکٹر شمعون اسرائیلی، گاندھی جی ان کے کاموں سے بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے اپنی ایک تحریر میں ہادی صاحب کے کاموں کو سراہا بھی تھا۔

* ڈاکٹر کبیر احمد جائسی، ریڈر ان ایرانین اسٹڈیز، ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے اُن کا تعلق نباتیات [BOTANY] کے ریڈر کی حیثیت سے شروع ہوا۔ اس زمانے تک یونیورسٹی میں ارضیات کا درس نہیں دیا جاتا تھا۔ علی گڑھ میں کچھ مدت گزارنے کے بعد ہادی صاحب دوبارہ لندن گئے اور لندن یونیورسٹی سے فارسی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس آئے اس ڈگری کے حصول کے بعد ان کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ فارسی کا صدر اور پروفیسر مقرر کیا گیا۔ جہاں ۲ ستمبر ۱۹۵۸ء تک وہ نئی نسل کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

یہاں اس امر کی نشاندہی ضروری ہے کہ ہادی حسن صاحب نے اپنی عمر کے ساٹھ سال، ۱۹۵۴ء میں پورے کر لیے تھے۔ اس زمانے کے وائس چانسلر، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے ہادی حسن صاحب کی مدت ملازمت میں بیک وقت چار سال کی توسیع دی۔ اس طرح وہ ۱۹۵۸ء تک کام کرتے رہے۔ گزشتہ چالیس برسوں میں ہادی حسن صاحب کے علاوہ صرف پروفیسر محمد حبیب صاحب کو اسی طرح کی چار سالہ توسیع دی گئی تھی۔ ان توسیعات سے جہاں ان اساتذہ کے غیر معمولی علم وفضل پر روشنی پڑتی ہے وہیں ذاکر صاحب کی علم نوازی اور اہل علم کی قدر افزائی کا بھی کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔

درس وتدریس کی مشغولیتوں کے باوجود انھوں نے جو علمی کارنامے انجام دیے، اُن کی فہرست درج ذیل ہے تاکہ نئی نسل کو اس بات کا علم ہو سکے کہ اس کے بزرگ کس انتھک محنت، لگن اور دیدہ ریزی سے کام کر کے اس کے لیے کتنا اہم اور وقیع سرمایہ چھوڑ گئے ہیں۔

1. Studies In Persian Literature 1923
2. A History Of Persian Navigation 1928
3. Falaki - His Life Time & works 1929
4. Diwan-e-Falaki Shervani 1930
5. Raziuddin Nishapuri - His Life and works. 1940
6. The Unique Madras Ms. of Diwan-e-Falaki 1951
7. Moughal Poetry, Its Historical and Cultural Value 1952
8. The Unique Diwan of Emperor Humayun 1953
9. Qasim Kahi - His Life time and works. 1954
10. Diwan-e-kahi
11. Majmua-e-Maqalat (Persian) 1956
12. Shakuntla (Persian Translation) 1956
13. Researches In Persian Literature 1958

ہادی صاحب نے فارسی علم وادب کی جو گراں قدر خدمات انجام دیں اس کا اعتراف ہندوستان اور ایران دونوں کی حکومتوں نے کیا۔ ۱۹۵۹ء میں حکومتِ ہند نے ان کو اپنے اعزاز سے نوازتے ہوئے سرٹیفکیٹ آف آنر دیا۔ جس کے ساتھ ایک اعزازیہ بھی تاحیات اُن کو ملتا رہا۔

۱۹۶۰ء میں ایران کی حکومت نے اپنے انعام "نشانِ دانش درجۂ اول" سے نواز کر ہادی صاحب کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ اس کے ایک سال کے بعد یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے اُن کو فارسی ادبیات پر کام کرنے کے لیے ایک معقول وظیفہ دیا لیکن افسوس ہے کہ علمی دنیا بہت دنوں تک ان کے کاموں سے مستفید نہ ہو سکی۔ اپنی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے تقریباً چھ سال بعد ۲۳ مئی ۱۹۶۳ء کو شام کے ساڑھے چھ بجے انھوں نے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کی اور دوسرے دن یونیورسٹی کے اس قبرستان میں ابدی نیند سونے کے لیے سپرد خاک کیے گئے جہاں غیر منقسم ہندوستان کے سیکڑوں آفتاب و ماہتاب دفن ہیں۔

ہادی حسن صاحب کو قدرت نے ذہن رسا کے ساتھ ساتھ بلا کی قوتِ حافظہ بھی دی تھی۔ وہ ایک بالغ نظر دانشور ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے زبردست خطیب بھی تھے، جن لوگوں کو اُن کی تقریروں سے بہرہ مند ہونے کے مواقع ملے ہیں وہ یہی محسوس کرتے رہے ہیں

کہ الفاظ ان کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے اور یکے بعد دیگرے مناسب و برمحل الفاظ کا استعمال کرکے اپنی تقریروں سے جادو جگایا کرتے، اگر اثنائے تقریر میں ان کی زبان سے لفظ "عزت" نکل جاتا تو وہ منٹوں شہرت، دولت، صداقت، شجاعت، عشرت جیسے الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے اپنی طلاقت لسانی کا ثبوت دیتے ان کی یہ خطابت صرف فارسی زبان تک ہی محدود نہ تھی بلکہ انگریزی زبان میں بھی ان کی تقریریں اسی پایے کی ہوتیں۔ غالبًا وہ اردو میں تقریر کرنے کے عادی نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب علی گڑھ کے اردو مقررین کا ذکر ہوتا ہے تو ہم کو ان کا نام کہیں نظر نہیں آتا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ بہت کم افراد کو تقریر و تحریر دونوں میں مہارت ہوتی ہے۔ قدرت نے ان کو دونوں اوصاف سے نوازا تھا اور انھوں نے بھی تحریر و تقریر دونوں ہی کا بھرپور مظاہرہ بھی کیا۔

نئی نسل کو شاید ہی اس بات کا علم ہو کہ اس فارسی کے جید عالم کا جواہر لال نہرو میڈیکل کالج کی تاسیس میں کتنا بڑا حصہ رہا ہے اس کالج کی تاسیس کے لیے جب چندہ کی مہم شروع کی گئی تو ہادی صاحب مرحوم نے تن تنہا شب و روز کی انتھک محنت کے بعد تیس لاکھ روپیہ بطور چندہ جمع کیا۔ خدا نے ان کی اس محنت کی لاج رکھ لی اور وہ جب ایک کامیاب و کامراں استاد کی زندگی گزار کر اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے تو اس سے ایک سال قبل ان کے خوابوں کی تعبیر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کا میڈیکل کالج معرض وجود میں آچکا تھا اور وہاں طالب علموں نے باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔[۳]

ایک مختصر سی تحریر میں ہادی حسن صاحب کے تمام علمی کاموں کا جائزہ لینا اور عصر حاضر میں اُن کی معنویت کو اجاگر کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ہم ان کی صرف ایک کتاب "ایرانی بحریہ کی تاریخ" [A History of Persian Navigation] کا جائزہ درج ذیل سطور میں پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اپنے موضوع کی ندرت کی وجہ سے یہ ہادی حسن صاحب کا ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر ایران کے فارسی ادب میں بھی نہیں ملتی۔

ہادی حسن صاحب کا ایرانی بحریہ کی تاریخ کا یہ مطالعہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں انھوں نے اس بات سے بحث کی ہے کہ زمانۂ ماقبل تاریخ میں ایرانی بحریہ کا نظم کیا تھا۔ دوسرے باب میں انھوں نے اس بات سے بحث کی ہے، ہخامنشیوں [ACHAE-MENIONS] کے عہد میں ایرانی بحریہ میں کیا کیا تغیر و تبدل ہوا۔ تیسرا باب اس مطالعے کے لیے وقف ہے کہ ساسانی حکومت کے قیام سے پہلے مشرقی ممالک میں تجارت کی صورتِ حال کیا تھی۔ اس موضوع سے عالمانہ انداز سے عہدہ برآ ہونے کے بعد انھوں نے چوتھے باب میں ساسانیوں کے زمانے کے ایرانی بحریہ کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ پانچویں باب میں اسلام کے ابتدائی دور کے ایران میں بحریہ کی جو کیفیت تھی اور ایرانیوں نے دوسری قوموں سے جو اثرات قبول کیے تھے، ان کا تاریخی شواہد کی روشنی میں مطالعہ کیا گیا ہے۔ پھر چھٹے باب میں انھوں نے اس بات سے بھی بحث کی ہے کہ دسویں صدی عیسوی سے لے کر سولھویں صدی تک ایرانی بحریہ میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں، کون کون سی نئی نئی چیزیں ایجاد کی گئیں اور کن کن چیزوں کو از کار رفتہ قرار دیتے ہوئے ترک کیا گیا۔ ساتویں باب میں فارسی ادبیات میں ایرانی بحریہ کے متعلق جو معلومات محفوظ ہیں، اُن کو بنیاد بنا کر ایران کی تاریخ کی گمشدہ کڑیوں کی بازیافت کی بڑی دلکش اور جاذب نظر کوشش کی گئی ہے۔

"ایرانی بحریہ کی تاریخ" کے اس اجمالی تعارف کے بعد اب ہم ہر باب کے مندرجات پر ایک طائرانہ نظر ڈال رہے ہیں تاکہ ہادی حسن صاحب کے ایک علمی کارنامے کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگایا جاسکے۔

ایران کی تاریخ کا وہ دور جو کہ زمانۂ ماقبل تاریخ کے نام سے موسوم ہے دو خاندانوں کے عہد حکومت سے عبارت ہے جن میں سے پہلے کا نام 'پیش دادی خاندان' اور دوسرے کا "کیانی خاندان" ہے۔ ایران کی تاریخ کے ماہرین ایک عرصے تک ان دونوں خاندانوں کے بادشاہوں کو اساطیری کردار سمجھتے رہے۔ اشکانی عہد کی ایک کتاب 'یادگار زریر' اور ساسانی عہد کی کتاب 'کارنامک ارتخشیر پاپکان' کی بازیافت کے بعد بہت سے مورخین نے اپنا نقطۂ نظر تبدیل کر لیا ہے اور پیش دادی اور کیانی دونوں خاندانوں کے بادشاہوں کو اساطیری نہیں بلکہ حقیقی و واقعی کردار سمجھتے ہیں۔

مستشرقین کے علاوہ خود ایران کے بہت سے فاضلین اسی خیال کے حامی ہیں جن میں ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کا نام سرفہرست ہے۔ ڈاکٹر صفا نے اپنی کتاب 'حماسہ سرائی در ایران' میں اُن کے خاندانوں کے حقیقی اور واقعی خاندان ہونے پر بڑی عالمانہ بحث کی ہے[۵] اشکانی اور ساسانی دور کی جن دو کتابوں کے نام اوپر درج کیے گئے ہیں اُن سے بھی اس بات کی ایک گونہ تصدیق ہوتی ہے کہ جن پیش دادی اور کیانی بادشاہوں کو اساطیری کردار سمجھا جاتا رہا ہے، وہ واقعی اور حقیقی بادشاہ تھے۔

ایران کی قدیم روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ایران میں جو سب سے پہلی کشتی (یا جہاز) بنائی گئی، اس کا موجد مشہور پیش دادی بادشاہ جمشید تھا۔ یہ روایت مادیوں، ہخامنشیوں، اشکانیوں اور ساسانیوں کے دور سے گزرتی ہوئی اس دور کے لوگوں تک پہنچی جو ظہور اسلام کے بعد کے ایرانی معاشرے میں بود و باش رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ظہور اسلام کے بعد جو منثور اور منظوم شاہنامے لکھے گئے ہیں ان میں بھی جمشید کو ایران میں کشتی سازی کا موجد کہا گیا ہے۔ ہادی حسن صاحب نے بھی اس روایت کو نقل کرتے ہوئے اپنی بات کا آغاز کیا ہے اور شاہنامۂ فردوسی کے درج ذیل شعر سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ اپنی ایجاد کردہ کشتی کے ذریعے دوسرے ملکوں کا سفر کیا کرتا تھا۔

گزر کرد از آن پس بہ کشتی بر آب
زکشور بہ کشور بر آمد شتاب

جمشید کے سلسلے میں قدیم ماخذ صرف اتنی ہی معلومات فراہم کرتے ہیں لیکن زمانۂ ماقبل تاریخ کے ایک دوسرے بادشاہ ضحاک کا جب یہی قدیم ماخذ ذکر کرتے ہیں تو اس کی آبی مہموں کا بطور خاص ذکر کرتے ہیں جو ظہور اسلام کے بعد لکھے جانے والے شاہناموں میں بھی درج ہیں۔ ضحاک کے سلسلے میں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اس کے ظلم و ستم اور فریدوں کے باپ کے قتل کی وجہ سے عام طور سے ایرانی مورخین اس کو ایک غاصب اور غیر ایرانی بادشاہ قرار دیتے ہیں۔ اس موقع پر اس بحث سے صرف نظر کرتے ہوئے کہ ضحاک ایرانی تھا یا غیر ایرانی، ہادی صاحب نے صرف اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اسدی طوسی کا منظوم شاہنامہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ ضحاک کے بحری بیڑے نے ہندوستان کے مہاراج کی نہ صرف مدد کی بلکہ لنکا کے باغی امیر باہو (فارسی میں اس کو بہو کہا گیا ہے) یا سراندیپ شاہ کی سرکوبی بھی کی تھی۔ اس سلسلے میں اسدی طوسی کے یہ اشعار نقل کیے گئے ہیں جن میں ضحاک اپنے امیر البحر کو حکم دیتا دکھائی دیتا ہے۔

سوی کشور ہند پرواز کن
سراندیپ شہ را زکین ساز کن
بہو را ببند و ز آنجا بیار
بدرگاہ مہراج برکش بدار

اس حملے میں ایرانی فوج کامیاب رہی اور جب یہ فوج اپنے وطن واپس آنے لگی تو مہاراج نے ایک سو بیس کشتیاں اس ایرانی فوج کو بطور تحفہ دیں۔

پیش دادی خاندان کے زوال کے بعد جب زمام سلطنت کیانی حکمرانوں کے ہاتھوں میں آئی تو اس دور میں بھی ایرانیوں کی بحری مہمیں جاری رہیں۔ شاہ نامہ کی رو سے کیانی بادشاہ آبی راستے کے ذریعے مکران تک آیا تھا۔ کیانیوں کے زمانے میں کشتیوں کے علاوہ جہاز بھی بنائے جانے لگے تھے۔ کیکاؤس کے آبی سفر کے سلسلے میں مصر، نیمروز اور مکران کے نام آتے ہیں۔ ہادی حسن صاحب نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ نیمروز کا لفظ سیستان کے لیے اور مکران کا لفظ بلوچستان کے ساحلی علاقے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ہادی حسن صاحب نے ظہور اسلام کے بعد کے مورخین یعنی طبری، مسعودی اور ثعالبی کی تحریروں سے بھی استفادہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ثعالبی نے کیکاؤس کے سلسلے میں جو معلومات درج کی ہیں وہ سب شاہنامۂ فردوسی سے ماخوذ ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ثعالبی نے کہیں کہیں پر شاہنامہ میں درج معلومات کو بالکل مختصر کر کے تحریر کیا ہے اور بعض مقامات پر ان معلومات کو اتنا پھیلا کر تحریر کیا ہے کہ یہ معلومات ایک نئی چیز معلوم ہونے لگی ہیں۔ بہرحال اس باب میں ہادی حسن صاحب نے ان تمام معلومات کو درج کر دیا ہے جو زمانۂ ماقبل تاریخ کے ایرانیہ بحریہ کے وجود پر روشنی ڈالتی ہیں۔

شاہنامہ میں زمانہ ماقبل تاریخ کے بادشاہوں کی جن آبی مہموں کی عکاسی کی گئی ہے ان پر بعض مستشرقین نے اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ شاہنامہ کے اشعار سمندر کا تفصیلی ذکر نہیں کرتے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایرانی قوم فردوسی کے عہد تک سمندری سفر کے احوال و کوائف سے بے خبر تھی۔ ان مستشرقین نے فردوسی کی فراہم کردہ بعض معلومات کو بھی غلط ثابت کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاہنامہ میں جن آبی مہموں کا ذکر ہے وہ شاعر کی تخیل کی پیدا کردہ ہیں اصل و حقیقی نہیں ہیں اور اسی بات کو بنیاد بنا کر انھوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ایرانی قوم اس زمانے تک سمندر اور سمندری سفر سے بیزار تھی۔ ہادی حسن صاحب نے مستشرقین کی تمام بحث کو سمیٹتے ہوئے مستشرقین سے یہ چبھتا سوال کیا ہے کہ اگر فردوسی نے سمندر کی صحیح تصویر کشی نہیں کی ہے تو اس سے یہ بات کہاں ثابت ہوتی ہے کہ کیکاؤس اور کیخسرو کی آبی مہم کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے؟ اسی طرح اگر اسدی سمندر کے احوال و کوائف سے پوری طرح باخبر نہیں ہے تو اس سے یہ نتیجہ کیسے برآمد کیا جا سکتا ہے کہ گرشاسپ کی آبی مہم شاعر کے ذہن و دماغ کی اختراع ہے اور گرشاسپ کا کوئی بحری بیڑا تھا ہی نہیں۔ اسی لیے ہادی حسن صاحب کا خیال ہے کہ شاہنامہ اور گرشاسپ نامہ میں جو کچھ مندرج ہے اس کا ہوشمندی سے مطالعہ کرنا چاہیے اور کیکاؤس اور گرشاسپ کی شخصیتوں کے گرد جو اساطیری دھند چھا گئی ہے اس سے صرف نظر کرتے ہوئے ان کی اصل اور حقیقی شخصیت کی بازیافت کرنی چاہیے۔ ایرانی بحریہ کے ان ابتدائی نقوش کی نشان دہی کرنے کے بعد وہ ہخامنشی دور کے بحریہ کا مطالعہ پیش کرتے ہیں۔

ہخامنشیوں کی جو تاریخ ہم تک پہنچی ہے وہ بڑی حد تک مصدقہ ہے کیوں کہ یونانی مورخ ہیروڈوٹس [Herodotous] نے اس زمانے کے کوائف و حالات کو اپنی کتاب میں محفوظ کر دیا ہے۔ ہخامنشی خاندان کی تاریخ ہم کو یہ بتلاتی ہے کہ یہ نسل ایک "زراعت پیشہ" نسل تھی جس کو دریاؤں اور سمندروں سے کوئی خاص سروکار نہ تھا اس لیے اس خاندان کے حکمراں اول اول تو اپنے ملک کی بحریہ سے بے نیاز رہے مگر جب ان کو یہ محسوس ہونے لگا کہ ان کی حکومت کی بقا کے لیے سمندر پر بھی اُن کی حکمرانی ضروری ہے تو وہ اپنی بحریہ کی ترتیب و تشکیل میں مصروف ہوئے۔ قدیم ایران کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نسل کے لوگ کشتی یا جہاز سازی میں کوئی خاص درک نہ رکھتے تھے لیکن ان کے زیر نگین جو قومیں تھیں وہ اس فن میں ماہر تھیں اس لیے کشتی اور جہاز رانی کا کام ان ہی غلام قوموں کے سپرد کر دیا گیا اُن کی نگرانی ہخامنشی خاندان کے لوگ کرتے اس طرح رفتہ رفتہ ہخامنشیوں نے اپنی بحری طاقت بڑھائی اور ایک دن سمندر پر بھی اُن کی حکمرانی مسلّم ہو گئی۔ اسی خاندان کے مشہور ترین بادشاہ داریوش [DARIUS] نے دریائے نیل سے سوئز تک کی وسیع و عریض نہر بنوائی جو آج بھی باقی ہے داریوش نے اس نہر کے بن جانے اور جاری ہو جانے کے بعد جو کتبہ وہاں لگوایا تھا اس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

"بادشاہ داریوش کہتا ہے، میں ایک ایرانی ہوں
اور میں نے ایرانیوں کی مدد سے مصر کو فتح کیا ہے۔
میں نے حکم دیا کہ دریائے نیل جو کہ مصر میں بہتا ہے،
سے لے کر اس سمندر تک نہر کھود دی جائے جو نواح
ایران میں بہتا ہے جس طرح میں نے حکم دیا اُسی
طرح یہ نہر کھودی اور بنائی گئی"۔

داریوش نے اپنی حکمت عملی سے مصر کے علاوہ بابل کو بھی مسخر کر لیا تھا۔ بابل کے لوگ تو اس سے شدید نفرت کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بابل کی حکومت ہخامنشیوں کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ مگر مصر کے لوگوں میں داریوش کی بڑی عزت و وقعت تھی وہ جب تک زندہ رہا اہالیان مصر اس کی تعظیم و تکریم کرتے رہے اور جب مر گیا تو یہی مصری اس کی پرستش کرنے لگے۔ اس زمانے میں ہخامنشیوں کی سمندر پر حکمرانی تھی۔ اول اول اس کا یہ حال تھا کہ جہاز یا کشتی پر صرف ایرانی جھنڈا ہوتا اور جہاز راں اور سارا عملہ دیگر قوموں کے غلاموں پر مشتمل ہوتا۔ اس کے کچھ دنوں بعد ایرانی جھنڈے کے ساتھ ساتھ ایرانی آفیسر بھی مقرر ہونے لگے۔

ہوتے ہوتے بات یہاں تک پہنچی کہ ایرانی افراد کو امیر البحر مقرر کیا جانے لگا اور دیکھتے دیکھتے سمندر پر ہخامنشیوں کی حکمرانی مسلم ہو گئی۔ ایک عرصے تک یہ صورت حال قایم رہی۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہخامنشیوں نے فن جہاز سازی میں کوئی پیش رفت نہ کی تھی بلکہ ان کی ساری بحری قوت دوسری اقوام کی رہینِ منت تھی۔ اس لیے جب سکندر نے ایران پر بحری راستے سے حملہ کیا تو ہخامنشی خاندان اپنا دفاع نہ کر سکا اور ایران اس کے ہاتھوں سے نکل کر سکندر اور اس کے بعد اس کی اولاد کے ہاتھوں میں چلا گیا۔

ہخامنشی اور ساسانیوں کے دورِ حکومت کے درمیانی عرصے میں ایران پر یونان کی بھی حکمرانی رہی۔ جو فن جہاز سازی سے بخوبی واقف تھے اور اشکانیوں کی بھی جو خالص ایرانی النسل خاندان تھا۔ اس لیے ہادی حسن صاحب نے اپنی کتاب کا تیسرا باب اس مطالعے کے لیے مخصوص کیا ہے کہ ساسانیوں کی حکومت قایم ہونے سے قبل سرزمین مشرق میں تجارت کی صورت حال کیا تھی اور کن کن ملکوں کے لوگ کہاں کہاں کی تجارت پر چھائے ہوئے تھے؟ ایرانی بحریہ کی تاریخ لکھتے وقت اس موضوع کو زیر بحث لانا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب غور سے اس باب کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہادی حسن صاحب نے کس حکمت کے تحت اس موضوع سے بحث کی ہے۔ اس باب کا چند الفاظ میں خلاصہ یہ ہے کہ ایرانیوں نے جب تک سمندر کو اپنی آماجگاہ نہیں بنایا تھا، مشرق کے ساحلی علاقوں کی تقریباً تمام تجارت پر عربوں کے مختلف قبیلوں کا قبضہ تھا۔ صرف سلک کی تجارت پر چینیوں کی اجارہ داری تھی اور وہی پورے مشرق میں سلک برآمد کیا کرتے تھے۔ یہ صورت حال یونانیوں کے زمانے کے ایران میں بھی باقی رہی اور اُس ایران میں بھی جس کو اشکانیوں کے عہد کا ایران کہا جاتا ہے۔ اشکانیوں کے زوال کے بعد جب ساسانیوں کی حکومت قایم ہوئی تو جنگی ضرورت کے علاوہ تجارتی ضرورت کے تحت ایرانیوں نے بحریہ پر خاص توجہ دی اور اپنی بحریہ کی تنظیم نو کر کے ایرانی بھی مشرق کی تجارت میں دخیل ہو گئے۔ اس سلسلے میں ایرانیوں کو رومی اور عرب تاجروں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن اب انھوں نے بحریہ میں اتنی ترقی کر لی تھی کہ وہ اِن اقوام سے تجارت کے میدان میں نہ صرف مقابلہ کرنے لگے بلکہ تجارت پر بھی حاوی ہو گئے۔ اس صورتِ حال کو سمجھے بغیر ساسانیوں کے زمانے کے بحریہ کو سمجھنا مشکل تھا۔ اس لیے ہادی حسن صاحب نے یہ باب لکھ کر اس سے ایک تمہید کا کام لیا ہے۔ اصل موضوع اس کے بعد شروع ہوتا ہے جس پر آئندہ سطور میں روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

اس طویل باب میں ہادی حسن صاحب نے ساسانیوں کے زمانے کے ایران کی تمدنی، معاشرتی اور سیاسی پیش رفت کا بڑی دقت نظری سے جائزہ لیا ہے اور اس سلسلے میں اُن کو مشرقی اور مغربی مورخین کے یہاں سے جو بھی مواد دستیاب ہو سکا ہے، اس کو اپنے نقد و تبصرہ کے ساتھ جمع کر کے اس دور کی بڑی اچھی تصویر کشی کی ہے۔ اس باب میں انھوں نے یہ دکھلایا ہے کہ ساسانیوں نے کس طرح اپنی برّی طاقت کو بڑھا کر اپنے ملک کو مزید استحکام بخشا، برّی طاقت کے بڑھنے کے ساتھ ان کی بحری طاقت بھی بڑھتی رہی اور ایرانی بحریہ کا شمار مضبوط بحریوں میں ہونے لگا۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہادی حسن صاحب نے اس دور کے بارے میں جو تاریخی مواد مختلف کتابوں میں ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا، اس کو بڑے دلکش اور جاذب نظر انداز سے یکجا کر دیا ہے مگر اس عہد کی بحریہ کی جو تصویر وہ پیش کرتے ہیں ہمارے نزدیک وہ دھندلی دھندلی سی ہے۔ اس باب کو پڑھ کر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ساسانیوں کے زمانے میں جہاز سازی میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں؟ اس عہد میں جہاز کس طرز اور کس انداز کے بنائے جاتے تھے؟ سفینہ، زورق اور کشتی میں کیا فرق ہوتا تھا؟ کشتی کے لفظ کا اطلاق صرف BOAT پر ہوتا تھا یا اس سے کبھی کبھی جہاز بھی مراد لیا جاتا تھا؟ اسی طرح زورق کا صحیح مفہوم کیا ہے اور زورق و کشتی میں کیا فرق و اختلاف ہے۔ سفینہ کا لفظ صرف جہاز کے لیے مخصوص تھا یا اس سے کبھی کبھی بڑی کشتی بھی مراد لی جاتی تھی؟ اگر ہادی حسن صاحب نے ان تمام باتوں کا بھی احاطہ کر لیا ہوتا تو اس کتاب کا یہ باب نہ صرف یہ کہ جامع ہوتا بلکہ ایرانی بحریہ کی تاریخ پر مکمل اور بھرپور روشنی بھی ڈالتا۔ موجودہ صورت میں تو یہ باب اُس دور کے ایران کی سیاسی، ثقافتی اور تجارتی پیش رفت پر تو منصفانہ انداز سے نظر ڈالتا

ملر ایران کی بحریہ کی جو تصویر کشی کرتا ہے وہ مبہم اور غیر واضح
ہے۔

ساسانیوں کے دور کے ایرانی بحریہ سے بحث کرنے کے بعد
ی حسن صاحب نے اسلام کے ابتدائی دور کے ایرانی بحریہ کو اپنے
طالعے کا موضوع بنایا ہے جیسا کہ معلوم ہے عربوں کے زیر نگیں آنے
ے بعد بھی ایرانیوں نے نہ تو اپنی انفرادیت کھوئی اور نہ ہی اپنی زبان
رکوئی آنچ آنے دی ۔ مقتضائے وقت کے مطابق اپنا رسم الخط ضرور
بدیل کیا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں ایرانیوں کی بحری راستے کے ذریعے
بنی تجارت بحال رہی۔ اس دور سے پہلے وہ حمیریوں کے ذریعے سلک
درآمد کیا کرتے۔ لیکن ظہور اسلام کے بعد سلک کی درآمد براہ
راست ان کے ہاتھوں میں آگئی اور حمیریوں کی اجارہ داری ختم ہو گئی
اس باب کو مرتب کرنے کے لیے ہادی حسن صاحب نے متعدد چینی
سیّاحوں کے سفر ناموں کا بغور مطالعہ کر کے، اس زمانے کے ایرانیوں
کی تجارت پر بڑی بھرپور نظر ڈالی ہے اور اس کی جو بھی جزئیات ان
کو مل سکی ہیں ان تمام کو انھوں نے بڑے منطقی انداز سے جمع کر دیا
ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ہمارے نزدیک "بحریہ کی تاریخ"
تجارت کی تاریخ سے بالکل جداگانہ نوعیت کی چیز ہوتی ہے۔ اس
کتاب کے پہلے باب میں ہادی حسن صاحب نے جس طرح ایرانی بحریہ
کا تعارف کرایا ہے، زیر بحث باب میں اس طرح کا کوئی تعارف
نہیں ملتا۔ بلکہ اُن کا سارا زور اس بات پر صرف ہوتا ہے کہ عربوں
کے غلبے کے باوجود ایران کی سمندری تجارت، ایرانیوں کے ہاتھوں میں
رہی اور وہ اپنا مال لے کر دنیا کے دور دراز ملکوں کا سفر کرتے
تھے۔ تاریخی حقایق کی حیثیت سے یہ باب نہ صرف یہ کہ بہت اہم ہے بلکہ
اس کو تحقیق کا بھی ایک اعلیٰ نمونہ کہا جائے گا۔ مگر اس باب کے مطالعے
سے بھی ہم کو اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ ایرانیوں نے ظہور اسلام کے
بعد جہاز سازی میں کیا کیا ترقی کی اور اس دور کی جہاز سازی
گزشتہ دور کی جہاز سازی سے کس حد تک اور کس قدر مختلف
ہے؟

اس کے بعد ہادی حسن صاحب نے دسویں صدی عیسوی سے
لے کر سولھویں صدی عیسوی تک کے ایرانی بحریہ کو اپنی تحقیق کا موضوع
بنایا ہے۔ تاریخی اور تحقیقی اعتبار سے یہ باب بھی بڑی کد و کاوش
اور دیدہ ریزی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ قدیم عرب سیاحوں اور جغرافیہ
نویسوں نے اس زمانے کے ایران کی بحری تجارت کے بارے میں جو کچھ
بھی لکھا ہے ان تمام اطلاعات سے اس باب میں نہ صرف فائدہ اُٹھایا
گیا ہے بلکہ ان پر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے بعض نئے امور کی طرف
بھی اشارے کیے گئے ہیں۔ لیکن اس باب میں بھی ہم کو یہی کمی محسوس
ہوتی ہے کہ اس میں تجارت کی تاریخ تو بڑے مفصل اور عالمانہ انداز
سے مرتب کر دی گئی ہے مگر بحریہ کی پیش رفت پر اتنا زور نہیں
صرف کیا گیا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس باب کے آخر میں تاریخ
بیہقی سے ایسے اقتباسات دیے گئے ہیں جن سے ایرانیوں کی کشتی
رانی پر روشنی پڑتی ہے۔ بیہقی کے اقتباسات سے ایک نئی الجھن
یہ پیدا ہوتی ہے کہ اس نے جس نوع کی کشتیوں کا ذکر کیا ہے وہ ابتدائی
عہد کی کشتیوں کے مماثل ہیں۔ اس لیے ہادی حسن صاحب کے ذہن
میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ان "آن گھڑ" کشتیوں کے ذریعے سوئز سے
لے کر چین کی بندرگاہوں تک کس طرح سفر کیا جاتا رہا ہوگا۔ اس
سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

"مجھے اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ بحری سفر
کے قابل دریاؤں کی قلّت اور رفتہ رفتہ کر کے معلوم
ہونے والے بحری راستوں کے تطابق ہی میں اس سوال کا
جواب مضمر ہے (یہ تطابق اس لیے بھی اہم ہے کہ) ایران
میں بحری سفر کے قابل صرف ایک ہی دریا ہے جس کا نام
کارون ہے اور یہ دریا بھی اہواز سے بحری سفر
کے قابل ہوتا ہے۔" (ص ۱۵۰)

اس باب کو پڑھنے کے بعد ہمارے نزدیک ایرانیوں کی جہاز
رانی کا مسئلہ کچھ اور الجھتا نظر آتا ہے۔ کیوں کہ پروفیسر ہادی حسن
صاحب نے قدیم فارسی کتابوں سے جو حوالے دیے ہیں اُن سے اگر
ایک طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں کی بحری تجارت میں پیش رفت
ہوئی اور وہ دور دراز ملکوں تک پہنچنے لگے تو دوسری طرف یہ

احساس بھی ہوتا ہے کہ وہ لوگ جن کشتیوں پر سفر کرتے تھے وہ ترقی یافتہ بڑی کشتیاں یا جہاز نہ ہوتے تھے بلکہ ابتدائی زمانے کی کشتیوں کی شکل کی کوئی چیز ہوتی تھی۔ ہادی حسن صاحب نے ایرانیوں کی جہاز رانی کے سلسلے میں جو بھی مواد دستیاب ہو سکتا تھا، ان سب کو اکٹھا کر دیا ہے۔ اگر اس مواد کی روشنی میں ایرانیوں کی جہاز رانی کی واضح تصویر نہیں ابھرتی تو اس میں نہ تو تحقیق کی خامی کا دخل ہے اور نہ ہی کسی کوتاہی کا بلکہ قلتِ مواد کا دخل ہے، ان کا کارنامہ یہ ہے کہ قلتِ مواد کے باوجود انھوں نے ایرانی بحریہ کی تاریخ مرتب کرنے کی امکانی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کا آخری باب علمی اعتبار سے بہت اہم ہے جس میں ہادی حسن صاحب نے ایرانیوں کی جہاز رانی پر فارسی ادبیات کی مدد سے شواہد پیش کیے ہیں، اس کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم اس باب پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

فارسی ادبیات میں بہت سی ایسی حکایتیں یا واقعات ملتے ہیں جن کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایران کے لوگ بحری سفر یا خود دریاؤں سے ڈرتے تھے۔ مثال کے طور پر اپنے زمانے کے مشہور ترین طبیب ذکریائے رازی کا ایک واقعہ نقل کرنے کے قابل ہے جس کو نظامی عروضی سمرقندی نے "چہار مقالہ" میں درج کیا ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ عماد الدین پیروز شاہ نے جو کہ ترمذ میں مقیم تھا ذکریائے رازی کو طلب کیا۔ ترمذ جانے کے لیے دریائے جیحوں کو پار کرنا ضروری تھا۔ اس لیے جب ذکریائے رازی جیحوں کے کنارے پہنچا اور اس نے دریا کی کیفیت دیکھی تو اپنے ہوش و حواس کھو دیے اور اس نے یہ کہہ کر بحری سفر سے انکار کیا کہ " خداوند تعالیٰ کا فرمان ہے کہ خود کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں مبتلا نہ کرو، اس لیے یہ دانائی نہ ہوگی کہ میں ایسے پر خطر دریا میں سفر کروں۔" لیکن چوں کہ اس کو طلب کیا گیا تھا اس لیے عمال نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک بنڈل کی طرح کشتی میں ڈال دیا اور منزل مقصود پر پہنچ کر ہی اس کو کھولا گیا۔

اسی طرح بہت سے ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایرانیوں کو بحری سفر سے کتنا ڈر معلوم ہوتا تھا۔

ہادی حسن صاحب نے اس سلسلے میں انوری اور معزی کے اشعار شواہد کے طور پر پیش کیے ہیں۔ اسی طرح عبدالرزاق نے نثر میں اور حافظ نے شعر میں بحری سفر سے اپنے خوف کا اظہار کیا ہے۔ ظہور اسلام کے بعد کی فارسی شاعری اور نثر میں اس طرح کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایرانی بحری سفر کے عادی نہ تھے۔ غالباً ان ہی روایتوں، حکایتوں اور اشعار کی روشنی میں پروفیسر نولدیکی نے فردوسی کے ان اشعار پر گرفت کی ہے جو اس نے قدیم ایرانی بادشاہوں کے سفر کے سلسلے میں لکھے ہیں۔ خاص طور پر نولدیکی نے فردوسی کے ان اشعار پر اعتراضات کیے ہیں جو فردوسی نے کیخسرو کے بحری سفر کے سلسلے میں نظم کیے ہیں۔ ہادی حسن صاحب نے نولدیکی کے اعتراضات کا بڑے ہی عالمانہ انداز سے جائزہ لے کر فارسی شعر کی بہت سی گرہوں کو کھولنے کی سعی بلیغ کی ہے۔ جس کو مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

ہادی حسن صاحب نے سب سے پہلے تو شاعرانہ صناعی یا حسن کاری اور عدم واقفیت کے درمیان خط فاصل کھینچا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ فردوسی کے اشعار اس کی عدم واقفیت کی تصویر کشی نہیں کرتے بلکہ اس کی شاعرانہ صناعی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے نولدیکی کے تمام شکوک و شبہات کو رد کرتے ہوئے فارسی ادبیات سے دوسری مثالوں کے ذریعے اپنی بات کی وضاحت کی ہے۔ مثلاً انھوں نے مثنوی مولانا روم کی ایک حکایت نقل کی ہے جو ایک ایسے بط کے بچے کی تصویر کشی کرتی ہے، جس کو ایک پالتو مرغی نے اپنے پروں کے نیچے سے کر نکالا ہے۔ بط کے بچے نے مرغی کا کوئی اثر قبول نہیں کیا بلکہ پیدا ہونے کے بعد ہی عازم دریا ہو گیا۔

اس حکایت میں ہادی حسن صاحب کے نزدیک تین علامتوں (symbols) سے کام لیا گیا ہے۔ ایک تو بیکراں سمندر ہے جو خدا کے بے جہت اور لامکان و لازمان ہونے کی علامت ہے۔ بط کا بچہ انسان کی علامت کے طور پر اس نظم پارہ میں پیش کیا گیا ہے۔ بط کے بچے کا پیدا ہوتے ہی دریا کی طرف جانا، انسان کی اپنی اصل کی طرف مراجعت کی علامت ہے۔ اس حکایت میں خدا کے لیے جس سمندر کو علامت کے طور

پر استعمال کیا گیا ہے، اس کو بط کے بچے کی مناسبت سے شاعر کو محدود کر دینا پڑا ہے اور وہ بظاہر ایک ایسا تالاب نظر آنے لگا ہے جس کے چاروں طرف خاردار تار لگے ہوئے ہیں۔ ہادی حسن صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ شاعرانہ صناعی کا تقاضا یہی تھا کہ لامحدود کو محدود کی شکل میں پیش کیا جائے تاکہ تصویر کا رنگ و روغن صحیح طور پر ابھر سکے۔ اسی طرح شاعرانہ صناعی کے لیے فردوسی کو بھی کچھ تصرفات کرنے پڑے جن کو بنیاد بنا کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فردوسی سمندر کے احوال و کوائف سے بے خبر تھا اور اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ واقعہ نہیں ایک خیالی تصویر ہے۔ اپنی بات واضح کرنے کے لیے ہادی حسن صاحب نے مغربی ادبیات سے بھی اسی طرح کی مثالیں دی ہیں اور خاص طور سے ورڈزورتھ Wordsworth اور بودلیر Baudelaire کے اشعار نقل کر کے ان کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی بات کہی ہے:

اختتام کلام کے طور پر انھوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایران کے میدانی علاقوں اور خلیج فارس کے پاس بسنے والے ایرانیوں کے درمیان ہم کو ایک خط فاصل کھینچنا ہوگا تاکہ غلط بحث کا امکان نہ رہے اپنی بات کی وضاحت کے لیے انھوں نے صابئی عربوں اور بدوؤں کی مثال پیش کی ہے۔ صابئی عرب بحری سفر کے عادی اور سمندر سے محبت کرنے والے لوگ تھے۔ اس کے برخلاف بدوؤں کو ریگ زاروں کا سفر بھاتا تھا۔ یہی حال ایرانیوں کا بھی تھا۔ مگر اس صورت حال سے سر جان مالکم نے بہت غلط نتیجہ اخذ کیا ہے اور انھوں نے خلیج فارس کے آس پاس رہنے والے تمام افراد کو چوں کہ وہ بحری سفر کرنے والے تھے عربوں کی اولاد قرار دیا ہے۔ پروفیسر ہادی حسن صاحب نے اس بات سے اختلاف کرتے ہوئے اس کو ایک قیاس قرار دیا ہے اور تحریر کیا ہے کہ صفویوں کے دور سے پہلے جو بحری بیڑے تھے ان میں داریوش، اردشیر پاپکان اور شاہپور اعظم کے بحری بیڑے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان بحری بیڑوں نے دور دراز کے ملکوں میں تاخت و تاز کی اور کامیاب و کامران ہو کر وطن واپس آئے۔ ان بیڑوں سے وابستہ عملہ عرب نہ تھا۔ اس سلسلے میں ہادی حسن صاحب نے مقدسی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:

"جزیرہ نمائے عرب میں جتنے بھی جہاز راں یا جہاز ساز تھے وہ سب کے سب ایرانی النسل تھے۔"

مقدسی کی اس عبارت سے ایرانیوں کی جہاز رانی اور جہاز سازی کا مزید ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

ہادی حسن صاحب کی یہ کتاب ۱۹۲۸ء میں لندن سے شائع ہوئی تھی۔ اٹھاون برس کا زمانہ گزر جانے کی وجہ سے اس موضوع پر نئی نئی معلومات فراہم ہو گئی ہیں۔ بہت سے نئے کتبوں کا پتہ چلا لیا گیا ہے اور ان کے معانی و مفاہیم متعین کر لیے گئے ہیں۔ ان تمام نئی معلومات کی روشنی میں اگر اس کتاب کو نئے سرے سے مرتب کر دیا جائے تو یہ ہادی حسن صاحب کی خدمت ہونے کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی بھی ایک بڑی خدمت ہوگی۔

حواشی

۱ اگر اس تحریر کا مکمل حوالہ دے دیا جاتا تو نئی نسل کے لیے زیادہ فائدہ مند ہوتا۔

۲ ہمایوں کے دیوان کا یہ مخطوطہ پروفیسر سید حسن عسکری صاحب نے دریافت کیا تھا اور اس کا بھرپور تعارف حافظ شمس الدین احمد شعبہ فارسی پٹنہ کالج نے رسالہ معیار کی کئی قسطوں میں کرایا تھا (میں اس اطلاع کے لیے پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کا شکر گزار ہوں)۔

۳ یہ سوانحی معلومات ڈاکٹر شمعون اسرائیلی کی انگریزی تحریر مطبوعہ انڈو ایرانیکا جلد ۱۶ نمبر ۲ جون ۱۹۶۳ء ص ۱۰۲-۱۰۳ سے ماخوذ ہیں۔

۴ بہت سے مورخین کے نزدیک آل ماد اور آل پارس کا تعلق بھی زمانہ ما قبل تاریخ سے ہے۔

۵ مزید تفصیل کے لیے میری کتاب ذبیح اللہ صفا۔ حیات اور کارنامے مطبوعہ ترقی اردو بورڈ دہلی جولائی ۱۹۸۳ء ملاحظہ ہو۔

سعید انصاری*

ای۔سی۔جی

ایک دفعہ ایک مریض میرے پاس ای۔سی۔جی کرانے آیا۔ اسے ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ شاید اسے عارضۂ قلب ہے، اس لیے پہلے ای۔سی۔جی کرالو۔ پھر صحیح تشخیص ہو سکے گی۔

وہ ای۔سی۔جی کے بارے میں مجھ سے عجیب وغریب سوال کرنے لگا۔ اس نے مجھ سے پوچھا:

"کیا واقعی مجھے دل کی تکلیف ہے؟"

میں نے الٹا اس سے پوچھ لیا:

"آپ جانتے ہیں دل کیا ہے؟"

اس سوال پر وہ ہونقوں کی طرح میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اسے دل کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔

میں نے اسے بتایا اور اپنی کتابوں سے تصویریں بھی دکھائیں کہ دل سینے کے جوف میں دونوں پھیپھڑوں کے درمیان کسی قدر بائیں طرف کو ہٹا ہوا جو تھی، پانچویں اور چھٹی پسلیوں کے نیچے واقع ہوتا ہے۔ اس کے گرد ایک رطوبت پیدا کرنے والی جھلی لپٹی ہوئی ہوتی ہے اس جھلی سے جو رطوبت نکلتی ہے، وہ دل کو تر رکھتی ہے۔ پردۂ شکم (ڈایافرام) دل کو نیچے سے سہارا دیتا ہے۔ دل کے عین نیچے پردۂ شکم کے دوسری طرف معدہ واقع ہے۔ یہ اعضا ایک دوسرے کے اس قدر قریب ہیں کہ اگر ایک کے کام میں فرق پڑتا ہے تو اس کا اثر دوسرے پر بھی پڑتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ وہ مریض میری گفتگو بڑے اشتیاق سے سن رہا تھا۔ زندگی بھر اس نے دل کی پروا نہ کی، لیکن اب دل کا معاملہ زندگی اور موت کا مسئلہ بن کر اس کے سامنے تھا تو وہ اس کے بارے میں میری گفتگو انہماک سے سن رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا:

"دل پمپ کی طرح اندر سے ایک کھوکھلا عضو ہے، جس کی دیواریں عضلات کا کام کرتی ہیں۔ اگر دل کو چیر کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دل کے چار حصے ہوتے ہیں۔ اوپر کے دونوں حصے چھوٹے ہوتے ہیں اور اذن کہلاتے ہیں۔ نیچے کے دونوں حصے بڑے ہوتے ہیں اور بطن کہلاتے ہیں۔ درمیانی دیوار دل کو چار حصوں میں اس طرح تقسیم کرتی ہے کہ دائیں بائیں حصوں کے درمیان خون کے گزرنے کا کوئی راستہ نہیں رہتا۔ دونوں اذن کی تلی میں راستہ ہوتا ہے جس کے ذریعے خون اذن سے بطن میں جاتا ہے۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ خون ہمیشہ اذن سے بطن میں جاتا ہے۔ اس کی مخالف سمت میں کبھی نہیں جا سکتا۔ کیونکہ ان کے درمیان راستوں پر

---

*ڈاکٹر سعید انصاری، سمن آباد۔ لاہور۔ پاکستان

والو لگے ہوتے ہیں۔"

مریض صبر نہ کرسکا۔ اس نے کہا:

"میں سب سمجھ گیا ــــ یہ ای سی جی کیا ہوتا ہے؟"

میں نے کہا: "تم کچھ بھی نہیں سمجھے۔ دل کی کہانی بہت لمبی ہے اور دلچسپ بھی۔ بہرحال ایک نکتہ اور یاد رکھو۔ دل کے پمپ میں خون جمع ہوتا رہتا ہے اور دل سے نکلتا بھی رہتا ہے۔ دل سے خون نکل کر جسم کا دورہ کرتا ہوا پھر دل میں واپس آجاتا ہے۔ جن نالیوں کے ذریعے خون اس طرح چکر کاٹتا ہے، اس کو خون کی نالیاں کہتے ہیں۔ خون کی بعض نالیاں موٹی ہوتی ہیں اور بعض بال سے بھی زیادہ باریک ہوتی ہیں۔ یہ نالیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ وہ نالیاں جو دل سے خون جسم کے مختلف حصّوں کو لے جاتی ہیں، ان کو شریان کہتے ہیں اور جو نالیاں جسم کے مختلف حصوں سے دل کو خون واپس لاتی ہیں، اُن کو ورید کہتے ہیں۔"

جس طرح گھڑی میں ایک سکنڈ کے بعد دوسرے سکنڈ کی ٹک کی آواز آتی ہے یا جس طرح ایک نبض کے بعد دوسری نبض دھڑکتی ہے، بالکل اسی طرح دل کے دونوں خانے اذن اور بطن انتہائی خوش آہنگی کے ساتھ یکے بعد دیگرے سکڑتے اور پھیلتے ہیں پہلے اذن والے حصّے سکڑتے ہیں اور وریدوں کی طرف آیا ہوا خون بطن کی طرف منتقل کرتے ہیں۔ پھر بطن والے حصّے سکڑتے ہیں اور خون کو شریانوں میں پھینکتے ہیں۔

"تو گویا اس طرح ایک تسلسل، تواتر اور ہم آہنگی قایم ہوجاتی ہے۔ یہ میں سمجھ گیا۔" اس مریض نے اطمینان سے کہا۔

میں نے کہا: "یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اذن اور بطن کے مابین یہ تسلسل یونہی قایم نہیں ہوجاتا۔ بلکہ قدرت نے اس کو قایم رکھنے کے لیے دل کے اندر ایک عجیب کارخانہ لگا رکھا ہے۔ داہنے اذن کے اوپر والے حصّے پر ایک ننھی سی گانٹھ ہوتی ہے۔ اس گانٹھ سے برقی رو اٹھتی ہے جو دونوں اذن اور دونوں بطن میں سے گزر کر پورے جسم میں پھیل جاتی ہے۔ جب آپ سوئچ دباتے ہیں تو بجلی کا کرنٹ تاروں کے اندر سے ہوتا ہوا بلب تک پہنچ جاتا ہے۔ بالکل یہی عمل کارخانۂ دل میں دہرایا جاتا ہے۔ جب برقی رو دل کے عضلات سے گزرتی ہے تو اس کی وجہ سے اذن اور بطن سکڑتے ہیں اور خون پھینکتے ہیں۔ دل کے خانوں سے فقط خون ہی نہیں گزرتا، خون کے ساتھ ساتھ برقی رو بھی گزرتی ہیں جو شریانوں اور وریدوں کے ذریعے پورے جسم میں جاتی ہیں۔

مریض نے پوچھا:

"لیکن برقی رو کا سراغ کیوں کر لگتا ہے؟"

میں نے کہا:

"اسی طرف آرہا ہوں۔ اذن اور بطن کی طرح برقی روئیں ایک قدرتی تسلسل اور ہم آہنگی کے ساتھ اُٹھتی اور پھیلتی ہیں اور نظم کے ساتھ پورے جسم میں خون کے ساتھ ہر جگہ اور ہر وقت موجود ہوتی ہیں۔ اُن کا سراغ لگانا ہو تو جسم کے کسی بھی حصّے پر، کسی بھی حساس برقیرے (الیکٹروڈ) رکھ کر دریافت کرلو۔ جب آدمی لیٹا آرام کر رہا ہو تو اس وقت صرف دل کے عضلات سے برقی رواں ہوتی ہے اور جب آدمی سرگرم عمل ہو، کوئی کام کر رہا ہو، بھاگ رہا ہو، ورزش کر رہا ہو تو جسم کے ایک ایک عضو سے برقی روئیں اٹھ

بس آرام کی حالت میں آدمی کے جسم کے مقررہ حصّوں سے بر مَس کیے جائیں تو وہ صرف اس برقی رو کو اپنی گرفت میں لے لیں گے فقط دل کے سکڑنے اور پھیلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس برقی رو کو افزوں گر (ایمپلی فائر) میں لے جایا جاتا ہے جو اس کی طاقت کو گنا زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ افزوں گر کے بعد اس کو برقناطیسی آلے لے جایا جاتا ہے جس کے عین وسط میں ایک نہایت باریک سوئی جیسا یافتہ قلم لگا ہوتا ہے۔ یہ قلم برقی رو کی قوت، سمت اور اتار چڑھا درج کرتا جاتا ہے۔ برقی رو اوپر کی طرف جاتی ہے تو قلم بھی اوپر کی جاتا ہے اور برقی رو نیچے کی طرف جاتی ہے تو قلم بھی نیچے کی طرف جا قوت زیادہ شدید ہوتی ہے تو قلم موٹا ہوجاتا ہے۔ قوت قدرے کم ہو تو قلم بھی خفیف ہوجاتا ہے۔ کاغذ جس پر اندراج ہوتا ہے، کاغذ کا بنا ہوتا ہے، جس پر موم کی قسم کا ایک مسالہ پھرا ہوتا ہے جو حرارت سے پگھل جاتا ہے۔ حرارت یافتہ قلم کی جنبش سے موم کا مسالہ پگھل جا اور اندراج کا نشان تحریری سطروں کی طرح صاف نظر آنے لگتا ہے۔

اِس تحریر کو ای ۔سی ۔جی کہتے ہیں یعنی الیکٹرو کارڈیو گرام' دل کی برقی حرکات کا گراف ۔ اس گراف کی تشریح اور وضاحت ان اصولوں اور معیاروں کے مطابق کی جاتی ہے جو چند سال قبل ماہرین کی ایک بین الاقوامی کمیٹی نے مقرر کر دیے ہیں، تاکہ دنیا بھر میں گراف بندی اس کی تشریح' اس کی تحقیق یکساں اصول اور معیار کے مطابق ہو سکے۔

تندرست اشخاص اور دل کے مریضوں کے ہزاروں گراف بنائے گئے۔ ان کا مطالعہ کیا گیا اور پھر یہ اصول وضع کیا گیا۔

اس مریض نے کہا: "تو آپ کے خیال میں' میں بھی ای سی جی کرالوں؟"

میں نے کہا: "جب ڈاکٹر ای ۔سی ۔جی کرانے کے لیے کہہ دے تو مریض کو ہرگز تامل نہیں کرنا چاہیے ۔ای سی جی سے ڈاکٹر کا شبہ دور ہو جاتا ہے ۔ دل میں کوئی خامی ہو تو اس کا آسانی سے پتا چل جاتا ہے ۔گیس وغیرہ کی کوئی اور تکلیف ہو تو اس کی بھی تشخیص میں مدد ملتی ہے ۔ای سی جی بے ضرر چیز ہے"۔

مریض نے ای سی جی کا گراف دیکھ رکھا تھا بولا: "ڈاکٹر! گراف اونچی نیچی لہروں کی کیوں کر وضاحت کرتے ہیں؟"

میں نے کہا: "دیکھو بھائی، ان برقی لہروں کی اونچ نیچ' رفتار' شدت اور سائز سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ دل کے چاروں خانے' اذن اور بطن اپنی اپنی جگہ سلامت ہیں یا نہیں ۔ گھٹ یا بڑھ تو نہیں گئے دل کی دھڑکنوں کی رفتار نارمل ہے یا ابنارمل ۔ خون کی گردش کی رفتار درست ہے یا نہیں ۔ ای ۔سی ۔جی کے علاوہ دوسری قسم کے ٹیسٹ بھی ہوتے ہیں ۔ ان سب کا معائنہ کرنے سے مرض کی صحیح تشخیص کرنے میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے"۔

مریض نے پوچھا: ای ۔سی ۔جی میں کچھ حروف لکھے ہوتے ہیں ۔ ان کا کیا مقصد ہوتا ہے؟"

میں نے وضاحت کی: "یہ خاکہ غور سے دیکھو ۔ یہ ایک صحت مند آدمی کا ای ۔سی ۔جی ہے ۔ "P" کا مطلب ہے وہ برقی رَو جو اذن کے سکڑنے سے پیدا ہوتی ہے ۔ QRS کا مطلب ہے وہ برقی رو جو دونوں بطن کے سکڑنے سے پیدا ہوتی ہے ۔ "T" وہ رو ہے جو بطن کے ڈھیلا پڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔

اس نے اب ایک اور ہی سوال کر دیا: "لیکن جسم کے مختلف حصوں پر برقیرے کیوں لگائے جاتے ہیں۔

میں نے کہا: اس لیے کہ جسم کے مختلف حصوں میں موجود برقی رَو کا اندرا جائے۔ پھر یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ مختلف جسمانی حالتوں میں برقی رو کی حالت مختلـ ہے۔ حالت آرام میں کچھ اور' کام کرنے کی حالت میں کچھ اور ۔ بلکہ ورزش کی میں کچھ اور ۔ اسی لیے ایک شخص کے کئی کئی ای ۔سی ۔جی لیے جاـ لسے دوڑایا جاتا ہے اور دوران خون تیز کر کے ای ۔سی ۔جی لیا ہے ۔ پھر اسے آرام سے لٹا کر اس کیفیت میں ای ۔سی ۔جی لیا جا تاکہ خون کی مختلف گردش کے وقت یعنی مختلف برقی شدت کے دل کی حرکات کا جائزہ لیا جا سکے ۔

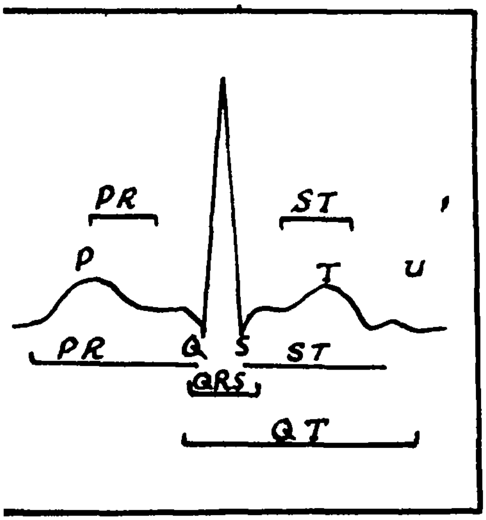
اس نے کہا:

"ڈاکٹر صاحب! کیا مشین سے غلطی نہیں ہو سکتی؟"

میں نے کہا:

"بالکل ہو سکتی ہے اور اکثر ہوتی بھی ہے ۔ای سی جی اتن حساس اور نازک مشین سے لیا جاتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ مشـ کی صفائی کر رکھی گئی ہو' اور اسے احتیاط سے استعمال کیا جائے ۔ بجا سے ای سی جی کا نتیجہ بھی غلط برآمد ہو گا ۔

آیے، آپ کا ای ۔سی ۔جی کر لیتے ہیں ۔



ایس۔ ایس۔ گِل*
ترجمہ/
سیّد شفیق احمد**

مسلمانوں کی گومگو حالت

نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن

ہندو مسلم روابط کی تاریخ کو مدّنظر رکھتے ہوئے مطلقہ مسلم خواتین کی ابتر حالت پر موجودہ اظہار تشویش و ہمدردی بے مثال بھی ہے اور دل کو طمانیت بھی بخشتی ہے۔

نہ صرف روشن خیال و سیکولر ہندو حضرات بلکہ واضح طور پر فرقہ پرست ہندو تنظیمیں بھی اس انسانی مسئلے پر کھل کر اظہار خیال کر رہی ہیں۔ لیکن یہ بات کچھ اس طرح کھٹکتی ہے جیسے کوئی شخص اپنے پڑوسی کی بیوی کی فلاح و بہبود کا ضرورت سے زیادہ خواستگار ہو۔ اس وجہ سے یہ معاملہ کچھ مشتبہ سا لگتا ہے۔

شاہ بانو کیس سے نکلے ہوئے مسایل اگر جزدیاتی طور پر الگ الگ دیکھے جائیں تو وہ نہایت سیدھے سادے ہیں۔ اس بظاہر دردمندانہ فیصلے کے خلاف مسلمان صف آرا ہیں۔ یہ فیصلہ شدید تنازعے کا باعث بن گیا ہے اور "میڈیا" نے اس کو ایک اہم قومی مسئلے میں تبدیل کر دیا ہے۔ ایک ہونہار نوجوان وزیر کو اس مسئلے پر استعفیٰ دینا پڑا اور مرکزی سرکار کو بھی مجبوراً مسلمانوں کے مجروح جذبات کی تشفی کے لیے ایک مبہم بل پاس کرانے میں نہایت عجلت دکھانی پڑی۔

ایک مہذب سوسائٹی کی کیمیائی پرکھ اس بات سے ہوتی ہے کہ اس میں کمزور اور پسماندہ لوگوں پر کتنی توجہ دی جا رہی ہے۔ اس روشنی میں شاہ بانو کیس مقدمے کا فیصلہ غلط نہیں کہا جا سکتا یہ بحث جاری ہے کہ مسلم پرسنل لا' کو وقت کے سانچے میں ڈھلنا چاہیے۔ تاکہ وہ موجودہ زمانے سے مطابقت حاصل کر سکے۔ بہت سے مسلم ممالک نے بھی اس ضمن میں زیادہ آزاد خیالی کی راہ اپنائی ہے

اصل مسئلہ

لیکن کیا اصل مسئلہ یہی ہے جس پر مسلمان اِس قدر چراغ پا ہیں؟ اس سے قبل کہ اس اہم سوال کا جواب دیا جائے ہمیں ہندوستانی مسلمانوں کی نفسیات کا بھی تجزیہ کرنا ہوگا۔ وہ اس احساس سے نجات نہیں پا سکے ہیں کہ وہ 'محصور' ہیں۔ ان کے لیے سماج میں جگہ سکڑتی جا رہی ہے اور اب اس پورے نظام میں ان کے لیے حاشیائی' جگہ رہ گئی ہے۔ ان سے اب یہ کہنا لغو ہوگا کہ وہ ایک آزاد خیال' متحمل اور سیکولر سماج میں رہتے ہیں۔ علی گڑھ' میرٹھ جل گاؤں' جمشید پور' بھیونڈی' بڑودا اور اورنگ آباد کی یادیں ان کی بصیرت پر مثلِ ابر چھائی رہتی ہیں۔ ان کی سمجھ میں کیسے آ سکتا ہے کہ سرکاری نوکریوں میں ان کا تناسب اتنا کم کیوں ہے؟ ملک کی تجارت اور صنعت میں اُن کا حصّہ اتنا حقیر کیوں ہے؟

---

* ایس۔ ایس۔ گِل۔ آئی۔ اے۔ ایس (ریٹائرڈ)۔ سابق سکریٹری، انفارمیشن و براڈکاسٹنگ۔ "دی مسلم انڈیا" مطبوعہ۔ انڈین ایکسپریس۔ ۲۳/اپریل ۱۹۸۶ء

** سیّد شفیق احمد۔ امیر نشاں، علی گڑھ۔

اور قرض دینے والے مالی اداروں سے آخر انھیں کوئی فائدہ کیوں نہیں پہنچ رہا ہے؟ اگرچہ سماجی اور تعلیمی اعتبار سے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ پچھڑا ہوا ہے لیکن پھر بھی مخصوص سرکاری اسکیموں، تعلیمی اداروں اور سرکاری نوکریوں میں اُن کے لیے جگہیں محفوظ نہیں کی جاتیں۔ کچھ رسمی باتیں بھی کہی جا رہی ہیں۔ چونکہ ایک مسلمان چار تک شادیاں کر سکتا ہے لہذا یہ یقین بھی کر لیا جاتا ہے کہ ہر مسلمان ضرور ایسا ہی کرتا ہے۔ زیرِ نظر مطلقہ خواتین کے مسئلے کو ہی لیجیے۔ کیا کسی نے یہ تخمینہ لگایا ہے کہ مطلقہ بے معاش خواتین کا سماج میں کیا فیصد ہے؟ کتنی عورتیں نان و نفقہ سے محروم ہیں؟ ہم میں سے کتنے لوگ واقف ہیں کہ کتنی خواتین نے ناقابل برداشت زندگی گزارنے کے بجائے مٹی کا تیل چھڑک کر خودکشی کرنے کو ترجیح دی ہو۔

شاہ بانو کا مقدمہ

مسلمان شاہ بانو کے مقدمے سے اٹھنے والے شور پر حیران ہیں۔ انھیں اس سے تکلیف پہنچی ہے کہ اُن کے آنکھ کے مچھر کو اونٹ بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ جب کہ غیر مسلموں کے آنکھ کے شہتیر بھی بہ آسانی نظر انداز کیے جاتے ہیں۔ اس حقیقت نے بھی مسلمانوں کی زندگی دوبھر کر دی ہے کہ مسلم مطلقہ خواتین کے قائد ہندو بنتے جا رہے ہیں اگر یہ امر واقعی ہے کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے بارے میں غیر مسلم اس قدر متفکر ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ان کی سیکڑوں دیگر سماجی اور اقتصادی کمزوریوں کے بارے سنجیدگی سے احتجاج نہیں کرتے۔ دوسری طرف نچلی ذات کے ہندوؤں نے صدیوں سے سماجی اور اقتصادی زیادتیاں برداشت کی ہیں۔ ان کو انھیں روکنا چاہیئے۔ کیا مسلمان یہ سوچنے میں حق بجانب نہیں ہیں کہ کیا وہ ان تمام ہمدردیوں اور توجہ کے مستحق نہیں جو بڑی نیامنی سے مطلقہ مسلم خواتین پر لٹائی جا رہی ہیں؟

صفائی سے یہ کہنا پڑے گا کہ ہر مسلمان یہ بات بڑی بے چینی سے محسوس کرتا ہے کہ اگرچہ شاہ بانو معاملے کی پیروی دیانت دار اور کشادہ دل ہندو حضرات کر رہے ہیں لیکن پھر بھی کچھ متعصب عناصر اس طایفے کے گیت میں سر ملا رہے ہیں اور وہ شاہ بانو کی چھڑی سے ہی ان کو پیٹنا چاہتے ہیں۔

مسلمانوں کے لیے شاہ بانو کا کیس محض مطلقہ یا مفلس بیواؤں کے نان و نفقہ کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ان کی مذہبی آزادی پر ایک کاری ضرب ہے۔ ماضی قریب میں بھی اُن پر چوٹیں پڑ چکی ہیں۔ مثلاً سالہا سال سے التوا میں پڑے رام جنم بھومی / بابری مسجد کے معاملے کو ہی لیجیے۔ عرصہ چار سو سال سے مسلمان اس عبادت گاہ کے ایک حصّے میں عبادت کرتے آئے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں عدالت کے حکم سے یہ عبادت گاہ مقفل کر دی گئی تھی۔ تقریباً تین سال قبل "وشو ہندو پریشد" نے ایکتا ماتا یگن یاترا اس عبادت گاہ کو آزاد کرانے کے لیے کی اور جب سے ہی ہانڈی میں اُبال آ رہا ہے۔ امسال پہلی فروری کو ڈسٹرکٹ جج فیض آباد نے اس عبادت گاہ کو صرف ہندو معتقدین کے لیے کھولنے کا حکم صادر کیا۔ اس پر وحشیانہ طریقے سے خوشی کا اظہار کیا گیا اور اسے 'دھرم' کی جیت تصور کیا گیا۔ ایک غلط کام کو صحیح کیا گیا۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ فیض آباد کے محدود حکم کو جس انداز سے تعمیل کیا گیا اور جو معنیٰ اس کو پہنائے گئے اس سے مسلمانوں میں مکمل بے چارگی کا احساس بڑھ گیا ہے۔ جس انداز سے مسجد پر قبضہ کر کے ایک بڑی جماعت کو اکٹھا کر کے مذہبی رسومات ادا کی گئیں، اس سے قانونی چارہ جوئی اور عدالتی کارروائی کی امیدیں قبل از وقت ختم ہو گئیں۔

اس کے بعد کلکتہ کی عدالت میں قرآن پر پابندی لگانے کے لیے رام سروپ کے مقدمے کو لیجیے۔ یہ مقدمہ صرف اس لیے دائر کیا گیا تھا کہ قرآن نفرت پھیلاتا ہے اور تحمل کی تعلیم نہیں دیتا ہے۔ مقدمہ کی درخواست بذات خود انتہائی لغو تھی بلکہ اس سے بھی غلط عدالت خفیفہ کو اسے سننے کا حکم تھا۔ شکر ہے کہ اپیل میں یہ حکم منسوخ کر دیا گیا۔ پھر بھی ایک قانونی عدالت کا ایک انتہائی جارحانہ اور تعصب سے بھرپور درخواست کا پہلے مرحلے پر سننے کا حکم ہی مسلمانوں کو زبردست صدمہ پہنچانے کے لیے کافی تھا۔

مجروح جذبات: ان تمام واقعات کا اثر مسلمانوں

کی نفسیات پر کیا ہوا ہوگا' اس کا اندازہ بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے۔
وہ نہ صرف غم و غصّے سے بھرے ہوئے ہیں۔ بلکہ ان کے انداز میں تلخی اور مایوسی آگئی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تیج صرف ان کی طرف ہی کسے جاتے ہیں۔ بہت سے انکوائری کمیشنوں نے فرقہ وارانہ فسادات میں قانون کے محافظوں کو جانبدار ہونے کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور ان پر تنقید کی ہے۔ مسلمان اس نتیجے پر پہنچ گئے ہیں کہ اب قانونی دفعات بھی ان کے جائز حقوق کا تحفظ نہیں کرسکتیں۔
'سماج سدھار' سیاست کی طرح ایک ممکنات کا آرٹ ہے۔ مذہب سے پیوستہ سماجی رسومات فرقے کے تحت الشعور میں جم گئی ہیں اور آسانی سے تبدیل نہیں کی جاسکتی ہیں۔ چوں کہ عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے پھر بھی اسے یاد کرنا سودمند ہوگا کہ کس شدت سے ہندو کوڈ بل کی مخالفت ڈاکٹر راجندر پرشاد' ٹھاکر داس بھارگو' کیلاش ناتھ کاٹجو' آنند سوامی آینگر جیسی سیکولر شخصیتوں نے کی تھی۔
ہر شخص میں زیادہ سے زیادہ قابل تعظیم دکھائی دینے کی خواہش تو ہوتی ہے لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو مساوات اور انسانیت کی تعلیم دیتا ہے۔ ہندو مذہب کی خوبصورتی' طاقت اور اس کی وسعت بہت سے دیوی دیوتاؤں میں ہے۔ اسلام کی خوبصورتی اس کے وحدت کے تصور میں ہے۔ اس وجہ سے دو بڑے مذاہب کے معتقدین میں نظریاتی اختلاف قدرتی بات ہے۔ کاش ایک ہزار سال کی ہم وطنی نے انھیں یہ سکھا دیا ہوتا کہ ایک دوسرے کی مذہبی جگہ پر زبردستی قبضہ نہیں کرنا چاہیئے۔ پرسنل لا جیسے اہم معاملوں میں ترمیم کی تجویزیں بذات خود مسلم فرقے سے آنی چاہیئے۔ دوسرے لوگوں کے گھروں کو ٹھیک کرنے کی کوشش یقیناً اختلافات اور تصادم کا سبب بنتی ہے۔

حقیقی اصلاح

پھر بھی ان باتوں سے ناامید ہونے کا کوئی جواز نہیں ہے اور نہ ہی یہ کسی ترقی پسند اصلاح کے خلاف ہے۔ مسلمان مطلقہ خواتین کو زیادہ ہمدردی اور تحفظ کی ضرورت ہے۔ اگر مسلمانوں کو وقت کے ساتھ چلنا ہے تو انھیں سماجی خودروی کے لیے اپنی حکمت عملی وضع کرنی ہوگی۔ فوری اور بنیادی اصلاح کی ضرورت تو ہندو قوم کو بھی کم نہیں ہے۔ ایک اسلامی حکومت میں مسلمانوں کے لیے اپنے مسائل اور کمزوریوں پر اطمینان سے بحث کرنا نسبتاً آسان ہے۔ زیادہ تعداد میں غیر مسلموں سے آباد اس ملک میں مسلمان 'محصور' ذہنیت کا شکار ہوگئے ہیں اور وہ نفسیاتی قلعہ بندی کرنے لگے ہیں تاکہ وہ اپنی تہذیبی و تمدنی شناخت برقرار رکھ سکیں۔ ایسے ماحول میں بامعنی اور نیک دل ہندو حضرات کی سماجی اصلاح کی کوششیں انھیں ان کے محفوظ مذہبی خولوں میں پیچھے ڈھکیل دیں گی اور ان کوششوں کا اثر الٹا ہوگا۔ ایسی سبھی کوششیں انھیں فرقہ وارانہ حدبندی کی جانب لے جائیں گی اور ملک دشمن عناصر کے ہاتھ مضبوط کریں گی۔

بقیہ: "فائی سے لیا" صفحہ نمبر ۵۴

لیکن صرف اپنی پھرتی اور مہارت کی وجہ سے اس کے ڈنک سے بچی رہتی ہے۔ میامی یونیورسٹی کے ماہرین نے اس بات کو غلط ثابت کردیا ہے۔ انھوں نے نومیاس کی جسامت کی مچھلیاں پکڑیں اور انھیں فائی سے لیا زہر اتنی مقدار میں دیا کہ وہ ہلاک ہوجائیں۔ جب اسی مقدار میں یہی زہر نومیاس کو دیا گیا تو اس پر کچھ اثر نہ ہوا بلکہ دس گنا زہر بھی اسے ہلاک نہ کرسکا۔

فائی سے لیا کی محدود افزائش کا راز بہت دنوں تک پردۂ راز میں رہا۔ آخر سائنس دانوں کی کاوشیں رنگ لائیں اور ایک دیو قامت کچھوے کا سراغ ملا۔ فائی سے لیا اس کا من بھاتا کھاجا ہے۔ بھورے سرخ رنگ کی سینگ یا خول میں لپٹا ہوا پانچ ساڑھے پانچ من وزنی یہ کچھوا فائی سے لیا کے جھگھٹوں پر حملہ کرتا ہے اور اس کی زہریلی شاخوں کو کاٹتا چلا جاتا ہے۔ فائی سے لیا اسے اپنے زہریلے ڈنک کی زد پر رکھ لیتی ہے۔ کچھوے کی آنکھیں سوج کر بند ہوجاتی ہیں لیکن منھ چلتا رہتا ہے۔ آخر کار فائی سے لیا بالکل بے ضرر اور بے بس ہوکر رہ جاتی ہے۔

ظفر علی راجا

فائی سے لیا

امریکی، افریقی یا یورپی ممالک کے سمندروں میں پیراکی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اگر آپ کو پانی میں فٹ فٹ بھر لمبے نیلے اور سنہری خوشنما غبّاروں کا پورا ایک قافلہ رواں دواں دکھائی دے تو بچوں کی تفریح طبع کے لیے انھیں پکڑ کر گھر لے جانے کے لیے ان کی طرف مت لپکیے بلکہ یہ غور کیجیے کہ ان غبّاروں کے اوپری حصے خوبصورت، تراشیدہ، سفید نرم نرم اور پھولے پھولے سے تو دکھائی نہیں دے رہے اور اگر واقعی ایسا ہے تو پھر آپ اپنی جان بچانے کی فکر کیجیے اور جتنی جلدی ہو سکے ساحل کی طرف بھاگیے۔ وہ اس لیے کہ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو عین ممکن ہے کہ اگلے چند لمحوں میں "فائی سے لیا" کے دامِ زہرابی میں گرفتار ہو جائیں۔

اگست ۱۹۶۵ء میں انیس سالہ سٹیفن کوننگ نے بھی ایسی ہی غلطی کی تھی۔ وہ نیویارک کے ساحل پر ہزاروں دوسرے تفریح پسندوں کی طرح موجود تھا۔ بلکہ خنک پانی سے لطف اندوز ہونے کے لیے تیر رہا تھا کہ اچانک اس نے سطحِ آب پر رنگین غبارے تیرتے دیکھے۔ اس نے خوشی خوشی ان کی طرف غوطہ لگایا لیکن دوسرے ہی لمحے لوگوں نے اس کی دردناک چیخیں سنیں۔ وہ بچاؤ بچاؤ پکار رہا تھا۔ ایک قریبی پیراک اس ناگہانی اور ان دیکھی آفت سے بچانے کے لیے کوننگ کی طرف لپکا۔ اس نے دیکھا کہ بہت سی نیلگوں رسیاں کوننگ کے سر، گردن اور شانوں سے لپٹی ہوئی ہیں۔ قبل اس کے کہ وہ کوننگ کو چھڑاتا، خود اس کی کربناک چیخ نے ساحل سے تماشا دیکھنے والوں کو ہلا دیا۔ بہت سے پیراک اُن کی طرف جھپٹے، لیکن چند ہی لمحوں بعد وہ خود بھی درد سے تڑپتے ساحل کی سمت آ رہے تھے۔ پورے ساحل پر تفریحی موسیقی اور محفلِ رقص کے بجائے آہوں، کراہوں اور تڑپتے ہوئے لوگوں کا کرب کسی فلم کے منظر کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ کوننگ رکتی ہوئی سانس اور شدید کھانسی پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہوا کسی نہ کسی طرح ساحل پر پہنچا اور بے ہوش ہو گیا۔ ہسپتال کے آکسیجن ٹینٹ میں جب اسے ہوش آیا تو اس کے گرد بہت سے دوسرے پیراک اسی حالت میں پڑے تھے، سب کے سب درد کی شدت سے بے تاب تھے۔

اگست کے اسی ایک ہفتے میں نیویارک کے ساحل پر ایک سو دوسرے پیراک ان پراسرار غباروں سے ڈسے گئے۔ ساحل کی طرف چلتی ہوئی ہوائیں ان غباروں کو چھدرے پانی کی طرف بہا لاتی تھیں اور پھر ظاہر ہے کہ کوننگ کے سے حالات رونما ہوتے تھے۔

یہ نیلے اور سنہری غبارے دراصل غبارے نہیں تھے، بلکہ سمندر کی سب سے عجیب مخلوق "فائی سے لیا" تھا۔ فائی سے لیا کے بارے میں حقائق کی اکثریت ابھی تک پردۂ اسرار میں ہے۔ تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ پرتگالی سمندروں میں آج سے تین سو سال قبل انگریز ملاحوں نے سب سے پہلے اس پُراسرار مخلوق کو

ڈاکٹر ظفر علی راجا۔ ڈی ۲۱۲، ناظم آباد کالونی، کراچی، پاکستان

دیکھا تھا۔ فائی سے لیا کا قافلہ دور سے اس زمانے کے جنگجو بحری قزاقوں کے بیڑے سے مشابہ نظر آرہا تھا۔ لہذا انگریز ملاحوں نے اس کا نام جنگجو آدمی رکھ دیا۔ "فائی سے لیا" یونانی زبان کا لفظ ہے جو غبارہ نما چیزوں کے لیے مستعمل ہے۔

فائی سے لیا کی حکمرانی دور دور تک پھیلی ہوئی ہے وہ سکاٹ لینڈ، انگلینڈ، آئرلینڈ، امریکہ اور یورپی ممالک کے سمندروں سے لے کر ایشیائی ساحلوں تک بحری قزاقوں کی طرح دندناتی پھرتی ہے۔

سمندر میں تیرتے برف کے بڑے بڑے تودوں کی طرح فائی سے لیا بھی دھوکے کی ٹٹی ہے۔ وہ سطح پر تو صرف غبارے کی طرح نظر آتی ہے لیکن اس غبارے کے نیچے بڑ کی جڑوں کی طرح لمبے لمبے نیلگوں ربن اور زندہ رسیاں ایک جال کی طرح لٹکی رہتی ہیں جو سو سو فٹ گہرائی میں تیرتے ہوئے شکار تک بڑی آہستگی اور آسانی سے جا پہنچتی ہیں۔ فائی سے لیا کی ان شاخوں میں ہزارہا ڈنک ہوتے ہیں جو ایک سریع الاثر زہر سے لیس ہوتے ہیں۔ یہ زہر اتنا طاقتور ہوتا ہے جتنا کہ کوبرا۔۔۔ میامی یونیورسٹی کے شعبۂ بحر نے اس کے زہر پر تحقیق کی تو پتہ چلا کہ اس کے بداثرات سے اعصابی نظام تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ چھ انچ لمبی مچھلیاں اور اسی جسامت کے دوسرے سمندری جانور اس کی عام خوراک ہیں اور یہ بچارے تو اس کے صرف ایک ڈنک سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ زہر کی تیزی کا اندازہ کیجیے کہ اگر عرصے سے مری ہوئی فائی سے لیا کی سوکھی ہوئی شاخ پر غلطی سے پاؤں پڑ جائے تو پاؤں میں سرخی اور جلن سی پھیلتی چلی جاتی ہے۔ میامی یونیورسٹی کی تجربہ گاہ میں اس زہر کو خشک سفوف کی شکل میں محفوظ کیا گیا تھا۔ چھ سال کے بعد جب اسے آزمایا گیا تو اس کی تیزی اور ہلاکت آفرینی ویسی کی ویسی تھی۔

پانی میں فائی سے لیا کا زہر نہایت سرعت سے اثر کرتا ہے۔ اس کے اثر سے چند لمحوں میں خون کا دباؤ تیزی سے کم ہونے لگتا ہے اور نبض ڈوب جاتی ہے۔

میامی یونیورسٹی کے ایک سائنس داں کو فائی سے لیا نے ڈس لیا تھا۔ اس بے چارے کو شدید درد اور اذیت کی حالت میں ہسپتال لے جایا جا رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کا سانس رکنے لگا۔ ڈاکٹروں نے اس کے سانس کی آمد و رفت ایک مشینی پھیپھڑے کے ذریعے جاری رکھی۔ متواتر دو ماہ کے علاج کے بعد وہ صحت مند ہوا۔ اس کی چھاتی پر ڈنک کے سرخ ابھرے ابھرے نشانات آج تک اس واقعے کی یاد دلانے کے لیے موجود ہیں۔ ۱۹[illegible]ء میں میامی ہی کے ساحل پر ایک تاجر اس پراسرار زہر کا نشانہ بنا لیکن ڈاکٹروں کی سرتوڑ کوشش کے باوجود جانبر نہ ہو سکا۔ فائی سے لیا کے زہر کا کوئی مکمل تریاق ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا۔ لیکن مقامِ ماؤف پر الکحل ملنے پر شدید درد اور دوسرے بداثرات کافی حد تک کم ہو جاتے ہیں۔ فائی سے لیا کے شکار کا طریقہ بھی خود اس کی طرح نرالا ہے۔ جس طرح جنگل کے بادشاہ شیر کو گیدڑ شکار کی خبر دیتا ہے۔ اسی طرح فائی سے لیا کی مددگار ایک شوخ نیلے رنگ کی مچھلی نومیاس ہے جس کے بدن پر سنہری دھاریاں بنی ہوتی ہیں۔ یہ چھوٹی سی خوبصورت مچھلی فائی سے لیا کی قاتل شاخوں سے خاصی دور پانی میں اچھل کود مچاتی ہے۔ بڑی مچھلیاں جب اس نوالۂ تر کو دیکھتی ہیں تو اس کی طرف لپکتی ہیں۔ یہ نوالۂ تر انہیں جل دے کر بجلی کی سی سرعت سے فائی سے لیا کی شاخوں کے جال میں جا گھستا ہے۔ بڑی مچھلیاں اس کے تعاقب میں خود اپنی موت کی آغوش میں آ پہنچتی ہیں۔ فائی سے لیا کے زہریلے ڈنک ان کا کام تمام کر دیتے ہیں اور اس کی قاتل شاخوں میں موجود سرخ گلابی یا مالٹا رنگ کے غدود فوراً ایک خاص قسم کا مواد خارج کرتے ہیں جو شکار کے جسمانی رگ و ریشے کی توڑ پھوڑ کرنے کے بعد چند لمحوں میں پروٹینی اجزا کو الگ کر دیتا ہے اور چند دوسرے غدود اسے جذب کر کے جزو بدن بنا دیتے ہیں۔ اس سارے عمل کے دوران یہ ننھی مددگار اپنے حصے کی خوراک فائی سے لیا کے شکنجے سے نوچ نوچ کر کھاتی رہتی ہے اور یہ زہریلی مخلوق اپنے ننھے مددگار کے انعام حاصل کرنے کے اس طریقے کو بڑی کشادہ دلی سے برداشت کرتی ہے۔

کافی عرصے تک یہ خیال کیا جاتا رہا کہ ننھی مچھلی جس کا نام نومیاس ہے عام مچھلیوں کی طرح فائی سے لیا کے زہر کا نشانہ بن سکتی ہے۔

باقی صفحہ نمبر ۵۲ پر

احمد رشید شیروانی*

ساڑھے ننانوے فیصد پاس

مرادآباد شہر کے نو مسلم اداروں سے ۱۹۸۶ء کے جونیئر ہائی اسکول بورڈ کے نتائج آئے ہیں۔ سب ملا کر تین سو ساٹھ ۳۶۰ مسلم بچے شریک ہوئے اور تین سو اٹھاون ۳۵۸ یعنی قریب ساڑھے ننانوے فیصد پاس ہو گئے۔ بنات القریش اسکول اور عاصم بہاری اسکول سے ایک ایک طالبہ فیل ہوئیں۔ باقی سات سے سو فیصد پاس۔ چنانچہ یہاں پاس فیصد کا موازنہ تو کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیوں کہ قریب سب ہی پاس ہیں۔ راحت مولائی گرلز اسکول سے دو طالبات، اسلامیہ گرلز اسکول سے ایک طالبہ، مونس مسلم گرلز اسکول سے دو طالبات اور اسلامیہ بوائز اسکول سے دو طلباء کی تھرڈ ڈویژن آئی۔ یعنی کل تین سو ساٹھ ۳۶۰ میں سے دو فیل اور سات کی تھرڈ ڈویژن۔ باقی تین سو اکیاون یعنی ساڑھے ستانوے فیصد بچے فرسٹ یا سکنڈ میں پاس ہوئے۔ گویا تھرڈ ڈویژن بھی تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ اس لیے ہم نے صرف فرسٹ ڈویژن اور سکنڈ ڈویژن کا تناسب چارٹ میں دیا ہے اور اِن نو اداروں کے نتائج کو فرسٹ ڈویژن کے تناسب کے اعتبار سے چارٹ میں درج کیا ہے ملاحظہ فرمایئے۔

مرادآباد شہر کے مسلم جونیئر ہائی اسکولوں کے نتائج ۱۹۸۶ء

شریک امتحان	فرسٹ ڈویژن		سکنڈ ڈویژن		اسکول کا نام
	تعداد	فیصد	تعداد	فیصد	
۲۱	۲۱	سو	—	صفر	جنت نشان گرلز اسکول
۱۱۸	۸۹	پچہتر	۲۹	پچیس	فلاح دارین ہائر سکنڈری
۳۲	۱۶	پچاس	۱۶	پچاس	مسلم گرلز اسکول
۴۸	۱۶	تینتیس	۳۱	پینسٹھ	بنات القریش گرلز اسکول
۲۳	۳	تیرہ	۱۸	اٹھتر	راحت مولائی گرلز اسکول
۲۰	۲	دس	۱۷	پچاسی	عاصم بہاری گرلز اسکول
۴۱	۳	سات	۳۷	نوّے	اسلامیہ گرلز اسکول
۴۵	—	صفر	۴۳	چھیانوے	اسلامیہ بوائز اسکول
۱۲	—	صفر	۱۰	تراسی	مونس گرلز اسکول
۳۶۰	۱۵۰	بیالیس	۲۰۱	چھپن	نو اسکولوں میں مسلم بچوں کے نتائج

* احمد رشید شیروانی، ۱۲ اے کناٹ پیلس، نئی دہلی۔

جنت نشاں اسکول سے سو فیصد فرسٹ ڈویژن ۔ فلاح دارین ہائی اسکول سے جونیئر ہائی اسکول بورڈ امتحان میں پچھتر فیصد فرسٹ
ن ۔ مسلم گرلز اسکول سے پچاس فیصد فرسٹ ڈویژن ۔ بنات القریش سے تینتیس ۳۳ فیصد فرسٹ ڈویژن ۔ یعنی ان چار اسکولوں
لر دو سو ۲۱۹ انیس بچوں میں سے ایک سو بیالیس یعنی قریب پینسٹھ فیصد بچے فرسٹ ڈویژن لائے ۔

البتہ اگلے تین اسکولوں میں فرسٹ ڈویژن کا تناسب تیرہ فیصد اور سات فیصد کے درمیان ہے. یعنی اوسطاً قریب دس
۔ اور دو اسکول ایسے بھی ہیں جہاں فرسٹ ڈویژن صفر ہے ۔

مسلم گرلز اسکول سے آٹھ غیر مسلم طالبات بھی شریک ہوئیں جو سب پاس ہوئیں ۔ پانچ فرسٹ ڈویژن میں اور تین سکنڈ
ن میں ۔ اسلامیہ بوائز اسکول سے ایک غیر مسلم طالب علم شریک ہوا جو سکنڈ ڈویژن میں پاس ہو گیا ۔ البتہ چارٹ میں ہم نے
ے نتائج شامل نہیں کیے ہیں ۔ وہاں صرف مسلم بچوں کے نتائج لیے ہیں ۔

"ایسا کیوں؟"

عام طور پر مسلم ہائی اسکول کے ذمہ داران اپنے بچوں کو جونیئر ہائی اسکول بورڈ امتحان میں شریک نہیں کرتے ۔
اس لیے کہ یہ ضروری نہیں ہے ۔ ہائی اسکولوں کو یہ اختیار ہے کہ وہ اپنے ادارے میں چاہیں تو آٹھویں کلاس کا اندرونی
ن لیں یا پھر چاہیں تو اُن کو جونیئر ہائی اسکول بورڈ امتحان میں شریک کرائیں ۔ بیشتر مسلم ہائی اسکول اندرونی امتحان کو ترجیح دیتے
البتہ بعض مسلم ہائی اسکول اپنے آٹھویں کلاس کے بچوں کو جونیئر ہائی اسکول بورڈ امتحان میں شریک کرانا بہتر سمجھتے ہیں ۔

ایک ہیڈ ماسٹر صاحب سے پوچھا گیا کہ اس کی کیا ضرورت ہے تو انھوں نے بتایا کہ اگر کوئی لڑکا آٹھویں کلاس کا بورڈ
تحان دے اور پھر بعد میں وہ کسی وجہ سے ہائی اسکول کا امتحان نہ بھی دے سکے یا ہائی اسکول بورڈ امتحان میں فیل بھی
ائے تو کم سے کم اس کے پاس جونیئر ہائی اسکول کا سرٹیفکیٹ اور مارک شیٹ ہوگی اور وہ کسی آئی ۔ ٹی. آئی وغیرہ میں
کورسز میں داخلہ لے سکے گا ۔ ورنہ اسکولوں کے اندرونی امتحانوں کے نتیجے کو کئی جگہ یہ کہہ کر نظرانداز کر دیا جاتا ہے کہ یہ
تند نہیں ۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے تو پھر دیگر مسلم ہائی اسکولوں کے ذمہ داران بھی غور فرمائیں اور اگر مناسب سمجھیں تو
، آٹھویں کلاس کے بچوں کو بھی جونیئر ہائی اسکول بورڈ امتحان میں شریک کرایا کریں ۔

مقامی کوشش

مراد آباد شہر میں گزشتہ چند سال کے دوران مسلم اداروں کے نتائج نمایاں طور پر بہتر ہوئے ہیں ۔ چند ایک اداروں
، تو پہلے بھی نتائج بہت اچھے تھے ۔ لیکن بیشتر اداروں میں کافی خراب تھے لیکن اس کے بعد بہتر ہوئے ۔ یقیناً اس بہتری کے لیے
۔ آباد شہر کے مسلم اداروں کے ہیڈ ماسٹر صاحبان اور ہیڈ مسٹریس صاحبائیں اور محترم اساتذہ اور محترمہ اساتذات اور مسلم
دوں کے بچے اور ان کے والدین سب ہی مبارکباد کے مستحق ہیں ۔ البتہ اس میں وہاں مسلم تعلیمی کمیٹی اور اس کے کارکنوں کی
لوص کوششوں کو بھی کافی دخل ہے اور ہمارے یہ ساتھی اور بھائی بھی مبارکباد کے مستحق ہیں ۔

کہکشاں علوی*

سماج میں عورت کا مقام

تاریخی پس منظر میں

مختلف زمانوں میں مردوں اور عورتوں کے ساتھ مختلف اور متضاد خصوصیات منسوب کی جاتی رہی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مردوں کو عقلی اور جسمانی طور پر افضلیت دی جاتی رہی اور عورتوں کو نسبتاً کمزور اور کمتر تصور کیا جاتا رہا۔ زمانۂ قدیم میں مردوں کے بارے میں یہ خیال عام تھا کہ ان میں عقلیت اور فعالیت زیادہ ہوتی ہے اور عورتیں حسی اور جذباتی سطح پر زندگی گزارتی ہیں۔ عورتیں اسی سبب سے کمزور سمجھی جاتی رہیں اور مردوں کو بہادر اور جانباز تصور کیا جاتا رہا۔ اگر اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں میں بعض کمزوریاں ضرور ہوتی ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ عورتوں کو کسی میدان میں افضلیت ہی حاصل نہیں۔ ہر سماج اور تہذیب میں زندگی کی ذمہ داریوں کی تقسیم مختلف افراد کی صلاحیتوں کے مطابق ہوتی ہے۔ عورتوں کے لیے جس طرح بعض گھریلو ذمہ داریاں مخصوص ہیں۔ اسی طرح مردوں کے ذمہ بھی ان کی صلاحیت کے مطابق بعض کام خاص کر دیے گئے ہیں۔ پہلے یہ تقسیم بالکل اسی طرح سے سخت تھی جس طرح یہ سمجھا جاتا تھا کہ امیر لوگ عیش و عشرت کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور غریبوں کی قسمت میں تمام عمر کے لیے محنت اور مشقت کرنا لکھا ہوا ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ عورتیں عام طور پر کمزور ہوتی ہیں اور ان پر بچوں کی پرورش وغیرہ کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے۔ اس لئے عام طور سے ان کے سپرد ایسے کام کیے جاتے ہیں جنہیں وہ آسانی سے انجام دے سکیں مثلاً گھر کی دیکھ بھال اور کھانا پکانا وغیرہ اس کے خلاف مرد زیادہ محنت کے کام کرتے تھے اور محنت و مزدوری کرکے کھانے پینے کا سامان فراہم کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب ایسی حالت ہوگی تو مرد خود بخود سمجھنے لگے گا کہ وہ رزق حاصل کرنے والا ہے اور اسی کی وجہ سے گھر کا نظام چل رہا ہے۔ شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ مردوں نے اپنے اختیارات کا زیادہ استعمال کیا اور عورتوں کو دوسرے درجہ کی مخلوق سمجھا۔ کچھ قدیم تہذیبوں میں تو عورتوں کو بالکل اختیارات نہیں دیے جاتے تھے اور وہ سامان کی طرح سمجھی جاتی تھیں۔ مگر ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض قبیلوں میں عورت کو حکمراں کی حیثیت حاصل ہوئی تھی، یہاں تک کہ شادی کے بعد مرد اپنی بیوی کے گھر پر آکر رہتا تھا۔ لیکن ایسا بہت کم جگہوں پر دیکھا گیا ہے۔

قدیم زمانے میں یونان تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔ اس میں عورت کو کافی حقوق حاصل تھے۔ مگر رومن دور میں عورتوں کے حقوق بہت کم کر دیے گئے اور ان کو کم عقل سمجھا جانے لگا۔ ان کے لیے یہ لازم تھا کہ مردوں کے اشارے پر چلیں۔ عیسائیت کے دور میں بھی کوئی خاص حقوق نہیں تھے۔ عورتوں کو گناہ مجسم سمجھا جاتا تھا اس لئے کہ بنیادی طور پر عورت ہی نے خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی اور شیطان کے بہکاوے میں آکر حضرت آدم کو بہکایا تھا۔ اس زمانے میں عورتوں کی حالت اور بھی زیادہ ابتر تھی۔ عرب مرد، عورت کو حقیر سمجھتے تھے۔ لڑکی کی پیدائش کو ناک کٹنے کے مترادف خیال کرتے تھے اور اکثر اسے زندہ دفن کر دیتے تھے۔ ہندوستان میں بھی عورتوں کی حالت کچھ بہتر نہیں تھی۔ ان کو کوئی خاص حقوق حاصل نہیں تھے۔ ماں باپ کی جائداد میں اس کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ شادی کے بعد کنیادان کا تصور تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اب عورت کو

---

* کہکشاں علوی، علوی لاج، دودھ پور، علی گڑھ

شوہر کے صبیت چڑھادیا گیا اور اس کا ماں باپ پر کوئی حق نہیں ہے۔

یورپ میں انقلاب فرانس کے بعد جب لوگوں نے آزادی، اخوت اور برابری کا نعرہ لگایا تو عورتوں کو ان کے جائز حقوق دیے جانے کا رجحان پیدا ہوا۔ اس کے بعد یورپ میں صنعتی انقلاب آیا اور عورتوں کے حقوق کا احساس زیادہ تیز ہوا۔ کیونکہ اب کارخانوں اور دفتروں میں کام کرنے والوں کی مانگ بڑھ گئی۔ اس لئے مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی کام کرنے کا موقع مل گیا۔ اور انھوں نے مردوں کے برابر اجرت طلب کرنا شروع کردی۔ صنعتی انقلاب کے بعد مادی ترقی کی جو سرگرمی شروع ہوئی اس میں خاندان کی نوعیت میں تبدیلی آگئی اور عورت کی ذمہ داریوں میں بچوں کی پرورش کی زیادہ اہمیت نہیں رہ گئی یعنی عورتوں پر بچوں کی تربیت کی ذمہ داری نہیں سمجھی جاتی تھی۔ کیونکہ وہ دفتر یا کارخانے میں کام کرنے کے لیے جانے لگی۔ اس لیے بچوں کی پرورش کے لیے CRECHES قائم کئے گئے جہاں کام کرنے والی عورتوں کے بچوں کی دیکھ بھال ہوتی تھی اور شام کو جب مرد اور عورت کام سے واپس آئے تو بچوں کو اپنے گھر واپس لے جاتے تھے۔ بعض لوگ بچوں کو آیاؤں کے سپرد کر دیتے اور خود کام پر چلے جاتے اور بڑے بچے اسکول بھیج دیئے جاتے اس طرح مرد اور عورت کے کام ایک جیسے ہوگئے۔ اس لئے ان کو برابر کے حقوق دینے کے لئے مختلف تحریکیں وجود میں آئیں۔

انیسویں صدی تک یورپ میں عورت کو کمزور سمجھا جاتا رہا اونچے گھرانوں کی عورتوں کو خاص طور سے ایسی تربیت دی جاتی تھی کہ کمزور رہیں کمزوری اور نزاکت انکی خوبی سمجھی جاتی تھی تاہم کام کرنے والی عورتوں کے حالات مختلف تھے وہ مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتیں اور اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کرتی تھیں۔ اسی زمانے میں مرد اور عورت کی خصوصیات کے بارے میں سماجی اور نفسیاتی مطالعے کئے گئے اور ان کی روشنی میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی کہ مردوں اور عورتوں کے نفسیاتی اختلافات ان کی جسمانی ساخت اور حیاتیاتی اعمال کی مناسبت سے ہیں ایک فرائڈ نے کہا تھا کہ "جسمانی ساخت ہی انسان کا مقدر ہے" (ANOTOMY IS DESTINY) بہرحال ماہرین نفسیات و سماجیات نے ان تجربات کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا کہ عورتوں احساس کی شدت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کی یادداشت اچھی ہوتی ہے اور بات چیت یا میل جول کی صلاحیت بھی ان زیادہ ہوتی ہے۔ جب کہ مردوں میں میکانکی ادراک زیادہ ہوتا اور عورتوں کے برخلاف مرد دوسروں پر انحصار بہت کم کرتے ہیں آسانی سے ہمت بھی نہیں ہارتے۔ تاہم ان تحقیقات کے بارے یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ ان کی بنیاد جن تجربوں پر رکھی گئی ان کا تعلق کسی یکسی مخصوص سماجی گروہ سے تھا۔ ظاہر ہے کہ دوسرے قسم کے گروہوں کے لئے یہ بات اس حد تک درست نہیں ہو سکتی اس قسم کی تحقیقات یا ان کے علاوہ دوسرے تجربوں کی بنیاد پر بعض لوگوں نے عورت کو کمزور ثابت کرنے اور مردوں کے مقابلے میں اس کو کم صلاحیت کا حامل ہونے پر زور دیا اور عورتوں کو ان جائز حقوق سے محروم رکھنے کی کوشش کی۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد ۱۹۴۵ء وجود میں آئی جس انسانی حقوق کا چارٹر منظور کیا جس میں مردوں اور عورتوں حقوق میں کسی قسم کا امتیاز نہیں برتا گیا۔

ہمارے ملک میں آزادی کے بعد جو دستور بنایا گیا۔ اس عورتوں اور مردوں کو مساوی حقوق دیئے گئے۔ تاہم عورتیں عرصہ دراز سے حقوق سے محروم تھیں اس لیے پورے طور پر ا دستوری حقوق کے تحفظ پر عمل درآمد نہیں ہو سکا۔ مثلاً عورت مرد کو تعلیم کے یکساں مواقع فراہم کو تا ہمارے دستور کا بنیادی ہے۔ مگر آزادی کے ۳۹ برس کے بعد بھی عورتیں تعلیم کے م میں مردوں سے بہت پیچھے ہیں۔ اسی طرح اگرچہ مردوں اور عور کے لیے کام کے مواقع فراہم کیے جانے میں کوئی امتیاز نہیں برتا لیکن عورتیں زندگی کے مختلف شعبوں میں خال خال ہی حصہ نظر آتی ہیں۔

جب عورتوں کے حقوق کا ذکر ہو رہا ہے تو نامناسب کہ اس موقع پر اسلام میں عورتوں کے حقوق کا بھی ذکر کیا جا اسلام نے تمام بنی نوع انسان کو عام انسانی حقوق، دیئے

خصوصیت کے ساتھ اسلام نے عورتوں کو وہ تمام انسانی حقوق بھی دیئے ہیں، جو مردوں کو حاصل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے ساتھ شفقت اور مہربانی سے پیش آنا مردوں کے لئے لازم قرار دیا گیا ہے۔ اسلام نے عورتوں کو سماج میں ان کا صحیح مقام دیا ہے اور ان کا مرتبہ قدیم زمانے کے مقابلے میں بہت بلند کر دیا ہے۔ عورت سماج میں ایک خود مختار حیثیت کی مالک بنائی گئی اور اس کے اپنے انفرادی حقوق مقرر کر دیے گئے۔ عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے کا حق دیا گیا ہے اور ساتھ ہی مال و دولت رکھنے کا بھی حق دیا گیا ہے اور ان کو اپنے شوہر اور والدین کی جائداد میں حصہ دار بنایا گیا ہے۔

اسلام میں جو حقوق عورتوں کو دیئے گئے ہیں وہ کسی انسان کے دیے ہوئے نہیں ہیں نہ ان کے پیچھے رسم و رواج سماجی آداب اور سماجی روایات کا کوئی دخل ہے۔ عورتوں کے حقوق براہ راست قرآن پاک میں مقرر کر دیے گئے۔ اس لیے اس سے کوئی مسلمان روگردانی نہیں کر سکتا اور نہ ان پر کوئی اعتراض کر سکتا ہے۔ مثلاً بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ عورتوں کو جائداد میں بھائی کے مقابلے میں آدھا حصہ دیا جاتا ہے اور بعض معاملات میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر تصور کی جاتی ہے۔

جدید تحقیقات کی روشنی میں یہ بات اب بہت زیادہ ڈھکی چھپی نہیں رہ گئی ہے کہ عورت ذہنی اور نفسیاتی طور پر مرد کے مقابلے میں نسبتاً کمزور ہے اس لیے گواہی کے مقابلے میں دو عورتوں کی مثال بہت غیر فطری نہیں معلوم ہوتی۔ اسی طرح جائداد میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے نصف ملنے کا سوال ہے تو اس کا جواز یہ ہے کہ مرد کو صرف اپنے والدین کی جائداد ملتی ہے جبکہ عورت والدین کی جائداد کے علاوہ شوہر اور اپنے بزرگوں کی جائداد میں بھی حصہ دار ہوتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کا نقطۂ نظر زیادہ فطری اور عقلی بنیادوں پر قائم ہے۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ اسلام میں مرد اور عورت کے حقوق کا تصور فطری بنیادوں پر قائم ہے تو اسلام کے بدخواہوں کی دلیل بے معنی ہو جاتی ہے کہ اسلام ایک پرانا مذہب ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ بیسویں صدی کے جمہوری ڈھانچے کو اپنائیں۔ وہ نیا سیاسی یا سماجی نظام جس نے فطری مطالبوں کو اہمیت نہیں دی ہے۔ اب اس کی خامیاں روز بروز لوگوں پر واضح ہوتی جا رہی ہیں۔ مثال کے طور پر جدید سماج میں عورتوں کو جس قسم کی آزادی دی گئی ہے اس سے آج گھریلو زندگی درہم برہم ہو کر رہ گئی ہے اور بچے ماں کی شفقت اور محبت سے محروم ہو گئے ہیں۔

مندرجہ بالا تجزیے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تاریخی طور پر اگر مردوں کا ایک مخصوص مقام ہے تو عورتیں بھی اپنی ذمہ داریوں کی مناسبت سے سماج میں کوئی کم اہمیت نہیں رکھتیں۔ اس لیے برتری اور کمتری کی بات نہ کر کے ہمیں اس بات پر توجہ دینی چاہیے کہ عورت اور مرد کے جسمانی اور حیاتیاتی اختلاف کا معاملہ اپنی جگہ پر ہے مگر دونوں کا مقام ایک دوسرے سے کم نہیں۔ مرد اگر روزی روٹی کماتا ہے تو عورت اس کے نظم و نسق اور بچوں کی تربیت کا غیر معمولی فریضہ انجام دیتی ہے۔ زندگی کے کاموں کی یہ تقسیم جہاں توازن کے ساتھ نہیں رکھی جاتی وہیں ایسا سماج وجود میں آ سکتا ہے جس میں ہر اگلی نسل بزرگوں کی تربیت سے محروم اور ماں باپ کے ورثے کے لیے نا اہل سمجھی جائے گی۔

مسئلہ صرف یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں اپنی حدوں کا خیال رکھیں اور اپنے اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہونے میں غیر ضروری تقابل اور موازنہ کا رویّہ اختیار نہ کریں۔ یہ بات کسی کی نگاہوں سے مخفی نہیں ہے کہ مغرب میں "آزادیٔ نسواں" کی جو تحریک پچھلی کئی دہائیوں میں بڑے زور شور سے چلتی رہی، اب اپنی موت آپ مر رہی ہے۔ اب مغربی ممالک کی بیشتر خواتین کو اس بات کا اندازہ ہونے لگا ہے کہ گھریلو ذمہ داریاں اور بچوں کی پرورش و پرداخت بجائے خود اتنی بڑی ذمہ داری اور عظیم فریضہ ہے جس کے حسن و خوبی کے ساتھ

باقی صفحہ نمبر ۶۰ پر ملاحظہ فرمایئے



ہماری سرزمین
ہمارے عوام
ہماری تاریخ
ہماری ثقافت
مادرِ وطن پر
ہمارے فخر نے
ہمیں انگریزوں کے
خلاف لڑنے
اور آزادی کو
جیتنے
کی قوت دی۔

اس مشعل کو روشن رکھئے

اور اس جذبۂ تفاخر نے
ہمیں ہندوستان کو
دنیا کی ایک بڑی
صنعتی طاقت بنانے
کے لیے آگے بڑھایا
اور یہی جذبۂ تفاخر
ہمیں پھوٹ ڈالنے والی
طاقتوں کے خلاف نبرد آزما
ہونے اور ہندوستان کی سلامتی کو
محفوظ رکھنے کے لیے
ہمیشہ متحد کرتا رہے گا۔

وہ اگست کا جذبہ

ٹینڈر نوٹس

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نوٹس برائے ٹینڈر یونیورسٹی سائیکل اسٹینڈ ۸۷-۱۹۸۶ء دفتر ہذا سے مندرجہ ذیل اسٹینڈس کے لیے ٹھیکہ یکم اکتوبر ۱۹۸۶ء لغایت ۳۰ ستمبر ۸۷ء تک کے لیے دیا جائے گا۔

۱-	کیمسٹری، بوٹنی ڈپارٹمنٹ	صبح ۷½ بجے سے رات دس بجے تک
۲-	فزکس، میتھمیٹکس، اسٹیٹسٹکس ڈپارٹمنٹ	〃 〃 〃 ۲½ بجے دوپہر تک
۳-	جغرافیہ ڈپارٹمنٹ	〃 〃 〃 〃 〃
۴-	کامرس ڈپارٹمنٹ	〃 〃 〃 رات دس بجے تک
۵	ایم-بی-اے ڈپارٹمنٹ	〃 〃 〃 〃 〃
۶-	فیکلٹی آرٹس، سوشل سائنس	〃 〃 〃 〃 〃
۷-	فیکلٹی آف لاء	〃 〃 〃 ۲½ بجے دوپہر تک
۸-	انجینئرنگ کالج مین بلڈنگ	〃 〃 رات ۹ بجے تک
۹-	سول انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ	〃 〃 رات ۱۰ بجے تک
۱۰	یونیورسٹی پولی ٹیکنک	〃 〃 〃 〃 〃
۱۱	ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ	〃 〃 ۲½ بجے دوپہر تک
۱۲	میڈیکل کالج اسپتال	دن رات
۱۳	میڈیکل کالج (او-پی-ڈی)	صبح ۷½ بجے سے ۲½ بجے دوپہر تک
۱۴	پرنسپل آفس میڈیکل کالج	〃 〃 〃 ۴½ بجے شام تک
۱۵-	طبیہ کالج	〃 〃 〃 ۲½ بجے دوپہر تک
۱۶	ڈینٹس کالج	〃 〃 〃 〃 〃
۱۷	طبیہ کالج اسپتال	〃 〃 〃 〃 〃

١٨-	مولانا آزاد لائبریری	صبح ½٧ بجے سے رات ١٠ بجے تک
١٩	ایس۔ٹی۔ہائی اسکول	″ ″ ″ ½٢ بجے دوپہر تک
٢٠	سٹی ہائی اسکول (دو اسٹینڈ)	″ ″ ″ ″
٢١	گرلس ہائی اسکول	″ ″ ″ ″ ″
٢٢	بی۔ای انجینرنگ کالج	شام ½٥ بجے سے ½٩ بجے رات تک
٢٣	انجینرنگ کالج لائبریری	شام ٥ بجے سے ١٠ بجے رات تک
٢٤	ایڈمنسٹریٹیو بلاک	صبح ٩ بجے سے ٥ بجے شام تک

ٹھیکہ لینے والے شخص یونیورسٹی کیش سیکشن میں مبلغ پانچ سو (-/500) روپے ارنسٹ منی جمع کرکے پراکٹر آفس سے ٹینڈر فارم حاصل کرسکتے ہیں۔ زائد سے زائد رقم بھر کر -/٥٠ روپے کی رسید کے ساتھ لفافے میں سیل بند کرکے ٤ ستمبر ١٩٨٦ء کو شام ٤ بجے تک دفتر ہذا میں جمع کردیں۔

ٹینڈرس ٩ ستمبر ١٩٨٦ء کو شام ٤ بجے پراکٹر آفس میں ٹینڈر دینے والے حضرات کی موجودگی میں کھولے جائیں گے اور سب سے زیادہ رقم کے ٹینڈر کھلنے کے فوراً بعد ٹھیکیدار متعلقہ کو ¼ رقم ضرور جمع کرنی ہوگی۔ بقیہ رقم ٣١ دسمبر ١٩٨٦ء تک ضرور جمع کرانی ہوگی۔

منظور شدہ ٹھیکیدار کو پانچ ہزار (-/٥٠٠٠) روپے زرِ نقد بطور ضمانت تین یوم کے اندر جمع کرنا ہوگا۔ اور تحریری معاہدہ (Agreement) پر دستخط کرنے ہوں گے جو پڑھ کر سنایا جائے گا۔ مسودہ معاہدہ دفتر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

یونیورسٹی کو یہ حق ہوگا کہ بغیر کوئی وجہ بتائے کسی بھی یا سب ٹینڈر دینے والے حضرات کے ٹینڈرز خارج کردے اور ایسے تجربہ کار شخص کو جس کا یونیورسٹی میں کبھی ریکارڈ خراب نہیں رہا ہو، اس کو ترجیح [Preference] دی جاسکتی ہے۔

ٹھیکہ ملنے والے ٹھیکیدار کو غیر رجسٹرڈ شدہ سائیکل کے لیے ٢٥ پیسے اور غیر رجسٹرڈ شدہ اسکوٹر، موٹر سائیکل اور موپیڈ کے لیے ٥٠ پیسے سے زیادہ چارج کرنے کا حق نہ ہوگا۔

(ڈاکٹر ایس۔ اے۔ صادق)
پراکٹر
اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ۔

(538/1288)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۰/ ۸۶-۸۷

درج ذیل جگہوں کے لیے مقررہ فارم پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱- سسٹم انجینیر [سوفٹ ویر] (ایک جگہ) (عارضی)
کمپیوٹر سینٹر
شرح تنخواہ:- ۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰- مع الاؤنسز
قابلیت:

(الف) لازمی:- کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرس ڈگری یا پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ہونا چاہیے۔ اور ساتھ میں سسٹم پروگرامر کی حیثیت سے کم از کم پانچ سال کا تجربہ ہونا چاہیے۔

(ب) پسندیدہ: کمپیوٹر سائنس میں ریسرچ ڈگری ہو یا اس کے مساوی سافٹ ویر ڈویلپمنٹ پروجیکٹ کا کام ہو۔

کام کی نوعیت:- ۱- کمپیوٹر سسٹم کی دیکھ ریکھ اور کمپیوٹنگ سسٹم کے ملٹی پروگرامنگ، بیچ اور ٹائم شیرڈ موڈ اور کمپیوٹرنٹ ورکنگ میں بہتر کارکردگی کے لیے سافٹ ویر کو فروغ دینا اور تکمیل کو پہنچانا۔

۲ سینٹر کی تدریسی و دیگر علمی پروگراموں میں شرکت کرنا۔

۳ کمپیوٹر استعمال کرنے والوں کی کمپیوٹر پروگرام بنانے میں مدد کرنا۔

۴ کمپیوٹر سینٹر کے عملی پہلو [Operational Aspects] میں مدد کرنا اور وقتاً فوقتاً تفویض کیے جانے والے فرائض کو انجام دینا۔

نوٹ:- وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۸/ ۸۵-۸۶- مورخہ یکم جولائی ۱۹۸۵ء اور اشتہار نمبر ۱۳/ ۸۵-۸۶ مورخہ ۲ ستمبر ۱۹۸۵ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں۔ ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ موزوں تصور کیے گیے تو اُن کو پہلی درخواست کی بنیاد پر امیدوار شمار کیا جائے گا۔

۲- پوسٹ:- سینئر ریسرچ فیلو۔ (ایک جگہ) (عارضی)۔ (ڈی- ایس- اے پروگرام کے تحت)
ڈیپارٹمنٹ:- فزکس ڈپارٹمنٹ۔
شرح تنخواہ:- ۱۰۰۰/- روپے ماہانہ (مقررہ)

-/۸۰۰ روپے ماہانہ (مقررہ) (اُن امیدواروں کے لیے جن کے پاس اعلیٰ تعلیمی لیاقت ہو)

قابلیت:

۱- لازمی- ایم-ایس سی (فزکس) یا بی-ٹیک (الیکٹریکل انجینرنگ/الیکٹرانکس) یا ایم-اے (لینگوئیسٹکس) اور ساتھ میں ڈیجیٹل سگنل پروسسنگ میں کم از کم دو سالہ تحقیق کا تجربہ یا ایم-ٹیک (الیکٹریکل انجینرنگ/الیکٹرونکس)

۲- پسندیدہ:- ایم-فل یا جمع شدہ پی ایچ-ڈی کی تھیسس

۳- پوسٹ- جونیر انسٹرومینٹیشن آفیسر (ایک جگہ) (مستقل)

ڈپارٹمنٹ:- کیمسٹری ڈپارٹمنٹ-

شرح تنخواہ:- ۷۰۰- ۴۰- ۱۱۰۰- ۵۰- ۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز

قابلیت:-

۱- لازمی- کیمسٹری/فزکس/انسٹرومینٹیشن میں کم از کم سکنڈ کلاس میں ایم ایس سی کی ڈگری ہو- یا الیکٹریکل الیکٹرونکس انجینرنگ میں بیچلرز ڈگری ہو یا کسی ہندوستانی یا غیر ملکی یونیورسٹی سے جو منظور شدہ ہو انسٹرومینٹ ٹیکنالوجی میں ڈگری ہو-

۲- مختلف الیکٹرونکس اور انیالیٹکل انسٹرومینٹس (مثلاً ماس اسپکٹرومیٹر، ویپر میٹر، کیری ایم ۶۰ اسپکٹرو پولیری میٹر این ایم آر اسپکٹرومیٹر، ویپر فیز، کرومیٹوگراف وغیرہ) کا کسی کیمیکل/فزیکل لیباریٹری جو کسی منظور شدہ ریسرچ انسٹی ٹیوشن یا کسی معروف انڈسٹریل انڈرٹیکنگ کی ہوں ان کو چلانے/دیکھ ریکھ کرنے/اور مرمت کرنے کا تین سال کا تجربہ ہو-

۲- پسندیدہ:- باہر کا تجربہ

نوٹ:- ان امیدواروں کی تعلیمی لیاقت کے سلسلے میں نرمی برتی جا سکتی ہے جو کہ اس کام کے لیے موزوں متصور ہوں اور کم از کم دس سال اس سے نیچے کے گریڈ میں یا اس یونیورسٹی میں کام کر چکے ہوں-

۴- پوسٹ:- اسسٹنٹ انجینیر (دو جگہیں) (مستقل)

ڈپارٹمنٹ:- بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

شرح تنخواہ:- ۶۵۰- ۳۰- ۷۴۰- ۳۵- ۸۱۰- ای-بی- ۳۵- ۸۸۰- ۴۰- ۱۰۰۰- ای-بی- ۴۰- ۱۲۰۰ روپے مع الاؤنسز

قابلیت:-

۱- لازمی:- کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی سے سول انجینرنگ میں ڈگری حاصل کی ہو- یا اے ایم آئی ای یا سول انجینرنگ میں ڈپلوما حاصل کیا ہو-

۲- بلڈنگ، روڈ کنسٹرکشن، واٹر سپلائی، ڈرینج، آر-سی کے کام کا پانچ سال کا تجربہ ڈگری ہولڈرز کے لیے اور-اے-ایم-آئی-ای کی ڈگری ہولڈرز کے لیے ہونا چاہیے- اور

ڈپلوما ہولڈرز امیدواروں کے لیے دس سال کا تجربہ ہونا چاہیئے۔

۲- پسندیدہ:- اسٹورز کی دیکھ ریکھ کا تجربہ قابل ترجیح ہوگا۔

۵- پوسٹ: ڈرائنگ ٹیچر (ایک جگہ) (مستقل)

ڈپارٹمنٹ:- سول انجینیرنگ ڈپارٹمنٹ، ذاکر حسین کالج آف انجینیرنگ اینڈ ٹیکنالوجی۔

شرح تنخواہ:- ۶۵۰-۳۰-۷۴۰-۳۵-۸۸۰-ای بی ۴۰-۹۶۰ مع الاونسز

قابلیت:- ڈپلوما انجینیرنگ کے ساتھ کم از کم پانچ سال کا تدریسی تجربہ ہونا چاہیے اور دو سال کا عملی تجربہ ہونا بھی ضروری ہے۔

نوٹ:- وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۲۵/ ۸۵-۸۶ مورخہ ۲۷ جنوری ۸۶ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں اُن کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ موزوں خیال کیے گئے تو اُن کو پہلی درخواست کی بنیاد پر ہی امیدوار سمجھا جائے گا۔

۶- پوسٹ: سینیر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (آئی۔ وی فلوئیڈ یونٹ)۔ (ایک جگہ)۔ (مستقل)۔

ڈپارٹمنٹ: جے۔ این۔ میڈیکل کالج اسپتال

شرح تنخواہ:- ۵۵۰-۲۵-۷۵۰-ای بی-۳۰-۹۰۰ روپے مع دیگر الاونسز

قابلیت:-

ا- مرکزی گورنمنٹ سے منظور شدہ کسی یونیورسٹی کا فارمیسی یا فارمیوٹیکل کیمسٹری میں گریجویٹ ہو اور گریجویشن کے بعد اس لائسنس کے لاگو ہونے والی ڈرگس کے مینوفیکچرنگ کا کم سے کم ۱۸ ماہ کا عملی تجربہ ہو۔ البتہ اگر کوئی اپنے یونیورسٹی کورس کے دوران اس لائسنس کے لاگو ہونے والی مینوفیکچر آف ڈرگس کی چھ ماہ کی ٹریننگ لی ہو تو اس کے لیے عملی تجربے کی مدت میں چھ ماہ کی تخفیف کی جاسکتی ہے۔

یا

ب- مرکزی گورنمنٹ سے منظور شدہ کسی یونیورسٹی کا سائنس میں گریجویٹ جس نے کیمسٹری یا مائیکرو بیالوجی کو اپنی ڈگری کے لیے بطور خاص مضمون لیا ہو اور جس نے گریجویشن کے بعد اس لائسنس کے لاگو ہونے والی ڈرگس کی مینوفیکچرنگ کا کم سے کم تین سال کا عملی تجربہ حاصل کیا ہو

یا

ج- مرکزی گورنمنٹ سے منظور شدہ کسی یونیورسٹی سے میڈیسن میں گریجویٹ ہو اور گریجویشن کے بعد بیالوجیکل پروڈکٹس کے مینوفیکچر اور ٹیسٹنگ کا کم سے کم تین سال کا تجربہ ہو۔

د- مرکزی گورنمنٹ سے منظور شدہ کسی یونیورسٹی سے کیمیکل انجینیرنگ میں گریجویٹ ہو اور گریجویشن کے بعد اس لائسنس کے لاگو ہونے والی ڈرگس کی مینوفیکچرنگ کا تین سال کا عملی تجربہ ہو۔

نوٹ:- موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ بھی دینا ہوگا

۷۔ پوسٹ: سینیئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (نیفرولوجی) (ایک جگہ)۔ (مستقل)
ڈپارٹمنٹ: میڈیسن ڈپارٹمنٹ
شرح تنخواہ: ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپے مع الاؤنسز
قابلیت:-

۱۔ لازمی ۱۔ بی۔ ایس سی۔
۲۔ کسی میڈیکل کالج کی بائیوکیمیکل لیبارٹری میں کام کرنے کا کم از کم تین سال کا تجربہ ہو۔
۲۔ پسندیدہ: ۱۔ میڈیکل لیبارٹری ٹیکنالوجی میں ڈپلوما ہو۔
۲۔ نیفرولوجی یونٹ میں کام کرنے کا تجربہ ہو۔
نوٹ:- موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے پیشتر ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۸۔ پوسٹ: سینیئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (دو جگہیں) (مستقل)۔
ڈپارٹمنٹ: جے۔ این میڈیکل کالج اسپتال۔
شرح تنخواہ:- ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز
قابلیت۔ ۱۔ بی۔ ایس سی
۲۔ میڈیکل لیب ٹیکنالوجی میں ڈپلوما حاصل کیا ہو اور ساتھ میں کسی منظور شدہ اسپتال میں کم از کم تین سال کا عملی تجربہ کلینیکل پیتھالوجی میں ہونا چاہیئے۔
نوٹ:- موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے پیشتر ایک پریکٹیکل امتحان دینا ہوگا۔

۹ پوسٹ:- الیکٹرونکس انجینیرنگ میں انسٹرکٹر (ریڈیو) (ایک جگہ)۔ (مستقل)۔
ڈپارٹمنٹ:- ویمنس پالی ٹیکنک۔
شرح تنخواہ:- ۴۲۰ - ۴۴۰ - ۱۵ - ۵۱۵ - ای بی - ۱۵ - ۵۶۰ - ۲۰ - ۷۰۰ - ای بی - ۲۵ - ۷۵۰ روپے مع الاؤنسز
قابلیت:- الیکٹرونکس / ریڈیو / ٹیلی کمیونیکیشن میں (تین سالہ مدت کا) ڈپلوما ہونا چاہیئے۔ اور ساتھ میں کسی مشہور ورک شاپ میں اس فیلڈ کا تین سال کا موزوں عملی تجربہ ہونا چاہیے۔

یا

ہائی اسکول پاس ہو اور ساتھ میں آئی۔ ٹی۔ آئی کا سرٹیفکیٹ اس موزوں میدان میں ہونا چاہیئے اور کسی مشہور ورک شاپ میں آئی۔ ٹی۔ آئی کے بعد متعلقہ فیلڈ میں کم از کم دس سال کا عملی تجربہ ہونا چاہیے۔

یا

نوٹ:- موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے پیشتر ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۱۰۔ پوسٹ:- انسٹرکٹر (شارٹ ہینڈ اور ٹائپ رائٹنگ)۔ (ایک جگہ) (عارضی)۔
ڈپارٹمنٹ:- ویمنس پولی ٹیکنک۔
شرح تنخواہ:- ۴۲۰ - ۴۴۰ - ۱۵ - ۵۱۵ - ای بی ۱۵ - ۵۶۰ - ای بی ۲۰ - ۷۰۰ - ای بی ۲۵ - ۷۵۰ روپے مع الاؤنسز

قابلیت :- کامرس میں گڈ سکنڈ کلاس بیچلرز ڈگری ہو اور ساتھ میں شارٹ ہینڈ اور ٹائپ رائٹنگ بحیثیت خصوصی مضمون رہا ہو - اور کم از کم تین سال کا اسٹینوگرافی کا عملی تجربہ ہو -

یا

گڈ سکنڈ کلاس میں بیچلرز ڈگری ہو اور ساتھ میں فرسٹ کلاس میں شارٹ ہینڈ اور ٹائپ رائٹنگ میں ڈپلوما کیا ہو اور اسٹینوگرافی کا تین سال کا عملی تجربہ ہو -

نوٹ :- ۱ خواتین امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی اور اُن کے لیے تجربے کی مدت میں نرمی برتی جائے گی -

نوٹ ۲- موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے قبل شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ میں ایک ٹیسٹ دینا ہوگا -

۱۱- پوسٹ :- انسٹرکٹر [ہیٹ پاور لیب] - [ایک جگہ] [مستقل]

ڈپارٹمنٹ : یونیورسٹی پالی ٹیکنک -

شرح تنخواہ :- ۴۴۰- ۱۵- ۵۱۵- ای بی- ۵۶۰- ۲۰- ۷۰۰- ای بی- ۲۵- ۵۰، روپے مع الاؤنسز -

قابلیت :- مکینکل انجینیرنگ میں (تین سالہ مدت کا) ڈپلوما ہو اور ساتھ میں آئی سی انجن / بوائلر کی دیکھ ریکھ اور کسی مشہور و معروف ورک شاپ میں کام کرنے کا تین سال کا عملی تجربہ ہو -

یا

ہائی اسکول پاس ہو اور اس موزوں میدان میں آئی- ٹی- آئی کا سرٹیفکیٹ اور ساتھ میں آئی- ٹی- آئی کے بعد ۱۰ سال کام کرنے کا عملی تجربہ کسی مشہور ورک شاپ کا ہو اور آئی سی انجن / بوائلر کی دیکھ ریکھ کا تجربہ ہو -

نوٹ :- موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا -

۱۲ پوسٹ :- ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر (میتھ میٹکس) - (ایک جگہ) - [مستقل] -

ڈپارٹمنٹ : اے - ایم - یو - سٹی برانچ اسکول

شرح تنخواہ :- ۴۴۰- ۱۵- ۵۱۵- ای بی- ۱۵- ۵۶۰- ۲۰- ۷۰۰- ای بی- ۲۵- ۵۰، روپے مع الاؤنسز

قابلیت :-

۱- لازمی ۱- سائنس میں بیچلرز ڈگری ہو جس میں میتھ میٹکس بطور ایک خاص مضمون کے رہا ہو -
۲- ایجوکیشن میں ڈگری یا ڈپلوما ہو -
۳- انگریزی / اردو / ہندی میڈیم میں تدریس کی صلاحیت ہو -

۲- پسندیدہ - کسی سکنڈری اسکول میں تدریس کا تجربہ ہو -

نوٹ :- خواتین امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی -

۱۳- پوسٹ: ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر (انگریزی) - (ایک جگہ) - (مستقل)۔
ڈپارٹمنٹ: اے-ایم-یو سٹی برانچ اسکول۔
شرح تنخواہ:- ۴۴۰-۱۵-۵۱۵-ای-بی-۱۵-۵۶۰-۲۰-۷۰۰-ای-بی-۲۵-۷۵۰ روپے مع الاؤنسز
قابلیت:-

۱- لازمی ۱- بیچلرز ڈگری انگریزی میں ہو۔
۲- ایجوکیشن میں ڈگری یا ڈپلوما ہو۔
۳- انگریزی/اردو/ہندی میڈیم میں تدریس کی صلاحیت ہو۔
۲- پسندیدہ:- کسی سکنڈری اسکول میں تدریس کا تجربہ۔
نوٹ:- خواتین امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی۔

۱۴- پوسٹ: جونیئر انسٹرومنٹ مکینک (بوائلر مستری) - [ایک جگہ] - [مستقل]
ڈپارٹمنٹ: مکینکل انجینیرنگ ڈپارٹمنٹ۔
شرح تنخواہ: ۴۲۵-۱۵-۵۶۰-ای-بی-۲۰-۶۴۰ روپے مع الاؤنسز۔
قابلیت

۱- لازمی- انجینیرنگ کی موزوں برانچ میں عمومی پوسٹ میٹرک ڈپلوما ہو- اور ساتھ میں دو سال کا تجربہ ہو۔

یا

پڑھا لکھا ہو اور ساتھ ہی ساتھ سکنڈ کلاس میں بوائلر کا موزوں اہلیت کا سرٹیفکیٹ ہو اور کسی تسلیم شدہ انسٹی ٹیوٹ یا انڈسٹری میں بوائلر کو چلانے اور اس کی دیکھ بھال کرنے کا دس سال کا تجربہ رکھتا ہو۔
۲- پسندیدہ: وہ امیدوار جو کہ کسی انجینیرنگ کالج میں کام کرنے کا تجربہ رکھتے ہوں اُن کو ترجیح دی جائے گی۔
نوٹ:- موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۱۵- پوسٹ:- سپروائزر (بوٹینکل گارڈن)- (ایک جگہ)- (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید)۔
ڈپارٹمنٹ: باٹنی ڈپارٹمنٹ۔
شرح تنخواہ:- ۴۲۵-۱۵-۵۰۰-ای-بی-۱۵-۵۶۰-۲۰-۷۰۰ مع الاؤنسز
قابلیت:

۱- لازمی- کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی سے بی- ایس سی (ایگریکلچر) کیا ہو۔ اور جس میں ہارٹی کلچر بحیثیت ایک مضمون کے رہا ہو۔
۲- پسندیدہ- بوٹینکل گارڈن میں سپروائزر کی حیثیت سے کام کرنے کا عملی تجربہ۔

۱۶- پوسٹ: ٹیکنیکل اسسٹنٹ (ایک جگہ)- (عارضی)۔
ڈپارٹمنٹ: سول انجینیرنگ ڈپارٹمنٹ۔

شرح تنخواہ:- ۴۲۵ - ۱۵ - ۵۰۰ - ای۔بی - ۵۶۰ - ۲۰ - ۶۰۰ روپے مع الاؤنسز۔
قابلیت:- ٹریڈ سرٹیفکیٹ ہو اور متعلقہ میدان میں کم از کم پانچ سال کا تجربہ ہو۔

یا

پڑھا لکھا ہو اور متعلقہ میدان میں دس سال کا تجربہ رکھتا ہو۔

نوٹ:- موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۱۷- پوسٹ:- جونیئر انسٹرومنٹ مکینک (ایک جگہ) (مستقل)۔
ڈیپارٹمنٹ:- سول انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ۔
شرح تنخواہ:- ۴۲۵ - ۱۵ - ۵۶۰ - ای۔بی ۲۰ - ۶۴۰ روپے مع الاؤنسز۔
قابلیت: ٹریڈ میں آئی۔ٹی۔آئی کا سرٹیفکیٹ ہو۔

یا

ویلڈر یا پلمبر کی حیثیت سے پانچ سال کا تجربہ ہو۔

نوٹ:- موزوں امیدواروں کو ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۱۸- پوسٹ: جونیئر انسٹرومنٹ مکینک ۔[ایک جگہ] - [مستقل]۔
ڈیپارٹمنٹ: الیکٹریکل انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ۔
شرح تنخواہ:- ۴۲۵ - ۱۵ - ۵۶۰ - ای۔بی - ۲۰ - ۶۴۰ روپے مع الاؤنسز۔
قابلیت:- ٹریڈ سرٹیفکیٹ اور ساتھ میں متعلقہ میدان میں کم از کم پانچ سال کا تجربہ ہو

یا

پڑھا لکھا ہو اور مکینک/انسٹرومنٹ مکینک/وائرمین کی حیثیت سے ۱۰ سال کا تجربہ۔

نوٹ:- موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۱۹- پوسٹ:- جونیئر انسٹرومنٹ مکینک [وائرمین] - [ایک جگہ] [مستقل]
ڈیپارٹمنٹ:- الیکٹریکل انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ۔
شرح تنخواہ:- ۴۲۵ - ۱۵ - ۵۶۰ - ای۔بی ۲۰ - ۶۴۰ روپے مع الاؤنسز۔
قابلیت:- ٹریڈ سرٹیفکیٹ کے ساتھ کم از کم پانچ سال کا متعلقہ میدان میں تجربہ ہو۔

یا

پڑھا لکھا ہو اور ساتھ میں بحیثیت مکینک/انسٹرومنٹ مکینک/وائرمین دس سال کا تجربہ۔

نوٹ:- موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۲۰- پوسٹ:- سینیئر لیباریٹری اسسٹنٹ [دو جگہیں] [ایک مستقل اور دوسری عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید]۔
ڈیپارٹمنٹ: میڈیسن ڈیپارٹمنٹ۔
شرح تنخواہ:- ۳۸۰ - ۱۲ - ۵۰۰ - ای۔بی ۱۵ - ۵۶۰ - مع الاؤنسز۔

قابلیت:

۱- لازمی۔ سائنس کے ساتھ ہائیر سکنڈری پاس شدہ۔ کسی میڈیکل کالج کی ای-ای-جی لیب میں کام کرنے کا تجربہ۔

۲- پسندیدہ:- ای-ای-جی میں ٹریننگ / ڈپلوما۔

نوٹ:- موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۲۱- پوسٹ: سینئر لیبارٹری اسسٹنٹ [دو جگہیں] [عارضی]۔

ڈپارٹمنٹ: فزیالوجی ڈپارٹمنٹ۔

شرح تنخواہ:- ۳۸۰-۱۲-۵۰۰-ای-بی-۱۵-۵۶۰ روپے مع الاؤنسز۔

قابلیت:- سائنس کے مضامین کے ساتھ ہایر سکنڈری یا اُس کے مساوی کوئی امتحان اور ساتھ میں فزیالوجی میں کام کرنے کا مکمل تجربہ۔

۲۲- پوسٹ:- فارمیسسٹ [تین جگہیں] [ایک جگہ مستقل اور دو عارضی]

ڈپارٹمنٹ:- یونیورسٹی ہیلتھ سروس۔

شرح تنخواہ:- ۳۳۰-۱۰-۳۸۰-ای-بی-۱۲-۵۰۰-ای-بی-۱۵-۵۶۰ روپے مع الاؤنسز۔

قابلیت:-

۱- لازمی ۱- ہائی اسکول یا اس کے مساوی کوئی امتحان پاس کیا ہو۔

۲- کسی منظور شدہ ادارے سے فارمیسی میں ڈپلوما۔

۳- کسی صوبائی فارمیسی کونسل میں بحیثیت فارمیسسٹ رجسٹرڈ ہو۔

۲- پسندیدہ:- ۱- کسی تسلیم شدہ اسپتال یا ڈسپنسری میں بحیثیت فارمیسسٹ ۳ سال کا تجربہ۔

۲- موزوں امیدوار ملنے کی صورت میں تعلیمی لیاقت میں نرمی برتی جاسکتی ہے۔

۲۳ پوسٹ: اسسٹنٹ ڈرافٹس مین [ایک جگہ] [عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید]

ڈپارٹمنٹ: بلڈنگ ڈپارٹمنٹ۔

شرح تنخواہ:- ۲۶۰-۸-۳۰۰-ای-بی-۸-۳۴۰-۱۰-۳۸۰-ای-بی-۱۰-۴۳۰ روپے مع الاؤنسز

قابلیت:

۱- لازمی- ڈرافٹس مین شپ کورس میں سرٹیفکیٹ ہو یا اس کے مساوی کوئی تعلیمی لیاقت ہو۔ اور ساتھ میں دو سال کا عملی تجربہ ہو۔

۲- پسندیدہ:- کسی مشہور آرکیٹیکٹ فرم یا اس جیسی کسی آرگنائزیشن میں کام کرنے کا تجربہ۔

عمر:- ۲۵ سال سے ۴۰ سال تک ہونا چاہیئے۔

نوٹ:- موزوں امیدوار کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

پوسٹ: نسخہ بند (ایک جگہ) - (مستقل) -
ڈپارٹمنٹ: اجمل خاں طبیہ کالج اسپتال۔
شرح تنخواہ۔ ۲۶۰ - ۶ - ۳۲۶ - ای - بی - ۸ - ۳۵۰ - مع دیگر الاؤنسز۔
قابلیت:
تعلیمی۔ یونیورسٹی سے منظور شدہ ہائی اسکول یا اُس کے مساوی کوئی اورینٹل امتحانات پاس شدہ ہوں۔
ٹیکنیکل۔ یونانی میڈیسن میں ڈپلوما ہو یا یونیورسٹی یا بورڈ سے تسلیم شدہ سہایک حکیم ہوں
تجربہ:- نسخہ بندی میں تین سال کا تجربہ ہونے پر قابل ترجیح ہوں گے۔

نوٹ:- وہ حضرات جو اشتہار نمبر ۲۴/۸۵ - ۸۶ مورخہ ، جنوری ۱۹۸۶ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں اُن کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ موزوں خیال کیے گئے، تو اُن کو پہلی درخواست کی بنیاد پر ہی امیدوار تصور کیا جائے گا۔

۱- پوسٹ:- جونیئر ریسرچ فیلو (دو جگہیں) (عارضی) (جن میں سے ایک باٹنی نیماٹولوجی میں اور دوسری آرگینک کیمسٹری میں) (ریسرچ اسکیم کے تحت)
ڈپارٹمنٹ: باٹنی ڈپارٹمنٹ۔
مقررہ تنخواہ -/۱۰۰۰ روپے ماہانہ (این - ای - ٹی کوالیفائیڈ امیدواروں کے لیے) یا
مقررہ تنخواہ -/۸۰۰ روپے ماہانہ (دوسرے امیدواروں کے واسطے)
قابلیت: برائے پوسٹ نمبر ۱
باٹنی میں فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس ایم ایس سی کی ڈگری اور پلانٹ پیتھالوجی / نیماٹولوجی میں تخصص حاصل ہو یا ایم ایس سی (ایگریکلچر) نیماٹولوجی میں اور ساتھ میں فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس میں بی۔ایس سی کی ڈگری۔
پوسٹ نمبر ۲ کے لیے
۱- لازمی۔ آرگینک کیمسٹری میں فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس میں ایم۔ایس سی کی ڈگری اور ساتھ میں فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس میں بی۔ایس سی کی ڈگری!
۲- پسندیدہ:- فائیٹو کیمسٹری اور پروٹینز پر تحقیق کا کچھ تجربہ۔
نوٹ - این۔ ای۔ ٹی کوالیفائیڈ امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی۔

۲- پوسٹ:- پرائمری ٹیچر (سنی دینیات میں) (ایک جگہ) (مستقل)
ڈپارٹمنٹ:- اے۔ ایم۔ یو سٹی برانچ اسکول۔
شرح تنخواہ:- ۳۳۰ - ۱۰ - ۳۸۰ - ای - بی - ۱۲ - ۵۰۰ - ای - بی - ۱۵ - ۵۶۰ روپے مع الاؤنسز۔
قابلیت
۱- لازمی۔ سنی دینیات میں ڈگری یا کسی اورینٹل ادارے یا مدرسے سے اس کے مساوی ڈگری

اور عربی و اردو میں اچھی لیاقت

۲۔ انگریزی / اردو / ہندی میں تدریس کی صلاحیت

۳۔ تدریس / ایجوکیشن میں ڈگری / یا ڈپلوما۔

پسندیدہ ۱۔ کسی سکنڈری اسکول میں تدریس کا تجربہ۔

غیر معمولی استعداد اور تجربے کے حامل افراد کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے۔

انٹرویو کے لیے بلائے جانے والے افراد کو بطور ٹی۔ اے ریلوے کے سکنڈ کلاس کا یک طرفہ سنگل کرایہ دیا جائے گا۔

مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سیلیکشن کمیٹی) کے دفتر سے رجسٹرار آفس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے دفتر سے ۵ روپے (برائے اسامی نمبر ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۱۲، ۱۳، ۲۵ اور ۲۶) اور باقی ماندہ اسامیوں کے لیے ۳ روپے نقد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کیش سیکشن میں جمع کرکے یا اسی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو، بذات خود یا ۱۰ × ۲۳ سینٹی میٹر کا خود کا پتہ لکھا اور مطلوبہ ٹکٹ چسپاں لفافہ بھیج کر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

درخواستیں موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۳ ستمبر ۱۹۸۶ء (آفس ٹائم تک) ہے۔

نامکمل اور تاخیر سے ملنے والی درخواستیں ناقابل قبول ہوں گی

سید شاہد علی

(رجسٹرار)

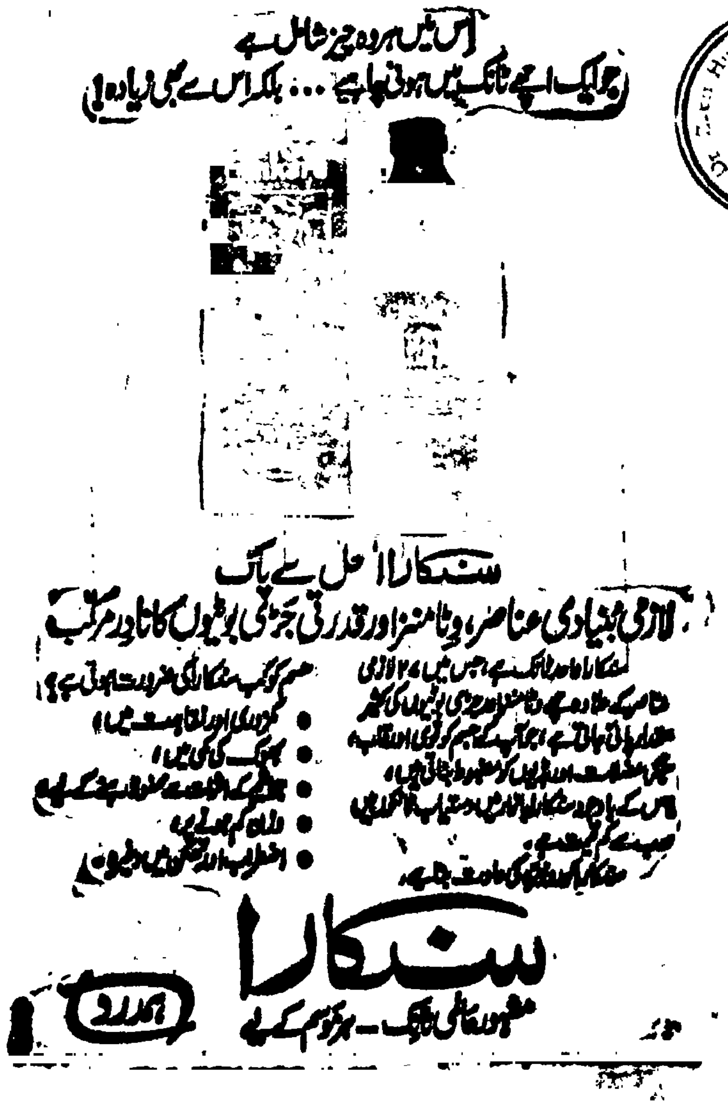
[559/1333]

…: تہذیب الاخلاق ٹرسٹ علی گڑھ - پرنٹر پبلشر: نورالحسن نقوی : مقام اشاعت: شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پریس : ایس ۔ کے آفسیٹ پریس - دہلی

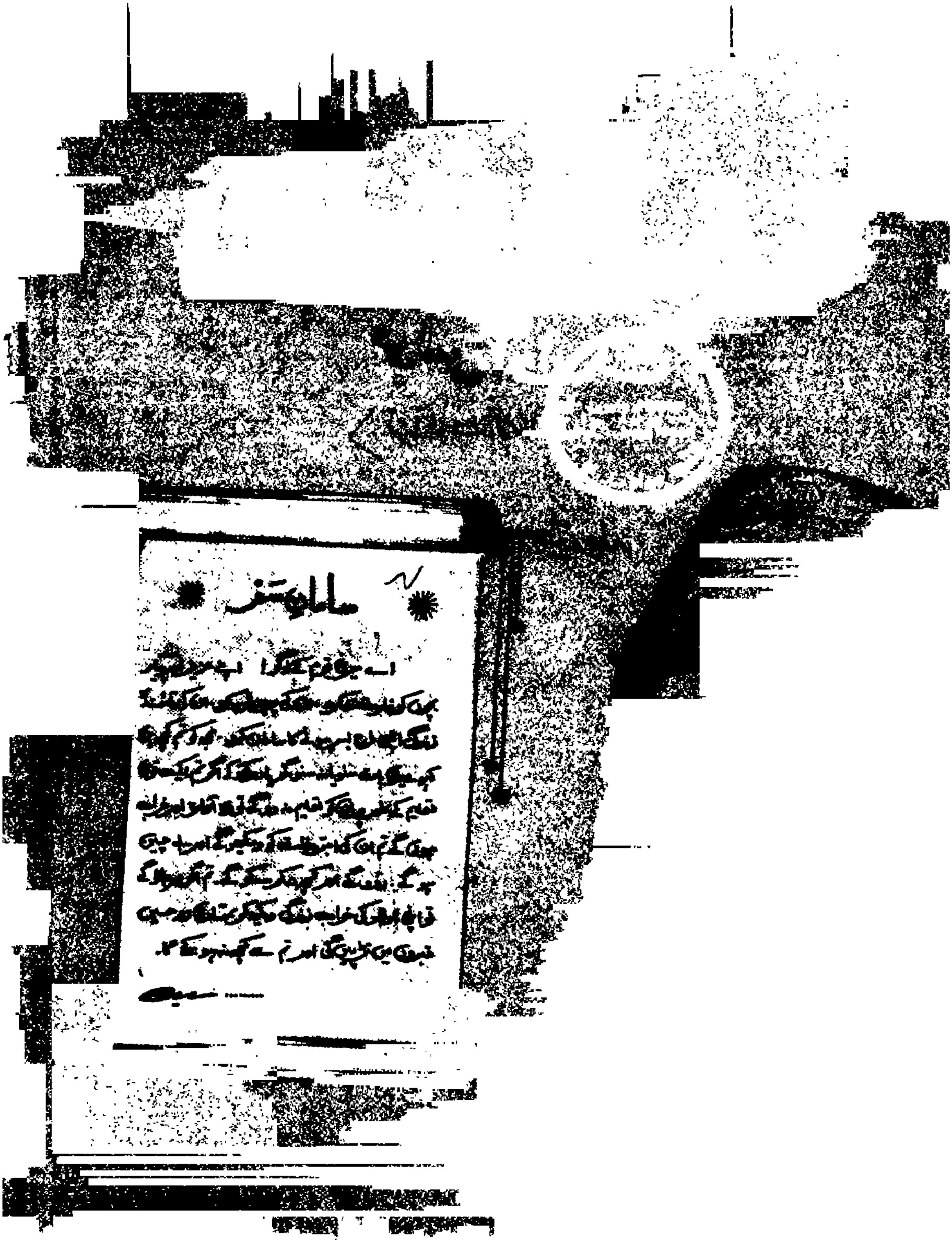


شربت
دماغین
تمام دماغی کام کرنیوالوں
کے لئے نایاب تحفہ
خون صفا

Tahzibul Akhlaq Fortnightly Regd. No. L/ALG 247



Litho Colour Printers, Achal Tal, G. T. Road, Aligarh Phone : 4185



مندرجات

پیغام	جناب سید ہاشم علی	۳
پیغام	پروفیسر وصی الرحمٰن	۵
اداریہ		۶
رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف	ڈاکٹر نورالحسن نقوی	۹
قومی اتفاق	سرسید احمد خاںؒ	۱۲
؟	جناب سید حامد	۱۵
دیرینہ سال پیرے	پروفیسر آل احمد سرور	۱۷
سرسید ڈے	جناب اشتیاق حسین قریشی	۲۰
تفسیر القرآن کا فارسی ترجمہ	ڈاکٹر کبیر احمد جائسی	۲۲
سرسید، تعلیم اور قومی یک جہتی	جناب علی اختر خاں	۳۱
سرسید ایک مفکر تعلیم	ڈاکٹر نظام الدین ایس گوریکر	۴۵
آثار الصنادید — ایک جائزہ	ڈاکٹر اصغر عباس	۵۱
سرسید کا تصور تعلیم اور ذریعۂ تعلیم	ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ	۵۸
سرسید کے دینی افکار	جناب فرخ جلالی	۶۳
خطبات احمدیہ	جناب ابوعلی	۶۷
سرسید کی تفسیر قرآن میں نعت رسول کریمؐ	حکیم محمد حسین خاں شفاؔ	۷۲
سرسید مشاہیر کی نظر میں	جناب شباب الدین	۷۴
سائنٹی فک سوسائٹی اور اس کی خدمات	جناب امتیاز احمد	۸۱
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سائنس دانوں کو قومی انعام	پروفیسر اسرار احمد	۹۱

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان سے ہر حال متفق ہو۔]

پیغام

SYED HASHIM ALI
VICE - CHANCELLOR

OFFICE 3834
RES. 3173
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH - 202001
U.P. INDIA

محبی اسرار احمد صاحب
السلام علیکم

مجھے یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی کہ یوم سرسید کے موقع پر تہذیب الاخلاق اپنا خصوصی شمارہ شائع کر رہا ہے۔ اس موقع پر میں تہذیب الاخلاق کے توسط سے وابستگان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کو یہ بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ زندگی ایک حرکت پذیر شے ہے جس میں ہر آن تغیر و تبدل رونما ہوا کرتا ہے۔ تغیر و تبدل کے تسلسل سے زندگی کی پیشرفت ہوتی ہے اور انفس و آفاق کی نئی نئی راہیں سامنے دکھلائی دیتی ہیں۔ سرسید نے زندگی کے اس راز کو سمجھا اور اپنے زمانے کی معروف قدروں سے انحراف کرتے ہوئے ایک ایسی راہ اپنائی جو زندگی کے تغیر و تبدل کے تمام تقاضوں کو پورا کرتی تھی۔ اس راہ میں جو چند اہم مقامات آئے تھے ان میں سائنٹفک سوسائٹی کا قیام، تہذیب الاخلاق کا اجرا، قدیم تاریخی کتابوں کی جدید انداز کی ترتیب و تدوین اور مدرستہ العلوم مسلمانان، علی گڑھ کی تاسیس خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مدرستہ العلوم مسلمانان، کالج بنا اور اس کے بعد یونیورسٹی، چھیاسٹھ برسوں سے یہ یونیورسٹی زمانے کے گرم و سرد کا مقابلہ کرتی ہوئی اپنے وجود کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ آج اس یونیورسٹی کے شعبوں میں جو توسیع ہو چکی ہے، جو نئے نئے علوم پڑھائے جانے لگے ہیں، جو نئی نئی وسیع و عریض عمارتیں تعمیر ہو چکی ہیں، طلبہ کی تعداد جس قدر بڑھ چکی ہے، اب سے چالیس پچاس سال پہلے اس کا تصور بھی مشکل تھا،

جب کسی ادارے میں توسیع ہوتی ہے تو نئے نئے مسائل سامنے آتے ہیں، رفتارِ سفر میں تغیر و تبدل واقع ہوتا ہے، روایات میں قطع و برید ہوتی ہے، مقصد تو وہی رہتا ہے مگر حصولِ مقصد کی راہیں اکثر بدل جایا کرتی ہیں جن کو ظاہر بین افراد اصل سے انحراف کا نام دیتے ہیں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں توسیع ہوئی ہے اور ہو رہی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ رفتارِ سفر میں تبدیلی آئی ہے، روایات میں ترمیم و تنسیخ ہوئی ہے اور حصولِ مقصد کی راہ اب وہ نہیں ہے جو اب سے ساٹھ ستر برس پہلے تھی لیکن اس کو اصل سے انحراف قرار دینا کور نظری ہوگی۔

کہنا تو بہت کچھ چاہتا ہوں مگر اپنی بات کو مختصر کرتے ہوئے صرف اتنا عرض کرنے پر اکتفا کروں گا کہ وابستگانِ مسلم یونیورسٹی خواہ وہ طالب علم ہوں یا استاد یا انتظامیہ کے اراکین سرسید ؒ کے مشن کو اپنا پیشِ نظر رکھیں، طلبہ ان سے ان تھک محنت، بے خوفی اور ایثار کا درس لیں، اساتذہ ان کے اس معروضی اندازِ نظر کو اپنانے کی کوشش کریں جو ان کی تصانیف اور تہذیب الاخلاق کے صفحات میں آج بھی منارۂ نور بنا ہوا ہے۔ انتظامیہ کے اراکین اپنے دلوں میں وہی تڑپ اور ملک و ملت کا درد پیدا کریں جس سے سرسید ؒ کا سینہ معمور تھا۔ اگر طلبہ، اساتذہ اور انتظامیہ کے اراکین نے مل جل کر اس بات کا بیڑا اٹھا لیا کہ وہ سرسید ؒ کے مشن کو آگے بڑھاتے جائیں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس میں کامیابی نہ ہو۔ میری درخواست یہ بھی ہوگی کہ وہ دشمنانِ علم و دانش جو ہر دور میں مسلم یونیورسٹی کی ترقی اور پرامن فضا کو خراب کرنے میں مشغول رہتے ہیں اُن سے ہوشیار رہیے، اُن کی بے بنیاد افواہوں پر یقین نہ کیجیے اور اُن کی ہر اس کوشش کو متفقہ طور پر ناکام بنانے کی کوشش کیجیے جو اس خوشگوار اور محبت بھری فضا کو خراب کرنا چاہتے ہیں جو گذشتہ ایک سال سے کئی برسوں کے بعد حاصل ہوئی ہے۔

یوم سرسید کے موقع پر تہذیب الاخلاق اپنا خصوصی شمارہ شائع کر رہا ہے میں اس کی کامیابی اور مقبولیت کے لیے دست بدعا ہوں۔ خدا کرے آپ اور آپ کے رفقائے کار کی سعی، سعیِ جمیل ثابت ہو۔

۲۲-۹-۸۹

پیغام

PROF. WASIUR RAHMAN
PRO-VICE-CHANCELLOR

Phones : City : 6727
Uny. : 229
Res. : 5471

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH-202001
U. P. INDIA

محبّی اسرار احمد صاحب، السلام علیکم

مجھے یہ جان کر از حد مسرت ہوئی کہ اکتوبر کے مہینے میں "تہذیب الاخلاق" اپنا سرسید نمبر شایع کر رہا ہے، مجھے امید ہے کہ آپ اس نمبر میں ایسے مقالات شایع کریں گے جن میں اس بات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہوگی کہ عصر حاضر میں سرسید کے افکار و نظریات کی اہمیت و معنویت کیا ہے؟ سچ پوچھیے تو ابھی سرسید کی ہمہ جہت شخصیت پر کام کرنے کی بہت گنجائش ہے۔ انھوں نے فارسی متون کو مرتب کر کے ہند۔ ایرانی ادبیات کے جس پہلو کو اجاگر کیا ہے، اس پر ابھی تک کوئی بھرپور کام نہیں ہوا ہے، اسی طرح ان کا نظریۂ تعلیم، لسانیات، مذہب و قومیت بھی اس بات کے متقاضی ہیں کہ ان کا از سر نو جائزہ لے کر دقت نظر کے ساتھ ان کا تحلیل و تجزیہ کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ عصر حاضر میں ان کے مذکورہ نظریات کی اہمیت کیا ہے؟ یہ کام کسی فرد واحد سے مشکل ہی سے ہو سکے گا۔ اگر آپ اور آپ کے رفقا سب مل جل کر ایک ٹیم کی طرح سرسید کے افکار و نظریات کا مطالعہ کر کے تہذیب الاخلاق کے ذریعے اپنا حاصل مطالعہ پیش کریں تو یہ ایک مفید علمی کام ہوگا۔

آپ جانتے ہی ہیں کہ ہر دور کے تقاضے جداگانہ ہوتے ہیں، سرسیدؒ کے عہد کے تقاضوں اور ہمارے عہد کے تقاضوں میں جو فرق ہے اس فرق کو مدّ نظر رکھے بغیر اس تحریک کو برقرار اور زندہ و فعال رکھنا شاید ممکن نہ ہو۔ اس لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ اور آپ کے رفقا جب سرسیدؒ کا مطالعہ کریں تو ادوار کے تقاضوں کے فرق و اختلاف پر ضرور گہری نظر رکھیں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ تہذیب الاخلاق کا یہ خصوصی شمارہ ہر لحاظ سے کامیاب ہو۔

والسلام

وصی الرحمٰن

اداریہ

۱۷؍اکتوبر ——— مسیحائے قوم سرسیدؒ کی تاریخ پیدائش۔ علیگ برادری کا یومِ عید؛ جگہ جگہ جشن کا اہتمام۔ سرسیدؒ اور ان کی اصلاحی و تعلیمی تحریک کی قصیدہ خوانیاں۔ ان کے اخلاص اور ایثار کا پُرسوز بیان۔ الفاظ کے موتیوں سے مرصع خراج عقیدت۔ مسلم یونیورسٹی کی ہر عمارت دلہن کی طرح سجی ہوئی۔ اس کا ہر ہوسٹل بقعۂ نور۔ رات میں اجتماعی طعام (کمیونٹی ڈنر) جس کی نظیر نہ ملے۔ بلاشبہ ہم علی جس طرح سرسیدؒ کی یاد تازہ کرتے ہیں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اُس سرا ایثار و خلوص کی یاد میں جتنا کچھ بھی کیا جائے کم ہے۔

لیکن! یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مدتوں سے ہر سال سرسیدؒ کی یاد تازہ کرنے، ان کی اصلاحی، جدید تعلیمی تحریک پر صدائے تحسین بلند کرنے اور ان کے ایثار و قربانی پر سر دھننے کے باوجود سرسیدؒ کے سو سا بعد بھی ہندوستانی مسلمان تعلیمی، سماجی اور اقتصادی لحاظ سے نہ صرف پسماندہ ہے بلکہ پسماندہ تر ہوتا چ جا رہا ہے۔ کیا یہ امر اس حقیقت کی طرف اشارہ نہیں کرتا کہ جانشینان سرسیدؒ اور علیگ برادری نے سر کے بعد دھیرے دھیرے ان کی تعلیمات اور ان کے افکار کے ساتھ وہی سلوک کرنا شروع کر دیا جو اس پہلے اسلاف کی تعلیمات کے ساتھ کیا جاتا رہا تھا اور جس کے خلاف خود سرسیدؒ نے آواز بلند کی تھی۔ کیا یہ بات صداقت سے خالی ہے کہ ان کے افکار کو خوبصورت جلدوں میں بند کر کے لائبریریوں کی زینت بنا دیا اور کبھی کبھار اس کا ورد کر کے خوش ہو لیا گیا کہ سرسید کی جانشینی کا حق ادا کر دیا۔ قبل اس کے کہ ہم علا اس اظہار حقیقت پر چراغ پا ہوں ذرا علی گڑھ شہر کی مسلم بستیوں کی طرف ایک نگاہ اٹھا کر دیکھ لیں۔ یہ بات باعث شرم نہیں کہ خاص اس شہر میں جہاں تقریباً ایک صدی سے سرسیدؒ کی قائم کردہ علمی درس گاہ ہو، وہاں مسلمانوں کی تقریباً ساری آبادی جدید تعلیم کجا ہر قسم کی تعلیم سے ناآشنا ہو اور غربت و افلا لبادہ اوڑھے زندگی کا بوجھ گھسیٹ رہی ہو؟ تلخ نوائی معاف! حقیقت تو یہ ہے کہ ہم علیگ سرسیدؒ کی تعلی اور ان کے افکار کا ایک مزار بنا کر اس کے مجاور بن بیٹھے ہیں اور ہر سال خاص خاص موقعوں پر اس پردہ کشائی کر کے سرسیدؒ کے لائق جانشین ہونے کا خراج تحسین وصول کر کے خوش ہو لیتے ہیں

بات جانے دیجیے۔ اگر آزادی کے بعد ہی سے ہر علیگ نے مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے ہفتہ میں چند گھنٹے بھی وقف کیا ہوتا تو ہندوستانی مسلمانوں کی وہ ابتر حالت نہ ہوتی جو آج ہے۔

سر سید رحمۃ اللہ علیہ کے فکر و عمل میں جو بات سب سے نمایاں ہے وہ ہے حد سے بڑھی جذباتیت اور بے جا تعصب سے اجتناب۔ جذباتیت ــــــ وہ آگ جس کے شعلے عقل کو جھلس دیں اور جس سے مغلوب ہو کر انسان خودکشی تک کر لینے سے گریز نہ کرے۔ تعصب ــــــ وہ زہر جسے پی کر انسان اندھا ہو جائے اور حق و انصاف کی راہ سے ہٹ جائے۔

تصور میں لائیے ۱۸۵۷ء کا زمانہ۔ ہندوستانی خصوصاً مسلمان اپنا سب کچھ داؤں پر لگا کر سیاست کی آخری بازی بھی ہار چکا ہے۔ ہندوستان کی عظمت کا نشان مغلیہ تخت و تاج "کمپنی بہادر" کی قدموں کی خاک بنا ہوا ہے۔ وہ سر جس کے سامنے اغیار سرنگوں ہونے میں فخر محسوس کرتے تھے اب خود سرنگوں ہو کر عزت و ناموس کی بھیک مانگ رہا ہے۔ انگریز اور اس کے حواری فتح و کامرانی کے نشے میں چور بدمست ہاتھی کی طرح چاروں طرف دندناتے پھر رہے ہیں۔ شہر کے شہر ویران اور گاؤں کے گاؤں برباد۔ شاہراہیں ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کے خون سے سرخ اور چوراہے ان کی لٹکتی ہوئی لاشوں سے آباد۔ قتل و غارت گری کا وہ بازار گرم کہ چنگیز بھی پناہ مانگے اور وحشت و بربریت کا وہ ننگا ناچ کہ ابلیس بھی آنکھ بند کر لے۔

غور کیجیے۔ اپنے وطن اور اپنی قوم پر آنے والی اس قیامت کو دیکھ کر سر سید رحمۃ اللہ علیہ کے اس حساس دل پر جس کی ہر دھڑکن اپنوں کے لیے وقف ہو چکی ہو کیا کچھ نہ بیت گئی ہو گی۔ اپنی قوم کے غم میں ہمہ وقت اشکبار رہنے والی آنکھوں میں کتنا کتنا خون نہ اُتر آیا ہو گا۔ غم و غصے سے ان کے جذبات میں کیسے کیسے ابال نہ آئے ہوں گے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے جذبات کو بے قابو نہ ہونے دیا اور ہوش کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ وہ ایک نادان مجاہد کی طرح خودکشی کے غار میں نہ کود پڑے۔ یا ایک عقلمند بزدل کی طرح انگریزوں کے خلاف تعصب کی چادر اوڑھ کر گوشہ نشین نہ ہو رہے بلکہ ایک دانا مجاہد کی طرح اس جہالت اور ان سماجی برائیوں کے خلاف صف آرا ہو گئے جن کی وجہ سے مسلمانوں پر یہ قہر الٰہی ٹوٹا تھا۔ ان کے سامنے قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ کا آئینہ تھا۔ جس میں وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ سنت الٰہی کن کن اوصاف سے متصف اقوام کو عزت و جاہ سے نوازتی ہے اور کن کن برائیوں میں ملوث اقوام کو اس سے محروم کرتی ہے۔ اس آئینے میں انھیں صاف نظر آ رہا تھا کہ اس زمانے کے ہندوستانی خصوصاً مسلم معاشرے میں ہر وہ برائی موجود تھی جن میں ملوث اقوام کو قعر مذلت کی کھائیوں میں پھینک دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی عجیب حالت تھی وہ جہالت کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے مگر اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ علم کی روشنی بس ان ہی سے ہے۔ علمی طور پر دیوالیہ بن چکے تھے مگر یہ زعم کہ علم کا خزانہ بس ان ہی کے پاس ہے۔ مختلف طبقات میں منقسم تھے مگر یہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں مساوات کے علم بردار بس وہی ہیں۔ سخت قسم کے تعصب میں گرفتار تھے مگر سوچتے تھے کہ ان سے بڑھ کر کوئی کشادہ دل نہیں۔ وہ لایعنی رسومات اور طرح طرح کے توہمات میں گھرے ہوئے تھے اور طرفہ ستم کہ گویا یہ عین اسلامی تعلیمات ہیں۔ نا اتفاقی، آپسی کھینچ تان، بغض و حسد، بے جا تکبر، کاہلی و

تن آسانی غرض کہ شاید ہی ایسا کوئی سماجی مرض ہو جس میں وہ مبتلا نہ رہے ہوں۔ سرسیدؒ نے حالات کا منصفانہ اور غیر متعصبانہ تجزیہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک مسلم معاشرے سے ان برائیوں کا قلع قمع نہ ہوگا اس وقت تک بڑی سے بڑی قربانی بھی مسلمانوں کو پستی کے اس غار سے نہیں نکال سکتی جس میں وہ پھینک دیے گئے ہیں۔

دنیا واقف ہے کہ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد سرسیدؒ نے دل و جان سے اپنی اصلاحی و تعلیمی تحریک شروع کی۔ دنیا نے یہ بھی دیکھا کہ جس جوش و خروش سے انھوں نے اپنی تحریک کا آغاز کیا تھا اسی جوش و تندی سے ان کی مخالفت بھی ہوئی۔ وہ کون سا الزام ہے جو ان پر نہ لگایا گیا اور وہ کون سی زیادتی ہے جو ان کے ساتھ روا نہ رکھی گئی۔ انھیں غدّارِ قوم اور حکومتِ وقت کا ایجنٹ کہا گیا، دہریہ اور ملحد قرار دیا گیا، ان کے خلاف کثیر تعداد میں کفر و ارتداد کے فتاوے جاری کیے گئے اور بعضوں نے تو انھیں واجب القتل تک قرار دیا۔ لیکن وہ مخالفت کی اس بے رحمانہ یلغار سے گھبرا کر کسی گوشۂ عافیت میں بیٹھ نہ رہے اور نہ ہی اپنے مخالفوں کی بابت کسی قسم کے تعصب میں گرفتار ہوئے۔ اس معاملے میں بھی انھوں نے اپنے جذبات کو ہوش پر حاوی نہ ہونے دیا کیوں کہ انھیں قدرت کے اس قانون کا بخوبی علم تھا کہ جس شے میں جتنا زیادہ جمود ہوگا وہ تبدیلیوں کی اتنی ہی زیادہ مخالفت کرے گی۔

سوچنے کا مقام ہے؛ اسلام کے نام پر ہونے والی اس ہمہ گیر اندھی مخالفت کے ردّ عمل کے طور پر اگر سرسیدؒ خاموش بیٹھ رہتے تو آج کا ہندوستانی مسلمان کس عالم میں ہوتا۔ نہ تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہوتی اور نہ اُس کے فیض سے پائی جانے والی مسلمانوں میں جدید تعلیم کی یہ تھوڑی بہت روشنی — پچھلی چند صدیوں سے مسلم سماج کا یہ المیہ رہا ہے کہ جب بھی کسی روشن دماغ نے عقل و دانش کی راہ دکھائی، سماجی اصلاح اور مضبوط بنیاد فلاحی کام کی دعوت دی تو اس کے خلاف مخالفتوں کا ایک طوفان برپا کر دیا گیا۔ اس کے برخلاف موقع پرستوں، ابن الوقتوں، سیاسی طالع آزماؤں اور جذبات سے کھیلنے والوں کے قدموں پر عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کیے گئے۔

ہندوستان کے مسلمان آج جن حالات سے دوچار اور جس پسماندگی کے شکار ہیں ان کا غیر جذباتی تجزیہ کرنے کے بعد ہر ذی ہوش اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی ترقی کا راز اسی راہ پر چلنے میں مضمر ہے جسے سرسیدؒ نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دکھایا تھا — اور وہ ہے جدید تعلیم سے آراستگی، محنت و جانفشانی اور سماجی برائیوں کے خلاف جہاد کی راہ۔ مگر اس راہ پر کامیابی کی اولین شرط یہ ہے کہ حتی الامکان وقتی اور فروعی مسائل میں الجھ کر اپنی توانائی ضائع کرنے سے احتراز کیا جائے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ مسلمان اس ملک میں اقلیت میں ہیں۔ اور دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ اقلیتیں ایک باعزت اور باوقار مقام اسی وقت حاصل کر سکتی ہیں جب وہ خود میں وہ اوصافِ حمیدہ پیدا کریں کہ دوسرے اُن کے نقشِ قدم پر چلنے پر مجبور ہوں اور جانفشانی اور عرق ریزی سے وہ کمال پیدا کریں کہ ملک کے لیے ناگزیر بن جائیں۔

اسرار احمد

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

اکتوبر کا مبارک مہینہ سرسیّد کی ولادت کا مہینہ ہے۔ قوم کے اس عظیم محسن کی طرف سے یوں تو ہمیں کبھی بھی غافل نہ ہونا چاہیے لیکن سال میں کم سے کم ایک دفعہ یعنی اس مہینے اس کی یاد کو ضرور تازہ کر لینا چاہیے۔ اس کی ساری زندگی اس فکر میں بسر ہوگئی کہ کس طرح قوم کو تباہ حالی سے نجات ملے۔ جس قوم کے لیے اس نے اپنا آرام و سکون اور مال و متاع سبھی کچھ برباد کر دیا اس قوم کی طرف سے انعام ملا تو یہ کہ اسے مرتد، ملحد، زندیق، خود غرض، سرکار کا خوشامدی اور اس جیسے نہ جانے کتنے خطابات سے نوازا گیا۔ مگر ان سب کے جواب میں اس نے اپنے دادا کی سنت پر عمل کرتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ اے خدا انھیں سچا راستہ دکھا، یہ نہیں جانتے کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ نہ ان تمام باتوں سے وہ بددل ہوا بلکہ اسی عزم و ہمّت سے اپنے کام میں لگا رہا۔ کیوں کہ اللہ تعالےٰ نے اسے آہنی اعصاب عطا فرمائے تھے مگر تھا تو وہ آخر انسان ہی۔ جب ایک معزز شخص نے اس پر یہ الزام لگایا کہ کالج کے آنریری سکریٹری (یعنی سرسیّد) عمارات کی تعمیر میں اس لیے زیادہ سرگرم رہتے ہیں کہ اس سے کچھ مالی منفعت بھی ہوتی ہے تو اس کے دل پر چوٹ بھی اور اس نے تہذیب الاخلاق میں لکھا کہ ایسی باتوں سے دل تو دکھتا ہی ہے۔

قومی خدمت کرنے والوں کی قسمت میں انعام تو یہ ایک ہی ہے یعنی بہتان تراشی لیکن مختلف شخصیتوں پر اس کے ردِ عمل مختلف ہوتے ہیں۔ ایک ردِ عمل تو وہ تھا جو آپ نے اوپر کی سطر در میں ملاحظہ فرمایا یعنی ایک مخلص اور حوصلہ مند انسان ہنستے ہنستے جتنے وار سہ سکتا تھا سہتا رہا مگر جب قوتِ برداشت نے جواب دے دیا تو کراہ اٹھا۔ اور اب ملاحظہ ہو ایک اور ردِ عمل۔

خلافت تحریک کے روحِ رواں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی تھے۔ مولانا محمد علی کو ملک کے زیادہ دورے کرنے پڑتے تھے، زیادہ تقریریں کرنی پڑتی تھیں، ملاقاتوں کے لیے زیادہ و نکالنا ہوتا تھا۔ اس لیے خلافت کمیٹی کے دفتر کی نگرانی مولانا علی کے سپرد تھی۔ کمیٹی کا چندہ بھی مولانا کی تحویل میں رہتا تھا۔ محمد علی دھان پان قسم کے انسان تھے تو مولانا شوکت علی بے حد شحیم۔ آخر اللہ میاں کی دی ہوئی توند کو کہاں لے جاتے۔ بعض انھیں "شکم ملت" کہتے تھے اور الزام لگاتے تھے کہ مولانا کے ذاتی اخراجات اسی چندے کی رقم سے پورے ہوتے ہیں۔ ہر یہی سمجھتا ہے کہ جس شخص کی تحویل میں قومی سرمایہ ہے وہ ضرور خرد برد کرتا ہوگا۔ مولانا شوکت علی ایک جلسے میں تقریر کر رہے تھے۔ میں سے کسی نے کاغذ کا ایک پرزہ بھیجا۔ انھوں نے تقریر دوران اس پر نظر ڈالی اور مٹھی میں دبا لیا۔ تقریر کر کے رخصت لگے تو مجمع سے شور اٹھا۔ مولانا اس پرزے کا جواب پھر مائک پر لوٹ کے آئے۔ بولے ابھی سامعین میں سے

تو بھیجا ہے اور پوچھا ہے کہ مولانا آپ کا ذریعۂ معاش کیا ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ "قوم کا کام کرتے ہیں اور (توند پر دونوں ہاتھ مار کے فرمایا) قوم کا چندہ کھاتے ہیں۔" یہ ہوا اینٹ کا جواب پتھر۔ اسے دوسرا ردِعمل سمجھیے۔ جو قومی کام کا ارادہ کرے وہ اپنی کھال موٹی کر لے۔ ذکی الحس اور زود رنج لوگوں کا اس میدان میں کام نہیں۔

اس سلسلے میں ایک تیسرا رویہ بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ مخالفین کی لعن طعن اور دشنام طرازی انھیں ایک خاص لطف بہم پہنچاتی ہے۔ انھیں خوش کرنے کو یہ خیال کافی ہوتا ہے کہ ہمارے دشمن کو کتنی تکلیف پہنچی ہوگی، اس کی کتنی راتیں بے آرام رہی ہوں گی، اس نے کتنے وقت پیٹ بھر کے کھانا نہ کھایا ہوگا جس کے [illegible] بدگوئی کا یہ فوّارہ چھوٹا ہے۔ ہم اس رویے کو صحت مند نہیں کہتے۔ دشمن کو تکلیف میں دیکھ کر خوش ہونا انسانی کمزوری ہے بلکہ اسے ایک طرح کی خباثت کہیے۔ اس سخت اور مکروہ لفظ کا استعمال کرنے کے بعد اب ہم بصد عجز تسلیم کرتے ہیں کہ آپ کے تہذیب الاخلاق کے چند خدمت گزاروں کا تعلق اگر اس قبیلے سے ہو تو کچھ حیرت کی بات نہیں۔

آج جب اردو کے پرانے اور مضبوط اخبارات ایک ایک کر کے بند ہوتے جا رہے ہیں، علمی و ادبی رسائل کبھی کبھی سو سے بھی کم تعداد میں چھاپے جاتے ہیں اور اتنے خریدار بھی میسر نہیں آتے۔ ایسے سنگین حالات میں آپ کے تہذیب الاخلاق نے عام لوگوں کے سارے اندازوں کے خلاف اپنے قدم جما لیے۔ پانچ سو سے کچھ کم لائف ممبر بہم پہنچا لیے (اگر یہ اسکیم مجبوراً اور مصلحتاً ختم نہ کر دی گئی ہوتی تو شاید اس وقت ایک ہزار لائف ممبر ہوتے) پھر اردو رسائل کی روایت کے قطعاً برعکس یہ کل رقم یونین بینک میں بطور سرمایۂ محفوظ جمع کر دی گئی۔ سب سے اہم بات یہ کہ اپنی سنجیدگی اور مقصدیت کو برقرار رکھنے کے باوجود تہذیب الاخلاق کی تعداد اشاعت ہزاروں تک پہنچ گئی۔ مسلم یونیورسٹی شروع سے اس کی سرپرستی کر رہی تھی حالانکہ اس کا علیحدہ، خود مختار اور رجسٹرڈ ٹرسٹ تھا۔ لیکن یونیورسٹی کا وائس چانسلر اس کا صدر ہوتا تھا اور ٹرسٹ کے بیشتر اراکین اس یونیورسٹی سے متعلق تھے۔ اس دوران قارئین کے حلقے کو وسیع کرنے کے خیال سے پندرہ روزہ تہذیب الاخلاق کے ساتھ ساتھ پندرہ روزہ نشانت (ہندی) بھی جاری کیا گیا۔

مسلم یونیورسٹی نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ انتظامیہ، اساتذہ، طلبا اور علم دوست حلقے کے درمیان رابطے کا کوئی ذریعہ ان رسالوں سے زیادہ قوی اور معتبر نہیں ہو سکتا۔ تہذیب الاخلاق اور نشانت کی مکمل سرپرستی کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کا مطلب تھا معقول عملے، سرمایے اور جملہ سہولیات کی فراہمی۔ بس یہی ستم ہو گیا۔ رسالوں کے خلاف یونیورسٹی کے حکام کو گمنام خطوط موصول ہوئے، اخبارات میں فرضی نام سے بلکہ چہرے پر نسوانی نقاب ڈال کر مراسلے شائع کرائے گئے۔ اس وقت تو ہم بس صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ان حرکتوں سے کچھ ہونے والا نہیں۔ بالفرض یونیورسٹی کو یقین دلا دیا جائے کہ ان رسالوں کا معیار پست ہے اور یہ سرپرستی کے مستحق نہیں، تو الحمدللہ ابھی ٹرسٹ زندہ ہے وہ اس بوجھ کو پھر سے اٹھا لے گا۔

تنقید بلکہ نکتہ چینی کا بھی ہم نے ہمیشہ خیر مقدم کیا ہے۔ اعتراضات اور تجاویز کو ہم نے ہمیشہ خوش دلی سے سنا ہے اور ہمدردوں کے مشورے سے ان دونوں رسالوں کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان رسالوں میں چٹپٹا مواد پیش نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم یہ کوشش برابر رہی ہے کہ انھیں زیادہ سے زیادہ دلچسپ، مفید اور پُر از معلومات بنایا جائے۔ یہ کام سہل نہیں۔ راقم کی علالت کے بعد جن اصحاب نے ادارت سنبھالی انھوں نے ان رسالوں کو بہتر اور مقبول تر بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ مگر مشکل کام زیادہ وقت چاہتا ہے۔ آپ کا تعاون حاصل رہا اور آپ کی تجاویز موصول ہوتی

ہیں تو مدیر اور مجلسِ ادارت کی کوششیں ضرور
رآور ہوں گی مگر جن نادان "احباب" نے سازش
راستہ اختیار کیا ہے ان کو تو انشاءاللہ ناکامی ہی کا
نہ دیکھنا پڑے گا۔ میں ان دنوں علیل ہوں اور
داخل اسپتال، مگر دل میں درد سوا ہوا تو اتنا کچھ
عرض کرنا پڑا اس میں کچھ تلخ نوائی کا رنگ بھی پیدا
ہو گیا جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

نورالحسن نقوی
جواہر لال نہرو میڈیکل کالج
مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ۔

قابلِ تقلید

سرسیدؒ ساری زندگی ہدف ملامت بنے رہے۔ ان کے مخالفین ہمیشہ انھیں طنز، تعریض اور دشنام کا طرح طرح سے نشانہ بنائے رہے۔ کسی صاحب نے ان کے خلاف ایک سخت مراسلہ لکھ کر فرضی نام سے اخبار میں شایع کرایا جسے سرسید نے قابلِ التفات ہی نہ سمجھا۔ آخر کار وہ صاحب شرمندہ ہو کر سرسید کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معافی مانگی۔ جواب میں اس مردِ بزرگ نے جو کچھ فرمایا وہ قابل توجہ ہے۔ انھوں نے کہا نہ مجھے مراسلے کا گلہ ہے نہ اس کے سخت لہجے کا۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ تم نے اخلاقی جرأت سے کام نہ لیا۔ اگر میرے خلاف کچھ کہنا تھا تو کہتے، برملا کہتے مگر بزدلوں اور نامردوں کی طرح چھپ کر وار کرنا شریفوں کا شیوہ نہیں۔ سرسیدؒ پہلے صاحبِ قلم تھے جنھوں نے اردو صحافت میں بیباکی اور صاف گوئی کی بنیاد ڈالی۔ جو کچھ کہا، جو کچھ لکھا صاف صاف اور اپنے نام سے۔ کاش ہمارے عہد کے اہل قلم اور مراسلہ نگار خود میں سرسیدؒ کی سی جرات پیدا کر سکیں۔

سر سید احمد خاںؒ

قومی اتفاق

قوم کا لفظ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنوں پر کسی قدر غور کرنا لازم ہے۔ زمانۂ دراز سے جس کی ابتدا تاریخی زمانہ سے بھی بالاتر ہے، قوموں کا شمار کسی بزرگ کی نسل میں ہونے، یا کسی ملک کا باشندہ ہونے سے ہوتا تھا۔

محمد رسول اللہ صلعم بابی انت وامی نے اس تفرقۂ قومی کو، جو صرف دنیاوی اعتبار سے تھا، مٹا دیا اور ایک روحانی رشتۂ قومی قائم کیا جو ایک حبل المتین:

لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

سے مضبوط تھا۔ تمام قومی سلسلے، تمام قومی رشتے، سب کے سب اس روحانی رشتے کے سامنے نیست و نابود ہو گئے؛ اور ایک نیا روحانی بلکہ خدائی قومی رشتہ قائم ہو گیا۔

اسلام کسی سے نہیں پوچھتا کہ وہ ترک ہے یا تاجیک؟ وہ افریقہ کا رہنے والا ہے یا عرب کا؟ وہ چین کا باشندہ ہے یا ماچین کا؟ وہ پنجاب میں پیدا ہوا ہے یا ہندوستان میں؟ وہ کالے رنگ کا ہے یا گورے کا؟ بلکہ جس کسی نے عروۃ الوثقیٰ کلمۂ توحید کو مستحکم پکڑا وہ ایک قوم ہو گیا! بلکہ ایک روحانی باپ کا بیٹا!! کیونکہ خدا نے خود فرمایا ہے۔

انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون۔

کون شخص ہے جو دو بھائیوں کو ایک باپ کا بیٹا نہیں جانتا؟ پھر جب کہ خود خدا نے تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی فرمایا ہے تو ہم سب کا ایک روحانی باپ کی اولاد ہونے میں کیا شک رہا ہے؟

مجھے اس بات کے دیکھنے سے نہایت افسوس ہے کہ ہم سب آپس میں بھائی تو ہیں مگر مثل برادران یوسفؑ کے ہیں آپس میں دوستی اور محبت، یک دلی اور یک جہتی بہت کم ہے۔ حسد، بغض و عداوت کا ہر جگہ اثر پایا جاتا ہے، جس کا نتیجہ آپس کی نااتفاقی ہے۔ شیطان، جس نے خدا سے وعدہ کیا کہ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ۔ ایک مقدس اور بظاہر نہایت نورانی حیلے سے آپس میں بھائیوں کے، جن کو کہ خدا نے بھائی بنایا ہے، نفاق ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے؛ اور جس طرح کہ ہمارے باپ حضرت آدمؑ اس کے دھوکے کو خالص دوستی سمجھ کر، دھوکے میں آ گئے اسی طرح ہم بھی اس کے دھوکے میں آ جاتے ہیں، اور اس نفاق کو، جو ہر حالت میں مردود ہے، ایک مقدس لباس پہناتے ہیں، یعنی مذہبی مقدس لباس کا خلعت، اسے عنایت کرتے ہیں۔

کون شخص ہے جو اس بات کو نہیں جانتا ہے؛

من قال لا الہ الا اللہ، فھو مسلم۔ من استقبل قبلتنا فھو مسلم ومن ھو مسلم فھو اخ۔

امام اعظمؒ کا مذہب مشہور ہے۔

لانکفر اھل القبلۃ ط

باہمہ فروعِ مسائل میں اختلاف ہونے کے سبب کس طرح ہماری قوم نے اس حبل المتین کی بندش کو توڑا ہے، اور اس رشتہ، اخوت کو، جسے خود خدا نے قائم کیا تھا، چھوڑا ہے جس قصبہ اور شہر میں جاؤ، جس مسجد اور امام باڑے میں گزرو، باہم مسلمانوں کے، شیعہ و سنی، وہابی و بدعتی، لامذہب و مقلد ہونے کی بنا پر آپس میں نفاق و عداوت پاؤ گے۔

ان نااتفاقیوں نے ہماری قوم کو نہایت ضعیف اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ جمعیت کی برکت ہماری قوم سے جاتی رہی ہے۔ قومی ہمدردی اور قومی ترقی اور قومی امور کے سرانجام دینے میں اس نالائق نااتفاقی نے بہت کچھ اثر بد پہونچایا ہے۔ پس ہماری قومی ترقی کا سب سے اوّل مرحلہ یہ ہے کہ ہم سب آپس کی محبت سے اس عداوت و نفاق کو، یکتائی و یک جہتی سے مبدّل کریں۔

یکتائی و یک جہتی سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ سب لوگ اپنے اپنے عقاید کو چھوڑ کر ایک عقیدے پر قائم ہو جاویں۔ یہ امر تو قانونِ قدرت کے برخلاف ہے، جو ہو نہیں سکتا، نہ تو پہلے کبھی ہوا، اور نہ آئندہ کبھی ہوگا۔

اتفاق کے قائم رکھنے کی جس کی ہم کو ضرورت ہے ایک اور عقلی و نقلی راہ ہے جس کی پیروی قومی اتحاد کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ انسان جب اپنی ہستی پر نظر ڈالے گا تو اپنے میں دو حصے پاوے گا: ایک حصہ خدا کا؛ اور ایک حصہ اپنے ابنائے جنس کا۔ انسان کا دل یا اس کا اعتقاد، یا مختصر طور سے یوں کہو کہ اس کا مذہب، خدا کا حصہ ہے جس میں دوسرا کوئی شریک نہیں؛ اس کے عقائد کی جو کچھ بھلائی یا برائی ہو، اس کا معاملہ اس کے خدا کے ساتھ ہے؛ نہ بھائی اس میں شریک ہے، نہ بیٹا، نہ دوست، نہ آشنا، اور نہ قوم۔ پس ہم کو اس بات سے، جس کا اثر ہر ایک کی صرف ذات تک محدود ہے اور ہم سے کچھ تعلق نہیں ہے، کچھ بھی تعلق رکھنا نہیں چاہیئے۔ ہم کو کسی شخص سے اس خیال پر کہ وہ شیعہ ہے یا سنّی، وہابی ہے یا بدعتی، لامذہب ہے یا مقلد، یا نیچری یا اس سے کسی بدتر لقب کے ساتھ ملقب ہے، جب کہ وہ خدا و خدا کے رسول کو برحق جانتا ہے، کسی قسم کی عداوت و مخالفت رکھنی نہیں چاہیے، بلکہ اس کو بھی بھائی اور کلمہ کا شریک سمجھنا اور اس اخوت کو جس کو خدا نے قائم کیا ہے، قائم رکھنا چاہیے

نہایت افسوس اور نادانی کی بات ہے کہ ہم کسی سے ایسے امر میں عداوت رکھیں جس کا اثر خود اسی تک محدود ہے اور ہم کو اس سے کچھ بھی ضرر و نقصان نہیں۔ جو حصہ کہ انسان میں اس کے ابنائے جنس کا ہے اس سے ہم کو غرض رکھنی چاہیئے اور وہ حصہ آپس کی محبت، باہمی دوستی، ایک دوسرے کی اعانت، ایک دوسرے کی ہمدردی ہے جس کے مجموعہ کا نام قومی ہمدردی ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے خدا کے حکم کی بھی اطاعت اور آپس میں برادرانہ برتاؤ، قومی اتفاق، قومی ہمدردی قائم ہو سکتی ہے جو قومی ترقی کے لیے پہلی منزل ہے۔

یہ بات ہم کو بھولنی نہیں چاہیئے کہ ان روحانی بھائیوں کے سوا اور بھی ہمارے وطنی بھائی ہیں گو وہ ہمارے ساتھ اس کلمہ میں، جس نے ہم مختلف قوموں اور مختلف فرقوں کو ایک قوم اور آپس میں روحانی بھائی بنایا ہے، شریک نہیں ہیں، مگر بہت سے تمدنی امور ہیں جن میں ہم اور وہ، مثل بھائیوں کے، شریک ہیں۔ ہمسایہ کا ادب ہمارے مذہب کا ایک جزو ہے اور یہی ہمسائگی وسعت پاتے پاتے ہم ملکی اور ہم وطنی کی وسعت تک پہونچ گئی ہے۔

ان ہم وطن بھائیوں میں بھی دو حصے ہیں، ایک خدا کا اور ایک ابنائے جنس کا: خدا کا حصہ خدا کے لیے چھوڑو اور جو حصہ ان میں ابنائے جنس کا ہے اس سے غرض رکھو تمام امور انسانیت میں جو تمدن و معاشرت سے تعلق رکھتے

ہیں ایک دوسرے کے مددگار رہو! آپس میں سچی محبت، سچی دوستی اور دوستانہ بردباری رکھو!

اتفاق کی خوبیاں لوگوں نے بہت کچھ بیان کی ہیں اور وہ ایسی ظاہر ہیں کہ کوئی شخص اتفاق سے کبھی ان کو بھول نہیں سکتا۔ بہت بڑے بڑے واقعات دنیا میں گزرے ہیں، جن کو پرانی تاریخیں یاد دلاتی ہیں؛ اور جن کی یاد سے ایک عجیب اثر ہمارے دلوں میں ہوتا ہے، وہ سب باہمی اتفاق کا نتیجہ ہے۔ ایک ناچیز ریشۂ گیاہ جو تنہا نہایت کمزور ہوتا ہے باہمی اتفاق سے ایسا قوی اور زبردست ہوجاتا ہے کہ بڑی سے بڑی قوت کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس وقت تعلیم یافتہ دنیا میں جو کچھ ترقی ہے، یا نامہذب ملکوں میں جو کچھ طاقت ہے وہ سب اتفاق کی بدولت ہے۔

بعض قابلِ ادب بزرگوں کا قول ہے کہ جس طرح اصلی دوستی دنیا میں ناپید ہے، اسی طرح آپس کا اتفاق بھی ناممکن ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ تمام انسانوں کی طبائع اور اُن کے اغراض مختلف ہیں اور جب کہ اغراض مختلف ہیں تو ضرور ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے مخالف ہوں۔ کوئی قوم مہذب یا نامہذب ایسی نہیں پائی جاوے گی جس میں باہم حسد و نفاق، عداوت اور باہمی حقارت نہ پائی جاتی ہو۔ ہاں! یہ بات سچ ہے مگر جس اتفاق پر ہم بحث کرتے ہیں وہ شخصی اتفاق نہیں ہے بلکہ قومی اتفاق ہے! ہمارے آپس میں بمقتضائے بشریت کیسا ہی نفاق ہو، جو خدا کے نزدیک ایک سخت گناہ ہے، مگر وہ قومی اتحاد اور قومی اتفاق کا مانع نہیں ہے۔ قومی بھلائی یا قومی برائی کا اثر تمام قوم کے لوگوں پر پہونچتا ہے۔ اس لیے جلبِ منفعت یا دفعِ مضرت میں سب لوگ متفق ہوجاتے ہیں اور شخصی تنازعات کا اس وقت کچھ اثر باقی نہیں رہتا ہے۔

اس زمانے میں جو سب سے بڑا سبب ہماری قوم کے تنزل کا ہے وہ یہی ہے کہ ہم میں قومی اتفاق کا خیال نسیاً منسیاً ہوگیا ہے۔ کسی کو بجز ذاتی منفعت کے قومی بھلائی یا قومی منفعت کا خیال بھی نہیں آتا ہے۔ اگر کوئی کچھ کرتا بھی ہے تو اس کو پہلے اپنی ذاتی غرض مدّنظر ہوتی ہے اور قومی بھلائی کے پردے سے اس کی پردہ پوشی کرنی چاہتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمارے کاموں میں برکت نہیں ہوتی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہماری قوم میں نیکی کا خیال نہیں ہے۔ نہیں! اُن میں بہت کچھ نیکی ہے اور بہت سے نیک کام ان سے ہوتے ہیں۔ کیسی کیسی عالیشان مسجدیں، کیسے کیسے عالیشان امام باڑے، کیسی کیسی نفیس خانقاہیں ان کی نیکی کی یادگاریں موجود ہیں۔ اب بھی ہر شہر اور قصبے میں دیکھو گے کہ لوگ کس قدر خیر خیرات کرتے ہیں۔ بھوکوں کو کھلاتے ہیں، حج و زیارت میں روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ مسجدیں بنواتے ہیں کوئی ایسا کام جس میں اُن کی دانست میں مذہبی نیکی ہو، دل و جان سے اس میں مصروف ہوتے ہیں۔ سب لوگ قبول کریں گے کہ اس نیت سے یہ کام کیے جاتے ہیں کہ قیامت کے دن ان کو اس کا بدلہ ملے گا اور روزِ حشر میں اُن کو ثواب حاصل ہوگا۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو درحقیقت یہ سب کام خودغرضی اور ذاتی منفعت کے ہیں، نہ ابنائے جنس کی بھلائی اور قومی ہمدردی کے! جب تک ہمارے دل میں یہ جوش نہ پیدا ہو کہ جو کام ہم کریں، وہ قوم کے لیے کریں نہ اپنے ثواب آخرت کے لیے، اس وقت تک قومی ہمدردی کا جوش پیدا نہیں ہوسکتا۔

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اُن ثواب کے کاموں کو بُرا جانتا ہوں یا اُن کی کچھ حقارت کرتا ہوں۔ بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ میں اصلی قومی ہمدردی کو ذہن نشین کرنے میں کوشش کروں اور دوسرے کاموں سے جو امتیاز ہے اس کو بتلاؤں۔

سید حامد

؟

(سرسیدؒ کے ۸۸ سال بعد)

ٹیلی وژن پر کوئز کا پروگرام آتا ہے جس میں مقابلے کے ڈھنگ پر ہندوستان بھر کے ذہین طالب علم شریک ہوتے ہیں۔ ان کی عام معلومات کو طرح طرح سے آنکا جاتا ہے۔ بڑا دلکش ہوتا ہے یہ پروگرام۔ لوگ اس کا انتظار کرتے ہیں ــــ کھیل کود، فنون لطیفہ، ادب، سیاست، سائنس اور فلمی دنیا، غرض کہ زندگی کے ہر شعبے کے متعلق سوالات کیے جاتے ہیں۔ جوابات کو نمبر ملتے ہیں۔ مقابلے میں شریک ہونے والوں کی تعداد اب ہزاروں تک پہنچ رہی ہوگی۔ مجھے یہ حسرت رہی کوئی مسلمان لڑکا یا لڑکی بھی شریک ہوتی۔

اسے آپ کیا کہیے گا غفلت، جہالت، بے خبری یا بے بہری۔ اتنا بڑا ملک، اتنی بڑی آبادی، نو دس کروڑ کے لگ بھگ مسلمان اور ہم چند طالب علم بھی ایسے پیدا نہ کرسکے جو باخبری کی آزمائش میں پورے اترتے یا کم از کم اس میں شریک ہونے کا حوصلہ رکھتے۔

آپ جانتے ہی ہیں کہ حکومت نے معلوم نہیں کس مصلحت سے تعلیم کے فرقہ وارانہ اعداد و شمار شائع کرنا بند کر دیے۔ ہم کس طرح جانیں کہ ہم حرف شناسی اور تعلیم میں آگے بڑھ رہے ہیں کہ پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ موٹے موٹے اشاریوں پر ہی تکیہ کرنا پڑے گا۔ کوئز اور مقابلے کے امتحانوں اور ٹیلنٹ ریسرچ اسکیم میں شرکت اور کامیابی کا تناسب کیا ہے؟ نہ ہونے کے برابر۔ نتیجہ کیا نکلا۔ ہمارے یہاں پڑھائی کم ہے اور اس سے بھی تشویشناک یہ بات کہ ہمارے اداروں میں پڑھائی کا معیار گرا ہوا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کا کوئی تعلیمی ادارہ اس کلیہ سے کلیتاً مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہمارے جن اداروں کا معیار کچھ بہتر ہوتا ہے اس کی بہتری میں غیر مسلم طالب علموں کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔

ہمارا سب سے بڑا ادارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔ حکومت کی گرفت نہ ہو تو خانہ جنگی اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردے اس ریگ زار میں کئی نخلستان ہیں جہاں تحقیق اور معیار پروان چڑھ رہے ہیں۔ نخلستانوں سے نکلیے تو ہر طرف ریت ہی ریت بے حسی، خودغرضی، جہالت کاہلی، غیبت اور بے عملی کی ریت۔ یونیورسٹی اسکول کی عمارت پر نظر ڈالیے۔ ہندوستان بھر میں گنتی کے دو چار ہائی اسکول ہوں گے جن کو اتنی کھلی اور با ترتیب اور کشادہ اور خوبصورت اور موزوں عمارت ملی ہو۔ اساتذہ اچھی تنخواہیں پاتے ہیں، پاس ہی یونیورسٹی کے استاد ہیں۔ محلّ وقوع اور وحدتِ اہتمام کو اس کا ضامن ہونا چاہیے تھا کہ یونیورسٹی کی فیکلٹی اپنی اس نرسری کی دیکھ بھال کرتی۔ یونیورسٹی اسکول (جس کا نام نہ معلوم کیوں ایس۔ ٹی۔ ہائی اسکول رکھ دیا گیا) کے طالب علم بیرونی طالب علموں سے بہت زیادہ قابل ہونا چاہئیں تھے۔ حال یہ ہے کہ ان کے ساتھ اگر داخلے میں نمبروں کی بہت بڑی رعایت نہ کی جائے تو تو یونیورسٹی میں انھیں داخلہ ہی نہ ملے۔ یونیورسٹی کے معیار کو گرانے کی ذمہ داری خود یونیورسٹی کے اسکولوں پر، اس کے استادوں کے علاوہ، عاید ہوتی ہے پس دو میں دو دھارائیں

اگر ملتی ہیں؛

۱۔ یونیورسٹی اسکولوں کے طلبہ

۲۔ بیرونی طلبہ

پہلی دھار گدلی ہوتی ہے اور دوسری اجلی۔ مورخ، اخلاف، ملت اور ملک یونیورسٹی کو اس تنگ معیاری کے لیے معاف نہیں کریں گے۔ فردِ جرم لگاتے وقت راقم کو احساس ہے کہ اس کے دامن پر بھی چھینٹے پڑ رہے ہیں۔ پانچ سال تک یونیورسٹی کی زمام اس کے ہاتھ میں رہی، اس نے کون سے تیر مار لیے انفعال کے قطرے اس کی آنکھوں کو نم کر رہے ہیں۔ وہ اپنی ذمہ داری اور تقصیر کا معترف ہے لیکن اس نے اپنی سی کوشش ضرور کی۔ بے حسی کی دیوار میں دراڑ نہ ڈال سکا۔ اس کے علاوہ جو لوگ احتساب سے خائف تھے انھوں نے جھاڑیوں میں چنگاریاں ڈال دیں اور آگ بجھاتے رہنا اس کا مقدر ہو گیا۔

مسلم اسکولوں اور کالجوں کا یہ حال ہے کہ ان پر خود غرض جاہل قبضہ کر لیتے ہیں۔ جن کی دلچسپی کے دو رُخ ہیں:۔

(۱) اگر نیت خراب ہے تو اسکول کو آمدنی کا ذریعہ بنا لیں۔

۲۔ نااہلوں کو داخل کرائیں، ناکاموں کو پروموشن دلائیں۔

یہ لوگ پرنسپل اور استادوں کو کام نہیں کرنے دیتے۔ ان میں سے بعض کا الحاق استادوں کے ایک گروہ کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ ان اداروں کا ایک نشان امتیاز مقدمہ بازی اور تعطل ہے۔

سوالیہ نشان سے ہم نے اس مضمون کی شروعات کی تھی، اسی پر ہم اس کا خاتمہ کر رہے ہیں۔ فضا پر ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بنا ہوا ہے جس کا جواب ہمیں دینا ہے کیا کسی قوم یا گروہ کے لیے جو بے خبری کی تہ تک پہنچ گیا ہو، کوئی امکان بقا کا باقی رہ جاتا ہے؟ کیا اس دور میں جو علم اور علم کی کنیز ٹیکنولوجی اور ٹیکنولوجی کے نور نظر کمپیوٹر اور اس کی دختر نیک اختر الکٹرونکس کا دور ہے کوئی ایسا طبقہ جو علم، ٹکنولوجی، الیکٹرونکس اور کمپیوٹر سب سے منہ موڑ لے، جانبر ہو سکتا ہے؟

دنیا میں عزت ایک بڑی چیز ہے۔ مگر وہ ہر شخص کو فرداً فرداً کسی طرح نہیں مل سکتی جب تک کہ اس قوم کو جس میں کا وہ شخص ہے عزت حاصل نہ ہو۔ اگر ایسی قوم میں سے جو ذلیل ہے کسی خاص شخص کو عزت حاصل ہو تو اس سے قوم کو تو کیا عزت ہوگی وہ خود اس وجہ سے کہ وہ اس ذلیل قوم میں کا شخص ہے، ہمیشہ ذلیل ہی رہے گا۔ پس جو لوگ اپنی عزت چاہتے ہیں ان کا بھی فرض ہے کہ قوم کی عزت میں کوشش کریں۔ جب قوم ذلت سے نکل جاوے گی اور پھر اس میں سے کوئی شخص کسی قسم کی عزت حاصل کرے گا تو اس کی اصلی عزت ہوگی اور وہ بھی کل قوم کی عزت کا باعث ہوگا۔ امید ہے کہ مجھ مسافر کی اس صدا کا آپ ہمیشہ خیال رکھیں گے۔

[سر سید ؒ]

آل احمد سرور

دیرینہ سال پیرے...

۱۷ اکتوبر سر سیّد کی پیدائش کا دن ہے۔ یعنی ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو سر سیّد کی پیدائش کو ایک سو انہتّر برس ہو گئے۔ سر سیّد کی تحریک نے اردو ادب میں انقلاب برپا کر دیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو جدید دور کی ضروریات سے آشنا کیا، عقلیت کی شمع روشن کی، تہذیب و معاشرت کی اصلاح کی، رواجی مذہب اور حقیقی مذہب کے فرق کو واضح کیا نئی تعلیم کے لیے راہیں نکالیں اور سچی سیاست کے آداب سکھائے اور ایک ایسی نسل تیار کر دی جس نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنے خلوص اور لنظر کی بدولت بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ سر سیّد کے کام پر مختلف لوگوں نے تنقیدیں کیں اور اپنی صلاحیت اور نقطۂ نظر کے مطابق اس کی اہمیت بھی متعین کی۔ سر سیّد نے بہت سی باتیں صرف اپنے دور کے لیے کہی تھیں لیکن مجموعی طور پر ان کا پیام آج بھی ہمارے لیے بڑی گرمی اور روشنی رکھتا ہے۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ آج کے حالات میں اس کی اہمیت زیادہ ہی ہو جاتی ہے۔

سر سیّد کی ساری زندگی اور پورے کام کو ذہن میں رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری ملازمت کے زمانے میں تصنیف و تالیف کے شغل نے ان میں ایک سنجیدہ مزاج ایک دور بیں نگاہ اور قوموں کے عروج و زوال پر غور کرنے والا ایک ذہن پیدا کر دیا تھا۔ وہ زمانے کی رفتار اور زندگی کے ارتقا کے قانون کو سمجھ گئے تھے اور ان کا یہ پختہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ ماضی کی شوکت کے طلسمات میں اسیر رہنا تباہی کا باعث ہوگا۔

سر سید دراصل ایک مجدد نہیں مصلح ہیں۔ ان کا بنیادی سروکار مذہب سے نہیں مگر وہ یہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی زندگی کا مرکز اور محور مذہب ہے اور اس لیے انھوں نے اس کی ایک نئی تعبیر و تفسیر پر زور دیا۔ پروفیسر مجیب نے انھیں ایک سیکولر مفکر کہا ہے۔ خود انھوں نے پٹنہ کے ایک لکچر میں کہا تھا۔

" دین چھوڑنے سے دنیا نہیں جاتی، مگر دنیا چھوڑنے سے دین بھی چلا جاتا ہے۔"

سر سیّد کے یہاں ارضیت، واقعیت اور روحِ عصر کا یہ احساس انھیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ اس سلسلے میں نادان خدا پرست اور دانا دنیا دار کی حکایت ان کے نقطۂ نظر کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ عقاید اور عبادات کو اہمیت دیتے ہیں، مگر معاملات پر ان کی توجہ زیادہ ہے۔

سر سیّد نے علما یا اکبر الہ آبادی کی طرح مغرب اور اس کے افکار و اقدار کو خطرہ نہیں سمجھا وہ مغرب کے حریف نہیں حلیف تھے انھوں نے عقلیت کو اپنا رہبر بنایا۔ یہ دوسری بات ہے کہ عقلیت کا ان کا تصور اپنے زمانے کی نارسائی سے آزاد نہ تھا۔ جدید علوم اور انگریزی تعلیم کی حمایت میں انھوں نے تن من دھن سب کچھ لگا دیا۔ تہذیب الاخلاق میں ان کے مذہب

کے ایک فعال تصور کے ساتھ تہذیب کا بھی ایک خاصا ترقی یافتہ تصور ملتا ہے مگر ان کے مذہبی افکار تفسیر قرآن سے معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے خدا کے قول وفعل میں مطابقت کی تلاش کو اپنی زندگی کا اصول بنایا۔ فوق فطری عناصر سے انکار معجزات کی اہمیت کی نفی، معراج اور شق القمر کی رُویا کے ذریعے سے تاویل محض کھینچ تان نہیں ہے بلکہ جیسا کہ حالی نے حیات جاوید میں لکھا ہے، ان سے پہلے بہت سے علماء نے اسے تسلیم کیا تھا۔ سرسید کا یہ کہنا کہ اجماع حجتِ شرعی نہیں ہے، قیاس حجت شرعی نہیں ہے تقلید واجب نہیں۔ معجزہ دلیل نبوت نہیں ہوسکتا۔ خدا کی ذات وصفات اور اسماء، وافعال کے متعلق جو کچھ قرآن یا حدیثوں میں بیان ہوا ہے وہ سب بہ طریق مجاز واستعارہ وتمثیل بیان ہوا ہے اور معاد کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ بھی بطور مجاز ہے نہ بطور حقیقت' نیا خیال نہیں ہے۔ ہاں غلامی کے ابطال، تعددِ ازدواج اور قرآن میں مقصود اور غیر مقصود کلام کے متعلق ان کی رائے میں علمائے سلف سے انحراف ملتا ہے۔ یہاں سرسید اگرچہ راسخ العقیدہ مسلمانوں سے الگ نظر آتے ہیں مگر ان کی تعبیر وتفسیر کی عصریت اور معنویت میں شبہ نہیں۔

سرسید تاریخ اور داستان کے فرق کو سمجھتے تھے ذہن انسانی کی ترقی اور فہم انسانی کی گہرائی پر ان کی نظر تھی وہ نہ مذہب کو رسم کا درجہ دینے کو تیار تھے نہ رسم کو مذہب کا۔ وہ نئے دور نئے تقاضوں اور نئی ضروریات کا احساس رکھتے تھے نئے مغربی اداروں مثلاً قومیت یا جمہوریت اور آزادی کے متعلق مغربی خیالات سے انھیں خوف ضرور تھا مگر ان کی یہ کوشش کہ مذہب کا قدیم تصور ترقی کی دوڑ میں حائل نہ ہو' ہر لحاظ سے قابل قدر تھی۔ ان کی تعلیمی کوششوں کو بڑی مقبولیت ملی، ہاں ان کی مذہبی اصلاح کی تحریک کا اثر زیادہ گہرا نہ ہوسکا لیکن ان کی چنگاری سے چراغ علی، امیر علی، اقبال اور مولانا آزاد سبھی کو اپنا چراغ جلانے کا موقع ملا۔

اگر تجدد اور اصلاح کو مذہبی خیالات کے علاوہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی دیکھا جائے تو سرسید کی اہمیت اور بھی واضح ہوتی ہے۔ ادب میں سرسید کا رویہ بلاشبہ ایک مصلح کا ہے اور تہذیب الاخلاق نے قدیم ادب وانشا پر جو اعتراضات کیے وہ اس لحاظ سے بالکل مناسب تھے کہ اس میں حقیقت نگاری پر توجہ کم تھی اور اس کا اسلوب ترصیع وتزئین کو خیال کے ابلاغ پر زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ سرسید کے اثر سے اردو نثر کو صحیح معنوں میں نثر بننے کا موقع ملا اور اس نے مضمون نگاری، انشائیہ، علوم، تاریخ، ناول، سوانح، تنقید سب کی طرف توجہ کی۔ سرسید کی نثر اعلیٰ درجے کی نثر نہیں ہے۔ وہ صرف اپنے خیال کو کسی نہ کسی طرح بیان کرنے پر قانع ہیں حسن بیان سے انھیں زیادہ غرض نہیں مگر اس میں نثر کی بنیادی خوبیاں موجود ہیں۔ سرسید کی نثر نے امکانات کی طرف رہنمائی کی اور حالی، شبلی، نذیر احمد سب کے لیے فضا ہموار کی۔ پھر سرسید نے ایک علمی نقطۂ نظر بنایا، گو انھوں نے اس علمی نقطۂ نظر کے لیے مغرب پر ضرورت سے زیادہ تکیہ کیا۔ سرسید نے تعلیم، معاشرت، سیاست سبھی شعبوں میں زندگی کی ایک رَو دوڑادی اور مغربی ادبیات سے استفادہ اور ان کے جمالیاتی اور فنی معیاروں سے کسب فیض کرنے کا موقع فراہم کیا۔ سرسید نے مسلمانوں کی ذہنی دنیا بھی بدل دی اور اردو دنیا میں بھی ایک انقلاب برپا کردیا وہ نوآبادیاتی نظام کی برکتوں سے خیرہ ضرور ہوگئے مگر اس طبقے کو جو اپنے حال میں مگن تھا، نئی فضاؤں اور نئے آفاق کا احساس دلا کر انھوں نے ایک عہد آفریں رول انجام دیا۔

سرسید نے ہندوستانیوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً یہ تعلیم دی کہ وہ مغرب کی ہر چیز سے بھڑکیں نہیں بلکہ اس کی سائنس، تہذیب، علم اور فکر کو جذب کریں۔ انھوں نے ہر مسئلے میں عقل کو رہنما بنایا اور انسانی تجربے اور علم کی مدد سے ہر وقت کام لینے پر زور دیا۔ انھوں نے دین کے ساتھ

دنیا پر بھی توجہ دی۔ انھوں نے ایک تعلیمی ادارہ قایم کیا جو مشرق و مغرب کی بہترین روایات کا آئینہ دار تھا۔ سر سیّد نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ سب سے پہلے اپنی تعلیمی پستی کو دور کریں اور اپنے پیروں پر کھڑے ہوں اس کے بعد سیاسی حقوق کے لیے جدوجہد کریں۔ آج بھی ہم میں حقایق سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت کم ہے۔ ہم دقیانوسی تصورات کو گلے سے لگائے ہوئے ہیں۔ سر سیّد ہمیں سکھاتے ہیں کہ علمی دنیا میں اپنا مقام پیدا کریں۔ جدید افکار کو اپنائیں، عقلیت کو رہنما بنائیں۔ سنی سنائی باتوں پر کان دھرنے کے بجائے تجربات کو پرکھیں۔ سر سیّد آج زندہ ہوتے تو وہ ہندوستانی قومیت کے پرجوش مبلغ و حامی ہوتے۔

سر سیّد نے ہمیں ازمنۂ وسطیٰ کے ذہن سے نکالا اور عقلیت کے سہارے نئے حالات میں اپنی زندگی بنانے کی طرف مائل کیا۔ سر سیّد ماضی کی صالح روایات کا احساس رکھتے تھے۔ وہ اپنی تہذیب، زبان، ادب، معاشرت کی خوبیوں کو بھی جانتے تھے اور خامیوں کو بھی مگر وہ آگے بڑھنا چاہتے تھے محض پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنا انھیں پسند نہ تھا۔ یہ ضروری نہیں کہ ان کے تمام خیالات سے اتفاق کیا جائے کیوں کہ انھوں نے بہت سی باتیں ان مخصوص حالات کو دیکھ کر کہی تھیں جو ان کے زمانے میں درپیش تھے مگر ان کے افکار و اعمال کے پیچھے جو روح تھی اس سے ہمیں آج بھی روشنی اور گرمی مل سکتی ہے۔ آج بھی ہمیں ایک تنقیدی شعور پیدا کرنا ہے جو نئے کو ڈر کے مارے رد کر دے نہ پرانے کو آنکھ بند کر کے قبول کرے بلکہ ہر چیز کو اس کی ضرورت اور افادیت کے لحاظ سے دیکھے اور جو چیز ناموزوں یا نامناسب ہو گئی ہے اس پر خواہ مخواہ اصرار نہ کرے۔

سر سید کی سوانح عمری حالی نے لکھی اور خوب لکھی مگر اب ایک نئی سوانح عمری کی ضرورت ہے۔ اسی طرح سر سید کے کام کے مختلف پہلوؤں پر موجودہ علمی معیاروں کے مطابق معروضی اور بے لاگ تجزیے کی بھی ضرورت ہے۔ سر سیّد کی تمام تصانیف کے نئے ایڈیشن مناسب حواشی کے ساتھ شایع ہونے چاہئیں۔ اس کے علاوہ سر سید کی موجودہ دور میں معنویت پر سمینار کرنا اور مقالات پڑھوانے اور ان پر بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ جو لوگ سر سیّد کو ایک مقدس شخصیت سمجھ کر ان کے کاموں کو تنقیدی نظر سے دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے وہ غلطی پر ہیں۔ اسی طرح جو لوگ سر سیّد کو اگلے وقتوں کا بزرگ سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں وہ اور زیادہ غلطی پر ہیں، سر سیّد فرشتہ نہ تھے، آدمی تھے۔ وہ غلطیوں سے پاک نہ تھے، مگر وہ ہمارا بہت بڑا ذہنی سرمایہ ہیں اور اس سرمایے کو مناسب طریقے سے برت کر ہی ہم موجودہ زندگی کے پیچ و خم سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

سر سیّد نے بے شک انگریزی حکومت کی حمایت کی، مگر اس سے فائدہ بھی اٹھایا۔ ان کا کالج جو بعد میں یونیورسٹی بنا ان کی تحریک کا ایک پہلو ہے۔ اس سے بڑا پہلو ان کا وہ قومی اور اخلاقی مشن ہے جس کے سہارے انھوں نے فکر و فن دونوں کے سانچوں کو بدل دیا اور پوری قومی زندگی کو تعمیری جوش و جذبے سے معمور کر دیا۔ ان کی تحریک سے انگریز حکمرانوں نے فائدہ اٹھایا اور کالج کی ابتدائی نسلیں حکومت کی مشین کے لیے کل پرزے مہیا کرنے میں مصروف ہو گئیں مگر اس کالج سے بغاوت کی چنگاریاں بھی پھوٹیں اور یہ واقعہ ہے کہ یہ چنگاریاں ان شعلوں سے زیادہ خطرناک تھیں جو بعض علما کی تحریروں میں لپکتے تھے۔ کیوں کہ ان میں آزادی، جمہوریت، انفرادیت، سماج کا تصور زیادہ بھرپور اور گرم تھا۔ سر سیّد نے تہذیبی دائرے میں علما کی قیادت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اور ان کے اثر سے وہ عاشقانِ پاک طینت پیدا ہوئے جنھوں نے مغرب کے آتش کدہ سے چنگاریاں لے کر اپنی بزم کی تاریکی کو ختم کیا۔

آج سر سیّد کا نام لینا کافی نہیں ان کے افکار کی روح کو سمجھنا ان کے حقیقی پیغام کو پہچاننا اور انھوں نے اپنے دور کو سامنے رکھ کر جو باتیں کہی تھیں ان کو نظر انداز کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ ہر نسل کو اپنے ماضی کا اسی طرح سوجھ بوجھ کے ساتھ جائزہ لینا پڑتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم موجودہ نسل میں یہ سوجھ بوجھ پیدا کریں تاکہ جدید ہندوستان کے نقشے میں ہمارا رنگ بھی ہو اور ہمارے رنگ سے پوری قوم کے نقشے کا حسن بھی قایم رہے۔

اشتیاق حسین قریشی

سر سید ڈے

" اے دوستو! مجھ کو یہ بات کچھ زیادہ خوش کرنے والی نہیں ہے کہ کسی مسلمان نے بی اے یا ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرلی ہے۔ میری خوشی قوم کو قوم بنانے کی ہے۔"

" کوئی قوم جس کو اپنے بچوں اور قوم کی تعلیم کی خواہش ہو جب تک وہ تعلیم اپنے ہاتھ میں نہ لیوے اس کا پورا ہونا غیر ممکن ہے۔"

" میں تم سے سچی بات کہتا ہوں کہ قومی تعلیم اور قومی عزت ہم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہونے کی جب تک ہم اپنی تعلیم کا کام خود اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے۔ گورنمنٹ کی قدرت سے خارج ہے کہ وہ ہمارے تمام مقاصد کی تکمیل کر سکے۔"

" مسلمانوں کو یہ شرم نہیں آتی کہ مشنری تعلیم گاہوں میں وہ اپنے لڑکوں کو بھیجتے ہیں۔ ان کو جوش پیدا نہیں ہوتا، ان کو غیرت نہیں آتی۔"

—— سر سید ——

سر سید نے تعلیم کے مسئلے پر مختصر الفاظ میں مختلف موقعوں پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بہت واضح اور صاف ہیں۔ انھوں نے انگریزوں کی تقلید کی دعوت نہیں دی۔ بلکہ انھوں نے مسلمانوں کو تعلیمی مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لینے کی ترغیب دی۔

ہر سال ۱۷ اکتوبر کو "سر سید ڈے" بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ کھانے پینے کا بہت اہتمام کیا جاتا ہے۔ کچھ تقریریں بھی ہو جاتی ہیں۔

یہ اُس محسن اعظم کو خراج عقیدت ہے جو اولڈ بوائز پیش کرتے ہیں، گویا وہ کام و دہن کی لذتوں کے لیے زندگی بھر جدوجہد کرتا رہا اور یہ وصیت کر گیا کہ میرے مرنے کے بعد تم سالانہ عرس کرتے رہنا اور کھانے کا خاص اہتمام رکھنا۔

مسلمانوں کو سوچنا چاہیے کہ کیا یہ دن نئے عزم و ہمت اور نئے نئے منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لیے منایا نہیں جا سکتا۔

سر سید نے اپنے بڑھاپے کے ایام میں ملت اسلامیہ کو نئی زندگی دینے کے لیے جیسی مشقت کی اور اس کے لیے دن رات جدوجہد کی اگر اس کا عشر عشیر بھی ہم کرنے کے لیے تیار ہو جائیں تو ہر سال پتہ نہیں کتنے نئے ادارے قائم ہو جائیں۔ کتنے اخبار اور رسالے شائع ہونے لگیں، کتنی لائبریریاں قائم ہو جائیں، کتنے ٹیکنیکل اسکول کھل جائیں، کتنے کوچنگ سینٹر قائم ہو جائیں اور اس طرح قوم کی تعمیر کا وہ عظیم کام جو سر سید نے شروع کیا تھا، وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے۔

غور سے دیکھا جائے تو ملک میں جدید ادارے سب سر سید کی تحریک کے مرہون منت ہیں۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، یہ مقصد ہم سے فوت ہوتا گیا۔ نئے اداروں

کے قیام کی کوشش خال ہی خال ہے۔ زیادہ تر پرانے ادارے جو خستہ حال ہیں، ان پر کنٹرول رکھنے کا جھگڑا اور مقدمہ بازی کا سلسلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ گویا عملی خراج عقیدت ہم اس طرح پیش کر رہے ہیں کہ اسلاف کے قایم کیے ہوئے اداروں کو ترقی دینے کے بجائے انھیں اپنے اقتدار اور ذاتی اغراض کا ذریعہ بنالیا ہے زیادہ تر تعلیمی ادارے ایسے ملیں گے جن کا فرنیچر اور بلڈنگ از کار رفتہ ہو چکے ہیں۔ بڑے بڑے رقبوں پر پھیلے ہوئے یہ ادارے زبان حال سے یہ کہہ رہے ہیں کہ ؎

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

کیا سرسید احمد خاں کا چمن اسی طرح برباد ہوتا رہے گا اور ہم ۱۷ اکتوبر کو محض رسمی اور روایتی انداز سے مناتے رہیں گے۔

یہ بات کتنی تشویش ناک ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں ۶۰ ، فیصد[1] طلبا اپنے والدین سے ہندی میں خط و کتابت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ لاکھوں بچے اپنی مادری زبان اردو سے محروم ہو چکے ہیں۔ کیا سرسیدؒ زندہ ہوتے تو وہ خاموش تماشائی رہتے یا اپنا سب کچھ جھونک دیتے؟

وقت کا تقاضا بھی ہے اور سرسیدؒ کی یاد منانے کا صحیح طریقہ بھی یہ ہے کہ ہم تعلیمی محاذ پر ڈٹ جائیں اور ہر سطح پر اس کے لیے جد و جہد کریں۔ جو ادارے قایم ہیں اُن کو معیاری بنائیں ۔ جہاں ادارے نہیں ہیں وہاں نئے ادارے قایم کریں۔

[1] ہمارے نزدیک یہ فیصد درست نہیں ہے۔ (ادارہ)

"غدر کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا اس کا رنج تھا۔ جب ہمارے دوست مسٹر شیکسپیر نے .... تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت تھا، اور ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ کی مالیت کا تھا، مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو بربادی ہو اور میں ان کی جائیداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے اور درحقیقت یہ بالکل سچی بات تھی۔ میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اسی خیال اور غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑی ہے اس کو دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ہجرت کا ارادہ موقوف کیا اور قومی ہمدردی کو پسند کیا ....."

سرسید

کبیر احمد جائسی (علیگ)

تفسیر القرآن کا فارسی ترجمہ

اِس بات کا علم کم ہی لوگوں کو ہوگا کہ سرسیدؒ کی متنازع فیہ تفسیر کلام پاک کا فارسی زبان میں دو جلدوں میں تفسیر القرآن ہی کے نام سے بڑی آب و تاب کے ساتھ ترجمہ ہوا ہے۔ شاید یہ یاد دلانا بے محل نہ ہو کہ علمی دنیا میں صرف انہی کتابوں کے ترجمے کیے جاتے ہیں جن کو کسی نہ کسی لحاظ سے کوئی نہ کوئی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ سرسیدؒ کی تفسیر کی پذیرائی ہندوستان میں تو کم ہی ہوئی، مگر ایک ایرانی عالم کے نزدیک یہ تفسیر اتنی اہم ٹھہری کہ اس نے اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کر ڈالا۔ حالاں کہ خود فارسی زبان میں جو تفسیری سرمایہ موجود ہے اس کے سامنے اردو زبان کے تفسیری سرمایے کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ سرسیدؒ کی تفسیر کے مترجم مشہور ایرانی عالم سید محمد تقی فخر داعی گیلانی ہیں جنھوں نے متعدد اردو اور انگریزی کی کتابوں کے فارسی ترجمے کر کے اپنی زبان کے ادبیات کے دامن کو وسیع تر کرنے کی کوشش کی ہے۔

فاضل مترجم نے سرسیدؒ کی تفسیر کے صرف ترجمے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ دونوں جلدوں میں انھوں نے مقدمے بھی لکھے ہیں، جن میں انھوں نے سرسیدؒ کی تفسیر کی اہمیت و معنویت کو واضح و روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے سرسیدؒ کے انداز تفسیر کو سمجھنے کے لیے دو مقالات سے بھی مدد لی ہے جن میں سے ایک خود سرسید کا لکھا ہے جس کا عنوان "تحریر فی اصول التفسیر" ہے۔ انھوں نے سرسیدؒ کے اس مقالے کا بھی فارسی زبان میں ترجمہ کر کے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے اور دوسرا علامہ شبلی نعمانیؒ کا ہے جو علوم القرآن[1] کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں علامہ شبلی نعمانیؒ کو تو سرسیدؒ کی مذہبی فکر کا شدید مخالف سمجھا جاتا رہا ہے اور ان کے معتقدین ان کو اسی رنگ میں نہ صرف پیش کرتے رہے ہیں بلکہ آج بھی پیش کرتے ہیں مگر یہ ایک عجیب لیکن دلچسپ بات ہے کہ ایک ایرانی سرسیدؒ کی تفسیر کو علامہ شبلی نعمانیؒ کے حوالے سے سمجھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔

فخر داعی گیلانی کے مقدمہ سے اس حیرت انگیز مگر خوشگوار حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ سرسیدؒ کے انتقال کے تقریباً چوبیس برسوں کے بعد ایک فارسی مجلہ 'کاوہ' برلن میں "مشاہیر مردان مشرق و مغرب" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع ہوا تھا، جس میں سرسید کا بھی خاص طور سے ذکر ہے۔ فخر داعی گیلانی نے مجلہ 'کاوہ' کی اس تحریر کو حرف بہ حرف نقل کر کے اپنے قارئین کو سرسیدؒ کی شخصیت اور کارناموں سے روشناس کرایا ہے۔ مذکورہ تحریر میں ہم ہندوستانیوں کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے اِس لیے اس سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔ البتہ اس قدر عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں یہ تحریر معرض وجود میں آئی تھی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اپنے

ابتدائی دور میں تھی اور اس وقت اس درس گاہ میں کل ایک ہزار طلبہ زیر تعلیم تھے۔ مقالہ نگار کے نزدیک یہ ہندوستان کی وہ واحد یونیورسٹی ہے جو خود ہندوستانیوں کے سرمایے سے عالم وجود میں آئی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مقالہ نگار نے یونیورسٹی کی مسجد، پریس، اسپتال اور گزٹ کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ غالباً یہ چیزیں ایک ایرانی کے لیے نئی رہی ہوں گی۔ اس لیے اس نے خاص طور سے ان کا ذکر کیا ہے۔

فخر داعی گیلانی نے اپنے قارئین سے مقدمہ میں گذارش کی ہے کہ وہ سرسید کی تفسیر کا فارسی ترجمہ پڑھنے سے پہلے سرسیدؒ کے مقالے "تحریر فی اصول التفسیر" کو ٹھہر ٹھہر کر غور و فکر سے چند بار پڑھ لیں تاکہ ان کو سرسید کی مذہبی فکر تک رسائی حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ علاوہ بریں انھوں نے اپنے مقدمہ میں سرسیدؒ کے اس قول "من شاگرد مکتب قرآنم" [میں مکتب قرآن کا طالب علم ہوں] کو خاص طور سے نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ سرسیدؒ کی تحریر کا ماخذ چوں کہ قرآن اور صرف قرآن ہے اس لیے انھوں نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں سے کسی بھی فرقے کی طرف داری نہیں کی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے ہر اس مفسرؒ کی رائے کو بلا خوف و خطر مسترد کر دیا ہے جس کی رائے کا اثبات کلام پاک سے نہیں ہوتا۔ فخر داعی کے نزدیک سرسیدؒ کی تفسیر کلام پاک "عدیم النظیر" ہے اور وہ اپنے مقدمہ میں بار بار اس کی طرف اشارہ کرکے اس تفسیر کی اہمیت کو اپنے قارئین پر واضح کرتے ہیں مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"کتاب تفسیر القرآن رو ہمرفتہ حقایق و معارفی را در بر دارد کہ نظیر آنرا در ہیچ یک از کتب مماثل نمی توان بدست آورد و چون پایۂ بیانات (کلیہ) بقدری بلند و نیز عمیق و دقیق است کہ بحث در اطراف آن و اظہار نظر از عہدۂ من بندہ بواسطۂ کمی سرمایہ خارج است علیہذا قضاوت آنرا بعہدۂ خوانندگان فاضل وامیگذارم و این بیان را در ہمین جا ختم می نمایم، ہمین قدر می نویسم کہ امروز بواسطۂ ترقی حیرت انگیز علوم، مذہب در ہمہ جا رو بہ ضعف و سستی نہادہ تنہا طریق برای حفظ عقاید مذہبی دانشجویان ہمانا اشاعہ و انتشار این گونہ آثار علمی محققین معاصر است۔" ۵۵

[مجموعی طور سے کتاب تفسیر القرآن ان حقایق اور معارف کی حامل ہے جن کی نظیر کسی بھی تفسیر کی کتاب سے ہاتھ نہیں آسکتی۔ چوں کہ ان کے بیانات کی اساس اتنی بلند، دقیق اور عمیق ہے کہ یہ بندہ اپنی کم علمی کی وجہ سے ان کے اطراف کا نہ تو احاطہ کر سکتا ہے اور نہ ہی ان پر کوئی رائے ظاہر کر سکتا ہے اس لیے اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا کام میں قارئین پر چھوڑتا ہوں اور اپنی بات کو یہیں پر ختم کرتے ہوئے صرف اس قدر تحریر کرتا ہوں کہ آج علوم کی حیرت انگیز ترقی کی وجہ سے (دنیا میں) ہر جگہ مذہب ضعیف اور سست بنیاد ہو گیا ہے۔ اپنے مذہبی عقاید کی حفاظت کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس طرح کے معاصر طالبان علم محققوں کی علمی یادگاروں کو شائع کیا جائے]

اس مقدمہ کی یہ بات ہم کو بہت کھٹکتی ہے کہ سید محمد تقی فخر داعی گیلانی نے اپنی "کم علمی" کا سہارا لیتے ہوئے سرسیدؒ کی تفسیری فکر پر کوئی تنقیدی نظر نہیں ڈالی ہے۔ اگر وہ وقت نکال کر فارسی کی چند قدیم و جدید تفسیروں سے سرسیدؒ کی تفسیر کا تقابلی مطالعہ کر لیتے تو ان کے قاری کے سامنے یہ نکتہ بالکل واضح ہو کر آجاتا کہ سرسید اپنی تفسیری آراء

کسی قدیم یا اپنے معاصر مفسر سے متاثر ہیں یا نہیں؟ علاوہ برین اس بات کا بھی علم ہوتا کہ چوتھی صدی ہجری کے وسط سے سرسیّد کے عہد تک فارسی زبان میں ایران میں جو تفسیریں لکھی گئی ہیں، اُن میں کوئی ایسی تفسیر بھی ہے جو سرسیدؒ کی تفسیری فکر کی ہم نوائی کرتی ہے؟ فارسی کا تفسیری سرمایہ انتہائی وسیع ہے اگر فخر داعی گیلانی نے سرسیّد کی تفسیر کا ترجمہ کرنے کے بعد اپنا مقدمہ لکھتے وقت اس کام کو کر ڈالا ہوتا تو ان کا مقدمہ عدیم النظیر نہ سہی اعلیٰ درجے کا کہلانے کا مستحق ہوتا۔

تفسیر القرآن کی دوسری جلد بہمن ماہ ۱۳۳۲ھ ش میں شایع ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس کے مقدمہ کے مطالعے سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ جب تفسیر القرآن کی پہلی جلد کا ترجمہ شایع ہوا تو اہلِ علم نے اس کی بڑی گرم جوشی سے پذیرائی کی۔ کچھ ہی عرصے کے بعد ان سے تقاضا ہونے لگا کہ تفسیر القرآن کی دوسری جلد کا بھی ترجمہ وہ جلد از جلد منظر عام پر لائیں لیکن اس وقت وہ پرسی سایکس کی انگریزی کتاب کا فارسی ترجمہ "تاریخ مفصل ایران" کے نام سے کرنے میں مشغول تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ علامہ شبلی نعمانی" کی کتاب "سوانح مولانا روم" کا بھی فارسی ترجمہ کرتے جاتے تھے۔ جب ان دونوں ترجموں سے ان کو فرصت ملی تو ان پر اتنی تھکن غالب آگئی کہ ان کے معالجوں کو انھیں مشورہ دینا پڑا کہ وہ کچھ دنوں تک ایران سے باہر کسی دوسرے ملک میں جا کر آرام کریں لیکن ان کے ایک دوست نے جن کا نام انھوں نے نہیں لکھا ہے، تفسیر القرآن کی دوسری جلد کے ترجمے کی ترغیب دینی شروع کی۔ اس ترغیب نے ان پر مہمیز کا کام کیا اور وہ یکسو ہو کر اس کام میں لگ گئے۔ اس طرح تفسیر القرآن کی دوسری جلد کا ترجمہ اختتام کو پہنچا۔

جلد دوم کے مقدمہ میں بھی فخر داعی گیلانی نے سرسیدؒ کی مختصر سوانح حیات تحریر کر دی ہے۔ تاکہ جو لوگ تفسیر القرآن کی پہلی جلد نہ دیکھ سکے ہوں اور دوسری جلد ان کے ہاتھوں میں ہو وہ بھی سرسیدؒ کی زندگی اور ماحول سے کسی قدر واقف ہو جائیں۔ تاکہ ان کو اس بات کا اندازہ کرنے میں آسانی ہو کہ سرسیّد کون تھے، کیا تھے، کن حالات اور کس ماحول میں انھوں نے زندگی بسر کی اور ان کے کارہائے نمایاں کیا کیا تھے؟ جب وہ ان حقایق سے کسی حد تک آگاہ ہو جائیں تو تفسیر القرآن جلد دوم کا مطالعہ کریں۔ سرسیّدؒ کے مختصر حالات زندگی تحریر کرنے کے بعد انھوں نے اس مقدمہ میں بھی "تحریر فی اصول التفسیر" کے تمام نکات کا اپنی زبان میں ایک خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ تاکہ ان کا ایرانی قاری سرسیدؒ کی تفسیری فکر سے بخوبی آشنا رہے اور جب وہ تفسیر القرآن کے ترجمے کا مطالعہ کرے تو سرسیّدؒ کی ہر بات کا سمجھنا اس کے لیے سہل ہو۔

تفسیر القرآن جلد اول کے مقدمہ ہی کی طرح جلد دوم کے مقدمہ میں بھی فخر داعی گیلانی نے سرسیّدؒ کی تفسیری فکر پر اپنی کوئی رائے ظاہر کرنے سے گریز کیا ہے۔ تاہم وہ بعض بعض باتیں ایسی لکھ گئے ہیں جن کے مطالعے سے یہ نتیجہ برآمد کیا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک سرسیّد کی تفسیری فکر کس قدر و قیمت کی حامل ہے؟ مثلاً ایک جگہ تحریر کرتے ہیں:

"او در ضمن بیان تفسیر آیات، بسیاری از مسائل غامضہ و نیز مطالب بسیار دقیق فلسفی و علمی را با منطق توانا و بیان شیوا بقدری قشنگ و خوب روشن و علاجی نمودہ کہ از روی بسیاری از رازها پردہ برداشتہ است، بعلاوہ تمامی ایرادات و اعتراضات سخت مخالفین را ہم جوابہ قاطع و دندان شکن دادہ است، در اثبات مسائل اکثراً دلائلی کہ آوردہ راستی بقدر سادہ و روشن و دلنشین است کہ برای خوانندہ جای ابہام و تردیدی باقی نمی ماند"۔[۲]

[انھوں نے آیتوں کی تفسیر کے سلسلے میں بہت سے غامض مسئلوں اور گہرے علمی و فلسفیانہ

مطالب کو زبردست منطق اور بہترین انداز بیان میں اس قدر خوبصورت واضح اور چھان پھٹک کر پیش کیا ہے کہ بہت سے رازوں پر سے پردہ اٹھا دیا ہے۔ اس کے علاوہ مخالفین کے تمام سخت اعتراضوں کا بھی مسکت اور دندان شکن جواب دیا ہے۔ مسائل کے اثبات میں وہ جو دلیلیں پیش کرتے ہیں واقعی وہ اس قدر سہل، دلنشین اور واضح ہیں کہ ان کے قاری کے لیے ابہام اور انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔"

ایک غیر جانب دار اور غیر عالم کی حیثیت سے جب ہم سرسیدؒ کی تفسیر کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم اس الجھن سے دوچار رہتے ہیں کہ قرآن پاک کی اب تک جتنی تفسیریں لکھی گئی ہیں وہ اپنے افکار و نظریات میں ایک جیسی نہیں ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جس دور کے علما کا احادیث کے مطالعے سے خاص شغف رہا ہے اس دور میں کلام پاک کی جتنی بھی تفسیریں لکھی گئی ہیں، وہ سب کی سب صرف احادیث نبویؐ سے مستفاد ہیں، جب مسلمانوں میں یونانی فلسفہ عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تو اس دور کی بیشتر تفسیروں میں یونانی فلسفے کے افکار و نظریات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ جب تصوف مسلمانوں کا اوڑھنا بچھونا بن گیا تو اس دور کی ساری تفسیریں متصوفانہ نقطۂ نظر سے لکھی گئیں۔ لیکن جب سرسیدؒ اپنے عہد کے علوم جدیدہ کے انکشافات و اکتشافات کی روشنی میں قرآن پاک کی آیات کی توضیح، تشریح اور تعبیر کرتے ہیں تو ان کی نہ صرف شدید مخالفت ہوتی ہے بلکہ ان کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا جاتا ہے حالاں کہ وہ اس بات کے قایل ہیں کہ

" ایک خدا خالق کائنات موجود ہے۔ اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے انبیا مبعوث کیے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول برحق و خاتم المرسلین ہیں۔" "قرآن مجید کلام الٰہی ہے۔" "قرآن مجید بلفظہٖ آنحضرتؐ کے قلب پر القا ہوا تھا اور وہی الفاظ اور اسی نظم سے جس طرح القا ہوا ہے آنحضرتؐ نے لوگوں کو پڑھ کر سنایا۔" "قرآن مجید بالکل سچ ہے کوئی بات اس میں غلط یا خلاف واقعہ مندرج نہیں۔" "صفات ثبوتی اور سلبی ذات باری کے جس قدر قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں سب سچ اور درست ہیں، مگر ان صفات کی ماہیت کا من حیث ہی ہی جاننا مافوق عقل انسانی ہے۔" "صفات باری عین ذات ہیں اور وہ مثل ذات کے ازلی و ابدی ہیں اور مقتضائے ذات ظہور صفات ہے۔" "تمام صفات باری نامحدود اور مطلق عن القیود ہیں۔" "قرآن مجید میں کوئی امر ایسا نہیں جو قانون فطرت کے برخلاف ہو۔" "قرآن مجید جس قدر نازل ہوا ہے بتمامہٖ موجود ہے نہ اس میں ایک حرف کم ہوا ہے نہ زیادہ۔" "ہر ایک سورۃ کی آیات کی ترتیب منصوص ہے۔" "قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ نہیں ہے یعنی اس کی کوئی آیت کسی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوئی۔" "قرآن مجید دفعۃً اور واحدۃً نازل نہیں ہوا ہے، بلکہ نجماً نجماً نازل ہوا ہے۔" "موجودات عالم اور مصنوعات کائنات کی نسبت جو کچھ خدا نے قرآن مجید میں کہا ہے وہ سب موحوٰ یا بحیثیۃ من الحیثیات مطابق واقع ہے۔" "باوجود اس بات کے تسلیم کرنے کے کہ قرآن مجید بلفظہٖ کلام خدا ہے، مگر جب کہ وہ عربی میں اور انسان کی زبان میں نازل ہوا ہے تو اس کے معنی اس طرح پر لگائے جاویں گے جیسے کہ

ایک نہایت فصیح عربی زبان میں کلام کرنے والے
کے معنی لگائے جاتے ہیں اور جس طرح کہ انسان
استعارہ و مجاز، کنایہ و تمثیل اور لمی و اقناعی و
خطابی و استقرائی و الزامی کو کام میں لاتا ہے
اُسی طرح قرآن مجید میں بھی استعارہ و مجاز کنایہ و
تمثیل اور دلائل لمی و اقناعی و خطابی و استقرائی و
الزامی سب موجود ہیں[illegible]"

سر سیّد درج بالا جن پندرہ باتوں کے قایل ہیں اُن میں ہمارے نزدیک ایک اہم بات یہ ہے کہ بعض علما کے برخلاف سر سیدؒ اس بات کے قایل ہیں کہ قرآن کے مضامین ہی نہیں بلکہ اس کے الفاظ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیے گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک سر سیدؒ کی تفسیر سے علما نے جو شدید اختلاف کیا اس کے دو خاص اسباب تھے۔

۱۔ خرق عادت کا انکار اور آیات متشابہات کی تعبیر و توجیہ تشریح میں جمہور علما کی روش سے ہٹ کر ایک دوسری ہی روش اختیار کرنا بالخصوص ان تفسیری تفصیلات کا انکار کرنا جو اسرائیلیات کے ذریعے ہماری بیشتر تفسیروں میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان اسرائیلی تفصیلات سے ہمارے بعض اہم اور معتبر علما اختلاف کرتے رہے ہیں مگر قصّہ سننے اور سنانے کی جو جبلی خواہش انسان میں ہوتی ہے وہ اس کو قدم قدم پر افسانہ و افسوں کے اختراع پر اکساتی رہتی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب بھی اس بات کے قایل ہیں کہ "نقل از بنی اسرائیل بیشتر است کہ در دین ما داخل شده[illegible] [بہت سی اسرائیلی روایتیں ایسی ہیں جو ہمارے دین میں داخل ہوئیں] سر سیدؒ کے ایک کم عمر معاصر علامہ شبلی نعمانیؒ کا بھی کچھ ایسا ہی خیال ہے (علامہ سر سیدؒ سے چالیس برس چھوٹے تھے) وہ اپنے مقالے علوم القرآن میں تحریر فرماتے ہیں:

"قصص اور حقایق اشیاء کے متعلق تصنیفات
کا جو سرمایہ ہے وہ درحقیقت شرم کا باعث ہے اور
افسوس اور سخت افسوس ہے کہ تفسیر کے اجزا
میں جو حصہ سب سے زیادہ عوام میں مقبول اور
متداول ہے، اور سلسلہ بسلسلہ تمام اسلامی لٹریچر
میں سرایت کر گیا ہے وہ یہی حصہ ہے۔ انبیا اور
صلحائے سابقین کے افسانے جو یہودیوں میں
پھیلے ہوئے تھے وہ نہایت مبالغہ آمیز اور دور از کار
تھے۔ قرآن مجید میں نہایت اجمال کے ساتھ صرف
اُن واقعات کو بیان کیا گیا جو فی نفسہٖ صحیح تھے اور
جن سے طبایع پر کوئی اخلاقی عمدہ اثر پڑتا تھا
ہمارے مفسروں نے قرآن مجید کو ایک متن قرار
دیا اور اس کی شرح میں وہ تمام بے ہودہ
افسانے شامل کر دیے جن کے سامنے بوستان خیال
کی بھی کچھ حقیقت نہیں۔ حقایق اشیاء کے متعلق جو
کچھ قرآن مجید میں مذکور تھا اس کے ساتھ بھی یہی
سلوک کیا گیا۔ چاہ بابل، کوہ قاف، سکندر ذوالقرنین
یاجوج ماجوج وغیرہ وغیرہ کی نسبت جو روایتیں
مسلمانوں میں پھیلی ہیں وہ ان ہی تفسیروں کی
بدولت ہیں[illegible]"

یہ مقالہ جس زمانے میں معرض وجود میں آیا ہوگا، سر سیّد کی تفسیر کے کئی ناقد یقیناً بقید حیات رہے ہوں گے۔ مگر ہم کو یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوتا ہے کہ علامہ شبلیؒ کی اس تحریر پر سر سیدؒ کا کوئی ناقد ان کی گرفت نہیں کرتا کہ وہ اسرائیلی روایات کے سلسلے میں سر سیّد کے ہم نوا کیوں ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھی یہ سوچنا پڑتا ہے کہ سر سیدؒ کی مذہبی فکر سے ان کے عہد حیات میں جو اختلاف کیا گیا اس کے محرکات صرف یہی نہیں تھے کہ علما سید کی تفسیری فکر کو گمراہ کن سمجھتے تھے۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ رہی ہوگی کہ ان کے مخالفوں کو ان کی تعلیمی، اصلاحی اور سماجی تحریک سے شدید اختلاف تھا۔ فریق مخالف کی ہر بات کی مخالفت کرنا انسان کی فطری کمزوری ہے جس سے اس عہد کے علما بھی مبرا قرار

نہیں دیے جاسکتے۔ سرسیّد سے پہلے نہ جانے کتنے تفسیری مکتبِ فکر وجود میں آئے۔ نجانے کتنی نئی نئی عقلی باتوں کو تفسیر کلام پاک میں شامل کیا گیا۔ معتزلی، متصوفانہ اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے قرآن پاک کی آیات کی تفسیر، تاویل اور تشریح کی گئی مگر جس شد و مد کے ساتھ سرسید کی تفسیر کو ہدف تنقید بنایا گیا وہ دوسروں کی تفسیری تاویلات کے ضمن میں کم نظر آتا ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک سرسیّد کی تفسیر کی مخالفت کا اصل سبب ان کی "دینی گمرہی" نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سرسیّد نے خرق عادت کے سلسلے میں جو رویہ اختیار کیا ہے اس کو ماضی قریب کے ایک عالم نے کس نظر سے دیکھا ہے؟ اس سلسلے میں فزداعی گیلانی نے اپنے ترجمے کی دوسری جلد میں تحریر کیا ہے:

"درخصوص مسئلہ اعجاز و خرق عادت کہ از مسایل عمدۂ کتاب است و راجع بان منقول از ابن رشد در صدر کتاب مبسوطاً بحث شدہ یکی دو تذکر است کہ لازم می دانم آنرا در این جا بعرض برسانم۔ اولاً این مرد بزرگ منکر اصل اعجاز نیست ولی باین حرف کہ آن دلیل بر ثبوت نبوت باشد جداً مخالف است و ثانیاً در این شکی نیست کہ در انسان قوہ ای وجود دارد کہ افعالی شگفت انگیز از وی صدور می یابد کہ حتیٰ دانشمندان علوم جدیدہ آنہا را بہ خرق تعبیر می کنند و معترفند کہ آن از دسترس جسم و مادہ خارج می باشد و بنابرین کسی کہ عاقل است چگونہ می تواند آنرا سراسر انکار کند البتہ این فرق ہست کہ عوام مردم معتقد اند کہ آنہا مستقیماً و براہ راست از خدا بروز و ظہور میرسند برخلاف خواص و مردم دانا کہ می گویند در عالم اسباب ہر چیز وابستہ بسبب علت است و در روی این اصل برای خوارق عادات نیم علت و سببی درکار است، چنانکہ حکما و عرفای اسلام مثل حکیم ابوعلی سینا، امام غزالی، شاہ ولی اللہ امور خارق العادہ را معلول علل و اسباب دانستہ اند و آن علل و اسباب را ہم وضوحاً تشریح کردہ اند۔ ابن سینا در آخر کتاب اشارات فصلی بنام "مقامات العارفین" باز کردہ و راجع بہ علل و اسباب مزبور مبسوطاً بحث نمودہ و آنہا را مخصوصاً نشان دادہ است، ماخوانندگان را بآنجا حوالہ میدہیم۔ در خاتمۂ این بیان تذکرا می نویسم کہ ترقیٔ شگفت انگیز علوم، پیش رفت سریع فلسفۂ مادی و بالاخرہ واژگون شدنِ اساس حکمت کہ بر مشاہدات طبیعی و علوم تجربتی و ریاضی گذاشتہ شدہ است چنانکہ دیدہ میشود عقاید کہن را از ریشہ کندہ و اساس مذہب را در ہمہ جا بطور وحشتناکی متزلزل گردانیدہ است برای حفظ عقاید مذہبی دانشجویان امروز جز نشر و انتشار این گونہ آثار و کتابہای کہ بر مبانیٔ تحقیق و موازین عقل و منطق قرار گرفتہ باشند گمان نمی کنم راہ دیگری باشد[21]۔"

[خاص طور سے معجزات اور خرق عادت کا مسئلہ جو کہ کتاب کے عمدہ مسائل میں ہے، اس سلسلے میں ابن رشد نے جو کچھ لکھا ہے اس پر کتاب میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے (اس سلسلے کی) دو ایک باتیں ہیں جن کو میں اس جگہ پر بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ یہ عظیم انسان (سرسیدؒ) معجزات کی حقیقت کا منکر نہیں ہے۔ لیکن وہ اس بات کا سخت مخالف ہے کہ معجزات نبوت کی دلیل اور ثبوت ہوتے ہیں۔ دویم یہ کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ انسان میں ایک ایسی قوت موجود ہے جس سے ایسے حیرت انگیز افعال ظاہر ہوتے ہیں جن کو علوم جدیدہ کے ماہرین بھی خرق عادت کے نام سے

تعبیر کرتے ہیں اور اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ (افعال) جسم اور مادہ کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ شخص جو کہ عاقل ہے کس طرح ان (افعال) کا کلیتہً انکار کر سکتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ عوام اس بات کے قایل ہیں کہ یہ براہِ راست خدا کی طرف سے نمایاں اور ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس خواص اور دانشمند لوگ یہ کہتے ہیں کہ عالم اسباب میں ہر چیز سبب اور علت سے وابستہ ہے اور اس نظریہ کے مطابق خرقِ عادت کے لیے بھی سبب اور علت درکار ہیں۔ چنانچہ مسلمان فلسفیوں اور عارفوں مثلاً ابو علی سینا، امام غزالی اور شاہ ولی اللہ نے خارق العادت امور کو علل و اسباب کا معلول سمجھا ہے اور ان علل و اسباب کی بڑی وضاحت کے ساتھ تشریح کی ہے۔ ابن سینا نے اپنی کتاب اشارات کے آخر میں ایک فصل "مقامات العارفین" کے عنوان سے لکھی ہے اور درج بالا علل و اسباب کے سلسلے میں بڑی تفصیل سے بحث کرتے ہوئے ان کی خاص طور پر نشاندہی کی ہے۔ ہم اپنے قارئین کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہیں۔ اس بحث کے خاتمے پر ہم بطور یاد دہانی تحریر کرتے ہیں کہ علوم کی حیرت انگیز ترقی، مادّی فلسفہ کی تیز رفتار پیشرفت اور اس فلسفہ کی بنیادوں کے ذمے جانے نے، جس کی بنیاد طبیعی مشاہدات، تجرباتی علوم اور ریاضی پر رکھی گئی ہے، قدیم عقاید کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا ہے اور (دنیا میں) ہر جگہ مذہب کی بنیادوں کو وحشت انگیز حد تک متزلزل کر دیا ہے۔ مذہبی عقیدوں کی حفاظت کے لیے آج کے دانشمندوں کے سامنے اس راہ کے علاوہ میرے خیال میں کوئی اور راہ نہیں ہے کہ اس طرح کی مذہبی کتابوں کی نشر و اشاعت کی جائے جن کی بنیاد تحقیق، عقلی میزانوں اور منطق پر رکھی گئی ہو۔]

درج بالا اقتباس کے غائر مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ایک طرف تو فخر داعی گیلانی نے سر سید پر عاید ہونے والے الزاموں کی تردید کی ہے اور دوسری طرف اس بات کی ضرورت بھی محسوس کی ہے کہ موجودہ دور میں مذہبی عقاید کی حفاظت کے لیے "تفسیر القرآن" جیسی کتابوں کی اشاعت ہونی چاہیے علوم جدیدہ کی برق رفتار پیشرفت نے مذہبی اعتقادوں کو جس طرح متزلزل کر دیا ہے اس کا دفیعہ اسی طرح ممکن ہے "تفسیر القرآن" لکھنے کا سر سید کا مقصد بھی وہی تھا جس کی طرف فخر داعی گیلانی نے اشارہ کیا ہے۔ سر سید نے "تحریر فی اصول التفسیر" کے دیباچے میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں علوم جدیدہ کو رائج کرنے کے ذمہ دار وہ تھے اس لیے یہ ان کا فرض ہوتا ہے کہ علوم جدیدہ کی تحصیل کے بعد ہندوستانی مسلمان جن مذہبی شکوک و شبہات میں مبتلا ہوں ان کا سدّ باب وہی کریں۔ سر سید کی تفسیر قرآن پاک "تفسیر القرآن" اُن راسخ العقیدہ مسلمانوں کے لیے نہیں لکھی گئی ہے جن کے قلوب مذہبی امور میں شکوک و شبہات سے پاک ہیں۔

سید محمد تقی فخر داعی گیلانی نے جس محنت، دیدہ ریزی اور علمی بصیرت سے سر سید کی اردو نثر کا خوبصورت ترین فارسی میں ترجمہ کیا ہے اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی ان کے ترجمے کے اسلوب پر تو ہم کسی دوسرے موقع پر روشنی ڈالیں گے۔ اس وقت ان کے ترجمے کے چند نمونے ہی نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان نمونوں کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکے گا کہ انھوں نے سر سید کی علمی تحریر کا کس شگفتہ اور علمی انداز کی فارسی میں ترجمہ

کیا ہے۔

سرسید نے سورۂ بقرہ کی تفسیر کی ابتدا اس طرح کی ہے

"(الم) یہ سورۃ انہی انتیس سورتوں میں سے ہے جن کو خود خدا نے ان کے نام سے موسوم کیا ہے یہ حروف مقطعات ان سورتوں کے نام ہیں جن کے (جو ان کی ؟) ابتدا میں آئے ہیں اور جو سورتیں باہم کسی قسم کی مناسبت رکھتی ہیں ان کے ایک ہی سے نام مقرر کیے ہیں اب یہاں تین باتیں غور طلب ہیں۔ ایک یہ کہ انہی انتیس سورتوں کا نام مقرر کرنے کا کیا سبب ہے۔ دوسرے یہ کہ حروف مقطعات سے کیوں ان کے نام مقرر کیے ہیں۔ تیسری یہ کہ جن حروف مقطعات سے ان سورتوں کے نام مقرر کیے ہیں انہی حروف سے ان کا نام مقرر کرنے کا کیا سبب ہے"[22]

سرسید کی اس تحریر کا ترجمہ فخر داعی گیلانی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"(الم) از میان سُور نوزدگانہ ای کہ خدا برای آنہا نام مقرر کردہ است یکی ہم ہمین سورہ است۔ این نام عبارت از حروف مقطعہ ایست کہ در ابتدای سُور مزبورہ درج می باشد مخصوصاً سُوری کہ بین آنہا جہت جامعہ یا قدر مشترکی وجود دارد بنام واحد خواندہ شدہ اند۔ حال سہ مطلب در این جاہست کہ ہر کدام قابل ملاحظہ می باشد۔ یکی آنکہ چرا برای این سورہ ہا نام تعیین شدہ و دیگر چرا این نام بحروف مقطعہ تخصیص یافتہ است۔ سوم این کہ وجہ اختصاص آن بحروف مزبورہ چیست ؟"[23]

اس کے بعد سرسید تحریر کرتے ہیں:

"قرآن مجید پر غور کرنے سے اعلانیہ پایا جاتا ہے کہ جس سورت کو خدا تعالیٰ نے تسمیہ طور پر یا اس طرزِ کلام پر شروع کیا ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے یا یہ خدا کی کتاب ہے، اس مقام پر خدا نے اس سورت کو کسی اسم سے موسوم کیا ہے تاکہ ان کا نام لینے سے اس کے مسمیٰ پر اس امر کا اطلاق ہو جس کا اطلاق کرنا منظور ہے اور جن سورتوں کو اس طرزِ کلام سے شروع نہیں کیا ان کا نام رکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی"[24]

اب اس عبارت کا فارسی ترجمہ ملاحظہ ہو:

"بعد از غوص در قرآن مجید این مطلب ظاہر میشود کہ خداوند ہر سورہ ای را کہ بطور تسمیہ یا بدین اسلوب افتتاح کردہ کہ "این ست کتاب خدا و یا آن، کلام خدا است، برای آن سورہ نام مقرر داشتہ است تا از ذکر نام اطلاق امری کہ در نظر گرفتہ شدہ است آن امر برمسمای آن نام اطلاق شدہ باشد و معلوم است سورہ ہای کہ بطرز مزبور افتتاح کلام نشدہ ضرورتی برای تعیین یا انتخاب نام نبودہ است"[25]

اس کے بعد سرسیدؒ نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

"مثلاً اس سورت کا نام جس کی ہم تفسیر کر رہے ہیں (الم) ہے۔ اب خدا تعالیٰ نے طرزِ کلام اس طرح پر شروع کیا ہے کہ یہ سورت خدا کے کتاب کی ہے تو اس نے اس سورت کا نام لے کر کہہ دیا کہ الم یعنی اس کا مسمیٰ وہ کتاب ہے پس الم جو اس سورت کا نام ہے مبتدا ہے اور ذلک مبتداء ثانی ہے اور الکتاب اس کی خبر ہے اور یہ مبتدا و خبر مل کر پہلے

مبتدا کی خبر ہیں، اور الم کا مسمیٰ ذٰلک الکتاب پر محمول ہے۔"[۲۴]

فخر داعی گیلانی نے اس عبارت کو یوں فارسی زبان کے قالب میں ڈھالا ہے:

"مثلاً سورۂ حاضر کہ نامش الم می باشد چون طرز کلام را خداوند بدین نحو شروع فرمودہ کہ "این سوۂ کتاب خدا است" لذا دیدہ میشود کہ نام برای آن مقرر کردہ می فرماید، الم یعنی مسمای وی آن (مسمی) کتاب است، پس الم کہ نام سورہ است مبتدا است، "ذٰلک" مبتدا، ثانی و "الکتاب" خبر آن میشود و این جملۂ مبتدا و خبر، خبر است برای مبتدای اول و "الم" یعنی مسمای آن محمول بر "ذٰلک الکتاب" است۔"[۲۸]

درج بالا چند مثالوں ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فخر داعی گیلانی نے سرسیدؒ کی اردو تفسیر القرآن کو کتنی آسان، دلکش اور غیر مبہم فارسی زبان میں منتقل کیا ہے اور اپنے ترجمے کو ایک طبع زاد تحریر کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔

بعض تاملات کی بنا پر ہندوستان میں تو سرسید کی تفسیر کے پڑھنے والے انگشت شمار ہیں مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ اس فارسی ترجمے کے ذریعے سرسید کی مذہبی فکر سے وہ لوگ واقف ہوتے رہتے ہیں جن کی مادری زبان فارسی ہے۔ اس ترجمے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ایرانی عالم کے نزدیک سرسیدؒ کی مذہبی فکر اتنی توانا اور فعال ہے کہ اس نے اس فکر سے اپنے ہم زبانوں کو واقف کرانا ضروری سمجھا اور اس کے ترجمے میں اپنی عمر عزیز کا اچھا خاصہ حصہ صرف کیا۔

حواشی

۱ مقالات شبلی، ج ۱، ص ۲۵-۳۳، دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء

۲ تفسیر القرآن، ج ۱، اشاعت دوم، مرداد ۱۳۳۴ شمسی، ص ح

۳ تفسیر القرآن ج ۲، اشاعت اول، ص، ھ

۴ تحریر فی اصول التفسیر، نولکشور سٹیم پریس لاہور، ۱۹۱۳ء ص ۱۹

۵ ایضاً

۶ ایضاً

۷ ایضاً

۸ ایضاً ص ۲۰

۹ ایضاً ص ۲۰-۲۱

۱۰ ایضاً ص ۲۱

۱۱ ایضاً

۱۲ ایضاً ص ۲۵-۲۶

۱۳ ایضاً ص ۲۸

۱۴ ایضاً

۱۵ ایضاً

۱۶ ایضاً ص ۲۹ ۱۷ ایضاً ص ۳۰

۱۸ ایضاً ص ۳۰

۱۹ الفوز الکبیر، بحوالہ تحریر فی اصول التفسیر ص ۳۴

۲۰ مقالات شبلی ج ۱، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء ص ۴۰-۴۱

۲۱ ج دوم ص ھ، د ۲۲ ص ۲

۲۳ تفسیر القرآن، ج ۱، مطبع گلزار محمدی لاہور، ۱۸۹۱ء ص ۱۴

۲۴ تفسیر القرآن (فارسی ترجمہ) ج ۱، ص ۴۰

۲۵ " (اردو)، ص ۱۴

۲۶ تفسیر القرآن (ترجمہ فارسی) ج ۱، ص ۱۴۔

۲۷ " (اردو) ج ۱، ص ۱۴

۲۸ " (فارسی) " ص ۴۰

علی اختر خاں

سرسیدؒ، تعلیم اور قومی یکجہتی

ہندوستان صدیوں سے مختلف مذاہب، نظریوں، زبانوں اور تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف قوموں، نسلوں اور رنگوں کے لوگ یہاں آئے اور سدا کے لیے یہیں رچ بس گئے۔ وہ آپس میں اس طرح شیر و شکر ہوئے کہ دوئی کا احساس جاتا رہا۔ تہذیبوں کے اس اختلاط مسلسل سے 'کثرت میں وحدت' کا تصور جاگا اور "پُرامن بقائے باہم" کا جمہوری نظریہ وقت کی اہم ترین ضرورت بن کر نمودار ہوا اور ہندوستان میں ایک ایسے کلچر کو فروغ ہوا جسے "گنگا جمنی" کلچر سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ یہ گنگا جمنی تہذیب (جو دراصل مختلف تہذیبی عناصر کا ایک حسین امتزاج اور سنگم ہے) ہندوستان کے مزاج کی پہچان اور اس کے خوابوں کی آبرو بن گئی، جس کی حفاظت شاہوں اور گداؤں، صوفیوں اور سنتوں، دانشوروں اور مزدوروں نے ہر دور میں اپنے اپنے طور پر کی ہے۔ جب بھی اس پر کوئی کڑا وقت آن پڑا ہے۔ عوام اور خواص کی صفوں سے لوگ آگے بڑھے ہیں اور اپنی حریتِ فکر، سماجی سرگرمیوں اور خدمت و ایثار سے اس کی بقا کی ضمانت دی ہے اور اسے پروان چڑھانے کی سبیلیں نکالی ہیں۔ ایک مشترکہ تہذیب سے یہ والہانہ اجتماعی لگاؤ اور اس کی بقا و فروغ کے لیے یہ مشترکہ اور مسلسل کوششیں ہی دراصل ہندوستان کی عظمت کا نشان اور اس کی بقا اور فلاح و بہبود کی ضمانت ہیں۔

تہذیبوں کے اس تنوع اور رنگا رنگی کے صدقہ کہ جس کے طفیل ہمارا یہ عظیم ملک ایک حسین اور دلکش گلدستہ نظر آتا ہے۔ لیکن بُرا ہو بیرون و اندرونِ ملک سے چلنے والی ان تیز و گرم ہواؤں کا کہ جن کی سازشوں سے گلدستے کے پھول کبھی کبھی (اور اب تو اکثر) آپس میں زور زور سے ٹکرانے لگتے ہیں، ٹکرا ٹکرا کر لہو لہان ہو جاتے ہیں، اُن کی خوشبو اڑنے لگتی ہے، رنگ نچڑنے لگتا ہے۔ ایسے میں ان لوگوں کی بے ساختہ یاد آنا عین فطری ہے جنھوں نے ان پھولوں کو بادِ سموم سے بچایا ہے، انھیں اپنے خونِ جگر کی سرخی دی ہے، ان کے درمیان فاصلوں کو کم کرنے اور ان میں جذباتی ہم آہنگی یگانگت اور یک جہتی پیدا کرنے کے سو سو جتن کیے ہیں، اپنے سر دھڑ کی بازی لگائی ہے اور حب الوطنی اور قومی خدمت و ایثار کی اعلیٰ ترین مثالیں اور معیار قایم کیے ہیں ——— ہندوستان کے انھیں مایۂ ناز اور جیالے سپوتوں میں ایک سرسید احمد خاںؒ بھی تھے، ایک انقلابی مصلح، علی گڑھ تحریک کے بانی اور روحِ رواں، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (موجودہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے بانی، اور جدید ہندوستان کے عظیم معماروں میں ایک۔

سرسیدؒ نے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی حفاظت اور صحیح معنوں میں یہاں قومی یک جہتی کو فروغ دینے کی کوششوں کے اس سلسلے کو جس کا ایک سرا اکبر اعظم اور دوسرا مہاتما گاندھی

جواہر لال نہرو اور ان کے ہم نواؤں سے ملتا ہے، کو آگے بڑھانے میں ایک نہایت اہم اور انقلابی کردار ادا کیا ہے۔ وہ انقلاب روس سے سو سال قبل ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور انھوں نے قیام انڈین نیشنل کانگریس سے تیرہ سال بعد ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ میں وفات پائی۔ وہ گفتار ہی کے نہیں کردار کے بھی غازی تھے۔ وہ فکر و عمل کا ایک ایسا آتش فشاں تھے جو ملک و ملت کی دردمندی میں ایک بار پھٹ پڑا تو پورے اکیاسی سال تک دہکتا رہا اور لوگوں کو دہکاتا رہا۔ وہ اصلاحی سرگرمیوں کا ایسا سرچشمہ تھے جس نے تعلیم، مذہب ادب اور سیاست جیسے ہماری قومی و ملی زندگی کے مختلف میدانوں کو سیراب کیا ہے اور ریگ زاروں میں بھی گل و بوٹے اگائے ہیں۔ سرگرمیوں اور کارکردگیوں سے پُر ان کی اکیاسی سالہ زندگی بلاشبہ ہماری قومی و ملی تاریخ کا ایک ایسا روشن باب ہے جس کی بتدریج پھیلتی شعاؤں سے نسلیں در نسلیں کسب نور کرتی رہیں گی۔

سرسید ایک بعید بینی نگاہ صدیوں کا سینہ چیر کر آگے نکل جانے والے ذہن رسا اور زبردست سماجی حسیت کے مالک تھے۔ قومی و ملی مسائل کے سلسلے میں ان کا رویہ عام مسلمانوں اور مصلحوں کی طرح جذباتی نہیں بلکہ بعید عقلی، عملی اور حقیقت پسندانہ تھا۔ 'اسباب بغاوتِ ہند' کے مصنف سے اس سے کم یا مختلف کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ انھوں نے مغلیہ سلطنت کا زوال، برطانوی سامراج کا عروج اور اس کا جور و استبداد ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت ہند اور اس سے پیدا شدہ جہنم زار حالات اور اپنے ہم وطنوں خصوصاً مسلمانوں کی زبوں حالی اور کسمپرسی کا عالم اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور ایک دور اندیش اور مصلحت بیں سماجی مدبر کی حیثیت سے محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستانی عوام بالخصوص مسلمان مستقبل قریب میں ایک اور ناکام بغاوت ہند کے سنگین نتائج کے متحمل نہیں ہو سکتے، نہ ہی وہ اپنے آپ کو ایک اور 'اسباب بغاوت ہند' لکھنے کو راضی پاتے تھے۔ چنانچہ

انھوں نے اپنے ہم وطنوں بالخصوص مسلمانوں کی اشک شوئی و شیرازہ بندی کرنے، ان کی صلاحیتوں اور محدود وسائل و ذرائع کو ضائع ہونے سے بچانے اور ان کو مستقبل کے لیے ایک ہمہ گیر، مضبوط اور موثر مگر فی الوقت انگریزوں کی آنکھوں میں نہ کھٹکنے والی تیاری میں لگانے کا تاریخی اور دور رس فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے سے جو پالیسی انھوں نے مرتب کی اس کے تین اہم نکات تھے:

۱۔ حکومت وقت کے تئیں وقتی طور پر سیاسی مخاصمت کے بجائے مفاہمت کا رویہ اپنانا اور بدلے میں تعلیمی اور معاشی میدانوں میں ترقی کے زیادہ سے زیادہ مواقع اور ذرائع حاصل کرنا۔

۲۔ وقتی اور لاحاصل سیاسی سرگرمیوں اور ایجی ٹیشنوں میں حصہ لینے کے بجائے تعلیمی، سماجی اور اقتصادی میدانوں میں بنیادی اور ٹھوس نوعیت کے اصلاحی کام کرنا تاکہ ان میدانوں میں ہندوستانی قوم کی پسماندگی دور ہو سکے اور وہ یوروپین اقوام کے ہم پلہ ہو سکے۔

۳۔ مسلمانوں کو ان کی روایتی تعلیم کے ساتھ ہی جدید سائنسی تعلیم سے بھی آراستہ و پیراستہ کرنا اور ان کی تعلیمی پسماندگی اور معاشی بدحالی دور کرنے پر خصوصی توجہ دینا کیونکہ وہ انگریزوں کے عتاب کا زیادہ شکار اور زبردست انتشار اور یاس میں مبتلا تھے اور اپنے ہم وطنوں سے تعلیمی و معاشی میدان میں نصف صدی پیچھے تھے۔

ایک بار فیصلہ کر لینے اور حکمت عملی طے کرنے کے بعد وہ اسے عمل میں لانے میں کیسے ہی جان سے جٹ گئے۔ چنانچہ ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم یا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا جو اپنے قیام سے ہی ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا امین اور اس کے سیکولر اور جمہوری مزاج کا پاسدار اور پاسبان ہے۔ کالج کے قیام کی غرض و غایت اور اس کے سیکولر اور قومی کردار اور نصب العین کی وضاحت کرتے ہوئے سرسید

۳۰ جنوری ۱۸۸۴ء کو انڈین ایسوسی ایشن لاہور کی طرف سے پیش کیے گئے ایک سپاس نامے کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میرے عزیز دوستو! آپ نے اپنے ایڈریس میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کا ذکر کیا ہے۔ مجھ کو افسوس ہوگا اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ یہ کالج ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز ظاہر کرنے کے لیے قایم کیا گیا ہے۔ خاص سبب جو اس کالج کے قایم کرنے کا ہوا یہ تھا جیسا کہ میں یقین کرتا ہوں کہ آپ بھی واقف ہیں کہ مسلمان روز بروز زیادہ تر ذلیل اور محتاج ہوتے جاتے تھے۔ ان کے مذہبی تعصبات نے ان کو اس تعلیم سے باز رکھا تھا جو سرکاری کالجوں، مدرسوں میں دی جاتی تھی اور اسی وجہ سے یہ امر ضروری خیال کیا گیا کہ ان کے واسطے کوئی خاص انتظام کیا جاوے۔ اس کی مثال اس طرح پر دی جاسکتی ہے فرض کرو کہ دو بھائی ایسے ہیں جن میں ایک بالکل طاقتور اور تندرست ہے اور دوسرا بیمار ہے اور اس کی تندرستی زوال پر ہے۔ پس اس کے تمام بھائیوں کا یہ فرض ہوگا کہ اس بیمار بھائی کی صحت کی تدبیر کریں اور اس کو مدد دیں۔ یہی خیال تھا جس نے مجھ کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قایم کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ مگر میں اس بات کے بیان کرنے سے خوش ہوں کہ اس کالج میں دونوں بھائی ایک ہی سی تعلیم پاتے ہیں۔ کالج کے تمام حقوق جو اس شخص سے جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے بلا کسی قید کے اس شخص سے بھی متعلق ہیں جو اپنے تئیں ہندو بیان کرتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ذرا بھی امتیاز نہیں ہے۔ صرف وہی شخص انعام کا دعویٰ کر سکتا ہے جو اپنی سعی اور کوشش سے اسے حاصل کرے۔ اس کالج میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر وظیفوں کے مستحق ہیں اور دونوں کے ساتھ بطور بورڈر یکساں سلوک کیا جاتا ہے۔ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں۔"[1]

اور ۲۷ جنوری ۱۸۸۴ء کو انجمن اسلامیہ لاہور کی طرف سے پیش کردہ ایک سپاس نامے کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

"مدرسۃ العلوم بیشک ایک ذریعہ قومی ترقی کا ہے یہاں پر قوم سے میری مراد صرف مسلمانوں ہی سے نہیں ہے بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی سے۔ مدرسۃ العلوم بلاشبہ مسلمانوں کی ابتر حالت کے درست کرنے کے لیے، اور جو افسوسناک محرومی ان کو یوروپین سائنسز اور لٹریچر کے حاصل کرنے میں تھی، اس کے رفع کرنے کو قایم کیا گیا۔ مگر اس میں ہندو اور مسلمان دونوں پڑھتے ہیں اور تربیت جو ہندوستان میں مقصود ہے دونوں کو دی جاتی ہے۔ ہم لوگ آپس میں کسی کو ہندو کسی کو مسلمان کہیں، مگر غیر ملک میں ہم سب نیٹو (Native) یعنی ہندوستانی کہلائے جاتے ہیں۔ غیر ملک والے خدا بخش اور گنگا رام دونوں کو ہندوستانی سمجھتے ہیں۔"[2]

اس طرح اپنی حکمت عملی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے انھوں نے اپنے ہم وطنوں بالخصوص مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کا مناسب انتظام کیا اور اسی طرح جب ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو انڈین نیشنل کانگریس قایم ہوئی تو سر سید نے اپنے ہم وطنوں بالخصوص مسلمانوں کو اس سیاسی گروہ اور اس کی سرگرمیوں سے دور رہنے اور اپنے آپ کو خالص تعلیمی و سماجی نوعیت کے نسبتاً بے ضرر لیکن زیادہ سود مند اصلاحی کاموں میں لگائے

رکھنے کی تلقین کی۔

سرسید کی انگریزوں سے مفاہمت، کانگریس سے مغایرت اور مسلمانوں کے کاز (cause) کی وکالت کی پالیسی کو لے کر بعض مصنفین اور سیاسی تجزیہ کاروں نے ان پر شدید نکتہ چینیاں اور الزام تراشیاں کی ہیں۔ انگریزوں سے قربت اور کانگریس سے دوری کی بنا پر بعضوں نے انھیں انگریزوں کا آلہ کار اور آزادیٔ ہندوستان کا مخالف تک گردانا ہے۔ حالاں کہ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک سرسید ہی پر کیا موقوف انیسویں صدی کے بیشتر ہندو اور مسلم سماجی رہنما اور مصلح انگریزی حکومت کے ملازم یا مقرب اور اس کی پالیسیوں کے زبردست حامی رہے ہیں۔ خود راجہ رام موہن رائے ۱۸۳۳ — ۱۷۷۲ء جنھیں جدید ہندوستان کا معمار اول کہا جاتا ہے ۱۸۰۳-۱۸۱۵ء کے دوران یعنی اپنے ریٹائرمنٹ تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم رہے اور اپنی بیش بہا سماجی اور اصلاحی سرگرمیوں کے ساتھ ہی انگریزی حکومت اور لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کی بھرپور حمایت کرتے رہے۔ ۱۸۲۳ء میں لارڈ ایمہرسٹ (Lord Amherest) کو ایک خط لکھ کر انھوں نے "سائنٹفک اور انگلش ایجوکیشن کی زبردست سفارش اور روایتی انداز کی سنسکرت (ورناکیولر) ایجوکیشن کی شدید مخالفت کی"۔ ۳ کانگریس کی مخالفت وہ اس لیے نہیں کر سکے کہ کانگریس اس وقت تک وجود میں آئی ہی نہیں تھی۔ لیکن ان کے طرز فکر و استدلال کو دیکھتے ہوئے قیاس اغلب ہے کہ اگر وہ سرسید کے زمانے میں ہوتے اور انہیں جیسے مسائل سے دوچار ہوتے تو وہ بھی شاید سرسید ہی کی طرح وقتی طور پر کانگریس کی مخالفت کرتے۔

راجہ رام موہن رائے اور سرسید کے خیالات میں زبردست مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں انگریزی حکومت کے مقرب اور ملازم، دونوں جدید سائنٹفک ایجوکیشن کے مبلغ اور ورناکیولر ایجوکیشن کے نکتہ چیں، دونوں اپنے اپنے مزاج و کردار میں سیکولر اور روادار، دونوں قومی یکجہتی و ترقی کے علم بردار، دونوں اپنے اپنے مذہبی فرقوں میں مروجہ فرسودہ روایات و تعصبات کی بیخ کنی کے درپے اور ان کی جگہ ایک جدید سائنسی مزاج اور رویہ پیدا کرنے کے خواہاں اور دونوں مقصد براری کے لیے سیاسی ایجی ٹیشن کے بجائے تعلیمی و سماجی اصلاحات کو زیادہ موثر حربہ سمجھنے اور اسی طور استعمال کرنے پر مصر —— پھر یہ کیسی ستم ظریفی اور ناانصافی ہے کہ ایک کو تو بڑے فخریہ انداز میں جدید ہندوستان کا معمار اول اور دوسرے کو تحقیر آمیز انداز میں' انگریزوں کا آلہ کار' کہا جاتا ہے؟ جب کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں پر کیے گئے اندھا دھند مظالم کا چشم دید گواہ ہونے اور پسماندہ اور کمزور اقلیتی فرقے سے متعلق ہونے کی بنا پر سرسید کے یہاں انگریزوں کی عدم مخالفت کا راجہ رام موہن رائے کے بمقابلے زیادہ معقول جواز موجود تھا۔ آخر کو دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے! ان حالات میں انگریزی حکومت کی انفرادی یا اجتماعی مخالفت خودکشی کے مترادف ہوتی اور خودکشی کو تدبر اور بہادری سے علاقہ نہیں ہوتا اور اسلام میں تو خودکشی بہر طور حرام ہے۔

یہ صحیح ہے کہ سرسیدؒ نے ۲۸ر دسمبر ۱۸۸۷ء کو (جس دن کانگریس کا تیسرا سالانہ اجلاس مدراس میں بدرالدین طیب جی کی صدارت میں ہو رہا تھا) لکھنؤ میں اپنی ایک سیاسی تقریر (جو ان کی واحد سیاسی تقریر تھی) میں کانگریس پر سخت تنقید کی اور مسلمانوں کو کانگریس سے دور رہنے کو کہا۔ لیکن یہ مخالفت بعض لوگوں کے خیال کے برخلاف، اس بنا پر نہیں تھی کہ کانگریس ایک ہندو آرگنائزیشن ہے یا یہ کہ وہ ہندوستان کی آزادی چاہتی ہے۔ بلکہ اس وقت وہ سرے سے ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں اور ایجی ٹیشنوں کے ہی خلاف تھے۔ چنانچہ جب ۱۸۸۸ء میں سید امیر علی نے سرسیدؒ سے کلکتہ میں ملاقات کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ محڈن نیشنل کانفرنس جو کانگریس کی پیش رو انڈین نیشنل کانفرنس کی متبادل آرگنائزیشن

سمجھی جاتی تھی) میں شامل ہو جائیں تو انھوں نے کانگریس ہی کی طرح اس میں بھی شمولیت سے انکار کر دیا۔[۴] ان کا خیال تھا کہ سیاسی سرگرمیاں بلا وجہ انگریزی حکومت کے غصے اور عتاب کو دعوت دیں گی اور اس طرح ان کی تعلیمی اور سماجی اصلاحات کے ہمہ گیر پروگرام میں خلل پڑے گا جسے کہ وہ پوری یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ چلانا چاہتے تھے تاکہ مسلمانوں کی پسماندگی دور ہو سکے اور وہ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر پورے اعتماد کے ساتھ قومی ترقی کی شاہراہ پر چل سکیں اور ان پر کسی طرح بھی بوجھ نہ بنیں۔ مسلمانوں کی پسماندگی دور کرنے کے سلسلے میں سرسید کی یہ عبوری حکمتِ عملی کسی طرح بھی فرقہ وارانہ اور علیحدگی پسندانہ نہ تھی بلکہ خالص قوم پرستانہ اور سوشلسٹک (Socialistic) تھی جس کی عملی تائید ہمیں آگے چل کر ہریجنوں کی پسماندگی دور کرنے کے سلسلے میں اپنائی گئی مہاتما گاندھی کی پالیسی میں ملتی ہے۔ گاندھی جی نے ہریجنوں (جو اتفاق سے ان کے ہم مذہب ہیں) کے کاز کی بجا طور پر پُرزور وکالت کی اور ان کے لیے ایک لمبی مدت تک ہر قسم کے تحفظات و مراعات کو قومی پالیسی کا جزو بنایا۔ لیکن ان کی قوم پرستی اور جمہوریت نوازی بجا طور پر ہمیشہ شبہ سے بالاتر رہی۔ پھر اگر خالص انسانیت نوازانہ جذبہ کے تحت سرسیدؒ نے اپنے ہم مذہب پسماندہ طبقے کو محض وقتی طور پر انگریزی حکومت سے مفاہمت سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کشی اور کانگریس سے مغایرت اختیار کرنے کی تلقین کی تو ان پر فرقہ پرستی اور علیحدگی پسندی جیسے سنگین الزامات کیوں کر عاید کیے جا سکتے ہیں؟ کوئی بھی قومی رہنما یا مصلح اگر خالص قومی مفاد اور ضرورت کے تحت کسی فرقے یا طبقے کی عام طور پر تسلیم شدہ پسماندگی دور کرنے کی کوشش کرتا ہے، چاہے وہ فرقہ یا طبقہ اس کا ہم مذہب ہی کیوں نہ ہو تو اس کی کوششوں کو خالص قوم پرستانہ، جمہوری اور سوشلسٹک اور اس لحاظ سے قابلِ تحسین و ستائش قرار دینا چاہیئے، چاہے وہ قومی رہنما اور مصلح مہاتما گاندھی ہوں یا سرسید، راجہ رام موہن رائے ہوں یا ڈاکٹر امبیڈکر۔ دور ساز قومی شخصیتوں اور ان کے کارناموں کو آنکنے کا سماجی پیمانہ ہر قسم کے تعصبات سے پاک ہونا چاہیئے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ سرسید نے جس کانگریس سے بے اعتنائی برتی وہ ۱۹۲۰ء کے بعد صحیح معنوں میں ایک عوامی اور سیکولر تحریک بن کر ابھرنے اور مکمل آزادیٔ ہند کا نعرہ بلند کرنے والی مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی جوہر، جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی کانگریس نہیں تھی۔ بلکہ ۱۸۸۵ء–۱۸۹۸ء کے درمیان کی وہ نوزائیدہ کانگریس تھی جس کی پیدائش مشکوک خدوخال غیر واضح اور مقاصد مبہم تھے۔ کانگریس کے بانی اور اس کے اصلی قائد اور روح رواں اے او ہیوم (ایک ریٹائرڈ انگریز سول سرونٹ) نے کانگریس کو ایک سیفٹی والو (Safety Valve) کے طور پر متصور کیا تھا جو آئندہ چوتھائی صدی میں برطانوی نظام کے خلاف ہندوستانیوں کے دلوں میں پک کر تیار ہونے والے انقلاب اور آزادی کے لاوے کو آسانی اور خاموشی سے خارج کر دے اور برطانوی نظام کو تہس نہس ہونے سے بچا لے۔ کانگریس کے قیام کی غرض و غایت ہیوم کے اپنے الفاظ (ترجمہ: مضمون نگار) میں پڑھیے:-

"اس سے پہلے کہ وہ ناعاقبت اندیش اور فتنہ انگیز بازاری لیڈر نمودار ہوں جو کہ آئندہ چوتھائی صدی میں یقیناً نمودار ہونے والے ہیں (ہندوستانیوں کے) اس عظیم نچلے متوسط طبقے کو پکڑ کر اور بڑی احتیاط کے ساتھ ان کو ایک ہلکے اور بے ضرر قسم کے سیاسی بخار کا ٹیکہ لگا کر ہم اس آئندہ پھوٹ پڑنے والی پُر تشدد اور وبائی سیاسی ابتری کی غارت گری کے خلاف جو کہ دوسری صورت میں ناگزیر ہو گی ایک واحد اور قابل اعتماد احتیاطی تدبیر اختیار کر رہے ہیں۔"[۵]

"مغربی تعلیم اور خیالات و نظریات نے ایسے دماغ

کا بند کھول دیا ہے جن کو اگر صحیح سمت نہ دی گئی
اور کنٹرول نہ کیا گیا۔ تو دیر یا سویر ان سے ایسے
نتائج برآمد ہوں گے جن کی ہلاکت آفرینیوں کا تصور
بھی محال ہے اور محض انہیں دھاروں کو، جب
تک کہ مہلت حاصل ہے، محدود کرنے، کنٹرول
کرنے اور محفوظ سمتوں میں موڑنے کی غرض سے
ہی اس کانگریس کی تشکیل کی گئی ہے"۔ ۶

اس طرح یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کی پیدائش مشکوک تھی اور اس کا قیام تحریک آزادی ہند کے بطور نہیں بلکہ اس کے اسقاط یا کم از کم اسے چوتھائی صدی موخر کرنے کی غرض سے عمل میں آیا تھا۔ لالہ لاجپت رائے کی بھی اس ابتدائی دور کی کانگریس کے متعلق ایسی ہی رائے تھی۔ ان کا خیال تھا کہ "چونکہ کانگریس کے بانی اور قاید اے۔ او۔ ہیوم تھے جن کی اولین وفاداری ناگزیر طور پر برطانیہ کے ساتھ تھی، اس لیے کانگریس کا مقصد ہندوستان کی آزادی ہو ہی نہیں سکتا تھا"۔ ۷

بہت سے سیاسی مبصرین کی رائے ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس ۱۹۱۷ء کے بعد ہی انڈین نیشنل موومنٹ (قومی تحریک ہند) بن پائی جب کہ اس پر کانگریس کے "انتہا پسندوں" کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۹۱۷-۱۸۸۵ء کے دور میں تو وہ لارڈ میکالے کے تعلیمی نظام کے پروردہ اور برطانوی طرز فکر و زندگی کے دلدادہ، اعلیٰ طبقے کے خوش باش خوش پوش اور عوام سے کٹے ہوئے لوگوں کا زیادہ سے زیادہ ایک سیاسی کلب تھی۔ جس کے غالب ممبروں (سریندر ناتھ بنرجی، ڈبلیو۔ سی۔ بونرجی، دادا بھائی نوروجی، فیروز شاہ مہتہ وغیرہ) کی مستقل یہ خواہش اور کوشش تھی (طوالت کے ڈر سے متعلقہ اقتباسات سے گریز کیا جا رہا ہے) کہ:-

۱۔ برطانوی تخت و تاج سے ان کی غلامانہ وفاداری کے پیہم اظہار کو اُن کے مسلسل اصرار پر قبولیت کا سرٹیفکیٹ اور پھر اس کا صلہ مل جائے۔

۲۔ ہندوستان کا مملکت برطانیہ میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے انضمام ہو جائے، سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہندوستان کی کونسل کو توڑ دیا جائے اور کانگریس کو 'برٹش پارلیمنٹ برائے ہندوستان' کا درجہ حاصل ہو جائے۔

۳۔ لیجسلیٹیو کونسلوں میں منتخب ہندوستانیوں کو بھی نمائندگی دی جائے اور برطانوی سیاسی اداروں کو ہندوستان میں بھی قایم کیا جائے۔

۴۔ انڈین سول سروس کے لیے مقابلے کا امتحان انگلستان کے ساتھ ہی ہندوستان میں بھی لیا جائے۔

۵۔ اسلحہ ایکٹ میں سدھار کر کے ہندوستانیوں کو بھی اسلحہ رکھنے کا حق دیا جائے وغیرہ۔

کانگریس کے قیام (۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء) کے وقت ہی بمبئی میں منعقد اس کے پہلے اجلاس میں اس کے صدر ڈبلیو۔ سی بونرجی نے اپنے صدارتی خطبے میں کانگریس کو 'نیشنل اسمبلی آف انڈیا' قرار دیا اور تقریر کا خاتمہ اس بات پر زور دے کر کیا کہ: (ترجمہ مضمون نگار)

"کانگریسی ہندوستان میں برطانوی حکومت کو
دائمی بنانے کے آرزومند ہیں اور ان کا منتہائے
مقصود صرف انتظام حکومت میں شرکت حاصل کرنا
ہے اور وہ یہ حلف لیتے ہیں کہ یہ مقصد وہ خالص
دستوری طریقوں سے حاصل کریں گے"۔ ۵

اسی طرح ۲۸ دسمبر ۱۸۹۸ء کو (یعنی سر سید کی وفات کے چند مہینوں بعد) مدراس میں منعقد کانگریس کے چودھویں سالانہ اجلاس میں اس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر سبا راؤ پنٹولو نے ۱۸۵۷ء کے غدر کی یاد دلاتے ہوئے ناگواری کے ساتھ کہا (ترجمہ مضمون نگار):-

آج ہندوستانی رہنماؤں میں چیدہ اور بہترین،
اپنے اپنے پیشوں میں کمال یافتہ اور اپنے ہم وطنوں

میں عزت یافتہ، سال بہ سال ملتے ہیں۔ اسی حکومت
کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے جس کو ۱۸۵۷ء
میں جاہل اور گمراہ عوام نے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش
کی تھی۔" ۱۰

اور یہ یقین دلایا کہ؛

"جب تک کانگریس زندہ ہے، ۱۸۵۷ کے واقعات
دوبارہ رونما نہیں ہوں گے۔" ۱۱

کانگریس مکمل آزادی ہندوستان کا نعرہ بلند کرنا تو کجا سوراج (ہوم رول) کی بات بھی زبان پر لاتے ڈرتی تھی) (دادا بھائی نوروجی سوراج کو 'ضبط نفس' سے زیادہ کا مفہوم دینے کو تیار نہیں تھے) سوراج کی مانگ تو ۱۹۰۶ء میں کانگریس کے کلکتہ سیشن میں بعید محتاط لفظوں میں پیش کی گئی۔ اور مکمل آزادیٔ ہندوستان کی مانگ کی تجویز تو پہلی بار کانگریس کے دسمبر ۱۹۲۱ء کے احمد آباد سیشن میں گلستان سر سیّد کے ہی ایک پھول مولانا حسرت موہانی نے پیش کی تھی مگر مصلحتیں آڑے آئیں اور تجویز مسترد کر دی گئی۔

اس طرح یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ سر سید نے ۱۸۸۵ء ۱۸۹۸ء کی تیرہ سالہ مدت میں جس کانگریس کو دیکھا وہ ایسی دلکش ہرگز نہیں تھی کہ آدمی کا دل بے اختیار اسے اپنانے کو چاہے۔ اس لیے کانگریس میں ان کی عدم شمولیت کا اتنا ملال نہیں ہونا چاہیے۔ رہی حکومت وقت کے تئیں وفاداری تو اس میں کانگریس اور سر سید کے رویوں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ کانگریس سیاسی حربہ استعمال کر کے سیاسی فائدے اٹھانا چاہتی تھی، جب کہ سر سیّد نے اپنے لیے تعلیم کا میدان چن لیا تھا۔

ایک اور وجہ کانگریس سے سر سیّد کی مغایرت کی یہ تھی کہ کانگریس پر بی۔ جی تلک اور لالہ لاجپت رائے جیسے انتہا پسندوں کا غلبہ بڑھتا جا رہا تھا، جن کے نیشنلزم کے بارے میں بعض مورخین اور سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ اس سے ہندو بنیاد پرستی اور احیاء پسندی نیز مسلم بیزاری اور اردو دشمنی کے جذبوں کو ہوا مل رہی تھی۔ لالہ لاجپت رائے (جو ہندو مسلم اور سکھ مشترکہ کلچر کی پیداوار تھے، جن کی ماں سکھ تھیں اور والد منشی لالہ رادھا کشن اگروال عملی طور پر اسلام کے بعید قریب اور سر سیّد کے زبردست مداح تھے) جب آریہ سماج کے زیر اثر آئے تو اپنے خیالات میں بعید کٹر اور انتہا پسند ہو گئے۔ وہ اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں (ترجمہ مضمون نگار):-

"اسلام کے لیے احترام کا جذبہ جو میرے اندر اوائل
عمری کی ٹریننگ سے پیدا ہو گیا تھا، وہ نفرت میں
بدل گیا۔" ۱۲

اور اپریل ۱۸۸۲ء میں امبالہ میں اپنی پہلی پبلک تقریر میں انھوں نے اردو کی سخت مخالفت کی اور ہندی کی زبردست وکالت کرتے ہوئے کہا کہ ہندوؤں کے سیاسی اتحاد اور استحکام کے لیے لازمی ہے کہ ہندی کو قومی زبان بنایا جائے۔ اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ اردو کی مخالفت اور ہندی کی موافقت انھوں نے اردو کے وسیلے سے کرنی شروع کی تھی کیوں کہ اس وقت تک وہ ہندی کے حروف تک سے ناآشنا تھے ۱۳

ہو سکتا ہے کہ اگر سر سیّد ۱۹۲۰ء کے بعد کے زمانے میں ہوتے اور ان کے سامنے مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی جوہر، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر امبیڈکر کی عوامی اور سیکولر کانگریس پیش کی جاتی تو وہ اور ان کے رفقاء اسے اپنا لیتے اور ان کے اور گاندھی جی کے ایک ساتھ، ایک پلیٹ فارم پر آ جانے سے ہو سکتا ہے کہ ہندوستانی برصغیر کا نقشہ ہی آج کچھ اور ہوتا۔ کیوں کہ گاندھی جی ہی کی طرح سر سیّد بھی ایک ٹھنڈے دل و دماغ اور آہنی ارادوں کے، انسانیت نواز اور دور ساز انسان تھے۔

سر سیّد کے متذکرہ بالا سیاسی موقف اور تعلیمی پالیسی کی بھرپور تائید پنڈت جواہر لال نہرو جیسے عظیم سیاسی مدبر اور قومی رہنما نے بھی کی ہے۔ اپنی آٹو بایوگرافی میں وہ رقم طراز ہیں:-

"انھوں نے اس قسم کی تعلیم کو رواج دینے کے لیے مسلمانوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں تمام تر توجہ وقف کر دی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی توجہ کسی اور طرف منعطف ہو۔ مسلمانوں کے جمود اور جھجک پر غلبہ پانے کا کام بہت مشکل تھا۔ دوسری طرف بورژوا ہندوؤں کی کوششوں سے وطن پرستی کی ایک نئی تحریک شروع ہو رہی تھی۔ اس میں مسلمانوں کی شرکت سے ان کے نزدیک ان کی توجہ اور دھیان بٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے انھوں نے اس کی مخالفت کی۔ ہندو جو مغربی تعلیم میں نصف صدی مسلمانوں سے آگے تھے، حکومت پر نکتہ چینی کا مشغلہ اختیار کر سکتے تھے، لیکن وہ اپنے تعلیمی کاموں کے لیے حکومت کا بھرپور تعاون چاہتے تھے اور اس لیے وہ جلد بازی میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتے تھے جس سے ان کے کاموں کو نقصان پہنچے ...... سر سیّد کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کر دینی چاہییں، یقیناً درست اور صحیح تھا۔ بغیر اس تعلیم کے میرا خیال ہے کہ مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی موثر حصّہ نہیں لے سکتے تھے بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہندوؤں کے مقابلے میں غیر موثر بن جائیں گے جو تعلیم میں بھی ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط تھے۔ ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں ابھی تک کوئی بورژوا طبقہ نہیں پیدا ہوا تھا، اس لیے نہ تو تاریخی حالات اس کی اجازت دیتے تھے اور نہ اُن کے خیالات میں کوئی ایسا انقلاب پیدا ہوا تھا کہ مسلمان بورژوا تحریک وطنیت میں شامل ہو جاتے۔ سر سیّد کی یہ تمام کارروائیاں جو بظاہر ہیں معتدل قسم کی معلوم ہوتی ہیں، حقیقتاً ایک قسم کا انقلاب پیدا کرنا چاہتی تھیں۔"[14]

پروفیسر خلیق احمد نظامی پنڈت نہرو کی مندرجہ بالا رائے سے اتفاق کرتے ہوئے ان کے اس خیال سے بھی متفق نظر آتے ہیں کہ:۔

"سر سید کا پیغام ...... اس وقت کے لیے مناسب حال اور ضروری تھا لیکن ایک ترقی کرنے والی جماعت کے لیے وہ آخری نصب العین نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ممکن ہے اگر وہ ایک نسل تک اور زندہ رہتے تو اپنے پیغام کو کوئی نیا رخ دیتے۔"[15]

بعض مصنفین اور سیاسی مبصرین سر سید کو علیحدگی پسند ہی نہیں بلکہ "دو قومی نظریے" کا بانی مبانی بھی قرار دیتے ہیں مثلاً کے۔ ایم۔ پانیکر اپنی کتاب "دی فاونڈیشنز آف نیو انڈیا" (The Foundations of New India) میں دو قومی نظریے اور مسلم علیحدگی پسندی کے لیے سر سیّد کو ہی ایک طرح سے ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔[16] اور عتیق صدیقی اپنی کتاب "سر سید احمد خاں — ایک سیاسی مطالعہ" میں لکھتے ہیں:

"یہ حقیقت ہے کہ سر سیّد کا ذہن فرقہ پروری کی آلودگی سے اگرچہ کبھی بھی پاک نہیں رہا، تاہم مسلمانوں کی فرقہ وارانہ سیاسی تنظیموں کے خارزار میں الجھنے سے اپنے دامن کو انھوں نے بچایا تھا۔"[17]

مزید لکھتے ہیں:۔

"یہ حقیقت ہے کہ دو قومی نظریہ (Two-Nation Theory) ــ جسے مسلم لیگ نے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں اپنا کر مطالبۂ پاکستان کی بنیاد بنایا، اس کے موجد اقبال یا جناح نہیں، سر سیّد ہی تھے۔"[18]

لیکن ان دو سنگین الزامات (سر سیّد کے ذہن کا فرقہ پروری

کی آلودگی سے کبھی بھی پاک نہ رہنا، اور ان کا دو قومی نظریے کا موجد ہونا جنہیں عتیق صدیقی "حقیقتیں" مانتے ہیں، کے سلسلے میں انھوں نے جو ثبوت پیش کیے ہیں، اس میں لفظوں کی کھینچا تانی کرکے بہت دور کی کوڑی لانے والی بات تو ضرور ہے لیکن عقل کو باور کرانے والی بات نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کسی کے بارے میں معروضی اور ایماندارانہ رائے قایم کرتے وقت کس بات کو وزن دینا چاہیے؟ اسے جو اس نے برملا اور متعدد بار کہا اور کیا ہے؟ یا اسے جس کا وجود یا واضح ثبوت خود اس کے قول و فعل میں تو نہ ملے لیکن جسے ضرورت سے زیادہ تخلیقی اذہان اپنے تخیل سے برآمد کرلیں؟

سرسید کی تقریر، تحریر اور عمل میں تو کہیں بھی فرقہ پروری یا دو قومی نظریے کی حمایت کا واضح ثبوت نہیں ملتا۔ انھوں نے کہیں یہ نہیں کہا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کا فایدہ صرف اور صرف ان کے فرقے کے لوگ ہی اٹھائیں گے اور دوسرے اس سے یکسر محروم رکھے جائیں گے۔ دنیا جانتی ہے کہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کا قیام ہے اور اس کے قیام کی غرض و غایت اس مضمون میں شامل ان کی تقریروں کے اقتباسات سے صاف اور واضح ہوجاتی ہے۔ یہ ادارہ روز اوّل ہی سے اپنے بانی کے سیکولر اور روادار مزاج اور طرزِ فکر کا ترجمان رہا ہے۔ اس کے دروازے بلا ملک و مذہب سبھی کے لیے ہمیشہ کھلے رہے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے اپنی متعدد تقریروں میں صاف اور واضح الفاظ میں کہا ہے کہ: وہ ہندوستان میں بسنے والے تمام لوگوں کو جن میں ہندو، مسلمان اور سکھ سبھی شامل ہیں، ایک قوم سمجھتے ہیں۔ پھر یہ دو قومی نظریے کا بانی، ہونے والی بات کہاں سے آگئی؟ ان کے اپنے قول و فعل میں تو فرقہ پروری یا دو قومی نظریے کی وکالت کہیں دور دور تک نظر نہیں آتی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ سے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

والی بات ہو؟

مندرجہ بالا بہتانوں کی تردید میں پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر تارا چند کی مستند رایوں پر مشتمل دو اقتباسات (ترجمہ مضمون نگار) پیش ہیں:

"وہ (سرسید احمد خاں) کسی طرح بھی ہندو مخالف یا فرقہ وارانہ بنیاد پر علیحدگی پسند نہ تھے۔ بار بار انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ مذہبی اختلافات کو سیاسی یا قومی اہمیت نہیں دینی چاہیے "کیا ایک ہی سرزمین پر تم دونوں نہیں بستے"؟ انھوں نے کہا، "یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان الفاظ صرف مذہبی پہچان کے لیے ہیں ورنہ تمام لوگ چاہے ہندو یا مسلمان، یہاں تک کہ عیسائی بھی جو کہ اس ملک میں بستے ہیں، سبھی اس لحاظ سے ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔" ۱۹

"سرسید احمد خاں ہندو مسلم سیاسی تعاون میں یقین رکھتے تھے۔ یہ کہنا حقیقت کا منہ چڑانا ہے کہ وہ دو قومی نظریے کے بانی تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے اور اس اتحاد کی راہ میں وہ مذہب یا ضمیر کے نام پر کسی رکاوٹ یا اعتراض کے قایل نہ تھے۔ کانگریس سے ان کا اختلاف محض سیاسی مصلحت اور حکمت عملی کی بنیاد پر تھا اور اس قسم کے اختلافات ہندوؤں میں بھی موجود تھے۔ مثلاً زمین داروں اور تعلیم یافتہ متوسط طبقے کے مابین"۔ ۲۰

خود سرسید نے ۳۰ جنوری ۱۸۸۴ء کو انڈین ایسوسی ایشن لاہور کے صدر دیال سنگھ کی جانب سے پیش کردہ ایک سپاس نامے کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے اپنے

کسی تصورِ قومیت کی تشریح و وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:
" لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ معنیٰ ہیں جس میں مَیں لفظ نیشن کی تعبیر کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے لائق نہیں ہے کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے۔ کیوں کہ ہم اس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن جو بات کہ ہم دیکھ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں، ایک ہی حاکم کے زیرِ حکومت ہیں۔ ہم سب کے فائدے کے مخرج ایک ہی ہیں۔ ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برابر برداشت کرتے ہیں۔ یہی مختلف وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں قوموں (یہاں سرسید 'قوم' بمعنی مذہبی فرقہ یا کمیونٹی استعمال کر رہے ہیں۔ مضمون نگار) کو جو ہندوستان میں آباد ہیں ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ 'ہندو' یعنی ہندوستان کی رہنے والی قوم۔" ۲۱

اور ۲۷ر جنوری ۱۸۸۳ء کو پٹنہ میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

" اے عزیزو! جس طرح ہندوؤں کی شریف قومیں اس ملک میں آئیں اسی طرح ہم بھی آئے ہندو اپنا ملک بھول گئے۔ اپنے دیس سے پردیسی ہونے کا زمانہ ان کو یاد نہیں رہا اور ہندوستان ہی کو انھوں نے اپنا وطن سمجھا۔ ہم نے بھی ہندوستان کو اپنا وطن سمجھا۔ پس اب ہندوستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے۔ ہندوستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں۔ مقدس گنگا جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں۔ ہندوستان کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں۔ مرنے جینے میں دونوں کا ساتھ ہے مسلمانوں نے ہندوؤں کی سیکڑوں رسمیں اختیار کرلیں۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کی سیکڑوں عادتیں لے لیں۔ پس اگر ہم اس حصّے سے جو ہم دونوں میں خدا کا حصّہ ہے (یہاں سرسید کا اشارہ مذہبی معاملات کی طرف ہے۔ مضمون نگار) قطع نظر کریں تو درحقیقت ہندوستان میں ہم دونوں باعتبار اہلِ وطن ہونے کے ایک قوم ہیں (واضح ہو کہ سرسید قومیت کی بنیاد مذہب نہیں بلکہ ملک و وطن قرار دے رہے ہیں۔ مضمون نگار) اور ہم دونوں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی و بہبود ممکن ہے (واضح ہو کہ سرسید ہندو مسلم اتحاد و تعاون کو ملک کی فلاح و بہبود کے لیے لازم قرار دیتے ہیں۔ ۔ مضمون نگار)۔ اے میرے دوستو! میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی دو خوبصورت اور رسیلی آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ آپس میں نفاق رکھیں گے تو پیاری دلہن بھینگی ہو جاوے گی۔" ۲۲

اور ۲۷ر جنوری ۱۸۸۴ء کو گورداس پور میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:۔

" اس وقت ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں (یہاں سرسید قوم کا لفظ بمعنی مذہبی فرقہ یا کمیونٹی استعمال کر رہے ہیں ۔۔۔ مضمون نگار) آباد ہیں اور اس طرح سے ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے۔ ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے ایک آب و ہوا کے شریک ہیں۔ ایک دریا یا کنویں

کا پانی پیتے ہیں۔ مرنے جینے میں ایک دوسرے
کے رنج و راحت کا شریک ہوتا ہے۔ ایک کو
دوسرے سے بغیر ملے چارہ نہیں۔ ہم کو ایک دل
ہو کر مجموعی حالت میں کوشش کرنی چاہیئے (واضح
ہو کہ سرسید یہاں ہندو مسلم اتحاد و تعاون کی
تلقین کر رہے ہیں۔ مضمون نگار)۔ اگر ایسا
ہوگا تو سنبھل جائیں گے نہیں تو ایک دوسرے کے
اثر سے دونوں قومیں (یہاں پھر سرسید قوم
کا لفظ بمعنیٰ مذہبی گروہ یا فرقہ استعمال کر رہے
ہیں — مضمون نگار) تباہ اور بگڑ جاویں گی۔
پرانی تاریخوں، پرانی کتابوں میں دیکھا اور سنا
ہوگا اور اب بھی دیکھتے ہیں کہ قوم کا اطلاق ایک
ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے (سرسید کا
جغرافیائی اور سماجیاتی تصور قومیت ملاحظہ ہو
— مضمون نگار) افغانستان کے مختلف لوگ
ایک قوم کہلاتے ہیں۔ ایران کے مختلف لوگ
ایرانی کہلاتے ہیں۔ یورپین مختلف خیال اور
مختلف مذاہب کے ہیں مگر سب ایک قوم میں شمار
ہوتے ہیں، گو اُن میں دوسرے ملک کے بھی
لوگ آکر بس جاتے ہیں، مگر وہ آپس میں مل جل
کر ایک ہی قوم کہلاتے ہیں، غرض یہ کہ قدیم سے
قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے
گو اُن میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔
(یہاں سرسید کا اشارہ مذہبی، لسانی اور
تہذیبی انفرادیتوں اور امتیازات کی طرف ہے
— مضمون نگار)۔ اے ہندوؤ اور
مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک
کے باشندے ہو؟ کیا اسی سرزمین پر تم دونوں
نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے؟
یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی
پہ مرتے اور اسی پہ جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو
اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو مسلمان
اور عیسائی بھی جو اس ملک میں رہتے ہیں اس
اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔ جب یہ سب
گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی
فائدے میں جو اُن سب کا ملک کہلاتا ہے ایک
ہونا چاہیے۔"[۴۳] (یہاں پھر سرسید قوم کا
سماجیاتی تصور پیش کرتے ہوئے ملک کے مفاد
میں سب کے اتحاد و تعاون کی تلقین کر رہے ہیں۔
— مضمون نگار)

اور اسی طرح ۳۰ر دسمبر ۱۸۷۳ء کو لاہور میں تقریر کرتے
ہوئے انہوں نے کہا:-

"میں نے اس وقت انجمن میں اپنی زبان سے کئی
دفعہ "قوم" کا لفظ بیان کیا۔ اس سے مطلب
صرف مسلمانوں ہی سے نہیں ہے۔ میری یہ رائے
ہے کہ تمام انسان بالکل شخص واحد ہیں اور میں
قوم کی خصوصیت کے واسطے مذہب اور فرقہ اور
گروہ کو نہیں پسند کرتا (سرسید کا غیر فرقہ وارانہ
اور خالص سماجیاتی تصور قومیت ملاحظہ ہو۔
— مضمون نگار) میری رائے اگر سچ ہے تو
میں کالے سے کالے رنگ کے انسان اور گورے
سے گورے رنگ کے انسان کو، وہ جو اعلیٰ سے
اعلیٰ درجہ کی تہذیب میں اپنی زندگی بسر کرتے
ہیں اور وہ جو ابھی نیچر کے جوش میں ہیں اور جنگلوں
میں اپنے دن کاٹ رہے ہیں سب کو اپنا بھائی
اور ایک قوم تصور کرتا ہوں (سرسید کا غیر نسلی،
غیر طبقاتی، بین الاقوامی اور انسانیت نوازانہ
تصور قومیت ملاحظہ ہو — مضمون نگار)۔ میری

تمام آرزو یہ ہے کہ بلا لحاظ قوم و مذہب کے تمام انسان آپس میں ایک دوسرے کی بھلائی پر متفق ہوں۔ مذہب بے شک سب کا علیحدہ علیحدہ ہے مگر اس کے لحاظ سے آپس میں کوئی دشمنی کی وجہ نہیں ہے۔" ۲۴ (مذہبی اختلافات سے بلند ہو کر انسان دوستی کے لیے اتحاد و تعاون کی تلقین ملاحظہ ہو ــــ مضمون نگار)

مختلف مواقع و مقامات پر کی گئی "سر سید" کی متعدد تقاریر سے طویل اقتباسات جو شامل مضمون ہیں، کا اگر بغور مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے تو "سر سید" کے نظریہ قومیت و قومی یک جہتی اور تعلیم سے متعلق مندرجہ ذیل اہم نکات ابھر کر سامنے آتے ہیں:۔

۱۔ "سر سید" سماجیات اور سیاسیات کے باقاعدہ طالب علم تو تھے نہیں۔ اس لیے جدید سیاسی و سماجیاتی اصطلاحات کے استعمال کے سلسلے میں پیشہ ورانہ مہارت اور احتیاط کی ان سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ انھوں نے "قوم" کی اصطلاح موقع و محل کے اعتبار سے کہیں تو "نیشن" اور کہیں "مذہبی فرقہ یا کمیونٹی" کے مفہوم میں استعمال کی ہے (آج بھی پنجاب کے اطراف میں لوگ عام بول چال میں اکثر "قوم" کو ان دونوں معنوں میں استعمال کر لیتے ہیں)۔ لیکن اس طرح نہیں استعمال کی ہے کہ ان کا منشاء سمجھنے میں کسی کو دقت ہو۔ پھر بھی اگر لوگ غلط فہمی کو راہ دینا ہی چاہیں تو کیا کیا جا سکتا ہے؟

۲۔ "سر سید" کا تصور قومیت فسطائی نہیں ہے، جہاں اقلیتی مذاہب زبانوں اور تہذیبوں کو کچل کر، آمریت کی چکی میں پیس کر، ان کی انفرادیت کو ختم کر دیا جاتا ہے اور صرف اکثریتی اور غالب مذہب، زبان اور تہذیب کو "قوم" کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ اور "ایک ملک، ایک مذہب، ایک زبان، ایک تہذیب" کا مہلک نظریہ سب پر تھوپنے کی اٹھتے بیٹھتے کوشش کی جاتی ہے۔ سر سید کا نظریہ قومیت جدید، سماجیاتی اور جمہوری ہے، جہاں ملک و سماج کے مختلف طبقوں کو اپنے اپنے مذاہب، زبانوں اور تہذیبوں پر قائم رہنے اور ان کو فروغ دینے کی مکمل آزادی اور مناسب مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ سر سید کا تصور قومیت گنگا جمنی ہے جہاں عناصر ترکیبی اپنی اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے بھی ایک اجتماعی وحدت کا نمونہ پیش کرتے ہیں اور گلدستے کے پھولوں کی طرح اپنی انفرادیت سے اجتماعیت کو فروغ دیتے ہیں اور ساتھ ہی ایک دوسرے کا رنگ و روپ بھی دوبالا کرتے ہیں۔

۳۔ "سر سید" کا نظریہ قومیت جمہوری ہونے کے ساتھ ہی سیکولر اور سوشلسٹک بھی ہے۔ وہ طبقوں اور فرقوں کے درمیان مذہب، زبان اور کلچر کی بنیاد پر کسی تفریق کے قایل نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تمام طبقوں اور فرقوں کو بلا تفریق ترقی کے یکساں مواقع ملنے چاہئیں۔ لیکن اوروں کے برخلاف ان کے یہاں "یکساں مواقع" کا تصور بھی نہایت جدید اور سوشلسٹک ہے۔ مواقع اور ذرایع کی فراہمی کے سلسلے میں وہ ریاضیاتی مساوات [Mathematical Equality] کے قایل نہیں تھے کہ ہر طبقے یا فرقے کو یکساں مواقع دیے جائیں چاہے وہ دوسروں کے مقابلے میں کتنا ہی پسماندہ یا ترقی یافتہ کیوں نہ ہو۔ وہ اس معاملے میں سماجیاتی مساوات [Sociological Equality] کے قایل تھے، یعنی کہ جو طبقہ یا فرقہ جتنا پسماندہ یا ترقی یافتہ ہو اس کو اسی کی مناسبت سے مواقع اور ذرایع مہیا کیے جائیں۔ تاکہ پسماندہ اور ترقی یافتہ طبقوں اور فرقوں کے درمیان کا سماجی فاصلہ (Social Distance) جلد سے جلد دور ہو جائے۔ مہاتما گاندھی کی ہی طرح وہ بھی یہ سمجھتے تھے کہ اگر پسماندہ اور ترقی یافتہ طبقوں اور فرقوں کو

ریاضیاتی مساوات کے نام پر بالکل برابر کے مواقع اور ذرائع
فراہم کیے گئے تو دونوں کے درمیان کا فاصلہ کبھی پُر ہو ہی
نہیں سکتا، بلکہ اور بڑھتا جائے گا۔ کیوں کہ ترقی یافتہ طبقہ
یا فرقہ اپنی بہتر پوزیشن کی وجہ سے ان مواقع اور ذرائع
کا بہتر استعمال کرکے ان سے نسبتاً زیادہ فائدہ اٹھائے گا
اور زیادہ آگے بڑھ جائے گا۔ اسی لیے گاندھی جی نے
ہریجنوں کے لیے ہر قسم کے تحفظات و مراعات کا اہتمام کیا اور
اسی لیے سرسید نے مسلمانوں کی پسماندگی دور کرنے کے لیے
خصوصی انتظام کیا۔ یعنی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا،
گو اپنے سیکولر اور جمہوری مزاج کی وجہ سے انھوں
نے اس کے دروازے روز اول ہی سے بلا تفریق ملک و
مذہب سبھی پر کھول دیے ہیں۔

۴- سرسید کا تصور قومیت فرقہ وارانہ اور طبقاتی عصبیتوں
ہی سے نہیں بلکہ نسلی عصبیتوں سے بھی پاک ہے۔ جیسا کہ
آخری اقتباس سے ظاہر ہے۔ وہ مذہب، فرقہ اور گروہ
کی بنیاد پر تفریق کو ہی ناپسند نہیں کرتے بلکہ کالے اور
گورے، مہذب اور غیر مہذب، ترقی یافتہ اور غیر ترقی
یافتہ یا ترقی پذیر میں بھی کسی تفریق کے روادار نہیں
ہیں۔ وہ سبھی انسانوں کو اپنا بھائی اور ایک قوم سمجھتے ہیں
اس طرح سرسید کا نظریہ قومیت اپنے اندر جمہوریت،
سیکولرازم، سوشلزم، ہیومنزم (Humanism)
اور بین الاقوامیت کا حسین اور گہرا عمیق امتزاج لیے
ہوئے ہے اور مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو
جیسے عظیم قومی رہنماؤں کے تصور قومیت کی پیش روی
کرتا ہے۔

۵- گاندھی جی ہی کی طرح سرسید کا بھی خیال تھا کہ صحیح
معنوں میں قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی اسی وقت
ممکن ہے، جب سماج کے مختلف طبقوں اور فرقوں کے
درمیان تعلیمی، سیاسی، سماجی اور سب سے بڑھ
کر اقتصادی سطح پر یگانگت ہو اور کسی طبقے یا فرقے کے
دل میں یہ نظر انداز کر دیے جانے یا پیچھے چھوڑ دیے جانے"
[Having been left out] کا احساس
نہ ہو۔ ان کو اپنی انفرادیتوں کے ساتھ زندہ رہنے اور
ترقی کرنے کے مناسب اور ضروری مواقع ملیں اور
قومی دولت (National wealth) کے پیدا اور
خرچ کرنے میں ان کو برابر کا موقع اور حصہ ملے۔ سرسید
کو شدید احساس تھا کہ ہندو اور مسلمان ہندوستانی قوم
کی دو ٹانگوں کی مانند ہیں۔ اس لیے قومی ترقی کی دوڑ
میں ایک ٹانگ اگر دوسری سے بہت پیچھے رہ گئی تو قوم
لڑھک جائے گی اور ملک منہ کے بل آ رہے گا۔ اسی
لیے مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی پسماندگی دور کرنے کی
تا زندگی کوشش کرکے انھوں نے جو عظیم قومی خدمت
انجام دی ہے، ملک و قوم اس کے لیے ہمیشہ ان کے
احسان مند رہیں گے۔

۶- گاندھی جی کی ہی طرح سرسید بھی تعلیم کو شخصیت کی ہمہ گیر
تعمیر کا ذریعہ اور ملک کے مسائل اور دکھوں کا مداوا
سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چوں کہ مسلمان بحیثیت ایک
طبقہ یا فرقہ زیادہ مسائل سے دوچار ہیں اس لیے ان
کو تعلیم، خاص کر جدید سائنسی اور تکنیکی تعلیم کی اوروں
سے زیادہ ضرورت ہے۔ تعلیم کے بغیر وہ قومی یک جہتی و
ترقی کے سلسلے میں اپنا جائز رول ادا نہیں کر سکتے
اس لیے سرسید نے جس ذہنی انقلاب کی بنیاد ڈالی
اس کی ابتدا تعلیم ہے ـــ اور انتہا؟ شاید حد امکان سے
پرے! اقبال کے شعر میں تصرف کرتے ہوئے کہ

ستاروں سے آگے جہاں در جہاں ہیں
بہت سے مگر امتحاں درمیاں ہیں

حواشی

۱۔ خلیق احمد نظامی؛ سیّد احمد خاں (ترجمہ اصغر عباس)۔ (پبلی کیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات و نشریات، حکومت ہند، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء) صفحہ ۱۱

۲۔ عشرت علی قریشی (مرتب)؛ سر سیّد احمد خاں؛ سیکولرازم اور ہندو مسلم اتحاد کا دیوتا۔ (مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۷۹ء) صفحہ ۸

۳۔ Encyclopaedia Britannica Vol 19, P. 627

۴ خلیق احمد نظامی؛ متذکرہ، صفحہ ۱۵۵
عتیق صدیقی؛ سر سیّد احمد خاں — ایک سیاسی مطالعہ (مکتبہ جامعہ لیمیٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء) صفحہ ۲۹۰

5 A.O. Hume's Speach: "The Indian National Congress: Its Origin, Aims and Objects" — as quoted by: Daniel Argov: Moderates and Extremists in The Indian Nationalist Movement — 1883 – 1920 (Asia Publishing House, Bombay, 1967) P. 63

6 Ibid (quoted in the Footnote)

7 Ibid

8 Ibid 'Introduction' P. x

9 Ibid P. 31

10&11 Ibid P. 80

12&13 Ibid P. 60

۱۴ خلیق احمد نظامی، متذکرہ، صفحات ۵۶-۱۵۵

۱۵ ایضاً صفحات ۵۷-۱۵۶

16 K.M. Pannikar:- The Foundations of New India (George Allen & Unwin Ltd., London, 1963) PP-55-57

۱۷۔ عتیق صدیقی، متذکرہ، صفحہ ۲۸۹

۱۸ ایضاً صفحہ ۳۰۰

19 Jawahar Lal Nehru :- Discovery Of India P.411 - The Signet Press, Calcutta,

20 Tara Chand: History Of The Freedom Movement in India (Publications Division, Ministry of Information & Broad-casting, Govt. of India, New Delhi, 1967) PP 358–59

۲۱ خلیق احمد نظامی؛ متذکرہ، صفحہ ۱۴۶

۲۲ ایضاً صفحہ ۱۵۲

۲۳ ایضاً صفحات ۱۵۳-۱۵۲

۲۴۔ عشرت علی قریشی (مرتب) متذکرہ، صفحات ۶-۵

نظام الدین ایس گوریکر

سرسیّد
ایک مفکرِ تعلیم

کسی نے سچ کہا ہے کہ اچھے دوست کی مثال ایک بجان درخت سی ہے۔ جب تک وہ سرسبز ہے اس کے سایے میں راحت ملتی ہے اور اس کے پھل سے لذت حاصل ہوتی ہے اور جب خشک ہوجاتا ہے تو اپنی لکڑی سے طرح طرح کے فائدے پہنچاتا ہے۔ یہ مثل سرسید (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء) پر بھی ہر اعتبار سے صادق آتی ہے۔

سرسیّد احمد خاں انیسویں صدی کے اوائل میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے آخری ایام بھی دیکھے اور برطانوی اقتدار کی تدریجی ترقی کے آثار بھی۔ ایسے تاریک بلکہ المناک دور میں سرسیّد کی رفاقت اور قیادت خصوصی طور پر مسلمانوں کے لیے ایک نعمت سے کم نہ تھی۔ جب تک وہ حیات رہے سرسیّد اپنے ہاتھ، پانوں اور زبان کے ساتھ جان مال اور قلم سے مسلمانانِ ہند کی بالخصوص رہنمائی کرتے رہے اور جب اللہ کو پیارے ہوگئے تو مسلمان اُن کے احسانات کو یاد کرکے ان کے اعمال اور افکار کا نہ صرف اعتراف کرنے لگے بلکہ ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے عمل پیرا ہونے کی آج بھی کوشش کر رہے ہیں۔ اگرچہ اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سرسیّد کی ہمہ جہت شخصیت متنازع فیہ رہی ہے۔ مذہبی عقائد کے لحاظ سے علمائے وقت نے انھیں کافر اور ملحد کہا تو روشن خیال گروہ نے انھیں مجتہد العصر اور امام زماں کے ناموں سے یاد کیا۔ تعلیمی افکار کے اعتبار سے دقیانوسی طبقہ نے انھیں اسلام کش اور انگریزوں کا پٹھو قرار دیا تو ماہرینِ تعلیم نے انھیں زمانہ شناس اور دور اندیش کہا اور سیاسی اعمال کی حیثیت سے ناسمجھ لوگوں نے انھیں ابن الوقت کہا تو دانشوروں نے انھیں مصلحِ قوم کا خطاب دیا۔ بہرکیف ان کی خدمات مذہبی ہوں یا تعلیمی، قومی ہوں یا سیاسی اگر انھیں مصلحتِ وقت تصور کریں اور حالاتِ حاضرہ کے پیشِ نظر ان کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ اُن کے احسانات قوم پر اس قدر ہیں کہ وہ کسی صورت میں بھی ان سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی۔

سن ستاون کی جنگ آزادی میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کا جو خون خرابہ ہوا اور دونوں قومیں جس زبوں حالی کا شکار ہوئیں اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سچ ہے کہ انگریز حاکم بن چکے تھے اور ہندوستانی محکوم۔ لیکن مسلم قوم سب سے زیادہ معتوب سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے کہ انگریزوں نے حکومت ان ہی سے چھین لی تھی۔ ایسے آڑے وقت میں سرسیّد احمد خاں نے مسیحا بن کر سب سے پہلے "اسبابِ بغاوتِ ہند" اور بعد میں "لائل محمڈنز آف انڈیا" لکھ کر بڑی خوبی کے ساتھ مسلمانانِ ہند کی صفائی پیش کی اور مسلمانوں کو بری الذمہ قرار دیا اور واضح طور پر افسرانِ حکومت کی غلط کاریوں کی نشاندہی کی اور حکومتِ برطانیہ کو غدر کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اس طرح انھوں نے ان نازک حالات میں اپنی حق گوئی، بے باکی اور

جرأت مندی کا ثبوت دے کر مسلمانوں کی زبوں حالی کا علاج تعلیم و تربیت میں بتلایا اور بقول ڈاکٹر محمد اقبالؒ

اس دور میں تعلیم ہے امراضِ ملت کی دوا

مسلم معاشرے کی اصلاح اور ترقی کے لیے سرسید نے جو منصوبے بنائے اور جو تحریک شروع کی اس میں تعلیم و تربیت کو بنیادی اہمیت دی بلکہ اپنے زمانے کے ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی خرابیوں کا واحد علاج تعلیم ہی کو قرار دیا۔ سرسید نے اس بات کی وضاحت کی کہ تعلیم انسان میں زبردست تبدیلی لاتی ہے اور انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو نکھارتی ہے۔ سرسید نے بغیر تعلیم کے انسان کی روح کو ایک کھردرے سنگِ مرمر کی چٹان کے مانند بتلایا۔ جب تک سنگ تراش اس میں ہاتھ نہیں لگاتا، اس کو تراش کر سڈول نہیں بناتا اور پالش سے آراستہ نہیں کرتا، اس وقت تک اس کے جوہر اسی میں پوشیدہ رہتے ہیں اور اس کے خوبصورت بیل بوٹے اور خوش نما رنگ روپ ظاہر نہیں ہوتے۔ یہی حال انسان کی روح کا ہے، وہ کتنا ہی نیک دل ہو جب تک اس پر عمدہ تعلیم کا اثر نہیں ہوتا، اس وقت تک اس کی ہر خوبی اور اس کا ہر کمال جو اس میں چھپے رہتے ہیں، اس کی مدد کے بغیر ظاہر نہیں ہوتیں۔ مسلمانانِ ہند کی جہالت اور تعصب کو دور کرنے کے لیے تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے سرسید نے فرمایا:

" میں اپنی قوم میں بھی ہزاروں خوبیاں دیکھتا ہوں پر ناشائستہ، ان میں جرأت مندی اور بے باکی پاتا ہوں پر خوفناک، اُن میں قومی استقلال دیکھتا ہوں پر بے ڈھنگا، ان میں صبر و قناعت بھی ہے پر بے موقع، پس میرا دل جلتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی ان کی عمدہ صفتیں عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جائیں تو دین اور دنیا دونوں کے لیے کیسی کچھ مفید ہوں[2]

سرسید نے زندگی کو کامیاب بنانے اور صحیح تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لیے اس بات کو بار بار دہرایا کہ انسان یہ فیصلہ کرلے کہ اس کو کیا بننا ہے اور کیا کرنا ہے۔ اگر وہ بخوبی تصفیہ کرتا ہے اور اپنے تصفیے میں غلطی نہیں کرتا تو اس میں عزم جزم پیدا ہوتا ہے اور اس کو کامیابی ضرور حاصل ہوتی ہے۔ کامیابی کی جڑ اس فیصلے میں مضمر ہوتی ہے کہ میں کیا بنوں گا اور میں کیا کروں گا۔

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کے لیے سرسید کے خیال میں یہ بھی ضروری ہے کہ ان کو جدید علوم و فنون کی فائدہ مند تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم سے بھی آراستہ کریں اور مذہبی تعلیم کے لیے ذی علم اور ذی فہم اصحاب یکجا جمع ہوں اور بحث و مباحثے کے بعد وہ ایسا نصاب مرتب کریں جو بلحاظ حالات زمانہ اور بنظر علوم و فنون جدیدہ مطابقت رکھتا ہو اور جو پرانی اور دقیانوسی تعلیم سے مختلف یعنی ترمیم شدہ ہو، ضروریات وقت کے موافق ہو اور جو مذہبی مقاصد کو بھی پورا کرتا ہو[3]

سرسید مزید فرماتے ہیں کہ مذہبی تعلیم کا اہتمام حکومت سے کروانا اور خود کچھ نہ کرنا بے حسی اور بے غیرتی کی بات ہے اپنی مذہبی تعلیم کا ہمیں خود انتظام کرنا چاہیے۔ کیوں کہ مسلمان مذہبی تعلیم کو اپنی تعلیم کا لازمی حصّہ قرار دیتے ہیں۔ پس ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم اپنے ہاتھ میں لیں تاکہ وہ اپنے بچوں کو دونوں طرح کی تعلیم خاطر خواہ دلا سکیں[4]

سرسید کے خیال میں نہ صرف تعلیمی ترقی کی خاطر بلکہ سیاسی، معاشرتی اور مذہبی اعتبار سے بھی انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اہالیانِ ہند میں برادرانِ وطن نے اس ضرورت کو محسوس کرلیا اور انگریزی تعلیم حاصل کرکے بہرہ مند ہو رہے ہیں۔ لیکن مسلمان انگریزی سے متنفر نظر آتے ہیں اور ان کی یہ نفرت ان کی ترقی کے راستے میں مزاحمت بن گئی ہے۔ سرسید نے انگریزی تعلیم کی اشاعت کی

خاطر اور اسے اپنانے کے لیے یہ استدلال پیش کیا کہ حکمراں قوم کی زبان سیکھنے میں ہی ترقی ہوتی ہے۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانے میں عربی زبان کا رواج تھا، ہندوؤں کے عہد میں سنسکرت برابر رائج تھی اور مسلمانوں کے دورِ حکومت میں فارسی کا دور دورہ تھا اور اب ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت ہے اس لیے انگریزی زبان ترقی پر ہے لیکن مسلمانوں نے انگریزی زبان کے حاصل کرنے میں کوتاہی کی ہے جو ان کی بڑی غلطی ہے۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ مسلمان انگریزی زبان سے اس لیے نفرت کرتے ہیں کہ اُن کا بڑا گروہ خصوصاً علمائے وقت انگریزی کی تعلیم کو اسلام کے منافی تصور کرتا ہے۔ سرسیّد نے اس خیال کی تردید میں کہا کہ اکثر ثقہ لوگ انگریزی پڑھے لکھے طبقے کو بدعقیدہ یا دہریہ کہتے ہیں۔ یہ خام خیالی ہے مگر میں ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جو انگریزی مطلق نہیں جانتے لیکن بدعقیدہ ہیں سرسیّد نے مزید کہا کہ جو علمائے اسلام یہ کہتے ہیں کہ انگریزی کی تعلیم اور علومِ جدیدہ میں ترقی کرنے میں مسلمانوں کے ایمان میں خلل ہوتا ہے ان کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام میں اور دنیاوی عزت میں کوئی تناقص نہیں ہے۔

سرسیّد کے مطابق مدارس میں مغربی علوم کو دیسی زبان میں تعلیم دینا مناسب ہے۔ یہاں دیسی زبان سے مراد اردو زبان ہے لیکن اعلیٰ تعلیم کا ہندوستانی زبان کے ذریعے اہتمام کرنا خالی از فائدہ ہے۔ لہٰذا اعلیٰ تعلیم کو صرف انگریزی میں دینا فائدہ مند ثابت ہوگا۔ اسی نظریے کے پیشِ نظر جب حکومت نے کلکتہ یونیورسٹی کو ختم کرکے اردو یونیورسٹی قائم کرنی چاہی تو انھوں نے فوراً کنارہ کشی اختیار کرلی کیوں کہ اُن کے خیال میں اس اقدام سے مسلمان انگریزی زبان سے محروم ہوجائیں گے اور یہ محرومی اعلیٰ تعلیم اور علمی ترقی کے لیے نقصان رساں ہوگی۔

سرسیّد کی تعلیم سے دلچسپی اگرچہ ۱۸۵۰ء کے بعد سے شروع ہوئی لیکن ان کے افکار و خیالات آہستہ آہستہ پروان چڑھنے لگے اور برسوں کے بعد ان کے تعلیمی افکار نے تعلیمی تحریک کی شکل اختیار کرلی۔

سرسیّد نے تعلیمی تحریک کا آغاز عملی طور پر ۱۸۵۹ء میں ایک فارسی ذریعۂ تعلیم مدرسے سے کیا اور یہ فارسی مدرسہ تحصیلی اسکول کے قائم ہوتے ہی اس کا حصّہ بنایا گیا۔ غازی پور کے اس مدرسے میں اردو فارسی عربی کے ساتھ سنسکرت کی تعلیم کا بھی اہتمام تھا۔ یہ آج بھی وکٹوریہ اسکول کے نام سے جاری ہے اور تعلیم کی اہمیت اور افادیت پر ایک مختصر کتابچہ تصنیف کیا اور اس میں حکومت کے قائم کیے ہوئے مشرقی زبانوں کے مدرسوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ یہ مدرسے وقت کی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہیں اور یہ رائے دی کہ حکومت اِن اسکولوں کا ذریعۂ تعلیم انگریزی کردے۔ تاکہ ہندوستانی بچّے اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھاسکیں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ بچّے کی ذہنی تربیت اور ترقی کے لیے مادری زبان زیادہ مفید ہوتی ہے۔

سرسیّد نے خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کرنے کی خاطر ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں عوام کے تعاون اور چندے سے ایک مدرسہ قائم کیا اور پُرزور اپیل کی کہ اہلِ ہند تعلیم کا اہتمام خود کریں تاکہ وہ احساسِ کمتری کا شکار نہ ہوجائیں۔

سائنٹفک سوسائٹی کا قیام غازی پور میں ۱۸۶۳ء میں عمل میں آیا جو سرسیّد کی تعلیمی تحریک کا دوسرا سنگِ میل ہے اور غازی پور سے علی گڑھ میں تبادلہ ہوتے ہی انھوں نے اس سوسائٹی کی عمارت کا سنگِ بنیاد ۱۸۶۴ء میں علی گڑھ میں رکھا اور اس عمارت میں اب طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جاری ہے اور اس طرح یہ عمارت آج بھی امراضِ انسانی کی دوا کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ اس سوسائٹی کے بنیادی مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ادبی اور علمی کتب و رسائل انگریزی زبان سے اردو میں ترجمہ کرواکر ہندوستانیوں میں نہ صرف انگریزی ادب اور مغربی علوم کا مذاق پیدا کیا جائے بلکہ علمی اور ادبی مضامین پر تقاریر کا اہتمام بھی کیا جائے اور ساتھ ہی ایک

اخبار کے ذریعے عوام کو حالاتِ حاضرہ سے آگاہ کیا جائے۔ یہ اخبار اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہو اور اس کے ممبر ہندو، مسلمان اور انگریز تینوں ہوں تاکہ باہمی قومی مغایرت اور مذہبی تعصب آہستہ آہستہ کم ہو جائے۔ اس ہفتہ وار اخبار کا نام علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ رکھا گیا جو ۱۸۶۶ء میں جاری ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد یہ اخبار سہ روزہ ہو گیا۔ اس اخبار کا ایک کالم اردو میں اور ایک کالم انگریزی میں ہوا کرتا تھا۔ سرسید کی تعلیمی تحریک کے بڑھاوے میں اس اخبار کی اہمیت اور افادیت سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سائنٹفک سوسائٹی کے مقاصد میں یہ بھی شامل تھا کہ ہندوستان میں کاشتکاری کے مروجہ طریقوں میں تبدیلی لائی جائے تاکہ ایک طرف کاشتکار اور صنعت کار کی معاشی حالت بہتر ہو تو دوسری طرف حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہو۔ اور اسی کے پیشِ نظر مغرب کے ٹیکنیکل علوم کو اردو میں منتقل کیا گیا اور بالخصوص رابرٹ اور ٹینیسن کی میکانیکس کی کتابوں کو اردو کا جامہ پہنا دیا اور ہندوستانیوں کو یورپ کے زراعتی اور صنعتی کلوں اور ہتھیاروں کو سمجھنے اور ان کے استعمال کرنے کی تعلیم کا اہتمام ان ترجموں کے ذریعے سے کیا گیا اور ایک کتاب بنام "قدیم نظام دیہی ہندوستان میں" سرسید نے تالیف کی۔ اس کا ایک نسخہ آج بھی انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔

سرسید نے تعلیمی تحریک کے سلسلے میں وائسرائے ہند کو ایک یادداشت ۱۸۶۷ء میں پیش کی۔ اس میں ذیل کی باتیں درج تھیں جو وقت کی پکار کے مترادف تھیں۔

۱۔ مختلف علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم کا دیسی زبانوں میں خاطر خواہ اہتمام کیا جائے۔
۲۔ امتحانات کا ذریعہ انگریزی کے ساتھ ساتھ دیسی زبانوں میں بھی تسلیم کیا جائے۔
۳۔ مختلف فیکلٹیوں میں جس طرح کامیاب طالب علموں کو سندات دی جاتی ہیں اسی طرح اردو ذریعۂ امتحانات میں شریک ہونے والے کامیاب طلبہ کو بھی دی جائیں۔
۴۔ کلکتہ یونیورسٹی میں ایک اردو شعبے کا انتظام کیا جائے۔
۵۔ شمالی یا مغربی ہند کی کسی ایک یونیورسٹی کو اردو یونیورسٹی بنایا جائے۔

اس یادداشت کے پیشِ نظر جب حکومت نے کلکتہ یونیورسٹی کو ختم کر کے اردو یونیورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو سرسید نے نہ صرف کنارہ کشی اختیار کر لی بلکہ اس فیصلے کی سخت مخالفت کی۔ حالات کا جائزہ لینے کے بعد حکومت کو اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنا پڑی۔

ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب نے ۱۸۶۸ء میں سرکارِ پنجاب کو ایک میمورنڈم ارسال کیا جس میں یہ سفارش کی کہ حکومت لاہور میں اردو یونیورسٹی اور دہلی میں دائرالترجمہ قائم کرے اور اگر دونوں صوبوں کے لیے ایک اردو یونیورسٹی قائم کرنا ہے تو اس کا مقام دہلی ہو۔

سرسید نے اعلیٰ پیمانے پر جدید قسم کی درس گاہیں اور تعلیمی ادارے قائم کرنے کے لیے انگلستان کے سفر کو ضروری سمجھا تاکہ وہاں کی طرزِ تعلیم سے وہ واقفیت حاصل کریں اور اس کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے درس گاہوں کا منصوبہ بنا سکیں۔ آخرکار انھوں نے انگلستان کے سفر کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اگرچہ ان کی مالی حیثیت اس کی اجازت نہیں دیتی تھی تاہم محسن الملک نواب سید مہدی علی کے الفاظ میں:

> "جب سید احمد خاں لندن جانے کو تھے تو مالی مشکلات اس قسم کی تھیں کہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس ارادے کو پورا نہ کر سکتا تھا۔ انھوں نے اپنے کتب خانے کو بیچا، گھر اور کوٹھی کو رہن رکھا اور سفر کی تیاری کی۔ انھوں نے بارہا مجھ سے اس بارے میں پیشتر ذکر کیا تھا کہ میرا مقصود پورا نہیں ہو سکتا جب تک میں بذاتِ خود اس

اصول وطرزِ تعلیم سے واقفیت حاصل نہ کرلوں"۔

الغرض یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو وہ بنارس سے لندن کے لیے روانہ ہوگئے اور انھوں نے تمام حالاتِ سفر کو ایک سفرنامے کی صورت میں تحریر کیا جو تہذیب الاخلاق میں باقاعدہ شائع ہوتا رہا۔ سرسیّد نے انگلستان کے طرزِ تعلیم کو دیکھا، کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کا خود جاکر معائنہ کیا اور وہاں کے ماہرینِ تعلیم سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد ایک تعلیمی منصوبہ بنایا جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے کارآمد اور مفید ثابت ہوا۔ دوسرے لفظوں میں ایک کالج قایم کرنے کے لیے سرسیّد نے ایک اسکیم تیار کی اور یہ اسکیم صوبائی اور مرکزی حکومتوں کو ارسال کی جو حکومت ہند نے بخوشی منظور کرلی اور اینگلو اورینٹل کالج قایم کرنے کا فیصلہ کرلیا اور مسلمانوں کے آرا کے پیشِ نظر علی گڑھ کو مجوزہ کالج کے لیے انتخاب کیا گیا۔ ایک کمیٹی خواستگار ترقیٔ تعلیم مسلمانانِ ہند نے دسمبر ۱۸۷۳ء میں ابتدائی مدرسے کے قیام کی تجویز پاس کی اور ۱۸۷۵ء میں مخالفت کے باوجود اس مدرسے کا افتتاح ہوا اور باقاعدہ تعلیم شروع ہوگئی۔ [۸]

سرسیّد نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد علی گڑھ میں سکونت اختیار کرلی اور اپنی انتھک مساعی، اپنے فرصت کے اوقات اور اپنی تمام صلاحیتیں کالج کے قیام کے لیے وقف کردیں اور ۱۸۷۷ء میں وائسرے ہند نے اس کالج کا سنگِ بنیاد رکھا جس کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور اردو میں مدرسۃ العلوم تجویز کیا گیا۔ [۹]

سرسیّد کی خواہش کے مطابق مسلمانوں نے متفقہ طور پر کالج کو یونیورسٹی کا روپ دینا منظور کیا۔ اس تعلیمی ادارے کی بنیاد چھ نکات پر رکھی گئی جن میں سے درج ذیل اہم ہیں:

اس یونیورسٹی کا نظم و نسق مکمل طور پر حکومت کے دخل سے آزاد رہے گا۔

۲- یہ یونیورسٹی خود کفیل ہوگی اور کسی خارجی امداد کو قبول نہیں کرے گی۔ نیز اپنی سالانہ آمدنی خود پیدا کرے گی۔

۳- اس یونیورسٹی کی اقامتی زندگی اور اس کے ضابطوں کی پابندی اتنی ہی لازمی ہوگی جتنی حصولِ تعلیم ضروری اور لابدی ہوگی۔

سرسیّد نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے جنوری ۱۸۷۷ء کے شمارے میں یہ تحریر فرمایا کہ اس کالج کی بنیاد ایسے اسلوب پر رکھی گئی ہے جو ماضی میں اس ملک کو پہلے کبھی دیکھنے کے لیے نصیب نہیں ہوئی۔ یہ کالج بے تعصبی اور ترقی کے اصول پر مبنی ہے جس کی نظیر مشرق کی تاریخ میں ہنوز نہیں پائی جاتی ہے۔

سرسید کی رائے میں یہ کالج جدید وقدیم خیالات کا سنگم بنے اور مشرق ومغرب کے درمیان پل کا کام دے۔ دوسرے مشرقی علوم کے احیاء کے ساتھ مذہبی تعلیم کی اشاعت کا اہتمام کرے اور تیسرے آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے نمونے پر یہ کالج خصوصی توجہ دے اور ان میں نمایاں فرق صرف یہ ہو کہ جہاں انگریزی یونیورسٹیوں میں عیسائیت کی تعلیم دی جاتی ہے وہاں اس کالج میں اسلامیات کی تعلیم دی جائے۔ آج یہ کالج مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) کے نام سے موسوم ہے اور یہ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ایشیا میں اپنی نوعیت کا سب سے بڑا تعلیمی اور ثقافتی مسلم ادارہ تصور کیا جاتا ہے۔

مدرسۃ العلوم کے قیام کے بعد سرسیّد نے ایک کل ہند تعلیمی ادارے کے قیام کی ضرورت محسوس کی اور ۱۸۸۶ء میں انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی جو بعد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے موسوم ہوگئی۔ اس کے مقاصد میں مسلمانانِ ہند کے عمل میں اتحاد اور ارادوں میں ہم آہنگی پیدا ہو اور اپنی قومی تعلیم، معاشرتی ترقی اور اقتصادی استحکام کے بارے میں جمع ہوکر تبادلۂ خیال کرسکیں۔ آج یہ کانفرنس مسلمانوں کی علمی اور تعلیمی بلکہ درپردہ تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا

محور بن گئی ہے اور سرسیّد کی وفات حسرت آیات کے بعد بھی یہ کانفرنس روز بروز ترقی کر رہی ہے اور اُن کی تحریک کی صدائے بازگشت کے طور پر ہندوستان کے مختلف مقامات پر مسلم ادارے قائم ہوئے جن میں انجمن اسلام بمبئی (۱۸۷۵ء)، انجمن حمایت اسلام لاہور (۱۸۸۵ء)، انجمن اسلام ہجیرہ (۱۹۰۷ء) اور اسی قبیل کے دیگر تعلیمی ادارے قابل ذکر ہیں۔

اس ضمن میں ایک اور امر کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان سے واپسی کے بعد سرسیّد نے تہذیب الاخلاق نامی رسالے کا اجرا کیا جو انگلستان کے "ٹیٹلر" "اسپیکٹیٹر" اور گارجین نامی رسالوں کے طرز پر تھا۔ تہذیب الاخلاق ابن خازن کی کتاب کا نام ہے جو سرسیّد کو بہت پسند آئی۔ اس رسالے نے جہاں معاشرتی، اصلاحی اور لسانی حیثیت سے زبردست کام کیا ہے وہاں سرسیّد کے تعلیمی افکار اور اعمال کی اشاعت میں بھی معقول رول ادا کیا ہے۔

تہذیب الاخلاق تین ادوار میں نکلا۔ پہلا شمارہ ۱۸۷۰ء میں شایع ہوا اور ۱۸۷۶ء تک نکلتا رہا۔ بعد میں تین سال اور تیسرے دور میں بھی تین سال تک برابر جاری رہا اور آج بھی کوئی پانچ سال سے برابر نکل رہا ہے جس کے لیے سابق وائس چانسلر سید حامد صاحب قابل مبارکباد ہیں۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ سرسیّد احمد خاں نے اگرچہ اپنا تن من دھن سب کچھ مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا تھا مگر مسلم قوم نے ان کے احسانات کو فراموش ہی نہیں کیا بلکہ ان پر ذہن کما الزام لگایا جو ان کی موت کا سبب بنا؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

حواشی

۱ ماہنامہ الحق : جولائی ۱۹۸۴ء (اکوڑہ خٹک۔ ضلع پشاور۔ پاکستان) ص ۵۔

۲ سرسید کے آخری مضامین مرتبہ امام الدین د احمد مخدومی ص ۲۳

۳ مقالات سرسیّد (پنجم) مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی ص ۱۴۷

۴ سرسیّد کے مضامین تہذیب الاخلاق۔ ص ۱۴۸

۵ سفرنامۂ پنجاب (تقریر امرتسر)۔ جنوری ۱۸۸۴ء

۶ سرسیّد کے آخری مضامین ص ۲۶

۷ ایضاً۔ ص ۲۰

۸ خطوط سرسیّد (مکتوب بنام محمد حسین آزاد) ص ۲۲

۹ حیات جاوید از الطاف حسین حالی ص ۲۴۰

۱۰ ایضاً ص ۲۴۵۔

"کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں کہ وہ اپنی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کو کھو دے۔"

سر سیّد

اصغر عباس

آثار الصنادید — ایک جائزہ

جس کتاب نے سرسیدؔ کو شہرت دیارِ فرنگ کے علمی حلقوں میں پہنچا دی وہ ان کی مشہور کتاب آثار الصنادید ہے۔ سرسید پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے آثارِ قدیمہ کے موضوع پر اردو میں کتاب لکھی اور شایع کی۔ حالیؔ نے اس کتاب کو سرسید کی آئندہ ترقیات کی پہلی سیڑھی بتایا ہے۔ غالب نے اس کتاب پر تقریظ تو لکھی ہے ویسے بھی وہ اس کتاب کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ سید رجب علی ارسطو جاہ میر منشی گورنمنٹ پنجاب کو وہ ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں:

"آج کل دوستوں میں سے ایک دوست نے ایک کتاب دہلی کی نئی اور پرانی عمارتوں کے حال میں نقشوں کے ساتھ لکھی ہے۔ گویا ایک چمن سجایا ہے۔ علاوہ ازیں چوتھے باب میں جو کتاب کا آخری حصہ ہے اس شہر کے شاعروں کے اشعار رقم کیے ہیں۔ کیوں کہ یہ نسخہ جامعیت کے سبب سے مجھے پسند آیا۔ ایک نسخہ چھپا ہوا جو تین جلدوں پر مشتمل ہے مطبع سے خرید کر بطور ارمغان بھیج رہا ہوں۔"

آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن ۱۲ر ستمبر ۱۸۴۶ء کو مکمل ہوا اور مطبع سید الاخبار سے باہتمام سید عبدالغفور ۱۸۴۷ء میں شایع ہوا۔ یہ کتاب چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے نام کے بارے میں سرسید لکھتے ہیں:

"اس مناسبت سے کہ صنادید روزگار کے آثار اور اعیان مملکت ہند کے احوال و اطوار پر مشتمل ہے۔ آثار الصنادید نام رکھا اور چار باب پر مرتب کیا۔"

ابتدا میں نواب ضیاء الدین نیر درخشاں کی فارسی میں منظوم تقریظ ہے۔ اس کے بعد کتاب کا دیباچہ ہے جس کے آخر میں سرسید دعا کرتے ہیں:

"نخلبند جہاں اور چمن آرائے کن فکاں سے امید یہ ہے کہ اس گلشن جنت نظیر کو آبیاری ابر رحمت سے ایسا سرسبز کرے کہ ہر ورق اس کا برگ طوبیٰ کا ہمسر ہو اور ہر سطر اس کی سنبل فردوس کے برابر نہ شقایق اس کے مضامین رنگین کا مقابلہ کر سکے اور نہ نسرین اس کی شگفتگی عبارت کے برابر ہو سکے مطالعہ اس کا ارباب شوق کو مفید ہو اور سیر اس کی بہتر از ہنگامۂ نوروز و عید۔ غالباً دعائے نیم شبی اور نالۂ سحری کارگر ہوا کہ جب نظر تامل سے اس مجموعہ کو دیکھا تو جیسا دل چاہتا تھا اس سے زیادہ پایا۔"

دیباچے کے بعد سر طامس تیافلس مٹکف صاحب بہادر کلاں دہلی کی تعریف میں سرسید کی فارسی مثنوی ہے۔ اس کے بعد پہلا باب دہلی شہر کے باہر کی عمارتوں کے حال میں ہے جو دو سو اڑتیس صفحات کو محیط ہے۔ اس میں بیرون شہر کی ایک سو تیس عمارتوں

کا حال رقم کیا گیا ہے۔ اسی باب میں قلعہ تغلق آباد کے بارے میں سرسید لکھتے ہیں:۔

"یہ قلعہ غیاث الدین تغلق شاہ بیٹے ملک تغلق نے جو غیاث الدین بلبن کے غلاموں میں سے تھا، بنایا ہے۔ اس قلعہ کی تیاری ۷۲۱ھ میں شروع ہوئی اور بہت جلد تیار ہو گیا۔ کسی زمانے میں یہ قلعہ بہت نفیس و لطیف ہوگا، لیکن اب بالکل خراب اور ویران ہے۔ اکثر جگہ سے فصیل قلعہ کی قایم ہے مگر اندر کے مکان بالکل ٹوٹ گئے ہیں کہ نام و نشان تک نہیں رہا۔ بجز گڈھوں اور پتھروں کے ڈھیر کے اور کچھ نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ کے بیچوں بیچ میں ایک بہت بلند مکان بنا ہوا تھا اور وہ بادشاہ کی بیٹھک تھی اور اس کو جہاں نما کہا کرتے تھے۔ لوگوں کے ذہن میں یہ سما رہا ہے کہ اس سے بڑا اور کوئی قلعہ نہیں ہے اور کہتے ہیں کہ اس قلعے کے چھپن کوٹ اور باون دروازے ہیں۔ میں نے جو اس قلعے کو بخوبی دیکھا تو یہ خیال غلط معلوم ہوا اور یہ بات تحقیق ہوئی کہ یہ قلعہ بہت بڑا نہیں ہے۔ بادشاہ نے مغرب کی طرف قلعہ بنایا تھا اور تین طرف یعنی مشرق اور شمال اور جنوب کی طرف تغلق آباد کا شہر آباد کیا تھا اور شہر کی فصیل اور قلعہ کی فصیل اس خوبصورتی سے ملا کر بنائی ہے کہ یہ سارا شہر اور قلعہ ایک قلعہ معلوم ہوتا ہے۔"

اسی باب میں مقبرہ مرزا جہانگیر کا ذکر سرسید یوں کرتے ہیں:

"مرزا جہانگیر محمد اکبر شاہ ثانی کے بیٹے تھے اور انھوں نے سٹین صاحب پر جو دلی کے ریذیڈنٹ تھے تمنچہ مارا تھا۔ اور اسی سبب سے انگریزوں نے بطور نظر بند کے الہ آباد بھیج دیا تھا اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ نواب ممتاز محل ان کی ماں اُن کو بہت چاہتی تھیں۔ انھوں نے نواب مختار الدولہ خواجہ وحید الدین احمد خاں (سرسید کے بڑے ماموں جو ۱۸۵۷ء کی شورش میں گولیوں کا نشانہ بنے) خلف اکبر وزیر اعظم دستور معظم نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ کو الہ آباد بھیجا اور ان کی لاش کو منگوا کر یہاں دفن کیا اور یہ مقبرہ بنایا۔"

آثار الصنادید کے پہلے باب میں مسجد قوت الاسلام کا ذکر سرسید کے الفاظ میں دیکھیے:

"یہ مسجد وہ ہے جس کا ایک مینار قطب صاحب کی لاٹھ مشہور ہے۔ یہ مسجد نہایت عجیب و غریب ہے۔ یقین ہے کہ ایسی بڑی مسجد روئے زمین پر نہ ہوگی اور چشم فلک نے بھی نہ دیکھی ہوگی۔ حقیقت میں اپنا مثل روئے زمین پر نہیں رکھتی باوجود اس قدر بلندی اور بڑائی کے ایسی خوبصورت اور خوش وضع ہے کہ جس کا کچھ بیان نہیں ہو سکتا۔ ایک ایک پتھر پر وہ منبت کاری اور گل کاری ہے کہ دیکھنے سے علاقہ رکھتی ہے اس کی ایک ایک بیل مسلسل پر سے ہزاروں معشوقوں کی زلف دوتا قربان ہے اور اس کی ادنیٰ سے ادنیٰ پھول پنکھڑی پر سے سیکڑوں گل رخوں کے لب جاں بخش نثار ہیں۔"

اسی مسجد کے پاس ایک لوہے کی لاٹھ کھڑی ہے جسے قدیم زمانے میں راجا دھاوا والی سندھ نے بنوایا تھا، اس کا ذکر کرتے ہوئے سرسید یہ واقعہ بھی بیان کرتے ہیں۔

"میں اس لاٹھ کا حال بیٹھا ہوا لکھ رہا تھا کہ یکایک بہت عورتیں جوان جوان خوبصورت خوبصورت آئیں اور اس لاٹھ کو کولی میں لیا

اتفاق سے ان میں ایک عورت کی کوٹلی میں جو سب
سے خوبصورت تھی یہ لاٹھ نہ آئی اور سب نے اس
کو چھیڑنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ رونکی ہوگئی
میں ایک کونے میں بیٹھا ہوا چپکا نقشہ کھینچ رہا تھا
اور حال لکھتا تھا۔ خدا جانے ان عورتوں نے
کیا جانا کوئی ملان یا سیانا یا خادم سمجھ کر مجھ
سے پوچھا کہ کیوں میاں جی! جس کی کوٹلی میں یہ
لاٹھ آئے وہ حرام کا ہوتا ہے یا نہیں۔ میں اپنے
دل میں بہت ہنسا اور اپنے دل میں کہا کہ خوب
منصفی کرنی پڑی۔ لاچار میں نے ان سے کہا کہ
بیس برس کی عمر سے سوا نلنے کا اعتبار کیا جاتا
ہے۔ اگر تمہاری عمریں اتنی ہیں تو میں بتاؤں
جو کہ ان میں سے کسی کی عمر اس قدر نہ تھی ہنس
کر چلی گئیں میں پھر اپنا کام کرنے لگا۔"

آثار الصنادید کے دوسرے باب میں لال قلعہ اور اس
کی عمارتوں کا بیان چوالیس صفحوں میں ہے۔ تیسرے باب
میں خاص شہر شاہجہاں آباد کی عمارات، مساجد، مدرسے،
حویلیوں، کنووں، باولیوں، مندروں، بازاروں، مزاروں
اور کھڑکیوں وغیرہ کے ذکر سے ان کا جغرافیہ اور محل وقوع
کی نشاندہی کی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سیر المنازل کے مرتب
کی نظر سے آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن نہیں گزرا۔ ورنہ وہ یہ
نہ لکھتے کہ سرسید نے اپنی کتاب میں دہلی کی گلیوں اور کوچوں
کا کوئی خاص ذکر نہیں کیا ہے۔ تراہہ بیرم خاں کے محل وقوع
کا ذکر سرسید ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"اس سے آگے ایک چھوٹا سا چوک ہے اس
میں ایک تو یہی رستہ آتا ہے جس کا ہم ذکر
کرتے آتے ہیں اور اسی کا ایک رستہ دلی
دروازے کو ہو کے جاتا ہے اور ایک رستہ
بائیں طرف فیض بازار کی طرف جاتا ہے۔ اس واسطے
تراہہ مشہور ہے اور یہاں ایک نامی مسجد ہے۔
دائی کی مسجد۔ یہ مسجد بہت عمدہ ایک برج کی
بہت نامی ہے.... اس سے آگے جانب فیض
بازار، نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ
فریدالدین احمد خاں مصلح جنگ کی حویلی ہے (یہی
حویلی سرسید کی جائے ولادت ہے) یہ حویلی
پہلے نواب مہدی قلی خاں کی تھی۔ بعد اس کے انھوں
نے اس کو خرید فرمایا۔"

مکان نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ کے بیان کے بعد سرسید اسی
باب میں سید رفائی صاحب کی مسجد کا حال لکھتے ہیں۔

" یہ مسجد دست راست کو واقع ہے اور بنا
اس کی بہت قدیم ہے لیکن جو کہ سید صاحب اس
اس مسجد میں بہت رہے ہیں اور اس مسجد کی
مرمت بھی کی ہے اس واسطے ان کے نام سے
مشہور ہو گئی ہے۔ یہ سید صاحب بڑے مقتدائے
روزگار تھے اور ان کے ہاں ایک مجلس بنام حضرہ
ہوا کرتی تھی اور اس میں مرید خاص حاضر ہوا
کرتے تھے اور یہ قید تھی کہ اس کے گرد و پیش
میں عورت نہ ہو اور مریدین خاص کے ہاتھ میں
چھرے ہوتے تھے اور ان سب پر ایک حالت
طاری ہوتی تھی کہ دنیا و مافیہا فراموش کرتے
تھے اور اس حالت میں کلمۂ طیبہ پڑھتے تھے اور
وہ چھرے ایک دوسرے کو مارتے تھے مگر زخم
کا اثر نہ ہوتا تھا اور احیاناً اگر کبھی ہوا بھی تو
فی الفور سید صاحب نے اپنا لب لگایا اور وہ
زخم اچھا ہو گیا اور اب سید صاحب کو مرے ہوئے
تیس برس کے قریب ہوئے۔"

تیسرے باب میں مدرسۂ غازی الدین خاں (قدیم دلی کالج)
کی عمارت کا بھی حال لکھا ہے۔ سرسید لکھتے ہیں:

"یہ مدرسہ احمد شاہ بادشاہ اور عالمگیر ثانی کے عہد میں تیار ہوا تھا۔ غازی الدین خاں نے جو ان سلاطین کے عمدہ اراکین میں سے تھا، اس کو تیار کیا تھا۔ ایک مدت ہوئی کہ انگریزوں نے چاہا تھا کہ اس کو منہدم کر دیں بلکہ انہدام اس کا شروع ہو گیا تھا ازبسکہ بنا اس کی نہایت مستحکم ہے جب تک کہ ایک گز بھر دیوار ٹوٹی کئی کدالیں ٹوٹ گئیں جو کہ اس کے انہدام میں بھی بہت روپیہ کا صرف پڑتا تھا اور عمارت بھی بسبب خوبی کے یادگار سلف تھی، اس کا انہدام موقوف کر کر ایک خندق اس کے گرد کھدوا کر اس کو شہر میں لے لیا اور سرکار انگریزی نے اس کو طالب علموں کی تعلیم کے واسطے پسند کیا۔ چند مدرس عربی اور فارسی اور شاستری کے اس میں مقرر کر دیے۔ چند مدت کے بعد نواب فضل علی خاں اعتماد الدولہ وزیر شاہ اودھ نے بھی اس مدرسے کے خرچ کے واسطے ایک لاکھ ستر ہزار روپے دیے۔"

مجھے احساس ہے کہ یہاں آثار الصنادید کے ابواب سے قدرے تفصیل سے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔ لیکن ان سے صرف یہ وضاحت مقصود ہے کہ آثار الصنادید کے تینوں باب واضح خیال، واضح اظہار کا نمونہ ہیں۔ ان ابواب میں عبارت آرائی نہیں کی گئی ہے۔ ہاں کہیں کہیں جن کی مثال بہت کم ہے، عمارتوں کے بیان میں غیر متعلق واقعات آگئے ہیں۔ لیکن یہ حصے بھی سہ نثر ظہوری سے متاثر ہیں، جس کا اندازہ اوپر کے اقتباسات سے ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ آثار الصنادید کی زبان تکلفات بارد سے مملو ہے، صحت کے قریب نہیں معلوم ہوتا۔

آثار الصنادید کا چوتھا باب دلی اور دلی کے لوگوں کے بیان میں ہے۔ اس باب کے شروع میں ان شہروں اور قلعوں کا بیان ہے جو ازمنہ قدیم تا دم تحریر دلی میں آباد اور تعمیر ہوئے تھے۔ اس کے بعد دہلی کی صفات اور آب و ہوا کا بیان ہے اور اسی کے ساتھ اردو زبان کی پیدائش اور ارتقا کا ذکر ہے۔ دہلی کی عام زبان کے سلسلے میں سرسید لکھتے ہیں:

"یہاں جو زبان مروج ہے اور جس میں سب لوگ بولتے چالتے ہیں اس کا نام اردو ہے۔ اگرچہ اس زبان میں اکثر فارسی اور عربی اور سنسکرت کے الفاظ مستعمل ہیں اور بعضے بعضوں میں کچھ تغیر کر لیا ہے۔ لیکن اس زمانے میں اور شہر کے لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اردو زبان میں یا تو فارسی کے لغت بہت جلد جلد ملا دیتے ہیں یا فارسی کی ترکیب پر لکھنے لگتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں اچھی نہیں، ان سے اردو پن نہیں رہتا اور ظاہر ہے کہ اس بات کے کہ کس قدر فارسی کی ترکیب دی جاوے اور کون کون سے لغت اور زبانوں کے نہ بولے جاویں کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہو سکتا۔ یہ بات صرف اہل زبانوں کی صحت پر منحصر ہے"۔

اس کے بعد مشاہیر دہلی کا بیان ہے جن میں مشائخ، علما، فقرا، اطبا، شعرا، خوش نویسوں، مصوروں اور ماہرین موسیقی کا حال ہے۔ ان مشاہیر کی کل تعداد ایک سو بیس ہے۔ یہ باب دو سو چھیالیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے مشاہیر کا تذکرہ کرنے سے پہلے سرسید لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ لوگ یہ خیال کریں گے کہ میں نے جو اس شہر کے لوگوں کا حال لکھا ہے وہ بہ نظر حب الوطن ہو گا۔ لیکن جن لوگوں کے مزاج میں انصاف ہے وہ میری اس ساری کتاب کو دیکھ کر یہ جان لیں گے کہ میں نے جو حال لکھا ہے وہ افراط و تفریط سے خالی ہے۔ حقیقت میں یہاں کے لوگ ایسے

ہیں کہ شاید ہفت اقلیم کے نہ ہوں گے۔ ہر شخص ہزار ہزار خوبی کا مجموعہ اور لاکھ لاکھ ہنروں کا گلدستہ ہے ہر ایک کو علم و ہنر سے شوق اور دن رات لکھنے پڑھنے ہی سے ذوق ہے۔ ہر ایک کی جبلت میں اخلاق ایسا سمایا ہے کہ اگر ایک ایک بات ان کی لکھی جاوے تو ہزار ہزار اخلاق کی کتاب بن جاوے اس پر حلم ویسا ہی مروت ویسی ہی دوست پرستی کا کچھ بیان نہیں۔ بغض وحسد کا کچھ نشان نہیں۔"

دراصل آثار الصنادید کے چوتھے باب میں سرسید استعارات، مناسبات لفظی تکرار اور مرصع زبان کی بعض صفات کا استعمال کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ چوتھے باب کا موضوع تاریخ نہیں اوصاف نگاری ہے اور جس زمانے میں سرسید نے یہ باب لکھا ہے اس وقت دہلی کے ارباب علم ظہوری اور بیدل کی پیروی پر فخر کرتے تھے۔ پھر اس دور میں اوصاف نگاری کے لیے مرصع اسلوب اور تقریظی انداز کو لازمی سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے سرسید بھی اسی رجحان سے متاثر ہوئے۔ مثال کے طور پر امام بخش صہبائی کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"راقم میں سررشتۂ محبت واخلاص ایسا مستحکم ہے کہ گویا دو قالب میں ایک جان جاری وساری ہے اور یہ امر دال ہے اس بات پر کہ ذکر اوصاف حمیدہ اس یگانۂ روزگار کا شاید نتیجہ افراط محبت کا ہو لیکن راقم نے مراتب دوستی ومدارج اتحاد کو اس امر میں کچھ دخل نہیں دیا اور جو کچھ بیان واقعی تھا اسی کو لکھا۔ وگرنہ محبت کا اقتضا یہ تھا کہ جس وقت ان کے محامد واوصاف میں زبان کھولتا اور تحریر مناقب میں قلم کو ہاتھ میں لیتا تو شاید سوالات محشر کے جواب کی تقریب ہی ایک دو لمحہ کے واسطے زبان کو اس ذکر سے باز رکھتی اور صدمہ زلزلہ قیامت قلم کو ایک دو دفعہ ہاتھ سے گرا دیتا جو کہ اوصاف نفس الامری غیر متناہی ہیں اور ان کا حصر ظرف اعداد نامتناہی میں بھی محال ہے۔ بالفرض اگر ہمت ان کے بیان سے عاجز نہ ہو زبان کوشش کا درماندہ اور قلم جوبیں کا فرسودہ ہونا ممکن ہے۔ ناگزیر انھیں ایک دو کلمہ پر قناعت کر کر ان کے کلام بلاغت نظام سے بطریق یادگار کے درج کتاب کرتا ہوں۔"

اسی باب میں مرزا شاہرخ بیگ کا حال بھی لکھا ہے جنھوں نے آثار الصنادید کے نقشے اور تصویریں تیار کی تھیں۔ سرسید رقمطراز ہیں:-

"فن تصویر میں نہایت کامل اور اقران وامثال سے اس کام میں گوئے سبقت لے گئے۔ مژۂ چشم حور اگر ان کا موئے قلم بنے بجا ہے اور بیاض گردن پری اگر ان کا صفحہ ہو تو زیبا ہے۔ کل نقشے اس کتاب کے فیض علی خاں موصوف اور ان کی استعانت سے مرتب ہوئے ہیں۔ کام ان نقشوں کا نمونہ ان کی صنعت کا ہے۔"

کہا جاتا ہے کہ آثار الصنادید کے بعض مقامات صہبائی کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ لیکن یہ مقامات اگر ہو سکتے ہیں تو صرف چوتھے باب میں۔ مجھے اس میں بھی تامل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر صہبائی نے سرسید کی اس سلسلے میں مدد کی ہوتی تو اس کا ذکر کتاب میں کہیں نہ کہیں وہ ضرور کرتے جیسا کہ انھوں نے آثار کی تصویریں بنانے والوں کا کیا ہے۔ پھر اگر ہم سرسید کی تحریریں دیکھیں تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پرانے طریقے کی اردو لکھنے پر قادر تھے اور یہ امر فطری ہے۔ اس لیے کہ سرسید جس تہذیب کے زائیدہ تھے کچھ نہ کچھ اس کا ان کے اسلوب پر اثر پڑنا ناگزیر تھا۔

چوتھے باب کے آخر میں غالب کی فارسی نثر میں تقریظ ہے اور امام بخش صہبائی کا فارسی میں ریویو ہے اور کتاب

کاخاتمہ مولوی صدرالدین آزردہ کی منظوم فارسی تقریظ سے ہوتا ہے۔

آثار الصنادید سرسید نے اس وقت لکھی جب ملک میں آثار عتیق سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کتاب نے ملک میں اثری شعور پیدا کیا۔ اس کتاب سے اردو میں تعمیرات کی اصطلاحات کا اضافہ ہوا۔ اس کتاب کی تیاری میں سرسید کو سیکڑوں تاریخی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا۔ بہت سی عمارتوں کی پیمائش کرنی پڑی۔ بہت سے کتبے ایسے خطوط میں تھے جو پڑھے نہیں جا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض عمارتوں پر نصب کتبوں کے چربے اتارنا اور ہر کتبے کو اس کے اصلی خط میں دکھانا بڑا مشکل کام تھا۔ خصوصاً قطب مینار کے کتبے پڑھنے میں انکو خاصی زحمت اٹھانی پڑی۔ حالی سرسید کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ان کتبات کو پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذ میں بندھوا لیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ بیٹھ کر ہر کتبے کا چربہ اتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرط محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔"

اس طرح آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۶ء میں تیار ہوا اور ۱۸۴۷ء میں شایع ہوا۔ اسی زمانے میں دہلی کے کلکٹر اور مجسٹریٹ آرتھر اسٹیسن رابرٹس انگلستان جا رہے تھے۔ وہ اس کتاب کو اپنے ساتھ لے گئے اور لندن میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا۔ دوسرے ممبروں کے علاوہ کرنل سیکس ممبر کورٹ آف ڈائرکٹرز نے بھی اس کتاب کو پسند کیا اور انگریزی میں اس کے ترجمے کی ضرورت کا اظہار کیا۔ جب مسٹر رابرٹس ہندوستان آئے تو انھوں نے سرسید کی شرکت سے اس کا انگریزی ترجمہ کرنا شروع کیا۔ انگریزی ترجمے کے چند صفحات شایع بھی ہوئے لیکن اس کا انگریزی ترجمہ مکمل نہ ہو سکا۔ اسی زمانے میں سرسید نے کتاب پر نظر ثانی کی اور حقایق کے بیان میں جہاں غیر متعلق چیزیں آگئی تھیں انھیں حذف کر دیا۔ چوتھے باب کو بالکل نکال دیا۔ جس پر کہیں کہیں داستانی رنگ کا پرتو ہے۔ پھر انگریزی میں ترجمہ کرنے میں دقت ہوتی ہوگی۔ غرض کہ مسٹر رابرٹس کی ایما پر سرسید نے اس کے نقائص دور کیے اور چھ سو صفحے کی کتاب کو دو سو صفحے تک محدود کر دیا۔

آثار الصنادید کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۴ء میں شایع ہوا۔ پہلا باب دہلی کی عملداریوں کے مختصر حالات میں ہے جو تینتالیس صفحے کا ہے۔

دوسرا باب دہلی میں قلعوں کے بننے اور شہروں کے آباد ہونے کے بیان میں ہے جو ترپن صفحات پر مشتمل ہے

تیسرا باب بادشاہوں اور امیروں کی متفرق بنائی ہوئی عمارتوں کے بیان میں ہے جو ایک سو آٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ چھ صفحے کا دیباچہ اور باسٹھ صفحات کتبات اور نقشے کے ہیں۔ اس میں وہ مثنوی شامل نہیں جو سر طامس تیافلس مٹکف بہادر کی تعریف میں سرسید نے لکھی تھی، مختلف لوگوں کی تقریظیں بھی حذف کر دی گئیں، جو آثار کے پہلے ایڈیشن میں تھیں۔ اس ایڈیشن کے تینوں باب مطبع احمدی واقع دہلی باہتمام شیخ ظفر علی ۱۸۵۳ء میں چھپے ہیں اور کتاب کا ٹائیٹل اور دیباچہ مطبع سلطانی واقع قلعہ معلیٰ ۱۸۵۴ء میں طبع ہوئے۔ سرسید لکھتے ہیں:

"پہلی کتاب سے یہ کتاب کئی باتوں میں اچھی ہے:

۱- اس کتاب کا پہلا باب جس میں مختصر ہندوستان کی آبادی اور پرانی اور نئی عملداریوں کا ذکر ہے، پہلی کتاب میں نہ تھا۔

۲- پہلی کتاب کے دوسرے باب میں صرف شاہجہاں آباد کے قلعہ کا ذکر تھا۔ اس کتاب

کے دوسرے باب میں اس قلعہ کا بھی پہلی کتاب سے بہتر بیان ہے اور علاوہ اس کے ابتدائے آبادی سے آج تک جس قدر قلعہ اور بنے اور شہر بسے ان سب کا بھی ذکر ہے۔

۳۔ پہلی کتاب کے پہلے اور تیسرے باب میں جس قدر مطالب تھے وہ سب اس کتاب کے تیسرے باب میں اکٹھے ہیں بلکہ بعض پُرانے مکانات کا اور حال جو دریافت ہوا ہے وہ زیادہ ہے۔

۴۔ پہلی کتاب میں دو نقص تھے ایک یہ کہ بعضے پرانے مکانات کا اصلی حال دریافت نہ ہوا تھا۔ دوسرے یہ کہ پہلی کتاب میں بعض جگہ بیان حالات میں کچھ غلطی ہوگئی تھی اس کتاب میں یہ دونوں نقص دور کیے گئے۔

۵۔ پہلی کتاب میں عمارات کا بیان متفرق اور غیر منظم تھا۔ اب کی دفعہ سب عمارات کا حال بہ ترتیب سال بنا انتظام سے لکھا گیا۔

۶۔ پہلی کتاب میں جو حال بیان کیا گیا تھا، اس کی سند نہ تھی اب کے کتاب میں جو حال لکھا گیا ہے اکثر اس کی سند کے لیے نام اس کتاب تاریخ کا جس سے وہ حال لکھا گیا حاشیہ پر مندرج ہے۔

۷۔ بڑی عمدہ بات اس حال کی کتاب میں یہ ہے کہ جس قدر کتبہ پرانی عمارتوں میں ہیں علاوہ سب اصلی قطع اور اصلی خط کے مطابق اس کتاب میں مندرج ہیں اور یہ فہرست ہے ان کتابوں کی جن سے یہ کتاب مرتب ہوئی"

یہاں آثار الصنادید کے دونوں ایڈیشنوں کے امتیازات کی تفصیل حذف کی جاتی ہے۔ صرف دوسرے ایڈیشن میں جو ین فرق نظر آتا ہے ان کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

آثار الصنادید کا دوسرا ایڈیشن مغربی آداب تحقیق کا آئینہ دار ہے، اس کے اندراجات میں پہلے ایڈیشن کے مقابلے میں اچھا خاصا فرق نظر آتا ہے انداز بیان پر بھی سے نثر ظہوری کے اثرات جو پہلے خال خال تھے، اب نہیں دکھائی دیتے۔ عبارت سیدھی سادی ہے، بیان میں ابہام یا اشکال نہیں اور عمارات کا بیان واضح ہے۔ لفاظی بالکل دکھائی نہیں دیتی اس ایڈیشن میں جو کچھ لکھا ہے اس کے مآخذ اور مصادر کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ اسی ایڈیشن کو فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے فرانسیسی زبان کا جامہ پہنایا۔ یہ پہلے تین قسطوں میں فرانس کے موقر رسالہ ژورنال ایشیاتیکی میں شایع ہوا۔ اور بعد میں کتابی شکل میں چھپا۔ اسی ترجمے کو دیکھ کر رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن نے سرسید کو اپنا اعزازی فیلو منتخب کیا اور سرسید کو لکھا کہ آپ کی اس کتاب کو یورپ کے علمی حلقوں میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ طبقات ناصری کے انگریزی ترجمے میں ریورٹی نے لکھا ہے کہ سرسید کے قلم سے دلی کے آثار کے بارے میں جو نکل گیا ہے اس پر مجھے انگلی رکھنے کی ہمت نہیں۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ کلکتہ یونیورسٹی نے اسے اپنے نصاب میں شامل کیا تھا۔ ذکاء اللہ نے لکھا ہے کہ آثار الصنادید کے چلتے سرسید نے سید الاخبار سے توجہ ہٹالی اور اخبار بند کرنا پڑا۔

> انسان کو چاہیئے کہ اپنے مخالف سے بھی مخالفت کرنے میں سچائی اور راستبازی نیکی اور نیک دلی کو کام میں لاوے کہ یہی طریقہ اپنے مخالف پر فتح پانے کا ہے ورنہ بعوض اپنے مخالف کے خود اپنے تئیں آپ رسوا کرنا ہے۔"
>
> سرسید

مرزا خلیل بیگ

سرسیّد کا تصوّرِ تعلیم اور ذریعۂ تعلیم

انقلابِ غدر کے بعد سرسیّد احمد خاں (۱۸۱۷ء–۱۸۹۸ء) ہندوستانی مسلمانوں کے ایک عظیم رہنما بن کر سامنے آئے۔ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی نہ صرف سیاسی قیادت کی، بلکہ اس سے کہیں زیادہ ان کی سماجی، مذہبی، ذہنی اور تعلیمی رہنمائی میں حصّہ لیا۔ ان کی تمام تر تصانیف، خطبات، مضامین اور تقاریر اس امر کا مظہر ہیں کہ انھیں ہندوستانی مسلمانوں کے سماجی، سیاسی اور تعلیمی مسائل سے حد درجہ لگاؤ تھا۔ یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ انیسویں صدی کے دوران بالخصوص غدر ۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی حالات نہایت بدتر ہو چکے تھے۔ تعلیم کے میدان میں وہ یہاں کی دوسری قوموں کے مقابلے میں بہت پیچھے تھے اور ان کی سماجی حیثیت تو تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی۔ سرسیّد کو ان تمام باتوں کا نہایت گہرا دکھ تھا۔ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو گمنامی اور جہالت کے غار سے 'نکالنے'، انھیں توہم پرستی سے باز رکھنے اور سیاسی اور سماجی اعتبار سے انھیں ایک زندہ قوم میں ڈھالنے کے لیے تعلیم کا سہارا لیا۔ یہ ضرور ہے کہ سرسیّد نے مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ کے لیے مدارس قایم کیے اور کالج کی بنا ڈالی اور ایسا کالج جو آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں کا ہم پلہ ہو۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا مقصد محض مسلمانوں کو ڈگریاں تقسیم کرنا نہیں تھا اور نہ ہی ان کا یہ مقصد تھا کہ کالج کی چہاردیواری سے نکلنے کے بعد مسلمان انگریزوں کی غلامی میں مصروفِ کار ہو جائیں۔

سرسیّد کے نزدیک تعلیم کا بہت وسیع تصور تھا وہ "تعلیم" کا لفظ محدود معنیٰ میں استعمال نہیں کرتے تھے۔ وہ تعلیم سے محض لکھنا پڑھنا سیکھنا ہی مراد نہیں لیتے تھے، بلکہ اسے اخلاقی بلندی اور ذہنی کشادگی کا ایک بہترین وسیلہ بھی سمجھتے تھے۔ وہ تعلیم کو رجعت پسندی اور توہم پرستی نیز عقائد کی پستی کے خلاف ایک زبردست طاقت تصور کرتے تھے۔ سرسیّد کے نزدیک تعلیم حصولِ معاش کا ہی ذریعہ نہیں، بلکہ "زندگی کے کاروبار" میں ایک "نہایت مفید اور کارآمد چیز" بھی تھی۔

یہاں پنجاب کے لفٹننٹ گورنر (۱۸۹۷ء تا ۱۹۰۲ء) سر ولیم میکورتھ ینگ کی تقریر کا ایک اقتباس نقل کرنا بیجا نہ ہوگا جو انھوں نے ایم۔اے۔او کالج کے ڈگری یافتہ طالب علموں کے جلسے میں کی تھی اور جس سے سرسیّد کو مکمل طور پر اتفاقِ رائے تھا۔

"ان کی ڈگریاں اس بات کے لیے ہیں کہ وہ اپنے یومیہ معاملات اور گفتگو میں معزز برتاؤ اختیار کریں۔ اخلاق اور عمدہ تعلیم کی ترقی میں مدد دیں۔ سوشل انتظام اور اپنے ہم جنسوں کی بہبودی کے قایم رکھنے میں کوشاں

رہیں۔ المختصر ایک بھاری سلطنت کے برآوردہ
شہریوں کے فرائض انجام ادا کرتے رہیں۔"

ماہرین تعلیم کے نزدیک تعلیم کے مقاصد دو طرح کے ہیں۔ اوّل انفرادی مقاصد اور دوم اجتماعی یا سماجی مقاصد۔ جہاں تک تعلیم کے انفرادی مقاصد کا تعلق ہے، یہ افراد کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل اور کردار سازی — (Character Building) — میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ان سے افراد کی ذہنی اور اخلاقی نشو و نما میں مدد ملتی ہے تعلیم کے اجتماعی یا سماجی مقاصد کے تحت افراد کے مقابلے میں سماج یا معاشرے پر سارا زور صرف ہوتا ہے جس میں توجہ کا مرکز فرد نہیں بلکہ معاشرہ ہوتا ہے۔ اجتماعی تعلیم کا بنیادی مقصد معاشرے کی بہتری، فلاح و بہبود اور ہمہ جہتی ترقی ہے۔ لیکن فرد چوں کہ معاشرے کا ہی ایک رکن ہوتا ہے، اس لیے سماج کی ترقی افراد کی ترقی بھی ہے۔ سرسید کے نزدیک تعلیم کا جو تصور تھا، اس میں تعلیم کے انفرادی اور اجتماعی دونوں مقاصد شامل تھے۔ سرسید نے اپنے خطبات اور تحریروں میں جا بہ جا تعلیم کے انفرادی اور اجتماعی یا سماجی دونوں مقاصد پر زور دیا ہے۔ سرسید کے نزدیک فرد اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ معاشرہ۔ کیوں کہ معاشرے یا سوسائٹی کا وجود افراد کے وجود ہی سے قایم ہے۔ اگر افراد کی ذہنی تعمیر و تربیت اور اخلاقی نشو و نما بہتر طور پر ہوتی ہے تو معاشرے کی حالت خود بہ خود درست ہو سکتی ہے۔

سرسید کے نزدیک تعلیم کا مقصد جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، محض لکھنا پڑھنا سیکھنا ہی نہیں تھا۔ بلکہ تعلیم سے وہ فرد کی مکمل تربیت اور اس کی شخصیت کی پوری نشو و نما مراد لیتے تھے۔ تعلیم کے بارے میں تقریباً نصف صدی بعد مہاتما گاندھی جی نے بھی بالکل یہی نظریہ پیش کیا تھا۔ وہ تعلیم سے انسان کی تمام تر قوتوں کا ارتقا اور صلاحیتوں کی بیداری مراد لیتے تھے۔ مثلاً جسمانی، ذہنی، اخلاقی اور روحانی صلاحیتیں جو انسان کے اندر فطری طور پر پہلے سے موجود ہوتی ہیں اور موقع ملنے پر بیدار ہو سکتی ہیں۔ ان تمام باتوں کا تعلق تعلیم کے انفرادی مقاصد سے ہے لیکن سرسید کے نزدیک تعلیم کے اجتماعی یا سماجی مقاصد بھی اتنے ہی اہم تھے جتنے کہ انفرادی مقاصد لیکن محض رسمی تعلیم کے ذریعے یہ مقاصد حاصل نہیں کیے جا سکتے سرسید کا خیال تھا کہ

"جب تک کہ خود اس قوم کے چند لوگ اس قوم
کی سوسائٹی کے مہذب کرنے پر آمادہ نہ ہوں
اور دلی سعی و کوشش نہ کریں، سوسائٹی کی
حالت درست نہیں ہو سکتی۔"

اور جب تک کہ سوسائٹی کی حالت درست نہیں ہوتی تعلیم کے اجتماعی یا سماجی مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کے دورِ اقتدار میں ہندوستان میں جو نظامِ تعلیم رائج تھا اس سے سرسید مطمئن نہیں تھے۔ ان کے خیال میں یہ تعلیمی ڈھانچہ تعلیم کے اجتماعی یا سماجی مقاصد کو حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ کیوں کہ اس سے بقول سرسید سماج یا معاشرے کی درستی نہیں ہو پاتی تھی۔ سرسید "تعلیم" کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"باوجودیکہ کئی قرن گورنمنٹ کو ہندوستانیوں
کو تعلیم دیتے ہوئے گزرے مگر ان کی سوسائٹی
کی حالت اب تک درست نہیں ہوئی۔"

اسی مضمون میں وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:

"انگریزی گورنمنٹ سوائے تعلیم دینے کے اور
کوئی طریقہ اختیار نہیں کر سکتی جس سے ہندوستانیوں
میں سوسائٹی کی حالت اچھی ہو اور عمدہ سوسائٹی
ان کی بن جاوے۔"

سرسید تعلیم کے مادی فوائد سے کہیں زیادہ اس کے اخلاقی فوائد پر نظر رکھتے تھے۔ وہ تعلیم کی اصل غرض و غایت اور منشا کے بارے میں مسٹر کرول کے حوالے سے لکھتے

ہیں:

"تعلیم کا منشا یہ نہیں ہے کہ چند آدمیوں کی دولت
بڑھ جائے یا آنکہ غربا کے مقابلہ باقیماندہ اشخاص
کی زیادہ رعایت کی جائے اور نہ تعلیم کا منشا یہ
ہے کہ اس کے ذریعے سے یہ لوگ صرف اپنی باہمی
محافظت کریں یا سوداگری اور تجارت ہی کو ترقی
دیں۔ بلکہ تعلیم کی خاص غایت اور اصل منشا یہ ہے
کہ لوگ نیک محفر اور عمدہ قسم کے باشندے
ہو جاویں .... اور لوگوں
کے سوشیل اور اخلاقی خصائل کی تکمیل کریں،
اور ان بھاری اور عمدہ کاموں کا حوصلہ دیں
جن سے ملک کی عزت اور زینت ہوتی ہے۔"

سرسید نے اپنی تحریر و تقریر میں جہاں کہیں بھی تعلیم کا ذکر کیا ہے اس کے اخلاقی پہلوؤں پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ وہ اخلاقی تعلیم کو اتنا ہی ضروری سمجھتے تھے جتنا رسمی یا مکتبی تعلیم کو۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ سرسید کے نزدیک زیادہ تر "کتابی تعلیم" سے متعلق ہے۔ سرسید کے خیال میں ــــ

"اخلاقی تعلیم صرف کتابوں کی تعلیم سے حاصل نہیں
ہوتی، بلکہ عمدہ سوسائٹی اس کی تعلیم دیتی ہے۔"

انھوں نے ایک جگہ اور لکھا ہے کہ ــــ

"اخلاقی اور شریف النفسی کی تعلیم عمدہ سوسائٹی
پر منحصر ہے۔"

لیکن وہ نہایت افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں کہ ــــ

"ہندوستان میں جو قدیم سوسائٹی علما اور
نیک، خدا پرست، رحم دل، نیک خصلت لوگوں
سے مرکب تھی وہ مدت ہوئی کہ مردہ ہو گئی ہے
اور نئی سوسائٹی جو زمانہ حال کے موافق ہو اب
تک قایم نہیں ہوئی یا مکمل نہیں ہوئی۔"

ایسی صورتِ حال میں سرسید اخلاقی تعلیم کی تمام تر ذمہ داری اساتذہ کو سونپتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"اسکول ماسٹروں کو چاہیے کہ اپنے شاگردوں
کے نقشِ ذہن کرتے رہیں کہ وہ اعلیٰ درجہ
کا چلن اور شریفانہ اور اولوالعزمیاں اختیار
کریں اور اسی طرح ہمارے کالجوں کے پروفیسروں
کو بھی منجملہ ایسے لوگوں کے ہونا چاہیے جن میں
خیالات عالیہ پائے جاتے ہوں۔"

سرسید تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کو بھی اتنا ہی ضروری سمجھتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ

"تربیت تعلیم کا بہت بڑا رکن ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ وہ اے۔ ایم۔ او کالج میں زیرِ تعلیم طلبہ کی تربیت کا حتی المقدور خیال رکھتے تھے۔ انھیں اس بات کا بیحد افسوس تھا کہ انگلستان کے کالجوں اور اسکولوں میں طلبا کو جس طرح کی تربیت دی جاتی ہے وہ یہاں "محال" ہے لیکن خوشی بھی تھی کہ ــــ

"ہندوستان کے اور کالجوں کی نسبت مدرسۃ العلوم
میں تعلیم کے ساتھ عمدہ تربیت بھی ہوتی ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید علوم جدیدہ اور انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے حق میں تھے۔ لیکن جس طرح کی اعلیٰ تعلیم ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اس وقت رائج تھی وہ اس سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہندوستان کی یونیورسٹیاں مثل انگلستان
کی یونیورسٹیوں کے اعلیٰ تعلیم کی ڈگریاں دیتی
ہیں۔ مگر اس کو اعلیٰ تعلیم کہنا نہایت شرم کی
بات ہے۔"

سرسید کے نزدیک "اعلیٰ تعلیم صرف چند کتابوں کے پڑھ لینے اور طوطے کی طرح یاد کر لینے اور امتحان دے دینے اور انگریزی میں (آئی ٹیلی ٹیل) بول لینے سے

نہیں ہوتی ۔" اسے وہ" اعلیٰ درجے کی تعلیم نہیں بلکہ ایک ادنیٰ درجے کی تعلیم تصور کرتے تھے۔ سرسید کے نزدیک اعلیٰ تعلیم کے مقاصد بالکل دوسرے تھے۔ وہ اعلیٰ تعلیم، علم میں اعلیٰ درجے کی ترقی کو سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک نئی نئی ایجادوں اور عمدہ عمدہ تصانیف سے ملک کو فائدہ پہنچانے کا نام اعلیٰ تعلیم تھا۔

موجودہ نظامِ تعلیم کی ایک خرابی یہ بتائی جاتی ہے کہ طلبہ بھی سیاست میں حصہ لینے لگے ہیں۔ طلبہ کو آئے دن یہ تلقین کی جاتی ہے کہ وہ سیاست میں حصہ نہ لیں۔ سرسید نے ایک صدی پیشتر یہ خیال پیش کیا تھا کہ طلبہ کو سیاسی معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے اور انھیں صرف اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ اپنے ایک مضمون " ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم اور گورنمنٹ" میں سرسید لکھتے ہیں:

" پولیٹکل امور میں کسی کالج کے طالب علموں کا کام نہیں ہے، بلکہ ان کو اپنے تحصیل علوم میں مشغول رہنا چاہیے۔ پولیٹکل امور ایسے نازک اور باریک ہیں کہ بڑی معلومات اور وسیع علم اور بہت سے تجربوں کے بعد اس میں رائے لگانے کا موقع ملتا ہے۔ جن کا علم ابھی کچا ہے وہ کیا رائے اس کی نسبت لگا سکتے ہیں۔"

سرسید کے دور میں سائنس اور ٹکنالوجی نے اگرچہ اتنی ترقی نہیں کی تھی جتنی کہ ہم آج دیکھتے ہیں۔ تاہم وہ ٹیکنیکل ایجوکیشن کی ضرورتوں کو سمجھتے تھے اور اس کے حق میں ٹیکنیکل ایجوکیشن کے فوائد پر بھی ان کی نظر تھی۔ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اس قسم کی تعلیم حصول معاش کے لیے بہت ضروری ہے۔ ان کا خیال تھا کہ دوسری قسم کی تعلیم " انسان کو انسان اور اس کی عقلی اور دماغی قوتوں کے کامل اور اس کے اخلاق کو عمدہ بنانے میں بہت مدد کرتی ہے۔" لیکن حصول معاش کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ " حرفت اور فن کی تعلیم جیسے ٹکنیکل ایجوکیشن سے تعبیر کیا جاتا ہے زیادہ وسعت دی جاوے"۔

سرسید تصورِ تعلیم کے ساتھ ساتھ ذریعۂ تعلیم کے بارے میں بھی ایک واضح تصور رکھتے تھے۔ وہ اپنے تصورات، نظریات نیز عمل کے اعتبار سے ایک جدید ذہن کے انسان تھے۔ وہ زمانے کی ہر اس نئی چیز کا خیر مقدم کرتے تھے جس سے قوم کی بھلائی اور اس کی فلاح و بہبود کا راستہ نکلتا تھا۔ مسلمانوں میں جدید تعلیم کے فروغ کے لیے عملی جدوجہد ان کے اسی تصور کا نتیجہ ہے۔ ان کے خیال میں جدید تعلیم کے لیے جدید زبان ہی ذریعۂ تعلیم کا حق ادا کر سکتی ہے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ جس ملک میں جو زبان حکومت کرتی ہے یا جس زبان کا عروج ہوتا ہے اسی زبان میں تعلیم پانا اختیار کیا جاتا ہے۔ انھوں نے مثال دی ہے کہ خلفائے بنی امیہ اور بنی عباس کے دور میں عربی زبان کا عروج تھا لہٰذا ہر شخص اسی زبان کو سیکھنا چاہتا تھا۔ ہندوؤں کے زمانے میں ہندوستان میں سنسکرت زبان کا عروج تھا لہٰذا اس کو ذریعہ تعلیم کے طور پر سیکھتے تھے۔ جب مسلمانوں کا دور آیا تو فارسی کو عروج حاصل ہوا۔ لہٰذا سب فارسی زبان میں تعلیم حاصل کرنے لگے اور اب چوں کہ زمانہ انگریزی کا ہے لہٰذا انگریزی میں تعلیم اختیار کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

یہ بات نہایت دلچسپ ہے کہ سرسید اردو زبان کی ترقی اور اس کی فلاح و بقا کے دل سے خواہاں تھے اور تا دمِ آخر وہ اردو کے حق کے لیے لڑتے رہے لیکن یہ سب کچھ کالج کی چہار دیواری سے باہر تھا۔ کالج میں وہ ہمیشہ انگریزی کو ہی ذریعۂ تعلیم رکھنا چاہتے تھے۔ ان کی یہ ہمیشہ کوشش رہی کہ ایم۔ اے۔ او کالج کے طلبا انگریزی میں اعلیٰ علمی لیاقت پیدا کریں اور تمام مضامین انگریزی کے ذریعے سے حاصل کریں سرسید کے اس خیال سے ان کے بیٹے سید محمود بھی متفق تھے۔ انھوں نے جو تعلیمی اسکیم مرتب کی تھی اور جو سید محمود اسکیم کے نام سے مشہور ہوئی اس کی ایک عبارت یہاں نقل کرنا بیجا نہ ہوگا

" اعلیٰ درجے کی دنیوی تعلیم کے لیے نہایت ضروری

ہے کہ کلیتہً انگریزی زبان میں تعلیم ہو تاکہ مسلمان لڑکے انگریزی میں ایسے قابل نکلیں کہ جو اعلےٰ سے اعلےٰ عہدے ہندوستانیوں کو مل سکتے ہیں، ان کو وہ حاصل کر سکیں، نیز جو علوم انگریزی زبان میں ہیں اس میں پورا کمال حاصل کر کے ایسی کتابیں تالیف و تصنیف کریں جو عموماً قوم کے لیے مفید ہوں۔"

(بہ حوالہ "شعر و زبان" از پروفیسر مسعود حسین خاں، ص ۲۱۲)

پروفیسر مسعود حسین خاں اپنے ایک مضمون "علی گڑھ تحریک، مسلم یونیورسٹی اور اردو زبان" (مشمولہ "شعر و زبان") میں کہ سرسیّد کی لسانی پالیسی کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"یہ بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ سرسید ہندی کے مقابلے میں اردو کے لیے شروع سے سینہ سپر نظر آتے ہیں لیکن تعلیمی میدان میں وہ ابتدا سے انگریزی زبان اور تہذیب کے کوشاں رہے۔"

سرسیّد دیسی زبانوں یا اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا صرف یہ خیال ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ "دیسی زبان" کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم دینا ناممکن ہے۔ تھیوڈر بیک اور ماریسن کی پرنسپلی کے زمانے میں کالج میں انگریزی کا زور اور بھی بڑھ گیا اور طلبا کو اردو میں تقریریں "کم" کرنے کی ہدایت دی جانے لگی تاکہ ان کا انگریزی کا معیار نہ گرنے پائے۔ سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعہ سرسید کا دیسی زبان کا تجربہ اگرچہ بہت اچھا ثابت نہیں ہوا تھا۔ تاہم انھوں نے کالج میں ایک "اورینٹل فیکلٹی" قایم کی جس میں دیسی زبان ذریعہ تعلیم تھی۔ لیکن یہ تجربہ بھی بالآخر ناکام رہا۔ ۱۸۸۵ء میں یہ شعبہ بند کر دیا گیا۔ سرسیّد اس پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

"اس شعبے (اورینٹل) کی تائید میں ایک لفظ نہیں کہا جا سکتا۔ اس سے بہت سی توقعات تھیں لیکن حاصل کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس شعبے کا ایسی صورت میں مزید قائم رکھنا جب کہ طلبہ عربی، فارسی ادبیات کے ساتھ موجودہ فنون کو سیکھنے کی صلاحیت کا اظہار نہیں کرتے، بیکارِ محض ہے۔"

[بہ حوالہ "شعر و زبان" از مسعود حسین خاں، ص ۲۲۳]

سرسیّد کے متعلق یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ وہ ایک تازہ کار اور جدید ذہن رکھتے تھے اور سو سال آگے کی بات سوچ لیتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسیّد نے آج سے تقریباً سو سال قبل تعلیم سے متعلق جو تصورات پیش کیے تھے ان کی اہمیت و افادیت اور ضرورت آج بھی ہے بلکہ آج کے پُر انتشار دور میں اور ایسے دور میں جب کہ اخلاقی قدریں تیزی سے پائمال ہوتی جا رہی ہیں، ان باتوں کی Relevance اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ سرسیّد نے رسمی تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تعلیم پر بھی زور دیا ہے۔ تعلیم کے ساتھ وہ تربیت کو بھی نہایت ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد محض لکھنا پڑھنا ہی نہیں بلکہ انسان کی شخصیت کی مکمل نشو و نما اور اس کے کردار کی بھرپور تعمیر و تشکیل بھی تھی۔ تعلیم کے اجتماعی مقاصد بھی اتنے ہی ضروری تھے جتنے کہ انفرادی مقاصد۔ اعلیٰ تعلیم علم میں اعلیٰ درجے کی ترقی کا نام ہے۔ طلبہ کے اخلاق کی ذمّہ داری معاشرے کے علاوہ اساتذہ پر بھی عائد ہوتی ہے۔ طلبہ کو سیاسی معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ معاشی ترقی اور خوشحالی کے لیے ٹیکنیکل ایجوکیشن بہت ضروری ہے۔ تعلیم سے متعلق یہ چند ایسی باتیں ہیں جو سرسیّد نے اگرچہ سو سال قبل کہی تھیں لیکن جن کی اہمیت سے آج بھی کسی کو انکار ممکن نہیں۔ یہی بات سرسیّد کے ذریعۂ تعلیم کے نظریے کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ آج کون ہے جو انگریزی ذریعۂ تعلیم کی اہمیت و افادیت اور ضرورت سے انکار کر سکتا ہے؟

فرخ جلالی

سر سید کے دینی افکار و عقاید

سر سید کے دینی افکار اور آرار کو مشتبہ اور مبہم انداز میں پیش کیا گیا اور یہ باور کرایا گیا کہ سر سید کے عقاید میں سوائے بے دینی اور بے یقینی کے کچھ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی مشکل یہ آن پڑی کہ سر سید کی وفات (۱۸۹۸ء) کے بعد علی گڑھ تحریک اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج پر سر سید کے مخالفین کا قبضہ ہوتا گیا۔

اس سلسلے میں انیسویں صدی کے ہندوستان میں مسلمانوں کے مذہبی ماحول سے تھوڑی واقفیت ضروری ہے۔ انیسویں صدی کے ہندوستان میں عقاید پر مباحث اٹھارویں صدی کے مقابلے میں زیادہ نظر آتے ہیں۔ تیموری مغل حکومت کے استحکام کے زمانے میں اعمال اور انتظام پر توجہ زیادہ تھی۔ کیا یہ بات توجہ کے قابل نہیں ہے کہ انگریزی حکومت کے بڑھتے ہوئے استحکام کے ساتھ مسلمانوں کے درمیان عقاید کے فروعی حصے پر مباحث کے دروازے کھل جاتے ہیں جو مباحثے سے بڑھ کر مجادلے کی صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ انگریزی حکومت کے فیصلہ کن اقتدار کے بڑھنے کا زمانہ ۱۷۷۴ء سے ۱۸۰۳ء تک ہے۔ ۱۷۷۴ء میں حافظ رحمت خاں کی شکست روہیل کھنڈ میں، ۱۷۹۹ء میں ٹیپو کی شہادت اور ۱۸۰۳ء میں شمالی ہند میں دہلی اور ہریانہ تک لارڈ لیک کی فتوحات نے انگریزی حکومت کے استحکام کا دروازہ کھول دیا۔ یہ مذہبی مباحثے ۱۸۰۳ء کے بعد سے شروع ہو کر بڑھتے جاتے رہے۔ اب اس بات کی تحقیق کی ضرورت ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ خصوصیت کے اعتبار سے ۱۸۵۷ء کے بعد یہ مباحث تیز سے تیز تر ہو گئے۔ یہ بھی یاد رہے کہ ۱۸۵۷ء سے قبل یہ مذہبی مباحث کا زیادہ رخ پادریوں کی طرف تھا۔ ۱۸۵۷ء سے قبل مولوی رحمت اللہ کیرانوی اور مولوی آل حسن موہانی اس سلسلے میں مسلمانوں کی طرف سے پیش پیش تھے۔

سر سید نے جب مذہبی مباحث پر لکھنا شروع کیا تو سر سید کے بعض دینی افکار شدید مذہبی مباحثے سے بڑھ کر ملکی منافرت میں تبدیل ہو گئے۔

یوں تو سر سید نے مذہبی موضوعات پر ۱۸۴۲ء سے لکھنا شروع کیا لیکن ۱۸۴۷ء میں سر سید کی کتاب آثار الصنادید شایع ہوئی جو دہلی کی عمارات کی تاریخ تھی ساتھ ہی سر سید نے تہذیبی تاریخ پر بھی لکھا۔ اس کے سوانحی حصے میں مولانا فضل حق خیر آبادی اور شاہ اسمٰعیل شہید پر سوانحی خاکے لکھے۔ ان میں دونوں کے لیے مدح اور تعریف کا عنصر زیادہ تھا۔ دونوں کی شمولیت اس بات کی مظہر ہے کہ سر سید دونوں کے اختلافات کو علمی حیثیت دیتے تھے۔ شاہ اسمٰعیل کا انتقال سترہ برس ہوئے تو ہو چکا تھا مولانا فضل حق اور مولوی شاہ اسمٰعیل میں شدید اختلاف تھا۔ سر سید کا رجحان شروع سے شاہ ولی اللہ

اور شاہ عبدالعزیز کی طرف تھا۔ سرسید کی پہلی مذہبی کتاب جلاء القلوب بذکر المحبوب (۱۸۴۳ء) شاہ ولی اللہ کی ایک کتاب کا خلاصہ ہے اور سرسید کی دوسری کتاب تحفۂ حسن شاہ عبدالعزیز کی کتاب تحفۂ اثناعشریہ کے ایک باب کی تلخیص اور ترجمہ تھی، جو شیعی عقاید کے رد میں ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ۶۳-۱۸۶۲ء میں سرسید نے جب انجیل پر اپنی تفسیر تبیین الکلام شایع کی تو وہ انتہائی مشکل مباحث پر تھی یورپ کی کرسچین دنیا نے اس کو ناپسند کیا۔ اس کے بعد سرسید نے جب "احکام طعام اہل کتاب" لکھی تو مسلمانوں کے ایک طبقے نے اس کی مخالفت کی۔ ۱۸۷۰ء میں لندن کے دوران قیام میں اپنے ہم عصر بلکہ اپنے ہی حاکم ولیم میور کی دل آزار کتاب "لائف آف محمد" کا جواب "خطبات احمدیہ" کی صورت میں دیا۔ تو یہ حضورؐ کی حیات مبارکہ پر غیر معمولی تحقیقی کام تھا۔ اس کتاب نے گورنر ولیم میور کو سخت ناراض کر دیا۔

دسمبر ۱۸۷۰ء میں لندن کی واپسی کے بعد سرسید نے تہذیب الاخلاق کا اجراء کیا۔ تدبّر اور تفکّر اس رسالے کے قبلہ نما تھے۔ تعلیم، سماجی اصلاح اور دین میں تفکّر اس کی ہمہ جہت سمتیں تھیں۔ اس رسالے کے مستقل شایع ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں تعلیم کی تحریک پیدا ہوئی شعاتی افکار اور مباحث کا دروازہ کھل گیا اور مذہبی دنیا میں ایک شور مچ گیا اور سرسید پر یہ الزام لگایا گیا کہ سرسید احمد ضروریاتِ دین کے منکر ہیں۔ جنت اور دوزخ، قیامت اور معاد کے قایل نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ آپس میں مخالف گروہ متفق ہو کر سرسید کی تردید میں طنز اور تضحیک تک پہنچ گئے۔ سرسید کے مخالفین کا ایک حصہ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز تھا۔

مذہبی تحقیق کی قدیم سے یہ راہ رہی ہے کہ تفکّر دینی میں جہاں بہت سے مشکل عقدے مزید واضح ہوتے رہے ہیں وہاں عقل انسانی اور طرزِ لسانی سے کچھ نہ کچھ معاملات اور مباحث الجھتے بھی رہے ہیں۔ عقل کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے روشنی کی کرن کی طرح وہ سیدھی چلتی ہے اطراف کا مکمل احاطہ اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہاں ایک خاص شیشہ ایک اصول کے باعث اس کے ارتکاز یا رخ کو موڑ دیتا ہے ہاں روشنی پلٹ پلٹ کر جس طرح فضا کو منوّر کرتی ہے اسی طرح بیدار ذہن اور باصلاحیت قلب اپنے وجدان یا رہبری اور سلامت طبع کے باعث اس راہ سے آسانی سے گزر جاتا ہے۔ سرسید کے ساتھ یہی ہوا۔

سرسید نے مذہبی تحقیق کی اس مشکل راہ میں قدم رکھا جہاں فہم انسانی کے محدود تجربے کے باعث وہ کبھی مغالطے میں بھی مبتلا ہوئے اور رسالت کی نوری کرن اور قومی ہمدردی کے باعث بحیثیت مجموعی وہ اسلام کے بنیادی ارکان اور اساس سے ہم آہنگ اور مطیع رہے اور یہی شاید ان کی مغفرت کا سامان اور دنیوی کامرانی کا باعث بنا ہوگا۔

مشتاق حسین وقار الملک جب علی گڑھ میں عدالت میں نوکر تھے ان کے حاکم نے نماز پڑھنے سے روکا۔ انھوں نے سرسید سے مشورہ کیا۔ سرسید نے ان کو تحریری صلاح دی کہ ان حالات میں نوکری چھوڑنا ٹھیک رہے گا اور مشتاق حسین نے ملازمت چھوڑ دی۔ اس کے بعد وہ حیدرآباد میں جا کر وقار الملک ہو گئے۔ صوبے کے حاکم ولیم میور نے جب حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایک مخالفانہ بے تحقیق کتاب لکھی، سرسید نے ۱۸۷۰ء میں اس کتاب کا لندن جا کر تحقیقی جواب لکھا اور اردو انگریزی میں شایع کیا۔ مغربی دنیا سے آج تک اس کا جواب نہ بن پڑا۔ سرسید کے مخالف علماء نے سرسید کی مذہبی تحریروں کے سخت جواب لکھے لیکن خطباتِ احمدیہ ان حملوں سے محفوظ رہی اور یہ شاید سرسید کے باشعور عشقِ رسولؐ کا صدقہ ہے۔

انیسویں صدی میں انگریزوں کے اشاروں اور ایما سے اور مختلف حالات کے تحت ہندوستانی مسلمان جن مباحث مذہبی

میں پھنس گئے تھے۔ سرسیّد نے اس اختلاف کا رخ موڑا اور مذہبی مباحث کو اعلیٰ سطح بخشی۔ سرسیّد بنیادی طور سے اہلِ سنت کے ہم مسلک رہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بچپن سے ان کے ذہن میں شاہ غلام علی کی خانقاہ سے متعلق ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے نقش بندی مزاج کا وہ رنگ اپنا اثر رکھتا تھا جو مذہبی تحقیق میں اپنا منفرد اور چونکا دینے والے انداز کا حامل بھی رہا ہے۔

اس کو محض اتفاق نہیں سمجھنا چاہیے کہ انیسویں صدی میں ہندوستان کے مختلف مذہبی افکار اور عقاید کے نمائندے صوفیہ کے کئی سلسلوں سے متعلق اور متاثر رہے ہیں۔ یہ سلسلۂ تصوّف کی سطح پر متحد تھے لیکن تعلیم اور مذہبی تحقیق کے میدان میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

تہذیب الاخلاق کے پہلے سات سالہ دور میں مباحثِ دینی پر کافی مضامین شائع ہوئے۔

تہذیب الاخلاق کے دورِ شباب میں سرسیّد کو اپنی مذہبی عقاید کے بارے میں ایک مضمون لکھنا پڑا۔ جس میں انھوں نے واضح طور سے اپنے بنیادی عقیدے بیان کیے تھے۔ شاید گھبرا کر مگر متانت کے ساتھ اس مضمون کا نام ہی انھوں نے "دافع البہتان" رکھا تھا۔ جس پر توجہ کی ضرورت اس لیے ہے کہ سرسیّد کے انتقال کے بعد علی گڑھ تحریک اور مدرسۃ العلوم مسلمانان (سرسیّد نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا یہی نام اردو میں رکھا تھا) پر سرسیّد سے نفرت کرنے والوں کا بھی قبضہ ہوتا چلا گیا اور سرسیّد کی آواز اور تحریک ایسی دب گئی کہ اب مسلم یونیورسٹی میں جب کہ تحقیق کی ہر راہ کھل گئی ہے، مگر یہ راستہ بند ہے۔

سرسیّد کے عقاید مذہبی پر سرسیّد کی حیات میں کافی لکھا گیا اور مرنے کے بعد بھی بہت کچھ لکھا گیا مگر حضرت سید الحاج مولانا مولوی علی بخش خاں صاحب بہادر نے ایک کتاب سرسیّد کے عقاید مذہبی پر "تائید اسلام" کے نام سے لکھی تھی۔ سرسیّد مخالفین کی پرواہ کم کرتے تھے، مگر مولوی علی بخش کو نہ جانے کیوں ہمیشہ اہمیت دیتے تھے۔ سرسیّد نے دافع البہتان نام کے مضمون میں اپنے عقایدِ مذہبی کے بارے میں مندرجہ ذیل باتیں خاص طور سے لکھیں۔

۱- "میرے نزدیک کوئی مذہب سوائے مذہب اسلام کے مطابق مرضیِ الٰہی کے نہیں ہے۔"

۲- مولوی علی بخش کا کہنا تھا کہ احکام معاد پر اعتقاد لانا اور صحیح جاننا مخاطب (سرسیّد) کے نزدیک مانع ترقی ہے سرسیّد نے جواب میں لکھا:
"لعنت خدا کی ہو اس پر جس نے یہ لکھا ہو اور جس کا یہ اعتقاد ہو۔"

۳- سرسیّد نے لکھا: "میرے اعتقاد میں شریعت حقہ محمدیہ خاتم شریعت ہے جیسا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبوۃ ہیں۔"

۴- سرسیّد نے تحریر کیا: "میرے عقیدے میں کوئی مسئلۂ شرعی تہذیب کے خلاف نہیں ہے اور جس تعدد ازدواج کی نسبت شرع میں اجازت ہے وہ عین تہذیب ہے۔"

۵- سرسیّد نے وضاحت کی "نعیم جنت و وعیدِ جہنم اور بعث بعد الموت پر میں اعتقاد رکھتا ہوں۔"

۶- سرسیّد نے مزید لکھا "بلاشبہ میرا اعتقاد ہے کہ جس قدر کہ فرائض مذہب اسلام میں ہیں وہ فطرت اللہ یعنی نیچر کے مطابق ہیں اور بلاشبہ صرف فرائض کا ادا کرنا اور گناہوں سے بچنا بہشت میں جانے کو کافی ہے۔"

۷- سرسیّد نے تحریر کیا کہ "خدا اس قول پر میرا خاتمہ کرے کہ بعد ادائے فرائض کوئی عبادت قومی بھلائی میں کوشش کرنے سے بہتر نہیں ہے۔"

۸۔ سرسید نے لکھا کہ " بلاشبہ میری سمجھ ہے کہ قرآن مجید کے معنی اس طرح پر لینے چاہئیں جس طرح اعراب عرب سمجھتے تھے اور جن کی زبان میں قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ یہ مشرب شاہ ولی اللہ صاحب کا ہے "

۹۔ سرسید نے یہ بات بھی کہی کہ "میرا قول ہے کہ ملک کے لفظ کا قوائے انسانی پر بھی اطلاق ہوا ہے اور میں نے کسی ایسے وجود کا جو علاوہ انسان کے ہو اور ملک کا اطلاق جس پر کیا جاوے انکار نہیں کیا ہے "

۱۰۔ سرسید نے جبر و اختیار کے بارے میں لکھا۔ " میرے نزدیک بین الجبر والاختیار کوئی چیز نہیں۔ بلکہ انسان اپنی جبلت اور فطرت میں مجبور اور اپنی قدرت میں مختار ہے "

۱۱ سرسید نے لکھا۔ " میں عملِ احادیث پر بلحاظِ مراتب ان کے ثبوت لازم سمجھتا ہوں "

۱۲۔ سرسید نے تحریر کیا : " قرآن اور حدیث عمل کرنے کے لیے پڑھو اور جو مسئلہ اس میں پاؤ وہ عمل کرو۔ خواہ وہ شافعی کے مطابق ہو یا خواہ حنفی کے اور اگر عمل کرنے کے لیے نہیں پڑھتے تو اس کا پڑھنا محض بے فائدہ ہے "

۱۳۔ اور سرسید نے یہ بھی لکھا کہ " ایمان لانا بلاشبہ ذریعۂ نجات ہے۔ بخشش کے لیے اعمال پر گھمنڈ نہیں کرنا چاہیئے "

۱۴۔ " سوائے شرک کے خدا سب گناہوں کو معاف کرے گا "

غرض کہ سرسید کے مذہبی افکار اور عقائد ایسے نہیں ہیں کہ ان پر توجہ نہیں دینی چاہیئے : سرسید کے عقاید مذہبی اور افکار پر کم سے کم علمی انداز سے تحقیق علی گڑھ میں ضرور کرنی چاہیئے جواب تحقیق کا مرکز بنا چاہتا ہے۔

"ہمیشہ تعلیم سے یہ مقصود رہا ہے کہ انسان میں ایک ملکہ اور اس کی عقل و ذہن میں ایک جدت پیدا ہو تاکہ جو امور پیش آئیں ان کے سمجھنے کی برائی بھلائی جاننے کی اور عجائباتِ قدرتِ الٰہی پر فکر کرنے کی اس کو طاقت ہو۔ اس کے اخلاق درست ہوں۔ معاملات معاش کو نہایت صلاحیت سے انجام دے اور امور معاد پر غور کرے۔ گورنمنٹ کا یہ کہنا کہ ہم کو اس قدر تربیت سے کچھ علاقہ نہیں بلکہ ہم اس قدر تعلیم کے خواہاں ہیں جو امور معاش سے علاقہ رکھتی ہیں اور جو منحصر ہے صرف جغرافیہ، حساب اور ہندسہ پر، نہایت بے جا ہے "

سرسید

ابو علی

خطباتِ احمدیہ

(اردو میں سیرت کی اولین کتاب)

ہم اپنے ایک مضمون میں اپنا یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں کہ اردو میں سیرت کی جو چند اہم اور مستند کتابیں ہیں، ان میں ایک کتاب سرسیّد علیہ الرحمہ کی خطباتِ احمدیہ بھی ہے جو مشہور دشمنِ اسلام مستشرق سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کے جواب میں لکھی گئی ہے، لیکن اب تک اس کا مطالعہ ردِّ نصاریٰ یا ردِّ مستشرقین کی حیثیت سے تو ضرور کیا جاتا رہا ہے اور اسی حیثیت سے وہ شروع ہی سے دارالمصنفین کے رفقاء کے نصاب میں بھی شامل ہے، سیّد صاحب خاص طور سے رفقاء کو اس کے مطالعے کی ہدایت فرماتے تھے، سیّد صاحب (مولانا سید سلیمان ندوی ناظمِ اوّل دارالمصنفین اعظم گڑھ) کے پاکستان چلے جانے کے بعد جب مولانا شاہ معین الدین ندوی ناظم ہوئے تو وہ بھی نئے رفقاء کو اس کے مطالعے کی ہدایت فرماتے تھے، اور فرماتے تھے کہ اس کے پڑھے بغیر نہ کوئی اچھا مصنف ہو سکتا ہے نہ مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دے سکتا ہے۔

لیکن اس کا بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ یہ فنِ سیرت کی بھی ایک اچھی کتاب ہے کیونکہ اس کے متعدد خطبات سیرتِ نبوی ہی سے متعلق ہیں اور اس کا نام بھی اس کی مناسبت سے الخطبات الاحمدیہ فی العرب و سیرۃ المحمدیہ ہے۔ اس لحاظ سے اس کا شمار سیرت کی کتابوں میں بھی ہونا چاہیے بلکہ سیرت میں جو بہترین اور مستند کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں ہمارے نزدیک اولیت کا شرف اسی کو حاصل ہے۔ سرسیّد پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اردو میں عرب قبل بعثت کی تاریخ پر اتنا قیمتی اور گراں بہا مواد اکٹھا کیا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ پوری فراخ دلی کے ساتھ ان کی اس کاوش اور کوشش کا ذکر کیا جاتا اور اس کے لیے ان کی روح کو خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا۔ یہ کتاب اگرچہ فرطِ شہرت کی بنا پر تعارف سے مستغنی ہے، لیکن اس کے متعلق خواص علم تک محض یہی جانتے ہیں کہ وہ صرف سر ولیم میور کی کتاب 'لائف آف محمد' کا جواب ہے اور اس سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے جس میں خصوصیت کے ساتھ اس کی غلط بیانیوں کی تصحیح کی گئی ہے، لیکن وہ سیرت کی بھی کتاب ہے، اس کا بہت کم لوگوں کو علم ہے۔ سیرت کی مستند کتابوں کا نام لیا جاتا ہے تو قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی رحمۃ اللعالمین، مولانا شبلی کی سیرت النبی، مولانا عبدالرؤف دانا پوری کی اصح السیر، مولانا اشرف علی تھانوی کی "نشر الطیب" مولانا حفظ الرحمٰن کی رسول کریم، مولانا مناظر احسن گیلانی کی النبی الخاتم، مولانا ابراہیم سیالکوٹی کی سیر المصطفیٰ، سید امیر علی کی تنقید الکلام فی شارع الاسلام، خواجہ عبدالحی فاروقی کی ہمارے رسول، حاجی موسیٰ ذتاولی کی مولود ہالینڈ، مولانا عنایت رسول کی بشریٰ پر آ کر زبان رک جاتی ہے۔ بھولے سے بھی سرسیّد کی اس کتاب کا نام کسی کی زبان پر نہیں آتا۔ ذیل کی چند سطور میں ہم اسی حیثیت سے اس کا تعارف کرانا اور اس کے مباحث

پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

اِس کتاب کے ابتدائی تین چار خطبے عرب کے جغرافیہ، عرب کی قدیم تاریخ، عرب کے قبائل، عرب کی قدیم قوموں عاد، ثمود، بنی اسماعیل بنی قطورہ، عرب کے رسوم، عادات، عرب کے ماقبل اسلام مذاہب یعنی بت پرستی، لامذہبیت، خداپرستی، الہامی مذہب، مذہب صابئی حضرت ابراہیمؑ اور دیگر انبیائے عرب، یہودی مذہب وغیرہ سے متعلق ہیں۔ ان ہی مباحث کو مولانا سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بیش بہا تالیف ارض القرآن کی دونوں جلدوں میں براہِ راست عبری و عربی و انگریزی ماخذ یونانی، رومی و اسرائیلی لٹریچر اور آثار قدیمہ کی جدید ترین تحقیقات سے بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ گو اس میں تاریخ و جغرافیہ و اقوام و قبائل عرب سے متعلق سر سیّد علیہ الرحمہ کی ان ابتدائی کوششوں کا ذکر نہیں ہے۔ سیرت کی پہلی جلد میں فنِ سیرت کی عربی تصانیف کا پورے استقصا کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، لیکن اردو میں اس سے پہلے جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُن سے شاید ان کی عدم اہمیت کی بنا پر تعرض نہیں کیا گیا ہے۔

چوتھے خطبے میں یہ ثابت کیا ہے کہ مذہب اِسلام تمام انسانوں کے لیے رحمت ہے، دار المصنفین سے آج سے دس بارہ سال پہلے "دین رحمت" کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی جو مولانا شاہ معین الدین ندوی کی زندگی کی آخری کتاب ہے۔ اس کے نام کے متعلق بہت زمانے تک ہمیں بڑا تذبذب تھا کہ آخر اس کتاب کا یہ نام کیوں رکھا گیا ہے کہ قرآن عظیم میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تو رحمۃ اللعالمین کہا گیا ہے:

"اے رسولؐ! ہم نے تم کو تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے"

لیکن نفسِ اِسلام کو نہ تو قرآن میں کسی جگہ اور نہ حدیث کے پورے ذخیرے میں دین رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے، تو ہم نے سمجھا کہ فاضل مصنف نے کیا عجب ہے کہ اپنی کتاب کے لیے نام اِسی خطباتِ احمدیہ سے مستعار لیا ہو کہ جس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے اور آپؐ کی ذات تمام کائنات انسانی وغیر انسانی کے لیے سراپا رحمت تھی، اسی طرح آپؐ جو دین لائے تھے وہ بھی آپ کی ذات ہی کی طرح اپنی تعلیمات کے اعتبار سے خیر و برکت کا خزانہ اور تمام کائنات کے لیے یکسر رحمت ہے۔ حضور اقدس کی زندگی میں جن لوگوں نے اس دین کو قبول کیا اور آپؐ کے بعد بھی جن لوگوں کو اس کے قبول کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، اس کے مظاہر ان کی زندگیوں کے مرقع میں آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں کہ اس کے قبول کرنے کے ساتھ ہی اُن کی کیا کایا پلٹ ہو جاتی ہے اور وہ اپنے عادات و اطوار و اخلاق کے لحاظ سے "فرشتہ" آسمانی نظر آنے لگتے ہیں۔ آج بھی جو اس دین کو صدق دل کے ساتھ قبول کرتا ہے تو اس میں بھی اِسلام کی پوری روح اور رحمت کی پوری صفت اس کی ہر ہر ادا میں سرایت کر جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دین خود اسی پر اترا ہے وہی اس کا حامل اور اس کا مبلغ ہے۔ مگر جہاں تک ہم کو معلوم ہے کہ اس کتاب کی تالیف کے وقت عربی ماخذ کے علاوہ مولانا سیّد سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی کی چھٹی جلد جو اخلاق پر ہے اور ڈپٹی نذیر احمد کی الحقوق والفرائض وغیرہ تو ضرور مصنف کے پیش نظر تھی لیکن اس کتاب کے مطالعے یا اس سے استفادہ کا شاید ہی ان کو خیال آیا ہو، اس کو محض توارد ہی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح جب مولانا ابوالحسن علی ندوی نے سیرت میں اپنی عربی کتاب السیرۃ النبویہ کا اردو میں ترجمہ کرایا، تو اس کا نام بھی بجائے رسول رحمت کے نبی رحمت رکھا۔ قرآن مجید میں رسول کے مشتقات کے ساتھ تو رحمت کا لفظ ضرور آیا ہے لیکن نبی کے مشتقات کے ساتھ پورے قرآن میں کہیں رحمت کا لفظ نہیں آیا ہے۔ اس لیے یہ نام بھی ہمیں کچھ عجیب سا معلوم ہوا۔ مولانا غلام رسول مہر کی اردو میں سیرت کی کتاب کا نام رسول رحمت ہے جو بہت مناسب ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے بچوں کے لیے عام فہم اردو میں سیرت کی کتاب لکھی تو اس کا نام 'رحمتِ عالم' رکھا۔ جو بے حد بلیغ اور قرآن کے عین مطابق ہے۔

ساتواں خطبہ قرآن پر ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے

کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر کس طرح قرآن نازل ہوا۔ اس کی کتابت اور حفظ کا کیا طریقہ تھا۔ سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کس طرح ہوئی، اور کس نے کی، قرآن کا سات قراتوں میں نازل ہونا۔ حضور خود بھی تلاوت فرماتے تھے اور صحابہؓ کو بھی اس کے پڑھنے اور تلاوت کرنے کی ہمیشہ ہدایت فرماتے تھے۔

قرآن مجید کی آیات کے ناسخ و منسوخ ہونے کا بیان، حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ خلافت میں جو کل ڈھائی برس رہا، کس طرح جمع ہوا، حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں تمام قلمرو اسلامیہ میں کس طرح تقسیم ہوا، قرآن مجید کا اپنا طرز بیان ہی اس کے الہامی اور منجانب اللہ ہونے کو ثابت کرتا ہے۔ آخر میں سر ولیم میور اور دوسرے یورپین مورخوں نے قرآن کے متعلق جو غلطیاں کی ہیں، ان کی نشان دہی کی ہے اور ان کی تصحیح کی ہے۔

آٹھواں خطبہ خانہ کعبہ کی تعمیر کی تفصیلات پر ہے۔ نویں خطبے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ حضرت ابراہیمؑ تک لکھا ہے اور آخر میں اپنا نسب نامہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک لکھا ہے۔ دسویں خطبے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تورات اور انجیل کی تمام بشارتوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ گیارہویں خطبے میں شق صدر اور معراج کا بیان ہے۔ بارہویں خطبے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے لے کر آپؐ کی بارہ برس کی عمر تک کے حالات ہیں ان ہی بارہ خطبوں پر یہ کتاب مشتمل ہے۔

اس کے دیباچے میں عربی میں سیرت پر جو اہم کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ محدثین میں سے کسی نے اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات پر کوئی مرتب اور مستقل کتاب نہیں لکھی، لیکن ان کا امت پر یہ بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اپنی جوامع اور مسانید میں ان حدیثوں کو جمع کر دیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے متعلق ہیں۔ ان حدیثوں سے آپ کی زندگی کے صحیح حالات معلوم کیے جا سکتے ہیں اور آپ کی زندگی کا ایک معتبر تذکرہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔

محدثین میں صرف امام ترمذی نے جو صحاح ستہ کے مرتبین میں شامل ہیں اپنی مشہور کتاب جامع صحیح ترمذی کے سوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں بھی ایک کتاب لکھی ہے جو شمائل ترمذی کے نام سے مشہور ہے۔ مگر اس میں آپؐ کی زندگی کے تمام حالات مندرج نہیں ہیں۔ بلکہ صرف آپؐ کے حالات و شمائل اخلاق کے ذکر ہی تک محدود کر دیا ہے، مگر ہے وہ بہت ہی مستند اور معتبر۔

ان حدیث کی کتابوں کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جو کتب سیر کے نام سے موسوم ہیں۔ مثلاً ابن اسحاق، ابن ہشام، طبقات واقدی طبری، سیرۃ شامی، ابوالفداء، مسعودی اور مواہب لدنیہ وغیرہ عربی کی ان اہم کتابوں کے علاوہ عربی و فارسی دونوں زبانوں میں اور بھی کتابیں لکھی گئی ہیں جو تمام تر ان ہی مذکورہ بالا کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

مسلمان مورخوں اور سیرت نگاروں کے علاوہ عیسائی مورخوں نے بھی اسلام اور بانی اسلام کے متعلق بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں لیکن ان میں سوائے سخت کلامی اور بدزبانی کے اور کچھ نہیں ہے۔

ان کتابوں میں سب سے عمدہ کتاب وہ ہے جو سر ولیم میور صاحب نے نہایت لیاقت، قابلیت اور کمال خوبی کے ساتھ لکھی ہے اور چار موٹی موٹی جلدوں میں ہے۔ سر ولیم کو مغربی علوم کے ساتھ مشرقی علوم میں بھی بڑا درک حاصل تھا اس وجہ سے یورپ کے ملکوں میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی گئی، مگر اس کی تمام تر بنیاد واقدی کے بیانات پر ہے جو مسلمانوں میں درجہ اعتبار نہیں رکھتا۔ اگرچہ سر ولیم میور صاحب نہایت نیک طبیعت اور قابل توصیف لیاقت رکھتے ہیں، لیکن انھوں نے اسلام اور بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم

ے حالات بہت توڑ مروڑ کر لکھے ہیں جس سے آپؐ کی سیرت بالکل
مسخ ہوکر رہ گئی ہے۔ اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ اس کا رد
لکھا جائے اور صحیح حالات پر مشتمل سیرت کی کتاب لکھی جائے۔ یہ
خطبات احمدیہ میری اسی خواہش کی تکمیل ہے۔"

سر ولیم میور صوبہ متحدہ یعنی اضلاع شمال وجنوب کے لفٹنٹ
گورنر تھے اور سرسید بنارس میں سب جج کے منصب پر سرفراز تھے
ان سے اور دیگر انگریز دوستوں سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔
مسلمانوں کو انگریزوں سے معاشرتی وتمدنی روابط وتعلقات قائم
کرنے کے لیے "احکام طعام اہل کتاب" بھی لکھی تھی، جس سے مسلمان
ان سے بدظن ہوگئے تھے۔ یہاں تک کہ ان کو کرسٹان تک کہنے لگے تھے
علماء کا گروہ ان کے بعض تفردات کی وجہ سے پہلے سے بدظن تھا، لیکن پھر
بھی سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" شائع ہوئی تو سرسیدؒ کی
حمیت اسلامی بھڑک اٹھی۔ اس کتاب کا مطالعہ کیا تو اُن کو محسوس
ہوا کہ اسلام کی سیدھی سادی اور عمدہ باتیں بھی سر ولیم میور کو بری
معلوم ہوئیں۔ وہ اس کا جواب لکھنے کے لیے بے چین ہوگئے اور اس
کے خلاف ان کے دل میں جو احساسات پیدا ہوگئے تھے ان کا اظہار
بھی کرنے لگے تھے۔ لیکن سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کے لیے جن
کتابوں کی ضرورت تھی وہ یہاں دستیاب نہیں تھیں۔ اس لیے
ان کو ولایت جانے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ بعض خیرخواہ سرکاری
عہدے داروں کے منع کرنے کے باوجود لندن چلے گئے اور اپنی
ملازمت کو خطرے میں ڈال دیا۔ برطانوی حکومت سے اپنی سالہا
سال کی وفاداری کی ذرہ برابر پرواہ نہیں کی۔ اسی دوران میں
اپنے صاحبزادے سید محمود کو تعلیم کے لیے لندن بھیجنے والے تھے، ان
کے لیے سرکاری وظیفہ کا بھی مسئلہ ان کے پیش نظر تھا۔ لیکن سر ولیم
میور کی کتاب کا جواب لکھنے کا خیال سب پر غالب تھا۔ دوسرا کوئی
ہوتا، تو شاید ان ذاتی مصلحتوں کو نظرانداز نہ کرتا۔ لیکن انھوں نے
پوری عزیمت کے ساتھ سارے مصالح کو نظرانداز کر دیا، اور لندن
پہنچ گئے۔ انڈیا آفس کے کتب خانے اور برٹش میوزیم لائبریری
سے استفادہ کے علاوہ سیر وتاریخ کی بہت ساری کتابیں جو
مصر و فرانس اور جرمنی میں چھپی تھیں منگوائیں اور لیٹن اور انگریزی
کی نایاب قدیم کتابیں گراں قیمت پر لندن کے بازار سے خریدیں۔

اس کتاب کی تالیف کے دوران میں ان کے جو جذبات
تھے اور اُن کو جو مالی مشکلات درپیش تھیں، ان کے متعلق وہ
محسن الملک کو لکھتے ہیں:

> "ولیم صاحب کی کتاب کو دیکھ رہا ہوں، اس
> نے دل کو جلا دیا۔ اس کی ناانصافیاں اور تعصبات
> دیکھ کر دل کباب ہوگیا اور مصمم ارادہ کرلیا کہ
> آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں کتاب
> لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہوجائے
> اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہوجاؤں تو
> بلا سے۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

> "کسی مہاجن سے میرے لیے ہزار روپے قرض
> لیجیے... ایک صاحب کو دلی خط لکھا ہے کہ میرا
> اسباب اور میرے ظروف مسی فروخت
> کرکے ایک ہزار روپیہ بھیج دو۔"

اس کی طباعت میں چار ہزار کی لاگت آئی۔ اپنا ذاتی روپیہ
اور قرض کا روپیہ سب اس کے نذر ہوگیا۔ اسی دوران میں
ان کی صاحبزادی کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس سے ان کی مالی
پریشانیاں اور زیادہ بڑھ گئیں۔ وہ اس کتاب کو مکمل کرکے
انگلستان سے روانہ ہوئے تو آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ
اُن کے پاس زادِ راہ کے لیے کچھ باقی نہیں رہ گیا تھا، بہت
بے سروسامانی کے عالم میں کسی طرح ہندوستان واپس
آئے۔ لیکن ان کو اپنے اس کارنامے پر اتنی خوشی اور اطمینان
تھا کہ لکھتے ہیں کہ:

> "سر ولیم میور اور دوسرے مستشرقین نے اب
> تک جو کچھ لکھا ہے، سب کے ایک ایک حرف کا جواب
> اتنا محققانہ ہے کہ ہر شخص خواہ وہ کتنا ہی بے دین

ہو پکار اٹھے گا کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے۔"

ریورنڈ ہوپر نے اس کتاب پر ان الفاظ میں اظہارِ خیال کیا ہے:

"میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برسوں میں سیّد احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو۔"

اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مناظرانہ، مخاصمانہ، معاندانہ مجادلانہ طریقے کے بجائے ہمدردانہ، دوستانہ مصلحانہ اور غیر متعصبانہ طریقے پر لکھی گئی ہے، اس میں کہیں بھی آپ کو جذباتیت، غصہ، غضب، طنز و تعریض کا شائبہ تک نظر نہ آئے گا۔

ایک خصوصیت اس کی سادگی بیان اور منصفانہ طریقِ استدلال ہے اور اپنے مخاطب کو جواب دیتے ہوئے انتہائی شرافت، نرم خوئی اور ہمدردانہ لہجہ پوری کتاب میں برقرار رکھا ہے۔

اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سرسید نے اسلام کی حمایت اور مختلف اعتراضوں کے جواب میں جمہور علماء ہی کے مسلک کی ترجمانی کی ہے جس کی وجہ سے اس کتاب کی افادیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے اور مسلمانوں کے کسی فرقے نے بھی آج تک اس سے اختلاف کا اظہار نہیں کیا اور پھر اس کتاب کے وقت تک اسلام کے بعض مسائل کے متعلق جمہور کے مسلک سے الگ ان کے دل میں وہ خیالات پیدا نہیں ہوئے تھے جن کا اظہار بہت بعد میں اپنی تفسیر احمدیہ میں کیا ہے جس سے جمہور علماء ان سے بدظن ہو گئے تھے۔

"دنیا میں کسی قوم کی ترقی کے یہی
دو نشان ہیں۔ ایک یہ کہ وہ یہ
سمجھنے لگیں کہ وہ ذلت اور خرابی
میں مبتلا ہیں اور دوسرا نشان
یہ ہے کہ اس ذلت سے نکلنے کی
کچھ کوشش شروع کر دیں"

سرسیدؒ

حکیم محمد حسین خاں شفا

سر سید کی تفسیرِ قرآن میں نعتِ رسولِ کریم ﷺ

کچھ کیفیتیں اور لذتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کو آدمی محسوس تو کرتا ہے لیکن اُن کا الفاظ میں اظہار آسان نہیں ہوتا۔ اسی قسم کی لذتوں میں سے ایک لذت القا ر یا الہام بھی ہے۔ "اہلِ دل" اور "خاصانِ خدا" کا کہنا ہے کہ جب عبادت و ریاضت یا تدبر و تفکر کے دوران ایک استغراقی کیفیت طاری ہوتی ہے اور وجدانِ سلیم "عالمِ سفلی" سے ملاءِ اعلیٰ اور پھر مبدا فیاض سے مل جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں انسان کو "انکشافِ حق" یا "دیدارِ حق" میسر آجاتا ہے۔ اس لمحے اسے یقین ہوتا ہے کہ زندگی کا بھید مل گیا، عقدۂ لاینحل کھل گیا، معراج ہوگئی۔ اس کیفیت کے دوران کبھی کبھی صاحبِ کشف ایسی باتیں کہہ جاتا ہے یا ایسے کام کر جاتا ہے کہ جو عام انسانوں کی سمجھ و صلاحیت سے بالاتر ہوتے ہیں۔ بلکہ بلا کیفیت اور بالقصد صاحبِ کشف بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ اس کی مثالیں بہت ہیں۔ کاملین و عابدین کی حیات و ملفوظات میں اس قسم کے واقعات بھرے پڑے ہیں۔

سر سید احمد خاں کی زندگی میں بھی ایک واقعہ کچھ اسی قسم کا پیش آیا، جس کا ذکر انھوں نے اپنی مرتبہ "تفسیرِ قرآن" میں کیا ہے۔ سر سید اپنے مذہب اور قوم پر فدا تھے۔ انھوں نے سیرتِ رسولِ اکرم ﷺ اور تفسیرِ قرآن اس جذبے کے تحت تصنیف کی تھیں کہ یورپ کی نشاۃِ ثانیہ کے بعد مغربی افکار کی یلغار اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا سائنسی ذہن و معقولیت پسندی کہیں حال و مستقبل کی نسل کو اسلام اور اسلامی تعلیمات سے برگشتہ نہ کر دے۔ جیسے قدماء کی غلط تشریحات اور فلسفۂ یونان کی روشنی میں اسلامی عقائد کی تعبیرات نے پہلے ہی مشکوک بنا دیا تھا۔ تدبرِ قرآن کے دوران سر سید کو حیات بعد ممات، حشر اجساد، جزا و سزا وغیرہ ایسے عقائد پر غور کرنا پڑا جن کی معقول و عصری ذہن کے لیے قابلِ قبول تشریح سے سر سید کی عقل قاصر تھی۔ ان مسائل پر غور کرتے ہوئے سر سید پر استغراقی کیفیت طاری ہوئی اور انھیں یہ محسوس ہوا کہ خود شارحِ اسلام ﷺ ان مسائل کے رموز و نکات سر سید کو بتا رہے ہیں، جن سے ان کا ذہن مطمئن ہوگیا اور پھر انھوں نے ایک بحث روح سے متعلق سورۃ الاعراف میں صفحہ ۳۰ سے ۳۵ تک تحریر کی اور اپنے نزدیک ان مسائل کو عقل کی روشنی میں جدید ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے حل کر دیا۔ سر سید نے اس بحث میں عقل و نقل، سائنس اور مذہب کے امتزاج سے نئی نسل کو ایک راستہ دکھایا جس پر بعد کے مفسرین نے عمارت تعمیر کی۔ چوں کہ سر سید کے ذہن میں یہ تھا کہ وہ پہلی مرتبہ غیبی اشارے سے ان مسائل کو حل کر رہے ہیں اور انھیں اس اہم کام میں اپنے مورثِ اعلیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید حاصل ہے۔ اس بنا پر اس بحث کے اختتام پر ہدیۂ تشکر کے طور پر فی البدیہہ ایک فارسی نعت موزوں ہوگئی۔ جس کو انھوں نے اسی بحث میں تحریر کر دیا تاکہ یادگار رہے۔

سرسید نے جس زوال پذیر زمانے میں جنم لیا تھا اس میں
بلی خود فریبی اور شعر و شاعری عام تھی۔ ابتدائے جوانی میں رسم زمانہ
موافق آہی تخلص[2] رکھ کر سرسید نے بھی شاعری شروع کی چنانچہ
چند تذکروں میں ان کا ذکر ملتا ہے[3]۔ لیکن جلد ہی سرسید نے
نبضِ زمانہ اور ضروریات ملک و قوم کو سمجھ لیا اور اپنا وقت فلاحی
کاموں میں صرف کرنا شروع کر دیا جس نے انھیں زندۂ جاوید بنا دیا۔
عالم ہوش و خرد کی غالباً یہ سرسید کی پہلی اور آخری نعت ہے جو تفسیر
قرآن کا جز ہونے کی وجہ سے عام نظروں سے اب تک اوجھل تھی
ہم اسے مع اردو ترجمے کے پیش کر رہے ہیں۔
اس نعت سے قبل بطور شانِ نزول سرسید نے تحریر کیا ہے:
"کچھ حقائق ہیں جو نہ حکمت یونان میں پائے جاتے ہیں اور نہ
فلسفہ علم کلام میں۔ بلکہ یہ انوار ہیں مشکوٰۃ نبوت محمدی صلی اللہ
علیہ وسلم کے جو بلا واسطہ سفینۂ سینۂ منور محمدیؐ سے سینۂ اہری
یعنی "میرے سینے" میں پہنچے ہیں گو کہ نابلدان کوہِ حقیقت
ان انوار محمدیؐ کو نعوذ باللہ کفر و زندقہ سے تعبیر کریں۔"
اس کے بعد سرسید نے لمؤلفہ کہہ کر اپنی یہ نعت لکھی ہے۔

نعت

فلاطون طفلکی باشد بہ یونانی کہ من دارم
مسیحا رشک میدارد بہ درمانی کہ من دارم
زکفر من چہ میخواہی ز ایمانم چہ می پرسی
ہمان یک جلوۂ عشق است ایمانی کہ من دارم
خدا دارم دلِ بریان زعشق مصطفےٰ دارم
ندارد ہیچ کافر ساز و سامانی کہ من دارم
ز جبریل امین قرآن بہ پیغامی نمی خواہم
ہمہ گفتار معشوق است قرآنی کہ من دارم
فلک یک مطلع خورشید دارد باہمہ شوکت
ہزاران این چنین دارد گریبانی کہ من دارم
ز برہان تا بہ ایمان سنگ ہا دارد رہ واعظ
ندارد ہیچ واعظ ہمچو برہانی کہ من دارم

ترجمہ

۱ میرے پاس جو یونان ہے اس میں افلاطون ایک بچے کی حیثیت رکھتا ہے۔
میرے پاس جو علاج ہے اس پر مسیحا بھی رشک کرتے ہیں
۲ تم میرے کفر سے کیا چاہتے ہو، میرے ایمان کے بارے میں کیا پوچھتے ہو۔
میرے پاس جو ایمان ہے وہ اسی عشق کا ایک جلوہ ہے
۳۔ میں خدا رکھتا ہوں عشق مصطفےٰ میں جلا بھنا دل رکھتا ہوں۔
میرے پاس جو ساز و سامان ہے وہ کوئی کافر نہیں رکھتا
۴۔ میں جبریل امین سے قرآن کا پیغام سننا نہیں چاہتا۔
میرے پاس تو وہ قرآن ہے جو مکمل میرے محبوب کی زبان سے ادا ہوا ہے
۵۔ آسمان کے پاس اس قدر شان و شوکت کے باوجود صرف ایک خورشید ہے۔
لیکن میرے گریبان میں اس جیسے ہزاروں سورج موجود ہیں
۶۔ واعظ عقل و دلائل سے میلوں کے پھیرے ایمان تک پہنچتا ہے۔
لیکن میرے پاس جو دلائل ہیں وہ کسی واعظ کے پاس نہیں ہیں۔

حواشی

۱۔ تفسیر القرآن۔ ص ۱۱۲ سورۃ الاعراف۔ جلد سوم۔ نول کشور لاہور
۲۔ گلستان سخن مطبوعہ ۱۲۷۱ھ میں سرسید کا بحیثیت شاعر صفحہ ۱۲۷ سے ۱۳۰ تک تذکرہ ہے۔
۳۔ سرسید کی چند فارسی غزلیں مختلف کتابوں میں منفرد اشعار کئی کتابوں میں ساتھ اول و آخر میں اور کچھ طویل منظومات بھی ہماری نظر سے گزری ہیں سرسید کی نو دریافت کتاب "فقرات" مرتبہ راقم الحروف میں بھی ایک شعر ہے۔

شباب الدین

سر سیدؒ — مشاہیر کی نظر میں

ہمہ جہت شخصیات کا طرۂ امتیاز یہ ہوتا ہے کہ ان کے افکار و خیالات سے کئی کئی نسلیں اپنے چراغ روشن کرتی ہیں، کسی نسل کے نزدیک ان کی اہمیت و معنویت ان کے کارناموں کے کسی پہلو میں مضمر ہوتی ہے تو کسی دوسری نسل کے نزدیک اس شخصیت کا کوئی دوسرا ہی پہلو جاذب نظر اور قابل تقلید ہوتا ہے۔ سر سیدؒ کی شخصیت بھی ان ہی ہمہ جہت شخصیات میں سے ہے جس سے کئی نسلیں متاثر ہوئی ہیں۔ ان کے افکار و نظریات ان کے معاصرین کے لیے بھی چراغ راہ گذر تھے اور ان کے بعد آنے والی نسلوں کے لیے بھی۔ عہدِ حاضر میں بھی بہت سے ایسے افراد موجود ہیں جو سر سیدؒ کے فکری چراغ سے اپنا چراغ جلاتے ہیں اور اسی کی ضو فشانی میں اپنی زندگانی کا سفر تمام کرتے ہیں۔

سر سیدؒ کی زندگی کا سب سے تابناک پہلو یہ ہے کہ انھوں نے تصادم کا نہیں بلکہ مفاہمت کا راستہ اختیار کیا اور اسی کے ذریعے انھوں نے کٹھن سے کٹھن سفر کو بھی بڑی سبک گامی سے طے کر لیا۔ مفاہمت کے معنیٰ یہ نہیں ہوتے کہ انسان "جرأت انکار" کھو بیٹھے اور دوسروں کی ہر بات پر آمنّا و صدّقنا کہتا چلا جائے۔ مفاہمت کے اصل معنیٰ یہ ہوتے ہیں کہ بلا سبب تصادم سے گریز کیا جائے اور ہر آن ہر لمحے حزبِ اختلاف کا فریضہ انجام دینے کی کوشش نہ کی جائے۔ سر سیدؒ کی زندگی میں بہت سے لمحات ایسے بھی آئے جہاں ان کو اپنی جرأتِ انکار سے کام لینا پڑا۔ طوالت کا یہ محل نہیں، اس مقام پر صرف یہ یاد دلانا کافی ہے کہ جب سر سیدؒ نے سائنٹفک سوسائٹی اور مدرسۃ العلوم قایم کیا، تو مسٹر کیمپسن ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن اس بات کے متمنی ہوئے کہ ان دونوں اداروں پر کسی نہ کسی شکل میں ان کا غلبہ رہے۔ سر سیدؒ اگرچہ عام حالات میں مفاہمت کا راستہ اختیار کرنے کے عادی تھے مگر اس موقع پر انھوں نے جرأت انکار سے کام لیتے ہوئے سوسائٹی اور مدرسۃ العلوم پر ان کا یا کسی دوسرے انگریز کا غلبہ نہ ہونے دیا۔ سر سیدؒ کے طریق مفاہمت کو بعض کم نظر آج بھی تملق و چاپلوسی قرار دیتے ہیں۔ ان کی نظر اس حقیقت پر مطلق نہیں پڑتی کہ سر سیدؒ کے نزدیک "عزتِ نفس" ہر چیز سے زیادہ ارفع و اعلیٰ تھی۔ انھوں نے اپنے انتقال سے تقریباً آٹھ برس قبل ایک جلسۂ عام میں کہا تھا۔

> "ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پرواہ نہ کرنی چاہیے اور اگر ہم میں سلف رسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر لوگوں کی رایوں پر نہیں"[1]

درج بالا بیان سے یہ نتیجہ صاف طور سے نکالا جا سکتا ہے کہ مفاہمت کی راہ اپناتے ہوئے آزادیٔ رائے کو برقرار رکھا جا سکتا ہے، اسی کے لیے جیا اور مرا جا سکتا

[1] خطبہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۹۱ء

ہے، مگر مفاہمت کی راہ کا دامن ہاتھوں سے نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس کے برعکس تصادم کا راستہ عقلی اندھے پن کا راستہ ہے، فکری دیوالیہ پن کا راستہ ہے، نظر کی کمی کا راستہ ہے، مخالفت برائے مخالفت کا راستہ ہے، جس مخالفت کا منشا و مقصود صرف اپنے فریق کی رائے کی مخالفت ہی ہو، اس کی قدر و قیمت معلوم، سرسید کی زندگی کے اس پہلو نے مختلف لوگوں کو مختلف طریقوں سے متاثر کیا ہے۔

درج ذیل سطور میں ہم چند ارباب فکر و نظر کی وہ رائیں نقل کر رہے ہیں جو انھوں نے سرسید کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ظاہر کی ہیں۔ یہاں پر اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ ہم ان رایوں کو "سفارشی اسناد" کی حیثیت سے نہیں پیش کر رہے ہیں۔ سرسید کی عظمت و بلندی ان رایوں کی محتاج نہیں ہے۔ ان کو نقل کرنے کا اصل مقصد یہ دکھانا ہے کہ کس طرح ان کی شخصیت سے ان کے معاصرین اور پھر ان کے بعد آنے والے ارباب فکر و نظر متاثر ہوتے رہے اور آج بھی متاثر ہو رہے ہیں۔

مولانا حالی

"کسی بزرگ کا قول ہے کہ "اچھے دوست کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گنجان میوہ دار درخت کہ جب تک سرسبز ہے، اس کے سایہ میں راحت ملتی ہے اور اس کے پھل سے لذت حاصل ہوتی ہے اور جب خشک ہو گیا تو اپنی لکڑی سے طرح طرح کے فائدے پہنچاتا ہے۔" یہی مثال ہمارے ہیرو سرسید کی تھی، وہ سبھی مسلمانوں کا ایسا ہی دوست تھا، جب تک زندہ رہا، اپنے ہاتھ پاؤں، زبان، قلم، جان اور مال سے ان کی مدد کرتا رہا، اور جب مر گیا تو اپنی محبت اور اپنے کام کی عظمت کا نقش لوگوں کے دلوں میں یادگار چھوڑ گیا تاکہ ان کی بھلائی کا کام، جو اس نے ادھورا چھوڑا ہے اس کو سب مل کر پورا کریں۔"

محسن الملک مہدی علی خاں

"سنہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں مرحوم [سرسید] نے جس قومی خیر خواہی کے ارگن کو بجایا دم واپسیں تک اس کی آواز منقطع نہیں ہوئی اور ایک سے ایک بڑھ کر نغز، دلکش اس سے نکلتا چلا آیا، جہاں جہاں وہ سرکاری خدمات کے تعلق سے رہے ان کے آثار حمیدہ مدرسے اور سوسائٹیاں وغیرہ وہاں موجود ہیں اور ظاہر کرتے ہیں کہ ایک قومی خیر خواہ اور ایک قومی ریفارمر نے ان کی بنیاد ڈالی ہے، مگر سب سے بڑا اور بہت بڑا احسان جو انھوں نے قوم پر کیا، ملک پر کیا، سرکار پر کیا، ان پر کیا جو اب موجود ہیں اور ان پر کیا جو آگے پیدا ہوں گے، وہ علی گڑھ کالج کا جاری کرنا تھا، انھیں کا فکر تھا، صحیح و صائب کہ اس نے ایسے کالج کی ضرورت کو سمجھا اور انھیں کی ہمت تھی بلند و وسیع کہ اس کے بنانے اور جاری کرنے کا ارادہ کیا اور انھیں کا استقلال تھا متین و مستحکم کہ جو سوچا تھا اور اس کا ارادہ کیا تھا، کر دکھایا۔"

پروفیسر آرنلڈ

" تاریخ سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں بڑے آدمی اکثر گزرے ہیں لیکن ان میں بہت کم ایسے نکلیں گے جن میں یہ حیرت انگیز اوصاف اور

لیاقتیں مجتمع ہوں وہ (سرسید) ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق، علم کا حامی، قوم کا سوشل رفارمر پولیٹیشن، مصنف اور مضمون نگار تھا۔ اس کا اثر اس سوچنے والے عالم کا سا نہ تھا جو گوشۂ تنہائی میں بیٹھا اپنی تحریروں سے لوگوں کے دل اکسائے بلکہ وہ علانیہ دنیا کے سامنے لوگوں میں لوگوں کا رہبر بن کر آیا اس لیے آیا کہ جس بات کو سچ اور صحیح سمجھے۔ اگر اس کی دنیا مخالف ہو تو ساری دنیا سے لڑنے کے لیے ہر وقت آمادہ اور تیار رہے۔ ہندوستان میں ایسے شخص کی مثال جیسا کہ وہ تھا کہاں مل سکتی ہے کہ نہ جاہ و مرتبہ تھا اور نہ دولت تھی، باوجود اس کے ہندوستان میں مسلمانوں کی قوم کا سردار بن کر ظاہر ہوا، یہ وہ مرتبہ ہے جو اس سے پہلے کسی شخص کو بغیر تلوار کے زور سے حاصل نہیں ہوا۔"

علامہ شبلی

"سید احمد خاں اپنے پروردگار کے جوارِ رحمت میں چلے گئے، دیکھو ہماری قومی عمارت کے ستون ہل رہے ہیں، میں کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن اس وقت طاقتِ گویائی کہاں سے لاؤں۔"

تھیوڈر بیک

"ان (سرسید) کے اندر بڑی صلاحیتیں تھیں لیکن اس سے زیادہ ان کا اعلیٰ اخلاق تھا۔ مجھے پورے انگلستان اور ہندوستان میں کوئی شخص ایسا نہیں ملا جس نے میرے اندر اپنے لیے اتنا جذبۂ پسندیدگی اور عزت

پیدا کیا ہو۔"

راجہ جے کشن داس

"یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب تک کوئی سہل طریقہ علوم و فنون مروجہ یورپ کے حاصل ہونے کا سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن اب جو یہ تدبیر یعنی تقرر سینٹیفک سوسائٹی کا سید احمد خاں صاحب نے اپنی عالی ہمتی سے محض اپنے ہم وطنوں کی بھلائی کے لیے کیا ہے۔ یہ نہایت عمدہ تدبیر ہے۔ اس میں صرف تھوڑا صرف کرنے سے آپ کو اور اپنی اولاد کو اور اپنے جمیع ہم وطنوں کو نہایت عمدہ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔"

حسام الملک نواب سید علی حسن خاں

"مجھ کو متعدد مرتبہ سرسید مرحوم سے جلوت و خلوت میں ملنے کا اور ان کے حکیمانہ اور فلسفیانہ اقوال اور مذہبی خیالات سے مستفید ہونے کا اور ان کی تالیفات و مضامین پر غور کرنے کا موقع ملا۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ یورپ کے علوم جدیدہ کے مقابل میں سرسید مرحوم نے ایک جدید علم کلام کی بنیاد ڈالی اور انگریزی خواں تعلیم یافتہ گروہ کو ہاویہ کفر و ارتداد میں گرنے سے بچایا اور دین الفطرۃ اسلام کے وقار قایم رکھنے کی جو سعی ان کے دست و قلم و زبان سے وقوع میں آئی اس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کو ان کے مقاصدِ جلیلہ میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ دنیائے علم، عالمِ اسلام میں ہمیشہ ان

کو ممتاز درجہ حاصل رہے گا اور آئندہ نسلیں ہمیشہ ان کے مساعیٔ جمیلہ کی فخر کے ساتھ شکر گزار رہیں گی۔"

سر تھیوڈور مارلین

"سر سید نے توہمات اور تنگ نظری کی مخالفت کی۔ اپنے خیالات کی وجہ سے سر سید کو بہت پریشانی اٹھانی پڑی، لیکن کوئی دھمکی ان کی ہمت کو دھیما نہ کر سکتی تھی۔ آخرکار ان کی سنجیدہ شخصیت مخالفتوں اور غلط فہمیوں پر چھا گئی اور زندگی کے آخری دنوں میں ان کا زبردست اثر رہا۔ جب علی گڑھ کالج کی مسجد میں اپنی آخری آرام گاہ میں پہنچائے گئے تو اُن کے ایک پرانے دوست نے مجھ سے کہا۔ "دوسرے لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں اور تعلیمی ادارے قایم کیے ہیں لیکن ایک پوری قوم کو تنزل سے بچا لینا ایک پیغمبر کا کام ہے۔" میرے خیال میں یہ رائے سر سید کی شخصیت اور اُن کے کام کا صحیح اعتراف ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ میں اُن سے زیادہ بڑے آدمی سے نہیں ملا۔"

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

"سر سید مرحوم اور اُن کے رفقا کے حسنِ عمل اور جانباز کوشش سے تعلیم و تربیت کے جو سامان ایم۔ اے۔ او کالج میں ہوئے اور ان کے نتائج جو ملک نے دیکھے وہ تاریخ ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد کرے گی۔"

سی۔ ایف۔ اینڈریوز اور گریجا مکرجی

"انیسویں صدی میں ہندوستان کے مسلمانوں میں سب سے زیادہ نمایاں شخصیت سر سید احمد خاں کی تھی۔ غدر کے دب جانے کے بعد مسلمانوں نے انگریزوں کے ہاتھوں سب سے زیادہ مصیبت اُٹھائی۔ اچھے اچھے خاندان تباہ ہو گئے اور شمالی ہندوستان کے بہت سے حصوں میں مسلمانوں کی حالت بڑی مایوس کن ہو گئی۔ جہالت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ مسلمان سب فرقوں سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ جس شخص نے اس مایوسی کا طلسم توڑا وہ سر سید احمد خاں ہی تھا۔"

خالدہ ادیب خانم

"سر سید احمد خاں کو کسی بھی پہلو سے دیکھا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑا سا پتھر ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا ہو۔ اس نے جو لہریں اٹھائیں وہ اب تک حرکت میں ہیں خواہ ہمیشہ اس سمت میں نہ ہوں جو سر سید پسند کرتے۔"

ایچ۔ اے۔ آر۔ گب

"مایوسی کے اندھیرے میں مسلمانوں کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو ان کو روشنی میں لے جائے اور ان کی شکستہ دنیا کی تعمیرِ نو کرے۔ یہ شخص سر سید احمد خاں کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے اس عظیم رہنما کی عظمت نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ وہ

سادگی، سچائی، بلند دماغی، مقصد کی مضبوطی، جذب دل کی گہرائی اور ذاتی کشش جیسی خصوصیات کے مالک تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ اُن کا فرقہ جدید تعلیم حاصل کرے۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر وہ اپنے کام میں لگ گئے۔

اور سترہ سال کی محنت کے بعد سنہ ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ کی زمین پر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کھولنے میں کامیاب ہو گئے۔ جس نے سنہ ۱۹۲۰ء میں ان کی امیدوں کے مطابق ایک یونیورسٹی کی شکل اختیار کی۔ انھوں نے کالج کی رسم افتتاح کے وقت اعلان کیا تھا کہ ان کو ایسے اشخاص بنانے تھے، جو فراخ دلی، بلند نظری اور پاکیزہ اخلاق کی تعلیم دیں۔ ان کو اپنے مقاصد میں زبردست کامیابی حاصل ہوئی، ان کا اٹھایا ہوا خمیر پھیل چکا ہے اور آج اس مکتب خیال کے کتنے ہی لوگ ہیں جنھوں نے جدید باتوں کو اپنایا ہے اور ماضی کی اہم چیزوں سے بھی رشتہ قائم رکھا ہے۔ جو تمام لوگ اس مکتب خیال میں شامل ہیں، جو اسلام کو مغربی علوم، اخلاقیات اور معاشیات کے قریب لانے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ وہ یہ دکھا رہے ہیں کہ اسلام ایک محدود اور غیر ترقی پسند عقیدہ نہیں ہے بلکہ ایک عالمگیر اپیل اور عملی دنیا سے ہم آہنگ ہونے کی قوت رکھتا ہے۔"

اتیچ۔ جی۔ النس

"سر سیّد کے کردار کا ایک نمایاں پہلو تھا، ان کی مکمل بے خوفی، ان کی صاف گوئی بعض اوقات تشویش ناک ہو جاتی تھی، ان کا مخاطب خواہ وائسرے ہو یا کوئی مغضوب الغضب ملّا، عیسائی مشنری یا اخباری نمایندہ، وہ وہی کہتے تھے جو واقعی ان کے دل میں ہوتا تھا۔ بدنامی، مخالفت، گالیاں، جان لینے کی دھمکیاں کوئی چیز بھی ان کو اپنے ارادے سے باز نہ رکھ سکتی تھی۔ انھوں نے مکمل غیر جانبداری سے انگریز افسروں کو ان کی بے نیازی اور اپنے ہم وطنوں کو ان کی تنگ نظری پر ملامت کی۔ غدر کے اسباب پر ان کی کتاب صاف گوئی کی ایسی ہی مثال ہے جیسا پیغمبر اسلام کی زندگی پر ان کا مقالہ۔ صرف ایسا ہی نڈر شخص سلف گورنمنٹ کے بارے میں ایسے "کڑوے جملے" بول سکتا تھا۔ سر سیّد کسی جماعت کے نہیں تھے۔ آج کے رہنما علی گڑھ کی اس عظیم شخصیت کی بے غرضی اور خلوص سے بہت اچھا سبق لے سکتے ہیں"۔

آفتاب احمد خاں

"آپ کو معلوم ہے کہ وہ شخص جس نے ہندوستان میں سب سے پہلے سوراج کی حقیقت کو محسوس کیا وہ ہمارے رہبر سر سیّد تھے۔ وہ ذات سر سیّد ہی کی تھی جس نے اس حق کا مطالبہ کیا اور سوراج کے اولین نقوش اس ملک کے صفحات پر بٹھائے۔ سر سیّد ہی نے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور اہمیت سب سے پہلے محسوس کی اور اس کی تبلیغ ایسے وقت ایسے طریقے اور ایسی زبان میں کی جو آج تک قابل یادگار ہے

حصول سوراج کی آخری منزلوں کو طے کرنے کی سعادت خواہ کسی کو نصیب ہو، لیکن اس حقیقت کا اعتراف قرینِ انصاف ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب کہ ہر اُس شخص کے لیے جو اربابِ حکومت کے اشتباہ اور عتاب کا مورد تھا، مارشل لا اور دار و رسن پذیرائی کے لیے موجود تھے صرف سرسید کی وہ ذات تھی جو قوم و ملک کے لیے سب سے پہلے سینہ سپر ہوئی۔"

جواہر لال نہرو

" سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کر دینی چاہیں۔ یقیناً درست اور صحیح تھا۔ بغیر اس تعلیم کے میرا خیال ہے کہ مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی موثر حصّہ نہیں لے سکتے تھے۔ بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہندوؤں کے مقابلے میں غیر موثر بن جائیں گے جو تعلیم میں بھی ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط تھے۔ ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں ابھی تک کوئی بورژوا طبقہ نہیں پیدا ہوا تھا۔ اس لیے نہ تو تاریخی حالات اس کی اجازت دیتے تھے اور نہ اُن کے خیالات میں کوئی ایسا انقلاب پیدا ہوا تھا کہ مسلمان بورژوا تحریک وطنیت میں شامل ہو جاتے۔ سرسید کی یہ تمام کارروائیاں جو بظاہر ہمیں معتدل قسم کی معلوم ہوتی ہیں، حقیقتاً ایک قسم کا انقلاب پیدا کرنا چاہتی ہیں۔"

مولانا ابوالکلام آزاد

"مرحوم سرسید اور ان کے ساتھیوں نے علی گڑھ میں صرف ایک کالج ہی قایم نہیں کیا تھا بلکہ وقت کی تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک ترقی پسند حلقہ پیدا کر دیا تھا۔ اس حلقے کی مرکزی شخصیت خود ان کا وجود تھا اور اس کے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہو گئے تھے۔ ہندوستان کے کسی موقت الشیوع رسالے نے شاید ہی ایسے گہرے اثرات وقت کی دماغی رفتار پر ڈالے ہوں — جیسے کہ "تہذیب الاخلاق" سے مرتب ہوئے۔"

محمد علی جناح

" سرسید احمد خاں درحقیقت ایک جلیل القدر انسان تھے — انھوں نے ایک ایسی مثال چھوڑی ہے جو ہر مسلمان کے لیے قابلِ تقلید ہے۔ دراصل وہ اپنی انتھک محنت اور جان توڑ کوشش کی ایک روایت بن گئے مسلمانانِ ہند پر ان کا بڑا احسان ہے، اپنی قوم کے ساتھ خلوص اور عقیدت کی ایک مثال بن کر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی کی حیثیت سے وہ ہر مسلمان کے دل میں ہمیشہ زندہ رہیں گے ——— وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تحریک کے پیش رو کی حیثیت سے اب بھی زندہ ہیں اور ان کی سیرت کی عظمت کو ہم آج بھی محسوس کر رہے ہیں۔"

ڈاکٹر علامہ اقبال ۔ "... غالباً (سرسید)

دورِ جدید کے پہلے مسلمان ہیں جن نے آنے والے زمانے کے ایجابی مزاج کی ایک جھلک دیکھ لی .... لیکن ان کی حقیقی عظمت اس میں ہے کہ وہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جن نے اسلام کی نئی تعبیر کی ضرورت کو محسوس کیا اور اسی کے لیے سعی کی.....''

بابائے اردو مولوی عبدالحق

''دورِ گزشتہ میں ایسی عظیم ہستی اس سے پہلے کبھی نہیں تھی نہ اس کے بعد مسلمانوں کو نصیب ہوئی۔ اس کا زبردست عزم، استقلال، بے لوث خدمت، انہماک، ایثار، اصابتِ رائے، خلوص ایسی خوبیاں تھیں جو ایک فردِ واحد میں مشکل سے جمع ہوتی ہیں۔ اس نے شکست خوردہ، افسردہ دل قوم میں بیداری پیدا کی۔ ان کے بجھے ہوئے دلوں میں نیا جوش اور ولولہ پیدا کیا۔ اپنی مدد آپ کرنا اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سکھایا، خودداری کا سبق دیا اور حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلے قومیت کا خیال اسی نے دلایا اور ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک الگ قوم کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس کے لیے اس کو بڑی بڑی مصیبتیں اور اذیتیں جھیلنی پڑیں''۔

مولانا محمد علی جوہر

''حقیقت یہ ہے کہ سرسیّد سے زیادہ وسیع الخیال اور غیر متعصب شخص ملنا محال ہے۔ انھوں نے صوبجات متحدہ کے لفٹنٹ گورنر سر ولیم میور کی ناراضگی کی پروا نہ کی اور جو سیرت رسول اکرمؐ میور نے تصنیف کی تھی، اس کا رد لکھنا شروع کیا اور اس ناتمام مگر بے مثل سیرت کے پہلے حصے خطباتِ احمدیہ کے انگریزی ترجمے کو انگلستان جا کر طبع اور شایع کردیا۔ لیکن ساتھ ساتھ مسلمان مولویوں کی مخالفت کی پرواہ نہ کرکے انھوں نے انگریزوں کے ساتھ میل جول کو برابر ترقی دی''۔

نیاز فتحپوری

'' میں سرسیّد کو غیر معمولی خدمات کے لحاظ سے صاحبِ ولایت سمجھتا ہوں۔ مگر یہ ولایت صوفیا کی سی نہ تھی جو گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر صبر و شکر اور توکل و قناعت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ —— یہ ولایت ان علما کی سی نہ تھی جن کی اخلاقی تاب و توانائی کا انحصار صرف معجزات و خوارقِ عادات کے اظہار پر ہوتا ہے۔ بلکہ سرسیّد کی ولایت تھی پیہم سعی و عمل ایک مسلسل حرکت و اضطراب ایک ہمالیہ کا سا سنگین عزم، ایک کبھی نہ خشک ہونے والی عرق آلودہ پیشانی، اور ایک آگے بڑھ کر کبھی نہ پیچھے ہٹنے والا قدم یہی وہ خصوصیات ہیں جو کارزارِ حیات میں ایک انسان کو کامیاب بناتی ہیں اور انھیں خصوصیات نے سرسیّد کو بھی غیر معمولی کامیابی بخشی''۔

امتیاز احمد

سائنٹفک سوسائٹی اور اس کی خدمات

انیسویں صدی میں ہندوستان میں شروع ہونے والی علمی، ادبی، اصلاحی اور رفلاحی تحریکوں میں سرسید تحریک (علی گڑھ تحریک) کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس تحریک کے ذریعے سرسید نے اپنے ہم وطنوں میں عموماً اور ہندوستانی مسلمانوں میں خصوصاً بیداری کی لہر پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ سرسید کی دوربین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ جس طرح انگریز مخالف اور انگریز دشمن تحریکوں نے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں کو بدترین حالت میں پہنچا دیا تھا اُسی طرح اُن کی موجودہ روش اُن کو اس اندھے کنویں میں ڈھکیل سکتی ہے جس کی تاریکی اور گہرائی کا اُن کو کوئی اندازہ نہیں ہے اس کے علاوہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی برائیوں اور کمزوریوں سے بھی بخوبی واقف تھے جس نے ان کو تباہ وبرباد کر رکھا تھا۔ اس زمانے تک علوم وفنون میں بہت ترقی ہو گئی تھی اور اقتدار کی منتقلی کی وجہ سے مختلف سطحوں پر بہت ساری تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں اور ضرورت اس بات کی تھی کہ ان تبدیلیوں کے مطابق ہندوستانی معاشرے کو ڈھالا جائے خود کو بھی تبدیل کیا جائے تاکہ پیش رفت کی راہوں پر گامزن ہوا جا سکے، لیکن ہندی مسلمان ان تمام تبدیلیوں، ترقیوں اور ان سے پیدا ہونے والی ضرورتوں سے یکسر ناواقف تھا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ دنیا کہاں سے کہاں جا چکی ہے۔ ترقی کے ہر میدان میں مسلمان میلوں پیچھے رہ گیا ہے اور عقب ماندگی کی اُس منزل میں اپنی زندگی بسر کر رہا ہے جس کے بعد تباہی وبربادی کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی وہ اسباب ہیں جنھوں نے سرسید کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ قوم کی اصلاح و فلاح کا بیڑا اٹھائیں۔ ان کے نزدیک جدید علوم سے ناواقفیت ہی قوم کی پستی وزوال کا اصل سبب تھی۔ اس لیے انھوں نے قوم کو علوم جدیدہ سے متعارف کرانے کے لیے جو سب سے پہلا عملی قدم اُٹھایا وہ سائنٹی فک سوسائٹی کا قیام تھا۔

۱۲ مئی ۱۸۶۲ء کو سرسید مرادآباد سے منتقل ہو کر غازی پور آگئے اور یہیں سے ان کی اس تحریک کا آغاز ہوتا ہے جسے ہم سرسید تحریک یا علی گڑھ تحریک کہتے ہیں۔ غازی پور کے دوران قیام ۱۸۶۲ء میں ہی انھوں نے پندرہ صفحہ کا ایک کتابچہ بہ عنوان "التماس بخدمت ساکنان ہند درباب ترقی تعلیم اہل ہند" شائع کیا۔ جس کا خلاصہ مولانا حالی کے الفاظ میں یہ ہے:

> "ہندوستان میں علم پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیے جو اپنے قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ کر کے چھاپے"[1]

اس تحریر کو لوگوں میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ جس سے ان کی ہمت بھی بندھی اور ۹ جنوری ۱۸۶۳ء کو غازی پور میں ہی انھوں نے حسبِ منشا ایک سوسائٹی "سائنٹفک سوسائٹی"

کے نام سے قایم کی۔ بعض لوگوں نے اس کے قیام کا سال ۱۸۶۲ء اور بعض نے ۱۸۶۴ء لکھا ہے لیکن مولوی عبدالحق کے ایک خطبے میں بھی اس کی تاریخ ۱۸۶۳ء ہی ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اگلے سال ۱۸۶۴ء میں اُن کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا تھا۔

۱۸۶۴ء میں چونکہ سرسیّد کا علی گڑھ تبادلہ ہو گیا اور سرسیّد کے بغیر غازی پور میں سوسائٹی کا قایم رہنا ممکن نہ تھا، اس لیے انھوں نے اپنے ساتھ سوسائٹی کو بھی علی گڑھ منتقل کیا اور تمام سامان اور اسٹاف بھی ان کے ساتھ یہیں آگیا۔ کچھ دنوں بعد سوسائٹی کے لیے ایک مستقل مکان بنانے کی تجویز ہوئی جو تقریباً تیس ہزار کی لاگت سے خاص سرسیّد کے اہتمام اور نگرانی میں تیار ہوا۔ اس کا سنگ بنیاد آنریبل ڈریمنڈ لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب کے ہاتھوں رکھوایا گیا اور ۱۴ر فروری ۱۸۶۶ء کو مسٹر ولیمس کمشنر میرٹھ کے ہاتھوں اس کا افتتاح ہوا اس موقع پر مسٹر ولیمس نے جو تقریر کی اس کے درج ذیل جملے سرسیّد کے اس کام کی عظمت کو بخوبی واضح کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا:

"سیّد احمد خاں کے اس کام کی عظمت میں مبالغہ کرنا فضول ہے۔ تم سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ یہ انہی کا کام ہے اور وہی اس جلسے کی بڑی ترقی دینے والے ہیں اور اس عمدہ عمارت کے جس کے کھولنے کے لیے ہم سب جمع ہوئے ہیں وہی بانی ہیں اخیر کلام میرا یہ ہے کہ سیّد احمد خاں نے جو محبت لوگوں کے ساتھ ظاہر کی ہے سب کے دلوں پر اس کا اثر ضرور رہے گا۔ خدا کرے یہ انسٹی ٹیوٹ اس بات کا سبب ہو کہ ہم سب ہندوستانی اور انگریز ایسے بھلے کاموں میں دل سے شریک ہوا کریں اور یہی سیّد احمد خاں کی بڑی خواہش ہے۔ پس آؤ ہم سب اُن کی مدد کریں اور اُن کا شکریہ بھی ادا کریں۔ اے خدا اس انسٹی ٹیوٹ کو سرسبز کر۔" ۱۶

اغراض و مقاصد:

سوسائٹی کے اغراض و مقاصد درج ذیل تھے۔

۱۔ ان علوم و فنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان میں یا یورپ کی کسی اور زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے، ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں۔

۲۔ ایسا کوئی اخبار، یا گزٹ یا روزنامچہ یا میگزین وغیرہ چھاپ کر مشتہر کرنا جس سے ہندوستانیوں کی فہم و فراست کی ترقی ہو سکے۔

۳۔ ایشیا کے قدیم مصنفین کی کمیاب اور نفیس کتابوں کو تلاش کر کے بہم پہنچانا اور چھاپنا۔

مذہبی یا دینی کتابوں کو اس میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔

۱۸۶۳ء میں سوسائٹی کے اغراض و مقاصد مشتہر کرنے اور پبلک کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے سرسیّد نے کلکتہ کا سفر کیا اور ۶ر اکتوبر ۱۸۶۳ء کو مجلس مذاکرہ علمیہ میں ایک لمبا لکچر فارسی زبان میں دیا اور اِن الفاظ میں لوگوں کی توجہ سوسائٹی کے اغراض و مقاصد کی طرف مبذول کرائی۔

"مگر غرض دیگر قابل گذارد نی است، و آں ایں کہ در جزو زمان ہم کیشاں و ہم کشوران ما و شما از حلیۂ تربیت عاری شدہ اند و روز بروز عاری تر می شوند۔ پس دریں زمانہ صلاح و فلاح ہم کشوران ما در آنست کہ بہر طورے کہ تواند شد در ترقی تعلیم و تربیت شاں سعی ہا نمایم و آنچہ موانع و عوائق در تربیت ہم کیشاں بودہ اند در برداشتن آں ہمہ سعی و کوشش ہا کنیم۔ مردمان ایں زمانہ کہ تربیت ہم کیشاں ما را کہ بہ نظر حقارت می بینند باعث اصلی او ایں است کہ اکثر ہمدلان ما بآن کہ

در علوم باستانی ید طولیٰ دارند در علوم و فنون جدیدہ کہ مایہ نازش نوجوانان این زمانہ است عاری اند۔ پس نگریستنی است کہ باعث اینچنین ناواقفیت از علوم و فنون جدیدہ مفیدہ چیست۔ گویم کہ آں ہمہ علوم بہ زبان انگریزی اند و ہم کشوران ما تا حال بر تحصیل آن زبان توجہے کما ینبغی نیست ......

نوجوانان اقوام ما در خواندن زبان عربی معروف اند۔ بجہت حصول علوم و فنون جدیدہ ہم موقع و قابو یابند و آن بخوبی حاصل تواند شد۔ اگر ہم کشوران ما جمع شدہ انجمنے بیارایند و کتب علوم و فنون جدیدہ را از زبان انگریزی بہ فارسی یا عربی ترجمہ نمایند و آں را مشق نونہالان اقوام ما بدہند تا بذریعہ ہماں زبانے کہ بہ تحصیل آں معروف اند از علوم و فنون جدیدہ ہم کما ینبغی واقفیت سازند۔ علم و تربیت نام صورت زبان و کلام نیست۔ بہ ہر زبان کہ آں را بیاموزیم بہ مدعا می رسیم شد،،

شاید ایک بات اور گذارش کے قابل ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمارے اور آپ کے ہم مذہب اور ہم وطن جامۂ تربیت سے عاری ہیں اور دن بہ دن عاری ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لہٰذا اس دور میں ہمارے ہم وطنوں کی صلاح و بہبود اسی میں ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے، ان کی تعلیم و تربیت کی کوشش کریں اور ہم مذہبوں کی تربیت میں جتنے موانع ہوں ان سب کو دور کرنے کی سخت کوشش کریں۔ اس دور کے وہ لوگ جو ہمارے ہم مذہبوں کی تربیت کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ ہمارے اکثر بھائی قدیم علوم میں مہارت رکھتے ہیں لیکن جدید علوم و فنون میں کہ جو اس دور کے نوجوانوں کے لیے مایۂ فخر ہیں بالکل عاری ہیں۔ لہٰذا غور کرنے کی بات ہے کہ جدید علوم و فنون سے ناواقفیت کا سبب کیا ہے۔ میں نے تسلیم کیا کہ وہ سارے علوم انگریزی میں لکھے ہوئے ہیں اور ہمارے ہم وطنوں کو اب تک اس زبان کے سیکھنے کی طرف اتنی توجہ نہیں ہوئی ہے جتنی کہ چاہیے ....

میری قوم کے وہ نوجوان جو عربی زبان پڑھنے میں مشغول ہیں جدید علوم و فنون کے حاصل کرنے کی غرض سے موقع اور قدرت حاصل کریں اور وہ بہت اچھی طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر ہمارے ہم وطن اکٹھا ہو کر ایک انجمن بنائیں اور جدید علوم و فنون کی کتابوں کا انگریزی سے فارسی یا عربی میں ترجمہ کریں اور مشق کے لیے ہماری قوم کے نونہالوں کو دے دیں تاکہ وہ جس زبان کی تحصیل میں لگے ہیں اُسی میں کما حقہٗ جدید علوم و فنون سے بھی واقف ہو جائیں۔ علم و تربیت زبان و آواز کی صورت کا نام نہیں ہے۔ علم کو جس زبان میں بھی سیکھیں مقصد کو حاصل کر لیں گے[۱۵]

سوسائٹی کی ترتیب

سوسائٹی کی ترتیب اس طرح تھی

سوسائٹی میں تین قسم کے ممبران ہوتے تھے۔ معاون ممبر، آنریری ممبر اور رفقائے سوسائٹی۔ ان کے علاوہ سوسائٹی کے پیٹرن اور وائس پیٹرن بھی ہوتے تھے۔

معاون ممبر دو طرح کے ہوتے تھے۔ اول ممبران حضوری یعنی ایسے ممبران جو اس مقام میں یا اس سے قریب رہتے تھے جہاں سوسائٹی کا اجلاس ہوتا تھا۔ دوسرے ممبران مکاتیب یعنی وہ ممبران جو اس مقام سے جہاں سوسائٹی کا اجلاس ہوتا تھا

فاصلے پر رہنے کے سبب سوسائٹی کے جلسے میں شریک نہیں ہو سکتے تھے اور بذریعہ خط و کتابت سوسائٹی سے ارتباط رکھتے تھے۔

معاون ممبروں کی تعداد کی کوئی حد نہیں تھی۔ ہر شخص مبلغ ۲ روپے ماہانہ یا ۲۴ روپے سالانہ ادا کر کے سوسائٹی کا ممبر بن سکتا تھا۔ آنریری ممبروں کی تعداد دس اور رفقائے سوسائٹی کی پانچ متعین تھی۔ موجودہ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن بنگال، شمال مغرب، سینٹرل انڈیا، اودھ اور پنجاب قبول کرنے کی صورت میں اس کے آنریری ممبر ہوتے تھے۔ فرانس کے گارساں دتاسی کو بھی سوسائٹی کا آنریری ممبر بنایا گیا تھا۔ ۵۵

رفقائے سوسائٹی ایسے لوگ ہوتے تھے جو علوم و فنون میں مہارت اور قابلیت کے سبب شہرت یافتہ ہوتے تھے۔

سوسائٹی کے قیام کے وقت ڈیوک آف آرگائل جو اُس وقت وزیر ہند تھے، نے سوسائٹی کا پیٹرن ہونا منظور کیا۔ ڈرینڈ صاحب لفٹننٹ گورنر شمال مغرب اور میکلوڈ صاحب لفٹننٹ گورنر پنجاب، وائس پیٹرن قرار پائے۔ سوسائٹی کے علی گڑھ منتقل ہو جانے کے بعد مسٹر ولیم جنکسن بریلی اس کے صدر قرار پائے اور بہت سے ذی عزت اور صاحب رتبہ ہندو، مسلمان اور انگریزوں نے اس کی ممبری قبول کی۔ اس کے انگریز ممبروں کی تعداد چوالیس تھی جن کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ جے۔ ایچ۔ بٹین ۲۔ جے۔ ایچ۔ بکس۔ ۳۔ ڈبلو۔ جے براملی۔ ۴۔ ایم۔ براڈ ہرسٹ۔ ۵۔ لفٹننٹ ایس۔ بروک ۶۔ جے۔ ڈبلو۔ کلائیو۔ ۷۔ ڈبلو۔ گولڈ اسٹریم۔ ۸۔ اے کالون ۹۔ ایف۔ کوپر۔ ۱۰۔ لفٹننٹ کریگی۔ ۱۱۔ سی۔ ڈانیل ـــــ ۱۲۔ آر۔ ایم۔ ایڈورڈس۔ ۱۳۔ سی۔ اے۔ ایلیٹ۔ ۱۴۔ جی فانتھم۔ ۱۵۔ ڈبلو۔ اے۔ فاربس۔ ۱۶ لفٹننٹ جے۔ ایف آئی گریہم۔ ۱۷۔ لفٹننٹ۔ اے۔ ڈبلو۔ گریہم۔ ۱۸۔ کرنل جی۔ ڈبلو۔ ہملٹن ۱۹۔ ڈبلو۔ آر۔ ایم۔ ہال ایڈ ۲۰۔ ڈبلو اے۔ ہیو۔ ۲۱۔ اے۔ او۔ ہیوم۔ ۲۲۔ کرنل اے۔ لیک ۲۳۔ کرنل آر۔ میکلگسن۔ ۲۴۔ ایف۔ ڈی۔ میکلوڈ ـــــ ۲۵۔ جی۔ پی۔ منی۔ ۲۶۔ آر منی۔ ۲۷۔ اے۔ مانٹیگو۔ ۲۸۔ کرنل۔ آر۔ مارلیسن۔ ۲۹۔ ڈبلو۔ میور۔ ۳۰۔ جی۔ پامر ۳۱۔ ایف۔ بی۔ پیرسن۔ ۳۲۔ جے۔ ایچ۔ پرنسپ۔ ۳۳۔ جے۔ ایچ رکٹس۔ ۳۴۔ اے۔ اے۔ رابرٹس۔ ۳۵۔ بی سپیٹ۔ ۳۶۔ اے۔ شیکسپیر۔ ۳۷۔ ڈی۔ سمس۔ ۳۸۔ جے۔ سمسن ۳۹۔ آر۔ سمسن۔ ۴۰۔ جے۔ ایم۔ سی۔ سٹن بلٹ۔ ۴۱۔ جان اسٹریچی۔ ۴۲۔ جی۔ ڈی۔ ٹرنبل۔ ۴۳۔ ڈبلو۔ این۔ ٹرنر ۴۴۔ میجر آر وینڈ نگٹن ۵۶

ان انگریز ممبروں کے علاوہ سوسائٹی کے ہندوستانی ممبروں کی تعداد ۱۹۱ تھی جن میں سے چند کے نام یہ ہیں:

مہاراجہ ایسری پرشاد نرائن سنگھ کاشی نریش، نواب محمد امین اللہ خاں، راجہ پرتاپ سنگھ، بابو پیارے موہن بنرجی، محمد ارشاد علی خاں، منشی امجد علی خاں، محمد امداد علی، مولوی امانت اللہ، شیخ برکت علی، منشی رام غلام سنگھ، پنڈت رادھا کشن، منشی رام ملا وا، بابو روپ چندر گھوش۔

سوسائٹی کے ممبروں کو سوسائٹی کی مطبوعات اور اخبار مفت دیا جاتا تھا۔

سوسائٹی کا اخبار

۱۴ر فروری ۱۸۶۶ء کو سوسائٹی کی عمارت میں علی گڑھ میں سوسائٹی کا پہلا اجلاس ہوا جس میں صدر ڈبلو۔ جے۔ بریلی کی موجودگی میں یہ بات زیر بحث آئی کہ چونکہ ترجمۂ کتب سے صرف بڑے بڑے علمی مطالب ہی عوام کے سامنے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جن کا وقتاً فوقتاً ہندوستانیوں کو معلوم ہونا ضروری ہے، اس کے ذریعے پیش نہیں کی جا سکتیں اس لیے سوسائٹی کے مقاصد کے تحت ایک جرنل، رسالہ یا پیریاڈیکل سوسائٹی سے جاری کیا جائے۔ لہٰذا اتفاق رائے سے یہ طے پایا کہ ایک ہفتہ وار انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا جائے لہٰذا ۳۰ر مارچ ۱۸۶۶ء سے ایک ہفتہ وار اخبار "اخبار سائنٹفک سوسائٹی"

کے نام سے جاری ہوا۔ ؎۱۱

یہ اخبار ۸/۱ ڈیمائی سائز میں ۱۶ صفحات کا چھپتا تھا لیکن کبھی کبھی صفحات کم اور زیادہ بھی ہو جاتے تھے۔ اشاعت اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ایک ساتھ ہوتی تھی اور دونوں کے مضامین اور خبریں بھی الگ جگہ ایک ہی ہوتی تھیں اس کے اکثر مضامین اور خبریں مختلف اخباروں سے نقل یا ترجمہ کی ہوئی ہوتی تھیں۔ آج کل کے عام اردو اخباروں کی طرح اس میں بھی مختلف کمیٹیوں اور انجمنوں کے اجلاسوں کی روئدادیں ہوتی تھیں اور سوسائٹی میں ہونے والے لکچرس بھی اس میں شامل کیے جاتے تھے۔ لہٰذا اس کے ابتدائی دور میں ہمیں کچھ لکچرس ملتے ہیں جو درج تاریخوں میں سوسائٹی میں دیے گئے اور ان عنوانات کے تحت اخبار میں شائع ہوئے۔

۱۔ اوپر سنہ فصلی کے۔ بتاریخ یکم جون ۱۸۶۶ء۔ سرسید احمد خاں

۲۔ اوپر تحریک تعلیم عورتوں کے اس بات کے ثابت کرنے سے کہ مردوں اور عورتوں کا ذہن و استعداد برابر ہے
بتاریخ یکم جون ۱۸۶۶ء مسٹر ولبرٹ ڈگرودر

۳۔ ہندوستانی سردار اور ذی رتبہ اور باوجاہت لوگ اپنے رعب و داب کو اپنے ہم وطنوں کی بھلائی پر کس طرح کام میں لا سکتے ہیں۔
بتاریخ ۵ جولائی ۱۸۶۶ء سید محمد محمود

ان لکچرس کے بعد بہت دنوں تک کسی دوسرے لکچر کا پتہ نہیں چلتا جو سوسائٹی میں دیا گیا اور اخبار میں شائع ہوا ہو۔ کچھ شماروں میں نیلو ریڈنگ اینڈ ڈیبیٹنگ کلب اٹاوہ میں مختلف موضوعات پر دیے گئے لکچرس بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱۔ علم فلاحت از بابو تارا چند مکرجی
۲۔ عورتوں کی مصیبت زدہ حالت۔ از کھیترا موہن گنگولی
۳۔ ذاتوں کی تفریق کے حسن و قبح از منشی سدانند

۲ر جون ۱۸۷۷ء تک یہ اخبار اپنے ابتدائی نام "اخبار سائنٹفک سوسائٹی" کے نام سے جاری رہا۔ اسی درمیان اخبار "پروگرس" بھی اس میں شامل کر دیا گیا۔ ۲ر جون ۱۸۷۷ء کے شمارے سے اس کا نام "علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" ہو گیا۔ اور ہفت روزہ سے سہ روزہ کر دیا گیا۔ ہفت روزہ کی حیثیت سے اس کے کل ۵۰۸ شمارے شائع ہوئے۔ مولانا حالی اس کے بارے میں رقم طراز ہیں:

" اس میں سوشل، اخلاقی، علمی اور پولیٹیکل ؛ ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے۔ جب تک سرسید کی توجہ دوسری جانب مائل نہیں ہوئی علاوہ ان لیڈنگ آرٹیکلوں کے جو وہ خود لکھتے تھے انگریزی اخباروں سے عمدہ عمدہ آرٹیکل جو معاملات ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے برابر ترجمہ ہو کر اس میں چھاپے جاتے تھے۔ ہندوستان کے طریق معاشرت یا تعلیم یا کسی علمی یا تاریخی تحقیقات کے متعلق جتنے لکچر سوسائٹی میں دیے جاتے تھے وہ سب اس کے ذریعے سے شائع ہوتے تھے"۔ ؎۱۲

منظر اعظمی صاحب نے اس سوسائٹی کی فعالیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

" مقصد یہ تھا کہ انگریز اور انگریزی حکومت ہندوستانیوں کے مسائل سے اور ہندوستانی انگریزی طرز حکومت اور تہذیب و تمدن کے قریب آئیں تاکہ مفاہمت بڑھے اور منافرت دور ہو۔ اس کے ذریعے سوسائٹی کی تمام علمی، فنی اور تحقیقی سرگرمیاں منظر عام پر آتی رہتی تھیں۔ وہ لکچر بھی اس میں ہوتے تھے جو سوسائٹی کے زیر اہتمام وقتاً فوقتاً کرائے جاتے تھے۔ اس طرح اس خلیج کو پاٹنے کی برابر کوششیں کی جاتی رہیں جو ۱۸۵۷ء میں بہت وسیع ہو گئی تھی"۔ ؎۱۳

سوسائٹی کا دفتر: ۔ سوسائٹی کا دفتر درج ذیل ملازمین

پر مشتمل تھا جن کی تنخواہ ۱۴ر فروری ۱۸۶۶ء کے اجلاس کے فیصلے کے مطابق درج ذیل تھی۔

۱۔	بابو گنگا پرشاد مترجم	۸۰ روپیہ
۲	منشی محمد یار خاں	۵۰۔ روپیہ
۳۔	فدا علی داروغہ کتب و آلات	۱۰۔ روپیہ
۴۔	مولوی منیر الدین نقل نویس	۱۰۔ روپیہ
۵۔	دفتری	۵۔ روپیہ
۶۔	چوکیدار	۴۔ روپیہ
۷	چپراسی	۵۔ روپیہ
۸۔	کہار واسطے روشنی وحفاظت شیشہ آلات	۷۔ روپیہ
۹۔	سقہ	۲۔ روپیہ
۱۰۔	خاک روب	۲۔ روپیہ

سوسائٹی کی مطبوعات

چونکہ اس سوسائٹی کا پہلا اور اہم ترین مقصد ان علوم وفنون کی کتابوں کو ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ کرکے شائع کرنا تھا جن سے یہاں کے لوگ ناواقف تھے؛ اس کے علاوہ اُن نادر اور نفیس کتابوں کی فراہمی اور اشاعت بھی اس کے اغراض ومقاصد میں شامل تھی جو ہندوستان اور ایشیا کے دوسرے ملکوں کے مصنفین نے لکھی تھیں۔ اس لیے اسکے مقاصد کے پیش نظر درج ذیل کتابیں سوسائٹی کی طرف سے ترجمہ، تالیف اور تحقیق کرکے چھاپی گئیں۔ ضرورت اور سوسائٹی کی مالی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض ضخیم کتابوں کے صرف خاص خاص حصے ہی ترجمہ کرکے شائع کرائے گئے۔ بعض کتابیں پوری کی پوری بھی ترجمہ کرکے چھاپی گئیں۔ غرض مختلف صورتوں میں سوسائٹی سے جتنی مطبوعات شائع ہوئیں، وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ تاریخ مصر قدیم زمانہ کی مصنفہ رولن۔ انگریزی سے ترجمہ ہوکر مع تصویر شائع ہوئی۔ یہ کتاب ایک سو گیارہ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی قیمت مبلغ ۱ روپیہ ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بارے میں سرسید نے ان الفاظ میں سفارش کی تھی:

" میں کہہ سکتا ہوں کہ ایسی تاریخ میں کی ضرورت میں ہندوستانیوں کے لیے سمجھتا ہوں ایک بڑے نامی مصنف رولن صاحب کی قدیم قوموں کی تاریخ ہے جس میں قدیم قوموں کی ترقی اور علوم وفنون کی ایجاد کا حال اور ان کے قوانین اور انتظام کا ذکر اور اس کی بھلائی اور بُرائی ایک نہایت صفائی اور عمدگی اور فصیح تقریر سے بیان کی گئی ہے۔ درحقیقت وہ تاریخ جیسے کہ نوجوان طالب علموں کے تربیت کے لائق ویسے ہی پختہ اور تجربہ کار لوگوں کی توجہ کی مستحق ہے — ہندوستان کے لوگوں کی تربیت کے لیے میں اس تاریخ کو نہایت مفید سمجھتا ہوں۔ دنیا کی قوموں میں سے جس جس قدیم قوم نے کہ اوّل علوم وفنون میں ترقی پائی اور جس سے مصر والے میں مراد لیتا ہوں، اس کا حال نہایت خوبی سے اس بڑے مصنف نے لکھا ہے۔ ....

.... لائیکرگس کے قوانین کا اس مصنف نے نہایت عمدگی سے ذکر کیا ہے۔ اور جو کچھ کہ اس سے فائدے ہوئے ہیں اور جو جو باتیں اس میں بُری اور انسان کی خلقی طبیعت کے مخالف تھیں وہ بھی بیان کی ہیں۔ پس ایسے حالات کے پڑھنے سے امید ہے کہ ہندوستانیوں کی طبیعت پر بھی کچھ روشنی پڑے۔

بالفعل سوسائٹی کی مالی کمزوری کے سبب میں اس تمام کتاب کے ترجمہ ہونے کی سفارش میں تامل کرتا ہوں؛ لیکن میں کسی طرح رُک نہیں سکتا کہ اس کے خاص خاص حصوں کے ترجمہ ہونے

اور چھاپہ ہونے کی سفارش میں تامل کروں۔ مصر کی تاریخ کا اس کتاب میں بہت چھوٹا سا حصّہ ہے کل ایک سو صفحے ہیں اور اس میں دنیا کی اس قدیم قوم کا ذکر ہے جس نے سب سے اول علوم وفنون میں ترقی کی۔ اس لیے میں سفارش کرتا ہوں کہ وہ حصّہ اس کا ترجمہ ہو کر چھاپا جاوے۔"[۱۵]

۲۔ سیاست مدن:

یہ کتاب مل صاحب کی کتاب پولیٹیکل اکانمی کا انتخاب ہے جس کا ترجمہ پنڈت دھرم نارائن رائے بہادر، میر منشی اندور نے کیا ہے۔ اس کی اشاعت کے لیے سرسید نے جن الفاظ میں سفارش کی تھی وہ درج ذیل ہیں:

" ایک تیسری چیز اور سب سے زیادہ ضروری ہندوستان کے لیے ہے اور وہ کیا ہے؟ پولیٹیکل اکانمی ہے۔ یہ علم جس کو ہم سیاست مدن کہتے ہیں ہمارے ہاں بھی تھا۔ . . . . بالفرض اگر ہمارے ہاں کی سیاست مدن کی کتابیں دستیاب بھی ہوں تو بھی وہ کافی نہیں۔ کیوں کہ اب یورپ نے اس علم میں بہت ترقی کی ہے۔ اس علم سے ناواقفیت کا سبب ہے جو ہندوستانی ان قوانین کے اصول کو، جو گورنمنٹ سے جاری ہوتے ہیں مطلق نہیں سمجھتے . . . . علاوہ اس کے ان کا ذاتی نقصان بھی بہت بڑا ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ ہم اپنا ذاتی انتظام کس طرح کریں اور اپنے روپے اور اپنی محنت کو کس طرح اپنی دولت بڑھانے میں کام میں لاویں۔ پس اس علم کی بھی کسی عمدہ کتاب کا ترجمہ کرنا بہت ضروری ہے۔

میری رائے میں اس علم میں جو عمدہ کتاب ہے وہ مل صاحب کی "پولیٹیکل اکانمی" ہے۔ اس کتاب پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ وہ کسی قدر طویل ہے۔ میں کہتا ہوں ہاں۔ طویل ہے مگر کتاب کا ترجمہ ہونا چاہیے۔ تاکہ ہندوستانیوں کو اس کی ہر ایک جزئیات سے بخوبی واقفیت ہو اور اس کے تمام اصول ان کے دل میں بیٹھ جاویں۔ اس کتاب پر یہ اعتراض بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا کسی قدر حصّہ ہندوستان کے امورات سے علاقہ نہیں رکھتا بلکہ ولایت کے معاملات سے متعلق ہے۔ میں کہتا ہوں ہاں! اس کا بھی ترجمہ ہونا چاہیئے تاکہ ہندوستانیوں کی آنکھ کھلے اور وہ جانیں کہ انگریز اپنے گھر میں کیا کرتے ہیں۔"[۱۶]

اگرچہ سرسیّد کی سفارش کے مطابق اس پوری کتاب کا ترجمہ نہ ہو سکا تاہم اس کی افادیت کے پیش نظر اس کے اہم ترین حصّوں کا ترجمہ کر کے شایع کیا گیا۔

۳۔ رسالہ علم آب و ہوا مولفہ ٹامسن

سوسائٹی سے شایع ہونے والی کتابوں میں یہ اپنے مضمون نیچرل فلاسفی کا واحد رسالہ تھا۔ سرسیّد نے اس قسم کے رسائل شایع کرنے کے لیے جن الفاظ میں سفارش کی تھی وہ درج ذیل ہیں۔

" اب میں پھر ہندوستانیوں پر نظر کرتا ہوں کہ ان کو دولت کی ترقی کس طرح پر ہوتی ممکن ہے۔ بیرونی ملکوں کی تجارت البتہ ایسی چیز ہے کہ غیر ملک کا روپیہ اپنے گھر میں لاتی ہے مگر ایک مدت تک توقع نہیں ہو سکتی کہ ہندوستانی ایسی تجارت سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اگر وہ ایک لمبے عرصے میں اندرون ملک کی تجارت کو بھی ایک عمدہ قاعدہ کے ساتھ انجام دینے لگیں تو اس کو

بھی غنیمت سمجھنا چاہیے۔ پھر غور کرو کہ کیا چیز ہے جو ہندوستان کی دولت کو بڑھا دے گی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ چیز زمین ہے۔ تمام ہندوستانی اور تمام صاحب کلکٹر جنھوں نے بند و بست کا کام کیا ہے جانتے ہوں گے کہ پیداوار ملک کی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے اور جو اس کے سبب ہیں اُن میں سے بڑا سبب یہ ہے کہ جو علم کہ زمین کو زیادہ پیداواری کے لائق کرتا ہے اس سے ہندوستانی بالکل ناواقف ہیں۔ اس علم کی بنیاد نیچرل فلاسفی ہے جس سے ہم عناصر موجودہ کا حال اور اس کے استعمال کے طریق جان سکتے ہیں۔ . . . .

اس لیے میں سفارش کرتا ہوں کہ نیچرل فلاسفی کے علیحدہ علیحدہ چھوٹے چھوٹے رسالے مثلاً علم آب کا ایک رسالہ علم ہوا کا ایک رسالہ اور علی ہذا القیاس ترجمہ ہو کر چھاپے جاویں۔"[۲]

۴۔ تاریخ یونان حصہ اوّل، دوئم، سوئم صفحہ ۹۰۴ قیمت ۲ روپیہ آٹھ آنہ۔

۵۔ رسالہ علم فلاحت: یہ رابرٹ اسکاٹ برن کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس میں زمین کی ابتدا، ترقی، تبدیلیٔ فصل اور کاشت کے طریقے، جو اس وقت انگلستان میں رائج تھے مع تصاویر درج کیے گئے ہیں۔ صفحات ۲۵۲، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔

۶۔ تاریخ چین مصنفہ پادری ایکسوس، ترجمہ محمد زماں عرف فرنگی خاں۔ اس میں چینیوں کے مذاہب اور اُن کے آپس کے رواج اور عدالتوں کا طریقہ نہایت عمدہ لکھا ہے۔ صفحات ۱۹۶ اور قیمت ۱۲- آنہ

۷۔ تزک جہانگیری، بہ زبان فارسی۔ یہ کتاب مغل بادشاہ جہانگیر کی تصنیف ہے جو اُس نے اپنے عہد سلطنت کے حالات پر خود تصنیف کی ہے۔ صفحات ۴۲۶ قیمت پانچ روپیہ

۸۔ رسالہ انتظام مدن۔ یہ کتاب ولیم سینیئر کی کتاب پولیٹیکل اکانمی کا ترجمہ ہے۔ اس میں قواعد تجارت اور وہ اصول جن کے بموجب تمام لوگ آپس میں معاملات اور معیشت کرتے ہیں درج ہیں۔ صفحات ۳۹۴۔ قیمت ۲- روپیہ ۴- آنہ

۹۔ ایک گفتگو در عہد لارڈ ڈلہوزی و لارڈ کیننگ ترجمہ لفٹننٹ کرنل گریہم۔

۱۰۔ تاریخ ہند مؤلفہ الفسٹن حصہ اوّل و دویم

۱۱۔ رسالہ علم آلات مؤلفہ ٹامسن

۱۲۔ رسالہ علم طبیعات مولفہ ٹامسن

۱۳۔ رسالہ برقی مولفہ ہیرس

۱۴ دیباچہ تاریخ فیروز شاہی

۱۵۔ اقلیدس۔ مصنفہ ٹاڈ ہنٹر۔ ترجمہ مولوی ذکاء اللہ

۱۶۔ جغرافیہ۔ مؤلفہ پادری ڈکنسن حصہ اوّل، دوئم سوئم، چہارم۔ جس کو کئی انگریزی کتابوں سے تالیف کیا گیا۔

۱۷۔ ترجمہ علم مساحت مولفہ ٹاڈ ہنٹر

۱۸ ترجمہ علم مثلث مولفہ "

۱۹ ترجمہ الجبرا " " (مبتدیوں کیلیے)

۲۰ نظریہ مساوات " " "

۲۱ سائنٹفک مینول، مولفہ کال بریتھ اور ہاٹن

۲۲ سائنٹفک الجبرا " "

۲۳ ترجمہ ارتھمیٹک مولفہ برناڈ سمتھ

۲۴۔ ترجمہ الجبرا مولفہ برناڈ سمتھ

۲۵ ترجمہ حساب مولفہ گال بریتھ

۲۶ ترجمہ الجبرا مولفہ ٹاڈ ہنٹر

۲۷۔ پلین علم مثلث مولفہ گال بریتھ

۲۸ پلینو اور ڈیا ٹیگو میٹری Plaineo-Ordia-Tegeometry مولفہ ٹاڈ ہنٹر

۳۰۔ تکمیلی احصا Integral Calculus مولفہ ٹاڈ ہنٹر

۳۰۔ تفریقی احصا Differential Calculus مولفہ ٹاڈ ہنٹر

۳۱ تاریخ ایران حصہ اول و دوئم مولفہ سرجان میلکم

۳۲ رسالہ جیالوجی مصنف جان فلپس

۳۳ رسالہ علم فلاحت مصنف لائنی

۳۴۔ رسالہ علم طبیعات مصنف جے۔بے۔گریفن

۳۵۔ رسالہ پہاڑوں کی شہادت مصنف ملر

۳۶ کتب درباب علم سنسکرت از میکس مُلر

ان کتابوں کے علاوہ کچھ دوسری کتابوں کی تالیف وترجمہ بھی سوسائٹی کے پروگرام میں شامل تھا لیکن مختلف وجوہ کی بنا پر پروگرام پر پوری طرح عمل نہ ہوسکا اور بعض بعض کتابوں کے شروع ہونے کی نوبت بھی نہ آسکی اور بعض شروع ہوجانے کے باوجود مکمل نہ ہوسکیں۔ ایسی مجوزہ کتابوں میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱۔ فہرست کتب نظم ونثر اردو مطبوعہ بطور تاریخ زبان اردو۔ اس کتاب کی تالیف کا کام خود سرسید نے اپنے ذمے لیا تھا جس میں درج ذیل امور کی صراحت کی جانی تھی۔

نام کتاب، نام مصنف مع مختصر حال، زمانہ تصنیف، کچھ عبارت بطور نمونہ، طرزِ بیان اور بعض مضامین کا خلاصہ

۲۔ اردو لغت: اس لغت کی تالیف کا کام بھی سرسید نے اپنے ذمے لیا تھا اور نمونے کے طور پر اس کے چند اوراق تیار کیے تھے جو اس وقت علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئے تھے لیکن یہ لغت مکمل نہ ہوسکی۔ مولوی عبدالحق نے لغت کا وہ نمونہ اپنی کتاب میں شامل کرلیا ہے جس سے چند الفاظ یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) آٹھواں ص۔م } صفت اس معدود کی جس سے یہ عدد
آٹھویں ف۔ص۔ف } پورا ہوتا ہے اور جو سات کے بعد آتا ہے۔ مثلاً آٹھواں گھوڑا یعنی وہ گھوڑا جو سات گھوڑوں کے بعد ہے۔

۲۔ درجہ، مرتبہ۔ خواہ باعتبار ترقی کے ہو خواہ باعتبار تنزل کے مثلاً فلاں شخص امتحان میں آٹھواں رہا۔

آٹھویں۔ص۔م۔ یعنی آٹھواں جب کہ اپنے موصوف کے ساتھ ہو مثلاً آٹھویں دن آنا۔ آٹھویں درجہ پر پہنچنا

آٹھوں۔ص۔ آٹھ کے ہر ایک معدود کا کسی صفت میں شامل ہونا۔ مثلاً آٹھوں نے مارا۔ یعنی ہر شخص ان آٹھ کا مارنے میں شریک تھا[۵۱]

ان چند الفاظ سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سرسید کس طرح کی لغت تیار کرنا چاہتے تھے۔

۳۔ ایک مختصر رسالہ یورپ کے علوم وفنون کے بیان میں

۴۔ آدم اسمتھ کی کتاب کا پہلا، دوسرا، تیسرا اور چوتھا حصہ جو قوموں کی ترقی دولت کے بیان میں ہے۔

۵۔ رسالہ بھاپ کی کلوں کے بیان میں مصنف ڈبلو۔جے۔کورن رین کاین۔

۶۔ تاریخ جدید ہندوستان مولفہ مارشمین

۷۔ جغرافیہ کا ایک بڑا نسخہ

۸۔ رسالہ یورپ کے آلات کاشتکاری کے بیان میں

۹۔ رسالہ اثر کہربائی جس میں عملی اور علمی دونوں مذکور ہیں۔ مصنف بیکول۔

۱۰۔ تاریخ بھوپال مصنفہ سرجان میلکم ماخوذ از تاریخ ہند

۱۱۔ مسلمانوں کے عہد کی تاریخ اسپین

۱۲۔ تاریخ اسکندر اعظم مصنفہ ایرین

۱۳۔ مغلیہ دربار کا بیان مصنفہ برنیر

۱۴ واٹلی کی کتاب منطق

۱۵۔ جنرل کنگھم کی رپورٹ ان تلاشوں کی جو انہوں نے صوبہ بہار اور گورکھپور میں کیں۔

۱۶۔ رسالہ ہیئت مصنفہ دی۔ ول

۱۷ مواعظ سکندر مصنفہ ارسطو

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اس سوسائٹی پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

"دہلی کالج اور اس کی ورنی کلر ٹرانس لیشن سوسائٹی
کے بعد یہ دوسرا ادارہ تھا جس نے انگریزی سے مختلف علوم و
فنون کے ترجمے اردو میں شایع کیے۔ یہ کام جب آج کل
دشوار نظر آتا ہے تو اس وقت کس قدر دشوار ہوگا
جب نہ اچھے مترجم دستیاب تھے اور نہ اُن ترجموں
کی قدر کرنے والے کچھ زیادہ تعداد میں تھے"۔ ۱۹؎

مختصر یہ کہ یہ سوسائٹی اپنی مطبوعات، اخبار اور لکچروں کے ذریعے ہندوستانیوں میں علوم جدیدہ کی اشاعت اور ترویج و ترقی کی ہر ممکن کوشش کرتی رہی جس کا خاطر خواہ فائدہ ہوا۔ لوگ ان علوم کو حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہوئے اور آہستہ آہستہ انگریزوں اور ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کے درمیان جو دوری حائل تھی کم ہوتی گئی اور مسلمانوں میں علوم جدیدہ کے حصول کا جذبہ بڑھنے لگا، جو سر سیّد کا اصل مقصد تھا۔ مزید برآں سوسائٹی کی مطبوعات کے ذریعے اردو زبان و ادب کا دامن علمی، فنی اور ادبی گنجہائے گراں مایہ سے نہ صرف معمور ہوا بلکہ وہ اردو زبان کے مصنفین کو ایک ایسی راہ بھی دکھا گئیں جن پر چل کر اردو زبان و ادب نے پیش رفت کے بہت سارے مراحل طے کیے۔

حواشی

۱؎ حیاتِ جاوید شایع کردہ اکادمی پنجاب ٹرسٹ، لاہور۔ اشاعت فروری ۱۹۵۷ء صفحہ ۱۷۶

۲؎ علی گڑھ تحریک از مشرت علی قریشی ۱۹۸۱ء صفحہ ۱۷

۳؎ حیاتِ جاوید ص۔ ۱۷۶

۴؎ انیسویں صدی کے چند اہم علمی اور ادبی ادارے؛ از منظر اعظمی مطبوعہ آج کل ستمبر ۱۹۸۵ء

۵؎ خطباتِ عبدالحق ص ۹

۶؎ حیاتِ جاوید ص ۱۷۹

۷؎ متن میں "نمی" شایع ہوا ہے جو کتابت کی غلطی معلوم ہوتا ہے۔

۸؎ مجموعہ لکچرز و اسپیچیز؛ مرتبہ مولوی امام الدین صاحب گجراتی ص۔ ۱۴۔ ۱۳

۹؎ اس عبارت کے ترجمے کے لیے میں ڈاکٹر نجابت حسین صاحب کا شکر گزار ہوں۔

۱۰؎ سر سید احمد خاں، حالات و افکار؛ مصنفہ مولوی عبدالحق ص۔ ۱۴۲

۱۱؎ کتابچہ سائنٹفک سوسائٹی از پروفیسر خلیق احمد نظامی

۱۲؎ اخبار سائنٹفک سوسائٹی ۲۵ مئی ۱۸۶۶ء (روئداد سوسائٹی نمبر ۱۴)

۱۳؎ حیاتِ جاوید ص ۱۸۴

۱۴؎ انیسویں صدی کے چند علمی و ادبی ادارے؛ از منظر اعظمی مطبوعہ آج کل ستمبر ۱۹۸۵ء

۱۵؎ خطباتِ سر سید حصہ اول۔ مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور۔ ص ۸۷۔ ۸۶

۱۶؎ ایضاً ص ۸۹۔ ۸۸

۱۷؎ ایضاً ص۔ ۸۸۔ ۸۷

۱۸؎ سر سید احمد خاں، حالات و افکار؛ از مولوی عبدالحق

۱۹؎ ایضاً ص ۱۵۳

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سائنسدانوں کو

قومی انعام

یوم سرسید کے موقع پر ہمیں یہ خبر دیتے ہوئے انتہائی مسرت ہو رہی ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈپارٹمنٹ آف فزکس کے الکٹرانکس سیکشن (Electronics Section) کے تین ہونہار سائنس دانوں ڈاکٹر ارشد احمد، حسن شاہد رضوی اور رسیودھ کمار گپتا کو انسٹی ٹیوٹ آف الکٹرانکس اینڈ ٹیلی کمیونیکیشن انجینیرس [I.E.T.E] کے جریدے میں شایع ہونے والے ان کے ایک تحقیقی مقالہ پر سرجگدیش چندر بوس میموریل ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ ۱۷ر جنوری ۱۹۸۷ء کو دہلی میں پیش کیا جائے گا۔ ہمیں اس لحاظ سے مزید خوشی ہے کہ انعام یافتگان میں سے ایک جناب حسن شاہد رضوی کی قلمی نگارشات تہذیب الاخلاق کے صفحات کی زینت بنتی رہی ہیں اور اس لحاظ سے بھی کہ جس کام کو انعام کا مستحق قرار دیا گیا ہے اس کی داغ بیل اس یونیورسٹی کے ایک اولڈ بوائے اور فزکس ڈپارٹمنٹ کے سابق چیرمین پروفیسر رئیس احمد نے ڈالی تھی جو تہذیب الاخلاق کی مجلس ادارت کے ایک رکن ہیں۔

جس تحقیقی کارنامے پر ہمارے ان سائنس دانوں کو ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا ہے اس کا تعلق کمپیوٹر کے دائرہ کار کو وسیع کرنے سے ہے۔ ابھی تک انسان اور کمپیوٹر کے درمیان راہ و رسم کا ذریعہ ٹائپ رائٹر جیسی کی بورڈ ہے مگر مستقلاً اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ کسی طرح کمپیوٹر سے انسانی زبان میں رابطہ قایم کیا جاسکے۔ یعنی کمپیوٹر ہماری سنے اور ہم اس کی۔ کمپیوٹر میں یہ صلاحیت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ گفتگو کے دوران منہ سے نکلنے والی آواز کا بخوبی تجزیہ کیا جائے اور اس سے حاصل شدہ نتائج کی بنیاد پر ایک ایسی مشین ایجاد کی جائے جو کسی کی کہی ہوئی بات کو انسان کی ہی طرح سمجھے۔ ہمارے ان سائنس دانوں کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہندی بول چال کا سائنسی تجزیہ کیا ہے جو ہندی/اردو بول چال سمجھنے والی مشین کی ایجاد کی طرف ایک اہم قدم ہے۔

ہم ادارہ تہذیب الاخلاق کی جانب سے ان سائنس دانوں کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ نامساعد حالات کے باوجود وہ اپنی خداداد صلاحیت، محنت، اور لگن سے اسی طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا نام روشن کرتے رہیں۔

اسرار احمد

ہماری کچھ ایجنسیاں

۱ مسکین بک ڈپو
موتی ڈونگری روڈ - جے پور - راجستھان

۲- میسرز حنیف بک ڈپو
مومن پورہ - ناگپور

۳- مسٹر محمد حسین (بک سیلر)
اسٹیشن روڈ - دھنباد

۴- میسرز نسیم بک ڈپو
ٹاور چوک - دربھنگہ (بہار)

۵- مسٹر اعظم خاں
ٹاؤن اینڈ پوسٹ آفس تھریا نجابت خاں
ڈسٹرکٹ بریلی یو-پی

۶- میسرز بک ایمپوریم
سبزی باغ پٹنہ ۴- بہار

۷ میسرز محمد الیاس نیوز ایجنسی
۱۹ کولو ٹولہ اسٹریٹ - کلکتہ (بنگال)

۸- اسلامیہ بک ڈپو
تاتار پور چوک - بھاگلپور سٹی -

۹- میسرز نصرت بک ایجنسی
کوئن روڈ - انجمن بلڈنگ - ہبلی -

۱۰- میسرز مکتبہ معارف الاسلام
نظام پورہ - بھیونڈی

۱۱- میسرز آزاد بک سٹور
ساکچی بازار - جمشید پور -

۱۲ میسرز کتاب منزل
سبزی باغ - پٹنہ

۱۳ مسٹر طالب حسین
ایف - ڈی - ہائر سکنڈری اسکول
کاٹھ دروازہ - مراد آباد

۱۴ صدیق اختر انصاری
اردو نیوز پیپر ایجنٹ -
وارث پورہ - کامٹی

۱۵ طارق نیوز ایجنسی
مکتبہ معصوم شاہ - مومن پورہ - ناگپور

۱۶- مسٹر محمد حسین
جمال بک ڈپو، باری روڈ - گیا

۱۷- ایجوکیشنل بک ہاؤس
شمشاد مارکیٹ - اے - ایم - یو علی گڑھ

۱۸ میسرز سکریٹری غالب لائبریری
محمد بغیہ - فیروز آباد
ضلع آگرہ -

۱۹- مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ
پرنسز بلڈنگ - ای - آر - روڈ - بمبئی

۲۰- آزاد اسٹور
اردو بازار - دربھنگہ - بہار

۲۱ - انوار بک ڈپو
شمشاد مارکیٹ - اے - ایم - یو - علی گڑھ

۲۲- میسرز محمد پرویز اقبال
میگزین ایجنٹ
پوسٹ محمد سیو ریل پرائمری اسکول
۲۱- جی-ٹی روڈ بانس بگین
پوسٹ آفس ٹیٹا گڑھ
ضلع چوبیس پرگنہ
(مغربی بنگال)

۲۳- ظفر بک سیلر نمبر ۴
پوسٹ آفس جھڑیا
ضلع دھنباد-

۲۴- میسرز تنویر بکڈپو
جی-ٹی روڈ- نیو سٹی
آسنسول

۲۵- میسرز اے-کے- دلکش
کتاب گھر- جنک پورہ روڈ
سیتا مڑھی-

۲۶ میسرز مکتبہ عمر
بک سیلرز اینڈ نیوز پیپر ایجنٹ
مدینہ مسجد کمپلکس
مناکشی سرکل
بیجا پور

۲۷- فردوسی کتاب گھر
بک سیلر اینڈ پبلشر
بھوسیا چوک- دھارواڑ

۲۸ میسرز قیوم الدین نعیم الدین
قلعہ کی گھاٹی
جودھپور- راجستھان

۲۹ میسرز محمد نورانی بک سیلر
کمپنی باغ- مظفر پور

۳۰ میسرز سپر پبلیکیشن
ایچ ۳۲- گارڈن- ریچ روڈ
کلکتہ

۳۱- میسرز محمد جمال انصاری
معرفت سنگم پان دوکان
آپر کٹھی- سقریا
درسھنگہ (بہار)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۲/ ۸۶-۸۷

درج ذیل جگہوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ ٹریننگ اینڈ پلیسمنٹ آفیسر (ایک جگہ) (مستقل)

ڈپارٹمنٹ:- ذاکر حسین کالج آف انجینیرنگ اینڈ ٹیکنالوجی۔

شرح تنخواہ:- ۱۲۰۰-۵۰-۱۳۰۰-۶۰-۱۹۰۰ روپے مع الاؤنسز۔

قابلیت:-

۱۔ لازمی (ا) انجینیرنگ میں فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس بنیادی ڈگری۔

(ب) انجینیرنگ میں پوسٹ گریجویٹ ڈگری

(ج) دس سال کا تجربہ ہو جس میں سے کم از کم تین سال کا تجربہ کسی انڈسٹری میں ہونا چاہیے اور دو سال کا تجربہ تدریس / تحقیق میں ہونا چاہیے ساتھ میں کسی انڈسٹریل / تدریسی / تحقیقی ادارے میں کسی ممتاز جگہ پر فائز ہوں۔

۲۔ پسندیدہ:- انجینیرنگ گریجویٹس کے انڈسٹری پلیسمنٹ اور ان کی عملی تربیت کا انتظام کرنے یا سپروائز کرنے اور طلباء کی بہبودی کی دیکھ بھال کا تجربہ

۲۔ ریزیڈینٹ پیتھالوجسٹ (ایک جگہ) (عارضی)

ڈپارٹمنٹ:- جے۔ این۔ میڈیکل کالج اسپتال۔

شرح تنخواہ:- ۷۰۰-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ روپے مع الاؤنسز

قابلیت:-

۱۔ لازمی۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ڈگری کے ساتھ کسی تسلیم شدہ ادارے کے کلینیکل پیتھالوجی لیب میں ریزیڈینٹ / پیتھالوجسٹ کی حیثیت سے کام کرنے کا کم از کم ... سال کا تجربہ ہونا چاہیے۔

۲۔ پسندیدہ:- بائیو کیمیکل انالیسیز کے لیے کمپیوٹرائزڈ آلات کو استعمال کرنے کی صلاحیت۔
بیسک کمپیوٹر لینگویج میں ٹریننگ۔ کسی ریڈیو امیونو ایسے لیبارٹری سے ریڈیو امیونو ایسے ٹیکنیک کی جان کاری
پیتھالوجی میں پوسٹ گریجویٹ ڈگری یا ڈپلوما

۳۔ اسسٹنٹ انڈسٹری ٹیوٹو آفیسر (ایک جگہ) (مستقل)

ڈپارٹمنٹ جے۔ این۔ میڈیکل کالج اسپتال۔

شرح تنخواہ:- ۵۰۰-۲۵-۶۰۰-۳۰-۷۴۰-۳۵-۸۱۰-ای بی-۳۵-۸۸۰-۴۰-۱۰۰۰-ای بی-۴۰-۱۲۰۰ روپے مع الاونسیز

قابلیت:-

۱- آرٹس، سائنس، کامرس، سوشل سائنسز میں گریجویشن کیا ہو۔

۲- کسی تسلیم شدہ ادارے سے کم سے کم ایک سال کی مدت کا ہاسپٹل ایڈمنسٹریشن میں ڈپلوما حاصل کیا ہو۔

۳- اسپتال کے انتظامی امور کے میدان میں کام کرنے کا کچھ تجربہ ہونا چاہیے۔

۴- پوسٹ کا نام:- اسٹینو گرافرز [انگریزی]

شرح تنخواہ:- ۳۳۰-۱۰-۳۸۰-ای بی-۱۲-۵۰۰-ای بی-۱۵-۵۶۰ روپے مع الاونسیز

قابلیت:-

گریجویشن کے ساتھ ساتھ انگریزی کی اچھی جانکاری ہو۔
مختصر نویسی میں ۸۰ الفاظ فی منٹ اور انگریزی ٹائپنگ میں ۴۰ الفاظ فی منٹ کی رفتار ہونی چاہیئے۔

نوٹ:- ۱۵ اسٹینو گرافرز کو جو ۴۲۵-۷۰۰ روپے اور ۳۳۰-۵۶۰ روپے اسکیل پر پہلے سے ایڈہاک بنیاد پر کام کرتے رہے ہیں تو ان جگہوں کے لیے درخواستیں دینی ہوں گی۔

موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے قبل مختصر نویسی اور ٹائپنگ میں ایک ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۵- پوسٹ کا نام: جونیئر لیبارٹری اسسٹنٹ [ایک جگہ] [مستقل]۔

ڈپارٹمنٹ: میڈیسن ڈپارٹمنٹ

شرح تنخواہ:- ۲۶۰-۸-۳۰۰-ای بی-۸-۳۴۰-۱۰-۳۸۰-ای بی-۱۰-۴۳۰ روپے مع الاونسز۔

قابلیت:-

۱- لازمی- سائنس کے مضامین کے ساتھ ہائی اسکول پاس کیا ہو۔
کسی میڈیکل کالج سے متعلقہ لیبارٹری میں کام کرنے کا پہلے سے تجربہ ہو۔

۲- پسندیدہ:- بی-سی-جی میں ٹریننگ لی ہو۔

غیر معمولی تجربے اور اعلیٰ استعداد کے حامل افراد کیلئے ابتداء سے ہی اعلیٰ تنخواہ سے شروعات کی جاسکتی ہے۔
جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا اُن کو بطور ٹی-اے ریلوے کے سکنڈ کلاس کا ایک طرفہ سنگل کرایہ ادا کیا جائے گا۔
درخواست دینے کے لیے مقررہ فارم اور دیگر ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار [سلیکشن کمیٹی] رجسٹرار آفس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے دفتر سے ۵/- روپے [برائے پوسٹ نمبر ۱، ۲ اور ۳] اور ۳ روپے (باقی ماندہ جگہوں کے لیے)، نقد ادائیگی فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع کرکے یا اسی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر اے. ایم. یو علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو بذریعہ ڈاک ارسال کرکے حاصل کرسکتے ہیں۔ اگر درخواست فارم بذریعہ ڈاک حاصل کرنا چاہتے ہوں تو ۱۰×۲۳ سینٹی میٹر کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہوں

بھیجنا ہوگا۔

درخواست وصولیابی کی آخری تاریخ
١٤ر اکتوبر ١٩٨٦ء [آفس ٹائم تک]
نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی
درخواستیں ناقابل قبول ہوں
گی۔

سید شاہد علی
[رجسٹرار]

[584/1440]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ١١/ ٨٦-٨٧

درج ذیل جگہوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں

١- پروفیسرس
شرح تنخواہ ١٥٠٠-٦٠-١٨٠٠-١٠٠-٢٠٠٠-١٢٥/٢-٢٥٠٠ روپے مع الاؤنسیز

١- پروفیسر آف فزکس [ایکسپیرمنٹل اینڈ نیوکلیئر فزکس]
ڈپارٹمنٹ:- فزکس ڈپارٹمنٹ۔

٢- پروفیسر آف زولوجی۔
ڈپارٹمنٹ: زولوجی ڈپارٹمنٹ

٣- پروفیسرز آف جیوگرافی [دو جگہیں]
ڈپارٹمنٹ:- جیوگرافی ڈپارٹمنٹ۔

٤- پروفیسر آف اردو [ہندوستانی جمالیات اور اردو ادب]
ڈپارٹمنٹ:- اردو ڈپارٹمنٹ

قابلیت:-
١- لازمی:- معروف و ممتاز اسکالر جس کی اعلیٰ درجے کی معیاری مطبوعات ہوں اور وہ تحقیقی کام میں مشغول ہو۔ درس و تدریس اور/یا تحقیق کا دس سال کا تجربہ ہو۔ ڈاکٹریٹ کے معیار کی تحقیق کی نگرانی کا تجربہ رکھتے ہوں۔

یا

غیر معمولی صلاحیت کا اسکالر جو مسلمہ شہرت کا حامل ہو اور جس نے علمی میدان میں قابل ذکر اضافہ کیا ہو۔
ہندوستانی جمالیات کے بارے میں جانکاری رکھتا ہو۔ [صرف برائے پروفیسر آف اردو]۔

میں سب سے زیادہ زور ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ پر ہے۔

پوسٹ نمبر ۱۱ ریڈر ان مسلم فلاسفی کے لیے
مسلم فلاسفی / بہ عصر مغربی اخلاق اور مذہبی فلاسفی / ریاضی منطق میں تخصص یا اس کی اچھی پس منظری جانکاری

پوسٹ نمبر ۱۲ ریڈر ان لا کے لیے
تجارتی قانون میں تخصص (صرف ایک جگہ کے لیے)۔

پوسٹ نمبر ۹ ریڈر ان جغرافیہ کے لیے
جو حضرات اس جگہ کے لیے پہلے درخواست دے چکے ہیں ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ موزوں متصور ہوئے تو ان کو پہلی درخواست کی بنا پر ہی امیدوار تصور کیا جائے گا۔

لکچررس

شرح تنخواہ: ۷۰۰-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔

۱۳۔ لکچرر ان کیمسٹری (ایک جگہ عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید۔ ساتھ دوسری جگہیں عارضی)
ڈپارٹمنٹ: کیمسٹری ڈپارٹمنٹ۔

۱۴۔ لکچرر ان مراٹھی
ڈپارٹمنٹ: ماڈرن انڈین لینگویجز ڈپارٹمنٹ۔

قابلیت

ا۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا تحقیقی کام اور

(ب) اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ متعلقہ مضمون میں کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے کم از کم سکنڈ کلاس (سی' سیون پوائنٹ اسکیل میں) میں ماسٹر ڈگری یا کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے اس کے مساوی کوئی ڈگری۔

بین الموضوعی پروگراموں کی ترقی کی ضرورت کے مدنظر سے مذکورہ بالا الف اور ب میں ڈگریاں متعلقہ مضامین میں درکار ہوسکتی ہیں۔

اگر سلیکشن کمیٹی اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی امیدوار کا تحقیقی کام جیسا کہ اس کی تھیسس یا مطبوعہ کام سے ظاہر ہے بہت اعلیٰ درجے کا ہے تو اس صورت میں (ب) کے تحت مطلوبہ استعداد میں لچک پیدا کی جا سکتی ہے۔

اگر ڈاکٹریٹ ڈگری یا اس کے مساوی تحقیقی کام کا حامل امیدوار میسر نہ آسکے یا بصورت دیگر وہ موزوں تصور نہ کیا جائے تو اس صورت میں اچھے تعلیمی ریکارڈ کے حامل امیدوار کا [اس صورت میں ایم فل یا اس کے مساوی کوئی ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا تحقیقی کام کے امیدوار کو وزن دیتے ہوئے تقرر کیا جائے گا بشرطیکہ اس کو تحقیقی کام کا دو سالہ تجربہ ہو یا اس نے کسی ریسرچ لیبارٹری یا آرگنائزیشن میں دو سال تک علمی کام کیا ہو۔ ایسے امیدوار کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اپنی تقرری کے آٹھ سال کے اندر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرے یا اعلیٰ پایہ کے تحقیقی کام کا ثبوت پیش کرے ورنہ اس کو مستقبل میں اس وقت تک کوئی سالانہ ترقی نہ دی جائے گی جب تک وہ ان ضروریات کو پورا نہ کرلے۔

نوٹ:۔ پوسٹ نمبر ۱ پروفیسر آف فزکس کے لیے ایکسپیریمنٹل نیوکلیر فزکس کے میدان میں مہارت ہونا چاہیئے۔

پسندیدہ:۔ پوسٹ نمبر ۳ پروفیسر آف جیوگرافی کے لیے ایک جگہ کے واسطے۔
پولیٹکل جیوگرافی / ایکولوجی اور انوائیرومنٹل مینجمنٹ
دوسری جگہ کے واسطے:۔
انگریکلچرل جیوگرافی

پوسٹ نمبر ۴۔ پروفیسر آف اردو کے واسطے
سنسکرت یا عربی یا فارسی ادب کے بارے میں معلومات ہونا چاہیے۔
مغربی جمالیات کے بارے میں علم ہونا چاہیے
اسٹائیلسٹکس کی جان کاری۔

ریڈرس

شرح تنخواہ:۔ ۱۲۰۰ – ۵۰ – ۱۳۰۰ – ۶۰ – ۱۹۰۰ روپے مع الاؤنسیز

۵۔ ریڈرس ان زولوجی
ڈپارٹمنٹ: زولوجی ڈپارٹمنٹ

۶۔ ریڈر ان باٹنی [الگولوجی / مائیکروبیالوجی]
ڈپارٹمنٹ:۔ باٹنی ڈپارٹمنٹ

۷۔ ریڈر ان میتھمیٹکس۔
ڈپارٹمنٹ: میتھمیٹکس ڈپارٹمنٹ

۸۔ ریڈر ان جیولوجی [عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید]
ڈپارٹمنٹ:۔ جیولوجی ڈپارٹمنٹ

۹۔ ریڈر ان جیوگرافی۔
ڈپارٹمنٹ:۔ ویمنس کالج

۱۰۔ ریڈر [اکونومک ہسٹری) [سینٹر آف ایڈوانسڈ ہسٹری] اسٹڈیز ان ہسٹری]
ڈپارٹمنٹ:۔ ہسٹری ڈپارٹمنٹ

۱۱۔ ریڈر ان مسلم فلاسفی۔
ڈپارٹمنٹ:۔ فلاسفی ڈپارٹمنٹ۔

۱۲۔ ریڈرس ان لا۔
ڈپارٹمنٹ:۔ لا ڈپارٹمنٹ۔

قابلیت:

۱۔ لازمی۔
اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اس کے مساوی کوئی مطبوعہ کام۔ اس بات کا حتمی ثبوت کہ امیدوار مکمل طور پر (۱) تحقیق یا (۲) تدریس کے طریقوں میں اختراع یا (۳) تدریسی مواد میں کسی اضافے میں مصروف ہوں۔
تدریس اور / یا تحقیق کی رہنمائی کا تقریباً پانچ سال کا تجربہ ہو۔ ان پانچ سال میں سے کم از کم تین سال بحیثیت لکچرر یا اس کے مساوی کسی جگہ پر کام کرنے کا تجربہ ہو۔
اگر امیدوار کوئی اعلیٰ تدریسی یا تحقیقی ریکارڈ رکھتا ہو تو اس صورت میں مذکورہ بالا شرط میں نرمی برتی جاسکتی ہے۔
عربی اور فارسی زبانوں کا علم (صرف ریڈر ان مسلم فلاسفی کے واسطے)۔

پوسٹ نمبر ۶ ریڈر ان باٹنی کے لیے الگولوجی / مائیکروبیالوجی میں تخصیص ہونا چاہیے۔
پوسٹ نمبر ۱۰ ریڈر ان اکونامکس ہسٹری کے لیے سنٹر فار ایڈوانسڈ اسٹڈیز ان ہسٹری

نوٹ:- پوسٹ نمبر ۱۳ لیکچرر ان کیمسٹری کے لیے وہ حضرات جو اشتہار نمبر ۲۳/ ۸۵-۸۶ مورخہ ۹ر جنوری ۱۹۸۶ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ موزوں متصور ہوئے تو اُن کو پہلی درخواست کی بنیاد پر امیدوار سمجھا جائے گا۔

غیر معمولی قابلیت اور تجربے کے حامل افراد کو شروع ہی سے اعلیٰ تنخواہ دی جاسکتی ہے۔

جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا ان کو ایک سکنڈ کلاس کا ایک طرف کا کرایہ بطور ٹی۔اے دیا جائے گا۔

مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے دفتر سے نقد ادائیگی (مسلم یونیورسٹی کے فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ کے بعد یا فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام اسی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر [جو کہ کراسڈ ہو] بھیج کر ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کرسکتے ہیں

ڈاک سے حاصل کرنے کی صورت میں ۱۰ × ۲۲ سینٹی میٹر کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور ڈاک ٹکٹ چسپاں ہوں بھیجنا ہوگا۔

درخواستوں کی وصولیابی کی آخری تاریخ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۸۶ء (آفس ٹائم تک) ہے

نامکمل اور تاخیر سے ملنے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا

نوٹ: موزوں امیدواروں کو آئندہ جگہوں کے لیے پینل میں رکھا جاسکتا ہے

سید شاہد علی۔ (رجسٹرار)

(596/452)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۳/ ۸۶ - ۸۷

درج ذیل جگہوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں

۱- پروجیکٹ آفیسر (دو جگہیں) (عارضی)
سینٹر آف کانٹی نیوئنگ/ ایڈلٹ ایجوکیشن (ایک جگہ مرد اور دوسری عورت کے لیے)
شرح تنخواہ:- ۷۰۰- ۴۰- ۱۱۰۰- ۵۰- ۱۶۰۰ روپے مع الاؤنسز

قابلیت:-

(الف) لازمی: ۱ اڈلٹ/ کانٹی نیونگ/ کمیونٹی/ ایکسٹینشن ایجوکیشن/ کمیونٹی ڈویلپمنٹ میں کسی تسلیم شدہ ہندوستانی یونیورسٹی سے اچھا اکیڈمک ریکارڈ یا کسی بیرونی یونیورسٹی سے اس کے مساوی کوئی ڈگری

۲- تعلیم بالغان کے موضوع پر سوشل سائنسز یا ایجوکیشن میں ایم۔ فل یا پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری یا نمبرا میں درج شدہ موضوعات میں سے کسی پر لرنگ میٹریل اور لرنگ ریسورسز کی شہادت یا درج شدہ موضوع یا موضوعات پر شائع شدہ تحقیقی کام۔

یا

۱- سوشل سائنسز/ سوشل ورک/ ہیومینیز/ ایجوکیشن/ سائنسز/ ہوم سائنسز میں اچھا تعلیمی ریکارڈ۔

۲- کسی تسلیم شدہ ہندوستانی یونیورسٹی سے ایڈلٹ ایجوکیشن اور کانٹی نیونگ ایجوکیشن میں پوسٹ ماسٹرس ڈپلوما یا کسی بیرونی یونیورسٹی سے اس کے مساوی کوئی ڈپلوما/ ڈگری

۳- سوشل سائنسز کے کسی مضمون یا ایجوکیشن میں یا تعلیم بالغان سے متعلق کسی موضوع پر ایم۔فل یا پی ایچ ڈی کی ڈگری یا اڈلٹ/ کانٹی نیونگ/ کمیونٹی/ ایکسٹینشن/ ایجوکیشن/ کمیونٹی ڈویلپمنٹ میں شائع شدہ لرنگ ریسورسز کی شہادت یا ان موضوعات میں سے کسی موضوع پر شائع شدہ تحقیقی کام

(ب) پسندیدہ

ایڈلٹ/ کانٹی نیونگ/ ایکسٹینشن/ کمیونٹی/ نان فارمل ایجوکیشن/ کمیونٹی ڈویلپمنٹ کے موضوعات میں سے کسی موضوع میں دو سال کا فیلڈ ورک۔

یا
ایڈلٹ اور کانٹی نیونگ ایجوکیشن کے موضوعات میں گریجویٹ/پوسٹ گریجویٹ کے معیار کی تدریس کا دو سال کا تجربہ۔

۲۔ ریسرچ ایسوسی ایٹس (دو جگہیں) (عارضی)
ڈپارٹمنٹ : ہسٹری ڈپارٹمنٹ
مقررہ تنخواہ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

کیٹیگری	رقم	
اے	۱۴۰۰/-	ماہانہ
بی	۱۶۰۰/-	"
سی	۱۸۰۰/-	"
ڈی	۲۰۰۰/-	"

قابلیت
(۱) ضروری: ڈاکٹریٹ کی ڈگری اور انڈین میڈیول ہسٹری کے میدان میں خود کا مطبوعہ کام ہو۔
(۲) پسندیدہ: عمر ۴۵ سال سے کم (مرد امیدواروں کے لیے)
عمر ۵۵ سال سے کم (عورت امیدواروں کے لیے)

۳۔ ریسرچ ایسوسی ایٹ [ایک جگہ] [عارضی]
ڈپارٹمنٹ : (انٹر ڈسپلینری سینٹر آف ڈویلپمنٹ اسٹڈیز) فیکلٹی آف سوشل سائنسیز
شرح تنخواہ ۔ ۱۲۰۰/- روپے ماہانہ (مقررہ تنخواہ)
قابلیت :
۱. لازمی : ا۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اس کے مساوی کوئی اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام اور
ب۔ اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ (سیون پوائنٹ اسکیل میں B) کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے متعلقہ موضوع میں کم از کم سکنڈ کلاس میں ماسٹرس ڈگری یا کسی بیرونی یونیورسٹی سے اس کے مساوی کوئی ڈگری
ج کمپیوٹر سائنس میں ڈپلوما
د۔ سروے ریسرچ کا تجربہ
۲۔ پسندیدہ :۔ اسٹیٹسٹیکل ڈاٹا کو انٹرپریٹ کرنے کی صلاحیت

۴۔ وارڈ ماسٹر/وارڈ مسٹریس (۸ جگہیں) (مستقل)

ڈپارٹمنٹ :- جے۔ این۔ میڈیکل کالج اسپتال

شرح تنخواہ :- ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپے مع الاؤنسیز

قابلیت :- میٹرکولیشن یا اس کے مساوی

جنرل نرسنگ اور مڈوائفری میں ڈپلوما۔ کسی اسٹیٹ نرسنگ کونسل کی رجسٹریشن سرٹیفکیٹ

اسٹاف نرس کی حیثیت سے کم از کم پانچ سال کا تجربہ۔

وارڈ سسٹر کورس والوں کو ترجیح دی جائے گی

۵۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر [میتھے میٹکس] [ایک جگہ] [عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید]

گرلز ہائی اسکول۔

شرح تنخواہ :- ۴۴۰ - ۲۰ - ۵۰۰ - ای بی - ۲۵ - ۷۰۰ - ای بی ۲۵ - ۷۵۰ روپے مع الاؤنسز

قابلیت - ۱۔ لازمی ۱۔ متعلقہ مضمون میں گریجویشن

۲۔ ایجوکیشن میں ڈگری / ڈپلومہ

۳۔ ہائی اسکول کلاسز کو پڑھانے کا کم از کم دو سال کا تجربہ۔

۴۔ انگریزی / اردو / ہندی میڈیم کے ذریعے تعلیم دینے کی اہلیت

۶۔ اسٹاف نرسز [۴۳ جگہیں] [مستقل]

ڈپارٹمنٹ :- جے۔ این میڈیکل کالج اسپتال

شرح تنخواہ :- ۴۲۵ - ۱۵ - ۵۰۰ - ای بی - ۱۵ - ۶۰۰ - ۲۰ - ۷۰۰ روپے مع الاؤنسیز

قابلیت :- میٹرکولیشن یا اس کے مساوی۔

کسی تسلیم شدہ ادارے سے جنرل نرسنگ اینڈ مڈوائفری میں ڈپلوما اور کسی ریاست میں رجسٹریشن۔

جنرل ڈیوٹی نرس کی حیثیت سے کم از کم ایک سال کا تجربہ

۷۔ ٹیکنیکل اسسٹنٹ (ایک جگہ) (مستقل)

ڈپارٹمنٹ :- پیتھالوجی ڈپارٹمنٹ

شرح تنخواہ :- ۴۲۵ - ۱۵ - ۵۰۰ - ای بی - ۱۵ - ۵۶۰ - ۲۰ - ۷۰۰ روپے مع الاؤنسیز

قابلیت :

I ۔ لازمی۔ بی۔ ایس سی (بائیولوجی)

کسی تدریسی اسپتال کی ہسٹو پیتھالوجی اور ہیماٹولوجی کی لیبارٹری میں کام کرنے کا تجربہ۔

II پسندیدہ :- میڈیکل لیب ٹیکنالوجی میں ڈپلوما۔

نوٹ :- موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک تحریری امتحان دینا ہوگا

٨۔ سینیر لیبارٹری اسسٹنٹ (ایک جگہ) (مستقل)
۹ ۔ڈیپارٹمنٹ:۔ انستھیسیالوجی ڈیپارٹمنٹ۔
شرح تنخواہ:۔ ۳۸۰۔ ۱۲۔ ۵۰۰۔ ای۔بی۔ ۵۶۰۔ روپے مع الاؤنسیز
قابلیت:۔ سائنس کے مضامین کے ساتھ انٹرمیڈیٹ یا اس کے مساوی امتحان اور ساتھ میں انستھیسیالوجی ریکارڈ کا تین سال کا تجربہ۔

۹۔ مکینک [مکینکل] ۔[ایک جگہ] ۔[عارضی]
جے۔ این میڈیکل کالج
شرح تنخواہ:۔ ۲۶۰۔ ۶۔ ۲۹۰۔ ای۔بی ۶۔ ۳۲۶۔ ۸۔ ۳۶۶۔ ای۔بی۔ ۸۔ ۳۹۰ روپے مع الاؤنسیز
قابلیت:۔(۱) مکینک ٹریڈ میں آئی۔ٹی۔آئی۔ سرٹیفکیٹ (دو سالہ کورس) یا مکینکل ڈرافٹ مین شپ کی سرٹیفکیٹ (دو سالہ)
(۲) پلمبنگ اور سینیٹری وغیرہ فٹنگ کے کام کا تجربہ۔
نوٹ:۔ موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک عملی امتحان دینا ہوگا۔

۱۰۔ نرسنگ اسسٹنٹ [ایک جگہ] [مستقل]
یونیورسٹی ہیلتھ سروس۔
شرح تنخواہ:۔ ۲۶۰۔ ۶۔ ۳۲۶۔ ای۔بی۔ ۸۔ ۳۵۰ روپے مع الاؤنسیز
قابلیت:
۱۔ لازمی۔ ۱ ہائی اسکول
۲۔ معاون نرس اور مڈوائفری میں ڈپلوما
۳۔ رجسٹریشن
۲۔ پسندیدہ۔ کسی تسلیم شدہ اسپتال میں کام کرنے کا تین سال کا تجربہ

۱۱۔ نسخہ بند۔ [ایک جگہ] [مستقل]
اجمل خاں طبیہ کالج اسپتال
شرح تنخواہ:۔ ۲۶۰۔ ۶۔ ۳۲۶۔ ای۔بی۔ ۸۔ ۳۵۰۔ روپے مع الاؤنسیز
قابلیت:۔
تعلیمی:۔ ہائی اسکول یا اس کے مساوی کوئی اورینٹل امتحان جسے یونیورسٹی تسلیم کرتی ہو۔
ٹکنیکل: یونانی میڈیسن میں ڈپلوما یا سہایک حکیم جو کہ کسی صوبائی بورڈ یا یونیورسٹی

سے منظور شدہ ہو۔

تجربہ:۔ نسخہ بندی میں تین سال کا تجربہ قابل ترجیح سمجھا جائے گا۔

نوٹ:۔ وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۲۴/ ۸۵—۸۶ مورخہ ۷ر جنوری ۸۶ء اور اشتہار نمبر ۱۰/ ۸۶—۸۷ مورخہ ۱۳ر اگست ۱۹۸۶ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔
پہلی درخواست کی بنیاد پر ہی ان کو امیدوار تسلیم کیا جائے گا۔

اعلیٰ تعلیمی استعداد اور تجربے کے حامل افراد کو ابتدا سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جا سکتی ہے۔ انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے افراد کو سکنڈ کلاس ریلوے کا ایک طرف کا کرایہ بطور ٹی۔ اے دیا جائے گا۔
درخواستوں کے لیے مقررہ فارم اور دیگر ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) کے دفتر سے پانچ روپے نقد ادائیگی جو کہ مسلم یونیورسٹی کے فنانس آفس کے کیش سیکشن میں اور ۳ روپے باقی ماندہ جگہوں کے لیے نقد ادائیگی جو کہ مسلم یونیورسٹی کے فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع کی گئی ہو یا فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام واجب الادا اسی قیمت کا کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر بھیج کر ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کر سکتے ہیں۔ ڈاک سے طلب کرنے کی صورت میں ۱۰ × ۲۳ سینٹی میٹر کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور ٹکٹ چسپاں ہوں، بھیجنا ضروری ہے۔

درخواستوں کی وصولیابی کی آخری تاریخ ۲۵ر اکتوبر ۸۶ء (آفس ٹائم تک) ہے نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں ناقابل قبول ہوں گی۔

سید شاہد علی
رجسٹرار۔

(۵۱۵/۱۵۰۱)

میں سب سے زیادہ زور ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ پر ہے۔

پوسٹ نمبر ۱۱ ریڈر ان مسلم فلاسفی کے لیے
مسلم فلاسفی / بہ عصر مغربی اخلاق اور مذہبی فلاسفی / موزوں منطق میں تخصص یا اس کی اچھی پس منظری جانکاری

پوسٹ نمبر ۱۲ ریڈر ان لا کے لیے
تجارتی قانون میں تخصص (صرف ایک جگہ کے لیے)۔

پوسٹ نمبر ۹ ریڈر ان جغرافیہ کے لیے
جو حضرات اس جگہ کے لیے پہلے درخواست دے چکے ہیں ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ موزوں متصور ہوئے تو ان کو پہلی درخواست کی بنا پر ہی امیدوار تصور کیا جائے گا۔

لکچررس
شرح تنخواہ: ۷۰۰-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسز۔

۱۳- لکچرر ان کیمسٹری [ایک جگہ عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید۔ باقی دو سری جگہیں عارضی]
ڈپارٹمنٹ: کیمسٹری ڈپارٹمنٹ۔

۱۴- لکچرر ان مراٹھی
ڈپارٹمنٹ: ماڈرن انڈین لینگویجز ڈپارٹمنٹ۔
قابلیت
(ا) ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا تحقیقی کام اور

(ب) اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ متعلقہ مضمون میں کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے کم از کم سکنڈ کلاس (سی' سیون پوائنٹ اسکیل میں) میں ماسٹر ڈگری یا کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے اس کے مساوی کوئی ڈگری۔

بین الموضوعی پروگراموں کی ترقی کی ضرورت کے مدنظر سے مذکورہ بالا الف اور ب میں ڈگریاں متعلقہ مضامین میں درکار ہوسکتی ہیں۔

اگر سیلیکشن کمیٹی اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی امیدوار کا تحقیقی کام جیسا کہ اس کی تھیسیز یا مطبوعہ کام سے ظاہر ہے بہت اعلیٰ درجے کا ہے تو اس صورت میں (ب) کے تحت مطلوبہ استعداد میں لچک پیدا کی جا سکتی ہے۔

اگر ڈاکٹریٹ ڈگری یا اس کے مساوی تحقیقی کام کا حامل امیدوار میسر نہ آسکے یا بصورت دیگر وہ موزوں تصور نہ کیا جائے تو اس صورت میں اچھے تعلیمی ریکارڈ کے حامل امیدوار کا [اس صورت میں ایم فل یا اس کے مساوی کوئی ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا تحقیقی کام کے امیدوار کو وزن دیتے ہوئے] تقرر کیا جائے گا بشرطیکہ اس کو تحقیقی کام کا دو سالہ تجربہ ہو یا اس نے کسی ریسرچ لیباریٹری یا آرگنائزیشن میں دو سال تک عملی کام کیا ہو۔ ایسے امیدوار کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اپنی تقرری کے آٹھ سال کے اندر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرے یا اعلیٰ پایہ کے تحقیقی کام کا ثبوت پیش کرے ورنہ اس کو مستقبل میں اس وقت تک کوئی سالانہ ترقی نہ دی جائے گی جب تک وہ ان ضروریات کو پورا نہ کرے۔

نوٹ:- پوسٹ نمبر ۱ پروفیسر آف فزکس کے لیے
ایکسپریمنٹل نیوکلیر فزکس کے میدان میں مہارت
ہونا چاہیے۔

پسندیدہ:- پوسٹ نمبر ۳ پروفیسر آف جیوگرافی کے لیے
ایک جگہ کے واسطے۔
فزیکل جیوگرافی / ایکولوجی اور انوائیرونمنٹل
مینیجمنٹ
دوسری جگہ کے واسطے:-
ایگریکلچرل جیوگرافی

پوسٹ نمبر ۴ - پروفیسر آف اردو کے واسطے
سنسکرت یا عربی یا فارسی ادب
کے بارے میں معلومات ہونا چاہیے۔
مغربی جمالیات کے بارے میں علم ہونا چاہیے
اسٹائیلسٹکس کی جان کاری۔

ریڈرس

شرح تنخواہ:- ۱۲۰۰- ۵۰ - ۱۳۰۰- ۶۰ -
۱۹۰۰ روپے، مع الاؤنسیز

۵- ریڈرس ان زولوجی
ڈپارٹمنٹ: زولوجی ڈپارٹمنٹ
۶- ریڈر ان باٹنی [الگولوجی / مائیکروبیالوجی]
ڈپارٹمنٹ:- باٹنی ڈپارٹمنٹ
۷- ریڈر ان میتھمیٹکس۔
ڈپارٹمنٹ:- میتھمیٹکس ڈپارٹمنٹ
۸- ریڈر ان جیولوجی [عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید]
ڈپارٹمنٹ:- جیولوجی ڈپارٹمنٹ
۹- ریڈر ان جیوگرافی۔
ڈپارٹمنٹ:- ویمنس کالج

۱۰- ریڈر [اکونومک ہسٹری] [سینٹر آف ایڈوانسڈ
ہسٹری] اسٹڈیز ان ہسٹری]
ڈپارٹمنٹ:- ہسٹری ڈپارٹمنٹ
۱۱- ریڈر ان مسلم فلاسفی۔
ڈپارٹمنٹ:- فلاسفی ڈپارٹمنٹ۔
۱۲- ریڈرس ان لا۔
ڈپارٹمنٹ:- لا ڈپارٹمنٹ۔

قابلیت:

۱- لازمی۔
اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اس
کے مساوی کوئی مطبوعہ کام۔ اس بات کا حتمی
ثبوت کہ امیدوار مکمل طور پر تحقیق یا / اور تدریس
کے طریقوں میں اختراع یا / اور تدریسی مواد
میں کسی اضافے میں مصروف ہوں۔
تدریس اور / یا تحقیق کی رہنمائی کا تقریباً پانچ
سال کا تجربہ ہو۔ ان پانچ سال میں سے کم از کم
تین سال بحیثیت لکچرر یا اس کے مساوی کسی
جگہ پر کام کرنے کا تجربہ ہو۔
اگر امیدوار کوئی اعلیٰ تدریسی یا تحقیقی ریکارڈ
رکھتا ہو تو اس صورت میں مذکورہ بالا شرط میں
نرمی برتی جاسکتی ہے۔
عربی اور فارسی زبانوں کا علم (صرف
ریڈر ان مسلم فلاسفی کے واسطے)۔

پوسٹ نمبر ۶ ریڈر ان باٹنی کے لیے
الگولوجی / مائیکروبیالوجی میں تخصیص
ہونا چاہیے۔
پوسٹ نمبر ۱۰ ریڈر ان اکونامکس ہسٹری کے لیے
سنٹر فار ایڈوانسڈ اسٹڈیز ان ہسٹری

نوٹ:- پوسٹ نمبر ۱۳ لیکچرار ان کیمسٹری کے لیے وہ حضرات جو اشتہار نمبر ۲۳/ ۸۵-۸۶ مورخہ ۹ر جنوری ۱۹۸۶ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ موزوں متصور ہوئے تو اُن کو پہلی درخواست کی بنیاد پر امیدوار سمجھا جائے گا۔

غیر معمولی قابلیت اور تجربے کے حامل افراد کو شروع ہی سے اعلیٰ تنخواہ دی جا سکتی ہے۔

جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا ان کو ایک سکنڈ کلاس کا ایک طرف کا کرایہ بطور ٹی۔اے دیا جائے گا۔

مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کے دفتر سے نقد ادائیگی (مسلم یونیورسٹی کے فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) کے بعد یا فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام اسی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر [جو کراسڈ ہو] بھیج کر ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کر سکتے ہیں

ڈاک سے حاصل کرنے کی صورت میں

۱۰ × ۲۲ سینٹی میٹر کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور ڈاک ٹکٹ چسپاں ہوں بھیجنا ہوگا۔

درخواستوں کی وصولیابی کی آخری تاریخ

۱۵ر اکتوبر ۱۹۸۶ء (آفس ٹائم تک) ہے

نامکمل اور تاخیر سے ملنے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا

نوٹ:- موزوں امیدواروں کو آئندہ جگہوں کے لیے پینل میں رکھا جا سکتا ہے

(596/452) سید شاہد علی۔ (رجسٹرار)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ١٣/ ٨٦-٨٧

درج ذیل جگہوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں

١- پروجیکٹ آفیسرس (دو جگہیں) (عارضی)
سینٹر آف کانٹی نیونگ / ایڈلٹ ایجوکیشن (ایک جگہ مرد اور دوسری عورت کے لیے)
شرح تنخواہ:- ٧٠٠-٤٠-١١٠٠-٥٠-١٦٠٠ روپے مع الاؤنسیز

قابلیت:-

(ا) لازمی: ١- اڈلٹ / کانٹی نیونگ / کمیونٹی / ایکسٹینشن ایجوکیشن / کمیونٹی ڈویلپمنٹ میں کسی تسلیم شدہ ہندوستانی یونیورسٹی سے اچھا اکیڈمک ریکارڈ یا کسی بیرونی یونیورسٹی سے اس کے مساوی کوئی ڈگری

٢- تعلیم بالغان کے موضوع پر سوشل سائنسز یا ایجوکیشن میں ایم۔ فل یا پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری یا نمبر ا میں درج شدہ موضوعات میں سے کسی پر لرننگ میٹیریل اور لرننگ ری سورسز کی شہادت یا درج شدہ موضوع یا موضوعات پر شائع شدہ تحقیقی کام۔

یا

١- سوشل سائنسز / سوشل ورک / ہیومینیز / ایجوکیشن / سائنسز / ہوم سائنسز میں اچھا تعلیمی ریکارڈ۔

٢- کسی تسلیم شدہ ہندوستانی یونیورسٹی سے ایڈلٹ ایجوکیشن اور کانٹی نیونگ ایجوکیشن میں پوسٹ ماسٹرس ڈپلوما یا کسی بیرونی یونیورسٹی سے اس کے مساوی کوئی ڈپلوما / ڈگری

٣- سوشل سائنسز کے کسی مضمون یا ایجوکیشن میں یا تعلیم بالغان سے متعلق کسی موضوع پر ایم۔ فل یا پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری یا اڈلٹ / کانٹی نیونگ / کمیونٹی / ایکسٹینشن / ایجوکیشن / کمیونٹی ڈویلپمنٹ میں شائع شدہ لرننگ ری سورسز کی شہادت یا ان موضوعات میں سے کسی موضوع پر شائع شدہ تحقیقی کام

(ب) پسندیدہ

ایڈلٹ / کانٹی نیونگ / ایکسٹینشن / کمیونٹی / نان فارمل ایجوکیشن / کمیونٹی ڈویلپمنٹ کے موضوعات میں سے کسی موضوع میں دو سال کا فیلڈ ورک۔

یا

ایڈلٹ اور کانٹی نیوئنگ ایجوکیشن کے موضوعات میں گریجویٹ / پوسٹ گریجویٹ کے معیار کی تدریس کا دو سال کا تجربہ۔

۲۔ ریسرچ ایسوسی ایٹس (دو جگہیں) (عارضی)
ڈپارٹمنٹ : ہسٹری ڈپارٹمنٹ
مقررہ تنخواہ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

کیٹیگری	رقم	
اے	-/۱۴۰۰	ماہانہ
بی	-/۱۶۰۰	"
سی	-/۱۸۰۰	"
ڈی	-/۲۰۰۰	"

قابلیت
(i) ضروری: ڈاکٹریٹ کی ڈگری اور انڈین میڈیول ہسٹری کے میدان میں خود کا مطبوعہ کام ہو۔
(ii) پسندیدہ: عمر ۴۵ سال سے کم (مرد امیدواروں کے لیے)
عمر ۵۵ سال سے کم (عورت امیدواروں کے لیے)

۳۔ ریسرچ ایسوسی ایٹ [ایک جگہ] [عارضی]
ڈپارٹمنٹ : (انٹرڈسپلینری سینٹر آف ڈویلپمنٹ اسٹڈیز) فیکلٹی آف سوشل سائنسز
شرح تنخواہ: -/۱۲۰۰ روپے ماہانہ (مقررہ تنخواہ)
قابلیت :
۱۔ لازمی : ا۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اس کے مساوی کوئی اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام اور
ب۔ اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ (سیون پوائنٹ اسکیل میں ۲) کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے متعلقہ موضوع میں کم از کم سکنڈ کلاس میں ماسٹرس ڈگری یا کسی بیرونی یونیورسٹی سے اس کے مساوی کوئی ڈگری
ج کمپیوٹر سائنس میں ڈپلوما
د۔ سروے ریسرچ کا تجربہ
۲۔ پسندیدہ : اسٹیٹسٹیکل ڈاٹا کو انٹرپریٹ کرنے کی صلاحیت

۴۔ وارڈ ماسٹر / وارڈ مسٹریس (۸ جگہیں) (مستقل)

ڈیپارٹمنٹ :- جے۔ این۔ میڈیکل کالج اسپتال

شرح تنخواہ :- ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپے مع الاؤنسز

قابلیت :- میٹریکولیشن یا اس کے مساوی
جنرل نرسنگ اور مڈوائفری میں ڈپلوما۔ کسی اسٹیٹ نرسنگ کونسل کی رجسٹریشن سرٹیفکیٹ
اسٹاف نرس کی حیثیت سے کم ازکم پانچ سال کا تجربہ۔
وارڈ سسٹر کورس والوں کو ترجیح دی جائے گی

۵۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر [میتھے میٹکس] [ایک جگہ] [عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید]
گرلز ہائی اسکول۔

شرح تنخواہ :- ۴۴۰ - ۲۰ - ۵۰۰ - ای بی - ۲۵ - ۷۰۰ - ای بی ۲۵ - ۷۵۰ روپے مع الاؤنسز

قابلیت - ا۔ لازمی ا۔ متعلقہ مضمون میں گریجویشن
۲۔ ایجوکیشن میں ڈگری / ڈپلوما
۳۔ ہائی اسکول کلاسز کو پڑھانے کا کم ازکم دو سال کا تجربہ۔
۴۔ انگریزی / اردو / ہندی میڈیم کے ذریعے تعلیم دینے کی اہلیت

۶۔ اسٹاف نرسنز [۴۳ جگہیں] [مستقل]
ڈپارٹمنٹ :- جے۔ این میڈیکل کالج اسپتال

شرح تنخواہ :- ۴۲۵ - ۱۵ - ۵۰۰ - ای بی - ۱۵ - ۵۶۰ - ۲۰ - ۷۰۰ روپے مع الاؤنسز

قابلیت :- میٹریکولیشن یا اس کے مساوی۔
کسی تسلیم شدہ ادارے سے جنرل نرسنگ اینڈ مڈوائفری میں ڈپلوما اور کسی ریاست میں رجسٹریشن۔
جنرل ڈیوٹی نرس کی حیثیت سے کم ازکم ایک سال کا تجربہ

۷۔ ٹیکنیکل اسسٹنٹ (ایک جگہ) (مستقل)
ڈپارٹمنٹ :- پیتھالوجی ڈپارٹمنٹ

شرح تنخواہ :- ۴۲۵ - ۱۵ - ۵۰۰ - ای بی - ۱۵ - ۵۶۰ - ۲۰ - ۷۰۰ روپے مع الاؤنسز

قابلیت :

I ۔ لازمی۔ بی ایس سی (بائیولوجی)
کسی تدریسی اسپتال کی ہسٹو پیتھالوجی اور ہیماٹولوجی کی لیبارٹری میں کام کرنے کا تجربہ۔

II پسندیدہ :- میڈیکل لیب ٹیکنالوجی میں ڈپلوما۔

نوٹ :- موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک تحریری امتحان دینا ہوگا

۸- سینیر لیبارٹری اسسٹنٹ (ایک جگہ) (مستقل)

ڈیپارٹمنٹ:- انیستھیسیالوجی ڈیپارٹمنٹ۔

شرح تنخواہ:- ۳۸۰-۱۲-۵۰۰- ای-بی-۵۶۰- روپے مع الاؤنسیز

قابلیت:- سائنس کے مضامین کے ساتھ انٹرمیڈیٹ یا اس کے مساوی امتحان اور ساتھ میں انستھیسیالوجی ریکارڈ کا تین سال کا تجربہ۔

۹- مکینک [مکینکل] - [ایک جگہ] - [عارضی]

جے۔این میڈیکل کالج

شرح تنخواہ:- ۲۶۰-۶-۲۹۰- ای-بی ۶- ۳۲۶- ۸-۳۶۶- ای-بی-۸- ۳۹۰ روپے مع الاؤنسیز

قابلیت:- (۱) مکینک ٹریڈ میں آئی-ٹی-آئی- سرٹیفکیٹ (دوسالہ کورس) یا مکینکل ڈرافٹ مین شپ کی سرٹیفکیٹ (دوسالہ کورس)

(۲) پلمبنگ اور سینیٹری وغیرہ فٹنگ کے کام کا تجربہ۔

نوٹ:- موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک عملی امتحان دینا ہوگا۔

۱۰- نرسنگ اسسٹنٹ [ایک جگہ] [مستقل]

یونیورسٹی ہیلتھ سروس۔

شرح تنخواہ:- ۲۶۰-۶-۳۲۶- ای-بی-۸- ۳۵۰ روپے مع الاؤنسیز

قابلیت:

۱- لازمی- ۱ ہائی اسکول

۲- معاون نرس اور مڈوائفری میں ڈپلوما

۳- رجسٹریشن

۲- پسندیدہ- کسی تسلیم شدہ اسپتال میں کام کرنے کا تین سال کا تجربہ

۱۱- نسخہ بند- [ایک جگہ] [مستقل]

اجمل خاں طبیہ کالج اسپتال

شرح تنخواہ:- ۲۶۰-۶-۳۲۶- ای-بی-۸- ۳۵۰- روپے مع الاؤنسیز

قابلیت:-

تعلیمی:- ہائی اسکول یا اس کے مساوی کوئی اورینٹل امتحان جسے یونیورسٹی تسلیم کرتی ہو۔

ٹکنیکل: یونانی میڈیسن میں ڈپلوما یا سہاایک حکیم جو کہ کسی صوبائی بورڈ یا یونیورسٹی

سے منظور شدہ ہو۔

تجربہ:۔ نسخہ ہندی میں تین سال کا تجربہ قابل ترجیح سمجھا جائے گا۔

نوٹ:۔ وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۲۴ / ۸۵ — ۸۶ مورخہ ۱/ جنوری ۸۶ء اور اشتہار نمبر ۱۰/ ۸۶ — ۸۷ مورخہ ۱۳/ اگست ۱۹۸۶ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

پہلی درخواست کی بنیاد پر ہی ان کو امیدوار تسلیم کیا جائے گا۔

اعلیٰ تعلیمی استعداد اور تجربے کے حامل افراد کو ابتدا سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے۔ انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے افراد کو سکنڈ کلاس ریلوے کا ایک طرف کا کرایہ بطور ٹی۔ اے دیا جائے گا۔

درخواستوں کے لیے مقررہ فارم اور دیگر ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) کے دفتر سے پانچ روپے نقد ادائیگی جو کہ مسلم یونیورسٹی کے فنانس آفس کے کیش سیکشن میں اور ۳ روپے ماتی ماندہ جگہوں کے لیے نقد ادائیگی جو کہ مسلم یونیورسٹی کے فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع کی گئی ہو یا فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام واجب الادا اسی قیمت کا کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر بھیج کر ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کرسکتے ہیں۔ ڈاک سے طلب کرنے کی صورت میں ۱۰ × ۲۲ سینٹی میٹر کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور ٹکٹ چسپاں ہوں، بھیجنا ضروری ہے۔

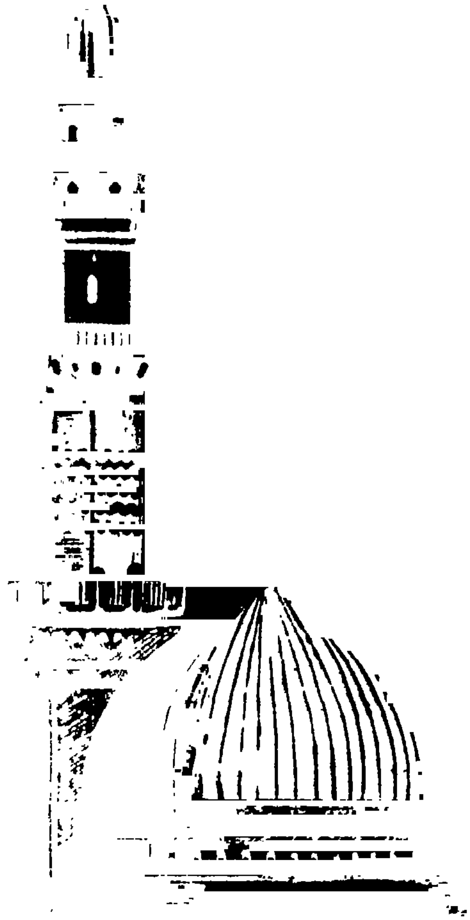
درخواستوں کی وصولیابی کی آخری تاریخ ۲۵/ اکتوبر ۸۶ء آفس ٹائم تک ہے نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں ناقابل قبول ہوں گی۔

سید شاہد علی

رجسٹرار۔

(۵۱۵/۱۵۰۱)

مالک تہذیب الاخلاق ٹرسٹ۔ پرنٹر و پبلشر: نور الحسن نقوی، ناظم اشاعت تحریر اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ مطبع: لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی



الحکمۃ ضالۃ المؤمن

حدیث مومن کا کھویا مال

مجلس ادارت

(تہذیب الاخلاق اور نشانات)

بانی

سرسید احمد خاںؒ

سرپرست

سید ہاشم علی

وائس چانسلر اے۔ایم۔یو۔

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۵ — یکم تا ۳۰ نومبر ۱۹۸۶ء — مشترکہ شمارہ ۲۱-۲۲

جوائنٹ ایڈیٹر
کبیر احمد جائسی

ایڈیٹر
اسرار احمد

اسسٹنٹ ایڈیٹر
شباب الدین

قیمت	تین روپے
زر سالانہ	تیس روپے

ترسیلِ زر کا پتہ
ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ اشاعت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ یوپی۔

مندرجات

اداریہ		۳
بشارات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (انجیل میں سے)	سرسیّد احمد خاںؒ	۶
سیرت نبوی کی ہمہ گیری	ڈاکٹر لیسین مظہر صدیقی	۱۴
اقلیت	جناب سید حامد	۱۸
خالد بن ولید	پروفیسر قاضی عبدالستار	۲۱
تدریس و تعلیم	پروفیسر خلیق احمد صدیقی	۲۶
رپورٹ	جناب سلیم احمد	۲۹
تعلیم کی مخالفت کیوں	جناب احمد رشید شروانی	۳۳
جوابِ دوست	پروفیسر نسیم انصاری	۳۵
ایڈریس	حکیم سمیع الرحمٰن خاں	۴۱
نئی تعلیمی پالیسی اور اقلیتیں	سیّد حامد / سیّد شفیق احمد	۴۵
سائنس اکیڈمی برائے تیسری دنیا	پروفیسر اسرار احمد	۵۸
شبلی کی مقالہ نگاری	جناب شباب الدین	۶۱
یوم الحساب	محترمہ سیّدہ فرحت	۶۸
مسلم یونیورسٹی میں یوم سرسیّد کی تقریبات	جناب راحت ابرار	۷۰

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان سے بہرحال متفق ہو۔]

اداریہ

ربیع الاوّل کا مہینہ عالم انسانیت کے محسنِ اعظم، احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ماہِ ولادت ہے، اس لیے دنیا کے چپّے چپّے اور کونے کونے میں بسے ہوئے ان کے پیرو اس ماہ مبارک کا احترام کرتے ہیں، ذکرِ رسولؐ کی محفلیں آراستہ کرتے ہیں، درود وسلام کی بلند آہنگ آوازوں سے حضورِ پرنورؐ کی بارگاہ میں اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ وہ دن جو کہ آپؐ کا روزِ ولادت ہے، ہر چھوٹے بڑے مسلمان کے لیے روزِ عید سے کم نہیں ہوتا، لوگ حسبِ حیثیت اپنے گھروں اور مسجدوں کو روشنی سے سجاتے ہیں، میلاد کی محفلیں منعقد کرتے ہیں، غریبوں مسکینوں، ناداروں، یتیموں اور بیواؤں کو کھانا کھلانے کے ساتھ ساتھ حسبِ مقدور ان کی مالی امداد بھی کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ پورا کا پورا مہینہ مسلمانوں کو اس بات کی یاد دلایا کرتا ہے کہ ان کے ہادیٔ برحق اور عالم انسانیت کے محسنِ اعظمؐ اسی ماہِ مبارک میں عالمِ قدس سے عالمِ امکان میں تشریف لائے تھے۔ آپؐ کے قدومِ میمنت لزوم نے دنیا کی ظلمت کو نور سے، پستی کو بلندی سے، ذہنی دیوالیہ پن کو تعقل سے آزادہ روی کو پابندیٔ شریعت سے غلامی کو آزادی سے، ظلم وجبر کو لطف وترحم سے بدل کر رکھ دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کا ان گھڑ بدّو جہانگیری وجہانبانی میں دنیا کی متمدن ترین قوموں کو بھی شرمانے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کا ایک بہت بڑا حصّہ اسلام کے زیرِ نگیں آگیا۔ یہ برکت تھی اس دین پر ایمان لانے اور عمل کرنے کی جس کو سرکارِ دوعالم سرورِ کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے تھے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات کی آمد سے دنیا میں جو عظیم ترین انقلاب آنے والا تھا، اس کو شجر و حجر، آب و آتش سب ہی محسوس کر رہے تھے۔ علامہ شبلی نعمانیؒ نے اپنی کتاب سیرۃ النبی میں اس ساعتِ مبارک کی عکاسی کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

> "اربابِ سیَر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ "آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتش کدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہوگیا" لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے، آتشِ فارس

نہیں بلکہ جحیم شر، آتش کدۂ کفر، آذر کدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں
میں خاک اُڑنے لگی، بت کدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا،
نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کرکے جھڑ گئے، توحید کا غلغلہ اُٹھا
آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاقِ انسانی کا آئینہ پرتو قدس
سے چمک اُٹھا۔"

علامہ شبلی نعمانیؒ کی اس بات سے کوئی بھی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ اربابِ سِیَر کا پیرایۂ بیان محدود ہے، وہ اپنے محدود پیرایۂ بیان میں جس بلند پروازی کا مظاہرہ کرسکتے تھے اس کی رسائی یہیں تک تھی کہ ایوانِ کسریٰ کے کنگروں کا گرنا، آتش کدۂ فارس کا سرد ہونا، دریائے ساوہ کا خشک ہونا اور پتھر کے مجسموں کے سجدہ ریز ہو جانے کا نقشہ دنیا کے سامنے پیش کردے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت کائنات کے ذرہ ذرہ نے اُس انقلاب کے معجزات کو محسوس کیا ہوگا جو چند برسوں کے بعد پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لینے والا تھا۔ شجر و حجر نے اس بات پر بارگاہ الٰہی میں سجدۂ شکر پیش کیا ہوگا کہ جن ظلم و ستم، جبر و جور، بے حیائی و عریانی، کمینگی و سفلہ پن اور جہل و نادانی کو دیکھتے دیکھتے ان کی آنکھیں پتھرا رہی تھیں اُن کے نیست و نابود ہونے کا زمانہ آگیا، زمین اس بات پر سجدۂ شکر بجا لائی ہوگی کہ اس کے سینہ پر دن رات جو فتنہ و فساد بپا رہتا ہے، اس کے بیخ و بن سے اکھڑنے کا وقت آن پہنچا، آسمان اس بات پر سجدہ ریز ہوا ہوگا کہ اس کے سایے میں جن غلاظتوں اور گناہوں کے چراغ روشن ہیں ان کے بجھنے اور معدوم ہو جانے کا وقت قریب آگیا۔ غرض کہ کائنات کے ہر ذرّے نے اُس انقلاب کو محسوس کرکے اپنے رب کے حضور میں سجدۂ شکر ادا کیا ہوگا جس کو اربابِ سِیَر اپنے محدود پیرایۂ بیان کی وجہ سے نوکِ قلم پر نہ لاسکے۔

بے جان چیزوں نے آنے والے انقلاب کو جس طرح محسوس کیا، اس کی صحیح اور حقیقی تصویر کشی سے ہمارا قلم عاجز ہے کیوں کہ ہم ان کے محسوسات تک دسترس نہیں رکھتے، لیکن ہمارا قلم ان زندگیوں کی تصویر کشی ضرور کرسکتا ہے جنھوں نے آپؐ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، آپؐ کی صحبت سے سرفراز ہوئے اور آپؐ کی رسالت پر اس وقت ایمان لائے جب آپؐ کو ہادیٔ برحق اور اللہ کا رسول تسلیم کرنا اپنے آپ کو شداید و مصائب میں مبتلا کردینے کے مترادف تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن پر کوڑے برسائے گئے، گرم بلکہ جھلستی ریت پر بھاری بھاری پتھروں سے دبائے گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو ایمان کی دولت اور حضورؐ کی محبت پانے سے پہلے انتہائی اکھڑ، بدمزاج، جنگ و جدل کے رسیا معبودانِ باطل کے پرستار، بچیوں کو زندہ دفن کردینے والے، قمار باز، شرابی، عیاش غرض کہ برائیوں کا مجموعہ تھے۔ لیکن جب وہ حضورؐ کی رسالت پر ایمان لائے تو انھوں نے اپنے دل کی گمرہی کے آذر کدوں کو سرد کردیا، اپنے نفسانیت کے بتوں کو توڑ ڈالا، اپنے پندار کے صنم کدوں کو ویران کرکے رکھ دیا، اپنے دریائے معاصی کو خشک ریگزار بنادیا، صرف ایک کلمۂ توحید کے اقرار نے ظالموں کو مہربان، شرابیوں کو پاکباز، ہر ہر در پر ناصیہ سائی کرنے والوں کو معبودِ برحق کا پرستار بنادیا۔ یہ انقلاب ایک تاریخی حقیقت ہے اور اس کے شواہد دنیا کی ہر زبان کی تاریخ کی کتابوں میں آج تک محفوظ ہیں۔

ایک وہ پتھر تھے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی خبر سن کر لرزہ براندام ہو کر زمین بوس ہوگئے،

مدتوں کے دہکتے ہوئے ایک وہ آتش کدے تھے جو سرد ہو گئے، دریا کا پانی خشک ہو گیا، صنم خانوں پر ویرانی چھا گئی اور ایک ہم ہیں کہ توحید و رسالت پر ایمان و یقین کا دعویٰ رکھنے کے باوجود اپنے دلوں میں سیکڑوں پندار کے صنم کدے سجائے بیٹھے ہیں۔ ہمارے ذہنوں میں نہ جانے کتنے گمرہی کے آذر کدے ہر آن دہکا کرتے ہیں، ہم اپنی خواہشات کے نت نئے نئے بت تراش کر ان کو مذہب کا نام دیا کرتے ہیں ہمارا ایمان اوراق خزاں دیدہ کی طرح ہر سمت بکھرا پڑا ہے اور ہم کو اس کی توفیق نہیں ہوتی کہ ان اوراقِ خزاں دیدہ کو اکٹھا کریں، ان کی شیرازہ بندی کریں اور ان کو ایک بار پھر اسی شجر سایہ دار کے قدموں میں سجا دیں جس کی شاخ سے جدا ہو کر یہ اوراق اِس حالت کو پہنچ گئے ہیں۔ آیئے ہم سب اس ماہِ مبارک میں صدق دل کے ساتھ عہد کریں کہ ہم اپنے پندار کے صنم کدوں کو ویران کر ڈالیں گے، نفسانیت کے بتوں کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیں گے، دریائے معاصی کو خشک کر کے رکھ دیں گے۔ گمرہی کے آذرکدوں کو نیست و نابود کر ڈالیں گے، شیرازۂ ناخداترسی کو بکھیر کر رکھ دیں گے۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم مسلمانوں کو دیکھ کر دنیا کے دوسرے لوگ ہمارے ہادیٔ برحق اور اللہ کے رسولؐ کو ہم ہی جیسا قیاس کرنے لگیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ گناہِ عظیم ہو گا جس کے لیے ہم سب، خواہ عالم ہوں یا عامی، علامۂ دہر ہوں یا فاضلِ دوراں عنداللہ ماخوذ ہوں گے۔

کبیر احمد جائسی

سرسیّد احمد خانؒ

بشارات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انجیل میں سے

بشارتِ اوّل

عیدِ فسح سے تھوڑی مدت پہلے جب حضرت عیسٰی کو معلوم ہوا کہ اب ان کا وقت بہت قریب آگیا ہے اور اب وہ گرفتار ہونے والے ہیں تو انھوں نے اپنے حواریوں کو بہت سی نصیحتیں کیں۔ انہی نصیحتوں میں یہ بھی فرمایا کہ "یہ امور میں نے تم سے کہے۔ جب کہ تمہارے ساتھ تھا لیکن پیریکلیطاس پاک روح جس کو باپ بھیجے گا میرے نام سے ہر بات تم کو سکھائے گا اور یاد دلا دے گا تم کو تمام وہ باتیں جو کہ میں نے تم سے کہی ہیں"۔ (انجیل یوحنا، باب ۱۴، ۲۵-۲۶) "تاہم میں تم سے سچ کہتا ہوں یہ بھلا ہے تمہارے لیے کہ یہاں سے میں چلا جاؤں۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو پیریکلیطاس تمہارے پاس نہ آوے گا"۔ (انجیل یوحنا، باب ۱۶، ۷)

بالفعل جو انجیل کے نسخے موجود ہیں اُن میں لفظ پیریکلیطاس اسی املا سے لکھا ہوا ہے۔ جس طرح کہ ہم نے لکھا ہے مگر ہم مسلمان یہ یقین نہیں کرتے کہ حضرت عیسٰی نے یہ یونانی لفظ بولا تھا۔ کیونکہ ان کی زبان عبرانی تھی جس میں کالڈی یعنی خالدیہ کے زبان کے لفظ بھی ملے ہوئے تھے۔ عبرانی و خالدی زبانیں ایک ہیں۔ پس ہم مسلمانوں کا یہ یقین ہے کہ اس مقام پر فارقلیط کا لفظ فرمایا تھا جیسا کہ بشپ مارش صاحب کی بھی رائے ہے مگر جب انجیلیں یونانی زبان میں لکھی گئیں تب اسی کی جگہ یونانی لفظ لکھا گیا۔ بایں ہمہ ابتدا میں اس لفظ کا ترجمہ پیریکلیطاس نہیں کیا گیا جس کے معنی تسلی دینے والے بیان کیے جاتے ہیں۔ بلکہ اس کا ترجمہ پیریکلیوطاس کیا گیا تھا جو ٹھیک ٹھیک فارقلیط کے لفظ کا ترجمہ ہے اور جس کا ترجمہ عربی زبان میں ٹھیک ٹھیک لفظ احمد ہے۔ بلاشبہ اس بات کا ثبوت کہ یہ لفظ پیریکلیوطاس ترجمہ ہوا تھا اور پیریکلیطاس نہیں تھا ہمارے ذمے ہے چنانچہ ہم اس کو بتائیدِ روح القدس بخوبی ثابت کریں گے۔ اس لفظ پر بہت بڑے بڑے عالموں نے بحث کی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ انھیں کے اقوال کا ذکر کرنا شاید کافی ہوگا۔

سر ولیم میور صاحب لائف آف محمد جلد اول صفحہ ۱۷، میں ارقام فرماتے ہیں۔ "یوحنا کی انجیل کا ترجمہ جو ابتدا میں عربی زبان میں ہوا اس میں اس لفظ کا ترجمہ غلطی سے احمد کر دیا گیا ہوگا یا کسی خودغرض جاہل راہب نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانے میں جعل سازی سے اس کا استعمال کیا ہوگا، جس کو مسلمان اپنے پیغمبر کی بشارت قرار دیتے ہیں"۔

اوّل تو ہم مسلمانوں کو یوحنا کی انجیل کے کسی ایسے عربی ترجمے کی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے پہلے (یا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود ہو مطلق اطلاع نہیں ہے نہ ہمارے اگلے بزرگوں نے اس کا کچھ ذکر کیا ہے اور نہ ایسے ترجمے کے موجود ہونے کا کچھ ثبوت پیش کیا گیا ہے۔ عرب میں حضرت متی کی اصلی انجیل جو عبرانی زبان میں تھی اور اب معدوم ہے، البتہ

پائی جاتی تھی اور اس کا ذکر ہمارے ہاں کی قدیم کتابوں میں پایا جاتا ہے مگر یوحنا کی انجیل کا کچھ ذکر نہیں ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ کسی خودغرض راہب نے یہ جعل سازی کی ہو اس پر ہم یقین نہیں کر سکتے کیونکہ اگر کسی خودغرض راہب کے اس لفظ میں جعل کرنے کا ہم یقین کریں گے جیسا کہ سر ولیم میور صاحب نے فرمایا ہے تو ہم کو بہ مجبوری اس بات کا یقین کرنا پڑے گا کہ بعض دین دار راہبوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتیں چھپانے کو بھی انجیل مقدس میں تحریفیں کی ہیں جیسا کہ عموماً مسلمان یقین کرتے ہیں مگر ہم کو ایسی بدگمانیوں پر تحقیق سے باز رہنا نہیں چاہیے بلکہ استقلال سے تفتیش کرنی چاہیے کہ اگلے عالموں نے اس پر کیا بحث کی ہے اور فیلالجی یعنی علم مطابق اللسان جو اس زمانے میں نہایت ترقی پر ہے، اس سے کیا ثابت ہوتا ہے۔

گاڈ فری ہیگنس جو ایک بہت بڑے عالم حال کے زمانے میں گزرے ہیں اور انگریز تو تھے ہی اور انگریزی زبان تو ان کی زبان ہی تھی مگر یونانی اور عبرانی و کالڈی زبان بھی خوب جانتے تھے اور علم مطابقت السنہ سے بھی واقف تھے، انھوں نے اس کی کیا تحقیق کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "مسلمان بیان کرتے آئے ہیں اور اب بھی بیان کرتے ہیں کہ یہ بشارت حضرت عیسیٰؑ نے محمد رسول اللہ کی دی ہے جس طرح حضرت اشعیاہ نے کیخسرو کی پیشگوئی کی تھی اور دونوں پیشگوئیوں میں دونوں کا نام بتا دیا گیا تھا۔"

گاڈ فری ہیگنس صاحب تو اس مقام پر مسلمانوں کی طرف سے ایک مجادلانہ تقریر کرتے ہیں اور اس کے بعد محققانہ، ان کی مجادلانہ تقریر مسلمانوں کی طرف سے یہ ہے کہ "مسلمان کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیا تھا وہ اس لفظ سے نہیں لیا جو لفظ کہ اب انجیلوں میں موجود ہے۔ بلکہ وہ لفظ پیریکلیوطاس تھا جس کے معنی بزبان عربی احمد کے ہیں اور ابتداً انجیل میں یہی لفظ تھا۔ مگر بعد میں اس کی تحریف کر دی ہے اور عیسائی اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ ان کی کتب موجودہ میں بہت سی تحریفیں یا اختلاف قرأت ہیں اور مسلمان یہ بھی کہتے ہیں کہ اس عبارت کے چھپانے کے لیے تمام قلمی نسخے غارت کر دیے گئے۔

قلمی نسخوں کے غارت ہو جانے کا انکار نہیں ہو سکتا اور یہ وہ بات ہے جس کی نسبت جواب باصواب دینا مشکل ہے اور قدیمی نسخوں کی نسبت تو یہ ہے کہ چھٹی صدی کے قبل کا کوئی بھی قلمی نسخہ موجود نہیں ہے مگر اگر اس کا جواب یہ دیا جاوے کہ ترتولین اور قدیمی مصنفوں کی عبارت سے ثابت ہو سکتا ہے کہ انجیلوں کی صحیح قرأت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے بیشتر ایسی ہی تھی جیسے کہ اب ہے اور اس لیے ان میں تحریف نہیں ہوئی تو اس صورت میں ان قدیمی نسخوں میں بھی تحریف کا ہونا ثابت کرنا پڑے گا اور کیا عجب ہے کہ ان میں بھی ہوئی ہو۔ جن لوگوں نے انجیل مقدس کے قدیمی قلمی نسخوں کو غارت کر دیا۔ انھوں نے ایک وصلی کو جس پر قدیمی مصنف کی تصنیف لکھی گئی ہو، از سر نو لکھنے میں کیا دریغ کیا ہو گا۔ اس بات کو اوّل درجے کے دین دار عالموں نے تسلیم کیا ہے کہ انجیل میں اور مقصدوں کے لیے تحریف ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ جو لوگ ایک مقصد کے لیے تحریف کریں گے وہ دوسرے مطلب کے لیے کیوں نہ کریں گے اور جو کہ تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ لفظ عبرانی ہے۔ پس اگر غلط لکھا گیا ہو تو گمان غالب یہ ہے کہ ابتدا کے عیسائی مورخوں نے جو دنیا میں سب سے بڑھ کر جھوٹ بولنے والے ہیں، اپنے خاص مطلب کے لیے جھوٹ بولا ہو اور یہ گمان نہایت ضعیف ہے کہ یوحنا حواری نے جو عبرانی شخص تھا کوئی غلطی کی ہو۔ کیوں وہ عبرانی و یونانی دونوں زبانوں کو سمجھتے تھے اور اگر بالفرض وہ عبرانی زبان کے بڑے عالم نہ ہوں اور اسی وجہ سے انھوں نے یونانی لفظ کلیطاس کو بجائے کلیوطاس غلطی سے لکھ دیا ہو تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ یوحنا کی انجیل کے اصل متن میں تحریف ہوئی ہے۔"

اس کے بعد گاڈ فری ہیگنس صاحب مسلمانوں کی طرف سے ایک اور مجادلانہ تقریر لکھتے ہیں اور وہ یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا بیان ہے کہ یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ اگر عیسائی مناسب سمجھتے تو نہایت عمدہ قلمی نسخوں کو محفوظ کر سکتے تھے جس طرح کہ انھوں نے بہت سے ولیوں کی لاشوں کو نہایت آسانی سے محفوظ رکھا ہے

چنانچہ یوحنا اور مریم اور پطرس اور پولس وغیرہ کی لاشیں ہر روز اٹلی میں نظر آتی ہیں۔

پس مسلمان ضرور بار بار عیسائیوں سے کہیں گے کہ اس غلط ترجمے کے چھپانے کے لیے کل قلمی نسخے غارت کر دیے یا اُن میں جھوٹ ملا دیا گیا اور اگر ایسا نہ تھا تو وہ غارت کیوں کر دیے گئے اور یہ عیسائیوں کو ان کا جواب باصواب دینے میں بہت کچھ دقت ہوگی۔ کیونکہ قلمی نسخوں کے غارت ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا اس لیے کہ وہ موجود نہیں ہیں۔

اِس لیے گاد فری ہیگنس صاحب نے محققانہ طور پر گفتگو شروع کی ہے اول وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ جو بشارتیں اِن آیتوں میں مندرج ہیں۔ ان سے بہت سے قدیم عیسائی کسی شخص کے مبعوث ہونے کی پیشگوئی سمجھتے تھے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رومی پادریوں اور پروٹسٹنٹ نے جو اس لفظ کے معنٰی میں تحریف کی ہے اور اس سے صرف روح القدس کا حواریوں پر آنا مراد لیا ہے، ابتدا میں یہ رائے عام نہ تھی۔ چنانچہ دوسری صدی میں ترتولین کے زمانے سے پہلے مانٹینی آس ایک شخص پیدا ہوا تھا جس کو بہت لوگ سمجھتے تھے کہ وہی پیریکلیوطاس ہے جس کے بھیجنے کا حضرت عیسٰیؑ نے وعدہ کیا تھا کہ اس کے دشمنوں نے اُس کی نسبت بے اصل بات مشہور کی تھی کہ وہ روح القدس ہونے کا دعوی کرتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں نے مانٹینی آس کے سبب انجیلوں میں تحریف کی اور یہ ماجرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ مانٹینی آس کے زمانے کے بعد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے بہت بیشتر مینیس کو بھی اُس کے پیرووں نے جو بڑے عالم اور طاقت ور تھے، وہی شخص سمجھا تھا جس کے مبعوث ہونے کی حضرت عیسٰی نے بشارت دی تھی۔ لیکن اس کے انجام سے ثابت ہوتا ہے مینس شخص موعود نہ تھا اور اس کے پیرو غلطی پر تھے۔

بعد اس کے گاڈ فری ہیگنس صاحب مسلمانوں کی طرف سے لکھتے ہیں کہ "مسلمان کہتے ہیں کہ اس لفظ سے جو عیسائی روح القدس کا حواریوں پر آنا مراد لیتے ہیں وہ کسی طرح درست نہیں ہو سکتا اگر اس کے معنی تشفی دہندہ کے ہوں تو وعدہ تو ایک تشفی دہندہ کے آنے کا تھا پھر یہ کہنا کہ ظہور بارہ زبانہ آتشیں کا وہی شخص موعود ہے محض فضول ہے۔ علاوہ اس کے حواریوں کے قوانین اور خود عیسائیوں کی کتاب سے کسی طرح پایا نہیں جاتا کہ روح القدس کا حواریوں میں آجانا تشفی دہندہ موعود کا آنا ہوا اور صرف زبان سے کہہ دینے سے ایسے دعوے کی تصدیق نہیں ہو سکتی ہے۔

علاوہ اس کے پینٹی کاسٹ کی ضیافت میں حواریوں پر روح القدس نازل ہو چکی تھی۔ کیونکہ بموجب قول عیسائیوں کے ایک بریدہ زبان آتش نے ہر ایک حواری پر طاری ہو کر اسی لمحے اُن کو سب زبانیں بولنے کی طاقت بخشی تھی اور یوحنا کے بیسویں باب کی بائیسویں آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت عیسیٰؑ نے اپنے جانے سے تھوڑے عرصے بیشتر یہ فیض ان کو عطا کر دیا تھا یعنی پینٹی کاسٹ کی ضیافت کو جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں دو مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ فیض مذکور عنایت کیا گیا تھا۔ عیسائی مذہب کی تمام مذہبی کتابوں میں کہیں نہیں پایا جاتا کہ یہ زبانہ ہائے آتشیں جن سے کہ سب زبانیں بولنے کی طاقت عطا ہوئی تھی، تشفی دہندہ موعود تھیں جو ایسا ہوتا تو ضرور کتاب مذکور میں ہوتا۔

اگر اس کے جواب میں یہ کہا جاوے کہ وہ عطایا جن کا بیان متی کی انجیل میں ہے اور فیض روح القدس جس کا بیان یوحنا کی انجیل کے بیسویں باب کی بائیسویں آیت میں ہے صرف چند روز کے لیے اور پھر لے لیا تھا اور بعد کو ہمیشہ کے لیے آیا تو مسلمان کہیں گے کہ یہ صرف ایک حیلہ ہے جس کی تصدیق انجیل کے کسی لفظ سے نہیں ہوتی۔

اسی بحث میں گاڈ فری ہیگنس صاحب نے ایک نہایت عمدہ قول فیصل لکھا ہے کہ یعنی اگر تسلیم کیا جاوے کہ یہ لفظ وہی ہے جو اس زمانے کے عیسائی کہتے ہیں اور اس کے معنی بھی روح القدس ہی کے ہوں تو مسلمان عیسائیوں سے کہیں گے کہ تم کہتے ہو کہ انجیل

میں بشارت ہے کہ روح القدس آوے گی یہ درست ہے کہ روح القدس آئی مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں آئی جن کو روح القدس سے الہام ہوتا تھا۔ پس تمہاری پیچیدہ عبارت کے یہی صحیح معنیٰ ہیں اور یہی معنی درستی کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔

یہ لفظ تو گاڈفری ہیگنس صاحب کے تھے اور میں اس پر اتنا اور زیادہ کرتا ہوں کہ جو عام ہدایت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی اور تمام جزیرۂ عرب بتوں کو چھوڑ کر ایک خدا کی پرستش کرنے لگا اور تمام دنیا میں وحدانیت کا ڈنکا بج گیا اور حضرت عیسیٰ پر جو اتہام خدا کا بیٹا ہونے کا کیا تھا وہ مٹ گیا اور اس بات کا بڑا ثبوت ہے کہ ضرور وہ روح القدس اور روح الصدق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔

اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمد رسول الله
واشهد ان محمد عبده ورسوله

اس کے بعد گاڈفری ہیگنس صاحب اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ یہ لفظ پیریکلیطاس جس کے معنیٰ تسلی یا تشفی دہندہ کے بیان کیے جاتے ہیں بلکہ یہ لفظ پیریکلیوطاس ہے جس کے معنیٰ احمد کے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی دلیل کو، بابت ترجمہ لفظ پیریکلیوطاس کے بجائے پیریکلیطاس کے اس طرز تحریر سے بہت مدد ملتی ہے جو سینٹ جیروم نے انجیل کے لیٹن ترجمے میں اختیار کی ہے۔ یعنی اس ترجمے میں لیٹن زبان میں پیریکلیطاس لکھا تھا پیریکلیوطاس کی جگہ۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ جس کتاب سے سینٹ جیروم نے لیٹن میں ترجمہ کیا اس میں لفظ پیریکلیوطاس تھا نہ پیریکلیطاس۔

لفظ پیریکلیطاس کے معنیٰ پر پادریوں میں بہت اختلاف ہے۔ چنانچہ مشہور عالم مائی کیلس کہتا ہے کہ ارنشائی نے بہت مناسب کہا ہے کہ اس کے معنی نہ حامی کے ہیں نہ تشفی دہندہ کے اور یہ بھی کہتا ہے کہ میں تحقیق خیال کرتا ہوں کہ پیریکلیطاس یا تو روح القدس کو کہتے ہیں یا معلم یا مالک کو یعنی بتانے والا خدا تعالیٰ کی سچائی کا اور میں اس کی رائے سے درباب صحیح نہ ہونے ترجمے کے مطابقت کرتا ہوں۔ گو میں اس کو ڈاکٹر یعنی عالم متبحر کا لقب نہیں دیتا بلکہ مانیٹر یعنی معلم کا لقب دیتا ہوں۔ اس لیے کہ جو معنیٰ اس نے لفظِ مذکور کے لکھے ہیں بہتیروں نے اختیار کیے ہیں۔ البتہ اس کے اثبات کا جو طرز اس نے اختیار کیا ہے وہ عجیب ہے۔ اس کو چاہیے تھا کہ لفظ مذکور کو کسی محقق کی تصنیف میں تلاش کرتا اور اس کے معنوں کی تشریح اس لفظ کے استعمال سے ثابت کرتا۔ اس نے ان سب باتوں کو چھوڑ کر جس زبان کے لفظ سے یہ نکلا ہے (یعنی کالڈی زبان سے) اس کے محاورے اور استعمال سے اپنا بیان ثابت کرنے پر استدلال رکھا ہے۔

بہت بڑے عالم اور معزز بشپ مارش نے کہا ہے کہ لفظ پیریکلیطاس کے تین ترجمے ہیں اور ہم کو اختیار ہے کہ ان میں سے جونسا چاہیں پسند کریں۔ اول معنی حامی کے ہیں جو معتبر اور یونانی اکابر کے نزدیک مسلّم ہیں۔ دوسرے معنیٰ مبین کے ہیں اور یہ وہ معنی ہیں کہ ارنسٹائی نے بحوالہ لفظ فارقلیط کے جو کالڈی زبان کا لفظ ہے، کیے ہیں۔ تیسرے معنیٰ واعظ کے ہیں جس کو خود بشپ مارش بحوالہ ایک عبارت مصنفہ فائلو کے تسلیم کیا ہے۔ پس یہ صاف ظاہر ہے کہ اس مشہور لفظ کے معنوں میں اور اس پیغمبر کی قسم میں جس کے بھیجنے کا حضرت عیسیٰؑ نے وعدہ کیا تھا بہت اشتباہ شک ہے۔

یہ لفظ گاڈفری ہیگنس صاحب کے ہیں مگر میں اس پر اتنا اور زیادہ کرتا ہوں کہ اگر بشپ مارش ہی کے معنی تسلیم کیے جاویں اور اس لفظ کو پیریکلیطاس ہی مانا جاوے اور اس کے معنیٰ واعظ ہی کے قرار دیے جاویں تو بھی بجز محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی کے حق میں یہ بشارت نہیں ہوسکتی اس لیے کہ حواریین جنھوں نے انجیل کا وعظ کیا وہ اس سے پہلے روح القدس سے معمور ہو چکے تھے اور وہ سب اُس وقت موجود تھے۔ اُن کی نسبت تو یہ کہا ہی نہیں جاسکتا کہ میں بھیجوں گا۔ کیونکہ وہ موجود تھے۔ محمد رسول اللہ جب آئے تو انھوں نے صاف صاف بتلایا۔ آنا بشو

مثلکم ــــــ واحدہ (سورہ مریم آیت ۱۱۰[1]) میں بھی تم سا ایک آدمی ہوں صرف مجھ پر وحی بھیجی گئی ہے بے شک تمہارا خدا وہی ایک خدا ہے۔ پھر اس سے بھی زیادہ صاف فرمایا، لا املک ــــــ یؤمنون۔ (اعراف: آیت ۱۸۸)[2] میں اپنی جان کے لیے بھی کچھ فائدہ یا نقصان پہنچانے پر قادر نہیں ہوں۔ بجز اس کے جو خدا چاہے اور اگر میں غیب کی بات جانتا ہوتا تو بہت کچھ بھلائیاں جمع کر لیتا اور مجھ کو کوئی برائی چھوتی بھی نہیں۔ میں تو ان قوموں کو جو ایمان لائی ہیں ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں۔ اور پھر اور بھی صاف فرمایا۔ قل انما اعظکم ــــــ عذاب شدید (سورہ سبا آیت ۴۶) "میں تو تم کو صرف ایک بات کا یعنی لا الہ الا اللہ کا وعظ کرتا ہوں پھر تم خالصتاً للہ دو دو ایک ایک کھڑے ہو اور سوچو کہ جو شخص تمہارے ساتھ ہے اس کو کچھ جنون نہیں۔ وہ تو تم کو صرف عذاب میں پڑنے سے پہلے ڈرانے والا ہے۔" اس کے سوا اور بہت سی جگہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی طرف سے فرمایا کہ خدا تم کو اس بات کا وعظ کرتا ہے اور خدا کا وعظ کرنا اور پیغمبر کا وعظ کرنا برابر ہے۔ پس سوائے محمد رسول اللہ ﷺ کے کسی پیغمبر نے ایسا صاف صاف نہیں فرمایا کہ میں تو صرف وعظ کہنے والا ہوں۔ پس اگر اس لفظ کے معنی واعظ ہی کے ہوں جیسا کہ بشپ مارش نے کہا ہے تو بھی وہ سچا واعظ بجز محمد رسول اللہ ﷺ کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

بعد اس کے گاڈ فری ہیگنس صاحب کہتے ہیں کہ "یہ تسلیم کرنا ضرور ہے کہ لفظ مذکور (یعنی فارقلیط) جیسا کہ بشپ مارش نے لکھا ہے کہ یقیناً عیسیٰ مسیح نے استعمال کیا تھا، مسلمانوں کے دعوے کو بہت کچھ سہارا دیتا ہے۔" وہ کہتے ہیں کہ "میری رائے میں اہل اسلام لفظ فارقلیط کو یونانی میں پیریکلیوطاس بنا لینے کا اسی قدر اختیار رکھتے ہیں جس قدر کہ عیسائی پیریکلیطاس کا۔" بلکہ ان کی رائے میں غلبہ کا پلہ مسلمانوں کی طرف ہے۔ کیونکہ عیسائی مجاز نہیں کہ پچھلے جزو میں لفظ زبان خالدی کے حرف یدیعنی یائے تحتانی کو جو مثل حرکت کسرے کے ہے یا حرف ایتا کو جو یائے تحتانی ممدودہ معروف کے برابر ہے حرف ایوتا کے عوض میں لیں۔

حرف یدحروف تہجی زبان خالدیہ کا دسواں حرف ہے اور شمار میں اس کے عدد بھی دس ہیں۔ پس اگر لفظ مذکور ایک زبان سے دوسری زبان میں بدلا جائے تو اس یونانی حرف سے بدلنا چاہیے جو دس کے معنی میں آیا ہے اور جو ابتدا میں حروف تہجی میں دسواں تھا، قبل اس کے کہ یونانیوں کا حرف ڈگامہ جاتا رہے جیسا کہ میں نے اس کو کثرت سے اپنے اس جواب مضمون میں ثابت کیا ہے جو درباب جواب[3] مغربی فرنگستان کے قدیمی پادریوں کے لکھا ہے۔

مگر میں علاوہ اس کے یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر حضرت عیسیٰ کا استعمال کیا ہوا لفظ فارقلیط تھا اور یہ کہ اس لفظ کے معنی ستودہ کے ہیں جیسا کہ سیل صاحب کا بھی قول ہے تو اس کا ترجمہ اس لفظ یونانی پیریکلیطاس میں غلط ہے۔ یعنی اختلاف قرأت کی جہت سے اور یہ کہ بشپ مارش اور انسٹائی دونوں کے کُل ترجمے غلط ہیں اور لفظ مذکور اس لفظ سے مبدل کرنا چاہیے جو ستودہ کے معنی رکھتا ہو اور واقع میں یہ لفظ پیریکلیوطاس ہونا چاہیئے۔

مگر اس کا ترجمہ فارقلیط علم کے معنی لے کر نہ کرنا چاہیے بلکہ اسم صفت کے طور پر کرنا چاہیے۔ چنانچہ اہل اسلام بمعنی احمد کے لیتے ہیں۔ اگر یہ لفظ حضرت عیسیٰ کا استعمال کیا ہوا زبان خالدیہ یا عبرانی یا عربی کا ہو تو اس سے وہی مراد پائی جانی چاہیے جو اس کے معنی ان زبانوں میں تھے۔ اگر وہ خالدیہ کا لفظ عربی مصدر سے مشتق ہو تو اس کے وہی معنی چاہئیں جو عربی مصدر کے ہیں

---

[1] یہ فاحش غلطی طباعت کی ہے۔ درج بالا آیت سورۂ کہف کی ہے۔ آیت کا نمبر درست ہے۔
[2] اصل میں "جنوب" کا لفظ شائع ہوا ہے جو یقیناً طباعت کی غلطی ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۹۵۰ [ادارہ]

اورتب اس کے معنیٰ ستودہ یا شخص ممتاز کے ہوں گے۔

اگر ناظرین غوض کریں گے تو معلوم کریں گے کہ لفظ کلیوطاس کو ہومر اور ہسیڈ دونوں نے بجائے ستودہ آدمی کے استعمال کیاہے۔ اس طرح سے میری دانست میں اہل اسلام کی دلیل اس سلیقے کے ساتھ ہے کہ اگر ان کو ان کی غلطی پر محمول کیا جائے تو عجب نہیں کہ بہت مشکل پڑے یہ ادنیٰ بات ہے مگر ان کی دلیل میری نظر سے نہیں گزری۔

مگر مجھ کو اس مشہور لفظ فارقلیط کی نسبت کچھ اور بھی کہنا ہے۔ اس کو بشپ مارش نے جس کے قول کو عیسائی صادق مانتے ہیں ایک مسلمان کی منتخب کی ہوئی دلیل میں تسلیم کر لیا ہے کہ وہ سُریانی یا خالدیہ یا عربی ہے مگر یونانی نہیں۔ ان زبانوں میں سے ایک کو یا دو کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ضرور بولتے ہوں گے یا ادنیٰ درجہ یہ کہ سمجھتے ہوں۔ اور یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ لفظ مذکور کے یونانی ترجمے کی نسبت آپ کو کچھ بحث ہوتی ہو۔ کیوں کہ حضرت عیسیٰؑ کے کلاموں کے یونانی ترجموں سے عرب کے لوگوں کو کیا غرض تھی۔ عرب میں ان ترجموں کا کیا کام تھا۔ ان لوگوں کو کیا فائدہ پہونچا سکتے تھے جو ان کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکتے تھے بجز ایسے لوگوں کے جو اس اصل زبان کو سمجھتے تھے جس کو حضرت عیسیٰؑ بولتے تھے۔ آپؐ نے لفظ مذکور اسی طرح بہ لیا ہوگا جیسے کہ منقول چلا آتا تھا یا جیسا کہ سیل صاحب نے اس کو لکھا ہے جس کے معنی ستودہ کے ہیں اور اس سے زیادہ غالبًا آپ نے کبھی دریافت نہیں کیا یہ خیال کرنا کیسا بیہودہ ہے کہ اپنی خاص زبان کے ایک لفظ کے معنیٰ کی تشریح غیر زبان میں ڈھونڈتے۔ آپ نے لفظ مذکور کو مثل اس زمانے کے دوسرے فرقوں کے شخص انسانی پر محمول کیا اور یہ اجازت نہیں دی کہ اس کو ثالث ثلثہ کہیں جیسا کہ اس زمانے کے موحد بھی کہتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے اس کو احمد کے معنیٰ میں لیا ہو اور اس کی نسبت کبھی جھگڑا یا شک نہ کیا ہو۔

یہ تمام تقریر گاڈ فری ہیگنس صاحب کی ہے جو انھوں نے مسلمانوں کی طرف سے کی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کی بحث لفظ پیریکلیطاس پر جو اب یونانی انجیل میں ہے یا لفظ پیریکلیوطاس پر جو اصل نسخوں میں تھا منحصر نہیں ہے کیونکہ یہ انجیلیں یونانی زبانوں میں لکھی گئی ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کی زبان نہیں تھی۔ پس انھوں نے جو لفظ فرمایا تھا وہ عبرانی یا خالدنی زبان کا تھا جو دونوں ایک ہیں۔ پس ہم مسلمان کہتے ہیں کہ وہ لفظ فارقلیط تھا۔ یونانی انجیلوں میں اس کے بجائے جو لفظ ہے فارقلیط کا ترجمہ ہے۔ ہم مسلمان کہتے ہیں کہ اس کا ترجمہ یونانی میں پیریکلیوطاس کیا گیا تھا جو درحقیقت صحیح ترجمہ ہے اور اس کا ثبوت بھی جہاں تک ہو سکا دیا گیا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ نہیں پیریکلیطاس ہی اس کا ہمیشہ سے ترجمہ چلا آتا ہے تو ہم مسلمان یہ کہیں گے کہ یہ ترجمہ غلط ہے کیونکہ فارقلیط کا ترجمہ پیریکلیطاس نہیں ہے بلکہ پیریکلیوطاس ہے اور اس کا فیصلہ عبری وخالدی زبان کے لغت کی تحقیق پر ہر وقت ہو سکتا ہے اور جو کہ مشہور ہے کہ انجیل یوحنا درحقیقت حضرت یوحنا حواری کی لکھی ہوئی ہے۔ اس لیے ہم یقین نہیں کر سکتے کہ حضرت یوحنا نے فارقلیط کے ترجمے میں غلطی کی ہو اور جو دلیلیں مذکور ہوئیں ان سے بھی پایا جاتا ہے کہ انھوں نے غلطی نہیں کی۔ اس لیے اصل میں وہ لفظ پیریکلیوطاس ہے یعنی احمد نہ پیریکلیطاس یعنی تسلی دہندہ۔

اکثر عیسائی خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے اس بشارت کو انجیل برنباس سے اخذ کیا ہے اور جارج سیل صاحب نے بھی ترجمۂ قرآن کے دیباچے میں یہی خیال کیا ہے بلکہ انھوں نے لکھا ہے کہ یہ آیت قرآن مجید کی یاتی من بعدی اسمہ احمد، اسی انجیل میں سے اخذ کی گئی ہے اور شاید اخیر زمانے کے ایک آدھ کچے مسلمان اور جاہل مولوی نے کہیں سن سنا کر کہ برنباس کی انجیل میں بھی یہ مطلب آیا ہے، شاید اس کا حوالہ دے دیا ہو مگر قدیم عالموں اور بڑے بڑے محققوں نے اس

بشارت کی بابت برنباس کی انجیل کا خواہ وہ صحیح ہو یا غلط نام تک نہیں لیا جارج سیل صاحب کی غلطی ہے جو وہ ایسا کہتے ہیں۔

بشارت دوم

جب بعد مصلوب ہونے اور قبر میں دفن کیے جانے کے حضرت عیسٰی زندہ ہو کر اُٹھے اور حواریوں سے ملے اور ان کے سامنے مچھلی کا ٹکڑا اور شہد کھایا تو بیت عنیا میں جانے اور آسمان پر چلے جانے سے تھوڑی دیر پہلے انھوں نے اپنے حواریوں سے فرمایا: "اور دیکھو میں بھیجتا ہوں وعدہ اپنے باپ کا تم پر لیکن تم شہر یروشلم میں جب تک کہ تم پر عطا ہو قوت اوپر سے" (انجیل لوقا باب ۲۴ آیت ۴۹)

چند سطروں کے بعد لوقا اپنی انجیل ختم کرتے ہیں اور کچھ ذکر اس وعدے کے پورا ہونے کا نہیں کرتے بلکہ لکھتے ہیں کہ حضرت عیسٰیؑ یہ کہہ کر آسمان پر چلے گئے تو تمام حواری اُن کو سجدہ کر کے بڑی خوشی سے یروشلم کو پھرے اور ہمیشہ ہیکل میں خدا کی تعریف اور شکر کرتے رہے اور انہی لفظوں پر لوقا کی انجیل ختم ہوتی ہے اور اس وعدے کے وفا ہونے کا کچھ ذکر نہیں ہوتا۔ پس ثابت ہوتا ہے کہ لوقا کی زندگی تک یا کم سے کم اس انجیل کے لکھے جانے کے وقت تک وہ وعدہ جس کو لوقا لکھ چکے تھے پورا نہیں ہوا تھا۔

لوقا کے نزدیک روح القدس کا زبانہائے آتشیں میں حواریوں پر نازل ہونا (اگر وہ اس کے بعد نازل بھی ہوئے ہیں) اس وعدے کا پورا ہونا نہیں تھا۔ کیوں کہ اگر ہوتا تو وہ اس وعدے کے پورا ہونے کا ذکر ضرور لکھتے۔ پس ضرور ہے کہ یہ وعدہ کسی اور شخص کے مبعوث ہونے کا تھا۔

اب ہم کو اُس شخص کی تلاش کرنی مناسب ہے جس کے آنے کی حضرت عیسٰیؑ نے بشارت دی۔ جب ہم اس آیت کو دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسٰیؑ نے حواریوں سے فرمایا کہ "اس وعدے کے آنے تک تم شہر یروشلم میں ٹھہرے رہو" تو ہم کو تعجب ہوتا ہے کہ اس وعدے کے آنے اور شہر یروشلم میں ٹھہرے رہنے سے کیا تعلق ہے۔ اگر بالفرض اس وعدے سے حواریوں پر روح القدس کا نازل ہونا ہی مراد تھی تو بھی یروشلم میں رہنے اور روح القدس کے آنے سے کوئی ضروری مناسبت نہیں پائی جاتی۔ کیوں کہ اگر حواری شہر کے باہر چلے جاتے تو بھی اُن کے پاس روح القدس اُسی طرح آسکتی تھی جیسے کہ شہر میں رہنے کی حالت میں آسکتی تھی۔

پس شہر یروشلم میں ٹھہرے رہنے سے یہ مطلب نہیں ہے جو اس کے لفظی معنوں سے نکلتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ وعدہ پورا ہو تم یروشلم سے وابستہ رہو اور اسی کی عزت اور تعظیم جیسی کہ پیشتر سے کرتے آئے ہو کرتے رہو۔ اسی کی طرف اپنا سر جھکاؤ اپنا منہ اسی کی طرف رکھو جب تک وہ وعدہ پورا ہو۔ چنانچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور وہ وعدہ پورا ہوا اور یروشلم میں رہنے کا زمانہ منقطع ہو گیا اور بیت اللہ میں رہنے کا زمانہ آیا۔ باپ کا وعدہ پورا ہوا اور اوپر سے عطا ہو گئی۔ بیت المقدس کی طرف جو مدت دراز سے قبلہ تھا موقوف ہوا اور مکہ میں ابراہیم کے بنائے ہوئے خانۂ خدا اور کعبۂ معظم کی طرف قبلۂ اہل ایمان قرار پایا۔ پس یہ بشارت صاف ہمارے پیغمبر کے مبعوث ہونے اور بیت المقدس کے قبلہ رہنے کے زمانے کے اختتام اور بیت اللہ الحرام کے قبلہ ہونے کی بشارت ہے۔

قال اللہ تبارک و تعالیٰ قد نریٰ تقلب وجھک فی السماء فلنولینک قبلۃ ترضٰھا فول وجھک شطر المسجد الحرام

[ہم آپ کے منہ کا (یہ) بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں۔ اس لیے ہم آپ کو اُسی قبلہ کی طرف متوجہ کر دیں گے جس کے لیے آپ کی مرضی ہے۔ (لو) پھر اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام (کعبہ) کی طرف کیا کیجیے]

بشارت سوم

" جب کہ حضرت یحییٰ پیغمبر ہوئے تو یروشلم سے یہودیوں نے کاہنوں اور لیویوں کو ان کے پاس بھیجا تاکہ ان سے پوچھیں کہ وہ کون ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ گئے اور ان سے یہ گفتگو ہوئی کہ اس نے یعنی حضرت یحییٰ نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا اور اقرار کیا کہ میں کرستاس یعنی عیسیٰ مسیح نہیں ہوں اور انھوں نے پوچھا اُس سے، پھر کون، کیا تو ایلیاس ہے؟ اور اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ تو وہ نبی ہے؛ اور اس نے جواب دیا نہیں۔ تب انھوں نے اس سے کہا کہ کون تو ہے تاکہ ہم جواب دے سکیں ان کو جنھوں نے ہم کو بھیجا ہے، اپنے تئیں تو کیا کہتا ہے۔ اُس نے کہا میں ہوں آواز اُس کی جو کہ جنگل میں چلاتا ہے سیدھا کرو رستہ خداوند کا جیسا کہ نبی اشعیاہ نے کہا اور وہ جو بھیجے گئے تھے فروسی تھے اور انھوں نے اس سے پوچھا اور اس سے کہا کہ تو کیوں اصطباغ کرتا ہے جب کہ تو نہ کرستاس عیسیٰ مسیح ہے اور نہ ایلیاس اور نہ وہ نبی"۔ (یوحنا باب ۱۔ آیت ۲۰ لغایت ۲۵)

ان اوپر کی آیتوں میں تین پیغمبروں کا ذکر ہے۔ ایک حضرت ایلیاسؑ کا اور دوسرے حضرت عیسیٰؑ کا اور تیسرے اس پیغمبر کا جو علاوہ حضرت عیسیٰؑ کے ہونے والا تھا۔ یہودی یقین کرتے تھے پیغمبر ایلیاسؑ جن کو مسلمان خضرؑ کہتے ہیں مرے نہیں بلکہ صرف انسانوں کی نظروں سے غائب ہو گئے ہیں اور یہودیوں کو حضرت عیسیٰ مسیحؑ کی نسبت یہ یقین تھا اور اب بھی ہے کہ وہ کسی نہ کسی دن آویں گے لیکن ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ حضرت مسیحؑ کے ایک اور پیغمبر کے آنے کی بھی امید رکھتے تھے اور وہ پیغمبر ایسا مشہور تھا کہ بجائے نام کے صرف اشارہ ہی اس کے بتانے کو کافی تھا جیسا کہ ہم مسلمان بھی پیغمبر کے نام کی جگہ صرف آنحضرت اشارے میں بحثتے بولتے ہیں۔ اور یہ مشہور پیغمبر کون ہو سکتا ہے بجز اس کے جس کے سبب خداتعالیٰ نے ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ کو برکت دی اور جس کی نسبت خداتعالیٰ نے موسیٰؑ سے کہا کہ تیرے بھائیوں میں تجھ سا پیغمبر پیدا کروں گا اور جس کی نسبت حضرت سلیمانؑ نے کہا کہ میرا محبوب سرخ و سفید سب میں تعریف کیا گیا محمدؐ ہے، یہی میرا محبوب ہے اور یہی میرا مطلوب اور جس کی نسبت حجی نبی نے فرمایا کہ احمد تمام قوموں کا آوے گا اور جس کی نسبت حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا کہ میرا جانا ضرور ہے تاکہ فارقلیط آئے۔ اب میں نہایت مضبوطی سے کہتا ہوں کہ یہ نامی اور مشہور پیغمبر حضرت محمدؐ ہیں واللہ حضرت محمدؐ ہیں۔

[منقول از الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ۔ سلسلۂ تالیفات وکیل ٹریڈنگ کمپنی لمٹیڈ، امرتسر، نمبر ۳، مطبوعہ نولکشور اسٹیم پریس لاہور۔ سنہ اشاعت ندارد، ص ۶۳۸ تا ۶۵۰]

"انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی برائی نہیں ہے جو مسلمانوں کی طرف نہ منسوب کی ہو۔ ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں اُن ہی تاریخوں کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے اور جو بات کہ ازراہِ ناانصافی اور تعصب کے مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے اس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں"۔

سرسیدؒ

محمد یٰسین مظہر صدیقی

سیرتِ نبوی کی ہمہ گیری

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے بارے میں یہ غلط فہمی بلکہ جہالت عام ہے کہ آپؐ دوسرے مذہبی رہنماؤں کی مانند محض ایک مذہبی رہنما تھے اور آپؐ کا میدانِ کار و عمل صرف مذہب کی تنگنائے تنگ تک محدود تھا۔ اس غلط فہمی کی اشاعت میں ہم مسلمانوں بالخصوص ہمارے علمائے کرام نے بڑا حصّہ لیا ہے۔ اس نافہمی اور غلط تصویر کشی کے پس پشت کسی بدنیتی یا بد دیانتی کا قبیح عامل کار فرما نہیں بلکہ سیرتِ نبویؐ کی ہمہ گیری سے ہماری عدم واقفیت اور عام جہالت اس کا سببِ اولین ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ جب ہم مسلمان یہ دعویٰ کرتے ہیں اور صحیح دعویٰ کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ دین و دنیا دونوں کے لیے اسوۂ خیر اور نمونۂ عمل ہے تو اس دعویٰ کا مدلول زندگی کے تمام گوشے اور پہلو بن جاتے ہیں۔ خواہ وہ مذہبی پہلو ہو یا ثقافتی، معاشرتی ہو یا اقتصادی، فوجی ہو یا انتظامی، سیاسی ہو یا تمدنی، اِس حیاتِ مستعار کا ہر پہلو اسوۂ رسول کی روشنی سے جگمگا سکتا ہے۔ سیرتِ طیبہ کا صحیح مطالعہ ہم کو دین و دنیا کے ہر دائرے اور شعبے میں نمونۂ نبوی فراہم کرتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیادی اور اولین حیثیت پیغمبرِ خدا اور فرستادۂ الٰہی کی ہے۔ خالق و مالک کائنات نے آپؐ کو اپنے آخری اور مکمل ترین پیغام کے ساتھ انسانوں کی ہدایت، انسانیت کی فلاح اور دنیائے فانی کو مظہرِ رحمتِ ربانی بنانے کے لیے مبعوث کیا تھا۔ چوں کہ آپ کے پیغام میں ابدیت اور ختم کا عنصر شامل تھا، اس لیے منطقی طور سے آپ کو زندگی کے ہر گوشے میں رہنمائی کا فریضہ انجام دینا تھا اور تاریخ کی شہادت ہے کہ آپ نے اپنے اس فرضِ منصبی کو باحسن وجوہ پورا کیا۔ تیرہ برس کی نبوی مکی زندگی میں آپ نے عقیدہ و عمل کی اولین بنیاد پورے استحکام کے ساتھ قایم کی۔ اصنام و مظاہر پرستی کے دھندلکوں کو چھانٹ کر قلوب و اذہان کو توحیدِ الٰہی، رسالتِ پیغمبران اور قیامِ آخرت کے انقلاب آفریں تصورات و عقاید سے روشناس کیا۔ یہی تین بنیادی تصورات تھے جنھوں نے گمراہ و بے دین مکیوں کو پاکیزہ زندگی عطا کی۔ طہارتِ قلب و دماغ سے طہارتِ جسم و جاں پیدا ہوئی۔ غیر اللہ کی اطاعت و محبت کی جگہ اصل خالق و مالک کی فرماں برداری اور محبت کا جذبہ بیدار ہوا۔ رسول کی اطاعت و فرماں برداری سے حسنِ عمل کی دولت ملی اور آخرت و حساب کتاب کے عقیدے نے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ پاکیزگیٔ حیات کا تصور پیدا کیا، جس نے پوری زندگی کی کایا پلٹ کر دی۔ اگرچہ مکی زندگی میں صرف بنیادی عقاید اور صرف ایک رکنِ اسلام یعنی نماز کی تعلیم دی گئی تھی، لیکن اسی میں پوری انسانی زندگی کے انقلاب کی روح پوشیدہ تھی۔ مدنی زندگی میں باقی ارکانِ ثلاثہ روزہ، زکوٰۃ اور حج کی فرضیت ہوئی لیکن اخلاقِ فاضلہ کی تعلیم مکی مرحلے میں شروع ہو چکی تھی اور بالآخر مدنی دورِ حیات میں پورے مذہب کی تکمیل ہو گئی۔

جس ساعتِ سعید میں پیغامِ محمدی کی تبلیغ شروع ہوئی اور

اس کے ثمرات ظاہر ہونے شروع ہوئے اسی لمحہ نادر میں اسلامی معاشرے کا سنگِ بنیاد رکھ دیا گیا تھا۔ جوں جوں مکہ میں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اسلامی سماج بھی وسیع ہوتا رہا۔ مسلمانوں کی معتدبہ تعداد ہونے کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی مسلمانوں میں مواخاۃ (باہمی اخوت و بھائی چارہ) قایم کیا۔ قریش کے دو مختلف خاندانوں کے دو دو فرد ایک دوسرے کے بھائی قرار دیے گئے، جو حقیقی بھائیوں سے بڑھ کر تھے محبت و شفقت، وراثت و ترکہ، امداد و تعاون اور خلوص و اخلاص میں وہ برابر کے شریک تھے۔ ظاہر ہے کہ اس معاشرے کی بنیاد خون کے رشتے کے بجائے مذہب کے الٰہی تعلق پر رکھی گئی تھی جو امن عالم اور فلاح انسانیت کے لیے زیادہ پائیدار ضامن ہے اگرچہ مکی دورِ حیات میں غیروں کے تسلط اور مشرکوں کے سیاسی تفوق کی بنا پر اسلامی معاشرہ منظم و مرتب نہ ہو سکا لیکن اس کی بنیادی تشکیل کا کام ہو چکا تھا اور جب ہی مدینہ منورہ میں غیر کا تسلط دور ہوا اور اپنوں کا تفوق آیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثالی اسلامی معاشرہ قایم کر دیا۔ جس کے افراد کا حال ایک جسم کے مختلف اعضا کی مانند تھا کہ ایک کا درد نہ صرف دوسرے کو تکلیف میں مبتلا کر دیتا تھا بلکہ پورے جسم کی بے چینی کا سبب بن جاتا تھا۔ اس معاشرے کی اساس محبت و مواسات، حق و انصاف اور فلاح انسانیت پر رکھی گئی تھی یہی سبب ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب، جوا، ناچ رنگ، سود اور دوسرے بہت سے کام جو نقصان دہ تھے، حرام قرار دیے اور اپنے تدریجی اور پر حکمت طریقۂ انقلاب سے اسلامی معاشرے کو تمام برائیوں سے پاک و صاف کر دیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا برپا کیا ہوا سماجی انقلاب آج بھی تمام عالمی سماجوں کے لیے منارۂ نور ہے اور تاقیامِ قیامت وہ روشنی فراہم کرتا رہے گا۔

سیرت طیبہ کا سیاسی پہلو بڑا اہم ہے اور عام طور سے یہی نگاہوں سے اوجھل رہ جاتا ہے۔ بعض رجعت پسند اور ظلمت پرست عالم اور عامی تو اس پہلو کے نام سے بدکنا شروع کر دیتے ہیں۔ خود ساختہ اور رجحانات آفریدہ مصالح کی آڑ میں اس اہم پہلو سے نہ صرف صرفِ نظر کرتے ہیں بلکہ اس کی تردید و تکذیب کو اپنا مسلک بنا لیتے ہیں، مگر یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ مدینہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اسلامی حکومت قایم کی جو ایک ملک گیر ریاست پر منتج ہوئی۔ اس اسلامی ریاست و حکومت کا آغاز معاشرے کی تشکیل کے ساتھ ساتھ ہوا۔ مواخاۃ جو اس مرحلے میں مہاجرین و انصار کے درمیان قایم کی گئی، اس کا سنگِ بنیاد ثابت ہوئی۔ مسلمانوں کے مختلف سماجی اور علاقائی طبقات کے اتحاد و تنظیم کے بعد مدینہ منورہ کی غیر مسلم آبادی کا مسئلہ آیا جو آپ نے اپنے معاہدۂ مشہور کے ذریعہ حل کیا اور جسے عام طور پر دستورِ مدینہ اور صحیفۂ نبوی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ محبت و تعاون اور امداد باہمی کے اصولوں پر مسلم اور غیر مسلم طبقات کو ایک سیاسی تنظیم کا جزو بنا دیا گیا تھا جس کی سربراہی قدرتی طور سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھی۔

شہرِ رسولؐ کی سیاسی اور سماجی تنظیم کے بعد قرب و جوار کے باسی قبیلوں کی باری آئی۔ ابتداً مغربی قبیلوں مزینہ، جہینہ، اسلم اور غفار سے ہوئی جو اسلام سے بھی آشنا تھے اور ساکنانِ مدینہ کے حلیف بھی۔ ساتھ ہی مشرقی قبیلوں سے بھی تعلقاتِ باہمی کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں باہمی تعاون اور دفاعی امداد کے معاہدے ہوئے مگر جلد ہی اسلام کے قدم ان قبیلوں میں جم گئے اور رفتہ رفتہ سہی مگر مختصر مدت میں یہ علاقے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی ماتحتی میں آگئے، اور شہری اسلامی ریاست کی حدود شہر کے باہر وسیع ہونے لگیں۔ ظاہر ہے کہ مکی اشرافیہ کو اسلام کی کامیابی اور اسلامی ریاست کی ترقی و وسعت ایک آنکھ نہ بھائی اور کافر مکہ اور مسلم مدینہ کے درمیان میں مسلح جنگوں اور حملوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

یہاں سے سیرت نبوی میں فوجی تنظیم کا پہلو شروع ہوتا ہے اگرچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت نبوی کے چھ ماہ بعد ہی غزوات وسرایا کا سلسلہ شروع کر دیا تھا تاہم ان کی نوعیت تبلیغی اور کسی حد تک سیاسی تھی۔ ان میں فوجی عنصر بہت کم تھا۔ قریش مکہ سے پہلے مسلح معرکہ میں مسلم فوجوں کی تعداد تین سو تیرہ پیادوں اور دو گھوڑوں پر مشتمل تھی۔ حکم الٰہی کی تعمیل، حالات زمانہ کے تقاضوں اور نبوی بصیرت نے اسلامی فوج کی تنظیم و تشکیل کی۔ رسول خدا ایک عظیم سالار فوج کے قالب میں ڈھل گیا کہ یہ بھی ایک شان رسالت تھی۔ بدر کی عظیم و بے مثال فتح خدائی فتح و نصرت کے ساتھ ساتھ یکسر رسول اکرم کی قائدانہ بصیرت اور سالارانہ عظمت کا نتیجہ تھی۔ اسی بصیرت و عظمت کا آئندہ نتیجہ یہ نکلا کہ پیغمبر سالار نے جو بھی لڑائی لڑی اور ہر محاذ پر کامیابی حاصل کی۔ قریش سے احد اور خندق کے معرکوں میں مسلم فوج کی تنظیم اور مضبوط ہوئی اور مسلم سپاہ کی تعداد بالترتیب ایک اور تین ہزار رہی جس میں معتد بہ تعداد شہسواروں کی بھی تھی۔ ۵ھ/۶۲۷ء تک پیغمبر سالار دفاعی جنگ پر مجبور رہے لیکن بعد کے برسوں میں انھوں نے کامیاب اقدام کیے۔ صلح حدیبیہ اور خیبر کے معرکوں سے اس دور جدید کا آغاز ہوا اور جنگ تبوک پر اس کا اختتام ہوا۔ قریش سے آخری تصادم فتح مکہ کے معرکہ میں ہوا جب مسلم سپاہ کی پیادہ فوج آٹھ ہزار اور شہسوار فوج دو ہزار پر مشتمل تھی اور روایات کے مطابق یہ اسلامی فوج پوری طرح سے لوہے میں غرق تھی معرکۂ حنین و طائف میں یہ تعداد بارہ ہزار تھی۔ اس سیل مسلح کے بعد عرب

بلغ العلیٰ بکمالہ

آپؐ اپنے کمال سے اوج کمال پر پہنچے

کشف الدجیٰ بجمالہ

آپؐ نے اپنے جمال سے تاریکیوں کو منور کیا

حسنت جمیع خصالہ

آپؐ کے تمام صفات بہترین ہیں

صلوا علیہ و آلہ

آپؐ پر اور آپ کی آل پر درود بھیجو

میں کوئی قبیلہ اسلامی فوج کے آگے سر اٹھانے کے قابل نہ رہا۔ اور سب کو اسلامی ریاست کی برتری تسلیم کرنی پڑی۔ اسلامی ریاست کی حدود جزیرہ نمائے عرب کے انتہائی کناروں تک وسیع ہو چکی تھیں۔ اس ابھرتی ہوئی طاقت سے وقت کی عظیم ترین رومی سلطنت نے ٹکر لینی چاہی، مگر تیس ہزار اسلامی سپاہ جن میں دس ہزار مسلح شہسوار تھے، کے سامنے آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اسلامی فوج کی یہ عظیم تشکیل و تنظیم محض آٹھ نو سال کی کوشش کا نتیجہ تھی۔ بلاشبہ یہ بے مثال تنظیم رسول اکرم کو عظیم ترین سالاروں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔ وہ مکی خانماں برباد جو آٹھ نو سال قبل اپنے ہی گھر سے بے یار و مددگار نکال باہر کیا گیا تھا، ایک قلیل عرصے میں نہ صرف اپنے شہر و وطن کا مالک بن گیا بلکہ پورے ملک کا مالک و حکمراں ہو چکا تھا۔

پھر تشکیل ریاست اور تنظیم فوج کے ساتھ ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عام نظم و نسق بھی قایم کیا۔ انتظامیہ میں پوری اسلامی ریاست کو مرکز کے علاوہ تقریباً چھبیس ولایات میں منقسم کیا جن کے باقاعدہ مستقل گورنر (والی) اور دوسرے انتظامی عہدہ دار مقرر کیے گئے۔ مرکز کے انتظامی امور اگرچہ آپؐ نے اپنے ہاتھ میں رکھے، تاہم اپنی مدد اور بہتر کارکردگی کے لیے کاتبوں، سفیروں، مشیروں، عاملوں، حاجبوں اور متعدد دوسرے کارکنوں کو مقرر کیا اور ان سے کام لیا۔ خواہ یہ انتظامیہ کتنا ہی ابتدائی اور قبائلی انداز کا رہا ہو، مگر اس نے سیاسی مرکزیت پیدا کی۔ ولایات یوں تو اندرونی معاملات میں والی کی نگرانی میں خود مختار تھیں۔ لیکن وہ مرکز اسلام یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کی ہدایات وارشادات کی پابند تھیں۔ یوں آپ مدینہ منورہ میں قیام فرما ہونے کے بعد بھی پورے ملک کے نظم ونسق پر نظر رکھتے اور اسے چلاتے تھے۔

اِسلامی معاشرہ اور ریاست کے مالی اور اقتصادی نظم و نسق میں آپ نے ایک پورا نظام الٰہی جو دولت کی منصفانہ گردش، عادلانہ تقسیم، اور فلاح انسان کے اصولوں پر مبنی تھا مسلمانوں کے اموال میں زکوٰۃ وخیرات اور صدقات مثلاً عشر، نصف العشر وغیرہ مقرر اور وصول کیے تو غیر مسلم رعایا سے جزیہ وخراج وصول کیے ان کی وصولیابی کے لیے ایک طرف اصول وضوابط مقرر کیے تو دوسری طرف عمال وافسر، پھر ان محاصل اور الٰہی صدقات کی عادلانہ تقسیم کا نظام قایم کیا جس سے مسلم اور غیر مسلم دونوں اسی طرح مستفید ہوتے تھے جس طرح وہ ان کی فراہمی کے لیے مکلف تھے۔ اسی ضمن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت وزراعت اور کاریگری و مزدوری کے اصول وقواعد بتلائے اور پورا اسلامی نظام قایم کیا جس میں خریدار ودکان دار، آجر و مستاجر اور زمین دار وکاشتکار کے عدل وانصاف پر مبنی حقوق و فرائض پوری طرح واضح تھے۔

غرض کہ حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں سیرتِ نبوی سے روشنی اور رہنمائی نہ ملتی ہو۔ انسانوں کی تعلیم وہدایت کے لیے پروردگارِ عالم کتابیں اور فرشتے بھیج سکتا تھا، مگر اس سے ہدایت ربانی کو روبہ عمل لانے کا علیا نہ کام نہیں ہوسکتا تھا۔ بعثتِ انبیاء کا مقصد یہی ہے کہ وہ اپنی لائی ہوئی تعلیم کو اپنی زندگی میں ڈھال کر مخاطبین کے سامنے نمونہ پیش کرتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چوں کہ خاتم الانبیاء ہیں، اس لیے آپ کو حیاتِ انسانی کے تمام گوشوں پر محیط تعلیم دی گئی اور پھر آپؐ نے اُس تعلیم الٰہی کو اپنی سیرت طیبہ میں برت کر دکھا دیا۔ مذہب اور سیاست، اقتصاد اور تمدن ہر ایک شعبہ کے اصول واقدار بتلائے اور پھر ان اصولوں کو اپنی اور اپنے صحابہ کرام کی زندگی میں جاری وساری کیا سیرتِ نبوی دین و دنیا دونوں کی فلاح کی ضامن ہے اور آج کا مسلمان اگر خوار ہے تو محض اس لیے کہ وہ سیرتِ نبوی کو محض تبرک سمجھتا ہے اور اس کے صرف ایک حصہ کو سامنے رکھتا ہے۔ کونین میں کامیابی حاصل کرنی ہے تو پوری سیرت مبارکہ کو نمونہ اور اسوہ بنا کر عمل کرنا ہوگا۔ ہاتفِ غیبی کی صدا آرہی ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ وست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی ست

یَاصَاحِبَ الْجَمَالِ وَیَاسَیِّدَ الْبَشَرِ
اے صاحب جمال اور اے انسانوں کے سردار
مِنْ وَجْهِكَ الْمُنِيرِ لَقَدْ نُوِّرَ الْقَمَرُ
آپؐ ہی کے روئے منور سے چاند روشن ہے
لَا يُمْكِنُ الثَّنَاءُ كَمَا كَانَ حَقُّهٗ
آپؐ کی تعریف کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر
قصہ مختصر یہ کہ آپؐ خدا کے بعد سب سے عظیم ہیں۔

سید حامد

اقلیت

تعداد میں جو کم ہوں، وہ اوصاف میں زیادہ ہوتے ہیں۔ مقدار اور معیار میں تعلق عام طور پر دشمنی کا ہوتا ہے۔ یونیورسٹیوں کی آبادی، آزادی کے بعد، ہندوستان میں تیزی کے ساتھ بڑھی ان کا معیار تدریس اور تحقیق کا معیار اسی تیزی کے ساتھ گرا۔ محلّہ کی آبادی گنجائش سے زیادہ بڑھ گئی تو اس کا شمار گندی بستی میں ہونے لگا۔ شہر کی آبادی اس کی بساط سے زیادہ ہو گئی تو شہر خوبی، خوبصورتی، صفائی اور آسایش سے محروم ہو گیا۔ ملک کی آبادی اگر سرپٹ دوڑنے لگے تو خوشحالی سکون، امن اور ترقی کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔ دماغ میں بہت سے خیالات ایک وقت میں آنے لگیں تو سوچنے سمجھنے کی طاقت اور کبھی کبھی ہوش و گوش کی خبر نہیں رہتی۔ گوہر یک دانہ وہی ایک خیال ہوتا ہے جس پر دیر تک غور و خوض ہوتا رہے۔

انسانی تہذیب اور انسانی آگاہی میں جو اضافہ بھی ہوا ہے وہ انہی لوگوں کی بدولت ہوا ہے جو اقلیت میں تھے۔ اکثریت ہر اصلاح اور ہر نئے خیال کی مخالفت کرتی چلی آئی ہے۔ اگر اکثریت کا بس چلتا تو انسانی تہذیب ایک قدم آگے نہ بڑھ پاتی۔ انسانوں کی اکثریت گھر سے زیادہ دور جانا اور ٹھہرنا نہیں چاہتی۔ نہ صرف جسمانی طور پر بلکہ ذہنی طور پر بھی۔ جس معاشرے میں انسان پیدا ہوتا ہے، جو ماحول اس نے بچپن سے اپنے اردگرد دیکھا ہے جن اطوار و عادات میں اس نے آنکھ کھولی ہے جو عقاید اور اوہام اس کی گھٹی میں پڑے ہیں، ان سے ہٹنا اس کے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اوائلِ آفرینش سے اب تک جو کچھ ہوا ہے اس پر نظر ڈالیے۔ وہ سب لوگ جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں امتیازات حاصل کیے ہیں وہ ہمیشہ اقلیت میں رہے ہیں۔ شہد کی مکھیوں کی ساری بستی، پھولوں سے رس چوس کر شہد بنانے کا سارا کاروبار، اس مکھی پر منحصر ہوتا ہے جو ہزاروں کے مقابلے میں ایک ہوتی ہے۔ نمازی نماز میں اس اقلیت کی پیروی کرتے ہیں جسے امام کا نام دیا جاتا ہے۔ فوج کے حوصلے اور پیش قدمی اور بالآخر فتح کا دار و مدار بیشتر اس کے سپہ سالار پر ہوتا ہے یا اُس وسیع تر اقلیت پر جسے فوج کے مختلف سطح کے افسروں کا نام دیا گیا ہے۔ پیغمبر، مصلح، راہنما اور ان کے وہ ابتدائی پیرو جو اُن کے پیغام اور اصلاح کو آگے بڑھاتے ہیں، ہمیشہ اقلیت میں ہوتے ہیں اور انھیں اکثریت کی مدافعت، مخالفت اور عداوت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

کوئی وجہ نہیں کہ وہ امتیاز اور بالادستی جو انسانی امور اور انسانی تاریخ میں اقلیت کو حاصل ہوئی ہے، قومی اقلیتوں کے حصے میں نہ آئے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جن ملکوں میں زبانی، مذہبی یا نسلی اقلیتیں آباد ہیں وہ خود کو اکثریت سے بہتر ثابت کرتی ہیں، ان کی صورتِ حال کی منطق ہی یہی ہے۔ اس لیے انھیں سخت محنت کرنا پڑتی ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے البتہ اس کلیّہ کو غلط ثابت کرنے کی ٹھان لی ہے۔ اول تو وہ اس بات کو اپنی بدقسمتی سمجھتے ہیں کہ وہ اقلیت کیوں ہیں، اکثریت کیوں نہیں۔ یہی نہیں، وہ اس امتیاز کو حاصل کرنے سے بالکل بے تعلق ہیں جو اقلیت کا پیدائشی حق ہے اور جو اسے فنا ہونے

سے بچاتا ہے۔ تعداد کا مقابلہ کرنے کے لیے مہارت درکار ہوتی ہے۔ مقدار کا جواب معیار سے دیا جاتا ہے اور یہ مقابلہ اور یہ جواب کدورت یا تلخی کے ساتھ نہ کیا جاتا ہے نہ دیا جاتا ہے بلکہ انسیت اور دلگیری کے ساتھ ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

جمہوریت میں قسمتوں کے فیصلے گنتی پر ہوتے ہیں۔ گنتی کے زنداں سے اقلیت صرف صلاحیت کے پر لگا کر نکل سکتی ہے۔ اقلیت اور غفلیت، اقلیت اور جہالت، اقلیت اور تساہل، اقلیت اور فسردہ دلی، اقلیت اور بے خبری، اقلیت اور عیش پسندی۔ یہ ساری ترکیبیں تصور میں آنے والی نہیں۔ اقلیت کے ساتھ ہمیشہ جفاکشی، ریاضت، مہارت، جستجو، تنظیم، انضباط، مقابلے کی لگن اور صلاحیت اور اقدامیت منسوب کی جاتی ہیں۔ سوچیے! ہندوستان کے مسلمانوں نے اقلیت کے جوہر کو ہاتھ سے دے دیا ہے۔ وہ اقلیت ہیں لیکن صرف وہ نقصانات برداشت کرنے کے لیے جن سے اقلیت کو عام طور پر سابقہ ہوتا ہے اور ہمارے وطن میں ہو رہا ہے۔ وہ اقلیت اس لحاظ سے نہیں ہیں کہ مشکلات کا حوصلے کے ساتھ مقابلہ کریں اور موانعات کو راستے سے ہٹائیں۔ جو کچھ اکثریت نہیں کر سکتی وہ کر دکھائیں مصائب اور مخالفت کو سنگ فساں بنا کر اپنے کردار اور اپنی شخصیت پر سان رکھیں۔

بعض نادان کہتے ہیں کہ مسلمان چار شادیاں کرتے ہیں اس لیے وہ اقلیت نہیں رہیں گے، اکثریت بن جائیں گے۔ اس بات پر ہنسی آتی ہے۔ پہلے تو ہندوستان میں ایک مسلمان بھی ایسا نہیں جس کی چار بیویاں ہوں۔ ایک بیوی سے زیادہ کی مثالیں بھی شاذ ہیں اور نہ ہونے کے برابر۔ اس کے علاوہ تھوڑی دیر کے لیے مان لیا جائے کہ ہر مسلمان مرد کی چار بیویاں ہیں تو دو باتیں اور ماننا پڑیں گی۔ یعنی یا تو مسلمانوں میں مردوں اور عورتوں کا باہمی تناسب ۴:۱ کا ہے یا تین چوتھائی مسلمان عورتوں کی شادی ہوتی ہی نہیں۔ دونوں باتیں مضحکہ خیز حد تک غلط ہیں۔ دوسرے، مساوی صنفی تعداد والی آبادی آبادی بڑھنے کا امکان اس شکل میں زیادہ ہے کہ ہر مرد کی اَ بیوی ہو، بہ نسبت اس کے کہ اس کی ایک سے زیادہ بیویا ہوں۔

ٹائمز آف انڈیا کے مدیر اعلیٰ شری گری لعل جین ہیں۔ اُن محبوب مشغلہ ہے کہ اپنے استدلال سے، جس کی خشتِ اول ٹ کج ہوتی ہے، اور غیر جانب داری کا روپ سمجھ کر، ہر وہ با ثابت کر دیں جو آگے جا کر مسلمانوں کے خلاف پڑتی ہو۔ انھو نے حال ہی میں بڑے ہیر پھیر سے یہ ثابت کر ڈالا کہ ہندو میں اچھائیت اور بنیاد پرستی آ ہی نہیں سکتی۔ منجملہ اور دلائل کے انھوں نے ان کی اکثریت کا بھی ذکر کیا۔ اس توجیہ کو آگے بڑ تو یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچائی جا سکتی ہے کہ اکثریت سے غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔ غلطی ہوگی تو اقلیت سے، جیسا کہ فسادا کے سلسلے میں بار ہا کہا گیا ہے کہ ایک بد نصیب اقلیت ہمیشہ ا کو اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ آؤ ہمیں تہ تیغ کر دو۔ اکثر کے جلوس پر پتھر پھینکنے کا کوئی دوسرا مقصد یا مفہوم ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن اس تحریر کا مقصد فسادات کی ثالثی کرنا نہیں ہے۔ ہم تو صرف یہ کہنا چاہتے تھے کہ مسلمانوں نے غلطیٔ انتخاب وہ ساری برائیاں، کمزوریاں، بدحالیاں اور مظلومیاں چن لیں جو سوءِ اتفاق سے اس اقلیت کے حصے میں آ سکتی ہیں جو غافل ہو اور ان ساری اچھائیوں کی طرف دیکھا بھی نہیں جن پر اقلیت کا ہمیشہ استحقاق رہا ہے۔ انھیں چاہیے کہ ان اچھائیوں کو اختیار کر لیں۔ ان اچھائیوں کی راہ دشوار اور پُر آشوب ہے۔ محنت، مشقت، مہارت، نظم و ضبط اور ہوش و کوشش کی راہ۔ اگر ہم اقلیت ہونے کا فائدہ اٹھائیں تو قسمت کی شکایت اور اکثریت پر رشک کرنا بھول جائیں۔ خدا نہ کرے ہم اکثریت میں ہوں۔ خدا ہمیں اقلیت ہونے کے آداب سکھا دے۔ ایسی اقلیت جو آگاہ، ہوشمند، جد پیشہ، مہارت پرداز اور صلاحیت کیش جو ہمارے وطنِ عزیز کی کلاہ میں پر کی طرح چمکے۔ خدا ہمیں اقلیت کے

منصب پر فائز ہونے کی توفیق رے۔

اکثریت میں ہونا اخلاقی خطرات کا حامل ہے۔ اکثریت میں ہو کر گھمنڈ سے بچنا تقریباً ایسا ہی ہے جیسے پانی میں رہ کر نہ بھیگنا۔ اکثریت اقلیت کو خاطر میں جبھی لاتی ہے جب وہ (آخر الذکر) اکثریت سے بہتر ہوتی ہے۔ اگر برابری پر رک گئی یا فروتر ہو گئی تو اقلیت کسی گنتی میں نہیں رہتی۔ آپ نے دو الفاظ بار بار پڑھے ہوں گے سنے ہوں گے، الفاظ کیوں انھیں تراکیب کہیے یا اصطلاحات، پہلے، نیشنل انٹیگریشن یا قومی وحدت سازی (اس کا ترجمہ قومی یک جہتی کیا گیا ہے اور جس سیاق میں یہ اصطلاح استعمال ہوتی ہے، اسے دیکھتے ہوئے یہی اصطلاح موزوں معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جس انگریزی اصطلاح کا اسے ترجمہ بتایا جا رہا ہے اس میں مفہوم کچھ ایسا نکلتا ہے کہ قوم کے ایک حصے کو بہ زور قومیت کی چھتری کے نیچے لایا جا رہا ہے)، دوسری اصطلاح ہے نیشنل مین اسٹریم یا خاص قومی دھارا۔ راقم نے چند سال ہوئے سرکار کی طرف سے منعقدہ ایک جلسے میں کہا تھا کہ نیشنل انٹیگریشن کی اصطلاح مناسب نہیں، اس کی جگہ "نیشنل سولی ڈیریٹی" یا "نیشنل ہارمنی" استعمال کرنا چاہیے۔ اس طرح نیشنل مین اسٹریم کا تصور غلط ہے۔ اگر مین اسٹریم یا خاص دھارا کہا گیا تو اس سے مفہوم اکثریت لیا جائے گا اور مراد یہ ہوگی کہ باقی سارے فرقے اکثریت میں ضم ہو جائیں۔ یہاں بھی جو ترجمہ رائج ہے وہ انگریزی اصطلاح کے ناخوش گوار مضمرات سے بری ہے۔ اس وقت سامعین نے شاید یہ سوچا ہو کہ یہ اقلیت کی بے جا خطر اندیشی ہے۔ ابھی چند روز ہوئے ٹائمز آف انڈیا نے راقم کے اندیشے کی لاج رکھ لی اور گری لعل جین صاحب نے مین اسٹریم "خاص قومی دھارا" کا وہی مفہوم لیا جو راقم نے لیا تھا۔ اور وہ فرقہ جو کثرت تعداد کے ساتھ زمانی طوالت کو بھی جوڑتا ہو کیا کچھ ناز اپنی طاقت اور قدامت پر نہ کرتا ہوگا۔ یہ ناز پہلے ڈھکا چھپا رہتا تھا، لیکن اب منظر عام پر آ رہا ہے، اس کو اور مہمیز لگ گئی ہے۔ مسلمانوں کی حالیہ زبوں حالی، بے حسی، نگوں بختی اور پسماندگی ہے۔

اکثریت کو بڑا اخلاقی خطرہ یہ درپیش رہتا ہے کہ وہ اپنی ہر بات کو صحیح اور اپنے ہر ردّ عمل کو روا اور اپنے اور صرف اپنے نقطۂ نظر کو قومی نقطۂ نظر سمجھتی ہے۔ اس کے نقطۂ نظر کے علاوہ کوئی دوسرا نقطۂ نظر صائب ہو ہی نہیں سکتا۔ اجتماعی خود پسندی کا یہ انداز پر خطر ہو سکتا ہے۔ یہ اپنے ساتھ وہ "بلنکرس" یا نقاب چشم لاتا ہے جو افق نگاہ کو محدود کر دیتا ہے۔ اور یہ اقلیتوں میں، خصوصاً پسماندہ اقلیتوں میں، اس ردّ عمل کو جنم دیتا ہے جو خود اس کی طرح حقیقت اور صواب سے اور قدرتی انداز نظر سے بعید ہوتا ہے۔

مجموعی اعتبار سے دیکھیے تو اقلیت ہونا اکثریت ہونے سے بہتر ہے۔ اکثریت کی افتاد طبع میں سہل پسندی راہ پا سکتی ہے؛ اکثریت تکبّر کی زد پر رہتی ہے۔ یہ اس کی شائستگی پر منحصر ہے کہ تکبّر کا اظہار کرے یا نہ کرے۔ اکثریت خود کو قومیت کا محافظ اور ترجمان سمجھنے لگتی ہے۔ اقلیت، اگر وہ صالح اور بیدار ہے تو، ہر وقت کمر کسے رہتی ہے، سدا ریاضت اور پرواز کے لیے آمادہ۔ موانع اور مشکلیں اسے پارس بنا دیتی ہیں۔ ہمیں اگر موقع دیا جاتا کہ اکثریت بنا چاہتے ہو کہ اقلیت تو ہم اقلیت کو قبول کرتے۔ مگر نہ ایسی اقلیت کو جیسی مسلمانانِ ہند اِس وقت ہیں، اقلیت کے نام پر داغ۔

زمانہ روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے
اگر زمانہ کسی حد تک منتہی ہو جاتا تو
یہ خیال صحیح تھا کہ علوم منتہی ہو گئے
مگر ہر کوئی جانتا ہے کہ زمانہ رکتا نہیں
وہ چلتا جاتا ہے۔ (سرسیدؒ)

قاضی عبدالستار

انیسویں قسط

خالد بن ولید

"تم جا سکتے ہو۔"

تاخیر کے بعد وہ پرچھائیوں کی طرح اٹھے اور پردے کے پیچھے غائب ہو گئے اور سیف اللہ کی آنکھوں کے سامنے ایک دن کا منظر کھلا پڑا تھا۔

ابھی وہ اسلام نہیں لائے تھے اور بلالؓ اپنے ساتھیوں کے ساتھ قافلے کے ایک پڑاؤ پر ان کے ہاتھ لگ گئے تھے اور انھوں نے بلالؓ اور ان کے ہمدموں کے گرد اپنے گھوڑوں کا حلقہ قائم کر دیا تھا اور آہستہ آہستہ دائرہ تنگ کرنے لگے تھے اور پھر اپنے گھوڑوں کو اس دائرے میں دوڑانے لگے تھے اور بلالؓ اور ان کے دوستوں کے پیروں کے ناخونوں کے قریب گھوڑوں کے نعلبند سم تڑپنے لگے تھے اور گھوڑوں کی سانسیں ان کے چہروں پر محسوس کی جانے لگی تھیں۔ یہاں تک کہ گھوڑے پسینے میں شرابور ہو گئے لیکن بلالؓ اپنے ہم نفسوں کے ساتھ اسی طرح ثابت قدمی کے ساتھ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کے تنگ دائرے میں قید کھڑے رہے۔

وہ رات فاروق اعظمؓ کے پورے عہد خلافت پر بھاری گزری عشاء کی نماز کو مدت گزر چکی تھی لیکن مسجد نبوی چراغوں سے منور تھی۔ دروازے پر گھوڑوں کا ہجوم تھا اور وہ شخص اعظم جس کے ڈر سے ہرقل کانپتا تھا متفکر تھا۔ امیر شام کے قاصد کے بیان سے جبین مبارک کی شکن اور گہری ہو گئی تھی۔ منبر نبویؐ کی سیڑھیوں سے وہ پشت لگا لی جس پر تاریخ عالم کی کثیر المساحت خلافت کا بوجھ تھا۔ بابُ العلم اور فاتح خیبر نے قدم رکھا تو سب کو محسوس ہوا کہ روشنی آ گئی۔ فاروقِ اعظمؓ کی پیشوائی پر عجلت کے ساتھ ان کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ حضرت عثمانؓ آئے تو نیابتِ امیر المومنین نے استقبال کیا۔ ابروئے خلافت کے اشارے پر ایک بدری صحابہ نے شام کے حاکم کا خط پڑھا۔

"خیانت کے نام پر خالد بن ولیدؓ کی معزولی ہوا کا ایک ایسا جھونکا ثابت ہوئی جو چشم زدن میں بگولہ بن گئی اور بگولہ آندھی کی صورت اختیار کرنے لگا ہے۔ خالد بن ولید خاموش ہیں۔ ان کی خاموشی ان کی دین داری اور ملت کے تئیں ان کی وفاداری کی ضمانت ہے۔ عبد الرحمٰن بن خالدؓ کی تقریر نے پورے دمشق کو ہلا دیا۔ خیانت کا لفظ مشروط تھا لیکن تھا۔ اسراف کے لفظ کو ایک مسئلہ بنا دیا۔ معانی و مطالب کی شعلگی نے خطرناک انداز اختیار کر لیا۔ چالیس ہزار درہم کی وہ رقم جو آپ نے بی بی ام کلثومؓ کے مہر میں ادا کی ایک ایسا جھنڈا بن گئی جس کے نیچے ایک دنیا کھڑی ہے؟ اسراف"

کی سزا کے ردِ عمل کے طور پر نوجوان سردار اور
سردار زادے نفائس اور عجائب کی دو کانیں خریدے
ڈال رہے ہیں۔ صورتِ حال کی سنگینی کا تقاضا ہے
کہ دربارِ خلافت فوراً اس مسئلے پر توجہ مبذول
کرے اور ہدایات جاری کرے۔"

دیر تک سکوت طاری رہا۔ قبیلۂ ازد کے سردار نے زبان
کھولی۔

"مہرِ نکاح کی رقم کتنی ہی کیوں نہ ہو اس پر اسراف
کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔"

"لیکن دریافت کیا جا سکتا ہے کہ یہ خطیر رقم کہاں
سے میسر ہوئی۔"

قبیلۂ خزرج کے سربراہ نے جواب دیا۔

"ہاں یہ امّتِ مسلمہ کا حق ہے اور اس حق سے
دست بردار نہیں ہوا جا سکتا۔"

کسی نے توثیق کر دی۔

"لیکن اس حق کے اظہار کے نام پر کسی فتنے کا دروازہ
بھی نہیں کھولا جا سکتا۔"

ایک تیز آواز بلند ہوئی۔

"اے امیر المومنینؓ! حاکمِ شام کو حکم دیجیے کہ
عبدالرحمٰن اور اس کے ہم نواؤں کو حراست میں
لے کر مدینے روانہ کر دیں۔ یہاں اس کی ایسی
تہدید کی جائے کہ جوانی کا خمار اتر جائے۔"

حضرت عثمانؓ نے ارشاد کیا۔

"اگر اس کی حراست کسی مسئلے کو پیدا کرے تو
تلوار سے حل کیا جائے۔"

کسی نے تائید کی۔

"صاحبِ ذوالفقار بھی تو کچھ فرمائیں۔"

ذوالفقار جو قیامت تک کے لیے افسانہ ہو چکی تھی اور
باب العلم کے سامنے رکھی تھی، اس پہ ہاتھ رکھ کر کسی سردار نے

عرض کیا۔ شیرِ خدا نے نگاہ اٹھائی تو ساری محفل شوریٰ متوجہ
ہو گئی۔ خط رکھ دیا۔

"امیر المومنین کو یہ لفافہ آج ملا ہے، اس کا
مضمون ہم پر کل فاش ہو چکا تھا۔ شاید ہی مدینے
کا کوئی ایسا اہم گھر ہو جو بے خبر ہو۔ خالدؔ کا
نام خالدؔ کے سکوت پر غالب آ چکا۔ حاکمِ شام
کی تحریر کی روشنائی ہولناک اندیشوں کی
غماز ہے۔ تحریرِ حاکمِ شام کی قوتِ فیصلہ کی برہمی
کی نظیر ہے۔ حروف کے دائرے دیوارِ خلافت
میں پڑنے والے رخنوں کی دلیل ہیں۔ عرب کا
کون سا قبیلہ اور قبیلے کا کون سا خاندان ہے جو
خالدؔ کی تلوار کا گھایل نہیں۔ یہی عبدالرحمٰن کی
کمزوری ہے۔ یہی خلافت کی طاقت ہے۔ فتنہ
دروازے پر دستک دے چکا۔ سیاست
کا تقاضا ہے کہ دروازہ کھول کر اس کا سر قلم
کرنے کے بجائے تالیفِ قلب سے بہلا کر واپس
کر دیا جائے۔"

"تعجب ہے کہ جس کے ہاتھ میں ذوالفقار ہے وہ
فتنے کی نمو داری اور عبدالرحمان کی تلبیس اور
کمزوری کے باوجود تالیفِ قلب کا مشورہ دے
رہا ہے۔"

کسی سردار نے تبصرہ کیا۔ باب العلم نے ذرا سا تأمل فرمایا

"ہم نے صرف عبدالرحمٰن کی ایک کمزوری کا ذکر
کیا ہے، خالدؔ کی کسی کمزوری کا ذکر نہیں کیا۔
خلافت کی کسی کمزوری کا ذکر نہیں کیا۔ شام ہرقل
کی عظیم سلطنت کا محض ایک صوبہ ہے جس پر
ہمارا قبضہ ہے۔ شام کا سمندر ہرقل کی بحری
طاقت کا شکار گاہ ہو سکتا ہے۔ شام اور مصر
کی سرحدی زمین سے تلواریں پیدا ہو سکتی ہیں۔

فارس نے ابھی عراق کھویا ہے۔ ہرقل اور یزدجرد اور ان کے سالار جانتے ہیں کہ جس تلوار نے ان کی بنیاد کھود ڈالی وہ خالد کے شانے پر جھول رہی ہے۔ شام اور عراق کے فاتح نہ ابو عبیدہؓ ہیں نہ سعد بن ابی وقاصؓ ۔ دنیا کو معلوم ہے کہ یہ خالدؓ کی تلوار کے پھل ہیں جو ہمارے دامن میں آگرے۔ عراق اور شام کی بڑی بڑی مشہور تلواریں خالد کی رکاب کی تربیت یافتہ ہیں۔ نہیں معلوم کہ عراق سے شام تک وہ کون سا سپہ سالار ہے جو خالد کے سامنے آسکتا ہے۔ خالد کے جنبش کرتے ہی عراق سے شام تک زلزلہ آجائے گا۔ فارس سے روم تک تہلکہ پڑ جائے گا۔ اس لیے ہم نے تدبر اور تالیف قلب کا مشورہ دیا۔ یہ مشورہ اس لیے بھی دیا گیا کہ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ امت میں ایک بار علم کی ہوئی تلوار قیامت تک نیام نہ ہوگی۔"

ایک بات اور ــــ یزید بن ابی سفیان اور عمرو بن العاص وہ لوگ ہیں جو بڑی بڑی سلطنتوں پر تنہا غالب آسکتے ہیں، وہ دونوں شام میں موجود ہیں۔ بیت المقدس عمرو بن العاص کے ہاتھ میں ہے۔ دارالحکومت پر یزید بن ابی سفیان قابض ہے، حمص میں خالد موجود ہیں۔ نہیں معلوم کہ شام ان کی مرضی کے خلاف کتنے سانس لے سکتا ہے۔"

"اور امین الامت ابو عبیدہ بن الجراحؓ"

کسی نے لقمہ دیا۔

"ابو عبیدہ کی پارسائی اور برگزیدگی دینی بندگی اور بےترمی قابل تعریف ہے، قابل احترام ہے لیکن یزید بن ابی سفیان کی سیادت اور عمل عمرو بن العاصؓ کی سیاست اور تدبر کے سامنے بے دست و پا ہیں۔ امیر المومنین کا فرض تھا کہ معزولی نامہ تحریر کرنے سے پہلے مجلس شوریٰ کا اعتماد حاصل کر لیتے، معزولی نامے کے مسودے پر غور کر لیتے۔ اس لیے کہ اسراف کے مفہوم کو عُشر اور زکوٰۃ کی قطعیت نہیں دی جا سکتی۔"

باب العلم کے سکوت فرماتے ہی حضرت عثمانؓ نے فرمایا:

"شیر خدا نے جو کچھ کہا سچ کہا، لیکن مسئلہ ابھی وہیں ہے جہاں تھا۔"

"مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ عبدالرحمٰن بن خالدؓ کو خاموش کیا جائے۔ اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ خالدؓ کو مدینے طلب کیا جائے۔"

ایک آواز بلند ہوئی ــــ شیر خدا نے جواب عطا کیا۔

"اور اگر خالد بن ولید نے آپ کی طلبی کو نامنظور کر دیا۔ وہ اس لیے بھی نامنظور کر سکتے ہیں کہ آپ انہیں معزول کر چکے اور وہ مدینے کے نظربندوں کے انجام سے واقف ہیں جو مدینے سے باہر قدم نکالنے سے عاجز ہیں۔ جن کی خدمت جہاد تک کی پیش کش کو ٹھکرا دیا گیا۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ مجلس شوریٰ کو اسی مسئلے پر غور کرنے کے لیے طلب کیا جائے جو مجلس شوریٰ کے فیصلوں کے نتیجے میں پیدا ہوا ہو۔ اور میرا یہ بھی مشورہ ہے کہ خلافت اعلان نامہ تیار کرے جو دنیا کو یقین دلائے کہ خالد بن ولیدؓ خیانت یا اسراف کے الزام میں نہیں معزول ہوئے۔ وہ اس لیے معزول ہوئے کہ دنیائے اسلام ان پر مفتون ہونے لگی تھی۔ اس حد تک اعتماد کرنے لگی تھی جس حد تک اعتماد کی اجازت اسلام نہیں دے سکتا۔ اس لیے معزول ہوئے کہ اگر کسی جنگ میں شہید

ہوجاتے تو مسلمانوں کا سیلاب فتوحات بے اعتمادی
کے صحرا میں خشک ہو کر رہ جاتا اور عبدالرحمٰن ابن خالدؓ
کے غیظ و غضب کو برداشت کیجیے جس طرح نوجوان
لڑکوں کی شرارتیں برداشت کی جاتی ہیں۔ صبر اور
تحمل سے کام لیجیے کہ بے صبری اور جلد بازی
سلطنتوں کو تباہ کر دیتی ہے۔"

امیر المومنینؓ کی جنبشِ سر نے شیرِ خدا کے مشورے پر تسلیم کی مہر
لگا دی۔

تمام بلادِ اسلامیہ اور ممالک محروسہ کی مسجدوں میں
نمازوں کے بعد خالد بن ولیدؓ کی الزامِ اسراف و خیانت سے
برأت کا اعلان کیا جانے لگا۔

عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے بیٹے کی تقریب میں ایک طور پر
پورا مدینہ جمع تھا۔ بنو ہاشم، بنو امیہ، بنو مخزوم اور مؤلفۃ القلوب
کا کوئی مشہور نام ایسا نہ تھا جو موجود نہ ہو۔ امیر المومنینؓ
اور شیرِ خدا تک تشریف فرما تھے کہ بنو ہاشم کے ایک نابینا بزرگ
عباد بن قیسؓ جنھوں نے یرموک میں اپنی آنکھیں دے ڈالی تھیں،
آتے ہی آتے گرجنے لگے۔

"عمر بن خطابؓ کے منادی پیٹنے والے کچھ کہیں لیکن
ہم جانتے ہیں کہ خالدؓ کیوں معزول ہوا۔"

ساری محفل عمر بن خطابؓ کو دیکھنے لگی۔ لیکن کسی نے یہ نہیں کہا
کہ امیر المومنینؓ بھی محفل میں موجود ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ بنی مخزوم
کے ایک ہم سن بزرگ نے چھیڑ دیا۔

"ہم جانتے ہیں کہ آپ جانتے ہیں لیکن عمر بن
خطاب کے خوف سے زبان نہیں کھول سکتے۔"

"خوف ۔۔ یہ کس چیز کا نام ہے؟ بنی ہاشم کے
گھوڑے خوف کا چارہ کھاتے ہیں اور عمر بن
خطابؓ، عمر بن خطابؓ ہے جس کو امیر المومنین ہماری
تصدیق اور تائید نے بنایا۔ امیر المومنین نہ فارس
کا کسریٰ ہے نہ روم کا ہرقل اور ان دونوں

کے دل بادل لشکروں کے ہم نے پرخچے اڑا دیئے۔"

"یہ تو ہم بھی جانتے ہیں۔ لیکن وہ بھی تو بتائیے
جو ہم نہیں جانتے؟"

"تو سن لے ۔۔ اور ایک ایک لفظ کی عمر بن
خطاب سے تصدیق کر لے۔ ایک زمانہ ہوا، جب
عمر بن خطاب لڑکے تھے اور خالد تو ان سے
بھی چھوٹے تھے۔ عکاظ میں دنگل ہو رہا تھا۔
عمرؓ کشتی کے فن میں طاق تھے اور اپنی عمر سے
بڑے بڑے پہلوانوں کو ایک ہی جھپٹ میں زیر
کر لیتے۔ کسی پہلوان کو مار کر للکار رہے تھے کہ
خالدؓ کا گزر ہو گیا۔ خالد شہسوار تھا، کشتی
کا فن نہیں جانتا تھا لیکن خالد تھا۔ اکھاڑے
میں اترتے ہی عمرؓ کو لپیٹ لیا اور معلوم نہیں
کیا ہوا کہ عمر کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ بڑا علاج معالجہ
ہوا تب کہیں برسوں میں ٹانگ ٹھیک ہوئی۔"

"تو آپ کا خیال ہے امیر المومنینؓ نے بدلہ
لیا ہے خالدؓ کو معزول کر کے؟"

"اور سن میری بات کی ٹانگ مت توڑ۔ جب
ارتداد کی آندھی چلی اور ایک دنیا زکوٰۃ کے
نام پر بدل گئی اور نائبِ رسول نے، خدا ان
کے درجات بلند کرے، خالد کو سپہ سالار بنا کر
مرتدین پر چڑھا دیا اور خالد ارتداد کی زمین
پر محمدی علم لہراتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ مالک
بن نویرہ کا سامنا ہو گیا جو اپنے قبیلے کی زکات
کھا چکا تھا، ایک ہی وار میں خالد کا شکار ہو گیا
مالک کی بیوی جمیلہ تھی خالدؓ نے اس سے
نکاح کر لیا۔ مالک کا بھائی شاعر بھی تھا اور
عمر بن خطابؓ کا دوست بھی۔ اس نے مالک کا
مرثیہ کہا اور ایسا کہا جیسا کہنے کا حق ہوتا ہے۔

عمرؓ بن خطابؓ نے سنا تو رو پڑے۔ نائب رسول سے بہت کچھ کہا سنا، لیکن نائب رسول اللہ نے صاف کہہ دیا کہ میں اللہ کی تلوار کو نیام نہیں کر سکتا۔ پھر مضیخ کا معرکہ ہوا۔ عبدالعزیٰ بن رہم اور لبید بن جریر جو مسلمان تھے لیکن دشمن کے ساتھ تھے اور ایسے اشعار پڑھ رہے تھے جن سے خدا کی وحدانیت اور رسول کی رسالت کا انکار ہوتا تھا، خالدؓ کے غضب کا لقمہ ہو گئے ابن خطابؓ نے ان دونوں کے قتل کا بھی مقدمہ بنا دیا لیکن خلیفۂ اکبرؓ نے خالد کو بری کر دیا اور سپہ سالاری بحال رکھی۔ نہ صرف یہ بلکہ تھوڑے دنوں بعد ہی سپہ سالار اعظم بنا دیا آج اگر نائب رسول زندہ ہوتے تو خالد ان کی نیابت کر رہا ہوتا۔ ہائے شیر اسلام کا عمامہ اتار لیا گیا۔ سیف اللہ کے ہاتھ باندھ دیے گیے۔ آفریں ہے مسلمانوں پر کہ وہ دیکھتے رہے۔ آفریں ہے شیر اسلام پر کہ گرجا تک نہیں۔ خدا کی قسم عمرؓ نے خالد کو اس لیے معزول کر دیا کہ خالد کا قد عمرؓ کے قد سے بلند ہو چکا اور عمرؓ بن خطابؓ نہیں چاہتے کہ دنیائے اسلام میں کوئی نام ایسا بھی ہو جو اُن کے بعد ان کے بیٹے عبدالرحمان بن عمرؓ کے لیے خطرہ بن سکے۔"

آخری فقرہ زبان سے ادا ہوا تھا کہ جیسے بجلی گر پڑی۔ بڑے بڑے ستون اسلام جن پر ایوان خلافت کھڑا تھا، ہل گئے وہ عالم ہوا کہ سکوت اپنے معانی کی حدود سے گزر گیا۔ امیرالمومنین کی نگاہ جو تحمل اور تحمّل کی میزان تھی، خلاؤں میں گم کردہ گئی۔ ضیافت عبادت کی طرح پوری ہوئی۔

تبلیغ و اشتہار کی جو خدمت ہزاروں مبلغ انجام نہیں دے سکتے تھے وہ عباد بن شمس کی تقریر اور امیرالمومنینؓ کی خاموشی نے سر انجام کر دی۔ چند ہی روز میں تمام عرب اور عراق اور شام کی بڑی بڑی مسجدیں اور نماز خانے اس تقریر سے گونجنے لگے۔ ایک ایک فقرے کو دس دس طرح کی حاشیہ آرائیوں سے دفتر بنا دیا گیا اور آخری جملہ تو اشتہار کے لشکروں کا جھنڈا بن گیا۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے عبدالرحمان بن عمرؓ کے لڑکوں کو خلافت کی مبارک باد دینے لگے۔ دمشق جو چالیس ہزار فاتح تلواروں کا گھر تھا، اس خاموش بغاوت اور دربردہ مخالفت کا مرکز بن گیا۔ یزید بن ابی سفیان دمشق کا گورنر ہی نہیں تھا، بنی امیہ کے روایتی جاہ و جلال اور اثر و اقتدار کا نشان تھا۔ ابی سفیانؓ کی سیاست، ہندہ کی طاقت اور معاویہ بن ابی سفیانؓ کی فراست نے اور عبدالرحمان بن خالد کے غیظ و غضب اور قرابت نے یزید بن ابی سفیان کو بنی مخزوم کے قلعۂ اقتدار میں بھی داخل کر دیا۔

اور سیف اللہ کا خیمہ اسی شان و شکوہ، اسی جلال و جمال سے آراستہ کھڑا تھا۔ چار ہزار سوار جو قنسرین کے گورنر کی رکاب میں نکلے تھے، بار بار کی فہمائش کے باوجود اسی طرح ہتھیاروں میں جکڑے کھڑے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ مکہ اور طائف سے اترنے والے سواروں نے ان کی تعداد میں اضافہ کر دیا تھا۔ جب وہ نماز کے لیے برآمد ہوتے تو وہ تلواریں جن کے قبضے فتوحات کے آشیانے تھے ان کے جلو میں نکل پڑتیں۔ حاکم شام کی پارسائی اور دور اندیشی
پرہیزگاری اور خوش اسلوبی نے
بڑی حد تک معاملات کو سنبھالے
رکھا تھا تاہم وہ ایک ایک
قدم پر مدینے سے
ہدایت مانگتے تھے
اور مدینہ!

(جاری ہے)

ہم کھاتے تھے، لیکن یہ الف سے انار کیا ہوا؟ یہ "الف" کیا ہے، کہاں سے آگیا؟ الف اور انار کا کیا تعلق ہے؟ ایک لمبا ہے ایک گول ہے نہیں نہیں، ان میں کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ مگر ماسٹر صاحب کہتے ہیں تو یاد کرنا ہی پڑے گا۔ اور یہ پکار، یہ بغیر سمجھے یاد کرنے کا عمل یہ زور زبردستی اور مجبوری دیر تک جاری رہتی ہے۔ ثانوی سطح تک بھی بچے کی سمجھ میں نہیں آتا یہ θ و sin، cos کیا ہوتا ہے یہ ہندسوں کو مربع یا مکعب بنا دینا اور مربع اور مکعب کے جذر نکالنا آخر کیوں ہوتا ہے اور اس کا کیا فائدہ ہے۔ گزرے ہوئے بادشاہوں اور حکمرانوں کی تاریخ ہم کیوں پڑھیں۔

؎ دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے + آخر اس درد کی دوا کیا ہے

کا مفہوم کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ سوال اس کے ذہن کو پراگندہ رکھتے ہیں یا وہ اپنے آپ کو اس عمل سے بالکل بے تعلق کر لیتا ہے۔ اس کے اندر کوئی شوق، کوئی جستجو، کوئی تجسس پیدا ہونے کے بجائے اس کی بدشوقی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ دیگر عوامل کے علاوہ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ ۶۰ سے ۰۷ فی صد تک بچے ابتدائی درجات سے ہی تعلیم چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ رسمی تعلیم کے بندھن ان کے لیے اور پریشانی کا سبب بنتے ہیں۔ اسکولوں کی فضا میں غیر رسمی تعلیم کا موقع نہیں۔ اقلِ قلیل تعداد ہی ایسی ہو سکتی ہے جن کے گھروں کے ماحول سے رسمی تعلیم میں مدد مل سکے یا غیر رسمی طور پر بچوں کی ذہنی نشو و نما ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعلیم کے مدارج بڑھتے رہنے کے باوجود حقیقی دلچسپی پیدا نہیں ہوتی۔ بچوں کے تخیل کو مہمیز نہیں ہوتی۔ ان کی فکر کو جلا نہیں ملتی ان کی نظر کو وسعت نہیں ملتی۔ ان کی اختراعی صلاحیتوں کے سوتے خشک ہونے لگتے ہیں اور اس طرح تعلیم اپنا وظیفہ ادا کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے۔

مگر اس میں قصور تعلیم کا ہے کہ تدریس کا؟ اگرچہ کہ تعلیم کی بے مقصدیت نے تعلیم کی بنیادوں کو کھوکھلا کیا اور نوخیز ذہنوں سے اس کی اہمیت وافادیت کو کم کیا۔ لیکن غور کیجیے تو خود تدریس کی کوتاہی کو بھی اس میں بڑا دخل ہے۔ اگر بچوں کے ذہن میں ابتدا سے ہی تشویق پیدا ہو، اگر وہ اسکول کے ماحول سے مانوس ہوں، جو کچھ انھیں سکھایا جا رہا ہے وہ اسے سمجھنے لگیں اور اس کا ربط و تعلق ان کو اپنی زندگی سے محسوس ہونے لگے تو ان پر یہ کیفیت طاری نہ ہو گی۔ ان کو صرف یاد کرنے اور رٹنے پر مجبور نہ ہونا پڑے گا۔ ان کی فکر کو مہمیز ہو تو وہ خود چیزوں کو سیکھنے کی طرف راغب ہوں گے۔ بلکہ اس سے بھی پہلے وہ خود ہی یہ جاننا چاہیں گے کہ وہ چیزوں کو کیسے سیکھیں۔ اگر یہ رغبت پیدا ہو سکے تو نہ صرف استاد کا کام ہلکا ہو جائے گا بلکہ بچے کی سیکھنے کی صلاحیتوں میں بھی کیفیتی تبدیلی ہو جائے گی۔ وہ جب کوئی نئی چیز سیکھنے کے تحیر اور مسرت سے دوچار ہو گا تو صرف مزید چیزوں کے سیکھنے کی طرف راغب ہو گا بلکہ خود اس کی اختراعی فکر بھی بیدار ہو گی۔ علم کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس سے لاعلمی کا احساس بڑھتا ہے۔ اگر چیزوں کے جاننے میں اختراعی فکر کی آمیزش ہو گی تو جاننے کی نوعیت ہی بدل جائے گی۔ تعلیم کی بے مقصدیت ختم ہو گی اور طالب علموں میں سطحی طور پر جو تعلیم سے بیزاری، بے دلی اور بے توجہی پائی جاتی ہے، ختم نہیں تو کم ضرور ہو جائے گی۔ ان کے لیے تعلیم بیزارکن عمل کے بجائے دلچسپ مشغلہ بنے گا اور اس طرح استاد کے سکھانے کے عمل میں ان کے سیکھنے کی مانگ بھی شامل ہو جائے گی۔

اس کے لیے جہاں تعلیم کے ڈھانچے کو بدلنے کی ضرورت ہے وہیں زیادہ ضرورت طریقِ تدریس کو بدلنے کی ہے۔ سکھانے اور سیکھنے میں ایک ایسی ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت ہے جہاں یہ دونوں عمل دو لخت نہ ہو جائیں اور الگ الگ نہ معلوم ہوں بلکہ صرف سیکھنے کا عمل ہی غالب نظر آئے۔ کیوں کہ جیسے ہی سکھانے کا عمل غالب ہوتا ہے، سیکھنے والوں میں بیزاری شروع ہو جاتی ہے۔ استاد کے فرائض میں سے ایک بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ طالب علموں میں شوق اور رغبت پیدا کر دے۔ اسی سے تدریس و تعلیم کا عمل تیز تر ہو سکتا ہے۔ زندگی کی تیز رفتاری، علوم کا تنوع اور وسعت، ملک کی بڑھتی ہوئی اور بدلتی ہوئی ضروریات سب اس بات کی متقاضی ہیں کہ تدریس کے طریقوں کو بدلا جائے۔ جتنی جلد یہ عمل شروع ہو اتنا ہی بہتر ہے۔

سلیم احمد

روبوٹ

۱۴۵ ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا یہ موٹر کاروں کا کارخانہ ہے جہاں "یلائی ماڈتھو" اور ڈاج کاریں بنائی جاتی ہیں۔ یہاں چند برس پہلے تک دو سو ویلڈر اپنے چہروں پر نقاب اوڑھے کام کرتے نظر آتے تھے۔ اب ویلڈر غائب ہو گئے ہیں۔ ان کی جگہ روبوٹ نے لے لی ہے، جن کی تعداد پچاس ہے۔ یہ روبوٹ رات دن کام کرتے ہیں جس کی وجہ سے کل پیداوار میں پچاس فیصد اضافہ ہو گیا ہے۔

یہ اٹلی ہے۔ شہر تورین سے باہر اس برقیاتی کارخانے میں "پریگیا" نامی روبوٹ تیار کر لیا گیا ہے جس پر ایک لاکھ ڈالر سے زائد خرچ ہوئے ہیں۔ اس روبوٹ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنے دونوں آہنی ہاتھوں سے ایک وقت میں کئی کئی کام سرانجام دے سکتا ہے۔ یہ اتنا عقلمند ہے کہ جب کوئی چیز اپنے پنجے میں اٹھاتا ہے، اور چیز ناقص ہو تو فوراً محسوس کر لیتا ہے اور وہ چیز ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ "پریگیا" ایک گھنٹے میں ۳۲۰ یونٹ کسی غلطی کے بغیر پیدا کرتا ہے۔ ایک دن میں متواتر چوبیس گھنٹے بے تکان کام کر سکتا ہے۔ حساب کی رو سے یہ ایک دن میں بیس آدمیوں کے برابر کام کر لیتا ہے۔ "جنرل الیکٹرک" کا منظور شدہ یہ روبوٹ ریڈیو سیٹ، ٹی۔ وی سیٹ اور الیکٹرک موٹریں" تیار کرتا ہے اور اصولاً ہر چیز بنا سکتا ہے۔

ریاست کولوریڈو میں گولڈن کے مقام پر محکمۂ توانائی کا خفیہ کارخانہ ہے۔ اونچی، موٹی، پختہ دیوار کے پیچھے ایک روبوٹ کے دونوں ہاتھ اسٹین لیس اسٹیل کا ایک بڑا دیگچہ اٹھاتے ہیں، جس میں گلابی رنگ کا سفوف بھرا ہوا ہے۔ یہ سفوف نہیں، زہر ہے۔ پلوٹونیم کا زہر۔ انسان نے اب تک جتنے عناصر دریافت کیے ہیں، پلوٹینم ان میں سب سے زیادہ زہریلا ہے۔ روبوٹ زہریلے مادے سے بھرا ہوا دیگچہ اٹھا کر انگیٹھی پر رکھتا ہے جہاں اسے ۹۵۰ فارن ہائیٹ پر تپایا جائے گا۔ پکتے پکتے یہ مادہ تین انچ قطر کا ایک بٹن بن جائے گا۔ اس بٹن پر ایک لاکھ ڈالر کی لاگت آتی ہے۔ یہ بٹن خلا نوردوں کے خلائی ہیکل میں استعمال کیا جاتا ہے۔ پلوٹینم کی ری پروسسنگ کا یہ خطرناک کام پہلے آدمی انجام دیتا تھا۔ اب روبوٹ سرانجام دیتا ہے، جو نہیں جانتا کہ خطرہ کیا ہوتا ہے۔

آدمی کا اپنا ثانی (روبوٹ) بنانے کا خیال بہت قدیم ہے۔ یونانی دیومالا میں دیوتا پروتھیس کا بار بار ذکر آتا ہے۔ جس نے مٹی سے مصنوعی آدمی بنایا تھا۔ یہ تو تھی دیومالا کی بات۔ انسان

دنیا میں روبوٹ کی آبادی

جاپان	۱۵۰۰
امریکہ	۳۵۰۰
مغربی جرمنی	۹۰۰
سویڈن	۷۰۰
اٹلی	۶۰۰
پولینڈ	۴۰۰
فرانس	۲۵۰
برطانیہ	۲۵۰
ناروے	۲۵۰
فن لینڈ	۱۵۰
روس	۵۰

نارتح میں اریتاس ماریم (۴۰۰/ ۳۵۰ ق م) پہلا شخص تھا جس نے ی کی فاختہ بنائی تھی جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ فضا میں اڑ تی تھی۔ دو سو سال کے بعد سکندریہ کے ایک مصنف ہیرو نے ایک ب "خود کار چیزیں" لکھی تھی، جس میں ایک ایسے مکانیکی تھیٹر کا ذکر کیا گیا جس میں لکڑی کے بنے ہوئے آدمی (روبوٹ) مذہبی تقریبات کے ج پر رقص کرتے تھے۔

جوہن نیپومک میلزل (۱۷۷۲۔ ۱۸۳۸ء) تمام روبوٹ سازوں بادشاہ تھا جس نے موسیقی کا وہ آلہ بنایا تھا جس سے تال دیتے ہیں، ہنے خود بجنے والا آرکسٹرا ایجاد کیا تھا۔ میلزل پہلا شخص تھا جس نے نوعی آدمی بنایا تھا۔ وہ یہی تھا جس نے شطرنج کھیلنے والا روبوٹ یا تھا۔

تیرھویں صدی عیسوی میں جرمنی کے فلسفی سینٹ میگنس نے لوہے ی، گماس، موم اور چمڑے سے مصنوعی آدمی بنانے میں اپنی عمر عزیز تیس سال صرف کیے۔ ایسا آدمی کہ اسے جو بھی دیکھے اصل کا گمان ہو، مکمل آدمی تو نہ بنا سکا، لیکن اس کے منہ میں زبان ڈال دی گئی تھی۔ بوٹ کو ایک خانقاہ میں حجرے کی دیوار کے پیچھے چھپا کر رکھ دیا گیا تھا، ں زائرین منت مرادیں مانگنے آتے تو روبوٹ کی آواز آتی:

"بول کیا لینے آیا ہے، تیری ہر مراد پوری ہوگی۔"

ینس کے شاگرد مشہور فلسفی تھامس اکیو یناس نے اس روبوٹ شیطان قرار دے کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

سوئٹزرلینڈ کے کیمیا داں پیراکلسس کو بھی مصنوعی آدمی بنانے بڑا شوق تھا۔ ویسے آدمی کی شکل کے پتلے اور مجسمے بنانے کا رواج ہر قوم اور ہر مذہب میں شروع سے چلا آرہا ہے۔ پہلا شخص جس ے "مصنوعی آدمی کے لیے "لفظ روبوٹ" استعمال کیا" وہ یوسلاواکیہ کا ڈراما نویس کارل چیپک تھا۔ اس نے اپنے شہرہ ماق ڈرامے "آر، یو، آر" میں اس اصطلاح کو ان کل پرزوں بنے ہوئے آدمیوں کے لیے استعمال کیا تھا، جو انسانی شکل کے تھے رانسانوں جیسا کام کرتے تھے۔ یہ ڈراما پہلی بار ۱۹۲۱ء میں پا تھا اور دنیا کی تقریباً تمام بڑی زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے، جن میں اردو زبان میں بھی شامل ہے۔

اس ڈرامے کی اشاعت کے بعد ادبیات میں روبوٹ کے بارے میں یہ تصور رواج پا گیا تھا کہ انسان نے روبوٹ بنا کر دراصل اپنا دشمن پیدا کر لیا ہے۔ ایک دن آئے گا انسان کا بنایا ہوا مشینی آدمی اس کے کنٹرول سے باہر ہو جائے گا اور خود انسان کی گردن دبوچ لے گا لیکن اب دوسرے تصور نے زیادہ مقبولیت حاصل کرلی ہے۔ یہ کہ روبوٹ کیا ہے، محض ایک مشین جو دوسری تمام مشینوں کی طرح انسان کے حکم کی غلام، فرماں بردار اور ترقی اور خوشحالی کی علامت ہے۔ اس تصور کو رائج کرنے میں دورِ جدید کے سائنس فکشن کے مشہور عالم ادیبوں اسحاق اسمو اور آرتھر سی کلارک نے غیر معمولی کردار ادا کیا۔ ان کے مختصر افسانوں اور ناولوں نے روبوٹ کو شیطان اور کافر و ملحد سمجھنے والوں کو عقل سلیم کی طرف آسانی سے مائل کر لیا ہے سائنس فکشن کے ساتھ ساتھ روبوٹ پر بننے والی فلموں یا ایسی فلموں نے بھی روبوٹ کے حق میں فضا سازگار کر دی ہے۔ جن کا ایک کردار روبوٹ ہوتا ہے۔ اب دنیا کے ہر ملک اور قوم کا بچہ بچہ روبوٹ سے ایک خاص قربت اور انس محسوس کرتا ہے۔

۱۹۸۰ء کے بعد تو صورت حال ایک دم اس قدر انقلاب خیز ہو گئی ہے کہ اب سائنسی حلقوں میں نئی اصطلاح "روبوٹی انقلاب" کے چرچے عام ہیں اور کہا جا رہا ہے کہ سترھویں صدی کے صنعتی انقلاب کے مقابلے میں اکیسویں صدی کے روبوٹی انقلاب کے اثرات و نتائج کہیں زیادہ اور معنی خیز ثابت ہوں گے۔ اب روبوٹ سائنس فکشن اور خوابوں کی دنیا سے نکل کر انسان کے عملی کاموں کا رفیق کار اور ساتھی بن گیا ہے۔ زوال پذیر صنعتوں کے تنِ مردہ میں روبوٹ حیات نو کی روح پھونک رہا ہے۔ چھوٹی کمپنیوں کو بڑی کمپنیوں جتنی پیداوار حاصل کرنے کا مژدہ سنا رہا ہے۔ بڑی بڑی کمپنیوں کو مزید بڑا بننے کا حوصلہ دے رہا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب روبوٹ معاشرے کا چلن مقرر کرے گا۔ معاشرہ اپنی قدروں کا تعین روبوٹ کے حوالے سے کرے گا۔

یہ فولادی کالر والے قوی ہیکل محنت کش کاریگر موٹر کاروں کے پرزے بناتے ہیں، پرزوں کو باہم جوڑ کر گاڑی کا ڈھانچہ بناتے

ہیں۔ ڈھانچے پر رنگ کرتے ہیں۔ اسی طرح ریفریجریٹر بناتے ہیں ۔ جہازوں کے پر بناتے ہیں اور ڈھانچے کھڑے کرتے ہیں۔ کوئلے اور دوسری دھاتوں کی کانیں کھودتے ہیں، گھر کے دروازے اور کھڑکیاں دھوتے ہیں ۔ برتن بھی دھولیتے ہیں۔ فصلوں پر کیڑے مار ادویہ چھڑکتے ہیں۔ سمندر کی گہرائی میں کھدائی کرکے قیمتی معدنیات تلاش کرتے ہیں اور دور کسی سیارچے میں خرابی ہوجائے تو اس کی مرمت کرتے ہیں ۔ اب تو بڑے روبوٹ خود ڈیزائن بنا کر نئے روبوٹ بھی بنانے لگے ہیں۔ انسان کی طرح روبوٹ کی دنیا میں دادا، باپ اور بیٹے کا تصور پیدا ہوگیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نسل انسانی ایک نئے صنعتی انقلاب کی سرحد پر کھڑی ہے جو پہلے صنعتی انقلاب سے کئی گنا زیادہ طوفانی اور نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔

پہلا صنعتی انقلاب جو دو سو سال قبل سترھویں صدی میں آیا تھا، جدید ٹکنالوجی کا بانی مبانی ثابت ہوا تھا۔ مگر اس کی قیمت بنی نوع انسان کو زبردست بے روزگاری اور شدید مشکلات کی صورت میں ادا کرنی پڑی تھی۔ بعض ماہرین آنے والے نئے روبوٹی انقلاب کے بارے میں بھی یہی خیال کرتے ہیں کہ تقریباً اسی قسم کی بے روزگاری اور شدید اقتصادی و معاشرتی بحران کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جب روبوٹ ہمارے سارے کام زیادہ تیزی، مستعدی، صحت اور ارزانی کے ساتھ سرانجام دینے لگیں گے تو انسان خالی بیٹھ کر کیا کرے گا؟ اس کا جواب روبوٹ بنانے والے یہ دیتے ہیں کہ وہ دوسرے زیادہ ضروری کام کیا کرے گا۔ وہ زیادہ ضروری کام کیا ہیں؟ آج کے مفکرین اور فلسفی اس سوال کا جواب سوچتے رہتے ہیں۔

روبوٹ کی اپنی منفرد خصوصیات ہیں جن کے باعث کہا جاسکتا ہے کہ اب اسے زوال نہیں آئے گا، بلکہ آنے والے وقتوں میں یہ ترقی کرے گا۔ نہ روبوٹ دن میں تین شفٹوں میں کام کرسکتا ہے۔ ایک منٹ کے لیے بھی آرام کرنے کی خواہش نہیں کرتا۔ پیشاب، پاخانے کے بہانے باہر جانے کی اجازت نہیں مانگتا۔ چائے پانی کے لیے وقفہ نہیں کرتا۔ گھر سے بیماری یا ضروری کام کی چھٹی کی درخواست نہیں بھیجتا۔ نخرے نہیں کرتا۔ خوشامد نہیں کراتا۔ موڈ اچھا نہ ہونے کا بہانہ نہیں تراشتا۔ لمبی چھٹیوں کا مطالبہ نہیں کرتا۔ سالانہ ترقی یا بونس نہیں مانگتا پنشن یا پراویڈنٹ فنڈ کا مطالبہ نہیں داغتا۔ بھوک ہڑتال کی دھمکیاں نہیں دیتا۔ جس جگہ کام کرتا ہے، وہاں انسان کی طرح خالی بوتلیں، خالی ڈبے، گنڈیری، مالٹے اور مونگ پھلی کے چھلکے نہیں چھوڑتا کہ صفائی کرنے والا بوریوں میں بھر کرلے جائے ۔۔ اس کے اوقاتِ کار سو فیصدی ہیں ۔ جبکہ اچھے سے اچھے انسان کے بھی اوقاتِ کار ساٹھ فیصد سے زیادہ نہیں ہوتے ۔ اس کا کام بھی اچھا، رویہ بھی اچھا۔ بے چارہ اپنی جگہ خاموش کھڑا رہتا ہے اور حسب الحکم کام کرتا ہے نہ کوئی حرفِ شکایت نہ کوئی عرض مدعا، حکومت کے قوانین، ٹریڈ یونین کے قواعد بجلی، گیس، دھویں، شور، تحفظ، استحکام، ترقی۔ ان سب لفظوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اس کا ایک ہی ماٹو ہے۔ ''کام، کام اور صرف کام'' کسی سے عشق نہیں، محبت نہیں، نفرت نہیں، کسی کے خلاف غصہ نہیں۔ رقابت نہیں، انتقام نہیں۔ اتنا کمزور بھی نہیں کہ خنجر ماریں گے، تو اس کے جسم سے خون بہہ نکلے گا، یا زہر کا پیالہ دیں گے تو مرجائے گا۔

روبوٹ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انسان کی تنخواہ تو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہتی ہے جبکہ اس کی تنخواہ گھٹتی رہتی ہے۔ بیس سال پہلے کارخانے میں کام کرنے والا ایک روبوٹ پچیس ہزار ڈالر میں تیار ہوتا تھا۔ اب چالیس ہزار ڈالر میں تیار ہوتا ہے۔ پہلے روبوٹ پر ۲۰،۶،۴ ڈالر فی گھنٹہ کی اجرت ٹھہری تھی، جب کہ مزدور بیس ڈالر فی گھنٹہ لیتا تھا۔ اب مزدور فی گھنٹہ تیس ڈالر لیتا ہے جب کہ روبوٹ کی اجرت فی گھنٹہ وہی ۲۰،۶،۴ ڈالر ہے۔ کہیں کہیں اضافہ ہوا ہوگا۔ تو بہت معمولی۔ روبوٹ ایک دفعہ بس اپنے بننے پر خرچ کراتا ہے، پھر مرتے دم تک کماتا ہی رہتا ہے۔

ویسے روبوٹی انقلاب بڑے صنعتی ملکوں میں تو شروع بھی ہوچکا ہے اور تیزی سے پھیل رہا ہے۔ دس سال ہوئے جنرل موٹرز، پہلا صنعتی ادارہ ہے جس نے روبوٹ کا آرڈر دیا تھا۔ اب اس ادارے کے پاس تین سو سے زائد روبوٹ ہیں اور پورے امریکہ میں ساڑھے تین ہزار سے زیادہ ہیں ۔ امریکہ کی سب سے بڑی روبوٹ ساز کمپنی ''یونی مشین'' ۱۹۵۹ء میں قائم ہوئی تھی۔ اسے کوئی پندرہ سال کی

مسلسل تجربہ کاری اور محنت و کاوش کے بعد ۱۹۷۰ء میں پہلی مرتبہ منافع (بارہ ملین ڈالر) ہوا۔ اب اس کمپنی کی طرف سے ہر ماہ ۵۵ روبوٹ بنائے جاتے ہیں جن کی فروخت سے ہر سال ۴۲ ملین ڈالر منافع ہوتا ہے دوسری کمپنی "ملاکرون" کی طرف سے "ٹی تھری" نام کے روبوٹ بنائے جاتے ہیں، جن سے ہر سال ۳۲ ملین ڈالر منافع ہوتا ہے۔ ایم۔آئی۔ٹی اور آئی۔بی۔ایم جیسے بڑے صنعتی ادارے بھی اپنی اپنی ضرورت کے مطابق روبوٹ بنا رہے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ۱۹۹۰ء تک روبوٹ انڈسٹری تین چار بلین ڈالر کے پیٹے میں آجائے گی۔

تاہم امریکی صنعت کاروں میں اتنا جوش و خروش نہیں پایا جاتا، جتنا کہ ہونا چاہیے تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے ملکوں، بالخصوص جاپان کی روبوٹ ساز کمپنیوں نے گویا مستقبل میں امریکہ کو مسابقت میں مات کر دینے کی قسم کھا رکھی ہے۔ جاپان نے اپنا پہلا روبوٹ ۱۹۶۷ء میں امریکہ کی یونی مشین کمپنی سے درآمد کیا تھا۔ اب حالت یہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ روبوٹ جاپان میں موجود ہیں جن کی تعداد دس ہزار سے زیادہ ہے۔ امریکہ اگر ایک روبوٹ بناتا ہے تو جاپان پانچ روبوٹ بنا لیتا ہے۔ روبوٹ کی کثرت کے باعث اب کیفیت یہ ہے کہ جاپان کی جس کمپنی میں چار سو کاریگر کام کرتے تھے وہاں اب صرف آٹھ دس کاریگر نظر آتے ہیں۔ سارا کام روبوٹ بھائیوں نے سنبھال لیا ہے۔ "جنرل الیکٹرک" (امریکہ) کے صدر نے حال ہی میں جاپان کا دورہ مکمل کر لینے کے بعد امریکہ واپس آکر بیان دیا ہے: "اگر ہم نے روبوٹ سازی میں پیداوار بڑھانے کی نئی تدابیر اختیار نہ کیں تو امریکہ کا نام اس صنعت سے بالکل ہی خارج ہو جائے گا۔" انھوں نے بتایا کہ جاپان کی جس صنعتی کمپنی میں چند برس پہلے دس روبوٹ تھے وہاں آج ڈیڑھ سو روبوٹ کام کر رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جاپان نے روبوٹ سازی کی صنعت میں تیزی سے ترقی کر لی ہے اور ترقی کی رفتار برابر بڑھ رہا ہے۔ ایک کمپنی میں ہر سال روبوٹ بنانے والا ایک نیا پلانٹ لگ جاتا ہے۔ جو اپنی جگہ ہر ماہ سو روبوٹ بنا ڈالتا ہے۔ اب تو جاپان میں ایسے روبوٹ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے جو دو ٹانگوں پر چلا کریں گے اور جو ن سی زبان بھی اس کے منھ میں پروگرام کی صورت میں بھر دی جائے گی، بولا کریں گے۔

روبوٹ کا بنیادی فریضہ یہ نہیں ہے کہ وہ انسانوں کی طرح نظر آیا کرے یا انسان کی طرح پیش آیا کرے۔ اس کا اصل منصب یہ ہے کہ وہ انسان کے کام آیا کرے، انسان کی خدمت بجالایا کرے۔ اس منصب کے لیے اسے صرف ایک ریتا دماغ (کمپیوٹر) اور ایک ہاتھ (مع انگلیوں) کی ضرورت پڑتی ہے کمپیوٹر ایک پلگ کے ساتھ لگا دیا جاتا ہے۔ کمپیوٹر سے کچھ تار جوڑ کر روبوٹ کے ہاتھ کے اعصاب اور رگوں میں پھیلا دیے جاتے ہیں۔ ان تاروں کے ذریعے کمپیوٹر کی ہدایات برقی تحریکات کی صورت میں انگلیوں کو بھیجی جاتی ہیں۔ کمپیوٹر جو حکم دیتا ہے انگلیاں فوراً حرکت میں آکر بجالاتی ہیں۔

روبوٹ نے اپنی ترقی کے پہلے مرحلے میں اپنی اہمیت منوالی ہے ثابت ہو گیا ہے کہ وہ انسان سے زیادہ محنتی، بے غرض، قابل اور ارزاں ہوتے ہیں اب دوسرے مرحلے میں داخل ہوتے وقت کوشش کی جا رہی ہے کہ زیادہ اسمارٹ روبوٹ بنائے جائیں۔ اصلی اور کھرا "اسمارٹ" وہی ہوگا جو انسان کی طرح حواس خمسہ پر عبور رکھتا ہو۔ جو دیکھ سکتا ہو، سن سکتا ہو، چکھ سکتا ہو، چھو سکتا ہو اور سونگھ سکتا ہو۔ فی الحال ان کو دیکھنے اور چھونے کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ جو کچھ وہ سیکھتے جاتے ہیں، اپنے استاد یعنی کمپیوٹر کو بتاتے جاتے ہیں کہ ہم اس حد تک سیکھ چکے ہیں اور اس حد تک سیکھنا باقی ہے۔ "دیکھنے" کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اسے اپنے کیمرے کی آنکھ سے نظر آ رہا ہے، اس کو خود ہی سمجھ بھی لیا کرے۔ "چھونے" کا مطلب یہ ہے کہ اس کے آہنی ہاتھ نے جو چھوئی یا پکڑی ہے اس کے محض وزن سائز یا شکل و صورت کا اندازہ نہ کرے، بلکہ درجۂ حرارت اور سختی یا نرمی کا بھی اندازہ کر لیا کرے۔ روبوٹ کو سننے، سونگھنے اور چکھنے کی بھی تربیت دی جا رہی ہے۔ حواس خمسہ میں کس حد تک ترقی کریں گے، اس کا دار و مدار "مصنوعی ذہانت" پر۔ مصنوعی ذہانت جدید سائنس کا ایک نیا اور مستقل باب ہے۔ روبوٹ ایسی حسیں اختیار کر لی ہیں، جن سے انسان ابھی ناآشنا تو نہیں لیکن کے سامنے بے اختیار ضرور ہے۔ مثلاً منعکس روشنی اور ریڈار اسونک کا ادراک، مگر یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ روبوٹ خواہ کتنی بھی ترقی کر جائے، رہے گا انسان کی مخلوق ہی۔ محسوسات و جذبات، خیالات نفس اور ضمیر روبوٹ میں کہاں سے آئیں گے۔ اپنی یہ دولت انسان کسی اور کو دینے کے لیے تیار نہ ہوگا۔

احمد رشید شیروانی

تعلیم کی مخالفت کیوں

حالاں کہ اب ایسی بے وقوفی کی بات بہت کم مسلمان کرتے ہیں۔ پھر بھی کبھی کبھار کسی اردو کے اخبار میں کوئی احمقانہ مراسلہ چھپ جاتا ہے کہ جدید تعلیم بہت بری چیز ہے اور مسلمانوں کو اس سے دور رہنا چاہیے۔ ایسے جاہل اور بے وقوف مراسلہ نگار عموماً کوئی بہت ہی پھٹیچر سے لوگ ہوتے ہیں جن کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں لیکن حال میں یو۔پی کے ایک اردو کے روزنامہ میں اداریہ نظر آیا جس میں یہی بات کہی گئی۔ مسلمانانِ ہند ذلیل وخوار کیوں ہیں؟ ظلم وستم کا شکار کیوں ہیں؟ ان پر ہر روز ایک نیا قہر کیوں برپا ہو رہا ہے؟ سنیے۔ اس اخبار کے 'عقلمند' مدیر صاحب کی رائے میں یہ سب اس لیے ہے کہ ہم (یعنی مسلمان) "موجودہ تعلیم حاصل کرکے اپنی فائز المرامی پر نازاں ہیں جب کہ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس قدر تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی ہم جاہل ہیں کیوں کہ موجودہ تعلیمی نصاب میں انسانیت اور روحانیت کا درس نہیں ہے۔ اس کا تعلق تو صرف مادیت اور مادی دنیا تک ہی ہے۔"

اس سے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے مسلمانانِ ہند جدید تعلیم حاصل کرنے میں تمام غیر مسلموں سے بہت آگے نکل گئے ہیں اور ملک کے سارے "مرام" پر مسلمان ہی مسلمان "فائز" ہو گئے ہیں۔ اور اس پر مسلمان بڑے "نازاں" ہیں۔ کوئی حد بھی ہوتی ہے غلط بیانی کی بھی۔ اگر نہیں ہوتی تو ہونی چاہیے۔ یعنی آج ہندوستان میں مسلمان تعلیم کے میدان میں غیر مسلموں کے اوسط سے کہیں پانچ گنا پیچھے ہیں اور کہیں تو دس گنا پیچھے ہیں اور اسی وجہ سے نہ صرف سرکاری سروسز میں بلکہ زندگی کے تقریباً تمام اہم شعبوں میں مسلمانوں کا تناسب گرا ہے۔ مسلمان بے نیل و مرام ہیں۔ مگر یہ "عاقلِ زماں" مدیر صاحب فرماتے ہیں کہ مسلمان ہندوستان میں بڑے "فائز المرام" ہیں۔ کیا خوب! مسلمان بیچارے چلا چلا کر رو رہے ہیں کہ ہائے سرکاری ملازمتوں میں ہمارا تناسب گرتے گرتے بمشکل دو تین فیصد رہ گیا ہے۔ ہمارے لیے بھی ویسے ہی ریزرویشن کر دو جیسے ہریجنوں وغیرہ کے لیے ہے۔ یعنی ہم کو بھی کم سے کم ہریجنوں کے برابر مان لو۔ بنا دو۔ مگر ان مدیر صاحب نے دریافت فرمایا کہ مسلمان اپنی "فائز المرامی" پر نازاں ہیں۔ بھئی واہ!

تارک الدنیا ہو جائیں؟

مسلمانوں کو یہ ہدایت فرمائی گئی ہے کہ "علم حاصل کرو چاہے چین جانا پڑے"۔ ظاہر ہے یہاں علم سے مراد دنیاوی علوم سے ہے جس کو یہ مدیر صاحب بڑی حقارت سے "صرف مادیت" بتا رہے ہیں۔ اسلام مسلمانوں کو یہ ہدایت دیتا ہے کہ اشیائے عالم کے بارے میں علم حاصل کرو۔ قوانینِ قدرت کے بارے میں اپنی معلومات بڑھاؤ۔ اسلام سب مسلمانوں کو تارک الدنیا ہونے کی تلقین نہیں کرتا۔ مادی دنیا سے غافل یا بے خبر ہونے کی ہدایت نہیں کرتا بلکہ اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں سے پورا فیض حاصل کرنا چاہیئے مسلمانوں کو۔ اور یہ فیض مسلمان تب ہی اچھی طرح حاصل کر سکتے ہیں

جب وہ مادی چیزوں کی بابت اور نظام فطرت کی بابت اپنی معلومات بڑھائیں۔

اللہ کی بنائی ہوئی زمین سے ہم کس طرح اور زیادہ غلہ اگا سکتے ہیں؟ کس قسم کی زمین میں کیسا بیج ڈالنا چاہیے؟ اور کون سا کھاد ڈالنا چاہیے؟ یعنی علم زراعت یا اگریکلچر مسلمانوں کو آنا چاہیے۔ اللہ کے بنائے سمندروں میں کون کون سی چیزیں ہیں جن سے انسان فیضیاب ہو سکتے ہیں؟ اور ان چیزوں کو انسان کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟ یعنی علم بحریات مسلمان حاصل کریں۔ زمین کے نیچے اللہ نے کیا کیا چیزیں بنائی ہیں جو انسان کے کام آ سکتی ہیں یعنی علم معدنیات مسلمان حاصل کریں۔ وغیرہ وغیرہ۔ جدید ٹکنالوجی سے مسلمان روشناس ہوں۔ مشینوں کو بنانا اور چلانا سیکھیں۔ فن تعمیر پر عبور حاصل کریں۔ وغیرہ

دین بھی اہم ہے

یہ کوئی نہیں کہتا کہ مسلمان اپنے دین کو نظرانداز کریں دین کو بھی سمجھیں، اس پر بھی عمل کریں۔ لیکن دینی تعلیم کو دنیاوی تعلیم کے خلاف قرار دینا اتنا ہی غلط ہے جتنا دنیاوی تعلیم کو دینی تعلیم کی ضد بتا دینا۔

آج قریب اسی فیصد ہندوستانی مسلمان تقریباً ان پڑھ ہیں۔ جاہل ہیں۔ نہ وہ علم دین حاصل کرتے ہیں نہ علم دنیا۔ اس لیے یہ جھگڑا کرنا بالکل فضول ہے کہ علم دین زیادہ ضروری ہے یا علم دنیا۔

دونوں حاصل کیے جائیں۔ جدید تعلیم کا کوئی سمجھدار حامی علم دین حاصل کرنے کی مخالفت نہیں کرتا۔ اور کوئی سمجھدار عالم دین مسلمانوں کو جدید تعلیم حاصل کرنے سے منع نہیں کرتا۔

جو مضمون بھی پڑھا جائے گا اس کا تعلق اسی کے موضوع سے ہوگا۔ مثلاً جغرافیہ میں دنیا کے پہاڑوں دریاؤں صحراؤں سمندروں وغیرہ کے بارے میں بتایا جائے گا اور بوٹنی میں نباتات کے بارے میں اور زولوجی میں حیوانات کے بارے میں۔ موٹر میکنک کے کورس میں یہ بتایا جائے گا کہ کار کا انجن کیسے چلتا ہے اور کون سا پرزہ کیا کام کرتا ہے۔ وغیرہ

مسلم بچوں کو اپنے دین سے واقف کرانا ان کے ماں باپ کا فرض ہے۔ اس لیے وہ انہیں خود دینی تعلیم دیں یا کسی عالم دین سے دلوائیں۔ کس نے منع کیا ہے؟ کس نے روکا ہے؟ کوئی صاحب دینی تعلیم کی اہمیت بتائیں۔ مسلمانوں کو اس کی طرف راغب کریں بالکل ٹھیک۔ مگر اس کے لیے جدید تعلیم یا دنیاوی تعلیم کی مخالفت کرنا کیوں ضروری ہے؟

مرحوم سر سید علیہ الرحمۃ نے اپنے ایک لکچر میں مدرسۃ العلوم کے بورڈروں کو مخاطب کرکے فرمایا تھا کہ "یہ شکایت سننے میں آئی ہے کہ انگریزی خواں طالب علم اپنے استادوں اور اپنے ماں باپ کا ادب نہیں کرتے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ تم میں ایسا کوئی نہیں ہے۔ مگر جو انگریزی خواں طالب علم ایسا کرتے ہیں وہ دنیا کی اور خدا کی لعنت کے مستحق ہیں۔ ماں باپ ان کا جسم پیدا کرنے والے ہیں اور استاد ان میں انسانیت ڈالتے ہیں۔ اس لیے استاد کا درجہ حقیقت میں ماں باپ سے بھی زیادہ ہے۔ جب خدا نے ماں باپ کی نسبت فرمایا ہے کہ لَا تَقُلْ لَّهُمَا أُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا تو اس پر خیال کرلو کہ تم کو استادوں کا کس قدر ادب کرنا واجب ہے"۔

پس مرحوم سر سید کی اس بیش بہا نصیحت اور آب زر سے لکھنے کے قابل الفاظ کو ہر وقت یاد رکھنا اور ان پر عمل کرنا ہم پر فرض ہے۔ (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۹۹ء)

نسیم انصاری

جوابِ دوست

مختار مسعود کے نام

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
او بصحرا رفت و ما در کوچہا رسوا شدیم

داستانِ رسوائی

علی گڑھ میں ہم دونوں اسکول میں اور اُس کے بعد یونیورسٹی میں ساتھ ساتھ تھے۔ آپ مجھ سے شاید تین برس آگے تھے۔ ۴۷ء میں میں ڈاکٹری پڑھنے کلکتہ چلا گیا اور آپ ایک سال اور علی گڑھ میں رہ کر پاکستان چلے گئے۔ ۴۷ء سے پہلے اور اس کے بعد جو کچھ ہمارے وطن اور وطن کے باہر ہوا اس سے ہم دونوں متاثر ہوئے۔ آپکی آواز دوست جب آج سے چودہ برس پہلے علی گڑھ آئی تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے آپ جوابِ دوست کا انتظار کریں۔ چودہ برس سوچتا رہا کہ کیا جواب دیا جائے۔ آخر یہ طے کیا کہ جو کچھ دل پر گزری ہے وہ رقم کر دی جائے۔

آپ نے چینی مسلمان بزرگ کے علی گڑھ آنے کا ذکر کیا ہے ایک چینی وفد لکھنؤ بھی آیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب وہ لوگ فرنگی محل آئے تو سجاد حیدر صاحب یلدرم نے ان کی باتوں کا ترجمہ میرے بزرگوں کے لیے کیا۔ یہ تو مجھے یاد نہیں کہ یہ ترجمہ چینی سے اردو میں تھا یا انگریزی سے اردو میں۔ بہرحال مولانا جمال میاں صاحب کی محل سرا میں یہ مجلس ہوئی تھی اور اس میں ہم بچوں کو بھی بلایا گیا تھا۔ آپکو شاید یہ خیال ہو کہ تذکروں میں فرنگی محل کی اس محلسرا کا نام خلافت کی تحریک کے سلسلے میں کئی بار آیا ہے۔ اسی میں تو گاندھی جی کے ٹھہرنے کا انتظام تھا اور یہیں ان فیصلوں میں سے کچھ فیصلے ہوئے تھے جنہوں نے ۲۱-۱۹۲۰ء میں ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرکے انگریزی اقتدار کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ یہیں سے تو مولانا محمد علی اور شوکت علی اپنے مرشد مولانا عبدالباری کی اجازت اور دعاؤں کے ساتھ سرفروشی کے انداز میں میدان میں اترے تھے اور گلیوں میں سنا جاتا تھا

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

اسی زمانے میں میرے دادا مولانا سلامت اللہ صاحب، چودھری خلیق الزماں، پنڈت موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو کے ساتھ لکھنؤ سینٹرل جیل میں نظر بند کر دیے گئے تھے دادا میاں کو دلارے میاں پکارا جاتا تھا۔ جب وہ جیل گئے تو اُن کے بھتیجے حامد کا نام لے کر ایک گانا لکھا گیا تھا جو میں نے اپنے بچپن میں سنا تھا۔

بولے حامد دلارے چچا سے
جیل جانا مبارک ہو تم کو

اسی زمانے میں یعنی ۲۱ء میں میرے والد مولانا محمد شفیع حمت اللہ صاحب کو بغاوت کے جرم میں ایک سال قیدِ بامشقت کی سزا کلکتہ میں ہوئی تھی جہاں وہ مولانا آزاد کی تحریک پر گورنمنٹ کے مدرسۂ عالیہ کے جواب میں ایک قومی مدرسہ قایم کرنے گئے تھے۔ اس مدرسہ کے پہلے افسر مدرس خود مولانا آزاد تھے، ان کی گرفتاری کے بعد مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے

ذمہ داری سنبھال لی اور جب وہ گرفتار ہوئے تو میرے والد اپنی گرفتاری تک افسر مدرس رہے۔ اس وقت ان کی عمر اکیس برس کی تھی اور ان کی گرفتاری ایک تقریر کی بنیاد پر ہوئی تھی جو انھوں نے ہاپیڈ پارک یعنی آج کے محمد علی پارک میں مصطفےٰ کمال پاشا کی حمایت میں کی تھی کہ اگر انگریزوں نے ان پر حملہ کیا تو ہندوستان سے ایک سپاہی بھی انگریزی فوج میں نہیں جائے گا۔

اب تو یہ باتیں خواب وخیال ہوگئیں۔ لیکن جب ہم اور آپ اسکول میں پڑھتے تھے تو آپ نے یہ ذکر سید محمد صاحب ٹونکی اور مولوی عقیل الرحمٰن صاحب کی زبان سے سنا ہو کہ یہ دونوں اسی تحریک میں جیل جاچکے تھے۔ ان لوگوں نے علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی کے مقابلے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی بنتے دیکھی تھی۔ ٹونکی صاحب نے نے علی گڑھ میں گاندھی جی کی آمد کا قصہ سنایا تھا کہ کس طرح ان کی آواز پر کالج کے بہت سے لڑکوں نے نان کوآپریشن میں شرکت کی تھی۔

خلافت اور نان کوآپریشن میں شریک ہونے والے اپنے بزرگوں سے میں نے بار بار پوچھا کہ آخر یہ تحریک کیوں ختم ہوگئی۔ کسی نے کوئی قطعی وجہ نہیں بتائی۔ سب نے یہی کہا کہ چوراچوری کے واقعے کے بعد گاندھی جی نے یہ کہہ کر تحریک واپس لے لی کہ لوگ تشدد پر آمادہ ہوگئے تھے۔ لیکن اب مجھے یقین ہے کہ تحریک کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ جو لوگ اس میں شریک تھے ان کے سامنے کوئی پروگرام نہیں تھا۔ یہ بالکل طے نہیں ہوا تھا کہ آزادی کے بعد ہندوستان کیا نقشہ ہوگا۔ ادھر تحریک میں مسلمانوں نے اپنے مذہب کے نام پر ایسا جوش دکھایا کہ ان کے ہم وطن یہ سمجھنے لگے کہ شاید یہ لوگ مغل یا پٹھان وضع کی حکومت دوبارہ ہندوستان میں قایم کرنا چاہتے ہیں۔ ادھر مسلمان خود نہیں جانتے تھے کہ ان کا مقصد کیا ہے۔ ہندو اور مسلمانوں میں مشترک جذبۂ آزادی تو تھا لیکن آزادی کے بعد کیا ہوگا، اس کے متعلق کسی کا ذہن صاف نہیں تھا۔ چنانچہ غلط فہمیاں بڑھیں اور اتنی بڑھیں کہ اس کے بعد ایسا بھائی چارہ پھر کبھی نہیں ہوسکا۔

سیاسی یادوں میں میری سب سے پہلی یاد لکھنؤ کا ایک الیکشن ہے جو شاید ۱۹۳۶ء میں ہوا تھا۔ مسلم لیگ، کانگریس اور جمیعۃ العلماء کے متفقہ نمائندے مولانا شوکت علی تھے جن کا مقابلہ سر شفاعت احمد خاں سے تھا۔ مولانا شوکت علی جیت گئے اور سب نے کہا کہ یہ برٹش گورنمنٹ کی بہت بڑی شکست ہوئی۔ تھوڑے دنوں کے بعد یوپی میں کانگریسی حکومت بن گئی۔ لیکن کچھ باتیں ایسی ہوئیں جن سے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ کانگریس سے ناراض ہوگیا۔ اب تو یہ باتیں سب کو معلوم ہوگئیں لیکن اس وقت بہت سے لوگوں کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ اب تک تو سب مسلمان کانگریس کے ساتھ تھے، اب ایسی کیا بات ہوئی کہ دونوں میں اختلاف ہوگیا۔

اس اختلاف کا مظاہرہ علی گڑھ میں بھی ہونے لگا۔ اس وقت تک زیادہ تر پڑھے لکھے لڑکے (علی گڑھ والوں کی زبان میں) کانگریسی تھے۔ مثلاً خواجہ احمد عباس، حیات اللہ انصاری، اسرار الحق مجاز، علی سردار جعفری، چچا صدیق (صدیق احمد صدیقی) وغیرہ وغیرہ ہم نے اور آپ نے تو ان میں سے صرف چند ہی کو علی گڑھ میں دیکھا تھا اور وہ اس گروہ کے آخری لوگ تھے۔ یعنی مجاز، جاں نثار اختر اور سلطان نیازی، اس کے بعد جب مسلمان کانگریس سے خفا ہوئے تو علی گڑھ میں ایک نئی ہوا چلنے لگی۔ جناح صاحب کا علی گڑھ آنا تو یاد ہوگا۔ کیسی بھیڑ تھی اسٹیشن پر اور کیسے ریل کی پٹری پر پٹاخے رکھے گئے تھے کہ جب ان پر سے کالکا میل کا انجن گزرا تو معلوم ہوتا تھا کہ جناح صاحب کے استقبال میں توپوں کی سلامی دی جارہی ہو۔

جناح صاحب کی یہ آمد تو شاید ۱۹۴۰ء کے بعد کی تھی، اس سے پہلے علی گڑھ میں فضا کا بدلنا مجھے ایک پوسٹر کی وجہ سے یاد ہے جو یوم نجات کے سلسلے میں نکالا گیا تھا۔ جب ۱۹۳۹ء میں کانگریسی حکومت نے استعفا دیا تو مسلم لیگ کی طرف سے سارے صوبے میں یوم نجات منایا گیا۔ حالاں کہ اس وقت میری عمر

دس برس کے قریب تھی۔ لیکن گھر کے سیاسی ماحول کی وجہ سے کچھ کچھ سیاست میری سمجھ میں آتی تھی۔ مجھے اس کا بڑا دکھ ہوا کہ ایک ہندوستانی حکومت کے ختم ہونے پر کوئی جشن منایا جائے۔

ابھی چند برس پہلے مولانا آزاد اور چودھری خلیق الزماں کی کتابیں پڑھ کر سمجھ میں آیا کہ آخر مسلم لیگ والے کانگریسی وزارت کے اتنا خلاف کیوں تھے۔ کانگریس کے ساتھ مل کر الیکشن جیتنے کے بعد وزارت کے متعلق ان کی امیدیں پوری نہیں ہوئیں اور وہ سمجھے کہ اس معاملے میں کانگریس نے ان کے ساتھ دھوکہ کیا ہے بس اس کے بعد تو دلوں میں ایک کے بعد دوسری گرہیں پڑتی گئیں۔

اسی زمانے میں سوشلزم کے چرچے ہونے لگے تھے۔ یہ لفظ سب سے پہلے میں نے فرنگی محل میں اپنے چچا حیات اللہ انصاری صاحب سے سنا تھا۔ عام طور پر یہ خیال تھا کہ سوشلسٹ لوگ خدا کے خلاف ہیں۔ اس لیے اس نام میں جہاں معمولی پڑھے لکھے لوگوں میں ایک طرح نفرت کی جھلک ملتی تھی، وہاں ہم نوعمر لڑکوں کے لیے ویسی ہی شاعرانہ اور رومانی کشش تھی جیسی غالب، حافظ اور حسرت کے شاعرانہ کفر اور رندی میں تھی۔ جس زمانے میں یہ چرچے شروع ہوئے اسی زمانے میں مجاز کی نظم "اندھیری رات کا مسافر" حیات اللہ چچا کے اخبار ہندوستان میں شائع ہوئی۔ نظم سب کو بہت پسند آئی اور ہم میں سے کچھ نے تو اسے زبانی بھی یاد کر لیا اس کا ایک مصرعہ تھا

"خدا سویا ہوا ہے اہرمن محشر بداماں ہے۔"

اس پر کچھ پرانی وضع کے لوگوں نے اعتراض کیا کہ دیکھا کیسی کفر کی باتیں کہتے ہیں یہ سوشلسٹ لوگ! میں نے اپنے والد سے پوچھا۔ انھوں نے سمجھایا کہ فارسی زبان میں اہرمن برائی کے دیوتا کو اور یزداں نیکی کے دیوتا کو کہتے ہیں۔ یہاں شاعر نے یزداں کے بجائے فارسی کا ایک دوسرا لفظ خدا استعمال کیا ہے۔ جو لوگ زبان نہیں جانتے وہ اس پر اعتراض کر رہے ہیں ۲
جاننے والوں کے لیے اس میں کوئی بری بات نہیں ہے۔ اس کے بعد تو یہ مصرعہ اور بھی اچھا لگنے لگا۔

بہت بعد کو یہ سمجھ میں آیا کہ ہندوستانی مسلمانوں (یا آج کل کی اصطلاح میں برصغیر کے مسلمانوں) کے ذہنی پس منظر میں کیسی کیسی کافرروایتیں قدم قدم پر ملتی ہیں اور اگر یہ نہ ہوتیں تو شاید ہماری تہذیب بالکل بے رنگ رہ جاتی۔ ذرا آپ خود ہی بتائیے کہ اگر ہم نے اور آپ نے

ہر لحظہ بشکل بت عیار بر آمد۔ گہ پیر و جواں شد
ہر دم بہ لباسِ دگر آں یار بر آمد۔ دل برد و رواں شد

نہ سنا ہوتا تو وحدت الوجود کا معاملہ کتنا بے رنگ لگتا۔ کیا اس کے بغیر ہماری غزل، نظم، مثنوی یا ادب کے کسی روپ میں کوئی جان رہ جاتی؟ اسی بنیاد پر سیکڑوں برس بعد کوئی کہہ سکتا تھا

"دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں"

بہر حال وحدت الوجود کے مسئلے کو طول دینا مقصود نہیں ہے صرف یہ کہنا ہے کہ مسلمانوں کی تہذیبی روایات میں ایسی کتنی ہی باتیں کو دخل ہے جنھیں سن کر سادہ لوح حضرات سوائے توبہ اور استغفار کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔

اس سلسلے میں شاید وہ واقعہ آپ کو یاد ہو جو جوش ملیح آبادی کے ساتھ یونیورسٹی کے میرس ہال میں پیش آیا تھا۔ آل انڈیا مشاعرہ تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور محفل رنگ پر تھی۔ آخر میں جوش صاحب کی باری آئی۔ آپ نے جھوم کر اپنی نظم سنائی جس کے آخر میں شیخ صاحب کی تعریف میں تھا

خدا کو اور نہ پہچانیں یہ حضرت
خدا کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں

اس پر ایک صاحب نے سخت اعتراض کیا کہ ایسی باتیں ہمارے مذہب کے خلاف ہیں۔ صاحب صدر نے جوش صاحب سے درخواست کی کہ آپ کوئی اور چیز سنایئے۔ جوش صاحب نے جواب دیا کہ جناب مشاعرے میں شرکت کے لیے آیا تھا تعلیم پڑھنے کی نیت نہیں تھی۔

اس قسم کی نوک جھونک سے ہماری تاریخ بھری پڑی ہے
بارگاہِ خداوندی میں کیسی کیسی گستاخیاں روا رکھی گئی ہیں۔ بیسویں
صدی کی بات جانے دیجیے، جب دامنِ یزداں چاک کرنے کی
دھمکی بھی دی گئی ہے۔ ذرا اپنے کسی یورپین دوست کو

آستیں برا و کشیدی ہمچو مکار آمدی
با خودی بہر خود تماشہ سوئے بازار آمدی

کی تفسیر سمجھانے کی کوشش کیجیے تب دیکھیے پاؤں کہاں جا پڑتا ہے
صوفیا اس کا جواز یوں دیتے ہیں کہ ظاہری ادب اور تمیز تو دوئی
کی نشانیاں ہیں جب دوئی ختم تو ادب اور تمیز کا کیا ذکر۔ وہ تو
علی الاعلان کہتے تھے

با خدا دیوانہ باشد و با محمدؐ ہوشیار

اور اس پر عمل بھی ہوتا تھا۔ بار بار یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر دنیا
کی اور کسی زبان میں اتنی فاسقانہ اور کافرانہ باتیں کہنے کا رواج
کیوں نہیں ہے۔ آپ کا تو خیر مضمون ہی انگریزی تھا۔ آپ کی نظر
ہم سائنس والوں سے زیادہ گہری ہے۔ کیا انگریزی، فرانسیسی
یا روسی ادب میں ایسی کوئی روایت ہے؟ اور لطف تو یہ ہے کہ
جن لوگوں نے ہماری تہذیب میں یہ رنگ بھرا ہے وہ نہ تو سوشلسٹ
تھے، نہ کمیونسٹ اور نہ ہی لامذہب۔ جب دہلی کے مشاعرے میں
یہ شعر پڑھا گیا ہوگا

کبھو دل بھی کیا ہے خوش کسی رند شرابی کا
بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور گلابی کا

ظاہر ہے کہ زانو پیٹ پیٹ کے داد دی گئی ہوگی، لیکن کسی نے میر
درد کی مذہبی گرفت نہیں کی۔

میرے خیال میں اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان دانشور بار بار
یہ جتا دینا چاہتے تھے کہ ان کے مذہب میں کلیسا کی طرح کوئی
ادارہ نہیں بننے دیا جائے گا۔ اسی لیے شیخ، محتسب اور واعظ
پر ہمیشہ اتنی طعنہ زنی رہی۔ ذاتی طور پر لوگ علماء اور مجتہدین کی
بڑی عزت کرتے تھے لیکن کبھی انھیں وہ درجہ دینے کو تیار نہیں
تھے جو یورپ میں کسی زمانے میں اہلِ کلیسا کا تھا۔ کفر کے فتوے
ضرور دیے گئے لیکن شاذ و نادر ہی کبھی کسی کو ان کی بنا پر سزا
دی گئی ہو اور جب سزا دی گئی تو نتیجہ سب کو معلوم ہے۔ منصور
کا ایسا ہیرو ہماری روایات میں شاید ہی کوئی دوسرا ہو لیکن جن
لوگوں نے اسے کافر قرار دے کر قتل کا فتویٰ دیا تھا۔ ان کا تو نام
بھی کوئی نہیں لیتا اور نہ جاننا چاہتا ہے۔

قاضی عبدالرشید صاحب تو آپ کو یاد ہوں گے، وہی
شیروانی، ترکی ٹوپی اور بیضوی شیشوں کی عینک والے نہایت
مہذب استاد۔ ایک دن کلاس میں انھوں نے دارا شکوہ کا
قصہ سنایا کہ جب اسے چھوٹے بھائی نے کافر کہہ کر قتل کا حکم دیا
تو اس نے ایک پرزہ پر یہ لکھ کر بھیجا

روزے کہ بود اذا السماء انشقت
وقتے کہ بود اذا الشمس کورت
من دامنِ تو گرفتم و گفتم
صنما! بای ذنبٍ قتلت

انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ پرچہ پڑھ کر اورنگ زیب
پر کیا گزری، لیکن اورنگ زیب کی تعریف کرنے والے بھی
اس واقعہ کا کوئی ذکر پسند نہیں کرتے۔

میں مسلم دانشوروں کا تذکرہ نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ
مجھے معلوم ہے کہ ان کا نام سنتے ہی آپ کی رومانی فطرت
آپ کو نہ معلوم کہاں کہاں لے جائے گی۔ کبھی تو یہ آپ کو ابن
سینا، عمر خیام، فارابی، البیرونی اور غزالی کے ساتھ بغداد
اور وسط ایشیا کے ان گنت شہروں میں لے جائے گی اور
کبھی یہ قرطبہ، قاہرہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیوں میں آپ کو
بھٹکائے گی۔ اور پھر آپ میری طرف مخاطب ہو کر پوچھیں گے
"وہ کہاں گئے یہ لوگ؟" میں نے بھی بار بار یہ سوال خود سے
کیا ہے۔ لیکن اس قصے کو پھر کبھی کے لیے اٹھا رکھیے۔ ابھی تو
علی گڑھ کی باتیں کی جائیں۔

ذکر تھا ۱۹۳۹ء کے بعد کے علی گڑھ کا جب دوسری

جنگ عظیم چھڑ چکی تھی۔ اس زمانے میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس کا علم شاید آپ کو بھی نہ ہو۔ سبھاش چندر بوس کانگریس کے باغی صدر تھے۔ بایں معنی کہ ان کا انتخاب گاندھی جی کی مرضی کے خلاف ہوا تھا وہ تری پورہ کانگریس کے بعد علی گڑھ بھی آئے تھے۔ یونیورسٹی کے کچھ لڑکوں نے شہر کی لائل میں ان کا استقبال کیا استقبال کرنے والوں میں فرنگی محل کے انور انصاری اور ان کے چھوٹے بھائی جنید انصاری بھی تھے۔ انور انصاری بعد کو یونیورسٹی میں سائیکالوجی کے پروفیسر ہوئے اور ۱۹۷۵ء میں انتقال کر گئے۔ سبھاش بوس کانگریس کے بائیں بازو کے ان رہنماؤں میں تھے جنھیں گاندھی جی کی اہنسا سے کوئی مذہبی لگاؤ نہیں تھا۔ میں نے سبھاش بوس کے سلسلے میں مذہبی لگاؤ کی اصطلاح جان بوجھ کر استعمال کی۔ اس لیے کہ گاندھی جی اور ان کے اثر میں بہت سے کانگریسی لیڈر یہ اعلان کرچکے تھے کہ اہنسا ان کے لیے ایک مذہبی عقیدہ کا درجہ رکھتی ہے۔ سبھاش بوس اور جواہر لال نہرو کی طرح مولانا آزاد بھی کئی مرتبہ یہ جتا چکے تھے کہ ان کے لیے اہنسا محض ایک پالیسی ہے جو انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے اس بنا پر قبول کی گئی ہے کہ وہ مفید معلوم ہوتی ہے۔ لیکن گاندھی جی خود اتنے مذہبی آدمی تھے کہ عام طور پر یہ مشہور کیا گیا کہ چوں کہ کانگریس میں زیادہ تر ہندو ہیں اور تشدد ہندو مذہب کے خلاف ہے' اس لیے کانگریس نے عدم تشدد کی پالیسی اختیار کی ہے۔ واقعہ اس کے بالکل خلاف تھا۔ عدم تشدد کا ہندو مذہب سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہندوؤں کی سب سے مقدس کتاب گیتا میں صرف وہ مکالمہ ہے جو سری کرشن جی مہاراج اور ارجن میں تشدد کے جواز میں ہوا۔ ارجن تو بار بار کہتے تھے کہ رشتہ داروں میں آپس میں خون خرابہ کیوں کیا جائے اور سری کرشن ان کو سمجھاتے تھے

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

اور جان کے معاملے میں ان کا کہنا تھا کہ جیسے جان دینے کی ضرورت پڑتی ہے ویسے ہی کبھی کبھی جان لینا بھی پڑتا ہے۔ گاندھی جی اہنسا کے معاملے میں گوتم بدھ اور مہاویر کی تعلیم سے زیادہ متاثر تھے۔ مجھے تو اکثر اس پر تعجب ہوتا ہے کہ اُنھوں نے بدھ مذہب کیوں نہ اختیار کرلیا۔ غالباً ان کی سیاست اس میں آڑے آئی۔ ایک طرف تو ان کی طبیعت پر مذہبی رنگ بہت گہرا تھا تو دوسری طرف سیاست ان کی رگ رگ میں بسی ہوئی تھی۔ مذہبی عقائد کی خاطر انھوں نے اپنی جان دے دی' سیاست میں وہ مسٹر جناح سے مات کھاگئے۔

کہاں ہے کا جھگڑا تھا دونوں میں؟ انگریزوں سے آزادی کے معاملے میں دونوں ایک تھے۔ سوال یہ تھا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد کیا ہوگا۔ گاندھی جی اور ان کے ساتھی کہتے تھے کہ ویسٹ منسٹر کی طرح کی جمہوریت ہونا چاہیے۔ مسٹر جناح کہتے تھے کہ اس قسم کی جمہوریت ہندوستان کے لیے موزوں نہیں ہے کہ اس سے صرف ایک مذہبی اکثریت کو پورے ہندوستان پر حکومت حاصل ہو جائے گی۔ ہندوستانی تحریک آزادی اس اختلاف کا کوئی حل نہ نکال سکی۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں علی گڑھ میں بھی یہ بحث زوروں پر چھڑ گئی۔ افضال حسین قادری صاحب جنھیں ہم افضال چچا کہتے تھے' لڑائی چھڑنے سے کچھ ہی دن پہلے انگلستان سے زولوجی میں پی ایچ۔ ڈی کر کے واپس آئے تھے۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ فلاسفی کے پروفیسر ظفر الحسن صاحب سے مل کر انھوں نے کچھ لوگوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک دفعہ پروفیسر ظفر الحسن صاحب کے دولت کدے پر کوئی جلسہ ہوا تھا۔ اس میں بدرالدین قادری اور ان کے بڑے بھائی اشفاق قادری کے ساتھ میں بھی بچہ پارٹی میں شامل ہوگیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بھی اس جلسہ میں ہوں گے۔ کیوں کہ اوّل تو آپ ان کے پڑوس میں رہتے تھے اور دوسرے یہ کہ ان کے بڑے لڑکے احمد شاید آپ کے دوست ہوں۔

بعد میں معلوم ہوا کہ افضال قادری صاحب کبھی

کے ان نوجوان طلبار میں تھے جنھوں نے ہندوستان کی تقسیم کا ایک نقشہ مسلم لیگ کے لاہور ریزولیوشن سے بہت پہلے بنایا تھا اگرچہ اس نقشہ میں حقیقت سے زیادہ رومان کو دخل تھا۔

۱۹۳۷ء سے پہلے تک علی گڑھ میں مسلم لیگ کا کوئی خاص اثر نہیں تھا۔ اوّل تو سرسیّد کے زمانے سے ایک روایت یہ بھی چلی آرہی تھی کہ مسلمانوں کو سیاست سے الگ رہنا چاہیے۔ چنانچہ ہمارے اکثر اساتذہ اسی کے قائل معلوم ہوتے تھے، اور پھر علی گڑھ کے نوابین کا بھی بہت اثر تھا جو ملک میں ہر عوامی تحریک سے اپنے کو الگ رکھتے تھے۔ لیکن ۱۹۴۰ء کے بعد یہ حالات بہت تیزی سے بدلنے لگے۔ سیاست کی ایسی ہوا چلی کہ ساری یونیورسٹی اس کی لپیٹ میں آگئی۔

ہم بچّوں کی ایک انجمن پیام برادری بھی تھی۔ جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی کے بچوں کی اسی نام کی انجمن کو ایک آل انڈیا حیثیت دے دی گئی تھی اور اسی کی ایک شاخ ظفرعمر صاحب کے بیٹے خلیل عمر نے اپنی کوٹھی نیلی چھتری میں کھول لی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، خلیل عمر اس کے صدر تھے اور میں ورکنگ کمیٹی کا ممبر تھا۔ میرے ساتھ احسان رشید، عزیز عمر، احمد سعید اور شایق بھی تھے۔ اسی پیام برادری کا ایک جلسہ یونین ہال میں کیا گیا جہاں میں نے فلسطین پر ایک تقریر کی جس پر مجھے فرسٹ پرائز ملا۔ علی گڑھ میں جیسے جیسے مسلم لیگ کی تحریک زور پکڑتی گئی، پیام برادری کی اہمیت کم ہوتی گئی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ جامعہ کے تعلق کی وجہ سے پیام برادری گویا ایسے لوگوں کے اثر میں تھی جنھیں اس زمانے میں مسلم لیگ کے مقابلے میں نیشنلسٹ کہا جاتا تھا۔ لیکن مجھے پیام برادری سے بہت دنوں تک جذباتی لگاؤ رہا اور اس میں صرف علی گڑھ کے تعلق ہی کو دخل نہیں تھا۔

اسی زمانے میں مجھے شہسواری کا شوق ہوا اور میں یونیورسٹی کے رائڈنگ کلب کا ممبر ہو گیا۔ ان دنوں اسے رائڈنگ اسکول کہتے تھے۔ آپ کو شاید یاد ہو کہ اسکول کے دو لڑکے گھوڑے کی ننگی پیٹ پر کھڑے ہو کر سرپٹ دوڑاتے تھے، ان میں سے ایک ضیاء الرب تھے اور دوسرا میں تھا۔ میری عمر دس برس کی تھی اور ضیاء الرب مجھ سے چار پانچ برس بڑے تھے۔ گھوڑے کی سواری کا شوق اب تک ہے جب اسکول اور اس کے بعد یونیورسٹی میں پڑھتا تھا بلم بازی اور جمپ بھی کرتا تھا۔ اب صرف سواری کرتا اور پولو کھیلتا ہوں۔ پولو میں نے ہی علی گڑھ میں شروع کرائی۔ لیکن یہ بہت بعد کا قصہ ہے۔

پولو تو کبھی کبھی ہوتا ہے۔ رائڈنگ کلب والوں کو اصل دلچسپی تو نیزہ بازی سے ہے۔ ہمارے لڑکے اور لڑکیاں دہلی میں آل انڈیا مقابلوں میں شرکت کرتے ہیں۔ مقابلہ پولس اور فوج والوں سے ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ ہماری ٹیم پولس اور فوج کو ہرا کر ٹرافی جیت لائی تھی۔ اس ٹیم میں پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب کا پوتا چھوٹو بھی تھا۔ چھوٹو اب تو ماشاء اللہ ڈاکٹر طارق وحید قریشی ایم۔ ایس سی۔ پی ایچ۔ ڈی کہلاتے ہیں۔ وحید بھائی کے چھوٹے بیٹے ہیں۔ ایک دفعہ میری چھوٹی بیٹی زویا نے بھی اس مقابلے میں انعام حاصل کیا تھا۔ (جاری)

اپنی مدد آپ

سرسیّد کہا کرتے تھے:

"انسان کی قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں کہ کوئی خضر ملے، گورنمنٹ فیاض ہو اور ہمارے سب کام کر دے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہر چیز ہمارے لیے کی جاوے اور ہم خود نہ کریں۔"

ان کی اس تنبیہ سے متاثر ہو کر ایک مرتبہ پانی کی کمی کو دور کرنے کے لیے طلباء نے خود ایک کنواں کھودا تھا۔

سمیع الرحمٰن خاں*

ایڈس

آج کل ایڈس کا جس قدر چرچا ہے، اتنی ہی یہ بیماری عوام کے لیے خوف وہراس کا سبب بنی ہوئی ہے۔ آئے دن نت نئی معلومات اور انکشافات ہو رہے ہیں۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائیزیشن (WHO) نے اس مرض کو عوام کی صحت کے لیے انتہائی خطرناک مرض قرار دیا ہے اور اس کے خلاف مہم کو اولیت دی ہے۔ اس کی تشخیص کے لیے جگہ جگہ مراکز قایم کیے جا رہے ہیں اور عوام کو اس مرض کی جانکاری اور اس سے بچاؤ کے لیے ہر ممکن اطلاع بہم پہنچائی جا رہی ہے۔

چند سال قبل تک کوئی اس بیماری کے نام سے واقف نہ تھا۔ ۱۹۸۱ء کے وسط میں ممالک متحدہ امریکہ میں ایڈس کے بارے میں پہلی مرتبہ معلومات حاصل ہوئیں۔ اس کے بعد دنیا کے مختلف ۴۳ ملکوں میں اس مرض میں مبتلا مریضوں کے بارے میں اطلاعات ملنے لگیں۔ اور اب تک اس مرض میں مبتلا تقریباً بیس ہزار مریضوں کے بارے میں معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ ہندوستان میں بھی اس مرض میں مبتلا مریضوں کی تصدیق ہو چکی ہے اور یہ تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ بمبئی میں ایک مریض اس بیماری سے مر چکا ہے جس کے خون کے نمونے مزید طبی جانچ کیلیے انگلستان بھیجے گئے ہیں۔

اسباب:- ایڈس ایک ایسی بیماری ہے جس میں جسم انسانی میں بیماری سے مقابلہ کرنے کی طبعی طاقت میں نقص آجاتا ہے، چنانچہ اس مرض میں مبتلا مریضوں میں ان بیماریوں سے جن کا انسان میں مناعت (بیماری سے مقابلہ کرنے کی طاقت) کے طبعی ہونے (Natural Immunity) کی صورت میں کوئی خطرہ نہیں ہوتا، مبتلا ہونے کی استعداد شدت سے زور پکڑ جاتی ہے۔ ایسی بیماریوں کو جو طبعی مناعت کے کم ہو جانے کی بنا پر جسم پر حاوی ہو جاتی ہیں "موقع پرست" (Opportunistic) تعدیہ یا مرض کہا جاتا ہے۔

اس مرض کا سبب ایک وائرس ہوتا ہے جس کو Human - T-Cell Lymphotropic Virus type III (H.T.L.V-III) کہتے ہیں لیکن اس وائرس کے تعدیے کی وجہ سے ایڈس ہمیشہ ہی نہیں ہوتا۔ ابتدائی مطالعے سے معلوم ہوا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں، اس وائرس کا تعدیہ ہو چکا ہے، صحت مند رہتے ہیں لیکن کچھ دوسرے لوگوں میں یہ مرض شدت کے مختلف مدارج میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ بعض لوگوں میں اس کا اثر برائے نام ہوتا ہے۔ مگر بعض لوگوں میں مرض بہت شدت اختیار کر لیتا ہے

مرض لگنے کے ذرایع

اس مرض کے ایک شخص سے دوسرے کو لگنے کے

مندرجہ ذیل ذرائع ہیں؛

۱۔ **جنسی تعلق :۔** ایسے لوگوں میں جن کے جنسی تعلقات ایک سے زیادہ افراد سے ہوں، چاہے وہ اُسی جنس کے ہوں یا مخالف جنس کے یا دونوں جنسوں کے۔ مرد کی منی میں اس بیماری کے وائرس ہوتے ہیں جو ایک سے دوسرے کو مرض لگنے کا سبب ہوتے ہیں۔

۲۔ ایک ہی سوئی سے مختلف افراد میں انجکشن لگانا۔ ایک ہی سوئی سے بغیر باقاعدہ مطہر STERLISE کیے ایک سے زیادہ افراد میں انجکشن لگانا یا ایسے مبتلائے مرض لوگوں کی استعمال شدہ سوئی سے انجکشن لگانا جو کسی دوا کا انجکشن لینے کے عادی ہوں۔

۳۔ انتقال الدم BLOOD TRANSFUSION

مزاج نزفی Haemo Philia (وہ بیماری جس میں معمولی اسباب سے خون بہت زیادہ نکل جاتا ہے) کے مریضوں اور اُن مریضوں میں جن کو خون دیا گیا ہو اس مرض کا وقوع خون کے ذریعے اس بیماری کا تعدیہ لگنے کا شاہد ہے۔

۴۔ ایسے خون یا خون سے تیار شدہ ادویہ کا استعمال جس میں مرض کے اثرات موجود ہوں اس مرض کے ایک دوسرے میں منتقل ہونے کا ذریعہ ہوتا ہے۔

یہ مرض ماں سے بچے میں پیدائش سے قبل جنینی زندگی میں یا پیدائش کے وقت یا پیدائش کے فوراً بعد منتقل ہوتا ہے۔

امریکہ میں کم و بیش نوّے فیصد مریض مندرجہ ذیل گروہوں میں سے کسی ایک گروہ میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ ایسے لوگ جن کے جنسی تعلقات اپنے ہم جنس یا دونوں جنسوں کے افراد سے ہوں (Homosexual or Bisexual)

۷۳ فی صد۔

۲۔ ایسے لوگ جو کسی دوا کانس میں انجکشن لینے کے عادی ہوں یا عادی رہے ہوں ۱۷ فی صد۔

۳۔ مزاج نزفی۔ HAEMO PHILIA یا خون کے انجماد سے متعلق مرض میں مبتلا اشخاص ایک فیصد۔

۴۔ ایسے افراد جن کو خون دیا گیا ہو یا خون سے تیار شدہ ادویہ بذریعہ انجکشن دی گئی ہوں دو فیصد۔

۵۔ مخالف جنس کے ایسے فرد سے جنسی تعلق جو ایڈس (ADS) میں مبتلا ہو یا اس میں مبتلا ہونے کے امکانات پیدا ہو۔ ایک فیصد۔

۶۔ وہ بچے جو مبتلائے مرض ماں سے پیدا ہوتے ہوں ایک فیصد۔

اس مرض میں مبتلا مریضوں کی پانچ فی صد تعداد ایسی ہے جو مذکورہ بالا گروہوں ہی میں سے کسی ایک گروہ میں شامل نہیں ہوتی۔ لیکن تحقیقات کرنے والے یقین رکھتے ہیں کہ یہ افراد بھی مندرجہ بالا گروہوں ہی میں سے کسی ایک گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

افریقہ کے ممالک میں یہ ترتیب کچھ مختلف ہے، جہاں یہ مرض مخالف جنس سے جنسی تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ جب کہ امریکہ میں اس مرض میں مبتلا کل مریضوں میں سے ۹۳ فی صد مریض ایسے مرد ہیں جن کے جنسی تعلقات اپنی ہی جنس (Homo Sexual) سے ہیں۔ لیکن افریقہ میں یہ مرض دونوں جنسوں میں برابر تناسب میں ہوتا ہے۔ یورپی ممالک کا حال تقریباً امریکہ ہی جیسا ہے۔

مدّت حضانت :

اس مرض کے وائرس HTLV کے داخل جسم ہونے اور مرض کے پیدا ہونے کی درمیانی مدّت چھ ماہ سے لے کر پانچ سال یا اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر وہ شخص جو اس مرض کے وایرس سے متاثر ہوا ہو، اس مرض میں مبتلا ہو۔

علامات اور نشانیاں

اس مرض میں مبتلا زیادہ تر مریضوں میں کوئی علامت نہیں ہوتی۔ کچھ مریضوں میں اس کی مندرجہ ذیل علامتیں ہوتی ہیں۔

۱۔ تھکان کا احساس

۲ بخار۔

۳۔ کھانسی۔

۴ بھوک کی کمی۔

۵۔ وزن کا کم ہو جانا۔

۶ دست آنا۔

۷- رات کے وقت پسینہ آنا۔

۸- جلد پر دھبے پڑ جانا۔

۹- گردن کنج ران یا بغل کے غدودوں کا بڑھ جانا۔

تشخیص :-

III-HTLV وائرس کے خلاف اجسام ضدیہ کی جسم میں موجودگی سے اس مرض کی تشخیص ممکن ہو گئی ہے۔ جسم انسانی میں -HT LV-III وائرس کے خلاف اُن اجسام (اجسام ضدیہ -ANTI BODIES) کی موجودگی جو جسم میں اس بیماری سے مقابلہ کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں، کو جانچ کر کے معلوم کر لیا جاتا ہے۔ ان وائرس کے خلاف اجسام ضدیہ کی جسم میں موجودگی سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ جسم میں ان وائرس کا تعدیہ ہو چکا ہے لیکن اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ فی الوقت بھی جسم میں ان کا تعدیہ ہے یا نہیں۔

مذکورہ جانچ سے ایسے افراد کو جن میں اس بیماری کے ہونے کا اندیشہ بہت زیادہ ہو (High Risk Group) اور خون اور خون سے بنی ہوئی ایسی ادویہ جن میں اس کے اثرات ہوں، کو امتیاز کر لیا جاتا ہے۔ اس سے خون دینے (Blood Transfusion) یا خون سے بنی ہوئی ادویہ مثلاً Factor VIII جس کی مزاج نزفی کے مریضوں کو دینے کی ضرورت ہوتی ہے، کے ذریعے بیماری کے ایک سے دوسرے میں پھیلنے سے روکنے میں مدد ملتی ہے۔

موقع پرست تعدیہ- (Opportunistic Infection)

امریکہ میں اب تک دیکھے گئے اس مرض میں مبتلا مریضوں میں سے تقریباً ۸۲ فیصد مریضوں میں مندرجہ ذیل شاذ و نادر ہونے والی دو میں سے کوئی ایک یا دونوں بیماریاں دیکھی گئی ہیں —

۱- نیوموسسٹک کیرنیائی نمونیہ — (PCP) PNEUMO-CYSTIC CARINII PNEUMONIA)

۲- کاپوسی سارکوما- (KAPOSI SARCOMA)

۱- PCP پھیپھڑوں کا ایک طفیلی تعدیہ- (PARASITIC-INFECTION) جس کی علامت کسی بھی وجہ سے ہونے والی شدید نمونیہ کی علامات سے ملتی جلتی ہوتی ہیں۔ مثلاً کھانسی آنا، بخار ہونا، سانس لینے میں دقت ہونا۔

۲- کاپوسی سارکوما (KAPOSI SARCOMA) سرطان (CANCER) کی ایک قسم ہے جو جلد پر جسم میں کسی بھی جگہ یا منہ میں ہوتا ہے۔ ابتدا میں یہ ایک خراش جیسا یا نیلگوں، بنفشئی یا بھورے رنگ کے دھبے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جو بڑا ہو جاتا ہے اور پھیل کر جسم کے دوسرے حصوں کو بھی متاثر کر دیتا ہے۔

قلب پر اثرات :-

قلب میں بھی کاپوسی سارکوما پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے قلب کے اندرونی حصے میں سوجن آجاتی ہے (Non-Bacterial Thrombotic Endo Carditis) جس سے قلب کے صمامات (VALVE) متاثر ہو جاتے ہیں اور صمامات کے کام میں خلل پیدا ہو جاتا ہے۔ شرائین اکلیلی (Coronary Arteries) میں اس رسولی کے خلیات کا ترسب ہو جاتا ہے جس سے سینے میں درد ہونے لگتا ہے۔

مزید برآں اس بیماری میں مبتلا مریضوں میں ایسٹ (Yeast) (سائیٹو میگیلو وائرس (Cytomegalo Virus) ہرپس وائرس (Herpes Virus) اور (PARASITES) مثلاً ٹوکسو پلازم (Toxo Plasma) کریپٹو اسپوراڈیا (Crypto Sporadia) کا تعدیہ بھی ہو جایا کرتا ہے۔

علاج :-

ابھی تک ایسی کوئی دوا دریافت نہیں ہوئی جو ایڈز کے لیے شافی حیثیت رکھتی ہو۔ اس کے موثر علاج کے لیے دواؤں پر تحقیقات برابر جاری ہیں۔ ایسی بیماریوں کا جن میں ایڈز کے مریض مبتلا ہو جاتے ہیں، شعاعوں (Radiation) جراحت (Surgery) اور ادویہ کے استعمال سے علاج کرنے میں معالجین کو کامیابی ہوتی ہے۔ لیکن مریض کے جسم کے مناعتی نظام کو طبعی حالت پر لانا ممکن نہیں ہو سکا ہے۔

نمونیہ کا علاج اینٹی بایوٹک ادویہ اور کاپوسی سارکوما (Kaposi Sarcoma) کا علاج انٹرفیرون (Inter Feron)

سے کیا جا سکتا ہے۔
"چوں کہ اس بیماری کے علاج کے لیے ابھی تک کوئی دوا دریافت نہیں ہوئی اس لیے تشخیص ہونے پر اس بیماری میں مبتلا مریض لاعلاج قرار دیے جاتے ہیں۔"

روک تھام

اس بیماری سے بچنے اور اس کے پھیلنے کو روکنے کے لیے مندرجہ ذیل احتیاطی تدابیر پر عمل کرنا ضروری ہے۔

۱۔ ایسے لوگوں سے جو ایڈس میں مبتلا ہوں یا جن میں ایڈس ہونے کا شدید اندیشہ ہو HRG ہائی رسک گروہ (High Risk Group) یا جن لوگوں میں ایڈس کے وائرس موجود ہوں، ان سے جنسی تعلق نہ رکھا جائے۔

ہائی رسک گروہ (High Risk Group) میں مندرجہ ذیل طرح کے افراد شامل ہیں۔

طوائف، اپنی ہی جنس سے تعلق رکھنے والے لوگ (Homo Sexuals) انجکشن کے ذریعے دواؤں کے غلط استعمال کے عادی لوگ، ایسے لوگ جن کو خون دیا جاتا ہو، جنسی تعلق سے پیدا ہونے والی بیماریوں میں مبتلا اشخاص اور بیرونی ممالک میں جانے والے حضرات جیسے ہوائی جہاز پر کام کرنے والا عملہ۔

۲۔ ایک سے زیادہ افراد سے جنسی تعلق نہ رکھا جائے۔

۳۔ درونِ وریدی انجکشن کے عادتاً ذاتی استعمال سے بچا جائے۔

۴۔ دانت صاف کرنے کے برش، استرے یا دوسری ایسی اشیا جن کے ایسے مریض کے استعمال میں آنے پر خون سے تعلق میں آنے کا امکان ہو، کا مشترکہ استعمال نہ کیا جائے۔

اس مرض کے متعلق چند شبہات ذہن سے نکال دینا چاہیے۔ مثلاً کام کاج کی جگہوں پر، اسکول یا گھر پر روزانہ لوگوں سے تعلق میں آنے سے اس بیماری کے لگنے کے شواہد نہیں ملے ہیں۔ نہ ہی یہ بیماری ہاتھ ملانے یا تقریبات کے موقع پر لوگوں سے ملنے جلنے سے لگتی ہے بلکہ حقیقتاً یہ بیماری جنسی تعلق یا انجکشن لگانے کی ایسی مشترکہ سوئی جس کو باقاعدہ مطہر (Sterlised) نہ کیا گیا ہو، سے لگتی ہے۔ اگر باقاعدہ احتیاط برتی جائے اور آلات کو باقاعدہ مطہر کر لیا جائے تو خون کے عطیات دینے والے لوگوں (Blood Donors) میں اس مرض کے لگنے کا امکان نہیں ہے۔

ایسے لوگوں سے رسمی تعلق، جو ایڈس میں مبتلا ہوں، یا مبتلا ہونے کے خطروں سے گھرے ہوں (HRG) سے دوسرے لوگوں میں اس بیماری کے لگنے کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ ابھی تک کوئی ایسی رپورٹ نہیں ملی جس سے یہ کہا جائے کہ یہ بیماری گھر میں کسی دوسرے ایڈس میں مبتلا مریض سے رسمی تعلق سے لگی۔ ایسے بچوں سے جو ایڈس میں مبتلا ہوں یا جن میں HTLV III وائرس کا تعدیہ ہو، سے بھی گھر کے دوسرے افراد کو تعدیہ نہیں ملا۔ حالاں کہ اس بیماری کے وائرس مریض کے آنسوؤں اور لعاب دہن میں پائے جاتے ہیں لیکن ایسے شواہد نہیں ملے کہ یہ بیماری مریض کے ان فضلات سے تعلق میں آنے سے لگی ہو۔

بقیہ صفحہ نمبر ۵۱ سے آگے

کا اظہار کیا کہ ایک ایسا ادارہ بنایا جائے جس کے پاس کم از کم ایک کروڑ روپیہ کا سرمایہ ہو۔ یہ ادارہ بہترین نوجوان مسلمان طلبا کو چنے، انھیں رہائش کھانے پینے کی سہولتیں مہیا کرے اور ان کا داخلہ ملک کی بہترین درس گاہوں میں کرائے۔ جب ایسے اچھے نوجوان اقلیتوں میں سے آئیں گے تو تعلیمی عمائدین کا ایک گروپ بن جائے گا۔ اس سے دوسروں کو بھی حوصلہ ملے گا۔

(۴) انھوں نے فرمایا کہ نصاب میں شامل تاریخ اور دیگر مضامین کی کتابوں سے غلط اور نقصان دہ مواد کو نکال دینا چاہیے۔ اگر ضرورت ہو تو ایک ایسی کمیٹی کا بھی انعقاد کیا جائے جو نقصان دہ مواد کو نکالنے کے سلسلے میں عدالتوں میں بھی قانونی چارہ جوئی کر سکے۔

(۵) سہ لسانی ضابطہ میں اردو کو شامل کیا جانا چاہیے۔

سید حامد
ترجمہ/ سید شفیق احمد

نئی تعلیمی پالیسی اور اقلیتیں

ملک میں اس وقت ایک جدید تعلیمی پالیسی زیر تشکیل ہے۔ اس پالیسی میں ہندوستانی مسلمانوں کے مخصوص تعلیمی و اقتصادی مسائل کا کس حد تک لحاظ رکھا گیا ہے اور ان مسائل کو حل کرنے میں کتنی ذمہ داری حکومت کی ہے اور کتنی خود مسلمانوں کی؟ ان موضوعات پر منعقد ہوئے ایک اہم سیمینار کی سفارشات کا اردو ترجمہ جون کے شمارے میں پیش کیا جا چکا ہے۔ زیر نظر مضمون اسی سیمینار میں پیش کیے گئے "کلیدی مقالہ" اور اس پر شرکاء کے خیالات کا اردو ترجمہ ہے۔

ایڈیٹر

دستاویز "تعلیم کی چنوتی" (چیلنج آف ایجوکیشن) جس میں ملک کی مجوزہ نئی تعلیمی پالیسی تشکیل دی گئی ہے اور ترمیم شدہ دستاویز جو بعد میں سامنے آئی۔ اپنے ادراکی تجربے، تکنیکی تعلیم، ایجاد و اختراع اور نئے اقدامات کی وجہ سے موافقت کی نگاہ سے دیکھی گئی ہے۔ اقلیتوں کے نقطۂ نگاہ سے یہ پالیسی پیپر (PAPER) پھر بھی مایوس کن ہے۔ ناہموار تعلیمی پھیلاؤ کو روکنے میں یہ پیپر ناکام رہا ہے۔ اس میں اس حقیقت سے چشم پوشی کی گئی ہے کہ ملک کی سب سے بڑی اقلیت تعلیمی اعتبار سے پچھڑ رہی ہے اور نتیجتاً سماجی اور اقتصادی طور پر بھی پسماندہ ہے ــــ اتنا ہی نہیں ان میں ایسے اقدامات کا فقدان ہے جو اس بڑھتی ہوئی ابتری کو روک سکیں۔ اگر یہ ابتری، پالیسی اور حالات جو اس کے ذمہ دار ہیں، نظر انداز کر دیے جائیں تو مسلمان الگ تھلگ ہو جائیں گے اور اپنے کو غیر محفوظ سمجھیں گے۔ اس سے خلفشار پیدا ہوگا اور ملک کی ترقی اثر انداز ہوگی۔ یہ حالت نہ صرف سنجیدگی سے قابل غور ہے بلکہ مہیب شکل اختیار کر چکی ہے اور ایک بہت بڑی ملک گیر کوشش اب وقت کی ضرورت ہے۔ ملک مسلمانوں کو ان کی قسمت پر چھوڑنے یا اُن کی پسماندگی کا الزام اپنے سر لینے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ایک ملک جس کا دستور یہ ضمانت دیتا ہو کہ ہر شہری کو برابر و یکساں حقوق حاصل ہوں گے اور جس نے ارتقاء میں سماجی انصاف کا عہد لیا ہو، وہ یہ نہیں دیکھ سکتا کہ آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ ترقی کے فوائد سے محروم رہے۔

یہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستانی مسلمان ملک کی ترقی میں اپنی آبادی کے تناسب سے حصہ نہیں لے پا رہے ہیں۔ اگر گراوٹ کے اس عمل کو روکا نہیں جاتا تو وہ ملک کی ترقی پر اثر انداز ہوگا اور اس طرح ایک اثاثہ بھاری بوجھ بن کر رہ جائے گا۔ تعلیم سماجی تغیر کا ایک موثر ذریعہ ہے

اس لیے مسلمانوں کو اوپر اٹھانے میں اسے استعمال کرنا چاہیے۔ اور اس راہ سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی مدد قومی ترقی کی رفتار تیز تر کرنے میں حاصل کرنی چاہیے۔ یہ واقعی افسوس ناک بات ہے کہ کہ ایک اتنا سیدھا معاملہ قابلِ توجہ نہ ہوا اور ملک کے منصوبے بنانے والوں کے دائرہ فکر سے باہر رہ گیا۔ بے حسی، دخل اندازی اور غیر محفوظیت جو مسلمانوں کو الگ تھلگ کر رہی ہے بغیر کسی رکاوٹ کے جاری ہے۔ مسلمانوں کو جہالت اور مایوسی کو چھوڑنا ہوگا۔ اگلے چودہ سال ملک کے لیے نہایت اہم ہیں اور خاص کر مسلمانوں کے لیے اُن کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ان کو قومی ترقی کے بیچ دھار میں لانے کے لیے ایک ملک گیر کوشش کی ضرورت ہے اور اگر وہ پیچھے رہتے ہیں تو ملک آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہ کوئی باریک بات نہیں جو سمجھ میں نہ آئے۔

حسب ذیل صفحات میں یہ تجویز ہے کہ؛

ا۔ مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر غور و خوض کیا جائے۔

ب۔ زیر عنوان موضوع پر حالیہ مباحثے کا خلاصہ شایع کیا جائے۔

پ۔ ضروری سفارشات تیار کی جائیں۔

ت۔ کارکردگی کو مانیٹر کرنے کا انتظام کیا جائے اور مسلمانوں کو پروگرام نافذ کرنے والے اداروں میں شامل کیا جائے۔

هندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی حالت

ا۔ دستاویز تعلیم کی چنوتی میں سب سے بڑی اقلیت کی تعلیمی پسماندگی کا نہ تو خاطر خواہ ذکر ہے اور نہ کسی اصلاحی کوشش کا۔ یہ فروگذاشت انتہائی تشویش کا باعث ہے اور پالیسی پیپر کو داغدار کرتی ہے۔

۱-۱ ماسوا مندرجہ فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے ملک میں تعلیمی اعتبار سے مسلمان سب سے پسماندہ لوگ ہیں۔ سب سے بُرا یہ ہے کہ وہ پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ ان کی سماجی اور اقتصادی بدحالی کی وجہ بھی صرف تعلیمی پسماندگی ہے۔

۱-۲ زیادہ تر مسلمان کاریگر، چھوٹی پونجی کے تاجر، چھوٹے کسان اور مزدور ہیں۔ انھیں معاشی مجبوری کی وجہ سے اپنے بچّوں کو کم عمری ہی سے محنت و مشقت کے کام پر لگانا پڑتا ہے اور تعلیم دلانے پر ان کی کمائی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

۱-۳ اقتصادی وجوہات سے پیدا ہوئی تعلیم سے بیگانگی اس خوف سے اور بڑھ جاتی ہے کہ اسکول کے نصاب میں قابل اعتراض عناصر بدقسمتی سے کسی نہ کسی طرح داخل ہوتے رہتے ہیں جو ان کے بچّوں کے ایمان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ نئی جگہوں پر اسکول کھولنے کے وقت مسلمانوں کی آبادیوں کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

۱-۴ وہ اسکول جو ہندوستانی مسلمانوں نے قایم کیے، عموماً برسوں تعلیم شدگی سے محروم رہتے ہیں۔ "اقلیتی ادارہ" تسلیم کرنے کی درخواستیں کسی نہ کسی بہانے سے یا تو پڑی رہتی ہیں یا مسترد کر دی جاتی ہیں۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ نامنظوری کی ایک وجہ انتظامیہ کمیٹی میں کسی غیر مسلم کی شمولیت بھی بتائی جاتی ہے۔ لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ مسلمانوں کے زیر انتظام اداروں سے غیر مسلموں کا ارتباط حوصلہ افزائی چاہتا ہے۔ کیوں کہ یہ قومی یک جہتی کی طرف ایک قدم ہے۔ اس کے بجائے یہ نامنظوری کی وجہ بتائی جاتی ہے۔ افسران کے اس کوتاہ خیالی اور تنگ نظری کے رویے نے جو انھوں نے اقلیتی کردار سے متعلق درخواستوں کے سلسلے میں اپنا رکھا ہے، قومی یک جہتی اور قومی ایکتا کی تحریک کو بے حد نقصان پہنچایا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مسلمان تنگ آکر قومی دھارے سے پھر الگ ہو جائیں۔

۱-۵ فرقہ وارانہ فسادات اور اس کی وجہ سے پیدا ہوئے غیر محفوظیت کے احساس نے مسلمانوں کو گھنی آبادی والے علاقوں میں جمع ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس نے مسلمانوں اور دوسرے فرقوں کے درمیان ایک قدرتی روک کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بستیوں کو گندی تاریک گلیوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جہاں تعلیم کی ضرورت

کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا ہے ۔ انھوں نے عام طور پر باہر نکل کر پھیلنا نامنظور کر دیا ہے۔ اس وجہ سے منصوبہ بند ترقی کے اس دور میں وہ مکانوں کی ان سہولتوں کو نہیں حاصل کر سکتے جو ہر شہر سے باہر اس کے گرد میسر ہیں ۔ جہاں انھوں نے ہمت اور دور اندیشی دکھائی وہاں انھیں دلی تکلیف پہنچانے والی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔

۱-۶ محرکات کو روکنے والا ایک عنصر اور ہے اور وہ ہے مسلمانوں کا تجربات پر مبنی قیاس کہ ان کے بچوں کی ملازمت پانے کے مواقع بہت معدوم ہیں ۔ اس لیے تعلیم پر وقت کیوں برباد کیا جائے ؟ اس سے بہتر یہ ہوگا کہ وہ وقت کچھ کمانے پر صرف کیا جائے ۔ نچلے درمیانی طبقے اور نچلے طبقے کے والدین یہ سوالات اپنے آپ سے کرتے ہیں اور ایسا جواب پاتے ہیں جو ان کے بچوں کے لیے تعلیم کے دروازے خود بخود بند کر دیتے ہیں۔

۱-۷ ابتدا میں تعلیم کی کمی اور بعدہٗ معاشرے میں قبولیت نیز مقابلہ جاتی جذبات کے فقدان نے مسلمانوں کو ملکی انتظام اور ترقی میں شمولیت سے محروم کر دیا ہے ۔ یہ برگشتگی نہ تو خود ان کے حق میں ہے اور نہ ہی ملک کے لیے مفید ہے ۔ عام آدمی پولیس کو ہی سرکار سمجھتا ہے اور پولیس میں مسلمانوں کی نہیں کے برابر نمائندگی ان میں احساس برگشتگی بڑھانے میں معاون ہوتی ہے ۔

۱-۸ یقیناً مسلمان نہایت آزردہ ہیں اندر ہی اندر سلگتے رہتے ہیں ، غصہ اور ہیجان میں مبتلا ہیں ۔ ان کے جذبات کو بری طرح اذیت پہنچتی ہے ۔ ان افسردہ کن حالات میں زندگی سے جاؤ رکھنے ، خود کو بہتر بنانے تو زریعہ معاش میں اضافہ کرنے اور پورے جوش سے ملکی ترقی میں شریک ہونے کے لیے انھیں کوئی جواز نظر نہیں آتا ہے

۱-۹ سہ لسانی ضابطہ کا تمایل پر مبنی نفاذ مسلمانوں کی تعلیم کے مقصد کو مندرجہ بالا وجوہات سے بھی زیادہ نقصان پہنچا رہا ہے ۔ ہندی بولنے والی زبان کی پٹی میں ہندی اور انگریزی کے علاوہ اردو کو بھی ضرور شامل کرنا چاہیے تھا ۔ اس فروگذاشت نے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے اور ان کے لیے لامتناہی اذیت کا سبب بھی بنی ہے ۔ ان جگہوں پر بھی جہاں اردو کو قدرے تسلیم کیا گیا ہے ، ایسا لگتا ہے جیسے جو بھی دائیں ہاتھ سے دیا گیا ، اسے بائیں ہاتھ سے لے لیا گیا ، یا تو کتابیں میسر نہیں ہوتیں یا اساتذہ نہیں ہوتے ۔ یا پھر کم از کم بچوں کی تعداد کو اس طرح منہا کیا جاتے ہیں جس سے کارکردگی کی رفتار سست ہو جاتی ہے ۔ اردو کے ساتھ یہ برتاؤ مسلمانوں کے غم و غصہ اور اذیت کا باعث بن رہا ہے ۔ تعلیم میں رکاوٹ کی یہ سب سے بڑی واحد وجہ ہے اور ان میں یہ احساس پیدا کر رہی ہے کہ ان کے ساتھ سنگین ناانصافی کی جا رہی ہے ۔

۱-۱۰ مسلمانوں میں تعلیم نسواں کی حالت بہت ابتر ہے ۔ اس کی وجہ کچھ تو رسم پردہ ہے اور کچھ خصوص انتظامات کی کمی جس سے یہ حالت بہتر کی جا سکے ۔

۱-۱۱ ان مجموعی وجوہات کی بنا پر ہندوستانی مسلمان ملک کی ترقی میں اپنے آبادی کے تناسب سے حصہ نہیں لے رہے ہیں ۔

۱-۱۲ ان کو آگے بڑھانے کے لیے اگر مخصوص اقدامات نہیں کیے جاتے تو وہ شرح ناخواندگی بڑھائیں گے ۔ ترقی کو تنزل کی طرف لے جائیں گے ۔ سب سے برا یہ ہے کہ جاہلیت کو مایوسی سے ہوا دی جاتی ہے ۔ قومی مفاد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ ایسے مخصوص اقدامات کیے جائیں جس سے مسلمانوں کو تعلیمی پسماندگی کے اوپر اٹھایا جا سکے ۔

۱-۱۳ یہ ماننا پڑے گا کہ ماضی میں ایسے بہت سے بیانات دیے گئے

جن میں پسماندہ اقلیتوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کہا گیا تھا۔ شریمتی اندرا گاندھی کے ۱۵ نکاتی پروگرام میں تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے اقدامات شامل تھے ان ہدایات کو بعد میں شری راجیو گاندھی نے بھی دہرایا لیکن بہت سی دفعات پر عمل درآمد سے زیادہ بے توجہی برتی گئی۔

۱-۱۴ قومی مفاد کا تقاضہ ہے کہ کسی بھی فرقہ یا گروپ کو پیچھے نہ چھوڑا جائے۔ ترقی کا سب سے قابل بھروسہ ذریعہ تعلیم ہے۔ لوگوں کو سوچنا چاہیے تھا کہ تعلیم کے فرقہ بہ فرقہ اعداد و شمار میسر ہوں۔ قومی مردم شماری کی دستاویزات میں خواندگی کے اعداد و شمار ۱۹۴۱ء تک شائع ہوئے۔ تعجب ہے کہ آزادی کے بعد رجسٹرار جنرل نے یہ اعداد و شمار شائع کرنے بند کر دیے۔ اس حقیقت کو جان کر یہ فروگذاشت اور بھی تعجب خیز لگتی ہے کہ مردم شماری میں ۱۹۵۱ء، ۱۹۶۱ء، ۱۹۷۱ء اور ۱۹۸۱ء میں یہ اعداد و شمار جمع کیے گئے تھے اور پھر انھیں کبوتروں کی مانند خانوں میں بند کر دیا گیا۔

۲۔ زیر عنوان موضوع پر حالیہ مباحثہ

تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اقلیتوں کے تعلیمی مسایل پر قومی اقلیتی کمیشن کو غور کرنا تھا۔ کمیشن ابھی تک کچھ نہ کر سکا۔ یہ جزوی طور پر اختیارات اور مصمم ارادے کے فقدان، نیز وسائل کی کمی کی وجہ سے ہوا۔ تفصیلی جائزے (مثلاً خواندگی سے متعلق شرح داخلہ و تعلیم چھوڑنے کی شرح، مختلف طبقوں کا جدید تعلیم کی طرف رجحان وغیرہ کے لیے) بالکل سرمایہ میسر نہیں ہے۔ آبادی کے تناسب کے لحاظ سے تعلیمی اداروں میں ان کے داخلے کی شرح سب سے کم ہے۔ پیشہ ورانہ اور تربیتی کورسز میں شرح نمائندگی کم سے کم ہے۔ انھوں نے عام طور پر سائنس، ریاضی اور ٹیکنیکل مضامین نہیں لیے۔ بہت سی وجوہات کی بنا پر (مع مقامی زور آزمائی اور مقابلہ جاتی جذبات کے فقدان کے) ان کو بہتر تعلیم گاہوں میں داخلہ نہیں مل پاتا۔

۲-۱ مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر گذشتہ سال کمیشن نے ایک سیمینار منعقد کیا تھا جس میں لوگوں نے کافی تعداد میں شرکت کی تھی۔ ان کے تین ورکنگ گروپس بنائے گئے جن کی صدارت جناب رئیس احمد صاحب وائس چیرمین یو۔جی۔سی، ڈاکٹر ستیہ بھوشن، ڈائرکٹر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ ایڈمنسٹریشن اور بیگم حمیدہ حبیب اللہ نے کی تھی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان ورکنگ گروپس کی سفارشات پر سرکار نے توجہ کی یا نہیں؟

۲-۲ مختلف انجمنوں نے ملک کے کچھ حصوں میں نئی تعلیمی پالیسی (دستاویز تعلیم کی چنوتی میں شامل) پر بہت سے سیمینار منعقد کیے جن میں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں قبل الآخر سیمینار الہ آباد یونیورسٹی نے منعقد کیا تھا۔ اسی موضوع اور وسیع بنیادوں پر مبنی ایک سیمینار اس ماہ کے شروع میں جے پور میں بھی ہوا اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس سیمینار کا انعقاد جنوب کی الامین سوسائٹی نے اور شمال کی خواجہ غریب نواز سوسائٹی نے کیا تھا۔ بہت سے مرکزی و ریاستی وزراء کی موجودگی نے اس کی اہمیت کو اور بڑھایا۔ کانگریس پارٹی سے شرکا میں شری ارجن سنگھ اور بیگم نجمہ ہبت اللہ تھیں۔

۲-۳ اپنی گنگا جمنی تہذیب کے استحکام اور قومی یک جہتی پر تعلیم کی افادیت پر تفصیلی سفارشات کی عدم موجودگی ایک دوسری فروگذاشت ہے جو ان حالیہ مباحثوں میں زیر غور نہ آئی۔

۲-۴ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا سیمینار کی واضح اور تعمیری سفارشات مقررہ شدہ ذرایع سے صاحب اختیار حاکموں کے پاس بھیجی نہ جا سکیں۔ سیمینار کی اہم سفارشات حسب ذیل ہیں:-

(۱) مسائل فوری کاروائی چاہتے ہیں کیوں کہ تعلیمی پالیسی جلد ہی مکمل ہونے والی ہے۔

(۲) یہ بھی ضروری ہے کہ اقلیت کو عمل درآمد میں نمائندگی دی جائے۔ اس سے نفاذ کی رفتار پر خاصہ فرق آئے گا۔

۳۔ سفارشات

فعال وزیراعظم کی معقول پسندی، منصف مزاجی اور سرکاری پالیسی پر ان کی عمل درآمد کرالینے کی صلاحیت پر پورا بھروسہ رکھتے ہوئے نئی تعلیمی پالیسی سے متعلق حسب ذیل تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں اور مختلف لوگوں میں تعلیم کے ناہموار پھیلاؤ کو نئی تعلیمی پالیسی کے ذریعہ ٹھیک کرنا چاہیے

۳-۱ عام طور پر اقلیتوں کے لیے اور خاص طور پر مسلمانوں کے لیے، جو کہ نہایت پسماندہ ہیں، مخصوص اقدامات کی ضرورت ہے۔

۳-۲ ساتویں منصوبے میں نئے اسکولوں کے لیے مسلم آبادی والے علاقوں کو اوّلیت ملنی چاہیے۔ اس طرح سے اس نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے جو اسکولوں کے لیے مقامات چننے کے سلسلے میں پہلے کیے گئے فیصلوں کی وجہ سے ہو چکا ہے۔

۳-۳ ہندوستانی مسلم عورتوں میں قلیل خواندگی وبائی صورت اختیار کیے ہوئے ہے۔ ایک یا دو نسلوں کے عبوری وقفہ میں جب تک رسم پردہ میں استراحت نہیں آتی، سرکار کو چاہیے کہ وہ مسلم آبادیوں اور ان کے نواح میں لڑکیوں کے کے اسکول مع ہوسٹل کے کھولے۔ لڑکیوں کی تعلیم کو پالیسی دستاویز میں رکھا گیا ہے۔ مردوں اور عورتوں کے درمیان ناخواندگی کے شگاف کو پاٹنے کے لیے مخصوص پروگرام بنانے چاہیں۔ اس ضمن میں مسلمان عورتیں، جو انتہائی پسماندہ ہیں، زیادہ توجہ کی مستحق ہیں۔

۳-۴ پالیسی پیپر میں بظاہر لاعلاج مرض یعنی تعلیم چھوڑنے کی بڑھتی ہوئی شرح کے مسئلے کا بھی حوالہ ہے۔ تعلیم چھوڑنے کی شرح میں فی زمانہ سب سے بڑا حصہ مسلمانوں کا ہے ایسا کچھ تو غریبی کی وجہ سے اور کچھ بے حسی کی وجہ سے ہے۔ دو اقدامات کی یہاں ضرورت ہے۔

(ا) کمزور طبقوں کو مالی امداد مہیا کی جائے اور امداد فیس، کتب، یونیفارم اور دوپہر کے کھانے تک محدود نہ ہو بلکہ معاوضے کی شکل میں بھی ہو۔ جو ان کے روزی چھوٹنے کے نقصان کی تلافی کر سکے۔

(ب) ان تعلیمی اور سماجی اداروں کی جو پسماندہ اور مظلوم لوگوں کی مدد کر رہے ہیں، مالی اعانت کی جائے۔

۳-۵ نصابی کتابوں میں خصوصاً تاریخ اور دیگر سماجی سائنسز میں اقلیتوں کے جذبات کو مجروح کرنے والا مواد شامل نہ ہو، اس کے لیے سخت نگرانی یا مانیٹرنگ کی ضرورت ہے۔

۳-۶ تعلیمی اداروں کے اقلیتی کردار کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں مرکزی سرکار کے محکمہ تعلیمات و تہذیب و تمدن کو واضح اور مفصل معیارِ عمل تشکیل دینا چاہیے۔ اس بات کی ہدایت جاری کی جائے کہ تسلیم شدگی کے لیے موصول درخواستوں پر ہمدردی اور تیزی سے کاروائی کی جائے۔

۳-۷ ملک کی اقلیتوں اور خصوصاً سب سے بڑی اقلیت کی نمائندگی بورڈ آف ایجوکیشن اور ان کمیٹیوں میں ہو جو نصابی کتابوں اور تسلیم شدگی کے معاملات پر غور کرتی ہیں، تاکہ ان میں اعتماد پیدا کیا جا سکے، انحراف کو روکا جا سکے اور افسران کو شرمندگی سے بچایا جا سکے۔

۳-۸ ابتدائی اسکول کی سطح یعنی درجہ پانچ تک تعلیم بہر صورت

مادری زبان میں دی جائے اور ان علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، تعلیم کا انتظام ان کی مادری زبان اردو میں کیا جائے۔ اردو رسم الخط میں لکھی ہوئی کتابیں مہیا کی جائیں۔ علاقائی زبانیں ایک لازمی مضمون کی شکل میں درجہ سوم سے شروع کی جائیں۔ اور درمیانی زبان درجہ ششم اور اس کے اوپر کے درجوں میں پڑھائی جائیں۔

۴-۹ مسلم اقلیت کی باضابطہ تعلیم کے لیے سائنسی طریقوں پر مبنی جائزے لیے جائیں تاکہ ضروری اعداد و شمار جمع کرنے کی بنیاد پڑ سکے۔

۴-۱۰ ابتدائی تعلیم کے لیے 'مدرسۂ نظام' کی کارشوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور مالی اعانت فراہم کی جائے۔ مدارس کے نصاب میں ضروری تبدیلیاں کی جائیں اور اوقات اس طرح سے متعین کیے جائیں کہ مدارس میں پڑھنے والے بچوں کا عام اسکولوں میں بھی داخلہ ہو سکے اور پڑھائی کے اوقات میں کوئی دشواری نہ ہو۔

۴-۱۱ مقامی دست کاری/حرفت کے پیشوں میں ابتدائی اسکول کی سطح پر تربیت شروع کرنی چاہیے اور اس پر اسکول کا تقریباً ۱۵ فیصد وقت صرف کیا جائے تاکہ معاشرہ نصاب کے مفید ہونے کا اعتراف کر سکے۔

۴-۱۲ موجودہ منصوبہ بندی کے طریق عمل میں مسلمانوں و دیگر تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اور غیر واضح کردہ آئینی مائنارٹیز کے لیے مخصوص دفعات کے اضافے کی ضرورت ہے۔ قومی اور صوبائی سطحوں پر متحد کرنے والی انجمنوں کو قایم کیا جائے تاکہ مسلمانوں کے زیر انتظام اداروں کی کارکردگی کی زیادہ سے زیادہ نگرانی کی جا سکے۔ اور اس بات کا اطمینان کر لیا جائے کہ ان میں بنیادی تعمیری سہولتیں میسر ہوں۔ ان میں تعلیمی معیار برقرار رکھا جا سکے اور اساتذہ کے حقوق کا تحفظ کیا جا سکے۔

۴-۱۳ سرکاری امداد کی رقومات میں معقول اضافہ کیا جائے تاکہ مسلمانوں کے زیر انتظام اداروں کو بنیادی تعمیری سہولتیں فراہم کی جا سکیں اور انھیں سرکاری اسکولوں کے برابر لایا جا سکے۔

۴-۱۴ تعلیمی اعتبار سے پسماندہ منتخب اضلاع میں ماڈل اسکول اس طور پر کھولے جائیں کہ مسلم بچوں کو داخلے کے معاملات میں سہولتیں حاصل ہوں۔ داخلوں میں رہائش و معاش کو ہی معیار مقرر کیا جائے۔

۴-۱۵ آئی۔ٹی۔آئیز ان مقامات پر کھولے جائیں جہاں کاریگروں اور اہل حرفہ کی بود و باش ہو اور کم از کم ۸۰ فیصد جگہیں ایسے لوگوں کے بچوں کے لیے متعین کی جائیں۔ تربیت کے لیے دستکاری کے پیشوں کو ہوشیاری سے چنا جائے تاکہ تربیت یافتہ لوگوں اور مقامی اسکیموں میں تال میل پیدا کیا جا سکے۔ کاروباری سرمایہ، مشتری اور بازار میں فروغ کی سہولیت ان لوگوں کو مہیا کرائی جائیں جو خود بیکار ہیں۔

۴-۱۶ اُن مسلمان بچوں کے لیے جو پسماندہ اور بدحال طبقے سے آتے ہیں، اصلاحی / تلافی کن تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

۴-۱۷ ہر صوبائی سرکار میں ایک محکمہ اقلیتوں کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے کھولا جائے۔ دیگر مسائل کو حل کرنے کے علاوہ یہ محکمہ یہ بھی دیکھے کہ تعلیمی اداروں میں مسلمان بچوں کی تعداد بڑھے، وہ درمیان میں تعلیم نہ چھوڑیں اور انھیں اپنے اپنے پیشوں سے متعلق رہنمائی فراہم ہو۔ یہ محکمہ تعلیمی اداروں کے اقلیتی کردار کو تسلیم کرانے اور سرکاری امداد کے حصول میں مدد کرے اور خاص طور پر اقلیتوں کی فلاح و بہبود کی اسکیموں کی تکمیل کی دیکھ بھال کرے۔

۳-۱۸ پسماندہ چالیس اضلاع کے ہر ایک منتخب شدہ بلاک میں سرکار کو کم از کم ایک تعلیم گاہ نسواں (درجہ ۱ سے ۱۲ تک) مع خواتین معلمات و ہوسٹل کی سہولتوں کے قایم کرنا چاہیے۔

۳-۱۹ تعلیمی اعتبار سے پسماندہ چالیس اضلاع میں سے ہر ایک میں سرکار کو پولیٹکنک اور پروڈکشن سینٹر کھولنا چاہیے اور ان میں لڑکیوں کے لیے مخصوص حرفتوں کی تعلیم دی جائے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے ان میں خواتین اتالیق مقرر کی جائیں۔ تربیت کا نصاب ایسا ہو جس میں خواتین کا خاص رجحان ہو۔ جیسے لباس بنانا، معتمدی کی مشق، الیکٹرونک سامان کا بنانا اور ان کی مرمت، دفاتر میں پیشوائی و پذیرائی اور سیاحت میں رہبری کے فرائض وغیرہ۔

۳-۲۰ مالی امداد کے قوانین میں ترمیمات کی جائیں۔ تاکہ اقلیتی اداروں کو پہلے سال سے ہی امداد اور مالی اعانت ملنی شروع ہو جائے۔

۳-۲۱ نہ صرف ۱۹۹۱ء میں ہونے والی مردم شماری بلکہ پچھلی چار دہائیوں کی مردم شماری کے خواندگی کے فرقہ بہ فرقہ اعداد و شمار شایع کیے جائیں۔

۳-۲۲ مشہور تعلیمی اداروں کو کافی مالی امداد فراہم کی جائے تاکہ وہ پسماندہ اقلیتی فرقے کے ذہین اور ضرورت مند طلبار کو مدد دے سکیں۔

۳-۲۳ مندرجہ بالا سفارشات دستور ہند کی دفعات نیز منصوبہ بند پالیسی کے اصولوں مثلاً منصفانہ ترقی اور تعلیمی پالیسی جو "تعلیم کی چنوتی" میں تشکیل دی گئی ہے کے عین مطابق ہیں۔ دفعہ ۲۹ میں حسب ذیل درج ہے:

(۱) "ہر فرقہ کو جو ہندوستانی سرزمین پر رہتا ہے، اپنی مخصوص امتیازی زبان رسم الخط یا تہذیب کو برقرار رکھنے کا حق حاصل ہوگا۔

(۲) دفعہ ۳۰ اقلیتوں کو تعلیمی ادارے کھولنے اور ان کا نظم و نسق چلانے کے حق کا تحفظ کرتی ہے۔

دفعہ ۳۵۰ کی رو سے ابتدائی سطح پر ذریعہ تعلیم مادری زبان میں ہونا چاہیے اور اس کے لیے سہولتیں مہیا کی جانی چاہیں۔

(۳) دستاویز تعلیم کی چنوتی میں لکھا ہے کہ مختلف جغرافیائی علاقوں کے لوگوں کے تعلیمی معیار میں نمایاں فرق نہیں رکھا جائے گا۔ آگے ایک نوٹ کے ذریعے حسب ذیل خطرے سے بھی آگاہ کیا گیا ہے۔

اگر تعلیم کو پھیلانے کے لیے مناسب اور کافی اقدامات نہیں اٹھائے گئے تو اقتصادی غیر استطاعت، علاقائی غیر یکسانیت اور سماجی غیر منصفی کا انکشاف اور بڑا ہوگا اور اس سے یک جہتی کو ختم کرنے والے عناصر کو بڑھاوا ملے گا۔

ایک اور جگہ پر یہ لکھا گیا ہے کہ غریب ناخواندہ خاندانوں کی لڑکیوں اور بچوں کے لیے مخصوص اصلاحی پروگراموں کی ضرورت ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ تفرقہ ڈالنے والی قوتوں کو ختم کرنے کے لیے ماحول میں تحمل اور امداد باہمی کے جذبات پیدا کرنے اور نادار پسماندہ لوگوں کے لیے اصلاحی پروگراموں کو فروغ دینے کی اشد ضرورت ہے۔

دراصل تعلیم حاصل کرنے کا مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب وہ سب ہی لوگ جو اسکولوں میں داخل ہوتے ہیں یکساں طور پر تعلیم جاری رکھ سکیں۔

راقم السطور نے دستور اور تعلیمی منصوبہ بندی کی پالیسیز سے مختلف دفعات خصوصاً پسماندہ مسلم فرقہ سے متعلق اور مناسب حلے واضح طور پر بیان کیے ہیں۔ ملت بکھر رہی ہے اور ملک کو مزید دیر ہونے سے پہلے ہی اس مسئلے کو گرفت میں لے لینا چاہیے۔ سرکار کو ایسے ٹھوس اقدامات کرنے چاہئیں جس سے ملک کی سب سے بڑی اقلیت کی بدحالی کو روکا جا سکے اور اسے قومی تعلیمی ترقی کی بیچ دھار میں لایا جا سکے۔

۴ نفاذ اور نگرانی

ماضی میں بہت سے اعلانات اور پالیسیاں نفاذ میں بے توجہی کا شکار ہو گئیں۔ اس وجہ سے عام طور پر اور اقلیتوں کا خصوصاً ان وعدوں اور پالیسیوں پر سے یقین اٹھ گیا ہے۔ موجودہ وزیر اعظم کے زمانے میں ترقی اور اصلاحی کوششوں کو بار آور کرانے پر خلوص سے زور دیا جا رہا ہے۔ ترقی کی رفتار بڑھائی جا رہی ہے۔ اس سے امیدیں بڑھی ہیں کہ مسلمانوں کو بھی تعلیمی فواید زیادہ سے زیادہ میسر ہوں گے۔ یہ امید کی جاتی ہے کہ پالیسی دستاویز سے ظاہر ہونے والا تجربہ جو اس میں حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، دہرایا نہیں جائے گا:

> "پالیسی قرار دادیں، منصوبے اور بیانات صرف کھوکھلے وعدے ہی رہتے ہیں جب تک ایسے اقدامات نہ اٹھائے جائیں جو ان وعدوں کو پورا کریں"۔

اس لیے پالیسی کی تفصیلات پروگرام اور معیار عمل کی شکل میں ہونی چاہئیں۔ عمل درآمد کرنے والے ادارے اقلیتوں اور پسماندہ طبقوں سے متعلق اصلاحی پروگراموں کے نفاذ میں کچھ زیادہ ہی بے توجہی برتتے ہیں۔ تمام منصوبوں اور پروگراموں پر عام طور سے اور پسماندہ لوگوں کے لیے مفید پروگراموں پر خاص طور سے مستقل نگاہ رکھنا چاہیے اور وقتاً فوقتاً ان کا جائزہ لیتے رہنا نہایت ضروری ہے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مرکزی، صوبائی اور ضلع کی سطح پر ادارے قایم کیے جائیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ متعلقہ اقلیتوں کو ان اداروں میں نمائندگی دی جائے۔ یہ قدم نفاذ کی ماہیت میں خاصہ فرق ڈالے گا۔

حال ہی میں شایع کیا گیا پالیسی پیپر یقیناً دستاویز 'چیلنج آف ایجوکیشن' سے بہتر ہے۔ اس میں اقلیتوں کی تعلیم کے بارے میں ایک عنوان کے تحت ایک پیراگراف دیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے یہ بہت زیادہ غیر مخصوص اور مبہم ہے۔ مندرجہ فہرست ذاتوں، قبیلوں اور معذور لوگوں کے بارے میں مخصوص اقدامات اور لائحۂ عمل کو واضح کیا گیا ہے مگر ایسا اقلیتوں کے بارے میں نہیں کیا گیا۔ ضمیمہ میں دیے گئے اقتباسات کو اقلیتوں سے متعلق پیراگراف سے ملا کر ان کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے ایک لائحۂ عمل بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ پالیسی مکمل ہونے سے پہلے ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ انتظامیہ کی نگرانی (مانیٹرنگ) کا طریقہ اس میں خود بخود مضمر ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے بنائے گئے پروگراموں کے نفاذ اور نگرانی میں ان لوگوں کو بھی شریک کرنا چاہیے جنھیں فایدہ پہنچنے کی امید ہے۔

ضمیمہ

۱-۵ قومی ترقی میں اضافہ، یکساں شہری ہونے اور تہذیب و تمدن رکھنے کا احساس پیدا کرنا اور قومی یک جہتی کو مضبوط بنانا۔

۱-۱۶ لوگوں میں انسانی قدروں اور سماجی انصاف کو سمو لینے کا جذبہ پیدا کرنا۔

۲-۳ قومی تعلیم کا طریق کار سب کے لیے یکساں طور پر مفید ہو اور اعلیٰ انسانی قدروں اور سماجی انصاف پر مبنی ہو۔

۲-۹ .... سرکار کو پروگرام چلانے کے سلسلے میں معقول رقومات منظور کرنا چاہیے تاکہ آبادی کے وہ سبھی طبقے جو تعلیم سے مبرا رہے ہیں، پروگرام میں شامل ہو سکیں۔

۲-۱۴ اس کا مقصد ہے کہ موجودہ نوجوان نسل کے ذہن سے بدظنی اور تعصبات جو ماحول یا پیدائش کی وجہ سے ہوں دور کیا جا سکے۔

۲-۱۹ باہمی اتفاق کا تصور، اشتراک کی ایک قسم ہے جو ایک چنوتی ہے اور امنگ بھی پیدا کرتا ہے۔

۵-۲۔ ان طبقات کی تعلیم پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے جن کی پہلی نسل میں زیادہ تعداد میں ناخواندہ لوگ موجود ہیں۔

۵-۷۔ بنیادی تعلیم میں مشترک اور ایک دوسرے پر منحصر دونوں پہلوؤں پر زیادہ زور دیا جائے گا: سبھی کا داخلہ اور ۱۴ سال کی عمر تک لازمی تعلیم۔

مباحثے میں اُٹھائے گئے پوائنٹس

خواجہ محمد شاہد صاحب جنرل سکریٹری اے۔ ایم۔ یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن (رجسٹرڈ) دہلی نے سیمپوزیم کے اغراض و مقاصد بتاتے ہوئے کہا کہ مباحثہ کن خطوط پر اور کن حدود میں ہونا چاہیے تاکہ بامعنی، قابل عمل اور مفید نتائج نکل سکیں۔ مباحثہ کے دوران شرکار کے اُٹھائے ہوئے حسب ذیل پوائنٹس انھوں نے نوٹ کیے:۔

جناب سید اشتیاق عابدی صاحب چیرمین وائی۔ آئی۔ سی

— تقریر کے ابتدا ہی میں انھوں نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ ایسا سنجیدہ سمینار اس سے قبل نہ ہو سکا

— اقلیتوں کے مسایل پر تعلیمی پالیسی کی روشنی میں بہت سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ کل کے ہندوستان میں اقلیتوں کی مستقبل میں ترقی اور ان کے وقار کیلیے یہ نہایت ضروری ہے۔

— اقلیتوں کے تعلیمی مسائل کو قومی پالیسی کے ڈھانچے میں ہی دیکھنا چاہیے۔

— اس بات کو بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کہیں دستور کی دفعات ۲۹ اور ۳۰ جس کی رو سے اقلیتوں کو تعلیمی ادارے کھولنے اور ان کا نظم ونسق سنبھالنے کے حقوق ملتے ہیں، کہیں بُرے طور پر تو اثر انداز نہیں ہو رہے ہیں۔

جناب سردار علی صاحب وکیل
پریسیڈنٹ وائی۔ آئی۔ سی۔

— شرکاء اور معزز مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ سیمپوزیم نہایت اہم ہے اور عین وقت پر منعقد کیا گیا ہے۔

— انھوں نے امید ظاہر کی کہ ایسے ہی سنجیدہ اور بامقصد سمینار سارے ہندوستان میں ہوں گے اور ان کی سفارشات، ایکشن پلان میں شامل کی جائیں گی۔

جناب عزیز میٹھو صاحب ایم۔ پی
چیرمین مائینارٹیز سیل۔ اے۔ آئی۔ سی۔ سی۔

— انھوں نے سہ لسانی ذریعہ تعلیم کی اہمیت پر زور دیا اور کہا کہ جنوبی ہندوستان میں اس کی اہمیت اور زیادہ ہے۔

— انھوں نے تعلیم ادھوری چھوڑنے کے معاملے کو خصوصاً اقلیتوں کے بچوں میں — خاص اہمیت دی۔

— اقلیتوں کے تعلیمی مسائل پر۔ اور زیادہ آل انڈیا مباحثے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔

جناب بدرالدین طیب جی صاحب
سابق وی۔ سی۔ اے۔ ایم۔ یو

— انھوں نے فرمایا کہ ان سفارشات پر عمل درآمد کیا جائے اور ایسا نہ ہو کہ عدم پیروی کی وجہ سے اور بہت سے دوسرے زیر عنوان سمیناروں کی سفارشات کی طرح ان سفارشات کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلے۔

— اردو ہندی زبان کا مسئلہ ایک بناوٹی پیداوار ہے۔ اردو ایک بڑی زبان ہے اور اس کے بولنے والوں کے جذبات کا احترام کرنا چاہیے۔ سرکار کو ان کے جذبات کی تشفی کرنی چاہیے۔

جناب سبط رضی صاحب۔ وزیر تعلیم یو۔ پی۔

— انھوں نے کہا کہ ایسا سمینار پہلے ہونا چاہیے تھا۔

— موجودہ تعلیمی نظام قومی سطح پر اپنے مقصد کو پانے میں ناکامیاب رہا ہے اور قومی تعلیمی نظام میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

— مجموعی طور پر شرح خواندگی ۳۶ فیصد ہے اور یو۔ پی میں ۲۷ فیصد ہے ایسا شاید اس لیے ہے کہ گزشتہ ۱۹۶۸ء کی تعلیمی پالیسی کا ڈھنگ سے نفاذ نہیں کیا گیا تھا، اس لیے پالیسی پر عمل درآمد کرانے کی ضرورت ہے حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی پالیسی کی کامیابی اس بات پر منحصر ہے کہ کتنے خلوص سے اس کا نفاذ کیا جاتا ہے۔

— یہ ذمہ داری خود مسلم ملت کی ہے کہ وہ اپنے کو تعلیمی اعتبار سے

سے الگ ہے۔ موجودہ حالت سر سید احمد خاں کے زمانے جیسی ہے۔ اگرچہ کہ موجودہ وقت مسلمانوں کے لیے مشکل ہے لیکن ان کے خیال میں مسلمانوں کا مستقبل تاریک نہیں ہے۔ مسلمانوں کو بحیثیت ایک ہندوستانی قوم کے پُرامید ہونا چاہیے۔

— غیر رسمی تعلیم (خصوصاً تعلیم چھوڑنے والوں کے لیے) کی اہمیت پر زور دیا ہے۔

— یو۔پی سرکار ایک "اوپن اسکول" کا انعقاد اوپن یونیورسٹی کے خطوط پر کر رہی ہے۔ ان میں طلبا کی حاضری ہفتہ میں ۲ یا ۳ بار ہی ضروری ہوگی۔ اسکول کے اوقات بھی طلبا کی ضرورت کے لحاظ سے مقرر کیے جا سکتے ہیں۔

— جہاں تک اقلیتی اسکولوں کی سرکاری تسلیم شدگی کا سوال ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اقلیتی اداروں کو بھی اپنی حالت خود سدھارنا چاہیے۔ اسکول کو قایم کرنا ہی صرف کافی نہیں ہے۔ وہاں آپسی جھگڑوں اور بدانتظامی کو بھی دور کرنا چاہیے۔

— اردو کا مسئلہ، مسئلہ تعلیم ہے۔

— انھوں نے مقابلہ جاتی امتحانات میں امیدواروں کی اچھی تیاری پر بھی زور دیا۔

جناب اے ایم خسرو صاحب

سابق وی۔سی، اے۔ایم۔یو۔

— انھوں نے مشورہ دیا کہ سرکار اور ملت دونوں کو ہی مل جل کر مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنا چاہیے۔ لیکن سر دست نئی تعلیمی پالیسی کی روشنی میں سرکار کا رول بہت اہم ہے۔

— انھوں نے گوپال کرشن کے جائزے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کا معیار ہر میدان میں نیچا ہے۔ اس حقیقت پر نئی تعلیمی پالیسی میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔

— "غریبی ہٹانے کے لیے اٹھائے گئے اقدامات میں اقلیتوں کو شامل نہیں کیا گیا۔ سماجی اصلاح اور فلاح و بہبود کے پروگراموں کو فرقہ کے تناسب میں اقلیتی فرقوں تک پہنچانا چاہیے۔

— مسلمانوں کے لیے جگہوں کا تحفظ کیا جائے، یہ درست نہیں ہے لیکن امر یقینی ہے پر ملازمتوں کے لیے خالی جگہوں کے لیے مانیٹرنگ کی جائے۔

— مادری زبان میں ہی تعلیم سب سے بہتر طور پر دی جا سکتی ہے۔ انھوں نے صوبوں میں مقبول زبان سے متعلق اپنے ایک جائزے کا بھی حوالہ دیا۔ نتائج سے یہ ظاہر ہے کہ ۱۷ صوبوں میں سے ۱۵ صوبوں میں ہندی یا تو مقبول ہے یا بولی جاتی ہے۔ دوسری بڑی زبانیں جیسے مراٹھی، بنگالی، گجراتی، انمیں سے ۵ یا ۶ صوبوں میں بولی / سمجھی جاتی ہے۔ اردو، انمیں سے ۱۴ صوبوں میں بولی جاتی ہے اور مقبول ہے۔ اس سے ظاہر ہے اردو صوبوں کی ایک بڑی تعداد میں اور ملک کے ایک بہت بڑے حصے میں بولی جاتی ہے۔ اس لیے اس زبان کے ساتھ انصاف ہونا چاہیے۔ انھوں نے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ اگر تعلیم مادری زبان میں نہیں دی جاتی تو پھر بعد میں کسی دوسرے ذریعۂ تعلیم کو اپنانے میں خاصی دشواری ہوتی ہے اور یہ مشکل اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں اور بڑھ جاتی ہے۔ اس مسئلہ پر بھی نئی تعلیمی پالیسی میں غور کرنا چاہیے۔

— نئی تعلیمی پالیسی میں مندرج کمپیوٹر استعمال کرنے کی تربیت اور حرفتی تعلیم کے اسکول مسلمانوں کی آبادیوں میں بھی کھولے جائیں اور مسلم اسکولوں میں ان مضامین کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

جناب رئیس احمد صاحب

سابق وائس چیرمین۔ یو۔جی۔سی

— انھوں نے فرمایا کہ اقلیتوں کے تعلیمی مسائل کو مجموعی طور پر

تناظری نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ موجودہ تعلیمی نظام ناخواندگی کو ختم کرنے میں ناکامیاب رہا ہے۔ سب ہی علاقوں میں مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کیے جا سکے۔ اگر نئی تعلیمی پالیسی کو پورے طور سے نافذ کیا جاتا ہے تو وہ مسلمانوں کی حالت کو بھی بہتر بنائے گی۔ ان کا خیال تھا کہ نئی تعلیمی پالیسی میں وہ تمام باتیں شامل کی گئی ہیں جن کا ذکر سید حامد صاحب کے مقالے میں تھا۔ اس لیے دراصل ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی تعلیمی پالیسی پر پوری طرح صدق دل سے عمل درآمد کیا جائے۔

— یہ کمیونٹی کی ذمہ داری ہے کہ وہ دیکھے کہ پالیسی کے فوائد اس تک پہنچیں۔ خود کمیونٹی کی طرف سے مثبت کارروائی کی ضرورت ہے۔

— کمیونٹی کو بھی اپنے تقدمات طے کرنے ہوں گے۔ سب سے زیادہ افضلیت تعلیم کو ہی ملنی چاہیے۔

— رضاکارانہ ادارے نئی تعلیمی پالیسی کے فوائد مسلم ملت تک لے جانے میں ایک اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔

— ملازمتوں میں مناسب نمائندگی کے لیے جگہوں کا تحفظ نہ کیا جائے۔ "امریکہ کی" پالیسی آن افرمیٹو ایکشن" کی طرح ایک پالیسی ہندوستان میں بھی اپنائی جائے۔ اس پالیسی کے تحت ہر ادارہ کو ایک رپورٹ دینی ہوتی ہے، جس میں یہ بتانا ہوتا ہے کہ ایک معینہ مدت میں کتنے سیاہ فاموں کو جگہیں دی گئیں اور اس بات کی وقتاً فوقتاً جواب دہی کرنی ہوتی ہے کہ مقررہ تناسب کیوں نہ برقرار رکھا جا سکا۔

جناب سید ہاشم علی صاحب

وی۔سی، اے ایم یو

— انھوں نے فرمایا کہ مقررین نے یا تو کمیونٹی کی یا سرکاری کاوشوں کی ضرورت پر زور دیا ہے، لیکن درحقیقت ایک متحدہ کوشش کی ضرورت ہے۔

— وزیر اعظم کی نئی تعلیمی پالیسی پر کی گئی تقریر کا انھوں نے خیر مقدم کیا

— قدیم تہذیب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ نئی نسل کو مسلمانوں کا تہذیبی ارتقاء میں حصہ یا قرون وسطیٰ میں کی گئی ان کی کاوشوں کو بھی بتانا چاہیے۔ انھوں نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ قدیم تہذیب کی تعلیم پر جو زور ڈالا جا رہا ہے کہیں وہ پچھلے ایک ہزار سال کی تاریخ میں کیے گئے مثبت کاموں کو، جو گنگا جمنی تہذیب کے ارتقاء اور اصل ہندوستانی اساس ہے، مسخ کرنے کا باعث نہ بن جائے۔ اسی ملی جلی تہذیب کے تحفظ کی ضرورت ہے، جو جدید جمہوری اور سیکولر ہندوستان کی بنیادوں کو مضبوط بنائے رکھ سکتا ہے۔

— غریبی کی دوبارہ تشریح کی ضرورت ہے۔ غریبی کو سیکولر بنایا جائے۔ پسماندگی دور کرنے کے لیے اٹھائے گئے بہت سے اقتصادی اقدامات کے فوائد کو اقلیتوں تک لے جانے کی ضرورت پر بھی انھوں نے زور دیا۔

— انھوں نے خبردار کیا کہ انتظامیہ میں دونوں فرقوں کے لوگ فرقہ وارانہ تمایل کا شکار ہیں۔ انھوں نے مثالیں دے کر بتایا کہ کوئی بھی اچھی پالیسی ایسے لوگ ناکام بنا سکتے ہیں۔ اس لیے عمل درآمدی اداروں میں اقلیتی فرقہ اور پسماندہ لوگوں کو شامل کیا جائے جس سے ایماندارانہ عمل درآمد اور ہر ایک کے مفاد کا تحفظ کیا جا سکے۔

— انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ملازمتوں میں حصہ آبادی کے تناسب سے ملنا چاہیے۔

— انھوں نے اس بات کا بھی مشورہ دیا کہ ہر پانچ سال بعد نتائج کا جائزہ لیا جائے۔

— سہ لسانی ذریعہ تعلیم کے اصول کو صدق دل سے اپنانے کی ضرورت ہے۔ مادری زبان کو ہی ذریعہ تعلیم بنانا چاہیے۔ اردو، ہندی زبان کے استعمال کے بارے

میں انھوں نے کہا کہ ٹی۔وی اور ریڈیو کے کارکن ایسی زبان کا استعمال کرتے ہیں جو عام طور پر سمجھی نہیں جاتی۔ انھوں نے ایک ملی جلی عام فہم زبان کو اپنانے کا مشورہ دیا۔ ان کے خیال میں اردو عام بول چال میں استعمال کی جانے والی ہندی ہے۔ وہ ہندی نہیں ہے جو دفتری مراسلات میں اور ٹی۔وی یا آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی جانے والی خبروں میں استعمال کی جاتی ہے۔

— انھوں نے فرمایا کہ ایک جائزے کے مطابق جنوبی ہند میں بولی جانے والی زبانوں میں ہزاروں اردو اور فارسی کے الفاظ مستعمل ہیں۔ انھوں نے افسوس ظاہر کیا کہ جنوبی صوبوں مثلاً آندھرا پردیش میں سہ لسانی ضابطے میں اردو کو شامل نہیں کیا گیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ سہ لسانی فارمولا ہندی بولے جانے والے صوبوں مثلاً یو۔پی اور بہار میں زیادہ بہتر طور پر نافذ کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ اردو بولنے والوں کو تنگ نظری کا ثبوت نہیں دینا چاہیئے۔

جناب جے۔ ایس۔ رندھاوا
پرنسپل خالصہ کالج۔ دہلی۔

— انھوں نے اقلیتی اداروں کے انتظامی مسائل پر تفصیل سے اظہار خیال کیا۔ دستور کی دفعات ۲۹ اور ۳۰ کی رو سے اقلیتوں کو اپنے ادارے قایم کرنے اور ان کا نظم و نسق چلانے کا حق ملتا ہے۔ انھوں نے کرناٹک کے ایک اقلیتی ادارے کا ذکر بہت تفصیل سے کیا اور یہ بھی بتایا کہ یہ معاملہ اب سپریم کورٹ کی ایک بنچ کے زیر غور ہے۔ انھوں نے خبردار کیا کہ صورت حال خاصی خطرناک ہے۔ یہ تعبیر بھی دی جا رہی ہے کہ اگر کسی ادارے میں اُس فرقہ کی طلبا کی تعداد زیادہ ہے جس نے اسے قایم نہیں کیا تھا اور اگر ایسا ادارہ ان امتحانات کے لیے طلبا کو تیار کرتا ہے جو سیکولر ادارے مثلاً صوبائی سرکار یا یونیورسٹیاں لیتی ہیں تو ایسا ادارہ اقلیتی اداروں کی تعریف میں نہیں آتا۔ چاہے اسے کسی اقلیت نے ہی کیوں نہ قایم کیا ہو۔

— انھوں نے اس کا مشورہ دیا کہ وزارت تعلیم میں ایک ایسا شعبہ ہونا چاہیئے جو اقلیتی اداروں کے مسائل سلجھائے اور دستور کی دفعات کی روشنی میں قوانین بنائے۔

— انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ اقلیتوں کی تعلیمی حالت کا ایک تفصیلی جائزہ لیا جائے جس میں ضلع کو ایک اکائی مانا جائے۔ کیونکہ ان کے خیال میں ہر ضلع کے اپنے الگ الگ مسائل ہیں۔

— انھوں نے ہندوستان کی سب سے خوبصورت زبان اردو کے لیے کچھ مستحکم اقدامات کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

جناب اے۔ آر۔ شروانی۔ ایجوکیشنسٹ

— اترپردیش سرکار کی اردو اور اقلیتوں کے تعلیمی اداروں کی بابت اپنائی گئی پالیسی کی انھوں نے سخت تنقید کی۔ انھوں نے خبردار کیا کہ یا تو سرکار کو ایسے وعدے نہیں کرنا چاہئیں جس سے اقلیتوں کی امیدیں بڑھیں یا پھر ان وعدوں کو پورا کیا جائے۔ "الیکشن مینی فیسٹو" میں کیے ہوئے وعدے کے مطابق اردو کو یوپی میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینا چاہیے۔

— اگر سرکار اپنی پالیسی کو ایمانداری سے نافذ کرتی ہے تو اقلیتیں کسی مخصوص اعانت کی درخواست نہیں کریں گی۔

— اگر سرکار اپنی پالیسی ، سب کے لیے تعلیم کو پوری طرح لاگو کرتی تو مسلمان بھی خواندہ و تعلیم یافتہ ہو گئے ہوتے۔ اس سے انھیں تعلیمی اور اقتصادی فائدہ ہوتا اور ان کے لیے کسی خاص اعانت کی ضرورت نہ ہوتی۔

— اس وقت یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اقلیتوں کی تعلیم کے بارے میں دیے گئے بہت سے مشورے نئی تعلیمی پالیسی میں شامل ہو جائیں۔

جناب منظور احمد صاحب

او۔ ایس۔ ڈی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ

— ایک تعلیمی پالیسی جس کا مقصد ملک کو یکساں تعلیمی نظام مہیا کرنا ہے بخود اپنے آپ میں ایک بڑا کام ہے اور جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

— اپنے تعلیمی ادارے کھولنے کے لیے اقلیتوں کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے اور ان کی طرف زیادہ کشادہ دلی کا رویّہ اپنانا چاہیے۔

— شہروں میں زیادہ تر مسلمان کاریگر اور مکینک ہیں۔ اس وجہ سے ان علاقوں میں جہاں ان کی آبادی زیادہ ہے، مدارسِ حرفت وفن کھولے جائیں اور ان کی حوصلہ افزائی کی جائے

— مردم شماری کے اعداد مہیّا نہ ہونے کی وجوہات کچھ بھی ہوں، لیکن یہ بات صاف ہے کہ تعلیمی اعتبار سے مسلمان پسماندہ ہیں۔ اس لیے نئے اسکول ان کی ہی آبادیوں میں کھلنے چاہئیں۔

— تعلیم کو ادھورا چھوڑنے اور بچّوں سے کام کروانے کے مسائل کی وجہ سے اس بات کی ضرورت ہے کہ راتکے اسکول یا 'اوپن' اسکول کھولے جائیں۔ موٹر گاڑیوں میں اسکول چلانے کی بھی کوشش کرنی چاہیئے۔

جناب مونس رضا صاحب

وائس چانسلر، دہلی یونیورسٹی۔

— اقلیتوں کے مسائل ملک کے مسایل ہیں اور انھیں الگ الگ کے نہیں دیکھنا چاہیے۔ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ایک ایسا پروگرام مرتب کیا جائے جس کے ذریعہ قومی نظام سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھایا جاسکے۔

— انکے جائزے کے مطابق ۴۰ فیصدی مسلمان نہ تو سب سے غریب ہیں اور نہ ہی وہ سب سے امیروں کے درجے میں آتے ہیں۔

— مسلمانوں کے مسائل صرف شہری مسلمانوں کے مسائل نہیں ہیں۔ کیوں ۹۰ فیصدی مسلمان گاؤں میں رہتے ہیں۔

— بدقسمتی سے شہروں میں رہنے والے مسلمان مسائل کو اس طرح پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ساری ملّت کے مسائل ہیں۔ اس طریقِ کار سے اصل اقتصادی مسائل نظر انداز ہو جاتے ہیں۔

— ان کے خیال میں تعلیمی اور اقتصادی حالات میں تال میل ہونا ضروری نہیں ہے۔ انھوں نے کیرالا اور پنجاب کی مثالیں دیں۔ کیرالہ میں سب سے زیادہ شرح خواندگی ہے لیکن اقتصادی حالات سب سے بہتر نہیں ہیں۔ جب کہ پنجاب میں اقتصادی حالت سب سے بہتر ہے، لیکن شرح خواندگی سب سے زیادہ نہیں ہے۔

— انھوں نے فرمایا کہ صحیح اعداد و شمار جو مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق ہوں، میسر نہیں ہیں۔ اس لیے شکایتوں اور مسائل پر آواز اُٹھانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ حالات کا تفصیلی اور مناسب جائزہ لے لیا جائے ورنہ اصل مسائل چھوٹ جائیں گے۔ پالیسی پر عملدر آمد بہت ضروری ہے۔ اس بابت میں انھوں نے حسبِ ذیل مشورے دیے۔

(۱) جائزہ لینے کے بعد ہی اسکول کھولنے کی جگہ کا تعین کرنا چاہیے۔

(۲) مسلمان زیادہ ترِ درمیان میں تعلیم چھوڑ دیتے ہیں اور یہ بات فنی / حرفتی اداروں سے میل نہیں کھاتی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے علاقوں میں آئی۔ ٹی۔ آئیز اور مدارسِ حرفت کھولنے کی ضرورت ہے۔

(۳) اعلی تعلیم سب سے بہتر اداروں میں حاصل کرنی چاہیے۔ مخصوص تعلیمی میدانوں میں اقلیتی ادارے بنانے کی جدوجہد کرنے کے بجائے ضرورت اس بات کی ہے کہ بہترین اداروں میں جگہیں حاصل کی جائیں۔ تعلیمی عمائدین کا ایک گروپ بنایا جائے۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب کہ ذہین اور ہونہار اقلیتی فرقے کے طلبہ کا داخلہ ملک کی بہترین درس گاہوں میں ہو سکے۔ انھوں نے اس خواہش

باقی صفحہ نمبر ۱۴۴ پر۔

اسرار احمد

سائنس اکیڈمی برائے تیسری دنیا

سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں تیسری دنیا کی بڑھتی ہوئی درماندگی پر عبدالسلام کے کرب اور ان کی تڑپ کا اظہار صرف ان کی سربراہی میں قایم نظریاتی طبعیات کے بین الاقوامی مرکز، اس کی روزافزوں ترقی اور اس کے تیسری دنیا میں فروغ سائنس کے مختلف النوع منصوبوں کی شکل میں ہی نہیں ہوا۔ ان کا درد مند دل انھیں یہ مستقل باور کراتا رہا کہ دنیا کی دو تہائی آبادی کے لیے یہ مرکز اپنے کارکنوں کی بے مثال جانفشانی اور خلوص کے باوجود بھی انتہائی ناکافی ہے۔ وہ مستقل اس خواب کی تعبیر کی جستجو میں سرگرداں رہے کہ کوئی ایسا نظم ہو جس سے تیسری دنیا میں وسیع پیمانے پر سائنس کی ہر شاخ کو فروغ دیا جاسکے اور جس سے تیسری دنیا کے تمام اعلیٰ دماغ سائنس داں بھی وابستہ ہوں۔ اگر جستجو خون دل سے رنگین ہو تو ناممکن ہے کہ لیلائے مقصود نہ ملے۔ سلام کی جستجو میں خلوص تھا، تڑپ تھی، صداقت تھی اور اس میں ان کا خون جگر بھی شامل تھا اس لیے یہ کیوں کر ممکن ہوتا کہ ان کی اس آبلہ پائی کو منزل نہ ملتی۔ سلام کو اپنی منزل مقصود ۱۹۸۳ء میں سائنس اکیڈمی برائے تیسری دنیا کی شکل میں ملی جس کے قیام کی کہانی خود انھیں کی زبان سے بھلی لگے گی۔

"سائنس اکیڈمی برائے تیسری دنیا کے قیام کی تحریک دراصل پونٹی فیکل اکیڈمی (Pontifical Academy) کے اجلاس عام منعقدہ ۷ر اکتوبر ۱۹۸۱ء کے موقع پر شروع ہوئی۔

اس اجلاس میں شریک ہونے والے تیسری دنیا کے ممبران اس امر پر متفق ہوئے کہ تیسری دنیا کے لیے ایک سائنس اکیڈمی کی اشد ضرورت ہے اور اس کے قیام کے لیے جدوجہد ہونی چاہیے ساتھ ہی یہ بھی طے پایا کہ تیسری دنیا کے ان مشہور سائنس دانوں کو، جو اپنے اعلیٰ سائنسی کارناموں کی بدولت دنیا کی مشہور سائنسی اکیڈمیوں یا تنظیموں کے فیلو یا ممبر منتخب کیے گئے ہیں اس بات کی دعوت دی جائے کہ مجوزہ اکیڈمی کے فاؤنڈنگ فیلو (Founding Fellow) بننا قبول کریں۔ دنیا کی جن بڑی سائنسی تنظیموں اور اکیڈمیوں کو اس مقصد کے لیے منتخب کیا گیا وہ یہ ہیں:

اٹلی کی نیشنل اکیڈمی Accademia Nazionale Deiten، ویٹیکن کی پونٹی فیکل اکیڈمی آف سائنس، برطانیہ کی رائل سوسائٹی، فرانس کی سائنس اکیڈمی (Academie des Sciences)، سوویت یونین کی سائنس اکیڈمی، سویڈن کی رائل سویڈش سائنس اکیڈمی، امریکی آرٹ اور سائنس اکیڈمی، اٹلی کی نیشنل اکیڈمی آف سائنس Accademia Nazionale delle Science della dai XL) اور ریاست ہائے متحدہ کی نیشنل سائنس اکیڈمی۔

اسی موقع پر سب لوگوں نے بالاتفاق میرے ذمے یہ کام کیا کہ میں تیسری دنیا کے مشہور سائنس دانوں سے رابطہ قایم کروں، مجوزہ اکیڈمی کے خدوخال تیار کروں اور اس کے پہلے اجلاس کی تیاری کروں۔ طے شدہ معیار پر پورے اترنے

والے پندرہ ترقی پذیر ممالک کے کل اٹھائیس سائنس داں ملے جنھوں نے ہماری دعوت پر ازروئے مہربانی مجوزہ اکیڈمی کا فاؤنڈنگ فیلو بننا قبول کرلیا۔ ان لوگوں نے مشورہ دیا کہ طے شدہ معیار پر پورے اترنے والے ان سائنسدانوں کو بھی اس اکیڈمی کا ایسوسیئٹ فاونڈنگ فیلو بنانا چاہیے جو یا تو کسی ترقی پذیر ملک کے شہری رہے ہوں یا جنھوں نے تیسری دنیا میں سائنس کو فروغ دینے کے لیے کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیا ہو۔ ایسے کل تیرہ[۱۳] سائنس داں ملے جنھوں نے بھی ہماری دعوت پر اس اکیڈمی کے ایسوسی ایٹ فاؤنڈنگ فیلو (Associate Founding Fellow) بننا منظور کرلیا۔

مجوزہ اکیڈمی کا پہلا افتتاحی اجلاس، ٹریسٹ انٹرنیشنل فاونڈیشن کے زیر سرپرستی ۱۱ر نومبر ۱۹۸۳ء کو اٹلی کی ٹریسٹ یونیورسٹی میں ہوا۔ اس اجلاس میں سائنس اکیڈمی برائے تیسری دنیا کی باضابطہ تشکیل ہوئی اور متفقہ طور پر مندرجہ ذیل عہدہ داران کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر: عبدالسلام پاکستان

نائب صدران:

کارلو چاگاس (Carlo Chagas) برازیل

ایم۔ جی۔ کے مینن انڈیا

تھامس آر۔ اوڈھیامبو (Thomas R. Odhiambo) کینیا

سکریٹری:

مارسیل روش (Marcel Roche) وینیزولا

ایکزیکیٹو سکریٹری:

محمد۔ ایچ۔ اے۔ حسن سوڈان

اس اکیڈمی کے قایم ہونے کے بعد سے اب تک ۵۱ ممبران کا اضافہ ہوا ہے۔ اس طرح اس کے موجودہ ممبروں کی کل تعداد ۹۲ ہے۔ یہ ۳۴ ترقی پذیر ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان ممبروں میں سے دس نوبل انعام یافتہ ہیں اور ایک فیلڈس میڈلسٹ (Fields Medalist) ہیں۔"

سائنس اکیڈمی برائے تیسری دنیا اس کرۂ ارض پر وہ پہلی کامیاب کوشش ہے جس سے ترقی پذیر ممالک سے تعلق رکھنے والے تمام نامور سائنس داں ایک پلیٹ فارم پر اس مقصد سے جمع ہوئے کہ وہ تیسری دنیا میں بنیادی وعلمی سائنسوں کو فروغ دیں۔ انھیں اعلیٰ ترین معیار تک پہنچانے میں مدد کریں اور ان ممالک کی نئی پود کو سائنسی تحقیق اور سائنسی اقدار کو اپنانے کی ترغیب دیں۔

اس اکیڈمی کے بنیادی اغراض ومقاصد میں ترقی پذیر ممالک کے سائنس دانوں کی حوصلہ افزائی کرنا، ان کی اعلیٰ تحقیقات کو اجاگر کرنا، ان کے درمیان باہم رابطہ کی سہولتیں مہیا کرنا ان کی تحقیقی کارکردگیوں کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کرنا اور ان کے پھولنے پھلنے میں مدد کرنا ہے۔ تاکہ ان کی عرق ریزیاں انسانیت کی فلاح وبہبود اور تیسری دنیا کی ترقی میں معاون ہوسکیں۔ اس اکیڈمی کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے درمیان باہم تعاون کو فروغ ہو جس سے تیسری دنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی پھولے پھلے اور وہاں کے اقتصادی مسائل کے سائنسی حل نکلیں۔

اتنے نیک اور وسیع بنیاد اغراض ومقاصد کو اپنے دامن میں سمیٹنے والی سائنس اکیڈمی برائے تیسری دنیا اپنے نوع کی ایک عظیم سائنسی تنظیم ہے جس کا وجود بلاشبہ عبدالسلام کے درد انسانیت کا مرہون منت ہے۔

اس اکیڈمی کے باضابطہ تشکیل ہوتے ہی سلام بحیثیت صدر کے اس کے لیے مختلف ذرایع سے سرمایہ کی فراہمی کی تگ ودو میں لگ گئے۔ ان کی قدآور شخصیت اور ان کے خلوص اور نیک نیتی پر دوسروں کے اعتماد کی وجہ سے ان کی کوششیں بارآور ہونے لگیں۔ ستمبر ۱۹۸۴ء میں کنیڈین انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ ایجنسی یعنی سیڈا (CIDA) نے پچاس ہزار کنیڈین ڈالر کی امداد دی جس سے اکیڈمی نے چھوٹے پیمانے پر اپنا دفتر قایم کیا اور اپنے ممبران کی ایک نشست بلائی۔ اکتوبر ۱۹۸۴ء

میں اٹلی کے وزیر خارجہ عزت مآب گیلیو اَنڈریوٹی (Giulio Andreotti) نے اس اکیڈمی کو پندرہ لاکھ ڈالر سالانہ کی خطیر امداد دینے کا اعلان کیا۔ اِس امداد کی بنیاد پر اکیڈمی نے جولائی ۱۹۸۵ء میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں دنیا کی تقریباً سبھی بڑی بڑی سائنسی تنظیموں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ درحقیقت اس اکیڈمی کی حقیقی زندگی کی ابتدا اسی کانفرنس سے ہوئی۔ اس کانفرنس میں تقریباً ۲۵۰ مندوبین نے شرکت کی تھی اور اس کا افتتاح اقوام متحدہ کے جنرل سکریٹری نے کیا تھا۔ اس کے علاوہ بنگلہ دیش، چین، گھانا، گوئٹے مالا، انڈیا، پاکستان، فلپائن، پرتگال اور سعودی عربیہ کے سربراہوں نے اس کے لیے اپنی نیک خواہشات بھیجیں۔

اس کانفرنس کے موقع پر پروفیسر زیکیکی (Zichichi) نے اٹلی کے وزیر خارجہ کا یہ اعلان سنایا کہ ۱۹۸۶ء سے اٹلی، سائنس اکیڈمی برائے تیسری دنیا کو، ۳۰ لاکھ ڈالر سالانہ کی امداد دیا کرے گا اور پروفیسر عبدالسلام نے یہ مژدہ سنایا کہ آئندہ تین سالوں کے لیے سیڈا نے اکیڈمی کو ۴ لاکھ ۲۳ ہزار کینیڈین ڈالر دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اس کانفرنس کے بعد اردن نے ۴ ہزار ڈالر سالانہ اور سری لنکا نے ایک ہزار ڈالر سالانہ کی امداد کا پیغام بھیجا۔

حکومت اطالیہ، سیڈا اور دیگر حکومتوں کی سائنس اکیڈمی برائے تیسری دنیا کے لیے یہ فراخ دلانہ امداد تنہا سلام کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ اکیڈمی اتنی قلیل مدت میں مالی طور پر اتنی مستحکم ہو گئی ہے کہ اس نے اپنے تشکیل شدہ پروگراموں پر بڑی تیزی سے عمل درآمد شروع کر دیا ہے۔ ان پروگراموں میں خاص خاص یہ ہیں:—

(الف) تیسری دنیا کے ہونہار نوجوان سائنس دانوں کو اپنے ملک میں رہ کر ریسرچ کرنے کے لیے مالی امداد۔

(ب) ترقی پذیر ممالک کے سائنس دانوں کے لیے تیسری دنیا کے کسی تعلیمی ادارہ یا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں جا کر ریسرچ کرنے کے لیے وظائف کا انتظام۔

(ج) تیسری دنیا کے سائنس دانوں کے لیے اٹلی کی تجربہ گاہوں میں کام کرنے کی سہولتوں کی فراہمی اور ان کے سفر و قیام کے اخراجات کا انتظام۔

(د) ترقی پذیر ممالک کے تعلیمی اداروں کی لائبریریوں کے لیے سائنسی کتب اور رسالوں کی فراہمی۔

(س) ترقی پذیر ممالک کے معیاری سائنسی کارناموں پر انعامات اور میڈل دینا، وغیرہ

اس طرح سائنس اکیڈمی برائے تیسری دنیا، نظریاتی طبیعیات کے بین الاقوامی مرکز کے بعد، تیسری دنیا پر سلام کی دوسری بڑی عنایت ہے۔ اس اکیڈمی نے تیسری دنیا میں سائنسی انقلاب کی ایک لہر پیدا کر دی ہے اور سلام کی اس سے جذباتی وابستگی اس بات کی ضامن ہے کہ یہ لہر ہر آن بڑھتی ہی چلی جائے گی۔

کامیابی کا راستہ

زمانہ کا ساتھ دو۔" خدا کا کوئی حکم تحریری نہیں آتا، مگر زمانہ کے حالات سے پایا جاتا ہے۔

سر سید

علم کے خزانوں کو اپنے قبضہ میں کر لو

"سب (ترقی) کی جڑ یہی ہے کہ سب سے پہلے علم کے خزانوں کو اپنے قابو میں کر لو۔"

سر سید

شہاب الدین

شبلی کی مقالہ نگاری

مقالاتِ شبلی جلد دوم کی روشنی میں

۱۸ نومبر ۱۹۸۶ء کو علامہ شبلی نعمانیؒ کے انتقال کو اکہتر برس ہو جائیں گے۔ علامہ شبلیؒ کے ماہِ وفات کی مناسبت سے یہ مقالہ شائع کیا جا رہا ہے، اس کو سرسیدؒ کی ایک یادگار، ادارہ تہذیب الاخلاق کا اس جلیل القدر مصنف کے حضور میں ایک نذرانۂ عقیدت سمجھنا چاہیے جس نے اپنی زندگی کا ایک قابلِ لحاظ حصہ سرسیدؒ کی معیت میں بسر کیا تھا۔ (ادارہ)

علامہ شبلی نعمانیؒ نے مختلف تصانیف کے علاوہ صدہا مقالے بھی اپنی یادگار میں چھوڑے تھے جو ملک کے مختلف رسالوں اور جریدوں میں بکھرے پڑے تھے۔ دارالمصنفین نے شبلی کی مستقل تصانیف کو شائع کرنے کے ساتھ ساتھ ان مقالوں کی تدوین و اشاعت کا بھی اہتمام کیا اور ان کے مقالات کو آٹھ جلدوں میں شائع کیا۔ یہ جلدیں موضوعات کے لحاظ سے مرتب کی گئی ہیں، جن میں دوسری جلد اُن مقالوں کے لیے مخصوص ہے جو ادبی ہیں، مستقل تصنیف اور مقالے میں ایک واضح اور بڑا فرق یہ ہوتا ہے کہ تصنیف میں تو مصنف اپنے موضوع کے ہر پہلو پر جس حد تک ممکن ہو سکتا ہے تفصیلی نظر ڈالتا ہے اور اس کے ہر ہر گوشے کو اس طرح بے نقاب کرتا ہے کہ موضوعِ زیرِ بحث آئینے کی طرح روشن ہو جائے لیکن مقالہ تفصیل کا نہیں اجمال کا حامل ہوتا ہے اور بیشتر کسی ایک موضوع کے ایک ہی پہلو پر لکھا جاتا ہے، اس میں مقالہ نگار کو اطناب کے بجائے ایجاز کا فن اپنانا ہوتا ہے۔ اگر مصوری کی اصطلاح استعمال کی جائے تو مقالے کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تصویر چہ کی مصوری ہے۔ اگرچہ اس کے بھی ہر خال و خط نمایاں ہوتے ہیں مگر ان کو کم سے کم جگہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ تصویر کے لیے اس طرح کی جگہ کی کوئی تحدید نہیں ہوتی۔ علامہ شبلی کی مستقل تصانیف کا جو رنگ ہے اس کا مکمل اور بھرپور عکس ان کے مقالوں میں بھی نظر آتا ہے، اس لیے ہم درجِ ذیل سطور میں ان کے فنِ مقالہ نگاری پر ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہیں تاکہ اس بات کا اندازہ لگایا جا سکے کہ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بلکہ اپنی مکمل بات کس طرح کہتے ہیں؟

شبلی کی تصانیف کا اگر غائر نظروں سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب تک ان کو موضوعِ زیرِ بحث پر پوری اور قابلِ اطمینان دسترس نہیں ہوتی وہ قلم نہیں اٹھاتے۔ علاوہ بریں ان کی تنقیدی نگاہ موضوعِ زیرِ بحث کے ہر پہلو کا ناقدانہ جائزہ لیتی چلتی ہے جس کی وجہ سے بہت سے مسلمات ٹوٹتے ہیں اور لاتعداد غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہوتا ہے۔ جہاں تک ان کے اندازِ بیان کا تعلق ہے، بلاشبہ اس کو سرسید تحریک کے اندازِ بیان کی ایک انتہائی اعلیٰ اور رفیع القدر گونج کا نام دیا

جا سکتا ہے۔ نذیر احمد کے علاوہ سرسیّد تحریک سے منسلک افراد کا انداز بیان اتنا سائنسی ہوتا ہے کہ بعض اوقات اس میں چاشنی کی کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔ لیکن شبلی کے قلم کا اعجاز یہ ہے کہ وہ سائنسی اور عقلی انداز بیان اختیار کرنے کے باوجود زبان کی متانت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیتے۔ موقع محل کے لحاظ سے ان کی نثر میں شاعری کی طرح مدوجزر آتے رہتے ہیں۔ کبھی ان کا لہجہ پرجوش ہو جاتا ہے اور آواز خطیبانہ۔ تو کبھی وہ نرم، سجل اور نازک الفاظ میں اپنی بات کے موتی رولنے لگتے ہیں۔ مگر تعقل اور سائنسی انداز بیان پر ان کی گرفت ڈھیلی نہیں پڑنے پاتی۔ شبلی کے مقالات بھی ان کے ان ہی اوصاف کے حامل ہیں۔ انھوں نے اپنے مقالات میں نہ تو صرف لفاظی سے کام لیا ہے اور نہ ہی بے جا صنائع و بدائع کا استعمال کیا ہے۔ اگر وہ کسی مقام پر جذباتی ہوتے بھی ہیں تو ہوش مندی کا دامن سختی سے تھامے رہتے ہیں اور اپنی نوکِ قلم سے کوئی ایسی بات نہیں نکلنے دیتے جو علمی دنیا میں پایۂ اعتبار سے ساقط قرار دی جا سکے۔ اگر ان کو اپنے کسی معاصر کے بعض افکار و نظریات سے اختلاف بھی ہوتا ہے تب بھی وہ ایک وسیع النظر عالم کی طرح اس کی اچھی اور صحیح بات کو بہ بانگِ دہل اچھی اور صحیح قرار دیتے ہیں۔ سرسیّد اور شبلی کے نظریاتی اختلاف کو بعد کے لوگوں نے ایک افسانہ بنا کر پیش کیا ہے۔ شبلی کا درج ذیل اقتباس اس افسانے کے سارے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیتا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

> "زمانہ جانتا ہے کہ مجھ کو سرسید کے مذہبی مسائل سے سخت اختلاف تھا اور میں ان کے بہت سے عقائد و خیالات کو بالکل غلط سمجھتا تھا۔ تاہم اس سے مجھ کو کبھی انکار نہ ہو سکا کہ ان مسائل کو سرسیّد نے جس طرح اردو زبان میں ادا کیا ہے، کوئی اور شخص کبھی ادا نہیں کر سکتا۔"

اقتباس درج بالا میں ہر لفظ کا دروبست، الفاظ کا برمحل انتخاب اور کم سے کم الفاظ میں اپنے ما فی الضمیر کو بیان کرنے کا فن نمایاں نظر آتا ہے۔ علاوہ بریں ان کی ناقدانہ نگاہ اس بات کی پردہ پوشی نہیں کرتی کہ ان کو بہت سے مذہبی مسائل میں سرسید سے اختلاف تھا جو ان سطور کے لکھتے وقت بھی باقی تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ ایک حقیقی ادیب و ناقد کی حیثیت سے سرسیّد کے انداز بیان اور تفہیم مسائل کی دل کھول کر داد دیتے ہیں اور اس کو اپنا ادبیانہ منصب سمجھتے ہیں۔ شبلی کی یہ صداقت پسندی، سچی بات کو سچی بات کہنا اور اپنی رائے کا برملا اظہار کرنا ان کے تمام مقالات کا خاصّہ ہے، یہاں پر اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ ہمارے عہد کے ایک محقق اور ناقد جناب رشید حسن خاں صاحب نے شبلی کے اس وصف کو "قطعیت" کے نام سے موسوم کیا ہے اور اس قطعیت کو تحقیق و تنقید دونوں کے لیے مضر قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شبلی کے یہاں یہ "قطعیت" ان کی جذباتیت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے، جس کی بنا پر وہ مقالات لکھتے وقت لوگوں کی صفات کا اس انداز سے تذکرہ کرتے ہیں جو قطعیت کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے۔ شبلی کی جذباتیت سے ہم کو بھی انکار نہیں لیکن جس قطعیت کو رشید حسن خاں صاحب شبلی کا عیب سمجھتے ہیں وہ ہمارے نزدیک ان کا ہنر ہے۔ اس قطعیت کی وجہ سے ان کی رائے میں کوئی جھول نہیں آنے پاتا، خواہ ہم ان کی رائے سے متفق ہوں یا نہ ہوں مگر ان کی ہر رائے اپنی جگہ دو ٹوک اور واضح ہوتی ہے اور اس کا سمجھنا ہر شخص کے لیے آسان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اسی مقالے کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "سرسیّد کی انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مختلف مضامین پر کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ لکھا ہے، اور جس مضمون کو لکھا ہے، اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ اس سے بڑھ کر ناممکن ہے۔ فارسی اور اردو میں بڑے بڑے شعرا اور نثار گزرے ہیں، لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو تمام قسم کے مضامین کا حق ادا کر سکتا تھا"

رشید حسن خاں صاحب نے شبلی کی اس بات سے اختلاف کیا ہے کہ سرسید نے "جس مضمون کو لکھا ہے اس درجے پر پہنچا دیا ہے کہ اس سے بڑھ کر ناممکن ہے۔" ان کے نزدیک شبلی کا یہ بیان قطعیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ غالباً ان کو لفظ "ناممکن" کی وجہ سے شبلی کے بیان میں قطعیت کی جھلک نظر آئی' ورنہ حقیقت یہ ہے کہ شبلی نے جو کچھ لکھا ہے وہ آج بھی اسی طرح بامعنیٰ اور صحیح ہے جس طرح اس وقت حقیقی اور درست تھی جب یہ بات لکھی گئی تھی۔ سرسید نے اردو میں جس ٹھوس علمی موضوعات پر مقالات لکھ کر "تہذیب الاخلاق" میں شائع کیے ان کا اگر غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو شبلی کی بات بالکل درست نظر آئے گی۔ سرسید کے بعد اردو زبان میں علمی لٹریچر کا ایک خاصا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے اور علوم و فنون کے ہر موضوع پر دو چار کتابیں ضرور مل جائیں گی۔ ان تمام کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ شبلی کی بات آج بھی درست ہے۔ علمی موضوعات پر ہماری زبان میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کو دو موٹے موٹے خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک قسم کی کتابیں تو وہ ہیں جن کا انداز بیان اور انشاء نہ صرف قابل فہم ہے بلکہ قابل تحسین بھی ہے، مگر ان کا علمی پہلو کمزور ہے اور وہ اپنے موضوعات کا پورا احاطہ نہیں کر پاتیں۔ دوسری طرح کی کتابیں وہ ہیں جو علمی لحاظ سے تو اپنے موضوع کا بخوبی احاطہ کرتی ہیں مگر ان کا انداز نگارش کچھ ایسا ہے کہ دو صفحات بھی ایک نشست میں پڑھنے دشوار ہیں۔ سرسید کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے موضوع سے بھی انصاف کیا ہے اور زبان کی لطافت کا بھی خیال رکھا ہے۔ شبلی نے سرسید کے اسی وصف کی تعریف کی ہے۔ اگر قطعیت اسی چیز کا نام ہے تو ہمارے ناقص خیال میں یہ تنقید و تحقیق کا نقص نہیں خوبی ہے۔

اسی طرح شبلی کا وہ مقالہ بھی قابل ذکر ہے جو ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا تھا، مگر اس کی معنویت آج بھی تر و تازہ ہے۔ یہ مقالہ "املا اور صحت الفاظ" کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ اس کی شان نزول یہ ہے کہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین کے" سے جو رسالہ شائع ہوتا تھا۔ اس میں میگزین کے کسی صاحب علم قاری کو بعض ایسی فروگذاشتیں نظر آئیں' جن کا سد باب ان کے نزدیک ضروری تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ان فروگذاشتوں کی اصلاح نہ کی گئی تو اردو میں بہت سے ایسے الفاظ لکھنے کا عام رواج ہو جائے گا جس سے اس کو سخت نقصان پہنچے گا۔ ان صاحب نے اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے بہت سی مثالیں بھی لکھیں اور شبلی سے درخواست کی کہ وہ علی گڑھ اخبار کا ایک حصہ ایسی غلطیوں کی تصحیح کے لیے مخصوص کر دیں تو اردو زبان پر بڑا احسان ہوگا۔ یہ خط کافی طویل ہے جس کا ہم نے چند سطروں میں خلاصہ لکھ دیا ہے۔ شبلی نے اپنے مقالے کے شروع میں ان صاحب کا پورا خط نقل کر دیا ہے' تاکہ ان کے تمام اعتراضات کالج میگزین پڑھنے والوں کے سامنے آ جائیں۔ پھر انھوں نے اصل مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ

"اردو زبان میں بہت سے ایسے الفاظ داخل ہو گئے یا ہوتے جاتے ہیں جو لغت اور ترکیب کے لحاظ سے غلط ہیں۔" [۴]

اس اعترافِ حقیقت کے بعد شبلی نے ایک بڑا اہم سوال اٹھایا ہے جو ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے۔

"سوال یہ ہے کہ آیا یہ عام قاعدہ قرار پا سکتا ہے یا نہیں کہ جو لفظ اصل لغت کے لحاظ سے غلط ہے' اس کا استعمال بھی عموماً غلط ہے۔" [۵]

اس خود کردہ سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے فارسی زبان کے اس تشکیلی دور کی طرف بڑے واضح اشارے کیے ہیں جب عربی زبان کے بہت سے الفاظ فارسی زبان میں بلا تکلف داخل کیے جا رہے تھے، فارسی شاعروں اور نثر نگاروں دونوں ہی نے بقول شبلی "جو عربی الفاظ برتے اس قدر غلط برتے کہ آج کم مایہ اردو داں ان سے زیادہ غلطی نہیں کر سکتے۔" ان غلطیوں کے باوجود بقولِ شبلی " وہی فارسی آج مستند اور

فصیح اور فصیح تر سمجھی جاتی ہے۔" ؎

انھوں نے سیلی، قاآنی، واآلہ، منوچہری، عرفی اور حزیں کے مصرعوں کو بطور مثال نقل کر کے یہ بات واضح کر دی کہ ان شعراء نے جن عربی الفاظ کا فارسی زبان میں استعمال کیا ہے وہ کس قدر غلط معنوں میں کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہی زبان آج بھی مستند سمجھی جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے شبلی رقم طراز ہیں:

"اصل حقیقت یہ ہے کہ زبان کی ابتدا عوام سے ہوتی ہے اور یہ گروہ صحت الفاظ سے بالکل بے خبر ہوتا ہے۔ خواص اسی زبان کو لے کر کاٹ چھانٹ کر اصلاح کرتے ہیں۔ اصلاح میں وہ بہت سے الفاظ کو اسی طرح چھوڑ دیتے ہیں جس کی وجہ کبھی تو یہ ہوتی ہے کہ وہ غلط الفاظ اس قدر عام استعمال میں رواج پا چکے ہوتے ہیں کہ صحت کے ساتھ بولے جائیں تو عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں اور کبھی یہ کہ یہ امر زبان کی عزت اور خود مختاری کی دلیل سمجھی جاتی ہے کہ دوسری زبان کے الفاظ اس میں آئیں تو اسی کے قالب میں ڈھل کر آئیں۔" ؎

زبان کی اس خود مختاری کو واضح کرنے کے بعد انھوں نے ہر قسم کے الفاظ کے استعمال و عدم استعمال کے لیے جو قاعدۂ کلیہ قرار دیا ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے:

"جو الفاظ فصحا اور مسلم الثبوت اہل زبان کے عام استعمال میں آجائیں وہ صحیح الاستعمال ہیں اور جن کو اہل زبان نے عموماً نہ قبول کیا ہو، ان کا استعمال صحیح نہیں۔" ؎

یہ مقالہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں شبلی نے زبان کو کوئی جامد و ساکت شے نہیں بلکہ ایک زندہ اور متحرک چیز قرار دیا ہے جس میں نئے نئے الفاظ بھی داخل ہوتے رہیں گے، پرانے الفاظ کے معانی اور مفاہیم میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہیں گی اور جو الفاظ اپنی معنویت برقرار نہ رکھ سکیں گے وہ متروک ہوتے رہیں گے۔ صحت زبان کا مسئلہ شبلی کے زمانے میں بھی تھا اور ہمارے زمانے میں بھی موجود ہے۔ اگر ہم شبلی کے درج بالا خیالات کو مشعل راہ بنالیں تو اردو زبان سے متعلق بہت سی ناخوشگوار بحثوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

انگریزوں کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی نے ہندوستان میں جو مسائل پیدا کیے ان میں سب سے اہم اور خطرناک مسئلہ زبان کا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں یو۔ پی کے چیف سکریٹری مسٹر برن نے ایک ورنکیولر کمیٹی اس مقصد کے لیے بنائی کہ اسکولوں اور کالجوں میں دیسی زبان کا کورس اس طرح مرتب کیا جائے جو اردو ہندی دونوں کے الفاظ اور عبارت میں پڑھا جا سکے۔ شبلی بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے، ان کو اس تجویز سے سخت اختلاف تھا، انھوں نے اپنے اختلاف کو ایک نوٹ کی شکل میں لکھ کر کمیٹی کے سامنے پیش کیا۔ یہ نوٹ اتنا جامع اور حقیقت پر مبنی تھا کہ کمیٹی کے ہندی داں ممبروں نے شبلی کی حمایت کی اور انگریزوں کی یہ چال ناکام ہو کر رہ گئی۔ شبلی کا یہ نوٹ سید سلیمان ندوی نے اکتوبر ۱۹۱۶ء کے معارف میں "اردو ہندی" کے عنوان سے شائع بھی کر دیا تھا۔ نوٹ خاصا طویل ہے۔ اس لیے ہم ان سطور میں شبلی کے خیالات کا خلاصہ پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

مسٹر برن نے اپنی یادداشت میں اردو اور ہندی کو دراصل ایک ہی زبان قرار دیا تھا۔ کیوں کہ ان دونوں کی گرامر ایک ہے۔ ان کے نزدیک جن دو زبانوں کی گرامر ایک ہوتی ہے وہ دراصل ایک ہی زبان ہوتی ہیں۔ شبلی نے مسٹر برن کے اس خیال سے اختلاف کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

"اگر دو زبانوں کی گرامر ایک ہو، لیکن الفاظ بالکل مختلف ہوں تو ان کو ایک زبان نہیں کہہ سکتے۔
مشرقی ہندوستان کی زبانوں کی گرامر قریباً بالکل متحد ہے، باوجود اس کے نہ وہ ایک زبانیں کہی جا سکتی ہیں، نہ ان کا کوئی مشترک کورس بن سکتا ہے۔" ؎

اس تحریر کی خوبی یہ ہے کہ شبلی نے اپنے زمانے کی ہندی کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان کے نزدیک ایک قسم وہ ہے جو دیہاتوں میں بولی جاتی ہے اور اس کو گنوار بولتے ہیں۔ دوسری جو شہر میں تعلیم یافتہ ہندو روزمرہ استعمال کرتے ہیں۔ شبلی کے نزدیک پہلی قسم کی ہندی میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اس میں کوئی کورس مرتب کیا جاسکے۔ اس کے لیے انھوں نے دلائل دیے ہیں اور یہ دکھایا ہے کہ ہر ضلع کی یہ ہندی الگ ہے اور ایک ضلع کا آدمی دوسرے ضلع کے آدمی کی بات کو آسانی سے نہیں سمجھ سکتا۔ علاوہ بریں اس زبان میں روزمرہ کے مطالب تو بیان ہوسکتے ہیں مگر یہ علمی زبان نہیں بن سکتی۔ دوسری قسم کی ہندی کے بارے میں شبلی نے تسلیم کیا ہے کہ اس میں اور اردو میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ مگر ان کے نزدیک کوئی مشترک کورس بنانے میں جو دقتیں درپیش ہوں گی ان میں سے اہم ترین یہ ہیں:

"ایک قسم کی مشترک زبانیں، صرف اس حد تک کے لٹریچر کے لیے کافی ہوسکتی ہے جو نہایت معمولی مطالب اور خیالات کے ادا کرنے کے لیے کافی ہو جیسے کہ جنرل ریڈر کی زبان ہے لیکن جب کہ یہ مقصود ہے کہ ورنکیولر کا سلسلہ کالج کے اخیر کلاسوں تک قایم رہے تو ایسے نصاب کے بنانے کی ضرورت ہوگی۔ جس میں ہر طرح کے علمی مضامین اور علمی خیالات ادا کیے جائیں۔ اس حالت میں ان مضامین اور خیالات اور اصطلاحات کے ادا کرنے کے لیے عام روزمرہ کے الفاظ کافی نہ ہوں گے، بلکہ کسی علمی زبان سے مستعار لینے پڑیں گے۔ یہ علمی زبان عربی یا سنسکرت ہوگی اور یہاں سخت کشمکش پیدا ہوگی۔ مسلمان ہرگز اس بات پر رضامند نہ ہوں گے کہ بجائے ان عربی الفاظ کے جن کو ہر تعلیم یافتہ مسلمان نہایت آسانی سے فوراً سمجھ سکتا ہے سنسکرت کے الفاظ سیکھیں، جو آج کے لیے بالکل گوش ناآشنا ہیں، ہندو بھی اگرچہ ان الفاظ سے درحقیقت گوش آشنا نہیں ہوں گے! لیکن وہ بطور ایثار کے اس محنت کو برداشت کریں گے۔ بہرحال جنرل ریڈر مروجہ حال سے آگے چل کر صاف فیصلہ کردینا ہوگا کہ اردو اور ہندی کے کورس الگ الگ ہوجائیں"۔ [۱۰]

اس سلسلے میں شبلی نے جو نقصانات بتائے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ نصاب تعلیم مرتب کرتے وقت ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہمیشہ کشمکش رہے گی کہ علمی اصطلاحات عربی سے اخذ کیے جائیں کہ سنسکرت سے، علاوہ بریں اس طرح کی جو زبان عالم وجود میں آئے گی وہ نہ تو اردو ہوگی اور نہ ہی ہندی بلکہ ایک نئی زبان ہوگی۔ اس لیے ان دونوں زبانوں کو الگ الگ اس طرح ترقی دینی چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کی راہ میں حائل نہ ہوں۔ اس تحریر کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے:

"گراموں کے معمولی اشتراک سے دونوں زبانوں کو ایک قرار دینا اور اس کی بنا پر آخر درجہ تک دونوں کا ایک نصاب بنانا سخت غلطی ہے، جس سے دونوں زبانیں برباد ہوجائیں گی"۔ [۱۱]

شبلی نے اس تحریر میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کی معنویت آج بھی برقرار ہے۔ آج بھی ہندی اور اردو کی جو کشمکش اور کشاکش ہے، اس کو شبلی کے فرمودات کی روشنی میں بہت کچھ کم کیا جاسکتا ہے اور دونوں زبانوں کو الگ الگ اور آزادانہ حیثیت سے پروان چڑھانے میں ان کے خیالات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

اس جلد کا ایک اور مقالہ ہماری خاص توجہ کا مستحق ہے، جس کا عنوان "عربی اور فارسی شاعری کا موازانہ" ہے۔ شبلی عربی اور فارسی دونوں زبانوں کے معتبر عالم تھے۔ جیسا کہ معلوم ہے عربی سامی نسل کی زبان ہے اور فارسی آریائی نسل کی، مگر تاریخ کی یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ایک آریائی

نسل کی [illegible] نسل کی زبان عربی ہے اس طرح متاثر ہوئی کہ [illegible] کے تقاضے کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا آریائی رسم الخط [illegible] بدل ڈالا اور اس کی جگہ پر عربی رسم الخط اختیار کیا جو آج بھی فارسی زبان کا مسلمہ رسم الخط ہے۔ علاوہ بریں فارسی میں تنوین کا استعمال عربی ہی کے اثر سے شروع ہوا جمع بنانے کا قاعدہ بھی عربی سے اخذ کیا گیا۔ اگرچہ قدیم فارسی طریقہ بھی برقرار رہا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہزارہا عربی الفاظ فارسی زبان میں اس طرح داخل ہوگئے کہ اگر آج ان الفاظ کو فارسی زبان سے خارج کر دیا جائے تو فارسی زبان بالکل بے مایہ ہو کر رہ جائے گی۔

ظہور اسلام کے بہت پہلے سے فارسی میں شعرگوئی کی روایت موجود تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ بعض ناقدین ادب نے تو زردشتی مذہب کی مقدس کتاب "اوستا" کو بھی منظوم کلام قرار دیا ہے۔ عربی اور فارسی شاعری میں صرف یہ فرق تھا کہ عربی شاعری عروضی اوزان کی پابند تھی اور ظہور اسلام سے قبل کی فارسی شاعری ہجائی اوزان کی۔ جب عربوں نے ایران کو فتح کر لیا اور ایرانیوں نے پہلوی رسم الخط کے نقائص کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو ترک کر کے عربی رسم الخط اختیار کیا تو ایرانی علماء اور فضلاء کو عربی شاعری سے روشناس ہونے کا نادر موقع ملا۔ غالباً اس کے اثر سے ایرانیوں نے بھی عروضی اوزان کی پابندی کی اور ظہور اسلام کے بعد کی تمام کی تمام فارسی شاعری ہجائی اوزان سے یکسر عاری نظر آتی ہے۔ اس تہذیبی لین دین کی وجہ سے عربی اور فارسی دونوں زبانوں کی شاعری کو بڑا فائدہ ہوا

شبلی کا درج بالا مقالہ اس بات پر نظر ڈالتا ہے کہ عربی شاعری کے وہ کون کون سے خصائص ہیں جو فارسی شاعری کا امتیاز ہیں اور فارسی شاعری کے وہ کون کون سے خصائص ہیں جن سے عربی زبان کی شاعری محروم ہے۔ اس سلسلے میں شبلی نے عربی کی رزمیہ شاعری، آزادانہ خیالات، مفاخرت، مناظر قدرت کا بیان، جذبات انسانی کی عکاسی کو عربی شاعری کے بنیادی خصائص قرار دیے ہیں۔ اس کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ شبلی فردوسی اور نظامی کی رزمیہ شاعری سے ناواقف تھے یا فارسی شعراء نے جس طرح جذبات انسانی کی عکاسی کی ہے ان سے نا آشنا تھے اصل معاملہ یہ ہے کہ شبلی کے نزدیک گفتار و کردار میں یک رنگی اور یکسانیت ہونی چاہیے۔ ان کے نزدیک فارسی شعرا گفتار کے تو غازی ہیں مگر کردار کے میدان میں وہ عربوں سے بہت پیچھے رہتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے ان تمام موضوعات کے سلسلے میں عربی شاعری کو فارسی شاعری پر فوقیت دی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ان کے نزدیک فارسی شاعری کی چند ترجیحی خصوصیات بھی ہیں جن میں عربی شاعری ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ ترجیحی خصوصیات یہ ہیں:

عربی شاعری صنف مثنوی سے عاری ہے۔ اس میں فلسفیانہ، اخلاقی اور متصوفانہ خیالات کو ادا کرنے کی وہ صلاحیت نہیں ہے، جو فارسی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس کے علاوہ فارسی شاعری میں صنف غزل کے جو لطیف، پرکیف اور دلکش نمونے وافر تعداد میں ملتے ہیں، عربی شاعری ان سے بھی

"اے میرے بچو اور میرے قومی پھولو! میری زندگی اور موت تمہارے لیے ہے۔ تم یقین جانو کہ اگر تمہاری حالت دین و دنیا میں اچھی ہوگی تو میں اپنی قبر میں نہایت خوشی اور آرام سے دلہن کے سونے کی مانند سوؤں گا اور خدا کا فرشتہ مجھ کو کہے گا کہ

نم کنومۃ العروس

اور اگر خدانخواستہ تمہاری حالت دین میں یا دنیا میں اچھی نہ ہوگی تو قبر میں بھی مجھ کو چین نہ ہوگا۔"

(نواب محسن الملک)

...سر جاری ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ عربی شاعری
...ں وہ خیالات کا تنوع نہیں ملتا جو فارسی شاعری
...ں ہر دو میں جلوہ گر رہا ہے۔ سب سے بڑی
...ت یہ ہے کہ فارسی شاعری نے تشبیہات میں
...ندرت اور جدت پیدا کی وہ عربی شاعری
...ں نہیں ملتی۔

...ج بالا سطور میں شبلی کے چند افکار و خیالات کا جو
...سرسری سا جائزہ لیا گیا ہے، اس سے اس بات کا بخوبی

اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ خواہ کسی موضوع پر مقالہ لکھیں اس کے ہر پہلو کا نہ صرف احاطہ کر لیتے ہیں بلکہ ہر ہر پہلو کے حسن و قبح کو نمایاں بھی کرتے جاتے ہیں اور جس بات کو درست سمجھتے ہیں اس کو درست اور جس کو غلط سمجھتے ہیں اس کو غلط کہتے ہیں، یہی ان کی مقالہ نگاری کا سب سے بڑا وصف ہے۔

* * * * * * * * * *

حواشی

ا۔ مقالات شبلی (جلد دوم) مرتبہ سید سلیمان ندوی۔ دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۵۰ء، ص ۶۴
۲۔ انتخاب مضامین شبلی، تعارف رشید حسن خاں۔ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۷۱ء ص۔ ۱۵
۳۔ مقالات شبلی (جلد دوم) مرتبہ سید سلیمان ندوی۔ دار المصنفین اعظم گڑھ ص ۶۱
۴۔ مقالات شبلی (جلد دوم) " " " ص ۶۹
۵۔ مقالات شبلی (جلد دوم) " " " ص ۶۹
۶۔ مقالات شبلی (جلد دوم) " " " ص ۷۰
۷۔ مقالات شبلی (جلد دوم) " " " ص ۷۰
۸۔ مقالات شبلی (جلد دوم) " " " ص ۷۱
۹۔ مقالات شبلی (جلد دوم) " " " ص ۷۶-۷۷
۱۰۔ مقالات شبلی (جلد دوم) " " " ص ۷۵
۱۱۔ مقالات شبلی (جلد دوم " " " ص ۷۸

استاد کا ادب

مولوی عنایت اللہ (مولوی ذکاء اللہ دہلوی کے بیٹے) مدرسۃ العلوم میں پڑھتے تھے۔ ان کی فارسی کی کلاس مولانا شبلی پڑھاتے تھے۔ کلاس میں ان کا جی نہ لگتا تھا۔ مولانا شبلی اکثر ان کو ڈانٹا کرتے تھے اور ان کے والد سے بھی شکایت کرتے رہتے تھے۔ مولوی عنایت اللہ کو بھی مولانا شبلی سے ضد ہو گئی تھی۔ ان کی نظموں کو مذاقیہ انداز سے ہوسٹل کے ہر کمرے کے پاس کھڑے ہو کر پڑھا کرتے تھے۔ مولانا شبلی کو جب خبر ہوئی تو اور زیادہ خفا ہونے لگے لیکن یہ ساری آزردگی ایک معمولی سی بات پر جاتی رہی۔ "ایک روز وہ (مولانا شبلی) چاندنی چوک دہلی میں کسی دکان سے جوتے خرید کرنے جا رہے تھے کہ میری نظر ان پر پڑی۔ میں نے ان کو سلام کیا اور بڑھ کر ان کے ہاتھ سے جوتے لے لیے کر میں قیام گاہ تک پہنچا دوں۔ بس بے حد خوش ہو گئے اور کہنے لگے کہ شریف خاندان کے بچوں سے اسی قسم کے اخلاق کی توقع ہوتی ہے۔" (علی گڑھ میگزین)

سیدہ فرحت

یوم الحساب

مولانا حالی مرحوم کی ایک مشہور تاریخی نظم جو انھوں نے ماؤں بہنو۔ بیٹیو کو مخاطب کر کے لکھی ہے اور یہ نظم شیخ عبداللہ مرحوم نے تحریک تعلیم نسواں کی تائید میں لکھوائی تھی۔ چنانچہ اس وقت بھی جب شیخ عبداللہ مرحوم اور بیگم عبداللہ مسلمان لڑکیوں کے تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھ رہے تھے تو عقل کے دشمن نام نہاد مذہبی حلقوں کی طرف سے مخالفت ہوئی تھی اور بانیان گرلز کالج کے حالاتِ زندگی پڑھنے اور سننے سے جیسا کہ پتہ چلتا ہے کہ اکثر مصلحین قوم اس کے مخالف تھے تو اس وقت حالی مرحوم نے اپنی نظم کے آخری حصے میں یہ دو شعر لکھے تھے ؎

آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب

مولانا عورتوں سے مخاطب ہیں

جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آب حیات
ٹھہرا تمہارے حق میں وہ زہر ہلاہل سر بسر

چنانچہ مندرجہ بالا سرعنوان حالی کی اسی نظم سے اخذ کیا گیا۔ اللہ بخشے حالی تعلیم نسواں کی حمایت میں قوم کو بیدار کرتے اور یوم الحساب سے ڈراتے گزر گئے اور شیخ عبداللہ بھی اس زہریلے سماج میں سانس لیتی ہوئی عورت کے لیے تعلیم و تربیت کا تریاق تجویز کر کے اور اپنی سی کر کے رخصت ہوئے۔

آج ہم بظاہر ایک ترقی یافتہ اور برق رفتار علمی و سائنسی دور سے گزر رہے ہیں۔ لاتعداد تعلیمی ادارے اور فلاحی و سماجی پروجیکٹ چل رہے ہیں، تبلیغی اور مذہبی تحریکیں چل رہی ہیں جس میں دینی تعلیمات کا پرچار اپنے خیال میں ہو رہا ہے پھر بھی ہم کو آج کے مسلم معاشرے میں چند ایک کو چھوڑ کر کوئی مسلمان عورت صحیح معنیٰ میں عالم، فاضل، محقق، مقنن، سائنسداں نظر نہیں آتی۔ پسماندہ غریب طبقے کا تو ذکر ہی کیا ان کو انسانوں کی طرح جینے کا حق بھی نہیں! خوش حال یا متوسط الحال طبقے میں بھی جہاں اب زمانے کی ضروریات کے تحت لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی ہیں وہاں بھی یہ علم دوستی اور تحقیق و تجسس کے جذبے کے تحت سائنٹفک نقطۂ نظر سے نہیں ہوتی، زیادہ تر یہ تعلیم ایک اچھا شوہر حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے جو ڈاکٹر، انجینیر یا پروفیسر وغیرہ ہو، خود ڈگری یافتہ ہو، اس لیے سند یافتہ بیوی چاہتا ہو یا پھر نئے زمانے میں بڑھتی ہوئی ضروریات پوری کرنے کے لیے نوکری کی خاطر تعلیمی ڈگریاں حاصل کی جاتی ہیں۔ دوسرے ملکوں میں اور خود ہمارے ملک ہی میں دوسری اقوام کی عورتیں اپنی علمی قابلیت اور عملی کارکردگی میں کتنا نام پیدا کر رہی ہیں اور ملک و قوم کی کتنی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ مگر ہمارے یہاں آج بھی نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمان لڑکی یا تو رسم و رواج کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی کہیں بیاہ دی جاتی ہے جہاں اس کا شوہر چاہے تو بچے پیدا کرانے کے ساتھ نوکری بھی کرالے یا پھر صرف گھر میں گھرداری کے فرائض انجام دے۔ حالانکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک ان پڑھ جاہل

ـت ہو یا نام نہاد ناقص تعلیم یافتہ عورت بحیثیت ماں اور
ی کے بھی اسی وقت کامیاب ثابت ہوتی ہے جو سائنٹی فک
اغ گردش خیالات اور صحت مند طریقۂ زندگی رکھتی ہو۔
ی دانش ور کا مشہور زمانہ قول اہلِ علم کی نظر سے گزرا ہوگا
ر بچّے کا پہلا مدرسہ ماں کی گود ہے۔ بلکہ اب سائنسی تحقیق
ابت کر رہی ہے کہ صرف پیدا ہونے کے بعد بلکہ پیدا ہونے
سے پہلے ہی ماں کے پیٹ ہی میں بچّہ جس طرح ماں کی جسمانی
خوبیوں اور کمزوریوں اور امراض وغیرہ کا اثر قبول کرتا
ہے۔ اسی طرح اس کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات، خیالات اور
رجحانات کا اثر قبل از پیدائش قبول کرتا ہے۔

آج روشن فکر غیر متعصب غیر مسلم بھی یہ قبول کر رہے ہیں کہ اسلام ایک سائنٹی فک مذہب ہے اور عورتوں کو بھی اس نے انسانی حقوق عطا کیے ہیں۔ مساوات اور انصاف اس کے سلسلے میں بھی ضروری اور لازمی ہے۔ طلب علم کی تاکید جس طرح مردوں کے لیے ہے اسی طرح عورتوں کے لیے بھی۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث ہے کہ طلب علم ہر مومن مرد اور عورت پر فرض ہے۔ علم حاصل کرو، چاہے اس کے لیے تم کو چین جانا پڑے۔ پھر یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ ظہور اسلام کے بعد مسلمان مردوں نے جہاں علوم دینی و دنیاوی حاصل کیے وہاں عورتوں نے بھی کیے اسلام کیوں کہ دین فطرت اور اس میں دین دنیا سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ بلکہ پوری انسانی زندگی عبادت بن سکتی ہے اگر وہ احکام اسلام کی حقیقت سمجھے ـــ اس دنیا کو جہنم کے بجائے جنت بنانے میں صرف ہو۔

ایک حدیث اور مشہور ہے کہ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ اس کی معنویت پر غور کیجیے کہ انسان کو نیک سیرت، اعلیٰ اخلاق و کردار کا حامل ماں کی تربیت ہی بنا سکتی ہے۔ ماں کی ذہنی کیفیات اور اچھے بُرے خیالات کا اثر قبل پیدائش ہی سے بچہ قبول کرنا شروع کر دیتا ہے جیسا کہ آج کل کی سائنسی تحقیقات ثابت کر رہی ہیں۔ سوچیے ایک ایسی ماں جو خود توہم پرستی اور جہل کے اندھیروں میں بھٹک رہی ہو، یا ناقص تعلیم و تربیت کا شکار ہو وہ کیسے ایک ذہنی طور پر صحت مند روشن فکر و نظر رکھنے والی نسل پیدا کر سکتی ہے جو خود جہنمی زندگی گزار رہی ہو وہ اولاد کو جنت کی راہ کیسے دکھا سکتی ہے ہمارے آج کے غلط کار اور مفاد پرست مذہبی ٹھیکیدار بھی شرع اسلامی اور آیات قرآنی کی غلط تاویل و تفسیر کر کے عورت کو علم و عمل کی دنیا میں قدم بڑھانے نہیں دیتے وہ بسم اللہ کے گنبد میں اُن کی صدائے بازگشت بن کر رہتی ہے مذہبی مبلغین موجودہ دور کی مغربی تعلیم اور تہذیب و معاشرے کی وہ بھیانک تصویر جو اُن کو آج کل کے موڈرن سرمایہ دار طبقے میں نظر آتی ہے اس کا بار بار حوالہ دے کر اور خدا کے قہر سے ڈر کر مسلمان عورت کو بے عمل، بزدل یا پھر باغی اور بے راہ رو بنا دیتے ہیں۔ مگر تاریخ اسلام کی ان نامور خواتین کے کارناموں سے روشناس نہیں کراتے جنھوں نے علم و عمل کی دنیا میں نام روشن کیا۔

یاد رکھیے کہ وہ کل کی بیل گاڑی ہو یا آج کل کے جیٹ ہوائی جہاز نہ تو بیل گاڑی ڈھنگ سے چل سکتی ہے جب تک دونوں پہیے برابر نہ ہوں اور نہ آج کل کا جیٹ ہوائی جہاز تیز رفتاری سے منزلیں طے کر سکتا ہے جب تک دونوں پنکھ صحیح نہ ہوں۔

موجودہ نسل کی بے راہ روی، ہنگامہ پروری اور اخلاقی پستی کا پس منظر ماؤں کا غیر تعلیم یافتہ یا ناقص تربیت ہونا ہے۔ شوہروں کی ناکامی اور پست ہمتی یا غلط کاری کا باعث بھی ایک جاہل، ناقص کردار اور کمزور شخصیت والی بیوی ہے۔ جتنے مشاہیر عالم گزرے ہیں ان کی ذہنی تربیت اور کردار سازی میں کسی نہ کسی دانش مند عورت کا حصّہ ہے خواہ وہ ماں کی شکل میں ہو یا بیوی اور رفیقِ کار کی حیثیت سے! چنانچہ اقبال کی زبان میں آخر میں اس مصرعہ پر مضمون ختم کرتی ہوں

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

کاش ہندوستانی مسلمان اس قرآنی آیت کا مطلب سمجھ سکیں

علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم

اور انسانوں میں صرف مرد ہی نہیں عورت کا بھی شمار ہے۔

راحت ابرار

مسلم یونیورسٹی میں یوم سرسید کی تقریبات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کینیڈی ہال میں یوم سرسید کے موقع پر تہنیتی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے مرکزی وزیر تعمیرات مسٹر عبدالغفور نے کہا کہ آج کا دن میری زندگی کا سب سے خوش نصیب دن ہے جب کہ ۴۴ سال بعد میں بانیٔ درس گاہ کے یوم پیدائش پر یہاں حاضر ہوا ہوں جو اس ادارے کو قایم نہ کرتے تو ہم نہ جانے کہاں ہوتے۔

انھوں نے کہا کہ سرسید کو جتنی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ ہندوستان کے کسی بھی رہنما کو نہیں کرنا پڑا۔

وزیر موصوف نے کہا کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے لیکن اس وقت ملک کو سب سے بڑا خطرہ سیکولرازم سے ہٹانے کے لیے ہو رہا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی ایک ساتھ آزاد ہوئے مگر ہندوستان نے اپنی آزادی کو برقرار رکھا اور ہر شخص کو رائے دینے کی مکمل آزادی ہے جب کہ پاکستان میں لوگ اس چیز کو ترس رہے ہیں اور کوئی مرد سامنے نہیں آرہا ہے اور عورتیں ہی جھنڈا لے کر نکل پڑی ہیں۔

انھوں نے کہا کہ آزادی سے قبل جو چھوا چھوت تھی وہ اب ختم ہوگئی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب بنارس ہندو یونیورسٹی میں اگر انڈے کا چھلکا بھی نظر آجاتا تھا تو طالب علموں کو خارج کردیا جاتا تھا خود آپ کے زمانے میں جب وہ ۱۹۴۴ء میں مسلم یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے اور اپنے ہندو ساتھیوں کے ساتھ ہندو ہوٹل میں کھانے کے لیے جاتے تھے تو انھیں اپنا نام بدلنا پڑتا تھا، کیوں کہ ہندو ہوٹل میں کسی مسلمان کو کھانے کی اجازت نہیں تھی، مگر آج تعلیم کی وجہ سے حالات بدل گئے ہیں۔

جناب عبدالغفور نے کہا کہ آج ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا دشمن ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایران عراق جنگ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ وہاں ساٹھ ہزار مسلمان اب تک مرچکے ہیں۔ خود مسلم ممالک بھی ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی میں اپنے طالب علمی کے دور کے بہت سے واقعات سناتے ہوئے طلبا سے اپیل کی کہ وہ کسی عظیم مقصد کو سامنے رکھ کر کام کریں۔

اس سے قبل مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی نے کہا کہ یہ ادارہ ہندوستان میں مسلم دانشوروں کا سب سے بڑا مرکز ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کا اس ادارے سے جذباتی رشتہ ہے اس رشتے کو محسوس کرتے ہوئے مرکزی سرکار کو اس طرف توجہ دینی چاہیے اور مسلم یونیورسٹی کی توسیع و ترقی کے لیے مزید اقدامات کرنے چاہئیں۔

انھوں نے کہا کہ بابائے قوم سرسید احمد خاں نے مسلم قوم کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے یہ ادارہ قایم کیا۔ اگر سرسید نہ ہوتے تو مسلمان ترقی نہ کرسکتے۔

وائس چانسلر نے کہا کہ سرسید کے زمانے سے آج تک اس

ادارے میں ایک ایسا گروہ ہے جو نہیں چاہتا کہ یونیورسٹی میں امن رہے اور مسلم قوم ترقی کرے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آئندہ کے لیے سیاسی امیدیں رکھتے ہیں اور پیشہ ور سیاست داں بننے کے لیے طلبہ کو اپنے مفاد میں استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے کانگریس پارٹی سمیت تمام سیاسی جماعتوں سے اپیل کی کہ وہ ایسے لوگوں کو ٹکٹ نہ دے جن کا مقصد فتنہ و فساد برپا کرنا ہے۔

جناب سیّد ہاشم علی نے کہا کہ پچھلے پندرہ ماہ سے یونیورسٹی میں بہت پُرامن اور تعلیمی ماحول رہا ہے اور یہاں اچھے لوگوں کی اکثریت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس ادارے کے طلبا کو حکومت سے بعض شکایات ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ملازمتوں میں ان کے ساتھ انصاف نہیں برتا جاتا ہے۔ میری کوشش ہے کہ مایوسی کا تصور ہمارے طلبہ سے دور ہو جائے اور وہ اتنی محنت کریں کہ پھر کوئی بھی تعصب انھیں ناکام نہ بنا سکے۔ انھوں نے دو ہزار لڑکوں کے لیے اور پانچ سو لڑکیوں کے لیے نئے ہوسٹلوں کا مطالبہ بھی وزیر تعمیرات سے کیا۔

شعبۂ سول انجینیرنگ کے پروفیسر شمیم احمد نے سرسیّد کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ سرسیّد کی زندگی ایک سمندر ہے جسے کوزے میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے کہا کہ اکیسویں صدی کا دور تقریر اور لیڈری کا دور نہیں ہوگا بلکہ جدید سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہوگا جس کے لیے ہمیں جدید علوم سے آراستہ کرنے کی ضرورت ہے۔

شعبۂ ہندی کے پروفیسر رویندر بھرمر نے کہا کہ مسلم یونیورسٹی محض ایک ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک تحریک ہے۔ سرسیّد نے ہندو مسلم ایکتا کی جو مثال اس ادارے میں قایم کی وہ آج بھی قایم ہے۔

لٹریری سوسائٹی کے سکریٹری مسٹر ایس۔ ایم۔ افضل نے سرسیّد کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ایک سیّد نے قوم کو سنوارنے کا اس وقت بیڑا اٹھایا اور آج پھر ایک سیّد (سیّد ہاشم علی) جو نسلاً اور عملاً سیّد ہے اس قوم کی فلاح کے لیے کام کر رہا ہے۔

ویمنس کالج اسٹوڈنٹس یونین کی صدر سنبل ہاشمی نے کہا کہ سرسیّد ایک روشن خیال، ترقی پسند اور مستقبل کے معمار تھے۔ ان کا جدید دماغ فرسودہ رسم و روایات سے بغاوت کرتا تھا، ہمیں بھی پیچھے دیکھنے کے بجائے مستقبل کی فکر کرنی چاہیے۔

مسلم یونیورسٹی کے چانسلر پروفیسر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے مہمانِ خصوصی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ غفور صاحب علی گڑھ کے ممتاز طلبا میں سے ایک ہیں اور انھوں نے صحیح معنوں میں سرسیّد کے خواب کو پورا کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی تقسیم کے بعد کے لوگوں کے بھی کارناموں کو "ناموران علی گڑھ" میں شامل کیا جانا چاہیے اور ان کے ناموں کی فہرست تیار کرنی چاہیے۔

اس تہنیتی جلسے میں ممبر انچارج پروفیسر عزیز الدین طارق نے سرسیّد اسٹیشنری مارٹ کی جانب سے غریب طلبا کی تعلیمی امداد کے لیے ایک لاکھ روپے کا چیک وائس چانسلر کو پیش کیا۔

مہمانِ خصوصی کو وائس چانسلر لاج سے کینیڈی ہال تک یونیورسٹی رائڈنگ کلب کی روایتی بگھی میں لایا اور لے جایا گیا۔ این۔ سی۔ سی کے طلبا نے مولانا آزاد لائبریری کے میدان میں گارڈ آف آنر پیش کیا۔

سرسیّد کی یوم پیدائش کے اس مبارک موقع پر جامع مسجد میں قرآن خوانی کا اہتمام کیا گیا اور سرسیّد کے مزار پر وائس چانسلر نے گلہائے عقیدت پیش کرنے کے بعد سرسیّد ہاؤس میں سرسیّد نمائش کا افتتاح فرمایا۔

مہمانِ خصوصی نے اپنے قیام کے دوران یونیورسٹی احاطہ کا دورہ بھی کیا۔

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

آئٹم ریٹ کی بنیاد پر سربمہر ٹینڈر مطلوب ہیں۔ جو ۲۰ نومبر ۱۹۸۶ء ایک بجے دوپہر تک موصول کیے جائیں گے۔ ٹینڈر اسی روز شام کو ۴ بجے تک کھول دیے جائیں گے۔

ٹینڈر فارم اور اس سے متعلق کاغذات یونیورسٹی انجینیر کے دفتر سے آفس ٹایم میں کام کے دن کسی وقت بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

ٹینڈر فارم کی فروخت فارم وصولیابی کی مقررہ تاریخ سے ۲۴ گھنٹے قبل بند کردی جائے گی۔

نمبر شمار	کام کی نوعیت	کام کے لیے تخمینی رقم	زر ضمانت	فارم کی قیمت	تکمیل کا
۱	'ع' ۱۱ ۶ کی چھتوں کی دوبارہ تعمیر (مسجد، اولڈ بلاک کا پچھلا حصہ، ایس ہوسٹل اور ایم۔ایم۔ہال کے کامن روم کے پرانے ٹوائیلیٹ کی کھڑکیوں کی تنصیب کا اہتمام	۲۰۲۷۰/- روپئے	۱۰/- روپئے	۵/- روپئے	تین

لفٹیننٹ کرنل حسن مظفر

یونیورسٹی انجینیر۔

(669/1830)

مالکہ تہذیب الاخلاق ٹرسٹ۔ پرنٹر پبلشر نورالحسن نقوی۔ مقام اشاعت: شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۔ پریس: شعوبی آفسیٹ پریس۔ دہلی ۶

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۵/ ۸۶-۸۷

درج ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ فوٹوگرافر۔ (ایک جگہ) (عارضی۔ چلتے رہنے کی امید)
ڈپارٹمنٹ: سینٹر آف وائلڈ لائف اینڈ آرنی تھالوجی
شرح تنخواہ: ۵۵۰-۲۵-۷۵۰-ای بی-۳۰-۹۰۰ روپے اور الاؤنسز
قابلیت:
۱۔ لازمی: ۱۔ بی۔ ایس سی ڈگری جس میں زولوجی اور باٹنی بطور اختیاری مضامین کے لیے ہوں۔
۲۔ فوٹوگرافی میں ڈگری یا ڈپلوما۔
۲۔ پسندیدہ: ۱۔ جدید فوٹوگرافی کی ٹیکنیک کا علم اور مختلف فوٹوگرافک سازوسامان کے استعمال کا تجربہ۔
۲۔ وائلڈ لائف فوٹوگرافی کا تجربہ اور کسی نیشنل پارک اور جانوروں کی جائے پناہ میں کام کا تجربہ۔

۲۔ انسٹرکٹر (مولڈنگ) (ایک جگہ) (عارضی) ورکشاپ۔
ڈپارٹمنٹ: مکینکل انجینئرنگ
شرح تنخواہ: ۴۴۰-۲۰-۵۰۰-ای بی-۲۵-۷۰۰-ای بی-۲۵-۷۵۰ روپے اور الاؤنسز
قابلیت:
۱۔ لازمی۔ مکینکل انجینئرنگ میں ڈپلوما۔
۲۔ پسندیدہ۔ مولڈنگ میں دو سال کا تجربہ۔
نوٹ: موزوں افراد کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۳- فیلڈ مین (ایک جگہ) (عارضی۔ چلتے رہنے کی امید)۔
ڈیپارٹمنٹ: سینٹر آف وائلڈ لائف اینڈ آرنی تھالوجی
شرح تنخواہ- ۴۲۵-۱۵-۵۰۰-ای بی-۱۵-۵۶۰-۲۰-۷۰۰ روپے اور الاؤنسز
قابلیت- ۱- لازمی- بی ایس سی کی ڈگری جس میں زولوجی اور باٹنی بحیثیت اختیاری مضامین کے لیے ہوں
۲- قدرتی جنگلی علاقوں میں کام کرنے کا تجربہ
۲- پسندیدہ سال اعلیٰ تعلیمی لیاقت
ککا وائلڈ لائف سے متعلق فیلڈ ورک میں ٹریننگ حاصل کی ہو۔
۴- اینیمل کیپر (ایک جگہ) (عارضی- چلتے رہنے کی امید)۔
ڈیپارٹمنٹ- سینٹر آف وائلڈ لائف اینڈ آرنی تھالوجی۔
شرح تنخواہ- ۴۲۵-۱۵-۵۰۰-ای بی-۱۵-۵۶۰-۲۰-۷۰۰ روپے اور الاؤنسز۔
قابلیت ۱- لازمی ۱- بی ایس سی کی ڈگری جس میں زولوجی اور باٹنی بحیثیت اختیاری مضامین کے لیے ہوں
۲- جانوروں کی دیکھ بھال اور ان کی غذاؤں کے بارے میں کوئی ڈپلوما/سرٹیفکیٹ۔
یا
زولوجی میں ایم ایس سی کی ڈگری ساتھ میں وائلڈ لائف بائیولوجی اور آرنی تھالوجی میں تخصص۔
۲- پسندیدہ- جنگلی جانوروں کی دیکھ بھال، ان کو ریڈیو- کالرس میں رکھنا اور خاموش کر دینے والی گنوں کا استعمال کرنے کی قابلیت۔
۵- ٹیکنیکل اسسٹنٹ (ایک جگہ) (مستقل)
ڈیپارٹمنٹ- سول انجینئرنگ۔
شرح تنخواہ- ۴۲۵-۱۵-۵۰۰-ای بی ۱۵-۵۶۰-۲۰-۷۰۰ روپے اور الاؤنسز
قابلیت- ایلکٹریکل/میکنیکل/الیکٹرانکس انجینئرنگ میں پوسٹ میٹرک ڈپلوما- اور ساتھ میں دو سال کا موزوں تجربہ
یا
متعلقہ ٹریڈ میں موزوں ٹریڈ سرٹیفکیٹ اور اس کے ساتھ سات سال کا موزوں تجربہ۔
نوٹ- موزوں افراد کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔
۶- ہارٹی کلچر اسسٹنٹ (ایک جگہ) (مستقل)
ڈیپارٹمنٹ- لینڈز اینڈ گارڈن۔
شرح تنخواہ- ۴۲۵-۱۵-۵۰۰-ای بی-۱۵-۵۶۰-۲۰-۷۰۰ روپے اور الاؤنسز
قابلیت- کسی تسلیم شدہ ادارے سے بی ایس سی (ایگریکلچر میں) جس میں ہارٹی کلچر بحیثیت ایک مضمون کے رہا ہو اور ساتھ ہی ساتھ کسی تسلیم شدہ/گورنمنٹ کے گارڈن میں کام کرنے کا دو سال کا تجربہ ہو۔
۷- ٹیکنیکل اسسٹنٹ (ایک جگہ) (مستقل)
ڈیپارٹمنٹ- ریڈیالوجی

شرح تنخواہ- ۴۲۵-۱۵-۵۰۰-ای بی-۱۵-۵۶۰-۲۰-۷۰۰ روپے اور الاؤنسز

قابلیت: ا- سائنس کے ساتھ گریجویٹ

۲- میڈیکل لیب ٹیکنالوجی میں ڈپلوما

۳- کسی تدریسی ادارے میں تین سال کا عملی تجربہ-

نوٹ:- موزوں افراد کو انٹرویو سے قبل پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا-

۸- ٹیکنیکل اسسٹنٹ (اسٹور) (ایک جگہ) (مستقل)-

ڈپارٹمنٹ- آبسٹیٹرکس اینڈ گائناکولوجی-

شرح تنخواہ:- ۴۲۵-۱۵-۵۰۰-ای بی-۱۵-۵۶۰-۲۰-۷۰۰ روپے اور الاؤنسز

قابلیت (۱) بی- ایس سی-

۲- اسٹور، میڈیکل کے سامان وغیرہ کی دیکھ ریکھ اور سامان کے استعمال کا تجربہ-

اگر کسی میڈیکل کالج میں کام کا تجربہ ہو تو قابل ترجیح ہوگا-

۹- پرائمری ٹیچر (ایک جگہ) (عارضی)

عبداللہ نرسری اسکول-

شرح تنخواہ:- ۳۳۰-۱۰-۳۸۰-ای بی-۱۲-۵۰۰-ای بی-۱۵-۵۶۰ روپے اور الاؤنسز

قابلیت:- لازمی:- ا- میٹرک ٹرینڈ-

۲- کسی انگلش میڈیم اسکول میں تدریس کا دو سال کا تجربہ

۳- اردو یا ہندی یا انگلش میڈیم کے ذریعہ تدریس کی اہلیت-

پسندیدہ:- ڈرائنگ پینٹ اور چارٹ وغیرہ تیار کرنے اور ہنر مندی کے ذریعے تعلیم دینے کی اہلیت-

۱۰- سینیئر ریسرچ فیلو (ایک جگہ) (عارضی) (ڈی- ایس- اے پروگرام کے تحت)-

ڈپارٹمنٹ:- فزکس-

شرح تنخواہ:- ۷۰۰ روپے ماہانہ (مقررہ)

۸۰۰ روپے ماہانہ (مقررہ) ان افراد کے لیے جو اعلیٰ تعلیمی لیاقت رکھتے ہوں)

قابلیت- ا- لازمی- ایم- ایس سی (فزکس) یا بی- ٹیک (الیکٹریکل انجینیرنگ/ الیکٹرونکس) یا ایم- اے (لنگوسٹکس میں) ان سب کے ساتھ ڈیجیٹل سگنل پروسسنگ میں کم از کم دو سال کا تحقیق کا تجربہ یا ایم- ٹیک (الیکٹریکل انجینیرنگ/ الیکٹرونکس)

پسندیدہ:- ایم- فل یا پی- ایچ- ڈی کی تھیسیز جمع کر دی ہو-

(۱۱) ڈرائیور- آئی ریلیف کیمپ (ایک جگہ) (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید)

ڈپارٹمنٹ آپتھلمالوجی انسٹی ٹیوٹ-

شرح تنخواہ:- ۲۶۰-۶-۲۹۰-ای بی-۶-۳۲۶-ای بی-۸-۳۹۰-۱۰-۴۰۰ روپے اور الاؤنسز

قابلیت:-

ا- لازمی- ا- پڑھا لکھا ہو

۲- ہلکی / بھاری گاڑیوں کے چلانے کا لائسنس

۳- ہلکی اور بھاری گاڑیوں کے چلانے کا کافی تجربہ اور خصوصی طور پر ایمبولنس چلانے کا تجربہ

۴- اردو، ہندی اور انگریزی زبان میں کام کرنے کی صلاحیت

پسندیدہ :- موٹر مکینک کا تجربہ۔

نوٹ :- موزوں افراد کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

غیر معمولی قابلیت اور تجربے کے حامل افراد کو شروع ہی سے اعلیٰ تنخواہ دی جا سکتی ہے۔

جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا، ان کو ایک سیکنڈ کلاس کا ایک طرف کا کرایہ بطور ٹی۔ اے دیا جائے گا۔

مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس کے دفتر سے نقد ادائیگی -/۵ روپے برائے اسامی نمبر ۹ اور باقی ماندہ اسامیوں کے لیے -/۳ روپے (مسلم یونیورسٹی) کے فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ یا فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام اسی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر (جو کراس کیا ہوا ہو) بھیج کر ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کر سکتے ہیں۔

ڈاک سے طلب کرنے کی صورت میں ۲۳×۱۰ سینٹی میٹر کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور ڈاک ٹکٹ چسپاں ہوں، بھیجنا ہوگا۔

درخواستوں کی وصولیابی کی آخری تاریخ

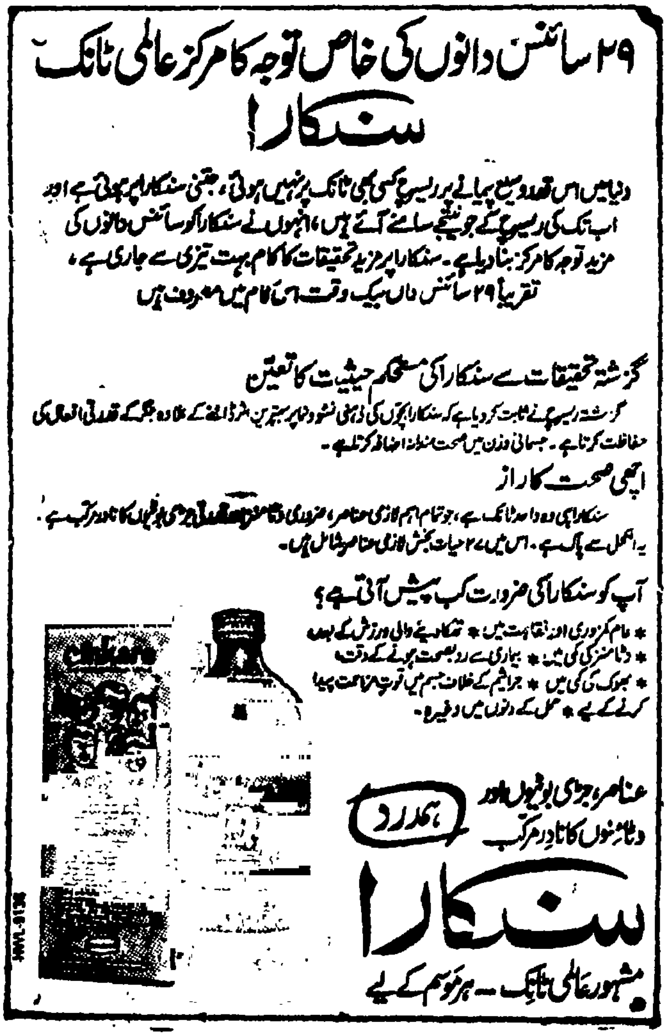
۲ر دسمبر ۱۹۸۶ء (آفس ٹائم تک) ہے

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں ناقابل قبول ہوں گی۔

سید شاہد علی
(رجسٹرار)

(692/1887)


بہار نوبے بی ٹانک
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے اور دانت
نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
دماغین
تمام دماغی کام کرنیوالوں
کے لئے نایاب تحفہ
شربت
نزلہ
کھانسی
زکام۔ نزلہ کے لئے
خون صفا
خون کی خرابی پھوڑے
پھنسی خارش اور
داد وغیرہ کی
دوا
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یو۔پی



Litho Colour Printers, Achal Tal, G. T. Road, Aligarh Phone : 4185



مجلس ادارت

(تہذیب الاخلاق اور نشانات)

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۵ * یکم تا ۳۱ دسمبر ۸۶ * مشترکہ شمارہ ۲۳-۲۴

بانی

سر سید احمد خاں رح

*

سرپرست

سید ہاشم علی

وائس چانسلر اے۔ایم۔یو

جوائنٹ ایڈیٹر

کبیر احمد جائسی

ایڈیٹر

اسرار احمد

اسسٹنٹ ایڈیٹر

شباب الدین

*

قیمت Rs. 3/-

زر سالانہ

انڈیا Rs. 30/-

بیرونی ممالک ہوائی ڈاک US $ 20/-

عام ڈاک US $ 6/-

تزئین و سرورق

*

ترسیل زر کا پتہ

ایڈیٹر

تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

(انڈیا)

مندرجات

اداریہ		۳
تربیت اطفال	سرسید احمد خاںؒ	۵
بے درد مقابلہ	جناب سید حامد	۸
البرٹ آئن اسٹائن	جناب سردار احمد (علیگ)	۱۱
خالد بن ولید	پروفیسر قاضی عبدالستار	۱۳
ایٹم	جناب ایچ احرار - آئی - اے رضوی ترجمہ جناب صغیر افراہیم	۱۸
جواب دوست	پروفیسر نسیم انصاری	۲۰
شیراز ہند	جناب بابو جیوتی سروپ سنگھ	۲۶
فزکس - ایک سائنس	جناب حبیب الحق انصاری	۲۹
ریاضی کی داستان	جناب طارق حنیف	۳۷
مولانا عبدالماجد دریابادی	ڈاکٹر محمد سالم قدوائی	۴۰
جبل پور کے نتائج کا تجزیہ	جناب احمد رشید شیروانی	۴۳
درس نظامی کے جدید تقاضے	مولانا غلام یحییٰ انجم	۴۵
بولتے پتھر	ڈاکٹر قمر غفار (علیگ)	۵۲
مسلمان جغرافیہ دانوں کی علمی و سائنسی خدمات۔	جناب ابو سعد خاں	۵۶
مسافر نواز بہتیرے	جناب شباب الدین	۶۱
مسلم یونیورسٹی کے شب و روز	جناب راحت ابرار	۶۳

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان سے بہرحال متفق ہو]

اداریہ

انسانی معاشرہ میں بے چینی اور بے اطمینانی پھیلا کر جو عوامل اس کو انتشار اور زوال کی طرف لے جاتے ہیں اُن میں افواہ سب سے زیادہ خطرناک اور تباہ کن عامل ہے۔ اسی افواہ کی وجہ سے بنے کھیل بگڑ جاتے ہیں، ایک بھائی دوسرے بھائی کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے، ایک انسان کا دوسرے انسان پر سے اعتماد اُٹھ جاتا ہے، لوگ تصویر کے صرف تاریک پہلو دیکھنے اور تلاش کرنے کے عادی بن جاتے ہیں، دلوں میں خاموش طوفان ہلچل مچانے لگتے ہیں، جذبات و احساسات آتش فشاں کے دہانے پر کھڑے ہو جاتے ہیں جن کو کسی چھوٹے سے چھوٹے واقعے کی ایک بے حقیقت سی چنگاری بھڑکا کر پوری پوری بستیوں کو خاکستر کر دیا کرتی ہے۔ افواہ کی ان سنگینیوں سے واقف ہونے کے باوجود ہم میں سے بیشتر لوگ اس کا فریب کھا ہی جاتے ہیں اور جب اس کی تباہی و بربادی سے پورا معاشرہ متاثر ہو چکتا ہے، جگہ جگہ تعصب اور نفرت کی آگ بھڑکنے لگتی ہے، انسانی خون پانی کی طرح بہہ چکتا ہے تو ہماری آنکھیں کھلتی ہیں اور ہم اپنے آپ کو ندامت کے بارگراں کے تلے دبا محسوس کرتے ہیں مگر ہماری ندامت ان نقصانات کی کوئی تلافی نہیں کراتی جو پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہوتا ہے۔

افواہ کی یہ کارفرمائی کچھ ہمارے ہی دور کا خاصہ نہیں ہے۔ اس کی کارفرمائی ہر دور میں رہی ہے جس کی ان گنت مثالیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے عرب کے گم کردہ راہ صحرانشینوں اور شہریوں کو اسلام کی دعوت دینی شروع کی تو جیسے جیسے لوگ آپؐ پر ایمان لا کر آپؐ کے گرد جمع ہونے لگے، شرارتی افراد نے طرح طرح کی افواہیں پھیلا کر ایمان لانے والوں کو صراطِ مستقیم سے بھٹکانے کی کوششوں کا آغاز کیا۔ جب شرپروں کی ریشہ دوانیاں حد سے بڑھ گئیں اور اس بات کا امکان پیدا ہونے لگا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ افواہوں سے متاثر ہو کر اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانے والے کسی ایسے ردِّعمل کے مرتکب ہو جائیں جس پر بعد میں ان کو ندامت ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کی رہبری کے لیے یہ حکم نازل ہوا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ۔

[اے ایمان والو اگر کوئی فاسق آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کر لیا کرو، کبھی کسی قوم کو نادانی سے کوئی ضرر نہ پہنچا دو، پھر اپنے کیے پر پچھتانا پڑے] (الحجرات ' ۶)

قرآن پاک کی اس واضح ہدایت کے بعد جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں اُن پر لازم ہے کہ وہ ہر خبر کو سن کر فوراً ہی اپنے ردّ عمل کا اظہار کرنا نہ شروع کر دیں۔ بلکہ اُس خبر کی خوب اچھی طرح تحقیق کر لیا کریں۔ پھر اس کے بعد اپنے کسی ردّ عمل کا اظہار کریں۔ ایمان لانے والوں کو اس بات سے بھی اجتناب کرنا چاہیے کہ وہ کسی فرد یا قوم کے ساتھ کوئی ایسی زیادتی نہ کریں جس پر بعد میں ان کو نادم ہونا پڑے۔

اگر قرآن پاک کی درج بالا آیات کو انسانی معاشرہ اپنا لائحہ عمل بنا لے تو وہ بہت سے فتنوں، فسادوں، تباہیوں اور بربادیوں سے بچ سکتا ہے۔ نجانے کتنی جانیں ایک معمولی سی افواہ کی بنا پر ضائع ہو جاتی ہیں، لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں کی املاک چشم زدن میں جل کر راکھ ہو جاتی ہیں، زخمیوں کے پشتے لگ جاتے ہیں اور ہر طرف خوف وہراس کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ کہیں کوئی ناگہانی حادثہ ہوتا ہے اور کوئی شخص کسی ٹرک، موٹر کار یا بس کے نیچے آ کر زخمی یا ہلاک ہو جاتا ہے تو فوراً یہ افواہ گردش کرنے لگتی ہے کہ مرنے یا زخمی ہونے والا ایک فرقے سے تعلق رکھتا ہے اور ٹرک یا بس ڈرائیور کسی دوسرے فرقے سے۔ پھر کوئی شخص اس بات کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ اصل حادثے کی تحقیق کرے اور اس کے اسباب وعلل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ فوراً نعرے بازی شروع ہو جاتی ہے، تھانے کا گھیراؤ ہوتا ہے، بسوں اور ٹرکوں کو نذر آتش کیا جانے لگتا ہے اور جب جوش، ہوش پر پوری طرح حاوی ہو جاتا ہے تو انسانی جانوں کی باری آتی ہے اور بے قصور لوگ مارے جانے لگتے ہیں اور بستیوں سے مل کی چمنیوں جیسا دھواں اُٹھنے لگتا ہے۔ جب افواہ کا یہ تانڈو ناچ ختم ہو جاتا ہے اور طوفان گزر جانے کے بعد چہار طرف مکمل خاموشی چھا جاتی ہے تو حساس دل رکھنے والے افراد ندامت میں غرق ہو جاتے ہیں کہ یہ کیسی غلطی ان سے سرزد ہو گئی مگر اس کی تلافی ان کے ہاتھوں میں نہیں ہوتی۔

ہمارے معاشرہ کی چھوٹی چھوٹی اکائیاں تک افواہوں سے متاثر ہوتی ہیں۔ مدرسے، اسکول، کالج، یونیورسٹیاں، اسپتال، کچہریاں، کارخانے غرض انسانی معاشرے کی ہر اکائی میں اسی طرح کی صورت حال سامنے آتی رہتی ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ بات بہت معمولی ہوتی ہے مگر اس کو مشتہر اس انداز سے کیا جاتا ہے کہ وہ ایک سنگین اور بھیانک چیز بن کر سامنے آتی ہے جب اس کی سنگینی کا احساس کر کے اس پر ردّ عمل کا اظہار کیا جاتا ہے تو جذبات کا طوفان جب تک پوری طرح تباہی و بربادی نہیں پھیلا لیتا کسی طرح فرو نہیں ہوتا۔ پھر ندامت کا دور شروع ہوتا ہے مگر ظاہر ہے ندامت، نقصانات کی تلافی نہیں کر سکتی۔

جو لوگ قرآن پاک کو کتاب ہدایت مانتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اگر صرف وہی لوگ خبروں کی اچھی طرح تصدیق کرنے کے بعد ہی اپنے ردّ عمل کا اظہار کرنے لگیں تو اس کا اثر دوسرے لوگوں پر بھی پڑے گا اور دھیرے دھیرے ہمارا پورا معاشرہ اس فکر کے سانچے میں ڈھلنے لگے گا۔ جب افواہوں کی کارفرمائی پر قابو پا لیا جائے گا تو نہ فرقہ وارانہ فسادات کو ہوا مل سکے گی نہ ہی انسانی معاشرہ میں ہلچل پیدا کرنے والے افراد کو کوئی ذہنی غذا۔ ہم مسلمانوں کا خیال ہے اور بالکل درست خیال ہے کہ ہمارا رب سارے جہانوں کا پالن ہار ہے، ہمارے رسولؐ سارے عالموں کے لیے رحمت اور ہم ان کے پیرو خیر الامت ہیں۔ خیر الامت ہونے کی وجہ سے یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم قرآنی تعلیمات پر سختی سے عمل کریں اور اس کے بتلائے اور دکھلائے راستے پر چلنے کی کوشش کریں تاکہ خیر الامت ہونے کی وجہ سے ہم پر جو فریضہ عائد ہوتا ہے اس سے عہدہ برآ ہو سکیں۔

کبیر احمد جائسی

سرسید احمد خاںؒ

تربیتِ اطفال

اگر ہم اس بات پر خیال کریں کہ انسان کے عیوب، مثل کالے بادلوں کے، جمع ہو کر ہم ہی پر برستے ہیں، تو دنیا سے انسانوں کے عیوب بہت کم ہو جاویں؛ اور اگر ہم مرے ہوئے لوگوں کی آواز پر کان دھریں، اور سمجھیں کہ وہ قبروں میں پڑے ہوئے زبانِ حال سے کیا کہہ رہے ہیں، تو شاید ایک بھی بُرائی دنیا میں نہ رہے۔

افسوس! کہ ہماری آنکھیں اندھی اور ہمارے کان بہرے ہیں!

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جب وقت گزر جاتا ہے، تو بہت سی باتوں کا پچھتاوا آتا ہے، کہ افسوس! ہم نے یہ نہ کیا، اور وہ نہ کیا؛ اور اس وقت پچھتانے سے کیا ہوتا ہے، کیوں کہ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا، اور لاعلاج رنج کا نہایت ہی جانکاہ رنج ہوتا ہے۔ پس؛ اگر ہم ایسے سخت رنج سے بچنا چاہیں، تو اس کا علاج صرف یہی ہے کہ موجودہ وقت کو غنیمت جانیں ؎

غنیمت داں ہمیں دم را کہ حالست!

یہ بات جو ہم نے کہی ٹھیک ٹھیک انسانوں کی طفولیت کی حالت سے نہایت ہی مناسبت رکھتی ہے؛ اس لیے، کہ جو عمر اور وقت تربیت کا ہے، جب وہ گزر جاتا ہے تو بجز لاعلاج رنج رہ جانے کے اور کچھ نہیں ہوتا؛ اور پھر ان کا ناتربیت یافتہ رہنا مثل کالی گھٹا کے ہم پر گرجتا ہے، اور ہم پر برستا ہے؛ اور کسی کے گھر کو بہا دیتا ہے اور کسی کے خانماں کو جلا دیتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی تمام چیزوں میں قدرتی تبادلہ ہوتا رہتا ہے؛ اور بجز انسان کے ایسی اور کوئی چیز نہیں ہے؛ جس کو اس تبادلے میں کچھ دخل ہو۔ اگرچہ انسان کو کسی چیز کے پیدا کرنے کی طاقت نہیں ہے، مگر اس میں اتنی قدرت ہے کہ بہت سی چیزوں کو اپنے اختیار اور قابو میں کر کر، اس قدرتی تبادلے میں شریک ہو۔ انسان ہی ایسا وجود ہے جو تھوڑا بہت کارخانۂ قدرت کے بگاڑنے یا سنوارنے میں دخل رکھتا ہے۔ وہی ایسا ذی عقل اور ذی شعور مخلوق ہے، کہ دنیا کی آئندہ کی رفتار کو روک سکتا ہے؛ یا ترقی کر سکتا ہے؛ یا ابتر و خراب حالت میں ڈال سکتا ہے۔

یہ اقتدار اس ناکامل اور فانی وجود کا، جیسا کہ لڑکوں کے تربیت یافتہ یا ناتربیت یافتہ رکھنے سے ظاہر ہوتا ہے، ایسا اور کسی چیز سے ظاہر نہیں ہوتا۔ جب کہ ہم لڑکوں کی حالت پر غور کرتے ہیں، اور ان کی بھولی بھالی اور سیدھی سادی طبیعتوں کو ہر ایک قسم کے گناہ سے پاک پاتے ہیں، اور ہر قسم کی تربیت کی استعداد اُن میں دیکھتے ہیں، تو ہم کو خدا کی کامل قدرت کا نمونہ دکھائی دیتا ہے، اور یقین ہوتا ہے کہ وہ اس ذات کامل کی دلی بخشش کی ہوئی چیزیں ہیں۔ اس کے بعد، ایک زمانہ تک وہ ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔

ہمارے سامنے ان کی عقل و فہم کی ترقی ہوتی ہے، اور ہماری تعلیم و تربیت ان میں اثر کرتی ہے۔ اگر، یا تو اچھی اچھی مثالوں کے دیکھنے سے شروع ہی سے ان میں عمدہ عمدہ عادتیں اور خصلتیں بیٹھ جاتی ہیں، اور یا بُری بُری نظیروں کے دیکھنے سے شروع ہی سے ان میں بدعادتیں اور خراب خصلتیں پڑ جاتی ہیں۔ بہرحال لڑکپن کا موسم نکل جاتا ہے؛ اور جو کچھ کہ لڑکوں نے ہماری صحبت اور تربیت سے نیک یا بد حاصل کیا ہو، اس کا اثر دنیا میں رہ جاتا ہے۔

لڑکپن کے زمانے میں، جو عمر کے سات برس سے پندرہ
تک ہے، وہی ایسا زمانہ زندگی کا ہے، جس میں آئندہ کی
دی کے لیے زیادہ تر کوشش ہو سکتی ہے۔ اس زمانے میں لڑکوں
ل ہر چیز کا متلاشی رہتا ہے، حافظہ تیز ہوتا ہے، قوتِ غور
یدا ہوتی ہے؛ اچھی عادتوں کا دیکھنا، اور عمدہ عمدہ نظیروں سے
یت پانا، جس کو عموماً نیک صحبت کہتے ہیں؛ نہایت ہی موثر ہوتا
یہ زمانہ لڑکوں کے لئے ذہنی وعقلی اور اخلاقی تخم ریزی کا ہوتا
کیوں کہ اس وقت تعلیم کو دل نہایت جلد قبول کرتا ہے، اور اس
کو، جس میں آئندہ نہایت عمدہ عمدہ پھل پھول پیدا ہوں گے،
جلد اُگا دیتا ہے۔ لیکن اگر اس زمانے میں تربیت نہیں ہوتی
بہت ہی کم فائدہ ہوتا ہے؛ کیوں کہ جوں جوں دن گذرتے
ہیں، عادت میں مضبوطی آتی جاتی ہے، یہاں تک کہ آخر کار
طبیعت سے مل جاتی ہے، اور طبیعت ثانی کہلاتی ہے، جس
ا نہایت ہی دشوار ہے۔

ایک نہایت لائق شخص کا حکیمانہ قول ہے کہ:

"لڑکپن کی طبیعت کتنے بڑے امر اہم کی چیز ہے، کہ
آئندہ کی بھلائی یا برائی اسی کی احتیاط و عدم احتیاط
پر منحصر ہے، جو لڑکوں کے مربیوں کی طرف سے ہوتی
ہے۔"

لوگ کہ قومی تربیت یا قومی ترقی کے خواہاں ہیں، ان کا سب
کام یہی ہے کہ لڑکوں کی تربیت کے لیے عمدہ انتظام کریں۔
ہم کو آئندہ کی بہبودی کی توقع ہے؛ ورنہ ہم پر یہی مثل
آتی ہے کہ "میاں! کہیں بوڑھے طوطے بھی پڑھتے ہیں"۔
ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں تربیتِ اطفال کا کوئی ذریعہ موجود
ہے، اور بڑا سبب اُن کی حالت کے تباہ ہونے اور اولاد کے نالائق
آوارہ ہو جانے کا یہی ہے۔ ہم ان حالتوں کا ذکر نہیں کرتے، جن
ل آوارہ اور خراب ہو جاتے ہیں، کیوں کہ اس کو تو سب برا جانتے
ہم تو اس حالت کا ذکر کرتے ہیں جس میں غلطی سے لوگ سمجھتے ہیں کہ
لڑکے نے خوب تربیت پائی ہے۔ غلطی اس لئے ہے کہ حقیقت میں

وہ تربیت عمدہ تربیت نہیں ہے؛ اور یہی سبب ہے کہ ان کو کچھ
لیاقت نہیں آتی، اور ان کے دل میں اخلاقی فیاضی اور طبیعت کی
آزادگی اور دل کی کشادگی پیدا نہیں ہوتی۔ تمام قویٰ، جو اُن میں
خدا تعالیٰ نے رکھے ہیں، سب پژمردہ اور ناکارہ رہ جاتے ہیں؛ اور
رفتہ رفتہ، ان میں وہ قویٰ جن سے انسان اپنے کسی زمانہ عمر میں نام آور
اور دل چلا، اور عالی حوصلہ، غیرت والا ہوتا ہے، باقی نہیں رہتے۔

مسلمانوں میں اگر کسی شخص کی اولاد عوام الناس کے لونڈوں
میں کھیل کود سے بچے، اور اپنے ہی ہم جولیوں میں رہے، اور اپنے یا اپنے
ہمسر خاندان کی صحبت اُٹھائے، اور دو زانو بیٹھنا اور جھک کر سلام
کرنا، یا عین کو ٹھیک مخرج سے نکال کر "سلام علیک" کرنا اور ہاتھ
جوڑ کر مزاج شریف پوچھنا سیکھ جاوے، تو نہایت سعادت مند
اور تربیت یافتہ گنا جاتا ہے؛ اور جب اس کے ساتھ اس کو کچھ
لکھنا پڑھنا بھی آتا ہو، اور کسی میاں جی یا مُلّا سے پڑھا بھی ہو، تو وہ
تربیت کے کنگورہ پر پہونچا ہوا سمجھا جاتا ہے؛ اور اگر بخت و اتفاق
سے اس نے دو چار کتابیں زیادہ پڑھ لیں، اور "صدرہ" "شمس بازغہ"
پڑھنے لگے، تو پھر تو باوا جان پھولے بھی نہیں سماتے، اور لڑکے کا
"میاں مولوی" اور "میاں فاضل محمد" کے سوا اور کوئی نام ہی نہیں لیتے۔

مگر صرف اتنا ہی، جتنا کہ بیان ہوا، کافی نہیں ہے؛ بلکہ مفید
تربیت ہونے کے لیے اور بہت کچھ ہونا چاہیئے۔ پس اگر غور سے دیکھا
جاوے اور انصاف کیا جاوے تو یہ تربیت کچھ تربیت نہیں ہے۔
ایسی تربیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکوں کے خیالات مثل جانوروں
کے خیالات کے محدود ہو جاتے ہیں، اور کسی قسم کی ترقی کا مادہ ان میں
نہیں رہتا۔ ان کی حرکات مودبانہ صرف ایسے بندر کی سی حرکات
ہوتی ہیں، جن کو سلام کہنا، اور ادب سے بیٹھنا، اور کھڑے رہنا سکھایا ہو۔

ان حرکات میں ان اخلاقی اوصاف کا، جن سے انخود حرکاتِ
انسانی بلا تصنع قدرتی ادب و اخلاق کے مقتضیٰ پر ہوتی ہیں، کچھ بھی اثر
نہیں پایا جاتا؛ بلکہ انسان میں جو ایک مہذب دلیری اور مودب بہادری
اور ممدوح خودداری ہونی چاہیئے، جس کو مختصر لفظ "غیرت" سے تعبیر
کیا جاتا ہے، ایسے ادب سکھانے سے باقی نہیں رہتی۔ اس کی بابت

بعوض اس کے کہ بلند ہونے پر مائل ہو، پست ہونے پر رجوع کرتی ہے، جس کا بد اثر اس کی آئندہ عمر میں ظاہر ہوتا ہے۔ پڑھنا لکھنا آجانے سے، اور منطقی یا فلسفی ہو جانے سے، کامل تربیت خیال نہ کر لینی چاہیے، قطع نظر اس کے کہ علوم غیر مفیدہ، کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتے۔

صرف پڑھ لکھ لینے سے تربیت کامل نہیں ہو جاتی۔ بہت سے پڑھے لکھے ایسے موجود ہیں، جو بلحاظ تربیت کے، محض ایک کُندۂ ناتراش ہونے سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتے۔ پس تربیت کامل کے لیے، جیسا کہ علوم مفیدہ کا پڑھنا شرط ہے، ویسا ہی اس کے ساتھ لڑکے کی زندگی کا ایسے طور پر اور ایسی حالت پر بسر ہونا ضرور ہے، جس سے روز بروز اس کے خیالات کو وسعت ہوتی جاوے، اس کی امنگ بڑھتی جاوے، اس کے قویٰ شگفتہ و شاداب رہیں۔ غیرت، جو ایک بڑا جوہر انسان کا ہے، اور برائیوں سے بچانے کے لیے نہایت عمدہ اور سچا محافظ ہے، ہمیشہ ترقی پر رہے۔ ظاہری اخلاق اور مؤدبانہ حرکات، اوپر اوپر، مثل روغن قاز کے نہ لگائے جاویں، بلکہ مثل چشمۂ شیریں کے خود اندر سے نکلیں۔

نماز، روزہ، اور کتب مذہبی کا پڑھنا، فی نفسہٖ نہایت عمدہ چیز ہے؛ مگر جب اس کی تعلیم ایسے بد طریقے سے ہوتی ہے، جیسے کہ اب مسلمانوں میں مروّج ہے، اس سے بجز اس کے کہ بد تعصبات بڑھ جاویں؛ اور بعوض نیکی اور نیک دلی کے، صفاتِ ذمیمہ ترقی پکڑیں، اور مثل کانٹے دار سخت پوست کے دل کو گھیر لیں، جس میں نیکی اور رحم اور رقّت اور ہمدردی سچائی اور راست بازی مطلق اثر کرنے نہ پاوے، اور کچھ نتیجہ نہیں ہوتا۔ ایسا تربیت یافتہ شخص، بجائے اس کے کہ فخر اسلام ہو، ننگِ اسلام ہوتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو جہاں اپنی اولاد کی تعلیم کی فکر ہونی چاہیے، اسی کے ساتھ اس بات کی بھی بہت بڑی فکر لازم ہے، کہ زمانۂ تربیت اور تحصیلِ علم میں لڑکوں کی زندگی بسر کرنے کی کیا تدبیر کرنی چاہیے، جس سے مقاصدِ مذکورہ بخوب ترین وجوہ حاصل ہوں۔

راست باز، متدیّن، پرہیزگار، عالی ہمّت، مستقل مزاج، اور رنج و مصیبت میں ثابت قدم، ہونے کے لیے یہ بات ضرور ہے کہ لڑکوں کا دل اور ان کی طبیعت ان صفات پر بخوبی حاوی ہو جاوے؛ ورنہ تمام پند و نصائح اور نماز و روزہ نقش برآب ہوتا ہے، اور نہایت جلد سب میں فتور آجاتا ہے، اور تمام زندگی کی امیدیں اور بہبودیاں جاتی رہتی ہیں، اور اس کا سبب صرف یہی ہے کہ ان سے کہا گیا، پر اُن کو سمجھنے نہیں دیا گیا، کہ فلانی چیز درحقیقت عمدہ ہے، اور ہر چیز کی قدر صرف اس کی عمدگی ہی پر منحصر ہے۔

اگرچہ لڑکوں کی تعلیم کا فرض مقدم ان کے ماں باپ پر ہے، مگر جیسی تعلیم کہ مطلوب ہے، وہ بغیر اس کے کہ تمام قوم آپس میں متفق ہو کر اس کو قائم نہ کرے، ممکن نہیں ہے؛ اور اس لیے وہ فرض تمام قوم سے متعلق ہوتا ہے؛ اور کچھ شک نہیں ہے کہ ایسے سامان تعلیم کے موجود نہ ہونے سے تمام قوم گنہگار اور شرمسار ہے؛ اور اس لیے میں امید کرتا ہوں کہ اب لوگ ہوشیار ہوں گے، اور اس فرض کفایہ کے پورا کرنے پر، جو بسبب ضرورت و حاجت شدید کے رتبہ میں فرض عین سے زیادہ بڑھ گیا ہے، توجہ فرمائیں گے۔

> پولیٹکل امور میں کسی کالج کے طالب علموں کا کام نہیں ہے، بلکہ ان کو اپنے تحصیل علوم میں مشغول رہنا چاہیے۔ پولیٹکل امور ایسے نازک اور باریک ہیں کہ بڑی معلومات اور وسیع علم اور بہت سے تجربوں کے بعد اس میں رائے لگانے کا موقع ملتا ہے۔ جن کا علم ابھی کچا ہے وہ کیا رائے اس کی نسبت لگا سکتے ہیں۔
>
> سرسید

سید حامد

بے درد مقابلہ

راقم الحروف ابھی کچھ دن ہوئے دلّی سے سری نگر گیا تھا۔
دلّی میں خبریں آرہی تھیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اس بات
پر احتجاج ہو رہا ہے کہ میڈیکل کالج کے امسال داخلے میں مسلمانوں
ی تعداد سو میں پچاس سے بھی کم ہو گئی ہے۔ سری نگر پہنچا تو پتہ
بلا کہ ریجنل انجینئرنگ کالج کے داخلوں میں مسلمانوں کی تعداد
سو میں تیس رہ گئی ہے۔ اس پر ہڑتال ہوئی، ہنگامہ ہوا۔ کسی
ے یہ نہیں سوچا کہ قصور اربابِ اختیار کا نہیں ہے۔

ہایر سکنڈری کے مرکزی امتحان کی جو فہرستیں نکلتی
ی ان میں امتیاز سے کامیاب ہونے والوں میں مسلمانوں کا
م شاید ہی کبھی نظر آتا ہو۔

مقابلے کے امتحانوں میں کامیابی شاذ ہی مسلمانوں
چھوتی ہے۔ سول سروسز میں وہ ڈیڑھ فی صد پر قناعت کرتے
ہ۔ دوسرے امتحانوں کا مطلع اس سے کم تاریک نہیں۔

این سی۔ ای۔ آر۔ ٹی (تعلیمی تحقیق اور تربیت کی قومی انجمن)
لاحیت کی تلاش (ٹیلنٹ سرچ) کے لیے جو امتحان لیتی ہے اس
فہرست میں مسلمانوں کا حصّہ آٹے میں نمک سے کم ہوتا ہے۔

ٹیلی وژن پر ایک عرصے سے "کوئز" (سوال وجواب)
ایک پروگرام آتا ہے جس میں اسکولوں کالجوں کے طلبا وطالبات
کے زبانی امتحان میں شریک ہو کر داد آگہی دیتے ہیں۔ کوئی
لو آج تک ان پروگراموں کی زینت نہ بن سکا۔

ملک کی زندگی کے مختلف شعبوں میں ہماری شرکت واجبی
سی ہے۔ ملک کی منصوبہ بند ترقی کی اسکیموں سے ہم نے
برائے نام فائدہ اٹھایا ہے اور ملک کو ترقی دینے میں ہمارا
حصّہ بہت کم رہا ہے۔

اور تو اور، کھیل جو ہمارے بائیں ہاتھ میں تھے ہمارے
ہاتھ سے نکل گئے۔ بعض ٹیمیں مسلمانوں کے وجود سے پاک ہو چکی
ہیں، بعض دوسری ٹیموں میں ایسا لگتا ہے کہ، ایک یا دو مسلمان
تبرّک کے طور پر رکھ لیے گئے ہیں۔

مسلمان مقابلہ کیوں نہیں کر پا رہے ہیں، وہ پیچھے کی
طرف کیوں ہٹتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے قوار اور حوصلے کو
کم ہمتی اور بے دلی اور آرام طلبی نے کیوں گھیر لیا ہے،
پیش قدمی سے انھیں چڑ کیوں ہو گئی ہے۔ ان کی غیرت کو
کیا ہو گیا، تحقیر کا ہدف بنتے ہیں اور خوش رہتے ہیں۔ بے حسی
کا دبیز لبادہ اوڑھنے سے ان کا مدعا کیا ہے۔ کیا خون ان
کی رگوں میں جم گیا ہے کیا وہ بھول گئے کہ حرکت میں برکت
ہے۔ آخر وہ محنت سے جی کیوں چراتے ہیں۔ رات گئے تک تیل
کیوں نہیں جلاتے، پسینہ کیوں نہیں بہاتے، تعلیم میں دل کیوں
نہیں لگاتے؟

ہماری تعلیم اچھی نہیں ہو پاتی اس کے ذمّہ دار کچھ حد تک
ماں باپ ہیں، ایک حد تک استاد اور ایک حد تک ناساز گار
حالات۔ ماں باپ زیادہ تر بے پڑھے لکھے ہیں اور جو پڑھے
لکھے ہیں ان میں سے بہت سے بچّوں کی تعلیم اور تربیت کی طرف سے

غافل ہیں۔ استادوں نے بغیر آنکھ جھپکائے سوداگری شروع کردی ہے کہ اصل شے آمدنی ہے جو ہر مرحلے پر حلال مشکلات بن جاتی ہے، پڑھائی میں کون سر کھپائے، کودک مغزوں کو کون پڑھائے۔ انھیں نوکری تو ملنے سے رہی۔ اور سند تو مل کر رہے گی۔ حکومت کو یہ فکر ہے کہ کس طرح ڈگری کو ملازمت سے جدا کرے۔ اسے کیا خبر کہ ڈگری ریاضت اور دیانت دونوں سے کبھی کی الگ ہو چکی۔ ایک ملازمت باقی رہ گئی ہے، اس سے بھی الگ ہو جائے گی۔ ملک میں تعلیم کا معیار کوئی اونچا نہیں ہے، لیکن سب سے زیادہ خراب حالت اُن اسکولوں اور کالجوں کی ہے جنھیں مسلمان چلاتے ہیں۔

اتوار (۵ر اکتوبر) کو ناگپور گیا تھا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے اس پروگرام میں شریک ہونے کے لیے جس کا مقصد ہے مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمیوں کو مکالمہ کے ذریعہ دور کرنا۔ ناگپور کے شہریوں نے اس مکالمہ کا اہتمام کیا تھا۔ ایک صاحب مجھ سے ملنے آئے اور کہا کہ مہاراشٹر (مہاراشٹر کے اس حصہ کی طرف ان کا روئے سخن تھا جسے ودربھ کہتے ہیں) میں اردو میڈیم کے پرائمری اسکولوں کی پڑھائی عام پرائمری اسکولوں سے بھی بدتر ہے۔ جو لڑکے ان اسکولوں سے پڑھ کر نکلتے ہیں ان کو دوسرے اسکولوں میں داخلہ مشکل سے ملتا ہے اور مل جاتا ہے تو وہ اپنی جماعت میں سدا کمزور رہتے ہیں۔ یہاں انسان سوچنے لگتا ہے کہ ان اسکولوں سے اردو کا بھلا ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، یہ بات یقینی ہے کہ ان سے جو طالب علم نکلتے ہیں وہ مقابلے کے کام کے نہیں رہتے، بیچارے ٹھوکریں کھاتے ہیں، یا دھکے۔ ساری ذمہ داری ان استادوں کی ہے جو سنجیدگی، محنت اور تیاری کے ساتھ پڑھانے کے علاوہ سب کچھ کرتے ہیں۔

اس میں کوئی بات اچنبھے کی نہیں۔ معاشرہ جب انحطاط کی راہ پکڑتا ہے تو اس کے سارے عناصر متاثر ہوتے ہیں اور وہ عناصر کچھ زیادہ ہی جن کے یہاں جوابدہی کا نظام یا تو معدوم یا بہت کمزور ہو چکا ہے۔ انیسویں صدی، خصوصاً انیسویں صدی کے دوسرے نصف بلکہ چوتھے ربع میں مسلمان تعلیمی اعتبار سے اپنے بھائیوں سے اس قدر پیچھے نہ تھے اور یہی حالت بیسویں صدی کے نصفِ اول میں تھی۔

ہوا یہ کہ تقسیم کے بعد مسلمانانِ ہند کا شیرازہ بکھر گیا۔ درمیانی طبقہ جو ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے، ٹوٹ گیا۔ اس طبقے کے لوگ بیشتر پاکستان چلے گئے۔ یہ بات شمالی ہندوستان اور آندھرا پردیش پر صادق آتی ہے۔ جو ہنگامے ہوئے جو کشت و خون سرحد کے دونوں طرف ہوا، اس نے اس طرف کے مسلمانوں کے حوصلوں کو پست کردیا۔ اور آزادی کے بعد ۲۵ سال تک یہ سلسلہ جاری رہا کہ جن پڑھے لکھوں کو یہاں نوکری نہیں ملی یا جن کی جان یا کاروبار خطرے میں پڑا انھوں نے پاکستان میں جا کر پناہ لی اور روزگار حاصل کیا ۱۹۷۲ء کے بعد، خدا کا شکر ہے، کہ یہ سلسلہ ٹوٹ گیا اور فرار کی راہ مسلمانوں پر بند ہو گئی اور ان کے نوجوانوں نے یہ محسوس کرلیا کہ ان کو جینا ہے اور روزی پیدا کرنا ہے، اسی وطن میں جہاں وہ پیدا ہوئے ہیں اور جس کی خاک ایک روز اپنی آغوش ان کے لیے کھولے گی۔ لیکن پچیس سال میں وہ بہت کچھ کھو بیٹھے تھے۔ جو کچھ انھوں نے کھویا اسی کی فہرست لمبی ہے۔ اعتماد اور ولولہ اور حوصلہ اور افتخار اور امتیاز ان کے ہاتھ سے جاتا رہا؛ اُن کی مادری زبان ان کی دسترس سے دور کردی گئی اور وہ اس ذہنی نشو و نما سے محروم ہو گئے جو مادری زبان کے ذریعے آگاہی حاصل کرنے سے ظہور پذیر ہوتی ہے؛ حفاظت اور عافیت کی طرف سے انھیں یکسوئی حاصل نہ ہو سکی۔ ملازمتیں ان کی گرفت سے نکل گئیں۔ ان کی حالت وہی ہو گئی جو گھر میں بے گھر ہونے سے ہوتی ہے۔ انھوں نے بڑھتے ہوئے تعلیمی وسائل سے فائدہ کم اٹھایا کہ ان کی رہبری کرنے کے لیے کوئی صالح قیادت نہ اٹھی اور نصاب میں ایسی باتیں داخل ہوتی رہیں جو مسلمانوں کے دین، ان کے عقیدوں اور روایتوں کے خلاف تھیں۔ غرض یہ کہ وہ امتیاز اور انتشار کا شکار ہو گئے۔ بچوں کو گھر میں تعلیمی ماحول نہیں ملا، نہ تعلیمی امداد مل سکی۔

راقم الحروف نے حکومت سے کہا کہ مسلمانوں کو آبادی کے بقدر اگر ملازمتیں نہیں دی جاسکتیں تو اُن کے ذہین طالب علموں کو وظائف ہی دیے جائیں تاکہ وہ ملازمتوں کے لیے مقابلہ کرسکیں حکومت کا پہلا ردِّ عمل مثبت تھا، لیکن حکومت کے عمّال نے اس تجویز کی قبا کو ایک درجن نشستوں کے غشار سے ایک سال کے اندر پارہ پارہ کردیا۔

بعض ہمدرد مشورہ دیتے ہیں کہ مسلمان اردو میڈیم اسکول نہ چلائیں اور اپنے بچّوں کو عام اسکولوں میں بھیجیں۔ پھر ان کی زبان کا کیا ہوگا؟ یو۔پی میں اب کتنے طالب علم رہ گئے ہیں جو اردو جانتے ہیں؟ یہ بات سر آنکھوں پر کہ اردو ہندوستان کی زبان ہے صرف مسلمانوں کی نہیں۔ لیکن اس دلنواز بات کو نچوڑیے تو کیا ملا۔ یہ وعدہ تو نہیں ملا کہ اردو ملک کی زبان ہے تو ملک خود اس کی حفاظت کرے گا اور اسے فروغ دے گا۔ ملک تو دراصل اس کے برعکس کررہا ہے۔ مسلمان بھی اس کی حفاظت نہیں کر پا رہے ہیں وہ تو شکایتوں کا دفتر کھول دیتے ہیں، عرضیاں گزارتے ہیں، سائل کی حیثیت سے سرکار کی خدمت میں جاتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے اردو والوں کو محضروں اور عرضداشتوں کا راستہ دکھادیا، وہ ابھی تک اسی راستے پر چلے جارہے ہیں، بجائے اس کے کہ اردو کی ابتدائی تعلیم کا انتظام خود گھر اور محلہ میں کرتے۔ جب کسی کو عمل کا حوصلہ نہیں ہوتا وہ فریاد کرتا ہے، عرضی گزارتا ہے، ٹھوکریں کھاتا ہے۔

اِن سارے عوامل کا نتیجہ یہ نکلا کہ گزشتہ چالیس سال میں مسلمان تعلیمی اعتبار سے اتنی سال پیچھے ہوگئے۔ اب وہ مقابلہ کریں تو کس طرح؟ اُن انجینئرنگ کالجوں اور میڈیکل کالجوں میں جو اُن کے لیے کھولے گئے یا جو اُن علاقوں میں واقع ہیں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، ان کالجوں میں ان کا تناسب بڑھنے کے بجائے گھٹ رہا ہے۔ سرکاری ملازمتوں میں ان کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے اور مسلمانوں میں یہ احساس بڑھتا جارہا ہے کہ اپنے وطن میں نہ انھیں انصاف مل رہا ہے، نہ اپنا حق، نہ روزگار۔ یہ احساس کوئی صحت مند احساس نہیں ہے، نہ اس سے شخصیت کو فروغ ہوتا ہے۔ اگر وہ اس احساس کا اظہار کریں تو ان پر فرقہ پرستی کا الزام لگتا ہے اور بعض لوگ انھیں احسان فراموش بتاتے ہیں۔ کوئی پوچھے کس کا احسان ان کم نصیبوں نے بھلادیا۔ اظہار نہ کریں تو کڑھتے ہیں، سُلگتے رہیں۔

بہرکیف ایسی صورت حالات میں ابھی پچیس سال تک وہ لاکھ کوشش کریں تو بھی ملک کے اُن فرقوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے جو تعلیمی حیثیت اور مادّی وسائل میں ان سے بہت آگے ہیں اور یہ فاصلہ بڑھتا جارہا ہے۔ اب اس کے سوائے کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا کہ آئندہ پچیس سال تک ان کے بچّوں کو اچھے تعلیمی اداروں اور پروفیشنل کالجوں میں ترجیحی اعتبار سے داخل کیا جائے۔ اور ان کے ذہین طالب علموں کو قبل از وقت تعلیمی امداد دی جائے تاکہ وقت آنے پر وہ روزگار کے لیے مقابلہ کرسکیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہندوستانی مسلمان ہر اعتبار سے دن بدن گرتے چلے جائیں گے اور اپنے وطن عزیز کے لیے توانائی اور افتخار کا ذریعہ بننے کے بجائے اسے نادانستہ اور بے ارادہ کمزور اور سست رَو کرنے کا سبب بن جائیں گے۔ دس کروڑ افراد اگر پسماندہ جاہل، غیر مطمئن اور غیر محفوظ ہوں اور روزگار کی بہت سی راہوں کو اپنے اوپر بند پاتے ہوں تو ان کا مقدر تو بگڑے گا ہی، ملک بھی کیونکر ترقی کر پائے گا؟

اگر ہمارے اربابِ اقتدار اور ہماری لائقِ احترام اکثریت اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل اور بے قید زاویۂ نگاہ سے غور کرے گی تو اسے مسلمانوں کی صلاحیت سوز حق تلفی کا اندازہ ہوجائے گا، اور وہ غلط فہمیوں اور تنگ نظریوں کو خیرباد کہہ کر ہندوستان کے جسم کے ایک حصّے کو مفلوج ہونے سے بچائے گی۔ لیکن اس موہوم امید میں ہمارے لیے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے کا جواز نہیں ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنی بساط کے مطابق ہم میں سے ہر ایک اپنے حلقۂ اثر میں اپنے بچّوں کی صلاحیتوں کو بڑھائیں، ان کی وقت پر صحیح رہنمائی کریں اور انھیں منظم طور پر علمی امداد دیں —— بے درد مقابلہ نہ کسی کا انتظار کرتا ہے، نہ کسی کی رعایت۔

سردار احمد (علیگ)

البرٹ آئن اسٹائن

اس میں دو رائیں نہیں ہیں کہ البرٹ آئن اسٹائن ہی بیسویں صدی کے وہ عظیم ترین سائنس داں تسلیم کیے گئے ہیں جنھوں نے قدیم سائنس کے تمام مفروضات کو غلط ثابت کرکے حیات و کائنات اور انسان و خدا کے بارے میں علم طبیعات و ریاضیات کی زبان میں جن حقیقت افروز صداقتوں کا انکشاف کیا، ان سے ایک طرف مغرب کے فلسفہ اور سائنس کے ایوان کی بنیادیں ہل گئیں تو دوسری طرف مشرق کی روحانی و مذہبی حقائق کی سچائی ثابت ہوئی۔ لیکن بقول برٹرانڈ رسل:

"EVERYBODY KNOWS THAT EINSTEIN DID SOMETHING ASTOUNDING, BUT VERY FEW PEOPLE KNOW EXACTLY WHAT IT WAS THAT HE DID."

(ہر ایک جانتا ہے کہ آئن اسٹائن نے غیر معمولی کارنامے انجام دیے، لیکن کم ہی یہ جانتے ہیں کہ اس نے کیا کیا)

عام طور پر آئن اسٹائن کے افکار و نظریات کو نہ سمجھنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ طبیعات اور ریاضیات کے وقائع سے متعلق ہیں اور ریاضی کی زبان کے علاوہ اور کسی طرح ان کی تشریح ممکن ہی نہیں ہے۔ پھر بھی آئن اسٹائن کے نظریات کو مثالوں کے ذریعے اور آسان زبان میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

آئن اسٹائن نے یوں تو سائنس کی دنیا میں اپنے نظریات سے ایک ہلچل مچادی، لیکن ان کے تمام کارناموں میں سب سے عظیم اور آئن اسٹائن کی عالمی شہرت کا باعث بننے والا "نظریۂ اضافیت" ہے۔ یہ نظریہ ۱۹۰۵ء میں سامنے آیا۔ اس وقت آئن اسٹائن کی عمر صرف چھبیس برس کی تھی اور سوئٹزرلینڈ کے ایک دفتر میں معمولی کام پر مامور تھے۔ ویسے بھی آئن اسٹائن کو پندرہ سال کی عمر ہی سے روزی روٹی کی فکر میں بڑے پاپڑ بیلنا پڑے تھے اور طرح طرح کی صعوبتوں و ناکامیابیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن علم کا بے انتہا شوق اور علم ریاضی میں خداداد قابلیت نے عظمت و شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ "نظریۂ اضافیت" میں آئن اسٹائن نے بتایا کہ تمام حرکات کی حیثیت اضافی محض ہے۔ اگر اس کائنات میں "اجرام فلکی" کا وجود نہ ہوتا تو ہمیں اپنی زمین کی گردش کا علم نہ ہو پاتا۔ کیوں کہ حرکت کا تصور اضافی ہے، جو دوسری چیزوں کے تعلق کے بغیر ناممکن ہے۔ اس کو اور وسعت دیتے ہوئے آئن اسٹائن نے وقت کی اضافیت کے مسئلے کو بھی زیر بحث لیا ہے۔

وقت کی اضافیت سے مراد یہ ہے کہ اگر ایک ہی واقعہ کو ایک ہی وقت میں دو مختلف مقامات پر سے دیکھنے والے اپنے مشاہدے کی گرفت میں لانا چاہیں تو بیک وقت نہیں لا سکتے۔ کیوں کہ موقع، محل اور رفتار کے لحاظ سے وقت کی حیثیت اضافی ہو جاتی ہے۔ مثلاً کسی واقعے کے دو ناظرین میں سے ایک زمین پر تھا اور دوسرا ہوائی جہاز میں تھا۔ ان دونوں کو اس واقعہ کے نظر آنے میں وقت کا فرق شامل ہو جانا لازمی ہے۔ اس طرح کسی دور ستارے میں کوئی دھماکہ یا چمک ہوئی تو اس وقت زمین پر بسنے والے نہیں دیکھ سکتے کیوں کہ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہے۔ اس لیے جب زمین پر کوئی اس واقعے کو دیکھے گا تو اس وقت سے کچھ پہلے یا بہت پہلے ہی وہ واقعہ ظہور میں آچکا ہوگا۔ آج ہم

نئے نئے ستاروں کو جب دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ آج پیدا ہوئے ہیں تو ہماری غلط فہمی ہے۔ کیوں کہ درحقیقت یہ بہت پہلے عالمِ وجود میں آ چکے تھے۔ ہماری غلط فہمی وقت کی اضافیت کے علم کو نہ جاننے کی وجہ سے ہے۔

آئن اسٹائن نے ابعاد (DIMENSION) تین کے بجائے چار ثابت کیے۔ یعنی بلندی، طول اور عرض میں۔ چوتھی چیز وقت بھی شامل ہے۔ اس طرح زمان و مکان ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔

آئن اسٹائن نے نظریۂ نور کے تحت یہ بات بتائی کہ اس کائنات میں صرف روشنی یا نور وہ واحد چیز ہے جس کی رفتار میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ خواہ اس کا تجربہ کسی بھی وقت، مقام اور سمت میں کیا جائے۔ نیوٹن کے نظریات کو باطل قرار دیتے ہوئے آئن اسٹائن نے یہ ثابت کیا کہ اس کائنات میں سکون نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ہر ذرہ حرکت میں ہے۔ (علامہ اقبالؒ نے بھی کہا تھا۔
فریبِ نظر ہے سکون و ثبات + تڑپتا ہے ہر ذرّۂ کائنات)

ظاہر ہے کہ ایسی کائنات جہاں ہر چیز حرکت میں ہے اور سکون و ثبات کا نام و نشان نہیں ہے، وہاں رفتار، طول، جسامت مقدار اور وقت کی پیمائش صرف اضافی حرکت ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ ہاں اضافیت سے پاک اگر کوئی شئے ہے تو وہ "نور" یا "روشنی" ہے۔

حرکت کی اضافی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے آئن اسٹائن نے یہ ثابت کیا کہ ہر چیز کی جسامت مقدار اور اس کا طول اس کی حرکت کی تیزی پر موقوف ہے۔ مثال کے طور پر ایک ہزار فٹ لمبی ایک ٹرین روشنی کے مقابلے میں ½ کی رفتار سے جا رہی ہے۔ اگر اسے باہر سے کوئی شخص دیکھے گا تو اسے وہ صرف چھ سو فٹ لمبی ہی دکھائی دے گی۔ لیکن ٹرین میں بیٹھے ہوئے مسافروں کے لیے وہ ایک ہزار فٹ لمبی ہی رہے گی۔

آئن اسٹائن نے نظریۂ اضافیت کی بنیاد پر درج ذیل فارمولا پیش کیا۔
$E=mc^2$ جس میں E توانائی ہے، m کمیت اور c رفتارِ نور ہے۔ اس فارمولے نے ایٹم بم کی بنیاد ڈالی۔

سائنس کی اس عظیم شخصیت نے ستاروں اور کرنوں کی حرکت کے قوانین بھی معلوم کیے کہ مکان (SPACE) خمدار ہے اور گردش کرنے والے سیارے اسی طرح آسان راستوں کو اپنائے ہوئے ہیں، جس طرح پانی اپنے بہاؤ میں ڈھال اور نشیب کی طرف رُخ کرتا ہے۔ اس خمی بہاؤ کے نتیجے میں روشنی کی جو بھی کرن ایک ستارے سے سرگرمِ سفر ہوتی ہے وہ آخر میں پھر اسی ستارے کی آغوش میں واپس پہنچ جاتی ہے، اگرچہ اس آخری منزل کو پانے میں کروڑوں سال لگ جاتے ہیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ زمین پر ایک ہی سمت میں سفر کرنے والا انسان اپنی ابتدائی منزل سفر پر پھر واپس پہنچ جاتا ہے۔

آئن اسٹائن نے 'فوٹو الیکٹرک' کے بھی اصول متعین کیے جس کے نتیجے میں آج ہم "ٹیلی ویژن" کے کرشمے دیکھ رہے ہیں۔

۱۹۵۰ء یعنی اپنی زندگی کے آخری برسوں میں آئن اسٹائن جس نظریے کو ثابت کرنے میں منہمک تھے وہ تھا فطرت کی وحدت اور ہم آہنگی کا نظریہ۔ آخر کار وہ یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ چھوٹے سے چھوٹے ذرّے کے لیے جو طبعی قوانین ہیں وہی اس کائنات کے بڑے سے بڑے جرمِ فلکی کے لیے بھی ہیں لیکن اس کا پورا جائزہ اس لیے ناممکن ہے کہ ریاضی کا علم اس راز کو سمجھنے میں اپنے کو محدود و مجبور پاتا ہے۔

آئن اسٹائن نے غیر مذہبی ماحول اور گھرانہ میں پرورش پائی تھی اور یورپ کی دہریہ فضا میں جوان ہوئے تھے، لیکن ان کے نظریات روحانی اقدار کی سچائی ثابت کرتے ہیں اور خود آئن اسٹائن نے مذہب اور سائنس پر اپنی رائے درج ذیل الفاظ میں دی ہے۔

"SCIENCE WITHOUT RELIGION IS LAME AND RELIGION WITHOUT SCIENCE IS BLIND."

[مذہب کے بغیر سائنس لنگڑی ہے اور سائنس کے بغیر مذہب اندھا]

منکرینِ خدا کے سامنے جس طرح سائنسی استدلال سے آئن اسٹائن نے ایک خدا کے وجود کی حقیقت سمجھائی اور مذہب اور سائنس کے حقیقی رشتوں کی نشاندہی کی، وہ انھیں کا حصہ تھا۔ جس کی تفصیل اس مختصر مضمون میں ناممکن ہے۔

قاضی عبدالستار

بیسویں قسط

خالد بن ولید

مسجد نبوی جمعے کی نماز کی تیاری کر رہی تھی کہ فارس سے مجاہدین کی ایک جماعت اتر پڑی۔ امیر المومنین نے خطبۂ مبارک میں اطلاع دی کہ بنی ثقیف کے وہ شجاع جنھوں نے عراق و فارس کی فتوحات میں بڑے بڑے کام کیے ہیں۔ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ نماز کے بعد وہ تم کو خطاب کریں گے۔ مقرر نے قادسیہ کی جنگ کا ذکر چھیڑ دیا اور زور بیان میں کہہ گیا کہ ہم نے چند ہزار لشکر کے ساتھ ان ٹڈی دل فوجوں کو شکست دی، جن کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ سنتے ہی حضرت زبیر کھڑے ہو گئے۔

"اے شخص کیا بکتا ہے۔ ہمارے شیر نے (خالد) ابلہ، مذار، ولجہ، عین التمر، دومۃ الجندل، حصید، خنافس، مصیخ، ثنی، زمیل اور فراض کی لڑائیوں میں فارس کی وہ دس لاکھ شاہی فوجیں کاٹ کر پھینک دیں۔ جیسی فوجیں اور جیسے سالار تو نے خواب میں نہیں دیکھے۔ یہ مسجد گواہ ہے کہ جب تک فاتح اسلام عراق میں مقیم رہا، ہم نے کسی جمعے کی نماز فتح کی نوید کے بغیر نہیں پڑھی۔ اسی مسجد کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ جب تک ہمارا فاتح شام میں سپہ سالار رہا اور ہرقل سے شام خالی نہیں ہو گیا، ہم نے ہر جمعے کی نماز کسی میدان کسی قلعے کسی شہر کسی مہم کی فتح کی خبر کے ساتھ پڑھی ہے۔ فتح کا سیلاب دھیما پڑ گیا جب ہمارے شیر سے سپہ سالاری چھینی گئی۔ فتح کا سیلاب تھم گیا۔ اترنے لگا جب ہمارا فاتح تلوار کی خدمت سے معزول ہوا۔

اے شخص تو نے اور تیرے سالاروں نے اس ملک کے مقابلے میں جس کے دانت اور پنجے خالد توڑ چکا تھا اور جس کے میدانوں میں پشتینی سپاہیوں کے بجائے دہقان ہتھیاروں کی نوکری بجانے کھڑے ہو گئے تھے اور جن کے سالار آزمودہ اور جنگ آزما سپہ سالاروں کے بجائے عیاش امیر ہوتے شکست کھائی ہے۔ ایسی شرمناک شکست کھائی ہے جس کی نظیر سے تاریخ اسلام خالی ہے۔ تو نے اور تیرے سالاروں نے جتنے مجاہد فتح کیے ہوئے ملک کو سنبھالنے میں برباد کر دیے، ضائع کر دیے، ان کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ ہے۔ یہ بیس ہزار مجاہد ہمارے فاتح اسلام کی رکاب میں ہوتے اور وہ سپہ سالار اعظم ہوتا تو اب تک ہم بلاد مغرب فتح کر چکے ہوتے۔

اے شخص دعا دے اس آسمان کو جو ہمارے شیر کو کھا گیا اور ہم تجھ جیسوں کی بولیاں سننے پر مجبور ہوئے۔

اے شخص — ہمارے سامنے جنھوں نے فتوحات خالدی کا تماشہ دیکھا ہے اور اس مقدس مقام پر

جس نے فاتح اسلام کی فتوحات کا غلغلہ سنا ہے
احتیاط سے گفتگو کرنے کی عادت ڈال۔"

آخری جملہ کہتے کہتے چل پڑے۔ آہستہ آہستہ مسجد خالی ہونے لگی۔ امیر المومنینؓ چند اصحاب کبار کے ساتھ بیٹھے رہے۔ مدینے کی نبض دیکھتے رہے۔

اسی رات حاکم شام کے نام فرمان لکھا گیا کہ جس طرح ممکن ہو خالد بن ولیدؓ کو دار الخلافت روانہ کرنے کی تدبیر کریں۔ حاکم شام صحابیٔ اکبر تھا۔ امین الامت تھا۔ حکومت شام اس کے پانوں کی پاپوش تھی۔ دمشق کے گورنر یزید بن ابی سفیانؓ کو طلب کرکے خط ہاتھ میں دے دیا۔ یزید بن ابی سفیانؓ نے خط پڑھا اور عبد الرحمان بن خالدؓ کے حوالے کر دیا۔ عبد الرحمانؓ نے طلب نامے کو گرفتاری کا عنوان دے دیا۔ اور چشم زدن میں قنسرین سے القدس تک ان کو جو خالدؓ کا نام لے کر جی رہے تھے، خبردار کر دیا۔ پوری سیاست اور فراست کے ساتھ شام کے تیسرے بڑے شہر حمص کو مرکز بنا دیا کہ دمشق پر یزید بن ابی سفیانؓ اور بیت المقدس پر عمرو بن العاصؓ کے نام کا پرچم لگا تھا۔ چند روز میں سیف اللہ کے عاشقوں کے دستے اترنے لگے۔ جب ہزار ہا جاں نثاروں کی صفیں آراستہ ہو گئیں تب ایک رات عبد الرحمان بن خالدؓ معاویہ بن ابی سفیانؓ کے ساتھ خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمانِ خلافت پیش کر دیا۔ انھوں نے خط پڑھا اور مسند پر ڈال دیا۔ اور مسکرائے۔

"ابن حنتمہ (حضرت عمرؓ) کا خیال تھا کہ جب ہمارے
کاندھے سے سپہ سالاری کا علم اتارا جائے گا تو ہم
بنی مخزوم کے روایتی غیظ و غضب کا اظہار کریں گے
اور ایسی حرکت کے مرتکب ہوں گے جو تربیتِ رسول
کی شان کے خلاف ہوگی۔ ہم نے اس خیال کو باطل
کر دیا ــــ جامع دمشق میں ہمارے ساتھ جو
سلوک ہوا وہ اگر احد پہاڑ کے ساتھ ہوا ہوتا تو
دو نیم ہو جاتا۔ لیکن ہم نے اس طرح انگیز کر لیا،
جس طرح اصیل اونٹ ساربان کی مار برداشت کرتا ہے۔"

"یہ ابن حنتمہ کے ترکش کا تیسرا تیر ہے۔"

"نہیں ــــ یہ آخری تیر ہے۔"

"رب کعبہ کی قسم۔ خالد اس تیر کا ایک ہدف کی طرح
انتظار کر رہا تھا۔"

اور اٹھ کر خیمے کے دوسرے درجے میں چلے گئے۔ عبد الرحمان بن خالدؓ اندر جانے کے لیے اٹھے۔ لیکن معاویہؓ نے ہاتھ پکڑ لیا۔

ہر چند کہ امین الامت سلطنت شام کے وائسرائے تھے تاہم شام کی پوری حکومت یزید بن ابی سفیانؓ اور عمرو بن العاصؓ کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں تھی۔ یزید بن ابی سفیانؓ کو عمرو بن العاصؓ پر ذاتی فضیلت کے علاوہ اس لیے بھی برتری حاصل تھی کہ وہ دمشق کا گورنر تھا اور دمشق شام کا دار الامارت تھا اور ابی سفیان کا سایہ ایک چھتر کی طرح قایم تھا اور معاویہ بن ابی سفیان یزید کے دست و بازو تھے۔ عمرو بن العاص بظاہر حاکم شام سے معاملاتِ ملکی میں ہدایات لینے حاضر ہوئے تھے، لیکن درپردہ یزید کی دعوت پر سوار ہوئے تھے اور ابی سفیان کے ساتھ مقیم تھے۔ خالد بن ولیدؓ کو خط دے کر معاویہ بن ابی سفیانؓ/عبد الرحمان بن خالدؓ کے ساتھ دمشق کے قصرِ حکومت میں داخل ہوئے تھے کہ ابی سفیانؓ نے طلب کر لیا۔

موسم بہار اور "چشم مشرق" کا موسم بہار، سلطنتوں کی دلہن کا موسم بہار، دمشق کا موسم بہار ہلکی ہلکی خوشگوار خنک ہواؤں کے پہلوؤں میں اقحوان اور خزامی اور گلاب کی خوشبوئیں گدگدیاں کرتی ہوئی، ہاتھی دانت کے تختوں پر دیبائے سفید کا فرش لگا ہوا، سرمائی پرندوں کے پروں کے تکیے پڑے ہوئے اور ان سب پر دمشق کے چاند کی چاندنی کا وہ عالم کہ زبان عاجز۔ تختوں کے درمیان سفید رومی قالینوں کے حاشیوں پر پاپوشیں اتاری بھی نہ گئی تھیں کہ ابی سفیانؓ کی آواز چمک گئی۔

"قبل اس کے کہ تم سیف اللہ کا خیال پیش کرو۔
عمرو بن العاص کی سیاست اور فراست نے حکم
لگا دیا ہے۔"

معاویہ بن ابی سفیان نے نگاہ اٹھائی تو چاندی کے مرصع شمعدان
ں قد آدم کافوری شمع کی روشنی میں بیت المقدس کے گورنر کا پورا
رہ اور روشن ہو گیا تھا۔

"لیکن عبدالرحمانؓ کا قیافہ تو کچھ اور ہی کہہ رہا ہے!"

ابی سفیان نے چاندی کی چوکی پر رکھی ہوئی سینی غوری سے سیاہ انگور کا خوشہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں سامنے کے تخت پر بیٹھ کر تکیوں سے لگ گئے۔ معاویہ بن ابی سفیان نے آہستہ سے عرض کیا۔

"کیا حکم لگایا ہے آپ نے"

ر دوسری غوری سے ترنج کا دانہ اٹھا لیا۔

"اپنے باپ ہی سے پوچھ لو"

رو بن العاص آسمان کو اس طرح دیکھنے لگے جیسے اس پر بھی کوئی
م لگانے والے ہیں۔

"ان کا قول ہے خالد مدینے جائیں گے۔ جا کر رہیں گے"

ناویہ بن ابی سفیانؓ نے عمرو بن العاصؓ کو دیکھا جنھوں نے نظریں
بحالی تھیں کہ ایوان کے ایک دروازے کا مصری مخملیں پردہ
ٹھا اور یزید بن ابی سفیان آ گئے۔ ابی سفیان کے علاوہ سب
ڑے ہو گئے۔ وہ ابی سفیان کے پہلو میں بیٹھ کر عبدالرحمان اور
ویہ بن ابی سفیان کو باری باری دیکھنے لگے۔ پھر آہستہ سے
لے۔

"سیف اللہ کے ارادوں کا کچھ اندازہ ہو سکا؟"

"عبدالرحمان کا خیال ہے کہ وہ مدینہ جائیں گے"

"امیر بیت المقدس کا بھی یہی خیال ہے"

ید بن ابی سفیان نے سر جھکا لیا۔ عمرو بن العاص نے ایک تکیہ زانو
پر رکھ لیا اور ایک ایک لفظ اس طرح ادا کیا جیسے کسی ملک سے صلح
شرائط نامہ پڑھ رہے ہوں۔

"یزید ـ یاد رکھو کہ سیف اللہ سپہ سالار ہیں۔ ـــ سپہ سالار اعظم ہیں ـــ اور اس رتبے کے کر دنیا میں ان کا کوئی مثیل نہیں"

"یہ کون سی نادر بات کہہ رہے ہو"

"میں نادر بات کی تمہید عرض کر رہا تھا یعنی سپہ سالار اعظم غنیم کے منتخب کیے ہوئے میدان میں غنیم کی مرضی کے مطابق لڑنا اپنی عظمت کے خلاف سمجھتا ہے"

"اور زنجیروں کے بجائے عمامے سے ہاتھ بندھوا لینے کو عین عظمت خیال کرتا ہے"

ابی سفیان نے تلخی سے ٹکڑہ لگایا۔ عمرو بن العاص نے عبدالرحمان کو دیکھا اور کہا

"سیف اللہ کی بڑی بڑی تاریخی لڑائیوں کی فتح کا ایک بڑا راز وہ تحیر بھی ہے جو اچانک ان کی سپہ سالاری میدان جنگ میں پیدا کر دیتی ہے اور دشمن کے اعصاب ٹوٹ جاتے ہیں اور ایک ہی یلغار میں فیصلہ ہو جاتا ہے"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو"

ابی سفیان نے جھنجھلا کر سوال کیا۔

"میں نہیں قریش کا سردار زادۂ اکبر اور دمشق کا گورنر یہ کہنا چاہتا ہے کہ آپ شام سے اس طرح نکلیے کہ سیکڑوں نامی گرامی تلواریں دس دس کوس کے فاصلے سے آپ کے آگے پیچھے چل رہی ہوں، لیکن آپ کی رکاب میں ہوں۔ اور سیف اللہ کے مدینے میں اترنے سے پہلے مکّے سے طائف اور خزاعہ سے تیم تک تمام نامور قبیلوں کے نامدار آپ سے شام میں بڑے ہوئے اپنے بیٹوں اور بھائیوں اور بھتیجوں اور دوستوں کی خیریت معلوم کرنے آتے رہیں اور کسی نہ کسی بہانے سے قیام کرتے رہیں۔ قیام کو طول دیتے رہیں۔ نہ صرف آپ کی بلکہ بنی مخزوم اور بنی ہاشم کی قیام گاہیں ان کا مرکز بن جائیں"

عمرو بن العاصؓ کے خاموش ہو جانے کے بعد یزید بن ابی سفیانؓ

جیسے خود کلامی کرنے لگے۔

"یہ تو معمولی اعراب بھی جانتے ہیں کہ شب خون وہی کامیاب ہوتا ہے جو سوتے ہوئے دشمن کو دبوچ لیتا ہے۔ جب دشمن ہوشیار ہو جاتا ہے تو خود شبخون کا خون ہو جاتا ہے۔"

"ابی سفیان جس شخص کا نام ہے اس کے گھر میں امارت رہی ہے اور اس نے امارت کی ہے اور"

"قریش اسے بھولے نہیں ہیں جو بھول گئے تھے ان کو یزید کی امارتِ دمشق نے یاد دلانا شروع کر دیا۔"

عمرو بن العاصؓ نے سانس لی تھی کہ معاویہ بن ابی سفیانؓ نے فقرہ ٹانک دیا۔

"بیت المقدس کی امارت نے بھی یاد دلانا شروع کر دیا ہے۔"

ابی سفیانؓ نے تصدیق کی۔

"عمرو بن العاص سے کہتا رہتا ہوں کہ شہادت بہادری کا ثبوت نہیں ہے۔ بہادری کے غلط استعمال کی شہادت ہے۔ اور سیف اللہ کی ذات میرے دعوی کی دلیل اور یہ بھی کہ جتنے شیر شکار کیے جاتے ہیں اتنی لومڑیاں نہیں ماری جاتیں۔"

عمرو بن العاصؓ اور معاویہ بن ابی سفیانؓ اس طرح سن رہے تھے جیسے ذہین شاگرد نامور استاد سے سبق لیتے ہیں۔ عبدالرحمان اٹھے تھے تو یزیدؓ نے تالی بجائی اور رومی غلاموں کا ایک پرا شتایق کی جھاڑیوں کی پشت سے نکل کر کھڑا ہو گیا۔

خیمے پر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سن کر سیف اللہ ٹہلتے ٹہلتے رک گئے۔ دیبائے سرخ کے قدِ آدم حصار کے داخلے پر کھڑے ہوئے غلام نے عبدالرحمان بن خالدؓ کی آمد کی خبر دی۔ سیف اللہ نے آسمان کو دیکھا جو پورے چاند کا تاج پہنے ساری زمین کو جگمگا رہا تھا۔

"اشقر کو تیار کرو۔"

غلام کو حکم دے کر اندر چلے گئے۔ قعقاع بن عمرو کے بھیجے ہوئے سیاہ ایرانی موزے پہنے، سیاہ چرمی سینہ بند کے تکمے لگائے اور تلوار شانے پر ڈال کر باہر آ گئے۔ گھوڑوں اور سواروں کی جنبشوں نے رات کی خاموشی میں شور کا پیوند لگا دیا تھا۔ اشقر کی لگام ہاتھ میں لی تو غرور سے زمین کھرچنے لگا۔ کتنے دنوں بعد سر منظر گردن پر تھپکی دی۔ ایال میں انگلیوں سے کنگھی کی۔ ابھی وہ ناز کر رہا تھا کہ عیاض بن غنم ہتھیار لگا کر کتنے ہی سواروں اور کوتل گھوڑوں کے ساتھ سامنے آ گئے۔ سیف اللہ نے مسکرا کر دیکھا اور آہستہ سے حکم دیا:

"تم لوگ آرام کرو ۔۔ ہم ابھی ٹہل کر آتے ہیں۔"

وہ چہلیں کرتے جنگی گھوڑے کو پیار سے ڈانٹتے اور سہماتے قصرِ دمشق کے سامنے سے گزرنے والی شاہراہ پر آ گئے تھے کہ ایک طرف سے کچھ سوار گھوڑوں کو چھیڑتے نکل گئے۔ مڑ کر دیکھا تو سواروں کا دستہ دور پرچھائیوں کی طرح چلا آ رہا تھا۔

نوجوانی کی وہ حسین راتیں یاد آ گئیں جب وہ اسی طرح چاندنی کے نشے سے بیقرار ہو کر راتوں میں خاموشی سے اٹھتے۔ اپنے ہاتھ سے گھوڑے پر زین رکھتے اور ہتھیار لگا کر دبے پاؤں مکے سے نکل آتے اور رنجان کی وادی سے گزر کر لق و دق صحرا میں چاندنی کا تماشہ دیکھتے رہتے۔ باپ اور اعمام کے درجنوں غلام گھوڑوں پر چڑھے پریشان ڈھونڈتے پھرتے رہتے۔ اور صبح جب ولید کا سامنا ہوتا تو کیا قہر کا عالم کس قیامت کا منظر ہوتا۔ وہ بھی تو ایسی ہی رات تھی۔ نور سے تراشی ہوئی نشے میں ڈوبی ہوئی عجیب و غریب رات جس کی شام عجیب جس کی صبح غریب۔ تیسرا پہر رخصت ہونے کے لیے اونٹ کی مہار تھامے کھڑا تھا اور وہ عکاظ کے تماشے دیکھتا گھوم رہا تھا۔ اکھاڑے کے سامنے سے گزرا تو عمر (حضرت) اکھاڑے میں کھڑے للکار رہے تھے اور سب خاموش تھے لے عمر (حضرت) کا یہ طنطنہ پسند نہیں آیا۔ نیزہ گاڑ کر گھوڑے کی باگ اٹکا گی اور اکھاڑے میں کود پڑا۔ ایک ہی پکڑ میں زیر ہونے لگے تو پوری طاقت لگا کر الٹ دینا چاہا۔ عمر (حضرت) کے داہنے پیر پر قینچی ڈال دی اور زور کر کے ان کے داؤں کو سنبھالا تو ان کی چیخ نکل گئی۔ پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ لوگ دوڑ پڑے تھے۔ ہجوم ہو گیا تھا۔ چند سال

ہجے اور فن کشتی کے ماہر عمر بن خطابؓ کی عکاظ میں یہ پہلی اور آخری ہار تھی۔ بنی مخزوم کے پُرستائش نعروں کے درمیان گھوڑے پر سوار ہو کر چل دیا۔ اس سال میلہ بھی اتنے زور کا ہوا تھا کہ تو بہ! عکاظ' عکاظ کی حدود سے گزر کر مکے کی گلیوں تک آ گیا تھا۔ وہ اعراب کا پُر جوش رقص دیکھ کر اٹھ رہا تھا کہ بنو تمیم کا قافلہ گزرنے لگا۔ بنو تمیم کا شاعر بنو تمیم کی مفاخرت میں اتنے جوشیلے اور لحن کے ساتھ اشعار پڑھ رہا تھا کہ عورتیں تک داد دے رہی تھیں اور سننے والے ان کے ساتھ ہونے لگے تھے۔ وہ اپنے گھوڑے کی راسیں تھامے کھڑا تھا کہ روشنی کا ایک جھماکہ سا ہوا۔ جیسے سارے عکاظ کی مشعلوں اور روشنیوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھال دیا گیا ہو۔ ایک ہی پیکر میں اتار دیا گیا ہو۔ جیسے اس کی ساری لطافت پر اس کے ایک چہرے نے اپنی مہر لگا دی ہو۔ ساری دنیا ان وحشی اور معصوم آنکھوں کے سامنے ہیچ ہو گئی۔ جب وہ تھمتی تو زمین و آسمان تھم جاتے۔ جب وہ چلتی تو ساری کائنات رقص کرنے لگتی۔ گھوڑے کی راسیں اس کے سینے پر تھیں لیکن وہ چلنے لگا گھوڑے کی راسیں اسی طرح سینے پر تھیں لیکن وہ رک گیا کہ سامنے لگے ہوئے خیموں کی بستی میں سارا قافلہ بکھر گیا۔ کھو گیا۔ اس کا گھوڑا پتھر کے گھوڑے کی طرح زمین پر جم گیا۔ جس پر وہ سنگین مجسمے کی مانند نصب تھا۔ پھر چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ اس کی آنکھوں کی طرح چاروں طرف اندھیرا ہو گیا۔ اس کے دل کی طرح سب کچھ سنسان ہو گیا۔ لیکن وہ اسی طرح ثابت قدم رہا۔ چاند کی طرح تمام ستارے تھک تھک کر رخصت ہونے لگے۔ لیکن وہ اسی طرح قایم رہا۔ پھر ایک خیمے کا پردہ ہٹا جیسے آسمان پھٹ گیا سورج طلوع ہو گیا۔ سورج نے اسے دیکھا اور غروب ہو گیا۔ ساتھ ہی ایک ہاتھ نے اس کے ہاتھ سے لگام لے لی۔ گھوڑا چلنے لگا۔ اس کا خیمہ اس کا آسمان دور ہونے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ تلوار کھینچ کر اس شخص کی گردن اڑا دے لیکن وہ تو صمد تھا۔ اس کے باپ کا غلام۔ جو ولید پر آقائی کرتا تھا۔

دن گزر رہے تھے اس مجسمۂ نور کی تلاش میں راتیں بسر ہو رہی تھیں۔ اس کی کرنوں کے حساب میں۔ کہ وہ مرکز نگاہ رخصت ہو گیا۔ اس طرح رخصت ہوا کہ اس کی بصارت اپنے محافے میں لپیٹ کر رکھ لی اور وہ خالی خالی آنکھیں لیے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار گھومتا رہا۔ ماہ و سال کا چاک بھی گھومتا رہا۔ عکاظ کا میدان پھر قیامت ہو گیا۔ اب صبح کا آفتاب جوان ہونے لگا تھا۔ کرنوں کے سات رنگ نمایاں ہونے لگے تھے۔ وہ ابوسفیان کی دلہن کے ساتھ جواہر کی دوکان پر جواہرات پسند کر رہا تھا کہ اچانک تمام جواہرات کالے پڑ گئے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو آفتاب سوا نیزے پر اتر آیا تھا۔

ہندہ نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"کیا ہے:"

"کیا نہیں ہے؟"

ہندہ کی آنکھوں کے دنبالے کانوں تک چلے گئے۔ ابرو پیشانی پر چڑھ گئے۔ اس نے کچھ جواہرات پسند کیے ان پر کنکریاں رکھ دیں اور آگے بڑھ گئی۔ دیر کے بعد جب آنکھوں کو نگاہیں واپس ملیں تو اس نے دوکاندار سے پسند کیے ہوئے جواہرات کی قیمت پوچھی اور خریطے سے سونے کی مہریں نکال کر ڈال دیں۔ دوکاندار کو تاکید کی کہ اس سے کہنا کہ تمہارے ایک ابن عم نے قیمت ادا کر دی دوکاندار ولید کے بیٹے کے سامنے خاموش تھا۔ وہ عکاظ کی رات دیکھنے کی تیاری کر رہا تھا کہ ابوسفیان کا غلام آ گیا۔ دالان سے چبوترے کے نیچے تک قالین پڑے تھے۔ وہ دونوں مخمل کے تکیوں سے لگے بیٹھے تھے۔ سامنے کنیزیں رقص کر رہی تھیں اور داہنی طرف صحن میں غلام ہدف پر حربے پھینک رہے تھے۔ وہ ابوسفیان کے پہلو میں بیٹھا بھی نہ تھا کہ ہندہ کھڑی ہو گئی۔ ایک کنیز کو اشارہ کیا۔ کنیز نے چاندی کی رکابی کا سرپوش ہٹا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ سب وہی زیور تھے جو اس نے پسند کیے تھے جن کی قیمت اشرفیوں میں ادا کی تھی۔ ابوسفیان نے صراحی اور پیالہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ ہندہ کی آواز آئی

"مالک بن نویرہ نے یہ زیورات واپس کر دیئے ہیں کہ ام تمیم اسکی منگیتر ہو چکی" (جاری ہے)

ایچ - احرار آئی - اے - رضوی
ترجمہ / صغیر افراہیم

ایٹم

آج کل ایٹم، ایٹم بم، ایٹمی توانائی کا ذکر عام ہے۔ فطری طور پر آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہوگا کہ اصل میں ایٹم (جوہر) ہے کیا؟ آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ ایٹم کیا ہوتا ہے؟ آپ کرۂ ارض کی کسی بھی چیز کو لے کر تقسیم کرتے چلے جایئے۔ آخر میں آپ کو ایک چھوٹا سا ذرّہ ملے گا۔ لیکن یہ ذرہ بھی درحقیقت ایٹم نہیں ہے۔ اِس چھوٹے سے ذرّے کو آپ خوردبین (MICROSCOPE) کے نیچے رکھ کر بہت ہی چھوٹے چھوٹے ذرّوں میں توڑ دیے، آخر میں ایک ایسی حالت آجائے گی کہ وہ ذرّہ ہمیں خالی آنکھ (Naked - EYE) سے دکھائی دینا بند ہو جائے گا۔ مگر دلچسپ بات تو یہ ہے کہ یہ مختصر ترین ذرّہ بھی ایٹم نہیں ہے۔ حقیقت میں ایٹم تو اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ عام خوردبین سے بھی دکھائی نہیں دیتا۔ ایٹم کی جسامت کے اختصار کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پانی کی ایک بوند میں تین ہزار تین سو ارب (۳،۳۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰) ایٹم ہوتے ہیں اور صرف ایک بال کی موٹائی میں چھ لاکھ پچیس ہزار (۶،۲۵،۰۰۰) ایٹم آجاتے ہیں۔ آج سے دو ہزار سال قبل یہ اندازہ لگایا جاتا تھا کہ زمین کی ہر ایک چیز چھوٹے چھوٹے ذرّوں سے مل کر بنی ہے اور یہ ذرّے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ان کو پھر سے تقسیم نہیں کیا جاسکتا ہے مگر ایٹم کے بارے میں جدید نظریات قدیم خیالات سے مختلف ہیں۔

عہدِ قدیم کے سائنس دانوں کا یہ خیال تھا کہ ذرّہ مکمل طور سے ٹھوس ہے اور ہر ایک چیز کے ذرّے مختلف ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر سونا چاندی اور پانی وغیرہ کے ذرّے مختلف ہیں لیکن اب ان دونوں نظریوں کو صحیح تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔ مختلف اجزاء کے ایٹموں کے ملنے سے سالمہ (MOLECULE) بنتا ہے۔ جیسے آکسیجن (OXYGEN) کا ایک ایٹم اور ہائیڈروجن (Hydrogen) کے دو ایٹموں سے مل کر پانی کا ایک سالمہ بنتا ہے۔

دنیا میں صرف ایک سو نو فطری عناصر پائے جاتے ہیں سب سے کم وزن کا عنصر ہائیڈروجن ہے جب کہ سب سے وزنی عنصر یورینیم (URANIUM) ہے۔ اس کے علاوہ سائنس دانوں نے بہت سے مصنوعی عنصر (ARTIFICIAL - ELEMENT) بھی بنائے ہیں جو کہ یورینیم سے بھی زیادہ وزنی ہیں۔ عظیم سائنس داں ڈالٹن (DOLTON) کے مطابق بھی ایٹم ٹھوس اور ناقابلِ تقسیم تھے اور ان کا خیال تھا کہ کسی مقناطیسی قوت کے ذریعے وہ ایک دوسرے سے چپاں رہتے ہیں لیکن آج کے ایٹم کا تصور ڈالٹن کے ایٹم کے تصوّر سے مختلف ہے۔ آج ایٹم کو ناقابلِ تقسیم نہیں بلکہ کئی بنیادی ذرّوں سے مل کر بنا جانا جاتا ہے۔ اب یہ بات تحقیقات سے ثابت ہے کہ ایٹم تین طرح کے مختلف ذرّوں سے مل کر بنا ہے جن کو پروٹان (PROTON) نیوٹران (NEUTRON) اور الکٹران (ELECTRON) کہتے ہیں۔ پروٹان پر مثبت چارج (Posi - tive change) ہوتا ہے۔ نیوٹران پر کوئی بھی چارج نہیں ہوتا ہے جب کہ الکٹران پر منفی چارج (Negative change)

ہوتا ہے۔

ایٹم کے دو حصے ہوتے ہیں پہلے حصے کو جو ٹھوس اور وزنی ہوتا ہے مرکزہ (NUCLEUS) کہتے ہیں۔ دوسرے حصے میں الیکٹران اپنے اپنے خانوں میں گردش کرتے ہیں۔ ہر ایک عنصر میں پروٹان اور الیکٹران کی تعداد الگ ہوتی ہے۔ مثلاً ہائیڈروجن کے ایٹم کے مرکزہ میں ایک پروٹان ہوتا ہے۔ جب کہ ایک الیکٹران اپنے دائرے میں گردش کرتا رہتا ہے۔ ہیلیم (HELIUM) کے ایٹم کے مرکز میں دو پروٹان اور دو نیوٹران ہوتے ہیں جب کہ دو الیکٹران اس کے چہار جانب دائروں میں لگاتار گردش کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح کاربن (CARBON) کے مرکزہ میں چھ پروٹان اور چھ نیوٹران ہوتے ہیں۔ جب کہ چھ الیکٹران اس کے دائروں میں برابر چکر لگاتے رہتے ہیں۔ کسی ایٹم میں پروٹان اور الیکٹران کی تعداد برابر ہوتی ہے۔ جب کہ نیوٹران کی تعداد الیکٹران اور پروٹان کی تعداد سے زائد بھی ہو سکتی ہے جیسے کہ مینگنیز (Manganese) کے ایک ایٹم میں الیکٹران اور پروٹان کی تعداد پچیس پچیس ہے جب کہ نیوٹران کی تعداد تیس ہے۔ ایک ایٹم کے وزن کا 9959 فیصد حصہ مرکزہ کا ہوتا ہے اور ایک الیکٹران کا وزن پروٹان کے وزن کا ۱۸۳۶ واں حصہ ہوتا ہے۔ ہر ایک عنصر میں پروٹان الیکٹران اور نیوٹران کی تعداد مختلف ہونے کی وجہ سے علیحدہ علیحدہ عنصر بنتے ہیں۔ مثلاً مینگنیز کے ایٹم میں پچیس پروٹان اور پچیس الیکٹران ہوتے ہیں۔ اگر ہم مینگنیز کے ایٹم سے کسی طرح ایک پروٹان اور ایک الیکٹران کم کر دیں تو کرومیم (Chromium) کے ایٹم میں بدل جائے گا۔

آج کل ایٹمی بھٹیوں سے توانائی (ENERGY) حاصل کر کے بجلی گھر بنائے جا رہے ہیں' لیکن یہ توانائی آتی کہاں سے ہے؟ آیئے ہم آپ کو اس کے بارے میں مختصراً بتاتے ہیں۔ درحقیقت ہر ایک ایٹم کی تقریباً پوری توانائی اس کے مرکزہ میں مرکوز ہوتی ہے۔ ان مرکزوں سے ہم توانائی دو طرح سے پیدا کر سکتے ہیں۔ ایک تو انہیں تقسیم کر کے جسے ہم انشقاق (FISSION) کہتے ہیں اور دوسرے دو جوہروں کے مرکزوں کو جوڑ کر جسے ہم گداخت (FUSION) کہتے ہیں۔

۱۔ مرکزائی انشقاق (NUCLEAR FISSION)

جرمنی کے سائنس داں ہارن (HARN) اور اسٹراس مین (STRASS MAN) نے ۱۹۳۹ء میں تحقیق کی کہ جب یورینیم پر آہستہ روی والے نیوٹرانوں سے بمباری کرائی جاتی ہے تو وہ کم وزن والے ایٹم دو عنصر میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ اس عمل کو مندرجہ ذیل طریقے سے ظاہر کیا جا سکتا ہے:

$$^{235}_{92}U + ^{1}_{0}n \rightarrow ^{143}_{56}Ba + ^{92}_{36}Kr + 3(^{1}_{0}n) + 200\ MeV$$

اس عمل کے ذریعے جو توانائی حاصل ہوتی اسے مرکزائی توانائی (NUCLEAR-ENERGY) کہتے ہیں۔

۲۔ مرکزائی گداخت (NUCLEAR FUSION)

ہلکے عنصروں کے مرکزائیوں کو ملا دینے پر بھاری مرکزائی بنتا ہے اس عمل (Process) کو مرکزائی گداخت کہتے ہیں۔ اس عمل کو مندرجہ ذیل طریقے سے ظاہر کیا جا سکتا ہے:

$$^{2}_{1}H + ^{3}_{1}H \rightarrow ^{4}_{2}He + ^{1}_{0}n + 1789\ MeV$$

مرکزائی توانائی دو طرح کی ہوتی ہے:

الف۔ بے قابو مرکزائی توانائی:۔ یہ توانائی کا بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے جسے قابو میں نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے یہ تباہ کن ہوتا ہے۔

ب۔ قابو میں رہنے والی مرکزائی توانائی:۔ مرکزائیوں کو منقسم کرنے کے لیے مرکزائی تعامل گر یا مرکزائی پائلس (NUCLEAR REACTORS- or NUCLEAR PILES) استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس قابو شدہ مرکزائی انشقاق سے جو توانائی حاصل ہوتی اس کو قابو میں کیا گیا ہے جس کا استعمال صحت مند کاموں کے لیے کیا جاتا ہے۔

ایٹمی پائل (ATOMIC PILE) یا مرکزائی تعامل گر (NUCLEAR REACTOR):۔ مرکزائی انشقاق اور مرکزائی گداخت سے غیر معمولی مقدار میں توانائی نکلتی ہے۔ اس توانائی کا استعمال تعمیری کاموں میں کیا جاتا ہے۔ ایسے سسٹم (مشین، تعامل گر) جن میں مسلسل ردِ عمل سے حاصل کی جانے والی توانائی کو قابو میں کیا جاتا ہے جوہری پائل یا مرکزائی تعامل گر کہلاتے ہیں۔

نسیم انصاری

جوابِ دوست

رائڈنگ کلب (یا اسکول) کا ذکر اس وجہ سے کیا کہ آپ کو علی گڑھ پھر یاد دلا دوں۔ اسکیٹنگ اور تیرنا بھی یہیں سیکھا۔ ذرا یاد کیجیے کہ ۱۹۴۲ء میں یونیورسٹی کے اولڈ بوائے اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری لیاقت علی خاں صاحب علی گڑھ آئے تھے اور ان کے لیے اسکیٹنگ شو کیا گیا تھا۔ اسکول کے بچوں کے علاوہ یونیورسٹی کے لڑکوں میں سے ڈھاکہ کے نواب عسکری بھی تھے۔ وہ فینسی ڈریس میں ہٹلر بنے تھے۔ میں نے گرلز کالج کی لڑکی کا لباس پہنا تھا انیس عمر نے بیرے کے کپڑے پہنے تھے اور سعید قادر نے شو پالش کرنے والے کے، جمشید منیر ایک یورپین خاتون کی وضع میں آئے تھے۔ انیس عمر تو اب دنیا میں نہیں رہے۔ سعید قادر پاکستان میں جنرل سعید قادر ہیں اور جمشید منیر یہیں انجینیرنگ کالج میں پروفیسر ہیں۔ اسکول میں ہم چار لڑکوں میں بڑی دوستی تھی۔ بدرالدین قادری، انیس عمر، سعید قادر اور مجھ میں۔ بدرالدین تو آج کل لاہور ہائی کورٹ میں ایڈوکیٹ ہیں۔ چند سال ہوئے ان سے کراچی میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہی محبت اور گرمجوشی کی تصویر جو بچپن سے میں اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہوں، سعید قادر تو شاید ہمیں بھول گئے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران علی گڑھ میں جو سب سے اہم تبدیلی ہوئی وہ کو سیاسی تھی کہ ایک دم سے ایسا معلوم ہونے لگا کہ سارے ملک کے رہنے والوں کے ساتھ ساتھ علی گڑھ کے پڑھنے اور پڑھانے والے بھی آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے بیتاب ہو رہے ہیں، لیکن اس سیاسی تبدیلی کے علاوہ کچھ اور باتیں بھی ایسی ہو رہی تھیں کہ جو بالکل نئی تھیں۔ اردو میں ایک نیا ادب جنم لے رہا تھا۔ خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو نے بالکل نئے انداز کے افسانے لکھنا شروع کیے تھے۔ اس سے پہلے حجاب اسمٰعیل (جو بعد میں حجاب امتیاز علی ہو گئیں) عظیم بیگ چغتائی اور ایم۔ اسلم کے افسانے پڑھے جاتے تھے۔ صحیح معنوں میں تو اردو میں افسانوں کو منشی پریم چند ہی نے مقبولیت بخشی تھی۔ ان کی پریم پچیسی اور پریم تیسی بہت شوق سے گھروں میں پڑھی جاتی تھی۔ گئودان اور چوگان ہستی دوسری لڑائی سے پہلے کے ناول تھے جو اس زمانے میں نکلے جب رتن ناتھ سرشار کے فسانۂ آزاد اور سیر کہسار کی مقبولیت ختم ہو چکی تھی اور اسی کے ساتھ عبدالحلیم شرر کے حسن انجلینا اور دوسرے تاریخی ناولوں کے چرچے بھی ختم ہو رہے تھے۔ شوکت آرا بیگم اور گدڑی کے لال کا تعلق بھی پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان والی نسلوں کے مذاق سے تھا۔

نئے لکھنے والوں کی علی گڑھ کے تہذیبی اسٹیج پر آمد بڑی دھماکہ خیز تھی۔ عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو کے

افسانے تو ہم اپنے بڑوں کی نظریں بچا کر پڑھتے تھے اور ر انگارے تو دیکھنے کو بھی نہیں ملتی تھی۔ جب اس کا تذکرہ ہوتا تو سب تمسخر کر دوسری باتیں شروع کر دیتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے فضا ایسی بدل گئی ڈپٹی نذیر احمد کی توبۃ النصوح اور مرآۃ العروس الماریوں کی زینت ہو کر رہ گئیں۔ گرمیوں کی چھٹی میں جب گھر جانا ہوتا تھا تو وہاں البتہ داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا پڑھنے کو ملتیں۔

نئے لکھنے والے الگ الگ طرح کے لوگ تھے اور ان کے افسانوں کے کردار ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ یہ لکھنے والے ترقی پسند کہلاتے تھے، باوجود اس کے کہ ترقی پسندی اسی طرح فیشن میں داخل ہو گئی تھی جیسے آج کل جینس کے نام کی پتلون۔ لیکن کوئی یہ نہیں بتاتا تھا کہ اس کی اصلیت کیا ہے۔ عام طور سے یہ خیال تھا کہ یہ سب ہندوستان میں ایک آزاد سماج بنانا چاہتے ہیں، جس میں غربت، افلاس، ریاکاری اور بدنفسی کا نام و نشان بھی نہ رہے۔ وہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔ کچھ دنوں کے بعد پتہ چلا کہ انیسویں صدی کے آخر کے یورپین خیالات اب ہندوستانی ادب پر اپنا اثر ڈال رہے ہیں۔ مارکس، فرائڈ اور ڈاروِن اپنی وفات کے پچاس ساٹھ برس کے بعد اب اردو کے ادیبوں کو متاثر کر رہے تھے۔

اس زمانے میں یونیورسٹی میں انگریزی کا شعبہ مرکز تھا ان یورپین خیالات کی اشاعت کا۔ خواجہ منظور صاحب محمود حسین صاحب، مختار حامد علی صاحب، بی۔ اے۔ خاں صاحب کے ذریعے نوجوانوں میں بھی نئی باتوں کے چرچے شروع ہو گئے۔ بشیر صاحب لائبریرین بھی اسی مذاق کے تھے۔ لیکن یہ سب کے سب اس زمانے کی سیاست سے بالکل علیحدہ رہتے تھے۔ انگریزی کے شعبے میں ایک ادبی انجمن لٹریری سوسائٹی کے نام سے قائم تھی۔ آپ بھی اس کے ممبر تھے اور مجھے بھی اس کا ممبر بنایا گیا تھا۔ مگر یہ بات تو عالمی جنگ کے بعد کی ہے۔ ابھی تو لڑائی کے زمانے کی باتیں ہو رہی تھیں۔

جیسے ہی یورپ میں جنگ چھڑی، یونیورسٹی میں ستار خیری صاحب اور ان کی بیگم حراست میں لے لیے گئے۔ بیگم جرمن تھیں ان کی چھوٹی بیٹی نعمت میرے ساتھ ظہور وارڈ میں پڑھتی تھی۔ نعمت کے علاوہ دو لڑکیاں اور بھی کلاس میں تھیں۔ ایک بشیر صاحب کی بیٹی ریحانہ اور دوسری ماسٹر محی الدین صاحب کی صاحبزادی ثریا۔ ریحانہ تو آج کل الٰہ آباد میں ڈاکٹری کی پریکٹس بڑی شان سے کر رہی ہیں۔ باقی دونوں پاکستان چلی گئیں۔

خیری صاحب کی ہمدردیاں شاید اس زمانے کے جرمنی حکمران پارٹی سے تھیں۔ انگریزوں کو ان کی ذات سے خطرہ محسوس ہوا اور وہ اسی لیے گرفتار کر لیے گئے۔ اس زمانے میں ایک خاکسار پارٹی بھی بنی جو بیلچے لے کر مارچ کرتے تھے اسکول کے کچھ لڑکے بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ تحریک کے لیڈر علامہ مشرقی تھے جن کا شمار ریاضی کے علماء میں ہوتا تھا۔

۱۹۴۰ء میں جب مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں ہوا تو میرے والد کے چچا مولوی عنایت اللہ صاحب مجھے بھی اپنے ساتھ لاہور لے گئے تھے۔ وہ مسلم لیگ کونسل کے ممبر تھے۔ لاہور میں خاکساروں نے صوبائی حکومت کے خلاف کوئی تحریک شروع کی تھی۔ اس تحریک کو سکندر حیات خاں کی حکومت نے سختی سے کچل دیا تھا۔ اسی زمانے میں پولس نے خاکساروں پر گولیاں چلائی تھیں اور کچھ لوگ مارے بھی گئے تھے۔ اس لیے بہت سے مسلمان سکندر حیات خاں سے ناخوش تھے۔ بہرحال مسلم لیگ کے اجلاس میں سر سکندر نے بڑی شان سے شرکت کی اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے انھوں نے پاکستان کے ریزولیوشن کی تائید بھی کی تھی۔

لاہور کا ریزولیوشن پاس ہونا تھا کہ مسلمانوں میں جیسے بجلی کی ایک لہر دوڑ گئی ہو۔ ادھر کانگریس نے اس کی سخت

مخالفت شروع کردی۔ جوں جوں کانگریس کی مخالفت بڑھتی جاتی تھی مسلم لیگ مسلمانوں کے لیے اتنی دلکش ہوتی جاتی تھی دیکھتے ہی دیکھتے یہ عوامی جماعت بن گئی۔

کانگریس کے پاکستان ریزولیوشن کی مخالفت کی۔ وجہ جمہوریت اور نیشنلزم کے وہ تصورات تھے جن کے سہارے پچھلے ساٹھ ستر برسوں سے مغربی تعلیم یافتہ لوگ آئندہ کے لیے منصوبے بنا رہے تھے۔ جمہوریت کا مطلب انگلستان کی پارلیمانی طرز کی حکومت اور نیشنلزم کے معنی ہزاروں برس پرانی روایات کی حفاظت کے تھے۔ ملک کے شمال مغربی اور شمال مشرقی حصوں کا حق خود ارادیت کی کوئی جگہ ان تصورات میں نہیں تھی۔ کانگریس کے بہت سے لیڈروں کو یہ یقین تھا کہ اگر آزاد ہندوستان میں ایسا کوئی انتظام کیا گیا تو انگریز ان علاقوں پر اپنا تسلط برقرار رکھ کر بقیہ ملک کی سیاست پر بھی اثر انداز ہوں گے اور اس طرح ہندوستان کی آزادی مذاق بن کر رہ جائے گی۔

مسلمان یہ سمجھ کر مسلم لیگ کی طرف بڑھے کہ انگریزوں کے ہندوستان سے جانے کے بعد وہ ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر نہ رہیں گے بلکہ کم از کم ملک کے ایک حصّہ میں وہ خود اپنے مفاد کی حفاظت کر سکیں گے اور اس طرح بقیہ ملک کے مسلمانوں کی حفاظت کی بھی ضمانت ہو جائے گی۔ بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے مفروضے بہت حد تک غلط تھے۔

لیکن سنہ ۲۲ء اور سنہ ۳۶ء کے درمیانی زمانے میں تو علی گڑھ کے نوجوانوں کو اپنے نیشنلزم کے اظہار کے لیے ایک نیا پرچم مل گیا۔ سنہ ۲۲ء کی تحریک خلافت اور نان کوآپریشن کی ناکامی کے بعد عام مسلمانوں کو ملکی سیاست سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی تھی۔ کانگریس ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی اور اس کے لیڈر گاندھی جی تھے جو ایسی باتیں کرنے لگے تھے جن میں عام مسلمان نوجوانوں کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا۔ نئے ہندوستان میں رام راج سے انھیں کوئی جذباتی لگاؤ نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ جب پہلی جنگ عظیم کے بعد سوشلزم اور کمیونزم کی باتیں ہونے لگیں تو بہت سے نوجوان متوجہ ہوئے۔ مولانا حسرت موہانی تو کمیونسٹ پارٹی کی پہلی کانگریس کی ریسپشن کمیٹی کے چیرمین تھے اور چند برسوں کے بعد جب میرٹھ کانسپریسی کیس چلا تو جن لوگوں کو سخت سزائیں سنائی گئیں ان میں شوکت عثمانی اور مظفر احمد بھی تھے۔ اس کے بعد تو بہت سے نوجوان کمیونسٹ تحریک میں شامل ہونے لگے۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہونے سے پہلے ڈاکٹر اشرف، سجاد ظہیر، محمود الظفر، ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ احمد اور بنگال کے عبدالرزاق اور قطب الدین کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہو گئے تھے۔ لیکن عام مسلم نوجوان اس تحریک سے ناواقف تھے۔ اس بات کا بہت چرچا تھا کہ سوشلزم اور کمیونزم مذہب کے خلاف ہیں۔ اس لیے مسلمان ان تحریکوں سے ذرا ڈرتے بھی تھے لیکن پاکستان کے نعرے نے یہ سب ذھنی رکاوٹیں دور کر دیں اس میں نہ تو ہندو اکثریت کے جبر کا کوئی اندیشہ تھا اور نہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ تحریکوں کے الحاد سے کوئی خطرہ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی نے دل کے دروازے کھول دیے ہوں۔ اقبال کے نغمے فضا میں گونجنے لگے۔ جب نواب بہادر یار جنگ کا استقبال اسٹریچی ہال میں ہوا تھا تو کسی نے خضر راہ کا ایک ٹکڑا ایسے جوش سے سنایا تھا کہ سننے والوں کے دلوں میں شعلے بھڑکنے لگے۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

ایسا لگتا تھا کہ اسٹریچی ہال میں زنجیروں کے کٹنے کی آوازیں سنائی دے رہی ہوں۔

لڑائی کے دوران مسلم لیگ اور کانگریس کے اتحاد کی تین کوششیں ہوئیں۔ اوّل تو راج گوپال اچاریہ کی قیادت میں مدراس کی لیجسلیٹو پارٹی نے مسلم لیگ کے لاہور ریزولیشن

کی حمایت میں اپنی آواز اٹھائی۔ مولانا آزاد صدر کانگریس کو یہ تحریک سخت ناگوار ہوئی اور انھوں نے راج گوپال اچاریہ کو مجبور کیا کہ وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ دے دیں۔ ملک کو یہ استعفیٰ بہت مہنگا پڑا کہ اس کے بعد اتحاد کے دروازے بند ہونے لگے۔

دوسری کوشش بھولا بھائی ڈیسائی نے کی جو اس زمانے میں سینٹرل اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے انھوں نے لیاقت علی خاں سے ایک سمجھوتہ کیا کہ کانگریس اور مسلم لیگ اسمبلی میں مل کر کام کریں گی۔ کانگریس ہائی کمان نے اسے بھی نامنظور کر دیا۔

تیسری کوشش خود گاندھی جی نے کی اور بمبئی میں انھوں نے مسٹر جناح سے براہ راست گفتگو کی۔ سب باتیں تقریباً طے ہو گئی تھیں لیکن معاملہ شاید اس پر اٹک گیا کہ مسٹر جناح کا اصرار تھا کہ لاہور ریزولیوشن کی بنیاد پر سمجھوتہ ابھی ہو جائے اور گاندھی جی کہتے تھے کہ باقاعدہ سمجھوتہ آزادی کے بعد ہی ہوگا۔ گویا بات بگڑتی ہی گئی اور الٹی ہو گئیں سب تدبیریں۔

یہ تھا وہ سیاسی پس منظر جس میں ہم اور آپ جوان ہو رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں سے ہمارا براہ راست تو کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہمارا تعلق تو رائڈنگ کلب سوئمنگ باتھ، اسکیٹنگ رنک، بوائے اسکاؤٹس، اسکول ڈراموں اور مشاعروں سے تھا۔ ناولوں کا بھی شوق تھا اور سینما کا بھی۔

ڈبیٹنگ کا ذکر پیام برادری کے سلسلے میں ہوا تھا اسکول میں جب میں پانچویں درجے میں تھا تو ایک تقریری مقابلہ ہوا۔ پانچویں، چھٹے اور ساتویں درجوں کے لیے جونیر ڈبیٹنگ سوسائٹی بنائی گئی تھی اور اوپر کے کلاسوں کے لیے سینیر ڈبیٹنگ سوسائٹی۔ جونیر ڈبیٹ میں مجھے پہلا، احمد ظفر الحسن کو جو ساتویں میں تھے۔ اور میرے کلاس فیلو بدر الدین قادری کو تیسرا انعام ملا۔ اس طرح ہم لوگ چیمپین ہو گئے ہمارے کلاس ٹیچر زین العابدین صاحب اتنا خوش ہوئے کہ انھوں نے ہمیں گلے لگا لیا اور سارے کلاس کی آئس کریم کی دعوت کر دی۔

اسکول کی تعلیم کے بعد بھی تقریری مقابلوں کا شوق جاری رہا۔ جب فرسٹ ایر میں پڑھتا تھا تو یونین ہال میں ایک ڈبیٹ ہوئی۔ موضوع تھا۔

"ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر"

میں نے اس کی مخالفت میں تقریر کی اور دوسرا انعام حاصل کیا پہلا انعام باغپت کے شوکت حمید اور تیسرا مونس رضا کو ملا جو آج کل دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔ مونس صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ وہ ایم۔ اے کے طالب علم تھے اور یونیورسٹی میں کمیونسٹ طالب علموں کے لیڈر۔ میں نے بھی ان کی پارٹی میں سرگرمی سے حصّہ لینا شروع کر دیا۔

مارکسسٹ فلسفے سے میری دلچسپی چند مہینے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ ہائی اسکول کا امتحان دے کر میں گرمیوں کی چھٹیوں میں جب گھر گیا تو والد صاحب نے ایک کتاب دیکھنے کو دی۔ حیدرآباد کے مظہر الدین صاحب کی تصنیف "ہیگل، مارکس اور اسلام"۔ یہ گویا میرا مارکسزم سے پہلا تعارف تھا۔ اس میں جس اسلام کا ذکر تھا وہ میرے لیے بالکل ایک نیا مذہب تھا میں نے والد صاحب سے پوچھا بھی کہ یہ کس اسلام کا ذکر ہے۔ انھوں نے سمجھایا کہ یہ ایک بہت پرانی تحریک ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں شروع ہوئی۔ اس کے ماننے والے اپنے علاوہ کسی کو سچا مسلمان نہیں سمجھتے اور ان کا عقیدہ ہے کہ الحکم للہ۔ یعنی حکومت کا حق صرف اللہ کو ہے اور باقی سب طرح کی حکومتیں باطل ہیں اور اللہ کا حق صرف اسی عقیدے کے مسلمان ہی جانتے ہیں۔ میں نے اپنے دل میں اس طرح کی باتوں کے لیے کوئی جگہ نہیں پائی۔ البتہ مارکس کی ڈائی لیکٹیکل میٹریلزم بہت دلچسپ معلوم ہوئی۔ چنانچہ جب علی گڑھ واپس آکر موقع ملا تو میں نے بڑے شوق سے اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔

اب سوچتا ہوں تو مذہب کے اس تصور سے اجتناب جس کا ذکر مظہر الدین صاحب کی کتاب میں تھا، میرے لیے بالکل قدرتی بات تھی۔ میرے مذہبی پس منظر میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک کے سب پیغمبروں کی تعلیمات تھیں، ان میں حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہما السلام کے علاوہ کسی نے حکومت نہیں کی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں بھی حکومت محض ایک جزوی سی بات تھی۔ خود آنحضرت صلعم کی مکی زندگی میں حکومت کا کوئی سوال نہیں تھا۔ قرآن شریف جتنا بھی تھوڑا بہت سمجھا تھا اس میں بھی حکومت کا براہِ راست کوئی ذکر نہیں پایا۔ اولیاء اللہ میں سے بھی کسی کو حکومت کے معاملات سے دلچسپی نہیں تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاء تو کبھی کسی کے دربار میں نہیں گئے، اور خود ہم لوگوں کے پیروں کے پیر حضرت شاہ عبدالرزاق بانسوی کا بھی دنیا داری کی ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

حضرت سید عبدالرزاق صاحب بانسوی کا زمانہ سترہویں صدی کے اواخر کا تھا۔ درسِ نظامی کے بانی ملّا نظام الدین کو ان سے بیعت تھی۔ سیّد صاحب نے کچھ پڑھا لکھا نہ تھا۔ اسی لیے خاندان کے افراد ملا صاحب کی بیعت پر سخت متعجب تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی ملا رضا نے (جن کی نویں پشت میں میں ہوں) ایک دن کہا کہ بھائی صاحب دیکھیے لوگ کیا کہتے ہیں کہ اتنے بڑے عالم اور ایک امّی محض کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ ملا نظام الدین نے جواب دیا کہ تم خود جاؤ تمہیں علم ہو جائے گا۔ چنانچہ ملا رضا سیّد صاحب سے ملنے بانسہ شریف ضلع بارہ بنکی روانہ ہو گئے۔

بانسہ لکھنؤ سے کچھ فاصلے پر ضلع بارہ بنکی میں ایک قصبہ ہے ملا صاحب جب بانسہ پہنچے تو کئی دن اور کئی راتیں سیّد صاحب کے دروازے پر بیٹھے کاٹ دیں۔ اس کے بعد ملاقات ہوئی۔ سیّد صاحب نے فرمایا کہ ایک جاہل آدمی سے ملنے کے لیے اتنے بڑے عالم نے کیسے تکلیف کی؟ ملا صاحب نے کچھ کہنا چاہا تو سید صاحب نے کہا کہ اس وقت ہم لکھنؤ جا رہے ہیں وہیں باتیں ہوں گی۔ ملّا رضا ساتھ ہو لیے۔ تھوڑی دور جا کر سیّد صاحب نے گھوڑے کی زین اتار کر اپنے کندھوں پر رکھ لی اور لگام پکڑ کر پیدل چلنے لگے۔ ملا صاحب نے اصرار سے زین اپنے کندھوں پر رکھ لی اور اس شان سے فرنگی محل کا یہ عالم فاضل ایک امّی محض کی رفاقت میں روانہ ہوا۔ لکھنؤ پہنچ کر انھوں نے اپنا ہاتھ سیّد صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔

کچھ دنوں بعد ملّا صاحب سیّد صاحب سے ملنے جا رہے تھے کہ راستے میں دیکھا کہ کچھ عورتیں ایک مرد کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہیں اور کچھ گانا بجانا بھی ہو رہا ہے۔ ملا صاحب نے شاید لاحول پڑھ کر آگے جانا چاہا کہ جھرمٹ سے مردانی آواز آئی "کہاں جاوت ہو؟ اگر سیّد صاحب کے پاس جاوت ہو تو ان سے ہمرا سلام کہنا۔" ملا صاحب کی ملاقات جب سیّد صاحب سے ہوئی اور انھوں نے راستے کا حال پوچھا تو ملا صاحب نے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ سیّد صاحب نے ہنس کر فرمایا "جانتے ہو وہ کون تھے؟ وہ سری کرشن مہاراج تھے۔"

یہ واقعہ میں نے اپنے بڑوں سے کئی بار سنا ہے اور میرے چچا زاد بھائی مفتی محمد رضا صاحب نے اسے ایک جگہ نقل بھی کیا ہے۔ روایت کی صحت سے قطع نظر جو بات قابلِ غور ہے وہ یہ کہ گذشتہ تین سو برسوں سے اس قسم کے چرچے فرنگی محل میں ہوتے رہے ہیں اور میں نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی۔ ایسے ماحول میں اس مذہبی فلسفے کی کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی جس کا ظہور حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان مخالفت کے زمانے میں ہوا تھا اور جس فلسفے کے ماننے والے ایک شخص کے ہاتھوں مولا علیؓ نے جام شہادت نوش فرمایا تھا۔

اس سلسلے میں ایک بات اور عرض کر دوں کہ یہ سید عبدالرزاق وہی ہیں جن کے متعلق مولانا حسرت کے ایک بزرگ کا دوہا ہے۔

مورے پیارے کنھیا براجت ہیں
مورے برج بھی بانسہ نگری

خود مولانا حسرت پر بھی یہ رنگ بہت گہرا چڑھا تھا۔ ان کے متعلق تو یہ سنا ہے کہ وہ جنم اشٹمی پر متھرا جاتے تھے اور سارے دن وہاں کرشن جی کی لیلا دیکھتے تھے۔ اپنے اشعار میں تو وہ ان کو سرگروہِ عاشقاں کہتے تھے۔

دیکھیے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ تذکرہ تھا میرے اور آپ کے اسکول کا۔ میں نے ۲۵ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ اس سال ایک انگریز ہیڈ ماسٹر تھے، نام تھا مسٹر ونس

انھوں نے ہیڈ بوائے کا ایک نیا عہدہ قایم کیا تھا اور مجھے اسکول کا ہیڈ بوائے بنایا تھا۔ اس کے علاوہ اسکول میگزین کا ایڈیٹر بھی تھا اور سائنٹی فک سوسائٹی اور ڈبیٹنگ سوسائٹی کا سکریٹری بھی۔ (یہ دونوں سوسائیٹیاں آپ کے اسکول چھوڑنے کے بعد بنائی گئی تھیں) بوائے اسکاؤٹس میں بھی اسی قسم کی ذمہ داری تھی۔ غرض یہ کہ اسکول والوں نے جی بھر کے مجھے برباد کرنے کی کوشش کی۔ بربادی تو شاید قسمت میں لکھی تھی ورنہ کوچۂ دلداری میں قدم کیوں پڑتا اور اس راہ میں جو سب پر گزرتی ہے وہ کیوں گزرتی ؟

ہائی اسکول کے امتحان سے پہلے منٹو ڈی یعنی تصدق رسول ہوسٹل کے ڈائننگ ہال میں ہم لوگوں کو ایک الوداعی ڈنر دیا گیا۔ شکریے کی تقریر میں میں نے اپنے اساتذہ سے مخاطب ہو کر پوچھا:

از مدرسہ بکعبہ روم یا بمیکدہ
اے پیرِ رہ بگو کہ طریقِ صواب چیست

یہ تقریب اسکول کی طالب علمی کی آخری یاد ہے، اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنی باہیں پھیلا دیں۔

اپنا محاسبہ آپ

بیان کیا جاتا ہے، ایک مسافر اتفاقاً خدا رسیدہ لوگوں کے حلقے میں پہنچ گیا اور ان کی اچھی صحبت سے اسے بہت فائدہ پہنچا۔ اس کی بری عادتیں چھوٹ گئیں اور وہ نیکی میں لذت محسوس کرنے لگا۔

یہ انقلاب یقیناً بے حد خوش گوار تھا۔ لیکن حاسدوں اور بدخواہوں کے دلوں کو کون بدل سکتا ہے۔ اس شخص کے مخالفوں نے اس کے بارے میں مشہور کر دیا کہ اس کا نیکی کی طرف راغب ہو جانا تو محض دنیا کے دکھانے کے لیے ہے۔

اس بات سے اسے بہت صدمہ پہنچا۔ چنانچہ وہ ایک دن اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا ماجرا بیان کیا۔

مرشد نے کہا،

یہ تو ہرگز پریشانی ہونے کی بات نہیں ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تیرے مخالف تجھے جیسا بتلاتے ہیں، تو ویسا نہیں۔ صدمے کی بات تو یہ ہوتی کہ تو اصلاً برا ہوتا اور لوگ تجھے نیک اور شریف بتلاتے۔"

— گلستانِ سعدی

جیوتی سروپ سنگھ

شیرازِ ہند

کسی وقت مشرقی ہندوستان میں جون پور اور بنگال یہ دو ہی خاص صوبے تھے۔ آج کا صدر کیراکت، مچھلی شہر، مڑیاہوں اور شاہ گنج تحصیلوں والا جون پور تو بہت چھوٹا ہے۔ صوبۂ جون پور کی سرحدیں ترہت (بہار) سے لے کر قنوج اور علی گڑھ تک وسیع تھیں۔ دہلی کے بادشاہ فیروز تغلق نے اپنے چچازاد بھائی محمد جونا کی یاد میں جون پور کو بسایا۔ اس کی تعمیر ۱۳۹۳-۹۴ء میں ہوئی۔ فیروز شاہ نے فیروزآباد فیروزپور اور حصار وغیرہ شہر بھی بسائے۔ لیکن جون پور کی حیثیت ہی کچھ دوسری تھی۔ ادب اور علم کا یہ مرکز تھا۔ یہاں عالمی شہرت کے لوگ تشریف فرماتے۔ تاریخ فیروز شاہی اور فتاویٰ جہانداری کے مصنف ضیاء الدین برنی نے اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ دہلی کے سلاطین کے گورنروں نے ان صوبوں کی داغ بیل ڈالی۔ بعد میں یہ گورنر اتنے طاقتور ہوگئے کہ انھوں نے سلطنت کے خلاف بغاوت کردی۔ لودی خاندان ۱۴۵۱-۱۵۲۶ء کے حکمرانوں نے سلطنت کو منظم کرنے کی بے حد کوشش کی، لیکن باغی گورنروں کو سر کرنے میں انھیں ناکوں چنے چبانے پڑے

جون پور کے شرقی حکمرانوں نے اپنے کو آزاد اعلان کر رکھا تھا۔ انھوں نے اپنے وقت میں جون پور کو شیرازِ ہند کے مرتبے تک پہنچایا۔ رعایا بہت خوش حال تھی ان کے زمانے میں فنکاروں کی بڑی عزت ہوتی تھی۔ ان کی حکومت کے دور میں فن، ادب، علم اور موسیقی سب میں بڑا اضافہ ہوا۔ خیال گائیکی اور طبلہ نوازی کے فن کو بھی بڑی اہمیت حاصل تھی۔ جون پور کی ٹھمری اور توڑی تو آج تک مشہور ہے۔ شرقی سلطانوں نے دہلی کے بادشاہ کو سر کرنے کے ہمیشہ منصوبے باندھے۔ جب دہلی کا بادشاہ بہلول لودی (۱۴۵۱-۱۴۸۹ء) سرہند پر حملہ کرنے گیا تو اچھا موقع پاکر جون پور کے شرقی سلطان محمود شاہ نے ایک لاکھ ستر ہزار گھوڑسواروں اور چودہ سو ہاتھیوں کی فوج لے کر دھاوا بول دیا۔ اس کی فتح یقینی تھی لیکن سپہ سالار دریا خاں لودی کی غداری کی وجہ سے بے چارہ شکست کھا گیا۔ لیکن بعد کے شرقی سلطانوں محمد شاہ اور حسین شاہ نے بھی بہلول لودی سے اپنی دشمنی برقرار رکھی اور اسے شکست دینے کے لیے کوشاں رہے۔ سلطان حسین شاہ نے جمنا ندی کو پار کرکے بہلول لودی کی فوج کو شکست بھی دے دی۔ بعد میں دونوں میں معاہدۂ امن ہوگیا۔ لیکن جب حسینؔ شاہ واپس جانے لگا تو بہلول لودی نے اس پر اچانک حملہ کردیا اور جون پور کو اپنی ریاست میں ملالیا۔ اس طرح مسلسل ۳۵ سال تک جنگ کرنے کے بعد بہلول لودی جون پور پر قبضہ کرسکا۔

جون پور کے تذکرے میں ابراہیم شرقی اور حسین شاہ شرقی کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ دونوں زندۂ جاوید ہوگئے ہیں۔ ابراہیم شرقی اتنا سخی علم نواز تھا کہ اس کی فیاضی سے متاثر ہو کر دور دراز سے عالم اس کے دربار میں جمع ہونے لگے۔ ان عالموں میں دہلی کے قاضی ملک العلماء شہاب الدین خاص تھے اسی زمانے میں "سنگیت شرومنی" جیسی موسیقی کی عمدہ کتاب کی تخلیق ہوئی۔ حسین شاہ شرقی (۱۴۶۲-۱۵۰۰ء) موسیقی کا اتنا ماہر تھا کہ اسے خیال کا موجد کہا جاتا ہے۔ یہی نہیں اس نے بارہ راگوں کو بھی ایجاد کیا۔ نواب واجد علی شاہ نے

اسے خیال 'نایک' کہا ہے۔

جون پور کی تاریخی حیثیت

جون پور کی تاریخ کئی دلچسپ واقعات سے بھری پڑی ہے۔ یہاں میں قارئین کی دلچسپی کے لیے ان میں سے دو ایک کا ذکر کر رہا ہوں۔ یہی وہ شہر جون پور ہے جہاں چوگان کھیلتے ہوئے جب بادشاہ سکندر لودی کے کچھ سردار آپس میں جھگڑنے لگے تو بادشاہ نے جو وہاں موقع پر موجود تھا، اس میں سے سرکش کو سرعام کوڑوں سے پٹوایا۔

اسی جون پور میں ایک بار بادشاہ بابر اپنے خاص امیروں کے ساتھ آیا۔ ان باوقار امیروں میں شیخ گھورن بھی تھے بادشاہ ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ وہ موسیقی کے استاد تھے۔ اتفاق سے وہ بابر کے سامنے ہی بخار میں مبتلا ہو گئے۔ پورے بیس دن تک بغیر کچھ کھائے وہ بستر پر پڑے رہے۔ جون پور کے مشہور صوفی شیخ ادہن نے مشورہ دیا کہ موسیقی کی ایک محفل آراستہ کی جائے۔ ایسا ہی ہوا۔ کچھ گانوں نے شیخ گھورن کے دل پر ایسا اثر کیا کہ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارا بہنے لگی اور ان کا بخار اچھا ہو گیا۔ اس کے بعد آرام سے انھوں نے کھانا کھایا۔

اب شیخ گھورن کی موسیقی کا جائزہ لیجیے۔ ایک بار بہار کے جشن میں وہ پھر بادشاہ بابر کے ساتھ اسی جون پور میں تشریف لائے۔ ایک دن انھوں نے محفل جمائی۔ جب کئی گائک گا بجا کر تھک گئے اور سامعین پر کوئی اثر نہیں ہوا تو شیخ صاحب خود گانے بیٹھے۔ انھوں نے ایسی پُردرد غزل گائی کہ سننے والے روتے روتے بے حال ہو گئے! اس وقت بہت سے صوفی فقیر بھی وہاں موجود تھے۔ مشہور مورخ ملا عبدالقادر بدایونی نے نھیں اپنے وقت کا بے جوڑ موسیقی کا استاد کہا ہے۔

انہیں شیخ گھورن کے شاگرد شیخ بجھو نے ۱۵۱۵ء میں اکبری دربار کے گنونتوں کو للکارا تھا۔ اکبر نے اس کے گانے پر بے حد خوش ہو کر انعام اکرام سے خوب نوازا۔

اسی جون پور میں سید محمد جون پوری نام کے ایک عالم صوفی رہتے تھے۔ ان کے مرید انھیں آخری مہدی مانتے ہیں۔ اکثر ان کی باتیں منطق سے بھری اور کھری ہوتی تھیں۔ چنانچہ ان کے مخالفین کی بھی تعداد کم نہ تھی۔ بے چارے کی ساری زندگی سفر میں گزری۔

ہندوستان کے اس شیراز (جون پور) سے تو سب سے زیادہ تعلق افغان بادشاہ شیر شاہ سوری کا تھا۔ اسی شہر میں وہ ۲۲ سال کی عمر میں فرید نام سے آیا تھا۔ اپنے والد حسن خاں اور سوتیلی ماں کی سختیوں سے تنگ آ کر اس نے شیراز ہند میں پناہ لی۔ یہیں رہ کر اس نے گلستاں، بوستاں اور سکندر نامہ پڑھا۔ اس نے عربی اور فارسی زبانوں کا اچھا مطالعہ کیا۔ اس کی ذہانت اور دوسرے اوصاف سے جون پور کا گورنر جمال خاں اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اس کے والدین میں میل ملاپ کرا دیا۔ بہار لوٹنے کے کچھ دن بعد ہی فرید پھر جون پور کے گورنر زبیر خاں کے یہاں چلا آیا۔ زبیر خاں نے ہی اس کا تعارف بابر بادشاہ سے کرا دیا۔ بابر اس کے خوش اخلاق اور عمدہ صفات سے بہت متاثر ہوا۔

خود بادشاہ بننے پر شیر شاہ نے دہلی سے سڑکوں کے ذریعے برہان پور اور جون پور کو جوڑ دیا۔ اس نے یہاں قلعہ بھی بنوایا۔ جون پور کی شاہی عمارتیں فنِ تعمیر کے اعتبار سے خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں مسلم اور راجپوت دونوں ہی فنِ تعمیر کے بہترین نمونے کی جھلک ملتی ہے۔

جون پور کا شاہی پل

جون پور کے ذکر میں اکبر بادشاہ کے بنوائے ہوئے شاہی پل کو بھلا کیسے بھلایا جا سکتا ہے؟ اس شہر کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے بادشاہ نے عبدالرحیم خان خاناں کو دریائے گومتی پر ایک پل بنوانے کا حکم دیا۔ خان خاناں نے ۱۵۶۴ء میں جون پور کے شاہی پل کی تعمیر کرائی۔ کابل کے چیف انجینیر جناب افضل علی کی زیر نگرانی اور انہیں کے نقشے کے بموجب پل بن کر تیار ہوا۔ سارے ملک میں یہ پل اپنی انوکھی حیثیت

رکھتا ہے۔ جون پور ہی ایک ایسا شہر ہے جسے دریائے گومتی بیچوں بیچ کاٹتا ہے۔ اس پر بنے ہوئے پل کی سطح سڑک کے برابر ہے۔ اسی کے ساتھ شہر کی مسجد ہے جس میں صوفی سنت شیخ شاہ کا مزار ہے۔ اس کے سامنے شیر اور ہاتھی کے مجسمے ہیں پل کے شمالی حصّے کی جانب حضرت لال شاہ کا مزار ہے تو اسی سے ملا ہوا ہنومان جی کے مندروں کا سلسلہ بھی دور تک چلا گیا ہے۔

اب تو شاہی پل کے مقابل مشرقی جانب کانگریسی حکومت کے دورِ اقتدار میں بھی ایک نیا پل تعمیر ہو گیا ہے لیکن اس کا اکبری پل سے کیا مقابلہ؟ یہ پل ۱۸۷۱ء سے لگاتار خوفناک سیلاب کے تھپیڑے کھا رہا ہے لیکن آج تک جوں کا توں پڑا ہوا ہے۔ ۱۷۷۴ء میں شہر کی حفاظت کے لیے کیپٹن بار کر آئے۔ پانی پل کے کافی اوپر بہہ رہا تھا۔ سیلاب کے حملے ۱۸۷۱ء، ۱۸۷۴ء، ۱۹۰۳ء، ۱۹۳۶ء، ۱۹۵۵ء، ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۵ء میں بھی ہوئے۔ ۱۹۸۰ء میں تو پورا شہر سیلاب سے متاثر ہوا۔ ڈھائی ماہ تک سیلاب کے پانی سے شہری پریشان رہے۔

سابق ضلع مجسٹریٹ شریمتی نیرا یادو نے سیلاب زدہ علاقوں کی جو امداد کی اور اس کے لیے جو مصائب خود برداشت کیے اس کے لیے لوگ عرصے تک ان کے مشکور اور ممنون رہیں گے۔

کہاں گیا وہ شیرازِ ہند؟ اس شاہی پل پر اب بڑی گاڑیاں نہیں چلتیں، لیکن مسافروں کا آنا جانا برابر جاری ہے۔ چہار سو اور اوند گنج کو جوڑنے والے اس پل پر بنی گومٹیوں میں ابھی کچھ دنوں پہلے تک بڑی رونق رہتی تھی۔ اس میں دوکانیں آباد تھیں اور ان دوکانوں میں خاصی بھیڑ ہوتی تھی۔ پل کے شمالی سرے سے لگا ہوا چہار سو محلہ ہے۔ نیچے طرح طرح کی دوکانیں ہیں اور اوپر طوائفیں آباد ہیں۔ ان دوکانوں میں کبھی عطر مہکتا رہتا تھا تو منچلا مکھیوں کے کوٹھوں پر طبلے کی تھاپ، سارنگی کی سریلی دھن اور پائلیوں کی جھنکار گونجا کرتی تھی۔ اب نہ ایسے عطر فروش ہیں اور نہ وہ بیبیاں! کوٹھوں پر مجرے تو بہت کم ہوتے ہیں ہاں جسم کے سودے برابر چالو رہتے ہیں۔

کبھی یہ شہر عطر کے لیے مشہور تھا۔ شہر سے سٹے ہوئے گاؤں پر جو پور میں بیلے کی کھیتی ہوتی تھی۔ عطر کی دوکانوں پر ایک تولے وزن سے لے کر ڈھائی سیر وزن تک کی چمڑے کی کپیاں دکھائی دیتی تھیں، جن میں لوگ عطر یا خوشبودار تیل خریدتے تھے۔ اب کانوں میں عطر کے پھاہے لگائے سر پر دوپلی ٹوپیاں پہنے اور آنکھوں میں سرمہ رچے بانکے چھیلوں کے کہیں دیدار نہیں ہوتے۔

اب تو یہ شیرازِ ہند جون پور اپنے شاندار ماضی کو یاد کرکے سر دھنتا ہے اور سرد آہیں بھرتا ہے اب نہ علم و ادب کی محفلیں آراستہ ہیں اور نہ شعر و سخن کی سرگرمیاں۔ کہاں سے لائیں پرانے جون پور کو ڈھونڈ کر؟ وہ تو گردشِ دوراں کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لیے گم ہو گیا!

- علم ایک ایسا سمندر ہے جس میں ڈوب کر ابھرنے والا انسان ہیرے کی مانند ہوتا ہے۔
- علم ایک ایسا خزانہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ جتنا تقسیم کرو اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے۔
- علم کے بغیر انسان ایسا ہے جیسے نگینے کے بغیر انگوٹھی۔
- علم کی روشنی سے جہالت کا اندھیرا دور ہوتا ہے۔

حبیب الحق انصاری

فزکس - ایک سائنس

(فائن مان لیکچرز سے ماخوذ)

سائنس کا اصول بلکہ اس کی تعریف یہ کہہ کر کی جاتی ہے کہ " سارے علم کی کسوٹی عمل ہے " یعنی سائنسی سچائی کی واحد کسوٹی عمل یا تجربہ ہے۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ سائنس کے قوانین خود کہاں سے نمودار ہوتے ہیں کہ ان کی تجربے سے تصدیق کی جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ یا تو خود تجربوں سے نشاندہی پاتے ہیں یا پھر ان کے لیے تخیّل اور تفکّر سے مدد ملتی ہے۔ یہ تخیل کا عمل اس قدر ضروری ہے کہ فزکس بلکہ کل سائنس کے عموماً دو حصے کر لیے جاتے ہیں ایک تخیلی سائنس اور دوسرا عملی سائنس۔

سائنسی اصول یا قوانین محض ایک حد تک ہی صحیح ہوتے ہیں مثلاً ایک قانون ہے کہ مختلف تفاعلات میں مادّے کی مقدار بقایاب ہوتی ہے لیکن یہ قانون بعض اور حالتوں میں جیسے زیادہ تیز رفتاروں پر غلط ہو جاتا ہے بلکہ جس قدر رفتار تیز ہوتی جائے گی اسی قدر یہ اصول غلط ہوتا جائے گا۔

سائنس سیکھنے سکھانے کا مطلب یہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ سارے معلوم اصول اور قوانین ایک جگہ بیان کر دیے جائیں اور ان کے مختلف استعمال بتا دیے جائیں۔ لیکن یہ طریقہ اس لیے مرغوب نہیں کہ ایک تو ان اصولوں کو صحیح طرح سمجھنے کے لیے ایک حد تک تکنیکل جانکاری درکار ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ مشکل بیان سے پہلے آسان بیان سمجھنا بہتر ہوتا ہے۔ اس لیے عموماً سائنس رفتہ رفتہ ہی پڑھائی اور سیکھی جاتی ہے۔

آئیے ایک نظر ہم عصر حاضر کی سائنسی سمجھ کی بابت معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں

مادہ ایٹموں سے بنا ہے

اگر کوئی یہ کہے کہ ایک جملے میں اس دنیا کی بابت سب سے اہم بات بتلایئے تو شاید وہ جملہ یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز ایٹموں سے بنی ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے ذرّے مسلسل حرکت کرتے رہتے ہیں اور جب تھوڑی دوری پر ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو تجاذب کی قوت سے کھینچتے ہیں لیکن جب ایک دوسرے کے بہت زیادہ قریب کیے جاتے ہیں تو ایک دوسرے کو زور سے دھکیلنے لگتے ہیں۔

ایٹم قطر میں محض دو تا چار اینگسٹرام (Angstrom) ہوتے ہیں (ایک اینگسٹرام = 10^{-8} cms) چیزیں ٹوٹ کر بکھر اس لیے نہیں جاتیں کہ ایٹموں اور سالموں کے درمیان تجاذب ہوتا ہے۔ جب ہم کسی شے کو گرم کرتے ہیں تو اس کے ایٹم زیادہ تیزی سے حرکت کرنے لگتے ہیں۔ اس حرکت کو گرمی (حرارت) کہتے ہیں۔ پانی کو زیادہ گرم کریں تو بھاپ بن جاتا ہے۔ یعنی پانی کے سالمے اب اتنی تیزی سے حرکت کرنے لگتے ہیں کہ سالمی تجاذب انہیں روک نہیں سکتا اور وہ پانی سے ٹوٹ کر نکل آتے ہیں۔ پانی کے سالمے میں ایک آکسیجن کا ایٹم اور دو ہائیڈروجن کے ایٹم ہوتے ہیں۔

کسی گیس کو بند کرنے والے برتن کی دیواروں پر گیس کے

ایٹموں یا سالموں کے ٹکرانے کا دوسرا نام گیس کا دباؤ کہلاتا ہے اس سے یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ اگر ہم گیس کو کسی طرح آہستہ سے دبا کر اس کا دباؤ بڑھائیں تو اس کی تپش (Temperature) بڑھے گی اور اگر آہستہ سے ڈھیل دے کر اس کا دباؤ گھٹائیں تو تپش گھٹے گی۔ ہوا مختلف گیسوں کا مکسچر ہوتی ہے۔

پانی کو ٹھنڈا کرتے جائیں تو برف بن جاتا ہے جو ایک بلّور (Crystals) ہے۔ برف میں سارے ایٹم ترتیب سے جمے ہوتے ہیں جس ترتیب میں ایک سمیٹری (Symmetry) ہوتی ہے۔ اس سمیٹری کا تعلق 120° کے گھماو سے ہوتا ہے۔ برف کے بلور میں خالی جگہ کافی ہوتی ہے۔ اس لیے عام چیزوں کے برخلاف برف پگھلنے پر سکڑتی ہے۔ برف کے ایٹم ساکت نہیں ہوتے۔ وہ مسلسل ہلتے جلتے رہتے ہیں۔ اگر برف کی تپش کم کرتے جائیں تو ایٹموں کا یہ ہلنا جلنا کم ہوتا جائے گا حتی کہ صفرِ مطلق (Absolute Zero) درجہ حرارت پر یہ سب سے کم ہوگا لیکن پھر بھی بالکل صفر نہیں ہو جائے گا۔ صفرِ مطلق تپش پر یہ سب سے کم حرکت البتہ سوائے ہیلیئم کے کسی اور شے کو پگھلا سکنے کے قابل نہیں ہوتی۔ ہیلیئم صفرِ مطلق تپش پر بھی نہیں جمتی جب تک کہ اس پر دباؤ نہ بڑھایا جائے۔

اینٹمی کام — کسی برتن کی سطح کو اگر اربوں گنا بڑا کرکے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کچھ سالمے سطح چھوڑ کر اوپر جا رہے ہیں اور کچھ لوٹ کر واپس آ رہے ہیں۔ ویسے عموماً دیکھنے میں کوئی تبدیلی اس لیے دکھائی نہیں دیتی کہ جتنے سالمے چھوڑ کر جا رہے ہوتے ہیں اتنے ہی لوٹ کر آ رہے ہوتے ہیں۔ لیکن اگر پنکھا چلا کر اوپر جانے والے سالموں کو دور ہٹا دیا جائے تو پانی بخار بن کر اڑنے لگے گا اور چوں کہ چھوڑ کر جانے والے سالمے اوسطاً زیادہ تیز رفتار ہوتے ہیں تو اس لیے تبخیر کی وجہ سے باقی پانی ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہوادار جگہوں پر رکھے گھڑوں میں پانی ٹھنڈا رہتا ہے اور گرم چائے پھونک کر ٹھنڈی کی جاتی ہے۔

عام نمک ایک بلور ہوتا ہے جس میں سوڈیم اور کلورین کے آیون (IONS) ترتیب سے جمے ہوتے ہیں۔ پانی میں ڈالنے پر منفی آکسیجن اور مثبت ہائیڈروجن کے تجاذب کے سبب کچھ آیون ٹوٹ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ اس طرح نمک پانی میں گھلتا ہے لیکن اربوں گنا بڑا کر کے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ جہاں کچھ آیون نمک سے ٹوٹ کر الگ ہوتے رہتے ہیں وہاں کچھ لوٹتے بھی رہتے ہیں۔ اگر پانی میں نمک تقریباً نہ ہونے کے برابر ہو تو زیادہ آیون ٹوٹ کر گھل رہے ہوں گے اور کم لوٹ کر واپس بلور میں آئیں گے۔ اس کے برخلاف اگر پانی میں ایک حد سے زیادہ نمک ہو تو زیادہ آیون لوٹ رہے ہوں گے اور کم ٹوٹ کر الگ ہو رہے ہوں گے۔ اس موخرالذکر کیس میں نمک گھلنے کے بجائے متبلور (Crystallized) ہونے لگتا ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ ایسا نہیں کہ ہر چیز فطرتاً سالموں کی شکل میں پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر عام نمک میں سوڈیم اور کلورین کے آیون ایک مکعب (Cubic) ترتیب میں مرتب ہوتے ہیں؛ لیکن انھیں نمک کے سالموں کی ترتیب نہیں سمجھا جا سکتا۔

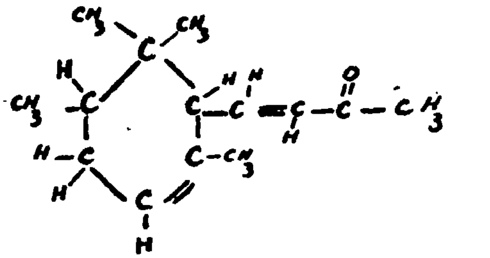
کیمیائی تبدیلیاں :۔ ایٹم تفاعلات (Reactions) کے ذریعے دوسرے ایٹموں سے مل کر نئے سالمے بناتے ہیں۔ ایسا عمل جس میں ایٹم کے ساتھیوں کی کوئی نئی ترتیب واقع ہوتی ہو کیمیائی تفاعل کہلاتا ہے۔ اس کے برخلاف تبخیر وغیرہ کو فزیکل تفاعل کہتے ہیں لیکن کیمیائی اور فزیکل تفاعلات میں ایسا نہیں کہ ایک خاص حدِ فاصل مقرر ہی ہو۔

ایٹم بھی عجیب ہوتے ہیں۔ وہ محض چند مخصوص ایٹموں کے ساتھ ہی مل کر جڑ سکتے ہیں اور وہ بھی اکثر مخصوص سمتوں میں ہی۔ تب یہ فزکس کا کام ہو جاتا ہے کہ معلوم کرے کہ ایٹم ایسا کیوں کرتے ہیں؟ مثال کے طور پر کاربن اور آکسیجن کے ایٹموں کو لیجیے۔ یہ بڑے زور شور سے جڑتے ہیں۔ بڑا ہنگامہ ہوتا ہے اور بڑی تعداد میں حرکتی توانائی پیدا ہوتی ہے۔ یہ عمل عام زبان میں جلنا کہلاتا ہے۔ اس عمل میں کاربن اور آکسیجن کے ملنے سے گرمی پیدا ہوتی ہے۔ بعض دفعہ یہ گرمی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اس سے روشنی بھی پیدا ہوتی ہے اور ہمیں شعلے دکھائی دینے لگتے ہیں۔

کاربن اور آکسیجن کے ملنے سے کاربن مونو آکسائیڈ بنتی ہے جس کو CO لکھ کر ظاہر کرتے ہیں۔ ایسا لکھنا ایک طرح سے اس سالمے کی تصویر بنانے کے مترادف ہے۔ CO میں ایک اور آکسیجن ایٹم جڑ سکتا ہے اور تب جو سالمہ بنتا ہے اسے کاربن ڈائی آکسائیڈ کہتے ہیں اور CO_2 لکھ کر ظاہر کرتے ہیں۔ اگر ہم کاربن کو بہت تھوڑی سی آکسیجن میں بڑی تیزی سے جلائیں (جیسا کہ آٹوموبیل انجن میں ہوتا ہے) تو کاربن مونو آکسائیڈ ہی زیادہ بنتی ہے۔

اس طرح کیمیا داں مختلف حالتوں میں ایٹموں کی مختلف ترتیبوں کی جانچ کرتے ہیں۔ ان جانچوں سے انھوں نے یہ پایا کہ ہر چیز ایٹموں کی کسی نہ کسی قسم کی ترتیب ہوتی ہے۔ مثلاً بنفشے کے پھول کی خوشبو ہی کو لیجیے۔ یہ خوشبو بھی ایک طرح کے سالمے کے مجموعے یعنی ایٹموں کی ترتیب پر مشتمل ہوتی ہے۔ کیمیا داں اس طرح مختلف چیزوں کو لیتے اور ان میں ایٹموں کی صحیح صحیح ترتیب معلوم کرتے رہتے ہیں مثلاً CO_2 سالمہ معلوم ہے کہ سیدھا اور سیمٹرک (Symmetric) ہوتا ہے، O-C-O کی طرح جب کہ بنفشے کی خوشبو کا سالمہ بڑا اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ ایک کیمیکل فارمولا جیسا کہ کہا گیا سالمے کی ایک تصویر سی ہوتا ہے لیکن سالمے تو تین بُعدوں میں پھیلے ہوتے ہیں۔ جب کہ کیمیا داں کو فارمولے دو بُعدوں میں لکھنا ہوتے ہیں پیچیدہ سے پیچیدہ سالموں کے لیے بھی کیمیا داں طرح طرح کے جاسوسی کے طریقوں سے ایٹموں کی ترتیب کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ کیمیا داں یہ جاسوسی مختلف بوتلوں کی چیزیں ملا کر رنگوں کی تبدیلیاں وغیرہ نوٹ کر کے کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک زبردست جاسوسی کام وہ ہے جسے ہم نامیاتی کیمیا (Organic Chemistry) کہتے ہیں۔ جب کیمیا دانوں نے اس طرح سالموں میں ایٹموں کی ترتیبیں بتائیں تو فزکس والوں نے اسے آسانی سے نہیں مانا۔ فزکس والوں نے آلے بنا کر فرداً فرداً ایٹموں کو دیکھنے کی کوشش کی۔ جب انھوں نے ایسا کیا اور دیکھا تو معلوم ہوا کہ کیمیا داں تقریباً ہمیشہ ہی صحیح کہتے رہے تھے۔

مختلف چیزوں کے کیمیائی نام رکھنا کیمیا دانوں کا ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ نام کے ذریعے سالمے میں ہر ایٹم کی بابت کہ کیا ہے اور کہاں ہے وغیرہ بتانا بھی مقصود ہوتا ہے۔ اس طرح مثلاً α-irone نامی چیز کا کیمیا داں جو نام دیتے ہیں وہ
4-(2,2,3,6 Tetramethyl-5-Cyclohexenyl)-3-Butene
ہے اور اس کا کیمیائی فارمولا حسب ذیل ہے:-



شکل نمبر ۱۔ یہ α-irone کی تصویر ہے۔

ایسا نہیں کہ کیمیا داں پیچیدہ باتیں کر کے خوش ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان بیچاروں کے روبرو سالموں کو الفاظ میں بیان کرنے کا ایک بہت مشکل مسئلہ ہوتا ہے۔

ہر چیز ایٹموں سے بنی ہے! یہی کل سائنس کا بنیادی مفروضہ ہے۔ مثلاً بایالوجی کا بنیادی مفروضہ ہے کہ ہر وہ چیز جو زندہ چیزیں کرتی ہیں، ایٹم کرتے ہیں۔ یعنی زندہ چیزیں جو کچھ کرتی ہیں، ان میں کوئی بات ایسی نہیں جو اس زاویہ نگاہ سے سمجھ میں نہ آ سکتی ہو کہ چیزیں فزکس کے اصولوں کے مطابق عمل کرتے ایٹموں سے بنی ہیں۔ یہ بات پہلے نہیں معلوم تھی لیکن اب اس بات کو قبول عام حاصل ہے۔

بنیادی فزکس

فزکس سے مراد چیزوں کی فطرت پر غور کرنا ہے۔ فطرت سے مراد چیزیں جیسے آج کل ہم سمجھتے ہیں کیوں ہے چیزیں مختلف شکلوں میں مختلف خاصیتوں کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہیں۔ تجسس کا تقاضا ہوتا ہے کہ ہم سوالات پوچھیں جن کے جواب میں کوشش ہوتی ہے کہ چیزوں کی تعداد کو اس طرح کم کیا جائے کہ کم چیزوں

سے زیادہ چیزیں سمجھ میں آجائیں

سوالات کا ایک حد تک جواب دینے کا ایک طریقہ وہ ہے جسے ہم سائنسی طریقہ کہتے ہیں۔ سائنسی طریقے کے معنی ہیں مشاہدہ، فکر اور تجربہ۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے دنیا ایک اسٹیج ہے جس پر ایک کھیل کھیلا جا رہا ہے جس کے قاعدے ہمیں معلوم نہیں۔ اس کھیل کو ایک حد تک دیکھنے کی ہمیں اجازت ہے۔ دنیا کے اس کھیل کے قاعدوں کا نام ہی ہم بنیادی فزکس رکھتے ہیں۔ اگر ہم یہ قاعدے جان لیں تو ہم کہتے ہیں کہ ہم نے دنیا کی بابت ایک حد تک سمجھ حاصل کر لی ہے۔

شروع میں ہم مظاہر فطرت کو مختلف خانوں میں بانٹ کر غور کرتے ہیں جیسے کہ حرارت، برق، میکانیات، مقناطیس، جزدلا کے خواص، کیمیائی مظاہر، نور، ایکسرے، نیوکلیر فزکس، ثقل، میسان (Meson) فزکس وغیرہ وغیرہ۔ مگر مقصد ہمارا ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ آخر میں سب ملا کر پوری پکچر دیکھی جا سکے۔ اس طرح کہ کوئی ایک مظہر ان مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا معلوم ہو سکے۔ تکمیل کی اس طرح کی کوششیں ہر دور میں ہوتی رہی ہیں اور آج بھی ہو سکتی ہیں۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا ایسا ممکن بھی ہے کہ واقعی طور پر سب کچھ ملانے سے دنیا ایک ہی چیز کی مختلف کیفیتوں کا اظہار معلوم ہو سکے، کوئی نہیں جانتا۔ ہم کل ملا کر بس اتنا جانتے ہیں کہ کسی دور میں ہم ایک حد تک مجموعی شکل پیش کر سکتے ہیں۔ مگر ہمیشہ کچھ نہ کچھ ایسا رہ جاتا ہے کہ جو اس تکمیل شدہ پکچر میں فٹ نہیں ہوتا۔ ہم کوشش کرتے جاتے ہیں اور پوچھتے جاتے ہیں کہ چیزیں کن سے بنی ہیں اور کم سے کم اجزا یا عناصر کتنے ہیں؟

موجودہ صدی کے اوائل میں ہماری فکر کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔ دنیا ایک تین بُعدی فضا میں واقع ہے جسے اقلیدس (Euclid) نے بیان کیا تھا اور جس میں تبدیلیاں ایک الگ بُعد وقت میں ہوتی ہیں۔ اجزاء جو کار فرما ہیں وہ ہیں ایٹم جو کچھ خواص رکھتے ہیں۔ مثلاً ایک خاصیت ہے جمود کی۔ یعنی ذرہ حرکت کر رہا ہے تو وہ اسی سمت میں اسی طرح حرکت کرتا رہے گا جب تک کہ اس پر کوئی قوت نہ عمل کرے۔ اس طرح دوسرا جز قوت تھا۔ یہ دو طرح کی تھیں ایک تو وہ جو ایٹموں کو پیچیدہ طور مختلف ترتیبوں میں جکڑے تھیں اور دوسری دور تک عمل والی قوت ثقل تھی جو فاصلے کے مربع (square) کے ساتھ معکوس طور سے (Inversely) بدلتی تھی۔ لیکن لازمی بات یہ معلوم نہیں تھا کہ چیزیں جب حرکت کر رہی ہوتی ہیں تو کیوں حرکت میں باقی رہتی ہیں یا ایک ثقل کا قانون ہے تو کیوں ہے۔ وغیرہ۔

یہ معلوم تھا کہ ایٹموں کی مسلسل بے ترتیب حرکت کا دوسرا نام حرارت ہے اور آواز کی لہریں ایٹموں کے مجموعوں کی کثیف لطیف لہریں ہوتی ہیں یہ سب بھی سمجھ لینا ایک بڑی بات تھی۔

جہاں تک بنیادی ذرّوں کا تعلق ہے یہ سمجھا جاتا تھا کہ (۹۲) مختلف قسم کے ایٹم ہیں جن کے مختلف کیمیائی نام ہیں۔

اس قوت کے بارے میں جو ایٹموں کو باہم جکڑے ہوئے ہے ضروری تھا کہ تجاذب اور تنفر دونوں خواص کی حامل ہو۔ ورنہ صرف تجاذب کے ہونے کی صورت میں سب چیزیں ایک دوسرے میں گر کر ایک نقطے میں سما جاتیں معدوم ہو جاتیں۔ وہ قوت جو ایٹموں کے بیچ تبادلِ فعل کی اساس ہے بالآخر برقی قوت ہی ہوتی ہے۔ یہ ایک زبردست قوت ہوتی ہے لیکن برق کے مثبت اور منفی ذرّے اس طرح توازن میں ہوتے ہیں کہ مجموعی طور پر ان کے دور پر واقع ہونے والے اثرات باہم معدوم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ساری چیزیں، جن میں ہم خود بھی شامل ہیں، بہت نفیس چھوٹے چھوٹے مگر زبردست طاقت سے تبادل فعل کرتے مثبت و منفی برقی اجزا سے بنی ہیں جو بڑی عمدگی کے ساتھ ایک دوسرے کے برقی اثر کو متوازن کیے ہوئے ہوتے ہیں۔

اس طرح ایٹموں کو یوں سمجھا گیا کہ بیچ میں ایک نیوکلیس + ہوتا ہے جو برقی طور پر مثبت اور بھاری تھا اور جس کے اطراف برقیوں کی ایک تعداد ہوتی تھی جو بہت ہلکے اور منفی برق کے حامل

والے تھے۔ نیوکلیئس میں بھی دریافت ہوا کہ دو طرح کے ذرّے ہیں۔ پروٹان اور نیوٹران۔ یہ دونوں کافی وزنی اور ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں مگر پروٹانس برقی طور پر مثبت چارج والے، تو نیوٹرانس بے چارج والے ہیں۔ بالعموم ایک ایٹم میں جتنے پروٹانس ہوتے ہیں، اُسی تعداد میں الیکٹرانس بھی ہوتے ہیں چیزوں کے کیمیائی خواص صرف ایک عدد پر منحصر ہوتے ہیں اور وہ عدد تھا برقیوں کی تعداد کا عدد۔

برقی قوت کے بارے میں یہ بھی دریافت ہوا کہ ایک برقی چارج ایک معنیٰ میں اپنے اطراف کی فضا کو ایسا بگاڑ دیتا ہے اور اس میں ایسی حالت پیدا کر دیتا ہے کہ اس میں دوسرا چارج رکھنے سے اِس دوسرے چارج پر ایک قوت عمل کرتی ہے۔ قوت پیدا کرنے کی اس خاصیت کو برقی فیلڈ (Field) کہتے ہیں۔ اس طرح دو اصول بنے (۱) چارجوں سے فیلڈ بنتی ہے اور (۲) فیلڈ میں موجود چارجوں پر قوتیں عمل کرتی ہیں اور وہ حرکت کرتے ہیں۔ ایک اور دلچسپ چیز مشاہدہ میں آئی۔ اگر چارجوں کو ہلایا جائے تو اثر معکوس مربع کے مقابلے زیادہ آہستگی کے ساتھ کم ہوتا ہے۔ لیکن بدلتے برقی فیلڈ کے ساتھ ہمیشہ مقناطیسی فیلڈ بھی ہوتا ہے۔ اس طرح ایک راست تبادلِ فعل کی جگہ ایک برقو مقناطیسی (Electro magnetic) فیلڈ کا وجود ماننا پڑتا ہے۔

برقو مقناطیسی فیلڈ میں لہریں ہو سکتی ہیں۔ ایسی کچھ لہریں وہ ہیں جنہیں روشنی کہتے ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جنہیں ریڈیو براڈ کاسٹ کہا جاتا ہے۔ یہ سب برقو مقناطیسی لہریں ہیں۔ ان میں فرق صرف ان کے ڈولنے کے تواتر (Frequency) کا ہوتا ہے۔ ہماری عمارتوں میں لگے تاروں میں گزرنے والی بجلی کا تواتر کوئی پچاس سائیکل فی سکنڈ ہوتا ہے۔ اگر ہم تواتر بڑھائیں تو 500 تا 1000 کیلو سائیکل (ایک کیلو سائیکل 1000 سائیکل) پر ریڈیو براڈ کاسٹ کی تواتر حدوں میں پہنچ جاتے ہیں تواتر اس سے زیادہ ہو تو FM اور TV میں استعمال

ہونے والی لہروں کے تواتر آتے ہیں اور زیادہ کرنے پر RADAR لہریں ملتی ہیں۔ اس سے زیادہ ہو تو پھر ایسی لہریں ملتی ہیں جنہیں ہم دیکھ سکتے ہیں۔ دکھائی دینے والی روشنی کی تواتر حدیں 5×10^{14} تا 5×10^{15} سائیکل فی سکنڈ ہوتی ہیں۔ اس سے کم تواتر دون احمری (Infrared) اور زیادہ تواتر بالا بنفشی (Ultra violet) تواتر کہلاتے ہیں۔ اگر ہم ان سے بھی زیادہ تواتر کی لہریں لیں تو ایکسریز (X-Rays) حاصل ہوتی ہیں۔ ایکسریز زیادہ تواتر کی روشنی سے الگ کچھ اور چیز نہیں۔ اس کے بعد گاماریز (Gama Rays) کے تواتر آتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ یعنی 10^{24} سائیکل فی سکنڈ تواتر کی لہریں نیوکلیائی اسراع گردوں (Nuclear Accele-rators) میں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ ان سے بھی ہزار گنا زیادہ تواتر کی لہریں صرف کاسمک شعاعوں (Cosmic Rays) میں ملتی ہیں۔ یہ شعاعیں ہمارے بس سے باہر ہوتی ہیں۔

سنہ ۱۹۲۰ء سے پہلے آئن اسٹائن نے تین بُعدی فضا اور اس کے ساتھ وقت کے ایک الگ بُعد کے تصور کو بدل کر دونوں کا ایک مجموعہ پیش کیا جسے ہم فضا۔ وقت کہتے ہیں اور پھر اسے مزید ترمیم کر کے خمیدہ فضا — وقت میں بدل دیا گیا جو کششِ ثقل کا مظہر مانا گیا۔

ایک اور انقلاب اس مزید دریافت سے آیا کہ ایٹموں کی دنیا میں عام میکانیات کے قاعدے جیسے جمود اور قوتوں کے ملنے ہوئے اصول کام نہیں کرتے، غلط ہو جاتے ہیں۔ چھوٹے پیمانے پر چیزیں بڑے پیمانے پر چیزوں کے مقابلے میں یکسر مختلف طرح کا برتاؤ دکھاتی ہیں۔ چونکہ یہ برتاؤ غیر مانوس ہوتا ہے اس لیے ان چھوٹے پیمانے کی چیزوں کو سوائے تحلیلی طریقوں کے اور طرح بیان کرنا ممکن ہی نہیں ہو پاتا۔ اس کام کے لیے بڑے فکر اور تخیل کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کام کافی مشکل ہوتا ہے۔

کوانٹم میکانیکس کے کئی پہلو ہیں۔ اول تو اس کی اجازت

نہیں ہوتی کہ ایک ذرّے کا مقام متعین ہو تو اس کی رفتار بھی متعین ہو سکے۔ اسے مثلاً $\Delta x \Delta p \geq \frac{h}{2\pi}$ لکھ کر ظاہر کر سکتے ہیں جہاں Δx اور Δp سے مراد جگہ اور مقدارِ حرکت کے عدم تعین کی مقدار ہے۔ اس بات سے ایک بڑا معمہ حل ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ بات کہ ایٹم اتنے بڑے کیوں ہوتے ہیں۔ کوئی پوچھے کہ ایٹم میں برقیے نیوکلیس میں کیوں نہیں جا گرتے تو جواب ہے اِس اصول کی وجہ سے۔ اس کے علاوہ ہم نے اوپر بتایا تھا کہ صفرِ مطلق تپش پر بھی بلّور کے ایٹم ہلنا جلنا بالکل بند نہیں کر دیتے۔ اس کی وجہ بھی یہی اصول ہے کیونکہ اگر وہ بالکل رُک جائیں تو ہم جان جائیں گے کہ صفر حرکت پر وہ کہاں تھے جو ممکن نہیں ہے۔

دوسری اہم اور دلچسپ تبدیلی جو کوانٹم میکانیکس کی وجہ سے سائنس کے خیالات اور فلسفے میں ہوئی ہے یہ ہے کہ اب یہ ٹھیک ٹھیک بتانا ممکن نہیں ہوتا کہ کسی خاص حالت میں کیا ہوگا۔ بعض دفعہ فلسفی کہتے ہیں کہ سائنس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب وہی حالتیں ہوں تو وہی بات ہمیشہ ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سائنس کی بنیادی شرط ہے۔ یہ درست نہیں ہے۔ یہ سائنس کی بنیادی شرط نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُسی حالت میں وہی بات ہمیشہ نہیں ہوتی۔ ہم محض ایک اوسط شماریاتی طرز پر دریافت کر سکتے ہیں کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس کے باوجود ہم نے دیکھا کہ سائنس یہ نہیں کہ ٹوٹ کر بکھر گئی ہو۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ پھر سائنس کی بنیادی شرط ہے کیا؟ یہ ہم نے شروع میں ہی بتا دیا کہ وہ شرط صرف یہ ہے کہ کسی خیال کی درستگی کی واحد کسوٹی تجربہ ہے۔ اگر کوئی بات نہیں ہوتی تو نہیں ہوتی۔ ہمیں جو ہم پاتے ہیں وہ بنانا ہوتا ہے اور اپنے خیالات اور نظریات اپنے واقعی تجربے کے مدِ نظر وضع کرنے ہوتے ہیں۔

کوانٹم میکانیکس، فیلڈ اور اس کی لہروں اور ذرّات ان سب کو متحد کر دیتی ہے۔ لہریں ذرّات کی طرح اور ذرّات لہروں کی طرح عمل کرتے ہیں۔ جب تواتر کم ہوتا ہے تو مظہر کا فیلڈ پہلو زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ تواتر بڑھنے پر ذرّاتی پہلو زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہم پہنچے، پروٹان اور نیوٹران کے ساتھ ایک اور ذرّہ شامل کر لیتے ہیں۔ یہ نیا ذرّہ نوریہ یا فوٹان کہلاتا ہے۔ الیکٹران اور پروٹان کے تبادلاتِ فعل کا یہ نظریہ جو برق مقناطیسی نظریہ ہی ہے لیکن ایسا کہ اس میں ہر بات کوانٹم میکانکی طور پر درست ہو کوانٹم برق قوئیات یا کوانٹم الیکٹرو ڈینامکس کہلاتا ہے۔ اس ایک نظریے میں ہم کو سوائے ثقل اور نیوکلیر معاملات کے باقی سارے عام مظاہر کے بنیادی اصول مل جاتے ہیں۔ اس طرح اصولی طور پر کوانٹم الیکٹرو ڈاینامکس ساری کیمیا اور زندگی کا بھی نظریہ ہے بشرطیکہ ہم یہ مان لیں کہ حیات بالآخر کیمیا میں اور اس طرح محض فزکس میں تخفیف پا سکتی ہے۔

اس کے علاوہ کوانٹم الیکٹرو ڈاینامکس کے مطابق الیکٹران کی طرح اسی مقدار مادّہ مگر مخالف برقی چارج کا ایک اور ذرّہ پوزیٹران (Positron) بھی ہونا چاہیے۔ الیکٹران اور پوزیٹران باہم ایک دوسرے کو فنا کر سکتے ہیں اور اپنے تئیں روشنی یا گاما ریز میں بدل جاتے ہیں۔ اس بات کی عمومی شکل یعنی یہ بات کہ ہر ذرّے کا ایک مخالف ذرّہ ہونا چاہیے بھی درست ثابت ہوتی ہے۔

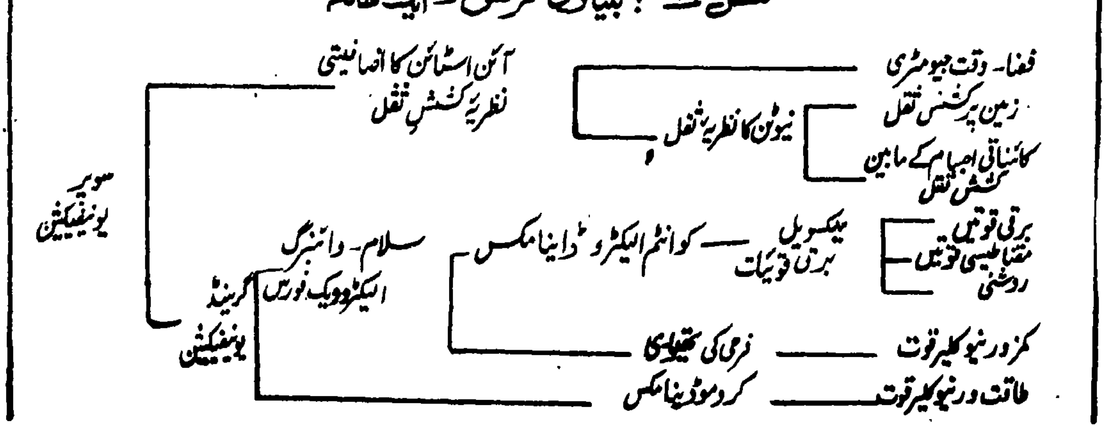
نیوکلیائی اور ذرّات

سوال یہ ہے کہ نیوکلیائی کن چیزوں سے بنے ہیں اور وہ چیزیں کس طرح جڑی رہتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ نیوکلیائی زبردست قوتوں سے جڑے ہوتے ہیں۔ جب یہ قوتیں آزاد ہوتی ہیں تو کیمیائی توانائی کے مقابلے میں ان کی آزاد کی ہوئی توانائی زبردست ہوتی ہے۔ یوکاوا نے تجویز کیا کہ پروٹانس اور نیوٹرانس کے درمیان جو قوت عمل کرتی ہے وہ بھی برق کی طرح ایک فیلڈ رکھتی ہے اور جب اس فیلڈ کو ہلایا جلایا جاتا ہے تو یہ ذرّے کی طرح عمل دکھاتی ہے۔ یوکاوا نے کہا کہ نیوکلیر قوات کی معلوم خواص کے مدِ نظر ان نئے ذرّوں کا وزن الیکٹرانس سے دو سو سے تین سو گنا زیادہ ہونا چاہیے اور کیا دیکھتے ہیں کہ کاسمک شعاعوں میں بالکل اسی وزن کے ذرّے دریافت ہو گئے۔ لیکن پھر پتہ چلا یہ غلط ذرّے تھے ان کو میئو میسان (mu meson) یا میئوان

(muon) کہا گیا۔ لیکن کچھ ہی دن بعد ایک اور ذرہ دریافت ہوا جو پائی میسان (Pi meson) یا پائی آن (Pion) تھا اور جس نے یوکاوا کی شرطوں کی تشفی کر دی۔

اس کے علاوہ کاسمک شعاعوں میں اور بہت سے ذرّے دریافت ہوئے۔ ایک عرصے تک ان ذرّوں کو ترتیب دے کر ایٹموں کے دوری جدول کی طرح کے جدول میں لانے کی کوشش ہوتی رہی۔ ایک اس طرح کی ترتیب جس میں ایک نئے نمبر عجیبیت (strangeness) کا استعمال کیا گیا قدرے کامیابی ہوئی۔ یہ نمبر برقی چارج کی طرح ذرّوں کی ایک خصوصیت سمجھا جا سکتا ہے۔ نیوکلیئر ریکشنز میں برقی چارج کی طرح یہ نمبر بھی بقا پا سکتا ہے۔ اس نئے جدول کی مدد سے ایک نئے ذرّے اُمیگا (Ω) کی پیشن گوئی ہوئی اور بعد میں یہ اسراع گروں میں تجربوں میں مشاہدہ کر لیا گیا۔ اس نئی ترتیب کے مطابق پروٹان، نیوٹران اور پائی آن وغیرہ سے بھی زیادہ بنیادی چیزیں ہیں جن کو کوارکس (Quarks) کہا جاتا ہے۔ دو کوارکس سے میسان اور تین سے پروٹان نیوٹران وغیرہ بنتے ہیں —— لیکن یہ کوارکس کبھی الگ سے مشاہدہ نہیں کیے گئے۔ ایک تجویز یہ ہے کہ دو کوارکس کے بیچ قوت کوارکس کے مابین دوری کے مطابق بڑھ جاتی ہے یعنی جتنی دوری زیادہ ہوگی قوت اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ اس لیے الگ الگ کوارکس مشاہدہ نہیں ہوتے۔ اس قوت کی فیلڈ بھی ذرّے کی طرح برتاؤ کر سکتی ہے اور وہ ذرہ کہلاتا ہے گوندیہ (Gluon)۔ کل چھ قسم کے کوارکس کا وجود اس وقت مانا جاتا ہے۔ کوارکس کے علاوہ لیپٹانس (Leptons) ہوتے ہیں۔ کوارکس اور لیپٹانس اس وقت سب چیزوں کے بنیادی جز سمجھے جاتے ہیں۔ چھ کوارکس کی طرح چھ ہی لیپٹانس کا وجود اس وقت مانا جاتا ہے۔ ان کے درمیان جو قوتیں عمل کرتی ہیں وہ سب کی سب فیلڈز اور اس لیے ذرّوں کی طرح برتاؤ کرتی ہیں۔ یہ ذرّے فوٹان، گلوآن اور گریویٹان کے علاوہ ڈبلیو اور زیڈ ذرّے بھی ہیں یہ ڈبلیو اور زیڈ ذرّے نیوکلیئر قوت کے کمزور جز کے فیلڈ ذرّے ہیں اور حال کی عظیم الشان دریافتوں میں سے ایک ہیں ان کی پیشن گوئی سلام اور وائنبرگ نے یہ بتا کر کی تھی کہ برقی مقناطیسی قوت اور نیوکلیئر قوت کا کمزور جز دراصل ایک حد میں ایک ہی قوت بن جاتے ہیں اور اس لیے فوٹان کی طرح زیڈ اور ڈبلیو ذرّوں کا وجود بھی ضروری ہے۔ ان سب کے علاوہ کچھ اور ذرّے بھی ہیں جن کی تلاش جاری ہے جو ابھی مشاہدہ نہیں کیے گئے۔ جیسے جیسے ہم زیادہ وزنی ذرّوں کی بات کرتے ہیں تو ان کو مصنوعی طور سے پیدا کرنے کے لیے بڑے بڑے اسراع گر درکار ہوتے ہیں۔ ڈبلیو اور زیڈ ذرّوں کی دریافت بھی عملی فزکس کا ایک کارنامہ ہے۔

شکل ۲ : بنیادی فزکس — ایک خاکہ



تو یہ ہے ہماری بنیادی فزکس کی پکچر۔ کوارکس اور اوران کے درمیان عمل کرتے فوٹان، ڈبلیو وزیڈ ذرے گلوان اور گریویٹان وغیرہ۔ کیا اس سے بھی زیادہ بنیادی سطح پر جایا جاسکتا ہے۔ طرح طرح کے نظریے ہیں۔ لیکن ابھی وثوق سے کوئی بات نہیں کی جاسکتی ہے۔ ابھی پروفیسر عبدالسلام علی گڑھ آئے تھے اور انھوں نے بتایا کہ نئے نظریوں کو تجربے سے جانچنے کے لیے ایک ایسے اسراع گر کی ضرورت ہے جس کی لمبائی یہاں سے لے کر سورج تک کی ہوگی۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اور زیادہ بنیادی سطح پر وثوق سے کچھ کہنے میں کیسی دشواریاں ہوسکتی ہیں۔ ہم اب تک کی اس پکچر کو گذشتہ صفحوں پر بنا کی شکل سے دکھا سکتے ہیں۔

(باقی)

۱۹۰۷ء (اے ایم او کالج) میں طلبا کی اسٹرائک ہوئی۔ جس نے بدنما صورت اختیار کرلی۔ محسن الملک بڑھاپے اور بیماری میں یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے اور سکریٹری کے عہدے سے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا۔ طلبا نے سنا تو ندامت سے ان کے سر جھک گئے اور ایک معافی نامہ لکھ کر اپنی خطاؤں سے درگزر کرنے کی درخواست کی۔ محسن الملک کا دل بھر آیا اور جواب دیا:

"خدا میرے عزیز طالب علموں کی عمر دراز کرے اور ان کو با اقبال کرے اور وہ قوم کے فخر ہوں۔ وہ میرے مرتے وقت اپنے سعادت مندانہ عمل سے تسلی دیں، میرا جنازہ اٹھائیں اور اپنے ہاتھوں سے مجھے دفن بھی کریں۔ میرے کوئی اولاد نہیں، میرے کوئی بچہ نہیں، مگر جتنے لڑکے یہاں ہیں وہ میرے بچے ہیں۔ گو وہ مجھے اپنا نہ سمجھیں مگر میں ان کو اپنا جگر گوشہ اور پارۂ دل سمجھتا ہوں اور یہ بھی امید رکھتا ہوں کہ مجھے اپنے ہاتھوں سے اسی سرزمین میں دفن کریں اور مٹی کے ڈھیلے میری قبر پر اپنے پیارے ہاتھ سے رکھیں۔"

آٹھ مہینے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ وہ وقت آپہنچا جس کا دھڑکا تھا۔ محسن الملک نے شملہ میں جان جان آفریں کے سپرد کی۔

جنازہ اٹاوہ لے جانے کے لیے گاڑی کے ذریعے جب علی گڑھ سے گزرا تو طلبا نے ان کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے نعش کو علی گڑھ میں اتار لیا اور سرسید کے قریب ان کو دفن کر دیا۔

طارق حنیف

ریاضی کی داستان

ریاضی کی داستان بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی حضرت انسان کی۔ پہلے پہل زمین پر سب لوگ شکاری تھے اور خوراک کے حصول میں جگہ جگہ مارے مارے پھرتے تھے۔ ان کی زندگی اس قدر محدود تھی کہ ان کو ریاضی کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ سادہ گنتی اور حصے بخرے کا علم ان کے لیے کافی تھا۔

ہاں اگر جگہوں کی تبدیلی میں ان کے موسم اور سمتوں کے علم کے فقدان کا شدت سے احساس تھا۔ شاید یہ بات زیادہ بے جا نہیں کہ ان کو یہ راز معلوم کرنے میں سینکڑوں برس لگ گئے کہ سمتوں کے تعین کے لیے ستارے سورج سے زیادہ قابل اعتماد ہیں۔ اسی وجہ سے پھر انھوں نے راتوں کو سفر شروع کیا۔

لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ زمین پر سورج چاند اور ستارے ہی پہلی "گھڑی" ثابت ہوئے۔ دن کے وقت شکاری سایوں کی لمبائی سے وقت کا اندازہ لگا لیتے مگر رات کو وقت کے لمبے وقفے کو ناپنے کے لیے وہ اکثر چاند کو گواہ بنا لیتے تھے۔ آخر کار ان پر یہ بھید کھلا کہ ایک پورے چاند سے دوسرے پورے چاند تک کل تیس دن ہوتے ہیں۔

ہزاروں سال بعد ان میں سے کچھ شکاریوں نے چرواہے اور کسانوں کا پیشہ اختیار کیا اور گاؤں میں بود و باش اختیار کی (یاد رہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے روئے زمین پر پہلی بستی بسائی) اور جانوروں کے ریوڑ پالنے شروع کیے۔ اب ان کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ اپنے مویشیوں کا حساب کتاب بھی رکھیں۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے انھوں نے جس نظام کا سہارا لیا وہ ٹیلی نظام (Tally System) ہے۔ اسی طرح کی گنتی عرصۂ دراز تک مروّج رہی اور کسی نہ کسی طرح آج بھی مروج ہے۔

چرواہوں کے وجود میں آنے سے گنتی ایجاد ہوئی۔ مگر کسانوں کا وجود اس سے بھی زیادہ قابل اعتبار نظام چاہتا تھا۔ ان کو اب تحریری "چاند کیلنڈر" سے بڑھ کر کیلنڈر چاہیے تھا جس سے موسموں کی پیش گوئی ہو سکے۔ اس مسئلے کا حل اس وقت کے علماء نے نکالا اور ایک کیلنڈر بنا کر کسانوں کو دیا۔ وہ کیلنڈر کسانوں کی ضرورت اس خوبی سے پوری کرتا تھا کہ اس کو دیکھتے ہی انھوں نے نعرہ لگایا "ہم نے زمین کو تسخیر کر لیا"۔

جیسے جیسے تہذیب ترقی کرتی گئی، گنتی، حساب کتاب اور ناپ تول کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ محسوس کی جانے لگی۔ اس کے بعد جس قدیم ترین نظام کا تاریخ سے پتہ چلتا ہے وہ آج سے ۵۰۰۰ سال قبل مسیح مصر اور میسوپوٹیمیا (Mesopotamia) کے لوگوں نے استعمال کیا۔

کسانوں نے زمین کی تقسیم بھی مروجہ گنتی کے اعتبار سے کی۔ وہ "ایک" کے لیے ایک خط کھینچتے تھے اور دس اور اس سے بالا اعداد کے لیے علیحدہ علیحدہ خطوط کھینچتے تھے۔ اس کے ایک ہزار سال بعد رومیوں نے ایک سے لے کر چار تک اعداد ایجاد کیے۔ مگر پانچ، دس اور پچاس کے لیے وہ اعداد کے بجائے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ اسی دوران چینی بھی تین تک اعداد بنا چکے تھے اور تین سے دس تک وہ علیحدہ علیحدہ نشان استعمال کرتے تھے۔

مرکزی امریکہ کے باشندے جنھیں میان کہتے ہیں صرف نقطے اور

اعداد سے کوئی نیا عدد لکھ سکتے تھے۔ لیکن اسی دوران ہندوستان کے لوگوں کا دھیان اس طرف گیا جس طرف ابھی تک کسی کا دھیان نہ گیا تھا یعنی انھیں احساس ہوا کہ صفر کے لیے بھی کوئی نشان ہونا چاہیے (یاد رہے کہ میاز وہی باشندے ہیں جنھوں نے تین سو سال بعد از مسیح ایک شاندار تہذیب قایم کی اور لگاتار چھ سو سال تک پھلتے پھولتے رہے۔ انھوں نے فن تعمیر ظروف سازی اور رنگ و روغن کو فروغ دینے میں گراں قدر خدمات انجام دیں جہاں وہ رہتے تھے اب وہ جگہ میکسیکو کے علاوہ کئی امریکی ریاستوں میں بٹی ہوئی ہے)۔

قدیم مصر کے علماء، طاقتور بھی تھے اور ماہر علوم جدید بھی۔ اب انھوں نے حکمًا مذہبی عمارات اور اہرام مصر تعمیر کرانا شروع کیے۔ انہیں عمارات کی تعمیر کے دوران معماروں نے ناپ تول کے سلسلے میں بہت کچھ دریافت کیا۔ گو ناپ تول کے نظام کے لیے یہ تعمیرات اسکول ثابت ہوئیں۔ معماروں نے ناپ تول کے لیے آلے بنائے اور ان کی اساس انسانی جسم کی لمبائی پر رکھی اور بعد میں ان کو لکڑی یا تانبے پر کرید کر باقاعدہ معیار قایم کیا۔

ہر سال علماء کسانوں سے اناج کی شکل میں خراج لیتے تھے۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ سب کسان ایک جیسا خراج دیں، انھوں نے شراب اناج اور تیل کے لیے مرتبان بنا رکھے تھے۔ ان ہی مرتبان سے وہ دوسری متعلقہ اشیاء بھی ناپ لیتے تھے۔ چوں کہ خراج کھیتوں کے لحاظ سے لیا جاتا تھا اس لیے علماء نے رقبہ ناپنے کے لیے "سہ زاویہ طریقہ" ایجاد کیا۔ جو آج بھی ارضی تجزیہ کرنے والے استعمال کرتے ہیں۔ سان ہی مصریوں نے مندرجہ بالا تمام معلومات کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھ کر مہر تصدیق ثبت کی۔

مصر کی قدیم تہذیب اور تہذیب میسوپوٹیمیا تقریبًا ایک جیسی تہذیبیں تھیں۔ دونوں تہذیبوں نے فلکیات کے مطالعہ میں بڑی خدمات انجام دیں۔

اسی دوران میسوپوٹیمیا کی تجارت بیرونی ممالک تک پھیلنے لگی اس لیے تاجر حضرات کو ایک بین الاقوامی معیاری پیمانے کی ضرورت کا شدت سے احساس ہوا۔ سہولت کے لیے انھوں نے چاندی کی چھوٹی چھوٹی سلاخیں استعمال کرنی شروع کیں۔ جن پر ان کے وزن کی مہر لگی ہوئی تھی۔ انہی لوگوں نے تہذیب کو "دولت" کے تصور سے روشناس کرایا اور "پیسہ" ایجاد کیا۔

۱۵۰۰ قبل مسیح میں فونیقیا (PHOENICIA) میں بحر روم کے مشرقی ساحل پر بڑے بڑے تجارتی مراکز قایم ہوئے۔ فونیقی ملاحوں نے ان تجارتی اشیاء کو بحر روم میں دور دراز کے سفر کے ذریعہ دور دور تک پھیلا دیا۔ ان ہی سفروں کے دوران ان ملاحوں نے زمین اور آسمان کا بغور مطالعہ کرکے اپنے جیومیٹری کے علم کو مزید مستحکم کیا۔ بعد میں یہی ملاح عظیم جہازران بنے اور جہازرانی کے ذریعے سائنس میں لوگوں کی رہنمائی کی۔

پہلے پہل یونانی جو کہ جزیرہ روم کے ساحل پر رہتے تھے سمندری تجارت کر سفر سے لطف اندوز ہونے لگے اور اس سے ان کو دوسرے ممالک سے علم اور دولت حاصل ہونے لگی۔ یونانیوں نے اس علم پر بحث کے لیے مصر زمین شہر کو بلایا اور نئے علم پر خوب بحث و تمحیص کی۔ اسی دوران حکیم فیثاغورث نے اپنا ریاضی کا علم ایک نوجوان کو پڑھایا بلکہ منتقل کر دیا۔ عوام کے بحث و مباحثے نے سوچ کے نئے زاویے دیے۔ اس طرح ہر نیا مسئلہ عوام میں بحث کے لیے پیش کیا جاتا۔ جیومیٹری کے اصولوں نے رفتہ رفتہ منطقی اصولوں کی شکل اختیار کر لی۔ ۳۰۰ قبل مسیح میں اقلیدس نے ان منطقی اصولوں کو کتابوں کی شکل میں لکھنا شروع کر دیا۔

ریاضی (ARITHMATIC) ایک یونانی لفظ ہے جس کا مطلب ہے "اعداد سے متعلق" یونانی اعداد کے ہیر پھیر کو حل کرنے میں بڑا لطف محسوس کرتے تھے۔ کیوں کہ وہ اعداد کو الفاظ سے ظاہر کرتے تھے۔

رومیوں نے اگرچہ تمام یورپ فتح کر لیا تھا، مگر اپنے اعداد کی بنیاد یونانیوں سے مستعار لے رکھی تھی اور جب رومی سلطنت تباہ ہوئی تو ان کا کام بھی مٹ گیا۔ مغربی لوگوں نے اس علم کو بھی نہ کریدا بلکہ جان بوجھ کر پس پشت ڈال دیا۔ اس دور میں پھر مشرق سے نور کی کرن پھوٹی۔

دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک تہذیب "وادیٔ مہران" کی بھی ہے جو اس وقت ہندوستان میں تھی۔ اس تہذیب کے ریاضی دان اتنے ہی ترقی یافتہ تھے جتنے میسوپوٹیمیا کے ریاضی دان۔

اگرچہ ہندوستان کے لوگوں نے ایک تا نو مختلف نشان مقرر کر رکھے تھے، مگر جس بات نے ان کو مشہور کیا وہ یہ تھی کہ وہ خالی کالم کو صفر (ZERO) سے ظاہر کرتے ہیں۔ اس ایجاد نے ریاضی کے بہت سے عددی مسائل کو حل کر دیا۔ ہندوستان کے ریاضی داں اعداد کو کسر میں لکھتے تھے اور قوسین (BRACKETS) بھی استعمال کرتے تھے اور ویسے

بھی آج ہم استعمال کرتے چلے آرہے ہیں۔ ۸۰۰ قبل مسیح میں یہ حضرات صفر کی ایجاد کا مژدہ لے کر بغداد پہنچے۔ بغداد اس وقت علم و حکمت کا سب سے بڑا اسلامی دار الخلافہ تھا۔ یہاں ہندوستانی ریاضی دانوں کا کام اور اقلیدس کی جیومیٹری کا مسلمانوں نے عربی میں ترجمہ کیا۔

اسلامی دار العلوم میں طلباء یونانی جیومیٹری، ہندوستانی ریاضی اور فلکیات کے علاوہ TRIGNOMETRY اور رقبہ کے علم کا مطالعہ کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ریاضی کا علم یورپ کی طرف پھیلنا شروع ہوا۔ ۱۴۰۰ قبل مسیح میں یورپ نے عربی ریاضی کو اچھی طرح سیکھ لیا۔ اور اس کو عمومی طور پر سکھانے کے لیے اسکول کھول دیے۔ نصابی کتب لکھی گئیں جن میں پہاڑے اور کئی دوسرے مفید گُر بتائے گئے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جمع (+)، تفریق (−) تقسیم (÷) اور ضرب (×) کے نشانات بتائے گئے۔

مگر عربی ریاضی کے یورپ پہنچنے سے پہلے ہندو اور مسلمان ریاضی دانوں نے عددی سوالات کو حل کر لیا تھا اور ان کے حل کے لیے قوانین بھی مرتب کر لیے تھے۔ ریاضی میں اگرچہ مسلمانوں نے بہت سا کام کیا مگر پھر بھی اس میں بہت سی دوسری قوموں نے بھی مدد کی۔ ہاں، مگر الجبرا خالصتاً عربوں کی ایجاد ہے اور یہ لفظ بھی عربی زبان کا ہے۔ عربوں نے جو الجبرا ایجاد کیا وہ ۱۶۰۰ قبل مسیح تک پڑھایا جاتا رہا۔ مگر اس کے بعد اس کو تبدیل کر دیا گیا اور وہ شکل دی گئی جس میں آج ہم اس کو پہچانتے ہیں۔

ریاضی کی جدید معلومات اور الجبرا سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد مغربی ریاضی داں اس قابل ہو گئے کہ جدید دنیا کے عملی مسائل کو حل کر سکیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، انھوں نے مشینیں اور ورکشاپ بنائے۔ سائنس دانوں نے زمین اور آسمان کا ایک نئی نظر سے مطالعہ کیا اور ریاضی کی نئی برانچ ایجاد کی جسے آج ہم CALCULUS کہتے ہیں۔ ماہر فلکیات اور انجینیر حضرات جب "حرکت" اور "تبدیلیٔ حرکت" کا مطالعہ کرتے ہیں تو CALCULUS کا سہارا لیتے ہیں۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ترقی کی نئی راہوں نے نئے نئے مسائل بھی پیدا کیے ہیں۔ ان ہی پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے حضرت انسان نے ریاضی کی کئی برانچیں ایجاد کیں۔ جو ریاضی کی ترقی کا بیّن ثبوت ہیں۔ مگر اب بھی ریاضی زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے ایسا ہی ہے جیسا ہزاروں سال پہلے چرواہوں اور کسانوں کے مسائل حل کرنے کے لیے تھا۔ اگرچہ آج کے مسائل زیادہ پیچیدہ ہیں، مگر آج کے ریاضی داں اس لحاظ سے خوش ہیں کہ انھوں نے کمپیوٹر ایجاد کر لیا ہے۔ آئندہ سالوں میں ریاضی میں اور ترقی ہوگی۔ کیوں کہ اس کی داستان ابھی ختم نہیں ہوئی۔

اہمیت کے لحاظ سے ریاضی سائنس کی کنجی ہے۔ اور سائنس کی ترقی میں اس کا جتنا ہاتھ ہے کسی دوسرے واحد مضمون کا نہیں۔ اس کی ترقی کا ذکر کرنے کے لیے صفحات درکار ہیں، مگر اتنی ترقی کے باوجود یہ اتنا بے بس ہے کہ آج تک کوئی ریاضی داں اس سوال کا جواب نہیں دے سکا

شہرہ بہت سنا ہے ریاضی میں آپ کا ــــ طولِ شبِ فراق ذرا ناپ دیجیے

"اپنے دوست سے خلق و مدارات کے ساتھ دوستی کرو۔ شاید وہ کسی دن تمہارا دشمن ہو جائے (اس وقت تمہارا خلق و مدارا اس کے پیشِ نظر رہے گا) اور اپنے دشمن سے دشمنی کرو لیکن خاطر و مدارات کا پہلو لیے ہو۔ کیوں کہ شاید وہ کسی دن تمہارا دوست ہو جائے"

نہج البلاغۃ۔

محمد سالم قدوائی

مولانا عبدالماجد دریابادی

(ایک ہمہ گیر شخصیت)

مولانا عبدالماجد دریابادی کی پیدائش مارچ ۱۸۹۲ء میں دریاباد میں ہوئی۔ ان کا خاندان ایک معزز خاندان تھا اور قرب و جوار میں اپنی ایک خاص حیثیت رکھتا تھا۔ ان کے مورث اعلیٰ قاضی معزالدین تھے، جنھیں لوگ علمی و دینی بزرگی کی وجہ سے قاضی قدوۃ العلم والدین کہتے تھے اور جو ہندوستان میں بسنے والے تمام قدوائیوں کے مورث اعلیٰ ہیں۔ ان کے دادا اور والد اور خاندان کے دوسرے افراد علمی و ادبی اور مذہبی امور میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ مولانا کی ابتدائی تعلیم زمانے کے دستور کے مطابق گھر پر ہی ہوئی۔ اس کے بعد سیتاپور کے ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ وہاں کی تعلیم ختم کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں لکھنؤ کے کیننگ کالج میں داخل ہوئے۔ ان کی دلچسپی کے مضامین انگریزی اور منطق (Logic) تھے۔ اسی زمانے میں ان کو فلسفہ سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ علی گڑھ فلسفہ میں ایم۔ اے کرنے گئے، مگر کچھ زیادہ جی نہ لگا۔ اس لیے وہاں سے واپس ہو گئے اور پھر ۱۹۱۲ء میں الٰہ آباد سے امتحان دیا کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر دہلی سینٹ اسٹیفن کالج سے ایم۔ اے کرنا چاہا مگر بعض گھریلو حالات کی بنا پر وہاں سے بھی واپس ہو گئے۔

پڑھنے لکھنے سے ان کو بچپن ہی سے دلچسپی تھی۔ خود لکھا ہے کہ ساتویں درجے میں تھے جب سے اودھ اخبار (لکھنؤ) میں چھوٹے چھوٹے مضامین اور خطوط بھیجنے لگے تھے۔ چونکہ والد صاحب کا خوف غالب رہتا تھا اس لیے زیادہ تر یہ چیزیں فرضی ناموں سے شائع ہوتی تھیں۔ کچھ عرصے بعد جب مزاج اور علم دونوں میں پختگی آنے لگی تو مختلف رسالوں میں مضامین شائع ہونے لگے اور بہت جلد علمی و ادبی حلقوں میں ان کی ایک حیثیت قائم ہو گئی۔ جس دور میں مالی حالات بہت اچھے نہ تھے، معاوضہ پر بہت سے مضامین، کتابیں اور ترجمے بھی کیے۔

مولانا کی پیدائش اور تربیت ایک مذہبی اور علمی گھرانے میں ہوئی تھی۔ لیکن جب ان کا مطالعے کا شوق زیادہ بڑھا اور خاص طور سے فلسفہ کا رنگ گہرا ہوا تو انگریزی کتابیں جو اسلام دشمن لوگوں کے قلم سے نکلی تھیں، بڑے شوق سے پڑھتے رہے ان کا اثر یہ ہوا کہ بہت جلد مذہب سے بیزاری پیدا ہو گئی اور علی الاعلان اپنے کو عقلیت پسند کہنے لگے۔ تقریباً دو سال یہی کیفیت رہی۔ لیکن ۱۹۲۰ء میں یہ کیفیت کم ہو گئی۔ جن لوگوں کا اثر ان کے ذہن پر اس سلسلے میں پڑا ان میں اکبر الٰہ آبادی اور مولانا محمد علی خاص طور پر نمایاں ہیں۔ یہ دونوں بزرگ ان کو تحریری اور زبانی دونوں انداز سے راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے اور مختلف انداز سے ان کی ذہنی گتھیوں کو سلجھانے میں لگے رہتے۔ بعض ہندو عالموں کی تحریروں کا بھی اثر پڑا اور آخر میں کفر و الحاد کی تاریکیوں کا پردہ حکیم امت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچنے پر تار تار ہو گیا۔ اور ذہن و دل کو وہ جلا اور سکون نصیب ہوا جس کے لیے بیقرار ہو کر مضطرب و پریشان حال رہتے تھے۔ یہاں سے ان

کو جو بھی ملا اس نے ان کی پیاسی روح اور بھٹکتی فکر کو نہ صرف سیراب کیا بلکہ وہ کچھ بھی دیا جس نے ان کے ذریعے سے بے شمار بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھائی اور ذہنی آسودگی اور قلب کا سکون عطا کیا۔

مولانا دریابادی کی علمی اور سیاسی زندگی میں مولانا محمد علی اور علامہ شبلی کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ مولانا محمد علی مولانا دریابادی کی علمیت کے قائل تھے۔ ان کے مضامین اور کتابوں کو پڑھتے اور قابل اعتراض حصوں پر گہری تنقید کرتے تھے اور خطوط لکھ کر ان کو سمجھاتے تھے۔ ان کے دلائل میں اتنا زور ہوتا تھا کہ مولانا دریابادی بہت جلد ان کی شخصیت سے متاثر ہونے لگے اور بہت جلد دونوں میں گہرے روابط قائم ہو گئے۔ مولانا محمد علی ان سے اپنے اخبار ہمدرد کے لیے مضامین لکھوانے لگے اور ساتھ ہی ساتھ خلافت کمیٹی کے کاموں میں بھی شامل کر لیا۔ مولانا محمد علی ایک بے مثال شخصیت کے مالک تھے۔ سچائی، ایمانداری اور بے باکی ان کے کردار کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ مولانا دریابادی پر بھی ان کے کردار کی گہری چھاپ تھی اور بعض لوگوں کا یہاں تک کہنا ہے کہ ان کی صدق گوئی مولانا محمد علی ہی کی صحبت کا نتیجہ تھی۔

دوسری شخصیت جس نے مولانا دریابادی پر گہرا اثر ڈالا وہ علامہ شبلی کی ہے۔ مولانا عبدالماجد نے ان سے بہت فیض اٹھایا۔ علامہ شبلی ایک زبردست محقق اور بے مثال عالم تھے اور ساری اسلامی دنیا میں ان کو بڑی عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ جب علامہ شبلی نے اپنی اہم ترین تصنیف سیرۃ النبی کا کام شروع کیا تو انھوں نے مولانا کی خدمات بحیثیت مترجم حاصل کیں۔ یعنی مولانا کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ حوالے کی انگریزی کتابوں سے ضروری اقتباسات کا اردو میں ترجمہ کریں۔ علامہ شبلی سوانح نگار، مورخ اور فارسی و اردو ادب کے ماہر تھے اور دوسرے متعلقہ علوم پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ علوم جدیدہ سے بھی مزید ساتھ رہ کر خاصی حد تک واقف ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کے ساتھ رہ کر علمی کام کرنا صرف سعادت ہی کی بات نہ تھی بلکہ اس سے ذہن و فکر کی بھی تربیت ہوتی تھی۔ مولانا دریابادی کو بھی علامہ شبلی کے ساتھ رہنے سے بہت سے علمی مسائل میں فائدہ پہنچا اور ان کے سوچنے اور سمجھنے کے انداز پر بھی اس کا بہت اثر پڑا۔ اسی کے ساتھ علامہ شبلی کے دوسرے شاگردوں کے علاوہ ان کے جانشین اور رشید شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی سے گہرے مراسم ہو گئے۔

مولانا عبدالماجد نے علمی و ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ اصلاحی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں ہندوستان میں طرح طرح کی تحریکیں جاری تھیں جن میں سے بہت سی گمراہی اور بے راہ روی کی طرف لے جا رہی تھیں اور کھرے کھوٹے کے فرق کو مٹانے کے ساتھ ساتھ اخلاقی قیود کو بھی پامال کر رہی تھیں۔ انھوں نے اپنی دینی لگن، بے باکی و حق گوئی کی بنا پر ایسی تمام باتوں کے خلاف آواز اٹھائی اور اس بات کی کوشش کی کہ لوگ خواہ وہ کسی بھی علاقے کے ہوں، بے راہ روی سے بچیں اور ایسے راستے پر چلیں جو ان کو منزل مقصود تک پہنچا سکے۔ اپنی اصلاحی تحریکات میں مولانا نے قرآن حکیم، احادیث رسول اور اسوۂ صحابہ کو سامنے رکھا اور جہاں بھی ضرورت سمجھی، ان ہی مصادر سے لوگوں کے لیے اصلاحی نکات فراہم کیے اور غور و فکر کی دعوت دی۔ اور اپنے دامن کو آلودگیوں سے بچائے رکھنے کی صلاح دی۔ ان کی اصلاحی تحریکوں کا انداز اتنا دلنشیں ہوتا تھا کہ لوگ ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ احادیث نبوی اور اقوال صحابہ کو اس طرح سے پیش کرتے تھے کہ لوگوں کے ذہنوں سے بڑے بڑے عقلاء اور فلاسفہ کے دلائل بے معنی ہو کر زائل ہو جاتے تھے۔

مولانا دریابادی کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں اور دنیا کے غیر مسلموں کے لیے قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ کیا۔ قرآن مجید کا مطالعہ انھوں نے بڑی گہرائی سے کیا تھا۔ اس کے تمام مذہبی، فکری، علمی، سماجی اور ادبی پہلوؤں کو پوری طرح سے سمجھتے تھے۔ اب تک قرآن مجید کے جو ترجمے ہوئے تھے ان میں سے بیشتر محض ترجمے ہی تھے۔ مولانا نے اپنے ترجمے میں تفسیری انداز اختیار کیا اور جدید علوم سے

متاثر لوگوں کا خیال رکھتے ہوئے بہت سے نوٹ بھی لگائے تاکہ اس کی دور حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگی ثابت ہو۔ ان کی اس تفسیر نے وقت کی ایک بہت اہم ضرورت کو پورا کیا۔ مولانا نے اردو میں بھی قرآن کریم کی تفسیر لکھی۔ ان سے پہلے بہت سے لوگ یہ کام کر چکے تھے۔ مگر مولانا نے اس میں بھی اپنے خاص انداز بیان اور طرز استدلال کی بنا پر ایک نئی راہ نکالی۔ ان کی یہ تفسیر علمی دنیا میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اور اس کا مطالعہ ہر اعتبار سے دینی فکر کو مالا مال کرتا ہے۔

مولانا کی تصانیف کی تعداد ۶۰ سے اوپر ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بے شمار مضامین، اخباری نوٹ اور علمی و ادبی خطوط بھی لکھے۔ ان سب میں انھوں نے اپنے انداز بیان اور علمی شگفتگی کی وجہ سے لوگوں کے لیے بہت اچھا مواد فراہم کیا ہے۔

مولانا کی زندگی کا پورا زمانہ سیاسی سرگرمیوں کا دور تھا' ان کے تعلقات بہت سے سیاسی رہنماؤں سے بھی تھے لیکن ان کی زندگی کا مقصد سیاسی چالوں میں الجھنا اور الجھانا نہ تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد یہ بنایا تھا کہ مسلمانوں کی اخلاقی اور مذہبی زبوں حالی سے نبرد آزما رہیں گے اور جس طرح بھی ممکن ہوگا ان کے حقوق کے تحفظ میں لگے رہیں گے۔ ان کی تمام تحریریں خاص طور سے ان کے اخباری کالم اس بات کا مکمل اور مدلل ثبوت ہیں، جن میں انھوں نے بغیر کسی ڈر اور جھجھک کے اپنے خیالات کا اظہار وضاحت سے کیا ہے۔ بہت سے ایسے مواقع بھی آئے جب اُن کو سچ بات کہنے پر دھمکیاں دی گئیں، ان کی تحریروں پر اعتراضات ہوئے اور ان کی زبان کو روکنے کے لیے ان کے اخبار کو بند کیا گیا' لیکن ان کے انداز بیان اور طرز سخن میں کسی قسم کی کمی آنے کے بجائے زورِ بیان میں اضافہ ہی ہوا اور اپنی بات کو زیادہ زور سے اور بے تکلفی سے کہنے کی راہ کھلی۔ سچ، صدق اور صدق جدید کا کوئی بھی شمارہ اٹھا کر دیکھیے میری باتوں کی صداقت مجسم دلیل بن کر سامنے آجائے گی۔

مولانا کی تمام تحریروں میں علم و حکمت کے نادر گہر بکھرے پڑے ہیں۔ وہ بڑی اہم باتوں کو اپنے دلکش انداز اور منفرد اسلوب میں بڑی چابک دستی سے بیان کرتے ہیں۔ وہ اسلامی تعلیم اور اس کی صداقت کے بہترین ترجمان ہیں۔ انھوں نے انسانی فطرت کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس کے نشیب و فراز سے پوری طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں انسانی فطرت کی عکاسی کی ہے اور جو باتیں کہی ہیں وہ اس کے مطابق ہونے کے ساتھ دل میں اترنے والی بھی ہیں۔ ان کی ایسی باتیں اتنی سادہ اور بے تکلف ہوتی ہیں کہ عام انسان بھی اس کے مفہوم کو آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔ ان کے بے لاگ تبصرے' چھوٹے چھوٹے پر معنی جملے ان کے دل کی کیفیات کے غماز ہیں۔ مولانا نے اپنی پوری زندگی مسلمانوں اور اسلام کی فلاح و ترقی کے لیے وقف کردی۔ ان کی دلسوزی، ایثار، بے لوث خدمت اور دل سے نکلنے والی آواز ہمیشہ لوگوں کو یقین محکم کے ساتھ عمل پیہم کی دعوت دیتی رہے گی۔

"تم اپنے بزرگوں کے حال سے مقابلہ کرو۔ آپ کے بزرگ جس زمانہ میں تھے انھوں نے اپنے تیئں اس زمانہ کے لائق بنا لیا تھا اس لیے وہ دولت اور حشمت اور عزت سے نہال تھے اور جس زمانہ میں کہ ہم ہیں ہم نے اپنے تیئں اس زمانہ کے لائق نہیں بنایا اور اس لیے نکبت اور ذلت میں ہیں"

سرسید

احمد رشید شیروانی

جبل پور کے نتائج کا تجزیہ

جبل پور کے سات مسلم اسکولوں کے مڈل بورڈ امتحان ۱۹۸۶ء کے نتائج پیش ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔ پانچ اسکولوں میں صرف مسلم بچے ہیں۔ دو اسکولوں میں کچھ غیر مسلم بچے بھی ہیں پہلے مسلم بچوں کے نتائج دیے ہیں' آخر میں غیر مسلم بچوں کے۔

تین خالص گرلز اسکولوں سے ملاکر تمام ایک سو ساٹھ[۱۶۰] مسلم طالبات پاس ہوئیں۔ سو فیصد پاس کے علاوہ ایک سو بتیس[۱۳۲] یعنی تراسی فیصد فرسٹ ڈویژن لائیں۔

جبل پور کی انجمن اسلامیہ دو ہائر سکنڈری اسکول اور دو مڈل اسکول چلا رہی ہے۔ ان چار سے ملاکر ایک سو اٹھاسی مسلم بچے (لڑکے اور لڑکیاں) شریک۔ ایک سو اٹھاون یعنی پچاسی فیصد پاس اور اٹھہتر یعنی اکتالیس فیصد فرسٹ ڈویژن۔ ان میں سے دو اسکولوں سے ملاکر سولہ غیر مسلم بچے بھی شریک ہوئے جن میں ۱۴ یعنی اٹھاسی فیصد پاس ہوئے اور آٹھ یعنی پچاس فیصد فرسٹ ڈویژن لائے۔

جبلپور کے مسلم اسکولوں کے نتائج مڈل بورڈ امتحان ۱۹۸۶

شریک امتحان	تعداد پاس	فرسٹ ڈویژن	فیصد پاس	فیصد فرسٹ	اسکول کا نام
۴۷	۴۷	۴۷	سو	سو	انجمن تعلیم ایجوکیشن اینڈ ویلفیر سوسائٹی گرلز
۴۶	۴۶	۳۸	سو	تراسی	انور گنج گرلز
۶۷	۶۷	۴۷	سو	ستتر	حنیفیہ گرلز
۱۶۰	۱۶۰	۱۳۲	سو	تراسی	تین گرلز اسکول
۳	۳	۳	سو	سو	مڈل اسکول — مڑھاتال
۹۹	۹۹	۶۶	سو	سڑسٹھ	ہائر سکنڈری — گوپال پور
۲۴	۱۲	۶	پچاس	پچیس	مڈل اسکول — کینٹونمنٹ
۶۲	۴۵	۳	بہتر	پانچ	ہائر سکنڈری — مڑھاتال
۱۸۸	[illegible]	[illegible]	[illegible]	اکتالیس	انجمن اسلامیہ کے چار اسکول
۳۴۸	۳۱۹	۲۱۰	بانوے	ساٹھ	تمام سات میں مسلم
۱۴	۱۲	۸	سو	سڑسٹھ	غیر مسلم مڈل اسکول — مڑھاتال
۴	۲	—	پچاس	صفر	ہائر سکنڈری — مڑھاتال
۱۶	۱۴	۸	اسی	پچاس	دو میں غیر
۳۶۴	۳۳۳	۲۱۸	اکیانوے	ساٹھ	تمام مسلم اور غیر مسلم

گویا غیر مسلم بچوں کا پاس فیصد بھی کچھ بہتر ہے اور فرسٹ ڈویژن کا تناسب بھی زیادہ ہے۔

صرف بُرائی کرنے والے

اگر ہم چاہیں تو جبل پور کی انجمن اسلامیہ پر تنقید کر سکتے ہیں کہ جب تین گرلز اسکولوں سے سو فیصد مسلم بچے پاس ہوئے تو انجمن کے چار اسکولوں سے صرف پچاسی فیصد کیوں پاس ہوئے؟ اور جناب جب تین گرلز اسکولوں سے تراسی فیصد مسلم بچیاں فرسٹ ڈویژن لائیں تو انجمن کے چار اسکولوں سے صرف اکتالیس فیصد کیوں؟ یہ سوال کیے جا سکتے ہیں۔ تاہم ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ انجمن کے پہلے دو اسکولوں سے بھی سو فیصد مسلم بچے پاس ہوئے ہیں اور اڑسٹھ فیصد فرسٹ ڈویژن لائے ہیں۔ البتہ انجمن کے دو اسکولوں کے نتائج کمتر ہیں۔ اور ان پر مزید توجہ دی جائے تو یہ بھی بہتر ہو سکتے ہیں۔ خاص کر انجمن کے مڑھاتال والے ہایر سکنڈری اسکول میں مسلم بچوں کا فرسٹ ڈویژن کا تناسب بہت کم ہے۔ صرف پانچ فیصد۔ اور کینٹونمنٹ والے مڈل اسکول میں پاس رزلٹ بہت کم ہے۔ صرف پچاس فیصد۔ اس پر توجہ ضرور دینا چاہیے۔

مگر تنقید کرتے وقت ہمیں یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ انجمن کے یہ چار اسکول اور ان کے علاوہ کئی پرائمری اسکول چلا رہی ہے اور جبل پور کے مسلم بچوں کی تعلیم میں بہت اہم رول ادا کر رہی ہے۔ اس لیے تنقید تعمیری ہونی چاہیے۔ یعنی بہتری لانے کی نیت سے ہونی چاہیے۔ یہ بات اس لیے واضح کرنی پڑی کہ پچھلی بار جب میں انجمن کے فنکشن میں جبل پور گیا تو میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ باہر مظاہرہ وغیرہ کر رہے تھے۔ اور انجمن کے ذمہ داران کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ میں نے ان حضرات سے بات چیت کی اور پھر کچھ لوگ مجھ سے ملنے اس ہوٹل میں بھی آئے جہاں میں ٹھہرا تھا۔ لیکن اس تمام گفتگو کے دوران میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ خود ان حضرات نے جبل پور کے مسلمانوں کی تعلیم کے فروغ کے لیے کیا کیا ہے۔

دوسروں سے پچھڑے کیوں؟

دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ مسلم اسکولوں میں مسلم غیر مسلم بچوں سے پیچھے کیوں ہیں؟ ٹیچرز تو سب کو یکساں پڑھا رہے ہوں گے۔ یہ سخت مقابلے کا دور ہے۔ مسلم اسکولوں سے باہر نکل کر ہمارے بچوں کو کھلے میدان میں (بلکہ یوں کہیے کہ اغیار کے اداروں میں جاکر) دوسروں سے مقابلہ کرنا ہے۔ تو اگر ہمارے بچے اپنے ہی اداروں میں دوسروں سے پچھڑ جائیں تو پھر باہر نکل کر وہ کس طرح دوسروں پر سبقت حاصل کریں گے؟

مسلمان دوسروں کی شکایتیں تو بہت کرتے ہیں اور ٹھیک ہی کرتے ہوں گے۔ مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے، مسلمانوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ بالکل ٹھیک۔ لیکن بھائی اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں کہ جب معلوم ہے کہ حق تلفی بھی ہوگی، اور ناانصافی بھی ہوگی تو ہمارے بچوں کو دوسروں سے کچھ زیادہ اہل بننا ہے۔ تاکہ تعصب کا مقابلہ کر سکیں۔ یہ جائے کہ مسلم بچے اپنے ہی اداروں میں دوسروں سے پچھڑے رہیں۔

نشاۃ الثانیہ

علی گڑھ کی بدولت ایک عام بیداری پیدا ہوئی اور قوم کے قوائے علم و عمل حرکت میں آئے۔ یہ گویا ہماری نشاۃ الثانیہ ہی کی ایک تحریک تھی۔

علامہ اقبال

غلام یحییٰ انجم

درسِ نظامی کے جدید تقاضے

دینی مدارس کی ابتداء

دینی مدارس باضابطہ طور پر کب وجود میں آئے، اس میں مورخین کا اختلاف ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پہلا عربی دینی مدرسہ ملک شاہ سلجوقی کے وزیر نظام الملک متوفی ۴۸۵ھ نے بغداد میں قایم کیا تھا۔ اس کے بعد بصرہ، بلخ، مرو اور دوسرے مقامات پر بھی عربی دینی مدارس کی بنیادیں رکھی گئیں۔ اس طرح یہ سلسلہ روزافزوں دراز ہوتا گیا۔ مگر اس تاریخی حقیقت کی کچھ مشہور مورخین جیسے علامہ جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) اور السبکی (متوفی ۷۵۶ھ) نے تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ نظام الملک کے مدرسہ قایم کرنے سے پہلے نیشاپور کے اندر ایک دینی ادارہ "المدرسۃ البیہقیہ" کے نام سے موجود تھا جس کی تعمیر سلطان محمود کے بھائی نصر بن سبکتگین کی کوششوں سے ہوئی تھی۔ مشہور مورخ تقی الدین المقریزی (متوفی ۸۴۵ھ) مدارس کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

(ترجمہ) "اسلام میں باضابطہ مدارس کا آغاز نہ تو دورِ صحابہ میں ہوا اور نہ دور تابعین میں۔ یہ سلسلہ چوتھی صدی ہجری کے بعد شروع ہوا اور سب سے پہلا مدرسہ "المدرسۃ البیہقیہ" کے نام سے نیشاپور میں قایم کیا گیا۔"

ہندوستان میں دینی مدارس کا آغاز

ہندوستان میں باضابطہ دینی مدارس کا آغاز محمود غزنوی کے دور سے سمجھنا چاہیے۔ یہ بادشاہ جو کہ علم دوست، علماء پرست تھا اور اس کا دربار علماء و فضلاء کی مقدس جماعت سے بھرا رہتا تھا۔ انھیں علماء کی صحبت کی بدولت ترویج علم کے سلسلے میں مدارس و مساجد کی تعمیر کا شوق دامن گیر ہوا۔ تاریخوں میں ملتا ہے کہ ۴۰۹ھ میں فتح قنوج سے غزنی واپسی کے بعد منتہائے ذوق و شوق میں مسجد اور مدرسے کی بنا ڈالی۔ تاریخ فرشتہ لکھتا ہے:

"سلطان محمود غزنوی نے اس مسجد کو اس قدر حسین بنوایا تھا کہ اس حسن و خوبصورتی کی وجہ سے اسے "عروس فلک" کہا جانے لگا تھا اور اس مسجد کے کنارے مدرسہ قایم کیا، جس میں عمدہ اور نایاب کتابوں کے نسخے فراہم کیے تھے۔"

سلطان کی علم دوستی کو دیکھ کر اس کے دربار کے تمام افراد امراء و رؤساء اور تمام اعیان مملکت کے اندر مدرسہ و مسجد قایم کرنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ تاریخ فرشتہ کے کہنے کے مطابق:

"اعیان مملکت میں ہر ایک نے مساجد، مدارس، سفارت خانے کی تعمیر میں پیش قدمی کا مظاہرہ کیا"

سلطان محمود کے بعد جب اس کا لڑکا شہاب الدین مسعود تخت نشین ہوا تو اس نے باپ کا طریقہ اپنایا اور علم پروری اور علماء نوازی کے معاملے میں باپ کے نقش قدم کو اپنے لیے مشعل راہ قرار دیا اور حدود مملکت میں بکثرت مدارس قایم کیے۔ تاریخ فرشتہ میں ہے:

اس کی حکومت کے شروع زمانے میں سلطنت میں اتنے زیادہ مدارس اور مساجد کی تعمیرات ہوئیں

کہ زبان ان کی تعداد بیان کرنے سے قاصر ہے"۔

مغل حکومت کا آخری چراغ گل ہونے تک دینی مدارس کا جال پوری مملکت میں بچھ گیا۔ اجمیر، دہلی، سندھ، لاہور، پنجاب، آگرہ، بنگال، مالوہ، بدایوں، اودھ، بہار، ملتان واچہ، کشمیر، لکھنو، گجرات، سورت اور جون پور و دیگر اضلاع میں سیکڑوں سے زائد مدارس قایم ہوئے جس میں کچھ تو حوادث زمانہ کے شکار ہو گئے اور کچھ چراغ سحری کی طرح ہیں موجودہ زمانہ میں جہاں اسلامی و دینی درس گاہیں قایم ہیں اور ان میں ایک مروج نصاب کے تحت دینی تعلیم دی جاتی ہے ان میں علی گڑھ، دہلی، اعظم گڑھ، دیوبند، بستی، لکھنو، بریلی، الہ آباد، کانپور، بنارس اور مرادآباد کا نام لیا جاسکتا ہے۔

دینی مدارس میں مروج نصاب تعلیم اور اسکے ارتقائی مراحل

اسلام کے نظام تعلیم کا اصل الاصول آیت کریمہ:

"لقد من اللہ .... ضلال المبین"

ترجمہ: "درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود ان ہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انھیں سناتا ہے، ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب و دانائی کی تعلیم دیتا ہے حالاں کہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے (آل عمران)

سے ماخوذ ہے۔ اس کی رو سے اسلام کی بعثت کے صرف تین مقاصد بظاہر معلوم ہوتے ہیں:

١- بذریعہ تلاوت آیات دعوت الی اللہ
٢- تزکیہ نفس
٣- تعلیم کتاب و حکمت

(الف) علوم دینیہ: پس اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم کی اساس قرآن کریم ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نے اس کی توضیح کی ہے، اس طرح تفسیر کا علم ظہور میں آیا ہے اور چونکہ قرآن فہمی کا قابل اعتماد ذریعہ خود مہبط وحی کے ارشادات و فرمودات اور آپ کا اُسوہ تھا اس لیے امت نے احادیث رسول کے ڈھونڈھنے اور جمع کرنے کے ساتھ اہتمام کیا۔ شاید دنیا میں کسی اور ہادی و مرشد کے اقوال و اعمال کے ساتھ اس کے متبعین نے اس درجہ اعتنا نہ کیا ہوگا جتنا امت مسلمہ نے اپنے رسول کے حق میں روا رکھا ہے۔

نزول قرآن کا بڑا مقصد بندوں کے لیے ایک ضابطۂ حیات کی فراہمی تھا جس پر عمل پیرا ہو کر وہ اپنی دنیا اور آخرت کو کامیاب بنا سکیں۔ اس کے لیے "سمجھداری" تفقہ کی ضرورت ہے جو اللہ تعالی کی جانب سے عطا کی جانے والی خیر مطلق ہے۔

ومن یرد اللہ بہ خیرا یفقہ فی الدین

"اللہ جسے بھلائی دینا چاہتا ہے اسے دین میں تفقہ (بصیرت تامہ) عطا فرماتا ہے"۔

اسی مناسبت سے اس ضابطۂ حیات کے علم کا نام "فقہ" رکھا گیا۔ پھر مطلوبہ ضابطۂ حیات کے دو جز ہیں ایک عملی زندگی سے متعلق اور دوسرا ذہنی و فکری سرگرمیوں سے متعلق۔ ثانی الذکر جلالت قدر کے پیش نظر اس کا نام "الفقہ الاکبر" رکھا گیا جو بعد میں بعض تاریخی اسباب کی بنا پر پہلے "علم التوحید والصفات" کے نام سے اور آخر کار بڑی رد و تردید کے بعد "کلام" کے نام سے تبدیل کیا گیا۔

اس کے بعد عملی زندگی سے متعلق ضابطۂ حیات کا علم صرف فقہ کے نام سے موسوم ہوا۔ بعد میں فقہ کے اس جز کی جو متوفیوں کے ورثا میں ان کے ترکہ کی تقسیم سے متعلق ہے اس کی اہمیت کے پیش نظر "فرائض" کے نام سے ایک مستقل حیثیت تسلیم کر لی گئی۔

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا دنیا کی کسی قوم نے اپنے ہادی و رہنما کے اقوال و اعمال کے ساتھ اس درجہ اعتنا نہیں برتا جتنا کہ امت مسلمہ نے۔ لہذا اس سرمایۂ سعادت (حدیث) کی روز افزوں مقبولیت و اہمیت سے اہل غرض طبقہ میں بھی لالچ پیدا ہوا کہ کیوں نہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے۔ بس انھوں نے احادیث صحیحہ کے ساتھ من گھڑت حدیثیں وضع کر کے خلط ملط کر دیں۔

یہ ایک خطرناک صورتِ حال تھی، اس کا تدارک بھی وقت کی اہم ضرورت تھا۔ لہٰذا حدیث صحیح کو ضعیف سے اور حقیقی کو وضعی سے ممتاز کرنے کے لیے ایک نیا علم ظہور میں آیا یہ "اصولِ حدیث" کا علم تھا

اس طرح قرآن کریم اور حدیث نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے مسائل فقہیہ کے استنباط کے لیے ایک مستقل علم کی ضرورت دامن گیر ہوئی۔

اس طرح مندرجہ ذیل علوم دینیہ اپنے اپنے وقت میں وجود میں آئے۔

۱۔ تفسیر ۲۔ حدیث ۳۔ اصولِ حدیث ۴۔ فقہ
۵۔ فرائض ۶۔ اصولِ فقہ ۷۔ عقائد و کلام

ب۔ علوم ادبیہ

قرآن و حدیث کے حقیقی معانی و مفاہیم کے درک کے لیے عربی زبان کی ساخت سے واقفیت ناگزیر تھی۔ حتیٰ کہ قرآن کریم کو صحیح اعراب کے ساتھ پڑھنے کے لیے اس زبان کے اصول و قواعد کا جاننا ناگزیر تھا۔ اس ضرورت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے "نحو" کا علم وجود میں آیا۔

بعد میں قواعد زبان عربی کا وہ جزو جو مختلف صیغوں کی گردان (تصریف) سے متعلق تھا نیز دوسرے متعلقہ مباحث پر مشتمل تھا "صرف" کے نام سے پڑھا جانے لگا۔

پھر چوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا معجزہ قرآن کریم ہے اور قرآن کریم وجوہِ اعجاز میں سب سے اہم اس کی فصاحت و بلاغت ہے جس تک پہنچنے کی خود فصحائے عرب جرأت نہ کر سکے اس حقیقت کو کماحقہٗ سمجھنے کے لیے نفس فصاحت و بلاغت کے بنیادی اور ثانوی اصول و قواعد کا جاننا ضروری تھا۔ یہ فرض "علم بلاغت" نے انجام دیا۔

زبان سے کماحقہٗ واقفیت حاصل کرنے کے لیے عربوں کے ادبی سرمایہ کا مطالعہ ناگزیر تھا۔ چنانچہ حسب تصریح حضرت عمر رضی اللہ عنہ "الشعر دیوان العرب"، اس لیے "نظم و نثر" عربی کی تعلیم عربی دانی کی شرط اولین قرار پائی۔

عربوں کی شعر گوئی کے مخصوص اوزان و بحور تھے، ان کے علم کا نام "عروض" ہے۔

اور اس طرح مندرجہ ذیل علوم علوم ادبیہ کے اجزاء کی حیثیت سے اپنی اپنی نوبت میں ظہور پذیر ہوئے۔

۱۔ نثر عربی (محاضرات) ۲۔ نظم عربی ۳۔ صرف و نحو
۵۔ بلاغت ۶۔ عروض

(ج) علوم عقلی (یا علوم حکمیہ)

اسلامی تعلیم جو کتاب و حکمت "سنت" کی تعلیم سے شروع ہوئی تھی، بتدریج ترقی کرتے کرتے مذکور الصدر علوم دینیہ و ادبیہ کے مختلف شعبوں سمیت مدارس کے نصاب درس و تدریس کا موضوع بن گئی مگر کچھ علوم اور بھی اہم تھے جو اندر ہی اندر اپنے شائقین پیدا کرتے رہے۔ ان کا مجموعی نام "فلسفہ" تھا جو بعد میں "حکمت"، "علوم عقلیہ" "علوم حکمیہ" "معقولات" وغیرہ کے نام سے موسوم ہوا۔ چوں کہ ان کا بیشتر حصہ اسلامی تعلیمات کے ساتھ دست و گریبان تھا، اس لیے ذمہ دارانِ امت نے شروع ہی سے اس پر قدغن لگائی تھی۔ مگر بمصداق "الانسان حریص علیٰ ما منع"، یہ خفیہ طور پر اپنے طلاب میں فروغ پاتا رہا اس کی تفصیل سے بیشتر خود اس "فلسفہ" کے اسلامی فکر میں متعارف ہونے کی اجمالی کیفیت سے واقف ہونا مستحسن ہوگا۔

اسلام کے پیش کردہ نظام اقدار میں حکمت کو خیر کثیر یا خیر اعلیٰ (Summum Boum) کا مقام حاصل ہے۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے

"ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا"۔
جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر (سب سے بڑی نیکی) عطا ہوئی۔

خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف قرآن کریم "معلم کتاب و حکمت" کے عنوان سے کراتا ہے اور اس معلم کتاب و حکمت

نے حکمت کو مردِ مومن کی متاعِ گم گشتہ قرار دیا اور اسے مامور کیا کہ جہاں پائے اسے لے لے۔

اس تعلیم نے پیروانِ اسلام میں حصولِ علم و حکمت کے لیے ایک بے پایاں تشنگی پیدا کر دی جو کسی طرح بجھنا ہی نہیں جانتی تھی یہاں تک کہ وہ "درِ ثمین" "نئے موتیوں" میں امتیاز کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ انھیں صرف حکمت چاہیے تھی، خواہ وہ نام ہی کی کیوں نہ ہو۔

اور یونانی فلسفہ تو اپنے نام کے لحاظ سے ہی محبت حکمت تھا اس لیے جوں ہی اہلِ اسلام میں سے منچلے جویلئے علم و حکمت کا سابقہ ان لوگوں سے پڑا جن کو اسلاف اس مزعومہ "حکمت یونان" کے دانائے راز تھے تو انھوں نے ان سے استفادہ کرنے میں دیر نہیں کی۔

پھر جب یہ فلسفہ اسلامی فکر میں داخل ہو گیا تو اس کے ردّ و قبول کے باب میں اکابرامت کے دو گروہ ہو گئے۔

ایک گروہ نے اسے اسلام کی بنیادی تعلیمات کے ساتھ دست و گریباں پایا اور اس لیے اسے دینِ متین کا حریف پنجہ شکن سمجھا۔ اسی موقف کے پیشوائے اوّل سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے۔ بعد میں یہ موقف متکلمین نے اپنایا اور اپنی تمام تر توجہ اس فلسفہ کے ردّ و ابطال پر مرکوز کر دی۔

مگر ایک دوسرا گروہ بھی تھا جو اس کی دلکشی اور معقولیت پسندی سے متاثر ہو کر اس کا گردیدہ ہو گیا۔ یہ لوگ کھل کر تو اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کر سکتے تھے مگر چوری چھپے اس کی تحصیل میں مصروف رہتے تھے۔

پھر چوں کہ یونانی فلسفہ ایک مستقل نظامِ فکر تھا اور اسلام کا حریف پنجہ شکن اس لیے دشمنانِ دین نے اپنی ملحدانہ سرگرمیوں میں معقول و موثر بنانے کے لیے اس کا سہارا لیا۔ اسی دورِ زندقہ کے اس بڑھتے ہوئے فتنہ کے تدارک کے لیے خلیفہ مہدی (۱۵۸ھ–۱۶۹ھ) نے متکلمین کو بلا کر ان ملاحدہ کے اصلاح عقائد کے ان کے رد میں کتابیں لکھنے کا حکم دیا۔ لہٰذا موخر الذکر نے اپنے حریفوں کو مواقف سے کماحقہ واقفیت کے لیے فلسفہ کا مطالعہ شروع کیا تاکہ حریف کو اس کے ہتھیاروں سے زیر کر سکیں وہ اپنے خارج وقت میں فلسفہ کی کتابوں کا (جس کا معتدبہ حصہ عربی میں ترجمہ ہو چکا تھا) اپنے طور پر مطالعہ کرتے ان کے مواقف کو سمجھتے، ان مواقف کی تائید میں ان کے دلائل و براہین سے واقفیت حاصل کرتے اور اس کے بعد ان کے ہفوات و اباطیل کا رد کرتے یہ صورتِ حال رہی۔ یہاں تک امام ابوالحسن الاشعری جو چالیس سال تک اعتزال کی آغوش میں پرورش پاتے رہے۔ توفیق ایزدی نے اسی بدعت سے تائب ہو کر گروہ اہلِ سنت و جماعت میں آملے۔ وہ اعتزال سے تائب تو ہوئے تھے مگر ان کی کلامی سرگرمیوں سے دست بردار نہیں ہوئے تھے جو وہ فلسفہ کے ردّ و ابطال میں مبذول کرتے تھے۔ اس لیے فلسفہ کا ردّ و ابطال ان کے یہاں جاری رہا اور یہی طریقہ کار ان کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ نے بھی برقرار رکھا۔ ابن عساکر دمشقی نے "تبیین کذب المفتری" میں امام اشعری کی سو سے اوپر تصانیف کی فہرست دی ہے۔ ان میں سے کوئی گیارہ بارہ تصانیف فلسفہ بالخصوص ارسطالیسی فلسفہ کے رد میں ہیں۔ امام صاحب کے دو شاگرد رشید تھے۔ امام ابوالحسن باہلی اور امام مجاہد الطائی۔ ان دونوں کے تین شاگرد تھے۔ قاضی ابوبکر باقلانی، امام ابن فورک اور امام ابواسحاق اسفرائنی علم کلام کی تاریخ میں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں قاضی ابوبکر باقلانی کی کتاب التمہید شایع ہو گئی اس کے متعدد ابواب فلسفہ کے رد میں ہیں۔

حضرات متکلمین کی ان تردیدی سرگرمیوں کے باوجود فلسفہ اندر ہی اندر اپنے ہم نوا پیدا کرتا رہا۔ جن عوامل نے فلسفہ کی ترقی میں خصوصی کردار انجام دیا، ان میں سب سے اہم باطنی تحریک تھی۔ یہ مختلف دشمنِ اسلام عناصر کا ایک گٹھ جوڑ تھا جو عرب اقتدار کو شامل کر کے قدیم ساسانی ملوکیت کے احیاء اور دینِ اسلام کی بیخ کنی کر کے مجوسیت کی بحالی کا خواب دیکھ رہا تھا۔

یہ اس تحریک کا ایک اہم رکن فلاسفہ کا گروہ تھا کیوں کہ معاشرے سے "خاکم بدہن" اسلام کو ختم کر دینے کے بعد جو خلا متوقع تھا وہ اسے فلسفہ سے پُر کرنا چاہتے تھے۔ لہذا اس تحریک میں گروہ فلاسفہ کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ عبیداللہ المہدی نے سلیمان بن الحسن بن سعید کو جو خط لکھا تھا، اس میں مرقوم تھا:

وَاذا ظفرت بالفلسفی فاحتفظ بہ فعلی الفلاسفۃ معولنا وانا وایاھم مجموعون علی ردّ نوامیس الانبیاءِ وعلی القول بقدم العالم"۔

(جب تمہیں کوئی فلسفی مل جائے تو اسے نظر میں رکھو کیوں کہ فلسفیوں پر ہمارا اعتماد ہے۔ ہم اور وہ انبیاء کی شریعت کے رد کرنے کے بارے میں اور اس عقیدہ میں کہ دنیا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی باہم متفق ہیں۔)

ایران کے بہت سے احیائیت پسند خاندان اس تحریک سے متاثر تھے، ان میں خصوصیت سے شیخ بوعلی سینا کا خاندان قابل ذکر ہے۔ کیوں کہ اس تحریک سے خاندان کی وابستگی کی بنا پر اس نے (ابن سینا نے) تفلسف میں مشغولیت اختیار کی اور پھر اس فلسفہ میں یہ کمال بہم پہنچایا کہ آج مشرق میں جو "علم فلسفہ" یا "یونانی فلسفہ" کے نام سے پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے وہ درحقیقت "ابن سینائی فلسفہ" ہے اور کم از کم برصغیر کے عربی مدارس میں جو بھی فلسفہ کا استاد ملے گا اس کا سلسلہ شیخ بوعلی سینا ہی تک پہنچے گا۔

بوعلی سینا نے ۴۲۸ھ میں وفات پائی اس کے بعد کوئی نصف صدی بعد امام غزالی کا نبوغ ہوا۔ امام ابوالحسن الاشعری کے بے شمار اصحاب میں سے امام ابوالقاسم الاسکاف تھے۔ ان کے شاگرد امام الحرمین عبدالملک جوینی تھے۔ ان کی کتاب "الشامل" اور کتاب "الارشاد" علم کلام کی ادبیات عالیہ میں شمار کی جاتی ہیں۔

امام الحرمین کے شاگرد رشید امام حجۃ الاسلام غزالی تھے جن کی شخصیت ابطال فلسفہ کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے اس فریضے کو بڑی ذمہ داری اور دیانت داری سے انجام دیا۔ جیسا کہ انھوں نے "تہافت الفلاسفہ" کے مقدمے میں لکھا ہے۔ پہلے فلسفے کا غیر جانبداری سے مطالعہ کیا، پھر اس میں سے ان مسائل کا انتخاب کیا جو اسلام کے دینی مواقف کے خلاف تھے اور ان کا بڑی شدت سے رد کیا۔

اول الذکر ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لیے انھوں نے "مقاصد الفلاسفہ" کے نام سے فلسفہ میں ایک کتاب لکھی اور ثانی الذکر کی تکمیل کے لیے "تہافت الفلاسفہ" تصنیف کی۔

امام صاحب کی ذمہ دارانہ روش نے فلسفہ کے خلاف دین پسند حلقوں میں جو عناد تھا، اس کی بہت کچھ تبدیل کر دی اور اسی زمانے سے فلسفہ کے رد کے لیے اس کے باقاعدہ اور باضابطہ تعلیم وتعلم کا رواج شروع ہوا اور فلسفہ کی تسلیم شدہ درس نصاب کا جزء بننے لگی۔ بایں ہمہ دین دار طبقہ کی فلسفہ بیزاری بھی برقرار رہی۔ لیکن جب ساتویں صدی ہجری میں ہلاکو نے عباسی خلافت کو ختم کر کے وسطی ایشیا اور ایران وعراق میں قیامت صغریٰ برپا کر دی تو پھر فلسفہ پسند طبائع کی بن آئی اور پھر ان لوگوں نے کھل کر فلسفہ کی تعلیم وتعلم کو فروغ دیا۔ اس پر آشوب زمانہ میں بھی بعض اہم شخصیتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ جیسے کمال الدین ابن انس، سیف الدین آمدی، عبداللطیف بغدادی، شہاب الدین سہروردی مقتول شیخ الاشراق (فلسفہ اشراق کے داعی) رازی، اثیر الدین ابہری وغیرہ اہم تھے۔ ان میں موخر الذکر اپنی ہدایۃ الحکمۃ کی وجہ سے نمایاں ہیں۔ جن کی شرح "میبذی"، "صدرا" آج کے دن تک عربی مدارس میں فلسفہ کے نصاب میں داخل ہیں۔ ہدایۃ الحکمۃ کے علاوہ وہ رسالہ ایساغوجی کے بھی مصنف

یا مرتب ہیں جو منطق کے مبتدیوں کے لیے داخل درس ہے لیکن اثیرالدین ابہری سے بھی زیادہ اہم شخصیت خواجہ نصیرالدین طوسی کی ہے جن کے غیر معمولی علم و فضل سے متاثر ہو کر قوم نے پہلی مرتبہ "الحکیم المحقق" کا خطاب دیا۔ ابن سینا کی فلسفہ کی فلک بوس عمارت جو امام رازی کی تنقید قریب بانہدام پہنچ چکی تھی۔ محقق طوسی کے نفس گرم کی تاثیر نے اس کی تجدید کی۔ انھوں نے بوعلی سینا کی "الاشارات والتنبیہات" کی شرح لکھی اور ان سے پہلے امام رازی نے اپنی شرح میں شیخ پر جو اعتراضات کیے تھے، ان کا جواب دیا۔ انھوں نے امام رازی کی "محصل" "افکار المتقدمین والمتاخرین" کی تنقید و تردید کے لیے "نقد المحصل" لکھی، ان کی "تجرید الکلام" اصولاً شیعی علم کلام کی کتاب ہے مگر اس کتاب پر قوشجی کی "شرح جدید تجرید" اور موخر الذکر علمائے متاخرین (جن کی اکثریت سنی تھی) کے حواشی در حواشی علی الحواشی فلسفہ اور معقولات کے اعلیٰ نصاب میں مشمول رہے ہیں۔

محقق طوسی کے شاگرد علامہ قطب الدین شیرازی تھے اعتقاداً وہ "علیکم بایمان العجائز" پر عامل تھے مگر فکری طور پر استاد سے بھی ایک قدم بڑھ گئے۔ انھوں نے شیخ شہاب الدین مقتول سہروردی کی "حکمۃ الاشراق" کی شرح لکھی۔ محقق طوسی کے ایک اور شاگرد یا قریبی دوست نجم الدین دبیران تھے جن کی "حکمۃ العین" پر میرک بخاری نے شرح لکھی اور وہ شرح کسی زمانے میں فلسفہ کے اعلیٰ نصاب میں داخل تھی۔

قطب الدین شیرازی کے شاگرد قطب الدین رازی تھے جنھوں نے کاتبی قزوینی کی "شمسیہ فی المنطق" کی شرح لکھی جو ان کے نام پر "قطبی" کہلاتی ہے۔ قطبی کے علاوہ انھوں نے سراج الدین ارموی کی "مطالع الانوار" پر بھی شرح لکھی ان کے علاوہ تصور و تصدیق پر ایک رسالہ لکھا جو کھو گیا تھا مگر بعد میں مل گیا۔ اس کا ایک نسخہ ہندوستان میں بھی تھا جس پر عہد عالمگیری میں میر زاہد ہروی نے شرح لکھی جو ان کے نام پر میر زاہد رسالہ اور ماتن کے نام پر (قطبی۔ امتیاز کے لیے) قطبیہ کہلایا۔

قطب الدین رازی کے شاگرد محمد بن مبارک شاہ منہ تھے جو ان کے منہ بولے بیٹے بھی تھے۔ جب میر سید شریف قطب الدین رازی سے شرح مطالع پڑھنے پہنچے تو انھوں نے انھیں محمد بن مبارک شاہ کے پاس جا کر اسے پڑھنے کا مشورہ دیا اور یہ بھی کہا کہ جس طرح ہم پڑھاتے ہیں اسی طرح وہ پڑھائیں گے۔ حسب روایت طاش کبری زادہ ان سے شرح مطالع پڑھی۔ بقول امام الدین ریاضی شرح حکمۃ العین پڑھی اور حسب تصریح سخاوی قاضی عضد الدین کی "المواقف فی الکـ" تھی۔

میر سید شریف کی شخصیت عربی مدارس کے لیے غیر معروف نہیں ہے۔ مبتدی ان کی صرف میر نحو میر سے صرف و نحو اور صغریٰ کبریٰ سے منطق شروع کرتا ہے۔ متوسطات کا طالب علم قطبی کے ساتھ ان کی میر قطبی پڑھتا ہے اور منتہی طالب علم ان کی شرح المواقف کے موقف امور عامہ پر میر زاہد کا حاشیہ کو میر زاہد شرح المواقف پڑھتا ہے۔ ان کے بے شمار شاگردوں میں سے تین شاگرد خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ دو ایران کے یعنی مولانا محی الدین کوشنکاری اور خواجہ حسن شاہ بقالی اور ایک ہندوستان کے مولانا ثناء الدین ملتانی۔

مولانا محی الدین کوشنکاری اور خواجہ حسن بقالی کے شاگرد جلال الدین دوانی جن کے یہاں وہ انتخابی تحریک اپنے ذروۂ کمال کو پہنچی جس کا آغاز محقق طوسی کے یہاں ہوا تھا اور جسے کسی مناسب و موزوں اصطلاح کی عدم موجودگی میں رد معقولات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ علامہ قوشجی نے محقق طوسی کی تجرید الکلام پر جو شرح لکھی تھی، محقق دوانی نے اس پر پہلے حاشیہ قدیمہ لکھا اور پھر حاشیہ جدیدہ اور یہ دونوں حاشیے اس صدی کی ابتدا تک معقولات کے اعلیٰ نصاب میں مشمول رہے۔

محقق دوانی خود تو ہندوستان نہیں آئے لیکن کم از کم پانچ

شاگرد خطیب ابوالفضل گازرونی، سید ابوالفضل استرآبادی
ملا عماد طارمی، خواجہ جمال الدین محمود اور میر رفیع الدین صفوی
اول الذکر چار شاگردوں کے فیض تعلیم وتدریس سے اس مسلک
میں معقولات کی گرم بازاری ہوئی۔

خواجہ جمال الدین محمود کے دو شاگرد تھے ایک مرزا
جان شیرازی اور دوسرے امیر فتح اللہ شیرازی۔ اول الذکر
کے شاگرد ملا یوسف کوسج شیرازی تھے۔ ان کے شاگرد ملا محمد
فاضل بدخشی، ان کے شاگرد میر زاہد ہروی ان کے شاگرد شاہ
عبدالرحیم (پدر بزرگوار شاہ ولی اللہ) ان کے شاہ عبدالعزیز
جن کے سلسلہ تلمذ میں دیوبند، سہارن پور اور مغربی ہندوستان
کے علماء منسلک ہیں۔

ثانی الذکر امیر فتح اللہ پہلے دکن آئے وہاں سے اکبر کی
طلب پر ہندوستان آئے جہاں ملا عبدالسلام لاہوری نے
ان سے کسب فیض کیا۔ ملا عبدالسلام لاہوری کے شاگرد
ملا عبدالسلام دیوی تھے۔ ان کے علاوہ ملا عبدالحلیم انصاری
ان کے شاگرد ان کے صاحبزادے ملا قطب الدین شہید سہالوی
اور ان کے صاحبزادے ملا نظام الدین سہالوی جن کے سلسلہ تلمذ
میں علمائے پورب بالخصوص فضلائے فرنگی محل آتے ہیں۔

ملا نظام الدین کے ایک اور شاگرد ملا کمال الدین تھے جن
کے سلسلہ تلمذ میں مولانا فضل حق خیرآبادی منسلک ہوتے ہیں۔
موخر الذکر سے خیرآباد ٹونک اور رام پور کے سلسلے چلے۔ ملا نظام
الدین کے خلف الرشید مولانا عبدالعلی بحر العلوم نے دکن اور
جنوبی ہند میں جاکر فرنگی محل کی علمی روایات کو متعارف کرایا۔

اس طرح ہندوستان کے جملہ علمائے معقولات کا سلسلہ
محقق دوانی تک پہنچتا ہے۔ محقق دوانی شاگرد تھے خواجہ حسن
بقال کے، اور یہ فاضل شاگرد تھے میر سید شریف جرجانی کے، جو
شاگرد تھے محمد بن مبارک شاہ منطقی کے اور وہ شاگرد تھے قطب
الدین رازی کے اور قطب الدین رازی شاگرد تھے قطب الدین
شیرازی کے اور قطب الدین شیرازی شاگرد تھے محقق طوسی کے۔

آج برصغیر کے عربی مدارس میں جو فلسفہ پڑھایا جاتا ہے،
وہ شیخ بوعلی سینا کا وضع کردہ ہے جس کی محقق طوسی نے تجدید
کی تھی اور ان مدارس کا جو بھی معلم یا متعلم ہے، اس کا سلسلہ تلمذ
محقق طوسی تک پہنچتا ہے۔ پھر محقق طوسی کے توسط سے شیخ بوعلی
سینا تک شیخ کے توسط سے فارابی تک، فارابی کے توسط سے
اسکندریہ کے مدرسہ فلسفہ کے معلمین تک اور ان کے ذریعے ارسطو
تک اور کلام میں امام ابوالحسن الاشعری تک پہنچتا ہے۔ ان سب
کی تفصیل طوالت کے خوف سے نظر انداز کی جا رہی ہے۔

—(باقی)—

ادبار کی نشانیاں

"جس قوم کے افراد کی تلواریں آپس ہی میں ٹکرانے لگیں شکست اس
قوم کا مقدر ہوتی ہے

اور

جس قوم میں غدار پیدا ہونے لگیں اس قوم کے مضبوط قلعے گھروندے
معلوم ہوتے ہیں"

شہید سلطان ٹیپو

عمر غفار (علیگ)

بولتے پتھر

جی ہاں، پتھر بولتے ہیں کیوں کہ یہ پتھر حال کے گواہ ہیں ماضی کے امین ہیں۔ جو اپنے گزشتہ کو موجود سے جوڑتے ہیں۔ پتھر جو ایک عالم کی داستان اپنے ٹھوس اور فراخ سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ عشق و محبت کی داستانیں، طاقت و اقتدار کی داستانیں باغی اور وطن پرستوں کی داستانیں، اتفاق و اتحاد کی داستانیں قومی یکجہتی اور رواداری کی دل پذیر داستانیں۔ ایسی ہی صدیوں پرانی اور حال سے وابستہ داستان کیوں نہ ہم اور آپ آج سنیں جو ہماری کہانی ان کی زبانی ہے۔

قصہ پرانا تو ہے مگر قدیم بھی نہیں۔ کل ہی کی سی تو بات لگتی ہے، جب مسلمانوں نے ہندوستان جنت نشان کی سرزمین پر اپنا قدم رکھا اور بقول اقبال:

اے آب رود گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

کارواں اترا، ہند کی سرزمین نے حسب روایت کلیجہ سے لگایا محبت کی آنچ نے اجنبیت اور بے گانگی کی پتھر جیسی برفیلی سل کو پگھلا کر بہا دیا۔ اب باہم شیر و شکر ہیں۔ من و تو کا امتیاز جاتا رہا۔ رشتے استوار ہونے لگے۔ تہذیب و تمدن کا لین دین شروع ہوا۔ مسلمانوں نے اگر خیال و الفاظ کو خوبصورت اور لطیف پیکر کی شکل دینے اور ان کے جوڑوں کی بدنمائی دور کرنے کے لیے جڑائی کے عمدہ مسالے فراہم کیے تو ہندوؤں نے بلند و اعلیٰ اور نرم و گرم افکار و خیال کو مجسم کرنے کے لیے پتھروں کو تراشنا سکھایا۔ اور مسلمانوں کا جمالیاتی ذوق پتھروں میں ڈھلنے لگا۔ سطحِ زمین کے کشادہ سینے پر ایک تاریخ کندہ کی جانے لگی۔ وہ تاریخ جس کو وقت اپنی بے مہری سے بھلا تو سکتا ہے جھٹلا نہیں سکتا۔ کیوں کہ جس طرح ادب کسی سماج کا آئینہ ہوتا ہے، اسی طرح فنِ تعمیر کے منہ بولتے شاہکار "قومی دستاویز" کا مقام رکھتے ہیں۔

پروفیسر مجیب کہتے ہیں کہ "فن تعمیر دراصل الفاظ کو پیکر میں اور پیکر کو الفاظ میں ڈھالتا ہے۔" اور یہ پیکر ماضی سے ہمارا تعلق ایسے ہی قایم کرتے ہیں جیسے اکیلے آدمی کی زندگی میں اس کا حافظہ۔ آج ہم کو بھی ماضی سے تعلق رکھنے والی ان کڑیوں کی کہانی وہ پتھر سنائیں گے جن کا حال سے ٹبرا روشن اور مضبوط بندھن ہے۔

تاریخ کا کوئی بھی طالب علم اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ اپنے دورِ حکومت میں مسلم حکمرانوں نے بڑی رواداری وسیع القلبی اور باہمی اتحاد کا ثبوت دیا ہے، جن میں اکبر کا نام سرفہرست آتا ہے اور جس کے نامن عمارتوں کے پیکر میں تراشیدہ یہ بولتے پتھر ہیں۔ سولہویں صدی کے وسط میں اکبر کے جد امجد اور ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے بانی بابر نے اپنی تزک میں نسلی اتحاد کے نتیجے میں جنم لینے والے فن تعمیر کے بارے میں راجہ مان سنگھ کے قلعہ کو اس اتحاد کی مثال قرار دیا ہے اور راجہ مان سنگھ کے قلعہ ہی پر کیا منحصر، اکبر کا قلعہ، شاہجہاں کا تاج محل اور ہندوستان کے کونے کونے میں بکھری ہوئی ایسی بے شمار

عمارتیں اس اتحاد و رواداری اور یک جہتی کی داستان سناتی ہیں۔

مگر قابلِ مطالعہ چیز اکبر کے دورِ حکومت میں تعمیر کی منزل سے گزرے ہوئے وہ مندر ہیں جن کے اندر ان دو تہذیبوں کا ملاپ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ مثلاً بنگال کے مندر، غالباً مسلم حکومت کے زمانے کی پہلی عمارت ہے جس میں مسجدوں کے طرز کو اپنایا گیا ہے۔ یہ مندر ۱۷۰۴ء اور ۱۷۲۲ء کے درمیان تعمیر ہوا جو ایک وسیع مربع عمارت پر پھیلا ہوا ہے۔ جس کی تین منزلیں ہیں اور تیسری منزل کے اوپر مرکزی مینار ہے جس کا کلس مخروطی ہے پہلی دو منزلوں پر مسلم طرز کے چار ہشت پہل مینار چاروں گوشوں پر بنے ہیں۔ ساری عمارت میں نوک دار محرابیں بنی ہیں۔ تمام سطح سرخ پکی مٹی کی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ کوئی تصویر یا مورتی نظر نہیں آتی۔

اسی طرح دہلی کا جین مندر، امرت سر میں سکھوں کا گولڈن ٹمپل، بنارس کا وشنو مندر، گوالیار میں سندھیا کی ماں کا تعمیر کیا ہوا مندر، کلکتہ کا پگوڈا، اور کھنڈ کا مندر وغیرہ۔

لاہور میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے محلات نیز امبر کے راجہ مان سنگھ جن کا انتقال ۱۶۱۵ء میں ہوا، ان کا محل جس میں مغلوں کے محلات کی طرح زنانہ محل، چھجے، باغات اور فوّارے بھی بنائے گئے ہیں۔ اسی زمانے میں مہارانا امر سنگھ نے اودے پور میں جھیل کے کنارے ایک بڑا محل بنایا جس کی پانچ منزلیں تھیں اور بالائی منزل سنگ مرمر کی۔ پھر اس میں چھجے دار کھڑکیاں اور جالی دار جھڑیاں بھی بنوائیں۔ ان کے ساتھ جہاں جابجا ہاتھیوں کی مورتیاں بنی ہیں وہاں مسلم طرز پر شہ نشینوں اور کوشکوں کا بھی اضافہ ہے راجہ جگت سنگھ نے اودے پور میں سنگِ موسیٰ کا محل بنایا جس کے کمرے کی دیواروں پر قیمتی تصویریں بنائی گئیں۔ اس میں بنگالی طرز کی جھکی ہوئی کارنسوں، چوٹی دار گنبدوں، کوشکوں، بالکونیوں اور کھلے ہوئے چبوتروں سے بڑی خوبصورتی پیدا کی گئی ہے۔ اسی طرح رانا کرن سنگھ کے لڑکے رانا امر سنگھ نے امر محل اور جگ مندر کے نام سے محل بنوائے۔ ان کی محرابوں کی ترصیع کاری، ستونوں پر کی گئی زینت و آرائش سب میں مغلوں کا طرز جھلکتا ہے۔ اور آگے چلیے۔ مدورا میں ترومل نایک کے محل کے بڑے بڑے کمروں، ستونوں، محرابوں اور کھڑکیوں کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ کسی ہندو راجہ کا محل ہے یا کسی مسلمان بادشاہ کا قصر۔ یہ سترھویں صدی کی بات ہے۔

بہرحال تاریخ داں اس سچائی کو متفقہ طور پر تسلیم کر چکے ہیں کہ انیسویں صدی تک جتنے محلات، مقبرے، سمادھی اور مندر بنائے گئے وہ چاہے جام نگر کے پچھمی علاقے میں ہوں یا کلکتہ کے پوربی حصوں میں یا پنجاب میں سکھوں کی ریاست میں یا وسط ہند میں جینیوں کی عبادت گاہوں میں، سب کی طرز تعمیر میں قومی ایکتا کا درس سمویا ہوا ہے۔ پتھروں نے یہ داستان تو مغلیہ اور اس سے بھی پہلے کے شمالی ہندوستان کی سنائی ہے۔ اب دیکھیے کہ جنوبی ہند کے پتھر کیا راگ الاپ رہے ہیں۔

یہ شہر حیدر آباد ہے۔ علم و ادب کا گہوارہ، اتحاد و اتفاق کا مرکز، قومی یک جہتی کا نشان۔ جس کی تاریخ قطب شاہی دور کے دامن سے لپٹی ہوئی ہے۔ ان سلوٹوں کو ذرا سا کھولیے تو سبھی کچھ دیکھیے۔

محمد قلی قطب شاہ، شہر حیدر آباد کا جنم داتا، جس نے دکنی تمدن کو بنانے میں بڑا حصہ لیا اور اس تمدن کو اگر محمد قلی قطب شاہ کا تمدن کہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ قلی قطب شاہ نے رواداری کے آدرشوں کو پتھر کے پیکروں میں اتار دیا ہے۔ جس کی مثال بھاگ متی کی اکلوتی بیٹی حیات بخشی بیگم کی گولکنڈہ میں آباد وہ مسجد ہے جس کی بیرونی کمانوں کے اندر ان کے نقش و نگار میں انگور کے خوشوں پر گلہریاں بیٹھی نظر آتی ہیں۔ جب کہ مسلمان جاندار کی تصویر بنانے کو اپنے بنیادی عقیدے کے خلاف سمجھتے تھے یہ موسیٰ خاں کی ٹولی مسجد ہے۔ جس کے اندرونی چھجے کو ہاتھیوں کی سونڈیں سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس میں مندروں کے طرز کے دھارے بنے ہیں جو مسجد کے پس منظر میں مندر کا نظارہ پیش

کر رہے ہیں۔ گولکنڈہ کے اندر بھاگ متی یعنی حیدر محل کے محل کی جانب مغربی حصار سے متصل باہر کی طرف قطب شاہ نے ایک مسجد اور اس کے برابر مندر بنایا تھا۔ مسجد تو بری بھلی حالت ہی میں سہی شاید اب بھی کچھ محفوظ ہے مگر مندر کا صرف ایک ستون کھڑا رہ گیا ہے جو کھڑا کھڑا مذہبی رواداری کی داستان دھراتا رہتا ہے۔

اس ہی حیدر آباد کے بیچوں بیچ "شہنشاہ کے سر پر رکھے تاج کے مانند" چار مینار" جس کی اپنی ایک کہانی اور تاریخ ہے آپ ہی کہیے اس کے اوپری حصے پر واقع چھوٹی سی مسجد کے پہلو میں شانے سے شانہ ملائے ایستادہ مندر کن رشتوں کی نشاندہی کر رہا ہے؟ یہ ہیں دکنی تمدن کی خصوصیات۔

دور کیوں جائیے نظام کے دور کی "جامعہ عثمانیہ" کی یہ پُرشکوہ یادگار عمارتیں آرٹس کالج، فزکس اور کیمسٹری کے ڈپارٹمنٹ ۔ قومی یک جہتی کے ضامن اور اس کے بانیوں کی وسعت قلبی اور رواداری کے گواہ ہیں۔ آرٹس کالج جس کے مندر کی وضع کے ستون، سردل والے دروازے، برآمدے اور لداؤ چھت اس عالی شان نقش و نگار کے گنبد کے درمیان چار پہلوؤں پر موجود ہے۔ جس کی نچلی منزل اپنی خصوصیات کی وجہ سے اگر کسی مندر کی یاد تازہ کرتی ہے تو بالائی منزل کی خوبصورت نازک کمانیں مسلم طرز کی غماز ہیں۔ دونوں اسلوب آپس میں یوں پیوستہ اور ہم آہنگ ہیں کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ کون سا اسلوب کہاں پر ختم اور کہاں سے شروع ہوتا ہے۔

حالیہ دور یعنی ۱۹۳۰ء کی دین " ادارۂ ادبیات اردو" کی خوبصورت عمارت بھی ہند و مسلم فنِ تعمیر میں ڈھل کر قومی یک جہتی کا آہنگ بن گئی ہے۔ جس کا بلند مینار، محراب دار اونچا دروازہ مسلم طرز کی عکاسی کرتا ہے تو سردل ڈال کر بٹھایا ہوا دروازہ اور اندرونی عمارت کی محرابیں ان کی نقاشی و ارنگل کے مندروں کی یاد دلاتی ہے۔

پتھر، اینٹوں، گارے اور چونے سے ڈھالا گیا عمارتوں کا یہ طرز اور روش کیا اپنی خاموش زبان سے زمانے کو رواداری اور آپسی محبت کا درس نہیں دیتا؟ ضرور دیتا ہے۔ مگر ہمارے سننے والے کان بہرے ہو گئے ہیں۔ چشمِ بینا میں روشنی نہیں، دلوں پر غرض کی چربی چھائی ہے۔ ہمارے ضمیر مردہ ہو گئے ہیں، احساسات سو گئے ہیں اور انسانیت دم توڑ چکی ہے۔ انسانیت کے مظہر گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو اور دیگر قائدین قوم کے سیکولر آدرش صرف کتابوں کی زینت بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ ہے آج کا المیہ۔ اخلاق و اقدار کی اعلیٰ تعلیم ہم بھول چکے ہیں۔ گمراہیوں اور نفسا نفسی کی بھول بھلیوں میں کھو کر اپنے حواس گم کر چکے ہیں۔ جہاں نہ سیکولرازم کی یہ جیتی جاگتی، پتھروں کی زبان سے فریاد کرتی نشانیاں ہم کو جھنجھوڑ پاتی ہیں اور نہ قومی رہنماؤں کے بھائی چارگی کے اپدیش اور آدرش بیدار کر پاتے ہیں۔ جن کا ہم زبان سے رونا روتے ہیں۔ کسی بھی سیاسی پلیٹ فارم سے ان کا پرچار کرتے ہیں۔ لیکن روح پیدا نہیں کر پاتے۔ دراصل انسان آج بھی بنیادی طور پر اتنا ہی وحشی اور غیر مہذب ہے جیسا پتھر اور لوہے کے زمانے میں تھا۔ تہذیب و تمدن اور شرافت کا ایک خول اس نے اپنے اوپر چڑھا لیا ہے، جس میں حالات کے ناخن اگر ذرا سی بھی کھروچ ڈال دیں تو اندر سے وہی درندگی اپنے خونی دانتوں کے ساتھ جھانکنے لگتی ہے۔ فقط طرزِ معاشرت بدل گیا۔ لیکن صدیاں گزرنے کے بعد بھی:

"دل اپنا پرانا پاپی تھا برسوں میں نمازی بن نہ سکا"

والی مثال صادق آتی ہے۔

عمارتوں کے پیکر میں ڈھلی قومی یک جہتی، مذہبی رواداری کی یہ نشانیاں اس دور کی بھی یادگار ہیں جب شہنشاہیت اور مطلق العنانیت تھی اور نوابی تھی اور آج جب کہ جمہوریت کا دور دورہ ہے لیکن بھائی چارے اور انسان دوستی کا فقدان آج کے دور کا امتیازی نشان بن چکا ہے۔ جگہ جگہ جنم لینے والے دنگے فساد، کشت و خون، سماج کی کوکھ میں پنپنے والی توڑ پھوڑ جس کی مثالیں ہیں۔ لیکن کیا بات ہے یہ فقدان اور بحران کل نہیں تھا۔ شاید کل عمل تھا۔ تھیوری کی شکل میں پروپیگنڈا نہیں تھا۔

ایسا کیوں؟ یہ کیوں کا سوالیہ نشان منہ کھولے ہوئے ہم سے آپ سے جواب مانگ رہا ہے۔

بے شک آج کا دور پھر کسی اکبر کا متلاشی ہے۔ قلی قطب شاہ اور نظام کو ڈھونڈتا ہے۔ راجہ مان سنگھ اور رام سنگھ کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ دیکھیں یہ تلاش و جستجو کس دن منزلِ مقصود کو پاتی ہے۔ انتشار اور 'راجی اور راجی'، کو ختم کرنے والا گاندھی آزاد اور جواہر لال کس موڑ پر ہمارا ہاتھ تھام کر منزل کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

وقت کی کیسی ستم ظریفی اور ہندوستان کی کیسی بدنصیبی ہے کہ عرصۂ دراز کی کوششوں، کاوشوں، قربانیوں اور بے شمار معصوم جانوں کا ہرجانہ دینے کے بعد آج ؎

بن گیا قصر تو پہرے پہ کوئی بیٹھ گیا
سو گئے خاک پہ ہم شورشِ تعمیر لیے
اپنی نس نس میں لیے سعیِ پیہم کی تھکن
بند آنکھوں میں اسی قصر کی تصویر لیے

آزادی، انسان دوستی، باہمی اتحاد، مذہبی رواداری کے جو محل ہمارے بزرگوں نے بنائے، سجائے، سنوارے، نکھارے اور جن کے خواب ہم نے اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے دیکھے، ان پر آج نفرت کدورت، تعصب، پھوٹ، دشمنی، ہوس، بے غیرتی اور مادہ پرستی کے ہیبت ناک دیو کا قبضہ اور پہرہ ہے۔ کیسی حسرت اور بے چارگی کا عالم طاری ہے۔ آنے والا کل کیا پیغام لے کر آئے گا۔ کب کیا؟ کب کیا؟ کا لامتناہی سلسلہ ایک زنجیر کی طرح چلا گیا ہے۔ کوئی ہے جو آگے بڑھے اور اس زنجیرِ مسلسل ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔

افسوس یہ ہے کہ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ اس زمانے میں علم کیا چیز ہے جس سے قومی ترقی ہوتی ہے۔ آج تک جو ہم نے جانا اور جو ہمارے بزرگوں نے جانا، علم کی حقیقت کو اسی قدر جانا کہ ایک شئے عقل ہے جو خیال میں اور حافظے میں رہتی ہے اور نفس کو اس سے بہت مزا اور روح کو خوشی حاصل ہوتی ہے مگر اس زمانہ میں اسی کو اصل علم کہتے ہیں جو دیکھنے اور برتنے اور تجربے میں آوے اور انسان کے لیے اس کے تمام کاموں میں مفید ہو۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے اگلے زمانہ کے عالم فاقہ مرتے تھے اور خیرات کے ٹکڑوں پر اوقات بسر کرتے تھے اور اس زمانے میں تربیت یافتہ ملکوں کے جو عالم ہیں وہ دولت و حشمت سے مالا مال ہیں اور ان سے اپنی قوم کی بھلائی اور ترقی ہر دم ہوتی ہے۔

سر سیدؒ

ابوسعد خاں

مسلمان جغرافیہ دانوں کی علمی اور سائنسی خدمات

جب اسلام کا ظہور ہوا تو یونانی اور رومن تہذیب فرسودہ اور جامد ہو چکی تھی۔ علم جغرافیہ کی دنیا میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور اس طرف بالکل توجہ نہیں دی جا رہی تھی۔ اس عدم توجہی سے اس بات کا زبردست خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ یونانی اور رومی ادوار میں کرۂ ارض کے متعلق جو نظریات اور معلومات حاصل ہو چکی تھیں کہیں ضائع نہ ہو جائیں۔ لیکن قدرت نے ان نظریات اور معلومات کی دیکھ بھال کا کام عربوں کے حوالے کر دیا اور عربوں نے اس ذمہ داری کو بخوبی نبھایا۔ عرب جغرافیہ دانوں نے یونانی اور رومی جغرافیہ دانوں کے نظریات اور معلومات کی نہ صرف حفاظت کی بلکہ اس وقت کے معلوم تمام جغرافیائی علوم کی حدود میں بے انتہا وسعت پیدا کی۔

عرب نہ صرف علم جغرافیہ کے محافظ تھے بلکہ کئی لحاظ سے اس کے خالق بھی تھے۔ عربوں نے یونانیوں اور رومیوں کے نظری علوم کو عملی سائنس میں تبدیل کر دیا۔ یونانی اور رومی ماخذ سے استفادہ کرنے کے بعد عرب جغرافیہ دانوں نے بطلیموس کی تصانیف سے یورپ کو متعارف کرایا۔ آراٹوستھینز اور دیگر یونانی جغرافیہ دانوں کے قدیم نظریے کو مانتے ہوئے کہ زمین گول ہے، عربوں نے اس کا قطر دریافت کیا اور عرض بلد اور طول بلد کی صحیح صحیح پیمائش کی۔ انھوں نے ستاروں کے متعلق تحقیقات کی اور زمین کی جسامت کا اندازہ کیا۔ مامون الرشید نے بغداد میں ایک بڑے دار العلوم (یونیورسٹی) کی بنیاد ڈالی جو ایک خاص اہمیت کی حامل رہ چکی ہے۔ اس یونیورسٹی میں زمین کی شکل و صورت، مقامات کے وقوع کا تعین، نقشہ سازی، نقل و حمل کے نظام، فلکیات اور انسانی بستیوں پر خاص طور سے تحقیقی کام کیا گیا۔ وہاں بہت سے طالب علم، یونانی اور رومی علم کے مشہور جغرافیہ دانوں مثلاً ہیروڈوٹس، ارسطو، بقراط، اراٹوستھینز، بطولمی اور اسٹرابو (STRABO) کی تحقیقات کو عربی زبان میں ترجمہ کرنے اور انھیں جمع کرنے کے لیے منتخب کیے گئے تھے۔ ان عالموں نے جغرافیہ کو اپنے تحقیقاتی اور علمی سرمایے سے مالا مال کیا۔ عربوں نے طبعی جغرافیہ، طبقات الارض، تاریخی جغرافیہ، علاقائی جغرافیہ، انسانی جغرافیہ، ریاضیاتی جغرافیہ اور فلکیات جیسے کارآمد اور اہم علوم میں سے بعض کی بنیاد خود قایم کی تھی اور دوسرے علوم میں اتنی زیادہ ترقی کی تھی کہ ان کے قایم کیے ہوئے بہت سے اصول اور نظریات آج بھی اپنی جگہ قایم ہیں اور مغرب میں ان علوم کی ترقی مسلمانوں ہی کی رکھی ہوئی بنیادوں پر ہوئی ہے۔ یورپ میں علم و فن کا از سر نو زندہ ہونا عربوں ہی کے طفیل ہے۔

المامون کے دور میں جغرافیہ دانوں کی بہت حوصلہ افزائی کی گئی۔ المامون نے خود جغرافیہ پر تحقیقی کام کیا۔ اس نے ارسطو اور بطولمی کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کر کے جغرافیہ اور فلکیات کے علم میں اضافہ کیا۔ اس نے مشرقی شام اور سنجار کے میدان میں زمین کی وسطی لائن پر دو ڈگری شمال کی دوری کا تجربہ کرایا جس سے کئی دلچسپ نتائج برآمد ہوئے۔ مثلاً زمین کا محیط ۲۰ ہزار چار سو میل اور قطر ۳ ہزار ۲۵۰ میل معلوم ہوا۔ یہ قطر زمین کے حقیقی قطر سے صرف ۵۰ میل کم تھا۔ المامون کے

دور میں کئی مشہور جغرافیہ داں گزرے ہیں جن میں الخوارزمی اور الفرغانی کے نام قابل ذکر ہیں۔ الخوارزمی (پ۔ ۸۰۰ء) نے اپنی کتاب زمین کی شکل (The Face of the Earth) میں ارسطو اور بطلیموس کی بنیاد پر مقامات کا محلّ وقوع، پہاڑ، ندیوں اور سمندروں کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے بغداد اور کئی دوسرے شہروں کے عرض بلد اور طول بلد بھی مقرر کیے۔ زمین کو آب وہوا کے لحاظ سے کئی طبقوں میں تقسیم کیا۔ الفرغانی نے "فلکیات کے عناصر" (ELEMENTS OF ASTRONOMY) کتاب کی تصنیف کی جو علم فلکیات سے متعلق مختلف اصول اور نظریات سے مالا مال ہے۔ یہ کتاب علمِ فلکیات کے لحاظ سے بہت ہی اہمیت کی حامل ہے۔ اس دور کا ایک اور جغرافیہ داں ابن رستم زمین کو ایک کرّہ تسلیم کرتے ہوئے اس کو ایک معلّق کرہ مانتا ہے۔ ابن رستم کی کتاب میں مدینۂ منوّرہ اور مکّۂ معظّمہ کے متعلق معلومات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں تمام عالمِ اسلام کی معلومات کے علاوہ اس زمانے کی کئی مشہور شاہراہوں کا بھی تفصیلی ذکر موجود ہے۔

البتانی (۹۲۵ — ۸۵۵ء) بھی ایک مشہور عرب جغرافیہ داں گزرے ہیں۔ ان کی کتاب "ستاروں کی نقل وحرکت" (ON THE - Movement of the Stars) بہت ہی مشہور کتاب ہے۔ یہ کتاب فلکیاتی تجربوں پر مشتمل ہے اس میں جغرافیائی طور پر عرض بلد اور طول بلد کا تعین، سورج اور ستاروں کی اونچائی معلوم کرنے کے طریقے بھی دیے گئے ہیں۔ البتانی نے فلکیاتی ٹیبلس (Astro-nomical Tables) بھی تیار کیا، جو بہت ہی اہمیت کا حامل ہے اس جدول (TABLES) میں البتانی نے ۸۱۰ - ۱۸۸۰ کے غیر متغیر تاروں کا ذکر کیا ہے۔ ابوالقاسم بن محمد بن حوقل — (۹۴۳ — ۹۸۶ء) ایک مشہور سیاح تھا۔ اس نے تقریباً تمام عالمِ اسلام کی سیر کی اور اپنی سیاحت کے دوران جو مواد اکٹھا کیا اُسے اپنی مشہور عالم تصنیف "صورت الارض" (SHAPE OF THE - EARTH) کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ حوقل نے اس کتاب میں دنیا کے کئی ملکوں اور شہروں کے نقشے بھی پیش کیے ہیں جو اس

کے بعد آنے والے محققین کے لیے مشعلِ راہ بنے۔ انھوں نے اپنی دوسری تصنیف، سڑکیں اور صوبے — (BOOK OF ROADS & PROVINCES) میں مختلف علاقوں کی شاہراہوں کا تذکرہ کیا ہے۔ حوقل کی ایک اور مشہور مایہ ناز تصنیف 'دنیا کے ممالک' ہے، جس میں انھوں نے روس، وسطی ایشیا، مشرق وسطیٰ، مشرقی افریقہ، سوڈان وغیرہ ممالک کا جغرافیائی، سماجی اور معاشی ذکر کیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی سات ہزار ۵ سو میل لمبی سیاحت کا بھی تذکرہ بہت ہی دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔

ابن خردازبہ (IBN KHARADABIH) نویں صدی عیسوی کا ایک عظیم جغرافیہ داں ہوا ہے جو علم وفضل کی بنیاد پر بابائے جغرافیہ کہلایا۔ اس نے اپنی مشہور کتاب "المسلک" میں پہلی دفعہ جغرافیہ نویسی کے قواعد مرتب کیے تھے۔ اس کتاب میں نہ صرف مختلف شہروں کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں بلکہ ہر دو مقام کے بیچ فاصلہ بھی درج ہے۔ انھوں نے زمین کی پوزیشن مختلف ستاروں کے بیچ اس طرح مانی ہے جس طرح انڈے کے بیچ اس کی زردی ہوتی ہے۔ انھوں نے شمالی اور جنوبی قطبین کو آب وہوا کے لحاظ سے سات طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔

المسعودی کی پیدائش ۹۰۰ء میں بغداد میں ہوئی۔ اس وقت تک بغداد علم وفن کا گہوارہ بن چکا تھا۔ اس لیے مسعودی کی تعلیم وتربیت بھی بغداد میں ہوئی۔ انھوں نے تاریخ، قانون، سائنس اور فلکیات اور مذہبی تعلیم حاصل کی۔ المسعودی دسویں صدی عیسوی کا عظیم عالم تھا۔ اس نے طبعی ماحول اور انسانوں کے باہمی رشتے کو اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ المسعودی اپنے زمانے کا مشہور سیاح گزرا ہے۔ اس نے گیلیسیا سے لے کر چین اور مڈغاسکر سے لے کر روس تک کی سیاحت کی۔ انھوں نے ہندوستان کا بھی سفر کیا۔ انھوں نے بطلیموس جیسے نامور جغرافیہ داں کے کئی نظریوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ مثلاً بطلیموس کے اس نظریے کو کہ افریقہ جنوب مشرقی ایشیا کے ساتھ خشکی کے ذریعے ملا ہوا ہے، غلط ثابت کیا ہے ان کی کتاب میں ۹۵۵ء کے زلزلوں

کا بھی ذکر ملتا ہے۔ انھوں نے سمندروں کی پیدائش کے سلسلے میں بھی اپنے نظریات پیش کیے جو بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی تصانیف میں 'انلس آف ٹائم' (ANNALS OF TIME) سونے کی چراگاہیں اور جواہرات کی کانیں - (MEADONS OF GOLD & MINES OF PRECIOUS STONS) - علامات و مشاہدے (THE BOOK OF INDICATION & OBSERVATION) وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔ المامون نے زمین کی شکل گول مانی تھی۔ المامون کے دور کی دستیاب دوریوں سے پیمائش کرکے اس نے خط استوا کے محیط کی لمبائی ۲۰۱۶۰ میل اور زمین کا قطر ۶۶۷۰ میل بتایا

گیارہویں صدی عیسوی کے ایک مشہور سائنس داں اور جغرافیہ داں ابن یونس نے پنڈلم کی حرکت سے وقت کی پیمائش کا طریقہ دریافت کیا اور بہت سے علاقوں کے طول بلد اور ارض بلد بھی دریافت کیے۔ ابن یونس نے کچھ مقامات کے عرض بلد دریافت کرکے ۱ ڈگری کے بیچ کی دوری ۵۶ ½ سے ۵۷ میل کے درمیان بتائی زمین کو گول ثابت کرنے کے لیے اس نے ساحل سے سمندر کی بناوٹ اور جہازوں کے ساحلوں پر آنے کے وقت کا منظر سمجھایا۔

ابوریحان محمد بن احمد البیرونی کا شمار دنیا کے عظیم ترین مسلم علماء میں کیا جاتا ہے۔ یہ خوارزم کے مضافات میں ۹۷۳ء میں پیدا ہوا۔ اُن کا اصلی نام محمد ہے لیکن البیرونی کے نام سے مشہور ہوئے۔ عربی اور فارسی کے بہت بڑے عالم ہونے کے علاوہ سنسکرت کے بھی مایہ ناز اسکالر تھے۔ اُن کی تصانیف کی تعداد ۱۱۴ سے بھی زیادہ بتائی جاتی ہے۔ البیرونی نے اپنی مختلف کتابوں میں اسٹرانمی اور ریاضیاتی جغرافیہ کو اہم مقام دیا ہے۔ انھوں نے یورال پہاڑ، سیر دریا، مارسیلز، بغداد، غزنی، قنوج اور دہلی وغیرہ شہروں کے طول بلد اور عرض بلد دریافت کیے۔ ان کے مطابق دو ارض بلد کے بیچ کی دوری ۵۶ میل تھی۔ زمین کو گول، ساکت اور خلا کے بیچ میں مانا ہے۔ البیرونی وہ پہلا جغرافیہ داں تھا جس نے ثابت کیا کہ موجودہ سندھو، گنگا کا میدان کسی زمانے میں سمندر تھا اور ہمالیہ کی پیدائش سمندر میں ہوئی ہے۔ البیرونی نے سب سے پہلے 'مسافت الارض' کے قواعد مرتب کیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے آتش فشاں کی وجوہات، مدوجزر کی وجوہات، زلزلے کے اسباب، سورج اور چاند گرہن، قدرتی چشموں کی ابتدا اور سطح زمین پر ہونے والی مختلف تبدیلیوں پر تحقیقاتی کام کیا ہے۔ البیرونی نے زمین کا محیط بھی دریافت کیا جو کہ ۲۴۷۷۹ میل تھا جو موجودہ پیمائش سے ۴۸ میل ہی کم ہے۔ البیرونی کی تمام تصانیف میں 'کتاب الہند' کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی اس کتاب میں ہندوستانی جغرافیہ سے متعلق بھی بہت سی معلومات درج ہیں۔ مثلاً ہندوستان کے شہروں، مقدس مقامات، شاہراہوں، دریاؤں، سمندروں، جزیروں، پہاڑوں، میدانوں، زراعت اور آبی حمل و نقل کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔

البیرونی کی کتاب 'ہیرے اور قیمتی پتھر' (THE BOOK OF MINERALS & PRECIOUS STONES) بھی بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور جغرافیہ داں پروفیسر کنڈریو نے ۱۹۴۱ء میں لکھا کہ عربی اور فارسی زبانوں میں معدنیات اور قیمتی چٹانوں پر لکھی گئی کتابوں سے یہ سب سے اہم کتاب ہے اس میں معدنیات اور چٹانوں کا تذکرہ سائنٹفک طور پر پیش کیا گیا ہے۔

محمد شریف الادریسی جو گیارہویں صدی عیسوی میں مراکش میں پیدا ہوئے جغرافیہ اور نقشہ نویسی میں عہد وسطیٰ کے امام تھے۔ ادریسی صرف مسلمانوں میں ہی نہیں بلکہ عیسائیوں اور دوسری قوموں میں بھی کافی مشہور و معزز تھے۔ ادریسی ہر لمحے اپنے کام میں مشغول رہتے تھے۔ سسلی میں وہ شاہ روجرس کے دربار میں اہم عہدے پر فائز تھے۔ یہاں پر رہ کر انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ روجرس کے کہنے پر اپنی شہرہ آفاق کتاب 'نزہت المشتاق' تصنیف کی جو کتاب الروجرس کے نام سے بھی موسوم ہے۔

پٹولمی کی طرح ادریسی نے بھی آب و ہوا کے لحاظ سے کرۂ ارض کو سات اہم طبقات میں تقسیم کیا اور ہر طبقے کو وہاں کے طول بلد اور عرض بلد کی پھیلاوٹ کے اصول کے مطابق کئی

ذیلی حلقوں میں تقسیم کیا۔ اس طرح ادریسی نے کل ۷۰ قسم کی آب و ہوا کا تفصیلی ذکر کیا ہے جو آج کل بھی یورپ میں موسمیات (Climatology) کے نام سے پڑھائے جاتے ہیں۔ یورپ کے تمام نقشہ نگار ۴۰۰ سال تک اس کتاب سے استفادہ کرتے رہے ۱۵ سال کی انتھک کوششوں کے بعد ادریسی نے چاندی کی ایک گول طشتری پر دنیا کا ایک نقشہ تیار کیا۔ اس تختی پر ان تمام ممالک کا نقشہ تیار کیا جو اس وقت تک معلوم ہو سکے تھے۔ اس چاندی کے ماڈل کو اسپیشل اسفیر (Special Sphere) بھی کہا جاتا تھا۔ اس نقشے کو سمجھنے کے لیے ادریسی نے ایک کتاب حوالہ (Reference book) بھی لکھی۔ اس کتاب سے نقشے کو آسانی سے سمجھا جا سکتا تھا۔ یہ دنیا کا پہلا نقشہ تھا جو چاندی کی تختی پر بنایا گیا۔

ادریسی کی دوسری اہم کتاب 'الروجاری' ہے۔ اس کتاب کے ساتھ تقریباً ۷۱ نقشے بھی تھے جو آج بھی آکسفورڈ اور پیرس کی یونیورسٹیوں کے میوزیم میں موجود ہیں۔ اس کتاب سے ادریسی کی شہرت میں بہت اضافہ ہوا اور اس کے نام کا چرچا بحیرہ روم کے ہر ملک میں ہونے لگا تھا۔ اس کتاب میں یونان، اٹلی، اسسلی فرانس، شمالی اور مغربی افریقہ، جرمنی، برطانیہ اور اسکنڈینیویا کے ممالک کا جغرافیائی، سیاسی، سماجی اور تجارتی تذکرہ کیا گیا ہے ادریسی پہلا جغرافیہ داں تھا جس نے مغربی افریقہ اور افریقہ کے اندرونی علاقوں کا تذکرہ بہت صحیح طور پر پیش کیا ہے۔ ادریسی وسطی عہد کا عظیم عرب جغرافیہ داں گزرا ہے۔ جس نے جغرافیہ سے متعلق حقایق میں دلچسپی لینا شروع کی۔ اس میں حقایق کو سمجھنے اور اس کی آزمائش کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی کولمبس نے جو نئی دنیا دریافت کی وہ ادریسی کی تصانیف اور نقشوں کی مرہون منت تھی۔ ادریسی کو عرب دنیا کا کولمبس تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر ادریسی کی تصانیف اور نقشے نہ ہوتے اور زمین کے بیضوی ہونے کا یونانی نظریہ نہ ہوتا تو کولمبس نئی دنیا دریافت نہیں کر سکتا تھا۔

تیرھویں صدی عیسوی میں نصیرالدین طوسی نے جغرافیہ پر تحقیقی کام کیا۔ طوسی کی تحقیق زمین کی پیمائش سے متعلق تھی۔ مد و جزر، بحری ہواؤں، بحری رویں (Ocean Currents) اور تہہ نشین بحری موادات سے متعلق ان کی کتابوں میں کافی مواد ملتا ہے۔ اس طرح ان کو بحر علم (Oceanography) کا عظیم عالم مانا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کئی ساحلی علاقوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ کئی مقامات کے طول بلد اور عرض بلد بھی مرتب کیے ہیں۔

ابن بطوطہ دنیا کا عظیم سیاح گزرا ہے جس نے اپنی زندگی کے ۳۰ سال سیاحت میں گزار دیے۔ ان کا پورا نام محمد بن عبداللہ معروف بہ ابن بطوطہ تھا۔ وہ مراکش کے تنجیر (Tangiers) شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ بچپن سے ہی سیاحت کے شوقین اور دلدادہ تھے۔ وہ یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک میں پہنچے۔ اس طرح انھوں نے معلومات کا ایک وسیع و عریض ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ جس کو اپنے 'سفرنامہ' میں درج کیا۔ ابن بطوطہ کا سفرنامہ اب بھی دنیا کا سب سے بڑا سفرنامہ خیال کیا جاتا ہے۔ انھوں نے کل ۷۵ ہزار میل کا سفر کیا۔ ابن بطوطہ کی سیاحت اور معلومات کا اس زمانے کی جغرافیہ میں ایک خاص مقام تھا۔ انھوں نے چین سے سوڈان اور زنجبار تک کے مختلف علاقوں اور بستیوں کا سفر ہی نہیں کیا، بلکہ ان تمام مقامات کا جغرافیائی، سماجی، سیاسی اور معاشرتی تذکرہ بھی پیش کیا ہے۔ ابن بطوطہ کو اسلامی دنیا کا مارکو پولو کہنا بے جا نہ ہوگا۔ دراصل انھوں نے مارکو پولو سے بھی زیادہ مدت تک اور کافی وسیع علاقے کی سیاحت کی۔

ابن خلدون (۱۴۰۶—۱۳۳۲ء) ایک مشہور و معروف جغرافیہ داں ہوئے ہیں۔ انھوں نے انسان اور ماحول کے باہمی رشتے پر روشنی ڈالی ہے اور اس حقیقت کو عیاں کرنے کی کوشش کی کہ انسان اور ماحول کے باہمی رشتے

بہت ہی گہرے اور مضبوط ہیں۔ ان کے مطابق انسانی جغرافیہ کی بنیاد 'طبعی جغرافیہ' ہے۔ انھوں نے ملکوں کے طبعی اور سماجی حالات کا ذکر وہاں کی تہذیب اور باشندوں کے آپسی رشتے کی روشنی میں کیا ہے۔ ابن خلدون انسانی جغرافیہ کا پہلا جغرافیہ داں تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کی کتابوں میں انسانی جغرافیہ کے علاوہ طبعی جغرافیہ سے متعلق کافی مواد ملتا ہے۔

ابن ماجہ ایک نامور ملاح اور سیاح گزرا ہے۔ یہ وہی نامور ملاح ہے جس کی رہنمائی میں واسکوڈی گاما ۱۴۹۸ء میں مشرقی افریقہ کی ایک بندرگاہ سے کالی کٹ پہنچا۔ ابن ماجہ نے تصانیف البحر کے نام سے جہاز رانی اور موسمیات پر ایک کتاب لکھی جو نظم میں ہے یہ کتاب برصغیر اور مشرق وسطیٰ کی کئی لائبریریوں میں موجود ہے۔

جغرافیہ میں مسلمانوں کی کاوشوں کی ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علم کے اس شعبے میں ان کی کتنی عظیم خدمات ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان ایک بار پھر سے سائنس کے میدان میں قائدانہ کردار ادا کریں۔

"آپ کو معلوم ہے کہ وہ شخص جس نے ہندوستان میں سب سے پہلے سوراج کی حقیقت کو محسوس کیا وہ ہمارے رہبر سرسید تھے وہ ذات سرسید ہی کی تھی جس نے اس حق کا مطالبہ کیا اور سوراج کے اولین نقوش اس ملک کے صفحات پر جمائے۔ سرسید ہی نے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور اہمیت سب سے پہلے محسوس کی اور اس کی تبلیغ ایسے وقت ایسے طریقے اور ایسی زبان میں کی جو آج تک قابل یادگار ہے۔ حصول سوراج کی آخری منزلوں کو طے کرنے کی سعادت خواہ کسی کو نصیب ہو، لیکن اس حقیقت کا اعتراف قرین انصاف ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب کہ ہر اس شخص کے لیے جو ارباب حکومت کے اشتباہ اور عتاب کا مورد تھا، مارشل لا اور دار و رسن، پذیرائی کے لیے موجود تھے۔ صرف سرسید کی وہ ذات تھی جو قوم و ملک کے لیے سب سے پہلے سینہ سپر ہوئی اور اس نے Representative Government کی اولین علمبرداری کا طرۂ امتیاز حاصل کیا۔ ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد ہی انھوں نے رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھا اور بغاوت کا پہلا سبب مجلس قانون ساز میں ہندوستانیوں کا بہ حیثیت رکن موجود نہ ہونا قرار دیا۔"

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں

شباب الدین

مسافر نواز بہتیرے*

ادارۂ تہذیب الاخلاق اور نشانت نے اپنے رسالوں کی توسیع اشاعت کی مہم کے پہلے مرحلے میں ایک دو رکنی وفد بمبئی اور بھیونڈی کے دورے پر بھیجا جو راقم الحروف اور ڈاکٹر شوکت علی خاں پر مشتمل تھا۔ یہ دورہ ایسے وقت میں ہوا جب بمبئی کی علیگرین برادری یوم سرسیّد کی تقریبات منعقد کرنے میں مصروف تھی۔ چنانچہ اس وفد نے بمبئی کے شاندار یوم سرسید میں شرکت کی جو واقعی سرسیّد کی شخصیت کے شایان شان تھا۔ بمبئی جیسی کاروباری جگہ میں ایسی تقریب کا انعقاد بجائے خود علیگ برادران کا ایک کارنامہ تھا۔ اس تقریب میں شرکت کرنے کے لیے مادر علمی کے طلبائے قدیم جوق در جوق دور دراز کی مسافت طے کرکے آئے اور چند گھنٹوں کے لیے اس طرح گھل مل گئے جیسے وہ بمبئی میں نہیں بلکہ اپنے طالب علمی کے دور کے علی گڑھ میں ہوں۔ اسی تقریب کے دوران وفد نے تمام علیگ بھائیوں سے ملاقات کی اور ان سے درخواست کی کہ سرسیّد کی تحریک کو زندہ اور فعال رکھنے کے لیے دونوں رسالوں کی توسیع اشاعت میں عملی تعاون کریں۔ وفد کی اس اپیل پر وہاں کے علیگ بھائیوں اور ہمدردانِ علی گڑھ نے اپنی دلچسپی اور جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف بمبئی اور بھیونڈی سے تہذیب الاخلاق اور نشانت کو اتنے خریدار مل گئے جن کے زر سالانہ کی مجموعی رقم اٹھائیس ہزار روپے سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ یوں تو اس سلسلے میں ہر علیگ بھائی نے وفد سے عملی تعاون کیا لیکن چند حضرات نے بے پایاں جوش و جذبے کے ساتھ اپنے خلوص و محبت کا مظاہرہ کیا اور اراکین وفد کی دل و جان سے پذیرائی کی۔ بمبئی جیسی مصروف ترین جگہ میں جہاں آدمی دن رات مشین کی طرح کام کرتا ہے، اس کو کسی دوسرے کام کے لیے ایک لمحہ بھی نکال پانا محال ہوتا ہے، اس کے باوجود بھی ان حضرات نے اپنا بیش قیمت وقت صرف کیا اور اپنے کاروبار کو چھوڑ کر ہمدردان علی گڑھ سے ملاقاتیں کروائیں۔ جس کے باعث وفد کو ایسے بہت سے حضرات سے بھی ملنے کا موقع ملا جو اگرچہ علیگ تو نہیں ہیں مگر سرسیّد کی تعلیمی و اصلاحی تحریک سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہمیں جن حضرات کا خصوصی تعاون حاصل رہا، ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

جناب اے۔ فیض صاحب، جناب جلیس احمد اعظمی صاحب (بھیونڈی)، جناب شمیم اختر خاں، جناب گلزار اعظمی صاحب، جناب احسان احمد صاحب (بھیونڈی)، جناب ہارون الرشید صاحب (علیگ)، جناب عرفان احمد صاحب (بھیونڈی) جناب منظور عالم اعظمی صاحب، جناب محمد شاہد خاں، جناب عقیل احمد صاحب، جناب خلیق احمد اعظمی صاحب (بھیونڈی) جناب فیاض احمد صاحب، جناب ایاز اعظمی،

جناب احسان احمد ظلّی صاحب، جناب آر۔ اے۔ فاروقی صاحب، جناب محتشم باللہ صاحب، ڈاکٹر شرف صاحب، جناب منظور احمد صاحب، جناب شمیم احمد صاحب، جناب سہراب احمد صاحب، جناب شمشاد الار صاحب، جناب ڈاکٹر زبیر احمد صاحب (بھیونڈی) جناب ہدایت اللہ صاحب، جناب سفیان احمد صاحب، ابوسعد خاں، جناب شفیق احمد صاحب، جناب اے۔کیو اعظمی صاحب، ڈاکٹر محمد ارشد صاحب، جناب ابومصلح انصاری صاحب، جناب انیس الدین صاحب، جناب قطب الدین صاحب، جناب افتخار احمد صاحب جناب سہیل احمد صاحب، جناب نیاز اعظمی صاحب، جناب نسیم انصاری صاحب ایڈوکیٹ (بھیونڈ جناب ابوبکر صاحب، جناب امتیاز احمد صاحب، جناب ابو طالب صاحب، جناب محمد اکمل صاحب (ناسک) جناب ممتاز احمد خاں صاحب (ناسک) جناب نورالہدیٰ صاحب، جناب عبدالقیوم صاحب، جناب عبدالنعیم صاحب جناب مرزا اظہر بیگ صاحب، جناب صلاح الدین صاحب، جناب اعجاز ریاض فاروقی صاحب، جناب علیم اختر خاں صاحب، جناب محمد اسلم صاحب، جناب اعجاز احمد صاحب، جناب مقتفی الدین خاں صاحب، جناب خلیل احمد صاحب (علیگ) (بھیونڈی) جناب شفیق احمد صاحب (بھیونڈی) جناب محمد خالد شیخ صاحب۔

ہم بمبئی اور بھیونڈی کے جملہ علی گڑھ کے قدیم طلبہ اور ہمدردان علی گڑھ کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں جنھوں نے ہمارے وفد کی پذیرائی کی اور علمی تعاون بھی عطا فرمایا۔ ہمیں امید ہے کہ ہر شہر کی علیگ برادری اسی طرح اپنی مادر علمی کو یاد رکھے گی اور بمبئی اور بھیونڈی کے بھائیوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تہذیب الاخلاق نشانات کی توسیع اشاعت میں حسب استطاعت حصہ لے گی۔

قوم کی بھلائی

پس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنو! اور اے میری قوم کے بچو! اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو، تاکہ اخیر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو آخیر ہے۔ اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے، آمین

سر سید

راحت ابرار

مسلم یونیورسٹی کے شب و روز

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ممتاز اولڈ بوائے اور جنگ آزادی کے عظیم رہنما راجہ مہندر پرتاپ سنگھ کا صد سالہ جشن انتہائی جوش و عقیدت کے ساتھ منایا گیا۔ اس موقع پر ایک تہنیتی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے اڑیسہ کے گورنر جناب بشمبر ناتھ پانڈے نے کہا کہ راجہ مہندر پرتاپ صحیح معنوں میں اس ادارے کے مایۂ ناز فرزند تھے۔ ان کی زندگی جد و جہد اور قربانی کی زندگی تھی، انھوں نے روسی انقلاب کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا اور ۱۹۱۵ء میں افغانستان میں ہندوستان کی آزاد حکومت کا اعلان کر دیا جس کے وہ صدر مقرر ہوئے۔

مسٹر پانڈے نے کہا کہ ہندوستان کی تاریخ کو ہمارے مورخوں نے فرقہ وارانہ بنیاد پر پیش کیا ہے اور ہماری دو نسلوں کے دماغ پراگندہ ہو گئے ہیں۔ نئے نئے دماغوں میں محبت کی جگہ نفرت بھری جاتی ہے جس کا نتیجہ ہے کہ آج ملک کو محفوظ رکھنے اور یک جہتی کا مسئلہ در پیش ہے۔ انھوں نے کہا کہ مذہب اسلام میں وہ ساری بنیادی چیزیں ہیں جو قومی یک جہتی کے لیے ضروری ہیں۔ انھوں نے قرآن و احادیث کی روشنی میں کئی مثالیں بھی پیش کیں۔ اورنگ زیب اور ٹیپو سلطان پر ہندو دشمنی کا الزام لگایا جاتا ہے جب کہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام بڑے مندروں کو جاگیریں اورنگ زیب نے ہی دی تھیں۔

گورنر موصوف نے کہا کہ سر سیّد احمد خاں نے عقل پسندانہ رویّہ یہاں اس ادارے کی بنیاد ڈالی اور ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا۔ آج سر سیّد کے مشن کو عام کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر پروفیسر وصی الرحمٰن نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ آج ہم اپنی ہی درس گاہ کے مثالی سپوت اور نڈر سپاہی کی سو سالہ تقریب منا رہے ہیں جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنے ملک پر نچھاور کر دیا اور وطن سے دور جا کر کابل میں جلا وطنی میں آزاد ہندوستان کا اعلان کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی تقسیم کے ساتھ ہی قومی یک جہتی کا مسئلہ بھی انتہائی پیچیدگی اختیار کر گیا ہے اور چند مفاد پرست عناصر کی جانب سے قومی یک جہتی میں رکاوٹیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ کہیں مذہب کہیں زبان اور کہیں علاقے کے نام پر عوام کے درمیان فاصلے پیدا کیے جا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مسلم یونیورسٹی ہندوستان کی واحد مثالی یونیورسٹی ہے جہاں تمام لوگ، خواہ وہ کسی بھی فرقے، علاقے یا ملک سے تعلق رکھتے ہوں، ایک ساتھ مل جل کر رہتے ہیں۔

پروفیسر وصی الرحمٰن نے کہا کہ مسلم یونیورسٹی نے جہاں تعلیمی اور ثقافتی میدان میں ملک کی شاندار خدمت کی ہے وہیں اس ادارے کے فرزندوں نے جنگ آزادی کو ایک نئی جان بخشی۔

نیشنل انٹیگریشن سمیتی کے نائب صدر پروفیسر شمیم احمد نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ ہندوستان میں صحیح سیکولرازم کے لیے لوگوں کے مزاج کو سمجھنا ہوگا اور مختلف تہذیبوں کو اہمیت دینی ہوگی۔ راجہ مہندر پرتاپ کی شاندار قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی زندگی سے سبق لینے اور ملک کے اتحاد اور سالمیت

کے لیے کام کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

فجی میں ہندوستان کے سابق سفیر کیپٹن بھگوان سنگھ نے کہا کہ راجہ مہیندر پرتاب اور مولوی برکت اللہ بھوپالی نے ترکستان جاکر انگریزوں کے خلاف جنگ کا فتویٰ حاصل کیا اور آزادی کا پرچم باہر کے ملکوں میں لہرایا۔ مگر آج ان مجاہدوں کو بھلا دیا گیا ہے۔ انھوں نے مورخوں سے اپیل کی کہ وہ دودھ پینے والے مجنوں کے علاوہ خون پینے والے مجنوں کے بھی کارناموں کو منظر عام پر لائیں۔

پروفیسر جی۔ کے۔ کھرانہ نے کہا کہ راجہ مہیندر پرتاپ ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۷ء تک اس ادارے کے طالب علم رہے اور یہاں رہ کر انھوں نے اسلامی تعلیم اور اس کی خوبیوں کو سمجھا اور مسلمانوں سے اچھے تعلقات قایم کیے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم ممالک میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔

اس موقع پر پروفیسر شان الحق حقی، پروفیسر رویندر بھرمرا اور اوشا رانی تومر نے بھی راجہ مہیندر پرتاپ کو خراج عقیدت پیش کیا۔

راجہ مہیندر پرتاب کی صد سالہ تقریب کے کنوینر اور مسلم یونیورسٹی کے ٹریژرار کنور عمار احمد خاں نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

—————

مسلمان اسی وقت معزز ہو سکتے ہیں جب خود ملت مضبوط اور مستحکم ہو۔ ہر شخص اپنے نقطۂ نظر سے سوچے تو کام نہیں چلے گا۔ اس لیے ہجرت کے پہلے سال ہی خدا نے وحی نازل کی تھی کہ اگر مسلمانوں نے اپنے ذاتی مفاد کو اجتماعی مفاد پر ترجیح دی تو صرف انھیں کا نہیں بلکہ ساری انسانیت کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔"

سید ابوالحسن علی ندوی

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پرسنٹیج کی بنیاد پر سربمہر ٹینڈرز مطلوب ہیں جو کہ ۹ ؍ دسمبر ۱۹۸۶ء ایک بجے دوپہر تک وصول کیے جائیں گے۔ ٹینڈرز اسی روز شام کو ۴ بجے کھول دیے جائیں گے۔ ٹینڈرز سے متعلق کاغذات کام کے دنوں میں کسی روز آفس ٹائم میں یونیورسٹی انجینئر کے دفتر سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

ٹینڈرز فارموں کی فروخت ٹینڈرز وصولیابی کی مقررہ تاریخ سے ۲۴ گھنٹے قبل بند کردی جائے گی۔

نمبر شمار	کام کا نام	ٹینڈر کے لیے مختص رقم	زر ضمانت	ٹینڈر کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱	اے/آر برائے یونیورسٹی بلڈنگس آف گروپ II-۱۰ اے ۱۲ ڈی ایس آر ۸۱ کی بنیاد پر	۴۱،۰۵۰.۰۰ روپے	۱،۹۵-- روپے	۵.۰۰ روپے	پانچ ماہ

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

یونیورسٹی انجینئر۔

(779/2023)

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پرسنٹیج کی بنیاد پر سربمہر ٹینڈرز مطلوب ہیں جو کہ ۹ ردسمبر ۱۹۸۶ء ایک بجے دوپہر تک وصول کیے جائیں گے۔ ٹینڈرز اسی روز شام کو ۴ بجے کھول دیے جائیں گے۔ ٹینڈرز سے متعلق کاغذات کام کے دنوں میں کسی بھی روز آفس ٹائم میں یونیورسٹی انجینئر کے دفتر سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ٹینڈرز فارموں کی فروخت ٹینڈرز وصولیابی کی مقررہ تاریخ سے ۲۴ گھنٹے قبل بند کر دی جائے گی۔

نمبر شمار	کام کا نام	ٹینڈر کے لیے مختص رقم	زر ضمانت	ٹینڈر کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱	اے/آر برائے یونیورسٹی بلڈنگس آف گروپ III- اے (۳) ڈی ایس آر ۸۱ کی بنیاد پر	۵۳،۱۲۰-۰۰ روپے	۱،۳۳۰-۰۰ روپے	۵-۰۰ روپے	چار ماہ

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

یونیورسٹی انجینئر

(747/1988)

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پرسنٹیج کی بنیاد پر سربمہر ٹینڈر مطلوب ہیں جو کہ ۹ ردسمبر ۸۶ ۱۹ء ایک بجے دوپہر تک وصول کیے جائیں گے۔ ٹینڈر اسی روز شام کو ۴ بجے کھول دیے جائیں گے۔ ٹینڈر سے متعلق کاغذات کام کے دنوں میں کسی بھی روز آفس ٹائم میں یونیورسٹی انجینئر کے دفتر سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

ٹینڈر فارموں کی فروخت ٹینڈرز کی وصولیابی کی مقررہ تاریخ سے ۲۴ گھنٹے قبل بند کردی جائے گی۔

نمبر شمار	کام کا نام	ٹینڈر کے لیے متعلق رقم	زر ضمانت	ٹینڈر کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱	اے/آر برائے یونیورسٹی بلڈنگس آف گروپ آئی۔ سی۔ (۱) ڈی۔ایس آر ۸۱ کی بنیاد پر	٦٣,٢٥٠.٠٠ روپے	١٥٨٥.٠٠ روپے	٥.٠٠ روپے	چار ماہ

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

یونیورسٹی انجینئر

(764/2008)

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پرسنٹیج کی بنیاد پر سربمہر ٹینڈرز مطلوب ہیں جو کہ ۹ ردسمبر ۱۹۸۶ء ایک بجے دوپہر تک وصول کیے جائیں گے۔ ٹینڈرز اسی روز شام کو ۴ بجے کھول دیے جائیں گے۔ ٹینڈر سے متعلق کاغذات کام کے دنوں میں کسی بھی روز آفس ٹائم میں یونیورسٹی انجینیر کے دفتر سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

ٹینڈر فارموں کی فروخت ٹینڈرز وصولیابی کی مقررہ تاریخ سے ۲۴ گھنٹے قبل بند کردی جائے گی۔

نمبر شمار	کام کا نام	ٹینڈر کے لیے مختص رقم	زر ضمانت	ٹینڈر کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱	اے/آر برائے یونیورسٹی بلڈنگس آف گروپ II-بی-(۱) ڈی ایس آر/۸۱ کی بنیاد پر	--/۶۳,۶۸۰ روپے	--/۱۵۹۵ روپے	--/۵ روپے	چار ماہ

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

یونیورسٹی انجینیر

(776/2020)

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پرسنٹیج کی بنیاد پر سربمہر ٹینڈرز مطلوب ہیں جو کہ ۹ دسمبر ۱۹۸۶ ایک بجے دوپہر تک وصول کیے جائیں گے۔ ٹینڈرز اسی روز شام کو ۴ بجے کھول دیے جائیں گے۔ ٹینڈرز سے متعلق کاغذات کام کے دنوں میں کسی بھی روز آفس ٹائم میں یونیورسٹی انجینئر کے دفتر سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

ٹینڈرز فارموں کی فروخت ٹینڈرز وصولیابی کی مقررہ تاریخ سے ۲۴ گھنٹے قبل بند کردی جائے گی۔

نمبر شمار	کام کا نام	ٹینڈر کے لیے مختص رقم	زر ضمانت	ٹینڈر کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱	اے/آر برائے یونیورسٹی بلڈنگس آف گروپ ’سی‘ (۲) ڈی ایس آر ۸۱ کی بنیاد پر	۵۵,۳۱۵.۰۰ روپے	۱,۳۸۵.۰۰ روپے	۵.۰۰ روپے	چار ماہ

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

یونیورسٹی انجینئر

(719/1960)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۶/ ۸۶ — ۸۷

درج ذیل جگہوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں

۱۔ ریسرچ ایسوسی ایٹس۔ (ہائی انرجی فزکس اینڈ تھیوریٹیکل نیوکلیر فزکس) (دو جگہیں) (عارضی)
(ڈی۔ ایس۔ اے پروگرام کے تحت)
ڈپارٹمنٹ:۔ فزکس
شرح تنخواہ:

	کیٹگری	رقم
	اے	۱۴۰۰۔۔۔۔ روپے ماہانہ
	بی	۱۶۰۰۔۔۔۔ روپے ماہانہ
	سی	۱۸۰۰۔۔۔۔ روپے ماہانہ
	ڈی	۲۰۰۰۔۔۔۔ روپے ماہانہ

قابلیت (برائے ہائی انرجی فزکس)
۱۔ لازمی:۔ ایکسپیریمنٹل ہائی انرجی فزکس (ایکسن) میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اس کے مساوی اعلیٰ معیار کا تحقیقی کام
۲۔ پسندیدہ:۔ تدریس کا کچھ تجربہ۔

قابلیت:۔ (برائے تھیوریٹیکل نیوکلیر فزکس)
۱۔ لازمی:۔ تھیوریٹیکل نیوکلیر فزکس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اس کے مساوی اعلیٰ معیار کا تحقیقی کام
۲۔ پسندیدہ۔ تدریس کا کچھ تجربہ۔

۲۔ فورمین [ایک جگہ] [مستقل]
ڈپارٹمنٹ: کیمیکل انجینیرنگ۔
شرح تنخواہ:۔ ۵۵۰۔ ۲۵۔ ۷۵۰۔ ای۔ بی۔ ۳۰۔ ۹۰۰روپے اور الاؤنسز۔

قابلیت:

۱۔ لازمی ۔ متعلقہ برانچ میں ڈپلومہ کے ساتھ مختلف کیمیکل انجینیئرنگ کی تجربہ گاہوں میں تجربوں کے انتظام اور اہتمام کا آٹھ سالہ تجربہ۔

۲۔ پسندیدہ۔ سائنس مضمون میں گریجویٹ ہونے کے ساتھ مصنوعی اشیاء بنانے، تجربے کے لیے آلات نکالنے اور ان کو چالو کرنے اور کیمیائی تجربوں کے لیے استعمال ہونے والی اشیاء کے طریقہ کار کا تجربہ۔ ایسے امیدوار کو ترجیح دی جائے گی جو خراد اور دوسری ورکشاپ کی مشینوں پر کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ غیر معمولی حالات میں وسیع مدتی اور مخصوص تجربے کے حامل امیدوار کے لیے قابلیت میں کچھ چھوٹ دی جا سکتی ہے۔

نوٹ:۔ موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل امتحان سے گزرنا ہوگا۔

۳۔ سینئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (تھیٹر) (ایک جگہ) (مستقل)

ڈپارٹمنٹ:۔ آپتھلمالوجی۔

شرح تنخواہ۔ ۵۵۰۔ ۲۵۔ ۷۵۰۔ ای بی۔ ۳۰۔ ۹۰۰ روپے اور الاؤنسز۔

قابلیت:

۱۔ لازمی ۔ بی۔ ایس سی یا اس کے مساوی ڈگری اور ساتھ ہی نرسنگ میں ڈپلوما سرٹیفکٹ۔ کسی معروف آنکھوں کے اسپتال یا میڈیکل کالج میں تھیٹر ٹیکنیشین کی حیثیت سے کام کرنے کا کافی تجربہ۔

یا

سائنس کے ساتھ انٹرمیڈیٹ یا اس کے مساوی کوئی امتحان پاس کیا ہو اور اس کے ساتھ ہی ساتھ نرسنگ میں ڈپلوما سرٹیفکٹ ہو۔ تھیٹر اسسٹنٹ ٹیکنیشین کی حیثیت سے دو سال کام کرنے کا تجربہ ہو۔ یا کسی معروف آنکھوں کے اسپتال / میڈیکل کالج میں چار سال کا عملی تجربہ ہو۔

۲۔ پسندیدہ۔ او۔ ٹی میں اور خصوصی طور پر کسی دیہی آئی ریلیف کیمپ میں کام کا تجربہ ہو۔

نوٹ: منتخب امیدوار کو ۲۰۔ نکاتی پروگرام کے تحت دیہی آئی ریلیف کیمپ میں کام کرنا ہوگا

۴۔ سینٹری انسپکٹر (ایک جگہ) (مستقل)

ڈپارٹمنٹ: یونیورسٹی ہیلتھ آفیسر کے آفس میں۔

شرح تنخواہ۔ ۴۲۵۔ ۱۵۔ ۵۶۰۔ ای بی۔ ۲۰۔ ۷۰۰ روپے اور الاؤنسز۔

قابلیت:۔ کسی تسلیم شدہ ادارے سے سینٹری انسپکٹر کا سرٹیفکٹ یا اس کے مساوی کوئی امتحان پاس کیا ہو۔ اور ساتھ ہی ساتھ کسی میونسپلٹی میں کام کا دو سال کا تجربہ ہو۔

۵۔ ڈرافٹس مین (ایک جگہ) (مستقل)

ڈپارٹمنٹ :۔ کیمیکل انجینئرنگ ۔
شرح تنخواہ :۔ ۳۸۰ - ۱۲ - ۵۰۰ - ای - بی - ۱۵ - ۵۶۰ روپے اور الاؤنسز ۔
قابلیت ۔

۱۔ لازمی ۔ ڈرافٹس مین شپ میں سرٹیفکٹ اور ڈرائنگ، ٹریننگ اور متعلقہ آلات اور مشینری کو چلانے کا تین سال کا تجربہ بھی ہو ۔

یا

مکینکل انجینئرنگ میں ڈپلوما حاصل کیا ہو اور ساتھ ہی ساتھ ڈرائنگ / ٹریننگ اور متعلقہ آلات اور مشینوں اچھی معلومات اور طریقہ، استعمال سے واقفیت ہو ۔

۲۔ پسندیدہ :۔ ڈرائنگ پروسس ایکوپمنٹس کا تجربہ اور کسی کیمیکل انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ میں کام کرنے کا تجربہ باعث ترجیح ہوگا ۔

نوٹ :۔ غیر معمولی حالات میں اگر امیدوار طویل اور خصوصی تجربے کا حامل ہو تو قابلیت کے معاملے میں رعایت دی جاسکتی ہے ۔

۶۔ کارپینٹر مستری (ایک جگہ) (مستقل)
ڈپارٹمنٹ :۔ بلڈنگ ڈپارٹمنٹ ۔
شرح تنخواہ ۔ ۲۶۰ - ۸ - ۳۰۰ - ای - بی - ۸ - ۳۴۰ - ۱۰ - ۳۸۰ - ای - بی - ۱۰ - ۴۲۰ روپے اور الاؤنسز
قابلیت ۔ متعلقہ میدان میں آئی - ٹی - آئی اور پانچ سال کا تجربہ ۔ یا
پڑھا لکھا اور ۱۰ سال کا تجربہ

نوٹ :۔ امیدوار کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل امتحان دینا ہوگا ۔

اعلیٰ قابلیت اور تجربے کے حامل افراد کو ابتداء سے اعلیٰ تنخواہ دی جاسکتی ہے ۔ وہ امیدوار جن کو انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا ان کو صرف ایک طرف کا سکنڈ کلاس ریلوے کا سنگل کرایہ بطور ٹی ۔ اے دیا جائے گا ۔

مقررہ درخواست فارم اور ان سے متعلق ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے یہاں سے پانچ روپے [صرف اسامی لئیر کے لیے] اور تین روپے باقی ماندہ اسامیوں کے لیے فنانس آفس کے کیش سیکشن میں نقد جمع کرکے یا اسی قیمت کا پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو بھیج کر حاصل کرسکتے ہیں ۔

فارم ڈاک سے منگانے کی صورت میں ۱۰×۲۲ سینٹی میٹر کا ٹکٹ چسپاں اور اپنا پتہ لکھا ہوا لفافہ بھی ارسال کریں ۔

درخواستوں کی وصولیابی کی آخری تاریخ ۴ دسمبر ۱۹۸۶ء (آفس ٹائم تک) ہے ۔
نامکمل اور تاخیر سے وصول ہونے والی درخواستیں ناقابل قبول ہوں گی ۔

سید شاہد علی
رجسٹرار

(707/1903)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۷/ ۸۶-۸۷

درج ذیل جگہوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ لائبریرین (ایک جگہ) (مستقل)
ڈپارٹمنٹ:۔ مولانا آزاد لائبریری
شرح تنخواہ:۔ ۱۵۰۰-۶۰-۱۸۰۰-۱۰۰-۲۰۰۰-۱۲۵/۲-۲۵۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت:۔ الف۔ فرسٹ یا سکنڈ کلاس میں ایم لب ایس سی

یا

ایم۔اے/ایم ایس سی/ایم کام اور ساتھ میں فرسٹ یا سکنڈ کلاس بی۔لب ایس سی یا لائبریری سائنس میں ڈپلوما۔

ب۔ بحیثیت لائبریرین دس سال کا تجربہ یا کسی یونیورسٹی لائبریری پروفیشن میں ذمہ دارانہ حیثیت سے کام کرنے کا تجربہ۔

ج۔ متعلقہ پروفیشن فیلڈ میں پی ایچ ڈی یا اس کے مساوی کوئی تحقیقی کام

د۔ مخصوص حالات میں اکیڈمک لائبریریز/ٹریننگ ان کمپیوٹرائزیشن/انفارمیشن ٹیکنالوجی/اسپیشلائزڈ ایریاز میں تجربہ پیش نظر رکھا جاسکتا ہے۔

۲۔ پرنسپل (ایک جگہ) (مستقل)۔ ۱۰+۲ سسٹم۔
شرح تنخواہ۔ ۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت۔ الف۔ ا۔ ماسٹرز ڈگری یا کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے ایسی آنرز ڈگری جو یو۔جی۔سی کے تحت کسی ہندوستانی یونیورسٹی کی ماسٹرز ڈگری کے مساوی تسلیم کی گئی ہو۔ یا ایسی ہندوستانی

یونیورسٹیز کی آنرز ڈگری جو کہ یو۔پی۔ایس۔سی کے نزدیک ماسٹرز ڈگری کے مساوی تسلیم کی جاتی ہو۔

۲۔ تدریس میں ڈگری یا ایجوکیشن میں ڈپلوما ہو یا ان کے مساوی کوئی قابلیت ہو اور درج ذیل میں سے کسی ایک میں تجربہ ہو۔

ا۔ کسی تسلیم شدہ کالج۔انٹرمیڈیٹ یا ہائر کلاسز۔ میں انتظامی امور کا تین سال کا تجربہ ہو۔

ب۔ کسی تسلیم شدہ ہائی اسکول میں انتظامی امور کا کم از کم پانچ سال کا تجربہ۔

ت۔ کسی تسلیم شدہ کالج یا ہائر سکنڈری اسکول میں تدریس کا کم از کم پانچ سال کا تجربہ یا کسی ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوشن میں اس کے مساوی تدریس کا تجربہ۔

ث۔ کسی تسلیم شدہ ہائر سکنڈری اسکول میں تدریس کا کم از کم آٹھ سال تدریس کا تجربہ۔

ج کسی تسلیم شدہ ہائی اسکول یا ہائر سکنڈری اسکول یا ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوشن میں کام کا پانچ سال کا تجربہ۔ جن میں تعلیمی انتظامات کا تین سال اور تدریس کا دو سال کا تجربہ ہو۔

یا

ب۔ بیچلر آف انجینئرنگ اور ساتھ ہی ساتھ کسی تسلیم شدہ کالج یا ہائی سکنڈری اسکول میں پانچ تدریس کا تجربہ۔

یا

ج کسی منظور شدہ ہائی اسکول کا ٹرینڈ گریجویٹ ہیڈ، جس کی عمر ۴۵ سے کم نہ ہو اور کسی تسلیم شدہ ہائی / ہائر سکنڈری اسکول میں سکنڈری کلاسز کی تدریس کا کم از کم ۱۵ سال کا تجربہ ہو (پندرہ سال میں سے پانچ سال کسی تسلیم شدہ ہائی اسکول کے ہیڈ کی حیثیت سے انتظامی امور کا تجربہ ہو)۔

یا

د ایسے حضرات جو ماسٹرز ڈگری رکھتے ہوں اور کسی تسلیم شدہ ہائر سکنڈری اور یا کسی تسلیم شدہ کالج میں پندرہ سال کا تدریسی تجربہ رکھتے ہوں اور جن کی عمر ۴۵ سال سے کم نہ ہو

یا

ہ ایسے ٹرینڈ پوسٹ گریجویٹ حضرات جو کسی تسلیم شدہ مڈل اسکول کے ہیڈ ہوں اور بحیثیت ہیڈ کے کم از کم آٹھ سال کسی تسلیم شدہ مڈل اسکول میں انتظامی امور کا تجربہ رکھتے ہوں۔

یا

وہ حضرات جو ایجوکیشن میں ماسٹرز ڈگری رکھتے ہوں اور ساتھ ہی ساتھ کلاز ا تا ہ میں سے کسی ایک مطلوبہ شرط کو پورا کرتے ہوں۔

نوٹ:۔ دو یا دو سے زیادہ اقسام کے تجربوں کو تناسب سے ملایا جاسکتا ہے، (الف) کے ۳ (ت) اور (ث) کو 8:5 یا 5:8 کی نسبت سے، جیسا کہ معلوم ہو، ملایا جاسکتا ہے۔

۳- پوسٹ گریجویٹ ٹیچرس (مستقل) ۱۰+۲ سسٹم ۷۵

۱-	انگریزی	۶ جگہیں	(۲- مستورات کے لیے)
۲-	اردو	۲ جگہیں	(۱- مستورات کے لیے)
۳-	ہندی	۲ جگہیں	(۱- مستورات کے لیے)
۴-	میتھے میٹکس	۵ جگہیں	(۲- مستورات کے لیے)
۵-	فزکس	۵ جگہیں	(۲- مستورات کے لیے)
۶-	کیمسٹری	۵ جگہیں	(۲- مستورات کے لیے)
۷-	بایولوجی	۵ جگہیں	(۲- مستورات کے لیے)
۸	اکونومکس	۳ جگہیں	(۱- مستورات کے لیے)
۹-	کامرس	۲ جگہیں	—
۱۰-	تاریخ	۱ جگہ	—
۱۱-	جغرافیہ	۱ جگہ	—
۱۲-	عربی	۱ جگہ	—
۱۳-	فارسی	۱ جگہ	—
۱۴-	سنسکرت	۱ جگہ	—

شرح تنخواہ - ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز

قابلیت - یکساں اچھے تعلیمی رکارڈ کے ساتھ فرسٹ ڈویژن یا پھر کم ازکم گڈ سکنڈ ڈویژن (سیون پوائنٹ اسکیل میں سی) متعلقہ مضمون میں ماسٹرز ڈگری۔

نوٹ:- وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۴۹/۸۴ - ۸۵ مورخہ ۱۵ جنوری ۸۵ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں، ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ موزوں پائے گئے تو ان کی پہلی درخواستوں کی بنیاد پر ہی ان کو امیدوار تصور کیا جائے گا۔ بہرحال ان کو سادہ کاغذ پر اپنا جدید بائیو ڈیٹا بھیج دینا چاہیے۔

۴- نرسنگ آفیسر (ایک جگہ) (مستقل)

ڈپارٹمنٹ:- یونیورسٹی ہیلتھ سروس

شرح تنخواہ:- ۵۵۰ - ۲۰ - ۶۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ روپے اور دیگر الاؤنسز

قابلیت:-

۱- لازمی- مڈوائفری اور جنرل نرسنگ میں سرٹیفکیٹ اور کسی ریاستی میڈیکل کونسل میں رجسٹریشن تسلیم شدہ سسٹر ٹیوٹر یا نرسنگ ایڈمنسٹریشن کورس میں سرٹیفکیٹ۔ نرسنگ کا سات سال کا تجربہ

ii پسندیدہ:- دو یا دو سال سے زیادہ کا انتظامی تجربہ۔

نوٹ:- مرد اسٹاف کو ترجیح دی جائے گی۔

۵- سینیئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (فزیوتھراپسٹ) (ایک جگہ) (مستقل)۔

ڈپارٹمنٹ:- میڈیکل کالج اسپتال۔

شرح تنخواہ:- ۵۵۰-۲۵-۷۵۰ ای-بی ۳۰-۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز

قابلیت- میٹرکولیشن یا اس کے مساوی۔ کسی تسلیم شدہ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ سے فزیوتھراپی میں ڈپلوما یا اس کے مساوی کوئی قابلیت۔ متعلقہ موضوع میں تین سال کا تجربہ۔ (ii) ایپلائنس میں ایک سال کا تجربہ۔

۶- سیکورٹی انسپکٹر- (دو جگہیں) (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید)

پروکٹر آفس۔

شرح تنخواہ:- ۵۵۰-۲۵-۷۵۰- ای-بی- ۳۰-۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز

قابلیت-

i- لازمی- بیچلرز ڈگری

ریٹائرڈ ایس ایچ او/انسپکٹر (پولیس) ملٹری یا دیگر پیراملٹری آرگنائزیشن کے ریٹائرڈ یا اس سے سبکدوش کیے جانے والے جونیئر کمیشنڈ کے عہدے کے افسران یا ان کے مساوی۔ واچ اینڈ وارڈ کا دس سال کا تجربہ۔

ii پسندیدہ:-

اچھا سروس ریکارڈ، اعلیٰ شخصیت اور عمدہ صحت جو دوسروں کو متاثر کر سکے ان سے عزت و احترام حاصل کر سکے اور ان کی رہنمائی کر سکے، فوج میں جونیئر کمیشنڈ افسر کے درجے کا یا نیم فوجی تنظیم سے وابستگی ترجیح ہوگی۔

۷- فارمیسسٹ (۶ جگہیں) (مستقل)

ڈپارٹمنٹ:- جے-این میڈیکل کالج اسپتال

شرح تنخواہ- ۳۳۰-۱۰-۳۸۰- ای بی ۱۲-۵۰۰-ای بی ۱۵-۵۶۰ روپے اور دیگر الاؤنسز

قابلیت میٹرکولیٹ یا اس کے مساوی۔ فارمیسی میں ڈپلوما سرٹیفکیٹ۔ کسی صوبے میں رجسٹریشن کا سرٹیفکیٹ۔ فارمیسسٹ کی حیثیت سے کام کرنے کا تین سال کا عملی تجربہ۔

۸- جونیئر لیباریٹری اسسٹنٹ (انسٹرومینٹیشن) (ایک جگہ) (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید)

ڈپارٹمنٹ۔ یونیورسٹی پالی ٹیکنک۔
شرح تنخواہ۔ ۲۶۰۔ ۸۔ ۳۰۰۔ ای بی ۸۔ ۳۴۰۔ ۱۰۔ ۳۸۰۔ ای بی ۱۰۔ ۴۳۰ روپے مع اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت ۱۔ لازمی۔ سائنس کے مضامین کے ساتھ میٹرک یا اس کے مساوی
۲۔ پسندیدہ۔ متعلقہ میدان میں تجربہ۔
نوٹ۔ موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل امتحان دینا ہوگا۔

۹۔ ٹریکٹر ڈرائیور (ایک جگہ) (مستقل)
ڈپارٹمنٹ:۔ بلڈنگ ڈپارٹمنٹ۔
شرح تنخواہ۔ ۲۶۰۔۶۔ ۲۹۰۔ ای بی۔ ۶۔ ۳۲۶۔ ۸۔ ۳۶۶۔ ای بی ۸۔ ۳۹۰۔۱۰۔۴۰۰ روپے اور الاؤنسز
قابلیت پڑھا ہونا چاہیے۔ اور لاگ بک بھرنے کی صلاحیت ہو۔ بھاری گاڑی چلانے کا باضابطہ لائسنس ہو۔
اور ساتھ ہی ساتھ ٹریکٹر اور خصوصاً روڈ رولر چلانے کا پانچ سال کا تجربہ ہو۔
عمر۔ ۲۵ سے ۴۰ سال کے درمیان۔
نوٹ۔ امیدواروں کو انٹرویو سے پیشتر ایک پریکٹیکل امتحان دینا ہوگا۔

غیر معمولی تجربے اور اعلیٰ استعداد کے حامل افراد کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے نوازا جا سکتا ہے۔
جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا ان کو بطور ٹی۔اے ریلوے کے سکنڈ کلاس کا یک طرفہ سنگل کرایہ دیا جائے گا۔

درخواست دینے کے لیے مجوزہ فارم اور دیگر ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) کے یہاں سے ۵/- روپے (برائے اسامی ۱ تا ۲) اور تین روپے (باقی ماندہ اسامیوں کے واسطے) نقد ادائیگی فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ یا بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر جو کہ فنانس آفیسر اے۔ ایم۔ یو کے نام واجب الادا ہو بذات خود یا ۱۰×۲۳ سینٹی میٹر کا ایسا لفافہ جس پر اپنا پتہ تحریر ہو اور مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہوں بھیج کر بذریعہ ڈاک حاصل کر سکتے ہیں۔
درخواستوں کی وصولیابی کی آخری تاریخ ۸ ار دسمبر ۱۹۸۶ء (آفس ٹائم تک) ہے۔
نامکمل اور تاخیر سے ملنے والی درخواستیں ناقابل قبول ہوں گی۔

سید شاہد علی
رجسٹرار

(821/2186)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نوٹس

تمام ایسے اہل پرائیویٹ اور ایکس اسٹوڈنٹس جو کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ۱۹۸۷ء کے درج ذیل امتحانات میں شرکت کے خواہش مند ہوں، ان کو صلاح دی جاتی ہے کہ وہ اپنی درخواستیں مقررہ فارموں پر مکمل طور پر بھر کر اور ساتھ میں مقررہ فیس اور دوسرے مطلوبہ کاغذات کے ساتھ کنٹرولر آف دی اگزامینیشنز کے دفتر میں ان مقررہ تاریخوں تک یا اس سے قبل جو ہر کورس کے سامنے مندرج ہیں، جمع کر دیں۔

درخواستیں کالم نمبر ۴ میں دی گئی تاریخوں تک ۱۰ روپے تاخیر فیس کے ساتھ قبول کی جاسکیں گی۔

نمبر شمار	امتحان کا نام	امتحان فارم اور فیس کی وصولیابی کی آخری تاریخ۔ بغیر لیٹ فیس	لیٹ فیس کے ساتھ
۱	۲	۳	۴
	برائے پرائیوٹ / سابق طلباء		
۱	بی اے / بی ایس سی / بی کام (آنرز) پارٹ III (اولڈ کورس)	۳۱ر دسمبر ۱۹۸۶ء	۱۵ر جنوری ۱۹۸۷ء
۲۔	ہائی اسکول (صرف دیفنس پرائیوٹ امیدوار)	۱۵ر جنوری ۱۹۸۷ء	۳۱ر جنوری ۱۹۸۷ء
۳۔	سکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ کورس (کلاس ۹-۱۰)	۱۵ر جنوری ۱۹۸۷ء	۳۱ر جنوری ۱۹۸۷ء
۴۔	سینیر سکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ کورس (پارٹ I / II)	۱۵ر جنوری ۱۹۸۷ء	۳۱ر جنوری ۱۹۸۷ء
۵	بی۔اے / بی۔ایس سی / بی۔کام (آنرز) پارٹ I (نئی اسکیم)	۱۵ر جنوری ۱۹۸۷ء	۳۱ر جنوری ۱۹۸۷ء

۱	۲	۳	۴
۶۔	بی اے / بی ایس سی / بی کام (آنرز) پارٹ II (نئی اسکیم)	۱۵ر جنوری ۱۹۸۷ء	۳۱ر جنوری ۱۹۸۷ء
۷	ایم اے / ایم ایس سی / ایم کام (فائنل)	۱۵ر جنوری ۱۹۸۷ء	۳۱ر جنوری ۱۹۸۷ء
۸	بی. ٹی ایچ (پریویس / فائنل ایم. ٹی ایچ (پریویس)	۱۵ر جنوری ۱۹۸۷ء	۳۱ر جنوری ۱۹۸۷ء
۹	سکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ / سینیر سکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ (کلاس ۱۱ ویں ۱۲ ویں بی اے پارٹ I / II صرف انگریزی میں	۱۵ر جنوری ۱۹۸۷ء	۳۱ر جنوری ۱۹۸۷ء
۱۰۔	بی. اے پارٹ ۱ / ۱۱		
۱۰	ایم ایس سی / ایم ایس سی / ایم کام (پریویس)	یکم فروری ۱۹۸۷ء	۱۵ر فروری ۱۹۸۷ء

صرف سابقہ طلباء کے لیے

۱	۲	۳	۴
۱۱۔	بی۔ ای۔ (فائنل)	۱۵ر دسمبر ۱۹۸۶ء	۳۰ر دسمبر ۱۹۸۶ء
۱۲۔	ایم۔ بی۔ اے سکنڈ ایر	۱۵ر جنوری ۱۹۸۷ء	۳۱ر جنوری ۱۹۸۷ء
۱۳۔	بی۔ لب۔ ایس سی / ایم لب ایس سی	۱۵ر جنوری ۱۹۸۷ء	۳۱ر جنوری ۱۹۸۷ء
۱۴۔	فائنل ایر ڈپلوما کورسز (برائے خواتین)	۱۵ر جنوری ۱۹۸۷	۳۱ر جنوری ۱۹۸۷ء
۱۵	فائنل ایر ڈپلوما اِن انجینئرنگ کورسز (لڑکوں کے لیے)	۱۵ر جنوری ۱۹۸۷ء	۳۱ر جنوری ۱۹۸۷ء
۱۶۔	ایل ایل بی / ایل ایل ایم	۱۵ر جنوری ۱۹۸۷ء	۳۱ر جنوری ۱۹۸۷ء
۱۷۔	ایم سی اے / I / II ایر	۱۵ر جنوری ۱۹۸۷ء	۳۱ر جنوری ۱۹۸۷ء
۱۸	پی ڈی سی اے	۱۵ر جنوری ۱۹۸۷ء	۳۱ر جنوری ۱۹۸۷ء
۱۹۔	پری۔ طب (I ایر) / بی یو ایم ایس I / II / III / IV / V پروفیشنل	۱۵ر جنوری ۱۹۸۷ء	۳۱ر جنوری ۱۹۸۷ء
۲۰۔	بی۔ ای I / II / III ایر	یکم فروری ۱۹۸۷ء	۱۵ر فروری ۱۹۸۷ء
۲۱۔	I / II ایر ڈپلوما اِن انجینئرنگ کورسز (لڑکوں کے لیے)	یکم فروری ۱۹۸۷ء	۱۵ر فروری ۱۹۸۷ء

۱	۲	۳	۴
۲۲ -	I/II ڈپلوما کورسز (لڑکیوں کے لیے)	یکم فروری ۱۹۸۷ء	۱۵ر فروری ۱۹۸۷ء
۲۳ -	سرٹیفکیٹ ان ڈرافٹس مین شپ I/II ایر	یکم فروری ۱۹۸۷ء	۱۵ر فروری ۱۹۸۷ء
۲۴	ڈپلوما ان ڈرافٹنگ اینڈ ڈیزائنگ	یکم فروری ۱۹۸۷ء	۱۵ر فروری ۱۹۸۷ء
۲۵	بی ایس سی (انجینیرنگ) I/II/III/IV/V ایر	یکم فروری ۱۹۸۷ء	۱۵ر فروری ۱۹۸۷ء
۲۶ -	ڈی بی اے / ڈی ایس ڈبلیو	یکم فروری ۱۹۸۷ء	۱۵ر فروری ۱۹۸۷ء
۲۷ -	بی-ایڈ / ایم-ایڈ	یکم فروری ۱۹۸۷ء	۱۵ر فروری ۱۹۸۷ء
۲۸ -	ایم-بی-اے I ایر	یکم فروری ۱۹۸۷ء	۱۵ر فروری ۱۹۸۷ء

امتحان فارم اور دوسری متعلقہ معلومات کنٹرولر آف دی ایگزامینیشن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دفتر سے بغیر قیمت کے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

اگر امتحانات کے فارم رجسٹرڈ ڈاک سے حاصل کرنا چاہتے ہوں تو اس کے لیے ۱۰×۲۲ سینٹی میٹر سائز کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور ۵۰-۴ کے ڈاک ٹکٹ چسپاں ہوں، بھیج کر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

فارم کے حصول کے لیے درخواست پر امتحان کا نام جس میں شرکت کے خواہش مند ہوں، کیٹیگری جیسے کہ سابق طالب علم یا ٹیچر امیدوار یا خواتین امیدوار ہونے کی صورت میں، جو بھی صورت حال ہو وہ صاف صاف تحریر کریں۔

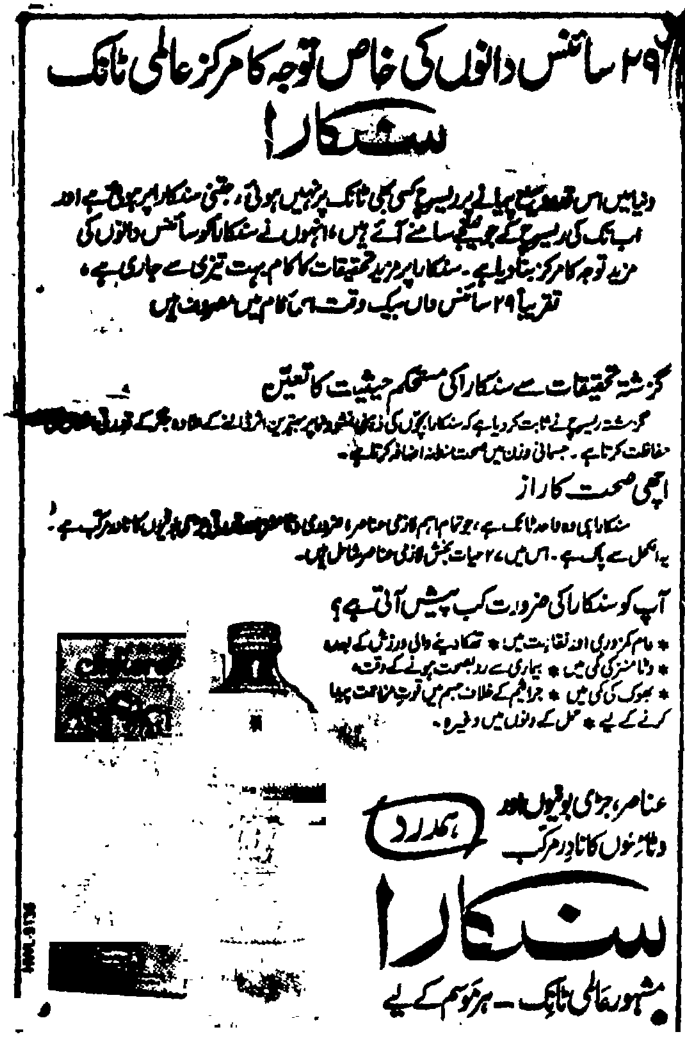
مقررہ تاریخ نکلنے کے بعد موصول ہونے والے امتحانات کے فارم قابل قبول نہ ہوں گے اور نہ ان کے سلسلے میں آئندہ کوئی خط و کتابت ہی کی جا سکے گی۔

این۔ موئیدین
کنٹرولر امتحانات و داخلہ

(818/2157)



بہار نو بے بی ٹانک
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے اور دانت نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
دماغین
تمام دماغی کام کرنیوالوں کے لئے نایاب تحفہ
شربت نزلہ
کھانسی
زکام۔ نزلہ کے لئے
خون صفا
خون کی خرابی پھوڑے پھنسی خارش اور داد وغیرہ کی دوا
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یوپی


۲۹ سائنس دانوں کی خاص توجہ کا مرکز عالمی ٹانک
سنکارا
دنیا میں اس قدر وسیع پیمانے پر ریسرچ کسی بھی ٹانک پر نہیں ہوئی، جتنی سنکارا پر ہوئی ہے اور اب تک کی ریسرچ کے جو نتیجے سامنے آئے ہیں، انھوں نے سنکارا کو سائنس دانوں کی مزید توجہ کا مرکز بنا دیا ہے۔ سنکارا پر مزید تحقیقات کا کام بہت تیزی سے جاری ہے۔ تقریباً ۲۹ سائنس داں بیک وقت اس کام میں مصروف ہیں
گزشتہ تحقیقات سے سنکارا کی مستحکم حیثیت کا تعین
اچھی صحت کا راز
آپ کو سنکارا کی ضرورت کب پیش آتی ہے؟
عناصر، جڑی بوٹیوں اور وٹامنوں کا نادر مرکب
ہمدرد
سنکارا
مشہور عالمی ٹانک — ہر موسم کے لیے